سنگلاخ چٹانوں سے ٹکرانے والے اور طوفانوں سے الجھنے والے وحشی نوجوان کی داستان

دیوتا

مکمل ناول

مصنف: طاہر جاوید مغل

میں نے زندگی میں بہت سے ناولز پڑھے ہوں گے یہ ایسا ناول ہے جو تین دن میں پڑھا لیکن شاید اس کے سحر سے تین سال نا نکل سکوں (وقار عظیم پاکستانی پوائنٹ)

عرضِ مصنف

جس وقت میں نے "اباقہ" شروع کی مجھے اسی وقت محسوس ہونے لگا تھا

کا فن آتا ہے۔ رنگوں

کی اس کہانی کی بنیاد اس

اور کہانی بنتے ہوئے وہ تخیل

لے آتا ہے اور تخیل کا حقیقت

منگولوں کے مظالم، خوارزم شاہ

اور اہل دین کی کوتاہ بینی، خوقند اور

نے اس کہانی کو دلچسپ اور گھمبیر بنا

ئی یہ ست رنگیا کہانی طاہر کی ذہانت اور

رفیق ڈوگر

وہ بلندی پر کھڑا تھا۔ اُس کے بڑے بڑے بال شانوں پر لہرا رہے تھے۔ لباس بوسیدہ تھا اور جسم پر مہینوں کی گرد جمی ہوئی تھی۔ وہ ساکت تھا .... بالکل بے حس و حرکت۔ صرف اُس کی آنکھیں متحرک تھیں۔ وہ اپنے سامنے ایک عجیب و غریب منظر دیکھ رہا تھا۔ ایک وسیع و عریض میدان میں حدِ نگاہ تک خیموں کا ایک جہاں آباد تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے خیموں کا ایک سمندر ہے جو اُفق تا اُفق پھیلا ہوا ہے، سینکڑوں نہیں، ہزاروں نہیں یہ لاکھوں خیمے تھے اور ان خیموں کے درمیان ایک بہت بڑا پرچم کافی بلندی پر لہرا رہا تھا۔ میلوں دور سے دیکھا جا سکتا تھا۔ اس پرچم پر یاک کی نو دمیں بنی ہوئی تھیں .... ہاں یہی پرچم تھا جس کے زیر سایہ چلنے والا وحشی تاتاریوں کا ٹڈی دل دنیا کے ایک بڑے حصے کو خاک و خون میں ڈبو چکا تھا۔ یہ خانِ اعظم چنگیز خاں کا پرچم تھا۔ دہشت و بربریت، قتل و غارت گری کی علامت یہ پرچم، قراقرم کی ہواؤں میں کسی عفریت کی طرح پھڑپھڑا رہا تھا۔ اجنبی نے اس پرچم پر نگاہیں مرکوز کیں۔ غروب ہوتے ہوئے سورج کی سرخی اُس کے چہرے پر منعکس ہو رہی تھی۔ وہ چند لمحے ٹکٹکی باندھے اس پرچم کو گھورتا رہا تب اُس کی نگاہ ایک بار پھر خیموں کے اس عظیم الشان شہر کا طواف کرنے لگی۔

خانِ اعظم چنگیز خاں مر چکا تھا اور اب اُس کی اولاد نئے خاقان کا انتخاب کرنے کے لئے قراقرم (سیاہ ریت کا شہر) میں جمع ہوئی تھی۔ خانِ اعظم کی موت کے بعد یہ پہلی قرولتائی (مجلس مشاورت) تھی۔ اس قرولتائی میں شرکت کے لئے دنیا کے دور دراز علاقوں سے وفود پہنچے تھے۔ بڑے بڑے سردار، شہزادے اور علاقوں کے حکمران کئی دنوں سے یہاں خیمے ایستادہ کئے ہوئے تھے۔ ایشیائے کوچک اور مشرقی یورپ کے مفتوحین اور دور افتادہ علاقوں کی اہم شخصیات یہاں موجود تھیں۔ ان میں سے بہت سوں کو آنا پڑا تھا اور بہت سے اس لئے آئے تھے تاکہ مستقبل کے فرمانرواؤں کو اپنی فرمانبرداری اور اطاعت گزاری کا یقین دلا سکیں۔ اس اجتماع میں دنیا کے سب سے بڑے فرمانروا کا انتخاب ہونے والا تھا۔ خانِ اعظم کا بڑا بیٹا جوجی تو خانِ اعظم سے پہلے ہی مر کر "نیلے جاودانی آسمان" کے اُس پار پہنچ چکا تھا۔ اب اس کے تین بیٹے تھے۔ سب سے بڑا چغتائی منجھلا اوغدائی اور چھوٹا

توالی۔ ان میں سے مستقبل کا حکمران کون ہو گا؟ کون خاقان کا لقب اختیار کرے گا؟ یہ سوال سب کے لئے اہم تھا۔ ہر کوئی آنے والے وقت کا منتظر تھا۔ خیموں کا یہ عظیم الشان شہر اپنے خاقان کا منتظر تھا۔ اس یادگار جشن طرب کا منتظر تھا جو خاقان کے انتخاب کے بعد برپا ہونا تھا۔ ہزاروں لاکھوں انسان حشرات الارض کی طرح ان خیموں کے درمیان گھومتے دکھائی دے رہے تھے۔ بچے بوڑھے جوان ان میں سب شامل تھے۔ شام کے کھانے کی تیاری ہو رہی تھی۔ فضا میں گوشت کی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ ہزاروں بھیڑیں بھونی جا رہی تھیں۔ آگ کا ہلکا ہلکا دھواں فضا میں پھیل رہا تھا۔

.... اور کچھ ایسا ہی دھواں اجنبی کے سینے میں بھی بھر رہا تھا۔ اُسے لگ رہا تھا جیسے اندر ہی اندر کوئی چنگاری سلگ رہی ہے' وہ کچھ دیر اور خیموں کے اس شہر کو دیکھتا رہا تو یہ چنگاری بھک سے ایک شعلے میں تبدیل ہو جائے گی۔ اس نے اپنا رخ پھیر لیا۔ اب اس کے سامنے خیمے نہیں تھے۔ حدِ نگاہ تک اونچے نیچے ٹیلے تھے اور اوپر نیم تاریک آسمان۔ وہ وہیں ایک جگہ بیٹھ گیا۔ اُس نے اپنے خالی پیٹ پر ہاتھ پھیرا۔ اسے یاد نہیں تھا وہ کب سے بھوکا ہے۔ شاید ایک دن سے' شاید دو دن سے یا شاید اس سے بھی زیادہ عرصے سے اور کم و بیش اتنے ہی عرصے سے اس نے پانی بھی نہیں پیا تھا۔ اُس کے ہونٹ سیاہ ہو کر پھٹ چکے تھے اس کے پاؤں ننگے تھے اور داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ وہ نمایاں قد کاٹھ والا نوجوان تھا۔ شانے چوڑے اور مضبوط تھے۔ عمر بیس بائیس سال رہی ہو گی۔

وہ خیموں کے شہر کی طرف پشت کیے بیٹھا رہا۔ اسے اس شہر سے' یہاں کے عوام و خواص اور ان کی مصروفیات سے کچھ نہیں لینا تھا۔ اس کے لیے ایک اور چیز اہم تھی بہت ہی اہم۔ یہ خیال ذہن میں آتے ہی اس کا ہاتھ خود بخود اپنے بائیں بازو کی .... طرف چلا گیا۔ کہنی سے ذرا اوپر گوشت میں کچھ الفاظ کندہ تھے۔ وہ بے خیالی میں دھیرے دھیرے اس حصے پر انگلیاں پھیرنے لگا' لیکن اس کا ذہن بالکل خالی تھا۔ صرف بھنی ہوئی بھیڑوں کی بھینی بھینی خوشبو تھی جو خیموں کے شہر سے جدا ہو کر ہوا کے دوش پر تیرتی اس کے نتھنوں تک پہنچ رہی تھی۔ وہ بیٹھا رہا........... بیٹھا رہا۔ اندھیرا گہرا ہونے لگا۔ دور سے آنے والی گوشت کی خوشبو کچھ اور اشتہا انگیز ہو گئی۔ پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور محتاط قدموں سے نزدیکی خیموں کی طرف بڑھنے لگا۔ کوئی ایک فرلانگ کا فاصلہ طے کر کے وہ ان خیموں سے بالکل قریب پہنچ گیا۔ یہاں پہنچ کر وہ زمین پر لیٹ گیا۔ ایک طرح سے یہ خیموں کے اس عظیم الشان شہر کی مضافاتی آبادی تھی۔ وہ خیموں کے عقب میں تھا اندر سے ہنسی مذاق اور باتوں کی آواز آ رہی تھی۔ اس نے دو تین خیموں کے قریب پہنچ کر کان

لگائے ہر خیمے میں ایک سے زیادہ افراد موجود تھے۔ عورتوں کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ چوتھا یا شاید پانچواں خیمہ نسبتاً خاموش تھا۔ اس نے خیمے کی درز سے اندر جھانکا۔ مومی شمع کی روشنی میں دو تاتاری زمین پر لیٹے تھے۔ دونوں فوجی لباس میں تھے۔ ایک سر کے نیچے کوئی چیز رکھے نیم دراز تھا اور بھنے ہوئے گوشت کے ٹکڑے چبا رہا تھا۔ دوسرا چت لیٹا ہوا تھا۔ ایک خوبصورت لڑکی اس کے پاؤں دبانے میں مصروف تھی۔ لڑکی یقیناً ان سینکڑوں ہزاروں عورتوں میں سے ایک تھی جو مختلف ملکوں اور علاقوں سے مال غنیمت کے ساتھ آئی تھیں۔ اجنبی کچھ دیر خیمے کی درز سے جھانکتا رہا پھر اس کا ہاتھ اپنی پنڈلی کی طرف گیا۔ اگلے ہی لمحے اس کے ہاتھ میں ایک عجیب وضع کا خنجر نظر آ رہا تھا۔ اس نے خنجر کی نوک خیمے پر رکھی اور "چرر" کی آواز سے خیمہ کٹتا چلا گیا۔ اندر لیٹے ہوئے دونوں سپاہی چونک کر اٹھ بیٹھے۔ لڑکی بھی کٹے ہوئے خیمے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ گوشت چبانے والا تاتاری اپنی جگہ سے اٹھا اور کٹے ہوئے حصے سے سر نکال کر باہر دیکھنے لگا۔ اس وقت اجنبی نے اس کے سر کے بال مٹھی میں جکڑ لیے۔ دوسرا ہاتھ مضبوطی سے اس کے منہ پر جم چکا تھا۔ پھر اس نے ایک زوردار جھٹکا دیا اور تاتاری خیمے سے باہر آ رہا۔ لڑکی اور دوسرا سپاہی خیمے کے اندر حیرت سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ انہیں یوں محسوس ہوا جیسے کسی غیر مرئی شے نے تنومند سپاہی کو اٹھا کر باہر پھینک دیا ہے۔ کوئی آواز نہیں آئی۔ کسی طرح کی جد وجہد ظاہر نہیں ہوئی۔ چند لمحے خاموشی سے گزر گئے۔ دوسرا تاتاری جو لڑکی سے پاؤں دبوا رہا تھا کھڑا ہو گیا۔ اس نے خیمے کی دیوار سے لگی ہوئی تلوار اتاری' اُسے نیام سے باہر نکالا اور محتاط قدموں سے اس سوراخ کی طرف بڑھا جہاں سے چند لمحے پہلے اس کا ساتھی غائب ہو گیا تھا۔ "کون ہے؟" اُس نے سوراخ کے قریب جھک کر قدرے بلند آواز سے کہا۔ اس وقت ایک ہاتھ تیزی سے اندر آیا اس سے پہلے کہ لڑکی کچھ سمجھتی یہ تاتاری بھی جیسے ہوا میں اُڑتا ہوا خیمے سے باہر نکل گیا۔ وہ سکتے کے عالم میں دیکھتی رہی۔ کوئی آہٹ سنائی نہیں دی۔ چند لمحے یوں ہی گزر گئے۔ پھر خیمے کا پھٹا ہوا کپڑا ہلا کسی نے جھانکا اور اندر آ گیا۔ لڑکی کو جھٹکا سا لگا۔ تھوڑی دیر پہلے اس نے نہایت خوفناک منظر دیکھا تھا۔ یکے بعد دیگرے دونوں تاتاری کٹے ہوئے خیمے کی دوسری طرف غائب ہو گئے تھے۔ یہ منظر اتنا عجیب و غریب تھا کہ کوئی بھی عورت ہوتی اپنے حواس پر قابو نہ رکھ سکتی اور چیختی چلاتی باہر بھاگ جاتی' لیکن اگر لڑکی اپنی جگہ کھڑی رہی تھا تو اس کی وجہ صرف یہی تھی کہ سوراخ سے غائب ہونے والے دونوں افراد تاتاری تھے اور وہ جانتی تھی کہ اس کے لیے تاتاری سے بڑھ کر ظالم سفاک اور قاتل چیز کوئی نہیں ہو سکتی۔ اگر خیمے کے دوسری طرف کوئی عفریت

بھی تھی تو اس سے ڈرنے کی ضرورت نہیں تھی' لیکن وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ خیمے کے اندر داخل ہونے والا بھی ایک تاتاری تھا۔ وہ سپاہی تو دکھائی نہیں دیتا تھا' لیکن اس کی وضع قطع یہ سمجھانے کے لیے کافی تھی کہ وہ بھی منگول ہے۔ لمبے بال نوکیلی مونچھیں اور قدرے اُوپر کو اٹھی ہوئی بھنویں' لیکن اس حلیے میں بھی وہ خاصا پُرکشش دکھائی دیتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے خنجر نما آلے سے ابھی تک لہو ٹپک رہا تھا۔ اس نے لپک کر خنجر لڑکی کی گردن پر رکھ دیا اور ہونٹوں سے "شی" کی آواز نکال کر اُسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ پھر وہ زمین پر پڑی ہوئی رکابی کی طرف بڑھا۔ بھیڑ کی نیم سوختہ ران کا ایک بڑا حصہ ابھی موجود تھا۔ قریب ہی ایک جگ پڑا تھا۔ اس نے جگ منہ کے قریب کیا' لیکن پھر فوراً پیچھے ہٹا دیا۔ اس میں شراب تھی۔ قریب ہی ایک دوسرا جگ پڑا تھا۔ اس میں پانی تھا۔ اس نے جگ سے منہ لگایا اور غٹاغٹ سارا پانی پی گیا۔ کچھ دیر وہ لڑکی کے سراپا کو عجیب و غریب نظروں سے گھورتا رہا' پھر اس نے ران اٹھائی اور لڑکی کو خاموش رہنے کی دھمکی دیتا ہوا سوراخ کی طرف بڑھا۔ اس کی حرکات میں نہایت تیزی اور پھرتی تھی۔ چمکدار آنکھیں لڑکی کی ایک ایک حرکت کا جائزہ لے رہی تھیں۔ پھر بڑے آرام سے کپڑا اٹھا کر وہ باہر نکل گیا۔ جونہی وہ نکلا لڑکی کے بھاگنے اور چیخنے کی آواز سنائی دی۔ خیمے سے چھن چھن کر آتی روشنی میں اجنبی نے زمین پر پڑی دونوں لاشوں کا جائزہ لیا۔ پھر نیچے جھک کر ایک لاش منتخب کی اور اسے اطمینان سے کندھے پر اٹھا کر چھلانگیں لگاتا ہوا غائب ہو گیا۔

☆------☆------☆

برہنہ تاتاری کی لاش دفن ہو چکی تھی اُس کا لباس اجنبی کے جسم پر تھا۔ وہ درختوں کے ایک جھنڈ میں چھپا ہُوا تھا۔ درختوں کی دوسری جانب سے عورتوں کے ہنسنے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ شاید وہ صبح کے غسل میں مصروف تھیں۔ پھر اجنبی نے ایک عورت کو دیکھا۔ اُس کے گیلے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس روپ میں وہ کوئی خوبصورت آسمانی مخلوق دکھائی دے رہی تھی۔ اُس نے ایک دو بار بالوں کو جھٹکا پھر گردن کے پیچھے اُن کا ڈھیلا سا جوڑا باندھ لیا اور ایک درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ اُس کی آنکھوں میں عجیب طرح کی اُداسی تھی۔ کتنی ہی دیر وہ گم صم بیٹھی درختوں کے پتوں کو دیکھتی رہی پھر اُس کے ہونٹوں پر ایک غمگین منگول نغمہ مچلنے لگا۔ کچھ عجیب طرح کا سحر تھا اُس کی گنگناہٹ میں۔ اجنبی غور سے سنتا رہا پھر دھیمے قدموں سے چلتا درختوں کے عقب سے نکل آیا۔ لڑکی نے اُسے دیکھا تو چونک کر کھڑی ہو گئی۔ اُس نے چیخنے کے لئے منہ

کھولا لیکن پھر اُسے اجنبی کی آنکھوں میں نہ جانے کیا چمک نظر آئی کہ خاموش رہ گئی۔ اجنبی اُسے یک ٹک دیکھتا ہوا بالکل قریب آ گیا۔ اُس کی آنکھوں میں عجیب طرح کا تجسس اور حیرانی بھری ہوئی تھی۔ لڑکی کو اُس سے بالکل خوف محسوس نہیں ہُوا نہ ہی وہ اسے کسی نام سے مخاطب کر سکی۔ اجنبی نوجوان بالکل خاموش کھڑا رہا پھر اُس نے ہاتھ بڑھا کر لڑکی کے جوڑے سے بالوں کی ایک لٹ نکالی اور ہاتھوں میں اُلٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ اُس کی نگاہیں لڑکی کے سراپا پر پھسل رہی تھیں لیکن انداز سے کسی قسم کی ہوسناکی کی بجائے ایک معصوم تجسس کا اظہار ہوتا تھا۔ لڑکی نے ایک جھٹکے سے اپنی لٹ چھڑائی اور قدرے تیز لہجے میں بولی۔ "کون ہے تو؟" زبان منگولی تھی۔

نوجوان خاموش کھڑا رہا اُس وقت درختوں کی دوسری طرف سے کسی نے ماریتا کہہ کر پکارا اور لڑکی تیز قدموں سے اُس طرف بڑھ گئی۔ نوجوان اجنبی تادیر اُس جگہ حیران سا کھڑا رہا۔ اُس کے سخت اور کھردرے ہاتھ پر ابھی تک بالوں کی نمی موجود تھی۔

دوسری طرف منگول سردار یورق اپنے وسیع و عریض شاندار خیمے میں بیٹھا تھا۔ جس چوکی پر وہ بیٹھا تھا وہ زمین سے کوئی ایک فٹ بلند تھی۔ اس پر خوبصورت نقش و نگار بنے تھے۔ خیمے کی دیواریں مضبوط کپڑے کی تھیں اور اُن پر جنگی ساز و سامان آویزاں تھا۔ یورق کا جسم کسی پہلوان کی طرح طاقتور تھا۔ اُس کے بازوؤں کی مچھلیاں نہایت نمایاں تھیں اور جب وہ ہاتھ میں پکڑا ہوا شراب کا گلاس منہ تک لے جانے کے لئے بازو کو حرکت دیتا تھا تو کندھے اور بازو کا ایک ایک مسل نمایاں ہو جاتا تھا۔ اُس کے اردگرد کئی دوسرے سردار اور شہہ زور بیٹھے تھے۔ ان میں ایک ترکمان سردار بھی تھا' اُس کا قد کسی طرح بھی سات فٹ سے کم نہیں تھا۔ یہ فن سپہ گری کا مانا ہوا استاد تھا۔ موضوع بحث وہ لاش تھی جو آج صبح ایک خیمے کے قریب سے ملی تھی۔ تلاش بسیار کے باوجود دوسری لاش کا کوئی پتہ نہیں چلا تھا۔ جو لاش دستیاب ہوئی تھی اُس کا گلا کسی تیز دھار آلے کے ساتھ نہایت بے دردی سے کاٹ دیا گیا تھا۔ سردار یورق نے پوچھا۔

"لڑکی نے کچھ نہیں بتایا؟"

ایک جلاد نما شخص نے ہاتھ باندھ کر کہا۔ "نہیں سردار! آپ کے حکم کے مطابق اُسے بوری میں بند کر کے پانی میں غوطے دیئے گئے ہیں۔ وہ قریب المرگ ہے لیکن کچھ بتا نہیں سکی۔ وہ بار بار یہی کہہ رہی ہے کہ وہ کوئی عجیب الخلقت شخص تھا اور شکل و صورت سے منگول نظر آ رہا تھا۔

یورق نے سخت لہجے میں میں کہا۔ "غلط بالکل غلط۔ ابھی اتنا بُرا وقت نہیں آیا۔ خانِ

اعظم کا کوئی بیٹا کسی دوسرے بیٹے کا گلا نہیں کاٹ سکتا۔ وہ منگول نہیں تھا کوئی اور تھا۔ یہ تمہاری بہت بڑی ناکامی ہے کہ اُسے ابھی تک گرفتار نہیں کر سکے۔ شاید تمہیں اطلاع نہ ہو کہ یہاں سے ایک فرلانگ دور سردار تماجن کے خیموں میں بھی ایک ایسا ہی واقعہ رونما ہو چکا ہے۔ ایک منگول سپاہی کا بے دردی سے گلا کاٹ دیا گیا ہے۔ جاودانی آسمان کی قسم نہ کبھی پہلے ایسا ہوا ہے اور نہ میں نے سنا ہے۔ جہاں خانِ اعظم کی اولاد فرد کش ہو وہاں سے تو ہوائیں بھی دھیمی چال سے گزرتی ہیں۔ کسی ماں کے جنے میں اتنی ہمت کہاں کہ وہ منگولوں کی حد میں قدم رکھنے کی کوشش کرے۔ جاؤ تمام علاقے میں پھیل جاؤ اور وہ جو کوئی بھی ہے اُسے گھسیٹتے ہوئے میرے پاس لے آؤ۔

☆-----☆-----☆

اجنبی ایک تاتاری سالار پر تلوار تانے کھڑا تھا۔ یہ بھی ایک الگ تھلگ خیمہ تھا۔ ایک طرح سے یہ خیمہ اس "خیموں کے شہر" کی آخری حد پر واقع تھا۔ منگول سالار زمین پر گرا ہوا تھا۔ قریب ہی ایک مٹکا ٹوٹا پڑا تھا۔ اس مٹکے میں بھرا ہوا گھوڑی کا دودھ سارے خیمے میں بکھر گیا تھا۔ منگول سردار کے کندھے پر ایک گہرا زخم نظر آ رہا تھا۔ اُس کا دایاں ہاتھ ابھی تک ٹوٹی ہوئی تلوار کے قبضے پر جما تھا۔ لگتا تھا چند لمحے پہلے یہاں کافی جدوجہد ہوئی ہے۔ اجنبی نے دایاں پاؤں اُٹھا کر منگول سالار کے پیٹ پر رکھا۔ تلوار کی نوک اُس کی آنکھوں کے قریب گردش کر رہی تھی۔ پھر اس کے ہونٹوں سے ایک سرسراتی ہوئی آواز نکلی۔ عجیب طرح کی غراہٹ تھی اس آواز میں جیسے چٹانوں اور فولاد کی سختی میں منہ زور ہواؤں کی سرکشی شامل ہو گئی ہو۔

"سردار بوغالی کدھر ہے؟" اُس نے منگول زبان میں کہا۔

منگول سالار خاموش رہا۔ اجنبی نے اپنے پاؤں کا دباؤ اچانک بڑھا دیا۔ نہ جانے اُس نے پیٹ کے کس حصے پر دباؤ ڈالا تھا' سالار کے منہ سے اوغ کی آواز نکل گئی اور جب ایسا کرتے ہوئے اُس نے منہ کھولا اجنبی کی تلوار اُس کے منہ میں گھس گئی۔ سالار کو تلوار کی موجودگی کا اُس وقت پتہ چلا جب اُس نے اپنا منہ بند کرنا چاہا۔ وہ اجنبی کی پھرتی پر ششدر رہ گیا۔ تلوار کی تیز نوک اُس کے تالو کے عقبی حصے سے چھو رہی تھی۔ اُس کا منہ کھلا رہ گیا اور آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں لہرانے لگیں۔ اجنبی کے خشک لب ایک بار پھر متحرک ہوئے۔

"سردار بوغالی کدھر ہے؟"

تاتاری ہاتھ کے اشارے سے اُسے کہنا چاہتا تھا کہ وہ تلوار پیچھے ہٹائے تاکہ وہ اُسے

بتا سکے' لیکن چنگیزی خون اُس میں جوش مار رہا تھا۔ وہ جان چکا تھا کہ اس کا مدِمقابل منگول نہیں کوئی اور ہے۔ اُس نے صرف منگول کا بھیس بدل رکھا ہے۔ وہ کون ہے؟ شاید عیسائی یا مسلمان۔ یقیناً یہ وہی ہے جس نے پرسوں رات اور کل صبح تین منگولوں کو ہلاک کیا ہے۔ اُس کے ذہن نے سوچا وہ ایک غیر منگول کے سامنے ہار نہیں مانے گا۔ کیا ہوا اگر وہ اس کے ہاتھوں قتل بھی ہو گیا۔ یقیناً اس بے وقوف کا انجام دردناک ہو گا۔ یہ موت کو ترس ترس کر مرے گا۔ یہ ساری باتیں ایک ساعت سے بھی کم وقت میں اُس کے ذہن سے گزر گئیں۔ پھر اُس نے اجنبی کے چہرے پر ایک خوفناک تاثر دیکھا۔ اُس کا ہاتھ متحرک ہوا اور تلوار کی تیز نوک "کھچ" کی آواز سے اُس کے گوشت میں دھنستی چلی گئی۔ اُس نے چیخنا چاہا' لیکن ناکام رہا' نمکین خون کا فوارہ اُس کے حلق میں اُبل پڑا۔ اُس نے دیکھا دور نیلے جاودانی آسمان میں ایک دریچہ اُس کے لئے کھل گیا ہے۔

تاتاری کو جہنم واصل کرنے کے بعد اجنبی نے اُس کے کپڑوں سے خون آلود تلوار صاف کی۔ اُسے میان میں ڈالا اور اطمینان سے چلتا ہوا خیمے سے باہر آ گیا۔ شام کا وقت تھا۔ رات کا کھانا تیار کرنے کے لئے جگہ جگہ آگ کے الاؤ روشن کئے جا رہے تھے۔ سینکڑوں لوگ اِدھر سے اُدھر آ جا رہے تھے۔ اجنبی اُن میں شامل ہو گیا۔ اُس کی عقابی نظریں تیزی سے دائیں بائیں حرکت کر رہی تھیں۔ وہ لوگوں کے چہرے دیکھ رہا تھا اُسے ایک چہرے کی تلاش تھی۔ وہی چہرہ جس کے حوالے سے ایک تحریر اُس کے بازو پر کندہ تھی۔ وہ جانتا تھا یہ ایک ایسے شخص کا چہرہ ہے جس کے ماتھے کے عین درمیان تلوار کا ایک زخم ہے۔ وہ زخم ایک سیدھی لکیر کی طرح اس کی پیشانی کے بالوں سے شروع ہو کر ناک کی چونچ تک چلا گیا ہے۔ یہ ایسا زخم ہے جسے ہزاروں میں پہچانا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ تھی جو وہ اس چہرے کو ہزاروں میں بڑی دلجمعی سے تلاش کر رہا تھا۔ یہ سردار بوغالی کا چہرہ تھا۔ وہ گھومتا رہا۔ یہاں تک کہ اندھیرا گہرا ہو گیا۔ خیموں کی طول طویل قطاروں کے درمیان لگی ہوئی مشعلیں جل اُٹھیں۔ لوگ رات کا کھانا کھانے میں مصروف ہو گئے۔ ایک جگہ ایک ٹوٹے ہوئے چھکڑے پر بہت بڑے طباق میں گھوڑے کا ابلا ہوا گوشت پڑا تھا۔ چند سپاہی بڑے بڑے ٹکڑوں کو دانتوں سے بھنبھوڑ رہے تھے۔ وہ بھی اُن کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ قریب ہی ایک بڑی مشعل جل رہی تھی۔ وہ اس انداز سے کھڑا ہوا تھا کہ مشعل کی روشنی براہِ راست اُس کے چہرے پر نہ پڑے۔ وہ بھی طباق سے گوشت کھانے میں مصروف ہو گیا۔ تاتاری سپاہی اپنے ہونے والے خاقان کی باتیں کر رہے تھے۔ اُن کی باتوں سے پتہ چلتا تھا کہ چنگیز خاں کے دو بیٹے تو قراقرم پہنچ چکے ہیں

لیکن منجھلا بیٹا اوغدائی جو دریائے یی سی کے کنارے موجود تھا' ابھی راستے میں ہے۔ اُس کی آمد سے قبل قرولتائی (مجلس مشاورت) کا انعقاد اور خاقان کا انتخاب ناممکن ہے بلکہ بعض لوگوں کا خیال تو یہ ہے کہ منجھلا بیٹا اوغدائی ہی خاقان بنے گا۔ کیونکہ خانِ اعظم نے مرنے سے پہلے اُسے اپنا جانشین قرار دیا تھا۔ اجنبی کو ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی وہ ان سپاہیوں کی زبان سے صرف ایک نام سننا چاہتا تھا اور وہ نام تھا سردار بوغالی کا۔ مگر اُس کی مراد پوری نہیں ہوئی۔ آخر وہ خود بول پڑا۔ اُس نے سر جھکائے عام سے لہجے میں پوچھا۔

"سردار بوغالی آج کل کہاں ہے؟"

اُس نے اندھیرے میں تیر چھوڑا تھا لیکن لگتا تھا تیر نشانے پر نہیں لگا کیونکہ اُس کے نزدیک موجود سپاہی اُس کی طرف دیکھنے لگے تھے۔

"تم بوغالی کی کمان میں نہیں ہو؟" ایک سپاہی نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔" اجنبی نے مختصر سا جواب دیا۔

"وہ سامنے یورت (خیمہ) ہے سردار کا۔" اُسی سپاہی نے کہا۔

اجنبی کے تن بدن میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ اُسے لگا جیسے بازو پر کندہ تحریر جلنے لگی ہے۔ اُسے قطعی امید نہیں تھی کہ وہ خان چغتائی کی فوج میں سے اتنی جلدی بوغالی کو ڈھونڈ لے گا۔ "سردار بوغالی .... سردار بوغالی۔" اُس کا رُواں رُواں جیسے للکارنے لگا۔ بظاہر وہ مطمئن انداز میں گوشت کے ٹکڑے چبا رہا تھا لیکن کن اکھیوں سے دیکھ رہا تھا کہ اُس کے نزدیک کھڑے افراد کچھ مشکوک نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ ایک شخص نے مٹی کا بڑا سا برتن اُس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "لو پیو۔" اُس نے برتن منہ کے قریب کیا۔ ایک بار پھر اُسے وہی سڑاند آئی جو پرسوں رات جگ کے اندر سے آئی تھی۔ اُس کا جی متلانے لگا۔ اُس نے ایک نظر قریب کھڑے سپاہیوں کی طرف دیکھا۔ وہ اُسی کی طرف متوجہ تھے۔ اُس نے پیالہ ہونٹوں سے لگایا اور غٹاغٹ چڑھا گیا۔ حلق اور سینے میں جیسے چھریاں سی چل گئیں۔ کوشش کے باوجود وہ اپنی کھانسی نہ روک سکا۔ قریب کھڑے سپاہی نے پوچھا۔

"خانِ اعظم کے اردو (لشکر) کے جوان تو نے کبھی شراب نہیں پی؟"

اجنبی نے نگاہیں اُٹھا کر اُس کی طرف دیکھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ اُس کے گرد کھڑے افراد کی نگاہوں میں شک کی بجلیاں کوند رہی ہیں۔ چند گز کے فاصلے پر ایک دوسرا تاتاری گھڑ سوار بھی گہری نظروں سے اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اجنبی نے دیکھا گھڑ سوار محافظ

کے عقب میں کھڑے دو مسلح پیادوں کے ہاتھ اپنی تلواروں کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اُس نے اطمینان سے پیالہ لکڑی کے تختے پر رکھ دیا۔ پھر آستین سے منہ پونچھا۔ اُس کے سینے میں دہکتی ہوئی چنگاری جو بہت دیر سے دھواں دے رہی تھی "بھک" سے شعلے میں بدل گئی۔ ایک آگ تھی جو جسم کے جنگل میں پھیل رہی تھی۔ وہ اب اس آگ پر قابو نہیں پا سکتا تھا۔ یہ ناممکن تھا .... ناممکن۔ اُس نے ایک نظر سردار بوغالی کے یورت کی طرف دیکھا۔ اُس کے گلے کی رگیں اُبھر آئیں۔ آنکھوں میں سفاک چمک لہرائی پھر اُس کا بھرپور گھونسہ قریبی شخص کے چہرے پر پڑا۔ وہ شخص جیسے اُچھل کر چھکڑے کے اوپر گرا۔ شراب سے بھرے ہوئے جگ اُلٹ کر آگ کے الاؤ میں جا گرے۔ اجنبی بھاگ کھڑا ہوا۔ اس کے بھاگتے ہی تاتاریوں کے للکارے گونجے۔ وہ تلواریں سونت کر اس کے پیچھے لپکے۔ اجنبی نہایت تیزی سے خیموں کی بھول بھلیوں میں گھس گیا' لیکن تعاقب کرنے والوں نے اسے سردار بوغالی کے خیمے کے عقب میں گھیر لیا۔ یہ سب کے سب افراد مسلح نہیں تھے۔ ان میں ایک دو سپاہی تھے باقی باورچی' گھوڑوں کے سائیس اور اس قسم کے ملازمین تھے۔ یہاں اجنبی نے اتنے وحشیانہ انداز میں تلوار چلائی کہ وحشی تاتاری بھی دنگ رہ گئے۔ قریباً دس آدمیوں کا گھیرا توڑ کر وہ آگ کے ایک بہت بڑے الاؤ کے سامنے آ گیا۔ اب اس کے عقب میں آگ بھڑک رہی تھی اور سامنے تاتاری جنگجو تلواریں لہرا رہے تھے۔ پھر اس کے منہ سے ایک ناقابل فہم آواز نکلی اور وہ تاتاریوں پر ٹوٹ پڑا' لیکن اس دفعہ اس کا مقابلہ عام سپاہیوں سے نہیں جنگجوؤں سے تھا۔ وہ بمشکل ایک شخص کو زخمی کر پایا تھا کہ اس کی تلوار کے تین ٹکڑے ہو گئے۔ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر وہ آگ کے الاؤ کی طرف بڑھا اور وہاں سے ایک جلتی ہوئی موٹی سی لکڑی اٹھالی۔ اب اس کے سامنے چار جنگجو تھے۔ ایک کے مقابلے میں چار تاتاری۔ یہ صورت حال اس بات کا ثبوت تھی کہ تاتاری سپاہی لاشعوری طور پر اس اجنبی سے خوفزدہ ہو گئے تھے۔ اجنبی حیران کن دلیری سے تاتاری جنگجوؤں پر حملہ آور ہوا۔ اس کی پھرتی قابلِ داد تھی۔ چند لمحوں میں اس نے دو سپاہیوں کو زمین چاٹنے پر مجبور کر دیا' لیکن اس دوران اس کے ہاتھ میں پکڑی لکڑی تلوار کے ایک زوردار وار سے کٹ کر دور جا گری۔ اس نے لکڑی کا باقی حصہ پھینکا اور خالی ہاتھ دونوں تاتاریوں پر ٹوٹ پڑا۔ یہ مقابلہ دیکھنے کے لائق تھا۔ اجنبی کا جسم کسی مشین کی طرح چل رہا تھا۔ وہ نہتا تھا لیکن اس کے جسم کا ہر حصہ ایک ہتھیار تھا' کہنیاں' گھٹنے' پاؤں ہاتھ ہر چیز تباہ کن تھی۔ تلوار کا ایک وار اس نے جھک کر بچایا پھر جب وہ سیدھا ہوا تو اس کا گھٹنا بھرپور قوت سے مدِمقابل کی ٹانگوں کے درمیانی حصے پر لگا۔ وہ تڑپ کر دوہرا ہو گیا اور

اس وقت اجنبی نے اسے بالوں سے پکڑ کر آگ میں دھکیل دیا۔ وہ ایک طرف سے الاؤ میں داخل ہوا اور چیختا ہوا دوسری طرف سے نکل گیا' لیکن اس دوران اس کے سارے کپڑے آگ پکڑ چکے تھے۔ وہ زمین پر لوٹتا اور بھیانک انداز میں چلاتا ہوا ایک جانب بھاگا۔ اس وقت کسی جانب سے ایک شخص گھوڑا دوڑاتا ہوا آیا اور آگ میں جلتے ہوئے شخص کا سر قلم کر گیا۔ اجنبی کا آخری مدمقابل چند لمحوں کے لیے اس خوفناک منظر میں محو ہو گیا تھا۔ پھر جیسے اسے ہوش آئی اور وہ دونوں ہاتھوں سے تلوار تھام کر اجنبی کی طرف لپکا' لیکن اسے دیر ہو چکی تھی۔ اجنبی اس سے پہلے وار کر چکا تھا وہ جیسے ہوا میں اڑتا ہوا آیا اور اس کا خنجر تاتاری سورما کا پیٹ چاک کر گیا۔ تاتاری کی ہوا میں اٹھی ہوئی تلوار اٹھی رہ گئی۔ اس نے نظر جھکا کر اپنے پیٹ کی طرف دیکھا۔ آنتیں پیٹ سے نکل کر زمین تک پہنچ رہی تھیں۔ وہ چکرا کر گرا اور پھڑک کر ساکت ہو گیا۔ اب اجنبی کے گرد قریباً پچاس افراد جمع ہو چکے تھے۔ ان سب کے ہاتھوں میں تلواریں چمک رہی تھیں۔ چہرے غصے سے تمتما رہے تھے۔ اردگرد کے خیموں سے بھی تاتاری بھاگ بھاگ کر موقعۂ واردات پر پہنچ رہے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھنے لگے۔ اجنبی پیچھے ہٹتا ہٹتا آگ کے الاؤ کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ اب آگ کی تپش سے اس کی پشت جل رہی تھی۔ وہ اپنے بالوں کے چرمر ہونے کی سڑاند بھی سونگھ سکتا تھا۔ ایک بار پھر اس کے جبڑے کی ہڈیاں بھنچ گئیں۔ اس نے خنجر کو بائیں ہاتھ سے دائیں ہاتھ میں کیا ہر لحہ نزدیک آتے ہوئے تاتاریوں کو دیکھنے لگا۔ اس وقت ایک رعب دار آواز گونجی۔ "ٹھہرو۔ اسے مارنا نہیں۔" اس کی طرف بڑھنے والے ٹھٹک کر رک گئے۔ اجنبی نے گردن گھما کر دیکھا۔ وہی گھڑ سوار چند قدم کے فاصلے پر کھڑا تھا جس نے جلتے ہوئے تاتاری کا سر قلم کر دیا تھا۔ وہ گھوڑے کو دلکی چال چلاتا اجنبی کے قریب لے آیا پھر سپاہیوں کی طرف رخ کر کے کہنے لگا۔

"اسے میرے یورت میں لاؤ۔"

تھوڑی دیر بعد اجنبی مسلح منگول سپاہیوں کے گھیرے میں چلتا ہوا ایک وسیع و عریض یورت میں داخل ہوا۔ سامنے لکڑی کے ایک تخت پر وہی گھڑ سوار ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ دو خوبصورت لڑکیاں اس کے دائیں بائیں کھڑی تھیں۔ نزدیک ہی ایک طویل القامت شخص کھڑا تھا۔ اس کے جسم پر چمکدار پتیوں والا لباس تھا۔ اجنبی کو سردار کے سامنے چھوڑ کر مسلح آدمی باہر چلے گئے سردار نے کہا۔

"منگول جوان .... اگر تو واقعی منگول ہے تو تیری بہادری اور دلیری دیکھ کر میرا سر فخر سے بلند ہو گیا ہے آ ذرا میرے قریب آ۔"

اجنبی چند قدم آگے بڑھ گیا۔ سردار تخت سے نیچے اترا اور اجنبی کے قریب پہنچ گیا۔ وہ اس کے جسم کو سونگھ رہا تھا۔ جیسے اس کی نسل کا اندازہ کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس نے اجنبی کے بڑے بڑے بال پیشانی سے پیچھے ہٹائے اور غور سے اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔ تب اس نے اس کے بازوؤں کی جلد دیکھی۔ پنڈلیوں سے کپڑا ہٹا کر ران پر ہاتھ پھیرا۔ اس کی کہنیاں اور گھٹنے دیکھے۔ پھر اپنی جگہ آکر بیٹھ گیا اور طویل سانس لے کر بولا۔

"نیلے جاودانی آسمان کی قسم تجھے کسی منگول ماں نے جنا ہے اور ماں بھی ایسی جو پتھر کی کوکھ رکھتی تھی۔ تو کہاں سے آیا ہے لڑکے؟" اجنبی خاموش رہا۔ سرداریورق کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھا وہ بولا۔ "اجنبی! خاقان اعظم کا غلام خاص تجھ سے مخاطب ہے۔ سمرقند بخارا سے لے کر معلوم دنیا کے آخری کناروں تک کسی میں اتنی ہمت ہے کہ خاقان کے غلام کوئی بات پوچھیں اور اس کا جواب نہ دیا جائے۔"

اجنبی نے ایک نظر بوڑھے' لیکن طاقتور سردار کی طرف دیکھا پھر لاپرواہی سے بولا۔ "صحرائے گوبی کے اس پار کوہ الطائی کے برف پوش دروں سے آیا ہوں۔ میرا نام اباقہ ہے۔"

"کس لیے آئے ہو؟"

"روٹی کی تلاش میں۔"

"تم اب تک خاقان اعظم کے چھ جان نثاروں کو ہلاک کر چکے ہو' کیوں؟"

"روٹی کے لئے۔"

خیمے میں ایک گھمبیر خاموشی چھا گئی۔ سرداریورق کی جگرپاش نگاہیں اجنبی کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ وہ اس چھوٹے سے فقرے کی سچائی جاننے کے لیے کسی اتھاہ گہرائی میں اترا ہوا تھا۔ "اس کی سزا جانتے ہو؟"

"بھوک کے علاوہ ہر سزا منظور ہے۔"

سردار کچھ دیر خاموش رہا پھر بولا۔ "نوجوان تیری گفتگو اور تیرا انداز مجھے پسند آیا۔ جاودانی آسمان کی قسم میں تجھے کبھی معاف نہ کرتا' لیکن خان اعظم کے بنائے ہوئے یاسا (قانون) میں تیرے جیسوں کے لیے گنجائش موجود ہے۔ بتا کیا تو گھوڑے کی پشت پر بیٹھ کر خوبصورت شہر' دولت کے ڈھیر اور دنیا کی حسین ترین عورتیں فتح کرنا چاہتا ہے؟ کیا غلے سے لدی ہوئی کھیتیاں اور رسیلے میوہ جات تجھے پسند ہیں .... بول؟"

"ہاں۔" اجنبی کے منہ سے غراہٹ آمیز آواز نکلی۔

سردار بولا۔ "تیری طاقت اور جوانمردی اس بات کی متقاضی ہے کہ تجھے کسی دستے

کا سالار بنا دیا جائے' لیکن ابھی تُو خام ہے۔ تیری منہ زور اور سرکش صلاحیتوں کو تربیت کے سانچے کی ضرورت ہے۔ میں تجھ میں ایک زبردست سپہ گر چھپا دیکھ رہا ہوں .... کیا تُو سپہ گری سیکھے گا؟"

"ہاں۔" مختصر سا جواب ملا۔

سردار نے لمبے تڑنگے ترکمان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "پاشا! آج سے تُو اس کی تربیت کرے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ تیری ہی طرح کا مرد میدان بنے۔ اسے دشمن پر عقاب کی طرح جھپٹنا اور شیر کی طرح چیرنا پھاڑنا سکھا .... لیکن ساتھ ساتھ اسے اپنے بچاؤ کے داؤ پیچ سے بھی آگاہ کر۔"

ترکمان سردار کچھ متذبذب نظر آ رہا تھا۔ "کیا کہنا چاہتے ہو پاشا۔" سردار یورق کی آواز آئی۔ پاشا کچھ جھجکتا ہوا سردار یورق کے قریب پہنچ گیا۔ پھر مدھم آواز میں بولا۔

"محترم منگول سردار! تیرا اقبال بلند ہو۔ مجھے اس مہربانی کی سمجھ نہیں آئی۔ یہ اجنبی جو اپنا نام اباقہ بتاتا ہے تین دن کے اندر چھ تاتاریوں کو بے دردی سے ہلاک کر چکا ہے۔ ان واقعات کی خبر ابھی تک شہزادہ چغتائی کو نہیں ہوئی۔ جب اس گڑبڑ کا انہیں پتہ چلے گا اور یہ بھی پتہ چلے گا کہ قاتل کو معاف کر دیا گیا ہے تو وہ سخت ناراض ہوں گے۔ ہو سکتا ہے.........."

"خاموش۔" سردار یوق دھاڑا۔ "تمہیں معلوم ہے ابھی کچھ دیر پہلے اباقہ سے مقابلے کے دوران جب ایک سپاہی کے کپڑوں کو آگ لگ گئی تھی وہ چلاتا ہوا بھاگا تھا میں نے اسے قتل کیوں کیا تھا؟ اس لیے کہ وہ خیموں کی طرف جا رہا تھا۔ اگر وہ کسی خیمے میں گھس جاتا تو اسے آگ لگ جاتی' ہو سکتا تھا دوسرے خیمے بھی آگ پکڑ لیتے۔ اس لیے میں نے اس کا سر تن سے جدا کر دیا.......... میں وہ دیکھ رہا تھا جو تم نہیں دیکھ رہے تھے۔ اب بھی میری نظر وہاں تک ہے جہاں تم نہیں دیکھ رہے۔ ان چھ منگولوں کی جگہ مجھے دشمنوں کے سینکڑوں تڑپتے ہوئے لاشے نظر آ رہے ہیں۔ لاشے جو اس جوان کی شمشیر بے اماں کا نشانہ بنیں گے۔ میں گھاٹے کا سودا نہیں کر رہا پاشا.......... ٹھہرو میں تمہیں بتاتا ہوں .... ٹھہرو۔" سردار یورق اپنی جگہ سے اٹھا اور کونے میں پڑی ہوئی ایک چھڑی اٹھائی۔ یہ چیڑ کی ایک لمبی اور لچکدار شاخ تھی۔ یورق نے شاخ داہنے ہاتھ میں لی اور خیمے کے کونے میں کھڑی ہوئی لڑکی کی طرف بڑھا۔ لڑکی نظریں جھکائے خاموش کھڑی تھی۔ سردار یورق کا ہاتھ بلند ہوا۔ شائیں کی آواز آئی اور چھڑی کی بھرپور ضرب تڑاخ سے لڑکی کے بازو پر پڑی۔ اس کے منہ سے چیخ نکل گئی اور آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ تب

سردار' پاشا کی طرف بڑھا ایک ایسی ہی بھرپور ضرب اس کے بازو پر پڑی اور اس کے منہ سے سسکاری کی آواز نکل گئی۔ پھر سردار اجنبی کے پاس آیا اور اتنی ہی بے دردی سے ایک ضرب اس کے بازو پر لگائی۔ وہ بالکل خاموش اور بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ سردار یورق تیزی سے گھوم کر لڑکی کے پاس آیا۔ اس نے ایک جھٹکے سے اس کا ریشمی لبادہ آستین سے پھاڑ دیا۔ لڑکی کا سارا جسم کانپ رہا تھا' ضرب اتنی زور دار تھی کہ کہنی سے اوپر اس کے بازو کی کھال ادھڑ گئی تھی۔ سرخ خون کے نیچے سفید سفید گوشت نظر آ رہا تھا۔ پھر سردار' پاشا کے پاس آیا۔ اس کی آستین اوپر اٹھائی۔ بازو پر ایک گہرا نیل نظر آ رہا تھا۔ تھوڑا سا خون بھی رسا تھا' لیکن کھال محفوظ تھی۔ تب سردار نے اجنبی کا بازو ننگا کیا۔ اس کے بازو پر ایک مدھم سے نشان کے سوا کچھ نہیں تھا۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس سیاہی مائل کھال پر کبھی کوئی ضرب لگی ہے۔ پاشا حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ سردار یورق نے کہا۔

"جاؤ پاشا! اسے اپنے ساتھ لے جاؤ۔ یہ فولاد ہے اس سے کوئی ایسا ہتھیار بناؤ جو خان اعظم کے دشمنوں کے لیے موت کا دوسرا نام ہو۔"

☆ ------ ☆ ------ ☆

کوئی چار دن بعد کی بات ہے ترکمان سردار پاشا' منگول سردار یورق کی خدمت میں حاضر ہوا۔ یورق اس وقت خیمے کے قالین پر اوندھا لیٹا ہوا تھا۔ تین انتہائی خوبصورت لڑکیاں اس کے جسم کے مساج میں مصروف تھیں۔ ان میں دو چینی نسل کی تھیں اور ایک ختائی۔ پورے خیمے میں خوشبودار تیل کی مہک رچی ہوئی تھی۔ یورق آنکھیں بند کیے پڑا تھا۔ کبھی کبھی وہ ایک ہاتھ سے اپنے بازو کا مسل ٹٹول لیتا تھا جیسے اندازہ لگا رہا ہو کہ کہیں اس کی غنودگی کا فائدہ اٹھا کر کسی نے مسل چرا تو نہیں لیا۔ پاشا نے اندر داخل ہو کر ٹوپی اتاری اور جھک کر سلام کیا۔ اس کی آواز پر یورق نے آنکھیں کھولیں اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پاشا بڑا نڈھال دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے چہرے پر جگہ جگہ نیلے نشان تھے۔ لگتا تھا کسی سے اس کا جھگڑا ہوا ہے۔ سردار یورق نے ان نشانوں کے بارے میں پوچھا تو پاشا بولا۔

"منگول سردار میں نے تیری بڑی چاکری کی ہے' لیکن یہ تُو نے جو نئی ذمے داری مجھ پر ڈالی ہے میرے بس کی نہیں۔ میں نے بڑے بڑے اجڈ منگولوں کو فنِ حرب کے اسرار و رموز سے آگاہ کیا ہے۔ بڑے بڑے خودسر سورماؤں سے میرا واسطہ پڑا ہے لیکن یہ لڑکا جو کچھ دن پہلے تُو نے میرے سپرد کیا ہے میری سمجھ سے بالاتر ہے۔ اسے نہ تو تلوار پکڑنی آتی ہے اور نہ ڈھال' لیکن وہ پھر بھی جنگجو ہے۔ کوئی ڈھال ایسی نہیں جو اس کے

وار کو روک سکے اور کوئی تلوار ایسی نہیں جو اس کی ڈھال کو دھوکا دے سکے۔ اس کے لڑنے کا انداز ایسا ہے جو نہ سمجھا جاسکتا ہے اور نہ سمجھایا۔ معزز سردار! میں مختصر الفاظ میں کہوں گا کہ وہ ایک پیدائشی جنگجو ہے اور جس طرح شیر ماں کے پیٹ سے حملے کے آداب سیکھ کے نکلتا ہے اسی طرح یہ نوجوان بھی بالکل اناڑی ہونے کے باوجود کمال کا ماہر ہے۔"

سردار یورق غور سے پاشا کی باتیں سن رہا تھا۔ اس نے پاشا کے چہرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے یہ زخم بھی تمہارے اس شاگرد کے لگائے ہوئے ہیں۔"

پاشا قدرے خجالت سے بولا۔ "منگول سردار' اس میں شاگردوں والی کوئی بات ہی نہیں ہے۔"

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ خیمے کے باہر سے کسی نے اندر آنے کی اجازت طلب کی۔ سردار یورق نے آنے کی اجازت دی۔ چھ مسلح سپاہی اندر گھس آئے۔ انہوں نے سردار یورق سے کہا۔

"خانِ محترم چغتائی کے حکم سے ہم آپ کو گرفتار کرنے آئے ہیں۔" سردار یورق کی آنکھیں حیرت سے ابل پڑیں۔

وہ ایک وسیع و عریض خیمہ تھا۔ سردار یورق کے خیمے کی نسبت یہ کہیں زیادہ بڑا اور خوبصورت تھا۔ اس خیمے میں کسی محل جیسی شان پائی جاتی تھی۔ فرش پر دبیز ایرانی قالین بچھے ہوئے تھے۔ دیواریں نفیس سمور کی تھیں۔ خیمے کے وسط میں لکڑی کا ایک خوبصورت تخت رکھا تھا۔ یہ تخت ایک عام آدمی کے قد سے دوگنا لمبا چوڑا تھا۔ زمین سے اس کی بلندی قریباً ایک ہاتھ رہی ہو گی۔ اس کے پایوں پر سونے چاندی کے پترے چڑھے ہوئے تھے۔ تخت پر جو شخص نیم دراز تھا وہ خانِ اعظم چنگیز خان کا سب سے بڑا بیٹا چغتائی تھا۔ اُس وقت اس کی آنکھیں غصے سے انگارہ ہو رہی تھیں۔ خیمے میں موجود ہر شخص سہما ہوا تھا۔ سردار یورق رسیوں سے بندھا چغتائی کے سامنے کھڑا تھا۔ ایک دوسرے کونے میں جنبی اباقہ موجود تھا۔ اُس کا جسم بھی رسیوں میں جکڑا ہوا تھا۔ مسلح پہریدار ننگی تلواریں لئے دونوں کے عقب میں تھے۔ سردار یورق کہہ رہا تھا۔

"خانِ محترم! غلام اپنا قصور مانتا ہے۔ چھ جاں نثاروں کا خون بہت بڑی بات ہے۔ مجھے یہ معاملہ آپ کے حضور پیش کرنا چاہئے تھا لیکن............"

"خاموش۔" خان چغتائی دھاڑا۔ خانِ اعظم کے بیٹے کی دھاڑ سے جیسے ہر چیز سہم گئی۔ وہ بولا۔ "'لیکن' کے بعد ہمیشہ بہانہ بازی شروع ہوتی ہے اور میں اس سلسلے میں کوئی

بہانہ سننا پسند نہیں کروں گا۔ خانِ اعظم کا "یاسا" ہر ایک کے لئے یکساں ہے۔ یورق! تم نے چھ منگولوں کے قاتل کو نہ صرف معاف کیا' بلکہ اُسے پناہ بھی دی۔ میں نہیں سمجھتا کہ تمہیں زندہ رہنا چاہئے۔" پھر وہ سپاہیوں سے بولا۔ "لے جاؤ ان دونوں کو اور بھوکے کتوں کے آگے ڈال دو۔"

حکم کی دیر تھی مسلح آدمی آگے بڑھے۔ انہوں نے سردار یورق کے سر سے ٹوپی اور کمر سے پٹی اتار لی' پھر اباقہ اور سردار یورق کو دھکیلتے ہوئے خیمے سے باہر لے چلے۔ "ٹھہرو!" خان چغتائی کی آواز آئی۔ ایک لمحے کے لئے سردار یورق کی بجھی ہوئی آنکھوں میں روشنی نظر آئی۔ شاید وہ سمجھ رہا تھا کہ خان چغتائی نے اپنے فیصلے پر نظر ثانی کی ہے' لیکن فوراً ہی اُس کی خوش فہمی دور ہو گئی۔ خان چغتائی نے کہا۔

"ان دونوں کو باری باری کتوں کے سامنے پھینکا جائے تاکہ دیکھنے والے کچھ دیر لطف اندوز ہو سکیں اور پہلے لڑکے کی سزا پر عملدر آمد کیا جائے۔"

مسلح آدمیوں نے انہیں تلواروں سے ٹھوکے دیئے۔ سردار یورق کی گردن جھکی ہوئی تھی اور چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ خیمے سے کچھ فاصلے پر ایک بہت بڑا گڑھا تھا۔ گڑھے کا فرش بالکل ہموار تھا اور اس کی گہرائی ایک عام آدمی کے قد سے ڈیڑھ گنا تھی۔ لگتا تھا جیسے کوئی خشک تالاب ہو۔ اس گڑھے میں چھ عدد خوفناک جبڑوں والے کتے بے چینی سے چکر لگا رہے تھے۔ گڑھے کے گرد بہت سے لوگ جمع ہو گئے تھے۔ مزید لوگ تیزی سے اس طرف آ رہے تھے۔ ایک شخص نے آگے بڑھ کر اباقہ کے سر پر کوئی چیز انڈیل دی۔ یہ گھوڑی کا جما ہوا دودھ تھا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتا اسے عقب سے زوردار دھکا پڑا اور وہ جیسے ہوا میں اڑتا ہوا گڑھے میں جا گرا۔ خونخوار کتوں نے اپنے کان کھڑے کیے ان کی دُمیں تیزی سے گردش کرنے لگیں۔ اباقہ نے ایک نظر گڑھے کے کناروں کی طرف دیکھا۔ مشتاق چہروں کا ہجوم دکھائی دے رہا تھا' عورتیں' مرد' بچے' بوڑھے سب یہ خونی تماشہ دیکھنے کے لیے بے چین تھے۔ پھر اباقہ کو ایک ایسا چہرہ نظر آیا کہ ایک لمحے کے لیے اس کی نگاہیں ساکت ہو گئیں۔ وہ کتوں کی گردش کرتی ہوئی دُمیں ان کے متحرک کان اور ان کی خوفناک غراہٹیں سب کچھ بھول گیا۔ وہ ایک نہایت حسین چہرہ تھا۔ وہی چہرہ جو اس نے چند روز پہلے گھنے درختوں میں دیکھا تھا۔ وہ گڑھے کے کنارے کھڑی آگے کی طرف جھکی ہوئی تھی۔ ریشمی زلفوں نے رخساروں کو چھپا رکھا تھا۔ جوش سے تمتماتے ہوئے چہروں کے ہجوم میں یہ سوگوار چہرہ اسے بہت عجیب لگا' لیکن صرف ایک لمحے کے لیے پھر اس کی نظر اپنے سامنے گئی۔ غراہٹیں بہت بلند ہو چکی تھیں۔ ایک کتا طوفانی رفتار سے اس

پر جھپٹا۔ اباقہ نے پھرتی سے پہلو بچایا۔ کتا زمین پر گر کر لڑھکا۔ اس دوران دوسرا کتا اس پر چھلانگ لگا چکا تھا۔ اباقہ کے جسم میں جیسے بجلیاں بھر گئیں اس نے کتے کے منہ پر ایک زناٹے کا تھپڑ رسید کیا۔ وہ ہوا ہی میں قلابازی کھا کر گڑھے کی دیوار کے پاس جا گرا۔ تیسرے کتے کے پیٹ میں اباقہ نے پاؤں کی زوردار ٹھوکر لگائی اور چوتھے کو اگلی ٹانگ سے پکڑ کر گھما دیا۔ یہ کتا دھپ کی زوردار آواز سے گڑھے کی دیوار کے ساتھ ٹکرایا اور کربناک چیخ مار کر ساکت ہو گیا۔ عجیب بات تھی اباقہ کا انداز مدافعانہ نہیں جارحانہ تھا۔ گڑھے کے گرد موجود لوگوں نے حیرت سے دیکھا کہ اس کے منہ سے ایک ناقابل فہم آواز نکلی اور وہ کسی درندے کی طرح کتوں پر جھپٹا .... پھر ایک انسان اور پانچ کتوں کے درمیان خوفناک لڑائی چھڑ گئی۔ اباقہ کے ہاتھ پاؤں مشین کی طرح چل رہے تھے۔ کتوں کے نوکیلے دانت اور تیز پنجے اس کے جسم کو کوئی خاص نقصان پہنچانے سے قاصر نظر آ رہے تھے۔ یہ ایک عجیب و غریب مقابلہ تھا۔ ایک کتے نے اباقہ کا ہاتھ جبڑوں میں جکڑ رکھا تھا جبکہ ایک کتے کی شہ رگ میں اباقہ نے اپنے دانت گاڑ رکھے تھے۔ چند ہی لمحے بعد اباقہ نے کتے کا نرخرہ ادھیڑ کر رکھ دیا۔ باقی چار کتے اب بھی اس سے لپٹے ہوئے تھے۔ وہ ان کے ساتھ لڑھکنیاں کھاتا ہوا گڑھے کی دیوار کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا۔ پھر تماشائیوں نے ایک اور حیرت انگیز منظر دیکھا۔ اباقہ اچانک اپنے پاؤں پر اچھلا اور کنارے پر بیٹھے ہوئے ایک سپاہی کے ہاتھ سے تلوار چھین لی۔ وہ سپاہی گڑھے میں گرتے گرتے بچا۔ اب چاروں کتے خوفناک انداز میں غرا رہے تھے اور اباقہ وحشیانہ انداز سے تلوار کو چاروں طرف گردش دے رہا تھا۔ کنارے پر کھڑے سپاہیوں نے اپنے تیر کمان سیدھے کر لیے، لیکن اس وقت خان چغتائی کی آواز گونجی "ٹھہرو" وہ ابھی ابھی آیا تھا اور بڑی دلچسپی سے یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ گڑھے کے اندر صورت حال یکسر بدل چکی تھی۔ اباقہ نے ایک کتے کی اگلی دونوں ٹانگیں کاٹ دی تھیں اور باقی تینوں کتے حملہ کرنے کی بجائے گڑھے کی دیواروں کے ساتھ لگے بھونک رہے تھے۔ چند لمحے کے اندر اندر اباقہ نے تینوں خونخوار کتوں کو تہ تیغ کر ڈالا .... چاروں طرف گھمبیر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ پھر اس خاموشی میں تالی کی آواز سنائی دی۔ خان چغتائی گڑھے کے کنارے کھڑا اباقہ کو داد دے رہا تھا۔ قریب ہی سردار یورق رسیوں سے بندھا کھڑا تھا۔ چغتائی بولا۔

"یورق! اسی لیے میں نے تمہیں بعد میں ہلاک کرنے کا حکم دیا تھا۔ اس اجنبی کی سزا دراصل اس کا امتحان بھی تھی۔ اس کی کامیابی نے تمہاری زندگی بھی بچا لی۔" یورق ہانپتے ہوئے جسم کے ساتھ خان چغتائی کے سامنے سجدے میں گر پڑا۔ اس کا سر چغتائی کے

قدموں میں تھا۔ چغتائی نے حکم دیا کہ اجنبی کو گڑھے سے نکال کر میرے یورت (خیمے) میں پہنچایا جائے۔ گڑھے کے کنارے کھڑے تاتاری بڑی حیرت سے اس مافوق الفطرت شخص کو دیکھ رہے تھے۔ وہ خود بھی بلا کے وحشی اور سخت جان تھے، لیکن اجنبی ان صفات میں ان سے بھی بڑھ کر تھا۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ کوئی غیر منگول اس درجہ جری اور جنگجو ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ تھی جو وہ اسے بغیر کسی شک کے منگول سمجھ رہے تھے۔ اجنبی کے کپڑے تار تار ہو چکے تھے، لیکن جسم پر چند معمولی زخموں کے سوا کوئی نشان نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس بے مثال شخص کو دیکھنے والوں میں دو آنکھیں خان چغتائی کی چہیتی بیوی مارینا کی بھی تھیں۔ ان غلافی آنکھوں میں اجنبی کے لئے کچھ بے نام جذبے کروٹیں لے رہے تھے۔

☆-----☆-----☆

سردار یورق اور اباقہ کی سزائیں معاف کر دی گئیں۔ اباقہ ایسے نڈر اور جری جنگجو کی دریافت پر سردار یورق کو انعام کے طور پر چار حسین و جمیل روسی دوشیزائیں سونپ دی گئیں اس کے علاوہ کسی ختائی حکمران کا لوٹا ہوا چھوٹا ہیروں جڑا تاج بھی یورق کے حصے میں آیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اباقہ نے خان چغتائی کی نظروں میں اہم مقام حاصل کر لیا۔ اسے خان چغتائی کی قربت نصیب ہوئی تو بہت سے لوگ اس سے جلنے لگے، لیکن بہت جلد وہ سب کے سب اس کی صلاحیتوں کے معترف ہو گئے۔ وہ عجوبہ روزگار انسان تھا .... لڑائی بھڑائی کے فن سے بالکل نا آشنا، لیکن ایسا جنگجو جس کے سامنے بڑے بڑے سالاروں کا پتا پانی ہو جاتا تھا۔ اگر تاتاری وحشی تھے تو وہ وحشی تر تھا اگر وہ عیار تھے تو وہ عیار ترین تھا۔ اس کی آنکھوں میں سانپ کی کشش، چال میں شیر کا بانکپن اور حرکات میں چیتے کی پھرتی تھی۔ خان چغتائی اسے سدھانا چاہتا تھا۔ وہ اسے میدانِ کارزار کا تباہ کن شمشیر زن بنانے کا خواہشمند تھا اور اسی خیال سے اس کی تربیت کی جا رہی تھی، لیکن اس تحریر سے ہر کوئی ناواقف تھا جو اباقہ کے بازو پر کھدی تھی اور جو دن رات کسی انگارے کی طرح دہکتی رہتی تھی۔ ایک پل اسے چین نہیں لینے دیتی تھی۔ بعض اوقات وہ اپنے خیمے میں سویا ہوا بڑبڑا اٹھتا تھا .... "سردار بوغالی۔ سردار بوغالی۔" ابھی تک وہ سردار بوغالی کی شکل نہیں دیکھ سکا تھا۔ اس نے اپنے طور پر معلوم کرنے کی کوشش کی تھی اور اسے پتہ چلا تھا کہ وہ اپنے دستے کے ساتھ جھیل بیکال کی طرف گیا ہوا ہے۔ خان اعظم کا منجھلا بیٹا خان اوغدائی جو اپنے عظیم الشان لشکر کے ساتھ سائبیریا کے مغرب میں دریائے ینی سی کے قریب پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا، قراقرم واپس آ رہا تھا۔ اس کے استقبال کے لیے جھیل بیکال پر کچھ دستے

بھیجے گئے تھے' سردار بوغالی کا دستہ بھی ان دستوں میں شامل تھا۔ خیموں کے اس شہر میں خان اوغدائی کے انتظار کے سوا اور کچھ نہیں ہو رہا تھا۔ لوگ آرام اور عیش و عشرت میں مصروف تھے۔ ان دنوں عبوری طور پر خانِ اعظم چنگیز خان کا سب سے چھوٹا بیٹا تولوئی' خاقان کے فرائض انجام دے رہا تھا۔

ایک رات اباقہ بڑی خاموشی سے اپنے خیمے سے نکلا آدھی رات گزر چکی تھی۔ چاروں طرف گھپ اندھیرا تھا' لیکن کہیں کہیں خیموں کے درمیان پہرے دار گھوم رہے تھے۔ تھوڑی دور خان چغتائی کا وسیع و عریض یورت نظر آ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ قطار میں کوئی ایک درجن یورت تھے۔ یہ یورت چغتائی کی بیویوں کے تھے۔ اباقہ بلی کی چال چلتا ہوا ان خیموں کے عقب میں پہنچ گیا۔ اس کی آنکھیں اندھیرے میں کسی سانپ ہی کی طرح حرکت کر رہی تھیں۔ ایک خیمے کے پاس پہنچ کر وہ رک گیا۔ یہ مارینا کا خیمہ تھا۔ وہ گھوم کر خیمے کے سامنے آیا۔ ایک پہریدار بڑے سست انداز میں خیموں کے درمیان ٹہل رہا تھا۔ جونہی وہ ٹہلتا ہوا دوسری جانب گیا۔ اباقہ نے پھرتی سے خنجر نکالا اور خیمے کے دروازے کی ڈوری کاٹتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ اندر صرف ایک چھوٹی سی شمع جل رہی تھی۔ مارینا ایک مسہری نما چوکی پر لیٹی ہوئی تھی۔ نیچے قالین پر تین کنیزیں بے خبر سو رہی تھیں۔ اباقہ کے اندر داخل ہوتے ہی مارینا خوفزدہ انداز میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔ شاید وہ پہلے سے جاگ رہی تھی۔ اس کے خوبصورت چہرے پر گھبراہٹ کے آثار نمودار ہوئے۔ پھر وہ تیزی سے اٹھی اور پھونک مار کر شمع بجھا دی۔ تب اس نے اباقہ کا ہاتھ اپنے نرم وگداز ہاتھ میں لے لیا اور احتیاط سے چلتی ہوئی خیمے کے کونے میں پہنچ گئی۔

"تم آج پھر آ گئے۔" وہ لرزتی ہوئی سرگوشی میں بولی۔

"ہاں۔" اباقہ نے جواب دیا۔

مارینا نے کہا۔ "دیکھو اباقہ کسی کو ان ملاقاتوں کا پتہ چل گیا تو ہم دونوں کو ایسی اذیت ناک موت کا سامنا کرنا پڑے گا کہ تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔"

"میں نہیں ڈرتا۔" وہ اٹک اٹک کر بولا۔

"لیکن میں ڈرتی ہوں۔ تمہارے لیے بھی اور اپنے لیے بھی۔ جو لوگ ایسے چھپ چھپ کر ملتے ہیں انہیں مجرم سمجھا جاتا ہے اور خان چغتائی کی بیوی سے ایسے ملنا تو ایک ناقابل معافی جرم ہے۔ میں تمہارے ہاتھ جوڑتی ہوں یہاں سے چلے جاؤ۔"

اباقہ نے کہا۔ "اچھا میں چلا جاتا ہوں لیکن .... پہلے ویسے ہی کرو۔"

مارینا نے اندھیرے میں ٹٹول کر اس کا ہاتھ پکڑا۔ پھر ہاتھ کو اپنے گرم رخسار پر رکھ

کر دبا لیا۔ اباقہ بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ اسے عجیب سا اطمینان حاصل ہو رہا تھا۔ نرم ہتھیلی اور رخسار کے درمیان اس کا کھردرا ہاتھ جیسے کسی آغوش میں چھپا ہوا تھا۔ اپنی بائیس سالہ زندگی میں ایسا فرحت بخش تجربہ اسے کبھی نہیں ہوا تھا۔ وہ تو چند روز پہلے تک عورت کی شکل سے بھی ناواقف تھا۔ سب سے پہلے کوئی بیس روز قبل مارینا نے اسی طرح اس کا ہاتھ اپنے رخسار پر رکھا تھا۔ جب گڑھے میں خونخوار کتوں سے اس کی لڑائی ہوئی تھی تو اس کا یہ ہاتھ زخمی ہو گیا تھا۔ اسے گڑھے سے باہر نکالا گیا تھا تو تاتاری اسے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ پھر کچھ عورتوں نے اسے گھیر لیا تھا۔ وہ اس کی سخت جلد پر انگلیاں چھو چھو کر دیکھ رہی تھیں اور حیرت کا اظہار کر رہی تھیں۔ ان میں مارینا بھی تھی۔ مارینا نے اس کا زخمی ہاتھ دیکھا تھا اور بالکل غیرارادی طور پر اسے اپنے رخسار سے لگا لیا تھا۔

اباقہ کے ذہن کی صاف تختی پر وہ پہلا تجربہ ان مٹ تحریر کی صورت نقش ہو گیا تھا۔ اپنا ہاتھ رخسار پر رکھوانے کے لیے وہ تیسری مرتبہ خان معظم چغتائی خاں کی بیوی کے یورت میں داخل ہوا تھا۔ وہ بڑی خاموشی سے بیٹھا تھا۔ مارینا نے اس کا ہاتھ اپنے رخسار پر رکھا ہوا تھا۔ اسے اس انتہائی خونخوار اور وحشی' لیکن انتہائی معصوم نوجوان پر حیرت ہو رہی تھی۔ دل کی کچھ عجیب سی کیفیت تھی۔ وہ اسے خیمے میں آنے سے منع کرتی تھی' لیکن اس کے انتظار میں جاگتی بھی رہتی تھی۔ عرصہ ہوا وہ پیار محبت کا مفہوم بھول چکی تھی۔ اسے کچھ یاد نہیں تھا کہ وہ کون ہے کہاں سے آئی ہے۔ اس نے جب سے ہوش سنبھالا تھا اپنے چاروں طرف ان درندہ نما لوگوں کے غول دیکھ رہی تھی۔ اسے کچھ بوڑھی تاتاری عورتوں نے پالا تھا۔ انہوں نے اسے بتایا تھا کہ دنیا کی تمام عورتیں خان اعظم چنگیز خاں کی ملکیت ہیں۔ دنیا کی ہر زندہ اور مردہ شے پر چنگیز خاں اور اس کے بیٹوں کو تصرف حاصل ہے۔ وہ جسے جب اور جیسے چاہیں استعمال کریں۔ مردوں کی حریصانہ نگاہیں دیکھ دیکھ کر مارینا کو اندازہ ہوا تھا کہ وہ بڑی خوبصورت ہے۔ وقت گزرتا رہا۔ اس میں جسمانی تبدیلیاں آئیں اور وہ جوان ہو گئی۔ پھر ایک روز خان اعظم کے بیٹے شہزادہ چغتائی کی نظر اس پر پڑی۔ شہزادہ کے آوارہ ہاتھوں پر مارینا کو سخت غصہ آیا۔ جب وہ چلا گیا تو مارینا رونے لگی۔ بوڑھی عورتوں نے مارینا کو بتایا کہ اسے تو رونے کی بجائے خوش ہونا چاہئے۔ شہزادہ چغتائی نے اسے اپنی بیوی بنانا پسند کر لیا ہے۔ پھر اس کی شادی ہو گئی۔ وہ ایک سجے سجائے خوبصورت خیمے میں آ گئی۔ یہاں آ کر اس کی معلومات میں کوئی خاص اضافہ نہیں ہوا۔ وہ پہلے سے جانتی تھی کہ دنیا کی تمام عورتیں خان اعظم اور اس کی اولاد کی ملکیت ہیں۔ وہ مردوں کی خواہش پوری کرنے کے لیے پیدا کی گئی ہیں .... پیار کسے کہتے ہیں'

محبت کیا ہوتی ہے۔ دلوں میں پھول کس موسم میں کھلتے ہیں' یہ باتیں نہ اسے بتائی گئیں اور نہ اسے ان کا تجربہ ہوا .... لیکن اب اس نوجوان کے بے حس و حرکت ہاتھ میں نہ جانے کیسا جادو تھا کہ وہ اسے مہینوں اپنے رخسار سے لگائے رکھنا چاہتی تھی .... وہ سوچ رہی تھی کاش وہ اس حرکت کے نتائج و عواقب سے آگاہ نہ ہوتی۔ اسے معلوم نہ ہوتا کہ اس جرم کی سزا کتنی بھیانک ہے۔

رات کافی بیت چکی تھی۔ قریب ہی کہیں پہریداروں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ مارینا نے اباقہ سے کہا کہ اب اپنے خیمے میں چلے جاؤ۔ اباقہ مایوسی سے اٹھا اور احتیاط سے اِدھر اُدھر دیکھ کر باہر نکل آیا۔

☆------☆------☆

شمال کی طرف سے گرد و غبار کا بہت بڑا بادل فضا میں بلند ہو رہا تھا۔ خان اوغدائی اپنے ٹڈی دل لشکر کے ساتھ قراقرم میں داخل ہو رہا تھا۔ انسانوں کی اس وسیع و عریض جھیل میں ایک اور بہت بڑا دریا آکر گرنے والا تھا۔ اباقہ ایک چھوٹے سے ٹیلے پر کھڑا تھا جہاں تک نگاہ جاتی تھی گھوڑے اور انسانی سر دکھائی دے رہے تھے۔ یہ خونی آندھی ہزارہا انسانی بستیوں کو نیست و نابود کر چکی تھی۔ ان لشکریوں کی گردن پر لاکھوں انسانوں کا خون تھا' لیکن اباقہ کو اس ٹڈی دل میں صرف ایک شخص سے مطلب تھا۔ صرف ایک گردن۔ ہاں غرور و نخوت سے اکڑی ہوئی صرف ایک گردن۔ اسے سردار بوغالی کی گردن توڑنا تھی یا خود ختم ہو جانا تھا۔ وہ دیکھتا رہا........... دیکھتا رہا۔ لشکر قریب آتا جا رہا تھا۔ پھر کسی کا ہاتھ اس کے کندھے پر آیا اور وہ چونک گیا۔ یہ اس کا استاد ترکمان سردار پاشا تھا۔ اس نے کہا کہ خان معظم چغتائی کے چھوٹے بھائی اوغدائی کی آمد پر ایک جشن کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔ اس جشن میں کچھ کھیل تماشے ہوں گے۔ تم بھی ان کھیلوں میں شرکت کرنا۔ اباقہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

دوسرے روز سہ پہر کے وقت خیموں کے درمیان ایک کھلی جگہ میں کھیلوں کا انتظام کیا گیا۔ تیر اندازی کے علاوہ تلوار بازی اور کشتی کے مقابلے بھی ہوئے۔ اس دفعہ کچھ سردار روس کے وسطی علاقے سے ایک نیا کھیل لے کر آئے تھے۔ یہ ایک دلچسپ کھیل تھا۔ اس کے لیے چیڑ کے دو طویل القامت تنے زمین میں گاڑ دیئے گئے تھے۔ دونوں تنوں کی بلندی ایک جیسی تھی اور یہ بالکل سیدھے تھے۔ مقابلہ کرنے والے دو کھلاڑی تیزی سے ان تنوں پر چڑھتے تھے اور بالائی سرے پر رکھی ہوئی ایک انسانی کھوپڑی کو ہاتھ لگا کر نیچے اتر آتے تھے۔ جس کے پاؤں پہلے زمین کو چھو لیتے وہ جیت جاتا تھا۔ تنے کافی بلند تھے

بہت سے تو نصف راستے تک جا کر ہمت ہار جاتے تھے۔ اباقہ کو یہ کھیل بہت پسند آیا۔ وہ واحد شخص تھا جو تین مرتبہ درخت پر چڑھا اور ہر بار جیتا' کوئی شخص اس سے زیادہ رفتاری کا مظاہرہ نہ کر سکا۔ خان اعظم کے تینوں بیٹے' بڑے بڑے سردار اور مصاحب سب یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ ہر کوئی اس کی سخت جانی اور پھرتی کا معترف تھا۔ اباقہ کو اس کی جیت کا انعام دیا ہی جانے والا تھا کہ خان چغتائی کی آواز آئی۔ اس نے کہا:

"وہ بڑے سر والا کوہستانی کدھر ہے جو برفیلے پہاڑوں پر رسے پھینکا کرتا تھا۔"

کچھ دیر تماشائیوں میں کھسر پھسر ہوتی رہی پھر چاق و چوبند جسم کا مالک ایک درمیانی عمر کا تاتاری آگے بڑھ آیا۔ اس کے منڈھے ہوئے سر پر بالوں کی ایک موٹی لٹ "بودی" کی صورت میں نظر آ رہی تھی۔ بھنویں خوفناک حد تک اوپر اٹھی ہوئی تھیں اور پیشانی کے عین درمیان ایک زخم تھا۔ تلوار کا یہ زخم پیشانی سے لے کر اس کی ناک تک چلا گیا تھا۔ اباقہ نے اسے دیکھا اور اس کی رگ رگ میں آگ بھر گئی۔ بلاشبہ یہی بوغالی تھا .... بوغالی نے ورزش کے انداز میں اپنے بازوؤں اور ٹانگوں کو حرکت دی پھر ترچھی نظر سے اسے دیکھتا ہوا اپنے درخت کے پاس کھڑا ہو گیا۔ اباقہ یک ٹک اپنے دشمن کو گھور رہا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا ابھی اس شخص پر جھپٹے اور ٹکڑے ٹکڑے کر دے' لیکن پھر اس نے اپنے دل کو سمجھایا یہ موقع ٹھیک نہیں' جہاں اتنے برس انتظار کیا وہاں کچھ دیر اور سہی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ تنے پر ٹکائے اور ڈھول کی تھاپ کا انتظار کرنے لگا۔ پھر ڈھول پر چوٹ پڑی دونوں تیزی سے اپنے اپنے درخت پر چڑھنے لگے۔ تماشائی ہمت افزائی میں مشغول تھے۔ اباقہ بہت تھکا ہوا تھا۔ اس کے بازوؤں پر خراشیں تھیں اور ان سے خون رس رہا تھا' لیکن اپنے ازلی دشمن کو دیکھ کر اس کے جسم میں نئی قوت عود کر آئی تھی۔ جب وہ چوٹی سے ہو کر زمین کی طرف آ رہے تھے تو بوغالی تھوڑا سا پیچھے تھا' لیکن اس نے چند گز اوپر ہی سے زمین پر چھلانگ لگا دی۔ یہ کھیل کے ضوابط کے خلاف تھا۔ "مکار" اباقہ کے منہ سے غراہٹ بلند ہوئی۔ سردار بوغالی طیش میں اس کی طرف بڑھا اور ایک زور دار مکہ اسے مارنا چاہا لیکن .... وہ اباقہ تھا کوئی عام شخص نہیں تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ بوغالی کو اس سے واقفیت نہیں تھی۔ بوغالی کا ہاتھ فضا میں لہرا کر رہ گیا۔ پھر اس کی ٹھوڑی کے نیچے ایسا طاقتور گھونسہ پڑا کہ وہ چکرا کر دور جا گرا۔ ایک لمحے کے لیے تو اسے پتہ ہی نہیں چلا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا۔ جب اس کے حواس بحال ہوئے تو دو سپاہیوں نے اسے بازوؤں سے پکڑا ہوا تھا جب کہ آٹھ دس سپاہی اباقہ کو سنبھالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس کی آنکھوں سے درندگی جھانک رہی تھی۔ خاقان تولوئی کی

رعب دار آواز نے سب کو اپنی اپنی جگہ ساکت کر دیا۔ خان چغتائی اس صورت حال سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اس نے چھوٹے بھائی خاقان تولوئی کو مشورہ دیا کیوں نہ ان دونوں کا دست بدست مقابلہ کرا دیا جائے۔

اباقہ نے چغتائی کے الفاظ سنے اور اس کی رگوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی' لیکن خاقان کے چہرے پر غیر رضامندی کے آثار نظر آ رہے تھے۔ اس نے مقابلے کا حکم نہیں دیا' بہرحال فیصلہ کرنے والوں نے اباقہ کو ہی فاتح قرار دیا۔ وہ خاقانِ وقت تولوئی سے انعام وصول کرنے آگے بڑھا۔ اس وقت اس کی نگاہ چغتائی کے عقب میں کھڑی مارینا کی طرف اٹھی۔ اس کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔ اس نے دستور کے مطابق جھک کر خاقان کو سلام کیا' لیکن درحقیقت وہ اپنا سر اپنی محبوبہ مارینا کے آگے جھکا رہا تھا۔ خاقان نے اسے اپنے ہاتھ سے ایک قیمتی ہار عنایت کیا۔ جب اباقہ ہار لے کر اسٹیج سے نیچے اترا تو خاقان کے مصاحبین میں سے ایک شخص تیزی سے اس کے قریب آیا۔ اس شخص نے امامہ باندھ رکھا تھا۔ لباس اور وضع قطع سے وہ مسلمان دکھائی دیتا تھا۔ وہ بڑے غور سے اباقہ کا بازو دیکھنے لگا۔ تنے پر بار بار اترنے اور چڑھنے کے دوران اباقہ کی قمیض سینے اور بازوؤں سے پھٹ گئی تھی۔ پھٹی ہوئی آستین میں سے اس کے بازو کی تحریر نظر آ رہی تھی۔ بوڑھا باریک بینی سے یہ تحریر دیکھتا رہا پھر اس کی آنکھوں میں بے پناہ تحیر نظر آنے لگا۔ وہ اباقہ کے ہاتھوں کی ہتھیلیاں دیکھنے لگا۔ اباقہ نے جھنجلا کر بوڑھے کو پرے دھکیلا اور آگے نکل گیا۔ بوڑھے کی نگاہیں دور تک اس کا تعاقب کرتی رہیں۔ سب لوگ چونکہ ایک اور مقابلہ دیکھنے میں مصروف تھے اس لیے کسی نے اس واقعے پر توجہ نہ دی۔

☆ — — — ☆ — — — ☆

منظر خاقان اوغدائی کے شاندار خیمے کا تھا۔ زبردست غور و خوض اور غیر معمولی تاخیر کے بعد بالآخر منگولوں نے اپنا خاقان چن لیا تھا۔ چنگیز خاں کے منجھلے بیٹے اوغدائی کو خاقان بنا دیا گیا تھا۔ اس انتخاب کی خوشی میں قراقرم کے طول و عرض میں زبردست جشن برپا تھا۔ شراب کباب اور شباب کی یادگار محفلیں جمی ہوئی تھیں۔ اس قسم کی سب سے بڑی اور پُرہنگام محفل خاقان اوغدائی کے محل نما یورت میں برپا تھی۔ چنگیز خاں کے تینوں بیٹے اپنے اہل خانہ اور مشیروں وزیروں کے ساتھ مصروف خورد و نوش تھے۔ بڑے بڑے مٹکوں میں شراب بھری ہوئی تھی۔ نوخیز اور حسین خادمائیں مہ نوشوں کے جام بھر رہی تھیں۔ مختلف مویشیوں کا ابلا اور بھنا ہوا گوشت بڑے بڑے طباقوں میں رکھا تھا۔ خان تولوئی کے بیٹے منگو خان' قبلائی خان' ہلاکو وغیرہ بھی محفل میں موجود تھے ان کی خمار آلود

نگاہیں جام و سبو سے اٹھتی تھیں تو گوشت کے ٹکڑوں پر جم جاتی تھیں۔ گوشت کے ٹکڑوں سے اٹھتی تھیں تو حسین لڑکیوں پر اٹک جاتی تھیں۔ ان کے ہاتھوں کو بزرگوں کی موجودگی نے قدرے لگام دے رکھی تھی ورنہ جہاں منگول شہزادے ہوں وہاں شیطان نہ ناچے یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ اگر اس محفل نشاط و طرب میں کوئی خاموش تھا تو وہ مارینا تھی۔ اس کی نگاہیں جس کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ وہ کہیں نظر نہیں آتا تھا۔ آ بھی کیسے سکتا تھا۔ وہ ایک معمولی سپاہی اس شاہی خیمے میں کیسے داخل ہوتا۔ کئی روز سے اباقہ سے اس کی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ اتنی دیر میں خان چغتائی کی بیوی ارغونا بھی اس کے پاس آکھڑی ہوئی۔ وہ اس سے عمر میں چھوٹی تھی لیکن مارینا کے حسن کا مقابلہ نہیں کرتی تھی۔

"کس کو دیکھ رہی ہو؟" وہ چبھتے ہوئے لہجے میں بولی۔

"نہیں کچھ نہیں یونہی۔" مارینا گڑبڑا کر بولی۔

"آج کل تم کچھ کھوئی کھوئی رہتی ہو۔ خادمائیں کہتی تھیں کہ تم رات دیر تک جاگتی رہتی ہو... خیمے میں!" ارغونا نے "خیمے میں" کا لفظ کچھ اس طرح استعمال کیا تھا کہ یکبارگی مارینا کے ماتھے پر پسینہ آ گیا۔ اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن اتنے میں خان تولوئی کی بیوی سیورا قطنی اُدھر آ نکلی۔ سلسلہ کلام منقطع ہو گیا۔ سیورا قطنی' ارغونا سے باتیں کرنے لگی۔ مارینا کی نگاہ اچانک داؤد بن مسلم پر پڑی۔ یہ وہی بوڑھا تھا جو کل مقابلے کے بعد بڑے غور سے اباقہ کے جسم کا معائنہ کر رہا تھا۔ مارینا نے اسے ایسا کرتے دیکھا تھا اور تب سے وہ نامعلوم شک میں مبتلا تھی۔ اس شخص نے خان چغتائی پر اپنی دانائی کا رعب گانٹھ رکھا تھا اور اسے مختلف معاملات پر مشورے دیتا رہتا تھا۔ اس وقت یہ بوڑھا خان چغتائی کے ساتھ ایک کونے میں کھڑا بڑی راز داری سے باتیں کر رہا تھا۔ مارینا ٹہلتی ہوئی اس جانب نکل گئی۔ وہ اس گفتگو کا موضوع جاننا چاہتی تھی۔

بوڑھے کی آواز جذبات کی شدت سے کانپ رہی تھی۔ "خان محترم یقین جانیے یہ نشان بڑا معنی خیز ہے۔ آج سے اٹھارہ سال پہلے جب سمرقند و بخارا خاقان اعظم چنگیز خاں کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے کانپ رہے تھے ایک مسلمان نقاش نے یہ نشان اپنے بیٹے کے بازو پر بنایا تھا۔ اس نقاش کا نام کمال الدین تھا وہ لکڑی پر بیل بوٹے بناتا تھا۔ ایک حملے میں اس نقاش کی نوجوان بیوی منگول سپاہیوں کی تفریح طبع کا شکار ہو کر مر گئی۔ نقاش اور اس کا بیٹا بمشکل جان بچا سکے۔ پھر جب منگول سپاہ آگے رخصت ہو گئے تو ایک دن کمال الدین کو اس کے ایک ملازم نے ڈھونڈ لیا۔ وہ اپنے بچے کو کندھے پر اٹھائے شہر سے باہر جا رہا تھا۔ اس کا ایک بازو کندھے سے کٹ چکا تھا۔ ملازم نے پوچھا کہ وہ کدھر جاتا ہے۔ نقاش

نے بتایا کہ جنگل میں۔ ملازم نے وجہ پوچھی تو وہ بولا۔

"شہروں میں رہنے والے' کتابیں پڑھنے والے اور بیل بوٹے بنانے والے کمزور اور بزدل ہوتے ہیں' گھوڑوں کی ننگی پیٹھوں پر بیٹھنے والے جنگجو جب چاہیں انہیں روند سکتے ہیں' ان کی عزتیں لوٹ سکتے ہیں۔"

وہ بیوی کے غم میں ہلکان دکھائی دیتا تھا۔ ملازم نے دیکھا بچے کے بازو پر فارسی میں کچھ الفاظ کندہ ہیں۔

یہ دو الفاظ تھے "ماں" اور "انتقام۔" ملازم نے پوچھا یہ حروف کیسے ہیں۔ وہ بولا۔

"یہ میں نے کندہ کئے ہیں اور کندہ کرنے والا قلم ہمیشہ کے لیے توڑ کر پھینک دیا ہے۔ اس قلم نے مجھے میری بیوی کی کٹی پھٹی لاش دی ہے۔ ایک معذور جسم اور جلا ہوا گھر دیا ہے۔ میں اس قلم اور اس قلم رو سے بہت دور جا رہا ہوں۔ گھنے جنگلوں میں' سنگلاخ پہاڑوں اور برف پوش وادیوں میں جہاں آسمانی بجلیاں اور برفیلے طوفان میرے بیٹے کی پرورش کریں گے۔ یہ نوکیلے پتھروں پر سوئے گا' آسمان کی چادر اوڑھے گا' درختوں کے پتے کھائے گا اور جنگلی درندے اس کے دوست ہوں گے۔ قسم خدا کی میں اسے ایک وحشی بناؤں گا جو وحشیوں کے گروہ میں گھس کر اپنی ماں کے قاتل کو جہنم واصل کرے گا۔"

ملازم نے پوچھا لیکن یہ اپنے دشمن کو پہچانے گا کیسے؟ اس نے جواب دیا۔ "میں اپنے بیٹے کو اس قاتل کے بارے میں اتنا کچھ بتا جاؤں گا کہ اگر وہ اس دنیا میں ہوا تو اس سے چھپ نہیں سکے گا۔ اس کے بعد وہ اپنے بچے کو لے کر چلا گیا۔"

خان چغتائی غور سے اس کی باتیں سن رہا تھا کچھ سوچ کر بولا۔ "لیکن تمہیں یہ سب باتیں کیسے معلوم ہوئیں؟"

بوڑھے نے جواب دیا۔ "خان محترم! میں ہی وہ ملازم ہوں جس سے کمال الدین نے یہ باتیں کی تھیں اس آخری ملاقات کے بعد وہ مجھے کبھی نظر نہ آیا۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے وہ کوہ الطائی کے قرب و جوار میں کہیں مرکھپ چکا ہے لیکن اس کا بیٹا اس کے منصوبے کے عین مطابق ایک خطرناک وحشی بن گیا ہے۔ میں نے اس کے بازو کا نشان بڑی اچھی طرح دیکھا ہے۔ یہ وہی تحریر ہے خان محترم۔ اس لڑکے کا نام اسماعیل ہے۔ میں نے اس کے ہاتھ اور پاؤں کی انگلیاں بھی دیکھی ہیں۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ پندرہ سولہ سال یا اس سے بھی زیادہ عرصہ کوہ الطائی کی برفانی وادیوں اور دامن کے گھنے جنگلوں میں گھومتا رہا ہے۔"

چغتائی نے کہا۔ "لیکن وہ منگول زبان بولتا ہے۔"

بوڑھے نے کہا۔ "خان محترم! اس کا باپ زبانیں سیکھنے کا شوقین تھا اور منگول زبان بھی جانتا تھا یقیناً اسی نے لڑکے کو یہ زبان سکھائی ہے تاکہ ایک تاتاری کے روپ میں اسے اپنا بدلہ لینے میں آسانی ہو۔"

خان چغتائی نے ایک طویل سانس بھری اور کہا۔ "اگر تم ٹھیک کہہ رہے ہو اور وہ لڑکا واقعی مسلمان ہے تو یہ بڑی خطرناک بات ہے۔"

بوڑھے نے کہا۔ "خان محترم جتنی جلدی اس کا کام تمام کر دیا جائے اتنا ہی بہتر ہے۔"

جس وقت یہ باتیں ہو رہی تھیں مارینا چند قدم کے فاصلے پر کھڑی تھی۔ اُسے زیادہ کچھ تو سمجھ نہیں آئی لیکن اتنا پتہ ضرور چل گیا کہ یہ باتیں اباقہ کے خلاف ہوئی ہیں۔ داؤد بن مسلم کے مطابق اباقہ منگول نہیں مسلمان ہے اور خان چغتائی اُس کی گرفتاری یا موت کا حکم صادر کرنے والا ہے۔ مارینا کو لگا جیسے کوئی اُس کا دل مٹھی میں مسل رہا ہے۔ وہ جلدی سے خیمے کے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ دروازے کے قریب پہنچ کر اُس نے احتیاط سے اِدھر اُدھر دیکھا اور باہر نکل گئی۔ اُس نے خود کو ایک سیاہ چادر میں چھپا رکھا تھا۔ اس کا رخ اباقہ کے خیمے کی طرف تھا۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ ہر طرف ہنگامہ ہاؤ ہو برپا تھا۔ وہ تیزی سے چلتی خیموں کے عقب میں آئی یہاں آ کر اُس نے محتاط نظروں سے اردگرد کا جائزہ لیا۔ کچھ دیر جھجکتی رہی پھر چھوٹا سا چکر کاٹ کر سیدھی اباقہ کے خیمے میں داخل ہو گئی لیکن وہ اس بات سے بے خبر تھی کہ خاقان کے یورت سے کوئی برابر اس کے تعاقب میں ہے۔ وہ خیمے میں داخل ہوئی۔ اباقہ اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ موجود تھا۔ ایک عورت کو دیکھ کر وہ تینوں ٹھٹک گئے۔ مارینا نے منہ چھپائے چھپائے اباقہ سے کہا کہ وہ اس سے تنہائی میں بات کرنا چاہتی ہے۔ اباقہ کے تاتاری ساتھی اس کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے باہر نکل گئے۔ ان کے نکلتے ہی مارینا نے چادر الٹ دی اور تیز لہجے میں بولی۔

"مجھے معلوم ہے تیرا نام اباقہ نہیں کچھ اور ہے لیکن میں تجھ سے تیرا نام پوچھنے نہیں آئی' یہ بتانے آئی ہوں کہ تیری زندگی سخت خطرے میں ہے' تو جو کوئی بھی ہے تیرا پول کھل چکا ہے۔ خان چغتائی اپنی زبان سے تیری گرفتاری کا حکم صادر کر چکا ہے .... اور یاد رکھ جس کی طرف سے چنگیز خاں کے بیٹے نظریں پھیرلیں اس کی طرف سے زمین آسمان نظریں پھیر لیتے ہیں۔ اگر بھاگ سکتا ہے تو بھاگ جا' ابھی وقت ہے شاید تقدیر تیرا

ساتھ دے۔"

اباقہ یعنی اسماعیل کے چہرے پر زلزلے کے آثار نظر آ رہے تھے۔ اُس کی عقابی نگاہیں خیمے کے ایک حصے پر جمی ہوئی تھیں۔ پھر بے انتہا پھرتی سے اس نے اپنا خنجر نکالا اور ایک جگہ سے خیمے کا کپڑا چاک کر دیا۔ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ خیمے کے باہر جو کوئی بھی کان لگائے کھڑا تھا اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور اندر آ گرا۔ مارینا نے حیرت اور خوف سے دیکھا۔ مسلمان نوجوان کی بانہوں میں جھولنے والا جسم خان چغتائی کی بیوی ارغونا کا تھا۔ اس کا رنگ زرد ہو رہا تھا اور آنکھیں خوف سے پھٹی ہوئی تھیں۔ وہ کبھی مارینا کی طرف دیکھتی تھی اور کبھی اسماعیل کی طرف۔ لگتا تھا اُسے دونوں کی بیک وقت موجودگی کا یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس کا ذہن حیرت سے وا تھا۔ پھر اسماعیل کی سفاک سرگوشی سنائی دی۔

"اور کس کس کو میرے اور مارینا کے متعلق بتایا ہے تُو نے؟"

اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں گھمائیں اور بولی۔ "کسی کو نہیں .... کسی کو بھی نہیں .... لیکن یاد رکھ اس گستاخی پر خان چغتائی تجھے..........."

ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ اسماعیل کا ایک ہاتھ لڑکی کے منہ پر آیا اور دوسرے ہاتھ سے اس نے اس کی شہ رگ کاٹ دی۔ خون کا فوارہ ابل کر خیمے کی دری پر جا گرا۔ مارینا سکتے کے عالم میں کھڑی تھی۔ چند لمحے بعد اسماعیل نے ارغونا کا بے جان جسم فرش پر لڑھکایا اور گھمبیر لہجے میں بولا۔

"تیرا راز ہمیشہ راز رہے گا۔ مجھے امید ہے۔"

مارینا اُس کی طرف یک ٹک دیکھ رہی تھی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ نوجوان اتنے بڑے جرم کا ارتکاب کر چکا ہے۔ خان چغتائی کی بیوی کو قتل کرنے والا اگر زندہ بھی تھا تو مرا ہوا ہی تھا۔ اسے لگا جیسے وہ ایک مرے ہوئے شخص کو اپنے سامنے کھڑا دیکھ رہی ہے۔ تب جیسے وہ چونک گئی لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔

"تمہیں تمہارے خدا کا واسطہ یہاں سے چلے جاؤ۔ میں تمہیں اپنے سامنے قتل ہوتا نہیں دیکھنا چاہتی۔ وہ بس پہنچا ہی چاہتے ہوں گے۔"

اسماعیل کی آنکھیں اچانک جیسے کسی گہری سوچ میں ڈوب گئیں ایک عجیب طرح کی اداسی اور کرب کی کیفیت تھی ان آنکھوں میں۔ وہ براہ راست مارینا کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ اُس کا دل چاہتا تھا وہ ایک بار پھر اس رخسار کو چھو کر دیکھے لیکن اب شاید اس کا موقع نہیں تھا۔ کچھ فاصلے سے نامانوس سا شور سنائی دینے لگا تھا۔ گھوڑوں کی ٹاپیں گونج رہی تھیں۔ خان چغتائی کے بھیجے ہوئے موت کے پیامبر تیزی سے اُس کی طرف بڑھ رہے

تھے۔ اس نے چادر میں لپٹی ہوئی آنسو بہاتی اور کانپتی ہوئی اس حسین عورت کو دیکھا جس نے اسے زندگی کے ایک نئے پہلو سے آشنا کیا تھا۔ وہ ایک بار پھر نہایت عاجزانہ لہجے میں بولی۔ "چلے جاؤ .... اباقہ چلے جاؤ۔"

اسماعیل نے اپنی تلوار اٹھائی' اور الٹے قدموں پیچھے ہٹتا ہوا بولا۔ "شاید میں پھر آؤں گا۔" اس نے پھٹے ہوئے خیمے کا کپڑا ہٹایا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ اس کے نکلتے ہی مارینا بھی باہر نکلی اور خیموں کی اوٹ لیتی ہوئی تیز قدموں سے ایک جانب چل دی۔

☆------☆------☆

وہ خیموں کے شہر سے کئی کوس دور لمبی لمبی خود رو گھاس میں چھپا رات ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ اسے ایک بار پھر تاتاریوں کی اس قاتل بستی میں گھسنا تھا .... اپنے دشمن کے لئے۔ اس کے بازو کی تحریر جیسے پھنک رہی تھی .... اسے بار بار اپنا فرض یاد دلا رہی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اس بستی میں اور اس کے گرد دور دور تک موت کے ہرکارے اس کی تلاش میں ہیں لیکن موت کے ڈر سے وہ اپنے دشمن کو معاف نہیں کر سکتا تھا۔ شام سے کچھ دیر پہلے اسے دور سے چند گھڑ سوار آتے دکھائی دیئے۔ وہ بے حس و حرکت اپنی جگہ پڑا رہا۔ اس سے پہلے بھی سواروں کی ایک دو ٹکڑیاں اس جگہ سے گزر چکی تھیں لیکن ابھی تک وہ ان کی نظروں میں آنے سے محفوظ رہا تھا۔ اس نے سمجھا شاید یہ بھی سواروں کی کوئی ایسی ہی ٹکڑی ہے لیکن تھوڑی دیر کے بعد اسے گرد و غبار کا دبیز بادل فضا میں بلند ہوتا نظر آیا۔ اس نے دیکھا ان چند سواروں کے عقب میں ایک فوج چلی آ رہی تھی۔ یہ قریباً دو ڈھائی ہزار سوار تھے۔ وہ ایک نیم دائرے کی شکل میں پھیلے ہوئے تھے اور انداز سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ اس کی تلاش میں ہیں۔ زمین گھوڑوں کی ٹاپوں سے دہل رہی تھی۔ وہ دم سادھے اپنی جگہ پڑا رہا۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ اس کے نزدیک آ کر گھڑ سوار دو حصوں میں تقسیم ہو گئے تھے۔ ایک حصہ اس کی طرف بڑھ رہا تھا جب کہ دوسرا بائیں طرف نکل گیا تھا۔ اس تقسیم کی وجہ سے اسماعیل گھڑ سواروں کی براہ راست زد سے محفوظ ہو گیا تھا۔ اس کی طرف بڑھنے والا دستہ قریباً پچاس قدم کے فاصلے سے گزرا۔ کئی گھڑ سواروں کا فاصلہ اس سے بھی کم تھا۔ وہ دھڑکتے دل کے ساتھ ان کے گزرنے کا انتظار کرتا رہا پھر دفعتاً اسے ایک ایسی شکل نظر آئی کہ وہ بُری طرح چونک گیا۔ جس دشمن کی تلاش میں وہ واپس قراقرم کا رخ کرنے والا تھا' وہ تو اس کے متعاقب دستے میں موجود تھا۔ وہ سردار بوغالی کو ہزاروں میں پہچان سکتا تھا۔ ایک بار پھر اس کی رگوں میں سیال آگ دوڑنے لگی اس نے گھاس میں سے سر بلند کیا۔ دستہ کافی آگے نکل گیا تھا لیکن

اکا دکا گھڑسوار ابھی گزر رہے تھے۔ اس نے شمال کی طرف دیکھا۔ دستے کا آخری گھڑسوار کوئی دو سو قدم کے فاصلے پر تھا۔ اس نے اچانک فیصلہ کیا اور گھاس میں تیزی سے رینگتا ہوا آگے بڑھا۔ وہ کسی سانپ کی طرح بل کھاتا ہوا جا رہا تھا۔ جنگلی گھاس کے تیز کنارے اس کی جلد کو متاثر کرنے سے قاصر تھے۔ گھڑسوار بہت قریب آ چکا تھا۔ پھر شاید اسے گھاس کی جنبش پر شک ہو گیا تھا۔ اس نے گھوڑے کی رفتار سست کی اور الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اسماعیل کو گھوڑے کے ہانپنے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ وہ سوار کو دیکھ رہا تھا اس کا ہاتھ تلوار کے قبضے پر تھا اور وہ زیادہ سے زیادہ دس قدم کے فاصلے پر موجود تھا۔ تب ایک چنگھاڑ کے ساتھ اسماعیل اپنی جگہ سے برآمد ہوا اور جنگلی درندے کی طرح حیران و پریشان تاتاری پر چھلانگ لگا دی۔

چند لمحے بعد وہ تاتاری کے گھوڑے پر سوار باگ سنبھال چکا تھا۔ تاتاری کی سربریدہ لاش گھاس پر اوندھی پڑی تھی۔ اس نے دیکھا آگے جاتے ہوئے گھڑسوار ٹھٹک کر رک گئے ہیں۔ شاید انہیں عقب میں ہونے والی گڑبڑ کا علم ہو گیا تھا پھر جونہی گھڑسواروں نے لگامیں موڑیں اسماعیل نے بھی گھوڑے کو ایڑ لگائی اور تیزی سے مغرب کی طرف روانہ ہو گیا۔

فوج اس کے تعاقب میں تھی۔ ریگستانی علاقے اور اونچے نیچے ٹیلوں میں بھاگتے ہوئے آج اسے شاید تیسرا دن تھا۔ وہ اس علاقے کے چپے چپے سے واقف دکھائی دیتا تھا۔ اگر وہ چاہتا تو ممکن تھا متعاقب گھڑسواروں کو جل دینے میں کامیاب ہو جاتا لیکن لگتا تھا وہ خود انہیں تعاقب میں رکھنا چاہتا ہے۔ اس نے کئی بار خود انہیں اپنے پیچھے لگایا تھا۔ اس کوشش میں ایک بار تو معمولی زخمی بھی ہو گیا تھا۔ گھڑسواروں کے کچھ دستے اس کے اتنے قریب پہنچ گئے تھے کہ ان کے چلائے ہوئے تیروں میں سے ایک اس کے بازو میں پیوست ہو گیا تھا لیکن پھر وہ ان کا اور اپنا درمیانی فاصلہ برقرار رکھنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ گھوڑے کے چرمی تھیلوں میں موجود تمام گوشت اور پنیر ختم ہو چکا تھا لیکن خوراک ختم ہونے کی اب اسے زیادہ پرواہ نہیں تھی۔ وہ منزل کے بہت قریب پہنچ چکا تھا۔ دور افق پر بلند و بالا کوہستانی سلسلہ دکھائی دے رہا تھا۔ وہ جانتا تھا اگر وہ ایک بار ان پہاڑوں میں داخل ہو گیا تو تاتاریوں کی یہ فوج اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی۔ وہ اطمینان کے ساتھ اپنے دشمن سے انتقام لے سکے گا۔

پھر جب اس کے گھوڑے کا سایہ آگے سے پیچھے کی طرف گیا وہ کوہستانی سلسلے میں داخل ہو چکا تھا۔ اس کا رخ بلند و بالا پہاڑوں کی طرف تھا۔ اس کے ذہن میں کیا تھا یہ

صرف اسی کو معلوم تھا' کسی اور کو نہیں۔ آخر وہ ایک بلند و بالا بنجر پہاڑ کے دامن میں پہنچ گیا۔ اس پہاڑ کا ایک حصہ بالکل سیدھی دیوار کی صورت تھا۔ اس دیوار میں بڑی بڑی دراڑیں تھیں اور پتھر کی دیوہیکل سلیں یوں اٹکی ہوئی تھیں جیسے ہاتھ لگاتے ہی گر پڑیں گی۔ اس بلند چوٹی سے گرنے والے پتھر' ملبے کے ایک عظیم الشان ڈھیر کی صورت پہاڑ کے دامن میں پڑے تھے۔ اسماعیل یہاں پہنچ کر گھوڑے سے اترا اور اس خطرناک پہاڑ پر چڑھنا شروع کر دیا۔ اس بالکل سیدھی دیوار پر چڑھنا جان پر کھیلنے کے مترادف تھا لیکن وہ حیرت انگیز مہارت سے چڑھتا چلا گیا۔ لگتا تھا اُس کی زندگی ایسی ہی ڈھلوانوں پر چڑھتے اترتے گزری ہے۔ جب تاتاری فوج پہاڑ کے دامن میں پہنچی انہوں نے اسماعیل کے چڑھنے کا حیرت انگیز منظر دیکھا۔ وہ سپاٹ عمودی ڈھلوان پر ایک سیاہ نقطے کی طرح دکھائی دے رہا تھا .... پھر ان کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ چوٹی پر پہنچ گیا۔ اس فوج کا سالار اپنے ساتھیوں کی طرح انگشت بدنداں یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ اس کے قریب ہی بوڑھا داؤد کھڑا تھا۔ انہوں نے قراقرم میں جشن کے دوران اس نوجوان کو درخت کے سیدھے تنے پر تیزی سے چڑھتے دیکھا تھا اور وہ اس کی مہارت کے معترف ہو گئے تھے لیکن یہ کارنامہ تو محیرالعقول تھا۔ وہ جس جگہ پہنچ گیا تھا وہاں ایک ہزار تاتاری گھڑسوار بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے۔ نہ ان کی تلواریں وہاں پہنچ سکتی تھیں اور نہ تیر۔ چنگیز خان کے وحشی بیٹے جو دشمن کو معاف کرنا نہیں جانتے تھے بالکل مجبور دکھائی دے رہے تھے۔ وہ دانت کچکچا کر اس بلند و بالا چوٹی کی طرف دیکھ رہے تھے جہاں صرف ان کی نگاہیں پہنچ سکتی تھیں۔ ان کا دشمن ان کے سامنے تھا لیکن وہ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے۔ پھر اچانک تاتاری سالار کے ذہن میں کوئی بات آئی اور اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ وہ پکار کر بولا۔

"سردار بوغالی کو بلاؤ .... سردار بوغالی کو بلاؤ۔"

دوسری طرف اسماعیل بڑے اطمینان سے اپنی تلوار کو ایک پتھر پر تیز کر رہا تھا۔ وہ جانتا تھا اس بلند و بالا چوٹی پر وہ بالکل محفوظ ہے۔ یہاں ایک شخص کے سوا اور کوئی نہیں پہنچ سکتا تھا .... اور اسی شخص کی اسے ضرورت تھی۔ اس نے تلوار کی دھار پر انگلیاں پھیریں پھر دور افق کی طرف دیکھنے لگا۔ ہوا کے تیز جھکڑ چلنے شروع ہو گئے تھے اور ان کی شدت میں لحہ بہ لحہ اضافہ ہو رہا تھا۔ دور نیچے منگول فوج چیونٹیوں کی طویل قطاروں کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ وہ اپنی جگہ اطمینان سے بیٹھا رہا .... بیٹھا رہا اور پھر اسے اپنے ازلی دشمن کی آہٹ سنائی دی۔ چند لمحے اور گزرے اور پھر اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ ہانپتا کانپتا ہوا سردار بوغالی اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کا ہاتھ اپنی

تلوار کے دستے پر تھا۔ اسماعیل بڑے اطمینان سے کھڑا ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک خاموش طوفان ٹھہرا ہوا تھا۔ اس کے تھکے ہوئے خوفزدہ مدمقابل کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ مقابلے سے پہلے ہی ہار گیا ہے۔ کتنی ہی دیر دونوں ایک دوسرے کو پرکھنے والی نظروں سے دیکھتے رہے۔ اسماعیل کو یوں لگ رہا تھا جیسے منگول سردار کو زبردستی اس کے مقابلے پر بھیجا گیا ہے۔ اس کے ہونٹوں سے پھنکارتی ہوئی آواز نکلی۔

"منگول! میرے باپ نے کہا تھا کہ تُو نے میری ماں کو بے آبرو کیا تھا۔ پھر اسے اذیتیں پہنچا کر قتل کر دیا تھا۔ ایسی ہی لاتعداد عورتوں کے نام پر میں تجھے ایک چھوٹی سی سزا دینا چاہتا ہوں............"

ابھی اسماعیل کا فقرہ پورا ہوا ہی تھا کہ سردار بوغالی نے ایک چیخ کے ساتھ اس پر وار کیا لیکن اسماعیل نے یہ وار بچایا پھر اس کی تلوار حرکت میں آئی اور بوغالی کو پتہ چلا کہ تلوار کا قبضہ اس کے ہاتھ سے نکل گیا ہے۔ ایک لمحے کے لئے اس نے اپنی تلوار کو ہوا میں معلق دیکھا اور پھر وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ تب اسماعیل عقاب کی طرح جھپٹا اور اسے اپنے آہنی بازوؤں میں جکڑ لیا۔ اس سے پہلے کہ بوغالی کچھ سمجھتا اس کے داہنے ہاتھ کی چاروں انگلیاں کٹ کر نیچے گر گئیں۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں شاید اگلے وار کا انتظار کر رہا تھا لیکن اسماعیل نے اگلا وار نہیں کیا۔

"چلا جا منگول ...." وہ گرجا "اتر سکتا ہے تو اتر جا اس پہاڑی سے ...."

منگول سردار کے ہاتھ خالی تھے۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ اس وحشی نوجوان کی خون بار آنکھوں نے اس کا ذہن ماؤف کر کے رکھ دیا تھا پھر وہ خوفزدہ نظروں سے اسے دیکھتا ہوا پہاڑی سے نیچے اترنے لگا۔ اسماعیل ایک پتھر پر جھکا' منگول سردار کے نیچے اترنے کا تماشا دیکھ رہا تھا۔ اس نے اسے ایک ایسی اذیت ناک سزا دی تھی جو ہزار موت پر بھاری تھی۔ اس خطرناک ڈھلوان پر ایک ہاتھ سے اترنا جان کنی کے مسلسل عذاب کا دوسرا نام تھا۔ کوئی چالیس ہاتھ نیچے جا کر منگول سردار کو اندازہ ہوا کہ نیچے اترنا ناممکن ہے .... لیکن اب وہ اوپر بھی نہیں آ سکتا تھا۔ وہ سسکتا رہا' تڑپتا رہا اور چیونٹی کی رفتار سے نیچے کھسکتا رہا۔ آندھی کے تیز جھونکے اس کی آنکھوں میں قراقرم کے ویرانوں کی مٹی لا لا کر بھرتے رہے .... بالآخر ایک کربناک چیخ کے ساتھ اس کا جسم پہاڑ کے دامن میں گرا اور ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔

اسماعیل تھوڑی دیر پتھر سے ٹیک لگائے کھڑا رہا۔ بہت دور نیچے تاتاریوں کے دستے مختلف اطراف میں پھیل رہے تھے۔ وہ چکر کاٹ کر دوسرے راستوں سے اس چوٹی کے

قریب پہنچنا چاہتے تھے لیکن اسماعیل جانتا تھا آٹھ پہر سے پہلے وہ ایسا نہیں کر سکیں گے۔ اس نے ایک نظر افق کی طرف دیکھا۔ سینکڑوں کوس دور قراقرم شہر کا منظر اس کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگا۔ اُسے ایسا لگا جیسے وہ ماریتا کے سامنے کھڑا ہے۔ وہ محبت بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہی ہے۔ اس کا داہنا ہاتھ خود بخود آگے بڑھ گیا جیسے اس کے رخسار کو چھونا چاہتا ہو۔ پھر اس نے سر جھٹکا اور رخ پھیر کر آہستہ آہستہ پہاڑ سے اترنا شروع کر دیا۔

ہوا اب پہلے سے تیز ہو گئی تھی۔ کبھی کبھی بجلی کی چمک میں پہاڑوں کی بلند و بالا چوٹیاں نظر آتیں اور پھر ہر طرف اندھیرے کی چادر پھیل جاتی۔ وہ تاریکی میں پاؤں جما جما کر نیچے اترتا رہا۔ اس طرف کی ڈھلوان زیادہ خطرناک نہیں تھی۔ وہ کافی نیچے آ گیا تھا جب اس کے حساس نتھنوں نے ہوا میں بارش کی خوشبو سونگھی۔ بادلوں کی گھن گرج میں بھی اضافہ ہو چکا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اچانک موسلادھار بارش ہونے لگی۔ وہ بارش میں چلتا رہا۔ رات اب نصف سے زائد گزر چکی تھی۔ پہاڑ کے دامن میں ایک جگہ رک کر اس نے کوئی خودرو بوٹی اکھاڑ کر کھائی۔ پیٹ بھرا تو آنکھیں بوجھل ہونے لگیں۔ وہ تین راتوں سے مسلسل جاگ رہا تھا۔ اس کی طرح اس کی نیند بھی جنگلی تھی۔ وہ کسی بھی جگہ کسی بھی لمحے سو جانا چاہتا تھا .... پھر اُسے اپنے قریب ہی کہیں بھیڑیے کی غراہٹ سنائی دی۔ وہ بلی کی چال چلتا آواز کی سمت بڑھا۔ دو بڑے پتھروں کے درمیان ایک سیاہ خلا دکھائی دے رہا تھا۔ یہ کوئی پہاڑی کھوہ تھی۔ اس کے قریب پہنچتے ہی غراہٹ تیز ہو گئی۔ پھر ایک بھیڑیے کی چمکدار آنکھیں دکھائی دیں۔ تب دو آنکھیں اور دکھائی دیں۔ اباقہ بڑے اطمینان سے اس خون آشام جوڑے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ خوف کی بجائے اس کی آنکھوں میں عجیب طرح کی شرارت کروٹیں لے رہی تھی۔ یوں لگتا تھا وہ بھیڑیوں کو نہیں بکری کے بچوں کو دیکھ رہا ہے۔ اس نے منہ سے عجیب طرح کی آواز نکالی اور آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگا۔ بھیڑیے غراتے ہوئے باہر نکل آئے۔ وہ نر اور مادہ تھے۔ اباقہ کے ہر قدم کے بدلے وہ ایک قدم اٹھا رہے تھے۔ ان کی زبانیں باہر لٹک آئی تھیں اور وہ حملے کے انداز میں آگے بڑھ رہے تھے۔ اباقہ کے ہاتھ میں خنجر تھا۔ اس نے الٹے قدموں چلتے ایک بڑے سے پتھر کا چکر لگایا اور پھر بھاگ کر بھیڑیوں کے بھٹ میں گھس گیا۔ بھیڑیے بھونکتے ہوئے اس کی طرف لپکے لیکن اس نے پھرتی سے ایک پتھر بھٹ کے دہانے پر کھسکا دیا۔ اب بھیڑیے اندر داخل نہیں ہو سکتے تھے۔ موسلادھار بارش میں بھیڑیوں کو ان کے گھر سے بے دخل کرنے کے بعد اباقہ اطمینان سے پتھریلی زمین پر لیٹ گیا۔ ذرا ہی دیر بعد وہ دنیا و

مافیہا سے بے خبر گہری نیند سو رہا تھا۔

دوبارہ اس کی آنکھ ایک دھچکے سے کھلی۔ وہ بھیڑیوں کے بھٹ میں سو رہا تھا۔ رات دہانے پر اس نے ایک پتھر رکھ دیا تھا لیکن پھر بھی ایک بڑی درز موجود تھی۔ اس درز سے آنے والی دھوپ کی کرنیں اس کے جسم پر پڑ رہی تھیں۔ پہلے تو وہ سمجھا شاید صبح ہو رہی ہے لیکن پھر اس نے سمتوں پر غور کیا اور اسے اندازہ ہوا کہ شام پڑ رہی ہے۔ وہ نصف رات اور سارا دن سوتا رہا تھا۔ اچانک اسے لگا کہ وہ اس جگہ تنہا نہیں ہے۔ بھٹ کے سوراخ میں سے ایک بانس نما چیز بار بار اندر آ رہی تھی۔ اسی چیز کی ضرب نے اسے نیند سے بیدار کیا تھا۔ شاید کھوہ سے باہر کوئی شخص اسے جگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ دفعتاً اسے خطرے کا احساس ہوا۔ وہ چھپکلی کی طرح رینگتا ہوا کھوہ کے دہانے پر پہنچا۔ اس نے درز سے جھانکا اور حیران رہ گیا۔ منگول فوج کے ان گنت سوار کمانوں پر تیر چڑھائے اس کے استقبال کے لئے تیار کھڑے تھے .... اس نے ایک نظر اردگرد کا جائزہ لیا اور سمجھ گیا کہ بچنے کی کوئی صورت نہیں۔ ایک زوردار دھکے سے اس نے دہانے پر رکھے پتھر کو لڑھکایا اور سینہ تان کر باہر نکل آیا۔

اباقہ نے چندھیائی ہوئی نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ اُس کے لمبے بال تیز ہوا میں لہرا رہے تھے۔ سیاہ سمور کی ٹوپی داہنے ہاتھ میں تھی۔ چاروں جانب منگول سپاہی کمانوں پر تیر چڑھائے تیار کھڑے تھے۔ ہر لحہ اُن کے زہ کھینچتے جا رہے تھے .... جیسے انہیں ڈر ہو کہ ان کا قیدی بھاپ بن کر اڑ جائے گا یا زمین اُسے نگل لے گی۔ اباقہ اطمینان سے دو قدم چل کر آگے آیا۔ یوں لگا جیسے وہ خود کو منگول سالار کے حوالے کرنے کے لئے آگے بڑھا ہے۔ پھر اچانک بجلی سی کوند گئی۔ اباقہ نے نشیب کی طرف جست بھری تھی۔ کمانوں سے نکلنے والے تیر ڈوبتے سورج کی روشنی میں چمکے اور ہوا کو چیرتے ہوئے چٹانوں کے ساتھ ٹکرائے۔ اباقہ کی چھلانگ دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ کسی عقاب کی طرح بازو پھیلائے ہوا میں اڑتا ہوا کوئی تیس گز نیچے گیا۔ پھر اس کا جسم ایک گھنے درخت کی شاخوں سے ٹکرایا۔ شاخیں ٹوٹنے کی آوازیں آئیں۔ نشیب میں جھانکنے والے منگولوں نے دیکھا کہ درخت سے جدا ہو کر اباقہ کا جسم ایک بار پھر نشیب میں لڑھک رہا ہے۔ وہ پشت کے بل چھوٹے بڑے گول کنکروں پر پھسلتا چلا جا رہا تھا۔ یوں لگتا تھا وہ توازن برقرار رکھنے کی کوشش میں ہے لیکن کامیاب نہیں ہو رہا۔ چند ساعتوں میں اس کی رفتار بہت تیز ہو گئی .... اب اگر یہ شخص پتھر کا بھی تھا تو اس کا ایک ٹکڑے میں رہنا محال تھا۔ پھر منگول سپاہیوں نے دیکھا کہ اس نے خود کو سنبھالنے کی کوشش ترک کر دی اور پاؤں کے زور پر

اچھلا۔ اس کے بعد وہ اونچے نیچے پتھروں کے عقب میں گم ہو گیا۔ "دیکھو اسے۔" دستے کا سالار چلایا۔ منگول سپاہیوں کا سکتہ ٹوٹا۔ وہ ڈھلوان کی طرف لپکے۔ ڈھلوان خطرناک تھی۔ وہ بڑی احتیاط سے اتر رہے تھے۔ آخر وہ اس جگہ پہنچے جہاں سے اباقہ ہوا میں اچھلا تھا۔ انہوں نے نیچے دیکھا۔ دور نیچے ایک بڑا برساتی نالہ دکھائی دیا۔ نالے کا سفید پانی ہلکے ہلکے شور سے نشیب کی طرف رواں تھا۔ اباقہ کا دور دور پتہ نہیں تھا۔ منگول سپاہی کافی دیر نالے کی سطح کو گھورتے رہے لیکن کہیں کوئی سیاہ نقطہ دکھائی نہیں دیا۔ "مر گیا۔" کئی سپاہیوں نے بیک وقت کہا۔ دوسروں نے تائید میں سر ہلایا۔ یقیناً کسی گوشت پوست کے انسان کا اتنی بلندی سے لڑھک کر بچ جانا ممکن نہیں تھا۔

☆-------☆-------☆

وہ ایک طوفانی شام تھی۔ آسمان پر گہرے سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے۔ گاہے گاہے بجلی بھی کڑک جاتی تھی۔ بارش کی تیز بوچھاڑیں اس کے زخموں پر نمک پاشی کر رہی تھیں۔ وہ درختوں کے ایک جھنڈ میں صنوبر سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ پتھروں پر رگڑ کھانے سے اس کا جسم جگہ جگہ سے چھل گیا تھا۔ پھر وہ ہوا میں اڑتا ہوا یخ بستہ پانی میں گرا تھا۔ پانی کے نیچے ہی نیچے تیرتا ہوا وہ بہاؤ کی جانب کافی دور نکل گیا تھا۔ پھر جب اس نے پانی کی سطح پر آ کر سانس لیا تھا تو وہ منگول سپاہیوں کو بہت پیچھے چھوڑ آیا تھا۔

اس نے دیکھا' داہنا کندھا' داہنی کہنی اور ٹانگ بری طرح زخمی تھی۔ جسم کے ان حصوں سے لباس بھی پھٹ چکا تھا۔ سر کے پچھلے حصے سے بہنے والا خون اب بھی اس کی گردن پر جما ہوا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور لنگڑاتا ہوا درختوں کے درمیان چلنے لگا۔ بجلی رہ رہ کر کڑک رہی تھی اور اسے معلوم تھا منگول طوفان باد و باراں سے ڈرتے ہیں۔ ایسے موسم میں وہ کھلے آسمان تلے آنے سے گریز کریں گے۔ وہ اطمینان سے چلتا رہا۔ اندھیرا ہونے سے پہلے وہ کسی خاص چیز کی تلاش میں تھا۔ قریباً ایک کوس چلنے کے بعد وہ ایک جگہ بیٹھ گیا۔ ایک بڑے پتھر کے نیچے نوکدار پتوں والی کوئی بوٹی اُگی ہوئی تھی۔ اباقہ کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اُس نے یہ بوٹی توڑی۔ وہیں سے دو پتھر لے کر اُسے رگڑا اور اپنے زخموں پر لگا لیا۔ جلن کم ہوتے ہی اُس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہونے لگیں' ہلکی ہلکی پھوار سے بچنے کے لئے وہ وہیں ایک درخت کے نیچے لیٹ گیا۔

صبح آنکھ کھلی' اس نے اپنے زخموں پر ایک نگاہ ڈالی اور آہستہ آہستہ شمال کی طرف چلنے لگا .... وہ چلتا رہا۔ بلا رُکے اور بے تکان۔ سورج ڈوبتا اور ابھرتا رہا۔ دن گزرتے رہے۔ دھیرے دھیرے اُس کے زخم مندمل ہونے لگے۔ اس کی چال میں تیزی آتی گئی۔

اس کی حرکات میں پھرتی اور انداز میں بانکپن آگیا۔ بہت دیر ہوئی اس نے اپنا فوجی لباس اور جوتے اتار کر پھینک دیئے تھے۔ اب اس کے جسم پر بس چمڑے کا ایک زیر جامہ تھا۔ ننگے پاؤں اور ننگے جسم وہ آزاد فضاؤں میں کسی نوجوان چیتے کی طرح زقندیں بھرتا چلا جاتا تھا۔ رات ہوتی تو کسی کھوہ یا گھنے درخت کے نیچے پڑ رہتا۔ صبح ہوتے ہی پھر اپنے سفر کا آغاز کر دیتا۔ خوراک کی اُسے کوئی کمی نہیں تھی۔ جڑی بوٹیاں' درختوں کے پتے' راستے میں ملنے والے جنگلی خرگوش اور گلہریاں' سب اُس کی خوراک تھے۔ اُسے کوئی جلدی نہیں تھی' لگتا تھا اُسے کہیں نہیں پہنچنا۔ بس انہی ویرانوں میں بھٹکنا اُس کا مقصد حیات ہے۔ اُس کا رخ بدستور شمال کی طرف تھا۔ اگر ویرانوں میں سے کسی ویرانے کو وہ دوسرے پر ترجیح دے سکتا تھا تو وہ کوہ الطائی کا ویرانہ تھا' جہاں ایک چوٹی پر گھنے درختوں کے نیچے اُس کا باپ ابدی نیند سو رہا تھا۔

کبھی یونہی اونچی نیچی گھاٹیوں میں چلتے چلتے اباقہ کے دل میں عجیب طرح کی کسک ہونے لگتی۔ اُسے لگتا جیسے سینے میں کوئی چٹکیاں لے رہا ہے۔ ایسے میں ایک دھندلا سا چہرہ اُس کی نگاہوں میں گھومنے لگتا۔ یہ مارینا کا چہرہ تھا۔ وہ اس تصور سے پیچھا چھڑانے کے لئے بھاگنے لگتا۔ زمین سے کنکر اٹھا اٹھا کر ہوا میں اچھالتا۔ سیٹیاں بجا کر پرندوں کو اپنی طرف متوجہ کرتا لیکن جب رات ہوتی اور وہ سونے کے لئے زمین کے بستر پر لیٹتا اور اُس کی نگاہ آسمان پر چمکتے ستاروں پر پڑتی تو اُسے وہ ہونٹ یاد آجاتے جن پر ایسے ہی جگنو چمکتے تھے۔ جب چاند نمودار ہوتا تو اُسے لگتا کہ اس میں سے مارینا کی شبیہہ جھانک رہی ہے۔ پھر جب وہ نیند کی آغوش میں چلا جاتا تو اُس کے کانوں میں ایک درد بھرا منگول نغمہ گونجنے لگتا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اباقہ کی اداسی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اسے لگتا تھا جیسے وہ اندر سے زخمی ہے۔ اگر وہ اندر سے زخمی ہے تو اُس کا علاج کیسے ہو گا۔ اُس کے باپ نے اُسے کوئی ایسی جڑی بوٹی نہیں بتائی تھی جو اندر کے زخموں کو ٹھیک کر سکے۔ یہ کیسی آگ تھی جو ہر وقت اُس کے سینے میں جلتی رہتی تھی۔ یہ کون سی طاقت تھی جو اس کے قدموں کو شمال کی جانب جانے سے روکتی تھی' اُسے جنوب کی طرف کھینچتی تھی۔

وہ موسم بہار کا ایک خوشگوار دن تھا۔ زمین سے گھاس کی پتیاں نمودار ہو رہی تھیں۔ دور گرم علاقوں کو ہجرت کرنے والے پرندے اپنے گھونسلوں میں واپس آ رہے تھے۔ اباقہ دیر تک بیٹھا اپنے داہنے ہاتھ کو گھورتا رہا۔ اس ہاتھ کو ایک رخسار کی ضرورت تھی اُس کے اندر سے ایک بلند لہر اٹھی۔ دفعتاً وہ اٹھا اور رخ موڑ کر جنوب کی طرف بھاگنے لگا۔

☆------☆------☆

مارینا درختوں کے درمیان اُس جھنڈ میں بیٹھی تھی جہاں پہلی بار اباقہ سے اُس کی ملاقات ہوئی۔ اُس کی آنکھیں کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ چہرے پر غم و اندوہ کی پرچھائیاں تھیں۔ بھیگے بالوں سے قطرہ قطرہ پانی ٹپک کر جیسے اُس کے دکھ کا ساتھ دے رہا تھا۔ نہ جانے وہ کیوں ابھی تک اس اجنبی کو بھلا نہیں سکی تھی' وہ جانتی تھی کہ وہ اب اس دنیا میں نہیں۔ چغتائی خاں کے بھیجے ہوئے منگول سپاہی اسے انجام کو پہنچا چکے ہیں۔ وہ بلند پہاڑ سے لڑھک کر موت کی وادی میں اتر چکا ہے لیکن پھر بھی اجنبی کی معصوم آنکھیں بار بار اس کے ذہن میں در آتی تھیں۔ اسے وہ کھردرا ہاتھ یاد آتا جو بے حس و حرکت اس کے رخسار پر پڑا رہتا تھا۔ ایسے میں نہ جانے کیوں اسے اپنے رخسار پر جلن کا احساس ہوتا۔ وہ گھبرا کر اپنا ہاتھ رخسار پر رکھ لیتی جیسے اس رخسار پر اباقہ کی ہتھیلی کا نشان ہو اور وہ اسے دوسروں کی نگاہوں سے چھپا رہی ہو۔ ابھی تک اس کا راز' راز ہی تھا۔ کسی کو معلوم نہیں ہوا تھا کہ ارغونا' اباقہ کے خیمے تک کیونکر پہنچی۔ لوگوں کا خیال یہی تھا کہ اباقہ' اُسے زبردستی اٹھا کر اپنے خیمے تک لایا تھا اور پھر مزاحمت پر اسے قتل کر دیا۔ اباقہ کے ان دو ساتھیوں کو خان چغتائی کے حکم پر قتل کر دیا گیا تھا۔ جنھوں نے بیان دیا تھا کہ سیاہ شال میں لپٹی ہوئی ایک عورت اباقہ سے ملنے آئی تھی۔ اس بیان سے ارغونا کے کردار پر شبہ ہونے کا اندیشہ تھا۔ مارینا اپنی سوچوں سے اچانک چونک گئی۔ چند قدم دور آمنہ کھڑی اسے گھور رہی تھی۔ جب بھی وہ آمنہ کو دیکھتی تھی اس کے دل میں عجیب سا خوف جاگزیں ہو جاتا تھا اسے لگتا تھا آمنہ اس حقیقت سے باخبر ہے جو ارغونا کے قتل کا سبب بنی۔ اس نے کئی بار آمنہ کو ٹٹولنے کی کوشش کی تھی لیکن اُس نے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا تھا۔ مارینا کو چونکتے دیکھ کر آمنہ اس کی طرف بڑھ آئی اور بے باکی سے بولی۔

"مالکہ! آپ کی یہ اداسی ختم ہونے کی بجائے بڑھتی جا رہی ہے۔"

مارینا نے چڑ کر کہا۔ "تمہیں کتنی بار کہا ہے میں بالکل ٹھیک ہوں' خواہ مخواہ زچ نہ کیا کر۔"

آمنہ اُس کی خادماؤں میں سب سے سمجھدار اور بڑی تھی۔ عمر یہی تیس سال رہی ہو گی۔ وہ مارینا کو پالنے والی تاتار عورتوں میں بھی شامل تھی۔ یہی وجہ تھی کہ مارینا سے آزادانہ گفتگو کر لیتی تھی۔ مارینا نے محسوس کیا تھا کہ جب سے اباقہ والا واقعہ ہوا ہے آمنہ اس سے کچھ زیادہ ہی بے تکلف ہو گئی ہے۔ اس کی یہ بے تکلفی بعض اوقات مارینا کو ہولا دیتی تھی۔ نہ جانے اُسے کیوں لگتا تھا کہ آمنہ اس سے چوہے بلی کا کھیل کھیل رہی ہے اور کسی روز ساری بات خان چغتائی کے کانوں تک پہنچا دے گی۔

☆------☆------☆

کئی دن کے سفر کے بعد اباقہ ایک بار پھر قراقرم کی فضاؤں میں داخل ہو گیا۔ جس وقت وہ خیموں کے عظیم الشان شہر کے نواح میں پہنچا' سورج نصف نہار پر تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اُڑ کر مارینا کے پاس پہنچ جائے۔ آگے بڑھنے سے پہلے اسے بہرصورت اندھیرا پڑنے کا انتظار کرنا تھا .... اور پھر انتظار کی گھڑیاں ختم ہو گئیں۔ اندھیرے کی چادر نے قراقرم کی وسعتوں کو ڈھانپ لیا۔ ننھے ننھے بے شمار جگنو خیموں کی بیکراں بستی میں چمکنے لگے۔ ان میں سے ایک جگنو اس خیمے کا بھی تھا جہاں مارینا موجود تھی۔ اباقہ کا دل شدت سے دھڑکنے لگا۔ وہ اپنی پناہ گاہ سے نکلا۔ چھپتا چھپاتا مرکزی خیموں تک پہنچا اور پھر لوگوں کے سیلاب میں گم ہو گیا۔ وہ جانتا تھا خان چغتائی کے خیموں کے قریب جانے میں خطرات پوشیدہ ہیں۔ وہاں بہت سے لوگ اُسے جانتے تھے۔ جوں جوں اندھیرا پھیل رہا تھا گھومنے پھرنے والوں کی تعداد کم ہو رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ کوئی اُسے پہچان لے اُسے کہیں چھپنا تھا۔ پھر اُس کا دھیان درختوں کے اُس جھنڈ کی طرف گیا جہاں معزز سرداروں کی بیویاں غسل کرنے اور منہ ہاتھ دھونے کے لئے آتی تھیں اور جس ایک کونے میں اس نے مارینا کو منگول گیت گاتے سنا تھا' وہ چھپتا چھپاتا درختوں کے اس جھنڈ تک پہنچا۔ ہر چیز ویسی ہی تھی جیسی وہ چھوڑ کر گیا تھا۔ وہ لمبی لمبی گھاس بھی وہیں تھی جہاں وہ چھپا رہا تھا اور وہ پتھر بھی نظر آ رہا تھا جہاں مارینا بیٹھی تھی۔ اس نے اس درخت پر محبت سے ہاتھ پھیرا جس سے مارینا نے ٹیک لگا رکھی تھی۔ پھر وہ گھاس میں گھس کر بیٹھ گیا۔ نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ صبح کا انتظار کرنے لگا۔ نہ جانے اسے کیوں یقین تھا کہ مارینا اس ویران کنج میں ضرور آئے گی۔ پہاڑ جیسی طویل رات کٹ گئی۔ صبح ہوئی اور اباقہ وحشی دل کی دھڑکنوں پر قابو پائے اپنی محبوبہ کے انتظار میں بیٹھا رہا۔ اجالا پھیلا' سورج طلوع ہوا .... دوپہر ہوئی' لیکن مارینا نہیں آئی۔ پھر شام ہوئی اور ایک طویل رات منہ پھاڑے اُس کے سامنے آ گئی۔ جیسے تیسے یہ رات بھی کٹی۔ اگلے روز وہ پھر آس لگا کر بیٹھ گیا۔ آج درختوں کی دوسری جانب سے کچھ عورتوں کے ہنسنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اباقہ کی امید بندھی لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ آوازیں مدھم ہو گئیں۔ مارینا آج بھی نہیں آئی۔ اباقہ سخت مایوس تھا یہ مایوسی اس کے اندر غصے کی لہریں پیدا کر رہی تھی۔ اس نے سوچا وہ سارے اندیشے بالائے طاق رکھ کر مارینا کے خیمے میں جائے گا۔ ابھی وہ اٹھنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ شاخوں میں حرکت پیدا ہوئی۔ جیسے بدلیوں کی اوٹ سے چاند نکلتا ہے' درختوں کے عقب سے مارینا نمودار ہوئی۔ وہ گلابی رنگ کے ایک کھلے ریشمی لبادے میں ملبوس

تھی۔ ہیروں کا ایک قیمتی ہار اس کے گلے میں جگمگا رہا تھا۔ وہ بے خیالی میں درختوں کے پتے توڑتی کچھ کھوئی کھوئی سی پتھر پر آ کر بیٹھ گئی۔ اباقہ کے لئے اب خود پر قابو رکھنا ناممکن تھا۔ وہ چھلانگ لگا کر مارینا کے سامنے آ گیا۔ مارینا نے اس ننگ دھڑنگ شخص کو دیکھ کر چیخ مارنے کے لئے منہ کھولا لیکن پھر ٹھٹک گئی۔ "اباقہ .... تم۔" وہ یک ٹک حیرت سے اسے دیکھتی رہی۔ "تم .... زندہ ہو۔"

"ہاں!" وہ اسے والہانہ انداز میں دیکھتے ہوئے بولا۔ مارینا بھی اسے عجیب وارفتگی کے عالم میں دیکھ رہی تھی۔ پھر جیسے وہ اپنے خیالوں سے چونکی۔ اُس کے چہرے پر سراسیمگی کے آثار نظر آئے۔

"اباقہ .... تم پاگل تو نہیں ہو۔ کیوں آئے ہو یہاں۔ یہ لوگ .... تمہیں ایسی اذیت ناک موت ماریں گے کہ ...." اچانک اس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے اور وہ ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگی۔ اباقہ اس کے قریب دو زانو بیٹھ گیا۔ اسے روتا دیکھ کر اس کی آنکھوں میں عجیب طرح کا دکھ کروٹیں لینے لگا تھا۔ مارینا کا ہاتھ آنکھوں سے ہٹانے کے لئے اس نے اس کی کلائی تھامی تو وہ تڑپ کر کھڑی ہو گئی اور گلوگیر آواز میں بولی۔

"اباقہ .... تم چلے کیوں نہیں جاتے یہاں سے۔ چلے جاؤ یہ دنیا یہ لوگ تمہارے لئے نہیں ہیں۔ تم جنگلوں اور بیابانوں کے آدمی ہو .... اس آب و ہوا میں زندہ نہیں رہ سکو گے۔"

اباقہ نے اُس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "میرے ساتھ چلو گی۔"

مارینا نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور بولی۔ "نہیں اباقہ نہیں۔ اس نیلے آسمان کے نیچے سے تو کوئی نکل سکتا ہے لیکن خاقانِ اعظم کی دسترس سے باہر ہونا ممکن نہیں۔ ایسا دماغ میں بھی مت لاؤ۔ اباقہ اگر تمہیں دوبارہ زندگی مل ہی گئی ہے تو اسے یوں مت گنواؤ۔ جاؤ جہاں کے ہو وہیں جا رہو۔"

اباقہ نے ذرا توقف کیا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "میں تمہارے بغیر نہیں جاؤں گا۔" اس کے لہجے میں سیاہ چٹانوں کی سختی اور الفاظ میں گہرے پانیوں کی ہیبت تھی۔ اس کا کہا ہوا ایک ایک لفظ ایک پہاڑ تھا۔ کچھ عجیب گونج تھی ان لفظوں میں۔ مارینا جیسے اندر سے کانپ گئی۔ اس نے اپنا ہاتھ بڑھا کر اباقہ کا ہاتھ تھام لیا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اس سرپھرے جنگلی کو اس خطرے سے کیونکر آگاہ کرے جو ایک چھری کی طرح اس کی شہ رگ تک پہنچ چکا تھا۔ اچانک جھاڑیوں میں سرسراہٹ ہوئی اور مارینا نے گھبرا کر

اباقہ کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ آنے والی آمنہ تھی۔ اسے دیکھ کر مارینا کا رنگ زرد ہو گیا۔ آمنہ نے پہلے اباقہ کی طرف اور پھر اپنی مالکہ کی طرف دیکھا۔ دونوں گہری نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھتی رہیں۔ اندیشوں میں ڈوبے ہوئے وہ چند لمحے بہت طویل تھے پھر آمنہ کے چہرے پر مسکراہٹ نظر آئی۔ وہ سر جھکا کر ادب سے بولی۔ "مالکہ گھبرائیں مت، لونڈی سب کچھ جانتی ہے۔ مجھے اباقہ کی ساری کہانی معلوم ہے۔ میں درختوں کے پیچھے کھڑی آپ کی باتیں سننے کی جسارت کر رہی تھی لیکن آپ مجھے معاف فرمائیں گی کیونکہ میرا اصل مقصد آپ کی .... حفاظت تھا۔ میں یہ بتانے آئی ہوں کہ خان تولائی کی بیوی سیورا قطنی آپ کو آوازیں دیتی پھر رہی ہے کہیں وہ اس جانب نہ آ نکلے۔" مارینا کے چہرے پر پریشانی نظر آئی اس نے اباقہ سے کہا۔ "میں پھر آؤں گی۔" اور تیزی سے واپس مڑ گئی۔

آمنہ بڑے انداز سے چلتی ہوئی اباقہ کے قریب آئی اور بولی۔ "سنا ہے اباقہ تمہیں درد نہیں ہوتا۔ منگول سپاہی بتاتے تھے کہ تمہیں خنجر بھی گھونپ دیں تو تکلیف نہیں ہوتی۔" پھر وہ اباقہ کی کلائی تھام کر اس کی جلد دیکھنے لگی۔ "کیا میں تمہیں کاٹ کر دیکھوں۔" وہ پُر تجسس لہجے میں بولی۔ پھر اباقہ کے جواب دینے سے پہلے ہی اس نے دانتوں سے اس کی کلائی پر کاٹ کھایا۔ اباقہ کے جبڑے بھنچ گئے۔ لڑکی نے اس کی کلائی سے دانت نکالے اور تعریفی لیکن خوفزدہ نظروں سے اسے دیکھتی ہوئی درختوں میں غائب ہو گئی۔

دوسرے دن اباقہ انتظار کرتا رہا لیکن مارینا نہیں آئی۔ یہ انتظار اس لئے بھی تکلیف دہ تھا کہ وہ سارا دن گھاس کے اندر بے حس و حرکت دبکا رہتا تھا۔ دو دن اور دو راتیں اسی کرب کے عالم میں گزر گئیں۔ آخر تیسرے دن دوپہر کے وقت اسے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ اس کا دل شدت سے دھڑکنے لگا۔ وہ شاخیں ہلنے اور مارینا کے نمودار ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ پھر شاخوں میں حرکت پیدا ہوئی لیکن مارینا کی بجائے ایک اور چہرہ دکھائی دیا۔ یہ آمنہ تھی۔ وہ احتیاط سے اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ پھر وہ ذرا سی آگے آئی اور اباقہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اُس کی آنکھوں میں امید کے دیے جل رہے تھے لیکن آمنہ کی آنکھیں بجھی ہوئی تھیں۔ وہ بہت سنجیدہ دکھائی دیتی تھی بلکہ اباقہ نے محسوس کیا کہ وہ اسے دیکھ کر چونک سی گئی ہے۔ شاید اس کا خیال تھا کہ اباقہ یہاں موجود نہیں ہو گا۔ اس نے کہا۔

"اباقہ مجھے مالکہ نے بھیجا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ تم فوراً یہاں سے چلے جاؤ .... ورنہ پکڑے جاؤ گے۔"

یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ مارینا کے منہ سے یہ فقرہ وہ کئی بار سن چکا تھا۔ اس نے

آمنہ سے کہا۔ "اس سے کہو، میں نہیں جاؤں گا۔" اس کا لہجہ پہلے کی طرح پُرعزم اور فیصلہ کن تھا۔ آمنہ واپس چلی گئی۔ اباقہ پھر اپنی پناہ گاہ میں چھپ گیا۔ ایک دن اور گزر گیا۔ اگلے روز صبح ہوئی تو اباقہ کا دل امید و ناامیدی کے درمیان ڈول رہا تھا۔ ایک ایک کر کے عورتیں درختوں کی دوسری جانب جمع ہونے لگیں۔ باتوں اور قہقہوں کی آوازیں سنائی دیں۔ پھر اباقہ کے حساس کانوں نے مارینا کی آواز پہچان لی۔ وہ آج آئی ہوئی تھی۔ وہ دل کی دھڑکنیں گنتا اور انتظار کرتا رہا۔ اس کے ہاتھ میں عجیب سی سنسناہٹ ہو رہی تھی۔ دست و رخسار کا بھولا بسرا رشتہ اسے بے چین کر رہا تھا۔ وہ منتظر رہا لیکن پھر ایک ایک کر کے آوازیں مدھم ہو گئیں۔ اس الگ تھلگ گوشے میں مکمل سکوت چھا گیا۔ تمام عورتیں واپس جا چکی تھیں۔ اباقہ کے سینے کی تپش بڑھی اور آہستہ آہستہ اس کا خون کھولنے لگا۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اسے کیا ہوا ہے۔ ایک بے قراری سی رگ و پے میں سرایت کر گئی تھی۔ جب رات کی تیرگی اچھی طرح پر پھیلا چکی تو وہ اپنی پناہ گاہ سے برآمد ہوا۔ جھنڈ سے نکل کر اس نے دیکھا۔ گول خیموں کی یہ بے کنار بستی نیند کے ابتدائی جھونکوں میں تھی۔ وہ تیزی سے چلتا ہوا خیموں کی بھول بھلیوں میں داخل ہو گیا۔ اس کے جسم میں عجیب طرح کی چستی آ گئی تھی۔ کبھی رینگتا اور کبھی چلتا پہریداروں سے چھپتا چھپاتا وہ کامیابی سے خان چغتائی اور اس کی ایک درجن بیویوں کے خیموں کے پاس پہنچ گیا۔ خیموں کے عقب سے ہو کر وہ مارینا کے خیمے تک پہنچا لیکن یہ دیکھ کر ٹھٹک گیا کہ خیمے کے عین سامنے ایک پہریدار کھڑا ہے۔ وہ وہیں رُک کر پہریدار کی حرکات و سکنات دیکھنے لگا۔ یوں لگتا تھا یہ پہریدار خاص طور پر مارینا کے یورت کی نگرانی کر رہا ہے۔ وہ دھیمے قدموں سے یورت کے چاروں طرف چکر کاٹ رہا تھا۔ اباقہ نے دیکھا اس قسم کا انتظام کسی دوسرے خیمے کے لئے نہیں تھا۔ وہ سوچنے لگا .... اس کا مطلب ہے مارینا نے اس کے ڈر سے یہ احتیاط کی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ اگر میں آؤں تو پہریدار کو ہوشیار دیکھ کر واپس چلا جاؤں۔ اس کے اعصاب غصے سے تن گئے۔ ایک لمحہ ضائع کئے بغیر اس نے خنجر نکالا اور پیٹ کے بل رینگتا ہوا یورت کی طرف بڑھا۔ ابھی وہ دور ہی تھا کہ پہریدار کی نظر اس پر پڑ گئی۔ اباقہ جس حالت میں تھا بالکل ساکت ہو گیا۔ اندھیرے میں اندازہ کرنا مشکل تھا کہ زمین پر کیا چیز پڑی ہے۔ پہریدار ہاتھ میں تلوار لئے غور سے اس کی طرف دیکھتا ہوا قریب پہنچا۔ اس وقت اباقہ اپنی جگہ سے اچھلا اور کسی عفریت کی طرح پہریدار سے لپٹ گیا۔ اس کا آہنی ہاتھ پہریدار کے منہ پر تھا۔ پہریدار پشت کے بل گرا۔ اس کے حلق سے نکلنے والی چیخ اس کے اندر ہی گونج کر رہ گئی۔ اسے بالکل پتہ نہیں چلا کہ اس کا گلا کٹ چکا

ہے۔ اسے اپنے سینے پر کوئی گرم گرم چیز پھیلتی محسوس ہوئی اور ایکا ایکی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا..........

پہریدار کو قتل کر کے اباقہ نے خونی خنجر سے خیمے کی ریشمی ڈوری کاٹی اور اندر گھس گیا۔ مارینا خادماؤں کے ساتھ بے خبر سو رہی تھی۔ موی شمع کی ہلکی ہلکی روشنی اس کے چہرے کو عجیب سحر بخش رہی تھی۔ وہ اس خوابیدہ حسن کے قریب پہنچا اور اس وقت مارینا نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ اونگھ میں تھی' جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کے چہرے پر خوشی کے تاثرات نظر آئے لیکن صرف ایک لمحے کے لئے .... پھر خوشی کی جگہ خوف آمیز تحیر نے لے لی۔ اس نے جلدی سے موی شمع بجھائی اور مدھم سرگوشی میں بولی۔

"اباقہ! کیوں آئے ہو یہاں؟"

اباقہ کے ذہن میں ان دنوں کی یاد تازہ ہو گئی جب وہ اس خیمے میں یہیں بیٹھ کر مارینا کے رخسار پر اپنا ہاتھ رکھا کرتا تھا۔ وہ بے ساختہ بولا۔ "میرا ہاتھ۔"

"کیا ہوا تمہارے ہاتھ کو۔" وہ حیرانی سے بولا۔

"وہاں رکھو۔"

پھر جیسے ساری بات مارینا کی سمجھ میں آ گئی۔ اگر روشنی ہوتی تو اباقہ اس کے چہرے پر شرم کی سرخی دیکھ سکتا تھا۔

"اباقہ .... تم کیسے آدمی ہو؟" وہ پریشانی سے بولی۔ "اچھا اگر .... تو پھر چلے جاؤ گے؟"

"ہاں!" اباقہ کے حلق سے غراہٹ نکلی۔ مارینا نے تاریکی میں ٹٹول کر اس کا ہاتھ پکڑا لیکن اس وقت ایک خادمہ نیند میں بڑبڑاتی ہوئی اٹھ گئی۔ مارینا نے اباقہ کا ہاتھ چھوڑ دیا اور گھبرائے ہوئے لہجے میں سرگوشی کی۔

"اباقہ .... تمہیں تمہارے خدا کا واسطہ یہاں سے چلے جاؤ۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ کل شام تم سے تالاب پر ملوں گی۔"

اباقہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا۔ "ٹھیک ہے۔ ورنہ میں کل پھر یہاں چلا آؤں گا۔" پھر مارینا کے جواب کا انتظار کئے بغیر وہ کسی سانپ کی طرح رینگتا ہوا خیمے کی تاریکی سے نکل گیا۔

☆=====☆=====☆

مارینا کہہ رہی تھی۔ "اباقہ تم بڑے ظالم ہو' سنگدل ہو۔ وہ میرا جاں نثار محافظ تھا جسے

کل رات تم نے قتل کیا ہے۔" اباقہ جیسے کچھ بھی نہیں سن رہا تھا۔ اس کی نگاہیں مارینا کے لب و رخسار پر مرکوز تھیں۔ وہ ان کی جنبش میں اتنا محو تھا کہ اسے پتہ ہی نہیں چلا مارینا کیا کہہ رہی ہے۔ وہ دونوں درختوں کے جھنڈ میں بیٹھے تھے۔ شام کے سائے آہستہ آہستہ گہرے ہو رہے تھے۔

اباقہ بولا۔ "مارینا! تم مجھ سے ڈرتی کیوں ہو؟"

مارینا نے کہا۔ "اباقہ! میں تم سے نہیں اس دنیا سے ڈرتی ہوں۔ تم بڑے ناسمجھ ہو۔"

"تو تم مجھ سے ڈرتی نہیں ہو؟"

"نہیں۔" مارینا نے سر جھکا کر کہا۔ وہ جانتی تھی "ڈرنے" سے اباقہ کا مطلب "نفرت" ہے اور جب وہ کہہ رہی ہے کہ اس سے ڈرتی نہیں تو اس کا مطلب ہے وہ اس سے نفرت نہیں کرتی۔ اباقہ کے چہرے پر خوشی کی چمک نظر آئی۔ وہ بولا۔

"ایک بار کہو میں تمہارے ساتھ جانا چاہتی ہوں۔"

مارینا نے دکھ سے کہا۔ "اس سے کیا ہو گا اباقہ! تمہیں معلوم ہے میں تمہارے ساتھ نہیں جا سکتی۔"

"بس میرے دل کو آرام آ جائے گا۔"

"اچھا اگر میں کہہ دوں تو .... تم یہاں سے چلے جاؤ گے؟"

"چلا جاؤں گا۔" اباقہ مخصوص لہجے میں بولا۔

مارینا نے کہا۔ "ہاں' اباقہ میں تمہارے ساتھ جانا چاہتی ہوں۔"

اچانک اباقہ کے چہرے پر ہیجان کے آثار نظر آئے۔ "تو پھر چلو مارینا ہم اسی وقت چلیں گے۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہو اباقہ۔" مارینا جیسے اندر سے لرز گئی۔

"تم نے اپنے دل کی بات کہہ دی ہے مارینا۔ تم میرے ساتھ جانا چاہتی ہو۔"

تب مارینا کو احساس ہوا کہ اس معصوم سے شخص نے اسے کتنی سادگی سے گھیر لیا تھا۔ کتنی سیدھی سادی منطق تھی۔ "تم میرے ساتھ چلو کیونکہ تم میرے ساتھ جانا چاہتی ہو۔"

"نہیں اباقہ!" وہ خوفزدہ لہجے میں بولی۔ "ایک بہت بڑا طوفان آ جائے گا۔"

"کوئی طوفان ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔" اباقہ غرایا۔ "کسی منگول ماں نے ایسا بیٹا جنم نہیں دیا جو ہمیں روک سکے .... کوئی پہاڑ ایسا نہیں جو ہمارا راستہ کاٹ سکے۔" تم گو

اباقہ روانی سے بول رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بجلیاں کوند رہی تھیں۔ اس نے مارینا کا ہاتھ تھام لیا۔ "چلو مارینا جس دنیا سے تمہیں نفرت ہے ہم اس سے دور نکل جائیں .... دور کوہ الطائی کے برف پوش پہاڑوں میں، وہاں ہم اپنا ایک گھر بنائیں گے۔"

ایک لمحے کے لئے مارینا کے جی میں آئی کہ وہ اباقہ کی بات مان لے۔ آنکھیں بند کر کے خود کو اس کی مضبوط بانہوں میں گرا دے، لیکن پھر جیسے وہ ہوش میں آ گئی۔ وہ جانتی تھی اباقہ کا ساتھ دینے میں ان دونوں کی موت ہے۔ وہ جب تک اباقہ کے ساتھ رہے گی اباقہ کو بھاگنا پڑے گا اور وہ جس خطۂ زمین پر رکے گا، خان چغتائی کے بپھرے ہوئے جنگجو ان کا خاتمہ کر دیں گے۔ خان چغتائی اپنی مغویہ بیوی کو زمین کی ساتویں تہہ سے بھی نکال لے گا اور پھر وہی نہیں مرے گی اباقہ بھی مرجائے گا .... اور اباقہ سے وہ محبت کرتی تھی۔ ایک لمحے کے اندر اس نے سب کچھ سوچ لیا۔ اباقہ سے ہاتھ چھڑا کر بولی۔ "نہیں اباقہ! میں تمہارے ساتھ نہیں جا سکتی۔"

اباقہ نے اس کا بازو پکڑ لیا اور درختوں کی جانب کھینچنے لگا۔ "ڈرو مت مارینا۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ کوئی ہماری گرد بھی نہیں پا سکتا۔"

"نہیں جانا، مجھے تمہارے ساتھ۔" وہ فیصلہ کن لہجے میں بولی۔ اباقہ کی آنکھوں میں برق سی لہرا گئی۔ ایک زناٹے کا تھپڑ مارینا کے ریشمی گال پر پڑا۔ "مارینا!" وہ زخمی درندے کی طرح غرایا اور ایک بار پھر اسے کھینچنے لگا۔

وہ چلائی۔ "چھوڑ دے اباقہ، میں کہتی ہوں چھوڑ دے مجھے۔" اس کی آواز کافی بلند تھی۔ دفعتاً بھاگتے ہوئے قدموں کی آوازیں آئیں۔ کسی نے درختوں کے پیچھے سے جھانکا۔ پھر وہ محافظوں کو بلانے کے لئے چیخنے لگا۔

مارینا گڑگڑائی۔ "اباقہ بھاگ جاؤ۔ تم اکیلے بہت دور نکل سکتے ہو۔" اباقہ نے خون بار نظروں سے اسے گھورا پھر الٹے ہاتھ کا ایک اور زوردار تھپڑ مارینا کے رخسار پر پڑا وہ نازک اندام لڑکی اچھل کر گھاس پر گری اور بے سدھ ہو گئی۔ اباقہ اپنی جگہ سے ایک قدم بھی نہیں ہلا۔ تب اچانک چاروں طرف سے تاتاری سپاہیوں نے اسے گھیر لیا۔ مشعل بردار آگے بڑھے اور سپاہیوں نے اپنی برچھیاں اس کی گردن سے لگا دیں۔

☆------☆------☆

اباقہ کو خاقان اوغدائی کے دربار میں پیش کیا گیا۔ یہ دربار ایک بہت بڑے یورت (خیمے) میں لگا ہوا تھا۔ کہنے کو تو یہ خیمہ تھا لیکن اس میں سینکڑوں آدمی بیک وقت بیٹھ سکتے تھے۔ خیمے کی دیواریں نفیس سمور کی تھیں۔ اس کی گول چھت کے درمیان ایک بڑا

سوراخ تھا۔ ایسا سوراخ منگولوں کے ہر خیمے میں ہوتا تھا۔ اس سے چمنی کا کام لیا جاتا تھا۔ خراب موسم یا برف باری میں اسے بند کر دیا جاتا تھا۔ فرش پر بیش قیمت ایرانی قالین بچھے تھے۔ تخت کے پایوں پر سونے کے منقش پترے چڑھے ہوئے تھے۔ خاقان کے مصاحبین اور سردار قطار اندر قطار کھڑے تھے۔ اب وہ خانہ بدوش نہیں تھے۔ چاول اور جمے ہوئے دودھ کی شراب کا وقت گزر چکا تھا۔ اب ان کے ہاتھوں میں ایران اور دمشق کی سرخ و سفید شرابیں تھیں۔ چمڑے اور سمور کی جگہ اطلس و کمخواب کی پوشاکوں نے لے لی تھی۔ چغتائی ریشم کی نفیس چادریں اس عظیم الشان یورت میں جا بجا لٹکی ہوئی تھیں۔ گوبی کے صحرا نشین فرمانروا کا خیمہ چہار بانگ دہل کی نعمتوں سے معمور تھا۔ دنیا کے مانے ہوئے جنگجو، حسین ترین عورتیں اور دور افتادہ علاقوں کے میوہ جات، کیا نہیں تھا اس خیمے میں۔ اوغدائی کے ہاتھ میں ہاتھی دانت سے مرصع ایک جریب تھی۔ اس کی شکل چھوٹے عصا جیسی تھی۔ یہ عصا اس بات کی علامت تھا کہ منگول قوم کی طرف سے اوغدائی تمام معلوم دنیا کا بلا شرکت غیرے حکمران ہے۔

خیمے میں موجود لوگوں میں چغتائی کے علاوہ، سردار یورق اور مسلم بن داؤد بھی موجود تھا۔ مسلم بن داؤد وہی بوڑھا تھا جس نے چغتائی کو اباقہ کے بازو کی تحریر سے آگاہ کیا تھا۔ سب لوگ اوغدائی کے ہونٹوں سے نکلنے والی آواز کے منتظر تھے۔ اباقہ برہنہ بدن زنجیروں میں جکڑا ہوا خاقان اوغدائی سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ اس کے جسم پر بس چمڑے کا ایک پائجامہ نما لباس تھا۔ چہرے پر چوٹوں کے نشان تھے جو اس بات کی نشاندہی کرتے تھے کہ گرفتاری کے بعد اسے بری طرح زد و کوب کیا گیا ہے۔ آخر خاقان کی رعب دار آواز بلند ہوئی۔

"لڑکے کون ہے تو اور کہاں سے آیا ہے۔ اگر تو مسلمان ہے تو قراقرم میں تیرا کیا کام؟"

اباقہ نے اپنی سوئی سوئی آنکھیں دنیا کے سب سے بڑے فرمانروا کے چہرے پر جمائیں اور خاموش رہا۔ خیمے میں سراسیمگی کی لہر دوڑ گئی۔ خاقان اعظم کوئی بات پوچھے اور اس کا جواب نہ دیا جائے یہ ایک ناقابل یقین بات تھی۔ اوغدائی کا چہرہ خون کے دباؤ سے سرخ ہو گیا۔ پھر جیسے اس نے اپنے غصے پر قابو پایا اور بولا۔ "بدقسمت لڑکے! خاموش رہ کر تو اپنی موت کو سخت تر بنا رہا ہے۔ نیلے جاودانی آسمان کی قسم، تجھے ایسی سزا ملے گی کہ تیرا رواں رواں موت کی طلب کرے گا۔ بول کون ہے تو۔ سردار بوغالی اور چغتائی کی بیوی کو کیوں قتل کیا تو نے .... یاد رکھ گیارہ منگولوں کا خون تیرے سر پر ہے اور تو نے

چغتائی کی بیوی ماریتا کو اٹھا کر لے جانے کی کوشش بھی کی ہے۔ تُو اپنی صفائی میں کیا کہنا چاہتا ہے؟"

تب ایک جلاد نما شخص آگے بڑھا اور خاقان کے سامنے ادب سے سر جھکا کر بولا۔

"خاقانِ معظم! غلام نے اس قیدی پر ہر حربہ آزمایا ہے لیکن یہ زبان نہیں کھولتا۔"

اس وقت ایک سردار اپنی جگہ سے کھڑا ہوا اور ادب سے سر جھکانے کے بعد بولا۔

"اے قابلِ صد احترام خاں! قیدی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اسے درد نہیں ہوتا............"

خاقان نے حیرت سے چینی دانا لیوست چائی کی طرف دیکھا۔ چنگیز خان اور اس کے بیٹے اس صاحب علم و دانش چینی سے بے حد متاثر تھے۔ کسی بھی الجھے ہوئے معاملے میں اس کی رائے کو حرفِ آخر سمجھا جاتا تھا۔ لیوست چائی نے غور و فکر میں ڈوبی ہوئی نگاہوں سے اباقہ کو دیکھا۔ پھر اپنی داڑھی کھجاتا ہوا بولا۔

"خانِ معظم! یہ ناممکن ہے کہ گوشت پوست کا انسان ہو اور اسے درد نہ ہو۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص اپنے اندر اتنی صلاحیت پیدا کر لے کہ اسے درد برداشت کرنا آ جائے۔"

"ہوں۔" خاقان نے پُر سوچ ہنکارا بھرا۔ "کسی جسم میں اتنی برداشت ہو سکتی ہے کہ اس پر ہمارا قہر ٹوٹے اور وہ رحم کی بھیک نہ مانگے؟ .... ناممکن۔" پھر وہ گرجا۔

"شامون!" ایک بلند و بالا تومند منگول خاقان کے عقب میں چل کر سامنے آ گیا۔ یہ شخص کوڑا زنی کا ماہر تسلیم کیا جاتا تھا۔ خاقان نے حکم دیا کہ قیدی کو اوندھا لٹا دیا جائے۔ پھر اس نے شامون سے کہا۔ "کوڑا ہاتھ میں لے اور اس وقت تک مار جب تک یہ گڑگڑانے نہ لگے اور ہاں یاد رکھ اگر تُو ناکام ہوا تو تیری گردن جائے گی۔" شامون کے چہرے پر زبردست جوش نظر آ رہا تھا۔ اس نے اباقہ کو دیکھ کر دانت کچکچائے۔ پھر کوڑا ہاتھ میں لیا اور مخصوص انداز میں گھما کر پوری قوت سے اباقہ کی پیٹھ پر مارا۔ تڑاخ کی آواز آئی۔ اباقہ نے نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا لیا۔ ایک بار پھر تڑاخ کی آواز سے کوڑا اس کی ننگی پیٹھ پر پڑا۔ اسے لگا جیسے دہکتی ہوئی آہنی سلاخ اس کی جلد میں اتار دی گئی ہے لیکن اس کے ہونٹ بند رہے۔ اس کی نگاہوں میں اپنے بوڑھے باپ کا چہرہ گھوم رہا تھا۔ وہ کوہ الطائی کے دامن میں ایک کھوہ کے اندر اپنے بیٹے کے ساتھ بیٹھا تھا۔ ایک برفانی ریچھ سے دست بدست لڑتے ہوئے دونوں باپ بیٹا زخمی ہو گئے تھے۔ ننھا اباقہ اوندھے منہ ایک پتھر پر گرا تھا اور اس کا ایک دانت ٹوٹ گیا تھا۔ وہ درد سے چلا رہا تھا۔ اس کے باپ نے اس دن

اسے جو سبق دیا تھا وہ آج تک اسے یاد تھا۔ اس نے کہا تھا بیٹے درد جسم پر نہیں ہوتا دماغ میں ہوتا ہے۔ درد اس لئے ہوتا ہے کہ ہم اسے محسوس کرتے ہیں۔ اس سے ڈرتے ہیں جب ہم درد سے ڈرتے ہیں تو وہ کئی گنا بڑھ جاتا ہے۔ تم اتنا ہی درد محسوس کرو جتنا ہو رہا ہے۔ ذرا غور کرو تمہیں کتنا درد ہو رہا ہے .... خوب اچھی طرح غور کرو اور پھر اباقہ نے غور کرنا شروع کیا تھا۔ ٹوٹے ہوئے دانت کی تکلیف آہستہ آہستہ کم ہونے لگی تھی۔ پھر وہ بالکل ختم ہو گئی تھی۔ اس دن سے اس کے ذہن پر یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ وہ درد دماغ میں ہوتا ہے، جسم میں نہیں۔ آہستہ آہستہ اس کو درد برداشت کرنے کی عادت پڑ گئی تھی۔ اس وقت بھی وہ یہ نہیں سوچ رہا تھا کہ وہ خاقان اوغدائی کے دربار میں اوندھے منہ فرش پر لیٹا ہے' ایک وحشی جلاد اس پر کوڑے برسا رہا ہے اور سینکڑوں نگاہیں اسے دیکھ رہی ہیں۔ وہ صرف درد کی اس لہر پر غور کر رہا تھا جو کوڑا لگنے سے اس کی پیٹھ سے اٹھتی تھی۔

کوڑے لگاتار برس رہے تھے اور وہ خاموشی سے کھا رہا تھا۔ ایک چیخ بار بار اس کے حلق تک آتی تھی لیکن ہونٹوں کی ناقابلِ عبور فصیل اسے روک لیتی تھی۔ کوڑا بردار کے چہرے پر اب جوش کی بجائے خوف دکھائی دینے لگا تھا۔ اس کا جسم پسینے میں نہا رہا تھا اور سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ وہ پریشان کن حد تک حیران تھا۔ اس کی ہر ضرب پر قیدی کا جسم ذرا سا اینٹھتا تھا اور بس۔ اس کے کان مضروب کی چیخ سننے کے لئے بے چین تھے لیکن وہ چیخ کہیں نہیں تھی۔ پشت کا گوشت جگہ جگہ سے سرخ ہو گیا تھا لیکن ابھی تک اس میں سے خون برآمد نہیں ہوا تھا۔ اب شامون کے بازو شل ہو چکے تھے۔ اس کی ضرب بتدریج کمزور ہو رہی تھی۔ آخر خاقان کی آواز گونجی "ٹھہرو۔" شامون نے ہارے ہوئے جواری کی طرح ہاتھ روک لیا۔ سارے خیمے میں موت کی سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ صرف شامون اور اباقہ کے ہانپنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ شامون رحم طلب نظروں سے خاقان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کڑی مشقت کی وجہ سے اس کا جسم ہولے ہولے لرز رہا تھا۔ خاقان نے حکم دیا کہ شامون کو ایک خنجر دیا جائے۔ ایک افسر نے شامون کو خنجر تھمایا۔ خاقان نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"منگول بہادر! اپنی سزا خود تجویز کرے گا۔" شامون کے چہرے پر ایک تاریک سایہ نظر آیا۔ پھر اس کا خنجر والا ہاتھ بلند ہوا اور وہ ایک کراہ کے ساتھ زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔ اس نے خنجر سے اپنا پیٹ چاک کر لیا تھا۔ جان کنی کے عالم میں پھڑکتے ہوئے بھاری بھرکم منگول کو چار سپاہی اٹھا کر باہر لے گئے۔

اباقہ کو بالوں سے پکڑ کر سیدھا کیا گیا۔ اس کا چہرہ پسینے میں تر تھا۔ کمر کی گہری ضربوں سے خون نکلنا شروع ہو گیا تھا لیکن اس کے دم خم میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ خاقان کی آواز گونجی۔

"اسے لے جاؤ۔ ہم اس کا فیصلہ بعد میں کریں گے۔"

☆ ---------- ☆ ---------- ☆

ماریتا لکڑی کی گدے دار چوکی پر اوندھی لیٹی تھی۔ بدن کی جنبش سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ رو رہی ہے۔ آمنہ اس کے قریب منقش قالین پر بیٹھی تھی۔ خیمے میں اور کوئی موجود نہیں تھا۔ اباقہ کو گرفتار ہوئے پندرہ روز گزر چکے تھے۔ آج خاقانِ معظم کے حکم سے ایک جشن کا اہتمام کیا جا رہا تھا۔ اس جشن میں حسب دستور کئی کھیل تماشے ہوتا تھے' لیکن سب سے خاص بات یہ تھی کہ یہاں اباقہ کو بھی لایا جا رہا تھا۔ لوگوں میں اباقہ کی آمد کا بہت شور و غل تھا۔ کہا جاتا تھا کہ کوہ الطائی سے ایک ایسے انسان نما جانور کو پکڑا گیا ہے جس کے بدن میں شیطان کی روح حلول کر گئی ہے۔ شامانوں نے خاقانِ اعظم کو مشورہ دیا ہے کہ اس جانور کو اذیتیں دے دے کر ہلاک کیا جائے تاکہ یہ روح واپس اپنے ٹھکانے کو بھاگ جائے۔ ماریتا کے لئے ایسی باتیں روح فرسا تھیں۔ وہ بغیر کچھ کھائے مسلسل تین دن سے رو رہی تھی۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ آمنہ نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا تو وہ جھڑک کر بولی۔

"میں کہہ چکی ہوں کہ مجھے کہیں نہیں جانا۔ لے جاؤ یہ لباس اور دفع ہو جاؤ۔" اس نے قریب رکھا ہوا خوبصورت لباس اٹھا کر خیمے کے دروازے پر پھینک دیا۔ آمنہ ہمت کر کے اس کے بالوں میں کنگھی کرنے لگی۔ ماریتا کی خاموشی سے اسے کچھ حوصلہ ہوا اور بولی۔

"مالکہ! خان چغتائی نے ابھی تیسری دفعہ مجھ سے پوچھا ہے کہ تمہاری مالکہ تیار ہوئی ہے یا نہیں۔ جب اباقہ کو کوڑے مارے جا رہے تھے اس وقت بھی آپ اٹھ کر چلی آئی تھیں۔ آج پھر آپ جانے سے انکار کر رہی ہیں .... مجھے تو ڈر ہے' آپ اپنے بارے میں خان چغتائی کو شک میں مبتلا کر لیں گی اور خدا نخواستہ اگر ایسا ہوا تو آپ ہی کی جان نہیں جائے گی' اباقہ کی موت بھی مزید دردناک ہو جائے گی۔" وہ ماریتا کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ رہی تھی۔ کافی دیر وہ ماریتا کو سمجھاتی رہی' آخر وہ اس کے ساتھ جانے پر رضامند ہو گئی۔

☆ ---------- ☆ ---------- ☆

وہ ایک کھلا میدان تھا۔ منگول ایک وسیع و عریض دائرے کی شکل میں کھڑے تھے۔ خاقان' اس کے بھائی' سردار' سپہ سالار اور مصاحبین اپنے اپنے اہل خانہ کے ساتھ موجود تھے۔ کشتیاں' کمند زنی' تیر اندازی بہت سے مقابلے ہوئے۔ خاقان جیتنے والوں کو اپنے ہاتھ سے انعام دیتا رہا۔ آخر اباقہ کو میدان میں لایا گیا وہ سر تا پا زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ اسے دیکھتے ہی لوگوں نے فلک شگاف نعرے لگائے۔ ان کا جوش و خروش دیدنی تھا۔ خاقان اوغدائی اور چغتائی خان کی نظروں میں اس مفلوک الحال قیدی کے لئے قہر کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ اس حقیر انسان نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ دنیا کے سب سے بڑے فرمانروا کا عتاب ایک معمولی قیدی سے رحم طلب نگاہوں کا خراج وصول نہیں کر سکتا۔ خاقان نے اشارہ کیا۔ ایک گھڑ سوار گھوڑا بھگاتا ہوا آیا۔ اس نے اباقہ پر رسی کی کمند پھینکی اور اسے میدان میں گھسیٹنے لگا۔ یہ سب کچھ بالکل اچانک ہوا۔ لوگوں نے ایک بار پھر نعرے بلند کئے۔ کھردری سطح پر پوری رفتار سے بھاگتے ہوئے گھڑ سوار نے ایک چکر مکمل کیا اور دیکھنے والے حیران رہ گئے' قیدی کی کراہ تک سنائی نہیں دی تھی۔ دوسرا چکر مکمل ہوا اور پھر تیسرا .... شاید قیدی بے ہوش ہو چکا تھا لیکن جب گھوڑا روکا گیا تو وہ ایک بار لڑکھڑا کر پاؤں پر کھڑا ہو گیا۔ اس کے جسم پر گرد و غبار اور چیتھڑوں کے سوا کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ گھڑ سوار یہی دیکھنا چاہتا تھا کہ کہیں وہ مر تو نہیں گیا۔ اس نے ایک بار پھر گھوڑے کو ایڑ لگائی قیدی اچھل کر زمین پر گرا اور گھوڑے کے پیچھے گھسٹنے لگا۔ تین چکر پھر مکمل ہوئے۔ لوگ انگشت بدنداں یہ منظر دیکھتے رہے۔ اس دفعہ گھوڑا رکا تو قیدی جلدی کھڑا نہیں ہوا۔ دو سپاہیوں نے اسے سہارا دیا اور پاؤں کی بندش کھول دی۔ تب ایک منگول میدان میں آیا۔ اس نے ہاتھ کی مٹھی پر ایک خوفناک عقاب بٹھا رکھا تھا۔ عقاب کی آنکھوں پر اندھیاری (غلاف) تھی۔ پھر اس نے اباقہ کے قریب پہنچ کر اندھیاری اٹھائی اور چمڑے کا تسمہ کھول دیا۔ عقاب کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح اباقہ پر جھپٹا۔ اباقہ نے بندھے ہوئے ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپایا۔ بھاگنے کی کوشش کی تو لڑکھڑا کر گرا۔ عقاب کے نوکیلے پنجے اس کی گردن میں پیوست ہو گئے۔ تیز مڑی ہوئی چونچ اس کی آنکھیں تلاش کر رہی تھی۔ اباقہ نے بندھے ہوئے ہاتھوں سے پرندے کو جھٹکنا چاہا لیکن ناکام رہا۔ ایک بار پھر وہ اٹھ کر بھاگا لیکن خاص طور پر سدھایا ہوا عقاب اسے ایک لمحے کی مہلت دینے کو تیار نہیں تھا .... وہ پھر منہ کے بل گرا۔ قیدی کی بے بسی دیکھ کر تماشائی پرجوش نعرے بلند کرنے لگے۔ پھر "عقاب باز" نے سیٹی بجائی۔ عقاب واپس گیا اور ایک تازہ دم عقاب' اباقہ پر حملہ آور ہوا۔ اباقہ کے اٹھنے سے پہلے ہی دوسرے عقاب نے اسے دبوچ

لیا۔

یہ ایک انتہائی لرزہ خیز تماشہ تھا لیکن اس جم غفیر میں چار آنکھیں ایسی تھیں جو یہ تماشا نہیں دیکھ رہی تھیں۔ ان میں سے دو آنکھیں مارینا کی تھیں اور دو بوڑھے مسلم بن داؤد کی۔ مارینا اس لئے نہیں دیکھ رہی تھی کہ اس کی اشکبار آنکھیں بند تھیں اور بوڑھا داؤد اس لئے نہیں دیکھ رہا تھا کہ وہ مارینا کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے دیکھا وہ اپنے خاوند کے قریب آنکھیں بند کئے بیٹھی ہے اور آنسو اس کے رخساروں سے بہہ رہے ہیں۔ وہ قہقہے لگاتے ہوئے چہروں کے درمیان اس غمزدہ چہرے کو دیکھ کر چونک گیا۔ اسے معلوم تھا اباقہ جب پکڑا گیا تو وہ مارینا کو اغوا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ذہن نے بہت سی کڑیوں کو ایک ساتھ مربوط کر دیا اور اس کو یہ شک ہوا کہ چغتائی کی بیوی' اباقہ یعنی "اسماعیل" سے محبت کرتی ہے .... پھر اس نے مارینا کو اپنی نشست سے اٹھتے اور پیچھے کی طرف راستہ بناتے دیکھا۔ کسی اندیشے کے تحت داؤد اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ اس نے دیکھا مارینا تیزی سے خیموں کی طرف بھاگی جا رہی ہے۔ وہ بھی اپنی جگہ سے اٹھا اور اس کے پیچھے ہو لیا۔

مارینا بھاگتی ہوئی اپنے خیمے میں پہنچی۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے سرخ ہو رہی تھیں۔ خیمے میں موجود دو خادماؤں کو اس نے فوراً باہر نکلنے کا حکم دیا۔ پھر بستر کے نیچے سے ایک خنجر نکال لیا۔ خنجر پکڑنے کا انداز اس بات کی گواہی دے رہا تھا کہ وہ اپنی زندگی ختم کرنے کا سوچ رہی ہے۔ اس وقت داؤد کی آواز آئی۔ مارینا نے کوئی جواب نہ دیا۔ پھر پردہ ہلا اور داؤد کا چہرہ دکھائی دیا۔ مارینا کے ہاتھ میں خنجر دیکھ کر وہ جلدی سے اندر آ گیا۔ پھر تیزی سے آگے بڑھ کر اس نے خنجر والی کلائی تھام لی۔

"غلام بلا اجازت اندر آنے پر معافی چاہتا ہے۔"

اس وقت آمنہ بھی ان دونوں کے پیچھے بھاگتی خیمے میں داخل ہوئی۔ اس نے لپک کر مارینا کے ہاتھ سے خنجر لے لیا۔

☆------☆------☆

اباقہ کو بے حد عذاب دیئے گئے۔ ہر روز اسے نئی موت سے دو چار ہونا پڑا لیکن چٹانوں کا بیٹا چٹانوں کی طرح غیر متزلزل رہا۔ ایک بار اس کے ہونٹوں سے صدائے شکوہ بلند نہیں ہوئی' ایک بار اس کی زبان نے امان نہیں مانگی۔ اس نے اپنے بارے میں کچھ بتایا نہ اس بے وفا عورت کے بارے میں جس کی خاطر اس نے اپنا سب کچھ قربان کر دیا تھا۔ اب اس کی جوان اور مضبوط جلد جگہ جگہ سے داغدار ہو چکی تھی۔ اس کے خوبصورت لمبے بال جھڑ گئے تھے۔ اس کی آنکھیں گہرائی میں اتر گئی تھیں اور جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ بن

گیا تھا۔ اب تو واقعی اس کے دماغ سے درد کا احساس مٹ چکا تھا۔ وہ ایک تنگ و تاریک کوٹھری میں پڑا تھا اور ہفتوں بلکہ مہینوں اسے کسی آدم زاد کی آواز سننا نصیب نہ ہوتی تھی۔ اس کوٹھری میں بس ایک چھوٹا سا سوراخ تھا۔ آٹھ پہر میں ایک بار یہ سوراخ کھلتا اور .... ایک پیالے میں تھوڑے سے جو اسے کھانے کو مل جاتے۔ اگلے دن پھر سوراخ پر آہٹ ہوتی۔ وہ خالی پیالہ باہر نکال دیتا اس میں کوئی نادیدہ ہاتھ مٹھی بھر پکے ہوئے جو ڈالتا اور سوراخ بند ہو جاتا۔ زندگی بس اسی مختصر سی حرکت کا نام رہ گئی تھی۔ ایک دن اس نے محسوس کیا کہ سوراخ میں سے نظر آنے والی روشنی مدھم پڑتی جا رہی ہے۔ سوراخ سے جو ہاتھ آتا تھا وہ بھی صاف دکھائی نہیں دیتا تھا۔ تب اس پر یہ انکشاف ہوا کہ اس کی بینائی آہستہ آہستہ زائل ہو رہی ہے۔ پھر ایک دن کوٹھری کا آہنی دروازہ کھلا اور چند منگول سپاہیوں کی دھندلی شکلیں دکھائی دیں۔ ان میں لمبی داڑھیوں والے دو بوڑھے معالج بھی تھے۔ وہ کافی دیر اس کا معائنہ کرتے رہے۔ انہوں نے اس سے کچھ سوالات بھی پوچھے' لیکن دیر ہوئی اباقہ نے بولنا چھوڑ دیا تھا۔ منگول سپاہیوں نے زبردستی اس کا منہ کھولا۔ معالجوں نے اس کی زبان دیکھی۔ پھر وہ ایک دوسرے سے باتیں کرنے لگے۔ انہیں شک تھا کہ قیدی قوت گویائی سے محروم ہو چکا ہے' لیکن ایسا نہیں تھا۔ اباقہ جانتا تھا وہ بول سکتا ہے۔ جب قید خانے کی اتھاہ تاریکی میں بیٹھے بیٹھے اس کا دل ڈوبنے لگتا تو وہ نادیدہ سنگلاخ دیوار پر ہاتھ پھیرتا اور دھیرے دھیرے پکارتا۔ "مارینا .... مارینا۔" اسے لگتا اس کے ہاتھ کے نیچے قید خانے کی چکنی دیوار نہیں مارینا کا رخسار ہے .... ہاں وہ بول سکتا تھا۔ کبھی نیم غنودگی کے عالم میں وہ "بابا" کا لفظ پکارتا اور اس کی آنکھوں کے سامنے کوہ الطائی کے برف پوش سلسلے گھوم جاتے اسے لگتا وہ اپنے باپ کے ساتھ وادی وادی اور جھرنا جھرنا گھوم رہا ہے۔

.... پھر گرمیوں کا موسم گزر گیا اور سرد ہواؤں نے قراقرم کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اباقہ کی تاریک قبر بھی ٹھنڈی ہو گئی۔ وہ دن رات کپکپاتا' لیکن آہستہ آہستہ یہ کپکپی کم ہوتی گئی۔ وہ ڈوبتے ہوئے ذہن کے ساتھ سوچتا' برف کا موسم تو اتنی جلدی نہیں گزرتا پھر یہ سردی کم کیوں ہو رہی ہے۔ پھر وہ سوچتا شاید اس کا جسم آہستہ آہستہ زندگی کی رمق سے محروم ہو رہا ہے اور یہ حقیقت تھی۔ اب اباقہ کو جو کا پیالہ لینے میں بھی دقت پیش آتی تھی وہ جسم کو گھسیٹتا ہوا وہاں تک پہنچتا تھا۔ انہی دنوں اسے شدید کھانسی شروع ہو گئی۔ ایک رات اس نے خواب میں دیکھا۔ وہ مارینا کا ہاتھ پکڑے ایک ناقابل عبور پہاڑی کے سلسلے پر اڑا جا رہا ہے۔ دور نیچے منگول سپاہی بیچارگی سے اسے دیکھ رہے ہیں۔ مارینا نے چمکتی ہوئی

تاروں کا زرق برق لباس پہن رکھا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنس رہے ہیں۔ پھر اچانک مارینا کا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ وہ اوجھل ہو گئی۔ اس نے دیکھا اس کا بوڑھا باپ صنوبر کے درختوں میں کھڑا اسے اپنی طرف بلا رہا ہے۔ اس وقت اباقہ کی آنکھ کھل گئی۔ اس کا چیتھڑوں میں لپٹا ہوا جسم ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ اسے لگا جیسے سانس سینے میں الجھ رہی ہے۔

☆------☆------☆

اباقہ کے قید خانے سے باہر حالات بہت بدل چکے تھے۔ وقت اپنی مخصوص رفتار سے چلتا ہوا آگے نکل چکا تھا۔ نامور سپہ سالار سوبدائی بہادر کے مشورے پر خاقان اوغدائی دیوار چین کے اس پار زریں خاندان کے تاجدار پر فیصلہ کن ضرب لگانے کے لیے روانہ ہو چکا تھا۔ اس کے ساتھ اس کا چھوٹا بھائی تولوئی بھی تھا۔ تولوئی کو لشکر میں میمنہ اور میسرہ پر اختیار دے دیا گیا تھا۔ تاہم اس مہم کا اصل کرتا دھرتا مشہور زمانہ سالار سوبدائی بہادر ہی تھا۔ اس نے تولوئی سے کہا تھا کہ وہ فوج کے میسرہ کے ساتھ دیوار چین کا طویل چکر کاٹ کر عقب سے دشمن پر حملہ آور ہو۔ منگولوں کی یلغار کے ساتھ ہی چین کے طول و عرض میں کشت و خون اور ظلم و بربریت کا نہ ختم ہونے والا کھیل شروع ہو چکا تھا۔ انسانی سروں کی فصل کاٹی جا رہی تھی۔ شہروں کے شہر صفحہ ہستی سے مٹ رہے تھے۔

چغتائی خان جو کہ قراقرم ہی میں تھا اپنے عالیشان خیمے میں منقش چوکی پر بیٹھا تھا۔ ایک خوبصورت اور نوخیز خادمہ ہاتھ میں جام لیے اس کے سامنے جھکی ہوئی تھی۔ چغتائی نے جام تھاما اور اس کی نگاہیں لڑکی کے چمکتے دمکتے خوبصورت چہرے پر اٹک گئیں۔ "کیا نام ہے تمہارا؟" اس نے اسے بازو سے پکڑ کر اپنی جانب کھینچتے ہوئے کہا۔ لڑکی منمنا کر رہ گئی۔ ایک مترجم لڑکی نے بتایا کہ یہ سلجوقی ترک ہے۔ اس کا نام صفیہ ہے۔ خان چغتائی بوالہوسی میں اپنے چھوٹے بھائیوں سے کچھ کم تھا' لیکن اتنی خوبصورت لڑکی دیکھ کر اس کی آنکھوں میں ایکا ایکی سرخ ڈورے تیرنے لگے۔ لڑکی اس ماحول میں بالکل نئی تھی۔ خان چغتائی کی تیز نگاہیں اپنے چہرے پر پا کر اس کی پیشانی پر پسینہ چمکنے لگا تھا۔ اس وقت ایک خادم اندر داخل ہوا اس نے ادب سے بتایا کہ ایک قاصد آیا ہے۔ چغتائی نے حاضر کرنے کا حکم دیا۔ یہ قاصد دیوار چین کے اس پار سے ایک نہایت اہم پیغام لایا تھا۔ چغتائی نے تمام عورتوں کو باہر جانے کا حکم دیا۔ قاصد نے بتایا۔

"خان معظم! اطلاعات سے پتہ چلا ہے کہ خان تولائی اپنے اردو (لشکر) کے ساتھ دیوار چین کی دوسری جانب ایک سرحدی قلعے کے سامنے فروکش ہیں۔ جیسا کہ آپ جانتے

ہیں فوجی منصوبے کے مطابق خان تولوئی کو دشمن کو تاراج کرتے ہوئے اس بڑے لشکر سے ملنا ہے جس کی قیادت خاقان محترم اوغدائی کے پاس ہے' لیکن یہ سرحدی قلعہ خان تولائی کے راستے میں ایک ناقابل عبور رکاوٹ بن گیا ہے۔"

چغتائی نے کہا۔ "ایسی کیا بات ہے اس قلعے میں کہ تولوئی جیسے جنگجو کے قدم بھی رک گئے ہیں؟"

قاصد نے کہا۔ "خان معظم آپ کا اقبال بلند ہو۔ دراصل یہ قلعہ تین اطراف سے قدرتی طور پر بالکل محفوظ ہے۔ اس کے دو اطراف گہری جھیل ہے اور ایک جانب بلند پہاڑی سلسلہ۔ صرف سامنے سے یلغار کرکے ہی اس قلعے کو سر کیا جا سکتا ہے' لیکن دشمن کے پاس رسد بے شمار ہے اور فصیل نہایت مضبوط۔ یوں لگتا ہے کہ ایک برس میں بھی منگول فوج اندر داخل نہیں ہو سکے گی۔"

چغتائی نے پوچھا۔ "کیا اس قلعے کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا؟"

"یہی تو دشواری ہے خان معظم۔ اگر منگول فوج راستہ بدلتی ہے تو اسے انتہائی دشوار گزار برف پوش پہاڑوں سے گزرنا پڑے گا۔ برف باری شروع ہونے والی ہے۔ ایسی صورت میں اس راستے کا انتخاب خودکشی کے مترادف ہے۔"

چغتائی کے چہرے پر لکیروں کا جال بچھا ہوا تھا وہ بولا۔ "پھر .... تولائی اب کیا چاہتا ہے؟"

قاصد نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور بولا۔ "خان معظم! آپ کے بھائی نے کہا ہے کچھ عرصہ پہلے منگول سپاہیوں نے ایک عجیب قسم کے جنگلی نوجوان کو گرفتار کیا تھا۔ اس نوجوان نے گرفتار ہونے سے پہلے آپ کے یورت کی ایک خاتون کو قتل کر دیا تھا اور دوسری کو اغوا کرنے کی کوشش کی تھی ...."

"ہاں .... ہاں آگے بولو!" چغتائی نے قدرے ناگواری سے کہا۔ شاید اسے اس ذکر سے کوفت ہوئی تھی۔

قاصد بولا۔ "خان تولوئی کے کچھ سرداروں کا کہنا ہے کہ وہ شخص عمودی ڈھلوان پر چڑھنے میں خاص مہارت رکھتا ہے۔ انہوں نے اسے کسی ایسے ہی ناقابل عبور پہاڑ پر چڑھتے دیکھا ہے .... دراصل خان معظم' اس قلعے کے عقب میں پتھر کی ایک سپاٹ سیدھی دیوار کئی سو فٹ تک چلی گئی ہے۔ نہایت غور و خوض کے بعد ہمارے سردار اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اگر کوئی شخص اس راستے سے قلعے میں داخل ہو جائے تو قلعہ سر ہو سکتا ہے۔ درحقیقت اس قلعے کے گرد جس قسم کی رکاوٹیں ہیں ان میں وہ نوجوان' منگول

سپاہ کی بڑی مدد کر سکتا ہے۔ بلکہ کچھ سرداروں کا تو خیال ہے کہ وہی نوجوان اس قلعے کو سر کر سکتا ہے۔ قلعے کے عقب میں سپاٹ دیوار ہی نہیں ایک گہری جھیل بھی ہے۔ خان تولوئی کی فوج میں کچھ ایسے آدمی بھی ہیں جنھوں نے اس نوجوان کو ایک پہاڑی سے برساتی ندی میں چھلانگ لگاتے دیکھا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ نوجوان سطح آب پر آئے بغیر حیرت انگیز مہارت سے تیرتا ہے............ معزز خان! منگول فوج کو اس نوجوان کی اشد ضرورت ہے............ کیا آپ کو معلوم ہے کہ وہ اب کہاں ہے؟"

قاصد کے آخری فقرے نے چغتائی خان کو گہری سوچ میں ڈال دیا۔ اس نے آخری بار اباقہ کے متعلق کوئی تین ماہ قبل سنا تھا۔ خاقان کے خصوصی معالجوں نے بتایا تھا کہ قیدی کی قوت گویائی ختم ہو چکی ہے اور وہ قریب المرگ ہے۔ اب وہ یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا............ کہ وہ زندہ ہے یا نہیں۔ اس نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔

"میری معلومات کے مطابق اس نوجوان کو شمالی قراقرم کے ایک قید خانے میں رکھا گیا تھا۔ ساموراً نامی شخص وہاں کا نگران تھا۔" پھر اس نے پہریدار کو آواز دی اور اسے حکم دیا کہ سردار یورق کو فوراً حاضر کیا جائے۔ تھوڑی دیر بعد سردار یورق اجازت طلب کر کے چغتائی کے عظیم الشان یورت میں داخل ہوا۔ سردار یورق وہی تھا جس نے سب سے پہلے اباقہ کی جان بچائی تھی۔ جب بپھرے ہوئے منگول سپاہی اسے آگ کے الاؤ کے قریب گھیر چکے تھے تو یورق ہی نے اسے ان کے نرغے سے نکالا تھا۔ وہ اس نوجوان کی غیر معمولی جسمانی ساخت اور جری طبیعت سے بے حد متاثر تھا۔ بعد میں اس نے کوشش کی تھی کہ ترکمان سردار اسے فن حرب سے آگاہ کرے' لیکن پھر حالات انہیں ایک دوسرے سے دور لے گئے تھے۔ اب اسے اباقہ کے بارے میں کچھ پتہ نہیں تھا۔ بس اتنا جانتا تھا کہ وہ خاقان اوغدائی کے عتاب کا شکار ہوا ہے۔ اس کا زندہ بچ رہنا اب ممکنات میں سے نہیں ہے وہ چغتائی خان کے سامنے سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ چغتائی نے کمال مہربانی سے اسے اپنے قریب بیٹھنے کا حکم دیا اور بولا۔

"یورق! شاید تجھے معلوم نہ ہو کہ اباقہ جو تیرا دوست بھی تھا آج کل خاقان کے حکم سے قید تنہائی کی سزا کاٹ رہا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تُو جا اور اس کا حال دریافت کر۔ اگر وہ زندہ ہے تو اسے یہاں لے آ۔ باقی باتیں میں تجھے بعد میں بتاؤں گا۔"

سردار یورق کے چہرے پر دبا دبا جوش نظر آنے لگا۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ چغتائی نے اباقہ کے متعلق کوئی اچھا فیصلہ کیا ہے۔ چغتائی سے ضروری ہدایات لے کر اور احترام سے سر جھکا کر وہ خیمے سے باہر نکل گیا۔

☆------☆------☆

سردار یورق چند دوسرے سواروں کے ساتھ تیز رفتاری سے گھوڑا دوڑاتا ہوا قید خانے کے سامنے پہنچا۔ اس نے نگران سے قید خانے کے اکلوتے قیدی کے متعلق پوچھا۔ اس نے بتایا کہ قیدی نے پچھلے تین روز سے کچھ نہیں کھایا' لیکن ابھی وہ مرا نہیں۔ یورق نے اسے فوراً دروازہ کھولنے کا حکم دیا۔ آہنی دروازہ کھلا۔ وہ ایک تاریک سرنگ سے گزر کر ایک دوسرے دروازے کے سامنے پہنچے۔ یہ دروازہ کھولا گیا تو یورق کو ایک تاریک کوٹھری نظر آئی۔ جب اس کی آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہوئیں تو اسے اس متعفن اور غلیظ کوٹھری میں ہڈیوں کا ایک ناقابل شناخت ڈھانچہ فرش پر پڑا دکھائی دیا۔ یورق کو یقین نہیں آیا کہ یہی اباقہ ہے۔ وہ خاقان اوغدائی کے معتوب کا حال دیکھ کر لرز اٹھا۔ اباقہ بے سدھ سیلن زدہ فرش پر پڑا تھا۔ گندگی میں پیدا ہونے والے چھوٹے چھوٹے کیڑے اس کے جسم پر رینگ رہے تھے۔ وہ اپنی چندھیائی ہوئی آنکھوں سے انہیں پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ یورق گھٹنوں کے بل بیٹھا پھر اس نے اپنا ہاتھ اباقہ کی پیشانی پر رکھا۔ ایک کمزور' لیکن غصیلے جھٹکے کے ساتھ اباقہ نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ سخت دل منگول کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔ اس نے سپاہیوں کو اشارہ کیا۔ انہوں نے اباقہ کو ہاتھوں میں اٹھایا اور باہر کھڑے چھکڑے تک لے آئے۔ اباقہ مچل مچل جا رہا تھا۔ یوں لگتا تھا اسے اپنے قید خانے سے نکلنا پسند نہیں۔ باہر کی تیز روشنی اس کی آنکھوں کو سخت تکلیف دے رہی تھی۔ وہ چہرہ بازوؤں میں چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔

اس شام اباقہ ایک کشادہ خیمے میں آرام دہ بستر پر لیٹا تھا۔ سردار یورق اس کے اوپر جھکا ہوا اسے ایک لعاب دار دوا پلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ترکمان سردار پاشا اور لمبی داڑھی والا معالج بھی اباقہ کے سرہانے کھڑے تھے۔ خیمے کے ایک کونے میں خوابیدہ آنکھوں والا ایک شامان (ساحر) متواتر اناپ شناپ پڑھ رہا تھا۔ کوشش کے باوجود سردار یورق دوائی کا ایک قطرہ بھی اباقہ کے حلق سے نہیں اتار سکا۔ اس کے دانت مضبوطی سے ایک دوسرے پر جمے تھے اور وہ سر دائیں بائیں ہلا رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد شامان اور معالج خیمے سے رخصت ہو گئے تو سردار یورق۔ اباقہ کے سرہانے آ بیٹھا۔ پاشا اس کی پائنتی کی طرف کھڑا تھا۔ سردار یورق نے اباقہ کے اوپر جھک کر نرمی سے کہا۔

"اباقہ .... نیلے جاودانی آسمان نے تمہیں ایک نئی زندگی بخشی ہے۔ منگولوں کو تمہاری ضرورت ہے۔ تم اپنی ہمت اور جوانمردی سے نہ صرف اپنی خطائیں معاف کرا سکتے ہو بلکہ دنیا کے خاقان کی نظروں میں خاص رتبہ پا سکتے ہو۔ ایسے موقعے بار بار نہیں ملا

کرتے۔" وہ بڑی دیر اباقہ کے کان میں سرگوشیاں کرتا رہا۔ اسے سمجھاتا رہا۔ یہاں تک کہ اباقہ کی آنکھیں بند ہو گئیں۔

اباقہ کو قید خانے سے نکلے ایک مہینہ ہو چکا تھا' لیکن سردار یورق کی سرتوڑ کوشش کے باوجود اس کی حالت میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔ منگول دربار کے کہنہ سال شامان' نجومی اور معالج اپنا اپنا زور لگا چکے تھے' لیکن اباقہ میں نئی روح کوئی نہیں پھونک سکا تھا۔ بستر پر پڑا ہوا' ہڈیوں کا ڈھانچہ' یک ٹک خیمے کی چھت کو گھورتا رہتا۔ وہ ابلے ہوئے جوؤں کے سوا کسی چیز کے لیے اپنا منہ نہیں کھولتا تھا۔ یہی جو تھے جو اس کے جسم و جان کا رشتہ برقرار رکھے ہوئے تھے۔ ایک دن چغتائی خان خود اس کی حالت دیکھنے کے لیے یورت میں پہنچا۔ سردار یورق کے چہرے پر مایوسی برس رہی تھی۔ چغتائی اپنی تند خوئی کی وجہ سے مشہور تھا۔ اباقہ کو اسی طرح بے جان لاشے کی مانند بستر پر پڑے دیکھ کر اس کا چنگیزی خون جوش مار گیا۔ اس نے پاؤں کی ایک زوردار ٹھوکر اباقہ کے بستر کو لگائی۔ پھر چنگھاڑتا ہوا اپنے سپاہیوں سے بولا۔

"لے جاؤ اس بدبخت کو اسی کوٹھری میں۔ یہ ہماری مہربانیوں کے لائق نہیں۔ اس کی تقدیر میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنا لکھا ہے' اسے مرنے دو۔"

سردار یورق نے کچھ کہنا چاہا' لیکن چغتائی کا غضب دیکھ کر خاموش رہ گیا۔ چغتائی کے حکم کے مطابق سپاہیوں نے اسی وقت اباقہ کو اٹھایا اور باہر لے گئے۔

چغتائی تیز قدموں سے چلتا ہوا اپنے خیمے میں واپس آ گیا۔ اس کا چہرہ ہمیشہ سے زیادہ پریشان نظر آ رہا تھا۔ دبیز قالین کو پاؤں تلے روندتا ہوا وہ بے چینی سے ٹہلنے لگا۔ پھر اس نے غم غلط کرنے کے لیے شراب کے جام چڑھانے شروع کر دیئے۔ حسین دوشیزائیں سرخ شراب کے جام .... بھرتی رہیں اور وہ پیتا رہا۔ وہ مدہوش ہو رہا تھا' لیکن پریشانیاں پیچھا نہیں چھوڑ رہی تھیں۔ اس نے لڑکیوں میں سے حسین صفیہ کو اپنے پاس بلایا اور اس سے دل بہلانے لگا۔ دوسری عورتیں بے تعلقی سے کھڑی تھیں۔ ایسے مناظر ان کے لیے روز کا معمول تھے۔ اس وقت ایک خادم نے اطلاع دی کہ مسلم بن داؤد شرف قدم بوسی کا طالب ہے۔ چغتائی نے اسے حاضر کرنے کو کہا۔ تیز چمکیلی آنکھوں والا بوڑھا داؤد اندر آیا اور ادب سے چغتائی کے چوبی تخت کے سامنے بیٹھ گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا مدہوش منگول زادہ خود ہی اپنی پریشانی کا رونا رونے لگا۔ وہ دیوار چین کے اس پار خان تولوئی کو پیش آنے والی مشکل کے بارے میں بتانے لگا اور کہنے لگا کہ وہ کسی طرح ان کی مدد کرنا چاہتا ہے۔

بوڑھے داؤد نے ادب سے کہا کہ وہ خان معظم کی پریشانی سے آگاہ ہے اور یہ بتانے آیا ہے کہ وہ اس مشکل کو حل کر سکتا ہے۔

چغتائی نے نشے کی ترنگ میں چونک کر اس کی طرف دیکھا اور بولا۔ "وہ کیسے؟"

داؤد نے کہا۔ "خان معظم! میرا خیال ہے کہ میں اباقہ کی چپ توڑنے میں کامیاب ہو سکتا ہوں۔" چغتائی کے چہرے پر بے یقینی کے تاثرات نظر آئے۔ مسلم بن داؤد نے پورے اعتماد سے کہا۔ "خان معظم مجھے صرف تین دن کی مہلت دیجئے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اباقہ آپ کے حکم مطابق چلے گا۔"

"ٹھیک ہے داؤد۔" چغتائی نے ترنگ میں ہاتھ لہرا کر کہا۔

"ہم نے ہمیشہ تجھ پر بھروسہ کیا ہے۔ اب بھی ہم تجھے منہ مانگا انعام دیں گے۔"

داؤد نے مئودب کھڑے ہو کر جانے کی اجازت مانگی۔ اس کے جاتے ہی چغتائی پھر عیش و عشرت میں مصروف ہو گیا۔

☆---------☆---------☆

اباقہ ایک بار پھر اس تنگ و تاریک اور غلیظ کوٹھری میں ڈال دیا گیا تھا۔ اس وقت وہ دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے جو دوسرا شخص تھا وہ مسلم بن داؤد تھا۔ مسلم بن داؤد کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اس کی زبان تیز قینچی کی طرح چل رہی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"اباقہ .... یہ ایک سنہرا موقعہ ہے۔ تمہیں آزادی ہی نہیں مل رہی زندگی کی سب سے عزیز شے بھی مل رہی ہے .... اور میرے خیال میں اب مجھے تم کو بتا ہی دینا چاہئے .... سنو اباقہ! اگر تم یہ مہم سر کر لو تو ماریتا تمہاری ہو سکتی ہے .... ہاں میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس سفر سے واپسی پر ماریتا تمہاری ملکیت ہو گی۔ تم اسے جب اور جہاں چاہو لے جا سکو گے اور اس بات کی زبان خود چغتائی خان نے دی ہے۔ وہ سمجھ گیا ہے کہ تم دونوں ایک دوسرے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔ اس کا کہنا ہے کہ زندگی میں اس نے بہت گناہ کیے ہیں' اب وہ دو ٹوٹے دلوں کو جوڑ کر ایک اچھا کام کرنا چاہتا ہے لیکن اس کی شرط وہی ہے جو میں نے تمہیں بتائی ہے۔ بولو .... اباقہ' کیا تم ماریتا کو حاصل کرنا چاہتے ہو۔"

ایک طویل عرصے کے بعد پہلی بار اباقہ کے ہونٹوں میں جنبش پیدا ہوئی۔ ایک مدھم آواز صدیوں کی ناتمام آرزوؤں کا روپ دھار کر اس کے زخمی سینے سے برآمد ہوئی۔ "ما .... ری .... تا۔" لیکن پھر اچانک اس کی آنکھیں بجھ کر ویران ہو گئیں۔ شاید

پر جھپٹا۔ اباق نے پھرتی سے پہلو بچایا۔ کتا زمین پر گر کر لڑھکا۔ اس دوران دوسرا کتا اس پر چھلانگ لگا چکا تھا۔ اباق کے جسم میں جیسے بجلیاں بھر گئیں۔ اس نے کتے کے منہ پر ایک زنانے کا تھپڑ رسید کیا۔ وہ ہوا ہی میں قلابازی کھا کر گڑھے کی دیوار کے پاس جا گرا۔ تیسرے کتے کے پیٹ میں اباق نے پاؤں کی زوردار ٹھوکر لگائی اور چوتھے کو اگلی ٹانگ سے پکڑ کر گھما دیا۔ یہ کتا دھپ کی زوردار آواز سے گڑھے کی دیوار کے ساتھ ٹکرایا اور کربناک چیخ مار کر ساکت ہو گیا۔ عجیب بات تھی اباق کا انداز مدافعانہ نہیں جارحانہ تھا۔ گڑھے کے گرد موجود لوگوں نے حیرت سے دیکھا کہ اس کے منہ سے ایک ناقابل فہم آواز نکلی اور وہ کسی درندے کی طرح کتوں پر جھپٹا .... پھر ایک انسان اور پانچ کتوں کے درمیان خوفناک لڑائی چھڑ گئی۔ اباق کے ہاتھ پاؤں مشین کی طرح چل رہے تھے۔ کتوں کے نوکیلے دانت اور تیز پنجے اس کے جسم کو کوئی خاص نقصان پہنچانے سے قاصر نظر آ رہے تھے۔ یہ ایک عجیب و غریب مقابلہ تھا۔ ایک کتے نے اباق کا ہاتھ جبڑوں میں جکڑ رکھا تھا جبکہ ایک کتے کی شہ رگ میں اباق نے اپنے دانت گاڑ رکھے تھے۔ چند ہی لمحے بعد اباق نے کتے کا نرخرہ ادھیڑ کر رکھ دیا۔ باقی چار کتے اب بھی اس سے لپٹے ہوئے تھے۔ وہ ان کے ساتھ لڑھکنیاں کھاتا ہوا گڑھے کی دیوار کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا۔ پھر تماشائیوں نے ایک اور حیرت انگیز منظر دیکھا۔ اباق اچانک اپنے پاؤں پر اچھلا اور کنارے پر بیٹھے ہوئے ایک سپاہی کے ہاتھ سے تلوار چھین لی۔ وہ سپاہی گڑھے میں گرتے گرتے بچا۔ اب چاروں کتے خوفناک انداز میں غرا رہے تھے اور اباق وحشیانہ انداز سے تلوار کو چاروں طرف گردش دے رہا تھا۔ کنارے پر کھڑے سپاہیوں نے اپنے تیر کمان سیدھے کر لیے' لیکن اس وقت خان چغتائی کی آواز گونجی "ٹھہرو" وہ ابھی ابھی آیا تھا اور بڑی دلچسپی سے یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ گڑھے کے اندر صورت حال یکسر بدل چکی تھی۔ اباق نے ایک کتے کی اگلی دونوں ٹانگیں کاٹ دی تھیں اور باقی تینوں کتے حملہ کرنے کی بجائے گڑھے کی دیواروں کے ساتھ لگے بھونک رہے تھے۔ چند لمحے کے اندر اندر اباق نے تینوں خونخوار کتوں کو تہ تیغ کر ڈالا .... چاروں طرف گمبھیر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ پھر اس خاموشی میں تالی کی آواز سنائی دی۔ خان چغتائی گڑھے کے کنارے کھڑا اباق کو داد دے رہا تھا۔ قریب ہی سردار یورق رسیوں سے بندھا کھڑا تھا۔ چغتائی بولا۔

"یورق! اسی لیے میں نے تمہیں بعد میں ہلاک کرنے کا حکم دیا تھا۔ اس اجنبی کی سزا دراصل اس کا امتحان بھی تھی۔ اس کی کامیابی نے تمہاری زندگی بھی بچا لی۔" یورق ہانپتے ہوئے جسم کے ساتھ خان چغتائی کے سامنے سجدے میں گر پڑا۔ اس کا سر چغتائی کے

قدموں میں تھا۔ چغتائی نے حکم دیا کہ اجنبی کو گڑھے سے نکال کر میرے یورت (خیمے) میں پہنچایا جائے۔ گڑھے کے کنارے کھڑے تاتاری بڑی حیرت سے اس مافوق الفطرت شخص کو دیکھ رہے تھے۔ وہ خود بھی بلا کے وحشی اور سخت جان تھے' لیکن اجنبی ان صفات میں ان سے بھی بڑھ کر تھا۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ کوئی غیر منگول اس درجہ جری اور جنگجو ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ تھی جو وہ اسے بغیر کسی شک کے منگول سمجھ رہے تھے۔ اجنبی کے کپڑے تار تار ہو چکے تھے' لیکن جسم پر چند معمولی زخموں کے سوا کوئی نشان نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس بے مثال شخص کو دیکھنے والوں میں وہ آنکھیں خان چغتائی کی چہیتی بیوی ماریتا کی بھی تھیں۔ ان غلافی آنکھوں میں اجنبی کے لئے کچھ بے نام جذبے کروٹیں لے رہے تھے۔

☆------☆------☆

سردار یورق اور اباق کی سزائیں معاف کر دی گئیں۔ اباق ایسے نڈر اور جری جنگجو کی دریافت پر سردار یورق کو انعام کے طور پر چار حسین و جمیل روسی دوشیزائیں سونپ دی گئیں اس کے علاوہ کسی ختائی حکمران کا ٹوٹا پھوٹا ہیروں جڑا تاج بھی یورق کے حصے میں آیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اباق نے خان چغتائی کی نظروں میں اہم مقام حاصل کر لیا۔ اسے خان چغتائی کی قربت نصیب ہوئی تو بہت سے لوگ اس سے جلنے لگے' لیکن بہت جلد وہ سب کے سب اس کی صلاحیتوں کے معترف ہو گئے۔ وہ عجوبہ روزگار انسان تھا .... لڑائی بھڑائی کے فن سے بالکل نا آشنا' لیکن ایسا جنگجو جس کے سامنے بڑے بڑے سالاروں کا پتا پانی ہو جاتا تھا۔ اگر تاتاری وحشی تھے تو وہ وحشی تر تھا اگر وہ عیار تھے تو وہ عیار ترین تھا۔ اس کی آنکھوں میں سانپ کی کشش' چال میں شیر کا بانکپن اور حرکات میں چیتے کی پھرتی تھی۔ خان چغتائی اسے سدھانا چاہتا تھا۔ وہ اسے میدان کارزار کا تباہ کن شمشیرزن بنانے کا خواہشمند تھا اور اسی خیال سے اس کی تربیت کی جا رہی تھی' لیکن اس تحریر سے ہر کوئی ناواقف تھا جو اباق کے بازو پر کھدی تھی اور جو دن رات کسی انگارے کی طرح دہکتی رہتی تھی۔ ایک پل اسے چین نہیں لینے دیتی تھی۔ بعض اوقات وہ اپنے خیمے میں سویا ہوا ہڑبڑا اٹھتا تھا .... "سردار بوغائی۔ سردار بوغائی۔" ابھی تک وہ سردار بوغائی کی شکل نہیں دیکھ سکا تھا۔ اس نے اپنے طور پر معلوم کرنے کی کوشش کی تھی اور اسے پتہ چلا تھا کہ وہ اپنے دستے کے ساتھ جھیل بیکال کی طرف گیا ہوا ہے۔ خان اعظم کا منجھلا بیٹا خان اوندائی جو اپنے عظیم الشان لشکر کے ساتھ سائبیریا کے مغرب میں دریائے پی ہی کے قریب پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا' قراقرم واپس آ رہا تھا۔ اس کے استقبال کے لیے جھیل بیکال پر کچھ دستے

اپنی خوش بختی پر یقین نہیں آیا تھا۔ داؤد جلدی سے بولا۔

"اباقہ! اگر تم کہو تو مارینا خود چل کر تمہارے پاس آسکتی ہے۔ وہ میرے بیان کی تصدیق کر سکتی ہے۔ بولو .... وہ یہاں آئے؟"

ایک بار پھر اباقہ کی آنکھوں کے دیئے جل اٹھے۔ اس کے خشک ہونٹ لرزاں ہو گئے۔ "ٹھیک ہے اباقہ .... ٹھیک ہے۔" داؤد نے اس کا کندھا تھپ تھپایا اور اٹھ کر باہر آگیا۔

منظر مارینا کے خیمے کا تھا۔ وہ پشت کے بل بستر پر لیٹی تھی۔ اس کے شہد رنگ بال ایک لمبی چوٹی کی صورت میں سینے پر پڑے تھے۔ وہ حسب معمول گہری سوچ میں کھوئی ہوئی تھی۔ وہ پہلے سے کافی کمزور ہو گئی تھی۔ مرمریں رخساروں سے جھلکنے والی سرخی کی جگہ ہلکی ہلکی زردی نے لے لی تھی۔ آنکھیں پہلے ہی کی طرح دلنشیں تھیں، لیکن ان میں ہر وقت ایک بے نام اداسی کروٹیں لیتی رہتی تھی۔ خادماؤں نے متعدد بار اسے راتوں کو سسکتے سنا تھا۔ کوئی غم اندر ہی اندر اس نازک لڑکی کی جان ہلکان کر رہا تھا۔ آمنہ انجانے اندیشوں کے تحت ہر وقت سائے کی طرح اس کے ساتھ لگی رہتی تھی۔ اباقہ کے بارے میں ان دونوں کو کچھ پتہ نہیں تھا۔ ایک دفعہ آمنہ نے اتنی سی ٹوہ لگائی تھی کہ وہ زندہ ہے اور کسی قید خانے میں نہایت ابتر حالت میں موت کی گھڑیاں گن رہا ہے۔ ایک دو بار مارینا نے اپنے شوہر چغتائی سے اس کے متعلق پوچھنے کا ارادہ کیا تھا، لیکن اباقہ کا نام زبان تک لانے کی ہمت اس کو نہیں ہوئی تھی۔ وہ اس سے کچھ نہیں پوچھ سکتی تھی۔ دل و دماغ میں ہر وقت ایک جنگ سی جاری رہتی تھی۔ وہ خود کو اباقہ کی بربادیوں کا ذمہ دار سمجھتی تھی۔ کبھی کبھی تو اسے اس چہرے ہی سے نفرت ہو جاتی تھی جس نے اباقہ کو اپنا دیوانہ بنا دیا تھا۔ مدت ہوئی اس نے آئینہ دیکھنا چھوڑ دیا تھا۔

اس تمام عرصے میں اس نے صرف چند بار مسلم بن داؤد کو دیکھا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ بوڑھا اس راز سے آگاہ ہو چکا ہے جسے چھپانے کے لیے اس نے اپنے دل و دماغ پر ہزارہا مظالم توڑے تھے۔ وہ آگاہ تھا کہ خان چغتائی کی بیوی ایک گمنام سپاہی سے محبت کرتی ہے۔ پہلے پہل تو اسے یہی خیال گزرا تھا کہ یہ بوڑھا چغتائی خان کو اس راز سے آگاہ کر دے گا اور سزا کے طور پر چغتائی خان اپنی چہیتی بیوی کی گردن مار دے گا، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اسے یہ خیال بدلنا پڑا تھا۔ مسلم بن داؤد یا تو معاملے کی تہہ تک نہیں پہنچا تھا یا اس نے اس راز کو اپنے سینے میں دفن کر لیا تھا، لیکن کس لیے؟ وہ ایسا نیک خو تو دکھائی نہیں دیتا تھا۔ شاید وہ اس راز کے بدلے اس سے کوئی فائدہ حاصل کرنا چاہتا

تھا، لیکن جب کئی ماہ گزر گئے تو مارینا کو اپنا یہ خیال بھی باطل محسوس ہوا۔ اب تو کافی عرصے سے اس نے مسلم بن داؤد کے متعلق سوچا بھی نہیں تھا۔ جب آمنہ نے آکر اطلاع دی کہ مسلم بن داؤد آپ سے ملنا چاہتا ہے تو وہ چونک گئی۔ ذہن میں ایک ساتھ کئی اندیشے سر ابھارنے لگے۔ اٹکی اٹکی آواز میں اس نے اسے حاضر کرنے کو کہا۔ بوڑھا داؤد آداب پیش کرتا ہوا اندر چلا آیا۔ مارینا نے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"کہو داؤد، اتنی رات گئے آنے کی زحمت کیوں کی؟"

وہ داڑھی سہلاتے ہوئے بولا۔ "بس مالکہ! بہت دن سے آپ کی خیریت دریافت کرنے کو جی چاہتا تھا۔" بہت جلد مارینا کو اندازہ ہوا کہ بوڑھا تخلیئے میں کچھ کہنا چاہتا ہے۔ اس نے خیمے میں موجود آمنہ اور ایک دوسری خادمہ کو باہر جانے کا حکم دیا۔ بوڑھا بڑی ہمت سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔ پھر بولا۔ "قابل احترام مالکہ! میں جانتا ہوں خاقان کے معتوب "اباقہ" کے لیے آپ کے دل میں ہمیشہ سے ایک نرم گوشہ موجود رہا ہے۔ اس وقت اباقہ شمالی قراقرم کے ایک قید خانے میں موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہے .... قدرت کی مہربانی ہے کہ خان چغتائی کے دل میں اس کے لیے رحم کا جذبہ بیدار ہوا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اسے اپنے کیے کی سزا مل چکی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ وہ ایک کار آمد سپاہی ثابت ہو سکتا ہے۔ لہٰذا اسے باقاعدہ فوج میں شامل کر کے مہمات پر بھیجا جانا چاہیے، لیکن وہ بے وقوف خان کی عنایات کو ٹھکرانے کا خطاوار ہو رہا ہے، جیسا کہ آپ بھی جانتی ہوں گی وہ درحقیقت مسلمان ہے اور ایک مسلمان ہونے کے ناطے مجھے اس کی بربادی کا بڑا افسوس ہے ...." مارینا نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

"اس کی بربادی کی شروعات بھی تو تم نے ہی کی تھی۔ تم نے ہی چغتائی خان کو اس بات سے آگاہ کیا تھا کہ وہ مسلمان ہے اور تم اسے جانتے ہو ...."

مسلم بن داؤد نے چونک کر مارینا کی طرف دیکھا۔ ایک ثانیے کے لیے اس کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار دکھائی دیئے، لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے بڑی ہوشیاری سے اپنے جذبات کو چھپا لیا۔ افسردگی سے بولا۔ "آپ کی معلومات بالکل درست ہیں مالکہ۔ میں نے ہی چغتائی خان کو بتایا تھا کہ اباقہ مسلمان ہے اور یہی بات اس کی تباہی کا پیش خیمہ بنی۔ یہی افسوس اور پچھتاوا ہے جو مجھے اباقہ کے لیے کچھ کرنے پر اکسا رہا ہے۔ میں اپنے ضمیر کا بوجھ کم کرنا چاہتا ہوں۔"

مارینا نے کہا۔ "کہو اب تم کیا کہنا چاہتے ہو۔"

داؤد نے آگے کو جھکتے ہوئے اپنی آواز کچھ اور دھیمی کر لی اور بولا۔ "مالکہ! میں خود

اس سے قید خانے میں ملا ہوں۔ میں نے اندازہ لگایا ہے کہ وہ آپ سے بہت متاثر ہے۔ اگر آپ ایک بار اس سے مل لیں اور اسے کہیں کہ وہ خان کی بات مان لے تو وہ اپنی ضد چھوڑ دے گا۔ دوسری صورت میں ظاہر ہے اسے اس تاریک کوٹھری میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنا ہو گا۔"

ماریتا کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ رحم سے ناآشنا چنگیز زادے چغتائی خان سے یہ "نیکی" کیونکر سرزد ہو گئی، لیکن ہوشیار داؤد نے اسے زیادہ سوچنے کا موقع نہیں دیا اور اباقہ کی حالت کی ایسی پُردرد تصویر کھینچی کہ ماریتا سب کچھ بھول بھال کر اس کے ساتھ چلنے کو تیار ہو گئی۔

☆------☆------☆

اباقہ ایک کونے میں سمٹا ہوا سردی سے کپکپا رہا تھا۔ پھر کوٹھری کا دروازہ کھلا اور اس تنگ و تاریک چاردیواری میں دنیا جہان کی وسعتیں، روشنیاں اور حرارتیں سمٹ آئیں۔ ماریتا اس کے سامنے کھڑی تھی۔ اس نے دھندلائی ہوئی آنکھوں کو ایک دو بار زور سے جھپکا۔ ہاں اس دفعہ یہ چہرہ خواب نہیں تھا۔ وہ ایک سیاہ چادر میں لپٹی ہوئی تھی، لیکن جتنی بھی نظر آ رہی تھی "ماریتا" تھی۔ وہ تو اس کی ایک انگلی دیکھ کر اسے پہچان سکتا تھا۔ اس کا دل چاہا وہ اپنے قدموں پر کھڑا ہو کر حسن کی اس ملکہ کا استقبال کرے۔ اس کے پاؤں تلے اپنی ہتھیلیاں رکھ دے۔ اس کے بیٹھنے کے لیے اپنے جسم کی کھال بچھا دے۔ وہ شاعری نہیں جانتا تھا اس نے کتابیں بھی نہیں پڑھی تھیں، لیکن پتہ نہیں اس کا دل ایسا کیوں چاہ رہا تھا۔ وہ اسے بتانا چاہتا تھا۔ "دیکھو ماریتا .... یہ ہے میرا گھر، یہ ہے وہ سیلن زدہ فرش جہاں میں مہینوں بے سدھ پڑا رہا ہوں۔ یہ وہ دیواریں ہیں جن پر ہاتھ پھیر کر میں تمہارا لمس یاد کیا کرتا تھا۔ یہ وہ سوراخ ہے جس میں سے مجھے تمہارے بدن کی مہک آتی تھی۔" وہ بہت کچھ کہنا چاہتا تھا پر کچھ نہ کہہ سکا۔ بس اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔ وہ دھیمے قدموں سے چلتی ہوئی آئی اور اس کے قریب بیٹھ گئی۔ کوٹھری کا دروازہ کھلا تھا، لیکن وہ دونوں اکیلے تھے۔ وہ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی چھلکتی ہوئی شراب دیکھ سکتا تھا۔ اس کے سانسوں کی مہک اس کے جسم و جاں میں اتر رہی تھی .... اباقہ کی آنکھوں میں کوئی سوال تھا۔ کوئی خواہش تھی اور ماریتا اس پیغام کو سمجھ رہی تھی۔ اس نے ایک نظر دروازے کی طرف دیکھا پھر آہستگی سے ہاتھ بڑھا کر اباقہ کا ہاتھ تھام لیا۔ کھردرا سخت اور استخوانی ہاتھ۔ پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتی ہوئی وہ آہستہ آہستہ اس ہاتھ کو اپنے رخسار پر لے گئی۔ ہاتھ نمناک رخسار سے ٹکرایا۔ اباقہ کی دھندلی آنکھوں میں معصوم ستارے جگمگا

اٹھے۔ اس کے لب جیسے کھلنے لگے۔ اس کے جسم میں زندگی دوڑنے لگی .... دست و رخسار کا رشتہ قائم ہو چکا تھا۔ اباقہ کا ہاتھ ماریتا کے رخسار اور ہاتھ کے درمیان تھا .... شاید یہی زندگی کی معراج تھی۔ اس سے آگے وہ کچھ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اگر اس وقت موت بھی آ جاتی تو اباقہ کی سرشاری دیکھ کر واپس لوٹ جاتی۔ وہ سسک کر بولی۔ "مجھے معاف کر دینا اباقہ .... میں بڑی ظالم ہوں، میں بڑی خود غرض ہوں، مجھے معاف کر دینا۔" وہ اس کا ہاتھ اپنے رخسار پر دبا رہی تھی۔ اباقہ کے لب ہلے، ایک خوابناک آواز اس کے سینے سے نکلی "ماری تا۔"

ماریتا نے کہا۔ "اباقہ .... بس یہی تمہاری ضد تھی نا۔ لو میں تمہارے پاس آ گئی۔ اب .... چغتائی خان کی بات مان لو۔ وہ جو کہتا ہے اس طرح کر لو .... بولو کرو گے نا؟" کوہ التائی کے دامن میں گنگنانے والے کسی جھرنے کے دو قطرے اباقہ کے رخساروں پر ڈھلک آئے .... اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆------☆------☆

جیسے موسم بدلتا ہے، جیسے بہار آتی ہے، جیسے برف پگھل کر جھرنوں میں گرتی ہے، جیسے برساتی نالے تند و تیز دریاؤں کا روپ دھارتے ہیں .... ایسے ہی اباقہ ہڈیوں کے ایک ٹھٹھرے ہوئے ڈھانچے سے صحت مند جوان کے روپ میں ڈھلنے لگا۔ اس کی آنکھوں کو چمک رخساروں کو گوشت اور جلد کو تازگی واپس مل گئی تھی۔ ہر روز وہ پہلے سے کچھ بہتر دکھائی دیتا تھا۔ سردار یورق دن رات اس کے ساتھ لگا رہتا تھا۔ وہ ایک آیا کی طرح اس کے آرام اور خوراک کا خیال رکھتا تھا۔ منگول حیران ہوتے تھے کہ اس جری سپہ سالار کے دل میں ایسی محبت کہاں سے در آئی۔ ترکمان پاشا اس کے جسم کو مکمل صحت مند حالت میں لانے کے لیے مختلف ورزشیں کراتا تھا۔ وہ گھنٹوں تلوار بازی اور تیراندازی میں مشغول رہتے۔ کبھی وہ بھاگتے بھاگتے دریائے کیرولان کے جنوبی کنارے پر جا پہنچتے۔ ایسے میں پاشا کو اباقہ کی نگاہوں میں ایک عجیب طرح کی خوشی کروٹیں لیتی محسوس ہوتی۔ وہ سمجھتا شاید یہ آزادی کی خوشی ہے، لیکن دوسروں کی طرح وہ بھی اصل حقیقت سے بے خبر تھا۔ اس خوشی کا صحیح تجزیہ صرف اور صرف مسلم بن داؤد ہی کر سکتا تھا۔

.... آخر ایک دن تلوار زنی کے دوران اباقہ نے اپنے ترک "اُستاد" کو سر سے اٹھا کر زمین پر پٹخ دیا، اس دن سردار یورق نے بے تاب چغتائی کو یہ خبر سنائی کہ اباقہ اب سفر پر روانہ ہو سکتا ہے۔ اگلے ہی روز سردار یورق اور اباقہ چند سپاہیوں کے ساتھ عازم سفر ہو گئے۔ وہ صبح کے وقت روانہ ہوئے۔ چغتائی خان نے انہیں رخصت کیا۔ اباقہ نے گھوڑا

جان بوجھ کر اس راستے پر ڈالا جہاں سے وہ مارینا کے خیمے کو دیکھ سکے۔ خیمے کے سامنے سے گزرتے ہوئے وہ بڑی دھیمی رفتار سے چل رہا تھا۔ سردار یورق اس کے آگے اور سپاہی پیچھے تھے۔ اس کی نظریں بے چینی سے خیمے کا طواف کر رہی تھیں لیکن .... مارینا کہیں دکھائی نہیں دی۔ تب اسے خیمے کے پردے میں ایک جھری نظر آئی۔ دو آنکھیں اس میں سے اسے دیکھ رہی تھیں .... وہ اتنی دور سے پہچان سکتا تھا کہ یہ مارینا کی آنکھیں ہیں۔ ناک اور پیشانی کا کچھ حصہ بھی دکھائی دے رہا تھا۔ وہ اس منظر کو اپنی آنکھوں میں اس طرح بھرنا چاہتا تھا کہ کیفیت ذہن پر نقش ہو جائے۔ دونوں کی آنکھیں چند لمحوں کے لیے ایک دوسرے سے ملیں۔ آنکھوں نے ایک دوسرے سے بہت کچھ کہا، لیکن سنا کچھ نہیں مارینا کی اداس آنکھوں نے کہا۔

"الوداع اجنبی! مجھے خوشی ہے تم نے مجھے بھلانے کا فیصلہ کر لیا۔ اب شاید کبھی تم سے ملاقات ہو گی یا نہیں۔"

اباقہ کی نگاہوں نے کہا۔ "خدا حافظ میری محبوبہ۔ میں تمہارے لیے جا رہا ہوں اور تمہارے لیے آؤں گا اور جب میں آؤں گا، تمہارا چاند سا چہرہ اور پھولوں سے رخسار میری امانت ہوں گے۔ پھر کوئی طاقت ہمیں ایک ہونے سے نہیں روک سکے گی۔"

ایک لمحے کے لیے گھوڑا اور خیمہ ایک دوسرے کے سامنے رہے پھر ان کے درمیان فاصلہ بڑھتا چلا گیا۔

☆------☆------☆

صحرائے گوبی کی بے کراں وسعتوں کو پاٹتے ہوئے وہ بالآخر دیوار چین کے قریب پہنچ گئے۔ اب انہیں اس دیوار کا طویل چکر کاٹ کر ملک چین کی حدود میں داخل ہونا تھا۔ یہ ایک دشوار گزار اور صبر آزما سفر تھا۔ دنوں انسانی شکل دکھائی نہیں دیتی تھی۔ بلند پہاڑ اور قاتل گھاٹیاں قدم قدم پر دام بچھائے ہوئے تھیں۔ ریت کے طوفان اور برفیلے جھکڑ آئے دن اس مختصر قافلے کو زیر و زبر کرتے رہتے تھے۔ کبھی کبھی انہیں کسی فوجی چوکی سے کچھ رسد مل جاتی اور کبھی ایسا بھی ہوتا کہ راستہ بھٹک کر کئی دن فاقے سے کاٹنا پڑتے۔ برفانی ہواؤں کی کاٹ سے بچنے کے لیے انہوں نے سمور کے بھاری لباس پہن رکھے تھے اور چہروں پر چربی ملی ہوئی تھی۔

بالآخر وہ چین کی سرزمین میں داخل ہوئے۔ چند روز کے سفر کے بعد انہیں اندازہ ہوا کہ اب منگول فوج کا پڑاؤ زیادہ دور نہیں۔ ایک دن انہیں ایک گھڑ سوار دستہ ملا جسے تولوئی خان نے خاص طور پر ان کے لیے بھیجا تھا۔ دستے کے سالار نے بتایا کہ قلعے پر

چھوٹے چھوٹے حملے جاری ہیں۔ منگول فوج کوشش کر رہی ہے کہ کسی طرح اس "رکاوٹ کو" پامال کیا جائے، لیکن ابھی تک کامیابی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ یہ دستہ سردار یورق اور اباقہ کو لے کر لشکر کے عظیم الشان پڑاؤ میں پہنچا۔ تھوڑی دیر بعد انہیں تولوئی خان کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ وہ اپنے وسیع و عریض خیمے میں شراب نوشی میں مصروف تھا۔ اباقہ کو دیکھ کر اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس نے اپنے ایک جنگجو اور ذہین سردار نور نمتائی کو حکم دیا کہ اس نوجوان کو تمام تفصیل سمجھائے اور جس طرح بھی اس سے کام لینا چاہے لے۔ یہ وہی سردار تھا جس نے پڑاؤ سے باہر یورق اور اباقہ کا استقبال کیا تھا۔ سردار نور نمتائی، اباقہ اور یورق کو اپنے خیمے میں لے گیا۔ ان کے سامنے بہترین کھانے اور پھل چن دیئے گئے۔ اباقہ اور یورق نے پیٹ بھر کر کھایا۔ نور نمتائی، اباقہ کی طرف گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ اسے اچھی طرح جانتا تھا۔ ارغونا کے قتل کے بعد جس دستے نے اباقہ کا تعاقب کیا تھا ان میں سردار نور نمتائی بھی شامل تھا۔ اس نے یورق اور اباقہ کو قلعے کی صورت حال بتاتے ہوئے کہا۔

"قلعے کی ساخت ایسی ہے کہ منگول فوج زچ ہو کر رہ گئی ہے۔ قلعے کے بڑے دروازے کی بائیں جانب ایک بڑی برجی ہے۔ اس برجی سے منگول فوج کو سب سے زیادہ نقصان پہنچایا جا رہا ہے۔ اس برجی کو قدرتی طور پر ایک چٹان کی آڑ میسر ہے اور اس کا زاویہ کچھ ایسا ہے کہ ہماری منجنیقوں کے گولے اور آتشیں تیر اسے چھوئے بغیر گزر جاتے ہیں۔ یہاں ختائیوں (چینیوں) نے بہت سا بارود اکٹھا کر رکھا ہے۔ بڑے بڑے مرتبانوں اور لوہے کی نالیوں میں گندھک اور سلفر بھر کر منگول فوج پر برسایا جاتا ہے .... اگر کسی طرح یہ برجی تباہ ہو جائے تو منگول جنگجو پلک جھپکنے میں قلعے کے اندر داخل ہو سکتے ہیں۔ چینی فوج بھی اس مورچے کی اہمیت سے آگاہ ہے اور اس نے برجی کی حفاظت کا خاطر خواہ انتظام کر رکھا ہے ...." سردار نے مزید بتایا۔ "ہمارا ایک جاسوس جو تاتاری قبیلے کا ایک نڈر جنگجو ہے۔ ہماری فوج کی آمد سے قبل ہی قلعے کے اندر گھسنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ ہمیں اس سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔ ہمیں اطلاع ملی تھی کہ وہ برجی تک پہنچنے کے محفوظ راستے سے آگاہ ہے اور بہت جلد اسے تباہ کر دے گا، لیکن اب ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ یا تو مارا گیا ہے یا گرفتار ہو چکا ہے۔ دوسری طرف یہ رکاوٹ ہمارے لیے دن بدن مصیبت بنتی جا رہی ہے۔ ہماری اطلاع کے مطابق اگر قلعے کی عقبی جانب سے اندر داخل ہوا جائے تو با آسانی اس برجی تک پہنچا جا سکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ختائی اس سمت کو بہت محفوظ خیال کرتے ہیں اور اس جانب انہوں نے حفاظتی انتظامات پر خاص

توجہ نہیں دی۔"

اباقہ جو بڑے غور سے منگول سردار کی باتیں سن رہا تھا بولا۔ "میں قلعے کو ایک نظر دیکھنا چاہتا ہوں۔"

منگول سردار اسی وقت کھڑا ہو گیا۔ سردار یورق بھی ساتھ تھا۔ وہ تینوں گھوڑے بھگاتے ہوئے پڑاؤ سے نکلے اور دشوار گزار گھاٹیوں کا چکر کاٹ کر قلعے کی عقبی جانب آگئے۔ دور کوئی تین کوس کے فاصلے پر جھیل کا شفاف پانی چمک رہا تھا۔ اس دیوار کے اوپر قلعے کی عقبی فصیل دکھائی دے رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کسی بہت بڑے ہاتھ نے پہاڑ کی چوٹی پر کھلونے جیسا قلعہ رکھ دیا ہو۔ قلعے کی اس جانب کسی قسم کی نقل و حرکت کے آثار نہیں ملتے تھے' لیکن سردار نور نمتائی نے بتایا کہ فصیل پر اکثر نگران گھومتے پھرتے دیکھے جاتے ہیں۔ اباقہ ایک پتھر پر کھڑا بڑی دیر تک اِدھر اُدھر کا جائزہ لیتا رہا۔ اس کے عریاں بازو' تنا ہوا سینہ اور استخوانی رخسار دھوپ میں سونے کی طرح دمک رہے تھے۔ اس کے سر پر گھرے سیاہ بال تھے اور آنکھوں میں سنہرے عقابوں کی چمک' وہ اب وہی پہلے والا اباقہ تھا۔

اس کے حلق سے غراہٹ بلند ہوئی۔ "ٹھیک ہے میں جاؤں گا۔"

"کب؟" سردار یورق نے چونک کر پوچھا۔

"ابھی اور اسی وقت۔" اباقہ نے جواب دیا۔

سردار نور نمتائی نے کہا۔ "نوجوان تو ابھی طویل سفر سے آیا ہے۔ ایک آدھ دن آرام کر لے۔"

اباقہ نے اٹل لہجے میں کہا۔ "نہیں .... مجھے ضرورت نہیں۔ بس مجھے ایک خنجر دے دو۔" اس کی نظریں بدستور قلعے کی بلند بالا فصیل پر جمی ہوئی تھیں۔ سردار نور نمتائی نے حیرت سے سردار یورق کی طرف دیکھا۔ یورق نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ سردار نے اپنی پٹی سے خنجر اتار کر اباقہ کے حوالے کر دیا۔ تلوار پہلے ہی اس کی کمر سے لٹک رہی تھی۔

سردار یورق نے کہا۔ "اباقہ! ٹھیک ہے اگر تم ابھی جانا چاہتے ہو تو جاؤ' لیکن دیکھو بڑی ہوشیاری سے .... ہم تولوئی خان کو تمہاری روانگی کی اطلاع دے دیتے ہیں .... میرا خیال ہے کسی لمبی چوڑی منصوبہ بندی کی ضرورت تو نہیں ہے؟"

سردار نور نمتائی نے کہا۔ "ہمارے ہراول دستے تو کب سے تیار بیٹھے ہیں۔ جونہی برجی تباہ ہوئی ہم دھاوا بول دیں گے۔"

اباقہ نے کہا۔ "اچھا میں چلتا ہوں۔" پھر وہ اونچی نیچی چٹانوں کو پھلانگتا ہوا نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

سردار یورق نے کہا۔

"آؤ نور نمتائی ہم تولائی خان کو اطلاع دیں۔"

اباقہ دشوار گزار گھاٹیوں سے ہوتا ہوا جھیل کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جونہی اسے اندازہ ہوا کہ وہ سردار یورق کی نظروں سے اوجھل ہو گیا ہے اس نے اپنی سمور کی ٹوپی اتار کر ہوا میں اچھالی۔ فوجی قمیض پھاڑ کر جسم سے جدا کی اور بھاری بھرکم جوتے پاؤں سے اتار کر کھڈوں میں پھینک دیے۔ یہ بندشیں اسے بہت تنگ کرتی تھیں لیکن سردار یورق کی وجہ سے وہ اب تک انہیں برداشت کر رہا تھا۔ نوکیلے کنکر اس کے پاؤں کے تلووں سے ٹکرائے' یخ بستہ ہوا نے اس کا سینہ چوما اور اسے لگا کہ وہ پنجرے سے نکل کر فضا میں آ گیا ہے۔ اونچی نیچی چٹانوں کو پھلانگتا وہ جس وقت جھیل کے کنارے پہنچا شام کے سائے پھیل چکے تھے۔ دور قلعے کی فصیل ایک دھند کی طرح نظر آ رہی تھی۔ یہ جگہ بالکل سنسان تھی پھر بھی وہ پتھروں میں چھپا مکمل اندھیرے کا انتظار کرتا رہا۔ جلد ہی قلعہ اور اس کے اردگرد کی پہاڑیاں نظروں سے اوجھل ہو گئیں۔ وہ جھیل کے کنارے پہنچا۔ اندھیرا ہونے سے پہلے اس نے اندازہ لگایا تھا کہ پہاڑ کی سپاٹ دیوار اور جھیل کے اس کنارے کے درمیان تقریباً نصف کوس کا فاصلہ ہے۔ وہ چند لمحے بعد کنارے پر کھڑا خود کو چھلانگ لگانے کے لیے تیار کر رہا تھا ....

یخ بستہ جھیل کو اس طرح پار کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا لیکن وہ اباقہ تھا' برف پوش پہاڑوں میں برف کے بستر پر سونے والا۔ جوں جوں وہ آگے بڑھ رہا تھا اس کے اندر کا سویا ہوا وحشی انگڑائی لے کر بیدار ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بتدریج درندگی اتر رہی تھی۔ وہ تیرتا رہا۔ اس کے آہنی بازو برفاب پانی کو چیرتے رہے پیچھے کو دھکیلتے رہے اور آخر وہ سیاہ دیوار کے قریب پہنچ گیا۔ اس وقت اس کی نگاہ دور اوپر قلعے کی فصیل کی طرف اٹھی۔ تاروں بھرے روشن آسمان کے پیش منظر میں اسے فصیل کے اوپر متحرک سپاہیوں کے ہیولے نظر آئے۔ اباقہ سمجھ گیا کہ اب اسے پانی کے اندر تیرنا ہو گا۔ اس نے ایک طویل سانس لی اور غوطہ زن ہو گیا۔

اب وہ پانی کے نیچے تیر رہا تھا۔ کچھ آگے جا کر اس نے اپنا سر سطح آب سے باہر نکالا اور اپنی سمت کا اندازہ کر کے پھر غوطے میں چلا گیا۔ اس کے چاروں جانب ٹھٹھری ہوئی تاریکی اور پانی کا شور تھا۔ اس کی ترکی کمان بائیں کندھے سے لٹک رہی تھی' ترکش دائیں جانب تھا' خنجر زیر جامہ میں اڑسا ہوا تھا اور تلوار نیام میں بند بائیں بغل کے ساتھ تھی۔

کبھی کبھی یہ ہتھیار آپس میں ٹکرا کر معمولی سا شور پیدا کرتے لیکن یہ شور پانی کے نیچے ہی گونج کر رہ جاتا .... اور پھر اس کے ہاتھ نوکیلے پتھروں سے ٹکرانے لگے۔ وہ سمجھ گیا کہ کنارہ قریب ہے۔ آہستہ روی سے تیرتا ہوا وہ کم گہرے پانی میں پہنچا اور پھر کھڑا ہو گیا۔ اس کے کندھے پانی سے باہر تھے۔ اس نے اوپر نگاہ دوڑائی۔ سیاہ پتھر کی دیوہیکل دیوار کسی عفریت کی طرح سامنے کھڑی تھی۔ یہاں سے اباقہ کو قلعے کی دیوار اور اس پر گھومتے ہوئے پہریدار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ وہ اطمینان سے چلتا ہوا سنگی دیوار کے عین نیچے پہنچ گیا۔ یہاں بھی پانی اس کی کمر تک پہنچ رہا تھا' لیکن اس تلاش میں وہ زیادہ دور بھی نہیں جا سکتا تھا۔ ایک جگہ رک کر اس نے ایک دراڑ میں ہاتھ پھنسایا اور زور لگا کر پانی سے باہر آگیا۔ دیوار کافی سپاٹ تھی لیکن اتنی عمودی بھی نہیں تھی جتنی دور سے دکھائی دیتی تھی۔ کم از کم اباقہ کے لیے اس پر چڑھنا دشوار نہیں تھا۔ وہ پتھروں کے اُبھرے ہوئے کناروں اور دراڑوں کے سہارے آہستہ آہستہ اوپر چڑھنے لگا۔ قریباً نصف دیوار طے کرنے کے بعد اسے اندازہ ہوا کہ چڑھائی اچانک خطرناک ہو گئی ہے۔ دیوار کا یہ حصہ عمودی بلکہ باہر کو ابھرا ہوا تھا۔ بیسیوں فٹ نیچے جھیل کا پانی چمک رہا تھا۔ کہیں کہیں چٹانوں کے سرے ابھرے ہوئے تھے۔ اتنی بلندی سے گر کر زندہ بچنا معجزے سے کم نہیں تھا۔ اباقہ نے خطرناک چڑھائی پر چڑھنا شروع کیا........... سخت سردی میں بھی اس کا جسم پسینے میں شرابور تھا۔ انگلیوں کی پوریں جیسے خون اگل رہی تھیں۔ بالآخر ایک جاں گسل جدوجہد کے بعد وہ پہاڑی دیوار طے کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اب وہ قلعے کی فصیل کے نیچے تھا اور اس فصیل پر خالی ہاتھ چڑھنا ممکن نہیں تھا لیکن اباقہ جانتا تھا وہ اس دیوار پر چڑھ جائے گا........... لیکن کیسے؟ یہ وہ بھی نہیں جانتا تھا۔ بس ایک بے نام یقین اور ناقابل تسخیر اعتماد تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ اس فصیل پر چڑھ جائے گا۔ دور سے دیکھنے پر یوں لگتا تھا جیسے جھیل کے پانی سے لے کر قلعے کی برجیوں تک دیوار بالکل سپاٹ ہے اور کہیں پاؤں دھرنے کی جگہ نہیں لیکن ایسی بات نہیں تھی۔ جہاں سے قلعے کی فصیل شروع ہوئی تھی وہاں ایک چوڑی پٹی تھی۔ دو آدمی ساتھ ساتھ اس پر چل سکتے تھے لیکن احتیاط کی ضرورت تھی۔ اباقہ فصیل کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا ایک جانب بڑھنے لگا۔ فصیل کے اوپر اب اسے پہریداروں کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ وہ اوپر چڑھنے کے لیے فصیل کا کوئی شکستہ حصہ تلاش کر رہا تھا۔ پھر ایک شے دیکھ کر اس کی نگاہیں چمک اٹھیں۔ دور نیچے جھیل میں کوئی چیز چمک رہی تھی۔ یہ کسی دھات کا برتن تھا اور اس برتن سے بندھا ہوا طویل رسہ اوپر فصیل کی برجیوں تک چلا گیا تھا۔ یہاں ایک بڑی چرخی لگی ہوئی تھی۔ اباقہ

جھ گیا۔ قلعے کے مکین جھیل سے پانی حاصل کرتے تھے .... لیکن یقینی بات تھی اس پانی کے قریب محافظ ہوں گے۔ اباقہ دبے پاؤں چلتا ہوا رسے کے قریب پہنچا۔ اس نے بائیں کندھے سے کمان اتاری۔ اس طاقتور کمان کو سینگوں کے ذریعے کڑا کیا گیا تھا۔ ایسی کمانیں منگول دور کے نشانے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ ان کمانوں میں استعمال ہونے والے تیر تین انگلی تک موٹے ہوتے تھے۔ ان کے سروں پر لوہا منڈھا ہوتا تھا۔ یہ وزنی تیر سنسناتا ہوا مدمقابل کی زرہ کو بھی چھید جاتا تھا۔ اس وقت اباقہ کے پاس ایسے ہی نصف درجن تیر موجود تھے۔ اس نے ترکش کا بند کھول کر کمان ہاتھ میں لی اور رسے کو پکڑ کر زور سے کھینچا۔ اوپر فصیل پر لگی ہوئی چرخی چرچرائی۔ اباقہ کی تیز نگاہیں فصیل کے کنارے پر جمی تھیں لیکن کوئی پہریدار نظر نہیں آیا۔ اباقہ نے کمان دوبارہ کندھے سے لٹکائی اور رسے کے ذریعے اوپر چڑھنے لگا۔ وہ بڑی احتیاط کر رہا تھا لیکن فصیل پر نصب چرخی بار بار چرچرا رہی تھی۔ پھر دفعتاً چرخی کے قریب ایک چہرہ دکھائی دیا۔ اباقہ اپنی جگہ پتھر کی طرح ساکت ہو گیا۔ اس کے پاؤں رسے کے گرد لپٹ چکے تھے۔ دونوں ہاتھ تقریباً آزاد تھے اور آہستہ آہستہ تیر اور کمان کی طرف بڑھ رہے تھے پہریدار کو شک ہو چکا تھا۔ وہ کچھ اور آگے کو جھک آیا۔ اس وقت بلا کی پھرتی سے اباقہ نے تیر زہ پر چڑھایا' نشانہ لیا اور تیر چھوڑ دیا۔ پہریدار کی کراہ گو دھیمی تھی لیکن شدید تکلیف کا اظہار کرتی تھی۔ وہ فصیل کے اوپر ہی اوندھا ہوا پھر ڈکراتا ہوا کنارے پر لڑھک گیا۔ اباقہ نے اسے کسی سیاہ چمگادڑ کی طرح اپنے قریب سے گزرتے دیکھا۔ پہلے وہ فصیل کی بنیاد میں گرا پھر وہاں سے لڑھک کر سینکڑوں فٹ نیچے جھیل میں جا گرا۔ ایک زوردار چھپاکا ہوا اور رات کے سناٹے میں یہ آواز دور تک پھیل گئی۔ اباقہ اب پوری رفتار سے اوپر چڑھ رہا تھا۔ چرخی بری طرح چلا رہی تھی لیکن اب اسے اس کی پرواہ نہیں تھی۔ پہریدار کسی بھی لمحے اس کے سر پر موت کی بارش کر سکتے تھے۔ جونہی اس کے ہاتھ فصیل کے کنگروں تک پہنچے چینی پہریداروں کے بھاگتے قدموں کی آواز آئی۔ اباقہ اچھل کر فصیل کے اوپر آیا۔ بجلی کی سرعت سے اس نے تلوار کھینچی اور نگاہیں اپنے مدمقابل پہریداروں پر گاڑ دیں۔ وہ تعداد میں پانچ تھے اور نزدیکی برجیوں سے بھاگتے ہوئے یہاں پہنچے تھے۔ اپنے سامنے ایک ننگ دھڑنگ منگول کو کھڑے دیکھ کر وہ چند لمحے کے لیے مبہوت رہ گئے۔ جب تک وہ حیرت کے اس جھٹکے سے سنبھلتے اباقہ کی برق رفتار تلوار ان میں سے دو کے سر قلم کر چکی تھی۔ پھر ان میں سے ایک اپنے نیزے کے ساتھ اباقہ پر جھپٹا لیکن وہ بھول گیا کہ اباقہ کہاں کھڑا ہے اور اگر اس کا نشانہ چوکا تو اس کا کیا حشر ہو گا۔ اباقہ فصیل کے بیرونی کنارے پر کھڑا تھا۔ اس نے جھکائی

دے کر وار بچایا اور ختائی پہریدار ایک کربناک سسکی کے ساتھ فصیل سے نیچے لڑھک گیا۔ باقی دونوں پہریدار تلواریں سونت کر اباقہ کے مقابل آئے' تاروں بھری رات میں فصیل کے اوپر تلواروں کی جھنکار پیدا ہوئی ۔ قدم متحرک ہوئے۔ آگے بڑھے' پیچھے ہٹے' ختائی پہریدار نہیں جانتے تھے ان کے سامنے کون ہے؟ ان کے سامنے کوہ الطائی کا وہ شمشیرزن تھا جس نے کسی اتالیق سے شمشیر زنی نہیں سیکھی تھی لیکن جس کی تلوار کے سامنے آنے کا مطلب تھا موت .... فوری موت۔

اباقہ دونوں پہریداروں سے لڑتا ہوا الٹے قدموں پیچھے ہٹ رہا تھا۔ وہ انہیں چرخی سے کافی دور لے آیا تھا۔ پھر دفعتاً اس نے قدم جمائے اور ایک طوفانی حملہ کیا۔ جھنکار کا آہنگ بدلا' یکے بعد دیگرے دونوں پہریدار خاک و خون میں لوٹ گئے۔ ایک کا سر تن سے جدا ہو گیا اور دوسرا سینے میں گہرا شگاف لیے راہیٔ عدم ہوا۔ اباقہ نے چاروں لاشوں کو گھسیٹ کر ایک جگہ اکٹھا کیا۔ لگتا تھا فصیل کے اس حصے میں بس یہی پانچ افراد پہرہ دے رہے تھے۔ خم دار فصیل آگے تک سنسان دکھائی دے رہی تھی۔ اباقہ نے ایک لاش منتخب کی اور اس کا لباس اتار کر پہننے لگا۔ آہنی خود سر پر رکھ کر وہ محتاط قدموں سے قلعے کے اگلے حصے کی طرف بڑھا۔ کوئی دو سو قدم کے فاصلے پر اسے تین چار اور پہریدار دکھائی دیئے جوں جوں وہ آگے بڑھ رہا تھا پہریداروں اور فصیل پر گھومنے پھرنے والے سپاہیوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا۔ فصیل کے اندر قلعے میں بے شمار لوگ آجا رہے تھے۔ جگہ جگہ مشعلیں روشن تھیں۔ فصیل کے اوپر برجیوں میں چاق و چوبند ختائی عسکری کیل کانٹے سے لیس ہر قسم کی مدافعت کے لیے تیار بیٹھے تھے۔ اباقہ ان کی زبردست تیاریاں دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ پھر اسے دور قلعے کا صدر دروازہ اور اس کے اوپر کی برجیاں دکھائی دینے لگیں۔ داہنی جانب کی برجی اس کی منزل تھی اسے اسی برجی کو تباہ کرنا تھا۔ اسے امید نہیں تھی کہ وہ اتنی آسانی سے برجی تک پہنچ جائے گا۔ اس کی رگوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی۔ وہ درمیانی رفتار سے آگے بڑھ رہا تھا جس مردہ پہریدار کی جوتی وہ پہنے ہوئے تھا اس کے پاؤں کافی چھوٹے تھے۔ اباقہ نے زبردستی جوتی میں پاؤں گھسیڑے تھے۔ اب اس کے ہر قدم پر چینی جوتی سے "چوں چوں" کی آواز بلند ہو رہی تھی لیکن اباقہ کو کیا پرواہ ہو سکتی تھی .... پھر اچانک وہ ٹھٹک گیا۔ فصیل کے اوپر چار بڑی بڑی کافوری مشعلیں روشن تھیں۔ تین چار افراد جو فوج کے اعلیٰ افسر دکھائی دیتے تھے ہر آنے جانے والے سے شناخت مانگ رہے تھے۔ پہلے تو اباقہ نے سوچا شاید اس کی چھپائی ہوئی لاشیں دریافت کر لی گئی ہیں لیکن پھر اسے اندازہ ہو کر یہ احتیاط یہاں کا معمول ہے۔ وہ وہیں رک کر قلعے کے اندر کی

سرگرمیاں دیکھنے لگا۔ ذہن تیزی سے اس مسئلے کا حل سوچ رہا تھا۔ فصیل کے عین نیچے اندر کی طرف زخمیوں کی مرہم پٹی ہو رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا قلعے کے دروازے پر جھڑپیں بدستور جاری ہیں۔ اباقہ نے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبایا اور زور سے کاٹ کھایا۔ پھر اس نے اپنی زبان کو بھی اسی طرح زخمی کر لیا۔ نمکین خون سے اس کا منہ بھر گیا۔ وہ ہونٹوں پر ہاتھ رکھے ایک نزدیکی راستے سے احاطے میں چلا گیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد وہ منہ پر بڑی سی پٹی بندھوائے واپس فصیل پر آگیا۔ اس پٹی کی وجہ سے اباقہ کا چہرہ چھپ کر رہ گیا تھا۔ کافوری مشعلوں کی روشنی میں پوچھ گچھ جاری تھی۔ اباقہ نپے تلے قدموں سے چلتا نگران افسروں کی طرف بڑھا۔ سرکردہ افسر گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اباقہ کسی بھی صورت حال کے لیے تیار تھا۔ افسر نے چینی زبان میں اس سے کچھ پوچھا۔ اباقہ نے زخمی منہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے "غوں غاں" میں جواب دیا اور بڑے اعتماد سے آگے بڑھ گیا تھا۔ فصیل کا یہ حصہ انتہائی اہم تھا اور یہاں زبردست حفاظتی انتظامات تھے .... ابھی اباقہ چند قدم ہی آگے گیا تھا کہ دفعتاً ایک ہاتھ اس کے کندھے پر آیا۔ اباقہ نے جلدی سے مڑ کر دیکھا۔ نگران چوکی کا وہی افسر اس کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ مشکوک نظروں سے اس کے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کی نگاہیں بار بار اباقہ کے پاؤں کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔ اباقہ نے نیچے دیکھا تو اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ پاؤں کے دباؤ سے جوتی پھٹ چکی تھی اور پاؤں کی تین انگلیاں باہر جھانک رہی تھیں۔ افسر نے پاؤں کی طرف اشارہ کر کے کچھ پوچھا۔ اباقہ نے حسب سابق مبہم آواز میں جواب دیا۔ افسر نے اسے بازو سے پکڑ کر روشنی کی طرف چلنے کو کہا۔ اردگرد کے کچھ اور افراد بھی اس معاملے کو دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ مشعلوں کے قریب پہنچ کر افسر نے ایک مشعل اٹھائی اور غور سے اباقہ کا چہرہ دیکھنے لگا۔

تب اباقہ کے حلق سے ایک ناراض درندے کی غراہٹ بلند ہوئی۔ اس سے پہلے کہ افسر اپنی تلوار کھینچتا اباقہ نہایت پھرتی سے جھکا اگلے ہی لمحے ختائی افسر اس کے بازوؤں پر بلند ہو چکا تھا۔ تین محافظ تلوار کھینچ کر اس کی طرف لپکے اور اباقہ نے بھاری بھرکم ختائی کو ان پر دے مارا۔ پھر اس نے اپنی تلوار کھینچی' دائیں اور بائیں دونوں اطراف سے کم و بیش بیس سپاہی اس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اباقہ الٹے قدموں فصیل کے اندرونی کنارے پر پہنچا۔ پھر ایک دم گھوم کر اس نے نیچے چھلانگ لگا دی۔ وہ سبز چارے کے بڑے بڑے گٹھوں کے اوپر گرا اور وہاں سے چھلانگ لگا کر زمین پر آگیا۔ فصیل پر شور و غل کی آواز سن کر احاطے میں سپاہی چوکنے ہوئے لیکن جب تک وہ اباقہ کو پکڑتے وہ ایک شخص کے پیٹ

میں تلوار گھونپ کر ایک راہداری میں گھس چکا تھا۔ "دوڑو پکڑو" کی آوازیں سنائی دیں اور قلعے کے اس حصے میں کھلبلی مچ گئی۔ اباقہ راہداری میں بھاگا چلا جارہا تھا۔ راہ گیروں سے ٹکراتا' پھلانگتا' کودتا وہ احاطے کی دوسری جانب نکل آیا۔ یہاں سینکڑوں چینی کاریگر دو قطاروں میں بیٹھے ہتھیار تیز کرنے میں مصروف تھے۔ اباقہ ان کے درمیان سے بھاگتا ہوا نکل گیا۔ وہ حیرت سے ایک دوسرے کی طرف تک رہے تھے۔ کچھ کی چھوٹی چھوٹی داڑھیاں غصیلے انداز میں ہل رہی تھیں۔ اتنے میں متعاقب سپاہیوں کا گروہ آیا اور دندناتا ہوا ان کاریگروں کا ساز و سامان الٹ پلٹ کر گیا۔ ایک اندرونی دیوار کے دروازے پر اباقہ کو ایک مسلح پہریدار نے روکا۔ اباقہ کی تلوار بجلی کی طرح چمکی اور پہریدار کو ڈھیر کر گئی۔ اس سے پہلے کہ اردگرد سے سپاہی دروازے تک پہنچتے' اباقہ چھلاوے کی طرح دوسری طرف نکل چکا تھا۔ گھاس کا ایک چھوٹا سا قطعہ پار کر کے وہ قلعے کے پچھلے حصے میں آگیا۔ چھکڑوں کی ایک طویل قطار سپاہیوں کو رسد پہنچا کر باہر نکل رہی تھی۔ وہ ایک اونچے چبوترے کی آڑ میں کھڑا ہو گیا۔ یہ چبوترا شاید قلعے کا پھانسی گھر تھا۔ جب چھکڑوں کی قطار اس کے قریب سے گزر گئی وہ بھاگتا ہوا آخری چھکڑے کے عقب میں گھس گیا۔ اس میں سپاہیوں کی ان دھلی وردیوں کا ڈھیر لگا تھا۔ وہ اس ڈھیر میں دبک کر بیٹھ گیا۔ جلد ہی اسے اندازہ ہوا کہ وہ قلعے کے عقبی دروازے کے قریب پہنچ چکا ہے' احتیاط سے اِدھر اُدھر جھانک کر وہ باہر نکل آیا۔ یہ قلعے کا رہائشی علاقہ تھا۔ کئی چھوٹے بڑے مکانات نظر آرہے تھے' کہیں کہیں مشعلیں اور قندیلیں روشن تھیں وہ تاریکی میں چلتا ہوا مکانوں کی بھول بھلیوں میں گھس گیا۔ جونہی وہ ایک گلی میں مڑا سامنے سے پانچ چھ گھڑسوار آتے دکھائی دیئے۔ ایک شخص نے انگلی سے اباقہ کی طرف اشارہ کیا اور گھوڑے سرپٹ دوڑ پڑے۔ اباقہ مڑ کر پوری رفتار سے بھاگا۔ ایک تیر شائیں سے اس کے سر پر سے نکل گیا۔ وہ سمجھ گیا کہ یوں بھاگنا موت کو دعوت دینا ہے۔ وہ ایک بغلی گلی میں مڑا۔ سامنے کھڑکی کے سرخ پردے میں سے شمع کی روشنی جھلک رہی تھی۔ اس نے نتائج سے بے پرواہ ہو کر کھڑکی کو دھکا دیا۔ جونہی پٹ کھلے وہ چھلانگ لگا کر اندر گھس گیا۔ ایک بھدی سی عورت آنکھیں پھاڑ کر چیخی۔ اباقہ نے جلدی سے گھوم کر کھڑکی بند کر دی۔ اس سے پہلے کہ عورت دوسری مرتبہ چیختی اباقہ بلائے ناگہانی کی طرح اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ اس کے ہاتھ میں خنجر تھا اور دوسرا ہاتھ مضبوطی سے عورت کے منہ پر جما ہوا تھا۔ تب بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز آئی اور سبز ریشم میں ملبوس ایک نوجوان دوشیزہ "چھم" سے اندر آگئی۔ آتے ساتھ ہی اس نے اباقہ پر ناقابل فہم الفاظ کی بارش کر دی۔ اباقہ نے بھدی

عورت کو چھوڑا اور عقاب کی طرح لپک کر لڑکی کو دبوچ لیا۔ اس کا خنجر لڑکی کی شہ رگ پر دھرا تھا۔ بھدی عورت نے منگول زبان میں کہا۔

"اگر تُو ختائی سپاہیوں سے بھاگ رہا ہے تو تجھے میری مالکہ کی گردن پر خنجر رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

اس وقت کھڑکی سے باہر گھوڑوں کی ٹاپیں گونجیں۔ بھدی عورت نے بھاگ کر کھڑکی کا پردہ درست کیا۔ اس وقت مکان کے بیرونی دروازے پر دستک ہوئی۔ اباقہ کی گرفت میں پھنسی ہوئی لڑکی نے تیز تیز کچھ کہا۔ بھدی عورت بولی۔

"اجنبی! مالکہ کو چھوڑ دے۔ یہی تیری جان بچاسکتی ہے۔"

اباقہ نے نہایت تیز نگاہوں سے عورت کو گھورا۔ پھر لڑکی پر گرفت ختم کر دی۔ اسے ان عورتوں میں دشمنی کی جھلک نظر نہیں آرہی تھی۔ لڑکی نے گھوم کر ایک گہری نظر اباقہ پر ڈالی۔ اس وقت دوبارہ دستک ہوئی۔ لڑکی اپنا لباس درست کرتی تیز قدموں سے باہر نکل گئی۔ منگول عورت نے اباقہ کا بازو پکڑا اور اسے ایک دیوار گیر الماری کے پیچھے کر دیا۔ نوجوان چینی لڑکی اور سپاہیوں کے درمیان ہونے والا مکالمہ اباقہ کو صاف سنائی دے رہا تھا۔ پھر سپاہی واپس لوٹ گئے۔ لڑکی دروازہ بند کر کے واپس کمرے میں چلی آئی یوں لگتا تھا گھر میں بس یہی دو عورتیں ہیں۔ اباقہ الماری کے عقب سے برآمد ہوا۔ خنجر ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔ چینی لڑکی نے منگول عورت سے کچھ کہا اور تب اباقہ کو پتہ چلا کہ منگول عورت کا نام "تاجورا" ہے۔ تاجورا نے اپنی چینی مالکہ کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا۔ "اجنبی! یہ خنجر واپس رکھ لے۔ تُو دشمنوں میں نہیں دوستوں میں ہے۔" اباقہ نے خنجر واپس رکھ لیا۔ اس نے پہلی بار غور سے لڑکی کو دیکھا۔ عمر کوئی سترہ اٹھارہ سال تھی۔ سبز ریشم کا ڈھیلا ڈھالا لبادہ اس کے دلکش جسمانی خطوط کو جابجا نمایاں کر رہا تھا۔ سیاہ چمکدار بال اس کی کمر پر لہرا رہے تھے۔ آنکھیں قدرے چھوٹی تھیں لیکن ان کی اپنی ایک دلکشی تھی۔ اباقہ نے محسوس کیا کہ لڑکی کچھ دیر پہلے تک روتی رہی ہے۔

☆-----☆-----☆

تھوڑی دیر بعد اباقہ بے تکلفی سے دونوں عورتوں کے سامنے بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے خالی رکابیوں کے ساتھ ہڈیوں کا ایک چھوٹا سا ڈھیر پڑا تھا۔ اس نے خوب پیٹ بھر کر کھانا کھایا تھا۔ ظاہر ہے منہ کی جعلی پٹی کھل چکی تھی ورنہ وہ اتنا ڈھیر سارا گوشت حلق سے نیچے کیسے اتارتا۔ چینی اور منگول عورت کے بارے میں اب وہ کافی کچھ جان چکا تھا۔ اسے جنگ کی موجودہ صورت حال کے متعلق بھی گراں قدر معلومات حاصل ہوئی تھیں۔

درحقیقت چین کا کن خاندان منگولوں کی بھرپور مزاحمت کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اس علاقے تک تو ایک طرح منگول بے روک ٹوک ہی آ گئے تھے۔ غیر جانبدار "سنگ" خاندان نے تبتی علاقے سے انہیں گزرنے کی اجازت دے دی تھی اور اگر وہ اجازت نہ بھی دیتے تو منگولوں کو تو بہرحال گزرنا ہی تھا لیکن اب کن حکمران اس یلغار سے پریشان ہو گئے تھے۔ وہ خم ٹھونک کر میدان میں آنے کا سوچ رہے تھے۔ یہ حالات تھے جن میں قلعے کی محصور فوج پایہ تخت سے آنے والی کمک کا انتظار کر رہی تھی۔

چینی دوشیزہ کا نام "فینگ ہن" تھا۔ وہ ایک اعلیٰ فوجی افسر کی بیٹی تھی لیکن ....
وہ اباقہ کہ مدد کیوں کر رہی تھی؟ یہ سوال بہت اہم تھا۔ اباقہ نے منگول خادمہ تاجورا سے اس بارے میں پوچھا۔ اس نے ایک نظر سامنے بیٹھی ہوئی اداس "فینگ ہن" کو دیکھا پھر بولی۔

"اجنبی! دراصل میری مالکہ .... ایک منگول نوجوان کے عشق میں گرفتار ہے۔ یہ نوجوان منگول فوج کا ایک جاسوس ہے اور کافی عرصے سے یہاں رہتا ہے۔ اس نوجوان کی محبت نے میری مالکہ کے دل سے منگولوں کا خوف دور کر دیا ہے۔ وہ منگولوں کو اچھا سمجھتی ہے۔ جب سے وہ نوجوان گرفتار ہوا ہے اور اسے موت کی سزا سنائی گئی ہے اس کے دل میں منگولوں کے لیے اور بھی ہمدردی پیدا ہو گئی ہے۔"

اباقہ کے ذہن میں جھماکا سا ہوا لیکن دلی جذبات اس کے پتھریلے چہرے پر نمودار نہ ہو سکے اس نے گھمبیر آواز میں پوچھا۔ "اس نوجوان کا نام "دھووک" تو نہیں؟"

"ہاں .... یہی نام ہے اس بدقسمت کا لیکن تم اسے ...."

"میں اسے جانتا ہوں .... مجھے اسی سے ملنا ہے۔" اباقہ کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ پڑاؤ سے رخصت ہوتے وقت نور نمتائی نے اسے جس نوجوان جاسوس کے بارے میں بتایا تھا اس کا نام دھووک ہی تھا۔ اس کا مطلب تھا منگولوں کا اندازہ درست تھا۔ دھووک گرفتار ہو چکا تھا۔ اباقہ نے تاجورا سے پوچھا۔ "اس وقت دھووک کہاں ہے؟"

تاجورا نے کہا۔ "وہ قید خانے میں ہے۔ آج رات کسی وقت یا کل صبح اسے پھانسی دے دی جائے گی۔"

چینی دوشیزہ شاید سمجھ چکی تھی کہ اس کے محبوب کی باتیں ہو رہی ہیں۔ اس کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے تھے۔ اباقہ سوچ رہا تھا فصیل کے اوپر اب محافظ بہت ہوشیار ہو چکے ہوں گے۔ انہیں چکمہ دے کر برجی تک پہنچنا آسان نہیں تھا۔ نور نمتائی نے بتایا تھا کہ دھووک، برجی کا خفیہ راستہ جانتا ہے۔ اگر وہ قید سے آزاد ہو جاتا ہے تو منگولوں کا

مسئلہ حل ہو سکتا تھا .... "ٹھیک ہے، میں اسے آزاد کراؤں گا۔" اباقہ نے با آواز بلند کہا۔

"کس کو آزاد کراؤ گے؟" تاجورا نے حیرانی سے پوچھا۔

"دھووک کو۔" اباقہ نے کہا۔

ذہین چینی دوشیزہ قیافے سے ان کی باتیں سمجھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں امید کی چمک دکھائی دی لیکن اُدھیڑ عمر تاجورا کی پیشانی پر بل پڑ گئے وہ بولی۔ "کیوں مفت میں جان گنوانا چاہتا ہے۔ تُو نے یہاں سے قدم باہر رکھا نہیں کہ پکڑا نہیں گیا۔"

چینی دوشیزہ فینگ ہن نے مداخلت کی اور اپنی زبان میں تاجورا سے کچھ کہنے لگا۔ تھوڑی دیر دونوں عورتوں میں تیز فقروں کا تبادلہ ہوتا رہا پھر تاجورا ہارے ہوئے لہجے میں اباقہ سے بولی۔ "میں نے اس لڑکی کو بچپن سے پالا ہے لیکن یہ میری بات بھی نہیں مانتی۔ ہٹ کی بڑی پکی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اگر تم دھووک کو رہا کرانا چاہتے ہو تو یہ تمہاری ہر طرح مدد کرے گی .... میرا خیال ہے دھووک کے ساتھ ساتھ یہ ہمیں بھی مروائے گی ...." اس موقع پر فینگ ہن نے پھر تاجورا کی بات کاٹی۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ تاجورا ترجمانی کے فرائض ہی انجام نہیں دے رہی اپنی طرف سے تبصرے بھی کر رہی ہے۔ پھر شاید اس نے یہی بات تاجورا سے بھی کہی تھی۔ تاجورا سنبھل گئی اور بعد کی گفتگو میں اس نے صرف فینگ ہن کی ترجمانی کی، اپنی طرف سے کوئی بات نہیں جوڑی۔ اس گفتگو میں یہ فیصلہ ہوا کہ دھووک کو رہا کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ فینگ ہن اپنے ایک خاص آدمی کے ذریعے اباقہ کو اس قید خانے تک پہنچائے گی جہاں دھووک قید ہے۔ اس کے بعد اسے چھڑانا اور یہاں تک لانا اباقہ کا کام ہو گا۔ کافی دیر وہ تفصیلات طے کرتے رہے اس کے بعد فینگ ہن نے منگول خادمہ کو اس آدمی کی طرف بھیجا جسے اباقہ کے ساتھ جانا تھا۔ ابھی منگول خادمہ تاجورا حکم کی تعمیل میں دروازے تک ہی جا پائی تھی کہ ایک کرخت دستک سنائی دی۔ فینگ ہن نے اباقہ کو پکڑ کر جلدی سے الماری کے پیچھے چھپا دیا۔ اباقہ کے حساس کان دوسرے کمرے سے آنے والی آوازوں پر لگے تھے۔ ایک بھاری بھرکم مردانہ آواز نے دونوں عورتوں کو خوفزدہ کر دیا تھا۔ اباقہ کو یہ اندازہ لگانے میں دشواری نہیں ہوئی کہ آنے والا فینگ ہن کا باپ ہے۔ وہ اپنے کپڑے بدل رہا تھا جس کا مطلب تھا اب اسے باہر نہیں جانا۔ اباقہ نے اندازہ لگایا کہ وہ بیٹی کو اس پُراسرار منگول کے بارے بتا رہا ہے جو عقبی فصیل سے قلعے میں گھس آیا ہے اور جس کی تلاش زور و شور سے جاری ہے۔ پھر ان کی گفتگو کا موضوع بدل گیا۔ دونوں عورتیں کچھ خاموش سی ہو گئی تھیں۔

اباقہ صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ تاجورا تیز قدموں سے اندر داخل ہوئی۔ اس نے برتن نکالنے کے لیے الماری کھولی اور اباقہ کے کان کے نزدیک سرگوشی میں بولی۔

"معاملہ بگڑ گیا ہے۔ دھووک کو ابھی پھانسی ہو رہی ہے شاید وہ پھانسی گھر کی طرف روانہ بھی ہو چکا ہے .... اور یہ مردود بڈھا کھانا کھانے کے بعد بھی دیر تک سونے والا نہیں۔"

تاجورا کافی گھبرائی ہوئی تھی۔ برتن لے کر وہ باہر نکل گئی۔ اس وقت فینگ ہن اندر داخل ہوئی۔ اباقہ نے الماری کے عقب سے جھانکا۔ وہ چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپائے سسکیاں روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ پھر باپ کی آواز آئی اور وہ آنسو پونچھتی باہر نکل گئی۔ جونہی وہ گئی اباقہ الماری کی اوٹ سے نکلا۔ اس نے بہ آہستگی سرخ پردہ ہٹا کر کھڑکی کھولی۔ ایک نظر گلی میں جھانکا اور کود کر باہر آ گیا۔ اس کی آنکھوں کی چمک ہر لحظہ نمایاں ہو رہی تھی۔ بدن میں کسی شکاری عقاب کی چستی عود کر آئی تھی۔ نتائج سے بے پرواہ ہو کر وہ گلی کے سرے کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ جانتا تھا پھانسی گھر کدھر ہے۔ دیواروں کے سائے میں چلتا مسلح گھڑسواروں کی نظروں سے بچتا وہ پھانسی گھر کے قریب پہنچ گیا۔ پھانسی گھر کو سنسان دیکھ کر اس کی پریشانی کچھ کم ہوئی۔ اس کا مطلب تھا دھووک ابھی یہاں نہیں پہنچا تھا۔ صرف چند افراد مشعلوں کی روشنی میں چبوترے پر کھڑے پھانسی کی تیاری کر رہے تھے۔ وہ ان کی نظروں سے بچتا ہوا دبے قدموں پھانسی گھر کے اندر داخل ہو گیا۔

☆------☆------☆

وہ پھانسی گھر کی تاریک کوٹھری میں چھپا ہوا تھا۔ دراصل یہ ایک گول کمرہ تھا۔ اس کمرے کے عین اوپر تختۂ دار تھا۔

پھانسی پانے والا تختہ کھینچے جانے کے بعد اسی گول کمرے میں جھولتا تھا۔ کمرے کی ہولناک تاریکی میں اباقہ دیوار سے چپکا کھڑا تھا۔ اس تاریکی میں نہ جانے کتنی روحیں پھڑپھڑائی تھیں۔ کتنے انسانوں نے زندگی کی آخری ہچکیاں لی تھیں' کتنے جسم تڑپے اور مچلے تھے لیکن اباقہ کو ان باتوں کی کیا پرواہ ہو سکتی تھی اس کی تیز نگاہیں تو چبوترے کا جائزہ لے رہی تھیں۔ مشعلوں کی روشنی میں چبوترے کا کچھ حصہ دکھائی دے رہا تھا پھانسی کا انتظام کرنے والے افراد کی جھلک بھی کبھی کبھار دکھائی دے جاتی تھی۔ وہ سمور کے بھاری کپڑوں میں لپٹے ہوئے تھے اور ان کی ٹھٹھری ہوئی سانسیں دھوئیں کی صورت خارج ہو رہی تھیں۔ ان کی باتیں اباقہ کے لیے ناقابل فہم تھیں۔ وہ خنجر ہاتھ میں لیے اپنی جگہ پر دبکا رہا۔ واقعات اباقہ کی توقع سے زیادہ رفتار کے ساتھ آگے بڑھ رہے تھے۔ پھر دھیرے

دھیرے پھانسی گھر کی رونق میں اضافہ ہونے لگا۔ چبوترے کے اوپر اور اردگرد لوگوں کی بھنبھناہٹ بڑھ گئی۔ پھر اباقہ کو اندازہ ہوا کہ مجرم آ گیا ہے۔ شاید اسے جلوس کی صورت میں لایا گیا تھا۔ بہت سی ملی جلی آوازیں آ رہی تھیں۔ چبوترے کے اوپر سرگرمیاں اور بڑھ گئی تھیں۔ اباقہ نے اپنی تلوار نکال لی تھی اس کے ذہن میں کوئی منصوبہ نہیں تھا۔ بس وہ یہ جانتا تھا اسے منگول جاسوس دھووک کو بچانا ہے۔ اس کا ارادہ تھا کہ جونہی دھووک کو تختۂ دار پر لایا گیا وہ اپنی جگہ سے حرکت کرے گا اور اس کمرے سے نکل کر چبوترے پر پہنچ جائے گا پھر .... پھر کیا ہو گا' نہ وہ جانتا تھا اور نہ چبوترے والے۔ اس کی تلوار جانتی تھی اور آنے والا وقت۔

آخر اسے چبوترے پر مجرم کے بندھے ہوئے پاؤں دکھائی دیے۔ اس نے ذرا سا سر نکال کر دیکھا۔ مجرم کی شکل نظر آئی لیکن وہ تو کوئی ادھیڑ عمر چینی تھا۔ اس کا مطلب تھا ایک سے زیادہ افراد کو پھانسی دی جا رہی تھی۔ وہ ایک بار پھر دیوار سے لگ گیا۔ مجرم تختہ دار پر لایا گیا۔ تختے کی بھیانک چرچراہٹ سنائی دی۔ ناقابلِ فہم زبان میں کسی نے تختہ کھینچنے کا حکم دیا۔ ایک کھٹکا ہوا "اوغ" کی آواز آئی پھر ایک سایہ خوفناک جھٹکے سے گول کمرے میں جھولنے لگا۔ اباقہ نے بدنصیب شخص کی گردن ٹوٹنے کی آواز سنی۔ اس کی آنکھوں سے ایک ہاتھ کے فاصلے پر ایک شخص جان کنی کے عالم میں تڑپ رہا تھا۔ اباقہ ساکت نگاہوں سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ مجرم کے پاؤں اباقہ کے سر سے قریباً نصف ہاتھ بلند تھے۔ پھر روح اور جسم کا رابطہ منقطع ہو گیا' اینٹھے ہوئے پاؤں ڈھیلے ہو کر نیچے لٹک گئے۔ تب ایک پُرشور آواز سے مُردہ جسم کمرے کے پختہ فرش پر آ گرا۔ رسہ کاٹ کر مجرم کی لاش بے دردی سے نیچے پھینک دی گئی تھی۔ اباقہ نے تلوار میان میں ڈالی اور خنجر نکال کر ہوشیار ہو گیا۔ چند لمحے بعد قدموں کی آواز آئی۔ ایک شخص اندر داخل ہوا۔ اس نے نہایت لاپرواہی سے مردے کی ٹانگ پکڑی اور گھسیٹتا ہوا باہر لے گیا۔ اباقہ کمرے کے تاریک حصے میں دیوار سے چپکا ہوا تھا اس لیے اس کی نگاہ سے محفوظ رہا۔ تب چبوترے پر ایک دوسرا شخص نظر آیا۔ یہ بھی کوئی چینی معتوب تھا۔ ایک بار پھر وہی عمل دوہرایا گیا۔ اباقہ گہری نظروں سے صورت حال کا جائزہ لیتا رہا۔ پھر اس کے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ وہ خون خرابے کے بغیر بھی دھووک کی جان بچا سکتا تھا۔

☆------☆------☆

دھووک تختۂ دار سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ پشت پر بندھے تھے اور دو سپاہیوں نے اسے بازوؤں سے تھام رکھا تھا۔ وہ ایک ستائیس اٹھائیس سالہ تنو

مند منگول نوجوان تھا۔ چہرے کے دو گہرے زخم اس کی جنگجویانہ خو کے غماز تھے۔ اس کی آنکھوں میں بلا کی چمک تھی۔ وہ چنگیز خاں کے سب سے چھوٹے بیٹے تولوئی خاں کے محافظ دستے کا رکن تھا اور منگولوں کے لیے اس کے کارناموں کی فہرست بہت طویل تھی لیکن اگر تولوئی اسے مشکل مہمات کے لیے منتخب کرتا تھا تو اسے نوازتا بھی نہایت فراخ دلی سے تھا۔ اس نے اپنی اب تک کی زندگی میں بہت کچھ دیکھا تھا اور کئی بار اس نے سوچا بھی تھا کہ اب اور کیا دیکھنا باقی ہے۔ دنیا کے بہترین کھانے وہ کھا چکا تھا۔ دور دراز کے میوہ جات اس کے حلق سے گزر چکے تھے' دنیا کی حسین ترین عورتوں کا قرب بھی حاصل کر چکا تھا لیکن اب جب کہ وہ سچ مچ نیلے آسمان کی دوسری جانب رخصت ہونے والا تھا' اکا دکا کئی خواہشیں دل کو افسردہ کرنے آدھمکی تھیں اور ان میں سب سے نمایاں خواہش فینگ ہن کی تھی۔ اس کا خوبصورت چہرہ بار بار اس کی نگاہوں میں گھوم رہا تھا۔ کاش وہ اس کے ساتھ اپنے قراقرم کے خیمے میں کچھ دن گزار سکتا۔ کاش اس کی گھنٹیوں جیسی آواز ایک بار پھر اس کے کانوں میں رس گھولتی لیکن اب تو یہ سب خواب کی باتیں تھیں۔ دو قیدی اپنے انجام کو پہنچ چکے تھے اور اب اس کی باری تھی۔

اور پھر دو سخت اور بے رحم ہاتھوں نے اسے آگے دھکیلا۔ جلاد نے نیچے جھک کر بے دردی سے اس کے پاؤں رسے میں کس دیے۔ دھووک نے ایک نظر آسمان کی طرف دیکھا...... ٹھٹھرے ہوئے تارے محویت سے تماشا دیکھ رہے تھے۔ یونہی اس کے ذہن نے سوچا' کتنا اچھا ہو کہ کسی مہربان دیوی کی نگاہ اس پر پڑے اور وہ اسے تختۂ دار سے اچک کر لے جائے۔ ختائی سپاہی اور جلاد حیرت سے دیکھتے رہ جائیں۔

...... لیکن ایسا تو صرف ان کہانیوں میں ہوتا تھا جو قراقرم میں لوگ آگ کے گرد بیٹھ کر کہتے اور سنتے تھے۔ یا کٹھ پتلیوں کے ان تماشوں میں دکھایا جاتا تھا جنہیں وہ بچپن سے دیکھتا آیا تھا۔ اس نے لاپرواہی سے گردن جھٹکی اور ایک اجڈ منگول کی بیزاری اس کے چہرے پر پھیل گئی۔ اس نے اپنے قدموں کی طرف دیکھا وہ تختۂ دار پر کھڑا تھا نیچے ایک تاریک کنواں تھا۔ اسی کنویں سے نکل کر اس کی مولود (روح) کو آسمان کی طرف پرواز کرنا تھی۔ پھر ایک جھٹکے سے اس کے منہ پر بوریے کا غلاف چڑھا دیا گیا۔ رسے کا پھندا اس کی گردن پر آیا۔ اس نے اپنے دانت بھینچ لیے۔ تب ایک کھٹکا ہوا۔ اس کے پاؤں تلے سے چوبی تختہ کھسکا۔ دھووک کا دل جیسے اچھل کر حلق میں آگیا۔ وہ نیچے گر رہا تھا۔ تب اس کے پاؤں کسی شے سے ٹکرائے۔ چند لمحے کے لیے اس کے حواس بالکل معطل رہے۔ پھر اس نے سوچا کہ وہ مر رہا ہے لیکن مرنے میں کوئی اذیت نہیں تھی۔ اس نے سینکڑوں

افراد کو اپنے ہاتھوں سے مارا تھا لیکن اسے "معلوم" نہیں تھا کہ مرنا اتنا آسان ہوتا ہے۔ اس کی گردن رسے سے لٹک رہی تھی لیکن اس کا کھچاؤ تکلیف دہ نہیں تھا...... اور اس کے پاؤں...... اس کے پاؤں کسی چیز پر دھرے تھے' کسی زندہ چیز پر شاید...... شاید یہ کسی کے ہاتھ تھے۔

☆======☆======☆

اباقہ نے کنویں کے اندر دھووک کے جسم کو اپنے ہاتھوں پر سہارا دیا تھا اور اس وقت وہ اس کے پاؤں کو سہارا دیے کھڑا تھا۔ وہ جانتا تھا دھووک کی گردن پر جو بوجھ ہے اس سے اس کی زندگی کو کوئی خطرہ نہیں۔ زیادہ سے زیادہ بے ہوش ہو جائے گا۔ کتنی ہی دیر اس عالم میں گزر گئی۔ پھر ایک جھٹکا لگا اور دھووک کا جسم اس کے سر سے ٹکراتا ہوا دھم سے فرش پر گرا۔ اباقہ کو خطرہ تھا کہ چوٹ لگنے سے دھووک کے منہ سے آواز نکلے گی لیکن شاید وہ بھی معاملے کی تہہ تک پہنچ چکا تھا۔ اس کا سر کافی زور سے گول دیوار کے ساتھ ٹکرایا تھا لیکن وہ خاموش رہا۔ اباقہ نے جلدی سے اس کے چہرے کا غلاف اتارا' خنجر سے اس کی بندشیں کاٹیں اور اپنی تلوار اس کے ہاتھ میں تھما دی۔ اس وقت باہر سے تیز قدموں کی آواز آئی۔ اباقہ جانتا تھا یہ لاشیں گھسیٹنے والا وہی بدمست ختائی ہے۔ وہ دیوار کے ساتھ چپک کر کھڑا ہو گیا۔ ختائی اپنی دھن میں جھومتا ہوا اندر داخل ہوا اور ملگجے اندھیرے میں لاش تلاش کرنے لگا۔ اس وقت اباقہ عقب سے نمودار ہوا اور کسی بھوت کی طرح اس سے لپٹ گیا۔ اس کا فولادی ہاتھ مضبوطی سے اس کے منہ پر جم چکا تھا۔ خوف کے شدید حملے نے مدمقابل کو قریباً مفلوج کر کے رکھ دیا تھا۔ اباقہ کو اس کی گردن کاٹنے میں ذرا بھی دشواری پیش نہ آئی۔ خون کا فوارہ نکل کر پختہ فرش پر گرا مقتول کا جسم بری طرح لرزنے لگا۔ اباقہ چند لمحے اس کے ٹھنڈا ہونے کا انتظار کرتا رہا پھر آرام سے اسے فرش پر لٹا دیا۔ تب اس نے دھووک سے کہا۔ "تلوار مجھے دے دو۔" دھووک نے ایک لمحہ جھجک کر تلوار اسے تھما دی۔ اباقہ نے تلوار میان میں ڈالی اور دھووک کو لیٹنے کی ہدایت کی۔ وہ اسی طرح کھڑا رہا۔ اباقہ سرگوشی کے انداز میں غرایا۔

"میں بات دوہرایا نہیں کرتا۔ نیچے لیٹ جاؤ۔ مجھے تم کو باہر لے جانا ہے۔"

دھووک اسے گہری نظروں سے دیکھتا ہوا نیچے لیٹ گیا اباقہ نے اس کے بازوؤں اور ٹانگوں پر کٹی ہوئی رسی یونہی لپیٹ دی۔ پھر اسے اوندھا کیا اور لاپرواہی سے ٹانگ پکڑ کر گھسیٹتا ہوا باہر نکل آیا۔ کوئی بیس قدم کے فاصلے پر ایک گھوڑا گاڑی کھڑی تھی۔ اس کے قریب چار مسلح سپاہی نظر آرہے تھے۔ اباقہ' دھووک کو گھسیٹتا ہوا ان کے قریب پہنچا۔ ایک

تنو مند سپاہی آگے بڑھا۔ اس نے دھووک کو کندھوں سے تھاما اور دونوں نے جھلا کر اسے گاڑی کے عقبی حصے میں ڈال دیا۔ پہلی دونوں لاشیں بھی اندر ہی پڑی تھیں۔ چاروں سپاہی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ اباقہ چند لمحے تذبذب میں کھڑا رہا پھر گھوم کر گاڑی بان کے ساتھ آبیٹھا۔ گاڑی بان نے کچھ پوچھا۔ اباقہ نے صرف "ہوں" میں جواب دیا۔ بہر حال خیریت گزری۔ گاڑی بان نے چابک دکھایا اور گھوڑے دوڑنے لگے۔ وہ قلعے کی بیرونی جانب جارہے تھے۔ تھوڑا آگے جاکر چند سپاہیوں نے گاڑی کو روک لیا اور بھی کئی گاڑیاں اور چھکڑے کھڑے تھے۔ سپاہی ان کی تلاشی لے رہے تھے۔ اباقہ سمجھ گیا کہ یہ اُسی کی تلاش ہو رہی ہے۔ وہ خاموشی سے گاڑی بان کے پہلو میں بیٹھا رہا۔ ایک موٹا چینی سپاہی ہاتھ میں مشعل لیے ان کی طرف بڑھا۔ اس نے پہلے گاڑی بان کو اور پھر اباقہ کو دیکھا۔ اباقہ کے چہرے پر نظر پڑتے ہی وہ ٹھٹکا۔ اب مزید تاخیر فضول تھی۔ اباقہ نے اپنے کندھے سے گاڑی بان کو زور سے دھکا دیا۔ وہ اچھل کر نیچے گرا۔ اباقہ نے لگام لہرا کر گھوڑے کی پشت پر جمائی۔ دونوں گھوڑے پچھلے پاؤں پر کھڑے ہوئے، ہنہنائے اور سرپٹ بھاگ کھڑے ہوئے۔ ایک ختائی افسر چلایا۔ "پکڑو جانے نہ پائے۔" اباقہ چھکڑوں کے درمیان سے راستہ بناتا گھوڑوں کو بھگاتا چلا گیا۔ سو ڈیڑھ سو قدم آگے اسے اندازہ ہوا کہ اس کے پیچھے گھڑ سوار بھاگے چلے آرہے ہیں۔ پیچھے گاڑی میں بیٹھے ہوئے سپاہیوں کو صورت حال کا علم نہیں تھا۔ وہ چیخ چیخ کر کچھ پوچھ رہے تھے۔ شاید اس تیز رفتاری پر حیران تھے۔ اباقہ نے تیزی سے گاڑی کو بائیں جانب موڑا۔ ابھی اس راستے پر وہ تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ آگے بڑی بڑی سیڑھیوں کا ایک چوڑا سلسلہ نظر آیا وہ منگولی میں چیخا۔

"دھووک .... دھووک! میری آواز سن رہے ہو؟"

"کیا بات ہے؟" اندر سے دھووک کی آواز آئی۔

"چھلانگ لگا دو۔" اباقہ چلایا اور اس کے ساتھ ہی اس نے خود بھی چھلانگ لگادی۔

تین چار پٹخنیاں کھا کر جب وہ اٹھا اس نے دیکھا کہ دھووک بھی چھلانگ لگا چکا ہے۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور راستے سے ہٹ کر قلعے کی جنوبی سمت میں بھاگے۔ اس وقت ایک زبردست گڑگڑاہٹ کے ساتھ سپاہیوں کی چیخیں سنائی دیں۔ تیز رفتار گھوڑا گاڑی سیڑھیوں پر لڑھک گئی تھی۔

وہ دونوں پوری رفتار سے بھاگتے سنگ مرمر کے ستونوں والی ایک عمارت میں داخل ہوئے۔ اس وقت سامنے سے کوئی آٹھ عدد مسلح سپاہی تلواریں سونت کر سامنے آگئے۔ اباقہ نے تلوار دھووک کی طرف اچھال دی اور خود خنجر نکال لیا۔ پلک جھپکتے میں قلعے کا یہ

تنہا گوشہ میدان کارزار میں بدل گیا۔ بہادر دھووک کی تلوار برق کے کوندے کی طرح چینی سپاہیوں پر لپک رہی تھی۔ جب کہ اباقہ کے چاروں ہاتھ پاؤں تلواروں کا کام دے رہے تھے۔ اس کی ہر ضرب ناقابل برداشت تھی وہ اپنے سنگلاخ پاؤں اور آہنی ہاتھوں کو وزنی ہتھوڑوں کی طرح استعمال کر رہا تھا۔ گاہے گاہے مٹھی میں دبا ہوا خنجر بھی چمک جاتا تھا۔ ایک عجیب دیوانگی تھی اس کے انداز میں۔ سپاہی اچھل اچھل کر سنگی ستونوں سے ٹکرائے اور کراہ کراہ کر خاموش ہو گئے۔ چند لمحوں میں میدان صاف ہو گیا۔ جو اباقہ کے خنجر اور طوفانی ضربوں سے بچے وہ دھووک کی تلوار کا شکار ہوئے۔ صرف ایک شخص بھاگنے میں کامیاب ہوا۔ اس وقت سیڑھیوں کی جانب سے سپاہیوں کی چیخ و پکار سنائی دینے لگی۔ اباقہ نے دھووک کو ساتھ لیا اور عمارت کی مخالف سمت بھاگ نکلا۔

☆------☆------☆

فینگ ہن بے چینی سے کمرے میں ٹہل رہی تھی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اس کا باپ وردی پہن کر واپس چلا گیا تھا۔ کمان دار کی طرف سے پیغام آیا تھا کہ قلعے کے اندر کچھ گڑ بڑ ہے اور اندیشہ ہے کہ ایک یا ایک سے زائد افراد اندر گھسنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ ان کی فوری تلاش اور صلاح مشورے کے لیے فینگ ہن کے باپ کی ضرورت تھی .... اور وہ چلا گیا تھا۔ اس نے کہا تھا شاید کل شام سے پہلے واپسی نہیں ہو گی۔ تاجورا اور فینگ ہن ایک بار پھر گھر میں تنہا تھیں۔ فینگ ہن بار بار کھڑکی کی درز سے گلی میں جھانکتی تھی۔ اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ اجنبی کدھر گیا۔ باپ کے جانے کے بعد جب اس نے الماری کے پیچھے دیکھا تھا تو وہاں کوئی نہیں تھا۔ کھڑکی بند تھی لیکن کنڈی گری ہوئی تھی۔ اس نے سوچا شاید وہ دھووک کی مدد کے لیے گیا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ اسے بچا لے۔ وہ سوچ رہی تھی جو شخص قلعے کی عقبی جھیل پاٹ کر اور عمودی دیواروں پر چڑھ کر قلعے کے اندر داخل ہو سکتا ہے اس کے لئے کوئی کام ناممکن نہیں۔ ہو سکتا ہے وہ دھووک کو بچانے میں کامیاب ہو جائے۔ ہو سکتا ہے ....

ایک بار جو اس نے کھڑکی کی درز سے جھانکا تو ایک سایہ سا لپکتا دکھائی دیا۔ پھر کھڑکی کے پٹ کھلے اور دھووک کا چہرہ نظر آیا۔ فینگ ہن کا منہ کھلا رہ گیا۔ اس پر شادی مرگ کی کیفیت طاری تھی۔ آنکھوں میں خوشی کے آنسو امڈ آئے تھے اس نے اسے بازو سے پکڑ کر اندر کھینچ لیا۔ اس کے پیچھے اباقہ تھا وہ بھی کود کر اندر آگیا۔ فینگ ہن نے کھڑکی بند کی اور نہایت تشکر نگاہوں سے اباقہ کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کے ہونٹ پھڑ پھڑا رہے تھے شاید اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ اس اجنبی کا شکریہ کیونکر ادا کرے جو اس کے محبوب کو تختۂ

دار سے بچا لایا تھا۔ اتنے میں تاجورا بھی کمرے میں پہنچ گئی۔ وہ پہلے دھووک اور پھر اباقہ کی بلائیں لینے لگی۔ فینگ ہن نے تاجورا سے کچھ کہا۔ تاجورا نے ترجمانی کرتے ہوئے اباقہ سے کہا۔

"اجنبی! میری مالکہ تیری بہادری سے بہت متاثر ہے۔ وہ جاننا چاہتی ہے تُو نے یہ کارنامہ کیونکر انجام دیا۔"

اباقہ نے چند الفاظ میں انہیں اس واقع کے متعلق بتایا اس دوران دھووک خاموشی سے اباقہ کی طرف دیکھتا رہا۔ اس نے تھوڑی دیر پہلے اباقہ کو ستونوں والی عمارت میں سپاہیوں سے لڑتے دیکھا تھا۔ وہ خود بھی ایک مانا ہوا جنگجو تھا لیکن اباقہ کے انداز مبازرت نے اسے ورطہ ء حیرت میں ڈال دیا تھا' وہ اس باکمال جنگجو پر رشک کرنے لگا تھا۔ اب جس طرح فینگ ہن والہانہ انداز میں اس سے باتیں کر رہی تھی اور اس کی تعریفی نگاہیں جس طرح اجنبی کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں' دھووک کو دل میں عجیب سی جلن محسوس ہونے لگی تھی۔ ایکا ایکی کئی بے نام وسوسوں نے اس کے ذہن میں جگہ بنا لی۔ وہ اباقہ سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا۔ وہ ٹوہ لگا رہا تھا کہ یہ شخص کون ہے؟ کس لیے آیا ہے؟ اور کتنی دیر سے یہاں ہے۔ سب سے اہم سوال یہ تھا کہ فینگ ہن کے بارے میں اس کے کیا خیالات ہیں۔ اباقہ نے دھووک کے طویل سوالوں کے جواب نہایت مختصر دیئے اور وہ بھی ان سوالوں کے جو نہایت ضروری تھے اور جن سے اباقہ کے مقصد اور آئندہ کے منصوبے پر روشنی پڑتی تھی۔ سردی کافی زیادہ تھی۔ تاجورا نے ان دونوں کے لیے انگیٹھی دہکائی .... فینگ ہن نے کھانا تیار کیا حالانکہ اباقہ کچھ دیر پہلے کھا چکا تھا لیکن فینگ ہن نے اسے بااصرار کھلوایا۔

اباقہ نے اندازہ لگایا تھا کہ اس کمرے میں وہ بالکل محفوظ ہیں۔ کھڑکی سے باہر گاہے گاہے گھوڑوں کی ٹاپیں اور سپاہیوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ان کی تلاش زور وشور سے جاری تھی۔ رات آہستہ آہستہ بھیگ رہی تھی۔ تاجورا اور فینگ ہن دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔ اباقہ اور دھووک انگیٹھی کے قریب بیٹھے برجی تک پہنچنے کا منصوبہ بنانے لگے۔ دھووک نے اسے بتایا کہ کس طرح اس نے برجی تک پہنچنے کا منصوبہ بنایا تھا اور کس طرح عین موقع پر گرفتار ہو گیا۔

وہ ساری رات انہوں نے جاگتے گزار دی۔ اگلے دن صبح سویرے فینگ ہن نے ان دونوں کو تنگ و تاریک عقبی کمرے میں بند کر دیا۔ اسی کمرے میں انہیں دو دفعہ گرما گرم کھانا پہنچ گیا۔ دو دفعہ فینگ ہن خود بھی ان کی خیریت دریافت کرنے آئی۔ وہ چھوٹی سی

وبصورت ناک والی لڑکی بڑے میٹھے لہجے کی مالک تھی لیکن جب بھی وہ اباقہ سے کوئی بات رتی دھووک کے چہرے پر بیزاری نظر آنے لگتی۔ شاید اسے ان دونوں کی ترجمانی پسند ہیں تھی۔

اگلے روز جب شام کی تاریکی پھیل گئی فینگ ہن پھر اس کمرے میں پہنچی۔ اس نے ھووک سے کہا۔ "تھوڑی دیر بعد میرا باپ آجائے گا لیکن وہ اپنے کمرے میں رہے گا۔ جب اندھیرا گہرا ہو جائے تو تم ساتھ والے کمرے کی کھڑکی کھول کر نکل جانا۔"

ایک بار پھر اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔ شاید وہ ان کی زندہ سلامت واپسی کے بارے فکر مند تھی اور واقعی وہ ایک نہایت خطرناک کام کرنے جا رہے تھے۔ فینگ ہن نے دھووک کا ہاتھ تھاما اور اشکبار نگاہوں سے اباقہ کی طرف دیکھا' پھر کوئی دعائیہ کلمہ کہہ کر باہر نکل گئی۔

جب تاریکی گہری ہو گئی تو اباقہ اور دھووک اپنی پناہ گاہ سے نکلے اور کھڑکی کی درز سے گلی کا اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد باہر کود گئے۔ ان کا رخ فصیل کی جانب تھا۔ بچتے بچاتے وہ کوئی دو سو قدم کے فاصلے پر پہنچے۔ ایک ویران جگہ رک کر دھووک نے خنجر سے مٹی کریدنی شروع کر دی۔ اباقہ نے اس کی مدد کی۔ تھوڑی دیر بعد وہ پتھر کی ایک بڑی سل سے مٹی ہٹانے میں کامیاب ہو گئے۔ دونوں نے زور لگا کر اس سل کو سرکایا۔ نیچے ایک تاریک خلا نظر آ رہا تھا۔ پہلے دھووک اور پھر اباقہ اس خلا میں داخل ہو گئے۔ وہ اپنے پاؤں پر کھڑے تھے اور ان کے کندھے اب بھی تاریک سوراخ سے باہر تھے۔ دونوں نے زور لگا کر پتھر کی سل پھر اپنی جگہ ٹکا دی۔ اندر کی تاریکی اور بھی گھٹا ٹوپ ہو گئی۔ دونوں نے اپنی صدریوں سے شمعیں نکالیں اور جلا لیں۔ وہ ایک تاریک سرنگ کے دہانے پر بیٹھے ہوئے تھے' سرنگ بالکل گول تھی اور اس کا قطر اتنا تھا کہ ایک درمیانے قد کا آدمی جھک کر گزر سکتا تھا۔ وہ محتاط قدموں سے آگے بڑھنے لگے۔ دھووک آگے تھا۔ سرنگ میں جا بجا جالے لٹکے ہوئے تھے۔ غیر ہموار فرش پر کہیں کہیں نہایت بدبو دار پانی جمع تھا۔ سخت سردی کی وجہ سے مچھروں اور دیگر کیڑے مکوڑوں کی پرورش نہیں ہوئی تھی لیکن سرخ تھوتھنیوں والے جسیم چوہے جگہ جگہ دکھائی دے رہے تھے۔ وہ اس پُر حبس سرنگ میں آگے ہی آگے بڑھتے چلے گئے۔ ایک دو جگہ چوہوں نے انہیں بے حد پریشان کیا۔ ایک جگہ نہایت پلا ہوا سانپ دھووک کی گردن سے لپیٹ گیا جسے اباقہ نے نہایت پھرتی سے پکڑ کر پتھریلی دیوار سے دے مارا .... بالآخر وہ منزل پر پہنچ گئے۔ دھووک نے بتایا کہ اس وقت وہ بیرونی دروازے کے عین نیچے کھڑے ہیں۔ یہاں بھی دہانے پر پتھر کی ایک وزنی سل تھی۔

دونوں نے مل کر زور لگایا۔ بمشکل تمام سل اپنی جگہ سے سرکی۔ محتاط نگاہوں سے اطراف کا جائزہ لے کر وہ باہر نکلے۔ اس وقت قدموں کی آہٹ آئی اور وہ بھاگتے ہوئے ایک تاریک گوشے میں چھپ گئے۔ جب قدموں کی آواز معدوم ہوئی وہ سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے فصیل پر آگئے۔ یہ برجی کا عقبی حصہ تھا۔ جلد ہی انہیں اندازہ ہو گیا کہ یہاں ہر کوئی اپنے حال میں مگن ہے۔ دراصل قلعے کے باہر منگول فوج سے زبردست جھڑپ ہو رہی تھی۔ گاہے گاہے فلک شگاف نعرے سنائی دیتے تھے۔ منجنیقوں کے گولے گونجدار آوازوں سے فصیل سے ٹکرا رہے تھے۔ تیروں کی سنسناہٹ، سلفر اور گندھک کے دھماکے اور زخمیوں کی چیخ و پکار سب کچھ مل کر قیامت کا سماں پیش کر رہے تھے۔ یہ افراتفری ان کے کام کے لیے بڑی سود مند تھی۔

یہ ایک بہت بڑی اور قدرتی طور پر محفوظ برجی تھی۔ اباقہ دیکھ رہا تھا اس میں بیسیوں سپاہی بیک وقت سمائے ہوئے تھے۔ آتشیں تیروں کے ڈھیر لگے تھے۔ قطار اندر قطار سلفر اور گندھک کے مرتبان دکھائی دے رہے تھے۔ کچھ سپاہی تہ خانوں سے مزید ہتھیار نکال رہے تھے لیکن اباقہ دیکھ رہا تھا آگ پکڑنے والے مادے کی حفاظت کا زبردست انتظام ہے۔ ایسی تمام اشیاء کو نم دار بوریے کی تہوں سے محفوظ رکھا گیا تھا۔ اباقہ کی نظر ایک بہت بڑے برتن پر پڑی۔ اس میں روغن بھرا ہوا تھا۔ یہ روغن چراغوں اور مشعلوں وغیرہ کے لیے تھا لیکن اباقہ نے اس سے ایک اور کام لینے کا فیصلہ کیا۔ اس نے مٹی کے ایک مرتبان نما برتن میں روغن بھرا اور دھوودک سے کہا کہ وہ کچھ فاصلے پر جلتی ہوئی دو مشعلیں اتار لائے۔ دھووک بھی اس کا مطلب سمجھ گیا تھا وہ گیا اور مشعلیں اتار لایا لیکن اسے اباقہ کا تحکمانہ لہجہ بری طرح کھٹک رہا تھا۔ اباقہ نے کہا' میں برجی کی طرف جا رہا ہوں' میں پہلو کی طرف سے روغن کا برتن برجی میں پھینکوں گا' جب میں برتن پھینک کر بیس پچیس قدم دور آجاؤں تو تم یہ مشعلیں برجی میں پھینک دینا .... اگر نشانہ خطا ہونے کا ڈر ہے تو کچھ اور مشعلیں اتار لاؤ۔

"نہیں .... میرا نشان بہت پکا ہے۔" دھووک نے عجیب لہجے میں جواب دیا۔

اباقہ ایک ہاتھ میں برتن تھام کر فصیل کی تاریکی میں برجی کی طرف بڑھا۔ پھر عجیب دلیرانہ انداز میں وہ تاریکی سے نکلا اور بھاگتا ہوا برجی کی طرف لپکا۔ برجی پر موجود چند سپاہیوں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتے اباقہ برتن گھما کر برجی میں پھینک چکا تھا' اس سے کوئی پچاس قدم دور دھووک ہاتھ میں مشعلیں لیے کھڑا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک خطرناک حاسدانہ چمک دکھائی دے رہی تھی۔ ابھی اباقہ

برتن پھینک کر بمشکل مڑا ہی تھا کہ دھووک نے اپنا طاقتور بازو گھمایا اور جلتی ہوئی بھاری بھرکم مشعل برجی کی طرف اچھال دی۔ مشعل برجی کے بالکل قریب گری۔ دھووک نے بلا توقف دوسری مشعل بھی برجی کی طرف پھینکی لیکن یہ مشعل ابھی ہوا ہی میں تھی کہ ایک سماعت شکن دھماکہ ہوا۔ دھووک اچھل کر ایک دیوار کی اوٹ میں گرا۔ قلعے کی مضبوط فصیل خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرز رہی تھی۔ چند لمحوں کے لیے تو دھووک کو محسوس ہوا جیسے وہ فصیل کے ساتھ ہی پیوند زمین ہو جائے گا۔ کچھ دیر کے بعد اس نے آنکھیں کھولیں۔ گرد و غبار کے سوا کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ برجی کے ساتھ ساتھ فصیل کا کچھ حصہ بھی تباہ ہو چکا تھا۔ چاروں طرف مکمل سکوت تھا کہیں زخمیوں کی آواز بھی سنائی نہیں پڑتی تھی .... لیکن دھووک جانتا تھا یہ طوفان سے پہلے کی خاموشی ہے .... اور پھر طوفان کے آثار نمودار ہوئے۔ قلعے کے سامنے منگول ٹڈی دل متحرک ہوا۔ ہتھیار چھنکے' پُرجوش نعرے بلند ہوئے۔ فلک شگاف للکاروں نے فضا کو گرمایا .... اور زمین ایک بار پھر لرزنے لگی لیکن اب لرزہ بارود کا نہیں تھا۔ اس وحشی قوم کی آمد کا تھا جسے مشرق و مغرب میں قہر خداوندی کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔

☆ ---------- ☆ ---------- ☆

قلعہ فتح ہو چکا تھا۔ ہزاروں ختائی تہ تیغ کر دیے گئے تھے۔ فصیل کے اوپر اور نیچے لاشوں کے انبار لگے تھے۔ آتشیں اور غیر آتشیں ہتھیاروں کے وسیع ذخائر پر منگول قابض ہو چکے تھے۔ بے شمار افراد کو قیدی بنا لیا گیا تھا۔ ان میں فوجی افسروں کے اہل خانہ بھی تھے۔ قلعے کے عقب میں واقع چھوٹا سا شہر تاراج کر دیا گیا تھا۔ تولوئی کے حکم پر حسین دوشیزاؤں کو منگول فوجی افسروں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ باقی عورتیں بھی اسی طرح درجہ بدرجہ سپاہیوں کے حصے میں آئی تھیں لیکن حسین دوشیزہ نینگ ہن کو دھووک نے مانگ لیا تھا۔ وہ اپنی اس کامیابی پر بے انتہا خوش تھا۔ جہاں وہ اپنی محبوبہ کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوا تھا۔ وہاں وہ اس شخص کو بھی ٹھکانے لگا چکا تھا جسے تھوڑے ہی عرصے میں وہ اپنا دشمن جاں سمجھنے لگا تھا اور وہ تھا .... اباقہ۔ اسے یقین تھا وہ برجی کے سینکڑوں ختائی سپاہیوں کے ساتھ ہی لقمہ اجل بن گیا ہو گا۔ وہ شخص جسے دیکھ کر نینگ ہن کی آنکھوں میں پسندیدگی کی چمک دکھائی دیتی تھی اب ہزاروں لاکھوں ٹن ملبے کے نیچے دب چکا تھا۔ وہ جانتا تھا جب چند روز یا چند ہفتے بعد برجی اور ٹوٹی ہوئی فصیل کا ملبہ ہٹایا جائے گا تو برآمد ہونے والی سینکڑوں مسخ شدہ لاشوں میں ایک لاش اباقہ کی بھی ہو گی۔ تولوئی قلعے کے ایک وسیع و عریض کمرے میں بیٹھا تھا۔ سپہ سالار اور سردار مؤدب انداز میں دائیں بائیں

کھڑے تھے۔ تولوئی نے دھوک کو حاضر کرنے کا حکم دیا۔ دھوک چند قدم چل کر احترام سے تولوئی خاں کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ تولوئی خاں کی آواز گونجی۔

"دھوک! مجھے تم پر فخر ہے' تم نے ہمیشہ کی طرح اپنا فرض خوبی سے نبھایا ہے .... تم نے قلعے کی برجی تباہ کر کے منگول فوج کے لیے زبردست آسانی پیدا کی۔ اس فتح میں تمہارا بہت بڑا ہاتھ ہے۔" پھر اچانک جیسے اسے کچھ یاد آیا وہ اپنے ساتھیوں کی طرف رخ کر کے بولا۔ "چغتائی خاں نے قراقرم سے ایک نوجوان کو خاص طور پر میری خدمت میں بھیجا تھا۔ وہ میری اجازت سے قلعے کی طرف روانہ بھی ہوا تھا۔ کیا تم لوگوں میں سے کسی کو اس کے بارے معلوم ہے؟"

دھوک نے ادب سے جھک کر کہا۔ "میں اس کے متعلق سب کچھ جانتا ہوں خان محترم' وہ مجھ سے ملا تھا۔ پھانسی گھر سے میرے فرار ہونے میں اس کی کوشش کو بھی داخل تھا۔ بعد میں' میں اسے ساتھ لے کر برجی پر پہنچا۔ منصوبے کے مطابق اسے برجی میں روغن پھینکنا تھا اور مجھے جلتی ہوئی مشعل لیکن روغن پھینکنے کے بعد وہ جلدی واپس نہ ہو سکا۔ اگر میں تاخیر کرتا تو نہ صرف ہم دونوں ہلاک ہو جاتے بلکہ برجی بھی محفوظ رہتی۔ مجبوراً میں نے مشعل پھینک دی۔ برجی تباہ ہوئی اور ختائی سپاہیوں کے ساتھ ساتھ اباقہ بھی ہلاک ہو گیا۔"

حاضرین میں سردار یورق بھی موجود تھا۔ اس کے چہرے سے گہرا دکھ جھانک رہا تھا۔ پھر تولوئی کے کہنے پر دھوک اپنے کارنامے کی تفصیلات بتانے لگا۔ اس نے سارا واقعہ اس طرح بیان کیا تھا کہ شروع سے آخر تک اس کی ذات نمایاں دکھائی دیتی تھی۔ یوں لگتا تھا اباقہ نے اس مہم میں کوئی خاص کردار ادا نہیں کیا۔

اس رات قلعے میں جشن فتح برپا تھا۔ چینی شراب کے جام لنڈھائے جا رہے تھے۔ حسین رقاصائیں نغمہ سرائی اور رقص میں مصروف تھیں۔ منگول فوج کے افسران اور سپاہی اپنی خلوتوں میں داد عیش دے رہے تھے' کبھی کسی جانب سے کسی عورت کی آواز اور کسی منگول کا بدمست قہقہہ بھی سنائی دے جاتا۔ دھوک چہرے پر پُرجوش مسکراہٹ سجائے فینگ ہن کے سامنے موجود تھا۔ وہ دونوں کمرے میں تنہا تھے۔

دھوک ہی کی بدولت فینگ ہن کے باپ کو جان کی امان ملی تھی پھر وہ دھوک کے مطالبے کو کیونکر تسلیم نہ کرتا۔ دھوک نے اس سے اس کی بیٹی کا رشتہ مانگا تھا اور اس نے بیٹی کی مرضی دیکھتے ہوئے فوراً اقرار کر لیا تھا۔ یہ رشتہ تو نہیں تھا تاہم ایک مفتوح کا فاتح سے باعزت سمجھوتہ ضرور تھا۔ فینگ ہن کے باپ کی رضامندی لے کر دھوک فینگ

ہن کے پاس آیا تھا۔ وہ اپنی سیاہ زلفیں بکھیرے قدرے سوگوار سی مسہری پر بیٹھی تھی۔ دھوک نے اس کی خوبصورت گردن دیکھی وہ اسے چھونا چاہتا تھا۔ وہ بہت کچھ چاہتا تھا لیکن ابھی کچھ معاشرتی تقاضے باقی تھے۔ اسے شادی کی رسم کے لیے شاید ایک آدھ دن اور انتظار کرنا تھا۔

وہ فینگ ہن سے بولا۔ "جان! تیرے باپ نے ہماری شادی کی منظوری دے دی ہے۔" لیکن اگر اس کا خیال تھا کہ یہ بات سن کر فینگ ہن خوشی سے گلنار ہو جائے گی تو اسے مایوسی ہوئی۔ وہ اسی طرح خاموش بیٹھی رہی۔ "کیا بات ہے جان؟" دھوک نے پوچھا۔ "کچھ پریشان ہو؟"

وہ بولی۔ "میں تم سے ایک بات پوچھنا چاہتی ہوں۔"

دھوک نے ذرا چونکتے ہوئے کہا۔ "پوچھو۔"

فینگ ہن نے کہا۔ "کیا واقعی اباقہ اپنی غلطی سے ہلاک ہوا ہے؟"

دھوک کے چہرے پر ایک زلزلہ سا نمودار ہوا لیکن پھر فوراً ہی وہ پُرسکون ہو گیا۔ نرم لہجے میں بولا۔ "جان! کیا تمہیں شک ہے کہ میں نے اسے مار دیا ہے۔"

فینگ ہن بولی۔ "نہیں دھوک! تم اسے کیوں مارنے لگے۔ دراصل .... مجھے اس کی موت کا یقین نہیں آ رہا۔ وہ بڑا .... بھلا شخص دکھائی دیتا تھا۔ اس کی معصوم شکل میری نظر میں گھوم رہی ہے۔"

دھوک نے بڑی نرمی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "فینگ! پھر کل ہماری شادی ہو رہی ہے نا۔"

وہ بولی۔ "دھوک! میرا دل بہت افسردہ ہے۔ ہمارے چاروں طرف سینکڑوں لاشیں سڑ رہی ہیں۔ کچھ روز ٹھہر جاؤ۔"

دھوک اسے شریر نظروں سے دیکھ کر بولا۔ "چلو دو تین روز اور سہی۔"

چاروں طرف بستروں اور زمین پر زخمی سپاہی پڑے تھے۔ کچھ کراہ رہے تھے۔ کچھ آہیں بھر رہے تھے اور کچھ درد سے بے تاب ہو کر چیخ رہے تھے۔ ایک بستر پر ایک عجیب سی رنگت اور ساخت کا ایک تنومند نوجوان لیٹا تھا۔ اس کا سر اور بایاں بازو پٹیوں میں جکڑے ہوئے تھے۔ ایک بوڑھا چینی طبیب قریب کھڑا گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ نوجوان کے پپوٹوں میں جنبش پیدا ہو رہی تھی۔ یہ نوجوان دو روز کے بعد فصیل کے ملبے سے ملا تھا۔ اس کا زندہ برآمد ہونا معجزے سے کم نہیں تھا۔ جہاندیدہ طبیب جانتا تھا اگر یہ سخت جان شخص ملبے کے نیچے زندہ رہا ہے تو بستر کے اوپر بھی زندہ رہے گا۔

اسے امید تھی کہ جلد ہی وہ ہوش میں آجائے گا اور اس کا اندازہ درست ثابت ہوا تھا .... نوجوان کی پلکیں وا ہو رہی تھیں۔ پھر اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔

یہ اباقہ تھا۔ اس نے دھندلائی ہوئی نگاہوں سے طبیب کی شکل دیکھی۔ کہیں دور .... بہت دور ماریتا کی آواز اس کے کانوں میں گھنٹیوں کی طرح گونج رہی تھی۔ جوں جوں اس کی آنکھیں کھلتی گئیں یہ آواز معدوم ہوتی گئی۔ اس نے سر گھما کر چاروں طرف دیکھا .... ذہن میں ایک ایک کر کے گزرے واقعات تازہ ہو رہے تھے۔ اس نے برجی میں روغن سے بھرا ہوا برتن پھینکا تھا۔ ابھی وہ واپس ہی مڑا تھا کہ .... اس سے آگے اسے کچھ یاد نہیں تھا۔ طبیب آگے بڑھا اور اس نے اباقہ کے منہ میں کوئی کسیلی دوائی انڈیل دی۔ اس کا ذہن ایک بار پھر گہری تاریکی میں ڈوب گیا۔ نہ جانے کتنی دیر بعد اسے پھر ہوش آیا' یہ وہی قلعہ تھا جو منگولوں کے لئے رکاوٹ بنا ہوا تھا' پچھلی بار جب اُس نے آنکھیں کھولی تھیں تو اُس وقت دن تھا لیکن اب اس کے سرہانے مومی شمع جل رہی تھی۔ ایک بار پھر اسے دوائی پلائی گئی۔ اس کی آنکھیں پھر بند ہو گئیں۔ آنکھیں کھلنے اور بند ہونے کا یہ سلسلہ شاید کئی روز چلتا رہتا لیکن ایک دن اباقہ چپکے سے بستر چھوڑ کر باہر نکل آیا۔ کڑوی کسیلی دواؤں اور نیم تاریک ماحول سے چھٹکارہ پا کر وہ کھلی فضا میں آگیا تھا' یہ وہی قلعہ تھا جسے تسخیر کرنے کے لئے منگول عرصے سے بے چین تھے لیکن اب وہ اسے پامال کر کے آگے بڑھ چکے تھے۔ اس قلعے میں انتظام کے لیے تھوڑی سی فوج رہ گئی تھی۔ اباقہ یہاں کے منتظم اعلیٰ سے ملا۔ اس سے پتہ چلا کہ تولوئی اپنے تیس ہزار لشکریوں کے ساتھ دریائے وائی کا بالائی حصہ عبور کر کے شمالی پہاڑوں کی طرف روانہ ہو چکا ہے۔

اباقہ پورا ایک دن سوچتا رہا۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ کدھر کا رخ کرے۔ سردار یورق کے بغیر اس کا واپس قراقرم جانا فضول تھا۔ اسے جس مہم پر روانہ کیا گیا تھا وہ اس نے سر کرلی تھی' لیکن چغتائی خان کے سامنے اس کی تصدیق ضروری تھی اور تصدیق سردار یورق کر سکتا تھا یا تولوئی خان کا کوئی قاصد۔ تو پھر اسے کیا کرنا چاہیے ....

وہ نصب شب کا وقت تھا۔ برفانی ہوائیں شکست خوردہ فصیل کے کنگروں سے سرگرشیاں کرتی گزر رہی تھیں۔ اباقہ نے قلعے کے اصطبل سے دو صحت مند گھوڑے لیے۔ ایک گھوڑے پر خوراک کے تھیلے اور کچھ ضروری سامان رکھا اور دوسرے گھوڑے پر زین ڈال کر قلعے سے نکل آیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ سرپٹ گھوڑے دوڑاتا ہوا شمال کی طرف روانہ ہو رہا تھا۔ تین روز پہلے تیس ہزار منگولوں نے اس جانب کوچ کیا تھا۔

☆ ☆ ☆

سنگ سلطنت کے غیر جانبدار علاقے کو پار کرنے کے بعد تولوئی نے شمال کا رخ کیا تھا اور ان دشوار گزار پہاڑوں میں داخل ہو گیا تھا جن سے آج تک کسی فوج کو گزرنے کا حوصلہ نہیں ہوا تھا۔ یہاں بھی منگول فوج کی مزاحمت نہیں ہوئی۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ وحشی خانہ بدوش اس جانب سے آن دھمکیں گے۔ جب اس یلغار کی اطلاعات "نان کنگ" کے دربار میں پہنچیں تو کن حکمران کو خطرے کی سنگینی اور شدت کا احساس ہوا۔ نامور کن سپہ سالاروں کی کمان میں چینی فوج کا بہترین حصہ منگولوں کی مزاحمت کے لیے جنوب کی طرف روانہ کر دیا گیا۔ سردیوں کا موسم تھا۔ ٹھنڈی ہواؤں کی شدت میں ہر روز اضافہ ہو رہا تھا' لیکن سخت موسموں کے پالے ہوئے منگول بلا رکے اپنا سفر جاری رکھے ہوئے تھے۔

سخت کوچ کی وجہ سے تولوئی کے پہاڑی دستوں کی تعداد گھٹ گئی تھی۔ اس کے علاوہ سردی کے ساتھ ساتھ خوراک کا مسئلہ بھی درپیش تھا' لیکن وہ منصوبے کے مطابق پیش قدمی جاری رکھنا چاہتا تھا اسے معلوم تھا دوسری جانب خاقان اوغدائی اور سوبدائی بہادر اپنے لشکر کے ساتھ دریائے زرد کے خط مدافعت کو عبور کر چکے ہوں گے اور اب شمالی قلعہ جات کو مسمار کرتے ہوئے دارالخلافہ کی طرف بڑھ رہے ہوں گے۔ تولوئی کو خاقان کی فوج سے اس طرح ملاپ کرنا تھا کہ کن سپاہ درمیان میں پس کر رہ جائیں' لیکن ابھی وہ شمالی پہاڑوں ہی میں تھا کہ کن فوج کے ہراول دستوں سے آمنا سامنا ہو گیا۔ ان دستوں کے پیچھے کن سپاہ کا عظیم الشان "قلب" پیش قدمی کر رہا تھا۔

ایک روز منگول اور کن (چینی) ہراول دستوں میں گھمسان کا رن پڑا۔ تولوئی خاں ایک بلند پہاڑی پر کھڑا میدان جنگ کی صورت حال دیکھ رہا تھا۔ کن فوج ایک پہاڑ کے عقب سے برآمد ہو کر بالکل اچانک حملہ آور ہوئی تھی۔ انہوں نے دائیں اور بائیں بازو سے حملہ کیا تھا۔ جب تک منگول سنبھلتے وہ دو اطراف سے گھر چکے تھے۔ پہلے تو ان کی صفوں میں ابتری پھیلی' لیکن جلد ہی وہ سنبھل گئے۔ یاک کی نو دُموں والا پرچم لہرایا۔ منگول سپاہی جو ذرا سا سمٹ گئے تھے۔ پھیلے اور پوری شدت سے دونوں اطراف میں ڈٹ گئے' لیکن اس دوران کن فوج کے کچھ دستے نہایت سرعت سے سامنے والے پہاڑ پر چڑھ گئے اور ہلاکت خیز تیراندازی شروع کر دی۔ تولوئی جانتا تھا کہ جب تک پچھلے دستے نہ پہنچ جائیں گھیرا توڑنا مشکل ہے' لیکن پچھلے دستے نصف منزل (تقریباً 12 میل) دور تھے صورت حال لمحہ بہ لمحہ منگولوں کے حق میں بگڑ رہی تھی۔ ان کی گھری ہوئی فوج ایک تنگ درے پر زور مار رہی تھی لیکن یہاں موجود کن دستہ ایک نہیں چلنے دیتا تھا۔

یہی وہ وقت تھا جب اباقہ دشوار گزار راستوں پر تیز رفتاری سے سفر کرتا ہوا منگول فوج کے ہراول دستوں تک پہنچا کیونکہ وہ ایک مختلف راستے سے آیا تھا۔ اس لیے وہ کن فوج کے عقب سے نمودار ہوا۔ ایک اونچی جگہ سے اس نے نیچے وادی میں لڑائی کا نقشہ دیکھا۔ گھمسان کا رن پڑا ہوا تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ منگول مشکل میں ہیں اور گھیرا توڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ پھر اس کی نگاہ تنگ پہاڑی درے اور اس میں صف آرا کن سپاہیوں پر پڑی۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر اس نے میان سے روغن میں ڈوبی ہوئی تلوار نکالی۔ گھوڑے کی باگ سنبھالی اور ایڑ لگا دی۔ گھوڑا تیر کی طرح ڈھلوان پر اڑا۔ شاید وہ بھی اب تک اپنے سوار کی تند مزاجی سے آگاہ ہو چکا تھا .... کوہ الطائی کا جنگجو وحشی شہاب ثاقب کی طرح کن دستے پر جھپٹ رہا تھا۔

تولوئی نے یہ منظر اپنے گھوڑے کی پیٹھ پر سے دیکھا۔ پہلے تو اسے لگا جیسے کوئی سیاہ پتھر ڈھلوان پر لڑھکتا چلا آرہا ہے۔ پھر اسے معلوم ہوا کہ یہ ایک سیاہ گھوڑا ہے اور اس پر ایک شہسوار ہاتھ میں تلوار تھامے کن دستے کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس سے پہلے کہ کن سپاہی اس کی طرف متوجہ ہوتے وہ بلائے ناگہانی کی طرح ان پر ٹوٹ پڑا۔ تولائی نے اسے کسی وحشی درندے کی طرح دشمنوں کے گروہ میں ڈوبتے ابھرتے دیکھا۔ اس کی تلوار کی لپک سب سے جدا تھی۔ پھر اس نے حیران نگاہوں سے دیکھا کہ کن دستے میں کھلبلی مچ رہی ہے۔ جیسے سیاہ بادل چھٹتا ہے اور سورج نمودار ہوتا ہے۔ ایسے ہی وہ نوجوان کن دستے کو زیروزبر کرتا محصور فوج تک پہنچ گیا۔ تب اس نے گھوڑے کا رخ پھیرا تلوار اوپر سیدھی کی اور ایک بار پھر گھوڑے کو ایڑ لگا دی' لیکن اس دفعہ وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ پندرہ بیس منگول جنگجو بھی تھے۔ کن دستہ پہلے صدمے سے سنبھلا بھی نہ تھا کہ پھر تلواروں کی زد میں آگیا۔ چند لمحوں کے لیے دونوں طرف سے پورا زور لگا پھر منگولوں نے ہلہ مارا اور کن سپاہیوں کو روندتے ہوئے درے سے باہر نکل گئے .... گھیرا ٹوٹ گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے منگول اطراف کی پہاڑیوں پر پھیل گئے۔ اس دوران منگول فوج کے پچھلے دستے بھی پہنچ گئے۔ ہر دستہ زبردست نعرہ زنی کے ساتھ جنگ میں شریک ہوتا رہا۔ دوپہر تک ایسے آثار دکھائی دینے لگے کہ جیسے کن فوج کا ایک سوار بھی منگولوں کے نرغے سے نہیں بچ سکے گا' لیکن پھر تولوئی اور اس کے سرداروں نے دیکھا کہ شمالی جانب سے ایک بہت بڑی کن فوج بڑھی آرہی ہے۔ کن حکمران نے تولوئی کو پوری قوت سے روکنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ بظاہر یہ حملہ غیر متوقع تھا' لیکن منگولوں کے منصوبے کے عین مطابق تھا۔ اس سے شمالی علاقے میں خاقان اوغدائی کی پیش قدمی آسان تر ہو جانا تھی۔ تولوئی نے

سالاروں سے مشورہ کیا۔ درحقیقت اس وقت تولوئی کے پاس اردوئے معلٰی کے قلب کا مختصر سا حصہ' تین دس ہزاری دستے تھے۔ یعنی کل تیس ہزار سپاہی۔ اب ان کی تعداد مزید گھٹ چکی تھی۔ اس فوج کے ساتھ چینیوں کا تادیر مقابلہ ناممکن تھا۔ لہٰذا تولوئی نے منگولوں کی آزمودہ حکمت عملی کے تحت فوج کو بتدریج پہاڑوں کی طرف پسپائی کا حکم دیا۔ بڑے نظم وضبط کے ساتھ منگول فوج پیچھے ہٹنے لگی۔

اس رات جب لڑائی کا زور ٹوٹ چکا تھا' تولوئی اپنے وسیع وعریض خیمے میں بیٹھا مے نوشی میں مشغول تھا۔ دو تین سالار اس کے قریب بیٹھے تھے۔ خیمے کا پردہ ہلا اور کچھ کمان دار ایک نوجوان کے ساتھ اندر داخل ہوئے۔ تولوئی اسے دیکھتے ہی پہچان گیا۔ اسی شخص کو چغتائی نے قراقرم سے بھیجا تھا۔ اس وقت وہ زخمی تھا۔ اس کا بایاں بازو پٹیوں میں جکڑا ہوا تھا۔

ایک افسر بولا۔ "محترم خان! اباقہ ہی نے آج صبح ہماری مدد کی تھی۔"

تولوئی حیرانی سے بولا۔ "اباقہ! تو زندہ ہے .... تیرے ساتھی تو تجھے مُردہ کہہ رہے تھے۔" پھر وہ سپاہیوں سے بولا۔ "سردار یورق کو بلاؤ۔ اس نے بیمار بکرے کی طرح گردن جھکا رکھی تھی .... اور ہاں دھوک کہاں ہے؟"

چند ہی لمحوں میں سردار یورق اور دھوک حاضر ہو گئے۔ دونوں نے اباقہ کو دیکھا۔ دونوں کے چہرے پر بے پناہ تحیر اُمڈ آیا' لیکن یورق کی حیرت میں خوشی کا عنصر تھا اور دھوک کی حیرت سے خوف جھلک رہا تھا۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ اتنے بڑے بڑے پتھروں کے نیچے دب کر بھی یہ شخص زندہ رہا ہے۔ اباقہ نے اس کی طرف دیکھا دونوں کی نظریں ملیں۔ دھوک نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور نگاہیں پھیر لیں۔ پتہ نہیں اباقہ اس کے خلاف کیا کہنے والا تھا۔

وہ کتنی ہی دیر سر جھکائے کھڑا رہا' لیکن پھر اسے اندازہ ہوا کہ اباقہ کسی اور موضوع پر بات کر رہا ہے۔ تب سردار یورق نے تولوئی خان سے اجازت لے کر اباقہ کو گلے سے لگا لیا۔ دھوک نے بھی آگے بڑھ کر اس کو نئی زندگی کی مبارک دی۔ تولوئی خان اباقہ پر بہت مہربان دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے وہیں کھڑے کھڑے اباقہ کو یک صدی سردار (ایک سو سپاہیوں کا کمان دار) بنا دیا۔ اباقہ بالکل خاموش کھڑا تھا۔ لگتا تھا اسے اس اعزاز پر کوئی خوشی نہیں ہوئی۔ تولوئی خان کی پیشانی پر بل پڑ گئے' لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا سردار یورق آگے بڑھ کر ادب سے بولا۔

"محترم خان! اگر مجھے اباقہ کی ترجمانی کی اجازت دی جائے تو میں کچھ کہنا چاہوں

گا۔"

"کہو"۔ تولوئی نے قدرے بیزاری سے کہا۔

یورق بولا۔ "محترم خان۔ خان اعظم کے بڑے بیٹے چغتائی خان نے اس نوجوان کو صرف ایک مہم کی شرط پر بھیجا تھا۔ وہ مہم سر ہو چکی ہے۔ یہ اب واپس جانا چاہتا ہے۔"

تولوئی خان کے چہرے پر غضب کے آثار نظر آئے۔ وہ غرایا۔ "تو کیا اسے ہماری بخشی ہوئی عزت اور ہماری قربت درکار نہیں۔"

جہاندیدہ یورق فوراً بولا۔ "نہیں خان محترم! میرا مطلب یہ تھا کہ یہ ایک حکم کی بجا آوری کر چکا ہے اب دوسرے حکم کی عدم موجودگی میں واپس جانا چاہتا ہے۔ اگر آپ اسے اپنے ساتھ رہنے کا حکم دیں گے تو یہ سرتابی کی جرأت نہیں کرے گا۔"

تولوئی کا تنا ہوا چہرہ ڈھیلا پڑ گیا۔ قدرے نرمی سے بولا۔ "نوجوان! تُو باقی مہم میں ہمارے ساتھ رہے گا......... بہت جلد ہم ختائی شہروں کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔ ان یادگار نظاروں کو دیکھے بغیر قراقرم لوٹ جانا بدبختی کی بات ہے۔ تُو واپس نہیں جائے گا۔"

☆------☆------☆

نینگ ہن اپنے خیمے میں چوبی تخت پر نیم دراز تھی۔ قریب ہی اس کا باپ سمور میں لپٹا گہری نیند سو رہا تھا۔ جنگ میں اس کی ٹانگ شدید زخمی ہوئی تھی۔ شادی کے لیے دھووک کا اصرار بڑھتا جا رہا تھا' لیکن وہ اسے ٹال رہی تھی۔ پتا نہیں کیوں؟ اسے خود کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ وہ اس کا محبوب تھا اس کے سوا کوئی مرد اس کی زندگی میں نہیں آسکتا تھا' لیکن پھر بھی وہ اس کی بیوی بننے سے ہچکچا رہی تھی۔ وہ اسے دل کی گہرائیوں سے پیار کرتی تھی اور اسے شفاف آئینے کی طرح دیکھنا چاہتی تھی' لیکن اس آئینے میں ایک دراڑ پڑ گئی تھی شاید بزدلی کی دراڑ۔ نہ جانے کیوں نینگ ہن کو شک ہو گیا تھا کہ اباقہ کو دھووک نے جان بوجھ کر مارا ہے۔ اسی اباقہ کو جس نے اپنی جان پر کھیل کر تختہ دار سے اس کی جان بچائی تھی۔ اسے دھووک کی وہ نگاہیں یاد تھیں جن سے وہ اباقہ کو دیکھتا تھا۔ یہ رقیبانہ نگاہیں نینگ ہن کے ذہن پر نقش ہو گئی تھیں......... نہ جانے کیوں کبھی کبھی اسے دھووک سے نفرت سی ہو جاتی تھی۔

اچانک خیمے کا پردہ ہلا اور دھووک اندر داخل ہوا۔ وہ لاپرواہی سے چلتا ہوا چوبی تخت پر آ بیٹھا۔

"اباقہ زندہ ہے۔" اس نے دفعتاً اعلان کیا۔

نینگ کا چہرہ حیرت آمیز مسرت میں نہا گیا۔ اس نے لرزاں لہجے میں دھووک سے تفصیل چاہی اور وہ بتانے لگا۔ وہ دلچسپی سے سنتی رہی .... آخر اس نے کہا کہ وہ اباقہ سے ملنا چاہتی ہے۔

"کیا کرو گی مل کر؟" دھووک نے پوچھا۔

وہ لڑکپن سے بولی۔ "کچھ نہیں۔ اس سے بھی یہی باتیں سنوں گی۔"

دفعتاً دھووک کا پارہ چڑھ گیا وہ بولا۔ "یہ کیوں نہیں کہتیں کہ تمہارے دل میں شک بیٹھ گیا ہے .... تم سمجھتی ہو میں نے اسے قتل کرنے کی کوشش کی تھی .... دیکھو نینگ! مجھے ایک بات بتا دو' صرف ایک بات' مجھ سے شادی کر رہی ہو یا نہیں؟"

نینگ ہن بولی۔ "میں کب انکار کر رہی ہوں۔"

دھووک گرجا۔ "تو پھر ٹھیک ہے۔ یہ شادی آج ہو گی اور اسی وقت۔ بولو ٹھیک ہے؟"

نینگ ہن نے خوفزدہ نظروں سے اپنے باپ کی طرف دیکھا' لیکن وہ سو رہا تھا یا شاید خود کو سویا ظاہر کر رہا تھا۔ وہ بولی۔ "دھووک! آہستہ بولو میرے والد جاگ جائیں گے۔"

دھووک غرایا۔ "میں کسی بیٹی اور کسی باپ سے نہیں ڈرتا۔ تم لوگ میرے احسان مند ہو' میں تمہارا احسان مند نہیں۔ جو بات میں نے پوچھی ہے اس کا جواب دو۔"

نینگ ہن' دھووک کے ہتک آمیز رویے سے روہانسی ہو رہی تھی۔ پھر اس نے ایک طویل سانس لی اور ایک خود دار عورت کے لہجے میں بولی۔ "دیکھو دھووک! میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ میرا جسم تم کسی بھی وقت حاصل کر سکتے ہو' لیکن میری محبت چاہتے ہو تو محبت سے حاصل کرو۔ مجھے یوں ذلیل نہ کرو۔"

دھووک نہایت کرخت لہجے میں بولا۔ "بدنصیب عورت! ذلیل تُو خود اپنے آپ کو کر رہی ہے۔ تُو میری آنکھوں میں دھول جھونک رہی ہے .... ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ میں وہ شاخ ہی کاٹ دوں گا جس پر تُو آشیانہ بنا رہی ہے۔"

دھووک کی آواز اتنی بلند تھی کہ نینگ ہن کا باپ جاگ گیا۔ دھووک نے اسے جاگتے دیکھا اور باپ بیٹی پر قہر آلود نگاہیں ڈالتا ہوا خیمے سے باہر نکل گیا۔

وہ غصے میں بھنایا ہوا دور تک پیر پٹختا چلا گیا۔ خون اس کی رگوں میں جوش کھائے ہوئے تیل کی طرح کھول رہا تھا۔ وہ ایک شکی مزاج سفاک منگول تھا۔ اس کی نگاہوں میں رہ رہ کے اباقہ کا چہرہ گھوم رہا تھا۔ اباقہ کے اب تک کے رویے سے اس نے اندازہ لگایا تھا کہ وہ اپنے زخمی ہونے کے سبب سے بے خبر تھا۔ برجی کے قریب دھووک نے جو وار

کھیلا تھا وہ اس سیدھے سادے جنگلی کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ دھووک کو اطمینان ہو گیا تھا کہ اباقہ اسے اپنا قاتل نہیں سمجھتا' لیکن یہ بدذات لڑکی خواہ مخواہ معاملے کو بگاڑ رہی تھی۔ وہ اس سے ملنا چاہتی تھی۔ اسے کریدنا چاہتی تھی۔ ممکن تھا اباقہ کو اپنے زخمی ہونے کا واقعہ اچھی طرح یاد نہ ہو جو بار بار کے تذکرے سے یاد آجائے۔ وہ سوچ رہا تھا۔ "اس بیوقوف لڑکی کو کیا ضرورت ہے اس سے ملنے کی .... یقیناً .... یقیناً وہ اس میں دلچسپی لینے لگی ہے۔" اس کے دماغ میں ایک بار پھر چنگاریاں سی اڑنے لگیں۔

☆======☆======☆

شام کا وقت تھا۔ سردی ناقابل برداشت ہو چکی تھی۔ دور تک پہاڑوں پر برف کی سفید چادر پھیل گئی تھی۔ یورتوں (خیموں) کی چھتوں کے گول سوراخ بند کر دیے گئے تھے۔ منگول سپاہی سموری وردیوں میں لپٹے انگیٹھیاں جلائے سردی بھگانے کی کوشش کر رہے تھے' لیکن یہ سردی اباقہ کے لیے نہیں تھی۔ وہ چمڑے کے عام لباس میں اپنے خیمے سے باہر ٹہل رہا تھا۔ اس کا رخ شمال کی طرف تھا۔ لگتا تھا جیسے وہ قراقرم کی طرف دیکھ رہا ہے۔ قراقرم .... جہاں اس کی جھیل جیسی آنکھوں والی ماریتا رہتی تھی۔ اس نے سوچا شاید وہ بھی دریائے کیرولان کے کنارے کھڑی جنوب کی طرف دیکھ رہی ہو۔ وہ بڑبڑایا' جیسے شمال کی طرف چلنے والی ہوا کو پیغام دے رہا ہو۔ "میں تیری شرط پوری کر کے ماریتا .... گھبرانا مت میں جلد لوٹوں گا۔" اس وقت ایک آواز سن کر وہ چونک گیا۔ تاجورا ایک گرم چادر میں لپٹی اس کے سامنے کھڑی تھی۔ اباقہ نے اس کے چہرے سے بھانپا کہ وہ کوئی اہم بات بتانے آئی ہے۔ اس نے اباقہ سے کہا کہ وہ مالکہ کا ایک پیغام لائی ہے اس نے کہا ہے کہ وہ بہت ہوشیار رہے۔ کوئی شخص اس کی جان لینے کی کوشش کر سکتا ہے۔

اباقہ نے اطمینان سے کہا۔ "میں اس شخص کا نام جانتا ہوں۔ وہ دھووک ہے۔"

تاجورا حیرانگی سے بولی۔ "تمہیں کیسے معلوم ہے ...."

اباقہ نے کہا۔ "اس کے علاوہ اس لشکر میں میرا دشمن اور کون ہو سکتا ہے۔"

تاجورا کی جہاندیدہ نگاہیں اباقہ کے چہرے پر لگی تھیں۔ پھر وہ گہری سانس لے کر بولی۔ "تو کیا .... فینگ ہن کا شک درست ہے؟"

"کیسا شک؟" اباقہ نے لاپرواہی سے کہا۔

"یہی کہ دھووک نے قلعے کی فصیل پر تمہیں قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔"

"شاید۔" اباقہ نے کہا۔

تاجورا بولی .... "لیکن تم نے جانتے بوجھتے بھی اس سے بدلہ نہیں لیا۔"

اباقہ نے کہا۔ "اس لیے کہ تیری مالکہ کو وہ اچھا لگتا ہے اور تیری مالکہ نے میری جان بچائی ہے۔"

تاجورا حیران نگاہوں سے اس عجیب و غریب شخص کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ وہ خاموش کھڑا تھا۔ پھر ایک جانب سے کوئی شخص اباقہ کی طرف آیا۔ یہ سردار یورق تھا۔ تاجورا خاموشی سے ایک طرف نکل گئی۔ یورق نے اباقہ سے کہا۔ "آج کچھ کھانے کو ملا ہے یا نہیں؟"

اباقہ نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر نفی میں سر ہلا دیا۔ دراصل ساری منگول فوج کو خوراک کا شدید مسئلہ درپیش تھا۔ دوسری طرف کن سپاہ ان پر پے در پے حملے کر رہی تھیں۔ تولائی حکمت عملی کے تحت اپنی فوج کو مسلسل پیچھے ہٹا رہا تھا۔ اب وہ دشوار گزار پہاڑی سلسلے میں داخل ہو گئے تھے۔ یہاں سردی چونکہ زیادہ تھی اس لیے جانوروں اور انسانوں کے لیے خوراک کی ضرورت اور بڑھ گئی تھی۔

سردار یورق نے اپنے خالی پیٹ پر ہاتھ پھیر کر بازو کے قدرے مرجھائے ہوئے مسل کو دیکھا اور بولا۔ "اباقہ! مجھے خبر ملی ہے کہ آج ہم کن فوج پر شبخون مار رہے ہیں۔ جو دستے اس شبخون میں شامل ہیں ان میں میرا دستہ بھی ہے۔ لہٰذا تم بھی ساتھ جا رہے ہو۔ بس اب خوش ہو جاؤ۔ کل ہمارے خیمے خوراک سے بھرے ہوں گے اور دشمن فوج ہماری طرح بھوک سے تلملا رہی ہو گی۔ تولائی خان نے ایسی پیش بندی کی ہے کہ آج رات دشمن اپنی بیشتر رسد سے محروم ہو جائے گا۔"

اس رات منتخب منگول فوج نے پہاڑوں کا ایک طویل چکر کاٹا اور نشیب میں خیمہ زن کن لشکر کے ایک حصے پر ٹوٹ پڑی۔ حملہ اس قدر اچانک تھا کہ کن فوج بوکھلا کر رہ گئی۔ وہ آنکھیں ملتے ہوئے نیند سے بیدار ہوئے اور تلواریں سونت کر اپنے ہی ساتھیوں پر حملہ آور ہو گئے۔ جب تک ان کی آنکھیں تاریکی میں دیکھنے کے قابل ہوتیں اور وہ صورت حال کا درست اندازہ لگاتے بھوکی منگول فوج نے دوسرا شدید حملہ کر دیا۔ کن اس حملے کی تاب نہ لا سکے اور اپنے خیمے چھوڑ کر پہاڑوں کی طرف بھاگ گئے' لیکن منگول فوج نے کوہستانی بھول بھلیوں میں ان کا پیچھا نہیں کیا۔ انہوں نے خیموں میں لوٹ مار شروع کر دی جس کے ہاتھ میں جو لگا اٹھا لیا۔

اباقہ کے گھوڑے پر اناج سے بھری ہوئی ایک بوری تھی۔ اس نے ایک جلتے ہوئے خیمے سے سمور کے بھاری کپڑے نکالنے کے لیے گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ اس وقت عقب سے ایک تیر سنسناتا ہوا آیا اور اس کے کندھے پر سے نکل گیا اس سے پہلے کہ وہ مڑ کر دیکھتا

دوسرا تیرا اس کے زخمی بازو میں پیوست ہو گیا۔ اباقہ نے تلملا کر گھوڑے کی باگیں کھینچیں۔ عقب سے اس پر تیر اندازی کے کیا معنی؟ تیر ایک پہاڑی کے عقب سے چلائے گئے تھے۔ اباقہ نے سموری کپڑوں کا خیال چھوڑا اور چٹان کی طرف لپکا۔ اس وقت چٹان کے عقب سے ایک گھڑ سوار برآمد ہوا اور مخالف سمت بھاگ نکلا۔ اباقہ کے کانوں میں تاجورا کے الفاظ گونج رہے تھے۔ ''کوئی شخص تمہاری جان لینے کی کوشش کر سکتا ہے۔'' اس نے گھڑ سوار کا تعاقب جاری رکھا۔ وہ لوٹ مار میں مصروف منگولوں کے درمیان سے گزرتا ہوا دوسری جانب نکل گیا۔ دونوں گھوڑے سرپٹ بھاگ رہے تھے اور ان کا درمیانی فاصلہ بتدریج کم ہو رہا تھا۔ آخر ایک زبردست دوڑ کے بعد اباقہ نے گھڑ سوار کو کن پڑاؤ کے جنوبی حصے میں پکڑ لیا۔ اس نے بھاگتے گھوڑے سے دوسرے گھوڑے پر چھلانگ لگائی اور نہایت صفائی سے گھڑ سوار کو لیتا ہوا سخت برف پر گرا۔ دونوں نے چند قلابازیاں کھائیں اور زور آزمائی کرنے لگے۔ گھڑ سوار اباقہ کے نیچے تھا۔ اس نے چہرہ ایک سیاہ کپڑے سے لپیٹ رکھا تھا۔ ایک جھٹکے سے اباقہ نے یہ کپڑا اتار پھینکا تھا۔ حسب توقع اس کے سامنے دھوک تھا۔ اباقہ ایک لمحے کے لیے اس طرف سے غافل ہوا اور اس نے نہایت پھرتی سے ٹانگیں اڑا کر اسے پیچھے کی طرف گرا دیا۔ اس کے وار میں بلا کی پھرتی اور طاقت تھی۔ اباقہ کو اندازہ ہوا کہ اس کا مدمقابل کوئی عام شخص نہیں۔ دونوں ساتھ ساتھ زمین سے اٹھے۔ پلک جھپکتے میں تلواریں نیاموں سے باہر نکلیں۔ ہاتھ متحرک ہوئے اور بجلیاں سی کوندنے لگیں۔ دھوک کے حملے میں غضب کا جوش اور تیزی تھی۔ اس کی آنکھیں جیسے تاریکی میں جل رہی تھیں۔ اباقہ جوابی حملہ کرتا۔ اچانک انہیں گھڑ سواروں نے گھیر لیا۔ بے شمار تیر ان کے جسموں کا نشانہ لے چکے تھے۔ ''خبردار' تلواریں پھینک دو۔'' منگول سالار کی آواز گونجی۔ اباقہ اور دھوک نے ہاتھ روک لیے۔ ''گرفتار کر لو دونوں کو'' .... ''دس ہزاری'' منگول سردار نے دوسرا حکم دیا۔ چند سپاہی آگے بڑھے انہوں نے اباقہ اور دھوک کو ایک دوسرے سے علیحدہ کیا پھر دونوں کے ہاتھ رسیوں سے باندھ دیئے۔ دس ہزاری سوار سخت غضبناک دکھائی دے رہا تھا۔ غرا کر بولا۔ ''تم نے عین جنگ میں ایک دوسرے کے خلاف تلوار اٹھائی ہے۔ یاسا (چنگیز خان کا بنایا ہوا قانون) میں تمہارے جیسے نافرمانوں کے لیے کڑی سزا مقرر ہے۔'' دھوک اب بھی پُر غضب نگاہوں سے اباقہ کو گھور رہا تھا۔

☆ ---------- ☆ ---------- ☆

اگلے روز دونوں متحارب نوجوانوں یعنی اباقہ اور دھوک کو تولوئی خان کے روبرو پیش

کیا گیا۔ منگول فوج کن فوج کا سامان رسد لوٹ کر اب مزید بلندی پر چڑھ گئی تھی۔ یہ علاقہ نہایت دشوار گزار پہاڑوں میں گھرا ہوا تھا۔ یخ بستہ ہوائیں منگول فوج کے خیموں کو چیرتی ہوئی اندر گھس رہی تھیں اور سردی میں مزید اضافہ ہو رہا تھا۔ تولوئی خاں اس وقت اپنے خاص خیمے میں بیٹھا تھا۔ یہ خیمہ موٹے سمور کا اور نسبتاً زیادہ مضبوط تھا۔ ایسے خیمے سرکش ہواؤں اور برفانی طوفان کا بڑی حفاظت سے مقابلہ کرتے تھے۔ تولوئی' سمور کے ایک بھاری بھرکم لباس میں ایک بڑی منقش انگیٹھی کے سامنے بیٹھا تھا۔ انگیٹھی کے قریب کھڑی حسین لڑکیوں کے چہرے شعلوں کی لپک میں گلنار ہو رہے تھے۔ شراب' کباب' شباب اور آگ نے اس خیمے کو برف کے سمندر میں ایک آرام دہ جزیرہ بنا دیا تھا۔ تولوئی نے اباقہ اور دھوک کی طرف دیکھا پھر غصے سے بولا۔

''کس قدر افسوس کی بات ہے' منگول فوج کے دو نامی گرامی بہادر ایک حقیر قیدی لڑکی کے لیے آپس میں جھگڑے ہیں .... مجھے یہ واقعہ سن کر سخت صدمہ ہوا ہے۔ نیلے آسمان کی قسم' تم دونوں کی سزا عبرتناک موت سے کم نہیں' لیکن تم دونوں نے منگول فوج کے لیے کچھ اچھے کارنامے بھی انجام دیئے ہیں۔ میں تم دونوں کو ایک موقع دے سکتا ہوں' لیکن .... لیکن شرط یہ ہے کہ پھر کبھی ایسا واقعہ رونما نہیں ہو گا۔''

دونوں اپنی اپنی جگہ خاموش کھڑے رہے۔ جہاندیدہ تولوئی ان کی خاموشی کا مطلب سمجھ رہا تھا۔ اس نے کہا .... ''مجھے بتایا گیا ہے کہ وہ لڑکی اس سے پہلے دھوک کو بخشی جا چکی ہے' لیکن اس بدلی ہوئی صورت حال میں لڑکی کسی کی ملکیت نہیں .... اسے قتل کر دیا جائے گا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ تم دونوں لڑکی کے لیے آپس میں مقابلہ کر لو۔ جو اس آزمائش میں جیت گیا لڑکی اس کے سپرد کر دی جائے گی .... لیکن اگر اس کے بعد بھی جھگڑے کی بات میرے کان تک پہنچی تو اس کا ایک ہی مطلب ہو گا .... لڑکی اور تم دونوں کی موت۔''

دھوک اور اباقہ نے بیک وقت مقابلے پر آمادگی ظاہر کی۔ حاضرین نے اس فیصلہ کا پرجوش خیر مقدم کیا۔ تولوئی نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ مسلح سپاہی اباقہ اور دھوک کو لیے ہوئے باہر نکل گئے۔ اباقہ کو اس کے خیمے میں پہنچا دیا گیا۔ اس کے ہاتھ کھول دیئے گئے تھے اور اب وہ آزاد تھا۔ تھوڑی دیر بعد سردار یورق اس کے کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے بتایا کہ کل تولوئی خان کے یورت کے سامنے تمہارا اور دھوک کا مقابلہ ہونا قرار پایا ہے۔ اس مقابلے میں کند ہتھیار استعمال کیے جائیں گے تاکہ کسی فریق کی جان جانے کا احتمال کم سے کم ہو۔ اباقہ سردار یورق سے اس مقابلے کی تفصیلات جاننا چاہتا تھا' لیکن

سردار یورق کچھ اور پوچھنا چاہ رہا تھا۔ اس نے کہا۔

"اباقہ! تم اس لڑکی کو چاہتے ہو۔" اباقہ نے نفی میں جواب دیا۔ یورق بولا۔ "پھر دھوک جیسے زہریلے انسان کو تم نے اپنا دشمن کیوں بنایا؟"

اباقہ نے مختصر الفاظ میں اسے شروع سے آخر تک کی بات بتادی۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ دھوک نے ہی اسے قلعے کی فصیل پر ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی۔ یورق پوری بات سن کر بولا۔ "اباقہ! میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ تم اس لڑکی کے احسان مند ہو اور اس کے محبوب کو کوئی نقصان پہنچانا نہیں چاہتے .... لیکن اب تم اس کا مقابلہ کیوں کر رہے ہو۔ تم نے تولوئی خاں کو یہ کیوں نہیں کہا کہ تمہیں لڑکی کی ضرورت نہیں۔ میرا خیال ہے اگر تم ایسا کہتے تو تولوئی لڑکی دھوک کے سپرد کر دیتا۔"

اباقہ چند لمحے خالی نظروں سے خیمے کی دیوار کو تکتا رہا پھر کہنے لگا......... "میں اس کا غرور توڑ کر لڑکی اسے واپس کردوں گا۔"

سردار یورق تھوڑی دیر بات کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرتا رہا پھر کہنے لگا.........

"اباقہ میں سمجھ گیا ہوں تم کیا چاہتے ہو .... لیکن تم وہ مقصد حاصل نہیں کر سکو گے جو چاہتے ہو۔ تم یہ تو نہیں چاہتے ناکہ دھوک اور فینگ ہن جدا ہو جائیں' لیکن جو طریقہ تم اختیار کر رہے ہو اس سے وہ جدا ہو جائیں گے۔"

اباقہ سوالیہ نظروں سے یورق کی طرف دیکھ رہا تھا۔ یورق نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔

"دیکھو اباقہ .... میرا تجربہ تمہاری عمر کے مساوی ہے۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ہٹ دھرم دھوک تمہاری بخشی ہوئی لڑکی قبول نہیں کرے گا۔ وہ اسے اپنی بہت بڑی توہین سمجھے گا۔ ان دونوں میں پہلے ہی شکوک موجود ہیں۔ دھوک کی ہار اسے اپنی محبوبہ سے اور بھی دور لے جائے گی۔"

اباقہ بولا۔ "میرے مقابلہ نہ کرنے کو بھی تو وہ اپنی توہین سمجھتا۔"

یورق نے کہا۔ "ہاں! میرا خیال ہے تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ تم مقابلے سے دستبردار ہو جاتے تو بھی وہ یہی سمجھتا کہ تم لڑکی اسے بخش رہے ہو۔"

اباقہ کے چہرے پر اب پریشانی کے آثار نظر آ رہے تھے وہ بولا۔ "پھر مجھے کیا کرنا چاہیے۔"

یورق جواب دینے میں متذبذب دکھائی دے رہا تھا۔ اباقہ نے دوبارہ پوچھا تو وہ بولا۔

"دیکھو' اگر تم اس لڑکی کا احسان چکانا چاہتے ہو تو .... تمہیں ایک قربانی دینا پڑے گی .... اب مجھے پتہ نہیں تم یہ کر سکو گے یا نہیں' لیکن اگر تم اس لڑکی سے مخلص ہو اور

جیسا کہ میں دیکھ رہا ہوں تم ہو تو پھر اس قربانی کے بغیر تمہارا مقصد پورا نہیں ہو سکتا۔"

"بولو!" اباقہ نے اپنی جلتی ہوئی عمیق آنکھیں یورق کے چہرے پر جمائیں۔

یورق بولا۔ "تمہیں دکھاوے کے طور پر مقابلہ ہارنا ہو گا۔ اس صورت حال میں بس یہی ایک طریقہ ہے ان دونوں کے ملاپ کا۔"

اباقہ گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ یورق نے اپنا بزرگانہ مشورہ دینے کو تو دے دیا تھا' لیکن اب وہ پچھتا رہا تھا۔ پتہ نہیں کیوں۔

.... اگلے روز تولوئی کے یورت کے سامنے بہت سے لوگ ایک وسیع دائرے میں کھڑے تھے۔ جاڑا منگول پڑاؤ پر ٹوٹ کر برسا تھا۔ ہلکی ہلکی برف باری جاری تھی۔ آج ایک طاقتور شخص کا مقابلہ دوسرے طاقتور شخص سے ہو رہا تھا۔ دھوک کی شہرت پورے اردوئے معلیٰ میں تھی وہ بلا کا طاقتور اور پھرتیلا تھا۔ تولوئی خان نہایت کڑی مہمات اس کے سپرد کرتا تھا۔ وہ ایک ہزاری سردار تھا' لیکن تولوئی کے نزدیک اس کی اہمیت اس سے بھی بڑھ کر تھی۔ دوسری طرف اباقہ تھا۔ اس عجیب و غریب نوجوان نے تھوڑے ہی عرصے میں بہت شہرت حاصل کر لی تھی۔ منگول فوج نے پچھلے ہی دنوں اس کا ایک زبردست کارنامہ دیکھا تھا' جب اس نے بلندی سے حملہ کر کے ایک درے سے کن دستے کے پاؤں اکھاڑے تھے۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ محصور قلعے کی برجی تباہ کرنے میں بھی اباقہ ہی کی جرأت کو دخل تھا' لیکن زیادہ تر لوگ اس کارنامے کا سہرا دھوک کے سر باندھتے تھے۔ بہر حال اپنی جگہ اباقہ کی شخصیت بھی زبردست اہمیت کی حامل تھی۔ لوگوں میں مشہور تھا کہ اس جنگلی کو درد نہیں ہوتا اور اس کی کھال بیل کے خشک چمڑے سے زیادہ سخت ہے .... اور آج ان دو حیرت انگیز انسانوں کا مقابلہ کھلے میدان میں ہو رہا تھا۔ سخت سردی کے باوجود وہ صبح سویرے سے یہ تماشا دیکھنے کے لیے جمع ہو رہے تھے۔ آخر تولوئی خان سمور کے لبادے میں ملبوس خیمے سے برآمد ہوا۔ خادمین نے اس کے سر پر ایک بڑا چھتر تان رکھا تھا۔ اس کے بیٹھتے ہی کھیل شروع ہو گیا۔ پہلے چند دوسرے پہلوانوں کے مقابلے ہوئے۔ پھر اباقہ اور دھوک کو میدان میں لایا گیا۔ دونوں کے جسموں پر زیر جامہ کے علاوہ سمور کی صدریاں تھیں جن کے اندر کی طرف بھیڑیے کے چمڑے کا استر لگا ہوا تھا۔ اباقہ کو دیکھ کر نوجوان سپاہیوں نے پرجوش نعرے لگائے۔ دھوک کے حمایتیوں نے بھی تلواریں چاچا کر اس کی حوصلہ افزائی کی۔ نزدیک ہی ایک چوکی پر کند ہتھیار' آہنی لاٹھیاں' زنجیریں اور دو ہتھوڑے رکھے تھے۔ دھوک نے لپک کر ایک ہتھوڑا اٹھایا۔ اباقہ نے لوہے کی زنجیر اٹھائی۔ دونوں جنگجو ایک دوسرے کے سامنے آئے۔ چند لمحے ایک دوسرے کو نظروں

سے تولتے رہے۔ گول دائرے کی شکل میں حرکت کرتے رہے۔ پھر دھوک نے ایک چنگھاڑ کے ساتھ ہتھوڑا گھمایا۔ اباقہ نے جھکائی دی اور زنجیر گھما کر اس کی ٹانگوں پر ماری۔ زنجیر ٹانگوں سے لپٹی۔ اباقہ نے زور سے جھٹکا دیا۔ دھوک اچھل کر پشت کے بل گرا۔ فضا زبردست نعروں سے گونجی لیکن اباقہ نے دوسرا وار کرنے میں پھرتی نہیں دکھائی۔ دھوک تیزی سے لوٹ لگا کر اٹھا۔ اٹھتے اٹھتے اس نے ہتھوڑا گھما کر اباقہ کی رانوں پر مارا اور منہ پر پاؤں کی زبردست ٹھوکر لگائی۔ اباقہ لڑکھڑا کر چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔ دھوک کے حمایتیوں نے آسمان پر پر اٹھالیا۔ حمایتیوں کے شوروغل نے دھوک کے جسم میں جیسے بجلی بھر دی دو قدم دوڑ کر اس نے ہتھوڑا گھمایا۔ اباقہ نے یہ آہنی وار کلائی پر روکا اور الٹے ہاتھ سے زنجیر اس کے منہ پر ماری۔ دھوک بری طرح تلملایا اور وحشیوں کی طرح تابڑ توڑ حملے کرنے لگا۔ پہلے تو لوگ سمجھے شاید اباقہ اسے تھکا رہا ہے' لیکن جلد ہی انہیں اندازہ ہوا کہ دھوک اباقہ پر حاوی ہو رہا ہے۔ ہتھوڑے کی وزنی ضربیں اب براہ راست اباقہ کے جسم پر لگ رہی تھیں۔ اس کے چہرے سے گرنے والے خون کے گرم قطرے سفید برف پر ناقابل فہم تحریر لکھ رہے تھے۔ وہ الٹے قدموں پیچھے ہٹ رہا تھا۔ گر رہا تھا' اٹھ رہا تھا پھر گر رہا تھا۔ دھوک کے حمائتی دیوانگی میں ناچ رہے تھے۔ آخر دھوک نے اباقہ کے سینے پر ایک زوردار ضرب لگائی وہ الٹ کر ہتھیاروں والی چوکی کے قریب گرا۔ دھوک نے لپک کر آہنی زنجیر اٹھائی اور اباقہ کے سینے پر چڑھ کر اس کا گلا گھونٹنے لگا۔ سردار یورق لوگوں میں کھڑا بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا۔ وہ اس وقت کو کوس رہا تھا جب اس کی زبان سے اباقہ کے لیے شکست کی بات نکلی تھی۔ تب تولوئی خان کی گونجدار آواز آئی۔ وہ دھوک کی فتح کا اعلان کر رہا تھا۔ دھوک نے ایک جھٹکے سے زنجیر برف پر پھینکی اور اباقہ پر قہر آلود نگاہ ڈالتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ تولوئی نے چند جملے اباقہ کے جرأت مندانہ مقابلے پر کہے اور پھر زور سے بولا۔ "لڑکی کو حاضر کیا جائے۔" دو خادمائیں حسین فینگ ہن کو دلہن کے لباس میں لیے مجمعے میں داخل ہوئیں۔ تولوئی نے حکم دیا۔ اسے فتح مند دھوک کے حوالے کر دیا جائے۔ دھوک میدان کے وسط میں کھڑا تھا۔ خادماؤں نے فینگ ہن کو اس کے پاس کھڑا کر دیا۔ اباقہ کسی پتھر کی طرح ساکت قریب ہی کھڑا تھا۔ اس کے بکھرے بالوں کے درمیان سے خون آلود چہرہ دکھائی دے رہا تھا ایک چینی طبیب اور دو سپاہی اسے سہارا دینے کے لیے آگے بڑھے۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں منع کر دیا۔ اس وقت فینگ ہن نے اشکبار نگاہوں سے اباقہ کی طرف دیکھا اور "چینی" میں کچھ کہا۔ دھوک نے اسے بے دردی سے پکڑا اور کھینچتا ہوا مجمعے سے باہر لے گیا۔ اس کے مداحوں نے ایک

بار پھر پرجوش نعرے بلند کیے .... تولوئی کے حکم پر مجمع منتشر ہونے لگا۔

☆-------☆-------☆

اس شام کا ذکر ہے۔ اباقہ اپنے یورت میں لیٹا ہوا تھا۔ اس نے اپنا جسم اونی لبادے میں چھپا رکھا تھا۔ یورت سے باہر اونچی نیچی پہاڑی چوٹیوں پر مسلسل برف گر رہی تھی۔ منگول پڑاؤ میں خاموشی تھی۔ بس کبھی کبھی دور سے کسی بیمار گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز سنائی دے جاتی تھی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے چینی طبیب اس کے زخموں پر بدبودار مرہم لگا کر گیا تھا۔ نہ جانے اباقہ کے دل میں کیا آئی تھی۔ اس نے اس سے پوچھا تھا کہ مقابلے کے بعد لڑکی نے چینی زبان کیا جملہ کہا تھا۔ چینی طبیب جو منگول زبان جانتا تھا مسکرا کر بولا تھا۔ "وہ کہہ رہی تھی' اباقہ! تو بڑا جھوٹا ہے۔ میں جانتی ہوں تو بڑا جھوٹا ہے۔"

بڑی دیر سے اباقہ اس فقرے پر غور کر رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا فینگ ہن پر اس جھوٹی لڑائی کا پول کھل گیا تھا۔ وہ جانتی تھی .... ہاں وہ سب کچھ جانتی تھی۔ اباقہ کو اس کی آنکھیں دیکھ کر ہی اندازہ ہو گیا تھا .... دفعتاً خیمے کا پردہ پھڑپھڑایا اور اباقہ اپنے خیالوں سے چونک گیا۔ کوئی عورت تیزی سے اندر داخل ہوئی۔ اس نے سر سے لبادہ اتارا۔ اباقہ نے دیکھا وہ تاجورا تھی۔ فینگ ہن کی خادمہ' اس کی روتی ہوئی آنکھیں کسی حادثے کی خبر دے رہی تھیں۔ پھر وہ چیخی۔

"اباقہ .... دھوک نے فینگ کو مار ڈالا۔" یہ آواز اباقہ کے کانوں میں بارودی دھماکوں کی طرح گونجی۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔ پھر تاجورا کے ساتھ بھاگتا ہوا وہ دھوک کے یورت کی طرف لپکا۔ پڑاؤ کی بھول بھلیوں سے گزر کر وہ دھوک کے یورت میں داخل ہوئے۔ زمین پر نئی نویلی دلہن کی لاش پڑی تھی۔ دونوں خالی ہاتھ دونوں پہلوؤں پر رکھے تھے۔ چھوٹے چھوٹے سفید اور آدھ کھلے ہاتھ۔ ان ہی ہاتھوں نے اس رات اسے پناہ دی تھی۔ انہی ہاتھوں نے اس رات اسے کھانا پکا کر کھلایا تھا' ہاں یہی ہاتھ تھے جو دشمنوں کے نرغے میں اس کا سہارا بنے تھے۔ اب یہ ہاتھ بے جان تھے۔ اس نے عجیب نگاہوں سے ان ہاتھوں کو دیکھا پھر گھٹنوں کے بل بیٹھ کر چھو لیا۔ اس نے قراقرم میں ماریتا کے رخسار کو بھی کئی بار چھوا تھا' لیکن ان ہاتھوں کے لمس میں کسی اور ہی طرح کا احساس تھا۔ یہ کیا احساس تھا؟ وہ اسے کوئی نام نہیں دے سکتا تھا۔ اس احساس سے وہ ہمیشہ محروم رہا تھا۔ اس نے باپ سے سنا تھا' ایک منگول نے اس کی ماں کو ایسے ہی بے عزت کر کے اس کی جان لے لی تھی۔ آج پھر وہی تاریخ دوہرائی گئی تھی۔ آج ایک اور مفتوح عورت کے ساتھ وہی ظلم ہوا تھا۔ اباقہ نے دیکھا فینگ ہن کا معصوم چہرہ بگڑا ہوا

تھا۔ اس کی ناک اور کان کاٹ لیے گئے تھے۔ اس کا جسم ظلم و بربریت کی منہ بولتی تصویر تھی۔ قریب ہی اس کا زخمی باپ ہاتھوں میں منہ چھپائے زارو قطار رو رہا تھا۔ تاجوران نے بتایا کہ دھوک اب تولائی خان کی طرف گیا ہے۔ وہاں جاکر وہ یہ الزام لگائے گا کہ اس کی بیوی اس سے بے وفائی کرکے خیمے سے بھاگ رہی تھی اس لیے اس کے ہاتھوں قتل ہو گئی۔ وہ سسکیاں لیتے ہوئے بولی۔ "نیلے جاودانی آسمان کی قسم! یہ ایسی نہیں تھی' میں نے اسے گود کھلایا ہے۔ یہ اس بے فیض سے محبت کرتی تھی' یہ ایسی ہرگز نہیں تھی۔"

اباقہ کو یہ تمام آوازیں کہیں دور سے آتی محسوس ہو رہی تھیں۔ اس کے ذہن میں "غضب" کے برق گھوڑے کو ایڑ لگ چکی تھی' دماغ کی زمین دہل رہی تھی' آنکھوں میں گرد و غبار کے بادل چھا رہے تھے۔ جیسے صحرا کا سورج آہستگی سے طلوع ہوتا ہے' جیسے افق پر چپکے سے سرخ آندھی بلند ہوتی ہے' ایسے وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنا رخ پھیرا اور دندناتا ہوا خیمے سے نکل گیا.......... وہ تولوئی کے یورت کی طرف بھاگ رہا تھا۔

☆-----☆-----☆

دھوک ابھی تولوئی خان کے یورت سے کافی دور تھا کہ اسے عقب میں قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ اس نے مڑ کر دیکھا' کوہ الطائی کا وحشی دیوانہ اس کے سامنے کھڑا تھا دھوک کے جسم میں ایک سرد پھریری دوڑ گئی۔ وہ غیر ارادی طور پر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔

اباقہ کے سینے سے غراہٹ بلند ہوئی۔ "قدم روک لے دھوک' تو ہزار سال میں بھی تولوئی کے یورت تک نہیں پہنچ سکے گا۔" اباقہ کے لہجے نے دھوک کو لرزا دیا' لیکن پھر وہ سنبھل کر بولا۔

"تو منگول کے بازو آزما چکا ہے مسلم زادے۔"

اباقہ بولا۔ "نہیں منگول زادے .... تجھے ابھی صرف سمرقند کی ہوا نے چھوا ہے' اس آگ سے ابھی تو محفوظ ہے جو برسوں پہلے تیرے باپ چنگیز نے بھڑکائی تھی۔"

وہ دھیمے قدموں سے چلتا اب دھوک کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا۔ پھر دھوک نے اچانک تلوار کھینچی اور اس پر حملہ کر دیا۔ اباقہ نے پہلا وار جھک کر بچایا' دوسرا وار تلوار پر روکا اور تیسرے وار سے پہلے دھوک کی تلوار ٹوٹ چکی تھی۔ اباقہ نے بھی اپنی تلوار پھینک دی۔ پھر ایک خوفناک چنگھاڑ کے ساتھ اس پر حملہ آور ہوا۔ اس کے طوفانی مکوں نے دھوک کو روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا۔ اب چاروں طرف ایک ہلچل نظر آ رہی تھی۔ خیموں کے پردے اٹھ رہے تھے۔ لوگ بھاگ بھاگ کر ان دونوں کے گرد جمع ہو

رہے تھے۔ اباقہ کا زخمی بازو بھی تنومند بازو کی طرح حرکت کر رہا تھا۔ وہ ہاتھوں اور پاؤں کو اس تواتر اور تیزی سے استعمال کر رہا تھا کہ دھوک کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ جسم کے کس حصے کا دفاع کرے اور کسے طوفانی ضربوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دے۔ اس کے کچھ ہمنواؤں نے چیخ چیخ کر اس کی حوصلہ افزائی کی۔ وہ ذرا سا سنبھلا۔ اس نے ایک دو وار بھی بچائے' لیکن منہ زور طوفانوں کے آگے ریت کے بند کب ٹھہرتے ہیں' سرکش ہواؤں میں ایستادہ رہنے والے شجر ٹوٹنے سے کب بچے ہیں؟ وہ اسے مار رہا تھا' منگولوں کے سورما کو جان سے مار رہا تھا اور ایسا کرنے کے لیے اسے کسی تلوار' نیزے یا خنجر کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کے ہاتھ ہی اس کام کے لیے کافی تھے۔ جہاں اس کی طوفانی ضرب لگتی تھی دھوک کی جلد خون اگل دیتی تھی۔ اب ان کے گرد تماشائیوں کا ایک جم غفیر نظر آ رہا تھا۔ ان میں سے کچھ صبح کی طرح اباقہ کے حق میں نعرے لگا رہے تھے۔ ایک طرف سردار یورق بھی کھڑا تھا۔ وہ بڑی خاموشی سے موت اور زندگی کی اس جنگ کا نظارہ کر رہے تھے۔ دھوک کے چند حمایتی بھاگتے ہوئے اس کے پاس پہنچے۔ "سردار یورق! اباقہ کو روکو .... وہ دھوک کو قتل کر دے گا۔"

سردار یورق نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اسے اب کوئی نہیں روک سکتا .... شاید نیلا جاودانی آسمان بھی نہیں۔ یہ مر جائے گا یا مار دے گا۔"

.... دھوک ہمت ہار چکا تھا۔ اس کا ایک ہونٹ کٹ کر نیچے لٹک رہا تھا۔ سامنے کے دانت ٹوٹ چکے تھے اور دائیں آنکھ ضائع ہو گئی تھی۔ پھر وہ لڑکھڑا کر گھٹنوں کے بل گرا۔ اس وقت اباقہ کا داہنا ہاتھ فضا میں بلند ہوا۔ اس کی ایڑیاں زمین سے اٹھیں' ایک چنگھاڑ کے ساتھ اس نے ایک خوفناک مکہ دھوک کے سر پر مارا .... ایک لمحے میں دھوک کے منہ ناک اور کانوں سے خون کی دھاریں بہہ نکلیں۔ اس کا جسم تھرتھرایا' زور سے پھڑکا اور اباقہ کے قدموں میں گر کر ساکت ہو گیا۔ اباقہ کی آنکھوں سے جیسے چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں منگولوں کا جم غفیر اس کے غضب سے سہما ہوا تھا۔ پھر تولوئی کے یورت کی طرف سے گھڑ سواروں کا ایک دستہ برآمد ہوا اور انہوں نے اباقہ کو گھیرے میں لے لیا۔

☆-----☆-----☆

اباقہ کو تولوئی خان کے سامنے پیش کیا گیا' لیکن دھوک قصوروار ثابت ہو چکا تھا۔ اس نے انتقامی جذبے کے تحت اپنی نئی نویلی دلہن کا گلا گھونٹ کر موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ "یاسا" کے تحت وہ سزائے موت کا مستحق تھا یہ اور بات ہے کہ اس سزا پر اباقہ کے

ہاتھوں عمل درآمد ہوا تھا۔ تولوئی خان اباقہ کی ساری کہانی سن کر اور بھی متاثر ہوا۔ اسے جب پتہ چلا کہ قلعہ کی برجی تباہ کرنے میں بھی اباقہ ہی کی تدبیر کار فرما تھی اور اس نے جان پر کھیل کر دھووک کو پھانسی سے بچایا تھا تو اس نے پاس بلا کر اس کی پیٹھ ٹھونکی۔ اباقہ نے تولوئی سے ماریتا کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ کیونکہ یہ اس کا نہیں مسلم بن داؤد اور چغتائی خان کا معاملہ تھا اور وہ انہی سے بات کرنا چاہتا تھا۔

اگلے کچھ ہفتے منگول اور کن فوج پر بہت بھاری گزرے۔ بلند اور دشوار گزار پہاڑوں میں دونوں فوجوں کو زبردست برفانی طوفانوں نے گھیر لیا تھا۔ رسد کے سلسلے منقطع ہو گئے۔ خوراک ختم ہو گئی' سپاہی بھوک سے مرنے لگے۔ منگولوں نے پہلے مُردہ مویشیوں اور پھر مُردہ انسانوں کا گوشت کھانا شروع کر دیا۔ زین کے چمڑے کو گھاس کی پتیوں کے ساتھ ابال ابال کر پیٹ کی آگ بجھائی جاتی۔ اکثر فاقہ زدہ منگول دستے کن فوج پر ٹوٹ پڑتے اور ان کی رسد لوٹ لیتے۔

اس دوران خاقان اوغدائی اور نامور سپہ سالار سوبدائی بہادر منگول ٹڈی دل کے ساتھ دریائے زرد کو پار کر کے بہت آگے بڑھ چکے تھے۔ کن شہزادی کی قلعہ بند فوجیں اس نئے خطرے کے مقابلے کے لیے اکٹھی کی گئیں اور لشکر کا قلب جو پہاڑوں میں تولوئی سے برسرپیکار تھا واپس بلا لیا گیا' لیکن تولوئی نے پیچھے ہٹتی ہوئی کن فوج پر تابڑ توڑ حملے کیے اور ان کی واپسی کو پسپائی میں بدل دیا۔ کن سپہ سالاروں نے جب دیکھا کہ اوغدائی اور سوبدائی بہادر شمال سے دارالحکومت نان کنگ کی طرف بڑھتے چلے آ رہے ہیں تو انہوں نے دریاؤں کے بند توڑنے کی کوشش کی تاکہ نان کنگ کے گرد پانی پھیل جائے اور منگول رک جائیں' لیکن منگول فوج کے ہراول دستے پہلے ہی ان بندوں پر پہنچ گئے اور ختائیوں کی یہ کوشش بھی ناکام ہو گئی۔ وہ پسپا ہوتے ہوئے دارالحکومت تک پہنچ گئے۔ دوسری طرف تولوئی' کن کی باقی ماندہ فوج یعنی اس کے قلب کو دھکیلتا ہوا نان کنگ تک لے آیا۔ یہ فوج تولوئی کے دستوں اور سوبدائی بہادر کی ہراول فوج کے درمیان بری طرح پھنس گئی اپنے ناقابل فہم داؤ و پیچ سے منگولوں نے دشمن کے قلب فوج کو مفلوج کر دیا تھا۔ اسے پالتو جانوروں کے اس گلے کی طرح گھیر لیا گیا تھا جس کے ذبح کرنے کا وقت آ گیا ہو۔ ایک طویل اور سخت لڑائی کے بعد منگولوں نے اس ختائی فوج کا صفایا کر دیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر انہوں نے کئی لاکھ کی آبادی والے دارالحکومت نان کنگ کا محاصرہ کر لیا۔ اباقہ نے ان لڑائیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ جس نے بھی اسے میدان جنگ میں دیکھا اس کے زورِ بازو کا معترف ہو گیا۔ اس کے سینے میں ایک آگ تھی جو ہر وقت شعلہ فشاں رہتی

تھی۔ اس آگ کی تپش کم کرنے کے لیے وہ خود کو میدان جنگ کی ہولناک مصروفیت میں گم کر دیتا تھا۔ وہ چاہتا تھا جب یہ مصروفیت ختم ہو' خاقان اوغدائی قراقرم کی طرف کوچ کا حکم دے چکا ہو۔ وہ جلد از جلد قراقرم پہنچنا چاہتا تھا۔ خیمے کی جھری سے جھانکنے والی ماریتا کی آنکھیں ہمہ وقت اس کے ذہن سے چپکی رہتی تھیں۔ کبھی کبھی اسے معصوم فینگ ہن کی یاد بھی آ جاتی تھی جسے وہ دور جنوب کے برف پوش پہاڑوں میں ابدی نیند سوتا چھوڑ آیا تھا۔

نان کنگ کا محاصرہ طویل ہوتا چلا گیا۔ اس دوران علاقے میں گرمیوں کا موسم شروع ہو گیا۔ خاقان اوغدائی شمالی چراگاہوں کی ٹھنڈی ہواؤں کا متلاشی تھا۔ وہ تولوئی کو ساتھ لے کر دیوار چین کے ساتھ ساتھ واپس ہٹا۔ کن فوج بھی اب تھک چکی تھی۔ شہنشاہ زریں صلح کرنا چاہتا تھا۔ خاقان اوغدائی نے حسب معمول اس سے تحفے طلب کیے۔ ان تحفوں میں قیمتی اشیاء کے ساتھ ساتھ چینی ہنرمند اور حسین لڑکیاں بھی شامل تھیں۔ گدگدائے جسموں والی نرم و نازک چینی دوشیزائیں چنگیز خان اور اس کے بیٹوں کے لیے ہمیشہ بڑی کشش رہی تھیں۔

شہنشاہ زریں نے اوغدائی کی تمام شرائط مان لیں۔ اوغدائی فتح مندانہ واپس پلٹا۔ واپسی کی اطلاع اباقہ کے لیے کسی نوید مسرت سے کم نہیں تھی۔ اس نے منگول فوج کے ساتھ شمال کی طرف سفر شروع کیا۔ بالآخر منگولوں نے خاقان کی قیادت میں عظیم' دیوار چین کو عبور کیا اور صحرائے گوبی میں داخل ہو گئے۔ اب آگے بڑھنے والا ہر قدم اباقہ کو ماریتا سے نزدیک تر کر رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں رات دن بے نام جذبوں کی جوت جلتی رہتی تھی۔ اب یہ جنگلی انسان فطرت کے کئی ان دیکھے گوشوں سے آگاہ ہو چکا تھا۔ اب وہ اپنے ہاتھ اور ماریتا کے رخسار سے آگے بھی بہت کچھ سوچ سکتا تھا۔ اس کا ہر قدم اسے ایک نئے جہاں کی دریافت کی طرف لے جا رہا تھا......... وہ بہت خوش تھا۔

مسلم بن داؤد' قراقرم میں اپنے شاندار خیمے کے اندر بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ چغتائی خاں کی مہربانیوں سے اس خیمے میں دنیا کی ہر آسائش موجود تھی اور ان دنوں چغتائی خاں اس پر زیادہ ہی مہربان تھا اور کیوں نہ ہوتا۔ اسی کی تدبیر سے وہ سخت جان وحشی "اباقہ" راہِ راست پر آیا تھا۔ نہ صرف اس نے وہ قلعہ سر کر وایا تھا بلکہ بعد کی مہمات میں بھی منگولوں کا بھرپور ہاتھ بٹایا تھا......... لیکن اب' اب وہ بلائے جان شخص واپس آ رہا تھا......... اور مسلم بن داؤد جانتا تھا' قراقرم پہنچ کر وہ سیدھا اس کے خیمے میں آئے گا اور اپنی سفید غیر متحرک آنکھیں اس کے چہرے پر جما کر خاموش کھڑا ہو جائے گا۔

اس کی خاموش آنکھیں جو سوال کریں گی۔ اس کا جواب مسلم بن داؤد کے پاس نہیں تھا۔ وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ چغتائی خاں سے کہے کہ وہ اپنی بیوی اباقہ کو سونپ دے۔ اباقہ کو بھیجتے وقت اس نے سوچا تھا کہ ممکن ہے وہ ان مہمات میں کہیں مرکھپ جائے اور اگر ایسا نہ بھی ہوا .... تو پھر سوچ لیا جائے گا کہ کیا کرنا ہے اور اب سوچنے کا وقت آگیا تھا۔ اباقہ لوٹ رہا تھا۔ اس کے یہاں پہنچنے سے پہلے اس مسئلے کا حل ضروری تھا .... اباقہ کو یہاں نہیں پہنچنا چاہئے تھا۔ کافی سوچ بچار کے بعد اس نے ایک خادم کو "داریان" نامی شخص کو بلانے بھیجا۔ یہ نوجوان سردار بوغالی کا بیٹا تھا۔ سردار بوغالی' اباقہ کے ہاتھوں ہلاک ہوا تھا۔ ان دنوں داریان اور اس کا چھوٹا بھائی اریان ایک مہم پر تھے۔ واپس آکر دونوں نے مسلم بن داؤد سے کئی بار اپنے باپ کے قاتل کا پتہ پوچھا تھا۔ مسلم بن داؤد نے کہا تھا وقت آنے پر بتاؤں گا۔ اس نے صرف اتنا بتایا تھا کہ اس کا نام اباقہ ہے اور وہ اس وقت قراقرم میں موجود نہیں .... لیکن آج وہ دونوں بھائیوں کو سب کچھ بتا دینا چاہتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد خیمے کا پردہ ہلا اور خادم دو دراز قد منگولوں کو لیے اندر داخل ہوا۔ ایک کا جسم ذرا فربہ تھا اور دوسرا چھریرے بدن کا۔ دونوں کی تیوریاں خطرناک انداز میں چڑھی ہوئی تھیں ان دونوں بھائیوں کا غصہ مشہور تھا۔ آپس میں بھی کئی بار لڑ چکے تھے۔ شاید یہ پہلا موقع تھا کہ دونوں کسی بات پر متفق ہوئے تھے اور ان کا "متفقہ" فیصلہ یہ تھا کہ ان کے باپ کے قاتل کو "تختہ" زمین کے اوپر سانس لینے کا کوئی حق نہیں۔

داؤد نے اٹھ کر گرمجوشی سے ان کا استقبال کیا اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا۔ بڑا بھائی داریان غصیلے لہجے میں بولا۔ "میرا خیال تھا تُو نے مجھے میرے باپ کے قاتلوں سے ملانے کے لیے بلایا ہے۔"

داؤد دبے دبے جوش سے بولا۔ "ہاں داریان تُو ٹھیک سمجھا ہے .... میں تم نے دونوں کو اسی لیے بلایا ہے۔"

پھر اس نے خادم کو باہر بھیج دیا اور دھیمے لہجے میں ان سے باتیں کرنے لگا۔ آہستہ آہستہ داریان اور اریان کے چہرے سرخ ہوتے جارہے تھے۔ ان کی شرابی آنکھوں سے چنگاریاں سی پھوٹنے لگی تھیں۔ پھر داریان بولا۔

"لیکن ہم وہاں پہنچیں گے کیسے؟"

مسلم بن داؤد بولا۔ "خاقان کے استقبال کے لیے ایک دستہ دیوار چین کی طرف روانہ ہو رہا ہے۔ میں تمہیں اس دستے کے ساتھ روانہ کر سکتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ قراقرم پہنچنے سے پہلے تمہارا دشمن کیفر کردار کو پہنچ جائے ...."

چھوٹا بھائی اریان اب تک خاموش بیٹھا تھا وہ بہت کم باتیں کرتا تھا' لیکن اب اس کے لیے اپنے جوش پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ ایک جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔ اس نے نیام سے تلوار کھینچی اور ہوا میں اس زور سے لہرائی کہ مسلم بن داؤد کی آنکھوں کے سامنے بجلی کوند گئی۔ وہ سرسراتے ہوئے لہجے میں بولا۔

"مسلم بن داؤد' مجھ جیسا تلوار زن آج تک کسی ماں نے پیدا نہیں کیا۔ اس ماں کی قسم میں اباقہ کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" دونوں بھائیوں نے تیوریاں چڑھا کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور صحرائی بگولوں کی طرح خیمے سے نکل گئے۔

چاندنی رات تھی۔ اباقہ اپنے خیمے میں گہری نیند سو رہا تھا۔ خیمے کے روزن سے چھن کر آنے والی چاندنی اس کے چہرے کو منور کر رہی تھی۔ منگول لشکر کا یہ خطرناک جنگجو ایک معصوم بچے کی طرح دکھائی دے رہا تھا اور یہ بچہ اس موت سے بے خبر تھا جو اس سے تھوڑے ہی فاصلے پر موجود تھی۔ سردار بوغالی کے بیٹے داریان اور اریان ایک خیمے میں موجود تھے' نصف رات بیت چکی تھی لیکن وہ ابھی تک جاگ رہے تھے۔ مومی شمعوں کی مدھم روشنی میں ان کے چہرے بڑے پُراسرار دکھائی دے رہے تھے۔ وہ رازدارانہ انداز میں کچھ سرگوشیاں کر رہے تھے۔ بڑا بھائی چھوٹے سے کہہ رہا تھا۔

"اریان! میری بات مان جاؤ۔ ہمارا مقصد صرف اس سے اپنے باپ کے قتل کا بدلہ لینا ہے۔ یہ مقصد سیدھی طرح حل ہو رہا ہے تو خود کو مصیبت میں ڈالنے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ اپنے خیمے میں پڑا بے خبر سو رہا ہے۔ ہم بہ آہستگی اندر داخل ہو کر اس کا کام تمام کر دیتے ہیں۔"

چھوٹا بھائی اریان جو کچھ زیادہ غصیلا تھا اور جس کی تیوریاں بڑے بھائی سے بھی چڑھی تھیں' تنک کر بولا۔ "داریان! اس طرح میرے انتقام کی آگ سرد نہیں ہو گی۔ اگر ہم اسے اپنی پہچان نہیں کرائیں گے تو اس کے قتل کا کوئی فائدہ نہیں۔ میں اسے یہ بتا کر ماروں گا کہ میں سردار بوغالی کا بیٹا ہوں۔"

داریان بولا۔ "لیکن اریان اس کے بارے ہم نے جو کچھ سنا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہایت خطرناک شخص ہے اگر وہ تم پر حاوی ہو گیا تو پھر؟"

اریان نے ایک جھٹکے سے تلوار نیام سے باہر کی۔ اس کی دھار پر ہاتھ پھیرتا ہوا خوفناک لہجے میں بولا۔ "داریان! تُو بزدل ہے اور مجھے بھی بزدلی کا سبق دے رہا ہے۔ قسم ہے جاودانی آسمان کی میں اسے کٹھ پتلی کی طرح نچاؤں گا اور بکری کی طرح کاٹ ڈالوں گا۔"

داریان جو اریان کی نسبت قدرے تحمل مزاج واقع ہوا تھا بولا۔ "اریان' بزرگوں کا

قول ہے دشمن کو کبھی حقیر نہیں سمجھنا چاہئے اگر فرض محال کسی حیلے سے اس نے تمہیں زیر کر ہی لیا تو پھر؟"

"پھر!" اریان کی آنکھوں میں مکارانہ چمک ابھری۔ "پھر ٹیلوں میں چھپے ہوئے میرے ایک درجن ساتھی اس کی تکہ بوٹی کر ڈالیں گے۔"

داریان نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔ "تو اس کا مطلب ہے تو اسے پڑاؤ سے باہر لے جانا چاہتا ہے۔"

"بالکل!" اریان اٹل لہجے میں بولا۔

"مجھے افسوس ہے اریان! میں تیرے ساتھ نہیں جاسکوں گا۔" بڑے بھائی نے کہا۔

اریان زہر خند لہجے میں بولا۔ "داریان تو جانتا ہے میں بزدل نہیں لیکن میں تیری طرح بے وقوف بھی نہیں اور مجھے یقین ہے اپنے باپ کا انتقام میں ہی لوں گا۔"

داریان نے ایک جھٹکے سے تلوار نیام میں واپس ڈالی اور دانت پیس کر غرایا۔ "تیرے لینے کو کچھ باقی رہے گا تو لے گا نا۔" پھر وہ اٹھا اور تیز قدموں سے چلتا خیمے سے باہر نکل گیا۔

چاندنی منگول پڑاؤ پر سفید دھند کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔ نزدیک ہی کسی گھوڑے کی ہنہناہٹ سنائی دی۔ تب کوئی سپاہی نیند میں کھانسا۔ اریان خاموشی سے چلتا ہوا ایک دوسرے خیمے کے سامنے پہنچا۔ اِدھر اُدھر دیکھ کر وہ اندر داخل ہوگیا۔ قریباً دس سپاہی کانٹے سے لیس، چوکس بیٹھے تھے۔ اریان نے انہیں کہا کہ وہ منصوبے کے مطابق ٹیلوں میں پہنچ جائیں۔ سپاہی فوراً اٹھنے کی تیاری کرنے لگے۔ اریان خیمے سے نکلا اور اباقہ کے خیمے کی طرف بڑھا۔ پردہ اٹھا کر وہ بے دھڑک اندر داخل ہوگیا۔ اباقہ لکڑی کی چوکی پر بے خبر سو رہا تھا۔ اب وہ ایک صدی سردار تھا۔ اس کی وردی قریب ہی ایک کھونٹی پر ہوئی تھی۔ اس کے جنگی ہتھیار ایک طرف ترتیب سے پڑے تھے۔ اریان چند لمحے اباقہ کو قہر آلود نظروں سے گھورتا رہا، پھر اپنے چہرے پر نرمی کی کیفیت پیدا کر کے آگے بڑھا۔ اس نے اسے شانے سے ہلایا تو وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"کیا بات ہے؟" اس نے بلند آواز سے پوچھا۔

اریان نے ہونٹوں سے "شی" کی آواز نکال کر اسے خاموش رہنے کو کہا اور دھیمے لہجے میں بولا۔ "اباقہ تیرے لئے قراقرم سے ایک، اہم پیغام ہے۔ مسلم بن داؤد کا۔"

اباقہ جو اجنبی کی بے وقت موجودگی پر حیران ہو رہا تھا مسلم بن داؤد کا نام سن کر چونک گیا۔ نیند کی غنودگی یکدم کوسوں دور بھاگ گئی تھی۔ اس کا دل مارنا کی کوئی بات

کے لئے بے تاب ہو گیا۔

"کیا بات ہے؟" اس نے اپنے اشتیاق کو دباتے ہوئے پوچھا۔

اریان بولا۔ "یہاں نہیں اباقہ میرے ساتھ آؤ۔"

اباقہ نے چند لمحے کچھ سوچا پھر خیمے کی دیوار سے اپنی تلوار اتاری اور اریان کے ساتھ ہو لیا۔

☆------☆------☆

دونوں گھوڑے دوڑاتے ہوئے پڑاؤ سے باہر آ گئے۔ چاندنی رات اونچے ٹیلوں پر بڑی دلکش دکھائی دے رہی تھی۔ وسیع و عریض منگول پڑاؤ ٹیلوں کے عقب میں رہ گیا تھا۔ قریب ترین خیمے بھی یہاں سے کم از کم نصف کوس دور تھے۔ اباقہ کو ایک نامعلوم سا شک ہو رہا تھا لیکن وہ برابر اریان کے ساتھ چلا آ رہا تھا۔ ڈرنا یا اندیشہ کرنا اس کی فطرت میں شامل نہیں تھا۔ آخر ایک جگہ پہنچ کر اریان نے گھوڑا روک لیا۔ اباقہ نے بھی لگامیں کھینچیں۔ اریان نے گھوڑے کا رخ موڑا۔ اب وہ اور اباقہ آمنے سامنے تھے۔ اس وقت اباقہ کو خطرے کا احساس ہوا لیکن وہ اپنی جگہ بے حرکت کھڑا رہا۔ اریان کی آنکھوں میں بجلیاں سی کوند رہی تھیں۔ اس کا ایک ہاتھ تلوار کے دستے پر تھا۔ پھر اس کی آواز رات کے روپہلے سناٹے میں گونجی۔

"اباقہ! مرنے کے لئے تیار ہو جا۔ تیرے سامنے سردار بوغالی کا بیٹا کھڑا ہے۔"

اباقہ گھوڑے کی پشت پر خاموش بیٹھا کھوئی ہوئی نظروں سے اپنے مدمقابل کی طرف دیکھتا رہا۔ اریان غضبناک لہجے میں بولا۔ "دیکھتا کیا ہے، تلوار نکال ورنہ ہاتھ ہلانے کی حسرت لئے مر جائے گا۔"

اباقہ دور سنہری خلا میں دیکھتا ہوا بولا۔ "چلا جا منگول زادے! تیرا کوئی قصور نہیں ...... اور جو مرا وہ قصوروار تھا۔"

اریان غرایا۔ "اپنی زبان روک بدنصیب اور اگر چلا سکتا ہے تو تلوار چلا۔" اس کے ساتھ ہی اس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور کسی درندے کی طرح اباقہ پر جھپٹا۔ اباقہ نے تیزی سے جھک کر یہ وار بچایا، اریان اپنی جھونک میں آگے نکل گیا۔ اباقہ نے بلا کی پھرتی سے گھوڑے کا رخ موڑا اور تلوار کھینچ لی۔ اب دونوں پھر آمنے سامنے تھے۔ اباقہ نے ایک طائرانہ نظر اطراف کے ٹیلوں پر ڈالی اور اطمینان سے بولا۔

"نادان منگول! اپنے چھپے ہوئے ساتھیوں کو بھی بلا لے تو اکیلا یہ صدمہ نہیں سہ سکے گا۔"

اس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور خوفناک
ایریان چلایا۔ "لے پھر سنبھال میرا وار۔"
رفتار سے اباقہ پر جھپٹا۔ اباقہ بھی گھوڑے کو ایڑ لگا چکا تھا۔ دونوں سوار ریت کے چمکیلے
میدان میں ایک لمحے کے لئے ملے۔ تلواریں زور سے ٹکرائیں اور ایریان الٹ کر
گھوڑے سے نیچے آ رہا۔ اباقہ نے گھوڑے کو روکا۔ رخ موڑا اور حیران کن تیزی سے
ایریان کے سر پر پہنچ گیا۔ وہ دوبارہ گھوڑے پر سوار ہونے کے لئے رکاب میں پاؤں رکھ چکا
تھا۔ اباقہ نے اپنے گھوڑے سے چھلانگ لگائی اور ایریان کے اوپر گرا۔ دونوں کچھ دور
ڈھلوان پر لڑھکتے چلے گئے۔ پھر ایریان نے نہایت پھرتی سے اباقہ کو پاؤں پر اچھال دیا۔
دونوں تیزی سے کھڑے ہوئے اور ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑے۔ چاندنی رات میں چمکتی
ریت پر تلواروں کی جھنکار بلند ہوئی .... اور بلند تر ہوتی چلی گئی۔ وہ ایک نہایت
زوردار مقابلہ تھا لیکن نہایت عجیب و غریب۔ ان میں سے ایک ماہر ترین شمشیر زن شمار
ہوتا تھا اور دوسرا اس فن کی ابجد سے بھی واقف نہیں تھا لیکن دونوں کی تلواریں یکساں
پھرتی سے حرکت کر رہی تھیں۔ کبھی تو یوں لگتا جیسے دونوں کے گرد برق رفتار جگنو گردش
کر رہے ہیں۔ اباقہ نے اب تک بہت سے شمشیر زن دیکھ لئے تھے اور انہیں زیر بھی کیا
تھا لیکن یہ شخص واقعی اپنے فن میں یکتا تھا۔ یہ اباقہ تھا جو اب تک اس کے جان لیوا
واروں سے بچا ہوا تھا۔ کوئی اور ہوتا تو کب کا ریت اور خون میں لوٹ چکا ہوتا۔ ایریان کا
فخر و غرور بے جا نہیں تھا، حقیقتاً وہ کسی بھی جنگجو کو زیر کر سکتا تھا لیکن اس کی بدقسمتی تھی
کہ وہ اباقہ کے سامنے تھا۔ جب اباقہ نے دیکھا کہ مدمقابل تلوار زنی میں حاوی ہو رہا ہے تو
اس نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر اپنی تلوار پھینک دی۔ اب وہ خالی ہاتھ اس زبردست
شمشیر زن کے آگے کھڑا تھا۔ شمشیر زن کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ اس کی پیاسی تلوار
آخری وار کے لئے بے چین ہے۔ شاید وہ سمجھ رہا تھا کہ لڑائی ختم ہو چکی ہے وہ ایک
بھرپور وار کے لئے اباقہ پر جھپٹا۔ اباقہ نے نہایت پھرتی سے جھکائی دی۔ پھر نہ جانے کس
طرح اس کی کلائی اباقہ کی دونوں پنڈلیوں میں جکڑی گئی۔ تب اباقہ زمین پر لیٹا لیٹا لٹو کی
طرح گھوما اور تلوار ایریان کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گری .... اس وقت ایریان
کے کانوں میں داریان کے الفاظ گونجے۔ "وہ ایک نہایت خطرناک شخص ہے۔ اگر فرض
محال کسی طرح اس نے تمہیں زیر کر لیا تو پھر.........؟"
اس کے جسم میں جیسے ایک دم سارے صحرا کی خنکی اتر گئی۔ تلوار کے بغیر.........
تلوار کے بغیر وہ کسی کام کا نہیں تھا۔ وہ زور سے چلایا۔ "ساتھیو!" ٹیلے کی دوسری جانب
سے سیاہ ہیولے برآمد ہوئے اور تیزی سے ان دونوں کی طرف لپکے لیکن اس وقت ایریان

نے دیکھا۔ اباقہ نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور کسی بہت بڑی چمگادڑ کی طرح اس سے
لپٹ گیا۔ اس نے چاہا کہ اپنا ہاتھ خنجر تک پہنچائے لیکن اس کے بازو جیسے شکنجے میں جکڑے
گئے تھے۔ تب اس نے اباقہ کا آہنی بازو اپنی گردن کے گرد محسوس کیا۔ ایک لمحے میں اسے
اندازہ ہو گیا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ وہ اس کی گردن توڑنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ آخر اس نے
پورا زور لگا کر اپنا ہاتھ خنجر کے دستے تک پہنچایا۔ اس کی انگلیاں خنجر کے ٹھنڈے ہوئے
دستے سے ٹکرائیں۔ اس کے کانوں نے قریب آتے ہوئے ساتھیوں کی آوازیں سنیں۔
خنجر کا لمس آخری تھا جو اس کی انگلیوں نے محسوس کیا ساتھیوں کی آوازیں آخری تھیں جو
اس کے کانوں نے سنیں۔ اس کی گردن کو ایک جھٹکا لگا اور اس کی نگاہوں کے سامنے
ابدی تاریکی چھا گئی۔

اباقہ نے مردہ ایریان کو ریت پر پھینکا جھپٹ کر تلوار اٹھائی اور ٹیلے کے پیچھے سے
برآمد ہونے والوں سے بھڑ گیا۔ وہ تعداد میں دس سے کم نہیں تھے لیکن ان کے حوصلے
ٹھٹھرے ہوئے تھے۔ انہوں نے چند لمحے پہلے اس جنگجو کو زندگی کی بازی ہارتے دیکھا تھا جو
درجنوں افراد پر بھاری تھا۔ ان کی تلواریں مرے مرے انداز میں اٹھ رہی تھیں۔ اباقہ
نے نہایت پھرتی سے ان میں سے دو کو ہلاک کر دیا اور باقی خوفزدہ انداز میں بھاگ کھڑے
ہوئے۔

☆ ———— ☆ ———— ☆

خاقان اوغدائی اپنے خیمے میں مخصوص چوکی پر لیٹا تھا۔ اس کے چہرے پر جیسے دنیا
جہان کی نقاہتیں سمٹ آئی تھیں۔ وہ بیمار تھا، پیچش کا مرض اسے بہت پرانا تھا لیکن ختا کے
دشوار گذار سفر نے اس مرض میں مزید شدت پیدا کر دی تھی۔ اس وقت اس سفری خیمے
میں خاقان کے چھوٹے بھائی تولوئی کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ خاقان نے تولوئی کو اشارے
سے کہا کہ وہ اپنا کان قریب لائے۔ تولوئی بھائی کے سینے پر جھک گیا۔ خاقان نحیف آواز
میں بولا۔

"تولوئی لگتا ہے میرا آخری وقت آ گیا ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں نیلے آسمان میں ایک
دروازہ میرے لئے کھل رہا ہے۔ شاید میں بہت جلد اس دروازے کے پار اپنے اور
تمہارے باپ خان اعظم (چنگیز خاں) کے پاس پہنچ جاؤں گا۔"

تولوئی نے بھائی کی مایوس کن باتیں سنیں تو اس کا دل بیٹھ گیا۔ ہزاروں لاکھوں
انسانوں کو موت کے گھاٹ اتارنے والا تولوئی، بڑے بھائی کی موت کا سوچ کر بے چین ہو
رہا تھا۔ ظلم اور سفاکی میں بے مثال ہونے کے باوجود چنگیز خان کے تینوں بیٹوں کو ایک

دوسرے سے بے پناہ انس تھا۔ تولوئی نے اسی وقت شامان (معالج ساحر) بلائے۔ شامانوں نے خاقان کے یورت کے گرد میخیں ٹھونک کر اسے سربمہر کیا اور جنوبی دروازے کے سامنے بیٹھ کر ڈھول بجانے لگے۔ وہ خاقان کے جسم سے چمٹی ہوئی بیماری کی بلاؤں کو بھگانے کی کوشش کر رہے تھے۔ منگول لشکر میں یہ خبر بڑی سرعت سے پھیل رہی تھی کہ خاقان اوغدائی بیمار پڑ گیا ہے۔ سردار یورق بھی یہی خبر سن کر اوغدائی کے خیمے کی طرف چلا آیا تھا۔

اس وقت رات کافی ہو گئی تھی لیکن بڑے بڑے سردار اور فوجی افسر اوغدائی کے خیمے کے گرد موجود تھے۔ ہر چہرہ خاقان کے لئے فکرمند دکھائی دے رہا تھا۔ آخر نصف شب کے بعد یورق اپنے خیمے کو واپس روانہ ہوا۔ ابھی وہ خیمے سے کچھ دور ہی تھا کہ اچانک اسے ایک سایہ نظر آیا جو بھاگ کر ایک خیمے کی اوٹ میں چلا گیا۔ یکایک سردار یورق کی تمام حسیں جاگ اٹھیں۔ اس کے بازوؤں کے مسل خود بخود پھڑکنے لگے۔ وہ شکاری کتے کے چوکنے انداز میں چلتا ہوا ایک خیمے کے عقب میں پہنچا۔ سایہ کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن سردار یورق اس معاملے کو یونہی نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ اسے آج ہی اباقہ نے بتایا تھا کہ کل رات کسی شخص نے اسے قتل کرنے کی کوشش کی ہے۔ سردار یورق نے اسے محتاط رہنے کا مشورہ دیا تھا لیکن وہ جانتا تھا اس قسم کی نصیحت اباقہ پر کوئی اثر نہیں کر سکتی۔ یہ تو ایسا ہی تھا جیسے کسی جنگلی درندے کو زرہ پہننے کا مشورہ دیا جائے۔ یورق جانتا تھا اباقہ اس وقت اپنے خیمے میں ٹانگیں پسارے بے خبر سو رہا ہو گا اور یورق نے دیکھا تھا کہ سائے کا رخ اباقہ کے خیمے ہی کی طرف ہے' وہ جھک کر بھاگتا ہوا کوئی بیس قدم آگے گیا اور پھر اسے اباقہ کا خیمہ دکھائی دیا۔ چاند کچھ دیر کے لئے کسی بدلی میں چھپ گیا تھا۔ پہلے تو یورق کو کچھ دکھائی نہیں دیا لیکن دفعتاً چاند نے اپنی کرنیں زمین پر پھینکیں۔ یورق کو اباقہ کے خیمے کے بالکل قریب ایک متحرک شے نظر آئی۔ اس کے اعصاب تن گئے۔ کوئی شخص رینگتا ہوا اباقہ کے خیمے میں داخل ہو رہا تھا۔ یورق بے آواز بھاگتا ہوا خیمے کے سامنے پہنچا۔ وہ اپنی تلوار پہلے ہی نیام سے باہر کر چکا تھا۔ تلوار کی نوک نے اس کے خیمے کا پردہ ہٹایا۔ اس کی آنکھوں نے خوفناک منظر دیکھا۔ سایہ اباقہ کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں ایک چمکدار شے تھی جو یقیناً خنجر تھا' یورق نے اسے للکارا۔ وہ بلا کی پھرتی سے مڑا اور مڑتے مڑتے چمکدار شے یورق پر پھینکی۔ حملہ اتنا اچانک تھا کہ یورق اپنی جگہ سے جنبش نہ کر سکا۔ خنجر اس کے بائیں بازو میں پیوست ہو گیا۔ یورق حملہ آور کی طرف جھپٹا لیکن اس وقت تک وہ بھی اپنی تلوار نکال چکا تھا۔ تلواریں پورے زور سے ٹکرائیں اور

خیمے میں جیسے کہرام مچ گیا۔ اباقہ جاگا تو اسے یوں لگا جیسے دو بپھرے ہوئے سانڈ خیمے میں گھس آئے ہیں۔ اگلے ہی لمحے خیمہ زمین بوس ہو گیا۔ اباقہ خود بخود خیمے سے نکل آیا تھا۔ اب اس کے سامنے خیمہ کسی دیوہیکل پرندے کی طرح پھڑپھڑا رہا تھا......... اچھل رہا تھا' بل کھا رہا تھا' اردگرد کے خیموں سے بھی سپاہی نکل نکل کر یہ تماشہ دیکھنے لگے۔ خیمہ مد و جزر کے عالم میں گھسٹتا ہوا کئی قدم آگے نکل گیا تھا۔ پھر خیمے کے اندر سے ایک دلدوز چیخ سنائی دی۔ تب کسی نے تلوار کی نوک سے خیمے کا کپڑا پھاڑا اور باہر نکل آیا۔ اباقہ مشعل لے کر اس کے قریب پہنچا۔ وہ سردار یورق تھا۔ اس کے بازو میں ایک خنجر پیوست تھا اور وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔ اباقہ نے آگے بڑھ کر یورق کا خنجر نکالا۔ سپاہیوں نے مل کر خیمہ اٹھایا اور اندر سے گھسیٹ گھسات کر ایک لاش برآمد کر لی۔ یہ ایک تنومند شحیم قوی ہیکل تاتاری تھا۔ مُردہ حالت میں بھی اس کے تیور کچھ کم خطرناک نہیں تھے۔ سردار یورق کے وار نے اس کی گردن نصف سے زائد کاٹ دی تھی۔ کسی نے پکار کر کہا یہ شخص تو پرسوں قراقرم سے آنے والے قافلے میں آیا تھا۔ ایک دوسرا بولا اس کا نام داریان ہے۔

☆------☆------☆

چغتائی خاں ان دنوں قراقرم میں موجود نہیں تھا۔ منگول اپنے خاقان اوغدائی کی صحت کے متعلق بہت فکرمند تھے۔ ایک دن ایک تیز رفتار قاصد اردوئے معلیٰ (بڑا لشکر) کی خبر لے کر قراقرم پہنچا۔ اس قاصد کی زبانی پتہ چلا کہ خاقان اب ٹھیک ہے۔ اس کی بیماری تولوئی خاں نے لے لی ہے۔ یہ ایک عجیب اور وضاحت طلب خبر تھی۔ مارینا کو جب یہ خبر ملی وہ اپنے یورت کے قالین پر ننگے پاؤں ٹہل رہی تھی۔ لمبی زلفیں ہلکے ہلکے پشت پر جھٹکے کھا رہی تھیں۔ وہ ہاتھوں کی انگلیاں مروڑتے ہوئے نہ جانے کن خیالوں میں کھوئی تھی۔ خادمہ آمنہ نے آ کر اسے خاقان کی صحت یابی کی خبر سنائی لیکن تفصیلات کا اسے بھی علم نہیں تھا۔

شام سے تھوڑی دیر پہلے مارینا نے مسلم بن داؤد کو اپنے خیمے میں طلب کیا۔ آمنہ کے پوچھنے پر مارینا نے بتایا کہ وہ اس سے خاقان کی صحت یابی کے متعلق تفصیلات پوچھنا چاہتی ہے۔ مسلم بن داؤد چونکہ چغتائی خاں کے بہت قریب تھا لہٰذا اسے ہر خبر پوری تفصیل اور پس منظر کے ساتھ معلوم ہوتی تھی۔ تھوڑی دیر بعد مسلم بن داؤد خیمے میں حاضر ہو گیا۔ اس کے چہرے پر ہر وقت ایک دھیمی مسکراہٹ پھیلی رہتی تھی۔ مارینا کو یہ مسکراہٹ کبھی اچھی نہیں لگی لیکن وہ برداشت کرنے کے سوا اور کیا کر سکتی تھی۔

وہ اپنی داڑھی کھجا کر بولا۔ "چغتائی خاں کی محترم بیوی نے مجھے یاد کیا ہے؟"

ماریتا نے کہا۔ "ہاں داؤد! میں نے ہی بلایا تھا۔ وہ خاقان کی بیماری اور صحت یابی کا کیا قصہ تھا۔" داؤد نے قاصد کی ترجمانی کرتے ہوئے جو بات بتائی اس سے پتہ چلا کہ خاقان کی بیماری نے تولوئی خاں کو سخت پریشان کر دیا تھا۔ اس کے کہنے پر شامانوں نے اس کا علاج کیا۔ انہوں نے پانی میں بکری کا دودھ اور شراب ملا کر لکڑی کی ہنڈیا پر چڑھائی۔ اس کے نیچے اوپلوں کی آگ جلائی گئی۔ جب یہ محلول تیار ہو گیا تو اس سے خاقان کے جسم کو دھویا گیا۔ شامانوں نے کہا کہ خاقان کے گوشت سے چمٹے ہوئے بیماری کے آسیب دھل گئے ہیں۔ بعدازاں یہ محلول تولوئی نے پی لیا۔ اس نے آسمان کی طرف سر اٹھا کر کہا۔ اے آسمان اگر تُو اس لئے اوغدائی کی جان لینا چاہتا ہے کہ اس نے ظلم کئے ہیں تو میری جان لے لے' میں نے اس سے کہیں زیادہ قتل و غارت کی ہے۔ اگر تُو اس لئے اسے اٹھانا چاہتا ہے کہ وہ خوبصورت ہے' تو میری طرف دیکھ وہ مجھ سے بھی بدصورت ہے تُو میری جان لے لے۔ یہ کہتے ہوئے تولوئی نے اس ہنڈیا کا سارا محلول حلق سے نیچے اتار لیا۔"

ماریتا اس بارے میں کچھ اور تفصیلات پوچھنے لگی۔ وہ لاشعوری طور پر باتوں کو طول دے رہی تھی۔ شاید وہ اباقہ کے بارے کچھ جاننا چاہتی تھی۔

ہوشیار مسلم بن داؤد جلد ہی اس کا مطمع نظر سمجھ گیا وہ کہنے لگا۔

"ہاں میں آپ کو اباقہ کے متعلق بتانا تو بھول ہی گیا۔ میں نے اس کے بارے قاصد سے خاص طور پر پوچھا ہے۔ اتفاقاً وہ اباقہ سے ملا بھی تھا۔ اس نے کہا کہ وہ بالکل خیریت سے ہے۔" ماریتا کی آنکھوں سے اطمینان جھلکنے لگا۔

داؤد ذرا گھمبیر لہجے میں بولا۔ "لیکن محترم خاتون! اب وہ سیدھا سادا جنگلی نہیں رہا۔ بڑا ہوشیار ہو گیا ہے۔ مجھے پتہ چلا ہے کہ وہ ایک چینی دوشیزہ پر فریفتہ ہو گیا تھا۔ رات دن اس کے عشق میں آہیں بھرتا تھا۔ بعد میں اس لڑکی کی خاطر اس نے منگول لشکر کے ایک شہ زور "دھوک" سے ٹکر لی اور اسے قتل کر دیا۔"

مسلم بن داؤد فرفر بول رہا تھا اور ماریتا کھوئی کھوئی نگاہوں سے باہر دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے وہی راستہ تھا جہاں سے آخری بار اباقہ گزر کر گیا تھا۔ وہ اس کا کچھ نہیں لگتا تھا............ وہ اسے بھول چکی تھی' لیکن نہ جانے کیوں داؤد کی بات سن کر اس کا دل بھر آیا تھا۔ ایک لہر سی اس کے سینے سے اٹھی اور آنکھوں میں نمی بن کر تیرنے لگی۔ اس نمی کو چھپانے کے لئے اس نے منہ پھیر لیا۔ مسلم بن داؤد جو اٹھنے کے لئے کوئی موقع تلاش کر رہا تھا اجازت لے کر باہر چلا آیا۔ اسے بہت جلدی تھی۔ باہر نکلتے ہی وہ تیز قدموں سے ایک جانب چل دیا۔ اندھیرا پھیل رہا تھا اور اسے چاند نکلنے سے پہلے

"ہینڈاس" کے خیمے میں پہنچنا تھا۔ ہینڈاس ایک بلغارین پہلوان تھا۔ وہ تحفے کے طور پر قراقرم پہنچا تھا اور واقعی وہ ایک تحفہ تھا۔ کیم شحیم جسم تھوڑی سی باہر کو نکلی ہوئی لیکن نہایت مضبوط توند۔ وہ ایسے داؤ پیچ سے واقف تھا' مقامی پہلوان جن کا توڑ کرنے سے قاصر رہتے تھے۔ اس کی سخت جانی کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ جس قافلے کے ساتھ قراقرم پہنچا تھا اس میں دس پہلوان اور تھے لیکن یہ تمام پہلوان منگول پہلوانوں سے ہڈیاں تڑوا بیٹھے تھے۔ جب کہ ہینڈاس نے ایک منگول کی پسلیاں توڑ دی تھیں۔ نامی گرامی منگول پہلوان ہینڈاس کی غیر معمولی صحت کو تسلیم کرتے تھے۔

ہینڈاس کی غیر معمولی صحت کا راز یہ تھا کہ وہ عورت اور شراب سے پرہیز کرتا تھا لیکن ایسا بھی نہیں کہ وہ ان چیزوں کو ہاتھ نہیں لگاتا تھا۔ دراصل اس نے اپنے لئے ایک ضابطہ بنا رکھا تھا۔ دو سال میں ایک مرتبہ وہ کھل کر جشن مناتا۔ (منگولوں کا سال چھ ماہ کا ہوتا تھا) یہ جشن کم از کم ایک ماہ جاری رہتا تھا۔ اس ایک ماہ میں وہ خود کو عورت اور شراب میں غرق کر دیتا تھا لیکن اس کے بعد وہ ان چیزوں کو پلٹ کر بھی نہ دیکھتا تھا۔ آج کل بھی وہ یہ جشن منا رہا تھا اور داؤد کو معلوم تھا اگر وہ جلد ہی اس کے خیمے تک نہیں پہنچا تو وہ عیش و طرب میں مصروف ہو چکا ہو گا' یا نشے میں مدہوش پڑا خراٹے لے رہا ہو گا۔

داؤد تقریباً بھاگتا ہوا اپنے خیمے میں پہنچا۔ اس نے تالی بجائی' خادمہ حاضر ہوئی۔ اس نے لڑکیوں کو حاضر کرنے کا حکم دیا۔ ذرا دیر بعد خیمے کا پردہ ہلا اور پانچ نہایت خوبصورت لڑکیاں اندر آ گئیں۔ یہ پانچ سفید فام لڑکیاں جو "وینس" سے آئی تھیں' چغتائی خاں نے اسے چند ماہ پہلے انعام میں دی تھیں۔ پہلے پہل تو وہ اسے بہت اچھی لگیں لیکن اب اس نے ان کے لئے ایک دوسرا خیمہ لگوا دیا تھا۔ لڑکیوں کو دیکھتے ہی اس کے جسم میں نقاہت سی اتر جاتی تھی۔ اس نے خاموش کھڑی لڑکیوں کو جانچنے والی نظر سے گھورا۔ پھر ان میں سے ایک کا بازو پکڑ کر باہر نکل آیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد وہ قراقرم کے شمالی حصے میں ایک بڑے خیمے کے اندر داخل ہو رہا تھا۔ لڑکی اس کے حکم پر باہر کھڑی رہ گئی۔ مسلم بن داؤد کا استقبال ایک فلک شگاف قہقہے نے کیا۔ پہاڑ جیسے جسم کا ایک سرخ و سپید شخص تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ بھاری بھرکم جثے کے باوجود وہ نہایت چاق و چوبند دکھائی دیتا تھا۔ داؤد کے چہرے پر دنیا جہان کی مظلومیت برس رہی تھی۔ وہ لرزاں لہجے میں بولا۔

"ہینڈاس تُو اسی طرح ہنستا رہے گا اور وہ جنونی یہاں پہنچ کر میرا کام تمام کر دے

گا۔"

"کون جنونی؟" ہینڈاس نے آنکھیں جھپکا کر کہا۔ "اچھا وہ اباقہ' لیکن تُو نے تو اسے مارنے کے لئے داریان اور اریان کو بھیج دیا تھا۔"

داؤد بولا۔ "ہینڈاس! وہ انسان نہیں شیطان ہے۔ مٹی کا نہیں آگ کا بنا ہوا ہے۔ اس نے داریان اور اریان دونوں کو بھسم کر دیا ہے' وہ دونوں اسے مارنے کی کوشش میں مارے گئے ہیں۔"

ہینڈاس حیرانی سے بولا۔ "یقین نہیں آتا۔"

داؤد نے تلملا کر کہا۔ "یقین کرنا پڑے گا اور یہ بھی یقین کرنا پڑے گا کہ خاقان اب صحت یاب ہو گیا ہے۔ اور یہ بھی یقین کرنا پڑے گا کہ منگول لشکر نے قراقرم کی طرف اپنا سفر شروع کر دیا ہے۔"

ہینڈاس بولا۔ "اس کا مطلب ہے تمہارا اباقہ جلد ہی قراقرم پہنچنے والا ہے۔"

داؤد بولا۔ "یہی مطلب نہیں اس کا یہ بھی مطلب ہے کہ میری جان سخت خطرے میں ہے۔ وہ موذی مجھے..........." داؤد کی آواز حلق میں پھنس گئی اس نے تھوک نگلا اور بولا۔ "ہینڈاس اسے ختم کر دو۔ یہ لو' یہ میں تمہارے لئے لایا ہوں۔" اس نے اپنے چغے کے اندر سے ایک تھیلی نکالی۔ ہینڈاس نے تھیلی لے کر کھولی اس کی ہتھیلی پر قیمتی پتھر چمکنے لگے۔ داؤد بولا۔ "یہی نہیں' ابھی ایک اور ہیرا میرے پاس ہے۔" پھر اس نے تالی بجائی۔ دروازے پر کھڑی لڑکی اندر داخل ہوئی۔ خیمہ جیسے اس کے حسن سے جگمگا اٹھا۔ اس کی صورت دیکھتے ہی ہینڈاس کی آنکھیں چمکنے لگیں اور وہ خوشی کے عالم میں بولا۔

"داؤد تُو میرا یار ہے۔ مجھے یاد ہے تُو نے ایک دفعہ چغتائی خاں سے میری جاں بخشی کروائی تھی۔ میں تیرے کام کیوں نہ آؤں گا۔ گھبرا مت' جا آرام کر۔ میں اباقہ کا سر لے کر بہت جلد تیرے پاس آؤں گا۔" پھر اس نے ہیرے قالین پر پھینکے اور لڑکی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ داؤد جانتا تھا اب یہاں رکنا فضول ہے۔ وہ اٹھا اور ہینڈاس کو یقین دہانی کراتا ہوا باہر چلا آیا۔

☆——☆——☆

قراقرم پہنچنے سے پہلے ہی خاقان اوغدائی اچھا ہو گیا اور تولوئی مر گیا۔ سب نے کہا اس نے اپنے بڑے بھائی کی بیماری پی لی تھی۔ اس لئے نیلے آسمان کی دوسری جانب چلا گیا۔ شامانوں (جادوگروں) کی بات سچ ثابت ہوئی تھی۔ انہوں نے بہت دن پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ تولوئی نے جو محلول پیا اس میں اس کے بھائی کی بیماری شامل تھی۔ شامانوں پر لوگوں کا

عقیدہ اور بھی پختہ ہو گیا تھا۔ انہیں نہ ماننے والے بھی اب ان کا نام احترام سے لینے لگے تھے۔

ایسا ہی ایک شامان یورق کو بتا رہا تھا کہ "اباقہ" کسی عورت کے عشق میں گرفتار ہے۔ وہ عورت اس کے دل و دماغ پر حاوی ہو چکی ہے لیکن اس عورت سے اباقہ کا ملاپ ممکن نہیں۔ وہ یقینی طور پر اس عورت کے چکر میں مارا جائے گا.......... موت کے آسیب اب بھی اس کے چاروں طرف گردش کر رہے ہیں۔

یورق کے چہرے پر بے پناہ تشویش دکھائی دینے لگی' وہ بولا۔ "اے معتبر بزرگ! کیا اس انجام سے بچنے کی کوئی صورت نہیں؟"

"نہیں سردار نہیں۔" بوڑھا شامان خوابناک آواز میں بولا۔ "تمہارا دوست آسمانی بلاؤں کی اس سازش سے بچ نہ پائے گا۔"

"کوئی صورت مہربان' کوئی صورت؟"

"اسے قراقرم سے کہیں دور لے جاؤ۔ ہو سکتا ہے جاودانی آسمان کا فیصلہ بدل جائے۔"

یورق گم صم بیٹھا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اب شامان سے کیا کہے۔ یہ شامان' غیب دانی کا ماہر بھی سمجھا جاتا تھا۔ اس نے یورت کے دروازے سے باہر گہری نظروں سے آسمان کی طرف دیکھا پھر بولا "........... ایک بات میں تمہیں بتا سکتا ہوں' ہو سکتا ہے تمہارے کسی کام آئے۔ جس شخص کے ہاتھوں اباقہ کے قتل ہونے کا خدشہ ہے اس کی پیدائش خنزیر کے سال کی ہو گی اور اس کے دونوں پاؤں کی انگلیاں برابر نہیں ہوں گی۔" (منگولوں میں جو جنتری استعمال ہوتی ہے اسے بارہ جانوروں کی جنتری کہا جاتا ہے۔ اس میں ہر سال کسی جانور کے نام سے منسوب تھا) یورق سوالیہ نظروں سے شامان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شامان نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "جو شخص اباقہ کی موت کا سبب بنے گا اس کے ایک پاؤں میں انگلی کم یا زیادہ ہو گی۔"

.... کافی دیر کے بعد یورق جب بوڑھے شامان کے خیمے سے برآمد ہوا اس کا چہرہ پریشانیوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ اس سے پہلے دو دفعہ اباقہ پر قاتلانہ حملہ ہو چکا تھا۔ یوں بھی وہ ہر وقت کھویا کھویا سا رہتا تھا۔ یورق کو شک تھا کہ اباقہ کسی چکر میں گرفتار ہے۔ اس نے ایک دفعہ پوچھا بھی تھا لیکن اباقہ نے کچھ نہیں بتایا۔

انہی خیالوں میں گم یورق جب اباقہ کے خیمے میں داخل ہوا تو وہ دونوں بازو سر کے نیچے رکھے زمین پر چت لیٹا تھا۔ یورق کے داخل ہونے پر بھی اس کے جسم میں حرکت

نہیں ہوئی۔ اس نے صرف آنکھیں گھما کر دیکھا۔ یورق اس کے قریب آ بیٹھا اور اسے شامان سے ہونے والی گفتگو کے کچھ حصے سنانے لگا۔ اباقہ خاموشی سے سنتا رہا۔ آخر یورق بولا۔

"اباقہ! تمہاری ساری عمر بیابانوں میں گزری ہے' تم انسانوں کے سازشی ذہن سے واقف نہیں۔ اگر تم مجھے دل کی بات نہیں بتاؤ گے تو بے موت مارے جاؤ گے۔ آخر تمہارے پیچھے کون لوگ ہیں کیا کسی عورت سے عشق کر رہے ہو تم' کہیں وہ .... چغتائی کی بیوی تو نہیں؟"

اباقہ کے سینے میں زلزلہ سا پیدا ہوا لیکن اس زلزلے کا ہلکا سا ارتعاش بھی اس کے چہرے پر ظاہر نہ ہو سکا۔ وہ گھمبیر لہجے میں بولا۔ "سردار یورق! زیادہ تو نہیں پی گئے' کچھ ہوش کی بات کرو۔"

سردار چند لمحے گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اٹھ کر باہر چلا گیا۔ اباقہ اسی طرح لیٹا رہا۔ اسے افسوس ہو رہا تھا کہ وہ یورق جیسے جاں نثار ساتھی اور دانا دوست سے دل کی بات چھپا رہا ہے' لیکن وہ مجبور تھا۔ مسلم بن داؤد نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ مارینا کی بات ان دونوں کے درمیان رہے گی۔ کسی تیسرے کو اس معاہدے کا ہرگز پتہ نہیں چلے گا۔ اباقہ اب تک اس وعدے پر قائم تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس پر قاتلانہ حملوں کا ذمے دار مسلم بن داؤد ہے۔

سردار یورق اس رات دیر تک اپنے خیمے میں ٹہلتا رہا۔ دو حسین خادمائیں بار بار اس کا خالی جام بھرتی رہیں۔ اس کی آنکھیں کثرت مے نوشی سے متورم ہو گئی تھیں۔ اسے اباقہ کی جوانمردی سے عشق کی حد تک لگاؤ تھا۔ وہ جانتا تھا ایسا جی دار اور سخت جان جنگجو برسوں میں نہیں صدیوں میں پیدا ہوتا ہے اور جب ایسا جنگجو دنیا میں آتا ہے اس کی زندگی سے بڑے بڑے مقاصد وابستہ ہوتے ہیں۔ ایسے انسان کا کسی عورت کے چکر میں پڑ کر تباہ ہو جانا ایک قابل افسوس امر تھا۔ کم از کم یورق کے لئے یہ بات کسی طور قابل قبول نہیں تھی۔ اس کے نزدیک عورت کا کام مرد کی خدمت اور اس کے لئے ہر طرح کا آرام فراہم کرنا تھا۔ عشق و محبت کی جولانیوں سے منگول کا ذہن بالکل نا آشنا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا اسے کیا کرنا چاہئے۔ اس سوچ میں گم وہ آہستہ آہستہ چلتا خیمے سے باہر نکل آیا اور ٹہلنے والے انداز میں جنوبی سمت بڑھنے لگا۔ قراقرم اب صرف تین روز کی مسافت پر تھا۔ منگول لشکریوں کے چہرے واپسی کی خوشی میں تمتما رہے تھے۔ اپنے یورتوں اور بیوی بچوں میں دوبارہ پہنچنے کی مسرت ان کے فلک شگاف قہقہوں اور چٹکلوں سے عیاں تھی اور خوشی کیوں

نہ ہوتی وہ فاتح واپس لوٹ رہے تھے۔ ان کے خیمے ختا کے مال غنیمت سے بھرے ہوئے تھے۔ دفعتاً یورق چونک گیا۔ اس کے کانوں میں ایک جانی پہچانی آواز پڑی تھی۔ اس نے مڑ کر دیکھا اور حیران رہ گیا۔ اگر اس کی نظر دھوکا نہیں کھا رہی تھی تو وہ ہینڈاس تھا۔ اس خطرناک بلغارین پہلوان کو وہ اچھی طرح جانتا تھا لیکن اس کی یہاں موجودگی کیا معنی رکھتی تھی۔ ہینڈاس اس وقت دو تاتاری سپاہیوں سے کھڑا باتیں کر رہا تھا۔ اس نے اپنا نصف سے زائد چہرہ چادر میں چھپا رکھا تھا۔ یورق ایک خیمے کی اوٹ میں ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد جب دراز قامت ہینڈاس آگے بڑھ گیا تو یورق تیز قدموں سے تاتاری سپاہیوں کے پاس آیا۔ وہ اپنے سردار یورق کو دیکھ کر مؤدب ہو گئے۔ یورق نے ان سے پوچھا۔

"ابھی تم جس شخص سے باتیں کر رہے تھے اسے پہچانتے ہو؟"

ایک سپاہی بولا۔ "محترم سردار ہم یہی بات کر رہے تھے ہمیں شک ہو رہا تھا کہ یہ مشہور بلغارین پہلوان ہینڈاس ہے۔"

یورق بولا۔ "تم بالکل ٹھیک سمجھے' یہ ہینڈاس ہی تھا' کیا کہہ رہا تھا یہ تم سے؟"

تاتاری سپاہی کے جواب نے یورق کو مزید پریشان کر دیا' وہ بولا۔ "سردار! یہ ہم سے اباقہ کا پتہ پوچھ رہا تھا۔"

یورق کے خدشے حقیقت کا روپ دھار رہے تھے۔ ایک سے بڑھ کر ایک خطرناک شخص اباقہ کی ٹوہ میں تھا۔ شامان کی بات پر یورق کا یقین اور بھی پختہ ہو گیا۔ اس نے کہا تھا کہ موت کے آسیب اباقہ کے ارد گرد منڈلا رہے ہیں۔

وہیں کھڑے کھڑے یورق نے ایک اہم فیصلہ کیا اور تیزی سے اباقہ کے خیمے کی طرف لپکا۔ شام کا اندھیرا گہری تیرگی میں ڈھل چکا تھا۔ یہاں وہاں خیموں کے درمیان بڑی بڑی مشعلیں روشن تھیں۔ کبھی بھاگتا اور کبھی چلتا ہوا یورق جلد ہی اباقہ کے خیمے پر پہنچ گیا۔ اس نے بہ آہستگی پردہ ہٹا کر اندر جھانکا۔ اباقہ مالِ غنیمت میں حاصل ہونے والا ایک نہایت قیمتی ہار انگلی سے لٹکائے غور سے دیکھ رہا تھا۔ مومی شمع کی روشنی میں قیمتی ہیرے جگمگا رہے تھے۔ یورق کو دیکھ کر اباقہ نے نہایت پھرتی سے ہار کو ایک جھٹکا دے کر مٹھی میں کر لیا۔ یورق دھیمے لیکن مستحکم قدموں سے اباقہ کی طرف بڑھا۔ اس کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ اباقہ ساکت نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"اباقہ! تمہیں میرے ساتھ چلنا ہو گا۔" یورق کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

اباقہ اس لہجے پر قدرے چونکا اور بولا۔ "کہاں سردار یورق؟"

یورق بولا۔ "جہاں میں کہوں گا.......... لیکن خوب اچھی طرح سُن لو یہ جگہ قراقرم

نہیں ہوگی۔"

اباقہ نے طویل سانس لے کر کہا۔ "سردار! تم شامان کی بات دل سے لگا بیٹھے ہو۔"

یورق غرایا۔ "کچھ بھی ہو اباقہ! میں تمہیں قراقرم نہیں جانے دوں گا۔"

اباقہ بولا۔ "مجھے افسوس ہے سردار' میں یہ بات نہیں مان سکتا۔"

"تمہیں ماننا ہوگی اباقہ۔" یورق چیخا۔

"میں نہیں مان سکتا۔" اباقہ نے بھی بلند آواز سے کہا۔

اس وقت اچانک یورق کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی اس کی ٹانگ پُورے زور سے اباقہ کے پیٹ پر لگی۔ اباقہ کے فرشتوں کو بھی اس حرکت کی توقع نہیں تھی۔ وہ ذرا سا نیچے جھکا اس وقت سردار یورق کی پشت پر بندھے ہوئے ہاتھ سامنے آئے۔ اس کے داہنے ہاتھ میں لوہے کی ایک وزنی لٹھ تھی۔ نہایت پُھرتی اور طاقت سے اس نے یہ لٹھ گھما کر اباقہ کے سر پر ماری۔ کھٹاک کی زوردار آواز آئی اور اباقہ کی آنکھوں میں ستارے ناچ گئے۔ وہ گھٹنوں کے بل جھکا۔ دوسری ضرب نہایت زور دار اور ماہرانہ طور پر لگائی گئی تھی۔ لٹھ کا اگلا حصہ اباقہ کے کانوں کے درمیان عین گدی پر لگا۔ وہ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح دھڑام سے زمین بوس ہوگیا۔ سردار یورق نے پردہ اٹھا کر ایک نظر باہر کا جائزہ لیا پھر اباقہ کے سر سے رسنے والے خون پر لکڑیوں کی راکھ ڈالی۔ تب اس نے خیمے سے ایک مضبوط رسی ڈھونڈی اور اس سے اچھی طرح اباقہ کی مشکیں کس دیں۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ خیمے سے باہر نکلا۔ اس نے ایک شخص کو اصطبل سے دو صحت مند گھوڑے لانے کو کہا۔ جونہی گھوڑے آئے اس نے ایک گھوڑے پر اباقہ کا بے ہوش جسم ڈالا اور دوسرے پر خود سوار ہو کر پڑاؤ سے باہر جانے والے راستے پر ہولیا۔ سردار یورق سے یہ پوچھنے کی ہمت کون کر سکتا تھا کہ گھوڑے پر بے ہوش جسم کس کا ہے اور وہ اس وقت پڑاؤ سے باہر کہاں جا رہا ہے۔

☆------☆------☆

جب دور افق پر صبح کے آثار نمودار ہوئے تو یورق نے گھوڑے گھنے درختوں کے نیچے روک دیئے۔ اس نے دوسرے گھوڑے سے اباقہ کا بے ہوش جسم اتارا۔ اسے گھاس پر لٹا کر اس نے گھوڑوں کو گھاس پر چرنے کے لئے چھوڑ دیا۔ تب وہ اباقہ کے قریب آ بیٹھا اور غور سے اس کے سر کا زخم دیکھنے لگا۔ خون رِس رِس کر اس کے بالوں کو بھگو چکا تھا لیکن اب اخراج بند ہوگیا تھا۔ اسے اطمینان ہوا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں اباقہ کی بے ہوشی اب گہری نیند میں بدل چکی تھی۔ یورق محویت کے عالم میں اس کا

چہرہ دیکھتا رہا۔ پھر اس کی نگاہ اباقہ کی بند مٹھی پر پڑی۔ ہار ابھی تک اس کی مٹھی میں تھا۔ ایکا ایکی اسے اباقہ پر بے پناہ ترس آیا۔ نہ جانے یہ ناسمجھ نوجوان دل کو کیا روگ لگا بیٹھا تھا۔ کتنی شدید خواہش تھی اسے قراقرم پہنچنے کی۔ روزانہ اس سے پوچھتا تھا کہ کتنی مسافت باقی رہ گئی ہے لیکن جو کچھ شامان نے کہا تھا اس کی سچائی بھی یورق پر ظاہر ہو چکی تھی۔ اتنے میں اباقہ کسمسایا اور آنکھیں کھول دیں۔ چند لمحے خالی نظروں سے اردگرد دیکھنے کے بعد وہ جیسے ہوش میں آگیا۔ اس نے جلدی سے اٹھنا چاہا لیکن ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ اس نے گہری نظروں سے یورق کی طرف دیکھا۔ ایک بار پھر پورا زور لگایا لیکن یورق نے اسے انسان سمجھ کر نہیں "اباقہ" سمجھ کر باندھا تھا۔ بندشیں نہایت مضبوط تھیں۔

یورق بولا۔ "بھوک لگی ہے اباقہ؟"

جواب میں اباقہ ایک زخمی درندے کی طرح غرا کر رہ گیا۔ یورق نے چرمی تھیلے سے خشک گوشت کا ایک بڑا سا ٹکڑا نکالا اور اباقہ کے منہ سے لگا دیا۔ اس نے منہ کھول کر ٹکڑا دانتوں میں جکڑا اور ناراض جانور کی طرح سر جھٹک کر اسے دور گرا دیا۔ یورق طنزیہ لہجے میں بولا۔

"کھاؤ گے بیٹا' جب بھوک تمہیں کھائے گی تو ضرور کھاؤ گے۔"

وہ اس کے سامنے بیٹھا اطمینان سے گوشت بھنبھوڑتا رہا۔ پھر اس نے اباقہ کو اٹھا کر دوبارہ ایک گھوڑے پر لادا اور ساتھ لے کر آگے روانہ ہوگیا۔

پہاڑ کے دامن میں وہ ایک بہت بڑا غار تھا۔ یورق اباقہ کو لے کر اس غار میں آگیا۔ پہلے ایک دو روز تو اباقہ نے کچھ کھایا اور نہ یورق سے بات کی' بس قہر آلود نگاہوں سے اسے گھورتا رہا لیکن پھر اسے اندازہ ہوا کہ اس طرح گزارا نہیں ہوگا۔ لگتا تھا یورق کو اس کی بالکل پرواہ نہیں' بولتا ہے تو بولے ورنہ چپ رہے' کھاتا ہے تو کھائے ورنہ مرجائے۔ وہ اس کے قریب بہت سا گوشت اور پنیر رکھ چھوڑتا تھا۔ خوراک کی خوشبو اباقہ کو ہر وقت پریشان کرتی رہی۔ طرہ یہ کہ سردار یورق بھی اس کے سامنے بیٹھ کر ہی کھاتا پیتا تھا۔ آخر ایک رات اباقہ سے برداشت نہ ہو سکا اس نے نہایت غصے کے عالم میں اپنے قریب رکھا ہوا سارا گوشت اور پنیر کھا لیا۔ اس کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے لیکن وہ لڑھکتا ہوا یورق کے چرمی تھیلے تک پہنچا۔ منہ سے تھیلے کو زمین پر گرایا اور اس کے اندر موجود سارا راشن بھی صاف کر دیا لیکن اگر اس کا خیال تھا کہ یورق بے خبر ہے تو وہ غلطی پر تھا۔ جب وہ اچھی طرح پیٹ بھر کر کھا چکا تو بظاہر سویا ہوا یورق انگڑائی لے کر اٹھ بیٹھا اور طنزیہ لہجے میں بولا۔

"کھانے پینے سے منع نہیں کروں گا لیکن ہو گا وہی جو میں چاہوں گا۔"

"کیا چاہتے ہو تم؟" اباقہ نہایت غصے سے بولا۔ چار روز کے بعد یہ پہلی بات تھی جو اس کی زبان سے نکلی۔

یورق نے موی شمع اپنے اور اس کے درمیان لا کر رکھ دی' پھر فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ "جب تک میں چاہوں گا تم اس غار میں رہو گے۔ بس۔"

اباقہ بولا۔ "اگر میں نہ رہوں تو پھر؟"

یورق مسکرایا۔ "مجھے خبر ہے اباقہ تو نے اپنی رسیاں پتھروں سے گھس گھس کر کمزور کرلی ہیں لیکن میں ابھی تمہارے ہاتھوں کو ایک اور رسی سے باندھ دوں گا اور کل شام سے پہلے پہلے تمہارا پکا انتظام کر دوں گا۔"

دوسرے روز سردار یورق گھوڑے پر سوار ہو کر صبح سویرے نکل گیا۔ نہ صرف اباقہ کی مشکیں کسی ہوئی تھیں بلکہ وہ ایک پتھر سے اس طرح بندھا ہوا تھا کہ دو تین گز سے آگے نہیں جا سکتا تھا۔ شام کے وقت یورق واپس آیا تو اس کا تھیلا خوراک سے بھرا ہوا تھا' کوئی اور شے بھی اس کے کندھے سے لٹک رہی تھی۔ جب غار میں مشعل کی روشنی ہوئی تو اباقہ نے دیکھا یہ لوہے کی ایک وزنی زنجیر تھی اور اس کے ساتھ ایک بڑا قفل لگا ہوا تھا۔ یورق نے بڑی مہارت سے اباقہ کو اس زنجیر کے ایک سرے سے باندھ دیا۔ "لو اباقہ اب بے فکر ہو کر کھاؤ پیو۔" وہ اس کے لئے بہت سا جنگلی پھل لایا تھا' لیکن پھل کے ساتھ روٹی اور گوشت بھی موجود تھا۔ شاید نزدیک ہی کوئی بستی تھی۔

☆======☆======☆

اباقہ کو غار کا قیدی ہوئے قریباً آٹھ روز ہو چکے تھے۔ یورق صبح سویرے گھوڑے پر سوار نکل جاتا اور عموماً شام گئے واپسی ہوتی۔ اباقہ سارا دن غار کے پتھریلے فرش پر لیٹا بیٹھا اس عجیب و غریب صورت حال پر غور کرتا رہتا۔ اسے اس بڈھے منگول کی کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ ماریتا کی یاد اسے دن رات ستاتی رہتی تھی۔ ایک روز وہ تنہا بیٹھا غار کے دہانے سے پھوٹنے والی روشنی کو دیکھ رہا تھا کہ قدموں کی چاپ سنائی دی۔ پھر بکری کا ایک چھوٹا سا سفید بچہ چھلانگیں لگاتا ہوا غار کے اندر آیا اور تاریکی میں بڑی حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ تب دہانے پر ایک انسانی ہیولا دکھائی دیا۔ یہ ایک لڑکی تھی۔ "پے جو...... پے جو۔" وہ بکری کے بچے کو آوازیں دے رہی تھی۔ شریر بچہ کچھ اور آگے گھس آیا۔ لڑکی پہلے تو اس ویران غار میں داخل ہونے سے گھبراتی رہی' پھر بازو پھیلا کر احتیاط سے اس کی طرف بڑھی۔ جونہی اس نے بچے کو دبوچنا چاہا وہ پھرتی سے پیچھے ہٹ گیا۔ لڑکی

ٹھوکر لگی اور وہ اوندھے منہ اباقہ کے سینے پر گری۔ اس کے حلق سے ایک چیخ نکلی اور وہ الٹے قدموں لڑکھڑاتی ہوئی دیوار سے جا لگی۔ شاید وہ بھاگ ہی جاتی لیکن اس وقت اس کی نظر اباقہ کی زنجیر پر پڑی اور وہ سمجھ گئی کہ اجنبی بے بس ہے۔ اباقہ نے کہا کہ ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ لڑکی کا خوف دور ہوا تو وہ اس سے کچھ ہٹ کر پتھروں پر بیٹھ گئی۔ اس کی خوبصورت آنکھیں حیرت سے اور بھی بڑی دکھائی دے رہی تھیں وہ مقامی لباس میں تھی لیکن مقامی عورتوں سے کہیں زیادہ خوبصورت تھی۔ اس نے بتایا کہ ایک شخص نے اسے یہاں قید کر رکھا ہے۔ وہ جانتا تھا لڑکی سے مدد کی توقع فضول ہے۔ اس مضبوط زنجیر اور قفل سے نبرد آزما ہونا لڑکی کے بس میں نہیں تھا۔ ہاں یہ ممکن تھا کہ وہ اپنی بستی سے کچھ لوگوں کو لے کر یہاں پہنچتی اور وہ اس کی بندشیں کھولتے۔ وہ لڑکی کا خوف دور کرنے کے لئے کافی دیر اس سے باتیں کرتا رہا۔ یورق کے واپس آنے میں ابھی کافی دیر تھی۔ اگر یہ کام آج ہی ہو جاتا تو کیا بُرا تھا۔ اس نے لڑکی سے کہا کہ وہ اپنی بستی سے کچھ آدمی لائے تاکہ وہ اسے آزاد کرا سکیں۔ لڑکی نے ہای بھرلی۔ اس نے کہا کہ وہ ابھی بستی واپس جا کر یہ خبر سناتی ہے۔ اس نے اپنا میمنا گود میں اٹھایا اور تیز قدموں سے باہر نکل گئی۔

اباقہ سارا دن انتظار کرتا رہا مگر لڑکی پلٹ کر نہیں آئی۔ پھر رات ہوئی اور دوسرے دن کی صبح ہو گئی۔ یورق حسب معمول کھانا وغیرہ کھا کر باہر نکل گیا۔ اباقہ بے چینی سے انتظار کرنے لگا۔ دوپہر کے وقت لڑکی غار کے دہانے پر نظر آئی لیکن وہ تنہا تھی۔ اس نے بتایا کہ وہ اپنا وعدہ پورا نہیں کر سکی۔ اس نے کہا کہ بستی کے قریباً تمام صحت مند مرد منگول فوج میں بھرتی ہو کر چلے گئے تھے۔ اب چند بوڑھے اور بیمار ہی بستی میں رہ گئے ہیں۔ ان میں سے کوئی یہاں آنے کو تیار نہیں۔ ان کا کہنا ہے پتہ نہیں قیدی کون ہے اور قید کرنے والا کون۔ وہ کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتے۔ تاہم لڑکی نے تسلی دیتے ہوئے کہا کہ منگول لشکر قراقرم واپس پہنچ گیا ہے۔ چند ہی روز میں تمام لشکری اپنے گھروں کو پلٹ آئیں گے۔ اس وقت وہ اس کی مدد کر سکے گی۔ لڑکی کی وضاحت اباقہ کی سمجھ میں نہیں آئی' بہرحال اس کی باتیں بہت دلنشیں اور خوبصورت تھیں۔ جتنی دیر وہ اباقہ کے پاس بیٹھی رہی اسے تنہائی کا قطعاً احساس نہیں ہوا۔

پھر یوں ہوا کہ لڑکی روزانہ اس کے پاس آنے لگی کبھی وہ اکیلی ہوتی اور کبھی اس کا میمنا اس کے ساتھ ہوتا۔ وہ عموماً اس کے لئے کھانے کی کوئی چیز لاتی اور اپنے ہاتھ سے کھلاتی۔ بعض اوقات وہ یک ٹک اباقہ کا چہرہ دیکھتی رہتی۔ اس نے بتایا کہ بستی کا ایک

چرواہا اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ وہ ایک خوش حال چرواہا ہے لیکن اس کے کندھے میں ایک ٹوٹا ہوا تیر ہے جس نے ایک بڑا زخم بنا دیا ہے۔ اس زخم سے ہر وقت پیپ رستی رہتی ہے۔ لڑکی کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ چرواہے سے بہت کراہت کھاتی ہے۔

ایک دن کا ذکر ہے یورق صبح غار سے جانے لگا تو ٹھٹک کر رک گیا۔ اباقہ نے دیکھا وہ بڑے غور سے زمین کا معائنہ کر رہا تھا۔ پھر اس نے جھک کر کوئی شے اٹھائی اور ہتھیلی پر رکھ کر دیکھنے لگا۔ اباقہ نے دیکھا یہ بکری کے بچے کی مینگنی تھی۔ یورق نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ”یہاں کوئی آتا ہے؟“

اباقہ خاموش رہا۔ سردار یورق ایک گھٹنا زمین پر ٹکا کر اس کے قریب بیٹھ گیا۔ پھر تحکمانہ لہجے میں بولا۔ ”اباقہ! اس سے پہلے بھی میں نے ایک لڑکی کو بکری کا بچہ اٹھائے غار سے نکلتے دیکھا تھا‘ لیکن وہ پتھروں کے پیچھے غائب ہو گئی۔ کہیں ایسا تو نہیں میرے جانے کے بعد کوئی تم سے ملنے آتا ہو۔ میری ایک بات غور سے سن لو اگر میں نے کبھی کسی کو تمہارے ساتھ دیکھ لیا تو تمہارا اور اس کا وہ حشر ہو گا جو کسی کا نہ ہوا ہو۔ مت سمجھنا کہ اس پہاڑ کی دوسری طرف سے کوئی تمہیں بچانے آئے گا۔ کوئی نہیں آئے گا اور جو آئے گا خود اپنا گڑھا کھودے گا۔“ یورق نے یہ الفاظ کہے اور پاؤں پٹختا ہوا غار سے باہر چلا گیا۔

دو تین روز اور گزر گئے اس دوران لڑکی سے ایک دفعہ اور ملاقات ہوئی اس نے بتایا کہ ابھی بستی میں کوئی سپاہی واپس نہیں آیا‘ لیکن جلد ہی ان کی آمد شروع ہو جائے گی اور پھر وہ اسے یہاں سے نکال لے جائے گی۔ لڑکی کا نام یاکی تھا۔ وہ چہرے کے ساتھ دل کی بھی بڑی خوبصورت تھی۔ اباقہ اب اس کے انداز میں لگاوٹ کی جھلک صاف محسوس کرتا تھا۔ وہ اکثر اپنا نرم و گداز ہاتھ اس کی کلائی پر رکھ دیتی جہاں وزنی زنجیر کی مسلسل رگڑ سے سیاہ نشان پڑ گیا تھا۔

اباقہ کو سردار یورق کا رویہ بالکل سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ آخر وہ روز صبح کے وقت کہاں نکل جاتا تھا۔ یقیناً وہ کسی نہایت اہم کام پر جاتا تھا۔ اس نے ایک ناغہ نہیں کیا تھا۔ حالانکہ اسے شک تھا کہ کوئی اس سے ملنے آتا ہے پھر بھی اپنا شک رفع کرنے کے لئے وہ دن کے وقت غار میں نہیں رک سکتا تھا۔

☆------☆------☆

وہ ایک بڑی سہانی صبح تھی۔ کالے بادل گھر کر آئے ہوئے تھے۔ ہلکی ہلکی پھوار [illegible] پہاڑی سبزہ نکھر آیا تھا۔ غار سے تھوڑی دور ایک چٹان کے نیچے سردار یورق یاکی کے [illegible] موجود تھا۔ یاکی کی بھیگی بھیگی زلفیں گردن اور رخساروں سے چمٹی ہوئی تھیں۔ وہ [illegible]

انداز میں سر جھکائے کچھ لجائی سی یورق کی باتیں سن رہی تھی‘ وہ کہہ رہا تھا۔

”میں اسے کہہ کر آیا ہوں کہ آج شام دیر سے واپس آؤں گا۔ تم دونوں سارا دن اطمینان سے اکٹھے گزار سکتے ہو۔ اس کی محبت کو تمہاری تھوڑی سی حوصلہ افزائی کی ضرورت ہے۔ ایک بار اس نے اقرار کر لیا تو پھر ہمیشہ کے لئے تمہارا ہو کر رہ جائے گا۔ جاؤ ...... میرا خیال ہے وہ تمہارا ہی انتظار کر رہا ہو گا۔“

یورق کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ تھی۔ یاکی نے اثبات میں سر ہلایا اور تیز قدموں سے غار کی جانب روانہ ہو گئی۔ یورق حسب معمول چٹان کے سائے میں لیٹ کر آرام کرنے لگا۔

وہ اندر داخل ہوئی تو اباقہ پتھر سے ٹیک لگائے دہانے ہی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ یاکی کے بھیگے سراپا پر نگاہیں دوڑاتا ہوا بولا۔ ”لگتا ہے غار سے باہر موسم بڑا خوبصورت ہے۔“

”ہاں‘ بڑے گہرے بادل ہیں۔“ یاکی آگ جلانے کے لئے لکڑیاں اکٹھی کرتی ہوئی بولی۔ وہ کچھ سردی اور کچھ تنہائی کی وجہ سے بری طرح کپکپا رہی تھی۔ وہ دیکھ رہی تھی اباقہ کی سفید غیر متحرک نگاہیں اسے گھور رہی ہیں۔ وہ گٹھڑی سی بن کر آگ کے قریب بیٹھ گئی اور بال سکھانے کی کوشش کرنے لگی۔ ایک بار پھر ان کی باتیں شروع ہو گئیں۔ اباقہ کے پوچھنے پر یاکی نے کہا۔

”میرے باپ نے اس چرواہے سے پچاس بکریاں اور دس یاک لئے تھے۔ اس نے دو برس بڑی محنت سے انہیں پالا۔ ہمیں امید تھی کہ اس ریوڑ کو بیچنے سے ہمارے دن پھر جائیں گے لیکن پچھلی خزاں میں میرا باپ ایک برفانی طوفان میں پھنس گیا۔ سارے کے سارے جانور ہلاک ہو گئے اور وہ بمشکل جان بچا کر گھر آیا۔ اب اس چرواہے کا ہم پر قرض ہے۔ اس قرض کے عوض وہ میرے باپ سے بھیڑ کی دس کھالیں حاصل کر چکا ہے اور اب میرا ہاتھ مانگ رہا ہے۔“

غار سے باہر بادل گرج رہے تھے‘ بارش ہو رہی تھی اور وہ دونوں آگ کے گرد بیٹھے باتوں میں مصروف تھے۔ پہلے پہل یاکی‘ اباقہ سے اتنے فاصلے پر بیٹھتی تھی کہ زنجیر کی وجہ سے وہ اپنا ہاتھ اس تک نہ پہنچا سکے لیکن اب وہ اس پر اعتماد کرنے لگی تھی۔ دونوں بالکل قریب قریب بیٹھے تھے۔ باہر کسی بلند چوٹی پر بجلی کا کڑکا سنائی دیا اور یاکی غیر ارادی طور پر اباقہ کے قریب سمٹ آئی۔ اباقہ کی آنکھوں میں کچھ عجیب طرح کی آگ روشن تھی۔ دفعتاً اس نے زنجیر میں جکڑا ہوا اپنا سخت اور کھردرا ہاتھ بڑھایا اور یاکی کے ننھے سے ہاتھ پر رکھ دیا۔ یاکی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ پھر جلدی سے پیچھے ہٹ گئی۔ اس کے چہرے

پر شعلوں کی لپک اور شرم کی سرخی یکجا ہو گئی تھی۔

اس دن کے بعد یاکی اور اباقہ کی ملاقات کا انداز بدل گیا۔ بے باکانہ گفتگو کی جگہ پُرجھجک خاموشی نے لے لی۔ اب ان کی باتیں ذو معنی ہوتی تھیں۔ یاکی اب پھر اباقہ سے ہٹ کر بیٹھنے لگی تھی لیکن اس گریز میں بھی لگاؤ کی دلکشی موجود ہوتی تھی۔ اگر کسی دن وہ نہ آتی تو دوسرے روز اباقہ ناراضگی کا اظہار کرتا۔ ایک روز وہ دونوں بیٹھے باتوں میں مصروف تھے کہ اچانک غار کے دہانے پر گھوڑوں کی ٹاپیں سنائی دیں۔ دوپہر کا وقت تھا۔ سردار یورق کے آنے کی توقع نہیں تھی لیکن دہانے کے اندر داخل ہونے والا شخص یورق ہی تھا۔ اس نے چند قدم ان دونوں کی طرف بڑھائے پھر ٹھٹک کر رک گیا۔ یاکی اسے دیکھ کر اٹھی اور اس کے پہلو سے ہوتی ہوئی باہر بھاگ گئی۔ یورق نے اسے پکڑنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ اباقہ کو گھورتا ہوا اس کے پاس آیا اور بولا۔

"تم نے میری بات نہیں مانی اباقہ! اب اس لڑکی کی موت کے ذمے دار تم ہو گے۔"

اباقہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "نہیں یورق! تم اسے نہیں مارو گے۔"

سردار یورق غصے سے بولا۔ "کیوں نہیں ماروں گا اس ناگن کو؟"

"سنو سردار یورق!" اباقہ کی آواز غار میں گونجی۔ "میں اس لڑکی سے محبت کرتا ہوں۔ میں اس سے شادی کروں گا۔ اس کی موت تمہیں بہت مہنگی پڑ سکتی ہے۔"

"اوہو تو نوبت یہاں تک پہنچ گئی۔" یورق قدرے طنزیہ لہجے میں بولا۔ "لیکن وہ قراقرم کی حسینہ؟"

"میں کسی حسینہ کو نہیں جانتا۔" اباقہ غرایا۔ "میں بس یاکی کو جانتا ہوں اور اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔"

یورق تادیر خاموشی سے اس عجیب و غریب جنگلی کو گھورتا رہا۔ پھر وہ ایک طویل سانس لے کر اٹھا۔ اس نے جیب سے چابی نکالی اور اباقہ کا قفل کھول دیا۔ "ٹھیک ہے اباقہ! اگر تم میری پابندیوں کو ناروا سمجھتے ہو تو جو جی چاہے کرو، میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔"

اباقہ خاموشی سے اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ پھر دفعتاً وہ اپنی جگہ سے اچھلا اور سردار یورق کے اوپر گرا۔ سردار یورق کو اس حملے کی بالکل توقع نہیں تھی۔ وہ لڑکھڑایا اور پشت کے بل سنگلاخ زمین پر گرا۔ گرتے ساتھ ہی اس کے منہ سے غراہٹ نکلی اور اس نے اباقہ کے منہ پر ٹانگ مارنا چاہی لیکن اباقہ یہ وار بچا گیا۔ بڑھاپے کے باوجود یورق کی صحت

رشک تھی لیکن اباقہ سی پھرتی اس کے بس میں نہیں تھی۔ اباقہ نے حیران کن تیزی سے اس کی کلائی تھامی اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتا اس کا بازو زنجیر کے ایک سرے سے منسلک ہو چکا تھا۔ عین اس وقت دہانے کی طرف سے بھاگتے قدموں کی آواز آئی۔ یاکی غار میں واپس آ رہی تھی۔ وہ حیران کن نظروں سے اباقہ اور یورق کی طرف دیکھنے لگی۔ اباقہ آزاد ہو چکا تھا جبکہ یورق کی کلائی زنجیر میں تھی۔

"اباقہ! یہ کیا کر رہے ہو۔" وہ حیرانی سے بولی۔

اباقہ نے آگے بڑھ کر یاکی کے بال مٹھی میں جکڑے اور زور سے دھکا دیا وہ لڑکھڑا کر پتھروں پر جا گری۔ "مکار، دغا باز۔" وہ غرایا۔

یاکی چلائی۔ "نہیں اباقہ، ایسے مت کہو، میں تم سے محبت کرتی ہوں۔"

اباقہ دانت پیس کر بولا۔ "بکواس مت کر۔ تُو سردار یورق کے کہنے پر محبت کا کھیل کھیل رہی تھی اور اب یہ کھیل ختم ہو چکا ہے۔"

"نہیں اباقہ! میں واقعی تم سے محبت کرتی ہوں۔" یاکی تڑپ کر بولی اور اس کی ٹانگوں سے لپٹ کر سسکنے لگی۔

سردار یورق بولا۔ "اباقہ! میں نے جو کچھ کیا تیرے بھلے کے لئے کیا۔ اب بھی میں کہتا ہوں اپنے ارادوں سے باز آ جا۔"

اباقہ سنی ان سنی کرتا ہوا دہانے کی طرف بڑھا۔ یاکی اس کے پیچھے بھاگی۔ غار سے نکل کر ایک بار پھر اس نے اباقہ کا بازو تھام لیا۔

"اباقہ میری بات تو سنو۔"

اباقہ نے ایک نظر اس کے غمناک چہرے کی طرف دیکھا اور بولا۔ "کیا کہنا چاہتی ہے لڑکی۔"

یاکی نے سسکیوں اور آہوں کے درمیان جو کہانی سنائی وہ یوں تھی۔

پہلے روز جب یاکی اباقہ سے مل کر غار سے نکلی سردار یورق نے اسے دیکھ لیا۔ اس نے یاکی سے کہا کہ غار میں قید نوجوان دراصل خاقان اوغدائی کے لشکر کا ایک صدی سردار ہے۔ اس کی شہہ زوری کی شہرت دور دور ہے۔ اس نے یاکی سے کہا کہ وہ اس نوجوان کا دل جیتنے کی کوشش کرے۔ اگر وہ ایسا کرنے میں کامیاب ہو گئی تو نہایت عزت اور شان کی زندگی بسر کرے گی۔ یاکی نے کہا کہ وہ تو اس کی مدد کے لئے بستی سے مردوں کو لینے جا رہی تھی۔ یورق نے اسے سختی سے منع کر دیا اور کہا کہ وہ اس سے بہانہ بنائے کہ بستی کے مرد جنگ میں ہیں اور کوئی غار تک آنے کو تیار نہیں۔

یاکی نے روتے ہوئے کہا۔ "اباقہ میرا کوئی قصور نہیں۔ تمہارے سردار نے جو کچھ کہا میں نے ویسا ہی کیا لیکن اب میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ میں .... تم سے محبت کرتی ہوں۔"

اباقہ نے جیسے اس کے الفاظ سنے ہی نہیں۔ خلا میں گھورتا ہوا بولا۔ "لیکن میں بھی کسی سے محبت کرتا ہوں اور یہ محبت میرے جسم میں ایسے شامل ہے جیسے .... جیسے آسمان میں نیلا رنگ۔" پھر وہ چونک کر بولا۔ "یاکی! تُو بہت اچھی لڑکی ہے۔ آ میرے ساتھ مجھے بتا کون شخص تجھے اور تیرے باپ کو تنگ کرتا ہے؟"

"نہیں اباقہ! وہ بہت خطرناک شخص ہے۔" یاکی خوفزدہ ہو کر بولی۔

اباقہ نے اس کا بازو پکڑ لیا اور پہاڑ کی چوٹی کی طرف بڑھا۔ اس کے انداز میں ایک ہیجانی کیفیت تھی جیسے کوئی آتش فشاں اندر ہی اندر کھول رہا ہو۔ پہاڑ کی دوسری جانب لڑکی کا گاؤں تھا۔ آخر وہ چوٹی پر پہنچ گئے۔ اباقہ نے دیکھا دامن کی سرسبز ترائی میں ایک چھوٹی سی بستی دکھائی دے رہی ہے۔ پچھلے پہر کی دھوپ میں چھوٹے چھوٹے سفید خیموں کے درمیان پالتو جانور گھوم پھر رہے ہیں۔ اباقہ لڑکی کو کھینچتا ہوا اس بستی میں پہنچا۔ لوگوں نے مضبوط جسم اور لمبے بالوں والے اس اجنبی کو یاکی کے ساتھ دیکھا اور حیران رہ گئے۔ وہ بغیر کسی سے بات کئے بستی کے عین درمیان پہنچ گیا۔ پھر اس کی غضبناک آواز گونجی۔

"کون ہے وہ شخص جو اس لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے؟" اس کے اردگرد موجود لوگ بالکل خاموش تھے۔ چند ہی لمحے میں اباقہ کے گرد ایک مجمع لگ گیا۔ اباقہ نے ایک بار پھر اپنے الفاظ دوہرائے۔ "کون ہے وہ شخص جو اس لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے؟"

ایک بوڑھا شخص اباقہ کو جواب دینے کے لئے آگے بڑھا لیکن اس وقت دبی دبی سرگوشیاں سنائی دیں۔ لوگوں نے مڑ کر دیکھا اور کسی کو آگے آنے کے لئے راستہ دینے لگے۔ اباقہ نے دیکھا ایک بہت موٹی گردن والا لحیم شحیم شخص لوگوں کو دونوں ہاتھوں سے پیچھے ہٹاتا ہوا آگے بڑھ رہا ہے۔ اس کے جسم پر برفانی چیتے کی کھال تھی اور سر پر سمور کی ایک بہت بڑی ٹوپی۔ وہ کسی مست ہاتھی کی طرح جھولتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔

اس کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی ایک لمبی لاٹھی سے پتہ چلتا تھا کہ وہ چرواہا ہے۔ اباقہ کے سامنے وہ خم ٹھونک کر کھڑا ہو گیا وہ ایک بدشکل شخص تھا اس کے بازو پر کندھے کے قریب ایک سفید کپڑا لپٹا ہوا تھا۔ کپڑے پر پیپ اور خون کے داغ صاف دیکھے جا سکتے تھے۔

"میں شادی کرنا چاہتا ہوں اس لڑکی سے۔" چرواہا گھن گرج سے بولا۔

اباقہ نے اس کے عین سامنے پہنچ کر کہا۔ "تم اس لئے شادی کرنا چاہتے ہو کہ لڑکی اور اس کا باپ تمہارے مقروض ہیں۔ یہ لو ان کا قرضہ ادا ہو گیا۔" اباقہ نے یہ کہتے ہوئے اپنی صدری میں ہاتھ ڈالا اور ہیرے کا ہار چرواہے کی طرف بڑھا دیا۔ چرواہے نے ہار دیکھا اور اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ وہ بڑے غور سے ان بیش بہا پتھروں کو دیکھ رہا تھا۔ بستی کے دو اور آدمی بھی قریب آ کر ہار کا معائنہ کرنے لگے۔

"کک .... کون ہے تُو؟" آخر چرواہا بولا۔ "یہ ہار کہاں سے ملا ہے تجھے؟"

اباقہ نے چرواہے کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی طویل لاٹھی پکڑی اور سرسراتے لہجے میں بولا۔ "میں کوئی بھی ہوں لیکن یاد رہے اب اس لڑکی اور اس کے باپ پر کوئی ظلم نہ ہو۔ ورنہ ...." فقرہ ادھورا چھوڑ کر اس نے چرواہے کی مضبوط لاٹھی دونوں ہاتھ میں پکڑی اور زور سے گھٹنا مار کر توڑ دی۔ پھر اس نے دونوں ٹکڑوں کو باہم ملایا اور ایک بار پھر گھٹنے پر مار کر توڑا۔ اب لاٹھی کے چار ٹکڑے تھے۔ اس نے چاروں ٹکڑے ملائے۔ مجمع حیرت سے گنگ یہ تماشہ دیکھ رہا تھا۔ کسی کو یقین نہیں تھا کہ یہ ٹکڑے پہلے کی طرح ٹوٹ جائیں گے لیکن اباقہ نے ایک بار پھر زور سے گھٹنا مارا اور لاٹھی کے آٹھ ٹکڑے ہو گئے۔ یہ سب کچھ چند لمحوں میں ہو گیا۔ لوگ سکتے کے عالم میں کھڑے ناقابل یقین نگاہوں سے اباقہ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اس کی سخت جانی حیران کن تھی۔ اباقہ خوفناک لہجے میں بولا۔

"چرواہے! تُو ایک تیر برسوں سے جسم میں لئے پھرتا ہے۔ اس لئے نہیں نکلواتا کہ تجھے درد ہو گا لیکن جو شخص تیرے سامنے کھڑا ہے اسے "درد" اتنا ہی عزیز ہے جتنا تجھے اپنا ریوڑ اور اپنی جان۔"

مجمع خوفزدہ انداز میں منتشر ہونے لگا۔ اب اباقہ کے پاس صرف یاکی اور اس کا باپ کھڑے تھے۔ چند قدم دور چرواہا بھی نظر آ رہا تھا۔ اباقہ گرج کر بولا۔

"جو میں نے کہا تمہاری سمجھ میں آیا؟"

چرواہے نے تھوک نگل کر زور زور سے سر ہلایا پھر آگے بڑھ کر ہار اباقہ کو واپس لوٹانے لگا۔ اباقہ بولا۔ "نہیں اسے لے جاؤ۔" چرواہے نے کپکپاتے ہوئے ہاتھوں سے ہار اپنے لباس میں رکھا اور تیز قدموں سے واپس چلا گیا۔ بوڑھا اباقہ کی بلائیں لے رہا تھا۔ یاکی حیرت سے گنگ اس کا چہرہ تکے جا رہی تھی۔ اباقہ نے کہا۔

"یاکی! میں تیرے اور تیرے باپ کے ذمے ایک کام لگاتا ہوں۔ غار میں قید شخص مجھے بہت عزیز ہے۔ تم دونوں کو اس کا خیال رکھنا ہو گا لیکن اسے دس روز سے پہلے آزاد نہیں ہونا چاہئے۔ میرا وعدہ ہے کہ آزاد ہو کر وہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا۔"

پھران دونوں کو ضروری ہدایات دے کر وہ واپس پلٹا۔ تب اسے احساس ہوا کہ یاکی رو رہی ہے۔ اس نے مڑ کر دیکھا اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اباقہ نے کہا۔

"یاکی! گھبرانا مت میں ہمیشہ تیرے قریب رہوں گا۔"

یاکی نے کہا۔ "ذرا رکو قیدی۔" پھر وہ بھاگتی ہوئی خیموں کی طرف گئی تھوڑی دیر بعد وہ واپس لوٹی تو اس کے ہاتھ میں ایک لباس تھا۔ چمڑے کا یہ لباس سوئی دھاگے کی مدد سے سیا گیا تھا۔ لباس کی خوبصورتی سے ظاہر تھا کہ اس پر بہت محنت کی گئی ہے۔

یاکی بولی۔ "یہ میں نے تیرے لئے بنایا تھا۔" پھر لباس اس کے ہاتھ میں دے کر وہ تیزی سے واپس پلٹ گئی۔ اباقہ کچھ دیر اسے خیموں کی طرف لوٹتے دیکھتا رہا پھر قدرے بوجھل قدموں سے غار کی طرف چل دیا۔

یاکی اور اس کے باپ سے رخصت ہو کر اباقہ غار میں پہنچا تو اس کے ہاتھ میں ایک تھیلا بھی تھا۔ یورق نے قہرآلود نگاہوں سے اسے گھورا۔ اباقہ نے تھیلا اس کی طرف پھینک دیا اور بولا۔

"یورق! تم نے اس غار میں میری بڑی "خاطرمدارت" کی ہے۔ میں بھی اس تھیلے میں تمہارے لئے پنیر اور گوشت لایا ہوں' لیکن اسے سنبھال کر رکھنا ہو سکتا ہے کسی روز یاکی تمہارے لئے کھانا لانا بھول جائے اور ہاں یاکی سے مدد کی درخواست مت کرنا کیونکہ وہ مدد نہیں کرے گی۔ جس طرح وہ تمہارا حکم ماننے پر مجبور تھی اسی طرح میرا حکم ماننے پر مجبور ہے۔ یہ تمہارا اور میرا معاملہ ہے اس میں اس بیچاری کا کوئی قصور نہیں۔"

یورق بولا۔ "اباقہ! میں آخری بار تجھ سے کہہ رہا ہوں قراقرم مت جا' زندہ نہیں بچے گا۔"

اباقہ نے کہا۔ "سردار یورق! دنیا کی کوئی طاقت مجھے قراقرم پہنچنے سے نہیں روک سکتی۔" پھر یورق پر الوداعی نگاہ ڈالتا ہوا وہ تیزی سے باہر نکل آیا۔

☆-------☆-------☆

منظر مسلم بن داؤد کے خیمے کا تھا۔ وہ دو منگول سالاروں کے ساتھ بیٹھا مے نوشی میں مصروف تھا۔ ایک بڑے طباق میں بکرے کی بھنی ہوئی سالم رانیں رکھی تھیں۔ چاول کی خانہ ساز شراب اب بھی منگولوں میں بڑی مقبول تھی ایک مغنیہ یورت کے کونے میں ایک منقش چوکی پر بیٹھی نغمہ سرائی میں مصروف تھی۔ اس کی دور افتادہ گھنٹیوں جیسی آواز داؤد کو کسی اور ہی دنیا میں لے گئی تھی۔ وہ ان دنوں بہت خوش تھا۔ چغتائی خاں جیسے عظیم فاتح کا قرب اسے نصیب تھا۔ پریشانیوں کے تمام بادل چھٹ گئے تھے۔ ہنداس نے اسے

بتایا تھا کہ اباقہ اور اس کا دوست یورق اپنے کسی دشمن کے ہاتھوں ہلاک ہو گئے ہیں۔ منگول لشکر کو قراقرم سے واپس آئے ہوئے دو ماہ ہو چکے تھے اور اب داؤد کو پختہ یقین ہو گیا تھا کہ اباقہ اس دنیا میں موجود نہیں۔ اگر وہ زندہ ہوتا تو شاید قراقرم میں قدم رکھنے والا پہلا شخص وہی ہوتا۔

داؤد ترنگ میں آہستہ آہستہ اپنے پاؤں کو حرکت دینے لگا۔ بڑھاپا اجازت نہیں دیتا تھا ورنہ شاید وہ اٹھ کر رقص ہی کرنے لگتا۔ دفعتاً یورت کا پردہ ہلا اور خادم اندر داخل ہوا۔

"حضور! اباقہ آپ سے ملنا چاہتا ہے۔"

ایک لمحے میں داؤد کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو گیا۔ شراب کی ساری حرارت اور مستی نہ جانے کہاں غائب ہو گئی۔ وہ منہ کھولے حیرت سے خادم کا چہرہ تک رہا تھا۔ مغنیہ کی دور افتادہ آواز اب اس کے کانوں کے بالکل قریب آ گئی تھی وہ کہہ رہی تھی۔

"میرا محبوب شبنم کا قطرہ نہیں جو لرزاں رہتا ہے
میرا محبوب ستارہ نہیں جو ستاروں میں گم رہتا ہے
اور میرا محبوب چاند بھی نہیں جسے بادل ڈھانپ لیتے ہیں
میرا محبوب تو سورج ہے
رات کتنی بھی طویل ہو سورج ضرور نکلے گا
اور جب وہ نکلے گا' چاند تارے اور شبنم کے قطرے ہوا ہو جائیں گے.........."

پھر جیسے داؤد اپنے حواس میں آیا۔ اس کا دل شدت سے دھڑکنے لگا تھا۔ اس نے دونوں سالاروں سے کہا کہ وہ پھر ان سے ملے گا۔ سالار باہر نکل گئے تو اباقہ خادم کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ اس کا چہرہ طویل راستوں کی گرد سے اٹا ہوا تھا۔ مسلم بن داؤد نے آگے بڑھ کر اس کا پرجوش استقبال کیا۔ اس نے جلدی سے چوکی پر سمور کی کھال بچھائی اور اباقہ کو بٹھایا۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے لیکن مصنوعی خوشی چہرے سے پھوٹی پڑتی تھی۔ لرزاں آواز میں بولا۔

"کہاں رہ گئے تھے تم اباقہ۔ میں تو اب مایوس ہو گیا تھا۔ خاقان اوغدائی تک تمہاری گمشدگی کے بارے فکر مند تھا۔ تمہاری تلاش میں ایک دستہ بھی بھیجا گیا تھا۔ ابھی کل ہی وہ دستہ ناکام واپس لوٹا ہے۔"

اباقہ کو اوغدائی یا اس کے بھائیوں کی پریشانی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ صرف اور صرف ماریتا کے بارے جاننا چاہتا تھا۔ گھبراہٹ میں داؤد کی باتیں طویل تر ہوتی جا رہی

تھیں۔ اس کا سازشی ذہن تیزی سے مستقبل کی منصوبہ بندی کر رہا تھا۔ اباقہ اکتا کر بولا۔

"داؤد .... مجھے صرف یہ بتاؤ .... "اپنی بات" تم کب پوری کر رہے ہو۔"

"بہت جلد .... بہت جلد۔" داؤد کی آواز بیٹھ گئی۔ "میں کل ہی خان چغتائی سے بات کرتا ہوں۔ تم بالکل فکر نہ کرو۔"

اباقہ کے جاتے ہی مسلم بن داؤد بے قراری سے خیمے میں ٹہلنے لگا۔ پھر وہ باہر نکلا اور تیزی سے ہینڈاس کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ دعا کر رہا تھا کہ ہینڈاس خیمے ہی میں موجود ہو لیکن یہ دیکھ کر وہ ٹھٹک گیا کہ خیمہ تاریک پڑا ہے۔ ساتھ والا چھوٹا خیمہ ہینڈاس کے خادمین کا تھا۔ ایک خادم نے اسے بتایا کہ ہینڈاس جا چکا ہے۔ "کہاں؟" داؤد کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ پھر اچانک اسے کوئی بات یاد آئی اور وہ لرز اٹھا۔ ہینڈاس نے اسے بتایا تھا کہ وہ ہر "جشن" کے بعد دو ماہ کے لئے پہاڑوں میں نکل جاتا ہے اور اپنی کھوئی ہوئی طاقت حاصل کرنے کے لئے قدرتی آب و ہوا اور خوراک پر گزارہ کرتا ہے۔ اس کا مطلب تھا ہینڈاس جا چکا ہے۔ ایکا ایکی داؤد کی پیشانی پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے۔ وہ کھڑے کھڑے سوچنے لگا' اب کیا ہو گا؟ جو شخص بوغالی اور دھوک جیسے بہادروں کو ہلاک کر چکا ہے وہ اسے کب چھوڑے گا .... صرف چغتائی خاں کی پناہ ہی اسے اس انجام سے بچا سکتی تھی لیکن چغتائی خاں سے وہ کیا کہے گا۔ چغتائی خاں کو جب یہ پتہ چلا کہ اباقہ اسے کیوں قتل کرنا چاہتا ہے تو اس کے طیش کا عالم کیا ہو گا۔ کیا وہ اپنی بیوی داؤ پر لگانے والے کو معاف کر دے گا۔ ہرگز نہیں .... ہرگز نہیں۔ وہ کسی سے مدد طلب نہیں کر سکتا۔ کسی سے نہیں۔

اس نے خوفزدہ نگاہوں سے اردگرد دیکھا۔ اس کے اردگرد سینکڑوں افراد گھوم پھر رہے تھے لیکن اسے لگ رہا تھا وہ اکیلا کھڑا ہے۔ ابھی اباقہ کسی خیمے کی اوٹ سے نکلے گا اور اپنے خنجر سے اس کی شہ رگ کاٹ ڈالے گا۔ اس کے ہونٹ خشک ہونے لگے۔ وہ تیز قدموں سے ایک جانب چل دیا۔

اباقہ دوسرے روز حسب وعدہ مسلم بن داؤد کے خیمے میں پہنچا لیکن اس کے نوکروں نے بتایا کہ مالک کہیں گئے ہوئے ہیں۔ اباقہ واپس چلا آیا۔ یہ رات بھی مارینا کے تصور میں گزر گئی۔ اس کی بے تابی بڑھتی جا رہی تھی۔ منزل پر پہنچ کر بھی وہ منزل سے دور تھا۔ وہ جانتا تھا اس خیمے سے چند سو قدم کے فاصلے پر چغتائی خاں کا خیمہ ہے اور اس کے پہلو میں وہ چھوٹا سا زرنگار خیمہ ہے جس کی دیواروں کے اندر اس کی طویل مہم جوئی کا انعام مارینا کی صورت میں چھپا ہوا ہے۔

دوسرے روز وہ پھر دھڑکتے دل کے ساتھ مسلم بن داؤد کے خیمے پر جا پہنچا لیکن وہ آج بھی موجود نہیں تھا۔ اباقہ کی بے قراریوں کو ہر لحظہ مہمیز لگ رہے تھے۔ اسی شش و پنج میں دو روز اور گزر گئے۔ اس دوران اباقہ چغتائی خاں سے بھی ملا اور اس نے مارینا کے خیمے کے بھی ایک دو چکر لگائے لیکن نہ تو مارینا دکھائی دی اور نہ چغتائی خاں کی باتوں سے کوئی عندیہ ظاہر ہوا۔ صرف یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کی زبردست خدمات کی وجہ سے چغتائی خاں اس کی سابقہ غلطیاں معاف کر چکا ہے۔

تیسرے روز وہ بے چین ہو کر ایک بار پھر مارینا کے یورت کے سامنے جا پہنچا۔ اس نے دیکھا کہ آج یورت کے سامنے ایک مسلح محافظ بھی کھڑا ہے۔ یہ محافظ کل اور پرسوں موجود نہیں تھا۔ یہ تو ظاہر تھا کہ مارینا کو اباقہ کی آمد کا پتہ چل گیا ہو گا لیکن مسلح محافظ کی موجودگی سے یہ بھی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اسے اپنے یورت کے سامنے گھومتے پھرتے دیکھ چکی ہے۔ ایک دم ہی اباقہ کو طیش آنے لگا۔ ابھی تک اس نے اباقہ کو اپنی ایک جھلک نہیں دکھائی تھی۔ ایسا کس لئے تھا؟ اس کا ذہن یہ سمجھنے سے قاصر تھا۔ محافظ کی موجودگی اس کے غضب کو اور ہوا دے رہی تھی۔ اس وقت تو وہ وہاں سے چلا گیا لیکن جب رات بھیگ گئی تو ایک بار پھر آ گیا۔

وہ ایک طوفانی اور اندھیری رات تھی۔ صحرائے گوبی کا ریتلا طوفان قراقرم کو زیر و زبر کر رہا تھا۔ وہ صحرائی بگولوں میں سے کسی آسیب کی طرح برآمد ہوا۔ محافظ ابھی تک چوکس کھڑا تھا۔ اباقہ ایک طیش آمیز بے باکی سے آگے بڑھا۔ محافظ نے سینہ تان کر راستہ روکا لیکن اباقہ ایک صدی سردار تھا۔ محافظ کو مؤدب لہجہ اختیار کرنا پڑا۔

"سردار! تم اندر نہیں جا سکتے۔" آندھی کے شور کی وجہ سے وہ چلا کر بولا۔

اباقہ بولا۔ "اور اگر میں نہ رکوں تو۔"

"تو مجھے تلوار کھینچنا پڑے گی۔"

"تمہیں کچھ نہیں کرنا پڑے گا۔" اباقہ بولا۔ اس کے ساتھ ہی اس کا داہنا ہاتھ فضا میں بلند ہوا۔ فولادی مکہ کسی ہتھوڑے کی طرح پہریدار کے سر پر پڑا۔ وہ ایک کراہ کے ساتھ ڈھیر ہو گیا۔ اس وقت خیمے کا اندرونی ریشمی پردہ ہلا اور اباقہ کے لئے جیسے رات میں دن ہو گیا۔ مارینا اس کے سامنے کھڑی تھی۔ شب خوابی کے لباس میں بال بکھیرے وہ ایک پری نظر آ رہی تھی' لیکن حیران و ناراض پری۔ اس نے اباقہ کے قدموں میں ڈھیر پہریدار کو دیکھا پھر اباقہ کو دیکھا اور ایک دم اس کی آنکھیں شعلے اگلنے لگیں۔ اباقہ اس کے تاثرات سے بے خبر یک ٹک اس کا سراپا دیکھے جا رہا تھا۔ جیسے نگاہوں کی ساری پیاس چند

لمحوں میں بجھا لینا چاہتا ہو۔ دفعتاً مارینا کا ہاتھ آگے بڑھا اس نے اباقہ کا گریبان پکڑا اور جھٹکے سے خیمے میں کھینچ لیا۔ پھر اس کا بھرپور طمانچہ اباقہ کے منہ پر پڑا .... پھر ایک اور طمانچہ پھر ایک اور۔ اباقہ سکتے کے عالم میں کھڑا تھا۔ طوفان کے شور میں اسے ان طمانچوں کی آواز سنائی نہیں دی تھی، کوئی درد بھی محسوس نہیں ہوا تھا لیکن وہ جانتا تھا۔ مارینا نے اسے طمانچے مارے ہیں اور یہ احساس ہر درد پر بھاری تھا۔ اس دوران مارینا کی خادمہ آمنہ بھی جاگ گئی تھی اور حیرت سے یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ مارینا غصے سے سرخ ہو رہی تھی اور چلا رہی تھی۔ پھر اس نے ایک چھڑی اٹھائی اور اباقہ پر پل پڑی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اسے مار رہی تھی اور چیخ رہی تھی۔ "شیطان، بدمعاش، کیوں میرے پیچھے پڑا ہے، کیوں پڑا ہے۔" چھڑی ٹوٹ گئی۔ وہ اسے دوہتڑ مارنے لگی لیکن وہ ساکت کھڑا رہا کسی حیران مجسمے کی طرح۔ پھر وہ نڈھال ہو کر زمین پر گر گئی اور سسکنے لگی۔ اباقہ نے جھک کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ اس نے ایک جھٹکے سے ہاتھ پیچھے ہٹایا اور چلائی۔ "دفع ہو جا جنگلی، اپنی شکل لے کر چلا جا یہاں سے۔ ورنہ کھال کھنچوا دوں گی۔" لیکن اباقہ نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی۔ وہ کھڑا رہا اسی طرح بالکل بے حرکت، مارینا پھر چلائی۔

"چلا کیوں نہیں جاتا یہاں سے، چلا جا؟" پھر وہ بستر پر گری اور رونے لگی۔ وہ روتی رہی، اباقہ کھڑا رہا۔ آمنہ حیرت سے ان دونوں کو دیکھتی رہی اور باہر صحرائی جھکڑ اودھم مچاتے رہے۔ آخر آمنہ آگے بڑھی اس نے اباقہ سے کہا۔

"تو چاہتا کیا ہے اباقہ؟ کیوں اپنی اور مالکہ کی جان کا دشمن ہے، کہیں چلا کیوں نہیں جاتا۔"

"چلا جاؤں گا۔ ہمیشہ کے لئے۔" اباقہ کی پرہیبت آواز طوفان کے شور سے ہم آہنگ تھی۔ "لیکن .... پہلے میری بات سننا ہوگی۔"

آمنہ بولی۔ "کیا کہنا چاہتا ہے تو؟"

اباقہ نے کہا۔ "پہلی بات تو یہ کہ تیری مالکہ کا پہریدار ہلاک نہیں ہوا صرف بے ہوش پڑا ہے۔"

آمنہ بولی۔ "تو چلو اسے اندر لے آئیں کہیں مر ہی نہ جائے۔" اباقہ نے آگے بڑھ کر خیمے کا اندرونی پردہ ہٹایا اور لاپرواہی سے محافظ کو ٹانگ سے پکڑ کر اندر کھینچ لیا۔ آمنہ نے اباقہ کو چوکی پر بٹھایا۔ پھر مارینا سے بولی۔ "مالکہ پہریدار زندہ ہے۔"

مارینا نے روتے ہوئے کہا۔ "آمنہ! اس جنگلی سے کہو میرے خیمے سے نکل جائے۔"

آمنہ بولی۔ "مالکہ! آپ اس کی بات سن لیں۔ یہ وعدہ کر رہا ہے کہ چلا جائے گا اور ہی نہیں آئے گا۔"

مارینا بدستور لیٹی رہی۔ خادمہ نے کسی نہ کسی طرح اسے اٹھا کر بٹھا دیا پھر اباقہ سے لگی۔ "اباقہ تو کیا کہنا چاہتا ہے۔ جلدی سے کہہ، ابھی پہریدار ہوش میں آجائے گا۔"

اباقہ براہ راست مارینا سے مخاطب ہوا۔ "مارینا، تو نے جو کہا میں نے کیا۔ تیرا غصہ سمجھا نہیں۔"

مارینا تیزی سے بولی۔ "کیا کہا تھا میں نے تم سے۔ یہی کہا تھا کہ مجھے بدنام اور ذلیل کرو، میرے یورت کے سامنے گھومو۔ جب جی چاہے میرے پہریدار کو قتل کرو اور اندر آ ۔ اباقہ کیا بگاڑا ہے میں نے تمہارا۔ کیوں ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑے ہو؟"

اباقہ رنجیدہ لہجے میں بولا۔ "مارینا! تو سارے وعدے بھول گئی۔ تو نے ہی تو قید خانے مجھ سے کہا تھا کہ چغتائی خاں کی بات مان لو۔ اس کی شرط پوری کر دو میں تمہاری ہو ں گی۔"

مارینا چونک گئی۔ اس نے اپنی سرخ آنکھیں اباقہ کی طرف اٹھائیں۔ "کیا کہہ رہے تم۔ میں نے تم سے کہا تھا؟"

اباقہ آزردگی سے بولا۔ "تو پھر کس نے کہا تھا مارینا، مسلم بن داؤد نے تو یہی کہا تھا کہ ائی خاں، مارینا کو تمہارے حوالے کر دے گا۔ شرط صرف ایک ہی بتائی گئی تھی اور وہ نے پوری کی۔ قلعے کی برجی میں نے ہی سر کی تھی مارینا۔"

مارینا حیران تھی۔ "برجی، شرط، مسلم بن داؤد؟" دفعتاً اسے احساس ہوا کہ کوئی گڑبڑ ۔ اس شخص کے ساتھ کوئی دھوکا ہوا ہے۔ وہ اٹھ کر اباقہ کے قریب چلی آئی۔ "اباقہ! تفصیل سے بتاؤ۔ مسلم بن داؤد نے کیا کہا تھا تم سے؟"

اباقہ نے کھوئے ہوئے لہجے میں شروع سے آخر تک ساری بات اسے بتا دی۔ مارینا ت سے سنتی رہی۔ اباقہ نے ان مصیبتوں کا ذکر نہیں کیا جو اسے اس کی راہ میں اٹھانا ۔ نہ ہی اس نے ان برفانی راتوں کی داستان سنائی جن کا ہر ہر لمحہ مارینا کی یاد میں گزرا .... لیکن مارینا نے اس کے درد کو طوفان کے تند ریلے کی طرح محسوس کیا۔ اس لے کے ارتعاش سے اس کا بدن لرزنے لگا۔ وہ کانپ اٹھی۔ ایک سیدھے سادے شخص کتنا گھناؤنا مذاق کیا گیا تھا۔ کس نے کیا تھا یہ مذاق؟ مسلم بن داؤد نے چغتائی خاں نے یا ں نے .... کتنی ناانصافی ہوئی تھی اباقہ سے۔ وہ اس کی خاطر صرف اس کی خاطر ہتھیلی پر لئے جنگلوں اور پہاڑوں میں لڑتا رہا تھا اور جب یہ لڑنے والا موت کے بعد

خوش و کامران واپس آیا تھا' اس کا استقبال پھولوں کے ہاروں اور مسکراہٹوں نے نہیں تھپڑوں' گالیوں اور ذلت آمیز سلوک نے کیا تھا۔ وہ تڑپ اٹھی اس نے اشکبار نگاہوں سے اباقہ کی طرف دیکھا اور سر جھکا کر رونے لگی۔ اس کا مطلب ہے یہ سب مسلم بن داؤد کی سازش ہے اور پھر اسے یاد آیا کہ مسلم بن داؤد ہی نے اس سے کہا تھا کہ اباقہ ایک ختائی لڑکی پر فدا ہو گیا تھا۔ یقیناً یہ بھی اس کا ایک جھوٹ تھا۔ اباقہ کے معصوم جذبات سے آگ اور خون کا کھیل کھیلا گیا تھا۔ ایکا ایکی اسے اباقہ پر بے پناہ ترس آیا۔ وہ کراہ اٹھی "مجھے معاف کر دے اباقہ' معاف کر دے۔ یہ لے چھڑی اور جتنا میں نے تجھے مارا ہے مجھے مار لے۔ لے پکڑ۔" وہ چھڑی اس کی طرف بڑھا رہی تھی۔ اباقہ نے اس کے ہاتھ سے چھڑی لے کر پھینک دی۔ مارینا بولی۔

"اباقہ! تو سچا ہے' میں جھوٹی تھی۔ واقعی تجھے اس خیمے میں آنے اور مجھ سے ملنے کا حق تھا...... اور اگر یہ حق تجھے میرے شوہر نے دیا ہے تو میں وعدہ کرتی ہوں کہ ابھی اور اسی وقت تیرے ساتھ چلوں گی .... تو یہیں رک میں' ابھی آتی ہوں۔"

مارینا نے جسم پر ایک شال لپیٹی اور نہایت غضب کے عالم میں خیمے سے باہر نکل گئی۔ آمنہ اسے روکتی ہی رہ گئی۔ تند و تیز جھکڑوں میں سر جھکا کر چلتی وہ چغتائی کے یورت میں پہنچی۔ پہریدار اسے دیکھ کر پیچھے ہٹ گیا۔ مارینا اندر داخل ہوئی۔ چغتائی گہری نیند سویا ہوا تھا۔ اس کے پاس ہی ایک حسین لڑکی بیہودہ لباس میں موجود تھی۔ مارینا نے جھنجوڑ کر چغتائی کو جگایا۔ وہ اپنی محبوب بیوی کی آنکھوں میں طیش کی بجلیاں دیکھ کر چونک گیا ٹھنڈے پانی کا پیالہ پی کر اس کے حواس کچھ ٹھکانے آئے اور اس نے مارینا سے اس بے وقت آمد کی وجہ دریافت کی۔ مارینا نے اس سے وہی بات پوچھی جو اباقہ نے بتائی تھی۔ چغتائی حیران نظر آنے لگا۔ پھر ذہن پر زور دیتا ہوا بولا۔

"مارینا! یقین کر میں نے داؤد سے کبھی کوئی ایسی بات نہیں کہی' اور تو جانتی ہے کہ نشے کی حالت میں کہی ہوئی بات بھی ہمیشہ یاد رہتی ہے۔ تو خود ہی سوچ میں یعنی چنگیز خان کا بیٹا اپنی بیوی کو یوں داؤ پر لگا سکتا ہوں۔" اس کا چہرہ فرط غضب سے تمتما رہا تھا۔ پھر بولا۔ "ہاں مجھے یاد آیا اس وقت داؤد نے کہا تھا کہ وہ اباقہ کو ختا کی مہم پر جانے کے لئے تیار کر سکتا ہے' لیکن کیسے یہ اس نے نہیں بتایا تھا' اب مجھے اندازہ ہوا یقیناً اس بدبخت نے اپنی طرف سے یہ بات بنائی ہو گی۔"

اباقہ چغتائی کے یورت کے ساتھ لگا یہ باتیں سن رہا تھا۔ طوفان کچھ دیر کے لئے رک سا گیا تھا۔ خیموں کے پھڑپھڑاتے ہوئے ہیولے ساکت تھے .... لیکن خاموشی اباقہ کے

اور ایک نئے طوفان کو جنم دے رہی تھی۔ اس کے بکھرے ہوئے بال پیشانی پر لہرا رہے تھے۔ سانس تیزی سے آ جا رہی تھی۔ اس کے نتھنے غیر معمولی طور پر پھولے ہوئے تھے .... اس کا مطلب تھا مسلم بن داؤد ہی اس کا مجرم تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اس سے بچتا پھر رہا تھا۔ اس نے اس کے ساتھ بہت بڑا فریب کیا تھا اور شاید اسے مروانے کی کوششیں بھی اسی نے کی تھیں۔ مختلف کڑیاں اباقہ کے ذہن میں مربوط ہو رہی تھیں۔ وہ اپنے ازلی دشمن کو پہچان چکا تھا۔ اس نے دل میں سوچا۔ "اے شیطان میں تجھے زمین کی تہوں میں بھی نہیں چھوڑوں گا۔ کبھی نہیں چھوڑوں گا۔"

☆ ——— ☆ ——— ☆

وہ بھاگتا ہوا مسلم بن داؤد کے خیمے میں پہنچا۔ حسب توقع وہ وہاں موجود نہیں تھا۔ وہ طوفان کی طرح ساتھ والے خیمے میں گھس گیا۔ اس خیمے میں داؤد کے خادمین براجمان تھے۔ "کہاں ہے تمہارا مالک؟" اباقہ گرجا۔ اباقہ اب منگول لشکر کی ایک جانی پہچانی شخصیت تھا۔ یہ سب خادم اباقہ کو جانتے تھے۔ اس کا طیش دیکھ کر وہ ہراساں ہو گئے۔ وہ اب تک اباقہ سے جھوٹ بول رہے تھے۔ درحقیقت داؤد تین روز پیشتر ہی قراقرم چھوڑ چکا تھا۔ اباقہ نے زناٹے کا تھپڑ ایک خادم کے منہ پر مارا۔ تھپڑ اتنا شدید تھا کہ وہ چکرا کر گرا اور بے ہوش ہو گیا۔ دوسرے یہ منظر دیکھ کر سہم گئے۔ ایک خادم نے بتایا کہ داؤد ہنڈاس کے پاس ہے۔

"کون ہنڈاس؟" اباقہ غرایا۔

"وہ ایک بلغارین پہلوان ہے اور آج کل مغربی پہاڑوں میں خیمہ زن ہے۔ مالک اسی کی تلاش میں گئے ہیں۔" تھوڑی دیر بعد اباقہ سرپٹ گھوڑا دوڑاتا قراقرم سے نکل رہا تھا۔ اس کا رخ مغربی پہاڑوں کی طرف تھا۔ ساری رات اور سارے دن کے مسلسل سفر کے بعد وہ مغرب کے سرسبز پہاڑوں میں پہنچ گیا۔ یہ جگہ قراقرم اور جھیل بالکش کے درمیان کہیں واقع تھی۔ جب تیسرے دن کا سورج نصف نہار پر تھا۔ وہ پہاڑوں کے درمیان ایک چھوٹا سا خیمہ ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ خیمہ نشیب میں گھاس کے سرسبز قطع پر ایستادہ تھا۔ اباقہ سمجھ گیا کہ یہی ہنڈاس کا ٹھکانہ ہے۔ وہ دشوار گزار ڈھلوان سے اترتا ہوا خیمے کے سامنے پہنچا۔

"ہنڈاس!" اس کی آواز پہاڑوں میں گونجی لیکن خیمے کے اندر کوئی حرکت پیدا نہ ہوئی۔ اس نے چند قدم آگے بڑھ کر دیکھا۔ خیمہ خالی تھا۔ "ہنڈاس!" وہ ایک بار پھر زور سے پکارا۔ اس کی آواز کی بازگشت سنائی دی۔ "ہنڈاس .... ہنڈاس۔" تب

نزدیکی چوٹی کے عقب سے ایک ہیولا برآمد ہوا۔ یہ ہینڈاس تھا۔ اس کا عریاں جسم سنہری
دھوپ میں چمک رہا تھا۔ اس کے پیچھے .... اس کے پیچھے مسلم بن داؤد تھا۔ ہینڈاس
کی آواز گونجی۔

"میں یہاں ہوں اباقہ۔ میں یہاں ہوں اباقہ۔" اس کی آواز وادی میں گونجی۔

اباقہ زور سے بولا۔ "ہینڈاس' مسلم بن داؤد کو میرے حوالے کر دو۔"

ہینڈاس بولا۔ "اباقہ' داؤد تک پہنچنے کے لئے تمہیں میری لاش سے گزرنا ہوگا اور
میری لاش گرانے کے لئے تمہارے جیسے دس بونے بھی ناکافی ہیں۔"

اباقہ کے نتھنے پھولتے جا رہے تھے۔ اس کی آنکھوں کی قاتل سرخی ہر لحظہ نمایاں ہو
رہی تھی۔ "سفید بندر" وہ زیر لب غرایا اور تیزی سے ڈھلوان پر چڑھنے لگا۔ ہینڈاس بھی
پھلانگتا ہوا نیچے آ رہا تھا۔ آخر ایک ہموار سطح پر دونوں ایک دوسرے کے سامنے آ گئے۔
ہینڈاس گہری نظروں سے اباقہ کو دیکھ رہا تھا۔ ہوا میں لہراتے ہوئے لمبے بال' میلی کچیلی فوجی
وردی' کئی دنوں کی بڑھی ہوئی داڑھی اور سفید متحرک آنکھیں۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا
کہ یہی وہ لڑکا ہے جو اباقہ کے نام سے پورے قراقرم میں مشہور ہے' جس کی چالاکی' بہادری
اور سخت جانی کو مثال بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ وہ سوچ رہا تھا کیا اسی لڑکے نے سردار بوقا
اور دھووک جیسے کہنہ مشق بہادروں کو زیر کیا ہے۔ دوسری طرف اباقہ اس پہاڑ جیسے
پہلوان کو نگاہوں میں تول رہا تھا۔ اس نے صرف ایک لنگوٹ پہن رکھا تھا اور تمام جسم پر
کسی تیل کی مالش کی ہوئی تھی۔ ہر ہر مسل اور رگ صاف نظر آ رہی تھی۔ اگر کہا جاتا کہ
یہ ایک ہاتھی اور چیونٹی کا مقابلہ تھا تو بے جا نہ ہو گا۔

☆======☆======☆

خاقان اوغدائی اپنے عالیشان یورت میں بیٹھا تھا۔ اپنے چھوٹے بھائی تولوئی کی موت
کے بعد وہ کثرت سے شراب نوشی کرنے لگا تھا۔ چغتائی نے اسے سختی سے منع کیا تھا مگر
اوغدائی نے کہا تھا۔ "چغتائی' تولوئی نے میری بیماری پی اور مجھ پر قربان ہو گیا۔ اس کا غم ہر
وقت پریشان رکھتا ہے۔"

چغتائی نے بڑے بھائی کی حیثیت سے خاقان کو حکم دیا تھا کہ وہ ایک دن میں چھ سے
زیادہ جام نہ پیا کرے لیکن خاقان نے اس بندش کا حل یہ نکالا تھا کہ جام پہلے سے بڑے
بنوا لئے تھے۔ اس وقت بھی وہ ایک بڑے جام میں شراب پی رہا تھا جب اس کا ایک افسر
تیزی سے اندر داخل ہوا۔ اس افسر کو چغتائی نے ہی مقرر کر رکھا تھا اور اس کی ذمے داری
تھی کہ جب خاقان کھا رہا ہو یا شراب پی رہا ہو تو وہ اس کے قریب موجود رہے۔ یہ افسر

جانتا تھا کہ خاقان نے بڑے جام بنوا لئے ہیں اور بڑے بھائی کی حکم عدولی کر رہا ہے لیکن وہ
خاقان کی شکایت کی جرأت کیونکر کر سکتا تھا۔ الٹا وہ خاقان کی پہریداری کے فرائض انجام
دیا کرتا تھا۔ اس وقت بھی افسر نے خاقان کو بروقت اطلاع دے دی کہ چغتائی' خاقان کے
یورت کی طرف آ رہا ہے۔ خاقان نے جلدی سے بڑے جام چھپانے کا حکم دیا اور بھائی کا
استقبال کرنے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ دونوں بھائی باتیں کرتے ہوئے منقش چوکی پر آ
بیٹھے۔ خاقان نے کہا۔

"چغتائی میں نے ہی تمہیں بلوایا تھا دراصل ایک مسئلہ درپیش ہے۔" چغتائی ہمہ تن
متوجہ ہو گیا۔ خاقان بولا۔ "میں تولوئی کی بیوہ سیوراقطی کے متعلق پریشان رہتا ہوں۔ وہ
نوجوان ہے خوبصورت ہے لیکن بہت دکھی اور تنہا ہے۔ میں نے اسے بھی بلایا تھا۔ میں
چاہتا ہوں ہم دونوں ہر طرح اس کی دلجوئی کریں۔"

اتنے میں خادم نے آ کر ادب سے عرض کی کہ تولوئی خاں کی محترم بیوی سیوراقطی'
باریابی کی خواہاں ہیں۔ اوغدائی اور چغتائی اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے۔ یورت کا دبیز ریشمی
پردہ ہلا اور سیوراقطی اندر داخل ہوئی۔ وہ متانت اور خوبصورتی کا مجسمہ دکھائی دے رہی
تھی۔ دھیمے قدموں سے چلتی وہ مرحوم شوہر کے بھائیوں کے پاس آ بیٹھی۔

کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد خاقان نے نہایت ملائمت سے کہا۔
"سیوراقطی' میرے بھائی اور تیرے خاوند تولوئی نے میرے لئے بڑی قربانی دی۔ میں اس
کے خانوادے کا احسان مند ہوں۔ مجھ سے کچھ مانگ سیوراقطی تُو جو مانگے گی میں دوں
گا۔"

سیوراقطی نے چونک کر خاقان کی طرف دیکھا۔ اس کی سوگوار آنکھیں گہری سوچ
میں ڈوب گئیں۔ پھر اس کے چہرے پر ایک غیر مرئی تبسم دکھائی دیا۔ وہ بولی۔ "آپ کے
ہوتے ہوئے مجھے کسی شے کی ضرورت نہیں' خاقان محترم اور پھر میرے پاس تولوئی کی
یادیں بھی تو ہیں۔ ان یادوں کے سہارے میں باقی زندگی بہ آسانی گزار سکتی ہوں۔"

خاقان بولا۔ "پھر بھی سیوراقطی کچھ تو مانگ۔"

تب سیوراقطی کے ہونٹوں پر ایک پُراسرار تبسم دکھائی دیا' ایک پُراسرار اور فاتحانہ
تبسم۔ اس کی زبان پر ایک نام تھا .... اور یہ نام کسی بھی وقت اس کے ہونٹوں پر آیا
چاہتا تھا۔ یہ نام اس جنگلی کا تھا جو چغتائی کی بیوی مارینا کے دل میں بستا تھا۔

لیکن سیوراقطی نہیں جانتی تھی' کوئی بھی نہیں جانتا تھا اباقہ کس منزل پر پہنچ چکا
ہے۔ ٹھیک اس وقت قراقرم سے قریباً چھ منزلوں کی مسافت پر مغرب کے سرسبز پہاڑوں

میں ایک فیصلہ ہو رہا تھا۔ مغرب کا جسیم پہلوان اور مشرق کا فولادی انسان ایک دوسرے کے سامنے تھے۔ ہینڈاس کا اعتماد دیدنی تھا۔ وہ دونوں بازو پھیلائے اباقہ سے چند بالشت کے فاصلے پر کھڑا تھا .... اور تب اباقہ کے پاؤں نے حرکت کی۔ وہ پنجوں کے بل اچھلا اور اس کے سر کی سنگ پاش ٹکر ہینڈاس کے سینے پر لگی۔ ہینڈاس کے پہاڑ جیسے جسم میں زلزلہ پیدا ہوا لیکن اس نے اپنی جگہ سے جنبش تک نہ کی۔ بلا توقف اباقہ نے دوسری ٹکر اسی جگہ ماری' پھر اسی تیزی سے تیسری اور چوتھی ٹکر بھی ہینڈاس کے سینے پر لگی۔ چوتھی ٹکر انتہائی زوردار تھی۔ ہینڈاس کا پندھار ٹوٹ گیا۔ وہ لڑکھڑایا اور پتھروں پر جا گرا لیکن فوراً ہی ایک غراہٹ کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ اس نے اباقہ کی زوردار ٹھوکر اپنے ہاتھ پر روکی اور اس کا پاؤں تھام لیا لیکن ایک لمحہ ضائع کئے بغیر اباقہ نے اچھل کر دوسری ٹانگ اس کے منہ پر ماری اور اس کے ہونٹوں سے خون کا فوارہ ابل پڑا۔ ہینڈاس نے اپنے پاؤں پر ٹپکتا ہوا خون دیکھا اور دیوانگی کے عالم میں اباقہ پر چھلانگ لگا دی۔ اتنے بھاری بھرکم جسم سے اباقہ کو ایسی پھرتی کی توقع ہرگز نہیں تھی۔ اس نے خود کو بچانے کی کوشش کی لیکن ہینڈاس اسے لیتا ہوا سنگلاخ زمین پر گرا۔ نہایت پھرتی سے اس نے ایک ایسا داؤ لگایا کہ اباقہ بے بس ہو گیا .... وہ بلغارین پہلوان کے خطرناک ترین داؤ میں پھنس چکا تھا۔ اس کی گردن پہلوان کے آہنی بازو میں تھی اور وہ ہر لحظہ گرفت سخت تر کر رہا تھا۔ اباقہ کے جسم کا زاویہ ایسا تھا کہ وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ صرف وہ اپنی کہنی سے ہینڈاس کی ناف کو نشانہ بنا سکتا تھا لیکن جب بھی وہ ایسا کرنے کے لئے اپنا جسم موڑ کر ہینڈاس کے قریب لاتا وہ اس کی گردن پر اچانک دباؤ بڑھا دیتا اور اباقہ تڑپ کر پیچھے ہٹ جاتا۔ کشمکش جاری رہی۔ آخر اباقہ کو احساس ہونے لگا کہ اس کی گردن پہلوان کے بازو سے کبھی نہ نکل سکے گی۔ اب اس کا دم گھٹنے لگا تھا اور آنکھوں میں بتدریج اندھیرا چھا رہا تھا۔ پتھروں سے ٹکرانے اور گرنے اٹھنے سے دونوں کے جسم چھل چکے تھے' دونوں بری طرح ہانپ رہے تھے۔ اب پہلوان اپنی بے پناہ طاقت کے ساتھ اباقہ کی گردن توڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس وقت اباقہ کے کانوں میں سردار یورق کے الفاظ گونجنے لگے۔ "اباقہ قراقرم نہ جا .... زندہ نہیں بچو گے۔" تو کیا شامان کا کہا سچ ثابت ہو رہا تھا۔ اباقہ نے ڈوبتے ذہن کے ساتھ سوچا۔ اس کے ساتھ ہی اسے اپنے مدمقابل کی بے پناہ طاقت کا احساس ہوا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے مارینا کا چہرہ گھوما اور وہ سمجھ گیا کہ اس کا آخری وقت آ گیا ہے۔ اس کی دھندلائی ہوئی نگاہیں پہلوان کی توانا پنڈلیوں اور ننگے پاؤں پر مرکوز تھیں۔ پہلوان کے دائیں پاؤں میں صرف چار انگلیاں تھیں۔

چشم فلک حیرت سے موت اور زندگی کی یہ جنگ دیکھ رہی تھی۔ بلغارین پہلوان کسی قیمت پر .... اباقہ کی گردن چھوڑنے کو تیار نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا اگر ایک بار اباقہ اس کے داؤ سے نکل گیا تو پھر اسے قابو کرنا ناممکن ہو گا۔ وہ اس کے جسم میں دوڑنے والی بجلیوں کا اندازہ کر چکا تھا۔ وہ اس کی غضبناک غراہٹیں بھی سن چکا تھا .... اباقہ کا چھوٹ جانا ایسا ہی تھا جیسے کسی آدم خور درندے کا پنجرے سے نکل آنا۔ وہ چاہتا تھا کہ یہ درندہ اس پنجرے میں دم گھٹ کے مر جائے اور وہ اپنی پوری قوت صرف کر رہا تھا۔ وہ انتظار کر رہا تھا کہ اباقہ اس کی ناف کو نشانہ بنانے کے لیے ایک بار پھر اپنا جسم موڑے اور وہ ایک بھرپور جھٹکا دے کر اس کی گردن توڑ ڈالے' لیکن اباقہ بھی ہینڈاس کی نیت بھانپ چکا تھا۔ دیر ہوئی اس نے اپنا جسم موڑنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ دفعتاً اباقہ کی نظر چٹان کے کنارے کی طرف اٹھ گئی۔ اس نے ڈوبتے ذہن کے ساتھ ایک آخری کوشش کا فیصلہ کیا اور ہینڈاس کو کنارے کی طرف دھکیلنے لگا۔ جب تک ہینڈاس کی چال سمجھتا وہ کنارے کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا .... ہینڈاس کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اباقہ کیا چاہتا ہے وہ اسے دھکیل کر نیچے کھڈ میں گرانے سے تو رہا۔ اگر وہ ایسا کرتا تو یقیناً خود بھی ساتھ ہی گرتا کیونکہ اس کی گردن ہینڈاس کے بازو میں تھی۔ پھر وہ کیا کر رہا ہے .... کیوں اسے کھڈ کی طرف دھکیل رہا ہے۔ کیوں دھکیل رہا ہے؟ .... ہینڈاس کا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا۔ یہ تو سراسر خودکشی ہے .... لیکن میں خودکشی نہیں کروں گا۔ میں اس کی گردن چھوڑ کر اسے کھڈ میں دھکیل دوں گا۔ ہینڈاس اب بالکل کنارے پر پہنچ چکا تھا۔ پھر جان بچانے کے فطری عمل کے تحت اس نے اباقہ کی گردن چھوڑ دی .... بس یہی لمحہ اس کے لیے قیامت بن گیا۔ اس سے پیشتر کہ وہ پینترا بدل کر اباقہ کو کھڈ میں دھکیلتا' اباقہ کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح اس کی چھاتی سے ٹکرایا۔ یہ ایک شدید ضرب تھی۔ ٹکر لگتے ہی ہینڈاس جان گیا کہ اب دنیا کی کوئی طاقت اسے کھڈ میں گرنے سے نہیں بچا سکتی۔ اس کے حلق سے ایک دلدوز چیخ نکلی۔ اس کے ہاتھ عقب میں کوئی سہارا ڈھونڈنے کے لیے بڑھے لیکن عقب میں ایک وسیع و عمیق خلا کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ آسمان یکلخت گھوم کر ہینڈاس کی آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ وہ سمجھ گیا کہ گہرے کھڈ کی طرف اس کا آخری سفر شروع ہو چکا ہے۔

☆------☆------☆

ہینڈاس کی آخری چیخ ابھی تک اباقہ کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ پھر اس نے سر اٹھا کر اوپر چوٹی کی طرف دیکھا۔ مسلم بن داؤد کہیں دکھائی نہیں دیا۔ اباقہ نے تیزی

سے پہاڑ پر چڑھنا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ چوٹی پر پہنچ گیا۔ اس کے سامنے حد نگاہ تک قراقرم کی چوٹیاں پھیلی تھیں۔ سیاہ چوٹیوں کے اوپر بادلوں کے سفید پرندے پر پھیلائے آرام کر رہے تھے۔ سرسبز پہاڑیوں کے درمیان کہیں کہیں برساتی نالوں کی سفید لکیریں دکھائی دے جاتی تھیں۔ انسانی نظر کو مبہوت کرنے کے لیے یہ منظر کافی تھا' لیکن اباقہ کی نگاہیں اس منظر میں "حسن" کی بجائے ایک "بدصورتی" کو تلاش کر رہی تھیں۔ وہ بدصورتی جو اس حسین منظر میں کہیں گم ہو گئی تھی۔ وہ مسلم بن داؤد کو دیکھ رہا تھا .... لیکن اس موذی کا کہیں نشان نہیں تھا۔ پھر اباقہ کو دائیں جانب شمال مشرق کی طرف ایک متحرک دھبہ دکھائی دیا۔ یہ ایک گھڑ سوار تھا' لیکن یہ داؤد نہیں ہو سکتا تھا۔ کیونکہ اس کا رخ اباقہ کی طرف تھا۔ آہستہ آہستہ گھڑ سوار کے خدوخال واضح ہونے لگے۔ وہ ایک خاکستری گھوڑے پر سوار تھا۔ اس نے اباقہ کو نہیں دیکھا اور ایک چھوٹا سا چکر کاٹ کر اپنا رخ قراقرم کی جانب پھیر لیا۔ اباقہ نے زور سے آواز دی۔ اس کی آواز پہاڑوں میں گونجی۔ گھڑ سوار ٹھٹک کر رکا۔ اباقہ تیزی سے نیچے اترنے لگا۔ گھڑ سوار بھی آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ پھر ایکدم گھوڑے کی رفتار تیز ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی ایک جانی پہچانی آواز اباقہ کے کانوں سے ٹکرائی .... "اباقہ!" یہ سردار یورق کی آواز تھی وہ خوب اچھی طرح پہچان رہا تھا۔ چند ہی لمحے بعد دونوں ایک دوسرے کے سامنے تھے یورق چھلانگ لگا کر نیچے اترا اور بھاگ کر اباقہ سے لپٹ گیا۔

"اباقہ' تو یہاں کیا کر رہا ہے؟"

اباقہ نے سنجیدگی سے کہا۔ "لیکن سردار تو یہاں کیا کر رہا ہے؟"

یورق تھوڑی دیر اسے دیکھتا رہا پھر اس کا ہاتھ پکڑا اور دونوں گھوڑے کے قریب سرسبز گھاس پر بیٹھ گئے۔ اباقہ کی گردن میں ابھی تک اینٹھن ہو رہی تھی۔ وہ بار بار گردن کو مسل رہا تھا۔ اس کے گھٹنوں اور کہنیوں سے لباس پھٹ چکا تھا اور خون رس رہا تھا یورق نے گہری نظروں سے اس کی ہیت کذائی دیکھی اور بولا۔

"میرا خیال ہے اباقہ تھوڑی دیر پہلے تو کسی سے لڑا ہے؟"

"ہاں!" اباقہ بولا۔ "اس بدبخت کی لاش پہاڑ کی دوسری جانب پڑی ہے۔"

یورق نے بے تابی سے پوچھا۔ "کون تھا وہ؟"

"ہنداس۔" اباقہ نے جواب دیا۔

یورق کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اباقہ اسے قراقرم پہنچنے سے لے کر ہنداس سے لڑائی تک کی کہانی سنانے لگا' یورق دم سادھے سنتا رہا۔ اس دوران اس نے اباقہ

زخموں پر پٹی باندھی اور دونوں نے خشک گوشت کے چند ٹکڑے بھی کھائے۔ آخر یورق بولا۔

"تو اس کا مطلب ہے .... مسلم بن داؤد نے تم سے بہت بڑا دھوکہ کیا ہے .... کاش تم مجھے سب کچھ بتا دیتے۔ تمہیں اتنی مصیبتیں ہرگز نہ اٹھانا پڑتیں .... بہر حال اب بتاؤ کیا ارادہ ہے؟"

اباقہ کھوئے ہوئے لہجے میں بولا۔ "میں مسلم داؤد کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

یورق بولا۔ "لیکن وہ تو تمہارا مسلمان بھائی ہے۔ بھائی کو مارو گے۔"

اباقہ غرایا۔ "میں کسی مسلمان یا عیسائی کو نہیں جانتا۔ جو مجھ سے دشمنی کرے گا میں اس سے دشمنی کروں گا' جو مجھے دھوکا دے گا' میں اسے جان سے مار دوں گا۔"

یورق چند لمحے اس کے سنگین لہجے پر غور کرتا رہا پھر بولا۔ "........ لیکن اس وقت کہاں جانے کا ارادہ ہے؟"

اباقہ فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ "قراقرم کے علاوہ کہیں بھی۔"

یورق کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا وہ آنکھیں پھاڑ کر بولا۔ "تمہارا مطلب ہے تم قراقرم نہیں جاؤ گے؟"

"کبھی نہیں۔" اباقہ بولا' اس کی سفید آنکھوں میں ہلکی ہلکی نمی تیر رہی تھی۔ یورق نے آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگا لیا' لیکن جب وہ جوش میں اسے سینے سے بھینچ رہا تھا اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار دکھائی دیئے۔ اباقہ نے چونک کر اسے خود سے جدا کیا۔ یورق نے اپنا بایاں ہاتھ جلدی سے لبادے میں چھپا لیا۔

اباقہ نے پریشانی سے پوچھا۔ "کیا ہوا تمہارے ہاتھ کو؟"

یورق لاپرواہی سے بولا۔ "کچھ نہیں اباقہ۔" اباقہ نے اصرار کیا تو یورق بولا۔ "تو نے مجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ میں اتنی جلدی تیری قید سے رہا ہو کر یہاں کیسے چلا آیا۔" اور تب ایکا ایکی سب کچھ اباقہ کی سمجھ میں آ گیا۔ اس کے چہرے پر حیرانی برسنے لگی۔ پھر وہ سنگین لہجے میں بولا۔ "تو تو نے اپنا ہاتھ کاٹ دیا سردار۔"

یورق مسکرایا۔ "نہیں جنگلی' سارا ہاتھ نہیں کاٹا۔" (وہ کبھی کبھی پیار سے اسے جنگلی کہہ کر بلاتا تھا۔)

اباقہ نے اس کا ہاتھ لبادے سے کھینچا۔ "اس پر ایک اونی کپڑے کی پٹی لپٹی ہوئی تھی۔ اباقہ نے پٹی کھولی۔ یورق نے کلائی کو زنجیر سے نکالنے کے لیے انگوٹھے کو کلائی کی جڑ تک کاٹ کر پھینک دیا تھا۔ اباقہ نے پشیمان نگاہوں سے یورق کی طرف دیکھا۔ یورق نے

ایک بلند قہقہہ لگایا اور بولا۔ "مجھے اپنا انگوٹھا جانے کا کوئی غم نہیں اباقہ .... تُو نے قراقرم جانے کا ارادہ ترک کر دیا' میرے لیے یہی بہت .... ہے۔ میرے انگوٹھے کی قربانی رائیگاں نہیں گئی۔"

اباقہ بولا۔ "اس کا مطلب ہے تم مجھے واپس لانے کے لیے قراقرم جا رہے تھے؟"

یورق بولا۔ "شاید .... بہرحال اب تو یہ موضوع تم خود ہی ختم کر چکے ہو .... ٹھیک ہے نا؟"

"بالکل!" اباقہ نے عزم سے کہا۔

☆======☆======☆

یاکی اس غار کے دہانے پر اداس بیٹھی تھی۔ بکری کا سفید میمنا اس کی گود میں تھا۔ آج سردار یورق کو غار سے غائب ہوئے دو روز ہو چکے تھے۔ اس نے اپنا انگوٹھا کاٹ کر پھینک دیا تھا اور بازو زنجیر سے نکال کر کہیں چلا گیا تھا۔ اس کے جانے سے یاکی اور بھی اداس ہو گئی تھی۔ وہ سوچتی تھی شاید سردار یورق سے ملنے قیدی (اباقہ) پھر واپس آئے اور نہ بھی آتا تو سردار یورق تو تھا۔ سردار یورق کو دیکھ کر اس سے دو باتیں کر کے یاکی کو یوں لگتا تھا جیسے اس نے اباقہ کی جھلک دیکھ لی ہے۔ سردار یورق تو کیا اس غار کی ہر دیوار ہر پتھر سے اُسے اُنسیت ہو گئی تھی۔ وہ اٹھ کر غار کے اندر چلی آئی۔ اس ویران اور تاریک غار سے اسے بالکل خوف محسوس نہیں ہوتا تھا۔ البتہ یہاں کی ویرانی اس کے لیے تکلیف دہ تھی۔ کبھی اس جگہ آگ کے قریب بیٹھ کر اس نے قیدی سے پہروں باتیں کی تھیں۔ یہیں پر قیدی نے پہلی بار اس کا جسم چھوا تھا۔ .... اس سے محبت کا اظہار کیا تھا .... لیکن وہ سب تو اس کا جھوٹ تھا۔ وہ اپنے سردار سے رہائی حاصل کرنے کے لیے اس سے محبت کا کھیل' کھیل رہا تھا .... لیکن وہ بھی تو اس سے کھیل رہی تھی' لیکن یہ کھیل اس کے لیے روگ بن گیا تھا۔ دفعتاً یاکی چونک گئی۔ دہانے پر آہٹ ہوئی تھی' پھر اس نے دیکھا "جوجو" اندر جھانک رہا ہے۔ وہی چرواہا تھا جو ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑا ہوا تھا جب سے قیدی نے اسے دھمکایا تھا وہ راہ راست پر آ گیا تھا لیکن اس کی خوشامدیں اور منتیں بدستور جاری تھیں۔ پہلے وہ لٹھ لے کر اس کے پیچھے گھومتا تھا لیکن اب بتیسی نکال کر اس کا تعاقب کرتا تھا وہ اِدھر اُدھر دیکھ کر اندر چلا آیا اور خوشامدی لہجے میں بولا۔

"یاکی! تُو اِدھر بیٹھی ہے' میں کب سے ڈھونڈ رہا ہوں۔ یہ دیکھ میں تیرے لیے کیا لایا ہوں۔"

اس نے رومال کھولا اور اندر سے بازوؤں کے بالائی حصے پر پہنے جانے والے

خوبصورت کڑے نکال لیے۔ "یہ دیکھو یاکی' ایسا زیور خاقان کی بیوی کی پاس بھی نہ ہو گا .... میں نے کل ہی ایک خراسانی تاجر سے خریدے ہیں' لے انہیں پہن لے تاکہ میرے دل کو کچھ سکون ہو۔" بڑے احترام سے اس نے کڑے یاکی کی طرف بڑھائے۔

یاکی روہانسے لہجے میں بولی۔ "جا .... جوجو۔ انہیں لے جا' مجھے نہیں چاہیے یہ سب کچھ۔"

جوجو بولا۔ "یاکی! تیرے حسن نے مجھے دیوانہ کر دیا ہے اپنے دیوانے پر یوں ظلم نہ کر۔"

یاکی نظریں جھکائے بیٹھی تھی۔ وہ کوشش کر رہی تھی کہ اس کی نگاہ جوجو کے غلیظ کندھے پر نہ پڑے۔ جوجو اسے نیم رضامندی سمجھ کے آگے بڑھا اور کڑے یاکی کے ہاتھ میں دے دیے۔ یاکی نے جھلا کر کڑے زمین پر پھینک دیئے اور منہ چھپا کر سسکیاں لینے لگی۔ یکدم جوجو کا لہجہ بدل گیا اور وہ غرایا۔ "بے وقوف لڑکی! تیری حماقتیں تجھے مہنگی پڑیں گی۔ مت سوچ کہ وہ قیدی پھر آئے گا۔" اس کی آواز غار میں گونجی۔ اس وقت دہانے پر گھوڑوں کی ٹاپیں سنائی دیں .... اور ایک ہیولا نظر آیا۔ یاکی نے چونک کر دیکھا۔ اس کی گود میں بیٹھا بکری کا بچہ منمنایا .... "قیدی!" یاکی کے ہونٹوں سے سرسراتی ہوئی آواز نکلی اور وہ دہانے کی طرف لپکی۔ اباقہ سے چند قدم کے فاصلے پر رک کر وہ اسے دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو لرز رہے تھے۔ وہ بولی۔ "تم آ گئے قیدی!"

"ہاں!" اباقہ بولا۔ "اور اب یہیں تمہارے پاس رہوں گا۔" یاکی پر شادیٔ مرگ کی کیفیت طاری تھی۔ اسے الگ رہا تھا جیسے اس کا دل میمنے کے دل سے بھی تیز دھڑک رہا ہے۔ وہ اس بے پایاں مسرت کو چھپانے کے لیے بھاگ کھڑی ہوئی۔ غار سے باہر اسے سردار یورق گھوڑے باندھتا دکھائی دیا۔ ایک لمحہ رک کر یاکی نے اسے دیکھا۔ پھر شرما کر نگاہیں جھکا لیں اور ہرنی کی طرح پتھروں کو پھلانگتی ہوئی بستی کی طرف نکل گئی۔

غار کے اندر اباقہ قہر آلود نگاہوں سے جوجو کو گھور رہا تھا۔ لمبا تڑنگا جوجو بھیگی بلی بنا کھڑا تھا۔ اباقہ نے گرج کر پوچھا۔

"چرواہے' تُو یہاں کیا کر رہا تھا؟"

جوجو گھگھیایا۔ "کچھ نہیں اجنبی .... کچھ بھی نہیں' تم یاکی سے پوچھ لو میں نے کچھ نہیں کیا۔"

عقب سے سردار یورق بولا۔ "اگر کچھ نہیں کیا تو کھڑا منہ کیا دیکھتا ہے .... جا

یہاں سے۔"

جوجو بوکھلاہٹ میں دہانے کی طرف لپکا۔ اباقہ نے جھک کر رومال میں بندھے ہوئے کڑے اٹھائے اور بولا۔ "یہ لیتا جا چرواہے۔ شاید تیری کسی بکری کے ہیں۔" جوجو گھبرا کر مڑا' پھر اباقہ سے کڑے لے کر بھاگتا ہوا نکل گیا۔

یاکی کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ وہ اپنے بوڑھے باپ کو لے کر غار میں پہنچی۔ وہ بھی بہت خوش دکھائی دیتا تھا۔ اس نے اباقہ اور یورق سے کہا کہ وہ دونوں اس کے ساتھ بستی میں ٹھہریں لیکن اباقہ اس غار میں رہنے پر مصر تھا۔ اس کی ساری زندگی غاروں میں گزری تھی اور غار اسے خیموں سے زیادہ آرام دہ معلوم ہوتے تھے۔ شام تک یاکی نے غار کے کئی چکر لگائے اور بہت سی ضروری اشیاء غار میں پہنچا دیں۔

☆-----☆-----☆

قراقرم میں خاقان کے زرتار خیمے کا منظر تھا۔ اوغدائی اور چغتائی منقش چوکی پر آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ خاقان اوغدائی کہہ رہا تھا۔ "چغتائی .... ذرا سمجھنے کی کوشش کرو۔ یہ بڑا گھمبیر معاملہ ہے۔ تولوئی خان کے ہم پر بڑے احسان ہیں۔ اب اس کی بیوہ جو چیز ہم سے مانگ رہی ہے وہ ہمیں دینا پڑے گی۔ ممکن ہے وہ ہماری آزمائش کر رہی ہو .... اس نوجوان اباقہ کا ملنا نہایت ضروری ہے آخر وہ کہاں جا سکتا ہے؟" چغتائی نے ایک گہری سانس لی اور بولا۔ "اوغدائی .... دراصل کچھ الجھن پیدا ہو گئی ہے۔ میں آخری بار اباقہ سے کوئی دس روز قبل ملا تھا۔ اس رات میری بیوی مارینا میرے یورت میں پہنچی۔ وہ سخت غصے میں تھی۔ اس نے بتایا کہ مسلم بن داؤد نے اباقہ سے زبردست دھوکا کیا ہے۔ اس بدبخت نے اباقہ سے کہا تھا کہ اگر وہ ختا کی مہم سر کر لے تو مارینا اس کے سپرد کر دی جائے گی۔ مجھے اس بات پر سخت طیش آیا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ صبح ہوتے ہی مسلم بن داؤد کی گردن اُڑا دوں گا' لیکن صبح نہ تو مسلم بن داؤد ملا اور نہ اباقہ۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے مسلم بن داؤد اپنی گردن پھنستے دیکھ کر قراقرم سے فرار ہو گیا ہے اور اباقہ اس کے تعاقب میں گیا ہے۔ میں نے چند دستے ان کی تلاش میں روانہ کیے تھے لیکن وہ گھوم پھر کر ناکام واپس آ گئے تھے۔

خاقان نے کہا۔ "چغتائی یہ تمہارا خانگی معاملہ ہے۔ میں کچھ نہیں کہوں گا' لیکن یہ امید ضرور رکھتا ہوں کہ تم اس نوجوان کو ڈھونڈنے کی پوری کوشش کرو گے اور جلد از جلد اسے میرے سامنے پیش کر دو گے۔"

چغتائی بولا۔ "خاقان' میں تیری مجبوری سمجھ رہا ہوں۔ موجودہ حالات میں اباقہ کا ملنا

نہایت ضروری ہے .... لیکن ایک بات سمجھ میں نہیں آتی' سیوراقطنی کو اس کی کیا ضرورت پڑ گئی۔"

خاقان بولا۔ "بات وہی ہے جو میں نے تم سے کہی ہے۔ وہ صرف ہماری آزمائش کر رہی ہے۔ وہ جانتی ہے کہ یہ نوجوان خاقان کی فوج کا ایک اہم جنگجو ہے اور اسے کسی دوسرے کے سپرد کرنا عسکری پہلو سے خاصا حوصلہ طلب ہے۔"

چغتائی نے تائیدی انداز میں سرہلایا پھر اٹھتا ہوا بولا۔

"درست ہے خاقان! میں اباقہ کو ڈھونڈنے کی کوشش کرتا ہوں۔ امید ہے جلد ہی ہم سیورراقطنی کی فرمائش پوری کر سکیں گے۔"

اس روز جب سہ پہر کے وقت دو "یک ہزاری" دستے قراقرم سے اباقہ اور مسلم داؤد کی تلاش میں روانہ ہو رہے تھے' اباقہ سینکڑوں میل دور ایک چٹان پر یاکی کے ساتھ بیٹھا تھا۔ یاکی کے لمبے بال ہوا میں لہرا رہے تھے کبھی کوئی طویل لٹ اباقہ کے چہرے کو بھی چھو جاتی تھی' لیکن وہ ملائم زلفوں کے لمس اور ان سے اڈنے والی جنگلی خوشبو کے احساس سے بالکل بے خبر تھا۔ اس کی نگاہیں دور قراقرم کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ ایک غیر مرئی ہاتھ دھیرے دھیرے اس کے دل میں چٹکیاں لے رہا تھا۔ یاکی ترچھی نگاہوں سے اس کا چہرہ دیکھتی رہی' پھر اس نے سر جھٹک کر زلفوں کا تازیانہ اباقہ کے چہرے پر لگایا وہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگا یاکی کی آنکھوں میں انجانے وسوسے تھے وہ بولی۔

"قیدی .... کہیں پھر چلے تو نہیں جاؤ گے؟"

اباقہ کے چہرے پر جھنجلاہٹ کے آثار دکھائی دیئے۔ اس نے کہا۔ "یاکی! تُو نے کتنی بار مجھ سے یہی سوال کیا ہے اور میں نے کہا .... نہیں جاؤں گا .... اگر تُو اس طرح تنگ کرتی رہی تو شاید ...."

یاکی کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں وہ بولی۔ "میرا دل بڑا پاگل ہے قیدی' خواہ مخواہ تجھے تنگ کرتا ہے اور مجھے بھی۔" پھر وہ اٹھی اور تیز قدموں سے بستی کی طرف لوٹ گئی۔ اباقہ کچھ دیر وہیں پتھر پر بیٹھا رہا پھر سست قدموں سے غار کی طرف چل دیا۔ سردار یورق کہیں شکار کے لیے گیا ہوا تھا۔ اباقہ پتھر سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گیا۔ ذہن بار بار مارینا کی طرف جا رہا تھا۔ وہ دھیان بٹانے کے لیے جان بوجھ کر یورق کے متعلق سوچنے لگا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ منگول سردار کیا چاہتا ہے۔ اسے قراقرم سے دور رکھنے کے لیے وہ منگول فوج میں اپنا عہدہ اپنا رتبہ سب کچھ داؤ پر لگانے کو تیار تھا۔ پُرعیش زندگی چھوڑ کر وہ اس کے ساتھ جنگلی باسیوں کی طرح رہ رہا تھا۔ شاید یہ سب کچھ اس شامان کی پیش گوئی کا نتیجہ تھا

جس نے دعویٰ کیا تھا کہ قراقرم سے اباقہ کی بدنصیبی وابستہ ہے۔ وہ سردار یورق کے متعلق سوچتا سوچتا نیند کی آغوش میں چلا گیا۔ جب دوبارہ اس کی آنکھ کھلی شام ہونے والی تھی۔ سردار یورق تھوڑی دور بیٹھا شکار کے پرندوں کی کھال اتار رہا تھا۔ دونوں باتیں کرنے لگے۔ اس دوران دہانے پر کوئی نظر آیا۔ اباقہ اور یورق سمجھے کہ یاکی رات کا کھانا لائی ہے' لیکن آج یاکی کی بجائے اس کا باپ آیا تھا۔ اس نے بتایا کہ یاکی کی طبیعت خراب ہے۔ اباقہ سمجھ گیا کہ یاکی ناراض ہو گئی ہے۔ اسے اپنے رویے پر افسوس ہوا۔ وہ بیچاری ان کی بہت خدمت کر رہی تھی۔ اس کے بعد دو روز تک یاکی کا باپ ہی کھانا لاتا رہا۔ تیسرے روز پھر یاکی آنا شروع ہو گئی' لیکن اس میں پہلی سی شوخی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ وہ خاموشی سے آتی اور کھانا دے کر چلی جاتی۔ یورق نے اس سے پوچھا بھی لیکن اس نے تسلی بخش جواب نہ دیا۔ اباقہ سے وہ بالکل بات نہیں کرتی تھی۔ یورق سمجھ رہا تھا کہ دونوں میں کچھ ان بن ہے۔ ایک روز یاکی آئی اور حسب معمول سردار یورق کے قریب بیٹھ کر باتیں کرنے لگی۔ تب اس کی نگاہ اباقہ کی طرف اٹھی .... اور جم کر رہ گئی۔ دفعتاً اس کا چہرہ خوشی سے گلنار ہو گیا .... بالکل ایک معصوم بچے کی خوشی تھی۔ اباقہ کے جسم پر وہی لباس تھا جو یاکی نے اسے سی کر دیا تھا۔ اباقہ پتھر سے ٹیک لگائے زیر لب مسکرا رہا تھا۔ اس کے کرخت چہرے پر یہ مسکراہٹ عید کے چاند کی طرح دلکش تھی۔ یورق نے کن اکھیوں سے دونوں کو دیکھا اور خود کو کھانے میں مگن ظاہر کرنے لگا۔ یاکی اٹھ کر اباقہ کے پاس پہنچی' کئی روز کے بعد آج پہلی بار اس نے اپنے ہاتھوں سے کھانا اباقہ کے سامنے رکھا۔ تھوڑی دیر بعد دونوں گھل مل کر باتیں کرنے لگے۔ کھانا کھانے کے بعد یورق بھی ان کے پاس آ بیٹھا اس نے خشک لکڑیوں کا چھوٹا سا ڈھیر درمیان میں رکھ کر آگ جلائی اور تینوں ہاتھ تاپتے ہوئے باتیں کرنے لگے۔ یاکی بہت خوش نظر آ رہی تھی .... یہ ویران غار پھر آباد ہو گیا تھا۔ اباقہ کی کسی عجیب و غریب بات پر یورق اور یاکی نے بلند قہقہہ لگایا' یاکی کی آواز گھنٹیوں کی طرح غار میں گونجی .... لیکن پھر اچانک یہ گھنٹیاں تھم گئیں .... کوئی تیزی سے غار کے اندر داخل ہوا تھا۔ یہ یاکی کا بوڑھا باپ تھا۔ وہ بری طرح ہانپ رہا تھا اس نے آتے ساتھ ہی کہا۔

"سردار' جو جو کچھ آدمیوں کو لے کر چراگاہ کی طرف گیا ہے۔ سنا ہے کہ وہاں منگول فوج کا ایک دستہ ٹھہرا ہوا ہے .... وہ تم دونوں کے متعلق اطلاع دینے گیا ہے۔"

یورق اور اباقہ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ یاکی کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے۔ وہ بھاگ کر غار کے دہانے کی طرف گئی۔ پھر تیزی سے واپس آئی اور باپ سے

بولی۔ "بابا! تمہیں دھوکا تو نہیں ہوا۔"

بوڑھا بولا۔ "نہیں یاکی۔ میں نے اپنے کانوں سے ان کی باتیں سنی ہیں اور اپنی آنکھوں سے انہیں جاتے دیکھا ہے۔"

اباقہ اطمینان سے بولا۔ "گھبراؤ مت بابا۔ قراقرم کے دس پندرہ یا بیس تیس سپاہی ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔"

سردار یورق نے پُر سوچ لہجے میں کہا۔ "اباقہ! میرا خیال ہے' ہمیں یہاں سے ادھر ادھر ہو جانا چاہئے۔"

اس دوران یاکی جو پھر دہانے کی طرف چل گئی تھی چیختی ہوئی واپس پلٹی۔ "سردار ...... وہ آ گئے ہیں' وہ بہت زیادہ ہیں۔ ان کے گھوڑے پوری وادی میں پھیلے ہوئے ہیں۔" اس کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔

سردار یورق اور اباقہ نے بیک وقت تلواریں نکالیں اور بھاگتے ہوئے غار کے دہانے پر پہنچے۔ چند قدم آگے جا کر دونوں نے نشیب میں جھانکا' سینکڑوں سپاہی چھوٹی ٹکڑیوں میں غار کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اباقہ بولا۔

"سردار کیا ارادہ ہے؟"

یورق نے اطمینان سے کہا۔ "ارادہ کیا ہے۔ ذرا گھاٹیوں میں انہیں جُل دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ بچ گئے تو ٹھیک پکڑے گئے تو دیکھا جائے گا۔"

اباقہ نے دیکھا یاکی کسی اداس مجسمے کی طرح ان دونوں کے قریب کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔ اباقہ اور یورق چھلانگیں لگا کر گھوڑوں پر بیٹھے۔ اباقہ نے یاکی سے کہا۔ "باپ کو لے کر گھر جاؤ یاکی۔ گھبراؤ مت' ہم واپس لوٹیں گے۔" پھر اس کا جواب سنے بغیر دونوں نے گھوڑوں کو ایڑ لگائی اور پہاڑ کی دوسری جانب بڑھے۔ ابھی وہ تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ اچانک ایک ٹیلے کی اوٹ سے گھوڑوں کی ٹاپیں سنائی دیں۔ وہ ٹھٹک کر رکے ابھی وہ گھوڑوں کا رخ موڑ ہی رہے تھے کہ گھڑ سوار ان کے سروں پر پہنچ گئے۔ وہ تعداد میں سو سے کم نہیں تھے۔ بھاگنا فضول تھا۔ اباقہ اور یورق اپنی جگہ کھڑے رہے۔ یورق اطمینان سے گھڑ سواروں کو دیکھ رہا تھا۔

"یہ تو سردار یورق ہے۔" ایک سوار کی آواز آئی۔

پھر ایک دوسرے سوار نے اباقہ کو بھی پہچان لیا۔ اس دوران عقب سے آنے والے دستے پہنچ گئے۔ ایک ہزاری سردار گھوڑا بڑھاتا ہوا یورق اور اباقہ کے سامنے پہنچا۔ وہ ایک چوڑے جبڑوں والا سخت گیر شخص تھا۔ اس نے بھاری آواز میں کہا۔

"کئی دنوں سے تم دونوں کی تلاش ہو رہی ہے۔ خاقان اوغدائی نے تمہیں فوراً طلب کیا ہے۔"

اباقہ بولا۔ "اور اگر ہم نہ جائیں تو۔"

یک ہزاری سردار بولا۔ "تو ہم بزور شمشیر لے جائیں گے ہمیں یہی حکم ملا ہے۔"

اباقہ کے چہرے کی رگیں تن گئیں، لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا یورق نے آہستگی کے ساتھ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ پھر اس کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے بولا۔

"تحمل .... جنگلی۔ یہ لوگ تعداد میں دو ہزار سے کم نہیں۔ خوامخواہ جان مصیبت میں ڈالنے کی کیا ضرورت ہے۔ ہم ان کی بات مان لیتے ہیں .... دیکھیں تو سہی قراقرم میں ہماری کیا ضرورت پڑ گئی ہے۔" پھر وہ بلند آواز میں بولا۔ "ٹھیک ہے ہزاری سردار، ہم تمہارے ساتھ جائیں گے۔"

یک ہزاری سردار ابھی تک اباقہ کو گھور رہا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر اباقہ کے سر سے ٹوپی اور کمر سے پٹی اتار لی۔ یہی سلوک سردار یورق کے ساتھ کیا گیا۔ تلواروں کے سائے میں وہ آہستہ آہستہ غار کی طرف بڑھنے لگے۔ اباقہ کی غصیلی نگاہیں سپاہیوں کے ہجوم میں کسی کی تلاش کر رہی تھیں۔ پھر اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ مطلوبہ شخص نظر آ گیا تھا۔ چرواہا جوجو۔ یک ہزاری سردار کے پہلو میں گھوڑا چلاتا، باتیں کرتا چلا جا رہا تھا۔ دس نیزہ بردار سوار اباقہ کے پیچھے تھے اور دس آگے۔ دو دو سپاہی تلواریں لیے دائیں بائیں چل رہے تھے۔ یورق کے گرد بھی کم و بیش اتنے ہی سپاہی تھے۔ یہ قافلہ آہستہ آہستہ غار کی طرف بڑھتا رہا۔ جوجو نے ایک دو دفعہ کن اکھیوں سے اباقہ کی طرف دیکھا لیکن اباقہ نے فوراً منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اس کی آنکھوں کی سرخی ہر لحظہ گہری ہو رہی تھی .... پھر اچانک اس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی، گھوڑا بھی جیسے منتظر تھا، اشارہ پاتے ہی تیر کی طرح بڑھا اور اگلے نیزہ برداروں کو چیرتا ہوا نکل گیا۔ نیزہ برداروں کے درمیان سے گزرتے ہوئے اباقہ ایک گھڑ سوار کا نیزہ چھین چکا تھا۔ وہ بلا کی رفتار سے یک ہزاری سردار اور جوجو کی طرف لپکا۔ کئی آوازیں گونجیں "خبردار .... خبردار!" لیکن اباقہ نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ نیزہ برداروں کی اگلی صف نیزے تانے اباقہ کے پیچھے بھاگی۔ اس وقت یک ہزاری سردار اور جوجو نے بھی مڑ کر دیکھا۔ دونوں کے چہروں پر تحیر نظر آیا۔ یک ہزاری سردار نے بلا کی پھرتی سے تلوار کھینچی .... "اباقہ" اس کے حلق سے تحکمانہ آواز نکلی۔ یہ سب کچھ پلک جھپکتے میں ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ سپاہیوں کی تلواریں پوری طرح

یانوں سے نکلتیں، اباقہ جوجو کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ پھر اس کا بازو لہرایا اور طویل نیزہ جھٹکے ے جوجو کے سینے میں ترازو ہو گیا۔ اس نے پھٹی ہوئی نگاہوں سے پہلے اپنے سینے کی رف اور پھر اباقہ کی طرف دیکھا .... شاید اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اباقہ اسے نیزے میں پرو چکا ہے۔ یک ہزاری سردار کی تلوار طیش کے عالم میں اٹھی .... لیکن اس نے ار کرنے کی غلطی نہیں کی۔ اباقہ کو زندہ اور بحفاظت قراقرم لانے کا حکم تھا۔ نیزہ بازوں کے نیزے بھی ہاتھوں میں معلق رہ گئے۔ جوجو نے دونوں ہاتھوں سے نیزہ تھام رکھا تھا۔ ان اس کی بند مٹھیوں سے دھاروں کی صورت میں زمین پر ٹپک رہا تھا۔ پھر وہ تیورا کر لڑکھڑایا اور زمین بوس ہو گیا۔

"تجھے کہا تھا نا گڈریے! میرا دشمن بننے کی کوشش نہ کرنا۔"

جوجو کا جسم چند بار زمین سے اچھلا اور ساکت ہو گیا۔ وہ مر چکا تھا۔ یک ہزاری سردار کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ وہ اباقہ کے ٹکڑے کر دیتا۔ اس نے سپاہیوں کو حکم دیا، اس کی طنابیں کس کے گھوڑے پر اوندھا لٹاؤ اور قراقرم لے چلو۔ اباقہ کے چہرے پر ایک بار پھر وفناک تاثرات نظر آئے۔ اس سے پہلے کہ کوئی نیا ہنگامہ شروع ہوتا یورق تیزی سے آگے بڑھا۔ اس نے یک ہزاری سردار کو سمجھایا اور اس بات کی ضمانت دی کہ اب اباقہ کی رف سے کوئی حرکت نہیں ہو گی۔ پھر بھی یک ہزاری سردار نے اباقہ کے ہاتھ پشت پر دھ دیے۔ کوچ کا حکم ہوا اور دستے قراقرم کی طرف روانہ ہو گئے۔

☆------☆------☆

خلاف توقع قراقرم میں چغتائی خان اباقہ کے ساتھ کمال مہربانی سے پیش آیا۔ دونوں باعزت طریقے سے چغتائی خان کے یورت پہنچایا گیا۔ سردار یورق کو اباقہ کے ساتھ دیکھ ر چغتائی خان کو قدرے حیرت ہوئی۔ اس کے پوچھنے پر یورق نے بہانہ بنایا کہ وہ اپنے لے کے ایک بھگوڑے سپاہی کی تلاش میں لشکر سے پیچھے رہ گیا تھا۔ وہیں پر اتفاق سے اس ی ملاقات اباقہ سے ہو گئی۔

اباقہ نے چغتائی خان کو بتایا کہ وہ مسلم بن داؤد کی تلاش میں تھا۔ وہ تو نہ ملا، لیکن س کا دوست اور دست راست بلغارین پہلوان ہنڈا اس کے ہاتھوں مارا گیا۔ اس موقع اباقہ اور یورق کو برآمد کرنے والے یک ہزاری سردار نے ان دونوں پر الزام تراشی کی شش کی، لیکن چغتائی نے اس کی بالکل حوصلہ افزائی نہیں کی۔

ان دونوں کو خیموں میں ٹھہرائے جانے کے بعد چغتائی خان اپنے چھوٹے بھائی قان اوغدائی کے محل نما یورت میں پہنچا۔ وہ مے نوشی میں مشغول تھا اور آج کچھ زیادہ

ہی پی رہا تھا۔ چغتائی نے کہا۔ "اوغدائی۔ میں تیرے لیے خوشخبری لایا ہوں۔ اباقہ مل گیا
ہے۔"

اوغدائی بولا۔ "یہ تو اور بھی برا ہوا چغتائی۔" چغتائی حیران نظر آنے لگا۔ اوغدائی
بولا۔ "اگر وہ نہ ملتا تو میں تولوئی کی بیوہ سے یہ تو کہہ سکتا تھا کہ وہ مل نہیں رہا۔ اب میں
اس کے ہوتے ہوئے بھی اسے سیوراقطنی کے سپرد نہیں کر سکتا۔"

چغتائی بولا۔ "کیوں خاقان! ایسی کیا بات ہو گئی ہے؟"

اوغدائی بولا۔ "تمہیں معلوم ہی ہے میری پہلی بیوی "توراکینہ" کس قدر ضدی
ہے۔ اسے جب سے پتہ چلا ہے کہ سیوراقطنی میری فوج کا ایک اہم سپاہی مانگ رہی ہے
اس نے ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا ہے۔ وہ کہتی ہے میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔ وہ طعنے دے
رہی تھی کہ کیا خاقان اتنا کمزور ہے کہ گھاس کے تنکے کی مانند ایک عورت کی پھونک سے
اڑ جاتا ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ سیوراقطنی نے اپنی فرمائش سے میری تحقیر کی ہے اور اسے
ہرگز یہ حق نہیں کہ مجھے ایسی آزمائشوں میں ڈالے۔ اب میرے بیٹے بھی اپنی ماں کی
طرفداری کر رہے ہیں اور اس طرح اچھا خاصا بحران پیدا ہو گیا ہے۔ ان سب کی ضد ہے
کہ اباقہ کو سیوراقطنی کے سپرد نہیں کیا جائے گا۔"

چغتائی چند لمحے خاموش رہا پھر بولا۔ "خاقان! تمہاری بیوی بات تو ٹھیک ہی کہہ رہی
ہے .... میری ایک تجویز ہے اگر تم پسند کرو تو۔"

"کیا؟" خاقان نے پوچھا۔

چغتائی بولا۔ "تم بھی سیوراقطنی کی ایک آزمائش کر ڈالو۔ وہ تمہاری محبت آزما رہی
ہے تم بھی تو دیکھو وہ کتنی وفادار ہے؟"

خاقان نے پوچھا کہ یہ آزمائش کس طرح ہو۔ چغتائی کا جواب تھا کہ یہ تمہارے
سوچنے کی بات ہے۔

چند روز بعد خاقان نے ایک اہم قدم اٹھایا۔ اس نے خاندان زریں (التان
خانوادے) کے شہزادوں اور معززین سے کسی قسم کا مشورہ کیے بغیر سولدو قبیلے کے دو ہزار
سوار اپنے ایک بیٹے کی کمان میں دے دیئے۔ اس سے تولوئی کی زیر کمان فوج میں غم و
غصے کی لہر دوڑ گئی۔ فوج کے چیدہ چیدہ افسر تولوئی کی بیوہ سیوراقطنی کے بیٹے اور دوسرے
عمائدین بھی موجود تھے۔ فوج کے افسروں نے کہا۔ "یہ دو ہزار سولدو سوار چنگیز خان کے
فرمان کے بموجب ہماری فوج کا اٹوٹ حصہ تھے۔ اب خاقان اوغدائی نے بغیر ہم سے
پوچھے انہیں اپنے بیٹے کی تحویل میں دے دیا ہے' یہ چنگیز خان کے فرمان کی سراسر خلاف

ورزی ہے ہم خاقان اوغدائی کے سامنے بھی یہی کہیں گے اور احتجاج کریں گے؟"

عقل مند اور فہیم سیوراقطنی نے ان افسروں کو نرمی سے سمجھاتے ہوئے کہا۔
"ہمارے پاس جو کچھ ہے خاقان کا ہی دیا ہوا ہے اور کس چیز کی ہمیں کمی ہے۔ خاقان
جانتا ہے کہ کون سا حکم ہمارے لیے سودمند ہے لہٰذا ہمارا فرض ہے کہ خاقان کے ہر
حکم پر اپنا سر جھکا دیں۔" اس کے سمجھانے سے فوج کے سردار اور افسر مطمئن ہو گئے'
خاص طور پر خاقان اوغدائی کا اطمینان ہو گیا۔ اس نے اپنے شہزادوں سے پوچھا۔ "بھلا
عورتوں میں کوئی اس کی نظیر بھی ہو سکتی ہے۔"

یہ مسئلہ جتنی شدت سے ابھرا تھا اتنی ہی خوش اسلوبی سے طے ہو گیا۔ اباقہ کو یورق
کی وساطت سے اس سارے معاملے کی خبر ملتی رہی تھی۔ وہ حیران تھا کہ یہ منگول سردار
اپنے معاملات کو کتنی ظرف مندی سے طے کرتے ہیں۔ دنیا کے بڑے حصے پر حکمران
ہونے کے باوجود آپس میں ان کا کتنا اتفاق ہے۔ چغتائی خان کے رویے نے بھی اسے بہت
متاثر کیا تھا۔ حالانکہ کچھ عرصہ پہلے اس نے اس کی ایک بیوی کو قتل کر ڈالا تھا' لیکن وہ
سب کچھ فراموش کر چکا تھا۔ اور وہ اس سے بڑی مروت سے پیش آیا تھا۔ ایک دن وہ اس
کی یورت میں داخل ہوا تو ماریتا سے آمنا سامنا ہو گیا۔ ایک ساعت کے لیے دونوں کی
آنکھیں ملیں اور زمین و آسمان کی گردش جیسے تھم گئی .... لیکن صرف ایک ساعت
کے لیے اور پھر دونوں اپنی اپنی دنیا میں واپس آ گئے۔ چغتائی اس وقت اپنی چوکی پر نیم دراز
اس کو دیکھ رہا تھا۔ ماریتا چغتائی خان کی دوسری بیویوں کے ساتھ اس کے پہلو میں بیٹھی
تھی۔ ریشم و کمخواب میں لپٹی اور خوشبوؤں میں بسی حسین عورتوں کی اس قطار میں وہ سب
سے نمایاں تھی۔ چغتائی نے کمال مہربانی سے اباقہ کو اپنے قریب بٹھا لیا۔ پھر ماریتا کے سوا
سب عورتوں کو یورت سے باہر جانے کا حکم دیا۔ تب وہ اباقہ سے بولا۔

"اباقہ! میں تمہارے پچھلے تمام قصور معاف کر چکا ہوں اور چاہتا ہوں کہ تم بھی پچھلی
باتیں بھول جاؤ .... مجھے اس بات کا بھی افسوس ہے کہ مسلم بن داؤد نے تمہیں دھوکا
دیا۔ بہرحال وہ میرے عتاب سے بچ نہیں سکے گا' اس کی تلاش جاری ہے۔" .... پھر
شراب کا ایک طویل گھونٹ لے کر اس نے اپنی گھنی بھنویں اٹھائیں اور اباقہ سے بولا۔
"ماریتا کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟"

یہ ایک بالکل غیر متوقع سوال تھا۔ اباقہ جیسا مرد آہن بھی چہرے کے اتار چڑھاؤ پر
قابو نہ رکھ سکا' لیکن وہ خاموش رہا' یکسر خاموش رہا۔ یہ ایک نہایت گھمبیر خاموشی تھی۔
چغتائی خان نے اس خاموشی کو توڑا۔ وہ بولا۔ "ماریتا کے متعلق تمہارے کیا خیالات

ہیں، میں نہیں جانتا' لیکن یہ بتانا تمہیں ضروری سمجھتا ہوں کہ وہ میری بیوی اور میری عزت ہے .... میرے خیال میں میرا یہ کہنا کافی ہو گا۔"

اباقہ سر جھکائے خاموش بیٹھا تھا۔ زندگی میں پہلی بار اسے کسی کے سامنے سر اٹھانے کی جرأت نہیں ہو رہی تھی۔ چغتائی بولا۔ "اباقہ! میں تیری بہادری اور ذہانت کا معترف ہوں۔ میں سمجھتا ہوں تجھ سے جو کچھ بھی ہوا نا سمجھی میں ہوا۔ اب تو ایک اچھے عسکری کی طرح خاقان کی چاکری کر اور اس کا ہر حکم مان۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تیری زندگی سنور جائے گی۔"

اباقہ نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔ ماریتا کی موجودگی اسے مرعوب کیے دے رہی تھی۔ وہ جلد از جلد اس کی نگاہوں کی زد سے نکل جانا چاہتا تھا۔ پھر ماریتا کی کھنکتی ہوئی آواز اس کے کانوں میں آئی۔ "اباقہ! میں بھی اس تکلیف پر معافی چاہتی ہوں جو مسلم بن داؤد کی وجہ سے تجھے پہنچی۔" اباقہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ اب خاموش ہو چکی تھی لیکن اس کی آنکھیں ابھی تک بول رہی تھیں۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "اباقہ! میرا بس چلے تو ان ہاتھوں کو آگ میں جلا دوں جن سے میں نے تجھے مارا تھا' اس زبان پر انگارے رکھ دوں جس نے تجھ سے تلخ کلامی کی تھی .... میرے محبوب میں تیرے جسم اور تیری روح کے زخموں سے آگاہ ہوں۔" اباقہ کچھ بھی نہ بول سکا۔ اس نے اٹھ کر اجازت چاہی اور یورت سے نکل آیا۔

کچھ روز بعد اباقہ کو سیورا قطی کے حوالے کر دیا گیا۔ سیورا قطی نے اسے پنج صدی سردار مقرر کر کے اپنے ذاتی دستے میں شامل کر لیا۔ وہ سیورا قطی کے محافظ کے فرائض انجام دینے لگا .... سیورا قطی کا جھکاؤ عیسائیت کی طرف تھا۔ وہ اکثر نسطوری پادریوں کے گرجے میں جاتی تھی اور وہ روزمرہ معاملات میں ان سے مشورے طلب کرتی تھی۔ یہ پادری سیورا قطی کے ذہن میں مسلمانوں کے خلاف نفرت ابھارتے رہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ خاقان کے دربار میں سیورا قطی مسلم دشمنی میں پیش پیش رہتی تھی۔ ایک مرتبہ اس نے ایک ایسا درویش خاقان کی خدمت میں پیش کیا جس کا دعویٰ تھا کہ چنگیز خان کی روح اسے خواب میں ملی ہے اور اس نے حکم دیا ہے کہ دنیا کے تمام مسلمانوں کو تہہ تیغ کیا جائے کیونکہ اس صورت میں منگول تا دیر اقبال مند رہ سکتے ہیں۔ جب اس درویش کو اس کے دعوے کے ساتھ خاقان کے روبرو پیش کیا گیا تو خاقان نے مترجم کے ذریعے درویش سے پوچھا کہ وہ اس سے کس زبان میں بات کر رہا ہے؟ درویش نے جواب دیا ترکی میں' وہ ترکی کے سوا کوئی زبان نہیں جانتا۔ خاقان نے کہا۔ اب یہ بتا کہ خان اعظم

چنگیز خان نے خواب میں تجھ سے کس زبان میں بات کی تھی۔ درویش پہلے تو سٹپٹایا پھر بولا کہ ترکی میں۔ خاقان نے حکم دیا کہ درویش کا سر اڑا دیا جائے۔ یہ جھوٹا ہے۔ خان اعظم منگولی کے سوا کوئی زبان نہیں جانتے تھے۔ اب درویش جو سیورا قطی کا پڑھایا ہوا تھا رحم طلب نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا لیکن خاقان کے آگے سیورا قطی کیا کر سکتی تھی وہ اپنے ہونٹ کاٹتی رہ گئی اور عیسائی درویش کا سر قلم کر دیا گیا۔

سیورا قطی کے پاس بخت یشوع نامی ایک پادری تھا۔ ایک روز وہ سیورا قطی سے ملا تو کہنے لگا۔

"محترم خاتون! میں نے آپ کے نئے محافظ "اباقہ" کو بڑے غور سے دیکھا ہے۔ واقعی آپ کا انتخاب لاکھوں میں ایک ہے۔ منگولوں کی فوج میں اس جیسے شاید چند ہی جاں نثار ہوں لیکن ایک بات یاد رہے وہ مسلمان کا بچہ ہے اور مسلمان کے خون سے مسلمانی اتنی جلدی نہیں نکل جاتی کہیں آگے چل کر وہ منگولوں کے لئے نقصان دہ ثابت نہ ہو۔"

سیورا قطی بولی۔ "بخت یشوع! میں نے بھی اسے بڑے قریب سے دیکھا ہے اور غور سے جانچا ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے آج سے سترہ اٹھارہ سال پہلے جب کہ یہ ابھی بچہ ہی تھا اس کا باپ اسے انسانی بستیوں سے دور جنگلوں میں لے گیا تھا۔ ان جنگلوں میں اس نے اسے انتقام کے سوا اور کوئی بات نہیں سکھائی۔ اس نے اسے نہ تو مسلمان بنایا اور نہ عیسائی یا منگول۔ اس نے اسے صرف جنگجو بنایا اور بدلہ لینا سکھایا پھر انسانی روپ میں یہ خونخوار درندہ قراقرم پہنچا اور اپنے شکار کو اچک کر لے گیا۔ اس نے اپنی ماں کے قاتل سردار بوغالی کو مار ڈالا لیکن اس قتل کے پیچھے کوئی مذہبی جذبہ نہیں صرف انتقام کارفرما تھا۔ اب یہ درندہ ہمارے قابو میں ہے۔ ہم اسے جس انداز میں چاہیں سدھا سکتے ہیں۔ میں تو یہاں تک کہہ سکتی ہوں کہ یہی مسلم زادہ' مسلمانوں کے لئے قہر آسمانی بن سکتا ہے۔ کیا تم بھول چکے ہو کہ ختا کی مہم میں اس نے کس طرح منگولوں کے لئے جان لڑائی تھی۔"

سیورا قطی کی باتیں سن کر پادری کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اس نے سیورا قطی کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا پھر دونوں دھیمے لہجے میں گفتگو کرنے لگے۔

اس دن کے بعد پادری عموماً اباقہ سے ملنے لگا۔ سیورا قطی کی ہدایت پر وہ بڑی ہوشیاری سے اباقہ کو ایک دھیما زہر پلانے میں مصروف تھا۔ وہ اباقہ کے دل میں منگولوں کی محبت اور مسلمانوں کے خلاف نفرت ابھار رہا تھا۔ جب وہ ایک دور دراز شہر بغداد کا ذکر کرتا جہاں مسلمان بادشاہ عیش و عشرت اور سازشوں میں مصروف رہتے تھے تو اباقہ کے ذہن میں مسلم بن داؤد کی یاد تازہ ہو جاتی۔ وہ سوچتا شاید اس شہر میں سب مسلم بن داؤد

ہی بستے ہیں۔ مکار اور سازشی۔ بوڑھا بخت یشوع اسے بتاتا کہ بخارا اور سمرقند کے گلی کوچوں میں بھڑکنے والی آگ کے اصل ذمہ دار اہل بغداد ہی تھے۔ خوارزم شاہ انہیں مدد کے لئے پکارتا رہا لیکن وہ حیلے بہانوں میں مصروف رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ منگولوں نے ان شہروں کو تاراج کر دیا اور وہی کچھ کیا جو قابض فوجیں مفتوحہ شہروں سے کرتی ہیں۔

پھر جب بخت یشوع منگولوں کے قصیدے پڑھتا تو اباقہ کے ذہن میں سردار یورق اور چغتائی خاں جیسے نام آتے۔ ان میں سے کچھ جاں نثار دوست تھے اور کچھ مہربان حکمران .... وہ چغتائی خاں کے متعلق سوچتا اور اس کی عنایتوں کا معترف ہوتا جاتا۔ کچھ روز پہلے سردار یورق کی زبانی ہی اباقہ کو معلوم ہوا تھا کہ چغتائی خاں، ماریتا کے ساتھ اس کی محبت سے بخوبی آگاہ ہے۔ یورق نے کہا تھا۔ "اباقہ چغتائی خاں جانتا ہے کہ تم ایک دوسرے کو دل و جان سے چاہتے ہو۔ وہ تمہاری محبت کی قدر کرتا ہے۔ اس نے خود مجھ سے کہا ہے کہ میرے مرنے کے بعد میری بیوی ماریتا، اباقہ کی ملکیت ہو گی اور یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ تمہارے لئے بہت بڑا اعزاز ہے۔ وہ تمہیں اپنے بیٹوں کی طرح سمجھتا ہے۔ (منگولوں میں رواج تھا کہ باپ کی موت کے بعد بیٹا اس کے مال و اسباب اور بیویوں کا مالک بن جاتا تھا) جب سے یورق نے یہ بات بتائی تھی اباقہ کے شب و روز میں ایک ٹھہراؤ سا آ گیا تھا۔ اس نے سنجیدگی سے خود کو اپنی ذمے داریوں میں مصروف کر لیا تھا۔ دھیرے دھیرے اسے قراقرم سے ایک خاص طرح کا لگاؤ ہوتا جا رہا تھا .... اور کیوں نہ ہوتا۔ اس بستی میں اس کی جان بستی تھی .... اور وہ کسی بھی وقت اس کے جسم میں داخل ہو سکتی تھی۔ کبھی کبھار یوں ہی اس کی سوچوں میں ایک خوبصورت پہاڑی لڑکی در آتی۔ وہ فوراً اسے پہچان لیتا یہ یاکی تھی۔ لیکن اگلے ہی لمحے ماریتا کی شہد رنگ زلفیں اس کی آنکھوں کے سامنے پھیل جاتیں اور یاکی کا چہرہ دھندلا جاتا۔ اس کے سینے کی گہرائیوں سے آواز نکلتی "ماریتا" اور وہ سوچنے لگتا۔ بوڑھے چغتائی کی عمر کیا ہو گی وہ کتنے سال اور جئے گا۔ شاید دو تین سال .... شاید سات آٹھ سال۔

☆-------☆-------☆

ایک دن سردار یورق اور اباقہ ایک بلند ٹیلے پر بیٹھے باتوں میں مصروف تھے۔ سورج دور جھیل بالکش کے پہاڑوں میں غروب ہو رہا تھا۔ ایک طرف سے دھول کے مرغولے دکھائی دیئے۔ یورق اور اباقہ غور سے دیکھنے لگے۔ یہ ایک چھوٹا سا قافلہ تھا۔ تین چار چھکڑے ایک قطار میں چلے آ رہے تھے۔ ان کے آگے آگے دو گھڑسوار تھے۔ قافلہ جب قریب پہنچا تو یورق اور اباقہ یہ دیکھ کر حیران ہوئے کہ قافلے کے تمام مسافر اندھے تھے۔

دو بچے اور ایک بوڑھی عورت ملا کر وہ کل اٹھارہ افراد تھے۔ یورق نے ایک شخص سے پوچھا کہ وہ کہاں سے آئے ہیں، اس نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا کہ وہ بول نہیں سکتا۔ ایک دوسرے شخص سے پوچھا تو اس نے بھی یہی جواب دیا۔ یورق اور اباقہ پر حیرت انگیز انکشاف ہوا کہ پورا قافلہ نہ صرف اندھا ہے بلکہ گونگا بھی ہے۔ کسی نے بڑی بے رحمی سے ان کی زبانیں کاٹ دی تھیں۔

اسی دن شام کو دوبارہ یورق اباقہ سے ملا تو اس نے قافلے کے متعلق بتایا کہ وہ آذربائیجان کی طرف سے آیا تھا۔ راستے میں خوارزم کے "بھگوڑے اور لٹیرے" بادشاہ جلال الدین کے ہتھے چڑھ گیا اس نے عورتوں کو اغوا کر کے تمام مال و اسباب لوٹ لیا اور اہل قافلہ کی آنکھیں نکال کر زبانیں کاٹ ڈالیں۔ قراقرم کے طول و عرض میں اس واقعے سے ہراس کی فضا پیدا ہو گئی۔ اباقہ نے کئی منگولوں کو یہ بھی کہتے سنا کہ جلال الدین خوارزم شاہ قراقرم کے قرب و جوار میں کہیں موجود ہے۔ بہرحال یہ عوام کی باتیں تھیں خواص جانتے تھے کہ ان افواہوں میں کوئی حقیقت نہیں۔ جلال الدین کے بارے اباقہ پادری بخت یشوع سے بھی بہت کچھ سن چکا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ اس شخص کا پورا نام جلال الدین خوارزم شاہ ہے اور یہ خوارزم کا بادشاہ تھا۔ اس کے باپ کا نام علاؤ الدین خوارزم تھا۔ چنگیز خاں نے علاؤ الدین کو زبردست شکست دی اور وہ کہیں روپوش ہو گیا۔ اس کے بعد اس کے بیٹے یعنی جلال الدین نے منگولوں سے ٹکر لی اور شکست کھائی۔ شکست کے بعد جلال الدین مٹھی بھر ساتھیوں کے ساتھ کہیں غائب ہو گیا۔ اب یہ لوگ چھوٹے چھوٹے قافلوں کو تنگ کرتے رہتے ہیں۔ کبھی کسی تنہا چوکی پر ہلہ بول دیتے ہیں اور کبھی کسی قصبے میں لوٹ مار شروع کر دیتے ہیں۔ پادری نے اباقہ کے سامنے جلال الدین خوارزم شاہ کی جو تصویر کھینچی تھی اس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک بہادر، لیکن نہایت ظالم اور سفاک شخص ہے، منگول فوج عرصے سے اس کے تعاقب میں ہے لیکن وہ ہاتھ نہیں آتا۔ خوارزم شاہ کے بارے اباقہ اتنا کچھ سن چکا تھا کہ لاشعوری طور پر اس کے ذہن میں اسے دیکھنے کی خواہش پیدا ہو گئی تھی۔

ایک روز جب اباقہ سیوراقطی کی پالکی کے ساتھ ساتھ خاقان اوغدائی کے یورت کی طرف جا رہا تھا۔ دو رویہ کھڑے لوگوں میں سے سردار یورق نے اسے اشارہ کیا۔ اباقہ نے ہاتھ کے اشارے سے اسے بتایا کہ وہ ابھی آتا ہے۔ جب سیوراقطی پالکی سے اتر کر خاقان کے یورت میں داخل ہو گئی تو اباقہ سردار یورق کی طرف روانہ ہوا۔ آج کئی دنوں بعد ملاقات ہوئی تھی۔ شاید اسی لئے سردار یورق نے اسے گلے سے لگا کر بھینچ لیا، لیکن جلدی

ہی اباقہ کو اندازہ ہوا کہ بات کچھ اور ہے' یورق کہیں جا رہا ہے۔ پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ کل کچھ دستوں کے ساتھ خوارزم کی طرف جا رہا ہے۔ یہ ایک طویل مہم ہے۔ باقی دستوں کو تو خراسان پہنچنا ہے اور اس کے دستے کو اس متلاشی فوج میں شامل ہونا ہے جو خوارزم کے برفانی علاقوں میں جلال الدین کو تلاش کر رہی ہے اور اس کے بچے کچھے سپاہیوں کا صفایا کرنے میں مصروف ہے۔ جلال الدین کا نام سن کر اباقہ ایک دم چونک اٹھا۔ اسے یہ معاملہ دلچسپ دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے یورق سے پوچھا۔

"خوارزم کی تلاش میں تمہارے بھیجے جانے کا کوئی خاص مقصد ہے۔"

یورق نے کہا۔ "نہیں کوئی خاص مقصد تو نہیں' لیکن میں ان سرداروں میں سے ایک ہوں جو آذربائیجان اور قفقاز وغیرہ کے ایک ایک چپے سے واقف ہیں۔ خان اعظم (چنگیز خاں) کے دور میں' میں ایک عرصہ وہاں برسرپیکار رہا ہوں۔ اب یہ خیال ظاہر کیا جا رہا ہے کہ جلال الدین انہی علاقوں میں کہیں روپوش ہے۔"

اباقہ بولا۔ "اس شخص کو دیکھنے کا تو مجھے بھی بہت شوق ہے .... کیا میں تمہارے ساتھ ...."

یورق کے چہرے پر دبا دبا جوش نظر آنے لگا۔ وہ بولا۔ "کیا خوب تجویز ہے .... اگر تم ساتھ رہو تو یہ مہم یادگار ہو جائے .... لیکن کیا سیوراقطی تمہیں جانے کی اجازت دے گی؟"

اباقہ سوچ میں پڑ گیا پھر بولا۔ "وہ پادری بخت یشوع کی ہر بات مانتی ہے میں اس کے ذریعے بات کرتا ہوں۔"

اس شام پادری بخت یشوع' سیوراقطی کے زرتار خیمے میں اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ سیوراقطی سادہ لیکن قیمتی لباس میں بڑی خوبصورت نظر آ رہی تھی۔ چار لونڈیاں دائیں بائیں مؤدب کھڑی تھیں۔ اس کے دو بیٹے قبلائی خاں اور ہلاکو خاں (جو ابھی بچے ہی تھے) اس کے قریب بیٹھے تھے۔ پادری بخت نے کچھ جھجکتے ہوئے اباقہ کا مدعا بیان کیا۔ سیوراقطی غصے سے بولی۔ "نہیں .... وہ نہیں جائے گا۔ خاقان اس کی خدمت مجھے سونپ چکا ہے' پھر وہ اس کے دستوں کے ساتھ کیوں جانے لگا۔"

پادری تھوڑا سا آگے کو کھسک آیا۔ اس کی آنکھوں میں عیاری کی چمک تھی۔ وہ بولا۔ "اے محترم خاتون! آپ بھول رہی ہیں کہ میں طویل عرصے سے اس کے ساتھ ہوں' وہ منگولوں سے بڑھ کر منگولوں کا وفادار ہو چکا ہے۔ مسلمانوں کے لیے اس کی ہلاکت آفرینی کسی آتش فشاں سے کم نہیں ہو گی ممکن ہے اپنی خداداد صلاحیتوں سے وہ

کوئی اہم کارنامہ انجام دے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ خوارزم شاہ کو ڈھونڈنے میں ہی کامیاب ہو جائے۔ اس صورت میں خاقان اوغدائی کی نظروں میں آپ کا درجہ اور بلند ہو جائے گا۔"

سیوراقطی سوچ میں پڑ گئی۔ وہ جانتی تھی کہ اباقہ چغتائی کی بیوی ماریتا پر ہزار جان سے فدا ہے' لہٰذا ایسا کوئی خطرہ نہ تھا کہ وہ منگولوں سے وفاداری ترک کر دے .... تو کیوں نہ اس کی حیرت انگیز صلاحیتوں کو زیادہ سے زیادہ استعمال کیا جائے۔

شام پڑے جب پادری بخت' سیوراقطی کے یورت سے نکلا' اس کے چہرے پر کامیابی کی چمک تھی۔ وہ وہاں سے اباقہ کے خیمے کی طرف چل دیا۔ وہ اپنے ذہن میں ایک ایسی تقریر مرتب کر رہا تھا جسے سن کر اباقہ' جلال الدین خوارزم شاہ کے بارے میں اور متجسس ہو جائے اور اس جنگجو جرنیل کو ڈھونڈنے اور زیر کرنے کی خواہش اس کے اندر بھڑک اٹھے۔

☆ ———— ☆ ———— ☆

اباقہ کی تیاری مکمل ہو چکی تھی۔ وہ یورق کے ساتھ خوارزم کی طرف روانہ ہو رہا تھا' لیکن جانے سے پہلے وہ ایک بار جی بھر کر ماریتا کو دیکھنا چاہتا تھا۔ دیر ہوئی وہ اس کی جھلک سے محروم تھا۔ اس نے .... بہانے سے ماریتا کے زرنگار خیمے کے کئی چکر لگائے لیکن وہ دکھائی نہیں دی۔ پورا ایک دن وہ تالاب اور درختوں کے جھنڈ کے اردگرد بھی منڈلاتا رہا' لیکن ماریتا وہاں نہیں آئی۔ یوں لگتا تھا وہ جان بوجھ کر اس سے ملنا نہیں چاہتی۔ آخر اباقہ کی روانگی کا دن آ گیا۔ علی الصبح سردار یورق نے اسے آ جگایا۔ جلد جلد تیار ہو کر وہ دونوں اس فوج میں شامل ہو گئے جو خاقان اوغدائی کے یورت کے سامنے قطاروں میں کھڑی تھی۔ سورج چڑھے روانگی ہوئی۔ وہ خیموں کے درمیان سے گزر رہے تھے۔ تمام لوگ خیموں سے باہر کھڑے گرمجوشی سے فوج کو رخصت کر رہے تھے .... لیکن ماریتا کا خیمہ آج بھی بند تھا۔ اباقہ کے دل پر گھونسا سا لگا .... لیکن پھر اسے ایک خیال آیا اس نے چونک کر دیکھا۔ خیمے کے پردے میں ایک جھری تھی اور اس میں دو آنکھیں موجود تھیں .... یہ آنکھیں صرف اور صرف اس کو دیکھ رہی تھیں۔ یہ ماریتا کی آنکھیں تھیں ان آنکھوں میں ہزاروں کہانیاں پوشیدہ تھیں ہزاروں بے نام ارمان اور ہزاروں ناتمام خواہشیں تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ آنکھیں ماریتا کے وجود سے علیحدہ ہو کر اس جھری سے آ لگی ہوں۔ وہ ان شناسا لیکن اجنبی آنکھوں کو دیکھتا رہا۔ اس کا گھوڑا دلکی چال چلتا رہا اور وہ اس زرنگار خیمے سے آگے نکل آیا۔ ایکا ایکی اس کا اداس و ملول دل

پُر مسرت دھڑکنوں سے سرشار ہو گیا۔ اس کے راستے میں قراقرم سے لے کر ایران تک جیسے کسی نے دلگداز تصورات کے میلے لگا دیے تھے۔

تھوڑی دیر بعد چمکتے سورج کے نیچے سفر کرتی وہ مختصر سی فوج جنوب مغرب کی طرف جا رہی تھی۔ خیموں کا عظیم الشان شہر ٹیلوں کے عقب میں رہ گیا۔ اب ان کے سامنے لق ودق پہاڑی سلسلے تھے۔ صحرائے گوبی کا موسم بھی عجیب افتاد انگیز تھا۔ گرمی پڑتی تو اتنی شدید کہ الامان' ہوائیں چلتیں تو ایسی سرکش کہ خیموں کے قدم اکھڑ جاتے اور چٹانیں اپنی جگہ سے ہل جاتیں اور سردی آتی تو بھی انتہا کی۔ ریت کے ٹیلوں پر برف کی تہہ جم جاتی' سبزہ نابود ہو جاتا۔ اتنا سخت جاڑا پڑتا کہ انسان اور جانور مرنے لگتے۔ بڑا متضاد اور شدید موسم تھا جس میں منگول نسل در نسل رہتے چلے آرہے تھے۔

اس وقت بھی ریت کے ٹیلوں پر برف کی تہیں دکھائی دینے لگی تھیں۔ سر پر حد نگاہ تک نیلا آسمان پھیلا ہوا تھا۔ جنوب مغرب سے چلنے والی مدھم ہوا اپنے ساتھ انجانی سرزمینوں کی خوشبو لا رہی تھی۔ دم بدم تیز ہوتی ہوئی دھوپ کی تمازت بڑی خوشگوار تھی۔ سردار یورق اور اباقہ پہلو بہ پہلو جا رہے تھے۔ دونوں اس طویل ساتھ سے بہت خوش دکھائی دیتے تھے۔

اپنے سفر کے تیسرے روز وہ ان پہاڑوں سے گزرے جہاں ایک بستی میں یاکی اور اس کا باپ رہتے تھے۔ ایکا ایکی بہت سی باتیں اباقہ کو یاد آگئیں۔ اس نے سوچا ایک بار یاکی کو دیکھنا چاہیے کہ وہ کس حالت میں ہے۔ وہ بستی ان کے راستے سے کافی ہٹ کر تھی۔ کم از کم ایک چوتھائی دن سفر تھا۔ یورق' اباقہ کے چہرے کا اتار چڑھاؤ دیکھ رہا تھا۔ اس نے اباقہ سے کہا کہ اگر یاکی کی خبرگیری کرنا چاہتے ہو تو میں سالار سے اجازت طلب کر لیتا ہوں' میرا خیال ہے اگر ہم تیز رفتاری سے سفر کریں تو اگلے پڑاؤ میں پھر فوج کے ساتھ مل جائیں گے۔ اباقہ کی آنکھوں میں رضامندی کے آثار تھے۔ سردار یورق تو خود بھی یہی چاہتا تھا۔ وہ فوراً سالار سے بات کرنے چلا گیا تھوڑی دیر بعد دونوں فوج سے علیحدہ ہو کر تیز رفتاری سے مغرب کی طرف جا رہے تھے۔ دوپہر کے وقت وہ اس غار کے سامنے سے گزرتے ہوئے پہاڑ پر پہنچے' لیکن دوسری طرف دیکھ کر انہیں سخت مایوسی ہوئی۔ بستی وہاں موجود نہیں تھی وہ خانہ بدوش لوگ سبز گھاس کی تلاش میں کہیں اور سدھار چکے تھے۔ اچانک اباقہ کو یاکی پر بہت ترس آیا۔ رخصت کے وقت اس نے کہا تھا میں جلد لوٹوں گا' لیکن آج کئی ماہ بعد وہ یہاں آیا تھا اور وہ بھی اتفاقاً۔ اس نے سوچا پتہ نہیں اب بھی اس سے ملاقات ہو گی یا نہیں۔ بہرحال اس بات کا اسے اطمینان تھا کہ یاکی کا قرض خوا

اور اس کا سب سے بڑا دشمن جوجو کیفر کردار کو پہنچ چکا ہے۔ کچھ دیر اس پرانے غار میں ستانے کے بعد وہ گھوڑوں پر سوار ہوئے اور واپس لشکر کی طرف روانہ ہو گئے۔

☆------☆------☆

یہ وہ دور تھا جب عالم اسلام پر سے تاتاریوں کا ہلاکت خیز سیلاب گزر چکا تھا۔ خوارزم کی سلطنت پارہ پارہ ہو چکی تھی۔ سمرقند' بخارا اور بلخ کی اینٹ سے اینٹ بج چکی تھی۔ غزنی' ہرات اور اصفہان جیسے شہر منگولوں کے قدموں تلے روندے جا چکے تھے۔ افغانستان سے آگے پشاور تک کو چنگیز خاں کے ہرکارے برباد کر چکے تھے۔ اس سیلاب کے راستے میں جو آخری رکاوٹ شاہ خوارزم جلال الدین کی صورت میں تھی' وہ دور ہو چکی تھی۔ جلال الدین' مسلمانوں کی حالت سے مایوس ہو کر ہمت ہار چکا تھا۔ اس نے برسوں عالم اسلام کے دروازے کی پہریداری کی تھی۔ خلافت عباسیہ کی جنگ وہ مملکت تاتار کی سرحد پر لڑتا رہا تھا۔ وہ تاتاریوں کے سیلاب کو اس امید پر روکے ہوئے تھا کہ ایک دن مسلمان جاگ جائیں گے۔ ان کی تلواریں اس کی مدد کر پہنچ جائیں گی' لیکن اس کی تمام قربانیاں رائیگاں گئی تھیں۔ اہل بغداد نے اسے دھوکے میں رکھا تھا۔ خلافت عباسیہ نے قلعہ خلافت کے محافظ کی پیٹھ میں چھرا گھونپا تھا۔ عین فیصلے کی گھڑی اسے تنہا چھوڑ دیا گیا تھا۔ اب اس کا ملک منگولوں کے قبضے میں تھا اور وہ دربدر ہو چکا تھا۔ مصیبتوں کے پہاڑ اس پر اس طرح ٹوٹے تھے کہ اس کے ظرف کا سمندر راچھل گیا تھا۔ غم دوراں کو بھلانے کے لیے پہلے اس نے رقص و سرود کی محفلوں اور مے نوشی کا سہارا لیا پھر سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر صرف ایک خدمتگار کے ساتھ برفستانوں میں بھٹکنے کے لیے نکل گیا۔ کسی کو معلوم نہیں تھا وہ کہاں اور کس حالت میں ہے اور ہے بھی یا نہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ کسی جگہ منگولوں کے خلاف جانبازوں کی ایک جری فوج تیار کر رہا ہے اور کسی دن ان پر قیامت بن کر ٹوٹے گا' لیکن اس کے برعکس کچھ لوگ یہ کہتے تھے کہ عالم اسلام کے مقدر کا وہ تابندہ ستارہ ڈوب کر ہمیشہ کے لیے نظروں سے اوجھل ہو چکا ہے۔ بہرحال منگول اس کی تلاش جاری رکھے ہوئے تھے۔ وہ اسے اب بھی آذربائیجان' قفقاز اور آرمینیا کی دشتوں میں ڈھونڈ رہے تھے۔ اس کے شبہے میں سینکڑوں آدمی قتل کیے جا چکے تھے اور کیے جا رہے تھے۔

اباقہ اور یورق منگول فوج کے ساتھ مقبوضہ خوارزم میں داخل ہوئے۔ ایک سرحدی چوکی پر رات گزارنے کے بعد لشکر آگے روانہ ہو گیا۔ ان کے راستے میں آنے والا خوارزم کا پہلا شہر توقند تھا۔ وہ جس وقت وہاں پہنچے ہلکی ہلکی برف باری ہو رہی تھی' پھر

منگول بھی کثرت سے دکھائی دے رہے تھے۔ لمبے جبوں اور داڑھیوں والے مقامی مرد اور پردہ دار عورتیں خاصی سہمی ہوئی نظر آتی تھیں کسی منگول کو دیکھ کر یہ لوگ فوراً راستہ چھوڑ دیتے تھے۔ فوج شہر میں داخل ہوئی تو وہ لوگ بھاگ کر اِدھر اُدھر چھپنے لگے۔ یہ فوج سیدھی قوقند کی چھاؤنی میں پہنچی۔ وہاں کم وبیش دس ہزار منگول سپاہی پہلے ہی موجود تھے۔ شام کے وقت اباقہ اور یورق بازار کی سیر کو نکل گئے۔ برف باری تھم چکی تھی۔ رونق پہلے سے کچھ زیادہ تھی۔ ایک دکان پر یورق ایک خوبصورت پوستین دیکھ کر رک گیا۔ قریب ہی ایک دوسرا منگول کھڑا ایک زرہ دیکھ رہا تھا یہ انہی کے دستے کا سپاہی تھا۔ اس اثناء میں کسی طرف سے ایک پتھر آیا اور یورق کے سر پر پڑا۔ کافی بڑا پتھر تھا۔ یورق نے سر پکڑ لیا۔ خون اس کی انگلیوں کے درمیان سے بہنے لگا۔ ساتھ کھڑے منگول نے پتھر کی سمت کا اندازہ کر لیا تھا اور یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ پتھر کس نے پھینکا ہے۔ وہ بھاگتا ہوا ایک دو منزلہ مکان میں داخل ہوا اور تھوڑی دیر بعد ایک آٹھ دس سالہ بچے کو گھسیٹتا ہوا باہر لے آیا۔ بچہ بری طرح چلا رہا تھا اور ایک عورت جو اس کی ماں لگتی تھی منگول کی منتیں کر رہی تھی کہ وہ بچے کو چھوڑ دے۔ ایک بوڑھی عورت جو شاید بچے کی دادی تھی ننگے سر اور ننگے پاؤں ان دونوں پیچھے بھاگی۔ منگول بچے کو گھسیٹتا ہوا بازار میں لایا۔ بچے نے منگول کے ہاتھ پر کاٹا اور اس نے دو تین زور دار تھپڑ اس کے منہ پر جڑ دیئے۔ ماں بے چین ہو کر منگول پر جھپٹی اور اس کا چہرہ نوچنے لگی۔ منگول نے بچے کو تو چھوڑ دیا اور عورت کو بالوں سے پکڑ لیا۔ بازار کے لوگ خوف سے بت بنے یہ تماشہ دیکھ رہے تھے۔ کسی کی ہمت نہیں تھی کہ آگے بڑھتا اور عورت کو چھڑاتا۔ منگول عورت کو بالوں سے گھسیٹتا ہوا عین چوراہے میں لے آیا۔ سردار یورق اور اباقہ منگول کی طرف بڑھے لیکن اس وقت اردگرد کھڑے لوگوں میں سے کسی نے تیر چلایا جو سنسناتا ہوا منگول سپاہی کے حلق میں پیوست ہو گیا۔ وہ تڑپ کر زمین پر گرا' تماشائی خوف سے چلائے۔ اباقہ اور یورق نے اپنی تلواریں کھینچیں۔ ایک دوسرا تیر آیا اور یورق کے بائیں بازو میں پیوست ہو گیا۔ اس وقت اباقہ کی عقابی نگاہوں نے ایک شخص کو ہجوم کے اندر سے بھاگتے دیکھا۔ وہ تیزی سے اس طرف لپکا' لوگوں کو دونوں ہاتھوں سے دائیں بائیں دھکیلتا وہ ایک تنگ سی گلی میں آیا لیکن یہاں پہنچ کر اسے دور دور تک تیرانداز کا سراغ نہیں ملا۔ وہ تیزی سے واپس پلٹا۔ چوراہا لوگوں سے تقریباً خالی ہو چکا تھا۔ اِکا دُکا افراد کونے کھدروں میں کھڑے خوفزدہ نظروں سے منگول کی لاش دیکھ رہے تھے۔ تین چار اور منگول سپاہی بھی اب موقع پر آ گئے تھے۔ ان میں سے ایک یورق کے بازو سے تیر نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اباقہ نے

گئے تھے۔ ان میں سے ایک یورق کے بازو سے تیر نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اباقہ نے
مردہ منگول کو دیکھا۔ وہ بالکل نوجوان تھا۔ ابھی مسیں بھی نہیں بھیگی تھیں۔ وہ ان کے ساتھ ہی قراقرم سے آیا تھا اور یورق کے دستے میں شامل تھا۔ اپنے سردار سے وفاداری کا حق نبھاتے ہوئے اس نے جان دے دی تھی۔ جلد ہی شہر کا منگول کمان دار چاق وچوبند دستے کے ساتھ موقعے پر پہنچ گیا۔ اس دوران منگول سپاہی اردگرد کے دکانداروں کو ان کی پناہ گاہوں سے کھینچ کھینچ کر چوراہے میں لا چکے تھے ان سب کے چہرے خوف سے تاریک تھے۔ چند ہی لمحے بعد تیر انداز کے نام کا پتہ چل گیا۔ وہ ایک ایرانی تھا اور اس کا نام اسد اللہ تھا۔ کسی وقت وہ خوارزم شاہ جلال الدین کی فوج کا سرگرم سپاہی تھا' لیکن اب وہ مقامی نوجوانوں کو منگولوں کے خلاف بھڑکانے کے سوا کچھ نہیں کرتا تھا۔ ایک دفعہ پہلے بھی وہ ایک منگول کو زخمی کر چکا تھا۔ اس منگول نے اسے ایک گلی میں لوگوں کو اکٹھا کر کے تقریر کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا' لیکن جب منگول اسے پکڑنے لگا تو اس نے اسے چھرا گھونپ دیا اور بھاگ گیا۔

منگول کمان دار سپاہی کے قتل پر سخت غضب ناک دکھائی دیتا تھا۔ اس نے موقع کے قریباً چالیس دکانداروں کو بازار کے چوراہے میں بری طرح پٹوایا۔ بالآخر ان میں سے ایک نے اسد اللہ کا ٹھکانہ بتا دیا۔ پتہ چلا کہ وہ قوقند کے شمالی محلے میں رہتا ہے۔ کمان دار فوراً ایک سو سواروں کو لے کر اس محلے کی طرف روانہ ہو گیا۔ اباقہ بھی اس دستے کے ساتھ تھا' لیکن یورق کو چونکہ گہرا زخم آیا تھا لہٰذا اسے چھاؤنی بھیج دیا گیا تھا۔ قوقند کے نیم روشن بازاروں میں سے گزرتے ہوئے منگول سپاہی اس محلے میں پہنچے تو تمام گھروں کے دروازے اور کھڑکیاں بند تھیں۔ بڑی پُراسراری خاموشی طاری تھی۔ کمان دار کے اشارے پر آٹھ دس منگول سپاہی دندناتے ہوئے ایک گھر میں گھس گئے اور وہاں سے دو نوجوانوں کو گھسیٹ کر باہر لے آئے۔ دونوں نوجوان بھائی لگتے تھے۔ ایک باریش تھا اور دوسرے کی ابھی داڑھی نہیں آئی تھی۔ دونوں کی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں تھیں۔ کمان دار نے بڑے بھائی سے اسد اللہ کا پتہ دریافت کیا۔ اس نے کہا کہ میں کسی اسد اللہ کو نہیں جانتا۔ ابھی الفاظ اس کے منہ میں ہی تھے کہ کمان دار کی تلوار لہرائی اور باریش نوجوان کا سر کٹ کر چھوٹے بھائی کے قدموں میں جا گرا۔ چھوٹا بھائی دہشت سے پھٹی ہوئی نظروں سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ اس کے سامنے اس کے بڑے بھائی کا سربریدہ جسم تڑپ رہا تھا۔ ایک دلدوز چیخ اس کے سینے میں گونج کر رہ گئی۔ کماندار نے تلوار کی نوک اس کے سینے پر رکھی اور اسی انداز میں پوچھا۔

"اسد اللہ کا گھر کون سا ہے؟" نوجوان نے ایک طویل سانس لے کر تھوک نگلا اور بولا۔

"میں کسی اسد اللہ کو نہیں جانتا۔"

کمان دار کے جبڑے بھنچ گئے ایک بار پھر اس کا ہاتھ اٹھا' لیکن اس وقت مکان کا دروازہ دھماکے سے کھلا اور ایک نوجوان لڑکی چیختی ہوئی باہر نکل آئی۔ "ٹھہرو میرے بھائی کو مت مارو۔" وہ چلائی اور بھاگ کر نوجوان لڑکے سے لپٹ گئی۔

کمان دار غرایا۔ "تو پھر بتاؤ کہاں ہے .... اسد اللہ کا گھر؟"

لڑکی نے سسکاری بھری۔ "اسد اللہ .... اسد اللہ اسی گھر میں رہتے ہیں۔"

لڑکی کی بات سنتے ہی کمان دار اور منگول سپاہی دوبارہ اس گھر میں گھس گئے۔ اندر ایک بوڑھے مرد اور اُدھیڑ عمر عورت کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ اُدھیڑ عمر عورت بے ہوش پڑی تھی۔ شاید وہ دروازے کی اوٹ سے اپنے بچے کے قتل کا منظر دیکھ چکی تھی۔ بوڑھا اسے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہا تھا۔ منگول سپاہی سیلاب کی طرح اندر داخل ہوئے اور طوفان کی طرح ہر شے کو تہ و بالا کر دیا۔ اسد اللہ تو انہیں نہیں ملا لیکن کچھ اہم سراغ مل گئے۔ اسد اللہ کے کمرے سے انہیں کاغذوں کا ایک پلندہ ملا۔ کمان دار کے حکم پر ایک مترجم نے یہ کاغذات پڑھ کر سنائے۔ ان تحریروں سے پتہ چلا کہ اسد اللہ کافی عرصے سے اس شہر میں سرگرم ہے۔ وہ منگولوں کے خلاف لوگوں اور خاص طور پر نوجوانوں کو تلوار اٹھانے کی ترغیب دیتا تھا۔ اسی محلے کے دو نوجوان بھی سرگرمی سے اس کا ساتھ دے رہے تھے۔ وہ دونوں بھی خوارزم شاہ کی فوج کے سابقہ سپاہی تھے۔

کمان دار کا چہرہ جوش غضب سے تمتما رہا تھا۔ اس کے حکم پر فوراً باقی کے دو گھروں پر بھی چھاپے مارے گئے۔ اسد اللہ کے دونوں ساتھیوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ منگول کمان دار نے حکم دیا کہ ان تینوں گھروں کے تمام مکینوں کو گرفتار کر لیا جائے اور مال واسباب لوٹ کر گھروں کو آگ لگا دی جائے۔ کمان دار کی ہدایت پر فوراً عمل ہوا۔ چیختے چلاتے مکینوں کو گرفتار کر کے گھروں کو آگ لگا دی گئی۔

جب اباقہ فوجی دستے کے ساتھ واپس چھاؤنی روانہ ہوا تو اس محلے کے کئی مکان آگ پکڑ چکے تھے اور دہشت زدہ لوگ آگ بجھانے کی بجائے جانیں بچا کر بھاگ رہے تھے۔

☆-------☆-------☆

یورق کی حالت بہت خراب تھی۔ اسے جس تیر سے نشانہ بنایا گیا تھا وہ زہر میں بجھا

ہوا تھا۔ پچھلے دو دن میں وہ ایک پل بھی نہیں سو سکا تھا اور اس کے ساتھ ہی اباقہ بھی جاگ رہا تھا۔ وہ لاکھ وحشی اور جنگلی سہی لیکن آخر ایک انسان تھا۔ اس کے اندر محبت کرنے اور محبت کو محسوس کرنے والا ایک دل تھا۔ وہ جانتا تھا یورق اسے کس قدر چاہتا ہے۔ اس کی خاطر وہ کئی بار اپنی زندگی داؤ پر لگا چکا تھا۔ ایک دفعہ اباقہ کی حمایت پر چغتائی خان نے اسے خونخوار کتوں کے آگے ڈالنے کا حکم دے دیا تھا اور ایک دفعہ اس نے اباقہ پر قاتلانہ حملہ کرنے والے "داریان" کا خنجر اپنے بازو پر جھیلا تھا .... اور اب وہی سردار یورق اس کے سامنے زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھا۔ شام کے وقت اس کی طبیعت کافی سنبھل گئی تھی اور فوجی طبیب نے امید ظاہر کی تھی کہ وہ بچ جائے گا' لیکن رات ڈھلنے کے ساتھ ساتھ یورق کی حالت بھی بگڑتی چلی گئی .... اور اب وہ چراغِ سحری کی طرح ٹمٹما رہا تھا۔ اباقہ دونوں ہاتھ پشت پر باندھے بے چینی سے برآمدے میں ٹہل رہا تھا۔ اس کی حالت پنجرے میں بند کسی غضبناک درندے کی سی تھی۔ اس کے بزرگ دوست اور جاں نثار ساتھی یورق کو بستر مرگ پر پہنچانے والا ابھی تک آزاد تھا۔ وہ آزادانہ سانس لے رہا تھا' چل پھر رہا تھا اور ظاہر ہے کھاتا پیتا بھی ہو گا .... لیکن سردار یورق اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکتا تھا' پچھلے چار پہر سے اس کے منہ میں پانی یا دوائی کی ایک بوند نہیں گئی تھی اور اب اس کی سانس بھی اٹک رہی تھی۔ اباقہ کی آنکھیں طیش سے جلنے لگیں۔ اس نے ایک طویل سانس لی اور تیز قدموں سے قید خانے کی طرف بڑھا۔ قید خانہ چھاؤنی کے احاطے کی دوسری جانب واقع تھا۔ کوٹھڑیوں کی ایک طویل قطار شمالاً جنوباً چلی گئی تھی۔ ہر کوٹھڑی کے سامنے لوہے کی سلاخوں والا بڑا جنگلہ تھا۔ اباقہ کوٹھڑیوں میں جھانکتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ قیدی برفانی ہواؤں کی زد میں سکڑے سمٹے ایک دوسرے کی ٹانگوں میں گھسے ہوئے بے سدھ پڑے تھے۔ پھٹے پرانے کمبل انہیں سردی سے بچانے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ کچھ اونگھ رہے تھے اور کچھ رات کے آخری پہر میں بھی جاگ رہے تھے۔ چھاؤنی کے اس حصے میں ایک گھمبیر خاموشی طاری تھی۔ اباقہ ایک کوٹھڑی کے سامنے رک کر اندر دیکھنے لگا۔ طاق میں جلتے چراغ کی مدھم روشنی میں چار پانچ بے حرکت جسم نظر آ رہے تھے یہ وہی قیدی تھے جو پرسوں منگول سپاہی کی ہلاکت کے بعد گرفتار کیے گئے تھے۔ ساتھ والی دو کھڑکیوں میں بھی ان کے ساتھی بند تھے۔ اباقہ کو معلوم تھا کہ گرفتار ہونے والے مردوں اور خاص طور پر اسد اللہ کے دو ساتھیوں پر بہت تشدد کیا گیا ہے لیکن انہوں نے اسد اللہ کا پتہ نہیں بتایا۔ اباقہ کے نتھنوں سے دھوئیں کی طرح جمی ہوئی سانس پھنکاروں کی صورت برآمد ہو رہی تھی۔ اس کے جبڑے مضبوطی سے ایک دوسرے پر

پیوست تھے' اس نے غضب کے عالم میں لوہے کی سلاخوں پر دو زوردار مکے رسید کیے۔ یخ بستہ لوہا ایک شور سے جھنجھنایا۔ قیدی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ وہ چندھیائی چندھیائی نظروں سے تاریکی میں دیکھ رہے تھے۔ شاید پہچاننے کی کوشش کر رہے تھے کہ باہر کون کھڑا ہے۔ اباقہ نے اسد اللہ کے دو ساتھیوں کو پہچان لیا تھا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں قریب آنے کا حکم دیا۔ وہ پہلے تو بیٹھے رہے پھر الجھے ہوئے انداز میں چلتے جنگلے کے قریب پہنچے۔ شاید وہ سمجھ رہے تھے کہ انہیں پوچھ گچھ کے لیے پھر کمان دار کے پاس لے جایا جا رہا ہے۔ اس وقت اباقہ کے دونوں ہاتھ برق رفتاری سے جنگلے کے اندر داخل ہوئے اور اس کے آہنی پنجوں نے دونوں نوجوانوں کے گریبان تھام لیے۔ پھر ایک غضب ناک جھٹکے سے اس نے انہیں اپنی طرف کھینچا۔ وہ دونوں جیسے اڑتے ہوئے جنگلے سے ٹکرائے۔ ان میں سے ایک کی کراہ نہایت بلند تھی۔ اباقہ نے اپنا چہرہ ان کے بالکل سامنے کیا اور سرسراتے ہوئے لہجے میں بولا۔

"کہاں ہے تمہارا ساتھی؟" وہ دونوں خاموش رہے۔ اباقہ نے ایک بار پھر انہیں پیچھے ہٹایا اور نہایت پھرتی سے اپنی طرف کھینچا' لیکن اس دفعہ دونوں نوجوان نے چہرے بچانے کے لیے اپنے بازو سامنے کر لیے تھے' لیکن اباقہ کے جھٹکے میں ناقابل مزاحمت قوت تھی۔ دونوں نوجوانوں کے سر ایک بار پھر جنگلے سے ٹکرائے اور پھر اباقہ پر جیسے درندگی سوار ہو گئی۔ وہ نہایت تیزی اور حیرت انگیز قوت سے دونوں قیدیوں کو بار بار جنگلے سے ٹکرانے لگا۔ وہ دونوں خاصے لمبے تڑنگے اور مضبوط نوجوان تھے۔ ان کے چہروں کے پرانے زخم اس بات کی گواہی دے رہے تھے کہ وہ کمزور افراد نہیں ہیں۔ ان کی سخت جانی کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہو گا کہ منگول سالار دو دن کی کوشش کے باوجود ابھی تک ان سے اسد اللہ کا پتہ نہیں جان سکا تھا' لیکن اباقہ کے سامنے یہ دونوں نوجوان بالکل بے بس دکھائی دے رہے تھے۔ انہوں نے خود کو اس کی گرفت سے چھڑانے کی بہت کوشش کی لیکن چند ہی لمحے میں ان کے چہرے لہولہان ہو گئے۔ اباقہ دیوانگی کے عالم میں چلا رہا تھا۔ "بتاؤ...... بتاؤ...... بتاؤ۔" شور وغل کی آوازوں سے ایکا ایکی پورا قید خانہ جاگ اٹھا تھا۔ قیدی جنگلوں سے منہ لگائے حیرت سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ کچھ چیخ رہے تھے اور کچھ محافظوں کو آوازیں دے رہے تھے۔ چھاؤنی کے احاطے سے چند محافظ مشعلیں اٹھائے تیزی سے قید خانے کی طرف بھاگے۔ اس وقت کوٹھڑی کا ایک تیسرا قیدی ہمت کر کے اباقہ کی طرف لپکا اور نوجوانوں کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگا۔ پھر اس نے ایک ہاتھ جنگلے سے نکال کر زوردار مکا اباقہ کے چہرے پر مارا۔ اباقہ نے ایک قیدی کو چھوڑ کر اس دوسرے قیدی کو کو

لیا۔ پہلا قیدی نیم بیہوشی کے عالم میں کوٹھڑی کے فرش پر جا گرا۔ اس وقت تک محافظ کوٹھڑی کے سامنے پہنچ چکے تھے' لیکن اپنے پنج صدی سردار (اباقہ) کو دیکھ کر انہوں نے کوئی مداخلت نہیں کی۔ اباقہ ایک بار پھر پھنکارا۔

"بتاؤ .... کہاں ہے وہ قاتل اسد اللہ؟" وہ ترکی بول رہا تھا اور ظاہر ہے قیدی اس کی بات اچھی طرح سمجھ رہے تھے لیکن اس کے باوجود وہ اپنی خاموشی برقرار رکھے ہوئے تھے۔ اباقہ نے ایک بار پھر انہیں جنگلے سے ٹکرانا شروع کر دیا۔ جو نیا قیدی اس کے چنگل میں پھنسا تھا وہ وہی نو عمر لڑکا تھا جس کے بڑے بھائی کا سر منگول کمان دار نے تلوار کے ایک ہی وار سے اُڑا کر اس کے قدموں میں پھینک دیا تھا۔ دو تین ضربیں کھا کر لڑکا زور سے چلایا۔ اس کی چیخ کے ساتھ بائیں طرف والی کوٹھڑی سے بھی ایک چیخ بلند ہوئی۔ یہ نسوانی چیخ لڑکے کی بہن کی تھی۔ وہ پکار کر بولی۔

"خدا کے لیے چھوڑ دو اسے۔ میں تمہیں بتاتی ہوں۔ سب کچھ بتاتی ہوں۔"

لڑکی کی آواز نے اباقہ کو اپنی جگہ جامد کر دیا۔ اس نے سر گھما کر گہری نظروں سے پریشان حال لڑکی کی طرف دیکھا اور قیدیوں کے گریبان چھوڑ دیئے۔ پہلا قیدی جو بے ہوش ہو چکا تھا کٹے ہوئے شہتیر کی طرح اپنے زمین بوس ساتھی پر جا گرا۔ اباقہ نے پہریدار سے کہا کوٹھڑی کا دروازہ کھولو۔ پہریدار نے کنجیاں نکال کر دروازہ کھولا۔ اباقہ نے حکم دیا کہ لڑکی کو میرے کمرے میں لایا جائے۔

تھوڑی دیر بعد لڑکی اور اباقہ ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے تھے۔ چند قدم دور اس علاج گاہ کا بڑا دروازہ نظر آ رہا تھا۔ جس کے ایک کمرے میں سردار یورق زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھا۔ اباقہ کی آنکھوں میں دکھ کے گہرے سائے تھے۔ وہ لڑکی کے حسین لیکن ملول چہرے پر نگاہیں ڈالے بغیر بولا۔

"کہو۔ تم کیا کہنا چاہتی ہو اس قاتل کے بارے میں؟"

لڑکی نے سرخ دوپٹے سے اپنے آنسو پونچھے اور سر جھکا کر بولی۔ "اگر میں ان کے بارے میں بتا دوں تو آپ ہمیں چھوڑ دیں گے؟"

اباقہ غرایا۔ "مجرموں کو سزا ضرور ملے گی لیکن جو بے قصور ہیں انہیں چھوڑ دیا جائے گا۔"

"لڑکی نے آنکھوں میں جمع ہونے والے آنسوؤں کو ایک بار پھر صاف کیا اور بولی۔"

"اگر اس وقت وہ آپ کو مل سکتے ہیں تو قونقد کے سابق داروغہ اصلاح الدین کے

گھر مل سکتے ہیں۔ داروغہ کا بیٹا ان کا گہرا دوست ہے۔"

اباقہ نے پوچھا۔ "تم یہ سب کچھ اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتی ہو؟"

لڑکی کا سر کچھ اور جھک گیا۔ دو شفاف آنسو اس کی جھولی میں گرے اور ریشمی قمیص کے نقش و نگار میں گم ہو گئے۔ وہ بولی۔ "وہ.......... میرے شوہر ہیں کچھ روز پیشتر ہی ہماری شادی ہوئی ہے۔"

اباقہ نے پوچھا۔ "جس گھر سے تمہیں گرفتار کیا گیا ہے اس سے تمہارا کیا رشتہ ہے؟"

لڑکی نے لگاتار گرتے آنسوؤں کے درمیان جو کچھ بتایا اس کا لب لباب یہ تھا۔ وہ بلخ کی رہنے والی تھی ۔اس کا والد اسد اللہ کے والد کا دوست تھا۔ دونوں دوستوں نے یہ رشتہ طے کیا لیکن دھوم دھام سے شادی کی نوبت نہ آئی۔ منگولوں کے حملے نے سب کچھ برباد کر دیا۔ گھرانے اجڑ گئے شہر برباد ہو گئے ۔اس سیلاب بلا خیز میں لڑکی جس کا نام ہاجرہ تھا تنہا رہ گئی۔ اسد کے خاندان کا کچھ پتہ نہیں چلا کہ ایران میں ان پر کیا بیتی۔ ہاجرہ ایک مدت اپنے منگیتر کا انتظار کرتی رہی ۔ آخر ایک ماہ پیشتر وہ اسے بلخ میں ملا جہاں وہ اپنے ایک دور کے رشتہ دار کے ہاں ٹھہری ہوئی تھی۔ کوئی بیس روز پیشتر نہایت خاموشی سے ان کی شادی ہو گئی اور وہ اسد کے ساتھ توقند آ گئی۔ یہاں اسد کو ایک وثیقہ نویس نے پناہ دے رکھی تھی۔ جس گھر سے اسے گرفتار کیا گیا وہ اس مسلمان وثیقہ نویس کا گھر تھا۔ اپنے پناہ گزیں کی رازداری کے لیے اس گھرانے نے بہت بڑی قربانی دی تھی ۔ وثیقہ نویس کا ایک لڑکا قتل ہو گیا تھا اور دوسرا قتل ہونے والا تھا۔ جب لڑکی نے گھر سے باہر آ کر اس کی جان بچائی تھی۔ وہ اس کا سگا بھائی نہیں تھا لیکن وہ اسے اپنے شوہر کے لیے جان گنواتے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اباقہ نے لڑکی کی پوری بات سننے کے بعد اسے واپس قید خانے میں بھیج دیا اور خود کماندار کے پاس پہنچا۔ کماندار اس وقت گہری نیند سو رہا تھا۔ پہلے تو وہ اباقہ کی بے وقت مداخلت پر بری طرح غرایا لیکن پھر اسے معاملے کی ہنگامی نوعیت کا احساس ہوا اور اس نے ایک دستے کو فوراً اباقہ کی معیت میں سابق داروغہ شہر کی طرف روانہ کر دیا۔ جس وقت دستہ چھاؤنی سے باہر نکلا شہر گہری نیند سو رہا تھا۔ سنسان سڑکوں پر گھوڑے دلکی چال چلنے لگے۔ ان کی ٹاپیں در و دیوار سے ٹکرا کر گونج اٹھیں۔ دور مشرق سے سپیدہ سحر نمودار ہو رہا تھا۔ دفعتاً ایک آواز سن کر اباقہ چونک گیا۔ ایک عجیب سی مترنم آواز تھی جو یخ بستہ فضا کا سینہ چیرتی' ڈوبتی ابھرتی چلی جا رہی تھی۔ یہ آواز اباقہ کے کانوں میں داخل ہوئی اور دل تک اترتی چلی گئی۔ اسے لگا جیسے یہ آواز اس نے پہلے بھی کہیں سنی ہے۔ بہت دیر پہلے......

مدت دیر پہلے۔ اباقہ نے گھوڑا روک لیا اس کے ساتھ ہی پیچھے آنے والے گھڑ سوار رک گئے۔ آواز اب زیادہ صاف سنائی دے رہی تھی۔ الفاظ اسے سمجھ نہیں آ رہے تھے لیکن ان میں عجیب کشش تھی۔ کوئی بوڑھا شخص دل کی اتھاہ گہرائیوں سے پکار رہا تھا۔ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ط اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ .... اباقہ خاموشی سے کھڑا سنتا رہا۔ ذہن کے نہاں خانوں میں پُراسرار نورانی انگلیاں سرسراتی رہیں۔ وہ سوچتا رہا یہ آواز اس نے پہلے پہل کہاں سنی تھی۔ دفعتاً آواز تھم گئی۔ اس کے ساتھ ہی اباقہ جیسے اپنے آپ میں واپس آ گیا۔ دستے کا ایک صدی سردار آگے بڑھا اور بولا۔ "سردار یہاں ساتھ ہی مسلمانوں کی عبادت گاہ ہے۔ ہر عبادت سے پہلے وہ ایسی ہی صدا لگاتے ہیں۔" اباقہ نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور دستہ آگے روانہ ہو گیا۔

☆------☆------☆

داروغہ کا بیٹا گھر سے غائب تھا۔ شاید اسے دو دن پیشتر ہی خطرے کا احساس ہو گیا تھا۔ اسد اللہ کا بھی کہیں پتہ نہیں تھا۔ بہرحال ایسے شواہد ضرور ملے جن سے پتہ چلا کہ اسد یہاں آتا جاتا رہتا تھا۔ داروغہ سے پوچھ گچھ کی گئی۔ جب نرمی سے کام نہ چلا تو سختی کی گئی پھر' بالآخر داروغہ جو پہلے ہی علیل تھا بے ہوش ہو گیا۔ اباقہ سمجھ رہا تھا کہ یہ تشدد فضول ہے۔ بوڑھا اپنے بیٹے یا اسد اللہ کے بارے کچھ نہیں جانتا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اباقہ کے غم و غصے میں اضافہ ہو رہا تھا۔ یورق کی حالت بدستور نازک تھی۔ اس کے سارے بدن پر نیلاہٹ چھا گئی تھی۔ اباقہ کا بس نہیں چل رہا تھا۔ اگر وہ قاتل اس کے سامنے آ جاتا تو اس کے بدن کا سارا خون نچوڑ کر یورق کے منہ میں ٹپکا دیتا۔ اسی شام کمان دار کی طرف سے اعلان ہوا کہ اگر پرسوں صبح تک مجرم اسد اللہ نے خود کو حکام کے حوالے نہ کیا تو وثیقہ نویس اور اس کے بیٹے کو سرعام پھانسی پر لٹکا دیا جائے گا۔ اعلان ہوتے ہی منادی کرنے والے توقند میں نقارے پیٹنے لگے۔ اندھیرا پھیلنے سے پہلے یہ خبر سارے شہر میں پھیل چکی تھی۔ قاصد اردگرد کے قصبوں میں بھی یہ اطلاع پہنچانے کے لیے روانہ ہو گئے۔

اگلے دن کا سورج طلوع ہوا اور سارے دن کا سفر ختم کر کے مغرب میں جھک گیا۔ سرِ شام ہی چھاؤنی کے باہر چوراہے میں پھانسی کی تیاری ہونے لگی۔ کمان دار کے حکم کے مطابق اگلے روز علی الصبح وثیقہ نویس اور اس کے بیٹے کو تختہ دار پر لٹکایا جانا تھا۔ ابھی رات کے اندھیرے نے اپنے پر پوری طرح نہیں کھولے تھے۔ توقند شہر کے گلی کوچوں اور چھاؤنی کے طول و عرض میں ایک ایک کر کے چراغ روشن ہو رہے تھے۔ دفعتاً ایک گھڑ

سوار چھاؤنی کو آنے والی سڑک پر نمودار ہوا اور تیزی سے گھوڑا دوڑاتا بڑے دروازے کے سامنے پہنچ گیا۔ چھاؤنی کے محافظوں نے اس کا نام پوچھا۔

"اسد اللہ!" اس نے گھمبیر لہجے میں کہا۔ وہ چوڑے شانوں والا ایک مضبوط جسم کا جوان تھا۔ چھوٹی چھوٹی سیاہ داڑھی اس کے سرخ وسپید چہرے پر بچ رہی تھی۔ اس کے ایک کندھے سے ترکش اور دوسرے سے تلوار لٹک رہی تھی۔ اس کا نام سن کر محافظ چونکے۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ سپاہیانہ خدوخال والے اس نوجوان کو کمان دار کے سامنے پیش کر رہے تھے۔ ایک سپاہی نے آگے بڑھ کر نوجوان کی تلوار اور تیر کمان' کمان دار کے سامنے رکھ دیئے۔

کمان دار اسے گھورتا ہوا بولا۔ "اچھا تو تم ہو خوارزم شاہ کے جوشیلے سپاہی۔"

نوجوان خاموش کھڑا رہا۔ منگول سردار بولا۔ "ڈوبتے جہاز کے چوہوں کے بارے سنا بہت تھا دیکھا آج ہے .... ہاں تو ذرا ہمیں بھی اپنی وہ شعلہ بیانی دکھاؤ جو اہل قوقند کی بجھی ہوئی راکھ میں چنگاریاں پیدا کر رہی ہے .... سنا ہے تمہاری تقریر بڑوں بڑوں کے سر گھما دیتی ہے۔"

نوجوان نے اطمینان سے کہا۔ "منگول سردار تقریر تو میں خود بھی کرنا چاہتا ہوں۔ اختلاف صرف جگہ کا ہو سکتا ہے۔"

"میں سمجھا نہیں۔" کمان دار نے کہا۔

نوجوان نے کہا۔ "اگر آپ اجازت دیں تو میں کل پھانسی کے تختے پر اہل قوقند سے خطاب کرنا چاہوں گا۔"

کمان دار تیزی سے گھوما اور اس کا زوردار تھپڑ اسد کے رخسار پر پڑا۔ وہ تھوڑا سا لڑکھڑایا ضرور' لیکن اس کے چہرے پر قطعی حیرانی نظر نہیں آئی' شاید اس تھپڑ کی اسے پہلے سے توقع تھی۔ منگول سردار چنگھاڑا۔ "ہم تجھے کتے کی موت ضرور ماریں گے' لیکن کتے کی طرح بھونکنے کی اجازت نہیں دیں گے۔" پھر وہ سپاہیوں سے مخاطب ہوا۔ "لے جاؤ اس بدبخت کو اور کل شام تک کے لیے کوٹھڑی میں بند کردو۔"

سپاہی نوجوان کو باہر لے گئے تو کمان دار بڑبڑایا۔ "کہتا ہے کہ تقریر کروں گا۔ کل کیا ہو گا یہ صرف نیلا آسمان جانتا ہے۔" پھر وہ سپاہیوں سے بولا۔ "جاؤ' اباقہ کو میرے پاس بھیجو۔" سپاہی حکم کی تعمیل میں چلے گئے اور تھوڑی دیر بعد اباقہ کو لے آئے۔

کمان دار بولا۔ "بیٹھو اباقہ! تمہارے لئے خوشخبری ہے۔"

وہ ان چند دنوں میں اباقہ کو بہت اہمیت دینے لگا۔ اس نوجوان کی شہرت تو اس نے

پہلے بھی بہت سنی تھی' لیکن اب قریب سے بھی دیکھ لیا تھا۔ وہ جانتا تھا یہ نوجوان ان بہادروں میں سے ہے جو تن تنہا معرکوں کی قسمت بدل دیا کرتے ہیں۔ اباقہ اس کے قریب ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ کمان دار بولا۔ "مجرم نے خود کو ہمارے حوالے کر دیا ہے اباقہ .... کل صبح اسے سر عام پھانسی دے دی جائے گی۔" اباقہ کے چہرے پر اطمینان کی جھلک دکھائی دی۔ پھر اس کی نگاہوں میں مجرم کی نوبیاہتا بیوی کا چہرہ گھوم گیا اور وہ کچھ افسردہ سا ہو گیا .... لیکن ایک قاتل کو اس کی سزا تو ملنی چاہئے .... اس نے اپنے دل کو سمجھایا۔ کماندار کی آنکھوں میں سفاک شرارت دکھائی دے رہی تھی۔ آگے کو جھک کر اباقہ سے بولا۔ "قیدی عورتوں میں سے کوئی عورت پسند کرنی ہے تو کر لو .... وہ مجرم کی نوبیاہتا بیوی کے بارے میں کیا خیال ہے؟" اباقہ خاموش رہا۔ کماندار بولا۔ "بھئی یوں بھی تو کل تک اسے بے سہارا ہی ہو جانا ہے۔"

اباقہ چونک کر بولا۔ "تو کیا تم اب بھی وثیقہ نویس اور اس کے بیٹے کو پھانسی دو گے۔"

جواب میں کمان دار نے ایک قہقہہ لگایا اور بولا۔ "ان دونوں کو ہی نہیں تمام مرد قیدیوں کی گردنیں اڑا دی جائیں گی۔"

اباقہ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ "کیا مطلب! تم ان سب مردوں کو قتل کر دو گے؟"

"بالکل!" کمان دار بولا۔ "ہم ہمیشہ سے ایسا ہی کرتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہم ان دشمنوں کے درمیان زندہ ہیں۔ انہیں معاف کرنا اپنے اوپر ظلم کرنا ہے........."

.... شاید کمان دار ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ اباقہ کو یاد آیا کہ کس طرح بازار میں سردار یورق کو زخمی اور اس کے ایک سپاہی کو ہلاک کیا گیا تھا۔ کمان دار کہہ رہا تھا۔

"وہ منادی تو صرف مجرم کو یہاں لانے کے لیے کرائی گئی تھی ورنہ ان لوگوں کی موت کا فیصلہ تو اسی وقت ہو گیا تھا۔" کافی دیر اباقہ اور کمان دار بیٹھے باتیں کرتے رہے پھر اباقہ نے کہا کہ وہ قیدی کو ایک نظر دیکھنا چاہتا ہے۔ کماندار نے اجازت دے دی۔ اباقہ دو سپاہیوں کے ساتھ قید خانے کی طرف روانہ ہوا۔ نئے قیدی کو ایک بالکل بند کوٹھڑی میں رکھا گیا تھا۔ اس کوٹھڑی میں جھانکنے کے لیے صرف ایک تنگ سوراخ تھا۔ اباقہ نے سوراخ سے آنکھیں لگائیں قیدی دیوار سے ٹیک لگائے خاموش بیٹھا تھا۔ اباقہ خاموشی سے اسے دیکھتا رہا پھر نہایت نفرت سے اس سوراخ میں تھوک دیا۔ اس کے بس میں ہوتا تو یورق کے دشمن کی بوٹیاں ابھی نوچ لیتا۔

سوراخ سے ہٹ کر وہ اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔ راستے میں اس نے تین کوٹھڑیوں میں بند ان قیدیوں کو دیکھا جو اپنی قریب آتی ہوئی موت سے بے خبر تھے۔ ابھی انہیں معلوم نہیں تھا کہ صبح انہیں "بڑے مجرم" کے ساتھ ہی موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔ ایک شخص اپنے شیر خوار بچے کو کندھے سے لگائے کوٹھڑی میں ٹہل رہا تھا۔ ایک قیدی عورت اپنے بیمار شوہر کا سر دبا رہی تھی۔ ایک کوٹھڑی میں اباقہ کو اسد کی بیوی بھی نظر آئی۔ وہ سب سے زیادہ اداس تھی۔ شاید اسے اپنے شوہر کی گرفتاری کا علم ہو چکا تھا۔ اسد کے دونوں ساتھی اباقہ کے غضب کا نشانہ بننے کے بعد شدید زخمی ہو گئے تھے۔ اباقہ نے دیکھا وہ دونوں ساتھ ساتھ لیٹے تھے اور وثیقہ نویس کا نوعمر لڑکا عثمان ان کے زخم دھو رہا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ ان زخموں کو اب دوا کی ضرورت نہیں رہی۔ منگول کمان دار کی طرف سے ان کی موت کا پروانہ جاری ہو چکا ہے۔

اباقہ دل میں ایک نامعلوم بوجھ لیے علاج گاہ میں یورق کے پاس چلا آیا۔ چھاؤنی کا ماہر ترین چینی طبیب یورق کا بگڑا ہوا زخم صاف کرنے میں مصروف تھا .... اس کے بازو کا بہت سا گوشت کاٹا جا چکا تھا اور اب اس زخم میں شراب ڈال کر اسے آگ دکھائی جا رہی تھی۔ اباقہ اس ناخوشگوار منظر سے نگاہیں چرا کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ کچھ دیر بعد وہ اپنے بستر پر لیٹا اونگھ رہا تھا۔

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا اباقہ کی آنکھ کھل گئی۔

اس کے کانوں میں کسی کے رونے کی آواز آئی' لیکن یہ کسی ایک شخص کی آواز نہیں تھی۔ بہت سی عورتیں اور بچے ایک ساتھ رو رہے تھے۔ بڑا دل ہلا دینے والا نوحہ تھا جو رات کے یخ بستہ سناٹے میں کبھی بلند اور کبھی دھیما ہو جاتا تھا۔ اباقہ اپنے بستر سے اترا اور کھڑکی کے پٹ کھول کر باہر جھانکنے لگا۔ دور مغرب کی سمت جھکے ہوئے چاند سے اندازہ ہوتا تھا کہ صبح زیادہ دور نہیں۔ برفانی چوٹیوں کو چھو کر آنے والی یخ بستہ ہوا اباقہ کے لیے کچھ زیادہ تکلیف دہ نہیں تھی۔ وہ کمرے سے نکل کر طویل برآمدے میں آ گیا۔ احاطے کی دیوار کے ساتھ ساتھ سمور میں لپٹے ہوئے منگول پہریدار ٹانگوں کو گرم رکھنے کے لیے آہستہ آہستہ ٹہل رہے تھے۔ ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور اس پُراسرار نوحے کی آواز اپنی تمام تر یاسیت کے ساتھ اباقہ کے کانوں سے ٹکرائی۔ وہ آواز کی سمت کا اندازہ لگا چکا تھا۔ یہ قید خانے کی کوٹھڑیوں سے آ رہی تھی۔ پھر اسے یہ سمجھنے میں بھی دیر نہیں لگی کہ یہ کن قیدیوں کی آواز ہے۔ یہ ان تین کوٹھڑیوں کے بدنصیب مکین تھے جن پر آج صبح قیامت بن کر ٹوٹنے والی تھی۔ اباقہ جان گیا کہ قیدیوں کو ان کی قسمت سے آگاہ کر دیا گیا ہے اور

بدنصیب مجرموں کے بیوی بچے گریہ و زاری کر رہے ہیں۔ وہ کافی دیر برآمدے میں کھڑا ان ڈوبتی ابھرتی آوازوں کو سنتا رہا۔ اس کے دل میں عجب سی بے کلی پیدا ہو رہی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا یہ کیسی بے چینی ہے۔ کل تک تو وہ ان لوگوں کی موت پر کچھ خاص رنجیدہ نہیں تھا۔ وہ اپنے کمرے میں چلا آیا اور کھڑکی بند کر کے دوبارہ سونے کی کوشش کرنے لگا' لیکن ہوا کے جھونکوں کے ساتھ وہ غمزدہ آوازیں بار بار اس کی سماعت سے ٹکراتی رہیں۔ آخر وہ بیزار سا ہو کر اٹھا اور پھر برآمدے میں چلا آیا۔ ٹہلتا ٹہلتا وہ احاطے کے بیرونی دروازے پر پہنچا اور باہر نکل گیا۔ وہ ان آوازوں سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا۔ اس نے تاریک اور سنسان سڑک پر یونہی بے مقصد گھومنا شروع کر دیا .... دفعتاً ایک دوسری آواز ابھری اور سناٹے کا سینہ چیرتی چلی گئی۔ "اللہ اکبر .... اللہ اکبر ...." کوئی بوڑھا شخص اپنے ناتواں جسم کی ساری قوت کے ساتھ اعلان کر رہا تھا۔ "اللہ اکبر .... اللہ اکبر۔" یہی آواز اباقہ نے دو روز پہلے اسی جگہ سنی تھی۔ وہ پتھر کے بت کی طرح ساکت اپنی جگہ کھڑا رہا .... رات کا سناٹا۔ آواز کا زیر و بم۔ الفاظ کی کشش .... سب کچھ مل کر اباقہ پر ایک جادو سا کر رہا تھا۔ اس کے دل میں جستجو پیدا ہوئی اور وہ اس آواز کا ماخذ ڈھونڈنے چل پڑا۔ بڑی سڑک سے وہ ایک چھوٹی گلی میں داخل ہوا اور پھر ایک اور گلی میں مڑ کر رک گیا۔ آواز ایک چھوٹی سی عمارت سے آ رہی تھی' کھڑکیوں میں مدھم روشنی ہو رہی تھی۔ ایک بلند چبوترے پر کوئی شخص دونوں ہاتھ کانوں سے لگائے کھڑا .... صدا لگا رہا تھا۔ پھر صدا ختم ہوئی۔ اس شخص نے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی اور منہ پر ہاتھ پھیر کر اباقہ کی طرف دیکھنے لگا۔

"آؤ اجنبی!" اس کے ہونٹوں سے ایک مترنم آواز بلند ہوئی۔ "آؤ .... ابھی نماز میں کافی وقت ہے ہم اطمینان سے باتیں کر سکتے ہیں۔" پھر وہ چبوترے سے نیچے اترا اور جھک کر اباقہ کے جوتے اتارنے لگا۔ اباقہ کو یہ عمل کچھ عجیب سا لگا وہ جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے ایک نظر بوڑھے کے باریش نورانی چہرے کی طرف دیکھا اور اس کے ہاتھ جیسے خود بخود اپنے جوتوں کی طرف بڑھ گئے۔

چند ہی لمحے بعد وہ عمارت سے ملحقہ ایک چھوٹے سے کمرے میں باریش شخص کے سامنے بیٹھا تھا۔ اس مختصر سے کمرے میں کتابوں کے ڈھیر لگے تھے اور شمعدان میں دو سفید شمعیں روشن تھیں۔ بزرگ نے اپنا ہاتھ بڑھا کر اباقہ کے ہاتھ پر رکھ دیا اور نہایت دھیمے لہجے میں باتیں کرنے لگا۔

.... وہ ایک طویل گفتگو تھی' وہ ایک جادوئی لہجہ تھا' وہ ایک نورانی فضا تھی۔

لمحہ بہ لمحہ اباقہ کے سینے کی گرہیں کھلتی چلی گئیں۔ اس طویل نشست کے دوران وہ بزرگ نماز کی غرض سے صرف ایک بار اٹھ کر باہر گئے اور واپس آکر پھر اپنا سحرانگیز کلام شروع دیا۔ بزرگ کے ہونٹ تواتر سے ہل رہے تھے اور اباقہ کے سامنے حقیقتیں بے نقاب رہی تھیں۔ اس چھوٹے سے حجرے میں بیٹھے بیٹھے اس نے سمرقند و بخارا کے جلتے ہو بازار دیکھے' کٹے ہوئے سروں کے مینار' مسجدوں میں بندھے ہوئے گھوڑے' عصمتیں لٹا آگ میں کودتی ہوئی عورتیں' سب کچھ اس کی نگاہوں سے گزرا۔ اس نے بغداد محلات میں خلافت عباسیہ کی جھلک دیکھی۔ محلات کی غلام گردشوں میں گونجتی ساز سرگوشیاں سنیں۔ شیرِ خوارزم جلال الدین کا اصل روپ اس کی آنکھوں کے سامنے .... وہ سنتا رہا' سنتا رہا پھر ایکا ایکی اس کی آنکھیں آبدیدہ ہو گئیں۔ اس کی نگاہ دھندلا گئیں۔ وہ دل میں پکار اٹھا۔ "اباقہ! تو ظالموں میں سے ہے' تو ظالموں کا دست و باز ہے۔ تو نے ان کے لیے مہمات سر کی ہیں' تو ان کے لیے جان لڑاتا رہا ہے۔ تو قاتلوں اور لٹیروں کے ہاتھ مضبوط کیے ہیں .... تو نے ایسا کیوں کیا اباقہ ایسا کیوں کیا؟" پھر فوراً ہی اسے اس سوال کا جواب ملا۔ مارینا کا دلفریب چہرہ اس کی نگاہوں میں گھوم گیا۔ اس کی حسین آنکھوں نے سوچ کے بے لگام گھوڑے کی باگیں کھینچ لیں۔ اس کا ذہن پکار اٹھا۔ "اباقہ یہی وہ صورت ہے جس کی خاطر تو بھٹکا رہا۔ یہی عورت تجھے خار دار راہوں پ برہنہ پا چلنے پر مجبور کرتی رہی ہے .... پہچان لے اسے۔" دل نے کہا۔ "لیکن تو اسے بھول نہیں سکے گا اباقہ۔ اسے بھولنا تیرے بس میں نہیں۔ کیوں منزل کو ہاتھ سے گنوا ہے۔ منگولوں کا وفادار رہ۔ اس میں تیری محبت کی کامیابی ہے۔" لیکن دل کے اس فیصلے کی عمر چند ساعتوں سے زیادہ نہیں تھی۔ ذہن میں ایک سورج طلوع ہو چکا تھا اور اس کی روشنی میں ہر شکل دھندلا رہی تھی۔ اس کی روپہلی کرنیں ہر فیصلے پر خط تنسیخ پھیر رہی تھیں۔ بزرگ ایک مہربان خاموشی سے اباقہ کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔ ان کی انگلیاں تسبیح پر تیزی سے گردش کر رہی تھیں۔ نوجوان کا چہرہ اس کے سینے میں برپا طوفانوں کی غمازی کر رہا تھا۔

ایک طویل خاموشی کے بعد اباقہ نے سر اٹھایا۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب طرح کا ٹھہراؤ تھا۔ وہ کسی اہم فیصلے کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا۔ اس نے پُرسکون لہجے میں کہا۔

"اے محترم بزرگ! مجھ سے بہت گناہ سرزد ہوئے ہیں۔" بزرگ نے کہا۔ "بیٹے! سمجھی میں تجھ سے جو گناہ ہوئے وہ خدا نے تجھے معاف کر دیئے۔"

اباقہ بولا۔ "محترم بزرگ! ایک گناہ ایسا ہے جو میرے ذہن سے زندگی بھر کے لیے

ہٹ چکا ہے .... یہاں .... سے بہت دور صحرائے گوبی کی وسعتوں میں ایک عورت ہے۔ اس کا نام مارینا ہے۔ وہ چنگیز خاں کے بیٹے کی بیوی ہے۔ میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا .... " دونوں کے درمیان کچھ دیر کے لیے ایک گھمبیر خاموشی حائل رہی۔ پھر بزرگ نے پوچھا۔ "کیا وہ منگول ہے؟"

اباقہ نے کہا۔ "نہیں محترم بزرگ' آج سے کئی سال پہلے اسے چنگیز خاں نے مال غنیمت میں حاصل کیا تھا .... میرا خیال ہے وہ خوارزم کے کسی علاقے کی ہے اور مسلمان ہے۔"

بزرگ نے کہا۔ "کیا تم اسے بیوی بنانا چاہتے ہو؟"

اباقہ بولا۔ "ہاں محترم .... لیکن کیا کسی کی بیوی چھیننا گناہ نہیں؟"

بزرگ کی آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک دکھائی دی اور وہ بولے۔ "کسی کی بیوی چھیننا گناہ ہے لیکن مال غنیمت میں گئی ہوئی کسی مسلمان عورت کو ذلت کی زندگی سے نکالنا بہت بڑا ثواب ہے۔ خدا کی قسم اگر میرا بوڑھا جسم گھوڑے پر بیٹھنے کی اجازت دے اور میرے بازوؤں میں وار روکنے کی صلاحیت ہو تو میں خود تمہارے ساتھ قراقرم جاؤں۔"

ایکا ایکی اباقہ کے چہرے پر بے پناہ جوش دکھائی دیا۔ اس کا سینہ فرط جذبات سے گونج اٹھا۔ اسے لگا وہ تمام زنجیریں ایک جھٹکے سے ٹوٹ گئی ہیں جنہوں نے اس کی مارینا کو باندھ رکھا تھا۔ منگولوں کے رسم و رواج اور ان کی تہذیب کے پرخچے وہ اپنی آنکھوں سے اڑتے دیکھ رہا تھا۔

بزرگ کہہ رہے تھے۔ "اے نوجوان اگر تجھ میں اتنا حوصلہ اور طاقت ہے کہ تو دشمن کے گھر میں اس پر ایک کاری ضرب لگا سکتا ہے تو لگا .... میری دعائیں تیرے ساتھ ہیں۔ خدا کرے قراقرم میں گھری ہوئی ہر عورت کو تیرے جیسا چاہنے والا ملے۔"

بزرگ کے الفاظ اباقہ کے سینے میں جوش اور جذبے کا طوفان برپا کر رہے تھے۔ وہ اس چھوٹے سے کمرے میں بیٹھا تھا' لیکن اس کی نگاہیں قراقرم میں تھیں۔ وہ منگولوں کے سر اڑا رہا تھا۔ ان کے یورت روند رہا تھا اور ہر لحظہ مارینا کے خیمے سے نزدیک ہو رہا تھا..........

اس نے اپنے خیالوں سے چونک کر بزرگ کی نورانی صورت دیکھی اور اپنے پُرجوش ہاتھوں میں ان کے ہاتھوں کو دبا لیا۔ پھر اس نے حجرے کے روزن سے باہر جھانکا۔ اس کے دل کی طرح حجرے سے باہر بھی نیا سویرا طلوع ہو چکا تھا۔ قوقند کے گلی کوچے جاگ اٹھے تھے۔ بزرگ اپنی جگہ سے اٹھے اور جھکے جھکے حجرے سے ایک کونے میں گئے۔ ایک شکستہ

صندوق کھول کر انہوں نے ایک پھولدار کپڑا نکالا۔ پھر اباقہ کے سامنے بیٹھ کر انہوں نے بڑی محبت سے اس کپڑے کی تہیں کھولیں اور بولے۔

"جس روز بخارا پر وحشی منگولوں نے گھوڑے دوڑائے' میں بازار سے اپنی ننھی بچی کا لباس خریدنے نکلا تھا۔ ان کے ہراول دستے آندھی کی طرح نمودار ہوئے اور سیلاب کی طرح شہر کے گلی کوچوں میں پھیل گئے۔ وہ قیامت کا دن تھا۔ اہل بخارا نے قہر خداوندی کو چنگیز خان کے روپ میں شہر کی عظیم الشان مسجد کے دروازے پر دیکھا۔ وہ مسجد کی سیڑھیوں کے سامنے پہنچ کر گھوڑے سے اترا اور لوگوں سے پوچھنے لگا' کیا یہ تمہارے بادشاہ کا گھر ہے' لوگوں نے جواب دیا۔ نہیں یہ ہمارے خدا کا گھر ہے۔ چنگیز خاں بولا۔ میرے سپاہیوں اور ان کے گھوڑوں کو ایسی کشادہ عمارتوں کی ضرورت ہے۔ ایسی تمام عمارتوں کے دروازے کھول دو' ہمارے آدمیوں کے لیے کھانے اور جانوروں کے لیے چارے کا انتظام کرو۔ تم لوگ قہر خداوندی سے ڈرتے ہو اور میں تمہارے لیے قہر خداوندی بن کر آیا ہوں۔ اس نے اپنے مترجم سے کہا کہ میری یہ باتیں ان لوگوں کو اچھی طرح سمجھا دو۔

اس کے بعد بخارا کے طول و عرض میں دہشت بربریت اور خونریزی کا وہ کھیل شروع ہوا جسے زبان پر لانے سے قوت گویائی جواب دینے لگتی ہے اور جسے تحریر کرنے سے قلم کانپ اٹھتا ہے۔ اس رات بخارا کے کسی مرد کو اپنے گھر میں گھسنے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ گلیوں اور چوراہوں میں کھڑے تھے اور تاتاریوں کے مظالم کا نشانہ بننے والی اپنی عورتوں کی چیخ و پکار سن رہے تھے۔ دروازوں پر سفاک محافظ موجود تھے' اگر کسی کی غیرت جوش مارتی اور وہ اپنے گھر میں گھسنے کی کوشش کرتا تو پلک جھپکتے میں اس کا سر اڑا دیا جاتا۔ امیروں کے محلات پر ظلم و ستم دوسرے علاقوں سے سوا تھا۔ ان کے ہاتھوں میں بیلچے تھما دیئے گئے اور کہا گیا کہ وہ اپنے خفیہ خزانوں کی نشاندہی کریں۔ انہیں چھوڑ دیا جائے گا۔ وہ اپنے مدفون اثاثے تاتاریوں کو پیش کرتے' لیکن مزید دولت کے لالچ میں تاتاری ان پر ظلم و ستم جاری رکھتے۔ یہاں تک کہ ان کی موت واقع ہو جاتی۔ شہر کے ایک حصے میں عورتوں کی عصمت دری کرنے والوں پر غیرت مند شہری نعرہ تکبیر بلند کرتے ہوئے ٹوٹ پڑے۔ خالی ہاتھ تلواروں اور نیزوں کا مقابلہ شروع ہوا۔ بپھرے ہوئے شہریوں نے بہت سے حملہ آوروں کے ہتھیار چھین کر انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا .... لیکن منگولوں کی زیادہ تر فوج گھوڑوں پر چوکس بیٹھی تھی۔ انہوں نے چند زوردار حملوں میں ہر طرف لاشیں بچھا دیں۔ اس واقعے کے بعد انہوں نے غضب کے عالم میں ایسا قتل عام کیا کہ چند عورتوں کے سوا میدان صاف ہو گیا۔ انہوں نے ان عورتوں کے ہاتھوں میں رسیاں باندھ کر

گھوڑوں کے ساتھ منسلک کیا اور سمرقند کی طرف روانہ ہو گئے۔ یہ عورتیں گھوڑوں کے ساتھ ساتھ بھاگتی رہیں۔ جب کوئی عورت دم توڑ کر گر پڑتی تو خنجر کے ساتھ اس کی رسی کاٹ دی جاتی .... ہاں وہ قیامت کا دن تھا۔ میں جب شہر کے دھواں دھار گلی کوچوں میں بھاگتا اپنے مکان پر پہنچا تو وہ آگ کے شعلوں پر تھا۔ میری ننھی بچی جس کے خوبصورت کپڑے میرے ہاتھوں میں تھے' مگر وہ کفن کا تقاضہ کر رہی تھی۔ کسی منگول نے اسے نیزے میں پرو کر گھر کی دہلیز پر پھینک دیا تھا......... میری بیوی کا کہیں پتہ نہیں چلا' خدا جانے وہ مر گئی یا جیتے جی مار دی گئی۔" اباقہ نے دیکھا بزرگ کی سفید براق داڑھی میں آنسوؤں کے موتی چمک رہے تھے۔ انہوں نے وہ پھولدار کپڑا اباقہ کی جھولی میں ڈال دیا اور بڑے جذباتی لہجے میں بولے۔

"نوجوان یہ ایک ایسی بچی کا لباس ہے جو ابھی چار سال کی بھی نہیں ہوئی تھی۔ یہ کپڑا کسی دوشیزہ کا تن تو نہیں ڈھانپ سکتا' لیکن اس کے سر کی چادر ضرور بن سکتا ہے اگر تم اس مسلمان لڑکی کو قراقرم سے نکالنے میں کامیاب ہو گئے تو ایک باپ کی طرف سے ایک بیٹی کا سر ڈھانپ دینا۔"

اباقہ نے بڑے احترام سے یہ کپڑا لیا اور اسے اپنی گردن کے گرد لپیٹ کر ایک بل دے دیا۔

عین اس وقت بڑی سڑک کی طرف سے ملا جلا شور بلند ہونے لگا۔ اباقہ خاموشی سے اس شور کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"میرا خیال ہے نوجوان! تم ان آوازوں پر غور کر رہے ہو۔ یہ آوازیں چوراہے میں واقع پھانسی کے چبوترے کی طرف سے آرہی ہیں۔ تمہیں معلوم ہی ہو گا آج کچھ بے گناہوں کو سرعام موت کے گھاٹ اتارا جا رہا ہے۔"

اباقہ بڑے عجیب انداز سے اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ اس کی سفید غیر متحرک آنکھیں روزن سے باہر دیکھ رہی تھیں۔ پھر اس کے ہونٹوں سے ایک ایسی آواز نکلی جو اس سے پہلے بزرگ نے نہیں سنی تھی .... شاید اپنی پوری زندگی میں نہیں سنی تھی .... یہ آواز انسانی تھی مگر انسان کی بھی نہیں تھی وہ آواز کسی درندے کی بھی نہیں تھی۔ وہ ایک عجیب غراہٹ کے ساتھ بولا۔

"......... نہیں محترم بزرگ .... آج اس چوراہے میں کسی کو پھانسی نہیں دی جا رہی۔ کسی کو نہیں۔ آج اس چوراہے میں صرف قتل ہوں گے اور آگ بھڑکے گی۔ آج اس چوراہے میں کھڑے ہو کر منگول اپنی لاشیں گنیں گے........."

اُس کے گلے کی رگیں تنی ہوئی تھیں اور گردن میں بندھا ہوا پھولدار کپڑا کسی پرچم کی طرح پھڑپھڑا رہا تھا۔ وہ نہایت تیز قدموں سے چوراہے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ پھر چوراہے سے کچھ دور رک کر اس نے تیز نظروں سے پھانسی کے چبوترے کا جائزہ لیا۔ سخت سردی کے باوجود چبوترے کے گرد لوگوں کا جم غفیر موجود تھا۔ سزائے موت کے قیدی لائے جاچکے تھے۔ وہ تعداد میں آٹھ تھے۔ سب سے آگے لمبے قد اور مضبوط شانوں والا نوجوان اسد اللہ تھا۔ اباقہ نے دیکھا اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر اوپر سے پٹی باندھ دی گئی تھی۔ سب قیدیوں کے ہاتھ پشت پر بندھے تھے۔ ان کے سروں پر ننگی تلواریں چمک رہی تھیں۔ اباقہ نے دیکھا کہ ابھی کماندار اور اعلیٰ افسران نہیں پہنچے تھے۔ شاید ان ہی کا انتظار کیا جارہا تھا۔ وقت بے حد قیمتی تھا اباقہ کی کامیابی کا انحصار اسی بات پر تھا کہ وہ کتنی تیزی سے حرکت کرتا ہے۔

وہ تیز قدموں سے چھاؤنی کے بڑے دروازے کی طرف بڑھا پھر احاطے سے ہوتا ہوا علاج گاہ میں داخل ہوگیا۔ یہ دیکھ کر اس کی آنکھیں چمک اٹھیں کہ سردار یورق اپنے بستر پر نیم دراز ہے۔ وہ ہوش میں تھا اور کوئی چیز کھا رہا تھا۔ اباقہ کو دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ چینی طبیب قریب ہی موجود تھا۔ اس نے بتایا کہ رات آخری پہر سے سردار ہوش میں ہے اور اس کی تکلیف میں بھی افاقہ ہوا ہے۔ اباقہ نے سوچا اس رات کا آخری پہر کتنا اہم تھا۔ اس کے لئے بھی اور سردار یورق کے لئے بھی۔ سردار یورق کو زندگی ملی تھی اور اس کی زندگی کا رخ متعین ہوا تھا۔ شاید یہ دونوں کام ایک ہی وقت اور ایک ہی لمحے ہونے تھے۔ اباقہ' یورق سے بہت کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن وقت بہت کم تھا۔ اس نے سردار سے کہا۔

"سردار! اگر میں تمہیں ایک سفر پر چلنے کو کہوں تو تم چل سکو گے؟"

سردار یورق مسکرا کر بولا۔ "جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے میں ٹانگوں سے چلا کرتا تھا اور اگر میری ٹانگ بھی زخمی ہوتی تو میں تمہارا کہنا نہ ٹالتا۔ کہو کہاں جانا ہے؟"

"میں ابھی آتا ہوں سردار!" اباقہ بولا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ اب اس کا رخ قیدخانے کی طرف تھا۔ کوٹھڑیوں کی طویل قطار کے سامنے پہنچ کر وہ ان تین کوٹھڑیوں کے سامنے رک گیا جہاں قیامت صغریٰ برپا تھی۔ بچوں اور عورتوں کے رونے کی آواز سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ کئی عورتیں سلاخوں سے سر پٹخ رہی تھیں۔ ایک عورت فرش پر بے ہوش پڑی تھی' ایک شیرخوار بچہ آہنی جنگلا تھامے بلک بلک کر رو رہا تھا۔ ماتم کناں مظلوموں کی بستی میں کوئی پُرسہ دینے والا نہیں تھا۔ منگول پہریدار اس لرزہ خیز منظر

...چپی سے دیکھ رہے تھے۔ گاہے گاہے وہ کوئی فقرہ کہہ کر زیرلب مسکرانے لگتے۔ اباقہ ...شی سے ان عورتوں کو دیکھتا رہا جن کے مردوں کو موت کے گھاٹ اتارا جارہا تھا۔ ان ...ں کو دیکھتا رہا جن کے سروں کو سائے سے محروم کیا جارہا تھا۔ پھر اس نے ایک پہریدار کو ...لم دیا کہ کوٹھڑیوں کے تالے کھول کر ان سب کو گھوڑا گاڑیوں میں بٹھایا جائے۔ پہریدار ...انی سے اباقہ کو دیکھنے لگا۔ اباقہ نے کہا کہ کماندار کے حکم کے مطابق ان سب کو پھانسی کا ...دکھایا جائے گا۔ بات سفاکی کی تھی فوراً منگول کی سمجھ میں آگئی۔ اُس نے جلدی سے ...یوں کا پیچھا نکالا۔ دو پہریدار قریب کھڑی گھوڑا گاڑیوں کی طرف بڑھے۔ چند ہی لمحے بعد ...واروں کے سائے میں تمام عورتوں اور بچوں کو گھوڑا گاڑیوں میں سوار کیا جاچکا تھا۔

اباقہ گھوڑے پر سوار ہوگیا اور گاڑیوں کو لے کر علاج گاہ کے سامنے رکا۔ پھر وہ ...ردار یورق کے پاس پہنچا۔ سردار یورق الجھی ہوئی نظروں سے اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ وہ ...سوس کر رہا تھا کہ اباقہ کوئی خطرناک کام کرنے جارہا ہے۔ وہ اب اس جنگلی کو بہت حد ...تک سمجھ چکا تھا۔ اباقہ کا خوفناک حد تک پُرسکون چہرہ اسے چونکا دینے کے لئے کافی تھا۔ ...ہرحال وہ جانتا تھا کہ اس وقت اباقہ کچھ نہیں بتائے گا۔ اباقہ یورق کے بستر پر جھکا پھر اس ...نے بڑی احتیاط سے اسے اپنے بازوؤں میں اٹھالیا۔ چینی طبیب لمبا چغہ سنبھالے بھاگتا ہوا ...پہنچا۔

"کہاں لے جارہے ہو اسے؟" وہ منگولی میں بولا۔

"کماندار کے پاس' اس کا حکم ہے۔" اباقہ نے جواب دیا۔ اس کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی کہ طبیب اگلا سوال پوچھنے کی ہمت نہ کرسکا۔ اباقہ' سردار یورق کو لئے باہر آیا اور بڑے آرام سے اسے ایک گاڑی میں بٹھا دیا۔ پھر وہ گھوڑے پر بیٹھا اور گاڑیوں کے آگے آگے چلتا چھاؤنی سے باہر آگیا۔ اب اس کا رخ پھانسی کے چبوترے کی طرف تھا۔ اس کے منصوبے کا سب سے خطرناک مرحلہ شروع ہونے والا تھا۔ اس مرحلے سے گزرنے کے لئے زبردست دلیری اور بے باکی کی ضرورت تھی۔ ایسی دلیری اور بے باکی جو مدمقابل ذہنوں کو ماؤف کرڈالے اور یہ صفات اباقہ میں موجود تھیں۔

وہ گھوڑا گاڑیوں کے آگے گھوڑا چلاتا ہجوم میں داخل ہوا اور سیدھا چبوترے کی طرف بڑھنے لگا۔ لوگ دونوں طرف ہٹ ہٹ کر گاڑیوں کو راستہ دے رہے تھے۔ ذرا ہی دیر میں وہ چبوترے کے سامنے پہنچ گیا۔ چبوترے پر موجود منگول پہریدار وضاحت طلب نظروں سے اباقہ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اباقہ گھوڑے سے اترا اور نپے تلے قدموں سے سیڑھیاں چڑھتا چبوترے پر پہنچ گیا۔ پھر اس نے نہایت اعتماد سے اپنا خنجر نکالا اور قیدیوں کی

رسیاں کاٹنے لگا۔ پہریدار پہلے تو خاموشی سے یہ سب کچھ دیکھتے رہے پھر ایک "یک صدی" سردار آگے بڑھا اور بولا۔

"سردار یہ تم کیا کر رہے ہو؟"

اباقہ نے اسے کڑی نظروں سے گھورا پھر بولا۔ "ابھی قراقرم سے ایک قاصد آیا ہے۔ کمان دار نے حکم دیا ہے کہ قیدیوں کو اس کے سامنے پیش کیا جائے۔"

تب ایک پنج صدی سردار تیزی سے قدم اٹھاتا آگے بڑھا۔ وہ اباقہ کو جانتا تھا۔ اس نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اباقہ! یہ تم انہیں کہاں لے جا رہے ہو؟"

"کمان دار کے پاس۔" اباقہ نے کہا۔

پنج صدی سردار اباقہ کے سامنے پہنچ کر بولا۔ "لیکن میری اطلاع کے مطابق کمان دار چند لمحوں میں یہاں پہنچ رہے ہیں۔"

اباقہ نے کہا۔ "اب وہ یہاں نہیں آئیں گے۔" ساتھ ساتھ وہ رسیاں کاٹتا جا رہا تھا۔

پنج صدی سردار نے آگے بڑھ کر اباقہ کا ہاتھ روک لیا اور بولا۔ "اباقہ! تمہارے پاس کماندار کا پروانہ ہے؟"

اباقہ نے غصے سے اس کا ہاتھ جھٹکا اور بولا۔ "میرے ہوتے ہوئے تمہیں پروانے کی ضرورت ہے؟"

پنج صدی سردار کو کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کیا کہے۔ جب تک وہ کوئی ٹھوس دلیل سوچتا اباقہ قیدیوں کو ننگی تلوار سے دھکیلتا سیڑھیاں اتر رہا تھا۔ چبوترے پر موجود محافظ بھی اس کی ہدایت پر عمل کر رہے تھے۔ سیڑھیاں اترتے ہوئے اباقہ کی نگاہ چھاؤنی کے بیرونی دروازے کی طرف اٹھ گئی۔ وہ یہاں سے لوہے کا بلند و بالا دروازہ صاف دیکھ رہا تھا۔ پہریدار بڑے مئودب انداز میں دروازہ کھول رہے تھے۔ یقیناً کمان دار اعلیٰ افسروں کے ساتھ چبوترے کی طرف آ رہا تھا۔ اب وقت نہ ہونے کے برابر تھا۔ اباقہ نے قیدیوں پر مصنوعی غصہ جھاڑا اور انہیں جلدی جلدی گھوڑا گاڑیوں میں سوار ہونے کا حکم دیا۔ یہ چاروں طرف سے بند لیکن کافی کشادہ گاڑیاں تھیں۔ قیدی یکے بعد دیگرے اندر داخل ہونے لگے۔ پنج صدی سردار اباقہ کا شانہ تھام کر بولا۔

"دیکھو اباقہ! اگر تمہاری کسی غلطی سے کماندار ناراض ہوا یا قیدی فرار ہوئے تو .... اس کے ذمہ دار تم ہو گے۔"

اباقہ جھلا کر بولا۔ "کہو تو چبوترے پر چڑھ کر اعلان کر دوں۔"

پنج صدی سردار ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔ اباقہ ایک گھوڑا گاڑی کے پاس پہنچا

اس نے ایک گاڑی کا دروازہ تھوڑا سا کھولا۔ اندر سردار یورق نیم دراز تھا۔ گاڑی میں عورتیں اور مرد بری طرح ٹھنسے ہوئے تھے۔ سردار یورق بازو کی تکلیف سے کراہ رہا تھا۔ اس نے گہری نظروں سے اباقہ کی طرف دیکھا اور بولا۔

"اباقہ! یہ تم کیا کر رہے ہو؟"

اباقہ نے کہا۔ "سردار! اگر زندہ رہا اور تم سے ملاقات ہوئی تو سب کچھ بتا دوں گا ..... ہاں گاڑی بانوں کی جگہ میرے دستے کے دو خاص آدمی گاڑیاں چلا رہے ہیں۔ یہ انہیں میری ہدایت کے مطابق لشکر سے باہر کسی محفوظ مقام تک پہنچانے کی کوشش کریں گے۔"

یورق کو کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا کہے لیکن گاڑی کی تاریکی میں دو آنکھیں اباقہ کو دیکھ رہی تھیں۔ یہ آنکھیں اسد اللہ کی تھیں۔ سردار یورق نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا لیکن اسی وقت اباقہ نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا۔ دروازہ بند ہوتے ہی گاڑی بانوں نے گھوڑوں کو چابک دکھائے اور دونوں گاڑیاں تیزی سے آگے بڑھ گئیں۔ ہجوم نے دو رویہ ہٹ کر راستہ بنایا۔ اباقہ اطمینان سے کھڑا گاڑیوں کو جاتے دیکھتا رہا۔ پھر گاڑیاں ہجوم سے باہر نکل گئیں۔ لوگوں نے آپس میں مل کر راستہ بند کر دیا لیکن پھر فوراً ہی ہجوم دوبارہ چھٹنے لگا۔ گھوڑوں کا ایک دستہ چبوترے کی طرف آ رہا تھا۔ اس دستے میں سب سے آگے کماندار کا گھوڑا تھا۔ پنج صدی سردار نے کماندار کی جھلک دیکھی اور اس کا رنگ اڑ گیا۔ اس نے تیز نظروں سے اباقہ کی طرف دیکھا۔ اباقہ اسی طرح اطمینان سے کھڑا تھا۔ پنج صدی سردار لرزاں لہجے میں بولا۔

"اباقہ یہ چکر کیا ہے؟ کماندار تو خود یہاں آ رہا ہے۔"

اباقہ مسکرایا اور اپنے لمبے بالوں کو جھٹک کر بولا۔ "گھبراتے کیوں ہو۔ ابھی کماندار یہاں آ کر تمہیں سب کچھ بتا دے گا۔"

سب نگاہیں کماندار اور اس کے محافظ دستے کی طرف لگی تھیں۔ محافظوں کے آہنی خود اور ڈھالیں سورج کی پہلی کرنوں سے چمک رہی تھیں۔ گھوڑے دلکی چال چلتے ترتیب سے آگے بڑھ رہے تھے۔ ان کا فاصلہ چبوترے سے قریباً سو قدم تھا۔ اباقہ جانتا تھا یہ لمحے بہت قیمتی ہیں۔ ان لمحوں میں وہ فرار ہونے کی کامیاب کوشش کر سکتا تھا لیکن یہ لمحے مفرور قیدیوں کے لئے بھی قیمتی تھے۔ ان لمحوں میں وہ کچھ اور دور نکل سکتے تھے۔ وہ اپنی جگہ بالکل ساکت کھڑا رہا۔ وہ دیکھ رہا تھا پنج صدی اور یک صدی سرداروں کے ہاتھ اب اپنی تلواروں پر ہیں۔ وہ دونوں کڑی نظروں سے اسے گھور رہے تھے۔ کماندار اعلیٰ افسروں

کے ہمراہ گھوڑے کو دھیمی رفتار سے چلاتا لمحہ بہ لمحہ چبوترے کے قریب پہنچ رہا تھا۔ ارد گر
کھڑے لوگ بالکل خاموش تھے۔ وہ جان چکے تھے کہ چبوترے پر کچھ گڑبڑ ہوئی ہے لیکن
اصل صورت حال سے وہ بھی بے خبر تھے۔ آخر کماندار چبوترے کے سامنے پہنچ گیا۔ پھر
اپنے ابلق گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے وہ گرج کر بولا۔ "قیدی کہاں ہیں؟"

یہ الفاظ اس ہنگامے کا نقطۂ آغاز تھے جو اگلے چند لمحوں میں رونما ہوا اور جس
توقند کے طول و عرض میں ہلچل مچا دی۔ جونہی یہ الفاظ کماندار کی زبان سے ادا ہوئے
صدی اور یک صدی سردار نے ایک ساتھ اپنی تلواریں نیاموں سے باہر کیں۔ اباقہ
اپنی جگہ سے زقند بھری اور چبوترے کی سیڑھیوں پر پہنچ گیا۔

"پکڑ لو جانے نہ پائے۔" پنج صدی سردار کا للکارا گونجا۔ پہریدار تلواریں سونت کر
اباقہ کی طرف لپکے لیکن اباقہ نے تلوار زنی کے لئے جو جگہ منتخب کی تھی وہ اس کے شاطر
ذہن کا منہ بولتا ثبوت فراہم کرتی تھی۔ وہ چبوترے کی سیڑھیوں میں کھڑا تھا۔ مدمقابل
بیسیوں تھے لیکن اس تنگ جگہ میں صرف دو یا تین افراد اس سے زور آزمائی کر
تھے۔ چبوترہ قریباً بیس فٹ بلند تھا اور اس پر چڑھنے کا واحد راستہ یہی تھا جہاں اباقہ تلوار
لئے کھڑا تھا۔ پہریدار بڑے جوش سے اس کی طرف بڑھے لیکن اس کے سامنے دو یا تین
افراد ہی آئے۔ تلواریں ٹکرائیں، قدم متحرک ہوئے، دل تیزی سے دھڑکے، سینکڑوں
نگاہوں نے اباقہ کی حیرت انگیز پھرتی کا نظارہ کیا۔ جیسے کوئی شیر شکاری کتوں پر جھپٹتا ہے
اسی طرح اباقہ نے پلک جھپکتے میں دو منگولوں کے پیٹ پھاڑ کر انہیں سیڑھیوں سے
لڑھکا دیا۔ دو اور منگول ان کی جگہ لینے کے لئے آگے بڑھے۔ اس مختصر سی جگہ میں
گھمسان کا رن پڑ رہا تھا۔ چند پہریدار لمبے نیزوں کے ذریعے اباقہ کو زک پہنچانے کی فکر میں
تھے۔ دباؤ بڑھتا جا رہا تھا، اباقہ لڑتا ہوا آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگا۔ دوسری طرف سپاہی
چبوترے پر چڑھنے کے لئے بے قراری سے چکر کاٹ رہے تھے۔ بدحواسی میں انہیں کچھ
سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اباقہ پر عقب سے کیسے حملہ کیا جائے۔ پنج صدی سردار جو
غضب میں تلوار سونت کر آگے بڑھا لیکن سیڑھیوں میں مزید کسی شخص کے گھسنے کی
گنجائش نہیں تھی۔ نتیجتاً چند ہی لمحوں میں وہ ایک آنکھ ضائع کرا کے نیچے اتر آیا۔ سردار
کے زخمی ہونے سے منگولوں کے غضب میں اور اضافہ ہوا۔ انہوں نے زبردست حملہ کیا
اور بالآخر اباقہ کو چبوترے تک پہنچانے میں کامیاب ہو گئے لیکن اس کامیابی کے لئے انہیں
کم از کم چھ جانوں کی قربانی دینا پڑی تھی۔

جونہی اباقہ سیڑھیوں سے ہٹا، منگول سپاہی زور لگا کر اوپر چڑھنے لگے۔ چند ہی

قریباً آٹھ سپاہی چبوترے پر اباقہ کے سامنے پہنچ چکے تھے۔ مجمع حیرت سے گنگ یہ
لڑائی دیکھ رہا تھا۔ یہ موت اور زندگی کی کشمکش تھی۔ لوگ جانتے تھے کہ ایک
ل دوسرے منگولوں سے لڑ رہا ہے لیکن پھر بھی ان کی ہمدردیاں اباقہ کے ساتھ تھیں۔
ں اب کچھ کچھ صورت حال کا اندازہ ہو رہا تھا۔ اسی منگول نے کچھ دیر پہلے قیدیوں کو
ل سے چبوترے سے اتارا تھا۔ شاید اسی جرم میں اسے گرفتار کرنے کی کوشش کی جا
تھی۔ اس وقت کچھ لوگوں کی چیخیں نکل گئیں۔ جب انہوں نے دیکھا کہ دو منگول
سے چبوترے پر چڑھنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ اب لمبے بالوں والے منگول کا بچنا
نہیں تھا لیکن پھر لوگوں نے ایک حیران کن اور ناقابلِ فراموش منظر دیکھا۔ لمبے بالوں
منگول نہایت وحشیانہ انداز میں تلوار چلاتا، چبوترے کے کنارے پر پہنچا اور اس سے
کہ عقب سے چڑھنے والے سپاہی اس پر حملہ کرتے اس نے رخ پھیرا اور ایک سپاہی
زخمی کر کے نیچے چھلانگ لگا دی۔ بیس فٹ کی بلندی سے وہ کسی پرندے کی طرح اڑتا
زمین پر آیا۔ زمین پر پاؤں ٹکتے ہی وہ اچھلا اور تیزی سے مخالف سمت میں دوڑ لگا دی۔
جانب منگول سپاہی نہ ہونے کے برابر تھے۔ شاید انہیں توقع ہی نہیں تھی کہ ان کا
اس طرف سے بھاگ نکلے گا۔ اس جانب کوئی تماشائی بھی نہیں تھا۔ سامنے ایک
گلی نظر آ رہی تھی۔ مکانوں کی کھڑکیاں کھلی تھیں اور ان سے جھانکنے والی آنکھیں
بھاگتے ہوئے منگول کو دیکھ رہی تھیں اور کبھی ان سرپٹ دوڑتے گھوڑوں کو جو
ل کا رخ کر رہے تھے۔ کماندار کے حکم پر یہ گھڑسوار مفرور قیدیوں کے تعاقب میں جا
تھے۔

اباقہ کی نظریں کشادہ گلی پر مرکوز تھیں۔ وہ ٹانگوں کی پوری قوت سے بھاگ رہا تھا۔
ور کی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا کہ منگول سپاہی اپنی کمانوں پر تیر چڑھا رہے ہیں۔ اُسے
م تھا کہ اگر وہ چند ساعتوں میں گلی تک نہ پہنچ سکا تو اس کا جسم سینکڑوں تیروں سے
ہو جائے گا۔ وہ اپنے ذہن میں لمحوں کا حساب جوڑ رہا تھا۔ کمانیں سیدھی ہو چکی
زہ کھچ گئے تھے، چٹکیاں کھلنے والی تھیں پھر اس نے بھاگتے بھاگتے ہوا میں چھلانگ
ور اڑتا ہوا گلی میں جا گرا۔ کئی تیر ہوا کو چیرتے ہوئے دائیں بائیں سے گزر گئے لیکن
کو زخمی ہونے سے نہ بچا سکا۔ اس کی ایک ٹانگ میں انگارہ اتر گیا تھا۔ زمین چھوتے
ایک بار پھر اٹھا۔ ایک جھٹکے سے اس نے تیر کھینچا اور گلی میں بھاگنے لگا۔ جونہی پہلی
ل دکھائی دی وہ اس میں مڑ گیا۔ اس کے پیچھے ایک شور محشر برپا تھا۔ ایک خلقت اس
قب میں تھی۔ وہ اندھا دھند بھاگ رہا تھا، کسی ایسے درندے کی طرح جسے زخمی

کرنے کے بعد گھنی جھاڑیوں میں ہنکایا جا رہا ہو۔ چبوترے پر لڑائی کے دوران اس کے
پر کئی زخم آئے تھے جن میں سے کندھے کا زخم خاصا تکلیف دہ تھا۔ وہ جانتا تھا اس
کندھا سرعت سے خون اگل رہا ہے لیکن یہ وقت خون روکنے کا نہیں، زندگی بچانے کا
اور وہ اپنی پوری کوشش کر رہا تھا۔ یکایک اسے سامنے سے منگول سپاہیوں کی ایک ٹک
اپنی طرف آتی دکھائی دی۔ وہ تیزی سے ایک اور گلی میں مڑ گیا۔ جونہی وہ اس گلی میں
دو منگول سپاہی تلواریں سونت کر اس پر جھپٹے۔ اسے چاروں طرف سے گھیرا جا رہا
اباقہ نے نیچے جھک کر ایک وار بچایا، ایک سپاہی کے منہ پر سر کی زوردار ٹکر ماری
دوسرے کی پنڈلی پر ایسا بھرپور وار کیا کہ ٹانگ گاجر کی طرح کٹ گئی۔ اس نے رخ
اور ایک اور گلی میں گھس گیا۔

یہ تنگ سی خمدار گلی تھی۔ ایک لمحے کے لئے وہ ٹھٹکا۔ اسے لگا جیسے وہ غلط را
اختیار کر رہا ہے لیکن اب فیصلہ بدلنے کا وقت نہیں تھا۔ سرپٹ بھاگتے منگول سپاہیوں
آوازیں سر پر پہنچ چکی تھیں۔ وہ اندھا دھند بھاگتا چلا گیا۔ کھڑکیوں سے سہمے ہوئے چہ
جھانک رہے تھے۔ اباقہ نے مڑ کر دیکھا۔ بیسیوں منگول سپاہی تلواریں لہراتے گلی
داخل ہو چکے تھے۔ ان کے چہرے غضب سے تمتما رہے تھے۔ بہرحال اباقہ کو یہ اطم
ضرور تھا کہ اس خمدار گلی میں وہ اس پر تیروں کی بوچھاڑ نہیں کر سکیں گے۔

اباقہ کی ٹانگیں شل ہو رہی تھیں اور بے شاخ گلی، شیطان کی آنت کی طرح
ہوتی جا رہی تھی .... آخر اباقہ کی نگاہیں ایک سپاٹ دیوار جم گئیں۔ اسے لگا جیسے
نے اس کے قدم تھام لئے ہیں، گلی بند تھی۔ وہ دیکھ چکا تھا لیکن پھر بھی بھاگتا رہا
اسے امید ہو کہ دیوار پھٹ جائے گی اور وہ اس کے اندر سے گزر جائے گا۔ شاید یہ
بچانے کا فطری عمل تھا۔ منگولوں کا غضبناک سیلاب زمین کا سینہ دہلاتا قریب پہنچ رہا
اباقہ نے سپاٹ دیوار کے سامنے پہنچ کر حسرت سے اس کی بلندی دیکھی اور ہونٹ کاٹ
رہ گیا۔ وہ مکمل طور پر گھر چکا تھا۔ ایک طویل سانس لے کر اس نے اپنا رخ پھیرا اور
سونت کر قریب آتے منگولوں کا انتظار کرنے لگا۔ وہ دیوار سے پیٹھ لگائے کھڑا تھا۔ اس
گلے میں ایک پھولدار کپڑا تھا اور جسم زخموں سے چور .... مارینا، مسلم بن داؤد
سردار یورق بہت سے چہرے اس کی نگاہوں میں گھوم گئے۔ وہ جانتا تھا موت اس کی
لپک رہی ہے لیکن اس کے مرنے سے پہلے کئی اور منگولوں کو مرنا تھا اور اس بات کی
اس کی چمکتی تلوار دے رہی تھی لیکن ایک بات سے وہ بے خبر تھا۔ شیطان کی آنت
بند ہوئی تھی وہاں ایک فرشتہ نمودار ہو چکا تھا۔ سپاٹ دیوار کے اوپر ایک چہرہ نظر آ

...... یہ اسد اللہ کا چہرہ تھا۔ مجاہد اسلام کی آنکھوں میں برق لہرا رہی تھی۔ اس کا سفید
امہ ہوا میں پھڑپھڑا رہا تھا۔

"اباقہ!" اس کی آواز نشیب میں گونجی۔

اباقہ نے خون آلود چہرہ اٹھا کر اوپر دیکھا۔ بلندی سے ایک رسی بل کھاتی نیچے آئی۔
نے پہلے رسی اور پھر بلندی پر نظر آنے والے نوجوان کو دیکھا۔ وہ پہچان گیا۔ یہ اسد
تھا۔ اس نے تلوار نیام میں ڈالی۔ رسی کو جھٹکا دے کر جانچا اور تیزی سے اوپر چڑھنا
ع کر دیا۔ منگول سپاہی اب گلی کے آخری موڑ پر تھے۔ ان کی آوازیں اباقہ کو صاف
ی دے رہی تھیں۔ اوپر کھڑے نوجوان کو بھی شاید اس بات کا احساس ہو چکا تھا۔ اس
زور لگا کر رسی کو کھینچنا شروع کر دیا۔

اس وقت اباقہ منڈھیر سے تقریباً دو ہاتھ کے فاصلے پر تھا جب منگول سپاہی موقع پر
۔ اباقہ نے آخری زور لگایا اور پھرتی سے منڈھیر پر چڑھ گیا۔ منگولوں کے چلائے ہوئے
ر دیوار سے ٹکرائے اور کچھ ہوا میں تیرتے چلے گئے۔ وہ اب بوکھلاہٹ میں چلا رہے
۔ اباقہ نے دیکھا باریش نوجوان نے منڈھیر سے سر نکالا اور منگولوں کی طرف دیکھ کر
ایت جوش سے مکہ لہرایا اردگرد کے مکانوں پر کھڑے لوگوں میں سے کسی نے نعرہ تکبیر کی
از بلند کی جواب میں "اللہ اکبر" کی صدا گونجی۔ اباقہ اور اسد اللہ نے ایک دوسرے کی
ف دیکھا اور تیزی سے چھتوں پر بھاگنے لگے۔

☆———☆———☆

پورے قوقند میں منگول سپاہی دندناتے پھر رہے تھے۔ اسد اللہ اور اباقہ ایک
نے سے مکان میں چھپے ہوئے تھے۔ یہ مکان اسد اللہ کے ایک نوجوان ساتھی کا تھا۔
نوجوان نے شام تک دو گھوڑوں کا انتظام کر دیا اور جب رات کا اندھیرا گہرا ہو گیا اور
کے در و دیوار سردی کی شدت سے ٹھٹھرنے لگے تو اباقہ اور اسد اللہ خاموشی سے نکل
ے ہوئے۔

مخصوص راستوں پر چلتے وہ جلد ہی شہر سے باہر نکل آئے۔ اب ان کا رخ قریبی
ں کی طرف تھا۔ قوقند آتے ہوئے اباقہ منگول فوج کے ساتھ ان ٹیلوں سے گزرا تھا اور
وقت بھی اس نے سوچا کہ چھپنے چھپانے کے لئے یہ جگہ اور خاص طور پر ایک تنگ
جو کوئی نصف کوس تک چلی گئی تھی، نہایت مفید ہے۔ اس نے گاڑی بانوں کو جو
کے دستے کے وفادار نوجوان تھے یہی ہدایت کی تھی کہ وہ اس گھاٹی تک پہنچنے کی
شش کریں۔

اسد اللہ کے ساتھی نے جو کچھ بتایا تھا اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ سزائے موت
قیدی پکڑے نہیں گئے۔ اب دو صورتیں ہو سکتی تھیں' یا تو گاڑی بان اباقہ کی ہدایت
مطابق اس تنگ گھاٹی میں پہنچ چکے تھے یا قیدی جو اس علاقے سے بہتر طور پر واقف
گاڑیوں کو کہیں اور لے گئے تھے۔ اب سوال یہ تھا کہ وہ اور کہاں جا سکتے تھے۔ اس
میں اسد اللہ نے کافی محنت کی تھی۔ اس نے نہایت غور و خوض کے بعد ایک نقشہ تیا
تھا اور اس پر کچھ نشانات لگائے تھے۔ تاہم سب سے پہلے وہ اسی تنگ گھاٹی میں جا
چاہتے تھے۔ ایک دن کی رفاقت میں اباقہ اور اسد اللہ ایک دوسرے کے متعلق کافی
جان چکے تھے۔ اسد اللہ کو اس جنگلی نوجوان میں ایک ایسی آگ فروزاں نظر آتی تھی
نے اس کا اپنا وجود بھی گرما دیا تھا۔ اباقہ نے اسے کچھ نہیں بتایا تھا لیکن اسد اللہ جان چکا
کہ وہ منگول فوج کا ایک اہم سردار ہے اور منگولوں سے رشتہ توڑ چکا ہے۔ یہ بات وہ
وقت جان گیا تھا جب اباقہ نے گھوڑا گاڑی میں اپنے زخمی ساتھی یورق سے الوداعی کلم
کہے تھے۔ اس وقت اسد اللہ پر اس حقیقت کا انکشاف ہوا تھا کہ یہ منگول نوجوان ا
جانیں بچا کر اپنی جان خطرے میں ڈال رہا ہے .... پھر یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ تنہا
خطرے کا مقابلہ کرے۔ جونہی گھوڑا گاڑیاں چھاؤنی سے آگے نکلی تھیں اسد اللہ کو
نیچے اتر آیا تھا۔ اس وقت تک پھانسی کے چبوترے پر بھاگ دوڑ شروع ہو چکی تھی۔
اللہ نے صورت حال پر کڑی نظر رکھی تھی۔ آخر وہ اباقہ کے کام آنے میں کامیاب ہ
تھا۔ اس نے بند گلی کے سرے پر پہنچ کر اسے اوپر اٹھا لیا تھا۔

یخ بستہ سردی میں گھوڑے دوڑاتے وہ رات کے دوسرے پہر سنسان ٹیلوں میں
گئے۔ چاروں طرف ہُو کا عالم تھا۔ شمال سے آنے والی سرد ہوائیں بدن میں گھسی جا
تھیں۔ اباقہ کی نگاہیں اندھیرے میں دیکھنے کی عادی تھیں۔ وہ بڑے غور سے اردگر
جائزہ لے رہا تھا۔ اس کے نتھنے عجیب انداز میں پھولے ہوئے تھے۔ جیسے کوئی جانو
میں بوٗ کو پہچاننے کی کوشش کرتا ہے۔ پھر اس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ اسد اللہ
اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ دو ڈھائی فرلانگ چل کر اباقہ پھر رک گیا۔ اس کی آ
کسی شے پر مرکوز تھیں۔ اسد اللہ نے اس کی نگاہوں کا تعاقب کیا۔ پھر وہ بھی چونک
دور کچھ فاصلے پر ایک دھبہ متحرک تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا
گھوڑوں سے اتر آئے۔

گھوڑوں کو پتھروں سے باندھ کر وہ بڑے محتاط انداز سے دھبے کی سمت بڑھے
کچھ دیر کے لئے دھبہ اوجھل ہو گیا لیکن دوبارہ نظر آیا تو کافی واضح تھا۔ صاف طو

ئی انسان تھا۔ اس کا بالائی دھڑ نظر آ رہا تھا۔ پہرہ دینے والے انداز میں وہ دائیں سے
ئیں چکر کاٹ رہا تھا۔ اباقہ اور اسد اللہ محتاط ہو گئے۔ ممکن تھا کہ منگول ان ٹیلوں میں پہنچ
چکے ہوں۔ آواز دینا کسی طور سودمند نہیں تھا۔ دونوں زمین پر رینگتے ہوئے سائے کی
طرف بڑھنے لگے۔ اسد اللہ دیکھ رہا تھا کہ اباقہ نے اپنا خنجر نکال لیا ہے۔ وہ سائے سے قریباً
ں قدم دور رہ گئے تھے۔ جب اسد اللہ اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

"اٹھ جاؤ اباقہ۔" وہ اطمینان سے بولا۔

اسد اللہ کی آواز سن کر سایہ تیزی سے گھوما اور ایک مترنم آواز سنائی دی۔ "اسد
اللہ یہ آپ ہیں۔"

"ہاں ہاجرہ!" اسد اللہ نے کہا۔

ہاجرہ تیزی سے اسد کی طرف لپکی لیکن اس دوران اباقہ بھی کھڑا ہو چکا تھا۔ وہ اسد
ے ایک بالشت کے فاصلے پر رک گئی۔ اس کی لرزاں آواز سنائی دی۔ "مجھے یقین تھا آپ
ئیں گے' مجھے یقین تھا۔" وہ رو رہی تھی۔

"ہاجرہ! اتنی سردی میں تم .... ہم تو سمجھے کوئی منگول سپاہی ہے۔" ہاجرہ نے
ئی جواب دینے کی بجائے سر جھکا لیا۔ اسد نے اباقہ کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "ہاجرہ!
کی نصرت ان کی شکل میں ہم تک پہنچی ہے۔ ان کا نام اباقہ ہے۔"

ہاجرہ نے دوپٹے سے آنسو پونچھے اور بولی۔ "میں انہیں اچھی طرح جانتی ہوں۔"

اباقہ جلدی سے بولا۔ "میرا خیال ہے ہمیں یہاں نہیں رکنا چاہئے۔"

ہاجرہ انہیں لے کر نشیب میں اترنے لگی۔ پندرہ بیس قدم آگے ایک پتھریلی دراڑ
آئی۔ یہ قریباً دس فٹ بلند اور دو فٹ چوڑی تھی۔ ہاجرہ اندر داخل ہو گئی۔ یہ ایک
ہ پہاڑی کھوہ تھی۔ سردار یورق اور دونوں گاڑی بانوں سمیت تمام قیدی یہاں موجود
۔ وہ پتھریلے فرش پر اوندھے سیدھے لیٹے تھے۔ درمیان میں کوئلے دہک رہے تھے۔
سوتے وقت انہوں نے الاؤ بھڑکایا تھا۔ جو اب تھوڑے سے کوئلوں کی شکل میں بدل
تھا۔ قدموں کی چاپ سن کر چند بچوں کے سوا تمام قیدی جاگ گئے۔ ہاجرہ نے جلدی
ایک لکڑی روشن کی اور اسے دیوار میں ٹکا دیا۔ اباقہ اور اسد کے لئے کھانے کا انتظام
لیا۔ لگتا تھا شام سے پہلے ان لوگوں کے ہاتھ کوئی اچھا شکار آ گیا تھا۔ کوئلوں پر بھنا ہوا
ں بکرے کا گوشت تھا۔ بھوک تو زیادہ نہیں تھی لیکن سردی کم کرنے کے لئے اسد اور
کھانے لگے۔ تمام افراد ان کے گرد گھیرا ڈالے بیٹھے تھے۔ سب نگاہیں نہایت ممنونیت
اباقہ کا طواف کر رہی تھیں۔ وہ اس ماحول سے کچھ خاص اثر لئے بغیر دلجمعی سے

گوشت چبانے میں مصروف تھا۔ سردار یورق جو آگ کے پاس لیٹا تھا خاموشی سے اس
طرف دیکھے جا رہا تھا۔

☆======☆======☆

اگلی رات معتوب قیدیوں کا یہ مختصر سا قافلہ بلخ کے ایک نواحی قصبے کی جانب روا
ہو گیا۔ اس روانگی کا فیصلہ نہایت غور و خوض کے بعد کیا گیا تھا۔ ان ٹیلوں میں تا
منگولوں کی نگاہ سے محفوظ رہنا ممکن نہیں تھا۔ بلکہ شام تک ایسے آثار بھی نظر آ
کہ کوئی نہ کوئی متلاشی دستہ ان کا کھوج لگا لے گا۔ وہ خود تو غار میں قدرے محفوظ
لیکن ان کی گھوڑا گاڑیاں باآسانی نظر آ سکتی تھیں۔

جونہی رات کے اندھیرے نے پَر پھیلائے، اباقہ اور اسد اللہ نے عورتوں
سمیت تمام مردوں کو گاڑیوں میں سوار کرایا۔ اباقہ نے اسد اللہ سے بہت کہا کہ وہ بھی
کے ساتھ چلا جائے لیکن وہ ایک نہیں مانا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس کی ضرورت یہاں
ہے۔ وہ یہیں رہے گا۔ اس نے مصطفیٰ نامی ایک نوجوان کو قافلہ سالار بنا دیا تھا۔

ناہموار پتھروں پر آہستہ آہستہ چلتی گاڑیاں اندھیرے میں مدغم ہو گئیں۔ اسد
ایک پتھر پر خاموش کھڑا تھا۔ شاید اس کی نگاہوں میں ابھی تک نوبیاہتا بیوی کا چہرہ گھوم
تھا۔ آخر اس نے اپنے سر کو ہلکے سے جھٹکا اور قریب کھڑے اباقہ کی طرف متوجہ ہو
دونوں آہستہ آہستہ چلتے غار میں واپس آ گئے۔ سردار یورق آگ کے قریب ایک پتھر
ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس کی حالت اب پہلے سے بہتر تھی۔ اس نے اسد اللہ سے کہا۔

"کیا تم کچھ دیر کے لئے باہر جا سکتے ہو؟"

"ضرور ضرور۔" اسد اللہ نے کہا اور الٹے قدموں باہر چلا گیا۔ اباقہ، یورق کے قر
بیٹھ گیا۔ یورق گھمبیر لہجے میں بولا۔

"اباقہ! میرا شک یقین میں بدل رہا ہے، کہیں تم .... خاقان سے غداری
نہیں اتر آئے؟"

اباقہ نے کہا۔ "میں نے کسی سے وفاداری نہیں کی تو غداری کیسی؟ جاہل
قیدیوں کی مدد کا سوال ہے .... یہ میرے دل کی آواز تھی۔"

یورق بولا۔ "اب کیا ارادہ ہے؟"

اباقہ نے ایک طویل سانس لی۔ اس کا ہاتھ جیسے خود بخود گلے میں بندھے کپڑ
چھونے لگا وہ بولا۔ "میں قراقرم واپس جا رہا ہوں سردار!"

"کس لئے؟" سردار نے کڑے تیوروں سے پوچھا۔

"مارینا کے لئے۔" اباقہ کی آواز نہایت پُرعزم تھی۔

سردار چند لمحے غور سے اسے دیکھتا رہا پھر بولا۔ "میرا خیال ہے اباقہ، تم بدل چکے
ہو۔"

اباقہ نے کہا۔ "یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟"

سردار بولا۔ "اگر تم وہی اباقہ ہوتے تو قراقرم کی بجائے میرے ساتھ آگے چلتے۔
اس مہم کو سر کرتے جس کے لئے ہمیں قراقرم سے روانہ کیا گیا ہے۔ یہ بات تمہیں بھی
اچھی طرح معلوم ہے کہ اگر ہم خوارزم شاہ کو ڈھونڈ سکے تو یہ ایسی کامیابی ہو گی جو
دربارِ معلیٰ میں ہمارے ناموں کو زندہ جاوید کر دے گی اور یہی وہ راستہ ہے جس پر چل
کر تم مارینا کو حاصل کر سکتے ہو لیکن نہیں، میں جانتا ہوں تم ایسا نہیں کرو گے۔"

اباقہ نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ "سردار یورق! میں ایسا کروں گا۔ ضرور کروں
گا۔ مارینا کو حاصل کرنے کے بعد میں خوارزم شاہ کو ڈھونڈنے نکلوں گا لیکن شاید تم میرا
ساتھ نہ دے سکو۔"

یورق جان چکا تھا اباقہ اپنا راستہ الگ کر رہا ہے۔ وہ چلا کر بولا۔ "اباقہ میں تجھے ایسا
نہیں کرنے دوں گا۔ تُو منگولوں سے غداری نہیں کر سکتا۔ نیلا آسمان تجھ پر قہر نازل کرے
گا۔"

اباقہ خاموشی سے یورق کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب اداسی کروٹیں
لے رہی تھی۔ پھر وہ قدرے نرمی سے بولا۔ "لیٹ جاؤ سردار، ابھی تمہاری طبیعت ٹھیک
نہیں ہوئی۔" اس نے گرم کمبل سردار کے کندھوں پر ڈالنا چاہا۔ سردار نے ایک جھٹکے سے
کمبل پیچھے ہٹا دیا۔ اس کا سارا جسم غصے سے لرز رہا تھا۔ وہ چلایا۔ "چلا جا یہاں سے مجھے
تیرے سہارے کی ضرورت نہیں۔ دفع ہو جا، میں جانتا ہوں شامان کا کہا سچ ثابت ہو گا۔ تُو
قراقرم ہی میں مرے گا اور اسی عورت کے لئے۔"

اباقہ کچھ دیر یورق کو کھڑا دیکھتا رہا پھر اس نے آگ میں چند لکڑیاں پھینکیں اور کونے
میں جا کر بیٹھ گیا۔

دوسری صبح اباقہ گھوڑے پر سوار ایک اونچے ٹیلے پر کھڑا تھا۔ اسد اُس کے پہلو میں
موجود تھا۔ تازہ دم گھوڑا اپنے اگلے سموں سے پتھریلی زمین کھودنے کی کوشش کر رہا تھا۔
گھوڑے کے دونوں طرف لٹکے چرمی تھیلے خشک گوشت اور پنیر سے بھرے ہوئے تھے۔
ان چیزوں کا انتظام اسد نے ایک قریبی بستی سے کیا تھا۔ اباقہ ایک طویل سفر پر جا رہا تھا۔

اسد اللہ بولا۔ "اباقہ! ایک بار پھر سوچ لو۔ تمہارا تنہا جانا خطرے سے خالی نہیں۔"

اباقہ بولا۔ "میرا جواب وہی ہے اسد۔ میں تنہا جاؤں گا اگر تم میری کوئی مدد کر
چاہتے ہو تو سردار یورق کا خیال رکھنا۔ اسے تمہاری تیمارداری کی ضرورت ہے۔" اس
ساتھ ہی اباقہ نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور روانہ ہو گیا۔

وہ جانتا تھا قوقند اور اس کے مضافات میں ابھی تک سرگرمی سے ان کی تلاش
رہی ہے۔ ظاہر ہے اردگرد کی چوکیوں کو بھی خبردار کر دیا گیا ہو گا۔ اب اسے ایسا را
اختیار کرنا تھا جو چاہے طویل ہو لیکن محفوظ ہو۔

یخ بستہ ہواؤں کی یورش میں دشوار گزار راستوں پر اباقہ نے اپنا سفر جاری رکھا۔
حتی الامکان راستے کی آبادیوں سے بچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ دن کا اجالا اور رات کی تار
ایک دوسرے کے تعاقب میں رہے' اباقہ کا گھوڑا فاصلوں کو نگلتا رہا۔ ایک شام جب
سابق سلطنت خوارزم کی حدود سے آگے نکل آیا تھا اسے ایک فوجی چوکی پر روک لیا گیا۔

وہ بڑی سرد شام تھی۔ برف کے گالے تواتر سے گر رہے تھے۔ وہ اباقہ تھا جو اس
موسم میں بھی سفر جاری رکھے ہوئے تھا۔ اگر اس کا گھوڑا ساتھ دیتا تو شاید وہ رات بھر
رہتا لیکن وہ جانتا تھا گھوڑا تھک کر چور ہو چکا ہے اسے آرام اور خوراک کی ضرورت ہے۔
آخر ایک جگہ اباقہ کو پرانی وضع کی ایک کھنڈر نما عمارت نظر آئی۔ شاید کسی وقت سلطنت
خوارزم کا کوئی امیر رئیس اس پر فضا مقام پر تفریح کے لئے آتا ہو گا لیکن اب شکستہ در و
دیوار کے سوا کچھ باقی نہیں تھا۔ اس طوفانی موسم میں یہ عمارت اباقہ کو نعمت غیر متر
محسوس ہوئی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ ایک فوجی چوکی ثابت ہو گی۔

وہ تھکے ماندے گھوڑے کو دھیمی چال چلاتا کھنڈر کی طرف بڑھنے لگا۔ گھوڑے کے
سم برف پر "شاک شاک" کی آواز پیدا کر رہے تھے۔ جمی ہوئی سانس اباقہ اور گھوڑے
کے نتھنوں سے پھنکاروں کی صورت برآمد ہو رہی تھی۔ کھنڈر کے بالکل نزدیک پہنچ کر
اندازہ ہوا کہ یہ عمارت انسانوں سے خالی نہیں لیکن اس وقت بھی اسے اندیشہ نہیں تھا
عمارت کے مکین فوجی ہوں گے۔ یکلخت بیرونی دروازہ کھلا اور دو پہریدار نظر آئے۔ ان کے
ہاتھ تلواروں پر تھے۔ اباقہ نے دیکھا دائیں بائیں دو برجیوں پر بھی تیرانداز کھڑے تھے۔

"کون ہو تم؟" برجی پر کھڑے پہریدار نے کڑک کر پوچھا۔

"اردوئے معلی کا ایک سپاہی۔" اباقہ نے جواب دیا۔

"کدھر جا رہے ہو؟"

"راستہ بھٹک گیا ہوں۔"

"شناخت نامہ یا پروانہ راہداری ہے تمہارے پاس؟"

"ہاں' لیکن تم پڑھ نہیں سکو گے۔" اباقہ نے یہ کہتے ہوئے اپنی صدری میں ہاتھ
ڈالا اور ایک تہہ کیا ہوا کاغذ نکال کر پہریدار کے حوالے کر دیا۔ پہریدار کچھ دیر بوسیدہ کاغذ
کو الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔ پھر اس نے اپنے ساتھی کو دکھایا۔ اسے بھی سمجھ نہیں آئی۔ وہ
بولا۔ "یہ تو بالکل نہیں پڑھا جاتا۔"

"ہاں بارش میں خراب ہو گیا ہے۔" اباقہ نے اعتماد سے جواب دیا۔

پہریدار نے الجھے ہوئے انداز میں کاغذ اباقہ کو واپس کر دیا۔ درحقیقت یہ بوسیدہ کاغذ
اباقہ کو راستے میں پڑا ملا تھا۔ بارش میں بھیگنے سے اس کی سیاہی پھیل چکی تھی۔ اباقہ نے
یونہی اسے جیب میں رکھ لیا تھا۔ اس کی بے پناہ خود اعتمادی کام آئی تھی۔ پہریداروں نے
دروازہ کھول دیا۔

اس چوکی میں کم و بیش پچیس سپاہی موجود تھے۔ پتہ چلا کہ چوکی کا کماندار پندرہ
سپاہیوں کے ساتھ گشت پر ہے۔ صبح سے پہلے اس کی واپسی متوقع نہیں۔ اباقہ کو قدرے
اطمینان ہوا۔ کماندار کی غیر موجودگی میں اس کا بھرم تا دیر قائم رہ سکتا تھا۔ ایک کشادہ
کمرے میں پانچ چھ سپاہی آگ جلائے بیٹھے تھے۔ انہوں نے مضبوطی سے کمبل لپیٹ رکھے
تھے اور گپ شپ میں مصروف تھے۔ اباقہ کو انہوں نے خندہ پیشانی سے اپنے پاس بٹھا لیا۔
ایک ادھیڑ عمر سپاہی اس کے لئے کھانا لے آیا۔ بہت جلد اباقہ ان میں گھل مل گیا۔ ادھیڑ عمر
سپاہی نے ایک کہانی چھیڑ رکھی تھی۔ وہ خاقان اوغدائی کا ایک واقعہ مزے لے لے کر بیان
کر رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"........... خاقان اوغدائی کی خواہش تھی کہ وہ قبیلہ دوسرے منگولوں سے کٹ کر
نہ رہے۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے قبیلے کے سربراہ کو ہدایت کی کہ وہ اپنی لڑکیوں کی شادیاں
باہر قبیلے سے کر دے۔ خاقان اوغدائی کی ہمیشہ سے خواہش رہی ہے کہ قبیلوں میں بھائی
چارے کی فضا قائم ہو اور وہ دشمنوں کے خلاف متحد رہیں لیکن قبیلے کے سردار کو خاقان کا
حکم دل سے منظور نہ تھا۔ اس نے نہایت خاموشی سے کچھ لڑکیوں کی شادیاں قبیلے کے
اندر ہی کر دیں۔ خاقان کو جب اس بات کا پتہ چلا تو وہ سخت مشتعل ہوا۔ اس نے قبیلے
کے تمام مرد و زن کو ایک جگہ اکٹھا کیا۔ پھر اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ جسے جو عورت پسند
ہو وہ اٹھا لے۔ سپاہی اور افسر حکم ملتے ہی عورتوں اور لڑکیوں پر ٹوٹ پڑے۔ قبیلے کے مرد
بت بستہ کھڑے رہ گئے۔ کسی کو مداخلت کی جرأت نہ ہوئی۔ میں بھی ان سپاہیوں میں
موجود تھا' میرے حصے میں ایک بڑی تیز لڑکی آئی.........."

سپاہی کی داستان طویل سے طویل ہوتی چلی گئی۔ اباقہ بوجھل آنکھوں سے سنتا رہا۔

جب یہ داستان ختم ہوئی قریباً نصف رات گزر چکی تھی۔ اس دوران ساتھ والے کمرے سے بار بار کسی کے گانے کی آواز آتی رہی۔ کوئی سپاہی شراب کے نشے میں مدہوش بار ایک ہی فقرہ دوہرا رہا تھا۔ ادھیڑ عمر سپاہی کی داستان انجام کو پہنچی تو اباقہ نے پوچھا۔

"یہ گانے والا کون ہے؟"

ادھیڑ عمر سپاہی مسکرا کر بولا۔ "ہے ایک دیوانہ۔ کچھ روز پہلے بھلا چنگا تھا۔ پھر ایک حسینہ کو دیکھا اور یہ حال ہو گیا۔"

ایک دوسرا سپاہی قہقہہ لگا کر بولا۔ "کہتا ہے میں ساری زندگی وہ ہاتھ نہیں دھوؤں جس نے حسینہ کے بال چھوئے تھے۔"

اباقہ نے پوچھا۔ "بھئی کون ہے وہ جادوگرنی۔"

ادھیڑ عمر سپاہی جس کا نام "یادو" تھا بولا۔ "کہو تو اسے یہیں بلوا لیتے ہیں خود تمہیں سب کچھ بتا دے گا۔" پھر اس نے دو ساتھیوں کو اشارہ کیا۔ وہ مسکراتے ہوئے باہر گئے۔ چند ہی لمحے بعد وہ کسی کو بازوؤں میں اٹھائے اندر داخل ہوئے اور آگ کے قریب لٹا دیا۔ وہ لمبی ناک اور چھوٹی چھوٹی آنکھوں والا ایک دھان پان تاتاری تھا۔ سپاہی کم اور گویا زیادہ لگتا تھا۔ نشے سے اس کی ہچکی بندھی ہوئی تھی۔ یادو نے کہا کہ اسے یونہی سمجھو۔ یہ بڑا باذوق شخص ہے۔ تک بندی کر کے شعر بھی کہتا ہے۔ بڑے بڑے سردار اس کے شعروں پر سر دھنتے ہیں۔ چلو پہلے تمہیں اس کے شعر ہی سنواتے ہیں۔" پھر دھان پان تاتاری سے شعر سنانے کی فرمائش کرنے لگا۔ تاتاری پہلے تو نخرا کرتا رہا۔ پھر اس نے شراب کا ایک گھونٹ بھرا اور لہک لہک کر گانے لگا۔

"اُس کی آنکھیں جھیل' اس کے رخسار سیب
اس کے دانت موتی' اس کے ہونٹ یاقوت
اس کی گردن صراحی' اس کے بال ریشم
لیکن وہ جھیل' سیب یا موتی نہیں۔ نہ ہی یاقوت صراحی یا ریشم ہے۔
وہ تو ان سب سے جدا ہے۔
اگر وہ چاہے تو صحرائے گوبی کا ہر ذرہ اس کا عاشق ہو جائے
لیکن وہ خانِ اعظم کے بیٹے کی قسمت ہے
وہ اس کی چہیتی بیوی ہے
....

شاعر نما سپاہی کے آخری شعروں نے اباقہ کو بری طرح چونکا دیا۔ وہ یادو سے بولا۔ "یادو! یہ کس کی بات کر رہا ہے؟"

یادو نے قہقہہ لگایا۔ دوسرے سپاہی بھی مسکرانے لگے۔ یادو بولا۔ "دوست دراصل بات یہ ہے۔ خان چغتائی ان دنوں سیر و شکار کے لئے نکلا ہوا ہے۔ ہم قراقرم سے خان چغتائی کے ساتھ ہی روانہ ہوئے تھے۔ کچھ دن خان نے جھیل بالکش کے مشرقی علاقے میں شکار کھیلا۔ پھر ہم اس چوکی پر آ گئے اور خان دوسری طرف روانہ ہو گیا۔ جن دنوں شکار ہو رہا تھا اس سپاہی کے ساتھ ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ خان چغتائی کے ہمراہ اس کی بیوی مارینا بھی ہے۔ وہ عموماً چھکڑے میں لدے ہوئے اپنے یورت میں بیٹھی رہتی تھی لیکن ان دنوں موسم کچھ خوشگوار تھا۔ چغتائی خان نے شکار کے دوران اسے اپنے ساتھ رکھا۔ گھنے درختوں میں ایک زخمی ریچھ کا تعاقب کرتے ہوئے چغتائی خاں دوسرے شکاریوں کے ساتھ آگے نکل گیا۔ جب کہ مارینا پیچھے رہ گئی۔ اتفاقاً اس کے لمبے بال ایک کانٹے دار جھاڑی میں الجھ گئے۔ اس نے مدد کے لئے آوازیں دیں۔ یہ خوش بخت سپاہی آگے بڑھا اور اس نے خوبصورت ملکہ کے بال شاخوں سے چھڑائے بس اُسی روز سے یہ لمبی لمبی آہیں بھر کر شعروں کی پیداوار بڑھا رہا ہے۔"

اباقہ بظاہر ادھیڑ عمر سپاہی کی باتیں سن رہا تھا لیکن اس کا ذہن کہیں دور پہنچا ہوا تھا۔ اس کا مطلب تھا اس چوکی تک پہنچنا اس کے حق میں بہتر ثابت ہوا تھا۔ وہ قراقرم کی طرف جا رہا تھا جب کہ اس کی محبوبہ وہاں موجود نہیں تھی۔ چغتائی خاں قراقرم سے دور مصروف شکار تھا۔ اباقہ کا دل شدت سے دھڑکنے لگا۔ وہ اپنی منزل سے کچھ اور قریب پہنچ گیا تھا۔ یہ بھی امکان تھا کہ مارینا کا حصول نسبتاً آسان ثابت ہو۔ اس نے سوچا کہ وقت ضائع کئے بغیر اسے آگے روانہ ہو جانا چاہئے۔

تھوڑی دیر خوش گپیوں میں مصروف رہ کر سپاہی آگ کے قریب لیٹ گئے۔ اباقہ بھی لیٹ گیا تھا لیکن نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ چوکی سے نکلنے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔ کافی دیر بعد جب تمام سپاہیوں کے خراٹے گونجنے لگے تو وہ بہ آہستگی اٹھا۔ تھوڑا سا راشن جمع کیا اور اصطبل کی طرف چل دیا۔ یہ دیکھ کر اسے مایوسی ہوئی کہ اصطبل کے دروازے پر ایک بڑا قفل لگا ہوا ہے۔

تھوڑی دیر وہ سوچتا رہا پھر تیز قدموں سے عمارت کے بیرونی دروازے کی طرف چل دیا۔ برف باری تھم چکی تھی لیکن ہوا نہایت سرد تھی۔ دروازے پر اب دو کی جگہ صرف ایک محافظ نظر آ رہا تھا۔ اوپر برجی میں بھی صرف ایک آدمی تھا۔ اباقہ کو اپنی طرف آتے دیکھ کر وہ بھی برجی سے اتر کر نیچے چلا آیا۔

"کیا بات ہے؟" اس نے کرخت لہجے میں کہا۔

اباقہ بولا۔ ”برف باری رُک گئی ہے۔ میں اپنا گھوڑا لے کر جانا چاہتا ہوں۔“
محافظ نے اپنی بڑی بڑی مونچھوں کو تاؤ دیا اور بولا۔
”نہیں دوست‘ تمہارے کاغذات مشکوک ہیں۔ کماندار کی آمد سے قبل تم نہیں سکو گے۔“

”یہ تو بڑی مشکل ہو جائے گی۔“ اباقہ بولا۔
”ہاں یہ تو ہے۔“ پہریدار ٹھسے سے بولا۔
اباقہ نے بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اچھا ایک بات بتاؤ۔ تم اباقہ کو جانتے ہو؟“
مونچھوں والا پہریدار بولا۔ ”ہاں جانتا ہوں لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو؟“
اباقہ بولا۔ ”یونہی۔ میں جاننا چاہتا تھا وہ کیسا ہے؟“
پہریدار بولا۔ ”بہت بہادر اور سفاک۔ تیرے میرے جیسے دس پندرہ آدمی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے اور ان دنوں وہ ویسے بھی مفرور ہے۔ تُو بھی ذرا دھیان سے رہنا۔“
اباقہ نے کہا۔ ”فرض کرو اگر وہ اس چوکی میں آ جائے تو تم اسے کیسے پہچانو گے۔ کوئی پہچان ہے تمہارے پاس؟“
”بالکل ہے‘ وہ درمیانے قد کا دبلا پتلا چوڑے شانوں والا نوجوان ہے۔ اس کے بال لمبے ہیں ....“ دفعتاً پہریدار نے فقرہ ادھورا چھوڑا اور غور سے اباقہ کی طرف دیکھنے لگا۔ اباقہ نے اطمینان سے اپنی سموری ٹوپی ہٹائی۔ اس کے لمبے بال ہوا میں لہرانے لگے۔ اس کا ہاتھ اپنی تلوار کے دستے پر پہنچا۔ ایک چمک سے تلوار باہر آئی۔ دونوں محافظ سکتے کے عالم میں اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ سرسراتی آواز میں بولا۔
”میں ہوں اباقہ‘ میں تمہیں قتل کرنا نہیں چاہتا۔“
پھر اس نے لباس کے اندر ہاتھ ڈال کر رسی کا گچھا نکالا اور پہریداروں کی طرف اچھال دیا۔ پہریدار چند لمحے سراسیمہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے رہے۔ پھر جیسے وہ سب کچھ سمجھ گئے۔ مونچھوں والے پہریدار نے دوسرے کی مشکیں کسیں اور پھر اپنے پاؤں باندھ لئے۔ باقی کا کام اباقہ نے مکمل کیا۔ اس نے مونچھوں والے کے ہاتھ باندھ کر دونوں کے منہ میں ان کی ٹوپیاں ٹھونس دیں۔ رسی کی گرہوں کا اچھی طرح جائزہ لیا اور ایک پہریدار کی جیب سے چابیاں نکال کر اصطبل کی طرف چل دیا۔
تاریک رات میں ایک بار پھر اس کا سفر شروع ہو چکا تھا۔ وہ چوکی کی طرف سے بالکل مطمئن تھا۔ ممکن تھا کہ اب تک پہریدار اپنی رسیاں کھول چکے ہوں لیکن اس سے کوئی فرق پڑنے والا نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا پہریدار خاموشی اختیار کریں گے۔ اگر وہ کسی کو

یں گے کہ مفرور اباقہ انہیں رسیوں سے باندھ کر چلا گیا ہے تو کماندار ان کی گردنیں اڑا گا۔ تھوڑی دیر بعد مطلع صاف ہو گیا اور ستارے نکل آئے۔ اباقہ نے اپنا رخ درست اور مزید تیزی سے آگے بڑھنے لگا۔

☆------☆------☆

اباقہ کا راشن ختم ہو چکا تھا۔ وہ بھوک سے نڈھال برفزار میں بھٹک رہا تھا۔ دوپہر سے ڑی دیر پہلے اسے سفید برف پر ایک متحرک دھبہ نظر آیا۔ شاید کوئی جانور تھا اس نے دھے سے کمان اتاری اور گھوڑا اس جانب دوڑا دیا .... جونہی وہ ایک ٹیلے کے ب سے نکلا سامنے گھڑسواروں کی ایک ٹکڑی دکھائی دی۔ یہ پانچ گھڑسوار تھے۔ سرتاپیر ی لبادوں میں چھپے ہوئے اور مسلح۔ اباقہ کو پہچاننے میں دیر نہ لگی کہ چغتائی خاں کے ہی ہیں۔ پریشانی کی بجائے اسے ایک طرح کا اطمینان ہوا۔
پلک جھپکتے میں گھڑسوار اس کے سر پر پہنچ گئے۔ ان کے ہاتھوں میں ننگی تلواریں یں۔ ایک سپاہی کے حکم پر اباقہ نے چہرے سے سمور کا کپڑا ہٹایا۔ ان میں سے کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔
”کہاں سے آ رہے ہو؟“ ایک نے کڑک دار آواز میں پوچھا۔
اباقہ کے لئے اب آسانی ہی آسانی تھی۔ اس نے جان بوجھ کر ایسے جواب دیا جن سپاہیوں کے شکوک میں اضافہ ہو اور وہ اسے اپنے سردار تک لے جائیں۔ اس کا د پورا ہوا۔ سپاہیوں نے اسے درمیان میں لیا اور پڑاؤ کی طرف روانہ ہو گئے۔ وہ اسے نوں کا کوئی بھٹکا ہوا جاسوس سمجھ رہے تھے۔ ان کی باتوں سے اباقہ نے اندازہ لگایا کہ سالار نہایت سخت گیر شخص ہے اور خاص طور پر جاسوسوں سے بہت سنگدلی سے پیش ہے۔ یہ بھی پتہ چلا کہ چند جاسوسوں کی گرفتاری کے بعد منگول ان دنوں بہت محتاط راستہ بھر سپاہی اسے آنے والے عذاب کے ذکر سے ”خوفزدہ“ کرتے رہے۔
کوئی نصف منزل کا سفر طے کر کے یہ مختصر سا قافلہ ایک پڑاؤ میں پہنچا۔ یہ ایک بہت اؤ تھا۔ ایک ہموار میدان میں سینکڑوں خیمے ایستادہ تھے۔ اباقہ نے دور ہی سے چغتائی کا اور اس پر لہراتا ہوا یاک کی دموں والا پرچم دیکھ لیا۔ وہ صحیح جگہ پہنچ گیا تھا۔ چھکڑوں ایک طویل قطار کے عقب سے ہوتے ہوئے پہریدار ایک بڑے خیمے کے سامنے پہنچے۔ ہ اصل پڑاؤ سے نصف کوس کے فاصلے پر تھا۔ اس کے ساتھ چھوٹے چھوٹے چند یمے تھے۔ اباقہ نے اندازہ لگایا کہ یہ چغتائی خان کے حفاظتی دستے کا پڑاؤ ہے۔ بلندی پر ی کی وجہ سے حفاظتی عملہ اردگرد بہتر طور پر نظر رکھ سکتا تھا۔ اباقہ کو خیمے کے اندر پہنچا

دیا گیا۔ اس کے ہاتھ پاؤں مضبوطی سے باندھ دیئے گئے۔ سپاہی واپس چلے گئے۔ خیمے کے دروازے پر موجود پہریداروں کی باتوں سے پتہ چلا کہ سردار بڑے پڑاؤ میں گیا ہوا ہے اباقہ نے سرسری نظروں سے خیمے کا جائزہ لیا اور اس نے محسوس کیا کہ سپاہیوں نے ا سالار کی سنگدلی اور سفاکی کا جو نقشہ کھینچا تھا وہ کوئی ایسا غلط بھی نہیں تھا۔ خیمے میں ایذارسانی کے کئی آلات موجود تھے اور فرش پر ایک نیم جان شخص پڑا سسک رہا تھا۔ کوئی مقامی شخص تھا جسے کسی شبہے میں یہاں لایا گیا تھا۔ اس کے جسم پر زخموں کے ا گنت نشان تھے۔ دانت ٹوٹے ہوئے تھے اور ہونٹ کٹ کر لٹک رہے تھے۔ لگتا تھا ا بے دردی سے مارا گیا ہے۔ مزید اذیت کے لئے اس کے تمام زخموں میں نمک بھر دیا گیا لیکن یہ نمک اب شاید مضروب کو کچھ زیادہ تکلیف نہیں دے رہا تھا۔ وہ نقاہت کی ا منزل پر پہنچ چکا تھا جہاں تمام احساسات برائے نام رہ جاتے ہیں۔

"پانی!" مضروب کے ہونٹوں سے نہایت نحیف آواز برآمد ہوئی۔ خیمے کو ایک دبی پردے سے دو حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ یہ پردہ ہلا اور ایک خوبصورت نوخیز خادمہ اندر جھانکا۔ وہ قدرے دکھ سے مضروب کی طرف دیکھ رہی تھی لیکن وہ پانی لینے نہیں گئی۔ شاید اسے حکم نہیں تھا۔ پھر اس کی نگاہ اباقہ پر پڑی اور اس کی آنکھوں میں بے پنا تاسف نظر آنے لگا۔ شاید وہ اس نئے قیدی کے انجام کا سوچ رہی تھی۔ اباقہ نے اس کی آنکھوں میں ہمدردی کی جھلک دیکھی تو اسے قریب بلایا۔ وہ اس سے اس کے سردار کے متعلق کچھ پوچھنا چاہتا تھا لیکن خادمہ اس کے پاس آنے سے ہچکچاتی رہی۔ اتنے میں ایک اور عورت اس کے عقب میں نظر آئی اور وہ دونوں پردے کے عقب میں چلی گئیں۔

خادمہ کے جانے کے بعد اباقہ کافی دیر اس نئی صورت حال کے بارے میں سوچتا رہا وہ اگر یہاں سے فرار ہونا چاہتا تو بہت زیادہ مشکل نہیں تھا لیکن فی الحال وہ کسی طرح کی ہنگامہ آرائی نہیں چاہتا تھا۔ آئندہ کی منصوبہ بندی کرتے کرتے اسے اونگھ آ گئی۔ نیم گرم خیمے میں وہ نہ جانے کتنی دیر اونگھتا رہا۔ دفعتاً ایک آہٹ سے وہ جاگ گیا۔ پہریداروں کی آوازیں بتا رہی تھیں کہ ان کا سالار واپس آ گیا ہے۔ پھر خیمے کا پردہ ہلا اور ایک گٹھم شخص تیزی سے اندر داخل ہوا۔ اس کا رخ زمین پر پڑے مضروب کی طرف تھا۔ شاید اس نے اباقہ کو دیکھا ہی نہیں۔ تلوار کی نوک چبھو کر اس نے مضروب کی حالت کا اندا لگایا۔ پھر ایک کرخت آواز خیمے میں گونجی۔ "مر گیا حرامی' لے جاؤ اسے۔"

مؤدب پہریدار تیزی سے آگے بڑھے اور لاش اٹھانے لگے۔ اس وقت دستہ سالا نے مڑ کر اباقہ کی طرف دیکھا۔ اباقہ کو سالار کی آواز کچھ جانی پہچانی لگ رہی تھی۔ اب ا

چہرہ دیکھا تو اسے شدید جھٹکا لگا .... خدا کی پناہ عجیب خوفناک شکل تھی سالار کی۔ اس کا چہرہ پچکا ہوا تھا۔ یوں لگتا تھا گرم لوہے کے گولے کو وزنی ہتھوڑے کی ضرب سے ٹیڑھا کر دیا گیا ہے۔ پیشانی پر اور آنکھ کے نیچے ایک زخم دراڑ کی صورت میں پڑ گیا تھا۔ اس کی وجہ سے پیشانی سکڑ گئی تھی اور ایک رخسار کی ہڈی اندر دب گئی تھی۔ اباقہ حیرانی سے دیکھتا رہا۔ اسے اس بدشکل چہرے میں شناسائی کی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔ دوسری طرف سالار کی آنکھوں میں بھی بے پناہ تحیر نظر آ رہا تھا۔ پھر اباقہ کے ذہن میں ایک زبردست دھماکہ ہوا .... اسے اپنی بصارت پر یقین نہیں آیا لیکن آنکھوں دیکھے منظر کو وہ کیونکر جھٹلا سکتا تھا۔ اس کے سامنے ہینڈاس کھڑا تھا۔ بلغارین پہلوان ہینڈاس جسے وہ جھیل بالکش کے نواح میں ایک چٹان سے کھڈ میں دھکیل چکا تھا۔ دونوں چند لمحے ساکت نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ پھر ہینڈاس کے حلق سے ایک فلک شگاف قہقہہ ابل پڑا۔ جیسے وزنی چٹان نشیب میں لڑھکتی ہے۔ ہینڈاس کا قہقہہ بلند اور تیز ہوتا چلا گیا۔ قہقہے کی حالت میں اس کا چہرہ اور بھی بھیانک لگ رہا تھا۔ آخر اس نے خود پر قابو پایا اور قدموں سے، چلتا' اباقہ کے سامنے پہنچ گیا۔ اس کے ہونٹوں سے سرسراتی آواز نکلی۔

"شکر ہے خدا کا' میرا انتظار ختم ہوا۔"

اباقہ نے کہا۔ "ہینڈاس' اگر تم زندہ بچ ہی گئے ہو تو زندگی کی قدر کرو۔"

ہینڈاس کی آنکھوں میں شعلے بھڑک رہے تھے۔ "کیسی زندگی اور کیسی موت اباقہ۔ مقابلہ ابھی ختم نہیں ہوا۔ مقابلہ جاری ہے اور اس وقت تک جاری رہے گا جب تک میں تجھے اپنے سے بھی زیادہ خوفناک بنا کر موت کے منہ میں نہ دھکیل دوں۔ میری زندگی برباد کرنے والے میں تجھے ایسی موت ماروں گا کہ سننے والوں کا کلیجہ منہ کو آئے گا۔"

کوہ الطائی کا سیدھا سادا نوجوان خاموش تھا۔ اس کے چہرے پر غضب کا کوئی اشارہ نہیں تھا۔ لگتا تھا اسے اس خوفناک پہلوان کے غضب اور اس کی دھمکیوں سے کوئی سروکار نہیں۔ ہینڈاس چند لمحے اسے سفاک نظروں سے گھورتا رہا پھر بولا۔

"میں جانتا ہوں تو یہاں کیوں آیا ہے۔ مارینا کی یاد تیری موت بن کر تجھے یہاں لے آئی ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ تیری موت کے ساتھ میرے آقا چغتائی کی عزت بھی محفوظ ہو جائے گی۔"

اباقہ اب بھی خاموش تھا۔ ہینڈاس خونخوار نظروں سے اسے دیکھتا رہا پھر پہریداروں کو ہدایات دینے لگا۔

پہریداروں نے اس کی مشکیں مزید مضبوطی سے کسیں اور تلواروں کی نوک سے

دھکیلتے ہوئے دوسرے خیمے میں لے گئے۔ یہ نسبتاً چھوٹا خیمہ تھا اور ہر قسم کی سہولت
عاری۔ خیمے سے باہر ہینڈاس نے چوکس پہریدار متعین کر دیئے تھے۔ اباقہ سوچنے
ہینڈاس اب کیا کرے گا۔ کیا وہ چغتائی کو اس کی گرفتاری کی اطلاع دے گا لیکن ہینڈاس
باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ایسا نہیں کرے گا .... شاید وہ اس سے دو بدو مقابلہ
کرنا چاہتا تھا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ تنہائی میں رکھ کر اسے اذیتیں دینا چاہتا ہو۔ بہر حال
کچھ بھی تھا یہ اباقہ کا دردِ سر نہیں تھا۔ اُس کا دردِ سر یہ تھا کہ وہ یہاں سے کیسے فرار
سکتا اور کیونکر مارینا کے پاس پہنچ سکتا ہے۔ اس نے گلے میں بندھے پھول دار کپڑے
چھوا اور اسے اپنے اندر ایک نئی طاقت کا احساس ہونے لگا۔

☆------☆------☆

اسد اللہ نے غار کے اندر عصر کی نماز ادا کی اور سردار یورق کے قریب آ بیٹھا۔
ں کے درمیان آگ جل رہی تھی اور اس کی روشنی ان کی آنکھوں میں سوچ کی
یاں اجاگر کر رہی تھی۔

سردار یورق بولا۔ "تم زیادہ سے زیادہ کتنے آدمی جمع کر سکتے ہو؟"

اسد اللہ نے کہا۔ "میں نے قوقند میں کافی کام کیا ہے۔ مجھے امید ہے میری ہدایت پر
زکم تین سو نوجوان ضرور یہاں جمع ہو جائیں گے' قریباً ایک سو افراد قریبی قصبے سے
جائیں گے۔ اگر تم کچھ دیر انتظار کر سکتے ہو تو بلخ سے کم و بیش دو سو رضاکار پہنچ سکتے
"

یورق بولا۔ "نہیں۔ ان کی ضرورت نہیں۔ ہمارے پاس وقت کم ہے۔ وہ بے
اب تک کافی دور نکل چکا ہو گا۔" اس کا اشارہ اباقہ کی طرف تھا۔ اباقہ کے جانے
ر یورق بے چین ہو گیا تھا۔ اس بے چینی کو وہ کوئی نام نہیں دے سکتا تھا۔
ورت سے سردار یورق کو کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا۔ اس کی اولاد بھی نہیں تھی۔
علوم نہیں تھا بچے کی محبت کیا ہوتی ہے لیکن اباقہ کے لئے اس کے دل میں ایک
شہ ہر وقت موجود رہتا تھا۔ وہ جانتا تھا مارینا کی کشش اسے واپس قراقرم لے گئی ہے
راقرم کا ہر گوشہ ایک کھلی قبر کی طرح اسے نگلنے کے لئے تیار تھا .... اور شامان
گوئی۔ اس پیش گوئی کی موجودگی میں اباقہ کا یہ سفر موت کا سفر تھا۔ یورق نے اسد
ساتھ مل کر فیصلہ کیا تھا کہ وہ اباقہ کی مدد کی کوشش کریں۔ خوارزم کی سرحد پر
لیاں ایسی تھیں جن سے بچ کر قراقرم کی طرف سفر جاری رکھنا خاصا دشوار تھا۔ عین
کہ اباقہ ان ہی میں سے کسی چوکی پر گرفتار ہو چکا ہو۔ یہ بھی امکان تھا کہ وہ برف
وجہ سے راستے ہی میں کہیں رکا ہوا ہو۔ اس صورت میں اسے واپس لایا جا سکتا

رق سے طویل مشورے کے بعد اسد اللہ غار سے نکلا۔ سورج مغرب کی طرف جھکا
ایک پتھر پر چڑھ کر اس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور جیب سے ایک سرخ رومال نکال کر

ہلانے لگا۔ دور قریباً ایک کوس کے فاصلے پر شیشے کی چمک دکھائی دی۔ اسد اللہ کا کوئی ساتھی اسے جوابی پیغام دے رہا تھا۔

عین اس وقت سینکڑوں میل دور اباقہ اس چھوٹے سے خیمے میں بیٹھا اپنے دل کی دھڑکنیں گن رہا تھا۔ کوئی انجانی کشش اسے بڑے پڑاؤ کی طرف کھینچ رہی تھی۔ کھلی ہوا میں وہ ماریتا کے سانسوں تک کی مہک سونگھ رہا تھا لیکن ہینڈا اس کے چنگل سے نکلنا ایسا آسان نہ تھا۔ وہ بری طرح پھنس چکا تھا۔ اس کی مشکیں مضبوطی سے کسی تھیں باہر بے نیام تلواروں کا پہرہ تھا۔ وہ خیمے میں بیٹھا سوچتا رہا۔ پھر سورج غروب ہوا اور تاریکی نے چاروں طرف پَر پھیلا دیئے۔ کافی دیر بعد خیمے کا پردہ ہلا اور ایک خادمہ اندر داخل ہوئی۔ وہ اس کے لئے کھانا لائی تھی۔ شمع کی مدھم روشنی میں اباقہ نے اس کا چہرہ دیکھا وہی لڑکی تھی جس سے مرتے ہوئے شخص نے پانی مانگا تھا اور وہ حسرت سے دیکھتی تھی۔ اباقہ کے قریب آ کر اس نے کھانا زمین پر رکھا۔ کچھ دیر گہری نظروں سے اس طرف دیکھتی رہی۔ پھر اس نے اطمینان سے اپنے لباس میں ہاتھ ڈالا اور ایک چھری نکال کر اباقہ کی رسیاں کاٹنے لگی۔ اباقہ حیران رہ گیا۔ وہ اس کی مدد کر رہی تھی لیکن کیوں اسے اپنی زندگی عزیز نہیں تھی۔ جب تک اباقہ نے یہی سوال لڑکی سے پوچھا وہ اس کے ہاتھ آزاد کر چکی تھی۔ مدھم لہجے میں بولی۔

"میں موت اور زندگی کی حد پار کر چکی ہوں اجنبی۔ مجھے کسی کا خوف نہیں۔"

تب اباقہ نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔ اس کی آنکھیں گہری سرخ اور ا... تھیں۔

"میں نے زہر کھایا ہے اجنبی۔" لڑکی کی سرسراتی ہوئی آواز آئی۔ "آج تم نے جس شخص کو پانی کے لیے ترستے اور مرتے دیکھا ہے وہ میرا شوہر تھا۔ یہ موت نہیں تو ا... ہے کہ میں اپنے شریک زندگی کے منہ میں پانی کے چند قطرے نہ ٹپکا سکی۔ جب پہریدار میری عزت لوٹ رہے تھے میرا شوہر میری چیخیں سن رہا تھا لیکن یہ صدمہ بھول گیا۔ میرے شوہر کو جاسوس ہونے کے شبہے میں جانوروں کی طرح اذیتیں دی... اس کی چیخیں میں تین راتیں سنتی رہی لیکن وہ چیخیں بھی مجھے بھول گئیں لیکن وہ آواز کبھی نہ بھولوں گی۔ جو میرے جاں بلب شوہر کے خشک ہونٹوں سے نکلی تھی۔ وہ تم سے پیاسا تھا اور اس نے پانی مانگا تھا .... ہاں اس پہاڑ کے دامن میں ایک ... سے جھونپڑے کے سامنے پتھروں سے چشمہ پھوٹتا رہے گا' لیکن اس چشمے سے کوئی ... نہیں بجھائے گا۔ نہ میرا شوہر' نہ میں اور نہ ہماری بھیڑیں ...." چرواہی نے ایک

اور اوندھے منہ گری۔ اباقہ نے اسے اپنے مضبوط بازوؤں میں تھام لیا۔ وہ اٹکی ہوئی آواز میں بولی۔ "چلا جا اجنبی' شاید تُو منگول ہے لیکن اس دھیان میں مت رہ۔ چنگیز خاں کے بیٹے جب کسی کو قید کرتے ہیں تو وہ منگول یا غیر منگول نہیں ہوتا' صرف قیدی ہوتا ہے' بدقسمت قیدی۔"

اباقہ نے پوچھا۔ "تُو مسلمان ہے؟"

لیکن لڑکی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ جواب دینے کے اختیار سے محروم ہو چکی تھی۔ اس کی سانس گلے میں الجھی' آنکھوں میں آئی اور منہ سے خون کا ایک فوارہ پھوٹ نکلا۔ ایک خونی قے کے ساتھ وہ اباقہ کے ہاتھوں میں دم توڑ گئی۔ اباقہ نے احتیاط سے اسے زمین پر لٹایا۔ چند لمحے خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ پھر جیسے چونک کر اپنے پاؤں کی رسیاں کاٹنے لگا۔

اتنے میں خیمے کے باہر سے ایک پہریدار کی بارعب آواز آئی۔ "اے لڑکی کیا کر رہی ہے۔ اندر یارانہ تو نہیں لگا بیٹھی۔"

اباقہ نے پھونک مار کر شمع بجھائی اور بلی کی چال چلتا پردے کے قریب پہنچ گیا۔ چھری اس کے ہاتھ میں تھی پھر اچانک وہ گلے کی پوری قوت سے چلایا یوں لگتا تھا جیسے کوئی اسے زمین پر لٹا کر ذبح کر رہا ہو۔ پہریداروں کو بوکھلا دینے کے لیے یہ آواز کافی تھی۔ وہ تیزی سے خیمے میں داخل ہوئے۔ اندر اندھیرا تھا۔ وہ آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے لگے۔ پہلے تین سپاہی اندر آئے پھر دو اور آ گئے .... اس وقت اباقہ جو خیمے کے سمور سے چپکا ہوا تھا خیمے سے باہر نکل گیا .... بوکھلاہٹ میں پانچ پہریدار اندر داخل ہو گئے تھے لیکن ایک جو ذرا سمجھدار تھا تلوار سونتے باہر کھڑا تھا۔ اباقہ کا ہیولا دیکھ کر وہ ٹھٹکا لیکن اس سے پہلے کہ وہ اسے پہچان کر شور مچاتا اباقہ کسی چیتے کی طرح لپکا اور اسے دبوچ کر ڈھلوان میں لڑھک گیا۔ یہ سب کچھ پلک جھپکتے میں ہو گیا۔ دس بارہ فٹ نیچے جا کر اباقہ نے پہریدار کو کسی بھیڑ کی طرح دبوچ لیا۔ پہریدار کی آنکھوں میں خوف کے سائے لہرائے وہ پورے زور سے چیخا لیکن یہ چیخ اس کے حلق سے باہر نہیں نکلی۔ اس کے ہونٹوں پر اباقہ کا مضبوط ہاتھ تھا۔ نوکدار چھری پہریدار کے سینے سے ٹکرائی اور اونی صدری کو چیرتی ہوئی دستے تک اتر گئی۔ اباقہ غرایا۔ "شاید تو بھی ان کتوں میں سے ایک ہے جو اس لڑکی کا جسم بھنبھوڑتے رہے ہیں۔" پہریدار پر جاں کنی کی کیفیت طاری ہو رہی تھی لیکن اباقہ اس کی موت کا انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے پلک جھپکتے میں پہریدار کی گردن توڑی اور سائے کی طرح تاریکی میں رینگ گیا۔

اب وہ تیزی سے اصل پڑاؤ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ راستہ ڈھلوان اور پتھریلا تھا لیکن اباقہ کو چلنے میں کوئی دشواری نہیں ہو رہی تھی۔ دور اوپر پہریداروں کا شور اور متحرک مشعلیں دکھائی دے رہی تھیں۔ ابھی ان کا دھیان نشیب کی طرف نہیں گیا تھا۔ شاید وہ سمجھتے تھے کہ قیدی اس دشوار راستے کو فرار کے لیے منتخب نہیں کر سکتا۔ لگتا تھا ابھی ہینڈاس کو پتہ نہیں چلا ورنہ وہ اپنے ساتھیوں کو سب سے پہلے اسی طرف دیکھنے کا حکم دیتا۔ یہ راستہ دشوار ضرور تھا لیکن سیدھا پڑاؤ کی طرف جاتا تھا' اور ہینڈاس جانتا تھا اباقہ فرار ہو کر کس طرف جائے گا۔

چھوٹے بڑے پتھروں کو پھلانگتا وہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ ہاتھ میں صرف ایک چھری تھی اور سینے میں ایک ہی نام گونج رہا تھا "مارینا"............ آخر وہ پڑاؤ کے اندر پہنچ گیا۔ نو دموں والا پرچم اس کی رہنمائی کر رہا تھا درختوں اور خیموں کی آڑ لیتا وہ چغتائی خاں کے خیمے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا وقت بہت کم ہے ہینڈاس اور اس کے سپاہی کسی بھی وقت گھوڑے دوڑاتے یہاں پہنچ سکتے ہیں۔ ان کے پہنچنے سے پہلے اسے مارینا سے ملنا تھا۔

خیموں کے اندر سے دھواں نکل رہا تھا۔ رات کے کھانے کے لیے شکار کا گوشت بھونا جا رہا تھا۔ اکا دکا افراد باہر بھی گھوم رہے تھے لیکن سب کے سب سموری لبادوں میں لپٹے تھے۔ اباقہ نے بھی چہرہ سموری ٹوپی میں چھپا رکھا تھا۔ ٹوپی کے نیچے کو لٹکے ہوئے بڑے بڑے کانوں نے اس کا منہ ڈھانپ رکھا تھا۔ وہ جانتا تھا اسے پہچانا نہ جا سکے گا۔ تھوڑی دور ایک منگول خشک لکڑی کو کلہاڑے سے پھاڑ رہا تھا اس کے قریب ایک لڑکی کھڑی تھی۔ اباقہ فوراً پہچان گیا وہ آمنہ تھی .... مارینا کی خادمہ' منگول اپنے کام میں مگن تھا۔ آمنہ نے ایک نظر اباقہ کی طرف دیکھا تو اس نے اپنے چہرے سے کپڑا ہٹایا اور ہاتھ سے اشارہ کیا۔ آمنہ نے غور سے دیکھا پھر جیسے وہ اسے پہچان گئی۔ ایک خیمے سے نکلنے والی روشنی میں اباقہ کا چہرہ اسے صاف نظر آ رہا تھا۔ اس نے محتاط نظروں سے منگول کی طرف دیکھا پھر تیز قدموں سے اباقہ کی طرف بڑھ آئی۔ اباقہ ایک خیمے کی اوٹ میں ہو گیا تھا۔

وہ چند لمحے متحیر نظروں سے اسے دیکھتی رہی پھر بولی۔ "تو یہاں؟"

اباقہ نے کہا۔ "آمنہ! میرا مارینا سے ملنا بہت ضروری ہے۔ اسے فوراً اطلاع دو۔"

آمنہ پریشانی سے دائیں بائیں دیکھ رہی تھی۔ اباقہ جانتا تھا آمنہ کے رویے میں ہمیشہ اس کے لیے ایک لچک رہی ہے۔ وہ قدرے نرم لہجے میں بولا۔ "آمنہ! میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ ذرا جلدی کرو۔"

آمنہ نے کہا۔ "اباقہ! تم مجھے آزمائش میں ڈال رہے ہو۔ بہرحال یہیں ٹھہرو۔ میں

کوشش کرتی ہوں۔"

مارینا اپنے خیمے میں دو سہیلیوں کے ساتھ بیٹھی تھی۔ یہ دونوں ایک بڑے سردار کی بیویاں تھیں۔ درمیان میں گرم انگیٹھی رکھی تھی۔ کوئلوں کا عکس مارینا کے گلابی رخساروں پر منعکس ہو رہا تھا۔ وہ کوئی بات کر رہی تھی۔ تب خیمے کا پردہ اٹھا اور آمنہ اندر داخل ہوئی۔ مارینا بولی۔

"تُو تو لکڑیاں لینے گئی تھی۔" آمنہ نے کہا۔ "ہاں وہ کاٹ رہا ہے۔" اُس کا ذہن تیزی سے مارینا کو باہر لانے کا منصوبہ سوچ رہا تھا۔

مارینا بولی۔ "تُو کچھ گھبرائی ہوئی ہے۔"

"وہ .... وہ آپ کو ...." آمنہ گڑبڑا کر رہ گئی۔

دونوں عورتوں میں سے ایک جو درمیانی عمر کی گھاگ سی عورت تھی بولی۔ "مارینا میرا خیال ہے چغتائی خاں نے تجھے یاد کیا ہے۔"

دوسری نے گرہ لگائی۔ "بوڑھا خان اسے اب کیا یاد کرے گا........... بس کوئی بات کرنا ہوگی۔"

پہلی عورت بولی۔ "اچھا مارینا' ہم چلتی ہیں۔"

مارینا نے کہا۔ "بیٹھو' میں ابھی آئی۔"

دوسری عورت بولی۔ "میں نے کہا تھا نا۔ وہ کسی کو اب کیا یاد کرے گا بس ابھی آ جاتی ہے۔"

مارینا کے چہرے پر حیا کی سُرخی پھیل گئی۔ اُسے یہ تبصرہ ناگوار گزر رہا تھا۔ بہرحال وہ کچھ کہے بغیر آمنہ کے ساتھ باہر آ گئی۔ آمنہ بڑی سراسیمہ دکھائی دیتی تھی۔ اُسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتی درختوں کی طرف بڑھی۔ مارینا کو حیرانی ہو رہی تھی۔ وہ اُسے کہاں لے جا رہی ہے۔ اسی ادھیڑ بن میں وہ درختوں میں پہنچی۔ اباقہ اوٹ سے نکل کر سامنے آ گیا۔ مارینا کے چہرے پر خوشگوار حیرت نظر آئی۔ "اباقہ تم؟" وہ لرزاں آواز میں بولی لیکن پھر فوراً ہی اُس کا بے لچک لہجہ لوٹ آیا۔ "تم یہاں کیسے پہنچ گئے؟"

اباقہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اُس نے آمنہ کی طرف دیکھا وہ جلدی سے واپس مڑ گئی۔ اباقہ دو قدم چل کر مارینا کے قریب پہنچا غور سے اُس کا چہرہ دیکھا۔ آج وہ اپنے اندر ایک عجیب اعتماد محسوس کر رہا تھا۔ اُس کے دل میں کوئی خلش نہیں تھی۔ وہ بے باکی سے مارینا کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ آج وہ اُس سے مرعوب بھی نہیں تھا۔

"مارینا!" اُس نے نرم لیکن ٹھوس لہجے میں کہا۔ "میں تمہیں لینے آیا ہوں۔"

مارینا غیرارادی طور پر ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ "اباقہ ہوش میں تو ہے۔" اُس نے
کہا۔

اباقہ بولا۔ "ہاں! ہوش میں ہوں۔ میرے ساتھ چلو مارینا۔ میں تمہیں یہاں نہیں
رہنے دوں گا۔"

مارینا جھلا کر بولی۔ "میں واپس جا رہی ہوں۔"

وہ واپس جانے کے لیے مڑی۔ اُس وقت اباقہ کا ہاتھ متحرک ہوا اور اُس نے
اطمینان سے مارینا کا کندھا تھام لیا۔ "ٹھیک ہے مارینا۔ واپس جاؤ لیکن کل اسی وقت میں
پھر آؤں گا اور تمہیں میرے ساتھ جانا ہوگا۔ اس قید خانے سے دور اس سرزمین پر جہاں
کی تُو رہنے والی ہے۔ جہاں تیرا بچپن گزرا ہے جہاں سے تجھے اُٹھایا گیا تھا۔"

مارینا کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ اس نے غور سے اباقہ کی طرف دیکھا۔
اس کے ہونٹ کپکپائے لیکن وہ کچھ بولی نہیں اور جب بولی تو اس کا سخت لہجہ اس کے
چہرے کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ "اباقہ چھوڑ دے مجھے۔ تیری کوئی بات میری سمجھ میں
نہیں آتی۔"

اباقہ نے کہا۔ "ٹھیک ہے مارینا لیکن یاد رہے کل اسی وقت میں تجھے لینے آؤں گا۔"
اس نے مارینا کا بازو چھوڑا اور وہ بغیر کچھ کہے تیزی سے خیموں کی طرف چلی گئی۔ اس
وقت اباقہ نے گھوڑوں کی ٹاپیں سنیں۔ وہ ان کی سمت کا اندازہ کرنے لگا۔ یہ جان کر وہ
پریشان ہو گیا کہ آوازیں دائیں بائیں دونوں جانب سے آ رہی ہیں۔ محسوس ہوتا تھا کہ
ہینداس نہ صرف پڑاؤ میں پہنچ گیا ہے بلکہ مارینا کے خیمے کو گھیرنے کی کوشش بھی کر رہا ہے
جس راستے سے اباقہ آیا تھا وہ مسدود ہو چکا تھا۔ وہ درختوں کی طرف بڑھا لیکن ابھی دو چند
قدم ہی گیا تھا کہ اس جانب بھی شور سنائی دینے لگا۔ دراصل اس جانب برف تھی اور ٹاپوں
کی آواز سنائی نہیں دی تھی۔ اس نے تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ گھڑ سوار
دکھائی نہیں دیے لیکن ان کے شور سے بخوبی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ چاروں طرف پھیل کر
آگے بڑھ رہے ہیں۔ اباقہ نے واپس خیموں کی طرف لپکنا چاہا لیکن اس وقت اس کا پاؤں
گھٹنے تک برف میں دھنس گیا۔ اس نے پاؤں نکالنے کے لیے دوسرے پاؤں پر زور ڈالا
اور وہ بھی نیچے گڑھے میں چلا گیا۔ اب وہ ناف تک برف میں دھنسا ہوا تھا اور گھڑ سوار
چاروں طرف سے اس کے قریب پہنچ رہے تھے مارینا کا خیمہ یہاں سے صرف پچیس قدم
کے فاصلے پر تھا۔

☆------☆------☆

چغتائی خاں اپنے خیمے میں نیم دراز تھا۔ منگول عمر کے آخری حصے میں عموماً گنٹھیے کے
مرض کا شکار ہو جاتے تھے۔ چغتائی خاں کو بھی جوڑوں کا درد شروع ہو چکا تھا۔ وہ اکثر
حسین خادماؤں سے اپنے جوڑوں کی مالش کرواتا رہتا تھا۔ اس وقت بھی دو کم عمر لڑکیاں
اس کے جسم پر مختلف تیلوں اور عطریات کی مالش میں مصروف تھیں۔ دبیز ایرانی قالین پر
انگیٹھی کے بالکل قریب بیٹھا وہ سوچ رہا تھا کہ اس نے اس موسم میں شکار پر آ کر خود اپنے
مرض کو دعوت دی ہے۔

اتنے میں خیمے سے باہر گھوڑوں کی ٹاپیں گونجیں۔ پھر بھاگو پکڑو کی آوازیں سنائی
دیں۔ تھوڑی دیر یہ ہنگامہ برپا رہا۔ چغتائی خان نے دو محافظوں کو پتہ کرنے بھیجا۔ چند لمحے
بعد محافظ ہینداس کے ساتھ خیمے میں داخل ہوئے۔ ہینداس بری طرح ہانپ رہا تھا۔ اس
کے ہاتھ میں تلوار تھی۔ چغتائی کے سامنے پہنچ کر اس نے ادب سے سر جھکایا اور بولا۔

"محترم خان سیورا قطنی کا محافظ خاص اباقہ ایک پہریدار کو قتل کر کے فرار ہو گیا۔"

چغتائی خان سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ "کیا کہہ رہے ہو ہینداس وہ تو سردار یورق کے
ساتھ ایران کی مہم پر ہے۔"

ہینداس بولا۔ "نہیں خان معظم وہ بدباطن منگول کی آبرو سے کھیلنے واپس
آ گیا ہے۔"

چغتائی خاں کے چہرے پر زلزلے کے آثار نظر آئے۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے
تخلیے کا حکم دیا۔ ہینداس کے سوا خیمہ خالی ہو گیا۔ ہینداس بولا۔

"محترم خان! میرے آدمیوں نے آج دوپہر اسے ایک جنوبی چوکی سے گرفتار کیا تھا
لیکن آپ تک پہنچنے سے پہلے ہی اس نے میرے ایک سپاہی کو قتل کر ڈالا اور بھاگ نکلا۔
جہاں تک میرا خیال ہے...... وہ محترمہ مارینا کے خیمے کی طرف آیا ہے۔"

چغتائی خاں غضب کے عالم میں کھڑا ہو گیا گرج کر بولا۔ "ہینداس! اب اسے بچ کر
نہیں جانا چاہیے پورے پڑاؤ کو گھیر لو اور ایک ایک یورت (خیمہ) میں تلاش کرو......
چپہ چپہ چھان مارو۔"

ہینداس سر جھکا کر تیزی سے باہر نکل گیا چغتائی خاں بے قراری سے خیمے میں ٹہلنے
لگا۔ وہ جانتا تھا اباقہ ایک بے مثال جنگجو ہے بے مثال بازوؤں کی منگول سلطنت کو
ضرورت تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جانتے بوجھتے چغتائی نے اباقہ سے نرم رویہ اختیار کیا تھا
اسے اچھی طرح علم تھا کہ اباقہ اس کی بیوی مارینا پر نگاہ رکھتا ہے۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ
اباقہ نے سردار بوغالی اور ارغونا کو قتل کیا ہے لیکن وہ اپنے اور منگولوں کے فائدے کے

لیے ان جرائم سے چشم پوشی کر رہا تھا اسے اندازہ نہیں تھا یہ سودا مہنگے سے مہنگا ہوتا چلا جائے گا۔ اباقہ کی سرکوبی اب ضروری ہو گئی تھی اس نے فیصلہ کر لیا کہ جونہی اباقہ گرفتار ہوا اس کی گردن مار دی جائے گی۔ وہ بے قراری سے ہینڈا اس کی واپسی کا انتظار کرنے لگا

گھوڑے دوڑتے رہے سپاہیوں کی آوازیں گونجتی رہیں اور چغتائی ٹہلتا رہا۔ کافی دیر بعد ہینڈا اس کی صورت دروازے پر نظر آئی۔ اس کا چہرہ یہ بتانے کے لیے کافی تھا کہ اباقہ کا پتہ نہیں چلا۔ اس نے ادب سے کہا۔

"محترم خان۔ لگتا ہے آستین کا وہ سانپ تاریکی میں کہیں رینگ گیا ہے۔ وہ پڑاؤ میں موجود نہیں۔ میں نے اپنے سپاہیوں کو چاروں طرف پھیلا دیا ہے وہ رات بھر اس کی تلاش جاری رکھیں گے مجھے امید ہے صبح تک اس کا سراغ مل جائے گا۔"

چغتائی خاں پُرسوچ لہجے میں بولا۔ "مجھے خدشہ ہے وہ بدبخت دوبارہ یہاں آنے کی کوشش کرے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ رات بھر پڑاؤ کے گرد سخت پہرہ رکھا جائے۔"

ہینڈا اس نے اپنے بھیانک چہرے کو کچھ اور بھیانک بناتے ہوئے کہا۔ "محترم خان .... آپ بالکل بے فکر رہیں۔"

مارینا اپنے خیمہ موجود میں تھی اس کا دل خشک پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ شام کے سائے آہستہ آہستہ طویل ہو رہے تھے۔ اباقہ کے الفاظ رہ رہ کر اس کے کانوں میں گونجتے تھے۔ "میں کل اسی وقت پھر آؤں گا۔" وہ دیکھ رہی تھی پڑاؤ سے باہر ہینڈا اس اپنے دستے کے سپاہیوں کے ساتھ کھڑا تھا۔ آٹھ پہر کے بعد تلاش کی سرگرمیاں ماند پڑ چکی تھیں لیکن نگرانی بدستور جاری تھی۔ اردگرد کے علاقے میں سپاہیوں کی ٹولیاں گردش کر رہی تھیں۔ اگر اباقہ دوبارہ پڑاؤ کا رُخ کرتا تو اس کا پکڑے جانا یقینی تھا......... اور مارینا جانتی تھی۔ وہ باز نہیں رہے گا وہی کرے گا جو اس نے کہا ہے......... تو کیا آج وہ اس کی لاش تڑپتی دیکھے گی۔ وہ بے خیالی میں چلتی خیمے کے پہلو میں پہنچی اور جالدار روزن سے آنکھیں لگا کر باہر دیکھنے لگی۔ اس کے خیمے سے آگے چند خیمے تھے پھر برف کی سفید چادر تھی اور کوئی سو قدم آگے درختوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ اس کا خیال تھا اباقہ کل انہی درختوں کے اندر گھس کر فرار ہوا ہوگا۔ کافی دیر وہ گم صم کھڑی اُن درختوں کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر اس کی نگاہیں برف کی سفید چادر پر پھسلنے لگیں منگول سپاہی یہاں کا چپہ چپہ دیکھ چکے تھے ان کے گھوڑوں کی ٹاپیں ہر ہر گوشے پر ثبت تھیں۔

مارینا کھڑی رہی ملگجے اندھیرے پر رات کی سیاہی غالب آنے لگی۔ خیموں کے درمیان

گ۔ مارینا کا دل اور شدت سے دھڑکنے لگا جنگلی کا دعدہ قریب پہنچ رہا تھا......... اس کی نگاہیں برف کے ہموار قطع پر مرکوز تھیں۔ دفعتاً اسے لگا کہ ایک جگہ سے برف حرکت رہی ہے......... اس کی نگاہ دھوکا نہیں کھا رہی تھی برف واقعی متحرک تھی۔

☆-------☆-------☆

وہ اباقہ تھا۔ برف کھانے والا' برف پر سونے والا اور یخ بستہ ہوائیں اوڑھنے والا۔ وہ آٹھ پہرے برف میں تھا۔ کل رات اس نے گھڑ سواروں کو قریب پہنچتے دیکھا اور خود کو برف میں دفن کر لیا تھا۔ وہ سرتاپیر برف میں چلا گیا تھا اس نے اپنے گرد گھوڑوں کی ٹاپیں سُنی تھیں۔ مسلح پہریداروں کی آوازیں سنی تھیں اُن کے للکارے اس کے کانوں تک پہنچے تھے اور وہ بے حس و حرکت اپنی یخ بستہ قبر میں لیٹا رہا تھا۔ سانس کی آمدورفت کے لیے اس نے صرف ایک چھوٹا سا سوراخ رہنے دیا تھا۔ رات آخری پہر جب تلاش کا شور قدرے سرد پڑا تھا۔ اس نے اپنے چہرے اور بالائی جسم سے برف ہٹائی تھی۔ صبح کے اجالے کے ساتھ اس نے ایک بار پھر خود کو ڈھانپ لیا تھا۔

ان آٹھ پہروں میں اس کے جسم نے کیا کیا عذاب نہیں سہے۔ اس کی رگ جاں پر کیا کیا آفت نہیں ٹوٹی لیکن اس نے سب کچھ برداشت کیا۔ صرف مارینا کے لیے جو اس سے چند گز کے فاصلے پر اپنے گرم خیمے میں موجود تھی .... اور اب وقت آگیا تھا' برف ہٹانے کا وقت۔ اُٹھنے اور کچھ کر گزرنے کا وقت اور پھر اس نے جسم کو حرکت دی اور اپنی پناہ گاہ سے نکل آیا۔ تاریکی لحہ بہ لحہ پھیلتی جا رہی تھی۔ اس نے اپنی مٹھیاں بھینچ کر گردن کو جنبش دی' پاؤں کو ہلایا رگ پٹھوں کو مائل بہ حرکت کیا اور گہری نظر سے اطراف کا جائزہ لے کر مارینا کے خیمے کی طرف بڑھنے لگا۔

کسی برفانی جانور کی طرح بے آواز رینگتا ہوا وہ خیمے کے عقب میں پہنچا۔ گرم صدری کے اندر ہاتھ ڈال کر چھری نکالی اور خیمے کا کپڑا کاٹ ڈالا۔ اس کے انداز میں عجیب سا ٹھہراؤ تھا جیسے تمام اندیشوں کو بالائے طاق رکھ چکا ہو پھر اس نے کٹا ہوا کپڑا ہٹایا اور اندر داخل ہو گیا۔

مارینا خیمے کے وسط میں کھڑی تھی۔ اس کی خوفزدہ نگاہیں اباقہ پر مرکوز تھیں۔ وہ چھری ہاتھ میں لیے اس کی طرف دیکھ رہا تھا چہرہ شدت سردی سے نیلگوں تھا سر کے بالوں اور بھنوؤں پر برف جمی تھی۔

"میں آگیا مارینا!" اس کی آواز میں ٹھوس برف کی سختی تھی

مارینا ہکلائی۔ "تم .... تم کہاں تھے اباقہ؟"

"یہیں تمہارے قریب یورت کے سامنے۔"

"اباقہ تو کیا شے ہے؟ مجھے کچھ سمجھ نہیں آتی۔"

"چلو ماریتا یہاں سے دور نکل چلیں ۔ پھر میں تمہیں بتاؤں گا کہ میں کون ہوں اور تم مجھے بتانا۔"

ماریتا کے چہرے پر پھر گریز کی کیفیت عود کر آئی۔ "نہیں اباقہ! میں ان راستوں کی سختی نہیں جھیل سکتی خدا کے لیے مجھے فراموش کر دے۔"

" نہیں ماریتا!" اباقہ کی بے باک آواز گونجی۔ "آج میں تجھے اس زرتار خیمے سے لے جاؤں گا۔ یہ خیمہ نہیں تیرا پنجرہ ہے آج یہ پنجرہ کھل جائے گا۔ خان کے سارے محافظ' اس کی ساری تلواریں اس کی ساری فوج مل کر بھی ہمارا راستہ نہیں روک سکے گی۔"

"تو مارا جائے گا اباقہ!"

"آج موت بھی میرا کچھ نہ بگاڑ سکے گی۔"

"اباقہ!"

"ماریتا!" اباقہ دو قدم آگے بڑھا ماریتا خوفزدہ انداز میں پیچھے ہٹنے لگی۔ "میرے ساتھ چلو ماریتا"

"نہیں اباقہ!"

" ماریتا! تو سمجھتی کیوں نہیں تو مسلمان ہے تیری جگہ منگولوں میں نہیں' مسلمانوں میں ہے تو یہاں غیر ہے۔"

"اباقہ میں کچھ سننا نہیں چاہتی۔"

"اباقہ عجیب سی آواز میں غرایا اس کا دایاں ہاتھ گھوما اور پورے زور سے ماریتا کے رخسار پڑا۔ ضرب اتنی اچانک اور شدید تھی کہ ماریتا چکرا کر گری اور بے سدھ گئی۔ اباقہ نے ٹھٹک کر اسے دیکھا پھر تیزی سے نیچے جھکا اور اس کا بے ہوش جسم پھول کی طرح کندھے پر اٹھا لیا۔

تب اس کی نگاہ دیوار پر لٹکی تلوار پر پڑی۔ اس نے تلوار نیام سے نکالی اور خیمے کے عقبی سوراخ سے باہر نکل آیا۔ محتاط نگاہوں سے اس نے اردگرد دیکھا۔ ہینڈا اس جو تھوڑی دیر پہلے چند سپاہیوں کے ساتھ پڑاؤ کے کنارے کھڑا تھا' اب دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اباقہ خیموں کی اوٹ لیتا برف کے ہموار قطع تک آیا پڑاؤ کے آخری خیمے سے باہر دو گھوڑے بندھے تھے۔ اباقہ نے ایک گھوڑے کی رسی کاٹی اسے کھینچتا ہوا تھوڑی دور لایا پھر ا

ات کے نیچے رک گیا۔ پہلے اس نے ماریتا کا بے ہوش جسم گھوڑے پر لادا پھر خود بھی ار ہو گیا۔ نہ گھوڑے کی پیٹھ پر کاٹھی تھی اور نہ منہ میں لگام۔ اباقہ نے اس کے ایال اے اور ایڑ لگا دی۔ گھوڑا تیزی سے ڈھلوان پر چڑھنے لگا۔ اباقہ کا ایک ہاتھ ماریتا کی کمر گرد تھا اس کا سر اباقہ کے بازو سے لگا تھا۔ وہ ماریتا کے بہت قریب تھا لیکن یہ وقت اس بت سے لطف اندوز ہونے کا نہیں تھا وہ جانتا تھا کہ وہ موت کی وادی میں ہے اس وادی باہر نکلنے تک وہ خود کو زندوں میں شمار نہیں کر سکتا تھا۔

کچھ آگے جا کر اباقہ کو دو گھڑسوار نظر آئے۔ اس نے خود کو پھرتی سے ایک چٹان کی ٹ میں چھپا لیا۔ گھڑسوار آگے نکل گئے تو پھر بلندی پر چڑھنے لگا۔ کچھ آگے جا کر اُسے دازہ ہوا کہ گھوڑا اُن دونوں کا بوجھ سہار کر اوپر نہیں چڑھ سکتا۔ وہ گھوڑے سے اُتر آیا یتا کو دوبارہ کندھے پر لادا اور پیدل آگے بڑھنے لگا۔ دفعتاً اسے اندازہ ہوا کہ ماریتا ہوش ں آ رہی ہے۔ وہ کسمسا رہی تھی۔ پھر اس نے ایک سسکاری لی اور اباقہ کے کندھے سے نے کے لیے زور لگانے لگی عین اُس وقت اباقہ کو گھڑسواروں کا ایک دستہ دکھائی دیا۔ ں وہ لمحہ تھا جب ماریتا زور سے چیخی۔ "چھوڑ دے اباقہ مجھے چھوڑ دے۔" اس کی آواز اٹے میں دور تک تیرتی چلی گئی۔ اباقہ نے صاف دیکھا کہ نشیب میں گھڑسواروں نے ڑے روک لیے۔ پھر اُن میں سے کسی کی نگاہ ماریتا کے سفید براق لباس پر پڑی اور وہ یا۔ اس کے ساتھ ہی گھوڑے اباقہ کی طرف بڑھنے لگے لیکن چڑھائی دشوار تھی۔ گھڑ واروں کو گھوڑوں سے نیچے اُترنا پڑا......... پھر اونچے نیچے ٹیلوں میں ایک زبردست دوڑ روع ہو گئی۔ اباقہ ماریتا کو کندھے پر اُٹھائے کسی چھلاوے کی طرح پتھر اور کھائیاں پھلانگتا جا رہا تھا۔ متعاقب سپاہی پوری رفتار سے اس تک پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ماریتا و کو چھڑانے کی جدوجہد میں مصروف تھی لیکن اب اباقہ کی گرفت خوفناک حد تک سخت ی۔ اس کے جسم میں جیسے بجلیاں دوڑ رہی تھیں۔ وہ راستے میں آنے والے گڑھوں اور ھائیوں کو لمبی چھلانگوں سے پار کر رہا تھا۔ متعاقب سپاہی بھی کسی نہ کسی طرح ان راوٹوں کو عبور کر رہے تھے لیکن "سبکدوش" ہونے کے باوجود وہ اباقہ سی پھرتی کا مظاہرہ ں کر پا رہے تھے۔ اباقہ نے جان بوجھ کر دشوار ترین راستہ منتخب کیا تھا۔ اس جانب کوئی ی ٹولی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

آخر ایک جگہ راستہ مسدود ہو گیا۔ اباقہ ایک گہری کھڈ کے کنارے کھڑا تھا۔ عاقب سپاہی پلک جھپکتے میں اس کے سر پر پہنچ گئے۔ وہ تعداد میں قریباً آٹھ تھے لیکن ان ں ایک ایسا تھا جو اکیلا آٹھ پر بھاری تھا اور وہ تھا ہینڈا اس۔ وہ ایک بے ڈول چٹان کی

طرح اباقہ کے سامنے کھڑا تھا۔ چاند کی مدھم روشنی میں اس کا چہرہ کسی ڈراؤنے خواب کے منظر دکھائی دیتا تھا۔ وہ ہانپتا ہوا بولا۔

"تجھے کہا تھا نا اباقہ' تجھے تیری موت یہاں لائی ہے .... اب اس محترم خاتون کو کندھے سے اتار دے اور مرنے کے لیے تیار ہو جا۔"

اباقہ نے حکم کی تعمیل کی۔ اس نے مارینا کو آرام سے پاؤں پر کھڑا کر دیا۔ مارینا تذبذب کے عالم میں اباقہ سے دور ہوئی اور ہینڈاس کے عقب میں چلی گئی۔ مارینا کی اس حرکت نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ اباقہ غضبناک انداز میں دھاڑا اور تلوار سونت کر ہینڈاس پر ٹوٹ پڑا۔ ہینڈاس شاید اس کا ارادہ بھانپ گیا تھا وہ پھرتی سے ایک جانب ہٹا۔ اباقہ ایک جھونک میں آگے نکل گیا۔ اس وقت ساتوں مسلح محافظ اس پر ٹوٹ پڑے۔ یہ اس کی سخت ترین تربیت کا امتحان تھا جو اباقہ نے کوہ الطائی کے ویرانوں میں حاصل کی تھی۔ اس کے باپ نے کہا تھا بیٹا دشمنوں میں گھر جاؤ تو کبھی دفاع نہ کرو۔ حملہ کرو اور مارنے کے لیے نہیں مرنے کے لیے لڑو۔ وار بچانے کے لیے نہیں زخم کھانے کے لیے لڑو........... اور اباقہ کی تلوار صاعقہ کی طرح چمک رہی تھی۔ اپنے پہلے ہی شدید حملے میں اس نے دو منگولوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ باقی منگول زبردست دباؤ میں آگئے تھے۔ ان کے لیے یہ احساس جان لیوا تھا کہ اردوئے معلیٰ کا خطرناک ترین جنگجو ان کے سامنے ہے۔ اباقہ نے اپنے تابڑ توڑ حملوں سے انہیں ایک کونے میں محصور کر دیا تھا۔ وہ جانتا تھا اس کی کامیابی اس میں ہے کہ اپنے مدمقابل تلوار زنوں کو بکھرنے نہ دے اور اپنی اس کوشش میں وہ کامیاب تھا۔ دو سپاہیوں نے یکے بعد دیگرے اس حصار سے نکلنے کی کوشش کی اور کٹ گئے۔ باقی تین سپاہیوں نے موت سر پر دیکھی تو غضب کے عالم میں اباقہ پر حملہ کیا لیکن اباقہ اب اپنی مخصوص صلاحیتوں کا مظاہرہ کر رہا تھا اور کیوں نہ کرتا۔ مارینا اسے دیکھ رہی تھی۔ یہ احساس اس کے رگ وپے میں شعلے بھڑکا رہا تھا پھر مارینا اور ہینڈاس نے دیکھا کہ تینوں منگول یکے بعد دیگرے گاجر مولی کی طرح کٹ گئے۔ آخری دو سپاہیوں نے بھاگنے کی کوشش کی لیکن اباقہ کی تلوار نے انہیں مہلت نہیں دی۔

کریہہ المنظر ہینڈاس جو جسامت میں پہاڑ کی طرح تھا اور جس کے ایک پاؤں میں چار انگلیاں تھیں' بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا۔ آخر وہ غراتا ہوا آگے بڑھا۔ چاند تاروں کی روشنی میں دونوں حریف ایک دوسرے کے سامنے آئے۔ مارینا دونوں ہاتھ منہ پر رکھے خوفزدہ نظروں سے یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کس کی کامیابی کی تمنا کرے۔ ایک طرف ہنداس تھا جو اس کے خاوند کا نمک خوار اور وفادار

دوسری طرف یہ جنگلی تھا جو اسے زبردستی لے جا رہا تھا' لیکن .... وہ اس کی موت بھی نہیں چاہتی تھی' اس نے بے قرار ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔

ہینڈاس غرایا۔ "تلوار پھینک دے اباقہ۔ تیرا میرا مقابلہ زور آزمائی کا تھا اور یہ وہیں سے شروع ہو گا۔"

اباقہ جانتا تھا ہینڈاس کشتی میں اس پر بھاری رہے گا' پھر بھی اس نے دشمن کی خواہش پوری کی۔ اس نے تلوار سنگلاخ زمین پر پھینکی۔ تلوار کی جھنکار مقابلہ شروع ہونے کی گھنٹی تھی۔ بدشکل ہینڈاس موت سے کھولتے آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑا۔ اس کا زوردار گھونسہ اباقہ کے منہ پر لگا۔ اباقہ چند قدم لڑکھڑایا۔ پہلوان نے اچھل کر دونوں ٹانگیں اباقہ کے منہ پر ماریں۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا مارینا کے پاس جا گرا۔ مارینا ایک چیخ مار کر پیچھے ہٹ گئی۔ اباقہ پر وحشت کا شدید حملہ ہوا۔ وہ زخمی چیتے کی طرح غرایا اور پلٹ کر اس مست ہاتھی سے لپٹ گیا' پہاڑوں کی گود میں دو درندے ایک دوسرے سے متصادم ہو گئے۔ وہ ایک سنگین لیکن صبر آزما جنگ تھی۔ دونوں میں سے کوئی ہار ماننے کو تیار نہیں تھا۔ ہینڈاس نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح پھر اباقہ اس کے پرانے داؤ میں پھنس جائے لیکن اباقہ پوری طرح ہوشیار تھا.......... دونوں کے جسم جگہ جگہ سے خون اگل رہے تھے۔ پسینے کی دھاریں اس خون کو بار بار دھو رہی تھیں۔ ایک بار ہینڈاس نے اباقہ کے لمبے بال دبوچنے کی کوشش کی تو اباقہ نے پھرتی سے جھک کر زوردار ٹکر اس کے پیٹ میں ماری۔ جواب میں ہینڈاس نے اپنا گھٹنا اس کے منہ پر رسید کیا۔ ضرب زوردار تھی اباقہ ڈگمگایا اور ٹھوکر لگنے سے پشت کے بل گر گیا.......... یہ ایک قیمتی لمحہ تھا۔ دفعتاً ہینڈاس کی آنکھوں میں عیارانہ چمک ابھری اس نے لپک کر ایک بڑا پتھر اٹھا لیا۔ وہ اس انداز سے کھڑا تھا کہ باآسانی اباقہ کو نشانہ بنا سکتا تھا.......... اور پھر اس نے نہایت طاقت سے وہ وزنی پتھر اباقہ کے سر پر دے مارا۔ اباقہ کو حرکت کرنے میں ایک ساعت کی دیر ہوتی تو اس کا سر ان گنت ٹکڑوں میں تقسیم ہو جاتا۔ وہ پھرتی سے ایک طرف لڑھکا۔ پتھر زمین سے ٹکرایا۔ ہینڈاس نے وار خالی جاتے دیکھا تو اباقہ کو چھاپنے کے لیے ہوا میں چھلانگ لگائی۔ ابھی وہ نصف راستے میں تھا کہ اسے اپنی موت نظر آ گئی۔ اباقہ کے ہاتھ میں تلوار تھی اور اس کا رخ ہینڈاس کے پیٹ کی طرف تھا۔ ہینڈاس نے اپنے جسم کو ہوا میں موڑنے کی کوشش کی لیکن کمان سے نکلے ہوئے تیر کو کوئی کب موڑ سکا ہے۔ ہینڈاس کے پیٹ اور تلوار کا ملاپ ہوا۔ ایک آگ سی اس کے پیٹ میں گھسی اور کمر کی طرف سے نکل گئی۔

اباقہ نے ہینڈاس کو ٹانگ سے دھکیل کر تلوار اس کے پیٹ سے نکالی۔ دوسرا بھرپور

وار اس نے اس کے سینے پر کیا۔ ہینڈاس پھٹی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اباقہ بولا۔

"ہینڈاس تو نے خود قانون بنایا اور خود ہی توڑا۔ یہ کشتی کا مقابلہ تھا تو تُو نے کشتی کیوں نہ کی۔" ہینڈاس کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ چند لمحے پہلے وہ اپنے ہاتھوں سے اباقہ کے سر پر پتھر پھینک چکا تھا.......... اس کے ہونٹ لرزے اور اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔

اباقہ نے مڑ کر دیکھا لیکن مارینا کا کوئی پتہ نہیں تھا۔ "مارینا!" اس کی آواز پہاڑوں میں گونجی۔ "مارینا .... مارینا۔" جیسے کئی آوازوں نے اس کے ساتھ مل کر مارینا کو تلاش کیا۔ اچانک آہٹ ہوئی۔ اباقہ نے مڑ کر دیکھا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں .... ہینڈاس خون میں ڈوبا ہوا اس کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ ابھی تک زندہ تھا۔ اس کے ہاتھ میں اباقہ ہی کی تلوار تھی۔ ایک غضبناک چنگھاڑ سے اس نے اباقہ پر وار کیا.......... لیکن اس وار میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ اباقہ جیسے سبک بدن کی جان لے سکتا۔ اباقہ نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر یہ وار بچایا۔ ہینڈاس تناور درخت کی طرح زمین پر گرا .... اور ساکت ہو گیا۔ اباقہ نے جھک کر احتیاط سے اس کی نبضیں ٹٹولیں وہ مر چکا تھا لیکن کیا وہ واقعی مر چکا تھا؟ اس سوال کے یقینی جواب کے لیے اباقہ نے خون آلود تلوار اٹھائی اور ہینڈاس کا سر اس کے گرانڈیل جسم سے جدا کر دیا۔

اس وقت اباقہ کی نگاہ دور نیچے ایک سفید دھبے پر پڑی۔ یہ مارینا کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ اباقہ سمجھ گیا کہ وہ نشیب میں گھوڑوں تک پہنچنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اس نے تلوار اٹھائی اور تیزی سے نیچے اترنے لگا۔ زبردست جدوجہد کے بعد وہ مارینا تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس وقت وہ ایک گھوڑے کی رکاب میں پاؤں رکھ رہی تھی۔ اباقہ نے اسے بازو سے تھاما تو وہ بالکل ساکت ہو گئی۔ اباقہ نے دیکھا پتھروں پر رگڑنے سے اس کا سفید لباس کئی جگہ سے پھٹا ہوا تھا۔ وہ بڑی تیزی سے یہاں تک پہنچی تھی۔ اگر اسے چند لمحے کی دیر ہوتی تو وہ واپس پڑاؤ میں پہنچ چکی ہوتی۔

اباقہ سختی سے بولا۔ "چلو مارینا! اب کوئی ہمارا راستہ روکنے والا نہیں۔"

مارینا لرزاں آواز میں بولی۔ "یہ مت کہو۔ یہ کہہ کہ اب کوئی تیرا راستہ روکنے والا نہیں .... کسی غلط فہمی میں نہ رہ۔ میں تیرے ناپاک ارادوں کے سامنے سر نہ جھکاؤں گی۔"

"مارینا!" اباقہ غضب سے دھاڑا۔ "چل میرے ساتھ۔"

مارینا تن کر کھڑی رہی۔ اس کے لمبے بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ وہ عورت کی عظمت اور ہمت کی منہ بولتی تصویر دکھائی دیتی تھی۔ وہ زخمی شیرنی کی طرح غرائی۔ "دیکھتا کیا ہے اباقہ۔ ایک زور کا تھپڑ میرے منہ پر مار۔ میں یقین دلاتی ہوں کہ ایک ناتواں عورت تجھ جیسے جری کا ہاتھ کھا کر ہوش میں نہ رہ سکے گی' بے ہوش ہو جاؤں تو اٹھا کر لے جا۔ بس تُو یہی کر سکتا ہے' اس سے زیادہ کچھ نہیں۔"

"مارینا!" اباقہ کا ہاتھ غضب کے عالم میں اٹھا لیکن اس کے دل نے اس کے ہاتھ کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ وہ چند لمحے حیرت سے حسن و وقار کے اس پیکر کو دیکھتا رہا۔ پھر اس کا ہاتھ آہستہ آہستہ نیچے ڈھلک گیا۔ مارینا تند لہجے میں بولی۔

"میرے لیے تجھ میں اور چنگیز زادوں میں کوئی فرق نہیں۔ وہ بھی بے کس عورتوں کو اٹھا کر اپنے یورتوں میں لاتے ہیں۔ تُو بھی ایک مفتوح عورت کو گھوڑے پر بٹھانا چاہتا ہے اور اگر تم میں اور ان میں کوئی فرق نہیں تو پھر میں تیرے ساتھ کیوں جاؤں؟ اس شوہر کے ساتھ وفادار کیوں نہ رہوں جو میرے یورت کا مالک ہے جس کے ساتھ میں نے عمر کا ایک حصہ گزارا ہے۔ اس سرزمین کو کیوں چھوڑوں جس سے میری یادیں وابستہ ہیں۔ ان لوگوں کو کیوں دھوکا دوں جو مجھ پر بھروسہ کرتے ہیں۔ نہیں اباقہ .... میں اپنی رضا سے تیرا ساتھ نہیں دے سکتی۔ ہاں میں تیرے قبضے میں ہوں تُو مجھ سے جو چاہے سلوک کر۔"

ایکا ایکی اباقہ کے ذہن میں ایک چشمہ پھوٹا اور اس کے اولین قطرے آنکھوں کے راستے اس کے رخساروں پر لڑھک آئے۔ اس کے چہرے کا تناؤ ایک اشکبار نرمی میں ڈھل گیا۔ اس نے تلوار نیام میں واپس ڈالی۔ لرزاں ہاتھوں سے گریبان میں بندھا ہوا پھولدار کپڑا کھولا اور مٹھی میں بھینچ لیا۔ پھر اس کی بھرائی ہوئی آواز ابھری۔

"میں غلطی پر تھا مارینا۔ میں سمجھا تھا اپنے ارادے سے میں سب کچھ کر سکتا ہوں لیکن میں بہت کمزور ہوں .... یہ دیکھ یہ کپڑا قوقند کے ایک مسلمان بزرگ نے مجھے دیا تھا۔ قوقند کی ایک عبادت گاہ میں بیٹھ کر اس نے مجھ سے درخواست کی تھی کہ اگر میں تجھے منگولوں سے آزاد کرانے میں کامیاب ہو گیا تو اس سے تیرا سر ڈھانپ دوں۔ میں نے گھمنڈ میں وعدہ کر لیا تھا۔ میں بھول گیا تھا تیرے سر پر آنے کو زرنگار چادریں ترستی ہیں۔ اس بے وقعت کپڑے کو کب جگہ ملے گی ...."

مارینا خاموشی سے منہ پھیرے کھڑی تھی۔ بہت دیر دونوں نے کچھ نہ کہا۔ آخر اباقہ نے دور نیچے پڑاؤ پر نگاہ ڈالی اور بولا۔ "چلی جا مارینا' تیرا خیمہ تیرا منتظر ہے' ابھی وہاں کسی

کو پتہ نہیں چلا ہو گا۔ جس راستے سے میں تجھے لایا تھا وہ راستہ تجھے باحفاظت خیمے تک پہنچا دے گا۔ ہینداس مر چکا ہے' لیکن اس کی گمشدگی چغتائی خاں کو زیادہ پریشان نہیں کرے گی۔ ہو سکتا ہے وہ سمجھے کو وہ میری تلاش میں کہیں نکل گیا ہے۔ ان لوگوں کی لاشیں بھی میں احتیاط سے کہیں چھپا دوں گا.........."

مارینا نے ایک نظر زخموں سے چور اباقہ کی طرف دیکھا۔ پھر تیز قدموں سے گھوڑے کی طرف بڑھ گئی۔ اباقہ ساکت کھڑا دیکھتا رہا۔ مارینا نے لگام تھامی اور سر جھکا کر ایڑ لگا دی۔ گھوڑا سست قدموں سے آگے بڑھنے لگا۔ لگتا تھا اس بے زبان کو بھی جدائی ناگوار گزر رہی تھی۔ ابھی گھوڑا چند گز ہی گیا تھا کہ اباقہ نے آواز دی۔ مارینا رک گئی۔ اباقہ اس کے پاس پہنچ کر بولا۔

"مارینا میں جنگلی شاید تجھے اپنے دل کی باتیں صحیح طرح سمجھا نہیں سکا۔ میری باتوں پر نہ جانا۔ اپنے ذہن سے کچھ سوچنا.......... ہو سکتا ہے .... ہو سکتا ہے تم اپنا ارادہ بدل دو۔ میں کل شام تک اسی جگہ تمہارا انتظار کروں گا۔ اگر تم نہیں آئیں تو چلا جاؤں گا۔ میرا وعدہ ہے تم پھر کبھی میری شکل نہ دیکھو گی۔" مارینا نے کچھ نہیں کہا' چہرے پر ڈھلک آنے والے ریشمی بالوں کو لرزتی انگلیوں سے پیچھے ہٹایا اور گھوڑے کو آگے بڑھا دیا۔

☆ ——— ☆ ——— ☆

اباقہ نے لاشیں ٹھکانے لگا دی تھیں۔ آٹھ گھوڑوں میں سے سات تتر بتر کر دیے تھے۔ ایک گھوڑے پر کاٹھی ڈال کے وہ تیار بیٹھا تھا۔ اس کی نگاہیں دور مغرب کی طرف جھکے ہوئے سورج پر تھیں۔ جیسے پانی میں ڈوبنے والا حسرت سے کنارے کی طرف دیکھتا ہے' اباقہ بھی کبھی کبھی پڑاؤ کی جانب دیکھ لیتا تھا۔ خدشات کے تلاطم میں امید کی چھوٹی چھوٹی کشتیاں ڈول رہی تھیں۔ زوال آفتاب سے وہ کسی معجزے کا منتظر تھا۔ سورج ڈوبنے کے ساتھ ساتھ اس کا دل بھی ڈوبتا جا رہا تھا۔ اس نے مارینا سے کہا تھا وہ شام تک اس کا انتظار کرے گا لیکن شام تو کب سے ہو چکی تھی۔ پھر اس نے دل کو بہت سمجھایا۔ سورج ڈوبنے کے بعد بھی تو کچھ دیر شام ہی رہتی ہے۔ آہستہ آہستہ دن کی روشنی غائب ہونے لگی' تاریکی نے پر پھیلا لئے۔ اباقہ نے خود کو حوصلہ دیا .... نہیں ابھی شام باقی ہے ابھی رات شروع نہیں ہوئی۔ پھر ملگجا اجالا بھی معدوم ہو گیا۔ ایکا ایکی اباقہ کا دل مایوسی کی اتھاہ تاریکی میں ڈوب گیا۔ وہ جان گیا کہ مارینا نہیں آئے گی وہ اب تک ایک سراب کے پیچھے بھاگتا رہا ہے۔ اس کے سینے کی گہرائی سے ایک طویل آہ نکلی اور وہ کسی بوڑھے شخص کی طرح گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا دل رونے کو چاہتا تھا لیکن وہ ایک کمزور

شخص کی طرح رونا نہیں چاہتا تھا۔ اسے معلوم تھا آنسو بہانے والے کو کوئی چپ نہیں کراتا۔ وہ اپنی زندگی میں جب بھی رویا تھا خود ہی چپ ہوا تھا۔ اسے یاد ہی نہیں تھا ماں کا مہربان بوسہ کیا ہوتا ہے' باپ کیسے لاڈ دیکھتا ہے' بہن بھائیوں کی گود کیا ہوتی ہے' وہ ہمیشہ سے تنہا تھا' اس نے آنکھوں پر یلغار کرنے والے آنسوؤں کو حلق میں گرایا اور اپنے گھوڑے کی طرف بڑھنے لگا۔

.... تب اسے گھوڑے کی ٹاپ سنائی دی۔ نہیں یہ میرا وہم ہے۔ اس نے خود کو سمجھایا۔ پھر بے قرار ہو کر اس نے سامنے دیکھا۔ سامنے وہی راستہ تھا جسے وہ دوپہر سے یک ٹک دیکھ رہا تھا لیکن اب یہ راستہ خالی نہیں تھا۔ اس پر ایک گھڑسوار تھا۔ وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھا چلا آ رہا تھا .... یہ گھڑسوار مرد نہیں تھا' عورت تھی' اس کے لمبے بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ یہ بال مارینا کے تھے' یہ تاریک ہیولا اس کی عزیز ترین ہستی کا تھا۔ اباقہ پلکیں جھپکائے بغیر دیکھ رہا تھا' جیسے اسے ڈر ہو کہ یہ منظر اوجھل ہو جائے گا۔ گھوڑا اباقہ سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑا ہو گیا .... مارینا کا باوقار حسین چہرہ اباقہ کے سامنے تھا۔ وہ بالکل خاموش تھی لیکن اس کی شفاف آنکھوں میں چمکنے والے آنسو اباقہ کی فتح کا اعلان کر رہے تھے۔ اباقہ کی نگاہ گھوڑے پر پڑی اس پر دو چرمی تھیلے لٹک رہے تھے۔ وہ سفر کے لئے تیار ہو کر آئی تھی۔ اباقہ کا دل چاہا کہ وہ ہوا میں قلابازی لگائے اور اتنے زور سے چیخے کہ پہاڑ جھنجھنا اٹھیں۔ چٹانیں لڑھکیں اور ان کے قہقہے جشن مسرت کا سماں پیدا کر دیں۔ آنسو' جنہیں اس نے روکنے کی قسم کھا رکھی تھی بے اختیار آنکھوں میں امڈ آئے۔

"مارینا!" وہ لرزاں آواز میں بولا۔

مارینا دلربا انداز میں مسکرائی اور بہ آہستگی گھوڑے سے اتر آئی۔ دونوں جلتی ہوئی خاموش نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے پھر مارینا نے رخ پھیرا اور بولی۔ "اباقہ! میں تیرے ساتھ دنیا کے آخری کنارے تک چلوں گی لیکن میری ایک شرط ہے۔"

اباقہ کے لئے اس سے بڑھ کر کوئی اعزاز نہیں تھا کہ مارینا اس کی ہم رکاب ہو اور اس کا چہرہ اس کی نگاہوں کے سامنے رہے وہ بے اختیار بولا۔ "مجھے یہ شرط بلا سنے منظور ہے مارینا۔"

"سوچ لو اباقہ' بعد میں تمہیں دقت نہ ہو۔"

"نہیں مارینا' جب تمہیں میری جان کی ضرورت ہو گی' ہونٹوں سے نہ کہنا' آنکھوں سے اشارہ کر دینا' تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ میں غلط نہ کہتا تھا۔"

مارینا نے کہا۔ "ہو سکتا ہے میں تمہاری جان نہ مانگوں۔"

اباقہ بولا۔ "میں تمہیں ہر اختیار دیتا ہوں! مارینا"

مارینا اس کے جذباتی انداز پر مسکرائی۔ اباقہ اس کی دلکش مسکراہٹ میں محو تھا' جب دفعتاً زمین لرزنے لگی۔ اباقہ نے غور کیا سینکڑوں گھڑسوار تیزی سے ان کی طرف بڑھ رہے تھے۔ چغتائی خاں سیلابِ بلاخیز کو حرکت میں لے آیا تھا۔

مارینا اور اباقہ نے چونک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ مارینا کی حوصلہ افزا نگاہیں اباقہ کے تن بدن میں فولاد کی سختی پیدا کر رہی تھیں۔ جوش سے اس کے گلے کی رگیں ابھر آئی تھیں۔ اس نے مارینا کو گھوڑے پر سوار کیا پھر چھلانگ لگا کر اپنے گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور بھاگ نکلے۔

دونوں گھوڑے پوری رفتار سے پہلو بہ پہلو بھاگ رہے تھے۔ چغتائی خاں اپنے تیز رفتار دستوں کے ساتھ ان کا تعاقب جاری رکھے ہوئے تھا۔ اباقہ اور مارینا کا رخ جنوب مغرب کی طرف تھا۔ چاند کی مدھم روشنی میں افق پر کچھ بلند و بالا تاریک سائے دکھائی دے رہے تھے۔ یہ ایک چھوٹا سا کوہستانی سلسلہ تھا۔ اباقہ کی پوری کوشش تھی کہ وہ کسی طرح ان پہاڑوں میں پہنچ جائے۔ اس کی نگاہیں راستے کے پیچ و خم پر تھیں اور حساس کان عقب سے آنے والی آوازوں پر لگے تھے۔ اس نے یہاں تک کے سفر میں متعاقب فوج کو ایسے ایسے چکمے دیے تھے کہ شہسواروں کو سمتیں بھول گئی تھیں۔ بہر حال فوج نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔ اب بچاؤ کی واحد صورت یہی تھی کہ وہ گھوڑوں کے بے دم ہونے سے پہلے سامنے والی پہاڑیوں میں پہنچ جائیں اور انہیں کوئی عمدہ پناہ گاہ میسر آجائے۔

بالآخر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے۔ دشوار گزار چڑھائی پر پہنچ کر اباقہ نے گھوڑا روکا۔ پھر نیچے اتر کر مارینا کو بھی اتار لیا۔ دونوں آگے پیچھے بھاگتے اوپر چڑھنے لگے۔ تاریکی میں کئی جگہ مارینا کا پاؤں پھسلا اور اباقہ نے اسے سہارا دیا۔ اگر وہ اکیلا ہوتا تو کوئی چڑھائی اس کے لیے دشوار نہیں تھی' لیکن مارینا کے ساتھ وہ پُرخطر بلندی پر نہیں جا سکتا تھا۔ اس کی نگاہیں چاروں سمت گردش کر رہی تھیں' لیکن کوئی غار' کھوہ یا چھپنے کی جگہ دکھائی نہیں دیتی تھی۔ مارینا بری طرح ہانپ رہی تھی اور اباقہ جانتا تھا اب وہ مزید بلندی پر نہیں جا سکتی۔ آخر اس نے مخالف سمت میں اترنے کا فیصلہ کیا۔ چند الفاظ میں مارینا کو حوصلہ دے کر وہ اسے نیچے اترنے کے لیے تیار کرنے لگا۔ ڈھلوان خطرناک تھی' لیکن مارینا اباقہ کی ہدایت پر آہستہ آہستہ اترنے لگی۔ ایک جگہ اس کا پاؤں بری طرح رپٹا' لیکن اباقہ چونکہ آگے تھا اس لیے وہ سینکڑوں فٹ نیچے گرنے سے محفوظ رہی۔

زبردست جدوجہد کے بعد وہ پہاڑ کی دوسری طرف دامن میں پہنچ گئے............ لیکن پھر اباقہ نے اپنے سامنے دیکھا اور اس کے سینے سے ایک طویل سانس خارج ہو گئی۔ بھاگنے کا راستہ مسدود تھا۔ ایک چوڑے پاٹ کی برفانی ندی ان کا راستہ روکے کھڑی تھی۔ اس نے دیکھا پانی کی سطح پر برف کے منجمد ٹکڑے سست روی سے تیر رہے تھے۔ اس یخ بستہ پانی کو پار کرنا کم از کم مارینا کے لیے ممکن نہیں تھا۔ مارینا بھی پریشانی سے اسے دیکھنے لگی۔ دونوں چند قدم آگے بڑھا کر ندی کے کنارے پہنچ گئے۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ پانی کی گہرائی کتنی ہے۔ اباقہ چند لمحے ندی اور مارینا کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اچانک اس نے جھک کر مارینا کو کندھے پر اٹھا لیا۔ وہ احتجاج ہی کرتی رہ گئی اور اباقہ اسے لے کر پانی میں داخل ہو گیا۔ اس کے دوسرے کندھے پر وہ دونوں چرمی تھیلے تھے جو انہوں نے گھوڑوں سے اتارے تھے۔ ندی کا پانی اباقہ کی ٹانگوں سے متحرک ہو کر آواز پیدا کر رہا تھا۔ مارینا ابھی تک دبے دبے لہجے میں اسے محتاط رہنے کا مشورہ دے رہی تھی' لیکن یہ بات وہ بھی سمجھ رہی تھی کہ ندی پار کیے بغیر ان کی زندگی محفوظ نہیں رہ سکتی۔ اب ان کی سلامتی کا انحصار اس بات پر تھا کہ ندی کتنی گہری ہے۔ اباقہ سوچ رہا تھا کہ اگر پانی اس کے کندھے تک پہنچ گیا تو وہ واپس لوٹ جائے گا۔

پانی آہستہ آہستہ اس کے سینے تک پہنچ گیا۔ مارینا کی پنڈلیاں اور گھٹنے' یخ بستہ پانی میں ڈوبنے لگے۔ اباقہ جانتا تھا مارینا کا نازک جسم زیادہ دیر اس برفاب کا لمس برداشت نہیں کر پائے گا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ سوچ سوچ کر آگے بڑھ رہا تھا۔ آخر پانی اباقہ کی بغلوں کو چھونے لگا۔ اب پاؤں کی ایک لغزش بھی ان دونوں کو یخ بستہ پانی کے حوالے کر سکتی تھی۔ وہ ندی کے بالکل درمیان میں تھے۔ اباقہ نہایت احتیاط سے آگے بڑھتا رہا بالآخر مشکل ترین مرحلہ گزر گیا۔ پانی کی سطح گرنے لگی لیکن اب اباقہ کا نچلا دھڑ مفلوج ہونے لگا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ کسی دوسرے کی ٹانگوں پر چل رہا ہے۔ اگلا کنارہ اب بھی ساٹھ ستر قدم کے فاصلے پر تھا۔ دفعتاً اباقہ ٹھٹک گیا۔ اس کی سانس رکنے لگی۔ اگلے کنارے پر کچھ متحرک روشنیاں نظر آئی تھیں۔ وہ وہیں رک کر ان روشنیوں کو دیکھنے لگا۔ یہ روشنیاں کسی ٹیلے یا پہاڑی کی اوٹ سے نکل رہی تھیں اور نکلتی ہی آ رہی تھیں۔ جلد ہی اباقہ سمجھ گیا کہ یہ منگول فوج کے مشعل بردار گھڑسوار ہیں۔ اگر اس کا اندازہ غلط نہیں تھا تو ان کی تعداد سینکڑوں میں تھی۔ وہ تیزی سے کنارے کی طرف لپک رہے تھے۔ مارینا کا رخ دوسری طرف تھا اور وہ اس بلائے ناگہانی سے بے خبر تھی۔ اس نے پوچھا۔

"اباقہ رک کیوں گئے؟"

اباقہ کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اسے کیا بتائے۔ قاتل ندی کے عین درمیان انہیں موت کے ہرکاروں نے گھیر لیا تھا۔ پیچھے بھی منگول تھے اور آگے بھی۔ وہ مارینا کو تھامے اس پانی میں کھڑا تھا جس میں کچھ دیر کھڑے رہنے کا مطلب موت کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اس نے تیز نگاہوں سے اردگرد دیکھا اور پھر اس کی آنکھوں میں امید کی مدھم سی روشنی دکھائی دی۔ کوئی پچیس تیس قدم دائیں جانب سفید پانی میں ایک سیاہ ہیولا دکھائی دے رہا تھا' شاید یہ کوئی ابھری ہوئی چٹان تھی۔ اباقہ تیزی سے بہاؤ کی مخالف سمت بڑھنے لگا۔ سامنے والے کنارے پر متحرک مشعلیں تیزی سے قریب آ رہی تھیں۔ جس وقت وہ ابھری ہوئی چٹان کے قریب پہنچا ندی کے کنارے مشعلوں کی ایک طویل قطار دکھائی دے رہی تھی۔ وہ گھڑسواروں کے ہیولے نہیں دیکھ سکتا تھا' لیکن گھوڑوں کی ہنہناہٹ اور سواروں کی دور افتادہ آوازیں اس کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔

اس نے اپنے کندھے کا خوبصورت بوجھ چٹان پر اتارا۔ پھر چری تھیلے پتھر پر رکھ کر خود بھی اوپر چڑھ آیا۔ یہ چٹان دور سے جتنی چھوٹی دکھائی دیتی تھی' اتنی نہیں تھی۔ کافی کشادہ جگہ تھی۔ ایک جانب ابھرے ہوئے حصے نے ادھورا سا سائبان بنا دیا تھا۔ دونوں جھک کر چلتے ہوئے اس سائبان کے نیچے بیٹھ گئے۔ مختصر سی آڑ کے باوجود یہ جگہ ہوا کی براہ راست زد سے محفوظ تھی۔

مارینا اور اباقہ نے دیکھا کہ کنارے پر نظر آنے والی مشعلیں کچھ دیر متحرک رہیں پھر آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگیں۔ جلد ہی انہیں اندازہ ہوا کہ گھڑسوار کنارے پر پڑاؤ ڈال رہے ہیں۔

☆------☆------☆

موت کے گھیرے میں وہ زندگی کا ننھا سا جزیرہ تھا۔ چٹان کے چاروں طرف نیم تاریک پانی تھا۔ اس پانی میں کہیں کہیں برف کے ٹکڑے پھولوں کی طرح کھلے ہوئے تھے۔ آسمان پر تارے تھے اور ان تاروں کے درمیان چاند بیٹھا کوئی دلکش کہانی سنا رہا تھا۔ اباقہ اور مارینا چٹان کے ابھرے ہوئے کنارے سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے جنوبی کنارے پر دکھائی دینے والی فوج خیمہ زن ہو چکی تھی۔ ان کی متعاقب فوج ابھی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ رات کے اس درمیانی حصے میں ہوا کی مدھم سرسراہٹ کے سوا کوئی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔

ایک روشنی آسمان پر تھی اور ایک اباقہ کے پہلو میں۔ وہ یک ٹک مارینا کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی نگاہوں کی گرمی مارینا کو پلکیں جھپکانے پر مجبور کر رہی تھی۔ آخر اباقہ کی آواز

نے اسے چونکا دیا۔

"مارینا! یہ چاند دیکھ رہی ہو۔"

"ہاں!" مارینا نے آہستہ سے کہا۔

اباقہ بولا۔ "جب یہ چاند .... اس ستارے کے قریب پہنچے گا۔ ہمارا پیچھا کرنے والی فوج ان پہاڑیوں میں پہنچ چکی ہوگی۔ پھر جب چاند اس نیچے والے روشن تارے کے ... میں ہوگا وہ لوگ ہمیں پہاڑوں میں ڈھونڈنے کے بعد ندی کے کنارے پہنچ چکے ہوں ... پھر جب چاند اس پہاڑی کے عقب میں ڈوبے گا' صبح ہونے والی ہوگی .... شاید ...ری زندگی کی آخری صبح۔"

مارینا نے ایک طویل سانس لی اور بولی۔ "مجھے یہ موت بخوشی منظور ہے اباقہ۔" پھر ...نے اباقہ کی گردن کی طرف دیکھا۔ وہاں پھولدار کپڑا بندھا ہوا تھا۔ اس نے ہاتھ ...اتے ہوئے کہا۔ "یہ مجھے دے دو اباقہ!" اباقہ نے چونک کر گردن کی طرف ہاتھ ...ائے اور گرہ کھول کر کپڑا مارینا کو تھما دیا۔ اس نے سر سے ریشمی چادر اتار کر پانی میں ...ک دی اور بڑی محبت سے کپڑا سر پر اوڑھ لیا۔

اباقہ مارینا کے کچھ قریب آ گیا۔ "مارینا!" وہ جذباتی لہجے میں بولا۔ "میں .... میں ...ں پیار کرنا چاہتا ہوں۔" اس کی نگاہیں بے قراری سے مارینا کا طواف کر رہی تھیں۔

مارینا کو اباقہ کے اس فقرے نے ایک دم پریشان کر دیا۔ پھر وہ سنبھل کر بولی۔ "اباقہ ...ت اچھے ہو۔ اتنے اچھے کہ میں نہ چاہنے کے باوجود تمہارے ساتھ چلی آئی ہوں اور ...عدہ ہے زندگی کی آخری سانس تک تمہارے ساتھ رہوں گی .... کیا تم اس سے ...ل نہیں ہو؟"

اباقہ نے عجیب انداز سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ "میں تمہارے پاس آنا چاہتا ...مارینا۔"

مارینا نے پلکیں جھپکائیں اور بہ آہستگی کھڑی ہو گئی۔ "نہیں اباقہ! تمہارے سامنے جو ...ڑی ہے وہ تمہاری کنیز ہے' تمہارے ساتھ خاردار راستے پر ننگے پاؤں چل کر موت ...ائے گی۔ اگر موت نے اسے تمہارے ساتھ چند دن اور گزارنے کی اجازت دی ...کھو گے وہ تمہیں کتنی دیوانگی سے چاہتی ہے .... لیکن خدارا اس سے کبھی یہ ... کرنا۔ اس سوال کا جواب تمہارے لیے مایوسی کے سوا کچھ نہیں لائے گا۔"

اباقہ بولا۔ "لیکن مارینا! میں تمہارے قریب آئے بغیر نہیں رہ سکتا۔"

مارینا نے کہا۔ "مت بھولو اباقہ کہ میرا تمہارا "ساتھ" مشروط ہے۔ میں نے روانگی

کے وقت تمہیں ایک شرط بتائی تھی اور تم نے بلا سنے منظور کی تھی۔ وہ شرط یہ
اباقہ۔ تم میرے پاس نہیں آؤ گے۔"

اباقہ الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ "لیکن کیوں ماریتا۔ میں تمہیں حاصل کرنے کے لیے آگ اور خون کے دریاؤں سے گزرا ہوں۔"

ماریتا بولی۔ "تم ایک عورت کے دل میں نہیں جھانک سکتے اباقہ۔ عورت کے دل کی کلی صرف ایک ہی سویرے میں کھلتی ہے۔ اگر نہ کھل سکے تو ہمیشہ کے لیے مرجھا جاتی ہے۔ تم مجھے دنیا کی ہر چیز سے زیادہ عزیز ہو' لیکن اگر تم اپنا عہد توڑو گے تو میں ایک پل تمہارے ساتھ نہیں رکوں گی۔"

اباقہ کو ایسا محسوس ہوا کہ اگر وہ اس کی طرف بڑھا تو وہ پانی میں چھلانگ لگانے سے بھی گریز نہیں کرے گی۔ "نہیں ماریتا!" اس کی آواز لرز اٹھی۔ "تم یہ کیوں سوچتی ہو کہ میں تمہیں ناراض کروں گا۔"

ماریتا نے رخ پھیر کر گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھا پھر دوبارہ پتھر سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ ان دونوں کے درمیان ایک بوجھل خاموشی حائل ہو گئی' لیکن یہ خاموشی بے زبان نہیں تھی۔ یہ متکلم خاموشی تھی۔ دل کی زبان دل کے کان سن رہے تھے۔ سوچ کی غیر مرئی لہریں اظہار مدعا پر قادر ہو گئی تھیں۔

اباقہ کے بے آواز الفاظ کہہ رہے تھے۔ "ماریتا! طلوع سحر سے پہلے یہ چند گھڑیاں اپنی ہیں۔ اس سے پہلے کہ حسرتیں ماتمی لباس پہن کر اجل کے اندھیرے میں گم ہو جائیں اس رات کی تاریکی میں محبت کے چراغ جلالیں۔ اس سے پہلے کہ یہ اختیار کامل بے بسی اور مجبوری میں بدل جائے اپنے شوق کو بے لگام کر دیں۔ اس سے پیشتر کہ بے قرار روحیں ہمیشہ کے لیے فضائے بسیط میں بھٹک جائیں' انہیں ایک کر دیں۔"

ماریتا کے بند ہونٹ کہہ رہے تھے۔ "اباقہ ہم دور ہو کر بھی قریب ہیں۔ میرے محبوب میں تیرے دل کی دھڑکنیں سن رہی ہوں۔ تیری سانسوں کی آہٹ محسوس کر رہی ہوں اور غم نہ کر۔ یہ قربت ابدی ہے۔ اگر تو صحرا میں چلے گا تو میں بادل بن کر تیرے ساتھ رہوں گی۔ تو برف زار میں ہو گا تو تیری پشت سے ہوائیں روکوں گی۔ تو میدان جنگ میں ہو گا تو تیرا پسینہ پونچھوں گی۔ تو سوئے گا تو تیری محافظت کروں گی۔ اگر تیری روح فضائے بسیط میں بھٹکی تو میں فلک فلک اسے ڈھونڈوں گی۔"

.... رات آہستہ آہستہ بیتتی رہی۔ چاند نے اپنا سفر جاری رکھا .... اور ماریتا کو ندی کے شمالی کنارے پر بھی حرکت کے آثار نظر آنے لگے۔ بہت سی

...اری کے دامن میں متحرک ہو گئیں۔ پھر اندازہ ہوا کہ بہت سے گھڑسوار کنارے پر جمع ہو رہے ہیں۔ شاید چغتائی خاں کے دستوں کو جنوبی کنارے پر پڑاؤ کے آثار نظر آ گئے تھے۔ ... پہاڑی کی اوٹ میں چھپ رہا تھا۔ مشرق سے سپیدہ سحر نمودار ہو رہا تھا۔ ماریتا اپنے دل کی دھڑکنیں گن رہی تھی اور اباقہ ترکش کے تیر۔

☆ ------ ☆ ------ ☆

علی الصبح اسد اللہ نماز پڑھنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ سردار یورق قریب ہی لیٹا ... خواب خرگوش کے مزے لے رہا تھا۔ رات گئے وہ اسی ندی کے کنارے خیمہ زن ہوئے ... سونے کے لیے تھوڑا سا وقت ملا تھا اس لیے بیدار ہونا گراں لگ رہا تھا۔ پھر بھی الصلوۃ خیر من النوم کی آواز سننے والے جاگ رہے تھے۔ اسد اللہ خیمے سے نکلا تو اس کی ... فوج کے کئی سپاہی وضو کے لیے ندی کا رخ کر رہے تھے۔ اسد اللہ بھی اس جانب ... دیا۔ اس وقت اسے شمالی کنارے پر متحرک روشنیاں دکھائی دیں۔ یوں لگ رہا تھا ... لشکر کا کوئی حصہ پہاڑی کے دامن میں موجود ہے۔ اسد اللہ کی طرح کچھ اور سپاہی ... اس جانب متوجہ تھے۔ یہ نہایت پریشان کن صورت حال تھی۔ وہ اور سردار یورق ... ساڑھے تین سو رضا کاروں کے ساتھ اباقہ کی تلاش اور اس کی مدد کے لیے نکلے ... اپنے مقصد میں کامیابی کے لیے ضروری تھا کہ وہ منگول فوج کی نظروں میں آئے بغیر ... تک رسائی حاصل کر لیں .... انہوں نے اپنے دستوں کے ساتھ اب تک نہایت ... سے سفر کیا تھا' لیکن فوجی لحاظ سے اس غیر اہم علاقے میں منگول فوج سے مڈبھیڑ ... کن تھی۔ یقینی بات تھی کہ منگول ان کے پڑاؤ سے آگاہ ہو چکے ہوں گے۔ پڑاؤ میں ... مشعلیں اس وقت بھی جل رہی تھیں۔

اسد اللہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر بھاگتا ہوا یورق کے پاس پہنچا۔ اس نے یورق کو جگا کر ... فوج کے بارے میں بتایا۔ وہ بھی حیران ہو گیا۔ اس نے کہا۔

"کہیں وہ کوئی ڈاکوؤں کا گروہ تو نہیں۔"

اسد اللہ نے کہا۔ "ان کی تعداد سے ظاہر ہے وہ ڈاکو نہیں۔ ندی کے پار بڑی تعداد ... مشعلیں نظر آ رہی ہیں۔"

یورق پُر سوچ لہجے میں بولا۔ "اگر منگول گھڑسوار اس علاقے میں موجود ہیں تو ان کا ... خاص مقصد ہو گا۔ ورنہ جس راستے پر ہم جا رہے ہیں یہاں دنوں انسانی شکل دکھائی ... دیتی۔"

یہ تو صاف ظاہر تھا کہ ندی کے دوسرے کنارے پر جو کوئی بھی ہے انہیں صاف دیکھ

چکا ہے لہٰذا اب چھپنا فضول تھا۔ مسلمان سپاہیوں نے وہیں کنارے پر باجماعت نماز ادا کی۔ اسد اللہ جب سلام پھیر کر فارغ ہوا تو ندی کا شمالی کنارہ دھند لکے میں دکھائی دینے لگا تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کنارے کے ساتھ ساتھ پانچ چھ سو کے قریب گھڑ سوار اور پیادے نظر آرہے تھے۔ ان کے لباسوں سے صاف ظاہر تھا کہ وہ منگول لشکر کے سوار ہیں۔ اسد اللہ نے محسوس کیا کہ وہ پہاڑی کے دامن میں کسی کی تلاش میں ہیں۔ ایک چاق و چوبند دستہ گھوڑوں پر سوار ندی کے عین کنارے پر کھڑا تھا۔ یہ لوگ انہی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ سردار یورق بھی خیمے سے نکل کر اسد اللہ کے قریب آن کھڑا ہوا۔ دونوں گفتگو کرنے لگے۔ منگولوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ بہتری اسی میں تھی کہ وہ اپنی مختصر جمعیت کے ساتھ یہاں سے نکل جائیں۔ منگول سپاہیوں کے ندی پار کرتے کرتے وہ باآسانی عقب کے پہاڑوں میں روپوش ہو سکتے تھے۔ یہ وجہ تھی کہ اسد اللہ اور یورق زیادہ پریشان نہیں تھے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ منگول کیا کرتے ہیں۔ مسلمان رضا کاروں کے لباس ایسے تھے کہ انہیں منظم دستے کے طور پر پہچانا نہیں جا سکتا تھا۔ یوں لگتا تھا یہ کوئی قافلہ ہے یا لیٹروں راہزنوں کا گروہ ہے۔ شاید منگول بھی یہی سمجھ رہے تھے۔

اسد اللہ نے دیکھا کہ ندی کے کنارے کھڑا منگول دستہ پانی میں اترنے کے لیے پر تول رہا تھا......... اور پھر ایک رضا کار نے چلا کر انگلی سے ایک طرف اشارہ کیا۔ اسد اللہ نے اس جانب دیکھا۔ پانی کے درمیان ایک ابھری ہوئی سیاہ چٹان دکھائی دے رہی تھی۔ اب کافی اجالا پھیل چکا تھا۔ اس چٹان پر دو متحرک اجسام نظر آرہے تھے۔ اسد اللہ نے دیکھا وہ مرد اور عورت تھے۔ عورت کے سر پر کوئی رومال نما چیز بندھی ہوئی تھی۔ اس کے پہلو میں ایک مرد تھا اس کے کندھے سے ترکش لٹک رہا تھا اور لمبے بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔

مرد کا ہیولا دیکھتے ہی اسد اللہ کے ذہن میں کوندا سا لپکا......... مرد اور عورت۔ کہیں یہ اباقہ اور مارینا تو نہیں۔ اس نے متحیر نگاہوں سے یورق کی طرف دیکھا۔ وہ بھی شاید اسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اس دوران مرد نے کندھے سے کمان اتارنے کے لیے تھوڑا سا رخ پھیرا اور اسد اللہ بے اختیار چلا اٹھا "اباقہ!" دوسری آواز میں سردار یورق نے بھی اس کا ساتھ دیا۔

"اباقہ!" ان کی آواز پانی پر تیرتی ہوئی چٹان تک پہنچی مرد اور عورت نے گھوم کر ان کی طرف دیکھا۔ وہ سو فیصد اباقہ تھا۔ سردار یورق' مارینا کو بھی پہچان چکا تھا۔ پھر اسد اللہ اسد نے نہایت جوش سے ہاتھ ہلائے۔ اباقہ چند لمحے ساکت کھڑا انہیں پہچاننے کی کوشش کرتا رہا پھر دفعتاً وہ بھی انہیں پہچان گیا۔ اس نے دونوں بازو بلند کیے اور زور زور سے ہلانے لگا۔ مارینا اس کے کندھے سے لگی کھڑی تھی۔

اتنے میں اسد اللہ نے دیکھا کہ قریباً پچیس منگول سپاہی ندی میں اتر کر چٹان کی طرف بڑھنے لگے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں بڑی بڑی ڈھالیں تھیں۔ پھر اسد اللہ نے اباقہ اور مارینا کو تیزی سے نیچے جھکتے دیکھا۔ وہ سمجھ گیا کہ کنارے پر کھڑے سپاہیوں نے تیر اندازی شروع کر دی ہے۔ وہ کنارے پر کھڑا ہو کر زور سے چلایا۔

"اباقہ! حوصلہ رکھو۔ ہم آرہے ہیں۔"

پھر اس نے جوانوں کو اشارہ کیا۔ لمبے قد کے قریباً پچاس مجاہد آگے آگئے۔ اسد اللہ نے ان میں سے پچیس آدمی چنے اور نہایت دلیری سے ندی میں کود گیا۔ اب ایک طرف سے منگول اور دوسری طرف سے مسلمان دستہ چٹان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ یورق کے بازو کا زخم چونکہ ابھی تک درست نہیں ہوا تھا۔ وہ کنارے پر کھڑا تھا اور باقی ماندہ رضا کاروں کو ہدایت دے رہا تھا۔ انہوں نے اپنی کمانیں اتار کر تیر چڑھا لیے تھے اور ندی کی طرف دیکھ رہے تھے۔

منگولوں کی ٹکڑی چونکہ پہلے پانی میں اتری تھی اس لیے وہ چٹان سے زیادہ قریب تھی۔ اسد اللہ تیزی سے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کنارے سے چٹان پر متواتر تیر اندازی ہو رہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اباقہ اور مارینا چٹان سے اترنے میں کامیاب نہیں ہوئے تھے۔ جونہی اسد اللہ اور اس کے ساتھی چٹان کے نزدیک پہنچے ان پر بھی تیروں کی بارش ہونے لگی' لیکن ان کے پاس دفاع کے لیے ڈھالیں موجود تھیں۔ وہ تلواریں سونتے چٹان کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ دوسری طرف اسد اللہ نے اباقہ کو چٹان سے تیر چلاتے دیکھا۔ منگول سپاہیوں کی ٹکڑی چٹان کے بالکل قریب پہنچ چکی تھی بلکہ چند سپاہی اوپر چڑھنے کی بھی کوشش کر رہے تھے۔ پھر اسد نے دیکھا کہ اباقہ کسی شاہین کی طرح اپنی پناہ گاہ سے نکلا اور اوپر چڑھنے والوں پر ٹوٹ پڑا۔ اس کی تلوار مخصوص انداز میں کھیلنے لگی۔ اسد اللہ چیخا۔ "اباقہ! میں آگیا ہوں۔" پھر اس نے نعرہ تکبیر بلند کیا۔ ساتھیوں نے "اللہ اکبر" سے جواب دیا اور تاتاریوں پر ٹوٹ پڑے۔ چٹان کے ارد گرد برفاب پانی میں زبردست لڑائی شروع ہو گئی۔ دونوں کناروں سے ہونے والی تیر اندازی اب رک گئی تھی کیونکہ دست بدست لڑنے والوں میں سے کوئی بھی زخمی ہو سکتا تھا۔ اس جگہ پانی سپاہیوں کے سینوں تک پہنچ رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جونہی کوئی گھائل ہوتا اس کے لیے پاؤں پر کھڑا رہنا مشکل ہو جاتا اور وہ یخ بستہ پانی میں غوطے کھانے لگتا۔

اباقہ کی بے جگری ہمیشہ سے سوا تھی اور اس کی وجہ صاف ظاہر تھی۔ مارینا چٹان سے اسے دیکھ رہی تھی۔ منگول سپاہی اسے حقیر چیونٹیوں کی طرح نظر آ رہے تھے۔ وہ آگے بڑھ بڑھ کر انہیں تلوار سے مسل رہا تھا۔ دفعتاً وہ برفاب پانی میں گم ہو جاتا۔ پھر اس کی تلوار کسی منگول کے زیریں بدن سے پار ہوتی اور ایک چیخ تلواروں کی جھنکار میں مدغم ہو جاتی .... ایک منگول کو جہنم واصل کر کے جب اس نے پانی سے سر نکالا تو شمالی کنارے پر چغتائی خاں کا ہیولا دکھائی دیا۔ وہ غضب ناک انداز میں چلا رہا تھا۔ پھر اباقہ نے دیکھا کہ بیسیوں منگول اس کے حکم پر پانی میں کود پڑے۔ ان کی تلواریں اور ڈھالیں سورج کی اولین کرنوں میں چمک رہی تھیں۔ ان کی تعداد کسی طرح بھی پانچ سو سے کم نہیں تھی۔ پھر اباقہ کے کانوں میں ایک دور افتادہ آواز پڑی۔ "اللہ اکبر" کی یہ پُر گونج صدا جنوبی کنارے سے آئی تھی۔ اس نے گھوم کر دیکھا۔ اسد اللہ کے جانباز بھی دلیری سے ندی میں چھلانگیں لگا رہے تھے۔ جب دو فوجیں ایک دوسرے پر جھپٹتی ہیں تو ان کی رفتار نہایت تیز ہوتی ہے' لیکن یہاں معاملہ برعکس تھا۔ چہرے جوش سے تمتما رہے تھے' لیکن رفتار بہت سست تھی۔ گہرے پانی میں قدم تیزی سے نہیں اٹھ سکتے تھے۔ ندی کے بیچ درمیان ایک چٹان پر قبضہ کرنے کے لیے زبردست معرکہ ہونے والا تھا۔ منگول اور مسلمان سپاہی ہر لحظہ ایک دوسرے کے قریب پہنچ رہے تھے۔

اسد اللہ زور سے گرجا۔ "سپاہیو! تمہاری تلواروں کو خون پلانے والے آ گئے ہیں۔ اس ندی کو ان وحشیوں کے خون سے سرخ کر دو۔ یہ قاتل ہیں تمہاری عزتوں اور جانوں کے .... ان سے انتقام لو۔"

پایاب پانی میں یہ ایک انوکھی لڑائی تھی۔ اس کے لیے انوکھی حکمت عملی کی ضرورت تھی۔ شیرِ خوارزم کا تربیت یافتہ مجاہد' اسد اللہ اپنے سپاہیوں کو بہاؤ کی مخالف سمت لے گیا۔ اس معمولی سی حرکت کا زبردست نتیجہ برآمد ہوا۔ منگولوں نے رضاکاروں کے مقابل آنے کے لیے اپنا رخ ان کی طرف پھیرا تو وہ خود بخود بہاؤ کی مخالف سمت میں آ گئے۔ اسد اللہ نے نعرہ تکبیر بلند کیا اور اس کے تین سو سرفروش فردِ واحد کی طرح منگول سپاہیوں پر ٹوٹ پڑے۔ منگول تعداد میں کہیں زیادہ تھے' لیکن پہلے ہی ہلے میں ان کے قدم اکھڑنے لگے اور .... تب انہیں اندازہ ہوا کہ مخالف تلواروں کی اعانت پانی کا بہاؤ بھی کر رہا ہے۔ چغتائی خاں کے حکم پر ندی میں کودنے والے منگولوں کی تعداد پانچ سو سے کم نہیں تھی' لیکن ان میں سے پچاس ساٹھ افراد تلواریں ٹکرانے سے پہلے ہی برفاب پانی میں ڈوب چکے تھے۔ اب مسلمانوں کا شدید حملہ جو ہوا تو ان کا ہر اول دستہ

ٹوٹے ہوئے تنکوں کی طرح پانی میں بہنے لگا۔

ایک منگول شہزادہ جواب تک کئی مسلمانوں سپاہیوں کو تہ تیغ کر چکا تھا آگے بڑھا اور چلا چلا کر ان کی ہمت بڑھانے لگا۔ منگولوں نے منظم ہو کر جوابی دھاوا بولا اور مسلمان سپاہیوں کو روکنے میں کامیاب ہو گئے۔ اسد اللہ نے دیکھا منگول شہزادہ سرتا پیر آہن پوش تھا۔ مسلمان جانباز آگے بڑھ بڑھ کر اس پر حملے کر رہے تھے' لیکن اس کی تلوار سے کٹ جاتے تھے۔ اسد اللہ غضب کے عالم میں اس کی طرف لپکا اور مقابل آ گیا۔ دونوں کی تلواریں ٹکرائیں اسد اللہ اس کی آہنی خود اور زرہ کے درمیانی خلا میں تلوار ڈالنے کی کوشش کرنے لگا' لیکن وہ بھی ایک کایاں تھا۔ کسی طرح قابو نہیں آتا تھا .... لیکن پھر وہ دفعتاً پانی میں غائب ہو گیا۔ اسد اللہ نے سمجھا کہ وہ نیچے سے حملہ کرے گا۔ اس نے تیزی سے اپنی جگہ چھوڑ دی۔ چند لمحے بعد پانی سے بلبلے برآمد ہوئے۔ منگول آہن پوش کسی مشکل میں تھا .... پھر اباقہ کسی آبی مخلوق کی طرح پانی سے برآمد ہوا۔ اس کے ہاتھوں میں منگول شہزادے کا کٹا ہوا سر تھا۔ یہ ایک خوفناک منظر تھا۔ شہ رگ سے نکلنے والا خون ایک لوتھڑے کی شکل میں نرخرے سے لٹک رہا تھا .... اسد دیکھتا ہی رہ گیا پھر اباقہ نے کٹا ہوا سر ہاتھوں میں بلند کیا اور زور سے گھما کر منگولوں کے درمیان پھینک دیا۔ اس کے ساتھ ہی مسلمان سپاہیوں نے زوردار نعرہ لگایا اور وہ منگولوں پر ٹوٹ پڑے۔ اباقہ سب سے آگے تھا۔ وہ منگولوں کے درمیان ایسے کوند رہا تھا جیسے سیاہ بادلوں میں بجلی۔

اس وقت اسد اللہ نے دیکھا کہ دو منگول سپاہی چٹان تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ اس نے تلوار نیام میں اڑسی اور خون منجمد کر دینے والے پانی میں تیرتا ہوا چٹان کی طرف بڑھا۔ پھر اس نے اباقہ کی حسین محبوبہ کو دیکھا۔ وہ تلوار سونتے برآمد ہوئی اور بڑے عزم سے سپاہیوں کے سامنے ڈٹ گئی۔ اسد کے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے ایک سپاہی کو گھائل کر کے نیچے لڑھکا دیا۔ اسد اب اتنے فاصلے پر پہنچ چکا تھا کہ دوسرے سپاہی کو تیر سے نشانہ بنا سکتا تھا۔ اس نے پانی میں کھڑے ہو کر تیر زہ پر چڑھایا .... لیکن اسے کھینچنے کی نوبت نہیں آئی۔ چٹان پر ہونے والی لڑائی کا فیصلہ ہو گیا۔ مقابل سپاہی کا پاؤں پھسلا اور مارینا کی تلوار اس کے پیٹ سے پار ہو گئی۔ وہ لڑھک کر ایک چھپاکے سے پانی میں جا گرا۔

ندی کے اندر منگول سپاہیوں کا برا حشر ہوا۔ ان میں سے صرف ایک چوتھائی جانیں بچانے میں کامیاب ہوئے۔ باقی قتل ہوئے یا ڈوب گئے۔ منگولوں کے اس نقصان کی ایک وجہ اسد کی بروقت حکمت عملی تھی اس نے ہوشیاری کا مظاہرہ کر کے ابتدا سے ہی منگولوں کو دفاع پر مجبور کر دیا تھا۔ دوسری وجہ اس شکست کی یہ تھی کہ چغتائی خاں کے

ساتھ آنے والے دستے میں آزمودہ کار سپاہی زیادہ نہیں تھے۔ کچھ تو سرے سے سپاہی ہی نہیں تھے۔ وہ شکاری تھے یا دوسرے ملازمین۔ چغتائی خاں کی غضبناک چنگھاڑ پر ان سب کو ندی میں کودنا پڑا تھا۔ پھر بھی یہ فتح اسد اللہ کے مٹھی بھر جانبازوں کی اولوالعزمی کا منہ بولتا ثبوت تھی۔

☆————☆————☆

سلطان جلال الدین .... سلطان جلال الدین .... اباقہ کے ذہن میں اب اسی ایک نام کی بازگشت تھی۔ وہ اس نام کے متعلق بہت کچھ سن چکا تھا۔ بہت کچھ دیکھ اور محسوس کر چکا تھا۔ اس کا بس چلتا تو اڑ کر اس عظیم الشان ہستی کے سامنے پہنچ جاتا۔ وہ چہرہ دیکھتا .... جسے شیر کا چہرہ کہا جاتا تھا۔ ان آنکھوں میں جھانکتا جن میں تاتاریوں کو جہنم دکھائی دیتا تھا۔ اس کے اندر ایک آواز اٹھی۔ "اباقہ! اس دل شکستہ لیکن عظیم مسلمان کو تیری ضرورت ہے۔ وہ ان گنت زمانوں سے تیری راہ دیکھ رہا ہے۔ کسی جنگل میں، کسی سنسان برف زار میں یا کسی پہاڑ کی کھوہ میں وہ تیرا انتظار کر رہا ہے۔" ایک انجانی کشش اباقہ کو مغرب کی طرف کھینچ رہی تھی۔ ایک رات اس نے خواب دیکھا۔ اس نے دیکھا ایک نورانی شکل کا شخص درویشوں کا لباس پہنے ایک دریا کے کنارے درخت سے ٹیک لگائے بیٹھا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ٹوٹی ہوئی تلوار ہے اور چہرے کے زخموں سے خون رس رہا ہے۔ وہ اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے خاموشی کے ساتھ اس کی طرف دیکھ رہا ہے۔ اس کے لب ہل رہے ہیں، لیکن آواز اباقہ کو سنائی نہیں دیتی۔

پھر اباقہ نے محسوس کیا کہ وہ بھاگ رہا ہے۔ وہ اس درویش کی طرف بھاگ رہا ہے، لیکن اس کے پاؤں منوں بھاری ہیں اور اس کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی ہے۔ وہ جلد از جلد درویش کے پاس پہنچنا چاہتا ہے، لیکن کامیاب نہیں ہوتا۔ وہ جانتا ہے یہ درویش جلال الدین خوارزم شاہ ہے۔ پھر دفعتاً اس کی آنکھ کھل گئی اس کا سارا جسم پسینے میں شرابور تھا۔ خیمے میں اس کے قریب ہی سردار یورق گہری نیند سو رہا تھا۔ ساتھ والے خیمے میں مارینا تھی۔ اس سے اگلا خیمہ اسد کا تھا۔ برفانی ندی میں چغتائی خاں کے دستوں کو شکست فاش دینے کے بعد انہوں نے تیزی سے جنوب مغرب کی طرف سفر کیا تھا اور اب تاتارستان سے کافی دور نکل آئے تھے۔ ان کا رخ توقند کی طرف تھا۔ قریباً تین سو مسلح رضا کار ان کے ساتھ تھے۔ رضا کاروں کے خیمے قریب ہی ایستادہ تھے۔ یہ پڑاؤ ایک محفوظ وادی میں تھا۔

خواب دیکھ کر اباقہ پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی۔ وہ کافی دیر بستر پہ بیٹھا

تاریکی میں گھورتا رہا۔ پھر ایک اُمنگ کے تحت وہ اٹھا اور شمعدان روشن کرنے لگا۔ روشنی ہوئی تو سردار یورق نے کسمسا کر آنکھیں کھول دیں۔ پھر اس کی نظر اباقہ کے چہرے پر پڑی اور اس کی نیند کافور ہو گئی۔ وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ جانتا تھا جب جنگلی کے چہرے پر ایسی سنجیدگی نظر آتی ہے تو وہ کوئی نہ کوئی گل کھلاتا ہے۔ اباقہ اپنا بستر گول کر رہا تھا ...... پھر وہ ضروری چیزیں تھیلے میں ڈالنے لگا۔

یورق نے حیرت سے پوچھا۔ "کہاں جا رہے ہو اباقہ۔"

اباقہ ٹھوس لہجے میں بولا۔ "سلطان جلال الدین کے پاس۔"

سردار یورق کے چہرے پر تشویش نظر آنے لگی۔ "اباقہ، تم سے کئی بار کہہ چکا ہوں کہ دیوانگی نہ کرو۔ پہلے ہم توقند چلتے ہیں۔ وہاں سے پوری منصوبہ بندی کر کے اس کی تلاش میں نکلیں گے۔"

اباقہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے ہاتھ تیزی سے چیزیں سمیٹنے میں مصروف تھے۔ پھر اس نے تھیلا کندھے سے لٹکایا۔ تلوار اور تیر کمان سنبھالے اور خیمے سے نکل آیا۔ یورق کو اس سے ایسی عجلت کی توقع نہیں تھی۔ وہ اباقہ .... اباقہ کہتا اس کے پیچھے لپکا اباقہ نہایت بے رخی سے مارینا کے خیمے کی طرف بڑھ رہا تھا۔

"مارینا۔" وہ خیمے سے باہر کھڑا ہو کر زور سے پکارا۔ چند لمحے بعد مارینا خیمے سے برآمد ہوئی۔ اس کی حسین آنکھیں نیند سے بوجھل تھیں اور زلفیں پریشان۔

"مارینا میں جا رہا ہوں۔" اباقہ فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ "تم میرے ساتھ چلو گی؟"

مارینا حیرت سے کبھی اباقہ اور کبھی یورق کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اسد بھی خیمے سے نکل کر ان کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ مارینا اباقہ کا پُرطیش چہرہ دیکھ کر تشویش سے بولی۔ "آخر ہوا کیا ہے؟"

اسد نے بہ آہستگی اباقہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "اباقہ ہم سے ناراض ہو گئے ہو۔"

اباقہ نے درشتگی سے اس کا ہاتھ جھٹکا اور گرج کر بولا۔ "تم لوگ مجھے اور نہیں روک سکتے۔ میں جا رہا ہوں اور اسی وقت جا رہا ہوں۔"

یورق بھی غصے سے بولا۔ "اباقہ، بے وقوفی کی بھی انتہا ہوتی ہے تو اس وقت نصف شب کو اٹھ کر جلال الدین کی تلاش میں جا رہا ہے جیسے وہ سامنے والی پہاڑی کے عقب میں بیٹھا ہے۔"

اباقہ نے یورق کو طیش سے گھورا، لیکن کچھ نہیں بولا۔ پھر اس نے مارینا اور اسد اللہ

کے چہرے دیکھے تب ایک جھٹکے سے مڑا اور تیز قدموں سے گھوڑوں کی طرف بڑھا۔ مار
تذبذب میں اسد اللہ اور یورق کے چہرے دیکھتی رہی۔ اباقہ گھوڑے پر زین کس رہا تھا۔
مدھم لہجے میں بولی۔

"سردار یورق وہ چلا جائے گا۔"

یورق بھنا کر بولا۔ "میری طرف سے آگ میں کودے۔"

اسد اللہ نے نرمی سے کہا۔ "سردار یورق' ہمیں اس کی بات مان لینی چاہیے۔"

"تو مان لو۔" یورق ایک ہی وقت میں غضبناک بھی تھا اور فکر مند بھی۔ اباقہ رکاب میں پاؤں رکھ رہا تھا۔ اسد اللہ نے اسے آواز دی۔ پھر بھاگ کر اس کے قریب پہنچ گیا۔

معاملہ گفت و شنید سے طے ہوگیا۔ اسد اللہ نے اپنے تمام رضاکاروں کو واپس قوقند اور بلخ بھیج دیا۔ اسد اللہ مارینا اباقہ اور سردار یورق گھوڑوں پر سوار تبریز کی طرف روانہ ہوئے۔ اطلاعات کے مطابق سلطان جلال الدین کو آخری مرتبہ تبریز کے نواح میں دیکھا گیا تھا۔ اسد اللہ کا خیال تھا کہ تلاش کا کام وہیں سے شروع کیا جائے۔

یورق ابھی تک اباقہ سے ناراض تھا لیکن پھر اسد اللہ اور مارینا کی کوششوں سے دونوں میں صلح ہو گئی۔ اباقہ کی ایک جنگلی مسکراہٹ نے یورق کی تمام خفگی دور کر دی۔ ان کے پاس کل چھ گھوڑے تھے۔ دو پر سامان لدا ہوا تھا اور چار پر وہ الگ الگ سوار تھے۔ جس علاقے میں وہ سفر کر رہے تھے' تاتاریوں سے مڈبھیڑ کے امکانات بہت زیادہ تھے' لیکن انہیں کوئی خاص خطرہ محسوس نہیں ہوتا تھا.......... شاید اس کی ایک وجہ اباقہ کی موجودگی تھی' حالانکہ سردار یورق اور اسد اللہ بھی اپنی اپنی جگہ دلیر جنگجو تھے' لیکن جیسے ستارے سورج کی ضیاء سے تابندگی حاصل کرتے ہیں' اباقہ کی موجودگی ان کے دلوں کو عجیب بے خوفی سے بھر دیتی تھی۔

☆--------☆--------☆

تبریز رنگ و بو کا شہر' خوبصورت عمارتوں اور باغیچوں کا شہر' چند کوس کے فاصلے پر تھا کہ شدید بارش شروع ہو گئی۔ چار تھکے ماندے مسافر گھوڑے دوڑاتے درختوں کے ایک جھنڈ میں داخل ہو گئے۔ جھنڈ میں ایک چھوٹا سا مزار نظر آیا۔ مزار سے ملحقہ چھت تلے ایک سفید ریش بزرگ مراقبے کی حالت میں بیٹھا تھا۔ گھوڑوں کی ٹاپیں سن کر اس نے آنکھیں کھولیں۔ اس کے سامنے چار گھڑ سوار کھڑے تھے۔ یہ مارینا' اباقہ' اسد اور یورق تھے۔

طوفانِ باد و باراں کا زور بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ رات انہوں نے اسی مزار میں گزارنے

کیا۔ باریش بزرگ نے انہیں اجازت دے دی۔ انہوں نے تھیلوں سے خشک گوشت
کے ٹکڑے نکال کر کھائے۔ بزرگ نے خشک لکڑیاں جلائیں۔ وہ ہاتھ تاپتے
باتیں کرنے لگے۔ اسد اللہ نے بزرگ سے مزار کے متعلق پوچھا۔ بزرگ نے بتایا
مہرجہاں نامی ایک عورت کا مزار ہے۔ کچھ عرصہ قبل یہ عورت حاکمہ تبریز تھی۔

اسد اللہ نے حیرت سے کہا۔ "حاکمہ تبریز کا مزار اس ویران جگہ پر؟"

بزرگ نے ایک طویل سانس لی اور دھیرے دھیرے انہیں ایک کہانی سنانے لگا۔
کا انداز ایسا پُر تاثیر تھا کہ وہ چاروں اپنی آنکھوں کے سامنے ایک جیتا جاگتا منظر دیکھنے

تبریز کا مضبوط قلعہ ان کی آنکھوں کے سامنے آیا۔ چمکتی تلواروں' نعروں کا شور۔
جری فوج محاصرہ کیے ہوئے اور ایک پُرعزم فوج قلعے میں محصور۔ ایک حسین عورت
کی برجی میں کھڑی حملہ آور فوج کا جائزہ لے رہی تھی۔ یہ مہرجہاں تھی' تبریز کی
۔ وہ اپنے ظالم جابر شوہر (اتابک) سے علیحدگی اختیار کر چکی تھی اور اب مختار کل
اس قلعے اور شہر کی حفاظت اس کی ذمے داری تھی اور وہ اس کی اہل بھی تھی' لیکن
فوج نے اس قلعے پر دھاوا بولا تھا وہ شکست کھانا نہیں جانتی تھی۔ مرنا جانتی تھی یا فتح
۔ اس لشکر جری کا سپہ سالار وہ مرد آہن تھا جس نے چنگیز خاں اور اس کے بیٹوں کی
نیندیں حرام کر دی تھیں۔ وہ جلال الدین خوارزم شاہ تھا۔ مہرجہاں نے جلال الدین کو قلعے
کی برجی سے دیکھا۔ وہ دفاعی خندق کی دوسری جانب اپنی تلوار زمین پر ٹکائے محویت سے
فصیل کی طرف دیکھ رہا تھا۔ فصیل پر جلنے والی سینکڑوں مشعلوں کی روشنی میں اس کا چہرہ خدائی تجلیوں
کا مظہر دکھائی دیتا تھا۔ کس شان اور دبدبے سے کھڑا تھا وہ۔ قلعے کو ایسے دیکھ رہا تھا جیسے
ایک شیر جھاڑیوں میں پھنسے ہوئے آہو کو دیکھتا ہے۔ مہرجہاں کو محسوس ہوا جیسے اس مرد
کو کسی سے لڑنا اپنے آپ سے لڑنا ہے۔ وہ کتنی ہی دیر کھڑی عجیب نظروں سے اسے دیکھتی
رہی۔ پھر وہ فصیل سے اتر کر اپنی محل سرا میں پہنچ گئی۔

وہ کئی راتیں مسلسل سوچتی رہی۔ پھر ایک صبح جب شہرپناہ' جنگ کی شدت سے لرز
رہی تھی۔ اس نے تبریز کے سب سے معتبر عالم عزالدین کو خلوت میں بلایا اور اس سے
ایک اہم مشورہ کیا۔ اس نے کہا کہ وہ اس خونریز لڑائی کا خاتمہ کرنا چاہتی ہے۔ وہ چاہتی
ہے کہ جلال الدین سے نکاح کر لے۔ کچھ بحث و تمحیص کے بعد اہل قلعہ نے اپنی ملکہ کی
تجویز کو قابل قبول جانا۔ تبریز کے قاضی کے ذریعے ملکہ کا پیغام جلال الدین کو پہنچایا گیا۔ وہ
مرد میدان جس کا بستر گھوڑے کی پیٹھ تھا اور جس کا دن تلواروں کے سائے میں گزرتا تھا

اس پیشکش پر غضب ناک ہوا۔ اس نے ملکہ کے وکیل کو للکار کر کہا۔

"کیا تم بھی مجھے رذیل منگولوں کی طرح سمجھتے ہو جو زر و جواہر اور حسین عورتوں کے لیے خون بہاتے ہیں۔ کیا تمہیں مجھ سے امان طلب کرنے کے لیے کوئی اور پیشکش نہ سوجھی۔"

اس کی پُر غضب دھاڑوں نے سفارتکاروں کا پتہ پانی کر دیا۔ جلال الدین نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "آج شام تک قلعے کی کنجیاں میرے حوالے کر دی جائیں ورنہ میں خندق کو تمہاری لاشوں سے پاٹ کر قلعے کے اندر پہنچ جاؤں گا۔"

محصور فوج سمجھتی تھی کہ سلطان جو کہہ رہا ہے ویسا ہی کرے گا۔ اس لیے وہ با عزت سعی کر رہے تھے کہ با عزت سمجھوتہ ہو جائے۔ دوسری طرف سلطان کے عمائدین اور عمائد بھی جانتے تھے کہ ان کی فوج قلعہ سر کرنے کو تو کر لے گی، لیکن اس کے لیے سینکڑوں جانوں کی قربانی لازمی ہو گی۔

جب سلطان جلال الدین نے اس پہلو سے سوچا تو اس کا رویہ قدرے نرم پڑ گیا۔ اس سے پیشتر وہ اپنی محبوب بیوی نیرہ اور اکلوتے لڑکے قطب الدین کو تاتاریوں سے جنگ میں گنوا چکا تھا۔ ان کی شہادت کا اس کے دل پر گہرا اثر تھا اور اس نے تا زندگی شادی نہ کرنے کا عہد کر رکھا تھا، لیکن خون مسلم کی ارزانی اسے کسی صورت گوارہ نہیں تھی۔ ایک مسلمان سپاہی کی جان بچانے کے لیے بھی وہ اپنی جان دینے کو تیار رہتا تھا۔ کافی غور و خوض کے بعد اس نے محصورین کی درخواست قبول کرنے کا فیصلہ کیا۔

اس رات قلعہ تبریز میں جشن کا سماں تھا۔ ہر ہر طاق میں بیسیوں مشعلیں اور قندیلیں روشن تھیں۔ عود و عنبر کی لپٹیں شہر کو گھیرے ہوئے تھیں۔ زرق برق لباس پہنے کنیزیں پھولوں سے بھرے طشت ہاتھوں میں لیے مؤدب کھڑی تھیں۔ غلام سونے کے تھال سروں پر اٹھائے چشم براہ تھے۔ ان لگنوں میں لعل و جواہرات اور موتی بھرے ہوئے تھے۔ ملکہ کا حکم تھا کہ جہاں جہاں سلطان جلال الدین یا اس کے گھوڑے کا قدم پڑے وہاں موتیوں کی بارش کی جائے۔ محل سرا تک جانے والے راستوں پر خوش رنگ قالین بچھے تھے۔ رات میں روزِ روشن کا سماں تھا۔ خلیفہ مامون کا تاریخی جشن بھی اس جشن کے مقابل ہیچ نظر آتا تھا۔ پھر سلطان جلال الدین قلعے میں داخل ہوا۔ استقبالیہ نعروں سے فضا گونج گئی۔ ملکہ مہرجہاں دھڑکتے دل سے اپنے محبوب فاتح کا انتظار کر رہی تھی۔ اس کی آنکھیں راہوں میں بچھی تھیں۔ وہ ہار کر بھی جیت گئی تھی۔

سلطان جلال الدین اور مہرجہاں کا نکاح ہو گیا، لیکن مہرجہاں نے کسی مسور ا

نہیں ایک جنگجو سپاہی سے شادی کی تھی۔ سلطان کے دامن میں مہرجہاں کی ... کے لیے بہت کم مسرتیں تھیں۔ اس کے دل میں تو دنیا جہاں کا درد سمایا ہوا تھا۔ اس ... ب و روز خدمت دین اور بقائے مسلمین کے لیے وقف تھے۔ وہ وہاں تھا ہی کہاں جو ... جہاں کو وصل کی خوشیوں سے ہمکنار کرتا۔ اس کی نگاہیں میدان جنگ میں اور ذہن ... شام، عرب و مصر میں بھٹکتا تھا۔ ہر آنے والا دن اس کے آلام میں اضافہ کر رہا تھا۔ ... منگولوں سے ایک فیصلہ کن جنگ لڑنا چاہتا تھا لیکن اس کے لیے اسے عالم اسلام کا ... ون درکار تھا۔ اس نے اپنے قاصد تمام اسلامی ممالک میں بھیج رکھے تھے لیکن واپس ... نے والا ہر قاصد اس کے لیے رضاکاروں کی بجائے نا امیدی کے تحفے لاتا تھا۔ وہ آخر ... تک اپنے مٹھی بھر جانبازوں کے ساتھ منگولوں سے نبرد آزما رہا۔ انہیں حوصلہ دیتا رہا ... مسلمان جاگ جائیں گے۔ بغداد، دمشق اور مصر سے لاکھوں رضاکار ان کی مدد کے ... پہنچ جائیں گے۔ پھر نہ صرف وہ اپنی کھوئی ہوئی سلطنت کے تمام علاقے تاتاریوں سے ... واپس چھین لیں گے بلکہ انہیں صحرائے گوبی کے آخری کناروں تک دھکیل دیا جائے گا ...... لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ بغداد کے علماء نے تاتاریوں سے جنگ کے خلاف فتوے ... ہے۔ انہوں نے جلال الدین کے مذہبی عقائد پر شکوک کا اظہار کیا۔ کسی نے اسے شیعہ ... کہا کسی نے سنی قرار دیا۔ خلافت عباسیہ نے اس کی پکار پر کان دھرنے کی بجائے تاتاریوں ... کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا دیا۔ اسے دشمنوں کے مقابل تنہا چھوڑ دیا گیا۔ اس کے ساتھی ... ول ہو کر اس سے جدا ہونے لگے۔ جو باقی رہ گئے انہیں اس نے خود جانے کی اجازت ... ے دی .... اور خود سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر آسمان حریت سے اوجھل ہو گیا۔"

باریش بزرگ نے اپنی آبدیدہ نگاہیں اٹھائیں اور لوح مزار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اور یہ ہے مہرجہاں اپنے سلطان کی دیوانی۔ جب تک اس کے ساتھ رہی اس کی نگاہ التفات کو ترستی رہی۔ جدا ہوئی تو اس کی آغوش مہر تلاش کرتی ہوئی آغوش قبر میں پہنچ گئی۔" بزرگ نے مارینا کی طرف دیکھا اور کہا۔ "اے لڑکی تو ان میں سے کس کی بیوی ہے؟"

تینوں خاموش رہے پھر اسد اللہ بولا۔ "یہ میری بہن ہے آقا۔"

بزرگ نے خلا میں گھورتے ہوئے کہا۔ "میدان جنگ میں کھیلنے والوں سے کبھی زیادہ پیار نہیں کیا کرتے۔ وہ حادثوں کی امانت ہوتے ہیں۔ دل کو روگ دے جاتے ہیں۔ ... جلال چلے جاتے ہیں اور مہرجہاں جیسی پگلیاں مر جاتی ہیں۔"

مارینا نے چونک کر بزرگ کی طرف دیکھا۔ پھر اس کی نگاہیں خود بخود اباقہ کی طرف

سرک گئیں۔ وہ جبڑے بھینچے لوح مزار کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شاید اس کا ذہن ابھی تک خوارزم کی بے بسی کا نقشہ کھینچ رہا تھا۔

اس رات اباقہ نے پھر وہی خواب دیکھا۔ درویش دریا کے کنارے درخت سے لگائے بیٹھا تھا اور اس کے ہاتھ میں ٹوٹی ہوئی تلوار تھی۔ اس کی نگاہیں اباقہ پر تھیں ہونٹ آہستہ آہستہ ہل رہے تھے۔ اباقہ حسب معمول اپنی شل ٹانگوں کے ساتھ درویش کی طرف بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے یہ خواب کئی بار دیکھا تھا لیکن اس رات میں ایک نئی بات ہوئی۔ اباقہ نے دیکھا کہ لمبا سفید جبہ پہنے ہوئے ایک عورت سورج کی طرف جا رہی ہے۔ عورت کا چہرہ نقاب میں پوشیدہ ہے۔ اباقہ اس راہ گیر سے پوچھتا ہے یہ سامنے درخت کے ساتھ بیٹھا ہوا درویش کون ہے۔ عورت کہتی میں اس شخص کا نام نہیں لے سکتی لیکن یہ بتا سکتی ہوں کہ یہ دریا "دجلہ" ہے۔"

اباقہ خواب سے بیدار ہوا تو اس کے کانوں میں دجلہ کے الفاظ ابھی تک گونج رہے تھے۔ "دجلہ .... دجلہ" اس نے بار بار یہ الفاظ دوہرائے۔ اس کی بڑبڑاہٹ قریب ہی لیٹا ہوا اسد اللہ جاگ گیا۔ وہ مزار سے ملحق ایک کمرے میں سو رہے تھے۔ درمیان میں چادر تنی تھی اور دوسری طرف ماریتا محو خواب تھی۔ اسد اللہ نے پوچھا۔

"کیا ہوا اباقہ؟"

اباقہ نے پسینے میں بھیگے بال پیشانی سے ہٹائے اور بولا۔ "اسد! تم نے بتایا تھا مسلمانوں کا خلیفہ بغداد کے شہر میں رہتا ہے اور یہ شہر ایک دریا کنارے پر ہے۔ تم اس دریا کا نام کیا بتایا تھا؟"

اسد نے کہا۔ "دجلہ۔"

اباقہ کی آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھری اور وہ بولا۔ "اسد! مجھے یقین ہے کہ اگر ہمیں سلطان کہیں ملا تو وہ جگہ بغداد ہو گی۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟"

اباقہ اسے وقتاً فوقتاً دکھائی دینے والے خواب کی تفصیل بتانے لگا۔ خواب کو جاننا قرین دانش نہیں تھا لیکن نہ جانے کیوں اسد کو بھی گمان ہو رہا تھا کہ تبریز میں سلطان کو ڈھونڈنا بے سود ہو گا۔ منگول اس علاقے کا چپہ چپہ چھان چکے ہیں۔ کل ایک قصبے سے بھی اسد کو ایسی ہی اطلاعات ملی تھیں۔ یہ اباقہ کی ضد تھی جو اس نے تبریز کے سفر کی حمایت کی تھی ورنہ اسے امید نہیں تھی کہ بچھڑے سلطان کا چہرہ دیکھ سکے گا۔ بغداد جانے کو وہ غنیمت سمجھتا تھا۔ اس میں تین فائدے تھے۔ ایک تو وہ تاتاریوں کی

نکل سکتے تھے۔ چغتائی خاں کی بیوی ان کے ساتھ تھی اور وہ مقبوضہ علاقے میں اس سے بڑھ کر خطرناک بات اور کوئی نہیں ہو سکتی تھی۔ دوسرا فائدہ یہ تھا کہ اسد بغداد جانے اور وہاں کے لوگوں میں جذبہ جہاد ابھارنے کا خواہش مند تھا۔ وہ کی خداداد صلاحیت سے بغداد کی بجھی ہوئی راکھ میں کچھ پھونکیں مارنا چاہتا تھا۔ بات یہ تھی کہ بغداد میں سلطان خوارزم کے ملنے کا امکان بہر حال تبریز سے زیادہ تھا۔ یہ بات خارج از امکان نہیں تھی کہ وہ کسی بھیس میں چھپتا چھپاتا وہاں تک جا پہنچا ہو۔ اس سے پہلے بھی خلیفہ الناصر الدین اللہ کے دور خلافت میں جلال الدین نے بغداد کا کیا تھا لیکن مخالفین نے خلیفہ سے سازباز کر کے اسے راستے ہی سے لوٹا دیا تھا)

ان پہلوؤں کو مدنظر رکھ کر اسد اللہ نے اباقہ کے خیال کی تائید کی۔ باقی رات وہ اسی موضوع پر بات کرتے رہے۔ علی الصبح سردار یورق بھی جاگ گیا۔ ان دونوں نے اسے منصوبے سے آگاہ کیا۔ وہ ایک طویل جماہی لے کر بولا۔

"مجھ سے کیا پوچھتے ہو۔ تمہارے ساتھ چل پڑا ہوں' اب جہاں بھی لے چلو۔"

چند روز اسد اللہ اور اباقہ تبریز کے گرد و نواح میں خاموشی سے سلطان جلال الدین کے متعلق معلومات حاصل کرتے رہے' لیکن اس کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا کہ ایک روز کی ایک ٹولی سے ان کی مڈبھیڑ ہو گئی۔ اباقہ اور اسد اللہ نے زبردست دلیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے تین سپاہیوں کو قتل کر ڈالا اور ایک نہر میں کود کر دوسری طرف نکل گئے۔ اگلے روز انہوں نے روانگی کا فیصلہ کیا۔ نصف شب کو چار افراد کا یہ مختصر سا قافلہ مہر کے مزار سے اپنے طویل اور پُر خطر سفر پر روانہ ہوا۔ ان کا رخ خلافت عباسیہ کے بغداد کی طرف تھا۔ اس دفعہ ماریتا مردانہ لباس میں تھی' اپنے ریشمی بالوں کو صافے میں چھپائے وہ ایک خوبرو لڑکا دکھائی دیتی تھی۔

☆——☆——☆

تیرھویں عیسوی کا بغداد جنت ارضی کا نمونہ تھا۔ بیس لاکھ انسانوں پر مشتمل اس عالی شان آبادی کو دریائے دجلہ دو حصوں میں تقسیم کرتا تھا۔ دونوں حصوں میں سڑکوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ عالیشان عمارتیں' خوبصورت باغ اور دلفریب سیر گاہیں۔ شہر کے درمیان قصر خلد کے نام سے ایک عالیشان عمارت تھی۔ اس عمارت میں عباسی قیام رکھتے تھے۔ قصر خلد کے اردگرد بے شمار محلات اور دیدہ زیب عمارتیں تھیں۔ اہل اقتدار امراء و روسا رہتے تھے۔ شام کے وقت دریائے دجلہ کے کنارے رنگین اور حسین چہروں کا ہجوم امڈ آتا تھا۔ خوشحال و شادمان اہل بغداد سیر و تفریح کے

لیے نکلتے۔ رات گئے تک مناظرے اور مشاعرے ہوتے۔ کھیل تماشے روزمرہ کا معمول
تھے۔ فارغ البالی اور بے فکری کا دَور تھا۔ دنیا جہاں کی نعمتیں اس خطہ زمین پر مرکوز ہو
تھیں۔

بغداد اہل نظر و اہل دانش سے خالی نہیں تھا لیکن ان کی عقل و دانش پیش آ
خطرے کو بھانپنے کی بجائے ایک دوسرے کو زیر کرنے میں مصروف تھی۔ تاتاری خوار
کو تاراج کرنے کے بعد خراساں' ایران و ترکستان کے وسیع علاقوں میں جمع ہو رہے
اور مسلمان علماء بے معنی مسائل کی تشریحات میں الجھے تھے۔ ان کی حیثیت ایک جسم
ان دو ہاتھوں کی تھی جو قیمتی انگشتریاں پہنے ایک دوسرے پر مکے برسانے میں مصروف
ہوں۔ مساجد بلند و بالا اور عظیم الشان تھیں۔ کتب خانے نادر کتابوں سے بھرے ہو
تھے۔ مدارس میں علوم کا چرچا تھا لیکن عمل مفقود۔ اہل بغداد اپنے حال میں مست تھے۔

وہ ایک سرمئی شام تھی دجلہ کے کنارے چہل پہل شروع ہو چکی تھی۔ شہر
معروف تاجر قوام الدین کی محل نما رہائش گاہ کے سامنے چار مسافر اترے۔ اسد اللہ
آگے بڑھ کر بلند و بالا آبنوسی دروازے پر دستک دی۔ ایک خوش لباس ملازم باہر نکلا۔ اسد
اللہ نے کچھ کہا۔ وہ اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد لبا مزین جبہ پہن ایک تنومند لیکن
رسیدہ شخص دروازے پر نظر آیا۔ اسد اللہ کو دیکھ کر اس کے چہرے پر شناسائی کے آثار
آئے اور وہ اسد کہتا ہوا جلدی سے سیڑھیاں اتر آیا۔ بھرپور معانقے کے بعد اس
سردار یورق اور اباقہ سے ہاتھ ملائے۔ ماریتا کے سر پر ہاتھ پھیرا اور ان چاروں کو لے
اندر چلا آیا۔ عمارت باہر سے جتنی خوبصورت تھی اندر سے بھی ویسی ہی آراستہ تھی۔
قالینوں پر چلتے ہوئے وہ وسیع مہمان خانے میں داخل ہوئے۔

قوام الدین' اسد اللہ کے چچا تھے۔ عرصے پہلے وہ خوارزم سے بغداد چلے آئے تھے
یہاں ان کا وسیع کاروبار تھا۔ ان کے ہوتے ہوئے اسد اللہ اور اباقہ وغیرہ کو کہیں
ٹھہرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ طویل اور کٹھن سفر کے بعد قوام الدین کے تپاک
انہیں بہت راحت پہنچائی۔ نہانے دھونے اور کھانے کے بعد انہوں نے مکمل آرام

.... جب دوبارہ اباقہ کی آنکھ کھلی تو نئے دن کا سورج چوتھائی سفر طے کر چکا تھا۔ ا
نے ایک کھڑکی سے پردہ ہٹایا۔ سامنے دجلہ کا منظر تھا۔ دھوپ کی کرنیں پانی پر اشرفیاں
بکھیر رہی تھیں۔ چھوٹی چھوٹی کشتیاں خوش باش لوگوں کو اِدھر اُدھر لیے پھرتی تھیں۔ ا
نے دیکھا کہ یورق' اسد اور ماریتا دریا کے کنارے سنگ مرمر کے بینچ پر بیٹھے لہروں کا
کر رہے ہیں۔ شاید وہ صبح ہی جاگ گئے تھے۔ اباقہ نے ایک بھرپور انگڑائی لی اور

وں سے چلتا کمرے سے باہر آگیا۔ نیچے قالین ہونے کی وجہ سے اس کے قدموں کی
سنائی نہیں دے رہی تھی۔ راہداری خالی تھی۔ دفعتاً ایک آواز سن کر وہ ٹھٹک گیا۔
آواز ایک بند کمرے سے آئی تھی۔ کوئی عورت سریلی آواز میں چیخی تھی۔ اباقہ نے بے
کھڑکی سے جھانکنے کی کوشش کی۔ اندر دبیز پردہ تھا لیکن پردے میں تھوڑی سی
رہ گئی تھی۔۔ اباقہ نے دیکھا ایک خوبصورت خادمہ بڑی شان سے بستر پر نیم دراز
اور ایک نوجوان جو چہرے مہرے سے قوام الدین کا بیٹا یعنی اس گھر کا مالک دکھائی دیتا
قالین پر دو زانو بیٹھا تھا۔ حسین لڑکی بڑے نخرے سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔
ان سرگوشی کے لہجے میں کچھ کہہ رہا تھا۔ اباقہ کا مزاج بڑا ہلکا پھلکا ہو رہا تھا۔ نہ جانے
اس کا دل چاہا کہ ان کی بات سنے۔ وہ راہداری سے ہٹ کر کمرے کے پہلو میں
بلندی پر ایک روشندان دکھائی دے رہا تھا۔ اباقہ نے بلی کی طرح گھٹنے جھکا کر چھلانگ
اور روشندان کا کنارہ پکڑ لیا۔ پھر بازوؤں کے زور پر خود کو اوپر اٹھا کر اس نے کان
شندان سے لگا دیئے۔ آواز بالکل صاف سنائی دے رہی تھی۔ اباقہ بازوؤں کے زور پر
طرح روشندان سے چپکا رہا۔ تا دیر اس آسن میں رہنا کسی عام شخص کے بس کا روگ
تھا لیکن وہ اباقہ تھا۔ اندر لڑکی کہہ رہی تھی۔

"حضور! جب تک آپ کے والد زندہ ہیں' آپ خیالی پلاؤ ہی پکاتے رہیں گے۔"

"نہیں پیاری!" نوجوان کی آواز آئی۔ "میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اب والا صاحب کو
آرام کرنا چاہیئے۔"

"کیا مطلب؟" لڑکی نے چونک کر پوچھا۔

"بس دیکھتی رہو۔ میں ایک تیر سے دو شکار کرنے والا ہوں۔ یعنی والد صاحب منظر
سے غائب اور ناظم شہر میری مٹھی میں۔"

"لیکن کیسے؟" لڑکی کی پُر اشتیاق آواز ابھری۔

"میں نے آج والد صاحب کو سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ الٹا مجھے چکر دینے
لگے۔ فرمانے لگے کہ اسد کے دونوں ساتھی ملازمت کی تلاش میں آئے ہیں حالانکہ مجھے
اب اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ کون ہیں۔ میں ان کی ساری باتیں سن چکا ہوں۔ اسد
نے خود والد صاحب کو بتایا ہے کہ وہ خوارزم شاہ کی تلاش میں ہیں اور اسد خود بھی
خوارزم شاہ کا سرگرم ساتھی رہ چکا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ناظم شہر انہیں گرفتار کر کے پھولا
سمائے گا۔ ویسے بھی وہ خوارزمیوں کا سخت مخالف ہے۔"

اتنے میں کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اباقہ نے روشندان کا کنارہ چھوڑا اور

بے آواز قالین پر گرا۔ ایک ملازم ہاتھوں میں طشت لیے راہداری سے گزرا۔ اس نے اباقہ کو پنجوں کے بل قالین پر گرتے دیکھا اور ٹھٹک کر رک گیا۔ سخت گیر چہرے والا یہ ایک ہٹا کٹا ملازم تھا۔ اس نے تیز لہجے میں پوچھا۔

"اے لڑکے۔ ادھر کیا کرتے ہو؟"

اباقہ نے جواب دینا ضروری نہیں سمجھا اور اس کے قریب سے گزرنے لگا۔ ملازم نے بڑی بے باکی سے اس کا بازو تھام لیا۔ اس دفعہ اس کا لہجہ خاصا تند تھا۔

"میں جو پوچھ رہا ہوں اس کا جواب دو۔"

"ورنہ؟" اباقہ نے اطمینان سے پوچھا۔

"ورنہ تگنی کا ناچ نچادوں گا۔" ملازم طشت نیچے رکھتے ہوئے بولا۔ اس کے ہونٹ غصے سے پھڑک رہے۔ "تم چوری کی نیت سے ادھر گھوم رہے تھے۔"

اباقہ بولا۔ "اپنے مالک کے مہمان پر الزام لگاتے ہو۔"

ملازم بولا۔ "یہ چھوٹے آقا کا کمرہ ہے اور میں ان کا خادم ہوں' میں نہیں جانتا کسی مہمان کو۔" اب وہ باقاعدہ اباقہ کو گرفت میں لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ اباقہ کو اس عظیم الوجود مسٹنڈے پر ہنسی آرہی تھی۔ اس کا ایک تھپڑ اس بغدادی مسخرے کو بے ہوش کرنے کے لیے کافی تھا بہر حال وہ بے حرکت کھڑا رہا۔ شور سن کر کمرے کا دروازہ کھلا اور قوام الدین کا بیٹا باہر نکل آیا۔ ایک دو اور خادم بھی بھاگتے ہوئے پہنچ گئے۔ موٹے خادم نے اباقہ کی شکایت لگائی۔ نوجوان خاموشی سے سنتا رہا۔ پھر اس کے ہونٹوں پر ایک مصلحت آمیز مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے خادم کو مہمان سے بدسلوکی پر ڈانٹا اور اباقہ سے معذرت کی۔ اباقہ لاپرواہی سے سرہلاتا بیرونی دروازے کی طرف چل دیا۔

باہر نکل کر وہ اس سنگی بینچ کی طرف بڑھا جہاں اسد وغیرہ بیٹھے تھے۔ اباقہ کو دیکھ کر اسد نے خوشی سے ہاتھ ہلایا۔ وہ ان کے قریب بیٹھ کر باتیں کرنے لگا۔ مارینا اور یورق قوام الدین کی مہمان نوازی کی تعریفیں کر رہے تھے۔ اباقہ' اسد اللہ کو ایک طرف لے گیا اور ابھی پیش آنے والے واقعے کے بارے بتانے لگا۔ اسد کے چہرے پر بھی پریشانی کے آثار نظر آئے۔ اس نے کہا۔ "ابھی دوپہر کے کھانے پر چچا جان آئیں گے تو میں بات کروں گا۔"

دوپہر کے کھانے میں اسد کا چچا زاد بھائی سیف الدین بھی شریک تھا۔ وہ خادم بھی ادھر اُدھر گھوم رہی تھی جسے اباقہ نے پردے کی جھری سے دیکھا تھا۔ اس وقت دونوں کے چہروں سے مطلق اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ کچھ دیر پہلے ایک خطرناک سازش کر رہے

تھے۔ سیف الدین باپ سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔ کھانا نہایت پُر تکلف اور مزیدار تھا۔ مارینا' سیف الدین کی بیوی سے گھل مل گئی تھی۔ وہ ابھی تک مردانہ لباس میں تھی اور لمبے بال شانوں پر پھیلے ہوئے تھے۔ اسد اللہ نے گھر والوں کو بتایا تھا کہ راستے میں تاتاریوں سے بچنے کے لیے اس نے بھیس بدل رکھا تھا۔ سیف الدین کی بیوی عجیب نظروں سے اباقہ کے جنگلی پن کا جائزہ لے رہی تھی۔ اس کے ذہن میں جو سوال اٹھ رہے تھے مارینا دھیمے لہجے میں ان کے جواب دے رہی تھی۔ کھانے کے بعد قوام الدین ستانے کے لیے دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ اسد اللہ بھی ان کے پیچھے گیا۔ انہوں نے حقے کی نال منہ میں دباتے ہوئے کہا۔ "بیٹے! تمہارے مہمانوں کو یہاں کوئی تکلیف تو نہیں۔"

اسد اللہ نے رسمی طور پر نفی میں جواب دیا۔ بغداد کی صورت حال پر بحث ہونے لگی۔ قوام الدین نے تاسف سے کہا کہ قوم مختلف دھڑوں میں بٹ کر رہ گئی ہے۔ دو اہم دھڑوں میں سے ایک خوازرم شاہ کا حامی ہے اور اس کے موقف کی تائید کرتا ہے۔ جبکہ دوسرا اسے بے دین اور جابر قرار دیتا ہے۔ مخالفت برائے مخالفت کا زہر گہرائی تک سرایت کر گیا ہے۔ سیاسی اور مجلسی زندگی کے بعد یہ دھڑے بندی گھریلو سطح تک پہنچ چکی ہے۔ باپ ایک موقف کا حامی ہے تو بیٹا دوسرے کا۔

یہ موقع اسد اللہ کی بات کے لیے موزوں تھا۔ وہ بولا۔ "چچا جان! بھائی سیف الدین ہماری موجودگی سے پریشان تو نہیں۔"

قوام الدین نے چونک کر اسد کی طرف دیکھا پھر بولا۔ "کیسے کہہ سکتے ہو؟" اسد نے دبے لفظوں میں اس سے بند کمرے میں ہونے والی گفتگو کا تذکرہ کیا۔ قوام الدین تشویش سے سنتا رہا پھر کھوکھلا سا قہقہہ لگا کر بولا۔ بولا۔ "نہیں اسد تمہیں یا تمہارے دوست کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ سیف الدین ایسا نہیں۔ کچھ نافرمان ضرور ہے لیکن ابھی تک میں اس کا باپ ہوں وہ میرا باپ نہیں بنا........."

دفعتاً قوام الدین کی زبان لڑکھڑا گئی۔ اس نے حقے کی نال چھوڑ کر سر تھام لیا۔ اسد بھی کافی دیر سے آنکھوں کو بوجھل محسوس کر رہا تھا۔ ایکا ایکی اسے کمرہ گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ قوام الدین بستر سے اٹھنے کی کوشش میں لڑکھڑا کر قالین پر گرا۔ اسد نے اسے تھامنا چاہا لیکن خود بھی ڈگمگا گیا۔

دوسرے کمرے میں سیف الدین کی بیوی ہلکی سی چیخ سے لہرا کر مارینا کی گود میں گری۔ مارینا نے اسے گود میں سنبھالا پھر اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھاما اور لرزاں آواز میں بولی۔ "اباقہ! ہمیں کچھ کھلا دیا گیا ہے۔" اباقہ نے سر جھٹک کر آنکھیں کھولیں۔ کمرے میں

سرخ، نیلے پیلے دائرے گھوم رہے تھے۔ ایکا ایکی اس کا منہ خشک ہو گیا تھا۔ اس نے د... مارینا سیف الدین کی بیوی کو اٹھانے کی کوشش میں خود بھی اس پر ڈھیر ہو گئی ہے۔ ... راہداری سے کئی چہرے نمودار ہوئے اور تیزی سے ان کی طرف بڑھنے لگے۔ اباقہ کی انگلیوں نے تلوار کے دستے کو چھوا۔ اس نے ایک جھٹکے سے تلوار نکالی۔ قریب آتے ہوئے چہرے قدرے حیرت سے اسے دیکھ رہے تھے۔ اباقہ کی آنکھوں کے سامنے پھیلی ہوئی دھند ہر لحظہ گہری ہوتی جا رہی تھی لیکن وہ کھڑا تھا۔ دفعتاً عقب سے کوئی وزنی چیز اس کے سر پر لگی۔ وہ گھٹنوں کے بل بیٹھا اور نرم قالین پر لڑھک گیا۔

☆------☆------☆

مارینا کی جب آنکھ کھلی وہ ایک معمولی مسہری پر لیٹی تھی۔ وہ آٹھ پہر یا اس سے بھی زیادہ بے ہوش رہی تھی۔ اس نے در و دیوار دیکھے اور اسے اندازہ ہوا کہ وہ اسی حویلی میں موجود ہے لیکن یہ کوئی تہہ خانہ تھا۔ بلندی سے سیڑھیاں نیچے کی طرف آ رہی تھیں۔ اکلوتی شمع کی روشنی میں تہہ خانہ نیم تاریک دکھائی دے رہا تھا۔ پھر مارینا کو اندازہ ہوا کہ وہ تنہا نہیں۔ اس کے قریب ہی قوام الدین موجود تھے۔ اسی دوران سیڑھیوں پر آہٹ ہوئی اور آہنی دروازہ کھل گیا۔ روشنی کی ایک لکیر اندر آئی۔ پھر کئی قدم نیچے اترنے لگے۔ ان میں سب سے آگے سیف الدین تھا۔ اس کا گریبان کھلا ہوا تھا اور وہ نشے میں جھوم رہا تھا۔

"کیا حال ہے بادا جان؟" وہ باپ کے سامنے جام نچاتا ہوا نہایت بے ادبی سے بولا۔ قوام الدین حیرت سے اپنے بیٹے کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔ ان کے لب تھرا کر رہ گئے۔ سیف الدین نے پیچھے مڑ کر حسین خادمہ کو بازو سے پکڑا اور باپ کے سامنے کرتا ہوا بولا۔ "دیکھ لیں آپ بھی اور آپ کی بہو بھی۔ یہی لڑکی آپ کی آنکھوں میں چبھتی تھی نا۔ اب یہ میرے دل کی ملکہ ہے۔ میں آج ہی اس سے نکاح کروں گا اور آپ کی یہ چہیتی بہو اسے اپنے ہاتھ سے دلہن بنائے گی۔ میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش یہی تھی کہ آپ کی چہیتی بہو اپنے ہاتھ سے اپنی سوکن کی سیج تیار کرے۔ چل اٹھ۔" وہ اپنی بیوی کی طرف دیکھ کر چنگھاڑا۔

"سیف الدین!" بوڑھا قوام الدین مضمحل شیر کی طرح دھاڑا اور بیٹے پر جھپٹا لیکن سیف الدین کے مسلح ملازموں نے قوام الدین کے بازو جکڑ لیے۔

"بس بادا جان!" سیف الدین طنز سے بولا۔ "آپ کے قویٰ اتنے مضبوط نہیں رہے کہ چھینا جھپٹی برداشت کر سکیں۔ یہ کمرہ آپ کی آرام گاہ ہے۔ کھائیے پیئے اور اللہ اللہ کیجئے۔"

قوام الدین زور سے مچلا۔ ملازموں نے شاید احترام کے تحت اسے مضبوطی سے نہیں تھام رکھا تھا۔ وہ ان کی گرفت سے نکل گیا۔ اس نے ایک ملازم کی پیٹی سے خنجر کھینچنے کی کوشش کی لیکن سیف الدین نے بے دردی سے دھکا دیا وہ لڑکھڑاتا ہوا زمین پر گرا۔ اس کا سر دیوار سے ٹکرایا اور وہ بے سدھ ہو گیا۔

"چل حرامزادی!" سیف الدین نے بیوی کے بال مٹھی میں جکڑے۔ مارینا غصے اور تمکنت سے بولی۔

"ایسے بدبخت بیٹوں پر آسمان سے لعنتیں برستی ہیں۔ شرمسار رہتی ہے وہ زمین جس پر تم جیسے رذیلوں کے پاؤں پڑتے ہیں۔"

سیف الدین نے بیوی کو چھوڑا اور نہایت قہر سے مارینا کی طرف بڑھا۔ اس کا ہاتھ اسے تھپڑ مارنے کے لیے اٹھا لیکن مارینا کے چہرے پر ایسا رعب حسن دکھائی دیا کہ وہ اپنا ارادہ پورا نہ کر سکا۔ اس کے چہرے کی سختی نرمی میں ڈھلی اور غور سے اسے دیکھنے لگا۔ اس کی حریصانہ نگاہیں مارینا کو ایک تشویشناک دھمکی دے رہی تھیں۔ پھر وہ مسکرا کر بولا۔ "آپ سے پھر بات کروں گا۔" تب اس نے روتی ہوئی بیوی کا بازو پکڑا اور کھینچتا ہوا باہر لے گیا۔

دروازہ بند ہوتے ہی مارینا بوڑھے قوام الدین کی طرف لپکی۔ وہ بے ہوشی میں ہلکے ہلکے کراہ رہا تھا۔ مارینا نے تپائی سے پیالہ اٹھا کر اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے دیے۔ جلد ہی وہ ہوش میں آ گیا لیکن جب اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو چیخ کر رہ گیا۔ دراصل وہ زخمی تھا۔ اس کا جسم بھاری بھرکم تھا اور وہ بری طرح لڑکھڑا کر گرا تھا۔ گرتے ساتھ ہی اس کا کولہا ٹوٹ گیا تھا۔ مارینا نے پلنگ سے بستر کھینچ کر زمین پر بچھایا اور بمشکل دھکیل کر قوام الدین کو ننگے فرش سے بستر پر کر دیا۔ پھر اس نے اپنی سمجھ کے مطابق بستر کی ایک چادر کس کے کولہے پر باندھ دی۔ اس عمل سے قوام الدین کو قدرے سکون ہوا۔ وہ مارینا کی ہمدردی سے بہت متاثر نظر آتا تھا لیکن بیٹے کا ظالمانہ رویہ اسے خون کے آنسو رلا رہا تھا۔ وہ غصے اور رنج کے عالم میں بار بار اسے کوسنے دے رہا تھا۔ پھر وہ مارینا سے بولا۔

"بیٹی! پتہ نہیں تو کون ہے لیکن مجھے تیرے اندر بیگمات کی سی سمجھداری اور جرأت دکھائی دیتی ہے۔ میرا خیال ہے میں تجھ پر ایک اہم ذمے داری ڈال سکتا ہوں۔"

مارینا نے پوچھا۔ "کیسی ذمے داری بزرگوار!"

قوام الدین بولا۔ "اپنے ساتھیوں کو بچانے کی ذمے داری۔"

ماریتا بولی۔ "وہ کس طرح؟"

قوام الدین نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ اسد اور تمہارے دونوں ساتھی دجلہ کے کنارے قید خانے میں موجود ہیں۔ میرے بیٹے کا شہر کے ناظم سے ملنا جلنا تھا۔ یقیناً انہیں ناظم ہی نے گرفتار کیا ہے۔ یہ ناظم ایک لالچی شخص ہے اور ناظم اعلیٰ بننے کا خواہش مند ہے۔ وہ اپنی کارکردگی وزیر داخلہ کو دکھانے کے لیے اکثر وبیشتر خوارزم شاہ کے حمایتیوں کو گرفتار کرتا رہتا ہے۔ وزیر داخلہ عبدالرشید' تاتاریوں کا زبردست حامی اور خوارزم شاہ کا کڑا مخالف ہے۔ گرفتار شدہ افراد کو اذیتیں دے کر ہلاک کرنا اس کا محبوب مشغلہ ہے۔"

"اب مجھے کیا کرنا چاہئے؟" ماریتا نے قدرے پریشانی سے پوچھا۔

قوام الدین بولا۔ "میں تمہیں ناظم اعلیٰ کا پتا بتاتا ہوں تم کسی طرح اُس کے پاس پہنچ کر اُسے صورت حال سے آگاہ کر دو۔ اگر قیدی وزیر داخلہ تک پہنچ نہیں گئے تو وہ ان کی رہائی کی تدبیر کر سکتا ہے۔"

ماریتا نے کہا۔ "لیکن بزرگوار' یہ تو تب ہو سکتا ہے کہ ہم اس قید خانے سے نکل سکیں۔"

قوام الدین کے چہرے پر ایک تلخ مسکراہٹ ابھری وہ بولا۔ "سیف الدین بڑا ہوشیار ہوگیا ہے لیکن ابھی وہ میرا باپ نہیں بنا۔ یہ شان و شوکت یہ کاروبار یہ خوشحالی میری محنت اور خدا کی رحمت کا نتیجہ ہے۔ اپنی یہ چھوٹی سی دنیا میں نے اپنے ہاتھوں تعمیر کی تھی .... اور یہ گھر بھی۔ یہ گھر سیف الدین نے نہیں میں نے بنوایا تھا اور یہ تہہ خانہ بھی جس میں آج اس ملعون نے مجھے قید کیا ہے .... اٹھو بیٹی .... اٹھو میں تمہیں بتاؤں اس تہہ خانے سے کیسے نکلا جا سکتا ہے۔"

ماریتا قوام الدین کی ہدایت پر اٹھ کھڑی ہوئی۔ قوام الدین نے انگلی سے ایک طرف اشارہ کیا۔ آتش دان کے اندر ایک ابھرا ہوا پتھر تھا۔ قوام الدین کی ہدایت پر ماریتا نے زور سے اسے دبایا۔ پتھر ایک جھٹکے سے دبتا چلا گیا اور ماریتا گرتے گرتے بچی۔ یہ پتھر دراصل ایک سنگی دروازہ تھا جو اب خلا میں لٹک رہا تھا۔ نیچے ایک نیم تاریک خلا تھا اور قریب ہی دریا کا شور سنائی دے رہا تھا۔ ماریتا نے حیرت سے قوام الدین کی طرف دیکھا۔ وہ ابھی تک مردانہ لباس میں تھی۔ اس نے اپنے بالوں کو کس کر سر پر باندھا اور بستر کی ایک ریشمی چادر پگڑی کی طرح لپیٹ لی۔ پھر وہ تیزی سے قوام الدین کے پاس آئی اور بولی۔ "بزرگوار میں وعدہ کرتی ہوں کہ بہت جلد آپ کا بیٹا آپ کے قدموں میں گڑگڑا رہا ہو گا۔"

وہ خلا میں اتر کر بائیں طرف بڑھی۔ ایک چھوٹے سوراخ سے رینگ کر وہ باہر نکل

آئی۔ یہ سوراخ جھاڑ جھنکاڑ میں چھپا ہوا تھا۔ تھوڑی دور دریا کا پانی چمک رہا تھا۔ سورج غروب ہو چکا تھا لیکن تاریکی ابھی نہیں پھیلی تھی۔

ماریتا درختوں سے ہوتی ہوئی شہر کی طرف چل دی۔ سرشام ہی قندیلیں اور مشعلیں فروزاں تھیں۔ چہل پہل زوروں پر تھی۔ ہر کوئی اپنے حال میں مگن تھا۔ تھوڑی دیر بعد تاریکی گہری ہو گئی اور ماریتا مزید اعتماد سے آگے بڑھنے لگی۔ آخر وہ قوام الدین کی بتائی ہوئی نشانیوں کے ذریعے ناظم اعلیٰ کی رہائش گاہ کے سامنے پہنچ گئی۔ اس نے دربان کو بتایا کہ وہ معروف تاجر قوام الدین کے گھر سے "آیا" ہے اور اس کا ناظم اعلیٰ سے ملنا بہت ضروری ہے۔ دربان نے اس عجیب وضع نازک اندام مرد کو گھورا اور ایک ملازم کو اطلاع دے کر بھیجا۔ تھوڑی دیر بعد ملازم اسے لے کر اندر چلا آیا۔ ماریتا نے دیکھا عمارت کے اندر کچھ بے ترتیبی سی نظر آ رہی تھی۔ کرسیاں' تپائیاں' پلنگ اِدھر اُدھر بکھرے پڑے تھے۔ فرش پر قالین دکھائی نہیں دیتے تھے۔ مختلف کمروں سے گزر کر خادم ایک منقش دروازے کے سامنے پہنچ کر رکا۔ اس نے مؤدب انداز میں دستک دی۔ اجازت ملنے پر اس نے ماریتا کو اندر جانے کی ہدایت کی' وہ دروازہ کھول کر اور ایک ریشمی پردہ ہٹا کر اندر داخل ہو گئی۔ سامنے مسہری پر ایک چوڑا چکلا شخص نیم دراز تھا۔ پگڑی قریب تپائی پر رکھی تھی اور گلے میں قیمتی مالائیں چمک رہی تھیں۔ ماریتا نے تمکنت سے پوچھا۔

"آپ ناظم اعلیٰ ہیں؟"

نیم دراز شخص نے اسے دلچسپ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "بالکل۔"

ماریتا سامنے کرسی پر بیٹھ گئی اور اس نے شروع سے آخر تک ناظم اعلیٰ کو قوام الدین اور اس کے بیٹے کی ساری کہانی سنا دی۔ قوام الدین نے بتایا تھا کہ ناظم اعلیٰ بڑی ہمدردی سے اس کی بات سنے گا اور فوری کارروائی کرے گا' لیکن یہاں معاملہ الٹ نظر آ رہا تھا۔ ماریتا دیکھ رہی تھی کہ جوں جوں وہ اس کی باتیں سن رہا تھا۔ اس کے چہرے کی درشتگی بڑھتی جا رہی تھی۔ آخر ماریتا نے بات ختم کی اور منتظر نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ ناظم اعلیٰ نے ایک قہر آلود سانس بھری اور بولا۔

"اچھا تو تم ناظم کی شکایت لے کر آئے ہو۔"

ماریتا بولی۔ "میں آپ سے انصاف مانگنے آئی ہوں۔"

ناظم بولا۔ "شکر ہے تم نے خود کو لڑکی تو تسلیم کیا۔"

ماریتا بولی۔ "یہ بھیس میں نے آپ کے لئے نہیں بدلا۔"

ناظم بولا۔ "لیکن ہو سکتا ہے اس خوبصورت چہرے کو سب سے زیادہ خطرہ مجھ ہی

سے ہو۔"

"کیا مطلب؟" مارینا چونکی۔

ناظم اٹھا اور جلدی سے آگے بڑھ کر دروازے کی کنڈی چڑھا دی۔ مارینا اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔ ناظم اعلیٰ کا کرخت چہرہ اور بھی کرخت ہو گیا تھا۔ وہ سرسراتے لہجے میں بولا۔ "جس ناظم کے خلاف تم الزامات کے طومار باندھ رہی ہو وہ میں ہی ہوں۔ کل رات میں ناظم تھا لیکن اس وقت ناظم اعلیٰ ہوں۔"

ایکا ایکی مارینا کا چہرہ زرد ہو گیا۔ وہ کچھ کچھ بات سمجھ رہی تھی۔

ناظم' ناظم اعلیٰ کے عہدے پر ترقی پا چکا تھا۔ اب یہ رہائش گاہ اس کی تھی۔ مارینا کو یاد آیا کہ جب وہ عمارت میں داخل ہوئی تھی۔ سامان اِدھر اُدھر بکھرا ہوا تھا۔ اس کا مطلب تھا پہلا ناظم اعلیٰ معزول ہو چکا تھا یا کہیں دور چلا گیا تھا۔ مارینا کو حالات کی سنگینی کا احساس ہوا۔ وہ بری طرح پھنس گئی تھی۔ صفائی پیش کرنے کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔ ناظم اعلیٰ چند بالشت کے فاصلے پر کھڑا شیطانی نگاہوں سے اسے گھور رہا تھا۔ اختیار طاقت اور بے خوفی اس کی ذات میں مجسم ہو گئی تھی۔ کمزوری' بے بسی اور خوف مارینا کی ذات کا حصہ بن گئے تھے۔

پھر وہ رعب سے بولا۔ "بیٹھ جاؤ لڑکی۔ خوبصورت چہروں پہ پریشانی مجھے اچھی نہیں لگتی۔"

مارینا نے پلکیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور بیٹھ گئی۔ اس کا چہرہ خدشات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ ناظم اعلیٰ نے قریب رکھی ہوئی طشتری سے انگور کا ایک گچھا اٹھایا اور اسے نوچتا ہوا اطمینان سے بولا۔ "دیکھو لڑکی! جہاں تم آگئی ہو وہاں میری مرضی کے خلاف پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا۔ تمہارے ساتھ وہ کچھ ہو سکتا ہے جس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتیں .... اپنے اور اپنے ساتھیوں کے بارے میں سب کچھ صاف صاف بتا دو تو تمہاری سزا میں کچھ تخفیف ہو سکتی ہے۔"

مارینا کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں چمک رہی تھیں۔ کتنی ہی دیر وہ بے بسی سے اپنے ہونٹ کاٹتی رہی اور کتنی دیر ناظم اعلیٰ اسے مستقبل کے آلام سے آگاہ کرتا رہا۔ اس نے مارینا کو بتایا کہ اس کے تینوں ساتھیوں کا مقدر اب صرف اور صرف موت ہے۔ وہ بھی ان کے ساتھ موت کے منہ میں جاتی لیکن سیف الدین کی نگاہِ انتخاب نے اسے بچا لیا تھا۔ وہ سیف الدین کے انتخاب کی تعریف کرتا ہوا بولا۔ "واقعی تم ایک موتی ہو۔" ناظم اعلیٰ کی باتوں سے مارینا نے اندازہ لگایا کہ وہ جو کہہ رہا ہے ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اباقہ اسد اور یورق کا

اب ایک دشوار امر تھا۔

آخر مارینا نے ایک طویل سانس لی۔ پھر احتیاط سے لفظوں کا انتخاب کیا اور بولی۔ "میں آپ کو اپنے دل کی بات بتا دیتی ہوں۔ پھر جو فیصلہ آپ چاہیں کریں۔ میرے تینوں ساتھی خوارزم شاہ کی تلاش میں یہاں آئے ہیں اور یہ بات بھی صحیح ہے کہ ان میں سے عبداللہ نامی نوجوان' خوارزم شاہ کا سرگرم ساتھی رہ چکا ہے۔ مجھے ان دونوں سے کوئی غرض نہیں۔ میں آپ سے اباقہ نامی اس نوجوان کے متعلق بات کرنا چاہتی ہوں۔"

ناظم اعلیٰ اسے خاموش ہوتے دیکھ کر بولا۔ "ہاں .... ہاں کہو' یہ باتیں تمہارے میرے درمیان رہیں گی۔"

مارینا کی گھنیری پلکیں کچھ اور جھک گئیں۔ اس نے کہا۔ "اباقہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔ وہ ایک ناسمجھ جنگلی ہے اور صرف .... میری وجہ سے انسانوں کے اس جنگل میں آ گیا ہے۔ اگر وہ مرا تو اس کی قصوروار صرف اور صرف میں ہوں گی۔"

ناظم اعلیٰ نے گہری سانس لی اور بولا۔ "اس کا مطلب ہے تم اسے آزاد کرانا چاہتی ہو۔"

"ہاں .... میں چاہتی ہوں کہ وہ اپنی دنیا میں واپس لوٹ جائے۔ اپنی خواہش کے لیے میں ہر قربانی دینے کو تیار ہوں۔"

ناظم کی جہاندیدہ آنکھیں مارینا پر جمی تھیں۔ "تو تم بھی اس سے محبت کرتی ہو .... خیر تمہاری یہ خواہش پوری کی جا سکتی ہے لیکن اس کا کیا ثبوت ہے کہ آزاد ہو کر وہ بے ضرر ثابت ہو گا اور واپس چلا جائے گا۔"

مارینا نے کہا۔ "آپ اسے نہیں جانتے۔ وہ بالکل جنگلی ہے' جانور کی طرح۔ اسے کسی بات سے سروکار نہیں۔ وہ صرف .... میری وجہ سے مارا مارا پھر رہا ہے۔ میں اسے اس طرح مایوس کروں گی کہ وہ پلٹ کر بھی اس شہر کی طرف نہیں دیکھے گا۔"

"وہ کس طرح؟"

مارینا نے ایک تلخ گھونٹ بھرا اور پلکیں جھکا کر بولی۔ "میں چاہتی ہوں کہ اسے آزاد کرنے سے پہلے آپ ایک دفعہ یہاں لائیں۔"

"ہوں!" ناظم اعلیٰ شرارت سے بولا۔ "تم میرے پہلو میں بیٹھ کر اس سے بات کرنا چاہتی ہو .... ہاں کئی سمجھدار عورتیں اپنے عاشقوں سے ایسے بھی نبٹتی ہیں .... ٹھیک ہے۔ اس چاند کو پہلو میں لانے کے لئے ہمیں سب منظور ہے' لیکن ٹھہرو۔ کیوں نہ ہم قید خانے ہی چلیں۔ ایک آدھ کوس کا تو فاصلہ ہے۔"

"جیسے آپ کی مرضی۔" مارینا نے کہا۔ وہ جانتی تھی کہ ناظم اسے اسد کی
حالت زار دکھا کر مزید خرزدہ کرنا چاہتا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک خوبصورت
بگھی' ناظم اعلیٰ اور مارینا کو قید خانے کی طرف لے جا رہی تھی۔ دو باوردی گھڑسوار
تانے آگے چل رہے تھے۔ ناظم اعلیٰ نے ٹھیک کہا تھا' قید خانہ زیادہ دور نہیں تھا۔
بھی زیادہ بڑی نہیں تھی۔ صرف مخصوص سیاسی قیدیوں کو یہاں رکھا جاتا تھا۔
پہریداروں نے ناظم اعلیٰ کی گاڑی دیکھ کر راستہ دیا۔ ڈیوڑھی سے ہوتی ہوئی بگھی
راہداری کے سامنے رکی۔ جیل خانے کا داروغہ خود بھاگا بھاگا پہنچا۔ ناظم اعلیٰ لمبا چغہ
ہوا اُتر آیا۔ جس وقت مارینا اُتر رہی تھی وہ داروغہ سے کہہ رہا تھا۔

"دیکھو کمال احسن' کل پکڑے جانے والے تین قیدیوں میں سے ایک کو میں
رہا ہوں .... لیکن اس کو رہا نہیں ہونا چاہیے۔ کیا سمجھے؟"

"بالکل سمجھ گیا جناب!" داروغہ بولا۔ "اسے یہاں سے نکلتے ہی دوبارہ پکڑ لیا جا
گا۔"

"ٹھیک سمجھے' یاد رکھنا یہ تینوں قیدی وزیر داخلہ کے علم میں آچکے ہیں۔ اگر
گرفتاری کے وقت قیدی مزاحمت کرے تو بے شک قتل کر دینا۔ بلکہ میرا تو خیال ہے
کی مصیبت آسان ہی کر دینا۔"

"جو حکم جناب۔" داروغہ مسکرایا۔

☆------☆------☆

اباقہ کو دوبارہ ہوش آئی تو وہ کوٹھڑی کے پتھریلے فرش پر پڑا تھا۔ قریب ہی
یورق اور اسد اللہ بھی موجود تھے۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے وہ دونوں بھی ہوش
آگئے۔ اباقہ کے سر پر چوٹ کا ابھار تھا۔ جب کہ وہ دونوں جسمانی طور پر محفوظ تھے لیکن
حفاظت تادیر برقرار نہ رہ سکی۔ جلد ہی انہیں تشدد اور ایذارسانی کے خوفناک شکنجے میں
دیا گیا۔ داروغہ جیل بنفس نفیس ان کی زبان کھلوانے کے لیے موجود تھا۔ وہ انہیں
کا جاسوس گردان رہا تھا اور ان کے منصوبے اور ان کے ساتھیوں کے متعلق جاننا چاہتا تھا۔
تشدد کا یہ عمل وقفے وقفے سے اب تک جاری تھا۔ خاص طور پر اسد اللہ پر
سختی کی گئی تھی۔ اس کے جسم اور چہرے پر چوٹوں کے گہرے نشان تھے لیکن اس
کے ہونٹ اس طرح سل گئے تھے کہ لگتا تھا دہن ہے ہی نہیں .... وہ ان کی اسیری
دوسری شام تھی۔ اسد اللہ کوٹھڑی کے فرش پر نڈھال پڑا تھا۔ یورق کو تنہائی میں
کرنے کے بعد ابھی واپس لایا گیا تھا۔ اباقہ بے چینی سے سلاخوں کے قریب ٹہل رہا

راہداری میں قدموں کی چاپ سنائی دی۔ پھر متحرک روشنیاں ان کی تاریک کوٹھڑی کی
بڑھنے لگیں۔ اباقہ نے دیکھا مارینا چند آدمیوں کے ساتھ چلتی ہوئی کوٹھڑی کی طرف
ہے۔ وہ ایک نہایت خوبصورت لباس پہنے ہوئے تھی۔ اس کے پہلو میں ایک
شخص تھا۔ چند محافظ اس کے ساتھ چل رہے تھے۔ مارینا کا جادوئی حسن دیکھ کر اباقہ
آنکھیں چمک اٹھیں۔ وہ سلاخوں سے آلگا۔ بارعب شخص نے پہریداروں سے کچھ کہا۔
پہریدار نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ اباقہ اور اسد اللہ کو بیڑیاں پہنائی گئی تھیں
پہریداروں نے اباقہ کو سہارا دے کر باہر نکالا۔ وہ محویت سے مارینا کی طرف دیکھ رہا
اس نے دیکھا کہ مارینا کا ہاتھ بارعب شخص کے ہاتھ میں ہے اور اس کے خوبصورت
سے عجب طرح کی بے رخی عیاں ہے۔ پھر مارینا نے بارعب شخص سے کچھ کہا اور
قدموں سے چلتی ہوئی اباقہ تک چلی آئی۔ چند لمحے وہ سر جھکائے جذبات پر قابو پانے
کوشش کرتی رہی پھر لرزاں آواز میں بولی۔

"اباقہ! چار آدمی یہ ہیں اور چار باہر ڈیوڑھی میں .... ڈیوڑھی یہاں سے کافی دور
ہے۔ اگر تم ان چار آدمیوں پر خاموشی سے قابو پالو تو باہر کھڑی ہوئی بگھی ہمیں نکلنے میں
دے سکتی ہے۔"

اباقہ نے پوچھا۔ "بگھی کے ساتھ کوئی سپاہی ہے؟"

مارینا بولی۔ "ہاں! دو گھڑسوار ہیں لیکن وہ بے حس و حرکت گھوڑوں پر بیٹھے ہیں۔
امید ہے وہ پیچھے مڑ کر نہیں دیکھیں گے۔"

"تمہارے پاس کوئی ہتھیار ہے؟"

"نہیں۔"

"کوئی بات نہیں۔" اباقہ نے مختصر جواب دیا۔ مارینا نے اس کی آنکھوں میں جھانکا
پھر سر جھکائے ہوئے واپس چلی گئی۔ بارعب شخص نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ ایک پہریدار
آگے بڑھا تاکہ اباقہ کی بیڑیاں کھول سکے .... وہ نہیں جانتا تھا وہ کس قیامت کو دعوت
دینے جا رہا ہے۔ وہ ایک طوفان کے بند کھولنے جا رہا تھا۔ سرزمین بغداد پر ایک صحرائی
بگولے کو ہوا دینے جا رہا تھا۔ اس نے نیچے جھک کر اباقہ کے پاؤں بیڑیوں سے آزاد کئے اور
مؤدب انداز میں ناظم اعلیٰ کے پیچھے جا کھڑا ہوا۔ ناظم اعلیٰ نے تحقیر آمیز انداز میں اباقہ کی
طرف دیکھا اور بولا۔ "تو آزاد ہے نوجوان۔"

اباقہ نے سر جھکایا اور سست قدموں سے دروازے کی طرف بڑھا۔ ناظم اعلیٰ کے
قریب سے گزرتے ہوئے اس کا فاصلہ تین گز کے قریب تھا۔ پھر دفعتاً اس کے جسم کی

بجلیاں کوندیں۔ اس نے جست بھری اور اُڑتا ہوا ناظم اعلیٰ کے عقب میں آیا۔ اس سے پہلے کہ محافظوں کے ہاتھ تلواروں تک پہنچتے وہ فرشتہ اجل کی طرح ناظم اعلیٰ کی شہ رگ پر مسلط ہو چکا تھا۔

ناظم اعلیٰ کی تلوار اب اسی کی گردن پر رکھی تھی۔ اباقہ کی ذرا سی جنبش اس کے سانس کا سلسلہ منقطع کر سکتی تھی' حالانکہ ماریتا کو سب کچھ معلوم تھا اور بڑے غور سے دیکھ رہی تھی لیکن اسے بھی پتہ نہیں چلا کہ کب اباقہ نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور ناظم اعلیٰ کے عقب میں آکر اس کی گردن دبوچ لی۔

"تلوار پھینک دو۔" اس کی سفاک آواز سنائی دی۔ ناظم اعلیٰ کو اباقہ کی شکل دکھائی نہیں دے رہی تھی لیکن سامنے کھڑے محافظوں کے چہرے یہ بتانے کے لیے کافی تھے کہ اسے گرفت میں لینے والے کے تاثرات نہایت خوفناک ہیں۔ ناظم اعلیٰ نے ہاتھ کے اشارے سے محافظوں کو تلواریں پھینکنے کا حکم دیا۔ اسی دوران سردار یورق بھی کوٹھڑی سے باہر نکل آیا تھا اس نے تمام تلواریں اکٹھی کیں اور ماریتا کے ساتھ مل کر نہایت پھرتی سے محافظوں کی مشکیں کسنے لگا۔ جونہی وہ اس کام سے فارغ ہوا اباقہ نے تلوار کا ایک بھرپور دستہ ناظم اعلیٰ کی کنپٹی پر رسید کر دیا۔ وہ لڑکھڑا کر اباقہ کے بازوؤں میں جھول گیا۔ اباقہ نے اسے آرام سے زمین پر لٹا دیا۔ اس وقت راہداری سے قدموں کی آواز آئی۔ ماریتا کے چہرے پر خوف کے تاثرات نظر آنے لگے۔ اباقہ تیزی سے آواز کی سمت بڑھا اور راہداری کے موڑ پر ایک کونے میں کھڑا ہو گیا۔ وہ دیوار سے کسی سائے کی طرح چپکا ہوا تھا۔ قدموں کی آواز لحہ بہ لحہ قریب آ رہی تھی۔ پھر آنے والا دکھائی دیا۔ وہ ایک موٹا تازہ سپاہی تھا اور تنہا تھا۔ اس نے اپنا "خود" لاپرواہی سے ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا اور جھومتا ہوا کوٹھڑیوں کی طرف بڑھ رہا تھا۔ کوٹھڑیوں کی صورت حال دیکھ کر وہ ٹھٹکا اور اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں حیرت سے پھیلنے کی کوشش کرنے لگیں۔ اس وقت اباقہ تیزی سے لپکا اور ناظم اعلیٰ کی طرح اس سپاہی کو بھی دبوچ لیا۔ سپاہی جو خاصا طاقتور تھا۔ خود کو چھڑانے کے لیے بُری طرح مچلا اباقہ چند لمحے اسے دبوچے کھڑا رہا۔ پھر جب اس کی مزاحمت بڑھی تو اباقہ نے نہایت اطمینان سے اس کا سر دیوار سے ٹکرا دیا۔ پہلے سپاہی کے ہاتھ سے آہنی ٹوپی گری پھر وہ خود بھی زمین بوس ہو گیا۔ یورق اور اباقہ نے کوٹھڑی میں گھس کر زخمی اسد کو سہارا دیا اور چاروں طرف طائرانہ نظر ڈالنے کے بعد جیل کے احاطے کی طرف بڑھے۔

راہداری کے سرے پر پہنچ کر انہوں نے دیکھا کہ بگھی وہیں موجود ہے لیکن دونوں

گھڑسوار گھوڑوں سے نیچے کھڑے گپیں ہانکنے میں مصروف ہیں۔ یہ صورت حال مخدوش تھی۔ اگر یہاں پر ان دونوں محافظوں کو قابو کرنے کی کوشش کی جاتی تو ڈیوڑھی میں موجود سپاہیوں کا متوجہ ہونا یقینی تھا۔ دوسری طرف یہ بھی امکان تھا کہ اس دوران کوٹھڑی کے سامنے بندھے ہوئے سپاہیوں میں سے کوئی آزاد ہو جاتا۔ ماریتا نے اس موقعے پر حاضر دماغی کا ثبوت دیا۔ اس نے اباقہ اور یورق کو اشارہ کیا اور وہ اسد کو لے کر کچھ پیچھے آ گئے اور ماریتا قدرے اونچی آواز میں باتیں کرنے لگی اور وہ تینوں اس کے ساتھ آگے بڑھنے لگے۔ محافظ یہ جان کر کہ ناظم اعلیٰ واپس آ رہا ہے جلدی سے گھوڑوں پر ایستادہ ہو گئے۔ اباقہ اور یورق نے آگے بڑھ کر اسد اللہ کو بگھی میں سوار کرایا پھر وہ تینوں بھی یکے بعد دیگرے اندر گھس گئے۔ ماریتا نے بگھی بان کو چلنے کا حکم دیا اور بگھی ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔ اب صرف ڈیوڑھی سے گزرنے کا مرحلہ باقی تھا۔ وہ دھڑکتے دلوں سے انتظار کرنے لگے۔ ڈیوڑھی پر موجود پہریداروں نے ناظم اعلیٰ کی بگھی دیکھی اور بلا تردد راستہ چھوڑ دیا۔ انہیں امید نہیں تھی کہ اتنی آسانی سے نکل جائیں گے۔ اب دو عدد گھڑسواروں اور بگھی بان سے پیچھا چھڑانے کا مسئلہ تھا اور یہ کام جلد از جلد کرنا تھا۔ جیل خانے میں کسی بھی وقت ان کا پول کھل سکتا تھا۔ بگھی اب درمیانی رفتار سے ناظم اعلیٰ کے محل کی طرف جا رہی تھی۔ اباقہ اور سردار یورق جانتے تھے کہ اگر بگھی ناظم کی رہائش گاہ تک پہنچ گئی تو جان بچانا اتنا آسان نہیں رہے گا۔ گزرنے والا ہر لحہ انہیں گرفتاری سے قریب تر کر رہا تھا۔ آخر ایک نسبتاً کم رونق والی جگہ دیکھ کر یورق نے ماریتا سے کہا کہ وہ بگھی بان کو روکنے کا کہے۔ منصوبے کے مطابق ماریتا نے بڑی گھبرائی ہوئی آواز میں بگھی بان سے کہا کہ بگھی روکو' ناظم اعلیٰ بے ہوش ہو گئے ہیں۔ بگھی بان نے گھوڑوں کی لگامیں کھینچیں۔ پہلو بہ پہلو چلتے ہوئے گھڑسوار بھی رک گئے۔ اسد اللہ دو نشستوں کے درمیان اوندھا لیٹ گیا۔ بگھی بان نے مسلح گھڑسواروں کو مطلع کیا۔ انہوں نے یکے بعد دیگرے اندر جھانکا۔ یورق نے خود کو ایک نشست کی اوٹ میں چھپا لیا۔ اباقہ کو دیکھ کر انہیں ذرا سا شک ہوا' لیکن ماریتا کی گھبرائی ہوئی آواز نے انہیں اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ وہ اسد اللہ کے اوپر جھکی ہوئی تھی اور اسے سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اباقہ اور یورق کا خیال تھا کہ گھڑسوار "ناظم اعلیٰ" کو دیکھنے اندر داخل ہوں گے اور وہ بہ آسانی ان پر قابو پا لیں گے لیکن ایک گھڑسوار تیز لہجے میں بگھی بان سے بولا۔

"چلو جلدی۔ علاج گاہ کی طرف چلو۔"

"نہیں۔" ماریتا تیزی سے بولی۔ "یہ تو شاید .... ختم ہو چکے ہیں۔"

"کیا؟" دونوں محافظوں کی زبان سے بیک وقت نکلا۔ وہ جلدی سے جھک کر اندر
داخل ہو گئے۔ اس مختصر سی جگہ میں گھسنا ان کے لئے قیامت بن گیا۔ اباقہ اور یورق نے
ایک ایک محافظ کو دبوچ لیا۔ اباقہ کی گرفت میں آنے والے محافظ کی گردن ایک جھٹکے سے
ٹوٹ گئی۔ جب کہ دوسرا کچھ دیر تڑپنے مچلنے کے بعد دم گھٹ کر بے ہوش ہو گیا۔ اب
صرف بگھی بان تھا اور اس سے نبٹنا کچھ ایسا مشکل مسئلہ نہیں تھا۔ وہ سیدھا سادا عمر
غلام دکھائی دیتا تھا۔ ماریتا نے اسے فوراً اندر آنے کو کہا۔ چند ہی لمحے بعد اس کی حوا
باختہ شکل عقبی حصے میں دکھائی دی۔ اباقہ نے بڑی صفائی سے اسے اندر گھسیٹ لیا۔ یورق
کی زبان سے ایک غلیظ گالی برآمد ہوئی اور اس نے تلوار کا بھرپور دستہ بگھی بان کی کنپٹی پر
مارا۔ وہ اباقہ کے ہاتھوں میں جھول گیا۔ اباقہ نے اسے دونوں محافظوں کے اوپر ڈال دیا۔
ماریتا جو یورق کی گالی پر کافی خجل ہو رہی تھی یہ دیکھ کر مطمئن ہوئی کہ اباقہ یا اسد میں
کسی کو بھی اس گالی کا پتہ نہیں چلا۔

چند لمحوں کے اندر جو کچھ بگھی میں ہوا' باہر کسی کو اس کی خبر نہیں ہوئی۔ اباقہ نے
نشستوں کی دوسری جانب بگھی بان کی جگہ سنبھالی اور اس کے چابک کا اشارہ پا کر گھوڑے
تیزی سے نشیب میں دوڑنے لگے۔ تھوڑا آگے جا کر اباقہ بائیں جانب مڑ گیا۔ یہ ایک
سنسان سڑک تھی اور جوں جوں وہ آگے بڑھتے گئے سنسان تر ہوتی گئی۔ تاریکی میں سڑک
کے دونوں جانب کھجور کے بلند درخت سر جھکائے کھڑے تھے۔ وہ چاروں جانتے تھے
ناظم اعلیٰ کی بگھی ان کے لئے بہت بڑا خطرہ ہے۔ اس بگھی کے ساتھ وہ کسی بھی وقت
سپاہیوں کی نظر میں آ سکتے تھے اور اس بات کا انہیں یقین تھا کہ اب تک ان کی تلاش
شروع ہو گئی ہو گی۔

بالآخر سنسان سڑک پر اباقہ اور یورق کو کسی گھوڑا گاڑی کی متحرک روشنی دکھائی
دی۔ دونوں نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور سنبھل کر بیٹھ گئے
دونوں گاڑیوں کا درمیانی فاصلہ بتدریج کم ہوتا چلا گیا۔ آخر اباقہ نے بگھی روک لی۔ ما
اندر سے نکلی اور ہاتھ کے اشارے سے دوسری گاڑی کو رکنے کا اشارہ کرنے لگی۔ اباقہ اور
یورق کسی بھی کارروائی کے لئے تیار تھے۔ یہ دو گھوڑوں والی ایک خستہ حال گاڑی تھی۔
مدھم سی زرد روشنی میں گاڑی بان کا چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔ وہ ایک ادھیڑ عمر شخص تھا
حلیے سے کوئی گوالا نظر آتا تھا۔ محسوس ہوتا تھا وہ گاڑی میں تنہا ہے۔ یورق کا کام اور
آسان ہو گیا تھا۔ وہ آرام سے باہر نکلا اور ٹہلتا ہوا گاڑی بان کے سر پر پہنچ گیا۔ اباقہ کا
تھا اب وہ گاڑی بان کو اٹھا کر کنارے کے درختوں میں پھینک دے گا۔ پھر یا تو وہ بے ہو

جائے گا یا اس کی ایک آدھ ہڈی پسلی ٹوٹ جائے گی .... لیکن نہ جانے کیوں اباقہ کو
ی بان کا چہرہ کچھ شناسا سا لگ رہا تھا۔ وہ ذہن پر زور دینے لگا کہ یہ شکل کہاں دیکھی ہے۔
وہ پکارا۔ "رک جاؤ سردار!" یورق نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ اباقہ بولا۔ "اس
شخص کو پہچانتے ہو؟"

یورق نے گھوم کر گاڑی بان کی طرف دیکھا۔ چند لمحے بعد وہ زور سے پکارا۔ "ارے
ے یہ تم ہو۔"

اب گاڑی بان بھی اسے پہچان چکا تھا۔ وہ "سردار یورق" کہتا ہوا گاڑی سے نیچے اتر
آیا۔ اس بوڑھے کو وہ دونوں اچھی طرح جانتے تھے .... وہ یاکی کا باپ تھا۔ وہ ایک غار
میں کئی روز ان کے لئے کھانا لے کر آتا رہا تھا۔ اباقہ کو دیکھ کر وہ تیزی سے اس کی طرف
بڑھا اور اسے سینے سے لگا کر بھینچ لیا۔ دونوں محویت سے باتیں کرنے لگے۔ اس دوران
یورق نے ناظم اعلیٰ کی بگھی سڑک سے ہٹا کر درختوں میں چھپا دی۔ بوڑھے نے اباقہ کو بتایا
کہ چند ماہ پہلے وہ اور اس کی بیٹی ایک قافلے کے ساتھ بغداد پہنچے تھے۔ یہاں اس کے پاس
بکریوں کا ایک گلہ ہے اور وہ ان کا دودھ دوہ کر بغداد کے مضافات سے شہر میں پہنچاتا
ہے۔ اس کی باتوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ یہاں کافی خوشحال ہے۔

اباقہ نے پوچھا۔ "بابا' یاکی کہاں ہے؟"

یاکی کے نام پر بوڑھا ایک دم اُداس ہو گیا۔ کچھ لمحے وہ اباقہ کو دیکھتا رہا پھر بولا۔
"بیٹے' وہ بیمار رہتی ہے۔ اب تو میں اس کی طرف سے مایوس ہو گیا ہوں۔ اس کی کچھ سمجھ
نہیں آتی۔"

اباقہ کے پوچھنے پر بوڑھے نے بتایا کہ اس وقت وہ گھر میں ہے۔ اباقہ نے کہا۔ "چلو
ہم تمہارے ساتھ گھر چلتے ہیں۔"

ماریتا بولی۔ "لیکن اباقہ' اس وقت اسد اللہ کے چچا کو ہماری ضرورت ہے میں انہیں
بری حالت میں ایک تہہ خانے میں چھوڑ کر آئی تھی۔ پتہ نہیں ان کے ساتھ بے رحم
ناظم نے کیا سلوک کیا ہو گا۔" پھر وہ وہیں کھڑے کھڑے اباقہ اور یورق کو ساری بات بتانے
لگی کہ کس طرح وہ تہہ خانے سے نکلی اور ناظم کے چنگل میں پھنستے پھنستے بچی۔

اسد کے ساتھ ساتھ اباقہ اور یورق کے چہرے پر بھی تشویش کے سائے منڈلانے
لگے۔ وہ چاروں بوڑھے کی گھوڑا گاڑی میں داخل ہوئے اور اندرونِ شہر کا رخ کیا۔ بوڑھا
شہر کے راستوں سے بخوبی واقف تھا۔ وہ انہیں نسبتاً محفوظ راستوں سے گزارتا ہوا دجلہ کی
سمت لے گیا۔ بغداد کی مساجد سے عشاء کی اذان بلند ہو رہی تھی۔ دریا کے کنارے

متحرک روشنیاں پانی میں منعکس ہو کر خوبصورت منظر پیش کر رہی تھیں۔ مختلف پُر رونق راستوں سے گزرتے وہ قوام الدین کی رہائش گاہ کے سامنے پہنچے لیکن وہی ہوا جس کا اباقہ اور یورق کو اندیشہ تھا۔ گاڑی کے اندر سے بغور جائزے کے بعد انہیں پتہ چلا کہ قوام الدین کے گھر کے گرد مسلح افراد موجود ہیں۔ وہ سادا لباس پہنے گرد و پیش پر گہری نگاہ رکھے ہوئے تھے۔ اس کا مطلب تھا ان کے جیل سے فرار کی خبر یہاں تک پہنچ چکی تھی۔ ناظم اعلیٰ نے اپنے بہی خواہ سیف الدین کی حفاظت اور ان کی گرفتاری کے لئے سادہ لباس والے متعین کر دیئے تھے .... اباقہ بری طرح پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ اگر صرف اس کے بس میں ہوتا تو وہ وندناتا ہوا اندر گھس جاتا پھر چاہے کتنا بھی کشت و خون ہوتا وہ سیف الدین کی گردن دبا کر چھوڑتا لیکن اس وقت وہ تنہا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ کئی دوسری زندگیاں بھی وابستہ ہو گئی تھیں۔ وہ کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔

باہم مشورے سے وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ فی الوقت قوام الدین کی کوئی مدد نہیں کی جا سکتی۔ اگر صرف اس کا بیٹا ہی اس کا دشمن ہوتا تو کوئی بات نہیں تھی یہاں تو ناظم اعلیٰ اور پوری بغداد انتظامیہ اس کی دشمن تھی۔ اب ناظم اعلیٰ یا وزیر داخلہ کے خلاف وہ شکایت لے کر کہاں جاتے اور اگر جاتے تو یقینی بات تھی خود ہی دھر لئے جاتے۔ آخر انہوں نے واپس جانے کا فیصلہ کیا۔ انہی راستوں سے ہوتے ہوئے وہ شہر کی حدود سے نکل آئے۔

مضافاتی علاقے میں چند دوسرے مکانوں میں گھرا ہوا وہ چھوٹا سا مکان تھا۔ بوڑھے نے دروازے پر دستک دی۔ چند لمحے بعد دروازہ کھلا۔ ایک لڑکی مٹی کا دیا ہاتھ میں لئے دہلیز پر نظر آئی۔ دیے کی لَو کی طرح وہ بھی کمزور اور زرد نظر آ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں عجب یاسیت بھری ہوئی تھی۔ اس نے حیرت سے مہمانوں کو دیکھا پھر اس کی نظر اباقہ کے چہرے پر پڑی اور اس کا منہ کھلا رہ گیا۔ دیا اس کے ہاتھوں میں لرزا اور تاریکی میں گم ہو گیا۔ اس کے منہ سے لرزتی ہوئی آواز نکلی۔ "اباقہ۔" چند لمحے خاموشی رہی۔ پھر لڑکی جیسے سنبھل کر اندر بھاگی۔ اس نے طاق میں رکھا ایک دوسرا دیا اٹھایا اور بھاگتی ہوئی واپس آئی۔ اب اس کا چہرہ ایک اور ہی منظر پیش کر رہا تھا۔ آنکھوں میں آنسو لرزاں تھے اور چہرہ مسرت آمیز حیرت میں ڈوبا ہوا تھا۔ بوڑھا بولا۔ "دیکھو بیٹی! تیرے مہمانوں کو کہاں سے پکڑ کر لایا ہوں۔" یاکی کو شاید آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ بے ساختہ اباقہ کو تکنے لگی۔ بکری کا ایک سفید بچہ صحن کے درمیان کھڑا حیرت سے مہمانوں کی صورتیں تک رہا تھا۔

☆------☆------☆

تین چار روز ان لوگوں نے مکمل آرام کیا۔ یاکی کی خوشی دیدنی تھی۔ اس کی زندگی میں جیسے بہار آ گئی تھی۔ پاؤں زمین پر ہی نہیں ٹکتے تھے۔ ہر وقت پروانے کی طرح اباقہ کے گرد منڈلاتی رہتی تھی۔ اس کا بس چلتا تو وہ لقمہ بن جاتی جو اباقہ کھاتا تھا۔ وہ چادر بن جاتی جس پر وہ سوتا تھا۔ وہ ہوا بن جاتی جس میں وہ سانس لیتا تھا۔ وہ مہمانوں کے قریب کھڑی ہمہ وقت ان کے ایک اشارے کی منتظر رہتی۔ ان چار پانچ دنوں ہی میں اس کے چہرے کی شادابی اور آنکھوں کی چمک لوٹنے لگی تھی۔ اس کا جسم پہلے سے کچھ دبلا ہو چکا تھا لیکن یہ دبلا پن بھی پُرکشش تھا۔ مارینا کے ساتھ اس کی گاڑھی چھننے لگی تھی۔ وہ ایک دوسرے سے خوب باتیں کرتیں' لیکن اباقہ نے محسوس کیا تھا کہ جب سے وہ یہاں آئے تھے مارینا کی آنکھوں میں عجیب سی افسردگی عود کر آئی تھی۔ شاید یاکی کو دیکھنے کے بعد ایسا ہوا تھا۔ بہرحال اپنے رویے سے اس نے کسی کو کچھ محسوس نہیں ہونے دیا تھا۔

ایک روز صبح کے وقت بوڑھا شہر میں دودھ پہنچا کر واپس آیا تو اباقہ گھر سے تھوڑی دور ایک کھیت کے منڈھیر پر تنہا بیٹھا تھا۔ اس نے آج پھر وہی خواب دیکھا تھا۔ درویش نما شخص دریا کے کنارے بیٹھا تھا۔ اس کے ہونٹ ہل رہے تھے' لیکن اباقہ کو کچھ سنائی نہیں دیتا تھا۔ وہ ٹانگوں کی پوری قوت سے اس کے قریب پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ آخر اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔ بستر چھوڑ کر وہ اس کھیت کے منڈھیر پر آ بیٹھا تھا اور اب گہری سوچ میں غلطاں تھا۔

یاکی کا باپ گھوڑا گاڑی کھڑی کر کے اس کے قریب ہی آن بیٹھا تھا۔ اباقہ نے پوچھا۔ "بابا شہر کا کیا حال ہے۔"

بوڑھے نے کہا۔ "بیٹے! میرا خیال ہے تمہیں کم از کم دو تین روز مزید انتظار کرنا ہے۔ ابھی تلاش ختم نہیں ہوئی۔ میں آج دجلہ کی طرف گیا تھا۔ قوام الدین کے گھر کے سامنے بھی پہرہ ابھی موجود ہے۔"

اباقہ خاموش بیٹھا رہا۔ بوڑھا بولا۔ "یاکی' تمہاری بات مانتی ہے۔ تم ہی اسے کچھ سمجھاؤ' کیوں زندگی برباد کر رہی ہے۔"

اباقہ نے پوچھا۔ "میں کیا سمجھاؤں بابا۔"

بوڑھا بولا۔ "دو ڈھائی ماہ پہلے کی بات ہے' اس کے لیے ایک بہت اچھا رشتہ آیا۔ شاید تم یقین نہیں کرو گے۔ وہ ایک بہت بڑا رئیس زادہ ہے۔ شہر میں کئی محل اور باغات اس کی ملکیت ہیں۔ لاکھوں میں کھیلتا ہے۔ اس نے یاکی کو میرے ساتھ شہر میں دیکھا اور پسند کر لیا۔ چند روز بعد اس نے اپنے بزرگوں کو میری اس کٹیا میں بھیجا۔ انہوں نے بڑی

عاجزی سے یاکی کا ہاتھ مانگا۔ مجھ میں تو اتنی ہمت نہیں تھی کہ ان معزز لوگوں سے آ
بھی ملا کر بات کرتا' لیکن اس لڑکی کی خاطر مجھے انہیں مایوس لوٹانا پڑا۔ میں نے کہا کہ
کر بتاؤں گا۔ اس کے بعد میں نے بہت جتن کیے کہ یاکی اس رشتے پر رضا مند ہو جا
لیکن بے وقوفی کی انتہا دیکھو کہ وہ مسلسل انکار کر رہی ہے۔ وہ لوگ اب بھی تقاضا کر رہے
ہیں' لیکن میں کوئی جواب نہیں دے پاتا۔ وہ نہایت شریف لوگ ہیں کہ بار بار میر
دروازے پر آجاتے ہیں ورنہ یہاں کے رئیس زادے کیا نہیں کر سکتے۔ کچھ ہی روز پہلے
بستی کی ایک لڑکی ایسے ہی چکر میں عزت گنوا چکی ہے۔"

اباقہ غور سے بوڑھے کی بات سنتا رہا۔ اسے سمجھ آرہی تھی کہ بوڑھا کیا کہہ رہا
ہے۔ آخر اس نے پُر عزم لہجے میں کہا۔

"تم بے فکر رہو بابا۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ یاکی وہیں شادی کرے گی جہاں تم چا
گے۔"

اسی دوران سردار یورق اور اسد اللہ بھی کھیت کی طرف آنکلے۔ گفتگو کا موضوع
بدل گیا۔ اسد اللہ نے بوڑھے سے شہر کی صورت حال دریافت کی۔ پھر چاروں مل
مشورے کرنے لگے۔ آخر فیصلہ ہوا کہ کل یاکی کا باپ جب شہر جائے گا تو قوام الدین کے
گھر کے متعلق معلومات حاصل کرے گا۔ اسد کو اپنے چچا کی بہت فکر تھی' لیکن اس سے
بھی زیادہ فکر ماریتا کو تھی۔ وقت رخصت وہ اس سے وعدہ کرکے آئی تھی کہ بہت جلد
لے کر آئے گی' لیکن آج پانچواں روز تھا وہ اس بدنصیب بوڑھے کے لیے کچھ نہیں کر
سکتے تھے۔

اسد کے زخم اب کافی بہتر تھے اگلے روز وہ چاروں بے چینی سے یاکی کے ابا کا
انتظار کر رہے تھے۔ وہ دوپہر کے وقت شہر سے واپس آیا۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ کوئی
اہم خبر لایا ہے' لیکن یہ بھی اندازہ ہو رہا تھا کہ خبر زیادہ اچھی نہیں۔ یہ خبر قوام الدین سے
متعلق تھی بوڑھے نے بتایا کہ لوگوں سے پتہ چلا ہے قوام الدین مر گیا ہے۔ وہ مخبوط
الحواس تھا کچھ روز پہلے اس پر پاگل پن کا شدید دورہ پڑا۔ اسے ایک کمرے میں بند کر دیا
گیا۔ وہیں اس نے دیواروں سے سر ٹکرا ٹکرا کر جان دے دی۔

چاروں سکتے کے عالم میں یہ روح فرسا اطلاع سنتے رہے۔ خاص طور پر اسد اس
سے بہت متاثر ہوا۔ ماریتا کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔ وہ اچھی طرح سمجھ رہے تھے
سفاک بیٹے نے باپ کی جان لے لی ہے۔ اس نے اسے قتل کر دیا تھا۔ اباقہ کے چہرے پر
جھلاہٹ نمایاں تھی۔ اس کی سیلانی فطرت اب کچھ کر گزرنے کے لیے بے قرار تھی۔ ا

اس نے گھن گرج کے ساتھ ساتھیوں کو مخاطب کیا۔

"میں بغداد جا رہا ہوں۔"

"کس لیے؟" یورق نے پوچھا۔

"جس لیے میں یہاں آیا ہوں۔ میں سلطان کو ڈھونڈوں گا۔"

وہ سمجھ گئے کہ اباقہ کا خون ایک بار پھر جوش مار گیا ہے۔ اب اسے روکنا مشکل تھا۔
ان کا بھی اب رکنا فضول تھا۔ وہ کب تک اس دور دراز مکان میں دبکے بیٹھے رہتے۔ تینوں
نے اپنی پناہ گاہ سے نکلنے کا فیصلہ کیا۔ صلاح مشورے سے وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ انہیں کسی
نہ کسی طرح حکام بالا تک رسائی حاصل کرنی چاہیے۔ اسی صورت میں حالات کا رخ ان کے
حق میں ہو سکتا ہے۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ جس شخص سے وہ رابطہ قائم کریں وہ
دار الخلافہ میں بلند مرتبت ہو اور ہو بھی خوارزم شاہ کا حامی۔ خلیفہ کے بارے میں کہا جاتا
تھا کہ اس کے دل میں خوارزم شاہ کے لیے نرم گوشہ ہے لیکن اگر وہ وزیر اعظم یا خلیفہ
تک پہنچنا چاہتے تو یہ ممکن نہیں تھا۔ یقیناً انہیں راستے میں ہی کہیں پکڑ لیا جاتا۔ اس مسئلے
کا ایک حل تھا۔ بغداد کی ایک اہم سماجی شخصیت اور جید عالم دین شیخ وحید الدین کو اسد
جانتا تھا۔ نہ صرف وہ اپنے حلقے میں مقبول تھے بلکہ خلیفہ مستنصر کے دربار میں بھی ان
کی بات سنی جاتی تھی۔ اسد اللہ کا خیال تھا کہ اگر کسی طرح وہ ایک بار شیخ وحید الدین کے
پاس پہنچ گئے تو پھر ان پر ہاتھ ڈالنا آسان نہیں رہے گا۔ سردار یورق کو بھی یہی تجویز پسند
آئی لیکن اباقہ کا ذہن کہیں اور پہنچا ہوا تھا۔ اس کے لیے بغداد میں دجلہ کے سوا کوئی چیز
نہیں تھی۔ وہ دریا کے کنارے دور تک گھومنا چاہتا تھا۔ اس کی سفید ساکت آنکھوں
میں کوئی خواب اٹک کر رہ گیا تھا۔

اگلے روز علی الصبح یورق' اسد اللہ اور اباقہ بغداد کی طرف روانہ ہوئے۔ ان کی
منزل مختلف تھیں۔

سردار یورق اور اسد شمالی بغداد میں جا رہے تھے جہاں اسد کو وحید الدین کا گھر
ڈھونڈنا تھا جبکہ اباقہ دریا کی سمت جا رہا تھا۔ راستے میں ایک جگہ یاکی کے باپ نے اسد اور
یورق کو اتار دیا۔ اباقہ بیٹھا رہا۔ آخر وہ دجلہ کنارے پہنچ گئے۔ یہاں اباقہ بھی اتر گیا۔ اس
نے اپنے لمبے بال ایک ٹوپی میں چھپا رکھے تھے۔ جسم پر قرینے کا لباس تھا پھر بھی اس کا
وحشی پن چھپائے نہیں چھپتا تھا اور شاید وہ چھپانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ وہ بڑی آزادی سے
دریا کے کنارے کنارے چلنے لگا۔ سورج لمحہ بہ لمحہ بلندی پر آ رہا تھا۔ دھوپ چڑھنے کے
ساتھ آمدورفت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اباقہ کنارے کنارے دور مشرق کی طرف نکل

گیا۔ ایک سنسان جگہ سے اس نے کشتی میں دریا پار کیا اور دوسرے کنارے پر ٹہلتا
واپس آگیا۔ جب وہ دوبارہ شہر کے وسط میں پہنچا دوپہر ہو چکی تھی۔ ایک بار پھر وہی
اس کی نگاہوں کے سامنے تھا جو چند روز پہلے اس نے قوام الدین کے گھر' ایک کھڑکی
دیکھا تھا۔ سطح آب پر چھوٹی چھوٹی کشتیاں تیر رہی تھیں۔ دھوپ پانی پر اشرفیاں سی بکھ
رہی تھی۔ رنگین آنچل لہرا رہے تھے۔ ایک جگہ کوئی شعبدے باز کرتب دکھانے
مصروف تھا۔ اس کے گرد بے فکرے تماشائی ٹھٹ لگائے کھڑے تھے۔ ایک جانب ا
سپیرا بین کی دھن پر سانپوں کو نچا رہا تھا۔ اباقہ کنارے پر کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی دور چند باورد
سپاہی مؤدب انداز میں کھڑے تھے۔ ایک رنگین و مزین چھتر کے نیچے کچھ خوش
خواتین بیٹھی تھیں۔ قریب ہی چند بچے کھیل رہے تھے۔ باوردی سپاہیوں کی موجودگی
اندازہ ہوتا تھا کہ یہ کسی اعلیٰ عہدے دار کا حرم ہے۔ اباقہ نے ایک نظر خواتین کی طر
دیکھا تو وہ اسی کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ شاید اس کے ڈیل ڈول پر تبصرہ کرنے
مصروف تھیں۔ ان کی آنکھوں میں دلچسپی کے آثار تھے۔ یہ دلچسپی سپاہیوں کو بھی اس
طرف متوجہ کر سکتی تھی۔ اباقہ نے آگے بڑھ جانا مناسب سمجھا' لیکن اس وقت ا
خوفناک چیخیں سنائی دیں۔ اس نے گھوم کر دیکھا ایک لرزہ خیز منظر اس کی آنکھوں
سامنے آیا۔ قریباً پندرہ بیس سانپ تیزی سے لہراتے ہوئے مختلف اطراف میں بڑھ ر
تھے۔ مرد عورتیں اور بچے چلاتے ہوئے چاروں طرف بھاگ رہے تھے۔ ابھی تھوڑی د
پہلے جہاں سپیرا تماشہ دکھا رہا تھا وہاں چند الٹی ہوئی پٹاریاں پڑی تھیں۔ کچھ پتہ نہیں تما
چند لمحوں میں کیا حادثہ پیش آیا کہ تماشہ دکھانے والا موت کے منہ میں چلا گیا۔ تماشہ د
والے خود تماشہ بن گئے اور زہریلے سانپ آزاد ہو گئے۔ مزین چھتر کے نیچے بھی ابل
گئی۔ اباقہ نے ایک باوردی سپاہی کو چلا کر زمین بوس ہوتے دیکھا۔ پھر اسے چھتر کے
کوئی دکھائی نہیں دیا' لیکن .... نہیں چھتر خالی نہیں تھا۔ ایک عورت اوندھے
زمین پر پڑی تھی اور ایک ڈھائی تین برس کی بچی اس کے قریب کھڑی رو رہی تھی
عورت کو کسی سانپ نے کاٹ کھایا تھا یا وہ بھگدڑ میں کچلی گئی تھی۔

ایک دلدوز منظر اباقہ کے سامنے تھا۔ بیسیوں سانپ عورت اور بچے کے گرد ر
رہے تھے اور دور دور کوئی شخص دکھائی نہیں دیتا تھا۔ دریا کے دوسرے کنارے پر لوگوں
جم غفیر نظر آ رہا تھا۔ کشتی [illegible] سہمے ہوئے کنارے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ان کی کشتیا
خود بخود پانی میں بہتی جا رہی تھیں۔ اباقہ کو لوگوں کا اس درجہ خوفزدہ ہونا سمجھ میں
آیا۔ لوگ تو لوگ مسلح سپاہی بھی بھاگ گئے تھے .... اس نے تلوار نکالی اور سانپوں

پھلانگتا ہوا عورت اور بچے کی طرف بڑھا۔ دو اژدھے بچے کے بالکل قریب پہنچ چکے تھے۔
دفعتاً اباقہ کو ایک چیز نظر آئی اور وہ لوگوں کے حد درجہ خوف کا سبب جان گیا۔ اس نے
ایک اڑتی ہوئی چیز دیکھی۔ خدا کی پناہ یہ ایک اڑنے والا سانپ تھا۔ اباقہ نے سن رکھا تھا
کہ ایسے سانپ ہوا میں پرواز کر کے مدمقابل کی پیشانی پر ڈنک مارتے ہیں اور ان کا ڈنک
شکار کو ایک لمحے میں عازم اجل کر دیتا ہے۔ وہی چھوٹا سا سانپ چھتر کے ارد گرد اڑا میں بھر
رہا تھا۔ اباقہ ایک لمحے کے لیے ٹھٹکا .... لیکن پھر تیر کی طرح بچے کی طرف لپکا ....
اژدھے اب بچے کے پاؤں کے نیچے رینگ رہے تھے وہ رو رو کر ماں کو جگانے کی کوشش کر
رہا تھا۔ اباقہ کی تلوار چمکی اور دونوں اژدھے یکے بعد دیگرے ٹکڑوں میں تبدیل ہو گئے۔
اباقہ کی نگاہ اڑنے والے سانپ کو ڈھونڈ رہی تھی۔ پھر یہ دیکھ کر اس کے رونگٹے کھڑے ہو
گئے کہ وہ ایک گز کے فاصلے پر چھتر کے بانس سے لپٹا ہوا تھا۔ اس کا زرد ڈنک تیزی سے
متحرک تھا۔ اباقہ نے اپنی نگاہیں اس پر جما دیں تلوار دھیرے دھیرے بلند کی لیکن اس سے
پہلے کہ وہ وار کرتا' سانپ نے چھلانگ لگائی۔ اباقہ نے پھرتی سے سر جھکایا۔ ایک تیر سا اس
کے قریب سے گزر گیا۔ بلا کی پھرتی سے اباقہ مڑا۔ سانپ اب مردہ سپاہی کی پیٹھ پر بیٹھا
تھا۔ وہ کسی بھی لمحے اچھل کر پھر اباقہ پر حملہ آور ہو سکتا تھا۔ واقعی یہ ایک خوفناک احساس
تھا۔ اباقہ کی عقابی نگاہیں سانپ کی ہر جنبش دیکھ رہی تھیں۔ کوئی چیز اس کے پاؤں سے لپٹی
ہوئی تھی۔ اباقہ جانتا تھا یہ روتی ہوئی معصوم بچی ہے۔ وہ اس کی ٹانگ کو اپنا آخری سہارا
جان کر اس سے لپٹ گئی تھی اور اباقہ جانتا تھا اسے اس بچی کو بچانا ہے۔ اس کے ہاتھ
تلوار پر تھے اور پتلیاں ایک نقطے پر مرکوز ہو گئی تھیں۔ وہ جانتا تھا بچی اسے پکار رہی ہے
سانپ چاروں طرف سے بڑھ رہے ہیں۔ لوگوں کی ڈری ڈری چیخیں بلند ہو رہی ہیں' لیکن
اس کی تمام تر توجہ سانپ کی آنکھوں پر تھی۔ وہ ان لمحوں کی قدر و قیمت جانتا تھا۔ پھر ایک
ایسی حرکت سے جسے انسانی آنکھ دیکھنے سے قاصر رہے سانپ نے اپنی جگہ سے حرکت کی۔
اباقہ کی تلوار برق کی طرح چمکی اور ہوا میں سانپ کے دو ٹکڑے ہو گئے تب اباقہ نے چیختے
چلاتے بچے کی طرف دیکھا۔ ایک چتلبری ناگن دو سنپولیوں کے ساتھ بے حس و حرکت
پڑی عورت کے قریب پہنچ چکی تھی۔ اباقہ نے آگے بڑھ کر سنپولیوں کو کچل دیا اور پے
در پے واروں سے ناگن کے ٹکڑے کر دیے۔ گھڑ سوار سپاہیوں کا ایک دستہ تلواریں لہراتا
اور شور مچاتا موقع پر پہنچ چکا تھا۔ انہوں نے ارد گرد رینگتے کچھ سانپوں کو مار ڈالا باقی سانپ
غائب ہو چکے تھے۔

اباقہ نے عورت کو اٹھایا وہ زندہ تھی۔ دہشت سے یا گرنے سے بے ہوش ہو گئی

تھی۔ چند لمحے بعد دو معزز جبہ پوش اس کی طرف بڑھے۔ ان میں سے ایک خلیفہ مستنصر باللہ کا بیٹا شہزادہ معتصم تھا۔ اس نے بڑی محبت سے اباقہ کا کندھا تھپکا اور شاباش دی۔ جلد ہی اباقہ کے گرد لوگوں کا ہجوم ہو گیا۔ دوسرے کنارے سے بھی دھڑا دھڑ کشتیاں پہنچ رہی تھیں۔ لوگ اسے قریب سے دیکھنے کے خواہاں تھے۔ اس کی جرأت اور دلیری کا ذکر ہر زبان پر تھا۔ اباقہ کا چہرہ تعریفی نگاہوں اور کندھے تھپکیوں کی زد میں تھے۔ ایک ہی واقعے نے اسے لمحوں میں کہاں سے کہاں پہنچا دیا تھا۔ اسے ایک بڑے جلوس کی شکل میں شہر کے اندر لایا گیا۔ جب یہ جلوس شہر کے نامونیہ چوک میں پہنچا اسے پتہ چلا کہ خلیفہ المسلمین نے اسے شرفِ باریابی بخشا ہے۔ وہ اس شخص سے ملنا چاہتے ہیں جس نے ان کی پیاری پوتی کی جان بچائی ہے۔

☆ ------ ☆ ------ ☆

سردار یورق اور اسد اللہ بالآخر شیخ وحید الدین کی رہائش گاہ ڈھونڈنے میں کامیاب رہے۔ اسد نے دربان کے ذریعے رقعہ اندر پہنچایا۔ شیخ صاحب کچھ مہمانوں سے مصروف گفتگو تھے۔ اسد اور یورق کو نشست گاہ میں بٹھا دیا گیا۔ دوپہر سے کچھ پہلے شیخ صاحب فراغت پا کر ان سے ملنے آئے۔ وہ درمیانہ قد اور مضبوط جسم کے مالک تھے۔ چہرے کے جلال کے باوجود وہ ایک مہربان شخصیت دکھائی دیتے تھے۔

انہوں نے اسد کی ساری بات سنی۔ اسد نے بتایا کہ ناظم اعلیٰ وزیر داخلہ کے ساتھ ملی بھگت کر کے غیر قانونی پکڑ دھکڑ میں مصروف ہے اور کئی لوگ اس کی خود ساختہ جیل میں اذیتیں جھیل رہے ہیں۔ شیخ وحید الدین نے تحمل سے ان کی بات سنی پھر کہنے لگے۔

"نوجوان! یہ سب باتیں ہمیں معلوم ہیں' لیکن حکومت کے اندر اور باہر ایک مضبوط گروہ ہر قیمت پر جلال الدین کی مخالفت کا تہیہ کیے ہوئے ہے۔ اگر اس مسئلے کو چھیڑا گیا تو آگ بھڑک اٹھے گی۔ بہر حال میں تمہاری روئیداد سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ میں کوشش کروں گا کہ آج کسی وقت خلیفہ سے تمہاری ملاقات ہو سکے۔ تم اپنی زبان سے انہیں سب کچھ بتانا اور کچھ نہ بھی ہوا تو کم از کم ناظم اعلیٰ کے خلاف تو کارروائی ہو گی۔ باقی تم لوگوں کو میرا مشورہ ہے کہ خود کو مصیبت میں نہ ڈالو۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں جلال الدین خود بھی خلافت عباسیہ سے مایوس ہو چکا ہے۔ پتہ نہیں وہ حیات بھی ہے یا نہیں۔ اس صورت میں ہماری تگ و دو کیا رنگ لائے گی۔ لگتا ہے مشیت ایزدی کو ابھی عالم اسلام کا امتحان مقصود ہے۔ ہمیں چاہئے کہ صبر و استقامت سے اس دورِ ابتلا کے خاتمے کا انتظار کریں۔"

اس روز دوپہر کے وقت جب اسد اور یورق شیخ وحید الدین کے ہمراہ خلیفہ کے دربار میں پہنچے وہاں کی فضا پُر ہنگام ہو رہی تھی۔

شیخ وحید الدین ان دونوں کو باہر کھڑا کر کے اندر چلے گئے۔ کافی دیر بعد ایک دربان انہیں لینے آیا۔ یورق اور اسد اس کے ساتھ خلیفہ کے دربار میں حاضر ہوئے۔ اندر امرا اور عمائدین کا ہجوم تھا۔ ایوان خلافت بھرا ہوا تھا۔ ہر نگاہ بڑے اشتیاق سے ایک ہی جانب مرکوز تھی۔ اسد اور یورق نے بھی اس طرف دیکھا اور ششدر رہ گئے.......... اباقہ خلیفہ المسلمین کے روبرو کھڑا تھا۔ اس کے گلے میں موتیوں کی ایک نہایت قیمتی مالا تھی جو شاید تھوڑی دیر قبل اسے خلیفہ کی طرف سے مرحمت کی گئی تھی۔ لگتا تھا تھوڑی دیر قبل اباقہ نے کوئی ایسا کام کیا ہے جس نے عمائدین شہر کو اس کا گرویدہ کر دیا ہے۔ پھر خلیفہ مستنصر کی آواز ابھری۔

"نوجوان ہم پوچھنا چاہتے ہیں کہ تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو؟"

اباقہ نے حسب عادت مختصر الفاظ میں جواب دیا۔ "میرا نام .... اباقہ ہے۔ میں یہاں سلطان خوارزم شاہ کو تلاش کر رہا ہوں۔"

"خوارزم شاہ!" کئی آوازیں بیک وقت ابھریں۔ کچھ آوازوں میں تحیر تھا اور کچھ میں تحیر کے ساتھ مسرت کی بھی آمیزش تھی۔

وزیر اعظم بھی دربار میں موجود تھے۔ انہوں نے کہا۔ "نوجوان۔ سلطان خوارزم کی تلاش میں تو بہت سے لوگ ہیں۔ تمہارا مقصد کیا ہے؟"

اباقہ۔ "بس مجھے اس سے ملنا ہے۔"

اس وقت اسد اللہ مجمعے کو چیرتا ہوا آگے بڑھا۔ کچھ محافظوں نے اسے روکنا چاہا' لیکن وہ دندناتا ہوا آگے نکل آیا۔ چند ہی لمحے بعد وہ اباقہ کے پہلو میں کھڑا تھا۔ خلیفہ اور وزیر اعظم سمیت تمام حاضرین اب اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

اسد اللہ جھک کر بولا۔ "خلیفہ المسلمین' بے ادبی کے لئے معافی چاہتا ہوں' لیکن مجھے اپنے دوست کی ترجمانی کے لیے آپ کے قریب آنا پڑا۔"

خلیفہ نے کہا۔ "تو تم اس نوجوان کے دوست ہو۔"

"جی ہاں حضور۔" اسد نے اعتماد سے کہا۔ "ہمارا ایک اور ساتھی بھی ہے۔ ہم تینوں چند روز پہلے تبریز سے یہاں پہنچے ہیں۔"

وزیر اعظم نے کہا۔ "خلیفہ المسلمین تمہارے دوست کی جوانمردی سے بہت متاثر ہوئے ہیں۔ وہ تمہارے بارے تفصیل سے جاننا چاہتے تھے۔"

اسد نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ بغداد میں ایسا باشعور اور با اختیار مجمع شاید اسے دوبارہ نہیں مل سکتا تھا۔ وہ اس سنہری موقع سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ وہ بولا۔

"خلیفہ المسلمین۔ ہم دولت خوارزم کے کھنڈروں سے نکل کر آئے ہیں۔ ہم اس سرزمین سے آئے ہیں' جہاں خدا اور اس کے رسول کا نام لینا ناقابل معافی جرم بن چکا ہے۔ جہاں مسجدوں میں تالے پڑے ہیں اور درس گاہوں میں چنگیز کے بیٹے شراب کے جام لنڈھاتے ہیں۔ یہ وہ سرزمین ہے خلیفہ المسلمین' جہاں خون مسلم پانی سے ارزاں ہو چکا ہے۔ وہاں تلوار اٹھانے والے بازو ہی نہیں کاٹے جاتے معافیاں مانگنے والے ہاتھ بھی کاٹ دیے جاتے ہیں۔ جوان رعنا ہی قتل نہیں کیے جاتے رحم مادر کے بچوں کو بھی مار دیا جاتا ہے۔ حسین عورتیں ہی لونڈیاں نہیں بنائی جاتیں معصوم بچوں کو بھی نیزے پر چڑھا دیا جاتا ہے .... ہم آپ کو کہاں تک سنائیں خلیفہ المسلمین' دیوار کے اُس پار دیکھیے سیلاب بلا خیز بڑھتا چلا آرہا ہے۔ وہ قاتل پانیوں کا ایک مہلک اجتماع ہے۔ نہ اس کی آنکھیں ہیں نہ ذہن۔ وہ صرف بہالے جانا جانتا ہے۔ اس کی موجوں میں خوارزم کے لاکھوں یتیم بچے' بے آسرا عورتیں اور شکستہ دل مرد ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں وہ ڈوب رہے ہیں' لیکن ان کی نگاہیں آپ کی طرف لگی ہیں ان کی زبان پر آپ کا نام ہے۔ وہ بغداد کی طرف دیکھ رہے ہیں خلیفۂ عالی۔"

اسد نے مجمع کی طرف دیکھا اور بولا۔ "میں اہل بغداد سے پوچھتا ہوں۔ کیوں وہ خاموش ہیں؟ کیوں پتھر ہو چکے ہیں؟ کیا وہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح وہ منگولوں کے شر سے بچ جائیں گے۔ نہیں کبھی نہیں۔ وہ جتنا جھکیں گے اتنا ہی بربادی سے قریب تر ہوں گے۔ پانی نے کبھی پستی کو معاف نہیں کیا' آگ خستہ لکڑی کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے' ہرن اگر خاموش رہے تو درندہ اسے نظر انداز نہیں کر دیتا.......... شبنم کہیں بھی چھپ جائے سورج کی تمازت اسے فنا کر کے چھوڑتی ہے' خلیفہ المسلمین! ذرا سوچیے۔ خوارزم شاہ کو کیا ضرورت تھی۔ اپنے جنت نظیر خطے کو جہنم زار بنانے کی؟ کوئی ضرورت نہیں تھی اس خطہ زمین کی بربادی کا سبب صرف یہ ہے کہ وہ لب ساحل تھا۔ سمندر کا قہر اچھلا اور اسے لپیٹ میں لے لیا۔ جیسے سیلاب آگے بڑھنے سے پہلے راستے کے چھوٹے چھوٹے گڑھوں کو بھرتا ہے' اسی صورت تاتاری خوارزم کے شہروں کو برباد کر رہے ہیں۔ اس تاخیر کو مہلت نہ سمجھیے۔ خدارا قانونِ فطرت کو جانیے۔ زد میں آنے والوں کو بچائیے اور آگے بڑھ کر بند باندھیے اگر یہ سب کچھ نہ ہوا تو وہ سب کچھ ہو گا جو دجلہ کے کناروں سے دیکھا جائے گا.........."

اسد کی جذباتی تقریر نے دربار میں سناٹا طاری کر دیا تھا۔ اس نے ایک لمحہ توقف کیا پھر اباقہ کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ "معزز محترم حاضرین۔ یہ مردم خیز مٹی اباقہ جیسے بہادروں سے خالی نہیں۔ ایک دفعہ دولت عباسیہ نے تاتاریوں کے خلاف اعلان جہاد کیا تو عالم اسلام کے لاکھوں مجاہد تلواریں کھینچ کر میدان میں آجائیں گے۔ پھر ان میں سے اباقہ جیسے چند بھی ہمیں مل گئے تو تاتاریوں کو صحرائے گوبی کے علاوہ کہیں پناہ نہیں ملے گی.......... ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ ہم کچھ کرنے کی ٹھان لیں۔ خدا کے لیے حوصلوں کو مرنے سے بچائیے۔ صلاحیتوں کو ضائع ہونے سے روکیے۔ اس سے پہلے کہ تلواروں کو زنگ لگ جائے اور بازو جفاکش نہ رہیں' میدان میں آجائیے .... ہاں میدان میں آجائیے۔"

چند لمحے دربار میں مکمل سناٹا رہا۔ آخر خلیفہ المسلمین مستنصرباللہ کی آواز ابھری۔ "نوجوان تمہاری تقریر نے ہم سب پر گہرا اثر کیا .... لیکن اگر میں کہوں کہ تم چند الفاظ میں اپنا مدعا بیان کرو تو کیا کہو گے؟"

اسد نے کہا۔ "خلیفہ المسلمین' جس سیلاب کا میں نے ذکر کیا ہے۔ اسے روکنے کی ضرورت ہے اور سلطان جلال الدین ان پانیوں کا شناور ہے۔ اسے ڈھونڈیے اگر وہ مل جائے تو اس کا حوصلہ تعمیر کیجیے۔ اگر اس کی ہمت بندھ گئی اور اس نے پھر سے گھوڑے پر زین ڈالی لی تو میں دعوے سے کہتا ہوں تاتاریوں کے خلاف نصف کامیابی عمل میں آجائے گی۔"

اباقہ نے گہری نظروں سے حاضرین کا جائزہ لیا۔ چہرے مختلف تاثرات پیش کر رہے ہے۔ کچھ چہروں پر تو دبا دبا جوش بھی نظر آرہا تھا۔ خود خلیفہ کی آنکھوں میں بھی فکر مندی کی جھلک پائی جاتی تھی۔ وہ بار بار کچھ کہنے کے لئے لبوں کو جنبش دے رہے تھے' لیکن لگتا تھا ان کا ذہن کئی بندھنوں میں جکڑا ہوا ہے۔ وہ ڈرتے ہیں کہ مبادا کوئی ایسی ویسی بات منہ سے نکل جائے۔ اس دوران شیخ وحیدالدین بھی خلیفہ کی اجازت سے کھڑے ہو گئے۔

انہوں نے اسد اللہ کی تائید اور خوارزم شاہ کی حمایت میں چند نہایت مؤثر لیکن تلے ہوئے فقرے کہے۔ ان کے کلام نے اسد کی تقریر کا تاثر مزید گہرا کر دیا۔ آخر میں شیخ وحیدالدین نے کہا۔ "خلیفہ معظم! آج سے چند روز پہلے اسد اور ان کے دونوں ساتھیوں کو خوارزم شاہ کی حمایت کے جرم میں گرفتار کیا گیا تھا یہ گرفتاری نئے ناظم اعلیٰ نے کی تھی۔ حراست کے دوران ان تینوں کو بدترین تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ بعدازاں یہ تینوں کسی طرح اس ناجائز حراست سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ بغداد کے طول

دعرض میں اب بھی چپکے چپکے ان کی تلاش ہو رہی ہے۔ میں ان لوگوں کو اچھی طرح جانتا
جو سلطان جلال الدین کی حمایت میں کھلنے والی ہر زبان کو کاٹنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ ان
میں سے کچھ چہرے اب بھی میری نگاہوں کے سامنے ہیں۔ اگر میں خاموش ہوں تو اس
لیے کہ میں مخالفت کی آگ بھڑکانا نہیں چاہتا' لیکن میں خلیفہ معظم سے اتنی توقع ضرور
کرتا ہوں کہ نئے ناظم اعلیٰ سے اس بارے میں باز پُرس کی جائے گی اور اگر الزام درست
ہوا تو اس کے خلاف تادیبی کارروائی ہو گی۔"

خلیفہ نے شیخ کی پوری بات سننے کے بعد انہیں تحقیقات کروانے کا یقین دلایا۔ خلیفہ
اب اباقہ اور اسد سے بہت متاثر نظر آ رہے تھے۔ وہ بڑی دلچسپی سے اسد کی زبانی اباقہ کی
داستان سن رہے تھے۔ اسد نے ابتدا سے کہانی شروع کی تھی۔ جب سمرقند پر قیامت ٹوٹی
تھی اور اباقہ کا باپ کم سن اباقہ کو لے کر جنگلوں میں چلا گیا تھا۔ اسد نے دانستہ طور پر اباقہ
کے قراقرم پہنچنے کا ذکر حذف کر دیا اور بتایا کہ وہ قوقند میں اسے ملا تھا اور اس کے بعد سے
دونوں اکٹھے ہیں۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ قوقند چھاؤنی میں اباقہ نے کتنی بہادری اور دلیری
سے اسے اور اس کے ساتھیوں کو یقینی پھانسی سے بچایا تھا۔ اباقہ کے کارنامے حاضرین کو
مبہوت کر رہے تھے .... لیکن پھر دفعتاً خلیفہ کے عقب میں بیٹھا ہوا ایک شخص کھڑا
ہوا اور سب اس کی طرف دیکھنے لگے۔ اباقہ نے بھی اسے دیکھا اور ششدر رہ گیا۔ اس
سے پہلے اس کی نظر اس پر نہیں پڑی تھی .... وہ مسلم بن داؤد تھا۔ اباقہ اسے حیرت
سے دیکھتا رہ گیا۔ آخری بار اباقہ نے اسے جھیل بالکش کے نواح میں دیکھا تھا۔ جہاں
بلغارین پہلوان ہینڈا اس کے ساتھ اس کی زبردست لڑائی ہوئی تھی۔ لڑائی کے بعد وہ مسلم
بن داؤد کو ڈھونڈتا رہ گیا تھا۔ دور دور اس کا کوئی پتہ نہیں چلا تھا .... اور آج وہ منحوس
صورت بوڑھا بڑی تمکنت سے خلیفہ کے عقب میں کھڑا تھا۔ اس کے جسم پر سیاہ رنگ کا
ایک خوبصورت جبہ تھا اور پگڑی میں قیمتی جھالریں لٹک رہی تھیں۔ دونوں کی نگاہیں ایک
دوسرے سے ٹکرائیں اور چند لمحے کے لیے ساکت رہ گئیں پھر داؤد نے نگاہیں پھیر لیں
اور بولا۔

"خلیفہ المسلمین غلام کچھ عرض کرنا چاہتا ہے۔"

خلیفہ نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا اور بولے۔ "ہاں ہاں کہو داؤد۔"

مسلم بن داؤد نے انگلی سے اباقہ کی طرف اشارہ کیا اور نہایت دلیری سے بولا۔

"حضور یہ شخص وہ نہیں جو نظر آتا ہے اور جو اسے بتایا جا رہا ہے۔"

خلیفہ نے کہا۔ "داؤد جو کہنا چاہتے ہو کھل کر کہو۔"

داؤد بولا۔ "خلیفہ المسلمین! بغداد کے عوام اور خواص کی طرف سے اس شخص کے
ساتھ والہانہ محبت کا اظہار کیا گیا ہے۔ اگر عوام اسے ایک بہادر نوجوان سمجھ رہے ہیں تو
اس اسے سلطان جلال الدین کا دلیر جانباز گردان رہے ہیں جبکہ حقیقت اس کے برعکس
ہے .... خلیفہ المسلمین! یہ شخص منگولوں کا جاسوس ہے اور خطرناک ارادوں سے
یہاں آیا ہے۔"

مسلم بن داؤد کی یہ اطلاع دھماکے سے کم نہیں تھی۔ حاضرین حیرت سے اس کی
طرف دیکھ رہے تھے۔ داؤد نے بلند آواز سے کہا۔

"خلیفہ عالی مقام! میں اپنے الزام کو ثابت کر سکتا ہوں۔ آپ سب جانتے ہیں کہ
میں قراقرم میں تھا۔ اپنی جان خطرے میں ڈال کر میں نے دولت عباسیہ کے لیے گراں قدر
خدمات انجام دی ہیں۔ قراقرم ہی میں میری اس شخص سے ملاقات ہوئی تھی۔ یہ وہاں
چغتائی خان کی فوج میں یک صدی سردار تھا۔ چین کی مہم میں اس نے منگولوں کے لیے
بڑی جانفشانی سے جنگ کی۔ میری معلومات کے مطابق بعد ازاں اسے پنج صدی سردار بنا کر
تولی کی بیوہ سیورا قطنی کا محافظ خاص کر دیا گیا۔ جہاں تک میں جانتا ہوں خوارزم کا مجاہد
ہونا تو دور کی بات ہے اس شخص نے کبھی خوارزم شاہ کو دیکھا تک نہیں۔ یہ سرتاپیر ایک
وحشی منگول ہے اور کسی خطرناک مقصد کے تحت یہاں بھیجا گیا ہے۔"

اسد نے چیخ کر کہا۔ "عالی جناب! یہ سراسر جھوٹ ہے۔ میرے ساتھی پر الزام
ہے۔"

داؤد تلملا کر آگے بڑھا اور اباقہ کے عین سامنے پہنچ کر بولا۔ "تجھے تیری ماں کی قسم
بتا تو اردوئے معلیٰ میں یک صدی سردار نہیں تھا۔ تُو نے چین کی مہم میں سینکڑوں
منگول دشمن قتل نہیں کیے۔ تُو سیورا قطنی کا محافظ خاص نہیں بنا؟"

پھر داؤد تیزی سے گھوما اور سردار یورق کی طرف انگلی سیدھی کی۔ وہ آخر میں دیوار
کے ساتھ کھڑا تھا۔ داؤد زور سے بولا۔ "اور جناب! یہ دیکھئے' یہ ہے وہ تیسرا ساتھی۔ اس
کا نام یورق ہے اور یہ منگول فوج کے خطرناک ترین سرداروں میں سے ایک ہے۔ اس
کے ہوتے ہوئے اس ایوان میں کسی کی جان بھی جا سکتی ہے اور یہ جان .... یہ جان
خلیفہ المسلمین کی بھی ہو سکتی ہے۔"

داؤد کا انداز اتنا ڈرامائی تھا کہ چہروں پر سراسیمگی دوڑ گئی۔ وزیر داخلہ تیزی سے
اٹھا۔ اس نے گرج کر سپاہیوں کو آگے آنے کی ہدایت کی۔ مسلح سپاہیوں نے لپک کر یورق
اور اباقہ کے گرد گھیرا ڈال لیا۔

شیخ وحید الدین یہ صورت حال دیکھ کر اٹھے۔ انہوں نے کہا "خلیفہ المسلمین! ہم
مہمانوں سے یہ برتاؤ سراسر بدسلوکی ہے۔ میں اسد کو اچھی طرح جانتا ہوں یہ خوارزم کا
جانباز ساتھ ہے۔ یہ جھوٹ نہیں کہہ سکتا وزیر داخلہ نے ان لوگوں کو گرفتار کر کے ایک
ہنگامے کو دعوت دی ہے۔"

مسلم بن داؤد نے شیخ وحید الدین سے کہا۔ "مولانا آپ کو دھوکے میں رکھا گیا ہے۔ ہو
سکتا ہے اس اسد نامی نوجوان کو بھی دھوکے میں رکھا گیا ہو۔ جن لوگوں کو آپ سلطان
جلال کی آبرو قرار دے رہے ہیں۔ میرے خیال میں وہ اس کے اولین دشمن ہیں۔
دیکھئے۔ یہ سردار یورق ہے۔ منگول لشکر میں مشہور تھا کہ یہ شخص جلال الدین کا سر کاٹ کر
لا سکتا ہے۔ میں جس وقت قراقرم سے آیا۔ اسے جلال الدین کی تلاش میں بھیجنے کی تیاری
کی جارہی تھی۔ میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں کہ یہ لوگ سلطان جلال الدین
کے قتل کا ارادہ لے کر قراقرم سے روانہ ہوئے ہوں گے۔"

دربار میں چند لمحے خاموشی رہی۔ اس سے پہلے کہ کوئی بولتا' داؤد اباقہ کے سامنے آ
کر بولا۔ "تم بتاؤ اباقہ' تمہیں چغتائی کی بیوی کی قسم' بتاؤ تم قراقرم سے جلال الدین کو قتل
کرنے نہیں نکلے تھے۔"

اباقہ نے نگاہیں اٹھائیں پھر ایک سچے اور کھرے آدمی کی طرح سینہ تان کر بولا۔
"ہاں اسی لیے نکلا تھا لیکن .... لیکن قوقند کی ایک عبادت گاہ میں ایک مسلمان بزرگ
کی باتیں سن کر ارادہ بدل دیا۔ اب میری تلوار ایک مسلمان سپاہی کی تلوار ہے۔"

داؤ چلایا۔ "سنیے عالی جناب سنیے یہ تسلیم کر رہا ہے .... لیکن یہ تسلیم نہیں کر رہا
کہ اب بھی اس کی تلوار جلال الدین کی گردن ڈھونڈ رہی ہے۔"

مجمع یکسر خاموش تھا۔ اباقہ اور اسد کے حمائتی کچھ بجھ سے گئے تھے۔ وزیر داخلہ نے
آگے بڑھ کر وزیر اعظم کے کان میں کچھ کہا......... وزیر اعظم نے خلیفہ کی طرف جھک کر
کوئی بات کی۔ خلیفہ کے چہرے پر تذبذب کے آثار نظر آئے۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد
انہوں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"موجودہ حالات میں ان دونوں افراد کو حراست میں رکھنا ضروری ہو گیا ہے۔
تیسرے نوجوان اسد کو چونکہ شیخ وحید الدین ذاتی طور پر جانتے ہیں اور اس کی ضمانت دے
رہے ہیں لہٰذا اسے چھوڑا جارہا ہے فوری طور پر تحقیق کی جائے گی اگر یہ دونوں افراد بھی
بے قصور ثابت ہوئے تو انہیں باعزت بری کیا جائے گا۔"

اسد پکار کر بولا۔ "مجھے یہ آزادی منظور نہیں۔ اگر میرے ساتھی مجرم ہیں تو میں بھی

ہوں۔" شیخ وحید الدین نے اس کا کندھا تھپتھپایا اور آنکھوں آنکھوں میں کچھ
سمجھانے لگا۔ مسلم بن داؤد نے نہایت عیاری سے ایسی صورت پیدا کر دی تھی کہ وہ لوگ
جو دیر پہلے اباقہ کے پُرجوش مداح دکھائی دیتے تھے اب خاموشی سے اسے تلواروں کے
سائے میں دیکھ رہے تھے۔ اسد حیران و پریشان کھڑا تھا۔

☆ ---------- ☆ ---------- ☆

اسد کے سامنے دو عورتیں بیٹھی تھیں۔ ایک کو حسین اور دوسری کو حسین ترین کہا
جا سکتا تھا۔ پہلی یاکی تھی اور دوسری مارینا۔ دونوں پریشان تھیں لیکن ایک کی پریشانی ظاہر
تھی اور دوسری کی پوشیدہ۔ مارینا کے چہرے سے ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ وہ دل گرفتہ ہے'
لیکن اسد جانتا تھا اس کی آنکھوں میں کتنا درد سمٹ آیا ہے۔ بالوں کی ایک طویل لٹ بل
کھا کر اس کی ناک کو چھو رہی تھی اور وہ ٹھوڑی کو ہاتھوں کے پیالے میں رکھے گہری سوچ
میں کھوئی ہوئی تھی۔ پھر اس نے پلکیں اٹھائیں اور یاکی کو دلاسہ دیتے ہوئے بولی۔ "تو
پریشان نہ ہو یاکی۔ میں اباقہ کو بچاؤں گی۔" اس کے لہجے میں عجیب اعتماد تھا۔

"وہ کیسے؟" اس نے پوچھا۔

مارینا بولی۔ "اس سوال کا جواب میری صورت میں تمہارے سامنے ہے۔"

"میں سمجھا نہیں۔" اسد بولا۔

مارینا نے کہا۔ "اسد' میں چغتائی خان کی بیوی تمہارے پاس ہوں۔ کیا یہ اس بات کا
ثبوت نہیں کہ اباقہ منگولوں سے ناطہ توڑ چکا ہے۔"

اسد اللہ کی پیشانی چمکنے لگی۔ یہ اہم نکتہ وہ اب تک بھولا ہوا تھا۔ چغتائی خان کی
بیوی کو اباقہ چھین لایا تھا۔ اس ناقابل معافی جرم کے ارتکاب کے بعد وہ قراقرم جانے کا
سوچ بھی نہیں سکتا تھا' پھر وہ جاسوس کیوں کر ہو سکتا ہے۔ اسد فوراً کھڑا ہو گیا۔ "چلو
مارینا! ہم اسی وقت شیخ صاحب کے پاس چلتے ہیں۔" مارینا کھڑی ہو گئی۔ تھوڑی ہی دیر بعد
...ل کے باپ کی گھوڑا گاڑی سرپٹ شہر کی طرف بھاگی جارہی تھی۔

عین اس وقت شیخ وحید الدین کے گھر سے چند فرلانگ کے فاصلے پر نئے ناظم اعلیٰ کی
رہائش گاہ پر مسلم بن داؤد' وزیر داخلہ عبدالرشید اور سیف الدین موجود تھے۔ مے نوشی کی
محفل جمی ہوئی تھی۔ دو خوبصورت کنیزیں بے ہودہ لباس پہنے ساقی گری کے فرائض انجام
دے رہی تھیں۔ ناظم اعلیٰ بار بار مسلم بن داؤد کی پیٹھ تھپک رہا تھا۔ خلیفہ کے سامنے اس
نے جس طرح اباقہ اور اس کے ساتھیوں کا گھیراؤ کیا تھا وہ ان کے لیے ایک بڑا کارنامہ تھا۔
کافی دیر وہ خوش گپیوں میں مصروف رہے۔ دفعتاً ایک خادم نے ناظم اعلیٰ کو کسی کی آمد کی

اطلاع دی۔ ناظم اپنا جبہ سنبھالتا ہوا کمرے سے باہر آیا۔ چھوٹی سی داڑھی والا شخص جھک کر آداب بجالایا۔ یہ شخص شیخ وحیدالدین کا خاص ملازم تھا' لیکن ناظم اعلیٰ کے لیے جاسوسی کے فرائض انجام دیتا تھا۔ اس نے کہا۔ "حضور! تھوڑی دیر پہلے ایک نوجوان ایک نہایت خوبصورت عورت کے ساتھ شیخ صاحب سے ملنے آیا ہے۔ ان کی باتوں سے پتہ چلا ہے کہ وہ عورت اپنے پاس کوئی ایسا ثبوت رکھتی ہے کہ اسے سنتے ہی خلیفہ کل پکڑے جانے والے دونوں منگولوں کو رہا کر دے گا۔ میں کوشش کے باوجود نہیں جان سکا کہ وہ ثبوت کیا ہے' لیکن شیخ صاحب اور اس نوجوان کی باتوں سے انداز ہوتا ہے کہ واقعی کوئی نہایت اہم ثبوت ہے' شیخ صاحب یہ ثبوت خلیفہ کو مکمل تخلیے میں پیش کرنا چاہتے ہیں۔ اب سے تھوڑی دیر بعد شیخ صاحب ان دونوں کو لے کر خلیفہ کے محل میں جانے والے ہیں۔

ناظم اعلیٰ کے چہرے پر بے چینی کے آثار نظر آئے۔ اس نے خادم کو کچھ اشرفیاں دے کر رخصت کر دیا اور خود ساتھیوں کی طرف لپکا۔ کنیزوں کو باہر بھیج کر اس نے انہیں اپنی اطلاع سے آگاہ کیا تو وہ بھی پریشان نظر آنے لگے۔ مسلم بن داؤد بولا۔ "سوچنا چاہیے وہ عورت ہو کون سکتی ہے؟"

وزیر داخلہ نے کہا۔ "فی الوقت ضرورت یہ ہے کہ انہیں خلیفہ کے پاس پہنچنے سے روکا جائے۔"

ناظم اعلیٰ شراب کی صراحی ایک طرف رکھتا ہوا۔ بولا۔ "یہ کام آپ مجھ پر چھوڑ دیجئے۔ اگر خلیفہ کے محل اور ان لوگوں کے درمیان نصف کوس سے کم فاصلہ نہیں تو وہ کبھی خلیفہ تک نہیں پہنچ سکیں گے ...."

اسد' مارینا اور شیخ وحیدالدین' خلیفہ کے محل کے سامنے گھوڑوں سے اترے۔ شیخ کو دیکھ کر دربانوں نے انہیں اندر جانے کی اجازت دی' وہ محل کے وسیع صحن میں داخل ہوئے۔ دور تک سبزہ بچھا تھا۔ درمیان سے ایک پختہ راستہ رہائشی عمارت کی طرف جاتا تھا۔ جس وقت وہ تینوں' دوسرے فوارے کے قریب سے گزر رہے تھے۔ اچانک درختوں کی تاریکی سے چند نقاب پوش بر آمد ہوئے اور اسد وغیرہ پر ٹوٹ پڑے۔ ایک مضبوط ہاتھ اسد کے ہونٹوں پر جم گیا۔ کسی نے اس کے سر پر زور سے تلوار کا دستہ مارا۔ وہ ڈگمگایا تو کئی ہاتھوں نے اسے زمین سے اٹھالیا۔ پھر اس نے محسوس کیا کہ حملہ آور اسے لے کر درختوں میں گھس گئے ہیں۔ اس نے اپنے حواس مجتمع کیے۔ ایک ہاتھ سے تلوار کی موجودگی کا یقین کیا اور پھر تڑپ کر ہاتھوں کی گرفت سے نکل گیا۔ اس وقت اس نے دیکھا

وحیدالدین بھی دو نقاب پوشوں سے برسرپیکار ہیں۔ مارینا کو دبوچنے والے نقاب پوش ... کر رک گئے تھے۔ مارینا خود کو چھڑانے کے لیے مچل رہی تھی۔ جونہی اسد نے تلوار ... تین نقاب پوش اس پر ٹوٹ پڑے۔ درختوں کے درمیان تلواروں کی جھنکار پیدا ... اسد کی تلوار تین تلواروں سے ٹکرانے لگی۔ وہ بڑی مہارت سے مدمقابل نقاب ... کو دھکیلتا ہوا پختہ راستے کی جانب لے گیا لیکن اس کی پیٹھ خالی تھی۔ پھر اس نے پیچھے بھاگتے قدموں کی آواز سنی۔ وہ سمجھ گیا کہ ایک حملہ آور عقب سے آرہا ہے۔ ... نے ایک لمحے کے لیے مڑ کر دیکھا لیکن عقب میں حملہ آور نہیں مارینا تھی وہ تلوار ... کر اس کا عقب محفوظ رکھنے پہنچ گئی تھی۔ دوسری طرف وحیدالدین عمر رسیدہ اور ... کے باوجود دو نقاب پوشوں کو سنبھالے ہوئے تھے۔ اسد نے ساتھیوں کا حوصلہ ... پوش سے حملہ کیا اور سامنے والے نقاب پوشوں میں سے ایک کو زمین پر گرا دیا۔ ... وقت پختہ راستے کی طرف سے بھاگتے قدموں کی آوازیں آئیں اور نقاب پوش انہیں ... کر درختوں میں گم ہو گئے .... مارینا اپنی تلوار سے خون پونچھ رہی تھی۔ یقیناً اس ... نقاب پوش کو گھائل کر دیا تھا۔ اس سے پہلے اسد برفانی ندی میں اس کی تلوار کے ... دیکھ چکا تھا۔ حسین ہونے کے ساتھ وہ ایک بلند ہمت عورت بھی تھی۔ اس کی تلوار ... بننے والا دم توڑ چکا تھا۔ اس وقت انہوں نے ایک کراہ سنی۔ وحیدالدین ایک ... سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے' وہ دونوں بھاگ کر ان کے پاس پہنچے۔ رہائش گاہ کی ... سے آنے والے سپاہی اور ملازمین بھی ان کے قریب پہنچ گئے تھے۔ اسد اللہ نے ... وحیدالدین شاید زخمی ہو گئے تھے۔ ان کے پیٹ پر تلوار کا ایک گہر زخم آیا تھا اور ... ہاتھ کی تین انگلیاں کٹ گئی تھیں۔ ان کی حالت دیکھ کر بے اختیار مارینا کے سینے سے ... نکل گئی۔ اسد کی آنکھوں میں بھی نمی تیر رہی تھی لیکن پھر دونوں نے دیکھا کہ شیخ زور لگا کر پاؤں پر کھڑے ہو گئے ہیں۔ وہ اسد کے کندھے کا سہارا لیتے ہوئے

"اسد! مجھے خلیفہ کے پاس لے چلو۔ یہ نہ ہو یہیں میری جان نکل جائے۔"

دو ملازم پالکی لینے کے لیے بھاگ لیکن شیخ صاحب اسد کا سہارا لے کر پیدل ہی چلنے لگے۔ باغ سے نکل کر وہ پختہ راستے پر پہنچے اور سیڑھیاں چڑھ کر رہائشی حصے ... گئے۔ ان کے زخم سے ٹپکنے والا خون سنگ مرمر کے فرش پر گل بوٹے بنا رہا تھا۔ وہ ... والی دروازے ہی میں تھے کہ خلیفہ مستنصر خود ان کے پاس پہنچ گئے۔

"یہ کیا ہو گیا مولانا؟" انہوں نے نہایت پریشانی سے کہا۔

"کچھ نہیں خلیفہ المسلمین .... معمولی زخم ہے۔ میں مروں گا نہیں۔"

خلیفہ نے طبیبوں کو حاضر کرنے کا حکم دیا۔ چند ہی لمحے میں طبیب بھاگتے ہوئے آ گئے انہوں نے زخم دیکھ کر خلیفہ اور اسد کو تسلی دی۔ زخم کو احتیاط سے سی کر پٹیاں لپیٹ دی گئیں۔ اس دوران محافظ دستے کے کماندار نے اطلاع دی کہ باغ میں پڑے ہوئے شخص کی شناخت کرلی گئی ہے۔ وہ محافظ دستوں سے ہی تعلق رکھتا ہے۔

عشاء کی اذان سے کچھ پہلے خلیفہ اسد اور مارینا سے محل کے ایک کمرے میں ملاقات کر رہا تھا۔ وحیدالدین بھی وہیں تھے۔ وہ ایک مسہری پر لیٹے ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنی زبان سے خلیفہ کو ساری بات بتائی تھی' یہ جاننے کے بعد کہ اباقہ چغتائی خان کی مسلمان بیوی کو تاتاریوں سے چھڑا کر لایا ہے خلیفہ کا رویہ کچھ نرم ہو گیا تھا اباقہ کے متعلق اس کے شکوک رفع ہو گئے لیکن ساتھ ہی وہ کچھ مضطرب بھی ہو گیا تھا۔ وحیدالدین اس کے اضطراب کی وجہ سمجھ رہے تھے۔ انہوں نے کہا۔

"خلیفہ معظم! ضروری نہیں کہ آپ اپنے مشیروں سے مارینا کا ذکر کریں۔ ظاہر ہے اگر ایسا ہوا تو کچھ لوگ یہ کہہ کر شور مچائیں گے کہ حکومت تاتاریوں کی مخالفت مول لے رہی ہے .... آپ اس بات کے مجاز ہیں کہ کسی بھی مجرم کو وجہ بتائے بغیر رہا کر دیں باقی میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ رہائی کے بعد یہ لوگ بغداد سے چلے جائیں گے۔"

شیخ کی دانشمند باتیں خلیفہ کے دل پر اثر کر رہی تھیں۔ اس کے رویے میں کافی تبدیلی نظر آنے لگی تھی۔ کچھ دیر بعد جب اسد اور مارینا شیخ کی پالکی لے کر خلیفہ کے محل سے روانہ ہو رہے تھے' انہیں امید تھی کہ کل کسی وقت اباقہ اور یورق کو رہا کر دیا جائے گا۔

☆------☆------☆

جس وقت اسد' وحیدالدین اور مارینا باغ میں نقاب پوشوں سے نبرد آزما تھے' ایک درخت کے پیچھے خشخشی داڑھی والا مسلم بن داؤد بے چینی سے ہاتھ مل رہا تھا۔ اس نے نقاب پوشوں کو بھاگتے اور وحیدالدین کو زخمی ہو کر گرتے دیکھا۔ وہ بھی تیزی سے نقاب پوشوں کے پیچھے لپک گیا۔ خلیفہ کے محل سے باہر آ کر وہ تیز قدموں سے اپنے گھر کی طرف نکل گیا۔ اس کے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ وہ مارینا کو پہچان گیا تھا چغتائی خان کی چہیتی بیوی مارینا' اباقہ کے ساتھ تھی۔ اس کا کیا مطلب تھا۔ صاف ظاہر تھا اباقہ اسے قراقرم سے بھگا کر لایا ہے اور یہی وہ ثبوت تھا جو وحیدالدین لے کر خلیفہ کے پاس پہنچا تھا۔ داؤد کے ہونٹوں پر ایک خطرناک مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ چند راستوں سے گزرتا ہوا وہ وزیر خارجہ کے محل کی طرف چل دیا۔

چند دن ہوئے قراقرم سے ایک سفارت بغداد پہنچی تھی۔ منگول سفیر خلیفہ اور قائدین کے دل جیتنے کے لیے لوٹ مار کا بے شمار سامان لے کر آئے تھے۔ ان بیش بہا تحائف نے لالچی امراء کی آنکھیں چندھیا دی تھیں۔ اب کئی روز سے یہ سفیر امراء رؤسا کی دعوتیں کھانے میں مصروف تھے۔ مسلم بن داؤد خلیفہ کا معتبر شمار ہوتا تھا۔ اس لیے وزیر خارجہ کے محل میں داخل ہونے سے اسے کسی نے نہیں روکا۔ امراء کے حلقوں میں وہ اب اچھی طرح پہچانا جانے لگا تھا۔ قراقرم سے بھاگنے کے بعد وہ سیدھا بغداد پہنچا تھا۔ منگولوں کا معتوب تو وہ ٹھہر ہی چکا تھا اس نے قراقرم کے راز بتا کر خلیفہ کا دل جیتنے کی کوشش کی تھی اور کامیاب رہا تھا۔ اپنی چرب زبانی' چاپلوسی اور عیاری سے اس نے دربار خلافت میں جلد ہی اہم مقام حاصل کر لیا تھا۔

محل کے پھاٹک سے گزر کر وہ رہائشی حصے کی طرف بڑھ گیا۔ محل سے ملحقہ ایک عالیشان مہمان خانے میں آج وزیر خارجہ کی طرف سے "معزز" مہمانوں کو پُرتکلف ضیافت دی جا رہی تھی۔ مرغن کھانوں کی بو سونگھتا مسلم بن داؤد طعام گاہ تک جا پہنچا۔ کھانا کھایا جا چکا تھا اب مہمان یہاں وہاں بیٹھے ایک مغنیہ کی آواز سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ مسلم بن داؤد نے کھڑکی کی اوٹ سے اچھی طرح منگول مہمانوں کا جائزہ لیا مبادا ان میں سے کوئی اسے پہچانتا ہو' پھر اس نے ایک راہ جاتی خادمہ کو روکا۔ لڑکی پہلے تو ٹھٹکی کہ شاید یہ بوڑھا اس سے کوئی چھیڑخانی کرنا چاہتا ہے لیکن جب داؤد نے اسے ایک پرچی تھمائی تو وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ داؤد نے خادمہ سے کہا یہ پرچی خاموشی سے سرخ ٹوپی والے موٹے منگول تک پہنچا دے۔ اس کام سے مطمئن ہو کر داؤد درختوں میں ٹہلنے لگا۔ حسب توقع تھوڑی ہی دیر بعد سرخ ٹوپی والا منگول طعام گاہ کے دروازے پر نظر آیا۔ وہ سفارت کا سربراہ تھا۔ داؤد نے اسے ہاتھ کے اشارے سے بلایا۔ وہ کچھ پریشان سا درختوں کی طرف چلا آیا۔ پرچی ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھی۔ قریب آ کر وہ منگولی میں بولا۔

"یہ تم نے کیا لکھا ہے۔ چغتائی کی بیوی مارینا کے متعلق تم کیا جانتے ہو؟"

داؤد بولا۔ "پہلے آپ مجھے یہ بتائیں۔ چغتائی خاں کی بیوی کے ساتھ قراقرم میں کیا ہوا ہے۔"

منگول سفیر نے سوچ کے کہا۔ "تم کوئی اہم بات جانتے ہو اس لیے تمہیں بتانے میں حرج نہیں۔ کوئی تین ماہ پہلے ایک پنج صدی سردار اباقہ اسے اغوا کر کے لے گیا ہے۔ چغتائی خاں نے ان دونوں کو گرفتار کرنے والے کے لیے بھاری انعام کا اعلان کر رکھا ہے۔

سینکڑوں افراد خوارزم میں ان کی تلاش کر رہے ہیں۔"

داؤد نے کہا۔ "اگر میں آپ کو مارینا اور اباقہ کا پتہ بتادوں تو میرا انعام کیا ہوگا؟"

ایکا ایکی سفیر کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ پھر اپنی خوشی کو چھپاتا ہوا بولا۔ "میں وعدہ کرتا ہوں کہ بغداد کے چند رئیسوں کے پاس ہی اتنی دولت ہو گی جتنی تمہارے حصے میں آئے گی۔"

داؤد اسے درختوں میں کچھ اور آگے لے گیا اور دھیمے لہجے میں باتیں کرنے لگا۔

دوسری طرف مارینا یاکی کے گھر ایک کھاٹ پر لیٹی ہوئی تھی۔ نرم گدوں پر سونے والی ونوں میں کہاں سے پہنچ گئی تھی لیکن وہ اس میں بھی خوش تھی۔ ایک میٹھا میٹھا درد جو اسے سوغات ملا تھا ہر آسائش پر بھاری تھا۔ اسے اباقہ کی قربت نصیب تھی وہ اس کی خدمت کر رہی تھی۔ اس کے لیے جان جوکھم میں ڈال رہی تھی۔ یہ احساس اس کے لیے بڑا فرحت بخش تھا۔ پھر اس کی نگاہوں میں اباقہ کا پتھریلا لیکن معصوم چہرہ گھوم گیا۔ وہ اس کی نگاہوں کی گرمی اپنے رخساروں پر محسوس کرنے لگی۔ کبھی کبھی وہ کتنی دزدیدہ نگاہوں سے اسے دیکھتا تھا۔ مارینا جھینپ جاتی تھی۔ ان نگاہوں میں محبت کی گرمی کے ساتھ ہزاروں شکوے گلے بھی ہوتے تھے۔ مارینا اس کے احساسات سمجھتی تھی لیکن اپنے دل پر اس کا بس نہیں تھا اور اس کا دل اباقہ کی قربت کے تصور سے لرز جاتا تھا۔ ایک انجانا خوف اس کے دل و دماغ پر حاوی ہو جاتا تھا۔

وہ بے خیالی میں آسمان پر چمکنے والے ستاروں کو گھورتی رہی۔ پھر اس کی نگاہوں میں شیخ وحیدالدین کا بارعب نورانی چہرہ گھوم گیا۔ وہ سوچنے لگی شاید وہ بھی کوئی ایسا ہی خدا کا بندہ تھا جس نے قوقند کی ایک مسجد میں اباقہ کو سیدھی راہ دکھائی تھی اور جس کا دیا ہوا پھولدار کپڑا مارینا کے پاس ایک مقدس تحفے کی صورت موجود تھا۔ اسے یاد آیا آج صبح شیخ وحیدالدین نے کتنے پیار سے "بیٹی" کہہ کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تھا۔ انہوں نے کہا تھا۔ بیٹی بے فکر رہو کل تک اباقہ رہا ہو جائے گا' وہ سوچنے لگی۔ انہوں نے خاص طور پر اسے ہی کیوں یہ تسلی دی۔ شاید اس لیے کہ وہ اباقہ کو اس کا .... اس سے آگے وہ کچھ نہ سوچ سکی۔ اس کی پیشانی پر پسینہ چمکنے لگا۔ اس نے گھبرا کر کروٹ بدلی اور قریب لیٹی ہوئی یاکی کا چہرہ دیکھنے لگی۔ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر سو رہی تھی۔ مارینا کی سوچوں کا رخ یاکی کی طرف ہو گیا۔ ایک ٹیس سی اس کے دل میں اٹھی لیکن پھر فوراً ہی ایک مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔ یاکی بھی اباقہ کو چاہتی تھی تو اس میں کیا حرج تھا۔ ایک شمع کے گرد کئی پروانے منڈلاتے ہیں اور پھر مارینا نے اباقہ سے کون سی توقع وابستہ کر رکھی تھی۔

وہ آزاد تھا جو چاہے کر سکتا تھا۔ وہ صرف اسے آنکھوں کے سامنے رکھنا چاہتی تھی۔ پھر وہ سوچنے لگی اگر یاکی کے ساتھ اباقہ کی شادی ہو جائے تو کیسا رہے۔ اس نے اپنے تصور میں اباقہ کو حسین یاکی کے پہلو میں بٹھا کر دیکھا اور مسکرا دی لیکن جب وہ مسکرا رہی تھی اسے محسوس ہوا کہ دل میں پھر ایک ٹیس سر ابھار رہی تھی۔ "اباقہ نے مجھے کیا کر دیا ہے۔" وہ ذہن کی بھاگ دوڑ سے عاجز ہو کر بڑبڑائی۔ اس نے آنکھوں پر بازو رکھا اور خیال بٹانے کے لیے اگلے دن کے متعلق سوچنے لگی۔ اسے قوی امید تھی کہ کل جب اسد اور وہ خلیفہ کے محل میں پہنچیں گے تو واپسی پر اباقہ ان کے ساتھ ہو گا۔ لاشعوری طور پر وہ ایک بار پھر اباقہ کے متعلق سوچنے لگی اور سوچتی سوچتی نیند کی آغوش میں چلی گئی۔

دوسرے روز دوپہر کے وقت اسد اور مارینا دوبارہ خلیفہ کے محل کی طرف روانہ ہوئے۔ شیخ وحیدالدین چونکہ زخمی تھے اس لیے ساتھ نہ جا سکے۔ مہمان خانے میں وہ دونوں کافی دیر خلیفہ کا انتظار کرتے رہے آخر خلیفہ کا خاص اہلکار ایک پروانہ تھامے اندر داخل ہوا۔ اس نے کہا کہ خلیفہ آپ سے ملنے آ رہے تھے لیکن کچھ مہمانوں کی وجہ سے پھر مصروف ہو گئے ہیں۔ انہوں نے قاضی شہر کا یہ فیصلہ آپ کے سپرد کرنے کو کہا ہے۔ اس کی رو سے آپ کے دونوں آدمیوں کو قید سے رہا کر دیا جائے گا۔ پھر اس نے ایک دوسرا کاغذ اسد کے سپرد کرتے ہوئے کہا۔ "یہ خلیفہ کا حکم بنام داروغہ جیل کے نام ہے اس میں اسے قیدیوں کی رہائی کا حکم دیا گیا ہے۔ میں دو ذمے دار افراد آپ کے ساتھ کر دیتا ہوں آپ ان کے ساتھ قید خانے تشریف لے جائیں۔

اسد نے کاغذات کا معائنہ کیا' وہ بالکل درست تھے۔ خلیفہ نے اپنا وعدہ نبھایا تھا۔ دونوں خوشی خوشی محل سے روانہ ہوئے۔ فوج کے دو افسران کے ساتھ تھے۔ جس وقت وہ محل کے سبزہ زار میں آئے اسد ایک چیز دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ ایک جانب چند گھوڑے بندھے ہوئے تھے ایک منگول گھوڑوں کے قریب کھڑا تھا۔ اسد نے فوج کے ایک افسر سے ان گھوڑوں کے متعلق پوچھا۔ افسر کے جواب نے اس کے شک کی تائید کر دی۔ یہ منگول سفارتکاروں کے گھوڑے تھے۔ وہ اس وقت خلیفہ سے مصروف گفتگو تھے جس وقت وہ اور مارینا محل میں داخل ہوئے تھے یہ گھوڑے موجود نہیں تھے۔ اس کا مطلب تھا یہ لوگ ابھی ابھی پہنچے تھے۔ نہ جانے کیوں اس کے دل میں وسوسے سر اٹھانے لگے۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ منگول سفارتکار اباقہ اور یورق کی موجودگی سے آگاہ ہو گئے تھے اور یہ کوئی ایسی انہونی بات نہیں تھی۔ اگر منگول سفارت کار یہاں موجود تھے اور داؤد جیسے منافق بھی بغداد کی سیاہ کاریوں میں اضافہ کر رہے تھے تو سب کچھ ہو سکتا تھا .... اسد کا دل چاہا

کہ وہ اُڑ کر قید خانے پہنچے اور اباقہ کو چھڑا لے جائے۔ خدا جانے کیوں اس کا دل
دے رہا تھا کہ اگر وہ ایسا نہ کر سکا تو اس دفعہ اباقہ اور یورق جیل سے زندہ باہر نہیں
گے۔

وہ فوجی افسروں کے ساتھ حتی الامکان عجلت سے قید خانے کی طرف روانہ
اسے معلوم تھا اگر منگول سفارتکار اباقہ اور یورق کی موجودگی سے آگاہ ہو گئے تو
خلیفہ کو پلک جھپکتے میں اپنا فیصلہ بدلنے پر مجبور کر سکتے ہیں۔ خلیفہ کے محل سے قید
فاصلہ قریباً چار کوس تھا۔ اسد فوجی افسروں کو بار بار تیز چلنے کے لیے کہہ رہا تھا۔ جب
خانے پہنچے تو پتہ چلا کہ داروغہ ابھی تھوڑی دیر پہلے کسی کام سے گیا ہے۔

اسد کی بے چینی میں مزید اضافہ ہو گیا۔ اس نے فوجی افسروں سے کہا کہ داروغہ
نائب کو دستاویزات دکھا دی جائیں' لیکن افسروں کا خیال تھا کہ یہ داروغہ کی ذمے
ہے۔ آخر خدا خدا کر کے داروغہ پہنچا۔ اسد نے اسے کاغذات دکھائے۔ جس وقت
کاغذات کا مطالعہ کر رہا تھا۔ اسد کو گھوڑوں کی ٹاپیں سنائی دیں۔ گھڑ سوار بڑی
دکھائی دیتے تھے۔ پھر محل کے چند اہلکار تیز قدموں سے اندر داخل ہوئے۔ ان کے
ایک منگول بھی تھا۔ ان کے چہرے دیکھتے ہی اسد کو صورت حال کا اندازہ ہو گیا۔ اس
نہایت پھرتی سے داروغہ کے ہاتھ سے کاغذ چھینے اور چند قدم بھاگ کر کھڑکی سے چھلانگ
دی۔ وہ باہر گھاس کے قطعے پر گرا اور گرتے ساتھ ہی اٹھ کر بیرونی دیوار کی طرف
سب کچھ اتنی جلدی ہوا کہ کسی کو کچھ سمجھنے کا موقعہ نہیں ملا۔ ماریتا بھی حیرت سے
کچھ دیکھتی رہ گئی۔ جب تک پھاٹک پر کھڑے سپاہی سنبھلتے اسد بیرونی دیوار پھاند کر
چکا تھا۔

"بھاگو .... بھاگو اس کا پیچھا کرو۔" داروغہ چلایا۔

محل سے آنے والے اہلکاروں میں ناظم اعلیٰ سب سے آگے تھا۔ اس نے لپک
ماریتا کو دبوچ لیا۔

☆-----☆-----☆

شیخ وحید الدین اپنے گھر مسہری پر دراز تھے۔ مزاج پرسی کے لیے آنے والوں کا
بندھا ہوا تھا۔ گھر کے اندر اور باہر بے شمار افراد جمع تھے۔ طبیبوں نے انہیں ملنے جلنے
منع کر رکھا تھا۔ ان کے چہرے پر زردی کھنڈی تھی لیکن حالت اب پہلے سے بہتر
تھی۔

اسد بغلی دروازے سے اندر داخل ہوا۔ وحید الدین اسے دیکھ کر مسکرائے۔ "

تمہارا کام ہو گیا؟" انہوں نے پوچھا۔

اسد نے جیب کے اندر سے قاضی کا فیصلہ اور خلیفہ کا حکم نامہ نکال کر ان کے
سامنے رکھ دیا۔ وحید الدین نے دونوں کاغذ دیکھے۔ پھر بولے۔ "یہ حکم نامہ تو خوشخبری کا
ہے لیکن تمہارے چہرے سے مایوسی ٹپک رہی ہے۔"

اسد بولا۔ "یا شیخ۔ مجھے شاید تھوڑی دیر بعد گرفتار کر لیا جائے گا۔ میں یہ امانت آپ
کو دینا چاہتا تھا منگول سفارتکار نے سارا کھیل بگاڑ دیا ہے۔ عین اس وقت جب داروغہ'
اباقہ اور یورق کو رہا کرنے والا تھا سفیر نے اسے فیصلہ بدلنے پر مجبور کر دیا ہے۔ میں بھی
بڑی مشکل سے بھاگ کر آیا ہوں۔"

ابھی مشکل سے اسد کا فقرہ مکمل ہوا تھا کہ دیوان خانے کی طرف سے بھاگتے
قدموں کی آوازیں آئیں اور چند مسلح سپاہی دندناتے ہوئے اندر داخل ہو گئے۔ اسد کو
دیکھتے ہی وہ تلواریں سونت کر اس کی طرف بڑھے شیخ وحید الدین' بے اختیار اٹھ کر کھڑے
ہو گئے۔ "نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔" وہ سپاہیوں کو دونوں ہاتھوں سے روک کر بولے۔ "تم
میرے گھر سے میرے مہمانوں کو گرفتار نہیں کر سکتے' پیچھے ہٹ جاؤ' میں خود خلیفہ سے
بات کروں گا۔"

کماندار سخت لہجے میں بولا۔ "مولانا' آپ ہٹ جائیے داروغہ جیل کی طرف سے اس
کی گرفتاری کا سخت حکم ہے۔"

کماندار نے آگے بڑھنے کی کوشش کی۔ وحید الدین نے اسے روکا۔ کماندار نے دھکا
دیا۔ مولانا لڑکھڑا کر ایک عقیدت مند کی بانہوں میں گرے۔ مزاج پرسی کے لیے آئے ہوئے
تمام افراد کے چہرے تمتمانے لگے۔ مولانا نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں کسی بھی حرکت
سے باز رکھا۔ اسد نے خود ہی آگے بڑھ کر گرفتاری پیش کر دی۔ سپاہیوں نے اسے گرفتار
کیا اور دھکیلتے ہوئے بیرونی دروازے سے باہر نکل گئے۔

کمرے کے اندر گھمبیر خاموشی طاری ہو گئی۔ شیخ وحید الدین ابھی تک اپنے زخم پر
ہاتھ رکھے کھڑے تھے۔ عقیدتمند سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ شیخ کی
نگاہیں کسی گہری سوچ میں ڈوبی تھیں۔ پھر وہ پُرعزم لہجے میں بولے۔

"مجھے دروازے تک لے چلو۔"

عقیدتمندوں نے انہیں ان کی خراب حالت کا احساس دلانا چاہا لیکن انہوں نے
دوبارہ وہی فقرہ دہرایا اور اس دفعہ لہجہ اتنا فیصلہ کن تھا کہ کسی کو حکم عدولی کا چارہ نہ ہوا۔
شیخ کو بازوؤں سے سہارا دے کر بیرونی دروازے تک پہنچایا گیا۔ وہ سیڑھیوں پر کھڑے ہو

کہ وہ اڑ کر قید خانے پہنچے اور اباقہ کو چھڑا لے جائے۔ خدا جانے کیوں اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ اگر وہ ایسا نہ کر سکا تو اس دفعہ اباقہ اور یورق جیل سے زندہ باہر نہیں آ سکیں گے۔

وہ فوجی افسروں کے ساتھ حتی الامکان عجلت سے قید خانے کی طرف روانہ ہوا۔ اسے معلوم تھا اگر منگول سفارتکار اباقہ اور یورق کی موجودگی سے آگاہ ہو گئے ہیں تو وہ خلیفہ کو پلک جھپکتے میں اپنا فیصلہ بدلنے پر مجبور کر سکتے ہیں۔ خلیفہ کے محل سے قید خانے کا فاصلہ قریباً چار کوس تھا۔ اسد فوجی افسروں کو بار بار تیز چلنے کے لیے کہہ رہا تھا۔ جب وہ قید خانے پہنچے تو پتہ چلا کہ داروغہ ابھی تھوڑی دیر پہلے کسی کام سے گیا ہے۔

اسد کی بے چینی میں مزید اضافہ ہو گیا۔ اس نے فوجی افسروں سے کہا کہ داروغہ کے نائب کو دستاویزات دکھا دی جائیں' لیکن افسروں کا خیال تھا کہ یہ داروغہ کی ذمے داری ہے۔ آخر خدا خدا کر کے داروغہ پہنچا۔ اسد نے اسے کاغذات دکھائے۔ جس وقت وہ کاغذات کا مطالعہ کر رہا تھا۔ اسد کو گھوڑوں کی ٹاپیں سنائی دیں۔ گھڑ سوار بڑی عجلت میں دکھائی دیتے تھے۔ پھر محل کے چند اہلکار تیز قدموں سے اندر داخل ہوئے۔ ان کے ساتھ ایک منگول بھی تھا۔ ان کے چہرے دیکھتے ہی اسد کو صورت حال کا اندازہ ہو گیا۔ اس نے نہایت پھرتی سے داروغہ کے ہاتھ سے کاغذ چھینے اور چند قدم بھاگ کر کھڑکی سے چھلانگ لگا دی۔ وہ باہر گھاس کے قطعے پر گرا اور گرتے ساتھ ہی اٹھ کر بیرونی دیوار کی طرف بھاگا۔ یہ سب کچھ اتنی جلدی ہوا کہ کسی کو کچھ سمجھنے کا موقعہ نہیں ملا۔ مارینا بھی حیرت سے یہ سب کچھ دیکھتی رہ گئی۔ جب تک پھاٹک پر کھڑے سپاہی سنبھلتے اسد بیرونی دیوار پھاند کر فرار ہو چکا تھا۔

"بھاگو...... بھاگو اس کا پیچھا کرو۔" داروغہ چلایا۔

محل سے آنے والے اہلکاروں میں ناظم اعلیٰ سب سے آگے تھا۔ اس نے لپک کر مارینا کو دبوچ لیا۔

☆-------☆-------☆

شیخ وحیدالدین اپنے گھر مسہری پر دراز تھے۔ مزاج پرسی کے لیے آنے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ گھر کے اندر اور باہر بے شمار افراد جمع تھے۔ طبیبوں نے انہیں ملنے جلنے سے منع کر رکھا تھا۔ ان کے چہرے پر زردی کھنڈی تھی لیکن حالت اب پہلے سے کچھ بہتر تھی۔

اسد بغلی دروازے سے اندر داخل ہوا۔ وحیدالدین اسے دیکھ کر مسکرائے۔ "

بھئی تمہارا کام ہو گیا؟" انہوں نے پوچھا۔

اسد نے جیب کے اندر سے قاضی کا فیصلہ اور خلیفہ کا حکم نامہ نکال کر ان کے سامنے رکھ دیا۔ وحیدالدین نے دونوں کاغذ دیکھے۔ پھر بولے۔ "یہ حکم نامہ تو خوشخبری کا ہے لیکن تمہارے چہرے سے مایوسی ٹپک رہی ہے۔"

اسد بولا۔ "یا شیخ۔ مجھے شاید تھوڑی دیر بعد گرفتار کر لیا جائے گا۔ میں یہ امانت آپ تک پہنچانا چاہتا تھا منگول سفارتکار نے سارا کھیل بگاڑ دیا ہے۔ میں اس وقت جب داروغہ' اباقہ اور یورق کو رہا کرنے والا تھا سفیر نے اسے فیصلہ بدلنے پر مجبور کر دیا ہے۔ میں بھی بڑی مشکل سے بھاگ کر آیا ہوں۔"

ابھی مشکل سے اسد کا فقرہ مکمل ہوا تھا کہ دیوان خانے کی طرف سے بھاگتے قدموں کی آوازیں آئیں اور چند مسلح سپاہی دندناتے ہوئے اندر داخل ہو گئے۔ اسد کو دیکھتے ہی وہ تلواریں سونت کر اس کی طرف بڑھے شیخ وحیدالدین' بے اختیار اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ "نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔" وہ سپاہیوں کو دونوں ہاتھوں سے روک کر بولے۔ "تم میرے گھر سے میرے مہمانوں کو گرفتار نہیں کر سکتے' پیچھے ہٹ جاؤ' میں خود خلیفہ سے بات کروں گا۔"

کماندار سخت لہجے میں بولا۔ "مولانا' آپ ہٹ جایئے داروغہ جیل کی طرف سے اس کی گرفتاری کا سخت حکم ہے۔"

کماندار نے آگے بڑھنے کی کوشش کی۔ وحیدالدین نے اسے روکا۔ کماندار نے دھکا دیا مولانا لڑکھڑا کر ایک عقیدت مند کی بانہوں میں گرے۔ مزاج پرسی کے لیے آئے ہوئے تمام افراد کے چہرے تمتمانے لگے۔ مولانا نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں کسی بھی حرکت سے باز رکھا۔ اسد نے خود ہی آگے بڑھ کر گرفتاری پیش کر دی۔ سپاہیوں نے اسے گرفتار کیا اور دھکیلتے ہوئے بیرونی دروازے سے باہر نکل گئے۔

کمرے کے اندر گھمبیر خاموشی طاری ہو گئی۔ شیخ وحیدالدین ابھی تک اپنے زخم پر ہاتھ رکھے کھڑے تھے۔ عقیدتمند سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ شیخ کی نگاہیں کسی گہری سوچ میں ڈوبی تھیں۔ پھر وہ پرعزم لہجے میں بولے۔

"مجھے دروازے تک لے چلو۔"

عقیدتمندوں نے انہیں ان کی خراب حالت کا احساس دلانا چاہا لیکن انہوں نے دوبارہ وہی فقرہ دوہرایا اور اس دفعہ لہجہ اتنا فیصلہ کن تھا کہ کسی کو حکم عدولی کا چارہ نہ ہوا۔ شیخ کو بازوؤں سے سہارا دے کر بیرونی دروازے تک پہنچایا گیا۔ وہ سیڑھیوں پر کھڑے ہو

گئے اور گھر کے سامنے جمع ہونے والے لوگوں کی طرف دیکھنے لگے۔ ایک تقریر ان
عرصے سے قرض چلی آ رہی تھی۔ اس تقریر کو انہوں نے اپنے سینے کی گہرائیوں میں دفن
کر رکھا تھا۔ صرف اس خدشے کے پیش نظر کہ امن کی فضا مکدر نہ ہو۔ سچائیوں کا انکشاف
کچھ بدباطنوں کو مشتعل نہ کر دے۔ مفاد عامہ کی خاطر انہوں نے ہمیشہ دبے لہجے میں
سنبھل سنبھل کر بات کی تھی لیکن آج وہ بولنا چاہتے تھے۔ اہل بغداد کا قرض اتارنا
چاہتے تھے۔ جب شیخ وحید الدین نے بولنا شروع کیا تو چند سو کا مجمع تھا لیکن جوں جوں ان
کی آواز بلند ہوتی گئی مجمع بڑھتا چلا گیا۔ دونوں طرف سے آمد و رفت بند ہو گئی۔ دیکھتے ہی
دیکھتے سینکڑوں لوگ جمع ہو گئے۔ ایک جم غفیر شیخ کی پُر جوش تقریر کے لیے ہمہ تن گوش
ہو گیا۔ ہاں یہی وہ انداز تھا جس کے لیے شیخ کے سامعین ایک مدت سے ترس رہے
تھے۔ سلطان جلال الدین کی حمایت اور تاتاریوں کی مخالفت میں ایسی کھلم کھلا اور پُر زور
تقریر اہل بغداد کے کانوں تک کبھی نہیں پہنچی تھی۔ وہ تقریر نہیں تھی ایک تیز دھار تلوار
تھی جو حق و باطل میں فیصلہ کر رہی تھی۔ مصلحتوں کے پردے پارہ پارہ ہو رہے تھے۔
منافقوں کے چہروں سے نقاب ہٹ رہے تھے۔ تقریر سننے والوں کا ایک گروہ فلک شگاف
نعرے لگا رہا تھا۔ یہ نعرے ان کالی بھیڑوں کے خلاف تھے جو حکومت میں رہ کر اسلام کے
خلاف سازشیں کر رہے تھے۔ خلیفہ کو دباؤ کے تحت غلط راستوں پر چلا رہے تھے ......
اور پھر ہجوم بے قابو ہو گیا۔ اُدھر شیخ کی تقریر عروج پر پہنچی اِدھر ان کا زخم خون اگلنے لگا۔
بخیئے ٹوٹ گئے تھے۔ جسم پر کپکپی طاری ہو رہی تھی ...... لیکن وہ بول رہے تھے۔ پھر ان
کی زبان لڑکھڑانے لگی۔ انہوں نے تقریر ختم کی اور سامعین سے اجازت طلب کر کے
واپس مڑے۔ ان کی حالت غیر تھی۔ عقیدت مندوں نے انہیں بازوؤں سے تھام لیا۔

چند ہی لمحے بعد مجمعے سے اِنا اللہ و انا الیہ راجعون کی صدا بلند ہوئی۔ شیخ وحید الدین
وفات پا گئے تھے۔ لوگ کچھ دیر سکتے کے عالم میں کھڑے رہے۔ پھر ایک پُر غضب گروہ
نعرے لگاتا ہوا دجلہ کی طرف بڑھا۔ سینکڑوں لوگ ان کے پیچھے تھے۔ وہ شیخ کی آخری
تقریر سے بہت کچھ جان چکے تھے۔ انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ خلیفہ پر دباؤ ڈال کر اس سے
کیسے کیسے فیصلے کروائے جا رہے ہیں۔

منظر جیل خانے کا تھا۔ سینکڑوں مشتعل افراد نے جیل پر حملہ کیا۔ محافظ معمولی
مزاحمت کے بعد بھاگ کھڑے ہوئے۔ جیل کا ایک حصہ توڑ کر بیسیوں قیدیوں کو رہا کرا لیا
گیا۔ ان میں اباقہ مارینا اور یورق بھی شامل تھے۔ اباقہ کو دیکھ کر لوگوں کے غضب اور
جوش میں اور اضافہ ہوا ...... یہی وہ نوجوان تھا جسے چند روز پہلے لوگ بڑی محبت اور

طاقت سے اپنے کندھوں پر اٹھا کر خلیفہ کے دربار تک لائے تھے لیکن وہاں اسے گرفتار
کر لیا گیا تھا اور وہ سب منہ لٹکا کر واپس چلے آئے تھے۔

جس وقت جیل پر حملہ ہوا داروغہ اور ناظم شہر بھی وہیں موجود تھے۔ داروغہ نے تو
اپنے عملے کی طرح بھاگنے میں عافیت سمجھی لیکن ناظم اپنے کچھ ساتھیوں کے ساتھ آخر
وقت تک مظاہرین کو روکنے کی کوشش کرتا رہا۔ اس نے چند افراد کو اپنی تلوار سے زخمی
بھی کیا۔ آخر مظاہرین نے بھرپور جوابی حملہ کیا اور ناظم اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ بھاگ
کھڑا ہوا۔ "جانے نہ پائے۔" ایک آواز بلند ہوئی۔ "ہاں پکڑ لو۔" بہت سی دوسری
آوازوں نے ساتھ دیا۔ لوگ بے قابو ہو کر سیلاب کی طرح ناظم کے پیچھے لپکے۔ ناظم
کہنہ چوک سے ہوتا ہوا دجلہ کے محلات کی طرف بڑھا۔ لوگ پیچھے رہ گئے لیکن ایک
مشتعل ٹولی تیزی رفتاری سے اس کا تعاقب کر رہی تھی۔ آخر ناظم گرتا پڑتا اپنے دوست
سیف الدین کے گھر میں داخل ہو گیا۔ مشتعل لوگوں نے محل نما عمارت کی دہلیز تک اس کا
تعاقب کیا پھر زور زور سے بلند و بالا آبنوسی دروازہ پیٹنے لگے۔ کچھ لوگ کھڑکیوں اور
دروازوں پر پتھر پھینکنے لگے۔ جلد ہی سارے کا سارا ہجوم سیف الدین کی رہائش گاہ کے
سامنے جمع ہو چکا تھا۔ لوگ ناظم اعلیٰ کو کسی صورت چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ دفعتاً محل نما
عمارت کی بالائی کھڑکیوں سے تیروں کی بارش ہونے لگی۔ نہتے لوگ جو کسی حد تک لاپرواہ
بھی تھے اپنا بچاؤ کرنے میں ناکام رہے۔ تیروں کی پہلی ہی باڑ چھ آدمیوں کی جان لے گئی۔
ایک پُرہول منظر تھا۔ لوگ چیختے چلاتے واپس بھاگے کچھ نے گھبراہٹ میں دریا میں
چھلانگیں لگا دیں۔ ایسی بھگدڑ مچی کہ میدان صاف ہو گیا لیکن تھوڑی ہی دیر بعد پھر
مشتعل گروہ پل کے قریب جمع ہونے لگے۔ ان کی خون بار آنکھیں بلند و بالا عمارت کے
دریچوں پر جمی تھیں اور سینوں سے نعرے ابل رہے تھے ...... لیکن وہ جانتے تھے قریب
جانا خطرناک ہے۔ ان سے کچھ ہی فاصلے پر چھ عدد لاشیں پڑی تھیں۔

...... پھر لوگوں نے دیکھا کہ ہجوم میں سے ایک نوجوان نکل کر تیزی سے آگے
بڑھا ...... اس کے جسم پر قیدیوں والا لباس تھا اور ہاتھ میں تلوار تھی۔ وہ اس نوجوان کو
اچھی طرح پہچانتے تھے ...... یہی اباقہ تھا ...... ہاں یہی اباقہ تھا۔ وہ اباقہ جس کی کہانی
ان دنوں بغداد کے گلی کوچوں میں گردش کر رہی تھی۔ وہ سر پر ایک چھوٹی سی ڈھال رکھے
بلا کی رفتار سے آبنوسی دروازے کی طرف بھاگ رہا تھا۔ تیر سنسنائے لیکن وہ ان سے بچتا
ہوا دروازے تک پہنچ گیا۔ دروازے کے قریب پہنچ کر بھی اس کی رفتار کم نہیں ہوئی اور
وہ پوری قوت سے چوبی تختوں کے ساتھ ٹکرایا لیکن پھاٹک نما مضبوط دروازہ ٹوٹنے سے

محفوظ رہا۔ نوجوان نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر چھلانگ لگا کر دروازے کا چھجہ پکڑ لیا۔ پھر اس نے اپنے جسم کو جھلایا اور تیزی سے اوپر چڑھنے لگا۔ کھڑکیوں میں چند چہرے دکھائی دیے وہ اباقہ کو ڈھونڈ رہے تھے لیکن وہ چھپکلی کی طرح دیوار سے چپکا' مختلف چیزوں کے سہارے اوپر چڑھ رہا تھا۔

☆------☆------☆

جب ہانپتا کانپتا ناظم کمرے میں داخل ہوا تھا' سیف الدین' وزیر داخلہ اور مسلم بن داؤد اکٹھے بیٹھے جام چڑھا رہے تھے۔ ناظم اعلیٰ نے انہیں جیل ٹوٹنے کی خبر سنائی اور باقی کی صورت حال وہ کھڑکیوں سے نظر آنے والے ہجوم کو دیکھ کر جان گئے۔ یوں تو مسلم بن داؤد کا نشہ ہجوم کو دیکھ کر ہی اترنے لگا تھا لیکن ابھی چند لمحے پہلے اس نے اباقہ کو تیزی سے عمارت کی طرف لپکتے دیکھا تھا اور اس کا رہا سہا خمار بھی کافور ہو گیا تھا۔ وہ جانتا تھا اباقہ کو روکنا ناظم اعلیٰ' سیف الدین اور اس کے چند ملازموں کے بس کا روگ نہیں .... یہ وہ بلا ہے جو سات کوٹھڑیوں میں بھی پہنچ سکتی ہے .... داؤد اب فرار ہونے کا سوچ رہا تھا۔ یہ سارا کیا دھرا اسی کا تھا لیکن سب سے زیادہ خوف بھی اسی کو محسوس ہو رہا تھا۔ موقع دیکھ کر وہ کمرے سے نکلا اور بوکھلایا ہوا اِدھر اُدھر گھومنے لگا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی یہاں سے کیسے نکلے۔ اچانک اسے ایک روزن سے کسی کے چیخنے کی آواز آئی۔ کمرے کو باہر سے کنڈی لگی تھی۔ وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو ایک نوجوان عورت دکھائی دی۔ اس کے دونوں ہاتھ ایک رسی سے جکڑ کر چھت سے باندھ دیے گئے تھے۔ عورت کے جسم پر پھٹا پرانا لباس تھا اور لگتا تھا وہ کئی دن کے فاقے سے ہے۔ اگر داؤد کا اندازہ غلط نہیں تھا تو یہ سیف الدین کی پہلی بیوی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ سیف الدین کی پہلی بیوی بڑی ذلت کی زندگی گزار رہی ہے۔ وہ اپنی "خادمہ" سوکن کے جوتے صاف کرتی ہے اور اس سے پٹتی ہے۔

عورت مسلم بن داؤد کو دیکھ کر زور زور سے رونے لگی۔ وہ پوچھ رہی تھی۔ "اس گھر میں کیا ہو رہا ہے۔ یہ لوگوں کی آوازیں کیسی ہیں۔ سب لوگ کہاں چلے گئے ہیں .... کوئی مجھے بھی کچھ بتائے۔" مسلم بن داؤد نے کہا۔

"گھر پر کچھ لوگوں نے حملہ کر دیا ہے۔ وہ تمہارے خاوند کو مارنا چاہتے ہیں ...."

"ہائے اللہ۔" عورت کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ "کیا تم مجھے کھول سکتے ہو؟"

مسلم بن داؤد کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ وہ بولا۔ "ضرور .... لیکن کیا تم مجھے چھت پر پہنچنے کا راستہ بتا سکو گی؟"

"کیوں نہیں .... کیوں نہیں۔" سیف الدین کی بیوی بولی۔ داؤد نے عورت کی رسیاں کاٹ دیں اور اس سے چھت تک جانے کا راستہ پوچھ کر تیزی سے سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ تیسری منزل پر پہنچ کر اس نے کچھ کھڑکیاں دیکھیں۔ یہ عمارت کا عقبی حصہ تھا۔ نیچے ایک پرانا باغ نظر آ رہا تھا۔ کثرت سے جھاڑ جھنکار اگا ہوا تھا۔ لگتا تھا قوام الدین نے اپنی زندگی میں اس کی طرف توجہ نہیں دی۔ اب شاید سیف الدین اسے ٹھیک کرنے کی فکر میں تھا۔ ایک جانب کھاد کا ایک بڑا ڈھیر نظر آ رہا تھا۔ مویشیوں کا گوبر' انسانی فضلہ' کوڑا کرکٹ سب کچھ اس میں شامل تھا .... لیکن مسلم بن داؤد اس ڈھیر کو ایسی للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے یہ پھولوں کا انبار ہو اور واقعی اباقہ کا سامنا کرنے سے اس گندگی میں کودنا اس کے لیے کہیں احسن تھا۔ اس نے کھڑکی سے ایک ٹانگ نیچے لٹکائی اور خوفزدہ نظروں سے بلندی کا جائزہ لینے لگا۔ وہ تیسری منزل پر تھا .... ایکا ایکی اس کی گھگھی بندھ گئی۔ اس نے کبھی بلندی سے چھلانگ نہیں لگائی تھی لیکن پھر اباقہ کا چہرہ اس کی نگاہوں میں گھوما اور اس نے ایک ہلکی سی چیخ کے ساتھ کھڑکی چھوڑ دی۔ فضا میں ہاتھ پاؤں چلاتا وہ کسی کیکڑے کی طرح سڑی ہوئی کھاد میں گرا اور اپنا لشتم پشتم جب سنبھالتا ہوا ...وں کی طرف بھاگ نکلا۔ اس کی لنگڑاہٹ اس کے فرار کو اور بھی مضحکہ خیز بنا رہی تھی۔

دوسری طرف عین اس وقت اباقہ عذاب الٰہی کی طرح کمرے میں نازل ہو چکا تھا .... دفعتاً ایک عقبی کھڑکی دھماکے سے کھلی۔ ناظم اعلیٰ اور سیف الدین نے تیزی سے گھوم کر دیکھا۔ قیدیوں کے لباس میں تلوار تھامے ننگے پاؤں وہ ان کے سامنے تھا۔ اس کی آنکھیں کسی غضبناک درندے کی طرح روشن تھیں۔ یوں لگتا تھا ایک ہی وقت میں وہ کمرے کی ہر شے کو دیکھ رہا ہے۔ کھڑکی سے آنے والے کسی پتھر نے وزیر داخلہ عبدالرشید کا سر پھوڑ دیا تھا اور وہ زمین پر بے سدھ پڑا تھا۔ ناظم اعلیٰ نے سیف الدین کو ہاتھ سے پیچھے کیا اور خود بڑے غرور سے اباقہ کے سامنے آیا۔ اسے معلوم نہیں تھا وہ کس آفت کے سامنے خم ٹھونک رہا ہے۔ اگر معلوم ہوتا تو شاید وہ بھی گندگی کے ڈھیر پر کودنے کو ترجیح دیتا۔ اباقہ کے حلق سے مخصوص غراہٹ نکلی۔ اس کی تلوار بلا خیز تیزی سے متحرک ہوئی۔ ناظم اعلیٰ نے پیچھے ہٹتے ہٹتے دو تین وار روکے پھر اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ بے خیالی میں کسی لشکر سے ٹکرا گیا ہے۔ اباقہ کی تلوار اس کے چاروں طرف جال سا بن رہی تھی۔ پلک جھپکتے میں اس کے جسم پر بیسیوں چرکے لگ گئے۔ پھر ایک بھرپور وار نے اس کا ہاتھ تلوار سمیت کاٹ کے فرش پر پھینک دیا۔ وہ اپنے کٹے ہوئے ہاتھ کو دیکھ رہا

تھا۔ جب ایک زوردار دھکے نے اسے اچھال کر وزیر داخلہ کے بے ہوش جسم کے برابر لٹا دیا۔ ہوش وحواس کھونے سے پہلے جو آخری منظر دیکھا وہ یہ تھا کہ اباقہ سیف الدین کا گلا اس کی کمان کے چلے سے گھونٹ رہا ہے اور اس کی حسین "خادمہ" بیوی چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھا رہی ہے۔"

"بدبخت رئیس زادے!" اباقہ کی بھاری آواز کمرے میں گونجی۔ "جا اپنے باپ کے پاس اور اسے اپنا کالا چہرہ دکھا.......... جا۔" وہ زور سے چیخا اور کمان کا چلا سیف الدین کی شہ رگ پر کسنے لگا۔ اس وقت سیف الدین کی پہلی بیوی ننگے سر اور ننگے پاؤں بھاگتی ہوئی آئی اور اباقہ سے لپٹ گئی۔ وہ چیخی۔

"چھوڑ دے اسے' خدا کے لیے چھوڑ دے۔ یہ میرا شوہر ہے۔"

اس وقت اس کی دوسری بیوی نے بھی ہمت کی اور آگے بڑھ کر اباقہ کے ہاتھوں کو دانتوں سے کاٹنے لگی۔ دونوں عورتیں اباقہ سے چمٹی ہوئی تھیں اور اباقہ نے سیف الدین کو دبوچ رکھا تھا۔ اس دوران اسد اللہ بھی ایک ٹوٹی ہوئی کھڑکی کے راستے کمرے میں داخل ہو گیا۔ اس نے پلک جھپکتے میں سیف الدین کے ایک ملازم کو ہلاک کر دیا اور باقی دو کو بے بس کر کے ایک کونے میں اوندھا لٹا دیا۔

عورتوں کی جدوجہد بڑھی تو اباقہ نے سیف الدین کی گردن پر گرفت ڈھیلی کر دی۔ پھر اس نے پشت سے اسے دھکا دیا اور وہ لڑکھڑاتا ہوا دیوار سے جا ٹکرایا۔ اب وہ سہمی ہوئی نظروں سے اباقہ اور اسد کی طرح دیکھ رہا تھا۔ اباقہ بولا۔

"اپنے باپ کے قاتل' چاہیے تو یہ تھا کہ تجھے تیرے ساتھیوں سے پہلے مارا جاتا.......... لیکن شاید تیری سانسیں ابھی باقی ہیں جا' چلا جا' اس سے پہلے کہ میں تیرا یہ عشرت کدہ جلا کر راکھ کر دوں یہاں سے نکل جا.......... اور اپنی بیوی کو بھی لیتا جا یہاں سے۔"

سیف الدین نے جلدی سے اپنی ایک اتری ہوئی جوتی پہنی۔ اس کی خادمہ بیوی نے آگے بڑھ کر اس کا ایک بازو پکڑ لیا۔ وہ اسے لے کر بیرونی دروازے کی طرف لپکا۔ اباقہ گہری نظروں سے منظر دیکھ رہا تھا۔ اس کی ساکت آنکھوں سے ایک اسرار جھانک رہا تھا۔ چہرہ پتھر کی طرح سخت تھا۔ جب سیف الدین دروازے کی دہلیز پر پہنچا۔ اباقہ کی کڑکدار آواز گونجی۔ "ٹھہر جا بدبخت۔"

سیف الدین اور اس کی بیوی نے زرد چہروں سے گھوم کر اسے دیکھا۔ اباقہ کے ہونٹوں پر ایک زہرخند مسکراہٹ نمودار ہوئی.......... وہ تلوار سونت کر بہ آہستگی ان دونوں کی طرف بڑھا۔ اسد کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ کتنی سفاکی تھی اس کے انداز

میں۔ وہ جان چکا تھا' اباقہ اب ان دونوں کو نہیں چھوڑے گا۔ اس نے اپنے سیدھے سادے انداز میں سیف الدین کا امتحان لیا تھا۔ اس بے وقوف کو موت سامنے دیکھ کر بھی عقل نہیں آئی تھی۔ اسد جانتا تھا اگر کمرے سے نکلتے وقت اس کے ساتھ اس کی پہلی بیوی ہوتی تو اباقہ انہیں کچھ نہ کہتا۔

وہ خوفناک انداز میں چلتا ہوا ان دونوں کے سر پر پہنچا۔ اس کی آنکھیں شعلے اگل رہی تھی۔ "نہیں.......... تم اسے نہیں مار سکتے۔" سیف الدین کی خادمہ بیوی چلائی اور بازو پھیلا کر سیف الدین کے آگے کھڑی ہو گئی۔ شاید وہ سمجھ رہی تھی کہ اباقہ کا دل پسیج جائے گا لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ اباقہ چند لمحے قہر آلود نظروں سے دونوں کو دیکھتا رہا۔ دونوں آگے پیچھے کھڑے تھے۔ پھر اس کی تلوار متحرک ہوئی.......... پہلے اس مکار خادمہ کے پیٹ میں اتری پھر سیف الدین کے پیٹ میں گھس گئی۔ کمرہ دلدوز چیخوں سے گونج اٹھا۔ ایک ہی وار میں دونوں میاں بیوی جہنم واصل ہو چکے تھے۔ سیف الدین کی پہلی بیوی یہ منظر دیکھ کر تیورا کر گری۔ وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ اباقہ نے ایک جھٹکے سے خون آلود تلوار نکالی اور بے ہوش وزیر خارجہ کی طرف بڑھا۔ اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ اس کا سر قلم کر دے گا۔

"نہیں اباقہ۔" اسد اللہ پکارا۔ "اسے کچھ نہ کہنا ورنہ ہم سب مشکل میں پڑ جائیں گے۔"

اباقہ کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے.......... اس وقت اس کی نگاہ کھڑکی سے نظر آنے والے مشتعل ہجوم کی طرف اٹھ گئی۔ دفعتاً اسے کوئی ایسی چیز نظر آئی کہ وہ اپنی جگہ جامد کھڑا رہ گیا۔ اس کی تمام حسیات صرف اور صرف آنکھوں میں سمٹ آئی تھیں۔ وہ اپنے اردگرد کے ماحول سے بالکل بے خبر ہو چکا تھا۔ اسد اللہ نے اس کی نظروں کا تعاقب کرنا چاہا لیکن ناکام رہا۔ نہ جانے اباقہ کو کیا دکھائی دیا تھا۔ جب اس نے واپس اباقہ کی طرف دیکھا تو وہ وہاں موجود نہیں تھا۔ دروازے کا جھولتا ہوا پردہ بتا رہا تھا کہ کوئی ہوا کی طرح کمرے سے نکل گیا ہے۔

اباقہ نے روشندان کے چھجے سے لٹک کر چھلانگ لگائی اور سیدھا سڑک پر آیا۔ پاؤں زمین ٹکتے ہی وہ سیدھا کھڑا ہوا اور ہجوم کی طرف بھاگا۔ ابھی چند لمحے پہلے اسے ہجوم میں ایک مانوس چہرہ دکھائی دیا تھا بلکہ کہنا چاہئے کہ اس چہرے کی صرف ایک جھلک دکھائی دی تھی۔ اباقہ کے ذہن میں یکبارگی قندیلیں سی روشن ہو گئی تھیں۔ وہ اس چہرے کو جانتا تھا۔ کہیں نہ کہیں اس نے یہ چہرہ ضرور دیکھا تھا۔ پھر اباقہ کے جسم میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی تھی۔

اسے محسوس ہوا تھا یہ اس خواب کا چہرہ ہے جو وہ اکثر راتوں کو دیکھا کرتا تھا۔ صرف ایک ساعت وہ خواب والا درویش اسے مجمعے میں کہیں دکھائی دیا تھا۔ اباقہ نے مشینی انداز میں کمرے کا پردہ اٹھایا تھا اور باہر نکل آیا تھا۔

.... اور اب وہ ہجوم کی طرف بھاگ رہا تھا۔ قریب قریب گری ہوئی چھ لاشوں کے پاس سے گزر کر وہ ہجوم میں گھس گیا اور دیوانوں کی طرح اس چہرے کو تلاش کرنے لگا۔ وہ لوگوں کو دھکیل رہا تھا۔ انہیں دائیں بائیں ہٹا رہا تھا اور لوگ حیرت سے اسے دیکھ رہے تھے۔ پھر اس نے ماریتا اور یورق کی گرفت اپنے کندھوں پر محسوس کی وہ چیخ چیخ کر پوچھ رہے تھے۔

"اباقہ کیا ہوا کچھ بتاؤ بھی؟ کس کو ڈھونڈ رہے ہو؟"

اباقہ انہیں نظر انداز کرتا ہجوم میں آگے بڑھتا رہا.......... لیکن انسانوں کے اس سمندر میں گوہر مطلوب اسے ہاتھ نہیں آیا۔ اب وہ ہجوم کی دوسری طرف نکل آیا تھا دجلہ کا پل سامنے نظر آرہا تھا۔ اباقہ نے پل کی طرف دیکھا اور ٹھٹک گیا۔ امن و امان بحال رکھنے کے لیے بغداد انتظامیہ حرکت میں آگئی تھی۔ کم و بیش ڈیڑھ سو مسلح سپاہی ایک کماندار کے ساتھ پل کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ان کے عقب میں گھڑ سوار سپاہیوں کی ایک اور ٹولی نظر آرہی تھی۔

یورق نے اباقہ کا کندھا دباتے ہوئے کہا۔ "جنگلی .... تیرے سسرال والے آگئے ہیں۔ اب سنبھل ذرا۔"

اباقہ اور ماریتا کی نگاہیں بھی تشویش [illegible] رہی تھیں۔ پھر جیسے اباقہ ہوش میں آیا اور ماریتا کا ہاتھ تھام کر واپس سیف الدین کے گھر کی طرف لپکا۔ یورق نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ اب بہت سے دوسرے لوگ پیش قدمی کرتے ہوئے دستوں کو دیکھ چکے تھے۔ ان میں بھگدڑ کے آثار نظر آنے لگے' لیکن ہجوم میں کچھ سر پھرے ایسے بھی تھے جو بھاگنے کی بجائے فلک شگاف نعرہ زنی کر رہے تھے ان لوگوں نے اباقہ یورق اور ماریتا کے گرد گھیرا ڈال لیا۔ وہ چلا چلا کر کہہ رہے تھے۔ "ہم ان بے گناہوں کو جیل میں نہیں جانے دیں گے۔"

"نہیں جانے دیں گے .... نہیں جانے دیں گے۔" ہاتھ بلند ہو رہے تھے' گھونسے لہرا رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے گھڑ سوار دستوں نے پل پار کر کے سیف الدین کے گھر کے سامنے صف باندھ لی۔ صورت حال کی سنگینی دیکھ کر زیادہ تر لوگ تتر بتر ہو گئے تھے۔ صرف [illegible] بڑھ سو کے قریب افراد اباقہ ماریتا' یورق اور اسد کے گرد جمع تھے۔ کماندار

گھوڑا بڑھا کر آگے آیا اور بلند آواز سے بولا۔

"جیل سے بھاگے ہوئے قیدیوں کو پناہ دینا ایک سنگین جرم ہے۔ آپ سب لوگ ہٹ جائیں تاکہ خلیفہ کے حکم کے مطابق مجرموں کو گرفتار کیا.........."

ابھی کماندار کا فقرہ پورا نہیں ہوا تھا کہ ایک پتھر اس کی چھاتی پر لگا اور وہ گھوڑے سے الٹتے الٹتے بچا۔ تکلیف کی شدت سے وہ دہرا ہو گیا۔ اس کا ایک ہاتھ سینے پر تھا دوسرے ہاتھ سے اس نے مسلح گھڑ سواروں کو آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ گھڑ سوار اشارے کے منتظر تھے۔ وہ بڑے بڑے کوڑے لہراتے مظاہرین پر جھپٹے۔ کچھ نے تلواریں نیام سے باہر نکالیں اور کچھ نیزوں کی انیاں چمکانے لگے۔ نہتے لوگوں نے جب سپاہیوں کا غیض و غضب دیکھا تو پسپا ہوئے لگے۔ کچھ لوگ کوڑے کھا کر بغلی گلیوں میں بھاگے۔ سپاہیوں نے دور تک ان کا تعاقب کیا' لیکن اس مشکل وقت میں بھی نوجوانوں کی ایک ٹولی اباقہ وغیرہ کے ساتھ رہی۔ آخر اباقہ یورق اور اسد کوئی پچاس نوجوانوں کے ساتھ سیف الدین کے گھر میں گھس گئے۔ اسد نے جلدی سے ہاتھ بڑھا کر بلند و بالا آہنی دروازہ بند کر دیا۔ اباقہ اور یورق بھاگتے ہوئے تیسری منزل پر پہنچے۔ اباقہ کی نگاہیں شعلہ بار ہو رہی تھیں وہ دیکھ رہا تھا کہ سپاہی ہر قیمت پر انہیں گرفتار کرنا چاہتے ہیں اور وہ کسی قیمت پر گرفتار ہونا نہیں چاہتا تھا۔ اس کا انداز بتا رہا تھا کہ اگر اس کی آزادی پر قدغن لگانے کی کوشش کی گئی تو اس کا نتیجہ اچھا نہیں ہو گا۔

کھڑکی کے سامنے پہنچتے ہی اباقہ نے بھرپور ٹھوکر سے شیشہ توڑا اور بے دریغ تیر اندازی شروع کر دی۔ یورق نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ عمارت کے سامنے جمع ہونے والے سپاہیوں کا آج تک بغداد کے کمزور دل مظاہرین سے واسطہ پڑا تھا جو یا تو مناظرے کرنے والے ہوتے تھے یا فرقہ وارانہ بلووں میں حصہ لینے والے۔ عموماً یہ لوگ سپاہیوں کی شکل دیکھ کر ہی دم دبا کر بھاگ جاتے تھے .... لیکن اس وقت ان سپاہیوں کو جن لوگوں سے واسطہ پڑا تھا وہ تماش بینوں کا گروہ نہیں تھا۔ سر پھرے اور سر بکف صحرا نشینوں کی ٹولی تھی اور اس ٹولی میں ایک ایسا شخص بھی تھا جو صحرائے گوبی کے درندوں میں جنگجو کے نام سے مشہور تھا۔ جس کے لیے جان لینا اور جان دینا سانس کی آمد و رفت کی طرح آسان اور سہل تھا اور وہ بے خوف شخص کمان سنبھالے سیف الدین کے گھر کی کھڑکی میں بیٹھا تھا.......... سپاہی اس براہ راست تیر اندازی پر پہلے تو بھونچکا رہ گئے پھر گھوڑے لپیٹ کر اور جانیں سنبھال کر پل کی طرف بھاگے۔ یورق اور اباقہ کی تیر اندازی نے کم از کم چار سپاہیوں کو گھائل کر دیا تھا۔ ایک سپاہی گھوڑے سے گر گیا تھا

اور اب لنگڑاتا ہوا سپاہیوں کے عقب میں بھاگ رہا تھا۔

سپاہیوں نے پل کے عین اوپر پہنچ کر دم لیا اور ایسا کر کے انہوں نے یقیناً عقلمندی کا ثبوت دیا تھا۔ کیونکہ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو کھلی جگہ میں عمارت سے برسنے والے تیر انہیں تمام "فرائض منصبی" سے فارغ کر دیتے۔ وہ جانتے تھے کہ جان ہے تو جہان ہے اور ... بھی ہے اور اگر جان نہیں تو جہان، تنخواہ دینار کچھ بھی نہیں۔ پل پر پہنچ کر سپاہیوں نے پھر سنبھالا لیا۔ پیچھے سے کچھ اور کمک بھی پہنچ گئی۔ کمان دار نے گہری نظروں سے صورت حال کا جائزہ لیا۔ ایک دستے کو فوراً چکر کاٹ کر عمارت کی اطراف میں پھیلنے کا حکم دیا گیا باقی نفری کو ایک جگہ جمع کر کے نئی ہدایات دی گئیں۔ ہدایات دیتے ہوئے کمان دار بار بار عمارت کی طرف بھی دیکھ لیتا تھا۔ صورت حال نازک ہونے کے باوجود اس کی آنکھوں میں گہرا اطمینان تھا۔ کچھ بھی تھا مجرموں کا بچنا اب ناممکن تھا۔ انہوں نے خود اپنی موت پر ... لگائی تھی۔ کمان دار جانتا تھا اگر اتنی نفری مجرموں پر قابو پانے میں ناکام رہی تو اتنی اور نفری پہنچ جائے گی۔ ان چار قیدیوں کو گرفتار کرنے کے لیے وہ چار ہزار یا چالیس ہزار افراد کی خدمات بھی حاصل کر سکتا تھا۔ اس کا اطمینان قابل فہم تھا۔ وہ جانتا تھا ابھی تھوڑی دیر ... قیدی اس کے سامنے ہتھیار پھینک کر ہاتھ اٹھا دیں گے، لیکن اسے انہیں معاف نہیں کرنا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے وزیراعظم کا اہلکار خاص اس کے پاس پہنچا تھا۔ اس نے وزیراعظم کا حکم پہنچایا تھا کہ قیدیوں کو حراست میں لینے کی کارروائی کے دوران ہی انہیں ہلاک کر دیا جائے۔ خاص طور پر اس جنگلی نوجوان اور اس کی خوبرو ساتھی لڑکی کو نہیں ... چاہیے۔ کمان دار اس حکم کا مطلب بخوبی سمجھتا تھا۔ وزیراعظم ایک بہت بڑے مسئلے کو ... سے ختم کرنا چاہتا تھا۔ لڑکے اور لڑکی کو رہا کرنے کا مطالبہ بغداد کے لوگ کر رہے تھے اور اسے قراقرم لے جانے کی خواہش منگول سفیر ظاہر کر چکے تھے۔ کسی کی بات بھی مانی جانے کی صورت میں دوسرا فریق ناراض ہو سکتا تھا۔ واقعی اس کا بہتر حل یہی تھا کہ اس افراتفری میں قیدیوں کو آزاد کر دیا جائے .... یعنی زندگیوں سے آزاد کر دیا جائے۔ قاضی نہ عدالت، نہ دعویٰ نہ جواب دعویٰ۔ خس کم جہاں پاک۔

☆ ---- ☆ ---- ☆

وزیر داخلہ اور سیف الدین کی بیوی آصفہ ایک ساتھ ہوش میں آئے تھے۔ ان کے ہوش میں آنے سے پہلے اسد ... سیف الدین اور اس کی خادمہ بیومی کی لاشیں کمرے سے ہٹوا چکا تھا۔ دو دوسرے ملازموں کی لاشیں بھی ہٹا دی گئی تھیں۔ ناظم اعلیٰ کا کٹا ہوا بازو اباقہ نے گھما کر کھڑکی سے باہر ... دیا تھا جسے پل پر جمع ہونے والے سپاہی ...

... آڑ میں دوسری چھ لاشوں کے ساتھ ہی اٹھا کر لے گئے تھے۔ ناظم اعلیٰ کا خون بند کر کے ... باندھ دی گئی تھی۔ وہ ابھی تک بے ہوش تھا۔ اس کی حالت خطرے سے باہر نہیں تھی۔

سپاہیوں نے بروقت حرکت کر کے عمارت کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا اور محصورین کی پچھلی جانب سے نکلنے کی امید ختم ہو گئی تھی۔ اب مقابلے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ آئندہ حالات کیا رخ اختیار کریں گے یہ وقت ہی بتلا سکتا تھا۔ اپنے ساتھ ہی عمارت میں گھس آنے والے قریباً پچاس نوجوانوں کو اسد نے بڑی سپاہیانہ سمجھ بوجھ سے مختلف حصوں پر مورچہ بند کر دیا تھا۔ عمارت کے اندر سے انہیں کچھ کمانیں تلواریں اور نیزے مل گئے تھے۔ یہ سامان کافی نہیں تھا لیکن اسد کو امید تھی اس کی مدد سے وہ کافی دیر تک اپنا دفاع کر سکیں گے۔ ان کے ساتھ اندر آنے والے نوجوانوں میں سے زیادہ تر شیخ وحید الدین کے شاگرد اور پرجوش حامی تھے۔ اسد وغیرہ کے کہنے کے باوجود انہوں نے ان کا ساتھ چھوڑنے سے انکار کر دیا تھا۔ انہی کی زبانی اباقہ یورق اور اسد کو شیخ وحید الدین کی گرفتاری اور وفات کے بعد پیش آنے والے واقعات کا علم ہوا تھا۔ اب صاف ظاہر تھا کہ یہ سب کیا دھرا منگول سفارتکاروں کا ہے۔ اباقہ یورق اور اسد فیصلہ کر چکے تھے کہ وہ خود کو دشمن کے حوالے نہیں کریں گے۔

تینوں اس وقت تیسری منزل کے ایک کشادہ کمرے میں بیٹھے تھے۔ مارینا ایک کونے میں کھڑی سیف الدین کی نڈھال بیوہ کو دلاسا دے رہی تھی۔ سردار یورق مارینا کو مخاطب کر کے قدرے تلخی سے بولا۔

"محترم خاتون (وہ ہمیشہ اسے اسی لقب سے مخاطب کرتا تھا) اس نوحہ کناں عورت کو یہاں سے لے جائیے۔ عورتوں کی موجودگی میں مرد بھی عورتوں کی طرح سوچنے لگتے ہیں۔"

مارینا نے گہری نظروں سے یورق کی طرف دیکھا۔ وہ اس کا اشارہ سمجھ رہی تھی۔ یورق ڈھکے چھپے لفظوں میں اسے اباقہ سے دور رہنے کی تلقین کر رہا تھا اور یہ کوئی پہلا موقع نہیں تھا۔ وہ بارہا لفظوں کے نشتر اسے چبھو چکا تھا۔ اس کے حسین چہرے پر خفگی کی لہر دوڑی لیکن وہ کچھ بولی نہیں۔ سیف الدین کی بیوہ کو پہلو سے لگائے وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

پل پر کھڑے ہوئے سپاہی شام سے تھوڑی دیر پہلے حرکت میں آئے۔ وہ کم از کم سو تھے اور ڈھالوں کی آڑ میں عمارت کی طرف بڑھ رہے تھے۔ عقب میں کھڑے تیر

اندازوں نے عمارت کی کھڑکیوں پر اندھا دھند تیر برسانا شروع کر دیے۔ اباقہ اور یورق نے فوراً جوابی تیراندازی کی۔ اسد کے حکم پر ان کے دوسرے ساتھیوں نے بھی تیر پھینکنا شروع کر دیے۔ اسد دیکھ رہا تھا کہ ان کے پھینکے ہوئے تیر کارگر نہیں ہو رہے۔ ڈھالیں سپاہیوں کی حفاظت کر رہی تھیں، لیکن یہ صورت تادیر برقرار نہیں رہ سکتی تھی۔ عمارت سے قریب آنے کے بعد سپاہیوں کو اوپر سے تیروں کا نشانہ بنایا جا سکتا تھا، لیکن شاید پیش قدمی کرنے والے بھی یہ بات سمجھ رہے تھے وہ ایک خاص حد تک آکر ٹھہر گئے تھے۔

دفعتاً اباقہ کی چھٹی حس نے اسے خبردار کیا۔ اسے اندازہ ہوا کہ یہ چال ہے۔ سامنے والے سپاہی انہیں صرف الجھا رہے ہیں۔ اس نے چونک کر اسد کی طرف دیکھا اسد کی آنکھوں میں بھی سوچ کی پرچھائیاں تھیں۔ دونوں کی نظریں ملیں اور ایک دہ ساتھ اٹھ کر عمارت کے عقبی حصے کی طرح بھاگے۔ اس وقت مارینا اور سیف الدین کی بیوہ آصفہ ہوئی ان کی طرف لپکیں۔ مارینا اسد اللہ سے لپٹ گئی اور آصفہ حواس باختگی میں بھاگی گئی۔ اباقہ اور اسد نے ایک ساتھ تلواریں نکالیں۔ تین عدد سپاہی ننگی تلواریں لیے راہداری میں داخل ہوئے۔ اباقہ کود کر ان سامنے آیا۔ اس کی تلوار نے بیک وقت دو وار روکے۔ اس وقت سیڑھیوں کی طرف سے قدموں کی پُرشور آوازیں آئیں۔ کئی بیسیوں سپاہی اس وقت دندناتے ہوئے اوپر چڑھ رہے ہیں۔ اباقہ چیخا۔ "اسد میں ان کو سنبھالتا ہوں تم دروازہ بند کرو۔" اس کے ساتھ ہی اس کی تلوار نے ایک سپاہی کا کام کر دیا اسد نہایت تیزی سے دروازے کی طرف لپکا۔ یہ دروازہ درحقیقت تیسری منزل کا صدر دروازہ تھا۔ اس کے بند ہونے سے تیسری منزل وقتی طور پر محفوظ ہو سکتی تھی۔ اسد نے وزنی دروازے کو دھکیل کر بند کیا، لیکن ابھی اس نے کھٹکا نہیں لگایا تھا کہ سپاہی آ گئے۔ انہوں نے زور لگا کر دروازہ کھولنا چاہا، لیکن اسد چٹان کی طرح ڈٹ گیا۔ اتنے میں مارینا بھی بھاگتی ہوئی اس کی مدد کو پہنچ گئی۔ وہ کھٹکا چڑھانے کی سر توڑ کوشش کر رہے تھے لیکن کامیابی نہیں ہو رہی تھی۔ قریب تھا کہ سپاہی انہیں دھکیل کر اندر آجاتے کہ چند نوجوان ان کی اعانت کو آگئے۔ سب نے زور لگا کر دروازہ بند کر دیا۔ اسد نے مڑ کر اندر داخل ہونے والے تینوں سپاہی بے بس ہو چکے تھے۔ ایک کی بے بسی تو ابدی تھی دوسرے دو اباقہ کی تلوار کی نوک پر ہاتھ اٹھائے کھڑے تھے۔ اسد اللہ نے گھوم کر اس طرف دیکھا۔ اب صرف بغلی کھڑکیاں ہی ایسی تھیں جہاں سے کوئی حملہ آور اندر داخل ہو سکتا تھا، لیکن یہاں سے اچانک زوردار حملہ کرنا ممکن نہیں تھا۔ پھر بھی اسد نے ہر کھڑکی کے سامنے ایک مسلح شخص کو چوکس کھڑا کر دیا۔ سیڑھیوں پر موجود سپاہی بڑے دروازے

سے مسلسل زور آزمائی میں مصروف تھے۔ اب اباقہ اور اسد وغیرہ کے ساتھ کل پندرہ افراد رہ گئے تھے۔ دوسری منزل پر موجود ساتھی گرفتار ہو گئے تھے یا مارے گئے تھے۔ ان کے بارے میں انہیں کچھ معلوم نہیں تھا۔

اباقہ نے مارینا اور آصفہ کی مدد سے دونوں سپاہیوں کی مشکیں کس کے انہیں ایک طرف ڈال دیا۔ اس دوران اسد اور یورق نے چند نوجوانوں کے ساتھ مل کر کمرے کا وزنی ساز و سامان، الماریاں صندوق، پلنگ وغیرہ دروازے کے سامنے .... ڈھیر کر دیے۔ اس سے دروازے کی قوت مدافعت میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ کچھ دیر بعد دوسری جانب سے ایک بھاری بھرکم آواز گونجی۔ بولنے والا شاید دستے کا کماندار تھا۔ اس نے بارعب لہجے میں کہا۔

"تم لوگ مکمل طور پر گھر چکے ہو۔ یہ دروازہ زیادہ دیر تمہیں پناہ نہیں دے سکے گا۔ شرافت سے خود کو حکام کے حوالے کر دو۔"

اسد پھنکارا۔ "منگول مفادات کی حفاظت کرنے والے تیرے منہ سے شرافت کا لفظ اب نہیں دیتا۔ رہا یہ دروازہ تو یہ اتنی آسانی سے تمہیں راستہ نہیں دے گا اور اگر یہ ٹوٹ بھی گیا تو میں قسم کھاتا ہوں اندر آنے والے تیرے پہلے پچاس سپاہیوں میں سے ایک بھی زندہ نہیں بچے گا اور میں جانتا ہوں اگر تو ایک بزدل افسر نہیں تو ان پچاس میں تو بھی ضرور ہوگا۔" اسد کی آواز دروازے سے باہر موجود تمام لوگ سن رہے تھے اور سمجھ رہے تھے۔

کماندار غرایا۔ "مت بھول کہ میں اس عمارت کو آگ کی نذر بھی کر سکتا ہوں۔ شعلوں میں ناچنے سے بہتر ہے کہ تم اور تمہارے ساتھی ہاتھ اٹھا کر باہر آجائیں۔"

اسد بولا۔ "شعلوں میں ہم ہی نہیں تمہارا ناظم اعلیٰ اور وزیر داخلہ بھی ناچے گا۔ اس کے علاوہ تمہارے تین سپاہی، اس گھر کا مکین سیف الدین جو تمہارے ناظم اعلیٰ کا گہرا دوست ہے اور اس کے بال بچے اسی آگ میں جلیں گے۔"

دوسری طرف چند لمحے خاموشی رہی تب ایک بار پھر دروازے پر زور آزمائی شروع ہو گئی۔ ایک نوجوان نے اسد سے آکر کہا آپ کو وزیر داخلہ عبدالرشید بلا رہے ہیں۔ اسد اور اباقہ وزیر داخلہ کے پاس پہنچے تو وہ سیف الدین کی خواب گاہ میں اسی کے بستر پر پڑا تھا۔ اسد اللہ نے احتیاطاً اس کے ہاتھ پشت پر بندھوا دیے تھے۔ اس کے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ وہ کچھ خوفزدہ بھی نظر آ رہا تھا۔ شاید اسے احساس تھا کہ خلیفہ کے سپاہیوں اور قیدیوں کی اس جنگ میں وہ بھی کام آسکتا ہے۔ اس نے کہا۔

"تم لوگ خواہ مخواہ اپنی مصیبتوں میں اضافہ کر رہے ہو۔ زیادہ دیر تم سپاہیوں کو اس
جگہ سے دور نہیں رکھ سکو گے۔ تمہارے ساتھ عورتیں اور بے گناہ شہری بھی ہیں۔ سب
کو موت کے منہ میں نہ دھکیلو۔ خود کو حکام کے حوالے کر دو۔ مجھے یقین ہے کہ حالات
بھی ہوئے اس تصادم سے بہتر ہوں گے۔ اگر تم کہو تو میں دروازے کے پاس کھڑا ہو کر
خود کماندار سے بات کرتا ہوں۔"

اسد نے اباقہ کی طرف دیکھا۔ اس کی خاموش نگاہوں میں نارضامندی کے آثار دیکھ
کر اس نے توقف کیا پھر کچھ سوچ کر بولا۔ "میں اپنے ساتھیوں سے مشورہ کر کے ہی کچھ
کہہ سکوں گا۔"

وزیر داخلہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اسد اللہ اباقہ کے ساتھ کمرے سے باہر نکل
آیا۔ وہ سوچ میں غلطاں تھا۔ یورق کے پاس پہنچ کر وہ دونوں بیٹھ گئے۔ دروازے پر کسی
وزنی چیز سے ضربیں لگائی جا رہی تھیں۔

یورق نے کہا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے کماندار بات کر رہا تھا کہ اگر ہم لوگ ہتھیار
پھینک کر دروازہ کھول دیں تو وہ ہمیں حفاظت سے اعلیٰ حکام تک پہنچانے کی ضمانت دیتا
ہے۔

"تو پھر کیا سوچا تم نے؟" اسد نے سردار سے پوچھا۔

سردار یورق بولا۔ "میں تم لوگوں اور تمہارے قول و فعل کے بارے میں زیادہ کچھ
نہیں جانتا .... ہو سکتا ہے جیتھے دار کی پیش کش میں چال ہو لیکن .... موجودہ
حالات میں ہم زیادہ دیر اپنا دفاع نہیں کر سکتے۔"

اسد بولا .... "اور سوچنے کی بات یہ ہے کہ ہم کس انتظار پر مدافعت جاری
رکھیں۔ کوئی کمک تو ہمیں پہنچنے سے رہی یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ محاصرہ کرنے والے دل
ہو کر چلے جائیں۔ یہ کوئی قلعہ تو ہے نہیں اور نہ ہم کوئی فوج ہیں۔"

یورق بولا۔ "اور عمارت بھی ایسی ہے جو کسی وقت بھی دشمن کو راہ دے سکتی ہے
ابھی مجھے لگ رہا تھا اوپر چھت کو اکھاڑنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔"

اتنے میں ایک نوجوان تیزی سے قریب آیا اور سرگوشی کے لہجے میں بولا۔ "جناب!
دروازے کا آہنی کھٹکا ٹیڑھا ہو رہا ہے۔ چند میخیں بھی اکھڑ گئی ہیں۔"

مارینا اور آصفہ کے رنگ متغیر نظر آنے لگے۔ آصفہ دھیمے لہجے میں بولی۔ "ہمیں
کماندار کی پیش کش مان لینی چاہیے۔ اگر یہ لوگ دروازہ توڑ کر اندر آئے تو .... بڑی
سختی کریں گے۔"

اسد نے اباقہ کی طرف دیکھا۔ "اباقہ! تم اب تک خاموش ہو۔ تمہارا کیا خیال ہے۔
ہمیں وزیر عبدالرشید کی بات مان لینی چاہیے۔"

اباقہ نے گہری نظروں سے پریشان چہروں کا جائزہ لیا۔ پھر اس کا ہاتھ تلوار کے قبضے پر
گیا۔ تلوار بہ آہستگی باہر آئی اور وہ اسے قالین پر ٹکا کر بولا۔

"یہ ہے میری رائے۔" اس کے سانس کی آمد و رفت تیز ہو گئی تھی۔ اسد اور یورق
اس کا مطلب اچھی طرح سمجھ رہے تھے۔ کتنی ہی دیر گھمبیر خاموشی طاری رہی پھر یورق
بولا۔

"اباقہ اس خونریزی سے فائدہ؟"

اباقہ نے کہا۔ "سردار تیرا خیال ہے کہ اپنا دفاع کر کے بھی ہمیں کچھ حاصل نہیں ہو
گا کیونکہ ہمیں کہیں سے کمک نہیں آئے گی .... لیکن کمک آئے گی۔ میں جانتا ہوں
کمک آئے گی۔"

اسد گہری نظروں سے اباقہ کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ اسے اباقہ کی بات سمجھ میں نہیں آئی'
لیکن کبھی کبھی اس کا دل چاہتا تھا کہ بغیر سمجھے بھی اس جنگلی کی رائے پر صاد کر دے۔ کمک
والی بات کسی حد تک اس کی سمجھ میں آئی تھی۔ اب پتہ نہیں اباقہ کے ذہن میں بھی یہی
بات تھی یا کچھ اور؟ بہر حال اباقہ کا عندیہ ظاہر ہوتے ہی اسد نے بھی تلوار نیام سے باہر
نکالی اور دوسروں کی طرح دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ اباقہ نے ہاتھ کے اشارے سے
سب کو پیچھے ہٹنے کا حکم دیا۔ وہ اور اسد تلواریں سونت کر دروازے کے سامنے کھڑے ہو
گئے۔ ان کے عقب میں سردار یورق تھا۔ یہ تینوں کی جنگ تھی اور وہ خود ہی لڑنا چاہتے
تھے۔ اباقہ کی شعلہ بار نگاہیں دروازے کے کھٹکے پر تھیں اور ہاتھ تلوار کے قبضے پر پتھر کی
طرح ساکت تھا۔

دروازہ وزنی ضربیں سہتا رہا آخر ایک تڑاخے کے ساتھ کھٹکا آہنی میخوں سمیت لکڑی
کا ساتھ چھوڑ گیا۔ ایک دھماکے سے دروازہ کھلا اور دو چوبی الماریاں دھماکوں سے ایک
دوسرے پلنگ پر جا گریں۔ اس وقت اباقہ نے چھلانگ لگائی اور ناگہانی بلا کی طرح حملہ آوروں
پر ٹوٹ پڑا۔ اس کی چنگھاڑ دل ہلا دینے والی تھی۔ سپاہیوں کو شاید اس جارحانہ انداز کی
توقع نہیں تھی۔ ان کا جوشیلا نعرہ سینوں میں دبک کر رہ گیا۔ انہیں دروازے کے اندر قدم
رکھنے کی مہلت بھی نہیں ملی تھی کہ تلواریں ان پر چمکنے لگی تھیں .... اور وہ
سیڑھیوں پر کھڑے تھے۔ سیڑھیوں پر کھڑے شخص کے لیے اوپر سے ہونے والا حملہ کس
قدر خطرناک ہو سکتا ہے یہ کماندار اور اس کے ساتھی بھی جانتے ہوں گے' لیکن اس کا

تجربہ انہیں اب ہو رہا تھا۔ کہاں کماندار قیدیوں کو قتل کرنے کا ارادہ کیے ہوئے تھا اور اب وہ اپنی جان بچانے کا سوچ رہا تھا۔ جب تک اس کی چیخ و پکار پر سپاہیوں کے قدم دستے کا ہر اول سپاہی بھی سب سے نچلی سیڑھی تک پہنچ چکا تھا۔ جیسے کسی مافوق الفطرت ہاتھ نے انہیں دھکیل کر سیڑھیوں سے نیچے گرا دیا تھا۔ کماندار نے لمبے بالوں والے وحشی نوجوان کو لپک لپک کر سپاہیوں پر حملہ آور ہوتے دیکھا پھر اس کے ساتھ ایک سرخ و سپید نوجوان نے زور دار ٹھوکر مار کر آخری سپاہی کو بھی دوسری منزل پر پھینک دیا۔ ان دونوں نے بلا کی پھرتی سے دوسری منزل کا دروازہ بند کر دیا۔ کماندار سر پیٹ کر رہ گیا۔ ایک دروازے کی بجائے اب دو دروازے اور پندرہ خطرناک زینے اس کی راہ میں حائل ہو چکے تھے .... اور یہ سب کچھ چند لمحوں میں ہو گیا تھا۔

☆ــــــــ☆ــــــــ☆

وزیر خارجہ ابن یاشر وزیراعظم کے محل میں موجود تھا۔ دونوں ایک شاندار کمرے میں سر جوڑے بیٹھے تھے اور وزیر خارجہ کہہ رہا تھا۔

"جناب میری گزارشات پر غور فرمائیے اور خلیفہ سے بھی مشورہ کر لیجیے۔ اس میں ہمارا فائدہ ہی فائدہ ہے۔ مجرموں کو عمارت میں گھسے آٹھ پہر ہونے کے کو آئے' لیکن ابھی تک ہم ان پر قابو نہیں پا سکے۔ آج دوپہر مامونیہ چوک میں ایک زبردست مظاہرہ ہوا ہے۔ لوگوں نے انتظامیہ کی شان میں ناقابل سماعت قصیدے پڑھے ہیں اور لوگوں کا غم و غصہ بھی بجا ہے۔ پہلے ہم نے اباقہ اور اس یورق نامی منگوں کو اس وقت گرفتار کیا جب لوگ انہیں کندھوں پر اٹھائے پھر رہے تھے۔ پھر شیخ وحید الدین کا قتل اور اس کے بعد قفل ٹوٹنے کا واقعہ' میں تو کہوں گا ہم نہایت غیر ذمے داری سے عوام کو اپنے سے دور کر رہے ہیں۔ اس وقت مناسب راستہ یہی ہے کہ حکومت کا کوئی اعلیٰ عہدیدار خود وہاں پہنچے اور اس کے پاس خلیفہ کا معافی نامہ ہو۔ قیدیوں کو پوری حفاظت اور عزت و احترام کے ساتھ یہاں لایا جائے اور ان کی پوری مہمان نوازی کی جائے۔ اس سے عوام کی خواہشات کا احترام ہو گا اور امن و امان کی فضا خود بخود ٹھیک ہو جائے گی۔"

وزیراعظم نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔ "تمہارا مطلب ہے کہ کچھ دیر بعد معاملہ سرد پڑ جائے گا اور لوگ مطمئن ہو جائیں گے تو مجرموں کو خاموشی سے منگول سفارت کاروں کے حوالے کر دیا جائے گا جس کے لیے وہ بار بار اصرار کر رہے ہیں۔ اس طرح لوگ بھی مطمئن ہو جائیں گے اور منگول سفارت بھی ناراض نہیں ہو گی لیکن تم ایک بات بھول رہے ہو۔ بات صرف عوام ہی کی نہیں خواص کی بھی ہے۔

ان میں بہت سے جلال الدین کے حامی اور اس حوالے سے قیدیوں کے ہمدرد ہیں۔ وہ لوگ اس معاملے پر گہری نظر رکھیں گے تاکہ قیدی کسی سازش کا شکار نہ ہو جائیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ان قیدیوں کو خود ہی دال میں کالا محسوس ہو اور وہ حکومت کی مہمانداری کو ٹھکرا کر کسی طرف نکل جائیں۔"

وزیر خارجہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "جناب عالی ایسا کچھ نہیں ہو گا۔ آپ یہ سب کچھ مجھ پر چھوڑ دیں۔ آپ صرف خلیفہ سے مشورہ کر کے ان سے معافی نامہ حاصل کر لیں۔"

وزیراعظم کو اپنے ماتحت کی باتوں میں خاصا وزن محسوس ہو رہا تھا۔ وہ کافی دیر اس معاملے کے مختلف پہلوؤں پر غور و فکر کرتے رہے۔ بالآخر وزیراعظم کو اپنا وہ فیصلہ غلط محسوس ہونے لگا جس میں اس نے ایک کماندار کو حکم دیا تھا کہ وہ چھاپے کے دوران ہی قیدیوں کو ہلاک کر دے۔

دور کہیں عصر کی اذان سنائی دے رہی تھی۔ عمارت کی تیسری منزل پر اباقہ اور اس کے ساتھیوں کا قبضہ برقرار تھا۔ اباقہ دیوار سے ٹیک لگائے ادھ کھلے دروازے کے سامنے بیٹھا تھا کمان اس کی گود میں اور تلوار ہاتھ میں تھی۔ اس کی نگاہیں دوسری منزل سے آنے والی سیڑھیوں پر جمی تھیں۔ آنکھیں نیند سے سرخ تھیں' لیکن اس کی قوت ارادی اسے سونے سے باز رکھے ہوئے تھی۔ اچانک دوسری منزل کی سیڑھیوں کی جانب کھلنے والے دروازے پر دستک ہوئی اور کوئی زور سے پکارا۔ اباقہ کا جسم مشینی انداز میں حرکت ہوا اور وہ چند زینے اتر کر دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ کسی نے ایک سفید کاغذ دروازے کی نچلی درز سے باہر نکال دیا۔ اباقہ بڑے محتاط انداز میں آگے بڑھا اور کاغذ لے کر واپس تیسری منزل پر چلا آیا۔ یہ ایک سفید لفافہ تھا۔ اباقہ نے لفافہ چاک کیا اور خط لے کر اسد اللہ کی طرف بڑھا۔ وہ ایک جگہ بیٹھا نماز پڑھ رہا تھا۔ سلام پھیر کر اس نے ہاتھ اٹھائے اور خشوع و خضوع کے ساتھ دعا مانگنے لگا۔ وہ اباقہ کی موجودگی سے بالکل بے خبر تھا۔ اس کے ہونٹ تواتر سے ہل رہے تھے اور بند پلکوں کے نیچے نمی نظر آ رہی تھی۔ وہ دعا مانگ کر فارغ ہوا تو اباقہ نے خط اس کی طرف بڑھا دیا۔ اسد جلدی جلدی تحریر پر نگاہیں دوڑاتا رہا پھر اس کے چہرے پر دبا دبا جوش نظر آیا۔ وہ بولا۔

"اباقہ' خدا نے ہماری سن لی۔ ہمیں اس مصیبت سے نجات مل رہی ہے .... یہ خط دربار خلافت سے آیا ہے .... یہ دیکھو .... خلیفہ کی مہر' ہمیں معافی مل گئی ہے۔ حاکم شہر' خلیفہ کے حکم پر خود ہمیں لینے آیا ہے۔"

اباقہ بولا۔ "اسد معافی کس بات کی' ہم نے کوئی جرم نہیں کیا.......... اور اگر بغداد کے حاکم' جان بچانے کی اس جدوجہد کو جرم سمجھتے ہیں تو پھر ہمارے جرم کافی سنگین ہیں۔"

"میں سمجھا نہیں۔" اسد بولا۔

اباقہ نے کہا۔ "ہم نے جھوٹ بولا تھا کہ سیف الدین اور ناظم اعلیٰ صحیح سلامت ہمارے پاس موجود ہیں۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ سیف الدین کل ہی مر گیا تھا اور ناظم اعلیٰ آج زخموں کی تاب نہ لا کر جان بحق ہو گیا ہے۔ کل اندر گھس آنے والے تمام سپاہیوں میں سے بھی ایک کو ہم نے ہلاک کر دیا تھا۔ اگر یہ معافی نامہ صحیح بھی ہے تو بھی خلیفہ کو ہمارے ان "جرائم" کا علم نہیں۔"

اسد بولا۔ "تمہارا خیال ہے کہ ہتھیار پھینکنا ہمارے لیے نقصان دہ ہو گا۔"

اباقہ بولا۔ "میں یہ نہیں کہتا' لیکن چاہتا ہوں کہ اس معاملے پر اچھی طرح سوچ بچار کر لی جائے۔"

سردار یورق اور اباقہ چند مقامی نوجوانوں کے ساتھ ایک گھنٹہ صلاح مشورے میں مصروف رہے۔ آخر متفقہ طور پر اس پیش کش کو ماننے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ اباقہ کی تجویز پر فیصلہ کیا گیا کہ ہتھیار پھینکنے سے پہلے ناظم شہر کو ناظم اعلیٰ اور سیف الدین وغیرہ کی موت سے آگاہ کر دیا جائے اور ان سے قول لیا جائے کہ ان اموات کے سلسلے میں انہیں مورد الزام نہیں ٹھہرایا جائے گا۔ اس بات چیت سے وہ اس نتیجے پر بھی پہنچے کہ انتظامیہ کے رویے میں یہ تبدیلی بغداد کی رائے عامہ کے نتیجے میں ہوئی ہے۔ عین ممکن ہے ان کے حق میں مظاہرے وغیرہ بھی ہوئے ہوں۔ ان کا اندازہ کافی حد تک درست تھا اور یہی وہ کمک تھی جس کی اباقہ نے پیش گوئی کی تھی۔

شرائط طے ہونے کے بعد انہوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ دو بگھیوں میں انہیں بغداد کے نواح میں پہنچایا گیا۔ ایک آرام دہ رہائش گاہ ان کے لیے کھول دی گئی۔ مقامی نوجوانوں کو راستے میں ان سے علیحدہ کر لیا گیا تھا۔ سوگوار آصفہ کو اس کے والدین اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ رہائش گاہ میں پہنچ کر ان سب نے نہا دھو کر کپڑے بدلے۔ رات کو انہیں وزیر خارجہ نے اپنے محل میں کھانے پر مدعو کیا تھا۔ خلیفہ کے معافی نامے کے بعد یہ اعزاز ان کے لیے خلاف توقع نہیں تھا۔

شام کو جب اباقہ اور اسد اور یورق وزیر خارجہ کے محل میں پہنچے تو ماریتا بھی ان کے ساتھ تھی۔ اس نے کئی دنوں کے بعد نیا لباس پہنا تھا اور اس لباس میں وہ نہایت خوبصورت نظر آ رہی تھی۔ اباقہ کی نظر بار بار اس کے دلکش چہرے کی طرف اٹھ جاتی

تھی۔ ایسے میں سردار یورق ناک بھوں چڑھا کر رہ جاتا۔ اباقہ کا والہانہ انداز اسے ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ وہ شروع سے اباقہ اور ماریتا کے ملاپ کے خلاف تھا۔ ہر وقت اس کی کوشش رہتی تھی کہ دونوں کو قریب آنے کا موقعہ نہ ملے اور اس کی بڑی وجہ وہی شامان کی پیش گوئی تھی یہ پیشین گوئی سردار یورق کے ذہن سے آسیب کی طرح چمٹ چکی تھی۔ شامان نے کہا تھا اباقہ اور ماریتا کا ملاپ ممکن نہیں اور اگر اباقہ اپنی کوشش سے باز نہ آیا تو عورت اس کی موت کا سبب بنے گی .... اور سردار یورق اباقہ سے محبت کرتا تھا۔ نہیں یہ ایک باپ کی محبت تھی۔ بڑے بھائی کی یا صرف ساتھی اور مداح کی' لیکن وہ اسے دل کی گہرائیوں سے چاہتا تھا۔ اس کی خاطر اس نے سرداری چھوڑی تھی۔ قراقرم سے وفاداری چھوڑی تھی۔ اپنا سب کچھ تیاگ دیا تھا۔ اب وہ اسے ایک عورت کے لیے جان دیتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔

خوبصورت بگھی میں سوار وہ محل کے بیرونی پھاٹک پر رکے۔ باوردی ملازمین نے بڑے احترام سے انہیں سجے سجائے مہمان خانے میں پہنچایا۔ کچھ دیر بعد وزیر خارجہ ابن یاشر دبیز ریشمی پردے کو اٹھا کر اندر داخل ہوا۔

اس نے گرمجوشی سے ان کا استقبال کیا۔ وزیر خارجہ ابن یاشر چوڑے چکلے جسم اور پھلدار مونچھوں والا ایک صحت مند شخص تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں عیاری اور معاملہ فہمی کی ملی جلی چمک دکھائی دیتی تھی۔ سب کو دیکھنے کے بعد اس کی نگاہیں اباقہ پر آکر رک گئیں۔ وہ ماحول سے لاتعلق سا بیٹھا در و دیوار کو گھور رہا تھا۔ جوتا اتار کر اس نے پاؤں قالین پر پھیلا رکھے تھے۔ انداز سے لگتا تھا کہ اسے خلافت عباسیہ کے وزیر خارجہ سے مل کر کوئی خاص خوشی نہیں ہوئی۔ ایک لمحے کے لیے وزیر خارجہ کی گھنی مونچھوں کے نیچے ایک پُراسرار مسکراہٹ نظر آئی اور غائب ہو گئی۔ اس نے اپنی پاٹ دار آواز میں کہا۔

"کچھ غلط فہمیوں کی وجہ سے آپ لوگوں کو جو تکالیف اٹھانا پڑی ہیں اس کا مجھے بے حد افسوس ہوا ہے۔ درحقیقت یہ سب کچھ قصر خلافت سے جاری ہونے والے کاغذات میں ایک سقم کی وجہ سے ہوا تھا۔ امیرالمومنین کو بھی اس بات کا بہت دکھ پہنچا تھا۔ وہ آج ہی آپ سے ملنا چاہتے تھے' لیکن طبیعت کی ناسازی آڑے آئی۔ بہرحال میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ شیخ وحید الدین مرحوم کے معزز مہمانوں کی حیثیت سے آپ کو بغداد میں کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔ اس عظیم و جلیل القدر ہستی کو تو ہم واپس نہیں لا سکتے' لیکن آپ لوگوں کی خدمت کر کے اپنے دل کا بوجھ کچھ ہلکا ضرور کر سکتے ہیں۔ آپ جب تک بغداد میں قیام کریں گے حکومت کے مہمان تصور ہوں گے۔ اس کے علاوہ اگر بغداد میں آپ کی

آمد کے ساتھ کوئی مقصد وابستہ ہے تو ہم اس مقصد کے حصول کے لیے آپ سے ہر طرح کا تعاون کریں گے۔ بلکہ میری یہ خواہش ہے کہ آپ میرے گھر ہی میں قیام فرمائیں۔ در حقیقت منگولوں کے بہت سے بہی خواہ ہماری صفوں میں موجود ہیں اور آپ کے ساتھ ایک ایسی خاتون ہیں جن کا تعلق قراقرم کے حکمران خاندان سے بیان کیا جارہا ہے۔ اس صورت میں آپ کوئی حادثہ بھی پیش آسکتا ہے۔"

وزیر خارجہ کی حیثیت سے ابن یاشر کو واقعی بات کرنے کا ڈھنگ آتا تھا۔ اس نے اپنا نقطۂ نظر خوش اسلوبی سے بیان کیا تھا۔ اس کے خاموش ہونے پر اسد نے پہلے تو اس کی مہمان نوازی کا شکریہ ادا کیا پھر ڈھکے چھپے لفظوں میں بتایا کہ وہ محل میں رہنے کی بجائے علیحدہ رہنا پسند کریں گے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ وہ خلیفہ سے ملنے کے خواہش مند ہیں۔ وزیر خارجہ نے کہا۔

"سنا ہے آپ لوگ جلال الدین کی تلاش میں یہاں پہنچے ہیں۔ کیا آپ لوگوں کو اس بارے میں کوئی اطلاع ملی ہے؟"

اباقہ نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ "جی۔ اطلاع ہی نہیں ملی میں انہیں دیکھ بھی چکا ہوں لیکن اس سے پہلے کہ میں ان تک پہنچتا وہ ہجوم میں گم ہو گئے۔"

وزیر خارجہ بولا۔ "یہ بھی تو ممکن ہے' تجھے دھوکا ہوا ہو۔"

اباقہ نے کہا۔ "چند دن کے بعد مجھے یہ بتانے کی ضرورت نہیں رہے گی کہ مجھے دھوکا نہیں ہوا تھا۔"

وزیر خارجہ نے کہا۔ "بہت خوب۔ اس کا مطلب ہے تمہیں یقین ہے کہ جلال الدین یہیں کہیں موجود ہے۔"

اباقہ نے لمبے بال پیشانی سے ہٹائے اور بولا۔ "اتنا ہی یقین ہے جتنا آپ کو محل سے باہر دجلہ کی موجودگی کا یقین ہے۔"

کچھ دیر بعد سب لوگ طعام گاہ کی طرف چل دیے۔ کھانے اور مہمانوں کو رخصت کرنے کے بعد ابن یاشر اپنی سرکاری بگھی میں بیٹھا اور وزیر اعظم کے محل کی طرف چل دیا۔ وزیر اعظم کا محل یہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ حسب توقع وزیر اعظم سے ملاقات خواب گاہ میں ہوئی۔ عشاء کی نماز ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی' لیکن وزیر اعظم ابھی بستر پر نہیں لیٹے تھے۔ وزیر خارجہ کو دیکھ کر ان کا چہرہ سوالیہ نشان بن گیا۔ وزیر خارجہ نے اطمینان سے ساری روئیداد بیان کی۔ اس نے بتایا کہ کوشش کے باوجود اباقہ وغیرہ اس کے محل میں قیام پر رضامند نہیں ہوئے۔

وزیر اعظم نے کہا۔ "پھر کیا ہو گا۔ کہیں وہ اچانک ہی اوجھل نہ ہو جائیں؟"

وزیر خارجہ بولا۔ "ایسا نہیں ہو گا جناب۔ میں نے انہیں رہنے کے لیے جو عمارت دی ہے اس کے دونوں جانب نہایت با اعتماد لوگ رہائش پذیر ہیں۔ ملازمین کے بھیس میں بھی ہمارے اہلکار ہوں گے۔ پھر سادہ لباس والے بھی آٹھوں پہر ارد گرد منڈلاتے رہیں گے ...... جناب ان کے محل میں نہ رہنے سے ہمیں ایک فائدہ بھی ہو سکتا ہے۔"

"وہ کیا؟" وزیر اعظم نے پوچھا۔

"وہ یہ جناب کہ انہیں کوئی حادثہ بھی پیش آسکتا ہے۔ میں نے انہیں بتایا تھا کہ بغداد میں منگولوں کے بہی خواہ اور خود منگول بھی موجود ہیں۔ یہ بات بغداد کے عوام بھی جانتے تھے اگر وہ لوگ میرے یا آپ کے محل میں رہتے تو ان کی حفاظت کی تمام تر ذمہ داری ہم پر عائد ہوتی' لیکن اس صورت میں .... ان پر کوئی شبخون بھی مار سکتا ہے۔"

"ہوں۔" وزیر اعظم کے باریک ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھری۔ "تمہارا مطلب ہے کہ "نامعلوم" لوگ چغتائی خان کی بیوی اور اس کے عاشق کو غائب کر سکتے ہیں۔"

"جی ہاں۔" وزیر خارجہ ابن یاشر کی مونچھیں مسکراہٹ کی وجہ سے کچھ اور پھیل گئیں۔

☆------☆------☆

پہلی راتوں کا چاند در و دیوار کو تاریکی کے حوالے کر کے مغرب میں روپوش ہو چکا تھا۔ یہ ایک وسیع اور خوبصورت عمارت تھی۔ بلند دروازوں کی محرابیں اور سفید دیواریں اس اندھیرے میں بارعب دکھائی دیتی تھیں۔ ایک سایہ ننگے پاؤں تیزی سے شفاف فرش پر چل رہا تھا۔ وہ برآمدے میں پہنچا اور پھر صحن میں آگیا۔ ایک بیل دیوار کے ساتھ ساتھ بالائی منزل کے دریچے تک چلی گئی تھی۔ سائے نے بیل کھینچ کر اس کی مضبوطی کا اندازہ کیا اور بے انتہا پھرتی سے دریچے تک پہنچ گیا۔ نیلگوں مخملی پردوں سے جھانکنے والی روشنی میں اس کا چہرہ صاف نظر آرہا تھا۔ وہ اباقہ تھا۔ چند لمحے وہ کھوئی کھوئی نظروں سے دریچے میں دیکھتا رہا۔ پھر اندر داخل ہو گیا۔ خوبصورت بستر میں ایک حسن بلا خیز بے ترتیب پڑا تھا۔ وہ مارینا تھی۔ سرہانے رکھے شمع دان کا عکس اس کے گلابی رخساروں پر پڑ رہا تھا۔ کچھ دیر محویت کے عالم میں اسے دیکھتا رہا پھر شانہ ہلا کر مارینا کو جگا دیا۔ وہ اس کی شکل دیکھ کر پہلے تو چونکی پھر اپنا لباس درست کرنے لگی۔

"کیا بات ہے اباقہ؟" وہ حیرت سے بولی۔

لیکن اس حیرت میں خوف کی آمیزش نہیں تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اباقہ اپنی حدود

سمجھ چکا ہے اگر وہ حدود پامال کرنے والا ہوتا تو اس برفانی ندی میں ایک چٹان پر گزا
ہوئی رات مارینا کے ذہن میں ایک بھیانک تجربہ بن کر رہ گئی ہوتی۔ بہت ممکن تھا کہ و
زندہ بھی نہ ہوتی۔

"مارینا۔" وہ گلوگیر آواز میں بولا۔ "آخر کب تک؟"

مارینا اس کی بات سمجھتے ہوئے بولی۔ "جب تک تم چاہو اباقہ اور جب نہ چاہو میرا
گلا گھونٹ دینا۔ یا اتنا کہہ دینا مرجا مارینا .... میں مرجاؤں گی۔"

فضا ایک دم نہایت جذباتی ہو گئی تھی۔ اباقہ نے طویل سانس لے کر سر جھٹکا او
بولا۔ "مارینا کوئی بات کریں تیری باتیں سننا چاہتا ہوں۔"

مارینا نے کہا۔ "اباقہ! اگر تُو کہے تو میں صبح سے شام تک تیرے سامنے بیٹھی باتی
کرتی رہوں' لیکن رات کی تاریکی میں باتیں کرنے سے باتیں جنم لیتی ہیں۔"

اباقہ نے کہا۔ "آج مجھے صرف یہ بتا دے تُو دنیا کی باتوں سے ڈرتی ہے یا اپنے دل
سے۔"

اس سے پہلے کہ مارینا کوئی جواب دیتی کھٹکا ہوا اور دریچے میں یورق کا سر نظر آیا۔
اباقہ اور مارینا چونک گئے۔ یورق نے بازوؤں پر زور دیا اور اباقہ کے انداز میں کود کر اند
آگیا۔ "تم یہاں جنگلی؟" وہ حیرت ظاہر کر کے بولا۔

اباقہ پہلے تو گڑبڑایا پھر خود سر لہجے میں بولا۔ "لیکن تم بھی تو یہاں ہو۔"

"مم میں' دراصل مجھے شک ہوا تھا کہ کوئی سایہ سابیل کے سہارے اوپر چڑھا
ہے۔"

"مجھے بھی یہی شک ہوا تھا۔" اباقہ بھنائے ہوئے لہجے میں بولا اور مارینا کے کمرے کا
دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

"ارے بات تو سن اباقہ۔" یورق اس کے پیچھے لپکا۔ دونوں آگے پیچھے باہر نکل گئے۔
مارینا نے اٹھ کر دروازہ دوبارہ بند کیا۔ اس کے ہونٹوں پر خفیف مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

اباقہ روز صبح سویرے نکل جاتا تھا اور شام گئے واپس آتا تھا۔ کبھی کبھی اسد بھی اس
کے ساتھ ہوتا تھا۔ ایک موہوم امید کے سہارے وہ بغداد کے طول و عرض میں جلال
الدین خوارزم شاہ کو تلاش کر رہے تھے۔ اسد اس تلاش کے ساتھ ساتھ مختلف ملی
سرگرمیوں میں بھی حصہ لے رہا تھا وزیر خارجہ ابن یاشر کی ایماء پر اس نے بغداد میں کئی
جگہ مجمعوں سے خطاب کیا تھا۔ شیخ وحیدالدین کی شہادت پر لوگوں کے جذبات مشتعل
تھے۔ اپنی تقریروں میں اس نے جہاں لوگوں کو صبر و تحمل کی تاکید کی تھی وہیں شیخ کے

نداز میں ان کے جذبہ اسلامی کو بھی ابھارا تھا۔ کافی اصرار کے بعد اسد اور اس کے
ساتھیوں کی ملاقات خلیفہ مستنصر سے کرائی گئی تھی۔ اس نے اسد کو خاص طور تاکید کی
تھی کہ وہ لوگوں کے جذبات ٹھنڈا کرنے میں مدد دے۔

اس روز اباقہ کو اطلاع ملی تھی کہ شہر سے باہر کچھ کوس کے فاصلے پر باب الخراسان
کی جانب ایک درویش کا ٹھکانہ ہے۔ اردگرد کے علاقے میں اسے بڑا مانا جاتا ہے۔ بغداد
سے بھی لوگ اپنی حاجات لے کر پہنچتے ہیں۔ یہ درویش درحقیقت ایک مستانہ شخص تھا۔
پڑھ پڑھ کر پھونکیں وغیرہ بھی مارتا تھا لیکن اباقہ اور اسد جس مقصد سے آئے تھے وہ پورا
نہیں ہوا۔ یہ شخص جلال الدین نہیں تھا۔ رات گئے ان دونوں کی واپسی ہوئی۔ اپنی
رہائش گاہ میں داخل ہوئے تو ماحول کچھ بدلا بدلا تھا۔ دلان میں مارینا ایک چوبی تخت پر بیٹھی
تھی اور وہ اکیلی نہیں تھی اس کے ساتھ ایک عورت تھی۔ قریب ہی سردار یورق کسی
اداس برگد کی طرح اپنی شاخیں جھکائے بیٹھا تھا۔ اباقہ نے نزدیک جاکر دیکھا مارینا کے
قریب بیٹھی لڑکی یاکی تھی۔ قریب ہی ایک سفید میمنا چھلانگیں لگا رہا تھا۔ یورق کئی بار کہہ
چکا تھا کہ یاکی کا پتہ کرنا چاہیے لیکن پچھلے دنوں اباقہ جلال الدین کی تلاش میں اتنا سرگرداں
رہا تھا کہ کہیں اور جانے کی مہلت ہی نہیں ملی تھی۔ سیف الدین کی بیوی اپنے گھر واپس
جا چکی تھی۔ اسد یا اباقہ میں سے کوئی اس کی خبر گیری کرنے بھی نہیں جا سکا تھا۔ اباقہ نے
سردار یورق کو دیکھا اور سمجھ گیا کہ وہی یاکی کو لے کر آیا ہے اور اس کے پاس کوئی اہم
اطلاع بھی ہے۔ ایک بات محسوس کر کے اباقہ بری طرح چونک گیا۔ یاکی کا باپ نظر نہیں
آرہا تھا۔ شاید وہ بیٹی کو چھوڑ کر واپس چلا گیا تھا لیکن ماحول کی یہ اداسی کچھ اور بتا رہی
تھی۔

مارینا گلوگیر لہجے میں بولی۔ "اباقہ! یاکی کا باپ مر گیا۔"

"کیسے؟" اسد اور اباقہ کی زبان سے بیک وقت نکلا۔

سردار یورق ڈرامائی لہجے میں بولا۔ "تمہیں معلوم ہے یاکی کا ہونے والا شوہر کون
تھا۔ میرا مطلب ہے جس سے یاکی کا باپ اس کی شادی کرنا چاہتا تھا۔"

اباقہ نے حیرانی سے پوچھا۔ "کون تھا وہ؟"

یورق نے انکشاف کرتے ہوئے کہا۔ "وہ رئیس زادہ .... سیف الدین تھا۔ ہاں
وہی سیف الدین جو اس سے پہلے دو بیویوں کا شوہر تھا۔ وہ خود کو کنوارہ ظاہر کر کے اس
کے بوڑھے باپ کو پھنسا رہا تھا۔" اباقہ اور اسد کو اس اطلاع نے سن کر دیا۔ وہ یاکی کے
قریب بیٹھ کر تفصیلات پوچھنے لگے۔ اس نے آنسو بہاتے ہوئے بتایا۔

"بابا کی موت سے ایک روز پہلے اس رئیس زادے کے فرضی ماں باپ ایک بار پھر میرے رشتے کا تقاضا لے کر آئے۔ میرے بابا نے کہا کہ وہ بیٹی کو رضا مند کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ پھر نہ جانے کیا باتیں ہوتی رہیں۔ آخر میں ایک دم لڑائی جھگڑے کی آوازیں آنے لگیں' مرد اور عورت کا لہجہ ایک دم بدل گیا تھا۔ وہ میرے بابا کو دھمکیاں دے رہے تھے۔ بابا نے بھی کہہ دیا کہ وہ جو چاہتے ہیں کر لیں۔ میں اپنی بیٹی پر زبردستی نہیں کر سکتا۔ اب یہ رشتہ نہیں ہو گا۔ اگلے روز دوپہر کے وقت جب اسد اور مارینا اباقہ کو جیل سے چھڑانے چلے گئے آٹھ دس گھڑ سواروں نے ہمارے گھر کو گھیر لیا۔ تین آدمی اندر آ گئے اور انہوں نے مجھے زبردستی لے جانے کی کوشش کی۔ میرے بابا نے مجھے بچانا چاہا۔ ظالموں نے ان کی کلہاڑی چھین لی اور اسی سے انہیں ہلاک کر دیا۔ چیخ و پکار سن کر بستی کے لوگ اکٹھے ہو گئے۔ انہوں نے گھڑ سواروں کو للکارا اور مقابلے پر آ گئے۔ گھڑ سواروں کو شاید اس بات کی امید نہیں تھی' انہوں نے جب پچاس ساٹھ افراد کو اپنے سامنے مسلح حالت میں دیکھا تو گھبرا گئے۔ تھوڑی سی لڑائی میں ان کے دو ساتھی زخمی ہو گئے اور باقی بھاگ گئے۔ بھاگتے بھاگتے انہوں نے مجھے بھی جان سے مارنے کی کوشش کی .... یہ دیکھو۔"

یاکی نے قمیض اٹھا کر اپنا سپید بازو دکھایا اس پر تلوار کا گہرا نشان تھا۔ "لیکن میں بچ گئی۔ زخمی ہونے والوں میں سے ایک تو فوراً ہلاک ہو گیا لیکن دوسرا بچ گیا۔ اس نے بتایا کہ ہم شہر کے مشہور رئیس سیف الدین کے کارندے ہیں۔"

سردار یورق بولا۔ "دراصل جس روز سیف الدین اور ناظم اعلیٰ تمہارے ہاتھوں قتل ہوئے وہ اس معصوم لڑکی کی عزت سے کھیلنے کا ارادہ کئے ہوئے تھے۔ بد معاشوں کی وہ ٹولی اسی مقصد سے سیف الدین کے گھر جمع تھی۔"

اباقہ اور اسد قدرت کی کرشمہ سازیوں پر حیران تھے۔ سزا جرم کا تعاقب کرتی ہوئی کن راستوں سے مجرم تک پہنچی تھی' عین ممکن تھا کہ اس روز شیخ وحید الدین داعی اجل کو لبیک نہ کہتے اور اگر ایسا ہو گیا تھا تو عین ممکن تھا مظاہرین مشتعل ہو کر جیل نہ توڑتے۔ اگر جیل ٹوٹی تھی تو ناظم اعلیٰ بھاگ کر کسی اور کے گھر میں بھی داخل ہو سکتا تھا لیکن وہ سیدھا سیف الدین کے گھر میں گھسا جہاں سیف الدین وزیر داخلہ عبدالرشید اور مسلم بن داؤد پہلے سے موجود تھے۔ کسی واقعہ کو وقوع پذیر ہونے سے روکنے کے لیے قدرت کیسے کیسے اسباب پیدا کر دیتی ہے۔ ایک معصوم لڑکی کی عزت کو محفوظ رہنا تھا اس لیے اباقہ مجرموں کے سر پر پہنچ گیا۔ اگر سیف الدین اور ناظم اعلیٰ جہنم داصل نہ ہوتے تو وہ اس قابل ضرور تھے کہ یاکی کو اٹھوانے کے لیے اس پوری بستی کو تہس نہس کر دیتے۔

اس واقعے کے دو بڑے مجرم یعنی ناظم اعلیٰ اور سیف الدین تو انجام کو پہنچ گئے تھے لیکن وزیر داخلہ عبدالرشید اور مسلم بن داؤد ابھی زندہ تھے۔ مسلم بن داؤد کے بارے میں عمارت کے ملازمین سے پتہ چلا تھا کہ کچھ دیر پہلے وہ یہاں موجود تھا لیکن اباقہ کو کوشش کے باوجود اس کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ آصفہ نے بتایا تھا کہ ایک بوڑھے نے بڑے گھبرائے ہوئے انداز میں اس سے چھت تک جانے کا راستہ پوچھا تھا اور پھر اسے کھول کر چلا گیا تھا۔ آصفہ نے جو حلیہ بتایا تھا اس سے اباقہ نے اندازہ لگایا تھا کہ وہ یقیناً مسلم بن داؤد ہو گا۔ چوتھا مجرم یعنی وزیر داخلہ عبدالرشید ابھی تک علاج گاہ (بیمارستان) میں تھا۔ سر پر پڑنے والے پتھر نے اس کی بینائی بری طرح متاثر کر دی تھی۔

اباقہ اسد اور یورق کافی دیر یاکی کی دلجوئی کرتے رہے۔ مارینا نے اسے اندر سے اپنا لباس لا کر دیا اور اس کی کنگھی کرنے لگی۔

☆------☆------☆

اباقہ بستر پر چت لیٹا تھا۔ سرہانے رکھے شمعدان میں صرف دو شمعیں باقی بچی تھیں وہ بھی کسی دم بجھنے کو تھیں۔ نیند اباقہ کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ جلال الدین کی موت نے اسے تھکا کر چور کر دیا تھا لیکن وہ سپر ڈالنے والوں میں سے نہیں تھا .... جلال الدین اور مارینا ہی تو اس کی حیات کے دو سر چشمے تھے۔ مارینا کا خیال ذہن میں آتے ہی اس کا دھیان یاکی کی طرف چلا گیا۔ یاکی کی وہ دل سے عزت کرتا تھا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ اس سے محبت کرتی ہے یہی وجہ تھی کہ اس نے دانستہ کبھی اس کا دل توڑنے کی کوشش نہیں کی تھی' لیکن کچھ دنوں سے یاکی کی موجودگی اسے عجیب الجھن میں مبتلا کر رہی تھی۔ دراصل وہ ہر وقت اس کے گرد منڈلاتی رہتی تھی۔ کھانا لانا' بستر درست کرنا' اس کا خیال رکھنا ہر کام جو پہلے مارینا کرتی تھی اب یاکی نے اپنے ذمے لے لیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ مارینا سے اس کا ملنا اب اور کم ہو گیا تھا۔ اباقہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اس سے پہلے سردار یورق نے ہی یاکی کے ذریعے اسے مارینا سے دور کرنے کی کوشش کی تھی۔ پہاڑی غار میں یاکی کا روزانہ اباقہ سے ملنا سردار یورق کی منصوبہ بندی کا ہی حصہ تھا اور اب یاکی کو اس کے گھر سے دجلہ کنارے کی اس رہائش گاہ میں لانے والا بھی سردار یورق ہی تھا۔ کیا اب وہ ایک بار پھر وہی کھیل کھیل رہا تھا .... آخر اسے کیا ضرورت تھی اباقہ اور مارینا کے بیچ آنے کی اور یاکی کو اس پر سوار کرنے کی۔

اباقہ کی سوچوں کا تانا بانا ایک مدھم آہٹ سے ٹوٹا۔ اس نے گھوم کر دیکھا یاکی سفید رنگ کا ایک خوبصورت لباس پہنے اندر داخل ہوئی۔ لباس کی رو پہلی تاریں شمعدان کی

مدھم روشنی میں جھلملا رہی تھیں۔ لمبے سیاہ بالوں کی چوٹیاں اس کے سینے پر تھیں۔ اباقہ کو جاگتے دیکھ کر وہ ٹھٹکی اور بولی۔

"......... آپ جاگ رہے ہیں۔ میں تو شمعدان بجھانے آئی تھی۔"

اباقہ دھیمے لہجے میں بولا۔ "میں نے جب سونا ہو گا بجھا لوں گا......... تم جاؤ۔"

یاکی نے کھڑکی کا پردہ درست کیا اور بہ آہستگی باہر نکل گئی۔ اباقہ کو ان تکلفات سے وحشت ہوتی تھی۔ اس نے اٹھ کر نہ صرف پردہ ہٹا دیا بلکہ کھڑکی بھی پوری کھول دی۔ دریا کی طرف سے آنے والی سرد ہوا اس کے چہرے سے ٹکرائی تو اسے کچھ سکون ہوا۔ مزید سکون کے لیے اس نے اپنی گرم صدری بھی اتار کر پھینک دی۔ اب اس کا ورزشی جسم کھڑکی سے آنے والی مدھم چاندنی میں چمک رہا تھا۔ وہ بے قراری سے کھڑکی کے سامنے ٹہلنے لگا۔ ذہن یاکی' یورق اور مارینا کے مابین بھٹک رہا تھا۔ اچانک چھت سے ایک آہٹ سنائی دی رات کے سناٹے میں آواز کافی صاف تھی اور اباقہ کے حساس کانوں نے فوراً پہچان لیا کہ کسی نے دوسری منزل کی چھت پر کمند پھینکی ہے .... پہلے لوہے اور پتھر کا ٹکراؤ پھر کرچ کی لمبی آواز جو کمند گھسٹنے سے پیدا ہوتی ہے .... اباقہ کے اعصاب تن گئے۔ وہ بلی کی چال چلتا دریچے پر پہنچا اور محتاط انداز سے باہر دیکھنے لگا۔ آہٹ مارینا کے کمرے کی طرف سے سنائی دی تھی لیکن یہاں سے کچھ نظر آنا ممکن نہیں تھا۔ ابھی اباقہ سوچ ہی رہا تھا کیا کرنا چاہیے کہ دفعتاً قدموں کی مدھم آواز سنائی دی۔ کم از کم چھ سات افراد دبے قدموں اس کے کمرے کی طرف آ رہے تھے وہ جلدی سے واپس مڑا اور بستر پر لیٹ گیا۔ اس کا کمرہ چونکہ زمینی منزل پر تھا اس لیے اندر آنے والوں کو کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ وہ کھلے ہوئے دریچے کی چوکھٹ پر چڑھے اور آرام سے اندر کود گئے۔ اباقہ بے حس و حرکت لیٹا تھا۔ تاریک سائے اس کے قریب تر پہنچ رہے تھے۔ پھر ایک ہاتھ فضا میں بلند ہوا۔ اباقہ دیکھ نہیں سکتا تھا کہ ہاتھ میں کیا ہے لیکن یہ وہ اچھی طرح سمجھتا تھا کہ یہ ہاتھ اسے نشانہ بنائے گا۔ نشانہ بننے سے پہلے ہی اس کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی۔ اس کی ٹانگیں اور بازو ایک ساتھ متحرک ہوئے اور دو افراد کراہ کر پیچھے الٹ گئے۔ اباقہ بستر پر کھڑا تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک حملہ آور کی تلوار تھی۔ پھر جھماکہ سا ہوا اور کمرے کی مدھم روشنی میں ایک زبردست جنگ شروع ہو گئی۔ حملہ آور خاصے اچھے تلوار زن تھے۔ انہوں نے بھرپور حملہ کیا اور اباقہ کو الٹے پاؤں بستر سے نیچے اترنا پڑا' لیکن پھر اس سے پہلے کہ حملہ آوروں میں سے کوئی تلوار چلاتا ہوا بستر پر چڑھتا اباقہ تیزی سے نیچے جھکا دوسرے ہی لمحے وہ بھاری بھرکم پلنگ حملہ آوروں پر الٹا چکا تھا کم از کم چار افراد پلنگ کے نیچے دب

گئے۔ اباقہ کی تلوار نے تیزی سے حرکت کی اور الٹے ہوئے پلنگ میں گھس کر دو حملہ آوروں کو چاٹ گئی۔ ایک شخص جو اباقہ کی پہلی ضرب سے چکرا کر فرش پر گر گیا تھا عقب سے آیا اور اباقہ کے سر کو نشانہ بنانا چاہا' اباقہ نے بے انتہا پھرتی سے پینترا بدلا اور تلوار اس کے کندھے کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ اس وقت اباقہ نے غور سے حملہ آور کی شکل دیکھی وہ منگول تھا۔ یہ دیکھتے ہی اس نے غضب سے تلوار گھمائی اور منگول کا سر کٹ کر دھم سے قالین پر جا گرا۔ باقی دھڑ چند لمحوں کے لیے بالکل ساکت کھڑا رہ گیا تھا۔ یہ ایک خوفناک نظارہ تھا اور شاید پلنگ کے نیچے سے برآمد ہونے والے منگول یہی نظارہ دیکھ رہے تھے۔ جب اباقہ نے نہایت پھرتی سے حملہ کر کے ان میں سے ایک کا پیٹ پھاڑ ڈالا اور منگول کی بھیانک چیخ کے ساتھ ہی سردار یورق اور اسد اللہ بھاگتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ باقی دو حملہ آوروں کو ان کے سپرد کر کے اباقہ نے چھلانگ لگائی اور اڑتا ہوا کھڑکی سے باہر آیا۔ اب وہ مارینا کے کمرے کی طرف بھاگ رہا تھا۔ برآمدے سے گزر کر وہ صحن میں آیا اس نے دیکھا تین مسلح افراد تلواریں سونتے اس کے استقبال کے لیے تیار تھے۔ مارینا کے کمرے کے سامنے ایک رسی چھت سے لٹکتی ہوئی نیچے آ رہی تھی۔ ایک آدمی اس کے ذریعے اوپر چڑھ رہا تھا۔ اباقہ نے زیر جامہ میں اڑسا ہوا خنجر نکالا اور بائیں ہاتھ سے بلا توقف اوپر چڑھنے والے کی طرف پھینک دیا۔ خنجر دیوار سے ٹکرانے کی آواز نہیں آئی۔ اس کا مطلب تھا نشانہ خطا نہیں گیا۔ جس وقت اباقہ کی تلوار نے حملہ آوروں کے پہلے وار روکے' خنجر کا شکار ہوا میں اڑتا ہوا دھڑام سے زمین پر گرا۔

مارینا نے شور و غل کی آواز سن کر دریچے سے جھانکا تو اسے نیچے صرف ایک ہاتھ کے فاصلے پر ایک بھیانک چہرہ نظر آیا۔ یہ کوئی منگول تھا جو ایک رسے سے لٹک رہا تھا۔ اس کی آنکھیں دہشت ناک انداز میں پھٹی ہوئی تھیں اور ادھ کھلے منہ سے ایک طویل کراہ برآمد ہو رہی تھی۔ مارینا نے دیکھا اس کا ایک ہاتھ پشت پر ہے شاید اسے کوئی تیر یا خنجر وغیرہ لگا تھا۔ پھر مارینا کو خوفناک انداز میں دیکھتا ہوا منگول الٹ کر نیچے فرش پر گرا۔ مارینا نے اسی وقت اباقہ کو دیکھا۔ اس کے بالائی جسم پر کوئی لباس نہیں تھا۔ تنومند جسم مدھم چاندنی میں چمک رہا تھا۔ اس کی تلوار بیک وقت تین تلواروں سے ٹکرا رہی تھی۔

"یا خدا خیر!" مارینا کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ اس نے ہاتھ منہ پر رکھ لئے اور عجیب انداز میں بڑبڑانے لگی۔ ایک مدمقابل کو اس نے لڑکھڑا کر گرتے دیکھا۔ پھر یورق اور اسد بھی بھاگتے ہوئے اباقہ کی مدد کو پہنچ گئے۔ اس وقت جیسے مارینا کو ہوش آیا وہ تیزی سے کمرے کے دروازے کی طرف لپکی۔ جب تک وہ سیڑھیوں کو لرزاں پیروں سے ٹٹولتی

نیچے پہنچی لڑائی ختم ہو چکی تھی۔ دو عدد منگول اسد اور یورق کی گرفت میں مکمل ر تھے۔ اباقہ کے عریاں کندھے سے خون رس رہا تھا۔ ایک منگول کی اچٹتی ہوئی تلوار لگی تھی۔ یہ واحد زخم تھا جو اس گھمسان کی لڑائی میں اسے آیا تھا۔ مارینا کی نگاہیں زخم جمی ہوئی تھیں لیکن اس سے پہلے کہ وہ آگے بڑھتی سردار یورق تیزی سے آگے آیا او زخم کا جائزہ لینے لگا۔ مارینا کھڑی دیکھتی رہ گئی۔

پکڑے جانے والے منگولوں سے پتہ چلا کہ وہ سارے بغداد شہر کے ہیں۔ ان دنو بغداد میں منگولوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ نہ جانے دس بارہ افراد کیسے اکٹھے گئے تھے۔ اباقہ اور اسد نے سختی کی تو گرفتار شدگان نے بتایا کہ وہ شہر میں مختلف کام کر ہیں۔ کچھ تجارت کی غرض سے یہاں پہنچے تھے اور کچھ قراقرم کے معتوب تھے جو اس دراز شہر میں چھپے ہوئے تھے۔ ان سب کو کل دوپہر کے بعد ایک نامعلوم شخص نے ا جگہ جمع کیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ انہیں ایک معمولی کام کا بھاری معاوضہ دیا جائے گا۔ چار سو دینار انہیں پیشگی دے دیے گئے تھے۔ گوت نامی ایک منگول ان کا سردار بنایا گیا انہیں اس عمارت میں گھس کر ایک لڑکی اور لڑکے کو اغوا کرنا تھا۔ گوت کو تمام تفصی سمجھا دی گئیں تھیں۔ اسے ان کمروں کا بھی علم تھا جہاں انہیں داخل ہونا تھا۔ اغوا بعد لڑکی اور لڑکے کو جس جگہ پہنچانا تھا اس کا علم بھی گوت ہی کو تھا۔ بدقسمتی یہ کمرے کی لڑائی میں گوت جاں بحق ہو گیا تھا۔ لہٰذا اس کے زندہ ہونے کی توقع "فضول" تھی۔ اگر یہ شخص زندہ ہوتا تو ان منگولوں کو چارے کے طور پر استعمال کر اصل مجرم تک پہنچا جا سکتا تھا۔ اباقہ کو اس بات پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ سرغنہ نے صر گوت کو ہی واپسی کے ٹھکانے سے آگاہ کیا ہو گا۔ اس قسم کی منصوبہ بندی میں ہمیشہ ا سے زائد افراد کو مکمل معلومات فراہم کی جاتی ہیں تاکہ اگر ایک شخص کارروائی کے دو ہلاک بھی ہو جائے تو دوسرا منصوبے کو اختتام تک پہنچائے۔ اباقہ نے مارینا اور یا کمرے سے نکلنے کا کہا۔ وہ چلی گئیں تو اس نے اچانک ایک قیدی کو دبوچ لیا۔ پھر اسے زور سے دیوار کے ساتھ مارا کہ اس کا رہا سہا دم خم بھی ختم ہو گیا۔ اس کے ناک اور سے خون کے فوارے پھوٹ رہے تھے۔ اباقہ نے دیوار سے ایک تیر کمان اتارا اور منگول کا نشانہ لے لیا۔ وہ دیوار کے سہارے بیٹھا تھا۔ اباقہ آہستہ آہستہ کمان کی زہ لگا۔ منگول کے چہرے پر کرب کے آثار پیدا ہو رہے تھے۔ اباقہ سفاک لہجے میں "دیکھو! زہ کے پورا کھنچنے تک بتا دو کہ تم نے اغوا کے بعد ہمیں کہاں لے جانا تھا۔ اگر رہو گے تو یہ تیر تمہیں نیلے آسمان کے پار پہنچا دے گا..........بولو۔"

منگول کی نگاہ آہستہ آہستہ کھنچتے ہوئے چلے پر لگی تھی۔ وہ ان میں سب سے صحت مند اور جوشیلا تھا لیکن موت سامنے دیکھ کر اس کے ہونٹ کپکپانے لگے تھے۔ آخر اس سے یہ اعصابی تناؤ برداشت نہیں ہوا وہ چلا اٹھا۔ "تمہیں خدا کا واسطہ مجھے مت مارو۔ مجھے کچھ معلوم نہیں۔" اباقہ نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں۔ چیونٹی کی رفتار سے اس کی انگلیاں کمان کا چلا کھینچتی رہیں۔ چمکدار انی والا تیر منگول کے دل کا نشان لیے ہوئے تھا۔ اس نے بے اختیار اپنے دل پر ہاتھ رکھ لیا اور آنکھیں بند کر کے ایک بار پھر چلایا۔ "نیلے جاودانی آسمانی کی قسم ہمیں کچھ نہیں بتایا گیا۔" اس کے ساتھ ہی اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن اسد نے تلوار کی نوک اس کی گردن پر رکھ دی۔ اباقہ اب کمان کا پورا چلا کھینچ چکا تھا۔ منگول دہشتناک نگاہوں سے تیر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کا پورا جسم پسینے میں نہا گیا تھا۔ اباقہ کے چہرے پر نہایت خوفناک تاثرات تھے۔ پھر اباقہ نے چٹکی کھولی۔ تیر "شاک" کی آواز سے نکلا۔ منگول ذبح ہوتے بکرے کی طرح چلایا' لیکن اس کی آواز عمارت سے باہر نہیں گئی۔ کیونکہ یہ عمارت کا محفوظ ترین کمرہ تھا۔ تیر منگول کی بغل کے درمیان دیوار میں پیوست ہو چکا تھا۔ اگر وہ چند انگل بھی بائیں جانب ہوتا تو منگول کی روح اس کے جدامجد چنگیز خاں کے حضور حاضر ہو چکی ہوتی۔

تبادلہ خیال کے بعد اسد اباقہ اور یورق اس نتیجے پر پہنچے کہ گرفتار شدہ منگول اپنے سرغنہ کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ یہ سرغنہ کی بیوقوفی تھی کہ اس نے صرف ایک شخص کو رازداں کیا تھا لیکن یہ بیوقوفی اس کے کام آگئی تھی۔

☆------☆------☆

وزیر خارجہ ابن یاشر اپنے محل میں سرکاری اہلکاروں اور دوسرے ملنے والوں سے ملاقات کر رہا تھا۔ اس کا دربان باری باری آواز دیتا۔ ملنے والا اندر داخل ہوتا جھک کر سلام کرتا اور ابن یاشر کے اشارے پر سامنے رکھی ہوئی کرسیوں میں سے کسی ایک پر بیٹھ جاتا۔ اس چھوٹے سے کمرے میں دنیا جہان کے موضوعات زیر بحث آ رہے تھے۔ مصر میں کیا ہو رہا ہے۔ شام میں کون تخت نشین ہونے والا ہے۔ ہندوستان میں سلطان التمش کیا کر رہا ہے۔ چین میں منگول فوجیں کہاں تک پہنچی ہیں۔ مشرقی یورپ کہاں تک منگول یلغار کی زد میں ہے۔ اگر کوئی موضوع زیر بحث نہیں تھا تو وہ مملکت عباسیہ کا تھا۔ چراغ تلے اندھیرے والی بات تھی۔ وزارت خارجہ کو اپنے ملک پر پڑتے ہوئے منگولوں کے مہیب سائے دکھائی نہیں دیتے تھے۔ کئی سو سال پر مشتمل امن اور فارغ البالی کے دور نے اہل بغداد کو تلخ حقائق سے آنکھیں بند کرنا سکھا دیا تھا۔

"تو آپ انہیں اٹھوانے کی فکر میں ہیں۔" داؤد نے پوچھا۔

"ہاں!" ابن یاشر نے کہا۔ "کیا تمہارے پاس کوئی تجویز ہے؟"

"نن .... نہیں نہیں۔" داؤد کے چہرے پر پھر ہراس نظر آنے لگا۔ "مجھے صرف میرا .... میرا کمرہ دکھا دیجیے۔"

دو تین روز بعد کی بات ہے وزیر خارجہ ابن یاشر بے چینی سے اپنی خواب گاہ میں ٹہل رہا تھا۔ شب خوابی کا ریشمی چغہ اس کے پیچھے پیچھے ایرانی قالین پر گھسٹ رہا تھا۔ بے خیالی میں وہ بار بار داہنے ہاتھ کا مکہ بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر مارتا تھا۔ مسلم بن داؤد بلی کی چال چلتا کھڑکی میں آیا اور وزیر خارجہ کو دیکھ کر چونکنے کی اداکاری کرتا ہوا بولا۔

"وزیر محترم آپ ابھی تک جاگ رہے ہیں۔"

ابن یاشر نے اسے اندر بلا لیا۔ پھر پریشانی کے عالم میں کہنے لگا۔ "داؤد! منگول سفارت پرسوں واپس جا رہی ہے۔ منگول سفیر کا کہنا ہے کہ وہ اب اباقہ اور ماریتا کے انتظار میں مزید نہیں رک سکتے۔ کچھ سمجھ نہیں آتی کیا کرنا چاہیے۔ مجھے تو ڈر ہے کہیں یہ معاملہ مؤخر نہ ہو جائے۔"

داؤد داڑھی کھجا کر بولا۔ "وزیر محترم! دراصل آپ نے اباقہ کی طاقت کا غلط اندازہ لگایا تھا۔ جب آپ بارہ غیر فوجی افراد کو اس کی گرفتاری کے لیے بھیج رہے تھے اگر میں آپ کے پاس ہوتا تو کبھی آپ کو یہ نہ کرنے دیتا۔ آپ اباقہ سے صحیح طرح واقف نہیں۔ قراقرم میں مشہور تھا کہ اس جنگلی کے جسم میں شیاطین کا بسیرا ہے اور یہ پیدائشی طور پر اس سے بے بہرہ ہے۔ اس کے کارناموں کی فہرست میں آپ کو نہیں سناؤں گا کیوں کہ وہ بہت طویل ہے۔ میں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ آپ اس کام کو آئندہ پر نہ ڈالیں۔ بلکہ ایسا کریں کہ اباقہ اور ماریتا کی بجائے فی الحال صرف ماریتا کو قراقرم واپس بھیج دیں۔ آپ کے پاس صرف دو روز کی مہلت ہے اس عرصے میں آپ اباقہ کو زیر نہیں کر سکیں گے۔ اس کے لیے مکمل منصوبہ بندی کی ضرورت ہو گی۔"

"تم کہنا کیا چاہتے ہو؟" وزیر خارجہ نے پوچھا۔

اور اچانک ہی مسلم بن داؤد کو احساس ہوا کہ وہ پھر اباقہ کے معاملے میں ملوث ہو رہا ہے۔ اس کے چہرے پر خوف کے سائے لہرانے لگے۔ وہ بولا۔ "مم .... میں تو کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ میرا تو صرف یہ مطلب ہے۔ ایک آدھ روز میں آپ اباقہ کو قابو نہیں کر سکیں گے۔"

جہاندیدہ وزیر خارجہ جان چکا تھا کہ داؤد کے سازشی ذہن میں کوئی ترکیب ہے ...

اس کی سازش گری کا معترف تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے اسے محل میں رہنے کی جگہ دی تھی۔ اس نے داؤد کو حوصلہ تسلی دے کر دوبارہ منہ کھولنے پر تیار کر لیا۔ داؤد بولا۔

"وزیر محترم! آپ وعدہ کریں اس معاملے میں کسی بھی مرحلے پر .... میرا نام نہ آئے گا۔"

ابن یاشر نے وعدہ کیا۔ داؤد بولا۔ "جناب آپ ایک سرو قد لڑکی اور ایک غلام کا بندوبست کریں۔ لڑکی کا رنگ سرخ و سپید اور غلام کا رنگ سانولا ہونا چاہیے اگر لڑکی بھی کنیزوں سے مل جائے تو زیادہ بہتر ہے لیکن اس کے بال گھنے اور شہد رنگ ہوں۔ آپ ان دونوں کا انتظام کر دیں' میں وعدہ کرتا ہوں کہ پرسوں منگول سفیر' چغتائی خاں کی بیوی کو ساتھ لے کر جائے گا اور اس طرح لے کر جائے گا کہ بغداد انتظامیہ یا حکومت پر حرف تک نہیں آئے گا۔"

وزیر خارجہ بولا۔ "حرف نہ آنے سے تمہارا کیا مطلب ہے۔"

داؤد نے کہا۔ "وزیر محترم۔ آپ نے بہت احتیاط کی ہے اور منگولوں کے ذریعے اباقہ اور ماریتا کو اٹھوانے کی کوشش کی لیکن یہ منصوبہ بھی خامی سے یکسر پاک نہیں تھوڑا بہت الزام تو حکومت پر آنا ہی تھا۔ لوگ ضرور کہتے کہ حکومت معزز مہمانوں کی حفاظت میں ناکام رہی ہے۔ بہت سے دانا معاملے کی تہہ تک بھی پہنچنے کی کوشش کرتے اور اگر ایسی کوئی بات نکل جاتی کہ اس اغوا میں حکومت کا ہاتھ ہے تو شیخ وحیدالدین کی موت کے بعد دبا ہوا طوفان ایک بار پھر شدت سے نمودار ہو جاتا ...."

مسلم بن داؤد اس وقت کافی پُر مغز باتیں کر رہا تھا ابن یاشر نے بے تابی سے کہا۔

"ہاں .... اب تم اپنا منصوبہ بتاؤ۔"

داؤ نے وزیر خارجہ کے ساتھ سر جوڑ لیا اور دھیمے لہجے میں باتیں کرنے لگا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی میلی آنکھیں شیطانی جذبوں کی چمک سے روشن تھیں۔ چہرے پر فریب کی لعنت برس رہی تھی۔ وہ بالکل بھول چکا تھا کہ اباقہ نام کا کوئی شخص بھی ہے جو اس کے اعصاب پر آسیب بن کر سوار رہتا ہے۔ آخر میں وزیر خارجہ بولا۔ "داؤد .... اگر اس افراتفری میں وہ مر گئی تو بڑا برا ہو گا ہم منگول سفیر کو کیا منہ دکھائیں گے۔"

"نہیں جناب!" داؤد جوش سے بولا۔ "آپ بیکار تردد نہ کریں۔"

☆ ———— ☆ ———— ☆

"دیکھو محترم خاتون۔" سردار یورق کہہ رہا تھا۔ "میں آج تم سے صاف بات کرنا چاہتا ہوں۔ تم اباقہ کے راستے سے ہٹ جاؤ۔ تم جانتی ہو کہ مصائب کے لشکر تمہارے ہم

"عمار بن زیاد حاضر ہو۔" دروازے پر کھڑے دربان نے آواز لگائی۔

نشست گاہ میں بیٹھا ہوا ایک مجہول سا شخص اٹھا اور دروازے کی طرف چل دیا اس نے اپنے سر پر ایک کپڑا ڈالا ہوا تھا۔ جس نے اس کا نصف سے زائد چہرہ اوجھل کر رکھا تھا۔ اندر آکر اس نے وزیر خارجہ کو فرشی سلام کیا اور لرزتا کانپتا ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ ابن یاشر نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا اور حیرانی سے بولا۔ "مسلم بن داؤد تُو؟"

"جی .... یہ میں ہی ہوں آپ کا غلام۔" مسلم بن داؤد نے سر سے کپڑا اتارتے ہوئے اپنی ہیئت کذائی کی رونمائی کی۔ پھٹا ہوا لباس، گرد آلود داڑھی اور جھاڑ جھنکاڑ بال۔ ابن یاشر تعجب سے بولا۔

"داؤد تُو نے یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے اور یہ عمار بن زیاد اور مسلم بن داؤد .... کیا معاملہ ہے؟ اور تُو کہاں غائب تھا۔ قصرِ خلافت میں بھی ایک روز تیری غیر حاضری کا ذکر ہوا تھا؟"

مسلم بن داؤد نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔ "حضور اتنے سارے سوال ایک دم۔ میں کس کس کا جواب دوں۔"

ابن یاشر بولا۔ "اچھا چلو شروع سے بتاؤ۔ تم غائب کہاں ہو گئے تھے؟"

داؤد نے لرزاں آواز میں کہا۔ "جناب! مجھے اپنی جان کا خطرہ تھا۔ تھا کیا اب بھی ہے اسی لیے آپ کے دربان کو اپنا نام غلط بتایا تھا۔ اس جنگلی اباقہ کو تو آپ اچھی طرح جانتے ہوں گے جو ان دنوں بغداد میں دندنا رہا ہے۔ جس روز اس نے سیف الدین ناظم اعلیٰ کو قتل کیا میں بڑی مشکل سے جان بچا کر بھاگا تھا۔ میں بھی وہیں تھا۔ دراصل میں وزیر داخلہ عبدالرشید کو ڈھونڈتا ہوا وہاں پہنچا تھا (داؤد نے یہ نہیں بتایا کہ وہ سب ایک محفل نشاط میں شریک ہونے کے لیے جمع ہوئے تھے) سیف الدین کو قتل اور ناظم اعلیٰ کو گھائل کرنے کے بعد وہ جنگلی میرے پیچھے بھاگا میں نے تیسری منزل سے چھلانگ لگا کر جان بچائی۔"

"تیسری منزل سے چھلانگ لگا کر۔" وزیر خارجہ نے حیرانی سے پوچھا۔

داؤد ہکلایا۔ "ہاں .... وہ .... دراصل میں مٹی کے ایک ڈھیر پر گرا .... وہاں سے نکل کر میں باب الخراسان کی طرف چلا گیا۔ ایک مضافاتی بستی کے ایک کاشتکار نے مجھے پناہ دے دی۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں خلیفہ کا مشیر ہوں۔ ایک مجبوری کے سبب یہاں پہنچا ہوں۔ جلد ہی چلا جاؤں گا۔ کچھ دن تو کسان نے میری خوب خاطر مدارت کی۔ پھر ان کا رویہ بدلنے لگا۔ کسان کی بیوی جو مٹی کے برتن بناتی تھی اور

کنگال تھی کہنے لگی کہ خلیفہ کا مشیر ہے تو چھپا کیوں پھرتا ہے، جا اپنے دشمن کو پھانسی لگوا۔ پھر اس بے وقوف عورت نے مجھ سے مٹی کھدوانی اور گوندھوانی شروع کر دی۔ مجھے شہر میں کوئی جائے پناہ نظر نہیں آتی تھی۔ رہ رہ کر آپ کا خیال ہی آتا تھا۔ سوچا مٹی کھودنے کی ذلت سے تو بہتر ہے آپ تک پہنچنے کی کوشش کروں۔"

وزیر خارجہ نے داؤد کی پوری بات سن کر کہا۔ "مجھے لگتا ہے تم اس جنگلی سے بہت ہی زیادہ خوفزدہ ہو۔ آخر وہ انسان ہے کوئی بھوت تو نہیں کہ بیس لاکھ انسانوں میں تمہیں ڈھونڈ کر چمٹ جائے گا۔"

داؤد بولا۔ "جناب اسے آپ بھوت ہی سمجھئے۔ مجھے تو یہ بھی پتہ چلا تھا کہ وہ سارے شہر میں مجھے تلاش کرتا رہا ہے۔"

"ارے نہیں۔" ابن یاشر نے ہاتھ ہلایا۔ "وہ تو اس بھگوڑے جلال الدین کی تلاش میں ہے۔"

داؤد بولا۔ "کچھ بھی ہے محترم۔ میرا آخری سہارا آپ ہیں۔ مجھے کسی ایسی جگہ چھپا دیجیے .... میرا مطلب ہے ایسی جگہ دے دیجیے جہاں میں آرام سے بیٹھ کر اللہ اللہ کرتا رہوں اور ہاں خلیفہ کو بھی اس کی خبر نہیں ہونی چاہیے۔ وہاں دربار میں دوست دشمن بہت ہیں۔"

ابن یاشر نے طویل سانس لے کر کہا۔ "ٹھیک ہے داؤد، تم خود محل میں چل پھر کر دیکھ لو۔ جو جگہ پسند ہو وہاں ڈیرہ لگالو۔"

اتنے میں دربان نے ایک پرچی لاکر ابن یاشر کو دی۔ "بھیج دو" ابن یاشر نے کہا۔ آنے والا انتظامیہ کا ایک افسر تھا۔ اس نے کھڑے کھڑے اطلاع دی کہ پانچوں منگول قیدیوں نے انتظامیہ کے حوالے کر دیے ہیں۔ افسر یہ مبہم اطلاع دے کر واپس چلا گیا اور ابن یاشر کا چہرہ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ داؤد سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا رہا تھا۔ آخر فطری تجسس سے مجبور ہو کر بولا۔ "محترم وزیر کیا بات ہے؟"

ابن یاشر نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور بولا۔ "ہاں .... تم تو اپنے خاص آدمی ہو تم سے کیا چھپانا۔ دراصل میں نے تمہارے اس بھوت اور اس کی بھوتنی کو بوتل میں بند کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ انہیں اٹھوانے کے لیے کچھ منگولوں کی خدمات حاصل کی گئی تھیں تاکہ ہم پر کوئی شک نہ ہو لیکن وہ منگول تو نرے بودے نکلے۔ بارہ آدمی تھے سات مارے گئے اور پانچ پکڑے گئے۔ اباقہ اور اس کے ساتھی ان کی مشکیں کس کر کوتوال کو حوالے کر گئے ہیں۔"

رکاب ہیں۔ تم جب تک اباقہ کے ساتھ رہو گی وہ مشکلوں میں گھرا رہے گا۔ اپنی زندگی اس کے ساتھ وابستہ کر کے تم اس کی زندگی کو بھی روگ لگا دو گی۔ شاید تم یہ بھی جانتی ہو کہ میں اس کی شادی یاکی سے کرنا چاہتا ہوں۔ باپ کی موت کے بعد وہ ایک بے سہارا لڑکی ہے وہ ہر طرح اباقہ کے لائق ہے لیکن صرف تمہاری وجہ سے اباقہ اسے نظرانداز کرتا ہے۔ میں اور اسد دونوں چاہتے ہیں کہ اباقہ' یاکی سے بیاہ کر لے۔"

مارینا نے خاموش نگاہوں سے سردار یورق کو دیکھا۔ پھر باوقار لہجے میں بولی۔ "سردار تُو نے یہ کیسے سوچ لیا کہ میں شادی کے خواب دیکھ رہی ہوں۔ اس غلط فہمی کو دور کر لے۔ میں خود چاہتی ہوں کہ اباقہ اور یاکی ایک بندھن میں بندھ جائیں' بلکہ میں خود ان دونوں کی شادی کروں گی۔"

سردار یورق بدستور روکھے لہجے میں بولا۔ "محترم خاتون! کیا تمہاری یہاں موجودگی میں اباقہ اس شادی پر رضامند ہو جائے گا؟"

ایکا ایکی مارینا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ ایک شہزادی کی بجائے ایک لاچار اور مجبور عورت دکھائی دینے لگی۔ لرزاں آواز میں بولی۔ "تو سردار تم مجھے اس گھر سے بھی نکالنا چاہتے ہو .... مجھے تم سے یہ امید نہ تھی۔"

دفعتاً اباقہ کی آواز آئی۔ وہ سردار یورق کو آوازیں دیتا اسی طرف آ رہا تھا۔ مارینا رخ پھیر کر جلدی سے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ اباقہ نے سردار یورق کو بتایا کہ وہ اسد کے ساتھ گھڑسواری کے لیے جا رہا ہے۔ دوپہر کے کھانے پر واپسی ہو گی۔ ایسی باتیں وہ عموماً مارینا کو سنانے کے لیے بلند آواز سے کیا کرتا تھا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا لیکن مارینا کہیں نظر نہیں آئی۔ ہاں کمرے میں ایک بھینی بھینی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ شاید کچھ دیر پہلے مارینا یہاں موجود تھی۔ سردار یورق نے اسے نتھنے پھلاتے دیکھا تو جلدی سے بولا۔ "جانا ہے تو جلدی جاؤ۔ دوپہر کو جاؤ گے تو دوپہر کو واپس کیسے آؤ گے۔"

اباقہ سست نظروں سے باہر نکل گیا۔ نہ جانے کیوں آج اس کا دل اداسی سے بھرا ہوا تھا۔ جب اباقہ دروازے کی طرف بڑھا ایک ادھیڑ عمر خادم ترچھی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

جب اباقہ اور اسد گھڑسواری سے واپس آئے سہ پہر ہونے والی تھی۔ ابھی وہ دجلہ کے پل پر ہی تھے کہ ایک عورت بھاگتی ہوئی ان کے گھوڑوں کے سامنے آئی۔ یہ عورت سیف الدین کے گھر سے برآمد ہوئی تھی۔ اباقہ نے دیکھا وہ آصفہ تھی۔ اس نے اباقہ کے گھوڑے کی لگام پکڑ لی اور چیخ کر بولی۔

"اباقہ کچھ سنا تُو نے۔"

"کیا ہوا؟" اسد اور اباقہ بیک وقت بولے۔

"اباقہ .... اباقہ تیری مارینا۔" آصفہ نے اتنا کہا اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

اسد نے اسے شانے سے جھنجھوڑا۔ "کیا کہہ رہی ہیں آپ؟"

عورت نے آنسوؤں سے لبریز چہرہ اٹھایا اور بین کرنے والے انداز میں بولی۔ "اباقہ .... تیری مارینا مر گئی .... جا اس کی لاش دیکھ لے۔"

اباقہ سکتے کے عالم میں کھڑا تھا۔ آصفہ کا ایک غلام آگے بڑھا اور ہاتھ باندھ کر گلوگیر آواز میں بولا۔ "میں خود دیکھ کر آ رہا ہوں آقا۔ کلثومیہ نہر کے پار ٹیلوں میں اس کی لاش پڑی ہے۔"

اباقہ جیسے ہوش میں آیا۔ پھر گھوڑے کی لگام تڑاخ سے غلام کے منہ پر پڑی' وہ لڑکھڑا کر پل کے جنگلے سے جا ٹکرایا۔ اباقہ اور اسد نے ایک ساتھ گھوڑے موڑے اور آندھی کی رفتار سے نہر کلثومیہ کی طرف بھاگے۔ بغداد کی شاہراہوں پر اندھا دھند گھوڑے بھگاتے وہ نہر کلثومیہ پہنچے اور اسے پار کر کے نواحی ٹیلوں میں داخل ہو گئے۔ دور ہی سے اباقہ اور اسد کو لوگوں کا ایک ہجوم نظر آیا' قریباً سو ڈیڑھ سو افراد تھے۔ سب کے سب ایک ہی جانب متوجہ تھے۔ شہر کی جانب سے کچھ اور لوگ بھی گھوڑوں پر سوار اور پیدل چلے آ رہے تھے۔ ہجوم کے قریب پہنچ کر اباقہ اور اسد چلتے گھوڑوں سے اترے اور ایک کھڈ کے کنارے کی طرف بھاگے۔ دونوں نے ایک ساتھ نیچے دیکھا۔ قریب اسی فٹ نیچے غیرہموار زمین پر کسی عورت کی لاش پڑی تھی۔ لاش کے گرد کوتوال اور اس کا عملہ موجود تھا۔ اباقہ بغیر رکے تیزی سے ڈھلوان پر بھاگتا چلا گیا۔ لاش سے چند گز کے فاصلے پر وہ ساکت کھڑا ہو گیا۔ اس کے پاؤں جیسے زمین میں پیوست تھے آنکھیں ایک نقطے پر مرکوز تھیں اور لمبے بال ہولے ہولے ہوا میں لہرا رہے تھے۔ اس کے سامنے مارینا کی مسخ شدہ لاش پڑی تھی۔ گردن ٹوٹ کر ایک طرف ڈھلکی ہوئی تھی چہرہ چیتھڑوں میں تبدیل ہو چکا تھا۔ گلابی پاؤں بے حس و حرکت تھے۔ وہ پھولدار کپڑا جو اباقہ نے اسے توقند کے ایک بزرگ کی طرف سے دیا تھا اس وقت اس کے سر پر تھا۔ گھر سے باہر نکلتے وقت وہ ہمیشہ یہ کپڑا اوڑھا کرتی تھی۔

اباقہ یہ کپڑا سینکڑوں میں پہچان سکتا تھا۔ وہ مارینا کا لباس پہچان سکتا تھا۔ اس کے ہاتھوں کے کنگن بھی پہچان سکتا تھا اور یہ سب چیزیں اعلان کر رہی تھیں کہ مارینا مر گئی ہے .... اباقہ کی نصف کائنات تباہ ہو چکی ہے اور جو باقی رہ گئی ہے اس میں بھی تاریکی

کے سوا اور کچھ نہیں رہا۔ اسد بھی اس کے پہلو میں کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ اور چہرہ تمتما رہا تھا۔ کوتوال ان دونوں کے قریب پہنچ کر بولا۔

"میرا خیال ہے مرنے والی آپ کی کوئی قریبی عزیزہ ہے تھوڑی دیر پہلے چند راہ گیروں نے اس کی لاش دیکھی ہے۔ موقع سے ظاہر ہے کہ متوفیہ اوپر ٹیلے سے گری ہے یا .... اسے گرایا گیا ہے اوپر ٹیلے پر ایک گھوڑا بھی ملا ہے۔ قیاس ہے کہ متوفیہ اسی گھوڑے پر یہاں تک پہنچی تھی۔"

کوتوال کی بات ختم ہوئی تو اباقہ نے گھوم کر اسد کی طرف دیکھا لیکن وہ وہاں موجود نہیں تھا۔ اس نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ اسد تیزی سے چڑھائی چڑھ رہا تھا اس کا انداز کچھ عجیب طرح کا تھا۔ اباقہ بھی اس کے پیچھے گیا۔ جب تک وہ ٹیلے پر پہنچا اسد اپنا گھوڑا لے کر ہوا ہو چکا تھا۔ اس کی آخری جھلک سے اباقہ نے اندازہ کیا کہ اس کا رخ دجلہ کے مغربی کنارے کی طرف ہے۔ شاید وہ واپس گھر جا رہا تھا۔ اباقہ نے بھی اپنا گھوڑا اس کے عقب میں دوڑایا۔

جب وہ اپنی رہائش گاہ پر پہنچا اسے وہاں اسد کا ہانپتا ہوا گھوڑا نظر آیا۔ اس کی توقع کے مطابق اسد گھر ہی پہنچا تھا۔ اباقہ نے گھوڑے سے چھلانگ لگائی اور صدر دروازے سے اندر داخل ہوا۔ صحن خالی تھا کسی اندرونی کمرے سے بلند آواز سے باتیں کرنے کی آواز آ رہی تھی۔ اباقہ کمرے کے سامنے پہنچا۔ اندر جھانکا تو اسد کا غضبناک چہرہ دکھائی دیا۔ اس کے سامنے سردار یورق کھڑا تھا۔ قریب ہی یاکی بھی موجود تھی۔ اسد زور سے گرجا۔

"جھوٹ مت بول سردار۔ تُو نے .... صرف تُو نے اس معصوم کی جان لی ہے۔ کل تُو نے مجھ سے کہا تھا کہ میں مارینا سے دو ٹوک بات کرنا چاہتا ہوں۔ میں اب اسے اس گھر میں مزید برداشت نہیں کر سکتا .... اپنے راستے سے ہٹانے کے لیے تُو اس کی جان سے کھیلا ہے سردار۔ تُو نے اسے قتل کیا ہے۔ ٹیلے پر لے جا کر دھکا دیا ہے اسے۔"

سردار یورق آنکھیں پھاڑے اسد کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اسد کا سارا بدن غصے سے لرز رہا تھا۔ سردار یورق گھمبیر لہجے میں بولا۔ "نہیں اسد! تم غلط سوچ رہے ہو۔ میں نے اس سے بات ضرور کی تھی۔ اس کا خون نہیں کیا۔"

اسد گرجا۔ "یہ خون صرف اور صرف تیرے سر ہے سردار۔ تُو نے اپنے ہاتھوں سے اس کا خون کیا ہے یا اپنی باتوں سے اسے خودکشی پر مجبور کیا ہے، تُو قاتل ہے سردار۔"

.... اور اس لمحے دروازہ زبردست دھماکے سے کھلا اسد یورق اور یاکی نے گھوم کر دیکھا۔ دروازے پر اباقہ کھڑا تھا۔ اس کا سپاٹ چہرہ ایک خوفناک طوفان کی اطلاع دے

رہا تھا۔ غیر متحرک نگاہیں سردار یورق کے چہرے پر تھیں۔ ہاتھ میں عریاں تلوار چمک رہی تھی۔ پھر اسد اور یورق نے دیکھا اباقہ کی آنکھوں سے پانی کے دو قطرے ڈھلکے اور استخوانی رخساروں پر پھسل کر نیچے آ رہے۔ اس کی یخ بستہ آواز جیسے کسی غار سے برآمد ہوئی۔

"سردار تُو نے مجھے ہلاک کر دیا اور خود بھی ہو گیا۔"

سردار یورق کے چہرے پر چنگیزی خون نے جوش مارا وہ جرأت سے بولا۔ "اباقہ ہوش کر۔ میں تیرا دشمن نہیں۔"

اباقہ بولا۔ "تجھ سے بڑھ کر روئے زمین پر میرا کوئی دشمن نہیں۔"

یورق نے اباقہ کو آگے بڑھتے دیکھا تو ایک قدم پیچھے ہٹ کر تلوار کے دستے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "اباقہ میں جانتا ہوں میں تجھ سے جیت نہیں سکتا، لیکن .... تیرا یہ بوڑھا ساتھی اتنا کمزور بھی نہیں ہے۔ کیا ہوا اگر اس کے ایک ہاتھ کا نصف حصہ تیری محبت میں قربان ہو چکا ہے اس کا دوسرا ہاتھ تو سالم ہے۔"

پھر یورق نے ماہرانہ انداز میں تلوار نیام سے باہر کی۔ اسد تیزی سے اباقہ کے سامنے آگیا لیکن اباقہ نے اسے کہنی کے ساتھ زور سے دھکا دیا اور یورق پر پل پڑا۔ دونوں کی تلواریں یکساں رفتار سے ٹکرائیں اور یاکی چلاتی ہوئی دروازے کی طرف بھاگی۔ پلک جھپکنے میں کمرہ میدان جنگ بن گیا۔ پھر اباقہ کا دھکا کھا کر یورق ایک کھڑکی سے ٹکرایا اور اسے توڑتا ہوا باہر جا گرا۔ اباقہ چنگھاڑ کے ساتھ اس کے پیچھے لپکا۔ تلواریں ایک بار پھر خونی انداز میں ٹکرائیں۔ اب وہ اباقہ اور یورق نہیں تھے۔ ایک طرف صحرائے گوبی کے ایک جنگجو قبیلے کا کہنہ مشق سردار تھا اور دوسری طرف کوہ الطائی کا وحشی دیوانہ۔

صورت حال ایسی تھی کہ اسد کچھ نہیں کر پا رہا تھا۔ اگر وہ اباقہ یا یورق میں سے کسی ایک کو تھامنے کی کوشش کرتا تو دوسرا اس موقعے سے فائدہ اٹھا کر وار کر جاتا۔ دونوں میں گھمسان کا رن پڑ گیا تھا۔ ساتھ ساتھ وہ دونوں کو روکنے کی سعی بھی کر رہا تھا۔ وہ جانتا تھا اگر تھوڑی دیر اور گزر گئی تو یورق، اباقہ کی تلوار سے جانبر نہ ہو سکے گا۔ اسے اباقہ کے سامنے سے ہٹانا ضروری تھا۔ پھر دفعتاً اسے موقعہ مل گیا۔ وہ نیچے جھکا اور اس نے سردار یورق کو دھکا دے کر ایک کھلے دروازے سے باہر نکال دیا۔ اس سے پہلے کہ اباقہ اس پر جھپٹتا۔ اسد نے پھرتی سے دروازہ بند کر دیا۔ اب یورق دروازے سے باہر اور اباقہ اندر تھا۔ اسد بازو پھیلا کر اباقہ سے لپٹ گیا۔ اس دن اسے صحیح معنوں میں اباقہ کی وحشیانہ طاقت کا اندازہ ہوا۔ اسے لگا جیسے وہ ریت کے بند سے منہ زور پانی کو روکنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اباقہ اس کے توانا ہاتھوں سے نکل نکل جا رہا تھا۔ اسد نے حیرت سے گنگ کھڑے

ملازموں کو آوازیں دیں اور کوئی چھ عدد ملازم اباقہ سے لپٹ گئے۔ "چھوڑ دو........ چھوڑ دو۔" وہ چلا رہا تھا۔ دوسری طرف دروازے سے باہر سردار یورق اباقہ کو للکار رہا تھا لیکن اس نے دروازہ توڑنے یا پیٹنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ کچھ دیر اس کی للکاریں سنائی دیتی رہیں پھر ایک دم وہ خاموش ہو گیا۔ پتہ نہیں وہ چلا گیا تھا یا اسے کوئی وہاں سے لے گیا تھا۔ اباقہ کو روکنا اب ناممکن ہو رہا تھا۔ پھر وہ چھ سات آدمیوں کے نرغے سے نکل کر تیر کی طرح دروازے کی طرف لپکا۔ دروازہ کھول کر وہ باہر آیا تو یورق کا دور دور پتہ نہیں تھا۔ اسد کا گھوڑا بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔

اسد نے اباقہ کو گھوڑے کی طرف لپکتے دیکھا تو ایک بار پھر اسے تھام لیا۔ "سنو اباقہ!" وہ چلا کر بولا۔ "جلد بازی ٹھیک نہیں۔ ہمیں کچھ سوچنا چاہیے........ ہو سکتا ہے اصل مجرم کوئی اور ہو........ اور یہ بھی........ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ مارینا کی لاش ہی نہ ہو۔ اس کا چہرہ تو کچلا ہوا تھا........"

لیکن اباقہ نے اس کی آواز جیسے سنی ہی نہیں وہ اسد کو گھسیٹتا ہوا صدر دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ پھر اس نے خود کو چھڑایا اور جست لگا کر اپنے گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ اس کے ہاتھ میں ننگی تلوار تھی۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اگر آج یورق اسے مل گیا تو یہ اس کی زندگی کی آخری شام ہو گی۔

اسد کھڑا سوچ رہا تھا اور اپنے دل سے پوچھ رہا تھا کہ اسے کتنے فیصد یقین ہے کہ وہ مارینا کی لاش نہیں تھی۔ جواب نہایت حوصلہ شکن تھا۔ پھر وہ سوچنے لگا اگر یورق بے قصور تھا اور اس نے مارینا کو قتل نہیں کیا تھا تو وہ ایکا ایکی اس کا گھوڑا لے کر کیوں غائب ہو گیا۔ اس کے بھاگنے کا انداز اسے اور بھی مشکوک بنا رہا تھا۔ اسد نے اباقہ کے گھوڑے کی اڑاتی ہوئی گرد کو دیکھا اور اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ "یا خدا خیر!"

.... سردار یورق کا پارہ نقطۂ عروج پر تھا جب ایک ملازم نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ یہ ایک پچیس چھبیس سالہ شخص تھا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب طرح کا کروٹیں لے رہا تھا۔ وہ سرگوشی میں بولا۔

"سردار! خواہ مخواہ تلوار نہ چلاؤ۔ مارینا زندہ ہے۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں۔"

سردار یورق نے غور سے نوجوان کی طرف دیکھا۔ اس کا نہایت سنجیدہ چہرہ یورق کو سوچنے پر مجبور کر رہا تھا۔ دروازے کے دوسری جانب اباقہ کی دھاڑیں سنائی دے رہی تھیں۔ لگتا تھا اسد اور گھر کے دوسرے ملازم اسے سنبھالنے کی سرتوڑ کوشش کر رہے ہیں۔ نوجوان ملازم نے یورق کو متذبذب دیکھا تو اس کا بازو تھام لیا۔

"سردار! خواہ مخواہ اپنی اور اباقہ کی زندگی کو خطرے میں نہ ڈالو۔ میرے ساتھ آؤ۔ میں تمہیں بتاؤں مارینا کہاں ہے۔" پھر وہ اسے کھینچتا ہوا بیرونی دروازے تک لے آیا تھا۔ "بیٹھو سردار۔ گھوڑے پر بیٹھو۔" اس نے اسد کا گھوڑا کھولتے ہوئے کہا تھا۔

سردار یورق کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ نوجوان کی بات درست ہے۔ مارینا زندہ ہے اگر مارینا زندہ تھی تو پھر اباقہ سے جنگ وجدل فضول تھی۔ اس بے وقوفی سے بچنے کے لیے وہ فوراً گھوڑے پر سوار ہو گیا........ ذرا سی دیر بعد ان دونوں کے گھوڑے اندرون شہر کی طرف جا رہے تھے۔

.... اور اب یورق اس نوجوان کے ساتھ ایک چھوٹے سے کمرے میں بیٹھا تھا۔ کمرہ بغداد کے روایتی انداز میں سجا ہوا تھا۔ فرش پر نمدے بچھے ہوئے تھے۔ ایک طرف شمعدان جل رہا تھا۔ نوجوان نے اپنی ٹوپی اتار کر گھٹنے پر رکھی اور پیشانی سے پسینہ پونچھ کر ہیجان انگیز انداز میں دروازے پر جھولتے پردے کو دیکھنے لگا۔ اس نے اپنا نام علی بتایا تھا۔ وہ وزیر خارجہ ابن یاشر کے محل میں ملازموں کا سردار تھا۔ خوش شکل نوجوان تھا' لیکن کسی اندرونی صدمے نے اسے نڈھال کر رکھا تھا۔ آخر اس نے اپنی کہانی سناتے ہوئے کہا۔

"سردار! شاید تمہیں معلوم نہ ہو تمہارے گھر کے تمام ملازم وزیر خارجہ کے جاسوس ہیں۔ وہ تمہاری ہر ہر بات وزیر خارجہ تک پہنچاتے ہیں۔ میں بھی ان میں سے ایک ہوں' لیکن یہ حالات کا پھیر ہے کہ اس وقت تم میرے گھر میں ہو اور میں تمہیں ایک راز سے آگاہ کر رہا ہوں........ کہیں تم یہ نہ سمجھو کہ یہ بھی میری کوئی چال ہے لہٰذا پہلے میں تمہیں یہ بتا دوں کہ میں ایسا کیوں کر رہا ہوں۔

"سردار' وزیر خارجہ نے جو کھیل کھیلا ہے اس میں میری ایک عزیز ہستی مجھ سے جدا ہوئی ہے۔ وہ میری بہن زبیدہ تھی۔ وہ میری سگی بہن نہیں تھی' لیکن شاید ہی کسی بھائی نے اپنی سگی بہن سے اتنا پیار کیا ہو جتنا مجھے اس سے تھا۔ میں اسے پیار سے زیبی کہتا تھا۔ زیبی ایک آزاد عورت نہیں تھی۔ وہ ابن یاشر کے ایک مشیر عبداللہ کی زرخرید لونڈی تھی۔ لونڈی ہونے کے . جود زیبی میں ایک آزاد عورت کی روح تھی وہ آزاد ہونا چاہتی تھی۔ کسی آزاد مرد سے شادی کر کے باعزت زندگی گزارنا چاہتی تھی۔ آزادی کی لگن ایک جوت کی طرح اس کے سینے میں جلتی تھی۔ اس کے آقا نے آزادی کی قیمت پانچ ہزار دینار مانگی تھی۔ پانچ ہزار دینار کا حصول زیبی کے لیے ممکن نہیں تھا' لیکن وہ اس ناممکن کو ممکن بنانے کا تہیہ کیے ہوئے تھی۔ وہ دن کو آقا کی خدمت کرتی تھی اور راتوں کو

جاگ کر سلائی کڑھائی کا کام کرتی تھی۔ اس کے کشید کیے ہوئے پھول بوٹوں میں آزادی کا رنگ تھا۔ آزاد فضاؤں میں اڑتے پرندوں کو وہ کپڑے پر اس خوبصورتی سے نقش کرتی تھی کہ نظر جامد ہو جاتی تھی۔ وہ رنگین دھاگے کو سن چلے چشموں اور رواں آبشاروں کی شکل دے دیتی تھی۔ میں اس کی کشیدہ کاری کو شہر میں بیچ آتا تھا اور جو رقم ملتی تھی اسے زبیدہ کے نام پر اپنے پاس جمع کر لیتا تھا۔ میں اور میری بیوی بھی گھر کے خرچ سے کچھ رقم بچا کر اس بچت میں شامل کر دیتے تھے۔ اب ہمارے پاس چار ہزار دینار ہو چکے تھے۔ زبی کے آقا نے اسے دو برس کی مہلت دے رکھی تھی اور اس مہلت کے ختم ہونے پر اس نے اسے ایک عیاش مقامی تاجر کے سپرد کر دینا تھا۔ یہ تاجر اسے زبی کے آٹھ ہزار دینار دے رہا تھا۔ اس انجام سے بچنے کے لیے وہ بیچاری سرتوڑ کوشش کر رہی تھی اور اب کچھ امید پیدا ہو چلی تھی کہ مہلت کے باقی دو مہینے ختم ہونے سے پہلے مطلوبہ رقم اکٹھی ہو جائے گی .... لیکن کل ساری امیدیں دم توڑ گئیں۔ پنجرہ کھلنے سے پہلے ہی پرندے کی موت آ گئی۔ قیدی کو آزاد فضا میں سانس لینا نصیب نہ ہوا ....“ علی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور اس نے چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا۔ چند لمحے وہ خود کو پرسکون کرنے کی کوشش کرتا رہا پھر بولا۔

”سردار! ٹیلوں میں جو لاش ملی ہے وہ مارینا کی نہیں میری منہ بولی بہن زبیدہ کی ہے۔ یہ وزیر خارجہ ابن یاشر کی ایک بہت گہری سازش تھی۔ پرسوں وزیر خارجہ کے حکم پر ایک غلام اور ایک کنیز کو اس کے محل میں پہنچایا گیا۔ وہاں خلیفہ مستنصر باللہ کا ایک بوڑھا مشیر مسلم بن داؤد بھی موجود تھا۔ مسلم بن داؤد نے غلام کے بازو پر چند حروف کندہ کروائے۔ میں بھی اس وقت وہیں موجود تھا۔ یہ تین الفاظ تھے۔ ”ماں کا انتقام“ الفاظ کندہ ہو چکے تو وزیر خارجہ کے حکم پر ایک سپاہی نے تیز دھار خنجر سے جلد کا وہ ٹکڑا غلام کے بازو سے علیحدہ کر لیا۔ اس کی بعد کنیز کو مسلم بن داؤد کے سامنے لایا گیا۔ وہ کنیز زبیدہ تھی۔ اس کے معصوم چہرے پر انجانے خدشے منڈلا رہے تھے۔ اس وقت مجھے بالکل علم نہیں تھا بیچاری کے ساتھ ایسا وحشیانہ سلوک ہونے والا ہے۔ مسلم بن داؤد غور سے اسے دیکھنے لگا۔ خاص طور پر اس کے بالوں کو اس نے بڑی توجہ سے دیکھا۔ زبیدہ کے بال [illegible] رنگ تھے بالکل جیسے مارینا کے ہیں۔ اس کے بعد زبیدہ کو دو سپاہیوں کے ساتھ رخصت کر دیا گیا۔ یہ زبیدہ کی آخری جھلک تھی جو میں نے دیکھی۔

آج صبح بازو کی جلد کا وہ کٹا ہوا ٹکڑا ایک خط کے ساتھ تمہارے گھر پہنچا۔ تم [illegible] اس وقت گھر میں موجود تھے۔ ہاں اباقہ اور اسد گھڑ سواری کے لیے جا چکے تھے۔ [illegible]

[illegible] گئی کہ جب خط لانے والا شخص خط مارینا تک پہنچائے تو وہ تنہا ہو۔ مارینا نے انسانی جلد کا وہ ٹکڑا دیکھا اور اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ یہ سمجھنے میں اسے ذرا بھی دیر نہ لگی کہ یہ اباقہ کے جسم کا ٹکڑا ہے۔ کیونکہ یہ الفاظ اباقہ کے بازو پر کندہ تھے۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے خط کھولا۔ اس پر لکھا تھا کہ اباقہ ہمارے قبضے میں ہے۔ اس کی جان بچانا چاہتی ہو تو ایک لمحہ ضائع کیے بغیر نہر کلثومیہ کے ٹیلوں کی طرف چل پڑو۔ تم مل جاؤ گی تو ہم اباقہ کو چھوڑ دیں گے۔ یہ ہمارا وعدہ ہے اگر کسی کو اطلاع دی تو اباقہ اذیت ناک موت سے دوچار ہو گا۔

”یہ خط پڑھتے ہی مارینا کا چہرہ زرد ہو گیا۔ کچھ دیر وہ بے چینی سے اندر باہر گھومتی رہی پھر خاموشی سے بیرونی دروازے پر آئی اور گھوڑا لے کر نکل گئی۔ ٹیلوں میں مارینا کو پکڑ لیا گیا اور نہایت راز داری سے وزیر خارجہ کے محل پہنچا دیا گیا۔ زبی کو گلا گھونٹ کر ہلاک کیا جا چکا تھا۔ مارینا کا لباس‘ چوڑیاں اور جوتے وغیرہ اسے پہنا دیئے گئے۔ پھر اس کا چہرہ مسخ کیا گیا اور ٹیلوں پر لے جا کر نیچے پھینک دیا گیا۔ وزیر خارجہ کے حکم کے مطابق مارینا کے گھوڑے کو بھی نیچے پھینکا جانا تھا‘ لیکن عین وقت پر کچھ راہ گیر پہنچ گئے اور یہ کام نہ کیا جا سکا ....“

سردار یورق آنکھیں پھاڑے یہ حیرت انگیز روداد سن رہا تھا۔ بغدادی انتظامیہ نے رائے عامہ کی مخالفت سے بچنے کے لیے کتنی گہری منصوبہ بندی کی تھی۔ علی کی آنکھیں سرخ تھیں اور وہ بار بار آنسو پونچھ رہا تھا۔ اچانک اس کی ہچکی بندھ گئی۔ وہ روتے ہوئے بولا۔

”سردار! یہ دیکھو .... یہ دیکھو‘ بستر کی چادریں‘ یہ تکیوں کے ریشمی غلاف یہ خوبصورت پردے .... یہ سب میری بدنصیب بہن کے ہاتھوں کی محنت ہے۔ ذرا اس دلکش کام کو دیکھو اور اندازہ لگاؤ وہ خود کتنی خوبصورت ہو گی .... جب اس کے رتجگے رنگ لانے والے تھے۔ جب اسے جاں گسل محنتوں کا ثمر ملنے والا تھا۔ وہ زندگی ہار بیٹھی۔ موت کے سوداگروں کو اس کی نو عمری پر رحم آیا اور نہ اس کی خوبصورت شکل پر۔ اس کے دلکش بال جن پر اسے ناز تھا اس کے لیے موت کا پھندا بن گئے۔ میری بہن .... میں تیری نیند سے بوجھل آنکھوں کے صدقے۔ تیری تھکی ہوئی انگلیوں پر قربان .... میں تیرے لیے کچھ نہ کر سکا۔ نمک حلالی کرتے میں نے تجھے کھو دیا۔“ علی بے قرار ہو کر دیوار سے سر ٹکرانے لگا۔ سردار یورق نے اسے تھام لیا۔ پھر گمبھیر آواز میں بولا۔

”حوصلہ رکھ دوست! مجرموں کو سزا ضرور ملے گی .... ضرور ملے گی۔“

☆------☆------☆

سردار یورق اور اباقہ کی ملاقات جلد ہی ہو گئی۔ اس وقت آسمان پر گھرے چھائے ہوئے تھے۔ مشرق کی طرف سے چلنے والی گرد آلود ہوا نے بغداد کے گلی سنسان کر رکھے تھے۔ اباقہ کو ڈھونڈتا ڈھونڈتا سردار یورق دجلہ کے مغربی کنارے آیا تھا۔ دفعتاً موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ سائے کی تلاش میں یورق نے چاروں نظر دوڑائی۔ اچانک اس کی نظر ایک شخص پر پڑی۔ بارش کی دبیز چادر کے اندر نے دیکھا ایک ہیولا سا کھجور کے درخت سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔

"کہیں یہ اباقہ تو نہیں۔" یورق نے تیزی سے سوچا۔ وہ گھوڑے کو ایڑ لگا کر در کے قریب بھیجا۔ اس کا اندازہ درست ثابت ہوا۔ وہ اباقہ تھا۔ اس کے لمبے بال بھیگ پیشانی سے چپکے ہوئے تھے۔ ننگی تلوار گود میں تھی۔ طوفانی موسم سے یکسر بے پرواہ سوچوں میں گم تھا۔ یورق کو دیکھ کر اس کے جسم میں حرکت ہوئی اور کسی معمول کی اٹھ کھڑا ہوا۔ یورق اب اور قریب آگیا تھا۔ اس نے دیکھا اباقہ کی آنکھیں انگار طرح جل رہی ہیں۔ ایک سرد لہر سردار کے جسم میں دوڑ گئی۔ اسے لگا اباقہ اچانک د کی طرح اس پر ٹوٹ پڑے گا۔

"اباقہ!" وہ جلدی سے بولا۔ "تلوار نیام میں ڈال لے .... مارینا زندہ ہے۔"

اباقہ کے ہونٹ سوالیہ انداز میں کھل گئے۔ "ہاں اباقہ! وہ لاش مارینا کی نہیں آمیرے ساتھ میں تجھے بتاؤں مارینا کہاں ہے؟"

"سردار! مجھ سے کوئی چال نہ چلنا۔" اباقہ کی آواز میں دنیا جہاں کا درد اور قہر گیا تھا۔ اس فقرے میں ایک خوفناک تنبیہہ بھی شامل تھی۔

"آمیرے ساتھ۔" یورق نے پورے یقین سے کہا۔ اباقہ کا گھوڑا قریب ہی ہوا تھا۔ وہ گھوڑے پر بیٹھا اور یورق کے عقب میں چل دیا۔ بارش میں اب مزید گئی تھی، لیکن دونوں موسم کی شدت سے بے پرواہ گھوڑے بھگاتے چلے جا رہے یوں لگتا تھا ان کے سوا بغداد کے سارے لوگ گھروں میں دبک چکے ہیں۔ بس کہیں بے فکرے چہرے بالکونیوں اور دریچوں سے برسات کا نظارہ کر رہے تھے۔

بغداد سے باہر نکل کر وہ مضافاتی علاقے میں پہنچ گئے تاریکی اب گہری ہو گئی دور عقب میں شہر کی جھلملاتی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ وہ اب مشرق کی طرف جانے شاہراہ پر پہنچ چکے تھے۔ سردار یورق ایک مسافر سرائے کے قریب جا کر ٹھہر گیا۔ شاہراہ عین اوپر یہ مسافر سرائے کافی بڑی تھی۔ اصطبل میں بندھے ہوئے گھوڑوں کی تعداد

ازہ ہوتا تھا کہ سرائے میں اس وقت بھی سو ڈیڑھ سو مسافر ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ایک دو کیوں میں ہلکی ہلکی روشنی کے سوا باقی عمارت تاریک دکھائی دیتی تھی، لیکن اندر سے بجنے کی ہلکی ہلکی آواز سنائی دے رہی تھی۔

"اباقہ تیری محبوبہ اس سرائے میں موجود ہے۔" یورق نے کہا۔

اباقہ کی آنکھوں میں اندرونی جذبوں کی چمک دکھائی دی۔ پھر دونوں گھوڑوں سے کود پیدل آگے بڑھے۔ دروازہ بند تھا۔ کھٹکھٹانے پر ایک دبلے پتلے منحنی سے شخص نے ڈی کھول کر باہر جھانکا۔ اباقہ اور یورق کو سر سے پاؤں تک گھورا۔ پھر باریک لیکن ت آواز میں بولا۔

"کوئی جگہ خالی نہیں۔ کوئی دوسری سرائے دیکھو۔"

یورق بولا۔ "لیکن ہمیں سرائے کے مالک سے ملنا ہے۔"

وہ شخص مزید بگڑ کر بولا۔ "کہہ جو دیا کوئی جگہ خالی نہیں مالک اس وقت کسی سے ں مل سکتے۔"

اس سے پہلے کہ وہ دروازہ بند کر دیتا اباقہ نے اس کی لاغر گردن پر ہاتھ ڈالا اور کھینچ باہر کیچڑ میں گرا دیا۔ دروازے کو دھکیل کر دونوں اندر داخل ہوئے۔ کوئی پندرہ بیس افر نشے میں دھت ایک رقاصہ کا ناچ دیکھنے میں مصروف تھے۔ ایک مسافر خود بھی جھوم وم کر ناچ رہا تھا۔ دونوں نے اس چھت کے نیچے موسم کی رنگینی کا جائزہ لیا۔ کیچڑ میں نے والا شخص خود کو سنبھال کر تند بگولے کی طرح اندر داخل ہوا۔ نہایت دلیری سے ں نے اباقہ کا گریبان پکڑ لیا اور جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر کچھ بولنے لگا۔ اس کی چیخ و پکار سن کر قاصہ کے تھرکتے پاؤں ساکت ہو گئے۔ دوسرے لوگ بھی اباقہ اور یورق کو گھورنے لگے۔ نے ایک خفیف جھٹکے سے اپنا گریبان چھڑایا۔ دو پہلوان نما افراد اس کے سامنے ڑے ہوئے۔

"کیا بات ہے؟" ان میں سے ایک نے کیچڑ میں لت پت پاسبان سے پوچھا۔

پاسبان نے اپنی باریک آواز میں کڑک کر اباقہ اور یورق کا جرم بتایا۔ اب خطرناک ں والے دو تین اور افراد بھی ان دونوں کے گرد جمع ہو چکے تھے۔

"کیا چاہتے ہو تم؟" ان میں سے ایک نے نہایت بد تمیزی سے اباقہ کو مخاطب کیا۔

اس سے پہلے کہ اباقہ کا ہاتھ گھومتا یورق جلدی سے بولا۔ "ہمیں صرف سرائے کے سے ملنا ہے۔"

"مالک سونے کے لیے اپنے کمرے میں جا چکا ہے۔ بغداد کا ناظم بھی آجائے تو اس

سے نہیں مل سکتا.......... تم کون ہو؟"

یورق اس کا سوال نظرانداز کر کے بولا۔ "میرا خیال ہے اسے ہم سے ملنا ہی پڑے گا۔"

ایک پہلوان نما شخص نے آستین اُڑس کر کہا۔ "اور میرا خیال ہے تم دونوں کا دماغ ٹھیک ہونے والا ہے۔"

لیکن پھر اس سے پہلے کہ کوئی ہنگامہ ہوتا۔ سیڑھیوں پر آہٹ سنائی دی۔ اباقہ اور یورق نے دیکھا سیڑھیوں کے آخر میں نظر آنے والا ایک دروازہ کھلا اور ایک مجسم شخص دکھائی دیا۔ اس کا قد قریباً ساڑھے چھ فٹ تھا۔ سب سے نمایاں چیز اس کا چہرہ تھا جو اس کے چوڑے شانوں پر کسی بڑے تربوز کی طرح رکھا تھا۔ گردن نہ ہونے کے برابر تھی۔ یہ سرائے کا مالک تھا۔ اباقہ اور یورق کو اب یہ بھی سمجھ آرہی تھی کہ اس نے اپنے آدمیوں کو تنہائی میں مخل نہ ہونے کا حکم کیوں دے رکھا ہے۔ اس کے پہلو میں ایک خوبرو لڑکی کھڑی تھی۔ لڑکی عام قد کاٹھ کی تھی' لیکن اس دیو کے پہلو میں ایک چھوٹی بچی لگ رہی تھی۔

"کیا شور ہے؟" اس نے گھن گرج کے ساتھ پوچھا۔

کیچڑ میں لت پت پاسبان نے آگے بڑھ کر کہا۔ "آقا.......... یہ گستاخ.......... آواز اس کے حلق میں اٹک گئی۔

سرائے کا مالک مست ہاتھی کی طرح جھومتا نیچے آیا۔ پھر اس نے بغیر کچھ کہے زنا٘ٹے کا تھپڑ اباقہ کو مارنا چاہا اور یہ حرکت اس کی بدقسمتی کا آغاز بن گئی۔ اباقہ نے پھرتی سے اس کا بازو تھام لیا اور ایکا ایکی پوری قوت سے کلائی دبا دی۔ اس کے ہاتھ نے آہنی شکنجے کی طرح کلائی کے رگ پٹھوں کو مسل کر رکھ دیا۔ سرائے کے مالک کو مدمقابل کی بے پناہ طاقت کا احساس ہوا۔ اس نے اباقہ کی جنونی آنکھوں میں جھانکا اور اس کا چہرہ زرد ہو گیا۔ اسے لگ رہا تھا اس نے کلائی چھڑانے کے لیے ذرا بھی زور لگایا تو ہڈی نازک شیشے کی طرح ٹوٹ جائے گی۔ یورق نے بھی سرائے کے مالک کا لرزتا ہوا ہاتھ دیکھ لیا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اباقہ نے کیا کیا ہے۔ وہ بڑے نرم لہجے میں بولا۔

"میرا خیال ہے۔ آپ نے ہمیں پہچان لیا ہے۔ چلئے ذرا کمرے میں چلتے ہیں۔"

لیکن مدِمقابل اتنی آسانی سے ہار ماننے والا نہیں تھا۔ اس نے کلائی چھڑانے کے لیے زور لگایا اور وہی ہوا جس کا یورق کو خطرہ تھا۔ اباقہ نے ایک مخصوص جھٹکے سے اس کی کلائی توڑ دی۔ اس وقت سرائے کے ملازموں میں سے دو تلواریں کھینچ کر آگے بڑھے۔

لیکن وہ کوئی ایسے ماہر شمشیر زن نہیں تھے کہ یورق جیسے سردار اور اباقہ جیسے جنگجو کے سامنے ٹھہر سکتے۔ اباقہ کی طرف بڑھنے والے شخص کے سینے پر بھرپور لات پڑی اور وہ اڑتا ہوا چند کرسیوں پر جا گرا۔ یورق پلک جھپکنے میں تلوار نکال چکا تھا۔ اس نے نہایت اطمینان اور صفائی سے اپنے مدمقابل کا ہاتھ کلائی پر سے کاٹ دیا۔ تلوار ہاتھ سمیت رقاصہ کے پاؤں میں جا گری اور وہ چلا کر بے ہوش ہو گئی۔ دو اور افراد تلواریں نکالنے کی کوشش کر رہے تھے' یورق کے تیور دیکھ کر ٹھٹک گئے۔ وہ تلوار چلانے والے نہیں دھونس جمانے والے لوگ تھے۔ بہت ہوا تو کسی سے دھینگا مشتی کر لی' لات مکہ چلا لیا۔ سیدھا سیدھا موت سے کھیلنا ان کے بس کا روگ نہیں تھا۔ یورق نے آگے بڑھ کر تلوار ہوا میں گھمائی اور وہ الٹے پاؤں پیچھے ہٹے۔

"اور کس کو شوق ہے زور آزمائی کا؟" یورق نے بلند آواز سے دریافت کیا۔ سب خاموش تھے۔ اباقہ نے سرائے کے مالک کی ٹوٹی ہوئی کلائی کھینچی اور وہ بلبلاتا ہوا اس کے ساتھ ہو لیا۔ اباقہ اسے سیڑھیاں چڑھاتا ہوا بالائی منزل کے کمرے میں لے آیا۔ یورق بیرونی دروازے پر کھڑا تھا اور سارے شرابیوں کو ایک قطار میں کھڑا کر رہا تھا۔ باقی مسافر شاید الگ تھلگ کمروں میں تھے۔ وہ یہاں ہونے والے ہنگامے سے بے خبر رہے تھے۔ یورق نے ان تمام کے سامنے صراحیاں رکھوا دیں اور انہیں پینے کا حکم دیا۔ شرابی جو پہلے ہی مدہوش تھے اور بھی مدہوش ہونے لگے۔ صرف دو افراد اس محفل نشاط سے لطف اندوز نہیں ہو پا رہے تھے۔ ایک رقاصہ جو فرش پر بے ہوش پڑی تھی اور دوسرا وہ شخص جس کا ہاتھ کٹ گیا تھا۔

دوسری طرف اباقہ کمرے میں سرائے کے مالک سے پوچھ گچھ کر رہا تھا۔ اس کی پوچھ گچھ کا انداز نہایت سادہ اور آسان فہم تھا۔ اس نے مالک کی ٹوٹی کلائی تھام رکھی تھی۔ جہاں وہ کچھ چھپانے کی کوشش کرتا اباقہ اس کی کلائی کو جنبش دے دیتا۔ وہ درد کی شدت سے چلا اٹھتا اور فرفر بولنے لگتا۔ تھوڑی دیر پہلے اس میں نظر آنے والی تمام اکڑفوں ایک رحم آمیز خوف میں بدل چکی تھی۔ اس نے قسمیں کھا کر اباقہ کو یقین دلایا کہ مارینا یا کوئی دوسری لڑکی اس سرائے میں موجود نہیں۔

اباقہ کو اس کی بات کا یقین کرنا پڑا۔ کیونکہ اگر مارینا یہاں موجود تھی تو اسے ڈھونڈنا مشکل نہیں تھا' لیکن یہ ایک بات اس کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ یورق کی اطلاع کے مطابق منگول سفارت کار ابھی بغداد میں موجود تھے۔ انہیں کل صبح روانہ ہونا تھا۔ یورق کا خیال تھا کہ مارینا کو راز داری کے خیال سے اس سرائے میں رکھا گیا ہے اور

کل منگول سفیر جاتے جاتے مارینا کو یہاں سے لے جائے گا' لیکن اب یہ شخص کہہ رہا
کہ وہ یہاں موجود نہیں۔ اس نے سرائے کے مالک کو پوری تفصیل بتانے پر مجبور کیا تو وہ
بولا۔

"کل میری سرائے میں دمشق سے آنے والا ایک تجارتی قافلہ ٹھہرا ہوا تھا یہ لوگ
سمرقند کے راستے کاشغر جا رہے تھے۔ ان کے پاس ساز و سامان سے بھرے ہوئے کئی
صندوق تھے۔ کل شام قافلے کا سردار عزیز ایک صندوق اونٹ سے اتروا رہا تھا۔ میرے
پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ شہر سے کچھ اور سامان خرید کر لایا ہے' لیکن میں نے دیکھا کہ
صندوق میں کچھ چھوٹے چھوٹے سوراخ بنائے گئے ہیں۔ مجھے شک سا ہوا۔ آخر ایسا
کیا سامان تھا جس کے لیے سوراخوں کی ضرورت تھی۔ میں نے اپنے ایک آدمی کے ذریعے
اس صندوق کا پتہ کروایا .... معلوم ہوا کہ اس صندوق میں کوئی لاش ہے۔ میں
عزیز کو بلوا کر اس سے پوچھ گچھ کی تو اس نے بتایا کہ صندوق میں لاش نہیں ایک بے
ہوش عورت ہے اور اسے شہر سے باہر پہنچانا ہے۔ اس نے بتایا کہ یہ اس کے ایک دوست
کا کام ہے اس لیے وہ کرنے پر مجبور ہے' لیکن جلد ہی میں نے اندازہ لگایا کہ اسے اس کام
کے لیے معقول معاوضہ دیا گیا ہے۔ میں نے .... اپنا منہ بند رکھنے کی قیمت طلب کی
اور اس نے مجھے تین ہزار دینار دیئے۔ اس کے بعد مجھے کچھ معلوم نہیں۔ عزیز اپنے
قافلے کے ساتھ کب اور کہاں گیا؟"

اس مرحلے پر اباقہ نے ایک دفعہ پھر اس کی کلائی جھنجھوڑی۔ سرائے کے مالک نے
کراہتے ہوئے اپنی آخری معلومات بھی اس کے حوالے کر دیں۔ اس نے کہا۔

"میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ عزیز اس عورت کو سمرقند اور خوارزم کی سرحد کے
درمیان کسی نامعلوم مقام پر اصل مالکوں کے حوالے کر دے گا۔ وہ مالک کل بغداد سے
روانہ ہونے والے ہیں۔ شاید وہ سفید لوگ ہیں اور خود کسی طرح کا خطرہ مول لینا نہیں
چاہتے۔"

اباقہ یہ بات اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ منگول سفیر جو "امن کے پیامبر" بن کر بغداد
آئے تھے۔ مارینا کو اپنے ساتھ لے جا کر کسی طرح کا مسئلہ کھڑا کرنا نہیں چاہتے تھے۔

خیر سگالی کے طور پر بغداد سے ایک مسلح دستہ منگول سفارتکاروں کو خوارزم کی
سرحد تک چھوڑنے جا رہا تھا۔ مسلمان سپاہیوں کی موجودگی میں مارینا کے اغوا کا پول کسی
وقت بھی کھل سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ مارینا کو ایک تجارتی قافلے کے ذریعے خوارزم
پہنچانے کا فیصلہ کیا گیا تھا' لیکن سوچنے کی بات یہ تھی کہ منگول سفارتکار شامی تاجروں سے

مارینا کو کس مقام پر حاصل کرنے والے تھے۔ خوارزم کی سرحد سے سمرقند تک سینکڑوں
بستیاں اور ان گنت قصبے تھے۔ اباقہ نے سرائے کے مالک پر بہت زور ڈالا' لیکن وہ یہ
بتانے سے قاصر رہا کہ بے ہوش عورت کی سپرداری کس جگہ عمل میں آئی ہے۔ یہ بات تو
ظاہر تھی کہ بغداد سے مشرق کی طرف جانے والے راستے پر بے شمار قافلے رواں ہوں
گے۔ ان میں سے مطلوبہ قافلہ کیوں کر ڈھونڈا جا سکتا تھا۔ اب ایک صورت تھی۔ کل
بغداد سے روانہ ہونے والے اس قافلے کا تعاقب کیا جائے جو منگول سفارتکاروں کو لے کر
خوارزم کی طرف روانہ ہو رہا تھا۔ صرف یہی ایک یقینی راستہ تھا مارینا تک پہنچنے کا۔

☆————☆————☆

اباقہ اپنے گھوڑے پر سوار ایک درخت کے نیچے تنہا کھڑا تھا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ کل
کی موسلا دھار بارش کے بعد چمکدار دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ منگول سفارت کاروں کے
قافلے کو کچھ دیر بعد اس راستے سے گزرنا تھا اور اباقہ کو ان کا تعاقب کرنا تھا۔ یہ ایک
طویل سفر تھا اور اس میں اباقہ بالکل تنہا تھا۔ اسد اور یاکی کو وہ بغداد میں چھوڑ آیا تھا۔ اسد
اس کے ساتھ جانا چاہتا تھا' لیکن اباقہ جانتا تھا اس کی نوبیاہتا بیوی بلخ کے نواحی قصبے کے
کسی گھر میں اس کی راہ دیکھ رہی ہو گی۔ قوقند کے قید خانے سے رہائی کے بعد اسد نے
صرف اباقہ ہی کی وجہ سے بیوی کے ساتھ بلخ جانے سے انکار کر دیا تھا۔ بعدازاں وہ یورق
کے ساتھ اباقہ کی مدد کو پہنچا تھا اور ایک خون ریز لڑائی کے بعد وہ مارینا کو منگولوں کے چنگل
سے چھڑانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

لیکن اس تگ و دو کا کیا فائدہ ہوا تھا؟ کچھ بھی نہیں۔ مارینا اور اباقہ نے ملاپ کا یہ
سنہری موقعہ کھو دیا تھا۔ ان کے ایک ہونے میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ اباق' مارینا کا بے
دام کا غلام تھا اور اب مارینا کا رویہ بھی کچھ تبدیل ہو رہا تھا لیکن کوئی نتیجہ نکلنے سے پہلے ہی
پانسہ پلٹ گیا تھا۔ چند ماہ اکٹھے رہنے کے بعد مارینا ایک بار پھر اباقہ سے دور ہو گئی تھی۔

معلوم نہیں اباقہ کے نصیب میں مارینا کو پانے کی خوشی تھی یا نہیں' لیکن وہ اسد کی
کو زندگی کی مسرتوں سے دور رکھنا نہیں چاہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نئے سفر میں اس
نے اسے اپنے ساتھ نہیں لیا تھا۔ اس نے مجبور کیا تھا کہ وہ اپنی بیوی کے پاس پہنچے اور
ہو سکے تو یاکی کو اپنے ساتھ رکھے۔ اسد نے یاکی کی ذمے داری قبول کر لی تھی۔ اس نے
وعدہ کیا تھا کہ کچھ دن بعد وہ یاکی کے ساتھ بلخ روانہ ہو جائے گا۔

سردار یورق کل رات سرائے سے باہر اس سے جدا ہو گیا تھا۔ یوں لگتا تھا وہ یقین
دلانے کے لیے اباقہ کے ساتھ تھا کہ مارینا کو اس نے نہیں مارا۔ جونہی اباقہ کو یقین ہو گیا

تھا اس نے اباقہ سے بات کرنا بھی گوارا نہیں کیا تھا اور گھوڑے کا رخ موڑ کر چل دیا تھا۔ اباقہ نے پوچھا بھی تھا کہاں جارہے ہو لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

...... اور اب اباقہ تنہا تھا۔ اس نے دیکھا دور گرد کے بادل نظر آئے۔ توقع کے مطابق یہ منگول سفارت کار ہی تھے۔ تھوڑی دیر بعد گھوڑے بھاگتے ہوئے اس کے قریب سے گزر گئے۔ اباقہ کھڑا رہا۔ جب قافلہ دور نکل گیا تو اس نے ایڑ لگائی اور درمیانی رفتار سے اس کے پیچھے چل دیا۔ اس کے دائیں بائیں کھیتوں کے سلسلے تھے۔ گندم کے آدھے پکے خوشوں پر سورج چمک رہا تھا۔ اباقہ نے ایک نظر گھوم کر بغداد کے آثار دیکھے ...... اس شہر نے اسے تنہا کر دیا تھا۔ پالی اور اسد کو وہ خود چھوڑ آیا تھا۔ ماریتا اس سے دور کر دی گئی تھی' لیکن یورق کو اس طرح اس کا ساتھ نہیں چھوڑنا چاہئے تھا۔ اس نے ایک سرد آہ بھری ...... اور اس وقت اس کی نگاہ بائیں طرف کھیتوں کی طرف اٹھ گئی۔ ایک گھڑ سوار تیزی سے گھوڑا بھگاتا اس کی طرف آرہا تھا۔ جلد ہی دونوں گھوڑے متوازی بھاگنے لگے۔ اس وقت اباقہ نے غور سے دیکھا۔ وہ سردار یورق تھا۔ اس کے چہرے پر خفگی کے آثار تھے لیکن صاف ظاہر تھا وہ اباقہ کے ساتھ چلنے کو آیا تھا۔ اباقہ کی اداسی دفعتاً ایک خوشگوار کیفیت میں ڈھل گئی۔ چند لمحے دونوں خاموشی سے گھوڑے چلاتے رہے۔ پھر اباقہ نے اپنی پانی کی چھاگل اس کی طرف اچھال دی۔ یورق نے چھاگل دبوچ لی اور غٹاغٹ کئی گھونٹ چڑھا گیا ...... شاید وہ اس طرح اپنا غصہ ٹھنڈا کر رہا تھا ...... اگلے کئی روز بغیر کسی اہم واقعے کے گزر گئے۔ اباقہ اور یورق میں صلح ہو چکی تھی۔ غلط فہمی دور ہو گئی تھی۔ یورق نے اباقہ کو تفصیل سے سارا واقعہ بتایا تھا کہ کس طرح قتل ہونے والی بدنصیب کنیز کے منہ بولے بھائی نے ماریتا کے اغوا کا راز فاش کیا اور اس کے ٹھکانے کا پتہ بتایا۔

دونوں بڑے محتاط طریقے سے منگول قافلے کا تعاقب کر رہے تھے۔ تعاقب میں کچھ دشواری اس لیے پیش آرہی تھی کہ اباقہ اور یورق راستے کی چوکیوں سے کترا کر گزرنے کی کوشش کرتے تھے۔ جب کہ منگول قافلے کو اس احتیاط کی ضرورت نہیں تھی۔ کئی دفعہ قافلے سے ان کا فاصلہ بڑھ کر پانچ چھ کوس ہو جاتا تھا' لیکن کبھی کبھی وہ اتنے قریب آجاتے تھے کہ ہوا کے دوش پر تیرتی ہوئی ان کی آوازیں بھی سن سکتے تھے۔ اپنے سفر کے گیارہویں روز وہ خوارزم کے مقبوضہ علاقے میں داخل ہو گئے۔ بغداد سے آنے والا فوجی دستہ یہاں منگول سفارت کاروں سے علیحدہ ہو گیا۔ اب اباقہ اور یورق کو مزید احتیاط کی ضرورت تھی۔ شامی تاجر کسی بھی جگہ ماریتا کو منگول سفیروں کے حوالے کر سکتے تھے۔

سفر کے پندرہویں روز شام کے وقت منگول قافلے نے ایک سرسبز قصبے میں قیام کیا یہ کاشتکاروں کا قصبہ تھا۔ تمام آبادی مسلمانوں کی تھی قصبے کے مضافات میں ایک چھوٹا سا قلعہ بھی موجود تھا۔ یہاں منگول فوجیوں نے بڑی مضبوط چوکی قائم کر رکھی تھی۔ قصبے کے اندر بھی منگول سپاہی بڑی تعداد میں گھومتے پھرتے نظر آرہے تھے۔ قصبے کے سرکردہ افراد نے بڑے احترام سے منگول سفیر کو خوش آمدید کہا۔ بستی کا بہترین گھر ان کی رہائش کے لیے خالی کر دیا گیا۔ اباقہ اور یورق کی کوشش رہتی تھی کہ ان کا بسیرا بھی منگول قافلے کے نزدیک ہی کہیں ہو' لیکن اس رات انہیں کامیابی نہیں ہوئی۔ جس سرائے میں وہ ٹھہرے وہ قصبے کے ایک سرے پر تھی۔ تاہم وہ اندھیرا پڑنے کے بعد منگول سفیر کے گھر کے گرد منڈلاتے رہے۔ ایک کھلے میدان میں منگول سفارت کاروں کے کھانے کا انتظام کیا گیا تھا۔ بڑی بڑی مشعلوں کے دائرے میں زمین پر دریاں بچھی تھیں۔ کھلے برتنوں میں بھیڑوں کا گوشت ابالا گیا تھا۔ تازہ دودھ' شہد اور مشروبات کا بھی مقدور بھر انتظام کیا گیا تھا۔ قصبے والے جانتے تھے منگول یہاں کے فاتح ہیں اور انہیں ناراض کرنا خود کو مصیبت میں ڈالنا ہے۔ کھانا ابھی شروع نہیں ہوا تھا۔ اباقہ اور یورق ایک تاریک گوشے میں دوسرے لوگوں کے درمیان کھڑے منگول مہمانوں کا جائزہ لے رہے تھے۔ سرخ ٹوپی والا ایک موٹا منگول ساتھیوں کے درمیان بیٹھا تھا۔ یہی اس سفارت کا سربراہ تھا۔ اباقہ اور یورق اپنے طویل تعاقب کے دوران اسے اچھی طرح پہچان چکے تھے۔ پھر اباقہ اور یورق نے دیکھا کہ لمبا قیمتی جبہ پہنے ایک ٹھگنا سا شخص مشعلوں کے دائرے میں داخل ہوا اور جھک کر منگول سفیر کو سلام کرنے لگا۔ سفیر نے اسے ہاتھ کے اشارے سے قریب بلا لیا۔ دونوں راز داری سے باتیں کرنے لگے۔ نووارد کے چہرے پر دبی دبی مسکراہٹ تھی۔ یورق نے اپنے قریب کھڑے ایک بوڑھے سے پوچھا۔

"محترم! یہ شخص کون ہے؟"

بوڑھے کے جواب نے اباقہ اور یورق کے خیال کی تائید کر دی۔ اس نے یورق کو دیکھے بغیر کہا۔ "بھائی! یہ سوداگر ہے۔ کل جو شامی قافلہ آیا ہے اس میں شامل ہے۔" اس کا مطلب تھا کہ ایک شامی قافلہ بھی قصبے میں موجود تھا۔ یقیناً یہ وہی قافلہ تھا جو ماریتا کو یہاں تک لایا تھا۔ اباقہ اور یورق کے دل شدت سے دھڑکنے لگے۔ خوارزم کی سرحد پار کرنے کے بعد سے وہ جس بے چینی کا شکار تھے وہ آج نقطہ عروج کو پہنچ چکی تھی۔ ماریتا اس قصبے میں کہیں موجود تھی اور شامی سوداگر اسے منگول سفیر کے حوالے کرنے والا تھا۔ یورق نے اباقہ کا کندھا دبایا اور دونوں لوگوں کے درمیان سے نکل کر ایک علیحدہ کونے میں

چلے گئے۔

"کیا خیال ہے سردار؟" اباقہ نے بے قراری سے پوچھا۔

یورق بولا۔ "تم جو بھی کرو میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

اباقہ نے کہا۔ "سردار اس کا مطلب ہے تمہیں ماریتا کی زندگی اور موت سے کوئی سروکار نہیں۔"

"نہیں اباقہ۔" یورق سنجیدگی سے بولا۔ "یہ کبھی دل میں نہ لانا۔ تم سے اختلاف اپنی جگہ' لیکن اس محترم خاتون کی زندگی کی فکر مجھے تم سے کم نہیں ہے۔"

"تو پھر بتاؤ ہمیں کیا کرنا چاہئے؟" اباقہ نے سرگوشی میں پوچھا۔

"میرا خیال ہے ہمیں حالات کا رخ دیکھنا چاہئے۔ شامی تاجر کو نظر سے اوجھل ہونے دینا اب بہت بڑی حماقت ہوگی۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" اباقہ نے تائید کی۔

دونوں لاپرواہی سے چلتے ہوئے پھر لوگوں کے درمیان آکھڑے ہوئے۔ منگول سفیر اور اس کے ساتھی آستین چڑھا کر کھانے پر حملہ آور ہو چکے تھے۔ ان کا وحشیانہ انداز دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ شامی تاجر کے علاوہ مقامی قلعہ دار بھی کھانے میں شریک تھا۔ کافی دیر بعد منگولوں نے پانی کے کٹورے چڑھائے اور ڈکارنا شروع کیا۔ میزبانوں نے جھک جھک کر برتن اٹھانے شروع کر دیے۔ کسی قسم کی بات چیت یا اظہار تشکر کے بغیر منگول سفیر اٹھ کھڑا ہوا۔ شامی تاجر اس کے ساتھ تھا۔ تیز تیز چلتے وہ ایک جانب روانہ ہو گئے۔ قلعہ دار کے علاوہ پندرہ بیس منگول سپاہی بھی ہمراہ تھے۔

ایک مکان کے سامنے جا کر یہ قافلہ رک گیا۔ پھر شامی تاجر منگول سفیر کے ساتھ اندر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد دروازہ کھلا اور ایک انسانی ہیولا لڑکھڑاتا ہوا باہر گرا۔ اباقہ اور یورق کوئی بیس گز کے فاصلے پر دیہاتیوں کے ایک چھوٹے سے گروہ میں کھڑے تھے۔ مشعلوں کی مدھم روشنی میں اباقہ نے دیکھا۔ لڑکھڑا کر گرنے والا اور پھر اٹھنے والا ہیولا ماریتا کا تھا۔ وہ شمع کی لو کی طرح زرد اور کمزور دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے بال پشت پر بکھرے تھے۔ سیاہ رنگ کا ایک چولا اس نے پہن رکھا تھا۔ کھلے گریبان سے جھانکتا ہوا اس کا ایک کندھا بے کسی کے اس منظر کو گھمبیر تر بنا رہا تھا۔ ابھی وہ بمشکل اٹھی تھی کہ منگول سفیر کے دوسرے دھکے نے اسے پھر زمین بوس کر دیا۔ وہ دوسرے منگولوں کے قدموں میں جا گری۔ اباقہ کے جسم میں تشنج کی کیفیت پیدا ہوئی' لیکن اس سے پہلے کہ وہ سراپا قہر بن کر اپنی جگہ سے حرکت کرتا یورق نے مضبوطی سے اس کا بازو تھام لیا۔

"نہیں اباقہ' ابھی نہیں۔" وہ سرگوشی میں بولا۔

ماریتا کو اب منگول سفیر کے ساتھیوں نے تھام لیا تھا۔ وہ اسے دھکیل دھکیل کر آگے بڑھا رہے تھے۔ پھر وہ اباقہ اور یورق کے بالکل قریب سے گزرے۔ انہوں نے دیکھا کہ ماریتا کو دھکیلنے کے علاوہ کھینچا جا رہا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ ایک رسی سے بندھے تھے اور ایک منگول یہ رسی کھینچ رہا تھا۔ ماریتا اب ایک کمزور سی مزاحمت کے سوا اور کچھ نہیں کر پا رہی تھی۔ اردگرد کھڑے لوگ سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ کوئی بدکردار منگول عورت ہے جسے گرفتار کر کے واپس قراقرم لے جایا جا رہا ہے۔ ماریتا کی یہ بے بسی اباقہ کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ اس کا جسم ایک بار پھر متحرک ہوا' لیکن یورق جانتا تھا اس وقت جوش میں اٹھایا گیا کوئی قدم ان تینوں کی تباہی کا باعث بن جائے گا۔ اس نے اباقہ کا ہاتھ پکڑا اور کھینچتا ہوا ماریتا سے دور لے گیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد وہ سرائے میں بیٹھا اباقہ کو سمجھا رہا تھا۔ "دیکھو اباقہ! جو کام ہم آسانی سے کر سکتے ہیں۔ اس کے لیے اتنا بڑا خطرہ مول کیوں لیں۔ کل کسی وقت منگول سفارت کار کو یہاں سے روانہ ہو جانا ہے۔ یہاں سے صرف ڈیڑھ دن کی مسافت پر پہاڑیوں کے سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اس سلسلے میں ہم ماریتا کو چھڑانے کی ایک کامیاب کوشش کر سکتے ہیں .... کیا خیال ہے تمہارا۔"

اباقہ کو یورق کی بات سمجھ آ رہی تھی۔ وہ خود بھی دیکھ رہا تھا کہ قصبے میں منگول فوجی بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ واقعی کل یا پرسوں کسی وقت وہ آسانی سے ماریتا کو چھڑا سکتے تھے۔ اباقہ کو اپنی تو پرواہ نہیں تھی لیکن کشمکش کے دوران اگر ماریتا کو کوئی نقصان پہنچ جاتا تو اباقہ خود کو کبھی معاف نہ کر سکتا۔ سوچ بچار کے بعد دونوں نے منگول قافلے کی روانگی کی تیاری کرنے کا فیصلہ کیا۔

اگلے روز صبح سویرے اباقہ اور یورق روانگی کی تیاری کرنے لگے' لیکن سورج طلوع ہوتے ہوتے گہرے بادل چھا گئے اور بارش شروع ہو گئی۔ دوپہر تک بارش کا زور اور بڑھ گیا۔ منگول قافلے کی روانگی رک گئی .... طوفانی بارش اور سرد ہواؤں کا یہ سلسلہ مسلسل دو دن جاری رہا۔ اباقہ اور یورق دو گمنام مسافروں کی طرح سرائے میں مطلع صاف ہونے کے منتظر رہے۔ آخر تیسرے روز موسم کچھ بہتر ہوا۔ دوپہر سے کچھ پہلے اباقہ نے یورق کو سرائے میں آکر بتایا کہ قافلہ جانے کے لیے تیار ہے۔ اس کے چہرے پر دبا دبا جوش نظر آ رہا تھا۔ دونوں جلدی جلدی اپنا سامان باندھنے لگے۔

تعاقب کا سلسلہ ایک بار پھر شروع ہو چکا تھا' لیکن اس مرتبہ وہ دونوں زیادہ پُرامید

تھے۔ شکوک و شبہات ختم ہو چکے تھے۔ تعاقب کا مقصد بالکل واضح تھا۔ مارینا منگول قافلے میں موجود تھی اور انہیں سمرقند پہنچنے سے پہلے پہلے اسے رہا کرانا تھا۔ تعاقب شروع کرنے سے پہلے وہ مارینا کی موجودگی کا بھی طرح یقین کر چکے تھے۔ بعد میں بھی گاہے بگاہے انہیں اس کے سیاہ لبادے کی جھلک نظر آتی رہی تھی۔ منگول قافلہ تقریباً بیس افراد پر مشتمل تھا ان میں چودہ تو سفارتی نمائندے تھے اور پانچ مسلح سپاہی تھے۔ جو رسمی طور پر قافلے کے ساتھ تھے۔ بیسواں فرد مارینا تھی۔ اس کے ہوا میں اڑتے ہوئے بال دور سے نظر آرہے تھے۔ اباقہ اور یورق کا خیال تھا کہ گھوڑے پر بٹھا کر اس کے ہاتھ پشت پر باندھ دیے گئے ہیں۔ بادلوں میں آنکھ مچولی کھیلتے سورج کے نیچے سفر کا یہ سلسلہ شام تک جاری رہا۔ منگول قافلے نے ایک ٹیلے کے اوپر پڑاؤ ڈالا۔ اباقہ اور یورق قریباً دو فرلانگ دور کچھ درختوں کے نیچے رک گئے۔ یہاں سے وہ ٹیلے پر بآسانی نظر رکھ سکتے تھے' لیکن منگولوں کے لیے انہیں دیکھنا اتنا آسان نہیں تھا۔ خشک گوشت اور پنیر جو انہوں نے پچھلی بستی سے حاصل کیا تھا تھیلوں میں موجود تھا۔ پیٹ کی آگ بجھا کر وہ درختوں کے نیچے نیم دراز ہو گئے۔ اب سوچنے کی بات یہ تھی کہ مارینا کی بازیابی کے لیے کل تک انتظار کیا جائے یا آج رات ہی اسے چھڑانے کی کوشش کی جائے۔ سردار یورق کا خیال تھا کہ پڑاؤ بلندی پر ہے اوپر چڑھنے کی کوشش میں وہ منگول پہریداروں کی نگاہ میں آجائیں گے۔ اس نے کہا۔

"اباقہ' جہاں اتنا صبر کیا ہے۔ آج کی رات اور کرلو۔ کل منگول قافلہ جن پہاڑیوں میں داخل ہو گا وہاں پر اسے بھیڑوں کے گلے کی طرح گھیر لیں گے۔" تھوڑی سی بحث کے بعد یورق اسے قائل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اباقہ نے ایک سرد آہ بھری اور سفری تھیلا سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گیا۔ اس کی اداس آنکھیں بدستور ٹیلے کی طرف لگی تھیں۔ جہاں چند روشنیاں ٹمٹما کر اسے مارینا کے وجود کا احساس دلا رہی تھیں۔ دھیرے دھیرے اس کی پلکیں بوجھل ہوئیں اور وہ سو گیا۔

رات کا نہ جانے کون سے پہر تھا۔ اباقہ کی آنکھ کھل گئی۔ چاند دور مغرب میں جھکا ہوا تھا۔ ٹیلے پر روشنیاں بدستور ٹمٹما رہی تھیں۔ مارینا' اباقہ کے سینے سے سرگوشی برآمد ہوئی۔ وہ سوچنے لگا' مارینا اس سے چند سو قدم کے فاصلے پر بے کسی کی حالت میں پڑی ہے اور وہ اس کی مدد نہیں کر سکتا۔ یہ کیسا انتظار ہے۔ یہ کیسی احتیاط ہے .... یکایک وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ "نہیں اسے کوئی انتظار نہیں کرنا۔ اسے اسی وقت مارینا کے پاس پہنچنا ہے۔ اس کی نازک کلائیوں کو رسی کی سخت بندش سے آزاد کرنا ہے .... اس کی چوٹوں کو سہلانا ہے اور اس کے سامنے دشمنوں کو اس کے سامنے .... موت کی نیند سلاتا

ہے۔ اس نے کن انکھیوں سے سوئے ہوئے یورق کی طرف دیکھا اور تلوار لے کر بہ آہستگی آگے بڑھ گیا۔

ذرا ہی دیر بعد وہ پیدل ٹیلے کی طرف بڑھ رہا تھا اس کا چہرہ تن گیا تھا اور سانس کی آمد و رفت ہر لمحہ تیز ہو رہی تھی۔ ٹیلے کے دامن میں پہنچ کر وہ اوندھے منہ زمین پر لیٹ گیا۔ ڈوبتے چاند کی روشنی اس کی آمد کا راز فاش کر سکتی تھی' لیکن وہ ہر خطرہ مول لینے کو تیار ہو چکا تھا۔ "کل کسی نے نہیں دیکھا۔" اپنے مرحوم باپ کی آواز اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ ہاں کل کسی نے نہیں دیکھا۔ اس کا ذہن تائید کر رہا تھا۔ وہ زمین سے چپک گیا اور بے آواز ڈھلوان پر چڑھنے لگا۔ بالکل جیسے کوئی درندہ شکار پر جھپٹنے کے لیے اونچی اونچی گھاس میں رینگتا ہے۔ ٹیلے پر ایستادہ خیموں میں مکمل خاموشی تھی۔ شاید منگول شراب چڑھا کر مدہوش پڑے تھے۔ کوئی پہریدار بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ حالات اباقہ کے لیے ساز گار تھے۔ وہ ٹیلے پر چڑھا اور رینگتا ہوا ایک خیمے کی طرف بڑھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ چھوٹا خیمہ مارینا کے لیے ہو گا' لیکن جب اس نے خیمے کا کپڑا پھاڑ کر اندر جھانکا تو موم شمع کی روشنی میں چند منگول نظر آئے۔ وہ زمین پر بے سدھ پڑے تھے۔ اباقہ نے پیچھے ہٹنے کے لئے حرکت کی لیکن دفعتاً وہ چونک گیا۔ زمین پر پڑے افراد کا انداز کچھ عجیب طرح کا تھا۔ اباقہ کو ایک شک ہوا اور وہ خاموشی سے اندر رینگ گیا۔ اچانک اس کے ہاتھ کسی سیال شے سے ٹکرائے۔ اس نے اپنا ہاتھ دیکھا وہ خون تھا .... زمین پر پڑے چاروں منگول مر چکے تھے۔ ان چاروں کے نرخرے کٹے ہوئے تھے۔ اباقہ چند لمحے حیران کھڑا رہا۔ پھر احتیاط سے باہر نکلا اور دوسرے خیمے کی طرف بڑھا۔ اب عریاں تلوار اس کے ہاتھ میں تھی۔ خیمے کا پردہ ہٹا کر وہ اندر داخل ہوا۔ یہاں بھی پانچ منگول بے سدھ پڑے نظر آئے۔ اباقہ دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ ان میں سے ایک بھی زندہ نہیں۔ وہ تیزی سے تیسرے خیمے کی طرف بڑھا۔ یہاں پانچوں فوجی مردہ پڑے تھے۔ "مارینا!" اباقہ زور سے چلایا اور چوتھے خیمے کی طرف بڑھا۔ یہ بھی ایک چھوٹا خیمہ تھا۔ اباقہ نے اندر جھانکا خیمہ بالکل خالی تھا' لیکن اس کے ساتھ والے خیمے میں کٹی گردن والی چار لاشیں پڑی تھیں۔ اباقہ چکرا کر رہ گیا۔

"مارینا!" منہ پر دونوں ہاتھ رکھ کر اس نے ایک بار پھر آواز دی۔ یہ آواز رات کے سناٹے میں دور تک تیرتی چلی گئی۔ اچانک اباقہ کو محسوس ہوا کہ کہیں نزدیک ہی کسی نے چلانے کی کوشش کی ہے۔ یہ ایک مردانہ آواز تھی اور فوجیوں کے ساتھ والے خیمے سے آئی تھی۔ اباقہ تیزی سے خیمے کی طرف بھاگا۔ پردہ ہٹا کر اس نے اندر جھانکا پانچ لاشوں

میں سے ایک اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ اباقہ نے موم شمع پکڑی اور بیٹھنے والے شخص کا چہرہ دیکھنے لگا۔ یہ چوڑے جبڑوں والا ایک صحت مند منگول تھا۔ گردن کٹی ہوئی تھی لیکن شاید شہ رگ بچ گئی تھی۔ اس کے کندھے پر بھی ایک گہرا زخم تھا۔

"پانی!" مضروب کے ہونٹوں سے نکلا اور وہ تیورا کر ایک بار پھر زمین بوس ہو گیا۔ اباقہ نے خیمے میں لٹکی چھاگل سے اسے پانی پلایا۔ اس نے پی لیا۔ چربی دار گردن نے اس کی خوراک اور سانس کی نالیوں کو کٹنے سے محفوظ رکھا تھا' لیکن کندھے کا زخم سینے تک پھیلا ہوا تھا اور اس بات کی چغلی کھا رہا تھا کہ مضروب کی حالت نازک ہے۔ اباقہ نے اس سے پیش آنے والے واقعے کے بارے پوچھا۔ اس نے سب سے پہلے تو اباقہ سے وعدہ لیا کہ وہ اسے اس حالت میں چھوڑ کر نہیں جائے گا۔ اباقہ نے وعدہ کر لیا۔ منگول سفارتکار نے کراہتے ہوئے اٹک اٹک کر جو کچھ بتایا اس کا لب لباب یہ تھا۔

منگول سفارت کار کا سربراہ طوطم خان جی جان سے قیدی عورت (ماریتا) کا عاشق ہو گیا تھا' پہلے روز کے بعد اس کا رویہ بھی ماریتا سے بہت نرم ہو گیا تھا۔ اس نے حکم دیا تھا کہ ماریتا کا ہر طرح خیال رکھا جائے اور اسے کسی طرح کی تکلیف نہ ہو' وہ بہت پریشان دکھائی دیتا تھا اور تین چار دن سے اندھا دھند شراب پی رہا تھا۔ رات اس نے ساتھیوں کو کھانے میں کوئی نشہ آور چیز ملا کر دے دی اور سوتے میں ہلاک کر دیا۔ زخمی منگول کو بھی وہ دوسروں کی طرح مردہ سمجھ کر چھوڑ گیا تھا لیکن قدرت نے اسے شاید اباقہ کے لیے زندہ رکھا تھا۔

منگول کی بات سے ظاہر تھا کہ سفیر طوطم خان ماریتا کو ساتھ لے کر کسی جانب نکل چکا ہے۔ اس نے زخمی منگول سے پوچھا۔ "کیا تم بتا سکتے ہو طوطم خان کس طرف گیا ہو گا۔"

زخمی نے بتایا۔ "مجھے اس بارے میں کچھ پتہ نہیں۔ ہاں جب وہ روانہ ہوا تو میں ہوش میں تھا۔ میں دیر تک ان کے گھوڑوں کی ٹاپیں سنتا رہا۔ مجھے یقین ہے وہ جنوب کی طرف گیا ہے۔"

اباقہ زخمی کے پاس سے اٹھا اور بھاگتا ہوا ٹیلے سے اترنے لگا۔ تقریباً ایک فرلانگ تک وہ بھاگتا چلا گیا۔ پھر ایک اونچی جگہ کھڑے ہو کر اس نے زور زور سے یورق کو آوازیں دیں۔ تھوڑی دیر بعد نشیب سے سردار یورق کی نیند میں ڈوبی ہوئی آواز آئی۔ "کیا بات ہے اباقہ؟"

"سردار! گھوڑے لے کر فوراً ٹیلے پر آجاؤ۔"

یورق کو اطلاع دے کر وہ بھاگم بھاگ ٹیلے پر واپس پہنچا۔ زخمی منگول کے مطابق طوطم خان کو روانہ ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔ وہ اس کا کھوج لگانے میں کامیاب ہو سکتے تھے۔ خیمے میں پہنچ کر اس نے منگول کے زخموں پر پٹی باندھی اس دوران سردار یورق بھی گھوڑوں سمیت پہنچ گیا۔ خیموں کے مناظر دیکھ کر وہ ششدر نظر آ رہا تھا۔ اباقہ نے اسے مختصر لفظوں میں یہاں کی صورت حال سے آگاہ کیا اور ماریتا کے بارے بتانے لگا۔ ماریتا کے بارے جان کر سردار یورق بھی پریشان ہو گیا۔ اس نے اباقہ کو خیمے سے باہر آنے کا اشارہ کیا۔ باہر آکر وہ بولا۔

"اباقہ اگر ہمیں ماریتا تک پہنچنا ہے تو جلدی کرنی ہو گی۔ اس نیم مردہ سفارتکار کو ہم کہاں گھسیٹتے پھریں گے۔"

اباقہ نے کہا۔ "نہیں سردار! میں اس سے وعدہ کر چکا ہوں۔ اب تو اسے لے جانا ہی پڑے گا۔"

یورق نے اباقہ کا اٹل ارادہ دیکھا تو بولا۔ "اچھا میں اس کے لیے گھوڑا لاتا ہوں۔"

سردار یورق پڑاؤ کے قریب بندھے ہوئے گھوڑوں کی طرف چلا گیا۔ اباقہ نے زخمی منگول کو احتیاط سے کندھے پر لادا اور باہر لے آیا' لیکن جس وقت دونوں زخمی کو گھوڑے پر سوار کرنے کی کوشش کر رہے تھے' اس کی طبیعت اچانک مزید بگڑ گئی۔ وہ بری طرح کراہنے لگا۔ اباقہ اور یورق نے اسے نیچے گھاس پر لٹا دیا۔ وہ لڑکھڑاتی زبان میں بولا۔

"بس .... میرے گناہوں کا سفر .... شاید ختم ہو گیا۔ میں تمہیں .... پہچان چکا ہوں .... تم اباقہ ہو اور تمہارا ساتھی .... سردار یورق ہے۔ تمہارا سلوک مجھے نیلے آسمان کے اس پار بھی .... یاد رہے گا۔ ایک بات .... سن جاؤ .... شاید کبھی تمہارے کام آئے۔"

جاں بلب منگول نے اباقہ کو کان قریب لانے کو کہا۔ اباقہ اس پر جھک گیا۔ منگول نے دھیمے لہجے میں کوئی بات کہی۔ پھر اس کی آنکھیں بند ہوئیں اور جسم لرز کر ساکت ہو گیا۔

"چلو سردار یورق!" اباقہ نے اپنے گھوڑے کی طرف لپکتے ہوئے کہا۔ چند ہی لمحے بعد دونوں طوفانی رفتار سے جنوب کی طرف بڑھ رہے تھے۔

☆ ☆

دور مشرق میں دکھائی دینے والا سورج اب کافی بلندی پر آ گیا تھا۔ یہ ایک میدانی علاقہ تھا اس لیے دور دور تک نگاہ دوڑائی جا سکتی تھی۔ وہ دونوں یہاں تک آندھی اور

طوفان کی طرح پہنچے تھے، لیکن اب ان کے گھوڑے درمیانی رفتار سے چل رہے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ گوہر مقصود انہیں ہاتھ آگیا تھا۔ قریباً دو فرلانگ کے فاصلے پر انہیں طوطم خان اور ماریتا نظر آرہے تھے۔ ماریتا کا سیاہ لبادہ اور کھلے بال اس بات کا یقین دلا رہے تھے کہ اباقہ کی جاں گسل بھاگ دوڑ بیکار نہیں گئی۔ اگر اباقہ اور یورق چاہتے تو تھوڑی سی کوشش کر کے ان تک پہنچ سکتے تھے لیکن سامنے ایک بستی کے آثار نظر آرہے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ طوطم خان سے ان کی مڈبھیڑ آبادی میں ہو۔ آبادی کے آگے پھر ویرانہ ہی ویرانہ تھا۔ وہ کسی بھی جگہ اسے گھیر سکتے تھے۔

بستی ذرا نشیب میں تھی۔ ایک راستہ آبادی کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہوا دوسری طرف نکل گیا تھا۔ اس راستے پر چہل پہل نظر آرہی تھی۔ طوطم خان اور ماریتا کے گھوڑے آبادی میں داخل ہوئے۔ یورق اور اباقہ ان پر مسلسل نظر رکھے ہوئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد گھوڑے بستی کے دوسری طرف نکل گئے۔ اب اباقہ اور یورق بستی کے درمیان تھے۔ یہ ایک چھوٹی سی بستی تھی لیکن اس راستے پر خاصی رونق تھی۔ یہ راستہ درحقیقت بستی کا اکلوتا بازار بھی تھا۔ دونوں طرف چھابڑی فروش آوازیں لگارہے تھے۔ سامان خورونوش اور دوسری اشیا سے لدے ہوئے خچر اور گدھے بھی جگہ جگہ کھڑے تھے۔ چند پھل فروش زمین پر دکانیں جمائے بیٹھے تھے۔ بازار کے عین درمیان ایک چھوٹا سا چوراہا تھا اور یہاں خاصا رش تھا۔ اباقہ اور یورق کے گھوڑے نہایت دھیمی رفتار سے چل رہے تھے۔ دفعتاً اباقہ کو ہجوم میں ایک شکل نظر آئی اور اس کا جسم سنسنا اٹھا۔ وہ منہ کھولے سکتے کے عالم میں ایک جانب دیکھے جارہا تھا۔ کچھ اسی قسم کی کیفیت ایک دفعہ سیف الدین کے گھر میں بھی اس پر طاری ہو چکی تھی۔ جب اس نے کھڑکی میں سے ہجوم پر نگاہ ڈالی تھی .... ہاں وہی چہرہ اسے پھر نظر آیا تھا۔ صرف ایک لمحے کے لیے اس کی بصارت کا ملاپ ایک خیرہ کن منظر سے ہوا تھا اور وہ زمین میں گڑا رہ گیا تھا۔ اس کی نگاہ دھوکا نہیں کھا سکتی تھی۔ وہ اباقہ تھا، اپنی طرف بڑھتے ہوئے تیر کی انی کو ہوا میں پرکھ سکتا تھا۔ اس نے ابھی ہجوم میں جو چہرہ دیکھا تھا وہ اسے پہچانتا تھا .... پھر جیسے وہ ایک دم ہوش میں آیا اور گھوڑے سے اتر کر اس چہرے کے پیچھے لپکا۔

"اباقہ .... اباقہ۔" یورق نے اسے زور سے پکارا اسے کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ ایکا ایکی اسے کیا ہو گیا ہے۔ اباقہ ہجوم کو چیرتا ہوا ایک طرف بڑھ رہا تھا۔ کئی راہ گیر اس کا دھکا لگنے سے گرے۔ ایک شہد فروش کا مرتبان ٹوٹا۔ ایک شیر فروش کی گدھی بدکی۔ ایک سبزی بیچنے والے کا خوانچہ الٹ گیا۔ اباقہ دیوانگی کے عالم میں اس شخص کو

ڈھونڈ رہا تھا۔ چوراہے سے دائیں طرف جانے والے راستے پر وہ قریباً ایک فرلانگ تک اسی طرح بڑھتا چلا گیا۔ آخر بستی کے آخری سرے پر اسے ایک شخص گھوڑے پر سوار ہوتا دکھائی دیا۔

"سلطان!" اباقہ کی زوردار آواز جیسے پوری بستی میں گونج گئی۔ گھڑ سوار نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ وہ اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا چکا تھا۔ اباقہ برہنہ پا تیزی سے گھوڑے کی طرف بھاگا۔ کوئی دو سو گز آگے جا کر اس نے گھوڑے کو جالیا۔ تیزی سے آگے بڑھ کر اس نے لگام تھام لی۔ پھر اس کی نگاہیں گھڑ سوار کی طرف اٹھیں۔ اس کے سامنے بوسیدہ لباس والا ایک خستہ حال شخص بیٹھا تھا .... لیکن اس کا چہرہ خدا کی پناہ۔ ایسا رعب و دبدبہ تھا اس صورت میں کہ اباقہ کی پلکیں لرزنے لگیں۔ جیسے چودھویں کا چاند گرد آلود بادلوں سے جھانکتا ہے اس شخص کا چہرہ بوسیدہ عمامے سے جھلک رہا تھا۔ ان آنکھوں میں ایک سحر پوشیدہ تھا، کوئی راز ان پتلیوں میں کروٹیں لے رہا تھا۔ وہ ایک ٹک اباقہ کو دیکھ رہا تھا۔ اباقہ نے لرزاں آواز میں کہا۔

"میں آگیا ہوں سلطان ...."

دو خشک لب ہلے اور ایک گھمبیر و پُرسکون آواز نے کہا۔ "تو کون ہے نوجوان اور کسے سلطان کہہ کر پکار رہا ہے۔"

اباقہ اسی جذباتی لہجے میں بولا۔ "آپ کے سوا میرے سامنے اور کون ہے آقا۔ میں آپ ہی کو سلطان کہہ رہا ہوں۔"

وہی ٹھہری ہوئی بارعب آواز پھر ابھری۔ "تجھے کوئی غلط فہمی ہوئی ہے نوجوان۔ پیچھے ہٹ۔ میرا راستہ کھوٹا نہ کر۔"

"نہیں سلطان جلال الدین۔" اباقہ نفی میں سر ہلا کر عزم سے بولا۔ "میں نے ملک ملک آپ کو تلاش کیا ہے۔ مہینوں آپ کی جستجو میں سرگرداں رہا ہوں .... اب میری موت ہی مجھے آپ سے جدا کر سکتی ہے۔"

اس مکالمے کے دوران بہت سے لوگ اباقہ اور گھڑ سوار کے گرد اکٹھے ہو چکے تھے۔ ان میں یورق بھی تھا اور وہ غریب چھابڑی فروش بھی جن کا اباقہ نے نقصان کیا تھا۔ گھڑ سوار کی تحکمانہ آواز گونجی۔

"میں سلطان جلال الدین نہیں، ایک عام شخص ہوں اور میری تجھ سے کوئی شناسائی نہیں .... چل پیچھے ہٹ۔" اس کے ساتھ ہی گھڑ سوار نے ایک جھٹکے سے لگام چھڑائی اور نہایت عجلت کے عالم میں آگے بڑھ گیا۔ اباقہ کی نگاہیں ایک لمحے کے لیے بھی اس کے

گھوڑے سے جدا نہیں ہوئیں۔ یورق آگے بڑھ کر بولا۔

"اباقہ! یہ کیا بیوقوفی ہے۔ تم اس بدحال شخص کو سلطان جلال الدین کہہ رہے ہو اور اس کی ٹانگوں سے لپٹ رہے ہو .... اور اُدھر وہ حرامی طوطم خان نکلا جا رہا ہے۔"

اباقہ جیسے ایک دم ہوش میں آیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے چہرے پر بے پناہ تذبذب امڈ آیا۔ تقدیر نے اسے کیسے دوراہے پر کھڑا کر دیا تھا۔ اس کی زندگی کی دو عزیز ترین ہستیاں دو مختلف راستوں پر محوِ سفر تھیں۔ وہ ان میں سے صرف ایک کے پیچھے جا سکتا تھا .... مارینا یا سلطان جلال الدین۔ فیصلہ نہایت سنگین تھا اور بہت جلد کرنا تھا۔ گزرنے والا ہر لمحہ اپنا خراج مانگ رہا تھا۔ یورق کو مارینا کے پیچھے بھیجنے سے کچھ حاصل ہونے والا نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا یورق اگر مارینا کو قتل نہیں کرے گا تو اسے واپس بھی نہیں لائے گا۔ یہ تو بھیڑیے کو بھیڑوں کی رکھوالی سونپنے والی بات تھی .... اس کا مطلب تھا اسے مارینا اور سلطان جلال الدین سے ایک کا انتخاب کرنا تھا' لیکن کیا واقعی وہ سلطان جلال الدین تھا۔ اس بات کا اس کے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا۔ بس خواب میں دیکھا ہوا ایک دھندلا چہرہ تھا اور ایک وجدانی یقین۔ ایک آواز سی اس کے دل سے اٹھ کر اسے گھڑسوار کے پیچھے چلنے کا اذن دے رہی تھی۔ اباقہ نے ایک نظر جنوب مشرق کی طرف دیکھا اور پھر نگاہیں جنوب کی طرف لگا دیں۔ گھڑسوار کی اڑائی ہوئی دھول ایک روشن مینار کی طرح اس کے سامنے تھی۔ پھر اس نے ایک طویل سانس لی اور سردار یورق سے بولا۔

"ہم گھڑسوار کے پیچھے جائیں گے سردار۔"

اس کا اٹل لہجہ سردار یورق کو بتا رہا تھا کہ اس فیصلے میں تبدیلی کی کوئی گنجائش نہیں۔ سردار یورق کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ وہ تو خود بھی اسے چغتائی خاں کی بیٹی سے دور رکھنا چاہتا تھا' لیکن یونہی رسمی طور اس نے کہا۔

"اباقہ .... لیکن مارینا۔"

اباقہ کے ہونٹ کپکپائے لیکن اس نے کچھ کہا نہیں۔ بس یورق کے ہاتھ سے اپنا گھوڑے کی لگام تھامی اور چھلانگ لگا کر سوار ہو گیا۔

جن لوگوں کا نقصان ہوا تھا وہ بے تاب ہو کر گھوڑے کے آگے کھڑے ہو گئے۔ سردار یورق نے گھن گرج کے ساتھ انہیں ڈانٹا۔ منگولوں کا خوف یہاں کے باشندوں پر آسیب کی طرح سوار تھا۔ یورق کے ڈانٹنے پر تقاضہ کرنے والے سہم کر پیچھے ہٹ گئے لیکن اباقہ نے گھوڑے کو ایڑ لگانے سے پہلے صدری میں ہاتھ ڈالا اور اشرفیوں کی ایک تھیلی ان کی طرف اچھال دی۔

بہت جلد وہ دونوں گھڑسوار تک پہنچ گئے۔ اس کی اڑائی ہوئی خاک میں وہ اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگے .... سہ پہر تک یہ سفر جاری رہا۔ گھڑسوار نے ایک دو بار مڑ کر دیکھا اور انہیں عقب میں پا کر بھی لاتعلقی اختیار کئے رکھی۔ آخر وہ چند درختوں کے نیچے رکا۔ اس نے ایک چشمے سے وضو کیا اور سائے میں نماز پڑھنے لگا۔ اباقہ اور یورق گھوڑے سے اتر کر سرسبز گھاس پر بیٹھ گئے۔ گھوڑے سبزے پر منہ مارنے لگے۔ اپنے اپنے تھیلوں سے انہوں نے کھانا کھایا اور تین افراد کا یہ انوکھا قافلہ پھر اسی صورت روانہ ہو گیا۔ یورق نے کھانے کے دوران عمامہ پوش شخص سے بات کرنا چاہی تھی لیکن اس کا رعب و دبدبہ دیکھ کر اسے ہمت نہیں پڑی تھی۔ شاید اباقہ کی بھی یہی کیفیت تھی۔

رات کو انہوں نے ایک ویرانے میں بسیرا کیا۔ خشک لکڑیوں کے دو چھوٹے چھوٹے الاؤ جلا کر وہ دو مختلف جگہوں پر سو رہے اور جنگل میں کہیں کسی شیر کی دھاڑیں سنائی دے رہی تھیں۔ سر پر تاروں بھرا آسمان تھا اور نیند اباقہ کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی' وہ سوچ رہا تھا شاید مارینا سے وہ ہمیشہ کے لیے جدا ہو گیا ہے۔ ایک مجبور عورت ایک طاقتور مرد کا کہاں تک مقابلہ کر سکتی ہے۔ وہ مر جائے گی' ماری جائے گی یا کسی گمنام گوشے میں پڑی ہمیشہ ہوس کی غلامی کرتی رہے گی۔ اباقہ کے لیے یہ ایک اذیت ناک احساس تھا لیکن اس سے بڑا اذیت ناک احساس ایک اور تھا اور وہ تھا عمامہ پوش کی بے اعتنائی۔ جس شخص کے لیے اس نے در در کی خاک چھانی تھی وہ قریب ہو کر بھی اس سے بہت دور تھا۔ اباقہ دو اذیتوں کے درمیان ایک گھائل پرندے کی طرح پھڑپھڑا رہا تھا۔

انسانوں کی دنیا میں آنے سے پہلے اسے صرف جسمانی تکلیف سے شناسائی تھی اور اس کا علاج وہ اپنے باپ کی ہدایت پر خود رو جڑی بوٹیوں سے کیا کرتا تھا' لیکن انسانوں میں قدم رکھنے کے بعد وہ درد کی ایک نئی قسم سے آشنا ہوا تھا۔ یہ بھوک کا درد نہیں تھا جو کوہ الطائی کے ویرانوں میں بھٹکتے ہوئے اس کے پیٹ میں اٹھتا تھا۔ سردی کا درد بھی نہیں تھا جو برف باری کے دوران اس کے ہاتھوں اور پاؤں کی انگلیوں میں گھس جایا کرتا تھا۔ زخموں کا درد بھی نہیں تھا جو کسی ریچھ یا بھیڑیئے سے لڑنے کے بعد اس کے جسم پر آتے تھے۔ یہ تو سینے کا درد تھا بے نام و نشان۔ سب سے پہلے یہ درد مارینا کو دیکھ کر جاگا تھا۔ سلطان جلال الدین کی محبت اور تلاش نے اسے فزوں تر کر دیا تھا۔ اس نے اپنی نگاہیں عمامہ پوش کے ہیولے پر جمائیں .... اور زیر لب مارینا مارینا پکارنے لگا۔ جانے کتنی دیر بعد اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہونا شروع ہوئیں .... شیر کی دھاڑ اب کہیں دور چلی گئی تھی۔

وہ ساری رات خواب اور بے خوابی کے درمیان بھٹکتا رہا۔ نامعلوم کون سا پہر تھا جب اس نے عمامہ پوش کے ہیولے میں حرکت دیکھی۔ وہ بہ آہستگی اٹھا اور وضو کر کے نماز پڑھنے لگا۔ پھر اس نے اپنا بستر لپیٹا اور دھیمے قدموں سے چلتا ہوا گھوڑے تک جا پہنچا۔ چند ہی لمحے بعد وہ گھوڑے کو لگام سے تھامے درختوں سے باہر نکل رہا تھا۔ اباقہ جو اب تک دم روکے پڑا تھا اٹھا اور جھنجھوڑ کر یورق کو جگا دیا۔ دونوں نے بستر لپیٹے اور انہیں گھوڑوں سے باندھ کر عجلت میں عمامہ پوش کے پیچھے چل دیے۔

دور آسمان پر ہلکی سی سفیدی نظر آ رہی تھی لیکن صبح کا اجالا ابھی بہت دور تھا۔ چند سو گز آگے جا کر عمامہ پوش نے مڑ کر دیکھا اور ان دونوں کو عقب میں پا کر گھوڑا روک لیا۔ پھر وہ رخ موڑ کر ان کے پاس پہنچا اور تندی سے بولا۔

"میں تمہیں کہہ چکا ہوں کہ میں سلطان جلال الدین نہیں ہو سکتا ہے میری شکل سلطان سے ملتی ہے۔ تم لوگ خواہ مخواہ اپنا وقت ضائع کر رہے ہو۔"

اباقہ کے لہجے میں اب ایک والہانہ خودسری عود کر آئی تھی۔ اس نے اٹل لہجے میں کہا۔ "نہیں سلطان، یا میں آپ کے ہاتھوں مارا جاؤں گا۔ یا دنیا کے آخری کنارے تک آپ کا تعاقب کروں گا۔"

عمامہ پوش نے اس لہجے پر چونک کر اباقہ کی طرف دیکھا۔ وہ ملگجے اندھیرے میں کسی تاریک چٹان کی طرح کھڑا تھا۔ اس کے لمبے بال نسیم سحری میں جھول رہے تھے اور صرف یہی ایک حرکت تھی جو اس کے جسم سے وابستہ تھی۔ ایک گمبھیر خاموشی ان تینوں کے درمیان حائل تھی۔ اس خاموشی کو ایک گھوڑے کی زوردار ہنہناہٹ نے توڑا۔ گھوڑے کی آواز سن کر اباقہ ایک دم چونک گیا۔ اس نے دیکھا کہ باقی گھوڑوں کے کان بھی عجیب انداز میں حرکت کر رہے ہیں۔ پھر قریبی درختوں سے لاتعداد چھوٹے بڑے پرندے فرانے سے اڑ گئے۔ گھنے جنگل کی طرف ایک لکڑبگا زور سے چلایا۔ اباقہ کا گھوڑا بے چینی سے اپنے اگلے سم زمین پر مار رہا تھا۔ اباقہ کے نتھنے غیر محسوس طور پر پھول گئے۔ اس کی حس شامہ پوری طرح بیدار ہو گئی تھی۔ پھر اسے ماحول میں اس تبدیلی کی وجہ سمجھ میں آئی۔ کوئی پانچ گز دائیں طرف جھاڑیوں میں دو روشن نقطے دکھائی دے رہے تھے۔ اباقہ کے کانوں میں وہ دھاڑیں گونجنے لگیں جو وہ رات بھر سنتا رہا تھا۔ اسے اب کوئی شک نہیں تھا کہ ان سے چند گز کے فاصلے پر کوئی خونی درندہ کھڑا ہے لیکن پھر اس سے پہلے کہ اباقہ اپنے ساتھیوں کو خطرے سے آگاہ کرتا، جھاڑیوں میں چمکنے والے نقطے متحرک ہوئے اور ایک پرچھائیں سی فضا میں بلند ہو کر ان کی طرف آئی۔

"سلطان!" اباقہ کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ پرچھائیں عمامہ پوش کے اوپر گری۔ عمامہ پوش اور پرچھائیں اوپر تلے نیچے گرے۔ اباقہ نے گھوڑے کی ڈری ہوئی آواز اور یورق کی چیخ ایک ساتھ سنی۔ پھر اسے شیر کی خوفناک دھاڑ سنائی دی۔ چند قدم کے فاصلے پر شیر اور عمامہ پوش ایک دوسرے سے گتھم گتھا تھے۔ ایک میکانکی عمل کے تحت اباقہ کے پاؤں گھوڑے کی پشت پر آئے۔ وہ وہاں سے اچھلا اور فضا میں اڑتا ہوا درندے کے اوپر گرا۔ اس نے اپنے بازوؤں کے نیچے ایک بالوں بھرا بدبودار اور متحرک جسم محسوس کیا۔ اس کے آہنی بازو دیوانگی کے عالم میں درندے کی کمر سے لپٹے اور ایک وحشیانہ جھٹکے سے اٹھا کر زمین پر پٹخ دیا۔ شیر غضب میں غرایا اور عمامہ پوش کو چھوڑ کر اباقہ سے لپٹ گیا۔ اباقہ کی چھاتی میں انگارے سے اتر گئے۔ درندے کا بدبودار گرم سانس اس کے منہ سے ٹکرایا۔ اس کے گلے سے برآمد ہونے والی ہیبت ناک آواز اباقہ نے سنی اور پھر ان کے درمیان ایک زبردست جنگ چھڑ گئی۔ تیزی سے قلابازیاں کھاتے ہوئے دونوں نشیب کی طرف گئے اور ایک کھائی میں گر گئے۔

اباقہ کو تلوار یا خنجر نکالنے کی مہلت ہی نہیں ملی تھی۔ وہ خالی ہاتھ اپنا دفاع کر رہا تھا۔ شیر کے دونوں اگلے پنجے اباقہ کے ہاتھوں میں تھے۔ وہ اپنی گردن اس کے خونی جبڑوں سے بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ جانتا تھا جس لمحے شیر کا پنجہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اس کی زندگی کا آخری لمحہ ہو گا۔ اس نے شیر کے پنجے نہیں پکڑ رکھے تھے اپنی سانس کی ڈوری تھام رکھی تھی۔ کھائی کے اوپر اسے سردار یورق کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ اس نے عمامہ پوش کو چھلانگ لگا کر کھائی میں اترتے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں تلوار تھی چند ثانیے کشمکش رہی اور پھر یکدم شیر غرایا اور اباقہ نے محسوس کیا کہ اس کے بازو ڈھیلے پڑ گئے ہیں۔ تب شیر اپنے پہلو پر گرا اور بری طرح مچلنے لگا لیکن اباقہ نے اس کے بازو نہیں چھوڑے۔ کوئی گرم مائع نہایت سرعت سے اباقہ کی ٹانگوں کو بھگو رہا تھا۔ یہ درندے کا لہو تھا۔ عمامہ پوش نے تلوار کے بھرپور وار سے اس کا پیٹ پھاڑ دیا تھا۔ اباقہ جانتا تھا اس تنگ کھائی میں زخمی درندہ ان کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ اس لیے اس وقت تک اس کے پنجے نہیں چھوڑے جب تک وہ مچل مچل کر ساکت نہیں ہو گیا۔ اب سردار یورق بھی خوفزدہ گھوڑوں کو باندھ کر کھائی میں اتر چکا تھا۔ اس نے اپنے سامان میں سے شمع نکال کر جلائی تھی۔ وہ ایک جوان نر شیر تھا۔ اس کا طویل اور صحت مند جسم پتھروں پر ساکت پڑا تھا۔ اباقہ اسے دیکھنے کے لیے اپنی جگہ سے اٹھا اور لڑکھڑا کر گرا۔ تب اسے پہلی بار اندازہ ہوا کہ وہ بری طرح زخمی ہے۔ اس کے سینے کا گوشت ادھڑ

گیا تھا اور کھائی میں گرنے سے ایک ٹانگ بری طرح زخمی ہوئی تھی۔ یہ اباقہ تھا ورنہ جس بری طرح وہ درندے سے گتھم گتھا ہو کر بلندی سے گرا تھا اس کا زندہ بچنا محال تھا۔ عمامہ پوش اور یورق اسے سہارا دے کر کھائی سے باہر لائے' سینے کے زخموں سے مسلسل خون رس رہا تھا۔ عمامہ پوش نے اپنے ہاتھوں سے اس کی مرہم پٹی کی۔ زخم گہرے تھے لیکن اگر چند روز احتیاط کی جاتی تو تندرستی کی امید تھی۔ اب دن نکل آیا تھا۔ اباقہ ایک پتھر سے ٹیک لگائے نیم دراز تھا۔ یورق اس کے لیے کہیں سے بیر کی شکل کا ایک خوش ذائقہ جنگلی پھل ڈھونڈ لایا تھا اور اپنے ہاتھوں سے کھلا رہا تھا۔ ساتھ ساتھ وہ باتیں کر رہا تھا۔ "اباقہ تم خواب کی باتیں کر رہے ہو اور خواب ہمیشہ دھوکہ دیتے ہیں۔"

"نہیں سردار۔" اباقہ نے کمزور آواز میں کہا۔ "یہ میرے دل کی گواہی ہے کہ وہ سلطان جلال الدین ہیں۔"

دھیمے لہجے میں وہ کتنی ہی دیر باتیں کرتے رہے پھر اباقہ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ اچانک یورق کو آہٹ محسوس ہوئی اس نے مڑ کر دیکھا۔ عمامہ پوش گھوڑے پر سوار تھا۔ اس کی بارعب آواز گونجی۔

"میں جا رہا ہوں' تمہارے ساتھی کو آرام اور تیمارداری کی ضرورت ہے۔ میں یہ تھیلا یہیں چھوڑے جا رہا ہوں میرا خیال ہے یہ خوراک تمہارے لیے چار پانچ روز تک کافی ہو گی۔ اس کے بعد تمہارا ساتھی گھوڑے پر سفر کے قابل ہو جائے گا۔" سردار یورق نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے عمامہ پوش کو دیکھتا رہا۔ عمامہ پوش بولا۔ "تمہارا ساتھی میری جان بچانے کی کوشش میں زخمی ہوا ہے اور مجھے اس کا احساس ہے۔ زندگی دینے والی اللہ کی ذات ہے لیکن میں اس نوجوان کا بھی احسان مند ہوں۔"

عمامہ پوش نے یہ الفاظ کہے اور گھوڑے کو آگے بڑھا دیا۔ اباقہ نے آنکھیں کھول کر یہ منظر دیکھا۔ اس کے جبڑے بھینچ گئے۔ پھر ایک ناقابل یقین کوشش کے ساتھ وہ اٹھا اور پاؤں پر کھڑا ہو گیا۔ یورق اسے تھامتا ہی رہ گیا۔ اباقہ اس کا ہاتھ جھٹک کر لنگڑاتا ہوا گھوڑے کی طرف بڑھا اور رکاب پر پاؤں رکھ کر سوار ہو گیا۔ یورق کی آواز سن کر جب عمامہ پوش نے مڑ کر دیکھا تو اباقہ گھوڑے پر سوار تھا۔ اس کے سینے کی پٹی پر خون کے بڑے بڑے دھبے نمودار ہو رہے تھے اور گندمی چہرہ ہلدی کی طرح زرد تھا۔ عمامہ پوش حیران کھڑا تھا۔ اباقہ نے بلند آواز سے کہا۔

"سلطان۔ آپ پانچ روز بعد کہہ رہے ہیں میں اس وقت بھی گھوڑے پر بیٹھ سکتا ہوں۔"

سردار یورق دیکھ رہا تھا۔ اباقہ کے لہجے کی مخصوص ضد عود کر آئی ہے۔ اباقہ کی طبیعت میں ایک عجیب طرح کا اڑیل پن تھا' لیکن اس اڑیل پن یا ہٹ دھرمی میں ایک نہایت پیاری سی معصومیت بھی شامل رہتی تھی۔ یہی انداز تھا جس سے اس نے بالآخر ماریتا کو جیت لیا تھا اور وہ قراقرم سے اس کے ساتھ چلی آئی تھی۔ عمامہ پوش نے غیر یقینی نظروں سے اباقہ کی طرف دیکھا۔ اس کے زخموں کی حالت اسے جنبش کی اجازت بھی نہیں دیتی تھی لیکن وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر نہ صرف گھوڑے پر سوار ہو گیا تھا بلکہ اب تعاقب پر بھی آمادہ نظر آتا تھا۔ عمامہ پوش وہیں کھڑا غصے اور پریشانی کی ملی جلی کیفیت میں اس عجیب و غریب جنگلی کو دیکھتا رہا......... پھر اس نے لگامیں کھینچیں اور گھوڑے کو واپس موڑ لیا اباقہ کے سامنے پہنچ کر وہ بولا۔

"سچ بتا کون ہے تُو اور کیا چاہتا ہے؟"

اباقہ نے اسی بے لچک لہجے میں کہا۔ "میں آپ کا غلام ہوں اور غلامی چاہتا ہوں۔ جہاں جا رہے ہیں مجھے بھی لے جائیں۔ بس یہی میری آرزو ہے۔"

عمامہ پوش گھوڑے سے اتر آیا۔ اباقہ نے بھی پاؤں زمین پر اتارا۔ یورق نے جلدی سے بڑھ کر اسے سہارا دیا۔ تینوں ایک بار پھر درختوں کے نیچے آ بیٹھے۔

عمامہ پوش نے پوچھا۔ "تُو شادی شدہ ہے نوجوان؟"

"نہیں۔" اباقہ نے کراہتے ہوئے کہا۔ "میں اس دنیا میں تنہا ہوں اور اس تنہائی نے مجھے دلیر کر دیا ہے کیوں کہ میرے بعد آنسو بہانے والا کوئی نہیں۔ آپ بلا خوف مجھے ہر مقتل میں ساتھ رکھ سکتے ہیں۔"

"نہیں .... نہیں۔" عمامہ پوش نے نہایت کرب انگیز انداز میں اپنا سر دائیں بائیں ہلایا۔ "نہیں نوجوان' میں بہت خون پی چکا ہوں' بہت ماؤں کو بے اولاد اور بہت بچوں کو یتیم کر چکا ہوں۔ اب مجھ میں اور حوصلہ نہیں۔"

اباقہ نے کہا۔ "کیا کہہ رہے ہیں سلطان۔"

عمامہ پوش دھاڑا۔ "مت کہو مجھے سلطان۔ میں سلطان نہیں ہوں' ایک لٹیرا ہوں ایک قاتل ہوں۔ ان گنت گھروں میں نقب لگائی ہے میں نے' اور اس کے بدلے لاشیں دی ہیں' معذور اور اپاہج جوان دیے ہیں۔ بھوک' غریب الوطنی اور مایوسی دی ہے۔"

اباقہ نمناک آنکھوں سے اس بارعب اور رنجور چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ پھر ملتجیانہ لہجے میں بولا۔ "ایک بار .... صرف ایک بار تسلیم کر لیں سلطان! کہ آپ ہی جلال الدین ہیں پھر میں آپ کو آپ کی تمام باتوں کا جواب دوں گا۔"

عمامہ پوش نے ایک گہری سانس لی۔ ایک نظر نیلگوں آسمان کی طرف دیکھا اور بولا۔

"ہاں .... تیرے سامنے جو بے یارومددگار شخص بیٹھا ہے' جس کے پاس ڈھنگ کی تلوار بھی نہیں .... سلطان جلال الدین ہی ہے۔"

اباقہ ایک لمحہ ضائع کئے بغیر جھکا اور اپنا سر سلطان جلال الدین کے قدموں میں رکھ دیا۔ پھر اپنی اشک بار نگاہیں اٹھا کر بولا۔ "اے سلطان! مجھے اپنے ساتھ لے چل۔"

سلطان جلال الدین اپنی جگہ سے اٹھا اور چند قدم چل کر بولا۔ "نہیں نوجوان! اب مجھ میں مزید لاشیں دیکھنے کا حوصلہ نہیں۔ برسوں میں خوارزم کے طول و عرض سے چھوٹی چھوٹی فوجیں جمع کر کے جنگ کی بھٹی میں جھونکتا رہا ہوں۔ اسلام کی سربلندی کے دعوئی پر میں نے بہت سے سر لیے ہیں۔ بہت قربانیاں حاصل کی ہیں۔ نہیں اب نہیں' اب ایک لاش بھی نہیں۔ ایک شخص کی ایک انگلی بھی نہیں۔ میرا ظرف جواب دے چکا ہے۔"

اباقہ نے کہا۔ "سلطان! میں آپ کی ساری زندگی سے واقف ہوں۔ آپ نے قربانیاں لی نہیں دی ہیں۔ اپنا ملک آپ نے قربان کیا۔ اپنی زندگی کو کانٹوں میں گھسیٹا' اپنے نو عمر بھائی رکن الدین کی جان کا نذرانہ پیش کیا۔ اپنی سب سے قیمتی متاع اپنی محبوب بیوی نیرہ اور اکلوتے بچے قطب الدین کو بھی قربان کر دیا۔ آپ کی نصف عمر گھوڑے کی پیٹھ پر تلواروں کے سائے میں گزری ہے۔ آپ سے بڑا سرفروش اور کون ہو گا سلطان؟ میں بہت کچھ نہیں جانتا لیکن یہ مجھے بھی معلوم ہے کہ اسلام اور مسلمانوں پر آپ کے احسان ان گنت ہیں۔"

سلطان نے ایک پتھر پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "سوال یہ ہے میرے "احسانوں" سے امت مسلمہ کو کیا فائدہ پہنچا۔ کیا بستیاں جلنے سے بچ گئیں؟ کیا تاتاری سروں کے مینار تعمیر نہ کر سکے؟ کیا عورتیں منگولوں کی ہم بستر باندیاں نہ بنیں؟ یہ سب کچھ ہوا اور اب یہ سیلاب آگے بڑھ رہا ہے۔ آج ایران تاراج ہو رہا ہے۔ کل بغداد کی باری آنے والی ہے۔ یہ تاریخ وہاں بھی دوہرائی جائے گی .... ہاں وہاں بھی دوہرائی جائے گی۔"

یورق نے پہلی بار بولتے ہوئے کہا۔ "سلطان جلال الدین! مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ ہوا اور جو کچھ ہونے والا ہے اس کی ذرہ بھر ذمہ داری آپ پر نہیں اور یہ بات آپ کا کوئی مداح نہیں کہہ رہا۔ میں کہہ رہا ہوں۔ سردار یورق' آپ کا ایک منگول دشمن۔ میں دعوے سے کہتا ہوں کہ اگر آپ درمیان سے ہٹ گئے ہوتے تو بغداد اب تک خاک و خون میں لوٹ چکا ہوتا۔"

اباقہ خود کو گھسیٹتا ہوا ایک بار پھر سلطان کے قدموں میں آ بیٹھا۔ "ہم دونوں تمہارے

ساتھ جائیں گے سلطان۔"

سلطان جلال الدین نے کہا۔ "میری منزل بڑی کٹھن ہے نوجوان۔ وہاں آدمی جا سکتا ہے واپس نہیں آ سکتا۔ تم اسے موت کی منزل بھی کہہ سکتے ہو۔"

"موت کا نام نہ لو آقا۔ یہ زندگی تمہارے نام ہو چکی۔"

سلطان جلال الدین نے پریشان نظروں سے اباقہ کا چہرہ دیکھا۔ پھر بولا۔ "مجھے سوچنے دے .... مجھے سوچنے دے نوجوان۔"

☆------☆------☆

وہ ایک تاریک رات تھی۔ شیر کی کھال جو یورق نے بڑی مہارت سے اتاری تھی ایک درخت پر لٹک رہی تھی۔ "شیر خوارزم" پر حملہ کرنے والا شیر مقام عبرت پر تھا۔ آگ کا الاؤ جلا کر وہ تینوں قریب قریب بیٹھے تھے۔ شعلوں کا عکس سلطان جلال الدین کے چہرے کو شاہانہ آب و تاب دے رہا تھا۔ اس کی آنکھیں کسی گہری سوچ میں گم تھیں۔ پھر اس کے ہونٹوں کی حرکت نے اس سکوت کو توڑا' وہ بولا۔

"......... یہ میری آخری جنگ ہے' جو میں نے تنہا لڑنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ جنگ زرہ پوش منگولوں کے خلاف نہیں' بدباطن منافقوں کے خلاف ہے اور یہ معرکہ میدان کارزار میں نہیں ایک دور دراز جزیرے پر ہو گا۔ یہ جزیرہ اس وقت مسلم دشمنی کا سب سے بڑا گڑھ بن چکا ہے اور اگر اس پھوڑے کو تلف نہ کیا گیا تو آئندہ برسوں میں اس کا زہر امت مسلمہ کے رگ و پے میں اس طرح سرایت کر جائے گا کہ مسلمانوں کے جانبر ہونے کے تمام امکانات ختم ہو جائیں گے۔"

اباقہ اور یورق ہمہ تن گوش تھے۔ سلطان نے کہا۔ "اس جزیرے پر ایک خونخوار اور بدبودار جانور چھپا بیٹھا ہے .... ہاں میں اس شخص کو جانور ہی کہوں گا وہ ملعون آج سے پندرہ برس پہلے میرے خوف سے روپوش ہو گیا تھا۔ اس کا نام فیروز ہے اور وہ اس بدبخت غیاث الدین کا بھانجا ہے۔ ٹھہرو .... میرا خیال ہے تم غیاث الدین کے متعلق نہیں جانتے۔ غیاث الدین میرا سوتیلا بھائی تھا لیکن میں نے اسے کبھی سوتیلا نہیں جانا۔ میں اسے اپنا معتمد سمجھتا تھا' لیکن اس نے سانپ بن کر مجھے ڈسا۔ میرے جاں نثار سپہ سالار ملک نصرت کو قتل کر دیا۔ اس قتل نے میری پُرجوش فوج کی کمر توڑ کر رکھ دی لیکن افسوس میں نے غیاث الدین کو اس کے کئے کی سزا نہیں دی۔ عین اس وقت جب میں اسے قتل کرانے والا تھا اس کی ماں نے روتے ہوئے میرے پاؤں پکڑ لیے۔ میں نے ایک سانپ کو بخش دیا۔ اس سانپ نے موقعہ ملتے ہی دوسرا وار کیا اور یہ وار پہلے سے کہیں

زیادہ سنگین اور جان لیوا تھا۔ عین میدان جنگ میں جب منگول فوج کے ساتھ ایک فیصلہ کن معرکہ ہونے والا تھا اور چند کامیابیوں کے بعد ہمارے حوصلے بہت بلند تھے' غدار غیاث الدین میدان میں موجود نوے فیصد سپاہیوں کو لے کر علیحدہ ہو گیا۔ وہ کرمان پہنچا اور وہاں اپنے بھانجے فیروز کے ساتھ مل کر میرے خلاف گٹھ جوڑ کرنے لگا' لیکن قدرت نے اسے اس کے کیے کی سزا دی۔ اس کے میزبان یعنی حاکم کرمان نے ہی اسے اور اس کی والدہ کو قتل کر ڈالا .... تم میری طویل باتوں سے اکتا تو نہیں رہے؟"

"نہیں سلطان معظم۔" اباقہ جلدی سے بولا۔ "آپ کی باتیں ختم ہو جائیں گی لیکن ہمارے کان پھر بھی ترستے رہیں گے۔"

سلطان نے الاؤ کے شعلوں کو گھورا اور بولا۔ "جس وقت غیاث الدین جہنم واصل ہوا فیروز کرمان کے مشرق میں ایک چھوٹے سے شہر کا والی تھا۔ مجھے معلوم ہوا کہ اس کے پاس چنگیز خاں کے پیامبر آتے ہیں۔ میں نے اسے جواب طلبی کے لیے اپنے پاس بلایا لیکن اس نے میرے حکم کی کوئی پرواہ نہیں کی۔ مجبوراً مجھے اس کی سرکوبی کے لیے جانا پڑا۔ میری آمد کی اطلاع سن کر وہ اپنے محل سے فرار ہو گیا۔ شہر کے لوگوں سے معلوم ہوا کہ والئی شہر ایک بے دین اور سنکی نوجوان ہے۔ کچھ لوگ اسے بہت اچھا اور کچھ بہت برا کہتے تھے۔ اس نے اپنے والد کو جو اس کے برعکس ایک نہایت دین دار شخص تھا' گوشہ نشین کر رکھا تھا۔ میں اس کے باپ سے ملا۔ مجھے یاد ہے اس نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا تھا۔

"سلطان! میرے بیٹے کو قتل کر دو۔ میری بیوی نے بچے کے روپ میں ایک ابوجہل کو جنم دیا ہے۔ پیدائش کے بعد جب اس کے کان میں اذان کی آواز دی جا رہی تھی اس نے دونوں ہاتھوں سے کان ڈھانپ لیے تھے۔ اب وہ اسلام اور اسلامی شعائر کا برملا مذاق اڑاتا ہے اور اپنے دہریے پن پر فخر کرتا ہے لیکن مجھے اس کے دہریے پن سے خوف نہیں اس کی خداداد صلاحیتوں سے خوف ہے وہ بلا کا ذہین اور شاطر ہے۔ بے دین عناصر اس کے گرد ایسے اکٹھے ہوتے ہیں جیسے مقناطیس کے گرد لوہا چون۔ اس میں کوئی ایسی کشش ہے کہ ملنے والوں کو اپنا گرویدہ کر لیتا ہے۔ اگر وہ زندہ رہا تو عین ممکن ہے پیغمبری کا دعویٰ کر دے یا روحانی پیشوا بن بیٹھے۔"

میں نے بوڑھے باپ کی خواہش پوری کرنے کی بہت کوشش کی۔ کئی برس اس موذی کو تلاش کیا لیکن وہ نہیں ملا۔ پھر میں نے سوچا شاید وہ بھی کئی دوسرے وطن فروشوں کی طرح تاتاریوں سے جا ملا ہے۔ گردش روز و شب میں' میں اس بات کو فراموش کر گیا۔ وقت اپنی رفتار سے چلتا رہا۔ میدان جنگ کے ہنگاموں میں پندرہ برس گزر گئے۔

کچھ روز پہلے کی بات ہے میں بغداد میں تھا۔ دجلہ کے کنارے بیٹھا تھا کہ میں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ ایک نہایت حسین و جمیل عورت زرق برق لباس پہنے پالکی سے اتری اور گھنے درختوں کی طرف چل دی۔ رات کا وقت تھا اس تنہا جگہ عورت کا یوں گم ہو جانا مجھے کچھ عجیب سا لگا۔ میں پالکی والوں سے نظر بچا کر درختوں میں گیا۔ میں نے دیکھا کہ ایک کھلی جگہ پر حسین عورت ایک مرد کے ساتھ بیٹھی ہے۔ مرد ایک روشن چہرے والا اُدھیڑ عمر بزرگ تھا کسی مسجد کا امام یا دینی مدرسے کا استاد دکھائی دیتا تھا لیکن اس کی حالت بڑی عبرت انگیز ہو رہی تھی۔ وہ عورت کے دونوں ہاتھ تھامے منتیں سماجتیں کرنے میں مصروف تھا۔ اس کی باتوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اس عورت کی وجہ سے اس کی تمام عزت خاک میں مل چکی ہے۔ وہ اپنے حلقہ ارباب میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا۔ اب وہ عورت سے درخواست کر رہا تھا کہ وہ اس سے نکاح کر لے اور کسی دوسرے شہر نکل چلے۔ عورت ناز و انداز دکھانے میں مصروف تھی اور اپنی مجبوریوں کا تذکرہ کر رہی تھی۔ میں نے فوراً اندازہ لگا لیا کہ اس عورت نے جان بوجھ کر اس پیر کہنہ سال کو فریب دیا ہے۔ مجھ سے عورت کی یہ فریب کاری اور مرد کی ذلت برداشت نہ ہوئی۔ میں درختوں میں داخل ہوا اور اس عورت کو بالوں سے جکڑ لیا۔ اس وقت مجھے بالکل امید نہیں تھی کہ کوئی بہت بڑا انکشاف ہونے والا ہے .... لیکن یہ انکشاف ہوا۔

عورت سے پتہ چلا کہ وہ ایک رنڈی ہے اور اسے ایک مرد نے اس نیک شخص کو ورغلانے پر مجبور کیا تھا۔ نہ جانے کیوں میرا دل چاہا کہ اس شیطان صفت شخص سے ملوں۔ میں عورت کو لے کر اس شخص تک پہنچا۔ وہ شہر کے ایک متمول محلے میں رہتا تھا۔ وہ ایک فوجی درس گاہ کا بھگوڑا طالب علم تھا اور کسی سابقہ فوجی کا بیٹا تھا۔ میں نے تلوار کی نوک اس کی گردن پر رکھی تو وہ بے حد خوفزدہ ہو گیا۔ اس نے مجھے کچھ ایسی باتیں بتا دیں جن کی مجھے قطعاً توقع نہیں تھی۔ اس نے بتایا کہ کچھ عرصہ پہلے وہ روزگار کی تلاش میں مشرقی ایران گیا تھا۔ وہاں اُس کی ملاقات لٹیروں سے ایک گروہ سے ہو گئی۔ وہ اسے ہرات کے راستے غزنی لے گئے۔ غزنی کے نواحی جنگلوں میں ایک خطرناک عورت نے اپنی خود مختار ریاست قائم کر رکھی ہے۔ وہاں اردگرد کے ممالک سے بھاگے ہوئے بڑے بڑے قاتل اور لٹیرے جمع ہیں۔ مختلف حکومتوں کے باغی بھی اس گروہ میں شامل ہیں۔ یہ گروہ اس عورت کو اپنی ملکہ تسلیم کرتا ہے۔ افغان حکومت بھی ان گھنے جنگلوں میں گھس کر اس عورت کی سرکوبی کی ہمت نہیں رکھتی۔

سابق فوجی کے بیٹے نے بتایا' مجھے اس عورت کے سامنے پیش کیا گیا اور کچھ امتحانوں

سے گزرنے کے بعد میں ان کے گروہ میں شامل ہو گیا۔ وہاں مجھے معلوم ہوا کہ یہ عورت دراصل ایک ایسے روحانی پیشوا کی پیروکار ہے جو خلیج فارس کے کسی جزیرے میں رہتا ہے اور پُراسرار قوتوں کا مالک ہے' میں کافی عرصہ ان کے گروہ میں رہا۔ آخر ایک روز عورت نے ایک مہم میرے سپرد کر کے مجھ واپس بغداد بھیج دیا۔ مجھے چار افراد کے نام دیے گئے۔ یہ چاروں بغداد کے اہم علماء تھے ان میں سے تین ایسے تھے جن کی میں نے کردار کشی کرنی تھی یا قتل کر دینا تھا اور چوتھا ایسا تھا جس کے ساتھ مجھے ہر طرح کے تعاون کی ہدایت کی گئی تھی ...."

نوجوان کی باتوں سے مجھے معلوم ہوا کہ وہ ان علماء میں سے ایک کو قتل کر چکا تھا اور دوسرے کو ورغلانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

بہت جلد مجھے معلوم ہو گیا کہ یہ کوئی بہت گہری سازش ہے۔ وہ تینوں حضرات جنہیں قتل کرنے کی ہدایت کی گئی تھی فرقہ وارانہ یک جہتی اور اسلامی اتحاد کے پیامبر تھے اور اپنے اپنے حلقوں میں انہیں بڑی توجہ اور احترام سے سنا جاتا تھا۔ چوتھا شخص جس کے ساتھ نوجوان کو پس پردہ تعاون کی ہدایت کی گئی تھی کٹر فرقہ پرست تھا اور اپنی شعلہ بیانی کی وجہ سے مشہور تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ کسی دور دراز مقام پر کوئی ایسا شخص مصروف عمل ہے جو مسلمانوں کے اتحاد اور سلامتی کا ازلی دشمن ہے۔ "روحانی پیشوا" کا لفظ میرے کانوں میں ایک بھولی بسری بازگشت جگا رہا تھا۔ میں نے اس بے رحم قاتل کو جہنم واصل کرنے سے پہلے اس روحانی پیشوا کا نام پوچھا۔ اس نے کہا کہ کوئی بھی اس کا نام نہیں جانتا۔ اتنا کہا جاتا ہے کہ درویشی سے پہلے وہ مغربی ایران کے کسی شہر کا والی تھا ....
مجھے یقین ہو چکا تھا کہ فارس کے کسی جزیرے میں بیٹھا ہوا ملعون وہی نوجوان ہے جو آج سے پندرہ سال پہلے میری تلوار سے بچ نکلا تھا۔"

اباقہ اور یورق خاموشی سے سلطان جلال الدین کی باتیں سن رہے تھے' اس کے خاموش ہونے پر اباقہ بولا۔ "سلطان معظم وہ جو کوئی بھی ہے اسلام کا دشمن ہے۔ اسے انجام تک پہنچانا ہمارا فرض ہے۔"

"ہاں اب یہی ایک فرض ہے۔" جلال الدین نے طویل سانس لے کر کہا۔ "چنگیز' چغتائی' اوغدائی سارے مل کر بھی عالم اسلام کو اتنا نقصان نہیں پہنچا سکتے جتنا وہ تنہا پہنچا رہا ہے۔ وہ چراغ چھین کر ہمیں عمیق گڑھوں کی طرف دھکیل رہا ہے۔ وہ امت مسلمہ کی رگوں سے خون کھینچ کر زہر بھر رہا ہے۔ خدا کی قسم وہ نہایت خاموشی سے ہمیں ہلاک کر رہا ہے۔"

اباقہ بولا۔ "اس مردود تک پہنچنے کا طریقہ کیا ہے سلطان؟"

سلطان کی کشادہ پیشانی پر بل نمودار ہوئے۔ "اس تک پہنچنے کے لیے پہلے اس عورت سے ملنا ہو گا جو غزنی کے نواحی جنگلوں میں رہتی ہے اور اس کی پیروکار بتائی جاتی ہے۔"

"تو چلیے سلطان معظم۔" اباقہ نے دبے دبے جوش سے کہا۔ "ہمیں اپنے پاؤں کی خاک بنا لیجیے اور داخل ہو جائیے' اس مملکت جبر میں جو اس ملعون تک پہنچنے کا دروازہ ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہماری تلواریں آپ کے دشمنوں پر قہر بن کر ٹوٹیں گی اور جب تک ہمارے جسموں میں خون کا آخری قطرہ رہے گا ہمارے بازو ساکت نہیں ہوں گے۔"

سلطان جلال الدین نے شعلوں کی اوٹ سے ایک بار پھر اباقہ کو دیکھا اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے .... کئی برس پہلے دریائے سندھ میں ڈوب جانے والا اس کا نوعمر بیٹا قطب الدین ایک نئے روپ میں اس کے سامنے آن کھڑا ہوا ہے۔

سلطان جلال الدین کے گھوڑے کی اڑتی ہوئی گرد اباقہ کے لیے کسی نعمت سے کم نہیں تھی۔ وہ جان بوجھ کر سلطان کے عقب میں چل رہا تھا۔ یورق' سلطان کے پہلو میں تھا۔ ان کا رخ جنوب مشرق کی طرف تھا۔ سلطان کی رفاقت اباقہ کو جیسے ہواؤں میں اڑا رہی تھی۔ وہ اپنا جسم سورج کی پہلی کرن کی طرح ہلکا اور سبک محسوس کر رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ اس وقت دشمن کی کوئی فوج بھی ان کے سامنے آجائے تو وہ تن تنہا اسے تہ تیغ کر ڈالے۔ دل و دماغ ایک عجیب ولولے سے بھرے ہوئے تھے۔

اس جذباتی کیفیت میں بھی ماریتا کا صدمہ جسم میں ٹوٹے ہوئے کانٹے کی طرح کبھی کبھی اپنی موجودگی کا احساس دلا جاتا تھا' لیکن پھر فوراً ہی اباقہ کی نظریں شیر خوارزم کی پشت پر جم جاتیں اور وہ سب کچھ بھول سا جاتا۔ اسے صرف ایک ہی بات یاد رہ جاتی۔ دنیا میں سب سے کشادہ سینے والا' سب سے مضبوط دل کا مالک' سب سے بلند حوصلہ شخص اس کے سامنے تھا۔

راستے میں وہ چھوٹی چھوٹی بستیوں سے خوراک اور گھوڑوں کے لیے چارہ حاصل کرتے تھے۔ کئی جگہ انہوں نے تاتاریوں کے ظلم و بربریت کے آثار بھی دیکھے۔ انہوں نے راکھ کے ایسے ڈھیر دیکھے جو کبھی انسانی بستیاں تھیں۔ انہوں نے ایسے قبرستان بھی دیکھے جہاں ایک بھی قبر نہیں تھی اور لاشیں زمین کے اوپر پڑی سڑ رہی تھیں۔ انہوں نے ایک ایسا جوہڑ دیکھا جس کے کنارے ایک عمر رسیدہ عورت بیٹھی رو رہی تھی اور جس کے

اندر اس کے اہل خانہ کی پھولی ہوئی متعفن لاشیں تیر رہی تھیں .... ننھے منے بچوں اور جوان عورتوں کی لاشیں۔ ایک ماہ قبل منگولوں کے سیلاب بلاخیز کا ایک سرکش ریلا اس جانب سے گزرا تھا۔ سلطان کے حکم پر اباقہ نے اس ضعیف عورت کو اپنے ساتھ گھوڑے پر بٹھالیا اور راستے میں آنے والی دوسری بستی میں پہنچا دیا۔

چھٹے روز ان کا مختصر سا قافلہ افغانستان میں داخل ہوا اور غزنی کی طرف بڑھنے لگا۔ دشوار گزار پہاڑی علاقوں میں سفر کرتے ہوئے وہ آغاز سفر کے پندرہویں روز غزنی سے ایک سو کوس دور شمال میں پہنچ گئے۔ بلند پہاڑوں پر حدِ نگاہ گھنے جنگلات پھیلے ہوئے تھے۔ ان پہاڑوں میں لاکھوں سپاہیوں پر مشتمل ایک فوج یوں سما سکتی تھی کہ نام و نشان نہ ملے۔ علاقہ دشوار گزار گھاٹیوں اور ندی نالوں سے پٹا ہوا تھا۔ اس ویرانے میں کہیں وہ عورت رہتی تھی جسے لٹیروں کی ملکہ کہا جاتا تھا اور جس کے ظلم و ستم کی داستانیں قرب وجوار میں مشہور تھیں۔

وہ ایک چمکدار دوپہر تھی۔ سلطان جلال الدین' یورق اور اباقہ پیاسے گھوڑوں کو ایک ندی سے پانی پلانے کے بعد ایک تنگ درے میں داخل ہونا چاہتے تھے کہ اونٹ سواروں کے ایک قافلے نے انہیں روک لیا۔ قافلے کا سردار بھاگتا ہوا ان کے قریب آیا اور ٹوٹی پھوٹی فارسی میں بولا کہ آگے جانا خطرناک ہے۔

سلطان نے کہا کہ اگر آگے جانا خطرناک ہے تو وہ یہاں کیوں گھوم رہا ہے۔

اس نے بتایا کہ ان کا مال و اسباب سے لدا ہوا ایک اونٹ گم ہو گیا تھا۔ وہ اسے تلاش کرنے یہاں تک آئے ہیں' لیکن اس سے آگے جانے کی ہمت ان میں بھی نہیں ہے۔ اس لیے واپس جارہے ہیں۔ اس نے کہا کہ یہاں سے آگے جانے والا کبھی زندہ واپس نہیں آتا۔ لٹیروں کی ملکہ کے بارے میں اس نے کچھ نہایت لرزہ خیز حکایتیں سنائیں اور پھر نہایت عجلت میں ساتھیوں کے ساتھ واپس چلا گیا۔ لٹیروں کی ملکہ کا نام اس نے راجی خاتون بتایا۔

سلطان جلال' یورق اور اباقہ نے وہاں کھڑے ہو کر اپنے سامانِ حرب کا معائنہ کیا اور پھر ایک عزم کے ساتھ آگے بڑھ گئے۔ جو جگہ شتربان کے لیے اختتام سفر تھی۔ ان کے لیے سفر کا آغاز تھی .... چاروں طرف ہُو کا عالم تھا۔ دھوپ میں تپتی ہوئی ہیبت ناک چٹانیں خاموش کھڑی تھیں۔ لگتا تھا چرند پرند بھی راجی خاتون کے خوف سے بھاگ گئے ہیں۔ خطرے کا میٹھا میٹھا احساس اباقہ کے تن بدن میں زندگی کی لہر پیدا کر رہا تھا۔ وہ شتربان کی باتوں پر غور کرنے لگا۔ اس کی سنائی ہوئی حکایتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ راجی خاتون

ایک نہایت ظالم اور سفاک عورت ہے۔ وہ بلا کی جنگجو ہے اور دشمن کو اذیتیں دے دے کر مارنا اس کا محبوب مشغلہ ہے۔ یہ سب باتیں اپنی جگہ بجا' لیکن لوگوں کا یہ بھی کہنا تھا کہ وہ ایک نہایت حسین عورت بلکہ لڑکی ہے۔ اباقہ سوچ رہا تھا کہ ایک نو عمر حسینہ اس قدر سفاک اور بے رحم ہو سکتی ہے۔ بہر حال اتنی زبانوں کو جھٹلایا بھی نہیں جا سکتا تھا۔

اونچی نیچی گھاٹیوں پر سفر کرتے انہیں سارا دن گزر گیا' لیکن کسی سے مڈبھیڑ نہیں ہوئی۔ رات کو انہوں نے ایک پہاڑی کھوہ میں بسیرا کیا' دوسرے روز پھر نکل کھڑے ہوئے۔ راجی خاتون تک پہنچنے کا اب بس یہی طریقہ تھا کہ وہ ان خطرناک پہاڑوں میں گھومتے رہیں تاکہ اگر کوئی راجی خاتون یہاں ہے تو اس کے آدمیوں کی نظر ان پر پڑ جائے۔ انہوں نے ایک خشک و بنجر نالے کی وسیع گزر گاہ میں اپنا سفر جاری رکھا۔ خوراک ختم ہونے کو تھی اور شکار بھی بہت کم دکھائی دیتا تھا۔ سب سے سنگین صورت حال پانی کی تھی۔ ان کی چھاگلیں خالی ہونے کے قریب تھیں۔ تیسرے روز انہیں افقی لکیر پر ایک بلند پہاڑ نظر آیا۔ یہ ایک سرسبز پہاڑ تھا اور اس کی چوٹی سفید بادلوں میں چھپی ہوئی تھی۔ یہاں پانی کی موجودگی بھی یقینی تھی۔ انہوں نے تیزی سے سفر جاری رکھا۔ پہاڑ کے دامن میں پہنچتے پہنچتے انہیں رات ہو گئی لیکن وہ مطمئن تھے۔ یہاں آبادی کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔ شاید وہ راجی خاتون کے ٹھکانے تک پہنچ گئے تھے۔ پہاڑ کے دامن میں جھلملاتی روشنیاں کسی بستی کا سراغ دے رہی تھیں۔ وہ بستی کے قبرستان سے گزرے اور محتاط قدموں سے آبادی کی طرف بڑھنے لگے۔ جوں جوں وہ آگے بڑھتے گئے بستی کی وسعت ان پر واضح ہوتی گئی۔ یہ ایک کافی بڑی بستی تھی اور ایک مقام پر بہت سی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ یہاں پہنچ کر سلطان جلال الدین اور اباقہ کو احساس ہوا کہ کچھ لوگ نہایت خاموشی سے ان پر نگاہ رکھے ہوئے ہیں۔ اس سے پہلے بھی ایک دو دفعہ اباقہ کو یہی احساس ہوا تھا' لیکن اس نے سلطان یا یورق سے ذکر نہیں کیا تھا۔ دفعتاً سلطان کو جھاڑیوں میں کوئی شخص دکھائی دیا۔ "رک جاؤ۔" سلطان کی تحکمانہ آواز گونجی۔ اس کے ساتھ ہی سلطان نے تیر کمان ایک جانب سیدھا کر دیا۔ اباقہ جو آگے تھا جلدی سے واپس مڑا۔ اُس وقت سلطان نے نامعلوم شخص کو دوسری بار رکنے کی تنبیہہ کی۔ پھر اباقہ نے دیکھا کہ سلطان نے چلہ کھینچ کر تیر چلا دیا۔ انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ بھاگنے والے کی ٹانگوں کا نشانہ بنا رہا ہے' لیکن اتفاقاً عین وقت پر بھاگنے والے کا پاؤں پھسلا اور وہ گر کر تیر کے سامنے آگیا۔ اس کی چیخ کربناک تھی۔ تینوں بھاگتے ہوئے موقعہ پر پہنچے۔ مقامی لباس میں یہ ایک نوجوان لڑکا تھا۔ تیر اس کی پشت میں دل کے مقام پر لگا تھا اور اسے فوری موت سے ہمکنار کر گیا تھا۔

تینوں متجسس نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ کوئی اور شخص نظر نہیں آیا۔ سلطان اس ناگہانی موت پر سخت افسردہ نظر آ رہا تھا۔ شواہد سے اندازہ ہوتا تھا کہ لڑکے کے ساتھی بھی موجود تھے لیکن وہ لڑکے سے پہلے بھاگنے میں کامیاب ہو گئے۔

انہوں نے اپنا سفر دوبارہ شروع کیا اور بالآخر بستی میں داخل ہو گئے۔ پتھروں سے بنے ہوئے نیچی چھتوں والے بے شمار مکان ان کے سامنے تھے۔ کچھ چھتوں پر برجیاں سی بنی ہوئی تھیں۔ جس گلی میں وہ داخل ہوئے وہ کافی کشادہ تھی اور یہاں ان کے استقبال کے لئے کم و بیش پانچ سو افراد جمع تھے۔ گھروں کی منڈیروں پر کثرت سے چراغ جل رہے تھے۔ مرد و زن رنگ برنگے لباسوں میں ملبوس تھے۔ روشن چہروں والے بچے اِدھر اُدھر پھر رہے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی تہوار منایا جا رہا ہے۔ عجب صورت حال تھی۔ جونہی وہ تینوں ہجوم کے قریب پہنچے۔ لمبی داڑھیوں اور تنگ پیشانیوں والے چار پانچ تلوار برداروں نے انہیں گھیرے میں لے لیا۔ وہ تینوں گھوڑوں سے اترے اور پیدل ان کے ساتھ چل دیئے۔ ہجوم یکسر خاموش تھا۔ تلوار برداروں نے بھی ان سے کوئی بات نہیں کی۔ اباقہ وغیرہ یہ فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے کہ بستی والوں نے ان کا استقبال کیا ہے یا انہیں گرفتار کیا گیا ہے۔ چراغوں کی مدھم روشنی میں چہروں کے تاثرات کچھ واضح نظر نہیں آ رہے تھے۔ سب سے غیر معمولی بات ان لوگوں کی خاموشی تھی۔ لوگوں کے ایک وسیع دائرے کے درمیان انہیں کھڑا کر دیا گیا۔ پھر ایک نہایت معمر شخص دو افراد کے سہارے آگے بڑھا۔ اس کے پیچھے پیچھے ایک عورت آ رہی تھی۔ عورت کے سر پر ایک پھول دار اوڑھنی تھی اور وہ سر جھکائے چل رہی تھی۔ اباقہ ' یورق اور سلطان میں سے کسی کو اس کی شکل دکھائی نہیں دی۔ عورت کی چال سے عجیب طرح کی اداسی اور بے بسی جھلک رہی تھی۔ معمر شخص اباقہ سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑا ہو گیا۔ پھر اس نے اپنا استخوانی ہاتھ بڑھا کر زیر لب کچھ کہا۔ تلواروں اور کلہاڑوں سے مسلح دس پندرہ افراد آگے بڑھے اور انہوں نے اباقہ وغیرہ کو مکمل طور پر گھیر لیا۔ تب اباقہ کی نگاہ اپنی دائیں جانب اٹھی اور وہ بری طرح چونک گیا......... ایک جگہ تین قبریں کھدی ہوئی تھیں۔ قریب ہی مٹی کھودنے والے آلات رکھے تھے اور تھکے ہارے مزدور قبروں کے کنارے بیٹھے تھے۔ دفعتاً اباقہ کو اندازہ ہوا کہ یہ قبریں ان کے لئے کھودی گئی ہیں۔ اس کا دل شدت سے دھڑکنے لگا۔ اس نے سلطان اور یورق کی طرف دیکھا۔ یورق بے خبر تھا لیکن سلطان بھی شاید اباقہ والے نتیجے پر پہنچ چکا تھا۔ اگر اباقہ کا اندازہ غلط نہیں تھا تو بائیں جانب والی قبر یورق کی تھی۔ وہ ان میں سب سے لمبا اور قوی ہیکل تھا۔ ایک اور عجیب چیز جو اباقہ کو

دکھائی دی ایک بہت بڑا طشت تھا۔ دھات کے اس منقش طشت میں ایک چمکدار لباس اور ایک پگڑی پڑی تھی۔ ایک نوجوان اس طشت کو دونوں ہاتھوں میں تھامے خاموش کھڑا تھا۔ اس نوجوان کے ساتھ آٹھ دس سال کا ایک گول مٹول بچہ تھا۔ اس نے کڑھائی والی گول ٹوپی پہن رکھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک تھالی تھی۔ تھالی میں ایک سیب اور چھری پڑی تھی۔ لگتا تھا یہاں کوئی عجیب و غریب لیکن سنگین رسم ادا کی جانے والی ہے۔ آخر ایک شخص آگے بڑھا۔ اس نے جو زبان بولی وہ پشتو سے مشابہ تھی لیکن اباقہ اسے سمجھ رہا تھا۔ اس کا باپ جو زبانوں کا ماہر تھا اسے کئی زبانیں سکھا گیا تھا۔ یورق نے ہاتھ ہلا کر بولنے والے شخص کو بتایا کہ انہیں اس کی بات سمجھ نہیں آ رہی۔ اس پر اس شخص نے ٹوٹی پھوٹی فارسی میں اپنا مدعا بیان کرنا شروع کیا۔ اس نے انہیں بتایا کہ اس بستی کا سردار دو ماہ سے روپوش ہے۔ اب اسے مردہ تصور کر لیا گیا ہے اور اس بستی کی قدیم رسم کے مطابق نئے سردار کا چناؤ ہونا ہے۔ کئی روز سے اس بستی کے مکین منڈیروں پر چراغ جلائے کسی نئے آنے والے کے منتظر تھے۔ یہاں کی رسم ہے کہ جب پہلا سردار بغیر وصیت کے مر جائے تو بستی میں داخل ہونے والے کسی اجنبی کو سردار بنایا جاتا ہے لیکن اس کے لئے ایک آزمائش ہے۔ نو وارد کو ایک سیب کھانے کے لئے دیا جاتا ہے۔ دیکھا جاتا ہے کہ وہ اس سیب کو کس طرح کھاتا ہے۔ اس کے کھانے کا طریقہ اس کے مستقبل کا فیصلہ کرتا ہے۔

سلطان جلال الدین نے بارعب آواز میں پوچھا۔ "طریقے سے تم لوگوں کا کیا مطلب ہے۔"

اس شخص نے بچے کو اشارہ کیا اور وہ سیب لے کر ان تینوں کے سامنے پہنچ گیا۔ وہ شخص بولا۔ "تم تینوں میں جو عمر کے لحاظ سے بڑا ہے وہ اس سیب کو کھائے گا۔ ہمیں صرف یہ دیکھنا ہے کہ وہ اس سیب کو بغیر چھیلے کھاتا ہے یا چھری سے چھیل کر۔ ایک صورت میں وہ اپنے دونوں ساتھیوں کو لے کر قبر میں اتر جائے گا اور دوسری صورت میں اسے خلعت فاخرہ پہنا کر سردار بنا دیا جائے گا۔"

سیب ان تینوں کے سامنے تھا اور وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ سردار یورق عمر کے لحاظ سے ان سب سے بڑا تھا اور یہ فرق اتنا واضح تھا کہ کسی کی نظر سے بھی چھپ نہیں سکتا تھا۔ معمر شخص نے اپنا ہڈیوں بھرا ہاتھ اٹھایا اور انگلی سے سردار یورق کی طرف اشارہ کیا۔ مطلب واضح تھا۔ اس سیدھے سادے لیکن خوفناک امتحان سے اسی کو گزرنا تھا۔ چاروں طرف کھڑے ہوئے بچے' پردہ نشین عورتیں اور مسلح مرد اب بھی

خاموش تھے۔ سردار یورق متذبذب ہوا تو عقب میں کھڑے ایک شخص نے تلوار کی نوک پر اسے آگے بڑھایا۔ سردار یورق نے سوالیہ نظروں سے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ اپنے عجیب و غریب میزبانوں کا حکم ماننے کے سوا ان کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔ سلطان جلال الدین نے یورق کی طرف دیکھ کر حوصلہ افزائی کے انداز میں سر ہلایا۔

سردار یورق چند قدم چل کر بچے کے قریب پہنچا۔ پھر اس نے تھالی کی طرف ہاتھ بڑھایا' بائیں ہاتھ میں سیب اٹھایا اور دائیں ہاتھ میں خنجر نما چھری تھام لی۔ اب وہ بھی اپنے سامنے کھدی ہوئی قبروں کو دیکھ چکا تھا۔ صورت حال کی سنگینی اس کے ماتھے کو عرق آلود کرنے لگی تھی۔ زندگی میں اس نے سینکڑوں بار سیب کھایا تھا کبھی چھیل کر اور کبھی چھلکے سمیت لیکن اس وقت اس معمولی عمل پر ان تینوں کی زندگی کا دار و مدار تھا۔ اس کا ذہن تیزی سے کوئی دلیل تلاش کر رہا تھا۔ چھلکا اتار کر کھانا نزاکت کی نشانی ہے لیکن اس سے صبر و تحمل کا اظہار ہوتا ہے۔ بغیر چھیلے کھانے سے لاپرواہی اور سخت کوشی ظاہر ہوتی ہے لیکن اس کو ندیدے پن سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ یورق کا ذہن مکمل طور پر دو حصوں میں تقسیم ہو گیا اور اس کے ہاتھ لرزنے لگے۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کیا کرے۔ پھر نتائج سے بے پرواہ ہو کر اس نے سیب کو منہ کی طرف لے جانے کا فیصلہ کیا۔ ابھی اس کے ہاتھ نے حرکت نہیں کی تھی کہ ایک نرم و ملائم آواز اس کے کانوں میں پڑی۔ یہ سلطان جلال الدین کی آواز تھی۔ وہ چند قدم پر اس کے پیچھے کھڑا تھا۔ نہایت آہستگی سے بولا۔

”چھری پکڑی ہے تو اسے استعمال کرو یورق۔“

سردار یورق نے ایک نظر مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ پھر اس پُراعتماد مشورے پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے چھری سیب پر رکھی اور لرزتے ہاتھوں سے چھیلنے لگا۔ ابھی اس نے بمشکل ایک چھلکا ہی اتارا تھا کہ خاموش فضا فلک شگاف نعروں سے گونج اٹھی۔ خاموشی کے سمندر میں اچانک ہی شور و غل کا طوفان اٹھ آیا تھا۔ چند نوجوان بھاگے بھاگے آئے اور سردار یورق کو اپنے کندھوں پر اٹھا کر ناچنے لگے۔ قریب ہی کھڑے کچھ افراد نفیریاں بجانے اور ڈھول پیٹنے لگے۔ کچھ لوگوں نے سلطان جلال الدین اور اباقہ کو بھی کندھوں پر اٹھا لیا۔ اباقہ نے دیکھا قبروں کے کنارے بیٹھے مزدور تیز تیز کدالیں چلا کر انہیں پاٹ رہے تھے۔ سردار یورق کو ایک جانب بلند چٹان پر بٹھا دیا گیا۔ یہ ہموار اور شفاف چٹان زمین سے کوئی دو گز بلند تھی۔ چٹان کی دونوں اطراف دو بڑی بڑی شمعیں جل رہی تھیں سلطان جلال الدین اور اباقہ کو بھی یورق کے پاس پہنچا دیا گیا۔ معمر شخص نے

طشت میں سے چمکدار پوشاک اٹھا کر احترام سے یورق کی گود میں رکھ دی۔ بہت بڑی پگڑی اس کے سر پر سجا دی گئی۔ اس حلیے میں سردار یورق عجیب و غریب نظر آنے لگا۔ اباقہ مسکرا مسکرا کر اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سلطان جلال الدین حسب معمول سنجیدہ تھا۔ نفیریوں کا آہنگ بدلا اور ان کے سامنے تلوار بردار مرد ایک خوبصورت رقص پیش کرنے لگا۔ یورق کے عقب میں کھڑا ایک شخص مٹھیاں بھر بھر کر کوئی چیز اس پر نچھاور کرتا تھا۔ یہ جَو تھے اور ان میں ماش کی دال ملی ہوئی تھی۔ یورق نے دیکھا وہ عورت جو سر جھکائے معمر شخص کے عقب میں چل رہی تھی اب اس کے پہلو میں بٹھا دی گئی ہے۔

☆---☆---☆

رات گئے تک یہ ہنگامہ جاری رہا۔ آخر ایک پُرتکلف کھانے کے بعد انہیں ان کی آرام گاہوں میں پہنچا دیا گیا۔ پتھر اور گارے سے بنا ہوا یہ ایک کافی بڑا مکان تھا۔ دو خصوصیات اسے دوسرے مکانوں سے علیحدہ کرتی تھیں۔ ایک تو یہ کہ ایک علیحدہ چٹان پر تھا۔ دوسرے اس کی چھت نسبتاً بلند تھی۔ اندر پہنچ کر وہ تینوں حیران رہ گئے۔ اس دور دراز بستی کے اس مکان میں دنیا کی بیشتر آسائشیں موجود تھیں۔ دبیز قالین' منقش پردے' فانوس' جھاڑ' ظروف' لیکن ان چیزوں کی آرائش میں بے ترتیبی اس بات کی طرف اشارہ کرتی تھی کہ یہ سب کچھ لوٹ کا مال ہے۔ معلوم نہیں بستی کے دوسرے گھروں میں بھی یہ آرائش موجود تھی یا یہ سب کچھ سردار کی رہائش گاہ ہی کے لئے مخصوص تھا۔ اباقہ اور سلطان جلال الدین کو بھی اسی مکان کے دو کمرے دے دیئے گئے تھے لیکن انہیں بتایا گیا تھا کہ وہ سردار کے مہمانوں کی حیثیت سے ایک دو دن یہاں قیام کر سکتے ہیں۔ بعد میں انہیں رہنے کے لئے بستی کا کوئی دوسرا مکان چننا ہوگا۔ سردار یورق کا کمرہ سب سے کشادہ اور آرام دہ تھا۔ دیواروں حتیٰ کہ چھت کو بھی پردوں اور قالینوں سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔ کمرے میں پہنچ کر سردار پلنگ پر گرا اور ایک طویل سانس لے کر اس عجیب و غریب صورت حال کا جائزہ لینے لگا۔ لمحوں میں وہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا تھا۔ سلطان جلال الدین کا قیافہ کام کر گیا تھا ورنہ بستی والوں نے تو ان کی قبریں بھی تیار کر رکھی تھیں۔ لگتا تھا وہ بہت پہلے ان کی آمد سے باخبر ہو چکے تھے۔ آئندہ کیا ہو گا اس کی اسے مطلق فکر نہیں تھی۔ یہ اباقہ اور سلطان جلال الدین کے سوچنے کا کام تھا۔ وہ تو ان کا ایک ساتھی تھا ....بس ایک انجانی کشش اسے اباقہ کے ساتھ لئے پھرتی تھی۔

یہ آرام و راحت اور ”سرداری“ کا احساس اسے ایک عرصے بعد نصیب ہوا تھا۔ طبیعت خواہ مخواہ ترنگ میں آ رہی تھی۔ ایسے میں کہیں چاول کی تیز شراب بھی مل جاتی تو

مزا آ جاتا۔ قراقرم کی یاد تازہ ہو جاتی۔ وہ اپنے مسل ٹٹولتا ہوا اٹھا اور کمرے میں اِدھر اُدھر جھانکنے لگا۔ کمرے کے اندر ہی ایک اور دروازہ تھا۔ فانوس کی روشنی میں ایک عورت قالین پر بیٹھی نظر آ رہی تھی۔ پہلے تو یورق الٹے قدموں پیچھے ہٹا لیکن پھر ہمت کر کے آگے بڑھا۔ یہ وہی عورت تھی جسے معمر شخص نے یورق کے سردار بننے کے بعد چٹان پر اس کے پہلو میں بٹھایا تھا۔ اس کے سر پر وہی پھولدار اوڑھنی تھی اور وہ گھٹنوں میں سر دیے خاموش بیٹھی تھی۔ یورق کی آہٹ پا کر اس نے گھٹنوں سے سر اٹھایا۔ یورق اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ ایک حسین عورت تھی، عمر لگ بھگ تقریباً تیس سال رہی ہو گی۔ وہ چاندی کی دھات کے زیورات سے لدی ہوئی تھی۔ جس چیز نے یورق کو سب سے زیادہ حیران کیا وہ ایک آہنی زنجیر تھی۔ اس زنجیر نے عورت کے دونوں خوبصورت ہاتھ جکڑ رکھے تھے۔ یورق کو اچانک وہ منظر یاد آ گیا جب اباقہ اسے ایک غار میں زنجیر سے باندھ کر چھوڑ آیا تھا اور اسے رہائی کے لئے ایک انگوٹھے سے محروم ہونا پڑا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ اس عورت کی حیثیت اس کمرے میں ایک قیدی کی ہے۔ عورت کے زیورات، بناؤ سنگھار اور زرق برق لباس کسی بات کی طرف اشارہ کر رہے تھے اور پھر دفعتاً یہ بات یورق کی سمجھ میں آ گئی۔ یہ عورت اس کی بیوی بنا دی گئی تھی۔

یورق زیر لب منگولی میں بڑبڑایا اور خوفزدہ انداز میں پیچھے ہٹنے لگا۔ عرصہ گزرا عورت اس کی زندگی سے نکل چکی تھی۔ اب تو اسے اس قسم کے تصور سے بھی الجھن ہوتی تھی۔ اس کی زندگی کے دو ہی شوق تھے۔ اچھے سے اچھا کھانا اور اپنے جسم کو چوکس اور خوبصورت رکھنا۔ اس کی عمر ساٹھ سے تجاوز کر چکی تھی، لیکن اب بھی اس کے مسل جوانوں سے بڑھ کر نمایاں تھے۔ تیسرا شوق جو اسے چراتا تھا شراب کا تھا۔

اس شوق میں وہ اس کمرے تک پہنچا تھا، لیکن یہاں کا تو منظر ہی کچھ اور تھا۔ یورق الٹے قدموں خوابگاہ سے نکلا اور پھر بڑے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ اس کے چہرے سے حیرت آمیز پریشانی ٹپک رہی تھی۔ کمرے سے باہر راہداری میں دو شمعیں مدھم روشنی پھیلا رہی تھیں۔ ایک ادھیڑ عمر باریش شخص کمر سے تلوار لٹکائے پہرہ دینے والے انداز سے ٹہل رہا تھا۔ یورق کو دیکھ کر وہ تیزی سے قریب آیا پھر سر جھکا شستہ فارسی میں بولا۔

"کیا حکم ہے سردار؟" سردار یورق اب کافی حد تک فارسی بول اور سمجھ لیتا تھا۔ اسی لہجے میں بولا۔ "حکم کے بچے یہ میرے کمرے میں کون عورت بیٹھی ہے؟"

"وہ آپ کی منکوحہ ہے سردار .... آپ کی بیوی ہے۔" بوڑھا ملائمت سے بولا۔

"کیا بکتے ہو؟ کب ہوئی ہے اس سے میری شادی؟"

"سردار! چٹان پر .... آپ نے اسے قبول کیا ہے۔"

"مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی۔" سردار جھنجلا کر بولا۔ "مجھے بتاؤ سب کیا ہے؟"

پہریدار دھیمی آواز میں اسے تفصیلات بتانے لگا۔ اس نے کہا۔ "سردار! ہمارا پہلا سردار دو ماہ پہلے بستی سے غائب ہو گیا۔ یہاں کا دستور ہے کہ ڈیڑھ چاند تک سردار کا انتظار کیا جاتا ہے پھر اسے مردہ تصور کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد بستی میں آنے والے کسی اجنبی کو سردار کے طور پر منتخب کیا جاتا ہے۔ مرحوم سردار کی بیوہ یا بیواؤں کی شادی نئے سردار سے کر دی جاتی ہے اور اگر اس کے بچے ہوں تو وہ نئے سردار کے بچے تصور ہوتے ہیں، لیکن پہلا سردار چونکہ بے اولاد تھا اور کثیرالازواج بھی نہیں تھا اس لیے آپ کے حصے میں صرف اس کی بیوی آئی ہے۔"

یورق کے ذہن میں وہ زنجیر آئی جس نے اس عورت کی کلائیاں جکڑ رکھی تھیں اس نے کہا۔ "کیا تمہارے ہاں عورتوں کو باندھ کر شادی کی جاتی ہے۔"

بوڑھا بولا۔ "نہیں سردار! ایسی بات نہیں۔ اسے آپ ہماری مجبوری سمجھئے۔"

یورق سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "میرا خیال ہے اس عورت کو اب بھی یقین ہو گا کہ اس کا شوہر زندہ ہے اس لیے وہ اس شادی پر رضامند نہیں ہو گی، لیکن تم اسے اپنی رسم کی بھینٹ چڑھ کر میرے کمرے میں چھوڑ آئے ہو۔"

"نہیں سردار۔" بوڑھا بولا۔ "ایسی کوئی بات نہیں۔ پہلے سردار کے مرنے کی تصدیق تو کئی طرح سے ہو چکی ہے۔ کئی شہادتیں ایسی موجود ہیں جن سے پتہ چلا ہے کہ سردار ندی میں ڈوب کر ہلاک ہوا ہے۔ ایک عورت خود اپنی آنکھوں سے اسے پہاڑ سے ندی میں لڑھکتے اور ڈوبتے دیکھ چکی ہے، لیکن ہم نے حجت پوری کرنے کے لیے ڈیڑھ چاند تک اس کا انتظار کیا ہے۔ دراصل اس بدنصیب پر اس کی بیوی نے کوئی سحر کر دیا تھا۔ اس سحر کے زیر اثر اس نے خود کو موت کے حوالے کر دیا۔ یہ عورت حسین ہونے کے باوجود نہایت خطرناک ہے۔ میں آپ کو یہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ یہ اچھے کردار کی مالک نہیں۔ اپنے شوہر سے اس کی بنتی نہیں تھی۔"

یورق نے کہا۔ "اس کا مطلب ہے، ایک خطرناک اور بدچلن عورت کو تم لوگوں نے میری بیوی بنا دیا ہے .... ایک سردار کے لیے یہ اچھا اعزاز ہے۔"

بوڑھا بولا۔ "سردار محترم رسم کی تکمیل کے لیے یہ سب ضروری تھا .... باقی دشمن اس وقت تک خطرناک ہوتا ہے جب تک وہ آزاد ہو۔ اب وہ قید ہے اور آپ اس

کے شر سے محفوظ ہیں' لیکن جرگہ آپ کو اس بات کا اختیار دیتا ہے کہ آپ چاہیں تو ان کی جان لے سکتے ہیں .... اس کے علاوہ دو تین یا چار جتنی عورتیں آپ چاہیں اپنی زوجیت میں لے سکتے ہیں۔"

سردار گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ بوڑھا اسے دیر تک اس بستی کے بارے بتاتا رہا اور اسے یہاں کے نشیب و فراز سے آگاہ کرتا رہا۔ لگتا تھا اسے اس خاص مقصد کے لیے یہاں متعین کیا گیا تھا۔

سردار یورق نے پوچھا۔ "کہا جاتا ہے کہ اس بستی میں کوئی ایسی عورت بھی ہے جسے لٹیروں کی ملکہ کہا جاتا ہے اور جو راجی خاتون کے نام سے مشہور ہے۔"

راجی خاتون کے نام پر بوڑھا بری طرح چونکا۔ خوفزدہ نگاہوں سے یورق کو دیکھتا ہوا پھر دھیمے لہجے میں بولا۔ "سردار! اب کبھی اسے لیٹروں کی ملکہ نہ کہنا۔ یہ لفظ تمہاری اور تمہارے ساتھیوں کی موت ہے۔"

"لیکن وہ ہے کہاں؟" سردار نے پوچھا۔

"وہ اس بستی میں نہیں۔" بوڑھے نے جواب دیا۔ "اس کا ٹھکانہ یہاں سے مشرق کی طرف دو روز کی مسافت پر ہے۔ اس علاقے کو ہماری زبان میں "کالے پہاڑوں کا وطن" کہا جاتا ہے .... " بوڑھا کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ پھر شاید اسے احساس ہوا کہ وہ بستی کے نئے سردار سے مخاطب ہے اور سردار سے کچھ چھپانا درست نہیں۔ وہ ایک طویل سانس لے بولا۔

"یہ آج سے آٹھ دس سال پہلے کی بات ہے جب ان کالے پہاڑوں میں پہلے پہل رستم نامی ایرانی لٹیرے نے پناہ لی۔ اس کا سیاہ قدم پڑتے ہی اس علاقے میں تاریکیوں کا راج ہو گیا۔ دنیا جہاں کے قاتل لٹیرے اور راہزن ان پہاڑیوں میں دندنانے لگے۔ اب وہاں بدی کی ایک مضبوط مملکت قائم ہو چکی ہے۔ رستم مر چکا ہے' لیکن اب اس کی بیٹی اپنے باپ کی گدی سنبھالے ہوئے ہے۔ وہ اپنے باپ سے کہیں بڑھ کر ظالم اور سفاک مشہور ہے۔ یہ تو خدا کا شکر ہے کہ اس کا باپ اپنی زندگی میں اس بستی کو اپنی امان دے گیا ہے۔ یہ لوگ ہم سے کچھ تردد نہیں کرتے کیونکہ ہم ان کے پڑوس کی حیثیت رکھتے ہیں' لیکن اس امان کے بدلے ہمیں اس علاقے میں داخل ہونے والے اجنبیوں پر گہری نظر رکھنا پڑتی ہے اور راجی خاتون کے آدمیوں کو باخبر رکھنا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ لوگ ہم سے ضروریات زندگی کی چیزیں بھی حاصل کرتے ہیں۔ یہ جو تمہیں ہمارے گھروں میں آرائش کا سامان نظر آ رہا ہے۔ انہی لوگوں کا دیا ہوا ہے۔ نقد جنس کے بدلے وہ ہمیں یہ

چیزیں دے جاتے ہیں۔"

یورق بولا۔ "ابھی تم نے کہا تھا کہ لٹیروں کی ملکہ ہماری موت ہے اس سے کیا مطلب ہے۔"

بوڑھے نے جواب دیا۔ "سردار اس بستی اور کالے پہاڑ والوں کے درمیان جو معاہدہ ہے اس کے مطابق بستی میں داخل ہونے والے ہر اجنبی کو راجی خاتون کے حضور پیش کرنا لازم ہوتا ہے۔ ایک عرصے سے ہم اس شرط کی پابندی کر رہے ہیں۔ کئی قافلوں' بے شمار افغان سپاہیوں اور بھولے بھٹکے مسافروں کو ہم راجی خاتون کے حوالے کر چکے ہیں' لیکن اس مرتبہ اپنی قدیم رسم کی خاطر ہم نے معاہدے کی خلاف ورزی کی ہے۔ آپ اور آپ کے ساتھیوں کو پیش نہیں کیا جا رہا۔ اب آپ ہمارے سردار ہیں اور آپ کے ساتھی ہمارے مہمان۔ اب آپ کو اس بستی کے باشندوں میں یوں گھل مل کر رہنا ہے کہ کسی کو علم نہ ہو کہ آپ باہر کے لوگ ہیں۔ اس لیے میں نے کہا تھا کہ آپ راجی خاتون کے لیے لٹیروں کی ملکہ کے الفاظ کبھی استعمال نہ کریں۔"

☆-------☆-------☆

تیسرے روز تک اباقہ اور سلطان جلال الدین اپنے طویل سفر کی تھکان مکمل طور پر اتار چکے تھے۔ انہوں نے سردار یورق سے ملاقات کی کوشش کی' لیکن بوڑھے پہریدار نے بتایا کہ سردار سو رہے ہیں آپ ان سے کچھ دیر بعد ملاقات کر سکیں گے۔ اباقہ' جلال الدین کے پیچھے پیچھے چلتا مکان سے باہر آ گیا۔ شام ہو چکی تھی۔ افق پر پھیلی ہوئی سرخی بتا رہی تھی کہ سورج ابھی ابھی غروب ہوا ہے۔ اباقہ نے دیکھا بہت سے مرد اور بچے مختلف ٹیلوں پر چڑھے مغرب کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دفعتاً ایک جانب سے شور و غل کی آواز سنائی دی۔ اباقہ نے دیکھا لوگ بڑے جوش خروش سے افق کی جانب انگلیوں سے اشارہ کر رہے تھے۔ اباقہ ہونقوں کی طرح یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ سلطان جلال الدین نے اس کی پریشانی بھانپ کر کہا۔

"اباقہ! کل مسلمانوں کا تہوار عید ہے۔ یہ سب لوگ عید کا چاند دیکھ رہے ہیں۔"

پھر اباقہ کو بھی شفق کی سرخی میں ایک باریک سی سفید لکیر نظر آئی۔ اس نے دیکھا قبیلے کے لوگ خوشی سے اچھل کود رہے تھے۔ نوجوانوں کی ایک ٹولی نے ایک بلند جگہ پر آگ کا الاؤ روشن کیا۔ اس الاؤ کے روشن ہوتے ہی بستی کے گھروں سے لوگ جوق در جوق نکل آئے اور خوشی کا اظہار کرنے لگے۔ ایک ادھیڑ عمر شخص نفیری بجانے لگا۔ ایک نوجوان دف بجا بجا کر ایک خوبصورت پہاڑی گیت گانے لگا۔ اس مدھر گیت نے ہر شخص کو

مسحور کر دیا۔ اباقہ کو گیت کے کچھ بول سمجھ میں آ رہے تھے۔ گانے والا کچھ ایسی بات کہہ رہا تھا۔

.... عید کا چاند نظر آتے ہی
گاؤں کی کنواریاں اور دلہنیں
پھولوں کی طرح کھل اٹھیں
اور ہر پھول کی خوشبو
ایک بلبل کو کھینچ لائی
اور ہر آنکھ کے آنگن میں
ایک محبوب اُتر آیا
آ میری محبوبہ' آج شام مجھے مل جا
اگر تو آج آ جائے۔
تو عید سے ایک دن پہلے میری عید ہو جائے

.... اس گیت کی لے نے اباقہ کو بہت دور پہنچا دیا۔ اس نے خوشی سے چمکتے دمکتے چہرے دیکھے اور حسرت کے ساتھ سوچا کاش ان میں ایک چہرہ اس کی مارینا کا بھی ہوتا۔ وہ دور ہی سے سہی ایک بار اس کی طرف دیکھتی اور مسکرا دیتی .... لیکن وہ تو نہ جانے کن عذابوں سے گزر رہی تھی۔ زندہ بھی تھی یا نہیں۔ اس کی خاطر قراقرم کی شاہی کو چھوڑ آنے والی تنکے سے حقیر ہو کر گردابوں میں کھو گئی تھی۔

اباقہ نے ایک سرد آہ بھری اور دھیمے قدموں سے ایک طرف چل دیا۔ سلطان جلال الدین ایک پتھر پر کھڑا نماز ادا کر رہا تھا۔ اس کے عقب سے ہوتا ہوا وہ نشیب کی طرف بڑھنے لگا۔ شور و غل اور ہنگامے سے دور رہ کر وہ چند لمحے مارینا کی یاد میں گزارنا چاہتا تھا۔ سامنے وہی قبرستان تھا جس سے گزر کر وہ بستی میں پہنچے تھے۔ قبرستان میں گہری تاریکی تھی۔ دیودار اور چیڑ کے بلند و بالا درخت سر جھکائے خاموش کھڑے تھے۔ کتنا فرق تھا زندوں اور مردوں کی بستی میں۔ شاید اباقہ کے دل کا ایک گوشہ بھی اس طرح مردہ ہو چکا تھا۔ اس گوشے میں تاریکی' مایوسی اور پچھتاوے کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ اباقہ ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ اس کے چاروں طرف چھوٹے چھوٹے کنکروں سے سجی ہوئی قبریں تھیں۔ عید کا مدھم چاند ان قبروں پر بھی چمک رہا ہو گا' لیکن یہاں افق کا منظر حسین نہیں تھا۔

دفعتاً ایک دھیمی آہٹ نے اسے چونکا دیا۔ اسے لگا جیسے کوئی خاموشی سے مٹی کھود

رہا ہے۔ تجسس سے مجبور ہو کر اباقہ اپنی جگہ سے اٹھا اور آہستگی کے ساتھ چند قدم آگے گیا۔ ایک منظر دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔ ملگجے اندھیرے میں ایک عجیب و غریب حلیے کی عورت نظر آ رہی تھی۔ اس کے بازو اور پنڈلیاں عریاں تھیں۔ ایک چادر اس کے زیریں جسم پر اور ایک پھٹا پرانا کرتہ بالائی جسم پر تھا۔ اس کے الجھے ہوئے لمبے بال شانوں پر بکھرے تھے۔ حرکات و سکنات سے وہ زیادہ عمر رسیدہ دکھائی نہیں دیتی تھی۔ قبر کی مٹی کھود کھود کر اس نے ڈھیر لگا رکھا تھا اور بری طرح ہانپ رہی تھی۔ اباقہ کے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے قبر کی تمام مٹی ہٹا دی۔ پھر اباقہ نے دیکھا وہ لکڑی کے تختے باہر نکال رہی ہے۔ اس کے ساتھ ہی مردار کی بو اباقہ کے نتھنوں میں گھسنے لگی۔ یہ سوچ کر وہ حیران ہوا یہ عورت قبر کے مردے کے ساتھ کچھ کرنے والی ہے۔ تختے ہٹانے کے بعد عورت نے قبر کے کنارے پڑا ہوا ایک دیا اور ایک پوٹلی اٹھائی اور غائب ہو گئی۔ اباقہ سانپ کی طرح رینگتا ہوا ایک درخت پر چڑھ گیا۔ اب اسے قبر کا اندرونی منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اباقہ کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اس دہشتناک منظر سے کانپ جاتا۔ دیے کی مدھم روشنی میں عورت مردے پر جھکی ہوئی تھی۔ اس نے اس کا کفن ہٹا دیا تھا۔ یہ کوئی باریش مرد تھا اور لگتا تھا ایک دو روز پہلے مرا ہے۔ لاش زیادہ پھولی ہوئی نہیں تھی۔ عورت نے مرد کا سینہ ننگا کیا پھر پوٹلی میں سے کوئی چیز نکال کر اس کے سینے پر گوندنے لگی۔ اچانک اباقہ کے ذہن میں جھماکہ سا ہوا۔

ایک بھولی بسری بات اسے یاد آ رہی تھی۔ کئی برس پہلے جب اس کا باپ اسے کوہ الطائی کے ویرانوں میں لیے پھرتا تھا۔ ایک دفعہ اس نے اسے مشرق میں واقع ایک کوہستانی خطے اور وہاں کے باشندوں کے بارے بتایا تھا۔ اس نے ان لوگوں کے ہاں رائج عجیب و غریب رسموں کا ذکر بھی کیا تھا۔ اس ذکر میں ایک ایسی رسم کا ذکر بھی آیا تھا جس میں کوئی عورت تازہ مردے کی قبر کھود کر اندر اتر جاتی ہے پھر وہ خمیر شدہ آٹا اس کے ننگے سینے پر گوندھتی ہے۔ یہ آٹا دو قسم کا ہوتا ہے سفید اور سیاہ ....''

اس سے آگے اباقہ کو کچھ یاد نہیں آ رہا تھا۔ بس اتنا یاد تھا کہ وہ اس آٹے کو کسی شگون کے لیے استعمال کرتی ہے .... اس وقت اباقہ نے سوچا بھی نہیں تھا کہ کسی وقت وہ اپنی آنکھوں سے اس رسم پر عمل ہوتا دیکھے گا۔

وہ دم بخود دیکھتا رہا۔ عورت کافی دیر اپنے کام میں مصروف رہی۔ پھر اس نے پوٹلی اور دیا اٹھایا اور باہر نکل آئی .... اسی طرح تختے قبر پر رکھ کر اس نے اوپر مٹی ڈالنا شروع کر دی۔ اباقہ غور سے جائزہ لے رہا تھا۔ یہ کوئی پچیس تیس سال عورت تھی۔ شکل

مکروہ اور آنکھیں چمکدار تھیں۔ اس کی حرکات میں عجیب طرح کا جنگلی پن پایا جاتا تھا۔ قبر بند کرنے کے بعد وہ کسی چھلاوے کی طرح پوٹلی کے ساتھ درختوں میں غائب ہو گئی .... لیکن وہ بھی اباقہ تھا۔ وہ چھلانگ لگا کر نیچے آیا اور نہایت تیزی سے عورت کا پیچھا کرنے لگا۔ قبرستان سے نکل کر عورت بستی کی طرف جا رہی تھی۔ بستی کے قریب پہنچ کر عورت کی رفتار آہستہ ہو گئی۔ اباقہ نے دیکھا بستی کے درمیان ہموار جگہ پر اب بہت سے لوگ جمع ہو گئے تھے ان میں عورتیں اور بچے بھی تھے۔ سردار یورق اسی بلند چٹان پر شان سے بیٹھا تھا۔ اس کی نوبیاہتا بیوی اس کے پہلو میں منہ چھپائے بیٹھی تھی۔ نوجوان گویے کے ساتھ اب اور بھی کئی افراد شامل ہو گئے تھے۔ یہ سب لوگ چاند رات کی خوشی منا رہے تھے۔

اباقہ نے دیکھا پُراسرار عورت مجمعے میں داخل ہوئی پھر سردار یورق کے عقب سے ہوتی ہوئی دوسری طرف نکل گئی۔ اباقہ کو احساس ہوا کہ عورت نے مجمعے میں کوئی غیر ضروری حرکت کی ہے' لیکن کیا؟ یہ وہ دیکھ نہیں سکا۔ دفعتاً ایک بار پھر اس کے ذہن میں کوندا سا لپکا .... اسے اس دہشتناک رسم کی باقی تفصیل بھی یاد آ گئی تھی۔ اس کے باپ نے بتایا تھا۔ آٹا گوندھنے والی عورت سفید آٹا اپنے کپڑوں پر لگا لیتی ہے تاکہ اس کا خاوند یا محبوب اس سے خوش ہو اور سیاہ آٹا ایسی عورتوں کے لباس پر لگاتی ہے جن سے وہ ملتی جلتی ہے۔ یا جن کو وہ اپنے محبوب سے دور رکھنا چاہتی ہے .... اباقہ حیرانی سے سوچ رہا تھا کیا واقعی یہ عورت وہی رسم ادا کر رہی ہے۔ اگر یہ درست تھا تو پھر اس عورت نے مجمعے میں شامل کسی عورت کے لباس پر وہ سیاہ خمیر لگایا تھا۔ وہ عورت کون ہو سکتی تھی۔ اباقہ سوچ رہا تھا اور اس کی نگاہیں مسلسل پُراسرار عورت کا تعاقب کر رہی تھیں۔ پھر اس نے دوبارہ عورت کا پیچھا شروع کر دیا۔

بستی کی گلیوں سے ہوتی ہوئی وہ عورت شمالی جانب نکل آئی۔ پوٹلی ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھی۔ بستی سے بالکل الگ تھلگ ایک مکان کے سامنے پہنچ کر وہ رکی۔ ایک نظر اِدھر اُدھر دیکھا اور اندر چلی گئی۔ اباقہ چند لمحے کھڑا سوچتا رہا۔ یہ مکان تاریک' حائط سے صحن اور نیچی چھت والے دو مختصر کمروں پر مشتمل تھا۔ اباقہ کا تجسس اسے کچھ دیکھنے پر مجبور کر رہا تھا۔ وہ آگے بڑھا۔ چھت پر چڑھنے میں اسے کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ چند بالشت نیچے ایک روشندان تھا۔ اس نے چھت پر اوندھے لیٹ کر روزن سے آنکھیں لگا دیں۔ اندر کا منظر چونکا دینے والا تھا۔ ایک تنومند قبول صورت مرد جس کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ تھی' رسیوں سے جکڑا زمین پر پڑا تھا۔ اس کا منہ کپڑا ٹھونس کر بند کر دیا گیا

تھا .... تھوڑی دیر بعد آہٹ سنائی دی اور عورت کمرے میں داخل ہوئی' لیکن اب وہ مختلف حلیے میں نظر آ رہی تھی۔ اس نے نیا لباس پہن رکھا تھا اور بناؤ سنگھار کرنے کی کوشش بھی کی تھی' لیکن اس بھونڈی کوشش نے اسے کچھ اور خوفناک بنا دیا تھا۔ ترچھی نظروں سے مرد کو دیکھتی ہوئی وہ اس کے پہلو میں بیٹھ گئی۔ اب وہ اباقہ کو نظر نہیں آ رہی تھی' لیکن اس کی موجودگی کمرے میں ثابت ہو رہی تھی۔ شاید وہ مرد سے کچھ کہہ رہی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ دھیرے دھیرے مرد کی کھردری داڑھی پر حرکت کر رہا تھا ....

دفعتاً کمرے میں ہلچل ہوئی اباقہ نے دیکھا کہ مرد نے ایک جھٹکے سے خود کو رسیوں کی بندش سے آزاد کروا لیا۔ پھر وہ عقاب کی طرح عورت پر جھپٹا۔ دونوں اباقہ کی نظر سے اوجھل ہو گئے' لیکن مرد کی دھاڑیں اور عورت کی چیخیں اس بات کا پتہ دے رہی تھیں کہ مرد اس پر قابو پانے کی کوشش کر رہا ہے اور وہ زبردست مزاحمت کر رہی ہے۔ چند لمحے بعد کمرے کا دروازہ ایک دھماکے سے کھلا۔ اباقہ نے چھت پر لیٹے لیٹے دیکھا تنومند مرد کے ہاتھ میں ایک خنجر تھا اور وہ اس مکروہ صورت عورت کو بالوں سے گھسیٹتا ہوا بستی کی جانب لے جا رہا تھا۔ عورت کے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے تھے' لیکن وہ وحشیانہ انداز میں اچھل اچھل کر مرد کو کاٹنے کی کوشش کر رہی تھی۔

عجیب و غریب مناظر اباقہ کے سامنے آ رہے تھے۔ وہ حیرانی کے عالم میں ان دونوں کے پیچھے چل دیا۔ بستی سے بلند ہونے والے شوروغل کی آوازیں یہاں تک پہنچ رہی تھیں۔ چاند دیکھنے کے بعد نوجوانوں نے جو الاؤ بھڑکایا تھا وہ ابھی تک روشن تھا۔ تنومند مرد اس الاؤ کی روشنی میں پہنچ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر اس کی گرجدار آواز سنائی دی اور لوگ یکلخت خاموش ہو گئے۔ گیتوں کی آواز بھی تھم گئی۔ بلند چٹان پر اباقہ کو سردار یورق اور اس کی بیوی کے ہیولے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ دونوں بھی یہ آواز سن کر کھڑے ہو گئے تھے۔ پھر اباقہ نے دیکھا کہ یورق کے پہلو میں کھڑی عورت چیختی ہوئی تنومند مرد کی طرف بھاگی وہ الاؤ کے قریب پہنچی اور مرد کے پاؤں میں گر گئی۔ اباقہ الاؤ سے چند گز دور تھا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی' لیکن مرد کے پاؤں میں گری ہوئی عورت چیخ چیخ کر کچھ کہہ رہی تھی۔ پھر اباقہ نے دیکھا مرد کا غضب نقطۂ عروج پر پہنچ گیا۔ اس نے بازوؤں میں جکڑی ہوئی جنگلی عورت کو دھکا دیا وہ لڑکھڑاتی ہوئی چند تلوار برداروں کی طرف گئی جنہوں نے اسے پکڑ لیا۔ مرد نے ایک شخص کے ہاتھ سے کوڑا چھینا اور ہجوم پر پل پڑا۔ لوگ چیختے ہوئے اس کے آگے آگے بھاگے۔ مسلح مرد بھی اس کی مزاحمت نہیں کر رہے تھے یوں لگتا تھا وہ بھیڑ بکریوں کے ریوڑ کو ہانک رہا ہے۔ جلد ہی اباقہ سمجھ گیا کہ یہ شخص ان کا گمشدہ

سردار ہے۔ سردار چیختا چلاتا بلند چٹان کی طرف بڑھا۔ چٹان پر سردار یورق حیران کھڑا تھا۔ اس کے عقب میں وہی بوڑھا نظر آرہا تھا جس نے یورق کے سر پر سرداری کی پگڑی رکھی تھی۔ اباقہ لوگوں کے درمیان چلتا ہوا چٹان کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ اس کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ کچھ ہونے والا ہے۔

تنومند مرد نے مقامی زبان میں چلا کر یورق سے کہا۔ "تجھے اس پتھر پر بیٹھنے کی جرأت کیسے ہوئی۔"

یورق کو اس کی بات سمجھ نہیں آئی' لیکن وہ نووارد کے تیور دیکھ کر چٹان سے نیچے اتر آیا۔ اس بار اس جری مرد نے شکستہ فارسی میں یورق کو مخاطب کیا۔

"تجھے اس چٹان پر بیٹھنے کی جرأت کیسے ہوئی اجنبی؟"

سردار یورق سنبھل کر بولا۔ "قبیلے والوں نے سردار بنا کر مجھے یہاں بٹھایا ہے۔"

"ہا.......... قبیلے والے۔" سردار نفرت سے بولا۔ "ان کی تو میں ایسی خبر لوں گا کہ عمر بھر یاد رکھیں گے۔ بجائے اس کے کہ یہ بیوقوف مجھے تلاش کرتے' انہوں نے تجھ ناپاک کو اس مقدس پتھر پر بٹھا دیا۔"

"اپنی زبان کو لگام دو۔" یورق کا پارہ بھی چڑھنے لگا۔

تنومند مرد غرا کر بولا۔ "میرا نام ابابکر خاں ہے اور میری رگوں میں ازبیک خون ہے۔ میں اپنے سامنے اونچا بولنے والے کی زبان گدی سے کھینچ لیتا ہوں۔"

اس کے ساتھ ہی ابابکر خاں کا کوڑا لہرایا اور تڑاخ کی آواز سے یورق کے کندھے پر پڑا۔ یورق نے کوڑا تھامنے کی کوشش کی لیکن ابابکر اسے صفائی سے کھینچ کر واپس لے گیا۔ کوڑے کا دوسرا وار پہلے سے شدید تھا۔ یورق اچھل کر چٹان سے ٹکرایا۔ پھر اس کے حلق سے ایک زخمی غراہٹ برآمد ہوئی اور وہ تیر کی طرح ابابکر خاں کی طرف لپکا لیکن اس وقت دائیں بائیں کھڑے کوئی پندرہ عدد مسلح افراد اس سے لپٹ گئے۔

ابابکر خاں غرایا۔ "ہٹا لو اس بدبخت کو میرے سامنے سے۔"

ایک شخص نے نہایت ادب سے سردار کے کان میں کچھ کہا۔ سردار نے اپنی دائیں جانب دیکھا گرج کر اپنے آدمیوں سے بولا۔ "پکڑ لو اس کو بھی۔" یہ فقرہ اس نے مقامی زبان میں کہا تھا لیکن اباقہ اس کی بات سمجھ رہا تھا۔ اس نے دیکھا چند مسلح آدمی لپکے اور انہوں نے ایک طرف کھڑے سلطان جلال الدین کے گرد بھی گھیرا ڈال لیا۔ اباقہ آہستہ آہستہ پیچھے کی طرف کھسکنے لگا۔ تاریکی میں پہنچ کر اس نے دیکھا چٹان کے سامنے سردار اس بوڑھے پر غضبناک ہو رہا تھا جو ہاتھ باندھے یورق کے پیچھے کھڑا تھا۔ سردار کی آواز پتھروں

سے ٹکرا کر گونج رہی تھی۔

"بابا! تو نے قبیلے کو غلط راہوں پر ڈالا' تو کیسا دانا ہے کیسا روحانی پیشوا ہے اس بستی کا۔ میں اسی بستی کے ایک گھر میں قید رہا اور تو مجھے ڈھونڈ نہ پایا' اس کی بجائے تو نے نیا سردار ڈھونڈ لیا۔"

بوڑھا مغلوب آواز میں بولا۔ "سردار! یہ میرا نہیں جرگے کا فیصلہ تھا۔"

"دیکھ لوں گا میں جرگے کو بھی۔ کہاں ہے وہ جرگہ میرے سامنے آئے۔" سردار چنگھاڑا۔

مجمعے میں ہلچل ہوئی اور چند اور افراد سر جھکائے سردار کے سامنے آگئے۔ سردار پھر گرجا۔ "میں مر تو نہیں گیا تھا.......... کیوں چناؤ کیا تم نے سردار کا؟"

ایک شخص دھیمی آواز میں بولا۔ "سردار! ہمیں گواہیاں ملی تھیں کہ آپ .... آپ ندی میں گر کر جاں بحق ہو گئے ہیں۔"

"کس نے دی تھی گواہی' کہاں ہیں وہ لوگ؟"

ایک شخص نے اس جنگلی عورت کی طرف انگلی اٹھائی جو چند گز کے فاصلے پر تین چار مردوں کی گرفت میں مچل رہی تھی۔ وہ کسی جنگلی گھوڑی کی طرح لمبی تڑنگی اور طاقتور دکھائی دیتی تھی۔

"ٹھیک ہے۔" سردار بولا۔ "اس کے علاوہ اور کون کون تھا؟"

مجمعے میں کھسر پھسر ہونے لگی۔ تادیر گواہ کے طور پر کوئی شخص سامنے نہیں آیا۔ آخر جرگے کا ایک شخص بولا۔ "سردار محترم! دراصل چشم دید گواہ صرف یہی عورت تھی۔"

سردار غضب سے دھاڑا۔ "حرام زادو! ایک عورت کی آدھی گواہی اور اس پر تم سب نے میرے مرنے کا یقین کر لیا۔ کیوں کیا تم نے ایسا؟" اس کا غصہ بے قابو ہو رہا تھا۔ اس نے لپک کر ایک شخص کے ہاتھ سے تلوار لے لی۔ جرگے کا ایک معزز شخص لرزاں آواز میں بولا۔

"سردار! تو ہم سب میں عقل اور روشنی والا ہے ہماری سمجھ اتنی نہیں جتنی تیری ہے۔ ہماری خطا معاف کر۔ ہماری خطا صرف یہ ہے کہ ہم کوشش کے باوجود تیری زندگی کا ثبوت حاصل نہ کر سکے۔"

"نہیں .... نہیں۔" سردار چلایا۔ "تمہاری خطا صرف یہی نہیں۔ تمہاری خطا یہ بھی ہے کہ تم نے میری پاکدامن بیوی پر تہمت لگائی۔ اسے ذلیل و رسوا کیا۔ اسے جادوگرنی قرار دیا اور ایک مردود سے اس کی شادی بھی کر دی۔ میں کیسے معاف کروں تم کو

.... میں ایک ایک کے ٹکڑے کر دوں گا۔" سردار غصے سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ یورق کو دیکھ کر اس کا غصہ اپنی آخری حدوں کو چھونے لگا۔ تلوار لہراتا ہوا وہ اس کی طرف بڑھا۔

"جہنمی شخص! پہلے میں تیرا قصہ پاک کروں گا۔ تو کھیلا ہے میری عزت سے۔"

اس نے تلوار اس انداز سے اٹھائی کہ اباقہ کو لگا یورق کا کام تمام ہو گیا لیکن پھر ایک جھماکہ سا ہوا۔ سردار کی بیوی جو اب یورق کی بیوی تھی تڑپ کر اٹھی اور اپنے سابقہ شوہر کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

"نہیں سردار" وہ چلائی۔ "اس خدا کے بندے نے تیری آبرو کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا ...." وہ ہچکیاں لے لے کر رونے لگی۔ سردار کی تلوار ہوا میں معلق رہ گئی وہ حیرت سے اپنی بیوی کا سراپا دیکھنے لگا۔ سردار یورق متانت سے بولا۔

"ہاں سردار! تو میری جان لینا چاہتا ہے تو لے لے لیکن میں نے تیرے گھر میں تین دن ایک مہذب مہمان کی طرح گزارے ہیں۔ تیری قوم نے اپنی نادانی سے مجھے جو مراعات دے دی تھیں میں نے ان سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا ...." یورق فارسی میں بولا تھا۔ بات سردار کی سمجھ میں آ رہی تھی۔ اس کے غضب میں کمی دکھائی دینے لگی۔ اس کی اٹھی ہوئی تلوار بھی نیچے آ گئی تھی۔ اباقہ کو پہلی بار احساس ہوا کہ یورق میں بگڑے ہوئے معاملے کو سدھارنے کی قدرتی صلاحیت پائی جاتی ہے .... آخر وہ خود بھی ایک منگول قبیلے کا سردار تھا۔ چٹان کے سامنے چند اور باتیں بھی ہوئیں لیکن اباقہ تک ان کی آواز نہیں آئی۔ پھر اباقہ نے سردار ابابکر کو تیزی سے چٹان پر چڑھتے دیکھا۔ اس کا انداز تقریر کرنے والا تھا۔

جرگے کے ارکان آگے بڑھے اور انہوں نے وہ پگڑی جو یورق کے سر سے اتاری تھی' احترام کے ساتھ ابابکر کے سر پر پہنا دی۔ اس کی بارعب آواز پتھروں میں گونجی۔

"قبیلے والو! میں زندہ سلامت تمہارے سامنے کھڑا ہوں اور میں تمہیں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ میری گمشدگی میں میری عورت کا کوئی دخل نہیں تھا۔ مجھے اس پر کامل بھروسہ ہے' وہ میری وفادار تھی اور وفادار ہے۔ اس نے مجھ پر کوئی سحر نہیں کیا۔ اگر تم لوگ یہ سمجھتے ہو کہ میری دوسری شادی نہ کرنے کی وجہ اس عورت کا سحر ہے تو اپنی غلط فہمی دور کر لو۔ آج میں تمہیں بتاتا ہوں .... یہ عورت ہزار بار میرے پاؤں پکڑ کر مجھ سے دوسری شادی کی درخواست کر چکی ہے .... لیکن یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ تقدیر کا لکھا اٹل ہے۔ اگر میری قسمت میں اولاد نہیں تو میں قبیلے کی ساری تندرست لڑکیوں سے شادی کر کے بھی بے اولاد رہوں گا .... مجھ پر کسی کا کوئی جادو ہے اور نہ

ہی میری گمشدگی کسی جادو کا نتیجہ تھی۔" سردار نے رک کر جنگلی عورت کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ فاحشہ عورت۔ جس کی جھوٹی گواہی پر تم نے مجھے مردہ تصور کر لیا میری گمشدگی کی اصل ذمہ دار ہے۔ اگر اس بستی میں کوئی جادو گرنی ہے تو یہ عورت ہے۔ یہی عورت ہے جو بے چین بدروح کی طرح اس بستی کی گلیوں میں گھومتی رہتی ہے اسی عورت نے تمہارے سردار کو بے ہوش کر کے رسیوں میں جکڑ رکھا تھا۔ میں پورے دو ماہ اس خبیث کے شکنجے میں رہا ہوں۔ یہ بدکردار عورت تمہارے سردار کا دامن گناہوں سے آلودہ کرنا چاہتی تھی لیکن میرے خدا نے مجھے اس کے شر سے محفوظ رکھا۔ آج میں اس کا حصار توڑنے میں کامیاب ہو گیا ...."

بہت سی آوازیں گونجیں۔ "سنگسار کر دو اسے .... سنگسار کر دو۔"

سردار نے بلند آواز سے کہا۔ "ہاں .... اس کی سزا سنگسار سے کم نہیں' لیکن یہ خوشی کا موقعہ ہے' میں چاند رات کو اس کریہہ منظر سے داغدار کرنا نہیں چاہتا۔"

ایک شخص پکار کر بولا۔ "........ لیکن جھوٹی گواہی دینے والی اس بدکار عورت کو زندہ رکھنا ہمیں منظور نہیں۔"

"ہاں ہمیں منظور نہیں۔" بہت سی آوازوں نے ہم آہنگ ہو کر کہا۔ سردار نے ہاتھ اٹھا کر لوگوں کو خاموش ہونے کا حکم دیا۔ پھر ایک طرف جھک کر بوڑھے سے کچھ مشورہ کرنے لگا۔ جرگے کے ارکان کو بھی اس گفتگو میں شریک کیا گیا۔ مشورے کے بعد سردار بلند آواز سے بولا۔ "جرگے کے مشورے سے میں اس منحوس عورت کو "غلاف" کی سزا دیتا ہوں۔"

سزا کا سن کر لوگوں نے پُرجوش نعرے لگائے۔ اباقہ نے دیکھا جنگلی عورت نے بری طرح مچلنا شروع کر دیا۔ پھر دفعتاً وہ مسلح افراد کی گرفت سے آزاد ہوئی اور شیر کی طرح سردار ابابکر کی طرف لپکی۔ اس کے پشت پر بندھے ہوئے ہاتھ آزاد نظر آ رہے تھے۔ شاید سردار نے انہیں مضبوطی سے نہیں باندھا تھا۔ ایک جست کے ساتھ وہ چٹان پر چڑھی اور ابابکر سے لپٹ گئی۔ ساتھ ساتھ وہ خوفناک انداز میں چیخ رہی تھی۔ اس کی انگلیاں ابابکر کی آنکھیں پھوڑنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ سردار نے پہلو بچا کر نہایت قوت سے اسے دھکا دیا اور وہ اڑتی ہوئی چٹان سے نیچے گری۔ اس سے پہلے کہ وہ پھر اٹھتی' مسلح افراد نے اسے دوبارہ گرفت میں لے لیا۔ چند آدمی ایک بڑا سا سیاہ غلاف لے کر آئے اور پھرتی سے عورت کے سر پر ڈال دیا۔ اباقہ نے دیکھا اس غلاف پر کئی جگہ چھوٹے چھوٹے پیوند لگے ہوئے تھے۔ ایک ڈوری کھینچ کر غلاف کا منہ بند کر دیا گیا۔ اب

وہ عورت اس سیاہ غلاف کے اندر مچل رہی تھی لیکن باہر نہیں نکل سکتی تھی۔ اس کی مکروہ چیخیں دور دور تک سنائی دے رہی تھیں۔ پھر اباقہ نے دیکھا ایک تنومند شخص ایک وزنی ہتھیار اٹھائے ہوئے سامنے آیا۔ یہ ہتھیار بڑے پھل کے ایک طویل نیزے جیسا تھا۔ عورت کے تڑپنے میں اب بہت شدت آچکی تھی۔ پھر ایک فلک شگاف نعرے کے ساتھ اس شخص نے یہ نیزا عورت کے جسم میں پیوست کر دیا۔ وار اتنا شدید تھا کہ بھاری بھرکم نیزا عورت کے جسم سے پار ہو کر زمین میں دھنس گیا۔ لوگوں نے پُرجوش آوازے بلند کئے۔ نیزے میں پرویا ہوا عورت کا جسم کافی دیر تڑپتا رہا' پھر اس شخص نے نیزا کھینچ کر باہر نکالا۔ غلاف میں ایک خون آلود سوراخ ہو چکا تھا۔ شاید ایسے ہی سوراخوں پر پیوند لگائے گئے تھے۔ چار آدمی آگے بڑھے اور بے حس و حرکت غلاف کو اٹھا کر میدان سے باہر لے گئے۔ میدان پہلے کی طرح صاف ہو گیا۔

اس وقت ایک بوڑھی عورت بال کھولے اور جھولی پھیلائے آگے آئی اور سردار کے نام کی دہائی دینے لگی۔ سردار نے عورت کا مدعا پوچھا۔ عورت نے سلطان جلال الدین کی طرف انگلی سیدھی کی اور پکار کر بولی۔

"سردار! یہ شخص میرے اکلوتے بیٹے کا قاتل ہے۔ میں چند روز بعد اس بدنصیب کی دلہن لانے والی تھی لیکن وہ اس کے تیر کا نشانہ بن گیا۔ اسے بے قصور مارا گیا سردار۔ جس رات پتہ چلا کہ کچھ اجنبی مہمان بستی کی طرف آرہے ہیں اور ان میں سے کسی ایک کو سردار چنا جائے گا تو بستی کے کچھ نوجوان ان مہمانوں کی شکل دیکھنے کے لیے جنگل میں چلے گئے۔ میرا بیٹا بھی ان میں شامل تھا۔ اس نے کسی پر حملہ نہیں کیا' کسی کو نقصان نہیں پہنچایا' ایک درخت سے ان لوگوں کو دیکھ رہا تھا کہ اس شخص نے تاک کر ایسا تیر مارا کہ وہ دوسرا سانس نہ لے سکا۔ بستی میں پہنچتے ہی ان لوگوں کو سرداری مل گئی اور میں دکھیاری صبر کا گھونٹ پی کر رہ گئی .... لیکن اب خدا نے تیرا سایہ پھر ہمارے سروں پر قائم کر دیا ہے' میں تجھ سے انصاف مانگتی ہوں سردار.........."

عورت مسلسل بول رہی تھی اور اباقہ کی نظروں میں وہ منظر گھوم رہا تھا۔ جب سلطان جلال الدین درختوں میں نوجوان کی لاش دیکھ رہا تھا اور اس کے ہونٹوں پر یہ فقرہ تھرتھرا رہا تھا۔ "اے خدا! مجھ پر رحم کر۔"

"میں اس مقدمے کا فیصلہ عید سے دو روز بعد تک اٹھا رکھتا ہوں۔ میں آپ لوگوں کو یقین دلاتا ہوں کہ جرم ثابت ہونے پر مجرم کو قرار واقعی سزا دی جائے گی' اور اسی بستی میں دی جائے گی۔ مجرم کو راجی خاتون کے حوالے نہیں کیا جائے گا۔ معاہدے کی رو سے

ہمیں اس بات کا مکمل اختیار ہے کہ ایسے اجنبی کو جو ہمارا مجرم ہو ہم خود سزا دے سکیں۔

ایک شخص نے مجمعے میں سے پوچھا۔ "سردار اس کا مطلب ہے کہ باقی دو اجنبیوں کو راجی خاتون کے سامنے پیش کر دیا جائے گا۔"

"ہاں بالکل ایسا ہی کرنا ہو گا۔" سردار نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "جرگے نے یہ تسلیم کیا ہے کہ ان کا فیصلہ غلط تھا۔ ان لوگوں کو راجی خاتون سے پوشیدہ رکھ کر تم لوگ بہت بڑی غلطی کر رہے تھے۔ مجھے تمہاری نادانیوں پر حیرت ہوتی ہے' کیا تم یہ سمجھتے تھے کہ تین افراد کی موجودگی سے راجی خاتون بے خبر رہے گی۔ کبھی نہیں۔ راجی خاتون کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ اس وادی کا ہر پتھر اس کا کان ہے اور ہر درخت کا پتہ اس کی آنکھ ہے۔ راجی خاتون بہت جلد جان جاتی کہ بستی کا نیا سردار کون ہے اور اس کے ساتھی کہاں ہیں۔ پھر تم لوگوں کا جو حشر ہوتا اس کا سوچ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو رہے ہیں .... بہت بڑی غلطی کر رہے تھے تم لوگ۔"

سردار کی تقریر جاری تھی' تقریر کا رخ دیکھ کر اباقہ نے دوبارہ آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنا شروع کر دیا تھا۔ اب وہ نشیب کی چٹانوں میں پہنچ چکا تھا۔ سردار کی مدھم آواز یہاں تک بھی پہنچ رہی تھی وہ کہہ رہا تھا۔ "ان اجنبیوں کو راجی خاتون کے حوالے کیا جائے گا۔ ہم معاہدے سے کسی صورت انحراف نہیں کریں گے .... ان کے تیسرے ساتھی کو فوراً تلاش کیا جائے تاکہ ہمیں راجی خاتون کے سامنے جھوٹا نہ ہونا پڑے۔" سردار کی آواز اب بالکل مدھم پڑ چکی تھی۔ اباقہ چٹانیں پھلانگتا ہوا تاریکی میں کافی دور نکل آیا تھا۔

☆======☆======☆

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ چٹان کے سامنے چاند رات کا جشن منانے کے بعد بستی والے گہری نیند سو رہے تھے۔ بس کبھی کبھی کسی گھر کے صحن سے بکری کے ممیانے یا بھیڑ کے بولنے کی آواز آجاتی۔ رویت ہلال کا اعلان کرنے والا الاؤ گرم راکھ میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اس سے تھوڑی دور وہ ہموار جگہ تھی جہاں جنگلی عورت کو موت کی سزا دی گئی تھی۔ ماحول کو دیکھ کر بالکل اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ یہاں کچھ دیر پہلے ہنگامہ ہائے ہو برپا رہ چکا ہے۔ اباقہ محتاط قدموں سے چلتا اس غار کی طرف بڑھ رہا تھا جہاں سلطان جلال الدین کو قید کیا گیا تھا۔ یہ غار سردار کے گھر سے چند گز کے فاصلے پر تھا۔ رات اباقہ نے چند آدمیوں کو دیکھا تھا جو سلطان کو غار میں بند کر کے دہانے پر ایک بھاری پتھر رکھ گئے تھے۔ یورق کو سردار اپنے ساتھ گھر لے گیا تھا لیکن ظاہر ہے اسے نقل و حرکت کی آزادی نہیں ہو گی۔ سلطان کو اس مصیبت سے نجات دلانے کے لیے اباقہ ہی کو کچھ کرنا تھا۔

وہ بلی کی چال چلتا غار کے دہانے پر پہنچ گیا۔ اس نے دیکھا دو صحت مند افراد پہرہ دینے والے انداز میں دہانے کے سامنے ٹہل رہے ہیں۔ دونوں کی تلواریں نیام میں تھیں۔ اباقہ کسی قسم کا شوروغل نہیں چاہتا تھا۔ اس نے پتھروں کی اوٹ میں ہو کر ہونٹوں سے سیٹی کی آواز نکالی۔ آواز سن کر ایک پہریدار محتاط قدموں سے اس کی طرف بڑھا۔ شاید یہ اس کا بڑھا ہوا اعتماد تھا کہ اس نے ابھی تک تلوار نہیں نکالی تھی۔

"کون؟" اس کے منہ سے اتنا ہی نکل پایا تھا کہ اباقہ نے اسے چھاپ لیا اس نے حیران کن پھرتی سے دونوں کہنیاں اباقہ کے پیٹ میں ماریں۔ وار اتنا شدید اور اچانک تھا کہ اگر اباقہ کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اپنی گرفت قائم نہ رکھ سکتا۔ پھر بھی اباقہ کے منہ سے ایک بے ساختہ کراہ نکل گئی۔ اس نے طیش میں آ کر مدمقابل کو پیچھے سے دھکا دیا اور اس کی پیشانی پتھروں سے ٹکرائی۔ وہ ایک ہلکی سی چیخ کے ساتھ اباقہ کے بازوؤں میں لہرا گیا۔ اباقہ نے اسے اطمینان سے نیچے لٹا دیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ سیدھا ہوتا کوئی دھم سے اس کی پشت پر آ رہا۔ اباقہ اوندھے منہ پتھروں پر گرا لیکن بجلی کی طرح تڑپ کر سیدھا ہو گیا۔ دوسرے پہریدار کا پہلا وار اباقہ نے ہوا میں خالی دیا۔ دوسرے وار سے پہلے وہ اپنی تلوار نکال چکا تھا۔ مدمقابل انداز سے ماہر شمشیر زن لگتا تھا اور خاصا پُر جوش بھی تھا۔ اس نے لپک کر اباقہ کے سر کو نشانہ بنایا۔ اباقہ نے جھک کر یہ وار خالی جانے دیا۔ دوسرا وار اچٹتا ہوا ایک پتھر پر لگا اور سنگ و آہن کے ملاپ سے چنگاریاں سی پھوٹیں۔ اباقہ کے ہاتھ میں تلوار تھی لیکن وہ تلوار سے تلوار ٹکرا نہیں سکتا تھا۔ لوہے کی جھنکار فوراً سردار کے آدمیوں کو بیدار کر دیتی۔ اباقہ کے دفاع نے مدمقابل کو اور شیر کر دیا تھا۔ شاید وہ سمجھ رہا تھا کہ اباقہ کو تلوار چلانا ہی نہیں آتی۔ پھر جونہی اس نے غلط فہمی میں ایک ڈھیلا ڈھالا وار کیا۔ کوہ الطائی کا پالا ہوا بے مثال "لڑاکا" حرکت میں آیا۔ بجلی کی سرعت سے اس نے ایک خوفناک ٹکر پہریدار کے منہ پر رسید کی۔ "کھٹاک" کی آواز آئی اور پہریدار ہلکی سی آواز بھی نکالے بغیر اپنے ساتھی پر ڈھیر ہو گیا۔ اباقہ نے جھک کر دونوں کو دیکھا پھر تیزی سے دہانے کی طرف لپکا۔ پتھر نہایت وزنی تھا اور پوری طرح دہانے کو ڈھانپ چکا تھا۔ سانس کی آمدورفت کے لیے شاید کوئی معمولی سی درز موجود ہو لیکن دیکھنے میں دہانہ بالکل بند دکھائی دیتا تھا۔ اباقہ نے سرگوشی کے انداز میں سلطان کو آوازیں دیں۔ اندر سے کوئی جواب نہیں آیا۔ اباقہ نے آواز ذرا بلند کی لیکن اس کے باوجود کوئی صدا نہیں آئی۔ جب سلطان کو قید کیا جا رہا تھا تو اس وقت اباقہ نے سنا تھا' ابابکر کے آدمی غار کے باہر سے سلطان سے بات کر رہے تھے۔ پتھر اس وقت بھی دہانے پر موجود تھا۔ پھر اب سلطان تک آواز

کیوں نہیں پہنچ رہی تھی۔ اباقہ بے قرار سا ہو گیا۔ خدانخواستہ سلطان کو کوئی گزند تو نہیں پہنچ گئی تھی۔ اگر سلطان سو بھی جاتا تو اتنی آوازوں سے اسے جاگ جانا چاہیے تھا۔ اباقہ نے بے چینی کے عالم میں چاروں طرف سے چٹان کا جائزہ لیا۔ اسے ہلانے کے لیے کم از کم چار آدمیوں کی ضرورت تھی۔ اس نے کچھ سوچا اور جلدی جلدی اپنی انگلیوں اور ناخنوں سے چٹان کے نیچے کی مٹی نکالنے لگا۔ اس کے عمل میں انتہا درجے کی تیزی اور طاقت تھی۔ اس دوران وہ گاہے بگاہے رک کر سلطان کو آواز بھی دے لیتا تھا۔ جواب نہ پا کر اس کے ہاتھ مزید تیزی سے متحرک ہو جاتے۔ تھوڑی ہی دیر میں اس نے چٹان کے نیچے سے مٹی نکال کر ایک چھوٹا سا ڈھیر لگا دیا۔ تب اس نے اپنی چوڑی پشت پتھریلی دیوار سے لگائی اور چٹان کا ایک ابھرا ہوا کونہ تھام کر پوری قوت سے دھکیلنے لگا۔ اس کے گلے کی رگیں پھولی ہوئی تھیں اور آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ بالآخر ایک سرسراہٹ کے ساتھ بھاری بھرکم چٹان نے اپنی جگہ چھوڑ دی۔ ایک گڑگڑاہٹ کے ساتھ وہ پہلو کے بل نیم پختہ زمین پر گری اور ایک قلابازی کھا کر ساکت ہو گئی .... اباقہ دیوانہ وار اندر گھسا۔

"سلطان .... سلطان!" وہ اندھوں کی طرح تاریکی میں ہاتھ پاؤں چلاتا ہوا بولا۔

بالآخر اس کے ہاتھ کسی زندہ جسم سے ٹکرائے۔ دہانے سے آنے والی تاروں کی مدھم روشنی میں اس نے دیکھا' سلطان کا ہیولا بالکل بے حس و حرکت تھا۔ خوارزم کا مجاہد بادشاہ اس پتھریلے فرش پر رات کے آخری پہر دو زانو بیٹھا تھا۔

سلطان نرم آواز میں بولا۔ "نہیں اباقہ! جب تک جلال الدین اپنی زندگی کا آخری مقصد پورا نہیں کرتا وہ نہیں مرے گا .... میں نے اپنی تمام شکستوں' محرومیوں کا اجر خدا سے صرف ایک ہی مانگا ہے .... اور وہ ہے اس ملعون کافر اعظم فیروز کے قتل کا شرف ...."

اباقہ بولا۔ "لیکن سلطان! میری آوازوں کا آپ نے جواب کیوں نہیں دیا تھا؟"

سلطان نے کہا۔ "اباقہ! جب میرے غم حد سے بڑھ جاتے ہیں تو میں ایک ایسے عمل میں مصروف ہو جاتا ہوں جو مجھے ہر دکھ و پریشانی سے بیگانہ کر دیتا ہے۔ میں اپنے غمزدہ ماحول سے بہت دور نکل جاتا ہوں .... بہت دور۔"

اباقہ نے پوچھا۔ "سلطان! وہ کیا عمل ہے جو ...." ابھی اباقہ کی بات منہ میں تھی کہ اچانک دہانے پر آہٹ سنائی دی۔ اباقہ اور سلطان جلال نے ایک ساتھ مڑ کر دیکھا۔ دہانے پر ایک ہیولا دکھائی دے رہا تھا۔ دہانے سے آنے والی مدھم روشنی میں نظر آ رہا تھا کہ آنے والا ایک کرانڈیل شخص ہے اور وہ خالی ہاتھ بھی نہیں تھا۔ اس کے ہاتھ میں پکڑے

اوزار کی چمک اباقہ اور سلطان دونوں محسوس کر سکتے تھے۔

"سردار ابابکر۔" اباقہ کے ذہن میں بجلی کی طرح یہ خیال کوندا' یقیناً پتھر لڑھکنے کی آواز نے سردار کے آدمیوں کو خبردار کر دیا تھا۔ اباقہ کا ہاتھ خودبخود اپنی ترکی تلوار کے قبضے پر چلا گیا۔ وہ تیزی سے اٹھا اور سلطان اور ابابکر کے درمیان کھڑا ہو گیا۔ وہ سمجھ رہا تھا غصیلا سردار کسی بھی وقت لپک کر سلطان پر حملہ آور ہو سکتا ہے .... لیکن سردار بالکل بے حرکت کھڑا رہا پھر اباقہ نے دیکھا کہ چار پانچ مسلح افراد مشعلیں اٹھائے دہانے پر آ کر کھڑے ہو گئے۔ تنگ و تاریک غار روشن ہو گیا۔ سردار کے ہاتھ میں چمکنے والا اوزار ایک بھاری بھر کم نیزہ تھا۔ ویسا ہی نیزہ جس نے چٹان کے سامنے جنگلی عورت کا کام تمام کیا تھا۔

اباقہ کی سرد آواز غار میں گونجی۔ "سردار! میرا نام اباقہ ہے اور میں اس غار میں آگے بڑھنے والا ہر قدم کاٹ ڈالوں گا۔"

سردار کے جسم میں اب بھی کوئی جنبش نہیں ہوئی اور اس وقت اباقہ نے دیکھا سردار کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ ایک ٹک سلطان جلال کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر بھرائی ہوئی آواز اس کے حلق سے نکلی۔ "آپ شیر خوارزم جلال الدین ہیں؟ خدا کی قسم مجھے اپنی آنکھوں پر اور اپنی قسمت پر یقین نہیں آ رہا۔" وہ یہ کہتا ہوا تیزی سے لپکا اور جلال الدین کے قدموں میں گر گیا۔

وہ ہچکیاں لے لے کر رو رہا تھا۔ سلطان جلال نے اسے بہ آہستگی اٹھایا۔ وہ سلطان کے ہاتھ چوم چوم کر آنکھوں سے لگانے لگا۔ "سلطان عالی سلطان عالی! مجھ بدنصیب کو اس طرح آپ کی زیارت نصیب ہو گی میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ میں کس طرح آپ کو خوش آمدید کہوں .... سلطان عالی مجھے معاف کر دیں۔ بے خبری میں مجھ سے جو گستاخیاں ہوئی ہیں مجھے معاف کر دیں۔"

سردار! بابکر کا انداز نہایت جذباتی تھا۔ سلطان دھیرے دھیرے اس کی پیٹھ تھپتھپاتا رہا۔ پھر اس نے ابابکر سے کہا۔ "اپنے ان آدمیوں کو سمجھا دو کہ اس واقعے کا ذکر بستی میں کسی سے نہ کریں۔ انہیں واپس بھیج دو اور میرے پاس آ کر بیٹھو میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

اباقہ سلطان کے حکم کا ترجمہ کرنا چاہتا تھا لیکن اس کی نوبت نہیں آئی۔ سردار جو اپنے قبیلے کے برعکس پڑھا لکھا شخص تھا' سلطان کی زبان سمجھ رہا تھا۔ وہ تیزی سے مڑا اور اپنے آدمیوں کو لے کر باہر نکل گیا۔

☆------☆------☆

درحقیقت سردار ابابکر پتھر لڑھکنے کی آواز سن کر گھر سے باہر نکلا تھا۔ پھر اس نے اباقہ اور سلطان کے درمیان ہونے والی گفتگو سنی اور سلطان کے بارے میں جان گیا۔ وہ خوارزم میں برسرپیکار مسلمانوں کے اس عظیم مجاہد کے بارے بہت کچھ سن چکا تھا اور اس کا غائبانہ عقیدت مند تھا۔ سلطان کی اصلیت جاننے کے بعد سردار ابابکر نے جو سب سے پہلا کام کیا وہ یہ تھا کہ مقتول نوجوان کے وارثوں کو راضی کر کے اپنی گرہ سے اس کا خون بہا ادا کیا۔

سلطان نے اسے سمجھا دیا کہ بستی میں کسی کو اس کی اصلیت کا پتہ نہ چلے اور ان تینوں کو پہلے کی طرح قیدیوں کی حیثیت سے راجی خاتون تک پہنچا دیا جائے۔

سردار ابابکر نے بڑے جوشیلے انداز میں کہا۔ "سلطان عالی! ہم راجی خاتون کے مقابلے میں بہت کمزور ہیں لیکن اگر آپ کا حکم ہو تو یہ سارا قبیلہ عورتوں اور بچوں سمیت تلواریں سونت کر آپ کے ساتھ چل پڑے اور قسم کھا کر عہد کرے کہ ان میں سے ایک بھی دشمن کو پیٹھ نہیں دکھائے گا۔ دشمن کو مار ڈالے گا یا شہادت کا مرتبہ پائے گا۔"

سلطان نے جواب میں ابابکر کے جذبے کی تعریف کی لیکن کہا۔ "ابابکر ابھی اس کا وقت نہیں آیا اگر کبھی ضرورت پڑی تو میں تمہارے جذبات کو یاد رکھوں گا۔ فی الحال تم ہمیں قیدیوں کی حیثیت سے وہاں پہنچا دو۔"

ابابکر نے اس حکم پر سر تسلیم خم کیا۔ صبح عید تھی۔ ان تینوں نے قبیلے کے لوگوں میں گھل مل کر عید کا تہوار منایا۔ اگلے روز سردار ابابکر پندرہ آدمیوں کے ساتھ اباقہ' یورق اور سلطان جلال کو لے کر "کالے پہاڑوں" کی طرف روانہ ہو گیا۔

سنگلاخ ویرانے میں یہ ایک دشوار گزار سفر تھا۔ جوں جوں وہ آگے بڑھتے گئے پہاڑوں پر سے سبزہ غائب ہوتا گیا۔ پانی ان کے پاس وافر تھا ورنہ سفر جاری رکھنا ممکن نہ ہوتا وہ سب کے سب سانڈنیوں پر سوار تھے۔ سلطان اباقہ اور یورق کے ہاتھ پشت پر باندھ دیے گئے تھے۔ ایک ایک مسلح آدمی ان کے عقب میں سوار تھا۔ وہ خشک برساتی نالہ جس کے چوڑے پاٹ میں سفر کرتے ہوئے وہ ابابکر کے ٹیلے تک پہنچے تھے اب ایک تنگ کھائی کی صورت اختیار کر چکا تھا۔ پھر یہ کھائی بھی ایک نالی کی صورت پہاڑی بھول بھلیوں میں معدوم ہو گئی۔ اباقہ نے محسوس کیا کہ اس جگہ سے آگے پہاڑوں کی چٹانیں سیاہی مائل نظر آنے لگی ہیں۔ جوں جوں وہ آگے بڑھتے رہے سورج کی تمازت میں جھلسے ہوئے سیاہ پتھروں کا رنگ گہرا ہوتا چلا گیا۔ سبزہ عنقا ہو چکا تھا۔ گرمی اتنی تھی کہ الامان والحفیظ۔ اب اباقہ کو سمجھ آ رہی تھی کہ راجی خاتون نے اس ویرانے میں ڈیرہ کیوں لگا رکھا تھا۔ راستے کا شناور ہوئے بغیر اس سیاہ جہنم میں سفر کرنا موت کو دعوت دینا تھا۔ اگر ابابکر اور اس کے

آدمی ساتھ نہ ہوتے تو اباقہ وغیرہ کبھی راحی خاتون تک نہ پہنچ پاتے۔

دوسرے روز دوپہر سے کچھ قبل ایک جگہ ابابکر نے اپنے آدمیوں کو پڑاؤ ڈالنے کا حکم دیا۔ وہ اپنی اونٹنی چلا کر اباقہ اور سلطان کے قریب آیا اور بولا۔

"غروب آفتاب سے پہلے ہم آگے سفر نہیں کر سکتے۔"

اس سے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ ان پہاڑوں میں چند کوس کا فاصلہ ایسا ہے جہاں گرمی ناقابل برداشت ہوتی ہے۔ دوپہر کے وقت سنگلاخ چٹانوں سے خارج ہونے والی حرارت اتنی زیادہ ہو جاتی ہے کہ مسافر کے بال جلنے لگتے ہیں اور وہ دم گھٹ کر مر جاتا ہے۔ اس علاقے کو وہ لوگ اپنی زبان میں "آگ کا راستہ" کہتے ہیں۔ "آگ کا راستہ" راحی خاتون اور ابابکر کے قبیلے کے درمیان حد فاصل کا کام دیتا تھا۔

ابابکر کی ہدایت پر ان سب نے ایک چٹان کے سائے تلے قیام کیا۔ ان تینوں کے ہاتھ اب کھول دیئے گئے تھے کیونکہ اس ویرانے میں پانی کے بغیر سزائے موت کا قیدی بھی فرار ہونے کا نہیں سوچ سکتا تھا۔ اباقہ بھی دوسروں کی طرح ایک جگہ لیٹ کر سستانے لگا۔ تمازت لحہ بہ لحہ بڑھتی جا رہی تھی۔ بالکل جیسے کوئی طوفان آہستہ آہستہ شدت پکڑتا ہے۔ قافلے والے سہمے ہوئے آنکھیں بند کئے لیٹے تھے۔ ہر جسم پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ ہوا کا کہیں گزر نہیں تھا لیکن اس جہنمی گرمی سے کہیں زیادہ تپش اباقہ کے سینے میں تھی۔ سنگلاخ فرش پر لیٹتے ہی ماریتا کی یاد ذہن میں آدھمکی تھی۔ بغداد کی خشک فضا میں دجلہ کے کنارے کتنی ریشمی راتیں اس نے ماریتا کے ساتھ ایک گھر میں گزاری تھیں۔ وصل ان دنوں کتنا آسان تھا لیکن پھر بھی کتنا مشکل رہا۔ شاید اگر یاکی نہ آجاتی تو کسی دن کوئی جذباتی لحہ ان دونوں کو ایک دوسرے کے قریب لے آتا۔ اباقہ کو یاد آیا یاکی کے آنے سے پہلے ماریتا اس کا کتنا خیال رکھا کرتی تھی۔ ہر وقت اس کے کاموں میں جتی رہتی تھی اور وہ دن .... وہ دن تو اباقہ کے ذہن میں نقش ہو گیا تھا جب علی الصبح اباقہ اور اسد اللہ شکار پر جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ اباقہ نے ایک ایسی قمیص پہن لی تھی جس کا گریبان اُدھڑا ہوا تھا۔ ماریتا نے پردے کے پیچھے سے آواز دے کر اسے اندر بلایا تھا۔ اس کی سنجیدہ آنکھوں میں ہلکی سی شوخی نظر آ رہی تھی۔ کھنکتی ہوئی آواز میں بولی تھی۔

"ایک بوڑھی خادمہ کئی روز سے کہہ رہی ہے کہ وہ کسی بچے کو گود لینا چاہتی ہے۔ میں آج اسے کہوں گی کہ وہ تمہیں گود لے لے۔ دیکھنے میں تم بڑے ہو لیکن کچھ ایسے بڑے بھی نہیں ہو۔"

اباقہ نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو ماریتا نے اس کے اُدھڑے ہوئے

گریبان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔ "اس طرح گھر سے باہر نکلو گے تو لوگ سمجھیں گے گھر والوں نے مار مار کر شکار پر بھیجا ہے کہ جاؤ شکار کر کے لاؤ ورنہ روٹی نہیں ملے گی۔" پھر ماریتا نے سوئی دانتوں میں دبا کر اُدھڑا ہوا گریبان برابر کیا تھا اور پھر.........

وہ شاید اسے سینے لگی تھی لیکن اباقہ کا ذہن ہواؤں میں اڑ رہا تھا۔ اسے صرف اتنا معلوم تھا کہ ماریتا کا مہکا ہوا بدن اس کے قریب ہے اور اس کی نازک انگلیاں اس کے سینے پر گردش کر رہی ہیں۔ وہ یک ٹک اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ آخر ماریتا نے دانتوں میں دبا کر دھاگا توڑا تھا اور ناراض نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی تھی لیکن ان ناراض نظروں میں بھی ایک طرح کا پیار شامل تھا۔

وہ دن ایسے ہی چھوٹے چھوٹے خوبصورت واقعات سے مزین تھے اور پھر سردار یورق' یاکی کو لے آیا تھا۔ یاکی کی آمد کے بعد ماریتا کا رویہ بتدریج کھچاؤ کا ہو گیا تھا .... اور پھر ایک منحوس دوپہر کو وہ اس سے جدا ہو گئی تھی۔ اس کے بعد اباقہ نے اسے مقبوضہ خوارزم میں دیکھا تھا جب وہ منگول سفارتکاروں کی ٹھوکروں میں تھی۔ اباقہ کو اس تک پہنچنے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا لیکن تقدیر پھر آڑے آئی تھی۔ ایک دوراہے پر وہ پھر اس سے جدا ہو گئی تھی۔ وہ اسے خود جدا ہوتے دیکھتا رہا لیکن کچھ نہ کر سکا۔ آسمان نے کیسا کڑا امتحان لیا تھا اس کی محبت کا۔

وہ زیر لب پکار اٹھا۔ "میں تیرا گناہ گار ہوں ماریتا .... میں تیرا مجرم ہوں۔"

دفعتاً ایک آواز سن کر اباقہ چونک گیا۔ اس نے دیکھا سلطان جلال چپکے سے آ کر اس کے قریب بیٹھ گیا ہے اس کا بارعب چہرہ گرمی کی شدت سے تمتما رہا تھا۔ لباس پسینے سے تربتر تھا۔ کچھ دیر وہ خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔ "اباقہ مجھے تیرے ساتھی یورق نے بتایا ہے کہ تیری افسردگی اور خاموشی کا سبب کوئی ماریتا نامی عورت ہے۔ تو نے راستے میں اسے کہیں کھو دیا ہے۔"

سلطان کے ہمدردانہ لہجے پر اباقہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ بولا۔ "ہاں سلطان! اس عورت نے میری خاطر دنیا کے سب سے جابر حکمرانوں کی دشمنی مول لی۔ قراقرم چھوڑ کر وہ میرے ساتھ چلی آئی .... لیکن میں اس کی آبرو کی حفاظت نہ کر سکا .... اس مہربان عورت کا غم میرے جسم میں زہر کی طرح پھیل گیا ہے سلطان۔ میں دن رات انگاروں پر لوٹتا ہوں۔ مجھے کسی کروٹ چین نہیں ہے ...."

سلطان نے آہستگی سے اباقہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس مہربانی پر اباقہ کے صبر کا بند ٹوٹ گیا اور وہ ہچکیاں لے لے کر رونے لگا۔ بالکل ایک نادان بچے کی طرح' سلطان

نے بازو بڑھایا اور اس کے الجھے ہوئے لمبے بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ اس کی آواز ابھری۔

"اباقہ! جب غم حد سے بڑھ جاتے ہیں تو کافر لوگ شراب پیتے ہیں' رقص و سرود کی محفلیں سجاتے ہیں' لیکن مسلمان غم کی انتہا میں اپنے خدا کی طرف رجوع کرتا ہے .... وہ قبلہ کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو جاتا ہے۔ کانوں کو ہاتھ لگا کر اللہ اکبر کہتا ہے اور "اللہ اکبر" کہہ کر سب کچھ بھول جاتا ہے۔ اس عمل کو نماز کہتے ہیں۔"

"نماز؟" اباقہ نے زیر لب دوہرایا۔

"ہاں نماز۔ تمہیں یاد ہے چند روز پہلے جب تم مجھے غار سے باہر کھڑے ہو کر آوازیں دے رہے تھے اور میں خاموش تھا۔ اس وقت میں نماز ہی ادا کر رہا تھا۔ ایک وقت تھا اباقہ جب مجھے بھی رنج و فکر نے مغلوب کر لیا تھا۔ جگر چھلنی کر دینے والے آلام سے گھبرا کر میں نے ہاتھ میں جام پکڑ لیا تھا اور اپنی بصارت و سماعت کو ناچ گانے میں الجھانے کی کوشش کی تھی لیکن یہ سب جھوٹے سہارے ثابت ہوئے۔ غم کا حقیقی مداوا یہی عمل ہے اباقہ جو میں نے تجھے بتایا ہے۔"

اباقہ نے کہا۔ "سلطان! لیکن مجھے تو نماز پڑھنا نہیں آتی۔"

سلطان نے کہا۔ "تو اٹھو۔ میرے ساتھ آؤ۔ شاید تمہاری جبیں سے پہلا سجدہ اسی سنگلاخ زمین پر ادا ہونا ہے۔ آؤ جیسے میں کرتا ہوں ویسے کرتے جاؤ۔"

اباقہ معمول کی طرح سلطان کے پیچھے چل دیا۔ سلطان نے مٹی کے ساتھ تیمم کیا اور ایک پتھر کے سائے میں کھڑا ہو گیا۔ اباقہ نے بھی یہی عمل دوہرایا۔ وہ خاموشی سے سلطان کے پیچھے کھڑا ہو گیا اور اس کی حرکات کی نقل کرنے لگا۔

آخر سلطان نے سلام پھیرا اور اباقہ سے بولا۔ "اب ہاتھ اٹھا کر خدا سے دعا مانگو۔ وہ سننے والا اور رحم کرنے والا ہے اپنے بندوں کی نیک خواہشات ضرور پوری کرتا ہے۔ خدا سے دعا مانگو کہ اے خدا میرے دل کی تمنا پوری کر یا مجھے صبر سکون عطا فرما۔"

اباقہ نے سلطان کی طرف دیکھا پھر دونوں ہاتھ سامنے پھیلا لیے۔ ایک شکستہ آرزو اس کے ہونٹوں سے نکلی۔ "اے خدا میرے دل کی تمنا پوری کر ...." اس سے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ اس کی آواز بھرا گئی۔ وہ پھر بولا۔ "اے خدا میرے دل کی تمنا پوری کر ...." لیکن دعا کا دوسرا حصہ اس سے پھر ادا نہیں ہوا۔ دو تین بار کوشش کرنے کے بعد اس نے ہاتھ گرا لیے اور سلطان سے گلوگیر آواز میں بولا۔

"یہ دعا مجھ سے نہیں مانگی جاتی سلطان۔"

"تو پھر جو تمہارے دل میں آتا ہے وہ کہو۔" سلطان نے کہا۔

اباقہ نے ایک نظر جلتے ہوئے آسمان کی طرف دیکھا اور ہاتھ اٹھا کر بولا۔ "اے خدا! مجھ کو مارنا چاہیے .... صرف مارنا ...."

"اے خدا! مجھے مارنا چاہئے صرف مارنا۔" اباقہ کی آواز میں ایک ایسی التجا اور ایک ایسی ضد پوشیدہ تھی کہ سلطان جلال الدین چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس وقت سنگلاخ زمین پر کسی گھوڑے کی سرپٹ ٹاپیں سنائی دیں۔ سلطان جلال کی طرح اباقہ نے بھی مڑ کر دیکھا ایک سرخی مائل گھوڑا تیزی سے ان کی طرف بھاگا چلا آ رہا تھا۔ اس پر کوئی سوار تھا لیکن وہ زخمی یا سخت نڈھال دکھائی دیتا تھا۔ وہ اوندھے منہ گھوڑے کی پشت پر لیٹا تھا۔ اس میں اتنی سکت بھی نہیں تھی کہ گھوڑے کی باگیں ہی کھینچ سکتا۔ گھوڑا پڑاؤ کے قریب پہنچ کر خود ہی سست ہو گیا۔ سردار اباکر کے ایک آدمی نے بھاگ کر اس کی باگیں تھام لیں۔ گھوڑے کو روکنے کے لئے اس نے باگوں کو جھٹکا دیا تو گھوڑا ہنہنا کر لڑکھڑایا اور زمین بوس ہو گیا۔ سوار اچھل کر چند گز دور لڑھک گیا۔ جب اباقہ اور سلطان جلال بھاگتے ہوئے گھوڑے تک پہنچے۔ سردار اباکر اجنبی سوار پر جھکا ہوا اس کی حالت کا جائزہ لے رہا تھا۔

وہ ایک چالیس پینتالیس سالہ شخص تھا۔ اس کا خاکستری لباس پسینے سے شرابور تھا۔ سر پر اس نے ایک ڈھاٹا باندھ رکھا تھا۔ جو گرنے سے کھل گیا تھا۔ اباقہ نے دیکھا اجنبی کا چہرہ سیاہی مائل تھا .... بالکل اس علاقے کے پتھروں کی طرح۔ ہونٹوں پر سفید پپڑیاں جمی ہوئی تھیں اور آنکھیں بند تھیں۔ جس چیز نے اباقہ کو حیران کیا وہ اجنبی کے جلے ہوئے بال تھے۔ بھنوؤں' مونچھوں اور داڑھی کے کچھ بال صاف جلے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ ناک اور آنکھوں کے نیچے کی جلد بھی جھلسی ہوئی تھی۔ باقی چہرہ شاید ڈھاٹے میں ہونے کی وجہ سے بچ گیا تھا۔ وہ کھینچ کھینچ کر سانس لے رہا تھا۔ اباقہ کو فوراً سردار اباکر کی بات یاد آئی کہ یہاں سے کچھ فاصلے پر ایک سرنگ نما راستہ ہے جسے' آگ کا راستہ کہا جاتا ہے اور دوپہر کے وقت اس میں سے گزرنے والا بمشکل بچتا ہے۔ یہ شخص بھی اسی راستے سے گزرا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ اباکر کے آدمی اسے فوراً اٹھا کر سائے میں لے گئے۔ اس کے منہ میں پانی ڈالا گیا۔ اس کے سر کو بھگویا گیا اور سینے کو گیلے کپڑے کا مساج کیا گیا' کتنی ہی دیر بعد اس نے آنکھیں کھولیں اور کچھ بولنے کے قابل ہوا۔ وہ اباکر کو پہلے سے جانتا تھا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے کہا کہ باقی آدمیوں کو اس کے گرد سے ہٹا دیا جائے۔ دوسرے لوگوں کی طرح سلطان' اباقہ اور یورق بھی اس کے قریب سے ہٹ کر ایک چٹان کے سائے میں جا بیٹھے۔

وہ شخص لیٹا لیٹا اباکر کے ساتھ باتیں کرنے لگا۔ آثار بتا رہے تھے کہ وہ کوئی نہایت

اہم اور سنسنی خیز اطلاع دے رہا ہے۔ ابابکر کا سر بار بار اثبات میں ہل رہا تھا۔ گاہے گاہے وہ اجنبی کی دھیمی آواز سننے کے لئے اس کے عین اوپر بھی جھک جاتا تھا۔ کافی دیر یہ گفتگو جاری رہی آخر سردار ابابکر اجنبی کو اپنے چند آدمیوں کے سپرد کر کے اس کے قریب سے اٹھ آیا۔ چٹانوں کے پیچھے سے چکر کاٹ کر وہ اباقہ اور سلطان کے پاس آ بیٹھا۔ اس جگہ سے وہ اجنبی کو دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس نے لرزاں لہجے میں انہیں یہ اطلاع دی کہ "کالے پہاڑوں کے وطن" میں کچھ اہم تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ سلطان' اباقہ اور یورق ہمہ تن گوش ہو گئے۔ سردار نے کہا۔

"دراصل کالے پہاڑوں میں رہنے والے لوگ دو طرح کے ہیں۔ ایک تو وہ جو رستم کے ساتھ یا اس کے دور میں یہاں آئے تھے اور اس کے خاص ساتھی رہے ہیں۔ ان میں سے زیادہ تو اب عمر رسیدہ ہیں اور ان کی تعداد بتدریج کم ہو رہی ہے۔ دوسرا گروہ وہ ہے جو حال ہی میں مختلف علاقوں سے بھاگ کر آنے والے مجرموں پر مشتمل ہے۔ اس گروہ میں بعض جوشیلے اور جذباتی نوجوان شامل ہیں۔ ان لوگوں کو رستم اور اس کے بنائے ہوئے قوانین سے زیادہ لگاؤ نہیں۔ بعض اوقات وہ رستم کے قریبی ساتھیوں کو بھی خاطر میں نہیں لاتے۔ سکندر نامی ایک ہندوستانی لٹیرا ان کا سرغنہ ہے۔ "کالے پہاڑوں کے وطن" سے آنے والے اس گھڑ سوار نے بتایا ہے کہ کوئی آٹھ پہر پہلے اس ہندوستانی لٹیرے نے راجی خاتون کے خلاف بغاوت کر دی ہے۔ اس نے اس واحد چشمے پر قبضہ کر لیا ہے جو کالے پہاڑوں میں زندگی کی تنہا علامت ہے۔ اس چشمے کے بغیر اس جہنم میں زندہ رہنے کا تصور بھی محال ہے۔ یہ شخص جو بھاگ کر آیا ہے اس چشمے کے خاص محافظوں میں شامل تھا۔ اسے تمام حالات کا علم نہیں لیکن اس کا خیال ہے کہ وادی میں خاصا خون خرابہ ہوا ہے۔۔ اس کے پیچھے بھی سکندر کے کچھ آدمی لگے ہوئے تھے۔ ان کے خوف سے اسے "آگ کے راستے" میں سے عین دوپہر کے وقت گزرنا پڑا۔ یہ نہایت سخت جان شخص ہے۔ یوں بھی اسے اس جہنم میں رہتے ہوئے عرصہ بیت چکا ہے۔ غیر معمولی قوت برداشت اس کے کام آئی اور یہ بچ گیا۔ ورنہ اتنی شدید گرمی میں وہاں سے زندہ گزرنا ناممکن تھا۔"

شاید ابابکر ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ اجنبی کا گھوڑا جہاں گرا تھا۔ وہیں پر دم توڑ گیا تھا۔ اس کی تمام جلد پر آبلے نظر آ رہے تھے۔

وہ تینوں بڑے غور سے ابابکر کی باتیں سن رہے تھے۔ اگر حالات ایسے ہی تھے جیسے گھڑ سوار نے بتائے تھے تو یہ ان کے لیے بہت اچھا ہوا تھا۔ کالے پہاڑوں کی کالی سلطنت میں

پڑی ہوئی یہ دراڑیں ان کی مددگار ثابت ہو سکتی تھیں۔ سلطان جلال نے کہا۔

"ابابکر! تمہارا کیا خیال ہے اگر سکندر نامی یہ نوجوان راجی خاتون کو اقتدار سے ہٹا چکا ہے تو وہ راجی خاتون کے قیدیوں کو قیدی ہی سمجھے گا؟"

ابابکر نے پُر سوچ لہجے میں کہا۔ "سلطان معظم! میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ ابھی راجی خاتون کے متعلق مجھے اس شخص نے کچھ نہیں بتایا.......ویسے یہ بات ہے کہ اختلافات کے باوجود کالے پہاڑ کے وطن میں راجی خاتون کو غیر متنازعہ حیثیت حاصل ہے۔ وہاں رہنے والا ہر شخص اسے واجب الاحترام سمجھتا ہے۔"

سلطان نے کہا۔ "اس کا مطلب ہے کہ جب تک ہم کالے پہاڑوں میں نہیں پہنچ جاتے وہاں کے حالات اور اپنے ساتھ ہونے والے سلوک کے متعلق کچھ نہیں جان سکتے۔" ابابکر کا جواب اثبات میں تھا۔

جب سائے ڈھل گئے اور سورج نے اپنی تین چوتھائی مسافت طے کر لی تو انہوں نے اپنا سفر دوبارہ شروع کیا۔ روانہ ہونے سے پہلے سردار ابابکر نے اجنبی گھڑ سوار کو اپنے ایک آدمی کے سپرد کر کے دونوں کو پانی سے بھری ہوئی دو چھاگلیں دے دی تھیں۔ سفر کے اس مرحلے میں انہیں ایک طویل اور تنگ پہاڑی درے سے گزرنا پڑا۔ دونوں جانب سنگلاخ چٹانیں سر پر جھکی ہوئی تھیں۔ بس ایک پتھریلی سرنگ تھی جس پر نیلا آسمان ایک لکیر کی طرح ساتھ ساتھ چلتا تھا۔ سورج ڈوب چکا تھا لیکن پھر بھی اس درے میں غضب کی تپش تھی۔ یہی آگ کا راستہ تھا۔ اس کے دونوں جانب موجود چٹانیں زردی مائل تھیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کچھ کیمیائی بخارات ان چٹانوں سے نکل کر سرنگ میں بھرتے رہتے تھے۔ جب سورج سر پر ہوتا ہوگا تو بخارات زیادہ تیزی سے نکلتے ہوں گے۔ شاید اسی وجہ سے مسافر کا دم گھٹ جاتا تھا۔ خدا خدا کر کے یہ سرنگ ختم ہوئی اور انھوں نے کھلے علاقے میں سفر شروع کیا۔

☆------☆------☆

دشوار گزار سفر کے بعد دوسرے روز دوپہر سے کچھ پہلے وہ کالے پہاڑوں کے وطن میں پہنچ گئے۔ یہ ایک چوکور وادی تھی۔ چاروں طرف بڑی بڑی سیاہ چٹانیں پُر ہیبت بلاؤں کی طرح ایستادہ تھیں لیکن اس چوکور کا ایک کونہ بالکل مختلف منظر پیش کرتا تھا۔ اس کونے میں سبزہ نظر آتا تھا۔ ایک دو چراگاہیں بھی دکھائی دیتی تھیں۔ لگتا تھا کسی لق و دق صحرا میں چھوٹا سا نخلستان ہے۔ اس کونے کے بیچوں بیچ ایک بہت بڑی تکونی ابھار والی عمارت تھی۔ ایسی ہی کچھ اور جھونپڑی نما تکونی عمارتیں بھی اس نخلستان میں دکھائی دے

رہی تھیں لیکن ان سب کی تعداد تیس چالیس سے زائد نہیں تھی۔ نخلستان سے باہر کم و بیش پانچ سو ایسی ہی چھوٹی بڑی تکونیں نظر آ رہی تھیں۔ وادی میں داخل ہونے کا صرف ایک ہی راستہ تھا۔ یہ راستہ زیادہ کشادہ نہیں تھا۔ تین اونٹ پہلو بہ پہلو بمشکل اس راستے سے گزر سکتے تھے۔ اباقہ نے دیکھا راستے کی دونوں اطراف ڈھاٹا پوش تیر انداز بلندی پر بیٹھے تھے۔ ایک چیز جس نے اباقہ کو حیران کیا یہ تھی کہ یہاں موجود تمام لوگوں کے چہرے سانولے یا سیاہی مائل تھے۔ حالانکہ شکلوں سے وہ مختلف علاقوں کے رہنے والے دکھائی دیتے تھے۔ سلطان نے اباقہ کی اس اُلجھن کو دور کرتے ہوئے بتایا کہ شدید گرمی اور مخصوص آب و ہوا کی وجہ سے ان لوگوں کے رنگ ایسے ہو گئے ہیں۔

وہ وادی میں داخل ہوئے تو سیاہ ڈھاٹوں والے دو مسلح افراد ان کی رہنمائی کے لیے چل پڑے۔ اباقہ نے اندازہ لگایا کہ سیاہ ڈھاٹوں یا پگڑیوں والے افراد اس وادی میں محافظوں یا پہریداروں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ تکونی عمارتوں کے قریب سے گزرے تو پتہ چلا کہ یہ عمارتیں پتھروں کو کسی مسالے سے جوڑ کر بنائی گئی ہیں۔ سردار یورق نے انھیں اپنی زبان میں "سنگی یورتوں" یعنی سنگی جھونپڑیوں کا نام دیا۔ ان جھونپڑیوں سے باہر انھیں بہت سی عورتیں بچے اور مرد ملے۔ سب کے سب سانولے تھے کچھ کم اور کچھ زیادہ۔ ایک بات انھوں نے محسوس کی کہ وہ سارے پیاس سے بے حال دکھائی دے رہے ہیں۔ آنکھیں ویران ہونٹ خشک اور چہروں پر بے زاری۔ زیادہ تر بچے رو رہے تھے۔ مختلف گلیوں سے گزرتے ہوئے بالآخر وہ سرسبز حصے میں داخل ہوئے۔ یہ سرسبز علاقہ ٹاٹ میں مخمل کے پیوند جیسا تھا۔ شاید اس سبزے کی وجہ وہ چشمہ تھا۔ جس پر راجی خاتون کے مخالف گروہ نے قبضہ جما رکھا تھا۔ ایک بڑی پتھریلی جھونپڑی کے سامنے پہنچ کر یہ مختصر قافلہ رک گیا۔ یہ وہی جھونپڑی تھی جو وادی میں داخل ہوتے وقت انھیں سب سے نمایاں دکھائی دی تھی۔ اندر داخل ہونے سے پہلے ابابکر نے سلطان کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔

"لگتا ہے بستی کے زیادہ تر حصے پر ابھی راجی خاتون کے حامیوں کا قبضہ ہے۔"

اباقہ کے حساس کانوں نے بھی یہ سرگوشی سنی۔ وہ عمارت میں داخل ہوئے تو یہ محسوس کر کے حیران رہ گئے کہ اندر کا درجہ حرارت باہر کے مقابلے میں نہایت کم تھا۔ جیسا کہ انھیں بعد ازاں پتہ چلا اس وادی میں ان تکونی عمارتوں کا رواج کچھ مصری باشندوں نے ڈالا تھا۔ یہ ان اہرام نما عمارتوں کی بناوٹ کا کرشمہ تھا کہ ان کے اندر گرمی کم محسوس ہوتی تھی۔ اباقہ نے دیکھا زمین پر بیش قیمت قالین بچھا ہوا تھا۔ چھت سے بڑی جھالردار

ایک خوبصورت پنکھا لٹک رہا تھا۔ سخت نقوش والا ایک کابلی کونے میں بیٹھا ریشمی ڈوری کو حرکت دے رہا تھا۔ ڈوری کی حرکت سے پنکھا بھی حرکت میں تھا۔ ایک لحیم شحیم شخص گاؤ تکیہ لگائے عین پنکھے کے نیچے بیٹھا تھا۔ اس کے دائیں بائیں چار پانچ ادھیڑ عمر لیکن سخت گیر شکلوں والے افراد بیٹھے تھے۔ سردار ابابکر تعظیم سے گاؤ تکیے والے شخص کے سامنے جھکا اور بولا۔

"آقا جعفر! یہ تین قیدی حاضر ہیں۔ چاند کی اُنتیس کو یہ ہماری بستی میں داخل ہوئے۔ انھوں نے ہمارا ایک آدمی بھی ہلاک کر ڈالا ہے۔"

"کوئی بات نہیں۔" آقا جعفر کی کرخت آواز اُبھری۔ "بہت سزا بھگتیں گے یہ اپنی غلطی کی۔ چلو انھیں قید خانے میں پہنچادو۔" شاید جعفر اپنے ساتھیوں کے ساتھ کسی اہم موضوع پر گفتگو کر رہا تھا۔ اس نے سردار ابابکر کو زیادہ وقت نہیں دیا اور چند رسمی باتیں کر کے اسے اباقہ وغیرہ کے ساتھ باہر بھیج دیا۔ اُن تینوں کو پیدل چلاتے ہوئے دوبارہ بنجر علاقے میں لایا گیا۔ ایک جگہ سیاہ پتھروں میں تنگ سی دراڑ دکھائی دی۔ دراڑ پر ایک شخص سیاہ ڈھاٹا باندھے کھڑا تھا۔ ان تینوں کو تلواروں کی نوک پر اس دراڑ کے اندر لے جایا گیا۔ دراڑ بتدریج ایک کشادہ راستے کی شکل اختیار کر گئی۔ پھر وہ یہ دیکھ کر حیران ہوئے کہ وہ ایک وسیع وعریض میدان میں کھڑے ہیں۔ یہ میدان قدرتی طور پر چاروں اطراف سے عمودی چٹانوں میں گھرا ہوا تھا۔ ان چٹانوں پر کہیں کہیں مسلح پہریدار بیٹھے نظر آ رہے تھے۔ میدان میں دو رویہ قطاروں میں بہت سی چھوٹی چھوٹی سنگی جھونپڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ ایسی ہی کچھ اور "جھونپڑیوں" کی تعمیر کا کام جاری تھا۔ بیسیوں قیدی چلچلاتی دھوپ میں پتھر توڑنے اور اٹھانے میں مصروف تھے۔ سنگی جھونپڑیوں اور ان سے باہر بھی سینکڑوں قیدی دکھائی دے رہے تھے۔ ان میں عورتیں' مرد' بچے سب شامل تھے۔ اباقہ نے دیکھا کہ وہ سب کے سب پیاسے تھے۔ پیاس تو اس قید خانے سے باہر بھی نظر آ رہی تھی لیکن یہاں اس کی شدت کچھ زیادہ ہی تھی۔ بعض عورتیں اور بچے تو قریب المرگ نظر آتے تھے۔ اب اباقہ کو سمجھ آئی کہ بستی میں داخل ہوتے ہی سردار ابابکر سمیت پورے قافلے سے پانی کی چھاگلیں کیوں لے لی گئی تھیں۔ یہ پانی محافظوں اور پہریداروں کے استعمال میں آیا تھا۔ درحقیقت انسانوں کی یہ بستی پانی کے ایک ایک قطرے کو ترس رہی تھی۔

سلطان' اباقہ اور یورق کو ہاتھ کھولنے کے بعد ایک ہی کوٹھڑی میں دھکیل دیا گیا۔ سردار ابابکر انھیں الوداعی نظروں سے دیکھتا ہوا باہر چلا گیا۔ اس وقت سیاہ چہرے والا ایک مکروہ سا شخص اندر داخل ہوا۔ کوٹھڑیوں میں جھانکتا ہوا وہ ان کی کوٹھڑی کے سامنے آ

گیا۔ وہ ایک گرانڈیل شخص تھا۔ گردن اور رخساروں کا گوشت لٹکا ہوا تھا۔ آنکھوں کے نیچے نظر آنے والے ابھار اس بات کی نشاندہی کرتے تھے کہ وہ بلا کا شرابی ہے۔ اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتا وہ بغور سلطان جلال کو دیکھے جا رہا تھا۔ اب اباقہ کو یاد آیا کہ یہ شخص گاؤ تکیے والے شخص کی دائیں جانب بیٹھا تھا اور اس وقت بھی بڑے غور سے سلطان جلال کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"میں نے تمہیں کہیں دیکھا ہے۔" گرانڈیل شخص کے حلق سے غراہٹ آمیز آواز برآمد ہوئی۔ اس کا اشارہ سلطان جلال کی طرف تھا۔

سلطان نے کہا۔ "ضرور دیکھا ہو گا۔ کہاں کے رہنے والے ہو تم؟"

وہ بولا۔ "تبریز کا۔"

سلطان نے پوچھا۔ "کوئی جرم کر کے آئے ہو یہاں؟"

وہ شخص بے ڈھنگے پن سے ہنسا۔ "جرائم کہو جرائم۔ تبریز کے لوگ چنگیز خاں کے بعد میرا نام لیتے ہیں۔ مجھے تبریز کا شیطان کہا جاتا تھا۔" وہ بے ساختہ ہنسنے لگا۔ پھر یکدم سنجیدہ ہوتا ہوا بولا۔ "لیکن میں نے تمہیں کہیں دیکھا ہے۔"

یورق نے مشورہ دیتے ہوئے کہا۔ "ذہن پر زور دو۔ اگر ہے تو۔"

اس نے یورق کی طنزیہ "اگر ہے تو" پر غور نہیں کیا وہ برابر اپنی پیشانی مسل رہا تھا۔ سلطان نے سنجیدگی سے کہا۔

"میں کبھی تبریز نہیں گیا۔ تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔"

وہ شخص الجھن سے بولا۔ "میری یادداشت بہت کمزور ہو گئی ہے لیکن تمہارا چہرہ میرے ذہن میں کہیں چھپا ہوا ہے۔ میں نے تمہیں کوئی بڑا کام کرتے دیکھا ہے یا کسی بہت اہم مقام پر دیکھا ہے۔ کیا تم نے کبھی کوئی........." فقرہ ادھورا چھوڑ کر وہ پھر پیشانی مسلنے لگا۔

"شراب کا ایک پیالہ چڑھاؤ شاید کچھ ہوش آئے۔" یورق نے پھر لقمہ دیا۔

سلطان نے اس کی سوچ بچار کا سلسلہ ختم کرنے کے لئے کہا۔ "مجھے معلوم ہوا ہے کہ باغیوں کے ایک گروہ نے بستی کے واحد چشمے پر قبضہ کر رکھا ہے۔ اگر تم یا تمہاری "راجی خاتون" چاہے تو میں اس مسئلے کو حل کر سکتا ہوں۔"

"کیسے؟" گرانڈیل شخص نے چونکتے ہوئے کہا۔

"یہ سب مجھ پر چھوڑ دو۔" سلطان نے اتنے اعتماد سے کہا کہ نووارد کی خمار زدہ میلی سی آنکھوں میں چمک اتر آئی۔ سلطان نے اسے آہنی جنگلے کے قریب بلایا اور دھیمے لہجے

میں اس سے باتیں کرنے لگا۔

☆======☆======☆

منظر جعفر کی اہرام نما رہائش گاہ کا تھا۔ جعفر کا پورا نام جعفر داراب تھا۔ اس وادی کے انتظام میں اسے نہایت اہم حیثیت حاصل تھی۔ اسے راجی خاتون کا معاون خصوصی سمجھا جاتا تھا۔ گرانڈیل شخص نڈھال سا اندر داخل ہوا اور دھم سے جعفر داراب کے قریب قالین پر بیٹھ گیا اس کا گلا پیاس سے خشک ہو رہا تھا۔

جعفر داراب نے پوچھا۔ "کہاں چلے گئے تھے جابر خان؟"

گرانڈیل شخص جس کا نام جابر تھا اور جو وادی کے محافظ دستوں کا سربراہ تھا' بولا۔ "قید خانے گیا تھا۔ ایک اہم خبر لایا ہوں لیکن ایک شرط سے سناؤں گا دو گھونٹ پانی پلاؤ۔"

جعفر داراب نے خشک لہجے میں کہا۔ "جابر! تم جانتے ہو اس وقت پوری بستی میں راجی خاتون کے سوا کسی کے پاس ایک بوند نہیں۔ میں کہاں سے لاؤں گا پانی؟"

"راجی خاتون کے پاس کہاں سے آتا ہے۔ اگر اس کے پاس ہے تو تمہارے پاس بھی ہے۔"

جعفر داراب کے چہرے پر طیش کے آثار نظر آئے .... لیکن پھر وہ تحمل سے بولا۔ "میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ چشمے سے صرف ایک مشکیزہ آیا تھا اور وہ راجی خاتون کے لئے تھا۔ اس بدبخت سکندر نے اپنے آدمی کو ہدایت کی تھی کہ وہ خود یہ مشکیزہ راجی خاتون تک پہنچائے۔"

جابر بولا۔ "تمہارا چہرہ بتاتا ہے' جعفر کہ تم اتنے پیاسے نہیں ہو جتنے ہم ہیں۔ بہر حال تمہارے لئے یہ اہم اطلاع ہے کہ ابھی ابابکر جو تین قیدی لایا ہے ان میں سے ایک شخص اس بات کی ذمے داری لے رہا ہے کہ وہ سکندر کو چشمہ چھوڑنے پر مجبور کر سکتا ہے۔ بلکہ اس کا کہنا ہے کہ سکندر یہ وادی ہی چھوڑ جائے گا اور کبھی واپس نہیں پلٹے گا۔"

"کیا وہ کوئی جادوگر ہے؟" جعفر داراب نے حیرت ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

جابر بولا۔ "نہیں جعفر! جادوگر تو نہیں لیکن اس کی زبان میں بہت تاثیر ہے۔ بزرگوں ولیوں پر تم یقین نہیں رکھتے لیکن مجھے تو وہ کوئی پہنچا ہوا شخص دکھائی دیتا ہے۔ نہ جانے کیوں مجھے لگتا ہے کہ اس شخص کو میں نے کسی بلند مرتبے پر فائز دیکھا ہے۔ تم نے نہیں دیکھا تھا اس کی آنکھوں میں کیسی مقناطیسی کشش تھی۔"

جعفر داراب بولا۔ "کچھ پتہ تو چلے وہ اس بدبخت کو کیسے راہ راست پر لائے گا۔"

جابر پر سوچ لہجے میں بولا۔ "میرا خیال ہے جعفر وہ ایک مذہبی شخص ہے اور مذہبی

لہجے میں بات کرے گا۔ تم جانتے ہو ویسے بھی ہندوستان کے لوگ مذہب کے معاملے میں جذباتی ہوتے ہیں۔"

جعفر بولا۔ "تو یوں کہو نا وہ ایک مولوی ہے اور وعظ نصیحت کرے گا۔ نہیں جابر۔ جیسے ہم ہیں سکندر بھی ویسا ہی ہے۔ پتھروں پر شبنم اثر نہیں کرتی۔"

جابر نے کہا۔ "جعفر! میں ایک اور بات سوچ رہا ہوں۔ جس وقت اس شخص نے سکندر اور اس کے ساتھیوں کو باتوں میں لگا رکھا ہو کیوں نہ ہم چشمے پر حملہ کریں۔"

یہ بات سن کر جعفر کے چہرے سے بیزاری کے آثار معدوم ہو گئے۔ اس نے تعریفی نظروں سے جابر کو دیکھا اور کہنے لگا۔ "تمہاری تجویز قابل غور ہے۔"

جابر حوصلہ افزائی پر بولا۔ "یوں بھی ہمارے پاس وقت تیزی سے کم ہو رہا ہے۔ اگر ایک آدھ پہر اور گزر گیا تو ہمارے آدمی نیم جان ہو کر تلوار اٹھانے کے قابل نہیں رہیں گے اور یہی سکندر شاہ چاہتا ہے۔"

جعفر داراب بولا۔ "تو ٹھیک ہے تم اس مولوی کو سفارتکاری کے لئے تیار کرو۔ اس کے بعد ہم دونوں حملہ کرنے والے دستوں کا معائنہ کریں گے۔"

☆---☆---☆

انہیں گرفتار ہوئے اب ایک پہر ہو چکا تھا۔ عصر کا وقت تھا۔ سلطان جلال نے نماز پڑھ کر سلام پھیرا اور کوٹھڑی کے آہنی جنگلے سے باہر دیکھنے لگا۔ جابر خاں اپنے آدمیوں کے ساتھ اسے لینے آ گیا تھا۔ سلطان نے اسے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ اباقہ اس کے ساتھ جائے گا۔ جابر خان نے دونوں کو احترام سے اپنے ساتھ لیا اور قید خانے کے بیرونی راستے کی طرف چل دیا۔ باہر اباقہ اور سلطان کے لئے دو گھوڑے موجود تھے۔ جابر کی معیت میں چلتے ہوئے وہ ہریالی والے علاقے میں پہنچے۔ ایک مقام سے گزرتے ہوئے اباقہ اور سلطان جلال کو عجیب وضع کا ایک پہاڑ نظر آیا۔ وادی میں داخل ہونے کے بعد ایک دو بار پہلے بھی انہیں اس بلند پہاڑ کی جھلک دکھائی دی تھی لیکن اس دفعہ وہ پہاڑ کے کافی قریب سے گزرے۔ پہاڑ کے دامن میں تھوڑی بہت ہریالی موجود تھی لیکن اس کی چوٹی دوسرے پہاڑوں کی طرح بنجر اور سیاہ تھی۔ اباقہ اور سلطان نے دیکھا کہ پہاڑ کے دامن میں ایک سرنگ نما راستہ ہے اور وہاں سے کچھ مزدور سروں پر پتھروں کے وزنی ٹکڑے رکھے باہر نکل رہے تھے۔ کچھ خچر بھی باربرداری کے لئے استعمال کئے جا رہے تھے۔ سلطان کے پوچھنے پر جابر نے بتایا کہ اس پہاڑ کو وادی میں "نیلے پہاڑ" کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ رستم کی بیٹی راجی خاتون اسی پہاڑ کے اندر رہتی ہے۔ اب جعفر داراب کی رہائش گاہ بھی اس پہاڑ کے اندر بنائی جا رہی ہے۔

نیلے پہاڑ سے کوئی تین سو گز آگے جا کر جابر خان نے اپنا گھوڑا روک لیا۔ اباقہ نے دیکھا کہ اس جگہ دو تین تناور درخت کاٹ کر زمین پر گرا دیئے گئے ہیں۔ جس سے راستہ مسدود ہو گیا ہے۔ غالباً یہ باغی گروہ کا کام تھا۔ اس کا مطلب تھا اس سے آگے باغیوں کا قبضہ ہے۔ یہاں پہنچ کر جابر خان نے سلطان جلال کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا اور پرجوش لہجے میں بولا۔

"حضرت! اگر آپ یہ مسئلہ حل کر دیں تو میں عہد کرتا ہوں کہ آپ اور آپ کے دونوں ساتھیوں کو بصد احترام اباکبر کے ساتھ واپس بھیج دیا جائے گا۔ وہ آپ کو آباد علاقے تک پہنچا دے گا۔ اس کے علاوہ بھی ہم مقدور بھر آپ کی خدمت کریں گے۔ آپ ماشاء

اللہ خود دانا ہیں لیکن میں آپ سے اتنا ضرور کہوں گا کہ صرف سکندر ہی کو نہیں اس کے خاص ساتھیوں کو بھی گفتگو میں شریک کریں گے۔ یہ نہ ہو کہ سکندر کے فیصلے کے باوجود اس کے ساتھی ہتھیار نہ ڈالیں۔"

سلطان نے صرف سرہلانے پر اکتفا کیا اور گھوڑے کو ایڑ لگا کر آگے بڑھ گیا۔ اباقہ ادب کو ملحوظ رکھتے ہوئے چند قدم پیچھے آ رہا تھا۔ جونہی وہ ایک گلی میں مڑے ننگی تلواریں لئے چند افراد ان کے سامنے آگئے۔

"کون ہو تم؟" ایک نے گرج کر پوچھا۔

سلطان نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "میں راجی خاتون کی طرف سے تمہارے سردار کے ساتھ صلح کی بات کرنے آیا ہوں۔"

نوجوانوں میں سے درمیانے قد کا ایک مضبوط سا جوان آگے بڑھا اور بولا۔ "میں سردار ہوں ان کا۔ کیا کہنا چاہتے ہو تم؟"

"تمہارا نام سکندر ہے؟" سلطان نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے پوچھا۔ نوجوان کا جواب اثبات میں تھا۔ سلطان نے کہا۔ "کیا یہاں کھڑے کھڑے بات ہو گی؟"

نوجوان بے رخی سے بولا۔ "یہاں سرے سے کوئی بات نہیں ہو گی۔ میں راجی خاتون کو اپنی شرائط بتا چکا ہوں۔ ہمارے مطالبے پورے ہو جائیں تو راجی خاتون سے ہمارا کوئی جھگڑا نہیں۔ ہم راجی خاتون کے وفادار غلام ہیں۔"

سلطان بولا۔ "تمہاری سب سے بڑی شرط یہ ہے نا کہ راجی خاتون اپنے پندرہ معتمد اور پرانے ساتھیوں کو جن میں جعفر داراب بھی شامل ہے تمہارے حوالے کر دے تاکہ تم ان سے اپنا انتقام لے سکو۔"

نوجوان بولا۔ "انتقام نہیں۔ انصاف کہو۔ اس ظلم کا حساب کہو جو یہ لوگ اب تک اس وادی کے لوگوں پر کرتے آئے ہیں۔" نوجوان سخت بھرا ہوا دکھائی دیتا تھا' بے تکان بولتا چلا گیا۔ "........... یہ لوگ ہمارا مارا ہوا شکار کھاتے ہیں اور ہمیں قریب بھی نہیں پھٹکنے دیتے۔ ہمارے بچے اور ہماری عورتیں ان کی پھینکی ہوئی ہڈیوں کے منتظر رہتے ہیں۔ ان لوگوں نے چشمے کے گرد گھنی چھاؤں میں اپنے عشرت کدے بنا رکھے ہیں اور وہ لوگ جو ان عشرت کدوں کے لئے عیش فراہم کرتے ہیں اپنے بچوں سمیت سنگلاخ پتھروں میں جھلستے ہیں۔ وہ جانور جن پر ہم منزلیں طے کر کے تجارتی قافلوں تک پہنچتے ہیں اور مال غنیمت لاتے ہیں' ہڈیوں کے ڈھانچے ہیں اور وہ جانور جو ان کے تھانوں پر کھڑے اونگھتے ہیں چربی کا ڈھیر ہو رہے ہیں۔ اس چشمے کو دیکھو اگر اس کا پانی وادی تک پہنچایا جائے تو

ساری وادی نہ سہی اس کا ایک حصہ ضرور شاداب ہو جائے لیکن یہ خبطی بوڑھے اس کے پانی کو حریص بازوؤں میں جکڑے بیٹھے ہیں۔ ان سے کوئی پوچھے آبی نالیاں کھودنی انہیں مشکل نظر آتی ہیں لیکن سینکڑوں قیدی ان کے حکم پر نیلے پہاڑ کے اندر جعفر داراب کے لئے محل تعمیر کرنے اور اس کی دیواروں پر نقش و نگار بنانے میں مصروف ہیں۔ بہت ہو چکی اب ہم یہ سب کچھ نہیں ہونے دیں گے۔ ہمیں بھی چشمے کے گرد گھر بنانے کی اجازت ہونی چاہئے۔ ہمارے بال بچوں کو بھی وافر پانی ملنا چاہئے۔ ہم بھی مال غنیمت سے مناسب حصے کے حقدار ہیں..........."

دفعتاً سکندر نے چونک کر سلطان اور اباقہ کی طرف دیکھا شاید جذبات کی رو میں وہ ایک اہم بات فراموش کر گیا تھا۔ الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ "لیکن تم کون ہو' اس سے پہلے میں نے تمہیں کبھی وادی میں نہیں دیکھا۔"

"ہم آج ہی قیدی ہو کر یہاں آئے ہیں۔" سلطان نے اس کی پریشانی دور کرتے ہوئے کہا۔ پھر طویل سانس لے کر بولا۔ "مجھے ایک بات بتاؤ سکندر دو سال کا وہ معصوم بچہ جو قید خانے میں اپنے باپ کی گود میں دم توڑ رہا ہے اور دو دن کا وہ شیرخوار جو اپنی جاں بلب ماں کی خشک چھاتی سے چمٹا اپنی مختصر زندگی کا آخری عذاب جھیل رہا ہے' وہ کس غلطی کا مرتکب ہوا ہے؟ ان جیسے سینکڑوں بچے یہ پوچھ رہے ہیں' ہم نے تمہارے خلاف کون سی سازش کی ہے' ہم نے تم پر کون سا ظلم کیا ہے؟"

سکندر ہٹ دھرمی سے بولا۔ "قصور ان بچوں کا نہیں ان کے والدین کا ہے۔ اگر ان کے بچے پیاس سے مر رہے ہیں تو وہ ان درندوں کو پکڑ کر ہمارے حوالے کیوں نہیں کرتے۔ اگر یہ بھی نہیں کر سکتے تو پھر ان بدبختوں کو ہمارے مقابلے پر بھیجیں ہم خود انہیں دیکھ لیں گے۔ یہ سب ان لوگوں کا قصور ہے جو ظلم سہنے کے عادی ہو چکے ہیں۔"

سلطان نے کہا۔ "تم یہ کیوں نہیں کہتے کہ قصور راجی خاتون کا ہے۔ اگر وہ یہاں کی فرمانروا ہے تو پھر قصور اس کا کیوں نہیں سمجھا جاتا۔ کسی شخص کو تمہارے حوالے کرنا یا نہ کرنا راجی خاتون کا کام ہے۔ کسی شخص کو تمہارے مقابلے پر بھیجنا یا نہ بھیجنا راجی خاتون کی ذمے داری ہے' نہ کہ لوگوں کی۔"

سکندر کا ایک ساتھی چیخ کر بولا۔ "ہم سب جانتے ہیں۔ رستم کے ان نام نہاد کھوسٹ ساتھیوں نے راجی خاتون کو اصل حالات سے بے خبر رکھا ہوا ہے۔ اسے کچھ معلوم نہیں نیلے پہاڑ سے باہر کیا ہو رہا ہے۔"

سلطان گھوڑے سے اتر کر سکندر کے قریب پہنچا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

"تم مسلمان ہو؟"

سکندر نے ہاں میں جواب دیا۔

سلطان نے کہا۔ "اگر واقعی مسلمان ہو تو خدا اور اس کے رسولؐ کو مانتے ہو؟" اس کا جواب بھی اثبات میں تھا۔ سلطان گرج کر بولا۔ "تو پھر یزید کیوں بن رہے ہو؟ کیوں اس وادی کو کربلا کی مثال بنا رہے ہو؟ اس ویرانے میں پیاس سے تڑپ تڑپ کر مرنے والوں کی بددعاؤں کا سامنا کر سکو گے تم؟ زندہ رہ سکو گے اتنا بڑا ظلم کر کے؟" سلطان کی آواز لحہ بہ لحہ بلند ہو رہی تھی۔ "........... خود کو دنیا کا بدترین انسان ثابت کرنے پر کیوں تلے ہوئے ہو تم۔ جواب دو........... میں کہتا ہوں جواب دو۔"

سکندر پر سلطان کی ہیبت طاری ہونے لگی۔ اس کے ہاتھ میں تلوار کانپنے لگی۔ "کیا چاہتے ہیں آپ؟" وہ سنبھل کر بولا۔

سلطان نے ایک طویل سانس لی۔ "میں چاہتا ہوں کہ سب سے پہلے بستی والوں کے لئے پانی کھول دو۔ باقی معاملات ہم آرام سے بیٹھ کر طے کر سکتے ہیں۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تمہارے ساتھ کوئی دھوکا نہیں ہو گا۔"

سکندر نے پیشانی پر نمودار ہونے والا عرق انگلی سے پونچھا اور کچھ دیر سوچ کر بولا۔ "ٹھیک ہے بستی والے خالی مشکیزے ان درختوں کے اوپر رکھ دیں جو ہم نے راستے پر گرا رکھے ہیں۔ ہم انہیں پانی سے بھر دیتے ہیں لیکن اس کے بعد فیصلہ ہونے تک پانی کی ایک بوند بستی میں نہیں جائے گی۔"

سلطان نے کہا۔ "ٹھیک ہے۔" پھر وہ اباقہ سے بولا کہ جا کر جابر خاں کے آدمیوں کو صورتِ حال سے آگاہ کر دو۔

☆------☆------☆

اس سنگلاخ وادی میں یہ ٹھنڈا میٹھا چشمہ قدرت کی کرشمہ سازیوں کا مظہر تھا .... وہی قدرت جو پتھر میں پھول اگاتی ہے۔ رات کے بطن سے سورج پیدا کرتی ہے اور گھٹاؤں کو بجلیوں کی پرورش سونپتی ہے۔ اس چشمے کی تین اطراف میں عمودی ڈھلوانیں تھیں۔ چوتھی جانب ایک تنگ سا راستہ تھا اس راستے میں تین آدمی بمشکل کندھے سے کندھا ملا کر گزر سکتے تھے۔ کوئی کتنی بھی بڑی فوج سے حملہ کرتا اس جانب سے چشمے تک پہنچنا ممکن نہیں تھا۔ باقی رہیں ڈھلوانیں' دو ڈھلوانیں تو ایسی تھیں جن سے اوپر چڑھنا موت کو دعوت دینا تھا۔ ہاں تیسری ڈھلوان جو مغرب کی طرف تھی کم خطرناک تھی۔ سکندر اور اس کے ساتھیوں نے چشمے پر قبضہ کر کے واقعی اہم کارنامہ انجام دیا تھا۔

غالباً انہوں نے محافظوں کی غفلت سے فائدہ اٹھایا تھا ورنہ صرف بیس آدمیوں کے ساتھ بغیر کسی جانی نقصان کے چشمے پر قبضہ کر لینا ناممکن کام تھا۔ راجی خاتون کے جو محافظ اس لڑائی میں ہلاک ہوئے تھے ان کی لاشیں ابھی تک درختوں کے نیچے پڑی تھیں۔ سکندر کے دو آدمی تنگ راستے پر مامور تھے اور دو آدمی اس ڈھلوان پر نظر رکھے ہوئے تھے جہاں سے حملہ ممکن تھا۔ باقی تمام آدمی تین چار اونٹوں کی مدد سے کچھ بڑے بڑے پتھروں کو کھینچنے اور اکھاڑنے میں مصروف تھے۔ اس وقت اباقہ کو ان کی اس مصروفیت کی سمجھ نہیں آئی۔ چشمے سے پانی کا اخراج وافر مقدار میں تھا۔ چشمے کے ساتھ ہی پانی کو ذخیرہ کرنے کے لئے ایک بہت بڑا تالاب بنایا گیا تھا۔ جب سلطان اور اباقہ یہاں پہنچے تھے تالاب کا چوتھائی حصہ بھرا ہوا تھا لیکن بستی والوں کے لئے مشکیزے نکالنے کے بعد پانی کی سطح اور نیچے گر گئی تھی۔

اب شام ہونے والی تھی۔ سلطان اور اباقہ ایک ہموار جگہ پر سکندر شاہ کے سامنے بیٹھے تھے۔ سلطان کہہ رہا تھا۔ "ایک بات میری سمجھ سے بالاتر ہے اگر تم سمجھتے ہو کہ جعفر داراب اور اس کے ساتھی راجی خاتون کو حالات سے بے خبر رکھے ہوئے ہیں تو تم نے راجی خاتون کو پانی کا مشکیزہ کیوں بھیجا۔ اگر تم یہ مشکیزہ نہ بھیجتے تو ظاہر ہے راجی خاتون کو بھی نیلے پہاڑ کے اندر پانی میسر نہ آتا۔ پھر وہ جعفر داراب سے پانی نہ ملنے کا سبب پوچھتی۔"

سکندر نے تسلیم کیا کہ یہ اس کی غلطی تھی۔ سلطان نے کہا۔ "تم ایسی ہی کچھ اور غلطیاں بھی کر رہے ہو۔ مثلاً تم اُن لوگوں کو فراموش کئے بیٹھے ہو جو تمہاری ہی طرح جعفر داراب اور اس کے ساتھیوں کی بالادستی سے نالاں ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ در پردہ تم سے ہمدردی رکھتے ہوں۔ پانی کی بندش سے وہ بھی اسی طرح عذاب میں مبتلا ہیں جس طرح بستی کے دوسرے لوگ۔"

"آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟" سکندر شاہ نے پوچھا۔ غیر شعوری طور پر وہ سلطان کو "آپ" کہنے لگا تھا۔

سلطان نے نرمی سے کہا۔ "دیکھو سکندر! انسان خطا کا پتلا ہے۔ کوئی رائے بھی آخری نہیں ہوتی۔ تم اپنے مطالبات پر نظرثانی کر کے انہیں کچھ نرم کرو۔ میں یہ ترمیم شدہ مطالبات لے کر راجی خاتون سے ملتا ہوں۔ اگر تمہارے دل میں اس کا احترام ہے تو اس کی رائے بھی تمہارے بارے میں زیادہ سخت نہیں ہو گی۔ میرا خیال ہے کوئی سمجھوتہ ہو جائے گا۔"

سکندر شاہ نے ترکش کندھے پر ڈالتے ہوئے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا اور بولا۔ "آپ یہاں آج ہی پہنچے ہیں۔ اتنی جلدی آپ یہاں کے گورکھ دھندوں کو کیا سمجھیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ جعفر داراب اور اس کے جہاندیدہ ساتھی آپ کو راجی خاتون تک نہ پہنچنے دیں گے۔"

سلطان نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ اچانک ڈھلوان پر کھڑے افراد چلانے لگے۔ "ہوشیار.......... ہوشیار۔"

سکندر نے ایک جھٹکے سے تلوار نیام سے باہر کی۔ گھوم کر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ پھر سلطان کی طرف دیکھ کر پھنکارا۔ "مجھے تم سے اس دغابازی کی امید نہ تھی۔"

اباقہ نے اپنی جگہ سے حرکت کرنے کی کوشش کی لیکن ایک تلوار کی نوک اس کی پشت پر آ گئی۔ سلطان کے سر پر بھی سکندر کے دو مسلح آدمی پہنچ گئے تھے۔ سلطان نے جب اباقہ کے بدلتے ہوئے تیور دیکھے تو آنکھ کے اشارے سے اسے پُرسکون رہنے کی ہدایت کی۔ سکندر اب بھاگتا ہوا ڈھلوان کے اوپر پہنچ چکا تھا۔ تنگ راستے پر وہی دو نگران رہ گئے تھے۔ سکندر سمیت باقی پندرہ افراد ڈھلوان پر کھڑے نیچے دیکھ رہے تھے۔ یہاں سے اباقہ اور سلطان کو کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن بے شمار آوازیں ان کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ وہ سمجھ گئے کہ یہ آوازیں چشمے پر حملہ کرنے والوں کی ہیں۔ جعفر داراب نے موقعہ غنیمت جان کر سکندر پر ہلہ بول دیا تھا۔ وہ دونوں حیرانی سے سوچ رہے تھے کہ سکندر اور اس کے پندرہ بیس آدمی جعفر داراب کے سینکڑوں مسلح آدمیوں کا مقابلہ کیوں کر کریں گے۔ وہ پتھروں کے عقب سے تیر برسا رہے تھے لیکن جواب میں آنے والے تیر کہیں زیادہ تھے۔ پیش قدمی کرنے والوں کی آوازیں اب بہت قریب آ گئی تھیں۔ اباقہ اور سلطان نے سکندر کے دو آدمیوں کو تیر کھا کر چشمے کے تالاب میں گرتے اور ڈوبتے دیکھا۔ اب ڈھلوان کے کنارے تاریکی میں صرف تیرہ ہیولے نظر آ رہے تھے یہ سکندر اور اس کے بارہ ساتھی تھے۔ نہ جانے انہیں کس بات کا انتظار تھا۔ دفعتاً سکندر نے چلا کر کچھ کہا۔ اس کے ساتھی حرکت میں آئے اور زمین چٹانوں کی گڑگڑاہٹ سے لرزنے لگی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے زلزلہ آ گیا ہے اور سینکڑوں چھوٹی بڑی چٹانیں نشیب میں لڑھک رہی ہیں .... اور تب اباقہ کو پتہ چلا کہ سکندر نے کیا چال کھیلی ہے۔ چشمے پر قبضہ جمانے کے بعد وہ اطمینان سے نہیں بیٹھا تھا۔ اس نے اپنا دفاع مضبوط کیا تھا۔ اباقہ اور سلطان نے سکندر کے آدمیوں کو اسی کام میں مصروف دیکھا تھا۔ انہوں نے بڑے بڑے پتھروں کو ڈھلوان پر اس طرح جما دیا تھا کہ معمولی کوشش سے نیچے لڑھک سکیں اور اب

جعفر داراب کے آدمی ان پتھروں کی زد میں تھے۔ ان کی کربناک چیخیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ پہاڑ کے دامن میں جیسے قیامت برپا تھی۔ پھر یہ شورِ محشر تھما اور سکون کے ایک مختصر وقفے کے بعد جعفر داراب کے آدمیوں کے للکارے پھر سنائی دینے لگے۔ یوں لگتا تھا پسپائی کے بعد وہ ایک بار پھر قدم جما رہے ہیں۔

اس وقت سکندر ایک بار پھر چلایا۔ ایک دفعہ پھر گڑگڑاہٹ کی مہیب آوازوں نے سینوں کو دہلا دیا۔ چٹانیں ایک بار پھر نشیب کے سفر پر روانہ ہو چکی تھیں۔ اس دفعہ چیخوں کی آوازیں زیادہ بھیانک اور کربناک تھیں۔ شاید جعفر داراب کے آدمی اپنے پہلے کچلے جانے والے ساتھیوں کا حشر دیکھ چکے تھے۔ سکندر کے آدمی تیراندازی بھی جاری رکھے ہوئے تھے۔ پھر اباقہ اور سلطان نے سکندر کا پُرجوش فاتحانہ نعرہ سنا۔ اس کے ساتھی خوشی سے اچھلنے لگے۔ قرائن بتا رہے تھے کہ جعفر داراب کے آدمی لاشیں چھوڑ کر میدان سے بھاگ رہے ہیں۔ اس وقت سلطان نے گہری نظروں سے اباقہ کی طرف دیکھا۔ اباقہ سلطان کی نگاہوں کا مفہوم سمجھ رہا تھا۔ حالات نے جو رخ اختیار کر لیا تھا اس میں اب سکندر سے کسی بھلائی کی توقع فضول تھی۔ وہ طیش میں ان کی گردنیں اڑانے کا حکم بھی دے سکتا تھا۔ وہ ان کا یہ مئوقف کبھی تسلیم نہ کرتا کہ انہیں اس حملے کا علم نہیں تھا۔ لہٰذا ان دونوں کو اب کچھ نہ کچھ کرنا تھا۔ چند ساعتیں اسی طرح گزریں۔ پھر اباقہ بجلی کی طرح حرکت میں آیا۔ نہ جانے اس نے کیا کیا کہ اس کے عقب میں کھڑا تلوار بردار اس کے اوپر سے ہوتا ہوا پتھریلی زمین پر گرا۔ اس کی تلوار اب اباقہ کے ہاتھ میں نظر آ رہی تھی۔ دوسری طرف شیر خوارزم بھی حرکت میں آ چکا تھا۔ اس کے بوڑھے جسم میں حرارت ایمانی خون بن کر دوڑتی تھی۔ اباقہ جنگل میں اسے شیر پر جھپٹتے اور اس کا پیٹ چاک کرتے دیکھ چکا تھا۔ اس سپاہیانہ ہنر کا مظاہرہ یہاں بھی دیکھنے میں آیا۔ سلطان نے دفعتاً مڑ کر تلوار زن کی تلوار پر ہاتھ ڈالا تھا اور اسے کندھے سے ایسا دھکا دیا تھا کہ وہ اڑتا ہوا تالاب میں جا گرا تھا۔ اس کا ساتھی جس نے اباقہ کو تلوار چھینتے دیکھا تھا پھرتی سے جھپٹا۔ اباقہ اس کے بھرپور وار سے بچنے کے لئے ایک گھٹنے پر جھک گیا۔ تلوار کی بجلی اس کے سر پر کوندی لیکن گزند پہنچائے بغیر گزر گئی۔ پھر اس سے پہلے کہ مدمقابل کو اپنا وار خالی جانے کا احساس ہوتا' اباقہ کی تلوار اس کی ناف میں ترازو ہو گئی۔ تلوار کھینچ کر وہ سیدھا کھڑا ہوا اور سلطان کے پیچھے لپکا۔ سلطان ڈھلوان کے کنارے پہنچ چکا تھا۔ اباقہ نے نیچے جھانک کر دیکھا۔ جھٹپٹے اندھیرے میں اسے جعفر داراب کے آدمی تیزی سے نیچے اترتے دکھائی دیئے۔ سکندر اور اس کے ساتھی اطمینان سے کھڑے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ابھی پتھروں کی ایک اور "قطار" باقی

ہے۔ اگر جعفر داراب کے آدمیوں نے پاؤں جمانے کی کوشش کی تو وہ پھر ان پر موت کی بارش کر دیں گے .... لیکن وہ اس آفت سے بے خبر تھے جو اباقہ اور سلطان جلال کی صورت میں دبے پاؤں ان کے عقب میں پہنچ چکی تھی۔ اباقہ اور سلطان ایک ساتھ ان پر ٹوٹ پڑے۔ جب تک وہ اس بلائے ناگہانی سے سنبھلتے ان کا ایک ساتھی ہلاک اور دوسرا زخمی ہو چکا تھا۔ اباقہ اور سلطان کی برق پاش تلواریں انہیں سنبھلنے کا موقع ہی نہیں دے رہی تھیں۔ یوں بھی وہ ڈھلوان پر کھڑے تھے۔ ایسا لگتا تھا اباقہ اور سلطان انہیں دھکیلتے ہوئے نیچے لے جائیں گے۔ یہاں تک کہ جعفر داراب کے بھاگتے ہوئے آدمیوں کی نظر ان پر پڑ جائے گی اور وہ واپس پلٹ آئیں گے لیکن اس وقت وہ شخص جسے اباقہ نے شروع میں پٹخنی دے کر زمین پر گرایا تھا اور جس کی وزنی تلوار اس وقت اباقہ کے ہاتھ میں چمک رہی تھی' ان دونوں کے عقب میں پہنچ گیا۔ وہ جلد از جلد اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔ انتقام کے اسی جذبے کے تحت اس نے صرف پانچ گز کے فاصلے سے انتہائی مہارت سے سلطان جلال پر تیر چلایا جو اس کی کمر میں پیوست ہو گیا۔

اباقہ نے تلوار چلاتے ہوئے تیر کی سنسناہٹ سنی اور گھوم کر دیکھا تو "شیرِ خوارزم" لڑکھڑا کر نیچے گر رہا تھا۔ وہ جیسے سکتے میں رہ گیا۔

"سلطان........." اس کے حلق سے بے ساختہ چیخ نکلی وہ لپک کر بڑھا اور سلطان کا جسم نیچے گرنے سے پہلے بازو پر سہار لیا۔ سلطان کا ہاتھ ابھی تک تلوار کے قبضے پر تھا لیکن آنکھیں بند تھیں۔ "سلطان .... سلطان۔" وہ بے قراری میں بار بار چیخا' لیکن کوئی جواب نہیں آیا۔ اس نے اپنے لرزاں بازو کو سیدھا کیا اور آرام سے سلطان کو پہلو کے بل پتھریلی زمین پر لٹا دیا۔ اس کے جبڑوں کی ہڈیاں ابھرتی جا رہی تھیں اور آنکھوں میں ایک خوفناک چمک نمودار ہو رہی تھی۔ تنگ راستے پر کھڑے ہوئے دو آدمی بھی اپنی جگہ چھوڑ کر یہاں پہنچ چکے تھے۔ اب اس کے گرد پندرہ تلوارزن کھڑے تھے لیکن ان میں سے کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ قراقرم کا سب سے خطرناک جنگجو ان کے درمیان ہے اور غضب میں آ چکا ہے۔ ایک آتش فشاں جسے کسی ارضی تبدیلی نے دفعتاً جگا دیا تھا۔ اب پھٹ پڑنے کو تیار تھا۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ وہ کتنے خطرے میں ہیں۔

اباقہ کا سر جھکا ہوا تھا اور لمبے بالوں نے چہرہ چھپا رکھا تھا۔ پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر اپنی گری ہوئی تلوار اٹھائی اور سیدھا کھڑا ہو گیا۔ کالے پہاڑوں کی کالی تاریکی میں وہ کوئی خونخوار آسیب دکھائی دے رہا تھا۔ ڈھلوان کے نشیب و فراز کو رات کی سیاہی دھیرے دھیرے ہڑپ کر رہی تھی۔ جعفر داراب کے پسپا ہونے والے آدمی دور نشیب میں پہنچ

چکے تھے۔ اب ان کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ جیسی آوازوں کے سوا کچھ سنائی نہیں دیتا تھا۔ دفعتاً ایک دھاڑ سے ویرانہ گونج اٹھا۔ جیسے زمین پھٹتی ہے' جیسے آسمان ٹوٹ پڑتا ہے' جیسے قیامت آتی ہے' ایسے ہی اباقہ اپنے دشمنوں پر ٹوٹ پڑا۔ دونوں ہاتھوں میں تلوار تھامے وہ چلا چلا کر سکندر اور اس کے ساتھیوں کو نشانہ بنا رہا تھا۔ وہ سب کے سب چھٹے ہوئے بدمعاش قاتل اور ڈاکو تھے۔ ان کی زندگیاں کشت و خون اور قتل و غارت سے عبارت تھیں لیکن اپنے عجیب و غریب مدِمقابل کے سامنے اچانک ہی ان کی ہمتیں جواب دے گئیں۔ ان کے ہاتھ پاؤں مفلوج ہو رہے تھے۔ وار کرنے کی بجائے وہ وار بچانے کی کوشش کر رہے تھے۔ بدحواسی میں ان میں سے دو تین اپنے ساتھیوں کی تلواروں سے بھی زخمی ہو گئے۔ جتنی دیر میں ان کے ذہنوں نے مدمقابل کی حیران کن برتری کو تسلیم کیا اور ان کی مردانگی نے ان کی ٹانگوں کو بھاگنے کی اجازت دی۔ ان میں سے چھ زمین بوس ہو چکے تھے۔ تب ان کا سرغنہ سکندر شاہ ایک چنگھاڑ کے ساتھ اباقہ کے سامنے آیا۔ اس کا پُراعتماد انداز بتا رہا تھا کہ وہ خود بھی ایک خطرناک جنگجو ہے' اباقہ کے دو وار اس نے پیچھے ہٹ کر خالی کر دیئے پھر جھک کر بے انتہا پھرتی سے اس کی ٹانگ کو نشانہ بنایا۔ تلوار کی نوک اباقہ کے گھٹنے کو چھیلتی ہوئی گزر گئی اور اب وہ اباقہ کی زد پر تھا۔ اباقہ نے وزنی تلوار دونوں ہاتھوں میں بلند کر کے سکندر شاہ کے سر کو نشانہ بنانا چاہا لیکن وہ کمال بے جگری سے آگے آیا اور سر کی بھرپور ضرب اباقہ کی چھاتی پر لگی۔ اباقہ جو ڈھلوان کی طرف تھا لڑکھڑا کر پتھروں پر گرا۔ اس وقت یکایک سکندر شاہ مخالف سمت میں بھاگ کھڑا ہوا۔ اباقہ جب تک اس کے بھاگنے کا مقصد سمجھتا۔ چٹانوں کی مہیب گڑگڑاہٹ سے ایک بار پھر زمین لرز اٹھی۔ اباقہ نے جلدی سے اٹھ کر بلندی کی طرف دیکھا اور سب کچھ سمجھ گیا۔ خونی چٹانوں کی تیسری قطار حرکت میں آ چکی تھی' اور اس دفعہ ان کی زد میں وہ خود تھا۔ یہ ایک پُر ہول منظر تھا۔ خوفناک سیاہ دھبے تیزی سے اس کی طرف بڑھتے چلے آ رہے تھے۔ ان میں کچھ چھوٹے تھے اور کچھ بہت بڑے۔ دور نیچے ایکبار پھر جعفر داراب کے آدمیوں کی چیخ و پکار سنائی دینے لگی تھی۔ حالانکہ وہ پتھروں کی زد سے باہر تھے پھر بھی چلا رہے تھے......... اباقہ کی نگاہیں ایک وزنی چٹان کی سمت تھیں۔ یہ چٹان سیدھی اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔ پھر راستے میں اس کے دو ٹکڑے ہوئے ایک ٹکڑا اچھلتا ہوا بائیں جانب نکل گیا' لیکن دوسرا ٹکڑا پوری رفتار سے اسے کچلنے کے لیے بڑھا۔ عین موقع پر اباقہ نے جست لگائی اور اُڑتا ہوا ایک ٹکڑے کی زد سے نکل گیا۔ وہ ایک کچلی ہوئی لاش پر گرا۔ وہاں سے اُٹھ کر اُس نے سلطان جلال کی طرف دوڑ لگائی۔ تربوز کے برابر ایک پتھر اس کے کندھے سے

ٹکراتا نکل گیا۔ ایک پتھر کو پھلانگ کر اس نے سلطان جلال کے ساکت جسم پر چھلانگ لگائی اور بازو پھیلا کر اس کے اوپر لیٹ گیا۔ سماعت شکن گڑگڑاہٹ سے ان گنت پتھر اس کے اوپر سے نکلتے چلے گئے۔ اباقہ جیسا مرد آہن بھی اس موقع پر اپنی آنکھیں کھلی نہ رکھ سکا زندگی اور موت کلی طور پر کسی نادیدہ طاقت کے ہاتھ میں تھی......... اور آخر اس نادیدہ طاقت نے اباقہ اور سلطان کو بچالیا۔ پتھروں کا جان لیوا سیلاب گزند پہنچائے بغیر ان کے سر پر سے گزر گیا۔

اباقہ نے سر اُٹھایا' اردگرد دیکھا اور تیزی سے اوپر چڑھنے لگا۔ وہ سکندر شاہ کو کسی قیمت پر نہیں چھوڑ سکتا تھا اور پھر وہ اسے نظر آ گیا۔ چند گز دور ایک سایہ بری طرح لنگڑاتا ہوا ڈھلوان پر چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اباقہ پہچان گیا وہ سکندر شاہ ہی تھا۔ کوئی چھوٹا موٹا پتھر اسے بھی لگ گیا تھا۔ چند ہی جستوں میں اباقہ نے اسے جالیا۔ وہ شاید اسے اپنا ہی کوئی آدمی سمجھ رہا تھا۔ اسے تب ہوش آئی جب اباقہ کے آہنی بازوؤں نے اسے جکڑا' اُٹھایا اور گھما کر سنگلاخ زمین پر دے مارا۔ سکندر شاہ کی آنکھوں میں ستارے ناچ گئے۔ پھر ایک ایسا مکہ اس کے منہ پر لگا جس نے نہ صرف اس کے کئی دانت توڑ ڈالے بلکہ سر کو بھی لٹو کی طرح گھما دیا۔ سکندر شاہ یہ سوچتا ہوا بے ہوش ہو گیا کہ ابھی جو چیز اس کے چہرے سے ٹکرائی تھی واقعی وہ کسی انسان کا مکہ تھا.........

☆ --- ☆ --- ☆

نیلے پہاڑ کے سامنے ایک ہموار میدان میں لوگوں کا جم غفیر لگا ہوا تھا۔ اس جم غفیر میں صرف مرد شامل تھے۔ عورتیں اور بچے کہیں دکھائی نہیں دیتے تھے۔ تمام لوگ چلچلاتی دھوپ میں صبح سے قطاروں میں کھڑے تھے۔ صرف سفید پگڑیوں والے چند معززین کو سایہ دار درختوں کے نیچے جگہ ملی تھی لیکن وہ بھی کھڑے تھے۔ یہ معززین رستم کے ساتھی تھے۔ سفید پگڑی ان کے اس اعزاز کی نشانی تھی۔ "معززین" ہونے کے باوجود تمام نامی گرامی مجرم رہ چکے تھے۔

ہر نگاہ نیلے پہاڑ کی طرف لگی ہوئی تھی۔ پہاڑ کے دامن میں تاریک دروازہ جس کی دونوں جانب سیاہ ڈھالوں والے مسلح افراد مؤدب کھڑے تھے' بالکل خالی تھا۔ اباقہ اس ہجوم میں ایک عام شخص کی طرح کھڑا تھا۔ طویل انتظار کے بعد دروازے میں چار افراد نظر آئے۔ انہوں نے خوبصورت رنگین فوجی لباس پہن رکھا تھا۔ شاید کسی روسی یا افغانی فوجی قافلے کو لوٹا گیا تھا۔ یہ وردیاں کسی ایسے ہی قافلے کی اُترن تھیں۔ ان چاروں افراد کے گلے سے طبل لٹک رہے تھے۔ ایک ساتھ انہوں نے طبل بجانے شروع کئے اور

دھیرے دھیرے آگے بڑھنے لگے۔ لوگ پنجوں کے بل کھڑے ہو کر یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ آج طویل عرصے کے بعد راجی خاتون اپنا دیدار کروا رہی تھی۔ ان کا پُر شوق ہونا فطری تھا۔

طبل والوں کے عقب میں پگڑی والا ایک دراز قد شخص برآمد ہوا۔ اس کا لباس بھی دیدہ زیب تھا۔ اس نے ایک سجے سجائے نہایت صحت مند اونٹ کی نکیل تھام رکھی تھی۔ اونٹ کی پشت پر زرتار چادر کے اوپر ایک پگڑی رکھی تھی اور ساتھ ہی ایک تلوار چمک رہی تھی۔ اونٹ کو ایک سایہ دار درخت کے نیچے دبیز قالین پر کھڑا کر دیا گیا۔ تمام لوگوں نے رکوع کے انداز میں جھک کر اونٹ کو تعظیم پیش کی۔ دراز قد شخص نے ماہرانہ انداز میں نکیل کو جنبش دی۔ اُونٹ نے اپنے دونوں پچھلے پاؤں جوڑے اور بڑی متانت سے قالین پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک ہی جیسے رنگین کپڑوں میں ملبوس قریباً دس عورتیں دروازے پر نظر آئیں۔ وہ دو قطاروں میں چل رہی تھیں۔ ان کے عقب میں چار صحتمند افراد ایک پالکی اُٹھائے ہوئے باہر نکلے۔ پالکی کے دروازوں پر سبز رنگ کے پردے لہرا رہے تھے۔ پالکی کے بانسوں پر چڑھے ہوئے سونے کے منقش پترے دھوپ میں چمک رہے تھے۔ کہاروں نے پالکی اونٹ کے قریب زمین پر اُتاری۔ پالکی کے عقب میں بھی دس بارہ عورتیں موجود تھیں۔ ان میں سے دو نے جلدی سے آگے بڑھ کر ایک جانب کا پردہ ہٹایا۔ پالکی ایک چبوترے کے قریب اُتری تھی۔ چبوترے پر آرام دہ کرسیاں رکھی تھیں۔ ایک کرسی جو زیادہ خوبصورت تھی راجی خاتون کے لیے مخصوص تھی۔ چبوترہ کوئی ایک گز بلند تھا اور اس کے پہلو میں چار زینے تھے۔ پالکی سے گلابی شلوار قمیض میں ملبوس کسی عورت کا حسین سراپا برآمد ہوا۔ تمام لباس پر بے شمار ننھے منے گول شیشے چمک رہے تھے۔ کمر سے تلوار لٹکی تھی اور آنکھوں کے سوا پورا چہرہ ایک ریشمی پگڑی میں چھپا ہوا تھا۔ پگڑی کے اوپر لگا ہوا ایک قیمتی ہیرا دیکھنے والوں کی نگاہیں خیرہ کر رہا تھا۔ ایک خادمہ نے آگے بڑھ کر اپنا طویل ریشمی آنچل سیڑھیوں پر بچھا دیا۔ راجی خاتون وقار سے قدم رکھتی چبوترے پر آ گئی۔ چبوترے پر کھڑے جعفر داراب اور جابر خان نے نہایت احترام سے جھک کر راجی خاتون کا استقبال کیا۔ اس کے ساتھ ہی دوسرے لوگ بھی تعظیماً جھک گئے۔ اباقہ دوسرے لوگوں کے ساتھ ایک کونے میں کھڑا یہ سارے مناظر دیکھ رہا تھا۔ اس کا دھیان اب تک مسلسل سلطان جلال کی طرف تھا۔ سلطان کی کمر پر گہرا زخم آیا تھا' لیکن جان بچ گئی تھی۔ وہ بستی کے ایک شفاخانے میں زیرِ علاج تھا۔ آج صبح جابر خان کا اہلکار اس کے پاس شفاخانے پہنچا تھا۔ اس نے اباقہ سے کہا تھا تمہارا دربار میں حاضر ہونا ضروری ہے۔ خیال ہے کہ راجی

خاتون تمہیں کسی انعام سے نوازے گی۔ اباقہ راجی خاتون کے انعام کے لیے سلطان جلال الدین کے پاس سے ہٹنا نہیں چاہتا تھا' لیکن یورق نے کہہ سن کر اسے بھیج دیا۔ یورق کو سلطان کے پاس بٹھا کر اباقہ جابر خاں کے آدمی کے ساتھ یہاں چلا آیا تھا۔

اس کی نظریں ایک بار پھر راجی خاتون کے سراپا پر جم گئیں۔ وہ بڑی شان سے مزین کرسی پر بیٹھی تھی۔ جعفر داراب نے جھک کر اس کے کان میں کچھ کہا۔ اس نے سر ہلایا اور تقریر کرنے کے انداز میں چبوترے کے درمیان پہنچ کر کھڑی ہو گئی۔ نقاب کے اندر سے ایک کھنکتی ہوئی آواز برآمد ہوئی۔ راجی خاتون نے شستہ فارسی میں بولنا شروع کیا۔

"حاضرین مجلس! میں رستم کی بیٹی اور کالے پہاڑوں کی وارث تم سے مخاطب ہوں۔ یہ وادی پچھلے چند روز سے جس بحران کا شکار تھی وہ بالآخر کل ختم ہو گیا ہے۔ باغیوں کا قلع قمع کر دیا گیا ہے اور ان کے سرغنہ کو اس کے کچھ ساتھیوں سمیت گرفتار کیا جا چکا ہے۔ ان لوگوں نے اپنے مذموم عزائم کی تکمیل کے لیے جس طرح اس وادی کے باسیوں پر عرصہ حیات تنگ کیا اور انہیں پانی کے ایک ایک گھونٹ کے لیے ترسایا وہ ہمارے قوانین کی بدترین خلاف ورزی ہے۔ میں نے اس سنگین معاملے کے تمام پہلوؤں پر غور کیا ہے اور اس فیصلے پر پہنچی ہوں کہ مجرموں کی کم از کم سزا سرعام پھانسی ہے۔ اپنی روایت کے مطابق ہم انہیں اذیت ناک موت سے ہمکنار کریں گے۔ ان کو غداروں کے لیے عبرت کا نشان بنا دیا جائے گا..........."

راجی خاتون بول رہی تھی اور اباقہ حیرت سے گنگ سوچ رہا تھا ایک عورت جو غالباً حسین بھی ہے اتنی سفاک اور بے مروت بھی ہو سکتی ہے۔ بالآخر اس سے رہا نہیں گیا وہ لوگوں کو پیچھے ہٹاتا تیزی سے آگے بڑھا اور چبوترے کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ سیاہ پگڑیوں والے دو مسلح افراد تیزی سے اسے تھامنے کے لئے بڑھے اس نے بازو جھٹک کر انہیں پیچھے ہٹایا اور بلند آواز سے بولا۔

"اے خاتون! میں ملزموں کے حق میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

"کون ہے یہ شخص؟" راجی خاتون نے ناراض لہجے میں پوچھا۔

جابر خان جلدی سے کھڑا ہو کر بولا۔ "اسے معاف کرنا راجی خاتون یہ اس وادی میں نیا ہے۔ یہی وہ شخص ہے جس نے نہایت مشکل وقت میں سکندر پر قابو پایا۔"

"اچھا تو تم ہو وہ۔" راجی خاتون کے لہجے میں نرمی عود کر آئی۔

"میرا نام اباقہ ہے خاتون' اور میں اپنے آقا کے ساتھ صلح کی بات چیت کے لیے سکندر کے پاس بھیجا گیا تھا۔ میں نہیں جانتا سکندر نے چشمے پر قبضہ کیوں کیا اور ایسا کر کے

اس نے بڑا جرم کیا ہے یا چھوٹا' لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ عین اس وقت جب صلح کی بات چیت کامیابی کے قریب پہنچ چکی تھی جعفر داراب نے اپنے آدمیوں کے ساتھ چھپ کر چشمے پر ہلہ بول دیا۔ ایسا کر کے اس نے نہ صرف ہماری جان خطرے میں ڈال دی بلکہ اپنے بھی بیسیوں آدمی مروا بیٹھا..........."

جعفر داراب جو خاصا پریشان نظر آ رہا تھا۔ اباقہ کی بات کاٹ کر بولا۔ "نوجوان! تم سکندر کو نہیں جانتے۔ وہ اول درجے کا مکار اور ڈھیٹ شخص ہے۔ اسے قابو کرنے کا یہی طریقہ تھا۔"

اباقہ بولا۔ "تو پھر ہمیں بات چیت کے لئے وہاں کیوں بھیجا گیا؟ کیا ہمیں چارے کے طور پر استعمال کیا گیا؟"

اباقہ کے تیکھے سوال پر جعفر داراب بغلیں جھانکنے لگا۔ جابر نے اس کی مدد کے لئے ہونٹ کھولنے چاہے' لیکن اباقہ ڈپٹ کر بولا۔ "جعفر داراب' یہ سارا کام تمہاری ہوشیاری کی وجہ سے خراب ہوا۔ تم جانتے ہو ہماری کوشش کے نتیجے میں سکندر بستی کو پانی دینے پر تیار ہو گیا تھا۔ وہ اپنے کئی مطالبات سے بھی دستبردار ہو گیا تھا۔ اگر تم عیارانہ چڑھائی نہ کرتے تو کبھی اس قدر جانی نقصان نہ ہوتا۔ یہ معاملہ نہایت خوش اسلوبی سے طے ہو چکا ہوتا۔"

جعفر داراب نے راجی خاتون کی طرف دیکھا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے اباقہ کو خاموش رہنے کی ہدایت کی اور بلند آواز سے بولی۔

"نوجوان! میں تمہاری شجاعت اور دلیری سے متاثر ہوئی ہوں لہذا اس گستاخی پر تمہیں معاف کیا جاتا ہے۔ آئندہ خیال رہے کہ راجی خاتون یا جعفر داراب کے کسی فیصلے پر اعتراض کی اس وادی میں کوئی گنجائش نہیں۔ اب تم اپنی جگہ پر جا کر کھڑے ہو سکتے ہو۔"

اباقہ نے بالوں کو جھٹکا دیا اور لاپرواہی سے چلتا ہوا واپس اپنی جگہ کھڑا ہو گیا۔ کچھ دیر بعد ایک جانب سے ہجوم پھٹا اور سکندر شاہ رسیوں سے جکڑا ہوا اندر داخل ہوا اس کے دو ساتھی بھی ساتھ تھے۔ تینوں کو چبوترے کے سامنے کھڑا کر دیا گیا۔ اباقہ نے دیکھا سکندر کے چہرے پر گہری مایوسی چھائی ہوئی تھی' لیکن وہ خوفزدہ نہیں تھا۔ اس کی شعلہ بار نگاہیں مسلسل جعفر داراب کو گھور رہی تھیں۔ دوسری طرف جعفر داراب کے چہرے پر فاتحانہ چمک دکھائی دے رہی تھی۔

"تمہاری آخری خواہش؟" محافظ دستوں کے کمان دار جابر خاں نے بلند آواز میں سکندر شاہ سے پوچھا۔

"میں آخری بار اپنے گھر کے در و دیوار دیکھنا چاہتا ہوں۔" وہ قدرے بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ اباقہ نے دیکھا اسے بولنے میں سخت دشواری ہو رہی ہے۔ رات جس جگہ اباقہ کا مکہ لگا تھا وہ بری طرح سوجی ہوئی تھی۔ راجی خاتون نے جعفر داراب کی طرف جھک کر کچھ مشورہ کیا۔ پھر ٹھوس آواز میں بولی۔ "اس وادی کے قانون کے مطابق تمہاری یہ خواہش پوری نہیں کی جاسکتی۔ کوئی اور خواہش ہو تو بتاؤ۔" سکندر نے زہر خند لہجے میں کہا۔ "پھر میرے ہاتھ کھول دیجئے تاکہ میں نیلے پہاڑ کے اندر محل تعمیر کرنے والے اس بوڑھے شیطان کو اپنے ساتھ قبر میں لے جاسکوں۔" اس کا اشارہ جعفر داراب کی طرف تھا۔

"زبان کو لگام دو۔" راجی خاتون گرجی۔

دو سیاہ پگڑیوں والوں نے جلدی سے آگے بڑھ کر سکندر شاہ کے منہ پر ہاتھ رکھ دیئے اور گھسیٹتے ہوئے پیچھے لے گئے۔ دوسرے دو قیدیوں سے بھی آخری خواہش پوچھی گئی اور پھر انہیں جلاد کے سپرد کر دیا گیا۔ یہ جلاد کوئی ختائی پہلوان تھا۔ اس نے تلوار کے بھرپور وار سے سکندر کا بایاں بازو اڑا دیا۔ دوسرا وار اس کی دائیں ٹانگ پر کیا گیا۔ وہ گاجر کی طرح ران پر سے کٹ گئی۔ تڑپتے اور لہو اگلتے جسم کو دو آدمی اٹھا کر اس درخت کی طرف بڑھے جہاں چادر پوش اونٹ براجمان تھا۔ اونٹ کے بالکل سامنے ایک درخت پر رسے کا پھندا لٹک رہا تھا۔ یہ پھندہ سکندر کے گلے میں ڈال کر اسے جھولنے کے لئے چھوڑ دیا گیا۔ چند ہی لمحے میں اس نے تڑپ تڑپ کر جان دے دی۔ جب اس کے بے جان جسم کو درخت سے اتارا جا رہا تھا۔ ختائی پہلوان دوسرے قیدی کا بازو کاٹنے کے لئے تلوار سونت رہا تھا..........

تھوڑی دیر بعد تینوں افراد کو موت سے ہمکنار کر دیا گیا۔ قیدیوں کو اذیت ناک طریقے سے پھانسی پاتے دیکھ کر اباقہ کا دل بجھ سا گیا.......... حالانکہ سکندر کو اس نے خود پکڑوایا تھا' لیکن نہ جانے کیوں اس کی موت پر اسے افسوس ہو رہا تھا۔ شاید وہ سمجھتا تھا کہ وہ اتنی کڑی سزا کا مستحق نہیں تھا۔ جیسا کہ سکندر کے رویے سے ظاہر تھا وہ راجی خاتون کا دل سے احترام کرتا تھا۔ اس وقت بھی جب اس نے بستی والوں کا پانی روک دیا تھا راجی خاتون کے لئے اس کا آدمی مشکیزہ لے کر پہنچا تھا۔ اباقہ کو کسی لمحے بھی احساس نہیں ہوا تھا کہ سکندر راجی خاتون سے کوئی عناد رکھتا ہے۔ اس کے برعکس وہ اس کا وفادار غلام ہونے کو باعث فخر سمجھتا تھا۔ ایسے شخص کو اتنی سفاکی سے قتل کر دینا ایک پتھر دل عورت کا ہی کام تھا۔ اباقہ نے سوچا اچھا ہوتا اگر میں اسے گرفتار ہی نہ کرتا .... لیکن یہ بھی

ضروری تھا۔ وہ سلطان کی حکمت عملی سمجھ رہا تھا۔ جب سلطان نے جعفر داراب اور سکندر شاہ کے درمیان مصالحتی کردار ادا کرنے کی پیشکش کی تھی تو اس کا مقصد یہی تھا کہ وہ کوئی ایسا کام کریں جس سے راجی خاتون ان کی احسان مند ہو اور وہ اس کی نگاہوں میں آ جائیں۔ یہ کام مصالحتی کوشش سے تو ہو نہ سکا یا جعفر داراب نے نہ ہونے دیا۔ پھر یہی صورت باقی رہ گئی کہ باغیوں کے خلاف جدوجہد کر کے راجی خاتون کی ہمدردی حاصل کی جائے۔ اس جدوجہد کے دوران سلطان جلال زخمی ہوا اور اباقہ نے آپے سے باہر ہو کر سکندر اور اس کے ساتھیوں کو روئی کی طرح دھن دیا۔ اس کے سات آدمی اباقہ کے ہاتھوں ہلاک ہوئے تھے' چار پانچ بھاگنے میں کامیاب ہو گئے تھے اور دو سکندر سمیت گرفتار ہوئے تھے۔ اب ان تینوں کی مسخ شدہ لاشیں قریبی درخت سے لٹک رہی تھیں۔ موقعے پر موجود لوگوں کے لئے یہ ایک عبرت انگیز منظر تھا۔

"قیدی نوجوان اباقہ کو حاضر کیا جائے۔" یہ جعفر داراب کی آواز تھی جو چبوترے سے بول رہا تھا۔ سیاہ پگڑیوں والے دو افراد نے قدرے احترام کے ساتھ اباقہ کو راجی خاتون کے سامنے پیش ہونے کو کہا۔ اباقہ ستے ہوئے قدموں سے چلتا چبوترے کے سامنے پہنچ گیا۔

"اوپر آ جا نوجوان۔" راجی خاتون کی مترنم آواز ابھری۔

اباقہ زینے چڑھ کر چبوترے پر پہنچ گیا۔ اس کے لمبے بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ راجی خاتون بولی۔

"یہاں کا دستور ہے کہ غدار اور باغی کا تمام ساز و سامان بمعہ مال مویشی اس سے چھین لیا جاتا ہے اور موت کی سزا کے بعد یہ تمام اثاثہ اس شخص کے سپرد کر دیا جاتا ہے جس نے مجرم کی نشاندہی کی ہو یا اس کی گرفتاری میں سب سے اہم کردار ادا کیا ہو۔ اب سکندر کا تمام مال و اسباب تمہارا ہے۔ چونکہ تم اب آزاد ہو اس لئے اگر چاہو تو یہ اسباب اپنے پاس رکھ سکتے ہو اور اگر وادی میں نہ رہنا چاہو تو یہ مال بستی کے کسی شخص کو فروخت کر سکتے ہو۔ اس کے علاوہ یہ .... ہار میری طرف سے تمہیں انعام ہے۔"

اباقہ نے دیکھا راجی خاتون کے دستانہ پوش ہاتھ میں موتیوں کا قیمتی ہار جگمگا رہا تھا۔ اباقہ نے آگے بڑھ کر ہار لے لیا۔ اس کا سارا بدن غصے سے لرز رہا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اپنے غصے کا اظہار کس طرح کرے۔ اسے یہ بھی خوف تھا کہ اس کی کسی حرکت سے سلطان جلال ناراض نہ ہو۔ یا اس کا کوئی قدم اس کی حکمت عملی کے خلاف نہ چلا جائے۔ پھر بھی وہ خود پر قابو نہ رکھ سکا۔ اس نے یہ ہار جعفر داراب کی گود میں پھینک

دیا اور بولا۔

"میرے خیال میں یہ شخص اس انعام کا زیادہ حقدار ہے۔ شاید اسی انعام کے لئے اس نے چشمے پر اپنے ساتھ آدمیوں کی قربانی دی ہے۔"

اباقہ کی آواز نے ہر شخص پر سکتہ طاری کر دیا۔ جعفر داراب بھی منہ کھولے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شاید کسی کے تصور میں بھی نہیں تھا کہ یہ نوجوان راجی خاتون کی مہربانی کو اس طرح ٹھکرائے گا۔ وادی کی سب سے بااختیار عورت کی یہ توہین ایک بہت بڑے طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی تھی۔ چند لمحوں کے سکوت کے بعد راجی خاتون اپنی نشست سے کھڑی ہو گئی۔ وہ بے چینی سے اپنی انگلیاں مروڑ رہی تھی۔ جعفر داراب بھی اس کے ساتھ ہی کھڑا ہو گیا تھا' وہ غضب ناک لہجے میں بولا۔

"گرفتار کر لو اس گستاخ بد زبان کو۔"

پانچ چھ آدمی تیزی سے لپکے اور انہوں نے اپنی ننگی تلواریں اور نیزے اباقہ کے جسم سے لگا دیئے۔ جعفر داراب کی آنکھیں خون اگل رہی تھیں۔ عمر رسیدہ ہونے کے باوجود وہ کافی صحت مند تھا۔ غصے سے اس کے جسم میں اور بھی توانائی عود کر آئی تھی۔ اباقہ اب تک اس کی جو توہین کرتا آیا تھا اس کا بدلہ لینے کا یہ اچھا موقع تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور اباقہ کے عین سامنے پہنچ گیا۔ چار آدمیوں نے اباقہ کو گرفت میں لے رکھا تھا اور دو نے نیزے اس کی پشت سے لگا رکھے تھے۔ جعفر داراب نے اپنی کمر میں اڑسا ہوا خنجر نکالا اور اس کی نوک اباقہ کے رخسار پر پھیرنے لگا۔ اس کی آنکھیں اباقہ کی آنکھوں میں پیوست تھیں۔ دانت پیس کر وہ غرایا۔

"راجی خاتون کے سامنے بے ادبی سے بولنے والے میں تیری زبان کاٹ ڈالوں گا۔ نکال اپنی زبان' میں کہتا ہوں نکال اپنی زبان ورنہ جان سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔"

جعفر داراب نے اباقہ کو ڈھلوان پر لڑتے نہیں دیکھا تھا۔ اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ کس شخص سے مخاطب ہے۔ اس کے خیال میں چھ آدمیوں کی گرفت بہت تھی اسے علم نہیں تھا کہ اگر اباقہ خود کو چھڑانے پر آیا تو چھ آدمی چھ تنکوں کی طرح ہوا میں اڑتے نظر آئیں گے۔ اپنی طاقت کے گھمنڈ میں وہ اباقہ کو زبان نکالنے کا حکم دے رہا تھا اور اباقہ ایسے کھڑا تھا جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہیں۔ اس کا یہ انداز' یہ وقار' یہ لاپرواہی راجی خاتون کو کچھ سوچنے پر مجبور کر رہی تھی۔ اس کی نقاب سے جھانکنے والی آنکھیں بکمال سے اباقہ کا جائزہ لے رہی تھیں۔ وہ سمجھ رہی تھی یہ کوئی معمولی شخص نہیں اگر جعفر داراب نے اپنے چھ آدمیوں کے گھمنڈ میں اس سے زبردستی کی تو یہ نہایت خطرناک ثابت

ہو گا۔ اگلے چند لمحوں میں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

"ٹھہرو۔" راجی خاتون کی بارعب آواز گونجی۔ "اس گستاخی کی سزا اسے میں دوں گی۔"

پھر اس نے آنکھ سے جابر خان کو اشارہ کیا۔ جابر خان آگے بڑھا اور اس نے ایک محافظ سے رسی لے کر مضبوطی سے اباقہ کے پاؤں باندھ دیئے۔ تھوڑی سی جدوجہد کے بعد اس کے بازو بھی باندھ دیئے گئے۔ جعفر داراب نے اباقہ کو دھکا دیا اور وہ کٹے ہوئے درخت کی طرح دھڑام سے چبوترے کے تختوں پر جا گرا۔

دربار برخاست ہوا۔ راجی خاتون سمیت تمام افراد قالین پر بیٹھے اونٹ کے سامنے رکوع کے بل جھک گئے۔ رکوع کے بل جھکے ہوئے یہ تمام لوگ ڈاکو' قاتل' لٹیرے' مختلف حکومتوں کے باغی اور غدار تھے .... اور ان میں ایک طوطم خان بھی تھا۔ وہی طوطم خان جو اپنے منگول ساتھیوں کو قتل کر کے ماریتا کو لے نکلا تھا۔ وہ ترچھی نظروں سے اباقہ کی طرف دیکھ رہا تھا اور اپنا چہرہ اباقہ سے چھپانے کے لئے اس نے پگڑی کا پلو موڑ کر دانتوں میں دبا لیا تھا.........

☆ ——— ☆ ——— ☆

اباقہ کو ایک گھوڑے پر اوندھا لٹا کر نیلے پہاڑ کے اندر لے جایا گیا۔ چند سرنگوں سے گزرتے ہوئے وہ ایک کھلی جگہ پر پہنچے۔ یہ جگہ ہوادار تھی۔ نادیدہ سوراخ باہر سے ہوا کی آمدورفت برقرار رکھے ہوئے تھے۔ کچھ تاریک جگہوں پر مشعلیں بھی جل رہی تھیں۔ باہر کی تپش کا نام و نشان بھی یہاں موجود نہ تھا۔ یہاں اباقہ کو زیادہ تر خادمائیں ہی نظر آئیں۔ سب نے ایک جیسا گلابی دھاریوں والا لباس پہن رکھا تھا۔ اباقہ نے دیکھا کہ ان سب کی رنگت سفید تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ نیلے پہاڑ سے شاذ و نادر ہی باہر نکلتی تھیں۔

ایک جگہ پہنچ کر اباقہ کو گھوڑے سے اتارا گیا اور اس کے پاؤں کھول دیئے گئے۔ یہاں سے آگے اسے پیدل جانا تھا۔ یہ جگہ زیادہ صاف ستھری اور پُرسکون تھی۔ لوبان کی بھینی بھینی خوشبو چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ یہاں پتھر توڑنے کی وہ دور افتادہ آوازیں بھی سنائی نہیں دیتی تھیں جو اباقہ کے اندازے کے مطابق جعفر داراب کے زیر تعمیر محل سے آ رہی تھیں۔ اباقہ کو لانے والے محافظ یہاں سے واپس چلے گئے اور خوبصورت کپڑوں میں ملبوس چار دوسرے محافظوں نے اسے اپنے گھیرے میں لے لیا' یہاں زمین پر قالین بچھے تھے اور سرنگ کے محرابی دروازوں پر مخملیں پردے جھول رہے تھے۔ وہ ان پردوں

سے گزرتے ہوئے ایک جگہ پہنچ کر رک گئے۔ سرنگ میں دائیں جانب ایک بڑا دروازہ تھا۔ یہاں چھت سے قندیل لٹک رہی تھی اور بیش قیمت پردے کے سامنے دو حسین خادمائیں مؤدب کھڑی تھیں یہاں مکمل خاموشی تھی۔ اباقہ اور محافظ کو دیکھ کر ایک خادمہ اندر چلی گئی۔

اباقہ نے در و دیوار کا جائزہ لینا شروع کیا۔ یہاں کی سب سے اہم چیز دو دیوار گیر تصویریں تھیں۔ انہیں پتھریلی دیواروں پر کندہ کیا گیا تھا۔ پہلی تصویر میں نیم عریاں لباس پہنے کچھ عورتیں سر جھکائے کھڑی تھیں اور چند ہٹے کٹے مرد انہیں اپنی اپنی طرف کھینچ رہے تھے۔ تمام عورتیں ایک ہی زنجیر سے بندھی ہوئی تھیں۔ اس تصویر سے اندازہ ہوتا تھا کہ مال غنیمت کے ساتھ پہنچنے والی عورتوں کی یہاں کیسے بندر بانٹ کی جاتی ہے۔ دوسری تصویر میں ایک اونٹ دکھائی دے رہا تھا۔ جیسا کہ بعد میں اباقہ کو پتہ چلا یہ رستم کا اونٹ تھا اور اسے اس وادی میں ایک متبرک حیثیت حاصل تھی۔ تھوڑی دیر بعد خادمہ واپس آئی اور اس نے محافظوں کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔ یہ بلند چھت والا ایک کشادہ کمرہ تھا۔ پہاڑ کے اندر واقع سرنگیں قدرتی تھیں لیکن یہ کمرہ انسانی ہاتھوں کی کاوش نظر آتا تھا۔ کم از کم اس کی تراش خراش اور دیواروں پر نظر آنے والی نقاشی انسانی کوشش کی مرہون منت تھی۔ اس کمرے سے گزر کر وہ ایک اور کمرے میں داخل ہوئے۔ یہ پہلے کمرے سے بھی بڑھ کر سجا سنورا تھا۔ فرش پر غالیچے تھے اور دیواریں دیدہ زیب نقش و نگار سے مزین۔ کمرے کے عین درمیان ایک بہت بڑا قیمتی فانوس لٹک رہا تھا۔ سامنے والی دیوار پر ایک بڑی شبیہہ کندہ تھی۔ بارعب چہرے والا ایک شخص ہاتھ میں تلوار لئے کھڑا تھا جیسے کہ بعد میں پتہ چلا یہ رستم کی شبیہہ تھی۔ یہاں راجی خاتون ایک خوبصورت مسہری پر نیم دراز تھی۔ چہرہ پہلے کی طرح ایک پگڑی میں چھپا ہوا تھا۔ شاید اباقہ کی آمد سے کچھ پہلے اس نے چہرہ چھپایا تھا۔ محافظوں نے اباقہ کو راجی خاتون کے سامنے کھڑا کیا اور اگلے حکم کے منتظر ہو گئے' لیکن راجی خاتون نے مزید کوئی ہدایت کئے بغیر انہیں واپس جانے کا حکم دیا۔ وہ گہری نظروں سے اباقہ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ مسہری کے قریب پھل رکھے تھے اور چھری راجی خاتون کے ہاتھ میں تھی وہ اٹھلا کر کھڑی ہوئی۔ اباقہ کی پشت پر پہنچی اور اس کے ہاتھ کی رسی کاٹ ڈالی۔ اباقہ اس حرکت پر حیران ہوا اور کچھ سراسیمہ بھی۔ اسے راجی خاتون کی آنکھوں سے کچھ عجیب طرح کی شعاعیں پھوٹتی محسوس ہو رہی تھیں۔ اسے لگ رہا تھا جو نادیدہ انگلیاں اس کے ذہن میں رینگ رہی ہیں۔ کوئی اس کے ذہن کو ٹٹولنے میں مصروف تھا۔ پھر راجی خاتون کی سحر انگیز آواز ابھری۔ بالکل جیسے کوئی خواب میں بولتا ہے۔

"میں برسوں سے تمہارا انتظار کر رہی تھی اباقہ۔"

اباقہ اس کی ملائمت اور سحر کاری پر حیران رہ گیا۔ اسے یقین نہیں آیا کہ یہ وہی عورت ہے جو آج صبح سکندر اور اس کے ساتھیوں کو بے دردی سے قتل کرنے کا حکم دے رہی تھی۔ راجی خاتون پھر بولی۔

"تم میرے بارے میں الجھن میں مبتلا ہو اباقہ! لیکن میں تمہارے بارے کسی الجھن کا شکار نہیں۔ مجھے معلوم ہے تم بہادر ہو' بے خوف ہو' بلا کے جنگجو ہو اور .... کسی خاص مقصد کے تحت یہاں آئے ہو۔ تمہاری طرح تمہارے ساتھی بھی معمولی آدمی نہیں وہ ان لوگوں میں سے ہیں جو ملکوں اور قوموں کی تقدیریں بدل دیتے ہیں۔"

اباقہ حیرت سے گنگ یہ سب کچھ سن رہا تھا۔ راجی خاتون بولی۔ "اباقہ! مجھے تمہاری ساری زندگی تمہاری آنکھوں میں نظر آ رہی ہے۔ اتنی واضح تو نہیں' لیکن ایسی مدھم بھی نہیں۔ دیکھو' میں تمہیں بتا سکتی ہوں کہ تم کسی مصور یا نقاش کے بیٹے ہو' تم نے اپنی ابتدائی زندگی جنگلوں اور ویرانوں کی سختیاں جھیلتے گزاری ہے .... شاید کسی انتقام کی خاطر۔ پھر تم نے شہروں کا رخ کیا' جنگیں لڑیں' مہمیں سر کیں' ایک نہایت خوبصورت عورت سے محبت کی۔ اس سے جدا ہوئے اور..........."

"اور کیا؟" اباقہ نے بے ساختہ پوچھا۔

"اور تم اب بھی اس سے محبت کرتے ہو۔"

اباقہ نے حیرت سے کہا۔ "کیا اس کا نام بتا سکتی ہو؟"

جواب میں راجی خاتون کے نقاب سے ایک قہقہہ برآمد ہوا۔ سنگی دیواروں کے اندر جیسے سینکڑوں جلترنگ بج اٹھے۔ راجی خاتون بولی۔ "تم نے مجھے جادوگرنی سمجھ لیا ہے' نہیں اباقہ! میں جادوگرنی نہیں اور نہ کوئی نجومی ہوں۔ میں قیافہ لگاتی ہوں اور یہ مجھے تسلیم ہے کہ میرا قیافہ کبھی غلط ثابت نہیں ہوتا۔ میری اس صلاحیت کو بعض لوگ جادوگری قرار دیتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں میں پُراسرار علوم کی مالک ہوں .... لیکن اصل حقیقت یہی ہے جو میں نے تمہیں بتائی ہے۔"

اباقہ کو حیرانی ہو رہی تھی کہ یہ پُراسرار عورت کتنی آسانی سے اس پر کھلتی جا رہی ہے۔ اس نے پوچھا۔ "راجی خاتون! دروازے پر کھڑی تمہاری خادمائیں..........."

"نہیں اباقہ۔" راجی خاتون بے تکلفی سے ہاتھ لہرا کر بولی۔ "وہ کچھ نہیں سن سکتیں اور نہ بول سکتی ہیں۔ گونگی بہری ہیں وہ۔"

اباقہ کو قدرے سکون ہوا وہ بولا۔ "راجی خاتون! تمہارے بارے میں جو داستانیں

مشہور ہیں ان سے تو پتہ چلتا ہے کہ تم بلا کی سفاک عورت ہو اور میں خود بھی کچھ دیر پہلے تمہاری سنگدلی کے مظاہرے دیکھ چکا ہوں۔ پھر مجھ ایسے گستاخ پر یہ مہربانیاں کیسی؟"

راجی خاتون نے اباقہ کا ہاتھ تھام کر بے تکلفی سے اسے مسہری پر بٹھالیا۔ مسہری اور راجی خاتون کے بدن سے اٹھنے والی مہک اباقہ کے ذہن پر عجیب اثر کر رہی تھی۔ بازو پر جس جگہ اس کی حنائی انگلیاں مس ہوئی تھیں اباقہ کو تپش سی محسوس ہو رہی تھی۔

راجی خاتون کھوئی ہوئی آواز میں بولی۔

"اباقہ! آج صبح جب میں نے تمہیں پہلی بار چبوترے کے سامنے دیکھا تو اس وقت میرے دل سے آواز آئی' راجی خاتون' وہ شخص آگیا ہے جو تیرے دل کی بات سنے گا' سمجھے گا اور تیری مدد کرے گا۔"

"مدد؟" اباقہ حیرت سے بولا۔ "تم جیسی با اختیار عورت کو کس مدد کی ضرورت ہے۔"

"با اختیار نہیں' بے اختیار کہو اباقہ!" راجی خاتون افسردگی سے بولی۔ "تم نے میری بابت جو سنا ہے اور میرا جو روپ دیکھا ہے میں اس کے بالکل برعکس ہوں۔ ٹھہرو میں تمہیں کچھ بتانے سے پہلے اجنبیت کی یہ دیوار گرا دوں۔" راجی خاتون نے کہا اور اپنا خوبصورت ہاتھ اپنی گردن کی طرف بڑھائے۔ منہ کے آگے سے پگڑی کا پلو ہٹا تو ایک چاند اباقہ کے سامنے طلوع ہو گیا۔ درحقیقت راجی خاتون ایک نہایت حسین اور ذہین چہرے کی مالک تھی۔ وہ کوشش کے باوجود اپنی نظریں اس کے چہرے سے نہ ہٹا سکا۔ دونوں یک ٹک ایک دوسرے کو دیکھتے رہے پھر راجی خاتون نے کمرے کے در و دیوار پر نگاہ دوڑائی اور دھیمی آواز میں بولی۔

"سنو اباقہ! اس وادی میں میرا نہیں جعفر داراب کا راج ہے۔ میں تو کٹھ پتلی ہوں ا[illegible] اس کے اشاروں پر ناچتی ہوں۔ اس لئے کہ میرے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔ میرا ہر حکم اس کے تابع ہوتا ہے۔ میں رستم کی بیٹی ہوں اس لئے لوگ میرا ظلم و[illegible] خاموشی سے برداشت کرتے ہیں۔ بس یہی میری کہانی ہے۔"

اباقہ اس انکشاف پر حیرت سے گنگ تھا۔ راجی خاتون نے کہا۔ "جعفر داراب [illegible] بیسیوں وفادار آنکھیں ہر وقت میری نگراں رہتی ہیں۔ بستی کے لوگوں سے میرا رابطہ ا[illegible] وقت کرایا جاتا ہے جب نہایت ضروری ہو' جیسے کہ آج تم نے دیکھا۔ میں جانتی تھی [illegible] اور اس کے ساتھیوں کا مئوقف درست ہے۔ وہ حق پر ہیں' لیکن میں ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے برعکس مجھے وہی حکم صادر کرنا پڑا جو مجھے کہا گیا تھا؟"

اباقہ نے کہا۔ "لیکن تم یہ سب کچھ اتنی آسانی سے مجھے بتا رہی ہو۔ کیا تمہیں اس وقت جعفر داراب سے کوئی خطرہ نہیں۔"

راجی خاتون عجیب پُراسرار لہجے میں بولی۔ "خطرہ تو ہر وقت رہتا ہے .... لیکن کچھ خطرے مول لینے پڑتے ہیں۔"

دفعتاً اباقہ نے محسوس کیا کہ کوئی اس کے عقب میں ہے۔ اس نے تیزی سے مڑ کر دیکھا۔ چار نقاب پوش تلواریں سونتے اس کے عقب میں کھڑے تھے۔ پہلے تو اباقہ سمجھا کہ یہ جعفر داراب کے آدمی ہیں' لیکن جب اس نے راجی خاتون کی طرف دیکھا تو اس کے چہرے پر گہرا سکون نظر آیا.......... اور اسی وقت اباقہ پر ایک اور انکشاف ہوا۔ اس کے عقب میں کھڑے نقاب پوش مرد نہیں عورتیں تھیں۔ ان کے جسموں پر سیاہ رنگ کے چست لباس چمک رہے تھے۔ وہ دھیرے دھیرے اباقہ کو چاروں طرف سے گھیر رہی تھیں اور ان کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ کوئی معمولی عورتیں نہیں۔

اباقہ حیرت سے کبھی راجی خاتون کو دیکھ رہا تھا اور کبھی تلواریں لہراتی ہوئی عورتوں کو۔ دفعتاً دائیں پہلو والی دو عورتیں برق رفتاری سے اباقہ پر جھپٹیں۔ اگر اباقہ غافل ہوتا تو اس کا زندہ بچنا محال تھا لیکن وہ غافل نہیں تھا۔ تیزی سے پینترہ بدل کر اس نے نہ صرف خود کو بچایا بلکہ ایک حملہ آور کی کمر پر ایسی ٹانگ رسید کی کہ وہ اُڑتی ہوئی ایک سنگی دیوار سے جا ٹکرائی۔ دیوار پر نرم غالیچہ آویزاں تھا۔ ورنہ عورت بُری طرح زخمی ہو جاتی۔ عین اس وقت تیسری عورت نے اباقہ پر حملہ کیا۔ اباقہ نے اس کا وار جھک کر بچایا جونہی عورت کا توازن خراب ہوا اباقہ نے اسے کندھے پر اٹھاکر پیچھے کی طرف لڑھکا دیا۔ وہ ایک سریلی چیخ کے ساتھ خوبصورت مسہری پر گری اور مسہری کا ایک بازو توڑ ڈالا۔ موقع غنیمت جان کر اباقہ لپکا اور اس نے دیوار سے لٹکی ہوئی دو تلواروں میں سے ایک اتار لی۔ اس دوران چوتھی عورت اس پر حملہ آور ہو چکی تھی۔ اپنے انداز اور لباس سے وہ تینوں عورتوں کی سردار لگتی تھی اس کا وار بھی سرداروں جیسا تھا۔ اباقہ کو جھکائی دے کر اس نے اس کے پیٹ پر وار کیا۔ تلوار کی نوک اس کی صدری پھاڑتی ہوئی نکل گئی۔ اگلے ہی لمحے دونوں کی تلواریں ٹکرائیں اور کمرے میں جیسے کہرام مچ گیا۔ پلک جھپکتے میں باقی تینوں عورتیں بھی اباقہ پر پل پڑیں۔ اباقہ کا بازو مشینی انداز میں متحرک تھا اور تلوار صاعقہ کی طرح چمک رہی تھیں۔ اس تلوار سے تا دیر محفوظ رہنا ناممکن تھا۔ پھر ایک بھرپور وار ایک عورت کے بازو پر پڑا اور اس وقت اباقہ کو اندازہ ہوا کہ اس کے ہاتھ میں ایک کند تلوار ہے۔ چار عدد سنگ پاش تلواروں میں اس کی تلوار کی حیثیت ایک چھڑی سے زیادہ

نہیں تھی۔ اس نے دیوار پر لٹکی دوسری تلوار کی طرف دیکھا وہ بھی اسی طرح کند تھی۔ اباقہ نے جھلا کر دو زبردست وار کیے اور دو عورتوں کی تلواریں ٹوٹ کر قالین پر جا گریں۔ باقی دو عورتیں مدمقابل کا غضب دیکھ کر ٹھٹک گئیں۔ ایک عورت کو اباقہ نے کندھے سے ایسا دھکا دیا کہ وہ دور تک لڑھکتی چلی گئی۔ عورتوں کی سردار نے جس کے ہونٹوں سے اب خون رس رہا تھا اباقہ کو ایک بار پھر اپنی خطرناک تلوار کا نشانہ بنانا چاہا لیکن اب پانسہ پلٹ چکا تھا۔ اس وقت اباقہ حیرت زدہ تھا اور عورتیں تازہ دم لیکن اس وقت وہ بُری طرح ہانپ رہی تھیں اور اباقہ کے ہاتھ پاؤں کھل گئے تھے۔ اس نے بڑے اطمینان سے عورت کے وار بچائے۔ پھر اپنی کند تلوار سے مقابل کی تلوار پر دستے کے قریب ایک ایسی ضرب لگائی کہ تلوار اس کے عرق آلود ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ ایک ساعت ضائع کیے بغیر اباقہ نے اپنی تلوار سردار عورت کی گردن پر رکھ دی۔ اس نے ذرا سا دباؤ بڑھایا تو عورت الٹے پاؤں ہٹتی ہوئی دیوار سے جا لگی۔ تلوار کی کند دھار اس کی گردن میں گھسی جا رہی تھی۔ وہ مترنم آواز میں چیخ اٹھی۔ ایک عورت نے اپنی ٹوٹی تلوار سے اباقہ کو نشانہ بنانا چاہا۔ وہ عقب سے دبے پاؤں آئی تھی۔ اباقہ نے اس کی طرف دیکھے بغیر ٹانگ چلائی۔ پاؤں کی ٹھوکر نشانے پر لگی اور عورت اُچھل کر راجی خاتون کے قدموں میں جا گری۔

"رک جاؤ اباقہ!" راجی خاتون نے تالی بجاتے ہوئے کہا۔

پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور شاہانہ انداز میں چلتی اباقہ کے قریب پہنچ گئی۔ حملہ آور عورتوں کی سردار ابھی تک دیوار سے لگی کھڑی تھی، لیکن اب اباقہ نے اس کی گردن سے تلوار ہٹالی تھی۔ وہ ہونٹوں سے خون پونچھ رہی تھی اور اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ راجی خاتون نے کہا۔ "میرا خیال ہے ثوبیہ! تیری تسلی ہو گئی ہو گی۔"

"جی ہاں!" ثوبیہ نے سر جھکائے جھکائے جواب دیا۔

راجی خاتون بولی۔ "میں نے اسے کند اور چھوٹی تلوار دی تھی۔ اگر اس کے پاس بھی تمہاری تلواروں جیسی تلوار ہوتی تو تم میں سے کسی کا زندہ بچنا محال تھا.......... اب تم جا سکتی ہو۔"

چاروں عورتوں نے تلواروں کے ٹکڑے اٹھائے، راجی خاتون کو جھک کر سلام کیا اور باہر نکل گئیں۔ راجی خاتون، اباقہ کو لے کر ایک خوبصورت تخت پر آ بیٹھی۔ "یہ میرے محافظ دستے کی عورتیں تھیں۔" وہ بولی۔ "میں ایک عورت ہونے کی حیثیت سے مرد محافظوں پر بھروسہ نہیں کر سکتی۔ اپنا یہ محافظ دستہ میں نے بڑی محنت سے تیار کیا ہے۔ اس دستے کی سالار ثوبیہ نامی ایک منگول باپ کی بیٹی ہے جو میرے باپ کے زمانے میں پناہ

گزینوں کے ساتھ اس وادی میں آیا تھا۔ ثوبیہ کی بہادری کا اندازہ تم اس بات سے کر سکتے ہو کہ میرے محافظ دستے میں آنے سے پہلے یہ مردوں کے شانہ بشانہ لوٹ مار کے لیے جاتی تھی اور ان سے زیادہ مال غنیمت لے کر لوٹتی تھی۔ اس جنگجو لڑکی کے چہرے پر زخموں کے کئی نشان ہیں اور ان نشانوں کے بدلے وہ بیسیوں افراد کو قتل کر چکی ہے۔ یہ میری محافظ ہی نہیں میری رازداں بھی ہے۔ اس نے مجھ سے کہا تھا.......... خیر چھوڑو اس بات کو۔ اس کا خیال تھا کہ تم اس کا اور اس کی تین ساتھیوں کا مقابلہ نہیں کر پاؤ گے۔ اس کا کہنا تھا کہ تم کوئی ایسی مافوق الفطرت چیز نہیں ہو کہ تمہارے بھروسے پر جعفر داراب جیسے شخص کو ناراض کر لیا جائے۔ یہی بات تھوڑی دیر پہلے تم نے بھی مجھ سے کہی تھی کہ میں جعفر داراب کے خطرے سے آنکھیں بند کر کے تم پر کیوں غلطی جا رہی ہوں.......... اباقہ میرا خیال ہے ثوبیہ کی طرح تمہیں بھی اپنے سوال کا جواب مل گیا ہو گا۔ تم ایک غیر معمولی شخص ہو اباقہ۔ مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی جھجک نہیں کہ تم ان لوگوں میں سے ہو جن کی خاطر ہر خطرہ مول لیا جا سکتا ہے۔ میں یقین سے کہہ سکتی ہوں، تمہارے بازوؤں پر بھروسہ کرنے والا کبھی گھاٹے میں نہیں رہا ہو گا اور نہ کبھی رہے گا۔"

اباقہ الجھے ہوئے انداز میں راجی خاتون کی طرف دیکھ رہا تھا۔ "اے خاتون کیا تم نے یہی سب کچھ بتانے کے لیے مجھے یہاں بلایا تھا۔"

راجی خاتون جو چند لمحوں کے لیے جذبات کی رو میں بہہ گئی تھی جیسے ہوش میں آگئی۔ اس نے ذرا ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اباقہ! میرا رویہ شاید تمہیں عجیب لگ رہا ہے، لیکن میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے پاس وقت کم ہے۔ بہت ہی کم اور شاید میں دوبارہ تم سے مل بھی نہ سکوں۔ اس لیے تھوڑے وقت میں زیادہ بات کہنے کی کوشش کر رہی ہوں۔"

اباقہ نے کہا۔ "راجی خاتون! تم نے مجھے اپنے اہم رازوں میں شریک کر کے احسان مند کیا ہے.......... لیکن میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟"

راجی خاتون بولی۔ "اباقہ وقت آنے پر میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گی۔ فی الحال میں چاہتی ہوں کہ تم اس وادی میں رہو۔ اپنے زخمی ساتھی کی تیمارداری کرو اور یہاں کے نشیب و فراز جانچو۔ بہتر ہو گا کہ تم جعفر داراب اور جابر وغیرہ پر اپنی وفاداری ثابت کرو۔ میں انہیں بتا دوں گی کہ تم نے اپنی خطا پر دست بستہ معافی طلب کر لی ہے۔ جعفر داراب سے وفاداری ظاہر کرنے کے لیے تمہاری حیثیت اس وادی کے باشندوں کی سی ہو جانی چاہیے۔ تم اور تمہارے ساتھی بہادر اور جنگجو ہیں اور اس وادی میں سکونت اختیار کرنے کے

لیے سب سے بڑی شرط یہی ہے۔ بزدل اور کمزور شخص اگر وفادار بھی ہو تو اسے قید خانے میں پھینک دیا جاتا ہے۔ پھر یا تو وہ بیگار کرتے کرتے دم توڑ جاتا ہے یا جعفر داراب کے بردہ فروش ساتھی اس کے دام کھرے کر لیتے ہیں۔"

"لیکن مجھے کرنا کیا ہو گا؟" اباقہ پہلو بدل کر بولا۔

راجی خاتون نے اسے انگلی اٹھا کر ٹوکا۔ "نہیں اباقہ! ابھی یہ سوال نہیں' لیکن یہ میں تمہیں بتادوں کہ وہ کام تمہارے شایان شان ہو گا.......... ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ تم اپنے ساتھیوں کے ساتھ جعفر داراب کی وفاداری کا دم بھرنا شروع کر دو۔ اس کے علاوہ اپنے بارے میں یہ مشہور رکھو کہ خلیج فارس میں بہت سفر کر چکے ہو اور تمہیں سمندری سفر کا خاطر خواہ تجربہ ہے.......... کیا تم نے کبھی خلیج فارس میں سفر کیا ہے؟"

"نہیں۔" اباقہ نے صاف گوئی سے جواب دیا۔

"کوئی بات نہیں۔" راجی خاتون بولی۔ "ثوبیہ نامی یہ لڑکی جس کے ساتھ ابھی تم نے مبارزت لی ہے۔ ڈاکوؤں کے ایک گروہ کے ساتھ ایک عرصہ "ہرمز" میں رہی ہے۔ خلیج میں بھی اس نے کافی سفر کیا ہے یہ تمہیں اس علاقے کے بارے میں بہت کچھ بتا سکتی ہے۔ کسی روز موقعہ دیکھ کر میں اسے تمہارے پاس بھیج دوں گی۔"

اباقہ نے پھر پوچھا۔ "راجی خاتون! مجھے کرنا کیا ہو گا؟"

راجی خاتون اس کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے بولی.......... "بہت جلد تمہیں میرا ایک پیغام ملے گا۔ پھر تمہیں فیصلہ کرنا ہو گا کہ ایک مجبور عورت کی مدد کرنا چاہتے ہو یا آج کی ملاقات ہمیشہ کے لیے بھول جانا چاہتے ہو۔"

اباقہ نے سوچا معلوم نہیں یہ عورت اس سے کیا مدد لینا چاہتی ہے۔ اس وادی میں ان کی آمد کا مقصد تو فیروز الدین تک پہنچنا تھا جو سلطان جلال الدین کے بقول ایک غلیظ اور بدبودار جانور تھا اور خلیج کے کسی دور دراز جزیرے میں چھپا بیٹھا تھا.......... لیکن یہ عورت بھی تو خلیج کا ذکر کر رہی تھی شاید.......... اس کے ذہن میں ایک خیال آیا اور وہ چونک کر راجی خاتون کی طرف دیکھنے لگا۔

☆ ———— ☆ ———— ☆

جعفر داراب کی رہائش گاہ سے کچھ دور قید خانے کے راستے میں بے شمار دوسری عمارتوں کے درمیان ایک عمارت طوطم خاں کا گھر تھی۔ اس گھر کے ایک حصے میں ماریتا موجود تھی۔ شام ہونے والی تھی۔ وادی پر آگ برسانے والا سورج اپنا دم خم کھو کر دور مغرب کے ٹیلوں میں غروب ہو رہا تھا۔ شمال مغرب سے ہلکی ہلکی ہوا چلنا شروع ہو گئی

تھی۔ بوڑھی خادمہ نے ماریتا کو نیند سے جاگتے دیکھا تو جلدی سے کھڑکی کھول دی۔ ماریتا مسہری پر نیم دراز کھڑکی سے باہر جھانکنے لگی۔ دور سینکڑوں میل دور بغداد کی گلیاں اور دجلہ کا چمکتا پانی اس کی آنکھوں کے سامنے لہرانے لگا۔ پس منظر میں اسے ایک دھندلا چہرہ نظر آیا۔ دراز بال خشک لب' اداس آنکھیں' یہ اباقہ کا چہرہ تھا۔ شروع شروع میں جب وہ یہ کھڑکی کھول کر مغرب کی طرف دیکھا کرتی تھی تو اس کے تصور میں گھس آنے والا یہ چہرہ نہایت واضح اور روشن ہوتا تھا' لیکن جوں جوں دن گزرتے گئے تھے اس چہرے کے نقوش دھندلاتے گئے تھے اور اب تو کبھی کبھی ماریتا کو یہ صورت پہچاننا بھی مشکل ہو جاتی تھی۔ اس نے سوچا شاید کسی دن وہ کھڑکی کھولے اور اپنے تصور کو آواز دے تو کوئی چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے نہ آئے۔ نہ اباقہ کا' نہ اسد کا' نہ یورق کا اور نہ یاکی کا۔ سب خواب و خیال کی باتیں ہو جائیں۔ اس نے ایک آہ بھری اور گھبرا کر کھڑکی بند کر دی۔ تب خادمہ نے اطلاع دی کہ آقا اندر آنا چاہتے ہیں۔ آقا سے اس کی مراد طوطم خان تھی۔ جب سے وہ اس وادی میں آئے تھے طوطم خان کا معمول تھا کہ وہ صبح کے وقت صرف ایک دفعہ اس سے ملنے کے لیے کمرے میں آتا تھا۔ اگر اس معمول کی خلاف ورزی ہوتی تھی تو اس کا مطلب ہوتا تھا کوئی اہم بات ہے۔ ماریتا نے اپنے بالوں کی لٹیں اوڑھنی میں چھپائیں اور سنبھل کر بیٹھ گئی۔ ذرا دیر بعد دروازے کا پردہ ہلا کر طوطم خاں اندر داخل ہوا۔ ہمیشہ کی طرح اس نے کہا۔

"کیسی ہو ماریتا؟" اور جواب کا انتظار کیے بغیر دائیں جانب رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔

ماریتا آنچل کی اوٹ سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی آج طوطم خان کی پیشانی کی لکیریں ہمیشہ سے گہری تھیں اور یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ کسی نہایت اہم موضوع پر بات کرنا چاہتا ہے۔ ماریتا کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ کچھ دیر کمرے میں ایک بوجھل خاموشی حائل رہی۔ پھر طوطم خاں نے کہا۔

"ماریتا! تم جانتی ہو تمہاری خاطر میں نے کیا کچھ کیا ہے اور کن کن مشکلوں سے گزرا ہوں۔ میں یہ سب کچھ دہرانا نہیں چاہتا۔ تم یہ بھی دیکھ چکی ہو کہ تمہاری محبت کی خاطر میں نے خود کو کس طرح بدلا ہے اور بدل رہا ہوں۔ میں نے تم سے عشق کیا ہے ماریتا اور اس بات کی گواہی تم اپنے آپ سے لے سکتی ہو.......... لیکن انتظار کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ تم نے مجھ سے کہا تھا' طوطم خاں! مجھے کچھ مہلت دو میں خود تمہیں جواب دوں گی.......... ماریتا! آج میں تمہارا فیصلہ سننے آیا ہوں' آخری فیصلہ۔"

ماریتا کو لگا جیسے کمرے کے اندر اس کا دم گھٹنے لگا ہے۔ اس نے گھبرا کر کھڑکی پھر

کھول دی۔ چند گہرے سانس لیے اور آنکھوں میں اُمڈنے والے آنسوؤں کو پینے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ جانتی تھی جلد یا بدیر اسے اس سوال کا سامنا کرنا پڑے گا۔ طوطم خاں نے اسے قراقرم کے عتاب سے بچایا تھا۔ اس کی خاطر اپنے سفارتکار ساتھیوں کو موت کے گھاٹ اتارا تھا' راستے کی ان گنت صعوبتوں کا سامنا کرتے ہوئے وہ اسے اس دور دراز وادی تک لایا تھا۔ اس کے ذہن میں ماریتا کا دل جیتنے کا سودا سمایا ہوا تھا اور اس مقصد کے حصول کے لیے اس نے کیا کچھ نہیں تھا۔ طوطم خاں کی محبت میں قہر اور مہر اس طرح گھل مل گئے تھے کہ ماریتا کو ہر لحہ اپنا دم گھٹتا محسوس ہوتا تھا.......... وہ سوچتی تھی طوطم خاں کے حصار سے کبھی نہیں نکل سکے گی' لیکن دل پاگل پھر بھی آس لگائے بیٹھا تھا۔ اسے لگتا تھا کسی دن ایک جنگلی ہوا کے جھونکے پر سوار آئے گا اور اس جان لیوا گھٹن سے نکال کر اسے آزاد فضاؤں میں لے جائے گا۔ کوئی اس کا راستہ نہ روک سکے گا۔ کوئی اس کا پیچھا نہ کر سکے گا۔ وہ للکار کر کہے گا' میرا نام اباقہ ہے جس کو اپنے کندھوں پر سر کی ضرورت نہ ہو وہ میرے سامنے آئے' جو اپنی زندگی سے بیزار ہو وہ میرا پیچھا کرے..........

لیکن وقت کے ساتھ ساتھ سب امیدیں دم توڑ گئی تھیں۔ ساری خوش فہمیاں کالے پہاڑوں کی بے اماں دھوپ میں خاکستر ہو گئی تھیں۔ اس دور افتادہ وادی تک کوئی نہ پہنچا تھا اور.......... اب طوطم خاں فیصلہ مانگ رہا تھا۔

ماریتا نے آنسوؤں کو روک کر حلق میں گرایا اور ٹھہری ہوئی آواز میں وہ فیصلہ سنا دیا جو وہ کئی روز پہلے کر چکی تھی۔ اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"طوطم خاں! میرا دل میرے بس میں نہیں۔ میں تمہارے احسانوں کے بوجھ تلے پسی جا رہی ہوں۔ اس بوجھ کو اتار دینا چاہتی ہوں' لیکن ابھی میں کچھ نہیں کر سکتی۔"

طوطم خاں زور دے کر بولا۔ "پھر کب ماریتا.......... آخر کب؟"

ماریتا کی خاموشی پر طوطم خاں قدرے برہمی سے بولا۔ "ماریتا! میں کوئی بچہ نہیں ہوں۔ مجھے اس طرح بہلانے کی کوشش نہ کرو۔ خوب سمجھ کر مجھے ایک وقت دے دو .... بس۔ اس وقت سے پہلے میں تم سے کچھ نہیں کہوں گا۔ بولو۔ میرے انتظار کا خاتمہ تمہیں کب منظور ہے۔ جواب دو۔"

ماریتا کے پاس طوطم خاں کے تحکمانہ سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اچانک وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ طوطم خاں خاموشی سے بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔ شکار پھندے سے نکل نکل جا رہا تھا' لیکن شکاری بھی گھاگ تھا۔ وہ نیلے پہاڑ کے سامنے سکندر کی پھانسی کے موقع پر قراقرم کے وحشی جنگجو کو دیکھ چکا تھا کہ شکار گاہ کی فضا بدلنے والی ہے۔ شکار اور شکاری

کے درمیان کچھ نئے چہرے حائل ہونے والے ہیں۔ اگر یہ موقع نکل گیا تو کبھی ہاتھ نہیں آئے گا۔ اس نے سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق پینترہ بدلا۔ وہ بولا۔ "ماریتا! ٹھیک ہے اگر تم ابھی تک اپنے دل کو سنبھال نہیں سکیں تو میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا' لیکن تمہیں مجھ سے کم از کم ایک وعدہ کرنا ہوگا۔ اگر تم شادی کرو گی تو مجھ سے' میرے سوا کسی اور سے نہیں کرو گی۔"

ماریتا کو لگا جیسے اس کی گردن کے گرد کسا ہوا پھندہ اچانک ڈھیلا پڑ گیا ہے۔ طوطم خاں کی دی ہوئی رعایت اسے بہت بڑی مہربانی محسوس ہوئی۔ اس نے بے ساختہ کہا۔

"ٹھیک ہے طوطم خاں! میں تم سے وعدہ کرتی ہوں' تمہارے علاوہ اب کوئی مرد میری زندگی میں نہیں آئے گا۔ اگر میں شادی کروں گی تو تم سے۔"

طوطم خاں بولا۔ "اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ کسی موڑ پر تم اپنے عہد سے پھر نہیں جاؤ گی۔"

ماریتا عاجزی سے بولی۔ "تم جیسے کہو میں تمہیں یقین دلانے کے لیے تیار ہوں۔"

طوطم خاں کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔ وہ بولا۔ "میں جانتا ہوں تمہیں اباقہ سے عزیز دنیا میں کوئی نہیں تھا۔ اگر میں تم سے اس خوش قسمت شخص کی قسم کھانے کو کہوں تو کھا سکو گی؟"

ماریتا خاموش رہی۔ طوطم خاں برہمی سے بولا۔ "ماریتا! مجھے یہ سمجھنے پر مجبور نہ کرو کہ تمہارے دل میں کھوٹ ہے۔"

ماریتا رونے لگی۔ پھر اس نے سر جھکایا اور شکستہ آواز میں بولی۔ "تم.......... جس کا نام لے رہے ہو' مجھے اسی کی قسم ہے اگر میں شادی کروں گی تو تم سے۔"

"بس ماریتا' مجھے یقین آیا۔ میرے نیلے آسمان کو یقین آیا۔" طوطم خاں خوش ہو کر بولا۔ "اب مجھے یہ اطمینان رہے گا کہ میں جہاں بھی رہوں' جیسے بھی رہوں۔ تم میری ہو صرف میری۔" ماریتا سر جھکائے سسکیاں روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔

☆ ---- ☆ ---- ☆

سلطان جلال الدین کی حالت ابھی خطرے سے باہر نہیں تھی۔ وہ مسلسل بے ہوش تھا۔ راجی خاتون کی رہائش گاہ سے واپس آ کر اباقہ نے سردار یورق کو سارا قصہ سنایا۔ سردار یورق بھی ان انکشافات پر حیران نظر آنے لگا۔ اگر سلطان جلال الدین ہوش میں ہوتا تو وہ فوراً اس سے مشورہ کرتے لیکن فی الوقت انہی دونوں کو آئندہ کا لائحہ عمل تیار کرنا تھا۔

سردار یورق نے مشورہ دیا کہ انہیں جابر سے رابطہ قائم کرنا چاہئے۔ وہ ان کے لیے

وادی میں رہائش' خوراک وغیرہ کا بندوبست کر سکتا ہے۔ جعفر داراب تک رسائی حاصل کرنے میں بھی وہی معاون ہو سکتا تھا۔ جابر کے رویے سے اباقہ اور یورق اندازہ لگا چکے تھے کہ اس کے دل میں ان کے لیے ایک نرم گوشہ موجود ہے۔ دوسرے روز یورق اور اباقہ جابر کے پاس پہنچے۔ اسے یہ خبر پہلے ہی پہنچ چکی تھی کہ راجی خاتون نے اباقہ کو معاف کر دیا ہے۔ اس نے سلطان جلال الدین کا حال دریافت کیا اور ایک بار پھر اس کی آنکھوں میں الجھن کے سائے لہرانے لگے۔ اباقہ اور یورق نے سلطان کا فرضی نام بتایا تھا اور شاید جابر کا ذہن ابھی تک یہ نام قبول نہیں کر سکا تھا۔ بہر حال اس بار بھی کوشش کے باوجود وہ سلطان کے متعلق کچھ یاد کرنے میں ناکام رہا۔ اباقہ اور یورق نے جابر خاں سے کہا کہ وہ اس وادی میں رہنا پسند کریں گے۔ یہاں کے لوگ اور یہاں کا ماحول ان کی طبع کے عین مطابق ہے۔ چونکہ وہ خود بھی جنگ آزما لوگ ہیں اس لیے راجی خاتون اور جعفر داراب کے لیے اہم خدمات انجام دے سکیں گے۔ جابر خاں نے اسی وقت مہربانی کا ثبوت دیا۔ اس نے کالی پگڑی والے ایک لحیم شحیم شخص کو بلایا اور اسے کہا کہ آج سے یہ دونوں افراد تیرے دستے میں شامل ہیں۔ یہ ہمت والے لوگ ہیں ان سے ہمت طلب کام لینا۔ اباقہ اور یورق جانتے تھے کہ انہیں ڈاکوؤں کے ایک جتھے میں شامل کیا جا رہا ہے اور کالی پگڑی والا اس کا سردار ہے۔ کالی پگڑی والے نے اثبات میں سر ہلایا اور سلام کر کے چلا گیا۔ جابر خاں نے اباقہ اور یورق سے وعدہ کیا کہ وہ جعفر داراب سے سفارش کر کے انہیں جلدی کوئی مکان دلوا دے گا۔ فی الوقت اس نے علاج گاہ میں انہیں سلطان جلال کے پاس ہی ٹھہرنے کا مشورہ دیا۔

حسب وعدہ تین چار روز کے اندر اندر مکان' خوراک' ملازمت سب کچھ انہیں مل گیا۔ جابر خاں تو ان کے لیے دو عدد خوبصورت بیویوں کا انتظام بھی کر رہا تھا' لیکن اباقہ اور یورق نے منع کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ انہیں صرف ایک مرد خادم عنایت کر دیا جائے۔ جابر خاں نے کہا کہ مرد خادموں کی فی الحال کمی ہے' جونہی کوئی اچھا خادم ملا ان کے سپرد کر دیا جائے گا۔ سب کچھ پالینے کے بعد اب اباقہ اور یورق کو صرف ایک پریشانی تھی' سلطان جلال الدین ابھی تک ہوش میں نہیں آیا تھا۔ صرف ایک روز اس کی طبیعت کچھ بحال ہوئی تھی' لیکن اگلے ہی روز دوبارہ بے ہوشی طاری ہو گئی تھی۔ صرف پانچ گز کے فاصلے سے چلایا گیا تیر اس کی پسلیوں کے درمیان سے گزر کر جوف سینہ میں پہنچ گیا تھا۔ زخم کاری تھا۔ یہ سلطان جلال الدین کی قوت ارادی تھی۔ جو اسے موت سے نبرد آزما رکھے ہوئے تھی۔ اباقہ کا تو کچھ کرنے کو دل نہیں چاہتا تھا' لیکن یورق کا مشورہ تھا کہ اسے سلطان جلال

کے مقصد کے حصول کے لیے کوشش جاری رکھنی چاہیے۔ جیسا کہ راجی خاتون کی باتوں سے ظاہر ہوا تھا وہ انہیں خلیج فارس بھیجنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ یا کوئی ایسی مہم سپرد کرنا چاہتی تھی جس کا تعلق خلیج فارس کے علاقے سے تھا۔ عین ممکن تھا کہ آگے چل کر راجی خاتون کی منزل ان کی اپنی منزل ثابت ہوتی۔ لہٰذا ضروری تھا کہ وہ راجی خاتون کے دیئے ہوئے مشوروں پر عمل کریں۔ وادی میں تو وہ حسب مشورہ رک ہی گئے تھے۔ جابر خاں کو اپنے کوائف سے آگاہ کرتے ہوئے انہوں نے اسے یہ بھی بتا دیا تھا کہ وہ خلیج فارس کے بحری قزاقوں کے ساتھ سفر کر چکے ہیں اور کشتی رانی میں ماہر ہیں۔ اب راجی خاتون کے تیسرے مشورے پر عمل کرتے ہوئے انہیں جعفر داراب سے اپنی وفاداری ثابت کرنا تھی اور ان کی طرف سے جعفر کے دل میں جو شکوک پیدا ہو چکے تھے انہیں رفع کرنا تھا۔

آخر ایک روز اباقہ کو اس کا سنہری موقع مل گیا۔ اس رات اپنے جتھے کے سردار کے حکم پر وہ جعفر داراب کی رہائش گاہ کے پہرے پر معمور تھا۔ اس کے دو ساتھیوں میں بڑی توند والا ایک نیشاپوری راہزن اور ایک گھاگ عراقی تھا۔ اباقہ کی حیثیت ان دونوں کے ماتحت کی تھی .... اس وقت نصف شب بیت چکی تھی۔ ہلکی ہلکی مسحور کن ہوا چل رہی تھی۔ پوری وادی خمار کی تاریکی میں ڈوبی تھی۔ دفعتاً جعفر داراب کی رہائش گاہ کے اندر سے دھماکہ سنائی دیا اور پچھلے حصے میں آگ بھڑک اٹھی۔ اس طرف جعفر داراب نے اپنے نہانے کے لیے ایک چھوٹا سا حوض بنوا رکھا تھا جس پر لکڑی کے تختوں کی چھت تھی اور چاروں طرف لکڑی ہی کی چار دیواری تھی۔ اس جانب سے جو شعلے برآمد ہوئے انہیں دیکھتے ہی اباقہ نے اندازہ لگا لیا کہ آگ کسی آتش گیر مادے سے لگی ہے چند ہی لمحے بعد اہرام نما رہائش گاہ کا بیرونی دروازہ دھماکے سے کھلا اور چند ملازمین چیختے ہوئے باہر نکلے۔ ان کے ساتھ ہی سیاہ دھوئیں کا ایک مرغولہ بھی برآمد ہوا۔ باہر نکلنے والوں میں دو خوبصورت کنیزیں اور ایک نوجوان خادم تھا۔ اباقہ کو جعفر داراب کی رہائش گاہ پر پہرہ دیتے ہوئے آج چوتھا روز تھا اور وہ جانتا تھا کہ خوبصورت کنیزیں ہر روز بدل دی جاتی ہیں۔ ظاہر ہے ایسا جعفر داراب کی تفریح طبع کے لیے کیا جاتا تھا۔ کنیز نے چیختے ہوئے بتایا کہ آقا مکان کے عقبی حصے میں آگ کے اندر گھر گئے تھے۔ اباقہ اور دوسرے پہریدار چند ساعتوں کے لیے آدھ کھلے دروازے کی طرف دیکھتے رہے شاید ان کا خیال تھا کہ جعفر داراب بھی کسی طرح نکل آئے گا' لیکن اب دروازے میں شعلوں کی چمک اور سیاہ دھوئیں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ مکان کے عقبی حصے سے برآمد ہونے والے نارنجی شعلے اب اور بلند ہو گئے تھے۔ نیشاپوری پہریدار نے چلا کر اباقہ اور اس کے ساتھی کو آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ وہ

تینوں بھاگتے ہوئے بیرونی دروازے کے سامنے پہنچے۔ نیشاپوری پہریدار چند قدم آگے بھی گیا' لیکن آگ اب پوری طرح پھیل چکی تھی۔ وہ کھانستا اور آنکھیں ملتا ہوا باہر نکل آیا۔ پھر اس نے اباقہ کو آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ شاید وہ اباقہ کی قربانی دے کر "سرخرو" ہونا چاہتا تھا۔ اس کے نزدیک اباقہ ایک ادنیٰ سا ماتحت تھا۔ ایسے ماتحت اپنے افسروں کو سرخرو کرنے کے لیے ہی تو ہوتے ہیں۔ اگر اباقہ نہ چاہتا تو وہ نیشاپوری بھینسا کسی صورت اباقہ کو اس آگ میں کودنے پر آمادہ نہیں کر سکتا تھا .... لیکن صورت حال مختلف تھی۔ اباقہ جعفر داراب کو بچانے کا فیصلہ کر چکا تھا .... اس نے نہایت تیزی سے مکان کا جائزہ لیا اور بھاگتا ہوا عقبی حصے میں پہنچ گیا۔ جعفر داراب کی خواب گاہ اسی حصے میں تھی اور آگ کا زیادہ زور بھی یہیں تھا۔ عقبی دروازہ اور حوض کا سائبان دھڑا دھڑ جل رہے تھے' اباقہ نے تیزی سے سوچا اور حوض میں چھلانگ لگا دی۔ ایک غوطہ لگا کر وہ عقبی دروازے کے سامنے پہنچا اور چند قدم بھاگ کر دروازے کے تختوں سے ٹکرایا۔ یہ ایک نہایت دلیرانہ اقدام تھا۔ ادھ جلے تختے ٹوٹے اور اباقہ لڑھکتا ہوا اندر جا گرا۔ گیلے لباس نے اسے فی الوقت آگ سے محفوظ رکھا تھا۔ زمین پر گرتے ہی وہ پھرتی سے اٹھا اور دھوئیں میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ قالین پردے بستر سب کچھ جل رہا تھا۔ اباقہ نے اپنی سانس سینے میں روک رکھی تھی۔ اسے معلوم تھا جونہی اس نے منہ کھولا۔ گاڑھا سیاہ دھواں اس کے پھیپھڑوں میں گھس کر اسے نیم جان کر دے گا۔

سانس روکنے میں اباقہ کو مہارت حاصل تھی۔ وہ پانی کے نیچے تادیر تیر سکتا تھا۔ اپنی اسی خوبی کی بنا پر وہ چین کی مہم میں اس قلعے تک پہنچنے میں کامیاب ہوا تھا جس کی ایک برجی منگول فوج کے لیے سدِراہ بنی ہوئی تھی .... لیکن یہاں صورت مختلف تھی۔ ناقابل برداشت تپش نے گھٹن میں بے پناہ اضافہ کر دیا تھا اور کچھ زہریلا دھواں اباقہ کے پھیپھڑوں میں پہلے سے پہنچ چکا تھا۔ رکی ہوئی سانس اس کے سینے میں بری طرح مچل رہی تھی اور وہ تیزی سے جعفر داراب کو ڈھونڈنے میں مصروف تھا۔

بالآخر اس کی ہمت جواب دینے لگی اور اس نے اس جلتی ہوئی قبر سے باہر نکلنے کا ارادہ کر لیا' لیکن عین اس وقت اس کا پاؤں کسی زندہ جسم سے ٹکرایا۔ اس نے نیچے جھک کر ٹٹولا' یقیناً وہ جعفر داراب تھا مگر اس کا جسم کسی وزنی چیز کے نیچے دبا تھا۔ شاید وہ کوئی چوبی الماری تھی۔ اباقہ کی قوت برداشت اب آخری حدوں کو چھو رہی تھی۔ ہونٹ جیسے سانس کی خواہش میں خود بخود وا ہو رہے تھے' لیکن وہ جانتا تھا یہ سانس اس کی زندگی کی آخری سانس ثابت ہو گی۔ سانس لیتے ہی سیاہ بدبودار دھواں اس کے سینے میں پہنچے گا اور وہ بھی

چکرا کر جعفر داراب کے پہلو میں جا گرے گا۔ اس نے اپنی بچی کھچی قوت جمع کی اور جعفر داراب کو الماری کے نیچے سے نکالنے کی کوشش کرنے لگا۔ مکان سے باہر لوگوں کی چیخ و پکار اس کے کانوں میں پہنچ رہی تھی۔ وہ یہ بھی محسوس کر رہا تھا کہ جلتی ہوئی چھت کسی بھی لمحے اس پر گر سکتی ہے۔ بمشکل اس نے جعفر داراب کا بے ہوش جسم الماری کے نیچے سے نکالا اور اسے کندھے پر ڈال لیا۔ اب وہ ذہن پر زور دے کر عقبی دروازے کی سمت جانے لگا۔ اس وقت ایک دھماکے سے جلتی ہوئی چھت کا ایک حصہ اس پر آن گرا۔ یکایک جیسے کسی نے آگ کا بنا ہوا کمبل اس پر پھینک دیا ہو۔ اباقہ کو بے پناہ تپش کا احساس ہوا۔ ایک ساعت کے لیے صرف ایک ساعت کے لیے اس نے اپنا اور جعفر داراب کا جلتا ہوا جسم دیکھا۔ پھر وہ تیزی سے بھاگا۔ عقبی دروازے پر پہنچتے ہی اسے حوض کا چمکتا پانی دکھائی دیا۔ اس نے چھلانگ لگائی اور جعفر سمیت اُڑتا ہوا حوض میں جا گرا۔

یہ چھلانگ زندگی کی چھلانگ ثابت ہوئی۔ اس سے پہلے کہ آگ ان کے کپڑوں کو جلا کر جسموں کو نقصان پہنچاتی۔ وہ حوض کے پانی میں پہنچ چکے تھے۔ حوض کے کنارے سے کئی ہاتھ ان کی طرف بڑھے اباقہ اور جعفر داراب کو باہر نکال لیا گیا۔ پھر انہیں آگ کی تپش سے دور کھلی جگہ پر لے جایا گیا۔ جعفر داراب کا شب خوابی کا لباس کئی جگہ سے جل چکا تھا اور جسم پر جلنے کے نشان تھے' لیکن اس کی حالت خطرے سے باہر تھی۔ اباقہ کو بھی ایک دو جگہ معمولی جلن ہو رہی تھی۔ اس کی صدری پر چند بڑے بڑے سوراخ بھی نظر آ رہے تھے۔ مکان سے نکلنے والے شعلے اب آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔ اباقہ جانتا تھا۔ جعفر داراب کے مکان میں ریشم' کمخواب اور مخمل کے تھانوں کے تھان پڑے ہیں۔ اس کے علاوہ وافر مقدار میں نہایت اعلیٰ قسم کی شراب بھی اندر موجود تھی یہ چیزیں اب آگ پکڑ گئی تھیں اور شعلوں کا رقص تیز تر ہو گیا تھا۔ اردگرد کے لوگ بھاگ کر جائے وقوع پر پہنچ رہے تھے۔ ان میں مرد عورتیں بچے سبھی شامل تھے۔ شعلوں کی روشنی چہرے پر منعکس ہو رہی تھی۔ وہ سب تماشائیوں کی حیثیت سے کھڑے تھے۔ آگ بجھانے کی کوشش کوئی بھی نہیں کر رہا تھا کیونکہ وہ جانتے تھے یہ مکان اب جل کر ہی بجھے گا۔ خواہ مخواہ پانی ضائع کرنے سے کچھ حاصل ہونے والا نہیں تھا۔ اباقہ بے خیالی میں ہجوم کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دفعتاً اس کی نگاہ ایک چہرے پر پڑی اور وہ جیسے سن ہو کر رہ گیا۔ شعلوں کی لپک ایک ایسے چہرے پر منعکس ہو رہی تھی جسے وہ سینکڑوں ہزاروں میں پہچان سکتا تھا۔ کہیں وہ خواب تو نہیں دیکھ رہا۔ اس نے بے دردی سے اپنا ہونٹ دانتوں میں چبا ڈالا۔ پھر وہ اٹھا اور کسی معمول کی طرح چلتا ہوا ہجوم کی طرف بڑھا۔ اس کی تمام حسیات

آنکھوں میں سمٹ آئی تھیں۔ چند گز چل کر وہ رکا اور زور سے پکارا۔

"ماریتا.........."

اس کی آواز بلند نہ ہوتی تو شوروغل میں دب کر رہ جاتی لیکن وہ آواز تو جیسے ساری آوازوں پر حاوی ہو گئی تھی۔ ہجوم میں نظر آنے والا چہرہ متحرک ہوا۔ پھر جیسے چاند تیز رفتار بادلوں میں چھپ جاتا ہے وہ چہرہ دوسرے چہروں میں اوجھل ہو گیا۔ اباقہ تیزی سے اس کے پیچھے لپکا۔ اس کی نگاہیں سرعت سے اردگرد کا جائزہ لے رہی تھیں۔ پھر اسے ایک ہیولا دکھائی دیا جو تیزی سے واپس جارہا تھا۔ "ماریتا" اباقہ کی آواز ایک بار پھر گونجی' لیکن ہیولا ساکت نہیں ہوا۔ اب وہ ایک تنگ گلی میں پہنچ چکے تھے۔ دونوں طرف اہرام نما مکانوں کی قطاریں تھیں۔ جونہی ہیولا ایک مکان کے عقب میں اوجھل ہوا۔ اباقہ نے دوڑ لگا دی۔ جب وہ اس مکان تک پہنچا ہیولا چالیس پچاس گز دور ایک اور مکان میں داخل ہوتا دکھائی دیا۔ اگر اباقہ کو ایک لمحے کی بھی تاخیر ہو جاتی تو وہ کبھی جان نہ سکتا کہ مشکوک ہیولا کس مکان میں داخل ہوا ہے۔ اباقہ نے چند لمحے رک کر سوچا پھر تیز قدموں سے اس مکان کی طرف بڑھا۔ دروازے پر پہنچ کر اس نے دستک دی۔ ایک بار' دوبار.......... لیکن کوئی جواب نہیں آیا۔ تیسری بار اباقہ نے کافی زور سے دروازہ پیٹا۔ چند لمحے بعد دوسری جانب سے آہٹ سنائی دی۔

"کون ہے؟" ایک نسوانی آواز نے پوچھا۔

"دروازہ کھولو۔" اباقہ کے لہجے میں تحکم تھا۔

چند لمحے بعد دروازہ کھل گیا۔ ایک اُدھیڑ عمر عورت خادمہ کے لباس میں اس کے سامنے کھڑی تھی۔ اس کی نگاہوں میں ہراس تھا۔ "وہ عورت کہاں ہے جو ابھی اس گھر میں داخل ہوئی۔" اباقہ تیزی سے بولا۔

"کون عورت؟" خادمہ بولی۔ "گھر میں تو ابھی میں آئی ہوں۔"

"جھوٹ مت بولو۔ میری نگاہ اتنی کمزور نہیں۔"

خادمہ غصے سے بولی۔ "مجھے تمہاری نگاہ سے کوئی سروکار نہیں۔ یہ جس شخص کا گھر ہے وہ نام پوچھے بغیر سر اتار لیا کرتا ہے۔ تم اپنا مطلب بتاؤ؟"

"مجھے اس عورت سے ملنا ہے جو ابھی ابھی گھر میں داخل ہوئی ہے۔ میں نے جو کچھ کہنا ہے اس سے کہوں گا۔" اباقہ کی آواز طیش سے لرز رہی تھی۔

خادمہ فیصلہ کن لہجے میں بولی۔ "میں تمہیں کہہ چکی ہوں کہ اس گھر میں میرے سوا کوئی عورت نہیں۔ تم اب جا سکتے ہو۔ دوسری صورت میں مجھے پڑوسیوں کو بلانا ہو گا۔"

اباقہ تذبذب کے عالم میں خادمہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جو کچھ اسے نظر آیا تھا دور سے اور نیم تاریکی میں نظر آیا تھا۔ اس سے قبل بھی کئی چہروں پر اسے ماریتا کا دھوکا ہو چکا تھا۔ اس دور افتادہ' جہنم نشاں وادی میں ماریتا کی موجودگی کیونکر ممکن ہے۔ وہ سوچنے لگا۔ ایک دوسری چیز جو اسے شبہے میں مبتلا کر رہی تھی' خادمہ کی اوڑھنی تھی اسے یاد پڑ رہا تھا کہ شعلوں کی روشنی میں اسے اسی اوڑھنی کی جھلک دکھائی دی تھی .... تو کیا واقعی اس نے اس اُدھیڑ عمر خادمہ کا تعاقب کیا تھا۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر خاموشی سے واپس چلا آیا لیکن جاتے جاتے وہ اس مکان کا محل وقوع اچھی طرح ذہن نشین کر چکا تھا۔

☆-----------☆-----------☆

سردار یورق جلال الدین کے سرہانے بیٹھا تھا۔ خواب آور دواؤں کے زیر اثر سلطان جلال گہری غنودگی کے عالم میں تھا۔ دھوپ کا عذاب لے کر قہرمان سورج اس سنگلاخ وادی پر طلوع ہو چکا تھا۔ دروازہ کھلا اور اباقہ اندر داخل ہوا۔ سلطان جلال کا جائزہ لینے کے بعد وہ یورق کے پاس آ بیٹھا۔ یورق دھیمی آواز میں بولا۔

"میں تمہاری رات کی کارکردگی سے آگاہ ہو چکا ہوں۔ جعفر داراب کو جلتے مکان سے نکال کر تم نے اہم کامیابی حاصل کی ہے۔ تم زخمی تو نہیں ہوئے؟"

اباقہ نے نفی میں سر ہلایا۔

یورق بولا۔ "پھر بھی میرا خیال ہے کہ آج تم آرام کرو۔ میں نے رات بھر کچھ آنکھ لگائی تھی اس لیے آسانی سے سلطان کے پاس بیٹھ سکتا ہوں۔ تم تین چار روز سے بالکل نہیں سوئے۔"

"میری فکر مت کرو۔" اباقہ نے عام سے لہجے میں کہا۔ "سلطان کی قربت مجھے نیند سے زیادہ مطلوب ہے۔"

یورق بولا۔ "لیکن جعفر کے مکان میں آگ لگی کیسے؟"

اباقہ نے کہا۔ "میرا خیال ہے' سکندر کا کوئی حامی ہو گا۔ ان لوگوں نے سکندر اور اس کے ساتھیوں کے معاملے میں سفاکی بھی تو بہت برتی ہے۔ کتنی بے رحمی سے انہیں موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔"

"مگر جعفر کے مکان کے گرد تو سخت حفاظتی انتظامات ہوتے ہیں۔" یورق بولا۔

اباقہ نے کہا۔ "ہو سکتا ہے کہ مکان کے اندر موجود افراد میں سے ہی کسی نے یہ کارنامہ انجام دیا۔ جعفر داراب کی خدمت پر ہر رات دو نئی کنیزیں معمور ہوتی ہیں۔ ممکن ہے ان کنیزوں میں سے کوئی اپنے لباس کے اندر آتش گیری مادہ چھپا کر لے گئی ہو؟"

یورق بولا۔ "میرے خیال میں ایسا نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آگ لگنے کے وقت کوئی شخص مکان کے عقبی حوض کی چاردیواری میں چھپا بیٹھا تھا۔ کل دوپہر کے وقت جب پہریدار سخت دھوپ سے بچنے کے لیے درختوں کے نیچے چلے گئے ہوں گے وہ شخص اندر گھس گیا ہو گا۔ نصف رات تک وہ وہیں کسی کونے میں دبکا رہا۔ پھر اس نے آگ لگائی اور جب افراتفری مچی تو آرام سے نکل گیا۔"

اباقہ نے یورق کو گھور کر دیکھا اور بولا۔ "تم یہ سب کچھ اتنے یقین سے کیسے کہ رہے ہو؟"

یورق کے چہرے پر ایک معنی خیز مسکراہٹ نظر آئی اور وہ بولا۔ "تم نے مجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ کل دوپہر کے بعد میں تمہیں نظر کیوں نہیں آیا۔"

اباقہ حیرت سے یورق کو دیکھ رہا ہے۔ "تت .... تو .... سب ...."

"ہاں .... ہاں۔" یورق نے آہستگی سے اس کا بازو دبایا۔ "میں تمہارے لیے ایک سنہری موقعہ فراہم کرنا چاہتا تھا اور مجھے یقین تھا کہ تم اس موقع سے فائدہ ضرور اٹھاؤ گے۔"

اباقہ چند لمحے خاموشی سے سردار یورق کی طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔ "سردار' لیکن اگر جعفر اس آگ میں جل مرتا؟"

یورق لاپرواہی سے بولا۔ "خس کم جہاں پاک۔ جل مرتا تو جل مرتا۔"

"مگر راجی خاتون نے جعفر کو مارنے کا نہیں اس کے شکوک رفع کرنے کا مشورہ دیا تھا۔"

یورق ایک گالی دے کر بولا۔ "مرجاتا تو .... سارے شکوک رفع ہو جاتے۔"

اتنے میں سلطان جلال نے کسمسا کر بدن کو جنبش دی۔ دونوں باتیں کرتے کرتے خاموش ہو گئے۔

اس دن اباقہ کو ایک پل چین نہیں آیا۔ وہ سارا دن رات کی تاریکی کا انتظار کرتا رہا۔ آگ کی خوابناک روشنی میں دیکھا ہوا چہرہ ہر لحظہ اس کے احساس کو ڈستا رہا۔ بالآخر شام ہوئی اور تاریکی نے اپنے پر پھیلانے شروع کر دیے۔ جب یورق اپنی نیند پوری کرنے کے بعد سلطان جلال الدین کی تیمارداری کے لیے پہنچ گیا تو اباقہ علاج گاہ سے باہر نکلا اور بے چینی دور کرنے کے لیے بے مقصد گلیوں میں گھومنے لگا۔ جعفر داراب کے مکان کو جلے دو پہر ہو گئے تھے' لیکن وادی کے مختلف حصوں سے لوگ ابھی تک خاکستر ملبے کا نظارہ کرنے آرہے تھے۔ چشمے کے گرد جہاں سفید پگڑی والے باشندوں کے گھر تھے حفاظتی انتظامات

اور سخت کر دیے گئے تھے۔ اپنے سردار کے مکان میں حاضری دے کر اور کل کے کارنامے پر شاباش وصول کر کے' رات گئے اباقہ باہر نکلا تو اس کا دل شدت سے دھڑکنے لگا۔ اس کا رخ اب کل والے مکان کی طرف تھا۔ وہ درست مکان کے سامنے پہنچا اور گھوم کر عقب میں چلا گیا۔ مغرب کی طرف کھلنے والی ایک چھوٹی سی کھڑکی جیسے اسے اپنی طرف بلا رہی تھی۔ رات اب کافی گہری ہو چکی تھی۔ وادی کے زیادہ تر مکین دن بھر کی گرمی سے نجات پانے کے بعد فوراً سو جاتے تھے۔ اباقہ نے اردگرد نگاہ دوڑائی' کوئی متنفس دکھائی نہیں دیا۔ اس نے کھڑکی پر دباؤ ڈالا تو وہ فوراً کھل گئی۔ ابھی وہ حیرت کے اس جھٹکے سے سنبھل بھی نہ پایا تھا کہ ایک اور شدید جھٹکا لگا۔ اس کے سامنے ماریتا کھڑی تھی۔ وہ مبہوت اس کی طرف دیکھتا رہا۔ کھلے بالوں اور ڈھیلے ڈھالے سرخ لبادے میں کوئی خیالی پیکر دکھائی دے رہی تھی۔ نہ جانے کتنی دیر وہ ایک دوسرے میں کھوئے رہے پھر ماریتا کی ٹھہری ہوئی آواز سنائی دی۔ "یہ مت پوچھنا اباقہ! کہ تم ماریتا ہی ہو نا .... ہاں میں ماریتا ہی ہوں۔ میں تمہاری عادت سے آگاہ ہوں۔ مجھے معلوم تھا تم آج رات ضرور آؤ گے۔ اسی لیے میں نے یہ کھڑکی کھلی رکھی تھی۔"

ماریتا کھلی کھڑکی کی بات کر رہی تھی' لیکن اس کے دل کی کھڑکی جیسے بند تھی۔ اباقہ اس کے لہجے کی اجنبیت پر چونک پڑا۔ وہ بولا۔ "ماریتا! مجھے کچھ سمجھ نہیں آتی تم سے کیا کہوں۔ تم اب تک کہاں تھیں اور میں جو یہ سب کچھ دیکھ رہا ہوں کیا ہے؟"

ماریتا روکھے لہجے میں بولی۔ "اباقہ! اتنا حیران ہونے کی کوئی بات نہیں۔ یہ تم جان ہی چکے ہو کہ میں مری نہیں زندہ ہوں لیکن تم یہی سمجھو کہ میں مر چکی ہوں۔ تمہارے لیے یہی جان لینا کافی ہے کہ میں .... کئی ماہ سے ایک دشمن مرد کی اسیر ہوں۔ شاید یہ سن کر تمہیں مجھ پر ترس آئے اس لیے میں تمہیں یہ بھی بتا دوں کہ اگر مجھ پر یہ سب کچھ نہ بھی بیتتی تو میرا رویہ تم سے یہی ہوتا۔ میں تم سے اور تمہارے ساتھی یورق کے جنگلی پن سے تنگ آچکی تھی۔ تم رات دن میرا نام لے کر آہیں بھرتے تھے اور وہ رات دن میرا نام لے کر کوسنے دیتا تھا۔ وہ مجھے ایک پل تمہارے ساتھ نہیں دیکھ سکتا تھا' اور صاف الفاظ میں کئی بار کہہ چکا تھا۔ میں فیصلہ کر چکی تھی کہ وہ گھر چھوڑ کر کہیں چلی جاؤں گی' لیکن پھر حادثہ پیش آگیا اور میں طوطم خان کی قید میں چلی آئی۔"

اباقہ نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "اس حادثے کے بارے کچھ نہیں بتاؤ گی جو تمہیں پیش آیا تھا۔"

ماریتا بولی۔ "تمہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہئے بس اسے تقدیر کی چال

سمجھ لو جو دست غیب نے یہ ثابت کرنے کے لیے کھیلی تھی کہ تم میری حفاظت کے اہل نہیں ہو۔"

اباقہ جو اب نرا جنگلی نہیں رہا تھا' جسے بات کرنے کا ڈھنگ آگیا تھا اور جو دلیل دینا جانتا تھا' غصے سے پھنکارا۔ "اپنی محبت پر الفاظ کے پردے نہ ڈالو۔ یہ کیوں نہیں کہتیں کہ تم میری زندگی بچانے کے لیے نہر کلثومیہ کے ٹیلوں میں گئی تھیں .... تم میری خاطر اس آگ میں کودی تھیں۔ تم نے جو کچھ کیا میرے لیے کیا۔ مجھے بے خبر مت سمجھو' میں سب جانتا ہوں۔ اس تمام عرصے میں تمہارے بہت قریب رہا ہوں مارینا۔ تم جن جن راستوں سے گزر کر یہاں پہنچی ہو میں نے بھی ان راستوں کی خاک چھانی ہے۔ اس سفر میں کئی مواقعے ایسے آئے جب میں تمہیں آزاد کرا سکتا تھا' لیکن ہر بار کوئی اتفاق آڑے آیا ...."

"میں بھی تو یہی کہہ رہی ہوں اباقہ' یہ اتفاقات وقت کا کھیل ہے اور اتفاق ہمارے ہاتھ سے نکل چکا ہے۔ ہمارے راستے اگر کبھی ملے بھی تھے تو اب جدا ہو چکے ہیں۔"

"مارینا۔" اباقہ احتیاط کو بالائے طاق رکھ کر بلند آواز سے بولا۔ "تم پھر وہی رویہ اختیار کر رہی ہو جو مجھے پاگل کر دیتا ہے۔ کیوں میرے دل کے ٹکڑے کرتی ہو۔ میرے صبر کا امتحان نہ لو۔ وہی بغداد والی مارینا بن جاؤ۔ وہی مارینا جس کے ہونٹوں پر میرے لیے مسکراہٹیں تھیں۔"

"وہ مارینا اب تمہیں نہیں ملے گی۔" یہ مردانہ آواز کمرے کے اندر سے آئی تھی۔ پھر ایک شخص مارینا کے عقب میں آن کھڑا ہوا۔ اباقہ اسے دیکھتے ہی پہچان گیا۔ وہ طوطم خاں تھا۔ مارینا سر جھکائے کھڑی تھی۔ اباقہ پریشانی سے کبھی طوطم خاں اور کبھی مارینا کو دیکھتا تھا۔ اس وقت طوطم خان نے کھڑکی پھلانگی اور باہر آگیا۔ اس کی نظریں اباقہ کے چہرے پر مرکوز تھیں اور انداز میں خوف کا شائبہ تک نہیں تھا۔ وہ ایک بہادر اور طاقتور منگول دکھائی دیتا تھا۔ ذرا جسیم ہونے کے باوجود وہ کافی پھرتیلا بھی تھا۔ اگر اس کی آنکھیں ذرا بڑی ہوتیں تو اسے ایک تنومند وجیہہ شخص کہا جا سکتا تھا۔ مارینا واپس جانے لگی تو وہ مادم آواز میں بولا۔ "ٹھہرو مارینا! جو بات ہونا ہے تمہارے سامنے ہو جائے۔"

مارینا کے پاؤں جیسے زمین میں پیوست ہو گئے۔ طوطم خاں بولا۔ "مجھے پتہ چلا ہے کہ کل جب جعفر داراب کے مکان میں آگ لگی تو تم یہاں آئے تھے۔ اس وقت میں حادثے کی خبر پا کر وہاں گیا ہوا تھا۔ مارینا بھی وہاں تھی' لیکن پھر اس نے تمہیں دیکھا اور خوفزدہ ہو کر گھر چلی آئی۔ تم نے اس کا تعاقب کیا اور میری خادمہ کو دھمکیاں دیں .... وہ

اباقہ! میں منگول ضرور ہوں' لیکن منگولوں سے بہت مختلف ہوں۔ اصول پرست ہوں اس لیے بے خوف بھی ہوں۔ سیدھی صاف بات کرنے سے کبھی نہیں گھبراتا۔ تم اور تمہارے ساتھی بغداد میں مارینا کی حفاظت کرنے سے قاصر رہے۔ اسے گرفتار کر کے قراقرم کی طرف روانہ کر دیا گیا جہاں بدترین جسمانی و ذہنی اذیتیں اس کی منتظر تھیں۔ اس موقعے پر میں نے مارینا کو تحفظ دیا اور اس تحفظ کے لیے کسی قربانی سے دریغ نہیں کیا۔ حتیٰ کہ اپنے قریبی ساتھیوں کو بھی قربان کر دیا۔ پھر اسے منگولوں اور مسلمانوں کے عذاب سے محفوظ رکھنے کے لیے میں اس دور دراز وادی میں لے آیا۔ اس وادی میں پہنچنے کے بعد یہ امید نہیں تھی کہ تم' تمہارے ساتھی یا مارینا کا کوئی اور نام نہاد خیر خواہ یہاں تک پہنچے گا۔ ڈاکوؤں بدمعاشوں اور لٹیروں کی اس بستی میں ایک نوجوان عورت کو مرد کے سہارے کی ضرورت تھی۔ اگر یہ اپنی دنیا چھوڑ چکی تھی تو میں بھی اپنی دنیا سے کٹ چکا تھا۔ ہم ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہو چکے تھے۔ یہ صورت حال تھی جس میں ہم دونوں نے شادی کا عہد کیا .... اب یہ میری منگیتر اور میری عزت ہے۔ بہت جلد میں اس سے شادی کرنے والا ہوں .... لیکن ٹھہرو تم یہ نہ سمجھو کہ میں اپنا کوئی فیصلہ مارینا پر زبردستی ٹھونسنے والا ہوں۔ حالانکہ مجھے تمہیں صفائی پیش کرنے کی کوئی ضرورت بھی نہیں' لیکن چونکہ تم کچھ عرصے مارینا کے ساتھ رہے ہو اس لیے میں چاہتا ہوں کہ وہ اپنی زبان سے تمہیں حقیقت سے آگاہ کرے ...." طوطم خاں مارینا کی طرف رخ کر کے بولا۔

"مارینا! بتاؤ کیا تم میرے علاوہ کسی اور سے شادی کا سوچ سکتی ہو؟ .... جواب دو۔" مارینا چند لمحے خاموش رہی پھر اس نے جھکا ہوا سر نفی میں ہلا دیا۔ طوطم خاں بولا اب اس جواب کو مد نظر رکھتے ہوئے بتاؤ۔ کیا تم اباقہ کے ساتھ جانا چاہو گی؟" مارینا نے ایک بار پھر نفی میں سر ہلایا۔ طوطم خاں نے کہا۔ "اب تم کھڑکی بند کر سکتی ہو۔" مارینا نے ہاتھ بڑھا کر کھڑکی بند کر دی۔

طوطم خاں نے اباقہ کو گہری نظروں سے دیکھا اور بولا۔ "اباقہ! میں چنگیز خاں کا بیٹا چغتائی خاں نہیں ہوں نہ ہی میں کوئی ایسا جنگجو ہوں کہ تمہیں پچھاڑنے کا دعویٰ کر سکوں' لیکن ایک بات میں تمہیں بتا دوں۔ میری مرضی کے خلاف تم مارینا کو مجھ سے نہ لے جا سکو گے۔ اگر ایسا کرنا چاہو گے تو میں تمہاری مزاحمت کروں گا۔ میں مانتا ہوں تم خطرناک مد مقابل ہو' لیکن بیس پچیس فیصد امکان اس بات کا ہے کہ میں تمہیں قتل کر دوں۔ دوسری صورت میں تم مجھے قتل کر ڈالو گے لیکن یاد رکھو مارینا کو تم پھر بھی حاصل نہ کر سکو

گے۔ یہ بات اتنی ہی یقینی ہے جتنا یہ کہ کل صبح سورج مشرق سے برآمد ہو گا۔" اباقہ نے کچھ کہنے کے لیے ہونٹ کھولے تو طوطم خان نے اسے ہاتھ سے خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے معلوم ہے تمہاری ابھی پوری تسلی نہیں ہوئی۔ تم اب بھی سوچ رہے ہو کہ مارینا پر میرا دباؤ ہے اس لیے وہ صحیح فیصلہ نہیں کر سکتی۔ تمہارے دل میں یہ بھی ہو گا کہ مجھے قتل کرنے کے بعد تم مارینا کو باآسانی حاصل کر سکو گے .... نہیں میرے دوست تم سراسر غلطی پر ہو۔ وقت بہت آگے نکل چکا ہے۔ مارینا اب میرے علاوہ کسی اور سے ناطہ جوڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ اگر تم آزمانا ہی چاہتے ہو تو ایسا کرو۔ میں یہاں سے چلا جاتا ہوں۔ تم دوسری طرف سے میرے گھر میں جاؤ اور مارینا سے کہو کہ میں نے طوطم خاں کو مار ڈالا ہے .... یہ لو میری تلوار' ثبوت کے طور پر ساتھ لیتے جاؤ۔ اس سے کہو کہ وہ تمہارے ساتھ چلے .... میں تمہیں یقین دلاتا ہوں وہ تمہیں دھتکار دے گی۔" طوطم خان کے لہجے میں بے پناہ اعتماد تھا۔ اس اعتماد کی وجہ وہ قسم تھی جو وہ مارینا کو دے چکا تھا۔ اسے معلوم تھا مارینا مرجائے گی' لیکن اپنا عہد نہیں توڑے گی اور جب اسے اپنا عہد نہیں توڑنا تو پھر وہ اباقہ کے ساتھ کیوں جائے گی۔ اباقہ ہر لمحہ اور ہر پل اس سے محبت کی بھیک مانگے گا۔ وہ اس کو کیسے سنبھالے گی۔ اس کا جینا دو بھر ہو جائے گا۔ یہ سب باتیں مارینا جانتی تھی اس لیے طوطم خاں کو معلوم تھا کہ وہ اباقہ کے سائے سے بھی دور رہنا چاہے گی۔ پھر اباقہ کا ساتھی یورق بھی تھا جو مارینا پر الزام لگا چکا تھا اور اسے صاف لفظوں میں کہہ چکا تھا کہ وہ اباقہ کا پیچھا چھوڑ دے۔ ان معلومات کی روشنی میں چالاک منگول سفارتکار کو صاف نظر آرہا تھا کہ اس کا کہا درست ثابت ہو گا اور مارینا اباقہ کے ساتھ جانے سے انکار کرے گی۔

اباقہ خاموشی سے طوطم خاں کی پیشکش پر غور کرنے لگا۔ طوطم خاں نے کہا۔ "اباقہ! لیکن ایک بات یاد رکھنا۔ میں تم پر اعتماد کر رہا ہوں' میرے اعتماد کو ٹھیس نہ پہنچے۔ مارینا کے ساتھ کوئی زبردستی نہیں ہو گی نہ میری طرف سے اور نہ تمہاری طرف سے۔"

یہ کہتے ہوئے طوطم خاں نے اپنی میان سے تلوار نکالی' اسے پاؤں کے نیچے دبا کر دوہرا کیا اور توڑ ڈالا۔ یہ ٹوٹی ہوئی تلوار اس نے اباقہ کو تھماتے ہوئے کہا۔ "جاؤ اباقہ اپنے دل کا وسوسہ نکال لو۔"

عین اس وقت کھڑکی کے پٹ کھلے اور مارینا اس میں نظر آئی۔ وہ دونوں چونک گئے۔ اس نے ان دونوں کی طرح دیکھے بغیر کہا۔ "میں تمہاری باتیں سن چکی ہوں۔ مجھ سے کوئی کھیل کھیلنے کی ضرورت نہیں۔" پھر وہ اباقہ سے مخاطب ہوئی۔ "اباقہ! پچھلی باتوں کو بھول جاؤ۔ یہ میرا پہلا اور آخری فیصلہ ہے میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گی۔ اب کبھی مجھ سے ملنے کی کوشش نہ کرنا۔" یہ کہتے ہوئے اس نے نہایت بے رخی سے کھڑکی بند کر دی۔

طوطم خان ایک ہاتھ کمر پر رکھے معنی خیز نظروں سے اباقہ کو دیکھنے لگا۔ اباقہ کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ وہی سپاٹ چہرہ وہی سفید بے حرکت آنکھیں وہی پتھرکی سی خاموشی جو قراقرم کے قید خانے میں اس پر طاری ہو گئی تھی۔ وہ مہینوں ایک تاریک کوٹھڑی میں پڑا سڑتا رہا تھا۔ سوکھ کر ہڈیوں کا ناقابل شناخت ڈھانچہ بن گیا تھا۔ آخر عیار مسلم بن داؤد نے مارینا کو اس قید خانے میں بھیج کر اباقہ کی زندہ لاش میں زندگی کی لہر دوڑائی تھی۔

طوطم خان سے کوئی بات کئے بغیر اباقہ خاموشی سے سر جھکا کر چل دیا۔ کس قدر تلخ ہے یہ زندگی۔ اس نے اپنے الجھے بالوں میں انگلیاں پھیر کر سوچا۔ کس قدر قابل نفرت ہے یہ زمین' یہ آسمان' یہ پہاڑ اور یہ سبزہ۔ حوادث کے سوا اس دنیا میں اور کیا رکھا ہے وہ شخص جو اسے زندگی کی طرح عزیز تھا اور جس کی رفاقت کے لیے اس نے ملک ملک کی خاک چھانی تھی بستر مرگ پر پڑا تھا' اور وہ عورت جس کی یاد میں وہ ہر روز انگاروں پر چلا تھا اور ہر رات کانٹوں کے بستر پر سویا تھا اسے بے رحمی سے دھتکار رہی تھی۔ ہاں کس قدر تلخ تھی یہ زندگی .... اباقہ کو ایک جگہ چند آدمی شراب پیتے نظر آئے۔ وہ ان میں جا کھڑا ہوا اور جام پر جام لنڈھانے لگا۔ پھر نشے میں چُور ہو کر وہیں گر پڑا۔

☆------☆------☆

مارینا نے کھڑکی بند کی اور بستر پر گر کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ جانتی تھی اس نے کس شخص کا دل توڑا ہے لیکن وہ مجبور تھی۔ حالات نے اسے زنجیر کر لیا تھا۔ وہ بلک بلک کر روتی رہی اور بوڑھی خادمہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتی رہی۔ نہ جانے کب مارینا نیند کی آغوش میں چلی گئی۔ صبح ہوئی تو اس کی آنکھیں متورم تھیں اور جسم کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ وہ وہیں لیٹی لیٹی حالات پر غور کرنے لگی۔ اس نے اباقہ سے جو کچھ کہا تھا سچ تھا۔ درحقیقت وہ اسی روز اباقہ کو چھوڑنے کا فیصلہ کر چکی تھی جس روز سردار یورق نے اس سے کہا تھا کہ محترم خاتون! آپ اباقہ سے شادی کے خواب دیکھ رہی ہیں پھر اس کے بعد ایک گمنام تحریر کے ذریعے اسے نہر کلثومیہ کے ٹیلوں میں بلوایا گیا تھا اور وہ منگول ہاتھوں میں چلی گئی تھی۔ چند روز پہلے تک اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ کبھی اباقہ سے ملاقات ہو سکے گی۔ یہی وجہ تھی کہ جب طوطم خان نے اس سے حلف اٹھانے کا تقاضہ کیا تھا تو وہ فوراً مان گئی تھی .... اور اب اس حلف کے بعد تو اباقہ کی زندگی میں

شامل ہونے کا امکان یکسر ختم ہو گیا تھا۔ ان کے درمیان ناقابل عبور فاصلے حائل ہو چکے تھے۔ ہاں ماریتا کے ذہن میں کبھی کبھی یہ شک ضرور جنم لیتا تھا کہ طوطم خان نے اباقہ کو وادی میں دیکھنے کے بعد اس سے حلف لیا تھا۔ وہ سمجھ گیا ہو گا کہ اباقہ اب ماریتا کو اس سے جدا کرنے کی کوشش کرے گا اس لیے ماریتا کو ہمیشہ کے لیے پابند کر دیا جائے۔ ماریتا نے اپنے اس شبہے کا اظہار طوطم خاں پر نہیں کیا تھا لیکن شاید وہ خود ہی بھانپ گیا تھا۔ اس نے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے ماریتا کو یقین دلایا تھا کہ اسے اباقہ کے بارے کچھ علم نہیں تھا .... پھر ماریتا نے اسے بھی دوسرے ناخوشگوار اتفاقات کی طرح ایک اتفاق ہی سمجھ لیا تھا۔

خادمہ کی آہٹ سن کر ماریتا اپنے خیالوں سے چونکی' پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر کھڑکی کھولی اور بے خیالی میں باہر دیکھنے لگی۔ دفعتاً اس کی نگاہ ایک شخص پر پڑی وہ کچھ دور چوراہے میں زمین پر پڑا تھا۔ ماریتا کے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ وہ رات اباقہ کو اسی لباس میں دیکھ چکی تھی۔ پھر اس کی نگاہ اس شخص کے لمبے گرد آلود بالوں پر پڑی اور اس کے دل نے پکار کر کہا یہ اباقہ ہے۔ اس کے سینے میں ایک ٹیس اٹھی اور وہ سسک پڑی۔

دوپہر تک ماریتا نے کئی بار کھڑکی کھولی اور ہر بار اس شخص کو بے حس و حرکت زمین پر پڑے پایا۔ لوگ مسکراتی نظروں سے اسے دیکھ دیکھ کر گزر رہے تھے۔ شاید وہ اسے کوئی عادی نشے باز سمجھ رہے تھے۔ مجرموں کی اس بستی میں ایسے خاک نشین نشے بازوں کی کوئی کمی بھی نہیں تھی۔ سہ پہر کے وقت جب ماریتا کھڑکی سے جھانک رہی تھی اسے ایک ایسی شکل نظر آئی جسے دیکھتے ہی وہ سمجھ گئی کہ زمین پر گرا ہوا شخص اباقہ ہی ہے۔ شکل سردار یورق کی تھی۔ ماریتا نے دیکھا۔ وہ دو دوسرے آدمیوں کے ساتھ اباقہ کو زمین سے اٹھانے کی کوشش کر رہا ہے۔ لگتا تھا وہ اسے تلاش کرتا ہوا ہی یہاں پہنچا ہے۔ یکایک ماریتا نے دیکھا کہ اباقہ سردار یورق کو دھکے دینے لگا۔ دو دوسرے آدمیوں نے اسے تھامنے کی کوشش کی لیکن اس نے انہیں اتنے زوردار تھپڑ مارے کہ وہ لڑھکتے ہوئے دور جا گرے۔ وہ ایک ناراض درندہ نظر آ رہا تھا۔

راہ چلتے لوگ رک رک یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ ماریتا تک آواز نہیں پہنچ رہی تھی لیکن وہ دیکھ رہی تھی کہ سردار یورق اسے سمجھانے کی کوشش کر رہا ہے۔ پھر لوگوں کا ہجوم بڑھ گیا اور ماریتا کی نگاہ کا راستہ مسدود ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد ماریتا نے سردار یورق کو اپنے ساتھیوں کے ساتھ مایوسی کے عالم میں واپس لوٹتے دیکھا۔ ہجوم چھٹا تو ماریتا نے دیکھا اباقہ وہیں اپنی جگہ بے حرکت پڑا ہے۔

قریباً تین دن اسی عالم گزر گئے۔ ان تین دنوں میں ماریتا کے دل پر کیا کیا عذاب نہیں گزرے۔ اس نے سخت چلچلاتی دھوپ اور رات کی خاموش تاریکی میں اباقہ کو بے حس و حرکت چوراہے میں پڑے دیکھا۔ اس نے راہ چلتے لوگوں کے قہقہے سنے۔ اس نے بچوں کو اس کے بے حرکت جسم پر کنکر مارتے دیکھا .... اسے ایک دو دفعہ سردار یورق بھی نظر آیا لیکن وہ ہر بار اباقہ کو ساتھ لے جانے میں ناکام رہا۔ اس روز سہ پہر کو ماریتا نے دیکھا تین راہ گیر کافی دیر اباقہ کی طرف جھکے رہے پھر وہ باتیں کرتے ہوئے کھڑکی کی طرف چلے آئے۔ ماریتا نے کان لگا کر ان کی باتیں سننے کی کوشش کی۔ ان میں سے ایک مسلمان تھا اور اباقہ کو کوئی پہنچا ہوا فقیر سمجھ رہا تھا۔ جب کہ دوسرے کا خیال تھا کہ وہ سخت بیمار ہے۔ اس نے کہا۔ "تم نے دیکھا نہیں اس کا جسم آگ میں تپ رہا تھا۔ میرا خیال ہے وہ فقیر وقیر نہیں اسے صرف لو لگی ہوئی ہے۔" تیسرا اس بات پر قہقہہ مار کر ہنس دیا۔ تینوں باتیں کرتے ہوئے آگے نکل گئے۔ ماریتا بے بسی سے کمرے میں ٹہلنے لگی۔ ذہن زمان و مکان کی حدود پھلانگ کر ماضی کی گرد چھاننے لگا۔ وہ سوچنے لگی اس نے اباقہ کو اب تک اس کی دیوانہ وار محبت کے بدلے میں کیا دیا ہے .... کیا دیا ہے؟ وہ سوچتی رہی اور ٹہلتی رہی' ٹہلتی رہی اور سوچتی رہی۔ سورج دور مغرب میں ڈوب گیا اور جب خادمہ نے آکر طاقدان کے چراغ روشن کیے اور وادی کے آسمان پر پہلا ستارہ ابھرا .... ماریتا ایک فیصلے پر پہنچ چکی تھی۔ ایک انتہائی اہم فیصلے پر۔

خادمہ نے طوطم خان کو اطلاع دی کہ مالکہ آپ کو ملنا چاہتی ہے تو وہ بہت خوش ہوا۔ جس وقت وہ کمرے میں داخل ہوا ماریتا مسہری پر بیٹھی تھی۔ مغرب کی طرف کھلنے والی کھڑکی بند تھی۔ طوطم خان نے آگے بڑھ کر کھڑکی کھول دی اور حیرانی سے بولا۔ "یہ خادمہ بھی باؤلی ہے سارا دن تو کھڑکی کھولے رکھتی ہے۔" طوطم خاں نے بات یونہی سے انداز میں کہی تھی لیکن ماریتا اس کا مطلب سمجھ رہی تھی۔ وہ چوراہے میں اباقہ کی موجودگی سے اچھی طرح آگاہ تھا لیکن اس سے کیا فرق پڑتا تھا۔ ماریتا آج جس فیصلے پر پہنچی تھی اس کے بعد ان باتوں کی کوئی اہمیت نہیں رہی تھی۔ اس نے نگاہیں اٹھا کر بے باکی سے طوطم خاں کی طرف دیکھا اور نہایت ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

"طوطم خاں! تم مجھ پر اعتماد کرتے ہو نا؟"

طوطم خاں بولا۔ "یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے۔ مجھے تم پر اتنا ہی اعتماد ہے جتنا اپنی ذات پر۔"

ماریتا بولی۔ "اس کے باوجود پچھلے چار روز سے تمہارے آدمی میری نگرانی کر رہے

ہیں۔"

طوطم خان ایک لمحے کے لیے سٹپٹایا پھر اعتماد سے بولا۔ "ماریتا! وہ تمہاری نگرانی نہیں حفاظت پر مامور ہیں۔ تم جانتی ہو اباقہ ایک سیلانی شخص ہے۔ وہ طیش کے عالم میں کچھ بھی کر سکتا ہے۔ اس کی یہاں موجودگی نے مجھے تمہاری طرف سے پریشان کر رکھا ہے۔"

ماریتا بولی۔ "ٹھیک ہے۔ میں تمہاری بات کا یقین کرتی ہوں۔" پھر احتیاط سے الفاظ کا انتخاب کرتے ہوئے وہ بولی۔ "تم سوچ رہے ہو گے میں نے تمہیں یہاں کیوں بلایا ہے .... طوطم خاں! میں جانتی ہوں کہ میری زندگی اب تمہارے ساتھ وابستہ ہو چکی ہے۔ اس میں میرے چاہنے یا نہ چاہنے کا کوئی سوال نہیں۔ حالات نے ہمیں ایک ہی راستے پر لاکھڑا کیا ہے لیکن تم جانتے ہو میرا ایک ماضی تھا اور اباقہ اس ماضی کا ایک حصہ ہے۔ مجھے اس اعتراف میں بھی عار نہیں کہ میں .... اس سے محبت کرتی تھی۔ اب میں اسے اس طرح گلیوں میں دربدر ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔ میں چاہتی ہوں کہ اس سے مل کر اسے سمجھاؤں۔ میں تم سے صرف ایک دن کی آزادی مانگتی ہوں۔ صرف ایک دن .... شام پڑنے سے پہلے میں تمہارے گھر واپس آجاؤں گی۔ کل سورج نکلنے سے غروب ہونے تک کا وقت تم مجھے اپنی مرضی سے گزار لینے دو۔ اس کے بعد تمام زندگی میں تم سے کچھ نہیں مانگوں گی۔"

طوطم خاں گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا اس کی آنکھوں میں چمک اور معاملہ فہمی تھی۔ وہ بولا۔ "اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ وہ تمہیں زبردستی اپنے ساتھ نہیں لے جائے گا۔"

"اس بات کی ضمانت میری زبان ہے طوطم خاں میں جو کہہ رہی ہوں ویسا ہی ہو گا۔"

طوطم خاں پُر سوچ ہنکارا بھر کر بولا۔ "تو کیا اس کے بعد اباقہ یہاں سے چلا جائے گا۔"

"میں تم سے یہ وعدہ نہیں کرتی لیکن یہ ضمانت ضرور دیتی ہوں کہ اس کے بعد تمہیں اباقہ کے معاملے میں کبھی پریشان نہیں ہونا پڑے گا۔"

طوطم خاں نے کہا۔ "ٹھیک ہے ماریتا' کل سورج کی پہلی اور آخری کرن کے درمیان تم جہاں چاہو جا سکتی ہو لیکن اپنا وہ عہد یاد رکھنا۔ تم نے کہا تھا طوطم خاں! میری زندگی میں اب تمہارے سوا کوئی مرد نہیں آئے گا۔"

ماریتا کی نگاہیں حیا اور برہمی کی شدت سے جھک گئیں۔ چہرے پر ایک بارعب سرخی

پھیل گئی۔ یہی وہ لمحے ہوتے تھے جب طوطم خاں' چڑیا کی طرح پھنسی ہوئی اس نازک سی حسینہ کے سامنے بے بس ہو جاتا تھا۔ اس کے تیور دیکھ کر جلدی سے بولا۔ "معاف کرنا ماریتا' شاید مجھے یہ بات نہیں کہنا چاہیے تھی۔"

ماریتا خاموش رہی۔ طوطم خاں نے ایک نظر کھڑکی سے باہر دیکھا۔ پھر ماریتا کے سراپا کو جلتی نگاہوں سے دیکھتا ہوا باہر نکل گیا۔

☆------☆------☆

اباقہ کے لیے وہ دن ایسے طلوع ہوا کہ اجالے کے ساتھ ہی اس پر حیرتوں اور مسرتوں کی بارش ہو گئی۔ اچانک ہی زندگی جھوم اٹھی اور کائنات رقص فرما ہو گئی۔ وہ بے سدھ زمین پر پڑا تھا۔ دفعتاً ایک نیم گرم ہاتھ اس کی پیشانی پر آیا۔ اس نے آنکھیں کھولیں۔ سامنے ماریتا تھی۔ وہ ایک چادر میں لپٹی ہوئی تھی سوج کی پہلی کرنیں اس کے چہرے کو تابندہ تر کر رہی تھیں۔ اباقہ چونک کر اٹھ بیٹھا۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ ماریتا مسکرا کر بولی۔ "یہ کیا حالت بنا رکھی ہے تم نے۔" اس کی آواز شہد بن کر اس کے کانوں میں ٹپکی اور تب اباقہ کو محسوس ہوا کہ اس کا بخار جاتا رہا ہے۔ پتہ نہیں یہ بخار رات کسی وقت اترا تھا یا ماریتا کے لمس نے اتار دیا تھا۔

"اٹھو اباقہ! میرے دل پر اتنا ستم نہ کرو۔ چلو آؤ میرے ساتھ۔" ماریتا ہاتھ بڑھا کر بولی۔ اباقہ نے میکانکی انداز میں اس کا ہاتھ تھام لیا اور ساتھ چل دیا۔

صبح سویرے اکا دکا راہ گیروں کے سوا کوئی یہ منظر دیکھنے والا نہیں تھا۔ کچھ آگے جا کر اباقہ بولا۔ "کہاں جانا ہے؟"

ماریتا قدرے شوخی سے بولی۔ "مجھے کیا معلوم تمہارا ٹھکانہ کہاں ہے۔"

"تو تم میرے گھر چلو گی۔" اباقہ کپکپاتی آواز میں بولا۔

"میں بغداد میں بھی تو تمہارے گھر میں تھی۔"

اباقہ کے جسم میں جیسے ایک نئی قوت عود کر آئی تھی۔ بیماری کی نقاہت لمحوں میں ہوا ہو رہی تھی۔ اس نے ماریتا کا ہاتھ تھام لیا اور تیزی سے اپنے مکان کی طرف روانہ ہو گیا۔ دروازے پر قفل تھا۔ اس کا مطلب تھا سردار یورق' سلطان جلال کے پاس ہے۔ جیب سے متبادل چابی نکال کر اس نے قفل کھولا اور ماریتا کو لے کر اندر آگیا۔ ماریتا نے چادر اتار کر پلنگ پر ڈالی اور بے تکلفی سے مکان کا جائزہ لینے لگی۔ اباقہ' ماریتا سے کچھ سننے کے لیے بے تاب نظر آ رہا تھا۔ ماریتا نے اس کی کیفیت بھانپتے ہوئے کہا۔

"ذرا صبر کرو اباقہ' میں تمہیں سب کچھ بتاؤں گی لیکن پہلے طعام پھر کام۔ میں جانتی

ہوں تم کئی روز سے بھوکے ہو۔ میں پہلے تمہیں کھانا کھلاؤں گی۔ میں کھانا بناتی ہوں تم اتنی دیر میں اپنا حلیہ درست کرلو۔"

مارینا میں آج پھر وہی مسحور کن شوخی نظر آرہی تھی۔ جس کا مظاہرہ وہ کبھی بھی بغداد میں کیا کرتی تھی۔ اباقہ اس تبدیلی پر جہاں حیران ہو رہا تھا وہاں خوش بھی تھا۔ جب تک اباقہ نے منہ ہاتھ دھو کر کپڑے تبدیل کئے مارینا اس کے لیے گرم گرم کھانا لے آئی۔ شہد، دودھ، روغن میں جوش دیا ہوا گوشت، پنیر اور صاف کی ہوئی گندم کی روٹی۔ سردار یورق جو کچھ رات کے کھانے کے لیے چھوڑ گیا تھا وہ سب مارینا کی زد میں آگیا تھا۔ کئی دن کے فاقے کے بعد اباقہ نے ایک یادگار کھانا کھایا۔ اس دوران مارینا کھوئی کھوئی نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔ پھر اس نے سردار یورق کے بارے میں پوچھا۔ اباقہ نے بتایا کہ وہ شام سے پہلے نہیں آئے گا، مارینا نے کہا۔ "اس کا مطلب ہے یہ دن پورے کا پورا ہمارا ہے۔"

"کیا مطلب؟" اباقہ چونک کر بولا۔

"یہی کہ یہ دن ہم دونوں اپنی مرضی سے گزاریں گے۔ چلو ایسا کرتے ہیں پہلے اس کباڑ خانے کو ٹھیک کرتے ہیں جس کے متعلق تمہیں خوش فہمی ہے کہ یہ تمہارا گھر ہے۔"

اباقہ اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ "مارینا پہلے یہ بتاؤ۔ یہ سب کچھ خواب ہے یا حقیقت اور اگر خواب ہے تو ٹوٹے گا تو نہیں۔ تم پھر مجھے چھوڑ تو نہیں جاؤ گی۔"

"نہیں اباقہ!" مارینا نے والہانہ انداز میں کہا۔ "یہ زندگی اب تیرے قدموں میں گزرے گی۔"

اباقہ اس بات پر جھوم اٹھا۔ مارینا نے پیچھے دیکھنے کے بہانے منہ پھیرلیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔ ان آنسوؤں کا راز صرف وہی جانتی تھی۔ طوطم خاں جانتا تھا نہ اباقہ اور نہ کوئی اور، یہ اس کی زندگی کا آخری سورج تھا۔ اس سورج کے سفر کے ساتھ ہی اس کی زندگی کا سفر بھی ختم ہو رہا تھا۔ سمرقند کی بے آسرا بیٹی، قراقرم کی مظلوم شہزادی، اباقہ کی بے کس محبوبہ اپنی دکھی زندگی کے خاتمے کا فیصلہ کر چکی تھی یہی وجہ تھی جو اس نے طوطم خاں سے اتنے یقین کے ساتھ کہا تھا کہ آج کے بعد اسے اباقہ کی طرف سے کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔

اس نے آنکھیں پھیلا کر آنسو روکے اور مسکراتی نظروں سے اباقہ کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ اپنے ہمیشہ سے شکوہ کناں محبوب کے دامن میں آج کچھ خوشیاں بھرنا چاہتی تھی

اور نہیں چاہتی تھی کہ ان خوشیوں میں غم کا کھوٹ شامل ہو۔ وہ آج اباقہ کے چہرے پر دکھ کا شائبہ بھی دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے شوخ لہجے میں کہا۔ "چلو آؤ اچھے بچوں کی طرح میرا ہاتھ بٹاؤ۔ جب شام کو تمہارا سردار یورق آئے تو اس کباڑ خانے کو دیکھ کر حیران رہ جائے۔"

اباقہ کسی معمول کی طرح مارینا کی ہدایات پر عمل کرنے لگا۔ انہوں نے گھر کا سارا سامان ایک جگہ جمع کیا۔ پھر مکان کی دیواریں اور فرش دھوئے اور تمام چیزیں سلیقے سے لگا دیں۔ وادی میں پانی کی کمی تھی اس لیے اباقہ کے بالوں میں ہفتوں کی گرد جمی ہوئی تھی۔ مارینا نے اپنے ہاتھوں سے اباقہ کا سر دھویا اس کے لمبے بالوں کو کنگھی کی اور اسے نیا لباس پہننے کو دیا۔ پھر اس نے اباقہ اور یورق کے تمام کپڑے دھو ڈالے۔ اب سورج طوع ہوئے دوپہر گزر چکے تھے۔ مارینا دوپہر کے کھانے کی تیاری کرنے لگی۔ اباقہ اس کی لگن دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ ایک بار پھر ایک انتہائی لذیذ کھانے نے اباقہ کا استقبال کیا۔

"میرے ہاتھ سے لقمہ کھاؤ گے؟" مارینا نے کہا۔

اباقہ نے فوراً منہ کھول دیا لیکن مارینا لقمہ اس کے ہونٹوں تک لے جا کر اپنے منہ میں لے گئی۔ اباقہ بھونچکا رہ گیا۔ مارینا ہنس ہنس کر سرخ ہونے لگی۔ دوسرا لقمہ اس نے بڑی محبت سے اباقہ کے منہ میں ڈالا۔ اباقہ اس کی اداؤں سے مسحور ہو رہا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد مارینا نے اباقہ اور یورق کے تمام مرمت طلب کپڑے ٹھیک کئے اور انہیں تہیں لگا کر چوبی صندوق میں رکھ دیا۔ پھر وہ اباقہ کے پاس آبیٹھی۔ تمازت کی وجہ سے اس کے گال سرخ ہو رہے تھے۔ شہد رنگ زلفوں کی لٹیں صراحی دار گردن سے چپکی تھیں۔ اس نے اباقہ کا ہاتھ اپنے نرم ہاتھ میں لے لیا اور میٹھے لہجے میں باتیں کرنے لگی۔ گزرے دنوں کی باتیں گزاری راتوں کی باتیں۔ ادھورے سوالوں اور جوابوں کی باتیں۔ اباقہ پر ایک حیرت آمیز شادمانی طاری تھی۔ وہ جیسے ہواؤں میں اڑ رہا تھا۔ اس نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور مارینا کے دہکتے رخساروں پر رکھ دیا۔ مارینا نے بڑی محبت سے یہ ہاتھ اپنے رخسار پر دبا لیا۔ اباقہ کی آنکھوں میں ماضی کے حسین مناظر زندہ ہو گئے۔ نہ جانے وہ کتنی دیر یونہی بیٹھے رہے۔ پھر مارینا اباقہ کے ملائم بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔ دفعتاً دو گرم قطرے اباقہ کے رخسار پر گرے۔ اباقہ نے چونک کر مارینا کی طرف دیکھا۔ "تم رو رہی ہو؟" وہ حیرانی سے بولا۔

"یہ خوشی کے آنسو ہیں۔" مارینا نے خوابناک لہجے میں کہا۔ "اتنے دنوں کے بعد یہ مسرت نصیب ہوئی ہے تو دل پر قابو نہیں رہا۔"

سہ پہر کے بعد دھوپ کی تمازت بہت حد تک کم ہوگئی۔ اباقہ نے کہا چلو مارینا کہیں

گھومنے چلتے ہویں۔ مارینا فوراً تیار ہو گئی' لیکن اباقہ محسوس کر رہا تھا کہ جوں جوں سورج ڈھل رہا ہے مارینا کے چہرے پر افسردگی طاری ہوتی جارہی ہے۔ تھوڑی دیر بعد مارینا گھڑ سواری کے لیے تیار ہو کر آ گئی۔ اباقہ نے دیکھا اس کے سر پر وہی پھولدار کپڑا ہے جو قوقند کے بزرگ نے اسے تحفے میں دیا تھا۔ یہ کپڑا اباقہ کو بغداد میں بدنصیب زبیدہ کے سر سے ملا تھا جسے مسلم بن داؤد نے قتل کروا کے ٹیلوں میں پھینک دیا تھا تاکہ اس کی لاش پر مارینا کی لاش کا دھوکا ہو سکے۔ یہ کپڑا اب تک اباقہ نے بڑی حفاظت سے رکھا ہوا تھا اور گھر کی صفائی کے وقت مارینا نے دیکھ لیا تھا۔ رومال کی طرح کپڑے کو سر پر باندھے ہوئے وہ نہایت خوبصورت لگ رہی تھی۔ اباقہ کو یک ٹک اپنی طرف دیکھتے پا کر وہ بے ساختہ شرما گئی لیکن پھر فوراً ہی اس کا چہرہ سپاٹ ہو گیا۔

چند ہی لمحے بعد وہ دونوں گھوڑوں پر سوار بستی سے باہر جارہے تھے۔ "مارینا! تم طوطم خاں کے پاس واپس تو نہیں جاؤ گی؟" اباقہ نے پوچھا۔

"نہیں اباقہ .... کبھی نہیں۔"

"ہمیشہ میرے پاس رہو گی نا؟" وہ کسی بچے کی طرح ضد کرتے ہوئے بولا۔ نہ جانے کیوں اس کے دل میں وسوسے سر اٹھا رہے تھے۔

"ہاں اباقہ! میں تم سے کہہ تو چکی ہوں۔" مارینا بولی۔

دونوں پتھریلی زمین پر گھوڑے دوڑاتے ہوئے ایک اونچی چوٹی پر پہنچ گئے۔ یہاں سے دور دور کے مناظر صاف نظر آتے تھے اور جو نظر نہیں آتے تھے انہیں آسمان دیکھ رہا تھا۔ شمال مشرق میں قراقرم تھا جہاں سے نکلنے والی منگول افواج ختا اور نان کنگ کے علاقوں میں اودھم مچا رہی تھیں' ان کی کمان سوبدائی بہادر کر رہا تھا۔ شمال میں ایران اور ترکستان کی وسعتیں تھیں جہاں منگول ٹڈی دل مسلمانوں پر آخری ضرب لگانے سے پہلے منظم ہو رہے تھے۔ شمال مغرب میں زار روس اور یورپ کے وسیع میدان تھے جو چنگیز کے پوتے باتو خاں کی ہیبت سے لرز رہے تھے۔ ان طوفانوں کے درمیان اور ان جھمیلوں سے لاتعلق اس تنہا چٹان پر محبت خیمہ زن تھی۔ محبت جو کائنات کا سب سے انمول جذبہ ہے۔ وہ محبت اس چٹان پر' پر کھولے ستا رہی تھی۔

"اباقہ! میں تھوڑی دیر کے لئے طوطم خاں کے گھر جانے کی اجازت چاہوں گی۔ وہاں میرے استعمال کی کچھ چیزیں پڑی ہیں۔"

"میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔" کالے پہاڑوں کی بستی پر سورج اپنی الوداعی کرنیں ڈال رہا تھا۔ دونوں دیر تک خاموشی سے بیٹھے غروب آفتاب کا منظر دیکھتے رہے۔

مارینا پر اب گہری سنجیدگی طاری ہو چکی تھی۔ آخر وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور اباقہ کے گھوڑے کے پاس پہنچ کر اسے پیار کرنے لگی' پھر اس کی گردن میں بانہیں ڈال کر سسک اٹھی۔ اباقہ نے اسے روتے ہوئے نہیں دیکھا لیکن وہ اس کی گہری خاموشی کو محسوس کر چکا تھا۔ تب دونوں اپنے اپنے گھوڑوں پر آ بیٹھے۔ اب ان کا رخ بستی کی طرف تھا۔ مارینا بولی۔

"نہیں اباقہ! تمہیں دیکھ کر خواہ مخواہ اس کا خون کھولے گا۔" پھر مارینا نے اباقہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا کچھ دیر اسے تھامے کھڑی رہی۔ پھر اباقہ کے چہرے پر الوداعی نظر ڈال کر اس نے گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔ اب وہ جس راستے پر جارہی تھی وہ سیدھا طوطم خاں کے گھر کی طرف جاتا تھا۔ کچھ آگے جا کر اس نے ڈبڈبائی آنکھوں سے مڑ کر دیکھا۔ اباقہ کا کہیں پتہ نہ تھا اس نے گھوڑے کو درختوں میں موڑ لیا اور تیزی سے واپس اسی بلند چٹان کی طرف بڑھ گئی۔ جہاں کچھ دیر پہلے وہ دونوں بیٹھے غروب آفتاب کا نظارہ کر رہے تھے۔ اس کے دل و دماغ میں ایک جنگ جاری تھی۔ دل کہہ رہا تھا زندگی اتنی ارزاں نہیں' اگر تم نے مرنا ہی ہے تو چند روز اور اباقہ کی رفاقت میں گزار لو۔ اپنی قسم پر قائم رہ کر بھی تم اپنے گلشن محبت سے چند پھول چن سکتی ہو' لیکن ذہن کہہ رہا تھا جس سفر کا انجام سفر ہے اس سفر سے کیا حاصل۔ ختم کر دو اس جدوجہد کو۔ تم نے طوطم خاں سے جو مہلت مانگی تھی وہ پوری ہو چکی۔ سورج ڈوب چکا پھر تمہاری زندگی کا سورج آسمان پر کیوں ہے۔ نہیں میں واپس نہیں جاؤں گی اس نے فیصلہ کیا اور تیزی سے اس چٹان کی طرف بڑھنے لگی جس کے دامن میں مہیب کھائیاں منہ کھولے کھڑی تھیں۔

☆ــــــــــ☆ــــــــــ☆

نیلے پہاڑ کے اندر راجی خاتون کے سجے سجائے کمرے جعفر داراب موجود تھا۔ اس کے ایک بازو پر ابھی تک پٹی بندھی ہوئی تھی۔ یہ پٹی اس آتشزدگی کی نشانی تھی جو چند روز پہلے اس کے مکان میں ہوئی تھی۔ جعفر داراب کہہ رہا تھا۔

"راجی خاتون! سفر کے دن قریب آ رہے ہیں اور ابھی تک میں آدمیوں کا بندوبست نہیں کر سکا۔"

راجی خاتون بولی۔ "جعفر داراب! تم بھی تو ہر سال سفر سے آ کر ان ملاحوں کو قتل کر ڈالتے ہو۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا تھا کہ ان لوگوں کو قید خانے میں ڈال دیا جاتا۔ اگلے برس پھر انہی لوگوں سے کام لیا جا سکتا تھا۔ ان کا تجربہ بھی نسبتاً زیادہ ہو جاتا۔"

جعفر داراب نے کہا۔ "راجی خاتون کہتی تو آپ ٹھیک ہیں لیکن ہمیں تو وہی کرنا ہے

جس کا جزیرے سے حکم آئے گا۔ درحقیقت شیخ نجدی نہیں چاہتے کہ جزیرے کا راستہ جاننے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو۔ اس وقت تک دنیا میں صرف تین آدمی ہیں جنہیں اس راستے کا علم ہے اور ان میں سے ایک میں ہوں۔ کیا یہ نظم و ضبط کی اعلیٰ ترین مثال نہیں۔"

"مثال تو واقعی اعلیٰ ہے لیکن اب ملاحوں کا انتظام کرو۔" دفعتاً راجی خاتون کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ "ہاں یاد آیا' وہ شخص کیا نام ہے اس کا........ اباقہ۔ سنا ہے اس نے تمہیں آگ سے نکالا تھا۔ وہ ہے بڑا سخت جان شخص۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ اور اس کے ساتھی خلیج فارس میں قزاقوں کے ساتھ رہے ہیں۔"

"ہاں سنا تو میں نے بھی تھا لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ خلیج فارس میں رہے ہیں .... اگر ایسی بات ہے تو کیوں نہ اس دفعہ انہیں ساتھ لے جاؤں۔ اس کے ساتھی کتنے ہیں؟"

"دو۔ ان میں سے ایک زخمی ہے لیکن میرا خیال ہے تمہاری روانگی تک وہ بھی ٹھیک ہو جائے گا۔"

"یہ تو بڑی اچھی بات ہوئی۔ ایک آدمی کی کسر رہ جائے گی وہ کسی دوسرے شخص سے پوری کی جا سکتی ہے۔" جعفر داراب اب خاصا خوش نظر آ رہا تھا۔

"عورت کا انتظام ہوا؟" راجی خاتون نے پوچھا۔

"نہیں ابھی تو نہیں لیکن وہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں۔ دو تین روز بعد قید خانے کا چکر لگاؤں گا۔ شاید کوئی اچھا چہرہ نظر آ جائے۔"

راجی خاتون نے پوچھا۔ "کیا وادی میں اچھے چہروں کی کمی ہو گئی ہے۔"

جعفر بولا۔ "نہیں خاتون! لیکن آپ تو جانتی ہیں' ہمیں کوئی ایسی عورت چاہیے جو نہ صرف خوبصورت ہو بلکہ اس کے چہرے پر ابھی یہاں کی آب و ہوا کا اثر بھی نہ ہوا ہو۔"

"تمہارا مطلب ہے وہ اس کالی وادی کے رنگ میں نہ رنگی گئی ہو۔"

"جی ہاں! یہ مطلب ہے میرا۔" جعفر داراب بظاہر بڑے احترام سے مخاطب تھا لیکن اس کے لہجے کی کاٹ اس کی طاقت اور خود مختاری کو ظاہر کرتی تھی تھوڑی دیر راجی خاتون کے پُر شکوہ کمرے میں بیٹھ کر جعفر داراب اٹھ کھڑا ہوا۔ مختلف سرنگوں سے گزرتا ہوا وہ دہانے پر پہنچا۔ ایک نظر اپنے زیر تعمیر محل پر ڈالی اور گھوڑے پر سوار ہو کر چل دیا۔

☆------☆------☆

شام ہو چکی تھی۔ ہلکی ہلکی تاریکی بستی کو لپیٹ میں لے رہی تھی۔ موسم بھی آج کچھ خوشگوار تھا۔ نیم گرم ہوا جسے سخت گرمی کے پیشِ نظر لوگ ٹھنڈی ہوا کہتے تھے شمالاً جنوباً چل رہی تھی۔ جعفر داراب نے پُر حبس گلیوں سے گزرنے کی بجائے بیرونی راستہ اختیار کیا۔ جب وہ اس دوراہے پر پہنچا جہاں سے دو راستے بستی کے دو مختلف حصوں کی طرف نکلتے تھے۔ اچانک اس کی نگاہ ایک لڑکی پر پڑی۔ وہ تیزی سے گھوڑا بھگاتی مخالف سمت میں جا رہی تھی۔ اس حسین مجسّمے کو ویرانے کی طرف جاتے دیکھ کر جعفر داراب کا ماتھا ٹھنکا۔ غیر ارادی طور پر اس نے گھوڑا پیچھے لگا دیا۔ لڑکی بلند چٹان پر پہنچی۔ گھوڑے سے اتر کر وہ کنارے کی طرف بڑھنے لگی۔ جعفر داراب کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ لڑکی کے ارادے خطرناک ہیں۔ شاید وہ خودکشی کرنا چاہتی تھی۔ جعفر داراب نے آواز دی لیکن وہ ان سنی کر کے آگے بڑھتی رہی۔ جعفر بھاگ کر گیا اور اس نے لڑکی کو اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ لڑکی بری طرح مچلنے لگی۔ اس کے بدن کی مسحور کن نرمی اور خوشبو نے ایک لمحے کے لیے جعفر داراب کو دیوانہ سا کر دیا لیکن پھر اسے یاد آیا کہ وہ اس بستی کا منتظم اعلیٰ ہے۔ لڑکیوں اور عورتوں کی اس کے لیے کیا کمی ہو سکتی ہے۔ اس نے لڑکی کو اپنے بازوؤں میں بری طرح جھنجھوڑا اور اٹھا کر گھوڑوں کے قریب لے گیا۔ لڑکی مسلسل چیخ رہی تھی۔

"مجھے چھوڑ دو' مجھے مر جانے دو مجھے مرنا ہے۔" یکایک وہ مچھلی کی طرح تڑپی اور ادھیڑ عمر جعفر کے بازوؤں سے نکل گئی۔ اس نے کنارے کی طرف بھاگنا چاہا لیکن جعفر داراب نے پکڑنے کی کوشش میں اسے دھکا دیا وہ اوندھے منہ پتھریلی زمین پر گر کر بے ہوش ہو گئی۔

تھوڑی ہی دیر بعد جعفر داراب اسے گھوڑے پر لاد کر بستی میں لا رہا تھا۔ راستے میں اس نے بار بار بے ہوش لڑکی کا چہرہ دیکھا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ اس کا ایک اور مسئلہ حل ہو گیا ہے۔ دورانِ سفر خلیجی لہروں کی بھینٹ چڑھانے کے لیے اسے' جیسی پری چہرہ لڑکی کی ضرورت تھی وہ اسے مل گئی ہے۔

☆------☆------☆

کالی بستی میں دو شخص دیوانوں کی طرح مارینا کو ڈھونڈ رہے تھے۔ ایک اباقہ تھا اور دوسرا طوطم خاں۔ پہلے تو طوطم خاں نے یہی سمجھا کہ مارینا نے اس کے ساتھ بدعہدی کی ہے اور اباقہ کے ساتھ بھاگ نکلی ہے لیکن بہت جلد اسے اباقہ بھی اپنی طرح سرگرداں نظر آیا۔ دونوں میں مختصر مکالمہ ہوا جس سے طوطم خاں کو پتہ چلا کہ مارینا اباقہ کے پاس نہیں اور اباقہ کو معلوم ہوا کہ وہ طوطم خاں کے پاس بھی نہیں گئی۔ کچھ دیر بعد انہیں ایک شخص کی زبانی معلوم ہوا کہ شام کے وقت آقا جعفر داراب اپنے گھوڑے پر ایک بے

ہوش لڑکی کو لاد کر لایا تھا۔ اس شخص نے لڑکی کا جو حلیہ بتایا اس نے اباقہ اور طوطم خاں پر واضح کردیا کہ وہ لڑکی مارینا تھی۔ جعفر داراب کے بارے میں طوطم خاں اچھی طرح جانتا تھا۔ اس کے گھر ہر رات دو نئی خوبصورت کنیزیں "خدمات" انجام دیتی تھیں اور ایک بار جو کنیز اس کے گھر میں رات گزارتی تھی اسے دوبارہ یہ اعزاز نصیب نہیں ہوتا تھا۔ جعفر داراب بلانوش اور عیاش شخص تھا۔ حسین و جمیل مارینا کی اس کے گھر میں موجودگی کا مطلب نہایت واضح تھا۔ طوطم خاں اور اباقہ دونوں بے چین ہو گئے۔

اباقہ جب غضب میں کھولتا ہوا گھر پہنچا تو سردار یورق علاج گاہ سے واپس آچکا تھا۔ اس کے ساتھ ابابکر خاں بھی تھا۔ ابابکر نے شروع میں بتایا تھا کہ اس کا کام صرف انہیں راجی خاتون تک پہنچانا ہے۔ اس کے بعد وہ اپنے قبیلے میں واپس چلا جائے گا لیکن وہ ابھی تک وہاں موجود تھا۔ اباقہ نے جب اس بابت سردار ابابکر سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ سلطان جلال کی حالت نازک تھی اور وہ انہیں اس حال میں چھوڑ کر چلا جاتا تو دن رات پریشان رہتا۔ وہ اسی وقت واپس جائے گا جب اپنی آنکھوں سے سلطان جلال کو مسکراتا دیکھ لے گا۔ اباقہ نے سردار یورق سے سلطان کی حالت کا پوچھا تو اس نے مژدہ سنایا کہ سلطان کی حالت اب کافی بہتر ہے۔ کوئی اور موقع ہوتا تو اباقہ یہ خبر سن کر خوشی سے اچھل پڑتا لیکن اس وقت اسے مارینا کی گمشدگی نے پریشان کر رکھا تھا وہ صرف سر ہلا کر رہ گیا۔ اس کی نظریں بار بار دیوار پر آویزاں تلوار اور ڈھال کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ یورق سمجھ گیا کہ جنگلی کے اندر پھر کوئی طوفان پل رہا ہے۔ اس کے قدم بے چینی سے کمرے کے فرش پر متحرک تھے۔ اس وقت دروازہ کھلا اور ایک عورت اندر داخل ہوئی۔ اس نے گھڑ سواری کا لباس پہن رکھا تھا اور چہرہ پگڑی میں چھپا ہوا تھا۔ مردوں کے انداز میں چلتی وہ دونوں کے قریب پہنچ گئی۔ اباقہ اس کی چال دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ یہ راجی خاتون کے محافظ دستے کی سالار ثوبیہ ہے۔ راجی خاتون نے کہا تھا کہ وہ کسی روز اسے اباقہ کے پاس بھیجے گی تاکہ وہ انہیں خلیج میں سفر کے بارے میں معلومات پہنچا سکے۔

ثوبیہ نے اس کے خیال کی تصدیق کر دی۔ اس نے کہا کہ اب موقعہ آگیا ہے .... وہ اسی لیے آئی ہے کہ انہیں خلیج کے متعلق معلومات بہم پہنچائے۔ اباقہ نے دیوار سے تلوار اتاری اور انتہائی سرد لہجے میں بولا۔ "تم غلط وقت پر آئی ہو ثوبیہ' میں ایک اہم کام سے جارہا ہوں۔"

ثوبیہ آرام سے بیٹھتی ہوئی بولی۔ "میں جانتی ہوں اباقہ' تم کس اہم کام سے جارہے ہو۔ تم آقا جعفر کے پاس جارہے ہو تاکہ اپنی محبوبہ مارینا کی عزت کی حفاظت کر سکو

.... لیکن تمہیں اس مہم جوئی کی کوئی ضرورت نہیں۔ مارینا وہاں بالکل محفوظ ہے؟؟"

"مارینا یہاں موجود ہے؟" سردار یورق کو جیسے بچھو نے ڈنک مارا۔

اباقہ اس کی بات ان سنی کرتے ہوئے ثوبیہ سے گویا ہوا۔ "تم یہ سب کچھ کس طرح کہہ سکتی ہو؟"

"مجھے راجی خاتون نے بتایا ہے۔ اس وادی کا کوئی راز ان سے چھپا نہیں رہ سکتا۔ انہوں نے کہا ہے کہ مارینا کو آقا جعفر داراب ایک خاص مقصد کے لیے اپنے گھر لے کر گیا ہے۔ اس کی عزت پر کوئی حرف نہیں آئے گا۔ لہٰذا تم اسے آزاد کرانے کی فکر میں مبتلا نہ ہو جانا۔ انہوں نے کہا ہے کہ اگر مارینا سے تمہارا تعلق ثابت ہو گیا تو سارا منصوبہ دھرا رہ جائے گا۔"

اباقہ حیرت سے ثوبیہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ جلد ہی اسے قائل کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ اس کے بعد وہ اباقہ کو اپنے معرکوں کی داستان سنانے لگی جو اسے خلیج کے پانیوں میں پیش آئے تھے۔

دوسری طرف طوطم خاں سراپا آتش بنا جعفر داراب کے مکان کے سامنے پہنچ چکا تھا۔ جعفر داراب کی یہ عارضی رہائش گاہ چشمے سے کچھ ہٹ کر واقع تھی۔ پگڑی پوش چوب داروں نے اس کی آمد کا سبب پوچھا۔ اس نے کہا وہ جعفر داراب سے ملنا چاہتا ہے۔ اندر اطلاع پہنچائی گئی۔ کچھ دیر کے بعد جعفر داراب نے اسے بلا لیا۔ گرمی کی وجہ سے وہ صرف ایک لنگوٹی پہنے ننگے فرش پر پڑا تھا۔ ایک خوبصورت کنیز دونوں ہاتھوں سے بھاری بھرکم پنکھے کی ڈوری کو حرکت دینے میں مصروف تھی۔ طوطم خاں نے تعظیم پیش کرنے کے بعد کہا۔

"آقا! آج جو لڑکی آپ کو بے ہوشی کی حالت میں ملی ہے وہ میری ہونے والی بیوی مارینا ہے۔"

جعفر داراب نے طوطم خاں کو سر سے پاؤں تک گھورا اور بولا۔ "تم یہ کہہ کر میری معلومات میں کوئی اضافہ نہیں کر رہے۔"

طوطم خاں بولا "........... لیکن آقا میں اس سے محبت کرتا ہوں اور بہت مشکلوں سے اسے لے کر آپ کی پناہ میں پہنچا ہوں۔"

جعفر داراب بولا۔ "طوطم خاں! اگر تو اس وادی کا باشندہ بن چکا ہے تو پھر یہاں کے تمام قوانین اور رسوم کی پاسداری بھی تجھے کرنا ہو گی۔ میں تجھے اس کے بدلے دس لڑکیاں دے سکتا ہوں لیکن وہ لڑکی اب تجھے نہیں مل سکتی۔ اسے ایک خاص مقصد کے لیے

حاصل کیا گیا ہے۔"

طوطم خاں قدرے برہمی سے بولا۔ "حضور! آپ کس مقصد کی بات کر رہے ہیں۔ میں اس کی بے حرمتی برداشت نہیں سکتا۔ میں اس سے محبت کرتا ہوں۔"

"خاک محبت کرتے ہو تم اس سے' وہ تمہارے لیے مرچکی ہے۔ اگر میں اسے بچانہ لیتا تو وہ خودکشی کر چکی ہوتی۔ تمہاری محبت سے چھٹکارہ پاچکی ہوتی۔ اس پر اب تمہارا کوئی حق نہیں۔ اور تم اس کی بے حرمتی کا خدشہ ظاہر کرکے مجھ پر بدکاری کا جو الزام لگا رہے ہو اس کی کڑی سزا ملے گی تمہیں۔" جعفر داراب اب اپنے اصل سفاکانہ روپ میں آرہا تھا۔ وہی روپ جس نے اس وادی کو بیرونی دنیا کے لیے وحشت کا نشان بنا رکھا تھا۔ وہ تلملا کر اٹھا اور دیوار سے لٹکا ہوا کوڑا اتار لیا۔ کمرے میں موجود خادمائیں دہشت سے سفید پڑ گئیں۔ جعفر داراب نے گھما کر کوڑا طوطم خاں کی گردن پر رسید کیا۔ کوڑا گردن سے لپٹ گیا۔ اس نے ایسا جھٹکا دیا کہ طوطم خاں لڑکھڑاتا ہوا جعفر کے قدموں میں آگرا۔ جہاندیدہ طوطم خاں جان چکا تھا کہ اس سے غلطی ہوگئی ہے۔ اسے جعفر داراب پر براہ راست اپنے شک کا اظہار نہیں کرنا چاہیے تھا۔ آخر وہ اس وادی کا سب سے بااختیار شخص تھا۔ خود کو سنبھالتے ہوئے وہ بولا۔ "آقا! میرا مقصد آپ پر الزام تراشی نہیں تھا۔ میں تو صرف یہ جاننا چاہتا تھا کہ اس لڑکی کو آپ نے کس خدمت کے لائق سمجھا ہے؟"

جعفر داراب غرایا۔ "اسی لہجے میں بات کر منگول کتے' اب گھگیا کیوں رہا ہے' پوچھ مجھ سے کہ کہاں ہے میری محبوبہ۔"

طوطم خاں زمین پر پڑا بے بسی سے جعفر داراب کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر یکایک اس کی رگوں میں خون نے جوش مارا اور وہ اپنی برداشت کھو بیٹھا۔ غصے سے کانپتا ہوا بولا۔ "تیرے جیسے ذلیل انسان خوبصورت عورت سے صرف ایک ہی مقصد رکھتے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کیا ہے وہ مقصد جس کے لیے تو نے اسے گھر میں ڈالا ہے۔"

دست و پا آٹھ محافظوں کے نرغے میں کھڑا تھا۔ جعفر کے حکم پر پہلے تو لاتوں اور گھونسوں سے اس کو بیدردی سے مارا گیا اور جب وہ نیم بے ہوش ہو گیا تو اس کی مشکیں کس دی گئیں۔ تین تازہ دم محافظ آگے بڑھے اور اسے گندم کے بورے کی طرح اٹھا کر کمرے سے باہر لے گئے۔

☆ ——— ☆ ——— ☆

کوئی بیس روز بعد کی بات ہے ایک مختصر سا قافلہ کالے پہاڑوں کی وادی سے باہر نکل رہا تھا۔ وہ تیرھویں یا چودھویں کی رات تھی۔ چاند ابھی ابھی طلوع ہوا تھا۔ اس کی سنہری کرنیں وادی کے سیاہ نشیب و فراز کو اور بھی پُراسرار بنا رہی تھیں۔ وادی میں داخل ہونے والے راستے پر کھڑے پہریداروں نے شناخت کے بعد قافلے کو آگے بڑھنے کی اجازت دے دی۔ اس قافلے میں کل چھ افراد شامل تھے۔ پانچ مرد اور ایک عورت۔ عورت مارینا تھی۔ مردوں میں سلطان جلال' یورق' اباقہ اور جعفر داراب شامل تھے۔ پانچواں مرد ایک ہندو سیوک رام تھا۔ وہ ایک لحیم شحیم اور تنومند شخص تھا۔ اس وادی میں پناہ لینے والے تمام لوگ بڑے بڑے جرائم کرکے آئے تھے لیکن سیوک رام کا جرم یہ تھا کہ اس نے ایک مندر پر بھینٹ چڑھایا ہوا سونا چوری کرنے کی کوشش کی تھی۔ ایک پروہت نے اسے دیکھ لیا۔ پروہت اور سیوک رام میں ہاتھاپائی ہوئی جس کے نتیجے میں سن رسیدہ پروہت کا "بولو رام" ہو گیا۔ بستی والوں کے خوف سے سیوک رام بھاگ نکلا اور بالآخر دربدر پھرتا اس وادی تک آگیا۔ اس جیسے غیر معروف اور چھوٹے مجرموں کے لیے کالے پہاڑوں کی وادی میں کوئی جگہ نہیں تھی۔ ایسے لوگوں کو عموماً قید خانے میں ڈال دیا جاتا تھا۔ اگر سیوک رام کو جعفر داراب کا قرب حاصل تھا تو اس کی ایک ہی وجہ تھی۔ وہ انتہائی درجے کا خوشامدی تھا۔

قافلہ جب وادی سے باہر نکلا تو چاند کافی بلندی پر آچکا تھا۔ مخروطی چوٹیوں والے مکانوں کی قطاریں دور تک دکھائی دے رہی تھیں۔ اباقہ نے سوچا ان ہی میں سے ایک ن سکندر کا ہو گا۔ جس کے درودیوار کو دیکھنے کی اس نے آخری وقت تمنا کی تھی۔ ‌ در اور اس کے ساتھیوں کی آخری چیخیں ابھی تک اباقہ کے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ ‌ کی نگاہوں میں وہ بے شمار چہرے بھی گھوم رہے تھے جو وادی کے سنگلاخ قید خانے میں ‌ یہ حسرت بن کر رہ گئے تھے۔ معصوم بچوں' عورتوں اور مردوں کے چہرے' اباقہ' سلطان یورق نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ وہ تینوں شاید ایک ہی بات سوچ رہے تھے۔ ‌ ل ہی دل میں اس وادی کے مظلوموں سے عہد کر رہے تھے۔ ہم واپس آئیں گے۔

ہمیں تمہارے مرجھائے چہروں اور ویران آنکھوں کی قسم ہم واپس آئیں گے' قہر و جبر کی تمام زنجیروں کو کاٹیں گے۔ تم پر ہونے والے ہر ظلم کا حساب لیں گے۔ ہم سے مایوس نہ ہونا ہمارا انتظار کرنا۔

عین اس وقت جب یہ قافلہ وادی سے نکل رہا تھا' سپہ سالار جابر خاں اپنے آراستہ مکان میں محفل نشاط جمائے بیٹھا تھا۔ ایک خوبصورت رقاصہ پاؤں تھرکا رہی تھی اور ایک نوخیز سپید لڑکی جس کی رنگت بتا رہی تھی کہ وہ حال ہی میں اس جنمی وادی میں لائی گئی ہے' سمٹی سمٹائی جابر خاں کی بغل میں بیٹھی تھی۔ اس محفل رنگ و طرب میں صرف چند افراد ہی مے نوشی سے گریز کر رہے تھے اور ان میں ایک سردار اباکر بھی تھا۔ وہ اب تک سلطان کی وجہ سے اس وادی میں مقیم تھا۔ اب جب کہ اسے علم ہوا تھا کہ سلطان اور اباقہ وغیرہ کچھ عرصے کے لیے جعفر داراب کے ساتھ وادی سے باہر جا رہے ہیں تو اس نے بھی اپنے قبیلے میں واپس جانے کا ارادہ کر لیا تھا۔ اس وقت وہ بیٹھا اسی سوچ میں گم تھا کہ جعفر داراب انہیں لے کر کہاں گیا ہے۔ سلطان یا اباقہ نے اس بارے میں اسے کچھ نہیں بتایا تھا' نہ ہی اس نے پوچھنے کی کوشش کی تھی۔

جابر خاں آج جام پر جام لنڈھا رہا تھا۔ اس کی راسیں ڈھیلی ہو گئی تھیں۔ جعفر داراب کے بعد وہی اس کا قائم مقام تھا۔ جب وہ نشے میں بالکل چور ہو گیا تو الٹی سیدھی حرکتیں کرنے لگا۔ پہلے بغل میں بیٹھی لڑکی کو تنگ کرتا رہا پھر اٹھا اور لٹک لٹک کر گانے لگا۔ اس کی بلا نوشی کے بارے اباکر نے بہت سنا تھا لیکن آج دیکھ بھی رہا تھا۔ اچانک جابر خاں گاتے گاتے چپ ہو گیا۔ اس کے چہرے پر کچھ عجیب سے تاثرات تھے جیسے کوئی بھولی بسری بات اچانک اس کے ذہن میں آ گئی ہو۔ جابر خاں نے اپنے سر کو ایک دو بار زور زور سے جھٹکا پھر لرزتے ہاتھوں سے ایک جام اور چڑھا گیا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے ابلی جا رہی تھیں۔ وہ سرسراتی آواز میں بولا۔ "مجھے یاد آ گیا .... مجھے یاد آ گیا۔ وہ جلال الدین ہے' خوارزم شاہ علاؤ الدین کا بیٹا جلال الدین ہے .... کہاں ہے وہ .... اوہ میرے خدا وہ تو جعفر کے ساتھ ہے۔ بہت برا ہوا۔ یہ تو بہت برا ہوا۔ گوہر' تغلق' سالنوق!" دفعتاً وہ حلق پھاڑ کر اپنے محافظوں کو آوازیں دینے لگا۔ جابر خاں نے تلوار نیام سے باہر کی کچھ دیر اپنے جھومتے جسم کو قابو کرنے کی کوشش کرتا رہا پھر ساتھیوں کو ساتھ لے کر نہایت عجلت میں اصطبل کی طرف بڑھا۔ چند ہی لمحے بعد سردار اباکر سرپٹ دوڑتے گھوڑوں کی ٹاپیں سن رہا تھا۔

حاضرین محفل حیرانی سے ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے تھے۔ سردار اباکر [illegible]

سمجھ چکا تھا۔ جابر خاں' خوارزم شاہ کی اصلیت جان گیا تھا اور اب جعفر داراب کو اس سے آگاہ کرنے جا رہا تھا۔ وہ مختصر سا قافلہ ابھی زیادہ دور نہیں گیا تھا۔ جابر خاں تھوڑی سی کوشش سے ان تک پہنچ سکتا تھا .... اور اس وقت اباکر نے فیصلہ کر لیا کہ وہ جابر کو جعفر داراب تک نہیں پہنچنے دے گا۔ اس نے اپنا ترکش دیکھا اس میں صرف ایک تیر تھا۔ وہ تیزی سے اپنے گھوڑے تک آیا اور پوری رفتار سے جابر خاں کے پیچھے ہو لیا۔

جابر خاں اور اس کے تین ساتھی اندھا دھند گھوڑے بھگاتے وادی سے نکلے۔ ان کی نگاہیں جعفر داراب اور اس کے ہمراہیوں کو تلاش کر رہی تھیں۔ ایک پُر پیچ راستے سے ہو کر جونہی وہ ایک پہاڑ کے دامن میں پہنچے' انہیں دور چاندنی میں جعفر داراب اور ساتھیوں کے ہیولے نظر آئے۔ جابر خاں نے گھوڑے کی رفتار اور تیز کی لیکن پھر اچانک اس نے دیکھا کہ پہاڑ کی دوسری جانب سے ایک گھڑ سوار نے برق رفتاری سے موڑ کاٹا اور ان کے راستے میں کھڑا ہو گیا۔ اس کے ہاتھ میں بے نیام تلوار تھی جو اس نے پرچم کی طرح ہاتھ میں اٹھا رکھی تھی۔ "رک جاؤ جابر خاں!" اس کی آواز ویرانے میں گونجی۔ "میں تمہیں ایک قدم آگے نہیں بڑھنے دوں گا۔"

"کون ہو تم؟" جابر چلایا۔

"میرا نام مسلمان ہے۔" اباکر کی خوابناک آواز سنائی دی۔

"میں پوچھتا ہوں کیا چاہتے ہو؟"

"شہادت!" اباکر کا جواب تھا۔

"لو پھر ہو جاؤ شہید۔" جابر دانت پیس کر غرایا اور اس کے گھوڑے نے اباکر کی طرف جست بھری اباکر کا چہرہ پگڑی میں چھپا ہوا تھا' صرف اس کی آنکھیں عریاں تھیں۔ ان آنکھوں میں جبر و ستم کے ماہ و سال خون بن کر اتر آئے تھے اور اس خون میں بغاوت کی چنگاریاں تھیں۔ جونہی جابر خاں نے وار کیا اباکر گھوڑے کی پشت سے لگ گیا۔ وار خالی گیا۔ دوسرا وار اباکر نے اپنی تلوار پر روکا .... پھر اس کے حلق سے فلک شگاف نعرہ تکبیر بلند ہوا اور وہ جابر خاں اور اس کے ساتھیوں پر ٹوٹ پڑا۔ چاندنی رات میں وہ ایک خونریز لڑائی تھی۔ اباکر نے ٹھیک ہی کہا تھا وہ موت اور زندگی سے بے پرواہ ہو کر میدان میں آیا تھا۔ چند ہی لمحے میں اس نے جابر خاں کے دو شرابی ساتھیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس دوران جابر نے عقب سے اس کی پشت پر ایک کاری زخم لگایا۔ تلوار اباکر کے سینے میں اندر تک اتر گئی۔ وہ الٹ کر گھوڑے سے نیچے گرا۔ جابر اپنا گھوڑا گھما کر اس کے سر پر لایا تاکہ فیصلہ کن وار کر سکے۔ اباکر دیوانہ وار جابر کے گھوڑے کی ٹانگوں سے

لپٹ گیا۔ اس نے گھوڑے کی اگلی ٹانگوں کو ایسا اڑنگا لگایا کہ وہ ہنہنا کر زمین بوس ہوگیا۔ جابر لڑھک کر پتھریلی زمین پر گرا۔ اس لمحے ابابکر نے ایک نعرہ کے ساتھ اس پر چھلانگ لگائی۔ اس کے ہاتھ میں پکڑی تلوار جابر کے سینے میں دل کے مقام پر ترازو ہوگئی۔ جابر کی آخری چیخ بڑی بھیانک تھی۔

"تبریز کا شیطان" ایک بار زور سے مچل کر جہنم واصل ہوگیا۔

ابابکر تیورا کر اس کے پہلو میں جا گرا۔ اس وقت اسے گھوڑے کی ٹاپیں سنائی دیں۔ جابر کا چوتھا ساتھی ہوشیاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے نکل بھاگا تھا۔ اس کا رُخ جعفر داراب کی طرف تھا۔ ایک لمحے کے لیے ابابکر کو محسوس ہوا کہ اس کی قربانی رائیگاں گئی۔ وہ سلطان کے راز کو راز رکھنے میں کامیاب نہیں ہوا۔ پھر اچانک اسے اپنے ترکش کا واحد تیر یاد آیا۔ اس نے بچی کھچی قوت جمع کی اور کمان کندھے سے اتار کر تیر اس پر چڑھا لیا۔ یہ ایک دو انگل موٹا دور مار تیر تھا۔ ابابکر نے کہنی کے بل جسم کو سہارا دے کر گھڑ سوار کی پشت کا نشانہ لیا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ اس کے پاس گھڑسوار کو روکنے کا پہلا اور آخری موقع ہے۔ اللہ کا نام لے کر اس نے تیر چھوڑا۔ چاند کی روشنی میں گھڑ سوار صاف نظر آ رہا تھا.......... تیر چلنے کے بعد بھی وہ سیدھا بھاگتا چلا گیا' پھر چند گز آگے جا کر وہ کٹے ہوئے درخت کی طرح گھوڑے کی پشت سے گرا اور زمین پر لڑھکتا چلا گیا۔

ابابکر نے ایک طویل سانس لی اور شکرگزار نظروں سے تاروں بھرے آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کا لباس خون سے تر تھا۔ وہ جانتا تھا یہ خون شہادت ہے۔ وہ جسم کو گھسیٹتا ہوا اُٹھا اور ایک ناقابل یقین کوشش کے ساتھ اپنے گھوڑے پر سوار ہوگیا۔ اس نے ڈوبتی نظروں سے آسمان کی طرف دیکھا اور بولا۔

"اے خدا! تُو مختارِ کُل ہے۔ مجھے تھوڑی سی زندگی اور دے دے۔ میں ایک بار اپنے قبیلے میں پہنچ جاؤں۔ میرے لوگ بڑے نادان ہیں' وہ بڑے سادہ لوح ہیں بالکل بچوں کی طرح ہیں۔ وہ بھٹک جائیں گے' پریشان ہو جائیں گے مجھے اتنی توفیق دے دے۔ اے مالک! میں ایک بار اپنی زبان سے انھیں آخری ہدایات دے دوں' ان کا راستہ سیدھا کر جاؤں۔ بس تھوڑی سی مہلت اے جان آفریں!"

اس نے گھوڑے کی لگام کو جھٹکا دیا اور اس کی پشت پر اوندھا لیٹ گیا۔ وفادار گھوڑا مالک کے اشارے پر بھاگنے لگا۔ بظاہر یہ ایک لاحاصل سفر تھا۔ ابابکر چند لمحوں کا مہمان تھا اور اس کی مسافت بہت طویل تھی۔ دو روز کا دشوار گزار سفر تھا بغیر پانی کے جسے طے کرنا ناممکنات میں سے تھا۔ پھر اس راستے میں وہ درہ بھی تھا جسے آگ کا راستہ کہا جاتا تھا اور

ایسی خطرناک پگڈنڈیاں بھی جن کو گھوڑے سے اترے بغیر طے کرنا خارج از مکان تھا۔ پھر بھی ابابکر آگے بڑھ رہا تھا' ایک لگن اور احساس ذمہ داری کے ساتھ۔

مگر روح اب داعی اجل کو لبیک کہنے کو تیار تھی' ابابکر کی آنکھوں میں ایک چمک سی پیدا ہوئی۔ اپنی محبوب بیوی کا چہرہ اس کی نگاہوں میں گھوما۔ وہ بھاگتے گھوڑے کی پشت سے پھسل کر زمین پر گرا اور ہر احساس سے عاری ہوگیا۔

☆------☆------☆

سلطان جلال اباقہ' یورق' ماریتا' سیوک رام اور جعفر داراب پر مشتمل یہ چھ افراد کا قافلہ تیزی سے ایرانی سرحد کی طرف بڑھ رہا تھا۔ دن کا اجالا پھیلنے تک وہ قریباً دو منزل آگے آ چکے تھے۔ انہیں کچھ معلوم نہیں تھا رات ان سے چند فرلانگ پیچھے کیا ہوا تھا۔ جابر خاں سلطان جلال کی حقیقت سے آگاہ ہو کر ان کے پیچھے لپکا تھا مگر شمع سلطانی کا پروانہ سردار ابابکر عشق کی لو پر خاکستر ہو گیا تھا۔ اس نے جابر خاں کو قافلے تک پہنچنے سے روک لیا تھا اور کامیاب کوشش کا صلہ اسے شہادت کی شکل میں ملا تھا۔ ان تمام حالات سے بے خبر یہ قافلہ اپنی منزل کی طرف گامزن تھا۔ راجی خاتون نے ثوبیہ کے ذریعے اباقہ وغیرہ کو ہدایت کی تھی کہ وہ دوران سفر ماریتا سے بالکل لاتعلق رہیں اور جعفر داراب سے اپنا رویہ ایسا رکھیں جیسے وہ اس کے بے دام کے غلام ہیں۔ ثوبیہ نے راجی خاتون کی جو ہدایات پہنچائی تھیں وہ ایک خفیہ مراسلے کی صورت میں تھیں۔ لکھا تھا۔

"جعفر داراب ایران کے ساحلی شہر "شاہ پور" پہنچے گا اور وہاں سے خلیج فارس میں ایک بادبانی کشتی پر سفر شروع کرے گا۔ یہ بادبانی کشتی تم لوگوں کو علاقہ ازدشیر خرہ کے ایک نامعلوم جزیرے میں پہنچائے گی۔ اس جزیرے پر شیخ نجدی نامی ایک شخص کا تسلط ہے اس شخص کا اصل نام فیروز الدین ہے۔ کہا جاتا ہے کہ عرصہ ہوا وہ مسلمانوں کے سلطان' جلال الدین خوارزم شاہ کے خوف سے بھاگ کر اس جزیرے پر آباد ہو گیا تھا اس سے زیادہ مجھے اس کے متعلق کچھ معلوم نہیں۔ یہ شخص شجرہ نسب کے اعتبار سے تو مسلمان ہے لیکن درحقیقت چنگیز زادوں سے بڑھ کر چنگیز کا وفادار ہے۔ اس کی وفاداریاں سینکڑوں میل دور قراقرم سے وابستہ ہیں۔ وہ منافق لعین مسلمانوں کو گھن کی طرح چاٹ رہا ہے۔ وہ اتحاد اور یگانگت کے مبلغین کو چن چن کر مرواتا ہے اور فتنہ و فساد برپا کرنے والے ملاؤں اور شر پسندوں کی درپردہ اعانت کرتا ہے لیکن وہ خود کبھی اپنے جزیرے سے باہر نہیں نکلا اور جو کوئی وہاں جاتا ہے واپس نہیں لوٹتا' سوائے تین افراد کے۔ ان میں سے ایک میرا باپ رستم تھا۔ جس کی جگہ اب جعفر داراب نے لے لی ہے۔ باقی دو افراد میں سے ایک مصر

میں ہے اور دوسرا عرب میں' یہ لوگ بھی بڑے بڑے جرائم پیشہ گروہوں کے سرغنے ہیں اور شیخ نجدی کے اشارے پر اپنے علاقوں میں قتل وغارت اور فریب کاری کا بازار گرم رکھتے ہیں۔ ان ملکوں کی حکومتیں بھی ان سے تنگ ہیں لیکن جس طرح افغانی' جعفر داراب کو پکڑنے سے قاصر ہیں اسی طرح وہ لوگ بھی ان کی پہنچ سے باہر ہیں اور اگر ان گروہوں کا قلع قمع کر بھی دیا جائے تو بھی اصل مجرم خلیج فارس کے اس جزیرے میں بالکل محفوظ رہے گا۔ کیونکہ اس کے ٹھکانے سے کوئی واقف نہیں۔ حتیٰ کہ چنگیز کے جانشین اوغدائی اور چغتائی بھی اس کے بارے میں کچھ نہ جانتے ہوں گے۔

اس کے علاوہ میں تمہیں یہ ہدایت بھی کرنا چاہتی ہوں کہ راستے میں جعفر داراب پر قابو پانے کی کوشش نہ کرنا۔ اگر تم نے ایسا کر کے اسے زبردستی جزیرے تک لے جانا چاہا تو یہ تمہاری بہت بڑی حماقت ہو گی۔ وہ فوراً موت کو گلے لگا لے گا اور اگر تم نے اسے بے بس کر لیا اور اس کے جسم کا ریشہ ریشہ بھی جدا کر دیا تو وہ تمہیں کچھ نہیں بتائے گا۔ آخر میں' میں تم تینوں سے اور خاص طور پر اباقہ سے قربانی کی طلبگار ہوں۔ جیسا کہ مجھے معلوم ہوا ہے تمہارے ساتھ جانے والی لڑکی کا نام ماریتا ہے اور اباقہ اس سے محبت کرتا ہے۔ یہ لڑکی تمہاری ہم سفر تو ہے لیکن منزل پر یہ تمہارے ساتھ نہیں پہنچ سکے گی۔ تمہیں اس کی جدائی برداشت کرنا ہو گی کیونکہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں' لیکن اس لڑکی کی موت رائیگاں نہیں جائے گی۔ تم لوگ ایک ایسا مقصد حاصل کرو گے جو عشق و محبت سے کہیں بلند تر ہے۔ تم ایک تاریخی کام کرنے جا رہے ہو۔ اگر تم اس جزیرے پر پہنچ گئے اور تم نے شیخ نجدی کا قلع قمع کر دیا تو عالم اسلام پر تمہارا یہ احسان عظیم ہو گا۔ اگر محمود غزنوی' صلاح الدین ایوبی اور جلال الدین کے نام لوگوں کے ذہنوں پر نقش ہیں تو گمراہی کی گمنام قوتوں سے ٹکرانے والے تم جیسے گمنام مجاہدوں کے نام ساتویں آسمان پر لکھے ہوئے ملیں گے۔ میں ایک مجرم باپ کی شرمسار بیٹی تمہاری کامیابی کی دعا کرتی ہوں اور تمنا کرتی ہوں کہ تمہارے بازوؤں کو وہ قوت عطا ہو جس نے بدر و حنین کے معرکوں میں کفر کا سینہ شق کر کے حق کو سرفراز اور باطل کو سرنگوں کیا تھا۔

میں تم سے جو قربانیاں طلب کر رہی ہوں یہ بہت بڑی ہیں لیکن میں جانتی ہوں اور ایک بار پھر کہتی ہوں کہ تم بھی معمولی لوگ نہیں ہو۔ میں تمہارے نام نہیں جانتی کام نہیں جانتی' یہ بھی نہیں جانتی تم کہاں سے آئے ہو اور تم نے کیا بھیس بدل رکھا ہے لیکن میرے دل کی گواہی ہے کہ تم جو بھی ہو تمہارا دل مسلمان ہے۔ تمہارے اندر نعرہ توحید گونج رہا ہے۔ اسلام کی خاطر جان دے دینا تمہارے لیے چنداں مشکل نہیں .... اور

مجھے یقین ہے کہ میرا یہ قیافہ بھی ہمیشہ کی طرح درست ثابت ہو گا۔"

اس تحریر میں تحریر کے علاوہ تقریر کی خوبیاں بھی شامل تھیں۔ ثوبیہ اپنی مالکہ راحی خاتون کی یہ تحریری ہدایات پہنچا کر رخصت ہو گئی تھی اور اس سے اگلے ہی روز جعفر داراب نے انہیں بلا کر سفر کی تیاری کا حکم دیا تھا۔

جعفر داراب کی رہنمائی میں ان کا سفر جاری رہا۔ وادی سے روانہ ہونے کے تین روز بعد انہوں نے زاہدان کو جانے والے راستے کو قطع کیا اور شاہ پور کی طرف پیش قدمی جاری رکھی۔ موسم خوشگوار تھا۔ سیوک رام سارا دن جعفر داراب کے ساتھ ساتھ چلتا رہتا تھا۔ اس کے چہرے پر ہمہ وقت خوشامد کے تاثرات طاری رہتے تھے اور اباقہ دیکھ دیکھ کر سوچتا تھا کہ بے وقوف شخص اپنے انجام سے کس قدر بے خبر ہے۔ اس کے شوق ہوا خوری نے اسے ایک ایسے سفر پر روانہ کر دیا تھا جس کا انجام موت کے سوا اور کچھ نہیں ہے یقینی موت .... سفر کے دوران یا واپسی پر جعفر داراب کے ہاتھوں۔

ماریتا کو اباقہ نے شروع ہی میں اشارے سے سمجھا دیا تھا کہ وہ ان سے بات کرنے کی کوشش نہ کرے اور وہ فوراً اس کا اشارہ سمجھ گئی تھی۔ بعد ازاں اباقہ اور سلطان جلال نے اس سے چند باتیں اس انداز سے کی تھیں۔ جیسے وہ ان کے لیے پہلے اجنبی رہی ہو۔ ماریتا زیادہ تر خاموش ہی رہی تھی۔ اس کا چہرہ مستقل غم میں ڈوبا ہوا تھا۔ پھر جب اسے معلوم ہوا تھا کہ ان کے ساتھ سفر کرنے والا شیر خوارزم جلال الدین ہے تو وہ حیرت کے سمندر میں گم ہو گئی تھی۔ دوسری طرف سلطان جلال بھی کمال شفقت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر محبت پھوار کی طرح برس رہی تھی۔ اچانک ماریتا کا دل چاہا کہ وہ اسی وقت گھوڑے سے اتر کر اس عظیم مجاہد کے قدم چوم لے۔ اس کی طرف دیکھ کر ماریتا کو یوں لگ رہا تھا جیسے وہ ایک بہت بڑے اور گھنے درخت کے سائے میں آ گئی ہے۔

☆-------☆-------☆

اپنے سفر کے ساتویں روز وہ شاہ پور سے ہوتے ہوئے جنابہ پہنچے۔ خلیج کے اس کے چھوٹے سے ساحلی شہر میں حبس اور گرمی اپنے عروج پر تھی۔ ان ساحلی علاقوں کے بارے کہا جاتا تھا کہ گرم ترین حمام کے بند کمرے میں اتنی گرمی نہیں ہوتی جتنی یہاں کی کھلی فضا میں ہوتی ہے۔ موسم گرما میں درجہ حرارت حیرت انگیز طور پر بڑھ جاتا تھا۔

اس قافلے نے دو روز تک ایک سرائے میں آرام کیا اور پھر تازہ دم ہو کر دوبارہ اپنے سفر کا آغاز کر دیا لیکن اس دفعہ ان کے سامنے زمین کی بجائے سمندر تھا اور ان کے نیچے گھوڑوں کی بجائے ایک بادبانی کشتی تھی۔ سفر کے آغاز میں ہوا ناموافق تھی۔ جعفر

داراب نے ان چاروں کو چپو سنبھالنے کا حکم دیا۔ وہ سارا دن درمیانی رفتار سے مغرب کی طرف محو سفر رہے۔ اگلے روز ان کے بادبان ہوا سے بھر گئے۔ اس روز انہیں بہت زیادہ مشقت نہیں کرنا پڑی۔ پھر بھی کشتی کا رخ درست رکھنے کے لیے نہیں بار بار چپوؤں سے مدد لینا پڑی۔ گاہے گاہے بادبانوں کی کھینچا تانی بھی جاری رہی۔ شام تک وہ خاصے نڈھال ہو چکے تھے۔

یہ اسی رات کا واقعہ ہے۔ ٹھنڈی ہوا نے مسحور کر کے انہیں جلد ہی نیند کی آغوش میں پہنچا دیا۔ سیوک رام کشتی کے چھوٹے سے حجرے میں جعفر داراب کے پاس بیٹھا تھا۔ دیر تک وہ اس کے پاؤں دباتا رہا پھر وہ بھی باہر آ کر اباقہ اور سردار یورق کے برابر لکڑی کے تختوں پر لیٹ گیا۔ مارینا کشتی کے مستول کے پاس ایک سائبان کے نیچے لیٹی تھی۔ مستول کے ساتھ جھولتی ہوئی ایک کہنہ سال قندیل کی روشنی میں سائبان کا کپڑا دھیرے دھیرے ہوا میں پھڑپھڑا رہا تھا۔ سلطان جلال نے کشتی کے چوبی کنارے سے ٹیک لگائے ایک نظر پوری کشتی کا جائزہ لیا پھر اپنے خیالوں میں گم ہو گیا۔

.... قدرت نے خود بخود ان کے لیے کیسے اسباب پیدا کر دیے تھے۔ وہ راجی خاتون کی تلاش میں کالے پہاڑوں کی وادی تک پہنچے تھے تاکہ اس سے خلیج فارس کے اس جزیرے کا پتہ معلوم کر سکیں جہاں فیروز الدین موجود تھا لیکن انہیں راجی خاتون سے کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی تھی۔ اس نے خود ہی انہیں ایک ایسی مہم سونپ دی تھی جو درا صل ان کی اپنی مہم تھی۔ اب وہ جعفر داراب کے ساتھ اس نامعلوم جزیرے کی طرف رواں تھے .... سوچتے سوچتے سلطان جلال کی آنکھیں بوجھل ہونے لگیں تو اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک چھوٹی سی تسبیح نکالی اور اس کی انگلیاں آہستہ آہستہ تسبیح کے دانوں پر گردش کرنے لگیں۔ تاروں بھرے آسمان اور سیاہ سمندر کی بیکراں وسعتوں کے درمیان کشتی ایک روشن نقطے کی طرح دھیرے دھیرے سرک رہی تھی۔ ٹھنڈی ہوا نیند کی جھولیاں بھر بھر کے لائی تھی اور یہ نیند اس نے کشتی کے مسافروں پر نچھاور کر دی تھی۔ چند گز کے فاصلے پر اباقہ ایک نوجوان کی بے فکر نیند سو رہا تھا۔ اس سے آگے سردار یورق تھا۔ اس منگول کی نیند خراٹے دار تھی۔ اس کے پہلو میں سیوک چت لیٹا ہوا تھا۔ لگتا تھا اس وقت بھی ستاروں کی چال دیکھ رہا ہے مگر اس کا بے حرکت سراپا بتا رہا تھا کہ وہ بھی سو چکا ہے۔ اس سے آگے مارینا تھی۔ کہتے ہیں نیند سولی پر بھی آ جاتی ہے۔ آفات میں گھری ہوئی یہ عورت بھی اپنے گرد و پیش سے ناطہ توڑ کر کچھ دیر کے لیے نیند کی پناہ میں چلی گئی تھی۔ بائیں طرف جعفر داراب کا حجرہ تھا۔ اپنے "وفادار غلاموں" کے ہوتے

ہوئے اسے کسی تردد کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ سرخ ایرانی شراب کے دو جام چڑھا کر کب کا بستر پر لڑھک چکا تھا۔ چاروں طرف دیکھ کر سلطان جلال نے اپنا سر بادبان کے موٹے رسے سے ٹکایا اور آنکھیں موند لیں، لیکن اس کی انگلیاں ابھی تک تسبیح پر متحرک تھیں۔

☆------☆------☆

سیوک رام نے دھیرے سے اپنا سر اٹھایا۔ بائیں طرف لیٹے اباقہ کی طرف دیکھا۔ دائیں طرف دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ منگول سردار کے خراٹے گواہ تھے کہ وہ گہری نیند میں ہے سیوک رام کے دل کی دھڑکن تیز ہونے لگی۔ اس نے کہنی کے زور پر جسم کو کشتی کے فرش سے بلند کیا اور سلطان جلال کی طرف دیکھنے لگا۔ سلطان جلال کا سر بادبان کے رسے سے ٹکا ہوا تھا اور جسم بالکل ساکت تھا .... "تو آخر یہ بوڑھا بھی سو گیا۔" سیوک رام زیر لب بڑبڑایا۔ اس کی رگوں میں خون کی روانی اتنی تیز ہو گئی تھی کہ وہ خود حیران ہو رہا تھا۔ نہایت دھیرے دھیرے اس نے اپنا سر مستول کی طرف گھمایا۔ سائبان کے نیچے حسین دوشیزہ کا بے حرکت سایہ نظر آ رہا تھا۔ صرف تین گز کے فاصلے پر وہ پری پیکر دنیا و مافیہا سے بے خبر پڑی تھی۔ سیوک رام نے تصور میں اس کا خوبصورت چہرہ دیکھا۔ ستواں ناک، غلافی آنکھیں، پنکھڑیوں سے ہونٹ اور پھر چہرے پر چھائی ہوئی وہ زردی مائل اداسی جس نے اس کے حسن کو ایک عجیب گداز بخش دیا تھا۔ آج سے کئی برس پہلے سیوک رام نے جب بنارس کے ایک مندر میں سونے کا ڈھیر دیکھا تھا تو اس کی ایسی ہی حالت ہوئی تھی۔ اسے اپنی طبیعت پر قابو نہیں رہا تھا .... اور پھر وہ سب خدشات بالائے طاق رکھ کر سونا حاصل کرنے کے لیے مندر میں داخل ہو گیا تھا۔ آج وہ کسی مندر میں نہیں تھا لیکن اس کا دل اسی انداز میں دھڑک رہا تھا۔ سائبان کے نیچے لیٹی ہوئی سونے جیسی زرد لڑکی کا چہرہ بار بار اس کی نگاہوں میں گھوم جاتا تھا۔ سیوک رام کو کچھ معلوم نہیں تھا آقا جعفر اس حسین لڑکی کو کس لیے اپنے ساتھ لے جا رہا ہے۔ پہلے تو اس کا خیال تھا کہ دوران سفر یہ لڑکی آقا جعفر کی دل بستگی کا سامان فراہم کرے گی لیکن اس نے دیکھا تھا کہ پچھلے دو ہفتے میں جعفر داراب نے اس کی طرف آنکھ بھی نہیں اٹھائی تھی۔ پھر سیوک رام اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ آقا جعفر اس لڑکی کو تحفے کے طور پر پیش کرنے کے لیے لے جا رہا ہے۔ وہ کئی بار سوچ چکا تھا کہ نہ جانے ان کی منزل کہاں ہے اور یہ حسین مجسمہ کس کو تحفہ دیا جائے گا۔ وہ دل ہی دل میں کئی بار اس نامعلوم شخص کی قسمت پر رشک کر چکا تھا۔ آخر آج دوپہر سیوک رام نے جعفر داراب سے پوچھ ہی لیا تھا۔ اس

نے کہا تھا۔

"آقا! اس عورت کو کس خدمت کے لیے ساتھ رکھا گیا ہے؟"

آقا جعفر کے چہرے پر ایک پُراسرار مسکراہٹ کھیلی تھی اور اس نے کہا تھا۔ "ہے اس کا بھی ایک مصرف بس آج کی رات' کل اس کو صرف کر دیا جائے گا۔"

اس سے آگے پوچھنے کی سیوک رام کو جرأت نہیں ہوئی تھی۔ وہ بہت دیر تک جعفر داراب کے فقرے پر غور کرتا رہا تھا۔ "بس آج کی رات' کل اس کو صرف کر دیا جائے گا" اسے کچھ سمجھ نہیں آئی تھی بس یہی اندازہ ہوا تھا کہ کل اس لڑکی کو کسی کے سپرد کر دیا جائے گا۔ یا شاید ہلاک کر دیا جائے۔ اتنا قیمتی ہیرا جس کی روشنی سیدھی دل پر منعکس ہوتی تھی اور جس کی موجودگی نے کشتی کی فضا کو ہفت رنگ بنا رکھا تھا کل' کشتی پر نہیں ہو گا۔ سیوک رام نے سوچا تھا گنگا کا پانی تو بہہ ہی جائے گا کیوں نہ اپنے ہاتھوں کو اس کے لمس سے سیراب کیا جائے .... اس نے ایک بار پھر چور نظروں سے چاروں طرف دیکھا اور دھیرے دھیرے سائبان کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ اوندھے منہ سانپ کی طرح بے آواز رینگتا چلا جا رہا تھا۔ کمر میں اڑسا ہوا خم دار خنجر اس نے اب اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ لڑکی کے قریب پہنچ کر اس کے دل میں خیال آیا اگر وہ اپنی کوشش میں ناکام رہا اور آقا جعفر کو اس حرکت کا علم ہو گیا تو اس کا رویہ کیا ہو گا۔ کہیں طیش میں آ کر وہ اس کے لیے کسی سخت سزا کا حکم نہ دے ڈالے۔ ایک لمحے کے لیے اس کے دل میں آئی کہ واپس چلا جائے لیکن اس دوران اس کی نگاہیں اس حسین مجسمے پر پڑیں اور تمام وسوسے اس کے دل سے نکل گئے۔ اس نے سوچا ایک معمولی کنیز کے لیے آقا جعفر اس کی برسوں کی خدمات کیونکر فراموش کر سکتا ہے۔ وہ آگے بڑھا اور منصوبے کے مطابق اس نے اپنا دایاں ہاتھ لڑکی کے ہونٹوں پر جما دیا۔ لڑکی کے ہاتھ پاؤں پہلے ہی بندھے ہوئے تھے۔ وہ صرف آنکھیں پٹ پٹا کر رہ گئی۔ سیوک رام نے اپنا خم دار خنجر لڑکی کی آنکھوں کے سامنے نچایا اور فارسی میں سرگوشی کی۔

"خبردار اگر حرکت کی تو گردن کاٹ ڈالوں گا۔"

لڑکی نے پوری قوت سے اپنا سر دائیں بائیں ہلایا لیکن اس وقت سیوک رام نے اپنی دوسری مٹھی میں اس کے بال جکڑ لیے.........

دوسری طرف سلطان جلال کو سائبان کی طرف سے ایک مدھم آہٹ سنائی دی اور اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ پہلے تو اسے لگا مارینا اپنی جگہ سے اٹھ کر بیٹھی ہوئی ہے۔ جب غور سے دیکھا تو پتہ چلا کہ یہ کسی مرد کا ہیولا ہے اور تب سلطان جلال کی نگاہ

سیوک رام کی خالی جگہ پر پڑی۔ ایک ہی لمحے میں اس کا ذہن بات کی تہہ تک پہنچ گیا۔ سیوک رام موقع دیکھ کر مارینا پر حملہ آور ہو گیا تھا۔ سلطان جلال کی آنکھوں میں ایک برق سی لہرائی۔ اس نے گود میں رکھی تلوار نیام سے باہر کی اور ایک جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔

"رک جا مردود!" وہ شیر کی طرح گرجا اور اس کی طرف لپکا' سیوک رام نے مارینا کو چھوڑا اور تیزی سے سلطان کی طرف گھوما۔ اس کی آنکھوں میں خوف ہی خوف تھا۔ سلطان جلال کو صرف اتنا پتہ چلا کہ سیوک رام نے کوئی شے اس پر پھینکی ہے۔ اس نے تیزی سے پینترہ بدلا اور خنجر سنسناتا ہوا چھپاکے سے تاریک پانی میں جا گرا۔ اس کے ساتھ ہی سیوک رام نے تلوار نیام سے برآمد کر لی۔ سلطان جلال نے بھی تلوار سیدھی کی۔ تاریک فضا میں لوہے سے لوہا ٹکرایا اور کشتی بری طرح ڈولنے لگی۔ سیوک رام خوف زدہ تھا اور اس خوف میں وہ تابڑ توڑ حملے کر رہا تھا۔ شاید وہ سلطان کی آنکھوں میں اپنی موت دیکھ رہا تھا۔ سلطان نے پیچھے ہٹتے ہوئے سیوک رام کے چند وار رو کے پھر دفعتاً اس نے قدم جمائے اور ہانپتے کانپتے سیوک رام کو دھکیلتا ہوا کشتی کے کنارے تک لے گیا۔ سیوک رام دیکھ چکا تھا کہ وہ اب مزید پیچھے نہیں ہٹ سکتا ورنہ پانی میں جا گرے گا۔ اس کے حلق سے ایک ڈری ڈری آواز نکلی۔ عین اس وقت سلطان جلال کی تلوار موت بن کر لپکی اور سیوک رام کے سینے میں ترازو ہو گئی۔ اس نے ایک چیخ ماری اور تلوار پھینک کر دونوں ہاتھوں سے کلیجہ تھام لیا۔ سلطان دانت پیس کر بولا۔ "جوان بیٹیوں کے باپ اتنی گہری نیند نہیں سویا کرتے' سیوک رام۔"

سیوک رام کی آنکھیں اذیت اور خوف سے پھٹی ہوئی تھیں اور وہ تلوار کو اپنے سینے سے نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ سلطان جلال نے اپنے پاؤں سے اس کا جسم دھکیلا جو الٹ کر کشتی سے نیچے پانی میں جا گرا۔

مارینا کی چیخ' تلواروں کی جھنکار اور کشتی کے ہچکولوں نے جعفر داراب سمیت تمام افراد کو جگا دیا تھا۔ جعفر داراب جو کچی نیند سے بیدار ہوا تھا بادبان کا رسہ تھامے حیرت سے کبھی سلطان اور کبھی اس کی خون آلود تلوار کی طرف دیکھ رہا تھا۔ قندیل کی جھلملاتی روشنی میں تلوار کی دھار پر سیوک رام کا خون ابھی تک چمک رہا تھا۔ اباقہ اور یورق دم بخود جعفر داراب کی طرف دیکھ رہے تھے۔ یہی حال مارینا کا تھا۔ انہیں کچھ معلوم نہیں تھا جعفر داراب کا ردعمل کیا ہو گا۔ آخر سلطان جلال نے اس کے مصاحب خاص کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ پھر جعفر داراب کی آواز ابھری۔ وہ مارینا سے مخاطب تھا۔

"اے لڑکی! کیا ماجرا ہے؟ تُو کیوں چیخی تھی؟"

ماریتا خاموش رہی۔ سلطان جلال بولا۔ "آقا! میں آپ کو بتاتا ہوں۔ سیوک رام نے اس کی عزت پر حملہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ میں نے اسے روکا تو وہ مجھ پر بھی حملہ آور ہو گیا۔"

"تم خاموش رہو۔" جعفر داراب دھاڑا۔ "تم بتاؤ لڑکی کیا ہوا تھا؟"

ماریتا نے ایک نظر سلطان کی طرف دیکھا اور بولی۔ "یہ درست کہہ رہے ہیں اس شیطان نے میری گردن پر خنجر رکھ دیا تھا۔ اگر یہ مدد کو نہ پہنچتے تو نہ جانے کیا ہوتا۔"

جعفر داراب کا تنا ہوا چہرہ ڈھیلا پڑ گیا۔ اس نے آگے بڑھ کر سلطان کا کندھا تھپتھپایا اور بولا۔ "تم نے جوانمردی کا ثبوت دیا ہے۔ آنکھیں اور کان کھلے رکھنے والے لوگ مجھے پسند ہیں لیکن ایک بات یاد رکھو۔ اب تم تین رہ گئے ہو اور تمہیں کشتی رانی میں پہلے سے زیادہ مشقت کرنا پڑے گی۔"

یورق نے سر جھکا کر کہا۔ "آقا! آپ پریشان نہ ہوں۔ آپ کی خدمات انجام دیتے ہوئے ہمارے بازو ٹوٹ بھی جائیں تو پرواہ نہیں۔"

"میں تمہاری فرماں برداری پر خوش ہوں۔" جعفر داراب گردن اکڑا کر بولا۔ "سفر سے واپسی پر میں تمہیں مالا مال کر دوں گا۔" وہ تینوں جانتے تھے واپسی پر جعفر داراب ملاحوں کا کیا حشر کرتا ہے۔ اگر کوئی اور موقعہ ہوتا تو یورق، جعفر داراب کی اس بات پر قہقہہ مار کر ہنس پڑتا لیکن اس وقت اس نے تعظیماً سر جھکانے پر ہی اکتفا کیا۔ جعفر داراب انہیں کچھ ضروری ہدایات دے کر واپس اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اباقہ نے جلدی سے آگے بڑھ کر سلطان کی پشت پر نظریں جما دیں۔ وہاں قمیص پر ایک سیاہ دھبہ نمودار ہو رہا تھا۔ یورق نے بھی اس دھبے کو دیکھا اور اس کی آنکھوں میں تشویش کے سائے لہرانے لگے۔ چند ہفتے پہلے پشت پر لگنے والا زخم ابھی پوری طرح ٹھیک نہیں ہوا تھا۔ سیوک رام سے تلوار زنی کے دوران زخم پھر کھل گیا تھا اور اس سے خارج ہونے والا خون سلطان کی قمیص کو داغدار کر رہا تھا۔ اباقہ نے قمیص اٹھا کر زخم دیکھا اور پھر سردار یورق کے ساتھ مل کر وہ زخم کی مرہم پٹی کرنے لگا۔

☆ ☆ ☆

اب تک وہ پُرسکون سمندر میں سفر کرتے چلے آ رہے تھے لیکن تیسرے روز دوپہر کے وقت وہ ایک ایسے سمندر میں داخل ہوئے جو تلاطم خیز تھا۔ جوں جوں وہ آگے بڑھتے رہے لہروں کے اتار چڑھاؤ میں اضافہ ہوتا رہا۔ آخر وہ ایک ویران جزیرے کے قریب سے گزرے۔ جزیرے پر کثرت سے سبزہ اگا ہوا تھا۔ کھجور کے بلند و بالا درخت بھی دکھائی دے

رہے تھے۔ ساحل سے کچھ ہٹ کر چند نیم پختہ گھروندے نظر آ رہے تھے لیکن یہ گھروندے انسانوں سے خالی تھے۔ شاید مچھلی کے شکار کے موسم میں یہاں شکاری آ کر ٹھہرتے تھے۔ ان گھروندوں کے قریب ہی انہیں ایک بلند قامت مجسمہ نظر آیا۔ انسانی قد سے دوگنا یہ سیاہ پتھر کا بت مشرق کی طرف منہ کئے کھڑا تھا۔ لہریں اس کے پاؤں کو چھو کر واپس لوٹ رہی تھیں۔

اس سے پہلے اپنے سمندری سفر کے پہلے روز وہ جزیرہ خارک دیکھ چکے تھے۔ اس کی پہاڑیوں پر سے انہیں جنابہ اور مہران کے ساحلی شہر صاف نظر آئے تھے لیکن یہ ایک دور دراز اور تنہا جزیرہ تھا۔ دور دور تک خشکی کا نشان دکھائی نہیں دیتا تھا۔ جعفر داراب کے حکم پر اباقہ اور یورق کشتی کو ویران کھاڑی پر لے گئے۔ بادبان گرا دیے گئے اور مضبوط رسی کے ساتھ کشتی کو کنارے کے ایک درخت سے باندھ دیا گیا۔ جعفر داراب نے اباقہ اور یورق کو حکم دیا کہ ماریتا کو اٹھا کر کشتی سے نیچے لے آئیں انہوں نے حکم کی تعمیل کی۔ ماریتا کے چہرے پر انجانے خوف کی پرچھائیاں لہرا رہی تھیں۔ اباقہ اور یورق نے اسے احتیاط سے ساحل کی ریت پر لٹا دیا۔ اس کے ہاتھ پاؤں ابھی تک بندھے ہوئے تھے۔ جعفر داراب اپنے حجرے کے اندر سے ایک وزنی نیزہ اٹھا لایا۔ یہ مخصوص ساخت کا نیزہ وہ اس سے پہلے سردار ابابکر کے پاس دیکھ چکے تھے۔ ابابکر کے قبیلے میں وحشی عورت کو "غلاف" کی جو سزا دی گئی تھی اس میں بھی ایسا ہی نیزہ استعمال ہوا تھا۔ جعفر داراب نے اباقہ کو حکم دیا کہ وہ ماریتا کو کندھے پر لاد کر سیاہ بت تک لے چلے۔ اباقہ نے جھک کر ماریتا کا جسم اٹھایا اور پھول کی طرح کندھے پر رکھ لیا۔ یہ ایک ایسا بوجھ تھا جسے اٹھا کر وہ کچھ اور ہلکا ہو گیا تھا۔ اس کے پاؤں جزیرے کی نم ریت پر تھے لیکن وہ جیسے ہواؤں میں اڑ رہا تھا۔ کوئی اور موقعہ ہوتا تو ان لمحوں کی دلکشی اس کے ذہن پر ہمیشہ کے لیے نقش ہو جاتی لیکن ان غیر یقینی حالات میں اور بہت سی سوچیں ذہن کو گھیرے ہوئے تھیں۔ ماریتا کے ساتھ جو سلوک ہونے والا تھا وہ تینوں اس سے آگاہ تھے لیکن انہیں صرف ماریتا ہی کو نہیں بچانا تھا جعفر داراب سے وفاداری کا بھرم بھی قائم رکھنا تھا۔ کبھی کبھی تو اباقہ سوچتا تھا کہیں سلطان جلال نے خود کو ماریتا کی قربانی کے لیے آمادہ تو نہیں کر لیا؟ پھر وہ خود ہی اپنے اس وحشت ناک خیال کو رد کر دیتا۔ نہیں .... ایسا نہیں ہو سکتا۔ سلطان جانتے ہیں میں ماریتا سے محبت کرتا ہوں۔ وہ میری آنکھوں کے سامنے میری محبت کا گلا کیوں گھونٹیں گے۔ وہ ضرور کوئی نہ کوئی راہ نکال لیں گے۔

وہ اب سیاہ مجسمے کے قریب پہنچ چکے تھے۔ جعفر داراب اباقہ کے پیچھے تھا اور اس

کے پیچھے سلطان اور یورق چلے آ رہے تھے۔ اباقہ نے دیکھا کہ اس جگہ ریت پر جگہ جگہ انسانی ہڈیاں بکھری ہوئی ہیں۔ ایک دو سالم ڈھانچے بھی نظر آئے لیکن وہ ریت میں دبے ہوئے تھے۔ اباقہ بخوبی سمجھ رہا تھا کہ یہ ان بدنصیبوں کے باقیات ہیں جنہیں وقتاً فوقتاً سیاہ بت کے قدموں میں قربان کیا جاتا رہا ہے۔ سمندری لہریں ان ہڈیوں کو دھکیل دھکیل کر قربان گاہ سے اتنی دور سے آتی تھیں۔ یہ ایک خوفزدہ کر دینے والا منظر تھا۔ اباقہ کی خواہش تھی کہ مارینا کی نگاہیں اس منظر سے محفوظ رہیں لیکن وہ اباقہ کے کندھے پر اوندھی لیٹی لیٹی یہ سب کچھ دیکھ چکی تھی۔ آخر اباقہ کو اس کی مدھم آواز سنائی دی۔

"اباقہ! یہ سب کیا ہے۔ مجھے کہاں لے جایا جا رہا ہے؟"

اباقہ نے بھی دھیمے لہجے میں جواب دیا۔ "مارینا! تم نہ کچھ دیکھو اور نہ سوچو۔ دیکھنا اور سوچنا ہمارا کام ہے۔ کون ہے جو ہمارے ہوتے ہوئے تمہارا بال بھی بیکا کر سکے۔" آخری الفاظ ادا کرتے کرتے اباقہ کی آواز بھرا گئی۔

اس کا خیال تھا کہ مارینا کوئی اور بات کرے گی لیکن وہ بالکل خاموش ہو گئی۔ یوں لگتا تھا اسے اپنی زندگی اور موت سے کوئی خاص دلچسپی نہیں رہی۔ وہ جب سے اس سفر پر روانہ ہوئی تھی ہر چیز کو طائرانہ نگاہ سے دیکھتی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا وہ اپنے گرد و پیش سے کٹ چکی ہے۔ اباقہ کو اس رویے کی بالکل سمجھ نہیں آتی تھی۔ وہ تو یہی سمجھتا تھا کہ اس شام مارینا' طوطم خاں کے گھر سے کچھ ضروری چیزیں لینے گئی تھی کہ جعفر داراب کے ہتھے چڑھ گئی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ جعفر داراب نے اس شام مارینا کو خودکشی سے بچایا تھا۔

وہ پانچوں اب سیاہ بت کے بالکل قریب پہنچ چکے تھے یہ ایک قدیم بت تھا۔ ماہ و سال کی گردش اور پانی کی مسلسل یورش نے اسے خاصا بوسیدہ کر دیا تھا۔ نقوش مدھم پڑ چکے تھے لیکن اس سے چہرے کی ہیبت میں اور اضافہ ہو گیا تھا۔ جعفر داراب کے حکم پر انہوں نے کھجوروں کے ایک جھنڈ کے نیچے قدم روک لیے۔ مارینا کو گھاس پر لٹا دیا گیا۔ دوپہر کا کھانا وہ کشتی سے ساتھ لے آئے تھے۔ معمول کے مطابق سردار یورق نے پہلے جعفر داراب کو کھانا پیش کیا۔ پھر اپنے ہاتھ سے مارینا کو چند لقمے کھلائے اور پھر وہ تینوں معدے کی طلب پوری کرنے میں مصروف ہو گئے۔ کھانے کے بعد وہ سایہ دار درختوں کے نیچے آرام کرنے کے لیے لیٹ گئے۔ سہ پہر کے وقت جعفر داراب نے انہیں جگا دیا۔ مغرب کی سمت جھکے ہوئے سورج کی ملگجی کرنیں اب سیاہ بت کی عریاں پشت پر پڑ رہی تھیں۔

وزنی نیزہ جو جعفر داراب کشتی سے لے کر آیا تھا اب بت کے قدموں میں ایک

چوکور پتھر پر رکھا تھا۔ جعفر داراب اس کے قریب ہی ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ اباقہ سمجھ گیا کہ آزمائش کا مرحلہ قریب آ گیا ہے۔ جعفر داراب نے بت کے سامنے کھڑے اباقہ کو حکم دیا کہ لڑکی کو کندھے پر لاد کر یہاں لے آؤ۔ اباقہ نے یہ آواز سن کر سلطان جلال کی طرف دیکھا۔ وہ چند گز کے فاصلے پر خاموش کھڑا تھا۔ اباقہ تذبذب کے عالم میں سردار یورق کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ بھی سلطان جلال کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ان کی طرف سے جو کچھ بھی کہنا تھا سلطان جلال نے کہنا تھا۔ اس کے ہوتے ہوئے وہ اپنی زبان نہیں کھول سکتے تھے .... اور سلطان خاموش تھا۔ اباقہ کے ذہن میں پھر راجی خاتون کے الفاظ گونجے۔ اس نے کہا تھا۔ "اس لڑکی کی قربانی رائیگاں نہیں جائے گی۔ تم لوگ ایک ایسا مقصد حاصل کرو گے جو عشق و محبت سے کہیں بالاتر ہے۔"

.... تو کیا سلطان جلال بھی اس انداز میں سوچنے پر آمادہ ہو گیا تھا۔ اباقہ کو ایک کربناک مایوسی کا احساس ہوا .... لیکن اس وقت اس نے دیکھا کہ سلطان جلال نپے تلے قدموں سے جعفر داراب کی طرف بڑھ رہا ہے۔ جعفر داراب اباقہ کی طرف دیکھ رہا تھا کہ اس نے حکم کی تعمیل میں مارینا کو اٹھانے میں اتنی دیر کیوں لگائی ہے۔ سلطان کو اپنی طرف بڑھتے پا کر وہ اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"کیا بات ہے خوارزمی!" جعفر داراب بولا۔ وہ سلطان جلال کو اسی نام سے پکارتا تھا۔ کبھی کبھی اسے "خوارزمی بوڑھا" بھی کہہ دیتا تھا' سلطان جلال نے تعظیم سے کہا۔

"آقا! کیا میں پوچھنے کی جسارت کر سکتا ہوں کہ آپ کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟"

جعفر کے چہرے پر برہمی کے آثار نظر آئے۔ کالے پہاڑوں کی وادی کے اس سفاک ترین شخص سے شاذ و نادر ہی کسی کو سوال پوچھنے کی ہمت ہوتی تھی اور سلطان نے یہ ہمت کی تھی۔ ایک لمحے کے لیے تو اباقہ کو لگا کہ جعفر غصے میں پھٹ پڑے گا۔ پھر شاید اسے کل رات کا واقعہ یاد آ گیا تھا کہ "خوارزمی بوڑھے" نے کس طرح اس لڑکی کی عزت بچائی تھی۔ اسی کارنامے کے صلے میں اس نے سلطان جلال کو اس کے سوال کا جواب دینا قبول کر لیا۔ وہ بولا۔

"اس سے آگے ہمارا سفر پُرخطر مرحلے میں داخل ہو جائے گا۔ وہاں سمندر میں زبردست طوفان اٹھتے رہتے ہیں۔ اس علاقے میں بہت کم لوگ سفر کرتے ہیں اور جو سفر کرتے ہیں ان کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ قدیم روایت پر عمل کرتے ہوئے' اس مقام پر ایک انسانی قربانی دیں۔ یہ مجسمہ جو نامعلوم ہاتھوں نے نامعلوم زمانے میں بنایا تھا ایک خوبصورت عورت کی قربانی لیے بغیر کسی کو آگے نہیں جانے دیتا۔ ماضی میں جو لوگ بھی

اس رسم کو توڑتے رہے ہیں انہیں عبرتناک تباہی کا سامنا ہوا ہے .... ہمارے لیے بھی ضروری ہے کہ آگے سفر کرنے سے پہلے یہاں اس عورت کو بھینٹ چڑھائیں۔"

سلطان نے کہا۔ "آقا! میں یہ کہنے کی جسارت کرتا ہوں کہ یہ سب غیر مسلموں کے توہمات ہیں حقیقت سے ان کا دور کا تعلق بھی نہیں۔ ہم ان پانیوں کے شناور ہیں۔ آپ اس بے گناہ لڑکی کی جان ضائع نہ کریں۔ ہم آپ سے وعدہ کرتے ہیں کہ بحفاظت آپ کو منزل تک پہنچائیں گے۔"

جعفر داراب نے طیش سے سلطان جلال کی طرف دیکھا۔ شاید اگر کوئی اور یہ بات کہتا تو وہ اس پر بری طرح برس پڑتا لیکن نہ چاہنے کے باوجود وہ سلطان سے محتاط رویہ رکھنے پر مجبور تھا۔ یہ سلطان کی عظیم الشان شخصیت کا اعجاز تھا۔ جعفر داراب قدرے برہمی سے بولا۔

"خوارزمی! میں اپنے معاملات میں مداخلت پسند نہیں کرتا۔ وہی کرو جو کہا جاتا ہے۔ تم لڑکی کو ادھر لاؤ۔" وہ اباقہ کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

اباقہ بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ یورق نے بھی اپنی جگہ سے جنبش نہیں کی۔ جعفر داراب کچھ دیر گہری نظروں سے ان کی طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔ "تم چاہتے کیا ہو؟"

سلطان جلال بولا۔ "آقا! ہم شرمندہ ہیں کہ ہمارے دل میں اس لڑکی کے لیے ہمدردی کے جذبات پائے جاتے ہیں کل ہم نے اس کی عزت بچا کر اس کی مدد کی تھی۔ آج ہم اسے نگاہوں کے سامنے مدد کے لئے پکارتا نہیں دیکھ سکتے۔"

جعفر داراب چلایا۔ "تم سے کون دیکھنے کو کہتا ہے۔ بس اسے اٹھا کر اس پتھر تک لے آؤ۔ پھر منہ پھیر کر اور کانوں میں انگلیاں ٹھونس کر کھڑے رہنا........."

سلطان بولا۔ "نہیں آقا۔ ہم یہ ستم برداشت نہیں کر سکتے۔"

دفعتاً جعفر داراب کا چہرہ غصے کی زیادتی سے سیاہ پڑ گیا۔ وہ دانت پیس کر بولا۔ "تو اس کا مطلب ہے مجھے روکو گے۔ خوب۔ میرے وفادار غلام میری مزاحمت کریں گے .... بہت خوب۔ اسی وفاداری پر نازاں تھے تم لوگ یہی ہے اپنے آقا کے لیے تمہارا عزم جاں نثاری۔"

سلطان بولا۔ "نہیں آقا۔ ہم آپ کا ہاتھ نہیں روک سکتے اور نہ ہی آپ کی مزاحمت کا سوچ سکتے ہیں لیکن اگر آپ نے اس لڑکی کو قتل کر دیا .... تو ہم آپ کا ساتھ نہیں دے سکیں گے۔ آپ کو تنہا آگے جانا ہو گا۔"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے مت جاؤ میرے ساتھ' لیکن میں یہ رسم ضرور پوری کروں

گا۔" جعفر دھاڑا اور ماریتا کے پاس پہنچ کر اسے قربان گاہ کی طرف گھسیٹنے لگا۔ اس کا جسم غصے سے کانپ رہا تھا۔ اباقہ یورق اور سلطان جلال خاموش کھڑے تھے۔ چند گز آگے جا کر جعفر رک گیا اور ہانپتے ہوئے ان تینوں کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ کچھ سوچ رہا ہے اور اسے سوچنا ہی چاہیے تھا ان تینوں کے بغیر اگر وہ سفر جاری رکھنے کا ارادہ رکھتا تھا تو یہ اس کی بہت بڑی حماقت تھی۔ لڑکی کی قربانی اپنی جگہ۔ لیکن موجوں کا مقابلہ کرنے کے لیے توانا بازوؤں اور تجربہ کار نگاہوں کی ضرورت تھی۔ وہ دیر تک ان تینوں کو گھورتا رہا پھر ذرا ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

"اپنی ہٹ دھرمی سے تم میرے اور اپنے لیے بہت سے خطرات پیدا کر رہے ہو۔ تم یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ میرے جانے کے بعد تم کبھی اس جزیرے سے نکل نہیں سکو گے۔"

سلطان بولا۔ "ہم بھی اس جزیرے میں رہنا نہیں چاہتے۔ ہم آپ کے ساتھ جانا چاہتے ہیں آقا۔"

جعفر مجسمے کی طرف انگلی اٹھا کر بولا۔ "اس کا غضب ہم سب کو لے ڈوبے گا۔"

"ایسا کچھ نہیں ہو گا آقا۔" سلطان یقین سے بولا۔ "آپ دیکھیں گے ایسا کچھ نہیں ہو گا۔ سمندر ہمیں راستہ دے گا اور ہوائیں ہماری انگلی تھامیں گی۔"

جعفر نے ایک طویل سانس لی اور قہر آلود نظروں سے ان تینوں کو گھورتا ہوا بولا۔ "......... ٹھیک ہے چلو کشتی میں لیکن یاد رکھو اگر آگے جا کر سمندر کے تیور بدلے تو میں اس لڑکی کو بے دریغ لہروں کی بھینٹ چڑھا دوں گا۔"

سلطان نے متانت سے کہا۔ "آقا آپ اس بات پر بھروسہ رکھیں کہ اس رسم شکنی کے سبب کوئی طوفان ہمارا راستہ نہیں روکے گا۔"

جعفر داراب نے غصیلے پن سے کہا۔ "اس کا پتہ بھی چل جائے گا۔" اس کے ساتھ ہی وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ساحل کی طرف چل دیا۔ یورق' اباقہ اور سلطان نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور زیر لب مسکرا دیئے۔ جعفر داراب جیسے پُرہیبت انسان کی پشت پر مسکرانے کی جرأت وہ تینوں ہی کر سکتے تھے۔

☆------☆------☆

خلیج فارس درحقیقت بحیرہ عرب ہی کی ایک شاخ ہے جو سعودی عرب اور ایران کو جدا کرتی ہے۔ کویت' بحرین' ہرمز' قشم اس کے بڑے بڑے جزیرے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی اس خلیج میں لاتعداد جزیرے موجود ہیں۔ خلیج فارس کی لمبائی قریباً 500 میل اور رقبہ

90000 مربع میل ہے .... اس خلیج کے ایک دور افتادہ حصے میں ایک بادبانی کشتی لہروں پر سوار مغرب کی طرف محو سفر تھی۔ شام کا وقت تھا آسمان پر ہلکے ہلکے بادل چھائے ہوئے تھے۔ جعفر داراب کشتی کے اگلے حصے میں کھڑا قطب نما کے ذریعے سفر کا رخ متعین کر رہا تھا۔ یورق اور اباقہ تندہی سے چپو چلانے میں مصروف تھے۔ سلطان جلال ایک کونے میں نیم دراز تھا۔ اس نے بار بار اباقہ سے کہا تھا کہ وہ اسے چپو چلانے دے لیکن اباقہ اور یورق جانتے تھے کہ سلطان کا زخم پھر کھل گیا ہے۔ کشتی رانی کی مشقت زخم کو مزید خراب کر سکتی تھی۔ انہیں گمنام مجسّمے والے جزیرے سے رخصت ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔ دور مشرق کی طرف جزیرے کا ساحل ایک لکیر کی طرح ابھی تک دکھائی دے رہا تھا۔ پھر اندھیرا گہرا ہو گیا اور یہ لکیر بھی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

اس وقت اباقہ اور یورق چپو چھوڑ کر رات کا کھانا کھانے کی تیاری کر رہے تھے جب دفعتاً یورق نے ایک طرف انگلی اٹھائی اور منہ میں کچھ بڑبڑانے لگا۔ اباقہ نے دیکھا اس کی آنکھوں میں خوف چمک رہا ہے۔ اباقہ نے اس کی نظروں کا تعاقب کیا تو خود بھی ٹھٹک کر رہ گیا۔ جنوب مغرب کی طرف آسمان پر ایک گہری سیاہ چادر سی نظر آ رہی تھی۔ یہ چادر کہیں کہیں چمکنے والے ستاروں کو ہڑپ کرتی ہوئی تیزی سے ان کی طرف بڑھ رہی تھی۔

"سلطان! آندھی آ رہی ہے۔" اباقہ نے سراسیمہ لہجے میں کہا۔

سلطان نے فرش سے اٹھ کر آسمان کی طرف دیکھا۔ اب جعفر داراب بھی ان کے پاس آ کھڑا ہوا تھا۔ سب کی نظریں افق پر جمی تھیں۔ خوفناک سیاہ چادر کسی عفریت کی طرح ان کی طرف لپک رہی تھی۔

"دیکھ لیا اپنی ضد کا انجام!" جعفر داراب زہرناک لہجے میں بولا۔ "اب بھگتو سب۔"

وہ تینوں خاموش تھے۔ دفعتاً سلطان چیخا۔ "بادبان گراؤ .... بادبان گراؤ۔" اباقہ اور یورق بادبانوں کی طرف لپکے۔ اس سے پہلے کہ طوفانی جھکڑ بادبانوں سے ٹکراتے وہ دونوں انہیں گرانے میں کامیاب ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی ہولناک طوفان نے انہیں آلیا۔ منہ زور سمندری جھکڑوں نے پلک جھپکتے میں ہر شے کو تہہ و بالا کر دیا۔ کپڑے، سامان خورد و نوش سائبان، حجرے کے چوبی تختے سب کچھ ہوا میں اڑتا نظر آیا۔ اباقہ اچھل کر سردار یورق سے ٹکرایا اور دونوں ماریتا کے قریب زمین بوس ہو گئے۔ ایک چوبی صندوق اس کے سر سے ٹکرایا اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ اس وقت ماریتا کی چیخ اس کے کانوں میں گونجی اور اباقہ جیسے نیند سے بیدار ہو گیا۔ وہ جان چکا تھا کہ ایک

زبردست طوفان نے انہیں گھیر لیا ہے اور یہ کشتی کسی بھی وقت لہروں کا رزق بن سکتی ہے .... لیکن اس کشتی میں ماریتا تھی اور سلطان جلال بھی تھا۔ نہیں یہ کشتی نہیں ڈوب سکتی۔ اس کشتی میں تو اس کی پوری دنیا آباد تھی۔ "سردار یورق!" وہ حلق کی پوری قوت سے چیخا۔ "چپو سنبھالو۔"

لیکن سردار کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ اس نے ٹٹول کر دیکھا سردار یورق کو کوئی سنگین چوٹ آئی تھی اور وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ اباقہ گرتا پڑتا چپوؤں کی طرف لپکا۔ ماریتا کی چیخیں گاہے گاہے اس کے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ اس نے دیکھا جعفر داراب مستول سے لپٹا ہوا تھا اور طوفانی ہوا اسے سمندر میں پھینکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ سلطان جلال کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ اباقہ نے چپو تھامے اور پوری قوت سے کشتی کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگا۔ دفعتاً زوردار بارش شروع ہو گئی۔ بارش کی دبیز چادر نے ہر شے کو ڈھانپ لیا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ان کے اوپر تلے ہر طرف سمندر ہی سمندر ہے۔ بارش کے آغاز کے ساتھ ہی پانی تیزی سے کشتی میں بھرنا شروع ہو گیا تھا۔ مہیب لہریں بھی اچھل اچھل کر انہیں ڈبونے میں اپنا کردار ادا کر رہی تھیں۔ یہ چھوٹی سی کشتی کبھی لہروں کے دوش پر آسمان کی طرف اٹھتی محسوس ہوتی اور کبھی سمندر کی گہرائی میں اترنے لگتی۔ غضبناک سمندر اور کشتی کی غرقابی میں صرف اباقہ حائل تھا۔ تنہا اباقہ۔ اس کے فولادی بازو کشتی کا توازن برقرار رکھنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ اچانک اباقہ نے دیکھا کہ جعفر داراب قندیل تھامے لڑکھڑاتا ہوا ماریتا کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کے ارادے خطرناک نظر آتے تھے۔ بارش کی دبیز چادر میں اباقہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔ جعفر نے قندیل نیچے رکھی اور بکھرے ہوئے سامان میں کچھ ڈھونڈنے لگا۔ جلد ہی اباقہ کو اس کے ہاتھوں میں وزنی نیزہ دکھائی دیا .... وہ ماریتا کو مار کر سمندر میں پھینکنا چاہتا تھا۔

اباقہ کو کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا کرے۔ اگر وہ چپو چھوڑ کر ماریتا کی طرف لپکتا تو کشتی الٹنے میں کوئی کسر باقی نہ رہتی۔ دوسری صورت میں جعفر داراب اس کی جان سے کھیل جاتا۔ پھر اباقہ کو سلطان جلال کا خیال آیا۔ وہ کشتی میں کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا .... تو کیا سلطان جلال بھی اسے چھوڑ گیا۔ یکایک اباقہ کے بازو شل ہونے لگے۔ اسے لگا کہ کشتی ڈوبنے سے پہلے ہی اس کا دل سینے میں ڈوب گیا ہے۔ اس کی نظروں نے بے قراری سے بپھرے ہوئے سمندر کو دیکھا لیکن سلطان جلال کہیں نہیں تھا .... دفعتاً ایک ہاتھ نے عقب سے اباقہ کا کندھا تھپتھپایا۔

"شاباش نوجوان، ہمت نہیں ہارنا۔" یہ سلطان جلال کی آواز تھی۔ زندگی اور عزم

سے بھرپور۔ اباقہ نے چونک کر پیچھے دیکھا۔ سلطان جلال اس کے عقب میں کھڑا تھا۔ وہ سب کچھ سمجھ گیا۔ طوفان کے شروع میں کشتی کو جو زبردست جھٹکا لگا تھا۔ اس نے سلطان جلال کو سمندر میں اچھال دیا لیکن وہ کشتی کا کنارہ تھامے تیرتا رہا تھا اور اب اوپر چڑھ آیا تھا۔

"سلطان .... مارینا۔" اباقہ کے حلق سے گھٹی گھٹی آواز نکلی۔

سلطان دیکھ چکا تھا کہ جعفر داراب خطرناک ارادے سے مارینا کے سر پر کھڑا ہے۔ وہ وہیں سے پکار کر بولا۔ "آقا! کوئی جلد بازی نہیں کرنا۔ یہ کشتی اس طوفان سے نکلے گی اور ضرور نکلے گی۔ آپ نیزہ تھام کر ہمارے حوصلے پست نہ کریں اس لڑکی سے دور ہٹ جائیں اور ہمارے چپوؤں کی کاٹ دیکھیں۔"

اباقہ نے دیکھا کہ سلطان کی بات کا خاطر خواہ اثر ہوا ہے اور جعفر مارینا کے پاس سے چند قدم پیچھے ہٹ گیا ہے۔ سلطان نے اباقہ کے عقب میں بیٹھ کر چپو سنبھال لیے ایکا ایکی اباقہ کے شل بازو توانائی سے بھر گئے اور اس کا دل سینے میں پوری طاقت سے دھڑکنے لگا۔ وہ بے پناہ جوش کے ساتھ لہروں سے جنگ میں مصروف ہو گیا۔ سلطان جلال توقع سے بڑھ کر اس کا ساتھ دے رہا تھا یوں لگتا تھا اس کے بوڑھے بازو چپو نہیں چلا رہے خوارزم کے میدانوں میں تاتاریوں کے سر اڑا رہے ہیں۔ ایک بے پناہ قوت جو اس کے وجود میں پنہاں تھی آناً فاناً بپھرے ہوئے سمندر سے برسرپیکار ہو گئی تھی۔

.... اور پھر مشکل ترین وقت گزر گیا۔ طوفان کا زور کم ہونے لگا۔ اس موقعے پر جیسے جعفر داراب کو ہوش آئی۔ اس نے مارینا کی بندشیں کھولیں اور اس کے ساتھ مل کر کشتی سے پانی نکالنے میں مصروف ہو گیا۔ وہ دونوں ڈول بھر بھر کر پانی باہر پھینکتے رہے اور اباقہ اور سلطان جان لڑا کر چپو چلاتے رہے۔ دھیرے دھیرے لہروں کا ہیجان کم ہونے لگا اور بارش کی تند بوچھاڑیں مسلسل پھوار میں تبدیل ہو گئیں .... جس وقت سلطان جلال چپو چلاتے چلاتے تیورا کر گرا اور مارینا نے اس کی پشت خون سے تر بتر دیکھ کر چیخ ماری' طوفان گزر چکا تھا اور بادلوں سے اکا دکا تارے جھانک رہے تھے۔

☆ ---- ☆ ---- ☆

کشتی تو طوفان سے نکل آئی تھی لیکن سلطان کی زندگی ایک بار پھر لہروں میں گھر گئی تھی۔ اس کی پشت پر کندھوں کے درمیان جو زخم تھا وہ پھر کھل گیا تھا۔ بخیے ٹوٹ گئے تھے اور خون نہایت تیزی سے بہہ رہا تھا۔ دوسری طرف سردار یورق کے سر پر گہری چوٹ آئی تھی لیکن وہ اب ہوش میں آ چکا تھا اور اس کی حالت تسلی بخش تھی۔ اباقہ اور یورق نے

مل کر سلطان کا خون روکنے کی کوشش کی بعدازاں اس پر روئی کے پھاہے رکھ کر پٹی باندھ دی گئی۔ سلطان جلال کی آنکھیں بند تھیں اور اسے سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی۔ مارینا کشتی کے ایک کونے میں بیٹھی یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ دور مشرق سے سپیدہ سحر نمودار ہو رہا تھا۔ باد صبا نے کشتی کے بادبان' مہربان ہوا سے بھر دیئے تھے اور وہ جو طوفان کے بعد کچھ دیر کے لیے راستے سے بھٹک گئے تھے اب پھر درست سمت میں رواں تھے۔ جعفر داراب کا ریشمی پردوں والا حجرہ تو برباد ہو چکا تھا اب وہ بھی ان کی طرح کھلے آسمان تلے بیٹھ گیا تھا۔ قطب نما اس کے ہاتھ میں تھا اور وہ ٹیک لگائے اونگھ رہا تھا .... مارینا کی نگاہیں ایک بار پھر سطح سمندر پر جم گئیں۔ وہ بڑی دیر سے سوچ رہی تھی اگر وہ خاموشی سے چھلانگ لگا دے تو شاید اباقہ اور یورق کو پتہ بھی نہ چل سکے۔ پھر جب تک وہ اس کی غیر موجودگی محسوس کریں گے وہ اپنے دکھوں سے چھٹکارا پا کر سمندر کی اتھاہ گہرائیوں میں اتر چکی ہو گی یا اس کا جسم کسی مچھلی کا رزق بن چکا ہو گا لیکن جب وہ یہ سوچ رہی تھی اس نگاہوں میں سلطان جلال کا نورانی چہرہ گھوم گیا۔ اسے وہ وقت یاد آیا جب طوفان اپنی انتہا پر تھا اور جعفر داراب نیزہ تھامے اس کے سر پر کھڑا تھا۔ مارینا نے سمجھ لیا تھا کہ اس کا آخری وقت آ گیا ہے مگر پھر سلطان جلال کی آواز آئی تھی اس نے جعفر داراب سے تھوڑی دیر کی مہلت مانگی تھی اور اباقہ کے ساتھ مل کر پوری تندہی سے چپو چلانے میں مصروف ہو گیا تھا۔ ان دونوں کی کوششیں رنگ لائی تھیں اور کشتی طوفان کا سامنا کرنے میں کامیاب رہی تھی۔

مارینا نے سوچا اس کی زندگی بچانے کے لیے سلطان نے اپنی زندگی داؤ پر لگا دی تھی اور اب وہ چند گز کے فاصلے پر اپنے ہی خون میں تر بتر پڑا تھا۔ جب ہوش میں آ کر اسے معلوم ہو گا کہ مارینا نے خودکشی کر لی تو اس کے دل پر کیا گزرے گی .... دل نے ذہن کو غالب ہوتے دیکھا تو پکار کر کہا۔ "مارینا! سلطان جلال کو کیا پتہ زندگی تمہارے لیے کتنی دشوار ہو چکی ہے۔ یہ صرف تم جانتی ہو یا تمہارا دل۔ ختم کر ڈالو اس حسرت بھری زندگی کو۔ اس سے بہتر موقعہ تمہیں پھر نہیں ملے گا۔ تمہارے ہاتھ پاؤں آزاد ہیں تم پر کوئی پہرہ نہیں' سمندر کی آغوش وا ہے۔ اباقہ کو تمہاری لاش پر آنسو بہانے کا دکھ بھی نہ جھیلنا پڑے گا ...."

خشک موسم میں بھی مارینا کی پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہو رہے تھے۔ وہ کبھی سلطان جلال اور اباقہ کی طرف دیکھتی اور کبھی چور نظروں سے سمندر کی طرف۔ اچانک ایک آواز نے اسے چونکا دیا۔ وہ سوچ کے جان لیوا بھنور سے باہر نکل آئی۔ اباقہ اسے بلا

رہا تھا۔ مارینا اپنی جگہ بیٹھی رہی۔ اباقہ نے ایک بار پھر کہا۔

"مارینا' سلطان تم سے بات کرنا چاہتے ہیں۔"

سلطان کا نام سن کر مارینا جیسے خود بخود کھڑی ہو گئی۔ بادبانوں کے رسے تھامتی وہ سلطان جلال کے پاس چلی آئی۔ مجاہد اسلام فخر خوارزم سلطان جلال لکڑی کے گیلے فرش پر ایک کروٹ پر لیٹا تھا۔ جگہ جگہ اس کے خون کے دھبے نظر آرہے تھے۔ اس کی آنکھیں نیم وا تھیں۔ تکیے کے طور پر سر کے نیچے ایک کپڑا رکھا تھا۔ اس نے پتلیاں گھما کر مارینا کو دیکھا اور ہاتھ سے اپنے قریب بیٹھنے کا اشارہ کیا اور اباقہ اور یورق اس کے پاس سے اٹھ کر پرے چلے گئے۔ سلطان جلال نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور مارینا کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ مارینا نے ایک جھرجھری لی اور اس کے سارے جسم میں ایک عجیب سنسناہٹ دوڑ گئی۔ اسے لگا جیسے قوت توانائی اور حوصلے کی غیر مرئی لہریں اس کے رگ و پے میں سرایت کرتی جارہی ہیں۔ سلطان جلال کی داڑھی جس میں چاندی کے تار چمک رہے تھے دھیرے سے ہلی اور اس کے ہونٹوں نے کہا۔

"بیٹی!" مارینا یکبارگی آگے کو جھک گئی۔ سلطان جلال نے کہا۔ "بیٹی' زندگی جیسی بھی ہو .... خدا کا انعام ہے۔ اس کو ٹھکراتے نہیں۔ خوشیاں وقتی ہوتی ہیں تو مصائب بھی ابدی نہیں ہوتے .... رات کتنی بھی تاریک ہو سویرا ضرور ہوتا ہے۔ وہ دیکھو .... مشرق سے سورج طلوع ہونے والا ہے۔ رات کے طوفان میں جن ملاحوں نے سپر ڈال دی اور جن مسافروں نے ہمت ہار دی یہ سورج ان کے لیے نہیں ہے۔ یہ ہمارے اور تمہارے لیے ہے .... میری بات سمجھ رہی ہو نا۔"

مارینا نے سر جھکایا۔ اس کے گیلے بالوں کی لٹیں آگے کو جھک آئیں۔ اس کی آنکھوں میں نمی تیر گئی اور اس نے ہولے سے سر ہلا دیا۔ اسے یوں لگ رہا تھا سلطان اس کی دلی کیفیت سے آگاہ ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس کے اندر موت اور زندگی کی کشمکش جاری ہے۔ وہ جیسے براہ راست اس کے دل میں جھانک رہا تھا' سلطان جلال نے اس کا ہاتھ اپنی نرم گرفت میں لے لیا اور الوہی لہجے میں نورانی باتیں کرنے لگا.......... دھیرے دھیرے مارینا کے ذہن پر چھائی ہوئی دھند چھٹنے لگی۔ اس کے سینے میں "آسانیوں" کی دھوپ طلوع ہوئی' جس نے اس کے ذہن پر جمی ہوئی "مشکلوں" کی برف پگھلا دی۔ اس کی آنکھوں سے تسلیم و رضا کے چشمے بہہ نکلے۔ کچھ دیر بعد جب وہ سلطان جلال کے پاس سے اٹھی تو ایک ایسے پھول کی مانند نظر آرہی تھی جس کی گرد آلود پنکھڑیوں کو ساون کی نرم پھوار نے دھو کر نکھار دیا ہو۔ اس کی آنکھوں میں زندگی کی چمک تھی اور اس چمک میں جینے کا حوصلہ

تھا اور اس حوصلے میں مضبوط ارادہ تھا' مصائب اور حوادث سے ٹکرانے کا۔

اس روز دوپہر تک اباقہ اور یورق کشتی کی بگڑی ہوئی حالت درست کرتے رہے۔ مارینا نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ جعفر داراب کا رویہ بھی ان سے قدرے بہتر تھا۔ وہ دیکھ چکا تھا کہ اس کے ملاح طوفانوں سے ٹکرانے کا اور کشتی کو بھنور سے نکالنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ انسانی جان کی قربانی دیئے بغیر وہ بھی کامیابی سے منزل کی طرف گامزن تھے۔ یہ بھی قدرت کی مہربانی تھی کہ اتنے سخت طوفان اور تاریکی کے باوجود وہ اپنے راستے سے نہیں بھٹکے تھے۔ اس کے علاوہ ان کا سامان خورد و نوش بھی محفوظ رہا تھا۔ یہ سامان نذر طوفان ہو جاتا تو نہ جانے ان پر کیا بیتتی۔

اگلے چار پانچ روز انہوں نے جنوب مغرب کی سمت سفر جاری رکھا۔ اس عرصے میں اس کے سوا اور کوئی خاص بات نہیں ہوئی کہ ایک مقام پر چند بڑی مچھلیوں نے ان کی کشتی کو گھیر لیا۔ اس مصیبت سے بچنے کے لیے انہوں نے پہلے سے انتظام کر رکھا تھا۔ راستے میں وہ وقتاً فوقتاً مچھلی کا شکار کرتے رہے تھے۔ فالتو گوشت انہوں نے ایک کونے میں سنبھال چھوڑا تھا۔ جب بڑی مچھلیاں حملہ آور ہوئیں تو انہوں نے گوشت کے یہ ٹکڑے سمندر میں پھینک دیے۔ مچھلیوں کو مصروف کرکے وہ نکل جانا چاہتے تھے لیکن ایک مچھلی نے پھر بھی تعاقب کیا۔ تقریباً چھ سات فرسخ تک یہ مچھلی ان کے ساتھ رہی۔ اباقہ اور یورق نے لمبے نیزوں کی مدد سے مچھلی کو کشتی سے دور رکھا۔ آخر وہ اس مصیبت سے جان چھڑانے میں کامیاب رہے۔

ان چار دنوں میں مارینا کے رویے میں بھی مثبت تبدیلی آئی تھی۔ وہ نہ صرف اباقہ اور یورق کا ہاتھ بٹاتی تھی بلکہ سلطان جلال کی تیمارداری کی تمام ذمے داری بھی اسی نے لے رکھی تھی۔ بہر حال اباقہ اور یورق کے ساتھ وہ بہت کم بات کرتی تھی۔ اباقہ بہت کوشش کر رہا تھا کہ کسی طرح اس سے تنہائی میں بات کرنے کا موقع ملے لیکن ابھی تک کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ اس رات ہوا موافق تھی اور اباقہ نے سردار یورق کو آرام کرنے کا موقع دیا۔ یورق چپو چھوڑ کر سونے کے لیے لیٹ گیا۔ جعفر داراب دیر ہوئی سو چکا تھا۔ بے ہوش پڑا تھا۔ شام کھانے کے بعد اس نے بہت زیادہ چڑھالی تھی۔ اب وہ ہاتھ پاؤں پھیلائے کشتی کے عقبی حصے میں چت پڑا تھا۔ سلطان جلال پشت کے زخم کی وجہ سے اس کروٹ لیٹا تھا کہ اباقہ کی طرف دیکھ نہیں سکتا تھا۔ ممکن تھا وہ بھی سو رہا ہو۔ مارینا اباقہ کے قریب ہی نیم دراز تھی۔ تیسرے عشرے کا چاند کشتی پر اپنی نرم کرنیں بکھیر رہا تھا۔ اباقہ کا دل چاہا کہ وہ مارینا سے چند باتیں کرے۔ اس نے چپو کشتی میں کھینچ لیے اور دھیرے سے

اٹھ کر مارینا کی طرف بڑھنا چاہا' لیکن اس وقت وہ ایک چیز دیکھ کر چونک گیا۔ سمندر میں تھوڑے فاصلے پر ایک بڑا سیاہ دھبہ نظر آرہا تھا۔ اباقہ غور سے دیکھنے لگا۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ کوئی بلند عمارت ہو۔ اس سنسان سمندر میں پانی پر عمارت کیا معنی رکھتی تھی۔ اباقہ نے سوچا یہ یقیناً اس کی نظر کا دھوکہ ہے۔ تھوڑی دیر میں کشتی تیزی سے تیرتی ہوئی عمارت نما شے کے قریب پہنچ گئی۔ دفعتاً چاند جو کچھ دیر کے لیے بادلوں میں چھپ گیا تھا دوبارہ نکل آیا۔ اس کی کرنیں اس شے پر منعکس ہوئیں اور اباقہ کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہ سیاہ دھبہ کوئی عمارت نہیں تھی اور نہ ہی وہ کوئی جہاز تھا۔ وہ ایک بہت بڑی مچھلی تھی۔ اس کی سیاہ جلد چاندنی میں چمک رہی تھی اور بڑی بڑی سرخ آنکھیں کشتی پر مرکوز تھیں۔ اباقہ سکتے کے عالم میں اس دیوہیکل مخلوق کی طرف دیکھے جارہا تھا۔ ان کی کشتی کا بلند ترین بادبان بھی اس مچھلی کے بالائی جبڑے سے کوئی دو ہاتھ نیچے تھا۔ اباقہ کو لگا کہ جیسے اس مچھلی نے منہ کھول کر سانس بھی لی تو ان کی کشتی اڑتی ہوئی اس کے حلق میں پہنچ جائے گی۔ چپو اباقہ کے ہاتھ سے چھوٹ کر پانی میں گر چکے تھے اور اس کا ہاتھ کمر پر اپنی تلوار تلاش کر رہا تھا۔ تلوار کمر پر نہیں تھی اگر ہوتی بھی تو اس کیا فائدہ تھا.......... کشتی مخصوص رفتار سے مچھلی کی طرف بڑھتی چلی جارہی تھی اور لگتا تھا کہ کسی بھی لمحے اس سے ٹکرائے گی۔ مچھلی بالکل بے حس و حرکت تھی۔ اباقہ نے سوچا شاید وہ سو رہی ہے۔ اس نے سن رکھا تھا کہ مچھلیوں کے پپوٹے نہیں ہوتے اور وہ کھلی آنکھوں سے سوتی ہیں۔

حیرت اور خوف کے پہلے شدید حملے کے بعد اباقہ ہوش میں آیا اور اس نے چیخ کر سردار یورق اور جعفر داراب کو پکارا۔ سردار یورق تو فوراً اٹھ گیا' لیکن جعفر داراب جو نشے میں چُور تھا بے حس و حرکت پڑا رہا۔ سردار یورق نے جب چند گز کے فاصلے پر ایک تاریک پہاڑ دیکھا تو اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ یہی حال مارینا کا ہوا تھا۔ وہ دوڑی اور اباقہ کی پشت سے لپٹ گئی۔ یورق نے تیزی سے بادبانوں کے رسے کھینچ کر کشتی کا رخ موڑنا چاہا' لیکن یہ کوشش اب بے سود تھی۔ اس کوہ گراں سے بچ کر نکل جانا ناممکن تھا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے ان کی کشتی مچھلی سے ٹکرائی اور سردار یورق جو رسیوں سے الجھ رہا تھا لڑھک کر سلطان جلال کے قریب جا گرا۔ سلطان جلال بھی بیدار ہو گیا تھا اور ساکت نظروں سے یہ ناقابل یقین منظر دیکھ رہا تھا۔ یہ تو ظاہر تھا کہ کشتی ٹکرانے کے بعد مچھلی حرکت ضرور کرے گی' اگر وہ سو بھی رہی تھی تو جاگ جائے گی۔ یہی وجہ تھی کہ جونہی کشتی اس کے جسم سے ٹکرائی اباقہ نے ایک طویل نیزہ اٹھایا اور پیچھے ہٹ کر مچھلی کی آنکھ کا نشانہ لے لیا.......... لیکن پھر اس سے پہلے کہ وہ نیزہ ہوا میں پھینکتا' یک لخت اس کا ہاتھ رک گیا۔ وہ یک ٹک مچھلی کے نچلے جبڑے کی طرف دیکھنے لگا۔ دائیں جانب سے سیڑھیوں کی ایک قطار پانی تک پہنچ رہی تھی اور اس لمحے نہ صرف اباقہ بلکہ سلطان اور یورق پر بھی یہ انکشاف ہوا کہ ان کے سامنے جو تاریک ہیولا ہے وہ کسی زندہ مچھلی کا نہیں۔ اس وقت اباقہ کو ایک اور چیز دکھائی دی جو اس سے پہلے اس نے نہیں دیکھی تھی۔ مچھلی کے دائیں پہلو کے قریب تین چار اور چھوٹی چھوٹی کشتیاں کھڑی تھیں۔ چاند طلوع ہوتے ہی اردگرد کا منظر بھی صاف نظر آنے لگا تھا۔ انہیں شمالاً جنوباً ایک سیاہ لکیر پھیلی نظر آرہی تھی۔ یقیناً یہ کسی جزیرے کا ساحل تھا پھر انہوں نے دیکھا کہ مچھلی کی ایک آنکھ پر نظر آنے والی سرخی خلا میں بدل گئی۔ وہاں ایک مشعل کی روشنی نظر آئی اور انہوں نے چند چہرے اپنے اوپر جھکے ہوئے دیکھے۔ تھوڑی دیر بعد مچھلی کے ادھ کھلے جبڑے میں بھی مشعلوں کی روشنی نظر آنے لگی۔ انہوں نے دیکھا کہ لمبے چغے پہنے ہوئے طویل داڑھیوں والے کچھ افراد سیڑھیاں اتر کر ان کی طرف بڑھنے لگے۔ چند کے ہاتھ میں مشعلیں تھیں اور کچھ تلواریں' بھالے لیے ہوئے تھے۔ اچانک مچھلی کے جبڑے سے ایک کرخت آواز سنائی دی۔ کوئی شخص فارسی میں ان سے مخاطب تھا۔ وہ انہیں حکم دے رہا تھا کہ کشتی کو سیڑھیوں کے قریب لے جائیں۔ اباقہ نے مچھلی کے نوکیلے دانتوں کے درمیان تیروں اور نیزوں کی چمکتی ہوئی انیاں دیکھیں اور سمجھ گیا کہ جبڑے میں کھڑے افراد نے کشتی کو نشانے پر لے رکھا ہے۔ اس نے سردار یورق کی طرف دیکھ کر سر ہلایا اور وہ دونوں چپو چلاتے ہوئے کشتی کو سیڑھیوں کے قریب لے گئے۔ یہ کافی چوڑی سیڑھیاں تھیں۔ ایک سیڑھی پر چھ سات افراد کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے ہو سکتے تھے۔ جونہی کشتی سیڑھیوں کے قریب پہنچی چغہ پوش افراد پھرتی سے چھلانگیں لگا کر کشتی پر کود گئے۔ آتے ساتھ ہی انہوں نے اباقہ اور یورق کو غیر مسلح کر کے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ مارینا ابھی تک اباقہ کے بازو سے چمٹی ہوئی تھی۔ چند افراد اسے کھینچتے ہوئے دور لے گئے۔

"کون ہو تم لوگ اور کہاں سے آئے ہو؟" ایک کھچڑی داڑھی والے شخص نے کرخت لہجے میں پوچھا۔ اس کی لمبی مونچھیں دونوں طرف ٹھوڑی پر لٹک رہی تھیں۔ کشتی پر کودنے والے زیادہ تر افراد کا حلیہ یہی تھا۔ اباقہ نے سلطان جلال کی طرف دیکھا۔ وہ اپنی جگہ پر لیٹے لیٹے نحیف آواز میں بولا۔

"صاحبو! ہم تو اس کشتی کے ملاح ہیں۔ تمہارے سوال کا جواب ہمارے آقا دیں گے۔"

کشتی پر کودنے والوں کی نگاہ اس سے پہلے سلطان جلال پر نہیں پڑی تھی۔ کھچڑی

داڑھی والا گرج کر بولا۔ "یہ کون ہے اور وہاں لیٹا کیا کر رہا ہے؟"

اباقہ نے زبان کھولتے ہوئے کہا۔ "یہ بیمار ہیں۔ اٹھ نہیں سکتے۔"

وہ شخص تحکمانہ لہجے میں اپنے ماتحتوں سے بولا۔ "اٹھاؤ اس بیمار کو اور تلاشی لو اس کی۔"

دو افراد تیزی سے سلطان جلال کی طرف بڑھے۔ اباقہ نے تنبیہ کرتے ہوئے کہا۔ "میں تمہیں بتا چکا ہوں یہ زخمی ہیں' اٹھ نہیں سکتے۔"

سلطان کی طرف بڑھنے والے افراد نے اباقہ کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے سلطان جلال کو کندھوں سے تھاما اور بے رحمی سے اٹھانے کی کوشش کرنے لگے۔ سلطان کے منہ سے ایک کراہ نکل گئی۔ یہ کراہ اباقہ کے تن بدن میں آگ بھڑکانے کے لیے کافی تھی۔ نتائج سے بے پرواہ ہو کر اس نے اپنے جسم کو جھٹکا دیا۔ اس کے بازو تھامنے والے دونوں افراد لڑکھڑا کر ایک دوسرے سے ٹکرائے اور ان کی گرفت ختم ہو گئی۔ اباقہ نے چھلانگ لگائی اور اڑتا ہوا اس شخص کی طرف گیا جو سلطان کا بازو کھینچ رہا تھا۔ سر کی بھرپور ٹکر اس شخص کے چہرے پر لگی اور وہ چیخ کر دوسری طرف الٹ گیا۔ اباقہ نے کشتی کے فرش کو چھونے سے پہلے دوسرا وار کیا۔ اس کی بھرپور ٹانگ دوسرے شخص کے پیٹ پر پڑی۔ یہ ضرب اتنی زوردار تھی کہ وہ شخص اچھل کر پانی میں جا گرا۔ یہ سب کچھ چند ساعتوں کے اندر اندر ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ لمبے چغے والے صورت حال سمجھ کر تلواریں سونتتے اور نیچے گرے ہوئے اباقہ پر حملہ آور ہوتے' یورق نے ایک شخص کے ہاتھ سے تلوار چھینی اور نعرہ لگا کر ان پر حملہ آور ہو گیا۔ اباقہ کے لیے اتنا وقت بہت تھا۔ اس نے ایک بار پھر چھلانگ لگائی اور اس وزنی نیزے پر گرا جو جعفر داراب نے پرانے کپڑوں کے نیچے چھپا کر رکھا ہوا تھا۔ اباقہ نے نیزہ اٹھایا اور خوفناک انداز میں کھڑا ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں قاتل چمک لہرا رہی تھی' وہ ہر قسم کے نتائج سے بے پرواہ ہو چکا تھا۔ یورق کے تابڑ توڑ حملوں سے کشتی بری طرح ڈول رہی تھی اور لگتا تھا کسی بھی لمحے الٹ جائے گی۔ تین آدمی مختلف چیزوں کو تھام تھام کر اباقہ کی طرف بڑھ رہے تھے .... پھر اس سے پہلے کہ اباقہ کا نیزہ خون ریزی کا آغاز کرتا اچانک ایک آواز نے سب کو چونکا دیا۔ یہ جعفر داراب کی آواز تھی۔ شور محشر سے آخر مردہ جاگ اٹھا تھا۔ چیخ و پکار اور کشتی کو لگنے والے زبردست ہچکولوں نے جعفر کو مدہوشی کی نیند سے بیدار کر دیا تھا۔ وہ چلا کر بولا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے۔ ٹھہرو......... میری بات سنو۔"

اباقہ کی طرف بڑھنے والے حملہ آوروں نے مڑ کر دیکھا۔ ان میں کھچڑی داڑھی والا شخص بھی تھا۔ جعفر داراب کے چہرے پر نظر پڑتے ہی اس کی آنکھوں میں حیرت کے آثار نظر آئے۔ "آپ؟" اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"ہاں یہ میں ہی ہوں عمرو۔ یہ اچھا استقبال ہو رہا ہے ہمارا۔"

کھچڑی ڈاڑھی والا جس کا نام جعفر نے عمرو لیا تھا' یورق کے ساتھ لڑنے والوں پر چیخا۔ "رک جاؤ۔"

لڑنے والوں نے چونکہ یورق کو گھیر لیا تھا اس لیے اس حکم پر انہیں خاصی کوفت ہوئی۔ ایک شخص نے رکتے رکتے بھی یورق کے بازو پر وار کرنا چاہا۔ یورق بھی کب چوکنے والا تھا اس نے بھی تلوار حملہ آور کے آہنی خود پر دے ماری۔

"رک جاؤ۔" عمرو پھر چلایا۔

دونوں طرف سے جنگ بندی ہو گئی۔ عمرو نامی اس شخص نے آگے بڑھ کر گرمجوشی سے جعفر داراب کو خوش آمدید کہا۔ پھر وہ اباقہ اور یورق وغیرہ کی طرف مڑ کر بولا۔ "مجھے افسوس ہے غلط فہمی کی وجہ سے آپ کو ہماری تلواروں کا سامنا کرنا پڑا۔" پھر وہ جعفر داراب سے بولا۔ "آقا! شاید آپ سو رہے تھے' لیکن ان ملاحوں نے آپ کو جگایا کیوں نہیں۔"

"وہ .... دراصل میرے سونے کے بعد ہوا کچھ تیز ہو گئی تھی اس لیے سفر جلدی طے ہو گیا۔ یہ لوگ سمجھ نہیں سکے کہ ہم منزل پر پہنچ چکے ہیں۔ خیر کوئی بات نہیں۔ آئندہ یہ ایسی غلطی نہیں کریں گے۔"

اس فقرے پر عمرو ایک مکروہ ہنسی ہنس دیا۔ اباقہ سلطان اور یورق اس ہنسی کا مطلب اچھی طرح سمجھ رہے تھے۔ جعفر کے کہنے کا مقصد تھا کہ آئندہ یہ ہوں گے ہی نہیں تو بھول کیسے کریں گے۔

عمرو کے حکم پر ان کا مال اسباب کشتی سے نکال لیا گیا۔ اس سامان میں دو بڑے چوبی صندوق بھی تھے ان کے اندر کیا تھا یہ جعفر کے سوا کسی کو معلوم نہیں تھا۔ عمرو کی ہدایت پر سلطان جلال کو بڑی احتیاط سے ایک پالکی نما بستر پر سوار کیا گیا۔ سیڑھیاں چڑھ کر وہ مچھلی کے منہ میں پہنچے۔ مشعلوں کی روشنی میں اندر کا منظر روشن تھا۔ یہاں پہنچ کر انہیں ایک بار پھر ذہنی دھچکا لگا۔ مچھلی مصنوعی نہیں اصلی تھی' لیکن اسے اس جہانِ فانی سے گزرے مدت ہو چکی تھی۔ اب صرف اس کا ڈھانچہ باقی رہ گیا تھا۔ اس دیوہیکل ڈھانچے پر مصنوعی کھال یا چمڑا اس طرح منڈھ دیا گیا تھا کہ باہر سے زندہ مچھلی نظر آتی تھی۔ اس مچھلی کا

سرنگ نما پیٹ اتنا فراخ تھا کہ ایک نگران چوکی آسانی سے اس میں سما گئی تھی۔ اگر اباقہ سلطان اور یورق اپنی آنکھوں سے اس مچھلی کو نہ دیکھتے اور کسی کی زبانی اس کی جسامت کا سنتے تو کبھی یقین نہ کرتے۔ مچھلی کی آنکھوں کے مقام پر اندر کی طرف دو چھوٹی بالکونیاں تھیں۔ جہاں دو دو محافظ چوکس بیٹھے تھے۔ کھوپڑی کی ہڈی سے دو بڑی قندیلیں لٹک رہی تھی۔ ان قندیلوں کی روشنی آنکھوں میں لگے ہوئے سرخ شیشوں کو روشن رکھتی تھی۔ سرخ شیشوں کے درمیان پتلیوں کے مقام پر دو چھوٹے چھوٹے روزن تھے غالباً ان روزنوں کے ذریعے ہی ان کی آمد کا پتہ چلایا گیا تھا۔ مچھلی کی دمچی کی طرف ایک دروازہ نظر آرہا تھا' جو جزیرے کی اس عجیب و غریب کھاڑی کا اندرونی دروازہ تھا۔ وہاں ایک سیاہ پوش نیزہ لیے چوکس کھڑا تھا۔

دروازے سے نکل کر انہوں نے اس پُراسرار جزیرے کی زمین پر پہلا قدم رکھا۔ چالیس پچاس گز چلنے کے بعد وہ ایسی جگہ پہنچے جہاں نشیب میں دور دور تک صاف دکھائی دے رہا تھا۔ وہ چاروں حیرت مجسم بن کر رہ گئے۔ چاند کی روشنی میں انہیں اپنے سامنے درختوں سے گھرا ایک خوبصورت شہر نظر آرہا تھا۔ روشن اور نیم تاریک کھڑکیاں' گنبد مینارے .... یوں لگتا تھا جیسے وہ اپنے سامنے ایک چھوٹا "شیراز" دیکھ رہے ہیں۔

☆------☆------☆

انہیں عجیب و غریب جزیرے اور جزیرے کے عجیب وغیریب لوگوں میں رہتے ہوئے چوتھا یا پانچواں دن تھا جب انہیں اندازہ ہوا کہ یہاں کسی زبردست جشن کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ وہ شہر کے ایک کم آباد علاقے کے کشادہ مکان میں رہ رہے تھے۔ جعفر داراب کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ ہاں اگر وہ ماریتا کو اپنے ساتھ لے جاتا تو بات اور تھی۔ جزیرے پر آمد کے روز اس نے کہا تھا کہ ماریتا اس کے ساتھ جائے گی لیکن سلطان جلال آڑے آیا تھا۔ اس جعفر داراب راضی ہو گیا تھا۔ ظاہر ہے واپسی کے سفر میں وہ کسی طرح کی بدمزگی نہیں چاہتا تھا۔

سلطان جلال الدین' اباقہ' ماریتا اور یورق ایک ہی جگہ رہ رہے تھے۔ ماریتا دن بھر سلطان جلال کی تیمارداری اور امور خانہ داری میں مصروف رہتی تھی۔ صرف ایک روز اباقہ کو اس سے بات کرنے کا موقع ملا تھا اور اسے اندازہ ہوا تھا کہ ماریتا اس سے ناراض نہیں .... ہاں "کالی وادی" میں ایک روز اس کے انداز میں جو والہانہ پن نظر آیا تھا۔ اس کا اب کہیں پتہ نہیں تھا۔ اس سے پہلے کہ اباقہ اس سے اس تبدیلی کے بارے پوچھتا' دوسرے کمرے سے سلطان جلال نے اسے آواز دی تھی اور ماریتا کے چہرے سے یوں ل

تھا جیسے ایک بڑی مصیبت سے اس کی جان بچ گئی ہو۔ وہ جلدی سے اٹھ کر سلطان جلال کے پاس چلی گئی تھی۔

حالانکہ جعفر داراب نے انہیں باہر گھومنے پھرنے سے منع کر رکھا تھا پھر بھی اباقہ اور سردار یورق روز ایک آدھ چکر باہر کا لگا آتے تھے اور انہی چکروں سے وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ ماہ زمستاں کی پہلی رات کو جزیرے پر ایک زبردست جشن برپا ہو رہا ہے۔ اباقہ نے سلطان جلال سے بھی اس جشن کا ذکر کیا تھا۔ سلطان جلال نے کہا تھا انہیں اس جشن میں ضرور شرکت کرنی چاہئے بلکہ اگر وہ چاہیں تو ماریتا کو بھی ساتھ لے جائیں۔ اس کی تفریح ہو جائے گی۔ سلطان جلال نے کہا تھا۔ "ہو سکتا ہے وہ ملعون فیروز الدین بھی اس جشن میں شریک ہو۔ اگر تم اس کی صورت نہ بھی دیکھ سکے تو تمہیں اس کے بارے میں اہم معلومات ضرور حاصل ہو سکیں گی۔"

اباقہ اور یورق بے چینی سے جشن کی رات کا انتظار کر رہے تھے۔ خاص طور پر اباقہ تو بہت خوش تھا۔ ماریتا ان کے ساتھ جا رہی تھی۔ یورق کے سوا ان کے درمیان اور کوئی نہیں ہو گا اور یورق کی کوئی بات ہی نہیں تھی۔ وہ جشن کا انتظار ہی شراب نوشی کے لیے کر رہا تھا۔ اسے معلوم ہوا تھا کہ اس جشن میں شراب پانی کی طرح بہائی جاتی ہے۔ ایک عرصے بعد یورق کے لیے یہ سنہری موقع فراہم ہو رہا تھا۔ اس کا ہوش میں رہنا بعید از قیاس تھا۔ اس کا مطلب تھا جشن کی شام ماریتا اور اباقہ اجنبی لوگوں کے ہجوم میں تنہا ہوں گے۔

لیکن جب جشن کی شام ہوئی تو اباقہ کی امیدوں پر اوس پڑ گئی ماریتا نے جشن میں جانے سے انکار کر دیا۔ شاید اس کا خیال تھا کہ سلطان کو تنہا چھوڑنا ٹھیک نہیں' لیکن اباقہ اس وقت سلطان پر آفرین بھیجے بغیر نہ رہ سکا جب اس نے ماریتا کو اپنی طرف سے ہر طرح مطمئن کر دیا اور بااصرار اسے اباقہ اور یورق کے ساتھ بھیجا۔

جزیرے کی روایت کے مطابق ان تینوں نے اپنے بہترین لباس پہنے۔ نہ چاہنے کے باوجود ماریتا کو معمولی سنگھار کرنا پڑا۔ اس تھوڑے سنگھار نے بھی اسے قیامت بنا دیا۔ پھر وہ گھر سے باہر نکلے اور لوگوں کے خوش باش ہجوم میں داخل ہو گئے۔ جزیرے پر جیسے رنگ اور روشنی کا سیلاب امڈ آیا تھا خاص طور پر نوجوان مرد اور عورتیں بیحد بنے سنورے تھے۔ ممتاز اور فاخرہ لباس پہنے پانچ پانچ دس دس افراد کی ٹولیاں جزیرے کے مرکز کی طرف رواں تھیں۔ آنچل لہرا رہے تھے۔ قہقہے بکھر رہے تھے۔ جب ماریتا کو اباقہ نے بتایا کہ یہ لوگ "حج" کرنے جا رہے ہیں تو وہ حیران رہ گئی۔ اباقہ اور یورق تو اس لفظ سے ناآشنا تھے لیکن ماریتا تھوڑا بہت جانتی تھی۔ اسے معلوم تھا یہ لفظ مسلمانوں کے ایک ایسے

مقدس فریضے کے لیے مخصوص ہے جس کی پاکیزگی اور عظمت ساری دنیا میں تسلیم کی جاتی ہے یہ منچلوں کی ٹولیاں ہنستی گاتی کون سے "حج" کے لئے جا رہی تھیں۔ جوں جوں وہ آگے بڑھتے گئے تنگ گلیوں میں لوگوں کا ہجوم زیادہ ہوتا گیا۔ آخر وہ ایک کھلے میدان میں پہنچ گئے۔ میدان کے بیچوں بیچ ایک مزار کی شکل کی عمارت نظر آ رہی تھی جس کے چاروں طرف لوگوں کا ہجوم تھا۔ ہر طرف قندیلیں اور مشعلیں روشن تھیں۔ ڈھول تاشے بج رہے تھے۔ ہیجان خیز موسیقی کی لہریں فضا کو پُرہنگام کر رہی تھیں۔ اباقہ یورق اور ماریتا ایک جانب کھڑے ہو گئے۔ کچھ دیر یہی تماشا جاری رہا پھر یکدم شور تھم گیا۔ لوگ خاموش ہو گئے۔ مزار نما عمارت کے سامنے اچانک ایک الاؤ بھڑکا اور اس کی روشنی میں ایک باریش شخص دکھائی دیا۔ وہ آگ کے رنگ کا لباس پہنے نپے تلے قدموں سے اس تخت کی طرف بڑھ رہا تھا جو الاؤ کے عین سامنے بچھایا گیا تھا۔ اس کے دائیں بائیں باریش افراد مؤدب انداز میں چل رہے تھے۔ وہ شخص تخت پر براجمان ہوا۔ سب لوگ اس کے سامنے جھک گئے۔ اس وقت اباقہ نے دیکھا تخت کے عقب میں رکھی ہوئی مزین کرسیوں پر کچھ افراد آ کر بیٹھ گئے۔ ان میں ایک جعفر داراب بھی تھا۔ اس نے بھی مقامی لوگوں کی طرح ایک طویل چغہ زیب تن کر رکھا تھا۔ کچھ دیر بعد الاؤ پر کوئی تیل ڈالا گیا جس شعلے اور بلند ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی نارنجی لباس والا تخت نشین بوڑھا اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ اس کا رنگ سفید اور سرخ تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ اوپر کی طرف بلند کیے اور گونجدار آواز میں بولا۔

"ابلیس کون ہے؟"

لوگ ایک زبان ہو کر بولے۔ "خدا کا اقرب فرشتہ۔"

اس شخص نے پھر کہا۔ "ہزاروں سال پہلے سانپ کی طرفداری کی وجہ سے ابلیس زمین پر بھیج دیا گیا .... لیکن وہ روئے زمین کے ہر کام میں مداخلت رکھتا ہے .... ابلیس کون ہے؟"

لوگ بولے۔ "خدا کا اقرب فرشتہ۔"

اس نے پھر کہا۔ "روز قیامت خدا پھر اس سے راضی ہو جائے گا اور اس کا شمار مقربین میں ہو گا۔ وہ خود پر لعنت بھیجنے والوں کو سخت سزا دے گا .... ابلیس کون ہے؟"

لوگوں نے ہم آہنگ ہو کر کہا۔ "خدا کا اقرب فرشتہ۔"

تخت نشین بوڑھا بولا۔ "قولِ ابلیس ہے۔ میں کرہ زمین کی تمام موجودات کا فرمانروا تھا اور ہوں اور جب تک یہ زمین قائم ہے رہوں گا۔ میں اپنے زیر اثر تمام لوگوں کے

اعمال پر تسلط رکھتا رہا ہوں اور اب بھی رکھتا ہوں .... ابلیس کون ہے؟"

لوگ بولے۔ "خدا کا اقرب فرشتہ۔" اس کے بعد سب حاضرین تیز تیز کچھ بولنے لگے۔ جب وہ خاموش ہوئے تو تخت نشین بوڑھے نے ایک کتاب اٹھائی اور اس کے اندر سے عربی زبان میں یہ دعا پڑھنے لگا۔

"میرے سامنے آفتاب طلوع ہوا ہے۔ مجھ پر دو جلاد مامور کر دیے گئے ہیں۔ انہوں نے کہا۔ اے مسکین' اٹھ جا اور اپنے دین کی صداقت پر گواہی دے۔ شیخ عدی اور اس کی امت پر اس کے عظیم الشان قبہ اور اس کے پیچھے تمام موجودات پر سلامتی ہو ...."

"سلامتی ہو۔" مجمعے نے گونجدار آواز میں کہا۔

اس کے ساتھ ہی موسیقی کا قیامت خیز شور بلند ہونے لگا۔ ہجوم میں کسی نشہ آور مشروب کے پیالے گردش کرنے لگے۔ یورق نے بھی جلدی سے آگے بڑھ کر ایک ساتھ دو پیالے لپک لیے۔ اباقہ اور ماریتا ساتھ ساتھ کھڑے حیرانی سے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ وہاں چودہ چودہ سال کی لڑکیاں اور لڑکے بھی نظر آ رہے تھے۔ سب ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ موسیقی کی لے تیز سے تیز اور ہیجان خیز ہوتی چلی گئی۔ لوگ مزار نما عمارت کے گرد جھومنے لگے ان کے جسم تھرکنے لگے۔ پورا مجمع جیسے کسی وجدانی کیفیت کے اثر میں چلا جا رہا تھا۔ موسیقی کے سوا اب کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ دل ایک تال پر دھڑک رہے تھے' پاؤں ایک سُر میں حرکت کر رہے تھے' سر ایک لے پر جھوم رہے تھے۔ موسیقی .... موسیقی' ہیجان اور خرمستی .... پھر ایک دم مشعلیں بجھ گئیں۔ قندیلیں تاریک ہو گئیں۔ چار سُو ایک پاگل تاریکی پھیل گئی۔ اس تاریکی میں جنس کا دیو آزاد ہو گیا۔ ماریتا سے کوئی ٹکرایا۔ اس نے ایک خوفزدہ چیخ ماری اور اباقہ کے بازو سے لپٹ گئی۔ ان دونوں کو لگا جیسے وہ غلاظت کی بے شمار ڈھیریوں کے درمیان کھڑے ہیں ان کے پاؤں گناہوں کی دلدل پر ہیں اور اگر وہ اس طرح کھڑے رہے تو یہ دلدل انہیں ہڑپ کر جائے گی۔

"چلو اباقہ۔" ماریتا تیز آواز میں چیخی اور اسے بازو سے پکڑ کر کھینچنے لگی۔ اباقہ نے اس کا ہاتھ تھاما اور وہ دونوں شیطان کے ملعون چیلوں کو پھلانگتے ہوئے شہر کی طرف بھاگ نکلے۔ سردار یورق کا کہیں پتہ نہیں تھا۔

☆------☆------☆

سردار یورق کا پتہ دوسرے روز چلا۔ وہ نشے میں دھت ساری رات ایک گلی میں پڑا رہا تھا۔ رات کے واقعات ان کے ذہنوں میں کسی خواب کی طرح نقش تھے۔ صبح اباقہ نے

سلطان جلال کو سب کچھ بتایا۔ سلطان جلال خاموشی سے سنتا رہا۔ آخر ایک طویل سانس لے کر بولا۔

"مجھے یقین ہو گیا ہے کہ ہم صحیح مقام پر پہنچے ہیں۔ نارنجی لباس پہنے ہوئے وہ شخص فیروزالدین عرف شیخ نجدی ہی تھا۔"

اباقہ اور یورق کے ذہنوں میں کئی روز سے ایک سوال ابھر رہا تھا۔ آخر اباقہ نے پوچھ ہی لیا۔ "سلطان معظم! یہ شیخ نجدی کیا چیز ہے؟"

سلطان نے کہا۔ "اباقہ' یہ ابلیس کا دوسرا نام ہے۔ شیطان کو شیخ نجدی بھی کہا جاتا ہے۔ نجد عرب کا ایک علاقہ ہے۔ کہتے ہیں کہ جب قریش مکہ نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نااعوذباللہ قتل کرنے کا ارادہ کیا تو شیطان' نجد کے شیخ کے روپ میں اس محفل میں پہنچا اور اس نے ان کے فیصلے کو درست قرار دیا اور اس مذموم ارادے کی تعریف کی۔"

اباقہ نے پوچھا۔ "یہ فیروزالدین خود کو شیخ نجدی کیوں کہلواتا ہے۔"

سلطان بولا۔ "تمہارے سوال کا جواب ان واقعات میں پوشیدہ ہے کہ جو رات تم تینوں نے دیکھے ہیں۔ اس جزیرے پر درحقیقت شیطان کی حکومت ہے۔ فیروزالدین شیطان کے روپ میں یہاں موجود ہے اور اپنی شیطانیت کا کھلم کھلا اقرار اور پرچار کرتا ہے۔ جس طرح شیطان قیامت تک کے لیے ہر فعل میں آزاد ہے شاید اسی طرح فیروزالدین نے بھی دنیا جہان کے گناہ کمانے کا تہیہ کر رکھا ہے۔"

سلطان نے اباقہ اور یورق سے کئی اور سوالات پوچھے فیروزالدین کی بابت سن سن کر سلطان کے چہرے سے جلال ٹپکنے لگا۔ وہ بے چینی سے اپنی بند مٹھی کو دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی پر مار رہا تھا یوں لگتا تھا۔ وہ جلد سے جلد شیخ نجدی کے سامنے پہنچ جانا چاہتا ہے' لیکن اس کی حالت ابھی ایسی نہیں تھی کہ وہ چل پھر سکتا۔ یہاں پر جو طبیب سلطان کو دیکھنے آ رہا تھا اس نے کہا تھا کہ مریض کو دوا سے زیادہ آرام کی ضرورت ہے۔ اگر انہوں نے دو تین ہفتے مکمل آرام کیا تو زخم ٹھیک ہو جائے گا۔ جعفر داراب نے ان سے علیحدہ ہوتے وقت کہا تھا کہ جزیرے پر ان کا قیام دو ہفتے کا ہو گا۔ اس کا مطلب تھا سلطان جلال کو مطلوبہ فراغت میسر تھی۔

اگلے روز سہ پہر کے وقت حسب معمول اباقہ چہل قدمی کے لیے نکل گیا۔ اس نے ایک لمبا سفید چغہ پہن رکھا تھا اور عربوں کے انداز میں اس کے سر پر عمامہ تھا۔ مختلف گلیوں سے ہوتا ہوا وہ بڑی شاہراہ پر نکل آیا۔ جزیرے میں سخت حبس رہتا تھا' لیکن شام

اور صبح کے وقت ٹھنڈی ہوا چلنے لگتی تھی۔ ہریالی یہاں اتنی تھی کہ مصروف راستوں پر بھی گھاس نظر آتی تھی۔ کھجور کے علاوہ ساگوان اور ناریل کے درخت بھی کثرت سے تھے۔ خوشنما گھروں پر انگور کی بیلیں بہت بھلی لگتی تھیں۔ جزیرے کی چراگاہوں میں صحتمند پالتو جانور' ریوڑوں کے ریوڑ گھومتے تھے۔ ہر طرف خوشحالی کا دور دورہ تھا۔ یہ لوگ اپنی ہر ضرورت جزیرے سے ہی پوری کرتے تھے اور اس میں انہیں کوئی دقت نہیں ہوتی تھی۔

اس روز اباقہ نے ایک خاص بات محسوس کی۔ چند جگہوں پر جزیرے کی فوج کے سپاہی ناکہ بندی کر کے پوچھ گچھ میں مصروف تھے۔ یہ سپاہی اپنے زرد لبادوں اور عریاں پنڈلیوں کی وجہ سے صاف پہچانے جاتے تھے۔ کچھ کے سروں پر آہنی خود بھی رکھے ہوئے تھے۔

جونہی اباقہ گھر لوٹنے کے لیے ایک تنگ گلی میں مڑا۔ ناکہ بندی سے واسطہ پڑ گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ واپس پلٹ کر کسی اور گلی میں داخل ہوتا۔ ناکہ بندی کرنے والوں کی نگاہ اس پر پڑ چکی تھی۔ اباقہ نے آگے بڑھتے رہنا مناسب سمجھا۔ اس وقت اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ ساری ناکہ بندی صرف اور صرف اس کی ذات کے لیے ہے۔ اس نے سمجھا زیادہ سے زیادہ یہ ہو گا کہ اسے پہچان لیا جائے گا اور جعفر داراب کو شکایت پہنچے گی کہ اس کا ایک ملاح آزادانہ شہر میں گھوم رہا ہے۔ اس سے ان کا کچھ بگڑنے والا نہیں تھا۔

اباقہ نپے تلے قدموں سے اس رکاوٹ کے قریب پہنچا جو راستہ روکنے کے لیے رکھی گئی تھی۔ دستہ سالار نے گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ کوائف دریافت کیے۔ اباقہ نے نام کے علاوہ تمام کوائف درست بتائے۔ دستہ سالار نے اباقہ کا عمامہ اٹھایا۔ اباقہ نے دیکھا کہ دستہ سالار کے ہاتھوں میں چند بال ہیں۔ وہ ان بالوں کا موازنہ اباقہ کے بالوں سے کر رہا تھا۔ دفعتاً اباقہ کے جسم میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ دستہ سالار کے ہاتھ میں اس کے بال تھے۔ اباقہ اپنے بالوں کو باآسانی پہچان سکتا تھا۔ غیر معمولی طور پر لمبے' سیاہ' چمکدار' لیکن موٹے بال۔ دستہ سالار بھی چونک چکا تھا۔ وہ نہایت غور سے اباقہ کا سر دیکھ رہا تھا۔ اباقہ کو احساس ہوا کہ کوئی زبردست جال اس کے گرد بنا جا رہا ہے۔ اتنے وسیع پیمانے پر اس کی تلاش ہو رہی تھی۔ یقیناً کوئی نہایت سنگین معاملہ پیش آنے والا تھا۔ پھر اچانک اسے کل رات کا واقعہ یاد آیا جب موسیقی کی دھنادھن اپنے عروج پر پہنچی تھی اور روشنیاں گل ہو گئی تھیں۔ ان کے چاروں طرف ایک گھناؤنا کھیل شروع ہو گیا تھا۔ اباقہ ماریتا کو لے بھاگا تھا۔ کوئی ہاتھ اس وقت اباقہ کے جسم پر رینگا تھا۔ پھر اس ہاتھ نے اباقہ کے بال مٹھی میں پکڑ لیے تھے۔ گرفت سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ کسی زور آور مرد کا ہاتھ ہے۔

اباقہ نے سر کو زور سے جھٹکا دیا تھا اور نادیدہ جسم کو پیچھے دھکیل دیا تھا۔ یہ بال .... یہ بال شاید اس شدید جھٹکے کے سبب اس کے سر سے جدا ہوئے تھے۔

یہ تمام خیالات چند ساعتوں کے اندر اندر اباقہ کے ذہن سے گزر گئے۔ "خطرہ .... خطرہ۔" اس کی چھٹی حس پکاری .... اس سے پہلے کہ دستہ سالار کا ہاتھ اپنی تلوار پر پہنچتا اور وہ چیخ کر اپنے ساتھیوں کو مطلع کرتا اباقہ نے اسے زور سے دھکا دیا اور بھاگ کھڑا ہوا۔ بھاگتے وقت اس کے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا تھا کہ کل رات ہجوم میں کوئی ایسا شخص موجود تھا جو اسے اباقہ کی حیثیت سے پہچانتا تھا۔ اس نے اسے پکڑنے کی کوشش کی تھی اور اب اسی کی اطلاع پر گلی گلی اس کی تلاش ہو رہی تھی .... اباقہ جتنی تیز رفتاری سے بھاگا سپاہیوں کو قطعاً امید نہیں تھی' لیکن وہ پہلے سے چوکس تھے۔ انہوں نے فوراً کمانوں پر تیر چڑھائے اباقہ نے اپنے پیچھے دستہ سالاری کی للکار سنی۔ وہ اسے رکنے کا حکم دے رہا تھا۔ مگر اباقہ بھاگتا چلا گیا۔ دائیں طرف ایک گلی نظر آئی اور وہ اس میں مڑ گیا۔ اس سے آگے گلیوں کا جال نظر آ رہا تھا۔ کہیں کہیں اکا دکا بچے کھیل رہے تھے اباقہ نے جلد جلد گلیاں بتدیل کیں اور تھوڑی دیر میں ناکہ بندی سے دور نکل آیا۔

اس وقت وہ سپاہیوں کی طرف سے کافی مطمئن ہو چکا تھا۔ جب اچانک اسے سامنے سے گھڑ سوار آتے دکھائی دیے۔ وہ زرد دلبادوں والے سپاہی تھے اور یقیناً اس کی تلاش میں تھے۔ اباقہ ٹھٹکا اس وقت ایک سپاہی نے تلوار سیدھی کر کے اباقہ کی طرف اشارہ کیا اور گھڑ سوار ایڑ لگا کر اس کی طرف لپکے۔ اباقہ نے رخ پھیرا اور واپس دوڑ پڑا۔ اسے اس بات کی فکر نہیں تھی کہ عقب سے اس پر تیر چلائے جائیں گے۔ اگر ان لوگوں نے تیر چلانے ہوتے تو اس وقت چلاتے جب اس نے ناکہ بندی توڑی تھی لگتا تھا وہ اسے زندہ گرفتار کرنا چاہتے ہیں۔ اباقہ تیزی سے بھاگتا ہوا ایک دوسری گلی میں مڑا۔ یہاں رونق تھی۔ لوگوں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ اباقہ لب سڑک واقعہ ایک قحبہ خانے میں داخل ہو گیا۔ شام کا وقت تھا قحبہ خانہ بھرا ہوا تھا۔ شیطان کے چیلے رنگ رلیاں منانے میں مصروف تھے۔ شراب' جوا' ناچ گانا سب کچھ چل رہا تھا۔ یوں لگتا تھا یہ لوگ دنیا میں صرف عیش کرنے کے لیے آئے ہیں۔ ان کے دن رات اسی خرمستی میں گزرتے تھے۔ کھیتی باڑی اور ضروریات زندگی کا حصول ان لوگوں کی ذمے داری تھی جو مختلف علاقوں سے غلام بنا کر یہاں لائے گئے تھے۔

اباقہ تیزی سے اندر داخل ہوا تو ایک کیم شحیم شخص سے ٹکرا گیا۔ اس شخص کے ہاتھ میں بلوری جام تھا۔ اباقہ کا دھکا لگنے سے وہ لڑکھڑایا اور جام اچھل گیا۔ اباقہ اسے نظر

انداز کرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ لڑکھڑانے والا شخص غصے میں پھنکارتا ہوا مڑا اور اس نے اباقہ کا چغہ کھینچ لیا۔ اباقہ نے مڑ کر دیکھا اور چونک گیا۔ وہ عمرو تھا۔ وہی کھچڑی داڑھی والا عمرو جس سے جزیرے پر آمد کے وقت ایک تلخ ملاقات ہو چکی تھی۔ اباقہ چونکہ عربی لباس میں تھا' عمرو اسے بالکل نہیں پہچان سکا۔ اس کے منہ سے ایک گالی نکلی اور ایک زور دار مکہ اس نے اباقہ کے منہ پر رسید کرنا چاہا۔ اباقہ تیزی سے جھک گیا۔ وار خالی گیا تو عمرو بھنا اٹھا۔ اس نے جام فرش پر پھینکا۔ نیام سے تلوار کھینچی اور بے دریغ اباقہ کے سر پر وار کیا۔ یہ وار ایک کرسی پر پڑا اور اسے دو حصوں میں تقسیم کر گیا۔ اباقہ نے جواباً ایک جچی تلی ٹانگ مدمقابل کے سینے پر رسید کی اور وہ اچھل کر ایک میز پر جا گرا۔ قحبہ خانے میں موجود لوگوں کے منہ سے بے ساختہ "ہو" کی آواز نکل گئی۔ شاید ان کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس شخص پر جوابی حملہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد تو جیسے قحبہ خانے میں زلزلہ آ گیا۔ عمرو اپنی تلوار سے لپک لپک کر اباقہ کو نشانہ بنانے کی کوشش کر رہا تھا اور اباقہ اسے پورے قحبہ خانے میں نچا رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ عمرو کے نیم گنجے سر پر ایک آدھ زور دار چپت بھی لگا دیتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ خود بھی اس کھیل سے لطف اندوز ہو رہا ہے۔ نہ جانے یہ تماشا کب تک جاری رہتا۔ اچانک اباقہ کو قحبہ خانے کے دروازے پر تلوار بردار سپاہیوں کی ایک ٹولی نظر آئی۔ وہ اسے ہی ڈھونڈ رہے تھے۔ عمرو نے جب سپاہیوں کو اندر داخل ہوتے دیکھا تو اور جوش سے اباقہ پر حملے کرنے لگا۔ اباقہ نے اسے جل دے کر چھلانگ لگائی اور سیدھا سیڑھیوں پر آیا۔ وہاں سے وہ بالائی منزل کی طرف لپکا۔ سپاہی چیخ و پکار کرتے پیچھا کرنے لگے۔ اباقہ بالائی منزل کی طویل راہداری میں داخل ہوا۔ وہ چھت پر پہنچنے کا راستہ تلاش کر رہا تھا' لیکن راستہ کہیں نظر نہیں آتا تھا۔ دفعتاً ایک دروازہ کھلا اور کسی نے اباقہ کا بازو پکڑ کر اندر کھینچ لیا۔ کمرے کی روشنی میں اباقہ نے دیکھا اسے اندر کھینچنے والی ایک لڑکی تھی۔ اس کی عمر چودہ پندرہ سال کے قریب ہو گی۔ وہ جزیرے کی عام عورتوں کی طرح خوبصورت لباس پہنے ہوئے تھی اور اس کی آنکھوں میں بے باکی کی چمک تھی۔ اس نے دروازہ بند کر دیا اور ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اباقہ کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ پھر اس نے پھرتی سے ایک بغلی دروازہ کھولا اور اباقہ کو ایک چھوٹے سے ڈربہ نما کمرے میں دھکیل دیا۔ اس کے بعد اس نے بڑے کمرے کی روشنی بجھا دی۔ غلام گردش میں بھاگتے دوڑتے قدموں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ مختلف دروازے کھولے اور بند کیے جا رہے تھے تھوڑی دیر بعد اس کمرے کے دروازے پر بھی دستک ہوئی۔ لڑکی نے قندیل روشن کی۔ دروازہ کھلا۔ کسی نے بھاری بھر کم آواز میں پوچھا۔

"نبیلہ! دروازہ اندر سے بند تھا؟"

"جی ہاں! ابا جان۔" لڑکی کی نیند سے بوجھل آواز سنائی دی۔

"ٹھیک ہے محتاط رہنا۔ ایک بدمعاش یہاں گھس آیا ہے۔ بڑا خطرناک شخص ہے۔"

لڑکی نے اس خبر پر حیرت اور خوف کا اظہار کیا۔ پھر چند باتیں کر کے اس نے دروازہ بند کر دیا۔ تب وہ بغلی دوازہ کھول کر اباقہ کے پاس چلی آئی۔ اباقہ کو اس کمرے میں پہنچانے کے بعد اس نے نہایت تیزی سے لباس تبدیل کر لیا تھا۔ اب وہ شب خوابی کے مہین لبادے میں نظر آ رہی تھی۔ وہ خوبصورت لڑکی کسی آدھ کھلے پھول کی طرح تروتازہ اور شوخ تھی۔ اباقہ کو دیکھ کر اس نے دھیرے سے تالی بجائی اور ہنس کر بولی۔

"خوب .... بہت خوب .... بہت ہی خوب۔ اجنبی' آپ نے میرا دل خوش کر دیا۔ کیا ناچ نچایا ہے اس بھالو کو۔"

"بھالو؟" اباقہ حیرت سے بولا۔

"ہاں وہی عمرو۔ لوگ اسے بھالو ہی کہتے ہیں' لیکن اس کے منہ پر نہیں۔ وہ بہت خطرناک شخص ہے۔ آپ نے اس کی آنکھیں دیکھی ہیں کیسے جلتی رہتی ہیں .... جب .... جب آپ اس کے سر پر چپت لگا رہے تھے میرا دل چاہ رہا تھا اچھل اچھل کر قہقہے لگاؤں' لیکن میرے ابا' آپ کو معلوم ہی ہے یہ ابا لوگ بڑے غصیلے ہوتے ہیں۔ یہ غصہ اگر وہ اس کالے بھالو پر کریں تو بات بھی ہے۔ خبیث رات گئے تک ہمارے قحبہ خانے میں رہتا ہے اور مجھے گھورتا ہے گندی باتیں کرتا ہے' لیکن ابا غصہ کرتے ہیں مجھ پر کہ میں اس بدمعاش سے سیدھے منہ بات کیوں نہیں کرتی۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے ...."

لڑکی بلا تکان بولتی جا رہی تھی اور اباقہ خاموشی سے سن رہا تھا .... رات نصف بیت گئی' لیکن لڑکی کی باتیں ختم نہیں ہوئیں۔ وہ ہر موضوع پر بلا رکے بول سکتی تھی۔ اباقہ کے کان دکھنے لگے اگر اسے باہر پکڑے جانے کا خوف نہ ہوتا تو نکل بھاگتا۔

رات کسی پہر اباقہ نیند کی آغوش میں چلا گیا۔ صبح ہوئی تو لڑکی ایک مختلف لباس میں نظر آئی۔ اس نے اباقہ سے کہا۔ "مجھے آپ کے بارے سب معلوم ہو گیا ہے۔ آپ وہی ہیں نا رانی خانم کو جس کی تلاش ہے؟"

"رانی خانم! تلاش .... کیا مطلب؟" اباقہ حیرانی سے بولا۔

لڑکی آنکھیں نچا کر بولی۔ "اب اتنے انجان بھی نہ بنیں۔ میں سب جانتی ہوں۔ جشن کی رات آپ نے رانی خانم کا دل چرایا اور پھر اس سے دامن چھڑا کر بھاگ گئے۔ اوہو .... میں غلط کہہ گئی' دامن نہیں بال چھڑا کر بھاگ گئے۔ رانی خانم کے ہاتھ آپ

کے سر کے کچھ بال آ گئے تھے۔ ان بالوں کی نشانی پر سارے شہر میں جناب کی تلاش ہو رہی ہے۔ کل ایک جگہ آپ کو پہچان بھی لیا گیا تھا لیکن آپ پھرتی کا مظاہرہ کر کے بھاگ گئے .... لیکن کب تک بچیں گے آپ۔ رانی خانم اتنی آسانی سے پیچھا چھوڑنے والی نہیں۔ آپ کو اپنا بنا کے چھوڑے گی۔"

اباقہ کی آنکھیں حیرت سے ابلی پڑ رہی تھیں۔ یہ بیٹھے بٹھائے کیا بلا گلے پڑ رہی تھی۔ یہ تو وہ دیکھ ہی چکا تھا کہ اس جزیرے میں مرد و زن کو مکمل جنسی آزادی حاصل ہے۔ شیطان کا یہ جزیرہ صحیح معنوں میں شیطانیت کا نمونہ تھا مگر یہ کیا حماقت تھی کہ ایک عورت پورے شہر میں اعلانیہ ایک مرد کو تلاش کروا رہی تھی۔ اباقہ کے ذہن میں آیا یقیناً یہ کوئی با اختیار عورت ہے۔ اس نے لڑکی سے اس بارے میں پوچھا تو وہ بے تکلفی سے بولی۔

"لگتا ہے جناب یہاں نئے پھنسے ہیں .... رانی خانم' شیخ معظم (شیخ نجدی) کی بیس خاص محبوباؤں میں سے ایک ہے۔ ان بیس عورتوں کو شیخ کی طرف سے وسیع اختیارات حاصل ہیں اور رانی خانم ان سب سے زیادہ با اختیار ہے وہ شیخ کی اولین محبوباؤں میں سے ہے نا۔"

اباقہ جانتا تھا اس جزیرے میں شادی بیاہ شوہر بیوی اور اولاد کا کوئی تصور نہیں۔ یہاں کے باسی اپنی سماجی زندگی میں انسانوں سے زیادہ جانوروں سے قریب تھے .... اس لڑکی کی بات درست معلوم ہوتی تھی۔ شاید اباقہ کی تلاش کی اصل وجہ یہی تھی۔ اباقہ کو قدرے سکون محسوس ہوا۔ یہ کوئی ایسا سنگین معاملہ نہیں تھا۔ وہ تو سمجھ رہا تھا شاید اس کی اصل حیثیت آشکار ہو گئی ہے۔ اس نے ارادہ کیا کہ اس باتونی لڑکی کی مہمان نوازی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے جانے کی اجازت چاہے' لیکن لڑکی نے یہ کہہ کر اسے پھر پریشان کر دیا کہ شہر میں ابھی تک اس کی تلاش زور شور سے جاری ہے۔ اس نے بڑے کمرے کی ایک کھڑکی سے پردہ ہٹایا۔ قحبہ خانے کے عین سامنے زرد لباسوں والے پہریدار موجود تھے۔ وہ نہ صرف قحبہ خانے کی نگرانی کر رہے تھے بلکہ مشکوک راہ گیروں کو بھی پوچھ گچھ کے لیے روک رہے تھے۔

اباقہ نے کہا۔ "میں یہاں سے جانا چاہتا ہوں۔"

نبیلہ بولی۔ "میں نے اس کا انتظام بھی کر رکھا ہے۔ میں روزانہ صبح کے وقت گوشت اور سبزیاں لینے شہر کی منڈی میں جاتی ہوں۔ گھوڑا گاڑی میں گوشت کے لیے ایک بڑا صندوق پڑا رہتا ہے آپ آسانی سے اس میں گھس سکتے ہیں۔ میں آپ کو عقبی

راستے سے گھوڑا گاڑی تک لے جاؤں گی۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو گی۔ ابھی تو ابا حضور سمیت ہمارے ملازم اپنی آدھی نیند بھی پوری نہیں کر سکے ہیں؟"

نبیلہ کی بات درست تھی۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ اباقہ کو لیے کمرے سے برآمد ہوئی تو یہاں وہاں میزوں اور فرش پر قہوہ خانے کے خادم گہری نیند سو رہے تھے۔ وہ دونوں دبے پاؤں چلتے سیڑھیوں پر آئے اور عقبی گلی میں کھڑی ایک گھوڑا گاڑی کے سامنے پہنچ گئے۔ نبیلہ نے دائیں بائیں دیکھ کر اباقہ کو گلی میں آنے کا اشارہ کیا اباقہ اپنا جبہ سنبھالتا گھوڑا گاڑی میں داخل ہوا اور نبیلہ کی ہدایت کے مطابق دیہاتی صندوق میں گھس گیا۔ ذرا ہی دیر بعد گاڑی روانہ ہو چکی تھی۔ سانس کی آمد و رفت کے لیے اباقہ نے صندوق کا ڈھکنا ذرا سا اٹھا رکھا تھا۔ گاڑی کے اگلے اور پچھلے حصے کے درمیان جو روزن تھا اس میں سے اسے نبیلہ دکھائی دے رہی تھی۔ ایک جگہ سپاہیوں نے اسے روکا' لیکن اس نے رکنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ سپاہیوں سے چند گپیں ہانک کر اس نے گھوڑوں کو دوبارہ چابک دکھا دی۔

جلد ہی وہ اباقہ کے بتائے ہوئے پتے پر پہنچ گئی۔ گھوڑے روک کر اس نے ان کے آگے چارہ ڈالا اور اباقہ کو صندوق سے نکلنے میں مدد دی۔ اباقہ نے صندوق سے نکل کر ادھر ادھر جھانکا۔ گلی خالی تھی۔ وہ دونوں گھوڑا گاڑی سے اتر کر مکان میں داخل ہو گئے .... یورق ماریتا اور سلطان اس کے لیے سخت پریشان تھے۔ ماریتا تو دروازے کے قریب ہی کھڑی تھی' اباقہ کو دیکھ کر اس کا کملایا ہوا چہرہ کھل اٹھا۔ سلطان برآمدے میں بستر پر ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ یورق روٹھی ہوئی بیوی کی طرح اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس پر ہر طرف سے سوالات کی بوچھاڑ ہو گئی۔ اباقہ نے مختصراً انہیں کل شام کے واقعات بتائے۔ نبیلہ اس دوران خلاف معمول خاموش بیٹھی رہی۔ اباقہ نے بات ختم کی تو سلطان نے نبیلہ کا شانہ تھپتھپایا۔

"شاباش بیٹی! تم نے ایک اجنبی کے ساتھ ہمدردی کر کے انسانیت کا ثبوت دیا ہے۔"

نبیلہ بولی۔ "اجنبی تو یہاں میں بھی ہوں چچا جان۔ مجھے یہ لوگ اور یہاں کا ماحول ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ کہتے ہیں کہ لوگوں کو اپنے وطن سے محبت ہوتی ہے' لیکن مجھے نفرت ہے اس وطن سے۔ میں اس دنیا سے نکل کر اس دنیا میں پہنچ جانا چاہتی ہوں جو اس سمندر سے پار ہے .... جہاں سے آپ اور جعفر داراب آئے ہیں' لیکن کیا کروں اس جزیرے میں آ کر کبھی کسی کو واپس جانا نصیب نہیں ہوا۔ آپ خوش قسمت ہیں کہ جعفر

داراب کے ساتھ واپس چلے جائیں گے لیکن کون جانے آپ ...." نبیلہ رک گئی۔

"ہاں ہاں کہو۔" سلطان نے کہا۔

وہ بولی۔ "کون جانے آپ زندہ بھی رہیں گے یا نہیں؟"

سلطان جلال نے کہا۔ "تم کم عمر ہونے کے باوجود خاصی ذہین ہو .... ہمیں اپنے اس جزیرے کے متعلق کچھ بتاؤ ہم جاننا چاہتے ہیں۔"

سلطان جلال کی فرمائش پر نبیلہ نے باتوں کی پٹاری کھول دی۔ وہ بڑی دیر تک بلا توقف بولتی چلی گئی اس دوران اگر اس کی زبان چند لمحوں کے لیے رکی تو اس وقت جب سلطان جلال' اباقہ یا یورق میں سے کسی نے کوئی سوال کیا۔ اس طویل گفتگو سے انہیں جو معلومات حاصل ہوئیں ان کا لب لباب یہ تھا۔

"فیروز الدین عرف نجدی شروع میں اپنے چند سو سپاہیوں اور کچھ عورتوں کے ساتھ اس جزیرے میں وارد ہوا تھا۔ اتفاقاً اس جزیرے کے قریب ہی انہوں نے سمندر میں ایک ایسا مقام دریافت کر لیا جو خلیج فارس کا بہترین موتی گھاٹ ثابت ہوا۔ اس مقام سے اتنی کثرت سے موتی نکلے کہ چند ہی سال میں شیخ نجدی مالا مال ہو گیا۔ اس نے اپنے ایک خاص آدمی کو یہ بے بہا دولت دے کر جزیرے سے باہر بھیجا چند ماہ بعد بحری جہازوں کا ایک تجارتی قافلہ اس جزیرے پر اترا۔ ان جہازوں پر اس جزیرے کو جنت ارضی کا نمونہ بنانے کے لیے ہر سامان موجود تھا۔ زرعی آلات' مویشی' پارچہ بافی کی کھڈیاں' فصلوں کے بیج اور ہر قسم کے ہنرمند' یہ تمام ساز و سامان کئی دن جزیرے پر اترتا رہا۔ پھر ان جہازوں کو ان کے ملاحوں سمیت غرق کر دیا گیا اور جزیرے کو جنت نشان بنانے کا عمل شروع ہوا' جو کئی سال جاری رہا۔

.... اور اب یہ جزیرہ جنت نشان بن چکا تھا' لیکن کچھ لوگوں کے لیے جہنم سے بدتر تھا۔ وہ ہزار کوشش کے باوجود خود کو اس غلیظ ماحول میں سمو نہیں سکے تھے اور نبیلہ بھی ان معدودے چند لوگوں میں سے ایک تھی۔ نبیلہ نے بتایا کہ شیخ نجدی خود کو "موصل" کے کسی شخص شیخ عدی کا پیرو کار بتاتا ہے اور جزیرے میں اپنے بنائے ہوئے مذہب کا پرچار کرتا ہے۔ اس مذہب کی تعلیمات کے مطابق انسان آدم و حوا کی اولاد نہیں ہے۔ شیطان یعنی خدا کا اقرب فرشتہ ابلیس آدم کے لیے ایک سیاہ فام عورت لایا تھا۔ اس عورت اور آدم کا پسینہ زمین میں دبایا گیا اور اس سے شیطان کا پہلا فدائی پیدا ہوا۔ شیخ نجدی کہتا ہے کہ طوفان نوح کی طرح ایک طوفان ایزدی بھی آیا تھا۔ اس کے سات ہزار سال بعد ہر ہزار سال میں ایک مرتبہ ایک خدا آسمان میں ظاہر ہوتا رہا اور یہ نئے خدا نئے

قواعد واحکامات کے پابند ہیں .... شیخ نجدی ہر سال ماہ آذر میں تین روزے رکھنے کا حکم دیتا ہے۔ اس کی تعلیمات کے مطابق دن میں ایک مرتبہ "نماز" بھی پڑھی جاتی ہے۔ جونہی سورج افق سے نمودار ہوتا ہے اس کے سامنے سجدہ ریز ہو کر دعائیں مانگی جاتی ہیں۔ یہاں کے لوگ سال میں ایک مرتبہ سفید گائے آفتاب کی بھینٹ کرتے ہیں تاکہ وہ روشنی اور گرمی عطا کرے۔ طلوع آفتاب کے وقت سب سجدہ ریز ہوتے ہیں اور گائے کو ذبح کرتے ہیں۔ اس مذہب کی رو سے شیخ عدی کے مزار پر مراسم حج ادا کرنا اہم فریضہ ہے' لیکن چونکہ شیخ عدی کا مزار موصل شہر میں ہے اور اس دور دراز جزیرے کے لوگ وہاں پہنچ نہیں سکتے اس لیے شیخ نجدی نے جزیرے کے اندر ہی مزار کی شکل کی ایک عمارت تعمیر کر رکھی ہے۔ اس عمارت کو شیخ عدی کا مزار تصور کر کے "حج" ادا کیا جاتا ہے ...."

سلطان جلال بڑے غور سے نبیلہ کی باتیں سن رہا تھا' اس نے کہا۔ "جہاں تک معلوم ہے شیخ عدی کی تعلیمات تو ہرگز یہ نہیں تھیں۔ وہ ایک برگزیدہ ہستی تھے۔ میں نے ان کے بارے سنا ہے وہ قریشی اموی عرب تھے۔ انہوں نے آج سے کوئی ڈیڑھ سو سال پہلے 505 ہجری میں موصل کے قریب رہائش اختیار کی۔ اپنے لیے ایک خانقاہ بنائی اور ایک سلسلہ تصوف کی بنیاد ڈالی۔ یہ درست ہے کہ کبھی کبھی وجد کی کیفیت میں ان کے منہ سے خلاف شریعت باتیں نکل جاتی تھیں' لیکن ان خرافات کو ان سے منسوب کرنا سراسر بددیانتی ہے .... ایسی بددیانتی شیخ نجدی جیسا شیطان صفت اور شیطان پرست شخص ہی کر سکتا ہے۔"

دفعتاً گھر کا بیرونی دروازہ دھماکے سے کھلا اور انہوں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ زرد لبادوں والے چند سپاہی دندناتے ہوئے اندر گھس آئے۔ ان کے ساتھ ایک عورت تھی۔ وہ کسی جنگلی بھینسے کی طرح صحت مند اور طاقتور دکھائی دیتی تھی۔ اس کے موٹے نقوش کو سانولے رنگ نے اور بھی بھدا بنا دیا تھا۔ وہ مست ہاتھی کی طرح جھومتی ہوئی اندر داخل ہوئی اور اباقہ کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

"رانی خانم۔" نبیلہ کے منہ سے بے ساختہ نکلا اور وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

اباقہ کو دیکھنے کے بعد موٹی عورت کے دانت نکل آئے تھے۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ اس کے چہرے پر والہانہ محبت کی برسات ہو رہی تھی۔ اس نے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں کو خوابناک بنا کر اباقہ کی طرف دیکھا۔ اس کے چوڑے چکلے جسم پر ایک نہایت قیمتی لباس چمک رہا تھا۔ "تو یہ ہے رانی خانم۔" اباقہ نے حیرانی سے سوچا۔ پھر اسے وہ آہنی گرفت یاد آئی جو جشن کی رات کسی نے اس کے بالوں پر قائم کی تھی۔ اسے یقین آ گیا کہ وہ اسی

عورت کا کام تھا۔ پھر اس نے دیکھا کہ عورت نے زیر لب کچھ کہا اور بازو پھیلا کر اس کی طرف لپکی۔ اباقہ کا دل چاہا کہ وہ چھلانگ لگا کر مسہری پر چڑھ جائے' لیکن پھر اس نے سوچا کہ اگر اس نے ایسا کیا تو بعد میں یورق اور ماریا اس کا خوب مذاق اڑائیں گے .... وہ اپنی جگہ کھڑا رہا۔

رانی خانم نے تیزی سے لپک کر اپنی بانہیں اباقہ کی گردن میں حمائل کرنا چاہیں' لیکن سردار یورق نے بروقت حرکت کی اور ان دونوں کے درمیان آ گیا۔ اس نے رانی خانم کا شدید "حملہ" اپنے ہاتھوں پر روکا' اس کوشش میں وہ تھوڑا سا لڑکھڑا بھی گیا۔ رانی خانم نے غصے سے یورق کی طرف دیکھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی' سردار یورق نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور پھر آنکھوں آنکھوں میں اسے ایک جانب چلنے کو کہا۔ اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ رانی خانم کو تنہائی میں کوئی خاص بات بتانا چاہتا ہے۔ رانی خانم چند لمحے تذبذب کے عالم میں اس کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر یورق کے ساتھ چل دی۔ یورق اسے برآمدے کے ایک گوشے میں لے گیا۔ رانی خانم کے ساتھ آنے والے سپاہی حیرانی سے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ اباقہ ماریا اور سلطان جلال کی سمجھ میں بھی نہیں آیا تھا کہ سردار یورق اس موٹی عورت سے کیا کہنا چاہتا ہے لیکن ان کا اندازہ تھا کہ وہ کوئی چال چلنے کی کوشش کرے گا۔ اباقہ اس کی آنکھوں میں ہلکی سی شرارت بھی دیکھ چکا تھا۔

دوسری طرف سردار یورق رازدارانہ لہجے میں رانی خانم سے کہہ رہا تھا۔ "......... رانی صاحبہ دیکھنے میں یہ بھلا چنگا لگتا ہے' لیکن ایک دم وحشی ہو جاتا ہے۔ خاص طور سے اس وقت جب کوئی بات اس کی مرضی کے خلاف ہو۔ ہم اس کے ساتھی ہیں اور اس کا مزاج اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ آپ نے اسے اپنی خدمت کے قابل سمجھا ہے یہ اس کے لئے اعزاز ہے' مگر یہ نہیں سمجھے گا۔ ہم سب مل کر اسے سمجھا لیتے ہیں۔ یہ آپ کے ساتھ ضرور جائے گا' بس ہمیں تھوڑی سی مہلت دیجئے۔"

جلد ہی سردار یورق' رانی خانم کو قائل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ رانی خانم اپنے سپاہیوں کو لے کر ایک الگ کمرے میں جا بیٹھی۔ سردار یورق دھیمے لہجے میں سلطان اور اباقہ سے باتیں کرنے لگا۔ سلطان نے بھی یورق کے اس خیال کی تائید کی کہ اباقہ کو اس عورت کے ساتھ چلے جانا چاہئے۔ جیسا کہ سننے میں آیا تھا یہ شیخ نجدی کی خاص محبوباؤں میں سے ایک تھی۔ اس کے ساتھ رہ کر شیخ نجدی اور اس کے روز و شب کے متعلق گراں قدر معلومات حاصل ہو سکتی تھیں۔ سلطان کا کہنا اباقہ کے لئے حکم کا درجہ رکھتا تھا۔ وہ فوراً

رانی خانم کے ساتھ جانے کو تیار ہو گیا۔

سردار یورق چہرے پر خوشی کے تاثرات لئے رانی خانم کے پاس پہنچا اور بولا۔

"مبارک ہو' رانی صاحبہ! وہ جنگلی آپ کے ساتھ جانے پر رضامند ہو گیا ہے .... لیکن میں پھر کہوں گا کہ کوئی بات اس کی مرضی کے خلاف نہ ہو اور ہاں ایک بات آپ کو بتا دوں' اسے اچھا کھانے اور اچھا پہننے کا شوق ہے۔ اگر آپ اس کا دل جیتنا چاہتی ہیں تو اس کی خوراک اور لباس کا خیال رکھیں۔ خاص طور پر اسے بھڑکیلے اور چست لباس بہت پسند ہیں۔"

رانی خانم اپنی بھاری آواز میں بولی۔ "تو فکر نہ کر منگول' ابلیس پرستوں کی اس بستی میں تیرے ساتھی کو کوئی تکلیف نہ ہو گی۔"

سردار یورق رانی خانم سے بات کر کے اباقہ کے پاس پہنچا اور دھیمے لہجے میں بولا۔

"اباقہ! میں نے تیرا راستہ سیدھا کر دیا ہے۔ رانی خانم تجھ سے چھیڑ چھاڑ کی کوشش نہیں کرے گی۔ مگر ایک بات یاد رکھنا' رانی خود بھی خوش لباس اور خوش خوراک ہے اور دوسروں کو بھی دیکھنا چاہتی ہے۔ اگر وہ تجھے اچھا کھانے کو دے اور عمدہ لباس پہننے کو کہے تو اعتراض مت کرنا۔ وہ برہم ہو جائے گی۔ اسے برہم ہونے کا موقعہ نہ دینا۔"

اباقہ نے اثبات میں سر ہلایا' اتنی دیر میں رانی ان کے پاس پہنچ گئی۔ اس نے اٹھلا کر اباقہ کی بانہوں میں بانہیں ڈالیں اور بے تکلفی سے اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگی۔ اباقہ نے آنکھیں آسمان کی طرف چڑھا کر ایک ٹھنڈی سانس لی۔ اس کے اس انداز پر یورق اور ماریتا مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔ اباقہ نے ماریتا کو دوپٹے میں منہ چھپائے مسکراتے دیکھا تو اسے خواہ مخواہ غصہ آنے لگا۔ اباقہ کو ماریتا کی صرف آنکھیں نظر آ رہی تھیں اور ان آنکھوں میں ایک خوبصورت سی شوخی تھی۔ نبیلہ کا چہرہ بھی سرخ ہو رہا تھا بلکہ اس کی تو شاید ہنسی چھوٹنے کو تھی' اس نے دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ رکھا تھا۔

اباقہ نے کسی ناراض بچے کی طرح ماریتا کی طرف دیکھا تو وہ چہرے پر زبردستی سنجیدگی طاری کرتی ہوئی کمرے کی طرف مڑ گئی۔ اس کے جاتے ہی نبیلہ بھی اندر بھاگی۔ رانی خانم اباقہ کو لے کر دروازے کی طرف بڑھی۔ اس کے مسلح سپاہی مئودب انداز میں پیچھے پیچھے چلنے لگے۔

☆------☆------☆

رانی خانم اسے اپنے خوبصورت محل میں لے آئی۔ یہ محل شیخ نجدی کے محل کی پشت پر واقع تھا۔ ایسے ہی کئی اور محل خوبصورت کھلونوں کی طرح چاروں طرف بکھرے

ہوئے تھے۔ ان میں شیخ نجدی کے منظور نظر لوگ' مصاحبین اور مشیران رہائش رکھتے تھے۔ نہایت حسین اور سرسبز علاقہ تھا۔ رانی خانم نے اباقہ کے لئے اپنی خواب گاہ کے پہلو میں ایک آرام دہ کمرہ خالی کروا دیا۔ ایک درجن خادم اور خادمائیں اس کی خدمت پر مامور کر دیئے گئے۔

اگلے روز ایک بہت بڑے طشت میں اباقہ کے لئے زرق برق' زرنگار پوشاک پہنچ گئی۔ جزیرے پر زیادہ تر لوگوں کا لباس لمبے چغوں پر مشتمل تھا لیکن اباقہ کے لئے جو لباس لایا گیا وہ خاصا چست تھا اسے دیکھتے ہی اباقہ کا دم سینے میں گھٹنے لگا۔ جنگل کی زندگی چھوڑنے کے بعد اس نے خود کو بہت بدلا تھا۔ وہ کبھی کبھار لباس اور جوتے وغیرہ پہننے لگا۔ خاص طور پر ماریتا کے سامنے ادھورے لباس میں اسے ایک جھجک سی محسوس ہوتی تھی مگر اس کا لباس ہمیشہ سادہ اور ڈھیلا ڈھالا ہوتا تھا اور جوتا تو وہ موقع ملتے ہی اتار کر پھینک دیتا تھا اور اب اس کے روبرو نہ صرف چست لباس تھا بلکہ جوتوں کا جوڑا بھی طشت میں پڑا منہ چڑھا رہا تھا۔ مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق اباقہ نے وہ چست لباس پہنا اور جوتا چڑھا کر بیٹھ گیا۔ شاید اسے ننگے بدن چھڑیوں سے مارا جاتا تو بھی اتنی تکلیف محسوس نہ ہوتی جو اس زرق برق لباس اور قیمتی جوتے کی وجہ سے ہو رہی تھی۔

اس روز شام تک چار اور پوشاکیں اور جوتوں کے دو اور جوڑے تیار ہو کر اس کے کمرے میں پہنچ گئے۔ ہر پوشاک ایک سے بڑھ کر ایک چست اور بھاری بھرکم تھی۔ ان پوشاکوں اور جوتوں کو دیکھ دیکھ کر اباقہ کا سر پیٹنے کو دل چاہ رہا تھا۔ رانی خانم کی خوشنودی کے لئے اسے یہ تمام پوشاکیں اور جوتے پہننے تھے۔ اسے رہ رہ کر سردار یورق پر تاؤ آنے لگا۔ اسی کے کہنے پر سلطان جلال نے اسے رانی خانم کے ساتھ جانے کا مشورہ دیا تھا۔ اب وہ ظالم عورت مرغن کھانے کھلا کھلا کر اور تنگ پوشاکیں پہنا پہنا کر اس کا ناک میں دم کرنے والی تھی۔

تین چار روز اباقہ نے جیسے تیسے گزارے۔ اس دوران اسے صرف ایک کام کی بات معلوم ہوئی اور وہ یہ کہ ایک ہفتے بعد شیخ نجدی اپنے مصاحبین کے ساتھ جزیرے سے چند کوس دور ایک موتی گھاٹ پر جائے گا۔ یہ سفر کشتیوں پر ہو گا اور اس سفر میں شیخ کی محبوبائیں (داشتائیں) بھی ساتھ ہوں گی۔ موتی گھاٹ یعنی موتی نکالنے والے مقام پر کیا ہو گا؟ اس کے بارے اباقہ کو کچھ معلوم نہ ہو سکا تھا۔

اس روز جزیرے کے آسمان پر ہلکے ہلکے بادل چھائے ہوئے تھے۔ موسم خوشگوار تھا۔ خادموں نے اسے جاگتے دیکھا تو جلدی سے نہاری (ناشتہ) لے آئے۔ آرام دہ مسہری

کے قریب ہی دسترخوان بچھا کر پانچ آدمیوں کا پُرتکلف کھانا اس پر چن دیا گیا۔ اباقہ کو معلوم تھا یہ پانچ آدمیوں کا کھانا اسے اکیلے ہی کھانا ہے اور رکابیاں تک صاف کرنی ہیں تاکہ رانی کا دل برا نہ ہو۔ اباقہ نے بیزاری سے کروٹ بدلی اور ایک بار پھر سو گیا۔ جب دوبارہ اس کی آنکھ کھلی ہلکی سی بارش کے بعد دھوپ نکل چکی تھی۔ سورج کافی اوپر آگیا تھا۔ اس وقت ایک خادم نے آکر اطلاع دی کہ رانی خانم تھوڑی دیر بعد آپ سے ملنے تشریف لا رہی ہیں' یہ اطلاع اباقہ کے لئے پریشان کن تھی۔ نہ صرف اس کا کھانا دسترخوان پر اسی طرح پڑا تھا بلکہ اس نے ڈھنگ کا لباس بھی نہیں پہن رکھا تھا۔ وہ جلدی سے دسترخوان پر جھپٹا اور ٹھنڈا کھانا حلق سے نیچے اتارنے لگا۔ کچھ مقوی حلوہ جات اور دودھ میں بنی ہوئی اشیاء اس نے ایک بڑے پیالے میں ڈال کر مسہری کے نیچے چھپا دیں اور دسترخوان صاف کر دیا۔ پھر وہ لباس کی طرف لپکا۔ کھینچ تان کر زرہ بکتر جیسا تکلیف دہ لباس زیب تن کیا اور چہرے کو حتی الامکان پُرسکون بنا کر رانی خانم کے انتظار میں قالین پر ٹہلنے لگا۔ اسے انتظار نہیں کرنا پڑا۔ جلد ہی رانی خانم بھڑکیلے لباس اور پورے سنگھار کے ساتھ جھومتی لچکتی اس کے کمرے میں پہنچ گئی۔ اس کے عقب میں ایک خادمہ کچھ اٹھائے ہوئے تھی۔ اباقہ کا ماتھا ٹھنکا' لیکن وہ کچھ بولا نہیں۔ رانی خانم نے والہانہ نظروں سے اباقہ کو دیکھا اور بولی۔

"مجھے لگتا ہے۔ میں صحیح طرح تمہارا خیال نہیں رکھ پا رہی۔ تم کچھ پریشان سے لگتے ہو۔ اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے بتاؤ۔"

اباقہ نے نفی میں سر ہلا کر کہا۔ "نہیں رانی خانم کچھ نہیں۔"

رانی خانم نے اپنی گول آنکھوں کو نشیلا بنا کر "دو آتشہ" کیا اور بولی۔ "مجھے سب معلوم ہے جان! آج میں نے شیخ معظم کے خاص درزی کو تمہارے لئے دو اور پوشاکیں بنانے کی ہدایت کی ہے۔ قسم سے ایسا کپڑا ہے کہ پھڑک اٹھو گے .... اور ہاں یہ میں تمہارے لئے اپنے ہاتھ سے بنا کے لائی ہوں۔" اس نے خادمہ کو اشارہ کیا اور اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا طشت دسترخوان پر رکھ دیا۔ رانی خانم نے اوپر سے جھالردار کپڑا ہٹایا۔ رکابی کسی سیاہ رنگ حلوے سے لبالب بھری ہوئی تھی۔ اس نامعقول حلوے میں کہیں کہیں سفید بادام ٹکے ہوئے تھے۔ چاروں طرف اخروٹ کا مغز بکھرا ہوا تھا۔ رانی خانم نزاکت سے بولی۔ "یہ ہمارے جزیرے کا من پسند کھانا ہے۔ اسے ہم آبولہ کہتے ہیں۔" پھر رانی خانم "آبولہ" کے اجزا اور فوائد بتانے میں مصروف ہو گئی اور اباقہ اپنی ابکائی روکنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کے پیٹ میں تو اب سانس لینے کی گنجائش بھی نہیں تھی اور رانی خانم یہ سوغات آبولہ لے آئی تھی۔ آخر وہ پھٹ پڑا۔ کئی دن سے برداشت کا جو

دامن اس نے تھام رکھا تھا ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ وہ چیخ کر بولا۔

"لے جاؤ اس آبولے کو یہاں سے لے جاؤ۔ نہیں کھانا مجھے یہ سب کچھ۔ نہیں پہننا مجھے یہ تمہارا لباس۔" پھر وہ پاؤں پٹختا ہوا باہر نکل گیا۔ رانی خانم رکابی لے کر اس کے پیچھے لپکی۔ "جان! ایک لقمہ تو اٹھاؤ' چکھو تو سہی۔" اباقہ نے اس کی ایک نہیں سنی اور محل کے بیرونی دروازے سے باہر نکل گیا۔ رانی خانم نے رکابی زمین پر پٹخی اور اباقہ کی خدمت پر مامور ملازموں پر برسنے لگی۔ خاص طور پر وہ خانساماں اور درزی کو کوس رہی تھی۔ اس خیال تھا کہ وہ دونوں "اسماعیل" کے بارے میں لاپرواہی برت رہے ہیں۔ اباقہ کا نام اسے اسماعیل ہی بتایا گیا تھا۔

اباقہ بھنایا ہوا محل سے نکلا اور جزیرے کی گلیوں میں آوارہ گردی کرنے لگا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ کوئی تنہا گوشہ دیکھ کر یہ تنگ لباس اتارے۔ ان اذیت ناک جوتوں سے چھٹکارا حاصل کرے' سر پر ٹکی ہوئی پگڑی کو ایک لنگوٹ کی طرح جسم پر باندھے اور سارا دن محل میں واپس نہ جائے۔ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ سرپٹ بھاگتے گھوڑوں کی آواز آئی۔ ایک گلی کے موڑ پر چار گھوڑوں والی گھوڑا گاڑی نمودار ہوئی۔ ایک دبلی پتلی لڑکی چابک تھامے' راسیں سنبھالے گاڑی کے اوپر کھڑی تھی۔ وہ فوراً پہچان گیا۔ یہ نبیلہ تھی۔ اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر اسے رکنے کا اشارہ کیا۔ نبیلہ نے زور سے راسیں کھینچیں اور ہانپتے ہوئے گھوڑے اباقہ کے عین سامنے رک گئے۔ "آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟" وہ بلند آواز سے بولی۔

اباقہ اسے جواب دینے کی بجائے گاڑی پر چڑھ آیا۔ اس نے عقبی حصے میں جھانکا اور بولا۔ "میرا خیال ہے گوشت اور سبزیاں لے کر آ رہی ہو۔"

"ہاں .... لیکن آپ؟"

اباقہ بولا۔ "چلو کسی تنہا جگہ تمہیں بتاتا ہوں۔"

نبیلہ خوشدلی سے بولی۔ "ٹھیک ہے۔ ایسا کریں میں یہ سامان ابا کے سپرد کر دوں پھر اسی طرح گاڑی میں چلیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔" اباقہ نے کہا۔ پھر اس نے نشست سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔

☆------☆------☆

سورج اس وقت عین سر پر تھا جب دونوں جزیرے کے شمالی ساحل پر گھوڑا گاڑی سے اترے اردگرد کوئی متنفس نہیں تھا۔ اباقہ نے اپنے جوتے اتار کر سمندر میں پھینکے۔ پھر

اپنے گریبان میں ہاتھ ڈالا اور ایک جھٹکے سے قیمتی پوشاک پھاڑ دی۔ نبیلہ کچھ حیران نظر آنے لگی۔

"یہ کیا کر رہے ہیں آپ۔" وہ کچھ ڈری ڈری سی بولی۔

"کچھ نہیں۔ مجھے یہ سب اچھا نہیں لگتا۔"

نبیلہ کو مارینا سے اسماعیل (اباقہ) کے بارے بہت کچھ معلوم ہوا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اسماعیل ایک مختلف شخص ہے اور یہ بھی کہ اس کا دل اس کی صورت سے کہیں زیادہ حسین ہے جلد ہی وہ دونوں گھل مل گئے۔ نبیلہ کی شوخ باتوں اور زندگی سے بھرپور قہقہوں نے اباقہ کی ساری کوفت دور کر دی۔ وہ ساحل کی ریت پر ننگے پاؤں چلتے دیر تک باتیں کرتے رہے۔ اس جزیرے کی باتیں، شیخ نجدی اور اس کی شیطان پرستی کی باتیں، یہاں کے نشیب و فراز اور حفاظتی انتظامات کی باتیں۔ نبیلہ نے بتایا کہ اس جزیرے پر چھوٹی اور بڑی ملا کر کل چھ کشتیاں ہیں۔ یہ کشتیاں ہمہ وقت سخت نگرانی میں رہتی ہیں۔ اس کے علاوہ اس جزیرے پر کشتی یا اس سے مشابہہ کوئی چیز بنانا سخت جرم ہے اور اس کی کم از کم سزا موت ہے۔ جزیرے کی فوج کے چوکس نگران آٹھوں پہر سمندر پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس نے بتایا کہ جزیرے کے اردگرد سمندر میں کیکڑے کی طرح کا ایک آبی جانور بکثرت پایا جاتا ہے۔ یہ آدمی کو کاٹ لے تو شدید درد کے ساتھ بخار ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات جان کے لالے پڑ جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی بغیر کشتی کے پانی میں اترنے کی جرأت نہیں کرتا۔

نبیلہ نے کئی ایسی کہانیاں سنائیں جن میں جزیرے سے فرار کی کوشش کرنے والوں کے عبرتناک انجام کا ذکر تھا۔ باتیں کرتے کرتے وہ کافی دور نکل آئے۔ یہاں اونچے نیچے ٹیلوں کا ایک سلسلہ سمندر سے ملا ہوا تھا۔ کئی قسم کے آبی پرندے سیاہ چٹانوں کے اوپر اڑتے دکھائی دے رہے تھے۔ ان کی مختلف آوازیں اس ویران ساحل پر دور تک گونج رہی تھیں۔ اباقہ اس خوبصورت منظر میں کھو گیا۔ اچانک اسے ایسی آواز آئی جیسے کہیں چھوٹی سی آبشار گر رہی ہو۔ مگر اردگرد کوئی آبشار نہیں تھی۔ پھر وہ اس آواز کی حقیقت سمجھ گیا۔ چٹان کے قریب سمندر کے پانی میں ایک بڑا بھنور پیدا ہو رہا تھا۔ چٹان کے قدموں میں کوئی بڑا سوراخ تھا اور پانی سرعت سے اس میں داخل ہو رہا تھا۔ اباقہ نے دیکھا کئی چٹانیں ایسی تھیں جن کے زیریں حصے پانی سے باہر تھے۔ ایسی چٹانوں کے نیچے سے سمندر کا پانی دور تک مٹی نکال کر لے گیا تھا۔ یہ چٹانیں کسی بھی وقت سمندر میں گر سکتی تھیں۔ خاص طور پر جس بھوری چٹان کے قدموں میں پانی جذب ہو رہا تھا وہ غیر محسوس

طور پر سمندر کی طرف جھک گئی تھی۔ اباقہ نے نبیلہ سے پوچھا۔ "ان چٹانوں کی دوسری جانب کیا ہے۔"

نبیلہ بولی۔ "ادھر ایک وسیع میدان ہے۔ یہ میدان پیالے کی شکل میں ہے اور اس میں لوگوں کے بیٹھنے کے لئے پتھریلی سیڑھیاں بنائی گئی ہیں۔ وہاں تہواروں کے موقع پر کھیل تماشے ہوتے ہیں اور ایک میلہ بھی لگتا ہے۔" اباقہ نے دیکھا ان چٹانوں پر کافی اوپر پانی کا نشان دکھائی دے رہا تھا جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ جوار بھاٹے کے دنوں میں سمندر کا پانی چڑھ جاتا ہے اور چٹانوں کا بیشتر حصہ پانی میں ڈوب جاتا ہے۔ اباقہ ان چٹانوں کو دیکھ رہا تھا جب اچانک اسے احساس ہوا کہ کوئی ان کے عقب میں موجود ہے۔ اس نے مڑ کر دیکھا کوئی چالیس پچاس قدم پیچھے ایک نوجوان کھجور کے ایک درخت تلے کھڑا تھا۔ اس سنسان جگہ اس شخص کی موجودگی سے ظاہر تھا کہ وہ ان کا پیچھا کرتا ہوا یہاں آیا ہے۔ نبیلہ نے بھی مڑ کر دیکھا۔ ایک دم اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا وہ یک ٹک نوجوان کی طرف دیکھنے لگی۔ نوجوان کی نظریں بھی نبیلہ پر تھیں۔ دونوں جیسے چند لمحوں کے لئے اباقہ کو فراموش کر چکے تھے۔ اباقہ نے دیکھا نبیلہ کی آنکھوں سے ایکا ایکی اداسی جھانکنے لگی ہے۔ قہقہے لگاتی اور مسکراتی ہوئی لڑکی اچانک نہ جانے کہاں گم ہو گئی تھی۔ پھر وہ اباقہ کی طرف مڑی اور تیزی سے بولی۔ "چلئے چلتے ہیں۔"

اباقہ کا انتظار کئے بغیر وہ آگے بڑھ گئی۔ اباقہ نے ایک بار پھر مڑ کر کھجور کے نیچے کھڑے نوجوان کو دیکھا۔ اتنی دور سے بھی اس کے چہرے پر افسردگی کے تاثرات صاف نظر آ رہے تھے۔ کچھ آگے جا کر نبیلہ ایک پتھر پر بیٹھ گئی۔ اباقہ کو لگا جیسے وہ آنکھیں پھیلا پھیلا کر آنسو پینے کی کوشش کر رہی ہے۔

"کیا بات ہے نبیلہ!" اباقہ نے پوچھا۔ "تم کچھ اداس ہو گئی ہو۔"

"کچھ نہیں۔" نبیلہ نے چہرے پر مسکراہٹ بکھیرنے کی کوشش کی۔ "کچھ بھی تو نہیں۔" اس کی آنکھوں میں چمکنے والا پانی اس کی زبان کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔

اباقہ چند لمحے اسے گھورتا رہا پھر بولا۔ "نبیلہ! میں ایک سیدھا سادا شخص ہوں اور سیدھی بات کرتا ہوں .... میرا اندازہ ہے کہ تم اس لڑکے سے محبت کرتی ہو جو کچھ دیر پہلے اس درخت کے نیچے کھڑا تھا۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں۔"

نبیلہ نے سر جھکا لیا، لیکن خاموش رہی۔ اباقہ نے محبت سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ سسک پڑی اور منہ چھپا کر رونے لگی۔ کافی دیر رونے کے بعد جب اس کے دل کا غبار ہلکا ہو گیا تو اباقہ نے کہا۔

"مجھے بتاؤ نبیلہ تم دونوں کے راستے میں کیا رکاوٹ ہے۔ شاید میں تمہاری مدد کر سکوں۔"

پہلے تو نبیلہ اسے کچھ بتانے سے گریز کرتی رہی۔ آخر اباقہ کے اصرار پر اسے مجبور ہونا پڑا۔ اس نے کہا۔ "اس کا نام سلیمان ہے۔ وہ ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھنے والا یتیم لڑکا ہے۔ میرے باپ کو کچھ نہیں دے سکتا۔ جبکہ اس جزیرے پر ہر چیز دولت کے ترازو میں تولی جاتی ہے۔ ماں باپ اولاد محبت اس جزیرے پر یہ سب بے معنی الفاظ ہیں۔ والدین اگر اپنی اولاد پر کچھ خرچ کرتے ہیں تو وہ اس کا صلہ چاہتے ہیں۔ ماں باپ اپنی بیٹیاں بیچتے ہیں اور بیٹوں کو ہوش سنبھالتے ہی اپنا بوجھ خود اٹھانا ہوتا ہے۔ میرا باپ بھی میری قیمت چاہتا ہے۔ یہ قیمت سلیمان جیسے مزدور پیشہ کے لئے بہت زیادہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے راستے جدا ہو گئے ہیں۔"

نبیلہ افسردگی سے بولی۔ "یہ غواص ہے۔ سمندر میں غوطہ لگا کر موتی نکالتا ہے' لیکن یہ موتی اس کے نہیں ہوتے' ان کے ہوتے ہیں جو اسے چند سکے مزدوری کے دیتے ہیں۔ پہلے پہل وہ کہا کرتا تھا' دیکھنا نبیلہ میں کسی روز ایک دم دولت مند ہو جاؤں گا اور تجھے بڑی شان سے اپنے گھر لے جاؤں گا .... لیکن یہ سب خواب کی باتیں تھیں۔ سلیمان کو اچھی طرح علم ہو چکا ہے کہ موتی ڈھونڈنا اور بات ہے اور موتیوں کا مالک ہونا اور بات۔ غوطہ خوری کی مزدوری سے بمشکل وہ اپنا پیٹ ہی پال سکتا ہے۔"

اباقہ غور سے نبیلہ کا چہرہ دیکھ رہا تھا بولا۔ "اگر سچ مچ تم دونوں کو اتنی دولت مل جائے کہ تم اپنی علیحدہ زندگی شروع کر دو تو؟"

نبیلہ کے چہرے پر ایک پھیکی مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ سر جھٹک کر بولی۔ "میں نے خواب دیکھنے چھوڑ دیئے ہیں۔ ان خوابوں نے مجھے بہت رلایا ہے۔ سلیمان بھی مجھے اس طرح خواب دکھایا کرتا تھا۔ کہا کرتا تھا میں موتی نکالنے کا مقابلہ جیتوں گا اور انعام حاصل کروں گا۔ یہاں جزیرے کے موتی گھاٹ پر ہر سال ماہ زمستاں میں ایک مقابلہ ہوتا ہے۔ جزیرے کے ماہر ترین غواص اس مقابلے میں حصہ لیتے ہیں جو سب سے زیادہ موتی نکالنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ اسے شیخ نجدی کی طرف سے اس کے نکالے گئے موتیوں کا چار انعام میں دیا جاتا ہے۔ سلیمان اس سے پہلے تین دفعہ مقابلے میں حصہ لے چکا ہے لیکن کامیاب نہیں ہوا۔ اس سے کہیں زیادہ ماہر غواص اس مقابلے میں موجود ہوتے ہیں۔"

اچانک اباقہ کے ذہن میں آیا کہ اگلے ہفتے شیخ نجدی اپنے مصاحبین کے ساتھ سمندر میں جا رہا ہے۔ کہیں یہ ہواخوری اس مقابلے کے سلسلے میں تو نہیں۔ جب اس نے

نبیلہ سے اس بات کا ذکر کیا تو اس نے اس خیال کی تائید کی۔ اس نے کہا یہ مقابلہ ہفتے ہی منعقد ہو رہا ہے۔ اباقہ نے پوچھا۔

"کیا اس دفعہ بھی سلیمان مقابلے میں شرکت کر رہا ہے۔"

نبیلہ نے بے دلی سے کہا۔ "شاید" اور خاموش ہو کر سمندر کی طرف دیکھنے لگی۔ جیسے اپنے حصے کے وہ موتی ڈھونڈنے کی کوشش کر رہی ہو جن سے اس کی زندگی کی خوشیاں وابستہ تھیں اور جو سمندر نے اپنے سینے میں چھپا رکھے تھے۔

☆------☆------☆

بڑی کشتی جسے بجرہ کہنا زیادہ مناسب ہو گا سب سے زیادہ خوبصورت تھی۔ سونے اور چاندی کے منقش پتروں کو جوڑ کر بنائے گئے ایک شاندار سائبان کے نیچے شیخ نجدی مزین کرسی پر موجود تھا۔ دو حسین خادمائیں اس کے دائیں بائیں کھڑی ساقی گری میں مصروف تھیں۔ شیخ کا رنگ سرخ و سفید تھا اور اس کی آنکھیں بھوری تھیں۔ سفید داڑھی اور نیم سفید مونچھوں سے جھانکتے ہوئے سرخ ہونٹ اس کے چہرے کو عجیب وجاہت بخشتے تھے۔ شیخ کی منظور نظر حسینائیں درجہ بدرجہ اس کے عقب میں آرام دہ نشستوں پر بیٹھی تھیں۔ رانی خانم بھی ان میں موجود تھی۔ دوسری کشتی میں شیخ کے مصاحبین اور قریبی عزیز موجود تھے۔ ان میں سب سے نمایاں حیثیت جعفر داراب اور اس کے دو ساتھیوں کو حاصل تھی۔ ان میں سے ایک عرب تھا اور دوسرا کوئی مصری باشندہ نظر آتا تھا۔ یہ تینوں قیمتی اور خوبصورت نشستوں پر براجمان تھے۔ یہی وہ تینوں افراد تھے جو باہر کی دنیا سے جزیرے کا واحد رابطہ تھے۔ ہر سال ماہ زمستاں میں یہ تینوں افراد جزیرے پر اترتے تھے۔ ان کے پاس شیخ نجدی اور دوسرے امراء کے لئے بیش قیمت تحائف ہوتے تھے۔ قریباً ایک ماہ یہ لوگ جزیرے پر ٹھہرتے تھے پھر موتیوں سے بھرے ہوئے صندوق اور شیخ نجدی کی ہدایات لے کر واپس چلے جاتے تھے۔

شیخ نجدی کے بجرے اور اس کشتی کے علاوہ تین اور کشتیاں سمندر میں موجود تھیں۔ یہ کشتیاں ملاحوں اور غواصوں سے بھری ہوئی تھیں۔ پانی کے رنگ سے ظاہر تھا کہ سمندر یہاں بہت گہرا ہے۔ یہی وہ موتی گھاٹ تھا جس نے اس جزیرے کو مالا مال کر رکھا تھا۔

کشتیوں کے بادبان گرے ہوئے تھے۔ ملاح انہیں ایک ہی مقام پر رکھنے کے لئے کبھی کبھار چند چپو چلا دیتے تھے۔ ایک بڑی کشتی پر غواصی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ مقابلے کے ضوابط کے مطابق تین تین غوطہ خوروں کی ٹولیاں بنائی گئی تھیں۔ ہر ٹولی تین

ہا تھی۔ اس کے بعد ان کے نکالے ہوئے موتیوں کی گنتی ہونا تھی اور نتیجے کا "مرتب" کیا جانا تھا۔ سیپیوں کو کھول کر ان سے موتی نکالنے والے اور گننے والے الگ کشتی پر سکوار تھے۔ غواص ایک دوسری کشتی پر تھے۔ یہ کل پندرہ غواص تھے یعنی غواصوں کی پانچ ٹولیاں تھیں۔ ان سب کے جسموں پر لنگوٹ تھے ہر ایک کی کمر سے رسی بندھی ہوئی تھی۔ اس رسی کا مقصد یہ تھا کہ اگر غوطے کے دوران غواص کا دم گھٹنے لگے تو وہ رسی کو حرکت دے دے اور اس کے ساتھی اسے جلدی سے اوپر کھینچ لیں۔ ہر غواص کی پشت پر ایک بڑے سمندری کچھوے کی ہڈی تھی یعنی کچھوے کا اوپر کا ٹھیکرا تھا۔ اس ہڈی کی بنی ہوئی ایک چمٹی سی ہر غواص نے اپنی ناک پر لگا رکھی تھی۔ ہر غواص کے پاس لوہے کی ایک سلاخ بھی تھی۔ یہ سلاخ سمندر کی تہہ میں جمی ہوئی سیپیاں اکھاڑنے اور پتھر ہٹانے کے کام آتی تھی۔ مقابلے میں حصہ لینے والے تمام غواصوں کے گلے سے چمڑے کے تھیلے لٹک رہے تھے۔ یہ تھیلے سیپیاں رکھنے کے لئے تھے۔

یہ تمام کے تمام غواص جزیرے کے تجربہ کار اور ماہر ترین غواص تھے۔ تادیر پانی کے نیچے رہنے کا انہیں ملکہ حاصل تھا اور بعض تو اس فن میں حیرت انگیز مہارت رکھتے تھے۔ وہ سب ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے تھے اور ایک دوسرے کی خوبیوں خامیوں سے آگاہ تھے' لیکن ان میں ایک ایسا غواص بھی تھا جو اجنبی تھا اور انہیں اس کے بارے کچھ علم نہیں تھا۔ یہ اباقہ تھا۔ اس کا عریاں بدن دھوپ میں سونے کی طرح چمک رہا تھا۔ لمبے بال ہوا میں محو رقص تھے۔ وہ سلیمان کی ٹولی میں تھا' لیکن سلیمان بھی اس کے متعلق زیادہ کچھ نہیں جانتا تھا۔ ان کی ملاقات کل ہی ہوئی تھی۔ سلیمان اپنے گھر پر تھا کہ یہ نوجوان اس سے ملنے پہنچا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ اس کا نام اسماعیل ہے اور وہ جعفر داراب کو جزیرے پر لانے والی کشتی کے ملاحوں میں سے ایک ہے۔ اس نے کہا تھا کہ وہ غواصی کے مقابلے میں شریک ہونا چاہتا ہے۔ سلیمان نے اسے پہچان لیا تھا۔ اس نے پوچھا تھا کہ نبیلہ سے اس کا کیا رشتہ ہے۔ نوجوان نے اعتماد سے کہا تھا۔ تم مجھے اس کا بھائی بھی سمجھ سکتے ہو۔ دیکھنے کو تو نوجوان صحت مند لگتا تھا لیکن وہ اسے مقابلے میں شریک کر کے اپنی کامیابی کے امکانات ختم کرنا نہیں چاہتا تھا۔ یہاں ایک سے ایک بڑھ کر ہنرمند "میدان" میں تھا' جبکہ یہ ایک نومولود نوجوان دکھائی دیتا تھا۔ غواصی کے متعلق اس کی معلومات بھی ناکافی تھیں۔

سلیمان اسے مقابلے میں شریک کرنے سے معذرت کرنا چاہتا تھا لیکن پھر اسے خیال آیا تھا کہ اس نوجوان کو اس ہستی نے بھیجا ہے جو اسے دنیا میں ہر چیز سے زیادہ عزیز ہے۔

یعنی نبیلہ نے' ہو سکتا ہے اس کی شمولیت کسی خوش بختی کا باعث بن جائے۔ اس کی زبان انکار کرتے کرتے رہ گئی تھی۔

.... اور اب جبکہ مقابلہ شروع ہونے میں چند لمحے باقی تھے سلیمان کو محسوس ہو رہا تھا کہ اس دفعہ کچھ ہونے والا ہے۔ یا تو وہ اس بری طرح شکست کھائے گا کہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہے گا' یا مقابلہ جیت جائے گا۔ وہ بار بار لمبے بالوں والے اس نوجوان کی طرف دیکھتا تھا جس نے اپنا نام اسماعیل بتایا تھا اور اسے لگتا تھا جیسے یہ شخص صرف ایک ملاح نہیں کچھ اور بھی ہے .... کوئی غیر معمولی صلاحیتوں والا شخص۔

دفعتاً شیخ نجدی کے عقب میں کھڑے دو نقارچیوں نے نقاروں پر چوٹ لگانے کے لئے اپنے ہاتھ بلند کئے .... پہلی چوٹ پر غواص کشتی کے کناروں پر پہنچ گئے۔ دوسری چوٹ پر وہ پانی میں کودنے کے لئے تیار ہوئے اور تیسری چوٹ پر انہوں نے چھلانگیں لگا دیں۔ اب سمندر پر لہروں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ دیر بعد غواص پانی سے نکلنے شروع ہوئے۔ پہلے غوطے میں اباقہ کے ہاتھ صرف پانچ سیپیاں آئیں۔ ان میں سے کسی سیپی سے موتی نہ نکل سکا۔ سلیمان نے تیس سیپیاں اکٹھی کیں اور ان سے تین موتی نکلے۔ تیسرے ساتھی کے جھولے سے پچیس سیپیاں نکلیں صرف دو موتی تھے۔ اس طرح پہلے غوطے میں وہ صرف پانچ موتی نکال سکے۔ کامیاب ترین ٹولی نے دس موتی نکالے تھے۔ سلیمان کی ٹولی کا نمبر چوتھا تھا۔ وہ خاصا مایوس نظر آ رہا تھا۔ خاص طور پر اسماعیل کی کارکردگی مایوس کن تھی۔

تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد دوسری چھلانگ کے لئے نقارہ بجا۔ غواصوں نے پھر چھلانگیں لگائیں اس دفعہ اباقہ خاصی دیر پانی کے نیچے رہا۔ اس کی نکالی ہوئی سیپیوں میں سے تین موتی نکلے۔ ان کے کل موتیوں کی تعداد تیرہ ہو گئی اور وہ مقابلے میں دوسرے نمبر پر آ گئے۔ صورت حال حوصلہ افزا تھی۔ چار سالوں میں یہ پہلا موقع تھا کہ سلیمان کی ٹولی دوسرے درجے پر آئی تھی۔ پہلے درجے پر آنے والی ٹولی کے موتی پندرہ تھے۔ تیرہ اور پندرہ میں کوئی بہت زیادہ فرق نہیں تھا۔ اگر تیسری چھلانگ میں وہ تینوں اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کرتے تو مقابلہ جیت بھی سکتے تھے۔

دوپہر کے کھانے کے بعد سب لوگوں نے کشتیوں میں ہی قیلولہ کیا اور پھر تیسری چھلانگ کی باری آئی۔ سلیمان نے اپنے دونوں ساتھیوں کی حوصلہ افزائی کی۔ دوسری ٹولیوں کے حمایتی بھی ان کی حوصلہ افزائی میں مصروف تھے۔

.... آخر نقارہ بجا اور تیسری چوٹ پر غواصوں نے دم روک کر پانی میں

چھلانگیں لگائیں۔ ان کی رسیاں پانی میں اترتی چلی گئیں اور پھر اِدھر اُدھر حرکت کرنے لگیں۔

تیسرے غوطے میں سلیمان نے پھر تین موتی حاصل کئے۔ یہ خوش آئند بات تھی۔ ابھی اس کے دونوں ساتھی پانی میں تھے اور امید تھی وہ دوسرے غوطے والی کارکردگی دوہرائیں گے۔ غواص یکے بعد دیگرے پانی سے نکل رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد اس کا تیسرا ساتھی باہر نکلا۔ وہ حتی الامکان پانی میں رہا تھا۔ اس کا رنگ سرسوں کی طرح زرد ہو رہا تھا اور ہونٹ سیاہ ہو گئے تھے۔ منہ کھول کر اس نے طویل سانسیں لیں اور پھر اپنا چرمی جھولا سیپیاں کھولنے والوں کے سامنے الٹ دیا۔ سلیمان کو اپنے اس ساتھی سے بہت سی امیدیں وابستہ تھیں لیکن جلد ہی اسے سخت مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کا یہ ساتھی اس دفعہ کوئی بھی موتی لانے میں ناکام رہا تھا۔ شکست سلیمان کی آنکھوں کے سامنے ناچنے لگی۔ ان کے موتیوں کی تعداد سولہ تھی۔ جبکہ مدمقابل ٹولی اکیس موتی نکالنے میں کامیاب رہی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا اب اسماعیل نامی وہ نوجوان کم از کم چھ موتی نکالتا تو وہ یہ مقابلہ جیت سکتے تھے اور یہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ ایک غوطے میں چھ موتی شاذ و نادر ہی نکلے تھے .... اچانک سلیمان کو اندازہ ہوا کہ تمام غواص کشتی میں پہنچ چکے ہیں سوائے اسماعیل (اباقہ) کے۔ اسے تشویش لاحق ہوئی۔ اس نے اسماعیل کی رسی کو پکڑ کر جھٹکے دیئے لیکن اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ شاید .... اس کا دم ٹوٹ چکا تھا۔ سلیمان بے قراری سے ہاتھ ملنے لگا۔ پھر اس نے ساتھیوں کو رسی کھینچنے کی ہدایت کی لیکن جب اس کے ساتھیوں نے زور لگانا چاہا تو رسی خود بخود اوپر آنے لگی۔ وہ غواص کے جسم سے علیحدہ ہو چکی تھی۔ سلیمان کا چہرہ تاریک ہو گیا۔ وہ سمجھ گیا کہ اجنبی کو کوئی حادثہ پیش آگیا ہے۔ تمام چہروں پر تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ گزرنے والا ہر لمحہ انہیں اس بات کا یقین دلا رہا تھا کہ غواص زندہ نہیں اور وہ یہ یقین کرنے میں حق بجانب تھے۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ پانی میں کودنے والا کون ہے؟ وہ اباقہ تھا۔ کوہ الطائی کے جان لیوا موسموں کا پالا ہوا۔ حبس دم کا ماہر۔ مچھلی کی طرح پانی کے نیچے تیرنے والا اور برف کی قبر میں زندہ دفن ہونے والا۔ ہر چہرہ فکرمند تھا۔ رانی خانم سب سے زیادہ بے قرار تھی۔ وہ اس وقت کو کوس رہی تھی جب اس نے اپنے اجنبی محبوب کو غواصی کی اجازت دی تھی۔ اس کی نگاہیں سمندر کی ہموار سطح پر بے چینی سے متحرک تھیں .... اچانک ہلچل پیدا ہوئی اور اباقہ پانی سے نمودار ہوا۔ کسی کو اپنی نگاہ پر یقین نہیں آیا۔ یہ کسی عام انسان کے بس کا روگ نہیں تھا۔ اباقہ کے لمبے بال اس کی گردن اور چہرے سے چپکے ہوئے تھے۔ اس نے سر کو ایک

زوردار جھٹکا دیا۔ منہ کھول کر چند گہرے سانس لئے اور تیرتا ہوا کشتیوں کی طرف بڑھا۔ اس کے گلے سے لٹکا ہوا چرمی تھیلا سیپیوں سے بھرا ہوا تھا۔ کشتی پر پہنچ کر اس نے یہ سیپیاں گنتی کرنے والوں کے سامنے الٹ دیں۔ موتی نکالنے والوں نے سیپیوں کو کھولا۔ اندر کے گوشت کو تیز دھار چھریوں سے کاٹنا شروع کیا۔ دل تیزی سے دھڑک رہے تھے۔ تمام نگاہیں موتی نکالنے والوں پر لگی تھیں۔ موتی نکلنے شروع ہوئے۔ ایک .... دو .... تین .... چار اور پھر پانچ۔ مقابلہ برابر ہو چکا تھا۔ اب آخری سیپی باقی تھی اور آخری موتی کی ضرورت تھی۔ موتی نکالنے والے نے لرزاں ہاتھوں سے سیپی کو کھولا۔ گوشت کاٹا .... ایک شور بلند ہوا۔ سلیمان اور اس کے ہمنوا اٹھ کر ناچنے لگے۔ سیپی میں گوہر موجود تھا۔ نقارے زور زور سے بجنے لگے۔ کچھ ملاحوں نے سلیمان کو کندھوں پر اٹھا لیا۔ سلیمان جیت چکا تھا۔ قواعد کے مطابق اب اسے نکالے گئے موتیوں کا چار گنا انعام میں دیا جانا تھا۔

☆------☆------☆

اباقہ' مارینا اور یورق کے لئے اگلے چند روز نہایت پُرلطف تھے۔ وہ نبیلہ اور سلیمان کی شادی کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ سلطان جلال الدین بھی اس شادی میں دلچسپی لے رہا تھا۔ اسی کے کہنے پر سلیمان نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ نبیلہ کو مسلمانوں کے انداز میں بیاہ کر لائے گا۔ ورنہ اس جزیرے میں تو صرف عورت مرد کی رضامندی ہی ازدواجی تعلقات کے لئے کافی سمجھی جاتی تھی۔

ان دنوں میں نبیلہ کے ساتھ مارینا کی گہری دوستی ہو گئی تھی اور وہ ایک سہیلی کی حیثیت سے نبیلہ کی شادی کی تیاری کر رہی تھی۔ وہ تو چاہتی تھی کہ کچھ دنوں کے لئے نبیلہ کے گھر ہی چلی جائے مگر نبیلہ نے اسے منع کر دیا تھا۔ اس نے کہا تھا۔ "آپا' میرا کوئی گھر نہیں۔ جہاں میں رہتی ہوں وہ ایک غلاظت خانہ ہے۔ فحبہ عورتوں کے فاحشہ قہقہے وہاں کی فضا کو آلودہ رکھتے ہیں۔ تمہارے جیسی پاکیزہ اور معصوم بہن پر تو اس چاردیواری کا سایہ بھی نہیں پڑنا چاہئے۔"

جوں جوں شادی کے دن قریب آ رہے تھے۔ ان کے جوش و خروش میں اضافہ ہو رہا تھا۔ مارینا دو خادماؤں کے ساتھ سارا دن عروسی کپڑے تیار کرنے میں مصروف رہتی تھی۔ کبھی کبھی اباقہ بھی رانی خانم سے جان چھڑا کر چلا آتا تھا۔ ہر روز وہ ایک سے ایک بڑھ کر نئے اور "اذیت ناک" لباس میں ملبوس ہوتا تھا۔ مارینا اسے دیکھ کر چپکے چپکے مسکراتی تھی لیکن اس کی طرح کسی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ یہ سب سردار یورق کی

شرارت ہے‘ اسی کے کہنے پر رانی خانم اباقہ کو ”آبولے“ کھلا رہی ہے اور پوشاکیں پہنا رہی ہے۔ سلیمان ان کے ساتھ ہی رہ رہا تھا۔ یورق اور مارینا اس سے چھیڑ چھاڑ جاری رکھتے تھے۔ اس روز بھی ایسی ہی محفل جمی ہوئی تھی۔ سلیمان ایک منقش چوبی ڈبہ لئے اندر داخل ہوا۔ اس ڈبے میں وہ موتی تھے جو اسے انعام میں حاصل ہوئے تھے۔ ان کی تعداد سو سے اوپر تھی اور مالیت ہزاروں دینار تک پہنچی تھی۔ ان میں چند نہایت اعلیٰ قسم کے موتی بھی تھے۔ سلیمان نے یہ ڈبہ مارینا کی طرف بڑھا دیا اور کہا کہ وہ اسے حفاظت سے رکھ لے۔ شادی کے روز انہیں یہ ڈبہ نبیلہ کے باپ کو پیش کرنا تھا۔ ابھی ڈبہ سلیمان کے ہاتھ میں ہی تھا کہ بیرونی دروازہ کھلا اور نبیلہ اندر داخل ہوئی۔ اس کے بال بکھرے تھے اور آنکھیں رو رو کر سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ سب اسے دیکھ کر حیران رہ گئے۔ سلیمان نے بے ساختہ پوچھا۔

”کیا ہوا نبیلہ؟“

نبیلہ روتے ہوئے بولی۔ ”مر گئی تمہارے لئے نبیلہ۔ بھول کیوں نہیں جاتے مجھے۔ کیوں ہلاک کر رہے ہو خود کو بھی اور مجھے بھی۔ ہمارا ملن کبھی نہیں ہو سکتا۔ کبھی نہیں ہو گا۔“

سلیمان حیران چہرہ لئے نبیلہ کے قریب پہنچا اور بولا۔ ”نبیلہ یہ کیا کہہ رہی ہو۔ شاید تمہارے باپ نے کچھ کہا ہے .... لیکن وہ کون ہوتا ہے اب بولنے والا۔ میں اسے منہ مانگی رقم دے رہا ہوں۔“ سلیمان کا اشارہ موتیوں کے ڈبے کی طرف تھا۔ نبیلہ نے نہایت دکھ کے ساتھ ڈبے کو ہاتھ مارا۔ وہ سلیمان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ تمام موتی نکل کر فرش پر بکھر گئے۔ نبیلہ چیخ کر بولی۔

”کچھ فائدہ نہیں تمہارے ان چند موتیوں کا کچھ قیمت نہیں ان کی .... میرے باپ کو اس سے دس گنا دینے والے موجود ہیں اور دے رہے ہیں۔ وہ کیوں مجھے تمہارے سپرد کرے گا۔ کیوں؟“

وہ سب سکتے کے عالم میں نبیلہ کی طرف دیکھ رہے تھے .... آخر اس گمبھیر خاموشی کو سلطان جلال کی آواز نے توڑا۔ ”تو اس کا مطلب ہے‘ تمہارا باپ وعدہ خلافی کر رہا ہے۔“

نبیلہ روتے ہوئے بولی۔ ”آپ کچھ نہیں جانتے یہاں کے بارے میں۔ شیطان کے اس شہر میں آپ اجنبی ہیں۔ یہاں وعدوں کا پاس کرنے والے آپ کو بہت کم ملیں گے۔ بااصول‘ راست گو اور بامروت لوگوں کو آپ کی دنیا میں اچھا سمجھا جاتا ہو گا۔ یہاں انہیں

بے وقوف گردانا جاتا ہے۔ یہاں ہر سوچ اور ہر عمل کے پیچھے ایک ہی طاقت کا ہاتھ ہے اور وہ ہے دولت کی طاقت.........“

یورق نے غصے سے کہا۔ ”ہمیں بتا کون ہے وہ شخص جو تیرے باپ کو دولت کی پیشکش کر رہا ہے۔“

اس بات کا جواب نبیلہ کی بجائے سلیمان نے دیا۔ اس نے کہا۔ ”میں جانتا ہوں اسے۔ یہ وہی مردود عمرو ہے۔ وہ شیخ نجدی کا بھتیجا ہے۔ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے۔ شیخ نجدی کے بھروسے پر کہہ رہا ہے۔“

اباقہ سخت لہجے میں بولا۔ ”اگر اسے اپنی دولت کا غرور ہے تو ہم یہ غرور توڑ دیں گے۔ وہ تیرے باپ کو دس گناہ دولت دے رہا ہے تو ہم بیس گنا دیں گے۔ اگر وہ بیس گنا دے گا تو ہم چالیس گنا دیں گے۔ دیکھیں گے وہ کہاں تک چلتا ہے۔“

سلیمان نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔ ”وہ بہت آگے تک چل سکتا ہے برادر۔ کیونکہ یہ اس کی اپنی دولت نہیں اور شیخ کے خزانے جزیرے کے محنت کش غلاموں کے خون پسینے سے بھرے ہوئے ہیں۔ اب اس مسئلے کا ایک ہی حل ہے .... عمرو کی موت۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ پیدا کرنے والے کی قسم اب میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ سلیمان کی آنکھوں سے چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں اور ہاتھ تیزی سے تلوار کے قبضے پر گردش کر رہا تھا۔ یوں لگتا تھا وہ ابھی خطرناک ارادے سے باہر نکل جائے گا۔

سلطان جلال جو مسہری پر ٹیک لگائے بیٹھا تھا‘ بارعب آواز میں بولا۔ ”سلیمان میرے پاس آؤ۔“ سلیمان نے گھوم کر سلطان جلال کی طرف دیکھا پھر دھیمے قدموں سے چلتا مسہری کے بازو پر بیٹھ گیا۔ سلطان نے مارینا سے کہا کہ وہ گھر کا بیرونی دروازہ بند کر دے۔ مارینا نے دروازہ بند کر دیا تو سلطان نے سلیمان کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا۔

”فرزند! تمہارا یہ فیصلہ جذباتی ہے۔ میری بات توجہ سے سنو۔ عمرو ایک شخص کا نام نہیں۔ یہ ایک نظام کا نام ہے۔ یہ شیطانی نظام پورے جزیرے پر مسلط ہے۔ اس نظام سے اکیلے ٹکراؤ گے تو شکست کھاؤ گے۔ زندگی جیسی انمول شے سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔ جو تم چاہتے ہو ہم بھی وہی چاہتے ہیں۔ یعنی عمرو اور اس کے پشت پناہوں کی موت‘ لیکن ہمیں یہ کام ایسے طریقے سے کرنا ہے کہ شیطانی قوتوں پر بھرپور ضرب لگے۔ ہمیں برائی کے اس تناور درخت پر کلہاڑے نہیں چلانے‘ اسے جڑوں سے اکھاڑ کر خلیج فارس میں پھینک دینا ہے اور اس عظیم مقصد کے حصول کے لئے صبر و تحمل اور غور و فکر کی ضرورت ہے۔“

سلطان جلال بہت دیر تک سلیمان اور نبیلہ کو سمجھاتا رہا۔ بالواسطہ وہ اباقہ‘ مارینا اور

یورق کی بھی اصلاح کر رہا تھا۔ انہیں بتا رہا تھا کہ ان کا مقصد کتنا عظیم ہے اور اس کے لئے انہیں کیسی قربانیوں کے لئے تیار رہنا چاہئے .... کچھ دیر بعد جب نبیلہ ان کے ہاں سے رخصت ہوئی تو اس کے دل کا بوجھ بہت حد تک ہلکا ہو چکا تھا۔ دوسری طرف سلیمان کے چہرے پر بھی ایک نئے عزم کی روشنی نظر آ رہی تھی۔ اسے یقین ہو چلا تھا کہ بہت جلد اس جزیرے پر ایک ایسا انقلاب آنے والا ہے جو شیخ نجدی اور اس کے ظلم و ستم کا خاتمہ کر ڈالے گا۔ پھر نہ نبیلہ کے باپ جیسے اولاد فروش رہیں گے اور نہ عمرو جیسے عیاش اور حریص خریدار۔ پھر دو پیار کرنے والوں کے درمیان مال و زر کی کوئی دیوار باقی نہیں رہے گی۔

☆------☆------☆

شام کا وقت تھا جزیرے پر تیز بارش ہو رہی تھی۔ سلطان جلال الدین کی حالت اب بہتر تھی۔ اس نے بستر سے نیچے اتر کر نماز ادا کی۔ پھر دریچہ گلی میں کھول کر گلی میں بارش کا نظارہ کرنے لگا۔ جب وہ نماز پڑھ رہا تھا ماریتا ایک پیالہ تپائی پر رکھ گئی تھی۔ اس میں سبزیوں کا شوربہ تھا۔ سلطان جلال نے پیالہ اٹھایا اور نیم گرم محلول کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لینے لگا۔ اس وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ ماریتا نے جا کر دروازہ کھولا۔ سلیمان ایک اجنبی کے ساتھ اندر چلا آیا۔ دونوں نے بارش سے بچنے کے لئے سر پر مومی چادریں اوڑھ رکھی تھیں۔ پھر بھی ان کے لباس کہیں کہیں سے بھیگ چکے تھے۔ اجنبی ایک لمبی داڑھی اور خمدار ناک والا بوڑھا شخص تھا۔ بڑی بڑی آنکھوں سے گزرے ماہ و سال کا تجربہ جھانک رہا تھا۔ سلیمان نے بوڑھے کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

"سلطان! ان کا نام رحمان ہے۔ لوگ انہیں رحمانی بابا کہتے ہیں۔ جزیرے کے شمالی علاقے میں ان کی دکان ہے۔ یہ نہایت اعلیٰ قسم کی تلواریں تیار کرتے ہیں۔"

سلطان نے رحمانی بابا کے ساتھ مصافحہ کیا۔ سلیمان نے انکشاف کرتے ہوئے کہا۔

"سلطان معظم! رحمانی بابا چند سال پہلے تک جزیرے کی فوج کے سالار اعلیٰ رہے ہیں۔ اب یہ اپنے فرائض سے سبکدوش ہو چکے ہیں لیکن فوج کے حلقوں میں ابھی تک انہیں خاصا اثر و رسوخ حاصل ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ شیخ نجدی اور اس کی شیطان پرستی کے سخت مخالف ہیں۔"

رحمانی بابا نے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "فوج سے میری سبکدوشی کی ایک وجہ یہ مخالفت بھی تھی۔"

سلطان جلال کے چہرے پر دبا دبا جوش نظر آنے لگا۔ سلیمان نے رحمانی بابا تک رسائی

حاصل کر کے ایک اہم کامیابی حاصل کی تھی۔ اس نے سلیمان سے پوچھا۔ "کیا تم نے انہیں ہمارے متعلق بتا دیا ہے۔"

سلیمان نے اقرار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "سلطان میں رحمانی بابا پر ہر طرح کا اعتماد کر سکتا ہوں۔"

رحمانی بابا نے اپنی گونجدار آواز میں کہا۔ "سلطان معظم میں آپ سے ملاقات کو اپنی خوش نصیبی تصور کرتا ہوں۔ جب آپ نوجوان تھے اس وقت میں خوارزم میں ہی تھا۔ شیخ نجدی اس وقت صرف فیروزالدین تھا۔ میں فیروزالدین کی فوج میں یک ہزاری سردار تھا۔ میرے دل میں آپ کو دیکھنے کی خواہش تھی لیکن افسوس یہ خواہش کبھی پوری نہ ہوئی۔ پھر ایک روز فیروزالدین آپ کے خوف سے پایہ تخت چھوڑ کر بھاگ نکلا۔ جو فوجی دستے اس کے ساتھ تھے ان میں میرا دستہ بھی شامل تھا۔ یہاں پہنچ کر ہم بیرونی دنیا سے بالکل کٹ گئے اور کچھ خبر نہ رہی کہ باہر کیا ہوا ہے۔"

جلد ہی سلطان جلال' رحمانی بابا' سلیمان اور سردار یورق کھل مل کر باتیں کرنے لگے۔ انہیں فوراً اندازہ ہو گیا کہ رحمانی بابا ان کے لئے گراں قدر خدمات انجام دے سکتا ہے۔ درحقیقت اس کے اندر خود بھی شیخ نجدی اور اس کے حواریوں کے لئے نفرت کا لاوا پک رہا تھا۔ وہ بدی کی اس مملکت کو ختم کرنے کی شدید خواہش رکھتا تھا۔ جب سلطان جلال نے اسے بتایا کہ شیخ نجدی اس جزیرے میں بیٹھ کر عالم اسلام کے خلاف کیسی کیسی سازشیں کر رہا ہے اور مسلمانوں کو کس کس طرح نقصان پہنچا رہا ہے تو رحمانی بابا کا غیض و غضب دوگنا ہو گیا۔ اس کے سینے میں دہکنے والی آگ کی تپش وہ سب محسوس کر رہے تھے۔

رحمانی بابا نے کہا۔ "سلطان معظم میں کسی ایسے ہی معجزے کا منتظر تھا۔ آپ اور آپ کے ساتھیوں سے مل کر میں خود کو بے انتہا طاقتور محسوس کر رہا ہوں۔ فوج کے بہت سے سردار دل و جان سے میری عزت کرتے ہیں۔ وہ میری ایک آواز پر اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیں گے۔ آپ حکم کریں مجھے کیا کرنا ہے اور کب کرنا ہے؟"

سلطان جلال الدین نے رحمانی بابا سے مختلف سوالات پوچھے۔ پھر وہ سب سرگوشیوں میں باتیں کرنے لگے۔ باہر کالے بادلوں میں بجلی چمک رہی تھی اور اندر .... ایک منصوبہ پرورش پا رہا تھا۔

☆------☆------☆

چند روز کے اندر اندر انہیں رحمانی بابا کی بے انتہا اہمیت کا احساس ہو گیا۔ نہایت

راز داری سے یکے بعد دیگرے فوج کے تین اعلیٰ سردار سلطان جلال الدین سے ملاقات کر چکے تھے۔ انہوں نے رحمانی بابا کے سامنے سلطان جلال سے اپنی مکمل وفاداری کا اظہار کیا تھا۔ یہ ایک بہت بڑی کامیابی تھی۔ سلطان جلال الدین اور اس کے ساتھی اسے تائید غیبی ہی قرار دے سکتے تھے۔ فوج کے ان افسروں اور سرداروں نے نہ صرف اپنی وفاداریوں کا یقین دلایا تھا بلکہ شیخ نجدی کے خلاف محاذ آرائی کے لئے نہایت قیمتی تجاویز بھی پیش کی تھیں۔

دوسری طرف سلیمان بھی زبردست سرگرمی دکھا رہا تھا۔ جزیرے پر موجود وہ لوگ جو غلاموں کی حیثیت رکھتے تھے اور جن سے نہایت معمولی معاوضے پر مشقت طلب کام لئے جاتے تھے دو علیحدہ بستیوں میں مقیم تھے۔ ان میں سے بہت سے ایسے تھے جن کا دم خم ہمیشہ کے لئے ختم ہو چکا تھا۔ وہ شیخ نجدی کے خلاف تلوار اٹھانے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے، لیکن کچھ میں جذبۂ حریت کی چنگاریاں باقی تھیں۔ سلیمان نے نہایت کامیابی کے ساتھ ایسے لوگوں سے رابطہ قائم کیا تھا اور اسے امید تھی کہ وہ بوقت جنگ چار پانچ سو افراد کا ایک دستہ میدان میں لا سکے گا۔

سارے کام نہایت تیز رفتاری اور خوش اسلوبی سے انجام پاتے چلے گئے۔ رحمانی بابا کے کاریگروں نے دن رات کام کر کے تلواروں کے ڈھیر لگا دیئے۔ سلیمان نے رازداری برقرار رکھتے ہوئے محنت کشوں کو آمادۂ پیکار کر لیا۔ سلطان جلال نے فوج کے سالاروں سے مل کر اس معرکے کی منصوبہ بندی مکمل کر لی۔ طے یہ ہوا کہ اب اس کام میں دیر نہ کی جائے۔ یہ راز سینہ بہ سینہ پھیل رہا تھا اور خطرہ تھا کہ جلد ہی فاش ہو جائے گا۔ غور و فکر کے بعد حملے کے لئے چاند کی پچیس تاریخ مقرر کی گئی۔ سلطان نے کریم خان نامی ایک ہزاروی سردار کو ہدایت کی کہ پچیس تاریخ کو صبح کے وقت جب شیخ نجدی اور جزیرے کے بیشتر باشندے طلوع آفتاب کے وقت آفتاب کے سامنے "شیطانی نماز" ادا کرنے میں مصروف ہوں، محل اور اردگرد کے علاقے پر قبضہ کر لیا جائے۔ ایک دوسرے سالار کو شہر میں امن و امان برقرار رکھنے کی ذمے داری سونپی گئی اور ایک سالار کو ہدایت کی گئی کہ حملے کے وقت وہ چھاؤنی سے شہر کو آنے والے راستوں کی ناکہ بندی کر لے تاکہ اگر چھاؤنی میں موجود شیخ نجدی کے حامی دستے مزاحمت کا سوچیں تو باہر کے دستوں سے ان کا رابطہ قائم نہ ہو سکے۔ مکمل منصوبہ بندی کے بعد سلطان جلال الدین اور اس کے ساتھی آخری تیاریوں میں مصروف ہو گئے لیکن چوبیس تاریخ کو انہیں اپنا پورا لائحہ عمل بدلنا پڑا۔ وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ جزیرے کے اندر ہی اندر پلنے والے اس طوفان کی خبر انتظامیہ کو ہو

گئی۔ اس وقت سلطان جلال، یورق اور رحمانی بابا گھر کے عقبی کمرے میں بیٹھے صلاح مشورے کر رہے تھے۔ دفعتاً دروازہ کھلا اور اباقہ آندھی و طوفان کی طرح اندر داخل ہوا۔ وہ رانی خانم کے محل سے آیا تھا۔ اس لئے عجیب ہیئت کذائی میں تھا۔ جسم پر ایک شوخ و شنگ لباس تھا۔ ایک بڑا سا عمامہ جو بھاگنے سے کھل گیا تھا اس کی گردن میں لٹک رہا تھا۔ جوتا وہ کہیں راستے میں پھینک آیا تھا۔ اس نے سلطان کے سامنے پہنچ کر ادب سے سلام کیا اور ہانپتے ہوئے بولا۔

"سلطان، مجھے محل سے پتہ چلا ہے کہ شیخ کے جاسوسوں نے سلیمان کے چند ساتھیوں کو گرفتار کر لیا ہے اور خود سلیمان بڑی مشکل سے جان بچا کر نکلا ہے۔ گرفتار شدہ افراد کو عقوبت خانے لے جایا گیا ہے جہاں ان سے سب کچھ اگلوا لیا جائے گا۔"

یہ ایک پریشان کن خبر تھی۔ اگر سلیمان کے ساتھی راز فاش کر دیتے اور جیسا کہ خدشہ تھا، وہ کر دیں گے تو تھوڑی ہی دیر میں جزیرے کے طول و عرض میں شیخ نجدی کی وفادار فوج حرکت میں آ سکتی تھی۔ اس کا مطلب تھا تلواریں اٹھنے سے پہلے ہی ہاتھ کاٹ دیئے جائیں گے اور تیر چلنے سے پہلے کمانیں توڑ دی جائیں گی۔ سلطان جلال نے فوراً رحمانی بابا کو ہدایت کی کہ وہ اپنے وفادار دستوں کو حرکت میں لے آئے۔

☆------☆------☆

جزیرے کے شمالی ساحل پر پہاڑیوں کے درمیان ایک بڑا لشکر جمع ہو رہا تھا۔ رحمانی بابا کے وفادار دستے اپنے اپنے سرداروں کے ساتھ شہر سے نکل آئے تھے اور اب ان پہاڑیوں میں اکٹھے ہو رہے تھے۔ دوسری طرف سلیمان نے بھی دانشمندی کا ثبوت دیا تھا۔ اس نے محنت کشوں کی بستی سے اپنے وفادار ساتھیوں کو نکال لیا تھا۔ افراتفری کی وجہ سے وہ چار پانچ سو کا دستہ تو نہیں لا سکا تھا لیکن دو ڈھائی سو افراد اس کے ساتھ موجود تھے۔ شیخ نجدی سے بغاوت کرنے والے سپاہی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں مسلسل چلے آ رہے تھے۔ سلطان جلال، رحمانی بابا کے ساتھ ایک ٹیلے پر کھڑا تھا۔ اس کی آنکھوں میں امید کی روشنی اور تشکر کی چمک دکھائی دے رہی تھی۔ خدا نے معمولی کوشش سے اسے اتنی بڑی کامیابی دی تھی۔ اس کے عقب میں ایک لشکر جری اکٹھا ہو چکا تھا اور وہ شخص جو برسوں سے اس جزیرے کا فرمانروا تھا اپنے تخت کو ڈانواں ڈول دیکھ رہا تھا۔

شیخ نجدی کی وفادار فوج نے فوری طور پر حملہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ لہٰذا وہ رات سلطان جلال اور رحمانی بابا نے فوج میں گشت کرتے گزار دی۔ جنگ کی منصوبہ بندی کی گئی۔ مختلف دستوں کی تشکیل اور تنظیم کی گئی۔ سلیمان کے ساتھ پہنچنے والے نہتے

محنت کشوں کو تلواریں اور دیگر ہتھیار فراہم کیئے گئے۔ میدان جنگ کا نقشہ بنایا گیا۔ سالار کریم خاں کو میمنہ (دائیں بازو) کا سالار بنایا گیا۔ قلب کی کمان خود سلطان نے اپنے ہاتھوں میں لی۔ محنت کشوں کے دستے کو چونکہ کسی ایسے سالار کی ضرورت تھی جو ان کے حوصلے جوان رکھے اور اپنی ولولہ انگیز قیادت سے ان کی عسکری مہارت کی کمی پوری کر دے' اس لئے اباقہ کو ان کی قیادت سونپی گئی۔ شہر چھوڑنے والے سپاہیوں اور محنت کشوں میں سے بہت سوں کے اہل و عیال بھی ان کے ساتھ تھے۔ ان کے لئے فوج کے عقب میں خیمے لگا دیئے گئے۔ ماریتا بھی وہیں موجود تھی۔ اس نے کچھ دوسری عورتوں کو اپنے ساتھ ملا لیا تھا اور وہ سب میدان جنگ میں سپاہیوں کی خدمت کے لئے کمربستہ نظر آتی تھیں۔

اگلے روز علی الصبح انہیں شیخ نجدی کی فوج نظر آ گئی۔ اونچی نیچی زمین پر گھوڑوں کی ایک قطار اور اس کے پس منظر میں شیطان کی شبیہہ والے سیاہ پرچم اور نیزے دکھائی دے رہے تھے۔ عقب میں گرد کے بادل بھی نظر آ رہے تھے۔ جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ ابھی دستوں کی آمد کا سلسلہ جاری ہے۔ شیخ نجدی کی فوج کا میسرہ سمندر کی طرف تھا۔ شہر اس کی پشت پر تھا۔ نجدی کی فوج کو اپنے مقابل دیکھ کر سلطان کی رگوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی۔ برسوں سے جو تمنا اس کے سینے میں پل رہی تھی۔ اس کے پورا ہونے کا وقت قریب آ گیا تھا۔ فیروزالدین عرف شیخ نجدی اس کی تلوار کے سامنے آنے والا تھا۔

نماز چاشت ادا کرنے کے بعد سلطان جلال نے فوج کی صف بندی کی۔ پھر وہ ایک ٹیلے پر کھڑا ہو گیا اور عریاں تلوار اپنے ہاتھ میں لے لی۔ ساتھیوں کے حوصلے بڑھانے کے لئے اس نے ایک ولولہ انگیز تقریر کی۔ یہی وہ وقت تھا جب شیخ نجدی کی فوج نے حرکت شروع کی۔ جزیرے کا شیطان پرست فرمانروا اپنی شیطانی طاقت کے ساتھ ان کی طرف بڑھ رہا تھا............ دونوں فوجیں مقابل پہنچ کر ٹھہر گئیں۔ تلواریں سنہری دھوپ میں چمک رہی تھیں۔ نیزوں کے پھل اور تیروں کی انیاں شفاف تھیں .... لیکن انہیں زیادہ دیر شفاف اور چمکدار نہیں رہنا تھا جسموں میں دوڑتا ہوا خون انہیں رنگین کرنے کے لئے رگوں سے اچھلنے والا تھا۔ پھر طبل جنگ بجا............ زمین گھوڑوں کی ٹاپوں سے دہلی۔ گرد و غبار کا ایک طوفان اٹھا اور اس طوفان میں ایک آواز رعد کی طرح کڑک گئی۔ یہ خوارزم کے مرد مجاہد سلطان جلال کی آواز تھی۔ "نعرۂ تکبیر اللہ اکبر"۔

ہتھیار چھلکے' تلواریں ٹکرائیں' گھوڑے ہنہنائے' زخمیوں کی چیخیں بلند ہوئیں اور حق و باطل پوری قوت سے معرکہ آرا ہو گئے۔ سلطان کی فوج تعداد میں کہیں کم تھی' لیکن اس کی قیادت ایسے لوگ کر رہے تھے جو تلواروں کے سائے میں موت تلاش کرنے

کے عادی تھے۔ شیر خوارزم جلال الدین' سردار یورق' رحمانی بابا' اباقہ' میدان جنگ میں ہر طرف اور ہر سمت وہی دکھائی دے رہے تھے۔ اِدھر پلٹے اُدھر جھپٹے۔ اِدھر ڈوبے اُدھر طلوع ہوئے۔ حالتِ جنگ میں جب ان کی نظر ایک دوسرے پر پڑتی تھی تو ان کے حوصلے سوا ہو جاتے تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ اپنی فوج کو جوش کی اس منزل تک لے گئے جہاں سر ہتھیلیوں پر رکھ لئے جاتے ہیں اور موت حقیر نظر آنے لگتی ہے۔

سہ پہر تک دونوں فوجوں میں گھمسان کی جنگ ہوئی۔ اس کے بعد شام تک وقفے وقفے سے جھڑپیں ہوتی رہیں۔ جب اندھیرا پھیلنے لگا تو دونوں فوجیں پیچھے ہٹ گئیں۔ میدان کارزار کام آنے والوں کی لاشوں سے بھرا ہوا تھا۔ سلطان جلال کی فوج نے شیخ نجدی کے لشکر جرار کو شدید نقصان پہنچایا تھا۔ شام کی نماز ادا کرنے کے بعد سلطان جلال نے سرکردہ سالاروں کے ساتھ پڑاؤ کا دورہ کیا۔ زخمی ہونے والوں کو حتی المقدور طبی امداد دی جا رہی تھی۔ زمین کے ایک ہموار قطعے کو سائبان لگا کر علاج گاہ کی شکل دے دی گئی تھی۔ طبی امداد فراہم کرنے والوں میں سلطان جلال کو ماریتا بھی نظر آئی۔ اسے اپنے تن من کی ہوش نہیں تھی۔ اس کے ہاتھ خون میں لتھڑے تھے اور بال پریشان تھے۔ وہ بڑے عزم اور حوصلے کے ساتھ زخمیوں کی مرہم پٹی میں مصروف تھی۔ سلطان جلال اس کے قریب کھڑا اسے محبت بھری نظروں سے دیکھتا رہا لیکن ماریتا کو بالکل علم نہیں ہوا۔

امید تھی کہ اگلے روز دونوں فوجوں میں فیصلہ کن معرکہ ہو گا۔ شیخ نجدی کی فوج کے حوصلے پست ہو چکے تھے اور اس کا اندازہ انہیں شام کو ہی ہو گیا تھا۔ بس لرزاں دیواروں کو ایک اور دھکے کی ضرورت تھی۔ سلطان جلال' اباقہ' یورق اور رحمانی بابا رات دیر تک جاگتے رہے۔ پھر وہ کچھ دیر کے لئے لیٹ گئے۔ آخری معرکے سے پہلے تازہ دم ہونا ضروری تھا۔ صبح نسب سے پہلے سلطان جلال کی آنکھ کھلی۔ دفعتاً اس کی چھٹی حس نے اسے کسی تبدیلی کا احساس دلایا اس نے خیمے کا پردہ اٹھایا اور باہر نکل آیا۔ یہ دیکھ کر وہ سکتے میں رہ گیا کہ جس جگہ رات کریم خاں کی فوج کا پڑاؤ تھا وہ اب خالی پڑی ہے کہیں کہیں اکا دکا خیمے اور بکھرا ہوا بے کار سامان پڑا تھا۔ ایک ہیولا تیزی سے بھاگا چلا آ رہا تھا۔ وہ قریب پہنچا تو سلطان نے دیکھا کہ وہ سلیمان ہے۔

"غضب ہو گیا سلطان معظم۔" اس نے ہراساں لہجے میں کہا۔ "کریم خاں واپس چلا گیا۔ وہ اپنے تمام سپاہی بھی ساتھ لے گیا ہے۔"

ان کے ساتھ آنے والے سپاہیوں میں بیشتر کریم خاں ہی کے تھے۔ سلطان نے مایوس نظروں سے پڑاؤ کا جائزہ لیا اور اس کے ہونٹوں سے بے ساختہ "انا للہ و انا الیہ

راجعون" کے الفاظ نکل گئے۔ "یہ کب ہوا سلیمان؟" اس نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔

"رات کسی پہر سلطان معظم' ہم گہری نیند میں تھے۔ ان لوگوں نے خاموشی سے پڑاؤ اٹھایا اور کوچ کر گئے۔"

اس وقت چند اور آدمی بھاگتے ہوئے سلطان جلال کے پاس پہنچے۔ انہوں نے بتایا کہ فوج کے باقی دستے بھی کریم خان کے عقب میں جا رہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ہم اب شیخ نجدی کے خلاف لڑ کر خودکشی نہیں کر سکتے۔"

سلیمان زور سے بولا۔ "روکو ان کو۔ کسی طرح انہیں روکنے کی کوشش کرو۔" پھر وہ سلطان سے مخاطب ہوا۔ "سلطان میرا خیال ہے وہ بددل ہو گئے ہیں۔ آپ انہیں سمجھانے کی کوشش کریں۔" سلطان کے چہرے پر افسردگی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ اس نے گھمبیر لہجے میں کہا۔ "سلیمان! جنگیں اس طرح نہیں لڑی جاتیں اور نہ جیتی جاتی ہیں۔ سپاہی اسی وقت مرجاتا ہے جب اس کا حوصلہ مرتا ہے جو جا رہے ہیں انہیں جانے دو۔"

اتنی دیر میں سردار یورق' اباقہ اور رحمانی بابا بھی باہر نکل آئے تھے۔ وہ حیرت سے یہ ساری باتیں سن رہے تھے۔ پھر رحمانی بابا' بے ساختہ سپاہیوں کی طرف بڑھا۔ غالباً وہ انہیں روکنا چاہتا تھا لیکن سلطان نے اسے بھی منع کر دیا۔ اس نے کہا۔ "رحمانی بابا! ان چند سو بے حوصلہ سپاہیوں کو روک کر آپ کیا کریں گے۔ جانے دیں انہیں۔"

رحمانی بابا اپنی جگہ کھڑا رہ گیا۔ وہ سب مایوسی کے سمندر میں ڈوبے چلے جا رہے تھے۔ آخر اباقہ نے رنجیدہ لہجے میں کہا۔ "یہ کیا ہوا سلطان معظم؟"

"کچھ نہیں .... میری قسمت میں شاید ایسے ہی مناظر دیکھنے لکھے ہیں۔" سلطان کی آواز میں پرانی عمارتوں کی شکستگی اور نڈھال مسافروں کی نقاہت اتر آئی تھی۔ اس کے چہرے کی زخم خوردہ مسکراہٹ دیکھ کر اباقہ تڑپ اٹھا۔

"ایسا مت کہیں سلطان۔ ایسا مت کہیں۔ ہمیں حکم دیں ہمیں کیا کرنا ہے۔" اباقہ نے لرزاں آواز میں کہا۔

سلطان نے کہا۔ "اب ہم پسپائی کے سوا اور کیا کر سکتے ہیں۔"

یورق' سلیمان اور رحمانی بابا نے اس فیصلے کی مخالفت کی۔ سلیمان نے جوش سے کہا۔ "سلطان معظم! ہم آخری آدمی اور آخری تیر تک لڑیں گے' ہتھیار نہیں ڈالیں گے۔"

سلطان کے چہرے پر اباقہ نے پہلی بار غضب کے آثار دیکھے۔ اس نے غصے سے کہا۔ "تم اس شکست کو بدترین شکست بنانے پر تلے ہوئے ہو۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے شیخ نجدی کی فوج ہمارے گرد گھیرا ڈالنے کے لئے حرکت میں آ چکی ہو گی یا آنے والی ہو گی۔

اگر ہم اکیلے ہوتے تو مار دھاڑ کر کے اس گھیرے کو توڑ کر نکل سکتے تھے لیکن یہ مت بھولو' ہمارے ساتھ عورتیں اور بچے بھی ہیں۔ ہمیں اپنا ساتھ دینے والے محنت کشوں اور ان کے اہل و عیال کو موت کے منہ میں نہیں دھکیلنا۔ وقت بہت کم ہے' ہمیں فوراً یہ جگہ چھوڑنی ہو گی۔"

بات اب ان سب کی سمجھ میں آ رہی تھی۔ اس وقت عقب کی پہاڑیوں میں روپوش ہونے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ سلطان کے حکم پر انہوں نے حتی الامکان عجلت سے کوچ کی تیاری کی اور پہاڑیوں کی طرف روانہ ہو گئے۔ ان پہاڑیوں میں روپوش ہونے سے پہلے انہوں نے دیکھا دور شہر کی طرف تین اطراف سے گرد کے بادل اٹھ رہے ہیں۔ سلطان کا اندازہ سو فیصد درست تھا۔ شیخ نجدی کی افواج انہیں نرغے میں لینے کے لئے حرکت میں آ چکی تھیں۔

☆======☆======☆

قریباً ڈھائی سو مرد اور اتنی ہی عورتیں اور بچے ان پہاڑیوں میں پڑاؤ ڈالے پڑے تھے۔ جزیرے کی باقی زمین کی طرح یہ پہاڑیاں بھی سرسبز تھیں۔ گھنے درختوں نے دن میں بھی رات کا سماں پیدا کر رکھا تھا۔ رحمانی بابا کا خیال تھا کہ اس جگہ وہ شیخ نجدی کی فوج سے کئی دن تک محفوظ رہ سکتے ہیں اور اس کے بعد اگر حملہ ہوا بھی تو براہ راست نہیں ہو گا۔ واقعی اس علاقے میں براہ راست حملہ نہیں ہو سکتا تھا اور اگر شیخ کی فوج یہ حماقت کرتی تو چھاپہ مار لڑائی سے اسے شدید نقصان پہنچایا جا سکتا تھا۔

جنگ میں شدید زخمی ہونے والے مرد ایک ایک کر کے مر رہے تھے۔ کیونکہ یہاں ان کا ٹھیک طرح علاج نہیں ہو رہا تھا۔ اباقہ جڑی بوٹیوں سے علاج کر سکتا تھا اور کر بھی رہا تھا لیکن تنہا آدمی کہاں تک بھاگ دوڑ کر سکتا تھا۔ ہر روز کئی عورتیں بیوہ اور بچے یتیم ہو جاتے تھے۔ ان کی آہ و زاری اس جنگل کو اداس رکھتی تھی۔ سلطان جلال زیادہ وقت خیمے میں گزارتا تھا۔ بس شام کے وقت تھوڑی دیر کے لئے باہر نکلتا اور دفاعی انتظامات کا جائزہ لے کر واپس چلا جاتا۔ اس کے چہرے پر اباقہ کرب کے آثار صاف دیکھ سکتا تھا۔ رہ رہ کر سلطان کا یہ فقرہ اباقہ کے کانوں میں گونجتا تھا۔ "میری قسمت میں شاید ایسے ہی مناظر دیکھنے لکھے ہیں۔" کتنا درد تھا ان الفاظ میں۔ یہ فقرہ پھانس بن کر اباقہ کے دل میں چبھ گیا تھا۔ سوتے جاگتے ہر وقت اس فقرے کی بازگشت اس کے کانوں میں رہتی تھی۔

ایک روز اباقہ اپنے خیالوں میں گم ایک پتھر سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا کہ رحمانی بابا اور سلیمان اس کے قریب آ بیٹھے۔ جب سے وہ یہاں آئے تھے رحمانی بابا کے چہرے پر اداسی کا

ایک دبیز نقاب پڑ گیا تھا۔ یقیناً اسے اس بات کا رنج تھا کہ وہ سلطان کی مشکلات میں اضافے کا سبب بنا ہے۔

باتوں باتوں میں جعفر داراب کا ذکر ہونے لگا۔ رحمانی بابا نے انگلیوں پر حساب لگا کر بتایا کہ کل جعفر داراب اور دوسرے دو افراد جزیرے سے واپس چلے جائیں گے۔ اس نے کہا۔ "چاند کی پہلی تاریخ کو صبح کے وقت کھاڑی سے انہیں روانہ کیا جاتا ہے۔ ہر سال اس موقع پر بہت سے لوگ انہیں الوداع کہنے کے لئے جمع ہوتے ہیں۔ سورج طلوع ہونے کے بعد شیخ نجدی تینوں مہمانوں کے ساتھ محل سے نکلتا ہے۔ محل سے کھاڑی تک کے راستے پر کھڑے سینکڑوں افراد رنگ برنگے رومال لہرا کر انہیں الوداع کہتے ہیں۔"

یکدم اباقہ چونک گیا۔ اس نے رحمانی بابا کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "تم نے کہا ہے کہ شیخ نجدی تینوں مہمانوں کے ساتھ محل سے نکلتا ہے۔ اس کا مطلب ہے وہ چاروں صبح کے وقت محل میں موجود ہوتے ہیں۔"

رحمانی بابا نے کہا۔ "وہ چاروں ہی نہیں شیخ کے خاص خاص ساتھی اور مصاحبین بھی محل میں ہوتے ہیں اور اس روز شیخ کے ساتھ نہاری (ناشتہ) کھاتے ہیں۔"

رحمانی بابا اباقہ کے سوال کا جواب دے کر پھر باتوں میں مصروف ہو گیا لیکن اباقہ کا ذہن اب اس کی باتوں میں نہیں تھا۔ وہ کچھ اور سوچ رہا تھا۔ اس کے ذہن میں ایک کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کیوں نہ پورے جزیرے سے ٹکر لینے کی بجائے جزیرے کے فرمانراؤں کو تہ تیغ کر دیا جائے۔ وہ ایک ہی وقت میں ایک ہی مقام پر جمع ہو رہے تھے اگر اس مقام کو ان کی قتل گاہ بنا دیا جاتا تو جزیرہ شیطانی قوتوں کے اثر سے نکل سکتا تھا۔ نہ بھی نکلتا ان قوتوں کی گرفت کمزور پڑ سکتی تھی لیکن یہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ جان کا خطرہ مول لئے بغیر اس کام کے متعلق سوچنا ایسے ہی تھا جیسے آدمی پانی میں چھلانگ لگائے اور توقع رکھے کہ اس کا لباس خشک رہے گا۔ یہ سراسر موت کے منہ میں جانے والی بات تھی اور وہ تنہا یہ کام کر بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کے لئے آدمیوں کی ضرورت تھی لیکن کیا آدمیوں کے ساتھ جا کر وہ رازداری برقرار رکھ سکتا ہے؟ اس کا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا۔ یہ نہ ہو کہ منزل پر پہنچنے سے پہلے ہی انہیں دھر لیا جائے .... ہاں یہ کام تنہا کرنے والا تھا' اسے اکیلے جانا ہو گا۔ بالکل اکیلے۔ اگر وہ شیطان کے ان تمام چیلوں کو نہ مار سکا تو بھی شیخ نجدی اور اس کے تین مہمان تو کہیں نہیں گئے .... ہاں وہ انہیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔ اس نے بے خیالی میں اپنا عہد زیر لب دوہرایا۔ سلیمان اور رحمانی بابا چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ "کیا ہوا اباقہ!" رحمانی بابا نے پوچھا۔

"کچھ نہیں .... کچھ بھی تو نہیں۔" اباقہ نے نفی میں سر ہلایا اور خاموشی سے اٹھ کر چل دیا۔ رحمانی بابا اور سلیمان اس کی آنکھوں میں بھڑکتے ہوئے شعلے دیکھنے سے قاصر رہے۔

☆-----☆-----☆

اس کے بدن پر صرف ایک لنگوٹ تھا اور اس نے سارے بدن پر سیاہی ملی ہوئی تھی۔ سر کی طرح اس کے پاؤں بھی ننگے تھے۔ اوزار کے نام پر اس کے پاس صرف ایک خنجر تھا جو اس نے لنگوٹ میں چھپا رکھا تھا۔ وہ پڑاؤ میں سلطان جلال کے خیمے کے پاس کھڑا تھا۔ وہ یک ٹک سلطان جلال کے خیمے کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر زیر لب بڑبڑایا۔ "مجھے معاف کرنا سلطان۔ میں حکم عدولی کر رہا ہوں۔ آپ کی اجازت کے بغیر شیخ نجدی کی طرف جا رہا ہوں۔ اپنے غلام کی اس پہلی اور آخری خطا کو معاف کر دینا۔" اس نے ڈبڈباتی آنکھوں سے سلطان جلال کے خیمے پر الوداعی نگاہ ڈالی اور ایک سائے کی طرح اونچے نیچے پتھروں میں روپوش ہو گیا۔

رات کا آخری پہر تھا۔ شیخ نجدی کے عظیم الشان محل کی دیواروں کے نیچے زرد قباؤں اور ننگی پنڈلیوں والے چوکس پہریدار گشت کر رہے تھے۔ یہ ایک تاریک رات تھی۔ بادلوں کی چادر نے زمین کو چاند تاروں کی روشنی سے محروم کر رکھا تھا لیکن شیخ نجدی کے محل کے چاروں طرف قندیلیں روشن تھیں جن کی روشنی میں اس کے در و بام' اس کی بالکونیاں' اس کی خوبصورت کھڑکیاں اور رنگین پردے صاف نظر آ رہے تھے۔ محل کے عقب میں رانی خانم کا محل تھا۔ اس محل کے عقب میں ایک چھوٹا سا باغیچہ تھا۔ اس باغیچے کی تاریکی میں' اباقہ زمین سے چپکا اوندھے منہ لیٹا تھا۔ وہ رانی خانم کے محل میں کئی روز رہا تھا اور یہاں کے نشیب و فراز سے بخوبی واقف تھا۔ اسے معلوم تھا کہ رانی خانم کے محل پر صرف دو پہریدار ہوتے ہیں اور ان میں سے ایک رات گئے نشہ کر کے سو جاتا ہے۔ دوسرا بھی کوئی بہت ہوشیار شخص نہیں تھا۔ محل کے اندر تین چار پہریدار اور تھے لیکن اباقہ کو ان کی پرواہ نہیں تھی۔ اسے صرف بیرونی پہریدار سے نبٹنا تھا۔

کافی دیر وہ زمین سے چپکا سن گن لیتا رہا۔ پھر اس نے ایک پتھر اٹھا کر اپنے سامنے پانی کے حوض میں پھینکا۔ اس کا خیال تھا کہ پہریدار آواز سن کر حوض پر آئے گا اور وہ آنکھ بچا کر تیزی سے محل میں داخل ہو جائے گا لیکن تین چار پتھر پھینکنے کے باوجود کوئی شخص اس طرف نہیں آیا تو اباقہ سمجھ گیا کہ دوسرا پہریدار بھی دروازے پر موجود نہیں۔ وہ سانپ کی طرح رینگتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔ ادھیڑ عمر پہریدار نشے میں دھت دیوار

سے ٹیک لگائے سو رہا تھا۔ اباقہ نے بہ آہستگی دروازہ کھولا اور ہوا کی طرح اندر داخل ہو گیا۔ وہ جانتا تھا اسے کن راستوں سے ہو کر چھت پر پہنچنا ہے۔ احتیاط سے چلتا ہوا وہ سیڑھیوں تک پہنچا تو رانی خانم کی خوابگاہ میں روشنی نظر آئی۔ یونہی اباقہ نے اندر جھانکا اور پھر جلدی سے نگاہیں ہٹا لیں۔ اندر کا منظر ناقابل دید تھا۔ یہ تو خوابگاہ تھی' اس شیطانی جزیرے کے گلی کوچوں میں بھی ایسے مناظر دیکھنے میں آجاتے تھے۔ وہ نوجوان پہریدار جسے بیرونی دروازے پر موجود ہونا چاہئے تھا رانی خانم کے پہلو میں تھا۔ اباقہ دبے پاؤں سیڑھیاں چڑھتا چلا گیا۔ محل کی کشادہ چھت پر پہنچ کر اس نے شیخ نجدی کے محل کی طرف دیکھا۔ دونوں عمارتوں کے درمیان ایک چھ گز چوڑا راستہ تھا۔ اس راستے میں مسلح پہریدار موجود رہتے تھے۔ دوسری طرف شیخ نجدی کے محل کی چھت پر بھی ایک مسلح پہریدار کھڑا تھا۔ اس کا مدھم ہیولا اباقہ کو نظر آ رہا تھا۔ اباقہ کے سامنے دو مسئلے تھے۔ ایک تو جست لگا کر چھ گز چوڑے راستے کو پار کرنا۔ دوسرے شیخ کے محل کی چھت پر موجود پہریدار پر خاموشی سے غلبہ پانا۔ پہلا کام زیادہ مشکل تھا۔ چھ گز طویل چھلانگ اسے اس طرح لگانا تھی کہ دونوں چھتوں پر کوئی آواز پیدا نہ ہو۔ نہ پہلی چھت پر بھاگنے کی آواز اور نہ دوسری چھت پر کودنے کی آواز۔ دونوں صورتوں میں نیچے والوں کا ہوشیار ہو جانا یقینی تھا۔ چھت پر اوندھے منہ لیٹے لیٹے اباقہ نے یہ سب کچھ سوچا۔ پھر لنگوٹ کو چھو کر خنجر کی موجودگی کا یقین کیا۔ دونوں چھتوں کے درمیان فاصلے کو ذہن میں رکھ کر اپنے جسم کو تولا۔ ایک طویل سانس لی اور اٹھ کر دوڑ لگا دی۔ وہ ننگے پاؤں تھا اور پنجوں کے بل بھاگ رہا تھا۔ اس کے لمبے بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ چھت کے کنارے پر پہنچ کر اس نے پوری قوت سے اپنے جسم کو اچھالا۔ دونوں ہاتھ سامنے کی طرف تھے۔ گھٹنے پیٹ کے قریب آ گئے تھے۔ وہ درمیان راستے پر پرواز کرتا ہوا دوسری چھت پر گیا۔ ایک بے آواز قلابازی کھا کر وہ پہریدار کے قدموں میں پہنچ گیا۔ پہریدار پشت کئے کھڑا تھا۔ جونہی اس نے مدھم سی آہٹ پر مڑ کر دیکھا' اباقہ اٹھا اور اس کا طوفانی مکہ پہریدار کے جبڑے پر پڑا۔ وہ لہرا کر نیچے گرا تو اباقہ نے لپک کر اسے بازوؤں میں تھام لیا۔ اس کی گردن بغل میں دبا کر اباقہ نے ایک وحشیانہ جھٹکا دیا اور پہریدار زندگی کے تمام جھمیلوں سے آزاد ہو گیا۔ اس کا بے جان جسم کندھے پر اٹھا کر اباقہ نے سیڑھیوں کے قریب ایک تاریک کوٹھڑی میں چھپا دیا۔

چھت پر دھوئیں کے اخراج کے لئے دو تین دودکش (چمنیاں) نظر آ رہی تھیں۔ اباقہ کو معلوم تھا ان میں سے ایک دودکش اس آتش دان کی ہے جو شیخ نجدی کی طعام گاہ میں ہے۔ یہ معلومات اسے رانی خانم کے ہاں قیام کے دوران حاصل ہوئی تھیں۔ دودکش

(چمنی) کے اوپر لوہے کی ایک چادر سائبان کی شکل میں رکھی گئی تھی۔ تھوڑی سی کوشش سے اباقہ نے یہ چادر علیحدہ کر دی۔ اب وہ دودکش کے اندر گھس کر طعام گاہ میں پہنچ سکتا تھا۔ اس نے اپنا جسم دودکش میں داخل کیا اور چادر کو دوبارہ دودکش کے اوپر رکھا پھر ہاتھ پاؤں پھیلا کر وہ دھیرے دھیرے نیچے کھسکنے لگا۔ اس کی سخت جلد اسے ہر قسم کی خراشوں سے محفوظ رکھے ہوئے تھی۔ جلد ہی وہ آتشدان کے اندر کھڑا تھا۔ جسم سانپ کی طرح موڑ کر اس نے خود کو دودکش سے باہر نکالا۔ طعام گاہ میں مکمل تاریکی تھی۔ اس نے کوشش کی کہ اِدھر اُدھر چھپنے کی کوئی مناسب جگہ مل جائے لیکن ناکامی ہوئی۔ کچھ سوچ کر وہ دوبارہ دودکش میں گھس گیا۔ طعام گاہ میں چھپنے کے لئے اس سے بہتر کوئی اور جگہ نہیں تھی۔

ایک طویل انتظار کے بعد صبح کی آمد ہوئی۔ محل میں چہل پہل کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ اباقہ آتشدان سے ایک گز اوپر دودکش کے اندر دو ابھری ہوئی اینٹوں پر پاؤں جما کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے علاوہ دودکش میں پاؤں ٹکانے کی اور کوئی جگہ نہیں تھی۔ اباقہ نے سوچا اگر کسی وجہ سے اسے واپس اوپر جانا پڑا تو کسی صورت نہ جا سکے گا۔ اندرونی سطح ہموار تھی اور ایسا کوئی سہارا نہیں تھا جو اس کے جسم کو اوپر لے جا سکتا۔ بالآخر طعام گاہ میں خادمین کی آمدورفت کا سلسلہ شروع ہوا۔ ایک وقت آیا کہ اباقہ کے نتھنوں میں کھانوں کی خوشبوئیں گھسنے لگیں۔ رانی خانم کے آبولہ کی خوشبو تو وہ سینکڑوں میں پہچان سکتا تھا۔ بھوک کی وجہ سے یہ ناپسندیدہ ترین خوشبو بھی اسے کچھ زیادہ بری نہیں لگی۔ آخر وہ آوازیں سنائی دیں جن کا اباقہ کو دیر سے انتظار تھا۔ جعفر داراب شیخ نجدی کی کسی بات پر قہقہہ لگاتا ہوا طعام گاہ میں داخل ہوا تھا۔ دوسرے مہمانوں کی ملی جلی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ اباقہ کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ توانا بازو کچھ کر گزرنے کو بے تاب ہو گئے۔ سب کچھ توقع کے مطابق ہو رہا تھا۔ شیخ اور اس کے ساتھی دسترخوان پر باتوں میں مصروف تھے۔

شیخ نجدی کی آواز آئی۔ ”ہمیں جعفر داراب کا مشکور ہونا چاہئے کہ اس کے سبب ہمیں سلطان جلال الدین جیسے نامور شخص کی مہمان نوازی کا شرف حاصل ہوا۔“

جعفر داراب نے شیخ نجدی کی آواز میں طنز کی کاٹ محسوس کرتے ہوئے کہا۔ ”یا شیخ! میں شرمندہ ہوں کہ اپنے ملاحوں کی پرکھ نہ کر سکا۔ میرے گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ سیدھے سادے لوگ اتنے خطرناک اور نامور سردار ثابت ہوں گے۔“

شیخ نجدی نے جعفر کے لہجے میں پشیمانی کی جھلک محسوس کی تو خوشدلی سے بولا۔

"خیر! ایک طرح یہ اچھا ہی ہوا ہے' بڑھاپے میں اب جلال الدین کو آرام کی ضرورت ہے۔ ابلیس نے چاہا تو یہ جزیرہ اس کی آخری آرام گاہ ثابت ہو گا۔"

عربی مہمان کی آواز آئی۔ "یا شیخ! میں تو حیران ہوں یہ پانسہ آخر پلٹا کس طرح۔ فوج کے جرنیل راتوں رات کیسے پلٹ آئے۔"

جواب میں شیخ نجدی کا قہقہہ سنائی دیا۔ اس نے کسی کا کندھا تھپ تھپایا اور کہا۔ "یہ سب میرے اس بیٹے عمرو کا کارنامہ ہے۔"

مصری مہمان نے عمرو سے وہی سوال کیا تو وہ بولا۔ "دراصل فوج کے جرنیل کافی عرصے سے کچھ مطالبات کر رہے تھے۔ اسی دوران وہ بوڑھا "رحمانی" بیچ میں کود پڑا۔ اس نے جرنیلوں کو بھڑکایا اور وہ ہم پر دباؤ ڈالنے کے لئے فوراً اس کا ساتھ دینے پر رضامند ہو گئے۔ ان میں سے کچھ ایسے بھی تھے جو واقعی "رحمانی" کے وفادار تھے۔ بہرحال جنگ کے روز ہم پر واضح ہو گیا کہ دشمن کا پلہ بھاری رہے گا۔ اس رات میں بھیس بدل کر خاموشی سے جلال الدین کے پڑاؤ میں گیا۔ مجھے معلوم تھا اگر میں کریم خاں کو باغی فوج سے علیحدہ کرنے میں کامیاب ہو گیا تو بازی پلٹ جائے گی اور یہی ہوا۔ میں نے کریم خاں اور اس کے ماتحت سرداروں کو نہ صرف ان کے مطالبات کی منظوری کا یقین دلایا بلکہ انعام و اکرام کا وعدہ بھی کیا۔ نتیجتاً کریم خان تین چوتھائی فوج کے ساتھ راتوں رات پڑاؤ میں واپس آ گیا.........."

"اب سلطان جلال اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں کیا اطلاع ہے۔" عربی مہمان نے پوچھا۔

عمرو کی بجائے شیخ نجدی نے جواب دیا۔ "بہت جلد انہیں چوہوں کی طرح پکڑ لیا جائے گا اور سمندر کے نمکین پانی میں غوطے دے کر ان کی نجاستیں دور کی جائیں گی۔ اگر پھر بھی کوئی سخت جان زندہ بچ نکلا تو اسے کتوں کے آگے ڈال دیا جائے گا۔"

مصری کی پُرمزاح آواز سنائی دی۔ "سلطان جلال الدین .... اور کتے .... ہاہا۔ یا شیخ آپ کو اس کا کچھ تو احترام کرنا چاہئے۔ میرے خیال میں اس کے لئے آپ کسی شیر وغیرہ کا انتظام کریں۔" جواب میں کمرہ قہقہوں سے گونج اٹھا۔ شیخ نجدی ہنستے ہوئے بولا۔ "شیر بھی ہمارے پاس ہیں لیکن معلوم نہیں وہ جلال کو منہ لگائیں یا نہیں۔ آخر وہ بھی تو شیر ہے۔ نام کا ہوا تو کیا۔" کمرے میں ایک بار پھر قہقہے گونجنے لگے۔ دود کش کے اندر اباقہ کے جسم کا سارا خون سر کو چڑھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ کسی بھی وقت وہ اپنی پناہ گاہ سے نکلنے کو تھا۔

شیخ نجدی نے کہا۔ "افسوس تو اس بات کا رہے گا کہ تم تینوں وہ خاطرمدارات نہیں دیکھ سکو گے جو ہم جزیرے پر سلطان جلال اور اس کے ساتھیوں کی کرنے والے ہیں۔"

اتنے میں کوئی شخص تیزی سے طعام گاہ میں داخل ہوا اور وہ سب خاموش ہو گئے۔ اس شخص کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ "رکئے شیخ حضور! کھانے سے ہاتھ روک لیجیے۔ یہ کھانا مہلک ہو سکتا ہے .... چھ .... چھت پر پہریدار کی لاش پائی گئی ہے۔"

"کب؟" عمرو کی آواز آئی۔

"ابھی حضور! اتفاقاً زنان خانے میں زائد ایندھن کی ضرورت پڑ گئی تھی۔ اوپر کوٹھڑی سے ایندھن نکالا گیا تو نیچے پہریدار کی لاش پڑی تھی.........."

ایک دوسرا شخص بولا۔ حضور لگتا ہے کوئی شخص محل میں گھس آیا ہے اور رات سے یہیں موجود ہے۔"

اس کے بعد اباقہ کو ملا جلا شور سنائی دیا۔ بھاگتے دوڑتے قدموں اور چیخنے چلانے کی آوازوں سے لگتا تھا کہ محل کے ایک ایک کونے میں مسلح آدمی اسے تلاش کر رہے ہیں۔ طعام گاہ میں بھی مسلح سپاہی موجود تھے .... کتنی ہی دیر یہ افراتفری موجود رہی۔ پھر ایک شخص نے آکر اعتراف کیا کہ تلاش میں ناکامی ہوئی ہے۔

اس وقت اباقہ کو شیخ نجدی کی پُراسرار آواز سنائی دی۔ "ٹھیک ہے تلاش ختم کرو اور اس آتشدان میں تھوڑی سی آگ جلاؤ۔"

اباقہ اس آواز پر بھونچکا رہ گیا۔ موسم ہرگز ایسا نہیں تھا کہ آگ کی ضرورت پڑتی .... جس خادم کو حکم دیا گیا تھا وہ بھی شاید حیران کھڑا تھا۔ جب شیخ نجدی نے ڈپٹ کر اسے کہا کہ وہ کھڑا منہ کیا دیکھ رہا ہے۔ اباقہ کے جسم میں ایک لہر سی دوڑ گئی۔ اس کا مطلب تھا شیخ نجدی اس کی موجودگی سے آگاہ ہو گیا ہے .... لیکن کیسے .... کیونکر؟ اور تب اباقہ کی نگاہ نیچے آتشدان پر پڑی۔ اس کا خون کھول کر رہ گیا۔ آتش دان کی دھول پر اس کے ننگے پاؤں کے نشانات ثبت تھے۔ یہ نشان رات اس وقت پڑے تھے جب وہ کمرے میں داخل ہوا تھا۔ ابھی وہ یہ سب سوچ ہی رہا تھا کہ نیچے آہٹ ہوئی اور آتشدان میں لکڑیاں نظر آئیں۔ پھر ایک ہاتھ نے ان پر روغن گرا دیا۔ اسے زندہ جلانے کی تیاری کی جا رہی تھی۔ اوپر تو وہ جا نہیں سکتا تھا ظاہر تھا اسے دم گھٹ کر نیچے آتشدان میں گرنا تھا۔ اگر کمرے میں نکلتا تو بیسیوں تلواریں اس کا سینہ چھیدنے کو تیار ملتیں۔ اس کے ذہن میں شیخ نجدی کا سرخ و سپید شیطانی چہرہ گھوما۔ اس کی مکروہ آواز کی بازگشت سنائی دی اور اس کا سارا جسم آتش دان بن گیا۔ دماغ میں جیسے بھک بھک سے سیکڑوں شعلے

بھڑک اٹھے۔ اس نے وہی کیا جو اس موقعے پر اس جیسے بے خوف انسان کو کرنا چاہئے تھا۔ اس نے اپنے سر کو پیچھے ہٹایا اور ایک وحشیانہ ٹکر آتش دان کی دیوار پر ماری۔ یہ دیوار دو انگل موٹی اینٹوں کی تھی۔ اس خوفناک ٹکر نے دیوار کو لرزہ بہ اندام کر دیا۔ دوسری ٹکر سے بیسیوں اینٹیں اکھڑیں اور سارے کمرے میں بکھر گئیں۔ ایک ساتھ کئی چیخیں بلند ہوئیں۔ دود کش سے نکلنے والا ننگ دھڑنگ' سیاہ رنگ اباقہ ان کے سامنے کھڑا تھا۔ پھر اس کا ہاتھ اپنے خنجر تک گیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ نتائج سے بے پرواہ ہو کر حاضرین کمرہ پر ٹوٹ پڑتا کوئی دس عدد نیزوں کی انیاں اس کے عریاں بدن کو بوسہ دینے لگیں۔ یہ نیزہ بردار دود کش کے دائیں بائیں کھڑے تھے اور اتنے چوکس تھے کہ اگر اباقہ انگلی کو بھی جنبش دیتا تو وہ اسے نیزوں سے چھلنی کر ڈالتے۔ اب حرکت کا مطلب خود کشی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ اباقہ نے شعلہ فشاں نگاہوں سے شیخ نجدی کی طرف دیکھا۔ وہ اس سے صرف دو قدم کے فاصلے پر اطمینان سے کھڑا تھا۔ اباقہ نے بڑے کرب کے ساتھ سوچا کاش اس کی قسمت میں زندگی بھر کی مسافتیں لکھی ہوتیں لیکن یہ دو قدم نہ ہوتے۔ یہ دو قدم اسے ایک بہت بڑے اعزاز سے محروم کر رہے تھے۔ بہت بڑے اعزاز سے............

☆-----☆-----☆

اباقہ نہ جانے کب تک بے سدھ پڑا رہا۔ شاید اسے کھانے میں کوئی خواب آور دوا دی گئی تھی۔ وہ نیند سے بیدار ہوا تو ایک خوبصورت مسہری پر پڑا تھا۔ اس مسہری پر بستر کی جگہ گلاب سرخ کی پتیاں بچھی تھیں اور یہ مسہری زمین کی بجائے پانی میں رکھی تھی۔ اس شفاف پانی میں رنگین مچھلیاں تیر رہی تھیں۔ وہ حیرانی سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ پہلے تو اسے محسوس ہوا کہ وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہے لیکن یہ حقیقت تھی وہ کسی انتہائی خوبصورت باغ میں تھا۔ چاروں طرف پھلوں سے لدے ہوئے درخت تھے۔ انگوروں کی بیلیں پھولوں کی بیلوں سے بغلگیر ہو کر خوبصورت درختوں سے لپٹی ہوئی تھیں۔ ٹہنیوں پر رنگین پروں والے پرندے چہک رہے تھے۔ کہیں کہیں مور اور ہنس راج بھی گھومتے نظر آتے تھے۔ اس کی مسہری دراصل بطخ کی شکل کی ایک کشتی تھی۔ اس کشتی میں چند حسین و جمیل لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ ایک لڑکی کی گود میں ستار تھا۔ مضراب کی حرکت فضا میں مسحور کن دھنیں بکھیر رہی تھی۔ دوسری لڑکی کوئی خوبصورت گیت گا رہی تھی۔ تیسری اباقہ کے سامنے کھڑی تھی اور اس کے پاؤں رقص کے انداز میں مسلسل تھرک رہے تھے۔ ایک نازنین چاندی کا طشت لئے اباقہ کے سامنے دو زانو بیٹھی تھی۔ اس طشت میں شیریں میوے سلیقے سے سجے ہوئے تھے۔ سرخ شراب کی صراحی تھامے ایک نوجوان لڑکا اباقہ کے

حکم کا منتظر تھا۔ اباقہ کا گلا خشک ہو رہا تھا۔ اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ "مجھے پانی دو۔"

لڑکیاں اپنی اپنی جگہ بے حرکت بیٹھی رہیں۔ اس وقت اباقہ کو نہر کے کنارے سرخ و سپید چہرے والا ایک باریش شخص نظر آیا۔ وہ شیخ نجدی تھا۔ شیخ نجدی نے کہا۔

"اے نوجوان! یہ سب کچھ جو تجھے نظر آ رہا ہے اور وہ سب کچھ بھی جو ابھی تیری نظروں سے اوجھل ہے تیرا ہے۔ تیرے ذہن میں آج تک کوئی ایسی خواہش پیدا نہ ہوئی ہو گی جو اس گلشن میں پوری نہ ہو سکتی ہو۔ جو ہماری اطاعت کرتے ہیں' ان کے لئے ہم زندگی کو اسی طرح حسین بنا دیتے ہیں............"

"کیا چاہتے ہو تم؟" اباقہ نے بلند آواز سے پوچھا۔

شیخ نجدی نے تھوڑی دور ایک سفید عمارت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ہم چاہتے ہیں کہ تو اس گلشن اور اس محل کا مالک بنے۔ یہاں اپنی زندگی نعمتوں کے جھرمٹ اور مسرتوں کے ہجوم میں گزارے۔"

اباقہ نے پوچھا۔ "اگر میں ایسا چاہوں تو مجھے کیا کرنا ہو گا؟"

"صرف .... ہماری اطاعت۔ ابلیس کو خدا کا اقرب فرشتہ ماننا ہو گا اور یہ یقین رکھنا ہو گا کہ وہ رُوئے زمین کے ہر کام میں مداخلت رکھتا ہے۔ وہی روزی دیتا ہے اور وہی بھوک' خوش نصیبی اور بدبختی اسی کے وسیلے سے ہے۔ ہر انسانی عمل میں اس کی مرضی شامل ہوتی ہے............"

اباقہ نے کہا۔ "اگر میں کہوں کہ میں یہ سب کچھ مانتا ہوں .... تو پھر؟"

شیخ نجدی کی بھوری آنکھوں میں ایک شیطانی چمک نظر آئی۔ وہ بولا۔ "تو پھر میرے بچے! تجھے بتانا ہو گا کہ تیرا اصل نام کیا ہے؟ تیرے ساتھی کون کون ہیں اور اس وقت وہ کہاں ہیں۔ ان سوالوں کے جواب دے کر تو اپنی پوری حیات کے لئے عیش و آرام اور راحت خرید لے گا۔ بول میرے بچے' جواب دے۔"

اباقہ نے کہا۔ "اگر میں ان سوالوں کے جواب نہ دے سکوں تو؟"

شیخ نجدی کے چہرے پر گہری سنجیدگی عود کر آئی۔ اس نے کہا۔ "میرے بچے اس دنیا میں کسی چیز اور کسی حالت کو ثبات نہیں۔ انسان یا تو خوش قسمتی کی طرف بڑھتا ہے یا بدبختی کی طرف۔ اگر خوش قسمتی کی طرف نہیں بڑھو گے تو بدبختی کی طرف چلے جاؤ گے۔ ذرا اپنے دائیں طرف دیکھو۔"

اباقہ نے دائیں جانب دیکھا۔ باغ کی بلند دیوار میں اب ایک دروازہ نظر آ رہا تھا۔ اس دروازے کی دوسری جانب اباقہ کو ایک پنجرہ نظر آیا۔ لوہے کے اس بڑے پنجرے میں

بہت سے گدھ نظر آ رہے تھے۔ ایک مادر زاد برہنہ شخص پنجرے میں پڑا تڑپ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ عقب میں بندھے تھے اور گدھ اس کا گوشت نوچ رہے تھے۔ حیرت کی بات تھی کہ بد قسمت شخص بالکل خاموش تھا۔ تب اباقہ نے دیکھا کہ اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر اسے مضبوطی سے بند کر دیا گیا ہے۔ اس منظر پر نگاہیں جمائے رکھنا اباقہ جیسے جنگلی کو بھی مشکل لگ رہا تھا۔ اس نے آنکھیں پھیر لیں لیکن مظلوم شخص کے تڑپنے اور اس کے جسم کے آہنی جنگلے سے ٹکرانے کی آوازیں بھی کچھ کم اذیت ناک نہیں تھیں۔ شیخ نجدی کے چہرے پر ایک آسودہ مسکراہٹ کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور دو کنیزوں نے دروازہ بند کر دیا۔ شیخ نجدی بولا۔

"دیکھا تم نے خوش نصیبی اور بدبختی کے درمیان کتنا فرق ہے۔ صرف ایک بالشت چوڑی دیوار کا۔ اب تمہیں سوچنا ہے کہ تم دیوار کے اس طرف رہنا چاہتے ہو یا نہیں۔"

اباقہ خاموشی سے شیخ نجدی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اب تک تمام گفتگو اس نے لیٹے لیٹے کی تھی۔ شیخ نجدی کنارے پر کھڑا تھا۔ کشتی ساکن پانی پر چکراتی چکراتی اس کے کچھ قریب چلی گئی تھی۔ اباقہ نے سوچا اگر وہ نہر میں چھلانگ لگائے تو دو تین ہاتھوں میں کنارے تک پہنچ جائے گا۔ شیخ کی گردن توڑنے کا یہ ایک سنہری موقعہ تھا۔ اس نے ایک نظر اپنے گرد موجود عورتوں کو دیکھا .... پھر ایک دم جسم کو حرکت دے کر پانی میں چھلانگ لگانا چاہی لیکن کراہ کر رہ گیا۔ اس کی کمر کے گرد ایک آہنی زنجیر لپٹی ہوئی تھی۔ اس وزنی زنجیر کا ایک سرا کشتی کے فرش سے منسلک تھا۔ اباقہ نے جسم کو دو تین زوردار جھٹکے دیئے لیکن زنجیر توڑنے میں ناکام رہا۔ اس پر وحشت سوار ہو گئی۔ اس کا جسم پارے کی طرح مچلنے لگا۔ کشتی پر ہلچل مچ گئی۔ لڑکیاں چلانے لگیں۔ کشتی اب بری طرح ڈول رہی تھی۔ اباقہ جھٹکے پر جھٹکے دے رہا تھا اور ہر جھٹکا پہلے سے شدید تر تھا۔ لڑکیاں ہذیانی انداز میں چیخ رہی تھیں۔ پھر ایک چھپاکے کے ساتھ کشتی الٹ گئی۔ طشت' پھل' ساغر و مینا' ساز سب کچھ پانی میں بہتا نظر آیا۔ بطخ نما کشتی اب اوندھے منہ پانی پر تیر رہی تھی۔ عشوہ طراز لڑکیاں ڈبکیاں کھا رہی تھیں۔ اباقہ نے اپنے توانا بازوؤں کو حرکت دی اور کشتی سمیت کنارے کی طرف بڑھا۔ اگر وہ تنہا ہوتا تو شاید پلک جھپکتے میں شیخ نجدی کے سر پر پہنچ جاتا لیکن وزنی کشتی کے ساتھ اس کی رفتار زیادہ تیز نہیں تھی۔ شیخ نجدی نے اباقہ کو اس طرح کنارے کی طرف بڑھتے دیکھا تو اس کے چہرے پر سایہ سا لہرا گیا .... لیکن ابھی اباقہ کنارے سے دو تین گز دور تھا کہ شیخ نے تالی بجائی۔ درختوں کی اوٹ سے پندرہ بیس نیزہ بردار نکل کر اباقہ کی طرف بڑھے پھر انہوں نے پانی میں چھلانگیں لگائیں اور چاروں طرف

سے اباقہ کو گھیر لیا۔

اباقہ نے خونخوار نظروں سے شیخ نجدی کی طرف دیکھا۔ شیخ کی آنکھوں میں خفیف سی حیرت نظر آ رہی تھی۔ اس کے چہرے کا آفتابی رنگ بھی کچھ پھیکا پڑ گیا تھا۔ اباقہ خاموشی سے شیخ کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھیں خاموشی کی زبان میں قسم کھا رہی تھیں۔ "شیخ نجدی! تو میرے سلطان کا دشمن ہے۔ میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ خود لاش بن جاؤں گا یا تجھے بنا دوں گا۔"

اگلے روز اباقہ دیوار کی دوسری طرف پہنچ چکا تھا۔ اگر دیوار کی اس طرف جنت تھی تو اس طرف جہنم۔ جنت میں جنت کے لوازمات تھے لیکن بدقسمتی سے جہنم میں آگ نہیں تھی۔ آگ کی بجائے وہاں اذیتوں کے ایسے سامان تھے جن سے پناہ حاصل کرنے کے لئے انسان آگ کی گود میں چھپنا غنیمت سمجھے۔ اباقہ کے جسم کو تختہ مشق بنانے میں صرف ایک بات کا خیال رکھا گیا اور وہ یہ کہ زندگی اور موت کی درمیانی لکیر مٹنے نہ پائے۔ اس کے جسم کے ایک ایک ریشے کو عذاب آشنا کیا گیا لیکن اس کے چہرے پر بے حسی کا ایسا نقاب پڑا اور اس کی زبان کو خاموشی کا ایسا قفل لگا کہ اذیتیں دینے والے ہانپ ہانپ گئے۔ عقوبت خانے کی دیواریں ششدر تھیں' مردم آزار آلات حیران تھے' جلاد سن تھے کہ یہ انہیں کیسے شخص سے پالا پڑا ہے۔ نہ اس کی آنکھ سے آنسو گرتا ہے اور نہ زبان سے نالہ بلند ہوتا ہے .... اب صرف ایک ہی کسر رہ گئی تھی۔ اس شخص کی سخت جانی کی سزا اس کی زندگی چھین کر دی جائے .... لیکن اس کی انہیں اجازت نہیں تھی۔ ہاں .... ابھی انہیں اس کی اجازت نہیں تھی۔

☆---☆---☆

سلطان جلال ٹیلوں کے درمیان ایستادہ اپنے خیمے میں بیٹھا تھا۔ سلیمان اندر داخل ہوا۔ اس نے جھک کر سلطان کو سلام کیا اور مؤدب کھڑا ہو گیا۔ "کیا اطلاع لائے ہو سلیمان؟" سلطان جلال نے پوچھا۔

سلیمان نے رنجیدہ لہجے میں کہا۔ "سلطان خبر کچھ اچھی نہیں۔ اباقہ شیخ نجدی کے محل میں پہنچا تھا جہاں سے اسے گرفتار کر لیا گیا ہے۔ اس وقت وہ جزیرے کے سب سے بدنام عقوبت خانے میں ہے .... اس پر سخت تشدد کیا جا رہا ہے۔" آخری الفاظ ادا کرتے کرتے سلیمان کی آواز بھرا گئی۔

سلطان جلال اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور بے چینی سے خیمے میں ٹہلنے لگا۔ "اور کوئی خبر؟" اس نے سلیمان سے پوچھا۔

"کچھ نہیں سلطان۔" سلیمان نے سر جھکائے جھکائے جواب دیا۔ اس کے چہرے پر رنج و الم کے گہرے سائے تھے۔

سلطان جلال بغور سلیمان کا چہرہ دیکھ رہا تھا' بولا۔ "سلیمان! تم کچھ چھپا رہے ہو۔ میں نے تمہیں اس لئے شہر بھیجا تھا تاکہ وہاں کے حالات معلوم کر سکوں۔ تمہیں جو کچھ معلوم ہوا ہے سب بتاؤ۔"

سلیمان نے پہلے تو پس و پیش سے کام لینے کی کوشش کی مگر جب اس نے سلطان جلال کے چہرے پر خفگی کے آثار دیکھے تو بولا۔ "سلطان معظم! نبیلہ .... نبیلہ دو روز بعد عمرو کے حرم میں چلی جائے گی۔" اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے اور وہ سلطان کے سامنے سر جھکا کر واپس چلا گیا۔

سلطان اپنی جگہ کھڑا گہری سوچ میں گم تھا۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ کسی اہم فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا ہے۔ پھر اس نے چوب دار کو آواز دی اور اسے حکم دیا کہ سردار یورق کو خیمے میں حاضر کیا جائے۔ تھوڑی دیر بعد سردار یورق اندر داخل ہوا اور سلام کر کے مئودب کھڑا ہو گیا۔ سلطان جلال نے اسے اپنے پاس بٹھا لیا اور بولا۔ "سردار یورق! اباقہ شیخ نجدی کی قید میں ہے اور نبیلہ کا باپ اسے عمرو کے سپرد کر رہا ہے۔ ہمیں اب حرکت میں آنا ہو گا' اباقہ کو قید سے چھڑانے کے لئے اور نبیلہ کو بچانے کے لئے ....
تم فوراً دو دستے تیار کرو۔"

"جو حکم سلطانِ معظم!" یورق سر جھکا کر بولا۔

سلطان نے کہا۔ "دونوں دستوں میں دس دس گھڑسوار ہوں۔ ایک دستے کی قیادت تم کرو گے اور دوسرے کی میں۔ میری ذمہ داری اباقہ کو قید خانے سے چھڑانا ہے جب کہ تم نبیلہ کو قحبہ خانے سے نکالو گے۔ یہ دونوں کام ہر قیمت پر ہونے چاہئیں۔"

یورق جوش سے بولا۔ "سلطان معظم! جو کام آپ نے کہہ دیا وہ کام ہو گیا۔ اگر یورق کی زندگی نہ چلی گئی تو نبیلہ ہر صورت اس قحبہ خانے سے نکلے گی اور یہاں پہنچے گی۔"

سلطان نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ تم اپنے دستے میں مارینا کو بھی شامل کر لو۔ وہ نبیلہ کی سہیلی کے روپ میں قحبہ خانے میں جائے اور اس سے مل کر اسے تمام صورت حال بتا دے۔ اگر حالات سازگار ہوں تو وہ دونوں خاموشی کے ساتھ وہاں سے نکل آئیں۔ اس طرح خون خرابے کا امکان کم ہو جائے گا۔"

"جو حکم سلطان معظم!"

سلطان نے کہا۔ "نبیلہ کو نکالنے کے بعد تم کھاڑی کے جنوبی ٹیلوں میں پہنچ جاؤ

گے۔ میں بھی اپنے کام سے فارغ ہو کر وہیں پہنچوں گا۔ تم سمجھ گئے ہو نا؟"

یورق نے اثبات میں سر ہلایا۔ سلطان جلال بولا۔ "بس ٹھیک ہے۔ اب تم فوراً چلنے کی تیاری کرو۔"

.... اسی روز سہ پہر کے وقت سلطان جلال اپنے دس سواروں کے ساتھ کھاڑی کے جنوبی ٹیلوں میں موجود تھا .... لیکن اباقہ اس کے ساتھ نہیں تھا۔ سلطان جلال منصوبے کے مطابق قید خانے پہنچا تھا لیکن وہاں سے معلوم ہوا تھا کہ اباقہ کو یہاں سے لے جایا جا چکا ہے۔ کہاں لے جایا جا چکا ہے' اس کے بارے میں علم نہیں ہو سکا تھا۔ ہاں یہ اندازہ ہوا تھا کہ اسے اور کچھ دوسرے قیدیوں کو عبرتناک طریقے سے سزائے موت دی جائے گی۔ ان اطلاعات کے بعد سلطان جلال ان ٹیلوں میں پہنچ گیا تھا اور بے چینی سے سردار یورق کا انتظار کر رہا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد چند گھڑسوار انہیں اپنی طرف آتے دکھائی دیئے۔ سلطان جلال انہیں بغور دیکھنے لگا۔ یورق' سلیمان اور مارینا کو وہ دور سے بھی پہچان سکتا تھا مگر نبیلہ ان میں نہیں تھی۔

کچھ ہی دیر بعد سردار یورق نے اپنا گھوڑا سلطان کے سامنے روکا اور چھلانگ لگا کر نیچے اتر آیا۔ وہ اس وقت جنگی لباس میں تھا۔ آہنی خود اس کے سر پر چمک رہا تھا۔ اس نے سر جھکا کر کہا۔ "سلطان معظم! نبیلہ اس قحبہ خانے میں موجود نہیں۔ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ شہر سے باہر کہیں آج کوئی زبردست تماشا ہو رہا ہے اور شہر کی بیشتر آبادی تماشا گاہ میں گئی ہوئی ہے۔ نبیلہ کو بھی اس کا باپ وہیں لے گیا ہے۔"

رحمانی بابا جو سلطان کے دستے میں شامل تھا بولا۔ "سلطان معظم! میں سب کچھ سمجھ گیا ہوں۔ یہ وہی تماشا ہے جس کے بارے میں ہمیں قید خانے سے معلوم ہوا ہے۔ یہاں شیخ نجدی کے مجرموں کو سرعام اور عبرتناک سزا دی جاتی ہے اور شہر بھر کے بے فکرے ہولناک مناظر دیکھنے کے شوق میں وہاں جمع ہو جاتے ہیں۔ آیئے میں آپ کو اس مقتل تک لے چلتا ہوں۔ وہاں آپ کو شیخ نجدی کا اصل روپ دیکھنے کو ملے گا۔"

سب کے چہروں پر سنسنی دوڑ گئی۔ سلطان نے سر ہلا کر رحمانی بابا کو اجازت دی اور وہ انہیں لے کر شمال کی طرف چل نکلا۔

جلد ہی انہیں اونچے نیچے ٹیلوں کے عقب میں شور و غل کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ یوں لگتا تھا کسی جگہ بے شمار افراد ایک جگہ جمع ہیں۔ سلطان جلال اور رحمانی بابا سمیت وہ سب گھوڑوں سے اتر گئے اور انہیں ایک جگہ باندھ کر پیدل آگے بڑھنے لگے۔ چند گھاٹیاں پار کر کے جب وہ نشیب میں دیکھنے کے قابل ہوئے تو ان کی آنکھیں حیرت سے

دا رہ گئیں۔ ایک کھلے میدان میں ہزاروں افراد جمع تھے۔ یہ وسیع و عریض میدان دائرے کی شکل میں تھا اور زمین کو کھود کر بنایا گیا تھا۔ اس کی شکل ایک بڑے پیالے کی سی ہو گئی تھی۔ اس پیالے میں رنگ برنگ کپڑے پہنے ہزاروں مرد و زن جمع تھے۔ میدان کے درمیان کھلی جگہ پر ایک بڑا سا آہنی جنگلا نظر آ رہا تھا۔ یہ جنگلا کوئی پانچ گز بلند اور دائرے کی شکل میں تھا۔ دائرے کا قطر بیس گز رہا ہو گا۔ جنگلے کے بیچ و بیچ ایک ستون نظر آ رہا تھا' اس کی اونچائی قریباً دس گیارہ گز تھی۔ یہ ستون دراصل کسی درخت کا سیدھا تنا تھا۔ انہوں نے دیکھا کہ کوئی شخص اس تنے پر چڑھنے کی کوشش کر رہا ہے لیکن اس سے چڑھا نہیں جا رہا.......... اور تب ان کی نگاہ نیچے گئی۔ تنے کے نیچے چند جانور کھڑے تھے۔ اتنی دور سے بھی وہ انہیں صاف پہچان سکتے تھے۔ وہ شیر تھے۔ ان کی دُمیں تیزی سے حرکت کر رہی تھیں اور سُرخی مائل سنہری بدن دھوپ میں چمک رہے تھے۔ ان میں سے ایک شیر تھا اور دو شیرنیاں۔ ایک شیرنی اچھل اچھل کر تنے سے چمٹے ہوئے ننگ دھڑنگ شخص تک پہنچنے کی کوشش کر رہی تھی اور تب انہوں نے سلیمان کی سسکیاں سنیں۔ وہ سب اس کی طرف دیکھنے لگے۔ "کیا ہوا سلیمان؟" سردار یورق نے پوچھا۔

رحمانی بابا بولا۔ "وہ شخص جو آپ کو درخت کے تنے سے چمٹا نظر آ رہا ہے۔ سلیمان کا ساتھی ہے۔ یہ وہی لوگ ہیں جو محنت کشوں کی بستی سے گرفتار کئے گئے ہیں اور سلیمان بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ انہیں موت کی سزا دی جا رہی ہے۔" اس دوران انہوں نے دیکھا کہ درخت کے تنے سے چمٹا ہوا شخص پھسل کر تیزی سے نیچے آیا لیکن پھر ہاتھ پاؤں چلا کر اوپر چڑھنے لگا۔ پوری تماشاگاہ قہقہوں سے گونج اٹھی۔

رحمانی بابا بولا۔ "درخت کا یہ تنا جو زمین میں گاڑا گیا ہے بغیر چھلکے کے ہے۔ اس کی ملائم سطح پر ایک روغن مل دیا گیا ہے۔ قیدی سے کہا جاتا ہے کہ وہ اس تنے پر چڑھ کر بھوکے درندوں سے اپنی جان بچالے مصیبت کا مارا شخص موت سے بھاگنے کے لئے زور لگا کر تنے پر چڑھ جاتا ہے لیکن چکنی سطح کی وجہ سے وہ زیادہ اوپر نہیں جا سکتا۔ اس کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں اور وہ کوشش کے باوجود نیچے پھسلنے لگتا ہے۔ پھر جب وہ محسوس کرتا ہے کہ شیر چھلانگ لگا کر اسے گرا دے گا اور پھاڑ ڈالے گا تو وہ پھر زور لگا کر اوپر چڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔ دیکھنے والوں کے لئے یہ صورت حال بڑی مضحکہ خیز ہوتی ہے اور وہ ہنس ہنس کر بے حال ہو جاتے ہیں۔"

اس دوران درخت پر چڑھا ہوا شخص ایک بار پھر پھسلتا ہوا نیچے آنے لگا۔ موت کے خوف سے اس کے ہاتھ پاؤں تیزی سے چل رہے تھے لیکن وہ بتدریج نیچے آ رہا تھا۔

تماشائیوں کے قہقہوں سے وسیع و عریض تماشاگاہ گونج رہی تھی۔ پھر شیرنی نے اچھل کر قیدی کو پنجہ مارا اور وہ ہاتھ پاؤں چلاتا زمین پر گرا۔ چاروں طرف گھومتے درندے اس پر جھپٹے اور اس کا جسم چیرنے پھاڑنے میں مصروف ہو گئے۔ درندگی کا یہ مظاہرہ ان سے کم و بیش ڈھائی سو گز دور ہو رہا تھا لیکن پھر بھی وہ سن رہ گئے۔ مارینا اپنے آنسوؤں پر قابو نہ رکھ سکی اور گھٹنوں میں منہ چھپا کر رونے لگی۔

جب قیدی کے ٹکڑے درندوں کے پیٹ میں پہنچ چکے اور اس کی ہڈیاں بھی پہلے بدنصیبوں کی طرح پنجرے میں بکھر گئیں تو ایک اور قیدی کو میدان میں لایا گیا اور اسے دیکھتے ہی مارینا چلا اٹھی۔ "یہ تو.......... یہ تو اباقہ ہے۔"

مارینا کے ساتھ ساتھ یورق کا چہرہ بھی دھواں ہو گیا۔ اسے بھی معلوم نہیں تھا کہ اباقہ ان قیدیوں میں شامل ہے۔ سلطان جلال اور رحمانی بابا کو یہ بات قید خانے سے معلوم ہو چکی تھی۔ مگر انہیں بھی اباقہ کو دیکھ کر کچھ کم صدمہ نہیں ہوا۔ یورق چیخ کر بولا۔ "سلطان! آپ دیکھ رہے ہیں۔ یہ اباقہ ہے۔"

سلطان کی نگاہیں آسمان کی طرف تھیں وہ گھمبیر آواز میں بولا۔ "ہاں میں دیکھ رہا ہوں اور وہ خدا بھی دیکھ رہا ہے۔ جو وہ جانتا ہے ہم نہیں جانتے۔"

مارینا نے اپنا نچلا ہونٹ اتنے زور سے دانتوں میں دبا رکھا تھا کہ خون نمودار ہو گیا تھا۔ اس کی اشک بار آنکھیں تماشاگاہ پر مرکوز تھیں۔ وہاں.......... اباقہ دھیمے قدموں سے جنگلے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کے سیاہ بال اس کا کشادہ سینہ' اس کے توانا بازو۔ مارینا کی نگاہیں اس کے سراپا سے چپکی ہوئی تھیں۔ ہاں یہ اباقہ تھا۔ اس کا محبوب' اس کے خواب دیکھنے والا' اس کی چاہت میں دیوانہ۔ اس کی ایک مسکراہٹ کا طلبگار اور وہ ناکام اور مایوس موت کی طرف جا رہا تھا۔ کبھی نہ واپس لوٹنے کے لئے۔ اب کبھی وہ اسے حسرت بھری نگاہوں سے نہیں دیکھے گا' کبھی اسے تنگ نہیں کرے گا' اب کبھی اس کے لبوں پر معصوم سوال نہیں مچلیں گے' ہاں سب کچھ ختم ہو رہا تھا شاید۔

☆ ——— ☆ ——— ☆

اباقہ نے میدان میں داخل ہو کر چاروں طرف دیکھا۔ تین اطراف انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر تھا اور ایک جانب عمودی چٹانیں۔ یہ ایک گول میدان تھا کچھ کچھ فاصلے پر شیطان کی شبیہہ والے سیاہ پرچم لہرا رہے تھے۔ مشرق کی طرف کچھ بلندی پر طاؤس کا ایک بڑا مجسمہ نظر آ رہا تھا۔ ایسے چھوٹے اور بڑے مجسّمے اباقہ نے جزیرے پر کئی جگہ دیکھے تھے۔ شیطان پرست طاؤس کو مقدس سمجھ کر اس کی پوجا کرتے تھے۔ اباقہ نے

ہجوم پر ایک نظر دوڑائی اسے مرد و زن کے ہجوم میں بچے کہیں نظر نہیں آئے۔ غالباً یہ ہیبت ناک "تفریح" صرف بڑوں کے لئے مخصوص تھی۔

سامنے میدان کے بیچوں بیچ ایک گول آہنی جنگلا رکھا تھا۔ پہریدار نیزوں کی انیاں اس کی پشت سے لگائے عقب میں چل رہے تھے۔ اباقہ کا جسم زخموں سے چُور تھا اور اسے چلنے میں دشواری ہو رہی تھی۔ مگر اسے چلنا تھا۔ جب تک جسم میں جان تھی چلنا تھا۔ آہنی جنگلے کے دروازے پر پہنچ کر اس کے ہاتھ کھول دیئے گئے۔ پھر دو سپاہیوں نے دروازہ کھول کر پھرتی سے اسے اندر دھکیل دیا۔ پنجرے میں چاروں طرف جسموں کے ادھ کھائے ٹکڑے اور آنتیں بکھری ہوئی تھیں۔ درندوں کے جسموں سے اٹھنے والی بو اس منظر کو اور بھی کریہہ بنا رہی تھی۔ اباقہ کو دیکھتے ہی خونخوار درندے غرانے لگے۔ ان کی دُمیں تیزی سے گردش کر رہی تھیں۔ اباقہ نے اپنے سامنے درخت کے تنے کو دیکھا۔ اسے معلوم تھا کہ تنا یہاں کیوں گاڑا گیا ہے۔ اس نے چند قدم بھاگ کر چھلانگ لگائی اور تنے سے لپٹ گیا۔ تنے کی سطح چکنی تھی لیکن وہ تیزی سے ہاتھ پاؤں چلا کر اوپر چڑھنے لگا۔ اس سے پہلے قراقرم میں وہ تنے پر چڑھنے کا ایک ایسا مقابلہ جیت چکا تھا لیکن یہاں صورت حال مختلف اور نہایت سنگین تھی۔ تنے کی سطح پر روغن ملا گیا تھا اور نیچے خون آشام درندے اس کے منتظر تھے۔ ان تھک کوشش سے اباقہ کوئی سات گز اوپر جانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کی سانس سینے میں نہیں سما رہی تھی اور جسم پسینے میں شرابور ہو گیا تھا۔ یہ پسینہ اس کے کام کو اور مشکل بنا رہا تھا۔ ابھی تنے کا بالائی سرا کوئی چار گز اوپر تھا۔ آخر اباقہ کے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے۔ تماشاگاہ پر خاموشی چھائی تھی۔ آج تک کوئی قیدی اتنی بلندی تک نہ پہنچا سکا تھا۔

.... اب تماشائی منتظر تھے کہ تماشا شروع ہو اور قیدی ہمت ہار کر نیچے پھسلنے لگے اور واقعی اب اباقہ کی ہمت جواب دے چکی تھی .... لیکن وہ جدوجہد ترک کرنے والا شخص نہیں تھا۔ اس کے باپ نے اسے باہر کی طاقتوں کے ساتھ ساتھ اندرونی کمزوریوں سے لڑنا بھی سکھایا تھا اور وہ لڑنا جانتا تھا۔ آخری وقت اور آخری سانس تک۔ جب وہ نیچے پھسلنے لگا تو اس نے اپنے دانت بے انتہا طاقت کے ساتھ تنے کے اندر گاڑ دیئے۔ اس کا جسم ساکت ہو گیا۔ جان بچانے کی یہ ایک انوکھی ترکیب تھی۔

سانسیں درست کرنے کے بعد اس نے ایک اور زبردست کوشش کی اور تنے کے بالائی سرے تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ تماشائیوں کی نگاہیں حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں۔ اباقہ نے تنے پر کھڑے ہو کر چاروں طرف دیکھا' پھر اس نے ایک زوردار چھلانگ لگائی اور

قلابازی کھاتا ہوا جنگلے سے باہر گرا۔ تماشائیوں نے سمجھا کہ اتنی بلندی سے گر کر اب وہ پھر نہ اٹھ سکے گا لیکن جب پہریدار نیزے تھامنے بھاگتے ہوئے اس کے پاس پہنچے تو وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ پہریداروں نے اسے گھیرنا چاہا۔ اس نے حیرت انگیز پھرتی سے ایک پہریدار کا نیزہ چھینا اور دستے کے کماندار کو زخمی کر کے دروازے کی طرف بھاگا مگر اس وقت دروازے سے کوئی دو درجن نیزہ بردار اندر گھس آئے۔ وہ سب کے سب زرہ پوش اور مسلح تھے دوسری طرف اباقہ کے جسم پر ایک لنگوٹ کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ اس کا جسم بھی زخموں سے چُور تھا۔ یہ لوہے اور انسانی گوشت کا مقابلہ تھا۔ پیچھے آنے والے پہریداروں میں سے دو نے نیزے پھینکے۔ ایک نیزہ اباقہ کی ران پر لگا اور وہ لڑکھڑا کر گرا۔ آگے والے نیزہ برداروں نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا اور لاتوں اور گھونسوں سے انتہائی بے دردی سے مارنے لگے۔ ضربیں ایک تواتر سے اباقہ کے جسم پر پڑ رہی تھیں۔ مجمعے میں جوش و خروش کی لہر دوڑ گئی۔ لوگ زرہ پوش سپاہیوں کو ان کی سفاکی پر دل کھول کر داد دے رہے تھے۔ جلد ہی اباقہ کے جسم کا چپہ چپہ خون اگلنے لگا۔ وہ بے سدھ ہو گیا تو اس کے ہاتھ آہنی زنجیر میں جکڑے گئے اور صحتمند سپاہی اسے گھسیٹتے ہوئے میدان کی شمالی جانب لے گئے۔ یہاں ایک مزین کرسی پر شیخ نجدی پورے جاہ و جلال سے فروکش تھا۔ اس کے مصاحبین سرخ کرسیوں کی دو قطاروں میں بیٹھے تھے۔ شیخ نجدی نے بلند آواز سے کہا۔

"قیدی! تُو نے ہمیں اور ہماری رعایا کو اپنی اچھل کود سے لطف اندوز کیا۔ اس کے صلے میں تُو ہم سے اپنی مرضی کی موت مانگ سکتا ہے۔"

اباقہ نے اپنا خون آلود چہرہ اٹھایا۔ اس کے اندر نفرت کا جوالامکھی دہک رہا تھا۔ وہ آہنی ہاتھوں کی گرفت میں گرج کر بولا۔ "ذلیل کتے تُو مجھے موت دینے والا کون ہوتا ہے۔ میں اسی وقت مروں گا جب میری سانسیں پوری ہوں گی اور اسی طرح مروں گا جیسے میرا خدا چاہے گا۔"

شیخ نجدی کے لئے ذلیل کتے کا خطاب سن کر اس کے اردگرد بیٹھے لوگ آگ بگولہ ہو گئے۔ وہ سب چلانے لگے۔ "مارو اسے .... مارو اسے۔"

زرہ پوش سپاہیوں نے ایک بار پھر اباقہ کو ٹھوکروں اور گھونسوں پر رکھ لیا۔ وہ ادھ موا ہو گیا تو اسے بغلوں میں ہاتھ دے کر پھر کھڑا کیا گیا۔ اباقہ لوگوں کی طرف انگلی اٹھا کر چلایا۔

"میری بات سنو .... میری بات سنو۔ ہوش میں آ جاؤ۔ یہ شیخ نجدی' یہ غلیظ

جانور تمہیں تباہی کی طرف لے جا رہا ہے۔ تم نے اس کے خلاف تلوار اٹھا کر جو فیصلہ کیا
تھا وہ درست تھا۔ یہ تمہیں فریب دے رہا ہے۔ اس کی فطرت وہی ہے۔ یہ تمہیں
دھوکے سے مارے گا۔ ہوش میں آؤ۔ رزق دینے والی وہ قدرت ہے جو آسمانوں پر موجود
ہے۔ اُس سے ڈرو۔ اس سے نہ ڈرو.........."

اباقہ کوئی مقرر نہیں تھا۔ وہ بات بھی اچھی طرح نہ کر سکتا تھا مگر وحشت کی فراوانی
میں اس کی زبان بلا ڈر کے بول رہی تھی .... یہ اور بات ہے کہ اس تقریر کا الٹا اثر ہو
رہا تھا۔ تماشائی اس کے ہر فقرے پر قہقہے لگا رہے تھے۔ ہنس رہے تھے' اُچھل رہے تھے۔
پھر دو آدمیوں نے اباقہ کے منہ پر ہاتھ رکھا اور باقی اسے کھینچتے ہوئے شیخ نجدی سے دور
لے گئے۔

میدان کے درمیان لے جا کر اسے پھر مارنا شروع کر دیا گیا۔ اُسے مارنے کے لئے
کند چیزیں استعمال کی جا رہی تھیں' مبادا وہ جلدی نہ مرجائے۔ اسے لاٹھیوں' ڈھالوں'
آہنی خودوں اور زنجیروں سے مارا جا رہا تھا۔ یہ ایک دلدوز منظر تھا۔ اباقہ کے ہاتھ بندھے
تھے اور وہ بار بار پشت کے بل گرتا تھا۔

سلطان جلال' سردار یورق' رحمانی بابا' سلیمان اور ماریتا ٹیلوں کے عقب سے یہ
ہولناک نظارہ دیکھ رہے تھے۔ وہ جانتے تھے اور سب جانتے تھے کہ اب اباقہ کے لئے وہ
کچھ نہیں کر سکتے۔ اگر جذبات سے مغلوب ہو کر وہ میدان میں کودتے' سینکڑوں سپاہی ان
کی دھجیاں بکھیر دیتے۔ مرنا تو جلد یا بدیر انہیں بھی تھا لیکن وہ موت کو اتنا ارزاں نہیں
چاہتے تھے۔ وہ شیخ نجدی اور اس کی طاغوتی مملکت کو خاکستر کر کے مرنا چاہتے تھے اور اس
کے لئے پہاڑ جیسے حوصلے اور سمندر جیسے ضبط کی ضرورت تھی۔ ان کی آنکھیں خون کے
آنسو رو رہی تھیں لیکن وہ خاموش تھے' پتھروں کی طرح ساکت کھڑے تھے۔ آخر اس
خاموشی میں سلیمان کی غمناک آواز ابھری۔

"اے میرے مولا اپنے اس بندے کی مشکل آسان کر دے اگر اسے مرنا ہے تو
اسے جلد موت دے دے۔"

سلیمان کی یہ دعا اباقہ کے لئے تھی لیکن یہ دعا جب ماریتا کے کانوں میں پڑی تو وہ
تڑپ اٹھی۔ اس نے چلا کر کہا۔ "خاموش ہو جاؤ۔ وہ نہیں مر سکتا۔ وہ زندہ رہے گا' تم
دیکھنا وہ زندہ رہے گا۔ وہ اباقہ ہے .... اباقہ ہے وہ۔"

ماریتا کی آواز شدت جذبات سے لرز رہی تھی۔ دور نیچے اباقہ کو مارنے والے اب
اسے نیزوں سے پیٹ رہے تھے۔ اباقہ اٹھ اٹھ کر گر رہا تھا۔

☆=======☆=======☆

تماشاگاہ نعروں سے گونج رہی تھی۔ اباقہ نے گردن گھما کر دیکھا۔ اس کے عقب میں
چٹانیں تھیں اور چٹانوں کے عقب میں پُر شور سمندر' سمندر کی لہریں چٹانوں کی طویل دیوار
سے ٹکراتی تھیں تو اوپر اچھلنے والے پانی کے کچھ چھینٹے اس وسیع تماشاگاہ میں آگرتے
تھے۔ اباقہ کی پیشانی سے بہنے والا خون اس کی آنکھوں میں بھرا تھا۔ اس نے خون کی اس
سرخ چادر کے پیچھے سے دیکھا بالآخر وہ اس بھوری چٹان تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔
وہ اس چٹان کو اچھی طرح پہچانتا تھا.......... خوب اچھی طرح۔

ایک بار پھر وہ ضربیں اس کی پشت پر لگیں اور وہ لڑکھڑا کر چند قدم آگے گرا۔ اب
وہ بھوری چٹان کے قدموں میں تھا۔ یہ دو گز چوڑی چٹان کوئی چھ گز بلند تھی اور دو بڑی
چٹانوں کے درمیان کسی پھانس کی طرح اٹکی ہوئی تھی۔ اباقہ جانتا تھا اس چٹان کی دوسری
جانب کیا ہے۔ سمندر کا پانی اس چٹان کے نیچے سے بہت سی مٹی نکال کر لے گیا تھا۔ وہ
کسی ایسے درخت کی طرح تھی جسے دیمک کھا چکی ہو لیکن وہ صحیح سلامت کھڑا ہو۔ اس
خاموش چٹان کا رازداں صرف اباقہ تھا۔ دفعتاً اباقہ لڑکھڑاتا ہوا اپنی دائیں جانب بڑھا۔
یہاں ایک آہنی گول لٹھ پر شیطان کی شبیہہ والا سیاہ پرچم لہرا رہا تھا۔ اباقہ نے ایک جھٹکے
سے یہ آہنی لٹھ اکھاڑ لی۔ زرہ پوش سپاہی چوکس ہو گئے۔ شاید وہ سمجھ تھے کہ اباقہ حملہ کرنا
چاہتا ہے مگر اباقہ ان کی طرف متوجہ ہوئے بغیر بھوری چٹان کی طرف بڑھا۔ وہ چٹان کے
زیریں حصے میں ایک خلا دیکھ چکا تھا۔ اس نے جسم کی رہی سہی قوت جمع کی اور چند قدم
بھاگ کر پوری ہمت سے یہ طویل لٹھ اس خلا میں پیوست کر دی۔ لٹھ قریباً دو گز تک چٹان
کے نیچے گھس گئی۔ زرہ بکتر سپاہیوں کے ساتھ ساتھ پوری تماشاگاہ قہقہوں سے گونج اٹھی۔
وہ سمجھ رہے تھے کہ موت کو سامنے دیکھ کر قیدی کے حواس جاتے رہے ہیں اور وہ پتھروں
کو نشانہ بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اباقہ نے اس آہنی لٹھ کا دوسرا سرا اپنے بندھے
ہاتھوں میں تھاما اور پوری قوت سے اسے اوپر کی طرف اٹھانے لگا۔

زرہ پوش سپاہی اطمینان سے ایک طرف کھڑے تھے۔ تماشائی بھی دلچسپی سے اباقہ کو
زور آزمائی کرتے دیکھ رہے تھے۔ اباقہ کے جسم کی ساری قوت اس کے بازوؤں میں جمع ہو
ٹی تھی۔ گلے کی رگیں پھول گئی تھیں۔ آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ جسم کا ایک ایک
ل نمایاں تھا۔ پنجے زمین میں گڑے ہوئے تھے۔ سارا وجود بے پناہ مشقت کے سبب
ھیرے دھیرے لرز رہا تھا۔ کئی لمحے گزر گئے لیکن کچھ نہیں ہوا۔ تماشائیوں کے قہقہے بلند
ے بلند ہو رہے تھے۔ اگر قیدی اس وزنی چٹان کو اپنی جگہ سے ہلانے کی کوشش کر رہا تھا

تو وہ اس پر ہنسنے کے سوا اور کیا کر سکتے تھے۔ زرہ پوش سپاہیوں کے چہرے بھی مسکرا رہے تھے۔ پھر دفعتاً ان کی مسکراہٹیں معدوم ہونے لگیں۔ چٹان کے اوپر سے چھوٹے چھوٹے پتھر گر کر نیچے آ رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی انہیں گڑگڑاہٹ کی مدھم آواز آنے لگی۔ انہوں نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا کیا واقعی چٹان اپنی جگہ سے سرک رہی ہے .... یقیناً ایسا ہی تھا۔ چٹان غیر محسوس طور پر باہر کی طرف جھک رہی تھی۔ اس وقت اباقہ کے حلق سے ایک خوفناک چنگھاڑ بلند ہوئی .... اور قہقہے لگاتے ہوئے سینکڑوں ہزاروں تماشائیوں کو سانپ سونگھ گیا۔ چٹان باہر کی طرف سرک رہی تھی۔ گڑگڑاہٹ مہیب ہوتی چلی گئی .... پھر ایک زبردست آواز سے یہ ستون نما چٹان باہر جا گری۔ سمندری پانی کا ایک تندریلا دیوانہ وار تماشا گاہ میں گھسا۔ اباقہ اور زرہ پوش سپاہی تیزی سے ایک طرف بھاگے۔ سفید جھاگ اڑاتا ہوا پانی ایک چادر کی طرف میدان میں پھیلنے لگا۔ تماشائی حیرت سے گنگ یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ دفعتاً ان کی چیخیں بلند ہوئیں۔ ایک خوفناک ترین منظر ان کی آنکھوں کے سامنے آیا۔ سمندر کی ایک دیوہیکل لہر پوری قوت کے ساتھ آئی اور اس نئے درّے کے ساتھ ٹکرائی۔ تند و تیز بے قابو پانی طوفانی رفتار سے اندر گھسا۔ اس کے ساتھ ہی اردگرد کی دو چٹانیں لرزہ خیز گڑگڑاہٹ کے ساتھ اپنی جگہ چھوڑ گئیں۔ تماشائیوں کی نگاہوں نے ایک ناقابل یقین منظر دیکھا۔ سمندر کے اور ان کے درمیان جو سنگلاخ دیوار حائل تھی اس میں ایک وسیع شگاف نظر آ رہا تھا۔ سفید جھاگ اڑاتا پانی حیران کن رفتار سے ان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وسیع تماشا گاہ کربناک چیخوں سے گونجی اور ہزاروں انسانوں کا ہجوم سینکڑوں انسانوں کو پاؤں تلے روندتا پناہ کی تلاش میں بھاگا .... پناہ آج کہیں نہیں تھی۔ بپھرے ہوئے سمندر کا ریلا پُرشور آواز میں ایک ہی بات دوہرا رہا تھا۔ "میں تمہاری موت ہوں .... میں تمہاری موت ہوں۔" یہ آواز تماشا گاہ میں موجود ہر فرد کے لئے تھی، ہر ذی روح کے لئے تھی .... اور اس معصوم لڑکی کے لئے بھی تھی جس کا نام نبیلہ تھا..........

اگر کوئی تماشا گاہ سے باہر تھا تو وہ سلطان جلال اور اس کے ساتھی تھے اور وہ اپنے سامنے ہزاروں شیطان پرستوں کو پانی کی لہروں پر ہاتھ پاؤں مارتے دیکھ رہے تھے۔ دفعتاً سردار یورق کی نگاہ نیچے کسی پر پڑی اور وہ چیخ اٹھا "نبیلہ" اس کے ہاتھ کی انگلی جس طرف اشارہ کر رہی تھی وہاں سینکڑوں سر اور ہاتھ نظر آ رہے تھے .... پھر بھی سلیمان کی نگاہوں نے اپنی محبوبہ کو پہچان لیا۔ وہ سبز لباس میں تھی اور اسے اس لباس میں وہ پہلے بھی کئی بار دیکھ چکا تھا۔ اس کی جان سے پیاری ہستی موت و حیات کی کشمکش میں تھی۔

کنارے سے یہ منظر کیسے دیکھ سکتا تھا۔ وہ گہرے پانیوں کا شناور تھا۔ جزیرے کا سب سے بلند ہمت غوطہ خور .... اور اس دفعہ سوال کسی موتی کا نہیں تھا، ایک قیمتی ہیرے کا تھا، جو برسوں سے سلیمان کے دل کی انگوٹھی میں جگمگا رہا تھا۔ وہ اس ہیرے کو تاریک پانیوں میں گم ہوتے کیسے دیکھ سکتا تھا۔ وہ بھاگا .... پیالہ نما میدان کی ڈھلوان پر پہنچا اور پھر تیزی سے دوڑتا ہوا ٹھاٹھیں مارتے پانی میں کود گیا۔ سردار یورق نے بھی ایک لمحہ ضائع کئے بغیر سلیمان کی تقلید کی۔ دونوں پُرشور پانی میں ہاتھ پاؤں مارتے، سبز لباس والی دوشیزہ کے قریب پہنچے۔ سلیمان نے نبیلہ کی آواز دور ہی سے پہچان لی۔ وہ ہذیانی انداز میں چیخ رہی تھی۔ سردار یورق اور سلیمان نے لپک کر اسے بازوؤں میں تھام لیا۔ دفعتاً سردار یورق کو احساس ہوا کہ نبیلہ اکیلی نہیں اس کے چاروں طرف کچھ اور افراد موجود ہیں جو اسے گھیرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان افراد میں سے عمرو کی شکل سب سے نمایاں نظر آئی۔ عمرو نے بھی سردار یورق اور سلیمان کو پہچان لیا تھا۔ اس نے اپنے ساتھی سپاہیوں سے چلا کر کچھ کہا اور وہ یورق اور سلیمان پر ٹوٹ پڑے۔ شور مچاتے پانی پر سینکڑوں ڈوبتے ابھرتے لوگوں کے درمیان وہ آپس میں آمادہ پیکار ہو گئے۔ تلواروں اور خنجروں کا آزادانہ استعمال ہونے لگا۔ سلیمان اور یورق قریباً آٹھ آدمیوں کے سامنے اپنا دفاع کر رہے تھے۔ دیکھا جائے تو درحقیقت اکیلا یورق ہی آٹھ آدمیوں سے نبرد آزما تھا سلیمان نے تو نیم بے ہوش نبیلہ کو سہارا دے رکھا تھا۔ اپنا اور نبیلہ کا جسم سطح آب پر رکھنے کے لیے اسے سخت جدوجہد کرنا پڑ رہی تھی۔

دوسری طرف اباقہ شیخ نجدی کی تلاش میں تھا۔ وہ پانی کے پہلے تند و تیز ریلے سے خود کو بچانے میں کامیاب رہا تھا اور اب تیزی سے تیرتا ہوا اس جانب جا رہا تھا جہاں کچھ دیر پہلے شیخ نجدی اپنے مصاحبوں کے ساتھ پورے کروفر سے موجود تھا لیکن سرخ کرسیوں کی وہ دو قطاریں اب ناپید تھیں۔ وہ تمام کروفر اور شاہانہ ٹھاٹ سمندر کے گستاخ پانی کی نذر ہو چکا تھا۔ وسیع تماشا گاہ کا تین چوتھائی حصہ زیر آب آ چکا تھا اور جو بچ گیا تھا وہ تیزی سے سمندر کا لقمہ بن رہا تھا۔ بہت جلد یہاں سمندر کے سوا کچھ باقی رہنے والا نہیں تھا۔ یہاں اباقہ کو بے شمار دوسری لاشوں کے ساتھ رانی خانم کی لاش بھی تیرتی نظر آئی لیکن اتنی فرصت کسے تھی کہ کسی مرنے والے پر افسوس کا اظہار کرتا۔ اباقہ نے چاروں طرف شیخ نجدی کی تلاش میں نگاہیں دوڑائیں مگر لگتا تھا اسے بھی اپنے سینکڑوں مصاحبین کی طرح نشست چھوڑنے کی مہلت نہیں ملی تھی۔ اس کی شیطانی آگ خلیج کے پانی میں سرد ہو چکی تھی۔

اس وقت پانی پر تیرتی ہوئی ایک آواز اباقہ کے کانوں میں پڑی "اباقہ" وہ اس آواز کو ان گنت آوازوں میں بھی پہچان گیا۔ یہ اس کے بوڑھے دوست کی آواز تھی۔ سردار یورق کی آواز۔ اباقہ نے تڑپ کر اس کی جانب دیکھا۔ چالیس پچاس گز دور اسے تلواروں کی چمک دکھائی دی۔ اباقہ کا جسم تن گیا۔ زخمی جسم کے روئیں روئیں میں اٹھنے والی تمام ٹیسیں معدوم ہو گئیں۔ اس نے طویل سانس لی اور پانی کو کاٹتا ہوا پوری رفتار سے سردار یورق کی طرف بڑھا۔ سردار یورق تنہا کئی آدمیوں سے بھڑا ہوا تھا۔ اباقہ نے پانی میں غوطہ لگایا اور نیچے ہی نیچے تیرتا تصادم کی جگہ پہنچ گیا۔ وہ اپنا شکار منتخب کر چکا تھا۔ عمرو کا زیریں جسم اسے پانی میں صاف نظر آ رہا تھا۔ اس کے ساتھی سپاہیوں کی پنڈلیاں عریاں تھیں جب کہ وہ مکمل لباس میں تھا۔ اباقہ نے کسی آبی جانور کی طرح جھپٹ کر اس کی ٹانگیں پکڑیں اور نیچے پانی میں کھینچ لیا۔ عمرو کا خوفزدہ چہرہ اور پھٹی ہوئی آنکھیں اباقہ کو صاف نظر آ رہی تھیں۔ یہی وہ شخص تھا جس نے مکاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے راتوں رات ان کی فتح کو شکست میں بدل دیا تھا۔ وہ فوج کے اہم سردار کریم خاں کو ورغلا کر اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ پھر اباقہ کو شیخ نجدی کی طعام گاہ کا منظر یاد آیا۔ وہ زبان یاد آئی جو عمرو اور شیخ نجدی نے سلطان کے متعلق استعمال کی تھی۔ اباقہ کے جبڑے بھنچ گئے۔ اس نے نظر بھر کر عمرو کی ہراساں آنکھوں میں دیکھا پھر ایک جھکی دے کر اس کی گردن بغل میں لے لی۔ عمرو کوئی کمزور شخص نہیں تھا۔ اس نے اباقہ کے داؤ سے نکلنے کے لئے بہت زور مارا لیکن بپھرے ہوئے اباقہ کے سامنے اس کی ایک نہیں چلی۔ اباقہ نے ایک مخصوص جھٹکے سے اس کی گردن توڑ دی اور تڑپتا لاشا لاپرواہی سے پانی میں چھوڑ دیا۔ اس کے بعد وہ یورق اور سلیمان کا ہاتھ بٹانے کے لئے تیزی سے سطح آب پر نمودار ہو گیا۔

☆------☆------☆

عمرو کے کچھ ساتھیوں کو ہلاک کر کے اور کچھ سے پیچھا چھڑا کر اباقہ' یورق اور سلیمان نبیلہ کو لئے ٹیلوں پر چڑھ گئے۔ ان کے جسم پانی میں شرابور تھے۔ اباقہ کے جسم پر جگہ جگہ خون کے دھبے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ چلتے ہوئے بری طرح لنگڑا بھی رہا تھا۔ اس کی ران پر نیزا لگا تھا اور گہرا زخم آیا تھا۔ سلطان جلال تیزی سے آگے آیا۔ اباقہ نے سر جھکا کر اس کے ہاتھوں کو چوما۔ سلطان نے اس کا سر دونوں ہاتھوں میں لے کر بھیگی پیشانی کو ایک طویل بوسہ دیا۔ اباقہ کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔ پھر اس کی نگاہ مارینا کی طرف اٹھ گئی۔ مارینا سب سے پیچھے کھڑی اشکبار نگاہوں سے اسے تک رہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ سب کے سامنے اباقہ کی مزاج پرسی کیسے کرے۔ کچھ کہنا بھی مشکل تھا اور نہ کہنا

بھی باعث شرمندگی۔ پھر وہ چند قدم چل کر آگے آئی اور سلطان جلال کے عقب میں کھڑے ہو کر بولی۔ "تمہاری ٹانگ سے خون بہہ رہا ہے اباقہ۔"

اباقہ نے چونک کر ٹانگ کی طرف دیکھا جیسے پہلے اسے اس زخم کا علم ہی نہیں تھا۔ سلطان کی ہدایت پر سردار یورق نے سلطان کی چادر سے ایک پٹی پھاڑی اور اباقہ کی ٹانگ پر لپیٹ دی۔

"شیخ نجدی کا کیا ہوا؟" اباقہ سے سلطان جلال کا پہلا سوال یہی تھا۔

اباقہ نے کہا۔ "سلطان معظم! میں کچھ کہہ نہیں سکتا' لیکن عمرو کو میں اپنے ہاتھوں سے جہنم واصل کر کے آیا ہوں۔"

سلطان نے اپنا گھوڑا سنبھالتے ہوئے کہا۔ "ہمیں فوراً شیخ کے محل چلنا ہو گا۔ ابھی اور اسی وقت۔ اس کے حکم پر سب گھوڑوں پر سوار ہو گئے۔ نبیلہ اپنے باپ کی موت پر ابھی تک ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ مارینا نے اسے اپنے ساتھ سوار کر لیا۔ ابھی وہ محل سے کچھ دور ہی تھے کہ سپاہیوں کے ایک دستے سے ان کی مڈبھیڑ ہو گئی۔ وہ تماشاگاہ کے حادثے کی خبر پا کر سرپٹ اس طرف بھاگے جا رہے تھے۔ رحمانی بابا نے پہچان کر انہیں روکا۔ وہ اس کے وفادار سپاہیوں میں سے تھے۔ اس نے انہیں بتایا کہ اب تماشاگاہ میں ان کے کرنے کو کچھ باقی نہیں بچا۔ سب کچھ ختم ہو گیا ہے۔

ایک سپاہی رحمانی بابا کے پاس آیا اور اس نے بتایا کہ اس نے تھوڑی دیر پہلے شیخ نجدی اور اس کے کچھ ساتھیوں کو کھاڑی کی طرف جاتے دیکھا ہے۔ یہ اطلاع سلطان جلال' اباقہ اور ان کے ساتھیوں کے لئے دھماکہ خیز تھی۔ سلطان جلال نے اس سپاہی سے جلدی جلدی کچھ باتیں پوچھیں اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ تیزی سے کھاڑی کی طرف بڑھا۔ سرپٹ گھوڑے بھگاتے وہ مچھلی کے اس دیوہیکل ڈھانچے تک جا پہنچے جو جزیرے کی کھاڑی کا کام دیتا تھا۔ یہاں انہیں چند ہراساں محافظوں کے سوا کوئی دکھائی نہیں دیا۔ ان محافظوں سے کچھ پوچھنے سے پیشتر ہی انہیں معلوم ہو گیا کہ شیخ نجدی جزیرے سے فرار ہو چکا ہے۔ کھاڑی پر موجود چھ کشتیوں میں سے ایک کشتی غائب تھی۔ اباقہ نے محافظوں کو ذرا دھمکا کر اس بات کی تصدیق کر لی کہ چھٹی کشتی پر شیخ نجدی اپنے پانچ ساتھیوں کے ساتھ جزیرے سے فرار ہوا ہے۔

.... یہ فیصلے کی گھڑی تھی .... برائی کا درخت تو کٹ چکا تھا لیکن اس کی جڑ ابھی زمین میں موجود تھی۔ اس جڑ سے پھر ایک تناور درخت وجود میں آ سکتا تھا۔ سلطان نے رحمانی بابا سے کہا کہ وہ اپنے وفادار ساتھیوں کے ساتھ اس جزیرے کا نظم و نسق

سنبھال لے۔ اس نے رحمانی بابا کو کچھ ضروری ہدایات اور مشورے دیئے اور پھر اپنے ساتھیوں کے ساتھ فوراً جزیرہ چھوڑنے کا ارادہ کر لیا۔ اچانک نبیلہ روتی ہوئی سلطان جلال کے سامنے پہنچ گئی۔

"سلطان عالی! آپ نے مجھے دختر کہا تھا۔ خدا کے لئے مجھے بھی اپنے ساتھ لے جائیں۔ میں اس جگہ اب ایک لمحہ نہیں رک سکتی۔ یہاں میرے لئے کچھ باقی نہیں بچا۔" باپ کی موت نبیلہ کو ابھی تک اشک بار کئے ہوئے تھی۔ سلطان جلال نے اسے سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ ایک ناسمجھ بچی کی طرح مسلسل روئے جا رہی تھی۔ آخر سلطان نے اسے بھی ساتھ لے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ ظاہر تھا اب سلیمان بھی ان کے ساتھ جائے گا۔ ایک طرح کشتی کی سواریاں پوری ہو گئی تھیں۔ آمد کے سفر میں ان کے ساتھ سیوک رام تھا اور اب سلیمان۔ جعفر داراب کی جگہ نبیلہ نے پُر کر دی تھی۔ انہوں نے پانچ کشتیوں میں سے سب سے موزوں کشتی منتخب کی۔ ایک چھوٹی کشتی انہوں نے احتیاط کے طور پر اور ساتھ لے لی۔ اس دوران رحمانی بابا کے ساتھیوں نے ان کے لئے رخت سفر کا انتظام کر دیا۔ جس وقت سورج اس شیطانی جزیرے کے انجام پر غور کرتا مغرب میں ڈوب رہا تھا سلطان جلال اپنے ہمراہیوں کے ساتھ واپسی کے سفر پر روانہ ہو چکا تھا۔ جزیرے کی سوگوار فضا ہر لحظہ دھندلی ہوتی جا رہی تھی۔ اس دھندلکے میں مرنے والوں کی آخری چیخیں ابھی تک گونج رہی تھیں۔ اب ان چیخوں میں ماتم کرنے والوں کی آہ و بکا بھی شامل ہوتی جا رہی تھی۔ ابھی یہ شور بہت دھیما تھا لیکن دھیرے دھیرے اس شور کو بڑھنا تھا' بہت بڑھنا تھا۔ آج کی رات اس جزیرے کے لئے نہایت المناک تھی اور نہایت خوش آئند بھی۔

سورج مغرب میں ڈوب رہا تھا اور سلطان جلال اپنے ساتھیوں کے ساتھ سمندر کے سینے پر طلوع ہو رہا تھا۔ ان کی کشتیاں آہستہ آہستہ ساحل سے دور ہٹتی جا رہی تھیں۔ کنارے پر رحمانی بابا کے سینکڑوں ساتھی کھڑے انہیں الوداع کہہ رہے تھے۔ پھر آہستہ آہستہ ساحل ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ کھاڑی پر موجود کوہ قامت مچھلی کی سرخ نگاہیں ان پر مرکوز ہو گئیں۔ یہ مچھلی ایک طرح سے پانی میں تیرتا ہوا پل تھا جو سمندر اور جزیرے کے اونچے ساحل کو ملاتا تھا۔ سلیمان نے انہیں بتایا کہ ایسا ہی ایک پل ہرمز کے قریبی شہر "جرون" میں موجود ہے۔ وہاں ایک بہت بڑی مچھلی کا سر شہر کے داخلی دروازے کا کام دیتا ہے۔ لوگ اس کی ایک آنکھ میں سے داخل ہوتے اور دوسری سے نکلتے ہیں۔

سمندر کی لہروں پر ان کا سفر مسلسل جاری رہا۔ دوسرے روز یہ اہم بات ہوئی کہ وہ راستے سے بھٹک گئے۔ اس غلطی کی وجہ سے انہوں نے چار پہر ایک مختلف سمت میں سفر

جاری رکھا۔ جب دوبارہ ان کا رخ صحیح ہوا تو ہوا غیر موافق ہو گئی۔ بہر حال وہ راستے کی مشکلات پر قابو پاتے آگے بڑھتے رہے۔ انہیں اندازہ ہو چکا تھا کہ ان کی منزل ۔"کالے پہاڑوں کی وادی" ہی ثابت ہو گی۔ شیخ نجدی کے لیے محفوظ اور موزوں پناہ گاہ اب وہی وادی ہو سکتی تھی۔

پہلے والے راستے پر سفر کرتے ہوئے وہ ساحلی شہر خبابہ اور وہاں سے شاہ پور پہنچے۔ دشت لوط کی ہوا کھاتے ہوئے انہوں نے ایرانی علاقے میں سفر جاری رکھا اور بالآخر افغانستان کے علاقے میں داخل ہو گئے۔

☆------☆------☆

طوطم خان کوئی دو ماہ کالی وادی کے قید خانے میں سڑتا رہا۔ سخت گرمی میں اسے کھلے آسمان کے نیچے پتھر توڑنے پڑے اور بوجھ اٹھانا پڑا۔ اس نے بار بار یہی سوچا جعفر داراب سے بگاڑ کر اس نے اچھا نہیں کیا۔ پھر اسے معلوم ہوا کہ جعفر داراب اپنے نامعلوم سفر سے واپس لوٹ آیا ہے اس نے ایک خاص آدمی کے ہاتھ اسے پیغام بھجوایا کہ وہ اپنی غلطی پر شرمندہ ہے اور اس سے مل کر معافی مانگنا چاہتا ہے۔ کچھ بھی تھا طوطم خاں منگولوں کا سفیر تھا۔ جعفر داراب کے لیے وہ ایک نہایت اہم شخص تھا۔ اس نے اسے بلاوا بھیجا۔ طوطم خاں نے جعفر داراب سے معافی مانگ لی اور اس سے وفاداری کا عہد کیا۔ وہ مارینا کے متعلق پوچھنا چاہتا تھا کہ اس کا کیا ہوا لیکن اس کی ہمت نہیں پڑی۔ جعفر داراب نے بھی اس بارے میں کوئی بات نہیں کی۔ چند روز بعد جعفر داراب نے اسے بلایا۔ اس کی باتوں سے ظاہر ہوا کہ اس نے طوطم خاں کی معذرت قبول کر لی ہے اور اب وہ اسے اس کی قابلیت کے مطابق کوئی ذمے داری سونپنا چاہتا ہے۔ جعفر داراب نے طوطم خاں کو نیلے پہاڑ کے اندر موجود محافظوں کی سرداری سونپی۔ اگلے ہی روز طوطم خاں نے اپنا کام سنبھال لیا۔ وہ جب سے یہاں آیا تھا پہلی بار نیلے پہاڑ کے اندر گیا تھا۔ پہاڑ کے اندر داخل ہوتے ہی دائیں طرف جعفر داراب کا نو تعمیر شدہ محل نظر آتا تھا۔ پہاڑ کو اندر سے کھود کر دیدہ زیب دالانوں' راہداریوں اور خواب گاہوں کی شکل دے دی گئی تھی۔ آئینوں کا استعمال اس کثرت سے کیا گیا تھا کہ قندیلیں روشن ہوتے ہی در و دیوار بقعہ نور بن جاتے تھے۔ وادی کی نسبت یہاں کا درجہ حرارت بھی بہت کم رہتا تھا۔ بائیں جانب وہ سرنگ تھی جو بل کھاتی راجی خاتون کی رہائش گاہ کی طرف جاتی تھی۔ طوطم خاں کو اسی حصے کی محافظت سپرد تھی۔ سرنگ کے دہانے سے آگے قریباً دو سو گز کا فاصلہ طوطم خاں کی عملداری میں تھا۔ اس سے آگے راجی خاتون نے اپنی ذاتی محافظ عورتیں تعینات کر رکھی

تھیں۔ خاص اور نہایت اہم ضرورت کے سوا مرد محافظوں کو اس سے آگے جانے کی اجازت نہیں تھی۔

طوطم خاں کو اپنی اس نئی ملازمت پر کئی روز گزر گئے۔ ایک روز اس نے راجی خاتون کے محافظ دستے کی سالار ثوبیہ کو دیکھا جو نہایت تیزی سے راجی خاتون کی رہائش گاہ کی طرف جا رہی تھی۔ طوطم خاں نے اس سے پہلے بھی اسے کئی دفعہ راجی خاتون کے پاس آتے جاتے دیکھا تھا لیکن آج اس کا انداز کچھ دوسرا تھا۔ وہ نہایت خوش نظر آتی تھی اور اس کا انداز بتاتا تھا کہ وہ راجی خاتون کے لیے کوئی نہایت اہم اطلاع لے کر جا رہی ہے۔ طوطم خاں کی رگ تجسس پھڑکی۔ وہ خود کو ثوبیہ کے تعاقب سے باز نہ رکھ سکا۔ مختلف سرنگوں سے ہوتی ہوئی ثوبیہ راجی خاتون کی قیام گاہ کے سامنے پہنچ گئی۔ دروازوں پر کھڑی محافظ عورتوں نے ٹھٹک کر طوطم خاں کو دیکھا لیکن وہ ہاتھ میں ایک کاغذ لیے اعتماد سے آگے بڑھتا چلا گیا۔ محافظ عورتوں نے سمجھا شاید وہ کوئی ضروری نوعیت کا پیغام لے کر جا رہا ہے۔ آخر طوطم خاں اس دروازے کے سامنے پہنچ گیا جس پر دبیز مخملیں پردے لٹک رہے تھے اور دو گونگی بہری خادمائیں ایک نہایت خوبصورت قندیل کے نیچے مؤدب کھڑی تھیں۔ طوطم خاں پھرتی سے ایک دیوار کے ساتھ چپک گیا۔ اس کے دل میں شدید خواہش ابھر رہی تھی کہ وہ راجی خاتون کا مسکن دیکھے لیکن اس سے آگے بڑھنا سخت خطرناک تھا۔ وہ وہیں کھڑا ہو کر اندر کی آوازیں سننے لگا۔ ثوبیہ اور راجی خاتون بلند آواز سے باتیں کر رہی تھیں (یہاں موجود تمام پہریدار گونگی اور بہری تھیں) ثوبیہ خوشی سے لرزاں آواز میں کہہ رہی تھی۔ "خاتون معظم! میں نے اپنی آنکھوں سے ماریتا کو دیکھا ہے۔"

راجی خاتون بولی۔ "اس کا مطلب ہے کہ اباقہ اور سلطان جلال الدین بھی یہاں موجود ہوں گے۔"

"بالکل خاتون معظم۔"

راجی خاتون بولی۔ "مجھے ایک اور بات بھی سمجھ آ رہی ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ اباقہ اور سلطان جلال نے شیخ نجدی کے ٹھکانے کو تہس نہس کر دیا ہے۔ شیخ نجدی اپنی جان بچا کر بھاگا ہے اور اباقہ وغیرہ اس کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں آئے ہیں۔"

ثوبیہ حیرت سے بولی۔ "آپ کا مطلب ہے کہ شیخ نجدی بھی یہاں موجود ہے؟"

"بالکل!" راجی خاتون کی مترنم اور پُر اعتماد آواز ابھری۔ "شیخ نجدی اس وادی میں آ چکا ہے اور اس وقت جعفر داراب کی پناہ میں ہے۔"

ثوبیہ بولی۔ "خاتون معظم! آپ کا قیافہ ہمیشہ درست ثابت ہوا ہے .... ذرا اباقہ

اور سلطان جلال کے متعلق بھی تو اندازہ لگائیے وہ کہاں ہیں۔ خاص طور پر اباقہ کے متعلق تو آپ کے دل کی گواہی معتبر ہو گی۔" ثوبیہ کی آواز میں ہلکی سی شوخی بھی تھی۔

"کیا مطلب؟" راجی خاتون کی آواز آئی۔

ثوبیہ بولی۔ "میری پیاری ملکہ! بندی ایک مدت سے آپ کے ساتھ ہے۔ آپ کی قیافہ شناسی سے وہ بھی فیض یاب ہوئی ہے۔ اباقہ کے نام پر آپ کے رخساروں پر کھلنے والی شفق اسے بہت کچھ سمجھا دیتی ہے۔"

"ثوبیہ!" راجی خاتون کی تحکمانہ آواز ابھری۔

"معافی چاہتی ہوں خاتون معظم۔" ثوبیہ جلدی سے بولی۔ "پھر بھی تو بتائیے۔ اباقہ اور سلطان جلال کہاں ہوں گے؟"

چند لمحے کمرے میں خاموشی طاری رہی۔ پھر راجی خاتون کی گھنٹیوں جیسی پُراسرار آواز ابھری۔ "وہ بھی وادی میں موجود ہیں۔ کھلے آسمان کے نیچے .... کھلے آسمان کے نیچے، کہیں مشقت کر رہے ہیں۔"

ثوبیہ بولی۔ "خاتون معظم! میں کچھ سمجھی نہیں۔"

راجی خاتون بولی۔ "فی الحال اسے راز ہی رہنے دو کیونکہ میں خود بھی یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔ تم اب یوں کرو کہ فوراً اس مکان کی نگرانی شروع کر دو۔ جہاں ماریتا موجود ہے ممکن ہے اباقہ یا اس کے ساتھیوں میں سے کوئی اس تک پہنچے اور وہاں اباقہ اور اس کے تمام ساتھیوں کو تحفظ دینا بھی تمہاری ذمے داری ہے۔"

"آپ فکر ہی نہ کریں ملکہ! بندی آپ کے حکم پر جان دینا خوش نصیبی سمجھتی ہے۔"

راجی خاتون سے اجازت لے کر ثوبیہ باہر نکل آئی۔ وہ چست لباس میں ملبوس سر پر خود پہنے اور کمر سے تلوار لٹکائے تیزی سے دہانے کی طرف جا رہی تھی۔ اپنی مردانہ چال سے وہ بالکل کوئی لڑکا دکھائی دیتی تھی۔ جب وہ کچھ دور نکل گئی تو طوطم خاں بھی اپنی جگہ سے حرکت میں آ گیا مختلف محرابی دروازوں سے گزر کر وہ دہانے پر پہنچا تو ثوبیہ اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا رہی تھی۔ طوطم خاں بھاگ کر اپنے گھوڑے تک پہنچا اور ثوبیہ کے پیچھے لگ گیا۔

شام کا وقت تھا۔ ڈوبنے والے سورج کی سرخی آسمان پر پھیلی ہوئی تھی۔ طوطم خان نے احتیاط سے ثوبیہ کا تعاقب شروع کر دیا لیکن جلد ہی طوطم خاں کی یہ خوش فہمی دور ہو گئی کہ ثوبیہ اپنے تعاقب سے بالکل بے خبر ہے۔ یہ نہایت تشویشناک صورت حال تھی۔ اس نے ثوبیہ سے اپنا فاصلہ اور بڑھا دیا۔ مگر جونہی وہ ایک گلی میں مڑا، ثوبیہ بیس پچیس گز

دور کھڑی نظر آئی۔ اس کا رخ طوطم خان کی طرف تھا۔ طوطم خان نے چہرہ پگڑی میں چھپا رکھا تھا اس لیے اسے یقین تھا کہ ثوبیہ اسے پہچان نہ پائی ہو گی پھر بھی غیرارادی طور پر اس کے ہاتھوں نے لگام کھینچ لی۔ گھوڑا رک گیا۔ گھوڑا رکتے ہی ثوبیہ کا شک یقین میں بدل گیا اور اس نے اپنا گھوڑا تیزی سے طوطم خاں کی طرف بڑھایا۔ طوطم خاں کے عیار ذہن نے نہایت عجلت سے ایک فیصلہ کیا۔ اس نے گھوڑے کو موڑا اور اندھا دھند مخالف سمت میں بھاگ کھڑا ہوا۔ جعفر داراب کی جلی ہوئی اہرام نما رہائش گاہ کے قریب سے ہو کر وہ ٹیلوں کی طرف بڑھ گیا۔ حسب توقع ثوبیہ اس کے تعاقب میں تھی۔ ٹیلوں میں پہنچ کر طوطم خاں نے پھرتی سے اپنا گھوڑا چند جھاڑیوں کی اوٹ میں کر لیا۔ بھاری بھر کم ہونے کے باوجود اس میں بلا کی پھرتی تھی۔ اس نے اپنی تلوار نکالی اور ثوبیہ کا انتظار کرنے لگا۔ جونہی ثوبیہ گھوڑا دوڑاتی درختوں کے قریب سے گزری طوطم خاں نے اپنے گھوڑے کو ہلکی سی ایڑ لگائی اور لپک کر ثوبیہ پر وار کیا۔ تلوار ثوبیہ کے کندھے پر پڑی اور وہ گھوڑے سمیت الٹ کر زمین پر گری۔ گھوڑا ہنہناتا ہوا ایک جانب بھاگ گیا۔ ثوبیہ دو قلابازیاں کھا کر کھڑی ہوئی تو طوطم خاں گھوڑے پر سوار اس کے سامنے کھڑا تھا۔ ثوبیہ کا آہنی خود گر چکا تھا۔ طوطم خاں نے گھوڑے پر سے ہاتھ بڑھا کر اس کے بال اپنی مٹھی میں جکڑ لیے اور تلوار اس کی گردن پر رکھ دی۔ وہ چاہتا تھا کہ تلوار کے زور پر ثوبیہ سے مارینا کا اتہ پتہ معلوم کرے .... لیکن اس نے راجی خاتون کی محافظ خاص کی عسکری مہارت کا اندازہ لگانے میں بہت غلطی کی تھی۔ دفعتاً ثوبیہ نے طوطم خاں کا تلوار والا ہاتھ پکڑا اور ایک زبردست جھٹکے سے زمین پر گرا دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کی تلوار نیام سے باہر آئی اور بجلی بن کر طوطم خاں کے سر پر چمکی۔ طوطم خاں نے ثوبیہ سے تلوار زنی شروع کی تو جلد ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ کس پائے کی شمشیر زن ہے۔ طوطم خان کو دانتوں پسینہ آ گیا۔ وہ دوبار گرتے گرتے بچا اور تیسری بار سچ مچ گر گیا لینے کے دینے پڑ گئے تھے۔ پھر اس نے اپنی عیاری سے کام لیا۔ ایک ہاتھ سے ثوبیہ کا وار روکتے ہوئے اس نے دوسرے ہاتھ سے اسے رکنے کا اشارہ کیا۔

"ٹھہرو لڑکی! میری بات سنو۔"

ثوبیہ نے تلوار کی نوک طوطم خاں کے سینے پر رکھ دی۔ "پگڑی ہٹاؤ۔" وہ گرج کر بولی۔

اس وقت طوطم خاں اپنی مہارت دکھا گیا۔ اپنا سینہ بچا کر اس نے نہایت پھرتی سے تلوار کا سیدھا وار کیا۔ ثوبیہ کے منہ سے آہ نکل گئی۔ تلوار اس کے سینے میں پیوست ہو

چکی تھی۔ وہ لڑکھڑا کر گری لیکن گرتے گرتے بھی اس نے طوطم خاں کے سر کو نشان بنانے کی کوشش کی جو کامیاب نہیں ہوئی۔ ثوبیہ کے چہرے پر ایک مطمئن مسکراہٹ تھی۔ موت کا کرب اس مسکراہٹ کے پیچھے معدوم ہو چکا تھا۔ چند لمحوں بعد اس کی آنکھیں پتھرا گئیں۔

☆------☆------☆

کھلے آسمان کے نیچے اباقہ پتھر توڑ رہا تھا۔ اس سے چند گز کے فاصلے پر سردار یورق اور سلیمان بھی اسی کام میں مصروف تھے۔ سلطان جلال الدین ان میں نہیں تھا۔ وہ تینوں اپنے منصوبے کے مطابق کل رات ہی اس قید خانے میں داخل ہو گئے تھے۔ اس کے لیے انہیں صرف ایک محافظ کی جان لینا پڑی تھی۔ ہاں اب اگر وہ یہاں سے نکلنا چاہتے تو شاید بیسیوں کو قتل کر کے بھی نہ نکل سکتے لیکن فی الحال وہ نکلنا چاہتے بھی نہیں تھے۔ انہیں اس قید خانے سے اس وقت نکلنا تھا جب یہاں کا ہر قیدی جعفر داراب کے خون کا پیاسا ہو چکا ہوتا۔ انہیں ان بے جان جسموں میں زندگی کی تڑپ اور جینے کا حوصلہ پیدا کرنا تھا۔ ان کے جھکے ہوئے سروں کو اٹھانا تھا اور ان کے ہاتھوں کو وہ توانائی دینا تھی کہ اکڑی ہوئی گردنیں خود بخود ان کی گرفت میں آ جائیں۔ انہیں ان لوگوں کی کایا پلٹنا تھی .... اور یہ مقصد کسی ایسی انہونی سے حاصل ہو سکتا تھا جس کا ظلم کی اس کالی وادی میں تصور بھی نہ کیا جا سکتا ہو۔ مظلوم تعداد میں بہت تھے لیکن حوصلہ میں بہت تھوڑے۔ ان کے خوابیدہ حوصلوں کو کسی صور اسرافیل کی ضرورت تھی۔

پھر وہ قیامت کا روز بھی آ گیا جب چند سرفروشوں کی دیوانگی نے ایک صور پھونکا۔ ظلم و ستم کی پختہ قبریں پھٹ گئیں۔ صدیوں کے مردہ جسم جاگ اٹھے اور محشر برپا ہو گیا۔

وہ اس وادی کا ایک گرم ترین اور طویل دن تھا۔ دوپہر کے وقت آسمان سے آگ نچھاور ہو رہی تھی۔ زمین بھٹی کے لوہے کی طرح تپ رہی تھی۔ ایک عورت اپنے معصوم بچے کو ایک چٹان کے مختصر سائے میں لٹائے پتھر اٹھا رہی تھی۔ یہ پتھر قریباً نصف فرلانگ دور اس مقام پر پہنچائے جا رہے تھے جہاں ماہر کاریگر بیٹھے انہیں خوبصورت اینٹوں میں تراش رہے تھے۔ عورت وزنی پتھر سر پر اٹھائے ذرا دم لینے کے لیے رکی تو سردار یورق کے قریب بیٹھ گئی۔ سردار نے کہا۔

"اے عورت! اس مشقت سے تیرا سارا جسم آنسو اگل رہا ہے تو تیری آنکھوں کو رونے کی کیا ضرورت ہے؟"

عورت نے پھٹی اوڑھنی سے آنسو پونچھتے ہوئے اس چٹان کی طرف اشارہ کیا۔ جہاں

چند لمحے پہلے اس کا نومولود بچہ گلا پھاڑ پھاڑ کر رو رہا تھا۔ اب وہ چپ ہو چکا تھا۔ وہ بولی۔

"میں اپنے بچے کو دیکھنا چاہتی ہوں' وہ چپ کیوں ہو گیا ہے۔ محافظ نے مجھ پر کوڑے برسائے۔ کہتا ہے کہ بچہ روتا ہے تو تم دوڑتی ہو اور چپ ہوتا ہے تو تم دوڑتی ہو۔ اپنا کام کرو .... اب تم بتاؤ بھائی۔ مجھے کیا معلوم وہ روتے روتے چپ ہوا ہے یا چپ ہوتے ہوتے چپ ہو گیا ہے۔" عورت زار و قطار رونے لگی۔ پھر ہچکیاں لیتے ہوئے یورق سے بولی۔ "بھائی! میرا اتنا کام کر سکتے ہو کہ اس بدنصیب کو جا کر دیکھ لو۔ زندہ بھی ہے یا .... ؟" وہ پھر رو دی۔

یورق بولا۔ "میں بہت دیر سے تجھے دیکھ رہا ہوں۔ دیکھ بی بی! وہ تیرا بچہ ہے۔ دنیا کی کوئی طاقت ایک ماں کو ایک روتے بلکتے بچے کے پاس جانے سے نہیں روک سکتی اور اگر وہ کسی وجہ سے رکتی ہے تو پھر وہ ماں نہیں۔ جا تُو اپنے بچے کے پاس۔ میں دیکھتا ہوں کون تیرے راستے میں آتا ہے۔"

عورت جیسے پہلے ہی کشمکش میں مبتلا تھی۔ اس نے گھوم کر ایک نظر کوڑا بردار پہریداروں کی طرف دیکھا پھر ایک نظر بچے کی طرف دوڑائی اور بے اختیار ہو کر اس جانب لپکی۔ پہریداروں کی مکروہ آوازیں فضا میں گونجیں لیکن وہ عورت تیر کی طرح بڑھتی چلی گئی۔ اس نے بچے کو جا کر دیکھا' سینے سے لگایا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ پہریدار لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس کے سر پر پہنچ گیا۔ کچھ دیکھے سنے بغیر اس نے عورت پر کوڑے برسانے شروع کر دیے۔

"میرا بچہ مرگیا ہے .... میرا بچہ مرگیا ہے۔" عورت ہذیانی انداز میں چیخی لیکن کوڑے برسانے والا ہاتھ نہیں رکا۔ عورت مردہ بچے کو ضربوں سے بچانے کی کوشش کرتی رہی۔ پھر وہ گری اور بچہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ پہریدار جیسے غصے میں دیوانہ ہو رہا تھا۔ قیدی کن اکھیوں سے یہ منظر دیکھ رہے تھے کسی میں اتنی جرأت بھی نہیں تھی کہ آنکھ بھر کر اُدھر دیکھ سکتا۔ پہریدار کوڑے لہراتے ہوئے' لوگوں پر چیخ رہے تھے۔ "سب اپنا اپنا کام کرو .... تم سب اپنا اپنا کام کرو۔"

.... سب اپنا اپنا کام کر رہے تھے اور ایک عورت مظلومیت کی انتہا سے گزر رہی تھی۔ سردار یورق نے اپنے ہاتھ کا ہتھوڑا پھینکا اور تیزی سے عورت کی طرف لپکا۔ اس کے بوڑھے جسم میں چیتے کی سی پھرتی عود کر آئی تھی .... پھر اس نے پہریدار کا لہراتا ہوا کوڑا اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔ غلیظ گالیوں کی بوچھاڑ منگول کے سینے سے برآمد ہوئی۔ ایک خوفناک ٹکر اس نے پہریدار کے چہرے پر ماری اور دیوانوں کی طرح اس پر ٹوٹ پڑا۔

یہ منظر حیران کن تھا۔ قیدیوں کی گردنیں خودبخود اس طرف مڑ گئیں۔ جو جہاں تھا وہیں ساکت ہو گیا۔ وہ جیسے کوئی خواب دیکھ رہے تھے۔ بوڑھا منگول تنومند پہریدار کو اٹھا اٹھا کر پٹخ رہا تھا۔ ایسا منظر انہوں نے پہلے کہاں دیکھا تھا۔ پہریدار کی چیخیں بہت بلند تھیں۔ پھر بہت سے پہریدار کوڑے لہراتے ہوئے اس طرف لپکے۔ انہوں نے سردار یورق پر کوڑوں کی بارش کر دی' لیکن وہ کوئی خستہ حال قیدی نہیں تھا۔ منگول سردار تھا۔ قراقرم میں سینکڑوں سپاہی اس کے اشارے پر چلتے تھے۔ اس کی تلوار کی دھوم دور دور تھی۔ وہ اپنی پوری طاقت کے ساتھ کوڑا برداروں سے ٹکرا گیا۔ اس نے لمحوں میں ان کے چھکے چھڑا دیے۔ عقاب کی طرح لپک کر اس نے ایک پہریدار سے تلوار چھینی اور بے دریغ چلانا شروع کر دی۔ کوئی دس پہریداروں کو بھیڑوں کی طرح ہانکتا ہوا وہ میدان کے آخری کنارے تک لے گیا۔ اچانک سلیمان ایک پتھر پر چڑھ کر چیخا۔

"دیکھتے کیا ہو؟ پکڑ لو ان کو یہ تمہاری عورتوں اور بچوں کے قاتل ہیں۔ ان خونی بھیڑیوں سے حساب لو۔"

سردار یورق کی بے جگری اور بے باکی نے قیدیوں میں جوش و خروش کی ایک لہر دوڑا دی تھی۔ سلیمان نے زمین پر گرے بچے کی لاش ہاتھ میں اٹھا کر آسمان کی طرف بلند کی اور پکارا۔ "یہ دو ماہ کا معصوم انصاف مانگتا ہے۔ اسے کس جرم کی سزا دی گئی۔ کس جرم میں بھوکا پیاسا مارا گیا اسے۔"

لوگوں کے سینوں میں سلگتی ہوئی آگ ایکا ایکی بھڑک اٹھی۔ ان کے چہرے اندرونی غضب سے تمتمانے لگے۔ پھر کسی نے ایک کونے سے چیخ کر کہا۔ "مارو ان ظالموں کو" دوسرے کونے سے کسی نے نعرۂ تکبیر بلند کیا اور لوگ تیزی سے پہریداروں کی طرف لپکے۔ یکایک ایک آواز نے سب کو ٹھٹکا دیا۔ قید خانے کے داخلی راستے سے گھڑسواروں کی ایک طویل قطار اندر داخل ہو رہی تھی۔ زرہ پوش مسلح سپاہی تیزی سے میدان میں جمع ہو رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں ڈھالیں اور چمکتی ہوئی تلواریں تھیں۔ پھر ان کے عقب سے ایک گھڑسوار تیزی سے آگے آیا۔ دو گھڑسوار اس کے عقب میں تھے۔ یہ جعفر داراب تھا .... اس وادی کا سفاک ترین شخص۔ اس کے ایک ہاتھ میں عریاں تلوار اور دوسرے میں کوڑا تھا۔ وہ بڑے اعتماد سے مجمعے کے سامنے پہنچا۔ اسے دیکھتے ہی لوگ پیچھے ہٹنے لگے۔ سردار یورق سے لڑنے والوں کی مدد کو کچھ اور محافظ پہنچ گئے۔ ایک نے عقب سے سردار پر وار کیا۔ جونہی سردار لڑکھڑایا محافظوں نے اسے دبوچ لیا۔ پھر وہ اسے بری طرح زد و کوب کرنے لگے۔ مجمعے میں سے کسی نے نعرہ لگایا۔ "جعفر داراب ظالم

ہے۔" اور ایک پتھر اس کے گھوڑے کی طرف اچھالا۔ یہ وہی شخص تھا جس نے اس سے پہلے نعرہ تکبیر بلند کیا تھا۔ جعفر داراب نے تیزی سے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور نہایت دلیری سے مجمعے میں گھس گیا۔ پتھر پھینکنے والے شخص نے لوگوں میں چھپنے کی کوشش کی لیکن جعفر نے اسے دبوچ لیا۔ بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا وہ اسے باہر لے آیا۔ یہ ایک ادھیڑ عمر شخص تھا۔ خشک بال اور بے تحاشہ بڑھی ہوئی داڑھی۔ جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ ہو رہا تھا لیکن وہ پوری طاقت سے خود کو جعفر کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔ جعفر نے اسے دھکا دیا اور وہ زرہ پوش سپاہیوں کے سامنے جا گرا۔ جعفر کے اشارے پر سپاہی اسے بے دردی سے مارنے لگے۔ چند ہی لمحوں میں وہ اوندھے منہ بے ہوش پڑا تھا۔ جعفر نے ایک جھٹکے سے اپنا کوڑا ہوا میں لہرایا۔ تڑاخ کی آواز کی آئی۔ جعفر پھنکارا۔ "اور کس کو شوق ہے پتھر پھینکنے کا اور کون نعرہ لگائے گا؟"

لوگوں کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ یوسق کی مدد کو لپکنے والے بھی نہ جانے کن کونوں میں چھپ گئے تھے۔ سہمے ہوئے لوگوں کے اس ہجوم میں اباقہ بھی موجود تھا۔ وہ خاموشی سے یہ ساری کارروائی دیکھ رہا تھا....... اور سوچ رہا تھا کہ اس کا آگے بڑھنا ٹھیک ہے یا نہیں۔ وہ جانتا تھا اس کے گرد کھڑے مرد و زن کے سینوں میں ایک آگ روشن ہے لیکن کیا یہ آگ شعلہ بن سکے گی؟ شعلہ بن کر دشمن کو چاٹ سکے گی؟ جو کچھ ہونا تھا ایک لمحے میں ہو جانا تھا۔ اس ایک لمحے میں لوگ بھیڑ بکریوں کی طرح بھاگ بھی سکتے تھے اور جعفر داراب کے سامنے ڈٹ بھی سکتے تھے۔ اس کے لیے موت بھی بن سکتے تھے۔ یہ فیصلے کا لمحہ تھا اور فیصلہ بہت مشکل تھا۔ جعفر داراب چیخ کر سپاہیوں سے بولا۔

"لے جاؤ اس مردود کو باندھ کر۔"

سپاہیوں نے سردار یوسق کی مشکیں کسیں اور گھسیٹتے ہوئے قید خانے سے باہر لے چلے۔ جعفر داراب ابھی تک مجمعے کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کا اعتماد دیدنی تھا۔ پھر اس نے زور سے کوڑا لہرایا اور چیخا۔ "چلو سب لوگ....... چلو اپنا اپنا کام کرو۔" لوگوں نے مردہ قدموں سے جنبش کی....... اور اس لمحے اباقہ اپنی جگہ سے حرکت میں آیا۔ وہ بھاگتا ہوا مجمعے سے باہر نکلا اور کسی درندے کی طرح جعفر داراب پر جھپٹا۔ اس نے جعفر داراب کا گریبان پکڑا اور ایسا شدید جھٹکا دیا کہ وہ اڑتا ہوا زمین پر آیا۔ تلوار اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گری۔ اباقہ نے اسے گریبان سے پکڑ کر اٹھایا اور ایسا زوردار مکہ اس کے سینے میں مارا کہ وہ تکلیف سے دوہرا ہو گیا۔ پھر اباقہ کی بھرپور ٹانگ جعفر کے منہ پر پڑی اور وہ لڑکھڑاتا ہوا مجمعے کے سامنے جا گرا۔ یہ سب کچھ چند ساعتوں کے اندر اندر ہو گیا۔ اباقہ

ایک لمحے میں ہلچل پیدا ہوئی .... کچھ آوازیں بلند ہوئیں اور پھر جیسے سیلاب نے حفاظتی بند توڑ دیے۔ کھولتا ہوا آتش فشاں پھٹ پڑا۔ لوگ چلاتے ہوئے جعفر داراب اور اس کے ساتھیوں پر ٹوٹ پڑے۔ کالی وادی کی کالی حکومت اپنی تاریخ کے سب سے خوفناک بحران کا شکار ہو چکی تھی۔ جعفر داراب کے آہن پوش سپاہیوں نے نہتے لوگوں کو تلواروں اور نیزوں سے روکنا چاہا۔ نعرے بلند ہوئے چیخیں گونجیں۔ اباقہ نے اپنے چاروں طرف بھاگتے دوڑتے قدموں کی آوازیں سنیں۔ اس نے نہتے ہجوم کو سپاہیوں پر جھپٹتے، پلٹتے اور پھر جھپٹتے دیکھا....... اس نے جعفر داراب کی لاش کو لوگوں کے قدموں میں مسخ ہوتے دیکھا، اس نے محافظوں کے نیزوں پر اچھلتے جسم دیکھے، اس نے قیدیوں کے جوش سے تمتماتے چہرے دیکھے اور ان کے فاتحانہ نعرے سنے اور وہ سمجھ گیا کہ اب رکنے کا نہیں آگے بڑھنے کا وقت ہے، سوچنے کی نہیں عمل کی گھڑی ہے۔ جو آگ فروزاں ہو چکی تھی وہ سب کچھ جلا سکتی تھی۔ جو سیلاب بہہ نکلا تھا وہ ہر چٹان کو بہا سکتا تھا۔ اس نے ایک گھوڑا سنبھالا اور نعرہ زن لوگوں کے درمیان سے راستہ بناتا جیل خانے کے داخلی راستے تک پہنچ گیا۔ اس نے تلوار دونوں ہاتھوں میں بلند کی اور چلایا۔

"آگے بڑھو دوستو۔ جعفر داراب کی فوج کا ایسا حشر کرو کہ تمہارے مظلوموں کی روحیں سکون پا جائیں۔ آج حساب لے لو اپنے تمام زخموں کا۔"

لوگوں نے اس شیر دل نوجوان کو اپنے سامنے دیکھا تو ان کے حوصلے سوا ہو گئے۔

☆------☆------☆

سلطان جلال نے اپنا کام نہایت خوش اسلوبی سے کیا تھا۔ وہ نہایت رازداری سے سکندر کے گھر پہنچا تھا۔ اس کے بیوی بچوں سے ملا تھا۔ سکندر کی پھانسی کا غم اس کی بیوی کے چہرے پر ابھی تازہ تھا۔ اس کا سیاہ لباس اس کی سوگواری کا گواہ تھا۔ سلطان جانتا تھا یہی سوگواری ابھی تک سکندر کے ساتھیوں اور ہمنواؤں پر بھی طاری ہو گی۔ وہ سب اس منظر کو نہیں بھولے ہوں گے جب سکندر کو ہاتھ پاؤں کاٹ کر پھانسی پر چڑھا دیا گیا تھا۔ وہ اس کے ساتھیوں سے رابطہ قائم کرنا چاہتا تھا۔ سکندر کی بیوی نے اس سلسلے میں بہت تعاون کیا۔ دو تین روز کے اندر ہی سلطان جلال بہت سے لوگوں کے ساتھ رابطہ قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے انہیں بتایا کہ جعفر داراب اور اس کے سن رسیدہ ساتھیوں کے خلاف ایک زبردست کارروائی کی جانے والی ہے .... راجی خاتون کی سب لوگ بہت عزت کرتے تھے۔ سلطان نے چیدہ چیدہ لوگوں کو یہ بھی بتا دیا کہ یہ سب کچھ راجی خاتون کی ایما پر کیا جا رہا ہے۔ اندر ہی اندر سکندر کے حامیوں نے اپنی تیاری مکمل کر لی۔ یہی وجہ

تھی کہ جونہی جیل میں بغاوت کی خبر پہنچی سپاہی اس کے ساتھی تلواریں لہراتے ہوئے گلی کوچوں میں نکل آئے۔ تھوڑی ہی دیر میں سکندر کے گھر کے سامنے ایک جم غفیر اکٹھا ہو گیا۔ یہ لوگ جعفر داراب کے خلاف زبردست نعرہ زنی کر رہے تھے۔ منصوبے کے مطابق سلطان جلال ان لوگوں کے ساتھ "نیلے پہاڑ" کی طرف بڑھا۔ جعفر داراب کے نو تعمیر شدہ محل میں شیخ نجدی پناہ گزیں تھا۔ سلطان اور اس کے ساتھی جب گھوڑے بھگاتے ہوئے وادی کے سرسبز علاقے کی طرف بڑھے تو انہیں لوگوں کے چہروں پر خوف و ہراس کی فراوانی نظر آئی۔ کچھ لوگوں نے بتایا کہ جیل ٹوٹ گئی ہے اور قیدیوں کا ایک جم غفیر فوج کے مستقر کی طرف گیا ہے۔ اس چوراہے میں سلطان کو جگہ جگہ کالی پگڑی والوں کی لاشیں بھی دکھائی دیں۔ یہ لاشیں سلطان اور اس کے ساتھیوں کا حوصلہ بڑھانے کا سبب بن رہی تھیں۔ ان کے نعرے بلند تر ہو رہے تھے۔ سلطان جلال دل میں دعا کر رہا تھا کہ اباقہ اور اس کے ساتھیوں کو جعفر داراب کی مسلح و منظم فوج پر فتح نصیب ہو۔ مکمل فتح تب ہی ممکن تھی جب دونوں محاذوں پر کامیابی ہوتی۔

تھوڑی ہی دیر میں سلطان جلال اور اس کے ساتھی گھوڑے دوڑاتے "نیلے پہاڑ" کے سامنے پہنچ گئے۔ یہاں سلطان کو مسلح فوجیوں کا ایک ہجوم نظر آیا۔ یہ لوگ گھوڑوں پر سوار مفرور قیدیوں کی سرکوبی کے لیے روانہ ہونے والے تھے۔ سلطان جلال اپنے دستے کے ہمراہ بڑی بہادری سے اس فوج کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ فوج کا سالار جو اب جابر خاں کا بھائی تھا آگے بڑھ کر بولا۔ "کون ہو تم لوگ اور ہمارے راستے میں کیوں کھڑے ہو؟"

سلطان جلال گھوڑا چلا کر سالار کے سامنے پہنچا اور خم ٹھونک کر بولا۔ "اپنے سپاہیوں سے کہو کہ ہتھیار پھینک دیں جعفر داراب کا تختہ الٹ چکا ہے۔"

سالار نے جواب میں تلوار نیام سے باہر کی اور حملہ کرنے کی نیت سے آگے بڑھا۔ اس وقت "نیلے پہاڑ" کے اندر سے راجی خاتون برآمد ہوئی۔ وہ رستم کے بے سجائے اونٹ پر سوار تھی۔ رنگین کپڑوں والی خادمائیں مؤدب انداز میں آگے پیچھے چل رہی تھیں۔ رستم کے اونٹ کو دیکھتے ہی کالی پگڑی والے تمام گھڑسوار گھوڑوں سے نیچے اترے اور احتراماً جھک گئے۔ راجی خاتون کی باریک لیکن تحکمانہ آواز ابھری۔

"میں رستم کی بیٹی اور ان پہاڑوں کی وارث راجی خاتون تمہیں یہ حکم دیتی ہوں کہ قید خانے سے آزاد ہونے والے قیدیوں کی مدد کی جائے۔ میرا یہ پیغام وادی کے ہر سپاہی اور ہر باشندے تک پہنچا دیا جائے اور جو اس حکم کے بعد بھی جعفر داراب سے وفاداری کا دم بھریں ان کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے .... میں اپنا پیغام ایک بار پھر دوہرا رہی ہوں......"

راجی خاتون کا یہ پیغام سپاہیوں کے لیے کسی دھچکے سے کم نہیں تھا مگر بہت جلد انہوں نے اپنی حیرانی پر قابو پالیا۔ تھوڑی دیر کے اندر اندر تین چوتھائی فوج اس کے حکم کی تعمیل میں روانہ ہو گئی۔ دو تین سو سپاہیوں پر مشتمل ایک دستہ جو جعفر داراب کے قریبی ساتھیوں کی قیادت میں تھا۔ اس حکم سے روگردانی پر آمادہ نظر آتا تھا۔ سلطان جلال نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا اور وہ پلک جھپکتے میں ان پر ٹوٹ پڑے۔ "نیلے پہاڑ" کے سامنے سرنگ کے دہانے پر ایک زوردار جھڑپ ہوئی اور سلطان جلال مزاحم دستے کو روندتا ہوا نیلے پہاڑ میں داخل ہو گیا۔ اب اس کا ہدف جعفر داراب کا محل تھا۔ قندیلوں کی روشنی میں شیشے کے در و دیوار جگمگا رہے تھے۔ رنگین آبگینے، دبیز قالین، ریشم اور کمخواب کے پردے، لگتا تھا یہ کالے پہاڑوں کا ویرانہ نہیں غزنی یا بغداد کا شاہی مسکن ہے۔ پھر یہ شاہی مسکن گستاخ آوازوں سے گونج اٹھا۔ شیشے چکنا چور ہوئے۔ دبیز قالینوں پر گھوڑے دوڑے ریشم اور کمخواب کے پردوں نے آگ پکڑی اور رنگین آبگینے پارہ پارہ ہونے لگے اور یہ سب کچھ کرنے والے جعفر داراب کے اپنے ہی ساتھی تھے۔ یہ وہی تھے جو اس کے ساتھ مل کر قتل و غارت اور لوٹ مار کے بازار گرم کرتے رہے تھے۔ یہ سب معاشرے سے بھاگے ہوئے اور ٹھکرائے ہوئے جرائم پیشہ لوگ تھے مگر خدا نے ان کے درمیان ایسا تفرقہ ڈالا تھا کہ وہ ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہو گئے تھے۔ دو برائیوں کا تصادم ایک نیکی کو جنم دیتا ہے۔ یہاں بھی برائی کی کوکھ سے نیکی جنم لے رہی تھی۔

سلطان نے محل کا چپہ چپہ دیکھا لیکن شیخ نجدی کا کہیں سراغ نہیں ملا۔ پھر جعفر داراب کے ایک بوڑھے خادم نے بتایا کہ آقا جعفر داراب کا سرخ و سپید رنگت والا مہمان تھوڑی دیر پہلے بدحواسی کے عالم میں محل سے نکلا ہے یہ اطلاع اس بات کی طرف اشارہ کر رہی تھی کہ شیخ کو بغاوت کا علم ہو گیا تھا اور یہ بھی پتہ چل گیا تھا کہ اب جعفر داراب اسے تحفظ نہ دے سکے گا۔ وہ موقع سے فائدہ اٹھا کر ایک بار پھر بھاگ نکلا تھا۔ سلطان چند ساتھیوں کے ساتھ تیزی سے باہر نکلا۔ سرنگ کے دہانے پر اسے راجی خاتون اپنے سجے سجائے اونٹ پر بیٹھی ملی۔ سلطان جلال قریب پہنچا تو اس نے اسے ہاتھ سے رکنے کا اشارہ کیا۔ اس کے حکم پر شتربان نے اونٹ بٹھا دیا۔ راجی خاتون اونٹ سے اتری۔ سلطان جلال کے پاس پہنچی اور لرزاں آواز میں بولی۔ "سلطان معظم! بندی آپ کی قدم بوسی کا شرف حاصل کرنا چاہتی ہے۔"

سلطان نے ہاتھ اٹھا کر اسے اس ارادے سے باز رکھا اور بولا۔ "راجی خاتون! میں

اسلام کا ایک ادنیٰ سپاہی ہوں، کوئی فرمانروا نہیں۔"

راحی خاتون بولی۔ "سلطان معظم! آپ کے قرب کے یہ لمحے میرے لیے سعادت سے کم نہیں لیکن میں جانتی ہوں آپ کا وقت بہت قیمتی ہے۔ آپ کو شیخ نجدی کی تلاش ہے اور شیخ نجدی ہر لحہ آپ سے دور تر ہو رہا ہے .... میری اطلاع کے مطابق شیخ [illegible]ن آپ کی آمد سے تھوڑی دیر پہلے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مشرق کی جانب نکلا ہے۔ [illegible]م ہوا ہے کہ وہ غزنی یا کابل پہنچنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ ابھی وہ زیادہ دور نہیں گیا ہو گا۔"

سلطان جلال نے راحی خاتون کو خدا حافظ کہا اور ساتھیوں کو پیچھے آنے کا اشارہ کرتے ہوئے گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔

☆------☆------☆

بار اوّل ________ ۲۰۰۲ء
مطبع ________ یو اینڈ می پرنٹرز، لاہور
کمپوزنگ ________ مغل کمپوزنگ سنٹر، لاہور
قیمت ________ ۲۵۰ روپے

ابھی وہ وادی کے داخلی راستے سے دور تھے کہ سلطان کو اپنے پیچھے اباقہ سرپٹ گھوڑا دوڑاتا نظر آیا۔ اس کے ہاتھ میں عریاں تلوار تھی جس پر ابھی تک خون چمک رہا تھا۔ اس نے سلطان کو بتایا کہ فوجی مستقر پر قبضہ کرلیا گیا ہے۔ راجی خاتون کا پیغام ملتے ہی بہت سے سپاہیوں نے مزاحمت ترک کر دی۔ لڑائی جاری رکھنے والوں کو تہ تیغ کر دیا گیا۔ اس نے بتایا کہ فوجی مستقر سے وہ سیدھا نیلے پہاڑ پہنچا تھا وہاں سے اسے معلوم ہوا کہ سلطان معظم، شیخ نجدی کے تعاقب میں گئے ہیں وہ ایک لمحہ ضائع کئے بغیر ان کے پیچھے آیا ہے۔ سلطان نے کہا۔ "میرا خیال ہے اباقہ! تمہیں یہیں وادی میں رہنا چاہیے۔"

"اباقہ بولا۔ "سلطان! جعفر داراب مارا جا چکا ہے۔ اس کے وفادار دوستوں کو کچل دیا گیا ہے۔ میرا خیال ہے حالات راجی خاتون کے مکمل قابو میں ہیں۔ پھر یورق اور سلیمان وغیرہ بھی اس کی مدد کے لیے موجود ہیں۔"

سلطان کی خاموشی نیم رضامندی کا اظہار تھی۔ اباقہ نے دل ہی دل میں اس خاموشی کے برقرار رہنے کی دعا مانگی اور سلطان کی ہمرکابی میں سفر شروع کر دیا۔ ان کا رخ مشرق کی طرف تھا۔ مشرق جہاں سے دھیرے دھیرے رات کی تاریکی نمودار ہو رہی تھی۔ آج یہ تاریکی کچھ زیادہ ہی گھمبیر لگ رہی تھی۔ شاید اس لیے کہ ایک سیاہ شخص اس طرف گیا تھا۔ وہ سیاہ شخص جس کے جلو میں تاریکیوں کا ٹڈی دل تھا اور جس کی ہستی عالم اسلام کے لیے ایک طویل اور تاریک رات سے کم نہیں تھی۔ وادی میں جعفر داراب کا تختہ الٹے تین چار روز گزر چکے تھے۔ راجی خاتون نے نیلے پہاڑ سے نکل کر مکمل امن و سکون بحال کر لیا تھا۔ اب وہ صحیح معنوں میں یہاں کی فرمانروا تھی۔ اس نے یورق اور سلیمان کی بہت عزت افزائی کی تھی۔ آخر وہ سلطان جلال اور اباقہ کے ساتھی تھے۔ سلطان جلال اور اباقہ کا ابھی کچھ پتہ نہیں چلا تھا۔ راجی خاتون سردار یورق کو ایک دستے کے ساتھ سلطان اور اباقہ کی تلاش میں بھیجنے کا سوچ رہی تھی۔ خاص طور پر وہ اباقہ کے بارے بہت فکر مند تھی۔ وادی میں کسی کو بھی ٹھیک طرح معلوم نہیں تھا کہ اباقہ' سلطان جلال کے ساتھ گیا ہے یا نہیں۔

منظر جعفر داراب کی رہائش گاہ کا تھا۔ جعفر کی موت کے بعد یہ رہائش گاہ اب راجی خاتون کے استعمال میں تھی۔ وہ ایک منقش چوبی تخت پر گاؤ تکیہ لگائے بیٹھی تھی۔ خوبصورت کنیزیں مور پنکھ لیے اس کی اطراف میں کھڑی تھیں۔ جس تخت پر راجی خاتون بیٹھی تھی اس کے چاروں طرف ایک باریک ریشمی کپڑے کے پردے لٹک رہے تھے۔ فی الوقت یہ پردے سمٹے ہوئے تھے۔ جب دربان نے آکر بتایا کہ طوطم خاں' ملکہ عالیہ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتا ہے' تو راجی خاتون نے یہ پردے چاروں طرف کھنچوا دیے۔ باریک کپڑوں میں سے اس کا حسن کسی شمع کی لو کی طرح جھلک رہا تھا۔ ذرا ہی دیر بعد طوطم خاں جھک کر آداب بجاتا اندر داخل ہوا اور راجی خاتون کے سامنے ایک پُر تکلف کرسی پر بیٹھ گیا۔

"میں آپ سے تنہائی میں کچھ کہنا چاہتا ہوں ملکہ عالیہ!" طوطم خاں بولا۔

راجی خاتون نے تخلیے کا حکم دیا۔ سب باہر چلے گئے صرف کوئی بھری دو کنیزیں اس کی اطراف میں کھڑی رہ گئیں۔ طوطم خاں نے کہا۔ "ملکہ عالیہ! اگر میں آپ کی نئی زندگی کے متعلق کچھ کہوں تو یہ جسارت قابل معافی ہو گی؟"

راجی خاتون نے طوطم خاں سوال کا جواب نہیں دیا۔ اس کی روشن آنکھیں طوطم خاں کی پیشانی پر مرکوز تھیں اور چہرے ایک پُر اسرار سنجیدگی طاری تھی۔ طوطم خاں بے چینی سے پہلو بدلنے لگا۔ آخر راجی خاتون کی آواز ابھری۔ "اے منگول تُو نے اپنی حدود سے تجاوز کیا ہے۔ تُو نیلے پہاڑ کے اندر صرف ایک محافظ تھا لیکن میں تیرے کانوں کے نشان اپنی خوابگاہ کی دیواروں پر دیکھ رہی ہوں۔"

طوطم خان کا منہ حیرت سے کھلا تھا۔ راجی خاتون بولی۔

"یہ ٹھیک ہے طوطم خاں کہ میرے دل میں اباقہ کے لیے ہمدردی ہے۔ میں اسے پسند کرتی ہوں .... ہاں اب بتا تُو کیا کہنا چاہتا ہے۔ کیا تجویز لایا ہے تُو؟"

طوطم خاں لرزاں آواز میں بولا۔ "ملکہ! آپ کی روحانی قوتوں کے بارے بہت کچھ سنا تھا آج اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔ آپ کو .... آپ کو یہ سب کچھ کیسے معلوم ہوا؟"

راجی خاتون کے چہرے پر ناراضگی کے آثار ابھرے۔ وہ بولی۔ "اب اس بات کا ذکر کر کے مجھے اپنی سزا یاد نہ دلواؤ۔ کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟"

طوطم خاں چند لمحے حواس درست کرنے کے بعد بولا۔ "خاتون معظم! اباقہ ایک ایسی عورت کے پیچھے ہے جو چنگیز خاں کے بیٹے چغتائی کی بیوی ہے۔ اس عورت نے اباقہ کو بری

طرح دام میں پھنسا رکھا ہے۔ اگر اس عورت کو اباقہ کے راستے سے ہٹا دیا جائے تو اباقہ کی زندگی آسان اور خوبصورت ہو سکتی ہے۔"

راجی خاتون بولی۔ "طوطم خاں! تم سیدھی طرح یہ کیوں نہیں کہتے کہ تم خود بھی اس عورت کے عشق میں گرفتار ہو۔"

طوطم خاں بولا۔ "ملکہ! آپ کی فراست سے کوئی بات پوشیدہ نہیں۔ میں خود بھی آپ سے واشگاف بات کرنا چاہتا ہوں آپ ٹھنڈے دل سے سوچیے۔ غلام کی تجویز میں آپ کو بھلائی نظر آئے گی۔ اگر پھر بھی آپ کو میری نیک نیتی پر شبہ ہو تو جو سزا چاہے دیجیے گا۔"

راجی خاتون بولی۔ "کہو طوطم خان۔ کیا کہنا چاہتے ہو۔"

راجی خاتون کے لہجے کی نرمی سے طوطم خاں کا حوصلہ بڑھا اور وہ بولا۔ "ملکہ عالیہ وہ عورت ایک دوسری عورت کے ساتھ شاہی مہمان کی حیثیت سے آپ کی تحویل میں ہے۔ آپ اس کے ساتھ میری شادی کرا دیجیے۔ میں اسے لے کر یہاں سے کہیں دور چلا جاؤں گا۔ اباقہ واپسی پر پریشان ضرور ہو گا' لیکن جب اسے آپ جیسی مہربان ہستی کی رفاقت نصیب ہوئی تو چند ہی روز میں سب کچھ بھول جائے گا.........."

راجی خاتون کی کشادہ پیشانی پر دھیرے دھیرے سوچ کی لکیریں ابھر رہی تھیں عین اس وقت کالے پہاڑوں کی وادی "دہ طور دغرہ علاقہ" سے کوسوں دور "یور لارہ" کے قریب زور دار جھڑپ ہو رہی تھی۔ سلطان جلال اور اباقہ نے بالآخر شیخ نجدی اور اس کے ساتھیوں کا سراغ پالیا تھا۔ وہ تعداد میں کوئی سو افراد تھے اور سب کے سب مسلح۔ سلطان اور اباقہ نہیں چاہتے تھے کہ انہیں تعاقب کا علم ہو' لیکن ایک ہموار میدان میں یہ راز' راز نہ رہ سکا اور اب دونوں طرف سے زبردست تیر اندازی ہو رہی تھی۔ سلطان اور اباقہ اپنے آٹھ ساتھیوں کے ساتھ نسبتاً بلندی پر تھے اور مقابل سپاہیوں کی نظر سے چھپے ہوئے تھے۔ انہوں نے اتنی مہارت سے تیر اندازی کی تھی کہ شیخ نجدی اور اس کے ساتھیوں کو چکرا کر رکھ دیا تھا۔ وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہو گئے تھے کہ ان کے مقابل کم از کم پچاس ساٹھ آدمی ہیں۔ اس وقت شام کے سائے پھیل رہے تھے۔ جب سلطان اور اباقہ کو اندازہ ہوا کہ دشمن کی طرف سے تیر اندازی میں کمی واقع ہو گئی ہے۔ سلطان کی ہدایت پر اباقہ نے ایک ٹیلے سے نشیب کا جائزہ لیا اور صورت حال اس سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔ قریباً ساٹھ آدمیوں کا ایک جتھہ تاریکی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے جنوب مشرق کی طرف نکل رہا تھا۔ اباقہ کے لیے بات کی تہہ تک پہنچنا دشوار ثابت نہیں ہوا۔ وہ سمجھ گیا کہ شیخ نجدی نے کچھ

تیراندازوں کو ان کا راستہ روکنے کے لیے یہاں چھوڑ دیا ہے اور خود باقی ساتھیوں کے ساتھ فرار ہو رہا ہے۔

اس نے سلطان جلال الدین کو ساری بات بتائی تو وہ بھی فکر مند نظر آنے لگا۔ یہ تو ظاہر تھا کہ مدمقابل تیرانداز انہیں تعاقب جاری رکھنے کی اجازت نہیں دیں گے .... ہاں یہ ہو سکتا تھا کہ شیخ نجدی والی چال چلی جاتی۔ ایک یا دو آدمی خاموشی کے ساتھ کلاوا کاٹ کر شیخ کے تعاقب میں روانہ ہو جاتے اور باقی تیراندازی جاری رکھتے۔ اس کام میں خطرہ تو تھا' لیکن شیخ نجدی کی روپوشی اس سے کہیں .... کہیں زیادہ خطرناک تھی۔ سلطان اور اباقہ کے درمیان مشورہ ہوا اور اباقہ سلطان جلال کو اس بات پر قائل کرنے میں کامیاب رہا کہ وہ تنہا شیخ نجدی کا تعاقب کرتا ہے۔ سلطان نے اسے ضروری ہدایات دیں۔ اباقہ نے اپنا گھوڑا کھولا اور حتی الامکان احتیاط سے ٹیلوں کے درمیان چلنے لگا۔ خوش قسمتی سے اس کی احتیاط بار آور رہی اور وہ مقابل تیراندازوں کی نظر میں آئے بغیر شیخ نجدی کے تعاقب میں لگ گیا۔ وہ رات کی تاریکی میں اس سرنگ نما درے سے گزرے جسے "آگ کا راستہ" کہا جاتا تھا۔ یہاں سے گزر کر انہوں نے جنوب مشرق کی سمت سفر جاری رکھا۔ چند کوس آگے عام راستے سے ہٹ کر ایک دشوار گھاٹی میں پڑاؤ ڈالا گیا۔ آگ روشن کر کے خوردونوش کا انتظام کیا گیا اور اہل قافلہ آرام کرنے کے لیے لیٹ گئے۔ ان سے کوئی نصف کوس دور اباقہ نے بھی اپنے گھوڑے کے چرمی تھیلے سے راشن نکال کر کھایا۔ چند گھونٹ پانی کے لیے اور دن بھر کے تپے ہوئے پتھروں پر لیٹ گیا۔ اس کی آنکھوں میں شیخ نجدی کا سرخ و سپید چہرہ گھوم رہا تھا اور ذہن اس تک پہنچنے کے منصوبے سوچ رہا تھا۔ پھر اسے نیند آ گئی۔

آنکھ کھلی تو سورج اپنا ایک چوتھائی سفر طے کر چکا تھا۔ دھوپ کی چبھن اور حرارت میں ہر لحظہ اضافہ ہو رہا تھا۔ اباقہ گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا مگر یہ دیکھ کر اسے اطمینان ہوا کہ شیخ نجدی کا پڑاؤ ابھی تک موجود ہے۔ شاید وہ لوگ بھی اسی طرح تھک کر سو رہے تھے۔ اباقہ اب ان کی نقل و حرکت دیکھ سکتا تھا۔ ان کے خود اور آہنی ہتھیار دھوپ میں چمک رہے تھے۔ کچھ گھوڑے چارے کی تلاش میں منہ مارتے پڑاؤ سے کافی دور نکل آئے تھے۔ پڑاؤ میں ایک دو جگہ سے دھواں بھی برآمد ہو رہا تھا۔ اباقہ اپنی جگہ سے پڑاؤ کی نگرانی کرتا رہا۔ گرمی کی شدت میں لحہ بہ لحہ اضافہ ہوتا چلا گیا۔ چٹانوں کے مختصر سائے بھی جلنے لگے۔ اباقہ نے اپنی چھاگل سے دو گھونٹ پانی کے پیئے اور اس وقت اس نے دیکھا کہ سورج نصف نہار تک پہنچنے والا ہے۔ ایک اور جہنمی دوپہر قدم قدم ان کالی چٹانوں میں اتر رہی

تھی۔ دفعتاً ایک خیال سے اباقہ کا چہرہ تمتما اٹھا۔ وہ ان پچاس ساٹھ مسلح آدمیوں کے بیچ میں سے بھی شیخ نجدی کو اٹھا کر لے جا سکتا تھا۔ وہ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے .... ہاں وہ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے۔

اباقہ نے اپنا گھوڑا کھولا اور اس پر سوار ہو کر بڑے اعتماد سے پڑاؤ کی طرف بڑھا۔ وہ دیکھ چکا تھا کہ شیخ نجدی کے ہم سفروں میں کچھ افراد سادے لباس میں بھی ہیں۔ لو کے تھپیڑوں سے بچنے کے لیے سب نے چہروں پر پگڑیاں لپیٹ رکھی تھیں۔ اباقہ تیزی سے گھوڑا بھگاتا' پڑاؤ میں پہنچ گیا۔ شیخ نجدی کا اکلوتا خیمہ ایک چھوٹی سی چٹان پر ایستادہ تھا۔ اباقہ سیدھا اس کی طرف بڑھا۔ اس سے پہلے کہ اردگرد موجود باوردی سپاہی چوکنے ہوتے اباقہ اپنی تلوار سے خیمے کو چاک کرتا ہوا گھوڑے سمیت اندر داخل ہو گیا۔ گھوڑا زور سے ہنہنایا جیسے اپنے سوار کی اس دلیری پر وہ بھی خوش ہوا ہو۔ اباقہ کی نظر شیخ نجدی پر پڑی۔ وہ اپنے بدن کے گرد ایک بھیگی چادر لپیٹے' گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ دو عقیدت مند پنکھا ہلانے میں مصروف تھے۔ ان سب کی آنکھیں اباقہ کو دیکھ کر پھٹی رہ گئیں۔ کمال سرعت سے اباقہ نے جھک کر شیخ نجدی کا بازو پکڑا اور جیسے عقاب خرگوش کو اچک کر لے جاتا ہے' اباقہ شیخ نجدی کو اچک کر لے گیا۔ گھوڑے کو ایڑ لگی تو وہ ٹیلوں کے درمیان سرپٹ بھاگا۔ اس کے ساتھ ہی عقب میں ان گنت ٹاپیں گونجیں۔ دستہ سالاروں نے چیخ چیخ کر اپنے سپاہیوں کو آوازیں دیں اور کوئی پچاس عدد گھڑ سوار اباقہ کے پیچھے لپکے۔

جو کچھ اباقہ نے کرنا تھا وہ پہلے سے سوچ چکا تھا۔ اس نے اپنا گھوڑا سیدھا "آگ کے راستے" کی طرف بڑھایا۔ تعاقب کرنے والے ہر لحظہ قریب تر پہنچ رہے تھے۔ اباقہ اب ان کے تیروں کی زد میں آنے ہی والا تھا۔ اس کے اشارے پر گھوڑے نے آخری زور لگایا اور سرپٹ دوڑتا آگ کے راستے میں داخل ہو گیا۔ یہ عین دوپہر کا وقت تھا اور اس وقت کوئی اس راستے پر چلنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا مگر وہ اباقہ تھا۔ اس سے کوئی بات بھی ناممکن نہیں تھی۔ کچھ آگے جا کر اباقہ ٹھہر گیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ اس سرنگ نما راستے کے دہانے پر شیخ نجدی کے ساتھی کھڑے نظر آئے۔ وہ چلا چلا کر کچھ کہہ بھی رہے تھے۔ اباقہ جانتا تھا اب وہ اس کا پیچھا کرنے کی ہمت نہیں کر پائیں گے۔ ان کی آنکھوں کے سامنے وہ شیخ نجدی کو لے جا رہا تھا۔ اس نے اپنا منہ سر اچھی طرح لپیٹا اور گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔ گھوڑا ان مخصوص ساخت کی سرمئی چٹانوں کے درمیان سرپٹ دوڑنے لگا۔ زرد رنگ کے کیمیائی بخارات اس راستے پر دھند کی طرح پھیلے ہوئے تھے۔ یہ مہلک دھند بتدریج گہری ہوتی جا رہی تھی۔ شدید تپش اور گھٹن جسم کو ہلکان کیے دے رہی تھی۔ شیخ

نجدی بار بار چلا رہا تھا۔
"بیوقوف شخص تُو خودکشی کر رہا ہے۔ ہم یہاں سے نہیں گزر سکیں گے۔" اباقہ نے جیسے اپنے کان اور آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ وہ حبس دم کا ماہر تھا۔ سانس سینے میں روک کے وہ پوری رفتار سے گھوڑا بھگاتا چلا گیا۔

دوسری طرف۔ "آگ کے راستے" کے اس پار سلطان جلال محاصرہ کرنے والوں سے برسرِ پیکار تھا۔ اس کے آٹھ ساتھیوں میں سے چار علی الصبح شہید ہو گئے تھے۔

دوپہر سے پہلے ان کے تیر بھی ختم ہو گئے۔ محاصرہ کرنے والوں نے گھیرا تنگ کر دیا اور اس ٹیلے پر قبضہ کرنے کی کوشش کرنے لگے جس پر سلطان جلال چار ساتھیوں کے ساتھ ڈٹا ہوا تھا۔ پہلے تو سلطان جلال اور اس کے ساتھیوں نے پتھروں سے انہیں روکنے کی کوشش کی۔ پھر جب یہ بھی ممکن نہ رہا تو تلواریں سونت کر مردانہ وار باہر نکل آئے۔ دشمن سپاہیوں کی تعداد تقریباً بیس تھی' لیکن جب سلطان جلال اور اس کے ساتھیوں نے اللہ اکبر کا نعرہ لگایا اور ان پر حملہ کیا تو وہ تتر بتر ہونے لگے۔ وہ تعداد میں کثیر ضرور تھے' لیکن انہیں وہ قیادت نصیب نہیں تھی جو سلطان کے چار سپاہیوں کے پاس تھی۔ سلطان کی سحرانگیز شخصیت نے ان چار افراد کو چار چٹانیں بنا دیا تھا۔

زبردست لڑائی ہوئی۔ پہلے ہی ہلے میں دشمن کے چھ سپاہی کھیت رہے۔ سلطان نے انہیں سنبھلنے کا موقع دیے بغیر دوسرا حملہ کیا اور اپنی برق پاش تلوار سے تین سپاہیوں کے سر اڑا دیے۔ عسکری صلاحیت کا یہ زبردست معیار مدمقابل سپاہیوں کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا۔ انہیں کیا معلوم تھا قسمت انہیں گھیر کر شیرِ خوارزم کے سامنے لے آئی ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں ٹیلے کے چاروں جانب دشمن سپاہیوں کی لاشیں نظر آ رہی تھیں۔ صرف چار افراد جان بچا کر بھاگنے میں کامیاب ہوئے۔ سلطان نے ان کا پیچھا کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ سلطان کا ایک ساتھی شہید ہوا اور دوسرے کو شدید زخم آئے۔ اس وقت سلطان کی نگاہ جنوب مشرق کی طرف اٹھی۔ اس نے دیکھا کہ کوئی شخص کسی جانور یا انسان کو کندھے پر لادے بھاگا چلا آ رہا ہے۔ سلطان نے اس کی چال سے پہچان لیا وہ اباقہ تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ ان کے پاس پہنچ گیا۔ اس کا سر اور چہرہ مکمل طور پر ایک پگڑی میں چھپا ہوا تھا۔ سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ اس کے کندھے پر شیخ نجدی تھا......... لیکن بڑی بُری حالت میں۔ اس کی داڑھی اور سر کے بیشتر بال جھلسے ہوئے تھے۔ سرخ و سپید چہرے پر جگہ جگہ آبلے نظر آ رہے تھے۔ ہاتھ اور پاؤں کی حالت بھی یہی تھی۔ اباقہ نے اسے نہایت نفرت سے سنگلاخ زمین پر پھینک دیا۔ یہ دیکھ کر وہ چونکے کہ شیخ کے جسم

میں کوئی حرکت پیدا نہیں ہوئی۔ شاید وہ بے ہوش تھا۔
"تمہارا گھوڑا؟" سلطان نے اباقہ سے پوچھا۔
"وہ راستے میں مر گیا ہے سلطان۔" اباقہ ہانپتے ہوئے بولا۔ سلطان کی نظریں شیخ کے چہرے پر مرکوز ہو گئیں۔ وہ کھوئی ہوئی آواز میں بولا۔
"میری خواہش تھی نجدی .... کہ جب تُو میرے سامنے آتا تو تیرے ہاتھ میں تلوار ہوتی اور تیرے پیچھے ایک لشکر تو مجھ سے مقابلہ کرتا پھر تُو مجھے مار دیتا یا میں تجھے' لیکن تُو ایسی ذلیل اور مجبور حالت میں میرے پاس پہنچا ہے کہ زمین سے سر بھی نہیں اٹھا سکتا .... بہرحال میرے لیے یہ سعادت کچھ کم نہیں کہ میں اپنے ہاتھ سے تیرے نجس وجود کو ختم کروں۔" سلطان نے ہاتھ بڑھایا۔ اباقہ نے ایک سپاہی کا گرا ہوا نیزا سلطان کے ہاتھ میں تھما دیا۔ سلطان نے نیزا دونوں ہاتھوں میں تھاما اور پوری طاقت سے نجدی کے دل کے مقام پر پیوست کر دیا۔ یکایک نجدی نے آنکھیں کھول دیں۔ کسی درندے جیسی بھوری آنکھیں خوفناک انداز میں ان کی طرف دیکھنے لگیں۔ شیخ کا جسم زور سے مچلنے لگا۔ آنکھیں ابھی تک سلطان جلال پر مرکوز تھیں' لیکن پھر دھیرے دھیرے وہ پتھرانے لگیں اور آخر بے نور ہو گئیں۔ ان گنت بدکاروں کا پشت پناہ' ان گنت نیک ہستیوں کا قاتل۔ ان گنت عصمتوں کا لٹیرا' شیطان کا پیروکار' فیروز الدین عرف شیخ نجدی عبرتناک حالت میں مردہ پڑا تھا۔ اباقہ نے اس کا سر کاٹ کر نشانی کے طور پر ایک تھیلے میں رکھ لیا اور اس کا جلا کٹا جسم چیل کوؤں کے لیے چھوڑ دیا .... فوراً بعد اباقہ اور سلطان جلال اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ واپس "کالے پہاڑوں" کی طرف روانہ ہو گئے۔

☆------☆------☆

راجی خاتون نے سلیمان' ماریتا اور سردار یورق سے فرداً فرداً ملاقاتیں کیں۔ کافی سوچ بچار کے بعد اس نے طوطم خان کو بلایا اور بتایا کہ وہ ماریتا سے اس کی شادی کر دے گی۔ طوطم خاں کا سیروں خون بڑھ گیا۔ اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ وہ ماریتا کو لے کر یہاں سے چلا جائے گا اور کبھی واپس نہیں آئے گا۔ طے یہ پایا کہ یہ شادی مسلمانوں کے رسم و رواج کے مطابق ہو گی۔ راجی' خاتون نے طوطم خاں کو تیاری کا حکم دیا۔ طوطم خاں لمبے چوڑے تکلفات میں نہیں پڑنا چاہتا تھا لیکن راجی خاتون کا حکم ٹالنا بھی ممکن نہیں تھا۔ وہ شادی کی تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔ تیسرے روز اس نے راجی خاتون کی خدمت میں حاضر ہو کر تیاریوں کی تکمیل کا دعویٰ کیا۔ راجی خاتون نے کہا' ماریتا شاہی مہمان ہے۔ اس کی رخصتی میرے ہاں سے ہو گی۔ اس لیے یہ رسم بھی اچھے طریقے سے انجام پانی چاہیے۔

اس نے طوطم خان کی تیاری کو نامکمل قرار دیا۔ طوطم خاں ایک بار پھر ضروری اشیاء کی فراہمی میں جت گیا۔ اس کو سب سے زیادہ خطرہ سلطان جلال اور اباقہ کی طرف سے تھا۔ وہ کسی بھی وقت وادی میں واپس پہنچ سکتے تھے۔ وہ دل ہی دل میں راجی خاتون کو کوسنے دے رہا تھا کہ اس کے تکلفات کی وجہ سے تاخیر ہو رہی ہے۔ کبھی کبھی اس کے ذہن میں عجیب شکوک سر اٹھانے لگتے تھے۔ آخر وہی ہوا جس کا خطرہ تھا۔ ایک روز وہ ریشمی کپڑے "جز" اور "شیریں باف" کے نہایت اعلیٰ قسم کے تھان لے کر راجی خاتون کے پاس پہنچا تو سامنے ہی سلطان جلال اور اباقہ بیٹھے تھے۔ راجی خاتون اور قاضی القضات عمادالدین بھی وہیں موجود تھے۔ قاضی عمادالدین کوئی معمولی قاضی نہیں تھا۔ خلیفہ المسلمین کے حکم سے وہ ایک عرصہ نجف کا قاضی رہا تھا۔ بعدازاں اس کے خلاف کچھ بدخواہوں نے سازش کی اور وہ خلیفہ کے عتاب سے بچنے کے لیے روپوش ہو گیا۔ اس طرح وہ ایک مفرور ملزم تھا' لیکن کالی وادی میں اس کی حیثیت قاضی ہی کی تھی۔ راجی خاتون سمیت وہ چاروں کسی اہم مسئلے پر گفتگو کر رہے تھے۔ طوطم خان نے آداب پیش کیا اور ذرا ہٹ کر مؤدب بیٹھ گیا۔ راجی خاتون بولی۔

"طوطم خاں! ہم یہاں ایک مسئلے پر غور کر رہے ہیں .... کوئی شخص کسی دوسرے شخص کو حبس بے جا میں رکھ کر بزور طاقت قسم کھانے پر مجبور کرتا ہے۔ اگر وہ قسم نہ کھائے تو اس کی جان جاتی ہے۔ تو اس قسم کی اسلامی نقطہ نگاہ سے کیا حیثیت ہو گی .... تم بتاؤ منگول معاشرے میں ایسی قسم یا حلف کو کیا سمجھا جاتا ہے؟"

طوطم خان کو راجی خاتون کا یہ سوال کچھ عجیب اور بے موقعہ سا لگا۔ اس نے غور کیا اور ایکدم اس کے پسینے چھوٹنے لگے۔ آخر وہ گھاگ سفارت کار تھا۔ سمجھ گیا کہ راجی خاتون کا اشارہ کس طرف ہے۔ اس کا مطلب تھا' ماریتا نے راجی خاتون کو سب کچھ بتا دیا ہے۔ اس نے ایک طویل سانس لے کر اپنے چہرے سے پسینہ پونچھا اور بولا۔ "قسم تو قسم ہوتی ہے ملکہ عالیہ۔ اگر کوئی بالغ مرد یا عورت بقائمی ہوش و حواس قسم کھاتا ہے' تو اسے پورا کرنا ضروری ہوتا ہے.........."

یکایک راجی خاتون کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ وہ رعب دار آواز میں بولی۔ "تُو جھوٹ بولتا ہے منگول۔ میں نے جو سوال پوچھا ہے تُو نے اس کا جواب دیانت داری سے نہیں دیا۔" پھر اس نے تالی بجائی۔ ایک غلام ادب سے اندر داخل ہوا۔ راجی خاتون بولی۔ "جاؤ' نویان کو حاضر کرو۔" غلام واپس چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد ایک عمر رسیدہ منگول کو لیے حاضر ہوا۔ منگول نے جھک کر سلام کیا۔ راجی خاتون بولی۔

"نویان! تُو یہ بتا کہ اگر کسی کو جبر سے قسم کھانے پر مجبور کیا جائے اور اس سے کسی بات کا عہد لیا جائے تو منگولوں میں اس عہد کی کیا حیثیت ہوتی ہے۔"

بوڑھے نے اپنی داڑھی کھجائی اور چھوٹی چھوٹی آنکھوں کو سکیڑ کر بولا۔ "ملکہ عالیہ! چنگیز خان کے قانون "یاسا" کی رو سے زبردستی کرنے والا مجرم سمجھا جاتا ہے۔ میں جس قبیلے سے تعلق رکھتا ہوں وہاں اگر کوئی کسی سے زبردستی عہد لیتا تھا تو اسے اس عہد سے آزاد کرایا جاتا تھا۔ یہ ثابت ہونے پر کہ عہد زبردستی لیا گیا ہے' عہد لینے والے پر زبردستی کی جاتی تھی اور اسے مجبور کیا جاتا تھا کہ وہ دوسرے شخص کو عہد سے آزاد کر دے۔"

راجی خاتون بولی۔ "میں کچھ مزید تفصیل جاننا چاہتی ہوں۔"

بوڑھا منگول بولا۔ "ہمارے ہاں مجرم کو چت زمین پر لٹا دیا جاتا ہے۔ اس کے ہاتھ پاؤں چاروں طرف رسیوں سے باندھ دیے جاتے ہیں۔ پھر اس کے سینے پر لوہے یا پتھر کی گرم سل رکھی جاتی ہے۔ جب یہ سل اٹھائی جاتی ہے تو اس کے سینے کا گوشت بھی ساتھ ہی اُدھڑا چلا آتا ہے۔ اس سے کہا جاتا ہے کہ وہ فلاں شخص کو اپنے عہد سے آزاد کر دے۔ اگر وہ نہیں مانتا تو اس کے زخموں پر پیشاب اور راکھ ملا کر ڈالی جاتی ہے۔ یہ تمام عمل بار بار دہرایا جاتا ہے یہاں تک کہ مجرم مان جاتا ہے یا مر جاتا ہے۔"

"بہت خوب۔" راجی خاتون بولی۔ "طوطم خان! تمہارے ہم قوم نے تمہیں تمہارے مستقبل کا بہت اچھا نقشہ دکھایا ہے۔" طوطم خان کا رنگ پیلا پڑنے لگا۔ راجی خاتون نے کہا۔ "اگر اس عذاب سے بچنا چاہتے ہو تو ماریتا کو اس عہد سے آزاد کر دو کہ اگر وہ شادی کرے گی تو تم سے۔ اپنی زبان سے اقرار کرو کہ تم نے اسے اس عہد سے آزاد کیا۔"

طوطم خاں کی پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہونے لگے لیکن وہ بولا کچھ نہیں۔

"جواب دو۔" راجی خاتون گرج کر بولی۔

طوطم خان نے کہا۔ "ملکہ! آپ نے تو مجھے شادی کی تیاریوں کا حکم دیا تھا۔"

راجی خاتون بولی۔ "یہ شادی ضرور ہو گی لیکن تم سے نہیں .... اباقہ سے۔"

اس دفعہ اباقہ کے حیران ہونے کی باری تھی۔ وہ بے ساختہ اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ راجی خاتون کے تاثرات کہہ رہے تھے کہ وہ کوئی جھوٹ نہیں بول رہی۔ اس نے سلطان جلال کی طرف دیکھا۔ وہاں سے ایک دھیمی سی مسکراہٹ نظر آئی۔ اباقہ کو لگا کہ زمین آسمان اس کی نظروں میں گھوم رہے ہیں۔

☆-----☆-----☆

چند ہی روز میں حالات کیا سے کیا ہو گئے۔ ان دنوں میں جو مختلف واقعات پیش آئے ان میں سے دو اہم ترین تھے۔ پہلا یہ کہ سلطان جلال اور راجی خاتون کی کوششوں سے ماریتا اس شادی پر رضامند ہو گئی اور دوسرا یہ کہ راجی خاتون نے اس شادی کو ایک عظیم الشان جشن کی صورت دینے کا فیصلہ کیا۔ کالے پہاڑوں کی وادی میں جوش و خروش کی ایک لہر دوڑ گئی۔ کئی قیدیوں کی سزائیں معاف ہو گئیں اور کئی مجرموں کی خطائیں بخش دی گئیں۔ ان مجرموں میں جعفر دارب کے بیسیوں ساتھی بھی تھے۔ جنہیں چوراہوں میں پھانسی پر لٹکایا جانا تھا.......... مگر اس جشن مسرت کے پیش نظر انہیں بھی معاف کر دیا گیا۔ پوری وادی میں آجا کے دو افراد ایسے تھے جنہیں اس شادی کی خوشی نہ تھی۔ ایک تو ظاہر ہے طوطم خاں رہا ہو گا۔ عذاب کے خوف سے اس نے ماریتا کو اپنے قول سے آزاد ضرور کر دیا تھا لیکن دل سے وہ اس پری چہرہ کو کیونکر بھلا سکتا تھا۔ اس شادی کا دوسرا مخالف سردار یورق تھا۔ اس کی تختی دل پر ابھی تک قراقرم کے شامان (جادوگر) کی پیشین گوئی درج تھی۔ اس نے کہا تھا یہ عورت اباقہ کی زندگی میں نہیں آسکتی صرف اس کی زندگی برباد کر سکتی ہے۔ شادی کی تیاریاں دیکھ کر کبھی کبھی یورق کا دل بجھ سا جاتا تھا۔ شادی کا دن قریب آیا تو سلطان نے ایک اور فیصلہ کیا۔ اس نے کہا کہ سلیمان اور نبیلہ کی شادی بھی ساتھ ہی ہو گی۔ جشن کی خوشیوں میں ایک اور مسرت کا اضافہ ہو گیا اس روز اباقہ چھپا تا ماریتا کو دیکھنے کے لیے مہمان خانے جا پہنچا۔ وہ اندر داخل ہوا تو ماریتا اور نبیلہ ایک تخت پر بیٹھی سلائی کڑھائی میں مصروف تھیں۔ اباقہ کو دیکھ کر ماریتا ٹھٹکی پھر اس کے چہرے پر حیا کی سرخی پھیلتی گئی۔ وہ تیزی سے اٹھ کر اندر چلی گئی۔ نبیلہ نے اباقہ کو دیکھا تو اٹھ کر بولی۔

"آیئے بھائی جان!.......... آپ کہیں بھول تو نہیں گئے۔ جہاں تک بندی کا خیال ہے آج چاند کی بارہ تاریخ ہے۔ ابھی تین روز باقی ہیں آپ کی آمد میں۔"

اباقہ مسکرایا اور بولا۔ "میں تو یونہی چلا آیا تھا۔"

نبیلہ آنکھ نچا کر بولی۔ "اچھا تو آپ یونہی چلے آئے تھے۔ ٹھیک ہے آپ یونہی بیٹھئے۔ میں خادمہ بھیج کر مروانے سے سلطان معظم کو بلواتی ہوں۔ ان سے بیٹھ کر گپ شپ کیجئے گا۔"

اباقہ بوکھلا کر بولا۔ "یہ غضب نہ کرنا۔ میں ان کے پاس سے ہی تو آرہا ہوں۔"

"پھر کیا چاہیے جناب کو۔" نبیلہ مصنوعی لاپرواہی سے بولی۔

اباقہ بولا۔ "تم اچھی طرح سمجھ رہی ہو۔ کئی دنوں کے بعد آج یہاں تک پہنچنے کا

موقع ملا ہے۔ کیا یونہی واپس چلا جاؤں؟"

نبیلہ زور سے سرہلا کر بولی۔ "سمجھ گئی۔ آپا سے ملنا چاہتے ہیں آپ.......... لیکن اگر کوئی اوپر سے آگیا تو مصیبت پڑ جائے گی۔ لڑکیاں اور کنیزیں ساتھ والے کمرے میں بیٹھی مہندی بنا رہی ہیں۔"

اباقہ نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔ "ایسے موقعوں پر ہی تو اپنے کام آتے ہیں۔ تم کسی کو اس طرف نہ آنے دینا۔ بس میں یوں آیا۔" وہ چٹکی بجا کر بولا۔ نبیلہ نے شوخ نظروں سے اباقہ کا مسکین چہرہ دیکھا اور اِدھر اُدھر دیکھ کر بولی۔ "ٹھیک ہے بس آنا جانا کیجئے۔"

اباقہ اٹھ کر اس کمرے کی طرف بڑھا جدھر ماریتا گئی تھی۔ وہ ایک مخملیں پردے کی اوٹ میں کھڑی تھی۔ صرف اس کا بازو اور چہرے کا کچھ حصہ دکھائی دے رہا تھا۔ کانچ کی ہلکی پھلکی چوڑیاں اس کی نازک کلائی پر بہت خوبصورت لگ رہی تھیں۔ اباقہ اس کے پاس پہنچ کر بولا۔

"ماریتا.......... تم خوش ہو نا۔"

ماریتا نے پلکیں جھکا لیں۔ پلکوں کی یہ جنبش' اباقہ کو زندگی کی سب سے بڑی نوید دے رہی تھی۔ یہ جنبش ایک بہت بڑا اقرار بھی تھی اور اعتبار بھی۔ اباقہ مسحور نظروں سے ماریتا کا چہرہ دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔ "ماریتا! اگر تمہارے دل میں کسی طرح کی الجھن ہو تو مجھے بتا دو۔ مجھے تمہاری خوشی ہر چیز سے زیادہ عزیز ہے۔"

ماریتا نظروں کو جھکائے جھکائے بولی۔ "بس اب آپ جایئے نا۔ جو کچھ کہنا ہے نبیلہ سے کہہ دیجئے۔ میں سن لوں گی۔"

اس کے حسین چہرے پر شفق کھلی ہوئی تھی۔ اباقہ جھوم اٹھا۔ پہلی بار ماریتا نے اسے "آپ" کہا تھا۔ تکریم کا یہ لفظ اسے بہت کچھ سمجھا رہا تھا۔ اس نے سرشار ہو کر ماریتا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا اور بولا۔

"تمہارے بغیر سال گزرے' لیکن اب یہ دو روز گزارنے مجھے مشکل ہو رہے ہیں۔ کب وہ گھڑی آئے گی جب ہم دونوں کے درمیان کوئی نہ ہو گا.........."

دفعتاً کمرہ قہقہوں سے گونج اٹھا۔ بغلی دروازوں سے کوئی ڈیڑھ درجن لڑکیاں ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوتی اندر گھس آئیں۔ ان میں نبیلہ سب سے آگے تھی۔ اباقہ کے ساتھ ساتھ ماریتا بھی بوکھلا کر رہ گئی۔ نبیلہ نے اپنی ہنسی روکی اور اباقہ کے سامنے پہنچ کر بولی۔

"توبہ یا اللہ .... توبہ یا اللہ کتنے جھوٹے ہیں آپ۔ کہتے تھے یوں آؤں گا۔ چٹکی بجاتے۔ میں تو چٹکیاں بجاتے بجاتے تھک گئی .... اور یہاں ابھی لیلیٰ مجنوں کا پہلا باب

پہلے یہ قاصد معروف شہر ریازان کے کینیناؤں (رئیسوں) کے پاس پہنچے یہ ایک عورت اور دو مرد تھے۔ عورت بدشکل تھی اور اس کی چال ڈھال مردوں والی تھی۔ اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ جادوگرنی تھی۔ ان قاصدوں نے شہر کے رؤسا کو سوبدائی بہادر کا پیغام دیتے ہوئے کہا۔ "ہمیں ہر چیز کا دسواں حصہ بطور خراج دو۔ دس فیصد آدمی۔ دس فیصد رئیس' دس فیصد عورتیں' دس فیصد گھوڑے۔ ہر چیز کا ایک عشر۔ ہمارے خاقان کے سامنے سر جھکا دیے جائیں اور اس کی اطاعت اختیار کی جائے۔"

شہر کے رئیسوں کو جب معلوم ہوا کہ منگول قاصد اپنے گستاخانہ پیغام کے ساتھ آئے ہیں تو انہوں نے انہیں ریازان شہر کی فصیل کے اندر داخل نہ ہونے دیا۔ باہر جا کر ان سے ملاقات کی اور انہیں کہا کہ جب تک اس فصیل کے اندر ایک شخص بھی زندہ ہے تم شہر کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتے .... ہاں جب ہم ختم ہو جائیں گے تو ہر شے تمہاری ملکیت ہو جائے گی۔ منگول قاصدوں نے یہ جواب سن کر بُرے بُرے منہ بنائے اور واپس لوٹ گئے۔

روسیوں پر اب یہ ظاہر ہو گیا تھا کہ وحشی منگول کسی بھی وقت ان پر حملہ آور ہو سکتے ہیں۔ شہر کے تمام رئیس اور صاحب الرائے افراد سر جوڑ کر بیٹھے۔ اردگرد کے حاکموں سے مدد کی درخواست کے لیے قاصد دوڑائے گئے۔ ریازان کا رئیس اعظم ایک زیرک اور دوراندیش شخص تھا۔ وہ جانتا تھا روس کا طول و عرض منگولوں کے سیلاب بے اماں کی زد میں آنے والا ہے۔ انہیں روکنے کے لیے صرف بہادری ہی نہیں حکمت عملی کی ضرورت بھی ہو گی۔ اس نے نہایت غور و خوض کے بعد اپنے مشیروں کے سامنے ایک منصوبہ پیش کیا۔ اس نے کہا کہ ہمیں منگولوں کی جنگی حکمت عملی سے آگاہ ہونے کے لیے ایسے جنگجو افراد کی خدمات حاصل کرنا چاہئیں جو منگولوں کے ساتھ رہ کر لڑ چکے ہوں لیکن اب دل و جان سے ان کے دشمن ہوں۔ منگولوں کے اہم باغی سردار بھی ہمارے لیے گراں قدر ثابت ہو سکتے ہیں۔

رئیس اعظم کی اس تجویز پر خوب غور و خوض کیا گیا اور بالآخر اسے قابل عمل جانا گیا۔ ایک بوڑھے منگول سردار کی مدد سے جو قراقرم کا معتوب ہو کر ریازان میں پناہ گزین تھا کچھ افراد کی ایک فہرست تیار کی گئی۔ اس فہرست کو ایک خفیہ دستاویز کی شکل دے کر ایک نہایت ہوشیار روسی سالار کے حوالے کیا گیا اور اسے ہدایت کی گئی کہ یہ افراد جہاں جہاں اور جس حالت میں بھی ہوں ان سے رابطہ قائم کیا جائے اور انہیں فرداً فرداً روس کے رؤسا کا یہ پیغام پہنچایا جائے۔ روسی سالار مائیکل کو دی جانے والی اس فہرست میں ایک

نام "سردار یورق" اور ایک نام "سردار اباقہ" بھی تھا۔

☆------☆------☆

ناقابل فراموش حادثے کے بعد اباقہ کو وادی سے گم ہوئے پانچ ہفتے گزر گئے تو سردار یورق اور سلیمان نے واپسی کے بارے سوچنا شروع کیا۔ گمان غالب یہی تھا کہ اباقہ نے عراق کا رخ کیا ہو گا۔ سلطان کی جان سے کھیلنے والے بغداد سے آئے تھے اور اب بغداد ہی اباقہ کی منزل ہو سکتا تھا۔ سفر کی تیاری کرنے کے بعد ایک روز سردار یورق نے راجی خاتون سے واپسی کی اجازت مانگی۔ راجی خاتون انہیں وادی میں روکنا چاہتی تھی' لیکن وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اس جہنم زار میں مستقل طور پر رہنا کوئی خوشگوار تجربہ نہیں۔ آخر کچھ پس و پیش کے بعد اس نے انہیں اجازت دے دی .... اسی رات ایک المناک واقعہ پیش آیا۔

وہ ایک تاریک رات تھی۔ نبیلہ اور مارینا شاہی مہمان خانے کے "زنانے" میں موجود تھیں۔ نبیلہ اور مارینا ایک ہی خوابگاہ میں سوتی تھیں۔ بلکہ عام طور پر وہ ایک ہی پلنگ پر سو رہتی تھیں۔ نبیلہ ڈاکوؤں اور قاتلوں کی اس بستی میں خاص طور پر بہت خوفزدہ نظر آتی تھی۔ اس رات بھی دونوں ایک دوسری کے پہلو میں لیٹی تھیں۔ دالان میں تین کنیزیں سو رہی تھیں۔ دروازے کے باہر چوب دار موجود تھا۔ دونوں خاموش لیٹی تھیں۔ ایک دوسرے کو بتا رہی تھیں کہ سو رہی ہیں۔ درحقیقت دونوں جاگ رہی تھیں۔ اپنی اپنی جگہ اس غم کو محسوس کر رہی تھیں جو سلطان جلال اور اباقہ انہیں دے گئے تھے ....
دفعتاً کمرے کی عقبی کھڑکی دھاکے سے کھلی اور دو نقاب پوش اندر گھس آئے۔ نبیلہ کی چیخ کے ساتھ ہی مارینا بھی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ایک نقاب پوش نے لپک کر نبیلہ کے سر پر کوئی وزنی چیز ماری۔ وہ تیورا کر گری لیکن بے ہوش نہیں ہوئی۔ دونوں نقاب پوشوں نے اسے بے ہوش جان کر مارینا کو دبوچ لیا۔ مارینا نے دیوار پر آویزاں تلوار تک پہنچنے کی کوشش کی' لیکن ناکام رہی۔ ایک گرانڈیل نقاب پوش نے جھپٹ کر اسے کندھے پر ڈال لیا۔ نبیلہ چیخ کر اس نقاب پوش کی ٹانگوں سے لپٹ گئی۔ دوسرے نقاب پوش نے اس کے سر پر ایک اور ضرب لگائی۔ نبیلہ دروازے تک اس کی ٹانگوں کے ساتھ گھسٹتی چلی گئی۔ پھر بے دم ہو کر گر پڑی۔ دالان میں تینوں کنیزیں دیوار سے لگی تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ ایک نقاب پوش ان کے سر پر ننگی تلوار لیے کھڑا تھا۔ مارینا کے منہ پر ایک نقاب پوش کا ہاتھ تھا۔ اس کی چیخیں سینے میں ہی گھٹ کر رہ گئی تھیں۔ عین دروازے پر ایک بند گھوڑا گاڑی کھڑی تھی۔ مارینا کو اس میں ڈال دیا گیا۔ گھوڑا گاڑی روانہ ہوئی اور چند ناہموار راستوں

سے گزر کر ایک جگہ رک گئی۔ یہاں تین نقاب پوش گھوڑوں پر سوار موجود تھے۔ مارینا کو گھوڑا گاڑی سے نکالا گیا اور ایک گھڑ سوار نے اسے اپنے سامنے بٹھالیا۔ مارینا نے دیکھا وہ وادی سے باہر آ چکی تھی۔ اس کا منہ اب ایک کپڑے سے بند کر دیا گیا تھا تاہم اگر یہ بندش نہ بھی ہوتی تو یہاں اس کی چیخ و پکار سننے والا کوئی نہیں تھا۔ گھوڑوں کو ایڑ لگی اور وہ سرپٹ دوڑنے لگے۔ کوئی چوتھائی منزل یہ سفر جاری رہا پھر ہانپتے ہوئے گھوڑے دشوار گزار ٹیلوں میں رک گئے۔ مارینا کے ہاتھ پشت پر باندھ دیئے گئے۔ ایک نقاب پوش نے دوسرے دو نقاب پوشوں کو پاس بلایا۔ پھر لباس میں سے ایک تھیلی نکال کر انہیں دی اور وہ سلام کر کے واپس چلے گئے۔ نقاب پوش نے مارینا کو گھوڑے سے اتارا اور دھکا دے کر اسے سنگلاخ زمین پر گرا دیا۔ اس نے نقاب ہٹائی وہ طوطم خاں تھا۔ اس کے چہرے پر سفاکی نظر آ رہی تھی۔ آنکھیں اندھیرے میں کسی درندے کی طرح روشن تھیں۔ وہ پھنکارا۔

"بد ذات عورت میں نے .... میں نے تجھ سے محبت کی۔ تجھے عزت دینا چاہی' تیرا احترام کیا' لیکن .... لیکن تو نے ثابت کیا کہ تو اس عزت و احترام کے قابل نہ تھی' نہ ہی تو اس لائق تھی کہ تجھ سے محبت کی جاتی۔ تو نے اپنا عہد توڑا' اپنی قسم بھلائی اور اس جنگلی کے ساتھ شادی کو تیار ہو گئی' لیکن تقدیر نے پھر تجھے میرے بس میں دے دیا ہے۔"

مارینا کے چہرے پر خوف کے سائے تھے۔ وہ روہانسی آواز میں بولی۔ "مجھے معاف کر دو طوطم خاں۔ میں .... میں مجبور ہو گئی تھی۔ تمہیں تمہاری محبت کا واسطہ میری بات پر یقین کرو ...."

طوطم خان غرایا۔ "مت نام لو محبت کا۔ مجھے نفرت ہے تم سے شدید ترین نفرت۔"
مارینا نے بے بسی سے اردگرد دیکھا۔ چاروں طرف تاریکی تھی' گھمبیر تاریکی۔ ایسی ہی تاریکی مارینا کے ذہن پر بھی چھا رہی تھی۔ طوطم خاں وحشیانہ انداز میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

مارینا التجا آمیز لہجے میں بولی۔ "طوطم خاں میری مجبوری کو سمجھنے کی کوشش کرو۔"
طوطم خاں چند قدم چل کر آگے آیا۔ مارینا کے سر پر پہنچ کر جھکا پھر اس کا بھرپور تھپڑ مارینا کے گال پر پڑا۔ رات کے سناٹے میں دور تک اس تھپڑ کی آواز گونجی۔ مارینا گھوم کر رہ گئی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے گہری تاریکی چھا رہی تھی۔ اس وقت اس کے ذہن کی دھند سے اباقہ کا چہرہ نمودار ہوا۔ اس نے سوچا کیا یہ ممکن ہے کہ کہیں سے اباقہ گھوڑا

دوڑاتا ہوا آئے اور اسے اس عذاب سے بچا لے جائے .... پھر سلطان جلال کی نورانی شبیہہ اس کی آنکھوں کے سامنے آئی۔ آہ سلطان جلال' اس نے بڑے درد کے ساتھ سوچا۔ آپ بھی مجھے بے آسرا چھوڑ کر چلے گئے۔ اس تاریک ویرانے میں کون بچانے آئے گا مجھے' کوئی نہیں .... ہاں کوئی نہیں۔ یہ سب خیالی باتیں ہیں۔ انسان کبھی نا امید نہیں ہوتا۔ بدترین حالات میں بھی اس کی آس بندھی رہتی ہے۔ وہ سوچتا ہے شاید یہ ہو جائے' شاید وہ ہو جائے۔ پھانسی پانے والا بھی اس وقت تک اپنی زندگی سے مایوس نہیں ہوتا جب تک اس کے پاؤں کے نیچے سے تختہ نہیں نکلتا۔

چند لمحوں کے اندر اندر بے شمار خیالات مارینا کے ذہن سے گزر گئے۔ سب کچھ جانتے ہوئے بھی اس نے سوچا' یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ شاید طوطم خاں کو مجھ پر رحم آ جائے۔ شاید کوئی بھولا بھٹکا راہی اِدھر آ نکلے .... شاید کوئی موذی جانور طوطم خاں کو ڈس لے .... یا شاید کوئی پتھر لڑھک کر اس پر آ گرے لیکن کچھ نہیں ہوا۔ طوطم خاں کی وحشیانہ نظریں اس پر مرکوز رہیں۔ اس کے چہرے کی خباثت بڑھتی چلی گئی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر مارینا کے بال مٹھی میں جکڑ لئے .... پھر تاریکی سسک اٹھی۔ آسمان شبنم رونے لگا اور غم سے سنگلاخ زمین کا کلیجہ پھٹ گیا .... دیر بعد جب طوطم خاں اپنے گھوڑے کی طرف بڑھا تو مارینا اپنا سب کچھ لٹا چکی تھی۔ وہ سکتے کے عالم میں زمین پر پڑی تھی۔ طوطم خاں نے گھوڑے سے لٹکے ہوئے چرمی تھیلے سے ایک بوتل نکالی۔ شیشے کی یہ چھوٹی سی بوتل لے کر وہ مارینا کے سر پر پہنچ گیا۔ اس کے ہیولے سے ایک کرخت آواز برآمد ہوئی اور ٹیلوں میں گونجتی چلی گئی۔ "بے وفا عورت' آج میں تیرے چہرے کو اتنا حسین بنا دوں گا کہ کوئی بھی اس کے حسن کی تاب نہ لا سکے گا۔ جدھر سے تو گزرے گی لوگ اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیں گے۔" مارینا نے چیخنا چاہا لیکن اس کی آنکھوں سے آنسو ہی خشک نہیں ہوئے تھے۔ چیخیں بھی اس کے حلق سے روٹھ گئی تھیں۔ وہ لرزاں پلکوں سے طوطم خاں کے ہاتھ میں دبی بوتل کی طرف دیکھتی رہی۔ طوطم خاں نے بوتل کا ڈھکن کھولا۔ وہ اس پر جھکا اور ایک سیال اچھل کر مارینا کے چہرے پر آ گرا .... ہاں یہ تیزاب ہی تھا۔ مارینا کربناک انداز میں چیخی پھر درد سے بے تاب ہو کر کھڑی ہو گئی۔ طوطم خاں کے قہقہے فلک شگاف تھے۔ ان قہقہوں کی جلن بھی تیزاب سے کچھ کم نہیں تھی۔ مارینا اپنے چہرے کا حشر دیکھنا چاہتی تھی لیکن اس کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے .... ہاں وہ اپنی گردن سے لٹکتے ہوئے گوشت کے ٹکڑے دیکھ سکتی تھی۔ وہ جلے ہوئے بالوں کی بو بھی محسوس کر سکتی تھی۔ یہ شواہد اسے بتا رہے تھے کہ وہ

ایک کریہہ عورت کا روپ دھار چکی ہے۔ اسے لگا جیسے آسمان پر چمکتے ستارے اس کی حالت پر مسکرا رہے ہیں۔ تاریک ٹیلے اس کی طرف پشت کیے کھڑے ہیں تاکہ ان کی نظر اس کے مکروہ چہرے پر نہ پڑ سکے۔ درد و کرب سے بے چین ہو کر مارینا نے اپنے ہونٹ دانتوں میں دبانے چاہے لیکن اسے معلوم ہوا کہ اب اس کے چہرے پر ہونٹ نام کی کوئی چیز نہیں رہی۔ اس کے سینے سے ایک پُردرد چیخ بلند ہوئی اور وہ دیوانہ وار ٹیلوں کی طرف بھاگ نکلی۔ ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ وہ سوچ رہی تھی اباقہ جب اسے اس حالت میں دیکھے گا تو اس پر کیا گزرے گی۔ اس کے چہرے پر کیسی حیرت نظر آئے گی۔ پھر یہ حیرت ایک نفرت میں ڈھل جائے گی۔ نفرت جس میں ہلکا ہلکا خوف بھی شامل ہو گا۔ نفرت اور خوف کا یہ ملا جلا تاثر کس قدر اذیت ناک ہو گا۔ نہیں، کبھی نہیں۔ مارینا نے بھاگتے بھاگتے سوچا، میرے محبوب کے چہرے پر یہ تاثر کبھی نہیں آئے گا۔ میں اُس کی نظروں میں ویسی ہی حسین رہوں گی جیسی کبھی تھی۔ وہ میرا یہ چہرہ کبھی نہیں دیکھے گا۔ میں زندگی کی سرحد پار کر جاؤں گی۔ زمین کی گہرائی میں چھپ جاؤں گی۔ پھر اس کے کانوں میں سلطان جلال کے الفاظ گونجے۔ "زندگی کیسی بھی ہو مارینا قدرت کا انمول عطیہ ہے۔" کسی وقت یہ الفاظ اُسے بہت پُرمعنی لگے تھے، سیدھے اس کے دل میں اُتر گئے تھے، لیکن آج ان الفاظ نے بھی اپنے اثر سے بچھڑ کر خودکشی کر لی تھی۔ آج یہ الفاظ مردہ محسوس ہو رہے تھے۔ مارینا اندھا دھند بھاگتی ایک بلند ٹیلے پر چڑھ گئی۔ دور نیچے ابھی تک طوطم خاں کے فاتحانہ قہقہے گونج رہے تھے۔ مارینا نے نیچے انجانی گہرائیوں کی طرف دیکھا۔ پھر اس کی زبان پر "اباقہ" کا نام آیا اور وہ نشیب میں کود پڑی..........

ایک طویل چیخ اس کے ہونٹوں سے نکلی .... اور ایکا ایکی اس کی بند پلکوں پر روشنی نمودار ہوئی۔ کوئی دور سے اسے پکار رہا تھا۔ "کیا بات ہے مارینا .... کیا ہوا؟" پھر یہ دور کی آواز دھیرے دھیرے قریب آنے لگی اور جب بالکل قریب آ گئی تو مارینا نے محسوس کیا کہ وہ کسی بستر پر ہے۔ اس نے جلدی سے آنکھیں کھول دیں۔ کمرے میں ہلکی ہلکی روشنی ہو رہی تھی۔ طوطم خاں ایک شمعدان لئے اس کے سامنے کھڑا تھا۔ مارینا ایکدم اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کا ہاتھ سب سے پہلے اپنے چہرے پر گیا۔ چہرہ صحیح سلامت تھا۔ پلکیں ناک ہونٹ سب کچھ صحیح سلامت تھا۔ اس کی آنکھوں میں خوشی سے آنسو لرزنے لگے۔ طوطم خاں گھمبیر آواز میں بولا۔ "میرا خیال ہے تُو نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا تھا۔"

مارینا نے لرزاں آواز میں پوچھا۔ "میں کہاں ہوں طوطم اور یہاں کیسے آئی؟"

"تُو .... تُو ٹیلوں میں بے ہوش ہو گئی تھی۔" طوطم خاں نے بے رخی سے

جواب دیا۔ دفعتاً مارینا کو سب کچھ یاد آ گیا۔ طوطم خاں نے اسے گھوڑے سے اتار کر سنگلاخ زمین پر پھینکا تھا۔ پھر ان کے درمیان چند باتیں ہوئی تھیں اور طوطم خاں نے اس کے منہ پر زور سے طمانچہ مارا تھا۔ اس کے بعد اسے کچھ یاد نہیں تھا کیا ہوا۔ مارینا کا ہاتھ بے اختیار اپنے گال کی طرف چلا گیا۔ اس کے ہونٹوں کے ایک کونے پر ابھی تک زخم کا چھوٹا سا نشان موجود تھا۔ یہ زخم اسی طمانچے کی نشانی تھا۔ مارینا کے سر میں ٹیس سی اٹھی۔ اس کا ہاتھ اپنے سر کی طرف گیا۔ ایک طرف نمایاں ابھار تھا۔ طمانچہ کھا کر شاید وہ پتھروں پر گری تھی اور اس کا سر کسی پتھر سے ٹکرایا تھا۔ اس نے بغور اردگرد کا جائزہ لیا جسے اس نے پہلے پہل کمرہ سمجھا تھا وہ درحقیقت ایک غار تھا۔ اس کی دیواریں ہموار تھیں اور چھت کی بلندی تقریباً ایک کمرے کے برابر تھی۔ وہ جس بستر پر پڑی تھی وہ پتھر کی ایک سل پر بچھایا گیا تھا۔ غار کے دہانے سے مدھم روشنی اندر آ رہی تھی۔ یوں لگتا تھا شام ہونے والی ہے۔ اس کا مطلب تھا وہ خاصی دیر بے ہوش رہی ہے۔ یہ علاقہ بھی کالے پہاڑوں کی وادی کا نہیں لگتا تھا۔

طوطم خاں کے گھوڑے سے لٹکے ہوئے دونوں چرمی تھیلے زمین پر پڑے تھے۔ اس میں سے بہت سی اشیاء نکال کر طوطم خاں نے اِدھر اُدھر رکھ چھوڑی تھیں۔ لگتا تھا اس کا ارادہ اس غار میں طویل قیام کا ہے۔ مارینا کے ہاتھ جو طوطم خاں نے اپنی موجودگی میں تھوڑی دیر کے لئے کھول دیئے تھے وہ انہیں دوبارہ باندھتے ہوئے بولا۔

"مارینا! گئے وقتوں میں لوگ اپنی عورتوں کو گلے میں زنجیر ڈال کر باندھ دیا کرتے تھے۔ میں ایسا نہیں کر سکتا۔ مگر تمہارے یہ ہاتھ بھی آزاد نہیں رکھ سکتا۔ تمہیں اب میرے ہاتھوں کو اپنے ہاتھ سمجھنا ہو گا۔ ہم انسانوں اور انسانی بستیوں سے بہت دور اسی غار میں رہیں گے۔ اب کبھی کوئی "اباقہ" ہمارے درمیان نہ آ پائے گا۔ مجھے یقین ہے ایک روز تمہارے دل میں میری محبت جاگے گی، ضرور جاگے گی۔"

ان چند فقروں میں طوطم خاں نے اپنے تمام ارادوں کا اظہار کر دیا تھا۔ مارینا نے طوطم خاں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "طوطم خاں! تم بہت ہوشیار ہو لیکن تم نے ہمیشہ غلط سوچا ہے .... کاش، کاش تم ایک عورت کو سمجھ سکتے۔"

طوطم خاں نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور گھوڑوں کو چارہ ڈالنے کے لئے باہر نکل گیا۔

☆ ------ ☆ ------ ☆

بغداد کے طول و عرض میں ہونے والے حفاظتی انتظامات کے بعد پُراسرار وارداتوں

کا سلسلہ کچھ دنوں کے لئے رک گیا۔ تین چار ہفتے گزرنے کے بعد نہ صرف لوگوں کے خوف و ہراس میں کمی واقع ہو گئی بلکہ مجرم کو گرفتار کرنے کے لئے جو تفتیشی عمل شروع کیا گیا تھا وہ بھی سرد پڑ گیا۔ قصر خلد کے علاقے میں بھی سراسیمگی کی فضا ختم ہو گئی۔ امراء روسا ایک دوسرے کے ہاں داد عیش دینے کے لئے پھر جمع ہونے لگے۔ رات گئے تک برپا رہنے والی شعر و سخن اور نغمہ و سرود کی محفلیں پھر جمنے لگیں۔ سر شام ہی امرا کے محلوں میں جو ویرانی چھا جاتی تھی' دور ہو گئی۔ بغداد جیسے مصروف اور پُرہنگام شہر میں کسی بھی کیفیت کو دوام نہیں تھا۔ عین ممکن تھا کہ چند روز تک حالات جوں کے توں رہتے تو لوگ بھول بھی جاتے کہ کسی شخص نے خلافت عباسیہ کے مرکز میں گھس کر ہلچل مچائی تھی اور دربار خلافت سے وابستہ کئی اہم اور با اثر شخصیتوں کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ بغداد کی ایک شام نہایت سنسنی خیز ثابت ہوئی۔ دبے ہوئے تمام خدشات پھر جوان ہو کر دلوں میں آ سمائے' چہرے پھر رنگ بدلنے لگے۔ محلات کی پردہ پوش خلوتوں میں پھر ڈری ہوئی سرگوشیاں سنائی دینے لگیں۔

جس شام کا یہ ذکر ہے مسلم بن داؤد اپنے محسن اور وزیر خاجہ ابن یاشر کے محل میں موجود تھا۔ مارینا کی روانگی اور اباقہ کے روپوش ہونے کے بعد سے وہ ابھی تک یہیں تھا۔ ابن یاشر نے اس کے لئے اپنے وسیع محل کا ایک حصہ وقف کر دیا تھا۔ مسلم بن داؤد زیادہ تر وہیں رہتا تھا۔ محل کی چاردیواری میں اسے زندگی کی ہر آسائش میسر تھی۔ دو تین ماہ تو وہ محل کے اس گوشے سے باہر ہی نہیں نکلا تھا۔ پھر جب اباقہ کے بارے کوئی خبر نہیں آئی اور اسے یقین ہونے لگا کہ اباقہ بغداد میں موجود نہیں بلکہ شاید عراق میں بھی موجود نہیں تو اس کی رسی تھوڑی سی دراز ہوئی۔ وہ کبھی کبھی پرانے ملنے جلنے والوں کے ہاں جانے لگا۔ ایک دو بار دربارِ خلافت کا چکر بھی لگا لیکن وہ جہاں بھی جاتا تھا ایک عجیب طرح کا خوف اس کے سر پر سوار رہتا تھا۔ یہ خوف اسی وقت دور ہوتا تھا جب وہ محل کی چاردیواری میں محافظوں کے نرغے میں پہنچ جاتا تھا۔ اس شام بھی وہ اپنے خلوت کدے میں موجود تھا کہ وزیر خارجہ ابن یاشر کا خادم خاص تیز قدموں سے آتا دکھائی دیا۔ اس نے قریب آ کر بتایا کہ آقا نے آپ کو یاد کیا ہے۔ مسلم بن داؤد یاشر کی نشست گاہ میں پہنچا تو وہ بے چینی سے قالین پر ٹہل رہا تھا۔ اس نے کہا۔

"مسلم بن داؤد تمہیں کچھ معلوم ہے .... کچھ دیر پہلے امیر نصیر کو اس کے اہل خانہ سمیت موت کے گھاٹ اتار دیا گیا ہے۔" داؤد نے سکتے کے عالم میں یہ خبر سنی۔ یاشر نے مزید کہا۔ "یہ واردات بھی اسی شخص نے کی ہے جو اس سے پہلے کئی افراد کے خون سے ہاتھ رنگ چکا ہے۔ امیر نصیر آج اپنی بیوی بہن اور ایک خادم کے ساتھ دجلہ کی سیر کر رہا تھا۔ ان کا ڈونگا اس جانب نکل گیا جہاں ایک ماہ قبل مشہور تاجر احتشام الدین کا قتل ہوا تھا۔ ٹھیک اسی مقام پر کوئی شخص ان کے ڈونگے میں داخل ہوا۔ اس نے امیر نصیر کو بیوی اور بہن سمیت مار ڈالا۔ اس دوران خادم کو جو ڈونگے کے اگلے حصے میں بیٹھا تھا کچھ شک ہوا۔ اس نے آوازیں دے کر قریبی کشتیوں کو اپنی طرف متوجہ کیا اور پھر خود پانی میں چھلانگ لگا دی۔ تھوڑی دیر بعد جب چند کشتیاں ڈونگے کے قریب پہنچیں تو وہاں مکمل سکون تھا۔ کچھ آدمی ہمت کر کے ڈونگے پر اترے۔ امیر نصیر کی بیوی اور بہن مردہ پڑی تھیں۔ ان کی گردنیں کٹی ہوئی تھیں۔ امیر نصیر شدید زخمی تھا۔ اسے فوراً بیمارستان پہنچا دیا گیا۔ جہاں اس کی حالت نازک ہے۔"

مسلم بن داؤد نے یہ ساری روئیداد نہایت پریشانی کے عالم میں سنی۔ اس کے چہرے پر عجیب عجیب رنگ آ رہے تھے۔ پھر وہ بے دم ہو کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ لرزاں آواز میں ابن یاشر سے کہنے لگا۔ "وزیر محترم! میرے دل میں کئی روز سے ایک شبہ ہے' آپ کی اطلاع کے بعد یہ شبہ اور قوی ہو گیا ہے۔ مجھے لگتا ہے.........." یہاں تک کہہ کر مسلم بن داؤد کا چہرہ تاریک ہو گیا۔ اپنے ہونٹوں پر زبان پھیر کر اس نے تھوک نگلا اور بولا۔ "مجھے شک ہے وزیر محترم! کہیں یہ شخص وہی خونی اباقہ تو نہیں؟"

ابن یاشر کے چہرے پر چھائی ہوئی سنجیدگی کچھ اور گہری ہو گئی۔ وہ بولا۔ "تم ٹھیک کہتے ہو مسلم بن داؤد' امیر نصیر کے جس ملازم نے خوفزدہ ہو کر پانی میں چھلانگ لگائی تھی اس نے قاتل کی ایک جھلک دیکھی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ لمبے بالوں اور عریاں بدن والا ایک جنگلی شخص ہے۔"

مسلم بن داؤد کا چہرہ بالکل دھواں دھواں ہو گیا۔ اس نے سینے پر ہاتھ رکھ لیا اور کپکپاتی آواز میں بولا۔ "وزیر محترم .... مم .... میرے دل کو کچھ ہو رہا ہے۔"

ابن یاشر نے تالی بجائی' ایک خادم اندر داخل ہوا۔ ابن یاشر نے اسے پانی لانے کا حکم دیا۔ پھر مسلم بن داؤد کی ڈھارس بندھانے کی کوشش کرنے لگا۔ بوڑھے کے سارے جسم پر لرزہ طاری تھا۔ لگتا تھا اسے اختلاج قلب کا دورہ پڑ گیا ہے۔ اس کی حالت ابن یاشر کو بھی خوفزدہ کر رہی تھی۔ مسلم بن داؤد نے دو گھونٹ پانی پی لیا تو ابن یاشر نے خادموں کو حکم دیا کہ اسے اٹھا کر اس کی قیام گاہ میں لے جائیں۔ چار آدمیوں نے مسلم بن داؤد کو ہاتھوں میں اٹھایا اور اسے ابن یاشر کی نشست گاہ سے باہر لے گئے۔

نماز مغرب کے بعد ابن یاشر' مسلم بن داؤد کی مزاج پرسی کے لئے پہنچا تو اس کی

حالت بہتر پائی۔ وہ مصلے پر بیٹھا ایک لمبی تسبیح پھیر رہا تھا۔ ابن یاشر کو دیکھ کر اس نے وظیفہ ختم کیا اور اس کے ساتھ ایک خوبصورت حوض کے کنارے آ بیٹھا۔ کچھ دیر وہ اس نئی واردات کے بارے باتیں کرتے رہے۔ ابن یاشر نے بتایا کہ تھوڑی دیر پہلے بیمارستان سے اطلاع آئی ہے کہ امیر نصیر کو ہوش آ گیا ہے۔ مسلم بن داؤد نے کہا۔

"وزیر محترم! اگر امیر نصیر کو ہوش آ گیا ہے تو آپ کو اس سے ملاقات کی کوشش کرنی چاہئے۔ میری ناچیز رائے میں آپ کی یہ کوشش کسی اہم راز سے پردہ اٹھا سکتی ہے۔"

ابن یاشر کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ واقعی بات قابل غور تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد وزیر خارجہ ابن یاشر اپنی مخصوص بگھی میں محل سے باہر نکل رہا تھا۔ اس کا رخ بیمارستان کی طرف تھا۔

جب وہ بیمارستان پہنچا تو ناظم شہر اور وزیر داخلہ عبدالرشید بھی وہیں موجود تھا ان کے علاوہ بھی کئی اعلیٰ عہدیدار وہاں موجود پائے گئے۔ سب کے چہروں پر ہراس پایا جاتا تھا۔ وزیر داخلہ عبدالرشید نے گلوگیر لہجے میں ابن یاشر کو بتایا کہ چند لمحے پہلے امیر نصیر انتقال کر گیا ہے۔ ابن یاشر کے ذہن میں جو سوال کلبلا رہا تھا وہ اس کے ہونٹوں پر آئے بغیر نہ رہا۔ اس نے کہا۔ "عبدالرشید' کیا امیر نصیر نے کوئی نزاعی بیان دیا ہے؟"

عبدالرشید نے اثبات میں سر ہلایا اور ابن یاشر کو ایک طرف آنے کو کہا۔ ناظم شہر بھی ان کے ساتھ ہی چلا آیا۔ وہ تینوں نہایت رازداری سے گفتگو کرنے لگے۔ وزیر داخلہ عبدالرشید نے کہا۔ "یہ نہایت اہم بیان ہے اور ہم تینوں کے علاوہ فی الحال کسی کو اس بارے علم نہیں اور نہ ہونا چاہئے۔ بیان یہ ہے کہ حملہ آور وہی نوجوان اباقہ ہے جس نے چند ماہ پہلے اپنی مجرمانہ سرگرمیوں کی وجہ سے بغداد کے لوگوں میں کافی شہرت حاصل کی تھی۔ آپ کو یاد ہو گا کہ اس نے سیف الدین کے مکان پر بھی قبضہ کر لیا تھا اور ناظم اعلیٰ اور سیف الدین سمیت کئی افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔

"ہاں .... ہاں مجھے سب معلوم ہے۔" ابن یاشر نے کہا۔

وزیر داخلہ بولا۔ "امیر نصیر نے اپنے بیان میں اس واردات کی تفصیل بتاتے ہوئے کہا ہے کہ ڈونگے میں داخل ہوتے ہی مجرم نے پہلے اس کی بیوی اور بہن کو مار دیا کیونکہ انہوں نے شور مچانے کی کوشش کی تھی۔ پھر وہ نہایت درندگی سے اس پر جھپٹا اور اپنا خنجر اس کی گردن پر رکھ کر کہنے لگا کہ عبداللہ مشہدی کا پتہ بتاؤ۔ دہشت زدہ ہو کر اس نے عبداللہ مشہدی کا پتہ بتایا۔ اتنے میں ڈونگے کے اگلے حصے سے خادم نے شور مچا دیا۔ مجرم

نے امیر نصیر کی گردن پر خنجر کا وار کیا اور اسے تڑپتا چھوڑ کر پانی میں غوطہ لگا گیا۔"

وزیر خارجہ بولا۔ "یہ عبداللہ مشہدی کون ہے۔ نام کچھ سنا ہوا لگتا ہے۔"

وزیر داخلہ عبدالرشید نے بتایا۔ "عبداللہ مشہدی اسمٰعیلی فرقے کا چھری بند فدائی تھا۔ بعد میں منحرف ہو گیا۔ اب وہ صرف ایک کرائے کا قاتل ہے۔ معقول معاوضہ دے کر اس سے کوئی کسی کا قتل بھی کرا سکتا ہے۔ اب تک کئی سو افراد کو موت کے گھاٹ اتار چکا ہے۔"

وزیر خارجہ ابن یاشر بولا۔ "ہاں یاد آیا۔ یہ تو بہت خطرناک شخص ہے۔ آج کل وہ بغداد میں ہے؟"

ناظم شہر نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ "بالکل جناب وہ شرقی جہت کے سلطانی محلے میں رہائش پذیر ہے۔" ناظم شہر چونکہ وزیر خارجہ اور وزیر داخلہ دونوں کے مقابلے میں کم عمر تھا اسی لئے خاصا دبا دبا لگ رہا تھا۔

وزیر خارجہ نے کہا۔ "تمہارا کیا خیال ہے عبدالرشید' مجرم عبداللہ مشہدی کو کیوں ڈھونڈ رہا ہے۔"

عبدالرشید نے کہا۔ "بخدا مجھے اس بارے میں کچھ علم نہیں۔ ہو سکتا ہے مجرم کی اس سے کوئی ذاتی رنجش ہو۔"

وزیر خارجہ نے اسے ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھ کر کہا۔ "عبدالرشید کہیں عبداللہ مشہدی کے رابطے دربارِ خلافت سے تو نہیں؟"

عبدالرشید بولا۔ "آپ کا مطلب ہے کہ حکومت نے مشہدی کو اباقہ اور اس کے ساتھیوں کے خلاف استعمال کیا ہے۔ محترم وزیر! میرے خیال میں ایسا نہیں اور اگر ایسا ہوا بھی ہے تو میرے علم میں یہ بات ہرگز نہیں۔ ہو سکتا ہے اعلیٰ سطح پر کوئی فیصلہ کیا گیا ہو۔"

وزیر خارجہ نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔ "قاتل مشہدی کو ڈھونڈتا پھر رہا ہے اور مقتول امیر نصیر نے اسے اس کا پتہ بتا دیا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اب وہ اُسی کی طرف رخ کرے گا ...." بولتے بولتے ابن یاشر رکا پھر ناظم سے کہنے لگا۔ "منصور! تم نے عبداللہ مشہدی کی حفاظت کا انتظام کیا ہے؟"

ناظم نے کہا۔ "ہاں جناب! میں نے امیر نصیر کے نزاعی بیان کے فوراً بعد چار سپاہیوں کو سادہ لباس میں عبداللہ مشہدی کے مکان پر تعینات کرا دیا ہے۔"

"کیا بات کر رہے ہو منصور۔" وزیر خارجہ ناظم پر بگڑا۔ "چار آدمی اس درندے کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ وہاں کم از کم بیس پچیس بغدادی سورماؤں کو بھیجو پھر شاید وہ اس کی

کچھ مزاحمت کر سکیں۔"

ناظم نے اثبات میں سرہلایا۔ وزیر خارجہ ابن یاشر کے چہرے سے پریشانی مترشح تھی۔ مارینا کی موت کا جو ڈھونگ رچایا گیا تھا اس میں مسلم بن داؤد اور وہ اہم کردار تھے۔ انہوں نے ہی مارینا کو منگول سفیر طوطم خاں کی تحویل میں دیا تھا۔ اباقہ کے خلاف یہ ایک بہت بڑی سازش تھی۔ اگر اباقہ دوبارہ بغداد پہنچ چکا تھا تو ان کی جانوں کو بھی خطرہ لاحق ہو سکتا تھا۔ وزیر خارجہ نے ناظم سے پوچھا۔

"امیر نصیر کے زندہ بچ رہنے کا کن کن لوگوں کو پتہ ہے؟"

ناظم نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ امیر نصیر تو.........."

وزیر خارجہ بات کاٹ کر غصے سے بولا۔ "مجھے بھی پتہ ہے وہ مرگیا ہے۔ مجھے یہ بتاؤ دجلہ پر کتنے لوگوں کو معلوم ہوا تھا کہ امیر نصیر قاتلانہ حملے میں فوری ہلاکت سے بچ گیا ہے؟"

ناظم نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال ہے کسی کو بھی علم نہیں تھا۔ لاشیں ڈونگے سے نکالی گئیں تو امیر نصیر بھی مرا ہوا ہی دکھائی دیتا تھا۔ یہ بعد میں پتہ چلا کہ ابھی امیر کی نبضیں چل رہی ہیں۔"

وزیر خارجہ بولا۔ "یہ ٹھیک ہوا۔ اب ایک بات غور سے سن لو۔ کسی شخص کو یہ علم نہیں ہونا چاہئے کہ امیر نصیر موقع پر نہیں بیمارستان میں مرا ہے۔ نہ ہی اس کے نزاعی بیان کا کسی کو پتہ چلنا چاہئے۔ جن لوگوں کو ان باتوں کا علم ہے انہیں فوراً راز داری کا پابند کر دو۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا؟"

ناظم ابھی بات کی تہہ تک نہیں پہنچا تھا۔ وزیر داخلہ عبدالرشید نے اس کی مدد کرتے ہوئے کہا۔ "وزیر محترم چاہتے ہیں کہ مجرم یہی سمجھتا رہے کہ اس کا راز راز ہے۔ یعنی امیر نصیر موقع پر ہلاک ہوا ہے اور اس نے کوئی نزاعی بیان نہیں دیا ورنہ وہ عبداللہ مشہدی کے ٹھکانے کا رخ نہیں کرے گا۔"

ناظم کو اپنی کم فہمی پر خفت سی ہو رہی تھی۔ اسی خفت کو مٹانے کے لئے وہ جلدی سے ایک جانب نکل گیا۔ وزیر داخلہ عبدالرشید نے گہری سانس لے کر کہا۔ "میں نے ان تمام وارداتوں پر غور کیا ہے۔ وزیر محترم! مجھے ایسا لگا ہے کہ مجرم یعنی اباقہ نے اب تک جتنے قتل کئے ہیں وہ صرف عبداللہ مشہدی تک پہنچنے کے لئے کئے ہیں۔ وہ مقتولین سے عبداللہ مشہدی کے بارے پوچھتا رہا ہے اور ان کی زبان ہمیشہ کے لئے خاموش کرتا رہا ہے۔ اس طرح قدم بہ قدم وہ مشہدی تک پہنچ گیا ہے۔ آج کے ان میں صرف ایک قتل

ایسا ہے جو اس تسلسل سے علیحدہ ہے اور وہ ہے امیر موسیٰ کا قتل لیکن ممکن ہے جس روز اس نے امیر موسیٰ کو قتل کیا اس روز بھی وہ امیر نصیر کو قتل کرنے آیا ہو کیونکہ اس روز امیر نصیر، امیر موسیٰ کا مہمان تھا۔"

وزیر خارجہ نے کہا۔ "کچھ بھی ہے عبدالرشید! مجھے بغداد کی فضا میں نئے ہنگاموں کی بو آ رہی ہے۔ ہمیں بہت محتاط رہنا چاہئے۔" پھر دونوں اس موضوع پر گفتگو کرتے آہستہ آہستہ اپنی بگھیوں کی طرف چل دیئے۔

☆-----☆-----☆

بغداد کے مضافات میں ال محمودیہ کی طرف دجلہ کے کنارے درختوں کا ایک جھنڈ اباقہ کا مسکن تھا۔ اس کے سینے میں ہروقت ایک آگ روشن رہتی تھی، آنکھیں انگاروں کی طرح جلتی رہتی تھیں۔ اس کے لبوں پر صرف ایک ہی نام تھا "عبداللہ مشہدی" وہ تصور ہی تصور میں سینکڑوں بار اس شخص کو موت کے گھاٹ اتار چکا تھا۔ اس کی دھجیاں بکھیر چکا تھا اور آج .... آج سچ مچ وہ لمحہ قریب آنے والا تھا جب اباقہ اس موذی کے سینے پر چڑھ کر اس سے اپنے سلطان کے خون کا حساب لے سکتا تھا۔

رات کی تاریکی نے نشیب و فراز کو ایک کر دیا اور آسمان پر چمکنے والے نصف چاند کا عکس دجلہ کی لہروں پر مچلنے لگا تو اباقہ اپنی پناہ گاہ سے باہر نکلا اور محتاط قدموں سے شہر کی طرف چل دیا۔ اس سے پہلے بھی وہ کئی دفعہ اپنے اکلوتے خنجر کے ساتھ اس راستے پر برہنہ پا چل چکا تھا۔ اس نے دجلہ کے کنارے گھات لگا کر تفریحی بجروں میں کئی قتل کئے تھے اور پھر پانی کے اندر ہی اندر تیرتا موقعۂ واردات سے دور چلا آیا تھا۔ اس نے شہر کے اندر گھس کر بھی کئی افراد کو موت کے گھاٹ اتارا تھا .... لیکن آج اس کا خنجر اس گردن تک پہنچنے والا تھا جس سے ابلنے والے خون کی پیاس اباقہ کی نس نس میں رچی ہوئی تھی۔ آج وہ عبداللہ مشہدی کی طرف جا رہا تھا۔ جان توڑ کوشش کے بعد کل اسے امیر نصیر نامی شخص سے مشہدی کا پتہ معلوم ہو گیا تھا۔

ایک لنگوٹی کے سوا اباقہ کے جسم پر کچھ نہ تھا۔ اس نے جسم پر سیاہی مل رکھی تھی اور وہ تاریکی کا ایک حصہ معلوم ہوتا تھا۔ جیسے شکار کے قریب پہنچ کر درندے کے جسم میں چستی عود کر آتی ہے۔ اباقہ کے انداز میں بھی پھرتی آ گئی تھی۔ آنکھیں چراغوں کی طرح روشن تھیں۔ وہ بغداد کی شرقی جہت میں پہنچا اور پھر محتاط قدموں سے چوک بامونیہ کی طرف چل دیا۔ رات اب کافی گزر چکی تھی۔ گلی کوچوں کی رونق مکمل طور پر ختم ہو گئی تھی۔ ایک دو جگہ اباقہ کا آمنا سامنا مسلح سپاہیوں سے ہوا لیکن ایسے موقعوں پر کنی کتراتا

اسے خوب آتا تھا۔ وہ کسی بھی شخص کی نظر میں آئے بغیر چوک مامونیہ کی طرف بڑھتا رہا۔ ایک تنگ سی گلی پار کر کے وہ سلطانی محلہ میں آ گیا۔

یہ متوسط درجے کی آبادی تھی۔ اِکا دُکا ڈیوڑھیوں میں روشنی نظر آ رہی تھی۔ آخر اباقہ کو مطلوبہ مکان مل گیا۔ دو منزلہ اس مکان کے محرابی دروازوں پر کوئی قندیل روشن نہیں تھی۔ یہی عبداللہ مشہدی کا ٹھکانہ تھا۔ گلی سنسان تھی اور مکان میں کسی طرح کی نقل و حرکت دکھائی نہیں دیتی تھی۔ اچانک ایک پہریدار گلی کے پختہ فرش پر لٹھ کھٹکھٹاتا نمودار ہوا۔ اباقہ پھرتی سے ایک نیم تاریک گوشے میں ہو گیا۔ جب پہریدار گزرا تو اباقہ بھاگ کر مشہدی کے مکان کی طرف لپکا۔ اس نے اچھل کر دروازے کا چھجہ پکڑا' بازوؤں کے زور پر جسم کو اٹھایا اور اوپر چڑھ گیا۔ اس سے پہلے کہ پہریدار گشت کرتا ہوا گھوم کر واپس آتا' اباقہ مختلف چیزوں کے سہارے چھت پر پہنچ چکا تھا۔

چھت سے اس نے اردگرد کا جائزہ لیا۔ ستاروں کی مدھم روشنی میں بغداد کی خوابیدہ وسعتیں دکھائی دے رہی تھیں۔ جامع مسجد کے مینار' قصر خلد کے گنبد' ذی شان محلات کی دھندلی برجیاں' بیس لاکھ انسانوں کا شہر خاموشی سے سو رہا تھا۔ ہر شے کو ایک پُرسکون تاریکی نے ڈھانپ رکھا تھا۔ اباقہ نے اپنے لنگوٹ سے خمدار خنجر نکالا اور دھڑکتے دل سے سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ اس وقت جیسے زلزلہ آ گیا۔ دھڑ دھڑ سے دروازے کھلے اور اردگرد کی چھتوں پر اباقہ کو کئی ہیولے نظر آئے۔ ان کے سروں پر خود تھے اور جسموں پر لوہا چمک رہا تھا۔ وہ یقیناً خلیفہ کے مسلح سپاہی تھے۔ اباقہ جہاں تھا وہیں رہ گیا۔ پھر یکایک جیسے اسے ہوش آئی۔ وہ پوری رفتار سے بھاگا اور اس دروازے سے ٹکرایا جو چھت سے اترنے والے زینوں پر کھلتا تھا۔ ٹکر زوردار تھی لیکن مضبوط دروازہ ٹوٹ نہیں سکا۔ اس سے پہلے کہ اباقہ پیچھے ہٹ کر دوسری ٹکر دروازے کو مارتا' سپاہی کود کر مشہدی کی چھت پر آ گئے۔ "رک جاؤ۔" ان کا سالار پکارا لیکن اباقہ رکنے کے لئے نہیں آیا تھا۔ اس نے آواز کے رخ پر جست کی اور چیتے کی طرح دستہ سالار پر گرا۔ سالار کو عقب سے دبوچ کر اس نے اپنا قاتل خنجر اس کے نرخرے پر رکھ دیا۔

"خبردار اگر کسی نے حرکت کی۔" وہ چنگھاڑا۔

لیکن یہ معاملہ ایک سالار کی جان کا نہیں تھا۔ مسلح دستے کو ہر قیمت پر اباقہ کی گرفتاری کا حکم تھا۔ ایک ہوشیار سپاہی نے عقب سے اباقہ پر حملہ آور ہونا چاہا۔ اباقہ کو اس کے بھاگتے قدموں کی آواز آئی اور اس نے اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنا دیا۔ تیز دھار خنجر نے دستہ سالار کی شہ رگ صاف کاٹ ڈالی۔ پھر ایک جھٹکے سے اباقہ نے اس کے نیام

کی تلوار کھینچی اور تڑپ کر اپنی جگہ چھوڑ دی۔ عقب سے آنے والا حملہ آور اپنی جھونک میں آگے بڑھتا چلا گیا۔ سالار کی ناگہانی موت نے مسلح سپاہیوں کو مرنے مارنے پر آمادہ کر دیا تھا۔ وہ تلواریں سونت کر اباقہ پر ٹوٹ پڑے۔ اباقہ اس یورش کے لئے پہلے سے تیار تھا۔ اس کی تلوار نے حرکت کی اور مشہدی کی چھت پر زبردست لڑائی ہونے لگی۔ اباقہ کے انداز میں بلا کی درندگی تھی۔ وہ وہی قراقرم والا اباقہ بن چکا تھا۔ بے رحم سفاک اور قاتل۔ آنکھوں میں خون کی سرخی لئے سردار بوغالی کو تلاش کرنے والا وحشی .... اس نے پلک جھپکتے میں مشہدی کی چھت پر سپاہیوں کے چھکے چھڑا دیئے۔ اتنے میں سیڑھیوں کا دروازہ کھلا اور مزید کمک پہنچ گئی۔ اباقہ نے تازہ دم سپاہیوں میں سے بھی دو کو شدید زخمی کیا اور پھر جست لگا کر ساتھ والی چھت پر کود گیا۔ کچھ نیزے اس کی طرف اچھلے لیکن وہ ان سے دور تھا۔ جب تک سپاہی کمانوں پر تیر چڑھاتے وہ چھلاوے کی طرح چھتیں پھلانگتا ان سے دور ہوتا چلا گیا۔ سپاہیوں کی چیخ و پکار بھاگ دوڑ میں بدل گئی۔ ایک دستہ سالار کے حکم پر کئی سپاہی اباقہ کے پیچھے لپکے۔ انہوں نے دو تین چھتیں تو نہایت تیزی سے پھلانگیں لیکن چوتھی چھت پر پہنچنے سے وہ قاصر رہے اور زیادہ تر سپاہی ایک چوڑی گلی کو پھلانگنے کی کوشش میں نیچے گر گئے۔ سالار نے یہ منظر دیکھا تو سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ یہ خبر سن رہا تھا کہ مجرم نے گلی کے جنوبی سرے پر دو اور سپاہیوں کو ہلاک کر دیا ہے اور فرار ہو گیا ہے۔

☆------☆------☆

کالی وادی میں یہ تیسری مصیبت تھی جو سردار یورق کے سر پر پڑی۔ پہلے سلطان جلال انہیں داغ مفارقت دے گیا۔ پھر اباقہ روپوش ہوا اور پھر مارینا طوطم خاں کی بھینٹ چڑھ گئی۔ سردار یورق نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ دور دور تک کالے پہاڑوں کو کھنگالا لیکن مارینا کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ اس پر گہری مایوسی طاری ہو گئی۔ اس نے فوری طور پر وادی چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ راجی خاتون کو جب اس کے فیصلے کا علم ہوا تو اس نے اسے اپنے پاس بلایا۔ وہ بڑی مروت اور ہمدردی سے پیش آئی اور کافی دیر اس سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی۔ اس نے سردار یورق کو بتایا کہ وہ درندہ نما مجرموں کی اس بستی کو اب انسانوں کی بستی بنانے کی کوشش کرے گی۔ آہستہ آہستہ وہ انہیں لوٹ مار سے دور اور محنت مشقت سے قریب لے جائے گی۔ ان کے بچوں کو تعلیم دینے کی کوشش کی جائے گی۔ انشاء اللہ جلد ہی یہاں کی کایا پلٹ جائے گی۔ وقت رخصت راجی خاتون نے سردار یورق کو ایک تحریری پیغام اباقہ کے لئے دیا اور کہا کہ اگر کبھی اباقہ سے ملاقات ہو تو اسے

یہ پیغام ضرور دینا۔

اسی روز سردار یورق' سلیمان اور نبیلہ' راجی خاتون کے پروانہ راہداری اور ساما
سے لدے ہوئے تین اونٹوں کے ساتھ ایرانی سرحد کی طرف روانہ ہوئے۔ ایرانی علا
میں داخل ہو کر ان کا سفر نسبتاً آسان ہو گیا۔ انہوں نے مغرب کی طرف سفر جاری رکھا او
آخر کوئی ایک ماہ کے بعد عراق میں داخل ہو گئے۔ ان کی منزل بغداد تھی .... بغدا
جہاں انہیں اباقہ کو ڈھونڈنا تھا۔

بغداد میں پہنچ کر سردار یورق نے ایک پرانے شناسا اور قابل اعتماد دوست کی مدد
کرائے پر مکان حاصل کر لیا۔ ایک دو روز میں ہی یورق کو اندازہ ہو گیا کہ شہر کے اس
حصے میں فضا کچھ کشیدہ اور غیر یقینی سی ہے۔ ایک عجیب طرح کا ہراس بھی کئی چہروں پر نظر
آ رہا تھا۔ یورق نے تھوڑی سی تحقیق کی تو اسے پتہ چلا کہ قصر خلد اور اس کے ارد گرد کا
علاقہ آج کل پُراسرار وارداتوں کی زد میں ہے۔ اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ صرف تین روز
قبل دجلہ میں ایک تفریحی بجرے پر تین افراد کو بے دردی سے قتل کر دیا گیا ہے۔ خلیفہ کا
ایک امیر نصیرالدین اپنی شریک حیات اور ہمشیرہ کے ساتھ بجرے پر سیر کر رہا تھا کہ نامعلوم
قاتل نے بجرے میں گھس کر ان کے سر تن سے جدا کر دیئے۔

یورق شام تک ان وارداتوں کے متعلق مختلف پہلوؤں سے غور کرتا رہا۔ شام کو اس
کا دوست جو ایک علاج گاہ (بیمارستان) میں ملازم تھا آیا تو اس نے سردار یورق کو ایک
نہایت اہم اطلاع پہنچائی۔ اس نے بتایا کہ کل پانچ چھ زخمی سپاہیوں کو بیمارستان میں داخل
کیا گیا تھا۔ ان کی حالت کو دوسروں سے پوشیدہ رکھا جا رہا تھا۔ آج وہ معلوم کرنے میں
کامیاب ہو گیا کہ یہ سپاہی کل رات سلطانی محلّہ میں ہونے والی ایک جھڑپ میں زخمی
ہوئے تھے۔

سردار یورق نے جھڑپ کے بارے میں پوچھا تو اس کا دوست طویل سانس لے کر
بولا۔ "سردار! میرے پاس تمہارے لئے ایک اہم اطلاع ہے۔ اب معلوم نہیں تمہارے
لئے یہ بدخبری ہے یا خوشخبری۔ خوشخبری یہ ہے کہ میں نے اباقہ کا سراغ لگا لیا ہے اور
بدخبری تمہارے لئے یہ ہو سکتی ہے کہ بغداد میں اوپر نیچے ہونے والی ان وحشیانہ وارداتوں
کے ڈانڈے اباقہ سے جا ملتے ہیں۔"

سردار یورق نے چونک کر پوچھا۔ "تمہارا مطلب ہے کہ یہ قتل اباقہ نے کئے
ہیں۔"

اس کا معالج دوست بولا۔ "سردار! میں فی الوقت یقین سے کچھ کہہ نہیں سکتا لیکن

سلطانی محلّہ کے لوگوں میں جو افواہیں گردش کر رہی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ حملہ آور
لمبے بالوں والا ایک ننگ دھڑنگ شخص تھا۔ اب تم یہ بھی بتا رہے ہو کہ اباقہ بغداد میں
موجود ہے۔ مجھے تمہارا تو پتہ نہیں لیکن میرا ذہن خواہ مخواہ اباقہ کی طرف جا رہا ہے۔"
یورق کو اس بات میں کافی وزن محسوس ہوا۔

اگلے چند روز میں یورق اور سلیمان کا یہ شک یقین میں بدل گیا کہ یہ اباقہ ہی ہے
جس نے شہر میں قتل و غارت کا بازار گرم کر رکھا ہے۔ یہ نہایت خطرناک صورت حال
تھی۔ یوں لگتا تھا اباقہ کو غصے نے پاگل کر دیا ہے۔ وہ اپنے غضب کا اظہار نہایت وحشیانہ
طریقے سے کر رہا تھا۔ یہ وحشت جہاں دوسروں کے لئے پُرخطر تھی وہاں اس کے اپنے
لئے بھی جان لیوا ثابت ہو سکتی تھی۔ یورق نہایت پریشانی کے عالم میں سوچنے لگا کہ اباقہ
سے کیونکر رابطہ قائم کیا جا سکتا ہے۔ اس وقت اسے سہارے اور راہنمائی کی جتنی ضرورت
تھی شاید پہلے کبھی نہیں تھی لیکن اس تک پہنچا کیسے جائے؟ یہ سوال مسلسل سوچ بچار کے
باوجود حل طلب تھا۔

☆ ------ ☆ ------ ☆

فاطمہ دلہن کے روپ میں سکھیوں میں گھری بیٹھی تھی۔ وہ وزیر داخلہ عبدالرشید کی
اکلوتی بیٹی تھی۔ اپنی اکلوتی بیٹی کی شادی پر عبدالرشید نے دولت پانی کی طرح بہا دی تھی۔
بہاتا بھی کیوں نہ وہ اس کی انتہائی لاڈلی اولاد تھی۔ ناز و نعم میں پلی ہوئی انتہائی حسین اور
تعلیم یافتہ۔ اس کے لئے دور دور سے رشتے آئے تھے۔ بڑے بڑے امرا اور رؤسا نے
عبدالرشید سے ناطہ جوڑنا چاہا تھا لیکن وہ اپنی بیٹی کو بچپن سے اس کے ایک چچازاد سے
منسوب کر چکا تھا۔ لڑکے کا نام صالح تھا اور اس کا باپ بغداد کے معروف ترین تاجروں میں
سے تھا۔ کوئی چار برس پہلے صالح ایک تجارتی قافلے کے ساتھ ابادان کی طرف گیا۔ اسے
تین چار ماہ میں واپس آ جانا تھا مگر چھ ماہ گزرنے کے باوجود اس کا کچھ پتہ نہیں چلا تو اس کی
تلاش شروع کی گئی۔ ان دنوں خوارزم کی سرحد پار منگولوں کے ٹڈی دل گھوم رہے تھے۔
ان کے جتھے بعض اوقات سرحد پر بھی کر آتے تھے۔ کچھ تجارتی قافلوں کو بھی انہوں نے
لوٹا تھا۔ تلاش بسیار کے بعد صالح کے وارث اس نتیجے پر پہنچے کہ اس کے قافلے کو بھی کوئی
حادثہ پیش آ گیا ہے۔ مایوس ہو کر وہ واپس لوٹ آئے۔ دو سال گزر گئے لیکن صالح کا کچھ
پتہ نہیں چلا۔ عبدالرشید کو اپنی بیٹی کی شادی کی فکر ہوئی مگر جلد ہی اسے معلوم ہو گیا کہ
اس کی بیٹی اپنے بچپن کے منگیتر کے سوا کسی سے شادی نہیں کرے گی۔ اس نے بہت
جتن کئے کہ کسی طرح بیٹی کو قائل کر سکے لیکن وہ اپنے فیصلے پر ڈٹی رہی۔ عبدالرشید نے

صالح کی تلاش میں روپیہ پانی کی طرح بہایا۔ اپنے اختیارات کا استعمال بھی کیا لیکن صالح کا کچھ پتہ نہ چل سکا۔ وہ بیٹی کو ہمیشہ کے لئے گھر میں بٹھا کر دنیا کے طعنے نہیں سن سکتا تھا۔ آخر اسے اس معاملے میں سخت رویہ اختیار کرنا پڑا۔ امیر التجار فاطمہ کو بہو بنانے کے لئے بے چین تھا۔ عبدالرشید نے اس سے بات چیت شروع کی۔ قریب تھا کہ یہ رشتہ طے ہو جاتا کہ فاطمہ کی دعائیں سنی گئیں۔ اس کے نالے کام آگئے۔ ایک روز چپکے سے اس کے خوابوں کا شہزادہ لوٹ آیا۔ معلوم ہوا کہ وہ تاتاری ڈاکوؤں کے ایک گروہ کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔ تین برس ان کی قید میں رہنے کے بعد وہ فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ صالح کی آمد سے دونوں گھرانوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ زور و شور سے شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ وزیر داخلہ عبدالرشید نے اس شادی کو یادگار بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ بغداد بھر کے خواص اس تقریب میں جمع تھے۔ تین روز جشن برپا رہا۔ مہمانوں کی خاطر تواضع میں رات دن ایک کر دیئے گئے۔ آخر یہ جشن اپنے عروج پر پہنچ گیا۔ فاطمہ کی رخصتی کا وقت قریب آگیا۔ وہ اپنی سکھیوں میں گھری بیٹھی تھی جب دولہا کی ماں اور بہن اسے لینے کے لئے پہنچ گئیں۔ رخصتی کے مختلف خوشگوار اور رقت آمیز مراحل سے گزر کر فاطمہ اس سجی سجائی پالکی میں آبیٹھی جس کے آگے آگے دولہا کا گھوڑا تھا۔ سسرال کا گھر چونکہ دور تھا اس لئے تھوڑا آگے جا کر فاطمہ کو پالکی سے اتار کر ایک شاندار بگھی میں بٹھا دیا گیا۔ بارات کا یہ جلوس اس شان سے اپنی منزل کی طرف روانہ ہوا کہ بگھی کے آگے آگے دولہا کا مزین گھوڑا تھا۔ اطراف اور عقب میں باراتیوں کی سواریاں تھیں اور سب سے آگے ایک محافظ دستہ تھا جو لوگوں کو سامنے سے ہٹا کر راستہ صاف کر رہا تھا۔

راستے پر دو رویہ کھڑے افراد اس شاندار بارات کو دیکھ کر دانتوں میں انگلیاں دبا رہے تھے۔ انہی محو حیرت تماشائیوں میں ایک جنگلی بھی تھا' اباقہ۔ ایک میلے سے کمبل میں اس کا سارا جسم لپٹ ہوا تھا۔ یہی کمبل اس نے سر پر بھی اوڑھ رکھا تھا۔ کمبل کے گھونگٹ سے اس کی چمکدار آنکھیں تیزی سے ہر شے کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اس کے چہرے پر عجیب سی دیوانگی تھی۔ جیسے وہ اپنی موت اور زندگی سے بالکل بے پرواہ ہو چکا ہے۔ جونہی سجی ہوئی بگھی اس کے قریب سے گزری اس نے اپنے جسم کو حرکت دی۔ پہریدار چھڑیوں سے لوگوں کو پیچھے ہٹا رہے تھے۔ لوگ چھڑیاں بھی کھا رہے تھے اور تالیاں بھی پیٹ رہے تھے۔ اباقہ ان لوگوں کے درمیان سے ہوتا ہوا آگے آیا۔ اس نے ایک جھٹکے سے اپنا کمبل اتارا اور بگھی کے پیچھے بھاگا۔ چند قدم بھاگ کر اس نے چھلانگ لگائی اور بگھی بان کے سر پر پہنچ گیا۔ اس کا ننگ دھڑنگ جسم اور اس کا انداز دیکھ کر لوگوں کی

چیخیں نکل گئیں۔ وہ اس قدر سراسیمہ ہوئے کہ بغیر کچھ دیکھے بھاگ کھڑے ہوئے۔ اباقہ نے خنجر بگھی بان کے دل میں پیوست کیا اور نہایت نفرت سے دھکا دے کر اسے نیچے گرا دیا۔ یہ سب کچھ چند ساعتوں کے اندر ہو گیا۔ جب تک محافظ سپاہی اور باراتی صورت حال کو سمجھتے اور ان کے ہاتھ اپنے ہتھیاروں تک پہنچتے' اباقہ نے گھوڑوں کی لگام کو زور سے جھٹکا دیا۔ اس کے ہاتھ میں پکڑے چابک سے تڑاخ کی آواز آئی اور گھوڑے اچھل کر سرپٹ بھاگے۔ سامنے والے محافظ ابھی تک سحر زدہ کھڑے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے انہوں نے اپنی آنکھوں سے ایک جیتا جاگتا بھوت دیکھ لیا ہو۔ درحقیقت ننگ دھڑنگ "قاتل" کا خوف ان کے ذہنوں میں اس طرح بیٹھ چکا تھا کہ جب اچانک انہوں نے اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھا تو سکتے میں رہ گئے۔ پلک جھپکتے میں اباقہ گھوڑوں کو کشادہ سڑک پر لے آیا۔ اس کے عقب میں ان گنت چیخیں گونج رہی تھیں۔ یہ چیخیں اس کے کانوں کو عجیب سا سکون بخش رہی تھیں۔ یہ احساس اس کے لئے نہایت خوشگوار تھا کہ اس نے دو شادی والے گھروں کو ماتم کدہ بنا دیا ہے .... ہاں اسی طرح اس کی شادی بھی تو ماتم میں تبدیل ہوئی تھی .... ماریتا بھی شاید اسی طرح روئی ہو گی جس طرح بگھی میں بیٹھی دلہن رو رہی تھی۔ اس کے دولہا پر ٹوٹنے والی قیامت اباقہ کے سر پر بھی تو ٹوٹی تھی اور یہ سب کچھ کرنے والے کون تھے؟ یہی بغداد والے۔ اباقہ نے نہایت نفرت سے گھوڑوں کو چابک رسید کئے اور ان کی رفتار اور تیز ہو گئی۔ بگھی اب جیسے ہوا میں اڑ رہی تھی۔ راستے پر موجود اکا دکا افراد حیرت سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ جلد ہی اباقہ کو اپنے پیچھے سرپٹ دوڑتے گھوڑوں کی آوازیں آنے لگیں۔ اس نے پوری رفتار سے دوڑتی بگھی کو کچے میں اتارا اور سیدھا نہر عثمانیہ کے ٹیلوں کی طرف بڑھا۔ شام کی تاریکی آہستہ آہستہ گہری ہو رہی تھی۔ مگر اباقہ ان راستوں کی ہر اونچ نیچ سے واقف تھا۔ تعاقب میں آنے والوں کو جل دینے کے لئے اس نے بگھی کو ایک باغ میں گھسا دیا اور پھر وہاں سے نکل کر مختلف رخ پر بھاگ کھڑا ہوا۔ وہ جان چکا تھا کہ بگھی میں دلہن کے علاوہ دو اور لڑکیاں بھی موجود ہیں۔ وہ غالباً اس کی سہیلیاں تھیں۔ اباقہ نے انہیں اس قدر خوفزدہ کر دیا تھا کہ بگھی سے چھلانگ لگانا تو درکنا انہیں چیخنے کی ہمت بھی نہیں ہو رہی تھی۔ کچھ ایسی ہی درندگی تھی اس کے انداز میں۔ تعاقب کرنے والے ایک بار پھر بگھی کے پیچھے لگ گئے۔ مگر اب ان کا فاصلہ کافی زیادہ تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ فاصلہ گھٹاتے اباقہ ٹیلوں میں پہنچ گیا۔ انہی ٹیلوں میں کہیں مسلم بن داؤد نے زبیدہ نامی کنیز کو ماریتا کا لباس پہنا کر موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ وقت آج پھر ویسا ہی کھیل کھیل رہا تھا لیکن مہرے اس دفعہ اور تھے۔

ایک کھڈ کے کنارے پہنچتے ہی اباقہ نے بگھی روکی' پھر خنجر نکالا اور لڑکیوں کو بگھی سے اترنے کا حکم دیا۔ وہ لرزتی کانپتی نیچے اتریں تو اباقہ نے گھوڑوں کو چابک دکھا دیا۔ گھوڑے بدکے اور ایک بار پھر اندھا دھند بھاگنے لگے۔ خنجر کے زور پر اباقہ لڑکیوں کو دھکیلتا ہوا ٹیلوں کے اندر لے آیا۔ صرف ایک لڑکی نے تھوڑی سی مزاحمت کی۔ اباقہ نے اتنی درندگی سے خنجر اس کے گلے پر رکھا کہ وہ چیخ کر رہ گئی۔ اس کے بعد کسی کو اس سے الجھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ وہ ٹیلوں کے اندر ہی چلاتا لڑکیوں کو کوئی دو فرلانگ دور لے آیا۔ اندھیرا اب کافی گہرا ہو چکا تھا۔ ایک تاریک سایہ نکل کر اباقہ کے سامنے آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں تلوار تھی۔ "تم آ گئے اسماعیل!" سائے نے قریب پہنچ کر کہا۔

"ہاں۔" اباقہ کے حلق سے مختصر غراہٹ نکلی۔

نو وارد گول چہرے والا ایک تنومند شخص تھا۔ شکل سے شریف آدمی نہیں لگتا تھا۔ وہ دونوں تلوار اور خنجر کے زور پر لڑکیوں کو لے کر ٹیلوں کے دامن میں پہنچ گئے۔ کوئی دو فرلانگ تک وہ ٹیلوں کے ساتھ ساتھ چلتے رہے آخر ایک ہموار جگہ پر دو کمروں کے چھوٹے سے مکان کے سامنے پہنچ کر رک گئے۔ یہ کچا مکان بظاہر کسی کاشتکار کا دکھائی دیتا تھا۔ مکان کے ساتھ ہی تھوڑی سی کاشت شدہ اراضی بھی موجود تھی۔ اس اراضی سے کچھ ہٹ کر کھیتوں کا ایک وسیع سلسلہ نظر آتا تھا۔ گول چہرے والے نے دروازے کا قفل کھولا اور وہ سب اندر چلے گئے۔ اباقہ نے لڑکیوں کو ایک کمرے میں بند کر دیا اور گول چہرے والے شخص کے ساتھ دوسرے کمرے میں آ بیٹھا۔

گول چہرے والا چراغ کی روشنی میں زمین پر کچھ لکیریں کھینچنے لگا۔ شاید کوئی حساب جوڑ رہا تھا۔ حساب جوڑ کر وہ بولا۔ "برادر' راشن اور مکان کا کرایہ ملا کر کل سو اشرفیاں مجھے دے دو۔ باقی میں نے چھوٹی چھوٹی چیزیں اس میں شامل نہیں کیں ایک کمبل تھا جو تم کہیں چھوڑ آئے ہو۔ میری تلوار بھی تم اپنے پاس رکھ رہے ہو۔ پھر تمہیں یہاں تک لانے کے لئے میں نے جو خطرہ مول لیا ہے اس کا معاوضہ اس میں شامل نہیں۔" اباقہ نے اپنے لنگوٹ میں ہاتھ ڈالا اور ایک موتی نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ یہ موتی ایک لڑکی کے ہار کا تھا۔ بگھی سے اترنے کے بعد جب اس لڑکی نے مزاحمت کی تھی تو یہ ہار ٹوٹ گیا تھا۔ گول چہرے والے نے موتی لے کر کرتے کی جیب میں رکھ لیا۔ پھر بولا۔ "برادر اسماعیل' اصل چیز رازداری ہے۔ اتنا بڑا راز سینے میں رکھنا بہت دل گردے کا کام ہے۔ یہ درست ہے کہ تم اس جگہ بالکل محفوظ رہو گے .... لیکن فرض کرو اگر کسی وجہ سے میں تمہارا راز نہ رکھ سکوں تو تمہارا کیا انجام ہو گا؟"

اباقہ نے پرسکون لہجے میں کہا۔ "عبدل! راز تو میں بھی تمہارا رکھ رہا ہوں۔ تم اس مکان میں خود کو کاشتکار ظاہر کرتے ہو لیکن اصل میں تم یہاں کھجوروں کے شیرے سے اعلیٰ شراب تیار کرتے ہو؟ تم میرے رازدار ہو تو میں تمہارا رازدار ہوں۔"

عبدل کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا' بولا۔ "برادر' میری بات چھوڑو۔ میں چند سو اشرفیوں کی شراب تیار کرتا ہوں لیکن تم نے تو ہزاروں پر ہاتھ صاف کیا ہے؟"

اباقہ اس لالچی شخص کا مطلب سمجھ رہا تھا........ اس کی نظر ایک آدھ لڑکی پر تھی وہ ان زیورات کے بارے میں سوچ رہا تھا جو لڑکیاں پہنے ہوئے تھیں۔ ایسے شخص پر کسی قسم کا اعتبار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اباقہ نے ایک لمحے کے لئے سوچا پھر دفعتاً اس کی زوردار ٹھوکر عبدل کے پیٹ میں لگی۔ عبدل کو اباقہ سے اتنی پھرتی کی ہرگز توقع نہیں تھی۔ نہ ہی اس نے کبھی یہ سوچا تھا کہ ایک شخص ننگے پاؤں سے اتنی زوردار ٹھوکر رسید کر سکتا ہے۔ ضرب کی شدت سے اس کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ اباقہ نے لپک کر اس کا تنومند جسم بازوؤں میں جکڑا اور دھکیل کر زور سے دیوار کے ساتھ ٹکرا دیا۔ عبدل کا سر دیوار سے ٹکرایا اور وہ اباقہ کے بازوؤں میں جھول گیا۔

☆======☆======☆

جب اباقہ نے وزیر خارجہ عبدالرشید کی بیٹی اور اس کی دو سہیلیوں کو اغوا کیا' سردار یورق دجلہ کے کنارے بیٹھا پانی پر رواں کشتیوں کو دیکھ رہا تھا۔ واردات کی اطلاع پا کر وہ موقعۂ واردات پر پہنچا۔ وہاں اس وقت سینکڑوں لوگ جمع تھے۔ ہر ایک اپنے انداز میں اس واقعے کو بیان کر رہا تھا۔ بہرحال اس بات پر سب متفق تھے کہ یہ واردات بھی اسی جنگلی اباقہ نے کی ہے۔ لوگ اس المناک واقعے پر بہت رنجیدہ تھے۔ یورق نے محسوس کیا کہ اباقہ کے بارے میں ہمدردی کی جو لہر بغداد کے لوگوں میں پائی جاتی تھی وہ بالکل معدوم ہو چکی ہے۔ لوگ اس کی کارروائیوں پر سخت نکتہ چینی کر رہے تھے۔ بعض تو اسے پھانسی پر لٹکانے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ بے گناہ بگھی بان کی لاش موقعۂ واردات پر ہی رکھی تھی۔ اس کا کوئی قریبی عزیز دھاڑیں مار مار کر میت پر رو رہا تھا۔ یہاں یورق کو لوگوں کے چہروں پر تاسف اور غضب کے ملے جلے آثار نظر آئے۔ پھر کچھ لوگ حکومت کے خلاف زبردست نعرہ بازی کرنے لگے۔ وہ الزام لگا رہے تھے کہ انتظامیہ لوگوں کی جان و مال کے تحفظ میں ناکام ہو چکی ہے۔ اس وقت ناظم اعلیٰ کچھ افسروں کے ساتھ وہاں پہنچ گیا۔ اس نے مشتعل لوگوں سے وعدہ کیا کہ مجرم کو جلد از جلد گرفتار کر کے عبرتناک سزا دی جائے گی۔ یورق' ناظم اعلیٰ کی زبانی ان تدبیروں کے متعلق سنتا رہا جو اباقہ کو گرفتار کرنے کے

لئے کی جا رہی تھیں اور اس کا خون رگوں میں کھولتا رہا۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اباقہ کو ایک بُرے انجام سے بچانے کے لئے کیا کیا جا سکتا ہے۔

اگلے روز وہ نبیلہ اور سلیمان کو گھر میں چھوڑ کر شہر میں نکل آیا اور بے مقصد گلیوں میں گھومتا رہا۔ بس ایک ہی امید تھی کہ شاید اباقہ شہر میں موجود ہو اور کہیں کسی موڑ پر وہ اسے یا اسے وہ دیکھ لے۔ اب تو اسے اس طرح گھومتے ہوئے بھی ڈر لگتا تھا کہ کہیں کوئی اسے اباقہ کے ساتھی کی حیثیت سے پہچان نہ لے۔ دوپہر کے وقت وہ تھک ہار کر پھر دجلہ کے کنارے جا بیٹھا۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں پہلے پہلے اس نے دجلہ کے پانی کو چھوا تھا۔ اس وقت وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ اباقہ' اسد اور ماریتا بھی تھے۔ اس وقت ان کے حوصلے کتنے جوان تھے' کتنا اعتماد تھا ان کے آگے بڑھتے ہوئے قدموں میں۔ وہ ایک دوسرے کا سہارا تھے اور ایک دوسرے کی ہمت بھی لیکن اب سب کچھ بکھر گیا تھا۔ وہ تنہا رہ گیا تھا۔ نہ اس کے سامنے کوئی راستہ تھا اور نہ منزل۔ بوڑھا یورق دیر تک بیٹھا پانی کو گھورتا رہا۔ وہ اس لمحے سے بے خبر تھا جو اس کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا اور حالات کو ایک نئی کروٹ دینے والا تھا۔ اچانک اسے عقب میں آہٹ محسوس ہوئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا سامنے اسد کھڑا مسکرا رہا تھا۔ شیر جیسے چہرے والا شیر جیسا جوان۔ اس کے چہرے پر ہمیشہ کی طرح ایک غیر متزلزل اطمینان نظر آ رہا تھا۔ وہ تیزی سے بڑھا اور سردار یورق سے بغلگیر ہو گیا۔ اس کی چوڑی چھاتی سے لگ کر نہ جانے کیوں بوڑھے یورق کی آنکھوں میں نمی سی تیر گئی۔ اس نے مضبوطی سے اسے اپنے بازوؤں میں لے لیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد وہ دونوں دریا کے کنارے گھاس کے ایک قطعہ پر بیٹھے گرمجوشی سے باتیں کر رہے تھے۔ ان کا انداز بتا رہا تھا کہ ان کے پاس کرنے کی بہت سی باتیں ہیں لیکن اگر ان کے پاس باتیں بہت تھیں تو وقت بھی کم نہیں تھا اور یہی وجہ تھی کہ ان کی گفتگو میں ایک ترتیب تھی۔ وہ رفتہ رفتہ آگے بڑھ رہے تھے۔ ایک دوسرے کی معلومات میں اضافہ کر رہے تھے۔ اسد کی کہانی مختصر تھی۔ اس نے بتایا کہ وہ یاکی کو ساتھ لے کر بلخ چلا گیا تھا۔ اس کی بیوی کو بچہ ہونے والا تھا۔ وہ قریباً چار ماہ وہاں رہا۔ پھر اپنے پہلے بچے کی صورت دیکھتے ہی وہ واپس بغداد چلا آیا۔ اسے اباقہ کی فکر لاحق تھی۔

اس موقع پر یورق نے بتایا کہ اباقہ اکیلا ہی نہیں تھا وہ بھی اس کے ساتھ گیا تھا۔

اسد اس اطلاع پر حیران ہوا پھر اپنی کہانی جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "میں جانتا تھا اباقہ ایک نہایت پُرخطر مہم پر گیا ہے۔ وہ منگول سفارتکاروں کے تعاقب میں ہے تاکہ ماریتا کو ان سے چھڑا سکے۔ اس مہم میں کامیابی کا امکان پچاس فیصد سے زیادہ نہیں تھا۔ وقت

گزرنے کے ساتھ ساتھ میری پریشانی بڑھتی رہی۔ میں نے بغداد اور قرب و جوار میں اباقہ کو تلاش کرنے کی بہت کوشش کی مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ پھر قراقرم سے آنے والے ایک تاتاری سے مجھے پتہ چلا کہ چغتائی خاں کی بیوی ماریتا ابھی تک واپس قراقرم نہیں پہنچی۔ نہ ہی وہ منگول سفارتکار طوطم خاں واپس لوٹا ہے۔ اس طرح سے مجھے کچھ سکون ہوا اور میں نے اندازہ لگایا کہ اباقہ نے سفارتکاروں کو کہیں راستے میں موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔ میری امید بندھ گئی کہ جلد یا بدیر اباقہ بغداد ضرور لوٹے گا۔ میں نے کچھ دوستوں کے تعاون سے مشرقی بغداد میں عطریات کی دکان کھولی اور حسنات احمد کے فرضی نام سے رہنے لگا۔ میرا معمول تھا کہ ہر دوسرے تیسرے روز اس مقام پر ضرور آتا تھا اور دریا کے کنارے گھومتے چہروں کے ہجوم میں اباقہ کو ڈھونڈنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ آج بھی میں اسی معمول کے تحت یہاں آیا تھا۔"

اسد کے بعد یورق نے اپنی کہانی سنائی۔ سلطان جلال الدین سے ملاقات' سردار ابابکر کے قبیلے اور کالے پہاڑوں کی وادی کا تذکرہ کرتا ہوا وہ شیخ نجدی تک پہنچا۔ پھر جب اس نے شیخ نجدی کے انجام کے بعد سلطان جلال کی شہادت کا ذکر کیا تو اس کے ساتھ ساتھ اسداللہ بھی اداس ہو گیا۔ بعد میں یورق نے اباقہ کی گمشدگی اور ماریتا کے اغوا کا ذکر کیا اور بتایا کہ کن صعوبتوں سے گزرتا ہوا وہ اپنے دو ہمراہیوں کے ساتھ بغداد پہنچا ہے۔ کہانی کے انجام تک پہنچتے پہنچتے یورق کی آنکھوں میں پھر نمی تیرنے لگی۔ وہ بے حد رنجیدہ نظر آ رہا تھا۔ اسداللہ گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر دفعتاً وہ قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر سردار یورق کا کندھا تھپتھپایا اور بولا۔ "سردار! سب سے پہلے تو میں تمہیں اسلام قبول کرنے پر دلی مبارک باد دیتا ہوں۔ اس کے بعد تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ مسلمان کے لئے مایوسی گناہ ہے۔ حالات کیسے بھی ہوں خدائے وحدہٗ لاشریک کو ماننے والے ہمت نہیں ہارتے۔ تاریخ اسلام کیا ہے؟ پیٹ پر پتھر باندھ کر دفاعی خندقیں کھودنے کا نام تاریخ اسلام ہے' شہیدوں کے چہروں کی آخری مسکراہٹ سے روشنی لے کر مفتوح فصیلوں پر چراغاں کرنے کی روئیداد تاریخ اسلام ہے۔ جن کڑے مقامات پر حوصلے ٹوٹ جاتے ہیں اور تلواریں چھوٹ جاتی ہیں ان مقامات سے سربکف آگے بڑھنے والے زندہ دلوں کا اعمالنامہ تاریخ اسلام ہے .... سردار ہمت سے کام لو۔ انشاء اللہ ہم اس امتحان سے بھی سرخرو نکلیں گے۔"

اسداللہ کے مجاہدانہ عزم اور ولولہ انگیز باتوں نے سردار یورق کے اندر ایک نئی روح دوڑا دی۔ یہ مجاہد اسلام واقعی ایک جادو اثر مقرر بھی تھا۔ کتنی ہی دیر وہ گھاس کے

اس قطعہ پر بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ اسد اللہ نے بتایا کہ وہ اباقہ کی بغداد میں موجودگی سے باخبر ہو چکا ہے بلکہ اس کے کچھ ساتھی خفیہ طور پر اس کی تلاش بھی کر رہے ہیں۔ بہت جلد کوئی نہ کوئی سراغ مل جائے گا۔

باتوں میں وقت گزرنے کا کوئی احساس ہی نہیں ہوا۔ جیسے پلک جھپکتے میں دوپہر سے شام ہو گئی۔ تھوڑی ہی دور اسد اللہ کی شاندار بگھی کھڑی تھی۔ اسد اللہ یورق کو لے کر بگھی میں آیا اور وہ شہر کی شفاف سڑکوں پر چلتے ہوئے اس رہائش گاہ تک پہنچے جہاں یورق کے ساتھ نبیلہ اور سلیمان بھی مقیم تھے۔ یہ ایک چھوٹا سا تنگ و تاریک گھر تھا۔ اسد اللہ نے یورق سے اصرار کیا کہ وہ سب اس کے ساتھ چلیں۔ یورق نے کہا کہ اس وقت ان کا میزبان موجود نہیں۔ وہ اس سے اجازت لے لیں پھر ایک آدھ روز میں اس کی طرف منتقل ہو جائیں گے۔ اسد اللہ نے کہا ٹھیک ہے۔ وہ پرسوں عصر کے بعد گھوڑا گاڑی لے کر انہیں لینے پہنچ جائے گا۔

☆ ——— ☆ ——— ☆

مسلم بن داؤد کو شراب کی لت قراقرم میں ہی پڑی تھی۔ وہ ان حسین دنوں کو ابھی تک نہیں بھولا تھا جب منگولوں کے جد امجد چنگیز خاں کے دربار میں بیٹھ کر وہ پرانے چاولوں کی تیز شراب کے جام چڑھایا کرتا تھا۔ اس کے خیمے میں حسین اور نرم و نازک لڑکیاں اس کی آمد کی منتظر ہوتی تھیں۔ اس وقت ابھی بڑھاپا بھی اتنا ٹوٹ کر نہیں برسا تھا۔ سموری خیمے کے گرم فرش پر بیٹھ کر وہ خوش فعلیوں میں مصروف رہا کرتا تھا اب تو وہ سب گئی گزری باتیں ہو گئی تھیں۔ قراقرم اس سے چھوٹ گیا تھا اور اباقہ کا خوف بھوت بن کر اس سے چمٹا رہتا تھا۔ عورتوں میں اس کی دلچسپی بہت حد تک کم ہو گئی تھی اور شراب یہاں ملتی نہیں تھی۔ ہاں کبھی کبھی وہ اپنے ایک خاص خادم کے ذریعے ایک آدھ صراحی منگوا لیتا تھا.......... اس روز بھی اسے شدید طلب محسوس ہو رہی تھی۔ بغداد میں اباقہ کی موجودگی مسلم بن داؤد کے اعصاب کو بری طرح متاثر کر رہی تھی۔ بیٹھے بیٹھے اسے یوں لگتا تھا کہ جیسے ٹانگوں سے جان نکلی جا رہی ہے کبھی پسینہ آ جاتا تھا اور کبھی سردی لگنے لگتی تھی۔

دروازہ کھلا اور اس کا خادم خاص یعقوب اندر داخل ہوا وہ خالی ہاتھ واپس آیا تھا۔ مسلم بن داؤد نے اس کی طرف ناراضگی سے دیکھا۔ یعقوب نے ادب سے جھک کر سلام کیا۔ اور بولا۔ "آقا! ناکامی ہوئی ہے۔ مے فروش آج بھی نہیں ملا۔ گھر کا دروازہ بند ہے' باہر سے قفل لگا ہے۔ کسی کاشتکار سے بھی اس کے بارے کوئی پتہ نہیں چلا۔"

یکدم داؤد کو طیش آ گیا۔ وہ پھنکارا۔ "مجھے کچھ معلوم نہیں جہاں سے بھی لاسکو لاؤ۔"

خادم منمنایا۔ "آقا! اور کوئی ٹھکانہ تو میرے علم میں .... نہیں۔"

داؤد کے جی میں آئی کہ کیوں نہ وہ خود خادم کے ساتھ جائے لیکن پھر وہ کپکپا کر رہ گیا۔ مے فروش نہر کلثومیہ کے ٹیلوں کے پاس رہتا تھا اور اباقہ بھی اپنی آخری واردات کے بعد انہی ٹیلوں میں روپوش ہوا تھا۔ نہیں اس کا اس طرف جانا مناسب نہیں۔ اس نے خادم کو گھور کر دیکھا اور ہدایت کی کہ دوپہر کے کھانے کے بعد وہ پھر مے فروش کا پتہ کرے اور اگر اسے رات بھر اس کے دروازے کے سامنے بیٹھنا پڑے تو بھی کچھ لے کر واپس آئے۔ خادم ادب سے سر جھکا کر واپس چلا گیا۔

دوبارہ اس کی شکل داؤد نے عصر کے بعد دیکھی۔ وہ اس دفعہ بھی خالی ہاتھ تھا لیکن اس دفعہ اس کے چہرے پر کچھ عجیب قسم کے تاثرات تھے۔ اس نے نہایت راز داری سے داؤد کو بتایا کہ اسے کچھ گڑبڑ محسوس ہوتی ہے۔ مے فروش کے گھر کو تو تالا لگا ہوا ہے لیکن اندر کوئی موجود ہے۔ اس نے کچھ دبی دبی نسوانی چیخیں سنی ہیں.........."

ایکا ایکی داؤد کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اس نے خادم سے کچھ تفصیل معلوم کی پھر بے چینی سے کمرے سے ٹہلنے لگا۔ اسے یقین ہوتا جا رہا تھا کہ اس مکان میں اباقہ موجود ہے۔ کبھی کبھی تو اس کا دل چاہتا تھا کہ لعنت بھیجے اس معاملے پر اور اباقہ پر' لیکن کبھی اس کی شیطانی فطرت جاگ اٹھتی تھی اور اس کا دماغ اسے شرارت پر اکسانے لگتا تھا۔ آخر اس سے نہیں رہا گیا۔ وہ فوراً وزیر خارجہ ابن یاشر کی نشست گاہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ یقیناً وہ ایک بہت بڑا کام کرنے جا رہا تھا .... بہت بڑا اور اہم کام۔ اباقہ جیسے خونی کو گرفتار کرانا کوئی معمولی کارنامہ نہیں تھا۔

تھوڑی ہی دیر بعد وزیر خارجہ ابن یاشر اور مسلم بن داؤد کے درمیان نہایت اہم نوعیت کی گفتگو ہو رہی تھی۔ اس دوران ناظم بھی وہاں پہنچ گیا۔ ابن یاشر نے اسے ہدایت کی کہ وہ محتاط طریقے سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کرے کہ اباقہ مغویہ لڑکیوں کے ساتھ واقعی اس مکان میں موجود ہے؟ ناظم اثبات میں سر ہلا کر اٹھ گیا۔ اتنے میں کچھ اور متعلقہ افسر اور کوتوال شہر وہاں پہنچ گئے۔ تیزی سے منصوبہ بندی کی جانے لگی۔ ناظم نشست گاہ میں داخل ہوا تو سب کی نظریں اس کی طرف اٹھ گئیں۔ اس کے چہرے پر کامیابی کا جوش تھا۔ اس نے بتایا کہ اطلاعات درست ہیں۔ مجرم واقعی لڑکیوں کے ساتھ اس مکان میں موجود ہے۔ ناظم کی ہدایت پر فوراً کارروائی کی تیاری شروع کر دی گئی۔ ایسے کاموں کے

لیے مخصوص سپاہیوں میں سے ایک جتھہ چنا گیا اور انہیں چھاپے کی تفصیلات سے آگاہ کیا گیا۔ عین اس وقت جب یہ چھاپہ مار دستہ نہر کلثومیہ کے ٹیلوں کی طرف روانہ ہونے والا تھا' وزیر داخلہ عبدالرشید بھاگم بھاگ وہاں پہنچ گیا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور حالت نہایت خستہ ہو رہی تھی۔ اس نے چلا کر پوچھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟

ابن یاشر نے کہا کہ مجرم کی گرفتاری کے لیے چھاپہ مار دستہ روانہ کیا جا رہا ہے۔

وزیر داخلہ نے تیزی سے کہا۔ "تم نے کون سے اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے یہ اہم فیصلہ کیا ہے۔ یہ کارروائی نہیں ہو گی۔ ہرگز نہیں ہو گی۔"

وزیر خارجہ ابن یاشر نے برہمی سے کہا۔ "عبدالرشید کچھ سمجھنے کی کوشش کرو۔ یہ صرف تمہارا یا تمہاری بیٹی کا معاملہ نہیں پورے ملک کا مفاد اس سے وابستہ ہے۔ ایسے خونی مجرموں کے خلاف اگر ہم فوری کارروائی نہیں کریں گے تو لوگوں کا اعتماد ہم پر سے اُٹھ جائے گا۔"

قریب تھا کہ نوبت وزیر داخلہ اور وزیر خارجہ میں ہاتھا پائی تک پہنچ جاتی کہ ناظم شہر بیچ میں آیا اور اس نے فریقین کے جذبات ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔ فیصلہ ہوا کہ فوری طور پر کارروائی نہ کی جائے اور وزیر داخلہ اپنے مؤقف سے خلیفہ کو آگاہ کریں۔

.... اسی شام وزیر داخلہ عبدالرشید' قصر خلد میں خلیفہ مستنصر باللہ کی پُرشکوہ نشست گاہ میں موجود تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور داڑھی بھیگی ہوئی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "امیرالمومنین! وہ میری اکلوتی بچی ہے۔ میری زندگی کا حاصل۔ اگر اسے کچھ ہو گیا تو میں زندہ نہیں بچوں گا۔ میں اس جنگلی کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ میں نے اسے بہت قریب سے دیکھا ہے۔ انسان کو مارنا اس کے لیے چیونٹی مسلنے کے برابر ہے۔ اگر اس پر حملہ کیا گیا تو وہ مشتعل ہو کر تینوں بچیوں کو ہلاک کر ڈالے گا۔ میں پورے دعوے سے کہہ سکتا ہوں ان میں سے ایک بھی زندہ نہ بچے گی۔"

خلیفہ مستنصر باللہ کی پیشانی پر لکیروں کا جال بچھا تھا۔ انہوں نے مہربان نظروں سے عبدالرشید کے آبدیدہ چہرے کی طرف دیکھا اور بولے۔ "............ تو تم کیا چاہتے ہو رشید؟"

عبدالرشید نے کہا۔ "امیرالمومنین! خدا آپ کا سایہ ہمارے سروں پر سلامت رکھے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس جنگلی پر فوری چڑھائی کرنے کی بجائے حکمت عملی سے کام لیا جائے۔ ہمارا اصل مقصد اس کی گرفتاری ہے .... اور اس کے لیے کوئی ایسا راستہ بھی اختیار کیا جا سکتا ہے' جس سے بے گناہ بچیوں کا خون ہمارے سروں پر نہ آئے۔"

خلیفہ نے کہا۔ "تمہارا مطلب ہے کہ مجرم کو گھیر کر اس سے گفت و شنید کی راہ اختیار کی جائے .... ٹھیک ہے اگر اس سے مقصد حاصل ہو سکتا ہے تو ایسا کر لو لیکن ایک بات یاد رکھنا۔ مجرم نے انتہائی گھناؤنے جرائم کا ارتکاب کیا ہے۔ اسے کسی طور گرفتاری سے بچنا نہیں چاہیے۔ اگر ہم اسے عبرتناک انجام سے دو چار نہ کر سکے تو عام شخص کے ذہن پر اس کا بہت برا اثر پڑے گا۔"

عبدالرشید نے ادب سے کہا۔ "امیرالمومنین! میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں۔ آپ بالکل بے فکر رہیں۔"

☆------☆------☆

دو ہفتے گزر گئے لیکن لڑکیوں کے اغوا کا مسئلہ حل ہونے کی بجائے مزید سنگین ہو گیا۔ اباقہ سرتاپا انتقام بن چکا تھا۔ اس کا ایک ہی مطالبہ تھا' کرائے کے قاتل عبداللہ مشہدی کو اس کے حوالے کر دیا جائے۔ انتظامیہ یہ مطالبہ پورا نہیں کر سکتی تھی۔ عبداللہ مشہدی کا کہیں پتہ نہیں تھا۔

لڑکیوں کو چھڑانا تو درکنار' انتظامیہ اپنے دو اور آدمی گنوا بیٹھی۔ خلیفہ کے امیروں میں سے دو امیر اباقہ سے بات چیت کے لیے اس مکان میں پہنچے اور وہیں پھنس گئے۔ اباقہ نے ان کو بھی واپس نہیں آنے دیا۔ اس کا رویہ بالکل ایک درندے کا سا تھا۔ حکام چکرا کر رہ گئے تھے۔ انہیں کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اس معاملے کو کیسے سلجھائیں۔ معاملہ صرف وزیر داخلہ کی بیٹی کا ہی نہیں تھا۔ اب دو امیر بھی اس جال میں پھنسے تھے۔ دوسری دو لڑکیاں بھی کوئی عام لڑکیاں نہیں تھیں۔ وہ نہایت اعلیٰ اور صاحب حیثیت خاندانوں کی چشم و چراغ تھیں۔ پورے شہر میں بے چینی کی ایک لہر سی دوڑ رہی تھی' انتظامیہ پر دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ کچھ لوگ اس حق میں تھے کہ جس طرح بھی ہو عبداللہ مشہدی کو گرفتار کر کے مجرم کے حوالے کر دیا جائے۔ کسی کو کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔

ایک شام کا ذکر ہے۔ ابھی وزیر داخلہ کے محل میں چراغ جل رہے تھے کہ ایک نوجوان صدر دروازے پر گھوڑے سے اترا۔ اس کے چہرے کا زیادہ تر حصہ پگڑی میں پوشیدہ تھا۔ اس نے کاغذ کا ایک پرزہ دربانوں کو دیا اور خود گھوڑے کے پاس کھڑا ہو کر اس کی گردن تھپتھپانے لگا۔ تھوڑی ہی دیر بعد ایک دربان تیز قدموں سے باہر آیا اور احترام کے ساتھ نوجوان کو اندر لے گیا۔ مختلف راہداریوں سے گزر کر دونوں ایک سجے سجائے عالیشان کمرے میں پہنچے۔ کمرہ اگر بتیوں کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ ایک تخت پر جائے نماز بچھا تھا اور وزیر داخلہ عبدالرشید آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے رحل

تھی اور رحل پر قرآن مجید' جو اس نے ابھی ابھی بند کیا تھا۔

نوجوان کو دیکھ کر وہ فوراً کھڑا ہو گیا۔ "تم .... تم اباقہ کے دوست ہو نا؟"

"جی ہاں۔" نوجوان نے اعتماد سے جواب دیا۔

وزیر داخلہ گہری نظروں سے اسے دیکھتا رہا پھر بولا۔ "اسد اللہ! میں دنیا کے عیش طرب میں ڈوبا ہوا تھا' آج دل پر چوٹ پڑی ہے تو عرق ندامت میں ڈوب گیا ہوں کرم اپنی نظریں میرے چہرے سے پھیر لو میں ان نظروں کی تاب نہیں لا سکتا۔" اس اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا۔

اسد نے کہا۔ "وزیر محترم میں آپ کے زخموں پر نمک پاشی کے لیے نہیں مر رکھنے کے لیے آیا ہوں۔ غلطیاں کس سے نہیں ہوتیں۔ خدا معاف کرنے والا ہے۔"

وزیر داخلہ نے گلوگیر لہجے میں۔ "دیکھو اسد! اپنے تمام اختیار اور طاقت کے باوجود میں کتنا بے بس ہو گیا ہوں۔ اپنی بیٹی کے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔"

اسد نے کہا۔ "وزیر محترم میں اسی لیے آپ کے پاس آیا ہوں۔ میں پوری سچائی ساتھ یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ نے احتیاط کا جو رویہ اختیار کیا ہے بالکل درست ہے۔ اباقہ کے خلاف طاقت استعمال کی جاتی تو آپ کا اب تک سب کچھ ختم ہو گیا ہوتا۔ اس وقت وہ اپنے حواس میں نہیں۔ اس کے سامنے جو بھی آئے گا مارا جائے گا۔ میں دعو سے کہہ سکتا ہوں کہ آپ کے سینکڑوں سپاہی بھی مل کر اسے گرفتار نہیں کر سکتے۔ لڑے گا' مارے گا اور مر جائے گا۔"

وزیر داخلہ نے کہا۔ "اگر تم میرے ہمدرد بن کر آئے ہو تو پھر تمہاری ہر تجویز مجھے منظور ہے۔"

اسد نے کہا۔ "جناب وزیر میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ فی الوقت آپ مجھے اس تک پہنچانے کا انتظام کریں اور دعا کریں کہ میں اسے قائل کرنے میں کامیاب رہوں۔ اگر میں ایسا نہ کر سکا تو پھر ایک دوسرا راستہ اختیار کریں گے۔"

وزیر داخلہ خاموش نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اسد نے اس کے انداز کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔ "جناب وزیر! اگر آپ مجھ پر اعتماد نہیں کر پا رہے ہے تو رہنے دیں۔ بلکہ آپ اگر چاہیں تو مجھے اباقہ کے ساتھی کی حیثیت سے گرفتار بھی کر سکتے ہیں۔ میں اس صورت حال کے لیے تیار ہو کر آیا ہوں۔"

"نہیں .... نہیں اسد۔ ایسا مت کہو۔" وزیر داخلہ نے بے قراری سے ہاتھ ہلا کر کہا۔ "تم تو میرے پاس رحمت کے فرشتے کی طرح آئے ہو .... میں ابھی تمہاری

روانگی کا انتظام کرواتا ہوں۔" پھر اس نے اپنے آنسو پونچھے اور محافظوں کو ہدایات دینے کے لیے تالی بجانے لگا۔

☆ ------ ☆ ------ ☆

اباقہ نے پانچوں یرغمالیوں کی مشکیں کس رکھی تھیں۔ چھٹا یرغمالی یعنی اس مکان کا مالک عبدل دوسرے کمرے میں تھا۔ کل رات اس نے اباقہ پر حملہ کی کوشش کی تھی مگر اباقہ نے نہایت درندگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کی داہنی ٹانگ ران پر سے توڑ دی تھی۔ اب وہ ساتھ والے کمرے میں فرش پر پڑا کراہ رہا تھا۔ کبھی کبھی اس کی چیخیں نہایت دردناک ہو جاتی تھیں۔ عبدل کو ملنے والی اس سزا نے دوسرے یرغمالیوں کو سہما کر رکھ دیا تھا۔

اباقہ کمرے میں دہلیز پر چوکھٹ سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس کے جسم پر ایک نہایت بوسیدہ لباس تھا۔ زہر میں بجھی ہوئی لمبی تلوار گو نیام میں تھی لیکن اباقہ کا ہاتھ اس کے دستے پر تھا۔ وہ پلک جھپکتے میں اس "موت" کو نیام سے باہر کر سکتا تھا۔

دونوں نو گرفتار شدہ امیر کچے فرش پر سوئے پڑے تھے۔ اس خاکی بچھونے نے ان کے قیمتی لباسوں کا حلیہ اس طرح بگاڑ دیا تھا کہ پہچاننا مشکل ہو رہا تھا۔ تینوں لڑکیاں بھی قریب قریب لیٹی ہوئی تھیں۔ طاق میں رکھے چراغ کی مدھم روشنی ان کے زرد چہروں پر لرز رہی تھی۔ اچانک فاطمہ کی دبی دبی سسکیاں سنائی دیں۔ پھر یہ آواز بلند ہوتی چلی گئی وہ رو رہی تھی۔ اس کی سہیلی ثریا اٹھ کر بیٹھ گئی اور اسے تسلی دینے لگی۔ ثریا تینوں لڑکیوں میں سے بڑی تھی اور خاصی باہمت تھی۔ اس نے گھوڑا گاڑی سے اترنے کے بعد اباقہ پر حملہ کیا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ فاطمہ کے سر پر ہاتھ پھیر رہی تھی مگر چپ ہونے کی بجائے فاطمہ کے رونے میں شدت آ رہی تھی۔

اچانک اباقہ دھاڑا۔ "چپ ہو جاؤ .... میں کہتا ہوں چپ ہو جاؤ .... ورنہ میں تمہارا سر توڑ دوں گا۔" فاطمہ نے ہونٹ بھینچنے کی کوشش کی لیکن ہچکیاں بے ساختہ اس کے سینے سے اُبل رہی تھیں۔ وہ ہچکیاں روکنے میں ناکام رہی۔ اس کے ضبط کا بند ٹوٹ گیا اور وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ ثریا اباقہ پر چیخی۔ "میں نے کتنی بار تمہیں منع کیا ہے تم اسے کچھ مت کہا کرو۔ میں خود چپ کرا لوں گی اسے۔" اباقہ نے خون بار نظروں سے ثریا کو دیکھا پھر تلوار کے دستے کو بھینچ کر رہ گیا۔ ثریا اپنی سہیلی کو چپ کرانے کی کوشش کرنے لگی۔ باقی یرغمالی بھی اٹھ کر بیٹھ گئے اور سہمی ہوئی نظروں سے اباقہ کو دیکھنے لگے۔ اباقہ اپنی جگہ سے کھڑا ہوا اور گرج کر بولا۔ "میں ابھی واپس آؤں تو یہ لڑکی چپ ہو چکی ہو۔ سمجھے تم۔" سب کے سر بے ساختہ اثبات میں ہلنے لگے۔ اباقہ اٹھا اور ٹہلتا ہوا باہر

صحن میں آ گیا۔ رات کا پہلا پہر گزرنے کو تھا۔ آسمان پر چاند ستارے چمک رہے تھے۔ اباقہ نے بیرونی چار دیواری سے باہر جھانکا۔ سامنے کھیتوں کا طویل سلسلہ نظر آ رہا تھا۔ ان کھیتوں نے اس مکان کو دو اطراف سے گھیر رکھا تھا۔ خوش قسمتی سے فصل اتنی بلند نہیں تھی کہ آدمی اس کے اندر چلتا ہوا مکان سے قریب پہنچ سکے۔ مکان کی باقی دو اطراف قدرتی طور پر ٹیلوں کی وجہ سے محفوظ تھیں۔ اباقہ کو اس جانب سے کوئی فکر نہیں تھی۔ دفعتاً اباقہ کو محسوس ہوا کہ کوئی شخص کھیتوں میں چلتا ہوا اس کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس کے ہاتھ میں "صلح کا پرچم" لہرا رہا تھا۔ اباقہ جانتا تھا کہ یہ مکان مکمل طور پر سپاہیوں کے نرغے میں ہے۔ اس لئے نو وارد کو دیکھتے ہی اباقہ چوکنا ہو گیا۔ نووارد کی چال کچھ پہچانی سی لگ رہی تھی۔ وہ قریب پہنچا تو اباقہ حیران رہ گیا۔ وہ اسد اللہ تھا۔ پھر اسد کی آواز فضا میں گونجی۔ "اباقہ! میں اسد تم سے ملنا چاہتا ہوں اسد۔" اباقہ نے ہاتھ ہلایا۔ دروازے پر چونکہ باہر سے قفل لگا تھا۔ اس لیے اباقہ کی ہدایت پر اسد دیوار پھلانگ کر اندر آ گیا۔ دونوں نے دیر تک معانقہ کیا۔ پھر دھیمے قدموں سے چلتے اس کمرے میں آ گئے جہاں عبدل زخمی حالت میں پڑا کراہ رہا تھا۔

"کیسے آئے ہو اسد؟" اباقہ نے پوچھا۔ اسد کو اس کے لہجے میں عجیب طرح کی سرد مہری محسوس ہو رہی تھی۔ اس سرد مہری کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ بولا۔

"اباقہ! میں سب کچھ جان چکا ہوں۔ تمہارے خلیج فارس کے سفر اور پھر سلطان جلال الدین کی شہادت تک ہر بات مجھے معلوم ہے۔ میں جانتا ہوں سلطان کی شہادت سے تمہیں کس قدر صدمہ پہنچ سکتا تھا۔ اس واقعے پر تمہارا رد عمل بھی فطری ہے .... مگر اباقہ ...."

"بس اسد اللہ!" اباقہ اس کی بات کاٹ کر بولا۔ "اس سے آگے کچھ مت کہنا۔ کیونکہ اس سے آگے جو بھی تم کہو گے وہ میں مانوں گا نہیں۔" اسد نے اباقہ کی آنکھوں میں دیکھا اور کانپ کر رہ گیا۔ وہاں جنون اور سرکشی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ اس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور نہایت دھیمے اور محتاط لہجے میں اباقہ کو سمجھانے کی کوشش کرنے لگا۔ یہ اس کا حسن کلام تھا کہ اباقہ نہ چاہنے کے باوجود سن رہا تھا لیکن یہ بات بھی واضح تھی کہ الفاظ اس پر مطلق اثر نہیں کر رہے۔ یہ ایسے ہی تھا جیسے آواز کی لہریں کسی چٹان سے ٹکرا رہی ہوں۔ اسد بہت دیر اباقہ کو اس کے اقدام کے نتائج و عواقب سے آگاہ کرتا رہا۔ اسے سمجھاتا رہا کہ وہ بے گناہ لوگوں کو اپنے انتقام کا نشانہ نہ بنائے۔ اپنے انتقام کو ایسے راستے پر نہ چلائے کہ اپنے بیگانے سب اس کے دشمن ہو

جائیں۔ اس نے اسے بہت سے متبادل راستے بتائے۔ بہت سے طریقوں سے اسے راہ راست پر لانے کی کوشش کی۔ مگر سب کچھ بے اثر ہوا۔ اباقہ خاموش بیٹھا رہا۔ اس کی آنکھوں میں اجنبیت اور برف جیسی سختی کے سوا اور کچھ نہیں تھا .... دفعتاً اسد کو دروازے پر ہلکی سی آہٹ سنائی دی۔ اس نے دیکھا ایک لڑکی دروازے پر نمودار ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھری تھی۔ اباقہ کی اس جانب پشت تھی اس لیے وہ لڑکی کو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ لڑکی دونوں ہاتھوں میں چھری تھامے دبے قدموں سے اندر آئی۔ ایک ساعت کے لیے اس کی نظریں اسد سے ملیں .... اور اس ایک ساعت میں ہی اس نے اسد کو سمجھایا کہ وہ کیا کرنا چاہتی ہے۔ وہ اباقہ پر حملہ آور ہو رہی تھی اور چاہتی تھی کہ اسد بھی اس سے تعاون کرے۔ لڑکی کے انداز میں ہوشیاری اور بے خوفی پائی جاتی تھی اور لگتا تھا کہ اس نے جو کچھ سوچا ہے کر گزرے گی۔

اسد اللہ نے ایک نظر اباقہ کے چہرے کی طرف دیکھا اور سمجھ گیا کہ لڑکی دھوکہ کھا رہی ہے۔ اس بیچاری کو کیا معلوم تھا وہ کس شخص پر داؤ آزمانے جا رہی ہے۔ حساس کانوں والا اباقہ اپنے عقب سے بے خبر نہیں تھا۔ میدان کار زار کے آزمودہ جنگجو کی آنکھیں چاروں طرف دیکھ رہی تھیں .... پھر اس سے پہلے کہ اسد اباقہ کو تھامتا یا لڑکی کو روکنے کی کوشش کرتا وہ کچھ ہو گیا جو اسد ہرگز نہیں چاہتا تھا۔ لڑکی نے آخری چند قدم نہایت تیزی سے اٹھائے اور لپک کر اباقہ پر حملہ آور ہوئی۔ اباقہ نے تیزی سے اپنی جگہ چھوڑی اس کی تلوار بجلی کی طرح کوندی اور لڑکی کے سینے سے آرپار ہو گئی وہ دردناک انداز میں چیخی۔ ساتھ والے کمرے سے اس کی سہیلیوں کی آوازیں آئیں۔ "ثریا .... ثریا۔" لڑکی کے جسم سے ابلنے والا خون زمین میں جذب ہو رہا تھا۔ اباقہ پتھر کی طرح بے حس و حرکت کھڑا تھا۔ اس نے زمین پر گری لڑکی کا زخم دیکھا۔ اس کی نبضیں ٹٹولیں، مگر اب اس میں زندگی کی کوئی رمق باقی نہیں تھی۔ ساتھ والے کمرے سے لڑکیاں ابھی تک چیخ رہی تھیں۔ "ثریا .... ثریا۔" لیکن اب وہ اسے آوازیں نہیں دے رہی تھیں۔ اس کا ماتم کر رہی تھیں۔

اسد نے اباقہ کو جھنجھوڑا۔ "یہ کیا کر دیا تم نے اباقہ .... یہ کیا کر رہے ہو؟ خدا کے لیے ہوش میں آؤ۔"

اباقہ تلوار ہاتھ میں لیے یک ٹک دروازے کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔ وہ خوفناک لہجے میں بولا۔ "چلے جاؤ اسد .... تم بھی چلے جاؤ۔ میری تلوار کچھ بھی کر سکتی ہے۔"

اسد بولا۔ "اپنے دوست کو مارو گے اباقہ؟"

اباقہ نے کہا۔ "کیسی دوستی .... کیسی دشمنی۔ میرے لیے اس دنیا میں کچھ باقی نہیں اسد .... میرا سلطان مرگیا .... میرا باپ مرگیا .... وہ شخص مرگیا جسے میں ایک پل نظروں سے اوجھل نہ کرتا تھا۔ اس کے سر کی قسم اب یہ آنکھیں کسی کو نہ دیکھیں گی۔ اگر دیکھیں گی تو اس کے قاتلوں کو۔ وہ میرے دشمن ہوں یا دوست میں انہیں چن چن کر ماروں گا۔"

اسد بولا۔ "تُو نے بہت کو مارا ہے اباقہ۔ میں تیرے اجاڑے ہوئے گھر دیکھ کر آرہا ہوں۔"

اباقہ آنسو بہاتا ہوا بولا۔ "تُو نے ابھی کچھ نہیں دیکھا اسد۔ خدا کی قسم ابھی تُو نے کچھ نہیں دیکھا۔ ابھی بغداد کی ہر گلی میں صف ماتم بچھے گی، ہر گھر سے نالہ بلند ہوگا، ہر آنکھ خون روئے گی۔"

اسد نے کہا۔ "سلطان کی شہادت نے تجھے دل برداشتہ کر رکھا ہے۔ سمجھنے کی کوشش کر اباقہ کسی کے مرنے سے سب کچھ ختم نہیں ہو جاتا اور عظیم لوگ تو جاتے جاتے کچھ دے بھی جاتے ہیں۔ ان کے عظیم مقاصد زندہ رہتے ہیں اور ان کے نقوشِ قدم، منزلوں کے سراغ دیتے ہیں۔"

"نہیں اسد! نہ کوئی راستہ اور نہ کوئی منزل۔ سب کچھ لٹ گیا اب کچھ باقی نہیں۔ اب تو بس مارنا ہے اور مرجانا ہے۔"

اسد یک ٹک اباقہ کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی آنسو جھلملانے لگے تھے۔ پھر وہ پُر عزم لہجے میں بولا۔ "نہیں اباقہ .... ابھی سب کچھ نہیں لٹا۔ ابھی بہت کچھ باقی ہے۔ ہاں ابھی بہت کچھ باقی ہے۔" پھر وہ تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔ اباقہ اسے جاتے دیکھتا رہا۔

☆------☆------☆

منظر وزیر داخلہ عبدالرشید کی عالی شان نشست گاہ کا تھا۔ وہ اور اسداللہ مصروف گفتگو تھے۔ عبدالرشید فکر مند لہجے میں کہہ رہا تھا۔ "اسداللہ! مجھ پر دباؤ بڑھنا شروع ہو گیا ہے۔ میں جانتا ہوں کچھ ہی روز بعد مجھ سے کھلے عام مطالبہ کیا جانے لگے گا کہ میں مجرم کے خلاف راست اقدام کرواؤں۔"

اسد نے کہا۔ "میں اس سلسلے میں کیا عرض کر سکتا ہوں۔ وہ اکیلا شخص ہے۔ آپ کی لاتعداد فوج کا مقابلہ تو نہیں کر سکتا۔ ظاہر ہے وہ مارا جائے گا .... لیکن ایک بات

میں پھر کہوں گا کہ یرغمالیوں میں سے کوئی خوش قسمت ہی زندہ بچ سکے گا اور مجھے کہنے دیجیے کہ وہ سب سے پہلے آپ کی بیٹی ...."

"بس خدا کے لیے اور کچھ مت کہو۔" عبدالرشید نے تڑپ کر کہا۔ "مجھے میری بچی دنیا کی ہر شے سے زیادہ عزیز ہے .... کچھ بھی کرو اسد، لیکن کسی طرح میری فاطمہ کو بچا لو۔" عبدالرشید اپنے آنسو روکنے کی کوشش کرنے لگا۔ اسد کے چہرے پر سوچ کی پرچھائیاں تھیں۔ پھر وہ گھمبیر آواز میں بولا۔

"......... وزیر محترم! میری سمجھ میں تو اب ایک ہی راستہ آتا ہے۔ اس وقت اباقہ کو اگر کوئی قابو میں کر سکتا ہے تو وہ ماریتا ہے۔ اباقہ اس سے محبت کرتا ہے۔ شاید آپ بھی اس کے متعلق جانتے ہوں۔"

عبدالرشید فوراً بولا۔ "ہاں .... میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ یہ وہی عورت ہے نا جسے چغتائی خاں کی بیوی کہا جاتا ہے اور جسے منگول سفیر طوطم خاں اپنے ساتھ واپس لے جانا چاہتا تھا .... لیکن اس وقت وہ کہاں ہے؟"

اسد نے کہا۔ "یہی تو معلوم نہیں وزیر محترم۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہو چکا ہوگا، منگول سفیر نے اسے قراقرم نہیں پہنچایا۔ میری اطلاعات کے مطابق وہ ابھی تک منگول سفیر کے قبضے میں ہے وہ اسے لے کر ایران کے مشرقی سرحدی علاقے میں کہیں روپوش ہے۔"

وزیر داخلہ نے کہا۔ "اسداللہ! اگر یہ عورت اس جنگلی کو قابو میں کر سکتی ہے تو خدا کے لیے اسے ڈھونڈنے کی کوشش کرو۔ میں ہر طرح سے تعاون کو تیار ہوں۔"

اس نے کہا۔ "وزیر محترم! یہ کام اتنا آسان نہیں۔ اس کے لیے کچھ وقت درکار ہے۔ کیا آپ اتنی دیر "اوپر" کا دباؤ برداشت کر لیں گے؟"

وزیر داخلہ نے کہا۔ "میں اپنی پوری کوشش کروں گا۔"

اسد نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "وزیر محترم! آپ برا نہ مانیں تو میں ایک تجویز پیش کر سکتا ہوں۔"

"اسد! بیٹے! میں تمہیں اس مسئلے کے حل کے لیے کلی اختیار دیتا ہوں۔"

اس نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔ "وزیر محترم! میں جانتا ہوں کہ آپ عبداللہ مشہدی کو ڈھونڈنے میں بالکل ناکام رہے ہیں۔ اس کے ملنے کی کوئی امید بھی نہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ ملک چھوڑ کر جا چکا ہو .... مگر آپ اپنی اس ناکامی کو عیاں نہ ہونے دیں۔ خلیفہ اور وزیر اعظم پر یہی ظاہر کرتے رہیں کہ عبداللہ مشہدی کی تلاش جاری ہے

اور مجرم سے گفت و شنید بھی آگے بڑھ رہی ہے۔ دوسری طرف آپ اباقہ پر بھی یہی ظاہر کریں کہ عبداللہ مشہدی کی تلاش میں پیش رفت ہوئی ہے اور عنقریب اس کا مطالبہ پورا کیا جا سکے گا۔ اس طرح نہ صرف آپ اباقہ کو پُرسکون رکھنے میں کامیاب رہیں گے بلکہ حکومت سے بھی خاطر خواہ مہلت حاصل کر لیں گے۔"

وزیر داخلہ کو اس نوجوان کی باتوں میں کسی دانا کی سی دانشمندی نظر آ رہی تھی۔ ایک لمحے کو اس نے سوچا کیا ہی اچھا ہو یہ نوجوان اس کا مشیر بنے۔ ذہنی طور پر اس نے اسد اللہ کی تجویز مان لی تھی۔ اتنے میں دروازہ کھلا اور ایک نوجوان سلام کرتا ہوا اندر آ گیا۔ اچھے قد کاٹھ کا یہ ایک خوش شکل نوجوان تھا لیکن چہرے سے گہرا دکھ جھلک رہا تھا۔ عبدالرشید نے نوجوان کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ "یہ صالح ہے۔ فاطمہ کا شوہر۔" اسد نے غور سے اس بدنصیب شوہر کو دیکھا جو اپنی محبوب بیوی کا گھونگھٹ اٹھانے سے بھی محروم رہا تھا۔ کئی کٹھن مرحلوں سے گزرنے کے بعد وہ اپنی منزل تک پہنچ تھا لیکن دو ہاتھ کے فاصلے سے وقت کی آندھی نے اسے اڑا کر کہیں کا کہیں پھینک دیا تھا۔ صالح کی آمد نے ماحول کو ایکدم سوگوار کر دیا۔ تعارف کراتے کراتے عبدالرشید کی آنکھیں ڈبڈبا گئی تھیں۔ گفتگو کا رخ بدلنے کے لیے اسد اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا لیکن دلوں میں لگی آگ گفتگو کو اپنی لپیٹ میں ضرور لے لیتی ہے۔ جلد ہی ان کا موضوع گفتگو پھر اباقہ فاطمہ اور عبداللہ مشہدی ہو گئے۔ صالح نے اس سے پوچھا۔

"بھائی جان! یہ کہانی جو اباقہ نے شروع کی ہے۔ آخر کہاں ختم ہو گی؟"

اسد نے طویل سانس لے کر کہا۔ "ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا برادر۔ وہ بالکل اپنے بس میں نہیں۔ مجھے تو خوف ہے عبداللہ مشہدی کو قتل کر کے بھی وہ چین سے نہیں بیٹھے گا.........."

بہت دیر وہ اس موضوع کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتے رہے۔ پھر اسد اس وعدے کے ساتھ وزیر داخلہ سے رخصت ہو گیا کہ وہ کل ہی ماریتا کی تلاش میں روانہ ہوتا ہے۔ وزیر داخلہ نے کہا کہ پچاس آزمودہ کار سپاہیوں کا ایک دستہ خفیہ طور پر اس مہم میں اس کے ساتھ جائے گا۔ وہ تو اس سے زیادہ سپاہی بھیجنے پر بھی تیار تھا لیکن اسد خود زیادہ بھیڑ بھاڑ نہیں چاہتا تھا۔

تمام امور طے کرنے کے بعد اسد وزیر داخلہ کے محل سے نکلا اور گھوڑے پر بیٹھ کر اپنی رہائش گاہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ گھوڑا دلکی چال چلتا بغداد کی بارونق گلیوں سے گزر رہا تھا۔ اچانک ایک خرسوار اس کے ساتھ چلنے لگا۔ اس کے جسم پر بوسیدہ لباس تھا گلے

میں مالائیں اور گھنٹیاں لٹک رہی تھیں۔ چہرے پر اس نے بھبوت مل رکھی تھی۔ گدھا بھی اسی طرح گھنٹیوں اور رنگ برنگ کپڑے کے ٹکڑوں سے سجا ہوا تھا۔ دیکھنے میں یہ شخص بھیک مانگنے والا لگتا تھا............ لیکن اس کی آنکھوں میں ایک ایسی چمک تھی جو اسے بغداد کے عام فقیروں سے جدا کرتی تھی۔ اسد نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا اور پھر اپنے رخ پر دیکھنے لگا۔ اچانک فقیر نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ انداز بھیک مانگنے والا ہی تھا، مگر اس کے ہاتھ میں کاغذ کا ایک ٹکڑا تھا۔ نہایت صفائی سے اس نے یہ کاغذ اس کی جھولی میں گرا دیا۔ معاملہ پُراسرار تھا۔ اسد نے یونہی سے انداز میں کاغذ پکڑا اور اس کی تہیں کھولنے لگا۔ فقیر اب اسد کے آگے آگے چل رہا تھا۔ اسد نے کاغذ کی تحریر دیکھی لکھا تھا۔

اسد اللہ! میرے پیچھے پیچھے چلتے آؤ۔ تمہارے لیے کچھ اہم اطلاعات ہیں۔

ایک دوست

تحریر نہایت مبہم اور نامکمل تھی لیکن اتنی ہی پُرتجسس بھی۔ اسد نے اس ہدایت پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا اور دھیمی رفتار سے خرسوار کے عقب میں چلتا رہا۔ خرسوار اندرونِ شہر کی تنگ و تاریک گلیوں میں داخل ہو گیا۔ مساجد سے شام کی اذان بلند ہو رہی تھی۔ کہیں کہیں چراغ جل رہے تھے۔ عجیب پُراسرار اور افسانوی سا ماحول تھا۔ مختلف گلیوں سے گزر کر ایک جگہ بوڑھا خرسوار اچانک غائب ہو گیا۔ اسد گھوڑے پر سوار حیرانگی سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ دونوں اطراف جھروکوں اور محرابوں والے اونچے مکان تھے۔ قریب ہی ایک نانبائی اپنے کام میں مصروف تھا۔ اسد اس کے قریب جا کر کچھ پوچھنا چاہتا تھا کہ عقب سے دو گھڑسوار برآمد ہوئے اور نرم لہجے میں بولے۔ "چلیے جناب! ہمارے ساتھ آیئے۔" اسد خرسوار کے تعاقب میں اتنا مگن تھا کہ اپنے پیچھے آنے والوں سے آگاہ نہ ہو سکا۔ یقیناً یہ دونوں گھڑسوار شروع سے اس کے پیچھے تھے۔ وہ دونوں اسے لے کر ایک بڑے دروازے کے سامنے اُترے اور پھر اسے اندر لے گئے۔ بوڑھا خرسوار ایک کمرے میں گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس نے چہرے سے بھبوت صاف کر لی تھی لیکن باقی حلیہ ویسا ہی تھا۔ اسد نے دیکھا وہ کوئی غیر ملکی شخص تھا۔ رنگ سرخ و سپید اور آنکھیں نیلگوں۔ اسے اندر لانے والے دونوں گھڑسوار مقامی تھے اور اب غیر ملکی شخص کے عقب میں مؤدب کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک نے مترجم کے فرائض انجام دیئے اور اپنے مالک کا نام مائیکل بتایا۔ مائیکل اور اسد میں گفتگو شروع ہوئی اور دھیرے دھیرے پُراسرار ہوتی چلی گئی۔ مائیکل نے کہا۔ "میرے دوست! میں سینکڑوں میل کی مسافت طے کر کے سرزمین روس سے یہاں پہنچا ہوں۔ یہاں میری آمد کا مقصد چند افراد

سے ملاقات ہے۔ ان میں دو انتہائی اہم نام اباقہ اور سردار یورق ہیں۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ اباقہ اور سردار یورق اسی شہر میں موجود ہیں اور یہ بھی خبر ہے کہ تم کل رات اباقہ سے ملاقات کر چکے ہو۔ نوجوان! میں تمہیں کسی اندھیرے میں نہیں رکھنا چاہتا۔ میرے آدمی کل اس وقت سے تمہارے تعاقب میں ہیں جب تم نے وزیر داخلہ کے سامنے خود کو اباقہ کے ساتھی کی حیثیت سے پیش کیا تھا۔ اس وقت سے ہر پل تمہاری نگرانی کی گئی ہے۔ اس نگرانی کے سبب ہمیں معلوم ہو چکا ہے کہ سردار یورق تمہارے ساتھ رہائش پذیر ہے۔ مگر اباقہ کا مسئلہ ابھی جوں کا توں ہے۔ اب یہ تم بتاؤ کہ اس سے کیونکر ملاقات ہو سکتی ہے۔"

اسد نے کہا۔ "کیا آپ یہ وضاحت فرمائیں گے کہ آپ کو اباقہ اور یورق کی ضرورت کس سلسلے میں درپیش ہے۔"

مائیکل نے کہا۔ "نوجوان! تم اباقہ اور یورق کے ایک مخلص ساتھی کے طور پر سامنے آئے ہو اسی لئے میرے خیال میں تمہیں کچھ بتانے میں حرج نہیں ہے۔ سنو نوجوان! ہمارے ملک پر مشرق کے منگول ٹڈی دل حملہ آور ہو چکے ہیں۔ ان کی پُرہوس نگاہیں ہمارے ہنستے بستے پُرامن شہروں پر لگی ہیں۔ ان کے ناپاک قدم ہماری کھیتیوں کو روند رہے ہیں۔ دوسری طرف ہمارے نوجوان اپنی فصیلوں کو مضبوط کر رہے ہیں۔ اپنے حوصلوں کو آواز دے رہے ہیں اور اپنے ہتھیاروں کو چمکا رہے ہیں۔ ایک طوفان ہے جو سینوں میں پل رہا ہے' ایک تاریخ ہے جو رقم ہونے والی ہے۔ ہم جانتے ہیں منگولوں سے ٹکر لینا آسان نہیں۔ یہ درندہ نما انسان مشرق و مغرب میں خون کے دریا بہا چکے ہیں۔ ان کی سفاکی اور عیاری زبان زدِ عام ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ان سے پوری تیاری کے ساتھ ٹکر لیں۔ روسی فصیلوں سے باہر ان درندوں کا شایان شان استقبال ہو اور اس کے لئے ہمیں مضبوط بازوؤں اور تجربہ کار ذہنوں کی ضرورت ہے۔ ایسے بازو اور ایسے ذہن جو منگولوں سے برسرپیکار رہ چکے ہوں۔ جنہوں نے منگولوں کے حوصلے آزما رکھے ہوں اور ان کی چالوں کو سمجھ رکھا ہو۔ مجھے میرے آقاؤں نے ناموں کی ایک فہرست کے ساتھ بھیجا ہے۔ اس فہرست میں شامل بیشتر افراد سرزمین روس کا رخ کر چکے ہیں۔ جو باقی ہیں ان سے میں اور میرے ساتھی رابطے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اباقہ اور یورق بھی انہی میں شامل ہیں۔" اسد اور مائیکل میں تادیر گفتگو جاری رہی۔ دونوں نے ایک دوسرے کا مؤقف سمجھ لیا۔

اسد فوری طور پر اس "دعوت" کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا لیکن اسے یہ

بات کوئی ایسی بری بھی نہیں لگی۔ اصل فیصلہ تو اباقہ اور یورق خود ہی کر سکتے تھے مگر اولین مسئلہ اباقہ تک رسائی تھا۔ اسد نے تفصیل سے غیر ملکی مہمان کو بتایا کہ "اباقہ" کن حالات سے گزر رہا ہے اور اسے کس طرح مصائب نے جکڑ رکھا ہے۔ مائیکل کو جب معلوم ہوا کہ اسد کل اس عورت کی تلاش میں روانہ ہو رہا ہے جو اباقہ کی وحشت دور کرنے کا سبب بن سکتی ہے' تو اس نے ایک لحہ تاخیر کئے بغیر اپنی خدمات اسد کو پیش کر دیں گے۔ اس نے کہا۔

"نوجوان! اس وقت تمہاری اور ہماری منزل ایک ہے۔ میں اس سلسلے میں تم سے ہر طرح کے تعاون کو تیار ہوں۔ اگر تم چاہو تو میں خود تمہارے ساتھ چلنے کو تیار ہوں' ورنہ میں دو ایسے آدمی تمہارے سپرد کر دیتا ہوں جو چٹانوں سے زیادہ قوی اور سخت جان ہیں۔ تمہارے ایک اشارے پر وہ بلا جھجک اپنی جان دے دیں گے۔"

کچھ بحث تمحیص کے بعد اسداللہ نے مائیکل کا تعاون قبول کر لیا۔ اسے یہ شخص قابل اعتماد اور کارآمد لگا تھا۔ سب سے زیادہ اس کو اس کی حب الوطنی نے متاثر کیا۔

☆-------☆-------☆

ماریتا نے بچپن میں ایک کہانی سنی تھی۔ ایک ریچھ ایک عورت کو اٹھا کر غار میں لے جاتا ہے وہ اس سے عشق کرنے لگتا ہے۔ اس خیال سے کہ عورت اس کی غیر موجودگی میں بھاگ نہ جائے۔ وہ اس کے پیروں کے تلوے چاٹ چاٹ کر اتنے نازک کر دیتا ہے کہ وہ دو قدم بھی نہیں چل سکتی۔ کچھ ایسا ہی حال ماریتا کا بھی تھا۔ طوطم خاں نے اس کے تلوے تو نہیں چاٹے تھے لیکن جب بھی اسے کہیں باہر جانا ہوتا تھا وہ اس کے دونوں ہاتھ رسی سے پشت پر باندھ دیتا تھا۔ یہ غار ایک ایسی ڈھلوان پر واقع تھی کہ وہاں سے کھلے ہاتھوں اترنا بھی خاصا دشوار تھا۔ ہاتھ بندھے ہونے کی صورت میں وہاں سے اترنا سراسر موت کو دعوت دینا تھا۔ ایک روز ماریتا نے کوشش بھی کی تھی۔ اس کے دونوں گھٹنے اور ایک رخسار بری طرح چھل گیا تھا۔ اس روز طوطم خاں نے اس پر تھپڑوں کی بارش کر دی تھی۔ یہاں رہ کر طوطم خاں کا رویہ اس کے ساتھ کچھ عجیب سا ہو گیا تھا۔ کبھی تو اسے ماریتا پر بے پناہ طیش آ جاتا تھا۔ وہ اسے کئی کئی روز کھانے کو کچھ نہیں دیتا تھا اور بے دردی سے زدوکوب بھی کرتا تھا مگر پھر جلد ہی اسے اپنے رویے پر ندامت ہونے لگتی تھی۔ وہ نہ صرف اس سے معافی مانگتا تھا بلکہ آئندہ ایسا نہ کرنے کا عہد بھی دوہرانے لگتا تھا۔ جب اس کا مزاج ٹھیک ہوتا تھا تو وہ ہر طرح ماریتا کے آرام کا خیال رکھتا تھا اور کوشش کرتا تھا کہ اسے کوئی پریشانی یا تکلیف نہ ہو۔

جب سے مارینا یہاں آئی تھی اس نے طوطم خاں کے علاوہ کسی کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ انسان تو انسان' طوطم خاں تو یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ کوئی جانور یا پرندہ اس غار میں داخل ہو۔ ایک روز بلی کا ایک چھوٹا سا بچہ نہ جانے کہاں سے گھومتا ہوا آیا اور غار کے دہانے پر رکھے پتھر کے نیچے سے ہو کر اندر داخل ہو گیا۔ وہ زخمی تھا اور سردی سے کانپ رہا تھا۔ مارینا نے اپنے بندھے ہاتھوں سے اس کے زخم پر مرہم رکھی اور سردی سے بچانے کے لئے اسے ایک اونی کپڑے میں لپیٹ دیا۔ شام کے وقت طوطم آیا تو بلی کے بچے کو دیکھ کر غضب ناک ہو گیا۔ اس نے اس بیچارے کو دم سے پکڑ کر اتنی زور سے دیوار کے ساتھ مارا کہ وہ آواز نکالے بغیر مر گیا۔ مارینا وحشت کے اس مظاہرے پر رونے لگی۔ طوطم خاں نے اس پر بھی تھپڑوں کی بارش کر دی۔

مارینا کو طوطم خاں کا عجیب و غریب رویہ بالکل سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ ایک روز طوطم کی غیر موجودگی میں وہ دہانے کے قریب بیٹھی گزرے دنوں کی تلخ و شیریں یادوں میں گم تھی کہ ایک آہٹ سن کر چونک گئی۔ یہ آہٹ طوطم خاں کے بھاری بھرکم قدموں کی نہیں تھی۔ نہ ہی کسی جنگلی خرگوش یا گلہری کی تھی۔ وہ چوکنا ہو کر بیٹھ گئی۔ اچانک غار سے باہر ایک سایہ سا لہرایا اور ایک شخص جھک کر اندر جھانکنے لگا۔ اپنے سامنے ایک خوبصورت لڑکی کو بیٹھے دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت سے وا رہ گئیں۔ وہ دبلے پتلے جسم والا ایک ادھیڑ عمر شخص تھا۔ حلیے سے کوئی شکاری لگتا تھا' کندھے پر تیر کمان لٹک رہا تھا۔ اس کی داڑھی بڑھی تھی اور چہرے پر مہینوں کی گرد جمی تھی۔ عرصے کے بعد کسی انسان کو اپنے سامنے دیکھ کر مارینا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بوڑھا اسے حیرت سے دیکھتا ہوا اندر آ گیا۔

"تُو کون ہے لڑکی اور یہاں کیا کر رہی ہے؟" بڑھاپے کے باوجود اس کی آواز میں جوانوں کی سی زندہ دلی تھی۔ مارینا نے اسے اپنا نام بتایا اور پوچھا کہ وہ کون ہے اور اس ویرانے میں کیسے چلا آیا ہے۔ بوڑھے نے بتایا کہ وہ ایک شکاری ہے اس کی زندگی کا بڑا حصہ ویرانوں میں بھٹکتے اور قدرت کے مظاہر سے لطف اندوز ہوتے گزرا ہے۔ بعض اوقات وہ کئی کئی سال انسانی بستیوں کا رخ نہیں کرتا۔ اس نے بتایا کہ آج کل وہ ایک نایاب پرندے کی تلاش میں ہے۔

پھر اس نے مارینا کی کہانی سننا چاہی۔ مارینا نے مختصراً اسے اپنے متعلق بتایا۔ وہ جلد از جلد بوڑھے کو یہاں سے روانہ کر دینا چاہتی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ طوطم واپس آ جائے اور اس معصوم صورت بوڑھے کا حشر بھی' بلی کے اس بچے جیسا ہو۔ بوڑھے نے مارینا کی پریشانی اور اضطراب کو محسوس کر لیا۔ وہ بولا۔ "لڑکی! تُو گھبرا مت میں تجھے اس

ول کی قید سے نجات دلواؤں گا۔"

مارینا نے کہا۔ "بزرگوار! آپ میری مدد کی کوشش میں خود بھی نقصان اٹھائیں گے۔ بہت ظالم اور ہوشیار شخص ہے۔ اس ڈھلوان سے اترتے اترتے وہ ہمیں پکڑ لے گا۔ اس کے بعد جو کچھ ہو گا میں اس کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ اگر آپ میرے لئے کچھ کر سکتے ہیں تو یہ کریں کہ یہاں سے زندہ سلامت واپس چلے جائیں۔ پھر کبھی کسی انسانی بستی سے آپ کا گزر ہو تو ان لوگوں تک میری یہ درد بھری کہانی پہنچا دیں۔ شاید یہ بات کبھی ان کانوں تک بھی جا پہنچے جو میرے نام سے آشنا ہیں.......... شاید وہ میری رہائی کے لئے کوئی کوشش کر سکیں۔" بالآخر مارینا بوڑھے کو سمجھانے میں کامیاب ہو گئی۔ بوڑھا اسے خدا حافظ کہہ کر غار سے باہر نکل آیا۔ "مجھے بھولیے گا نہیں۔" مارینا نے لرزاں آواز میں کہا۔ بوڑھے نے اداسی سے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا اور مارینا کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

☆------☆------☆

سردار یورق نے ساری رات بستر پر کروٹیں بدلتے گزار دی۔ پھر قریبی مسجد سے اذان کی آواز بلند ہوئی۔ سردار نے اٹھ کر وضو کیا۔ نماز پڑھی اور اسد کی خوابگاہ کی طرف چل دیا۔ اسد مسجد میں نماز پڑھنے کے بعد ابھی ابھی واپس آیا تھا اور اب سامان رخت باندھنے میں مصروف تھا۔ یورق کو سامنے دیکھ کر وہ چونک گیا۔ یورق کے چہرے کی سنجیدگی بتا رہی تھی کہ وہ کوئی اہم بات کرنے آیا ہے۔

"اسد اللہ!" یورق نے گھمبیر لہجے میں کہا۔ "میں آج تمہارے سامنے ایک اعتراف کرنا چاہتا ہوں اور ایک اطلاع بھی دینا چاہتا ہوں۔ اس میں کوئی جھوٹ نہیں کہ جب مارینا "کالے پہاڑوں کی وادی" سے غائب ہوئی تو میں نے پوری دیانتداری سے اسے تلاش کرنے کی کوشش کی۔ مگر ایک بات ایسی ہے جو میں اب تک تم سے چھپاتا رہا ہوں۔ مجھے اپنے اس رویے پر شرمندگی بھی ہے اور افسوس بھی لیکن کیا کروں' میرے دل سے یہ بات کسی صورت نہیں نکلتی کہ وہ عورت اباقہ کی زندگی کے لئے خطرہ ہے۔ میں نے بغداد پہنچ کر بارہا کوشش کی کہ تمہیں مارینا کے بارے میں اس اہم اطلاع سے باخبر کر دوں لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ مگر آج جب کہ تم مارینا کی تلاش میں افغان سرحد کی طرف روانہ ہونے والے ہو' میں تمہیں بتا دینا چاہتا ہوں کہ مارینا اس علاقے میں نہیں ہے۔" چند لمحے توقف کے بعد سردار یورق نے ایک طویل سانس لی اور بولا۔ "جب میں نبیلہ اور سلیمان کے ساتھ ایران سے ہوتا ہوا بغداد آ رہا تھا تو راستے میں ایک شخص نے دو ہزار

اشرفی کے بدلے مجھے ایک اہم اطلاع "فروخت" کی تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ وہ مارینا کو اغوا کرنے والے افراد میں شامل تھا۔ انہیں طوطم خاں نے چار ہزار اشرفیاں دی تھیں جو انہوں نے آپس میں تقسیم کیں۔ اس نے بتایا کہ طوطم خاں نے مارینا کے ساتھ "مشہد" کا ارادہ کیا تھا۔ گمانِ غالب یہ ہے کہ وہ "مشہد" کے نواح میں کہیں موجود ہے۔ ہم اُس وقت چونکہ "مشہد" سے کافی آگے نکل آئے تھے اور اس وقت مجھے اباقہ کی فکر بھی لاحق تھی اس لئے اس اطلاع پر میں "مشہد" کا رخ نہ کر سکا۔ ہاں تم سے ملنے کے بعد مجھے تمہیں اس بارے میں بتانا چاہئے تھا لیکن میں نہ بتا سکا۔ اپنی اس غلطی پر مَیں شرمندہ ہوں۔"

اسد نے یورق کی پوری بات سن کر اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولا۔ "سردار تم نے کبھی یہ سوچا کہ مَیں اتنے یقین کے ساتھ مارینا کی تلاش میں کیوں روانہ ہو رہا ہوں جب کہ اس کے متعلق میرے پاس کوئی اہم سراغ بھی نہیں؟" یورق سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اسد نے مسکرا کر کہا۔ "سردار یورق' میری چھٹی حس کہتی تھی کہ تم مارینا کے متعلق ضرور کچھ نہ کچھ جانتے ہو .... اور مجھے یہ بھی یقین تھا کہ تم مجھے روانہ ہوتے دیکھ کر یہ اہم اطلاع اپنے سینے میں دفن نہ رکھ سکو گے۔ مجھے تمہاری اندرونی سچائیوں پر بھروسہ تھا۔ سردار مجھے معلوم تھا تم اتنے بُرے دوست کبھی نہیں ہو سکتے۔ میں رات بھر تمہارا انتظار کرتا رہا ہوں سردار یورق! اور صبح بھی میں نے گڑگڑا کر خدا سے یہ دعا مانگی ہے کہ سردار یورق کے دل کی گرہ کھل جائے .... اور میری دعا قبول ہوئی سردار!"

"ہاں تمہاری دعا قبول ہوئی اسد!" سردار یورق نے مضبوطی سے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔ "جاؤ' خدا تمہارا مددگار ہو۔"

اسد نے کہا۔ "سردار یورق! جانے سے پہل میں ایک اور کام کرنا چاہتا ہوں۔ آج تک باپ بیٹوں کے نام رکھتے رہے ہیں مگر آج ایک نوجوان' اپنے بزرگ کا نام رکھنا چاہتا ہے۔ تم اس وقت "اللہ کی مدد" بن کر میرے پاس آئے ہو۔ میں تمہارا اسلامی نام نصراللہ رکھتا ہوں۔ نصراللہ کا مطلب ہے' اللہ کی مدد۔"

یورق نے خوشدلی سے اس نام کو قبول کیا لیکن تلفظ اسے کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ اسد نے اس کی پریشانی بھانپتے ہوئے ہنس کر کہا۔ "گھبراؤ مت سردار! ابھی ہم تمہیں یورق ہی کہیں گے۔ اباقہ کا نام بھی تو اسماعیل ہے مگر ہم اسے اباقہ کہتے ہیں۔" یورق ہنس دیا۔

اس دوران سلیمان اور نبیلہ بھی آ گئے اور سب مل کر اسداللہ کی روانگی کی تیاری

کرنے لگے۔

☆------☆------☆

ایک روز بعد کی بات ہے خلیفہ کے محل میں ایک منصوبہ پرورش پا رہا تھا۔ وزیراعظم کے علاوہ ابنِ یاشر اور مسلم بن داؤد بھی وہیں موجود تھے۔ ابن یاشر کہہ رہا تھا۔

"امیرالمومنین! اباقہ کو خواہ مخواہ ہوّا بنایا جا رہا ہے اور اسے ہوّا بنانے میں سب سے اہم کردار خود عبدالرشید نے ادا کیا ہے۔ سوچنے کی بات ہے ایک آدمی اور پورے شہر کو بے بس کر ڈالے۔ وہ انسان ہے کوئی جن تو نہیں۔ گستاخی معاف امیرالمومنین! میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں آپ مجھے صرف دس باہمت افراد اور چند گھڑی کی مہلت دے دیں میں اس پاگل کو مرے ہوئے کتے کی طرح گھسیٹتا آپ کے قدموں میں لے آؤں گا۔ بہت ہو گئی برداشت کی۔ کتنی دیدہ دلیری سے وہ ہم سے عبداللہ مشہدی کا مطالبہ کر رہا ہے۔ میں تو کہوں گا اگر عبداللہ مشہدی ملتا بھی ہے تو ہمیں اس کا مطالبہ ماننے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ تو ایک عدد مردود شخص ہے' خدا کی قسم اگر ایک فوج مل کر بھی امیرالمومنین کا سر جھکانا چاہے تو ہم جیسے جاں نثار اسے لہو میں ڈبو دیں۔"

وزیراعظم نے تائید کرنے والے انداز میں کہا۔ "اُس کی سفاکی درندگی کی حد تک پہنچی ہوئی ہے۔ جب سے اس نے ایک بچی کو قتل کیا ہے میں خود بھی سوچ رہا ہوں کہ اب ہمیں مزید کمزوری کا اظہار نہیں کرنا چاہئے۔"

وزیرِ خارجہ ابن یاشر نے کہا۔ "امیرالمومنین! مَیں تو کہتا ہوں کہ اُس کے خلاف کارروائی میں کسی قیمت پر تاخیر نہیں ہونی چاہئے۔"

خلیفہ مستنصر نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "ابن یاشر' میری اطلاعات کے مطابق وہ نہایت سفاک اور جنگجو شخص ہے۔ تمہیں یاد ہو گا۔ سیف الدین کے مکان پر ہماری کارروائی کو اُس نے کس بُری طرح ناکام کیا تھا۔ کہیں ایسا نہ ہو۔ اس مرتبہ بھی وہ نقصان پہنچائے۔"

اس موقع پر مسلم بن داؤد نے کہا۔ "امیرالمومنین' بندہ مجرم کو نہایت قریب سے جانتا ہے جس واقعے کا آپ ذکر کر رہے ہیں میں بھی اس میں موجود تھا۔ اس وقت مجرم کے ساتھ بیسیوں ساتھی تھے۔ بخدا آپ یقین کریں وہ تنہا کچھ بھی نہیں ہے۔ قراقرم میں کم از کم دو تین مواقع ایسے آئے جب مجھ جیسے ناتواں بوڑھے نے ڈٹ کر اس کا مقابلہ کیا۔ وہ پھرتیلا ضرور ہے لیکن اتنا بھی نہیں جتنا مشہور ہو چکا ہے۔ تلوار چلانا تو اسے سرے سے آتا ہی نہیں۔ یقین کریں قراقرم میں چغتائی خاں نے اس کی وہ درگت بنوائی تھی کہ

خدا کی پناہ۔ مار مار کر ادھ موا کر دیا تھا اور قید میں پھینکوا دیا تھا۔ وہاں سوکھ کر ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گیا تھا اور کوٹھڑی میں کیڑے پکڑ پکڑ کر کھاتا تھا۔ امیرالمومنین! یہ تو ہم لوگوں نے خواہ مخواہ اس کا خوف خود پر سوار کر رکھا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر اُس مکان پر اچانک ہلّہ بول دیا جائے تو وہ جان جانے کے خوف سے تلوار پھینک کر کھڑا ہو جائے گا۔"

وزیراعظم نے کہا۔ "ہاں یہ تو ہے۔ ایسے مجرم جب موت کو سامنے دیکھتے ہیں تو اپنی دھمکیاں بھول جاتے ہیں۔"

ابن یاشر نے کہا۔ "بالکل حضور! موت کا راگ الاپنا اور بات ہے' اسے گلے سے لگانا اور بات۔ مجھے کامل بھروسہ ہے کہ اگر ہم اچانک اس پر جا پڑیں تو وہ سکتے میں کھڑا رہ جائے گا۔ فرض محال اُس نے حرکت کی بھی تو ایک شخص کتنوں کو ہلاک کر سکے گا۔ زیادہ سے زیادہ وہ ایک یا دو یرغمالیوں کو زخمی کر پائے گا۔ کچھ بھی نہیں ہو گا امیرالمومنین! جو کچھ وہ کر رہا ہے' اس سے زیادہ کچھ نہیں ہو گا۔"

وزیراعظم نے طویل سانس لے کر کہا۔ "امیرالمومنین! محسوس ہو رہا ہے کہ لوگ اس معاملے کی وجہ سے حکومت کو مسلسل ہدف تنقید بنا رہے ہیں۔ یوں بھی عبدالرشید بیٹی کی وجہ سے کچھ جذباتی ہو رہا ہے۔ اُس کے کہنے پر ہم اس معاملے کو کب تک طول دیں گے۔ جتنی تاخیر ہو گی حل دشوار ہوتا جائے گا۔ پورے اٹھارہ روز ہو چکے ہیں۔ اب عبدالرشید دو تین ہفتوں کی اور مہلت مانگ رہا ہے۔ خبر نہیں اُس کے ذہن میں کیا ہے لیکن مسئلہ حل ہوتا نظر نہیں آتا۔"

ابن یاشر نے کہا۔ "جناب! ایسے مسئلے مہینوں میں نہیں ساعتوں میں حل کئے جاتے ہیں۔ لوگ تو اب انتظامیہ کی بزدلی کا مذاق اُڑانے لگے ہیں۔"

خلیفہ نے کہا۔ "عبدالرشید سے ایک بار پھر بات کر لی جائے آخر اُس کے پاس وزارتِ داخلہ کا قلمدان ہے۔"

ابن یاشر تیزی سے بولا۔ "خلیفہ المسلمین! یہ صرف وزارت داخلہ کا معاملہ نہیں' میری وزارت بھی اس میں ملوث ہے۔ منگول قاصد آئے دن مجرم کی زندہ یا مردہ گرفتاری کا مطالبہ کرتے رہتے ہیں۔ وہ کیا کہیں گے کہ ڈھونڈنا تو درکنار ہم ہاتھ آئے مجرم پر ہاتھ نہیں ڈال رہے۔"

خلیفہ کو ابن یاشر کے یہ الفاظ کچھ ناگوار گزرے مگر وزیراعظم نے اس ناگواری کو محسوس کرتے ہوئے فوراً کہا۔ "امیرالمومنین! عبدالرشید کو بلا تو لیا جائے مگر اس سے فائدہ کچھ نہیں جذباتی صدمے نے اُس کی قوت فیصلہ بُری طرح متاثر کی ہے۔ وہ بالکل بچوں

کے انداز میں سوچ رہا ہے۔ ہو سکتا ہے بعد میں وہ خود بھی ہمارے فیصلے کو سراہے مگر اس وقت وہ ہرگز نہیں مانے گا۔"

خلیفہ مستنصر نے تھکے تھکے انداز میں کہا۔ "ٹھیک ہے جو بھی کرنا ہے کرو' مگر خوب غور و فکر کر لو۔ یہ پیش نظر رہے کہ وہ افراد جو مجرم کی قید میں ہیں اُن کی تمام امیدیں ہم سے وابستہ ہیں۔ ان کی جانوں کا تحفظ ہماری ذمے داری ہے۔ اگر انہیں کچھ ہوا تو ایک طوفان کھڑا ہو جائے گا۔"

ابن یاشر نے کہا۔ "امیرالمومنین! ہم نے کافی سوچ بچار کی ہے۔ ایک بڑا اچھا منصوبہ ہمارے ذہن میں ہے۔ میری حاصل کردہ معلومات کے مطابق مکان کے اندر موجود راشن آج رات یا کل کسی وقت ختم ہو جائے گا۔ اس کے بعد یقینی طور پر مجرم کی طرف سے راشن کی مانگ آئے گی اور یہ پہلا موقع ہو گا کہ باہر کے کسی آدمی کو مکان کے اندر جانے کا موقع ملے گا۔ ہمارے جو آدمی راشن لے کر جائیں گے وہ بغداد کی ڈھائی لاکھ فوج میں سے چوٹی کے جانباز ہوں گے۔ ان میں سے ہر ایک اپنی جگہ کسی بلا سے کم نہیں۔ اُن کے اندر داخل ہوتے ہی اردگرد موجود سپاہی بھی مکان میں گھس جائیں گے اور انشاء اللہ اُس موذی کو موقع پر ہی ٹکڑے کر دیا جائے گا۔"

جس وقت یہ باتیں ہو رہی تھیں قصرِ خلد سے آگے' دجلہ کے اس پار نہر کلثومیہ کے نیلوں کے دامن میں اُس چھوٹے سے مکان کے اندر اباقہ نے فاطمہ کے ہاتھ کھولے اور حسب معمول اسے کھانا تیار کرنے کا حکم دیا۔ فاطمہ اٹھی اور لڑکھڑاتی ہوئی دوسرے کمرے میں گئی۔ ذرا ہی دیر بعد وہ واپس آ کر اباقہ کو بتا رہی تھی کہ تمام کا تمام راشن ختم ہو چکا ہے۔

سورج طلوع ہو چکا تھا۔ بغداد کی وسیع و عریض چھاؤنی کا اندرونی منظر تھا۔ ایک جانب ایک چھوٹی سی چاردیواری تھی۔ چاردیواری کے اندر زمین پر گھاس بچھی تھی۔ وزیر خارجہ ابن یاشر اپنے دو ساتھیوں کوتوال شہر اور ناظم کے ساتھ وہاں موجود تھا۔ وہ تینوں آرام دہ نشستوں پر بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے کم از کم آٹھ چاق و چوبند سپاہی موجود تھے۔ ان سپاہیوں کے سخت گیر چہرے اور ورزشی جسم بتا رہے تھے کہ وہ کوئی بھی مشکل ترین کام کر گزرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ان سپاہیوں کی قیادت ایک "یک ہزاری" سردار کے سپرد تھی۔ وہ ان کے سامنے کھڑا انہیں مختلف ہدایات دے رہا تھا۔ دراصل یہ ساری تیاری اباقہ کے خلاف ہو رہی تھی۔ خلیفہ نے وزیر خارجہ ابن یاشر کو اس مہم کا نگران اعلیٰ مقرر کیا تھا اور اسے اجازت دی تھی کہ وہ یرغمالیوں کو چھڑانے لیے اپنی صوابدید کے مطابق جو

چاہے اقدامات کرے۔

یک ہزاری سردار کے اشارے پر سپاہیوں نے تلوارزنی اور دست بدست لڑائی کی مشق شروع کر دی۔ وزیر خارجہ بڑے انہماک سے یہ مظاہرہ دیکھ رہا تھا۔ جب کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ یہ بوڑھا مسلم بن داؤد تھا۔ اس کی آنکھوں میں غیر معمولی چمک دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے منہ وزیر خارجہ کے کان کے قریب کیا اور بولا۔

"وزیر محترم! خوراک کی مانگ آگئی ہے۔"

اس اطلاع پر ابن یاشر کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی۔ اس نے معنی خیز نظروں سے ناظم اور کوتوال کی طرف دیکھا اور پھر تینوں اٹھ کر ایک کمرے میں آگئے۔ یہ یک ہزاری سردار کا دفتر تھا۔ دیواروں پر مختلف نقشے اور جنگی ہتھیار آویزاں تھے۔ وہ تینوں نشستوں پر بیٹھ گئے۔ مسلم بن داؤد نے بھی اندر آکر چوتھی نشست سنبھال لی۔ اپنی خشخشی داڑھی کھجا کر وہ بولا۔

"محترم حضرات! ابھی نگران دستے کے کمان دار نے اطلاع دی ہے کہ مجرم نے خشک خوراک کا تقاضا کیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ دوپہر سے پہل ایک بورا گندم کا آٹا' نصف بورا خشک گوشت اور دو تھیلے پنیر کے مکان میں پہنچا دیے جائیں۔"

وزیر خارجہ نے پُر جوش لہجے میں ناظم سے کہا۔ "منصور! میں نے کہا تھا نا آج یا کل کسی وقت کام شروع ہو جائے گا۔"

"آپ کا اندازہ بالکل درست ہے وزیر محترم۔" ناظم منصور نے کہا۔ "اب ہمیں آپ کی ہدایات کی ضرورت ہے۔"

وزیر خارجہ اٹھ کر دیوار تک گیا۔ وہاں ایک سفید کاغذ پر اس نے سیاہی سے مکان کا خیالی نقشہ بنا رکھا تھا۔ ایک جگہ انگلی رکھتے ہوئے وہ بولا۔ "یہ وہ کمرہ ہے جہاں مجرم نے یرغمالیوں کو رکھا ہے اور جس کی دہلیز پر وہ ہروقت بیٹھا رہتا ہے۔ چونکہ یہ کمرہ کچھ بلندی پر ہے اس لیے وہ باآسانی مکان کی چار دیواری سے باہر کھیتوں پر نظر رکھ سکتا ہے۔ آپ جانتے ہیں اب تک اس نے ہم سے جو بھی گفتگو کی ہے وہ اس کمرے کی دہلیز پر کی ہے اور گفتگو کرنے والا مکان کی چاردیواری سے باہر کھڑا رہا ہے .... مگر آج پہلی بار اسے مکان کا بیرونی قفل کھولنا ہو گا تاکہ خوراک وصول کر سکے۔ جیسا کہ ہمارا منصوبہ ہے مجرم کے لئے خوراک لے کر جانے والے افراد ہمارے ماہر ترین چھاپہ مار ہوں گے اور وہ اندر داخل ہو کر مجرم پر قابو پانے کی کوشش کریں گے' لیکن یہاں میں آپ کے سامنے دو چیزوں کی وضاحت کر دینا چاہتا ہوں۔ ہم سب اس وقت ایک دستے کی طرح کام کر رہے

ہیں اس مہم کی ناکامی یا کامیابی کی صورت میں ہم سب متاثر ہوں گے لہٰذا ضروری ہے کہ ہمارے درمیان مکمل افہام و تفہیم ہو۔ پہلی بات تو یہ کہ میں کل مشہور چینی طبیب فانگ ہو سے ملا تھا۔ فانگ ہو نے اس لڑکی کی لاش کا معائنہ کیا تھا جو مکان کے اندر مجرم کے وار سے ہلاک ہوئی۔ فانگ ہو کا کہنا ہے کہ لڑکی کے سینے میں جو زخم لگا وہ زہر میں بجھی ہوئی تلوار کا تھا۔ یہ زہر انتہائی تیز ہے کہ اس کا ایک چر کا بھی ہلاکت کا سبب بن سکتا ہے لہٰذا ہمیں یہ بات ذہن میں رکھنا ہو گی کہ مجرم کے پاس جو تلوار ہے وہ زہر میں بجھی ہوئی ہے۔ دوسری بات جو کل سے میرے ذہن میں کھٹک رہی ہے' یہ ہے کہ ہو سکتا ہے کہ مجرم خوراک وصول کرتے ہوئے بھی ہوشیاری دکھا جائے۔ اب تک کے جائزے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ انتہائی چوکنا شخص ہے۔ خوراک وصول کرنے کے لیے وہ دو طریقے اختیار کر سکتا ہے۔ ایک تو یہ کہ وہ خوراک لانے والوں سے کہے کہ اسے برآمدے یا کمرے میں ڈھیر کر دیں۔ اس صورت میں تو ہمارے منصوبے کی کامیابی کا امکان ہے لیکن دوسرا طریقہ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ خوراک کو صحن میں ڈھیر کروا دے اور بعد میں جب ہمارے آدمی واپس چلے آئیں تو وہ یرغمالیوں سے کہہ کر اسے اندر رکھوالے۔ اگر اس نے یہ دوسرا طریقہ اختیار کیا تو کیا ہماری ساری منصوبہ بندی دھری نہیں رہ جائے گی۔"

مسلم بن داؤد نے کہا۔ "وزیر محترم! آپ کا کہنا بالکل بجا ہے۔ میرے ذہن میں بھی یہ خدشہ موجود تھا۔"

ابن یاشر نے زور دے کر کہا۔ "یہ امکان واقعی موجود ہے اور اس کا ایک حل بھی ہے۔ کیوں نہ ہم ایسا کریں کہ خوراک اٹھانے والے بھی ہمارے آدمی ہوں اور "خوراک" بھی ہمارے آدمی۔"

جلد ہی مسلم بن داؤد اس جملے کا مفہوم سمجھ گیا۔ وہ بے ساختہ بولا۔ "سبحان اللہ۔ آپ کی فراست مسلمہ ہے۔ آپ کا مطلب ہے کہ خوراک کے بوروں میں خوراک کی جگہ ہمارے سپاہی ہوں۔"

"بالکل۔" وزیر خارجہ نے کہا۔ "خشک گوشت کے نصف بورے میں اگر پنیر کے دو تھیلے بھی رکھ دیے جائیں تو اس کا حجم خاصا ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اس میں بھی ایک آدمی جا سکتا ہے۔ رہا یہ مسئلہ کہ باہر سے دیکھنے میں کسی کو شک نہ ہو تو اس کے لیے ہم بوروں میں روئی وغیرہ رکھ سکتے ہیں تاکہ بیرونی سطح ہموار نظر آئے۔"

ناظم منصور نے کہا۔ "وزیر محترم! ایک تجویز میری بھی ہے۔ اگر آپ کا یہ منصوبہ ہے تو پھر مجرم کو خوراک کی فراہمی رات کی تاریکی میں کی جائے تاکہ اسے بوروں کی

ساخت پر کوئی شبہ نہ ہو۔"

وزیر خارجہ نے قہر آلود نظروں سے نوجوان ناظم کی طرف دیکھا پھر غصے سے بولا۔ "منصور! تم ہمیشہ ایسی بات کرتے ہو جس سے تصدیق ہوتی ہے کہ تم اس عہدے پر غیر موزوں ہو .... وہ شخص جو اٹھارہ روز سے پانچ آدمیوں کو یرغمال بنائے بیٹھا ہے اتنا گدھا ہرگز نہیں کہ ہمیں رات کی تاریکی میں خوراک پہنچانے کی اجازت دے۔"

مسلم بن داؤد نے وزیر خارجہ کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔ "محترم وزیر آپ کا خیال سو فیصد درست ہے میرا تو اندازہ ہے کہ ان کی خوراک رات ہی سے ختم ہے مگر اس نے دن چڑھنے کا انتظار اس لیے کیا تھا کہ اس متوقع کارروائی سے بچ سکے .... ویسے میں اس حد تک جناب منصور کی تائید ضرور کروں گا کہ مجرم کو خوراک کی فراہمی شام تک ٹال دی جائے۔ میرا مطلب ہے اگر رات کی تاریکی نہیں تو شام کا جھٹپٹا ہی سہی۔"

وزیر خارجہ نے کہا۔ "ہاں اس حد تک کوشش ضرور کی جا سکتی ہے۔"

وزیر خارجہ کی سرزنش پر ناظم منصور کافی بوکھلا گیا تھا۔ خفت دور کرنے کے لیے اس نے بات بدلی۔ "وزیر محترم! میرا مقصد یہ تھا کہ مجرم اور یرغمالیوں کو خوراک کے بغیر آٹھ پہر ہونے کو آئے ہیں۔ اگر کسی طرح انہیں رات تک ٹال دیا جائے تو ہو سکتا ہے رات کسی پہر بھوک سے بیتاب ہو کر وہ خوراک وصول کرنے پر رضامند ہو جائے۔"

وزیر خارجہ برہمی سے بولا۔ "اور اگر رات تک اس جنونی نے کسی بدبخت کا سر کاٹ کر کھیتوں میں اچھال دیا تو خلیفہ کو جواب تم دو گے یا ناظم اعلیٰ صاحب خود ذلیل ہوں گے؟" ناظم ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔ ابن یاشر اسی لہجے میں بولا۔ "منصور لگتا ہے تم ابھی تک مجرم کو سمجھ نہیں سکے ہو۔ نہ ہی تم نے اس "بحران" پر سنجیدگی سے غور و فکر کیا ہے۔ ہماری یہی غیر سنجیدگی ہے جس کی رو سے ایک تنہا شخص ابھی تک ہمیں انگلیوں پر نچا رہا ہے۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ مکان کے سامنے موجود ہمارا نگران دستہ اٹھارہ روز میں کم از کم تین بار اندر داخل ہونے کی کوشش کر چکا ہے۔ ہر بار ان کا خیال تھا کہ مجرم اس وقت سو رہا ہو گا' لیکن وہ ہر دفعہ انہیں جاگتا ہوا ملا۔ جو شخص اٹھارہ روز جاگ کر یا اس طرح سو کر گزارا سکتا ہے کہ ذرا سی آہٹ پر جاگ جائے' اس سے تم یہ توقع کر رہے ہو کہ وہ چند پہر کی بھوک سے بے تاب ہو کر اپنی گردن تمہارے ہاتھ میں دے دے گا۔" ناظم ہونٹ کاٹ کر رہ گیا۔

وزیر خارجہ نے اپنی چوڑی اور گھنی مونچھوں کو تاؤ دے کر کہا۔ "میں تمہیں اس شخص سے ڈرا نہیں رہا اور نہ ہی میں خود خوف کھاتا ہوں ہاں میں ہر معاملے کو پوری

یدگی سے لیتا ہوں اور یہی وجہ ہے .... یہی وجہ ہے کہ میں اس مردود پر قابو پاؤں گا ر چیونٹی کی طرح مسل کر رکھ دوں گا۔"

کچھ دیر بعد چھاپہ ماروں کا کماندار بھی اپنے ماتحتوں کو مشق کرانے کے بعد اندر آگیا۔ وہ سب سر جوڑ کر اپنے منصوبے کو آخری شکل دینے میں مصروف ہو گئے۔

☆------☆------☆

دونوں لڑکیاں سہمی ہوئی ایک کونے میں بیٹھی تھیں۔ بھوک کی وجہ سے ان کے چہرے اُترے ہوئے تھے۔ زیادہ بُرا حال گرفتار شدہ امیروں کا تھا۔ نقاہت کی وجہ سے ان موٹے تازے امیروں کو بیٹھنا بھی دشوار ہو رہا تھا۔ وہ زمین پر نیم دراز تھے۔ اباقہ نے دہلیز پر بیٹھے بیٹھے ایک نظر پھر کھیتوں کی طرف دوڑائی۔ اسے دال میں کچھ کالا نظر آ رہا تھا۔ دوپہر کے وقت ایک غیر مسلح سپاہی نے چاردیواری کے پاس آ کر اسے اطلاع دی تھی کہ خوراک کے بارے ان کا پیغام شہر پہنچا دیا گیا ہے۔ اباقہ کو بہت طیش آیا تھا۔ وہ تو سمجھ رہا تھا کہ دوپہر تک خوراک پہنچ جائے گی اور یہاں ابھی صرف پیغام ہی پہنچا ہے۔ اس نے سرد لہجے میں سپاہی کو مطلع کیا تھا کہ سہ پہر تک مطلوبہ اشیاء پہنچ جائیں ورنہ نتائج کی ذمہ داری ان پر ہو گی اور اب شام ہونے کو آئی تھی۔ اباقہ کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کی نظر بار بار ایک امیر کے چہرے پر جم جاتی تھی۔ امیر بھی دیکھ چکا تھا۔ اباقہ اسے خونخوار نظروں سے گھور رہا ہے اس کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا ایک جا رہا تھا اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ وہ جانتا تھا اباقہ طیش کے عالم میں کچھ بھی کر سکتا ہے۔ حکام کو سبق سکھانے کے لیے وہ کسی کی گردن بھی کاٹ سکتا ہے۔ اسی لیے تھوڑی دیر بعد جب اباقہ اپنی جگہ سے اٹھا تو لڑکیوں سمیت دونوں امیروں کے چہرے دھواں دھواں ہو گئے۔ خاص کر اس امیر کے منہ سے تو ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

فاطمہ کے ہاتھ کھلے ہوئے تھے۔ وہ جلدی سے اپنے بچھونے کی طرف بڑھی اور اس کے نیچے سے روٹی کا ایک ٹکڑا نکال کر اباقہ کی طرف بڑھا دیا۔ اس کی لرزاں آواز ابھری۔

"یہ میں نے اپنے حصے سے بچایا تھا۔ اگر تمہیں زیادہ بھوک لگی ہے تو یہ کھا لو۔ مگر خدا کے لیے کسی کو کچھ نہ کہنا۔ کچھ دیر انتظار کر لو۔ میرے ابا جان خوراک ضرور بھجوائیں گے۔"

اباقہ نے روٹی کا ٹکڑا فاطمہ کو واپس کرتے ہوئے کہا۔ "کل کے لیے کیوں بچاتی ہو۔ کھا لو اسے۔ کیا معلوم کل تمہیں دیکھنا ہے یا نہیں۔"

فاطمہ کے ساتھ ساتھ باقی یرغمالیوں کی آنکھیں بھی خوف سے پھیل گئی ایک امیر

جس کا نام عباسی تھا بولا۔ "تمہارا مطلب ہے کہ تم ہمیں قتل کردو گے۔"

اباقہ گھمبیر لہجے میں بولا۔ "تمہیں تمہارے حکمران قتل کریں گے۔ اپنی بے وقوفی اور ہٹ دھرمی سے۔ شاید وہ اس وقت تمہاری موت کے پروانے کو آخری شکل دے رہے ہیں۔"

فاطمہ چیخ کر بولی۔ "نہیں۔ ابا حضور، ایسا نہیں ہونے دیں گے۔"

اباقہ کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ ابھری۔ "اگر تمہارے ابا حضور ایسا نہ ہونے دیں تو بڑی اچھی بات ہے، لیکن ایسا ہو گا نہیں۔"

فاطمہ نے ہکلا کر پوچھا۔ "تمہارا مطلب ہے کہ وہ لوگ حملہ کر دیں گے؟"

اباقہ نے کہا۔ "شاید........"

امیر عباسی تھرتھر کانپنے لگا۔ تھوک نگل کر بولا۔ "اباقہ! اس میں ہمارا کیا قصور ہے۔ ہم تو اس معاملے میں ثالثی کے لیے آئے تھے۔ خدا کے لیے ہمیں چھوڑ دو۔"

اباقہ بولا۔ "تمہارا سب سے بڑا قصور یہ ہے کہ تم اس شہر کے باأثر افراد میں شمار ہوتے ہو۔ ان ہی باأثر افراد میں سے کچھ بدباطنوں نے ایک روشن چراغ کا نور میری آنکھوں سے چھینا ہے اور کیا پتہ یہ ظلم تم ہی نے کیا ہو۔"

دوسرے یرغمالی امیر رحمٰن نے جب صورت حال کی سنگین کروٹ کو محسوس کیا تو وہیں بیٹھے بٹھائے اپنی تمام دولت اور جائیداد اباقہ کو دینے کی پیشکش کر دی۔ اباقہ نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"نہیں امیر عبدالرحمٰن۔ ایک پھوٹی کوڑی نہیں۔ کچھ نہیں چاہیے مجھے۔ اگر کچھ کر سکتے ہو تو مجھے اس پیشہ ور قاتل عبداللہ مشہدی کی شکل دکھا دو۔ میں تمہارے شہر سے روٹی کا ایک لقمہ اور پانی کا ایک گھونٹ لیے بغیر واپس چلا جاؤں گا۔"

.... عین اس وقت جب یہ باتیں ہو رہی تھیں نہر کلثومیہ کی طرف دو خچروں کے ساتھ تین آدمی اس مکان کی طرف بڑھ رہے تھے۔ خچروں پر دو بورے لدے تھے۔ آدمی بظاہر غیر مسلح تھے، لیکن ان کے کپڑوں میں چھوٹی تلواریں بڑی احتیاط سے چھپائی گئی تھیں۔ اس کے علاوہ ان کے پاس خنجر بھی تھے۔ یہ سارا لوہا زہر میں بجھا ہوا تھا۔ بوروں میں بھی آدمی تھے۔ ایک بورا کچھ بڑا تھا، لیکن دوسرا چھوٹا۔ چھوٹے بورے میں جو شخص تھا وہ اپنی زندگی کی سب سے بڑی مشکل میں گرفتار تھا .... اس کا نام مسلم بن داؤد تھا۔ بوڑھے داؤد کے ساتھ عجیب حادثہ ہوا تھا۔ سہ پہر کے وقت جب ابن یاشر کی زیر نگرانی یہ دو بورے تیار ہو رہے تھے، وزیراعظم بنفس تیاریاں دیکھنے کے لیے چھاؤنی پہنچ

گئے تھے۔ گندم کا بورا تو ٹھیک نظر آرہا تھا، لیکن دوسرا بورا کچھ بڑا بن گیا تھا۔ مجرم کے مطالبے کے مطابق اس میں نصف بورا خشک گوشت اور دو چھوٹے تھیلے پنیر کے تھے۔ اصولی طور پر اس بورے کو دوسرے بورے سے چھوٹا ہونا چاہئے تھا مگر دونوں بوروں میں ایک ہی قد کاٹھ کے سپاہی بند تھے۔ وزیراعظم نے اس خامی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ دوسرے بورے میں کوئی کوتاہ قد اور کم وزن شخص بھیجا جائے۔ چھاپہ ماروں میں ایسی وضع کا کوئی سپاہی نہیں تھا بلکہ پوری چھاؤنی میں ایسا منحنی آدمی ملنا دشوار تھا۔ اچانک وزیراعظم کو یاد آیا کہ خلیفہ کے سامنے مسلم بن داؤد نے دعویٰ کیا تھا کہ وہ کئی بار اباقہ سے دو بدو لڑ چکا ہے اور ڈٹ کر اس کا مقابلہ کرتا رہا ہے۔ بوڑھے داؤد کا جسم بھی منحنی سا تھا۔ وزیراعظم نے داؤد سے کہا کہ کیوں نہ وہ اس کارِ خیر میں حصہ لے۔ مسلم بن داؤد کا رنگ فق ہو گیا تھا۔ اباقہ سے لڑنا کجا وہ تو اس کے سائے سے بھی بدکتا تھا۔ کہاں وزیراعظم اسے بورے میں گھسنے کا مشورہ دے رہے تھے۔ وہ بوکھلا کر ابن یاشر کی طرف دیکھنے لگا۔ ابن یاشر کو خاموش دیکھ کر وزیراعظم بولے۔

"بھئی اگر مسلم بن داؤد نے مجرم کے بازو آزمار کھے ہیں تو اسے بھیجنے میں حرج ہی کیا ہے۔ دوسرے جوانوں کے حوصلے بھی اس کی موجودگی میں بلند رہیں گے۔" پھر وزیراعظم نے داؤد سے پوچھا تھا۔ "داؤد! تم تیار ہونا۔" داؤد کی آواز حلق میں پھنس گئی تھی۔ مشکل سے تھوک نگل کر بولا تھا۔

"کیوں نہیں .... کیوں نہیں وزیراعظم۔"

.... اور اب مسلم بن داؤد بورے میں بند اباقہ کی طرف جارہا تھا۔ منصوبہ یہ تھا کہ مکان کے صحن میں پہنچ کر انہیں بورے کے اندر سے گردو پیش پر نظر رکھنا تھی۔ اگر اباقہ بوروں کو صحن میں رکھواتا تو انہیں حرکت میں آنے کے لیے تیار رہنا تھا۔ جونہی اباقہ ان کے پاس پہنچتا انہیں تیز دھار خنجروں سے جو ان کے ہاتھ ہی میں تھے بوروں کو چاک کرنا تھا اور اباقہ پر حملہ آور ہونا تھا۔ یہ عمل دونوں نے ایک ساتھ کرنا تھا۔ دو چھوٹے چھوٹے بگل بھی ان دونوں کو دیئے گئے تھے۔ اباقہ سے لڑائی کا آغاز ہوتے ہی انہیں یہ خاص قسم کے بگل بجا دینا تھے تاکہ مکان سے باہر موجود مسلح سپاہی موقع کی طرف لپک سکیں۔

مسلم بن داؤد بورے کے اندر خچر کی پشت پر اوندھا لیٹا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں خنجر اور دوسرے میں چاندی کا چھوٹا سا منقش بگل تھا۔ اسے ایک فیصد امید بھی نہیں تھی کہ وہ یہ خنجر اور بگل استعمال کر سکے گا۔ خلیفہ کے سامنے ہانکی ہوئی بڑ اس کے لیے زندگی

کا کٹھن ترین امتحان بن گئی تھی۔ آخر اس نے مری مری آواز میں دستہ سالار کو پکارا۔
"کیا بات ہے؟" باہر سے درشت لہجے میں پوچھا گیا۔
"میری طبیعت خراب ہو رہی ہے۔" داؤد نے فریاد کی۔
"اب کچھ نہیں ہو سکتا۔" باہر سے آواز آئی۔ "محترم وزیر کا حکم ہے کہ راستے میں بورے ہرگز نہ کھولے جائیں۔ ویسے بھی ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔"

.... سورج ڈوب چکا تھا۔ مغرب میں شفق کی سرخی پھیلی ہوئی تھی۔ دونوں کھیتوں کے درمیان چلتے ہوئے مکان کے سامنے پہنچے اور رک گئے۔ اباقہ یہ سارا منظر کمرے کی دہلیز پر سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے گہری نظروں سے ان تینوں آدمیوں کا جائزہ لیا جو خچروں کے پیچھے کھڑے تھے۔ ان میں سے دو نے بغداد کے عام مزدوروں کی طرح سروں پر رومال باندھ رکھے تھے۔ تیسرا فوجی وردی میں تھا' لیکن یہ وہ نہیں تھا جو اس سے پہلے اباقہ سے گفتگو کرتا رہا تھا۔ اس نے آگے آ کر بلند آواز سے کہا۔
"اباقہ! تمہارا مطلوبہ سامان پہنچ گیا ہے۔ اتروالو۔"
سامان کا جائزہ لے کر اباقہ نے پوچھا۔ "پنیر کے تھیلے کہاں ہیں؟"
سپاہی نے جواب دیا۔ "وہ خشک گوشت کے ساتھ بورے میں ہیں۔"
"ٹھیک ہے۔" اباقہ نے کہا۔ "صدر دروازے کی چابی پھینک رہا ہوں۔ قفل کھول کر خچر اندر لے آؤ۔"

پھر اباقہ نے سپاہی کو دکھا دکھا کر چابی ہوا میں اچھال دی۔ وہ چاردیواری سے کوئی دس گز دور جا گری۔ چند ہی لمحے بعد دروازے پر کھٹ پٹ ہوئی اور وہ کھل گیا۔ اباقہ کمرے کی دہلیز پر اس طرح کھڑا تھا کہ اگر اچانک صحن سے اس پر کوئی خنجر وغیرہ پھینکا جاتا تو اسے کوئی نقصان نہ پہنچتا۔ زہر میں بجھی ہوئی تلوار وہ نیام سے باہر کر چکا تھا۔ تلوار کو نیام سے باہر دیکھ کر کمرے کے اندر یرغمالیوں کے چہرے اور بھی پھیکے پڑ گئے تھے۔ انہیں محسوس ہو رہا تھا کہ کچھ ہونے والا ہے۔ دونوں لڑکیوں نے گھٹنوں میں منہ چھپا رکھے تھے۔ امیر عباسی بلند آواز میں سورۃ یٰسین کے ورد میں مصروف تھا۔ امیر رحمٰن بار بار ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔ خچر صحن میں پہنچے تو اباقہ پکارا۔
"رک جاؤ۔ سامان وہیں اُتار دو۔"

اس نے دیکھا سپاہی کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ اس بدلنے والے رنگ نے اباقہ کو مزید چوکنا کر دیا۔ اس کے نتھنے غیر محسوس طور پر پھول گئے اور سفید آنکھیں تیزی سے حرکت کرنے لگیں۔ مزدوروں نے بورے خچروں سے اتار کر صحن میں رکھ

دیے۔ وردی والے سپاہی نے بلند آواز سے کہا۔
"اباقہ! سامان دیکھ کر پورا کر لو۔"
"ٹھیک ہے میں دیکھ لوں گا۔ تم اب واپس جاؤ۔"

تینوں آدمی چند ساعتوں کے لیے کھڑے رہے۔ پھر وہ واپس مڑے اور دروازہ کھول کر باہر نکل گئے۔ اباقہ دہلیز پر کھڑا انہیں جاتے دیکھتا رہا۔ جب وہ تقریباً سو گز دور نکل گئے تو اباقہ برآمدے سے ہو کر صحن میں آیا۔ چاردیواری سے سر نکال کر اس نے ایک بار پھر تینوں افراد کی طرف دیکھا۔ وہ صحیح سمت پر جا رہے تھے۔ دونوں بورے صحن میں دروازے کے قریب پڑے تھے۔ اباقہ بوروں کی طرف بڑھا۔ اس وقت اچانک ایک بورے میں حرکت پیدا ہوئی۔ اس سے پہلے کہ اباقہ کچھ سمجھتا۔ بورا پہلو سے چاک ہوا اور کوئی شخص حیرت ناک پھرتی سے اس کی طرف آیا۔ اباقہ کو ایک ساعت کی بھی دیر ہوتی تو تیز دھار خنجر اس کی گردن کاٹ جاتا۔ کچھ ایسی ہی چابکدستی تھی حملہ آور کے انداز میں۔ اباقہ اس شخص کی پھرتی پر حیران رہ گیا۔ وار خالی جاتے ہی وہ شخص تیزی سے پلٹا اور اب اس کے ہاتھ میں تلوار نظر آ رہی تھی۔ جھکائی دے کر اس نے اباقہ کی ناف پر وار کیا۔ اباقہ جلدی سے پیچھے ہٹا اور ایسا کرتے ہوئے وہ دوسری بوری سے ٹکرا گیا۔ نتیجے میں وہ پشت کے بل زمین پر گرا۔ اباقہ نے کمرے کے اندر سے لڑکیوں کی چیخیں سنیں۔ وہ جان چکی تھیں کہ خطرے کی گھنٹی بج اٹھی ہے۔ اباقہ کے نیچے گرتے ہی حملہ آور نے اس پر جست لگائی' لیکن جست لگانے سے پہلے اس نے کوئی چیز ہونٹوں سے لگائی اور بگل کی آواز نیم تاریک فضا میں پھیلتی چلی گئی۔ اباقہ نے تیزی سے کروٹ بدلی اور حملہ آور کی زد سے نکل گیا۔ حملہ آور نے گر کر اٹھنے میں جلدی نہیں کی اور یہ اس کے حق میں بہت اچھا ہوا۔ ورنہ اباقہ کی زہر آلود تلوار اس کی گردن اڑا دیتی۔ وار خالی جانے کے فوراً بعد اباقہ کو احساس ہوا کہ اُس کا مقابلہ عام سپاہیوں سے نہیں' یقیناً بغداد حکام نے اپنے خاص تربیت یافتہ جوانوں کو اس کے مقابل بھیجا تھا۔ اس وقت بیرونی دروازہ ایک دھماکے سے کھلا اور خچروں کے ساتھ آنے والے تینوں آدمی تلواریں سونتے اندر گھس آئے۔ ایک ساعت ضائع کیے بغیر انہوں نے اباقہ پر دھاوا بولا۔ بیک وقت تین تلواریں اباقہ کی تلوار سے ٹکرائیں۔ اباقہ تلوار چلاتا ہوا آہستگی سے پیچھے ہٹا۔ اُس وقت نیچے گرے ہوئے چوتھے شخص نے لپک کر اباقہ کی ران پر وار کیا۔ ایک انگارا سا ٹانگ کے گوشت میں اتر گیا۔ اباقہ پر یہ خوفناک انکشاف ہوا کہ حملہ آوروں کی تلواریں بھی زہرناک ہیں۔ چار زبردست شمشیرزن' زہر میں ڈوبی ہوئی چار تلواروں کے ساتھ' موت کے چار فرشتوں کی طرح اُسے گھیرے کھڑے

تھے۔ اباقہ کے تن بدن میں بجلیاں بھر گئیں۔ خطرے کے شدید احساس نے اسے سر تا پا قہر بنا دیا۔ اس نے پشت دیوار سے لگائی اور چاروں حملہ آوروں سے بھڑ گیا۔ ایک حملہ آور کے پیٹ سے اس کی تلوار کی نوک ٹکرائی تو اسے اندازہ ہوا کہ انہوں نے لباس تلے زرہ بکتر پہن رکھے ہیں۔ وہ چیخا۔

"بزدلو' لڑنے آئے تھے تو مردوں کی طرح آتے۔" پھر اس نے جھلا کر تلوار کا وار کیا تو ایک حملہ آور کی گردن شانوں سے صاف اڑ گئی پھر اس نے ناقابل یقین تیزی سے جھک کر ایک حملہ آور کا پاؤں ٹخنے پر سے کاٹ ڈالا۔ اس وقت اس نے دیکھا کہ دونوں امیر تیزی سے کمرے کی دہلیز پر آئے۔ ان کے پاؤں آزاد تھے۔ غالباً فاطمہ نے اپنے آزاد ہاتھوں کا فائدہ اٹھایا تھا اور ان دونوں کے پاؤں کھول ڈالے تھے۔ اباقہ نے انہیں فرار ہوتے دیکھا تو حملہ آوروں کو جھکائی دے کر دروازے کی طرف لپکا۔ امیر رحمٰن تو اسے دیکھ کر واپس کمرے میں گھس گیا مگر امیر عباسی تذبذب کے عالم میں وہیں کھڑا رہا۔ عقب سے ایک حملہ آور نے اباقہ پر خنجر پھینکا' جو نشانہ چوکنے سے امیر عباسی کے دل میں پیوست ہو گیا۔ ایک چیخ کے ساتھ وہ برآمدے میں آگرا۔ اباقہ نے مڑ کر حملہ آوروں کی طرف دیکھا تو اس کی نگاہ سامنے کھیتوں کی طرف اٹھ گئی۔ کم و بیش بیس تیرانداز اس کا نشانہ لے چکے تھے۔ اباقہ نے چھلانگ لگائی اور دہلیز پر سے ہٹ گیا۔ بیسیوں تیر سنسناتے ہوئے اس کے قریب سے گزر گئے۔ ابھی وہ اٹھنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ تیروں کی ایک اور باڑ آئی' پھر ایک اور باڑ اور پھر جیسے تیروں کی بارش شروع ہو گئی۔ ان گنت تیر کمرے کی دیواروں اور دروازے میں پیوست ہو گئے۔ اباقہ اپنی جگہ دبکا رہا۔ وہ جانتا تھا یہاں سے اٹھنے کی قیمت موت ہے۔ دفعتاً ایک لڑکی چلاتی ہوئی کمرے سے نکلی۔ نیم تاریکی کے باوجود' اباقہ پہچان گیا۔ یہ فاطمہ تھی۔ اباقہ نے لیٹے لیٹے اس کا پاؤں پکڑا اور وہ چیختی ہوئی زمین بوس ہو گئی۔ اباقہ کی آنکھوں سے درندگی جھلک رہی تھی۔ اس نے لڑکی کی گردن ایک ہاتھ سے پکڑی اور دوسرے ہاتھ میں تلوار ایک طویل خنجر کی طرح تھام لی۔ وہ پھنکارا۔

"تیرے باپ کے پاس تیری لاش واپس جائے گی۔"

فاطمہ نے زمین پر لیٹے لیٹے رحم طلب نظروں سے اباقہ کو دیکھا مگر اس کی آنکھوں میں انتقام کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ چہرہ پتھر کی طرح سخت تھا۔ اس نے تلوار بلند کی۔ فاطمہ نے جان بچانے کے فطری عمل کے تحت دونوں ہاتھ سامنے کر دیئے۔ اباقہ کی نگاہ اس کے مہندی لگے ہاتھوں پر پڑی اسے یاد آیا' ایک روز ماریتا نے بھی تو ایسے ہی مہندی لگائی تھی۔ ایسے ہی نقش و نگار اس کے ہاتھوں پر بھی تو کاڑھے گئے تھے۔ نہ جانے اس

وقت وہ خوبصورت ہاتھ کہاں ہوں گے۔ ان پر یہ نقش و نگار باقی بھی ہوں گے یا نہیں۔ دفعتاً اباقہ کے دل سے آواز آئی۔ "اباقہ! اس لڑکی کو چھوڑ دے یہ لڑکی بھی ماریتا کی طرح مظلوم ہے۔ اس کی جان بخش دے۔ شاید اس کے صدقے ہی تجھے تیری ماریتا بھی مل جائے۔" وہ خاموش نظروں سے لڑکی کی طرف دیکھتا رہا پھر تلوار نیچے کر لی۔

اُس نے سرگوشی میں لڑکی سے پوچھا۔ "امیر رحمٰن اور تیری سہیلی کہاں ہیں؟"

وہ سسکاری لے کر بولی۔ "دونوں مر گئے۔ ان کے جسم تیروں سے چھلنی ہیں۔"

اباقہ نے محسوس کیا کہ تیراندازی ایک دم رُک گئی ہے۔ برآمدے میں خشک بھوسے کا ایک ڈھیر تھا اور وہ دونوں اس وقت وہاں چھپے ہوئے تھے۔ عارضی طور پر یہ جگہ چھپنے کے لئے نہایت موزوں تھی۔ اباقہ نے صحن میں نگاہ دوڑائی تاریکی اب کافی گہری ہو گئی تھی۔ باقی ماندہ دو حملہ آور بھی نظر نہیں آ رہے تھے۔ چاروں طرف ایک گہری خاموشی طاری تھی۔ پھر اچانک خاموشی کا یہ طلسم ٹوٹ گیا۔ ایک قریبی ستون کے عقب سے دونوں حملہ آور برآمد ہوئے اور تیزی سے کمرے کی طرف بڑھے۔ ان کی پھرتی دیدنی تھی مگر اباقہ وہاں ہوتا تو انہیں ملتا۔ جونہی حملہ آور اندر گھسے اباقہ نے لپک کر دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ پھر اس نے ایک ہاتھ میں فاطمہ کا بازو پکڑا اور تیزی سے صحن میں آیا۔ ایک لمحے کے لئے اس کی نگاہ خشک گوشت اور پنیر کی بوری کی طرف گئی۔ اس نے ایک ہاتھ سے ہلکورا دے کر بوری کمر پر لاد لی۔ کمرے کے اندر اب دروازہ بُری طرح پیٹا جا رہا تھا۔ اباقہ فاطمہ کے ساتھ بیرونی دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنا توانا بازو فاطمہ کی نازک گردن میں حمائل کر رکھا تھا۔ پھنکار کر بولا۔ "اگر آواز نکالو گی تو گردن توڑ دوں گا۔"

بیرونی دروازے کے باہر بھاگتے قدموں کی آوازیں بتدریج قریب آ رہی تھیں۔ یہ تیراندازوں کا وہ دستہ تھا جنہوں نے کمرے کے دروازے پر تیروں کی بوچھاڑ کی تھی۔ جونہی یہ افراد بھاگتے ہوئے اندر گھسے اباقہ نے فاطمہ کو لیا اور باہر نکل آیا۔ کھیتوں میں تاریکی تھی مگر دور کچھ روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ یہ روشنیاں مشعل بردار گھڑسواروں کی تھیں جو اپنے چھاپہ ماروں کی کارکردگی دیکھنے کے لئے تیزی سے مکان کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اباقہ ان کے پہنچنے سے پہلے ٹیلوں میں داخل ہو جانا چاہتا تھا۔ اس کی کمر پر لدے ہوئے بورے میں بوڑھا مسلم بن داؤد تھا جو دیر ہوئی بے ہوش ہو چکا تھا۔

☆ ------ ☆ ------ ☆

خلیفہ مستنصر کا چہرہ غصے سے تمتما رہا تھا۔ ابن یاشر سر جھکائے اس کے سامنے کرسی

پر بیٹھا تھا۔ وزیراعظم بھی خاصا ملول نظر آ رہا تھا۔ خلیفہ نے سخت لہجے میں ابن یاشر سے کہا۔ "ابن یاشر! تُو تو کہتا تھا میں چند گھڑی میں اس کو مرے ہوئے کتے کی طرح کھینچ کر آپ کے قدموں میں لے آؤں گا۔ کہاں ہے تمہارا وہ مرا ہوا کتا۔ میں نے تو سنا ہے کہ موقعے پر بے گناہ یرغمالیوں اور تمہارے سورماؤں کی لاشیں پڑی ہیں۔ کیا اسی وقت میں نے تمہیں ڈرایا نہیں تھا؟"

ابن یاشر نے کہا۔ "امیرالمومنین! سارا کام صرف ایک شخص کی وجہ سے خراب ہوا۔ جناب وزیراعظم کی ہدایت پر ہم نے مسلم بن داؤد کو بھی چھاپہ مار دستے کے ساتھ روانہ کیا تھا۔ اس نے منصوبے کے مطابق بروقت حرکت نہیں کی اور بورے میں چھپا بیٹھا رہا۔ مجرم نے موقعے سے فائدہ اٹھا کر پانسا پلٹ دیا۔"

الزام وزیراعظم پر آیا تھا اس لیے اس نے ابن یاشر کو گھور کر کہا۔ "یاشر تم مسلم بن داؤد کو مجھ سے بہتر جانتے تھے اگر وہ اس قابل نہیں تھا تو تم اسی وقت اعتراض کر دیتے۔"

خلیفہ نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "بات یہ نہیں ہے۔ میرے خیال میں وہ منصوبہ، منصوبہ ہی نہیں جو ایک شخص کی بے عملی کی وجہ سے تباہ ہو کر رہ جائے۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ یہ ایک نازک معاملہ ہے اس کے ہر پہلو پر اچھی طرح غور کر لو اس وقت تم نے میری بات سنی تھی؟"

ابن یاشر نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ باہر سے شوروغل کی آوازیں آنے لگیں۔ خلیفہ کے اشارے پر ایک مؤدب خادم نے دریچے سے باہر جھانکا۔ شوروغل کی آواز تیز ہو گئی تھی۔ یوں لگتا تھا لوگوں کا ایک انبوہ نعرہ زنی کر رہا ہے۔ خادم نے جائزہ لینے کے بعد کہا۔ "امیرالمومنین! سو ڈیڑھ سو آدمی نہر کلثومیہ پر پیش آنے والے حادثے پر اظہار افسوس کر رہے ہیں۔"

خلیفہ کے حکم پر خادم نے دریچہ بند کر دیا۔ سوچ کی گہری لکیریں اس کی پیشانی پر پھیل رہی تھیں۔ وزیر کھنکار کر بولا۔

"امیرالمومنین، اس پورے سانحے میں ایک ہی اطلاع حوصلہ افزا ہے اور وہ یہ کہ عبدالرشید کی بیٹی فاطمہ ابھی زندہ ہے۔"

خلیفہ نے کہا۔ "اور کیا یہ حقیقت حوصلہ شکن نہیں کہ اس کے زندہ رہنے میں ہماری کارروائی کا کوئی دخل نہیں؟ مجھے یہ سوچ کر شرم محسوس ہو رہی ہے کہ کچھ ہی دیر بعد اس ناکامی کی خبر پورے بغداد میں پھیل جائے گی۔"

وزیراعظم نے تسلی دینے کے لیے کہا۔ "امیرالمومنین، ہمارے سپاہی مسلسل مجرم کے تعاقب میں ہیں۔ ہو سکتا ہے جلد ہی کوئی اچھی خبر آ جائے۔"

..........جس وقت قصر خلد کی روشنیوں میں یہ باتیں ہو رہی تھیں، نہر کلثومیہ کے پار ٹیلوں کی مدھم چاندنی میں اباقہ فاطمہ کے ساتھ چلتے چلتے اچانک رک گیا۔ اسے بڑی دیر سے ایک شبہ سا ہو رہا تھا۔ اس نے بورا کمر سے اتار کر نیچے رکھا اور غور سے اسے دیکھنے لگا۔ پھر اس نے تلوار نکالی اور بورے کا منہ باندھنے والی رسی کاٹ ڈالی۔ فاطمہ بے سدھ ہو کر اونچی گھاس میں بیٹھ گئی۔ اس کا خیال تھا کہ اباقہ کو بھوک نے ستایا ہے اور اب وہ بورے سے کھانے کی کوئی چیز نکالے گا۔ اس وقت خشک گوشت کا ایک ٹکڑا یا تھوڑا سا پنیر ان کے جسموں میں نئی زندگی دوڑا سکتا تھا۔ اباقہ نے بورے میں ہاتھ ڈالا اور دفعتاً پیچھے ہٹا لیا۔ فاطمہ نے محسوس کیا کہ بورے میں خوراک کی بجائے کچھ اور ہے۔ اباقہ نے بورے کو نیچے سے پکڑا اور ایک جھٹکے سے الٹا دیا اندر سے ایک انسانی ہیولا برآمد ہوا اور دھم سے گھاس پر گرا۔ کسی سانپ کی طرح اس نے کنڈلی مار رکھی تھی۔ زمین پر گر کر اس کے منہ سے ہلکی سی کراہ نکل گئی۔ اباقہ غور سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جیسے اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہے۔ پھر اس کے ہونٹوں سے سرسراتی آواز نکلی۔ "مسلم بن داؤد!"..........

مسلم بن داؤد کے ایک ہاتھ میں ابھی تک خنجر تھا۔ اباقہ نے یہ خنجر اس کی بند مٹھی سے نکال لیا۔ ایک دو آہیں بھر کر بوڑھے داؤد نے آنکھیں کھول دیں۔ کچھ دیر وہ خالی نظروں سے آسمان کو تکتا رہا۔ پھر اس کی نظر اباقہ پر پڑی مگر اس کے چہرے پر کوئی تاثر نظر نہیں آیا۔ شاید وہ اسے خواب سمجھ رہا تھا۔ اس نے کسمسا کر کروٹ بدلی، پھر واپس مڑ کر اباقہ کی طرف دیکھا اور دفعتاً اس کے چہرے پر دنیا جہان کا خوف سمٹ آیا۔ آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں اور چھوٹی سی داڑھی بے خیالی میں مسلسل ہلتی جا رہی تھی۔ اس نے ایک چیخ ماری اور اٹھ کر مخالف سمت میں بھاگا۔ چند قدم بھاگ کر ٹھوکر کھائی اور پتھروں پر گرا۔ گرتے ہی پھر اٹھا اور ایک خطرناک ڈھلوان پر چڑھنے لگا۔ تین چار گز اوپر گیا ہو گا پھسل کر نیچے آ گیا۔ مگر ارادے کا پکا تھا پھر زور لگا کر اوپر چڑھنے لگا۔ چار گز کی بلندی سے اسے پھر اوندھے منہ پھسل کر نیچے آنا پڑا۔ نہایت ہراس کے عالم میں داؤد نے یہ عمل تین بار دوہرایا۔ پھر ایک نظر فاطمہ اور اباقہ کی طرف دیکھا۔ اباقہ اپنی جگہ بے حرکت بیٹھا تھا۔ داؤد نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی اور اباقہ کے بالکل پاس سے گزرتا ہوا دوسری سمت میں بھاگ کھڑا ہوا، لیکن ادھر بھی ٹیلے تھے۔ تب اباقہ اپنی جگہ سے کھڑا ہوا اس کے ہاتھ میں مسلم بن داؤد کا خنجر تھا۔ بوڑھا ٹیلے پر چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا اور اس کے حلق سے

لگاتار ڈری آوازیں نکل رہی تھیں۔ اس طرف ڈھلوان زیادہ عمودی نہیں تھی۔ بوڑھا کوئی دس گز اوپر پہنچ گیا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ ٹیلہ پار کر کے دوسری طرف اترتا اباقہ نے خنجر والا ہاتھ لہرایا اور بوڑھے کی طویل چیخ سناٹے کو چیر گئی۔ وہ ہاتھ پاؤں چلاتا بلندی سے نیچے گرا اور اباقہ کے قدموں میں پہنچ گیا۔ وہ ایسے تڑپ رہا تھا جیسے جان کنی کا عالم طاری ہو' لیکن خنجر اس کی پنڈلی میں لگا تھا۔ اباقہ نے خنجر نکالا اور اس کی شہ رگ پر رکھ دیا۔ داؤد کے منہ سے ناقابل فہم آوازیں نکلنے لگیں۔ کبھی وہ تڑپنے لگتا اور کبھی تڑپنا چھوڑ کر ہاتھ جوڑنے لگتا۔

اباقہ خونخوار لہجے میں بولا۔ "بتا مسلم بن داؤد۔ اپنے جرم خود ہی بتا۔ تُو نے اب تک میرے ساتھ جو کچھ کیا ہے۔ بتا سب کچھ۔"

مسلم بن داؤد کے حلق سے مرغی جیسی آواز نکلی۔ وہ کپکپاتا ہوا بولا۔ "اباقہ! میں نے تیرے ساتھ بہت ظلم کیے ہیں۔ میں تیرا گناہ گار ہوں۔ مجھے معاف کر دے۔"

اباقہ غرایا۔ "میں نے تجھ سے تیرے جرم پوچھے ہیں"

بوڑھا منمنایا۔ "میرے جرائم بے حساب ہیں اباقہ۔"

اباقہ نے کہا۔ "جتنے بھی ہیں بتا۔"

بوڑھا لرزاں آواز میں بولا۔ "میرا سب سے پہلا جرم تو یہ ہے کہ میں نے تجھ سے جھوٹا وعدہ کیا اور مارینا کا لالچ دے کر تجھے چین کی مہم پر بھیجا .... میرا دوسرا جرم یہ ہے کہ میں نے ہینڈا اس کے ہاتھوں تجھے قتل کرانے کی کوشش کی۔ میرا تیسرا جرم یہ ہے کہ میں نے خلیفہ وقت کے دربار میں تجھ پر جاسوسی کی تہمت لگائی ...." یہاں تک کہہ کے داؤد خاموش ہو گیا۔

"آگے بتا.......... آگے بتا۔" اباقہ غرایا۔

داؤد رو دینے والے لہجے میں بولا۔ "میرا چوتھا جرم یہ ہے کہ میں نے زبیدہ نامی کنیز کو مارا اور مارینا کو اغوا کرانے کی سازش کی۔"

"اس سے پہلے ناظم اعلیٰ کے ساتھ مل کر معصوم یاکی کی عزت لوٹنے کا منصوبہ تیرے باپ نے بنایا تھا؟"

اباقہ دھاڑا۔

"ہاں اس میں بھی میں شریک تھا۔"

"ہاں آگے بول۔"

"پھر میں نے مارینا کو طوطم خان کے حوالے کرا دیا اور یہ جھوٹی خبر پھیلائی کہ اس

نے خودکشی کر لی ہے۔ اس کے بعد .... اس کے بعد میں نے کچھ نہیں کیا اباقہ۔"

"اس کے بعد تُو نے کچھ نہیں کیا؟" اباقہ نے پوچھا۔

"کچھ نہیں کیا۔" داؤد ہاتھ جوڑ کر بولا۔

"اور یہ جو تو بورے میں سے برآمد ہوا ہے' یہ جہنم میں جا رہا تھا؟"

داؤد ہکلایا۔ "مجھے زبردستی بھیجا گیا ہے اباقہ۔ خدا کی قسم اس میں میری مرضی نہیں تھی۔"

اباقہ خونخواری سے بولا۔ "مسلم بن داؤد! تُو بھول رہا ہے' لیکن میرا حافظہ کمزور نہیں۔ تیرا سب سے پہلا جرم یہ ہے کہ تُو نے قراقرم میں میرے بازو پر کندہ تحریر دیکھی اور اس سے چنگیز کے بیٹے تولائی خاں کو آگاہ کر دیا۔ میری مصیبتوں کا آغاز یہیں سے ہوا تھا داؤد۔ صرف تیری اس غداری پر میں تیرے جسم کو دس بار ٹکڑے کر سکتا ہوں لیکن میں تجھے اتنی جلدی نہیں ماروں گا۔ اسی طرح تڑپاؤں گا جس طرح تُو نے مجھے تڑپایا ہے۔" اباقہ کی آنکھیں مدھم چاندنی میں ہیروں کی طرح چمک رہی تھیں۔

مسلم بن داؤد نے کانپتے ہاتھ سے خنجر اپنی شہ رگ سے ہٹایا اور بولا۔ "اباقہ مجھے چھوڑ دے۔ بخدا میں تجھے مالا مال کر دوں گا۔ اتنا کچھ دوں گا کہ تُو تصور بھی نہیں کر سکتا۔"

"کیا دے گا تُو مجھے؟" اباقہ نے پوچھا۔

مسلم بن داؤد نے کہا۔ "میرے پاس جو کچھ ہے تُو لے لے۔ چار صندوق اشرفیوں اور قیمتی پتھروں سے بھرے ہوئے میرے پاس رکھے ہیں۔ دربار خلافت سے وقتاً فوقتاً ملنے والے تحائف ہیں جن کی مالیت لاکھوں تک پہنچتی ہے۔ بغداد کی انتہائی حسین ترین کنیزیں میری ملکیت ہیں۔ میں ان میں سے تین ایسی حسین لڑکیاں تجھے دوں گا کہ تیری راتیں ہفت رنگ ہو جائیں گی۔ بخدا تو .... تُو مارینا کو بھی بھول جائے گا۔ مجھے میرے ساز و سامان میں سے صرف ایک مصلّے اور ایک تسبیح کی ضرورت ہے۔ میں سب کچھ چھوڑ کر جنگلوں میں چلا جاؤں گا۔"

اباقہ نے خنجر دوبارہ مسلم بن داؤد کی گردن پر رکھ دیا اور دانت پیس کر بولا۔ "منحوس بڈھے! یہ ساری دولت تیری جان نہیں بچا سکتی بلکہ اس سے دس گنا دولت بھی ہوتی تو میں تجھے زندہ نہ چھوڑتا۔ باقی رہی مصلّے اور تسبیح کی بات' تو تُو مصلّے پر بیٹھ کر بھی سازشیں سوچے گا اور تسبیح کے دانوں پر بھی تجھے منصوبے سوجھیں گے۔ میں تیری فطرت سے آگاہ ہوں مسلم بن داؤد۔"

اباقہ نے اس کی گردن پر خنجر کا دباؤ بڑھایا تو وہ چیخ اٹھا۔ شاید سمجھ رہا تھا کہ ذبح

ہونے کا وقت آ گیا۔ اباقہ نے کہا۔ "نہیں داؤد! ابھی نہیں پہلے تُو مجھے یہ بتائے گا کہ تُو یہاں کیسے پہنچا ہے اور تیرے ساتھ اس سازش میں اور کون کون شریک تھا۔"

داؤد گڑگڑایا۔ "اگر میں سب کچھ سچ سچ بتادوں تو تُو مجھے معاف کردے گا۔"

داؤد ایک بار پھر منتیں ساجتیں کرنے لگا۔ ساتھ ساتھ وہ اپنی آمد کا احوال بھی سناتا جارہا تھا۔ اس نے کم و بیش سب کچھ سچ سچ بتا دیا۔ سوائے اس کے کہ اس نے وزیر خارجہ کو اس بات سے آگاہ کیا تھا کہ اباقہ شراب فروش کے گھر چھپا ہوا تھا۔ وزیر خارجہ ابن یاشر کے متعلق سن کر اباقہ کے جبڑے بھنچ گئے۔ داؤد کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس ساری کارروائی کا کرتا دھرتا وہی ہے۔ اس سے پہلے ماریا کے اغوا کی سازش بھی داؤد نے اسی کے ساتھ مل کر تیار کی تھی۔

اباقہ کی زندگی میں ایک بار پھر درندگی اور سرکشی کی جھلک دکھائی دینے لگی......... وہ داؤد سے کرید کرید کر ابن یاشر کے متعلق سوالات پوچھنے لگا۔ مثلاً یہ کہ یاشر اپنے محل میں کس وقت موجود ہوتا ہے۔ وہ سوتا کس وقت ہے۔ محل کا نقشہ کیا ہے۔ اس کی خواب گاہ کے قریب کتنے پہریدار موجود ہوتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ فاطمہ ایک طرف سمٹی سمٹائی بیٹھی حیرت سے یہ باتیں سن رہی تھی۔

☆------☆------☆

اسد اللہ ایرانی علاقے میں سفر کرتا ہوا مشہد کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اس کے ساتھ پچاس سواروں کا ایک دستہ تھا۔ اس کے علاوہ وہ دو عدد روسی جانباز تھے جو وقت رخصت مائیکل نے اس کے ساتھ کر دیے تھے۔ تاتاری دستوں کے ساتھ مڈبھیڑ سے بچنے کے لیے وہ بستیوں سے ہٹ کر سفر کر رہے تھے۔ مشہد سے کوئی تین منزل دور انہوں نے ایک رات ایک چھوٹے سے گاؤں میں قیام کیا۔ گاؤں کے قریب ہی ایک کشادہ جگہ انہوں نے خیمے لگا دیے۔ وہ سب کے سب عام دیہاتی لباس میں تھے۔ گاؤں میں پتہ چلا کہ ایک قافلہ اترا ہے تو لوگ مختلف اشیاء بیچنے کے لیے آنے لگے۔ رات جب انہوں نے کھانا کھا لیا تو ایک رقاصہ اپنے سازندوں کے ساتھ آ دھمکی۔ وہ ان کے سامنے رقص کرنا چاہتی تھی مگر اسد اللہ نے اسے منع کر دیا۔ رقاصہ کے اصرار پر اسد نے صرف اتنی اجازت دی کہ وہ انہیں کوئی نغمہ سنا دے۔

نوخیز نیشاپوری رقاصہ نے اٹھلا کر پوچھا۔ "کوئی پرانا نغمہ یا تازہ؟"

اسد کے ایک ساتھی نے کہا۔ "اپنی طرح تازہ سناؤ۔"

رقاصہ نے سازندوں کو اشارہ کیا۔ انہوں نے ساز چھیڑے۔ رقاصہ کی مدھر آواز فضا

میں ابھری۔ وہ ایک پُرسوز فارسی گیت گا رہی تھی۔ اس کے بول کچھ یوں تھے۔

میں داستانوں کی شہزادی نہیں۔
لیکن میں ایک دیو کی قید میں ہوں۔
میں گزارا ہوا وقت نہیں۔
مگر واپس آنے سے معذور ہوں۔
میں غار میں اگا ہوا وہ پھول ہوں۔
جس نے کبھی نیلا آسمان نہیں دیکھا۔
میں سمرقند کی تتلی
قراقرم کی مٹھی میں ہوں
میرا سانس گھٹ رہا ہے۔
اے ہوا مجھے ڈھونڈ لے۔

.... گیت ختم ہو گیا مگر اسد کے سارے جسم میں ایک عجیب سی سنسناہٹ چھوڑ گیا۔ اس نے رقاصہ سے پوچھا یہ پُر درد گیت اس نے کہاں سے سنا۔ رقاصہ نے اپنے ایک سازندے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اس کا نام رضا ہے۔ یہ شاعری بھی کرتا ہے۔ اس نے یہ گیت لکھا ہے۔"

اسد نے نوجوان شاعر سے مخاطب ہو کر کہا۔ "بھئی! بہت خوب گیت لکھا ہے تم نے۔ بہت درد ہے اس میں۔"

نوجوان شاعر نے اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے عرض کیا۔ "حضور اس گیت میں درد اس لیے ہے کہ اس میں سچائی ہے۔"

"کیا مطلب؟" اسد کے ایک ساتھی نے پوچھا۔

شاعر نے کہا۔ "یہ کوئی زیادہ پرانی بات نہیں۔ آج سے کوئی ایک ماہ پہلے میں دس بارہ کوس دور ایک قصبے میں گیا تھا۔ ہم سات آٹھ مسافر قصبے کی سرائے میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ اس رات بڑی بارش ہو رہی تھی۔ سردی بھی اپنے عروج پر تھی۔ کوئی نصف رات کا عمل ہو گا جب کسی نے سرائے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ ہم سب اٹھ بیٹھے۔ سرائے کے مالک نے دروازہ کھولا۔ باہر ایک بوڑھا شخص کھڑا تھا۔ اس کا پھٹا پرانا لباس بارش میں بری طرح بھیگا ہوا تھا۔ وہ نہ جانے کہاں کہاں کی خاک چھانتا یہاں تک پہنچا تھا۔ حلیے سے کوئی بھٹکا ہوا شکاری لگتا تھا۔ سرائے کا مالک اسے اندر لے آیا۔ بوڑھے کو شدید بخار تھا۔ اسے ہم نے خشک کپڑے دیے اور سردی دور کرنے کے لیے آگ جلائی۔ بوڑھے کی حالت

خاصی تشویشناک تھی۔ وہ کھینچ کھینچ کر سانس لے رہا تھا۔ ہمارے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ شمالی پہاڑوں سے آیا ہے۔ اس نے کہا۔

"میں نے ان پہاڑوں میں ایک حسین لڑکی کو دیکھا ہے۔ وہ ایک نہایت طاقتور اور سخت دل منگول کی قید میں ہے اس لڑکی نے مجھ سے درخواست کی تھی کہ میں اس کی قید کا حال کسی بستی کے مکینوں تک پہنچا دوں۔ میں نے دل میں اپنی اس بیٹی سے عہد کیا تھا کہ اس کی خواہش ضرور پوری کروں گا۔ میں نے مشہد کا ارادہ کیا لیکن راستے میں بیمار پڑ گیا۔ بیماری کے باوجود گرتا پڑتا یہاں تک پہنچا ہوں۔"

اسی رات پچھلے پہر بوڑھا انتقال کر گیا۔ صبح تک اس کی سنائی ہوئی کہانی پوری بستی میں گردش کرنے لگی۔ مجھے بھی اس کہانی نے بہت متاثر کیا اور اس میں نے یہ گیت لکھا۔"

نوجوان شاعر کی بات سن کر اسد کی بے چینی میں زبردست اضافہ ہو گیا۔ اس نے پوچھا۔ "نوجوان! کیا تُو اس لڑکی کا نام بتا سکتا ہے۔"

نوجوان نے کہا۔ "بوڑھے نے اس کا نام بتایا ضرور تھا لیکن میرے ذہن سے اتر گیا ہے۔ بہر حال اس قصبے میں کئی لوگوں کو یہ نام معلوم ہو گا۔"

اسد نے پوچھا۔ "بوڑھے نے اس جگہ کی نشاندہی کی تھی۔ جہاں وہ لڑکی قید ہے۔"

نوجوان نے کہا۔ "بالکل کی تھی بلکہ اس نے زمین پر لکیریں کھینچ کر بھی سمجھایا تھا۔ یہ ساری باتیں سرائے کے مالک کو معلوم ہیں۔"

اسد اسی وقت اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ اس نے نوجوان شاعر سے کہا۔ "رضا! تم نے ہمیں نہایت اہم اطلاعات دی ہیں۔ اب تھوڑی سی تکلیف اور کرو۔ تمہیں میرے ساتھ اسی وقت اس قصبے تک چلنا ہو گا۔"

..........اگلے روز صبح کے وقت اسد کا دستہ طوفانی رفتار سے شمالی پہاڑوں کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ وہ اڑ کر یہ سفر طے کر لیتا۔ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ غار میں قید وہ لڑکی ماریا ہی ہے اور اسے زنجیر کرنے والا وہی بدبخت طوطم خاں ہے۔

☆-----☆-----☆

دوسرے روز ٹھیک دوپہر کے وقت وہ اپنی منزل پر پہنچ چکے تھے۔ یہ سرسبز پہاڑی علاقہ تھا۔ پرندے اور چھوٹے موٹے جانور بھی کثرت سے تھے۔ اس کے باوجود انسانی آبادی کہیں دکھائی نہیں دیتی تھی۔ اس علاقے میں انہیں ایک ایسی پہاڑی تلاش کرنا تھی جس کی چوٹی دیکھ کر ایسے لگتا ہو کہ کسی چڑیا کے بچے نے دانہ لینے کے لیے منہ کھول رکھا

ہے۔ یہ نشانی اسد کو اس سرائے کے مالک نے بتائی تھی۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ اس سے پہلے من چلے نوجوانوں کی ایک ٹولی اس لڑکی کی تلاش میں روانہ ہوئی تھی لیکن چند روز بعد ہی وہ مایوس ہو کر واپس لوٹ آئے تھے۔

اسد نے اپنے ساتھیوں کو دو دو تین تین کی ٹولیوں میں مختلف اطراف میں پھیلا دیا اور شام کے وقت ایک مقررہ جگہ ملنے کی ہدایت کی۔ دن ڈھلے تک وہ مطلوبہ چوٹی تلاش کرتے رہے۔ شام کو وہ ملے تو کسی کی طرف سے حوصلہ افزا خبر نہیں آئی۔ اگلے روز پھر تلاش شروع ہوئی۔ اسد نے ویران ٹیلوں میں ایک تنہا شخص کو دیکھ لیا۔ وہ اپنے دس ساتھیوں کے ساتھ گھوڑے بھگاتا اس شخص تک پہنچا اور اسے دیکھتے ہی وہ سمجھ گیا کہ یہی طوطم خاں ہے۔ اس سے پہلے اس نے طوطم خاں کی ایک جھلک دیکھی تھی۔

طوطم خاں بھی گہری نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ اسد اور اس کے ساتھیوں کے جسموں پر سادہ لباس تھے اور انہوں نے اپنے چہرے پگڑیوں میں چھپا رکھے تھے۔ دیکھنے میں وہ روزگار کی تلاش میں نکلے ہوئے مسافر یا ڈاکو لگتے تھے۔ اپنے سامنے اتنے آدمی دیکھ کر بھی طوطم خان کے چہرے پر مطلق خوف نظر نہیں آیا۔

اسد نے پوچھا۔ "کون ہو تم؟"

طوطم خان اطمینان سے بولا۔ "یہی سوال تم سے میرا بھی ہے۔"

اسد نے کہا۔ "ہم مسافر ہیں روزگار کی تلاش میں مشہد جا رہے ہیں۔"

طوطم خاں انہیں ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھتا رہا۔ شاید سوچ رہا تھا کہ اگر یہ مسافر ہیں تو اِدھر کیسے آنکلے ہیں۔ اسد نے اس کی الجھن بھانپ کر کہا۔ "ہم کل سے راستہ بھٹکے ہوئے ہیں لیکن تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

طوطم اعتماد سے بولا۔ "میں یہاں کچھ بھی کر رہا ہوں، تم سے مطلب نہیں، لیکن میں تمہیں ایک عارضی روزگار ضرور فراہم کر سکتا ہوں۔"

"کیا مطلب؟" اسد نے پوچھا۔

طوطم نے بے تکلفی سے کہا۔ "گھوڑے سے نیچے اترو تو کچھ بات کریں۔"

اسد اور اس کے ساتھی نیچے اتر آئے۔ کچھ دیر جان پہچان کی گفتگو کے بعد طوطم بولا۔ "اس کام کا معاوضہ میں تمہیں دو ایسے قیمتی پتھروں کی شکل میں دے سکتا ہوں، مشہد میں جن کی مالیت کم از کم پانچ ہزار اشرفی ہے، لیکن تمہیں میرے ساتھ پورا تعاون کرنا ہو گا اور کسی قسم کا لالچ دل میں نہیں لانا ہو گا۔"

تھوڑی سی گفتگو کے بعد اسد اور طوطم میں شرائط طے ہو گئیں۔ طوطم خاں نے

سامنے پھیلی ہوئی چٹانوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہاں کل سے ایک عورت
چھپی ہوئی ہے۔ اس سے آگے ایک تیز بہاؤ والا پہاڑی نالا ہے' اس لیے وہ پار نہیں
سکتی۔ انہی چٹانوں میں اس نے کہیں پناہ لے رکھی ہے۔ اسے تلاش کرنا ہے۔"
اسد نے کہا۔ "یہ عورت ہے کون؟"
طوطم خاں بولا۔ "یہ عورت میری ملکیت ہے لیکن وفادار نہیں۔ میں اسے را
راست پر لانے کے لیے اس ویرانے میں لے آیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ لوگوں سے دور ر
کر سدھر جائے گی' مگر ابھی تک کامیابی نہیں ہوئی۔ پچھلے تین ماہ میں اس نے کم از کم چا
دفعہ فرار ہونے کی کوشش کی ہے ...."
طوطم خاں کافی دیر اسد کو ماریتا کے متعلق بتاتا رہا اور اسد صبر و تحمل سے یہ باتیں
سنتا رہا۔ اس کا خون اندر ہی اندر کھول رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد انہوں نے اپنے کام کا آغاز
کر دیا اور اونچی نیچی چٹانوں میں ماریتا کی تلاش میں مصروف ہو گئے .... شام ہونے میں
تھوڑی دیر باقی تھی جب اسد سے کوئی سو گز آگے ایک سپاہی چلایا۔ "یہ رہی ...."
اس کے ساتھ ہی اسد نے سرخ لباس والی ایک عورت کو تیزی سے بھاگتے دیکھا۔ اس کے
لمبے ریشمی بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ ایک سپاہی سامنے سے آیا اور اس نے دونوں ہاتھ
پھیلا کر عورت کو روکنا چاہا۔ عورت نے تیزی سے رخ بدلا اور نشیب میں چھلانگ لگا دی
لیکن یہاں سے ٹھوکر لگی اور وہ اوندھے منہ زمین پر گری اس کے منہ سے ہلکی سی کراہ
نکل گئی۔ اسد اتنے فاصلے سے بھی یہ آواز پہچان گیا وہ ماریتا ہی تھی۔ اس سے پہلے کہ
ماریتا پھر اٹھنے کی کوشش کرتی' طوطم خاں پتھر پھلانگتا ہوا اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ اس نے
اسے بالوں سے پکڑ کر اٹھایا اور ایک زور کا تھپڑ مارا۔ اسد کے تن بدن میں بجلی سی دوڑ
گئی۔ مگر اس نے ضبط کیا اور دھیمے قدموں سے چلتا ماریتا کے قریب پہنچ گیا۔ اس کا چہرہ ابھی
تک پگڑی میں چھپا ہوا تھا۔ دوسرے سپاہی بھی موقع پر پہنچ چکے تھے۔ ماریتا نے ایک ایک
کی صورت دیکھی' پھر روہانسی آواز میں بولی۔
"خدا کے لیے مجھے اس ظالم کے پنجے سے نکال لو۔ یہ مجھے مار ڈالے گا۔"
جواب میں طوطم خان نے ایک غصیلا قہقہہ لگایا۔ ماریتا کی بے چارگی پر اسد کا دل
خون ہو رہا تھا۔ اب اور انتظار مشکل تھا۔ وہ ایک قدم آگے بڑھا۔ ماریتا التجا آمیز نظروں
سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اسد نے پگڑی کا پلو چہرے سے ہٹایا۔ ماریتا نے اسے دیکھا
اور سکتے کے عالم میں رہ گئی۔
"اسد!" اس کے ہونٹوں سے ایک حیرت ناک چیخ نکلی۔ پھر اس کے چہرے پر

مسرت کی یلغار ہوئی اور وہ خود کو طوطم خاں سے چھڑاتی ہوئی تیر کی طرح اسد کی طرف
آئی۔ چند قدم بھاگ کر وہ اسد سے لپٹ گئی اور بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے
لگی۔ اب طوطم خاں کے حیران ہونے کی باری تھی۔ وہ منہ کھولے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ پھر
اس نے ایک جھٹکے سے تلوار نکالی اور ماریتا کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ "کیا حماقت ہے
یہ؟"
"رک جاؤ۔" اسد چلایا .... "مجھے دیکھو! میں بھائی ہوں اس بہن کا۔ اگر ایک
قدم بڑھاؤ گے تو ٹکڑے کر دوں گا۔"
طوطم نے سنی ان سنی کرتے ہوئے ماریتا کی طرف چھلانگ لگائی۔ اسد نے پھرتی سے
گھوم کر ماریتا کو اپنی آڑ میں کر لیا۔ طوطم کا وار اسد کے کندھے کو چھوتا ہوا گزر گیا۔ اسد
کے سپاہیوں نے تلواریں نکالیں اور تیزی سے طوطم کو گھیر لیا۔
"رک جاؤ۔" اسد اللہ بولا۔ "یہ میری بہن کا گناہ گار ہے اس سے حساب بھی میں
ہی لوں گا۔"
"نہیں اسد۔" ماریتا اس کا بازو پکڑتے ہوئے بولی۔ "تمہیں کچھ ہو نہ جائے۔"
اسد نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ "نہیں ماریتا۔ باغیرت بھائی بہنوں کو یوں بے
آسرا چھوڑ کر نہیں مرتے۔"
اس نے کھینچ کر ماریتا کو خود سے جدا کیا اور چھلانگ لگا کر طوطم خاں کے سامنے آیا۔
طوطم خاں کی تلوار بجلی کی طرح کوندی۔ اسد تیزی سے نیچے جھکا پھر اس کا بھرپور مکہ طوطم
کی ٹھوڑی پر پڑا اور وہ الٹ کر پتھروں میں گرا۔ اس نے تلوار نکالی اور طوطم کو اٹھنے کا
موقع دیا۔ طوطم پر ایک دم وحشت سوار ہو گئی۔ وہ چلا کر اسد پر حملہ آور ہوا۔ تلواریں
ٹکرائیں اور دونوں میں گھمسان کی لڑائی ہونے لگی۔ سپاہی ساکت کھڑے یہ منظر دیکھ رہے
تھے۔ طوطم کے ایک زوردار حملے سے اسد لڑکھڑا کر جھاڑیوں میں گرا۔ طوطم خاں اس
موقع پر فیصلہ کن وار کر سکتا تھا مگر اسد نے زبردست ذہانت کا مظاہرہ کیا اور لیٹے لیٹے تلوار
طوطم کی طرف اچھال دی خنجر کی طرح تیرتی ہوئی تلوار طوطم کے اٹھے ہوئے بازو میں
پیوست ہو گئی۔ وہ ایک لمحے کے لیے ٹھٹکا۔ اس ایک لمحے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اسد اپنے
پاؤں پر کھڑا ہوا اور اس نے ایک طاقتور مکہ طوطم کے منہ پر مارا۔ طوطم لڑکھڑایا اور اس کے
بعد اسے سنبھلنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ تلوار اس کے زخمی ہاتھ سے چھوٹ گئی اور اسد اسے
روئی کی طرح دھنکنے لگا۔ اس کا انداز غضبناک تھا .... تھوڑی ہی دیر بعد لحیم شحیم
منگول خون میں لت پت سنگلاخ زمین پر پڑا تھا۔ اس میں سر اٹھانے کی ہمت بھی باقی نہیں

رہی تھی۔ اسد کی ہدایت پر سپاہیوں نے آگے بڑھ کر اس کی مشکیں کس دیں۔ اسد ماریتا کے پاس پہنچا' اپنی پگڑی جو لڑائی کے دوران کھل چکی تھی اس نے پتھروں سے اٹھائی اور آنچل کی طرح ماریتا کے سر پر پھیلا دی۔

☆——☆——☆

.... نہر کلثومیہ کے پار اباقہ کے خلاف چھاپا مار کارروائی ناکام ہوئے دو ہفتے گزر چکے تھے۔ ایک روز خلیفۂ وقت اپنے دربار میں موجود تھے۔ مصاحبین و امرا درجہ بدرجہ مزین نشستوں پر بیٹھے تھے۔ کچھ سیاسی امور پر گفتگو ہو رہی تھی۔ دفعتاً ناظم شہر تیز قدموں سے اندر داخل ہوا اور آداب بجا کر خلیفہ کے قریب پہنچ گیا۔ خلیفہ کے پاس جھک کر اس نے نہایت دھیمے لہجے میں کوئی بات کہی۔ خلیفہ کے چہرے پر ہلکی سی پریشانی دکھائی دی۔ انہوں نے ناظم سے کچھ کہا اور وہ جلدی سے باہر نکل گیا۔ ذرا ہی دیر بعد وہ ایک ادھیڑ عمر شخص کو لیے اندر داخل ہوا۔ یہ شخص خلیفہ کے روبرو ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ ناظم نے اس سے کہا۔

"اے شخص' جو کچھ تُو نے مجھے بتایا امیرالمومنین تیری زبان سے سننا چاہتے ہیں۔"

ادھیڑ عمر شخص نے لرزاں آواز میں کہا۔ "خلیفۃ المسلمین! میں بندہ حقیر شہر کے جنوبی حصے میں نہر کلثومیہ کے پاس آٹے کی ایک چکی کا مالک ہوں۔ کل کام کی زیادتی کی وجہ سے میں رات گئے گھر روانہ ہوا۔ میں نہر کے دوسرے پل کے پاس پہنچا تھا کہ ایک سایہ تاریکی سے نکلا اور اس نے مجھے دبوچ لیا۔ یا امیر! میں نے اس کی شکل دیکھی تو سر تا پیر کانپ گیا۔"

خلیفہ مستنصر نے کہا۔ "اے شخص! جو کہنا ہے مختصر کہہ۔"

اس شخص نے تھوک نگل کر کہا۔ "امیرالمومنین!.......... وہ اباقہ تھا۔ اس نے مجھ سے کہا' جا شہر والوں کو بتا دے میں کل ٹھیک نصف شب کو ان کی بستی میں آؤں گا۔ عین جس گھڑی رات کا تیسرا پہر شروع ہو گا میں امیر التجار معین الملک کو اٹھا لے جاؤں گا۔ وہ اپنے گرد جتنی دیواریں کھڑی کرنا چاہتا ہے کر لے' حکومت اس کو بچانے کے لیے جتنا زور لگا سکتی ہے لگا لے مگر نصف شب کے بعد معین الملک میرے رحم و کرم پر ہو گا۔"

.... پورے دربار کے لیے یہ اطلاع دھماکہ خیز تھی۔ مجرم کی دیدہ دلیری حد سے تجاوز کر چکی تھی۔ اس نے نہ صرف حکومت وقت کے ایک نہایت اہم عہدیدار پر ہاتھ ڈالنے کا فیصلہ کیا تھا بلکہ ڈنکے کی چوٹ پر اس کا اعلان بھی کر رہا تھا۔ بغداد انتظامیہ کے لیے یہ ایک کھلی آزمائش تھی۔ لوگوں میں پہلے ہی اضطراب کی لہر دوڑ رہی تھی۔ مجرم ناکام

کارروائی کے بعد مغویہ اور مسلم بن داؤد کے ساتھ روپوش ہو چکا تھا۔ اگر وہ اس بار بھی کامیاب رہتا تو حکومت کا کہیں ٹھکانا نہ تھا۔ خلیفہ نے اسی وقت دربار برخاست کر دیا اور اپنے خاص مشیروں اور مصاحبین کے ساتھ صلاح مشورہ شروع کر دیا۔

شام تک مختلف عہدیداروں میں ملاقاتیں جاری رہیں۔ ایک زبردست لائحہ عمل تیار کیا گیا۔ خلیفہ کا حکم تھا کہ مجرم کو کسی قیمت پر کامیاب نہیں ہونا چاہیے۔ پورے شہر کی ناکہ بندی کر دی گئی تھی' خاص طور معین الملک کی رہائش گاہ قلعے کا منظر پیش کر رہی تھی۔ ان تیاریوں کو دیکھ کر آسانی سے کہا جا سکتا تھا کہ اگر مجرم نے معین الملک تک پہنچنے کی حماقت کی تو اس کا انجام دردناک ہو گا۔ معین الملک تک پہنچنا تو دور کی بات "سلیمانی ٹوپی" کے بغیر وہ اس علاقے میں بھی داخل نہ ہو سکتا تھا۔ ہر گلی اور ہر موڑ پر سادہ لباس والے سپاہی موجود تھے۔ بلامبالغہ بغداد کی تین چوتھائی انتظامیہ اس علاقے کو گھیرے ہوئے تھی۔ معین الملک کے مکان کی اس طرح تلاشی لی گئی تھی کہ کہیں چوہے کا بچہ بھی ہوتا تو پکڑا جاتا۔ مکان میں جو دستہ تعینات کیا گیا تھا اس کے ایک ایک سپاہی کی شناخت کی گئی تھی۔ ناظم شہر کا حکم تھا کہ عشاء کے بعد فجر کی اذان تک کوئی شخص مرد' عورت یا بچہ معین الملک سے ملاقات نہیں کرے گا .... مجرم نے ایک عجیب طرح کا ہراس ذہنوں پر طاری کر دیا تھا۔ کوتوال شہر ادھ کھلے دروازے کی درز سے بار بار معین الملک کو دیکھتا تھا جیسے ڈر رہا ہو کہ وہ بھاپ بن کر اڑ جائے گا۔ جوں جوں رات بھیگ رہی تھی' دلوں کی دھڑکنیں تیز ہو رہی تھیں۔ سینکڑوں نگاہیں معین الملک کی محافظت کا فریضہ انجام دے رہی تھیں۔ آخر رات کا دوسرا پہر ختم ہوا۔ تیسرے پہر کی پہلی گھڑی شروع ہوئی۔ ایک ایک پل برسوں پر محیط تھا.......... وقت دھیرے دھیرے سرکتا رہا اور آخر پہلی گھڑی ختم ہو گئی۔ دوسری گھڑی شروع ہوئی اور وہ بھی ختم ہو گئی .... کچھ نہیں ہوا۔ معین الملک اپنی جگہ موجود تھا۔ پہریداروں کے اعصاب آہستہ آہستہ پُرسکون ہونے لگے۔ خطرے کا وقت گزر گیا تھا۔ دروازے پر کھڑے فربہ اندام کوتوال نے ایک طویل جمائی لی اور اس وقت ناظم شہر بدحواسی میں بھاگتا ہوا اندر داخل ہوا۔ کوتوال کے قریب پہنچ کر وہ بولا۔

"غضب ہو گیا عمار۔ غضب ہو گیا۔ مجرم مغربی حصے سے وزیر خارجہ کو اٹھا کر لے گیا ہے۔"

یہ خبر کوتوال کے سر پر وزنی ہتھوڑے کی ضرب ثابت ہوئی۔ ساتھی سپاہیوں کی طرح اس کا منہ بھی کھلا رہ گیا۔ جو پہلا خیال اس کے ذہن میں آیا یہی تھا۔ "مجرم نے ہم سے بہت بڑا دھوکا کیا ہے .... بہت بڑا دھوکا۔"

تھوڑی ہی دیر میں انتظامیہ کے مخصوص حلقوں میں کھلبلی مچ چکی تھی۔ وزیر خارجہ کا اغوا کوئی معمولی بات نہیں تھی اور مجرم نے یہ اغوا اس طرح کیا تھا کہ پوری انتظامیہ کے چہرے پر طمانچے کے نشان رہ گئے تھے۔ انتظامیہ نے تمام وسائل معین الملک کی حفاظت پر لگا دیے تھے اور دوسری طرف ایک ایسا کام ہو گیا تھا جو ہرگز نہیں ہونا چاہیے تھا۔ وزیر خارجہ کا اغوا معین الملک کی موت سے کہیں زیادہ سنگین تھا۔ یہ خبر جب خلیفہ مستنصر تک پہنچی تو انہوں نے سب سے پہلا حکم یہی دیا کہ اس خبر کو پھیلنے سے روکا جائے۔ خوش قسمتی سے اس حکم کی درست طور پر تعمیل ہوئی۔ انتظامیہ اس خبر کو اپنے ذمہ دار حلقوں تک محدود رکھنے میں کامیاب ہو گئی۔ نچلی سطح کے جو اہلکار اس حادثے سے باخبر ہو چکے تھے۔ ان کے لیے نظر بندی کے احکامات جاری کر دیے گئے۔ خلیفہ مستنصر نے دوسرا حکم یہ دیا کہ مجرم کو ہر قیمت اور ہر صورت میں روپوش ہونے سے روکا جائے۔ اس کے لیے فوج کی خدمات حاصل کی جائیں اور کسی مصلحت کو آڑے نہ آنے دیا جائے۔

جس وقت بغداد کے لوگ گہری نیند سو رہے تھے' انتظامی حلقوں میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔

.... دوسری طرف اباقہ' وزیر خارجہ کو عقاب کی طرح اچک کر اپنے چٹانی بسیرے میں واپس پہنچ چکا تھا۔ اب اس کے یرغمالیوں کی تعداد پھر تین ہو گئی تھی اور ان میں خلافت عباسیہ کا وزیر خارجہ بھی شامل تھا۔ وزیر خارجہ ابن یاشر کو ہوش آ چکا تھا لیکن اسے ابھی تک یقین نہیں آیا تھا کہ وہ اباقہ کے ہاتھوں اغوا ہو چکا ہے۔ اسے صرف اتنا یاد تھا کہ وہ رات گئے اپنی خواب گاہ میں ٹہل رہا تھا اچانک عقب سے کسی نے اس کے سر پر ضرب لگائی تھی اور وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھ ان ٹیلوں کی تیرگی میں کھلی تھی اور اس نے اپنی آنکھوں کے سامنے اباقہ کا وحشی چہرہ دیکھا تھا۔ اس کی آنکھیں تاریکی میں انگاروں کی طرح روشن تھیں۔ کچھ ہی دور اسے مسلم بن داؤد اور فاطمہ نظر آ رہے تھے۔ وہ دونوں سہمے ہوئے بیٹھے تھے۔ ان کی مشکیں کسی ہوئی تھیں۔

ابن یاشر خطرناک لہجے میں بولا۔ "اباقہ تُو نے اپنی موت کو دعوت دی ہے۔ جانتا ہے یہ حماقت تیری موت کو کتنا عبرتناک بنا سکتی ہے؟"

جواب میں اباقہ نے زمین پر تھوکا اور نفرت سے بولا۔ "تُو اپنی موت کو یاد کر ابن یاشر۔ میری موت کتنی بھی اذیت ناک ہوئی۔ اس زندگی سے سہل ہو گی۔"

ابن یاشر بولا۔ "تُو نے موت کا صرف نام سنا ہے اباقہ۔"

اباقہ دھاڑا۔ "میں خود موت ہوں ابن یاشر۔ دیکھ میں تجھے دکھاتا ہوں .... میں

خود موت ہوں۔"

اباقہ مسلم بن داؤد کی طرف بڑھا۔ پھر اس نے کپڑے کی ایک پٹی مضبوطی سے اس کی آنکھوں پر باندھ دی۔ داؤد چیخنے چلانے لگا مگر اس کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ اباقہ نے تڑپتے مچلتے داؤد کو اٹھایا اور تھوڑی دور ایک کھائی کے پاس لے گیا۔ پھر اس نے خنجر سے اس کے ہاتھ آزاد کئے اور ان ہاتھوں میں ایک ابھرے ہوئے پتھر کا کونہ تھما دیا۔

داؤد چلایا۔ "کیا کر رہے ہو اباقہ؟"

اباقہ نے اطمینان سے کہا۔ "میں کچھ نہیں کر رہا لیکن اگر تم نے اس پتھر کو چھوڑ دیا تو نیچے کھائی میں جا گرو گے۔ جسم کے دس پچاس ٹکڑے ضرور ہو جائیں گے۔ صبح ہونے میں ایک پہر باقی ہے۔ اگر صبح تک لٹکتے رہو گے تو اتار لوں گا۔"

یہ سنتے ہی داؤد مقناطیس کی طرح پتھر سے چمٹ گیا۔ اس کے پاؤں خلا میں لٹک رہے تھے۔ اباقہ واپس ابن یاشر اور فاطمہ کے پاس آیا۔ "اگر تم دونوں نے ایک لفظ بھی زبان سے نکالا تو میری تلوار نیام سے باہر آ جائے گی۔"

مسلم بن داؤد نے ہاتھوں کی پوری طاقت سے پتھر کو تھام رکھا تھا۔ وہ بار بار اپنے پاؤں سکیڑ رہا تھا لیکن کہیں جگہ ہوتی تو اس کے پاؤں ٹکتے۔ اس کے ہونٹوں سے معافیاں' درخواستیں اور التجائیں پانی کے دھارے کی طرح نکلنے لگیں۔ نہ جانے کن کن پاکیزہ ہستیوں' بزرگوں اور ولیوں کی قسمیں کھا کھا کر وہ اباقہ کو اپنے نیک چال چلن کا یقین دلا رہا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ اس کی آواز گلے میں پھنسنے لگی۔ اس نے چیخنا چلانا اور رونا شروع کر دیا۔ پھر رونے کی آواز بھی مدھم ہو گئی۔ اب اس کے حلق سے ایک لرزہ خیز خرخراہٹ نکل رہی تھی۔ یہ خرخراہٹ بتا رہی تھی کہ وہ جسم و جان کی پوری قوت سے پتھر کو تھامے رکھنے کی کوشش کر رہا ہے مگر اس کے بازو اور اس کی انگلیاں شل ہو چکی تھیں۔ جانے کتنی دیر داؤد پر جان کنی کا عالم طاری رہا پھر اس کے حلق سے ایک چیخ بلند ہوئی جو لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی چلی گئی۔ جب یہ چیخ نقطۂ عروج پر پہنچی تو پتھر اس کے ہاتھ سے نکل گیا .... وہ دھم سے دو گز نیچے سخت زمین پر آ گرا۔ اباقہ کے حلق سے ایک وحشیانہ قہقہہ بلند ہوا۔ اس قہقہے کی گونج نے فاطمہ اور ابن یاشر کو لرزا کر رکھ دیا۔ درحقیقت اباقہ نے داؤد کو صرف دو گز کی بلندی پر لٹکایا تھا۔ اس نے اپنی جگہ سے اٹھ کر داؤد کی آنکھیں کھولیں۔ وہ ایک بار پھر بے ہوش ہو چکا تھا۔ اس کا چہرہ دیکھ کر اباقہ بولا۔

"داؤد! اپنے ظلم کی وجہ سے تجھے ابھی بہت تڑپنا ہے۔"

☆ ☆ ☆

اسداللہ‘ مارینا اور طوطم خاں کے ساتھ واپس بغداد پہنچا تو سیدھا وزیر داخلہ عبدالرشید کے محل پر آیا۔ راستے میں مارینا اور طوطم کو وہ سلیمان کی تحویل میں دے آیا تھا۔ عبدالرشید نے خود صدر دروازے پر آکر اسداللہ کا استقبال کیا۔ اس کی آنکھوں میں ڈرے ہوئے سوال تھے۔ اسد نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"ہم کامیاب لوٹے ہیں جناب۔"

وزیر داخلہ کے مدقوق چہرے پر امید کی روشنی چمکی۔ بیٹی کے غم نے گھلا کر اسے آدھا کر دیا تھا۔ دونوں ساتھ ساتھ چلتے نشست گاہ میں آ بیٹھے۔ اسد نے کہا۔ "جناب تازہ ترین صورت حال کیا ہے۔"

وزیر داخلہ نے اس پر انکشاف کرتے ہوئے کہا کہ کل اباقہ نے وزیر خارجہ ابن یاشر کو بھی اغوا کر لیا ہے۔ اس اغوا کی حیرت انگیز تفصیلات بتانے کے بعد وزیر داخلہ نے کہا کہ آج صبح ٹیلوں میں اباقہ کے ٹھکانے کا سراغ لگا لیا گیا ہے۔ فوج کے کئی دستوں نے اس مقام کو گھیر لیا ہے۔

اسد نے کہا۔ "جناب جتنی جلدی ہو سکے آپ مجھے اباقہ تک پہنچانے کا انتظام کریں۔ اس سلسلے میں کوئی دشواری تو نہیں؟"

وزیر داخلہ نے بے دلی سے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اب کیا دشواری ہے اسد! اب تو وزیر خارجہ خود اغوا ہو گیا ہے۔ اب تو دربار خلافت سے بھی مصالحتی کوششوں کی حمایت ہو گی۔ تم ابھی میرے ساتھ چل سکتے ہو۔"

اسد نے محسوس کیا کہ وزیر داخلہ پر ناامیدی طاری ہے۔ شاید اسے یقین نہیں تھا کہ اباقہ کو گفت و شنید پر آمادہ کیا جا سکے گا۔

.... ٹھیک تین گھڑی بعد اسد‘ یورق اور مارینا ان ٹیلوں میں پہنچ چکے تھے جہاں اباقہ نے فاطمہ‘ داؤد اور ابن یاشر کو یرغمال بنا رکھا تھا۔ ان ٹیلوں کو چاروں طرف سے فوجیوں نے گھیر رکھا تھا اور عام آدمی کو اس جانب آنے کی کسی صورت اجازت نہیں تھی۔ مقامی کمانڈار کو پہلے سے اطلاع کی جا چکی تھی۔ کمانڈار کی ہدایت پر ایک پیغام بر ٹیلوں میں آگے گیا اور ایک پتھر پر چڑھ کر بلند آواز میں اباقہ کو بتایا کہ اس کے کچھ دوست اس سے ملنا چاہتے ہیں۔ اباقہ کا ہیولا دور ایک پتھر پر نظر آ رہا تھا۔ اس نے چلا کر کہا۔ "مجھے صرف ایک شخص سے ملنا ہے اور اس کا نام عبداللہ مشہدی ہے۔ اپنے کمانڈار کو بتا دو کہ اگر شام تک یہ مطالبہ پورا نہیں ہوا تو ابن یاشر کا سر اس کی گردن پر نہیں رہے گا۔"

اسداللہ نے مارینا کا بازو پکڑ کر اسے سپاہیوں کے عقب سے آگے کر دیا۔ اباقہ واپس

لوٹ رہا تھا۔ جب مارینا کی آواز ٹیلوں میں گونجی "اباقہ.........."

اباقہ مڑا اور اس کا جسم ساکت ہو کر رہ گیا۔ تب اسداللہ اور یورق بھی آگے آئے اور مارینا کے ساتھ اباقہ کی طرف بڑھنے لگے۔ تھوڑی ہی دیر بعد اباقہ اور مارینا آمنے سامنے کھڑے تھے۔ اباقہ یک ٹک مارینا کو دیکھ رہا تھا اس کی آنکھوں میں ایک بار پھر آنسو جھلملا رہے تھے۔ اس نے لرزاں آواز میں اپنا دکھ مارینا کو سنایا۔

"مارینا! سلطان مر گیا‘ وہ ہمیں تنہا چھوڑ گیا.......... ہم یتیم ہو گئے مارینا۔"

مارینا کی آنکھوں میں بھی نمی تیر گئی۔ کئی ماہ پرانا غم پہلے روز کی طرح تازہ ہو گیا تھا۔ وہ آگے بڑھ کر نرمی سے بولی۔ "اباقہ! غم کا یہ پہاڑ صرف تم پر ہی نہیں ہم پر بھی ٹوٹا ہے۔"

اباقہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ خاموش کھڑا تھا۔ یورق نے کہا۔ "جنگلی ہمیں بیٹھنے کے لئے بھی نہ کہے گا۔"

"نہیں سردار! خدا کے لئے مجھے تنہا چھوڑ دو۔"

مارینا نے کہا۔ "اسد میں اباقہ سے تنہائی میں کچھ کہنا چاہتی ہوں۔"

اسد اور یورق نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور چند قدم پیچھے ہٹ کر پتھروں پر بیٹھ گئے۔ مارینا نے گہری نظروں سے اباقہ کی آنکھوں میں جھانکا۔ ان آنکھوں میں ایک خاموش جادو تھا۔ اباقہ نگاہیں جھکا کر رہ گیا۔ مارینا اور وہ ساتھ ساتھ بیٹھ گئے۔ اباقہ کا رخ چند گز دور یرغمالیوں کی طرف تھا۔ مگر اس کے کان مارینا کی طرف لگے تھے۔ مارینا دھیمے لہجے میں اس سے گفتگو کرنے لگی۔ وہ اپنے لفظوں کی نرم انگلیوں سے اباقہ کے زخموں پر مرہم رکھ رہی تھی۔ آخر اس نے بڑی لجاجت سے اباقہ سے کہا کہ وہ یرغمالیوں کو رہا کر دے۔ کیونکہ عبداللہ مشہدی روپوش ہو چکا ہے اس لئے اس جدوجہد سے کچھ حاصل نہیں۔ اس نے اباقہ کو اسد کا منصوبہ سمجھاتے ہوئے کہا وہ ایک یرغمالی کو یہیں رہا کر دیتے ہیں۔ باقی دو یرغمالیوں کو وہ اپنے ساتھ رکھیں گے اور اس شرط پر رہا کریں گے کہ ان کا پیچھا نہ کیا جائے۔ اباقہ اس کی بات کاٹ کر بولا۔

"مارینا.......... میں.......... یہ نہیں کر سکتا۔ کسی صورت نہیں۔"

مارینا چند لمحے اس کی صورت دیکھتی رہی پھر اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ غصے سے بولی۔ "اباقہ! کیا یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟"

اباقہ خاموش رہا۔ مارینا نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔ "اباقہ! میں تو تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ تم مجھے اس بے رخی سے جواب دو گے۔ تم نے میری التجا ٹھکرا کر

میرے دل پر جو زخم لگایا ہے عمر بھر مندمل نہ ہو سکے گا۔ کاش میں تمہارے پاس نہ آتی۔"

اباقہ نے چونک کر مارینا کی طرف دیکھا۔ اس کا حسین چہرہ غم میں ڈوبا ہوا تھا۔ اباقہ کے جبڑے بھنچ گئے۔ اس کے چہرے پر زبردست کشمکش نظر آ رہی تھی۔ اس نے ایک نظر یرغمالیوں کی طرف دیکھا پھر تلوار نہایت غصے سے پتھروں میں پھینک کر اٹھ گیا۔ تلوار گرنے کی آواز سن کر یورق اور اسد تیزی سے ان کی طرف آئے۔ اباقہ رخ پھیر کر کھڑا تھا۔ اسد نے محبت سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولا۔ "اباقہ! ہم جانتے ہیں ہم تجھ پر زبردستی کر رہے ہیں لیکن ہمیں معاف کر۔"

مارینا نے اپنے آنسو پونچھ ڈالے تھے۔ اس کے چہرے پر مسرت کی جھلک تھی۔

یورق نے کہا۔ "اباقہ! تجھے یہاں سے نکلنے کا منصوبہ مارینا نے بتا دیا ہو گا۔ تجھے کوئی اعتراض تو نہیں۔"

اباقہ نے رخ پھیرے بغیر جواب دیا۔ "جو تمہارا دل چاہے کرو۔"

مارینا اسد اور یورق جلد جلد کچھ مشورہ کرنے لگے۔ پھر اسد ٹیلوں میں آگے گیا۔ دوسری طرف سے وزیر داخلہ عبدالرشید کچھ افسروں کے ساتھ آگے بڑھا۔ کافی دیر ان کے درمیان گفتگو ہوتی رہی۔ پھر اسد نے واپس آ کر بتایا کہ شرائط طے ہو گئی ہیں۔ ہم عبداللہ مشہدی کے مطالبے سے دستبردار ہو گئے ہیں۔ فاطمہ کو اسی وقت رہا کر دیا جائے گا۔ باقی دو یرغمالی ہمارے ساتھ رہیں گے۔ اپنے تعاقب کی طرف سے مطمئن ہو کر ہم اُن دونوں کو راستے میں کہیں چھوڑ دیں گے۔ اباقہ اس ساری گفتگو سے لاتعلق رہا تھا۔

اسداللہ فاطمہ کے پاس پہنچا۔ اس کے جسم پر ابھی تک دلہن کا لباس تھا مگر اب یہ لباس پہچانا نہیں جاتا تھا۔ اسد نے اس کی مشکیں کھولیں اور بولا۔

"جاؤ فاطمہ! ان ٹیلوں کے پیچھے تمہارا باپ تمہارا انتظار کر رہا ہے۔"

"اور تمہارا دولہا بھی۔" یورق نے لقمہ دیا۔

فاطمہ کی آنکھوں میں آنسو چمک گئے۔ اس نے ایک نظر اباقہ اور اسد کی طرف دیکھا پھر پنجرے سے اڑنے والی چڑیا کی طرح اترائی کی جانب بھاگ کھڑی ہوئی۔ باپ اور بیٹی کا ملاپ کوئی ایک فرلانگ آگے ہوا۔ اس جذباتی منظر کو اباقہ بھی دیکھ رہا تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا ایک نادیدہ بوجھ اس کے دل سے اتر گیا ہے۔

تھوڑی ہی دیر بعد اباقہ، اسد، مارینا اور یورق ایک بند گھوڑا گاڑی میں شہر کی طرف جا رہے تھے۔ وزیر خارجہ ابن یاشر اور مسلم بن داؤد ان کے ساتھ تھے۔ محاصرہ کرنے والے دستوں نے معاہدے کے مطابق ان کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی۔ نہر کلثومیہ

وہ سیدھے اس مکان پر پہنچے جہاں سلیمان اور نبیلہ مقیم تھے۔ طوطم خاں بھی وہیں تھا۔ ان تینوں کو گاڑی میں لاد کر وہ پھر روانہ ہو گئے۔ گاڑی میں خورد و نوش کا وافر انتظام تھا۔ گھوڑے اصیل اور صحت مند تھے۔

☆ ☆ ☆

بغداد سے کوئی پندرہ کوس دور آ کر انہیں اندازہ ہوا کہ ان کا تعاقب کیا جا رہا ہے۔ تعاقب کرنے والے تین گھڑسوار تھے۔ یہ سراسر معاہدے کی خلاف ورزی تھی۔ اسد نے ایک مصالحت کنندہ کی حیثیت سے وزیر داخلہ عبدالرشید اور دوسرے افسروں کو ضمانت دی تھی کہ دونوں یرغمالیوں کو خوارزم کی سرحد پار کرنے سے پہلے ہی رہا کر دیا جائے گا بشرطیکہ ان کا تعاقب نہ کیا جائے۔ اب نامعلوم گھڑسواروں کا یہ تعاقب اسد اور یورق کو تشویش میں مبتلا کر رہا تھا مگر جلد ہی ان کی یہ تشویش دور ہو گئی۔ ایک ویران جگہ یہ گھڑسوار، گھوڑا گاڑی کے بالکل قریب پہنچ گئے اور اس وقت اسد نے مائیکل کو پہچان لیا۔ گھوڑا گاڑی ایک طرف درختوں میں کھڑی کر دی گئی۔ مائیکل نے گھوڑے سے اتر کر سب کے ساتھ گرمجوشی سے مصافحہ کیا۔ اسد نے اباقہ اور سلیمان سے مائیکل کا تعارف کیا۔ کچھ دیر ستانے کے بعد یہ قافلہ پھر آگے روانہ ہوا۔ اس دفعہ مائیکل اور اس کے دو ساتھی گھڑسوار بھی ان کے ساتھ تھے۔

انہوں نے رات بھر بغیر رکے سفر جاری رکھا۔ اگلے روز شام کے وقت وہ درختوں سے گھرے ہوئے ایک کہنہ سال مکان کے سامنے پہنچے۔ یہ مکان کسی زمیندار کی ملکیت تھا جو سرحد پر تاتاریوں کے خوف سے اسے چھوڑ کر جا چکا تھا۔ ایک دفعہ سفر کے دوران اسد نے اس مکان کا سراغ لگایا تھا۔ اس کا لگایا ہوا یہ سراغ آج ان کے لئے مفید ثابت ہوا تھا۔ مکان اجاڑ تھا۔ دیواروں پر کائی اور چھتوں پر گھاس اگی ہوئی تھی۔ کمروں میں گیدڑوں اور پرندوں نے بسیرا کر رکھا تھا۔ ان سب نے مل کر کوشش کی اور رات سونے کے وقت تک تین کمروں کو قیام کے قابل بنا لیا۔ نبیلہ اور مارینا نے خشک راشن نکال کر دسترخوان بچھایا۔ کھانا کھانے کے بعد وہ تھکن کے باوجود رات گئے تک باتیں کرتے رہے۔ پھر ایسے سوئے کہ اگلے روز دوپہر کے وقت بیدار ہوئے۔ اسد کسی کام سے گیا ہوا تھا۔ یورق نے جاگتے ساتھ ہی مسلم بن داؤد سے گن گن کر بدلے لینے شروع کر دیئے۔ وہ اس کمرے میں گیا جہاں وزیر خارجہ ابن یاشر طوطم خاں اور مسلم بن داؤد بندھے پڑے تھے۔ اس کمرے کا فرش چونکہ گندا تھا، لہٰذا یورق جب داؤد کو باہر لایا تو اس کی ہیئت دیکھنے کے قابل تھی۔ گرد اور پرندوں کے بیٹ اس کے جسم سے بھبھوت کی طرح چمٹے ہوئے تھے۔ پنڈلی کے

زخم کی وجہ سے وہ تھوڑا لنگڑا بھی رہا تھا۔ یورق نے مسلم بن داؤد کو پہلے تو گھوڑوں کی خدمت پر لگایا۔ پھر اسے حکم دیا کہ وہ درختوں سے لکڑیاں اکٹھی کرے۔ جب وہ لکڑیاں اکٹھی کر چکا تو یورق اس سے اپنے جسم کی مالش کرانے لگا۔ مالش کرنے کے بعد داؤد بری طرح ہانپ رہا تھا مگر یورق نے اسے ہدایت کی کہ وہ پتھروں کا چولہا بنا کر اس میں آگ جلائے۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ داؤد نے سیدھا ٹیڑھا چولہا بنایا اور آگ جلانے میں مصروف ہو گیا۔ لکڑیاں گیلی تھیں اور دھوئیں سے داؤد کی آنکھیں نکلی جا رہی تھیں۔ پھونکیں مار مار کر وہ بے حال ہو رہا تھا۔ ماریتا اور نبیلہ کو مسلم بن داؤد کی حالت دیکھ کر مسکراہٹ روکنی مشکل ہو گئی۔ آخر ماریتا کو اس پر ترس آیا اور اس نے آگ جلا کر داؤد کو اس مشکل سے نکالا۔ اباقہ ابھی تک گم صم تھا۔ کچھ دیر بعد اسد بھی واپس آ گیا۔ وہ سب مل کر اباقہ کی دلجوئی کی کوشش کرنے لگے۔

اسد نے کہا۔ "اباقہ! یقین رکھو' عبداللہ مشہدی صرف تمہارا ہی نہیں ہمارا بھی دشمن اول ہے۔ اس کا تڑپتا لاشا دیکھنے کو ہماری آنکھیں بھی ترس رہی ہیں لیکن حالات کو دیکھتے ہوئے ہمیں تحمل سے کام لینا ہے۔ وہ بدبخت اس وقت کہیں روپوش ہو چکا ہے۔ بغداد والوں کو خود اس کا علم نہیں۔ ہم اہل شہر سے ٹکرا کر کچھ حاصل نہیں کر سکتے۔ میں بلکہ ہم سب خدا کو حاضر ناضر جان کر وعدہ کرتے ہیں کہ حالات سازگار ہوتے ہی عبداللہ مشہدی کو زمین کی ساتویں تہہ سے بھی ڈھونڈ نکالیں گے اور عبرتناک انجام سے دوچار کریں گے۔ سلطان جلال ہمیں بھولا ہے اور نہ بھول سکتا ہے۔ اس کا کہا ہوا ہر لفظ ہمارے دلوں پر نقش ہے ...."

اس موقع پر مائیکل آگے آیا اور اس نے اباقہ کو بتایا کہ اس کے ملک میں حالات نے کیا کروٹ لی ہے۔ وہاں کی سرحدوں پر کیا خطرات منڈلا رہے ہیں اور شہر کن حادثوں کی زد میں ہیں۔ اس نے اباقہ سے درخواست کی کہ وہ وحشی منگولوں کے خلاف لڑنے کے لیے اس کے ہمراہ سرزمین روس کا رخ کرے۔ مترجم کی وساطت سے مائیکل تادیر اباقہ کو اپنے موقف سے آگاہ کرتا رہا۔ اباقہ اس کی بات سن رہا تھا لیکن اس کا چہرہ تاثرات سے عاری تھا۔ وہ برف کی سل دکھائی دے رہا تھا۔

اس رات کا ذکر ہے' نبیلہ اور ماریتا اپنے کمرے میں بیٹھی تھیں زمین پر ایک دبیز غالیچہ بچھا ہوا تھا اور آتشدان میں آگ دہک رہی تھی۔ ساتھ والے کمرے میں تینوں قیدی محبوس تھے۔

نبیلہ نے کہا۔ "لگتا ہے بھائی جان اباقہ آپ سے ناراض ہیں۔" ماریتا تھوڑی ایک

... پر ٹکائے گہری سوچ میں گم تھی۔ نبیلہ نے جواب نہ پا کر پھر کہا۔ "سلیمان مجھے بتا رہے تھے کہ اسد بھائی آج سارا دن کسی گاؤں میں ہمارے رہنے کے لیے مکان تلاش کرتے رہے ہیں۔" ماریتا نے پھر بھی کوئی جواب نہیں دیا۔ نبیلہ نے شوخی سے ماریتا کو چٹکی بھری اور بولی۔ "آپا' اگر بھائی جان اس گورے کے ساتھ منگولوں سے لڑنے چلے گئے تو نہ جانے کتنی دیر پچھتاتی رہو گی۔ جا کر انہیں منالو نا۔ تمہیں کھا تو نہیں جائیں گے۔"

ماریتا نے مصنوعی خفگی سے نبیلہ کو دیکھا پھر بولی۔ "میں کیوں مناؤں' میں نے اسے کیا کہا تھا۔ ہم سب اس کا بھلا ہی سوچ رہے ہیں۔"

نبیلہ آنکھیں نچا کر بولی۔ "آپا! کسی کا پتھر بھی چوٹ نہیں دیتا اور کسی کا پھول بھی ... نکال دیتا ہے۔"

"تو کیا کروں میں؟" ماریتا نے پوچھا۔

"ہائیں .... ہائیں۔" نبیلہ نے آنکھیں نکالیں۔ "اب یہ بھی مجھے بتانا پڑے گا۔ ... آخر تم اس کی ہونے والی دلہن ہو' جا کر خوش کر لو اسے جیسے ہوتا ہے۔" ماریتا خاموش رہی۔ نبیلہ لاپرواہی کی اداکاری کرتے ہوئے بولی۔ "ٹھیک ہے ہمیں کیا۔ نہیں ... تو نہ جاؤ۔ وہ تو آج کل میں چلا ہی جائے گا۔"

ماریتا بھی ذرا شوخی سے بولی۔ "مجھے تو نہیں لگتا وہ جائے گا۔ تم دیکھ نہیں رہی تھیں ... منہ پھلا رکھا تھا اس نے لگتا تھا کوئی بوڑھی بال بکھیرے بیٹھی ہے۔"

"توبہ توبہ۔ اپنے مجازی خدا کے متعلق یہ واہیات!" نبیلہ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولی۔ "میں تو بھئی ابھی بتاتی ہوں جا کر بھائی جان کو ابھی تو کچھ نہیں بگڑا ہمارے چاند جیسے بھیا کا۔" پھر اس سے پہلے کہ نبیلہ اٹھتی ماریتا نے اس کی چوٹی پکڑ کر دوبارہ بٹھا دیا۔

"سلیمان نے تجھے کچھ زیادہ ہی شریر کر دیا ہے۔"

نبیلہ مسکرا کر بولی۔ "ہاں' ہیں تو وہ بڑے شریر۔" پھر اس سے پہلے کہ نبیلہ جان ... کر ان شرارتوں کی تفصیل میں جاتی ماریتا نے تکیے پر سر ڈال کر منہ سر لپیٹتے ہوئے کہا۔

"نبیلہ! میں تو سو رہی ہوں تو بھی سو جا۔"

نبیلہ نے کہا۔ "........... تو نہیں جاؤ گی تم بھائی جان کے پاس!"

"نہیں۔" ماریتا سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"روؤ گی بیٹھ کر انشاء اللہ!" نبیلہ نے بڑے خلوص کے ساتھ کہا اور کروٹ بدل کر لیٹ گئی۔

☆------☆------☆

.... کوئی گھڑی ڈیڑھ گھڑی بعد مارینا نے آہستہ سے سر اٹھا کر نبیلہ کی طرف دیکھا۔ اس کی سانس کی مدھم آواز بتا رہی تھی کہ وہ سو چکی ہے۔ آتشدان میں دہکتے ہوئے کوئلوں کی ہلکی سرخی کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ مارینا نے کان لگا کر سنا' ساتھ والے کمرے میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ وہ جانتی تھی اسد' یورق' اباقہ اور سلیمان باری باری پہرہ دیتے ہیں۔ پہلے پہر کا پہرہ اباقہ کا تھا۔ مارینا جسم کو چادر میں لپیٹتے ہوئے دھیرے سے اٹھی اور کھڑکی سے باہر جھانکنے لگی۔ برآمدے اور صحن میں خاموشی تھی۔ وہ دبے قدموں چلتی صحن میں آئی اور بہ آہستگی دروازہ کھول کر باہر آ گئی۔ کچھ ہی دور اسے اباقہ کا ہیولہ نظر آیا۔ وہ گھوڑوں کے پاس ایک درخت کے گرے ہوئے تنے پر بیٹھا تھا۔ خاموش اور بے حس و حرکت۔ مارینا دھڑکتے دل کے ساتھ اس کی طرف بڑھی اور قریب پہنچ کر ہولے سے بولی۔ "اباقہ۔"

اباقہ نے ایکدم مڑ کر دیکھا لیکن پھر آہستہ سے منہ پھر لیا۔ مارینا نے ایک نظر واپس مکان کے دروازے کی طرف دیکھا اور اباقہ کے قریب بیٹھ گئی۔

"مجھ سے ناراض ہو اباقہ؟" وہ بے ساختہ معصومیت کے ساتھ بولی۔

اباقہ نے منہ پھیر لیا۔ مارینا نے اس کی آستین تھام کر اپنی طرف کھینچی۔ "بہت ناراض ہو اباقہ؟"

اباقہ نے خشک لہجے میں کہا۔ "تم سے نہیں' اپنی قسمت سے ناراض ہوں۔"

مارینا نے اس کا بازو تھام لیا اور نرمی سے کہا۔ "دیکھو اباقہ! اپنے سلطان سے محبت کے اظہار کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ ہم اس کے ارادوں کو عملی جامہ پہنائیں۔ تمہیں یاد ہو گا۔ سلطان نے کہا تھا' ہم منگولوں سے دشمنی کریں گے' وہ ہمیں جہاں' جب اور جس حالت میں ملیں گے ہم انہیں ماریں گے۔ ان کی زندگیاں حرام کریں گے .... اباقہ! کیا تم صرف عبداللہ مشہدی کے تعاقب میں رہو گے اور سلطان کے اس فرمان کو بھول جاؤ گے۔"

اباقہ بولا۔ "مارینا! میرے سینے میں جو آگ بھڑک رہی ہے' میں اسے کیسے ٹھنڈا کروں؟"

مارینا نے مسکرا کر کہا۔ "اگر یہ آگ میرا گلا گھونٹنے سے ٹھنڈی ہو سکتی ہے تو لو میرا گلا حاضر ہے۔"

"نہیں مارینا" اباقہ' بے تابی سے بولا۔ "ایسی باتیں مت کرو۔ تم .... تم تو میری زندگی کا آخری سہارا ہو۔"

مارینا کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔ اباقہ نے بڑے کرب کے ساتھ ان خوبصورت آنکھوں کی طرف دیکھا۔ پھر میکانکی انداز میں اس کے بازو آگے بڑھے اور مارینا اس کے سینے سے لگ گئی .... تاریکی میں وہ دونوں ایک ہی انسانی جسم کا حصہ دکھائی دے رہے تھے۔

☆---------☆---------☆

اگلے روز اباقہ نیند سے بیدار ہوا تو اسد اور سفید رنگت والا مائیکل' صحن کی دھوپ میں کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ مارینا اور نبیلہ دوسرے کمرے میں کھانا تیار کرنے میں مصروف تھیں۔ اباقہ کو بیدار ہو کر صحن میں آتے دیکھا تو نبیلہ کپڑے سے ہاتھ صاف کرتی باہر نکل آئی۔ اس کی آنکھوں میں ہمیشہ کی طرح شرارت ناچ رہی تھی۔ اباقہ کو چھیڑتے ہوئے بولی۔ "لگتا ہے بھائی جان آپ رات دیر تک جاگتے رہے ہیں۔"

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔" اباقہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

نبیلہ نے مارینا کو آواز دی۔ "آپا! ذرا باہر آ کر دیکھنا میں سچ کہہ رہی ہوں یا جھوٹ۔"

نبیلہ کی دو آوازوں پر تو مارینا باہر نہیں آئی مگر تیسری آواز پر اسے دروازے سے جھانکنا پڑا۔ اس کی شرمگیں نگاہیں ایک لمحے کو اباقہ سے ٹکرائیں پھر وہ نبیلہ سے بولی۔

"کیوں شور کر رہی ہو؟"

"شور تو بھائی جان کی آنکھیں کر رہی ہیں جناب۔" وہ کمر لچکا کر بولی۔

برآمدے سے یورق کی آواز آئی۔ "کس کی آنکھیں کیا کر رہی ہیں بھئی۔"

"کچھ نہیں کچھ نہیں۔" نبیلہ نے ترچھی نظروں سے مارینا کو دیکھا۔ اس کی گھرکی پر بات بدل کر بولی۔ "داؤد کی آنکھوں میں چمگادڑ کی بیٹ پڑ گئی ہے' کہہ رہا ہے درد کر رہی ہیں۔"

یورق کے حلق سے قہقہہ بلند ہوا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ داؤد کی شان میں کوئی قصیدہ پڑھتا۔ بیرونی دروازہ شور سے کھلا اور مائیکل کا ایک آدمی تیزی سے اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا۔ اس نے کاغذ مائیکل کو تھما دیا۔ مائیکل غور سے کاغذ کی تحریر پڑھنے لگا۔ اس کے چہرے کا رنگ بدلتا جا رہا تھا۔ تحریر ختم ہوئی تو مائیکل کا رنگ برف کی طرف سفید تھا۔ یورق اور اباقہ بھی مائیکل کے قریب جا کھڑے ہوئے۔ تحریر پڑھ کر مائیکل نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور کاغذ اسد کی طرف بڑھا دیا۔ اسد نے یہ کاغذ ترجمان کو دیا اور بولا پڑھ کر سناؤ۔ ترجمان نے خط پڑھنا شروع کیا۔

31 دسمبر 1237ء ریازان کے نامہ نگار کی طرف سے افسر بکار خاص مائیکل ہوور تھ

کے نام .... احوال یہ ہے کہ منگول فوج مختصر محاصرے کے بعد ریازان میں داخل ہو گئی ہے۔ مغل منجنیقوں کی شعلہ باری سے ریازان کی کاٹھ کی فصیلیں خاکستر ہو گئیں۔ ابھی ہمیں اچھی طرح یہ احساس بھی نہ ہو پایا تھا کہ ہماری فصیلیں جواب دے چکی ہیں کہ مغل سوار شہر کے اندر داخل ہو گئے۔ ہماری سپاہ نے دیوانہ وار مقابلہ کیا لیکن ان جنگلیوں کے سامنے کسی کا بس نہ چلا .... ریازان مقتل بن گیا۔ مردوں کو تعاقب کر کے برف و خون سے سرخ گلیوں میں پکڑا گیا اور زندہ سیخوں پر چڑھا دیا گیا۔ سیخوں سے چھد کے تلملا تلملا کے ریازان کے ان گنت سجیلے زندگی کی سرحد پار کر گئے۔ پادریوں نے کلیساؤں میں روپوش ہو کر دروازے بند کر لیے تھے۔ دروازے توڑ کر انہیں پکڑا گیا اور بھیڑوں کی طرح ذبح کیا گیا۔ ان کے ساتھ جو عورتیں کلیساؤں میں پناہ گزین تھیں ان سے انسانیت سوز سلوک کیا گیا۔ ان کی عصمت دری کی گئی اور پھر انہیں قتل کر دیا گیا۔ پورا شہر کھنڈر بن چکا ہے۔ تعفن زدہ گلیوں سے دھواں اٹھتا ہے اور لاشوں کے ڈھیروں پر بچے روتے ہیں۔ آگے نہ جانے کیا ہونے والا ہے۔ خدا ہمارے گناہ معاف کرے۔"

مائیکل کے چہرے پر فکر کی گہری پرچھائیاں تھیں۔ ایک روز پہلے اس نے بتایا تھا کہ اس کے بیوی بچے بھی ریازان میں مقیم ہیں۔ اسد اور یورق بھی خاموش کھڑے تھے۔ اباقہ کے ذہن میں برسوں پہلے کا وہ منظر گھوم رہا تھا جب سمرقند و بخارا میں بھی آگ اور خون کا یہ کھیل کھیلا گیا تھا .... اندرونی حدت سے اباقہ چہرہ تمتمانے لگا۔ اس نے آگے بڑھ کر مائیکل کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولا۔

"ہم تمہارے ساتھ چلیں گے دوست۔"

مائیکل کو اباقہ کی بات سمجھ نہیں آئی لیکن چہرے کے تاثرات سے وہ جان گیا کہ اس سے کیا کہا جا رہا ہے۔ اسد کے چہرے پر بھی اطمینان کے تاثرات تھے۔ اباقہ نے مائیکل سے مخاطب ہو کر کہا۔ "لیکن تمہارے ساتھ جانے کے لیے میری ایک شرط ہے۔ اسد اللہ بھی ہمارے ساتھ چلے گا۔"

ترجمان نے یہ بات مائیکل تک پہنچائی تو وہ مسکرا دیا۔ بولا۔ "میں اپنے اختیارات استعمال کرتے ہوئے اسد سے پہلے ہی جانے کی درخواست کر چکا ہوں۔"

اسد بولا۔ "اور میں اس شرط پر رضامندی ظاہر کر چکا ہوں کہ اباقہ بھی ساتھ جائے گا۔" اباقہ کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی، اگر اسے خوفناک سنجیدگی کہا جاتا تو بے جا نہ تھا۔

☆------☆------☆

اس رات وہ روانگی کے لیے بالکل تیار ہو چکے تھے۔ لائحہ عمل یہ تھا کہ علی الصبح اسد نے ماریتا، نبیلہ اور سلیمان کو اس گاؤں میں پہنچا دینا تھا جہاں اس نے ان کی رہائش کا انتظام کیا تھا۔ سلیمان اور نبیلہ کے متعلق یہاں کی انتظامیہ کچھ نہیں جانتی تھی، صرف ماریتا کے بارے قدرے تشویش ہو سکتی تھی مگر یہاں وہ خوارزم کی نسبتاً کہیں زیادہ محفوظ تھی جہاں منگول قابض اندھیر مچا رہے تھے۔ یوں بھی اس دور افتادہ گاؤں میں ایک پردہ نشین لڑکی کا سراغ لگانا ناممکن تھا۔ داؤد اور ابن یاشر کے متعلق فیصلہ کیا گیا کہ انہیں بندھی مشکوں کے ساتھ یہیں چھوڑ دیا جائے کسی سرحدی چوکی پر ان کے بارے پیغام پہنچا دیا جائے گا کہ وہ فلاں جگہ بندھے پڑے ہیں۔ یہ ساری حکمت عملی اسد اور یورق نے تیار کی تھی، اباقہ بالکل لاتعلق رہا تھا۔ کسی وقت تو اسد کو اندیشہ محسوس ہوتا تھا کہ یرغمالیوں کو چھوڑتے وقت وہ طیش میں آ جائے گا۔ خاص طور پر مسلم بن داؤد کو معاف کرنا اباقہ کے لیے بے حد مشکل تھا .... بہرحال یہ کڑوا گھونٹ ان سب کو پینا ہی تھا۔ طوطم خاں کے بارے ابھی تک انہوں نے کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا۔

رات کا پہلا پہر نصف سے زائد گزر چکا تھا۔ اباقہ پہرے پر تھا اور بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ صبح کا اجالا ماریتا کو ایک بار پھر اس سے جدا کر رہا تھا۔ پھر ان دونوں کے درمیان میدان جنگ کی بے کراں وسعتیں تھیں۔ چمکتی تلواریں تھیں، نیزے اور بھالے تھے، خون کی ندیاں تھیں اور حوادث کے طوفان۔ اسے یقین تھا آج رات ماریتا اس سے ملنے ضرور آئے گی .... اور پھر دروازے میں حرکت پیدا ہوئی۔ ایک انسانی ہیولا مکان سے برآمد ہوا اور اباقہ کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ ماریتا ہی تھی۔ اباقہ آگے بڑھا اور بے اختیار ہو کر اس کے ہاتھ تھام لیے دونوں درخت کے گرے ہوئے تنے پر بیٹھ گئے۔ ملگجی چاندنی درختوں سے چھن چھن کر ان تک پہنچ رہی تھی۔ جنگلی پھولوں کی بھینی مہک فضا میں رچی ہوئی تھی۔ دور کہیں کوئی چکور اپنا راگ الاپ رہا تھا۔

"میں تمہارا انتظار کروں گی۔" ماریتا نے کہا۔

"میں .... تمہارے لیے واپس لوٹوں گا۔" اباقہ نے کہا۔

"میں ایسی ہی چاندنی راتوں میں بیٹھ کر دعا کیا کروں گی کہ جب تم واپس لوٹو تو تمہارا لون بھی تمہارے ساتھ ہو۔"

"وقت زخموں کا مرہم ہے ماریتا۔"

"اباقہ!"

"ماریتا!"

دفعتاً ایک آہٹ نے انہیں چونکا دیا۔ دونوں نے بیک وقت مڑ کر دیکھا۔ ان کے سامنے طوطم خاں کھڑا تھا۔ درختوں سے اترنے والی چاندنی اس کے غضبناک چہرے کو نہایت خوفناک بنا رہی تھی۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں طیش کی بجلیاں چمک رہی تھیں۔ ماریتا اور اباقہ کو محو دیکھ کر وہ نہایت آہستگی سے آیا تھا اور قریب رکھی ہوئی اباقہ کی تلوار اٹھا کر پیچھے ہٹ گیا تھا۔ اب یہ عریاں تلوار اس کے ہاتھوں میں چمک رہی تھی۔

وہ سرسراتی آواز میں ماریتا سے مخاطب ہوا۔ "میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا ماریتا۔ دنیا کی آخری سرحد اور زندگی کی آخری سانس تک تیرا پیچھا کروں گا۔ تو میری نہیں تو کسی کی بھی نہ ہو سکے گی۔" طوطم خاں ایسے جنونی انداز میں بول رہا تھا کہ ماریتا کانپ کر رہ گئی۔ وہ سرکتی ہوئی اباقہ کے قریب چلی گئی۔ اباقہ کی نگاہیں طوطم کی تلوار پر تھیں جو وہ دھیرے دھیرے ہلا رہا تھا۔ پھر ایکدم طوطم نے یہ تلوار ماریتا کے قدموں میں پھینک دی اور بولا۔

"مجھ سے پیچھا چھڑانے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے۔ مجھے اپنے ہاتھ سے قتل کر دو۔ قتل کر دو مجھے۔" یہ کہتے ہوئے طوطم نے نہایت وحشت کے عالم میں اپنا گریبان پھاڑا اور ان کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

ماریتا بے بسی سے اباقہ کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کا چہرہ زرد ہو کر چاندنی کا حصہ بن گیا تھا۔ اباقہ بھی کبھی تلوار کو اور کبھی طوطم کو دیکھ رہا تھا۔ طوطم پھر بولا۔ "سوچتے کیا ہو۔ میں تمہارا سب سے بڑا دشمن تمہارے سامنے کھڑا ہوں۔ مارو مجھے' ورنہ میں تمہاری زندگیاں حرام کر دوں گا۔"

اباقہ نے ماریتا کی طرف دیکھا اور ایک طویل سانس لے کر بولا۔ "اگر ہم تمہارے خون سے ہاتھ نہ رنگنا چاہیں تو پھر؟"

"تو پھر تجھے آج ایک فیصلہ کرنا ہو گا۔" طوطم خاں نے غضب ناک لہجے میں کہا اور اباقہ کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔

"کیسا فیصلہ؟" اباقہ نے پوچھا۔

"چنگیز خاں کے پوتے باتو خاں کا سر۔"

"کیا مطلب؟" اباقہ نے کہا۔

"مطلب یہ کہ میں بھی تمہارے ساتھ روس کی مہم پر جاؤں گا۔ منگول لشکر کی قیادت چنگیز کا پوتا باتو خاں کر رہا ہے۔ ہم دونوں اس کا سر حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔ ماریتا سے شادی وہی کرے گا جو باتو خاں کا سر لائے گا۔"

اباقہ اور ماریتا حیرت سے منہ کھولے طوطم خاں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اباقہ بولا۔

"طوطم خاں! تم جانتے ہو تم کیا بات کر رہے ہو؟"

"اچھی طرح جانتا ہوں۔" طوطم ایک قدم آگے بڑھتا ہوا بولا۔ "تمہیں یہی گھمنڈ ہے نا کہ تم بہادر اور طاقتور ہو۔ تو پھر بنو بہادر' سوچ کیا رہے ہو۔ ہم دونوں کے لئے میدان کھلا ہے۔"

اباقہ نے گہری سانس لے کر کہا۔ "طوطم تم ایسی بات کر رہے ہو جس پر شاید بعد میں تمہیں خود بھی پچھتانا پڑے۔ باتو خاں تک پہنچنا تمہارے خیال میں کوئی آسان کام ہے۔"

طوطم زہریلے لہجے میں بولا۔ "اور ماریتا کا حاصل کرنا تمہارے خیال میں آسان ہے۔ باتو خان کا سر نادر ہے تو ماریتا اس سے بڑھ کر نادر ہے۔ یا کہہ دو کہ تمہیں ماریتا سے سچی محبت نہیں۔ تم صرف اس کے حسن کے شکاری ہو۔ کہہ دو یہ بات۔"

ماریتا طوطم خاں پر چیخی۔ "چپ ہو جاؤ۔ خدا کے لئے چپ ہو جاؤ۔ تم کچھ نہیں جانتے میرے بارے میں۔"

طوطم وحشیانہ انداز میں غرایا۔ "تُو اس معاملے میں مت بول۔ مجھے بات کرنے دے اس جنگجو بہادر سے۔ ہاں بول اباقہ کیا خیال ہے تیرا۔"

اباقہ نے ایک نظر ماریتا کی طرف دیکھا پھر بولا۔ "ٹھیک ہے طوطم خاں۔ اگر اس طرح تیرا منحوس سایہ ماریتا سے ہٹ سکتا ہے تو مجھے یہ شرط منظور ہے۔"

"منحوس" کے لفظ پر طوطم خاں کا چہرہ غصے سے تمتما گیا۔ وہ گرجا۔ "اپنی زبان کو لگام دے اباقہ۔ اگر میں چاہتا تو اس وقت یہاں تیری لاش تڑپ رہی ہوتی' لیکن میں تجھے ہرانا چاہتا ہوں۔ مرتو تُو اس وقت خود ہی جائے گا جب ماریتا کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دیکھے گا۔"

اباقہ نے مرعوب ہوئے بغیر کہا۔ "اس کا فیصلہ وقت کرے گا طوطم۔"

طوطم نے ہاتھ آگے بڑھا کر کہا۔ "تو ٹھیک ہے ملا ہاتھ۔ ماریتا اس کی ہو گی جس کے پاس باتو خاں کا سر ہو گا۔"

اباقہ نے ہاتھ آگے بڑھایا اور دونوں کے پنجے ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے۔ ماریتا کا رنگ زرد ہو رہا تھا' وہ احتجاجی لہجے میں چیخی۔ "اباقہ۔"

اباقہ نے بے پناہ اعتماد سے کہا۔ "اپنی محبت پر بھروسہ رکھو ماریتا۔ وہی ہو گا جو تم چاہو گی۔ میں یہ معاملہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دوں گا۔"

ماریتا نے چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپایا اور سسکنے لگی۔ اباقہ نے آگے بڑھ کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھنا چاہا لیکن طوطم خاں لپک کر سامنے آ گیا۔

"نہیں اباقہ!" وہ غرایا۔ "ماریتا کو چھونے کا حق اب اسی کو ملے گا جو باتو کا سر لائے گا۔"

اباقہ اپنی جگہ کھڑا رہ گیا۔

ماریتا نے ایک نظر اباقہ کی طرف دیکھا پھر چادر کے پلو سے چہرہ ڈھانپتی ہوئی تیز قدموں سے مکان کی طرف بڑھ گئی۔

☆------☆------☆

اسد اللہ علی الصبح نبیلہ، سلیمان اور ماریتا کو لے کر روانہ ہو گیا۔ انہیں گاؤں تک پہنچا کر اسے فوراً واپس آ جانا تھا۔ اس دوران اباقہ وغیرہ کو روانگی کی تیاری کرنا تھی۔ وقت رخصت سلیمان فرداً فرداً سب سے بغلگیر ہوا۔ خصوصاً اباقہ سے وہ دیر تک معانقہ کرتا رہا۔ نبیلہ اور ماریتا گھوڑوں پر سوار درخت کے نیچے کھڑی تھیں۔ اسد اللہ بھی ان کے ساتھ تھا۔ اباقہ کی نگاہیں مسلسل ماریتا کی پشت پر جمی تھیں۔ کچھ ہی دور طوطم خاں کھڑا اباقہ کو گھور رہا تھا۔

شاید اس لئے ماریتا نے اباقہ کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ گھوڑے حرکت میں آئے اور ان کے سموں کی اڑائی ہوئی گرد سنہری دھوپ میں چمکنے لگی۔ ماریتا کی زرد اوڑھنی آہستہ آہستہ اباقہ سے دور ہوتی جا رہی تھی۔ اباقہ سوچ رہا تھا۔ ابھی اس اوڑھنی میں حرکت پیدا ہو گی اور ماریتا ایک بار پھر مڑ کر الوداعی نظروں سے اس کی طرف دیکھے گی .... لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ اباقہ سے زرد اوڑھنی کا فاصلہ بڑھتا چلا گیا اور پھر وہ درختوں میں اوجھل ہو گئی۔ ماریتا اور اباقہ کے درمیان تنی ہوئی کوئی ڈور جیسے جھٹکے سے ٹوٹ گئی .... اباقہ نے ایک آہ بھری۔ کتنی افسردہ کر دینے والی جدائی تھی یہ۔ جذبے سہمے ہوئے تھے اور لفظ خاموش۔ ایک حرف تسلی اباقہ کی زبان پر اٹکا رہ گیا تھا اور ایک اشک لرزاں ماریتا کی آنکھ میں چلا گیا تھا۔ بہت سی ان کہی باتوں کی دھول اباقہ کے سینے میں پھیلنے لگی۔ اسے لگا جیسے اس کا دم گھٹ رہا ہے۔ اس نے کچھ دور کھڑے طوطم کو جلتی نظروں سے دیکھا اور اندر چلا گیا۔

دن کا دوسرا پہر شروع ہو رہا تھا۔ جب اسد، سلیمان وغیرہ کو چھوڑ کر واپس آ گیا۔ ادھر روسی نمائندے مائیکل کی سربراہی میں قافلہ روانگی کی تیاری کر چکا تھا۔ انہیں سوداگروں کے بھیس میں سفر کرنا تھا اور اس کے لئے مائیکل نے سامان تجارت کا انتظام کر رکھا تھا۔ ہندوستانی صندل، عود اور کافور جو بغداد میں عام ملتا تھا، اس نے کافی مقدار میں خرید رکھا تھا۔ اس کے علاوہ بنگال کا مخملی کپڑا اور سراندیپ کے یاقوت اور بلور بھی ان کے

پاس موجود تھے۔ یہ اشیاء یہ ثابت کرنے کے لئے کافی تھیں کہ وہ ملک ملک بھٹکنے والے تاجر ہیں اور ان کے کسی کام کے عسکری مقاصد نہیں۔ اسد اللہ واپس پہنچا تو اس نے اباقہ کو مسلم بن داؤد اور ابن یاشر کے سامنے کھڑا پایا۔ ان دونوں کی مشکیں مضبوطی سے کس دی گئیں تھیں اور وہ ایک کمرے کے گرد آلود فرش پر پڑے تھے۔ اباقہ غصیلی نظروں سے ان دونوں کو گھور رہا تھا پھر وہ نہایت سرد لہجے میں بولا۔

"مسلم بن داؤد، یہ نہ سمجھنا میں تجھے اپنی جان کے خوف سے چھوڑے جا رہا ہوں۔ اگر تیرے دل میں کوئی ایسی بات ہے تو میں تجھے قسمت آزمائی کا پورا موقع دے سکتا ہوں۔ میں تیری بندشیں کھول سکتا ہوں اور اپنی تلوار تیرے ہاتھ میں دے سکتا ہوں۔ پھر تجھ سے یہ وعدہ بھی کر سکتا ہوں کہ میرا کوئی ساتھی تیرے راستے میں نہیں آئے گا۔ اگر تو چاہے تو مجھے ان رسیوں میں باندھ بھی سکتا ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں اگر تو اپنی ہمت سے بھاگ کر ایک کوس دور نکل گیا تو تیرا پیچھا نہیں کروں گا۔ بول تجھے منظور ہے؟"

مسلم بن داؤد گھگیایا۔ "نہیں اباقہ! میں جانتا ہوں تو کسی کے خوف سے ہمیں رہا نہیں کر رہا۔ یہ تیری مہربانی ہے، تیری عنایت ہے اباقہ۔ ہم تیری جوانمردی کا امتحان لے کر اپنی زندگی گنوانے کی حماقت نہیں کریں گے۔"

اباقہ نے ابن یاشر کی طرف دیکھا۔ "تیرے دل میں کوئی وسوسہ ہے ابن یاشر تو تو بھی نکال لے۔ سنا ہے تو نے خلیفہ سے کہا تھا کہ مجھے مرے ہوئے کتے کی طرح گھسیٹتا اس کے قدموں میں لے آئے گا۔ میں تجھے خلیفہ کے سامنے سرخرو ہونے کا موقع دے رہا ہوں۔ اپنی بندشیں مجھے دے کر میری تلوار لے لے اور بھاگ جا اگر بھاگ سکتا ہے۔"

مسلم بن داؤد نے پھر فریاد کی۔ "نہیں اباقہ، ہمیں شرمندہ نہ کر۔ ہم پہلے ہی بہت شرمسار ہیں۔"

ابن یاشر نے گھور کر داؤد کو دیکھا۔ وہ بار بار "ہم" کا لفظ استعمال کر کے اپنے ساتھ ساتھ اس کی بھی تذلیل کر رہا تھا۔ آخر وہ خلافت عباسیہ کا وزیر خارجہ تھا کوئی عام شخص نہیں تھا۔ غصے کی ایک لہر اس کے اندر سے اٹھی اور اس کی زبان کو گویائی دے گئی۔ وہ خشک لہجے میں بولا۔ "اباقہ حالات ایسے ہیں کہ تو یہ سب کچھ کہہ سکتا ہے، لیکن یہ مت بھول اگلی دفعہ جب ہمارا سامنا ہو گا تو صورت حال مختلف ہو گی۔"

اباقہ دانت پیس کر بولا۔ "صورت حال وہی ہو گی جس میں، میں تجھے تیرے محل سے اٹھا کے لایا تھا بدبخت انسان۔"

ابن یاشر اطمینان سے بولا۔ "میزبانی کا شکریہ اباقہ۔ میرے لئے یہ چند روز اچھی

تفریح ثابت ہوئے ہیں۔"

.... یہیں پر ابن یاشر وہ غلطی کر گیا جو اس جیسے دانا شخص کو ہرگز نہیں کرنی چاہئے تھی۔ اس کی بات میں چھپا ہوا طنز اباقہ کو آگ بگولا کرنے کے لئے کافی تھا۔ اس نے ایک جھٹکے سے تلوار نیام سے باہر کی۔ مسلم بن داؤد اس کے تیور دیکھ کر خوف سے چلایا۔ اسد نے یہ منظر دیکھا تو تیزی سے اباقہ کی طرف بڑھا اور اسے اپنی بانہوں میں لینے کی کوشش کی۔ اباقہ نے مچھلی کی طرح تڑپ کر خود کو اس کی گرفت سے چھڑایا اور تلوار سونت کر ابن یاشر کی طرف بڑھا۔ مسلم بن داؤد کی ہذیانی چیخ یورق اور مائیکل کو بھی کمرے کی طرف متوجہ کر چکی تھی۔ ابھی اباقہ ابن یاشر سے دو گز دور تھا کہ یورق لپک کر اس سے بغلگیر ہو گیا اور پورے زور سے اسے دھکیلتا ہوا دروازے تک لے گیا۔ اباقہ فرط غضب میں آپے سے باہر ہو رہا تھا۔ اس کے حلق سے غراہٹیں نکل رہی تھیں۔ "ذلیل انسان میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ یہیں تیری قبر بناؤں گا۔" ابن یاشر اپنی جگہ بے حرکت بیٹھا تھا اس کا رنگ سرسوں کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ چوڑی مونچھوں کے نیچے ہونٹ تھرا رہے تھے۔ دفعتاً اباقہ نے زور مارا اور قوی ہیکل یورق کو ایک طرف دھکیلتا ہوا پھر ابن یاشر پر جھپٹا۔ اس وقت مائیکل اس کے سامنے آیا وہ خود کو عریاں تلوار سے بچاتا ہوا اباقہ سے لپٹ گیا۔ عقب سے یورق اور پہلو سے اسد نے اسے تھام لیا۔ اباقہ کے جسم میں جیسے بجلیاں کوند رہی تھیں۔ اس نے ان تینوں کے درمیان سے اپنی تلوار نکالی اور یاشر کے چہرے پر وار کیا۔ تلوار کی نوک' نیزے کی انی کی طرح یاشر کی ناک سے ٹکرائی اور دایاں نتھنا پھاڑتی ہوئی ابرو تک چلی گئی۔ پلک جھپکتے میں گہرے زخم سے خون کی دھاریں بہہ نکلیں۔ اسد' یورق اور مائیکل بے قابو اباقہ کو کھینچتے ہوئے کمرے سے باہر لے گئے۔ ابن داؤد آنکھیں بند کئے منہ میں کچھ بڑبڑا رہا تھا لگتا تھا اسے لرزے کا بخار چڑھا ہوا ہے۔

اس واقعے کے ٹھیک ایک گھڑی بعد ان کا قافلہ شمال کی جانب محو سفر ہو گیا۔ طوطم خاں بھی ان کے ساتھ تھا۔ اباقہ اور اسد کے کہنے پر مائیکل اسے بھی ساتھ لے جانے پر رضامند ہو گیا تھا۔ اسد نے مائیکل کو بتایا تھا کہ طوطم خاں منگولوں کا منحرف سفیر ہے اور خاقان کے ہرکارے اسے کئی مہینوں سے خوارزم اور عراق کے علاقوں میں تلاش کر رہے ہیں۔ مائیکل کو بھی ایسے ہی "منگول دشمنوں" کی ضرورت تھی۔ اس نے طوطم کو ساتھ لے جانے کی ہامی بھر لی۔

روانہ ہونے سے پہلے اسد اور یورق نے احتیاط کے ساتھ یاشر کی مرہم پٹی کر دی تھی۔ اس کا زخم خاصا سنگین تھا مگر وہ خون روکنے میں کامیاب رہے تھے۔ اب انہیں

صرف ایک کام کرنا تھا۔ کسی نزدیکی چوکی پر یہ اطلاع دینی تھی کہ مسلم بن داؤد اور یاشر فلاں جگہ پڑے ہیں۔

پھر ان کا یہ کام خود بخود آسان ہو گیا۔ سرحدی جنگل میں انہیں ایک فوجی سوار نظر آیا۔ اسد نے آگے بڑھ کر اس کا راستہ روک لیا۔ فوجی سوار نے پوچھنے پر بتایا کہ نزدیکی چوکی یہاں سے کم از کم نصف منزل کی دوری پر ہے۔ اسد نے اس سوار سے اس کا گھوڑا چھینا اور اس کے جوتے بھی اتروا لئے۔ پھر اسے اس کھنڈر نما مکان کا پتہ دیتے ہوئے کہا کہ وہاں دو ایسے افراد بندھے پڑے ہیں جن کے بارے میں اپنے کماندار کو اطلاع دے کر وہ شاباش اور انعام کا حقدار ٹھہر سکتا ہے۔ سوار نے روہانسی آواز میں کہا۔ "لیکن گھوڑے کی گمشدگی پر جو سزا ملے گی؟" یورق بولا۔ "بے وقوف! ایک مریل گھوڑے کے بدلے تو انہیں دو پلے ہوئے خچر دے گا تو وہ سزا کیوں دیں گے تجھے۔ ان میں سے ایک خچر تھوڑا سا زخمی ضرور ہے لیکن وہ سرکاری خچر ہے۔ تیرے گھوڑے جیسے پچاس گھوڑے بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ جا شاباش۔"

تنہا فوجی سوار نے اُلجھی نظروں سے ان عجیب و غریب تاجروں کو دیکھا اور ننگے پاؤں کانٹوں سے بچتا بچاتا آہستہ آہستہ جنوب مشرق کی طرف چل دیا۔ اسد کو امید تھی کہ وہ رات سے پہلے اپنی چوکی تک نہ پہنچ سکے گا۔ اس سے پیشتر وہ ابن یاشر اور خلیفہ مستنصر کی پہنچ سے دور نکل چکے ہوں گے۔

☆------☆------☆

اسد کا اندازہ درست تھا۔ اس رات انہوں نے سرحد سے کوئی چالیس کوس آگے درختوں سے گھرے ہوئے ایک محفوظ مقام پر پڑاؤ ڈالا۔ تھوڑی سی ہموار جگہ دیکھ کر تین خیمے ایستادہ کر دیئے گئے۔ سامان تجارت ایک خیمے میں منتقل کر کے وہاں مائیکل نے اپنے دو آدمی پہرے پر بٹھا دیئے۔ اسد اباقہ اور مائیکل ایک ہی خیمے میں تھے۔ کھانا کھا کر جب سب لوگ سونے کی تیاری کر رہے تھے اباقہ ٹہلتا ہوا پڑاؤ سے آگے نکل گیا۔ آسمان پر چاند چمک رہا تھا۔ تاروں کی محفل سجی تھی۔ جنگلی پھولوں کی خوشبو سے لدی ہوا شاخوں سے اٹھکیلیاں کر رہی تھی .... لیکن آج یہ سب کچھ اباقہ کو اچھا نہیں لگا۔ اس ماحول پر جیسے کسی نے اداسی کی مہر لگا دی تھی۔ رہ رہ کر اباقہ کو مارینا کی جدائی کا منظر یاد آتا تھا۔ عجیب عجیب وسوسے اس کے دل میں سر اٹھا رہے تھے۔ جاتی دفعہ اس نے ایک نظر بھی تو اسے نہیں دیکھا تھا۔ حالات نے انہیں کہاں سے کہاں لا پھینکا تھا۔ ایک وقت تھا کہ ان کے درمیان صرف ایک رات کا فاصلہ تھا .... ایک رات کی چند گھڑیوں کا فاصلہ' صبح

وہ ایک بندھن میں بندھنے والے تھے۔ اس وقت وہ چند گھڑیاں گزارنی بھی کتنی مشکل محسوس ہوتی تھیں لیکن اب قدرت نے انہیں ماہ و سال کا انتظار دے کر دو مختلف سمتوں کو روانہ کر دیا تھا۔ شاید اسی ستم ظریفی کا نام زندگی تھا۔ اباقہ دیر تک بیٹھا سوچتا رہا پھر اٹھا اور سست قدموں سے چلتا سفری خیمے میں واپس آگیا۔ مائیکل سو چکا تھا۔ اسد شمعدان کی روشنی میں کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ اباقہ نے اپنا بستر کھولا اور خیمے کے ایک کونے میں بچھانے لگا۔ اچانک اس کی نظر ایک کپڑے پر پڑی۔ اس نے کپڑے کی تہیں کھولیں تو ایک کاغذ اور بالوں کی ایک ریشمی لٹ پھسل کر اس کی جھولی میں آگری۔ اس نے بے اختیار ہو کر لٹ کو چھوا اور چھونے سے پہلے ہی وہ پہچان گیا کہ یہ لٹ ماریتا کی ہے۔ یہ خوشبو، یہ رنگت یہ طوالت اور کس کا نصیب ہو سکتی تھی۔ اس نے چور نظروں سے اسد کو دیکھا وہ اپنی کتاب میں گم تھا۔ اباقہ نے لٹ جلدی سے تکیے کے نیچے چھپادی پھر خط کھول کر دیکھنے لگا۔ سفید کاغذ پر آڑی ترچھی لکیریں ہی تھیں۔ یقیناً یہ خط اور یہ لٹ بستر باندھتے وقت اس میں رکھے گئے تھے۔ غالباً بستر ماریتا اور نبیلہ نے باندھے تھے۔ نبیلہ کا نام ذہن میں آتے ہی اباقہ سمجھ گیا کہ اگر یہ خط ماریتا کا ہے تو اس نے نبیلہ سے لکھوایا ہے۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر اس نے یہ خط اسد کی طرف بڑھا دیا۔ اسد نے خط دیکھ کر کتاب بند کی اور اس کے چہرے پر دلکش مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے مسکراتی نظروں سے اباقہ کو دیکھا اور بولا۔ "ماریتا کا خط ہے۔"

اباقہ کا دل جو پہلے ہی شدت سے دھڑک رہا تھا باقاعدہ اچھلنے لگا۔ اسد نے شمعدان قریب کیا اور پڑھنے لگا۔ "اباقہ! تم جا رہے ہو۔ تم جہاں جاؤ گے میری دعائیں تمہارے ساتھ ہوں گی۔ انشاء اللہ تم ایک روز سرخرو ہو کر واپس لوٹو گے۔ اس وقت اگر میں زندہ ہوئی تو گھر کی دلہیز پر تمہارا انتظار کر رہی ہوں گی اور اگر مرگئی تو میری قبر کی مٹی تمہارے ہاتھوں کی منتظر ہو گی۔ اباقہ! ایک بات میں آج تم پر کھول دینا چاہتی ہوں۔ میری زندگی اور موت اب صرف اور صرف تم سے وابستہ ہے اور یہ حقیقت کسی شرط میں ہارنے یا جیتنے سے بدل نہیں سکتی اگر ہار اور جیت کی بات کرتے ہو تو تم نے مجھے اس وقت جیت لیا تھا جب میں قراقرم سے تمہارے ساتھ چل پڑی تھی۔ اب اگر تم مجھے ہارنا بھی چاہو تو نہیں ہار سکتے۔ کیونکہ میں تمہاری ہار بننے کی بجائے اپنی عزت کی جنگ لڑتے ہوئے مرنا پسند کروں گی .... اباقہ! میں ایک کمزور عورت ہوں، تمہیں مجھ سے کوئی بھی چھین سکتا ہے لیکن میں ایک مضبوط عورت بھی ہوں مجھے تم سے کوئی نہیں چھین سکتا۔" تمہاری منتظر ماریتا۔

اسد نے خط پڑھ کر اباقہ کی طرف دیکھا اور بولا۔ "اباقہ! آخری جملہ تمہاری سمجھ میں آیا؟"

اباقہ نے کہا۔ "ذرا پھر پڑھو۔"

اسد نے دہرایا۔ "اباقہ! میں ایک کمزور عورت ہوں، تمہیں مجھ سے کوئی بھی چھین سکتا ہے لیکن میں ایک مضبوط عورت بھی ہوں مجھے تم سے کوئی نہیں چھین سکتا۔"

اباقہ نے سر ہلایا۔ "میں سمجھ رہا ہوں اسد۔ اس نے کہا ہے کہ شاید کوئی اور حسین عورت یا حسین لمحہ میرا راستہ بدلنے کی کوشش کرے لیکن اسد وہ اتنی کمزور بھی نہیں جتنا وہ خود کو سمجھتی ہے۔ وہ ایک جادو ہے جو میری رگ رگ میں سما چکا ہے، وہ میرے روئیں روئیں پر حکومت کرتی ہے............"

جذبات اور مسرت کی فراوانی میں یہ بات خود بخود اباقہ کی زبان سے نکل گئی تھی۔ اسد حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے اس وحشی کے اندر دھیرے دھیرے کوئی شاعر حلول کر رہا ہے۔ "وحشی شاعر" اس نے دل میں اباقہ کو ایک مناسب سا نام دیا اور اس نام پر خود ہی مسکرا اٹھا۔

اباقہ نے خیمے کے نیم وا دروازے سے باہر جھانکا۔ ان کے چھوٹے سے پڑاؤ پر چاندنی ٹوٹ کر برس رہی تھی۔ کچھ ہی دور مائیکل کے دونوں گونگے جانباز مجسموں کی طرح بے حرکت کھڑے پہرہ دے رہے۔ ایک چمکدار سیاہ گھوڑی درخت کی ایک جھکی شاخ پر منہ مارنے کی کوشش کر رہی تھی۔ یہ گھوڑی، یہ پہریدار یہ چاندنی اور یہ خیمے سب کچھ اباقہ کو بھلا لگا۔ ہر شے اچانک ہی حسین ہو گئی تھی۔ اس کے اندر ایک نئی ترنگ جاگ رہی تھی۔ آگے بڑھنے کی ترنگ دشمن سے نبرد آزما ہونے کی ترنگ، مشکلیں سر کرنے اور پھر فتح کا پھریرا لہراتے ہوئے واپس آنے کی ترنگ.........

☆------☆------☆

وہ ایک چمکیلی صبح تھی۔ زمین پر برف کی دبیز چادر نے اسے کچھ اور چمکیلا بنا دیا تھا۔ ماسکو اس زمانے میں بلندی پر واقع ایک عام سا شہر تھا اور اس جگہ واقع تھا جہاں اب کریملین کی عمارتیں ہیں۔ ماسکوا اور نگلی نایا ندیوں کا سنگم عین اس شہر کے دامن میں تھا۔ شہر پناہ سے باہر دور تک درختوں کا سلسلہ تھا۔ ان درختوں پر برف نے گھونسلے بنا رکھے تھے۔ ایک کھلی جگہ پر چند نوجوان لڑکیاں کھیل کود میں مصروف تھیں۔ یہ سب شاہی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کے محافظ گھوڑوں پر سوار کچھ فاصلے پر مئودب کھڑے تھے۔ لڑکیوں نے اونی کپڑے پہن رکھے تھے۔ ان کے سروں پر سموری ٹوپیاں

تھیں۔ انہوں نے برف کے تین مجسمے بنا رکھے تھے اور ان پر تیراندازی کی مشق کر رہی تھیں۔ مجسمے بڑی ہنرمندی سے بنائے گئے تھے اور انہیں دیکھتے ہی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ یہ جنوب مشرق میں بسنے والے وحشی منگولوں کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ کچھ فاصلے پر چند نو عمر لڑکیاں چھوٹی تلواروں سے تلوار بازی میں مصروف تھیں۔ لڑکیوں کی چہکاریں اور ان کے قہقہے فضا میں دور تک بکھر رہے تھے۔ ان سب سے الگ ایک منجمد ندی کے کنارے نتاشا بیٹھی تھی۔ اس نے چیڑ کے ایک درخت سے ٹیک لگا رکھی تھی۔ وہ تلوار ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھی جس سے وہ کچھ دیر پہلے مشق کر رہی تھی۔ نتاشا' دلادی میر کے رئیس اعظم یوری کی بیٹی تھی۔ ان دنوں وہ تفریح کی غرض سے اپنے چچا کے پاس ماسکو آئی ہوئی تھی۔ چچا کی بیٹی زارینہ اس کی گہری سہیلی تھی۔ اس وقت نتاشا کے کانوں میں زارینہ کا وہ فقرہ گونج رہا تھا جو اس نے دو ہفتے پہلے اسے دیکھتے ساتھ ہی کہا تھا۔ وہ بولی تھی۔
"خدا کی قسم! ایک سال میں قیامت بن گئی ہو۔"

"کیا میں واقعی قیامت بن گئی ہوں۔" نتاشا نے شفاف برف میں اپنا عکس دیکھنے کی کوشش کی ایسا کرتے ہوئے اس کی خمدار سنہری زلفیں آگے کو جھک آئیں اور ایک لٹ بل کھا کر اس کی ٹھوڑی کو چھونے لگی۔ نتاشا نے اپنے سراپا پر نگاہ دوڑائی اور نرم دھوپ بھی اس کے رخساروں میں چبھنے لگی۔ اس نے جلدی سے اپنے ٹھنڈے ہاتھ چہرے پر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے کانوں میں وہ دیہاتی گیت گونجنے لگا جس میں ایک ماں اپنی بیٹی سے کہتی ہے' تم اب اٹھارہ سال کی ہو گئی ہو اس لئے باغ میں پھول چننے نہ جایا کرو۔ پھولوں کے ساتھ نوکیلے کانٹے بھی ہوتے ہیں۔ پھولوں کا خیال ذہن میں آتے ہی نتاشا کے ذہن میں دنیا جہان کی مہک سما گئی۔ اس نے تصور میں دیکھا زمین پر دور دور تک پھولوں کی پتیاں بچھی ہیں۔ افق سے سورج طلوع ہو رہا ہے اس کی کرنوں میں پتیوں پر پڑی شبنم چمک رہی ہے۔ پھر ایک ہیولا نظر آتا ہے۔ یہ ایک شہزادہ ہے۔ اس کا طویل ریشمی دامن فضا میں لہرا رہا ہے اس کے ہاتھ میں گلاب کا ایک پھول ہے۔ وہ دوڑتا ہوا اس کی طرف آ رہا ہے لیکن لگتا ہے وہ تیر رہا ہے۔ پھر وہ اس کے قریب پہنچتا ہے اور نہایت احترام سے وہ پھول اس کے قدموں میں رکھ دیتا ہے .... یہ منظر نتاشا کئی بار دیکھ چکی تھی۔ یہ اس کی جاگتی آنکھوں کا خواب تھا جو تنہائی پاتے ہی اس کے حواس پر طاری ہو جاتا تھا۔ ایک طویل سانس لے کر نتاشا نے سر جھٹکا اور ٹھوڑی ہاتھوں پر ٹکا کر منجمد ندی کا نظارہ کرنے لگی .... دفعتاً اسے گھوڑوں کی ٹاپیں سنائی دیں۔ شہر کو جانے والا راستہ ندی کے دوسری جانب سے گزرتا تھا اور یہ گھوڑے اسی راستے پر آ رہے تھے۔

اچانک نتاشا کے دل میں ایک خدشہ جاگا۔ سرحدی علاقوں سے منگولوں کے حملوں کی خبریں آ رہی تھیں۔ ریازان کی تباہی کی داستانیں ہر شخص کی زبان پر تھیں۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ منگول اس طرف بھی آ سکتے ہیں مگر زیادہ تر لوگ اس خدشے کو بے بنیاد قرار دیتے تھے۔ خود نتاشا کے والد نے دلادی میر سے اسے اپنے خط میں لکھا تھا کہ وہ اطمینان سے سیر و تفریح کرے۔ منگول لٹیرے ان کی منظم قوت سے ٹکرانے کا خیال بھی دل میں نہیں لا سکتے۔

نتاشا نے دل ہی دل میں ان وحشی لٹیروں پر لعنت بھیجی اور غور سے ندی کے پار دیکھنے لگی۔ گھوڑوں کی ٹاپیں اب نزدیک آ گئی تھیں اور قافلہ جلد ہی اس کے سامنے سے گزرنے والا تھا۔ ٹاپوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ گھڑسوار سرپٹ بھاگے چلے آ رہے ہیں۔ ان کی تعداد دس سے پندرہ کے درمیان تھی .... پھر نتاشا نے انہیں اپنے سامنے سے گزرتے دیکھا۔ وہ طوفانی رفتار سے اڑے چلے جا رہے تھے۔ ان کے چہروں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ طویل فاصلے طے کرتے ہوئے آئے ہیں۔ ان میں سے سب سے آگے ایک پتلا سا نوجوان تھا دوسرے سواروں کے برعکس اس کے سر پر ٹوپی وغیرہ نہیں تھی۔ اس کے لمبے بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ چہرہ تنا ہوا تھا اور پوستین کا گریبان کھلا تھا۔ پلک جھپکتے میں گھڑسوار اس کے سامنے سے گزر کر درختوں میں اوجھل ہو گئے۔ اب صرف ان کے گھوڑوں کی ٹاپیں سنائی دے رہی تھیں۔ نتاشا کی نگاہوں میں اس نوجوان کا چہرہ گھوم رہا تھا۔ وہ خوبصورت نہیں تھا لیکن اس کے چہرے اور اس کے انداز میں عجیب طرح کی کشش تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے ہوا کا ایک منہ زور جھونکا اس کے سامنے سے گزر گیا ہے' یا کوئی شہاب ثاقب تھا جو چمکیلی لکیر کھینچتا ہوا اس کے سامنے سے نکلا ہے۔ نتاشا سوچنے لگی نہ جانے یہ کون لوگ تھے اور کہاں جا رہے تھے۔ ان کا رخ تو شہر کی طرف ہی تھا لیکن ممکن تھا انہیں آگے جانا ہو۔ یونہی دل لگی کے لئے نتاشا سوچنے لگی یہ نوجوان جو اس نے دیکھا ہے اس کے خوابوں کے شہزادے سے کس حد تک ملتا ہے۔ اس نے تصور ہی تصور میں موازنہ کیا اور پھر خود ہی ہنس دی۔ ان دونوں میں کوئی مطابقت نہیں تھی۔
"نتاشا!" زارینہ نے دور سے آواز دی۔ "چلو واپس چلیں۔"
نتاشا اپنی جگہ سے اٹھی اور پتھر پھلانگتی ہوئی سہیلیوں کی طرف بڑھ گئی۔

☆------☆------☆

نتاشا نے اپنے کمرے میں آ کر گھڑسواری کا لباس تبدیل کیا۔ اب اس کے جسم پر خوبصورت پھولوں والا لباس نظر آ رہا تھا۔ ایک گرم شال اس نے کندھوں پر پھیلائی اور

آئینے میں اپنا جائزہ لینے لگی۔ اس وقت اسے نچلی منزل سے کچھ اونچی آوازیں سنائی دیں
یوں لگتا تھا کچھ لوگ جھگڑ رہے ہیں۔ نتاشا نے دروازہ کھولا اور برآمدے میں آ گئی۔ اسی
وقت زارینہ بھی بال سنوارتی اپنے کمرے سے نکل آئی۔ ان دونوں نے نیچے نشست
میں دیکھا۔ نیچے کا منظر دیکھ کر نتاشا دم بخود رہ گئی۔ وہ جنگلی نوجوان جسے اس نے "ننگی ند
ندی کے کنارے دیکھا تھا اب تین چار ساتھیوں کے ساتھ ان کی نشست گاہ میں موجود
لیکن اس طرح کہ نتاشا کا خون کھول کر رہ گیا۔ اس کے چچا صرف ایک زیر جامہ پہنے ا
لوگوں کے درمیان کھڑے تھے۔ دو آدمیوں نے انہیں بازوؤں سے تھام رکھا تھا۔ نشست
گاہ کے دروازے اندر سے بند تھے اور کوئی محافظ نظر نہیں آ رہا تھا۔ جو ایک شناسا چہرہ نتا
کو نظر آیا وہ محل کی باورچن کا سات آٹھ سالہ لڑکا تھا۔ وہ اپنی میلی کچیلی' مور کے پر وال
سرخ ٹوپی پہنے ہونقوں کی طرح ایک ایک کی صورت دیکھ رہا تھا۔ جنگلی کے ہاتھ میں تلوار
تھی جس کی نوک اس نے نتاشا کے چچا "آئیوان" کے عریاں پیٹ سے لگا رکھی تھی۔
آئیوان شہر کے نائب رئیس تھے ان کے ساتھ یہ سلوک حیران کن تھا۔ لگتا تھا ان لوگوں
نے انہیں بستر سے گھسیٹ کر نکالا ہے۔ وہ سخت غصے میں دکھائی دیتے تھے۔ گرج کر
بولے۔ "کیا کرو گے زیادہ سے زیادہ مجھے قتل کر ڈالو گے لیکن میں یہ حکم جاری نہیں کروں
گا۔ میں یہ حکم جاری کرنے کا مجاز ہی نہیں ہوں۔ ڈیوک (رئیس) خود آئیں گے تو یہ سب
کچھ' ہو گا۔"

جنگلی کا ایک ساتھی جو مقامی تھا اور کوئی فوجی افسر دکھائی دیتا تھا تیزی سے بولا۔
"جناب آئیوان! آپ ضابطے کی کارروائی میں الجھیں گے تو بڑا نقصان ہو گا۔ شہر کی
اینٹ سے اینٹ بج جائے گی۔ آپ اس نازک ترین صورت حال کو سمجھنے کی کوشش
کریں۔"

آئیوان نے لاپرواہی سے اپنا ہاتھ لہرایا۔ "تباہ ہو جائے سب کچھ' میں کہتا ہوں پورا
شہر راکھ ہو جائے مجھے کچھ نہیں لینا' اور جو کچھ تم نے میرے ساتھ کیا ہے اس کا حساب تم
سے ایسا لوں گا کہ یاد کرو گے۔" فقرہ ختم کر کے آئیوان نے زور سے ہچکی لی اور آگے پیچھے
جھولنے لگا۔ وہ شدید نشے میں دکھائی دیتا تھا۔

زارینہ اور نتاشا کے لئے یہ سب کچھ دیکھنا اب ناممکن ہو رہا تھا۔ زارینہ نے چیخ کر
باپ کو آواز دی اور وہ دونوں تیزی سے سیڑھیاں اترتی ہوئی نیچے آ گئیں۔ محافظوں کو
آوازیں دینا فضول تھا۔ نتاشا فوجی افسر پر چیخی۔ "کون ہو تم اور نائب رئیس سے یہ کیا
بیہودگی ہو رہی ہے۔"

فوجی افسر سینے پر ہاتھ رکھ کر تھوڑا سا جھکا اور بولا۔
"محترمہ! میرا نام مائیکل ہے' مائیکل ہوورتھ' میں آپ کو خوفزدہ کرنا نہیں چاہتا لیکن
حقیقت ہے کہ منگولوں کے ہراول دستے کسی بھی وقت شہر تک پہنچنے والے ہیں۔"
نتاشا اور زارینہ کے منہ سے ایک ساتھ ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ نتاشا بولی۔
"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟"
مائیکل بولا۔ "آپ مجھے نہیں جانتیں مس نتاشا! لیکن میں آپ کو جانتا ہوں۔ آپ
رئیس اعظم جناب کنیازیوری کی صاحبزادی ہیں۔ دراصل صورت حال بہت مخدوش ہے۔
مس نتاشا! ہم نے راستے میں سوزوال اور روستوف کے تباہ شدہ کھنڈر دیکھے ہیں۔ منگولوں
نے ان شہروں کو حسرتناک انجام سے دوچار کیا ہے۔"
"کیا کہہ رہے ہو تم؟" نتاشا اور زارینہ ایک ساتھ بولیں۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا
کہ یہ فوجی افسر ٹھیک کہہ رہا ہے اور سوزوال' روستوف جیسے شہر تاراج ہو گئے ہیں۔
مائیکل سلسلہ کلام جاری رکھتا ہوا بولا۔
"........... اور اب وہ ماسکو کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ یہاں سے تین منزل کے فاصلے
پر ہم نے ان کے ہراول دستوں کا پڑاؤ دیکھا ہے۔ آپ یقین کریں شہر کی سلامتی اس
وقت سخت خطرے میں ہے۔"
نتاشا اور زارینہ کے چہروں پر تاریک سائے لہرانے لگے۔ زارینہ ہونٹوں پر زبان پھیر
کر بولی۔ "لل لیکن .... میرے والد کا اس میں کیا قصور ہے؟"
مائیکل تیزی سے بولا۔ "آپ کے والد شہر کے دفاع کے لئے فوجی دستوں کو احکامات
جاری کر سکتے ہیں لیکن ان کا کہنا ہے کہ ہم بکواس کر رہے ہیں اور اگر صحیح بھی کہہ رہے
ہیں تو احکامات دینے کی ذمے داری رئیس کی ہے اور رئیس کا اس وقت کہیں پتہ نہیں۔
کہا جاتا ہے وہ شہر سے باہر ہیں۔"
آئیوان اس گفتگو کے دوران آنکھیں بند کئے مسلسل آگے پیچھے جھولتا رہا تھا۔
اسے دو آدمیوں نے تھام رکھا تھا ورنہ شاید وہ گر جاتا۔ گاہے گاہے وہ خود کو بے وقت
جگانے والوں کی شان میں ایک آدھ قصیدہ بھی پڑھ دیتا تھا۔ گو وہ نتاشا کا سگا چچا نہیں تھا
لیکن اس کی بے عزتی پر نتاشا کی برہمی سمجھ میں آنے والی بات تھی' وہ تند لہجے میں بولی۔
"کچھ بھی ہے آپ کو ان کی حالت کا خیال کرنا چاہئے تھا۔ برائے مہربانی آپ یہاں سے
تشریف لے جائیں اور اگر بہت ضروری ہے تو سپہ سالار سے بات کریں۔"
نتاشا کی اس بات پر سخت گیر جنگلی نے غضبناکی سے اسے گھورا مگر اس سے پہلے کہ

وہ کچھ بولتا مائیکل نے ایک جھٹکے سے تلوار نیام میں ڈالی اور ساتھیوں کے ساتھ باہر گیا۔ بازوؤں پر گرفت ختم ہوتے ہی آئیوان لڑکھڑانے لگا۔ زارینہ اور نتاشا نے لپک اسے تھام لیا ورنہ وہ شیشے کی نازک تپائی پر ڈھیر ہو جاتا۔ قریب کھڑے سات آٹھ سال نے یہ منظر دیکھا تو صورت حال کی سنگینی سے بے خبر کھلکھلا کر ہنس دیا۔ زارینہ اور نے اسے قہرآلود نظروں سے گھورا تو وہ یکدم سہم گیا اور کان لپیٹ کر دروازے سے نکل گیا۔

اب دوپہر ہونے کو آئی تھی۔ ہفتہ وار تعطیل تھی اس لئے شہر کی برف سے ہوئی گلیوں میں زیادہ چہل پہل نہیں تھی۔ مائیکل' اباقہ اور اسد وغیرہ نائب رئیس کے محافظ کے ساتھ سپہ سالار کی رہائش گاہ پر پہنچے۔ مائیکل نے اپنے شناختی کاغذات کے محافظ کو اندر بھیجا اور اسے کہا کہ سپہ سالار سے کہا جائے کہ ایک فوری نوعیت کے مسئلے گفتگو کے لئے ملاقات نہایت ضروری ہے۔ کافی انتظار کے بعد محافظ واپس آیا۔ اس کہا کہ سپہ سالار گھر میں نہیں وہ تھوڑی دیر پہلے قلعے کی طرف روانہ ہو چکے ہیں۔ نے کہا۔ "میں قلعے سے ہو کر آ رہا ہوں۔ وہاں نہ تو سپہ سالار کی سواری موجود ہے او وہ خود۔"

مائیکل پریشانی سے محافظ کی طرف دیکھنے لگا۔ محافظ کندھے اچکا کر بولا۔ "میں سلسلے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔"

جس وقت یہ باتیں ہو رہی تھیں سپہ سالار دو حسین عورتوں کے ساتھ اپنی نیم خوابگاہ میں موجود تھا اور تعطیل کا لطف اٹھا رہا تھا۔ وہ ان سے چند گز دور تھا لیکن وہ اس موجودگی سے بے خبر تھے۔ اسی طرح جیسے سپہ سالار اس تباہی سے بے خبر تھا جو تیزی اس کی طرف اور اس شہر کی طرف بڑھ رہی تھی۔ نیلا آسمان خاموش تھا۔ چمکتا ہوا سو جیسے ایک جگہ ٹھہر گیا تھا۔ دور اوپر اڑتا ہوا کوئی پرندہ بے قراری سے چلا رہا تھا۔

مائیکل نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ "ہمارے پاس مہلت بہت ہے۔ قلیل وقت میں ہمیں کسی ذمے دار شخص تک رسائی حاصل کرنا ہو گی۔" اس اسد اور اباقہ کو نائب رئیس کے محافظ کے ساتھ قلعے کی طرف روانہ کیا اور خود ساتھیوں کے ساتھ ایک اعلیٰ فوجی افسر کی رہائش گاہ کی طرف چل دیا۔ یورق کے علا طوطم خاں بھی اس کے ساتھ تھا۔

اباقہ اور اسد محافظ کے ساتھ گھوڑے بھگاتے قلعے کی طرف بڑھے۔ سپہ سالار گھر سے قلعے کے دروازے تک سنسان گلیاں ان کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے گونج

گئیں۔ یہ قلعہ بلندی پر واقع تھا اور یہاں کے دوسرے قلعوں کی طرح اس کی فصیلیں لکڑی کی تھیں۔ داخلی راستے پر مسلح محافظ موجود تھے۔ آئیوان کے ذاتی محافظ کی وجہ سے انہیں داخل ہونے سے روکا نہیں گیا۔ قلعے کے اندر وسیع احاطوں میں سپاہی چمکیلی دھوپ سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ سامان حرب کی جھلک کہیں دکھائی نہیں دیتی تھی۔ ان سپاہیوں کی حالت ان چڑیوں کی سی تھی جو پانی میں پھدکتی ہیں اور اپنے اوپر منڈلانے والے عقاب سے بے خبر ہوتی ہیں۔ ذاتی محافظ انہیں مختلف احاطوں سے گزار کر قلعے کے داروغہ کے پاس لے گیا۔ داروغہ بے چینی سے اپنے کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ جب اسے منگولوں کے ہراول دستوں کے بارے میں بتایا گیا تو اس کی پریشانی میں اضافہ ہو گیا۔ وہ اپنی گھونگھریالی داڑھی کھجاتا ہوا محافظ سے بولا۔

"مجھے ڈر ہے کہ یہ لوگ ٹھیک کہتے ہیں۔ ابھی میرے کچھ جاسوسوں نے اطلاع دی ہے کہ نواحی جنگل میں کچھ پُراسرار نقل و حرکت پائی جاتی ہے۔" پھر وہ اسد اور اباقہ سے مخاطب ہو کر بولا۔ "تمہارے خیال میں اگر وہ واقعی منگول ہیں تو ان کا شہر تک پہنچنے کا امکان کب تک ہے؟"

محافظ نے ترجمانی کے فرائض انجام دیتے ہوئے داروغہ کا یہ سوال اسد تک پہنچایا۔ اسد نے اباقہ کی طرف دیکھا۔ اباقہ کچھ کہنے کے لئے منہ کھولنا ہی چاہتا تھا کہ ایکدم خاموش ہو گیا۔ اس کے حساس کان ہوا کی لہروں پر ایک ہلچل محسوس کر رہے تھے۔ پھر ایکدم وہ مڑا اور قلعے کی فصیل کی طرف بھاگا۔ فصیل پر چڑھ کر اس نے نیچے دیکھا لیکن وہاں سے کچھ نظر نہیں آیا۔ وہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھتا ہوا ایک برجی کی طرف لپکا۔ برجی پر پہنچتے ہی اس کی نظر نشیب میں دور تک دیکھنے کے قابل ہو گئی اور اس کے ساتھ ہی اس کے جسم میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ قلعے سے صرف ایک کوس دور گھنے جنگل میں بے شمار نقطے حرکت کر رہے تھے۔ منگولوں کا ہلاکت خیز سیلاب قہرالٰہی کی طرح ماسکو کی طرف لپک رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں زمین لرزنے کو تھی۔ ہتھیار چمکنے کو تھے اور خون اچھلنے کو تھا۔ بے شمار چیخیں ابھی سے اباقہ کے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ اس نے نیچے دیکھا اور حلق پھاڑ کر چیخا۔ "منگول آ گئے۔"

اس وقت قریبی برجی پر کھڑا ایک اور محافظ بھی ہذیانی انداز میں چیخنے لگا۔ "منگول آ گئے..........." بے شمار آوازیں ایک ساتھ ابھریں اور ہر جسم کو پتھر کر گئیں۔ پھر شدید حیرانی کا یہ لمحہ گزرا اور دھوپ سینکتے ہوئے سپاہی اپنی وردیوں اور اپنے ہتھیاروں کی طرف لپکے۔

مائیکل اس وقت پنج ہزاری سردار رودف سے گفتگو کر رہا تھا جب اچانک زمین دہلنے لگی اور چیخ و پکار کی آوازیں سنائی دیں۔ سردار یورق بھی مائیکل کے ساتھ تھا۔ اس نے ان آوازوں کو غور سے سنا اور اطمینان سے تلوار نیام سے باہر کرلی۔ "اب گفتگو کا کچھ فائدہ نہیں۔" اس نے ترجمان سے کہا۔ "ہمارے دوست پہنچ گئے ہیں۔" دوستوں سے اس کی مراد منگول تھے۔ ترجمان نے یہ بات مائیکل وغیرہ تک پہنچائی اور ان کے چہرے بھی سفید ہو گئے۔ دفعتاً کمرے سے باہر آہٹ سنائی دی اور ایک زخمی سپاہی اس طرح بھاگتا اندر داخل ہوا کہ اس نے اپنی آنتیں اپنے ہاتھوں میں اٹھا رکھی تھیں۔ وہ چیخ کر رودف سے بولا۔ "آقا' محل کو آگ لگ گئی۔ اپنی جان بچایئے۔" پھر وہ تیورا کر گرا اور ساکت ہو گیا۔

یورق مائیکل اور طوطم تلواریں سونت کر باہر نکلے انہوں نے ایک سات آٹھ سال کی بچی کو دیکھا جس کے ریشمی لبادے میں آگ لگی تھی اور وہ چیختی ہوئی صحن میں چکرا رہی تھی۔ پھر ایک تیر آیا اور بچی کی مشکل آسان کر گیا۔ وہ اچھل کر پختہ فرش پر گری اور بے جان ہو گئی۔ سردار یورق نے دیکھا کہ تاتاری سپاہی محل سرا کی دیواریں پھلانگ پھلانگ کر اندر داخل ہو رہے ہیں۔ ان کے جسموں پر سمور کے لبادے اور سر پر آہنی خودیں تھیں جن پر جانوروں کی طرح سینگ لگے ہوئے تھے۔ ان کے چہرے جوش اور غضب سے تمتما رہے تھے۔ باچھوں سے جھاگ بہہ رہی تھی اور آنکھیں انگاروں کی طرح روشن تھیں۔ یورق کو وہ وقت یاد آیا جب وہ بھی ایسے ہی بے قابو وحشیوں کے ساتھ دشمن پر ہلہ بولا کرتا تھا۔ شراب کے نشے میں دھت اور خون کی پیاس سے بے قرار۔ اسے معلوم تھا محل میں گھسنے والے سپاہیوں کے پیچھے کم از کم پانچ گنا سپاہی اور موجود ہوں گے۔ لہٰذا ان سے تلوار زنی کرنا خودکشی کرنے کے برابر تھا۔ اس نے اپنے اوپر جھپٹنے والے دو تاتاری سپاہیوں کو شدید زخمی کیا پھر مائیکل کا ہاتھ پکڑتا ہوا ایک بند چوبی دروازے سے ٹکرایا اور اسے توڑتا ہوا باہر گلی میں جا گرا۔ عورتوں کا ایک گروہ خوفزدہ بکریوں کی طرح بھاگتا چلا جا رہا تھا۔ منگول شہرپناہ کے باہر سے گلی کوچوں پر آگ کی بارش کر رہے تھے۔ سلفر اور گندھک سے بھرے ہوئے مرتبان منجنیقوں کے ذریعے شہر میں پھینکے جا رہے تھے۔ یہ آتش گیر مادہ چپے چپے کو جہنم زار بنا رہا تھا۔ برف پر گرتے ہی یورق اور مائیکل اٹھے اور بھاگ کھڑے ہوئے۔ طوطم خاں بھی ان کے ساتھ بھاگ رہا تھا۔ قہرالٰہی کے مقابلے کو بہت دیر ہو چکی تھی۔

قلعے سے ایک فرلانگ دور یورق نے اباقہ اور اسد کو دیکھ لیا۔ وہ دھڑا دھڑ جلتے ہوئے مکانوں کے درمیان گھوڑے بھگاتے جنوب کی طرف جا رہے تھے۔ نائب رئیس کا

ذاتی محافظ بھی ان کے ساتھ تھا۔ سردار یورق نے پورے زور سے چیخ کر اباقہ کو آواز دی۔ اباقہ نے لگام کھینچی اور مڑ کر ان کی طرف دیکھنے لگا۔ منگولوں کا ایک دستہ مار دھاڑ کرتا تیزی سے یورق وغیرہ کی طرف آ رہا تھا۔ اباقہ نے اسد کو اشارہ کیا اور وہ تینوں انھیں بچانے کے لئے بڑھے۔ گھوڑے قریب پہنچے تو یورق بھاگ کر اسد کے پیچھے بیٹھ گیا۔ اسی طرح مائیکل محافظ کے پیچھے اور طوطم اباقہ کے پیچھے بیٹھ گیا۔ اس سے پہلے کہ منگول سر پر پہنچتے وہ گھوڑے بھگاتے ہوئے سیاہ دھوئیں میں روپوش ہو گئے۔

پورا شہر جل رہا تھا۔ گلیاں خون سے سرخ ہو رہی تھیں۔ لوگ بھاگ رہے تھے اور بھاگے چلے جا رہے تھے۔ "کدھر جانا ہے؟" اباقہ نے چیخ کر اسد سے پوچھا۔

اسد بولا۔ "آئیوان کے محل کی طرف چلو وہاں اصطبل میں گھوڑے موجود ہوں گے۔" انہوں نے اپنے گھوڑے آئیوان کے محل کی طرف سرپٹ دوڑا دیئے۔ محل کے قریب پہنچے تو وہ شعلوں پر نظر آیا۔ اباقہ' یورق سے بولا۔

"تم لوگ اصطبل میں گھوڑے دیکھو' ہم دیکھتے ہیں شاید اندر کوئی زندہ بچ گیا ہو۔"

یورق اور طوطم خاں' مائیکل کے ساتھ اصطبل کی طرف لپکے تو اباقہ اور اسد گھوڑوں کو ایڑ لگا کر محل کے احاطے میں گئے۔ اباقہ کی شہ پر گھوڑا ایک آدھ جلی کھڑکی سے کود کر اندر داخل ہو گیا۔ "کوئی ہے؟" اباقہ زور سے چیخا۔ اس وقت اسے زمین پر پڑی وہ گول ٹوپی نظر آئی جس پر مور کا پَر لگا تھا۔ "کوئی ہے؟" وہ پھر زور سے چیخا۔ جواب میں اسے قریب سے بچے کی چیخ سنائی دی۔ در و دیوار دھڑا دھڑ جل رہے تھے۔ شدید تپش کے سبب گھوڑا آگے بڑھا۔ سامنے کمرے کی دہلیز پر اسے کسی شخص کی ادھ جلی لاش نظر آئی۔ برہنہ جسم سے اس نے پہچانا وہ نائب رئیس آئیوان ہی تھا۔ اباقہ کے کانوں میں اس کے الفاظ گونجنے لگے۔ "سارا شہر بھی جل جائے تو مجھے کچھ نہیں لینا............" اس کے منہ سے نکلی بات کتنی جلدی پوری ہوئی تھی۔ اس کی لاش پھلانگ کر وہ آگے بڑھا تو زینہ نظر آیا۔ زینے پر بچھا سرخ قالین جگہ جگہ سے جل رہا تھا۔ زینے کے بالائی سرے پر ایک لڑکی کھڑی تھی۔ اباقہ پہچان گیا یہ وہی لڑکی تھی جسے مائیکل نے نتاشا کہہ کر بلایا تھا۔ وہ دھوئیں میں بری طرح کھانس رہی تھی۔ اباقہ کو دیکھ کر وہ چیخی۔ وہ اسے مدد کے لئے بلا رہی تھی۔ عین اس وقت زینے کے نیچے سے ایک آواز آئی۔ سرخ ٹوپی والا دبلا پتلا لڑکا سنگ مرمر کی ایک میز کے نیچے گھسا چیخ رہا تھا۔ "بچاؤ............ خدا کے لئے بچاؤ۔" وہ فارسی بول رہا تھا۔ اباقہ نے ایک نظر ان دونوں کی طرف دیکھا پھر اس کی نگاہ چھت کی طرف اٹھ گئی۔ چھت پوری طرح آگ کی لپیٹ میں تھی اور کسی بھی وقت گرا چاہتی تھی۔ ایک بہت بڑا

فانوس چھت سے ٹوٹ کر لڑکی کے پاؤں میں گرا اور زبردست چھناکے سے ٹوٹ گیا۔ لڑکی اب دونوں ہاتھ ہلا کر اباقہ کو مدد کے لئے بلا رہی تھی۔ دوسری طرف لڑکا ہذیانی انداز میں چیخ رہا تھا۔ چھت کے شہتیر تڑخنے لگے تھے۔ اباقہ کے پاس صرف اتنا وقت تھا کہ ان دونوں میں سے ایک کو بچا سکتا اس نے تیزی سے فیصلہ کیا اور زینے کے نیچے پھنسے لڑکے کی طرف بڑھا۔ اس نے ایک جلتے پلنگ کو پھلانگا اور لڑکے کو لے کر تیزی سے باہر کی طرف لپکا۔ اس وقت اس نے اسد کو دیکھا جو لڑکی کو کندھے پر اٹھائے زینے پھلانگتا ہوا نیچے آ رہا تھا۔ دونوں آگے پیچھے نشست گاہ سے باہر نکلے اور اس کے ساتھ ہی وسیع چھت خوفناک دھماکوں سے فرش پر آ گری۔ اباقہ اور اسد باہر نکلے تو یورق اور طوطم اصطبل سے گھوڑے حاصل کر چکے تھے۔ ان سب نے گھوڑے سنبھالے اور تیزی سے سڑک پر آئے۔ سامنے ایک بڑی حویلی کا دروازہ کھلا اور کوئی دس تاتاری سوار وحشیانہ قہقہے لگاتے ادھر سے برآمد ہوئے۔ وہ ایک نوجوان لڑکی کو کھینچتے ہوئے باہر لا رہے تھے۔ اباقہ وغیرہ کو دیکھ کر تاتاری ٹھٹکے اور تلواریں سونت کر ان پر حملہ آور ہوئے۔ دونوں طرف سے تلواریں ٹکرائیں' اباقہ' اسد اور یورق نے پلک جھپکتے میں ان میں سے چار کو ہلاک کر ڈالا۔ شاید تھوڑی سی مہلت اور ملتی تو ان میں سے ایک بھی زندہ نہ بچتا لیکن اس وقت عقب سے سرپٹ گھوڑوں کی آوازیں آنے لگیں۔ سردار یورق چلایا۔ "بھاگو۔" انہوں نے گھوڑوں کو ایڑ لگائی اور تیزی سے آگے بڑھے۔ جاتے جاتے سردار یورق نے تاک کر نیزہ پھینکا جو دو سپاہیوں کی گرفت میں مچلتی لڑکی کے سینے سے پار ہو گیا۔ سردار یورق جانتا تھا کہ اس نے لڑکی پر احسان کیا ہے۔ وحشی منگول قبضے میں آئی ہوئی نوجوان عورتوں سے جو سلوک کرتے تھے وہ لرزہ خیز ہوتا تھا۔ مرنے سے پہلے وہ ان درندوں کے ہاتھوں ہزار بار مرتی تھیں۔ اس سے پہلے کہ متعاقب دستہ ان پر تیروں کی بوچھاڑ کر سکتا وہ ایک تنگ گلی میں مڑے اور دھوئیں کے تاریک مرغولوں نے انہیں چھپا لیا۔ چونکہ اب کثیر تعداد میں منگول شہر میں داخل ہو چکے تھے اس لئے منجنیقوں کی آتش بازی کم ہو گئی تھی۔ ویسے بھی اب آتش بازی سے کوئی فائدہ نہیں تھا' پورا شہر جل رہا تھا۔ اباقہ اور اس کے ساتھی جلتے ماسکو کی دھواں دھواں گلیوں سے گزرتے شمال مغرب کی طرف نکل گئے۔ کھلی فضا میں پہنچتے ہی ان کے گھوڑوں نے رفتار پکڑی اور تیزی سے فاصلہ طے کرنے لگے۔

☆ ☆ ☆

اب ان کی منزل "ولادی میر" تھی۔ ولادی میر زرخیز وسط روس کا سب سے مستحکم شہر تھا۔ کئی برس پہلے "کیف" کے مذہبی شہر کی بجائے "ولادی میر" کو دارالحکومت بنا لیا گیا

تھا۔ یہاں کا رئیس اعظم کنیاز یوری ایک طاقتور حکمران سمجھا جاتا تھا۔ اس نے اردگرد کے امیروں اور جاگیرداروں کو زیر نگیں کر کے ایک مضبوط اور منظم فوج کی بنیاد رکھی تھی لیکن اردگرد کی ریاستوں سے اس کی چپقلش ہر وقت جاری رہتی تھی۔ اس کی ایک وجہ دارالحکومت کی "کیف" سے منتقلی بھی تھی۔ دسمبر کے آغاز میں جب منگولوں نے ریازان پر چڑھائی کی تو وہاں کے رئیسوں نے ولادی میر سے مدد کی درخواست کی تاکہ حملہ آوروں کو منہ توڑ جواب دیا جا سکے۔ اس وقت رئیس اعظم نے پس و پیش سے کام لیا۔ دراصل وہ اپنی جنگ خود لڑنا چاہتا تھا۔ اس کی اس خود غرضی نے اہل روس کو بہت نقصان پہنچایا۔

مائیکل کا خیال تھا کہ ریازان کے خطے سے پسپا ہونے والے منتشر روسی دستے ولادی میر میں یکجا ہو چکے ہوں گے اور رئیس اعظم یوری وہاں منگولوں کے خلاف ایک زبردست محاذ کھولنے کی تیاری مکمل کر چکا ہو گا۔ اب ضرورت اس امر کی تھی کہ وہ جلد از جلد ولادی میر پہنچیں اور اہل شہر کو ماسکو کے عبرتناک انجام کی خبر دے کر منگولوں کی تیز رفتار پیش قدمی سے آگاہ کرتے۔ توقع تھی کہ منگول لشکر کے ہراول دستے فوراً ہی آگے روانہ نہیں ہوں گے۔ وہ فتح کے نشے میں چُور باقی لشکر کا انتظار کریں گے۔ پھر سپہ سالار اعظم باتو خاں اور دوسرے سرداروں کے مشورے سے پیش قدمی کا رخ مقرر کیا جائے گا۔ اس کام میں دو تین روز لگ سکتے تھے۔ ماسکو سے ولادی میر تین روز کی مسافت پر تھا۔ اس کا مطلب تھا منگول لشکر کے ماسکو چھوڑنے سے پہلے وہ ولادی میر تک پہنچ جائیں گے۔

ماسکو سے ولادی میر تک کا راستہ گھنے جنگلوں اور برف سے ڈھکا ہوا تھا۔ مائیکل کی رہنمائی میں وہ حتی الامکان تیزی سے سفر کر رہے تھے۔ اندھیرا پڑنے تک وہ ماسکو سے ایک منزل آگے نکل آئے تھے۔ ان کا یہ قافلہ کل نو افراد پر مشتمل تھا۔ ان میں مائیکل کے علاوہ رئیس اعظم یوری کی بیٹی نتاشا اور وہ سات آٹھ سالہ بچہ بھی شامل تھا جس کی جان اباقہ نے بچائی تھی۔ وہ ابھی تک اباقہ کے ساتھ گھوڑے پر سوار تھا۔ اس کے ہاتھوں اور پاؤں پر آبلے پڑے ہوئے تھے۔ نتاشا پہلے اسد اور پھر مائیکل کے پیچھے بیٹھ کر سفر کرتی رہی تھی۔ وہ مسلسل آنسو بہا رہی تھی۔ اس کا چچا اس کے سامنے ایک تاتاری کی تلوار کا شکار ہو کر فرش پر گرا تھا اور آگ کی لپیٹ میں آیا تھا۔ نتاشا یہ منظر دیکھ کر ایک الماری کے پیچھے چھپ گئی تھی اس کی آنکھوں کے سامنے تاتاری سپاہی چیختی چلاتی زارینہ کو گھسیٹ کر کمرے سے باہر لے گئے تھے۔ وہ اب ان کے قبضے میں تھی اور سینکڑوں دوسری عورتوں کی طرح دردناک انجام سے دوچار ہو چکی تھی یا ہونے والی تھی۔ اباقہ کے آگے بیٹھا ہوا معصوم لڑکا بھی لگاتار رو رہا تھا۔ اس کی ماں بالائی منزل کے نعمت خانے میں ایک سپاہی کے

ہاتھوں قتل ہوئی تھی۔ اس نے ماں کی گردن سے ابلتا خون دیکھا تھا اور چیختا چلاتا نچلی منزل پر آکر میز کے نیچے چھپ گیا تھا۔ لڑکے نے اباقہ کو اپنا نام علی بتایا تھا۔ وہ اس دور دراز علاقے میں کیسے پہنچا یہ سب کچھ بتانے سے وہ قاصر تھا۔

نصف شب سے کچھ پہلے ان کے گھوڑے تھکن سے نڈھال ہو گئے تو وہ پڑاؤ ڈالنے پر مجبور ہوئے۔ ایک چھوٹی سی بستی میں انہوں نے قیام کا ارادہ کیا۔ بستی کے لوگ ماسکو کی تباہی سے باخبر ہو چکے تھے۔ پناہ گزینوں کی کئی ٹولیاں یہاں سے گزر چکی تھیں۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ اس قافلے میں ایک بڑے فوجی افسر کے علاوہ رئیس اعظم یوری کی بیٹی بھی ہے تو انہوں نے بستی کا سب سے اچھا مکان ان کے لئے خالی کر دیا۔ دہقانوں کی اس بستی میں زبردست ہراس پایا جاتا تھا۔ کچھ لوگ یہ جان کر کہ منگول اس طرف آ رہے ہیں راتوں رات اپنا قیمتی سامان اور اہل و عیال محفوظ جگہوں پر پہنچانے کی فکر میں تھے۔

اگلے روز علی الصبح انہوں نے پھر ولادی میر کی طرف سفر شروع کیا۔ بستی سے انہیں دو زائد گھوڑے اور خوراک کا سامان بھی حاصل ہو گیا تھا۔ دوپہر سے ذرا قبل جب وہ ستانے کے لئے ہموار جگہ تلاش کر رہے تھے اچانک درختوں سے کوئی پچاس عدد گھڑسوار نکلے اور ان پر حملہ آور ہو گئے۔ یہ حملہ اتنا اچانک اور شدید تھا کہ انہیں سنبھلنے کا موقعہ ہی نہیں ملا۔ اباقہ' علی کو اپنے آگے بٹھائے اس سے باتیں کر رہا تھا۔ دفعتاً گھوڑوں کی ہنہناہٹ سنائی دی اور درختوں سے اچھلنے والے دو چمکدار نیزے اس کے سر کی طرف آئے۔ وہ غیرارادی طور پر نیچے جھکا اور اس کی موت نیزوں کی صورت میں ایک بالشت کی بلندی سے گزر گئی۔ پہلے تو وہ یہی سمجھا کہ منگول حملہ آور ہو گئے ہیں' لیکن پھر اس نے اونی ٹوپیوں میں چھپے ہوئے حملہ آوروں کے سرخ و سپید چہرے دیکھے تو اسے اندازہ ہوا کہ یہ مقامی لوگ ہیں' لیکن انہوں نے حملہ کیوں کیا؟ یہ ایک اہم سوال تھا۔ اس وقت اس سوال کا جواب تلاش کرنا حماقت تھی موت ان کے سر پر منڈلا رہی تھی۔ اباقہ نے ہلکے پھلکے علی کو بازو سے پکڑ کر آگے سے پیچھے کیا اور حملہ آوروں سے ٹکرا گیا۔ اس کے سامنے دو طویل القامت گھڑسوار تھے۔ اباقہ نے ایک گھڑسوار کا وار بچا کر اسے کندھے سے ایسا دھکا دیا کہ وہ گھوڑے سے الٹ کر نیچے آ رہا۔ دوسرے گھڑسوار کو اباقہ کے سامنے آنا کچھ زیادہ ہی مہنگا پڑا۔ اباقہ نے بلا کی پھرتی سے اس کی گردن اڑا دی۔ پشت پر بیٹھے علی نے یہ منظر دیکھا تو خوف سے چلا اٹھا۔ اباقہ نے سمجھا شاید کوئی عقب سے آ رہا ہے اس نے چابکدستی سے گھوڑے کو گھمایا اور اس وقت اس کی نظر نتاشا کی طرف اٹھ گئی وہ گھوڑے

کے ایال (گردن کے بال) سے لپٹی ہوئی تھی اور گھوڑا سرپٹ دوڑ رہا تھا۔ ایک گھڑسوار تلوار سونتے اس کے تعاقب میں تھا۔ اباقہ نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور حملہ آور کے پیچھے لپکا۔ تینوں گھوڑے آندھی کی رفتار سے بھاگتے درختوں میں داخل ہو گئے۔ حملہ آور اب نتاشا کے بالکل نزدیک پہنچ چکا تھا۔ اس کا انداز بتا رہا تھا کہ قریب پہنچتے ہی وہ تلوار اس کی پشت میں گھونپ دے گا۔ اباقہ نے سرپٹ بھاگتے گھوڑے کی لگام چھوڑی اور کندھے سے کمان اتار کر حملہ آور کا نشانہ لے لیا۔ اس کا دوسرا تیر نشانے پر لگا اور گھڑسوار ایک کراہ کے ساتھ گھوڑے سے لڑھک گیا۔ چند لڑھکنیاں کھا کر وہ پر شور آواز کے ساتھ ایک درخت سے ٹکرایا۔ نتاشا کا گھوڑا ابھی تک سرپٹ بھاگ رہا تھا۔ نتاشا جو گھوڑے کی پشت سے کھسک گئی تھی سخت کوشش کے بعد ایال کے سہارے دوبارہ زین پر آ گئی تھی۔ نتاشا کا گھوڑا منہ زور تھا اور یوں بھی وہ اس پر تنہا تھی۔ اباقہ کو اس تک پہنچنے میں سخت دشواری پیش آ رہی تھی۔ بالآخر ایک طویل تعاقب کے بعد اس نے گھوڑے کو جا لیا اور لگامیں تھام کر اسے روکنے میں کامیاب ہو گیا۔ ٹہنیوں سے الجھ کر نتاشا کا قیمتی لباس کئی جگہ سے پھٹ چکا تھا۔ یہ اس کا قیمتی لباس اور قیمتی زیورات ہی تھے جنہوں نے حملہ آور کو اس کے پیچھے لگایا تھا۔

اباقہ نے نتاشا کا منہ زور گھوڑا خود سنبھالا اور اسے دوسرے گھوڑے پر بٹھا دیا۔ وہ ایسی جگہ کھڑے تھے جہاں چاروں طرف درختوں اور برف کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اصل قافلے سے بچھڑ کر وہ بہت دور نکل آئے تھے۔ انہوں نے جنگل کی بھول بھلیوں میں ساتھیوں کی تلاش شروع کر دی۔ اس بات کا دھڑکا بہت لگا ہوا تھا کہ کہیں اس تلاش کے بدلے میں حملہ آوروں سے ہی مڈبھیڑ نہ ہو جائے۔ سرما کی شام تیزی سے ان کی طرف بڑھ رہی تھی۔ آخر وہ تھک کر چور ہو گئے۔ علی نے تو باقاعدہ منہ بسورنا شروع کر دیا۔ مجبوراً اباقہ کو ایک جگہ قیام کرنا پڑا۔ سائبان کی طرح جھکی ہوئی ایک بڑی چٹان کے نیچے انہوں نے پناہ لی۔ خوش قسمتی سے اباقہ کے گھوڑے کے ساتھ راشن کا ایک تھیلا موجود تھا۔ اس نے نتاشا اور علی کو گوشت کے خشک ٹکڑے اور پنیر کھانے کو دیا۔ یہ بات ظاہر ہو چکی تھی کہ وہ قافلے سے بچھڑ چکے ہیں اور اب انہیں اکیلے ہی سفر کرنا ہو گا۔ قافلے کے انجام کے بارے میں انہیں پریشانی تھی۔ اباقہ جانتا تھا کہ جس قافلے میں یورق' اسد اور طوطم جیسے جنگجو ہیں ایسے قافلے کا پچاس سوار کچھ نہیں بگاڑ سکتے لیکن یہ بھی ہو سکتا تھا کہ ان پچاس سواروں کو مزید کمک مل گئی ہو۔ جیسے تیسے سردی میں کانپتے انہوں نے وہ رات گزاری اور صبح سویرے سورج کو دیکھ کر شمال مشرق کی طرف سفر شروع کر دیا۔ دوپہر کے

وقت سورج اچانک گہرے بادلوں میں روپوش ہو گیا۔ سہ پہر تک ہر شے کو تاریکی نے ڈھانپ لیا اور تیز ہوا چلنی شروع ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی برف باری بھی ہونے لگی۔ انہوں نے پھر ایک پہاڑی کھوہ میں پناہ لی۔ نتاشا کا رویہ اباقہ اور علی سے عجیب کھچا کھچا سا تھا۔ حالانکہ اباقہ نے خود کو مشکل میں ڈال کر اس کی جان بچائی تھی۔ شاید اس کے ذہن میں ابھی تک یہ بات تھی کہ اباقہ نے اس کے چچا سے ناروا سلوک کیا تھا اور جس وقت محل میں آگ لگی ہوئی تھی اس نے اسے نظرانداز کر کے ایک خادمہ کے لڑکے کی جان بچائی تھی۔

جس کھوہ میں انہوں نے پناہ لی وہ اتنی چھوٹی تھی کہ برف سے بچنے کے لئے انہیں ایک دوسرے سے جڑ کر بیٹھنا پڑتا تھا لیکن شاہی خاندان سے تعلق رکھنے والی نتاشا ایک بھکاری جیسے شخص اور ایک ادنیٰ ملازمہ کے چھوکرے کے ساتھ کیسے بیٹھ سکتی تھی۔ وہ ایک گھنے درخت تلے جا بیٹھی۔ اباقہ کا مرحوم باپ بہت سی زبانیں جانتا تھا۔ اس نے اباقہ کو بھی کئی زبانیں سکھائی تھیں۔ روسی زبان کے چند لفظ بھی اباقہ کو آتے تھے۔ اس نے انہی لفظوں کا الٹا سیدھا استعمال کر کے نتاشا سے کہا کہ وہاں کیوں بیٹھی ہو؟

جواب میں نتاشا نے رواں فارسی میں جواب دیا۔ "شکریہ میں یہاں ٹھیک ہوں۔"

اباقہ اس کی فارسی دانی پر حیران رہ گیا۔ علی نے اس کی حیرانی بھانپتے ہوئے کہا۔

"مالکہ نے فارسی سیکھ رکھی ہے۔ یہ میری ماں سے بھی فارسی بولا کرتی تھی۔"

.... ماں کا ذکر آتے ہی علی ایک بار پھر اداس ہو گیا۔ اب وہ ایک یتیم بچہ تھا۔ بے آسرا' بے سہارا اور کمزور سا۔ اسے دیکھ کر اباقہ کو اپنا بچپن یاد آ جاتا تھا۔ وہ سوچنے لگا علی کو پیش آنے والا حادثہ برسوں پہلے اسے بھی تو پیش آیا تھا۔ اسی طرح منگولوں نے اس کے شہر پر حملہ کر کے اس کی من موہنی صورت والی ماں کو شہید کر دیا تھا۔ وہ ماں کی لاش دیکھ کر زور زور سے چیخنے لگا تھا۔ پھر اس کے باپ نے اسے کندھوں پر اٹھا لیا تھا۔ اسی طرح جیسے اباقہ نے اس معصوم کو شعلوں سے اٹھایا تھا۔ جو کام اباقہ کے باپ نے کیا تھا وہ اس دفعہ اباقہ نے کیا تھا۔ اباقہ کو علی کے باپ کا خیال آیا اس نے پوچھا۔ "علی تمہارا باپ کہاں ہے؟"

علی بچگانہ انداز میں انگلیاں مروڑ کر بولا۔ "میری ماں کہتی تھی تمہارا باپ بڑا بہادر تھا۔ اس نے ایک لڑائی میں سات آدمیوں کو قتل کیا تھا پھر وہ خود بھی شہید ہو گیا۔"

.... اباقہ اور علی باتیں کرتے رہے' باہر برف باری تیز ہوتی جا رہی تھی۔ اباقہ نے کن اکھیوں سے دیکھا۔ درخت کے نیچے بیٹھی نتاشا اب اپنے آپ میں سمٹنے کی کوشش

کر رہی تھی۔ کبھی ہوا کا کوئی جھونکا آتا تو پتوں سے جھڑ کر بہت سی برف اس کے جسم پر آ گرتی۔

"مالکہ اندر آ جاؤ۔" علی پھر چلایا۔

"نہیں میں یہیں ٹھیک ہوں۔" وہ بڑے عزم سے بولی۔ اس وقت کہیں قریب ہی کسی بھیڑیے کے چلانے کی آواز آئی۔ اباقہ نے مسکرا کر سرگوشی کی۔ "دیکھنا اب وہ دوڑتی ہوئی آئے گی۔" ذرا ہی دیر بعد بھیڑیا پھر چیخا۔ نتاشا اپنی جگہ سے اٹھی اور بھاگتی ہوئی کھوہ میں آ گئی۔ اباقہ اور علی نے سمٹ کر اس کے لئے جگہ بنائی۔

علی بولا۔ "آپ تو نجومی ہیں۔ آپ نے کہا اب مالکہ دوڑتی ہوئی آئے گی اور وہ آ گئی۔ آپ کو کیسے پتہ چلا۔"

اباقہ علی کو بھیڑیے کے بارے بتا کر خوفزدہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے بات ٹال دی' لیکن نتاشا تو سمجھ ہی چکی تھی۔ بے عزتی کے احساس سے اس کا چہرہ اس سردی میں بھی سرخ ہو رہا تھا۔ اباقہ نے اس کی خفت دور کرنے کے لئے صبح ہونے والے واقعے کا ذکر چھیڑ دیا۔ نتاشا کی زبانی اسے اتنا پتہ چل سکا کہ علاقے میں راہ گیروں پر اس قسم کے حملے ہوتے ہی رہتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے علاقوں کے خودمختار حکمران ہیں جو آپس میں دست و گریباں رہتے ہیں۔ نتاشا کا خیال تھا کہ ان کے قافلے پر حملہ کسی قریبی جاگیردار نے کیا ہو گا۔

ساری رات وہ شدید طوفان کی زد میں رہے۔ صبح برف باری کا زور ٹوٹا اور وہ باہر نکلے تو انہوں نے ایک گھوڑا مرا ہوا پایا۔ وہ پہلے ہی کچھ پژمردہ تھا' سخت سردی اس کی جان لے گئی تھی۔ کفایت شعاری سے کھانا کھا کر وہ پھر سفر پر روانہ ہو گئے۔ اب گھوڑا ایک تھا اور سوار تین۔ اباقہ نے نتاشا کو گھوڑے پر بٹھا دیا اور علی سے کہا کہ وہ اس کے پیچھے بیٹھ جائے۔ علی اس کے پیچھے بیٹھا تو وہ جلدی سے نیچے اتر گئی۔ "کیا ہوا۔" اباقہ نے پوچھا۔

"میں اس کے ساتھ نہیں بیٹھ سکتی۔" وہ حقارت سے بولی۔

"کیوں؟" اباقہ نے تیزی سے پوچھا۔

"اس کے جسم سے بو آ رہی ہے۔"

اباقہ بولا۔ "خدا کا خوف کرو۔ اگر راستہ کھو گیا اور کچھ دن یہاں بھٹکتے رہے تو تمہارے جسم سے اس سے بڑھ کر بو آئے گی۔"

وہ تنک کر بولی۔ "بس میں کہہ چکی ہوں' میں تب بیٹھوں گی جب یہ اترے گا۔"

اباقہ فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ "تو ٹھیک ہے۔ اب یہ نہیں اترے گا۔"

علی نے نتاشا کی ناراضگی دیکھ کر نیچے اترنا چاہا' لیکن اباقہ نے جھڑک کر اسے بیٹھے رہنے کی ہدایت کی۔ پھر وہ خود بھی گھوڑے پر بیٹھ گیا۔ نتاشا ان کے پیچھے پیدل چلنے لگی۔ برف کئی جگہ گھوڑے کے گھٹنوں تک پہنچ رہی تھی۔ خاصا مشکل سفر تھا جلد ہی نتاشا بری طرح ہانپنے لگی اور آخر ایک جگہ بیٹھ گئی۔ کھلے لبادے کے نیچے اس کے جوتے' موزے اور پنڈلیاں تربتر تھیں۔ وہ جوتے اتار کر ان کے اندر سے برف نکالنے میں مصروف ہو گئی۔ اباقہ نے گھوڑا روک لیا علی پھر چلا کر بولا۔ "مالکہ گھوڑے پر بیٹھ جائیں۔" نتاشا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ رات کھوہ میں گفتگو کے دوران ان میں جو تھوڑی سی شناسائی پیدا ہوئی تھی وہ پھر بیگانگی میں بدل چکی تھی۔

تھوڑی دیر بعد اباقہ نے گھوڑا بڑھا دیا۔ نتاشا بھی اٹھ کر چلنے لگی۔ اب اسے برف سے پاؤں نکالنا مشکل ہو رہے تھے اور وہ ڈگمگا رہی تھی۔ قریباً تین کوس انہوں نے اسی طرح سفر کیا آخر ایک جگہ نتاشا نڈھال ہو کر بیٹھ گئی اور اونچی آواز میں رونے لگی۔ ساتھ ہی وہ مقامی زبان میں نہ جانے کیا کچھ کہہ رہی تھی۔ اباقہ کو کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی لیکن علی کچھ کچھ سمجھ رہا تھا اور اس کے تاثرات بتا رہے تھے کہ "مالکہ" ان دونوں کو کوسنے دے رہی ہے۔ وہ اپنی پتلی پتلی ٹانگوں سے چلتا نتاشا کے پاس پہنچا اور بولا۔ "خدا کے واسطے مالکہ' گھوڑے پر بیٹھ جائیں۔ میں گھوڑے کی دم کے پاس بیٹھ جاؤں گا۔ آپ کو بالکل بو نہیں آئے گی۔" نتاشا نے سرخ سرخ آنکھوں سے اسے گھورا پھر نہایت طیش کے عالم میں چلتی ہوئی گھوڑے پر آ بیٹھی۔ علی تیزی سے گھوڑے کی دم کے پاس بیٹھ گیا۔ اباقہ اس کی ہوشیاری دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔

ان کا سفر جاری رہا جلد ہی انہیں اندازہ ہو گیا کہ وہ صحیح سمت میں جا رہے ہیں۔ شام کو انہوں نے ایک چھوٹے سے مکان میں قیام کیا۔ پہاڑی ڈھلوان پر واقع اس تنہا مکان میں ایک مختصر سا خاندان رہتا تھا۔ رات کو سوتے وقت اباقہ نے علی سے پوچھا۔ "تمہاری مالکہ رو رو کر کیا کہہ رہی تھی؟"

علی نے پہلے تو بتانے سے انکار کیا پھر بولا۔ "وہ کہہ رہی تھی۔ تم دونوں جانور ہو گندے اور بدبودار اجڈ گنوار۔"

اباقہ جانتا تھا اس نے اس کے علاوہ بھی بہت کچھ کہا تھا لیکن علی نمک حلال ہونے کا ثبوت دے رہا تھا۔ صبح جب وہ روانہ ہوئے تو نتاشا کے پاس اپنا گھوڑا تھا۔ رات اس نے اپنے باپ کا تعارف کرا کے یا کوئی قیمتی زیور دے کر میزبانوں سے یہ گھوڑا حاصل کر لیا تھا۔ اس نے ایک گرم شال بھی حاصل کی تھی۔ بال جو اب تک کھلے ہوئے تھے اس نے دو

بالوں میں گوندھ کر کندھوں پر ڈال لئے تھے۔ رات کی پُرسکون نیند کے بعد وہ نکھری نکھری نظر آ رہی تھی۔

دلادی میر کی طرف ان کا سفر پھر شروع ہوا۔ موسم اب بہتر تھا.......... بقایا سفر عافیت سے گزرا اور وہ سہ پہر کے وقت دلادی میر کے مضافات میں پہنچ چکے تھے۔

☆------☆------☆

اسد' یورق' طوطم خان اور مائیکل نے ڈٹ کر حملہ آوروں کا مقابلہ کیا۔ مائیکل کے دوتوں منگولی محافظ بھی نہایت بے جگری سے لڑے۔ لڑائی کے دوران مائیکل گھوڑے سے نیچے گر گیا۔ عین اس وقت جب ایک حملہ آور اس پر نیزہ پھینکنا چاہتا تھا ایک شخص اچھل کر اس کے اوپر لیٹ گیا۔ نیزہ اس کے سینے سے پار ہوا اور مائیکل بچ گیا۔ مائیکل پر جان قربان کرنے والا اس کے دو جاں نثاروں میں سے ایک تھا۔ پلک جھپکتے میں درختوں سے چھلانگیں لگا کر کوئی دو درجن مزید افراد میدان میں آ گئے اور انہوں نے اس مختصر قافلے کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ ان کا گھیرا توڑ کر نکلنا گو بہت زیادہ مشکل نہیں تھا لیکن اسد اللہ نے اشارے سے اپنے ساتھیوں کو مبازرت سے روک دیا۔ مائیکل نے محاصرہ کرنے والوں سے چلا کر پوچھا۔

"کیا چاہتے ہو؟"

ان کا سردار آگے بڑھا اور گرج کر بولا۔ "اپنے ہتھیار دور پھینک کر گھوڑوں سے اتر آؤ۔"

انہوں نے ہتھیار پھینکے اور گھوڑوں سے اتر آئے۔ تین آدمیوں نے ان کی تلاشی لی اور پیش قبض خنجر بھی ان کے جسموں سے جدا کر دیئے۔ سردار کے حکم پر ایک طویل رسے سے ان کے ہاتھ باندھ دیئے گئے۔ چند گھڑسوار اباقہ اور نتاشا کی تلاش میں نکل گئے۔ تھوڑی ہی دیر بعد انہیں خالی ہاتھ لوٹنا پڑا۔ حملہ آور انہیں لے کر گھنے درختوں میں گھس گئے۔

اسد اللہ نے ترجمان کے ذریعے مائیکل سے پوچھا۔ "یہ لوگ کون ہیں اور کیا چاہتے ہیں۔" مائیکل نے کہا۔ "میرے اندازے کے مطابق یہ ایک مقامی رئیس کانکوف کے پالے ہوئے لشکری ہیں۔ ان لوگوں کا پیشہ لوٹ مار اور غلاموں کی تجارت ہے۔"

ایک جگہ وہ ٹھہرے تو اسد اللہ نے ان کے سردار سے گفتگو کی۔ مائیکل کا کہا درست تھا۔ حملہ آوروں کا مطمع نظر مال غنیمت تھا۔ اسد نے جب ان کے سردار کو بتایا کہ وہ سینکڑوں میل کا سفر طے کر کے منگولوں کے خلاف ان کی مدد کو آئے ہیں تو انہیں یقین

نہیں آیا۔ اسد نے ان کے سامنے ایک مئوثر تقریر کی۔ ترجمان ساتھ ساتھ ان کا مطلب بیان کرتا چلا گیا۔ اسد نے کہا۔

"دوستو، سنبھلنے کی کوشش کرو۔ منگولوں کا ہلاکت خیز سیلاب تمہارے شہروں کو خس و خاشاک کی طرح بہاتا چلا آ رہا ہے۔ ان کی تلواریں تمہارے خون کی پیاس میں ہانپ رہی ہیں۔ ان کے گھوڑے تمہاری لاشیں روندنے کو بے قرار ہیں .... اور تم ایک دوسرے کی گردن کاٹنے کی فکر میں ہو۔ جاؤ جا کر ماسکو کی راکھ اور وہاں کے کھنڈر دیکھو اور اندازہ لگاؤ کہ تمہارے شہروں کا کیا حشر ہونے والا ہے۔ یاد رکھو منگولوں کی تلوار یہ نہ دیکھے گی کہ یہ کون سے رئیس کا سپاہی ہے۔ وہ تلوار صرف کاٹے گی۔ وہ نہ تمہارے بچے دیکھے گی اور نہ بوڑھے۔ تمہاری عورتوں کو گھوڑوں کے پیچھے باندھ کر بھگایا جائے گا۔ ان عورتوں میں وہ باحیا لڑکیاں بھی ہوں گی جنہیں چشم فلک نے نہ دیکھا ہو گا اور وہ مائیں بھی ہوں گی جن کی چھاتیوں میں اپنے معصوم بچوں کا دودھ ہو گا۔ اپنے باپوں اور بھائیوں کو پکارتی اور اپنے بچوں کے لئے چلاتی وہ بھاگتی رہیں گی یہاں تک کہ گر کر دم توڑ دیں گی۔ ذرا سوچو جب وہ مریں گی تو اس زمین کا سینہ پھٹ نہ جائے گا۔ اس آسمان سے خون نہ برسے گا؟ .... اے دوستو! سنبھل جاؤ۔ خود پر اور اپنے پیاروں پر رحم کرو۔ آپس کے جھگڑے بھول کر ایک ہو جاؤ۔ ایک ایسی مضبوط دیوار بن جاؤ جو اس وحشی سیلاب کو روک سکے۔ اگر دیر کرو گے تو کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔ ہم تمہارے دست و بازو بن کر آئے ہیں، طویل مسافتیں طے کر کے یہاں تک پہنچے ہیں۔ اگر ہمیں مارو گے تو اپنے ہی ہاتھ کاٹو گے، اپنے ہی دوستوں میں کمی کرو گے........."

اسد کی تقریر ختم ہوئی تو حملہ آوروں کا رویہ مختلف نظر آ رہا تھا۔ سردار کی آنکھوں میں مہربانی کی جھلک تھی لیکن اس کے گروہ میں چند افراد تند و تیز باتیں کر رہے تھے ان کا خیال تھا کہ یہ لوگ جان بچانے کے لئے ایسی باتیں کر رہے ہیں۔

اسد نے کہا۔ "بھائیو! اگر تمہارے دل ہماری طرف صاف نہیں ہوئے تو ٹھیک ہے اپنی مرضی کر لو۔ ہماری جان کی ضرورت ہے تو لے لو۔ ہم تو آئے ہی جان قربان کرنے کے لئے ہیں۔ اگر تمہیں دولت کی ضرورت ہے تو ہمارا سب کچھ چھین لو ہمیں کوئی شکوہ نہیں۔ صرف ہماری تلواریں ہمارے پاس رہنے دینا تاکہ مشکل میں تمہارے کام آ سکیں۔"

حملہ آوروں کے چہروں پر کشمکش تھی۔ سردار نے اپنی تلوار نیام میں ڈال لی اور ساتھیوں سے کچھ گفتگو کرنے لگا۔ اسد نے انہیں متذبذب دیکھا تو مائیکل سے لے کر وہ تھیلا سردار کی طرف اچھال دیا جس میں سراندیپ کے یاقوت اور بلور تھے۔ سردار نے تھیلا

ہوا میں دبوچ لیا۔ اسد بولا۔

"ہمیں دولت کی ضرورت نہیں یہ سب کچھ رکھ لو ہمیں بیچ کر بھی تم اتنی دولت حاصل نہیں کر سکتے۔"

اسد کے پے در پے حملوں نے حملہ آوروں کو پشیمانی کی سرحد پر لا کھڑا کیا۔ وہ کچھ دیر آپس میں مشورہ کرتے رہے۔ پھر سردار تھیلا لئے اسد کے پاس واپس آیا اور اسے تھیلا تھماتے ہوئے بولا۔ "ہمیں افسوس ہے کہ ہم نے تم پر حملہ کیا۔ تمہاری باتوں نے ہمیں سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔"

"اسد بولا۔" اچھے بھائی، سوچو نہیں، عمل کرو۔ وقت قیامت کی چال چل رہا ہے۔ اپنے گھوڑے سنبھالو اور بستی بستی پھیل جاؤ۔ لوگوں کو خواب غفلت سے جگاؤ۔ رئیسوں کو عشرت کدوں سے نکالو۔ ہتھیار سنبھالو اور ایک پرچم تلے جمع ہو جاؤ۔"

اسد نے حملہ آوروں کو اس انداز میں سمجھایا کہ ان کے چہروں پر ہیجان نظر آنے لگا۔ ان کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اسد کی باتوں نے ان کے دل میں جگہ بنائی ہے۔ کچھ ضروری معلومات حاصل کرنے کے بعد وہ لوگ واپس جانے کو تیار ہو گئے۔ اسد نے تھیلے میں سے کچھ یاقوت نکال کر سردار کے حوالے کر دیئے۔ وہ لینے سے معترض تھا مگر اسد نے اسے یہ کہہ کر سمجھایا کہ یہ وہ خوشی سے دے رہا ہے۔ اس رقم کے عوض اگر چند گھوڑے آ جائیں گے۔ چند تلواریں آ جائیں گی اور چند سپاہیوں کو زاد راہ مل جائے گا تو منگولوں کے خلاف ان کی مزاحمت کچھ اور قوی ہو جائے گی۔

اس لڑائی میں دونوں طرف سے ایک ایک شخص ہلاک ہوا تھا۔ دونوں لاشیں سپرد خاک کرنے کی ذمے داری اسد نے اٹھالی۔ حملہ آور انہیں الوداع کہہ کر رخصت ہو گئے۔ ایک درخت کے نیچے دو قبریں کھود کر لاشیں دفنا دی گئیں۔ اسد اور یورق نے اپنے انداز میں دعا مانگی اور مائیکل نے اپنے انداز میں۔ اباقہ، نتاشا اور علی کا ملنا اب کافی دشوار نظر آتا تھا۔ پھر بھی انہوں نے اردگرد کے علاقے میں گھوڑے دوڑائے۔ آخر عصر کی نماز ادا کرنے کے بعد اسد نے مائیکل سے مشورہ کیا اور سفر دوبارہ شروع کر دیا۔

.... راستے کی مشکلوں پر قابو پاتے اور حتی الامکان تیزی سے سفر کرتے وہ اگلے روز دوپہر کے وقت دلادی میر کی حدود میں داخل ہو گئے۔ اس وقت موسم خراب ہو رہا تھا اور برف باری کے آثار نظر آتے تھے۔

دلادی میر میں ماسکو کی تباہی کی خبریں پہنچ چکی تھیں لیکن لوگوں پر صورت حال واضح نہیں تھی۔ سرکاری طور پر بھی اس المیے کی کوئی اطلاع نہیں تھی۔ یہ مائیکل تھا جس نے

دلادی میر کے حکام پر واضح کیا کہ ماسکو راکھ کا ڈھیر بن چکا ہے اور اب منگول گھوڑوں کا
رخ دلادی میر کی طرف ہے۔ اس تصدیق کے بعد دلادی میر کے طول و عرض میں خوف
اور اضطراب کی کیفیت اور شدید ہو گئی۔ اسد وغیرہ یہ جان کر پریشان ہوئے کہ اباقہ ابھی
تک دلادی میر نہیں پہنچا۔ خدشہ تھا کہ وہ نتاشا اور بچے کے ساتھ برفانی طوفان میں گھر گیا
ہو گا۔ اگلے روز دوپہر تک انہوں نے اباقہ کا انتظار کیا آخر اسد نے فیصلہ کیا کہ وہ ان کی
تلاش میں جائے گا۔ یورق اور مائیکل بھی تیار ہو گئے۔ مائیکل کے کہنے پر نائب سپہ سالار
نے فوج کا ایک دستہ بھی ان کے ساتھ کر دیا لیکن ابھی وہ سب شہر کے دروازے سے نکل
ہی رہے تھے کہ دور انہیں دو گھوڑے آتے دکھائی دیئے۔ اسد نے ساتھیوں کو رکنے کا
اشارہ کیا۔ وہ غور سے گھوڑوں کو دیکھتے رہے۔ پھر سب کے چہروں پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔
وہ اباقہ اور نتاشا ہی تھے۔ جونہی وہ قریب پہنچے اسد وغیرہ نے آگے بڑھ کر ان کا استقبال
کیا۔ سب کے چہروں پر اطمینان نظر آنے لگا۔ اب وہ دلادی میر کے دفاع کے لئے تیار
تھے۔ دلادی میر جس کی فضاؤں میں ان گنت ہنگامے پرورش پانے والے تھے۔

سہ پہر کا وقت تھا۔ جنوری کا ٹھٹھرا ہوا سورج تیزی سے مغرب کی طرف جھک رہا
تھا۔ عظیم الشان شہر دلادی میر کے طول و عرض میں روزمرہ کے معمولات جاری تھے۔
برف سے ڈھکی ہوئی سڑکوں پر سموری لباس پہنے لوگوں کا ایک جم غفیر متحرک تھا۔ بظاہر
زندگی معمول پر تھی لیکن چہروں پر ایک انجانا سا خوف پایا جاتا تھا۔ کچھ ڈری ڈری
سرگوشیاں گلی کوچوں میں گردش کر رہی تھیں اور یہ خوف تھا منگول وحشیوں کا۔ جن کے
لشکر، سیاہ بادلوں کی طرح دلادی میر کے افق پر چھا رہے تھے۔

شہر کے جنوبی حصے میں حضرت مریم کے کلیسا کے قریب متمول لوگوں کی شاندار
آبادی تھی۔ یہاں زیادہ تر تاجر پیشہ لوگ آباد تھے، لکڑی اور پتھر کی بنی ہوئی ڈھلوان
چھتوں والی خوبصورت عمارتیں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں، لیکن عین چوراہے میں ایک
سرخ رنگ کی عمارت ان سب سے جدا تھی۔ یہ شہر کے معروف تاجر توزن باخ کی رہائش
گاہ تھی۔ توزن باخ شہد کی مکھیاں پالتا تھا۔ اس مقصد کے لئے اس نے شہر کے مضافات
میں ایک وسیع قطعہ زمین حاصل کر رکھا تھا۔ پھلتے پھلتے اس کا کام اب اتنا پھیل گیا تھا کہ
اس نے شہد برآمد کرنا شروع کر دیا تھا۔ پچھلے چند سالوں سے اس کا نام شہد کے تاجر کی
حیثیت سے بہت مشہور ہوا تھا۔ توزن باخ اس وقت اپنی شاندار نشست گاہ میں موجود تھا۔
دریچوں کے دبیز پردے کھنچے ہوئے تھے۔ دروازے بند تھے اور دروازوں سے باہر چوکس
دربان کھڑے تھے۔ نشست گاہ کے اندر فانوس کی مدھم روشنی پھیلی تھی اور آتشدان میں

جلنے والی آگ نے کمرے کی فضا کو آرام دہ بنا دیا تھا۔ اس وقت توزن باخ کے علاوہ دو
منگول بھی کمرے میں موجود تھے۔ یہ دونوں منگول درحقیقت باتو خاں کے لشکر کے جاسوس
تھے۔ وہ پچھلے ایک ماہ سے دلادی میر میں مصروفِ کار تھے۔ منگولوں کا وطیرہ تھا کہ کسی بھی
شہر پر یلغار سے قبل وہاں اپنے جاسوس بھیجتے تھے۔ جو نہایت مہارت اور جانفشانی سے اپنے
لشکر کے لئے قیمتی معلومات حاصل کرتے تھے۔ ان جاسوسوں کی خصوصیت تھی کہ وہ جان
ہتھیلی پر رکھ کر اہم ترین مقامات تک رسائی حاصل کر لیتے تھے اور شہر کے دفاعی انتظامات
میں ایسے رخنے تلاش کر لیتے تھے جو ان کی فوج کے لئے فتح کا نشان بن جاتے تھے۔ اس
کے علاوہ یہ جاسوس شہر میں بدامنی اور مایوسی پھیلانے میں بھی اہم کردار ادا کرتے تھے۔
سراسیمگی پیدا کرنے والی زیادہ تر افواہوں کا منبع یہی منگول تخریب کار ہوتے تھے۔

توزن باخ کے پاس بیٹھے ہوئے یہ دونوں منگول بھی پرلے درجے کے عیار اور فتنہ
پرور افراد تھے۔ وہ بڑی روانی سے روسی بول رہے تھے اور ان کے خدوخال بھی مقامی
لوگوں سے ملتے جلتے تھے۔ بادی النظر میں انہیں منگولوں کی حیثیت سے پہچاننا دشوار تھا۔
ایک منگول نے شراب کا جام چڑھاتے ہوئے توزن باخ سے پوچھا۔

”جناب وقت تیزی سے جا رہا ہے۔ آپ کا آدمی کہیں جا کر سو تو نہیں گیا؟“

ابھی منگول کا فقرہ مکمل ہی ہوا تھا کہ دروازہ کھلا اور دربان نے ادب سے جھک کر
اطلاع دی کہ سردار یگوڈا آپ سے ملنا چاہتا ہے۔ توزن باخ نے سر کے اشارے سے اسے
اندر لانے کی اجازت دی۔ ذرا ہی دیر بعد ایک گرانڈیل شخص اندر داخل ہوا۔ نصف
آستین کے سموری لبادے سے اس کے توانا بازو جھانک رہے تھے۔ اس کی خود رو سنہری
داڑھی دونوں شانوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے ہمراہ ایک دبلے پتلے جسم والا شخص
تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ رکھے تھے اور مسلسل اپنے پاؤں کو گھور رہا تھا۔
گرانڈیل شخص بولا۔ ”مالک! رآئیوانا حاضر ہے۔“

توزن نے تنقیدی نظروں سے دبلے پتلے شخص کا جائزہ لیا اور دونوں منگولوں کی
طرف رخ کر کے بولا۔ ”دوستو یہ ہے رآئیوانا۔ یہ شاہی مطبخ کے اہم ترین باورچیوں میں
سے ایک ہے۔“

منگول نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ”رآئیوانا' سنا ہے کہ شاہی محل میں اہم
سرداروں کے اعزاز میں جو ضیافت دی جا رہی ہے' اس کی تیاری میں تم بھی شرکت کرو
گے۔“

”جی ہاں۔“ رآئیوانا نے جھک کر کہا۔

منگول بولا۔ "تو تمہیں ہماری پیشکش منظور ہے؟"

رآئیوانا نے کہا۔ "جناب! میں انکار کر کے آپ جیسے مہربانوں کو ناراض نہیں کر سکتا۔ لیکن.........."

"لیکن کیا؟" توزن باخ کی باریک آواز کمرے میں گونجی۔ اس کی بارعب شخصیت کے برعکس آواز خاصی مضحکہ خیز تھی۔

رآئیوانا جھجکتے ہوئے بولا۔ "جناب! میں آپ کی زبان سے اس بات کی یقین دہانی چاہتا ہوں کہ مجھے میری بیوی بچوں کے ساتھ بحفاظت نوود گرود پہنچایا جائے گا......... اور میری گرفتاری کی صورت میں مجھے تنہا نہیں چھوڑا جائے گا.........."

توزن باخ نے گرانڈیل شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "رآئیوانا تمہارے سامنے یہ یگوڈا کھڑا ہے' لیکن تم سمجھو کہ یہ میں کھڑا ہوں۔ اس نے تم سے جو کچھ کہا۔ وہ میں نے کہا ہے۔ جو وعدہ کیا ہے وہ میں نے کیا ہے اور میں نے جو وعدہ کیا ہے وہ ہر صورت میں پورا ہو گا۔ جونہی تصدیق ہوئی کہ کام ہو گیا ہے تمہارا انعام جو دو من خالص سونے کی شکل میں ہو گا تم تک پہنچ جائے گا۔ تمہیں اور تمہارے انعام کو بحفاظت نوود گرود پہنچانا ہمارے مسلح دستے کی ذمہ داری ہو گی۔ اس دستے کا کماندار یگوڈا ہو گا اب خود سوچ لو جو دستہ یگوڈا کی قیادت میں ہو گا اس کا راستہ روکنے کی جرأت اس علاقے میں کون کرے گا۔ یگوڈا اس وقت واپس آئے گا جب نوود گرود میں تم اپنی حفاظت کی طرف سے بالکل مطمئن ہو جاؤ گے۔ باقی رہی تمہاری گرفتاری کی بات تو اس کا امکان ایک فیصد بھی نہیں' لیکن اگر کوئی ایسی انہونی ہوئی تو ہم تمہیں تنہا چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اس معاملے میں ہماری سلامتی تمہاری سلامتی سے وابستہ ہے۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ دلادی میر کے ہر زنداں کی دیوار میں میرے لئے ایک دروازہ موجود ہے۔ اپنے اثر و رسوخ کی چابی سے میں یہ دروازہ جس وقت چاہوں کھول سکتا ہوں۔"

رآئیوانا بولا۔ "بس جناب .... مجھے آپ کی ہر بات پر یقین آیا۔ بس اب آپ مناسب مقدار میں خالص قسم کے زہر کا انتظام کر دیں۔"

توزن باخ نے تالی بجائی۔ دروازہ کھلا اور دربان ایک بوڑھے شخص کو لئے اندر داخل ہوا۔ میلا کچیلا لباس پہنے ہوئے یہ شخص فرشی سلام کرتا اندر داخل ہوا تو توزن باخ کے چہرے پر شیطانی مسکراہٹ نظر آنے لگی۔ وہ بوڑھے کی طرف اشارہ کر کے رآئیوانا سے مخاطب ہوا۔

"یہ دلادی میر کا سب سے تجربہ کار کیمیا گر ہے۔ مجھے امید ہے تمہیں اپنے مطلب

کی چیز مل جائے گی۔"

کیمیا گر نے اپنے کندھے سے لٹکتا ہوا چرمی تھیلا فرش پر رکھا اور اس کے اندر سے چند پڑیاں نکال لیں۔ پھر وہ ایک پڑیا کھولتا ہوا بولا۔

"یہ سفید رنگ کا سفوف سنکھیا ہے۔ اس کا ذائقہ بالکل نہیں ہوتا۔ چند گھونٹ پانی میں ملا کر بھی دیا جا سکتا ہے۔ نہایت مہلک زہر ہے۔ آٹھ پہر کے اندر موت واقع ہو جاتی ہے۔ مناسب مقدار میں دیا جائے تو کھانے والا ایک پہر بھی مشکل سے نکالتا ہے۔ میرے پاس اس کا سُرخ سفوف بھی ہے' لیکن سفید تمہارے کام کے لئے زیادہ مناسب رہے گا اور یہ دیکھو یہ "ست کچلا" ہے۔ میرا باپ یہ ہندوستان سے لے کر آیا ہے۔ وہاں اس کا درخت ہوتا ہے۔ اس درخت کے بیجوں سے یہ زہر نکالا جاتا ہے۔ یہ انتہائی زوداثر زہر ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے شکار تڑپ کر مر جاتا ہے۔ اگر سالن یا شیرینی میں ملا دو گے تو کھانے والے کو پتہ بھی نہ چلے گا۔"

ایک منگول نے پوچھا۔ "اور بابا.......... اس پڑیا میں کیا ہے؟"

بوڑھے نے اپنی پُراسرار بھنوؤں کو حرکت دی اور بولا۔ "یہ افیون ہے۔ پوست کے کچے دوزوں کو چیرا دے کر یہ زہر حاصل کیا جاتا ہے۔ میں نے اس میں دھتورے کی آمیزش کی ہے اور نہایت مہلک بنا دیا ہے' لیکن اس میں بو ہے اور ذائقہ بھی خاصا کڑوا ہے.........."

کافی دیر نشست گاہ میں مختلف زہروں کے متعلق گفتگو ہوتی رہی۔ آخر فوری اور یقینی نتیجہ حاصل کرنے کے لئے "ست کچلا" کے استعمال کا فیصلہ کیا گیا۔ باورچی رآئیوانا نے بوڑھے سے اپنی ضرورت کے مطابق زہریلا محلول حاصل کیا اور یہ ہلاکت آفریں نشست برخاست ہو گئی۔ گرانڈیل یگوڈا جب باورچی اور کیمیا گر کو لے کر باہر نکل گیا تو توزن باخ نے عیارانہ مسکراہٹ سے دونوں منگولوں کی طرف دیکھا اور باریک آواز میں بولا۔

"دوستو! آج رات شاہی ضیافت گاہ میں خالی برتنوں کے ساتھ خاقان اعظم کے دشمنوں کی لاشیں بھی اٹھیں گی۔"

دائیں طرف بیٹھے منگول نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ "ایک جام آج کی ضیافت کے نام.........." تینوں نے پیالے ٹکرائے اور ہونٹوں سے لگا لئے۔

☆ ---------- ☆ ---------- ☆

اباقہ' اسد وغیرہ کے ٹھہرنے کا انتظام رئیس اعظم کنیازیوری کے محل کے قریب ہی

کیا گیا تھا۔ یہ ایک پُرشکوہ اور وسیع و عریض رہائش گاہ تھی۔ اس میں وہ تمام مہمان قیام پذیر تھے جنہیں خاص مقاصد کے لئے دنیا کے مختلف حصوں سے مدعو کیا گیا تھا۔ ان سب مہمانوں میں دو باتیں مشترک تھیں۔ وہ بلا کے جنگجو اور غارت گر تھے اور سب کے سب قراتزم کے دشمن تھے۔ یہ کل چالیس افراد تھے جن میں سے کچھ خوارزم اور چین سے تعلق رکھتے تھے اور کچھ منگول تھے۔ اس رات ان تمام مہمانوں کے اعزاز میں ضیافت دی جا رہی تھی۔ رئیس اعظم یوری چونکہ خود شہر میں موجود نہیں تھا لہٰذا یہ ضیافت نائب رئیس کی طرف سے تھی۔ رئیس اعظم کی غیر موجودگی کا پتہ' اباقہ کو اسد سے چلا تھا۔ اس کی طرح اسے بھی تشویش ہوئی تھی۔ درحقیقت اس نازک موقعے پر رئیس اعظم کی غیر موجودگی شہر کے دفاع کو دشوار تر بنا سکتی تھی۔ اسد نے اباقہ کو بتایا تھا کہ اطلاعات کے مطابق رئیس اعظم منگولوں سے مقابلے کے لئے مضافاتی علاقوں سے فوج جمع کر رہے ہیں۔

شام کا وقت تھا۔ اباقہ نیند سے بیدار ہوا تو علی اسے نظر نہیں آیا۔ وہ اس کے ساتھ ہی پلنگ پر سویا تھا۔ اب اس کا پلنگ خالی نظر آ رہا تھا۔ اباقہ نے کھڑکی کے پٹ کھولے اور باہر جھانکنے لگا۔ سامنے سنگ مرمر کا خوبصورت صحن تھا۔ صحن کے بیچوں بیچ ایک نقرئی فوارہ رنگدار پانی فضا میں اُچھال رہا تھا۔ سامنے ہی رئیس اعظم کے شاندار محل کے در و دیوار نظر آ رہے تھے۔ فوارے کے پاس اسد اللہ بیٹھا ایک کتاب پڑھ رہا تھا۔ یہ کتاب عراق سے ہی اس کے ساتھ تھی۔ دراصل وہ روسی زبان سیکھنے کی کوشش کر رہا تھا اور اس میں اسے کامیابی بھی ہوئی تھی۔ کچھ دیر بعد اس نے کتاب سے نظریں اٹھائیں تو اباقہ نے چلا کر پوچھا۔

"اسد! تمہیں علی نظر نہیں آیا؟"

اسد کا جواب نفی میں تھا۔ اباقہ کو تشویش لاحق ہوئی۔ وہ صحن میں آیا اور علی کی تلاش میں اِدھر اُدھر گھومنے لگا۔ انجان جگہ پر لڑکے کا اس طرح نکل جانا تشویشناک تھا۔ اسے ڈھونڈتا اباقہ اس باغ کی طرف نکل گیا جو شاہی محل کی بیرونی دیوار کے ساتھ واقع ہے۔ ایک پستہ دیوار شاہی محل کو باغ سے جدا کرتی تھی۔ اس دیوار میں ایک دروازہ نظر آ رہا تھا۔ اباقہ کے دیکھتے ہی دیکھتے دروازہ کھلا اور علی نے چوروں کی طرح اس میں سے نکل کر باغ میں جھانکا۔ پھر وہ باغ میں آیا اور تیزی سے صحن کی طرف بھاگنے لگا۔ اباقہ اس کی نگاہ نہیں پڑی تھی۔ وہ سخت گھبرایا ہوا دکھائی دیتا تھا۔

"علی!" اباقہ نے اسے آواز دی

وہ ٹھٹک کر رک گیا۔ اباقہ نے اس کے قریب پہنچ کر پوچھا۔ "کہاں گئے تھے؟"

علی سخت سراسیمہ نظر آتا تھا۔ اس کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ کہنے لگا۔ "میں .... میں .... مجھے بڑی بھوک لگ رہی تھی۔"

اباقہ نے کہا۔ "اچھا تو تم کھانے کی خوشبو سونگھتے ہوئے محل میں چلے گئے تھے۔"

علی تھوک نگل کر بولا۔ "ہاں بالکل ایسا ہی ہوا تھا لیکن..............."

"لیکن کیا؟" اباقہ نے پوچھا۔ علی کی گول گول آنکھوں میں ہراس نظر آ رہا تھا۔ اباقہ کو لگا جیسے علی نے محل میں کوئی انہونی چیز دیکھی ہے۔ "تم خاموش کیوں ہو؟ بولتے کیوں نہیں۔" اباقہ نے اسے شانے سے جھنجھوڑا۔

علی سرگوشی میں بولا۔ "بھائی جان .... مجھے اتنے زور کی بھوک لگی تھی کہ میں آپ کے جاگنے کا انتظار نہ کر سکا۔ پہریدار سے نظر بچا کر میں محل کے مطبخ میں چلا گیا۔ وہاں بڑے بڑے دیگچوں میں کھانا پک رہا تھا۔ کھانا پکانے والا آدمی کوئی چیز لینے کے لئے باہر گیا تو میں اندر گھس گیا۔ ابھی میں ایک دیگچے کا ڈھکنا اٹھا ہی رہا تھا کہ باہر کھٹ پٹ کی آواز سنائی دی۔ میں جلدی سے ایک الماری کے پیچھے چھپ گیا۔ میں نے سمجھا کھانا پکانے والا واپس آ گیا ہے لیکن وہ کوئی اور شخص تھا۔ لباس سے وہ بھی باورچی دکھائی دیتا تھا۔ وہ چوروں کی طرح اِدھر اُدھر دیکھتا اندر آیا پھر اس نے اپنی قمیض کے اندر سے ایک شیشے کی بوتل نکالی۔ اس میں کوئی پانی جیسی چیز تھی۔ اس نے دو دیگچوں کے ڈھکن اٹھا کر یہ چیز اندر ڈال دی۔ وہ سخت گھبرایا ہوا دکھائی دیتا تھا اور اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ جونہی وہ شخص باہر نکلا میں بھی الماری کے پیچھے سے نکل کر بھاگ آیا۔"

اباقہ کے جسم میں سنسناہٹ دوڑنے لگی۔ علی اسے ایک نہایت خوفناک اطلاع فراہم کر رہا تھا۔ اباقہ نے اس سے پوچھا۔ "تیرا کیا خیال ہے۔ اس آدمی نے کھانے میں کیا ملایا ہے؟"

علی نے کہا۔ "میرا خیال ہے اس نے کوئی ایسی چیز کھانے میں ڈالی ہے جو نہیں ڈالنی چاہئے تھی۔ ہو سکتا ہے وہ کھانا کھانے والا مر جائے۔"

اباقہ نے کہا۔ "تو بالکل ٹھیک کہتا ہے۔ اس کھانے میں زہر ملایا گیا ہے۔ یہ کوئی بہت گہری سازش ہے۔"

"سازش .... سازش کیا ہوتی ہے؟" علی نے پوچھا۔

اباقہ نے اس کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "تمہیں کسی نے نعمت خانے سے نکلتے دیکھا تو نہیں۔" علی نے نفی میں سر ہلا دیا۔ اباقہ نے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ آؤ میرے

ساتھ۔"

ابھی وہ چند قدم ہی چلے تھے کہ اچانک درختوں کی اوٹ سے کوئی چھ عدد نقاب پوش نکلے اور ان کے سامنے آ گئے۔ ان کے ہاتھوں میں عریاں تلواریں تھیں۔ اس سے پہلے کہ اباقہ کچھ سمجھتا ایک جال اس پر آ پڑا۔ وہ جال کے اندر بری طرح مچلا۔ اس نے علی کو دیکھا جو اسے جال سے نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک نقاب پوش نے تلوار کا دستہ زور سے علی کے سر پر مارا۔ وہ لڑکھڑا کر گھاس پر گرا اور ساکت ہو گیا۔ ضرب اتنی شدید تھی کہ خون فوارے کی طرح اس کی پیشانی سے پھوٹ پڑا تھا۔ اباقہ کی آنکھوں میں سرخی اتر آئی مگر اس سے پیشتر کہ وہ کچھ کرتا عقب سے کسی وزنی شے کی ضرب اس کے سر پر پڑی۔ اس کا ذہن چکرا کر رہ گیا۔ پھر ایک اور شدید ضرب سے اس کی کھوپڑی جھنجھنائی اور اس کی آنکھوں کے سامنے ایک تاریک چادر تن گئی۔

دوبارہ اسے ہوش آئی تو وہ ایک پتھریلے تہہ خانے میں تھا۔ اس کے بال خون سے بھیگ کر گردن سے چپکے ہوئے تھے۔ یہ خون سر کے پچھلے حصے سے نکلا تھا اور سارے جسم کو بھگو گیا تھا۔ اباقہ نے زخم ٹٹولنے کے لئے ہاتھ بڑھانا چاہا تو ایک وزنی زنجیر جھنجھنا اٹھی۔ اس نے تہہ خانے کی نیم تاریکی میں اپنے سراپا کا جائزہ لیا۔ اس کے جسم پر ایک لنگوٹ کے سوا کچھ نہ تھا۔ پاؤں ٹخنوں کے پاس سے دو آہنی کڑوں میں جکڑے ہوئے تھے۔ ان کڑوں کا درمیانی فاصلہ ڈیڑھ گز کے قریب تھا اس لئے اباقہ کی دونوں ٹانگیں کھلی ہوئی تھیں۔ دونوں کلائیاں بھی آہنی کڑوں میں تھیں۔ ان کڑوں کی وزنی زنجیریں چھت سے منسلک تھیں۔ زنجیروں میں جھول نہیں تھا لہٰذا اباقہ کے دونوں بازو اوپر اٹھے ہوئے تھے۔ تہہ خانے میں سخت سردی تھی اور فرش اباقہ کے ننگے پاؤں کے نیچے برف ہو رہا تھا۔ میں کس کی قید میں ہوں؟ اباقہ کے ذہن میں پہلا سوال یہی تھا۔ پھر اچانک اسے سب کچھ یاد آ گیا۔ وہ اور علی باغ میں باتیں کر رہے تھے کہ .... علی کا خیال آتے ہی اباقہ کا دماغ جھنجھنا اٹھا.......... وہ زخمی ہو کر زمین پر گرا تھا۔ اس کی پیشانی سے خون ابل رہا تھا.......... پتہ نہیں وہ زندہ بھی ہے یا نہیں .... پھر اباقہ کو وہ باتیں یاد آئیں جو اس حادثے سے چند لمحے پہلے علی نے اس سے کی تھیں اور اس کے ساتھ ہی اباقہ لرز گیا۔ "میرے خدا!" بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔ پتہ نہیں وہ کتنی دیر بے ہوش رہا تھا۔ شاہی ضیافت ہو چکی تھی یا ہونے والی تھی۔ اگر ہونے والی تھی تو کتنی ہی جانوں کو شدید خطرہ لاحق تھا.......... اور ان جانوں میں اسد اور یورق کی جانیں بھی شامل تھیں۔ اسد اور یورق کا خیال آتے ہی اباقہ تڑپ اٹھا۔ اس کی خوفناک دھاڑ سے تہہ خانہ گونج گیا۔ "کوئی ہے۔" وہ سینے کی

پوری قوت سے چیخا تھا۔ اس کی چیخ کا کوئی جواب نہیں آیا۔ اس نے مسلسل چلانا شروع کر دیا۔ ساتھ ساتھ وہ آہنی زنجیروں کو زوردار جھٹکے دے رہا تھا۔ زنجیروں کی آواز اباقہ کی دھاڑوں کے ساتھ مل کر تہہ خانے میں قیامت کا سماں پیدا کر رہی تھی۔ اچانک اباقہ کی نگاہ تہہ خانے کے زینوں سے ہوتی ہوئی اس کے دروازے پر اٹک گئی۔ وہاں ایک سپاہی اطمینان سے تلوار گود میں رکھے بیٹھا تھا۔ اباقہ نے اسے خون بار نظروں سے گھور کر کہا۔

"مجھے یہاں قید کرنے والا کون ہے' بلاؤ اسے .... فوراً۔"

اس شخص کے اطمینان میں کوئی فرق نہیں آیا اور وہ اباقہ کو لاپرواہی سے دیکھ کر منہ چلاتا رہا۔ اباقہ نے غصے کے عالم میں اس پر چیخنا شروع کر دیا۔ شاید اس کا خیال تھا کہ اس طرح پہریدار طیش میں آ جائے گا لیکن وہ نہایت ہتک آمیز باتیں سن کر بھی ٹس سے مس نہیں ہوا۔ درحقیقت وہ روسی تھا اور اباقہ کی زبان سمجھ ہی نہیں رہا تھا۔ تھک ہار کر اباقہ خاموش ہو گیا اور زنجیروں سے زور آزمائی کرنے لگا۔ زنجیریں بھی پہریدار کی طرح اپنی جگہ اٹل تھیں۔ انہیں چھت کے پتھروں اور فرش میں نہایت مضبوطی سے گاڑا گیا تھا۔ اباقہ کو احساس تھا کہ اس کے پاس وقت بہت کم ہے۔ اسی احساس نے اسے ایک بار پھر چیخنے پر مجبور کر دیا۔ اسی وقت تہہ خانے کا آہنی دروازہ ایک مہیب گڑگڑاہٹ کے ساتھ کھلا اور قندیلوں کی روشنی دکھائی دی۔ غلاموں کی ایک قطار قندیلیں اٹھائے اندر داخل ہوئی۔ ان کے عقب میں چند مسلح سپاہی تھے۔ ایک بھاری تن توش کا شخص ان کا کماندار دکھائی دیتا تھا۔ وہ اباقہ کے قریب پہنچا اور قندیل کی روشنی میں احتیاط سے اس کی بندشیں دیکھنے لگا۔ اباقہ نے چلا کر اس سے کہا۔

"تم جو کوئی بھی ہو مجھے اسی وقت نائب رئیس سے ملواؤ۔ ورنہ تم سب کو بری طرح پچھتانا ہو گا۔"

اباقہ کی چیخ و پکار کا ان سپاہیوں پر بھی کوئی اثر نہیں ہوا۔ اگر اثر ہوا تو صرف یہ کہ ایک آدمی نے اچانک اباقہ کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا اور اوپر سے ایک ڈوری باندھ دی۔ اب اباقہ کے حلق سے صرف غوں غاں کی آواز نکل رہی تھی۔ آہنی دروازہ ایک بار پھر کھلا اور قندیل بردار غلاموں کے عقب میں چلتی ہوئی ایک حسین عورت زینہ زینہ تہہ خانے میں اترنے لگی۔ اباقہ نے پہچان لیا۔ وہ نتاشا تھی۔ وہ چمکدار سرخ لباس میں تھی اور چہرہ پتھر کی طرح سخت نظر آ رہا تھا۔ اچانک اباقہ کو اندازہ ہوا کہ وہ نتاشا کی قید میں ہے۔

نتاشا شاہانہ چال چلتی اس کے سامنے پہنچی اور پُر حقارت نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ اس کے نازک ہونٹ اندرونی غضب سے پھڑپھڑا رہے تھے۔ وہ ایک بھوکی شیرنی

دکھائی دیتی تھی' وہ اباقہ کے اس قدر قریب کھڑی تھی کہ اس کے جسم سے اٹھنے والی حرارت اباقہ کو اپنی عریاں جلد پر محسوس ہو رہی تھی۔ ایک غضبناک سرگوشی میں وہ بولی۔

"بدبخت شخص تو نے میرے باپ جیسے چچا کو توہین آمیز سلوک کا نشانہ بنایا۔ تو نے ایک ادنیٰ غلام لڑکے کے سامنے رئیس اعظم کی بیٹی کو بے عزت کیا۔ اس کی زندگی کو حقیر جان کر آگ میں گھرا چھوڑ دیا۔ تو نے اسے برف زار میں پا پیادہ چلایا اور خود گھوڑے پر سواری کی۔ تو نے اپنے ناپاک جسم کے ساتھ اس کے پہلو میں بیٹھنے کی جسارت کی۔ خدا کی قسم میں ان جرائم کی پاداش میں تیرے جسم کا ریشہ ریشہ الگ کر دوں گی۔ تیرا انجام شاہی گستاخوں کے لئے عبرت کی یادگار ہو گا۔"

اباقہ نے چیخ کر اس سے کہنا چاہا کہ وہ اپنے انتقام کی آگ ضرور ٹھنڈی کرے' لیکن پہلے ان لوگوں کی جان بچائے جو اس کے دوست بن کر دور دراز علاقوں سے یہاں پہنچے ہیں' لیکن وہ کچھ نہ کر سکا۔ اس کا منہ مضبوطی سے بند کر دیا گیا تھا تاکہ وہ شہزادی کی شان میں کوئی گستاخی نہ کر سکے۔ ایک غلام نے آگے بڑھ کر طشتری میں رکھی ہوئی ایک طویل چھڑی شہزادی کو پیش کی۔ شہزادی نے چھڑی اٹھائی اور نہایت نفرت سے گھما کر اباقہ کے منہ ماری۔ ایک طرح سے یہ اباقہ کی سزا کا افتتاح تھا۔ افتتاح کے بعد شہزادی نتاشا بڑی شان سے چلتی ہوئی ایک کرسی پر جا بیٹھی۔ دو تنومند غلام آگے بڑھے اور بید کی باریک چھڑیوں کے ساتھ اباقہ پر پل پڑے کوئی اور ہوتا تو لمحوں میں اس کی کھال ادھڑ جاتی' لیکن وہ اباقہ تھا' سخت جان' سخت جلد اور اذیت کو شربت کی طرح گھول کر پی جانے والا۔ یکے بعد دیگرے کئی چھڑیاں اس کے جسم پر ٹوٹ گئیں۔ اس کا ضبط دیکھ کر شہزادی کے ذہن میں ایک انوکھا خیال آیا۔ اس نے مارنے والوں کو حکم دیا کہ صرف مجرم کے چہرے کو نشانہ بنایا جائے .... چہرہ آخر چہرہ تھا۔ اس پر بے دریغ چھڑیاں پڑنی شروع ہوئیں تو کھال زخمی ہونی شروع ہوئی۔ یہ منظر لرزہ خیز تھا۔ اباقہ چہرے کو بچانے کے لئے مسلسل دائیں بائیں حرکت دے رہا تھا لیکن بچنا محال تھا۔ سر کے زخم نے بھی ایکا ایکی خون اگلنا شروع کر دیا تھا۔ جلد ہی اباقہ کے ہونٹ پھٹ گئے اور دونوں نتھنوں سے خون کی دھاریں بہہ نکلیں .... اباقہ نڈھال ہو گیا۔ شہزادی نے اپنے پاؤں کو حرکت دی۔ ایک غلام آگے بڑھا اور اس نے ادب سے شہزادی کی جوتی اتار لی۔ یہ جوتی لے کر وہ اباقہ کے پاس پہنچا اور اس کا تلوا اباقہ کی ناک کے سامنے کر دیا۔ پھر اپنی ناک ہاتھ پر رگڑ کر اس نے اباقہ کو سمجھایا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ شہزادی کی خواہش تھی کہ مجرم اپنی ذلالت ظاہر کرنے کے لئے جوتی پر ناک رگڑے۔

اباقہ نے خون سے بھیگا ہوا چہرہ اٹھایا۔ اس چہرے پر ایک عجیب سی وحشت برس رہی تھی۔ وہ حلق سے مسلسل "غوں غاں" کی آوازیں نکال کر اپنا مدعا بیان کرنے کی کوشش کر رہا تھا .... انہیں سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ شاہی ضیافت گاہ میں کیا قیامت ٹوٹنے والی ہے' لیکن وہاں اس کی سننے والا کوئی نہیں تھا۔ جب اس نے شہزادی نتاشا کی خواہش کے مطابق جوتے پر ناک رگڑنے سے انکار کیا تو ایک بار پھر وہ غضب ناک ہو گئی۔ اس نے غلام کے ہاتھ سے چھڑی لے کر بے دریغ اباقہ کے منہ پر مارنا شروع کر دی۔ یہاں تک کہ وہ نڈھال ہو گیا۔ وہ تلخ سرگوشی میں بولی۔

"میں تمہیں ماروں گی نہیں جنگلی' تیرا غرور توڑوں گی۔ تجھے ادب کرنا سکھاؤں گی۔ تو پالتو جانور کی طرح میرے قدموں میں بیٹھ کر دم ہلائے گا۔ یہ میرا تجھ سے وعدہ ہے۔ ہاں یہ کنیاز یوری کی بیٹی کا وعدہ ہے۔" پھر وہ چھڑی پھینک کر پاؤں پٹختی ہوئی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔ قندیل بردار غلاموں اور مسلح سپاہیوں نے اسے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ جب وہ چلی گئی تو اباقہ کے حلق میں ٹھنسا ہوا کپڑا نکال دیا گیا۔ اباقہ ایک بار پھر چیخنے چلانے لگا مگر وہاں اب اس کی زبان سمجھنے والا کوئی نہیں تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس تنہا پہریدار کے سوا تمام افراد تہہ خانے سے چلے گئے۔ پھر کچھ دیر بعد وہ پہریدار بھی میکانکی انداز میں چلتا ہوا باہر نکل گیا۔ واقعی ان ناقابل شکست زنجیروں کی موجودگی میں کسی پہریدار کی ضرورت نہیں تھی۔

اباقہ کی آواز اب تہہ خانے کی خالی دیواروں سے ٹکرا رہی تھی۔ "خدا کے لئے میری بات سنو .... خدا کے لئے۔" وہ بار بار یہ الفاظ دوہرا رہا تھا اور زنجیروں کو جھٹکے دے رہا تھا۔ اچانک اسے تہہ خانے کے نیم تاریک کونے میں ایک متحرک ہیولا دکھائی دیا۔ کوئی نہایت ضعیف شخص جھک کر چلتا ہوا اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جب وہ روشنی میں آیا تو اباقہ نے دیکھا کہ وہ ایک باریش بزرگ تھا۔ اس کے ہاتھوں میں ایک پیالہ تھا۔ ضعف کی وجہ سے اس کے ہاتھوں میں کپکپاہٹ تھی اور پانی فرش پر گرتا چلا آ رہا تھا۔ اباقہ نے اس کی پیشانی پر ایک سیاہ داغ دیکھا اور اس کے دل سے آواز آئی کہ یہ شخص مسلمان ہے۔ کئی مسلمان بزرگوں کی پیشانی پر اس نے ایسے داغ دیکھے تھے۔ قریب پہنچ کر بزرگ نے پیالہ اباقہ کے ہونٹوں سے لگا دیا اباقہ نے چند گھونٹ لئے پھر ایک موہوم امید کے سہارے بولا۔

"بابا! تم میری زبان سمجھتے ہو؟"

بوڑھے نے اثبات میں سر ہلایا۔ "اجنبی' تیری زبان سمجھتا ہوں اور یہ بھی جان گیا

ہوں کہ تیرے چیخنے چلانے کی وجہ کیا ہے۔"

اباقہ بے تابی سے بولا۔ "کیا تم میری مدد کر سکتے ہو؟"

بوڑھا بولا۔ "میں تیری مدد کرنا چاہتا ہوں' اس لئے کہ تو مسلمان ہے۔ میرے ہی خدا اور رسول ﷺ کو ماننے والا ہے۔ میں اس قید خانے کا خدمتگار ہوں۔ پچھلے بیس برس میں تو پہلا مسلمان ہے جو یہاں آیا ہے۔ تیرے انجام کا سوچ کر میرا دل کانپ رہا ہے .... کون ہے تو اور تیرے وہ ساتھی کون ہیں جن کے متعلق تجھے خطرہ ہے کہ انہیں زہر دے دیا جائے گا؟"

بے بسی کے احساس سے اباقہ کی آنکھیں بھیگ گئیں اس نے بوڑھے کو مختصراً اپنے اور ساتھیوں کے متعلق بتایا۔ بوڑھے نے طویل سانس لے کر کہا۔ "ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے عشاء کی نماز ادا کی ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ شاہی ضیافت اب شروع ہونے ہی والی ہے۔"

اباقہ کی بے قراری میں اور اضافہ ہو گیا وہ بولا۔ "بابا' مجھے بتا میں کیا کروں۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی۔"

بوڑھے نے کہا "بیٹے! مجھے بتا میں تیرے لئے کیا کر سکتا ہوں۔ میری حالت تو تو دیکھ ہی رہا ہے۔ ضعف کے سبب مجھے دو قدم چلنا بھی مشکل ہے۔ اگر میں توانا ہوتا تو شاید پہرے داروں سے بچ بچا کر تیرا پیغام ساتھیوں تک پہنچانے کی کوشش کرتا۔"

اباقہ عاجزی سے بولا۔ "بابا! میرے عزیز ترین دوستوں کی زندگی خطرے میں ہے۔ کیا تم مجھے ان کی زندگی بچانے کا موقع نہیں دے سکتے۔"

بوڑھا کسی گہری سوچ میں گم ہو گیا۔ ایک طویل خاموشی کے بعد بولا۔ "میرے بدنصیب بیٹے' تو نہیں جانتا کہ تو کہاں آ چکا ہے۔ نہ جانے تیرا کون سا گناہ تجھے شہزادی تاشا کی قید میں لے آیا ہے۔ یہ بڑی ظالم جگہ ہے بیٹے۔ میں نے ان سنگلاخ دیواروں کے اندر سفاکی اور بربریت کے ایسے مظاہرے دیکھے ہیں کہ میری زندگی بھر کی نیند اڑ چکی ہے۔ یہاں میں نے بڑے بڑے سورماؤں کو کتے بلیوں کی طرح زمین چاٹتے دیکھا ہے' بڑے بڑے بہادروں کو بھکاریوں کی طرح موت کی بھیک مانگتے سنا ہے۔ یہ در و دیوار انسانی بے بسی و بیچارگی کی ایسی خونچکاں داستانوں کے شاہد ہیں کہ جنہیں سننے اور سنانے کے لئے پہاڑ جیسا کلیجہ چاہئے۔ اس تہہ خانے میں رئیس اعظم کے صرف وہ مجرم لائے جاتے ہیں جن کو زندہ درگور کرنا مقصود ہوتا ہے۔ یہ بدقسمت قیدی مرنے سے پہلے ہزار بار مرتے اور ہزار بار جیتے ہیں۔ بالآخر جب ان کی لاش یہاں سے نکالی جاتی ہے تو وہ لاش نہیں ہوتی

مظلوم گوشت اور مجروح ہڈیوں کا ایک ایسا ڈھیر ہوتی ہے جسے دیکھ کر دوبارہ نہیں دیکھا جا سکتا۔ میرے بدنصیب بچے تو نے ابھی کچھ نہیں دیکھا۔ کاش میرے اختیار میں ہوتا اور میں تجھے اپنے ہاتھوں سے مار دیتا۔ اس تہہ خانے میں انسان کو عذاب دینے کے ایسے ایسے لوازم ہیں کہ انہیں دیکھ کر ہی آدھی موت واقع ہو جاتی ہے۔ کاش میں تیرے جسم سے تیری جان جدا کر سکتا .... کاش۔"

اباقہ بولا۔ "لیکن میں زندہ رہنا چاہتا ہوں بابا۔"

بوڑھا بولا۔ "تیری یہ خواہش دیرپا نہیں بچے۔ جب وہ موت کا فرشتہ تجھ پر مشق ستم شروع کرے گا تو تیری زبان سے جو پہلا کلمہ ادا ہو گا وہ یہی ہو گا' اے خدا مجھے موت دے دے۔"

"موت کا فرشتہ۔ یہ کون ہے؟" اباقہ نے پوچھا۔

بوڑھا بولا۔ "اس کا نام گھوڑا ہے۔ وہ اس قید خانے کا جلاد ہے۔ عرف عام میں اسے موت کا فرشتہ کہا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے اسے جس راستے سے گزرنا ہو وہاں سے جانور بھی بھاگ جاتے ہیں۔"

بوڑھے کا کلام کسی بھی سامع کا خون خشک کرنے کے لئے کافی تھا' لیکن اباقہ نے یہ سب کچھ مرعوب ہوئے بغیر سنا۔ بوڑھا خاموش ہوا تو اباقہ بولا۔

"بابا! اگر اس قید خانے کا جلاد موت کا فرشتہ ہے تو پھر اس وقت اس شہر میں ایک نہیں' دو موت کے فرشتے ہیں اور وہ دوسرا فرشتہ تیرے سامنے کھڑا ہے۔ میرا نام اباقہ ہے اور موت میری محبوبہ ہے۔ میرے پاس اتنی مہلت نہیں کہ میں تمہیں زیادہ کچھ بتا سکوں .... لیکن وقت سب کچھ بتا دے گا اور دکھا بھی دے گا۔" اباقہ کے لہجے میں مہیب چٹانوں کی گڑگڑاہٹ تھی۔ بوڑھا اپنی کمزور نگاہوں سے ایک ٹک اباقہ کو دیکھ رہا تھا۔ آخر اس نے اپنی لرزاں آواز میں کہا۔

"بیٹے کچھ دیر پہلے میں تیری قوت برداشت کا مشاہدہ کر چکا ہوں اور اسی لئے مجھے ڈر ہے کہ تجھ جیسا بہادر جوان ایک حسرت ناک موت کی امانت ہو گیا ہے۔"

اباقہ نے کہا۔ "کل کی بات کل پر چھوڑ دو بابا' کیا آج کی مشکل میں تم میری کوئی مدد کر سکتے ہو؟"

بوڑھے نے کہا۔ "ہاں! میں تمہاری یہ بندشیں کھول سکتا ہوں اور تمہیں وہ خفیہ راستہ بھی بتا سکتا ہوں' جو تمہیں اس عقوبت خانے سے باہر لے جا سکتا ہے' لیکن............"

"لیکن کیا؟"

"لیکن اس کے بعد میرے ساتھ جو کچھ ہو گا وہ ناقابل بیان ہے۔ قسم خدا کی اگر میرے مذہب میں خودکشی حرام نہ ہوتی تو میں تمہیں آزاد کر دیتا۔"

اباقہ نے کہا۔ "بابا! تو پھر میں تم سے ایک وعدہ کرتا ہوں۔ تم مجھے چھوڑ دو۔ میں اپنے ساتھیوں کو خطرے سے آگاہ کر کے واپس آ جاؤں گا۔ کسی کو پتہ نہیں چلے گا اور نہ تم پر کوئی حرف آئے گا۔"

اباقہ نے دیکھا بوڑھے کی آنکھوں میں آنسو لرز رہے ہیں۔ پھر وہ لرزتے ڈگمگاتے قدموں سے ایک طاق کی طرف بڑھا اور اس کے اندر سے ایک چابی نکال لی۔ اباقہ کے پاس پہنچ کر اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے داہنے ہاتھ کا قفل کھول دیا۔ باقی کے قفل اباقہ نے خود کھولے۔ ایک کونے میں اباقہ کا لباس ڈھیر تھا اس نے جلدی جلدی کپڑے پہنے۔ اس دوران بوڑھا دوبارہ اس طاق میں ہاتھ ڈال چکا تھا جہاں سے اس نے چابی نکالی تھی۔ وہ طاق کے اندر کسی چیز کو کھینچنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن ضعف کی وجہ سے کامیابی نہیں ہو رہی تھی۔ اباقہ نے طاق میں ہاتھ ڈالا تو ایک آہنی کڑا مٹھی میں آ گیا۔ اباقہ نے معمولی سی قوت لگائی تو گڑگڑاہٹ سے ایک چٹان سرکی اور عین طاق کے نیچے ایک چوکور خلا نظر آنے لگا۔ بوڑھے نے کہا۔ "جا بیٹا! خدا تیرا حامی و ناصر ہو۔"

اباقہ نے گلوگیر لہجے میں کہا۔ "بابا! میں جانتا ہوں تم نے کتنا بڑا خطرہ مول لیا ہے لیکن میں تمہیں مایوس نہیں کروں گا۔ میں واپس آؤں گا۔"

"نہیں بیٹا۔" بوڑھے نے کہا۔ "اب واپس آنے کی ضرورت نہیں۔ تم مجھے صرف اپنا یہ خنجر دے دو' تاکہ صبح جب پہریدار اندر داخل ہوں تو میں ان سے لڑ کر شہادت کا رتبہ پانے کی کوشش کر سکوں۔ خدا سے دعا کرنا کہ مجھے اس کوشش میں ناکامی نہ ہو۔"

بوڑھے نے اپنا کپکپاتا ہاتھ خنجر کے لئے اباقہ کی طرف بڑھایا۔ اباقہ نے جھک کر اس ہاتھ کو چوم لیا۔ پھر اسے سہارا دیتا ہوا کونے میں بچھے بستر کی طرف لایا اور آرام سے لٹا دیا۔ "نہیں بابا!" اس نے فیصلہ کن لہجہ میں کہا۔ "تمہیں کچھ نہیں کرنا۔ صرف میرا انتظار کرنا ہے۔" اس سے پہلے کہ بوڑھا کچھ کہتا۔ اباقہ مڑا اور تیزی سے چلتا ہوا خلا میں داخل ہو گیا۔ دیوار کی دوسری جانب ایک ویسا ہی طاق نظر آ رہا تھا۔ اباقہ نے اندر ہاتھ ڈالا آہنی کڑا موجود تھا۔ اباقہ نے اسے اپنی طرف کھینچا۔ چٹان مدھم آواز کے ساتھ دوبارہ اپنی جگہ بیٹھ گئی۔ سامنے ایک سرنگ نما راستہ تھا جو بتدریج اوپر اٹھتا چلا گیا تھا۔ اباقہ اس سرنگ میں چلتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ اس سرنگ کا اختتام ایک پتھریلی دیوار پر ہوا۔ اباقہ نے تاریکی میں

دیواروں کی چکنی سطح پر ہاتھ پھیرا اور اسے اندازہ ہوا کہ یہ کوئی چٹان ہے۔ اس نے ہاتھ کا ذرا سا دباؤ ڈالا تو چٹان گڑگڑاہٹ کے ساتھ سرک گئی۔ اباقہ کو سر پر کھلا آسمان دکھائی دیا۔ یخ بستہ ہوا کے جھونکوں نے اسے یقین دلایا کہ وہ قید خانے سے باہر آ چکا ہے۔ وہ محتاط انداز میں باہر نکلا۔ یہ مہمان خانے کا وہی باغ تھا جس میں اس پر اور علی پر حملہ ہوا تھا۔ اباقہ نے دیکھا سرنگ کے دھانے سے سرکنے والی چٹان دراصل ایک پتھریلا تختہ تھا جو آہنی پہیوں پر چلتا تھا۔ اس تختے کے اوپر پھولوں کی کیاریاں تھیں۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ کسی خفیہ راستے کا دروازہ ہے۔ اباقہ نے جھک کر اس تختے کو سرنگ پر برابر کرنا چاہا لیکن اس وقت کسی نے اس کی گردن پر تلوار کی نوک رکھ دی۔ اباقہ نے عقب میں دیکھا' دو تنومند سپاہی اطمینان سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے' لیکن ان کا یہ اطمینان زیادہ دیر برقرار نہ رہ سکا۔ اباقہ نے وہ حرکت کی جو ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی۔ وہ پوری قوت سے اپنے پنجوں پر اچھلا اور اس کی دونوں ٹانگیں دونوں سپاہیوں کے چہروں پر پڑیں۔ ایک کو لگنے والی ٹھوکر تو اس قدر شدید تھی کہ وہ ایک درخت سے ٹکرایا اور آواز نکالے بغیر ڈھیر ہو گیا۔ دوسرے نے اٹھنے کی کوشش ہی کی تھی کہ اباقہ نے عقاب کی طرح جھپٹ کر اسے دبوچ لیا۔ اس نے چلانے کے لئے منہ کھولا تو اباقہ کا خنجر اس کی شہ رگ کاٹ گیا۔ چیخنے کی حسرت ایک خرخراہٹ کی صورت اس کے گلے میں رہ گئی۔ اباقہ نے اسے پھرتی سے سرنگ میں دھکیلا پھر دوسرے سپاہی کا بھاری بھرکم جسم گھسیٹ کر سرنگ میں ڈالا۔ اس کی تلوار جو ابھی تک نیام میں تھی نکالی اور سنگی تختہ سرنگ پر برابر کر دیا۔ تلوار تھامے وہ اس دیوار کی طرف بڑھا جو محل اور مہمان خانے کے باغ کو جدا کرتی تھی اور جس میں ایک چھوٹا سا دروازہ تھا۔ اباقہ نے دروازے سے کان لگائے دوسری جانب پہریداروں کی موجودگی ثابت ہو رہی تھی۔ اباقہ نے تلوار دانتوں میں دبائی اور اچھل کر ایک درخت پر چڑھ گیا۔ اس درخت کی طویل شاخیں شاہی محل کی ایک کھڑکی تک پہنچتی تھیں۔ اباقہ ایک مضبوط شاخ سے جھولتا ہوا بے آواز کھڑکی تک پہنچا اور اندر کود گیا۔ یہاں اس نے ایک مسہری سے چادر اتاری اور اسے پگڑی کی طرح سر پر لپیٹ کر چہرہ چھپا لیا۔ پھر وہ تلوار سنبھالتا اندازے سے ضیافت گاہ کی طرف بڑھا۔ ایک راہداری میں دو باوردی محافظوں سے اس کا سامنا ہوا۔ اباقہ تیزی سے ایک کمرے میں گھس گیا۔ مگر محافظ اسے دیکھ چکے تھے وہ تلواریں سونتے اس کی طرف بڑھے۔ جونہی وہ تاریک کمرے میں گھسے اباقہ تیر کی طرح باہر نکلا۔ اس کی ٹکر سے دونوں محافظ لڑکھڑا کر دائیں بائیں گرے اور اباقہ طویل راہداری میں بھاگتا چلا گیا۔ کچھ آگے اسے کشادہ زینے نظر آئے' وہ زینے

پھلانگتا زیریں منزل پر پہنچا۔ ایک کنیز نے اسے خوفزدہ نظروں سے دیکھا اور چیخ کر الٹے پاؤں بھاگی۔ ایسا کرتے ہوئے وہ ایک خادم سے ٹکرائی جو بڑی سی طشتری لئے خراماں خراماں چلا جا رہا تھا۔ خادم اچھل کر فرش پر گرا اور کھانوں سے بھری ہوئی طشتری دور تک فرش پر پھسلتی چلی گئی۔ چیخ و پکار کی آواز اب بہت سے محافظوں کو اباقہ کی طرف متوجہ کر چکی تھی۔ اباقہ زینوں پر ان کے بھاگتے قدموں کی آوازیں سن رہا تھا۔ سامنے سے بھی ایسی ہی آوازیں آ رہی تھیں۔ اباقہ نے تیزی سے سوچا اور اس سمت بھاگا جدھر خادم طشتری کے ساتھ جا رہا تھا۔ ابھی وہ چند گز ہی بھاگا تھا کہ اس کی ناک سے کھانوں کی خوشبو ٹکرائی۔ اس خوشبو نے اس کی راہنمائی کی اور چند ہی لمحوں میں وہ عظیم الشان ضیافت گاہ کے دروازے پر پہنچ چکا تھا۔ اس نے ایک نظر اندر دیکھا۔ ضیافت گاہ کی بلند و بالا مخروطی چھت سے ان گنت فانوس لٹک رہے تھے۔ دیواروں پر شیشہ کاری کی گئی تھی اور روشنی نے شیشے کے ساتھ مل کر ضیافت گاہ کو بقعہ نور بنا دیا تھا۔ ایک طویل میز پر شاہی مہمان دو قطاروں میں بیٹھے تھے۔ ان کے پیچھے صاف ستھرے خادمین دست بستہ کھڑے تھے ....

کھانا بس شروع ہوا ہی چاہتا تھا بلکہ بہت سے مہمانوں کے ہاتھ میں تو نوالے بھی تھے۔ شاید وہ باہر ہونے والی چیخ و پکار سے ٹھٹک گئے تھے۔ اباقہ بھاگتا ہوا اندر داخل ہوا اس کے پیچھے دو تلوار بردار محافظ آندھی کی طرح اڑے چلے آ رہے تھے۔ اباقہ نے بھاگتے بھاگتے جست کی اور اوندھے منہ کھانے کی میز پر آیا۔ ایک چھناکا ہوا اور وہ کئی رکابیوں، طشتریوں اور پیالوں کو اپنے ساتھ لیتا ہوا فرش پر گرا۔ ضیافت گاہ میں مؤدب کھڑی کنیزوں کی چیخیں فضا میں گونجیں مہمانوں نے حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اباقہ فرش سے اٹھا تو اس کی نگاہ مائیکل پر پڑی جو نائب رئیس کے ساتھ بیٹھا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں ابھی تک پیالہ تھا۔ اباقہ کی ٹانگ گھومی اور پیالہ اچھل کر میز کے وسط میں جا گرا۔ اباقہ کا تعاقب کرنے والے محافظ اب میز کا چکر کاٹ کر اس کے پہلوؤں میں پہنچ چکے تھے۔ ان کی تلواریں اٹھی ہوئی تھیں اور انداز بتا رہا تھا کہ وہ قریب پہنچتے ہی اباقہ پر وار کریں گے۔ اباقہ بھی ان کے استقبال کے لئے تیار تھا، لیکن اس وقت نائب رئیس کی رعب دار آواز گونجی۔ "ٹھہرو.........."

اباقہ کے اردگرد محافظوں کے قدم رک گئے۔ مہمان دم بخود کھڑے تھے۔ ان کے لباس سالن سے داغدار تھے اور انواع و اقسام کا شوربہ قطرہ قطرہ میز سے ٹپک رہا تھا۔

"کون ہو تم؟" نائب رئیس نے پوچھا۔

اباقہ نے کچھ نہیں کہا، لیکن سینے پر ہاتھ رکھ کر ادب سے جھکا جس کا مطلب تھا کہ

میں جو کوئی بھی ہوں آپ کا خیر خواہ ہوں۔ نائب رئیس نے برہم ہو کر ایک بار پھر اپنا سوال دہرایا .... تب اسد اللہ کی آواز نے سب کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

"جناب! اس شخص کی کارروائی سے اندازہ ہوتا ہے کہ کھانا مہلک ہے۔ کیا کسی طرح اس بات کی تصدیق ہو سکتی ہے؟" اسد کا یہ سوال ترجمان کی وساطت سے نائب رئیس تک پہنچا تو اس نے فوراً ایک خادم کو ہاتھ کے اشارے سے بلایا۔ نائب رئیس کے سامنے چینی کا ایک منقش پیالہ تھا جس میں گوبھی کے گرم شوربے سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ نائب رئیس نے خادم کو شوربہ چکھنے کا حکم دیا۔ خادم نے فوراً حکم کی تعمیل کی۔ اس نے چار پانچ چمچ شوربے کے پیئے اور نائب رئیس کے اشارے پر چند قدم پیچھے ہٹ کر مؤدب کھڑا ہو گیا۔ سب نظریں خادم کی طرف لگی تھیں۔ تھوڑی ہی دیر بعد خادم کا رنگ بدلنا شروع ہو گیا۔ اس کا چہرہ سرخ ہوتا جا رہا تھا اور گلے کی رگیں پھول رہی تھیں مگر وہ نظریں جھکائے مؤدب کھڑا تھا۔ پھر یکلخت وہ لڑکھڑایا اور اوندھے منہ گر کر تڑپنے لگا۔ اس کی ایک باچھ سے خون کی دھار بہہ رہی تھی۔ تمام مہمان اس کے گرد جمع ہو گئے۔ جان کنی کے اذیت ناک مرحلے سے گزر کر خادم ٹھنڈا ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی جیسے محافظ دستے کے سردار کو ہوش آیا۔ وہ چیخ کر اپنے ماتحتوں سے بولا۔

"محل سے باہر جانے والے تمام راستے بند کر دیئے جائیں۔"

نائب رئیس نے حکم دیا۔ "تمام باورچیوں کو فوراً حاضر کیا جائے۔"

جس وقت یہ ہنگامہ ہو رہا تھا اچانک مائیکل کو نقاب پوش کا خیال آیا۔ اس نے جلدی جلدی چاروں طرف دیکھا پھر بلند آواز میں بولا۔

"نقاب پوش کہاں ہے؟"

سب دائیں بائیں دیکھنے لگے .... لیکن ان کی زندگیاں بچانے والا اجنبی ضیافت گاہ میں موجود نہیں تھا۔

☆----------☆----------☆

ہنگامے کا فائدہ اٹھا کر اباقہ ضیافت گاہ سے نکل آیا تھا۔ جب وہ دروازے سے نکل رہا تھا اس نے اسد کو دیکھا تھا۔ وہ بے قراری سے اسے چاروں طرف تلاش کر رہا تھا۔ اباقہ جلدی سے دروازہ پار کر گیا تھا۔ پھر بھی اسے شک تھا کہ اسد نے اسے نکلتے دیکھ لیا ہے۔ جلد ہی اس کا یہ شک درست ثابت ہو گیا۔ جونہی وہ اس کھڑکی تک پہنچا جہاں سے وہ درخت کی شاخ کا سہارا لے کر باغ میں اترتا تھا، اچانک ایک آواز نے اس کے قدم روک لئے۔ "اباقہ!" اباقہ نے جلدی سے گھوم کر دیکھا۔ اسد اس کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ

بولا۔ "اباقہ! تم ساری دنیا سے چھپ سکتے ہو' مجھ سے نہیں۔"

اباقہ بولا۔ "تیری نظر بڑی تیز ہے اسد۔"

اسد نے کہا۔ "اباقہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ تم اور علی اچانک کہاں غائب ہو گئے تھے؟"

اباقہ بولا۔ "اسد اس وقت یہ سب کچھ بتانے کا وقت نہیں۔ علی کو شہزادی' نتا... کے آدمیوں نے باغ میں زخمی کیا تھا۔ اس کی زندگی سخت خطرے میں ہے۔ ہمیں اسے... صورت ڈھونڈنا ہے۔ تم یہ سب کچھ مائیکل کو بتا کر اس کی مدد حاصل کرو۔ میں بھی ا... طور پر کوشش کرتا ہوں۔"

اسد' اباقہ سے بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا لیکن وہ بہت جلدی میں تھا۔ ایک دو باتیں... کہ اس نے اسد کو خدا حافظ کہا پھر کھڑکی سے جست لگا کر درخت کی شاخ تھامی اور تا... میں گم ہو گیا۔

درخت سے اتر کر اباقہ باغ میں پہنچا اور احتیاط سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ ا... مہمان خانے کے ایک محافظ پر شک تھا کہ وہ حملہ کرنے والے سپاہیوں کے ساتھ شا... تھا۔ اگر کسی طرح اس محافظ سے مڈبھیڑ ہو جاتی تو کوئی اہم بات معلوم ہو سکتی تھی... محافظوں کی کوٹھڑیاں مہمان خانے کے پہلو میں باغ کے ساتھ ہی واقع تھیں۔ اباقہ و... تک پہنچ بھی سکتا تھا لیکن اس وقت ان کوٹھڑیوں کے قریب چار پانچ محافظ کھڑے گ... ہانک رہے تھے۔ اباقہ وہیں تاریکی میں چھپ کر ان کے جانے کا انتظار کرنے لگا' لیکن ... کی گفتگو طویل سے طویل تر ہوتی چلی گئی۔ نہایت واہیات قسم کی گفتگو تھی۔ اپنی محبو... کے بارے میں وہ نہایت غلیظ زبان استعمال کر رہے تھے۔ ایک نوجوان محافظ اپنی محبو... شہزادی نتاشا کا ہم پلہ قرار دے رہا تھا۔ بالآخر کوئی دو گھڑی بعد وہ وہاں سے ٹلے اور... ایک موہوم امید کے سہارے ان کوٹھڑیوں کی طرف بڑھا۔ تین کوٹھڑیوں میں روشنی ... رہی تھی۔ اباقہ احتیاط سے باری باری ان کوٹھڑیوں میں جھانکنے لگا۔ کسی کوٹھڑی میں اپنا... مطلوبہ چہرہ نظر نہیں آیا' لیکن ایک کوٹھڑی میں ایسی گفتگو ہو رہی تھی کہ اباقہ کے... کھڑے ہو گئے۔ اباقہ تاریکی میں دیوار کے ساتھ چپکا ہوا تھا لہٰذا اس کے دیکھے جانے... امکان بہت کم تھا۔ کوٹھڑی میں جو افراد موجود تھے ان میں سے ایک مہمان خانے کا نگ... اعلیٰ تھا۔ دوسرا بھی کوئی اعلیٰ افسر تھا۔ دونوں کے چہرے دھواں دھواں ہو رہے ت... نامعلوم افسر نگران اعلیٰ کو کوئی اہم اطلاع دے رہا تھا۔ اس گفتگو میں بار بار منگول اور... کا ذکر آ رہا تھا۔ نگران اعلیٰ کی آنکھیں خوف سے پھیلتی جا رہی تھیں۔ اباقہ گو روسی ز... نہیں جانتا تھا لیکن جو چند لفظ اسے سمجھ آئے تھے اور جو تاثرات اسے دونوں روسیوں...

چہروں پر نظر آ رہے تھے وہ اسے ایک بہت بڑے خطرے سے آگاہ کر رہے تھے۔ اباقہ نے دیکھا کہ نگران اعلیٰ نے نہایت افراتفری کے عالم میں اپنے ہتھیار سنبھالے اور ساتھی افسر کے ساتھ دروازے کی طرف لپکا۔ جونہی وہ باہر نکلے اباقہ نے ساکت ہو کر سانس روک لی۔ وہ اس کے بالکل قریب سے ہوتے ہوئے اصطبل کی طرف بڑھ گئے۔ اباقہ نے کچھ دیر سوچا پھر وہ بھی ان کے پیچھے لپکا۔ نہایت اعتماد سے وہ ان کے پیچھے ہی پیچھے اصطبل میں گھس گیا۔ وہ دونوں اس قدر گھبرائے ہوئے تھے کہ ان سے کسی احتیاط کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ ان کی طرح اباقہ نے بھی اصطبل سے اپنا گھوڑا لیا۔ پھر تینوں گھوڑے تیزی سے مہمان خانے کے صدر دروازے کی طرف بڑھے۔ اباقہ نے اپنا گھوڑا دونوں گھوڑوں سے اس قدر قریب کر لیا کہ محافظوں نے اسے بھی نگران اعلیٰ کا ساتھی سمجھا۔ بغیر پوچھ گچھ کے وہ مہمان خانے سے باہر نکل آیا۔ باہر نکلتے ہی نگران اعلیٰ اپنے ساتھی کے ساتھ پوری رفتار سے مشرقی شہر کی طرف بھاگ نکلا۔ اباقہ نے کچھ فاصلے سے ان کا تعاقب جاری رکھا۔ بالآخر وہ ایک آبی گزرگاہ کے کنارے پہنچ گئے یہ آبی گزرگاہ شہر کے مشرقی کونے کو باقی شہر سے جدا کرتی تھی۔ یہ گزرگاہ ایک عمیق پہاڑی نالے کی صورت میں تھی جس کا پاٹ کئی مقامات پر دو سو گز کے قریب تھا۔ کم پاٹ والے مقامات پر تین پل بنائے گئے تھے جو مشرقی حصے کو باقی شہر سے ملاتے تھے۔ نگران اعلیٰ اور اس کا ساتھی پل پر پہنچے اور سرپٹ گھوڑے بھگاتے ہوئے دوسری طرف نکل گئے مگر جب اباقہ پل پر آیا تو اسے گھوڑے سے اترنا پڑا۔ دراصل یہ پل لکڑی کے تھے اور زیادہ مضبوط نہیں تھے۔ سواروں کے لئے حکم تھا کہ پل پر سے پاپیادہ گزریں۔ نگران اعلیٰ کی چونکہ سرکاری حیثیت تھی اس لئے وہ گھوڑے پر سوار گزر گیا تھا مگر اباقہ کو محافظ سپاہی کے کہنے پر نیچے اترنا پڑا۔ جب وہ حتی الامکان تیزی سے پل پار کر کے دوسری طرف پہنچا تو نگران اعلیٰ اور اس کے ساتھی کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ وہ اندازے سے ایک طرف چل دیا۔ راستے کے دونوں طرف اکا دکا مکان تھے لیکن گنجان آبادی ابھی تین چار فرلانگ کی دوری پر تھی۔ اچانک اباقہ کو آگ نظر آئی۔ اس آگ کی روشنی تاریک افق پر پھیلتی جا رہی تھی۔ اباقہ کو راستے میں چند افراد بھی ملے جو بھاگتے ہوئے پل کی طرف جا رہے تھے۔ وہ سخت خوفزدہ نظر آتے تھے۔ ایک موڑ پر اباقہ کو نگران اعلیٰ نظر آیا۔ اس کا گھوڑا قریب ہی پڑا تڑپ رہا تھا اور وہ خود ایک طرف بیٹھا اپنی چوٹیں سہلا رہا تھا۔ اباقہ نے گھوڑا اس کے پاس روکا اور کود کر نیچے آیا۔

"کیا بات ہے بھئی۔ گھوڑے کو کیا ہوا۔"

"ٹانگ ٹوٹ گئی ہے۔" نگران اعلیٰ نے جواب دیا۔

اباقہ کا چہرہ ابھی تک پگڑی میں چھپا تھا۔ اس لئے نگران اسے اپنے مہمان کی حیثیت سے پہچاننے سے قاصر تھا۔

اباقہ نے کہا۔ "کدھر جانا ہے۔ میرے گھوڑے پر بیٹھ جاؤ۔"

نگران بولا۔ "تم کدھر جا رہے ہو؟"

اچانک اباقہ کو اندازہ ہوا کہ ان کی ساری گفتگو ترکی میں ہو رہی ہے اسے خوشی ہوئی کہ نگران اس کی زبان سمجھتا ہے۔ اس نے کہا۔ "میں تو آبادی کی طرف جا رہا تھا...... لیکن یہ آگ۔"

نگران نے تشویشناک لہجے میں کہا۔ "میرا خیال ہے تم ابھی تک بے خبر ہو۔"

"کیسی بے خبری۔" اباقہ انجان بن کر بولا۔

نگران نے سراسیمگی سے کہا۔ "بھلے آدمی' منگولوں نے حملہ کر دیا ہے۔ وہ شہر میں گھس آئے ہیں اور زبردست قتل و غارت کر رہے ہیں۔ پورے دلادی میر پر قیامت ٹوٹنے والی ہے۔ میں اپنے بیوی بچوں کو نکالنے کے لئے جا رہا تھا کہ گر کر گھوڑے کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔"

"اور آپ کے بیوی بچے؟"

"جو خدا کو منظور۔" نگران گلوگیر لہجے میں بولا۔ "میرا ساتھی گیا ہے۔ اس کے اپنے بیوی بچے بھی ہیں۔ دیکھیں کون جیتا ہے اور کون مرتا۔"

اباقہ نے پوچھا۔ "آپ زخمی لگتے ہیں۔"

نگران کراہ کر بولا۔ "ہاں میرا ٹخنہ ٹوٹ گیا ہے' کندھے کا جوڑ بھی اکھڑا ہوا لگتا ہے لیکن مجھے اپنی پرواہ نہیں' کسی طرح میرے بچے نکل آئیں اور میں انہیں محفوظ مقام تک پہنچا دوں تو موت کو بھی گلے لگا لوں گا۔"

اباقہ نے دیکھا افق پر نظر آنے والی سرخی اب مزید پھیل گئی تھی۔ کچے راستے پر دکا ٹولیاں بھاگتی ہوئی پل کی طرف جا رہی تھیں۔ اباقہ نے کہا۔

"آپ کو منگولوں کے حملے کی اطلاع کس نے دی؟"

نگران بولا۔ "میرے اسی ساتھی نے جو میرے ساتھ آ رہا تھا' اسے دو سواروں سے معلوم ہوا تھا جو نائب رئیس کو خبر دینے کے لئے شاہی محل جا رہے تھے۔ انہوں نے بتایا ہے کہ مشرقی حصے میں ایک خونریز جھڑپ کے بعد منگولوں کے ہراول دستے شہر میں داخل ہو گئے ہیں۔"

اباقہ کا دماغ سنسنا رہا تھا' منگولوں سے کچھ بعید نہیں تھا۔ وہ انتہائی تیز رفتاری سے سفر

کرتے تھے اور اسی طرح بے خبری میں اپنے شکار کو دبوچ لیتے تھے اور اس دفعہ تو منگول ٹڈی دل کو جادو کے پر لگے ہوئے تھے۔ اطلاعات کے مطابق اس لشکر کی خصوصیت یہ تھی کہ اس کا ہر سپاہی گھڑسوار تھا۔ ڈیڑھ لاکھ کا یہ گھڑسوار لشکر باتو خاں کی قیادت میں ایک برق پا موت بن گیا تھا اور اب یہ موت دلادی میر پر سایہ فگن تھی۔ اگر واقعی ایسا ہو چکا تھا تو پھر دلادی میر کی یہ رات اپنی صبح سے محروم ہونے والی تھی۔ اباقہ نے نگران اعلیٰ سے کہا۔

"محترم! میں ذرا آگے جا کر صورت حال کا جائزہ لیتا ہوں۔ آپ گھبرائیے نہیں' میں ابھی لوٹتا ہوں۔"

نگران نے کراہتے ہوئے کہا۔ "کیوں خواہ مخواہ جان خطرے میں ڈالتے ہو۔ جاؤ نہیں اپنا انتظام کرو۔"

اباقہ نے کہا۔ "محترم! مجھے ابھی تک یقین نہیں کہ منگولوں نے حملہ کر دیا ہے۔ میں تصدیق کرنا چاہتا ہوں۔"

پھر اس سے پہلے کہ اباقہ گھوڑے پر سوار ہو کر اسے ایڑ لگاتا۔ کہیں دور سے چیخ و پکار کی آوازیں آنے لگیں۔ چند ہی لمحے بعد گھڑسوار سرپٹ گھوڑ دوڑاتے نمودار ہوئے۔ نگران اعلیٰ اور اباقہ کو دیکھ کر وہ رک گئے۔ ان میں وہ شخص بھی تھا جسے اباقہ نے کوٹھڑی میں نگران کے ساتھ دیکھا تھا اور جو یہاں تک اس کے ساتھ آیا تھا۔ وہ چھلانگ لگا کر گھوڑے سے اترا اور نگران اعلیٰ سے بولا۔

"گورکی! منگول جاسوسوں نے شہر میں قیامت برپا کر دی ہے۔"

"کیا مطلب؟" نگران اعلیٰ نے پوچھا۔

"مطلب یہ کہ منگول حملے کی خبر افواہ ہے مگر یہ افواہ اتنی تیزی سے پھیلی ہے کہ لوگ خوف سے پاگل ہو گئے ہیں' ہر طرف افراتفری مچی ہوئی ہے۔"

"اور یہ آگ؟"

"یہ آگ بھی اسی غدار ٹولے نے لگائی ہے تاکہ حملے کی خبر میں حقیقت کا رنگ بھرا جا سکے۔"

"اوہ میرے خدا!" نگران اعلیٰ کے سینے سے ایک طویل سانس خارج ہو گئی۔ اس کے انداز میں تشویش کے ساتھ اطمینان بھی موجود تھا۔ اس اطمینان کی وجہ ظاہر تھی۔ منگولوں کا خوف ہر آفت سے بڑھ کر گھمبیر تھا۔

نگران کے ساتھی نے کہا۔ "گورکی' میرا خیال ہے کوئی خوفناک حادثہ پیش آنے والا

ہے؟"

"کیا مطلب؟" نگران گورکی کا چہرہ پھر خوف کی آماجگاہ بن گیا۔

"تم یہ چیخ و پکار سن رہے ہو؟"

"ہاں!" گورکی نے جواب دیا۔

"سینکڑوں لوگ چیختے چلاتے پل کی طرف آ رہے ہیں۔ انہیں روکنا تقریباً ناممکن ہے اور تم جانتے ہی ہو پل کی حالت کیا ہے؟"

ایکا ایکی گورکی کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ وہ کراہ کر بولا۔ "تو انہیں روکو۔ روکتے کیوں نہیں انہیں۔"

ایک باوردی افسر بولا۔ "جناب' ہم نے بڑی کوشش کی ہے۔ لوگ اتنے خوفزدہ ہیں کہ کچھ نہیں سنتے۔"

اس وقت اباقہ نے محسوس کیا کہ شور بہت قریب پہنچ چکا ہے' پھر اسے چھوٹے چھوٹے گروہوں کے عقب میں لوگوں کا ایک جم غفیر نظر آیا۔ وہ جان بچانے کے لئے اندھا دھند پل کی طرف آ رہے تھے۔ اباقہ نے مڑ کر دیکھا۔ پل پر جلنے والی روشنیاں تقریباً نصف فرلانگ پیچھے دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ صورت حال کو بہت حد تک سمجھ چکا تھا۔ اس نے ایک نظر فوجی افسروں کے ہراساں چہرے دیکھے اور پل کی طرف دوڑ لگا دی۔ پلک جھپکتے اس نے نصف فرلانگ کا فاصلہ طے کیا۔ پل کے ناکے پر دو محافظ حیران پریشان اباقہ کے عقب میں دیکھ رہے تھے جہاں لوگوں کا ہجوم چیختا چلاتا ان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اباقہ سیدھا اس کوٹھڑی میں گھس گیا جو پل کے سرے پر پہریداروں کی رہائش کے لئے بنائی گئی تھی۔ مختصر کوٹھڑی میں دو تین صندوق پڑے تھے۔ دیواروں سے پہریداروں کی وردیاں اور ان کے ہتھیار لٹک رہے تھے۔ اباقہ کی نگاہیں تیزی سے کسی چیز کی تلاش میں تھیں۔ پھر وہ چیز اسے نظر آئی۔ یہ ایک گندا سا مرتبان تھا جس میں مشعلوں کا روغن رکھا تھا۔ اباقہ نے مرتبان اٹھایا اور وہیں سے گھما کر پل پر پھینکا۔ ساتھ ہی اس نے ایک جلتی ہوئی مشعل پھینک دی۔ پل کے تختوں نے آگ پکڑی اور دھڑا دھڑ جلنے لگے۔ خوفزدہ انسانی ریلا اب پل سے چند گز کی دوری پر تھا۔ کچھ ٹولیاں تو جلتی ہوئی آگ سے کود کر نکل گئیں مگر بڑے ہجوم کو اباقہ نے روک لیا۔ وہ دونوں ہاتھ پھیلا کر پل کے درمیان کھڑا ہو گیا اور چلا چلا کر انہیں خطرے سے آگاہ کرنے لگا مگر وہاں سنتا کون تھا۔ لوگ اندھے بہرے ہو چکے تھے۔ جانوروں کے بدکے ہوئے ریوڑ کی طرح وہ پل پر چڑھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ سینکڑوں نہیں ہزاروں افراد تھے۔ ان میں بچے عورتیں مرد سب شامل تھے اور ان کی تعداد

میں لمحہ بہ لمحہ اضافہ ہو رہا تھا۔ اباقہ نے پل کے جنگلے سے ایک مضبوط لکڑی اکھاڑی اور لوگوں پر پل پڑا۔ وہ انہیں مار رہا تھا' دھکیل رہا تھا' ان پر چلا رہا تھا۔ اباقہ کی زبردست مزاحمت دیکھ کر کچھ محافظ بھی اس کی مدد کو لپکے۔ عین اس وقت جب لوگ اباقہ اور تین دوسرے محافظوں کو روند کر پل پر چڑھنے والے تھے' گڑگڑاہٹ کی مہیب آواز کے ساتھ پل ٹوٹ گیا اور اس کے جلتے ہوئے تختے کوئی 20 گز نیچے برفانی پانی میں جا گرے۔ ہجوم غم و غصے کے عالم میں اباقہ اور اس کے ساتھی محافظوں پر ٹوٹ پڑا۔ مگر اس دوران کوئی چیخ کر بولا۔ "دوسرے پل کی طرف چلو۔" دیکھا دیکھی لوگ پہاڑی نالے کے ساتھ ساتھ دوسرے پل کی طرف بھاگے۔ ابھی وہ تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ انہیں رک جانا پڑا۔ کچھ لوگوں کی زبانی پتہ چلا کہ دوسرا پل جو کوئی دو فرلانگ دور تھا ٹوٹ گیا ہے اور اس حادثے میں سینکڑوں افراد ہلاک اور زخمی ہو گئے ہیں۔ یہ ایک روح فرسا خبر تھی۔ لوگ دم بخود رہ گئے۔ معلوم ہوا کہ اس پل پر بھی خوفزدہ لوگوں نے ہلہ بولا تھا اور محافظوں کے روکنے کے باوجود بے شمار افراد پل پر آ گئے تھے۔ نتیجے میں وہ ٹوٹ گیا اور اس پر موجود مرد عورتیں اور بچے برفانی نالے میں جا گرے۔ اس خبر نے لوگوں کو سہما کر رکھ دیا۔ اب وہ کشمکش کے عالم میں کبھی پہاڑی نالے کی طرف دیکھ رہے تھے اور کبھی مغرب میں آگ کے شعلوں کی طرف۔ اس موقعے پر شاہی مہمان خانے کا نگران اعلیٰ گورکی ایک بلند جگہ پر کھڑا ہو گیا اور اس نے ہجوم کو پرسکون کرنے کی کوشش کی۔ اس نے لوگوں کو بتایا کہ منگول حملے کی افواہ غدار ٹولے نے پھیلائی ہے اور ان کے جان و مال اپنے گھروں میں بالکل محفوظ ہیں۔ گورکی کی تقریر نے لوگوں کے حواس قدرے بحال کئے۔

تقریر کے بعد گورکی سیدھا اباقہ کے پاس پہنچا اور گرمجوشی سے اس کی پیٹھ تھپتھپائی۔ دوسرے لوگوں کی نگاہوں میں بھی اباقہ کے لئے ممنونیت کے جذبات تھے۔ اس نے بروقت کوشش کر کے سینکڑوں لوگوں کی جانیں بچا لی تھیں۔ لوگ اس کا چہرہ دیکھنے کے خواہشمند تھے لیکن پگڑی نے ابھی تک اس کی شکل چھپا رکھی تھی۔ اچانک گورکی کی نگاہ اس کے بازو پر پڑی۔ کہنی کے قریب ایک زخم نظر آ رہا تھا۔ شاید دھکم پیل میں کسی نے خنجر مار دیا تھا۔ گورکی کے اشارے پر ایک افسر نے آستین اٹھا کر اباقہ کا زخم دیکھا اور خون روکنے کے لئے پٹی باندھ دی۔ پھر کچھ افسر اور سپاہی ٹوٹے ہوئے پل کی طرف روانہ ہو گئے تاکہ امدادی کارروائیوں میں حصہ لے سکیں اور باقی افسر و سپاہی گورکی کے اگلے حکم کے منتظر ہو گئے۔ چونکہ اس وقت گورکی ہی وہاں سب سے ذمے دار فرد تھا لہٰذا سب نگاہیں اس کی طرف لگی تھیں۔ لوگوں کی بھاگ دوڑ تو ختم ہو گئی تھی مگر ان کا خوف

بدستور قائم تھا اور وہ واپس گھروں کو جانے سے انکاری تھے۔

اباقہ نے گورکی سے کہا کہ مسلح سپاہیوں کے ساتھ انہیں علاقے کا ایک چکر لگانا چاہئے اور دیکھنا چاہئے کہ ہنگامہ شروع کرنے والے کون تھے اور یہ کیسے شروع ہوا۔ گورکی کا اپنا خیال بھی یہی تھا لیکن زخمی ہونے کی وجہ سے وہ خود نہیں جا سکتا تھا۔ اس نے پندرہ سوار اباقہ کے ساتھ کر دیئے اور انہیں ہدایت کی کہ وہ جلد از جلد خبر لے کر آئیں۔ اباقہ ان سواروں کے ساتھ برق رفتاری سے آبادی کی طرف بڑھا۔ مشرقی حصے کی یہ آبادی کوئی پانچ ہزار نفوس پر مشتمل تھی اور اس وقت خالی تھی۔ تمام کے تمام لوگ گھروں سے باہر تھے۔ دروازے کھلے تھے' روشنیاں جل رہی تھیں' ایک بازار کھلا ہوا نظر آیا دکاندار جانیں بچانے کے لئے بھاگ چکے تھے۔ چند راستوں سے گزر کر اباقہ اور اس کے ساتھی سپاہی ان مکانوں تک پہنچ گئے جو آگ کے شعلوں پر تھے یہاں اباقہ کو چند لاشیں بھی نظر آئیں۔ ان لاشوں کی حالت سے ظاہر تھا کہ مرنے والے بھگدڑ میں کچلے گئے ہیں۔ اچانک ایک موڑ پر اباقہ اور اس کے ساتھیوں کے گھوڑوں پر تیروں کی بارش ہو گئی۔ تیروں کی پہلی ہی باڑ چار سپاہیوں کو گھوڑوں سے گرا گئی۔ گرنے والوں کی کربناک چیخیں بلند ہوئیں اور اس کے ساتھ ہی یہ مختصر سا دستہ تتر بتر ہو گیا۔ اباقہ نے گھوڑے کو تیزی سے ایک طرف موڑا اور تیراندازوں کی نظر سے بچنے کے لئے روشنی کی زد سے نکل گیا۔ گھوڑا سرعت سے ایک درخت کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اباقہ اس بات سے بے خبر تھا کہ اس درخت کی شاخوں میں ایک نیزہ بردار چھپا ہوا ہے وہ نیزہ بردار اپنا وزنی نیزہ ہاتھوں میں تول چکا تھا۔ اباقہ کو نشانہ بنانا اس کے لئے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا.......... جنگ کے میدان میں کبھی کبھی ایسے موقعے بھی آتے ہیں جب ایک نامور جنگجو ایک ادنیٰ پیادے کی زد پر ہوتا ہے۔ یہاں بھی کچھ ایسی ہی صورت حال تھی۔ بے خبری کا ایک لمحہ اباقہ کو موت کے روبرو لے آیا تھا..........

☆------☆------☆

اباقہ سے ملنے کے بعد اسد مزید پریشان ہو گیا۔ شہزادی نتاشا کو اباقہ پر حملہ کروانے کی کیا ضرورت تھی اور پھر علی کہاں گیا۔ اسے ہلاک کر دیا گیا؟ یہ سوچ اذیت ناک تھی۔ اسد جب واپس ضیافت گاہ میں پہنچا تو شوربہ پینے والا خادم دم توڑ چکا تھا اور "نقاب پوش" کی تلاش ہو رہی تھی۔ اسد' مائیکل کو ایک طرف لے گیا اور بولا۔ "وہ نقاب پوش اباقہ تھا۔ اس نے بتایا ہے کہ شہزادی نتاشا کے آدمیوں نے اس پر حملہ کیا تھا اور علی ان کے پاس ہے۔"

مائیکل نے حیران ہو کر کہا۔ "شہزادی کو اباقہ پر حملہ کروانے کی کیا ضرورت تھی۔

تاہم اگر ایسا ہوا ہے تو بڑا ہوا ہے۔ تم یہیں ٹھہرو میں پتہ کروانے کی کوشش کرتا ہوں۔"
یہ کہتے ہوئے مائیکل لمبے ڈگ بھرتا ایک بوڑھے شخص کے پاس جا کھڑا ہوا اور دھیمے لہجے میں باتیں کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد بوڑھے نے اطاعت گزاری سے سر ہلایا اور باہر نکل گیا۔ اسد اور مائیکل باتیں کرتے ہوئے ضیافت گاہ سے نکلے اور نشست گاہ میں آ بیٹھے۔ ان کا موضوع گفتگو علی اور اباقہ تھے۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ بوڑھا شخص واپس آ گیا۔ اس کا چہرہ کوئی اہم اطلاع دے رہا تھا۔ اسے دیکھ کر مائیکل اٹھا اور باہر نکل گیا۔ اسد نے انہیں عقبی باغ کی طرف جاتے دیکھا۔ مائیکل کی واپسی میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ اس نے آ کر اسد سے کہا۔ "برادر' تمہیں درست اطلاع ملی ہے۔ اباقہ اور علی پر واقعی حملہ ہوا ہے۔ عقبی باغ میں حوض کے پاس خون کے دھبے بھی موجود ہیں لیکن جہاں تک میں معلوم کر سکا ہوں علی' نتاشا کے آدمیوں کے پاس موجود نہیں۔ وہ خود بھی اس کے بارے میں سخت پریشان ہیں۔ اردگرد کے علاقے میں چپکے چپکے اس کی تلاش ہو رہی ہے۔ میرے آدمی نے جو اطلاع دی ہے اس سے پتہ چلا ہے کہ حملہ کرنے والوں نے اباقہ کو بھی کاری ضربیں لگائی تھیں۔ وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ حملہ آور اسے باغ سے اٹھا کر لے گئے۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ کہاں لے گئے۔ بہرحال اس دوران وہ بچہ وہیں پڑا رہا۔ شاید ان کا خیال تھا کہ واپس آ کر اس کا انتظام کر لیں گے مگر اباقہ کو محفوظ مقام تک پہنچاتے انہیں کچھ دیر لگی۔ جب وہ واپس باغ میں پہنچے تو بچہ وہاں موجود نہیں تھا۔ یہ بات بھی سمجھ میں آنے والی نہیں تھی کہ وہ ہوش میں آ کر چلا گیا اس کی چوٹ خاصی شدید تھی۔ حملہ آوروں نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ اتفاقاً کوئی باغ کی طرف نکل آیا اور اس نے بچے کو اٹھا لیا۔ مگر ابھی تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ بچے کو واقعی کسی نے اٹھایا ہے اور اگر اٹھایا ہے تو وہ کون ہے؟"

اس دوران سردار یورق بھی ان کے پاس آ کھڑا ہوا۔ وہ علی اور اباقہ کی گمشدگی سے پریشان تھا۔ اسد نے اسے شروع سے آخر تک ساری بات بتائی .... اچانک سردار یورق کی آنکھیں چمکنے لگیں وہ بولا۔

"میں سمجھ گیا' لڑکا کس کے پاس ہے۔"

"کس کے پاس ہے؟" اسد نے بے ساختہ پوچھا۔

یورق بولا۔ "پہلے یہ پتہ کراؤ' مہمان خانے میں میرا خدمت گار کون تھا اور اس وقت کہاں ہے؟"

اسد نے یورق کی بات مائیکل تک پہنچائی۔ مائیکل نے اسی بوڑھے شخص کو بلا کر کچھ ہدایات دیں اور وہ واپس چلا گیا۔ سردار یورق اسد سے بولا۔ "شام کے وقت جب میں

ضیافت پر آنے کے لئے تیار ہو رہا تھا۔ میں نے اس خادم سے گرم پانی لانے کے لئے کہا۔ وہ "بہت بہتر" کہہ کر چلا گیا مگر تھوڑی ہی دیر بعد میں نے اسے دیکھا کہ کندھے پر کوئی چیز رکھے تیزی سے صدر دروازے کی طرف جا رہا ہے۔ وہ خاصی وزنی شے تھی اور چادر میں لپٹی ہوئی تھی۔ اس کے بعد میں کافی دیر گرم پانی کا انتظار کرتا رہا لیکن پانی آیا اور نہ خدمتگار۔ مجھے خدمتگار کا مشکوک انداز اب اچھی طرح یاد آ رہا ہے..........."

ان کی گفتگو جاری تھی کہ مائیکل کے آدمی نے آ کر خدمتگار کے پورے کوائف بیان کر دیئے۔ وہ شہر کے مشرقی حصے کا رہائشی تھا۔ اس کا پورا پتہ ایک کاغذ پر لکھا ہوا تھا۔ مائیکل نے نائب رئیس سے محل سے نکلنے کی خصوصی اجازت حاصل کی اور اسد کو لے کر تیزی سے روانہ ہو گیا........... سرپٹ گھوڑے دوڑاتے وہ اس پہاڑی نالے تک پہنچے جو شہر کے مشرقی کونے کو باقی آبادی سے جدا کرتا تھا۔ پل پار کر کے وہ دوسری طرف آ گئے۔ خدمتگار کے چھوٹے سے مکان تک پہنچنے کے لئے انہیں مزید کچھ دیر گھوڑے بھگانے پڑے۔ آخر انہوں نے اس کا گھر ڈھونڈا اور دروازے پر دستک دی۔ تیسری دستک پر دروازہ کھلا اور ایک ڈری ہوئی شکل نظر آئی۔

"تمہارا نام جارج ہے؟" مائیکل نے پوچھا۔

"ج ج........... جی ہاں۔" دروازے میں کھڑے شخص نے جواب دیا۔ اس کی عمر چالیس برس کے لگ بھگ تھی۔ جسم پر شاہی خدمتگاروں کی مخصوص وردی نظر آ رہی تھی۔

مائیکل نے کہا۔ "اصولاً تمہیں اس وقت مہمان خانے میں ہونا چاہئے تھا۔ یہاں کیا کر رہے ہو؟"

خدمتگار سخت گھبرا گیا۔ "جناب میری طبیعت........... اچانک خراب..........."

مائیکل بولا۔ "تم نے نگران اعلیٰ سے چھٹی لی؟"

"جی ہاں........... نہیں نہیں۔"

اسد نے دیکھا کہ گھر کے سامنے ہی ایک گھوڑا گاڑی کھڑی ہے۔ اس نے مائیکل کی توجہ اس جانب دلائی۔ مائیکل نے خدمتگار سے کہا۔

"مہمان خانے کی یہ گھوڑا گاڑی یہاں کیسے کھڑی ہے۔"

خدمت گار جارج اور گھبرا گیا۔ بولا۔ "گاڑی بان میرا دوست ہے۔ مجھ سے ملنے آیا ہے۔"

مائیکل' اسد کے ساتھ گھوڑا گاڑی کی طرف بڑھا۔ سرد علاقوں میں استعمال ہونے

والی یہ مخصوص گھوڑا گاڑی چاروں طرف سے بند تھی' مائیکل کے حکم پر خدمتگار نے گاڑی کا عقبی دروازہ کھولا۔ گاڑی خالی تھی' ہاں مدھم روشنی میں مائیکل کو لکڑی کے فرش پر ایک دھبا سا نظر آیا۔ اس نے ہاتھ لگا کر دیکھا تو یہ خون تھا۔ خدمتگار اب تھر تھر کانپ رہا تھا۔ مائیکل نے اسے گھر کے اندر چلنے کا حکم دیا۔ وہ اندر پہنچے تو ایک کمرے میں گاڑی بان بھی بیٹھا نظر آ گیا۔ مائیکل اور اسد کو دیکھ کر اس کا رنگ بھی اڑ گیا۔ مائیکل نے تلوار نیام سے نکالتے ہوئے خدمتگار سے پوچھا۔ "بتاؤ جارج' بچہ کہاں ہے؟"

"کون سا بچہ جناب!" خدمتگار خوفزدہ لہجے میں بولا۔

"وہی بچہ جسے تم مہمان خانے کے باغ سے اٹھا کر لائے ہو۔"

خدمتگار نے کچھ کہنا چاہا لیکن مائیکل نے تلوار کی نوک اس کی گردن پر رکھ دی۔ وہ خوف سے سفید پڑ گیا۔ مائیکل غرایا۔ "جھوٹ بولو گے تو انہی قدموں پر ڈھیر کر دوں گا۔"

خدمتگار نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر اپنے ساتھی کی طرف دیکھا اور بولا۔ "جناب........... خدا گواہ ہے' میں نے بچے کو کسی بری نیت سے نہیں اٹھایا تھا........... وہ زخمی تھا اور سردی میں کھلے آسمان تلے پڑا تھا۔ نہ جانے کون اسے گھائل کر کے باغ میں پھینک گیا تھا۔ مجھ سے اس معصوم کی حالت نہ دیکھی گئی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اسے زخمی کرنے والے شاہی محافظ ہیں۔ اس کا مطلب تھا وہاں اس کی زندگی محفوظ نہیں تھی۔ یہ گاڑی بان میرا دوست ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ باغ میں ایک لڑکا زخمی پڑا ہے۔ میں اسے کسی طرح مہمان خانے سے نکالتا ہوں تم گاڑی پر اسے میرے گھر لے جاؤ۔ گاڑی بان مان گیا۔ میں نے لڑکے کو ایک چادر میں لپیٹ کر کندھے پر رکھا اور گاڑی میں لا ڈالا لیکن جب میں واپس آنے لگا تو میری نگاہ اپنے کپڑوں پر پڑی۔ لڑکے کے سر سے بہنے والے خون نے میرا لباس داغدار کر دیا تھا۔ اس حالت میں' میں واپس بھی نہیں جا سکتا تھا۔ اس لئے میں گاڑی بان کے ساتھ ہی بیٹھ گیا اور اسے گھر چلنے کو کہا۔ ہم حتی الامکان تیز رفتاری سے یہاں پہنچے۔ مگر پل پار کرنے کے بعد اچانک میری نگاہ عقب میں گئی تو لڑکا گاڑی میں نظر نہیں آیا۔ دروازہ جو اندر سے بند تھا' کھلا ہوا تھا۔ ہم دونوں چکرا کر رہ گئے۔ گاڑی واپس موڑی اور پل کے اردگرد کافی دیر لڑکے کو تلاش کرتے رہے لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔"

اسد اور مائیکل خاموشی سے خدمتگار کی بات سن رہے تھے۔ خدمتگار گلوگیر آواز میں بولا۔ "جناب! میرا قصور صرف اتنا ہے کہ بچے کی نازک حالت دیکھ کر میں اپنے دل پر قابو نہ رکھ سکا اور اسے نامعلوم دشمنوں سے بچانے کے لئے مہمان خانے سے باہر لے آیا۔

اب خدا معلوم وہ راستے میں کہاں گم ہو گیا ہے؟ میں نے تو اپنی طرف سے کوئی غفلت نہیں کی۔"

ادھیڑ عمر خدمتگار کی آنکھوں سے لگاتار آنسو بہہ رہے تھے اور وہ بری طرح لرز رہا تھا۔ مائیکل نے ذرا نرم لہجے میں کہا۔ "دیکھو' اگر تم نے جو کچھ بتایا ہے درست ہے اور بچے کی گمشدگی میں تمہاری غفلت کا دخل نہیں تو تمہیں سزا نہیں ملے گی۔"

خدمت گار نے جواب میں کچھ کہنا چاہا لیکن اس وقت اچانک باہر سے شور و غل کی آوازیں آنے لگیں۔ مائیکل نے جلدی سے اٹھ کر کھڑکی کھولی۔ ایک عجیب طرح کی روشنی اسے نظر آئی۔ شاید کہیں قریب ہی آگ لگی ہوئی تھی۔ پھر چند افراد بھاگتے ہوئے گلی سے گزرے' وہ چلا رہے تھے "منگول آ گئے .... منگول آ گئے۔" ان کلمات نے مائیکل کا خون رگوں میں جما دیا۔ اس نے گھوم کر اسد کی طرف دیکھا۔ وہ بھی شور و غل کا مفہوم سمجھ رہا تھا۔ حیرت سے اس کی آنکھیں کشادہ ہو گئی تھیں۔

خدمتگار دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر بولا۔ "خداوند' خیر۔" مائیکل کی تلوار پہلے ہی اس کے ہاتھ میں تھی۔ اسد نے بھی تلوار نکالی اور دونوں بھاگتے ہوئے مکان سے باہر نکلے۔ لوگ خوفزدگی کے عالم میں چکراتے پھر رہے تھے۔ ماؤں نے بچوں کو سینے سے لگا رکھا تھا اور مرد اپنی عورتوں کو آوازیں دے رہے تھے۔ کچھ لوگ شب خوابی کے لباس میں تھے۔ اسد نے ایک نوجوان جوڑے کو دیکھا جو سخت سردی میں صرف بستر کی چادریں لپیٹے ہوئے تھا۔ ایک بوڑھی عورت اسد کے سامنے لوگوں کے پاؤں تلے کچلی گئی۔ اسد اور مائیکل گھوڑوں پر سوار ہوئے اور لوگوں کے درمیان سے راستہ بناتے ان مکانوں کی طرف بڑھے جو آگ کی زد میں تھے۔ یہ کوئی تین عدد مکان تھے لیکن آبادی گنجان ہونے کی وجہ سے آگ دوسرے مکانوں تک بھی پھیل رہی تھی۔ بھگدڑ اور تاریکی میں کچھ سجھائی اور دکھائی نہیں دیتا تھا۔ پھر بھی اسد تیزی سے صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس سے پہلے وہ منگول وحشیوں کو بارہا یلغار کرتے دیکھ چکا تھا۔ وہ ننگے گھوڑوں پر سوار جانوروں کی طرح چیختے چلاتے حملہ آور ہوتے تھے۔ ان کی رفتار اتنی تیز ہوتی تھی کہ لوگوں کو بھاگنے کا موقع کم ہی ملتا تھا .... مگر یہاں صورت حال مختلف نظر آ رہی تھی۔ نہ منگول سواروں کا شور تھا اور نہ ان کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے زمین دہل رہی تھی .... بہت جلد اسد اور مائیکل کو اندازہ ہو گیا کہ منگول حملے کی خبر غلط ہے .... یہ کوئی اور معاملہ تھا۔

لوگوں کے خوف و ہراس میں لمحہ بہ لمحہ اضافہ ہو رہا تھا۔ کچی نیند سے بیدار ہونے

والے ذہن کچھ سوچنے سمجھنے سے قاصر نظر آتے تھے۔ جس کا جدھر منہ اٹھتا تھا بھاگا چلا جا رہا تھا۔ دم بدم پھیلتی ہوئی آگ دہشت میں مزید اضافہ کا سبب بن رہی تھی .... دیکھتے ہی دیکھتے گلیاں خالی ہو گئیں۔ لوگوں کا جم غفیر ان پلوں کی طرف بھاگا جو اس آبادی کا باقی شہر سے جوڑتے تھے۔ اسد اور مائیکل گھوڑوں سے اتر کر ایک مکان میں داخل ہو گئے۔ سیڑھیاں چڑھ کر وہ اس تین منزلہ مکان کی چھت پر پہنچے تو ان کی نظر دور دور تک دیکھنے کے قابل ہو گئی۔ منگول لشکر کے آثار کہیں دکھائی نہیں دیتے تھے۔ دفعتاً اسد کو تین چالیس گھڑسوار نظر آئے وہ عریاں تلواریں لہراتے ایک گلی سے نمودار ہوئے اور مختلف گھروں میں گھس گئے۔ جلد ہی اسد اور مائیکل جان گئے کہ یہ لٹیرے ہیں۔ وہ لوگوں کے گھروں سے قیمتی سامان نکال نکال کر ایک جگہ ڈھیر کر رہے تھے۔ پھر تین گھوڑا گاڑیاں نمودار ہوئیں' ان پر بھی لٹیروں کے ساتھی سوار تھے۔ قیمتی سامان ان گاڑیوں میں منتقل کیا جانے لگا۔ ساتھ ساتھ لوٹ کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ نقاب پوش افراد بھاگ بھاگ کر گھروں میں داخل ہو رہے تھے اور قیمتی سامان لے کر لوٹ رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے گھوڑا گاڑیاں پوری گنجائش تک لوٹ کے سامان سے بھر گئیں۔ اس دوران لٹیرے دو گاڑیاں اور ہنکا کر لے آئے۔ یہ بھی سامان سے بھری ہوئی تھیں۔ اسد اور مائیکل کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اس موقع پر وہ کیا کردار ادا کر سکتے ہیں اگر ان کے ساتھ کچھ آدمی ہوتے تو وہ ان لٹیروں کا مقابلہ کرنے کی کوشش کرتے' مگر دو تلواریں ان چالیس پچاس افراد کا کیا بگاڑ سکتی تھیں۔ بستی تقریباً مکینوں سے خالی ہو چکی تھی۔ اگر چند افراد موجود بھی تھے تو وہ کونے کھدروں میں چھپے تھے .... یا کچھ زخمی لوگ تھے جو گلیوں میں پڑے سسک رہے تھے۔

کچھ دیر بعد لٹیرے سامان سے بھری گھوڑا گاڑیوں کے ساتھ جانے کے لئے تیار ہو چکے تھے .... دفعتاً اسد کو مغربی سمت سے سرپٹ دوڑتے گھوڑوں کی آواز آئی۔ لٹیرے بھی یہ آواز سن چکے تھے۔ آگ کی مدھم روشنی میں اسد اور مائیکل نے دیکھا کہ لٹیروں کا سردار انہیں ادھر ادھر چھپنے کا حکم دے رہا تھا۔ وہ مختلف چیزوں کی آڑ لینے کے لئے بھاگے۔ ایک آدمی چند گز دور ایک درخت پر چڑھ گیا۔ یہ درخت کافی بلند تھا اور اس مکان کی چاردیواری کے ساتھ واقع تھا۔ جس کی چھت پر اسد اور مائیکل موجود تھے۔ چند لمحے بعد اسد نے گھڑسواروں کو دیکھا وہ تعداد میں پندرہ کے قریب تھے اور تیزی سے بھاگے چلے آ رہے تھے۔ ان کے لباس سے ظاہر تھا کہ وہ مسلح فوج کے جوان ہیں .... مگر ان میں ایک شخص کے جسم پر وردی نہیں تھی۔ وہ ان میں سب سے آگے تھا اور اس

کے ہاتھ میں تلوار چمک رہی تھی۔ اس نے اپنا چہرہ ایک پگڑی میں چھپا رکھا تھا۔ اسد دیکھتے ہی پہچان گیا' وہ اباقہ تھا۔ اچانک لٹیروں نے اباقہ اور اس کے ساتھیوں پر تیروں کی بوچھاڑ کر دی۔ اسد نے تین یا چار گھڑسواروں کو زخمی ہو کر گرتے دیکھا۔ اباقہ نے سر نیچے جھکایا اور گھوڑے کو پھرتی سے بائیں جانب موڑا۔ اب اس کا رخ اس درخت کی طرف تھا جس پر ایک لٹیرا نیزہ سنبھالے بیٹھا تھا۔ اسد کو اباقہ اور نیزہ بردار دونوں نظر آ رہے تھے۔ پھر یہ دیکھ کر اس کا دل دھڑکنا بھول گیا کہ نیزہ بردار نیزہ سونت چکا ہے اور اباقہ عین اس کی زد میں ہے۔ اگر اسد اپنے کندھے سے کمان اتار کر اس پر تیر چڑھانے کی کوشش کرتا تو تیر چڑھنے سے بہت پہلے اباقہ موت کی رتھ پر سوار ہو چکا ہوتا۔ یہ تو چند ساعتوں کا کھیل تھا۔ اباقہ کے سینے اور آہنی نیزے کے درمیان صرف ایک لمحہ حائل تھا اور یہ زندگی کا لمحہ تھا۔ اسد چند قدم بھاگا اور عقاب کی طرح اڑتا ہوا درخت کی طرف آیا۔ یہ ایک اندھی چھلانگ تھی۔ چھت' درخت سے کوئی چار گز بلند اور چھ گز دور تھی۔ اسد کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا مگر وہ ہر خطرہ مول لے چکا تھا۔ اسد کا جسم ہوا میں تیرتا ہوا نیزہ بردار سے ٹکرایا۔ تڑاخوں کی آواز سے درخت کی کئی شاخیں ٹوٹ گئیں اور وہ دونوں قلابازی کھا کر زمین پر گرے۔ اباقہ کا گھوڑا ان کے قریب سے گزرتا چلا گیا۔ گرتے ساتھ ہی اسد اٹھا اور اس نے ایک طوفانی گھونسہ نیزہ بردار کے چہرے پر مارا لیکن درحقیقت اس نے ایک مردہ شخص کو مکہ رسید کیا تھا۔ درخت سے گرتے ہی نیزہ بردار ہلاک ہو چکا تھا۔ اس کا اپنا ہی نیزہ اس کی گردن سے پار ہو گیا تھا۔ اس نے زور سے اباقہ کو آواز دی۔ اباقہ نے گھوم کر اسد کو دیکھا اور گھوڑا بھگا کر اس کے قریب لایا۔ اسد پہلے سے تیار تھا۔ اچھل کر اباقہ کے پیچھے بیٹھ گیا۔ اباقہ کے ساتھی سوار جو چند لمحوں کے لئے بکھر گئے تھے اب ایک تنگ سی گلی میں جمع ہو گئے تھے۔ اباقہ نے گھوڑے کا رخ اس گلی کی طرف کیا۔ دوسری طرف مائیکل بھی چھت سے اتر کر اس تنگ گلی کی طرف بڑھا۔ تیروں سے بچتے ہوئے وہ گلی تک پہنچ گئے۔ اسد نے اباقہ کو مختصراً صورت حال سے آگاہ کیا۔ یہ جان کر نامعلوم افراد لوگوں کے گھر لوٹ رہے ہیں' اباقہ کا گرم خون کھول گیا۔ اس نے اسد سے پوچھا۔

"یہ کل کتنے آدمی ہیں؟"

اسد نے بتایا ابھی تک پینتیس چالیس افراد سامنے آئے ہیں۔ ہو سکتا ہے ان کے مزید ساتھی بھی ہوں۔

اباقہ نے پوچھا۔ "پھر تمہارا کیا خیال ہے۔ کیا ہمیں ان کو روکنا چاہیے؟"

اسد نے اباقہ کے ساتھیوں کو گنا وہ تعداد میں کل بارہ تھے۔ یعنی وہ سب ملا کر پندرہ

آدمی بنتے تھے۔ اباقہ نے اسد کو اعداد و شمار میں الجھتے دیکھا تو بولا۔ "اسد! گھبراؤ مت۔ ہم ان لٹیروں سے زیر نہیں ہوں گے۔"

اسد نے مائیکل کی طرف دیکھا۔ مائیکل نے بھی اثبات میں سر ہلا دیا۔ ان سب نے تلواریں نکالیں اور مقابلے کے لئے تیار ہو گئے۔ ان کا تیار رہنا بڑا سودمند ثابت ہوا کیونکہ لٹیروں نے اپنے مورچے چھوڑ کر اچانک ان پر دھاوا بول دیا۔ شاید ان کا خیال تھا کہ انہیں اسی تنگ سی گلی میں گھیر کر مار دیا جائے گا۔ مگر وہ سب چونکہ تیار تھے اس لئے جب لٹیرے ان کی طرف بڑھے تو انہوں نے بھی گھوڑوں کو ایڑ لگائی اور کھلے میدان میں آ گئے۔ تعداد میں بہت فرق تھا لیکن جس دستے کے ساتھ اباقہ اور اسد جیسے جنگجو تھے اسے آسانی سے کیسے گھیرا جا سکتا تھا۔

اباقہ نے چھوٹتے ساتھ ہی لٹیروں کے سردار پر حملہ کیا۔ وہ ایک طاقتور شخص تھا اور بڑے اعتماد سے گھوڑے پر بیٹھا تھا۔ اباقہ کی تلوار سردار کی تلوار سے ٹکرائی۔ چند لمحے زور دار مقابلہ ہوا پھر اچانک اباقہ' سردار پر حاوی ہو گیا اور اسے دھکیلتا ہوا کئی گز پیچھے لے گیا۔ سردار نے سنبھلنے کی کوشش کی لیکن اس دوران اچانک اس نے خود کو تلوار میں پرویا ہوا پایا۔ وہ زندگی کی بازی ہار چکا تھا۔ اباقہ کی تلوار اس کے سینے میں تھی۔

سردار کے ہلاک ہوتے ہی اس کے ساتھیوں میں بددلی پھیل گئی۔ اباقہ اور اسد نے ایک ساتھ نعرۂ تکبیر بلند کرتے ہوئے زوردار حملہ کیا اور لٹیروں کے درمیان گھس گئے۔ اباقہ' اسد اور مائیکل کو دیکھ کر ان کے ساتھیوں کے حوصلے بھی بڑھے اور ان کی تلواریں تیزی سے چلنے لگیں۔ چند ہی لمحے میں لٹیروں کے پاؤں اکھڑ گئے اور وہ پیٹھ دکھا کر مختلف سمتوں میں بھاگ نکلے۔ اباقہ اور اس کے ساتھیوں نے گھوڑا گاڑیوں کے گرد گھیرا ڈال لیا۔

اسد کو خدشہ تھا کہ لٹیرے اتنی جلدی ہار نہیں مانیں گے۔ منظم ہو کر وہ پھر دھاوا بولیں گے۔ اس کا اندازہ درست تھا۔ دوسرے دھاوے میں کچھ دیر تو لگی لیکن یہ خاصا زوردار تھا۔ لٹیروں کے چند وہ ساتھی بھی جو ادھر ادھر بکھرے تھے' اکٹھے ہو گئے تھے۔ انہوں نے دو مختلف اطراف سے حملہ کیا اور انہیں دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ اباقہ' اسد اور مائیکل نے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ ساتھ ساتھ وہ اپنے ساتھیوں کا حوصلہ بھی بڑھا رہے تھے۔ یہی وہ وقت تھا جب "گھروں والے" اپنے گھروں کی حفاظت کو پہنچ گئے۔ اباقہ اور اسد کو گھڑسواروں کی دو تین ٹولیاں موقعے کی طرف بڑھتی دکھائی دیں۔ ان کے عقب میں اور لوگ بھی تھے۔ جلد ہی وہ سب ان کے ساتھ مقابلے میں شریک ہو گئے۔ کوئی بیس لٹیروں کو موقعے پر ہلاک کر دیا گیا۔ اتنے ہی گرفتار ہوئے اور باقی جان بچا کر بھاگ گئے۔

.... لوگ جوق در جوق واپس آ رہے تھے۔ کچھ مکانوں کی آگ بجھانے میں مصروف تھے اور کچھ اپنے گمشدہ عزیزوں کو تلاش کر رہے تھے۔ مگر ایک جم غفیر اسد اور مائیکل کے گرد جمع تھا۔ وہ سب اس نقاب پوش کو دیکھنا چاہتے تھے جو ان کے لئے فرشتۂ رحمت بن کر آیا تھا۔ نہایت جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نے نہ صرف سینکڑوں لوگوں کی زندگیاں بچائی تھیں بلکہ ان کے مال و اسباب کی حفاظت بھی کی تھی ....

لیکن اباقہ کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ وہاں تھا ہی نہیں۔ وہ اپنے گھوڑے پر سوار آخر شب کی تیرگی کو چیرتا تیزی سے شہر کی طرف جا رہا تھا۔ اسے اپنا وعدہ پورا کرنا تھا۔ سپیدۂ سحر نمودار ہونے سے پہلے روس کے سب سے خوفناک عقوبت خانے میں واپس پہنچنا تھا۔

☆-------☆-------☆

شہزادی نتاشا اپنے خوبصورت کمرے میں موجود تھی۔ وہ مسہری پر نیم دراز تھی اور اس کی رازداں کنیز کلثوم اس کے بالوں میں کنگھا کر رہی تھی۔ ان دونوں کے درمیان جو گفتگو ہو رہی تھی وہ کل رات پیش آنے والے واقعات کے بارے میں تھی۔ کلثوم کہہ رہی تھی "........... شہزادی صاحبہ' میں تو یہ سوچ کر دہل جاتی ہوں اگر وہ نقاب پوش چند لمحے تاخیر سے پہنچتا تو کیا ہوتا۔ کھانا بالکل تیار تھا اور کئی مہمان تو نوالے بھی اٹھا چکے تھے .... خدا کی پناہ' میں وہ منظر کبھی نہیں بھول سکتی۔ میں اس وقت ضیافت گاہ کے اندرونی دروازے میں کھڑی تھی۔ شور سنائی دیا اور پھر نقاب پوش بھاگتا ہوا اندر داخل ہوا۔ چند قدم بھاگ کر اس نے ہوا میں چھلانگ لگائی اور اوندھے منہ کھانے کی میز پر پھسلتا چلا گیا۔ میرے منہ سے بے ساختہ چیخیں نکل گئیں۔ بالکل یوں لگ رہا تھا جیسے میں کوئی خواب دیکھ رہی ہوں۔ میں کیا' ضیافت گاہ میں موجود ہر شخص یہ منظر دیکھ کر ششدر رہ گیا تھا........... مسلح محافظ اس کے پیچھے لپکے چلے آ رہے تھے۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ ان کے ہاتھوں میں ننگی تلواریں ہیں اور وہ قریب پہنچتے ہی اسے ہلاک کر دیں گے' مگر وہ اطمینان سے کھڑا تھا۔ لگتا تھا اسے ان کی پرواہ نہیں..........."

شہزادی نتاشا بولی۔ "میرا خیال ہے کہ نائب رئیس نے محافظوں کو حملہ نہ کرنے کا حکم دے کر اچھا کیا۔ ہو سکتا تھا مقابلے کی صورت میں وہ انہیں نقصان پہنچاتا........... وہ کوئی معمولی آدمی نہیں کلثوم! پل کے سامنے لوگوں کے ایک بے قابو ہجوم کے سامنے ڈٹ جانا اور انہیں روک لینا کسی عام آدمی کے بس کا روگ نہیں تھا........... اور پھر اس نے جس طرح لوٹ مار کرنے والوں کا مقابلہ کیا ہے' اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک ہے۔"

کلثوم بولی۔ "شہزادی صاحبہ! ایسے شخص کو تو رئیس اعظم کے ذاتی محافظوں میں شامل ہونا چاہئے۔ بخدا میں تو اس کی مردانگی کی عاشق ہو گئی ہوں .... کیا قد ہے' کیا مضبوط شانے ہیں۔ یہ چوڑی چھاتی اور جسم تو ایسا چھریرا ہے کہ بس دیکھتے ہی رہو۔ چہرہ پگڑی میں چھپا ہوا تھا لیکن آنکھیں گواہی دے رہی تھیں کہ وہ بدصورت نہیں۔ کاش میں ایک بار اسے دیکھ سکتی..........."

کلثوم خیالات کے دھارے میں شہزادی کی موجودگی بھی فراموش کر چکی تھی جب اس نے گھور کر اسے دیکھا تو وہ گڑبڑا کر چپ کر گئی اور گفتگو یہیں ختم ہو گئی۔

.... کچھ ہی دیر بعد شہزادی نتاشا محافظوں کے نرغے میں زمین دوز قید خانے کی طرف جا رہی تھی۔ اس نے سرخ رنگ کا ایک جھالردار لبادہ پہن رکھا تھا۔ سر پر ایک چھوٹا سا تاج تھا اور چہرے پر رعب و جلال۔ جب وہ قید خانے کے دروازے پر پہنچی تو گرانڈیل بابا' گیوڑا نے خود اس کا استقبال کیا۔ شہزادی کے ساتھ نیلی آنکھوں والا ایک خوبرو نوجوان بھی تھا۔ وہ دیکھنے میں کوئی شہزادہ لگتا تھا۔ شہزادی نتاشا بے تکلفی سے اس کے ساتھ باتیں کرتی چلی جا رہی تھی۔ چند سیڑھیاں اتر کر وہ وسیع تہہ خانے میں پہنچے تو مجرم زنجیروں میں جکڑا نظر آیا۔ اس کے قریب ہی ایک میز رکھی تھی جس پر ایذا رسانی کے بدترین آلات پڑے تھے۔ شہزادی نتاشا اس خوبرو نوجوان کے ہمراہ آرام دہ کرسی پر جا بیٹھی۔ مؤدب محافظ ان کے عقب میں آن کھڑے ہوئے۔ خوفناک صورت والے گیوڑا نے ایک بار پھر جھک کر انہیں تعظیم پیش کی اور ایذا رسانی کے آلات کی طرف بڑھا۔ اس نے لوہے کا ایک نہایت وزنی طوق اباقہ کی گردن میں ڈال دیا۔ اباقہ کے پاؤں حسب سابق آہنی کڑوں میں جکڑے ہوئے تھے۔ پاؤں کے نیچے پتھریلے فرش کی بجائے لوہے کی چادر تھی۔ اس چادر کے نیچے آگ جلا کر اسے گرم کیا جا سکتا تھا۔ گیوڑا کے حکم پر اس کے نیچے آگ جلائی جانے لگی۔ اس دوران تہہ خانے کے مختلف حصوں سے چیخ و پکار کی مدھم آوازیں مسلسل سنائی دے رہی تھیں۔ یہ تہہ خانہ دراصل کئی حصوں میں تقسیم تھا۔ سنگی دیواروں کے اندر ایسے کئی عقوبت خانے موجود تھے جہاں معتوب افراد کو اذیتیں دی جاتی تھیں۔ شہزادی نتاشا بچپن سے ان عقوبت خانوں کو دیکھ رہی تھی اور اب تڑپتے سسکتے لوگوں کو دیکھنا اس کی ضرورت بن چکا تھا۔ وہ ہفتے میں ایک آدھ بار ان تہہ خانوں کا چکر ضرور لگاتی تھی۔ تھوڑی تھوڑی دیر وہ ہر مجرم کی "تفریح گاہ" میں رکتی اور اس کی حالت کا نظارہ کرتی تھی۔ گیوڑا اس کے ساتھ ساتھ رہتا تھا۔ گاہے بگاہے وہ شہزادی کو خوش کرنے کے لئے اپنی سفاکی کا کوئی نیا نمونہ بھی پیش کر دیتا تھا۔

اس وقت بھی وہ بڑے انہماک سے اباقہ کا جائزہ لے رہا تھا اور سوچ رہا تھا اس مغرور شخص کو شہزادی کے سامنے چیخنے چلانے پر کتنی دیر میں مجبور کیا جا سکتا ہے۔ اباقہ کے عریاں پاؤں کے نیچے آہنی چادر بتدریج گرم ہو رہی تھی۔ پھر حدت کی وجہ سے اس نے اپنی انگلیاں سکوڑنا شروع کر دیں۔ کبھی وہ پنجوں کے بل کھڑا ہوتا اور کبھی ایڑیوں پر بوجھ ڈال کر پنجے اٹھا دیتا۔ آخر کب تک۔ چادر تپنے لگی اور جلتے ہوئے گوشت کی بو دھیرے دھیرے تہہ خانے میں پھیلنے لگی۔ لگ رہا تھا کہیں کباب بھونے جا رہے ہیں لیکن یہ کباب نہیں تھے یہ زندہ انسان کا گوشت تھا۔ اباقہ کا چہرہ تکلیف کی شدت سے سرخ ہو رہا تھا اور شدید سردی میں پسینہ دھاروں کی صورت اس کے جسم پر بہہ رہا تھا۔ آخر اذیت سے بے تاب ہو کر اس نے بازوؤں کے زور پر اپنے پاؤں آہنی چادر سے اٹھائے۔ زنجیروں میں بس اتنی گنجائش تھی کہ پاؤں چند انگل اوپر اٹھ سکے۔ لیکن اباقہ کے گلے میں وزنی طوق تھا۔ وہ چند لمحوں سے زیادہ خود کو ہوا میں معلق نہ رکھ سکا اور دوبارہ اس کے پاؤں چادر پر آ گئے۔

جب یہ لرزہ خیز کارروائی ہو رہی تھی' ایک محافظ دھیمے لہجے میں گیوڑا سے کچھ کہہ رہا تھا۔ شہزادی کے ساتھی خوبرو نوجوان نے انہیں سرگوشی کرتے ہوئے دیکھا اور بلند آواز سے کہا۔

"گیوڑا! یہ سپاہی کیا کہتا ہے۔"

گیوڑا پہلے تو جھجکا پھر شہزادی نتاشا اور نوجوان کے قریب آ کر بولا۔

"جناب! یہ شخص کہتا ہے کہ اس نے مجرم کو کل رات قید خانے سے باہر دیکھا ہے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" نتاشا ٹھٹک کر بولی۔

گیوڑا نے کہا۔ "شہزادی صاحبہ! اس کا کہنا ہے کہ کل رات جس نقاب پوش نے غلہ جلایا تھا وہ یہی مجرم ہے۔"

شہزادی چونک کر اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔ "وہ یہ کیسے کہہ سکتا ہے۔"

گیوڑا بولا۔ "شہزادی حضور! اس محافظ کا کہنا ہے کہ کل رات اس نے مجرم کے بازو پر اپنے ہاتھ سے پٹی کی تھی۔ مجرم کے بازو پر جو زخم ہے وہ اسے اچھی طرح پہچانتا ہے۔ اس کا یہ بھی کہنا ہے کہ کل یہ زخم نہیں تھا۔" شہزادی بغور اباقہ کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر الجھن کے آثار تھے۔ اس نے محافظ کو اپنے قریب بلایا اور کہا۔ "کل رات تم کس کی ماتحتی میں تھے۔"

محافظ نے سامان خانے کے نگران اعلیٰ گورکی کا نام لیا۔ شہزادی نے گیوڑا کو حکم دیا کہ فوراً گورکی کو حاضر کیا جائے۔

شہزادی کے حکم پر اباقہ کے پاؤں کے نیچے لکڑی کا ایک تختہ رکھ کر آگ بجھا دی گئی ...... تھوڑی ہی دیر بعد گورکی دو سپاہیوں کے سہارے سیڑھیاں اترتا ہوا تہہ خانے میں آ گیا۔ اس کے ٹخنے اور کندھے پر پٹیاں بندھی تھیں۔ شہزادی نے گورکی کو حکم دیا کہ وہ مجرم کا زخم شناخت کرے۔ گورکی نے اباقہ کے زخم کو غور سے دیکھا اور پکار اٹھا۔ "یہ وہی زخم ہے ...... بالکل وہی زخم ہے۔"

گیوڑا نے اباقہ کا لباس گورکی کے سامنے لہرایا۔ گورکی نے لباس دیکھا' پھر اباقہ کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے پر ہیجان کے آثار نظر آ رہے تھے۔ لرزاں آواز میں بولا۔

"شہزادی صاحبہ! میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کل پل جلا کر لوگوں کی جانیں لینے والا شخص یہی تھا۔"

سب حیرانی سے اباقہ کو دیکھ رہے تھے۔ اس خاموشی کو آخر نتاشا کی آواز نے توڑا۔ اس نے گورکی سے کہا کہ وہ اب جا سکتا ہے۔ گورکی دو افراد کے سہارے باہر نکل گیا۔ شہزادی نتاشا کی نگاہیں اب گیوڑا پر مرکوز تھیں۔ گیوڑا ان نگاہوں کا مفہوم سمجھتا تھا۔ وہ جانتا تھا شہزادی کیا پوچھ رہی ہے۔ اس نے تہہ خانے کے اکلوتے خادم کو بلانے کا حکم دیا۔ تھوڑی دیر بعد تہہ خانے کا سن رسیدہ خدمتگار کانپتا لرزتا ایک تاریک گوشے سے برآمد ہوا اور شہزادی کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

گیوڑا نے خوفناک لہجے میں پوچھا۔ "عبدالعزیز! قیدی یہاں سے کیسے نکلا؟"

بوڑھا جس کا نام عبدالعزیز تھا' تھر تھر کانپ رہا تھا۔ گیوڑا نے ہاتھ بڑھایا اور اس کی پتلی گردن کو مٹھی میں جکڑ لیا۔ ایک زوردار جھٹکا دے کر بولا۔

"خبیث بڈھے! بتا قیدی یہاں سے کیسے نکلا اور کیسے واپس آیا۔ بتا ورنہ مار مار کر تمہارا لہو کھلی کر دوں گا۔" بوڑھے نے گیوڑا کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے اور نحیف آواز میں جان بخشی کی درخواست کرنے لگا۔ وہ خاص طور پر گیوڑا سے خوفزدہ نظر آتا تھا۔ گیوڑا جارحانہ انداز میں بولا۔ "معافی بھی مل جائے گی پہلے تیری زبان تو کھل جائے۔" اس نے بوڑھے کو زوردار دھکا دیا اور وہ لڑکھڑاتا ہوا محافظوں کے قدموں میں گرا۔ اباقہ کے حلق میں کپڑا ٹھنسا تھا اس لئے وہ بول نہیں سکتا تھا' مگر وہ بری طرح مچل رہا تھا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ گیوڑا کے اشارے پر محافظ بوڑھے عبدالعزیز کو گھسیٹتے ہوئے ایک آہنی شکنجے تک لے گئے اور اس کا جسم کس دیا۔

شہزادی نتاشا قریب بیٹھے نوجوان سے سرگوشیوں میں گفتگو کر رہی تھی۔ "کہیں

سے کوئی واسطہ نہیں۔ تجھے میری اطاعت کرنا ہو گی اور اس کے بدلے دنیا جہان کی نعمتیں تیرے قدموں میں بچھی رہیں گی.........." اباقہ خاموشی سے سر جھکائے سنتا رہا۔ اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ ڈیوک کی زبان سے کسی خوفناک سازش کا انکشاف ہونے والا ہے..........

وہ دھیمے قدموں سے چلتا اباقہ کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ اس کی سانسوں سے شراب کی بو آ رہی تھی۔ پر کیف لہجے میں بولا۔

"اباقہ' تم یہاں کس لیے آئے تھے؟" اباقہ خاموش رہا۔ ڈیوک نے اپنا سوال دہرایا تو اباقہ جواب دینے پر مجبور ہو گیا۔ اس نے کہا۔

"ڈیوک! ہم اہل روس کی مدد کو آئے ہیں۔ رئیس اعظم کے ہاتھ مضبوط کرنا چاہتے ہیں۔"

"پھر تم نے ہاتھ مضبوط کیے؟" ڈیوک کے لہجے میں تمسخر تھا۔ اباقہ خاموش رہا۔ ڈیوک نے اباقہ کا زخمی چہرہ دیکھا جھک کر اس کے چھلے ہوئے پیروں کا معائنہ کیا اور منہ سے چچ چچ کر آواز نکالتا ہوا بولا۔ "افسوس' جو شخص رئیس اعظم کے ہاتھ مضبوط کرنے آتا ہے۔ اسے رئیس کی بیٹی پاؤں سے معذور کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ اسے عقوبت خانے میں ڈالا جاتا ہے۔ جانوروں کی طرح مارا جاتا ہے اور نہایت سفاکی سے قتل کا حکم صادر کیا جاتا ہے۔"

"میں سمجھا نہیں ڈیوک؟" اباقہ بولا۔

ڈیوک نے پوستین کی جیب سے ایک کاغذ نکالا اور اباقہ کی طرف بڑھاتا ہوا بولا۔ "یہ ہے تمہاری موت کا پروانہ' جو شہزادی نتاشا کے دستخطوں سے جاری ہوا ہے۔ اس پروانے میں لکھا ہے' مجرم کو عبرت ناک موت سے دو چار کیا جائے۔ تم جانتے ہو شاہی عقوبت خانے میں عبرت ناک موت سے کیا مطلب ہے؟" اباقہ سر جھکائے سنتا رہا۔ ڈیوک بولا۔ "اس عقوبت خانے میں ہر موت عبرتناک ہوتی ہے لیکن جس موت کو وہاں عبرتناک کہا جاتا ہے۔ اس بدنصیب کے ہر ہر عضو اور ہر ہر ریشے کو علیحدہ علیحدہ موت سے ہمکنار کیا جاتا ہے .... اور شہزادی نے تیرے لیے یہی موت تجویز کی تھی۔"

پروانہ اباقہ کے سامنے لہرا کر ڈیوک نے دوبارہ جیب میں ڈال لیا۔ "میری طرف دیکھو اباقہ۔" وہ اباقہ کی ٹھوڑی انگلی سے اٹھا کر بولا۔ "میں نے تمہیں نئی زندگی بخشی ہے۔ میں اس زندگی کی حفاظت بھی کر سکتا ہوں .... میرے لیے

کام کرو گے؟"

اباقہ کچھ دیر گہری سوچ میں ڈوبا رہا پھر بولا۔ "میں سمجھا نہیں۔ کیا تم منگولوں کا ساتھ دینے کی بات کر رہے ہو۔"

"ہرگز نہیں .... ہرگز نہیں۔" ڈیوک دونوں ہاتھ اٹھا کر بولا۔ "میں جانتا ہوں' تمہاری اس شہر میں موجودگی منگول دشمنی کے سبب ہے۔ پھر میں تم سے ایسی توقع کیوں رکھوں گا' میرا نہ تو منگولوں سے کوئی تعلق ہے اور نہ شہزادی نتاشا اور رئیس اعظم سے' میرے کچھ اور مقاصد ہیں۔"

اباقہ بولا۔ "ڈیوک! آپ جانتے ہیں دارالحکومت پر کسی بھی وقت منگولوں کا حملہ ہو سکتا ہے۔ دوسری طرف آپ اپنے مقاصد کی بات کر رہے ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ کی کسی کارروائی سے دفاعی کوششوں کو نقصان پہنچے۔"

ڈیوک کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ وہ چیخا۔ "کن لوگوں کی حمایت کر رہے ہو تم۔ کس حکومت کی دفاعی کوششوں کی فکر لاحق ہے تمہیں۔ اسی شہزادی نتاشا اور اس کے باپ کی حکومت کی جنہوں نے تمہیں تڑپا تڑپا کر مارنے کا حکم جاری کیا .... سنو اباقہ' غور سے سنو' حاکم کسی کے دوست نہیں ہوتے۔ وہ قراقرم کے ہوں یا ولادی میر کے' ان کا کام خون پینا ہوتا ہے۔ وہ جنگجو بہادروں کا خون پیتے ہیں اور ماؤں کے جوان بیٹوں کی لاشوں پر اپنے تخت بچھاتے ہیں .... ان سے تمہیں سوائے زخموں اور موت کے کچھ نہ ملے گا .... تم نے اس مختصر وقت میں' رئیس اعظم کے لیے کیا کچھ نہیں کیا۔ شاہی ضیافت گاہ میں بیسیوں مہمانوں اور عہدیداروں کو ہلاکت سے بچایا' ندی کا پل توڑ کر سینکڑوں لوگوں کی جانیں محفوظ کیں۔ ان کا مال واسباب بچانے کے لیے کیا کیا خطرات مول لئے ان سب نیکیوں کا صلہ تمہیں کیا ملا؟.........."

ڈیوک پر تاثیر انداز میں اباقہ کو سمجھاتا رہا اور اباقہ حسب سابق سر نیہوڑائے سنتا رہا۔ آخر اس نے ڈیوک کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔

"محترم ڈیوک! شہزادی نتاشا کے عقوبت خانے میں گزارے ہوئے وہ چند پہر میرے لیے اس ڈراؤنے خواب کی طرح ہیں جو زندگی بھر یاد رہتا ہے۔ میں شہزادی نتاشا کی اس یادگار میزبانی کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ اسے بتانا چاہتا ہوں کہ ظلم کتنی جلدی ظالم کی طرف لوٹ کر آتا ہے .... آہ! کتنے ولولے اور جوش سے میں یہاں پہنچا تھا۔ دل میں کچھ کرکے دکھانے کی آرزو تھی اور ذہن میں خیال تھا

کہ جو لوگ اتنی خواہش سے بلا رہے ہیں وہ سر آنکھوں پر بٹھائیں گے۔ ان کی نظروں میں پیار اور دلوں میں احسان مندی ہوگی لیکن یہاں سب کچھ الٹ پایا......... آتے ساتھ ہی مجھے آڑے ہاتھوں لیا گیا۔ چھپ کر مجھ پر حملہ کیا گیا میرے ساتھ ایک بچہ تھا۔ جو شدید زخمی ہوا اور اب نہ جانے کہاں ہے۔ میرے سفر کی تھکن کوڑوں سے اتاری گئی۔ میری ضیافت کے لیے منہ میں کپڑے ٹھونسے گئے اور میرے آرام کے لئے قبر کا انتخاب کیا گیا......... میرے دل میں شہزادی تاتاشا کے لیے انتقام کے شعلے بھڑک رہے ہیں ڈیوک۔"

"شاباش اباقہ!" ڈیوک نے اباقہ کا کندھا تھپ تھپایا۔ "ان شعلوں کو بھڑکائے رکھنا۔ یہ بڑے کام کی آگ ہے۔"

"مجھے کرنا کیا ہوگا؟" اباقہ نے پوچھا۔

"کچھ نہیں، تمہیں ہمارے دوست توزن بلخ کے اس شاندار محل میں صرف آرام کرنا ہوگا۔ وقت آنے پر تمہیں کام بتایا جائے گا۔"

"کیا میں اپنے دوستوں سے ملاقات کر سکتا ہوں؟"

"ہرگز نہیں۔" ڈیوک نے کہا۔ "میں نے تمہیں ابھی بتایا ہے کہ ماضی سے تمہارا کوئی رابطہ نہیں رہے گا۔ ماضی تمہاری موت ہے اور حال زندگی' اپنی زندگی کو سنبھالو۔ موت کی طرف مت دوڑو۔"

اباقہ نے کچھ دیر سوچ کر کہا۔ "ڈیوک! عقوبت خانے کے بوڑھے خدمتگار سے کیا سلوک ہوگا؟"

"ڈیوک بولا۔ "اسے بھی تمہاری طرح سزائے موت ہو چکی ہے لیکن اگر تم ہمارا ساتھ دینے پر تیار ہو تو اس کی زندگی محفوظ رہے گی۔"

اباقہ نے کہا۔ "مجھے سوچنے کے لیے وقت درکار ہے۔"

ڈیوک بولا۔ "میں اس کام کے لیے تمہیں آٹھ پہر دے سکتا ہوں"

اباقہ نے سر ہلا کر رضامندی ظاہر کی۔ ڈیوک نے تالی بجائی اور دو خادمائیں اباقہ کو لے کر اندرونی حصے کی طرف بڑھ گئیں۔

☆---------☆---------☆

توزن بلخ کے محل کے ایک کمرے میں اباقہ مسہری پر نیم دراز تھا۔ اس کی آنکھیں گہری سوچ میں ڈوبی تھیں۔ ڈیوک سے آٹھ پہر کی مہلت لینے کی اسے قطعاً ضرورت نہیں تھی۔ وہ بہت پہلے ڈیوک کا ساتھ دینے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ مہلت اس

نے صرف اس لیے طلب کی تھی کہ اس کی جلدی بازی کہیں ڈیوک کو شک میں نہ ڈال دے۔ اباقہ سمجھ چکا تھا ڈیوک درحقیقت رئیس اعظم سے غداری کر رہا ہے۔ وہ وادی میر کے ہزاروں لاکھوں انسانوں کی موت کا سامان کر رہا تھا۔ حالانکہ ڈیوک نے اعتراف نہیں کیا تھا لیکن اباقہ جان چکا تھا کہ وہ درپردہ منگولوں کا طرفدار ہے۔ اس طرفداری میں وہ کوئی ایسی کارروائی کرنے والا تھا جو حکومت کی دفاعی تیاریوں کو تہ و بالا کر سکتی تھی۔ یہ کارروائی کیا تھی۔ اس کے متعلق ڈیوک نے کوئی اشارہ نہیں دیا تھا۔ ظاہر تھا وہ اتنی جلدی اباقہ پر اعتماد نہیں کرے گا۔ اباقہ کے سامنے اب دو راستے تھے۔ ایک یہ کہ وہ کسی طرح محل سے نکلے اور حکومت کے ذمے دار افراد کو ساری حقیقت سے باخبر کر دے۔ دوسرا راستہ یہ تھا کہ خود کو شاہی خاندان کا دشمن ظاہر کر کے ڈیوک کے لیے کام کرنا قبول کرے اور یوں اس نامعلوم سازش کی تہہ تک پہنچے۔ پہلے طریقے میں کامیابی کا امکان بہت کم تھا۔ ڈیوک اتنا بے وقوف نہیں تھا کہ اس کی غداری آسانی سے ثابت کی جا سکتی۔ اس نے کھلے لفظوں میں اباقہ کے سامنے ملک دشمنی کا اعلان کیا تھا لیکن اباقہ کے پاس اس اعلان کا کوئی ثبوت نہیں تھا۔ فرض محال وہ محل سے نکل کر نائب رئیس یا شہزادی تاتاشا تک پہنچ بھی جاتا کہ ڈیوک تم سے غداری کر رہا ہے تو وہ اس کی بات پر یقین کرتے؟

ڈیوک کا شاہی خاندان میں زبردست اثر و رسوخ تھا۔ اباقہ دیکھ چکا تھا کہ عقوبت خانے میں وہ کس بے تکلفی سے شہزادی کے ساتھ مصروف گفتگو تھا۔ یقیناً اس نے شاہی خاندان پر اپنی وفاداری اور قابلیت کا سکہ جما رکھا تھا۔ اباقہ اس کے خلاف شکایت کر کے اپنی سزا میں اضافے کے سوا اور کیا کر سکتا تھا۔ ڈیوک کے چہرے سے نقاب نوچنے کے لئے ثبوت درکار تھا۔ کوئی نہایت ٹھوس ثبوت......... لیکن سوچنے کی بات تھی کیا ڈیوک آسانی سے اس کی وفاداری کا یقین کر لے گا۔ یہ خیال آتے ہی اباقہ کا ذہن ایسے الفاظ ڈھونڈنے میں مصروف ہو گیا جن میں وہ مؤثر طریقے سے ڈیوک کے سامنے اظہار وفاداری کر سکے......... سوچتے سوچتے اباقہ کی نگاہ کھڑکی سے باہر چلی گئی۔ وہ محل کی دوسری منزل پر قیام پذیر تھا۔ کھڑکی سے دور تک کے منظر نظر آ رہے تھے۔ شہر سے آگے ایک برف پوش کوہستانی سلسلہ حد نگاہ تک چلا گیا تھا۔ اباقہ کی سوچ پرواز کرتی ہوئی ان پہاڑوں کو پار کر کے دوسری طرف نکل گئی۔ دور بہت دور سرحد عراق کے کسی سرسبز گاؤں کا نقشہ اس کی آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ تصور کی نگاہوں سے اس نے مارینا کا ملیح چہرہ دیکھا۔ وہ گھر کے صحن

میں بیٹھی دھان کوٹ رہی تھی۔ یا گندم صاف کر رہی تھی۔ شاید سلیمان کے ہونے والے بچے کے لیے ایک ننھا سا کرتا بنا رہی تھا۔ بے خیالی میں اس کے ہونٹوں پہ منگول نغمہ مچل رہا تھا جو اباقہ نے پہلی بار قراقرم میں سنا تھا۔ وہی اداس اور رس بھرا نغمہ' جس میں ابدی پیاس کا ذکر تھا۔ روح کی پیاس' محبت کی پیاس اور ایک خوبصورت گھر کی پیاس وہ ایک تنہا پتھر پر بیٹھی تھی اور اس کے گیلے بالوں سے قطرہ قطرہ پانی ٹپک رہا تھا......... اباقہ کو اپنی کھردری ہتھیلی پر اس پانی کا لمس آج بھی یاد تھا .... اباقہ کے سینے سے ایک ہوک نکلی۔ وہ سوچنے لگا کتنا اچھا ہوتا عراق چھوڑنے سے پہلے وہ مارینا سے شادی کر لیتا۔ اس کے دامن کو خوشیوں سے بھر کر اس کی پیاس کو محبت کے سمندر میں ڈبو دیتا......... لیکن یہ خیال آتے ہی سلطان جلال کی خون رنگ چادر اس کی آنکھوں کے سامنے کھل گئی......... نہیں اس نے بڑے کرب سے سوچا۔ جو کچھ ہوا ٹھیک ہوا۔ اسے ایسا ہی کرنا چاہیے تھا۔ سلطان کے غم کو پس پشت ڈال کر وہ اپنی خوشیوں کا سامان کر لیتا تو اس کا دل اسے کبھی معاف نہ کرتا۔ ابھی تو سلطان کے دیئے ہوئے زخموں سے خون ٹپک رہا تھا۔ ابھی تو اس کے سانسوں کی مہک فضاؤں میں موجود تھی۔

"......... آہ عبداللہ مشہدی!" اباقہ دانت پیس کر زیر لب بڑبڑایا۔ "تیری موت میری زندگی پر قرض ہے۔ تیرے لہو کا گراں بار میں شب و روز کندھوں پہ اٹھائے پھرتا ہوں۔ جس روز تو میرے سامنے آیا وہ تیری زندگی کا آخری روز ہو گا۔ ظالم شخص تو نے ایک وار میں مجھ سے میری دو عزیز ترین ہستیاں چھین لیں۔ میرا سلطان مجھ سے جدا کر دیا اور میری مارینا کو مجھ سے دور کر دیا۔ میں تجھے کبھی معاف نہ کروں گا۔"

اباقہ بیٹھا رہا اور سوچتا رہا' مارینا روپ بدل بدل کر اس کے خیالوں میں آتی رہی اور وہ خاموشی کی زبان میں اس سے عہد و پیماں کرتا رہا......... جس وقت اباقہ مارینا کے بارے میں سوچ رہا تھا ایک اور شخص بھی ایسا کر رہا تھا......... وہ طوطم خان تھا۔ وہ ایک تازہ دم گھوڑے پر سوار ولادی میر سے باہر جانے والے راستے پر محو سفر تھا۔ اس کی دونوں جانب اونچے نیچے برف پوش ٹیلے تھے' کہیں کہیں روسی دہقان اپنے جھونپڑی نما گھروں سے برف ہٹاتے دکھائی دیتے تھے۔ طوطم خاں کی آنکھیں ان مناظر سے لطف اندوز ہو رہی تھیں اور ذہن مارینا کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس کا حسین سراپا' اس کی صراحی دار گردن' اس کے مسکرانے کا انداز ایک

ایک بات طوطم خاں کو یاد آ رہی تھی۔ وہ دل ہی دل میں پکار اٹھا۔ "اے نیلے آسمان سے اترنے والی حسین ترین عورت' تو میری ہے صرف میری۔ دیکھ! تیری خاطر میں بھیڑیوں کے جنگل میں گھسنے جا رہا ہوں۔ اس جنگل سے واپسی پر سب سے بڑے بھیڑیے باتو خان کا سر میرے تھیلے میں ہو گا۔ اگر یہ نہ ہوا تو پھر طوطم خاں بھی نہ ہو گا۔ وہ تیری محبت پر قربان ہو چکا ہو گا۔"

طوطم خاں کے اس سفر کا فیصلہ کل شام ہوا تھا۔ کل شام نائب رئیس نے شاہی مہمانوں کو ایک خاص نشست میں بلایا تھا۔ حکومت کے اہم عہدیداران اور مشیر بھی وہاں موجود تھے۔ موضوع بحث شہر کا دفاع تھا' نائب رئیس نے خاص طور پر مائیکل کے ہمراہ پہنچنے والے مہمانوں سے مشورے طلب کئے تھے۔ بحث و تمحیص کے بعد جو چند مشورے قبول کئے گئے تھے ان میں ایک مشورہ اسد کا بھی تھا۔ اسد نے کہا تھا کہ دشمن کی نقل و حرکت سے باخبر رہنے کے لیے ضروری ہے کہ چند جاسوس' منگول لشکر میں موجود ہوں۔ اگر منگول ولادی میر میں جاسوسی کا جال بچھا سکتے ہیں تو ہمیں بھی یہ کٹھن کام کر گزرنا چاہیے۔

منگول لشکر کی ہیبت اہل شہر پر اس طرح طاری تھی کہ ان کی صفوں میں گھسنے کا تصور بھی محال نظر آتا تھا۔ اسد کی تجویز سن کر ہی کئی مقامی عہدیداروں کے چہرے سفید پڑ گئے اس وقت طوطم خاں نے اپنی نشست چھوڑی اور کھڑے ہو کر یہ اعلان کیا کہ اس ذمے داری کے لیے وہ خود کو پیش کرتا ہے۔ طوطم خاں کی پیشکش کے بعد یکے بعد دیگرے تین اور منگول اٹھے اور انہوں نے نائب رئیس کے سامنے خود کو بطور رضا کار پیش کیا۔ باہم مشورے سے طے ہوا کہ چاروں افراد الگ الگ منگول لشکر کی طرف روانہ ہوں تاکہ کسی بدقسمتی کے سبب وہ ایک ساتھ ہی نہ پکڑے جائیں۔ نائب رئیس کے حکم پر ان چاروں کو منگول سپاہیوں کی مخصوص وردیاں اور ہتھیار مہیا کر دیے گئے۔ ضروری تیاری کے بعد سب سے پہلے طوطم خاں ولادی میر سے روانہ ہوا تھا......... اور اب اسے سفر کرتے ہوئے ڈھائی پہر گزر چکے تھے۔ ولادی میر کے مضافات کافی پیچھے رہ گئے تھے اور برف پوش وسعتوں میں اسے منگول ٹڈی دل کی تلاش تھی۔

خود کو جاسوسی کے لیے پیش کرنے میں طوطم خاں کا اپنا مفاد شامل تھا۔ وہ جانتا تھا کہ میدان جنگ میں چنگیز کے پوتے باتو خاں تک پہنچنا اور اس کا سر حاصل کرنا ایک دیوانے کا خواب ہے۔ جنگ کے دوران منگول صفوں کے پیچھے جانبازوں

میں گھرا ہوا باتو خان طوطم سے اتنا ہی دور رہتا۔ جتنا زمین سے نیلا آسمان تھا۔ اب اگر کسی طرح باتو خاں کا سر حاصل ہو سکتا تھا تو وہ جگہ میدان جنگ ہرگز نہیں تھی۔ طوطم خاں نے جب اباقہ کے سامنے باتو کے سر کی شرط رکھی تھی تو یہ نہایت سوچ سمجھ کر کیا تھا۔ اس وقت بھی اسے معلوم تھا کہ میدان جنگ میں باتو کا سر حاصل کرنے کا امکان اگر اباقہ کے لیے پانچ فیصد ہے تو خود اس کے لیے ایک فیصد بھی نہیں اور شاید اباقہ نے بھی اسی لیے یہ شرط قبول کرلی تھی۔ اس نے سوچا ہو گا یہ طوطم کا پاگل پن ہے۔ باتو خاں تک وہ کہاں پہنچ پائے گا۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ اس کوشش میں زندگی ہار جائے۔ اگر وہ اپنی موت آپ مر رہا تھا تو اباقہ کو کیا ضرورت تھی اس کے راستے میں آنے کی .... لیکن اباقہ نہیں جانتا تھا کہ طوطم خاں کے ذہن میں ایک گہری چال ہے۔ ایک ایسی چال جو باتو خاں جیسے طاقتور اور بلند اقبال سپہ سالار کی گردن اس کے خنجر تلے لا سکتی تھی .... طوطم خاں کو چار برس پہلے کا وہ زمانہ یاد تھا۔ جب قراقرم میں اس کی ملاقات زریں خیل سے آئے ہوئے ایک قافلے کے ساتھ ہوئی تھی۔ زریں خیل کا فرمان روا خان باتو تھا جو روس پر یلغار کرنے والی فوج کا سپہ سالار اعظم تھا۔ چنگیز خاں کے حرامی بیٹے جوچی کی اولاد تھا۔ جوچی اپنے دوسرے بھائیوں سے الگ تھلگ روس کے زرخیز دشتی علاقے میں رہا کرتا تھا۔ حرامی ہونے کا داغ پیشانی پر لئے قراقرم جانے سے ہمیشہ کتراتا رہا۔ خاقان اوغدائی نے اس کی موت کے بعد اس کے بیٹے باتو کو اسی علاقے کا والی مقرر کر رکھا تھا۔ طوطم خاں کی ملاقات اسی علاقے سے آئے ہوئے ایک قافلے کے ساتھ ہوئی تھی۔ اس قافلے میں ایک ایسا شخص بھی تھا جو باتو خاں کا ذاتی حجام تھا۔ اس کا نام مینگو تھا۔ مینگو اس قافلے کا ایک غیراہم شخص تھا لیکن جس بات نے اسے اہم بنا دیا وہ یہ تھی کہ اس کی شکل ہو بہو طوطم خاں سے ملتی تھی۔ طوطم خاں بھی مینگو سے ملنے پہنچا تھا اور اسے دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ چند روز ان دونوں کی زبردست مشابہت کا خوب تذکرہ رہا تھا۔ اس بات کو عرصہ گزر چکا تھا لیکن طوطم خاں کو یہ سب کچھ یاد تھا۔ اب کئی برس بعد اس حیرت انگیز اتفاق نے طوطم کو ایک ایسی کامیابی کا رستہ دکھایا تھا جو اسے اس کی حسین ترین منزل تک پہنچا سکتی تھی۔ اس کے ذہن میں دیر سے جو منصوبہ پرورش پا رہا تھا اس پر عمل کرنے کا وقت آگیا تھا۔

☆ ———— ☆ ———— ☆

تاشا شاہی محل کی بالکونی میں افسردہ کھڑی تھی۔ کئی پریشانیوں نے اسے گھیر رکھا تھا۔ سب سے پہلے تو اس کی پیاری سہیلی زارینہ منگول سپاہیوں کی بربریت کا شکار ہوئی۔ پھر وہ دلادی میر پہنچی تو پتہ چلا کہ اس کا باپ کنیازیوری فوج جمع کرنے کے لیے شہر سے باہر ہے۔ اس دوران سازشیوں نے شہر میں آفت مچا دی۔ شاہی مہمانوں کو زہر دینے کی خوفناک سازش کی گئی۔ شہر کے ایک حصے میں حملے کی افواہ پھیلا کر نظم ونسق درہم برہم کر دیا گیا۔ بے شمار لوگ ہلاک اور زخمی ہوئے۔ یہ تمام معاملات اپنی جگہ سنگین اور غمزدہ کرنے والے تھے' لیکن اس وقت ایک اور طرح کی افسردگی شہزادی پر طاری تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے رہ رہ کر اس نوجوان کا چہرہ آرہا تھا جسے اس نے سزائے موت کا حکم سنایا تھا۔ والد کی غیر موجودگی میں اس نے سینکڑوں افراد کی موت کے پروانے پر دستخط کئے تھے لیکن کبھی ایسا پچھتاوا اس کے ذہن میں نہیں سمایا۔ اس نے اس پچھتاوے کو بار بار جھٹکنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ ہر بار شدت سے ابھرا تھا۔ اس کی نگاہوں میں بار بار وہ منظر گھوم جاتے تھے جب وہ نوجوان کے ساتھ برف زار میں محو سفر تھی۔ اس برف زار میں وہ شہزادی نہیں صرف ایک عورت تھی کمزور اور بے بس' لیکن نوجوان نے اسے شرافت سے دلادی میر تک پہنچایا تھا۔ پھر اس نے شاہی ضیافت گاہ میں زہر دینے کی سازش ناکام بنا کر اور شہر کے مشرقی حصے میں خوفزدہ لوگوں کو حادثے سے بچا کر جو اہم کارنامے انجام دیے تھے۔ وہ اس بات کا تقاضا کرتے تھے کہ اسے انعام و اکرام سے نوازا جائے لیکن انعام کے بدلے اسے شدید ذہنی و جسمانی اذیت اور عبرتناک موت کے تحفے دیے گئے تھے۔ یہ سب کچھ اچانک ہی ہو گیا تھا .... تاشا کو احساس ہو رہا تھا کہ اس نے جلد بازی سے کام لیا ہے۔ جب عقوبت خانے میں گورکی نے اباقہ کا زخم پہچانا تھا اور انکشاف کیا تھا کہ اسی شخص نے رات لوگوں کو ہلاکت سے بچایا تو تاشا حیران رہ گئی تھی۔ اسے اس بات پر بھی حیرت ہوئی تھی کہ قیدی یہ سب کچھ کرنے کے بعد دوبارہ عقوبت خانے میں واپس آگیا ہے۔ اس بدنام ترین عقوبت خانے میں رضاکارانہ طور پر واپس پہنچنا بڑے دل گردے کا کام تھا اور قیدی نے یہ قربانی' بوڑھے خدمتگار کو الزام سے بچانے کے لیے دی تھی۔

اس وقت تاشا کے ذہن میں خیال ابھرا تھا کہ اس جوانمردی کے صلے میں اباقہ کی جان بخش دی جائے۔ اس نے ڈیوک پر اپنے خیال کا اظہار بھی کیا تھا' لیکن پھر ڈیوک نے نہ جانے کیا دلیل پیش کی تھی کہ وہ پروانہ موت پر دستخط کو تیار ہو گئی تھی .... ہاں جو کچھ ہوا وہ جلد بازی میں ہوا۔ اس میں زیادہ قصور ڈیوک کا تھا۔ اس نے اسے کچھ سوچنے

سمجھنے کا موقع ہی نہیں دیا۔

نتاشا نے سوچا کہ وہ کس طرح اس بے رحمی کا ازالہ کر سکتی ہے۔ اگر وہ نوجوان شادی شدہ ہوتا تو وہ اس کے بال بچوں پر نوازش کر کے دل کا بوجھ ہلکا کر لیتی۔ اگر اس کے بوڑھے والدین ہوتے تو وہ انہیں شاہی مراعات سے نواز سکتی تھی۔ مگر اس کا تو کوئی بھی نہیں تھا۔ نہ جانے کہاں کا رہنے والا تھا اور کہاں سے آیا تھا .... دفعتاً شہزادی نتاشا کے ذہن میں ایک خیال برق کی طرح کوندا۔ آج سوموار تھا۔ اتوار کے روز کسی کو سزائے موت نہ دی جاتی تھی۔ اگر گیوڑا نے قیدی کو سزا نہ دی ہو تو ممکن ہے .... ممکن ہے وہ ابھی زندہ ہو۔ یہ خیال ذہن میں آتے ہی نتاشا کے قدم خود بخود متحرک ہو گئے۔ وہ تیزی سے کمرے میں آئی اور تالی بجا کر اپنی رازداں کنیز کلثوم کو بلا لیا۔

"کلثوم! ہم اسی وقت قید خانے میں جائیں گے۔" اس نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

"اس وقت شہزادی صاحبہ؟" کلثوم نے حیرت سے کہا۔

"ہاں اسی وقت۔" وہ گرجی۔ "جلدی سے کسی محافظ کو بلاؤ۔"

.... تھوڑی ہی دیر بعد شہزادی نتاشا' کلثوم اور دو محافظوں کے ساتھ تیز قدموں سے عقوبت خانے کی طرف جا رہی تھی۔ محل سے ایک سرنگ سیدھی عقوبت خانے کے آہنی دروازے تک پہنچتی تھی۔ وہ دروازے پر پہنچے تو جلاد گیوڑا نے آگے بڑھ کر ان کا استقبال کیا۔ شہزادی دھڑکتے دل کے ساتھ سیڑھیاں اترنے لگی۔ اس کے ذہن نے بے اختیار سوچا کاش قیدی آہنی زنجیروں میں موجود ہو اور اپنی زندگی کے لیے کسی معجزے کا انتظار کر رہا ہو۔ کاش ابھی اس نے موت کی سرحد پار نہ کی ہو' وہ اسے رہا کرنے کا پکا ارادہ کر چکی تھی .... جونہی وہ آخری سیڑھیوں پر پہنچی اس کی نگاہ آہنی زنجیروں کی طرف اٹھ گئی .... وہ خالی جھول رہی تھیں قیدی ان میں موجود نہیں تھا۔ نتاشا نے ایک گہری سانس لی اور اپنے رنج پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔ چند لمحے بعد اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"گیوڑا! قیدی کہاں ہے؟"

گیوڑا نے کہا۔ "شہزادی صاحبہ! اسے تو آپ کے حکم کے مطابق کل ہی ہلاک کر دیا گیا تھا۔"

"ٹھیک ہے۔" نتاشا باوقار لہجے میں بولی۔ "ہمیں یہی تصدیق کرنا تھی۔" پھر وہ الٹے قدموں واپس چل دی۔ اس کے چہرے پر سکون مگر سینے میں مدوجزر تھا۔ زندگی میں پہلی بار اسے کسی جاندار کی موت کا افسوس ہو رہا تھا۔ محل کی طرف جاتے ہوئے وہ سوچ رہی

تھی کہ بدنصیب قیدی کے وارثوں کے لیے ضرور کچھ نہ کچھ کرے گی۔ اگر اس کے والدین نہیں تھے تو قریبی عزیز بھائی بہن وغیرہ ضرور ہوں گے۔ ان کے متعلق جاننے کے لیے وہ اس کے ساتھیوں سے رابطہ قائم کر سکتی تھی۔ وہ سوچنے لگی کہ یہ رابطہ ٹھیک رہے گا یا نہیں۔ اسی ادھیڑبن میں وہ محل میں پہنچی تو معلوم ہو کہ کچھ لوگ اس سے ملنا چاہتے ہیں۔ وہ شاہانہ انداز سے نشست گاہ میں داخل ہوئی اور اسد یورق وغیرہ کو دیکھ کر چونک گئی۔ اباقہ کے ساتھیوں کی حیثیت سے وہ انہیں اچھی طرح پہچانتی تھی۔ انہیں دیکھ کر پہلا خیال نتاشا کے ذہن میں یہی آیا کہ اس کا اندیشہ درست تھا۔ اباقہ نے مرنے سے پہلے ساتھیوں کو اپنی گرفتاری کے متعلق بتا دیا ہے۔ یہ خیال آتے ہی اس کے چہرے پر ایک گہری سنجیدگی چھا گئی اور وہ پھر سے شہزادی نتاشا نظر آنے لگی۔ رسمی کلمات کے بعد اس نے مائیکل سے پوچھا۔

"کیسے آئے ہیں آپ لوگ؟"

مائیکل نے احتیاط سے لفظوں کا انتخاب کرتے ہوئے کہا۔ "محترم شہزادی صاحبہ۔ ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ماسکو سے ولادی میر تک کے سفر میں ہمارے ساتھی اباقہ نے آپ کی شان میں کوئی گستاخی کی ہے جس کی سزا اسے قید کی شکل میں ملی ہے .... خدانخواستہ ہمارے کہنے کا مقصد یہ نہیں کہ آپ نے اسے قید کر کے کوئی ناانصافی کی ہے۔ آپ کا فیصلہ ہر شے سے بالاتر ہے' ہم تو صرف اپنے ساتھی کی طرف سے اظہار ندامت کے لیے حاضر ہوئے ہیں۔ وہ ایک جنگلی شخص ہے' برسوں مہذب معاشرے سے دور رہا ہے۔ شاہی آداب سے نابلد ہے۔ اگر اس کا کوئی عمل آپ کے مزاج پر گراں گزرا ہو تو ہم معافی کے خواستگار ہیں۔"

شہزادی نتاشا تیکھے لہجے میں بولی۔ "مختصراً کہو۔ کیا کہنا چاہتے ہو؟"

مائیکل نے کہا۔ "معظمہ شہزادی صاحبہ! ہم ملزم کے لیے رحم کی درخواست کرتے ہیں۔"

شہزادی غصے سے بولی۔ "تم نے یہ کیسے فرض کر لیا کہ تمہارا ساتھی ہماری قید میں ہے۔"

مائیکل اور اسد کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔ اسد نے صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔ "شہزادی صاحبہ! آپ کے رتبے اور اس کی نادانی نے ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کیا۔"

شہزادی کوئی سخت جواب دینا چاہتی تھی لیکن شاید اسے خیال آ گیا کہ اسد نے ماسکو کے محل میں اس کی جان بچائی تھی۔ وہ لہجے پر قابو پاتے ہوئے بولی۔

"ہم اس حقیقت کو سمجھتے ہیں کہ آپ لوگ ابل بیازان کے بلاوے پر یہاں آئے ہیں اور اس لیے ہمارے دل میں آپ لوگوں کا احترام ہے' لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ ہمارے نظامِ انصاف پر شک کریں۔ خاص طور پر مجھے مائیکل ہوورتھ سے گلہ ہے .... مائیکل تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ ہم چوری چھپے کسی مہمان کو قید میں ڈالیں گے؟"

مائیکل سر جھکائے بیٹھا رہا۔ شہزادی نے رعب سے کہا۔ "اگر تمہیں کسی طرح سے یہ اطلاع ملی ہے کہ تمہارا ساتھی شاہی حراست میں ہے تو یہ اطلاع غلط فہمی یا بدنیتی پر مبنی ہے۔ ممکن ہے یہ سازشیوں میں سے کسی کی حرکت ہو۔"

اسد' مائیکل اور یورق کے پاس اب کہنے کو کچھ نہیں رہا تھا۔ انہوں نے اٹھ کر اجازت لی اور نشست گاہ سے باہر نکل آئے' ان تینوں کے چہروں پر سخت تشویش پائی جاتی تھی۔ معاملہ نہایت الجھا ہوا تھا۔ گمشدگی کے بعد اباقہ اور اسد کے درمیان صرف ایک مختصر سا مکالمہ ہوا تھا۔ اب اسی مکالمے پر وہ مفروضے قائم کر رہے تھے۔ زہریلی ضیافت کو درہم برہم کرنے کے بعد جب اباقہ شاہی محل سے رخصت ہو رہا تھا تو اسد نے اسے پہچان کر اس کا پیچھا کیا تھا۔ اس موقعے پر اباقہ نے بتایا تھا کہ اس پر اور علی پر شہزادی نتاشا کے آدمیوں نے حملہ کیا ہے۔ اباقہ کے اس جملے سے انہوں نے فرض کیا تھا کہ وہ نتاشا کی قید میں ہے مگر شہزادی صاف انکار کر رہی تھی۔ اس کے انکار سے ایک خدشہ یہ بھی پیدا ہو گیا تھا کہ ممکن ہے شاہی حراست میں اباقہ کو کوئی حادثہ پیش آگیا ہو۔ زیرِ زمین شاہی عقوبت خانے کے متعلق انہوں نے بہت سی لرزا خیز کہانیاں سنی تھیں۔ اگر اباقہ اس عقوبت خانے میں پہنچا تھا تو اس کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

وہ تینوں شاہی محل کی ڈیوڑھی سے نکل اور اپنے اپنے خیالوں میں گم پیدل ہی مہمان خانے کی طرف چل دیے۔ مائیکل نے کہا۔

"علی کے ساتھ ساتھ اب ہمیں اباقہ کو بھی تلاش کرنا ہو گا۔ میرا خیال ہے کہ اس تلاش کا آغاز ہم ولادی میر کے مرکزی قید خانے سے کریں۔ کل کسی وقت قید خانے کا چکر لگایا جائے۔ ممکن ہے کسی جرم میں اسے گرفتار کر کے قید میں ڈال دیا گیا ہو۔ شہر میں ہنگامی حالت نافذ ہے اور انتظامیہ اجنبیوں سے نہایت سختی برت رہی ہے۔ اباقہ کو مہمان خانے سے نکلتے وقت احتیاط کرنی چاہیے تھی۔"

☆------☆------☆

توزان باخ کی محل نما رہائش گاہ میں تین چار روز اباقہ نے نہایت آرام سے گزارے۔ وہ سارا دن مسہری سے پاؤں لٹکائے لیٹا رہتا اور ایک کنیز وقفے وقفے سے اس

کے پاؤں کسی محلول سے دھوتی رہتی اس کے جلے ہوئے تلوے اب چلنے پھرنے کے قابل ہو چکے تھے۔ چہرے کے زخم بھی مناسب علاج سے مندمل ہو رہے تھے۔ چوتھے روز شام کے وقت توزن باخ نے اسے نشست گاہ میں طلب کیا۔ وہ نشست گاہ میں پہنچا تو ڈیوک کو بھی وہیں پایا۔ جلاد دیگوڈا ایک کونے میں مؤدب کھڑا تھا۔ ڈیوک نے کہا۔

"میرا خیال ہے اباقہ۔ تم جیسا آدمی بیکار بیٹھنے سے اکتا جاتا ہے۔"

اباقہ بولا۔ "ڈیوک! آپ نے بالکل درست اندازہ لگایا ہے۔"

ڈیوک نے کہا "میں نے تمہاری بے کاری ختم کرنے کا سامان کیا ہے۔" اباقہ ہمہ تن گوش ہو گیا۔ ڈیوک بولا۔ "تمہیں معلوم ہو گا کہ پچھلے ہفتے شہر کے مشرقی حصے میں گڑبڑ ہوئی تھی۔ منگول حملے کی افواہ پھیلی تھی اور کچھ گھروں کو آگ لگا دی گئی تھی۔ میری اطلاعات کے مطابق تم بھی وہاں موجود تھے اور شاہی خاندان سے حقِ وفاداری ادا کرتے ہوئے تم نے لوٹ مار کرنے والوں سے مقابلہ کیا تھا۔"

اباقہ نے کہا۔ "آپ کی اطلاع بالکل درست ہے مجھے افسوس ہے کہ میری تلوار ظالموں کی حمایت میں اٹھتی رہی۔" اس کے لہجے میں شاہی خاندان کے لیے نفرت کا اظہار نہایت واضح تھا۔ ڈیوک خوش ہو کر بولا۔

"میں چاہتا ہوں کہ تم خود سے ہونے والی ناانصافیوں کا حساب لو۔ جن لوگوں نے تمہاری قدر نہیں کی انہیں بتاؤ کہ تم کیا ہو۔"

اباقہ ادب سے جھک کر بولا۔ "میں ڈیوک کے حکم کا منتظر ہوں۔"

ڈیوک نے کہا۔ "اس ہنگامے میں کچھ افراد کو قیدی بنایا گیا تھا۔ ان میں ہمارا ایک نہایت خاص آدمی "سولیونی" بھی شامل ہے۔ سولیونی کی رہائی ہمارے لیے بے حد اہم ہے۔ وہ کچھ ایسے رازوں سے آگاہ ہے جن کا افشا ہمارے مقاصد کی موت ہے۔ سولیونی نے اب تک بڑی برداشت کا ثبوت دیا ہے اور سخت اذیتوں کے باوجود زبان بند رکھی ہے' لیکن وہ تادیر ایسا نہیں کر سکے گا۔ اس سے پہلے کہ وہ شاہی جلادوں کے سامنے سر ڈال دے ہمیں اسے آزاد کرانا ہے۔ ہماری اطلاعات کے مطابق آج بعد دوپہر اسے مرکزی قید خانے کی ایک قریبی علاج گاہ میں لے جایا جائے گا۔ ہم چاہتے ہیں کہ تم قید خانے اور علاج گاہ کے درمیانی راستے میں سرکاری گاڑی پر حملہ کر کے اسے چھڑانے کی کوشش کرو۔"

اباقہ بولا۔ "مجھے یہ کام کر کے بہت خوشی ہو گی۔"

"شاباش۔ مجھے تم سے یہی امید تھی۔ اب میں تمہیں وہ تفصیلات بتاتا ہوں جو اس

کام کے لیے درکار ہوں گی .... تصدیق شدہ اطلاعات کے مطابق سولیونی کو دوپہر سے ٹھیک چار گھڑی بعد ایک بند گاڑی میں قید خانے سے باہر لایا جائے گا۔ قید خانے کی مخصوص دھاتی گاڑی سیاہ رنگ کی ہے۔ اس کے عقب میں صرف ایک چھوٹا سا دروازہ ہے۔ دونوں پہلوؤں پر چوکور روشندان ہیں جن میں آہنی سلاخیں لگی ہوئی ہیں۔ گاڑی کے اندر پہنچنا تقریباً ناممکن ہے۔ واحد صورت یہی ہے گاڑی کو قیدی سمیت محافظوں سے چھین لیا جائے۔ محافظوں کی تعداد کے متعلق ہمیں حتمی معلومات حاصل نہیں۔ بہرحال یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ ان کی تعداد سولہ سے زیادہ نہیں ہو گی۔ چار محافظ سامنے' دو دو پہلوؤں میں اور آٹھ عقب میں ہو سکتے ہیں۔ قوی امکان ہے کہ تعداد اس سے کم ہو گی۔ اگر تم قید خانے کے بیرونی دروازے سے کوئی ایک فرلانگ دور کارروائی کرنے میں کامیاب ہو جاؤ تو کامیابی کے امکانات نہایت روشن ہیں۔ اس چھوٹے سے چوراہے سے ایک سڑک سیدھی اس عمارت کی طرف جاتی ہے جہاں ہم نے گاڑی چھپانے کا مکمل انتظام کر رکھا ہے۔ ایک دفعہ تم اس عمارت میں داخل ہو گئے تو بالکل محفوظ ہو جاؤ گے۔ گاڑی گھوڑوں سمیت سیدھی ایک تہہ خانے میں چلی جائے گی اور خفیہ راستہ بند ہو جائے گا۔ قید خانے کے محافظ لاکھ سر پٹکیں مگر گاڑی کا سراغ نہ لگا سکیں گے' بالآخر وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ گاڑی عمارت کے دوسرے دروازے سے نکل گئی ہے.........."

اباقہ بڑے غور سے ڈیوک کی باتیں سن رہا تھا۔ تمام معلومات ترتیب وار اس کے ذہن میں جمع ہو رہی تھیں۔ ایک طویل نشست کے بعد اباقہ وہاں سے اٹھا اور یگوڑا کے ساتھ موقع محل کا جائزہ لینے چل دیا۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے ایک بند گاڑی استعمال کی۔ شہزادی نتاشا کی نظروں میں اباقہ ہلاک ہو چکا تھا۔ اگر کسی جگہ کوئی اسے شناخت کر لیتا تو مسئلہ کھڑا ہو جاتا۔

یگوڑا اور اباقہ موقع کا تفصیلی جائزہ لے کر دوپہر کے وقت واپس آئے۔ ڈیوک اس وقت تک دس عدد شہسواروں کا انتظام کر چکا تھا۔ ان سواروں کو اباقہ کے ساتھ مل کر کارروائی میں حصہ لینا تھا۔ وہ سب کے سب تنومند اور پوری طرح مسلح تھے۔ انہیں اباقہ کی کمان میں دے کر ڈیوک واپس چلا گیا۔ توزن باغ کے اصطبل میں اب اباقہ اور اس کے ساتھی سوار تنہا تھے۔ اباقہ نے موقع محل کی مناسبت سے انہیں ضروری ہدایات دیں اور ڈیوک کے مخبروں کی طرف سے آخری اطلاعات کا انتظار کرنے لگا۔ پرخطر کاموں میں اباقہ کو عجیب طرح کا سرور آتا تھا۔ ایسے وقت اس کا سینہ سنسنی خیز دھڑکنوں سے لبریز ہو جاتا تھا۔ کسی ایسے درندے کی طرح جو اپنے شکار پر جھپٹنے کے لیے تیار ہو اس کی تمام

بیدار ہو کر جوان ہو جاتی تھیں۔

وقت دھیرے دھیرے گزرتا رہا۔ سورج روبہ زوال ہوا اور سائے بڑھنے لگے۔ آخر وہ اطلاع پہنچ گئی جس کا انتظار تھا۔ ایک گھڑ سوار مخبر اصطبل میں داخل ہوا اور اس نے بتایا کہ قیدی کو طے شدہ وقت کے مطابق علاج گاہ میں منتقل کیا جا رہا ہے۔ اباقہ اور اس کے ساتھی گھوڑوں پر سوار بیٹھے تھے۔ انہوں نے لگاموں کو جنبش دی اور گھوڑے متحرک ہو کر اصطبل کے دروازے کی طرف بڑھے۔

☆---------☆---------☆

مائیکل نے متعلقہ افسر سے اجازت نامہ حاصل کر لیا تھا۔ اب وہ اسد اور یورق کو لے کر مرکزی قید خانے کی طرف جا رہا تھا۔ زیادہ امید تو نہیں تھی لیکن ممکن تھا کہ قیدیوں کے ہجوم میں انہیں اباقہ کا چہرہ بھی نظر آ جاتا۔ ابھی وہ قید خانے کے صدر دروازے سے ایک فرلانگ دور تھے کہ ایک سیاہ گھوڑا گاڑی دکھائی دی۔ وہ مسلح محافظوں کے نرغے میں چوراہے کی طرف آ رہی تھی۔ مائیکل نے اسد اور یورق کی دلچسپی دیکھ کر انہیں بتایا کہ کسی قیدی کو علاج گاہ یا عدالت میں لے جایا جا رہا ہے۔

گاڑی درمیانی رفتار سے چلتی چوراہے میں پہنچی اس وقت تک وہ تینوں بھی چوراہے میں داخل ہو چکے تھے۔ دفعتاً ایک گلی سے چند گھڑ سوار برآمد ہوئے۔ ان کے ہاتھوں میں عریاں تلواریں کسی خطرے کا احساس دلا رہی تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے محافظوں پر حملہ کر دیا۔ حملہ آوروں کے چہرے پگڑیوں میں پوشیدہ تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ تینوں کچھ سمجھتے کئی محافظ تہ تیغ ہو گئے۔ گاڑی کے آگے جانے والے چار محافظ شور سن کر پلٹے اور تلواریں سونت کر ساتھیوں کے دفاع کو لپکے۔ اس وقت اسد نے دیکھا کہ ایک حملہ آور تیزی سے گھوڑا بھگاتا آیا پھر اس نے گاڑی پر چھلانگ لگائی۔ وہ شاید کوچ بان پر حملہ کرنا چاہتا تھا' لیکن کوچ بان ہوشیار نکلا اور اس نے نقصان اٹھانے سے پہلے ہی نیچے چھلانگ لگا دی۔ حملہ آور نے کوچ بان کی جگہ سنبھال کر گھوڑوں کی راسیں تھامیں اور نہایت مہارت سے انہیں آگے بڑھا دیا.......... دو محافظ گھوڑا گاڑی کی طرف لپکے لیکن راستے میں ہی تلواروں کا نشانہ بن گئے۔ گھوڑا گاڑی نے نہایت سرعت سے چکر کاٹا اور ایک سیدھی سڑک پر آ گئی یہ سب کچھ چند لمحوں کے اندر اندر وقوع پذیر ہوا۔ مائیکل چلایا۔

"میرا خیال ہے یہ شرپسندوں کا کام ہے۔"

اسد بولا۔ "ہمیں محافظوں کی مدد کرنا چاہیے۔"

مائیکل نے تلوار نیام سے باہر کر کے اسد کے خیال کی تصدیق کی۔ اسد اور یورق کی

تلواریں ایک ساتھ باہر آئیں وہ گھوڑا گاڑی کی طرف بڑھے۔ گھوڑا گاڑی اب سیدھی ان کی طرف آ رہی تھی۔ مائیکل چلایا۔ "رک جاؤ۔" گاڑی کی رفتار میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ یورق گاڑی کے راستے میں آیا کوچبانی کرنے والے شخص پر تلوار سے وار کیا۔ اس شخص نے حیرت انگیز پھرتی سے وار بچایا' مگر اسد کا وار کارگر رہا۔ اس نے نیچے جھک کر نہایت ہوشیاری سے ایک گھوڑے کی ٹانگوں پر وار کیا تھا۔ گھوڑے کی اگلی ٹانگ گھٹنے سے کٹ گئی اور وہ لڑکھڑا کر اوندھے منہ گرا۔ اپنے ساتھ وہ دوسرے دو گھوڑوں اور گاڑی کو بھی لیتا چلا گیا۔ زبردست گڑگڑاہٹ سے گاڑی اور گھوڑے زمین میں گھستے چلے گئے۔ کوچبانی کرنے والا اچھلا اور گھوڑوں کے اوپر سے ہوتا ہوا سڑک پر آیا۔ اسد اس کی طرف جھپٹا۔ تلوار کا پہلا وار حملہ آور نے جھک کر بچایا۔ دوسرے وار سے پہلے وہ سنبھل چکا تھا۔ دونوں کی تلواریں پوری شدت سے ٹکرائیں۔ اسد کو مدِمقابل کی بے پناہ قوت کا احساس ہوا۔ دفعتاً اس کے ذہن میں برق سی کوندگئی۔ اس نے غور سے حملہ آور کی آنکھیں دیکھیں اور پہچان گیا.......... اس کے سامنے اباقہ تھا' یہ اباقہ کے سوا اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

اسد کی تلوار منجمد ہو گئی "اباقہ" اس کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔

اباقہ نے سنی ان سنی کرتے ہوئے ایک بھرپور وار کیا۔ تلوار اسد کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گری۔ اباقہ نے گھوڑا گھمایا اور گھوڑا گاڑی کی طرف لپکا۔ گھوڑے ابھی تک تڑپ تڑپ کر اٹھنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ ان کی اس کوشش میں گاڑی ایک پہلو پر الٹ کر نیم دائرے میں گھوم رہی تھی۔ اباقہ نے قریب پہنچتے ہی دروازے کے آہنی قفل پر تلوار کے دو طوفانی وار کیے قفل ٹوٹ کر نیچے جا گرا' لیکن اس سے پہلے کہ وہ دروازہ کھولتا یورق گھوڑے کو گھما کر اباقہ کے سامنے آ گیا۔ اباقہ اور یورق کی تلواریں جھنجھنا اٹھیں۔ یورق کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ ابھی تک اباقہ کو پہچاننے میں ناکام رہا تھا۔ اسد آواز دے کر اسے بتانا چاہتا تھا کہ اس کے مقابل اباقہ ہے' لیکن وہ کسی فیصلے پر پہنچ نہیں پا رہا تھا۔ ممکن تھا اباقہ کسی خاص مقصد کے تحت خود کو چھپانا چاہتا ہو۔ دوسری طرف اگر وہ یورق کو نہ بتاتا تو ہو سکتا تھا اباقہ کو کوئی گزند پہنچتا.......... اب محافظ بھی ان کی مدد کو پہنچ چکے تھے۔ گھوڑا گاڑی کے اطراف زبردست لڑائی ہو رہی تھی۔ اسد نے یورق کو اباقہ کے ہاتھوں زخمی ہو کر گھوڑے سے گرتے دیکھا اور حیران رہ گیا۔ یورق نے اپنی زخمی ران دونوں ہاتھوں سے دبا رکھی تھی۔ اس وقت قید خانے کے صدر دروازے سے مزید محافظ موقع کی طرف لپکتے دکھائی دیے۔ اباقہ اور اس کے ساتھی بھی شاید یہ منظر

دیکھ چکے تھے۔ انہوں نے اچانک پسپائی اختیار کی اور دفاعی لڑائی لڑتے مختلف اطراف میں بھاگ نکلے۔

☆----------☆----------☆

منظر توزن بارخ کی نشست گاہ تھا۔ ڈیوک اباقہ کا کندھا تھپ تھپا رہا تھا۔ "کوئی بات نہیں اباقہ' کامیابی اور ناکامی ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ تم نے بہادری سے اپنی ذمے داری نبھائی ہے۔"

اباقہ نے کہا۔ "ڈیوک! میں چاہتا ہوں کہ مجھے اس کام کے لیے ایک اور موقع فراہم کیا جائے۔"

"حوصلہ رکھو جان من۔ حوصلہ رکھو۔" ڈیوک خوشدلی سے بولا۔ "میں جلد تمہیں پھر طلب کروں گا۔ اب تم جاؤ آرام کرو۔"

اباقہ نے جھک کر سلام کیا اور باہر نکل گیا۔ توزن بارخ نے گنجے سر پر ہاتھ پھیرا اور معنی خیز نظروں سے ڈیوک کی طرف دیکھنے لگا۔

ڈیوک بولا۔ "میں نے دستے میں دو مخبر بھی بھیجے تھے۔ ایک تو مارا گیا دوسرے نے جو اطلاعات دی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے اباقہ نے قریباً قریباً کامیابی حاصل کر ہی لی تھی۔ وہ کوچبان کو نیچے گرا کر اس کی نشست سنبھال چکا تھا۔ اتفاق یہ ہوا کہ جونہی گاڑی چوراہے سے گھوم کر سیدھی سڑک پر آئی سامنے سے تین سوار نکل آئے۔ ان میں ایک فوجی افسر مائیکل ہورتھ تھا۔ ان لوگوں نے گاڑی کا راستہ روکا اور ایک گھوڑے کی ٹانگ کاٹ دی۔ اتنے میں محافظ بھی پیچھے سے آ کر مقابلہ کرنے لگے۔ اباقہ نے پھر بھی کوشش کر کے گاڑی کے دروازے کا قفل توڑ دیا مگر اس دوران قید خانے سے بھی کمک پہنچ گئی مجبوراً ان لوگوں کو پسپا ہونا پڑا۔"

توزن بارخ اپنی مہین آواز میں بولا۔ "اس کا مطلب ہے تم اس نوجوان سے مطمئن ہو؟"

ڈیوک بولا۔ "پیارے تم تو جانتے ہو کہ ایسے کاموں میں اتنی جلدی مطمئن نہیں ہوا جاتا۔ تاہم مجھے امید ہے کہ جوان وفادار ثابت ہو گا۔"

توزن بولا۔ "اس سے امید کی کوئی خاص وجہ؟"

ڈیوک نے کہا۔ "ہاں اس کی ایک وجہ ہے.......... تھوڑی دیر پہلے معلوم ہوا ہے کہ گھوڑا گاڑی کا راستہ روکنے والے تین افراد میں دو افراد اباقہ کے قریبی ساتھیوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک کا نام اسد ہے۔ دوسرا کوئی منگول ہے۔ اباقہ نے نہ

صرف ان سے کوئی رابطہ قائم نہیں کیا بلکہ ان میں سے ایک کو مقابلے کے دوران زخمی بھی کر دیا ہے۔ اس اتفاقیہ جھڑپ سے ہمیں اس بات کا کھلا ثبوت ملا ہے کہ اباقہ ہمارے احکام کی پوری طرح پابندی کر رہا ہے۔"

توزن بارخ بولا۔ "میرا خیال ہے کہ عیش و عشرت کی چکا چوند نے اسے اسیر کر لیا ہے۔"

ڈیوک نے کہا۔ "مجھے تم اتفاق نہیں۔ اباقہ کو ہماری نوازشات نے متاثر ضرور کیا ہے لیکن اس کے رویے کا اصل محرک اس کے ساتھ ہونے والا ناروا سلوک ہے۔ وہ شہزادی تناشا اور شاہی خاندان کی دشمنی میں بہت آگے نکل گیا ہے۔"

توزن بولا۔ "جذبات سے کھیلنا تمہیں خوب آتا ہے ڈیوک۔"

ڈیوک کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ وہ بولا۔ "توزن' یہ شخص ایک ہیرا ہے ہیرا۔ ذرا صبر کرو' پھر دیکھو میں اس سے کیا کام لیتا ہوں۔" توزن بارخ نے قریب کھڑی کنیز کو اپنے پاس بلایا۔ اس کنیز کا نام روما تھا اور وہ مصری نژاد تھی۔ ناچ گانے کے علاوہ خوبصورتی میں بھی وہ لاجواب تھی۔ توزن نے کہا۔ "روما! اس جنگلی پر ایسا جادو کر کہ یہ یہیں کا ہو کر رہ جائے۔"

روما نے ادب سے کہا۔ آقا! میں آپ کی آنکھوں سے آپ کے دل کی بات جان لیتی ہوں۔ جب آپ نے مجھے اس کی خدمت پر مامور کیا تھا میں اسی وقت سمجھ گئی تھی کہ آپ کیا چاہتے ہیں.......... لیکن آقا' یہ خاصا بدذوق بلکہ کسی حد تک بیوقوف شخص ہے۔ پچھلے تین روز سے ٹس سے مس نہیں ہوا۔ بھلا بتایئے میری موجودگی میں کسی مرد کو نیند آسکتی ہے' لیکن وہ سوتا ہے بلکہ گھوڑے بیچ کر سوتا ہے۔ مجھے تو مسہری کے قریب بھی نہیں پھٹکنے دیتا۔"

"تو تم اپنی شکست کا اعتراف کر رہی ہو؟"

"نہیں کوشش تو میں جاری رکھوں گی' لیکن وہ کسی اور ڈھب کا آدمی لگتا ہے۔ ایک دن اس کے پاؤں دباتے لگی یوں اچھل کر کھڑا ہو گیا جیسے بچھو نے کاٹ کھایا ہو۔ ناچ گانے سے اس کوئی دلچسپی نہیں۔ کوئی ہنسی کی بات کروں تو اس کے سر سے گزر جاتی ہے.......... مجھے تو پاگل لگتا ہے۔ کسی دن ہڈی پسلی ہی ایک نہ کر دے۔"

توزن اور ڈیوک قہقہہ لگا کر ہنس دیئے۔ توزن بولا۔

"پیاری! اسے پاگل مت سمجھ۔ دیکھنے میں لگتا ہو گا مگر بہت گہرا شخص ہے۔"

☆--------☆--------☆

طوطم خان اپنے حلیے اور لباس سے اردوئے معلی (منگول لشکر) کا کوئی بھٹکا ہوا سوار دکھائی دیتا تھا۔ اس کے چہرے پر سفر کی تھکان تھی اور آنکھوں میں تلاش۔ وہ نگی نایا ندی کے کنارے ماسکو کے نواح میں پہنچ چکا تھا اور یہاں پہنچ کر اسے اندازہ ہوا تھا کہ وہ درست سمت میں جا رہا ہے۔ علاقے کے دیہات خالی تھے۔ فصلیں اجڑی ہوئی تھیں اور جگہ جگہ مسخ شدہ لاشوں پر چیل کوؤں کے جھنڈ نظر آتے تھے۔ یہی منگول پڑاؤ کی نشانیاں تھیں۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ ڈیڑھ لاکھ وحشی انسانوں کا جم غفیر قرب وجوار میں کہیں موجود ہے اور اپنا اگلا سفر پھر شروع کرنے سے پہلے دانت تیز کر رہا ہے۔

بالآخر چوتھے روز دوپہر کے وقت اسے منگول لشکر کے پڑاؤ کے آثار نظر آنے لگے۔ سب سے پہلے ایندھن کی تلاش میں نکلے ہوئے چند چھکڑے نظر آئے۔ کچھ آگے جا کر اس نے بلندی سے دیکھا تو حد نگاہ تک گول خیموں کا ایک جنگل دکھائی دیا' لیکن یہ صرف پڑاؤ کا ایک حصہ تھا۔ طوطم خان کو یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ وہ سپہ سالار اعظم کے پڑاؤ سے زیادہ دور نہیں۔ یاک کی نو دموں والا بلند و بالا پرچم باتو خاں کے پڑاؤ کی نشاندہی کر رہا تھا۔ وہ اتنی دور سے باتو خاں کا عظیم الشان زریں یورت (خیمہ) تو نہیں دیکھ سکتا تھا' لیکن پرچم کے مقام سے اندازہ ہوتا تھا کہ سپہ سالار کا یورت کوئی چار فرلانگ کے فاصلے پر ہے یہ سوچ کر طوطم خان کو اطمینان ہوا کہ پڑاؤ کے اس حصے میں اسے جاننے والا کوئی نہ ہو گا۔ ظاہر تھا باتو خاں کے خیمے کی چاروں جانب اس کے اپنے قبیلے زریں نیل کے خیمے تھے اور ان اجنبی لوگوں میں کوئی اسے کیسے جان سکتا تھا۔

وہ جانتا تھا باتو خاں کی طرح دوسرے شہزادے بھی اپنے اپنے شناختی پرچموں تلے اپنی افواج کے ساتھ خیمہ زن ہوں گے۔ اس لشکر عظیم میں چغتائی' اوغدائی اور تولوئی کے بیٹے شامل تھے۔ تسخیر روس کی اس مہم میں بہت سے منگول بچے انسانی شکار کے داؤ پیچ سیکھ رہے تھے۔ درحقیقت یہ یلغار چنگیز خان کے پوتوں کا ایک تربیتی سفر بھی تھا' جو وہ عظیم جنگجو سویدائی بہادر کی رہنمائی میں طے کر رہے تھے۔

طوطم خان کچھ دیر بلندی پر کھڑا پڑاؤ کا جائزہ لیتا رہا پھر اس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور نیلے جاودانی آسمان کو یاد کر کے منگول پڑاؤ کی طرف چل دیا۔ اسے سب سے پہلے شاہی حجام مینگو کو تلاش کرنا تھا۔ وہ دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا کہ نہ صرف مینگو اسے مل جائے بلکہ وہ بطور شاہی حجام اپنے فرائض بھی انجام دے رہا ہو۔

طوطم خان نے نصف چہرا سموری ٹوپی کی جھالر میں چھپا رکھا تھا۔ اسے احساس تھا کہ پڑاؤ کے اس حصے میں مینگو سے مشابہت کے سبب اس کے لیے کوئی مسئلہ کھڑا ہو سکتا ہے۔

مینگو کو بتانے میں حرج بھی کوئی نہیں تھا۔ اسے اب زندہ تھوڑا ہی رہنا تھا۔ اپنے متعلق کر طوطم نے مینگو سے اردوئے معلّی کے حالات پوچھے۔ مینگو نے محتاط لہجے میں جو کچھ بتایا اس کا لب لباب یہ تھا کہ منگول لشکر کو والادی میر پر حملے میں تاخیر ہو رہی ہے۔ اس تاخیر کی ایک وجہ مغل شہزادوں کی آپس کی چپقلش بھی ہے۔ وہ کسی فیصلے تک پہنچنے میں کافی دیر لگاتے ہیں۔ مینگو نے بتایا کہ باتو خاں اپنے رشتے کے بھائیوں سے بڑی مروت اور نرمی سے پیش آتا ہے اس لیے وہ اس سے بہت بے تکلف ہو گئے ہیں اور بعض اوقات اسے دق بھی کرنے لگتے ہیں۔ ایک طرف وہ اس کی مہمان نوازی پر اسے سائیں خاں (شاندار آدمی) کا خطاب دیتے ہیں اور دوسری طرف اس کی سادگی کا مذاق اڑاتے ہیں۔ خاص طور پر چغتائی خاں کے شریر بیٹے اس کے احکامات کی بالکل پروا نہیں کرتے۔ وہ آج کل شکار میں مصروف ہیں۔ امید ہے کہ ہفتے سے پیشتر کوچ کا حکم نہیں ہو گا۔"

.... طوطم خان بغور مینگو کی باتیں سن رہا تھا۔ اس سے غلطی ہوئی کہ وہ مینگو کی طرف سے پوری طرح ہوشیار نہ رہ سکا۔ مینگو جو جان بوجھ کر باتوں کو طول دے رہا تھا کسی ایسے ہی موقعے کی تلاش میں تھا۔ زمین دوز برتن سے جام بھرنے کے بہانے وہ جھکا' لیکن پھر تیزی سے سیدھا ہوا اور گھوم کر طوطم خاں پر آیا۔

برتن پر جھکتے وقت وہ اپنا خنجر ہاتھ میں کر چکا تھا۔ اگر طوطم سے ذرا بھی چوک، ہوتی تو یہ خنجر اس کی گردن میں پیوست ہو گیا ہوتا۔ پھرتی سے وار بچا کر اس نے مینگو کا جسم اپنے ہاتھوں پر روکا اور پھر ٹانگیں سکیڑ کر اس کے پیٹ سے لگا دیں۔ کمر پہلے ہی دیوار سے لگی ہوئی تھی یکدم زور سے اس نے جو ٹانگیں سیدھی کیں تو مینگو اچھل کر دیوار سے جا ٹکرایا۔ شدید ٹکر سے خستہ دیوار منہدم ہو گئی اور بہت سی اینٹیں مینگو پر جا گریں۔ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر طوطم نے چھلانگ لگائی اور مینگو پر گرا۔ خم دار خنجر ابھی تک مینگو کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے لیٹے لیٹے طوطم کو نشانہ بنانا چاہا مگر طوطم نے اس کا ہاتھ گرفت میں لے لیا۔ دونوں کا پلہ برابر تھا۔ زبردست کشمکش کے دوران اچانک طوطم داؤ چل گیا۔ اس نے مینگو کی کلائی اس انداز سے موڑی کہ خنجر اس کا اپنا ہی پیٹ چاک کر گیا۔

☆ ☆ ☆

اباقہ دونوں ہاتھ سینے پر باندھے کھڑا تھا۔ ڈیوک اس سے مخاطب تھا اور کہہ رہا تھا کہ آج علاج گاہ میں سولیوئی کی آخری رات ہے۔ اسے قید خانے واپس پہنچنے سے پہلے ہر صورت آزاد ہونا چاہیے۔ ڈیوک کی گفتگو سے اباقہ نے نتیجہ اخذ کیا کہ وہ آج رات علاج گاہ میں چھاپہ مار کارروائی کروانا چاہتا ہے۔ اس نے ڈیوک سے کہا۔

"محترم ڈیوک! میرے ذہن میں ایک اور منصوبہ ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ کام آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ کل دوپہر تک سولیوئی آپ کے پاس ہو گا۔"

اباقہ کے اس دوٹوک لہجے پر ڈیوک حیران رہ گیا۔ اباقہ کے چہرے پر جھلکتا ہوا بے پناہ اعتماد اس کے دعوے کو معتبر بنا رہا تھا۔ ڈیوک نے تعریفی نظروں سے اباقہ کو دیکھا اور بولا۔

"ٹھیک ہے اباقہ' میں طریقہ کار کا انتخاب تم پر چھوڑتا ہوں مجھے یقین ہے اس دفعہ تم کسی خوشخبری کے ساتھ لوٹو گے۔"

اباقہ نے کہا۔ "ڈیوک! میں آپ کی توقع پر پورا اترنے کے لیے جان کی بازی لگا دوں گا۔"

"شاباش اباقہ! میں نے تم سے بڑے کام لینے ہیں۔"

اباقہ نے ڈیوک سے اجازت طلب کی اور واپس اپنی آرام گاہ میں آ گیا۔ اس کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ سولیوئی کو شاہی حراست سے چھڑانے کا ایک منصوبہ اس کے ذہن میں تھا۔ اس منصوبے نے اس وقت جنم لیا تھا جب اسد کے وار سے گھوڑے کی ٹانگ کٹی تھی۔ تلوار بازی کے دوران اتفاقاً اباقہ کی نگاہ گاڑی کے پیندے کی طرف چلی گئی تھی۔ اس کی عقابی نگاہوں سے یہ بات چھپی نہ رہ سکی تھی کہ گاڑی کا آہنی فرش بری طرح زنگ آلود ہے۔ خاص طور پر اگلے پہیوں کے درمیان ایک مقام پر آہنی چادر بے حد متاثر تھی۔ یہاں سے گاڑی کے اندر بچھی ہوئی سیاہ دری جھانک رہی تھی۔

اس بات کا نوے فیصد امکان تھا کہ سولیوئی کو علاج گاہ سے وہی گاڑی واپس قید خانے لائے گی۔ اس بات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اباقہ نے پچھلے تین روز سے علاج گاہ اور قید خانے کے درمیان کئی چکر لگائے تھے۔ یہ چکر اس نے ایک بند گھوڑا گاڑی میں لگائے تھے۔ ایک دفعہ یگوڈا نے بھی اس کا ساتھ دیا تھا۔ اباقہ نے اس ڈیڑھ کوس کے راستے کا ہر نشیب و فراز ذہن نشین کر لیا تھا.......... اور اب وہ ایک نتیجے پر پہنچ چکا تھا.......... علاج گاہ سے کوئی چار فرلانگ دور ایک موڑ ایسا پڑتا تھا جو اباقہ کی کارروائی کے لیے موزوں ثابت ہو سکتا تھا۔ یہ موڑ قریباً نوے درجے کا زاویہ بناتا تھا۔ موڑ مڑنے کے ساتھ ہی ایک ڈیڑھ گز اونچی دیوار دور تک سڑک کے ساتھ ساتھ چلی گئی تھی۔ یہ دیوار سرکاری مویشی خانے کی تھی۔ منگول حملے کے خطرے کے پیش نظر یہاں سینکڑوں کی تعداد میں مویشی جمع کیے جا رہے تھے تاکہ قلعہ بند ہونے کی صورت میں خوراک کے کام آ سکیں۔ اباقہ اس نتیجے

پر پہنچا تھا کہ جب قید خانے کی گھوڑا گاڑی یہ موڑ مڑے گی۔ پیچھے آنے والا محافظ دستہ کم از کم بیس گز دور ہو گا۔ ان کے موڑ مڑنے سے پہلے اگر سولیونی گاڑی سے نکل کر مویشی خانے کی دیوار پھاند جاتا ہے تو کسی کو خبر نہ ہوتی۔ جہاں تک گھوڑا گاڑی سے نکلنے کا مسئلہ تھا وہ بہت کچھ اباقہ طے کر چکا تھا .... اس رات وہ دیر تک اپنے منصوبے کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتا رہا پھر خادمہ روما کو "خوابگاہ بدر" کر کے سو گیا۔

اگلے روز اباقہ کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ ڈیوک کے مخبروں نے بتایا کہ سرکاری گھوڑا گاڑی سولیونی کو لینے کے لیے علاج گاہ پہنچ چکی ہے۔ اس اطلاع کے بعد اباقہ نے علاج گاہ پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی۔ سیاہ رنگ کی گھوڑا گاڑی علاج گاہ کے احاطے میں ایک درخت کے نیچے کھڑی تھی۔ عقبی دروازے کے دائیں بائیں دو نشستیں تھیں جہاں نیزہ بردار محافظ چوکس بیٹھے تھے۔ تقدیر نے یہاں بھی اباقہ کا ساتھ دیا۔ گاڑی کے گرد کوئی مسلح محافظ نظر نہیں آیا۔ اگر کوئی تھا بھی تو وہ اِدھر اُدھر ہو گیا تھا۔ یا ہو سکتا تھا محافظوں کے اس جم غفیر میں شامل ہو گیا تھا جو علاج گاہ کے اندر سولیونی کا پہرا دے رہے تھے۔

اباقہ نے ایک چکر لگایا اور نہایت صفائی سے گاڑی کے نیچے رینگ گیا۔ پہیوں کو باہم مربوط کرنے والے لٹھ نما حصوں کو پکڑ کر وہ گاڑی کے پیندے سے چپک گیا۔ کمر کے پیچھے کوئی سہارا نہیں تھا اس لیے وہ جانتا تھا کہ اسے مستقل یہ حالت برقرار رکھنے کے لیے سخت کوشش کرنا پڑے گی .... وقت دھیرے دھیرے رینگتا رہا۔ پھر گاڑی کے اردگرد محافظوں کی چہل پہل نظر آنے لگی۔ دو محافظ باتیں کرتے ہوئے گاڑی کے بالکل قریب چلے آئے۔ وہ ترکی بول رہے تھے۔ ان کی باتوں سے اباقہ پر انکشاف ہوا کہ اس محافظ دستے کا کمان دار اسد اللہ ہے۔ اسد نے جس طرح گاڑی پر حملے کو ناکام بنایا تھا۔ اس نے داروغہ قید خانہ کو بہت متاثر کیا تھا۔ اس نے اسد سے درخواست کی تھی کہ وہ اس خطرناک مجرم کی نقل و حرکت کے دوران اس کی محافظت کرے۔ اباقہ کے لبوں پر ایک خفیف مسکراہٹ کھیل گئی۔ حالات اسے بار بار اسد کے سامنے لا رہے تھے۔

کوئی دو گھڑی کے کٹھن انتظار کے بعد مجرم کی روانگی کے آثار نظر آئے۔ پھر اباقہ نے سولیونی کے پاؤں دیکھے۔ وہ محافظوں کے نرغے میں گاڑی پر سوار ہو رہا تھا۔ یہ بڑے پُر خطر لمحات تھے۔ کسی بھی وقت کوئی ہوشیار محافظ گاڑی کے نیچے جھانک سکتا تھا۔ ایک موقعے پر تو اباقہ بال بال بچا' گھوڑوں کی لید اٹھانے کے لیے ایک شخص نیچے جھکا۔ اگر اس کا رخ ذرا سا تبدیل ہو جاتا تو وہ اباقہ کو دیکھ لیتا بہرحال یہ مراحل عافیت سے گزر گئے۔ ایک دھچکے کے ساتھ گاڑی حرکت میں آئی اور اس کے ساتھ ہی اباقہ نے اپنا کام شروع کر

دیا۔ اس نے لباس کے اندر سے ایک آری نما آلہ نکالا اور آہستہ آہستہ لوہے کی خستہ چادر کو کاٹنے لگا۔ پہلے تو کچھ مشکل پیش آئی پھر توقع سے زیادہ حوصلہ افزائی ہوئی۔ کئی جگہ سے جربھری چادر با آسانی کٹ گئی۔ چند بالشت چادر کاٹنے کے بعد اباقہ نے زور لگایا اور لوہے نے مڑ کر فرش میں ایک چھوٹا سا خلا کھول دیا۔ حسب توقع اباقہ کو دوسری جانب سولیونی کا حیرت زدہ چہرہ نظر آیا۔ کچھ کہنے سننے کی گنجائش نہیں تھی۔ وقت بہت کم تھا۔ گاڑی تیزی سے مختلف سڑکوں پر بھاگ رہی تھی۔ اباقہ نے خلا میں ہاتھ ڈالا اور سولیونی کی پشت پر بندھے ہوئے ہاتھوں کی بندش کاٹ دی۔ ہاتھ آزاد ہوتے ہی سولیونی کے چہرے پر امید کی جھلک نظر آنے لگی۔ اباقہ نے اپنے لباس کے اندر سے ایک اور آہنی آری نکال کر سولیونی کو تھما دی۔ سولیونی بغیر الفاظ کے سب کچھ سمجھ رہا تھا۔ اباقہ کی طرح اس نے بھی جلدی جلدی ایک جانب سے چادر کو کاٹنا شروع کر دیا۔ وقت محدود تھا اور مقررہ موڑ سے پہلے اباقہ اتنا چوڑا خلا پیدا کرنا چاہتا تھا جس سے سولیونی باہر نکل سکے۔ یہ ایک مشقت طلب کام تھا۔ سخت سردی میں بھی وہ پسینہ پسینہ ہو رہے تھے۔ مسلسل جھٹکے ان کے کام کو دشوار تر بنا رہے تھے۔ آخر ان کی دیوانہ وار محنت رنگ لائی اور چادر تین اطراف سے مناسب حد تک کٹ گئی۔ اباقہ نے زور لگا کر اسے دوہرا کیا اور سولیونی نے اپنا سر خلا میں ڈال دیا۔ باہر نکلنا ضرورت سے زیادہ دشوار ثابت ہوا۔ اباقہ کے ہاتھ زخمی ہو گئے اور کٹی ہوئی چادر نے سولیونی کے جسم پر بھی چرکے لگائے۔ عقب سے دیکھے جانے کا دھڑکا بھی ہر لمحے لگا ہوا تھا۔ یہ خطرہ بھی موجود تھا کہ راستے میں کوئی ابھرا ہوا پتھر ان دونوں کے مزاج پوچھ جائے۔ بالآخر سولیونی باہر نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔

اباقہ تیز نظروں سے اردگرد کا جائزہ لے رہا تھا۔ سولیونی بھی اب اسی کی طرح گاڑی کے پیندے سے چپکا ہوا تھا۔ مشکل یہ تھی کہ سولیونی صرف روسی جانتا تھا۔ اباقہ نے روسی ملی ترکی میں اسے لائحہ عمل سمجھانے کی کوشش کی پھر ناکام ہو کر اسے یہ بتایا کہ وہ بس اس کی نقل کرتا جائے۔ سولیونی نقل کرنے والی بات سمجھ گیا اور اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اباقہ کو اب اسی موڑ کا انتظار تھا جو کسی بھی لمحے پہنچا چاہتا تھا .... اور پھر گاڑی کے پہیوں نے چرچرا کر موڑ کی آمد کا اعلان کیا۔ اباقہ نے کہنی مار کر سولیونی کو چوکس کیا .... جونہی گاڑی نے موڑ مکمل کیا' اباقہ اور سولیونی نے ایک ساتھ گاڑی کا پیندا چھوڑ دیا۔ وہ پشت کے بل نیم پختہ راستے پر گرے اور تھوڑا سا پھسل کر ساکت ہو گئے۔ یکایک انہیں سر پر نیلا آسمان نظر آیا۔ گاڑی آگے گزر چکی تھی۔ "بھاگو!" اباقہ بولا اور اٹھ کر تیزی سے مویشی خانے کی دیوار کی طرف لپکا۔ سولیونی نے فوراً اباقہ کی تقلید کی اور اٹھ کر

اس کے پیچھے لپکا۔

دیوار پھلانگنے سے پہلے اباقہ نے دائیں طرف دیکھا اور اس کا دل اچھل کر رہ گیا۔ اس کے تمام اندازے غلط ثابت ہوئے تھے' یا کہہ لیجیے کہ اسد نے اس کے تمام اندازے غلط کر دیے تھے۔ عقبی محافظ دستہ گاڑی سے بہت قریب تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ دونوں دیوار پھاندتے اسد اور اس کے ساتھی موڑ پر پہنچ کر انہیں دیکھ چکے تھے۔ بہر طور اب رکنا فضول تھا۔ اباقہ اور سولیونی نے آگے پیچھے مویشی خانے میں چھلانگیں لگا دیں۔ اس حصے میں بیل بند تھے۔ سینکڑوں کی تعداد میں ہر نسل کے بیل اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ اباقہ نے چاردیواری کی دوسری جانب محافظوں کے آوازے سنے' وہ بدحواسی میں چلا رہے تھے۔ اس بات میں شبہے کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی کہ ان کا فرار ظاہر ہو چکا ہے۔

اباقہ نے سولیونی کا ہاتھ پکڑا اور بیلوں کے عظیم الشان ریوڑ میں گھستا چلا گیا۔ چارے پیشاب اور گوبر کی ملی جلی بو ان کے نتھنوں سے ٹکرائی۔ کئی بیل ان سے دشمنی پر آمادہ ہوئے لیکن اباقہ اور سولیونی ان کے سینگوں سے بچتے آگے بڑھتے چلے گئے۔ جانوروں کے اس جم غفیر میں نکاسی کا راستہ تلاش کرلینا آسان نہیں تھا۔ جلد ہی انہیں ایسی آوازیں سنائی دیں جن سے پتہ چلا کہ محافظ تلواریں سونتے مویشی خانے میں گھس آئے ہیں اور انہیں تلاش کر رہے ہیں۔ آوازوں کی سمت کا اندازہ کرکے وہ خود کو بچاتے رہے۔ وہ زیادہ تیزی بھی نہیں دکھا سکتے تھے۔ ایسا کرنے سے جانور بدکتے اور ان کی نشاندہی ہو جاتی۔ آخر ایک جگہ دو محافظوں سے ان کا سامنا ہو گیا۔ محافظوں نے انہیں دیکھتے ہی چلانے کے لیے منہ کھولا مگر اباقہ نے اتنی مہلت نہیں دی۔ اس نے دو قدم بھاگ کر چھلانگ لگائی اور ان دونوں کو لیتا ہوا زمین پر گرا۔ اس کے بازو محافظوں کی گردنوں سے اس طرح لپٹ گئے تھے کہ آواز نکالنا تو کجا انہیں سانس لینا بھی دشوار لگا ہوگا۔ ایک زبردست جھٹکے سے اباقہ نے ان دونوں کے سر ٹکرا دیے۔ اس عمل کے بعد نہایت اطمینان سے اس نے انہیں گرفت سے آزاد کر دیا۔ وہ بے جان لاشوں کی طرح زمین پر لڑھک گئے۔ دونوں کے ہاتھوں میں عریاں تلواریں تھیں اباقہ نے ایک تلوار اٹھائی اور سولیونی کو تھما دی۔ جونہی اباقہ سیدھا کھڑا ہوا اسے اپنے سامنے اسد نظر آیا۔ وہ دونوں محافظوں کے پیچھے ہی پیچھے یہاں پہنچا تھا۔ اباقہ آج ایک مختلف لباس میں تھا اور چہرہ حسب سابق پگڑی میں چھپا ہوا تھا' لیکن وہ جانتا تھا یہ پگڑی اسے اسد سے نہیں چھپا سکتی۔ پلک جھپکتے میں اسد اسے پہچان گیا۔ وہ تیزی سے بولا۔

"اباقہ! کیا بات ہے؟ تم کہاں غائب ہو۔"

اباقہ نے جواب دینے کی بجائے تلوار سیدھی کی اور اسد پر حملہ آور ہوا۔ اسد نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر اباقہ کا وار روکا۔ اس کے چہرے پر حیرانی تھی۔ اسے یاد تھا کہ اباقہ نے یوسق کو زخمی کر دیا تھا۔ اس لیے وہ کچھ محتاط بھی نظر آتا تھا۔ وہ تیزی سے بولا۔

"اباقہ! کچھ تو بتاؤ۔ کیا چاہتے ہو؟"

اباقہ نے سنی ان سنی کرتے ہوئے اسد پر ایک اور شدید حملہ کیا۔ اسد نے ایک وار بچایا تو اباقہ کی تلوار ایک بیل کی پسلیوں میں گھس گئی۔ وہ زور سے ڈکرایا اور تڑپ کر اچھلا اسد کی نگاہ ایک لمحہ کے لیے اباقہ سے ہٹی۔ اباقہ نے دو قدم بھاگ کر اسد کو کندھے سے ایک زوردار دھکا دیا۔

وہ اچھل کر بیلوں کے درمیان جا گرا۔ اباقہ کو کئی محافظوں کے سر نظر آئے تھے۔ وہ ریوڑ میں راستہ بناتے دو اطراف سے ان کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اباقہ اور سولیونی نے سر جھکائے اور دیکھتے ہی دیکھتے جانوروں کی بھیڑ میں گم ہو گئے۔

بیلوں کے درمیان جھک کر چلتے ہوئے انہوں نے ایک باڑ پار کی اور ایسے حصے میں پہنچ گئے۔ جہاں جنگلی گھوڑوں کے غول گھوم رہے تھے۔ گھوڑوں کے درمیان ہی درمیان چلتے وہ بالآخر نکاسی کے راستے کے قریب پہنچ گئے جہاں دو محافظ پہرا دے رہے تھے' لیکن اس طرح کہ مزے سے اپنی نشستوں سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ مویشی خانے کے ایک حصے میں ہونے والی ہلچل سے وہ قطعی بے خبر دکھائی دیتے تھے۔ ان کی یہ بے خبری اباقہ اور سولیونی کے لیے نہایت قیمتی تھی۔ انہوں نے گھوڑوں کے درمیان گھومتے ہوئے دو گھوڑے منتخب کیے اور پھر ایک ساتھ اچھل کر ان پر سوار ہو گئے۔ باڑے کا چوبی دروازہ وہ پہلے ہی کھول چکے تھے۔ گھوڑوں کے ایالوں (گردن کے بال) کو راسوں کی طرح استعمال کرتے ہوئے انہوں نے ایڑ لگائی۔ محافظوں نے جب اباقہ اور سولیونی کو دیکھا وہ گھوڑوں کو بھگاتے باڑے سے باہر نکل رہے تھے.......... اباقہ کی نظریں محافظوں پر جمی تھیں۔ ان میں سے صرف ایک محافظ کے کندھے پر کمان لٹک رہی تھی۔ یہ کمان ان کے لیے خطرناک ہو سکتی تھی۔ جب اباقہ اور سولیونی باڑے کے ناکے سے باہر نکلے محافظ ان سے دس گز کی دوری پر تھے اور چیخ چیخ کر انہیں رکنے کا حکم دے رہے تھے لیکن جب ان دونوں نے رکنے کا ارادہ نہیں کیا تو محافظوں کے ہاتھ اپنی تلواروں کی طرف بڑھے۔ اباقہ اور سولیونی سرپٹ گھوڑے بھگاتے مویشی خانے کے پھاٹک سے گزرے تو محافظوں کی تلواریں ابھی پوری طرح نیاموں سے باہر نہیں آئی تھیں۔ اباقہ کی تلوار چمکی اور اس نے بھاگتے گھوڑے سے محافظ کی کمان کا چلا صاف کاٹ دیا۔ یہ وار اتنی مہارت سے کیا گیا تھا کہ

محافظ کو بھی اپنے نقصان کا علم نہیں ہوا۔

جب اباقہ نے چند گز آگے جاکر دیکھا' محافظ بڑے جوش سے کمان اتار رہا تھا۔ دوسرا محافظ بدحواسی میں باڑے کے ناکے کی طرف بڑھ رہا تھا جہاں سے بے قابو گھوڑے ہنہناتے ہوئے باہر نکل رہے تھے۔ اباقہ کے ہونٹوں پر خفیف مسکراہٹ کھیل گئی............ مویشی خانے کا طویل چکر کاٹ کر اباقہ اور سولیونی شہر کے گنجان حصے میں داخل ہوگئے اور چھوٹی چھوٹی گلیوں میں سفر کرتے تو زن باغ کے محل کی طرف بڑھنے لگے۔

سولیونی کو ابھی تک یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ آزاد فضا میں سانس لے رہا ہے۔

☆======☆======☆

طوطم خاں' مینگو کا لباس پہن کر اپنی پُر خطر مہم کے پہلے مرحلے سے بخیریت گزر چکا تھا۔ اب اسے پڑاؤ کا رخ کرنا تھا۔ جو کام وہ کرنے جارہا تھا وہ کوئی معمولی کام نہیں تھا۔ منگولوں کے سپہ سالار اعظم کا سر قلم کرنا اور عافیت سے نکل جانا کسی کے تصور میں بھی نہیں آسکتا تھا' لیکن طوطم خاں نے نہ صرف اس انہونی کا تصور کیا تھا بلکہ اس کو عملی شکل بھی دے رہا تھا۔ یہ ٹھیک تھا کہ شکل کی مشابہت اس کے کام آرہی تھی' لیکن جان ہتھیلی پر رکھے بغیر اس کام کا بیڑا نہیں اٹھایا جاسکتا تھا اور اگر طوطم نے یہ بیڑا اٹھایا تھا اس کا اصل محرک صرف اور صرف مارینا تھی۔ یہ مارینا کا تصور تھا۔ جس نے اسے ہر اندیشے سے بے نیاز کر دیا تھا۔ مارینا............ یا کچھ نہیں۔ زندگی یا موت۔ اس کے ذہن میں یہی سمایا ہوا تھا............ آخری بار اس نے اچھی طرح اپنے حلیے کا جائزہ لیا اور دھڑکتے دل سے پڑاؤ کی طرف چل پڑا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ خیموں کے جنگل میں داخل ہو چکا تھا۔ جب پہلے شخص نے اسے دیکھ کر سلام کیا تو اطمینان کی ایک لہر طوطم کے جسم میں دوڑ گئی۔ اس کا مطلب تھا وہ دیکھنے میں شاہی حجام ہی نظر آرہا تھا۔ تاہم اس کی مشابہت کا اصل امتحان مینگو کے خیمے میں ہونا تھا۔ یہ کام اب اسے خاصا مشکل نظر آرہا تھا۔ نہ جانے کیوں اسے اندیشہ تھا کہ مینگو کے گھر والوں سے اس کی اصلیت چھپی نہ رہ سکے گی۔ انہی سوچوں میں گم اب وہ "خادم بستی" کے نواح میں پہنچ چکا تھا۔ دفعتاً ایک آواز نے اسے چونکا دیا۔

"اے مینگو! منصب دار تجھے بلا رہا ہے۔" طوطم کے قدم جیسے زمین میں گڑ گئے۔ اس نے سموری ٹوپی کو کچھ اور رخساروں پر جھکایا اور مڑ کر آواز کی سمت دیکھنے لگا۔ یہ ایک منگول سپاہی تھا اور ایک بڑے خیمے سے باہر کھڑا طوطم کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ مینگو کی بلانوشی سے آگاہ ہو چکا تھا۔ یہ بلانوشی طوطم کا پردہ بن سکتی تھی۔ اس نے ہاتھ شرابیوں کے انداز سے لہرایا اور لڑکھڑاتی آواز میں بولا۔

"کیا بات ہے؟"

جواب میں سپاہی نے کہا۔ "منصب دار تجھے بلا رہے ہیں داڑھی صاف کروائیں گے۔ اوزار ہیں تیرے پاس؟"

طوطم خاں نے آواز کو کچھ اور نشیلا بنایا اور بولا۔ "ہاں سب کچھ ہے۔ پھر کسی مدہوش شخص کی طرح جیب ٹٹولنے لگا۔ جیسے سارے اوزار جیب میں سے برآمد کرنا چاہتا ہو۔ اس کوشش میں وہ بار بار لڑکھڑا بھی رہا تھا۔ جان کے خوف نے اسے نہایت عمدہ اداکاری سکھا دی تھی۔ اس اثنا میں خیمے کا دروازہ کھلا اور لمبا تڑنگا منصب دار داڑھی کھجاتا ہوا برآمد ہوا۔ طوطم خاں بار بار ایک ہی جیب کو کھنگالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ منصب دار نے اس کی حالت دیکھ کر ایک موٹی سی گالی نکالی اور بولا۔ "حرامی پھر شراب میں غوطہ لگا آیا ہے۔" پھر وہ چوب دار سے کچھ کہنے لگا۔ شاید کسی اور حجام کو بلانے کا کہہ رہا تھا۔ طوطم خاں نے مطلع صاف دیکھا تو وہاں سے کھسک گیا۔ لشکریوں کے ہجوم میں گھس کر اس نے چند گہری سانسیں لیں اور اعصاب کو پُرسکون کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اسے اندازہ ہوا کہ کسی دوسرے کا بھیس بھرنا اتنا آسان نہیں جتنا وہ خیال کیا کرتا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ دن کی روشنی میں وہ مینگو کے گھر میں نہیں جائے گا۔ یہ سوچ کر وہ پڑاؤ کے ایک دوسرے حصے کی طرف نکل گیا منہ چھپائے لوگوں میں گھومتا رہا اور وقت گزارتا رہا۔ آخر شام ہوئی اور رات کے سائے پھیلنے لگے۔ یخ بستہ ہوا نے پڑاؤ کی چہل پہل کو خیموں میں دھکیلنا شروع کر دیا۔ طوطم نے ایک جگہ سے شراب کے دو تین جام چڑھائے اور لڑکھڑاتا ہوا مینگو .... کے یورت (خیمے) کی طرف چل دیا۔ نشہ کم تھا اور وہ جھوم زیادہ رہا تھا۔ ایک لشکری سے جب اس نے لپک لپک کر پوچھا۔ "میرا خیمہ کدھر ہے؟" تو لشکری کو بالکل تعجب نہیں ہوا۔ وہ اسے بازو سے پکڑ کر مینگو کے خیمے تک چھوڑ گیا۔

یہ مرحلہ نہایت کٹھن تھا۔ طوطم نے خیمے کا پردہ ہٹایا اور اندر داخل ہو گیا۔ خیمے کے عین درمیان جلتی ہوئی انگیٹھی نے ماحول کو گرما رکھا تھا' انگیٹھی سے زیادہ گرمی اس خوبصورت عورت کی تھی جو ایک تکیے سے ٹیک لگائے انگیٹھی کے پاس ہی نیم دراز تھی۔ طوطم خاں کو دیکھ کر وہ جلدی سے اٹھی اور سہارا دے کر آگ کے پاس لے آئی۔

"اتنی دیر کر دی۔" وہ شکایتی لہجے میں بولی۔ "میں تو انتظار کرکے سونے لگی تھی۔"

"سوجاتی کم بخت۔" طوطم نے دل میں کہا اور کھانستا ہوا شرابی لہجے میں بولا۔ "میرے گلے میں کانٹے پڑ گئے تھے۔ دوا لینے کے لیے طبیب کے پاس چلا گیا۔ وہاں ایک پرانا دوست مل گیا۔"

"ہائیں۔" وہ عورت حیرت سے آنکھیں نکال کر بولی۔ "چوبائی تو ابھی تمہارا پوچھتا ہوا یہاں آیا تھا۔"

طوطم فوراً سمجھ گیا کہ یہ "چوبائی" اس حرامزادے طبیب کا نام ہے جس سے ہیگو دوا لیتا ہوگا۔ بہر حال جہاں اسے عورت کی اس بات سے پریشانی ہوئی وہاں یہ اطمینان بھی ہوا کہ اس کے بدلے ہوئے لہجے کو عورت نے قابل غور نہیں جانا تھا۔ وہ کھانس کر بولا۔

"چوبائی کم بخت سے میرا جی بیزار ہو گیا ہے۔ میں تو آج .... ایک مسلمان طبیب کے پاس گیا تھا .... بڑا سیانا شخص ہے۔ کیا بھلا سا نام ہے اس کا............ کیا بھلا سا نام ہے اس کا ...." جب طوطم شرابیوں کے انداز میں طبیب کا نام یاد کر رہا تھا عورت خیمے کے دوسرے حصے کی طرف بڑھی۔ طوطم سمجھ چکا تھا کہ یہ ہیگو کی عورت ہے اور اب ایک فرمانبردار بیوی کی طرح اس کے لیے کھانا لانے گئی ہے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ عورت اس کے پاس بیٹھے اور اس کی شباہت اور لہجے پر زیادہ غور کرے۔ اس نے اسے آواز دے کر واپس بلا لیا تھا اور بانہوں میں لیتا ہوا بولا۔

"پیاری کھانا تو میں کھا آیا۔"

"تو کیا اب کھانا برابر کرنے کا ارادہ ہے؟" وہ شوخی سے بولی۔

"بالکل۔" طوطم نے کہا اور ہاتھ بڑھا کر شمعدان بجھا دیا۔

☆-------☆-------☆

اباقہ کی شاندار کامیابی اور سولیونی کی رہائی پر توزن باخ نے ایک جشن کا اہتمام کیا۔ ڈیوک کے علاوہ اس تقریب میں کوئی دو درجن خاص خاص افراد شامل تھے۔ پر تکلف کھانے کے بعد شراب کا دور چلا۔ پھر مصری رقاصہ روما نے اپنے تھرکتے جسم سے حاضرین کا خون گرمایا۔ اس روز اباقہ اس نتیجے پر پہنچا کہ ڈیوک اکیلا نہیں بلکہ منظم جماعت کے ساتھ کام کر رہا ہے۔ توزن باخ' روما' گھوڑا' سولیونی وغیرہ اس جماعت کے اہم کل پرزے ہیں۔ ان لوگوں کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ منگولوں کی آمد سے پہلے دلادی میر میں ایسے حالات پیدا کر دیے جائیں کہ شہر عدم استحکام کا شکار ہو کر پکے ہوئے پھل کی طرح حملہ آوروں کی جھولی میں جا گرے۔ یہ بات تو اباقہ پر ظاہر ہو ہی چکی تھی کہ شاہی مہمانوں کو زہر دینے کی کوشش اور منگول حملے کی افواہ سازی اسی تنظیم کے کارنامے تھے۔ رقص و سرود کی محفل کے بعد تمام مہمان ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے۔ آخر میں صرف توزن باخ اور ڈیوک رہ گئے۔ سولیونی ایک طرف کھڑا گھوڑا کے ساتھ شراب پی رہا تھا۔ وہ ابھی پوری طرح صحت مند نہیں تھا لیکن اپنی رہائی پر از حد مسرور نظر آتا تھا' ڈیوک نے آواز دے کر اباقہ کو قریب بلایا۔

"تم شراب نہیں پیتے؟" وہ مخمور لہجے میں بولا۔

"نہیں۔" اباقہ نے مختصر جواب دیا۔

توزن باخ چہک کر بولا۔ "اس کے باوجود شرابیوں کی طرح سوئے رہتے ہو۔ روما تو پگلا گئی ہے۔"

ڈیوک نے گھور کر توزن کو دیکھا۔ شاید وہ نہیں چاہتا تھا کہ اباقہ سے اس طرح کی گفتگو کی جائے۔

"میرے لیے کوئی حکم؟" اباقہ نے ادب سے پوچھا۔

ڈیوک نے اٹھ کر اس کا کندھا تھپ تھپایا۔ "ابھی کوئی حکم نہیں اباقہ۔ تمہاری کامیابی اتنی اہم ضرور ہے کہ چند دن اس کا لطف اٹھایا جائے .... اب تم آرام کرو۔ جس شئے کی ضرورت ہو روما سے کہنا تمہیں مل جائے گی۔ جونہی ضرورت پڑی میں تمہیں

طلب کرلوں گا۔"

اباقہ نے کہا۔"ڈیوک! میں ایک عرض کرنا چاہتا ہوں۔"

"بولو بولو۔" ڈیوک کی بجائے توزن باغ بولا۔ "آج جو مانگو گے ملے گا۔"

توزن باغ کے لہجے میں گھمنڈ تھا۔ اباقہ جانتا تھا یہ دولت کا گھمنڈ ہے۔ معا حسین عورتوں کی ملکیت اور اپنے اثر و رسوخ کا گھمنڈ ہے لیکن اباقہ کو اس کے اثر و رسوخ سے سروکار تھا' نہ دولت سے اور نہ حسین عورتوں سے۔ اس کے چہرے پر ایک ناگوار ابھر گیا۔ ڈیوک نے فوراً اس تاثر کو محسوس کیا اور ایک بار پھر گھور کر توزن کو دیکھا۔

"ہاں کہو اباقہ! کیا کہنا چاہتے ہو؟"

اباقہ نے کہا۔ "ڈیوک! بے کاری میرے لیے موت ہے میں کچھ کرنا چاہتا ہوں۔"

"مثلاً کیا؟"

اباقہ نے ذرا رک کر کہا۔ "میں .... شہزادی نتاشا سے اپنی توہین کا بدلہ لینا چاہتا ہوں۔ اس کے احسان میرے دل کا بوجھ بنے ہوئے ہیں اور یہ بوجھ اب میری برداشت سے باہر ہو چکا ہے۔"

ڈیوک کے چہرے پر مسرت کے آثار نظر آئے۔ وہ بولا۔ "تم ٹھیک کہتے ہو۔ اپنی توہین کبھی نہیں بھولا کرتے۔ شہزادی نتاشا کو مزا چکھانے کی خواہش' تمہارا حق بھی اور تمہاری انا کا تقاضا بھی' لیکن اباقہ! میں نہیں چاہتا کہ تم اپنے انتقام کی آگ کو اتنا بڑھا کہ اس کے شعلے تمہیں ہی لپیٹ میں لے لیں۔ اس آگ کو ایک دھیمی آنچ کی شکل دو۔ ویسی ہی دھیمی اور مسلسل آنچ جس نے عقوبت خانے میں تمہارے پاؤں جلائے لیکن تمہیں ہلاک نہیں کیا تھا۔ یہ آنچ بڑے کام کی چیز ہوتی ہے اباقہ' نہایت خاموشی خاکستر کر دیتی ہے۔ تم شہزادی نتاشا سے انتقام لینا چاہتے ہو۔ میں اس کے لیے تمہیں ایسا راستہ بتاؤں گا جو پورے شاہی خاندان کو خون کے آنسو رلا دے گا۔ تھوڑا سا صبر کرو' بس تھوڑا سا۔ میں تم سے ایک ایسا کام لینا چاہتا ہوں جو ولادی میر کی تاریخ بدل دے۔"

اباقہ نے ڈیوک کی آنکھوں میں دیکھا۔ ایک بار پھر اسے اندازہ ہوا کہ ڈیوک کے سینے میں کوئی زبردست سازش پرورش پا رہی ہے۔

جس وقت توزن باغ کے محل میں یہ باتیں ہو رہی تھیں' سردار یورق اور اسد مہمان خانے میں موجود تھے اور اباقہ کا معمہ حل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مائیکل پاس ہی بیٹھا تھا۔ تینوں کے چہرے سوچ میں ڈوبے تھے۔ یورق کی داہنی ران پر ابھی

پٹی بندھی ہوئی تھی۔ مائیکل نے کہا۔ "اسد .... آخر وہ انسان ہے۔ ہو سکتا ہے کسی خوف یا لالچ نے اس کا راستہ بدل ڈال ہو۔"

اسد فوراً نفی میں سر ہلانے لگا لیکن ایسا کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں واضح الجھن بھی نظر آ رہی تھی۔ اس نے کہا۔

"نہیں مائیکل۔ لالچ کی بات تو میں نہیں مان سکتا۔ ہاں ہو سکتا ہے کہ کسی شدید خوف نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا ہو۔ پھر بھی میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ اس خوف کا تعلق اس کی اپنی ذات سے نہیں ہو گا۔ ممکن ہے کسی اور کی جان بچانے کے لیے وہ یہ سب کر رہا ہو۔"

مائیکل بولا۔ "تمہارا مطلب ہے' علی کی خاطر وہ یہ سب کرنے پر مجبور ہوا ہے۔"

"بہت ممکن ہے۔"

مائیکل بولا۔ "میری سمجھ میں تو یہ بات نہیں آتی۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ کسی طرح تمہیں مطلع کر سکتا تھا۔"

اسد نے کہا۔ "ہو سکتا ہے اس کی کوئی مصلحت ہو۔"

مائیکل بولا۔ "یہ کیسی مصلحت ہے' جس نے اسے تم سے بیگانہ کر دیا ہے۔ سردار یورق ہی کو دیکھو۔ اس پر اتنی بیدردی سے اس نے وار کیا تھا کہ قسمت اچھی نہ ہوتی تو یہ وہیں ختم ہو گیا ہوتا۔"

یورق کو روسی سمجھ نہیں آ رہی تھی اس لیے وہ لاتعلق بیٹھا تھا۔ اسد نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ "مائیکل' اطمینان رکھو' اباقہ کے بارے میں تمہارے ہر سوال کا جواب وقت دے گا۔" کہنے کو تو اسد یہ بات کہہ رہا تھا مگر اس کا لہجہ یقین سے محروم تھا.........

اچانک کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی اور مہمان خانے کے ناظم نے اندر آ کر اطلاع دی کہ شاہی محل سے اسد اور یورق کے لئے بلاوا آیا ہے۔ شہزادی نتاشا نے انہیں شرف باریابی بخشا تھا۔ اسد اور یورق نے سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا پھر لباس وغیرہ تبدیل کرنے کے لیے نشستوں سے اٹھ گئے۔

تھوڑی ہی دیر بعد وہ شہزادی کے دو ذاتی محافظوں کی معیت میں محل کا رخ کر رہے تھے۔ مختلف مراحل سے گزر کر وہ بالآخر محل کی ذی شان نشست گاہ میں پہنچے۔ انہیں نشست گاہ میں بٹھا کر محافظ واپس چلے گئے۔ صرف دروازے پر مؤدب دربان کھڑے رہ گئے۔ دو خادماؤں نے ان کے سامنے قہوے کے برتن چن دیئے۔ وہ قہوے سے شغل کرتے رہے اور اپنی طلبی کے بارے سوچتے رہے۔ کوئی ایک گھڑی بعد نشست گاہ کے

اندرونی دروازے میں حرکت پیدا ہوئی۔ ریشمی پردے سرسرائے اور شہزادی تاتاشا ایک کنیز کے ساتھ اندر داخل ہوئی۔ اسد اور یورق نے اٹھ کر تعظیم پیش کی۔ شہزادی اپنی مخصوص نشست پر جا بیٹھی۔ اس کے ساتھ آنے والی کنیز کے سوا باقی کنیزیں باہر چلی گئیں۔ شہزادی نے اسد اور یورق کو فارسی میں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"آپ لوگ خیریت سے ہیں۔ یہاں کوئی تکلیف تو نہیں؟"

اسد نے مناسب لفظوں میں شہزادی کی مہمان نوازی کا شکریہ ادا کیا۔ شہزادی نے کہا۔ "ہمیں افسوس ہے کہ پچھلی ملاقات میں تم سے کچھ تلخ گفتگو ہوئی۔ ہمیں احساس ہے کہ تم لوگ منگولوں کے مقابل ہمارے دوست بن کر آئے ہو اور اب تک تم نے اپنی آمد کا مقصد بہ احسن طریقے سے پورا کیا ہے۔ جیسا کہ تم سب جانتے ہو رئیس اعظم ابھی تک دارالحکومت واپس نہیں پہنچے۔ ان کی غیر موجودگی میں یہاں کے معاملات کو درست رکھنا اور سازشیوں سے باخبر رہنا ہم سب کی ذمے داری ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ سب لوگ ایک منظم دستے کی طرح کام کریں اور نائب رئیس سے مسلسل رابطہ قائم رکھیں۔"

اسد نے احترام سے کہا "شہزادی صاحبہ! ہمارے خدا نے چاہا تو ہم آپ کو مایوس نہیں کریں گے۔ ہم آپ کے وفادار بن کر آئے ہیں اور رہیں گے۔"

شہزادی نے ایک گہری سانس لی۔ اسد کو محسوس ہوا جیسے وہ اپنے اصل موضوع کی طرف اب آئی ہے۔ اس کی نوخیز مترنم آواز نشست گاہ میں گونجی۔ "ہمیں اس بات کا قلق ہے کہ تمہارا ایک ساتھی نامعلوم حالات کا شکار ہو کر تم سے بچھڑ گیا۔ یقیناً اس کی جدائی نے تمہیں افسردہ کیا ہو گا بہرکیف وہ ایک بہادر جنگجو اور جاں نثار شخص تھا۔ اس نے آٹھ پہر کے قلیل وقت میں شاہی خاندان کے لیے گراں قدر خدمات انجام دیں۔ ہمیں منگولوں کا سامنا کرنے کے لیے ایسے سیماب صفت جوانوں کی ضرورت ہے۔ ہماری دعا ہے کہ اس کی گمشدگی عارضی ہو اور وہ دوبارہ تم لوگوں سے آملے' لیکن ان حالات میں کوئی امکان بھی رد نہیں کیا جا سکتا۔ ہو سکتا ہے وہ پچھلے ہفتے ہونے والے ہنگاموں میں جاں بحق ہو گیا ہو۔ ہم چاہتے ہیں کہ ایسے وفادار شخص کو اس کے شایان شان نوازا جائے۔ کیا آپ اس کے لواحقین کے متعلق کچھ بتا سکتے ہیں۔ ہم جاننا چاہتے ہیں کہ وہ کون تھا اور کہاں سے آیا تھا؟"

یورق اور اسد کو شہزادی کے لہجے پر کچھ حیرت سی ہو رہی تھی۔ یوں لگتا تھا وہ ایک مردہ شخص کے متعلق گفتگو کر رہی ہے۔ اگر اسد نے اباقہ کو صرف ایک روز پہلے زندہ

سلامت نہ دیکھا ہوتا تو شہزادی کا انداز انہیں ہراساں کر سکتا تھا۔

اس نے شہزادی کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ "محترمہ شہزادی آج سے برسوں پہلے جب چنگیز خاں نے سمرقند پر حملہ کیا تھا' ہزاروں شہیدوں کے خون میں اباقہ کی ماں کا خون بھی شامل تھا۔ اباقہ اس وقت ایک نوعمر لڑکا تھا۔ اباقہ کا اپاہج باپ اسے کندھے پر بٹھا کر سمرقند کے کھنڈروں سے نکلا اور کسی بستی میں جانے کی بجائے جنگلوں کا رخ کیا۔ اس نے ویرانوں کی بود و باش اختیار کی اور نہایت سخت موسموں میں اباقہ کو پروان چڑھایا۔ وہ اسے ایک ایسا فولادی انسان بنانا چاہتا تھا' جو ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کرنے کا اہل ہو اور جو منگول قاتلوں میں گھس کر ان سے اپنی ماں کا انتقام لے سکے۔ اپنے باپ کی موت کے بعد اباقہ بلائے ناگہانی کی طرح قراقرم میں داخل ہوا۔ وہ ایک غیر معمولی انسان بن چکا تھا۔ اس نے منگول وحشیوں سے ٹکر لی اور انہیں حیرت اور خون کے سمندر میں ڈبو ڈبو دیا۔ اس کی خونریزی سے جو جنگ شروع ہوئی وہ آج تک جاری ہے اور اگر وہ زندہ رہا تو نہ جانے کب تک جاری رہے گی۔ چنگیز کے بیٹے اس کے خون کے پیاسے ہیں اور وہ ان کے لیے راتوں کا ڈراؤنا خواب بن چکا ہے۔ اس خواب سے چھٹکارا پانے کے لیے انہوں نے اسے کہاں کہاں نہیں ڈھونڈا لیکن وہ انہیں کہیں نہیں ملا۔ اس کا کوئی ٹھکانہ ہے اور نہ کوئی کھوج۔ وہ ہوا کے ایک بے نام جھونکے کی طرح سدا گردش میں رہا ہے ....

معاف کیجئے شہزادی صاحبہ میں ذرا جذباتی ہو گیا۔ کہنے سے میرا مطلب یہ ہے کہ وہ ایک بے ٹھکانہ شخص ہے۔ نہ اس کا کوئی گھر ہے اور نہ والی وارث .... اگر آپ اس کی موت کی صورت میں اسے کوئی فائدہ پہنچانا چاہیں تو آپ کو ناکامی ہو گی۔"

شہزادی خاموش رہی۔ اسد نے دیکھا اس کے مغرور چہرے پر ایک عجیب طرح کی اداسی نظر آ رہی تھی۔ ایک پچھتاوا سا اس کی آنکھوں سے جھانک رہا تھا لیکن پھر فوراً ہی اس نے اپنے تاثرات پر قابو پایا اور زیر و قار لہجے میں بولی۔

"ٹھیک ہے' تم جا سکتے ہو۔ ہم سوچیں گے کہ اس بہادر شخص کے لیے کیا کر سکتے ہیں۔"

اسد اور یورق کھڑے ہوئے اور تعظیم پیش کر کے نشست گاہ سے باہر نکل گئے۔ شہزادی تاتاشا گم صم بیٹھی تھی۔ رازداں کنیز کلثوم گہری نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ ہولے سے بولی۔

"شہزادی' لگتا ہے آپ نے اس کی موت کا بہت اثر لیا ہے۔"

"ہاں' ہمیں افسوس ہوا ہے۔"

کلثوم بولی۔ "تو آپ نے سزا سنانے میں اتنی جلدی کیوں کی۔ ڈیوک تو آپ کو صرف مشورہ دے سکتا تھا فیصلہ تو آپ کو ہی کرنا تھا۔"

شہزادی غصے سے بولی۔ "یہ تمہیں کس نے کہا ہے کہ ہم نے ڈیوک کے مجبور کرنے پر فیصلہ دیا تھا۔"

کلثوم گڑ بڑائی۔ "نہیں' میرا مطلب تھا' ڈیوک بعض اوقات خواہ مخواہ دخل اندازی کی کوشش کرتا ہے۔"

شہزادی بولی۔ "اسے دخل اندازی کا حق ہے۔ یہ حق اسے فادر نے دیا ہے۔ وہ اسے پسند کرتے ہیں اور اس سے رائے بھی لیتے ہیں۔ وہ ہمیں رائے دے سکتا ہے لیکن فیصلہ ہم اپنی مرضی سے کرتے ہیں۔ آئندہ تم ہمارے متعلق اس طرح کا گمان کروگی تو ہمیں دکھ ہو گا۔"

کلثوم لجاجت سے بولی۔ "بندی معافی چاہتی ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میرے منہ سے ایسی بات نکلی۔"

شہزادی نے نشست چھوڑی اور دھیمے قدموں سے نشست گاہ کے قالین پر ٹہلنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں بار بار ایک چہرہ گھوم رہا تھا۔

☆------☆------☆

طوطم خان نے یہ تین دن نہایت مشکل میں گزارے تھے۔ وہ منہ اندھیرے اپنے خیمے سے نکلتا۔ سارا دن اِدھر اُدھر چھپتا پھرتا اور رات گئے نشے میں دھت ہو کر واپس آجاتا۔ اس کی بیوی یعنی مینگو کی بیوی ان غیر معمولی معمولات پر حیران تھی۔ طوطم نے اسے بتایا تھا کہ وہ اس مسلمان طبیب سے اپنا مکمل علاج کرا رہا ہے۔ علاج کے لیے ضروری ہے کہ منہ اندھیرے طبیب کے پاس پہنچ جائے۔ مینگو کی بیوی کو وقتی طور پر یقین آگیا تھا مگر ضروری نہیں تھا کہ یہ یقین تادیر برقرار رہتا۔ طوطم چاہتا تھا کہ جلد از جلد باتو خان سے اس کا سامنا ہو جائے۔ دراصل مشکل یہ پیش آرہی تھی کہ باتو خاں داڑھی نہیں منڈواتا تھا۔ بال بھی وہ شاذ و نادر ہی کٹواتا تھا۔ وہاں ہر پانچویں روز مونچھیں ترشوانے کے لیے اسے حجام کی ضرورت پیش آتی تھی۔ مینگو نے موت سے صرف ایک روز قبل اس کی مونچھیں تراشی تھیں .... یہ ساری معلومات کسی نہ کسی طرح مینگو کی بیوی سے حاصل کی تھیں۔ اب اسے پانچویں دن کا انتظار تھا۔ جب وہ کیل کانٹے سے لیس ہو کر باتو خان کے یورت میں جا سکتا تھا۔

چوتھا دن بھی اس نے کسی نہ کسی طرح گھوم پھر کر کاٹ لیا۔ رات گئے وہ جب

معمول کے مطابق نشے میں دھت اپنے خیمے میں پہنچا۔ یہ دیکھ کر اسے اطمینان ہوا کہ مینگو کی بیوی سو رہی ہے۔ وہ صبح اسے کہہ گیا تھا کہ اسے اگر واپسی میں دیر جائے تو وہ سو جایا کرے۔ اس نے شمعدان کی روشنی میں چت لیٹی عورت کو دیکھا اور زیر لب مسکرا دیا۔ اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ وہ دن دور نہیں جب مارینا اسی طرح اس کے بستر پر موجود ہو گی۔ اپنی تمام حشر سامانی اور خود سپردگی کے ساتھ۔

اس نے خیمے کے کونے میں پڑا ایک چوبی ڈبہ اٹھایا اور بہ آہستگی ڈھکن کھول کر اس کے اندر کی اشیاء دیکھنے لگا۔ سرخ مخملیں کپڑے میں حجامت کا اعلیٰ درجے کا سامان پڑا تھا۔ اس کے علاوہ چھوٹی چھوٹی بوتلوں میں چند محلول بھی تھے۔ طوطم کو معلوم تھا کہ یہ خوشبو ہو گی' کچھ ایسی دوائیاں بھی ہوں گی جو چیرا لگنے پر استعمال کی جاتی ہوں گی۔ بہرحال اسے ان چیزوں سے سروکار نہیں تھا۔ اس کے لیے سب سے اہم وہ ڈیڑھ بالشت لمبا تیز دھار آلہ تھا جو داڑھی یا سر مونڈھنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ آلے کی ایک بالشت لمبی تیز دھار شمعدان کی روشنی میں چمک رہی تھی۔ یہ دھار ایک بہت بڑا کام کرنے والی تھی۔ چند پہر کے بعد دنیا کے طاقتور ترین فوجی کماندار کی گردن اس دھار کی زد میں آنے والی تھی۔ یہ قتل جہاں اس کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش "مارینا" کی شکل میں پوری کرنے والا تھا' وہاں اس پر شان و شوکت اور بلند اقبالی کے دروازے بھی کھولنے والا تھا۔ وہ جانتا تھا باتو خاں کا کٹا ہوا سر اسے اہل روس کی نظروں میں کس مقام تک پہنچا دے گا۔ اپنے اس کارنامے سے وہ اہل روس کے لیے نجات دہندہ کا کردار ادا کر سکتا تھا ....

طوطم نے آہستگی سے آلے کی تیز دھار پر انگلی پھیری اور مطمئن ہو کر چوبی ڈبے کا ڈھکن بند کر دیا۔ پھر اس نے شمعدان کی شمعیں گل کیں اور کروٹ بدل کر بستر پر لیٹ گیا۔

.... رات نہ جانے کون سا پہر تھا جب اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔ اسے لگا کہ آنکھوں کے سامنے کوئی الاؤ جل رہا ہے۔ پھر اس کی آنکھیں پوری طرح دیکھنے کے قابل ہوئیں اور وہ جان کہ جسے وہ الاؤ سمجھ رہا تھا' وہ شمعدان ہے جو مینگو کی بیوی کے ہاتھ میں ہے۔ وہ اس پر جھکی ہوئی غور سے اس کی شکل دیکھ رہی تھی۔ طوطم خان کے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بجی اور جسم میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ اس نے دیکھا عورت کے چہرے پر حیرت اور خوف کے تاثرات ہیں وہ طوطم کو گھور کر لرزاں آواز میں بولی۔ "کون ہو تم؟"

عورت کا سوال کسی دھماکے سے کم نہیں تھا۔ طوطم بولا۔ "میں مینگو' اور کون؟"

عورت بولی۔ "نہیں۔ تم مینگو نہیں .... تم مینگو نہیں ...." پھر اس سے پہلے

کہ وہ شمعدان پھینکتی اور چیختی چلاتی خیمے سے باہر بھاگ جاتی۔ طوطم کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی اور اس نے تڑپ کر عورت کی گردن اپنے بازوؤں میں جکڑ لی۔ اس کا دوسرا ہاتھ عورت کے منہ پر تھا۔ عورت کی دہشت سے پھٹی ہوئی آنکھیں طوطم کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ ایک لمحے کے لیے طوطم کے دل میں آئی کہ اس عورت کی جان نہ لے۔ وہ اس کے ساتھ کچھ اچھا وقت گزار چکا تھا لیکن پھر اپنا انجام اس کی آنکھوں کے سامنے آگیا۔ نہیں .... وہ اس موقع پر کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ اس نے عورت کے ہونٹوں کی مضبوطی سے ڈھانپا اور گردن میں حمائل بازو کو ایک زبردست جھٹکا دیا۔ ہڈی چٹخنے کی آواز آئی اور عورت کی ساری جدوجہد یکسر ختم ہو گئی۔ طوطم کچھ دیر اسی طرح اس کی گردن دبائے کھڑا رہا پھر آہستہ آہستہ اس کا بے جان جسم قالین پر ڈال دیا۔

خیمے کا پردہ اٹھا کر اس نے ایک نظر باہر ستاروں کو دیکھا اور سمجھ گیا کہ صبح ہونے میں زیادہ دیر باقی نہیں۔ تھوڑے وقت میں اسے بہت زیادہ کام کرنا تھا۔ خیمے کے ایک حصے سے قالین ہٹا کر گڑھا کھودنا تھا۔ مردہ عورت کو اس میں دفن کرنا تھا۔ پھر نہانا دھونا تھا اور سپہ سالار اعظم کے حضور' حاضری کے لیے تیار ہونا تھا۔ اس نے گہری سانس لی اور جلدی جلدی اپنے کام میں جت گیا۔

☆--------☆--------☆

بند گھوڑا گاڑی شہر کی سڑکوں پر سے گزر رہی تھی اندر آرام دہ نشستوں پر ڈیوک اور تاجر توزن باخ موجود تھے۔ ڈیوک کہہ رہا تھا۔

"........... شبے کی اب کوئی گنجائش نہیں رہی۔ شاہی مہمان خانے سے ہمارے جاسوس نے اطلاع دی ہے کہ اباقہ کے ساتھی اسد' یورق وغیرہ اس کی طرف سے سخت پریشان ہیں۔ انہیں کچھ سمجھ نہیں آرہی کہ ان کا قریبی ساتھی دشمنوں سے کیسے جاملا۔ ان کا خیال ہے کہ اس کے ساتھ کوئی زبردستی کی جارہی ہے۔"

توزن باخ نے نسوانی آواز میں قہقہہ لگایا اور بولا۔ "اس کا مطلب ہے تم مطمئن ہو اور کل کی مہم میں اباقہ کو استعمال کرو گے۔"

"ہاں۔ اباقہ اور سولیونی دونوں کو۔ سولیونی اب پوری طرح صحت مند ہے اور اس نے کافی آرام بھی کر لیا ہے۔ وہ اباقہ کا اچھا معاون ثابت ہو گا۔"

عین اس وقت اباقہ محل کی تیسری منزل پر کھڑا نیچے بازار کا جائزہ لے رہا تھا۔ یہ شہر کا ایک مصروف چوراہا تھا اور کاروبار زندگی عروج پر نظر آرہا تھا۔ ایک مٹیالے رنگ کی گھوڑا گاڑی محل کی ڈیوڑھی میں داخل ہوئی اور اباقہ سمجھ گیا کہ ڈیوک اور توزن باخ

آئے ہیں۔ وہ ہمیشہ اسی گاڑی میں نہایت راز داری سے آیا جایا کرتے تھے۔ توزن باخ کا شمار حکومت کے ان مخالفین میں ہوتا تھا جو موجودہ سیاست سے نالاں تھے اور اپنی دولت کو حکومت کی مخالفت سرگرمیوں میں استعمال کر رہے تھے۔ دوسری طرف ڈیوک شاہی خاندان کا چہیتا مشیر تھا۔ وہ اگر برسرعام توزن بلخ سے ملتا تو اس کی وفاداریاں مشکوک ہو سکتی تھیں۔

تھوڑی دیر بعد اباقہ کو ڈیوک کی طرف سے بلاوا آگیا۔ وہ نشست گاہ میں توزن باخ کے ساتھ اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اباقہ نے نشست گاہ میں ان دونوں کو یکسر تنہا پایا۔ صرف سولیونی ایک کونے میں بیٹھا شراب سے شغل کر رہا تھا۔ یہ تنہائی اس بات کا اشارہ تھی کہ کسی نہایت اہم موضوع پر گفتگو ہونے والی ہے۔ کچھ ہی دیر بعد اباقہ کا یہ اندازہ درست ثابت ہوا جب رسمی گفتگو کے بعد ڈیوک اصل موضوع پر آگیا۔ اس نے کہا۔

"اباقہ! میں ایک نہایت اہم کام تمہارے سپرد کر رہا ہوں۔ اگر تم کامیاب ہوئے تو یقین کرو شاہی خاندان کی بنیادیں ہل جائیں گی۔ پھر شہزادی تاشا اور رئیس کنیاز جیسے فرعونوں سے انتقام لینا کوئی مشکل کام نہیں رہے گا۔"

اباقہ نے کہا۔ "ڈیوک' میں آپ کا ہر حکم بجالانے کو تیار ہوں۔"

ان دونوں کے درمیان حائل بہت سے پردے اب اٹھ چکے تھے۔ اباقہ جانتا تو پہلے سے تھا' لیکن اب یہ بات کھل چکی تھی کہ ڈیوک منگولوں کے ہاتھ مضبوط کر رہا ہے۔ اباقہ نے ڈیوک کو یہ تاثر دیا تھا کہ بدلے ہوئے حالات نے اسے بھی بدل ڈالا ہے اور اب اس کی زندگی کا پہلا اور آخری مقصد شاہی خاندان اور خاص طور پر شہزادی تاشا سے بدلہ لینا رہ گیا ہے۔ اس کے جذبہ انتقام کی تسکین میں اگر منگولوں کا فائدہ ہوتا ہے تو ہوتا رہے۔ اسے اب پرواہ نہیں۔

ڈیوک نے سرخ شراب کا جام ہونٹوں سے لگایا اور جذباتی لہجے میں بولا۔ "اباقہ! کل ٹھیک رات کے دوسرے پہر تم سولیونی کے ساتھ ایک مہم پر روانہ ہو گے۔ تمہیں قلعے کے اندر پہنچ کر ایک اہم عمارت کو تباہ کرنا ہے۔ اس عمارت میں اسلحے اور آتش گیر مادے کا سب سے بڑا ذخیرہ ہے۔ اگر یہ ذخیرہ تباہ ہو گیا تو رئیس اعظم کی کمر ٹوٹ جائے گی۔ شاہی فوج کی حالت اس بھیڑیے کی سی ہو جائے گی۔ جس کے دانت نکال دیے گئے ہوں.........."

اباقہ ڈیوک کی باتیں سن رہا تھا اور اس کے کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ وہ سمجھ رہا تھا ڈیوک کتنے ہلاکت خیز منصوبے کا ذکر کر رہا ہے۔ اس سے پیشتر چینی مہم میں اس نے

کل کی صبح کس کے نصیب میں ہے۔ آؤ اس شام کو یادگار بنا دیں یہ لو ایرانی شراب کا جام۔ تم اس میں ڈوب جاؤ اور میں تم میں ڈوب جاتی ہوں۔"

اباقہ بولا۔ "شراب کا یہ جام لے کر سولیونی کے پاس چلی جاؤ اور دونوں اس میں ڈوب جاؤ۔ وہ ساتھ والے کمرے میں موجود ہے۔ اسے تمہاری ضرورت بھی ہوگی۔"

"لیکن مجھے تو تمہاری ضرورت ہے۔" وہ اباقہ کے توانا جسم کو دزدیدہ نگاہوں سے دیکھ کر بولی۔

"میں کہتا ہوں چلی جاؤ یہاں سے ورنہ ...."

"ورنہ کیا؟" وہ دلفریب مسکراہٹ سے بولی۔ "میں تو آج نہیں جاؤں گی۔" اس نے اپنی لمبی چوٹی کو پیچھے سے گھما کر آگے کیا اور تکیے سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گئی وہ جانتی تھی کہ اباقہ اسے مسہری سے اٹھانے کے لیے ہاتھ نہیں لگائے گا۔ ان بیس دنوں میں اس نے ایک بار بھی اسے چھوا نہیں تھا۔

اباقہ بولا۔ "تو تم نہیں اٹھو گی یہاں سے۔"

"ہرگز نہیں۔" وہ آنکھوں کو نشیلا بنا کر بولی' لیکن دوسرے ہی لمحے اس کی چیخ نکل گئی۔ اباقہ نے جھک کر مسہری کا ایک بازو تھاما اور جھٹکے سے اسے الٹا دیا۔ روما لڑھک کر فرش پر گری اور بوکھلا کر اسے دیکھنے لگی۔ اس کے کولہے پر شدید چوٹ آئی تھی۔ کولہا سہلاتے ہوئے چیخی۔

"تو بالکل پاگل ہے' جنگلی ہے۔ میں تیرا سر توڑ دوں گی۔"

اس نے آبنوسی تپائی سے چاندی کا ایک وزنی گلدان اٹھایا اور اباقہ پر جھپٹی۔ اباقہ نے آسانی سے جھک کر یہ وار بچایا اور اسے اپنے دائیں بازو میں جکڑ لیا۔ وہ بری طرح مچل رہی تھی .... اسے اس وقت پتہ چلا جب اباقہ اس کی لمبی چوٹی سے اس کے ہاتھ پشت پر باندھ چکا تھا۔ اب وہ ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتی تو اس کے بال کھنچ جاتے تھے۔ اگر بالوں کو بچاتی تو ہاتھ نہیں چھوٹتے تھے۔ ہاتھ بندھے رہتے تو وہ اباقہ کا منہ کیسے نوچ سکتی تھی۔ اباقہ نے پلک جھپکتے میں اسے عجیب مشکل میں ڈال دیا تھا۔ اباقہ اس کی حالت پر مسکرایا' وہ آگ بگولا ہو رہی تھی۔ اگر اباقہ اسے چھوڑ دیتا تو شاید وہ ناگن چلا چلا کر کمرے میں ہر شے توڑ ڈالتی .... اتنی نامور رقاصہ کی یہ درگت معمولی بات نہیں تھی۔

اباقہ نے اس کا مچلتا تڑپتا جسم بانہوں میں اٹھایا اور اطمینان کے ساتھ خواب گاہ سے باہر نکل آیا۔ دروازے پر کھڑے دربان نے حیرت سے یہ منظر دیکھا۔ چند گز دور سولیونی کے کمرے کا دروازہ تھا۔ اباقہ نے پاؤں کی ٹھوکر سے دروازہ کھولا۔ سولیونی شراب کے نشے

میں دھت پڑا تھا۔ اباقہ نے تھوڑا سا جھک کر روما کو قالین پر پھینک دیا۔ کمر پر چوٹ لگنے سے وہ ایک بار پھر چیخی اور اباقہ کو صلواتیں سنانے لگی۔ برہمی نے اس کی ساری نزاکت چھین لی تھی۔ سولیونی نے روما کو دیکھا اور مخمور لہجے میں بولا۔

"آخاہ .... یہ پیاری روما ہے۔ بڑے دنوں بعد ملاقات ہوئی تجھ سے۔"

روما نے اس کی شان میں بھی ایک قصیدہ پڑھ دیا۔ اباقہ زیرلب مسکرایا اور دروازہ بند کر کے باہر نکل آیا۔

☆---------☆---------☆

طوطم خاں اب روانگی کے لیے بالکل تیار تھا۔ مردہ عورت کی لاش خیمے کے ایک کونے میں دفن ہو چکی تھی۔ طوطم خاں نے ایک بار پھر لکڑی کے اس منقش ڈبے کا جائزہ لیا جس میں حجامت کا سامان پڑا تھا۔ ڈبے کے اوپر سرخ رنگ کا ایک نشان لگا تھا۔ یہ نشان غالباً اس امر کی نشاندہی کرتا تھا کہ یہ ڈبہ سپہ سالارِ اعظم کے استعمال کے لیے ہے۔ طوطم نے خیمے کی چھت سے لٹکا ہوا ایک چرمی تھیلا اتارا۔ اس تھیلے میں سیاہی مائل مٹی بھری ہوئی تھی۔ اس چرمی تھیلے کا انتظام طوطم خاں نے دو روز پیشتر ہی کر لیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس تھیلے میں وہ باتو خان کا سر ڈال کر لائے گا۔ پھر اس نے سوچا کہیں ایسا نہ ہو کہ واپسی پر اس کے تھیلے کو کھول کر دیکھا جائے۔ یہ تھیلا پہرے داروں کی نظر میں مشکوک ٹھہر سکتا تھا۔ اس اندیشے کو دور کرنے کے لیے کل طوطم پڑاؤ کے مضافات میں گیا تھا۔ وہاں ایک جگہ سے اس نے مٹی کھود کر تھیلے میں بھری تھی۔ یہ مٹی قدرے سیاہی مائل تھی طوطم نے سوچا تھا وہ مٹی کا یہ تھیلا ساتھ لے کر باتو کے خیمے میں جائے گا۔ اگر پہریدار پوچھیں گے تو انہیں بتائے گا کہ یہ آذربائیجان کی مٹی ہے اور اسے جسم پر مل کر نہانے سے بہت سی بیماریاں دور ہوتی ہیں۔ (آذربائیجان اور گردونواح کے علاقوں میں واقع بعض جھیلوں کی مٹی میں معدنیات کی بہتات تھی اور حکماء ایسی مٹی کو اکسیر کا درجہ دیتے تھے) طوطم کا منصوبہ تھا کہ وہ یہ مٹی سوغات کے طور پر باتو خاں کے پاس لے جائے گا اور واپسی پر اس مٹی میں اس کا سر چھپا کر یورت سے باہر لے آئے گا۔ پہریداروں کے پوچھنے پر وہ کہہ سکتا تھا کہ سپہ سالار کو یہ سوغات پسند نہیں آئی۔ وہ کوئی بھی بہانہ بنا سکتا تھا۔

پوری تیاری کے بعد طوطم نے سامان اٹھایا اور خیمے سے باہر نکل آیا۔ اب اجالا پھیل چکا تھا ہلکی ہلکی دھند چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ خیموں کی چمنیوں سے نکلنے والا دھواں بھی اس دھند کا حصہ بن گیا تھا۔ پڑاؤ میں چہل پہل شروع ہو گئی تھی۔ طوطم خان خیمے سے نکلتے ہی تیز قدموں سے روانہ ہو گیا۔ وہ ظاہر کر رہا تھا کہ بہت جلدی میں ہے اور

اگر کسی نے اسے روک کر کوئی بات کرنا چاہی تو وہ ہرگز نہیں سنے گا۔ ایک ہاتھ میں مٹی کا تھیلا اور دوسرے میں چوبی صندوق لیے وہ "خادم بستی" سے باہر آیا اور سیدھا سالار اعظم باتو خاں کے خیمے کی طرف چل دیا۔ خیمے کو جانے والے راستے پر دو تین جگہ پہریدار چوکس کھڑے تھے۔ طوطم سر جھکائے ان کے درمیان سے گزرتا چلا گیا۔ خیمے کے عین سامنے دو اور محافظ موجود تھے۔ ان کے ہاتھوں میں عریاں تلواریں تھیں۔ سخت سردی میں طوطم کی پیشانی پر پسینہ آنے لگا۔ اس کا ہر قدم اسے خطرات سے قریب تر کر رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ان پہریداروں کے درمیان سے بھی تیزی کے ساتھ گزر جائے لیکن یہ اس کی غلطی تھی۔ جونہی وہ دروازے میں داخل ہونے لگا۔ پہریدار بولا۔ "ٹھہرو۔" طوطم کے قدم جیسے زمین میں گڑ گئے۔ پہریدار نے کہا۔

"کیا بات ہے۔ آج بہت جلدی ہے؟"

طوطم کو کھانسی کا شدید دورہ پڑا اور وہ صرف نفی میں سر ہلا کر رہ گیا۔

ایک پہریدار دبیز پردہ اٹھا کر اندر گیا۔ وہاں سے اس کی مدھم آواز سنائی دی۔ وہ باتو خاں سے شاہی حجام کو بھیجنے کی اجازت طلب کر رہا تھا۔ جواب میں باتو خاں نے جو کچھ کہا وہ اتنا مدھم تھا کہ آواز باہر نہیں آئی یا شاید اس نے ہاتھ کے اشارے سے جواب دے دیا تھا۔ چند لمحے بعد پردوں میں جنبش ہوئی اور پہریدار باہر آیا۔

"تم جا سکتے ہو۔" اس نے طوطم کو کھڑے دیکھ کر کہا۔

طوطم ایک لمحے کے لیے جھجکا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ پہریدار نے اسے اندر جانے کو کہا ہے یا واپس جانے کو۔ اس کا اٹھا ہوا ایک غلط قدم، اب اس کی جان لے سکتا تھا۔ وہ بال سے باریک اور تلوار سے تیز پل صراط پر پہنچ چکا تھا۔ ذہن ماؤف سا ہو گیا مگر ایک جگہ کھڑے رہنا بھی کم خطرناک نہیں تھا۔ اس نے فوری فیصلہ کیا اور خیمے کی طرف قدم بڑھائے۔ پہریداروں نے ہٹ کر اسے راستہ دیا۔ اس کے ہاتھ کے تھیلے کو نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ دبیز پردہ ہٹا کر وہ اندر داخل ہوا تو ایک سبز مخملی پردے نے اس کا راستہ روکا۔ یہ پردہ خیمے کی بلند چھت تک چلا گیا تھا۔ طوطم نے لرزاں ہاتھ سے پردہ ہٹایا۔ نیم گرم ہوا نے اس کا استقبال کیا۔ خیمے کے عین درمیان ایک بڑا آتشدان دہک رہا تھا۔ چمنی کی ایک دود کش (چمنی) آتشدان سے چھت تک چلی گئی تھی۔ ایک دو گز لمبے اور ڈیڑھ گز چوڑے مسہری نما خوبصورت چبوترے پر باتو خاں اوندھا پڑا تھا۔ اس کے جسم پر صرف ایک زیر جامہ تھا۔ ریشمی پھولدار تو شک بمشکل اس کی پنڈلیاں ڈھانپ رہی تھی۔ کمخواب کے گداز گدوں کے نیچے سچے موتیوں کی جھالریں لٹک رہی تھیں۔ بستر کے عین اوپر ایک فانوس

تھا جس میں ہیرے جڑے ہوئے تھے۔ چار خوبصورت لڑکیاں خیمے کے ایک حصے میں باتو کے نہانے کا انتظام کر رہی تھیں۔ یہ چاروں باتو خاں کی بیویاں تھیں۔ انہوں نے ایک بہت بڑی ناند (برتن) میں نیم گرم پانی ڈال رکھا تھا اور اب اس میں مختلف خوشبوئیں شامل کر رہی تھیں۔ پانی سے اٹھنے والی بھاپ نے پورے خیمے کو مہکا رکھا تھا۔ برتن کے پاس ہی باتو خاں کی پوشاک ایک کھونٹی سے لٹک رہی تھی۔ طوطم کو دیکھتے ہی باتوں کی بیویوں نے ایک ڈوری کھینچ کر پردہ برابر کر دیا۔ اب باتو خاں کا حمام، طوطم کی نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ ایک طرح یہ طوطم خاں کے لیے اچھا ہی ہوا تھا۔ طوطم نے مٹی سے بھرا ہوا تھیلا جلدی سے ایک پردے کی اوٹ میں رکھ دیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس تھیلے کے سبب باتو خاں اس سے کوئی سوال وجواب کرے۔ وہ بار بار کھانس بھی رہا تھا تاکہ آواز کی تبدیلی کا جواز پیدا ہو سکے۔ تاہم قسمت نے یہاں بھی اس کی یاوری کی باتو خاں نے اس سے زیادہ بات چیت نہیں کی۔ صرف ایک بار اسے مڑ کر دیکھا اور بولا۔

"آ گیا ہے ینگو؟"

سوال اس انداز میں کیا گیا تھا کہ جواب دینے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ طوطم کو یہ جان کر خوشی ہوئی کہ باتو خاں ابھی تک رات کے خمار میں ہے۔ اس کی آواز لڑکھڑا رہی تھی۔ طوطم نے غور سے چنگیز خاں کے اس نامور پوتے کو دیکھا جو زریں خاں کے نام سے ہزاروں لاکھوں انسانوں کی قسمت کا مالک تھا، لیکن آج اس کی تقدیر اسے طوطم خاں کی چھری تلے لے آئی تھی۔ باتو خاں نے کروٹ بدلتے ہوئے ایک طویل انگڑائی لی اور جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ طوطم جلدی سے رخ پھیر کر اپنے چوبی ڈبے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ مونچھیں اور داڑھی درست کرنے کے لیے اس نے ایک چھوٹی قینچی منتخب کی اور اسے آہستہ آہستہ چھری پر رگڑنے لگا۔ اسے باتو خاں کے معمولات کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ وہ پاؤں لٹکائے مسہری پر بیٹھا تھا۔ اب معلوم نہیں اسے یہیں براجمان رہنا تھا یا اٹھ کر کسی اور جگہ بیٹھنا تھا۔ طوطم خان کو افسوس ہونے لگا کہ اس نے ینگو کو اتنی جلدی قتل کیوں کیا۔ اگر وہ زندہ رہتا تو وہ طوطم کو گراں قدر معلومات فراہم کر سکتا تھا۔

"کیا کرتا ہے ینگو؟" اچانک باتو خاں کی بھاری آواز خیمے میں گونجی۔

طوطم کو معلوم ہوا کہ وہ کوئی غلطی کر رہا ہے۔ اس آواز کا ایک ہی مطلب تھا۔ باتو کو مسہری پر بیٹھے بیٹھے حجامت کروانا تھی۔ طوطم نے ڈبے سے قینچی اور آئینہ نکالا۔ آئینے کو قریب پڑی نقرئی تپائی پر باتو خاں کے سامنے کھسکا دیا۔ پھر قینچی لے کر اس کے سر پر آن کھڑا ہوا۔ وہ اس سے پہلے چنگیز کے بیٹوں تولوئی اور اوغدائی کے درباروں میں حاضری دے

چکا تھا۔ ایک سفیر کی حیثیت سے' تنہائی میں بھی ان سے مل چکا تھا' لیکن آج باتو خاں کی قربت اس پر جو دہشت سوار کر رہی تھی۔ وہ پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ شاید اس کی وجہ تھی کہ آج اس کی نیت میں فتور شامل تھا۔ اس نے تھوڑا سا جھک کر قینچی باتو خاں کی مونچھوں پر چلائی تو اپنے ہاتھوں کو لرزتا ہوا پایا .... تاہم باتو کے منہ سے شراب کی آ رہی تھی' وہ ابھی تک نیم غنودگی کے عالم میں تھا' یہ امر بہت حوصلہ افزا تھا۔ طوطم خاں نے دھیرے دھیرے باتو کی مونچھیں تراشیں' پھر ان کے کونے درست کرنے کے لیے اس نے چوبی ڈبے سے وہ تیز دھار آلہ نکال لیا جو باتو خاں کی گردن دو لخت کرنے کے لیے نہایت موزوں تھا۔ دبیز پردے کے عقب سے کھنکتی ہنسی سنائی دے رہی تھی۔ حمام میں کی نو خیز بیویاں' آب غسل تیار کرنے کے ساتھ ساتھ چھیڑ چھاڑ میں مصروف تھیں .... طوطم کے کام کے لیے یہ وقت نہایت مناسب تھا۔ اس نے تیز دھار آلے کو کھول کر باتو خاں کی مونچھوں پر رکھا۔ اس کی نگاہ باتو کی گردن پر تھی۔ گردن اور دھار میں نصف بالشت کا فاصلہ تھا۔ اب طوطم کے ہاتھ کی ایک جنبش باتو کو زندگی کی سرحد پار کرا سکتی تھی۔ اونگھتے ہوئے باتو کا منہ دبا کر اس کی گردن کاٹ دینا کچھ ایسا دشوار نہیں تھا لیکن اتنا آسان بھی نہیں تھا۔ طوطم کی پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہو رہے تھے۔ اس نے تیز دھار آلے کو مضبوطی سے تھاما اور جبڑے بھینچ کر' عمل کے لیے تیار ہو گیا......... اچانک باتو خاں نے نیم وا آنکھوں سے اسے دیکھا اور سرگوشی میں بولا۔

"کاٹ دے گردن۔ سوچتا کیا ہے؟"

یہ سرگوشی طوطم کو سر سے پیر تک پتھر کر گئی۔ وہ سکتے کے عالم میں باتو کو دیکھتا رہ گیا۔ باتو کا اعتماد دیدنی تھا .... پھر طوطم نے حیرت کے سکتے سے باہر آ کر واقعی باتو کی ہدایت پر عمل کیا۔ گردن کاٹنے کے لیے اس نے آلے کو حرکت دی .... مگر دیر ہو چکی تھی۔ باتو نے ایک ہاتھ سے اس کی کلائی تھامی اور داہنی ٹانگ اتنی زور سے اس کے پیٹ پر ماری کہ طوطم لڑکھڑاتا ہوا آتشدان کے قریب گرا۔ باتو خاں نے لپک کر اپنی تلوار خیمے کے بانس سے اتارنا چاہی اتنی دیر میں طوطم سنبھل چکا تھا۔ نتائج سے بے پروا ہو کر اس نے باتو پر چھلانگ لگائی اور اسے لیتا ہوا اس پردے پر گرا جو حمام کو باقی خیمے سے جدا کرتا تھا۔ یہ سب کچھ چند ساعتوں کے اندر اندر ہو گیا۔ باتو خاں کی بیویاں جو چیختی ہوئی باہر نکل گئی تھیں۔ باتو اور طوطم کی ٹکر سے دوبارہ حمام میں جا گریں۔ طوطم نے تیز دھار آلے سے باتو خاں پر وار کرنا چاہا مگر وہ ہوشیاری سے پہلو بچا گیا۔ طوطم کا زبردست وار باتو خاں کی بیوی کا پیٹ چاک کر گیا......... وہ ایک چیخ کے ساتھ اوندھے منہ غسل کے برتن میں گری اور

تڑپنے لگی' اس دوران پہرے دار اندھا دھند بھاگتے ہوئے اندر پہنچ گئے۔ انہوں نے طوطم خاں کو بازوؤں سے جکڑ لیا اور پورے زور سے گھسیٹتے خیمے کے وسط میں لے گئے۔ طوطم نے خود کو چھڑانے کے لیے سخت زور مارا۔ ایک موقع پر تو وہ قریباً چھوٹ ہی گیا تھا مگر اس وقت مزید پہرے دار موقعے پر پہنچ گئے اور انہوں نے طوطم کا ایک ایک عضو جکڑ لیا۔

"اسے مارنا نہیں۔" باتو خان کی آواز خیمے میں گونجی اور پہریدار جو جوش میں دیوانے ہو رہے تھے سنبھل گئے۔ طوطم خاں کی آنکھوں میں حیرت تھی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اچانک اس کا راز کیسے کھل گیا؟

☆--------☆--------☆

وہ ایک تاریک رات تھی۔ اباقہ اور سولیوتی' جلاد گگوڈا کے ساتھ شاہی عقوبت خانے میں موجود تھے۔ سولیوتی کی طرح اباقہ کے جسم پر بھی پہریداروں کا مخصوص لباس تھا۔ وہ گہری نظروں سے عقوبت خانے کے در و دیوار کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس ماحول سے وابستہ اس کی تلخ یادیں تازہ ہو گئی تھیں۔ اسے لگا جیسے اس کی چیخیں ابھی تک یہاں گونج رہی ہیں۔ وہ زنجیروں میں جکڑا پکار رہا تھا .... "کوئی ہے .... کوئی ہے۔ خدا کے لیے مجھے آزاد کرو۔ مجھے شہزادی نتاشا تک پہنچاؤ۔ شاہی مہمانوں کی زندگی خطرے میں ہے ...." پھر منظر اس کی نگاہوں میں گھوما جب نتاشا اسے چھڑیوں سے مار رہی تھی اور اس کے نتھنوں میں اس کے اپنے ہی جلے ہوئے گوشت کی بو گھس رہی تھی۔ کتنے ظالم تھے اس عقوبت خانے کے یہ در و دیوار .... اس وقت اس کی حیثیت ایک بدنصیب قیدی کی تھی' لیکن آج .... آج وہ اپنی مرضی سے یہاں پہنچا تھا۔ یہاں سے اسے ایک اہم مہم پر روانہ ہونا تھا۔ گگوڈا نے ان دونوں کی ملاقات ایک عمر رسیدہ شخص سے کروائی۔ اسے آروف کہا جاتا تھا۔ وہ قوت سماعت سے محروم تھا' لیکن اس کی آنکھوں میں بلا کی چمک تھی۔ اس چمک میں طمع اور حرص نمایاں تھی۔ گگوڈا نے کہا کہ آروف تمہیں سرنگ کے راستے قلعے تک لے جائے گا۔

ضروری تیاری کے بعد وہ سرنگ میں داخل ہو گئے۔ ان کے ہاتھوں میں مشعلیں اور نیزے تھے۔ نیزے ٹیک ٹیک کر وہ آگے بڑھنے لگے۔ جلد ہی انہیں معلوم ہو گیا کہ سرنگ نہ صرف طویل عرصے سے بند پڑی ہے بلکہ کئی جگہ سے ٹوٹ پھوٹ بھی گئی ہے اور آمد و رفت کے لیے انتہائی خطرناک ہے۔ فرش پر بڑے بڑے گڑھے نمودار ہو چکے تھے۔ جن گڑھوں پرانا بدبو دار پانی بھرا پڑا تھا۔ مچھر اور کیڑے مکوڑے کثرت سے تھے۔ اگر ان

کے ہاتھوں میں مشعلیں نہ ہوتیں تو شاید حشرات الارض ان کا حشر کر دیتے۔ بوڑھا آروف سب سے آگے تھا اور بڑی احتیاط سے ان کی رہبری کر رہا تھا۔ ایک جگہ پہنچ کر دفعتاً ان کی مشعلیں بجھ گئیں اور سانس سینے میں گھٹنے لگی۔ شاید اس حصے میں کوئی زہریلی گیس تھی۔ آروف کی ہدایت پر وہ بجھی مشعلوں کے ساتھ ہی تیزی سے آگے بڑھتے رہے۔ آگے نسبتاً بہتر ہوا ان کے سینوں میں داخل ہونے لگی۔ ایک جگہ آروف رک گیا۔ اس نے اباقہ اور سولیونی کو بھی روک لیا تھا۔ انہوں نے مشعلیں جلائیں۔ جونہی تاریکی میں روشنی کا ہالہ سا بنایا وہ تینوں بری طرح چونک گئے۔ آروف نے اس جگہ رک کر نہایت عقلمندی کا ثبوت دیا تھا۔ وہ تینوں جس جگہ کھڑے تھے وہاں سے سیڑھیوں کی ایک طویل قطار جاتی تھی، لیکن غضب یہ تھا کہ شروع کی پچیس تیس سیڑھیاں سرے سے غائب تھیں۔ ان کی جگہ زمین میں ایک بھیانک خلا نظر آ رہا تھا۔ آروف جہاں کھڑا تھا وہاں سے ایک بالشت آگے بڑھتا تو اس عمیق غار میں جا گرتا جو سیڑھیاں دھنسنے سے پیدا ہوا تھا۔ اس صورت میں یقیناً وہ موت کے منہ میں چلا جاتا۔ وہ خود بھی حیران تھا اور غیر یقینی نظروں سے اس ایک بالشت کے فاصلے کو دیکھ رہا تھا جو اس کی زندگی کا ضامن بن گیا تھا۔ وہ وہاں سے واپس پلٹے اور نصف فرلانگ پیچھے آ کر ایک چھوٹی سرنگ میں داخل ہو گئے۔ سرنگ میں کچھ آگے جا کر انہیں بیسیوں چمگادڑوں کا سامنا کرنا پڑا، تاہم وہ آگے بڑھتے رہے اور ایک دو ذیلی سرنگوں سے گزر کر دوبارہ بڑی سرنگ میں آ گئے۔ شکستہ سیڑھیاں پیچھے رہ گئی تھیں۔ کوئی ایک کوس کا فاصلہ انہوں پانچ گھڑی میں طے کیا۔ آخر آروف نے بتایا کہ وہ منزل کے قریب پہنچ چکے ہیں۔ ان کے دل انجانے تجسس سے دھڑکنے لگے۔

اباقہ آروف کے پیچھے تھا۔ خطرناک گڑھوں سے بچنے کے لیے وہ نہایت احتیاط سے چل رہے تھے۔ ان کی ساری توجہ اپنے قدموں کی طرف تھی۔ اس صورت حال میں وہ چھت کی طرف سے بڑی حد تک غافل ہو گئے تھے اچانک اباقہ کی نظر چھت کی طرف اٹھی اور وہ چیخ اٹھا۔ "رک جاؤ۔" اس کی یہ آواز آروف کے لیے تھی۔ آروف سے چند گز آگے چھت کی دراڑوں سے دو خوفناک اژدھے نکل کر الٹے لٹک رہے تھے۔ آروف اگر چلتا رہتا تو ان سے ٹکرائے بغیر نہ گزرتا اور یہی ہوا۔ آروف! اباقہ کی آواز کے باوجود نہ رکا .... اور اس وقت اباقہ کو یاد آیا کہ وہ قوت سماعت سے محروم ہے۔ یہ خیال سولیونی کے ذہن میں بھی آیا تھا۔ وہ تیزی سے بوڑھے کی طرف لپکے لیکن ان کی کوشش بے سود تھی۔ ان کا درمیانی فاصلہ زیادہ تھا۔ ایک اژدھے نے پھنکار کر بوڑھے پر حملہ کیا اور عین پیشانی پر ڈنک مارا۔ بوڑھے کے حلق سے ایک دلدوز چیخ نکلی اور مشعل

اس کے ہاتھ سے گر گئی۔ اباقہ نے لپک کر دوسرے اژدھے پر نیزے کا وار کیا۔ انی اس کے جسم کو چھیدتی ہوئی گزر گئی۔ اس نے تکلیف سے بے تاب ہو کر کسی درندے کی طرح اپنا چھوٹا سا جبڑا کھولا۔ اباقہ نے پوری قوت سے نیزا گھمایا اور اس میں پرویا ہوا اژدھا "پٹاخ" سے دیوار سے ٹکرایا۔ اباقہ نے گھوم کر دیکھا .... اس کے پاس ہی کھڑا سولیونی بوڑھے کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ دفعتاً بوڑھے کے دونوں نتھنوں سے کوئی سیاہی مائل شے برآمد ہوئی اور دونوں رخساروں پر پھیلتی چلی گئی۔ اباقہ نے مشعل اونچی کر کے دیکھا، یہ خون تھا۔ بوڑھا گرا اور جان کنی کے عالم میں تڑپنے لگا۔ اباقہ کو اپنے چاروں طرف دھپ دھپ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے کچھ پکے ہوئے پھل شاخوں سے گیلی زمین پر گر رہے ہوں۔ اس نے مشعل گھما کر چاروں طرف دیکھنے کی کوشش کی اور کانپ گیا۔ سرنگ کی دراڑوں سے ان گنت چھوٹے بڑے سانپ نکل نکل کر نیچے گر رہے تھے۔ شاید مشعلوں کی روشنی نے انہیں متحرک کر دیا تھا۔ اباقہ کو وہ منظر یاد آ گیا جب بغداد میں دجلہ کے کنارے ایک سپیرے کے سانپ آزاد ہو گئے تھے اور انہوں نے تفریح کے لیے آئے ہوئے لوگوں میں بھگدڑ مچا دی تھی۔ اباقہ نے تن تنہا ان سانپوں سے ایک زبردست جنگ لڑی تھی اور خلیفہ کی ایک قرابت دار خاتون کو موت کے منہ سے نکالا تھا۔

.... سولیونی بھی اب سانپ دیکھ چکا تھا اور اس کی آنکھوں میں ہراس نظر آ رہا تھا۔ اباقہ نے بوڑھے کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ نیلا پڑ گیا تھا اور آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔ پھر اس نے ایک ہچکی لی اور دم توڑ دیا .... سریع الاثر زہر نے دیکھتے ہی دیکھتے اس کی جان لے لی تھی۔ اب رکنا اور کچھ سوچنا فضول تھا۔ اباقہ نے سولیونی کو اشارہ کیا۔ دونوں نے مشعلیں سیدھی کیں اور سانپوں سے پاؤں بچا کر بھاگتے ہوئے سیدھے نکل گئے۔ چند گز آگے جا کر انہیں قدرے اطمینان ہوا۔ یہاں کوئی سانپ نظر نہیں آ رہا تھا ....

آروف کی رہنمائی سے محروم ہونے کے باوجود انہوں نے سفر جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔ کوئی نصف فرلانگ طے کرنے کے بعد انہیں دور ایک روشن نقطہ دکھائی دینے لگا۔ اباقہ نے اندازہ لگایا کہ یہ اس سرنگ کا دہانہ ہے۔ انہوں نے مشعلیں گل کر دیں اور مزید احتیاط سے آگے بڑھنے لگے۔ دہانے کے قریب پہنچ کر ایک بار پھر ان کا سامنا چمگادڑوں سے ہوا .... بالآخر وہ دہانے تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ ایک آہنی جنگلے نے ان کا راستہ روک رکھا تھا۔ جنگلے کی دوسری جانب کوئی متنفس دکھائی نہیں دیا۔ ہاں کبھی کبھی کسی گھوڑا گاڑی کی دور افتادہ آواز سنائی دے جاتی تھی۔ انہیں اب کوئی شک نہیں تھا کہ وہ قلعے کے اندر پہنچ چکے ہیں۔ اباقہ نے آہستہ آہستہ جنگلے پر دباؤ ڈالا، وہ ایک دروازہ تھا جو سیمن آواز

میں باہر کو کھل گیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور باہر نکل آئے۔ حسب توقع سیدھے ہاتھ پر انہیں گھاس کا ایک قطعہ نظر آیا۔ اس قطعے میں کہیں کہیں درخت بھی تھے۔ ایک کہر آلود تاریکی نے ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد انہیں پتھر کا مجسمہ نظر آگیا۔ اس کے ساتھ ہی انہیں اطمینان ہو گیا کہ وہ بالکل ٹھیک مقام پر پہنچے ہیں۔ انہوں نے اعتماد سے قدم بڑھائے اور مجسمے کی طرف چل دیے .... لیکن وہ اس بات سے بے خبر تھے کہ دو نگران آنکھیں انہیں حیرت سے دیکھ رہی ہیں۔

☆--------☆--------☆

وہ نگران آنکھیں مائیکل ہوورتھ کی تھیں۔ وہ قلعے کے اس حصے میں نگران دستے کا کمانڈر تھا۔ یہ ذمے داری اسے صرف دو روز پہلے ہی سونپی گئی تھی۔ آج شام وہ قلعے کے اس حصے سے گزر رہا تھا کہ اچانک اس کی نگاہ ان سیڑھیوں کی طرف اٹھ گئی۔ سیڑھیوں پر کوئی چمکدار چیز پڑی تھی۔ مائیکل نے قریب جا کر دیکھا تو یہ ایک پیش قبض تھی۔ لگتا تھا کوئی نوجوان سپاہی بے خیالی میں یہاں گرا گیا ہے۔ مائیکل پیش قبض اٹھانے کے لیے بڑھا تو اس کی نگاہ سیڑھیوں سے پھسلتی ہوئی کوئی چار گز نیچے سرنگ کے دہانے کی طرف اٹھ گئی۔ دہانے پر ایک زنگ آلود آہنی دروازہ نصب تھا۔ چونکہ اس طرف آمد و رفت بالکل نہیں تھی اس لیے دروازے کے سامنے کوڑا کرکٹ پڑا تھا۔ آوارہ کتے اور بلیاں بھی اس خالی جگہ کو رفع حاجت کے لیے استعمال کرتے رہے تھے۔ جس چیز نے مائیکل کو چونکایا وہ یہ تھی کہ آہنی دروازے پر قفل نظر نہیں آ رہا تھا۔ جہاں تک اسے یاد پڑتا تھا' پرسوں اس نے معائنے کے وقت سیڑھیوں سے جھانک کر دیکھا تھا تو ایک بڑا قفل صاف دکھائی دیا تھا۔ قلعے میں جتنے بھی ایسے دروازے تھے۔ ان پر بڑے بڑے قفل ڈال دیے گئے تھے تاکہ کوئی سپاہی غلطی سے ان بے آباد سرنگوں میں نہ چلا جائے .... مائیکل کی چھٹی حس نے خطرے کی گھنٹی بجائی۔ اس نے غور سے دروازے کے اردگرد کی زمین دیکھی۔ تازہ قدموں کے نشان دکھائی دے رہے تھے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ یہ پیش قبض بھی اسی شخص کی ہے جس نے دروازے کا قفل کھولا ہے۔

مائیکل کو عجیب طرح کی تشویش لاحق ہو گئی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اس دروازے کی نگرانی کروائے گا۔ اس نے اپنے دستے کے ایک ہوشیار سپاہی کو حکم دیا کہ وہ کسی محفوظ جگہ کھڑے ہو کر سیڑھیوں پر مکمل نظر رکھے اور جونہی کسی پُراسرار نقل و حرکت کا احساس ہو اسے مطلع کیا جائے۔

نصف شب سے کچھ پہلے مائیکل گشت کرتا ہوا پھر اس مقام پر پہنچا۔ اس کا مقرر کردہ

سپاہی ایک درخت کی اوٹ میں کھڑا بدستور پہرا دے رہا تھا۔ مائیکل اس سے صورت حال دریافت کرنے لگا۔ سپاہی نے بتایا کہ ابھی تک نگرانی لا حاصل رہی ہے۔ مائیکل آگے بڑھنے کے لیے قدم اٹھا چکا تھا جب اچانک ٹھٹک گیا۔ سیڑھیوں پر ایک متحرک سایہ نظر آیا تھا۔ مائیکل بھاگ کر پھر درخت کی اوٹ میں ہو گیا۔ سایہ کچھ دیر اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔ پھر اس نے ہاتھ سے کسی کو اشارہ کیا اور ایک دوسرا سر سیڑھیوں پر دکھائی دینے لگا۔ یہ دو افراد تھے۔ چند لمحے وہ ساکت کھڑے اردگرد کا جائزہ لیتے رہے پھر محتاط قدموں سے ان کی طرف بڑھے۔ ان کے ہاتھوں میں نیزے تھے اور لباسوں سے وہ قلعے کے پہریدار ہی نظر آتے تھے۔ مائیکل اور سپاہی تناور درخت کے ساتھ چپک گئے۔ دونوں سائے ان کے بالکل نزدیک سے گزرے۔

"وہ رہا مجسمہ۔" ایک سائے کی سرگوشی فضا میں ابھری۔ مائیکل سکتے میں رہ گیا۔ یہ آواز اس کے لیے اجنبی نہیں تھی۔ یورق اور اسد کے ساتھی اباقہ کی آواز وہ بخوبی پہچان سکتا تھا۔ سائے آگے بڑھ گئے تو مائیکل نے سپاہی کو وہیں کھڑے رہنے کی ہدایت کی اور نہایت احتیاط سے ان دونوں کے پیچھے چل دیا۔ وہ جانتا تھا کہ اباقہ ایک چوکنا اور حاضر دماغ شخص ہے' ذرا سی غلطی اسے تعاقب سے خبردار کر سکتی تھی۔ مائیکل درختوں کی اوٹ لے کر چل رہا تھا' لیکن سائے اِدھر اُدھر دیکھے بغیر سیدھے چلے جا رہے تھے۔ شاید وہ اپنی چال ڈھال سے خود کو پہرے دار ظاہر کرنا چاہتے تھے۔ بالآخر وہ گھاس کے اس ہموار قطعے میں پہنچ گئے جہاں ایک گمنام شہید کا مجسمہ نصب تھا۔ انہوں نے ایک نظر دائیں بائیں دیکھا اور اطمینان سے پہرا دینے والے انداز میں کھڑے ہو گئے۔ مائیکل کے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اباقہ کسی نہایت گہری سازش کے تحت یہاں آیا ہے۔ وہ چاہتا تو اسی وقت اباقہ اور اس کے ساتھی کے گرد گھیرا ڈال سکتا تھا لیکن وہ اسد' یورق وغیرہ کے سامنے کچا پڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اباقہ ان دونوں کا دوست تھا اور وہ اب بھی یہ ماننے کو تیار نہیں تھے کہ وہ دشمنوں سے مل چکا ہے۔ مائیکل نے تیزی سے فیصلہ کیا اور واپس پلٹا۔ سپاہی ابھی تک اس درخت کے پیچھے کھڑا تھا۔ مائیکل نے اس کے علاوہ ایک اور سپاہی کو ساتھ لیا اور دونوں کو احتیاط سے اس جگہ پہنچا دیا جہاں سے اباقہ اور اس کے ساتھی کو مجسمے کے قریب کھڑے دیکھا جا سکتا تھا۔ اس نے سپاہیوں کو ہدایت کی اگر یہ دونوں کسی قسم کی حرکت کریں تو فوراً نائب کمانڈر کو اطلاع دو۔

یہ کام کرنے کے بعد مائیکل تیز قدموں سے اپنے گھوڑے کی طرف چل دیا۔ گھوڑا نزدیکی اصطبل میں تھا۔ مائیکل گھوڑے پر سوار ہوا اور تیز رفتاری سے قلعے کے دروازے

کی طرف بڑھ گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد مائیکل شاہی مہمان خانے میں اسد اور یورق کے سامنے بیٹھا تھا۔ اسد اور یورق کو اس کی بات کا یقین نہیں آ رہا تھا' لیکن ماننے کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ مائیکل کہہ رہا تھا۔ "اسد! وہ قلعے کا انتہائی حساس علاقہ ہے۔ وہاں ایک عمارت میں فوجی دفاتر ہیں جہاں انتہائی اہم دستاویزات موجود ہیں۔ اس کے علاوہ اسلحہ گودام بھی وہاں سے تھوڑے ہی فاصلے پر ہے۔ میں تو اب سوچ رہا ہوں مجھے اباقہ کو وہاں چھوڑ کر آنا ہی نہیں چاہیے تھا کہیں وہ کوئی حرکت ہی نہ کر جائے۔"

اسد کے چہرے پر عجیب تاثرات نظر آ رہے تھے۔ وہ بولا۔ "مائیکل! گھبراؤ مت۔ میں وعدہ کرتا ہوں ہمارے ساتھی کی طرف سے تم لوگوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔"

مائیکل بولا۔ "اسد! ایسی باتیں کیوں کرتے ہو۔ وہ تمہارا نہیں میرا بھی ساتھی ہے لیکن موجودہ حالات میں ہم اس پر بھروسا نہیں کر سکتے۔"

اسد نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "میرے ساتھ آؤ مائیکل۔ میں آج اس سے بات کروں گا۔"

یورق بھی ساتھ چلنے کے لیے اٹھ گیا مگر اسد نے نرمی سے کہا۔ "سردار! مجھے ڈر ہے کہ تم اسے دیکھ کر مشتعل ہو جاؤ گے یا وہ تمہیں دیکھ کر بھڑک اٹھے گا۔ میری التجا ہے کہ مجھے تنہا اس سے بات کرنے دو۔"

مائیکل نے بھی اسد کے خیال کی تائید کی۔ یورق نے کچھ پس و پیش کے بعد ان کی بات مان لی۔ مائیکل اور اسد گھوڑوں پر سوار تیز رفتاری سے قلعے کی طرف روانہ ہوئے۔

☆-------☆-------☆

وہ جنوری کی ایک سرد ترین رات تھی۔ دارالحکومت "ولادی میر" کے در و دیوار برف ہو رہے تھے۔ نواحی پہاڑوں سے اٹھنے والے کہرے کے دبیز بادل آہستہ آہستہ شہر کے سنسان گلی کوچوں میں خیمہ زن ہو رہے تھے۔ یہ نصف شب کا عمل تھا۔ اسد اور مائیکل کے دونوں ماتحت چوکس کھڑے پہرا دے رہے تھے۔ کہرا تیزی سے پھیل رہا تھا۔ مائیکل نے اسد کو بتایا کہ گھاس کے اس قطعے کے عین درمیان ایک سنگی مجسمہ ہے۔ اباقہ اور اس کا ساتھی' پہرداروں کا لباس پہنے اسی مجسمے کے قریب موجود ہیں۔ اس نے مائیکل سے درخواست کی کہ وہ اباقہ کے پاس اکیلا جانا چاہتا ہے۔ مائیکل نے کہا۔ "میں خود بھی یہی چاہتا ہوں۔" اسد نے ایک گہری سانس لی اور مائیکل کی بتائی ہوئی سمت میں چل دیا۔ کہرا اب مزید گہرا ہو گیا تھا۔ چند گز آگے دیکھنا بھی دشوار ہو رہا تھا۔ اچانک اسد کو اندازہ ہوا کہ وہ مجسمے کے قریب پہنچ چکا ہے۔ کوئی دو گز بلند اس مجسمے کے قریب ہی دو پہردار

کھڑے تھے۔ اسد کو اپنی طرف آتے دیکھ کر وہ ٹھٹک گئے۔ اسد نے ڈیل ڈول سے پہچان لیا کہ ان میں اباقہ کون سا ہے۔ وہ سیدھا اس کے پاس پہنچا اباقہ کے ایک ہاتھ میں نیزا تھا۔ آج اس کے چہرے پر پگڑی نہیں تھی۔ اسد اس کے مدہم خد و خال دیکھ سکتا تھا۔

"یہاں کیوں آئے ہو؟" اباقہ نے انتہائی سخت لہجے میں پوچھا۔

اسد نے سکون سے کہا۔ "یہ جاننے کے لیے کہ منگولوں کا ازلی دشمن اور سلطان جلال کا جاں نثار ساتھی' اباقہ یہاں کیا کر رہا ہے۔"

اباقہ نے اجنبی لہجے میں کہا۔ "تو نے یہاں آ کر......... اچھا نہیں کیا اسد۔"

اسد بولا۔ "ہم بہت پریشان ہیں اباقہ۔"

اباقہ نے کہا۔ "میں تمہاری پریشانی ختم کیے دیتا ہوں۔" اس کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی کہ اسد چونک کر رہ گیا۔ پھر اس نے دیکھا کہ اباقہ نے اچانک نیزا سیدھا کیا اور اسد پر حملہ آور ہوا۔ اسد نے جلدی سے پہلو بچایا۔ اس وقت اباقہ کا ساتھی آگے آیا اور اس نے ایک زوردار ٹانگ اسد کے سینے پر ماری۔ اسد اس ضرب کے لیے تیار نہیں تھا۔ لڑکھڑا کر شبنم آلود گھاس پر گرا۔ اباقہ نے جست کی اور اسد پر آیا۔ اسد نے پہلو بدل کر خود کو بچا لیا۔ دونوں ساتھ ساتھ زمین سے اٹھے۔ اسد کچھ کہنا چاہتا تھا' لیکن اباقہ نے موقع ہی نہیں دیا۔ دونوں کے درمیان کوئی تین گز کا فاصلہ تھا۔ اباقہ نے نیزا تول کر اسد پر پھینکا۔ اسد بروقت جھکا اور نیزا اس کے سر سے گزرتا ہوا گیا۔ اسد ابھی حیرت کے اس جھٹکے سے سنبھلا بھی نہیں تھا کہ اباقہ اڑتا ہوا آیا اور اس کی دونوں ٹانگیں اسد کے سینے پر پڑیں۔ اسد ایک توانا شخص تھا۔ معمولی ضربات کو وہ خاطر میں نہیں لاتا تھا' لیکن اباقہ کی لگائی ہوئی ضرب نے اسے چکرا کر رکھ دیا۔ وہ اچھل کر پشت کے بل گرا۔ ابھی وہ اٹھ ہی رہا تھا کہ اباقہ پھر اس کے سر پر پہنچ گیا۔ اس کی ٹانگ گھومی۔ اسد نے بچنے کی بہت کوشش کی' لیکن اپنی پسلیاں نہ بچا سکا۔ تکلیف کی شدید لہر نے اسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

"اباقہ!" اس نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔

اباقہ نے ایک اور گھونسہ رسید کرنا چاہا' لیکن اب اسد مزاحمت کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اس نے تیزی سے جھک کر خود کو بچایا اور اباقہ کی ٹانگ کھینچنے کی کوشش کی۔ ایک بار پھر اسے احساس ہوا کہ آج اس کا مقابلہ ایک برتر شخص سے ہے۔ اباقہ نے اچھل کر نہ صرف ٹانگ بچائی بلکہ ایک ٹھوکر اسد کے سر پر ماری۔ اسد کے ذہن میں تاریکی بھرنے لگی۔ اس نے سر کو دو تین جھٹکے دیے۔ اباقہ اس کے سر پر کھڑا تھا۔ دفعتاً اسد نے گھوم کر زوردار کہنی اباقہ کے پیٹ میں ماری۔ اباقہ قدرے غافل کھڑا تھا۔ شاید اسے امید نہیں

تھی کہ اسد مزید جدوجہد کرے گا۔ ضرب کے ساتھ ہی وہ دوہرا ہو گیا۔ اسد نے اٹھتے اٹھتے ایک طوفانی مکہ اس کے جبڑے پر مارا۔ اباقہ ذرا سا لڑکھڑایا۔ اسد نے پے در پے دو اور مکے جڑ دیے۔ اس کے ذہن میں ایک ہی بات تھی۔ اگر اباقہ کسی خطرناک ارادے سے یہاں پہنچا ہے تو وہ یہ ارادہ پورا نہیں ہونے دے گا۔ اباقہ نے منہ میں جمع ہونے والا خون تاریکی میں تھوکا اور نگاہیں اسد پر جما دیں اسد نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے دو گہرے دوست' جانی دشمنوں کی طرح ایک دوسرے کے مقابل تھے۔ دونوں چوٹی کے جنگجو اور مرد میدان تھے۔ دونوں نے پشت سے پشت ملا کر بارہا دشمنوں کے چھکے چھڑائے تھے۔ دونوں کے راستے بھی ایک تھے اور منزل بھی' لیکن ایک غلط فہمی اس ٹھٹھری ہوئی شب میں دونوں کو ایک دوسرے کے سامنے لے آئی تھی' کہرا اب بہت گہرا ہو گیا تھا۔

چند قدم دور کھڑا سولیوانی بھی ہیولا سا نظر آ رہا تھا۔ یقینی بات تھی کہ مائیکل اور اس کے سپاہی یہاں ہونے والی جدوجہد سے بے خبر ہوں گے .... دفعتاً اباقہ نے جھکائی دے کر اسد پر چھلانگ لگائی۔ اسد جو اب پوری طرح غضب ناک ہو چکا تھا پھرتی سے ایک طرف ہٹا۔ پھر بھی دونوں ٹکرانے سے نہ بچ سکے' اباقہ کا کندھا اسد کے کندھے سے ٹکرایا اور دونوں اوپر نیچے ڈھیر ہو گئے لیکن اگر اباقہ کا خیال تھا کہ وہ اسد کو دبا لے گا تو اسے کامیابی نہیں ہوئی' پشت زمین پر لگتے ہی کمال مہارت سے اسد نے اسے ٹانگوں پر اچھال دیا۔ دونوں پھر ساتھ ساتھ اٹھے۔ اباقہ نے اس دفعہ پھر اسد پر چھلانگ لگائی۔ اسد نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر اسے ہاتھوں پر روکا۔ دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔ اسد جانتا تھا اباقہ کی ٹکر مقابل کے لیے مہلک ثابت ہوتی ہے' اس کی پوری کوشش تھی کہ خود کو اس ٹکر سے محفوظ رکھے۔ کھینچا تانی میں دونوں زمین پر گرے اور لوٹ پوٹ ہونے لگے۔ یکایک اسد کے کان میں اباقہ کی سرگوشی سنائی دی .... یہ سرگوشی ایک مدھر نغمے کی طرح اس کے کان میں رس گھولنے لگی۔ اسد کو لگا جیسے اس کے بدن میں بھڑکنے والا جوالا مکھی ایک ہی چھینٹے سے ٹھنڈا ہو گیا ہے۔ اباقہ نے اپنی سرگوشی میں صرف چار لفظ کہے تھے۔

"میں مجبور ہوں اسد۔"

یہ چار لفظ اسد کے ہر شکوے کو دور کر گئے تھے۔ ہر وسوسے کو مٹا گئے تھے ....

دفعتاً اسد نے اپنا جسم ڈھیلا چھوڑ دیا۔ اباقہ نے پھرتی سے اس کی گردن اپنے بازوؤں میں جکڑ لی۔ پھر حلق سے ایسی آواز نکالی جیسے بے پناہ قوت صرف کر رہا ہو۔ اسد سمجھ گیا کہ وہ اس کی گردن توڑنے کی اداکاری کر رہا ہے۔ اس نے اس تماشے میں اپنا کردار ادا کرتے ہوئے اچانک ہاتھ پاؤں پھینک دیے۔ اباقہ نے اسے لاپرواہی سے زمین پر پٹخ دیا۔ اسد

بے حس و حرکت پڑا تھا' لیکن اس کے جسم میں مسرت اور شادمانی کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ اسے لگ رہا تھا کہ کوئی نہایت قیمتی شے جو گم ہو گئی تھی واپس مل گئی ہے۔

☆ ======= ☆ ======= ☆

ابھی اسد اور اباقہ کی لڑائی بمشکل ختم ہوئی تھی کہ ایک قریبی درخت سے کوئی دھپ سے کودا۔ اس شخص نے سیاہ لباس پہن رکھا تھا اور تاریکی کا حصہ دکھائی دیتا تھا۔ وہ تیس بتیس سال کا ایک دبلا پتلا روسی تھا۔

اباقہ اور سولیوانی اس کی طرف گھوم گئے۔

"سرفروش۔" قریب پہنچ کر اس نے سرگوشی کی۔

سولیوانی نے اپنا اور اباقہ کا تعارف کرایا۔ وہ بولا۔ "تعارف کی ضرورت نہیں۔ میں کافی دیر سے تم لوگوں کو دیکھ رہا ہوں .... میرا خیال ہے اب ہمیں اور دیر نہیں کرنی چاہیے۔ ہو سکتا ہے اس شخص کے ساتھی کہیں قریب ہی ہوں اور اسے ڈھونڈتے ہوئے اِدھر آ نکلیں۔" اس کا اشارہ اسد کی طرف تھا۔

"ہمیں کرنا کیا ہے؟" اباقہ نے بے تابی سے پوچھا۔

وہ شخص بولا۔ "وقت کم ہے اور کام زیادہ۔ میں مختصراً تمہیں سب کچھ بتا دیتا ہوں۔ میرا نام پیٹر ہے۔ میں نے نو عمری میں چین کا سفر کیا تھا اور وہاں کے اسلحہ سازوں سے آتشیں اسلحہ بنانے کی تربیت حاصل کی تھی۔ میں تو ود گرد کا رہنے والا ہوں اور ڈیوک کو اپنا سیاسی اور روحانی پیشوا سمجھتا ہوں۔ اس کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ میرے لیے حکم کا درجہ رکھتا ہے۔ میں کیا ہماری تنظیم "سرفروش" کا ہر رکن ڈیوک کے حکم پر جان ہتھیلی پر رکھ سکتا ہے۔ ڈیوک نے ہی مجھے ایک برس پہلے فوجی اسلحہ خانے میں ملازمت دلوائی تھی۔ ایک ماہ پیشتر اس کے حکم پر میں نے ایک مقامی رکن سے مل کر اسلحے کے گودام میں ایک اہم کارروائی کی تھی۔ گودام کے تین حصے ہیں' جن میں سے ایک آتشیں اسلحے کے لیے مخصوص ہے۔ ہم دونوں نے کسی طرح اس گودام تک رسائی حاصل کی اور اس کے اندر دھماکہ خیز مواد رکھ دیا یہ مواد ہم نے زمین میں دبایا اور اسے آگ دکھانے کے لیے ایک بارودی فیتے سے منسلک کر دیا۔ یہ فیتہ ہم گودام سے کوئی پندرہ گز دور لے گئے اور اس کا سرا نہایت احتیاط سے چھپا دیا۔ ڈیوک کا حکم تھا کہ گودام کو معقول حملے سے صرف چار روز پیشتر تباہ کیا جائے' لیکن ہوا یہ کہ اس سے پہلے ہی اعلیٰ حکام نے کارخانے اور گودام کا تمام عملہ تبدیل کر دیا۔ یہ احتیاطی تدابیر ہمارے لیے ازحد نقصان دہ ثابت ہوئی۔ ہم ایک بڑے کارنامے کو انجام تک نہ پہنچا سکے۔ پچھلے دو ہفتے سے گودام کے اوپر پہرا

بہت سخت کر دیا گیا۔ کم از کم پندرہ عدد مسلح آہنی محافظ ہمہ وقت چوکس رہتے ہیں۔ ان سے ٹکرائے بغیر ہم بارودی فیتے تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے۔ ذیوک نے مجھے پیغام بھیجا تھا کہ وہ سولیونی کے ساتھ ایک ایسے شخص کو روانہ کر رہا ہے جو دس پندرہ محافظوں سے تنہا نبٹنے کی صلاحیت رکھتا ہے.......... اور تمہیں دیکھ کر میں محسوس کر رہا ہوں کہ اس نے کچھ ایسا غلط نہیں کہا تھا۔ تم نے ابھی جس طرح اس شخص کو موت کے گھاٹ اتارا ہے وہ کسی عام شخص کا کام نہیں۔ پیٹر کا اشارہ اسد کی طرف تھا۔ اباقہ یہ سوچ کر محظوظ ہوا کہ اسد بھی یہ سب کچھ سن رہا ہو گا۔

اباقہ نے پوچھا۔ "اب تم کیا کرنا چاہتے ہو؟"

پیٹر بولا۔ "میں نے کیا کرنا ہے۔ جو کرنا ہے تم نے کرنا ہے۔ میں سپاہی نہیں ہنرمند ہوں۔ اگر تمہاری تلواروں کے زور پر بارودی فیتے تک پہنچ گیا تو اسے آگ لگا دوں گا۔"

"پھر؟"

"پھر کیا۔" پیٹر سفاکی سے بولا۔ "فیتے کو آگ لگی تو یہ قلعہ جس پر رئیس اعظم اور اس کے ٹولے کو بڑا مان ہے' روئی کے گالے کی طرف فضا میں اڑتا نظر آئے گا.........."

اباقہ نے پیٹر کی باتوں سے اندازہ لگایا کہ وہ شاہی خاندان کا کٹر مخالف ہے اور جوش انتقام میں دیوانہ ہو رہا ہے۔ اسے ان ہزاروں لاکھوں جانوں کی مطلق پرواہ نہیں تھی جو اس سازش کے نتیجے میں منگول وحشیوں کی بھینٹ چڑھ سکتی تھیں۔ ولادی میر کے ہزاروں لاکھوں انسان اس کے ہم نسل تھے۔ اس کے اپنے ہی وطن کے رہنے والے تھے۔ اگر شہر اور خطے جدا تھے تو کیا' سرزمین تو ایک ہی تھی۔ ان کی رگوں میں ایک ہی باپ دادا کا خون رواں تھا۔

پیٹر کی ہدایت پر اباقہ اور سولیونی نے اپنی اپنی تلواریں نکال لیں۔ پیٹر بولا۔ "گودام کا صدر دروازہ یہاں سے ٹھیک ڈیڑھ سو گز کے فاصلے پر ہے۔ دروازے پر صرف دو پہریدار ہوں گے جنہیں قتل کرنا ہمارے لیے زیادہ دشوار نہیں ہو گا۔ ہماری اصل آزمائش اس عمارت کے برآمدے میں ہو گی جہاں کم از کم چودہ محافظ موجود ہوں گے۔ اگر ہم نے ان محافظوں پر قابو پالیا تو اس کمرے تک پہنچنے میں کامیاب ہو جائیں گے جو برآمدے اور گودام کے درمیان واقع ہے۔ گودام میں کھلنے والا آہنی دروازہ اسی کمرے میں ہے۔ اس دیوہیکل دروازے کو کھولنا یا توڑنا ہمارے بس میں نہیں اور ہمیں اس کی ضرورت بھی نہیں کیونکہ بارودی فیتے کا سرا اس کمرے میں موجود ہے۔ یہ کمرہ دراصل ایک دفتر ہے جہاں اسلحہ خانے کا "محافظ" اپنے عملے کے ساتھ بیٹھتا ہے اور گودام کا حساب کتاب رکھتا ہے۔"

اباقہ نے پوچھا۔ "پہلی مرتبہ تم اس گودام میں کیسے داخل ہوئے تھے۔"

پیٹر بولا۔ "اس سوال کا ہمارے موجودہ کام سے کوئی تعلق نہیں۔ تاہم میں بتا دیتا ں۔ یہ مشکل کام میرے ساتھی کی وجہ سے ممکن ہوا تھا۔ وہ ہماری تنظیم کا رکن تھا اور ن مزدوروں میں شامل تھا جو باربرداری کی غرض سے گودام کے اندر لے جائے جاتے تھے۔ میرا فراہم کیا ہوا دھماکہ خیز مادہ اسی نے گودام میں پہنچایا تھا' یہ ایک نہایت خطرناک کام تھا لیکن وہ محفوظ رہا.......... مگر چند روز پہلے ایک معمولی سا کام کرتے ہوئے وہ پکڑا گیا۔ اسے میرا ایک پیغام ذیوک تک پہنچانا تھا۔ قلعے سے نکلتے وقت پہریداروں نے اسے گرفتار کر لیا۔ وہ اسے پوچھ گچھ کے لیے لے جانا چاہتے تھے لیکن اس نے تنظیم کے ستور کے مطابق خطرہ محسوس کرتے ہوئے اپنے ہی خنجر سے خودکشی کر لی۔" بات ختم کر ے پیٹر نے اردگرد دیکھا اور بولا۔ "یہ دھند ہمارے لیے بہت سودمند ہے۔ میرا خیال ہے ہمیں اب اور دیر نہیں کرنا چاہیے۔"

دونوں نے پیٹر کی تائید کی اور ذہنی طور پر تیار ہو کر اس کے ساتھ چل دیے۔ وہ رختوں کے درمیان چلتے کوئی سو گز آگے گئے۔ اٹھنے والا ہر قدم انہیں مشکلات سے قریب تر کر رہا تھا۔ اچانک وہ ٹھٹک گئے۔ دو مسلح پہریدار ایک برجی پر کھڑے ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ درمیانی فاصلہ بہت کم تھا۔ سولیونی کے منہ سے بے ساختہ اوہ نکل گئی۔ اباقہ کی گرفت بھی تلوار پر سخت ہو گئی۔ پیٹر اطمینان سے بولا۔

"گھبرانے کی بات نہیں۔ یہ پہریدار اپنی خاموشی کی قیمت وصول کر چکے ہیں۔ ہمیں کچھ نہیں کہیں گے۔ تم سیدھے چلتے رہو۔"

اباقہ اور سولیونی نے پیٹر کی ہدایت پر عمل کیا۔ بالآخر انہیں اسلحہ گودام کا صدر دروازہ دکھائی دینے لگا۔ پیٹر کی اطلاع کے عین مطابق وہاں دو چوکس محافظ موجود تھے۔ ان کی موٹی صدریاں گھٹنوں تک لٹک رہی تھیں۔ سردی کے سبب ان کی سانس بھاپ کی صورت نکل رہی تھی اور ٹانگوں کو منجمد ہونے سے بچانے کے لیے وہ صدر دروازے کے سامنے ٹہل رہے تھے۔ ایک پہریدار بائیں جانب سے آتا دوسرا دائیں جانب سے۔ ایک دوسرے کے پہلو سے گزرتے ہوئے وہ قریباً چار گز کی دوری پر چلے جاتے۔ وہاں سے وہ ایڑیوں پر گھومتے اور پھر ایک دوسرے کی طرف بڑھنے لگتے۔ صدر دروازے پر ایک بڑی قندیل لٹک رہی تھی جس کی روشنی گہری دھند میں ایک ہالہ سا بنا رہی تھی۔ اس ہالے میں اباقہ پہریداروں کی عریاں تلواریں دیکھ سکتا تھا۔ عریاں تلواروں کے پہرے سے ظاہر تھا کہ گودام کی سخت حفاظت کی جا رہی ہے۔ پیٹر سرگوشی کے لہجے میں اباقہ سے بولا۔ "ان

دونوں پہریداروں کی آواز نہیں نکلنا چاہیے۔"

"ٹھیک ہے۔" اباقہ نے اعتماد سے کہا۔

ایک طرف سے سولیونی اور دوسری طرف سے اباقہ پہریداروں کی طرف بڑھے۔ وہ پیٹ کے بل رینگتے دو درختوں تک پہنچے اور ان کی اوٹ میں گھات لگا کر بیٹھ گئے۔ جونہی پہریداروں نے اپنا چکر مکمل کر کے ایک دوسرے کی طرف منہ پھیرا' سولیونی اور اباقہ پھرتی سے نکلے اور بھاگتے ہوئے اپنے اپنے شکار پر جا پڑے۔ کمرے کی وجہ سے یہ حملہ اتنا اچانک ثابت ہوا کہ پہریدار اپنی تلواروں کو حرکت تک نہ دے سکے۔ اباقہ کا بازو پہریدار کی گردن میں اس طرح حمائل ہوا کہ وہ منہ کھلا ہونے کے باوجود آواز نہ نکال سکا۔ تلوار کا وزنی دستہ کھناک سے اس کے سر پر پڑا۔ سموری ٹوپی کے باوجود پہریدار سے یہ شدید ضرب برداشت نہیں ہوئی اور وہ کراہ کر اباقہ کے بازو میں جھول گیا۔ اس کی تلوار پتھریلی زمین پر گرنے سے پہلے اباقہ نے اپنے پاؤں پر روک لی اور آرام سے نیچے رکھ دی۔ دوسری طرف سولیونی بھی اپنے شکار سے نبٹ چکا تھا لیکن اس نے پہریدار کو ہلاک کر دیا تھا۔ پشت سے گھونپی ہوئی تلوار پہریدار کے پیٹ سے نکل آئی تھی اور سولیونی کے مضبوط ہاتھ نے مرنے والے کی آخری چیخ ہونٹوں کے اندر ہی روک دی تھی۔ اس نے بھی اباقہ کی طرح پہریدار کا جسم زمین پر ڈال دیا۔ پھر دونوں' پہریداروں کو گھسیٹتے ہوئے گہری تاریکی میں پیٹر کے پاس لے گئے۔

"بہت خوب .... بہت خوب۔" پیٹر بے تابی سے بولا۔ "میرا خیال ہے اب تمہیں اندر جانے میں زیادہ دیر نہیں کرنا چاہیے .... تمہارا کیا خیال ہے اباقہ؟"

اباقہ نے سانس درست کرتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ پہلے میں تنہا اندر جا کر جائزہ لوں ممکن ہے کوئی ایسی صورت نکل آئے کہ ہم تصادم سے بچ سکیں۔"

پیٹر نے کہا۔ "یہ ممکن نہیں۔ ہمیں پہریداروں سے بہر صورت نبٹنا پڑے گا۔"

اباقہ نے قدرے تحکم سے کہا۔ "جنگ میں سب کچھ ممکن ہوتا ہے پیٹر۔ میرا خیال ہے کہ ایک سپاہی کی حیثیت سے میں اس موقع پر بہتر فیصلہ کر سکتا ہوں۔"

پیٹر اب تک اباقہ سے خاصا مرعوب ہو چکا تھا۔ اس نے زیادہ بحث نہیں کی بولا۔ "ٹھیک ہے ہم تمہارا انتظار کرتے ہیں۔ اگر جھڑپ شروع ہو گئی تو ہمیں آواز دے لینا۔"

اباقہ نے کہا۔ "درست ہے۔ تم اپنی تلواریں نکال کر تیار رہو۔"

سولیونی اور پیٹر کو درختوں پر چھوڑ کر اباقہ تیزی سے صدر دروازے کی طرف بڑھا۔ قندیل کی روشنی میں عمارت کے صحن کا کچھ حصہ دکھائی دے رہا تھا۔ اباقہ صحن میں پہنچا اور

دبے قدموں برآمدے کی طرف بڑھا۔ وہ پہریدار کے لباس میں تھا' سر پر خود اور پشت پر گول ڈھال تھی۔ اس کے جوتے پنڈلیوں تک پہنچ رہے تھے۔ برآمدے میں روشنی تھی۔ دو صحت مند سپاہی ایک دروازے پر پہرا دے رہے تھے۔ دیوار کے ساتھ ساتھ نشستیں تھیں جن پر کوئی ایک درجن سپاہی اکڑوں بیٹھے تھے۔ وہ سب کے سب سر سے پیر تک دے میں ڈوبے تھے۔ ایک چھوٹا سا آتشدان کونے میں دہک رہا تھا۔ اس آتشدان کی حدت اتنی ہرگز نہیں تھی کہ پہریدار سکون پا کر اونگھ سکتے۔ ہاں اس کا اتنا فائدہ ضرور تھا کہ نیچے بیٹھے اگر کسی سپاہی کے ہاتھ پاؤں سن ہونے لگیں تو وہ انہیں آتشدان پر جا کر تاپ سکتا تھا۔ اباقہ پہریداروں کے لباس میں تھا اس لیے وہ اندر داخل ہوا تو کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں دی۔ مگر جب وہ روشنی میں آیا تو ایک ساتھ کئی سپاہی چونک گئے۔

"کون ہو تم؟" ان کے کماندار نے نہایت خطرناک لہجے میں پوچھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے تلوار نیام سے باہر کر لی تھی۔ وہ موٹی گردن والا ایک سخت گیر شخص تھا۔

اباقہ تیزی سے بولا۔ "دیکھو صاحبو! میں تمہارا ہمدرد ہوں۔ میرا نام اباقہ ہے۔ تم جانتے ہو اس سے پہلے میں شاہی ضیافت گاہ میں شاہی مہمانوں کی جان بچا چکا ہوں۔ شہر کے مشرقی حصے میں لکڑی کا پل بھی میں نے ہی جلایا تھا۔ ہو سکتا ہے تم میں سے کوئی مجھے شکل سے بھی پہچانتا ہو۔ میرا خیال ہے یہ دونوں واقعات مجھے وفادار ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں۔"

کماندار کے چہرے پر طیش آمیز سراسیمگی نظر آ رہی تھی۔ وہ بولا۔ "تم کوئی بھی ہو' یہاں تک کیسے پہنچے؟"

اباقہ بولا۔ "میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ اس لیے زیادہ بتا نہیں سکتا۔ تمہیں میری ذات پر اعتماد کرنا ہو گا۔ میرے ساتھ اس وقت ایک ایسا شخص ہے جس نے اسلحہ خانے میں دھماکہ خیز مواد چھپا رکھا ہے اور اس مواد سے منسلک بارودی فیتہ تمہارے اردگرد کہیں موجود ہے۔ میں اس شخص کا معاون بن کر یہاں پہنچا ہوں۔ ہمارا منصوبہ تم سب کو تہ تیغ کرنے کا تھا لیکن میں ایسا نہیں چاہتا۔ لہٰذا تم سے درخواست کرتا ہوں کہ میرے ساتھ تعاون کرو۔"

"کیسا تعاون؟" کماندار نے تیوری چڑھا کر پوچھا۔ اس کی تلوار کا رخ اب اباقہ کی طرف تھا۔

اباقہ نے کہا۔ "تم میں سے دو تین آدمی خود کو مردہ ظاہر کر کے زمین پر لیٹ جائیں۔ باقی اس ساتھ والے چھوٹے کمرے میں چلے جائیں یا کسی اور طرف نکل جائیں۔

بولا۔ "یہ کیا رہے ہو؟" پھر جواب کا انتظار کئے بغیر دوبارہ بیرونی دروازے کی طرف بھاگا۔ اباقہ نے چھلانگ لگائی اور دہلیز کے قریب اسے چھاپ لیا۔ پیٹر نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر تلوار اپنی گردن پر پھیرنا چاہی۔ اباقہ نے اس کا ارادہ بھانپتے ہوئے اس کی کلائی گرفت میں لے لی۔ پیٹر نے جب یہ دیکھا کہ تلوار کا استعمال ممکن نہیں تو اس نے دوسرا ہاتھ اپنی پیٹی قبض کی طرف بڑھا دیا.......... مگر پیش قبض وہاں ہوتی تو ملتی۔ وہ تو شام کو ہی سرنگ کے دہانے پر گر گئی تھی جب پیٹر دروازے کا قفل کھولنے گیا تھا.......... اب وہ مائیکل کے قبضے میں تھی۔ پیٹر سمجھ گیا کہ وہ اپنی جان لینے کے اختیار سے محروم ہو چکا ہے۔ عین اس وقت برآمدے کی طرف سے بھاگتے قدموں کی آوازیں آئیں۔ یوں لگا جیسے بہت سے تازہ دم سپاہی گودام میں داخل ہو رہے ہیں۔

☆------☆------☆

رات کے آخری پہر شہزادی نتاشا کو جگا کر اس خوفناک سازش کی خبر سنائی گئی۔ شہزادی یہ سن کر لرز اٹھی کہ قلعے میں اسلحے کے گودام کو دھماکے سے اڑانے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ خبر سنانے کے لیے نائب رئیس بنفس نفیس محل میں پہنچا تھا۔ قلعے کا داروغہ بھی اس کے ہمراہ تھا۔ داروغہ نے بتایا کہ کس طرح گودام کے محافظوں نے جان پر کھیل کر مجرموں کو عین موقع پر گرفتار کر لیا۔

نائب رئیس نے کہا۔ "شہزادی! یہ ایک بہت گہری سازش تھی۔ ان لوگوں نے پہلے سے گودام کے اندر دھماکہ خیز مواد پہنچا دیا تھا۔ یہ مواد اور اس سے منسلک فیتہ اتنی ہوشیاری سے چھپایا گیا تھا کہ کوشش کے باوجود اس کا سراغ پانا مشکل تھا۔ اب بھی یہ لوگ پوری تیاری کے ساتھ آئے تھے۔ قلعے کے کچھ ملازمین بھی ان کے ساتھ ملے ہوئے ہیں۔ انہوں نے قلعے میں داخل ہونے کے لیے سرنگ استعمال کی اور مختلف مرحلوں سے گزرتے ہوئے کامیابی کے ساتھ گودام تک پہنچ گئے۔ محافظوں نے جرأت سے ان کا مقابلہ کیا اور عین اس وقت جب ملزم بارودی فیتے کو آگ دکھا چکے تھے ان پر قابو پا لیا گیا۔"

شہزادی نے پوچھا۔ "ملزموں کی تعداد کیا تھی؟"

نائب رئیس نے کہا۔ "عملی طور پر اس کارروائی میں حصہ لینے والے افراد چار تھے۔ ان میں سے ایک سرنگ کے اندر ہی ہلاک ہوا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اس کی لاش دہانے سے کوئی دو سو گز دور ڈھونڈ لی گئی ہے۔ خیال ہے کہ اسے زہریلے سانپوں نے ڈسا ہے۔ قلعے میں کل دو آدمی داخل ہوئے تھے۔ ایک شخص پیٹر قلعے سے ان کے ساتھ شامل

ہوا۔"

شہزادی نتاشا نے پوچھا۔ "باقی ملزموں کی شناخت ہوئی؟"

"ہاں۔ ان میں سے ایک تو سولیوفی ہے جو چند روز پہلے شاہی حراست سے فرار ہوا تھا۔ وہ گودام کے دروازے پر محافظوں سے تصادم کے دوران ہلاک ہو گیا ہے۔ دوسرا ملزم ایک ایسا شخص ہے جس کا نام سن کر میری طرح آپ بھی حیرت میں پڑ جائیں گی.......... مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہ وہ شخص ابھی تک زندہ کیسے ہے؟"

شہزادی نے پوچھا۔ "کیا نام ہے اس کا؟"

نائب رئیس نے اطمینان سے کہا۔ "اباقہ۔"

"اباقہ؟" شہزادی اپنی جگہ سے اچھل پڑی۔ پھر حیرت سے بولی۔ "لیکن اسے تو موت کی سزا دے دی گئی تھی۔"

نائب رئیس بولا۔ "میں بھی تو یہی کہہ رہا ہوں کہ اسے موت کی سزا دے دی گئی تھی۔"

شہزادی نتاشا کے سینے میں ایک ساتھ ہی خوشگوار اور ناخوشگوار دھڑکنوں نے یلغار کر دی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ یہ خبر سن کر اسے خوشی ہوئی ہے یا دکھ۔ وہ بولی۔ "نائب رئیس! آپ نے اچھی طرح دیکھا ہے 'وہ اباقہ ہی تھا؟"

نائب رئیس نے کہا۔ "میں نے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا لیکن جتنے لوگ بھی عقوبت خانے سے آئے ہیں۔ انہوں نے یہی کہا ہے کہ وہ اباقہ ہے۔"

شہزادی بولی۔ "آپ کا مطلب ہے کہ اس وقت وہ عقوبت خانے میں ہے؟"

نائب رئیس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "پیٹر اور وہ دونوں عقوبت خانے میں ہیں۔ انہیں محافظوں نے بارودی فیتے سے چند گز کی دوری پر گرفتار کیا تھا۔ وہ بھاگنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میرے ہی حکم پر انہیں عقوبت خانے لے جایا گیا ہے۔ اس گہری سازش کے سرغنہ کو بے نقاب کرنے کے لیے ہمارے پاس محدود وقت ہے اور یہ کام اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ ملزموں کی زبان جلد سے جلد کھول جائے۔"

شہزادی نے کہا۔ "کیا آپ کو یقین ہے کہ اباقہ مجرموں کے ساتھی کی حیثیت سے وہاں پہنچا تھا۔"

نائب رئیس نے کہا۔ "شہزادی! آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں محافظوں نے اسے گودام کے اندر سے رنگے ہاتھوں پکڑا ہے۔"

اچانک شہزادی نتاشا کو احساس ہوا کہ وہ اباقہ کے بارے میں ضرورت سے زیادہ

تجسس کا مظاہرہ کر رہی ہے۔ اپنے لہجے کو محتاط کرتے ہوئے اس نے کہا۔ "ہم ملزموں کو دیکھنا چاہیں گے۔"

نائب رئیس نے کہا۔ "درست ہے میں ابھی انتظام کرتا ہوں۔"

.... دوسری طرف توزن باخ کی محل نما رہائش گاہ میں ڈیوک اور توزن باخ، بے چینی سے اپنی مہم کے نتائج کا انتظار کر رہے تھے۔ انتظار کی گھڑیاں کاٹنی مشکل تھیں۔ ان کے لیے مصری رقاصہ روما سازوں کی مدھم آواز پر اپنے جسم کی نمائش میں مصروف تھی۔ ایک مصری نغمہ اس کے یاقوتی ہونٹوں سے نکل نشست گاہ کی نیم گرم فضا میں تحلیل ہو رہا تھا لیکن ڈیوک اور توزن باخ کا دھیان نہ اس نغمے کی طرف تھا اور نہ روما کے تھرکتے جسم کی طرف، ان کے کان کھڑکیوں سے باہر لگے تھے۔ جہاں تخ بستہ باد صبا، صبح کی آمد کا اعلان کر رہی تھی۔ اس باد صبا کے دوش پر تیرتا ہوا ایک خوفناک دھماکہ ان کے کانوں تک پہنچنے والا تھا۔ کسی بھی وقت .... کسی بھی لمحے، اباقہ سولیونی اور پیٹر اسلحہ خانے کو دھماکے سے اڑانے والے تھے۔ توزن باخ نے اپنے گنجے سر پر ہاتھ پھیرا اور پہلو بدل کر بولا۔ "کافی دیر ہو گئی ہے۔ اب کچھ ہو جانا چاہیے۔" اور پھر واقعی کچھ ہو گیا۔ اچانک نشست گاہ کا دروازہ کھلا اور یگوڈا ریشمی پردہ اٹھا کر ہانپتا ہوا اندر داخل ہوا۔ اس نے اپنی بھاری بھرکم آواز میں کہا۔

"محترم ڈیوک، ہم ناکام ہو گئے۔ سولیونی مارا گیا، اباقہ اور پیٹر گرفتار ہو گئے۔"

توزن باخ اور ڈیوک ایک ساتھ کھڑے ہو گئے۔ ساز تھم گئے۔ رقاصہ اپنی جگہ ساکت ہو گئی۔ ڈیوک نے ہاتھ میں پکڑا بلوری جام گھما کر ایک کھڑکی میں دے مارا۔ قیمتی شیشہ ٹوٹ گیا اور ٹھٹھری ہوئی ہوا پناہ کی تلاش میں اندر گھسنے لگی۔

"تخلیہ۔" ڈیوک ہاتھ اٹھا کر گرجا۔

سازندے، رقاصہ اور خادمائیں، چپ چاپ کان لپیٹ کر مختلف دروازوں سے نکل گئے۔ اب صرف یگوڈا کمرے میں کھڑا تھا۔ ڈیوک بولا۔ "یگوڈا! تم بھی باہر جاؤ۔ میں ابھی تمہیں بلاتا ہوں۔"

یگوڈا نے تعظیم میں سر جھکایا اور باہر نکل گیا۔ ڈیوک نے توزن باخ سے کہا۔ "کیا خیال ہے یگوڈا کو ختم کر دیا جائے؟"

توزن باخ بولا۔ "جیسے تم مناسب سمجھو لیکن اگر ہم اسے روپوش کر دیں تو بھی مقصد پورا ہو سکتا ہے۔ میرے خیال میں یگوڈا جیسے طاقت ور جاں نثار کو یونہی ضائع نہیں کرنا چاہیے۔"

ڈیوک نے پوچھا۔ "کیا تم اسے بحفاظت چھپانے کا انتظام کر سکتے ہو؟"

توزن باخ کا جواب اثبات میں تھا۔ ڈیوک نے فوراً تالی بجائی۔ دروازے پر کھڑا یگوڈا اندر آ گیا۔ ڈیوک بغیر کسی تمہید کے بولا۔ "یگوڈا، اب تم اس عمارت سے باہر نہیں نکلو گے۔ آج کسی وقت توزن باخ تمہیں کسی محفوظ مقام پر منتقل کر دے گا۔ کچھ دنوں کے لیے تمہارا روپوش ہونا ضروری ہو گیا ہے۔"

یگوڈا نے کہا۔ "جو حکم ڈیوک۔"

ڈیوک نے اسے جانے کا اشارہ کیا۔ یگوڈا چلا گیا تو ڈیوک کے چہرے پر گہری تشویش منڈلانے لگی۔ توزن باخ کے تاثرات بھی مختلف نہیں تھے۔ وہ بولا۔ "میرا خیال ہے کہ شاہی محل سے بلاوا آنے والا ہے۔" ڈیوک نے سر ہلا کر اس کی تائید کی۔ پھر کہنے لگا۔ "توزن! تم یہاں سے ہر طرح کے ثبوت ختم کر دو۔ تنظیم سے متعلق جو دستاویز موجود ہیں انہیں کہیں منتقل کر دو۔" توزن فوراً اس مشورے پر عمل کرنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ ڈیوک بھی بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ وہ جانتا تھا اسے دونوں قیدیوں یعنی اباقہ اور پیٹر کو زبان کھولنے سے پہلے ہمیشہ کے لیے خاموش کرنا ہے۔ یگوڈا کے بغیر عقوبت خانے میں یہ کام کر گزرنا خاصا دشوار تھا مگر ایک وفادار ساتھی کا تعاون ڈیوک کو اب بھی حاصل تھا اور یہ وفادار ساتھی تھی "دولت" تھوڑی دیر پہلے اس نے قیمتی پتھروں سے بھری ہوئی جو تھیلی توزن باخ سے حاصل کی تھی وہ سامنے تپائی پر پڑی تھی۔ تھیلی اٹھا کر اس نے لباس میں رکھی۔ پھر دو جام اوپر تلے چڑھا کر سموری ٹوپی میں منہ چھپایا اور اصطبل کی طرف بڑھ گیا۔ وہ جانتا تھا شاہی پیادے، شہزادی کا بلاوا لے کر اس کی رہائش گاہ پر پہنچنے والے ہوں گے۔

☆‐‐‐‐‐‐‐‐☆‐‐‐‐‐‐‐‐☆

شہزادی نتاشا کو کم عمر تھی لیکن فہم و فراست اور دانائی اسے اپنے عظیم باپ سے ورثے میں ملی تھی۔ اس وقت وہ شاہی عقوبت خانے کے فرش پر بے قراری سے ٹہل رہی تھی خوبصورت آنکھیں غصے سے انگارا ہو رہی تھیں۔ غلام اور محافظ مشعلیں اور تلواریں تھامے مجسموں کی طرح ساکت اور دم بخود کھڑے تھے۔ نائب رئیس اور داروغہ قلعہ بھی یہیں موجود تھا لیکن شہزادی کی برہمی محسوس کرتے ہوئے وہ بھی خاموش بیٹھے تھے۔ اباقہ آج پھر انہی زنجیروں میں جکڑا تھا جہاں چند روز پہلے اسے بدترین تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا لیکن اس دفعہ وہ اکیلا نہیں تھا اس کے ساتھ دوسرے شکنجے میں پیٹر بھی موجود تھا۔

تھوڑی دیر بعد سیڑھیوں پر آہٹ ہوئی اور ڈیوک محافظوں کے ساتھ تہ خانے میں اتر آیا۔ شہزادی نے گھوم کر اس کی طرف دیکھا۔ اس وقت ڈیوک کی نگاہ اباقہ پر پڑی تو اس نے ششدر رہ جانے کی شاندار اداکاری کی۔ حیرتناک لہجے میں بولا۔

"شہزادی! یہ .... یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں؟ یہ شخص ابھی زندہ ہے؟"

شہزادی نے کاٹ دار لہجے میں کہا۔ "یہی سوال پوچھنے کے لیے ہم نے تمہیں یہاں بلایا ہے۔"

ڈیوک بولا۔ "شہزادی! لیکن اسے .... اسے تو گیگوڑا نے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔"

شہزادی بولی۔ "ہم نے اسے گیگوڑا کے نہیں' تمہارے سپرد کیا تھا۔"

ڈیوک بولا۔ "بجا کہتی ہو شہزادی! لیکن میں نے اس کی سزا پر عملدر آمد کا حکم گیگوڑا کو دیا تھا۔"

شہزادی بولی۔ "تمہارا مطلب ہے کہ اس غلط بیانی کا ذمے دار گیگوڑا ہے۔"

ڈیوک بولا۔ "شہزادی! ان حالات میں اس کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے۔"

شہزادی محافظوں سے مخاطب ہو کر گرجی۔ "گیگوڑا کہاں ہے۔ ابھی تک حاضر کیوں نہیں ہوا؟"

دستے کے کمانڈار نے ادب سے ہاتھ باندھ کر کہا۔ "شہزادی حضور! سردار گیگوڑا کو ہر ممکن تلاش کیا گیا ہے مگر ابھی تک اس کا پتہ نہیں چلا۔"

نائب رئیس نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے پُر سوچ لہجے میں کہا۔ "میرا خیال ہے ڈیوک درست کہہ رہا ہے۔ گیگوڑا غدار ٹولے سے مل چکا ہے۔ ورنہ عین اس وقت جب اس پر ایک سنگین الزام لگایا جا رہا ہے' وہ موقعے پر موجود کیوں نہیں؟"

شہزادی کے چہرے کا تناؤ قدرے کم ہوا۔ وہ ڈیوک سے بولی۔ "ڈیوک! ہمیں افسوس ہے کہ تم نے اپنی صوابدید پر مجرم کو ایک غیر ذمے دار شخص کے سپرد کیا اور ہمیں بلا تصدیق اس کی سزا پر عملدر آمد کی اطلاع دی۔"

ڈیوک نے کہا۔ "شہزادی! میں تو تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ گیگوڑا جیسا شخص اس طرح کی بے وفائی کر سکتا ہے۔ اگر میرا اندازہ غلط نہیں تو اس نے مجرم کی سزا معاف کر کے اسے تخریب کاری کے لیے استعمال کیا ہے۔"

شہزادی نے کہا۔ "ابھی سب کچھ معلوم ہو جاتا ہے۔" اس نے عقوبت خانے کے جلادوں کو حکم دیا کہ مجرموں کے منہ میں ٹھونسے گئے کپڑے نکالے جائیں۔ حکم پر عمل

ہوا۔ شہزادی نے اباقہ سے پوچھا۔ "تم اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہتے ہو؟"

اباقہ نے ڈیوک کی طرف انگلی اٹھائی اور بولا۔ "شہزادی! تیرا مجرم تیرے پہلو میں کھڑا ہے۔ یہی شخص ہے جو منگولوں کا دست و بازو بن کر ان کی آمد کے لیے اس شہر کے راستے صاف کر رہا ہے۔ شہر میں جو کچھ ہو رہا ہے' سب اسی غدار کا کیا دھرا ہے۔"

اباقہ کے ان جملوں نے تہ خانے میں سناٹا طاری کر دیا۔ شہزادی کچھ دیر گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر بولی۔ "اے شخص! ہم تجھ سے کسی کے بارے رائے طلب نہیں کر رہے جو خود مجرم ہے' کسی دوسرے کو مجرم کیسے ٹھہرا سکتا ہے۔ اگر کچھ کہنا چاہتے ہو تو اپنی صفائی میں کہو۔"

اباقہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں اپنی صفائی میں یہی کہوں گا کہ میں بے گناہ ہوں۔ اگر مجھ سے کچھ جرم سرزد ہوئے ہیں تو وہ ضرورت کے تحت ہوئے ہیں۔ اگر میں وہ معمولی جرائم نہ کرتا تو آج دلاوی میر کا قلعہ اپنی بنیادوں پر موجود نہ ہوتا۔"

"کیا مطلب؟" شہزادی نے پوچھا۔

اباقہ نے کہا۔ "شہزادی صاحبہ! میں نے وہ جرم غداروں میں شامل ہونے کے لیے کئے تھے تاکہ ان کا شریک کار بن کر منصوبے سے آگاہ ہو سکوں اور خدا کا شکر ہے میں اپنے مقصد میں کامیاب رہا۔"

نائب رئیس نے کہا۔ "تو کس کامیابی کا ذکر کر رہا ہے۔ تجھے رنگے ہاتھوں گرفتار کیا گیا ہے اور تو ایک ایسا کام کرنے والا تھا جو شہر کے دفاع کو مسمار کر کے رکھ دیتا۔ تیری سزا عبرتناک موت ہے۔"

اباقہ نے اطمینان سے کہا۔ "مجھے تم لوگوں سے ایسے ہی سلوک کی توقع تھی لیکن میں اتنا ضرور کہوں گا کہ میں اسلحہ خانہ تباہ کرنے کے لیے نہیں اسے بچانے کے لئے گیا تھا۔"

نائب رئیس چیخا۔ "بکواس کرتا ہے تو۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی کسی کی شہ رگ پر تلوار رکھے بیٹھا ہو اور کہے کہ میں اس کی جان بچا رہا تھا۔ تم نے بارودی فیتے کو آگ لگائی اور بھاگ کھڑے ہوئے۔ اسلحہ خانہ کے محافظوں نے جان پر کھیل کر سلگتا ہوا فیتہ بجھایا اور تم دونوں کو گرفتار کیا۔"

اباقہ بولا۔ "شہزادی صاحبہ! یہ سب جھوٹ ہے۔ بارودی فیتہ محافظوں نے نہیں میں نے بجھایا تھا۔ آپ محافظ دستے کے کمانڈار سے پوچھ سکتی ہیں۔ بلکہ آپ کسی بھی زندہ محافظ سے پوچھ سکتی ہیں۔ میں نے انہیں کہا تھا کہ گودام میں کارروائی ہونے والی ہے۔ میں

مجرموں کا ساتھی بن کر یہاں آیا ہوں اور ان کی سازش ناکام بنانا چاہتا ہوں۔"

شہزادی داروغہ کی طرف گھومی۔ "داروغہ! اسلحہ خانے کے محافظ دستے کے کماندار حاضر کیا جائے۔"

داروغہ نے سپاہیوں کو ہدایت کی۔ چند ہی لمحے بعد کماندار سیڑھیوں سے اترتا نظر آیا۔ لڑائی کے دوران اباقہ نے اس کے سر پر تلوار کا زوردار وار کیا تھا۔ قسمت اچھی تھی کہ وہ بچ گیا۔ اب اس کا پورا سر پٹیوں میں جکڑا ہوا تھا اور ایک ٹوٹا ہوا بازو گلے میں لٹک رہا تھا۔ وہ شہزادی نتاشا اور نائب رئیس کے سامنے ادب سے جھکا اور سپاہیوں کے انداز میں سیدھا کھڑا ہو گیا۔ شہزادی نتاشا بھی اب نشست پر براجمان ہو چکی تھی۔ اس نے کماندار کو حکم دیا کہ وہ واقعے کی تفصیل بتائے۔ کماندار نے کہا۔ "معظمہ شہزادی صاحبہ! نصف شب کے بعد کا عمل تھا جب یہ شخص گودام میں داخل ہوا۔ اس سے پہلے وہ دروازے پر کھڑے ایک سپاہی کو قتل کر چکا تھا۔ اس نے اباقہ کے نام سے اپنا تعارف کرایا اور کہا کہ ایک شخص گودام میں دھماکا کرنا چاہتا ہے۔ وہ اس کا ساتھی بن کر آیا ہے تاکہ دھماکے کی سازش کو ناکام بنا سکے۔ میں نے پوچھا کہ میں کیا کر سکتا ہوں' یہ بولا کہ ہم میں سے دو تین سپاہی یہاں مردہ بن کر لیٹ جائیں اور باقی ادھر ادھر ہو جائیں تاکہ اس کا ساتھی کارروائی کے لیے اندر داخل ہو سکے۔ اس نے کہا کہ جونہی اس شخص نے بارودی فیتے کی نشاندہی کر دی وہ اسے گرفتار کر لے گا۔ میں نے اس کی احمقانہ باتوں پر یقین نہیں کیا۔ اچانک اس نے تلوار سے حملہ کر کے دو سپاہیوں کو شدید زخمی کر دیا۔ اس دوران اس کے دونوں ساتھی بھی اندر آ گئے۔ لڑائی کے دوران اتفاقاً قندیل ٹوٹ گئی اور برآمدے میں تاریکی پھیل گئی۔ تاریکی کے سبب ہمارے تین سپاہی اپنی ہی تلواروں کا شکار ہو گئے۔ اس دوران میں نے ان دونوں مجرموں کو دیکھا' یہ برآمدے سے گودام کے دفتر میں داخل ہو رہے تھے۔ شدید زخمی ہونے کے باوجود میں رینگتا ہوا دفتر میں پہنچا۔ مجرم پیٹر نے ایک سوراخ کے اندر سے بارودی فیتہ نکالا۔ مجرم اباقہ نے دیا سلائی سے آگ دکھائی اور دونوں مڑ کر بھاگے' میں نے اپنے ساتھیوں کو پکار کر کہا کہ مجرم فرار ہو رہے ہیں۔ خود میں بارودی فیتے کی طرف لپکا اور اس سے پہلے کہ فیتے کی آگ گودام کے اندر پہنچ جاتی میں نے اسے بجھا دیا۔ دونوں مجرموں کو دروازے کے قریب دوسرے دستے کے سپاہیوں نے گرفتار کر لیا۔"

کماندار کے جھوٹ پر اباقہ کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ اس نے جبڑے اتنے زور سے بھینچ رکھے تھے کہ ہڈیاں ابھر آئی تھیں۔ شہزادی' اباقہ سے مخاطب ہو کر بولی۔ "تم

صفائی میں کچھ اور کہنا چاہتے ہو؟" اباقہ پتھر کی طرح ساکت کھڑا رہا۔ نہ اس نے زبان سے کچھ کہا اور نہ ہی سر کو جنبش دی۔ شہزادی نے پیٹر سے پوچھا۔ "تمہیں اپنی صفائی میں کہنا ہے؟"

پیٹر نے کہا۔ "میں اپنے جرم کا اقرار کرتا ہوں۔"

شہزادی بولی۔ "تمہیں اس جرم پر کس نے آمادہ کیا؟"

پیٹر نے ایک نظر ڈیوک کی طرف دیکھا اور پھر جیسے اس کی نظروں کا مفہوم سمجھتے ہوئے بولا۔ "میں اور اباقہ گیوڑا کے لیے کام کرتے تھے۔ اسی نے ہمیں اس مہم پر روانہ کیا تھا۔"

نائب رئیس نے کہا۔ "لیکن تمہارا ساتھی سارا الزام ڈیوک پر دھر رہا ہے۔"

پیٹر نے کہا۔ "یہ اس کا اپنا فعل ہے لیکن میں گیوڑا کا وفادار ہونے کے باوجود محترم ڈیوک پر الزام تراشی کی ہمت نہیں کر سکتا۔"

شہزادی کی آنکھوں میں سوچ کی پرچھائیاں تھیں۔ وہ خود کو بہت مشکل میں محسوس کر رہی تھی۔ ایک دفعہ پہلے بھی اس سے ایک غلط فیصلہ ہو چکا تھا۔ اب پھر حالات اسے ویسے ہی فیصلے کی طرف لے جا رہے تھے۔ اس نے نائب رئیس سے سرگوشی کی۔

"نائب رئیس! کیوں نہ اس معاملے کو عدالت کے سپرد کر دیا جائے۔"

نائب رئیس نے ڈیوک کی طرف دیکھا۔ وہ بھی اب شہزادی اور نائب رئیس کے ساتھ نشست سنبھال چکا تھا۔ کچھ دیر ڈیوک کے ساتھ مشورہ کرنے کے بعد نائب رئیس نے کہا۔ "شہزادی! ان ہنگامی حالات کا تقاضا ہے کہ اس نوعیت کے فیصلے فوری طور پر ہوں تاکہ مجرموں کو قرار واقعی سزا مل سکے۔ اطلاعات سے پتہ چلتا ہے کہ منگول لشکر اب کسی بھی وقت ماسکو سے ولادی میر کی طرف کوچ کر سکتا ہے۔ اگر ہم عدالتی چکر میں پڑے تو غدار نہ جانے کتنے اور ایسے منصوبوں کو عملی جامہ پہنا ڈالیں گے۔ اگر ہمیں منگول حملے سے پہلے ہی شہربدر نہیں ہونا تو فوری فیصلے کر کے مجرموں کو عبرتناک سزائیں دینا ہوں گی۔"

شہزادی نے مشورہ طلب نظروں سے ڈیوک کی طرف دیکھا۔ ڈیوک کی آنکھوں میں نائب رئیس کی تائید نظر آ رہی تھی .... نہ جانے کیوں شہزادی کو محسوس ہو رہا تھا کہ ایک بار پھر اس کی زبان سے اباقہ کے متعلق غلط فیصلہ صادر ہو جائے گا۔ وہ بے چینی میں بار بار اپنے ہونٹ کاٹ رہی تھی۔ اتنے میں عقوبت خانے کے قائم مقام نگران نے جو گیوڑا کی جگہ کام کر رہا تھا' شہزادی نتاشا کے سامنے حاضر ہو کر کہا۔ "شہزادی حضور! ملزم اباقہ

کے دو ساتھی کافی دیر سے باہر موجود ہیں اور اصرار کر رہے ہیں کہ انھیں آپ کی قدم بوسی کی اجازت دی جائے۔ ایک مقامی افسر بھی ان کے ساتھ ہے۔"

شہزادی کے بولنے سے پہلے ہی نائب رئیس نے گرجدار آواز میں نگران کو منع کر دیا۔ نگران نے گھبرا کر واپس جانا چاہا لیکن شہزادی کی آواز نے اسے روک لیا۔ "ٹھہرو۔ ہم ان لوگوں کو اندر لانے کی خصوصی اجازت دیتے ہیں۔"

نگران نے پھر ادب سے سر جھکایا اور واپس چلا گیا۔ کچھ ہی دیر بعد مائیکل' اسد اور یورق سیڑھیوں پر نظر آئے۔ مائیکل نے آگے بڑھ کر فوجی انداز میں سلام کیا۔ اسد اور یورق نے تعظیم پیش کی۔ شہزادی نتاشا نرمی سے بولی۔ "کیا تم مجرم کی صفائی میں کچھ کہنا چاہتے ہو؟"

مائیکل نے احترام سے کہا۔ "شہزادی صاحبہ! اگر مجرم سے آپ کی مراد اباقہ ہے تو مجھے کہنے دیجئے کہ آپ کو درست اطلاعات نہیں مل رہیں۔ اباقہ مجرم نہیں' محسن ہے اس نے اپنی جان پر کھیل کر اسلحہ خانے کو تباہ ہونے سے بچایا ہے۔"

نائب رئیس نے کہا۔ "نوجوان! ہم یہ سب کچھ پہلے بھی سن چکے ہیں۔ اگر تمہارے پاس اپنے دعوے کے حق میں کوئی ثبوت ہے تو پیش کرو۔"

مائیکل نے کہا۔ "جناب رئیس! بحیثیت ایک نگران میں اس وقت سے اباقہ پر نگاہ رکھے ہوئے تھا جب وہ سولیونی کے ساتھ سرنگ سے نکل کر قلعے میں داخل ہوا تھا۔ وہاں اباقہ کا یہ قریبی ساتھی اسد اللہ اس سے ملا۔ اباقہ نے اسد اللہ سے وہی سب کچھ کہا جو آپ سب سن چکے ہیں۔ اس نے کہا کہ دشمن بہت ہوشیار ہے۔ انھیں دھوکے میں رکھنے کے لیے مجبوراً وہ ان کا ساتھ دے رہا ہے .... جناب رئیس اور محترمہ شہزادی صاحبہ! رئیس اعظم کے وفادار خادم کی حیثیت سے میں یہ گواہی دیتا ہوں کہ اباقہ بے گناہ ہے۔"

ڈیوک نے مائیکل سے پوچھا۔ "کیا اباقہ کی یہ باتیں تم نے اپنے کانوں سے سنی تھیں۔"

مائیکل نے کہا۔ "نہیں ڈیوک! میں اس وقت کچھ فاصلے پر تھا۔ یہ سب کچھ اس نے اسد سے کہا تھا۔"

ڈیوک بولا۔ "اباقہ کے دیرینہ ساتھی کی گواہی کس طرح معتبر ہو سکتی ہے اور اگر فرض محال یہ درست بھی ہے تو کون کہہ سکتا ہے کہ جو اس کی زبان پر تھا وہی دل میں بھی تھا۔ اپنی اس چال کا ذکر تو اس نے اسلحے خانے کے محافظوں سے بھی کیا تھا' لیکن پھر خود ہی بارودی فیتے کو آگ بھی دکھائی۔"

اسد نے پوچھا۔ "کون کہتا ہے کہ اباقہ نے خود بارودی فیتے کو آگ دکھائی تھی۔"

ڈیوک نے کہا۔ "وہاں موجود ہر محافظ نے یہ بیان دیا ہے اور محافظوں کا کماندار یہ تمہارے سامنے کھڑا ہے۔"

اسد نے بلند آواز میں اباقہ سے کہا۔ "اباقہ تم بولتے کیوں نہیں۔ کہتے کیوں نہیں یہ جھوٹ ہے۔"

اباقہ بے حرکت کھڑا رہا۔ اس کی آنکھوں میں سرخی اور ہونٹوں پر خاموشی جیسے جم کر رہ گئی تھی۔

ڈیوک بولا۔ "تم لوگ کس کس کو جھٹلاؤ گے۔ تمھیں ماننا پڑے گا کہ تمہارا یہ ساتھی جو بے شک بہادر ہے' اب اپنی بہادری فروخت کر چکا ہے۔ اس نے سازشیوں کا آلہ کار بن کر دلاوی میر کے لاکھوں انسانوں کی زندگی سے کھیلنے کی کوشش کی ہے۔ وہ ہماری سر زمین پر ہمارا ہمدرد بن کر ضرور آیا تھا لیکن اب وہ آستین کا سانپ بن چکا ہے۔"

.... یورق یہ سب کچھ خاموشی سے سن رہا تھا۔ وہ پچھلے کئی روز سے خاموش تھا۔ اس اجنبی شہر اور اجنبی لوگوں میں آ کر وہ کچھ کم گو ہو گیا تھا۔ ویسے بھی اسے یہ زبان نہیں آتی تھی۔ مگر اس کی آنکھیں تو سب کچھ دیکھ رہی تھیں۔ اس کا ذہن بھی سب کچھ سمجھ رہا تھا۔ وہ اباقہ کی مشکلات پر اندر ہی اندر کھول رہا تھا۔ ایک لاوا سا اس کے اندر پک رہا تھا اور یہ لاوا آج پھٹ پڑنے کو تیار ہو گیا تھا۔ جب ڈیوک نے اباقہ کو آستین کا سانپ کہا تو یورق کے چہرے پر اچانک زلزلے کے آثار نظر آئے .... پھر اس نے اپنی جگہ کھڑے کھڑے جست کی اور اڑتا ہوا کماندار پر آیا۔ کماندار سر پر پٹیاں باندھے شہزادی کے سامنے کھڑا تھا۔ یورق کا دھکا لگا تو وہ فرش پر گرا اور دور تک پھسلتا چلا گیا۔ یورق پھرتی سے اس کے سینے پر سوار ہو گیا اور اپنا وزنی خنجر اس کی شہ رگ پر رکھ دیا۔ یہ سب کچھ اتنی جلدی ہوا کہ کوئی شخص اپنی جگہ سے حرکت نہ کر سکا۔ جب تک وہ حیرت کے شدید جھٹکے سے سنبھلتے یورق کماندار کو پوری طرح بے بس کر چکا تھا۔

"خبردار!" اس کی وحشیانہ آواز تہہ خانے میں گونجی۔ "اگر کسی نے حرکت کی تو اس مردود کی گردن کاٹ دوں گا۔"

چند سپاہی اپنی اپنی جگہ سے ہلے مگر شہزادی نتاشا نے انھیں ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ وہ گرجی۔ "اے شخص! تو جانتا ہے اس گستاخی کی تجھے کیا سزا مل سکتی ہے؟"

سردار یورق جواباً گرجا۔ "مجھے جاننے کی ضرورت بھی نہیں۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ اگر اس شخص نے سچ نہ بولا تو میں اسے ہمیشہ کے لیے خاموش کر دوں گا۔"

شہزادی نے کہا۔ "کیا اس قتل کے بعد ہم تجھے معاف کر دیں گے؟"

یورق نے برجستہ کہا۔ "کوئی بیوقوف ہی تم جیسے ظالموں سے یہ توقع رکھ سکتا ہے۔ میں جانتا ہوں تمہارے اس عقوبت خانے میں مجھے اذیتیں دے دے کر مارا جائے گا' لیکن یہ اس وقت ہو گا جب میں زندہ تمہارے ہاتھ آؤں گا۔"

یورق کے وحشیانہ لہجے نے حاضرین کو مبہوت کر دیا۔ وہ ذہنی طور پر تسلیم کر چکے تھے کہ یہ شخص وہی کرے گا جیسا کہہ رہا ہے اور یہ حقیقت بھی تھی۔ اس کے پاس اتنا وقت تھا کہ وہ کماندار کی شہ رگ کاٹنے کے بعد خنجر اپنے سینے میں اتار سکتا تھا۔

داروغہ کے اشارے پر سپاہیوں نے ایک بار پھر یورق کی طرف کھسکنا چاہا مگر اس دفعہ نائب رئیس نے انہیں منع کر دیا۔ منگول سردار کی آنکھیں بجلی کی تیزی سے چاروں طرف حرکت رہی تھیں۔ سپاہیوں کو متحرک دیکھ کر اس نے کماندار کی تناور گردن پر خنجر کا دباؤ بڑھا دیا تھا۔ آج وہ یورق نہیں' صحرائے گوبی کا سفاک درندہ نظر آ رہا تھا۔ وہ درندہ جو گھاس کی چند پتیوں یا گوشت کے ایک ٹکڑے کے لیے جان لے بھی لیتا ہے اور دے بھی دیتا ہے۔ اچانک ایک تہہ خانے میں موجود ہر فرد خود کو اس کے سامنے بے بس محسوس کرنے لگا۔ وہ سمجھ گئے کہ کماندار کی قربانی دیئے بغیر وہ اس وحشی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔

یورق ترکی زبان میں چنگھاڑ کر بولا۔ "بتا اے خبیث شخص' تو نے اباقہ کو اپنی آنکھوں سے فیتہ سلگاتے دیکھا تھا؟"

کماندار کا چہرہ برف کی مانند سفید تھا۔ اس کے سر کے زخم سے خون رس رس کر پیشانی کو داغدار کر رہا تھا۔ وہ ایک بار ہکلا کر چپ ہو گیا۔ یورق نے اس کی گردن پر خنجر کا دباؤ بڑھایا تو یکبارگی وہ چلا اٹھا۔ "نہیں .... نہیں۔ میں نے اسے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا تھا۔"

یورق نے پوچھا۔ "کیا فیتے کی آگ تُو نے خود بھائی تھی؟"

کماندار بولا۔ "نہیں .... میں نے نہیں بھائی تھی۔"

"تو پھر کس نے بھائی تھی؟"

"ان دونوں میں سے کسی نے بھائی تھی .... میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا نہیں۔"

یورق بولا۔ "تُو نے جو آنکھوں سے دیکھا ہے وہ بتا۔"

کماندار بولا۔ "جب ہم اندر داخل ہوئے تو .... تو اباقہ کا ساتھی بھاگنے کی کوشش میں تھا اور اباقہ نے اسے عقب سے دبوچ رکھا تھا ...."

یورق اس کے سینے پر بیٹھا بیٹھا شہزادی کی طرف گھوما۔ "شہزادی سن رہی ہو۔ فیتے کی آگ اباقہ نے بھائی تھی اور مجرم کو فرار ہونے سے بھی اسی نے روکا تھا .... اگر اب بھی تجھے بھروسا نہیں تو یہ دیکھ میں تجھے ثبوت فراہم کرتا ہوں۔" یورق نے کماندار کو چھوڑا اور تیزی سے اباقہ کے قریب پہنچا۔ اس کا زنجیر میں جکڑا ہوا ایک ہاتھ یورق نے روشنی کی طرف کر دیا۔ وہاں ہتھیلی پر ایک سرخ نشان صاف نظر آ رہا تھا۔ یہ سلگتے فیتے کا نشان تھا۔ یورق بولا۔ "سب دیکھ لو' یہ ہے وہ ہاتھ جس نے تم سے وفاداری کی ہے۔ تمہاری طرف بڑھنے والی موت کو روکا ہے۔ تم لوگ ناشکرے ہو کہ اپنے محسن کو نہیں پہچان سکے۔ اس شخص کو نہیں پہچان سکے جو جان پر کھیل کر تمہارے خلاف سازشیں ناکام بناتا رہا ہے۔ جس نے ہر بدنامی مول لے کر تمہارے مجرموں کے چہرے بے نقاب کئے ہیں .... سنا تھا شہروں میں رہنے والے مہذب لوگ بڑے احسان شناس اور قدردان ہوتے ہیں لیکن یہاں آ کر معلوم ہوا کہ احسان شناسی تم لوگوں کو چھو کر نہیں گزری۔ تم لوگ پتھر کے تراشے ہوئے ہو' جن کی آنکھیں دیکھتی ہیں اور نہ کان سنتے ہیں۔ دیکھو اسے .... یہ اکیلا' تن تنہا تمہارے دشمنوں سے بھی لڑ رہا ہے اور تمہارے ظلم بھی سہہ رہا ہے۔ اس کے بدلے اس نے تم سے کوئی منصب نہیں مانگا' تم سے کوئی انعام نہیں چاہا' حتیٰ کہ شہرت کی طلب بھی نہیں کی' لیکن ذرا خود ہی سوچو' اپنے دلوں کو ٹٹولو کیا وہ اس سلوک کا مستحق تھا جو تم اس کے ساتھ کر رہے ہو۔ کیا ایک اذیت ناک موت ہی اس کی کوششوں کا صلہ ہے۔ اگر یہی صلہ ہے تو ٹھیک ہے۔ مار دو اسے' اور ساتھ مجھے بھی مار دو' کیونکہ میں اس بیوقوف کا دوست بھی ہوں اور اس کا باپ بھی .... ہاں مار دو ہم دونوں کو ہم اس کے مستحق ہیں۔"

شہزادی ناشتا بے قرار ہو کر اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔ "ایسا مت کہو سردار ہم کسی سے ناانصافی نہیں کریں گے۔" پھر اس نے گھوم کر ڈیوک کی طرف دیکھا اور جذباتی لہجے میں بولی۔ "ڈیوک! ان حالات میں ہمارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ تمہیں گرفتار کر لیں۔"

تہہ خانے میں موجود ہر چہرا اس سنسنی خیز فیصلے پر دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ ڈیوک سکون سے اپنی جگہ بیٹھا رہا' لیکن اس کی آنکھوں میں خوف کے واضح آثار تھے۔ شہزادی کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہوتے ہی مسلح محافظوں نے اسے گھیرے میں لے لیا۔ شہزادی نے دوسرا حکم جاری کرتے ہوئے کہا۔ "انتہائی تشویشناک بات ہے کہ مجرموں نے کامیابی سے قلعے کے حساس ترین حصے تک رسائی حاصل کی اور وہاں دھماکا خیز مواد چھپایا' فرائض

سے غفلت برتنے کی بنا پر ہم داروغہ قلعہ اور محافظ دستے کے کماندار کو اسی وقت معطل کرتے ہیں۔ ان کے خلاف قانون کے مطابق کارروائی ہو گی۔" یہ حکم سنتے ہی داروغہ اور کماندار کے چہرے اتر گئے مسلح افراد نے انہیں بھی حراست میں لے لیا۔

شہزادی نے اباقہ کی رہائی کا تحریری حکم نامہ جاری کیا اور اپنی نشست سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ذرا ہی دیر بعد وہ مشعل بردار غلاموں کے جلو میں سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔ درمیانی سرنگ سے گزر کر وہ شاہی محل میں آ گئی۔ وہ سیدھی اپنی خوابگاہ میں پہنچی اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ دروازہ بند ہوتے ہی اس کا شاہانہ انداز رخصت ہو گیا۔ وہ مسہری پر لیٹ کر چھت کے پھول بوٹوں کو گھورنے لگی۔ نہ جانے کیوں اس کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو رہی تھیں۔ بار بار اباقہ کا چہرا اس کی نگاہوں میں گھوم جاتا تھا۔ وہ اپنے اس تصور سے خود ہی گھبرا رہی تھی۔ آخر سوچ بچار کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ اسے اس نوجوان سے ہمدردی ہے۔ اس ہمدردی کی وجہ وہ زیادتیاں ہیں جو وہ اس پر کرتی رہی ہے۔ اس نے سوچا وہ اباقہ اور اس کے ساتھیوں کی دلجوئی کے لیے انہیں محل میں طلب کرے اور انعام و اکرام سے نوازے تاکہ اس کے دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہو۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد اس نے اپنے ذاتی محافظ کو طلب کیا اور اسے حکم دیا کہ وہ شاہی مہمان خانے میں اباقہ اور اس کے تین ساتھیوں تک یہ اطلاع پہنچا دے کہ کل شام شہزادی شاہی محل میں ان سے ملاقات کرے گی۔ ذاتی محافظ شہزادی کا حکم لے کر رخصت ہو گیا.......... اس کی واپسی کچھ دیر بعد ہوئی اس نے شہزادی کو بتایا کہ وہ اطلاع تو دے آیا ہے لیکن اباقہ اور اس کے ساتھی شہر چھوڑنے کے لیے تیار بیٹھے ہیں۔ خاص طور پر بوڑھا منگول سردار بہت برہم دکھائی دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے ہم اس میزبانی کے لائق نہیں ہیں۔ شہزادی نتاشا کو لگا جیسے اس کے اندر کوئی چیز چھناکے سے ٹوٹ گئی ہے۔

نتاشا اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔ اس کا حسین چہرہ رعب و جلال میں کچھ اور حسین ہو گیا تھا۔ وہ بلند آواز میں بولی۔ "انہیں یہ ہمت کیسے ہوئی کہ ہماری اجازت کے بغیر یہاں سے واپس جائیں۔"

محافظ بھلا اس سوال کا کیا جواب دیتا۔ خاموش کھڑا رہا۔ نتاشا نے کہا۔ "دستہ سالار کو بلاؤ۔ ہم ابھی اباقہ اور اس کے ساتھیوں کو گرفتار کرائیں گے۔"

مگر اس سے پہلے کہ وہ دروازے سے نکلتا' شہزادی نے اسے رکنے کا حکم دیا۔ اس کے چہرے پر زبردست کشمکش پائی جاتی تھی۔ لگتا تھا کہ وہ سمجھ نہیں پا رہی کہ اباقہ اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہیے۔ انہیں اس گستاخی پر سزا دینا چاہیے یا

درگزر کرنا چاہیے۔ آخر اس نے محافظ کو دیا ہوا حکم واپس لے لیا اور بے قراری سے کمرے میں ٹہلنے لگی۔

شام تک پیچ و تاب کھانے کے بعد شہزادی نے خود مہمان خانے کا رخ کیا۔ چند محافظ اور کنیزیں اس کے ساتھ تھیں۔ جب وہ مہمان خانے پہنچی' سردار یورق' اسد اور اباقہ رخت سفر باندھ رہے تھے۔ شہزادی کو اپنے سامنے دیکھ کر وہ دم بخود رہ گئے۔ شہزادی نے یورق سے پوچھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ یورق نے کہا۔

"شہزادی صاحبہ! اب ہمارا یہاں رہنا بہت مشکل ہے۔ ڈیوک اور اس کے ساتھیوں کو آپ کی حکومت میں نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ ان کی دشمنی مول لے کر ہم نے اچھا نہیں کیا۔"

شہزادی نے کہا۔ "یورق! تمہیں اس انداز میں سوچنے پر کس بات نے مجبور کیا؟"

یورق بولا۔ "شہزادی صاحبہ! بہت سی باتیں ہیں۔ ایک چھوٹی سی مثال آپ کو دیتا ہوں۔ آپ اچھی طرح جان چکی ہیں کہ تاجر توزن باخ' ڈیوک کا قریبی ساتھی ہے۔ اس کے باوجود آپ نے اسے گرفتار نہیں کیا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ڈیوک کا حلقۂ اثر بہت وسیع ہے۔"

شہزادی نے کہا۔ "سردار یورق! تم ہم پر بے اعتمادی کا اظہار کر رہے ہو۔ تمہیں ہمارے انصاف پر شک نہیں کرنا چاہیے۔ تم دیکھو گے کہ ڈیوک اور اس کے ساتھیوں کو قرار واقعی سزا ملے گی۔ جہاں تک توزن باخ کا سوال ہے اس کی گرفتاری کے احکامات جاری ہو چکے ہیں۔ اگر وہ زنداں میں نہیں پہنچا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ڈیوک کی گرفتاری کا سن کر روپوش ہو گیا ہے۔ اس کی تلاش سرگرمی سے جاری ہے۔ خیال ہے کہ اس نے خود کو شہر کے اندر ہی کسی خفیہ مقام پر چھپا رکھا ہے۔ ہم تمہیں واضح الفاظ میں یقین دلاتے ہیں کہ اسے معاف کیا جائے گا اور نہ اس کے کسی اہلکار کو۔ ہم تمہیں اس بات کی بھی ضمانت دیتے ہیں کہ تم سے جو زیادتیاں ہوئیں۔ ان کا مداوا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے گی۔ اس کے باوجود اگر تم دلادی میر چھوڑ کر جاؤ گے تو ہمیں تمہاری انسان دوستی پر شک ہو گا۔ ہم یہ سوچنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ عین اس وقت جب منگول حملہ آور ہماری طرف بڑھ رہے ہیں ہماری خیر خواہی کا دم بھرنے والے ہمیں چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔"

یورق بولا۔ "شہزادی صاحبہ! آپ جانتی ہیں کہ ہمارے جانے کی وجہ منگولوں کا خوف نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو ہم ادھر کا رخ ہی نہ کرتے۔"

شہزادی بولی۔ "پھر کیا وجہ ہے کہ ایسے نازک وقت تم اس شہر کو الوداع کہہ رہے ہو۔ میں مانتی ہوں کہ بدانتظامی کے سبب' تمہارے ساتھی اباقہ کے ساتھ ناروا سلوک ہوا ہے لیکن ان پُر آشوب حالات میں ان باتوں کو دوہرانے سے فائدہ نہیں.........."

شہزادی کافی دیر یورق' اسد اور اباقہ کو سمجھاتی رہی۔ آخر انہیں شہزادی کو یقین دلانا پڑا کہ وہ فی الحال ولادی میر سے نہیں جائیں گے۔ شہزادی نے انہیں بہ نفس نفیس شاہی محل میں ضیافت کی دعوت دی اور واپس چلی گئی۔

☆--------☆--------☆

شام کا وقت تھا۔ شہزادی نتاشا نے ریشمی لباس پہن کر اپنے نوخیز جسم کے نشیب و فراز کو دلچسپی سے دیکھا اور ایک بڑے آئینے کے سامنے بیٹھ کر سنگھار کرنے لگی۔ اچانک اس نے آئینے میں دیکھا کہ کلثوم عقب میں کھڑی مسکرا رہی ہے۔ نتاشا جلدی سے کھڑی ہوئی۔ کلثوم کی آنکھوں میں اسے عجیب طرح کی شرارت نظر آئی۔ نہ جانے کیوں نتاشا کے مرمریں رخساروں پر سرخی دوڑ گئی۔ کلثوم بولی۔

"آج یہ برق کس پہ گرے گی؟"

شہزادی نے لہجے کو خشک بنانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "کلثوم! ہر وقت مذاق اچھا نہیں لگتا۔" اس کا خیال تھا کہ سخت لہجے کی وجہ سے کلثوم کو مزید بات کرنے کی ہمت نہیں ہو گی مگر کلثوم بدستور ڈٹی رہی۔

"شہزادی صاحبہ گستاخی معاف آج تو آپ جسے دیکھیں گی بھسم کر دیں گی۔"

کوشش کے باوجود شہزادی اسے جھڑک نہ سکی۔ موضوع بدلتے ہوئے بولی۔

"نعمت خانے میں سب ٹھیک ہے؟"

کلثوم نے کہا۔ "جی شہزادی حضور! میں بڑے باورچی سے خود مل کر آئی ہوں۔ خوب تیاری کی ہے اس نے۔ تیتر کا گوشت ہے۔ بھنا ہوا اور سادہ بھی۔ تین چار طرح کی مچھلی ہے۔ سبزیوں اور گوشت کے عرق میں پکائے ہوئے چاول ہیں۔ اس کے علاوہ مشرقی علاقے کے باشندوں کی مرغوب خوراک گوشت کے ابلے ہوئے پارچے خاص طور پر تیار کرائے گئے ہیں۔ آپ کی ہدایت پر تین چار طرح کی شیرینی بھی تیار کرائی گئی ہے۔"

شہزادی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "ضیافت گاہ کی آرائش ہو گئی؟"

کلثوم بولی۔ "جی شہزادی عالیہ! نئے پردے لگا دیئے گئے ہیں۔ قالین بھی بدل دیا گیا ہے۔"

شہزادی نے کہا۔ "اور وہ فانوس جو میں نے بدلنے کو کہا تھا؟"

کلثوم نے ذرا سا اچھل کر دانتوں میں انگلی دبائی۔ "اوہ! وہ تو میں بھول ہی گئی۔" پھر وہ جلدی سے باہر نکل گئی۔ شہزادی نے ایک نظر آئینے پر ڈالی۔ بے خیالی میں اس نے کچھ زیادہ ہی سنگھار کر لیا تھا۔ اسے یاد آیا کہ جب اس کی مادر محترم زندہ تھیں۔ اسے ہلکے سنگھار کی ترغیب دیا کرتی تھیں۔ اس نے رومال پکڑا اور ہونٹوں کی سرخی اور رخساروں کے غازے کو معقول حد تک کم کر دیا۔ اس ہلکے پھلکے سنگھار نے اسے کچھ اور بھی نکھار دیا۔ وہ مسہری پر نیم دراز ہو کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ کلثوم کی شریر آنکھیں اس کے ذہن میں آسمائیں وہ ان آنکھوں کا مطلب سمجھتی تھی۔ کلثوم کا خیال تھا کہ شہزادی اباقہ میں دلچسپی لے رہی ہے۔ حالانکہ ایسی بات نہیں تھی۔ اس جنگلی سے اسے کچھ ہمدردی ضرور تھی مگر اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں تھا کہ وہ اس کے دل میں بس گیا ہے۔ مزید اطمینان کے لیے شہزادی نے یہی سوال اپنے آپ سے پوچھا اور اس کا جواب اسے یہی ملا کہ کلثوم کا اندازہ غلط ہے۔

چراغ جلنے کے دو گھڑی بعد مہمان نشست گاہ میں پہنچ گئے مہمانوں کی آمد کی اطلاع شہزادی کو اس کے ذاتی محافظوں نے دی تھی.......... شہزادی نشست گاہ میں پہنچی تو یہ دیکھ کر اسے جھٹکا سا لگا کہ اباقہ ان میں موجود نہیں۔ ایک مایوسی سی اس کے رگ و پے میں دوڑ گئی۔ تاہم اس نے خود پر قابو پایا اور خوشدلی سے یورق' اسد اور مائیکل کا استقبال کیا۔ نائب رئیس بھی اس موقع پر موجود تھا۔ رسمی گفتگو کے بعد شہزادی نے اباقہ کے بارے پوچھا۔ یورق نے بتایا کہ اسے دوپہر سے کچھ بخار ہے۔ اس اطلاع کے بعد شہزادی کی الجھن تو دور ہو گئی مگر وہ ضیافت کے اختتام تک کچھ بجھی بجھی سی رہی۔ جب یورق' اسد اور مائیکل روانہ ہونے لگے تو شہزادی نے انہیں خصوصی عنایت کا مستحق ٹھہراتے ہوئے گراں قدر تحائف دیئے۔ اس موقع پر اس نے نائب رئیس کو ہدایت کی کہ شہر کے دفاع کے متعلق ہر مشورے میں اباقہ اور اس کے ساتھیوں کو شریک کیا جائے۔

مہمانوں کی روانگی کے کچھ دیر بعد نتاشا محل کی بالکونی میں آ گئی۔ مطلع صاف تھا اور کھٹھرے ہوئے آسمان پر چاند تاروں کی محفل سجی تھی۔ خنک ہوا نتاشا کے ریشمی بالوں سے کھیلنے لگی۔ اسے رہ رہ کر اباقہ پر غصہ آ رہا تھا۔ اگر اسے تھوڑا بہت بخار تھا بھی تو اسے شاہی ضیافت پر آنا چاہیے تھا۔ پھر وہ خود ہی اپنے آپ کو سمجھانے لگی۔ ممکن ہے اس کی طبیعت زیادہ خراب ہو۔ یا طبیب نے اسے خواب آور دوا دے رکھی ہو۔ ابھی وہ بالکونی میں تھی جب کلثوم اس کے پہلو میں پہنچی۔ اس کے ساتھ دو شاہی جاسوس بھی تھے۔ جاسوسوں نے بتایا کہ ابھی کچھ دیر پہلے اباقہ نے شہر کے مغربی حصے میں مہاجروں کی بستی

میں تین آدمیوں کو بری طرح پیٹا ہے۔ شہزادی اس اطلاع پر حیران رہ گئی۔ ابھی تو اس کے ساتھی کہہ رہے تھے وہ بستر پر ہے اور اب اس کے بارے لڑائی بھڑائی کی اطلاع مل رہی ہے۔ شہزادی نے جاسوسوں سے تفصیل پوچھی۔ انہوں نے بتایا کہ غروب آفتاب کے فوراً بعد اباقہ کو مہاجروں کی بستی میں دیکھا گیا۔ اس کی موجودگی مشکوک تھی اس لیے اس کا تعاقب کیا گیا۔ وہ فیروز نامی ایک پارسی کے گھر پہنچا۔ دروازہ کھٹکھٹانے پر فیروز باہر آیا تو اباقہ نے اس سے علی نامی کسی لڑکے کا مطالبہ کیا۔ اباقہ کو شک تھا کہ یہ نو عمر لڑکا فیروز کے پاس ہے۔ فیروز نے اس الزام کو ماننے سے انکار کیا۔ اباقہ طیش میں آکر فیروز کو پیٹنے لگا۔ اس دوران فیروز کے دو بھائی بھی آگئے۔ انہوں نے اباقہ پر لاٹھیوں سے حملہ کیا مگر اباقہ نے انہیں بھی بری طرح مارا۔ پھر وہ فیروز کو گھسیٹتا ہوا اندر لے گیا۔ اندر جاکر بھی وہ اس سے علی کے بارے پوچھتا رہا۔ مکان کے اندر درحقیقت کیا بات چیت ہوئی اس کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا مگر فیروز کا یہی کہنا ہے کہ اباقہ نے اس سے لڑکے کے بارے پوچھا۔ جس کا اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

شہزادی کے چہرے پر غصے کی سرخی پھیل گئی۔ صاف ظاہر تھا کہ اباقہ نے جھوٹ بولا ہے۔ وہ صحت مند ہونے کے باوجود ضیافت پر نہیں آیا تھا۔ اس نے اسی وقت دستہ سالار کو طلب کیا اور اسے ہدایت کی کہ مہمان خانے سے اباقہ کو فوراً شاہی محل میں لایا جائے۔ اسے کہا جائے کہ یہ شہزادی کا حکم ہے۔ اگر وہ تعمیل میں حیل و حجت کرے تو اس کے ساتھی اسد کو حاضر کیا جائے۔

دستہ سالار شہزادی کے حکم پر ادب سے سر جھکا کر واپس چلا گیا۔ کوئی نصف گھڑی بعد وہ واپس آیا اور اس نے نشست گاہ میں داخل ہو کر شہزادی سے اباقہ کو پیش کرنے کی اجازت چاہی۔ اجازت ملنے پر وہ اباقہ کو اندر لے آیا۔ شہزادی نے تخلیے کا حکم دیا۔ اب اباقہ اور نتاشا تنہا تھے۔ ان کے درمیان ایک آبنوسی تپائی تھی جس پر ایک طلائی طشت میں تر و تازہ میوے پڑے تھے۔ تپائی کے عین اوپر ایک بیش قیمت فانوس جگمگا رہا تھا۔ اس کی روشنی میں نتاشا نے بغور اباقہ کو دیکھا۔ وہ میلی پوستین میں الجھے ہوئے بالوں کے ساتھ خاموش کھڑا تھا۔ شہزادی نے پوچھا۔

"اباقہ! تم کھانے پر نہیں آئے؟"

اباقہ نے کہا۔ "شہزادی عالیہ! میرے ساتھیوں نے آپ کو بتا دیا ہو گا۔"

شہزادی نے طنز سے کہا۔ "ہاں انہوں نے بتا دیا تھا کہ تم بیمار ہو۔ ہمیں معلوم ہوتا کہ تمہیں طبیب ڈھونڈنے کے لیے مہاجر بستی جانا پڑے گا تو ہم اپنا طبیب بھیج دیتے۔"

اباقہ کے چہرے پر رنگ سا آکر گزر گیا۔ وہ سنبھل کر بولا۔ "ٹھیک ہے شہزادی عالیہ اگر آپ کو معلوم ہو گیا ہے تو میں بھی چھپاؤں گا نہیں۔"

شہزادی نتاشا اس کے کڑوے سچ پر تلملا گئی غصے سے بولی۔ "اباقہ! تم مسلسل ہماری توہین کر رہے ہو۔ اس کی سزا جانتے ہو؟"

شہزادی کے تحکمانہ لہجے پر اباقہ بھڑک اٹھا۔ اس کی طرف انگلی اٹھا کر بولا۔

"شہزادی! مجھے سزاؤں سے مت ڈرا۔ اس وقت سے ڈر جب تُو اور تیری قوم سزاؤں کے نرغے میں ہو گی۔ تیرے ایک ایک ظلم کے بدلے تجھ پر دس گنا ظلم ہو گا۔"

شہزادی نے کہا۔ "کون سے ظلم کئے ہیں میں نے۔"

اباقہ اسی لہجے میں بولا۔ "تُو رئیس کی بیٹی ہے اس لیے بھول گئی ہے مگر میں ابھی نہیں بھولا۔ مجھے یاد ہے تُو نے ایک کم سن بچے کے ساتھ گھوڑے پر بیٹھنے سے اس لیے انکار کر دیا تھا کہ اس کے جسم پر میلے کپڑے تھے۔ تُو نے اسے اپنی توہین سمجھا تھا اور اسی توہین کا بدلہ چکانے کے لیے مجھے عقوبت خانے کے جہنم میں جھونک دیا تھا۔ شہزادی میرا دل تیرے لگائے ہوئے زخموں سے داغ داغ ہے۔ میں کیوں تیری دعوت قبول کرتا' کیوں نہ اس معصوم کو تلاش کرتا جو تیری عداوت کے سبب مجھ سے بچھڑ گیا.........."

شہزادی اپنے جلال کو قابو میں رکھ کر بولی۔ "علی کے گم ہونے میں ہمارا کیا قصور ہے؟"

اباقہ نے کہا۔ "اور کس کا قصور ہے۔ تیرے آدمیوں نے مجھ پر حملہ کیا تھا تو ساتھ اس معصوم کو بھی نشانہ بنایا تھا۔ وہ مہمان خانے کے باغ میں بے ہوش ہو کر گرا تھا۔ وہاں سے اسے مہمان خانے کا ایک خدا ترس خدمتگار اپنے گھر لے جا رہا تھا کہ وہ راستے میں گھوڑا گاڑی سے غائب ہو گیا۔ اس پر آنے والی مصیبت کی ذمہ دار تم اور صرف تم ہو۔"

اباقہ کے دل میں پلنے والا غصہ بے باک فقروں کی صورت اس کے ہونٹوں پر آگیا تھا۔ اچانک شہزادی کو احساس ہوا کہ اباقہ نے اس کی دعوت قبول نہ کر کے خود داری کا ثبوت دیا ہے۔ واقعی اس سے بہت ناانصافی ہوئی تھی۔ اس ناانصافی کا ازالہ ایک دعوت طعام یا چند تحائف نہیں تھے۔ شہزادی نے اپنے شاہی غصے پر قابو پایا اور اباقہ کے تند و تیز جملوں کو نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔ "اباقہ! ہمیں افسوس ہے کہ انتظامیہ ابھی تک تمہارے نو عمر ساتھی کو برآمد نہیں کر سکی۔ ہمیں افسوس اس بات کا بھی ہے کہ.........."

یکایک احساس ندامت سے شہزادی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ شاید زندگی میں پہلی بار وہ کسی سے اظہار معذرت کر رہی تھی۔ اس نے حوصلہ جمع کرتے ہوئے کہا۔ "اباقہ افسوس ہے کہ ہم

اگلے روز شام کے بعد شاہی محل کے عقبی دروازے سے ایک گھڑ سوار نکلا اور مشرق کی طرف چل دیا۔ کچھ آگے جا کر ایک دوسرا گھڑ سوار اس کے ساتھ مل گیا۔ دونوں کا رخ مغربی شہر کی طرف تھا۔ ایک نسبتاً کم آباد علاقے میں پہنچ کر شاہی محل سے برآمد ہونے والے گھڑ سوار نے وہ چادر اتار کر درختوں میں پھینک دی' جس نے اس کا چہرہ اور جسم چھپا رکھا تھا۔ یہ شہزادی نتاشا تھی اس وقت وہ لباس اور حلیے سے ایک غریب دہقان دوشیزہ نظر آ رہی تھی۔ اس کا ساتھی اباقہ تھا۔ دونوں خاموشی سے مختلف راستوں پر سفر کرتے ہوئے ایک مضافاتی بستی میں پہنچ گئے۔ اسے "مہاجر بستی" کہا جاتا تھا۔ جب سے روسی علاقے پر منگولوں کے حملے شروع ہوئے تھے۔ سرحدی بستیوں کے لوگ خود کو غیر محفوظ محسوس کرتے ہوئے دارالحکومت ولادی میر کی طرف کوچ کرنے لگے تھے۔ ان میں دور دراز علاقوں کے لوگ بھی تھے اور تو برباد شدہ شہروں سلاذل' ماسکو وغیرہ کے مہاجرین بھی۔ جو لوگ اول اول پہنچے تھے انہیں شہر کی فصیل کے اندر جگہ مل گئی تھی' مگر اب آنے والوں کو فصیل سے باہر ڈیرے ڈالنے پڑ رہے تھے۔ فصیل کے اندر مہاجرین کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی تھی۔ ان میں قدرے متمول لوگوں نے آبادی کے کچے پکے مکان خرید لیے تھے' باقیوں نے خیموں میں بسیرا کر رکھا تھا۔ ان میں کچھ بلغاری اور تپ چاق باشندے بھی تھے۔ کئی ماہ پہلے منگولوں کا خوف انہیں ہانکتا ہوا ولادی میر تک لے آیا تھا۔ یہ سب لٹے پٹے بے خانماں لوگ اس وقت نہایت تنگی کے دن گزار رہے تھے۔ اگر کچھ کے پاس معمولی اثاثہ تھا بھی تو روزگار نہ ہونے کی وجہ سے رزق ختم ہو چکا تھا۔ حکومت چونکہ خود سازشوں میں گھری ہوئی تھی لہٰذا وہ ان لوگوں کی بہبود کی طرف مطلق توجہ نہ دے سکی تھی۔

.... اباقہ اور شہزادی نتاشا گھوڑے چلاتے ہوئے بستی میں داخل ہوئے تو تنگ اور غلیظ گلیوں میں بھوک اور ننگ کا راج دیکھا۔ جھونپڑی نما بے چراغ گھروں میں معصوم بچے سو رہے تھے۔ ناکافی لباس پہنے کچھ مدقوق افراد سخت سردی میں ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ انہوں نے ایک بوڑھی عورت کو دیکھا جو ایک کمزور بکری کا دودھ دوہنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ ایک بچہ کوڑے کے ڈھیر سے کھانے کی کوئی چیز تلاش کر رہا تھا .... ہر طرف رقت آمیز مناظر بکھرے تھے۔

اباقہ' شہزادی نتاشا کو لے کر ایک مکان کے سامنے پہنچا اور لکڑی کے خستہ دروازے پر دستک دی۔ شہزادی نے پوچھا یہ کس کا گھر ہے۔ اباقہ نے سرگوشی میں کہا۔ "یہ لوگ بھی اپنا بچہ فروخت کر رہے ہیں۔ مجھے کل معلوم ہوا تھا۔" اتنے میں دروازہ کھلا اور ایک

درمیانی عمر کے شخص نے پوچھا۔ "کون ہے؟" اباقہ نے ترکی میں کہا۔

"بھائی! ہم مسافر ہیں۔ ہمارے پاس روٹی ہے۔ اگر تھوڑا سا سالن اور پانی مل جائے تو مہربانی ہو گی۔"

اس شخص کے چہرے پر پریشانی کے آثار نظر آئے۔ وہ انہیں انکار کرنا چاہتا تھا مگر پھر نہ جانے اس کے دل میں کیا آئی کہ وہ انہیں اندر لے آیا۔ تنگ صحن میں پھٹے پرانے بوریے پر ایک عورت اپنے چار بچوں کے ساتھ بیٹھی تھی۔ مدھم چراغ کی روشنی ان کے چہروں پر چھائی اداسی کی ہم رنگ ہو گئی تھی۔ اباقہ نے ایک نظر میں محسوس کیا کہ عورت رو رہی ہے۔ میزبان انہیں برآمدے میں لے گیا اور بیٹھنے کے لیے لکڑی کی چوکیاں دیں۔ پھر وہ اندر سے ایک پیالی لایا اس میں سبزی کا تھوڑا سا سالن اور اچار تھا۔ پانی کا کٹورا ان کے پاس رکھ کر وہ باہر چلا گیا۔ اباقہ نے رومال میں لپٹی ہوئی گندم کی روٹی نکالی اور آدھی توڑ کر شہزادی نتاشا کے ہاتھ میں تھما دی۔ شہزادی نتاشا حیران نظروں سے کبھی اس سیاہ روٹی کی طرف دیکھتی تھی اور کبھی پیالی کے خشک سالن کی طرف۔ اباقہ بولا۔ "کھاؤ شہزادی۔ ورنہ انہیں شک ہو گا۔" شہزادی نے ایک لقمہ توڑا کر منہ میں رکھا اور ہولے ہولے دانتوں سے کچلنے لگی۔ اب صحن کی طرف سے رونے کی آواز آ رہی تھی۔ اباقہ نے دیکھا کہ عورت اپنے ایک بچے کو بڑے پیار سے بنا سنوار رہی ہے۔ وہ اسے دھلے ہوئے کپڑے پہنا چکی تھی۔ مرد جو عورت کا شوہر تھا اس کے قریب کھڑا دھیمی آواز میں اسے تسلیاں دے رہا تھا۔ مرد کی یہ تسلیاں جلتی پر تیل کا کام دے رہی تھیں۔ اچانک عورت کا ضبط جواب دے گیا اور وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

مرد چیخا۔ "بدبخت اور گلا پھاڑ.......... اور گلا پھاڑ' ساری بستی کو سنا۔"

عورت روتی ہوئی بولی۔ "ہاں! میں سناؤں گی سب کو۔ میں نہیں بیچوں گی اپنا بچہ۔ بیچنا ہے تو مجھے بیچ دو۔ میں نہیں بیچوں گی اپنا بچہ.......... نہیں بیچوں گی۔"

مرد خاموش کھڑا رہا۔ شاید وہ جانتا تھا کہ یہ وقتی ابال ہے۔ رو لے گی تو جی ہلکا ہو جائے گا۔ عورت روتی رہی۔ بچے سسکیاں لیتے رہے اور مرد سر جھکائے خاموش کھڑا رہا۔ جلد ہی عورت کی ہچکیاں' سسکیوں میں بدل گئیں۔ پھر اس کے آنسو تھم گئے اور وہ دوبارہ بچے کو تیار کرنے میں مصروف ہو گئی۔

مرد ستے ہوئے قدموں سے برآمدے میں آ گیا۔ وہ ان دونوں سے آنکھیں چرا رہا تھا "کھانا کھا لیا؟" اس نے پوچھا۔ اباقہ نے اثبات میں جواب دیا۔ وہ برتن اٹھانے کو جھکا تو شہزادی نتاشا نے کہا۔ "بھائی یہ ظلم کیوں کر رہے ہو؟ کیوں بیچ رہے ہو اپنا بچہ؟" اس نے

برتن اٹھا کر ایک تختے پر رکھے اور آنسو پونچھ کر بولا۔ "بہن! میں کوئی انوکھا کام نہیں کر رہا۔ اس بستی کے ہر دوسرے تیسرے گھر میں یہی کچھ ہوا ہے یا ہو رہا ہے۔"

تناشا بولی۔ "اتنے مجبور کیوں ہو گئے ہو تم؟"

میزبان نے صحن میں بیٹھے بچوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ان معصوموں کو دیکھ رہی ہو۔ تین روز سے ان کے منہ میں خوراک کا ایک ریزہ نہیں گیا۔ ایک کی قربانی نہیں دیں گے تو ان سب کو سسک سسک کر مرنا ہو گا۔"

شہزادی نے کہا۔ "کیا تم جانتے ہو کہ تمہارے بچے کے خریدار کون ہیں اور وہ اس سے کیا سلوک کریں گے؟"

میزبان نے دل گرفتہ ہو کر کہا۔ "بہن! جب ہم نے بیچ دیا تو پھر ہمیں کیا' جیئے یا مرے۔ جو اس کے نصیب میں ہو گا مل جائے گا۔"

دفعتاً دروازے پر دستک ہوئی۔ میزبان نے جا کر دروازہ کھولا۔ باہر کسی شخص سے تھوڑی دیر گفتگو کرتا رہا' پھر دروازہ بند کر کے واپس بیوی کے پاس آ گیا۔ سر جھکا کر بولا۔ "آ جا بیٹے! میرے پاس آ جا' تیرے مالک آ گئے ہیں۔"

اچانک عورت نے کھینچ کر بچے کو سینے سے لگا لیا اور دلدوز آواز میں رونے لگی۔ وہ بار بار اس کے رخسار اور پیشانی چوم رہی تھی۔ "نہیں میرے بیٹے .... نہیں میرے بیٹے۔" بچے نے بھی بانہیں ماں کی گردن میں ڈال دیں۔ اس کی عمر پانچ چھ سال رہی ہو گی۔ مرد بچے کو اپنی طرف کھینچنے لگا۔ وہ ماں سے لپٹ لپٹ جا رہا تھا۔ ابدی جدائی کا یہ منظر رقت آمیز تھا۔ آخر مرد نے بچے کو ماں سے جدا کیا اور کندھے سے لگا کر دروازے کی طرف بڑھا۔ عورت غش کھا کر گر پڑی۔ باقی بچے اس سے چمٹ کر آہ و بکا کرنے لگے۔ مرد روتے ہوئے بچے کو لے کر باہر نکل گیا۔

تناشا اباقہ کے کندھے سے لگی یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ اباقہ کا چہرہ پتھر کی طرح سخت اور بے جان نظر آ رہا تھا۔ پھر اس نے تناشا کو ساتھ لیا اور بیرونی دروازے کی طرف بڑھا۔ دلیز سے باہر بچے کا باپ ہاتھ میں ایک چھوٹی سی تھیلی لیے کھڑا تھا۔ غالباً اس تھیلی میں اس کے بچے کا معاوضہ تھا۔ اس نے یہ معاوضہ قیمتی اثاثے کی طرح دونوں ہاتھوں میں تھام رکھا تھا اور رو رہا تھا۔ بستی کے دو تین مرد اسے تسلی دینے میں مصروف تھے۔ گلی میں کچھ آگے ایک بند گھوڑا گاڑی کھڑی تھی۔ گاڑی کے ساتھ دو قیم شحیم گھڑ سوار تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے قریبی گلی سے ایک اور گھڑ سوار برآمد ہوا۔ اس نے ایک نومولود بچہ گود میں اٹھا رکھا تھا۔ یہ بچہ بھی کسی بدنصیب والدین کا فروخت کردہ تھا۔ وہ اتنا کم عمر تھا کہ خود پر

گزرنے والے حادثے سے قطعی بے خبر خاموشی سے چلا آ رہا تھا۔ گھڑ سوار نے اسے بھی بند گاڑی میں ڈال دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے تینوں گھڑ سوار گھوڑا گاڑی کے ہمراہ بستی سے روانہ ہو گئے۔ اباقہ تناشا کو لے کر تیزی سے اپنے گھوڑوں تک پہنچا اور دونوں نے گاڑی کا تعاقب شروع کر دیا۔

☆-------☆-------☆

گاڑی شہر کی ایک متمول آبادی میں پہنچی اور سرخ رنگ کی ایک قدیم عمارت کے سامنے پہنچ کر رک گئی۔ اس عمارت کی ساخت بتاتی تھی کہ اسے دسویں یا گیارہویں صدی میں تعمیر کیا گیا ہے۔ بیرونی دروازہ کھلا اور گاڑی اندر داخل ہو گئی۔ اباقہ اور تناشا گھوڑوں سے اتر آئے۔ اباقہ نے دونوں گھوڑوں کی پشت پر دھپ جمائی اور وہ اندھیرے گم ہو گئے۔ تناشا اور اباقہ عمارت کی چار دیواری تک پہنچے۔ اندرونی دروازے پر ایک قندیل روشن تھی اور گھوڑا گاڑی کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔ گاڑی سے کوئی پانچ عدد بچے اتارے گئے اور گھڑ سوار انہیں لے کر دروازے میں گم ہو گئے گاڑی بھی ایک طرف چلی گئی۔ اباقہ نے اچھی طرح گردوپیش کا جائزہ لیا اور پھر تناشا کا ہاتھ تھام کر اندر داخل ہو گیا۔ دونوں تقریباً بھاگتے ہوئے اندرونی عمارت تک پہنچے اور ایک تاریک کونے میں دبک گئے۔ سانسیں درست کرنے کے بعد وہ اندر داخل ہوئے۔ اباقہ کی حرکات و سکنات میں کسی درندے کی چستی اور دلیری تھی۔ دفعتاً ایک جانب سے تیز قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ وہ ایک سیدھی راہداری میں تھے تناشا نے بڑی پریشانی سے اباقہ کی طرف دیکھا۔ اباقہ نے ادھر اُدھر نگاہ دوڑائی پھر تناشا کو لے کر ایک ستون کی آڑ میں ہو گیا۔ آنے والے تین افراد تھے۔ وہ باتیں کرتے سیدھے ان کی جانب بڑھ رہے تھے۔ ان کی نظروں سے محفوظ رہنے کے لیے ضروری تھا کہ اباقہ اور تناشا مکمل طور پر ستون کی آڑ میں رہیں۔ وہ ایک دوسرے سے لگ کر کھڑے ہو گئے۔ اباقہ کا ایک ہاتھ تلوار کے دستے پر تھا۔ تناشا کی تیز سانسوں کا زیروبم وہ صاف محسوس کر سکتا تھا۔ یہاں تک کہ اس کی دھڑکن کی گونج بھی اسے سنائی دے رہی تھی۔ وہ اس کا گداز جسم تھامے خاموش کھڑا رہا۔ بالآخر خطرہ ٹل گیا۔ قدموں کی چاپ ان کے پہلو سے ہو کر آگے نکل گئی۔ تناشا نے پلکیں اٹھا کر اباقہ کو دیکھا پھر جھجک کر پیچھے ہٹ گئی۔ اباقہ نے لاپرواہی سے اس کا ہاتھ تھاما اور ان تینوں افراد کے عقب میں چل دیا۔ وہ بڑی احتیاط سے آگے بڑھ رہے تھے۔ اچانک انہیں ایک کھڑکی میں روشنی نظر آئی۔ اندر سے گفتگو کی آواز آ رہی تھی۔ آگے جانے والے تینوں افراد بھی اوجھل ہو چکے تھے۔ شاید وہ بھی اسی کمرے میں گئے تھے۔ اباقہ نے کھڑکی سے آنکھیں

لگائیں۔ اتفاقاً اندر مخملی پردے میں ایک جھری موجود تھی۔ اس جھری نے کمرے کا تین چوتھائی منظر اس کے سامنے کھول دیا۔

بستی میں پہنچنے والے تینوں گھڑسوار آرام دہ نشستوں پر بیٹھے تھے۔ ان میں سنہری داڑھی اور لمبی سنہری مونچھوں والا ایک قد آور شخص نمایاں تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ سرغنہ ہے۔ اس کے ہاتھ میں تلوار تھی اور چار سے آٹھ سال کی عمر کے بچے سہمے ہوئے اس کے سامنے کھڑے تھے۔ ایک نومولود بچہ کمبل میں لپٹا فرش پر رکھا تھا' شاید اسے خواب آور دوا دے دی گئی تھی۔ سرغنہ ایک آدمی سے کہہ رہا تھا۔ "صبح ایک تگڑی آسامی آرہی ہے۔ بڑا دولتمند زرگر ہے اپنے تین بھائیوں کے لیے بھی مال خریدے گا۔ ان مردودوں کو بنا سنوار کر تیار رکھنا۔ منہ مانگی قیمت ملے گی۔"

اباقہ غور سے یہ سنسنی خیز گفتگو سن رہا تھا۔ اچانک اس کے حساس کانوں نے آہٹ محسوس کی۔ اس نے جلدی سے گھوم کر دیکھا اور دم بخود رہ گیا۔ عقب میں کم از کم آٹھ مسلح افراد کھڑے تھے۔ نتاشا ایک ہلکی سی چیخ کے ساتھ اس کے بازو سے لگ گئی۔ اباقہ کا ہاتھ تلوار کے قبضے پر گیا مگر پھر اس نے ارادہ ملتوی کر دیا۔ ایک تلوار بردار نے آگے بڑھ کر نتاشا کو اس سے جدا کیا اور دونوں کو غیر مسلح کر دیا۔ پھر وہ انہیں دھکیلتے ہوئے کمرے میں لے گئے۔ سرغنہ نے انہیں دیکھ کر ایک قہقہہ لگایا اور اپنے آدمیوں سے بولا۔ "ان چوہوں کو پکڑتے پکڑتے اتنی دیر لگا دی۔"

مخاطب بولا۔ "مالک! یہ کافی دیر باہر کھڑے رہے۔ ہم نے سوچا خود ہی اندر آجائیں تو بہتر ہے۔"

سرغنہ نے رعونت سے کہا۔ "ہاں میاں! اب ذرا جلدی جلدی بتا دو کہ کون ہو اور کس چکر میں ہمارے پیچھے آئے ہو؟"

اباقہ نے کہا۔ "تمہاری بات میری سمجھ میں نہیں آئی ہم تو مسافر ہیں سر چھپانے کو ٹھکانا ڈھونڈ رہے ہیں۔"

سرغنہ نے نتاشا کی پرواہ کیے بغیر اباقہ کو ایک غلیظ گالی دی اور اپنے آدمیوں سے بولا۔ "ان دونوں کو سر چھپانے کے لیے جگہ دو۔ ان کا ٹیڑھا پن میں صبح ٹھیک کروں گا۔"
مسلح آدمی انہیں دھکیلتے ہوئے بالائی منزل پر لے آئے۔ انہیں ایک کمرے میں بند کر دیا گیا۔ اس کمرے میں دیواریں برائے نام تھیں۔ چاروں طرف لوہے کی سلاخوں والی بڑی بڑی کھڑکیاں لگی تھیں۔ ان کھڑکیوں سے برفانی ہوا فراٹے بھرتی اندر داخل ہو رہی تھی۔ واقعی یہ سر چھپانے کی جگہ تھی۔ تن چھپانے کی جگہ نہیں تھی۔ فرش پر کوڑا کرکٹ

بکھرا تھا۔ مسلح آدمی انہیں بند کر کے جانے لگے تو شہزادی غصے سے بولی۔

"کیا ہم یہاں رات گزاریں گے؟"

ایک شخص بدتمیزی سے بولا۔ "تو اور کیا.......... تو شہزادی نتاشا ہے کہ تیرے لیے پھولوں کا بستر آئے گا۔ شکر کر کہ تجھے عزت سے رات گزارنے کا موقع مل رہا ہے۔ ہمارے ساتھ سونا پڑتا تو.........."

"خبردار۔" اباقہ نے گرج کر اس کی بات کاٹی۔ "ایک لفظ منہ سے نکالا تو گردن توڑ دوں گا۔"

مسلح افراد نے ہم آہنگ ہو کر قہقہہ لگایا دھمکی دینے والا بولا۔ "تیرا ٹیڑھا پن بھی صبح تک ٹھیک ہو جائے گا۔"

اور وہ واقعی ٹھیک کہہ گیا تھا۔ آتشدان اور کسی بھی گرم کپڑے کے بغیر اس ہوادار کمرے میں شب گزارنا عذاب سے کم نہیں تھا۔ جوں جوں رات بھیگتی گئی ان کے جسم بلاخیز سردی کی گرفت میں آتے چلے گئے۔ اباقہ نے شہزادی سے پوچھا۔

"شہزادی صاحبہ! محل سے آپ کی رات بھر کی غیر حاضری ہنگامہ بپا نہ کر دے۔"

شہزادی نے کہا۔ "نہیں اباقہ! میں اپنی کنیز خاص کلثوم کو سب بتا آئی ہوں۔ وہ صبح تک صورت حال سنبھالے رکھے گی' بلکہ دوپہر تک کوئی خطرہ نہیں۔ ہاں دوپہر کو نائب رئیس مجھ سے ملنے آرہا ہے۔ اس وقت کام بگڑ جائے گا۔"

اباقہ نے کہا۔ "گھبرائیں نہیں شہزادی صاحبہ! اللہ نے چاہا تو کچھ نہیں بگڑے گا۔ ہم ان سفاک لوگوں سے نبٹ کر صحیح سلامت واپس لوٹیں گے۔"

شہزادی نے خود کو اپنے ہی بازوؤں میں سمیٹتے ہوئے کہا۔ "یہ سب تو اس وقت ہو گا جب یہ سرد رات ہم کو زندہ چھوڑے گی۔"

اباقہ کو محسوس ہوا کہ نازک اندام شہزادی کی قوت برداشت جواب دینے لگی ہے۔ اس نے اپنی بوسیدہ صدری اتار کر اس کے شانوں پر ڈال دی۔ شہزادی نے پُر سوچ لہجے میں کہا۔

"اباقہ! یہ معاملہ بڑا پُراسرار لگتا ہے۔ آخر یہ لوگ معصوم بچوں کا کیا کر رہے ہیں' اور کون لوگ ہیں جو یہاں سے انہیں خریدنے آتے ہیں۔"

اباقہ بولا۔ "شہزادی! خود کو پریشان نہ کریں۔ صبح تک سب سامنے آجائے گا.......... ہو سکے تو سونے کی کوشش کریں۔"

اباقہ نے دیکھا کہ شہزادی کپکپا رہی ہے اور اس کے یاقوتی ہونٹوں پر برف سی جمتی

جارہی ہے۔ وہ سخت سردی محسوس کر رہی تھی۔ درحقیقت وہ ایک غریب دہقان لڑکی کے لباس میں آئی تھی اور یہ لباس اس بے رحم سردی کے لیے قطعی ناکافی تھا۔ اباقہ نے اپنی سموری ٹوپی اتار کر شہزادی کے سر پر پہنا دی۔ پھر بھی اس کی سردی کم نہیں ہوئی تو اس نے اپنی اونی قمیص اتار کر پھاڑی اور ایک چادر کی طرح اس کے گرد لپیٹ دی' وہ اباقہ کو اس عمل سے منع ہی کرتی رہ گئی۔ اباقہ کے بالائی جسم پر اب کچھ نہیں تھا۔ وہ شہزادی سے بولا۔ "آپ فکر مند نہ ہوں۔ میری پرورش ایسے ماحول میں ہوئی ہے کہ میں اس سردی میں کوئی تکلیف اٹھائے بغیر رات گزار سکتا ہوں۔"

شہزادی نے اس کی بات سنی لیکن کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی نگاہیں اباقہ کے بازوؤں پر مرکوز تھیں۔ وہاں عقوبت خانے میں ہونے والے تشدد کے نشانات ابھی تک موجود تھے۔ وہ کھوئے ہوئے لہجے میں بولی۔ "اباقہ! ہمیں معاف کردو۔"

اباقہ نے کہا۔ "شہزادی صاحبہ! میں آپ کو معافی دینے والا کون ہوتا ہوں۔ بس خدا سے دعا کریں کہ یہاں سے علی ہمیں زندہ سلامت مل جائے۔ پھر مجھے آپ سے کوئی شکوہ نہ رہے گا۔"

شہزادی نے اداسی سے کہا۔ "اس کا مطلب ہے کہ اگر علی نہ ملا تو تمہارا دل ہماری طرف سے صاف نہ ہو گا۔"

اباقہ بولا۔ "نہیں شہزادی! ایسی بات زبان پر نہ لائیں۔ مجھے یقین ہے علی ہمیں یہاں سے ملے گا۔"

☆ ———— ☆ ———— ☆

طوطم خاں منگولوں کی حراست میں تھا۔ اسے زنجیریں ڈال کر ایک خیمے میں پھینک دیا گیا تھا۔ خیمے کے باہر مسلح پہریدار تھے۔ وہ جانتا تھا کہ باتو خاں کے ہاتھوں اذیت ناک موت اس کا مقدر ہو چکی ہے۔ لہٰذا اس نے پوچھ گچھ کرنے والوں کے کسی سوال کا جواب نہیں دیا تھا۔ وہ جب سے یہاں قید تھا ایک ہی بات سوچ رہا تھا۔ اس کا راز کیسے کھلا؟ وہ شاہی حجام کے بھیس میں نہایت کامیابی سے باتو خاں تک پہنچ گیا تھا۔ اسے کامل یقین تھا کہ آخر وقت تک باتو اس کی اصلیت سے بے خبر تھا۔ مگر عین اس وقت جب وہ اس کا سر اتارنے کی تیاری کر رہا تھا باتو کو جیسے الہام ہو گیا تھا۔ اس کی کامرانی ایک لمحے کے فاصلے سے اپنا رخ بدل گئی تھی۔ کہاں وہ اباقہ کو نیچا دکھانے اور مارینا کے ساتھ داد عیش دینے کے خواب دیکھ رہا تھا اور کہاں پابہ زنجیر اس سرد خیمے میں پڑا تھا۔ کل رات اس کے خیمے میں چغتائی خاں کے بیٹے بائیدار اور پوتا بوری آئے تھے۔ اپنے دادا چنگیز خاں کی طرح ان کی

عیار آنکھوں سے بھی خون کی پیاس جھلک رہی تھی۔ طوطم خاں جانتا تھا جن بدنصیبوں کو دیکھ کر چنگیز زادوں کی آنکھوں میں ایسی پیاس نظر آتی ہے وہ عبرتناک موت کا شکار ہوتے ہیں۔ یہ پیاس طوطم کو بتا رہی تھی کہ وہ بائیدار اور پوتا بوری کے نزدیک ناقابل معافی مجرم ہے۔

وہ دونوں اس سے اپنے باپ کی بیوی مارینا کے متعلق پوچھتے رہے تھے۔ طوطم نے ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ اس نے کہا تھا مجھے مارینا کے متعلق کچھ معلوم نہیں اگر ہوتا تو بھی نہ بتاتا۔ اس کا خیال تھا کہ اس دو ٹوک جواب کے بعد اس پر تشدد کی انتہا کر دی جائے گی یا فوراً قتل کر دیا جائے گا۔ مگر یہ دونوں باتیں نہیں ہوئیں۔ دراصل نوجوان شہزادوں کی شکار سے واپسی کے بعد منگول لشکر کوچ کی تیاری میں تھا۔ سپہ سالار باتو خان اور سوبدائی بہادر جلد از جلد والادی میر پہنچنا چاہتے تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ طوطم خاں کا معاملہ موخر کر دیا گیا تھا۔ اس طرح طوطم خاں کی زندگی کچھ دن اور بڑھ گئی تھی' لیکن وہ اس سے بالکل خوش نہیں تھا۔

اچانک وہ اپنے خیالوں سے چونک پڑا۔ خیمے کا پردہ ہٹا اور ایک تاتار عورت کھانا لے کر اندر آگئی۔ چہرے پر چیچک کے داغوں والی یہ ایک مکروہ صورت بڑھیا تھی۔ جب وہ بات کرنے کے لئے منہ کھولتی تو اس کے ٹیڑھے دانت شکل کو کچھ اور ہیبت ناک بنا دیتے۔ طوطم کی آدھی بھوک تو اسے دیکھ کر ہی اڑ جاتی تھی۔ شاید اس عورت کی "دید" بھی اس کی سزا کا ایک حصہ تھی۔ ورنہ وہ جانتا تھا منگولوں کے پاس خدمت گاری کے لیے ایسی ایسی عورتیں ہیں کہ جو کھانا لے کر آئیں تو کھانا چھوڑ کر انہیں کھانے کو دل چاہے۔

اندر داخل ہو کر عورت نے کچھ فاصلے سے کھانے کا طبق طوطم کی طرف بڑھایا۔ بڑھیا نے کہا۔

"طوطم خاں! جس روز تو باتو خاں کی گردن کاٹنے لگا تھا اس روز بھی اس ہاتھ سے کام لیتا تو کبھی نہ پکڑا جاتا۔"

"مطلب؟" طوطم خاں نے حیرانی سے پوچھا۔

بڑھیا بولی۔ "شاید تجھے معلوم نہیں کہ بینگو ہر کام بائیں ہاتھ سے کرتا تھا۔ تو نے جب دائیں ہاتھ سے باتو کی حجامت بنانا شروع کی تو اسے معلوم ہو گیا کہ تو بینگو نہیں ہے۔"

طوطم خان سناٹے میں رہ گیا۔ بے خبری میں وہ کتنی بڑی غلطی کر گیا تھا۔ باتو خاں تو ایک عیار اور ہوشیار سپہ سالار تھا معمولی عقل والا آدمی بھی طوطم خان کی یہ غلطی فوراً پکڑ

لیتا۔ کئی دنوں کی کشمکش کے بعد آخر آج اسے اپنے سوال کا جواب مل گیا تھا۔ اس کی مخبری کسی اور نے نہیں خود اس کے اپنے ہاتھ نے کی تھی۔

☆ ــــــــــــ ☆ ــــــــــــ ☆

مشرق سے سپیدہ سحر نمودار ہو چکا تھا۔ ہلکی ہلکی روشنی اس کمرے میں بھی پہنچ رہی تھی جہاں اباقہ اور شہزادی نتاشا قید تھے۔ اچانک زیریں منزل سے ایسی آوازیں آنے لگیں جیسے کچھ بچے رو رہے ہوں اور کوئی شخص انہیں دھمکیوں سے چپ کرانے کی کوشش میں مصروف ہو۔ پھر ایک چیختی ہوئی آواز آئی۔ اباقہ نے پہچان لیا' یہ سنہری مونچھوں اور سنہری داڑھی والے سرغنہ کی آواز تھی۔ وہ بچوں کو بتا رہا تھا کہ ان کے نئے مالک پہنچ چکے ہیں۔ اگر کسی نے ان کے سامنے منہ بسورنے کی کوشش کی تو کھال ادھیڑ دی جائے گی۔

شہزادی نتاشا نے اباقہ سے کہا۔ "اباقہ' کیا ہم اس چوہے دان سے باہر نہیں نکل سکتے۔"

اباقہ نے کہا۔ "نکل سکتے ہیں۔"

"کس طرح؟" شہزادی حیرانی سے بولی۔

اباقہ نے کہا۔ "اس سامنے والی آہنی کھڑکی کو اکھاڑ کر۔"

نتاشا حیرت سے بولی۔ "یہ کیسے ممکن ہے؟"

اباقہ نے کہا۔ "ہر قید خانہ' آپ کے عقوبت خانے کی طرح مضبوط نہیں ہوتا۔" پھر وہ مطمئن انداز میں اپنی جگہ سے اٹھا اور آہنی کھڑکی کی سلاخیں تھام کر زور آزمائی کرنے لگا۔ دھیرے دھیرے اس کے گلے کی رگیں پھول گئیں اور بازوؤں کے مسل نمایاں تر ہو گئے۔ پھر اس نے ایک زوردار جھٹکا دیا۔ کڑاکے کی آواز آئی اور دیوار سے چند اینٹیں اکھڑ کر فرش پر آگریں۔ اس کے ساتھ ہی نتاشا نے ایک ناقابل یقین منظر دیکھا۔ آہنی کھڑکی اباقہ کے ہاتھوں میں تھی۔ کھڑکی ٹوٹنے کی آواز سن کر چند مسلح افراد بھاگتے ہوئے موقعے پر پہنچے۔ یہ وہی افراد تھے جنہوں نے رات نتاشا کو مذاق کا نشانہ بنایا تھا۔ ٹوٹی پھوٹی کھڑکی دیکھ کر وہ ایک لمحے کو حیرت زدہ رہ گئے۔ پھر ان کے ہاتھ نیاموں تک پہنچے اور خمدار تلواریں باہر آگئیں۔ اباقہ نے دو قدم بھاگ کر وزنی کھڑکی حملہ آوروں پر پھینک دی۔ وہ چیختے ہوئے اس کے نیچے ڈھیر ہو گئے۔ اباقہ نے نتاشا کا بازو پکڑا اور سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ ایک تلوار باز نے ان کا راستہ روکنے کی کوشش کی مگر اباقہ کی خوفناک ٹکر نے اسے سیڑھیوں سے لڑھکا کر فرش پر پہنچا دیا۔ اس کی تلوار درمیان کی سیڑھیوں پر پڑی رہ گئی تھی۔ اباقہ نے جھپٹ کر وہ تلوار اٹھائی اور چھلانگ لگا کر حملہ آور کے سینے میں گھونپ

دی۔ اس خوفناک منظر نے نتاشا کو لرزا کر رکھ دیا۔ اباقہ اسے ساتھ لیے رات والے کمرے میں آیا۔ کمرے کا منظر وہی تھا۔ بچے بھی موجود تھے' لیکن آج یہاں ایک نیا چہرا بھی دکھائی دے رہا تھا۔ یہ ایک باریش شخص تھا جس کے گلے میں سونے کی بڑی سی صلیب لٹک رہی تھی۔ اس کا سر بالوں سے صاف تھا۔ دیکھنے میں وہ کوئی پادری یا راسخ العقیدہ عیسائی نظر آتا تھا۔ اباقہ کو دیکھتے ہی وہ ایک کونے میں دبک گیا۔ سرغنہ اور اس کے دونوں ساتھی تلواریں سونت کر اباقہ پر حملہ آور ہوئے۔ مگر انہیں کیا معلوم تھا وہ کس مہلک جنگجو کے سامنے آئے تھے۔ اباقہ نے پلک جھپکتے میں ان میں سے ایک کی گردن اڑا دی۔ کٹا ہوا سر لڑھک کر بچوں کے قدموں میں گرا اور وہ چیخ اٹھے۔ نتاشا نے لپک کر انہیں بازوؤں میں سمیٹا اور دوسرے کونے میں لے گئی۔ اتنے میں اباقہ کی تلوار نے دوسرے شخص کا سینہ چاک کر دیا۔ وہ منہ کے بل اباقہ کے پاؤں میں گرا۔ سرغنہ خوفزدہ ہو کر مدافعت پر اتر آیا۔ وہ اس کوشش میں تھا کہ موقع ملے تو بھاگ نکلے۔ یکایک وہ جھکائی دے کر دروازے کی طرف لپکا مگر اباقہ ہوشیار تھا۔ اس نے پوری قوت سے گھٹنا اس کے منہ پر رسید کیا۔ اس ضرب نے اس کے کئی دانت توڑ دیے اور وہ ڈکراتا ہوا دیوار سے جا ٹکرایا۔

اچانک شہزادی چیخی۔ "اباقہ!"

اباقہ نے مڑ کر دیکھا ایک حملہ آور دروازے میں کھڑا اس پر نیزا پھینک رہا تھا۔ وہ تیزی سے جھکا۔ نیزا ایک دیوار میں لگا اور پرشور آواز سے چٹخ کر فرش پر لڑھک گیا۔ حملہ آور بھاگ چکا تھا۔ اباقہ نے تلوار کی نوک ہانپتے کانپتے سرغنہ کی گردن پر رکھ دی اور بولا۔

"مجھے افسوس ہے کہ تم میرا ٹیڑھا پن درست کرنے کے لائق نہیں رہے۔ اب تمہیں اس ٹیڑھے پن سے گزارا کرنا پڑے گا۔"

سرغنہ ہکلایا۔ "کک.......... کون ہو۔ کیا چاہتے ہو؟"

اباقہ نے کہا۔ "سب سے پہلے تو یہ بتاؤ کہ یہ ذات شریف کون ہے؟" اباقہ کا اشارا کونے میں کھڑے باریش شخص کی طرف تھا۔ وہ طلائی صلیب ہاتھوں میں تھامے تھرتھر کانپ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ شاید وہ چند قدم کے فاصلے پر کٹا ہوا انسانی سر نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ نتاشا بچوں کو سمیٹ کر کمرے سے باہر لے جا چکی تھی۔ جگہ کھڑی تھی جہاں اباقہ اسے دیکھ سکتا تھا۔

اباقہ کو جواب دینے سے پہلے سرغنہ نے تھوک نگلا۔

معروف زرگر اور سونے کے تاجر ڈیوڈ جان ہیں۔"

"یہ سونے کا تاجر یہاں کس لیے آیا تھا؟"

"میں اس بارے میں کچھ نہیں بتا سکتا۔" یکایک اباقہ پر درندگی سوار ہو گئی۔ اس نے ٹھوکروں اور گھونسوں سے سرغنہ کو اس طرح پیٹا کہ اس کے جسم کا چپا چپا خون اگلنے لگا۔ وہ اسے پکڑ پکڑ کر کمرے کی دیواروں سے ٹکراتا رہا۔ نتاشا جانتی تھی اباقہ اس قدر غضب ناک کیوں ہے۔ ماؤں کی گودیں اجاڑنے والا اس سے بہتر سلوک کا مستحق بھی نہیں تھا۔ آخر لحیم شحیم شخص چاروں شانے چت فرش پر جا گرا۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ اباقہ کی وحشت میں کوئی کمی نہیں آئی۔ وہ کونے میں دبکے زرگر کی طرف بڑھا اور اسے گریبان سے پکڑ کر ایک ایسا جھٹکا دیا کہ اس کا سفید بے داغ چغہ ناف تک پھٹتا چلا گیا تھا۔ وہ کانپتا لرزتا کمرے کے وسط میں آن گرا۔ اباقہ نے تلوار اس کے سینے پر رکھ کر کہا۔

"تو بتا۔ کس لیے یہاں آیا تھا؟"

زرگر اس سے پہلے تین آدمیوں کا عبرتناک انجام دیکھ چکا تھا۔ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اس نے بولنا شروع کر دیا۔ اباقہ جو کچھ پوچھتا گیا' وہ بتاتا گیا۔ زرگر کی باتوں سے کئی حیرت انگیز انکشافات ہوئے۔ اباقہ اور نتاشا کو پتہ چلا کہ دارالحکومت کے طول و عرض میں کیا کیا کچھ ہو رہا ہے۔ درحقیقت شہر میں تاتاریوں کا خوف اپنے عروج پر پہنچ چکا تھا۔ لوگ اپنی زندگیوں سے قریباً ناامید ہو چکے تھے۔ اس خوف اور ناامیدی کے عالم میں ان سے عجیب و غریب حرکات سرزد ہو رہی تھیں۔ جس روز ماسکو کی تباہی کی خبر ولادی میر پہنچی اور لوگوں نے عبادات کے لیے جوق در جوق گرجاؤں کا رخ کیا حضرت مریم .... کے کلیسا سے باہر ایک نیم دیوانے شخص نے بھرے مجمعے میں اعلان کیا کہ عنقریب ولادی میر کے کھنڈروں پر گدھ منڈلائیں گے اور کتے انسانی لاشیں نوچیں گے۔ خوفزدہ لوگ گھیرا ڈال کر اس شخص کی باتیں سننے لگے۔ اس نے کہا کہ وحشی تاتاری خدا کا قہر ہیں اور اس قہر سے کوئی شخص محفوظ نہیں رہے گا۔ کچھ لوگ پوچھنے لگے کہ بابا اس قہر سے بچنے کا کوئی راستہ ہے؟ بوڑھے نے کہا۔ "نہیں کوئی راستہ نہیں۔ یہ ہونی ہے اور ہو کر رہے گی۔" پھر اچانک بوڑھے نے آسمان کی طرف دیکھا اور لوگوں کو قریب قریب بلا کر سرگوشی میں بولا۔

"ہاں ایک رستہ ہے صرف ایک راستہ۔"

لوگوں نے پوچھا۔ "کیا؟" وہ بولا۔ "جو شخص اپنے گھر کی دہلیز پر ایک غلام بچے کا سر کاٹ کر دبائے گا وہ تاتاریوں کے شر سے محفوظ رہے گا۔" اس کے بعد بوڑھا توریت پڑھتا ہوا اور جھومتا ہوا ایک طرف چل دیا۔

بوڑھے کی یہ بات کچھ خوشحال گھرانوں تک پہنچی تو انہوں نے غلام بچے خرید کر ان

کی قربانی دی۔ دیکھا دیکھی کچھ اور صاحب ثروت لوگوں نے بھی یہ قبیح فعل انجام دیا۔ جان کے خوف نے لوگوں کو عقل و شعور سے بیگانہ کر رکھا تھا۔ وہ کوشش کر کے غلام بچے حاصل کرنے لگے آخر مزید بچوں کا حصول مشکل ہو گیا.......... زرگر نے بتایا کہ اسے بڑی مشکلوں سے اس ٹھکانے کا پتہ چلا تھا۔ بتانے والے نے بتایا تھا کہ یہاں سے مطلوبہ عمر کے بچے مل سکتے ہیں۔ وہ اپنے اور اپنے تین بھائیوں کے لیے چار بچے خریدنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ بردہ فروشوں نے ان چار بچوں کی ہوش ربا قیمت وصول کی تھی۔

زرگر کی باتیں اباقہ اور نتاشا کی آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی تھیں۔ اتنے میں دروازے پر آہٹ ہوئی اور شاہی فوج کے کچھ مسلح سپاہی دندناتے ہوئے اندر آ گئے۔ شاید کسی طرح انہیں عمارت میں ہونے والے ہنگامے کی اطلاع ہو گئی تھی۔ اباقہ کے ہاتھ میں خون آلود تلوار تھی اور فرش پر دو لاشیں تھیں۔ سپاہی اسے گرفتار کرنے کے لیے آگے بڑھے مگر شہزادی نتاشا ان کے راستے میں حائل ہو گئی۔ اس نے مختصر لفظوں میں اپنا تعارف کرایا تو سپاہی حیرت سے گنگ ہو گئے۔ اباقہ کے کہنے پر شہزادی نے دو سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ بے ہوش سرغنہ کے پاس چوکس کھڑے رہیں۔ باقی سپاہیوں کے ساتھ اباقہ اور نتاشا عمارت کے عقبی حصے کی طرف بڑھے۔ بچوں نے بتایا تھا کہ ان کے چند اور ساتھی وہاں ایک کوٹھڑی میں قید ہیں۔ مختلف راہداریوں سے ہوتے ہوئے وہ اس کوٹھڑی کے سامنے پہنچے۔ آہنی دروازے پر ایک بڑا قفل نظر آ رہا تھا۔ اباقہ نے سپاہیوں کو قفل توڑنے کی ہدایت کی۔ شہزادی نتاشا کی موجودگی نے سپاہیوں کو پوری طرح چوکس کر دیا تھا۔ انہوں نے چند ہی لمحوں میں قفل توڑ کر فرش پر ڈال دیا۔ اباقہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا ایک چٹائی پر دو بچے لحاف اوڑھے سو رہے تھے۔ دو بچے سہمے ہوئے دیوار سے لگے بیٹھے تھے۔ ان میں ایک علی تھا۔ اباقہ نے علی کو اور علی نے اسے دیکھا۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھا اور بازو پھیلا کر اباقہ کی طرف بھاگا۔ اباقہ نے اسے اٹھا کر گلے سے لگا لیا۔ علی کی زبان قینچی کی طرح چلنا شروع ہو گئی۔ وہ اباقہ کو اب تک پیش آنے والے تمام واقعات ایک ہی سانس میں سنانا چاہتا تھا۔ شہزادی نتاشا اس کی بے تابی پر مسکرا اٹھی۔ اباقہ نے اسے تھپکتے ہوئے کہا۔ "حوصلہ رکھو علی! میں تم سے ساری بات سنوں گا' لیکن ذرا ٹھہر جاؤ۔"

بچوں کو کوٹھڑی سے رہائی دلانے کے بعد اباقہ اور نتاشا دوبارہ اس .... کمرے میں پہنچے۔ سپاہیوں نے اب لاشیں وہاں سے ہٹا دی تھیں اور زرگر کی مشکیں کس کر ایک طرف بٹھا دیا تھا۔ مجرموں کا سرغنہ ہوش میں آ چکا تھا اور ایک سپاہی اس کے سینے پر تلوار

رکھے اس کے ساتھیوں کا پتہ دریافت کر رہا تھا۔ اباقہ نے سپاہی سے مخاطب ہو کر کہا۔

"اس سے ساتھیوں کا پتہ کیا پوچھتے ہو۔ یہ تو خود ساتھی ہے۔"

شہزادی نے کہا۔ "کیا مطلب؟"

اباقہ نے ادب سے کہا۔ "شہزادی صاحب! جہاں تک میرا اندازہ ہے اصل سرغنہ کوئی اور ہے۔"

شہزادی نے کہا۔ "اباقہ! تم نے ہمارے شبہے کی تصدیق کی ہے۔ ہمارا اپنا خیال بھی یہی ہے۔ رات اس کے آدمی اسے "چھوٹے آقا" کہہ کر مخاطب کر رہے تھے۔"

اباقہ بولا۔ "جب کہ یہ اونٹ کا اونٹ چھوٹا کسی طرف سے نہیں۔"

شہزادی بولی۔ "اس کا مطلب ہے، یہ رتبے میں چھوٹا ہے۔" شہزادی کے اشارے پر سپاہی نے تلوار کی نوک کا دباؤ بڑھایا تو سنہری مونچھوں والا کراہ اٹھا۔ شہزادی نے کہا۔ "اے شخص اگر عذاب کی موت مرنا نہیں چاہتا تو اپنے مالک کا پتہ بتا؟"

وہ زمین پر پڑا پڑا جھنجلا کر چیخا۔ "مجھے کچھ پتہ نہیں۔ میں کچھ نہیں بتاؤں گا' کچھ نہیں بتاؤں گا۔"

اس وقت علی نے چلا کر کہا۔ "حرامی! تو کچھ نہ بتا۔ تو کچھ نہ بتا۔" پھر وہ اباقہ سے مخاطب ہوا۔ "بھائی جان! اس سے کیا پوچھتے ہو۔ میرے ساتھ آیئے' میں آپ کو بتاتا ہوں اس کا آقا کہاں ہے۔ وہ ہر وقت کسی چور کی طرح ایک تہہ خانے میں گھسا رہتا ہے۔ باہر نکلتا بھی ہے تو منہ چھپائے ہوئے۔ آیئے میں آپ کو چوہے کے بل تک لے جاؤں۔"

سب حیرت سے علی کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ انہیں ساتھ لے کر مڑا اور پتلی ٹانگوں سے بھاگتا مختلف راہداریوں سے گزر گیا۔ وہ سب اس کے پیچھے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ آخر سنگ سرخ کی چند سیڑھیوں کے سامنے پہنچ کر وہ رک گیا۔ یہ سیڑھیاں نشیب میں ایک آہنی دروازے تک پہنچتی تھیں۔ دروازے پر نقش و نگار تھے اور پیتل کا ایک کڑا دستی کے طور پر منسلک تھا۔ علی نے گھوم کر انہیں چپ رہنے کا اشارہ کیا اور کڑے کے ذریعے ایک مخصوص دستک دی۔ دوسری یا تیسری دستک پر اندر آہٹ ہوئی اور دروازہ کھل گیا۔ جھری میں اباقہ کو مصری رقاصہ روما کی شکل دکھائی دی۔ وہ علی کو دیکھ کر بھنائی۔ "کیا ہے لڑکے۔ تو یہاں کیسے آیا.........."

علی نے شوخی سے کہا۔ "اپنی ٹانگوں پر چل کر آیا۔"

تب روما کی نگاہ علی کے پیچھے کھڑے اباقہ' نتاشا وغیرہ پر پڑی۔ اس نے جلدی سے دروازہ بند کرنا چاہا مگر علی نے پھرتی سے روما کی لمبی چوٹی پکڑ کر کھینچ لی۔ چوٹی آہنی تختوں کے درمیان آگئی اور روما کوشش کے باوجود دروازہ بند نہ کر سکی۔ اباقہ نے آگے بڑھ کر زور سے دھکا دیا اور روما ایک چیخ کے ساتھ اندر لڑھک گئی۔ وہ نامکمل لباس میں تھی۔ ایک چادر جو اس نے جسم سے لپیٹ رکھی تھی کھل گئی اور وہ اپنا آپ ڈھانپنے کی کوشش کرنے لگی۔ اس کی حالت نے شہزادی کو منہ پھیرنے پر مجبور کر دیا اباقہ کے پیچھے پیچھے سپاہی بھی دندناتے ہوئے اندر گھس گئے۔ روما کی یہاں موجودگی نے اباقہ کو حیران کر دیا تھا۔ اسے بڑی حد تک اندازہ ہو گیا تھا کہ بردہ فروشی کے اس مذموم کاروبار کا کرتا دھرتا کون ہے .... اس نے کمرے میں چاروں طرف نگاہ دوڑائی' لیکن روما کے علاوہ کوئی دوسرا شخص کمرے میں دکھائی نہیں دیا۔ دفعتاً علی نے چیخ کر ایک پردے کی طرف اشارہ کیا۔ پردے کا ابھار بتاتا تھا کہ کسی نے اس کے عقب میں چھپنے کی ناکام کوشش کی ہے۔ اباقہ کے اشارے پر سپاہیوں نے پردے کو گھیر لیا۔

اباقہ بلند آواز سے بولا۔ "باہر آجاؤ۔ توزن باخ! اب چھپنا فضول ہے۔"

پردے میں حرکت ہوئی اور توزن باخ سر جھکائے ہوئے نکل آیا۔ اس کی شفاف چندیا فانوس کی روشنی میں چمک رہی تھی۔ شہزادی نتاشا توزن باخ کو دیکھ کر حیران ہو رہی تھی۔ طنزیہ لہجے میں بولی۔

"بہت خوب توزن باخ! ہم گمان بھی نہ کر سکتے تھے کہ تم شہد بیچتے بیچتے' زہر بیچنے لگو گے۔ ماؤں کی گودیں اجاڑنے کا کاروبار' اچھا شروع کیا تم نے۔"

توزن باخ کی نظریں زمین میں گڑی جا رہی تھیں۔ شہزادی گرج کر سپاہیوں سے مخاطب ہوئی۔ "اس موذی کو گرفتار کرو اور قید تنہائی میں ڈال دو۔ ہم بہت جلد اس کا فیصلہ کریں گے۔"

حکم ملتے ہی سپاہیوں نے توزن باخ کو زمین پر گرا کر مشکیں کس دیں۔ شہزادی کا غضب دیکھ کر توزن باخ کی چندیا پسینے سے تر ہو گئی۔ وہ باریک آواز میں منمنایا۔

"شہزادی حضور! یہ ناچیز آپ سے رحم کی درخواست نہیں کرے گا' لیکن کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے ابا حضور سے مشورہ ضرور کر لیجئے گا۔"

شہزادی دانت پیس کر بولی۔ "زہریلے سانپ کو مارنے کے لیے کسی کی اجازت درکار نہیں ہوتی۔"

توزن باخ کی گرفتاری کے بعد وہ تہہ خانے سے برآمد ہوئے تو مسلح سپاہی اس عمارت میں موجود دیگر مجرموں کو گرفتار کر چکے تھے۔ ان میں وہ شخص بھی تھا جس نے رات شہزادی کو ظالمانہ سلوک کی دھمکی دی تھی۔ یہ جان کر یہ دہقان لڑکی شہزادی نتاشا

ہے اس کی سٹی گم ہوئی جا رہی تھی۔ وہ رحم طلب نظروں سے شہزادی اور اباقہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ یہاں سے برآمد ہونے والے بچوں میں وہ بچہ بھی تھا جسے انہوں نے کل ماں اپنی ماں سے جدا ہوتے دیکھا تھا۔ اگر آج مجرم گرفتار نہ ہوتے تو شاید یہ اس کی زندگی آخری دن ہوتا۔ زرگر کو فروخت کیے جانے والے بچوں میں وہ بھی شامل تھا۔ شہزادی نے اس بچے کے متعلق سپاہیوں کو خاص طور پر ہدایت کی اور کہا کہ اسے فی الفور اس ماں کے پاس پہنچایا جائے۔

☆---------☆---------☆

محل میں واپس پہنچتے ہی شہزادی نتاشا نے سب سے پہلے اپنے والد اور بھائیوں کے متعلق دریافت کیا' لیکن ان میں سے کوئی بھی دارالحکومت واپس نہیں آیا تھا۔ اپنے دونوں بہادر بھائیوں اور تجربہ کار والد کے بغیر وہ خود کو بالکل تنہا محسوس کر رہی تھی اور یہ کیفیت اکیلی اسی کی نہیں تھی۔ دارالحکومت کا ہر فرد اسی بے یقینی کا شکار تھا۔ اس نازک وقت میں رئیس اعظم کی دارالحکومت میں موجودگی اشد ضروری تھی۔ اس کی غیر موجودگی میں شہر کے دفاع کی تمام تر ذمے داری نتاشا کے کندھوں پر آگئی تھی اور اسی لئے وہ سب سے زیادہ پریشان بھی تھی۔ اس پریشانی کو اگر کوئی احساس کم کرتا تھا تو وہ اباقہ اور اس کے ساتھیوں کی موجودگی کا احساس تھا۔ شاید ان پرخطر لحات میں اسے یہ لوگ نہ ملتے تو وہ حوصلہ ہار بیٹھتی۔ اباقہ کے ساتھ اس نے بہت کم وقت گزارا تھا' لیکن آن کی آن میں وہ اس پر بے پناہ اعتماد کرنے لگی تھی۔ ایک طرح اس نے دفاع کے سلسلے میں اسے اپنا مشیر خاص بنالیا تھا۔

اس رات محل کی وسیع نشست گاہ میں شہر کے دفاع کے سلسلے میں ایک اہم مذاکرہ ہوا۔ شہزادی نے اپنے خیالات بیان کرتے ہوئے کہا۔ "ساتھیو! اب ہم مزید انتظار نہیں کر سکتے۔ رئیس اعظم کے بغیر ہی اب ہمیں مورچے سنبھالنے ہوں گے۔ اطلاعات کے مطابق منگول لشکر اپنا پڑاؤ اٹھا کر ولادی میر کی طرف کوچ شروع کر چکا ہے۔ اب ہمیں ہر کام ہنگامی بنیادوں پر کرنا ہو گا۔ ہمارا فیصلہ ہے کہ ہم آخری تلوار اور آخری بازو تک دشمن کا مقابلہ کریں گے۔ ہم انہیں بتائیں گے کہ پیش قدمی کرنے والوں کو کیسے روکا جاتا ہے اور بڑھتے ہوئے حوصلوں کو چکنا چور کرنے والے بازو کیسے ہوتے ہیں۔"

ایک سردار کھڑے ہو کر پرجوش لہجے میں کہا۔ "ہاں ہم لڑیں گے' آخری بازو اور آخری تلوار تک لڑیں گے۔"

حاضرین نے ہم آہنگ ہو کر اس پرجوش سردار کی تائید کی۔ شہزادی نے کہا۔ "اب

آپ لوگ دفاع کو مضبوط تر بنانے کے لیے اپنے مشورے دیں۔"

مصاحبین' عمائدین و عسکری مشیروں نے اپنی اپنی آراء شہزادی تک پہنچائیں۔ یہ سلسلہ کافی دیر جاری رہا۔ آخر میں شہزادی نے اپنی رائے پیش کرتے ہوئے کہا۔

"ہم نے آپ سب کی باتیں نہایت غور سے سنی ہیں اور ان سے استفادہ کیا ہے۔ آخر میں ہم اپنی رائے پیش کرتے ہیں اور ہمیں امید ہے کہ آپ کی اکثریت اسے پسند کرے گی۔"

شرکاء ہمہ تن گوش ہو گئے۔ شہزادی نے کہا۔ "ہمارا خیال ہے کہ دستیاب فوج کا زیادہ تر حصہ مغربی فصیل پر متعین کیا جائے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں مشرقی جانب عمیق پہاڑی نالا شہر کو قدرتی تحفظ فراہم کر رہا ہے۔ اگر ہم اس پہاڑی نالے کو اپنا دوسرا دفاعی حصار سمجھتے ہوئے اس جانب کی فصیل پر معمولی فوج لگا دیں تو مغربی فصیل کے لیے ہمیں زبردست عسکری قوت مہیا ہو سکتی ہے۔"

شہزادی کی تجویز نے حاضرین کو سوچنے پر مجبور کر دیا۔ ان کے چہروں پر دلچسپی کے آثار تھے۔ شہزادی نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "مشرق کی طرف سے بھرپور حملے کی توقع بہت کم ہے۔ اگر ہم مشرقی فصیل پر جو کئی کوس طویل ہے کہیں کہیں تیرانداز دستے کھڑے کر دیں اور اپنی پوری توجہ مغربی فصیل پر رکھیں تو دشمن کے دانت کھٹے کیے جا سکتے ہیں۔ رہا مشرقی حصے کا سوال تو وہاں کی مختصر آبادی کو پہاڑی نالے کے اس پار منتقل کیا جا سکتا ہے۔ فرض محال اگر تاتاری اس جانب سے شہر میں داخل ہو جائیں تو ہمارے دستے پسپائی اختیار کر کے نالے کے اس پار چلے آئیں گے اور لکڑی کے وہ دو تین پل توڑ دیے جائیں گے جو آمدورفت کا واحد ذریعہ ہیں۔ ہمارے مشیروں نے بتایا ہے کہ یہ وحشی قوم پانی کو مقدس سمجھتی ہے اور اس سے خوف بھی کھاتی ہے ان کی حتی الامکان کوشش ہوتی ہے کہ بہتے پانی میں نہ اتریں۔ قوی امید ہے کہ تاتاری پہاڑی نالا پار کرنے کی کوشش نہیں کریں گے اور اگر انہوں نے ایسا کیا بھی تو یہ کام ان کے لیے فصیل توڑنے سے کہیں زیادہ دشوار ثابت ہو گا۔"

شرکاء چہ میگوئیوں میں مصروف ہو گئے۔ اس تجویز کے مختلف پہلوؤں پر غور کیا گیا اور حاضرین کی اکثریت اس نتیجے پر پہنچی کہ اس قدرتی خندق کو اپنے دفاع کے لیے استعمال نہ کرنا بے وقوفی ہو گی .... شہزادی نے اسی وقت حکم دیا کہ مشرقی فصیل پر تعینات پچیس ہزار سپاہیوں کو فوری طور پر مغربی فیصل پر منتقل کر دیا جائے اور مشرقی حصے کی آبادی کو وہاں سے نکال لیا جائے۔

اس انقلابی فیصلے نے شہر میں زندگی کی لہر دوڑا دی۔ عوام کو اندازہ ہوا کہ حکومت سنجیدگی سے دفاعی تیاریوں میں مصروف ہے اور انہیں حملہ آوروں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا جائے گا۔ فوج میں بھی اس فیصلے کو سراہا گیا۔ جب پچیس ہزار کی فوج مغربی فصیل پہنچی تو شہر کا دفاع ناقابل تسخیر نظر آنے لگا۔ عسکریوں کے حوصلے دو گنے ہو گئے۔

یہ تجویز شہزادی کی اپنی نہیں تھی۔ اس منصوبے کی پیچھے جن مشیروں کا دماغ کام رہا تھا ان میں اباقہ اور اسد کے نام نمایاں تھے۔ سب سے پہلے اباقہ اور اسد نے ہی پہاڑی نالے کا ذکر کیا تھا۔ پھر کچھ دوسرے منگول اور بلغاری سرداروں نے بھی اس رائے کو سراہا تھا۔ پوری تفصیلات طے کرنے کے بعد ہی شہزادی نے یہ تجویز عمائدین کے سامنے پیش کی تھی۔

گزرنے والا ہر لمحہ قیامت کی گھڑیوں کو قریب تر لا رہا تھا۔ گھوڑوں کی ٹاپیں .... ' جنگی نعرے ' تلواروں کی جھنکار ' زخمیوں کی آہ و بکا۔ ابھی یہ صدائیں کہیں نہیں تھیں لیکن اہل ولادی میران صداؤں کو محسوس کر رہے تھے۔ وہ تصور کے کانوں سے سن رہے تھے اور تصور کی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ ہر دل ایک ہی انداز میں دھڑک رہا تھا اور ہر ذہن کی سوچ ایک تھی۔ کیا ہو گا۔ آنے والی گھڑیوں میں کیا ہو گا؟

رات دوسرے پہر بے خواب شہزادی نے اباقہ کو محل میں بلایا اور اس کے ساتھ چپکے سے مغربی فصیل کا جائزہ لینے کے لیے چل دی۔ اباقہ کی موجودگی میں اسے عجیب طرح کا سکون ملتا تھا۔ اسے دیکھ کر شہزادی کو لگتا تھا' اس شخص کے اعصاب فولاد کے ہیں۔ ان نازک حالات میں جب بڑے بڑے سورماؤں کے پتے پانی ہو رہے تھے۔ اس کے چہرے پریشانی کا شائبہ تک نہ تھا منگولوں کی بات کرتے ہوئے اس کے چہرے پر عجیب طرح کا تمسخر آ جاتا تھا۔ شہزادی نے جب بھی اس تمسخر کو دیکھا اسے اپنے اندر ایک تازہ ولولے اور اعتماد کا احساس ہوا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اباقہ سے منگولوں کا زیادہ سے زیادہ ذکر سننا چاہتی تھی۔

چاندنی رات تھی۔ دونوں گھوڑوں پر سوار مغربی فصیل پر پہنچے۔ چوکس دستے لمبی پوستینیں پہنے کیل کانٹے سے لیس اپنے مورچوں میں ڈٹے ہوئے تھے۔ یہ فصیل گو لکڑی کی تھی مگر بے حد مضبوط تھی۔ ولادی میر کا قلعہ روس کے مضبوط ترین قلعوں میں سے تھا۔ قلعے کا معائنہ کرنے کے بعد اباقہ اور نتاشا فصیل کے اوپر ہی اوپر گھوڑے دوڑاتے مشرق کی طرف نکل گئے۔ راستے میں جگہ جگہ سپاہیوں نے شہزادی کو پہچان کر پرجوش نعرے لگائے' حسب ہدایت فصیل کے مشرقی نیم دائرے میں کہیں کہیں تیر انداز د

متعین تھے۔ فصیل کے اوپر سے اباقہ اور نتاشا نے دیکھا۔ چاندنی میں دور پہاڑی نالے کے آثار نظر آ رہے تھے۔ اس حصے کی تمام آبادی اب نالے کے پار پہنچ چکی تھی۔ ایک برجی کے پاس پہنچ کر اباقہ اور نتاشا گھوڑوں سے اتر آئے۔ یخ بستہ ہوا فراٹے بھر رہی تھی۔ مگر ان کے جسموں پر سردی کے بچاؤ کے لیے معقول لباس تھا۔ شہزادی کھوئے ہوئے لہجے میں بولی۔

"اباقہ یہ چاند دیکھ رہے ہو۔"

اباقہ نے کہا۔ "ہاں دیکھ رہا ہوں۔"

شہزادی بولی۔ "یہ چاند اگلے ماہ آج کے دن' اس وقت' اسی جگہ چمکے گا مگر ہم تم اس فصیل پر اس جگہ نہیں ہوں گے۔ خدا معلوم یہ شہر بھی ہو گا یا نہیں۔"

اباقہ نے کہا۔ "شہزادی۔ یہ چاند تو صدیوں سے نکل رہا ہے اور نہ جانے کب تک نکلتا رہے گا۔ اسے کچھ فرق نہیں پڑتا کہ وہ بستی پر چمکتا ہے یا قبرستان پر۔ یہ تو زمین والوں کے سوچنے کی بات ہے کہ وہ اس کی چاندنی کو کب اور کہاں پانا چاہتے ہیں۔"

نتاشا نے کہا۔ "اباقہ تم بڑے مضبوط ارادوں کے مالک ہو۔ میں ڈرتی ہوں کہ کہیں تمہیں کھو نہ دوں۔"

اباقہ نے کہا۔ "شہزادی کوئی کسی کو نہیں کھوتا .... ہم چاند کھوتے ہیں تو سورج لیتے ہیں۔ پانی کھوتے ہیں تو ہری بھری کھیتی پا لیتے ہیں۔ ایندھن کھوتے ہیں تو آگ پا لیتے ہیں۔"

شہزادی نے کہا۔ "اباقہ! کیا واقعی تم جنگلوں میں پروان چڑھے ہو؟"

اباقہ نے کہا۔ "بے شک۔"

شہزادی بولی۔ "پھر تو لوگوں کو چاہیے کہ علم کی باتیں سکھانے کے لیے بچوں کو جنگلوں میں چھوڑ آئیں۔"

اباقہ ہنس دیا' شہزادی بھی ہنس دی۔ خوف کے اس سمندر میں ان ہنسی ایک چھوٹے جزیرے کی طرح تھی۔ جو آسمانی بجلی کی طرح ایک لمحے کے لیے روشن ہو کر پھر تیرگی میں گم ہو گیا تھا۔ وہ دونوں گھوڑوں پر سوار ہوئے اور واپس چل دیے۔

.... جونہی شہزادی محل میں پہنچی' اسے یہ اہم خبر ملی کہ اس کے دونوں بھائی واپس آ گئے ہیں۔ اباقہ کے ساتھ وہ تیزی سے محل کے اندرونی حصے میں پہنچی۔ نشست گاہ میں رئیس اعظم کے دونوں بیٹے شہزادہ اول' شہزادہ دوم موجود تھے۔ (اتفاقاً ان دونوں بھائیوں کے درست نام' تاریخ کی دستیاب کتب میں کہیں نہیں ملتے لہٰذا غلطی سے بچنے کے

کی اشد ضرورت ہے۔"

شہزادی نے بے بسی سے ہونٹ کاٹے اور تیزی سے گھوم کر باہر نکل گئی۔

☆-------☆-------☆

صبح سے بارش ہو رہی تھی۔ شہزادی نتاشا سفید رنگ کا ہلکا پھلکا گون پہنے مسہری پر نیم دراز تھی۔ آتشدان میں دہکتی ہوئی آگ نے خوابگاہ کو سکون بخش حدت سے بھر رکھا تھا۔ شہزادی خود کو اپنے گون ہی کی طرح ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔ رات' بھائیوں نے اس کے کندھوں سے ایک بڑا بوجھ اُتار دیا تھا۔ اب وہ اپنے فیصلوں کے خود ذمے دار تھے۔ شہزادی کو معلوم تھا کہ رات رات میں وہ فوجی دستے واپس مشرقی فصیل پر پہنچ چکے ہیں جو آٹھ پہر پہلے اس نے مغربی فصیل پر منتقل کیے تھے۔ وہ بھائیوں سے خفا ضرور تھی مگر ان کی کامیابی کے لیے دعاگو بھی تھی۔ اب ان کی کامیابی ہی دارالحکومت کے لاکھوں باشندوں کی زندگی کی ضامن تھی۔ اسے صرف اس بات کا افسوس تھا کہ اباقہ اور اس کے ساتھیوں کی طرف سے پیش کی گئی ایک بہترین تجویز پر عمل نہیں کروا سکی۔ یقیناً ان سب کی دل شکنی ہوئی تھی۔

پھر اس کا خیال اباقہ کی طرف چلا گیا۔ اس کے کانوں میں اپنے بھائی کے الفاظ گونجے۔ "آپ جانتی ہیں کہ لوگ آپ کے متعلق کیا باتیں کر رہے ہیں۔" شرم سے اس کے کانوں کی لوئیں سرخ ہو گئیں۔ وہ سوچنے لگی کہ لوگ کیا باتیں کرتے ہوں گے۔ شاید یہ کہتے ہوں کہ شہزادی اس نوجوان سے محبت کرنے لگی ہے۔ کس قدر بے ہودہ بات تھی اور کس قدر جھوٹی بھی......... اسے اباقہ سے ہمدردی ضرور تھی' لیکن اسے محبت تو نہیں کہا جا سکتا تھا۔ ایک انس تھا جو کسی بھی ایسے فرد سے پیدا ہو سکتا ہے جو دل کو اچھا لگتا ہو اور جس کے خیالات اپنے خیالات سے ملتے ہوں۔

وہ اس موضوع پر سوچ رہی تھی' جب دروازے پر کلثوم نے دستک دی۔ دستک پہچان کر شہزادی نے اسے اندر آنے کی اجازت دی۔ اس نے آداب کیا اور مؤدب کھڑی ہو گئی۔ شہزادی نے پوچھا کہ اس کی ہدایت کے مطابق نقد رقوم مہاجر بستی میں پہنچا دی گئی ہیں۔ کلثوم نے اثبات میں جواب دیا۔ شہزادی کے چہرے پر اطمینان نظر آنے لگا۔ اس نے کل رات ہی کلثوم کو ہدایت کی تھی کہ مہاجر بستی کے مکینوں کی مالی امداد کی جائے۔ خاص طور پر ان گھروں کی جو اپنے بچے فروخت کرنے پر مجبور ہوئے۔ شہزادی ایک دھند میں تحلیل ہو رہی تھی اور اس دھند کے اندر سے ایک رحم دل اور حساس لڑکی کا ہیولا ابھر رہا تھا۔

کلثوم نے کہا "شہزادی صاحبہ۔ شہر میں زبردست ہراس پایا جاتا ہے۔ اطلاع ملی ہے کہ منگول شہر سے ایک منزل کے فاصلے پر پہنچ چکے ہیں۔"

شہزادی نے آنکھیں بند کر کے سینے پر صلیب کا نشان بنایا۔ پھر اعصاب کو پُرسکون کرتے ہوئے بولی۔ "کلثوم' جو ہونا ہے ہو کر رہے گا اور اگر جلد ہو جائے تو اچھا ہے۔"

کلثوم نے جھرجھری لے کر کہا "شہزادی صاحبہ۔ محل کی تمام خواتین عبادت کے لیے گرجا جا رہی ہیں۔ آپ چلیں گی.........؟"

نتاشا نے کہا۔ "نہیں کلثوم' ہماری طبیعت ٹھیک نہیں۔"

کلثوم نے کہا۔ "شہزادی! اباقہ کے بارے میں کچھ پتہ چلا؟"

نتاشا بولی۔ "نہیں تو۔"

کلثوم نے کہا "رات آپ کے محترم بھائیوں نے اس کے ساتھ بے رخی کا سلوک کیا۔ وہ نشست گاہ میں آپ کا انتظار کر رہا تھا۔ آپ سے مل کر جب آپ کے بھائی واپس آئے تو انہوں نے اسے کہا کہ اب ہمیں ایک ضروری گفتگو کرنا ہے تم جاؤ۔"

"اب وہ کہاں ہے؟"

کلثوم نے کہا۔ "معلوم ہوا ہے کہ آج صبح شہزادہ اول خود مہمان خانے میں پہنچے تھے۔ انہوں نے تمام مہمانوں کو مختلف فوجی دستوں میں شامل کر دیا تاکہ وہ شہر کے دفاع میں حصہ لے سکیں۔ اباقہ اور اسد کو بھی ایک یک صدی سالار کی کمان میں دے کر فصیل پر بھیج دیا گیا ہے۔"

نتاشا کو حیرانی ہوئی کہ اباقہ اور اسد جیسے بہادروں کو یک صدی سالار کی کمان میں دیا گیا ہے۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ یہ سب کچھ عناد کی وجہ سے کیا گیا ہے۔ یکایک اسے اباقہ سے بے پناہ ہمدردی محسوس ہوئی۔ اس کا دل چاہا کہ اڑ کر اس کے پاس پہنچ جائے اور اس کی دلجوئی کرے۔ اس نے کلثوم سے پوچھا۔

"تمہیں معلوم ہے اباقہ اور اسد کس حصے میں ہیں؟"

کلثوم نے کہا "پیاری شہزادی۔ مجھے معلوم تھا آپ بہت سے سوال پوچھیں گی اس لیے بندی تمام معلومات حاصل کر کے آئی ہے۔ اباقہ اور اسد کا دستہ شہر کے چوتھے دروازے پر متعین برجی میں ہے۔ محل کی چھت سے آپ ان کا علم دیکھ سکتی ہیں۔"

شہزادی نے کہا۔ "کلثوم! ہمارا خیال ہے کہ ہم بھی دوسری خواتین کے ساتھ گرجے جائیں۔"

کلثوم نے معنی خیز نظروں سے اسے دیکھا اور بولی۔ "میرا خیال ہے آپ اباقہ سے

ملنا چاہتی ہیں۔"

نتاشا نے سنجیدگی سے کہا۔ "تم ٹھیک سمجھی ہو کلثوم۔"

.... کچھ ہی دیر بعد محل کی خواتین ایک شاندار گھوڑا گاڑی میں گرجے کی طرف روانہ ہوئیں۔ گاڑی کی دونوں اطراف خوبصورت وردیوں والے چاق و چوبند گھڑ سوار محافظ تھے مختلف پرہجوم راستوں سے گزر کر گھوڑا گاڑی حضرت مریم کے گرجے میں پہنچی۔ جب شاہی بیگمات گرجے اندر پہنچ گئیں تو نتاشا اور کلثوم باہر نکلیں اور ایک عام گاڑی میں آ بیٹھیں۔ نتاشا کی ہدایت پر گاڑی بان نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ اس کا رخ شہر کے چوتھے دروازے کی طرف تھا۔

بارش اب تھم چکی تھی مگر گلی کوچوں میں پانی کھڑا تھا پریشان چہروں کے ساتھ اہل ولادی میر مختلف کاموں میں مصروف تھے۔ گھوڑا گاڑی چند درختوں کے نیچے جا کھڑی ہوئی۔ کلثوم اندر سے برآمد ہوئی اور اباقہ کو بلانے چل دی شہزادی نے اسے ایک فرمان دے دیا تھا۔ اس فرمان کی موجودگی میں وہ آسانی سے اباقہ تک پہنچ سکتی تھی۔

کوئی نصف گھڑی بعد اباقہ ایک گھوڑے پر سوار گھوڑا گاڑی کی طرف آتا دکھائی دیا۔ نتاشا کی ہدایت پر گاڑی بان نے اسے گاڑی کے اندر بلا لیا۔ گھوڑے سے اتر کر اس نے دروازہ کھولا اور گاڑی میں آ گیا۔ اس کے چہرے پر بے پناہ افسردگی تھی۔

شہزادی نے کہا۔ "اباقہ! ہم صرف یہ کہنے کے لیے آئے ہیں کہ جو کچھ ہوا اس میں ہماری مرضی کو دخل نہ تھا۔"

اباقہ نے کہا "شہزادی! جو کچھ ہوا اسے بھول جائیں جو کچھ ہونے والا ہے اس کی فکر کریں.......... یہ شہر تاتاریوں کے سیلاب میں تنکے کی طرح بہنے والا ہے۔ مجھے امید کی کوئی کرن نظر نہیں آتی۔ کاش جو فیصلہ ہو چکا تھا برقرار رہتا۔" اباقہ کی زبان سے ادا ہونے والے ان الفاظ نے شہزادی کو خوف کے اتھاہ سمندر میں ڈبو دیا۔ اس نے جس شخص کے ہونٹوں سے اب تک مایوسی کا ایک لفظ نہیں سنا تھا آج وہ بھی ناامیدی کی بات کر رہا تھا۔

شہزادی نے کہا۔ "اباقہ! ہم کیا کر سکتے ہیں بتاؤ کیا کیا جا سکتا ہے؟"

اباقہ بولا۔ "کچھ نہیں۔ اب منصوبہ بندی کا وقت گزر چکا ہے۔ کچھ ہی دیر میں آپ کو تاتاریوں کے ہراول دستے دکھائی دینے لگیں گے۔ اب تو تلواریں ہیں اور بازو ہیں۔ زندگی اور موت کا فیصلہ میدان جنگ میں ہو گا۔"

.... یکایک فصیل کے اوپر اور فصیل کے نیچے نقارے بجنے لگے۔ نقاروں کی آواز کے ساتھ ہی ہر طرف سنسنی پھیل گئی۔ اباقہ نے کہا۔ "شہزادی! میرا خیال ہے اب آپ کو

چلنا چاہیے۔"

اچانک شہزادی کی خوبصورت آنکھیں بھیگ گئیں۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ یہ نقارے تاتاریوں کی آمد کا اعلان کر رہے ہیں اس نے ہاتھ بڑھا کر اباقہ کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ پھر رندھی آواز میں بولی۔ "اباقہ! ہم تم سے محبت کرتے ہیں .... جس گھڑی تمہیں پہلی بار دیکھا تھا۔ اس گھڑی سے محبت کرتے ہیں۔" شرم سے شہزادی کا چہرا سرخ ہو رہا تھا۔ اباقہ بھونچکا کھڑا رہ گیا۔ نتاشا نے اباقہ کے ہاتھ چھوڑے اور منہ پھیر کر بولی۔ "اب تم جا سکتے ہو۔"

اباقہ نے پریشانی سے نتاشا کی طرف دیکھا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اس موقعے پر کیا کہے۔ اس وقت نقاروں کی دھما دھم اور تیز ہو گئی۔ فصیل پر دور دور تک نقارے بجنے لگے تھے۔ اباقہ جیسے چونک گیا۔ اس نے شہزادی کو خدا حافظ کہا اور جلدی سے نیچے اتر آیا۔

☆ ☆ ☆

.... وہ فوج تھی یا ایک تند و تیز سیلاب تھا' لشکر تھا یا پگھلا ہوا لاوا تھا جو نشیب و فراز کو ایک کرتا فصیل کی طرف بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ ہزاروں گھوڑے تھے جو اپنے وحشی سواروں کو لیے آندھی کی رفتار سے قلعے کی طرف اڑے آ رہے تھے۔ سب سے آگے یاک کی نو دموں والا عسکری پرچم تھا اور اس کے پیچھے دنیا کی تیز رفتار ترین اور منظم ترین فوج تھی۔ اس فوج کا بیشتر حصہ منگولوں پر مشتمل تھا لیکن ان میں کچھ ترک بھی تھے' جو مدتوں سے مغربی ایشیا کے جنگلوں کے کنارے آباد چلے آتے تھے۔ کرغیز اور ایغوز بھی تھے اور خانہ بدوش ترکمان بھی' لیکن سب کے سب ایک سانچے میں ڈھلے ہوئے۔ ایک جسم کی طرح حرکت کرنے والے۔ سروں پر آہنی خود۔ جسموں پر چرمی زرہیں' ہاتھوں میں تلواریں اور نیزے' جن کی برچھیوں کے نیچے گھوڑے کی دم کے بال لگائے گئے تھے۔ آنکھوں میں خون کی پیاس اور ہونٹوں پر وحشیانہ نعرے۔ وہ آج سب کچھ مٹا دینے کا تہیہ کیے ہوئے تھے۔ ہراول سواروں اور ان کے گھوڑوں کے آہنی خود دوپہر کی دھوپ میں چمک رہے تھے۔ وہ دس دس کی اکائیوں پر مشتمل تھے۔ ہر اکائی ایک چھوٹی سی قیامت تھی اور ایسی لاتعداد قیامتیں ولادی میر کی طرف بڑھ رہی تھیں۔

اباقہ اسد کے ساتھ فصیل پر کھڑا تھا۔ اس کے لمبے بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ آنکھیں دور افق پر منگولوں کی آمد کا نظارہ کر رہی تھیں۔ غیر ارادی طور پر اس کا ہاتھ اپنی صدری کی جیب تک پہنچا .... اس جیب میں ریشمی زلفوں کی ایک لٹ تھی۔ اباقہ نے

وہ لٹ نکالی اور غور سے دیکھنے لگا۔ اس لٹ سے اسے مارینا کی خوشبو آ رہی تھی۔ مارینا جو اس کی پہلی اور آخری محبت تھی۔ مارینا وہ عورت تھی جسے ہوش سنبھالنے کے بعد اباقہ نے پہلی بار چھوا تھا۔ اس کے ہاتھ پر مارینا کے رخسار کی گرمی امر ہو چکی تھی .... ایک انمٹ مہر کی صورت ثبت ہو چکی تھی۔ اس نے کن انکھیوں سے اسد کو دیکھا۔ وہ اپنی کمان کا چلہ کس رہا تھا۔ بے اختیار اباقہ کا ہاتھ متحرک ہوا اور اس نے ان بالوں کو چوم لیا ایک خاموش صدا اس کے دل سے نکلی۔ "مارینا! اگر زندہ رہا تو تمہارا ہوں' اگر زندہ نہ رہا تو مجھے معاف کرنا۔"

لٹ دوبارہ جیب میں ڈال کر اس نے اسد کو دیکھا۔ منگولوں کے ہراول دستے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔ اباقہ نے کہا۔ "اسد! اگر ہم مارے گئے تو شہید کہلائیں گے یا نہیں۔"

اسد نے کہا۔ "اباقہ! ہم شہید کہلائیں گے۔ کیونکہ ہم رئیس اعظم کی خاطر منگولوں سے نہیں لڑ رہے۔ ہم انہیں مارنے کے لیے لڑ رہے ہیں۔ یاد ہے سلطان جلال الدین نے کہا تھا اگر ہم سو کوس چل کر ایک منگول کو بھی ماریں گے تو ہمارا سفر رائیگاں نہیں ہو گا۔ زمین سے ایک مردود کا بوجھ کم کرنا بہت بڑی کامیابی ہے۔"

اباقہ نے تلوار کا دستہ مضبوطی سے تھاما اور بولا .... "خدا کی قسم آج میں اپنی تلوار کو منگولوں کے خون سے سیراب کروں گا۔"

اسد نے کہا۔ "آج تو میرا بھی دل چاہتا ہے کہ سب کچھ بھول کر منگولوں کی صفوں میں گھس جاؤں اگر سلطان کی جان لینے والے ملعون عبداللہ حشدی کو ڈھونڈنے اور اس سے انتقام لینے کا خیال دل میں نہ ہوتا تو آج میں اپنے لیے شہادت کی موت طلب کرتا۔"

دونوں اپنے مورچے میں کھڑے منگول لشکر کو نزدیک تر آتے دیکھتے رہے۔ قلعے کی فصیل سے کوئی سو گز دور منگولوں کے ہراول دستے رک گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہراول دستوں کے پیچھے لشکریوں کے ٹھٹ لگ گئے۔ وہ ایک لاکھ سے زائد گھڑ سواروں کا لشکر جری تھا۔ انہوں نے پوری مغربی فصیل کے ساتھ ساتھ صفیں باندھ لیں۔ ان کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ تھوڑی ہی دیر میں زبردست ہلہ بول دیں گے۔ دوسری طرف فصیل پر موجود روسی آخری وقت بھی خود کو تسلیاں دے رہے تھے۔ اباقہ اور اسد کا "یک صدی" کماندار بار بار کہہ رہا تھا۔ "میرا خیال ہے منگول فوری حملہ نہیں کریں گے۔ وہ محاصرے کا ارادہ کر رہے ہیں۔" جب وہ یہ تجزیہ پیش کر رہا تھا اس کی آواز کپکپا رہی تھی اور چہرا سرسوں کی طرح زرد تھا۔ کماندار کا یہ حال تھا تو سپاہیوں کی کیفیت نامعلوم کیسی ہو گی۔ وہ

ایسے خزاں رسیدہ پتوں کی طرح تھے جو شاخوں سے جھڑنے کے لیے ہوا کے ایک جھونکے کے منتظر ہوں۔

.... اور پھر وہی ہوا جس کا خدشہ تھا۔ منگول لشکر کے عقب میں موجود دیو ہیکل منجنیقوں نے اچانک قلعے پر گولہ باری شروع کر دی۔ یہ سب کچھ اتنا اچانک اور شدید تھا کہ فصیل کے اوپر اور شہر کے اندر ہر طرف بھگدڑ مچ گئی۔ منوں وزنی گولے اور آتشیں مرتبان سنسناتے ہوئے آئے اور لرزہ خیز دھماکوں سے فصیل اور شہر پر گرنے لگے۔ یکایک جیسے کسی نے زلزلوں کو بے لگام چھوڑ دیا تھا۔ روسی فوج نے فصیل کے اوپر سے منگولوں کی ہلاکت آفریں منجنیقوں کو نشانہ بنانا چاہا مگر بدحواسی نے ان کی قوت ضرب سلب کر لی تھی۔ منگولوں کی جوابی گولا باری نے ان گنت روسی منجنیقوں کو آگ کا لباس پہنا دیا۔ فصیل پر ہر طرف آہ و بکا بلند ہونے لگی۔ اس دوران یہ خبر پھیل گئی کہ رئیس اعظم کا بڑا بیٹا گولا باری میں ہلاک ہو گیا ہے لشکریوں کے حوصلے اور پست ہو گئے۔ یہی وقت تھا جب منگولوں نے دوسری اور شدید ترین گولا باری کا آغاز کیا۔ ایسا لگا کہ آسمان سے یکایک آتش و سنگ کی بارش ہونے لگی ہے۔ فصیل پر جگہ جگہ آگ بھڑکنے لگی۔ ہر طرف گہرا سیاہ دھواں پھیل گیا۔ اس دھوئیں کی آڑ میں منگول لشکر نے پیش قدمی شروع کی۔ جونہی وہ تیروں کی زد میں آئے فصیل سے تیروں کی بارش شروع ہو گئی' لیکن ان تیروں سے ہلاک ہونے والے منگول نہیں' روسیوں کے اپنے ہی ہم وطن تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جنہیں مفتوح علاقوں سے گرفتار کیا گیا تھا۔ اب وہ منگول فوج کے آگے آگے چلتے ہوئے ان کے لیے سپر (ڈھال) کا کام دے رہے تھے (یہ منگولوں کا وطیرہ تھا کہ وہ مفتوح آبادیوں میں زبردست قتل عام کرتے تھے۔ صرف جوان عورتوں اور مردوں کو زندہ رکھا جاتا جو ان کے لیے افرادی قوت مہیا کر سکتے تھے۔ ان لوگوں کو ہنکا کر لشکر کے ساتھ شامل کر لیا جاتا تھا۔ اس طرح مفتوح علاقوں میں کوئی متنفس باقی ہی نہیں بچتا تھا جو ان کی مزاحمت کر سکے یا بغاوت کا سوچ سکے۔ معمولی خوراک دے کر ان قیدیوں سے سخت ترین کام لیے جاتے تھے۔ پھر جب کسی دوسرے قلعے پر حملہ کیا جاتا تھا تو ان قیدیوں کو ڈھال کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا)۔ روسی فوج کے تیروں نے ان کے اپنے عزیزوں کے سینے ہی چھلنی کیے۔ ان کے تیروں نے اپنے ہموطنوں کا خون ہی اچھالا۔ منگول پیش قدمی کر کے فصیل کے نیچے پہنچ گئے۔ ان کے پر جوش نعروں اور وحشیانہ چنگھاڑوں سے اہل شہر کے دل دہلے جا رہے تھے۔ لوگ گلیوں میں' چھتوں پر اور بازاروں میں دو زانو ہو کر سلامتی کی دعائیں مانگنے لگے۔ کلیساؤں کی گھنٹیاں پورے شہر میں گونج رہی تھیں۔ یکایک سینکڑوں کمندیں اچھل اچھل کر

فصیل پر گرنے لگیں۔ روسیوں نے نیچے جھانکا تو صحرائے گوبی کے وحشی زندگی اور موت سے بے پرواہ اوپر چڑھے آ رہے تھے۔ کہیں نزدیک سے کوئی روسی سالار چیخا۔

"سپاہیو! انہیں روکو۔ اگر اب انہیں نہ روکا تو کچھ باقی نہ رہے گا۔ شاباش بہادرو جانیں لڑا دو۔ قوم کی مائیں اور بیٹیاں تمہاری جاں نثاری کے سہارے پر ہیں۔"

روسیوں نے منگولوں کو روکنے کے لیے واقعی جانیں لڑا دیں۔ سخت گولا باری اور تیر اندازی سے بے پرواہ ہو کر فصیل پر کھڑے ہو گئے اور اوپر چڑھتے ہوئے منگولوں کو نیچے گرانے کی کوشش کرنے لگے .... لیکن اوپر چڑھنے والے انسان کہاں تھے۔ وہ خونخوار چھپکلیاں تھیں یا زہریلے سانپ تھے جو پھنکار رہے تھے اور رینگتے آ رہے تھے اور وہ ایک دو بھی نہیں تھے۔ سینکڑوں تھے لاتعداد تھے۔ عین اس وقت پر جسے دروازے پر شہزادہ دوم نے چلا کر حکم دیا۔ مشرقی فصیل کے کماندار سے کمک طلب کرو۔ برق رفتار گھوڑے مشرقی حصے کی طرف بڑھے' لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ قضا اہل شہر کو مہلت دینے کو تیار نہیں تھی۔ خونخوار شکلوں والے منگول' سینگوں والی آہنی خودیں پہنے اوپر چڑھ آئے۔ ان کے جسموں پر چرمی زرہیں تھیں اور ہاتھوں میں تیل میں ڈوبی ہوئی تلواریں یہ تلواریں نہیں تھیں۔ فرشتہ اجل کی آنکھیں تھیں جو بد حواس روسی بہادروں کو چن چن کر مار رہی تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے منگولوں نے فصیل کے ایک حصے پر قدم جما لیے اور روسیوں کے سر کٹے ہوئے پھلوں کی طرح فصیل کے دونوں اطراف گرنے لگے۔

اباقہ اس وقت فصیل کے چوتھے دروازے پر برسرپیکار تھا۔ اس کی تلوار منگولوں کے درمیان بجلی کی طرح کوند رہی تھی۔ اس نے ڈھال پھینک دی تھی اور دونوں ہاتھوں سے تلوار چلا رہا تھا۔ وہ وحشیوں سے وحشیوں کی طرح لڑ رہا تھا۔ ہر منگول اس کے لیے سردار بوغالی' اوغدائی یا چغتائی خان تھا۔ وہ دیوانہ وار ان کا خون اچھال رہا تھا۔ اچانک اسے تلواروں کی سماعت شکن جھنکار کے درمیان اسد کی آواز آئی۔ وہ اسے مدد کے لیے پکار رہا تھا۔ ایک منگول کا سر اڑا کر وہ تیزی سے اسد کی طرف لپکا۔ اسد ایک کمند کو فصیل سے نیچے پھینکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کم از کم پانچ منگول اس کمند سے لٹکے ہوئے تھے۔ اباقہ اور اسد نے زور لگا کر کمند فصیل سے چھڑا دی۔ پانچوں منگول بلندی سے پتھریلی زمین پر گرے اور ہلاک ہو گئے۔ اس دوران اباقہ کی نظر ایک اور کمند پر پڑی وہ اسد کے ساتھ اس دوسری کمند کی طرف لپکا اور چھڑانے کی کوشش کرنے لگا۔ یکایک ایک قیامت خیز شور نے انہیں اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ انہوں نے گھوم کر دیکھا اور سکتے میں رہ گئے۔ جنوب کی طرف فصیل کے دو دروازے کھل گئے تھے اور منگول سیلاب کے سرکش ریلوں کی طرح

اندر گھس رہے تھے۔ پھر جنوب کی طرف بھی ایسے ہی آثار نظر آئے کہ منگول ٹڈی دل شہر میں داخل ہو گیا ہے۔ اباقہ اور اسد نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور سمجھ گئے کہ اب "ولادی میر" میں بربریت اور سفاکی کی انتہا ہونے والی ہے۔ گلی کوچوں میں شیطان ننگا ہو کر ناچنے والا ہے .... جو گناہ گار ہیں وہ بھی اور جو بے گناہ ہیں وہ بھی' سب ایک ہی عذاب میں مبتلا ہونے والے ہیں۔ وہ بھاگتے ہوئے فصیل کے زینوں تک پہنچے اور چھلانگیں لگاتے ہوئے نیچے اترنے لگے۔

.... وہ جتنی رفتار سے بھاگ سکتے تھے بھاگے۔ ان کا رخ اپنے گھوڑوں کی طرف تھا۔ چند ہی لمحوں میں ان کے گھوڑے شہر کی لرزاں و خونچکاں گلیوں میں اڑے چلے جا رہے تھے۔ ان کا رخ شاہی محل کی طرف تھا۔ اچانک اباقہ نے مڑ کر دیکھا ان کے عقب میں ایک گھڑ سوار سرپٹ چلا آ رہا تھا۔ اباقہ نے پہچان لیا یہ یورق تھا۔

منگول اب شہر کے گلی کوچوں میں دندنا رہے تھے۔ ان کے جتھے گھوڑوں سمیت حویلیوں میں داخل ہو جاتے اور پھر اندر سے چیخ و پکار اور آہ و فغاں کی آوازیں آنے لگتیں۔ اباقہ کے سامنے ایک حویلی کی بالائی منزل کا دریچہ کھلا اور اس میں سے ایک نوجوان عورت نے پہلے اپنے شیر خوار بچے کو نیچے زمین پر پھینکا پھر خود بھی چھلانگ لگا دی۔ جب دونوں ماں بیٹا جان کنی کے عالم میں تڑپ رہے تھے۔ دریچے سے منگول وحشیوں کے دو تین چار چہرے جھانک رہے تھے۔ ایک اور مکان کی چھت پر ظالم و مظلوم میں زبردست جدوجہد ہو رہی تھی۔ ایک چودہ پندرہ سالہ لڑکا ایک نوجوان دوشیزہ سے چمٹا ہوا تھا جو شاید اس کی بہن تھی۔ دو منگول اسے بہن سے جدا کرنا چاہتے تھے مگر وہ کسی طور تیار نہیں تھا۔ آخر ایک منگول کی تلوار اس کے سینے سے پار ہو گئی۔ اس نے پھر بھی نوجوان بہن کو درندوں کے حوالے نہیں کیا۔ جھلا کر ایک منگول نے بہن بھائی کو چھت سے نیچے دھکا دے دیا۔ دارالحکومت کی بد قسمت گھڑیوں کا آغاز ہو چکا تھا اور منگول سو سا بھوکے عقابوں کی طرح مال غنیمت پر جھپٹ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں حرص کے شعلے تھے اور ہاتھوں میں قاتل شمشیریں۔ ان کے چہروں پر لکھا تھا کہ جو ان کے اور مال غنیمت کے درمیان آئے گا وہ اس کے چیتھڑے اڑا دیں گے۔ وہ قیمتی سامان اور نوجوان عورتوں کو کھینچ کھینچ کر گھروں سے نکال رہے تھے اور گھوڑوں پر ڈال کر یوں بھاگ رہے تھے جیسے آج اپنے خیموں کو اسباب شہر سے بھر دینا چاہتے ہوں۔ ایک قیامت وہ تھی جو فلک سے آتش و سنگ کی صورت برس رہی تھی اور ایک قیامت منگول گھوڑوں کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ وہ جس طرف کا رخ کرتے وہاں لرزہ خیز چیخوں اور آگ کے شعلوں کے

سوا کچھ نہ بچا تھا۔ معصوم بچے گھوڑوں تلے روندے جا رہے تھے۔ لاچار بوڑھے تلوار کی دھار پر تھے اور بے سہارا عورتیں اور نہتے مرد جان و عزت بچانے کے لیے بھاگ رہے تھے۔ کوئی منت سماجت قابل قبول نہیں تھی۔ کوئی نالہ رسا نہیں تھا۔ بعین ماسکو کا تھا۔ وہی منظر دوہرایا جا رہا تھا لیکن اس دفعہ مظلوموں کی تعداد ہزاروں میں نہیں لاکھوں میں تھی۔

اباقہ اسد اور یورق اندھا دھند گھوڑے بھگاتے چلے گئے۔ کہیں منگولوں سے کتراتے کہیں ان سے تلوار لڑاتے بالآخر وہ حضرت مریم کے گرجے تک جا پہنچے۔ ابھی منگولوں کا سیل بے اماں یہاں تک نہیں پہنچا تھا لیکن شہر میں اٹھتے ہوئے شعلے اور پتے کی طرح لرزاں زمین آنے والی خونی ساعتوں کا سارا احوال سنا رہی تھی۔ کلیسا کے بڑے دروازے پر جہاں حضرت مسیح کا ایک بہت بڑا مجسمہ صلیب پر نظر آ رہا تھا' اباقہ اسد گھوڑوں سے اترے اور بھاگتے ہوئے اندرونی حصے میں داخل ہو گئے۔ کلیسا کے دیوار جان لیوا دہشت سے کانپ رہے تھے۔ سینکڑوں ہزاروں افراد ہاتھ پھیلائے گڑگڑا کر سلامتی کی دعائیں مانگنے میں مصروف تھے۔ ایک پُر گونج پکار تھی جو چار سُو پھیلی تھی۔ اباقہ اسد اور یورق روتے بلکتے لوگوں کے درمیان سے راستہ بناتے کلیسا کی عقبی جانب آئے۔ یہاں انھوں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ سینکڑوں افراد قطاروں میں بیٹھے اپنے سر منڈوا رہے تھے موت سر پر دیکھ کر وہ سب کچھ تیاگ دینے کو تیار ہو گئے تھے۔ وہ راہبانیت اختیار کرنا چاہتے تھے کہ شاید خدا اسی کے صدقے ان سے اپنا عذاب ٹال دے۔ ایک طرف شاہی خاندان کے افراد بھی نظر آ رہے تھے۔ بجیلی صورتوں والے خوبرو شہزادے جنہیں اپنے بانکپن پر ناز تھا اور وہ حسین نو خیز شہزادیاں جن کی زلفوں پر ریشم و کمخواب رشک کرتے تھے اور ضعیف بیگمات جو سادگی اور وقار کا مجسمہ تھیں' سب کے سب حجاموں کے روبرو گردنیں جھکائے سر منڈوا رہے تھے۔ سر مونڈنے والوں کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور منڈوانے والوں کی گردنیں لرزاں تھیں۔ ہر کوئی اس جلدی میں تھا کہ اس کا سر پہلے مونڈا جائے تاکہ وہ پہلے متقی اور پرہیزگار بن سکے لیکن وہ نہیں جانتے تھے کہ توبہ کی مہلت ختم ہو چکی ہے عذاب کے دروازے کھل چکے ہیں اور قہر و غضب کے ہرکارے ملائکہ اجل کی اعانت کے لیے بڑھتے چلے آ رہے ہیں۔

"نتاشا!" اباقہ حلق کی پوری قوت سے چیخا۔

"نتاشا!" اسد نے بھی پورے زور سے آواز دی۔

"میں یہاں ہوں۔" لوگوں کی چیخ و پکار سے ایک تیز نسوانی آواز ابھرتی ہوئی محسوس

ہوئی۔ یورق نے ایک طرف اشارہ کیا۔ نتاشا ایک جگہ عورتوں کے درمیان کھڑی تھی۔ اس کے ریشمی بال ایک حجام کے ہاتھوں میں تھے اور وہ اس پر طبع آزمائی کرنے کے لیے بالکل تیار تھا۔ اباقہ بھاگتا ہوا نتاشا کے پاس پہنچا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتا ہوا ایک طرف لے آیا۔

نفسا نفسی کے عالم میں کسی کو کسی کی خبر نہیں تھی۔ وہ تینوں نتاشا کو لیے ہوئے گرجے کے عقبی دروازے سے باہر نکل آئے ابھی بمشکل وہ چند گز دور گئے تھے کہ ایک ہولناک کڑاکا سنائی دیا۔ اسد نے کہا۔

"میرا خیال ہے منگول پہنچ گئے ہیں۔"

اباقہ بولا۔ "تم ٹھیک کہتے ہو یہ صدر دروازے کے ٹوٹنے کی آواز تھی۔"

اس کے ساتھ ہی گرجے کے اندر سے ہولناک چیخیں سنائی دینے لگیں۔ اب وہاں رکنا فضول تھا۔ مظلومین کی قسمت پر آنسو بہاتے وہ تیزی سے ایک طرف روانہ ہو گئے۔ گھوڑے وہ گرجے کے صدر دروازے پر چھوڑ آئے تھے لہٰذا اب انھیں پیدل چلنا تھا۔ اباقہ اسد اور یورق کے ہاتھ میں عریاں تلواریں تھیں۔ نتاشا خالی ہاتھ تھی اور ان کے درمیان چل رہی تھی۔ تاتاریوں کی غارت گر ٹولیوں سے پہلو بچاتے وہ اس عمیق پہاڑی نالے کی طرف نکل آئے جو دو مقامات پر شہر کی فصیل کے نیچے سے گزرتا تھا۔ وہ نالے کی ترائی ڈھلوان پر پہنچے تو ایک پتھر کی اوٹ سے ٹھگنا سا سایہ نکل کر ان کے سامنے آ گیا۔ وہ علی تھا۔ وہ کافی خوفزدہ نظر آتا تھا۔

اباقہ سے کہنے لگا۔

"بھائی جان! کیا شہر میں آگ لگ گئی ہے؟ کیا تاتاری اندر آ گئے ہیں؟"

اباقہ نے کہا "تم یہ بتاؤ سب ٹھیک ہے نا؟"

"بالکل" علی سر ہلا کر بولا۔ پھر کندھے پر لٹکی کمان کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا۔ "اس کے ہوتے ہوئے آپ کو فکر کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ میرا نشانہ بہت پکا ہے۔"

وہ چاروں آگے پیچھے چلتے ایک چٹان کی اوٹ میں پہنچے۔ یہاں ایک چھوٹی سی کشتی موجود تھی۔ اس کشتی کا انتظام اباقہ اور اسد نے کل ہی کر لیا تھا۔ فصیل پر جانے سے پہلے وہ علی کو کشتی کی نگرانی کے لیے یہاں چھوڑ گئے تھے۔ کشتی میں مویشیوں کا چارہ بڑے گٹھوں کی صورت میں پڑا تھا۔

نتاشا نے کہا۔ "کیا ہم اس کشتی میں سفر کریں گے؟"

اباقہ نے کہا۔ "ہاں.......... لیکن ابھی نہیں۔ اندھیرا ذرا گہرا ہو لے۔"

پھر وہ چاروں مل کر بہ آہستگی کشتی کو پانی تک لے آئے۔ کشتی میں دو بڑے بڑے تھیلے بھی تھے جن میں خشک راشن بھرا ہوا تھا۔ اس دوران ایک جانب گھوڑوں کی آہٹ سنائی دی۔ وہ سب پتھر کی اوٹ میں ہو گئے۔ علی والا تیر کمان اب اباقہ کے ہاتھ میں تھا۔ ایک پتھر کے عقب میں اوندھا لیٹا تھا اور اس کی عقابی نظریں بلندی پر مرکوز تھیں۔ گھوڑے اب بالکل کنارے پر پہنچ چکے تھے پھر انھیں ملگجے اندھیرے میں دو انسانی ہیولے نظر آئے۔ یہ ایک لڑکی اور لڑکا تھے۔ دونوں سخت گھبراہٹ میں اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔ شاید انھیں خدشہ تھا کہ تاتاری ان کے تعاقب میں یہاں بھی پہنچ جائیں گے۔ اسد وغیرہ پتھروں کی اوٹ سے نکل آئے اور آواز دے کر ان دونوں کو قریب بلا لیا۔ ان دونوں کے سروالوں سے محروم تھے اور گلے میں صلیبیں لٹک رہی تھیں۔ نوجوان کے لباس پر خون کے چھینٹے تھے اور لڑکی کا رخسار زخمی تھی۔ زخمی رخسار اور منڈھے ہوئے سر کے باوجود وہ قبول صورت نظر آ رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا وہ واقعی قبول صورت رہی ہوگی۔ ان دونوں کے چہرے ہلدی کے مانند زرد تھے۔ انھوں نے بتایا کہ وہ گرجے میں موجود تھے جب تاتاریوں نے وہاں ہلہ بولا۔ انھوں نے تلوار کی زد میں آنے والے ہر شخص کو بے دریغ کاٹ کر رکھ دیا۔ کلیسا کے فرش مقتولین کے خون سے سرخ ہو گئے اور تاتاریوں کے پاؤں پھسلنے لگے۔

انھوں نے شاہی خاندان کے تمام افراد کو ایک جگہ جمع کیا اور بڑے بڑے کلہاڑوں سے ان کی گردنیں مار دیں۔

بلا فرق حسب و نسب اور رنگ و نسل عورتوں کی بے حرمتی کی گئی اور معصوم بچوں کو نیزوں پر اچھالا گیا۔

کلیسا میں موجود انسانوں کے جم غفیر میں سے جو چند خوش قسمت بچ کر نکل سکے ان میں یہ لڑکی لڑکا بھی شامل تھے۔ پہلے تو وہ کلیسا کے عقبی دروازے کے پاس خود کو مردہ ظاہر کر کے لاشوں میں پڑے رہے۔ پھر جب عورتوں اور بچوں کی ایک ٹولی بھرا مار کر دروازے سے نکل تو وہ بھی ان میں شامل ہو گئے۔ نوجوان کا لباس خون سے تر تھا۔ لڑکی کے رخسار پر ایسا نشان تھا جیسے کسی کتے نے کاٹ کھایا ہو۔ یہ نشان ایک لڑکی کے رخسار پر نہیں تھا، یہ مہذب انسانیت کے رخسار پر تھا جو منگولوں کی حیوانیت کا شکار تھی۔ یہ جابر کی مہر مجبور کے چہرے پر تھی، یہ وحشت کی مشق تہذیب کے بدن پر تھی۔ ہاں یہ ایک زخم ہی نہیں تھا ایک خونی عہد تھا، ایک رحم داستان تھی، ایک تاریخی حادثہ تھا۔

.... اندھیرا گہرا ہونے تک وہ انہی پتھروں میں چھپے رہے پھر کشتی پر سوار ہو کر

بہاؤ کے رخ بہنے لگے۔ چپو سردار یورق نے سنبھال رکھے تھے۔ اباقہ اور اسد کشتی کے درمیان کھڑے دور مشرق کی طرف دیکھ رہے تھے۔ کوئی ایک کوس آگے پہاڑی نالہ ایک تنگ درے کی صورت میں فصیل کے نیچے سے گزرتا تھا۔ اس مقام پر فصیل بڑے بڑے آہنی ستونوں پر ایستادہ تھی۔ تیرگی میں یہ مقام نظروں سے اوجھل تھا۔ مگر فصیل پر روشن مشعلیں نظر آ رہی تھیں۔ دوپہر تک جاری رہنے والی بارش کے سبب نالے میں پانی کا بہاؤ خاصا تیز تھا۔ ابھرے ہوئے پتھروں سے کشتی کو بچانے کے لیے یورق کو جدوجہد کرنا پڑ رہی تھی.......... بالآخر وہ فصیل کے قریب پہنچ گئے۔ اس مرحلے سے گزرنا خاصا دشوار تھا۔ ان کے دل شدت سے دھڑک رہے تھے۔ اباقہ نے سب کو لیٹنے کی ہدایت کی اور خود بھی لیٹ گیا۔ یورق نے گٹھے کھول کر چارا ان کے اوپر اس طرح پھیلا دیا کہ وہ مکمل طور پر چھپ گئے جب وہ فصیل کے نیچے سے گزرنے لگے تو وہاں موجود محافظ تاتاریوں نے انھیں روک لیا۔

"کون ہے؟" ایک تاتاری نے فصیل کے اوپر سے اجڈ آواز میں پوچھا۔

یورق نے تلوار لہرا کر منگولی میں جواب دیا۔ "میں باتو کے تومان کا ایک صدی سردار ہوں۔ اصطبل کے لیے چارا لایا ہوں۔"

کنارے پر کھڑے محافظوں نے مشعلوں کی روشنی کشتی پر ڈالی۔ یورق کے جسم پر ایک لنگوٹ کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ لہٰذا محافظوں نے سمجھا کہ یہ منگول لشکری ہے اور اس نے وردی اتار رکھی ہے مطمئن ہو کر انھوں نے اسے آگے جانے کی اجازت دے دی۔ فصیل سے آگے وہ کوئی ایک کوس تک پہاڑی نالے میں سفر کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ان کی کشتی ابھرے ہوئے پتھروں میں اٹکنے لگی۔ انہوں نے کشتی چھوڑی اور گھٹنے گھٹنے پانی میں چلتے ہوئے نالے سے باہر آ گئے۔ وہ خطرے کی حدود سے آگے آ چکے تھے۔ تباہ حال ولادی میر کی فصیل دور رہ گئی تھی۔ ابھی تک شہر میں کہیں کہیں شعلے اٹھ رہے تھے۔ فصیل کے اندر اور باہر منگول فتح کا جشن منانے میں مصروف تھے۔ اتنی دور سے بھی انہیں منگولوں کی ناچتی ہوئی مشعلیں دکھائی دے رہی تھیں۔ اس علاقے میں منگولوں سے مڈبھیڑ کا قوی امکان تھا لہٰذا انہوں نے اونچے اونچے برف پوش ٹیلوں میں نہایت احتیاط سے سفر شروع کیا۔ سب خاموش تھے۔ ان کے دل بچھڑنے والوں کی یاد میں آنسو بہا رہے تھے۔ نتاشا کا حال زیادہ پتلا تھا۔ ماسکو میں اس نے اپنے چچا اور اپنی عزیز سہیلی کی قربانی دی تھی۔ یہاں اس کا پورا خاندان منگولوں نے گاجر مولی کی طرح کاٹ دیا تھا۔ کٹنے والوں میں اس کے دونوں بھائی شہزادہ اول و دوم بھی شامل تھے۔ کچھ بھی تھا وہ آخر ان کی بہن تھی۔

اس کا کلیجہ ان کے غم میں پھٹا جارہا تھا۔ وہ اپنے خاندان کے ایک ایک فرد کو یاد کرتے آنسو بہا رہی تھی۔ اب دنیا میں اس کا واحد سہارا اس کا باپ تھا..........."

..........رئیس اعظم کنیازیوری۔ جو دارالحکومت پر گزرنے والی قیامت سے بے خبر کسی جگہ منگولوں کے خلاف ہتھیار اور فوج جمع کرنے میں مصروف تھا.........."آہ میرے پیارے باپ۔" نتاشا نے بڑے درد سے سوچا۔ "آپ کہاں ہیں آپ کا گلشن اجڑ گیا۔ پھول نوچ لیے گئے۔ کونپلیں پاؤں تلے روند دی گئیں۔ پودے جڑوں سے اکھاڑ لیے گئے۔ اے باغباں تو کہاں رہ گیا؟"

نوجوان لڑکا اور لڑکی بھی خاموش تھے۔ وہ دونوں بہن بھائی تھے۔ لڑکی بڑی تھی اور لڑکا چھوٹا۔ ان کا پورا گھرانہ اس یلغار میں کٹ گیا تھا۔ اس حادثے کا المناک پہلو یہ تھا کہ لڑکی اور لڑکے کا باپ جو ایک فوجی افسر تھا کئی برس کی گمشدگی کے بعد صرف دو ہفتے پہلے گھر واپس آیا تھا۔ وہ منگولوں کی پہلی یلغار میں گم ہو گیا تھا۔ یاد رہے کہ یہ منگولوں کی دوسری یلغار تھی اس سے پہلے 1223ء میں بھی انہوں نے روس پر چڑھائی کی تھی لیکن زیادہ نقصان پہنچائے بغیر سرحدی علاقوں سے واپس چلے گئے تھے) ابھی وہ جی بھر کر اپنے بچھڑے باپ کی صورت بھی نہ دیکھ سکے تھے کہ اسے موت کے پردے نے ہمیشہ کے لیے چھپا لیا تھا۔ لڑکی کے آنسو تو رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ اس کا نام ٹیزری کولت اور اس کے بھائی کا نام رانئل تھا۔

سخت سرد موسم میں انہوں نے شب و روز اپنا سفر جاری رکھا۔ کھانے کا سامان کافی نہیں تھا لیکن راستے میں اباقہ اور اسد نے شکار کا سلسلہ جاری رکھا جس سے انہیں خوراک کی کمی نہیں آئی۔ رات کو وہ بسیرے کے لیے کوئی نہ کوئی غار یا کھوہ تلاش کر لیتے۔ دن چڑھتے ہی اپنے پاؤں پر "سوار" ہو کر آگے بڑھنے لگتے۔ علی کی معصومانہ حرکتوں اور باتوں نے ان کے دلوں کا بوجھ بہت حد تک ہلکا کر دیا تھا۔ وہ ہر پل کچھ نہ کچھ کرتا رہتا تھا۔ اس کی زبان اور ہاتھ پاؤں اسی وقت ساکت ہوتے تھے جب وہ سو جاتا تھا بلکہ کبھی کبھار سوتے میں بھی کوئی تماشا کر جاتا تھا۔ ایک روز نصف شب کو وہ اٹھا اور نیند کے عالم میں تاتاریوں سے لڑائی شروع کر دی۔ ہوا میں خیالی تلوار چلاتا ہوا وہ نتاشا پر جا پڑا اور دست بدست لڑائی شروع کر دی۔ نتاشا چیختی ہوئی بیدار ہو گئی۔ اباقہ نے جھپٹ کر علی کو قابو کیا۔ اس کے گالوں پر چپت لگائے تاکہ وہ ہوش میں آسکے۔ ہوش میں آکر اس نے حیرت سے ارد گرد دیکھا اور اطمینان سے بستر پر پڑ کر سو گیا۔ صبح جب اباقہ نے اسے بتایا کہ رات اس نے کیا گل کھلایا ہے تو سخت پریشان ہوا اور جا کر نتاشا سے معافی مانگنے لگا۔ نتاشا نے مصنوعی خفگی

سے اس کی طرف دیکھا پھر اپنا کان دکھایا جو لوکی طرف سے چر کر زخمی ہو گیا تھا۔ رات دست بدست "لڑائی" میں علی کی انگلی نتاشا کے بندے میں چلی گئی تھی جس کے سبب کان سے خون نکل آیا تھا۔

زخمی کان دیکھ کر علی کی سٹی گم ہو گئی۔ وہ چپ چاپ اباقہ کے پاس چلا آیا۔ اس روز سارا دن اس نے کوئی شرارت نہیں کی۔ اگلے روز بھی گم صم رہا۔ اباقہ کو شک گزرا شاید وہ بیمار ہے۔ اس نے پوچھا تو وہ کہنے لگا کہ اب وہ کوئی شرارت نہیں کرے گا۔ اس نے اپنی بے وقوفی سے شہزادی نتاشا کو تکلیف پہنچائی ہے۔ اباقہ نے یہ بات نتاشا کو بتائی تو وہ دلکشی سے مسکرا دی۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ علی کو اپنے پاس بٹھائے اس سے میٹھی میٹھی باتیں کر رہی تھی۔ شہزادی کی مہربانی پر علی کا چہرہ کھل اٹھا۔ وہ ایک بار پھر چہکنے لگا۔ نتاشا نے اسے گود میں بھر کر سینے سے لگایا اور اس کا منہ چوم لیا۔ ایسا کرتے ہوئے وہ کن انکھیوں سے اباقہ کو دیکھ رہی تھی۔ اباقہ نے بھی یہ منظر دیکھا اور جلدی سے منہ پھیر لیا۔ اسے یاد تھا کہ اسی نتاشا نے ایک روز علی کے قریب بیٹھنے سے انکار کر دیا تھا۔ مگر آج وہ اس کا منہ چوم رہی تھی شاید اس لیے کہ اباقہ علی سے پیار کرتا تھا اور وہ اباقہ کو پسند کرنے لگی تھی۔ اباقہ کے کان وہ الفاظ بھولے نہیں تھے جو منگول حملے سے قبل نتاشا نے گھوڑا گاڑی میں اس سے کہے تھے۔ "اباقہ! ہم تم سے محبت کرتے ہیں۔" شاید انہی الفاظ کی باز گشت تھی جو نتاشا کی پلکوں کو ہر وقت جھکائے رکھتی تھی۔ جونہی اباقہ سے اس کی نگاہ ملتی تھی ایک شفق اس کے لب و رخسار کو ہم رنگ کر دیتی تھی۔

اباقہ نے علی کو آواز دی۔ "علی ادھر آؤ۔" وہ نتاشا کی گود سے نکلا اور زمین پر لیٹے سردار یورق کو پھلانگتا ہوا اباقہ کے پاس چلا آیا۔ اباقہ نے پوچھا۔ "کیا باتیں ہو رہی تھیں۔"

وہ کہنے لگا۔ "بھائی جان! شہزادی پوچھ رہی تھیں کہ ولادی میر میں جب تو زن باغ نے سارے بچے بیچ دیے تھے تو تم اتنے روز بکنے سے کیسے بچ رہے؟"

علی بولا۔ "میں نے کہا ایک تو میرا سر پھٹا ہوا تھا دوسرے جب بھی کوئی مجھے دیکھنے کے لیے آتا تھا' میں اپنا منہ یوں بنا لیتا تھا۔" اس کے بعد علی نے اپنا منہ ٹیڑھا کر کے اس طرح اباقہ کو دکھایا کہ اسے ہنسی روکنا مشکل ہو گئی۔ علی نے کہا۔

"بھائی جان! میں آج سے شہزادی نتاشا کے پاس سویا کروں گا۔"

اباقہ نے پوچھا۔ "وہ کیوں؟"

علی بولا۔ "اس لیے کہ انہیں رات کو ڈر لگتا ہے۔ آپ میرا تیر کمان مجھے دے

دیں۔ میں رات جاگ کر دونوں لڑکیوں کا پہرہ دیا کروں گا۔"

"دونوں لڑکیاں کون؟" اسد نے آنکھیں نکال کر پوچھا۔

"یہی شہزادی نتاشا اور شیزی۔"

قریب سے یورق نے کہا۔ "کم بخت یہ لڑکیاں ہیں۔ تجھ سے تو تین گنا عمریں ہیں ا
کی۔"

علی نے اکڑ کر کہا۔ "کچھ بھی ہے۔ ہیں تو عورتیں' مرد پھر مرد ہوتا ہے۔"

یورق نے کہا "ٹھیک ہے "مرد" صاحب۔ تم لڑکیوں کا پہرہ دیا کرو' ہم سویا کریں گے۔"

.... اس رات جب انہوں نے ایک برباد شدہ فوجی چوکی کے کھنڈر میں بسیرا کیا علی واقعی پہریداری پر آمادہ ہو گیا۔ اس نے اپنا بچھونا نتاشا اور شیزی کے قریب بچھا لیا اور تیر کمان گود میں رکھ کر اکڑوں بیٹھ گیا۔ کہنے لگا آپ سب سو جائیں۔ میں آج ساری رات جاگوں گا۔ پلک تک نہیں جھپکوں گا اور پہرہ دوں گا۔"

نتاشا اور شیزی اس کی باتیں سن سن کر مسکرا رہی تھیں۔ شیزی کولٹ نے مزاحیہ انداز میں کہا۔ "علی بھائی جان! اگر آپ کو نیند آ گئی تو؟"

یورق نے قریب سے لقمہ دیا۔ "اتنی حسین عورتوں کے پاس لیٹے ہوئے "مرد" کو نیند آ ہی نہیں سکتی۔"

شیزی تو یورق کی فارسی نہیں سمجھی لیکن نتاشا کے عارض گل رنگ ہو گئے۔ اس نے جھینپ کر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ علی کچھ دیر تو طمطراق سے بیٹھا رہا مگر پھر ابھی وہ سب جاگ ہی رہے تھے کہ اسے نیند نے آ لیا۔ اس کی پشت دیوار سے جا لگی اور آنکھیں بند ہو گئیں۔ نتاشا نے اسے سیدھا کر کے لٹایا .... وہ صبح تک بلکہ دن چڑھے تک پاؤں پھیلائے سویا رہا۔ یہاں تک کہ اباقہ کو اسے جھنجوڑ کر جگانا پڑا۔

☆------☆------☆

ان کا سفر برف زار میں بھٹکے ہوئے آہو کا سفر تھا۔ ایسا آہو جس کے عقب میں خونخوار بھیڑیے ہوں۔ انہیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ کدھر جانا ہے۔ عقب میں منگول تھے اور سامنے برفانی وسعتیں۔ نتاشا کا قیاس تھا کہ رئیس اعظم سٹ کے شہر میں موجود ہیں۔ اس قیاس تھا کے سہارے وہ اندازے سے سٹ کی سمت رواں تھے' مگر پانچویں روز انہیں اندازہ ہوا کہ وہ راستے سے بھٹک گئے ہیں۔ یہ حقیقت نہایت حوصلہ شکن تھی کہ ایک نیم دائرے میں سفر کرتے ہوئے وہ پھر ولادی میر کی سمت جا رہے تھے۔ اس روز انہوں نے

دوپہر کے وقت ہی سفر کا سلسلہ منقطع کر دیا اور ایک کشادہ غار میں ڈیرے ڈال دیے۔ خوراک تقریباً ختم ہو چکی تھی اور برفانی طوفان کے آثار بھی تھے۔ رائیل اور علی کو نتاشا اور شیزی کولٹ کے پاس چھوڑ کر اباقہ اسد اور یورق شکار کی تلاش میں نکلے' ان کی واپسی شام سے ذرا پہلے ہوئی۔ دونوں شکار ڈھونڈنے میں ناکام رہے تھے۔ ان کے خالی ہاتھ دیکھ کر سب کے چہرے پر مایوسی دوڑ گئی۔ مگر ابھی ایک امید باقی تھی۔ اباقہ واپس نہیں آیا تھا۔ ممکن تھا اسے کہیں شکار مل جاتا۔ موسم اب بے حد خراب ہو چکا تھا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے برف باری بھی شروع ہو گئی۔ سب اباقہ کے بارے پریشان ہونے لگے۔ خاص طور پر نتاشا کی آنکھوں سے سخت بے قراری جھانک رہی تھی۔ اس کی نظریں بار بار غار کے دہانے پر رکھے پتھر کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔ زرفشاں چہرے کی دھوپ پر اضطراب کی چھاؤں نے عجیب رنگ بکھیر دیے تھے۔ اس کے سفید موتیوں جیسے دانت بے خیالی میں بار بار احمریں لبوں کو کاٹ رہے تھے۔ انجانے اندیشے سبھی کے ذہنوں میں اُگ آئے تھے۔ کہیں اس کی مڈبھیڑ تاتاریوں سے نہ ہو گئی ہو .... کہیں اسے بھیڑیوں نے نہ گھیر لیا ہو۔ اس برف زار میں گام گام پر ایسے اندھے کنویں بھی موجود تھے کہ جن کے دہانوں کو برف کی پتلی تہہ نے ڈھانپ رکھا تھا۔ قدم پڑتے ہی انسان غار قضا میں جا گرتا تھا۔

غار سے باہر طوفانی ہوائیں چنگھاڑنے لگی تھیں۔ آخر اسد بے قرار ہو کر اپنی جگہ سے اٹھا اور دہانے کی طرف چل دیا لیکن ابھی وہ دہانے سے دور ہی تھا کہ باہر سے انسانی آواز سنائی دی۔ طوفان کے شور میں لپٹی ہوئی یہ آواز ان کے لیے مژدہ جاں فزا تھی۔ اسد اور یورق نے آگے بڑھ کر دہانے پر رکھا ہوا وزنی پتھر ایک جانب کھسکا دیا۔ شام کے جھٹ پٹے میں اباقہ دہانے پر کھڑا تھا مگر وہ بھی خالی ہاتھ تھا۔ اس کے کندھے پر شکار کا بوجھ نہیں تھا۔ انہیں قدرے مایوسی ہوئی مگر اس مایوسی کی حیثیت اس طمانیت کے ساتھ کچھ نہ تھی جو انہیں اباقہ کو صحیح سلامت دیکھ کر حاصل ہوئی تھی۔

"اندر آ جاؤ اباقہ!" یورق نے کہا۔

مگر اباقہ اپنی جگہ کھڑا رہا۔ تب یورق نے ہاتھ کی مشعل ذرا بلند کی اور نتاشا و شیزی کے حلق سے ایک ساتھ چیخ نکل گئی۔ ان کے وہم گمان میں بھی نہ تھا کہ اندر آنے والا شخص اباقہ کی بجائے ایک خونخوار منگول ہو گا۔ مشعل کی روشنی میں اس کی آنکھیں زہریلے ناگ کی طرح چمک رہی تھیں۔ پھر اس سے پہلے کہ یورق یا اسد میں سے کوئی اس پر جھپٹتا وہ واپس مڑا اور چلاتا ہوا باہر نکل گیا۔ اسد نے پوری رفتار سے اس کا تعاقب کیا۔ منگول نے بھاگتے بھاگتے اپنی کمان پر تیر چڑھایا اور ہوا میں چھوڑ دیا۔ یہ چھدرے ہوئے منہ

کا مخصوص تیر تھا۔ ایسے تیروں سے سیٹی کی تیز آواز برآمد ہو کر منگولوں کو خطرے سے آگاہ کرتی تھی۔ اسد نے بھاگتے بھاگتے اپنا نیزہ منگول کی پشت میں گھونپ دیا۔ وہ ایک بھیانک چیخ کے ساتھ اوندھے منہ برف پر گرا اور جان کنی میں تڑپنے لگا۔ تاہم مرتے مرتے وہ اپنا کام کر گیا تھا۔ اسد نے دیکھا کہ نشیب میں کم از کم چالیس گھڑسوار برف کی چادر پر سیاہ عفریتوں کی طرح غار کی طرف بڑھتے چلے آ رہے تھے۔ اسد نے اندازہ لگایا کہ یہ شکاری ہیں جو منگول لشکر سے علیحدہ ہو کر تفریح طبع کے لیے نکلے ہوئے ہیں۔ وہ مڑا اور پوری قوت سے بھاگتا ہوا غار میں پہنچا۔ اندر داخل ہوتے ہی اس نے یورق اور رانیل کے ساتھ مل کر پتھر غار کے دہانے پر برابر کرنے کی کوشش کی۔ اب یہ بتانے کی ضرورت نہیں تھی کہ منگول حملہ آور ہو رہے ہیں۔ ان کی وحشت ناک چیخیں غار میں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ وہ ہر لحہ قریب آ رہے تھے ابھی انہوں نے پتھر ٹھیک طرح برابر نہیں کیا تھا کہ منگول سواروں نے ہلہ بول دیا۔ غار میں داخل ہونے کے لیے وہ پتھر کو اندر کی طرف دھکیلنے لگے۔ اسد' یورق اور رانیل اندر سے زور لگا رہے تھے۔ پتھر کا اپنا وزن بھی ان کے پلڑے میں تھا۔ مگر کثرت تعداد نے پلڑا منگولوں کی طرف جھکا دیا۔ ایک گڑگڑاہٹ کے ساتھ وزنی پتھر غار میں لڑھک آیا۔ اس کے ساتھ ہی نتاشا اور ثیزری کی چیخیں غار میں گونجیں۔ اسد نے اللہ اکبر کا نعرہ مستانہ بلند کیا اور ہر خطرے سے بے نیاز ہو کر دشمن پر ٹوٹ پڑا۔ یورق اور رانیل نے اس کا بھرپور ساتھ دیا۔ منگول جو انہیں روند کر اندر آجانا چاہتے تھے' دہانے سے آگے نہ بڑھ سکے۔ اس وقت اسد نے دیکھا کہ شہزادی نتاشا بھی تلوار سونت کر دشمن کے مقابلے میں آگئی ہے۔ ان لمحوں میں وہ واقعی کسی ملک کی پرجلال ملکہ دکھائی دے رہی تھی۔ ایک منگول نے اس کا تند وار ڈھال پر روک کر اس کی تلوار والی کلائی تھام لی۔ مگر اس لمحے عقب سے علی برآمد ہوا اور نہایت بے خوفی سے اس نے ایک تیر منگول کی پشت میں داخل کر دیا۔ ایک گز کے فاصلے سے چلایا ہوا تیر منگول کو راہی عدم کر گیا۔ مگر اس دوران اور منگول تلواریں سونت کر اندر گھس آئے اور لڑائی کا پانسا ان کے حق میں پلٹ گیا۔ ایک منگول نے علی پر تلوار کا وار کیا اور وہ اپنی کمان سمیت اچھل کر آگ کے قریب گرا۔ ایک دوسرے منگول نے نہایت درندگی سے ثیزری کے بھائی رانیل کا سر تن سے جدا کر دیا۔ چار صحت مند منگولوں نے بوڑھے سردار یورق کو گھیر لیا .... یہی وہ وقت تھا جب اباقہ ایک پہاڑی بکرا کندھے پر لادے غار کی طرف واپس آ رہا تھا۔ اس نے نشیب سے دیکھا کہ گھڑسوار تاتاریوں نے دہانے کو گھیر رکھا ہے اور پر آشوب برفانی ہوا پر تلواروں کی جھنکار تیر رہی ہے۔ اس نے شکار برف پر پھینکا اور تلوار نکال کر غار

کی طرف لپکا۔ چند گز آگے اسے ایک خالی گھوڑا نظر آیا۔ گھوڑا اسی سوار کا تھا جسے اسد نے نیزہ مار کر ہلاک کیا تھا۔ اباقہ زقند لگا کر گھوڑے پر بیٹھا اور تند بگولے کی طرح ڈھلوان پر چڑھتا چلا گیا۔ بلندی پر پہنچ کر اسے احساس ہوا کہ غنیم تعداد میں کافی زیادہ ہے اور اس نے اسد' یورق وغیرہ کو گھیرا ہوا ہے۔ تب اس کی نگاہ ایک فربہ اندام منگول پر پڑی اور وہ پہچان گیا۔ یہ بودی تھا' چغتائی خاں کا سگا اور مارینا کا سوتیلا بیٹا۔ نہایت سفاک اور خونخوار کسی عام آدمی کے لیے اس کی دید ہی موت تھی' مگر اباقہ کے لیے اس کی دہشت خباثت اور طاقت کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ اس نے چلا کر بودی کو آواز دی۔ یہ آواز زور پکڑتے طوفان کی ہم نوا ہو کر برف پوش ٹیلوں میں گونجتی چلی گئی۔

"بودی! میں یہاں ہوں۔ پہچان مجھے۔ میں اباقہ ہوں۔ تیرے باپ کی عزت کا قاتل۔"

"تیرے باپ کی عزت کا قاتل۔" یہ الفاظ بازگشت بن کر ٹیلوں میں گونجے۔ تناور بودی نے گھوم کر اباقہ کی طرف دیکھا۔ اس کی تلوار خودبخود نیام سے باہر آگئی۔ یقینی بات تھی کہ وہ اباقہ کی آواز پہچان گیا ہے۔ اباقہ نے نے مزید یقین دہانی کے لیے اپنی ٹوپی سر سے اتار کر ہاتھ میں لے لی۔ اس کے دراز گیسو برفانی ہوا میں لہرائے اور نیم تاریکی میں اس کا ہیولا صاف پہچانا جانے لگا۔ بودی کی مضطرب آواز طوفان کا شور چیرتی چلی گئی۔

"پکڑو اس بدبخت کو۔ خبردار' جانے نہ پائے۔"

اباقہ نے گھوڑا موڑا اور ٹیلے سے اتر کر مخالف سمت میں بھاگا۔ منگولوں نے مخصوص جنگی نعرے کے ساتھ اس کا تعاقب کیا۔ اباقہ نے گھوم کر دیکھا غار کا دہانہ اب خالی تھا وہ حملہ آوروں کی نصف سے زائد تعداد کو اپنے پیچھے لگانے میں کامیاب رہا تھا۔ قدرے مطمئن ہو کر اس نے گھوڑے کی رفتار تیز کر دی' اور برفانی بھول بھلیوں میں داخل ہو گیا۔ برف پوش زمین پر گھوڑوں کی ٹاپیں کسی شادیانے کی دھمادھم پیدا کر رہی تھیں .... یہ موت کا شادیانہ تھا ایک ٹھٹھری ہوئی یخ بستہ موت کا تعاقب ایک ٹھٹھری ہوئی یخ بستہ موت کر رہی تھی۔ اباقہ کے پیچھے بیس گھڑسوار سیل بلاخیز کی طرح لپکے چلے آ رہے تھے۔ انہیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ صحراؤں اور برف زاروں کا ہمراز ان کے ساتھ کیا کرنے والا ہے۔

وہ انہیں پہلے سیدھا بھگاتا چلا گیا۔ پھر ایک موڑ پر اس نے دفعتاً گھوڑا روک لیا۔ منگول شکاری کتوں کی طرح اس کے پیچھے آ رہے تھے۔ پھر ٹاپوں کی دھمادھم یکایک تبدیل ہو گئی۔ آہنگ کی یہ تبدیلی ایک زبردست حادثے کی خبر دے رہی تھی۔ گھوڑوں کے سموں

کے نیچے اب ٹھوس برف نہیں عمیق اور جان لیوا خلا تھا۔ مگر گھڑ سوار جوش تعاقب میں اس تبدیلی کو خاطر میں نہیں لائے۔ یکایک ایک گونج کے ساتھ پانچ گھڑ سوار نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ ان کی آخری چیخیں اور ان کے گھوڑوں کی ہنہناہٹ طوفان کے شور میں اسی طرح دب گئی جس طرح وہ خود برف کی گہرائیوں میں دفن ہوئے۔ باقی گھڑ سواروں نے فوراً گھوڑے روکے اور غضبناک ہو کر اباقہ پر ٹوٹ پڑے۔ اباقہ جو قدرے بلندی پر تھا کوہی ندی کی طرح پھنکار کر ان پر جھپٹا اور پہلے ہلے میں دو منگولوں کو برف پر لمبا لٹا گیا۔ ان کے گھوڑے اچھلتے ہوئے بھاگے اور بدقسمتی سے وہ بھی اسی برفانی غار میں جاگرے۔ چغتائی کے بیٹے بودی نے ایک ساتھی کے ساتھ عقب سے اباقہ پر حملہ کیا۔ یہ ایک شدید حملہ تھا۔ اگر اباقہ عقب سے ہوشیار نہ ہوتا تو بودی کا وزنی کلہاڑا اس کا سر توڑ چکا تھا مگر اباقہ نے نہ صرف اپنا سر بچایا بلکہ ڈھال سے بودی کے گھوڑے کی کنپٹی پر ایسی خوفناک ضرب لگائی کہ وہ اپنی زباں میں الاماں پکارتا اسی برف کی طرف بھاگا جس کے نیچے عمیق گڑھا پانچ انسانوں اور سات گھوڑوں کو نگل چکا تھا۔ بودی نے جب یہ دیکھا کہ گھوڑا اسی گڑھے کی طرف لپکا جارہا ہے اور روکنے کے باوجود نہیں رکتا تو اس نے نہایت بدحواسی میں نیچے چھلانگ لگا دی۔ یہ گھوڑا بھی اپنے انجام کو پہنچا۔ اس دوران اباقہ نے نہایت برق روی سے حملہ کرکے دو منگولوں کو جہنم واصل کر دیا تھا۔ پھر کمال شجاعت اور بے خوفی سے اس نے منگول شہ سواروں کا گھیرا توڑا اور بلا کی تندی سے ایک جانب بھاگ کھڑا ہوا۔ بودی نے ساتھیوں کو للکار کر اس کے تعاقب کا حکم دیا۔ یخ بستہ اندھیرے میں مہلک برف پر ایک بار پھر موت نے موت کا تعاقب شروع کر دیا۔ اباقہ اوندھا ہو کر اپنے گھوڑے کی گردن سے چپکا ہوا تھا۔ گاہے گاہے سنسناتے تیر اس کے دائیں بائیں سے گزر رہے تھے۔ پھر جونہی اس نے ایک موڑ پر اپنا رخ تبدیل کیا۔ گھوڑا کربناک انداز میں ہنہنایا اور اچھل کر رہ گیا۔ ایک تیر اس کی گردن میں پیوست ہو چکا تھا۔ مگر وفادار جانور نے ایک نازک موقعے پر اپنے سوار کو مشکل میں نہیں ڈالا۔ گھائل ہونے کے باوجود اباقہ کے اشارے پر وہ بھاگتا چلا گیا......... اب وہ دو پہاڑیوں کے درمیان سے گزر رہے تھے۔ برفانی طوفان شدت اختیار کر چکا تھا۔ اچانک اباقہ کی نگاہ دائیں جانب بلندی کی طرف اٹھ گئی' ایک دیوہیکل برفانی تودہ گونج دار آواز میں پھسلتا ہوا نیچے آرہا تھا' ان ڈھلوانوں پر ایسے تودے ہمہ وقت پھسلتے رہتے تھے لیکن یہ ایک بہت بڑا تودہ تھا۔ اباقہ کا جسم سنسنا گیا۔ وہ جس درے سے گزر رہا تھا۔ تودے کو وہیں آکر گرنا تھا۔ ایک ساعت کے اندر اندر اباقہ کو فیصلہ کرنا تھا کہ وہ رکے یا نکل جائے۔ پھر اس کی سیماب طبعی نے اسے آگے بڑھنے پر اکسایا۔

وہ بغیر رکے دندناتا ہوا درے میں لپکتا چلا گیا۔ ڈھلوان پر پھسلتا ہوا تودہ مہیب گڑگڑاہٹ سے نشیب کی طرف بڑھ رہا تھا۔ گھوڑا بھی جیسے ان ساعتوں کی قدر و قیمت جان چکا تھا۔ وہ جسم و جان کی پوری طاقت سے اڑا چلا جارہا تھا۔ بالآخر وہ درے سے صاف نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ پُرہول گڑگڑاہٹ سے ڈھیروں برف نے درے میں گر کر اسے مسدود کر دیا۔ اباقہ جانتا تھا بودی اور اس کے ساتھی تودہ گرتے دیکھ کر پیچھے ہی رک گئے تھے ....مگر جب اس نے مڑ کر دیکھا تو ایک گھڑ سوار چند قدم کے فاصلے پر نظر آیا اس کا گھوڑا بھی اباقہ کے گھوڑے کی مانند بری طرح ہانپ رہا تھا۔ یہ ایک دراز قد منگول تھا جو جوش تعاقب میں اباقہ کے ساتھ ہی اس طرف نکل آیا تھا۔ اب وہ اپنے عقب میں دیکھ دیکھ کر بدحواس ہو رہا تھا۔ اس کے عقب میں سوائے برف کے اور کچھ نہیں تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ اب اسے تنہا جنگجو شخص کا مقابلہ کرنا ہو گا۔

اباقہ نے گھوڑا گھمایا اور تلوار سونت کر اس کے مقابل آگیا۔ اس طوفانی شام کے جھٹ پٹے میں وہ گہری نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ اچانک منگول نے شکستہ آواز میں کہا۔ "اباقہ! میں نے تمہارے بارے بہت کچھ سنا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ تم جیسے شجاع سے معرکہ آرائی کروں۔ بلکہ میں اس قابل ہی نہیں کہ تم سے لڑ سکوں۔"

اباقہ سمجھ گیا کہ مدمقابل اس سے جان بخشی کی درخواست کر رہا ہے مگر وہ کسی صورت اسے معاف کرنے کو تیار نہیں تھا۔ اس نے نہایت سفاکی سے کہا "تلوار سنبھال منگول زادے تیری جان صرف اسی صورت میں بچ سکتی ہے کہ تو مجھے مار ڈالے۔"

منگول کو جان کے خوف نے گھگیانے پر مجبور کر دیا۔ وہ بولا۔ "اباقہ مجھے مار کر تجھے کچھ حاصل نہ ہو گا۔ اگر تو چاہتا ہے تو میں یہ گھوڑا خود تجھے دے دیتا ہوں۔"

اباقہ غرآیا۔ "ذلیل انسان! تیری کوئی پیشکش میرا ارادہ نہیں بدل سکتی۔ میں زمین سے ایک مردود کا بوجھ ضرور کم کروں گا۔"

وہ تیر کی طرح منگول کی طرف لپکا اور حملہ آور ہو گیا۔ منگول نے آخری کوشش کے طور پر دیوانہ وار تلوار چلائی لیکن وہی ہوا جو وہ پہلے سے جانتا تھا۔ دفعتاً اباقہ کی شمشیر بے اماں برق کی مانند اس کے بائیں پہلو پر گری اور اسے پیٹ تک کاٹ گئی۔ وہ ایک دلدوز چیخ کے ساتھ برف پر گرا اور ٹھنڈا ہو گیا۔

اباقہ نے منگول کی طرف سے فارغ ہو کر اپنے گھوڑے کا جائزہ لیا۔ وہ شدید زخمی تھا۔ اباقہ کو اس کی مدد کا صرف ایک ہی راستہ سجھائی دیا۔ اس نے بڑے پیار سے اس کی گردن تھپتھپائی پھر دل کڑا کر کے وزنی تلوار کا ایک بھرپور وار اس کی گردن پر کیا اور

سر کاٹ کر رکھ دیا۔ بے زبان جانور برف زار میں سسک سسک کر مرنے کی اذیت سے بچ گیا تھا۔

دستہ بند ہو چکا تھا اور متعاقب دستے کی طرف سے اب کوئی اندیشہ نہیں تھا۔ اباقہ نے اطمینان سے دونوں گھوڑوں کی خرجینیں (چرمی تھیلے) دیکھیں۔ ایک خرجین سے چند تیروں اور ایک بوسیدہ کمبل کے سوا کچھ نہ ملا لیکن دوسری خرجین میں خشک گوشت کا ایک ٹکڑا ایک رکابی اور مشعل موجود تھی۔ یہ گوشت کمبل اور مشعل اس بلا خیز سردی میں بڑے کام کی اشیاء تھیں۔ اباقہ نے یہ چیزیں مقتول منگول کے گھوڑے پر رکھ لیں اور آگے روانہ ہو گیا۔

ضروری تھا کہ وہ جلد سے جلد کسی سائے میں پہنچے ورنہ یہ بے مہر سردی اس کا خون رگوں میں منجمد کر سکتی تھی۔ اس کا اندازہ تھا کہ وہ ساتھیوں سے کئی کوس آگے نکل آیا ہے۔ اس موسم اور تیرگی میں ان کا کھوج لگانا کار دارد تھا۔ بہتر یہی تھا کہ وہ کہیں ٹھہر کر سویرے کا انتظار کرے۔ پُر ہول ویرانے میں گھوڑے کو آہستہ آہستہ ہانکتا وہ مغرب کی طرف بڑھنے لگا۔ برف باری اب اتنی شدید ہو گئی تھی کہ اسے بار بار اپنے کندھے جھاڑنے پڑ رہے تھے۔ بھوک کسی نوکیلے خنجر کی طرح اس کے پیٹ میں اتری ہوئی تھی۔ اس نے خرجین میں ہاتھ ڈالا تاکہ گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے ایک دو نوالے کھا سکے' لیکن پھر اچانک اسے اندازہ ہوا کہ کچھ بلندی پر ایک چٹانی سائبان موجود ہے۔ اس موسم میں یہ سائبان نعمت غیر مترقبہ تھا۔ اباقہ نے خرجین بند کر دی اور گھوڑے کو بلندی کی طرف موڑ دیا۔ وہ نظروں نظروں میں سائبان کی موزونیت کا جائزہ لے رہا تھا۔ یکایک ایک آواز سن کر چونک گیا۔ اگر اس کی سماعت نے اسے بدترین دھوکا نہیں دیا تھا تو یہ انسانی آواز تھی۔ اس ہولناک اور جان لیوا ویرانے میں کسی انسان کی موجودگی نہایت سنسنی خیز تھی۔ اباقہ ٹھٹک کر رک گیا۔ اس کے کان آواز کی سمت متعین کر رہے تھے کہ دوبارہ وہی آواز سنائی دی۔ کوئی پُر درد لہجے میں کراہا تھا۔ اباقہ گھوڑے کو موڑ کر آواز کی سمت آیا۔ تاریکی میں برف کی سفید چادر پر اسے ایک سیاہ دھبہ دکھائی دیا۔ وہ جست لگا کر گھوڑے سے اترا۔ ایک انسان بے حس و حرکت پڑا دھیرے دھیرے برف کی قبر میں دفن ہو رہا تھا۔ اس میں اتنی سکت نہیں تھی کہ وہ اٹھ کر چند گز دور اس سائبان تک ہی پہنچ جائے۔ شاید وہ اسی سائبان تک پہنچنے کے لیے اس طرف آیا تھا مگر نصف بلندی پر پہنچ کر اس کی ہمت جواب دے گئی تھی۔ اباقہ نے خرجین سے مشعل نکال کر جلائی اور اس کی روشنی میں نیم مردہ شخص کا چہرہ دیکھا۔ یکایک اس کی آنکھیں حیرت سے کھل گئیں۔ وہ تصور بھی نہ کر سکتا تھا

کہ اس برفستان میں اس شخص سے ملاقات ہو سکتی ہے .... اس کے سامنے طوطم خاں تھا۔ طوطم خاں جو نہ صرف منگول ہونے کی حیثیت سے اس کا دشمن تھا بلکہ رقیب ہونے کی بنا پر بھی واجب القتل تھا۔ اباقہ عالم استعجاب میں اُسے دیکھتا رہ گیا۔ طوطم اپنے گرد و پیش سے مکمل طور پر بے خبر تھا۔ ہاں کبھی کبھی غنودگی یا بے ہوشی کے عالم میں اس کے ہونٹوں سے ایک دردناک کراہ نکل جاتی تھی۔

اباقہ چند لمحے سوچتا رہا' پھر اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ اس کا دشمن جاں اور رقیب روسیاہ بے بسی کے عالم میں موت سے دوچار تھا۔ اسے مارنے کے لیے اباقہ کو کسی تردد کی ضرورت نہیں تھی۔ ہاتھ تک ہلانے کی حاجت نہیں تھی۔ وہ صرف اپنے راستے پر آگے بڑھ جاتا' یہی عمل طوطم کی موت تھا .... مگر کیا وہ ایسا کر سکتا ہے؟ یہ سوال ایک گونج بن کر اس کے پورے جسم میں پھیل گیا۔ وہ کچھ دیر بے حرکت کھڑا سوچتا رہا۔ اس کے ذہن میں وہ منظر گھوم گیا۔ جب عراق چھوڑنے سے پیشتر ایک رات مارینا اور اباقہ چاندنی رات میں راز و نیاز کر رہے تھے اور طوطم وہاں پہنچ گیا تھا۔ اس نے تلوار مارینا کے سامنے پھینک کر کہا تھا' مارینا مجھے قتل کر دو ورنہ میں تم دونوں کو چین سے نہیں رہنے دوں گا۔ مارینا نے اس وقت نگاہیں جھکا لی تھیں۔ اباقہ جانتا تھا مارینا نے ایسا کیوں کیا۔ ایک طرح اس نے طوطم کی شیطانیت میں ایک کرن کی طرح چمکنے والی انسانیت کا اعتراف کیا تھا اور یہ حقیقت تھی کہ طوطم نے اپنے تمام تر ظلم و ستم کے باوجود مارینا سے شرافت کا سلوک کیا تھا۔ لاتعداد شب و روز ایسے گزرے تھے جن میں مارینا مکمل طور پر اس کے بس میں تھی۔ اگر وہ چاہتا تو اپنی حیوانیت کی تسکین کر سکتا تھا۔ مگر اس نے مارینا کو اس کی رضامندی سے حاصل کرنے کی کوشش کی تھی اور اس کی یہی ایک خوبی اس کی تمام برائیوں کو پس منظر میں دھکیل دیتی تھی۔

.... اباقہ جھکا اور اس نے اپنے جان بلب دشمن کو کندھے پر ڈال لیا۔ ایسا کرتے ہوئے طوطم کے جسم کو جھٹکا لگا اور وہ بری طرح کراہنے لگا۔ تب اباقہ کو اندازہ ہوا کہ وہ شدید زخمی ہے۔ اس کے پاؤں میں بیڑیاں بھی جھنجھنا رہی تھیں۔ اباقہ نے اسے کندھے پر ڈال کر دوسرے ہاتھ سے گھوڑے کی لگام تھامی اور برفانی ہوا کے تھپیڑے سہتا سائبان کی طرف بڑھنے لگا۔

☆------☆------☆

رات کا پچھلا پہر تھا۔ ایک تواتر سے گرتی ہوئی برف سنسان تاریکی کا حصہ بنی ہوئی تھی۔ یہ برف نظر نہیں آتی تھی لیکن اس کی سرسراہٹ محسوس کی جا سکتی تھی۔ جیسے کوئی

نازنین ریشمی اندھیرے میں بستر پر کروٹ بدلے یا جیسے تاریک آسمان پر کوئی پرندہ اپنے پروں کو جنبش دیتا گزر جائے.......... یہ سائبان جہاں اباقہ نے پناہ لے رکھی تھی کسی غار کی طرح محفوظ و کشادہ تھا۔ ایک پتھر کی آڑ میں اباقہ نے مشعل فروزاں کر دی تھی' پھر طوطم کو مقتول منگول کا کمبل اچھی طرح لپیٹ دیا تھا۔ رات کے تیسرے پہر طوطم نے آنکھیں کھولیں تو اباقہ نے گوشت کے چھوٹے ٹکڑے کر کے اسے کھلائے۔ اپنے قریب جلتی مشعل کو دیکھ کر وہ حیران ہوا' پھر اس کی نظر اباقہ پر پڑی اور وہ ششدر رہ گیا۔ اباقہ کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں ہراس کا نظر آنا حسب حال تھا.......... لیکن اب جب کہ رات کا آخری پہر شروع ہو چکا تھا' طوطم کا خوف کافی حد تک دور ہو گیا تھا۔ اباقہ نے اسے تفصیل سے بتایا کہ کس طرح وہ اسے برف میں پڑا ملا۔ جواباً طوطم خاں نے نحیف آواز میں اپنی کہانی سناتے ہوئے کہا۔

"میں منگول لشکر کے سالار اعظم باتو خاں کو قتل کرنے پہنچا تھا لیکن گرفتار ہوا۔ جب منگول دارالحکومت پر حملہ آور ہوئے تو میں ایک قیدی کی حیثیت سے عقبی خیموں میں تھا۔ لڑائی کے دوران اتفاقاً ایک آتشیں گولا اس چھکڑے پر گرا جس کے خیمے میں' میں موجود تھا۔ چھکڑا بان سمیت تین محافظ ہلاک ہو گئے۔ میرا ایک بازو بھی آتشیں دھماکے سے اڑ گیا۔ افراتفری کا فائدہ اٹھا کر میں نے منگول لشکر سے بھاگنے کی کوشش کی اور کامیاب رہا۔ بیڑیوں سمیت میں ایک گھوڑے کی پشت پر اوندھا لیٹ گیا اور لشکر سے باہر نکل آیا مگر اس سے پہلے کہ میں محفوظ فاصلے پر پہنچتا کچھ سپاہیوں نے مجھے دیکھ لیا اور رزم گاہ چھوڑ کر میرے پیچھے لگ گئے۔ میرا مشکی گھوڑا مجھے بلا کی رفتار سے اڑا کر شہر سے دور لے آیا۔ منگول سپاہیوں سے بچنے کے لیے میں پورے آٹھ پہر گھوڑے کو برف میں بھگاتا رہا۔ بالآخر وہ بے دم ہو کر گرا اور دوبارہ اٹھ نہ سکا۔ میرے پاؤں میں بیڑیاں تھیں اور بازو شدید زخمی تھا لیکن میں باتو خاں کے سپاہیوں کے ہاتھوں ذلت ناک موت مرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں خود کو گھسیٹتا ہوا آگے بڑھتا رہا.........." طوطم خاں نے رک کر گہری سانس لی اور بولا۔ "......... اب میں دو روز سے بھوکا پیاسا اس ویرانے میں بھٹک رہا ہوں۔ منگول سپاہی موت کی طرح میرا پیچھا کر رہے ہیں۔ ان کی تعداد بیس کے قریب ہے اور وہ دو ٹولیوں میں بٹے ہوئے اس پہاڑ کے دامن میں موجود ہیں۔ کل شام' طوفان شروع ہونے سے پہلے وہ میرے بہت قریب پہنچ گئے تھے مگر پھر شدید برف باری نے مجھے ان کی نظروں سے بچا لیا۔ میں بھوک سے نیم جان تھا۔ برف باری سے بچنے کے لیے اس سائبان تک پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا کہ چکرا کر گر گیا۔

طوطم خاں کی پوری کہانی سننے کے بعد اباقہ نے احتیاط سے اس کے زخموں کا معائنہ کیا۔ اس کا بازو کہنی کے اوپر سے غائب تھا۔ طوطم خاں نے زخم پر مٹی تھوپ رکھی تھی۔ سخت سردی کے سبب خون خود بخود رک گیا تھا۔ طوطم کی دونوں ٹانگیں بھی شدید زخمی تھیں۔ یہ زخم آہنی بیڑیوں کے تھے۔ تیز چلنے کی وجہ سے لوہے نے پنڈلیوں سے رگڑ کھا کھا کر گہرے گھاؤ ڈال دیے تھے۔ ان گہرے زخموں کے باوجود طوطم خاں چلتا رہا تھا۔

وہ رات انہوں نے جیسے تیسے کاٹی۔ علی الصبح برف باری تھمنے سے پہلے اباقہ نے طوطم خان کو اپنے ساتھ لیا اور مشرق کی طرف روانہ ہو گیا۔ امکان تھا کہ تعاقب کرنے والے منگول برف باری رکنے کے منتظر ہوں گے۔ اباقہ نے اپنا گھوڑا بھی وہیں چھوڑ دیا تھا۔ درحقیقت اس نے سفر کے لیے جو پُر خطر راستہ منتخب کیا تھا وہاں گھوڑا اسے کام نہ دے سکتا تھا۔ یوں بھی گھوڑا اب بھوک سے نڈھال ہو چکا تھا اور کسی وقت ساتھ چھوڑ سکتا تھا۔ اباقہ نے بھاری بھر کم طوطم کو کندھے پر ڈال رکھا تھا۔ دوسرے کندھے سے دونوں خرجینیں لٹک رہی تھیں۔ وہ نہایت احتیاط سے خطرناک ڈھلوانوں پر آگے بڑھنے لگا۔

سہ پہر کے وقت انہوں نے ایک جگہ قیام کیا۔ برف باری اب رک چکی تھی مگر نوکیلی ہوا جسموں سے آرپار ہو رہی تھی۔ طوطم خاں نے اباقہ سے کہا۔ "اباقہ! مجھ جیسے بدترین دشمن کے لیے اپنی زندگی خطرے میں نہ ڈال منگول سپاہی میرا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ تو کب تک مجھے کندھے پر ڈالے اس طرح سفر کرتا رہے گا۔"

اباقہ نے اطمینان سے کہا۔ "جب تک ہم کسی بستی میں نہیں پہنچ جاتے۔"

طوطم عجیب نظروں سے اباقہ کو دیکھنے لگا جیسے سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو کہ اس کا واسطہ کس قسم کے انسان سے پڑا ہے۔ تھوڑے آرام کے بعد انہوں نے پھر سفر شروع کر دیا۔ اس امر کے واضح آثار تھے کہ منگول بدستور ان کے تعاقب میں ہیں۔ ایک ٹیلے سے اباقہ کو دو تین کوس پیچھے سیاہ دھبے نظر آئے تھے جو یقیناً متعاقب سواروں کے تھے۔ جب رات گہری ہو گئی تو اباقہ نے بلندی پر واقع ایک تنگ کھوہ میں بسیرا کر لیا۔ اس رات پھر شدید برف باری شروع ہو گئی۔ طوطم کے زخم اب مزید تکلیف دہ ہو گئے تھے۔ وہ پتھریلی زمین پر نیم دراز تھا۔ اباقہ نے اس کے سر کے نیچے اپنی پوستین ایک گدے کی صورت رکھی دی تھی۔ مشعل کی روشنی میں طوطم کی نظریں مسلسل کھوہ کی چھت کو گھور رہی تھیں۔ وہ خوابیدہ لہجے میں بولا۔

"اباقہ! میری موت اب یقینی ہے اور مجھے اب زندگی کی حسرت بھی نہیں۔ تم دیکھ

رہے ہو میرا بازو اڑ چکا ہے اور گندھک نے چہرے کا ایک حصہ بھی جلا ڈالا ہے میں ایسی شکل کے ساتھ زندہ بچا بھی تو کیا فائدہ۔ میں اب کبھی مارینا کا سامنا نہ کر سکوں گا۔ مجھے اب کامل یقین ہو گیا ہے کہ مارینا کو تم سے کوئی جدا نہیں کر سکتا۔ نیلے آسمان کی لازوال طاقت نے تمہیں ایک کرنے کا فیصلہ کر رکھا ہے۔"

اباقہ نے کہا۔ "طوطم' حوصلے سے کام لے۔ تو زندہ رہے گا۔"

طوطم کے لبوں پر ایک پھیکی مسکراہٹ ابھری۔ "اباقہ' تو بہت بہادر ہے۔ ناممکن کو ممکن کر لیتا ہے' لیکن کسی کی موت نہیں ٹال سکتا۔"

اباقہ جانتا تھا طوطم ٹھیک کہہ رہا ہے۔ وہ اب ایک آدھ دن کا مہمان تھا۔ اس نے بات ٹالتے ہوئے کہا۔ "طوطم' کچھ کھائے گا۔"

طوطم نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اباقہ جی چاہتا ہے بہت سا گوشت ہو۔ بھنا ہوا اور گرم گرم۔ اس میں سے بھینی بھینی خوشبو اٹھ رہی ہو۔ میں کھاتا جاؤں اور کھاتا جاؤں۔ یہاں تک کہ سیر ہو جاؤں اور جب میں سیر ہو جاؤں تو مر جاؤں۔"

اباقہ زیر لب مسکرایا پھر اٹھ کر کھوہ کے دوسرے حصے میں چلا گیا۔ کوئی دو گھڑی بعد وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک رکابی تھی جس میں بھیڑ کے گرم گرم گوشت کے پارچے رکھے تھے۔ اباقہ نے یہ رکابی طوطم کے سامنے رکھ دی۔ گوشت کی خوشبو نے طوطم کو آنکھیں کھولنے پر مجبور کر دیا۔ رکابی دیکھ کر وہ ششدر رہ گیا۔ وہ کچھ دیر تک حیرت سے اباقہ کو تکتا رہا پھر اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اس نے منہ پھیر لیا اور کہا "نہیں اباقہ! میں یہ گوشت نہیں کھاؤں گا۔ اگر میں نے یہ کھا لیا تو تو اس برف زار میں بھوک کے ہاتھوں ایڑیاں رگڑ کر مر جائے گا۔"

اباقہ نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور بولا۔ "طوطم تیری معلومات ادھوری ہیں۔ شاید تجھے معلوم نہیں کہ دوسری خرجین میں بھی کچھ گوشت موجود ہے۔ یہ میرے راستے کے لیے کافی ہو گا۔"

اباقہ نے دوسری خرجین کی طرف اشارہ کیا جو مشعل کے پاس پڑی تھی۔ اس کا ابھار بتا رہا تھا کہ اس میں واقعی گوشت موجود ہے۔ یہ اور بات تھی کہ اباقہ نے طوطم کو مطمئن کرنے کے لیے اس میں ایک پتھر رکھ چھوڑا تھا۔ بہرحال وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہا اور طوطم مطمئن ہو کر وہ گوشت کھانے لگا جو اباقہ نے مشعل پر گرم کیا تھا اور چھوٹے چھوٹے پارچوں میں تقسیم کر دیا تھا کہ طوطم خان کو نگلنے میں آسانی رہے۔ طوطم نے تمام گوشت رغبت سے کھایا اور مطمئن سا ہو کر دوبارہ لیٹ گیا لیکن جلد ہی اسے متلی ہونے

لگی اور اس نے سب .... کھایا ہوا الٹ دیا۔ تاہم اس عمل سے اسے کچھ زیادہ کوفت نہیں ہوئی۔ وہ اپنی زندگی کی آخری لذت حاصل کر چکا تھا۔ جلد ہی اس پر غنودگی طاری ہو گئی اور وہ سو گیا۔ اباقہ بھی اس کے قریب ہی نیم دراز ہو گیا۔

سردی میں گہری نیند کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ یکایک اباقہ اٹھ بیٹھا۔ اس کی چھٹی حس خطرے سے آگاہ کر رہی۔ اس نے دیکھا طوطم خاں بھی اس کی طرح جاگ گیا ہے۔ اباقہ نے کھوہ سے جھانک کر باہر دیکھا۔ برف کے گالوں نے اس کے سر اور کندھوں پر گر کر موسم کی کیفیت بتائی۔ کچھ فاصلے پر برف پوش اندھیرے میں مشعلیں چمک رہی تھیں۔ وہ ایک دم چوکنا ہو گیا۔ متعاقب گھڑ سوار ان کی غفلت کا فائدہ اٹھا کر کھوہ کی طرف آ رہے تھے۔ ان کی تعداد کسی طرح بھی تیس سے کم نہ تھی۔ شاید راستے میں ملنے والا کوئی اور دستہ بھی ان کے ساتھ شامل ہو گیا تھا۔ وہ نیم دائرے میں کھوہ کی طرف گامزن تھے۔ اباقہ نے جھپٹ کر مشعل بجھائی پھر خرجینیں اٹھائیں اور طوطم کو کندھے پر ڈال کر کھوہ سے باہر نکل آیا۔ طوطم بار بار انکار میں سر ہلا رہا تھا اور اباقہ نے اسے کندھے پر مضبوطی سے سنبھال رکھا تھا ورنہ شاید وہ جان بوجھ کر نیچے لڑھک جاتا۔ گھٹنے گھٹنے برف میں اباقہ حتی الامکان تیزی سے آگے بڑھنے لگا۔ یہ نقاہت' تاریکی سردی اور بے یقینی کا سفر تھا' ناقابل گمان حد تک دشوار اور مہلک۔ مگر وہ اباقہ تھا۔ ارادے کا مضبوط اور ہٹ کا پکا۔ وہ جیتے جی طوطم کی مدد سے پیچھے ہٹنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ حتی الامکان تیزی سے آگے بڑھتا رہا۔ منگول سپاہی جو اب انہی کی طرح پاپیادہ تھے بتدریج .... قریب پہنچ رہے تھے۔ طوطم بار بار کہہ رہا تھا۔ "اباقہ مجھے چھوڑ دو .... مجھے اتار دو۔" پھر اچانک اباقہ کو عجیب طرح کی خرخراہٹ سنائی دی۔ یہ خرخراہٹ طوطم کے حلق سے برآمد ہوئی تھی۔ اباقہ نے طوطم کو جلدی سے برف پر لٹایا پھر تاریکی میں اس کے ہاتھوں نے طوطم کا گلا ٹٹولا۔ اس کی شاہ رگ کٹی ہوئی تھی اور گرم خون سے چہرا لتھڑا ہوا تھا۔ اباقہ نے ٹٹولا تو طوطم کے ہاتھ میں خنجر دبا تھا۔ یہ اباقہ ہی کا خنجر تھا جو اس نے اباقہ کی کمر سے نکال کر گلے پر پھیر لیا تھا۔ وہ شاید کچھ کہنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ اس کی زندگی کے آخری الفاظ تھے۔ اباقہ نے جھک کر کان اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ الفاظ ٹکڑوں کی صورت اس کے ہونٹوں سے برآمد ہو رہے تھے۔ "اباقہ .... تو بڑا .... اچھا .... دشمن .... ہے .... مارینا .... سے کہنا .... طو .... طم .... کو .... معاف .... " پھر آواز اتنی مدھم ہو گئی کہ اسے اباقہ نہ سن سکا۔ طوطم زندگی کی سرحد پار کر چکا تھا۔ اس کا جسم تاریک' سنسان اور بے نام برف کی آغوش میں تھا۔ اس کے پاؤں میں باتو خاں کی

پسنائی ہوئی بیڑیاں تھیں مگر اس کی روح آزاد ہو کر جاودانی آسمان کی طرف پرواز کر گئی تھی۔ اباقہ نے بوسیدہ کمبل طوطم کی لاش پر ڈال دیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

اس کے دل پر اب کوئی بوجھ نہیں تھا۔ اس نے طوطم خاں کو بچانے کی حتی الامکان کوشش کی تھی۔ اب اس کے سامنے دو راستے تھے۔ ایک تو یہ کہ واپس پلٹے اور شکاری کتوں کی مانند پیچھا کرنے والے منگولوں سے ٹکرا جائے۔ دوسرا یہ کہ وہ اپنے راستے پر تیزی سے آگے بڑھے اور منگولوں کی پہنچ سے دور نکل جائے۔ چند لمحوں کی سوچ بچار کے بعد اس نے دوسرا راستہ منتخب کیا۔ ان بیس تیس منگولوں سے ٹکرا کر وہ کچھ حاصل نہ کر سکتا تھا۔ اس کی تلوار کی دھار میں صحراؤں کی پیاس اتری ہوئی تھی۔ یہ پیاس بجھانے کے لیے ضروری تھا کہ وہ اسے خون کے سمندروں میں ڈبوئے۔ اس نے طوطم کے لاشے کو الوداع کہا اور تاریکی میں آگے بڑھتا چلا گیا۔

☆--------☆--------☆

.... نتاشا جھروکے میں گم صم کھڑی تھی۔ اس کے گلابی عارض زرد تھے اور شفاف جھیل جیسی آنکھوں میں اندوہ کے گرداب پڑ رہے تھے' وہ بے خیالی میں اپنا نچلا ہونٹ دانتوں سے کچل رہی تھی اور یہ اس بات کی نشانی تھی کہ وہ حد سے زیادہ رنجیدہ ہے۔ پچھلے چند روز میں حالات اس قدر تیزی سے بدلے تھے کہ وہ دم بخود رہ گئی تھی .... ان دنوں کی ایک ایک گھڑی تلاطم خیز حوادث کی امین تھی۔ اباقہ کو اس نے آخری بار برفانی غار میں دیکھا تھا' جب وہ اسد اور یورق کے ساتھ شکار کی تلاش میں تھا۔ پھر اسد اور یورق واپس آ گئے تھے اور کچھ ہی دیر بعد منگول سپاہیوں نے غار پر ہلہ بول دیا تھا۔

غار کے دہانے پر زبردست لڑائی ہو رہی تھی جب دور سے اباقہ کی آواز سنائی دی اور نصف سے زائد حملہ آور اباقہ کی طرف متوجہ ہو کر دہانے سے ہٹ گئے تھے۔ اس وقت اسد اور یورق نے ایک طوفانی حملہ کیا تھا اور بچے کھچے منگولوں کے چھکے چھڑا دیے تھے۔ نتاشا نے پہلی بار کسی کو اتنی بے جگری اور تندی سے لڑتے دیکھا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سات آٹھ منگول یورق اور اسد کی تلواروں کا نشانہ بنے اور باقی حواس باختہ ہو کر بھاگ نکلے۔ اس لڑائی میں نتاشا نے بھی حتی المقدور حصہ لیا تھا اور اس کی تلوار نے ایک منگول کو جہنم واصل کیا تھا۔ جبکہ ایک منگول علی کے تیر سے ہلاک ہوا تھا۔

اس معرکہ آرائی کے بعد انہوں نے اباقہ کو تلاش کرنے کی بہت کوشش کی مگر ناکامی ہوئی۔ اس مقام پر زیادہ دیر ٹھہرنا بھی خطرناک تھا لہٰذا انہوں نے رانیل کی لاش سپرد برف

کرنے کے بعد غار چھوڑ دیا۔

دوسرے روز انہیں ولادی میر کے مہاجروں کا ایک چھوٹا سا قافلہ مل گیا اور ان میں شامل ہو کر وہ "سٹ" کی طرف روانہ ہو گئے۔ دو روز کے دشوار گزار سفر کے بعد وہ "سٹ" پہنچے تو یہ جان کر انہیں ازحد اطمینان ہوا کہ رئیس اعظم کنیاز یوری سٹ ہی میں موجود ہیں۔ شہزادی نتاشا باپ سے ملی اور گلے لگ کر خوب روئی۔ ولادی میر کی داستان خونچکاں زبان زد عام تھی۔ حضرت مریم کے کلیسا میں تاتاریوں کے ہاتھوں شاہی خاندان کی دردناک موت نے ہر شخص کو ماتم کناں کر رکھا تھا۔ جس روز نتاشا علی' اسد اور یورق سٹ پہنچے۔ اسی روز شام کو ڈیوک بھی وہاں پہنچ گیا۔ اس خبیث کی آمد نے یکایک حالات کو ایک نیا رخ دے دیا۔ رئیس اعظم اس پر اندھا اعتماد رکھتے تھے۔ وہ رئیس اعظم سے ملا اور شہزادی نتاشا کے خلاف ان کے کان بھرے۔ اس نے کہا کہ شہزادی نتاشا آپ کی عزت سے کھیل رہی ہیں۔ رئیس اعظم کے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ شہزادی نتاشا کا نام ایک نوجوان اباقہ کے ساتھ لیا جا رہا ہے۔ منگولوں کے حملے سے صرف ایک روز قبل آدھی رات کو شہزادی اس نوجوان کے ساتھ محل سے باہر گئی اور آخری پہر واپس آئی۔ محل سے اس کی غیر موجودگی کی خبر پھیل گئی اور لوگ طرح طرح کی باتیں بنانے لگے۔ اس دوران شہزادہ اول و دوم بھی محل میں پہنچ گئے۔ وہ شہزادی کے طرز عمل سے سخت نالاں تھے۔ شہزادی کی واپسی پر انہوں نے اسے سرزنش بھی کی۔

ڈیوک کی باتیں سن کر رئیس اعظم بے حد حیران ہوئے انہوں نے نتاشا کو بیٹوں کی طرح پالا تھا اور اس پر بے پناہ بھروسہ بھی رکھتے تھے۔ رئیس اعظم اور شہزادوں کی غیر موجودگی میں تمام امور مملکت وہ انجام دیتی تھی اور اس میں بے پناہ صلاحیتیں بھی تھیں۔ رئیس اعظم کے لیے یہ یقین کرنا دشوار تھا کہ ان کی ذہین و لائق بیٹی ایک عام سے بے سدھ و بے مایہ نوجوان کی محبت میں گرفتار ہو گئی ہے مگر جب شہر میں پھیلنے والی افواہوں کا غبار ان کے مصاحبین و عمائدین کے چہروں پر بھی نظر آیا تو عرق ندامت ان کی پیشانی پر پھیلنے لگا۔ وہ نتاشا سے اور نتاشا ان سے نظریں چرانے لگی .... اور اب دو روز سے یہ کیفیت تھی کہ رئیس اعظم نے نتاشا سے کوئی بات نہ کی تھی۔ نہ کچھ کھایا پیا تھا اور نہ رات کو سوئے تھے۔ دوسری طرف نتاشا بھی ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہی تھی۔ پیارے باپ کی عزت اس کے لیے متاع کل تھی اور یہ متاع اس کے ہاتھوں برباد ہو رہی تھی۔ وہ بے گناہ تھی' اس کا دامن شبنم کی طرح پاک اور کرنوں کی طرح غیر آلود تھا مگر کیچڑ اچھالنے والی بے رحم زبانیں مسلسل حرکت میں تھیں اور بات کانوں کان سفر کرتی

کہیں سے کہیں پہنچ رہی تھی۔

.... نتاشا جھروکے میں کھڑی اپنے خیالوں میں محو تھی جب اچانک اس کے عقب میں آہٹ ہوئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا ذاتی خادمہ ہاتھ باندھے کھڑی تھی اسے دیکھتے ہی نتاشا کو کلثوم یاد آ گئی۔ وہ اس کی خادمہ ہی نہیں سہیلی بھی تھی۔ وہ بھی شاہی خاندان کے دوسرے افراد کی طرح کلیسا میں رہ گئی تھی۔ نتاشا جانتی تھی اب وہ اسے کبھی نہ دیکھ سکے گی۔ وہ کسی منگول سپاہی کی داشتہ بن چکی ہو گی یا اس کی بچی کھچی لاش دلادی میر کے کسی کوچے میں پڑی سڑ رہی ہو گی۔ اس نے ایک دکھ بھری سانس بھر کر خادمہ سے کہا۔ "کیا بات ہے؟"

خادمہ نے رعشہ زدہ آواز میں کہا۔ "شہزادی حضور آپ کو رئیس اعظم نے یاد فرمایا ہے۔"

شہزادی کے جسم میں سردی کی لہر دوڑ گئی۔ اچانک اسے لگا کہ اس کے پاؤں پتھر کے ہو گئے ہیں اور وہ کوشش کے باوجود اپنی جگہ سے حرکت نہ کر سکے گی۔ اس نے بمشکل خادمہ سے کہا۔ "ٹھیک ہے تم جاؤ ہم کچھ دیر بعد آتے ہیں۔"

خادمہ کے جاتے ہی وہ اپنی خواب گاہ میں داخل ہوئی اور بے قراری سے ٹہلنے لگی۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ باپ کا سامنا کس طرح کرے۔ بڑے بڑے فیصلے نہایت اعتماد سے کر جانے والی نتاشا مکتب میں پڑھنے والی کسی بچی کی طرح متذبذب اور ہراساں تھی۔ سخت بے چینی کے عالم میں وہ شاہی قیام گاہ سے باہر نکلی اور ایک گھوڑے پر سوار ہو کر بغیر کسی محافظ کے مضافاتی علاقے کی طرف چل دی۔ وہ کسی کھلی جگہ اطمینان سے بیٹھ کر اپنے اگلے اقدام کے بارے سوچنا چاہتی تھی۔ وہ ایک باہمت لڑکی تھی۔ کم حوصلہ ہوتی تو شاید اسی وقت جھروکے سے چھلانگ لگا کر اپنی حیات کا خاتمہ کر دیتی جب باپ کا بلاوا آیا تھا۔ مگر وہ جانتی تھی اس کی خودکشی مسئلے کا حل نہیں۔ وہ اپنی جان دے کر باپ کی ناموس کو اور بھی داغدار کر دے گی۔

وہ یونہی بے مقصد اونچے نیچے ٹیلوں میں گھوڑا بھگاتی رہی۔ اچانک اس کی نظر مشرق کی طرف اٹھی اور وہ ٹھٹک گئی۔ ایک گھڑ سوار تیزی سے بڑھا چلا آ رہا تھا۔ تن و توش سے وہ مرد دکھائی دیتا تھا' لیکن اس کے لمبے بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ نتاشا کے دل نے پکار کر کہا۔ "یہ اباقہ ہے" .... گھڑ سوار بتدریج اس کے نزدیک آ رہا تھا۔ نتاشا کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو گئیں۔ پھر اس نے پہچان لیا' وہ اباقہ ہی تھا۔ اباقہ نے بھی غور سے اسے دیکھا اور اس کا ہنہناتا اور ہانپتا ہوا گھوڑا عین اس کے سامنے پہنچ کر رک گیا۔

دونوں تعجب سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ نتاشا کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو اٹھ آئے اور وہ اپنا رخ پھیر کر انہیں چھپانے کی کوشش کرنے لگی۔ اباقہ جست لگا کر گھوڑے سے اترا۔ پھر اس کی مردانہ اور بارعب آواز نتاشا کے کانوں سے ٹکرائی۔

"شہزادی آپ یہاں؟ اور اس قدر پریشان؟"

شہزادی نے بھیگی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ وہ اس کے گھوڑے کی باگ تھامے کھڑا تھا۔ وہ بہ آہستگی گھوڑے سے اتری اور اباقہ کے ساتھ ایک پتھر پر آ بیٹھی۔ دونوں ایک دوسرے کو اپنے اپنے حالات سے آگاہ کرنے لگے .... اباقہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ ذیوک زندہ سلامت یہاں بھی پہنچ گیا ہے اور اس نے اپنی عداوت کا ثبوت فراہم کرتے ہوئے شہزادی کو ایک بدترین بہتان کا نشانہ بنایا ہے تو وہ کھول اٹھا۔ ایکا ایکی اس کے اندر کا وحشی انگڑائی لے کر بیدار ہو گیا۔ وہ پھنکارا۔

"شہزادی نتاشا! میں اس شیطان کی ٹانگیں چیر کر کتوں کے آگے پھینک دوں گا .... آیئے میرے ساتھ۔ یہ سب کچھ آپ کی آنکھوں کے سامنے ہو گا۔"

شہزادی نے منہ پھیر کر کہا۔ "نہیں اباقہ' ہم میں اتنی ہمت نہیں کہ کسی کا سامنا کر سکیں۔ ہمیں ابا حضور نے طلب کیا تھا۔ ہم ان کے روبرو نہیں ہو سکے تو کسی اور کی نگاہوں کی تاب کہاں لائیں گے۔"

اباقہ نے مضبوط و توانا لہجے میں کہا۔ "آپ کو تاب لانا ہو گی شہزادی صاحبہ۔ آپ بے گناہ ہیں۔ آپ کو منہ چھپا کر اور نگاہیں چرا کر لوگوں کی زبانیں دراز کرنے کا کوئی حق نہیں۔ آیئے میرے ساتھ' میں جواب دوں گا ہر سوال کا میں بتاؤں گا رئیس اعظم کو کہ ان کی بیٹی کیا ہے اور وہ اسے کیا سمجھ رہے ہیں۔"

نہایت بے خوفی اور جرأت سے اباقہ نے نتاشا کا بازو کندھے کے نیچے سے تھام لیا۔ اس کے آہنی ہاتھ کی گرفت نے شہزادی کے رگ و پے میں ایک نئی روح پھونک ڈالی اسے اپنے اندر بے پناہ اعتماد کا احساس ہونے لگا۔ یکایک اسے لگا کہ وہ ایک رئیس اعظم کی بیٹی شہزادی نتاشا نہیں ایک عام سی دہقان لڑکی ہے اور اباقہ ایک پُر جلال و باسطوت حکمران ہے اور وہ اس کے سائے میں کھڑی ہے۔ اس کا دل اس کی پناہ میں رہنا چاہتا ہے۔ اس نے خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا اور اباقہ کی ہدایات پر عمل کرنے لگی۔ اباقہ اسے ساتھ لے کر بے خوفی سے شہر کی طرف بڑھا۔ دونوں ساتھ ساتھ گھوڑے دوڑاتے فصیل کے اندر پہنچے اور پھر سیدھے شاہی مستقر کی طرف چل دیئے۔ رئیس اعظم قلعے کے اندر ایک رہائشی عمارت میں مقیم تھے۔ قلعے میں داخل ہو کر وہ اس عمارت کی طرف بڑھنے

گئے۔

راستے میں کچھ لوگوں نے انہیں دیکھا اور اباقہ کو پہچان کر چہ میگوئیاں کیں۔ گرد و پیش سے لاتعلق وہ گھوڑے ہانکتے ہوئے شاہی قیام گاہ میں پہنچ گئے۔ تھوڑی ہی دیر بعد رئیس اعظم کے روبرو حاضر ہونے کے لیے ایک دروازے سے اندر داخل ہو رہے تھے۔ یہ ایک وسیع و عریض کمرہ تھا۔ فرش پر بیش قیمت قالین بچھے تھے۔ دیواروں پر غالیچے آویزاں تھے اور ہتھیار لٹک رہے تھے۔ بلند وبالا اور مضبوط جسم کا مالک رئیس اعظم کنیازیوری ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کے جسم پر سونے کے بٹنوں والا سرخ کوٹ تھا۔ سنہری بال اس کے سرخ و سپید چہرے پر کسی تاج کی مانند نظر آ رہے تھے۔ اس کی بڑی بڑی اور گہری آنکھیں اباقہ و نتاشا پر مرکوز تھیں۔ اباقہ اور نتاشا نے تعظیم پیش کی۔ رئیس اعظم کی بارعب و پرہیبت آواز کمرے میں گونجی۔ "نتاشا' تمہارے ساتھ یہ شخص کون ہے۔"

نتاشا کی بجائے اباقہ نے جواب دیا۔ "رئیس اعظم۔ میرا نام اباقہ ہے۔ میں آپ کا ایک ادنیٰ خادم ہوں۔"

رئیس اعظم کی آنکھوں میں بجلی سی چمکی' لیکن پھر وہ خود پر قابو پا کر بولا۔ "تم نتاشا کے ساتھ کیوں آئے ہو؟"

اباقہ نے کہا۔ "اس لیے حضور کہ میرے دل میں آپ کا احترام تو ہے مگر خوف نہیں اور عالی جاہ! خوف اس لیے نہیں کہ میں بے گناہ ہوں۔ بالکل اسی طرح جیسے آپ کی بیٹی بے گناہ اور معصوم ہے۔"

شہزادی نتاشا کو جرأت ہوئی۔ اس نے آگے بڑھ کر باپ کے ہاتھوں کو بوسے دیے اور روتے ہوئے بولی۔ "پدر محترم! ہمیں آپ کی عزت دنیا کی ہر شے سے زیادہ عزیز ہے اگر آپ سمجھتے ہیں کہ ایسا نہیں تو خدا کے لیے اپنے ہاتھوں سے قتل کر دیجئے اسی جگہ اور اسی وقت۔"

شہزادی گھٹنوں کے بل باپ کے سامنے جھک گئی اور اپنا سر نگوں کر دیا۔ اس نے چہرا اپنے مرمریں ہاتھوں سے ڈھانپ رکھا تھا اور اس کی دل پذیر سسکیاں کسی مقدس گھنٹی کی طرح کمرے میں گونج رہی تھیں۔ رئیس اعظم کتنی ہی دیر بھیگی آنکھوں سے بیٹی کی طرف دیکھتے رہے پھر انہوں نے اسے شانوں سے تھام کر اٹھایا اور کھینچ کر سینے سے لگا لیا۔ شہزادی بلند آواز میں رونے لگی۔ رئیس اعظم کا ہاتھ اس کے ریشمی بالوں کو سہلانے لگا۔ پھر رئیس اعظم کی ملائم اور گلوگیر آواز سنائی دی۔

"بیٹی! ہم جانتے ہیں۔ تو پہاڑوں کی طرح سرفراز' باد صبا کی طرح صاف اور سمندروں کی طرح اعلیٰ ظرف ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ شبنم کی پاکیزگی' پھولوں کی معصومیت اور فرشتوں کی نیک خوئی پر شک کیا جا سکتا ہے مگر تجھ پر نہیں۔ تیری بے گناہی کا ہمیں یقین ہے جان پدر! لیکن ہم ان کالی زبانوں کا کیا کریں جو زہریلے سانپوں کی طرح بل کھا کھا کر ہماری ناموس کو چاٹنا چاہتی ہیں۔ ان آنکھوں کا کیا کریں جن کی بے مہر چمک ہماری شرافت اور نیک نامی کے اجالے کو گہنا رہی ہے۔ ہم جانتے ہیں ہم نے جو کچھ سنا وہ جھوٹ اور جو محسوس کیا وہ بے حقیقت ہے' مگر لوگوں کے افکار پر ہماری حکومت نہیں اور اس شیطان پر ہمارا بس نہیں جو دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے اور زبانوں کو آتش بار کر دیتا ہے۔"

اباقہ نے دیکھا کہ رئیس اعظم جس کی چہار دانگ دہل دھوم تھی اور جس کی جاہ و حشمت اور عظمت کا اعتراف روس کے طول و عرض میں کیا جاتا تھا۔ ایک مجبور و بے بس شخص کی مانند آزردہ ہے۔ وہ کچھ دیر گہری اور فہیم نگاہوں سے اباقہ اور نتاشا کی طرف دیکھتا رہا۔ اچانک اس کے چہرے پر عجیب طرح کی روشنی نظر آئی' جیسے وہ کسی نہایت اہم فیصلے پر پہنچ گیا ہے۔ مضبوط قدموں سے چلتا وہ اباقہ کے سامنے پہنچا اور بولا۔

"اباقہ! ہم تیرے بارے بہت کچھ جان چکے ہیں۔ ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ لوگوں کی زبانیں بند کرنے کے لیے اور جو کچھ ہو چکا ہے اس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے' ہم تمہیں اپنا داماد بنا لیں ...." اس فقرے کی گونج اباقہ کو مجسم حیرت کر گئی۔ وہ ساکت و جامد کھڑا رئیس اعظم کی طرف دیکھتا رہا۔ رئیس اعظم نے نتاشا کو کمرے سے باہر جانے کی ہدایت کی۔ وہ دروازے سے نکل گئی تو رئیس اعظم نے اباقہ کو اپنے برابر نشست دی اور ایک لاچار شخص کی عاجزی سے بولے۔

"بیٹے! اب ہماری عزت تمہارے ہاتھ میں ہے۔ حالات کے پھیر نے تجھے اس مقام پر لا کھڑا کیا ہے کہ وسطی روس کا سب سے بااختیار حکمران تیرا سوالی بن گیا ہے۔ ہم تیری ضرورت کی حقیقت کو دل و جان سے تسلیم کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ تو ہماری فرزندی میں آ جائے۔"

اباقہ سے کوئی جواب بن نہیں پڑ رہا تھا۔ اسے معلوم ہی نہیں تھا ایسے موقع پر کیا کہا جاتا ہے۔ رئیس اعظم نے اس کی پریشانی بھانپتے ہوئے کہا۔ "بیٹے! ہماری بیٹی کے بارے قیافہ گوئی اور افواہ سازی اتنی شدت اختیار کر گئی ہے کہ اگر ہم نے جلد ہی اس کے بارے کوئی وضاحت نہ کی تو صورت حال ابتر ہو جائے گی۔ پرسوں صبح عمائدین اور مصاحبین کے

ساتھ ہماری ایک اہم ملاقات ہے جس میں ہمیں بہر حال .... اس معاملے کی وضاحت کرنی ہے اور انہیں اعتماد میں لینا ہے۔ شاید خداوند نے ہماری دعائیں سن لی ہیں جو اس ملاقات سے قبل تم یہاں پہنچ گئے ہو۔ اب ہم اس صورت سرخرو ہو سکتے ہیں کہ کل سب کے سامنے تمہارے اور شہزادی کے رشتے کا اعلان کریں اور انہیں باور کرائیں کہ تمہارا میل ملاپ اس رشتے کے پس منظر میں تھا اور یہ رشتہ کچھ عرصہ پہلے ہم نے خود طے کیا تھا۔"

یکایک اباقہ اپنی نشست سے کھڑا ہو گیا۔ "رئیس اعظم! گستاخی معاف! میں آپ کی بیٹی سے شادی نہیں کر سکتا۔ میں کسی کو قول دے چکا ہوں۔ ایک بے سہارا لڑکی ملک عراق میں میری راہ دیکھ رہی ہے۔"

اباقہ نہیں جانتا تھا اس موقعے پر اس نے کیسی غلط بات کہہ دی ہے۔ ایکا ایکی رئیس اعظم کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ ان کی آنکھیں شعلہ بار ہو گئیں۔ وہ قہرناک لہجے میں بولے۔ "اگر تو نے کسی لڑکی کو قول دیا تھا تو ہماری بیٹی کو کیوں دھوکا دیا تو نے۔ کیوں اس سے راہ و رسم پیدا کر کے اسے بدنام کیا۔ اس کا ایک ہی مطلب ہے' تو بدکردار' بدنیت اور بدخواہ ہے۔ ہم تجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے تیری گستاخ زبان کو گدی سے کھینچ کر تیرے مغرور سر کے ٹکڑے کر دیں گے۔"

پھر رئیس اعظم کنیازیوری نے شاہانہ جلال سے تلوار کھینچی اور اباقہ کی طرف بڑھے' یہی وہ وقت تھا جب بغلی دروازے پر پڑا دبیز ریشمی پردہ متحرک ہوا اور ایک شخص نمودار ہو کر رئیس اعظم کی طرف لپکا۔ وہ رئیس اعظم کا ہم عمر تھا۔ اس کے بالوں میں سفیدی تھی اور لمبی داڑھی اس کے سینے پر لہرا رہی تھی۔ وہ اباقہ اور رئیس کے درمیان کھڑا ہو گیا اور احترام سے بولا۔

"رئیس اعظم! خدارا تحمل سے کام لیجئے۔ اس وقت جوش کی نہیں ہوش کی ضرورت ہے۔"

رئیس اعظم آپے سے باہر ہو رہا تھا۔ شاید اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ بے وقعت شخص اس کی اتنی بڑی پیش کش کو یوں ٹھکرا دے گا۔ اس نے داڑھی والے شخص کو دھکا دے کر اپنے راستے سے ہٹایا اور تلوار اٹھا کر آگے بڑھا۔ مگر داڑھی والا پھر اباقہ کے سامنے آ گیا اور بازو پھیلا کر بولا۔

"رئیس اعظم! یسوع کی قسم میں آپ کو ایسا نہ کرنے دوں گا خواہ میری جان چلی جائے اس نوجوان کو مارنے سے ہمارے مصائب دوگنا ہو جائیں گے .... خدا کے لیے

حوصلے سے کام لیجئے۔"

بالآخر بوڑھا شخص' رئیس اعظم کو اباقہ کے قتل سے باز رکھنے میں کامیاب رہا۔ اس نے اباقہ کو ساتھ لیا اور شاہی قیام گاہ کے ایک دوسرے آراستہ و پیراستہ کمرے میں آ گیا۔ اس نے اندر سے دروازہ بند کیا اور ملائم لہجے میں اباقہ کو ایک کرسی پر بیٹھنے کی ہدایت کی۔ اباقہ اکھڑپن سے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ بوڑھے شخص نے کہا۔ "بیٹے کیا پیو گے؟"

"کچھ نہیں۔" اباقہ نے مختصر جواب دیا۔

بوڑھے نے تالی بجائی اور ایک بغلی دروازے سے حسین خادمہ چاندی کے طشت میں قہوے کے برتن سجائے اندر داخل ہوئی۔ بوڑھے کے اصرار پر اباقہ نے ایک پیالی اٹھائی۔ خادمہ رخصت ہو گئی تو بوڑھا بولا۔

"بیٹے میرا نام فیرا ہے' فیرا یونت۔ میں رئیس اعظم کے بچپن کا ہمجولی ہوں اور اس وقت تم اور ہم کتنی بڑی مصیبت میں پھنس چکے ہیں۔ جیسا کہ تمہیں معلوم ہے منگول ہمارے شہروں کو پیوند زمین کرتے آگے بڑھے چلے آ رہے ہیں اس وقت ہمیں جس قوت اور یکجہتی کی ضرورت ہے وہ اسی صورت حاصل ہو سکتی ہے۔ اگر تمام گروہ اور قبیلے رئیس اعظم کو رہبر و راہنما جان کر اس کے جھنڈے تلے جمع ہو جائیں' لیکن موجودہ حالات میں رئیس اعظم کی کردار کشی کی جو صورت نکل رہی ہے وہ بہت مایوس کن اور خطرناک ہے .... تم ایک سمجھدار نوجوان دکھائی دیتے ہو اور ایک خدا کو ماننے والے بھی ہو۔ میں تم سے التجا کرتا ہوں کہ رئیس اعظم کو اگر اپنے بیسیوں محافظ بھی قتل کرانے پڑے تو تمہیں اس قیام گاہ سے زندہ باہر نہیں نکلنے دے گا۔ میں رئیس اعظم کی رگ رگ سے واقف ہوں۔ وہ بہت اعلیٰ ظرف انسان ہے لیکن غضب کے عالم میں اسے خود پر اختیار نہیں رہتا' اور تو نے اپنے انکار سے اسے انتہائی حد تک غضبناک کر دیا ہے۔ میں نہایت ہمدردی و دردمندی سے تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ تمہارا انکار تمہارے ان ساتھیوں کے لیے بھی مصیبت بن سکتا ہے جو اس وقت رئیس اعظم کی تحویل میں ہیں۔"

اباقہ نے چونک کر پوچھا۔ "کون سے ساتھی؟"

فیرا یونت نے جواب دیا۔ "وہی جو شہزادی صاحبہ کے ہمراہ یہاں پہنچے ہیں۔"

اباقہ سمجھ گیا کہ بوڑھا' اسد' یوحق اور علی کی بات کر رہا ہے۔ بوڑھا کافی دیر مختلف انداز سے اباقہ کو سمجھانے کی کوشش کرتا رہا لیکن اس پر ایک ناقابل فہم اور نامہربان خاموشی طاری ہو چکی تھی۔ رات کے پچھلے پہر بوڑھا مایوس و نامراد واپس چلا گیا۔ اباقہ اس کمرے میں بظاہر آزاد تھا' لیکن وہ جانتا تھا اسے سخت نگرانی میں رکھا گیا ہے' بوڑھے کی

ساتھ ہماری ایک اہم ملاقات ہے جس میں ہمیں بہر حال .... اس معاملے کی وضاحت کرنی ہے اور انہیں اعتماد میں لینا ہے۔ شاید خداوند نے ہماری دعائیں سن لی ہیں جو اس ملاقات سے قبل تم یہاں پہنچ گئے ہو۔ اب ہم اس صورت سرخرو ہو سکتے ہیں کہ کل سب کے سامنے تمہارے اور شہزادی کے رشتے کا اعلان کریں اور انہیں باور کرائیں کہ تمہارا میل ملاپ اس رشتے کے پس منظر میں تھا اور یہ رشتہ کچھ عرصہ پہلے ہم نے خود طے کیا تھا۔"

یکایک اباقہ اپنی نشست سے کھڑا ہو گیا۔ "رئیس اعظم! گستاخی معاف! میں آپ کی بیٹی سے شادی نہیں کر سکتا۔ میں کسی کو قول دے چکا ہوں۔ ایک بے سہارا لڑکی ملک عراق میں میری راہ دیکھ رہی ہے۔"

اباقہ نہیں جانتا تھا اس موقعے پر اس نے کیسی غلط بات کہہ دی ہے۔ ایکا ایکی رئیس اعظم کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ ان کی آنکھیں شعلہ بار ہو گئیں۔ وہ قہرناک لہجے میں بولے۔ "اگر تو نے کسی لڑکی کو قول دیا تھا تو ہماری بیٹی کو کیوں دھوکا دیا تو نے۔ کیوں اس سے راہ و رسم پیدا کر کے اسے بدنام کیا۔ اس کا ایک ہی مطلب ہے' تو بدکردار' بدنیت اور بدخواہ ہے۔ ہم تجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے تیری گستاخ زبان کو گدی سے کھینچ کر تیرے مغرور سر کے ٹکڑے کر دیں گے۔"

پھر رئیس اعظم کنیازیوری نے شاہانہ جلال سے تلوار کھینچی اور اباقہ کی طرف بڑھے' یہی وہ وقت تھا جب بغلی دروازے پر پڑا دبیز ریشمی پردا متحرک ہوا اور ایک شخص نمودار ہو کر رئیس اعظم کی طرف لپکا۔ وہ رئیس اعظم کا ہم عمر تھا۔ اس کے بالوں میں سفیدی تھی اور لمبی داڑھی اس کے سینے پر لہرا رہی تھی۔ وہ اباقہ اور رئیس کے درمیان کھڑا ہو گیا اور احترام سے بولا۔

"رئیس اعظم! خدارا تحمل سے کام لیجئے۔ اس وقت جوش کی نہیں ہوش کی ضرورت ہے۔"

رئیس اعظم آپے سے باہر ہو رہا تھا۔ شاید اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ بے وقعت شخص اس کی اتنی بڑی پیش کش کو یوں ٹھکرا دے گا۔ اس نے داڑھی والے شخص کو دھکا دے کر اپنے راستے سے ہٹایا اور تلوار اٹھا کر آگے بڑھا۔ مگر داڑھی والا پھر اباقہ کے سامنے آ گیا اور بازو پھیلا کر بولا۔

"رئیس اعظم! یسوع کی قسم میں آپ کو ایسا نہ کرنے دوں گا خواہ میری جان چلی جائے اس نوجوان کو مارنے سے ہمارے مصائب دوگنا ہو جائیں گے .... خدا کے لیے

حوصلے سے کام لیجئے۔"

بالآخر بوڑھا شخص' رئیس اعظم کو اباقہ کے قتل سے باز رکھنے میں کامیاب رہا۔ اس نے اباقہ کو ساتھ لیا اور شاہی قیام گاہ کے ایک دوسرے آراستہ و پیراستہ کمرے میں آ گیا۔ اس نے اندر سے دروازہ بند کیا اور ملائم لہجے میں اباقہ کو ایک کرسی پر بیٹھنے کی ہدایت کی۔ اباقہ اکڑپن سے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ بوڑھے شخص نے کہا۔ "بیٹے کیا پیو گے؟"

"کچھ نہیں۔" اباقہ نے مختصر جواب دیا۔

بوڑھے نے تالی بجائی اور ایک بغلی دروازے سے حسین خادمہ چاندی کے طشت میں قہوے کے برتن سجائے اندر داخل ہوئی۔ بوڑھے کے اصرار پر اباقہ نے ایک پیالی اٹھائی۔ خادمہ رخصت ہو گئی تو بوڑھا بولا۔

"بیٹے میرا نام فیرا ہے' فیرا یونت۔ میں رئیس اعظم کے بچپن کا' ہمجولی ہوں اور اس وقت تم اور ہم کتنی بڑی مصیبت میں پھنس چکے ہیں۔ جیسا کہ تمہیں معلوم ہے منگول ہمارے شہروں کو پیوند زمین کرتے آگے بڑھے چلے آ رہے ہیں اس وقت ہمیں جس قوت اور یکجہتی کی ضرورت ہے وہ اسی صورت حاصل ہو سکتی ہے۔ اگر تمام گروہ اور قبیلے رئیس اعظم کو رہبر و راہنما جان کر اس کے جھنڈے تلے جمع ہو جائیں' لیکن موجودہ حالات میں رئیس اعظم کی کردار کشی کی جو صورت نکل رہی ہے وہ بہت مایوس کن اور خطرناک ہے .... تم ایک سمجھدار نوجوان دکھائی دیتے ہو اور ایک خدا کو ماننے والے بھی ہو۔ میں تم سے التجا کرتا ہوں کہ رئیس اعظم کو اگر اپنے بیسیوں محافظ بھی قتل کرانے پڑے تو تمہیں اس قیام گاہ سے زندہ باہر نہیں نکلنے دے گا۔ میں رئیس اعظم کی رگ رگ سے واقف ہوں۔ وہ بہت اعلیٰ ظرف انسان ہے لیکن غضب کے عالم میں اسے خود پر اختیار نہیں رہتا' اور تو نے اپنے انکار سے اسے انتہائی حد تک غضبناک کر دیا ہے۔ میں نہایت ہمدردی و دردمندی سے تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ تمہارا انکار تمہارے ان ساتھیوں کے لیے بھی مصیبت بن سکتا ہے جو اس وقت رئیس اعظم کی تحویل میں ہیں۔"

اباقہ نے چونک کر پوچھا۔ "کون سے ساتھی؟"

فیرا یونت نے جواب دیا۔ "وہی جو شہزادی صاحب کے ہمراہ یہاں پہنچے ہیں۔"

اباقہ سمجھ گیا کہ بوڑھا' اسد' یوشق اور علی کی بات کر رہا ہے۔ بوڑھا کافی دیر مختلف انداز سے اباقہ کو سمجھانے کی کوشش کرتا رہا لیکن اس پر ایک ناقابل فہم اور نامہربان خاموشی طاری ہو چکی تھی۔ رات کے پچھلے پہر بوڑھا مایوس و نامراد واپس چلا گیا۔ اباقہ اس کمرے میں بظاہر آزاد تھا' لیکن وہ جانتا تھا اسے سخت نگرانی میں رکھا گیا ہے' بوڑھے کی

رخصتی کے بعد خادمائیں طلائی اور نقرئی برتنوں میں اس کے لیے عمدہ کھانے لے کر آئیں۔ وہ جب کھانے سے فارغ ہو کر کمرے میں ٹہل رہا تھا' دروازہ کھلا اور اسے اسد کا چہرا نظر آیا۔ دونوں نے بھاگ کر ایک دوسرے کو گلے لگا لیا۔ اسد نے کہا۔

"تمہیں زندہ سلامت پا کر مجھے ناقابل بیان خوشی ہو رہی ہے۔"

دونوں ایک دوسرے کو اپنے اپنے حالات سے آگاہ کرنے لگے۔ اسد نے اباقہ کو یورق اور علی کی خیریت سے آگاہ کیا اور بتایا کہ غار میں ہونے والی جھڑپ میں راتیل ہلاک ہو گیا تھا۔ اس کی بہن اب ان کے ساتھ ہے۔ جلد ہی ان کی گفتگو کا رخ موجودہ مسئلے کی طرف مڑ گیا۔ اسد نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔

"اباقہ! حالات نے ہمیں ایک نہایت اہم موڑ پر لا کھڑا کیا ہے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ رئیس اعظم کنیاز یوری کو اس طرح تمہیں شہزادی نتاشا کے رشتے کی پیش کش کرنا پڑے گی۔ کوئی اور شخص ہوتا تو اسے اپنے لیے نادر اعزاز سمجھتا' مگر میں جانتا ہوں تمہیں اس حیران کن پیش کش پر کوئی مسرت نہیں ہوئی اور تم نے پیش کش کو ٹھکرا دیا ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں اس کی وجہ کیا ہے' تم مارینا سے بے وفائی نہیں کر سکتے .... مگر اباقہ! وقت ہم سے قربانی مانگ رہا ہے۔ ایک عظیم انسان اس وقت آزمائش کے بھنور میں ہے۔ اس کی مدد کر کے تم خود کو عظیم ثابت کر سکتے ہو۔"

اباقہ نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ "اسد! تم بھی یہی کہہ رہے ہو۔"

اسد نے کہا۔ "اباقہ! میں تمہاری کیفیت سمجھتا ہوں' لیکن احوال یہ ہے کہ رئیس اعظم ہی نہیں ہم خود بھی اس وقت ایک سخت امتحان سے دوچار ہیں' اور ہم ہی نہیں بے گناہ شہزادی نتاشا کی زندگی موت بھی اسی سوال کے جواب سے وابستہ ہے۔ تمہیں نہایت سوچ سمجھ کر تحمل ایثار اور فراخدلی سے فیصلہ کرنا ہے۔" اس آراستہ کمرے کی نیم گرم فضا میں اباقہ اور اسد تا دیر مصروف گفتگو رہے۔ اباقہ بخوبی محسوس کر رہا تھا کہ اسد خود بھی نہیں چاہتا کہ اباقہ مارینا سے بے وفائی کرے لیکن حالات و اسباب ان کا ہانکا کر رہے تھے۔ اباقہ کا انکار اس کے ساتھیوں کے لیے تباہ کن ثابت ہو سکتا تھا۔ دوسری طرف بے قصور نتاشا کی بربادی کا اندیشہ بھی اسے کچوکے لگا رہا تھا۔

وہ دو روز اباقہ کے لیے نہایت عذاب ناک تھے۔ وہ فیصلے کی سولی پر تھا اور اندیشوں کے تیر اسے موت کی طرف دھکیل رہے تھے' یہ اس کے جسم کی نہیں اس کے عہد و پندار کی موت تھی۔ دوسری رات پچھلے پہر تک اسد' یورق اور فیرایونت نے علیحدہ علیحدہ اور اکٹھے کئی بار اس سے ملاقات کی۔ وہ ہر طرح اسے قائل کرنے کی کوشش کرتے رہے

لیکن اباقہ نے گھمبیر خاموشی کا پردہ چاک نہیں کیا۔ آخر وہ چلا اٹھا۔ "مجھے تنہا چھوڑ دو۔ خدا کے لیے مجھے اکیلا چھوڑ دو۔" اس وقت اس کے پاس بوڑھا فیرنت بیٹھا تھا۔ وہ گھبرا کر اٹھا اور باہر نکل گیا۔ اباقہ نے مسہری پر نیم دراز ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔ تنہائی پاتے ہی اس کا تھکا ماندہ ذہن غیر محسوس طور پر نیند کی وادی میں اتر گیا۔ اس نے ایک خواب دیکھا۔ ولادی میر کا پر شکوہ حکمران رئیس اعظم کنیاز یوری اپنا دامن پھیلائے اس کے سامنے کھڑا ہے۔ وہ بھیگی آنکھوں سے اباقہ کو دیکھتا ہے اور کہتا ہے۔ "بیٹے! مجھے اپنی رعایا کے سامنے خوار ہونے سے بچالو۔ دیکھو صبح ہونے والی ہے۔ یہ صبح میری ناموس کے آفتاب کو ہمیشہ کے لیے غروب کر دے گی۔"

اباقہ کہتا ہے۔ "نہیں رئیس اعظم' یہ ناممکن ہے۔"

دفعتاً رئیس اعظم کا چہرا تپے ہوئے لوہے کی مانند سرخ ہو جاتا ہے۔ وہ چنگھاڑتا ہے اور مسلح محافظ کسی کو دھکیلتے ہوئے اس کے سامنے لے آتے ہیں۔ اباقہ دیکھتا ہے وہ معصوم علی ہے۔ اس کا جسم عریاں ہے اور وہ سردی میں کسی کمزور میمنے کی طرح کانپ رہا ہے۔ رئیس اعظم ایک کوڑا اٹھاتا ہے اور بے دردی سے علی کو پیٹنے لگتا ہے۔ اس کی کھال ادھڑ رہی ہے۔ وہ چلا رہا ہے۔ "بھائی جان .... بھائی جان۔ مجھے بچالو' میں مر جاؤں گا۔" رئیس اعظم اپنا کوڑا علی کی دبلی گردن میں لپیٹتا ہے اور اسے بل دینے لگتا ہے۔ علی کا دم گھٹ جاتا ہے .... اور وہ مر جاتا ہے۔

اچانک اباقہ ایک کراہ کے ساتھ اٹھ بیٹھا۔ اس کا جسم پسینے سے شرابور تھا۔ دروازہ کھلا اور دو خادم بھاگتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ شاید نیند میں اباقہ زور سے چلایا تھا۔ اس نے حواس درست کیے اور خادموں سے کہا کہ فیرایونت سے کہہ کر اس کے دوست اسد اللہ کو بلایا جائے۔ خادم واپس چلے گئے۔ کچھ دیر بعد اسد کمرے میں داخل ہوا۔ غالباً وہ ابھی اسی رہائش گاہ میں تھا۔ اباقہ نے اسد سے کہا۔

"اسد! تم نے کل کہا تھا کہ نتاشا سے شادی کرنے کے باوجود میں مارینا کو بیوی بنا سکتا ہوں' کیا واقعی یوں ہو سکتا ہے؟"

اسد نے کہا۔ "یقیناً ہو سکتا ہے۔ عورت کی رضامندی اور مرد کی اطمینان بخش مالی حالت کی شرط کے ساتھ ہمارا مذہب مرد کو یہ اجازت دیتا ہے۔"

اباقہ نے کہا۔ "......... لیکن اسد! میں اس دور دراز خطے میں مارینا سے سینکڑوں کوس دور اس کی رضامندی کیونکر حاصل کر سکتا ہوں۔"

اسد نے کہا۔ "ہاں اس وقت یہ ممکن نہیں مگر اباقہ میں تم سے اس بات کا عہد کرتا

ہوں کہ مارینا کے دل میں پیدا ہونے والی ہر بدگمانی کو میں دور کروں گا۔ میں اسے بتاؤں گا کہ تم نے یہ شادی کیسے اور کن حالات میں کی۔ مجھے قوی امید ہے وہ میری معروضات قبول کرے گی۔"

اباقہ نے دریچے سے باہر دیکھا۔ برف گزیدہ سورج کی ٹھٹھری ہوئی نحیف کرنیں شہر کے باسیوں کو ایک مضطرب صبح کی خبر دے رہی تھیں۔ دور کہیں کسی کلیسا کی سہمی ہوئی گھنٹیاں برباد بستیوں اور بے کراں گورستانوں کا نوحہ سنا رہی تھیں۔ اباقہ نے بجھی ہوئی لیکن مضبوط آواز میں کہا۔ "اسد' میرے دوست' میرے بھائی! بوڑھے فیرایونت سے جا کر کہہ دو مجھے یہ شادی منظور ہے۔" اسد نے آگے بڑھ کر اباقہ کو گلے سے لگالیا۔

☆------☆------☆

ماتمی فضا کے باوجود رئیس اعظم کی بیٹی کی شادی کا جشن منایا گیا۔ خوف و ہراس کی حبس میں یہ شادی شادمانی کا ایک جھونکا تھی۔ انسانی فطرت ہے کہ وہ بدترین حالات میں بھی جینا سیکھ لیتا ہے۔ روسی بھی آگ اور خون کے درمیان جی رہے تھے۔ شہزادی نتاشا سفید عروسی لباس میں سہیلیوں کے درمیان بیٹھی آسمانی حور لگ رہی تھی۔ حیا کے بوجھ نے اس کی پلکوں کو یوں جھکایا تھا کہ آنکھوں کے آبگینے مستقل اوجھل ہو کر رہ گئے تھے۔ باریک جالی دار نقاب کے پیچھے اس کا چہرہ چلمن کے عقب میں جلنے والی شمع کی طرح روشن تھا۔ اس کے کنوارے جسم سے مخمور کن خوشبو کے سوتے پھوٹ رہے تھے۔ علی کہیں سے بھاگتا ہوا آیا اور نتاشا کی گود میں جا بیٹھا۔ زرق برق لباس میں وہ ایک چھوٹا سا شہزادہ لگ رہا تھا۔ نتاشا نے اس کا رخسار چوم لیا۔ جواب میں علی نے اس کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ "بھائی جان نے دیکھ لیا تو ناراض ہو جائیں گے۔"

"شیطان۔" نتاشا نے آہستہ سے کہا اور اسے چٹکی کاٹنے کی کوشش کی' لیکن وہ مچھلی کی طرح پھسل کر گرفت سے نکلا اور عورتوں میں گم ہو گیا۔

یہ ایک مسلمان مرد اور عیسائی عورت کی شادی تھی اور اس کی مخصوص رسومات تھیں۔

شادی کے ہنگامے میں دوسرے مہمانوں کے علاوہ ڈیوک بھی موجود تھا۔ وہ سخت افسردہ و ملول دکھائی دیتا تھا۔ اس کا سارا کھیل بگڑ گیا تھا۔ اسے تو توقع تھی کہ نتاشا اور اباقہ کے تعلق کے بارے جان کے رئیس اعظم کا غضب اپنی آخری حدوں کو چھو جائے گا اور اباقہ اس کے ساتھی اور نتاشا سب اس غضب کی آگ میں جل کر راکھ ہو جائیں گے۔ مگر رئیس اعظم نے اس نازک موقع پر تحمل کا ثبوت دیا تھا۔ رہی سہی کسر فیرایونت نے پوری

کر دی تھی اور یہ معاملہ ایسی خوش اسلوبی سے طے ہو رہا تھا کہ ڈیوک کے تن بدن سے چنگاریاں پھوٹنے لگی تھیں .... اس نے کبھی نتاشا سے محبت نہیں کی تھی۔ وہ اپنے دشمن کی بیٹی سے محبت کر ہی نہیں سکتا تھا۔

بہر حال لوگ اسے نتاشا کا منگیتر سمجھتے تھے اور آج وہی نتاشا اس جنگلی کے پہلو میں بیٹھی تھی جس نے اپنی عیاری سے اسے اور اس کی تنظیم کو زبردست نقصان پہنچایا تھا اور ہر قدم پر اس کی مزاحمت کی تھی۔ ڈیوک کا خون کھولنا ایک فطری امر تھا۔ وہ اپنے جسم کے اندر زخمی ناگ کی طرح بل کھا رہا تھا اور وہ اس وقت تک بل کھاتا رہا جب تک شادی کی تقریبات اختتام پذیر نہیں ہو گئیں۔

.... رات اپنے بال کھولے کسی خمار آلود حسینہ کی طرح دبے پاؤں زمین پر اتر آئی تھی۔ چاند نے اس کے استقبال کے لیے گلی کوچوں میں اپنی روشنی کے پھول بکھیر دیے تھے۔ سناٹا خاموشی کی دھن پر سکوت کا ایک ایسا نغمہ بکھیر رہا تھا جسے صرف محبت کرنے والوں کے کان سن سکتے تھے۔ منظر شاہی قیام گاہ کی ایک سجی سجائی خوابگاہ کا تھا۔ پھولوں سے معمور اور نقرئی جھالروں اور پیٹیوں سے مزین خوبصورت بستر پر شہزادی نتاشا کسی شاعر کے حسین ترین خوابوں کی تعبیر بنی بیٹھی تھی۔ اباقہ اپنے عروسی لباس میں اس سے دو قدم کے فاصلے پر موجود تھا۔ وہ نتاشا سے محبت نہیں کرتا تھا۔ مگر اب وہ اس کی بیوی تھی۔ اس کی قربت اباقہ کے رگ و پے میں ایک عجب طرح کی سنسنی بھر رہی تھی۔ وہ آہستگی سے قدم اٹھا کر مسہری پر آبیٹھا۔ اس کا گلا خشک ہو رہا تھا۔ رزم گاہوں میں دشمن کے چھکے چھڑا دینے والا اور قضائے ناگہانی کی طرح غنیم کی صفوں میں گھس جانے والا نڈر اباقہ اپنی زندگی کے سفر نو کے آغاز پر حواس باختہ تھا۔ نتاشا کے کانچ جیسے نازک اور بلور جیسے رنگین جسم سے قربت کا احساس اسے سوچنے کی صلاحیت سے عاری کر رہا تھا۔ تنگ اور چست عروسی لباس اس کے جسم میں سوئیاں سی چبھونے لگا تھا۔ اسے احساس ہو رہا تھا جیسے یہ لباس آگ کا بن گیا ہے۔ اسے اپنی وہی پرانی صدری اور خستہ زیر جامہ یاد آیا جو ہر موسم اور ہر جگہ اس کے ساتھ رہتا تھا اور جس میں رزم گاہوں کی گرد اور مسافتوں کا پسینہ اس طرح رچ بس گیا تھا کہ لباس کا حصہ بن گیا تھا۔ وہ کمرے کے ایک گوشے میں رکھے اس صندوق کی طرف بڑھا جس میں اس کی ذاتی اشیاء رکھ کر تالا لگا دیا گیا تھا۔ اس نے صندوق کا قفل کھولا اور اندر سے اپنا ڈھیلا ڈھالا لباس نکال لیا۔ لباس کے ساتھ ہی ایک اور چیز بھی صندوق سے نکل کر قالین پر آگری۔ یہ ایک بوسیدہ کاغذ تھا۔ اباقہ نے چونک کر اس کاغذ کی طرف دیکھا اور اس کی تہہ کھول کر دیکھنے لگا۔ اچانک اس کا چہرہ اتھاہ ...

کرب میں ڈوب گیا۔ یہ مارینا کا خط تھا۔ اس کا پہلا اور آخری خط' عراق سے روانگی کے وقت یہ خط اس نے اباقہ کے بستر میں رکھ دیا تھا۔ اباقہ نے بے چینی سے تحریر پر نظریں دوڑائیں۔ الفاظ سنسناتے تیروں کی مانند اس کی آنکھوں کی طرف لپکنے لگے۔ ایک سطر پر آکر اس کی نگاہ جامد ہو گئی۔ وہ پڑھنا نہیں جانتا تھا لیکن اس سطر کو اچھی طرح پہچانتا تھا۔ اس سطر میں مارینا نے لکھا تھا۔

"اباقہ! میں ایک کمزور عورت ہوں۔ تمہیں مجھ سے کوئی بھی چھین سکتا ہے' لیکن میں ایک مضبوط عورت بھی ہوں مجھے تم سے کوئی نہیں چھین سکتا۔" اباقہ کی پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہونے لگے۔ یہ اس آتشدان کی گرمی نہیں تھی جو خوابگاہ کے ایک گوشے میں جل رہا تھا۔ یہ نتاشا کے حسن بلاخیز کی حدت بھی نہیں تھی۔ یہ تپش اور جلن اس پیمان کی تھی جو اباقہ نے کبھی قراقرم کی بے سہارا شہزادی سے باندھا تھا۔ وہ بے قرار ہو کر حجلہ عروسی سے باہر نکل آیا اور زینے طے کر کے محل کی چھت پر چلا آیا۔ پہلے عشرے کی چاندنی چٹکی ہوئی تھی۔ جنوب سے آنے والی یخ بستہ ہوا جسم سے آرپار ہو رہی تھی۔ دور دیس سے آنے والی یہ ہوا اس کے اندر کی آگ کو اور بھڑکا گئی۔ اسے اس ہوا کے دوش پر مارینا کی سسکیاں سنائی دیں۔ وہ موسم کی خنکی سے بے پرواہ دونوں ہاتھ سینے پر باندھے خاموش کھڑا رہا۔ خاموش اور آزردہ خاطر۔ بہت دیر اسی طرح گزر گئی۔ دفعتاً وہ چونک کر رہ گیا۔ گھڑ سواروں کا ایک دستہ سرپٹ گھوڑے بھگاتا شاہی قیام گاہ کی طرف آ رہا تھا۔ ان کا انداز کسی خطرے کی نشاندہی کر رہا تھا۔ جب وہ قیام گاہ کے عین سامنے پہنچا تو اباقہ کو معلوم ہوا کہ وہ شاہی فوج کے سپاہی ہیں' لیکن جس منظر نے اباقہ کو زیادہ حیران کیا وہ یہ تھا کہ سپاہیوں کے ہمراہ ایک عورت بھی تھی۔ اس کے جسم میں میلا کچیلا لباس تھا اور گندے بال شانوں پر بکھرے تھے۔ وہ نوجوان تھی اور شکل کے اعتبار سے اسے قبول صورت کہا جا سکتا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے تھے اور اسے ایک قیدی کی حیثیت سے لایا جا رہا تھا۔ معاملہ خاصا اہم دکھائی دیتا تھا۔ اباقہ زینے اتر کر نیچے آیا تو مسلح سپاہی عورت کو رئیس اعظم کے حضور پیش کرنے کے لیے اندر لا چکے تھے۔ وہ مسلسل چیخ رہی تھی اور سپاہیوں سے زور آزمائی میں معروف تھی۔ اباقہ کے پوچھنے پر دستہ سالار نے جو ایک یک ہزاری سردار تھا' بتایا کہ اس عورت کو ایک مرد کے ساتھ شہر کے مضافات سے گرفتار کیا گیا ہے۔ یہ دونوں بھیک منگوں کے بھیس میں شہر کی طرف آ رہے تھے۔ سپاہیوں نے انہیں للکارا تو دونوں مقابلے پر اتر آئے۔ مرد تو موقعے پر ہلاک ہو گیا' لیکن اس عورت کو کافی جدوجہد کے بعد گرفتار کر لیا گیا۔ شبہ کیا جا رہا تھا کہ یہ منگول فوج کے جاسوس

اس گفتگو کے دوران رئیس اعظم بھی شب خوابی کے لباس میں موقعے پر پہنچ گئے۔ ی افسر اس معاملے کو بہت اہمیت دے رہے تھے ورنہ اس وقت رئیس اعظم کو بے ام نہ کیا جاتا۔ رئیس اعظم کی موجودگی میں منگول عورت سے پوچھ گچھ شروع ہوئی۔ ہر سوال کے جواب میں چیختی رہی یا ہذیانی قہقہے لگاتی رہی۔ ایک سپاہی نے اسے تھپڑ ۔ تو اس نے بے خوفی سے اس کے منہ پر تھوک دیا اور چلا کر بولی۔

"سفید چمڑی والے بدبخت جانورو' تمہارے ذبح ہونے کا وقت آگیا ہے۔ عنقریب تم ے گردنوں کو منگولوں کی تلواروں کے نیچے پاؤ گے۔ تمہاری عورتیں' صحرائے گوبی کے ں سے عزت اور رحم کی بھیک مانگ رہی ہوں گی۔"

موقعے پر موجود کسی کو عورت کی منگول زبان سمجھ نہیں آئی' لیکن اباقہ نہ صرف جا بلکہ جان بھی گیا کہ یہ عورت کسی عظیم خطرے کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ اس کے سے بھنچ گئے اور چہرا زلزلوں کی آماجگاہ بن گیا۔ غصے سے بے قابو ہو کر وہ آگے بڑھا اور ں کا زناٹے دار تھپڑ عورت کے رخسار پر پڑا۔ یہ ایک وحشی کا تھپڑ تھا اور اس میں ات' نفرت انتقام اور غضب بے پناہ طاقت کی صورت میں یکجا ہو گئے تھے۔ عورت جو ں مرد کی طرح لمبی تڑنگی اور مضبوط تھی۔ اس ضرب کو نہ سہہ سکی اور اچھل کر رئیس لم کے قدموں میں گری۔ اس کا گال پھٹ گیا تھا اور خون چہرے کو رنگین کر رہا تھا۔ ۔ سے کو وہ بھونچکی رہ گئی۔ پھر ایک بلند ہذیانی قہقہہ لگا کر بولی۔

"قسم لازوال آسمان کی باتو خاں میرے اس خون کے بدلے تمہارے شہر میں خون کی ں بہا دے گا۔"

اباقہ نے اس کی دھمکی نظر انداز کرتے ہوئے' رئیس اعظم کو مخاطب کیا اور ترکی بولا۔ "رئیس اعظم! فوج کو تیار کیجئے' منگول کسی بھی لمحے شہر کے دروازوں پر دستک ینے والے ہیں۔"

رئیس اعظم اور سپاہیوں کے چہروں پر بے پناہ حیرت نظر آئی۔ رئیس اعظم نے کہا۔ ٹے! یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ہماری اطلاعات کے مطابق آج صبح شہر سے سو کوس دور تک ل لشکر کی موجودگی کے آثار نہیں تھے۔"

اباقہ نے کہا۔ "گستاخی معاف رئیس اعظم' اہل روس کے تخمینوں کی یہی غلطی سا ہزیمت سے دو چار کر رہی ہے۔ آپ منگولوں کی پیش قدمی کا اندازہ اپنی سپاہ کی نہ حرکت سے کیوں لگاتے ہیں۔ آپ کے سپاہی انسان ہیں لیکن آپ کے مدمقابل وحشی

ہیں۔ وہ گھوڑوں کی ننگی پیٹھوں پر سفر کرتے ہیں اور بھاگتے گھوڑوں پر اپنی نیند پوری کر سکتے ہیں۔ انہیں کھانا پکانے اور کھانے کا وقت بھی درکار نہیں ہوتا۔ وہ محو سفر جانوروں کی پیٹھ میں خنجر گھونپتے ہیں اور منہ لگا کر خون پی جاتے ہیں........ اگر یہ منحوس عورت یہاں موجود ہے تو اس کا ایک ہی مطلب ہے۔ منگول لشکر کا ہراول آپ کی چوکیوں کو پیوند خاک کرتا شہر کی طرف بڑھ رہا ہے۔"

رئیس اعظم سمیت ہر شخص کا چہرہ خوف سے برف کی مانند سپید ہو گیا۔ رئیس اعظم نے کہا۔ "پھر ہمیں کیا کرنا چاہیے۔"

اس سے پہلے کہ اباقہ رئیس اعظم کے اس بے معنی سوال کا کوئی جواب دیتا، راہداری میں دندناتے قدموں کی آوازیں آئیں اور ہراساں چہروں کا ایک ہجوم اباقہ کے سامنے آگیا۔ ان میں سب سے آگے رئیس اعظم کا ایک معتمد سالار اور دست راست دورودژ تھا۔ اس نے تعظیمی تکلفات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے کہا۔

"رئیس اعظم! غضب ہو گیا۔ منگول ہمارے شہر پر اچانک حملہ بولنے کے لیے آگے بڑھے رہے ہیں۔ ان کے کچھ ہراول دستوں نے ہماری نواحی چوکیوں کو تاراج کر دیا ہے۔" دورودژ بری طرح ہانپ رہا تھا۔ اس کے ساتھ کچھ اور عسکری مشیر اور سردار بھی تھے۔ ڈیوک ان میں سب سے نمایاں نظر آرہا تھا۔

رئیس اعظم کی نگاہ انتخاب سب سے پہلے اس پر پڑی۔ انہوں نے کہا۔ "ڈیوک! اس صورت حال میں تمہاری کیا رائے ہے' ہمیں قلعہ بند رہنا چاہیے یا باہر نکل کر دشمن کو دعوت مبارزت دینی چاہیے۔"

اس سے پہلے کہ ڈیوک اپنے مخصوص دھیمے انداز میں کوئی رائے دیتا۔ اباقہ کی آواز کمرے میں گونج کر رہ گئی۔ وہ چیخ کر بولا۔ "نہیں رئیس اعظم یہ شخص مشورے کے قابل نہیں۔ میں آپ کو پہلے بھی بتا چکا ہوں۔ خدا کے لیے اعتبار کیجئے۔ یہ شخص........ یہ شخص غدار ہے۔ دلاور میر کے لاکھوں انسانوں کے خون میں اس ملعون کا ہاتھ بھی ہے۔"

اباقہ نے ڈیوک کے لیے نہایت سخت الفاظ استعمال کر دیے تھے۔ کمرے میں موجود ہر شخص کی آنکھوں میں ہراس نظر آنے لگا۔ رئیس اعظم کے چہرے پر سخت ناگواری کے آثار ابھرے لیکن پھر انہوں نے کمال قدرت سے ان پر قابو پایا اور معتدل لہجے میں بولے۔

"اباقہ! تم اور ڈیوک دونوں ہمارے بیٹے ہو۔ ہم ایک بیٹے کی زبان سے دوسرے کے متعلق ایسے الفاظ سننا پسند نہیں کریں گے۔ ڈیوک کے متعلق تمہارا رویہ یقیناً غلط فہمی

پر مبنی ہے۔" اباقہ تلملا کر رہ گیا لیکن منہ سے کچھ نہیں بولا۔ ڈیوک کی گہری اور نیلی آنکھوں میں گہرا سکون تھا' لیکن اس سکون کے پیچھے تباہی اور بربادی کا طوفان امڈا چلا آ رہا تھا........

وہ اطمینان سے بولا۔ "چچا جان! جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں ہماری زیادہ تر فوج فصیل سے باہر دریا کے کنارے پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے۔ پھر یہ فصیل بھی کوئی ایسی مضبوط نہیں لہذا اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کہ ہم کھلے میدان میں دشمن کا مقابلہ کریں یا فصیل کے اندر رہیں۔"

اور واقعی ڈیوک ٹھیک کہہ رہا تھا اس موقع پر شہر میں رہنا یا شہر سے نکلنا ایک برابر تھا۔ یہ مختصر سی شکستہ فصیل نہ تو لشکر کو اپنے اندر سمو سکتی تھی اور نہ تحفظ دے سکتی تھی۔ یہ بالکل صاف ظاہر تھا کوئی معجزہ رونما نہ ہوتا تو دشمن یہاں بھی انہیں آڑے ہاتھوں لینے والا تھا۔

اباقہ نے کہا۔ "رئیس اعظم! دشمن کو الجھانے کے لیے ہراول دستوں کو فوراً دریا کے کنارے کنارے آگے بڑھا دینا چاہیے۔ اس دوران باقی لشکر بھی تیار ہو کر میدان میں آ جائے گا۔"

سردار یورق نے اباقہ کی تائید کی۔ دوسرے سرداروں نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔ رئیس اعظم نے دورودژ سے کہا۔ "ہراول کے تین ہزار سپاہیوں کے ہمراہ تم فوراً کوچ کرو اور منگول ہراول کو روکنے کی کوشش کرو۔" پھر وہ میسرہ اور میمنہ کے سالاروں سے مخاطب ہو کر بولے۔ "تم دونوں فوراً سپاہیوں کو ہتھیار بند ہونے دو اور دریا کے ساتھ جنوب کے رخ پر صفیں ترتیب دو۔" دونوں سالار سر جھکا کر تیز قدموں سے دورودژ کے عقب میں روانہ ہو گئے۔

رئیس اعظم نے اباقہ سے کہا۔ "آج تمہاری شب عروسی ہے لہذا تم جنگ میں حصہ نہیں لوگے۔ اگر تمہارے ساتھی چاہیں تو وہ شریک ہو سکتے ہیں۔"

اباقہ نے ٹھوس اور فیصلہ کن لہجے میں کہا........ "نہیں رئیس اعظم! ایک سپاہی کے لیے میدان میں گزرنے والی رات ہی شب عروسی ہوتی ہے۔ آپ مجھے اپنی کمان میں لڑنے کی سعادت سے محروم نہ کیجئے۔"

رئیس اعظم اباقہ کو اجازت دینے پر آمادہ نظر نہیں آتے تھے۔ کچھ دوسرے سرداروں کا بھی یہی خیال تھا مگر اباقہ کے اصرار پر انہیں اپنا فیصلہ بدلنا پڑا۔ کچھ سوچ بچار کے بعد رئیس اعظم نے اباقہ سے کہا........ "اباقہ' تم اور تمہارے ساتھی لشکر کے قلب میں

ہمارے ساتھ رہیں گے۔ تم میں سے ہر ایک کی کمان میں یک ہزاری دستہ ہو گا۔"

ان تینوں نے تعظیماً سر خم کئے۔ پھر رئیس اعظم جنگی لباس پہننے کے لیے اپنی خیمہ گاہ کی طرف لپکا۔ اباقہ یورق اور اسد بھی دوڑتے ہوئے اپنے اپنے ٹھکانوں کی طرف چلے گئے۔

تھوڑی ہی دیر بعد وہ دریائے سیت کے کنارے اپنے اپنے دستوں کو منظم کر رہے تھے۔ سیت کا برفیلا پانی ایک دھیمی سرسراہٹ کے ساتھ اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھا۔ یوں لگتا تھا وہ اس قیامت سے قطعی بے خبر ہے جو اس کے کنارے برپا ہونے والی ہے۔ یا پھر وہ سب کچھ جانتا تھا......... اور نہایت خاموشی کے ساتھ اس خونی مقام سے آگے نکل جانا چاہتا تھا۔ خشکی پر ہلچل مچی ہوئی تھی۔ گھوڑے ہنہنا رہے تھے۔ ہتھیار چمک رہے تھے۔ سردار اپنے اپنے سپاہیوں کو آوازیں دے رہے تھے۔ نفسا نفسی کا عالم تھا۔ چہرے پر سراسیمگی اور عجلت نقش ہو گئی تھی......... عین اس وقت جب رئیس اعظم اپنی سپاہ کی صف بندی کر رہے تھے۔ سرپٹ دوڑتے گھوڑے خیمہ گاہ کی طرف بڑھے۔ قریب پہنچے تو معلوم ہوا یہ دورو ژ اور اس کے سپاہی ہیں۔ دورو ژ چلتے گھوڑے سے جست کر کے اترا اور رئیس اعظم کے سامنے پہنچ گیا اس کے چہرے پر خون کے چھینٹے تھے۔ آہنی خود کا ایک حصہ پچکا ہوا تھا۔ کمر جھکا کر وہ ہراساں لہجے میں بولا۔

رئیس اعظم' آپ پر جان قربان۔ ہمیں منگولوں نے گھیرے میں لے لیا ہے۔"

رئیس اعظم نے پوچھا۔ "وہ کتنی دور ہیں؟"

دورو ژ نے جواب دینا چاہا لیکن پھر خاموش ہو کر جنوب کی سمت دیکھنے لگا۔ اب جواب دینے کی ضرورت باقی نہیں تھی۔ روشن نقطوں کا ایک سیلاب نشیب سے برآمد ہو کر پڑاؤ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ خونی افق سے خونی لشکر نمودار ہو رہا تھا۔ ہوا کے دوش پر تیرتی ان کی ہزار ہا چیخیں ایک زہریلی گنگناہٹ کی طرح سنائی دے رہی تھیں۔ جیسے شب تاریک میں دور کہیں جنگل میں بھیڑیوں کا غول چیخ رہا ہو۔ ہاں وہ بھیڑیے ہی تھے جو گوبی کے صحرا سے سیر کے لیے نکلے تھے اور انسانی آبادیوں کے خون نے انہیں آدم خور بنا دیا تھا.........

ایک پُر ہول دہشت رئیس اعظم کنیازیوری کی سپاہ پر طاری ہو رہی تھی۔ انہوں نے وحشی منگولوں کے متعلق جتنی کہانیاں سنی تھیں۔ وہ ان کے ذہنوں سے نکل کر ان کے رگ و پے میں سرایت کر رہی تھیں۔ جسموں میں دوڑتا خون دھیرے دھیرے اپنی حدت کھو رہا تھا۔ فوج کے سالار چیخ چیخ کر صف بندی کا حکم دے رہے تھے مگر کچھ تاریکی اور کچھ بد حواسی میں یہ کام مشکل تر ہو گیا تھا......... اور پھر وقت ختم ہو گیا۔ طبل جنگ بج اٹھا

منگولوں کے ہراول دستے سر پر پہنچ گئے۔ جو تھوڑی بہت صف بندی ہوئی تھی وہ بھی ناپید ہو گئی اور روسی فوج ایک ہجوم کی طرح منگول دستوں سے بھڑنے پر مجبور ہو گئی۔ منگول اتنی رفتار اور تنظیم سے پہنچے تھے کہ پہلے ہی ہلے میں دور تک روسی فوج میں گھس گئے۔ پھر وہ دو حصوں میں تقسیم ہوئے اور دائیں بائیں پہلو سے روسیوں کا صفایا کرنے لگے۔ یورق اور اسد بھی باقی سپاہ کی طرح اپنے دستوں کو منظم کرنے میں ناکام رہے تھے۔ ہاں البتہ اباقہ نے ڈھائی تین سو سپاہیوں کو اپنی کمان میں لے لیا تھا اور اب وہ اس کے اشارے پر حرکت کر رہے تھے۔ رئیس اعظم نے شاید جان بوجھ کر اباقہ کو پچھلی صفوں میں رکھا تھا۔ وہ اس کی زندگی کے لیے کم از کم خطرہ پیدا کرنا چاہتے تھے .... مگر وہ تو خطروں کا شیدائی تھا' اس کی آرزو رہتی تھی کہ مخالف فوج کی طرف سے اٹھنے والی پہلی تلوار اس کی تلوار سے ٹکرائے۔ وہ پچھلی صفوں میں بری طرح پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ ایک پارہ اس کے اندر مچل کر اسے منگول سورماؤں کے رو برو جانے پر مجبور کر رہا تھا۔

.... لشکر کی ترتیب تو بگڑ ہی چکی تھی۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو ہمراہ لیا اور دل ہی دل میں منگولوں کو للکارتا ہوا دریا کی جانب بڑھا۔ یہاں منگول حملہ آوروں کا زور تھا اور روسی سپاہی کٹ کٹ کر پانی میں گر رہے تھے۔ وہ پست حوصلہ روسی سپاہیوں کے درمیان سے گزرتا ہوا عین منگولوں کے سامنے جا پہنچا۔ نعرہ تکبیر کی پُرجوش صدا کے ساتھ اس نے ایسا بھرپور حملہ کیا کہ منگول ٹھٹک کر رہ گئے۔ یہ منگول دستہ جو مبازرت میں مار دھاڑ کرتا کافی آگے نکل آیا تھا۔ اباقہ نے ایسی چال چلی کہ پلک جھپکتے میں اسے باقی لشکر سے کاٹ کر رکھ دیا۔ منگولوں نے واپسی کا راستہ مسدود پایا تو حواس باختہ ہو گئے۔ کہاں وہ جارحیت کی انتہا کو چھو رہے تھے اور کہاں اب اپنی جان بچانے کا سوچ رہے تھے۔ شوق شکار میں وہ خود نشانے پر آگئے تھے۔ اب ان کے پیچھے دریا تھا اور تین اطراف اباقہ کے سپاہی۔ ان کے پنج صدی سردار نے ایک زوردار جنگی نعرے کے ساتھ اباقہ کا گھیرا توڑنا چاہا مگر ناکام رہا۔ اباقہ اس کے مقابل آیا دونوں میں زبردست جدوجہد ہوئی۔ آخر سردار کے پاؤں اکھڑ گئے۔ وہ خود کو اباقہ کے تابڑ توڑ حملوں سے بچاتا بچاتا گھوڑے سمیت دریا میں جا گرا۔ ایک سپاہی نے لپک کر اپنا نیزہ اس کے سینے میں ترازو کر دیا۔ اس دوران دریا کے اس حصے پر منگولوں کا دباؤ ایک دم بڑھ گیا۔ شاید وہ اپنے محصور دستے کو بچانا چاہتے تھے۔ مگر محصورین میں سے بیشتر اپنے انجام کو پہنچ چکے تھے۔ اباقہ نے جب دشمن کو زور پکڑتے دیکھا تو اپنے سپاہیوں کو حفاظت سے پیچھے ہٹاتا لشکر سے آملا۔ اس مختصر سے معرکے میں کم و بیش دو سو منگول جہنم واصل ہوئے جبکہ اباقہ کے دستے کے صرف آٹھ سپاہی مارے گئے۔

بد نظمی کے سبب قلب کے ہراول کو منگول حملے سے زبردست نقصان پہنچا تھا۔ روسی فوج کے اس بہترین حصے کو منگولوں نے آٹھ دس جتھوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ ہر جتھا انفرادی طور پر اپنی بقاء کی جنگ میں مصروف تھا۔ ان جتھوں میں روس کے نامور بہادر اور جنگجو شامل تھے۔ ہتھیار ڈالنا یا کٹ مرنا ان کے لیے ایک برابر تھا۔ اس لیے وہ ہتھیار نہیں ڈال رہے تھے۔ لڑ کر مر رہے تھے وہ بار بار جنگی نعرے بلند کرتے اور ٹولیوں کی صورت میں دشمن پر جا پڑتے۔ اندھا دھند تلوار چلاتے رہتے یہاں تک کہ منگول ان کے جسموں کو کاٹ کر ان کے سر نیزوں پر بلند کر دیتے۔ کیسے کیسے چھبیلے جوان' کیسے کیسے خوبرو بیٹے اور محبوب شوہر اپنی مٹی کی حرمت پر قربان ہو رہے تھے۔ رئیس اعظم خود بھی جسم و جان کی پوری قوت سے لڑ رہے تھے۔ ان کی تلوار برق آسمانی کی مانند منگولوں کے سروں پر گر رہی تھی۔ بالآخر وہ اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ منگول سپاہیوں کا گھیرا توڑنے میں کامیاب ہو گئے اب ان کے سامنے ایک چھوٹا سا ٹیلا تھا۔ اس ٹیلے کا چکر کاٹ کر وہ اپنے لشکر کے میسرہ کے ساتھ مل سکتے تھے۔ انہوں نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور اپنے ساتھیوں کو پکارتے ہوئے ٹیلے کی طرف لپکے۔ یکایک ان کے پہلو سے ایک نیزہ آیا اور زرہ توڑتا ہوا پسلیوں میں گھس گیا۔ رئیس اعظم کے ہونٹوں سے ایک آہ نکلی۔ انہوں نے خود کو گھوڑے پر سنبھالنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے اور برف پر گر پڑے۔ ان کے ساتھی تاریکی اور افراتفری کے سبب اس حادثے سے بے خبر رہے تھے۔ رئیس اعظم کی اذیت دو گنا ہو گئی کہ وہ ان کی فوج کا ہی کوئی سالار تھا۔ نیم تاریکی میں اس کی وردی چیخ چیخ کر اس کربناک حقیقت کا اعلان کر رہی تھی کہ رئیس اعظم اپنوں کے ہاتھوں جان گنوا رہے ہیں۔ حملہ آور ان کے سر پر پہنچا اور ایک گھٹنا زمین پر ٹیک کر بیٹھ گیا اس کا چہرہ آہنی خود میں پوشیدہ تھا۔ رئیس اعظم اکھڑی ہوئی سانسوں میں بولے۔

"اے بدبخت! کون ہے تو؟"

حملہ آور نے ایک لمحہ توقف کیا۔ پھر اپنا خود چہرے سے ہٹا دیا۔ رئیس اعظم کی دھندلائی ہوئی نظریں اس کے چہرے پر مرکوز کیں اور سکتے میں رہ گئے۔ وہ ڈیوک تھا۔ وہی ڈیوک جسے وہ اپنے سگے بیٹوں کی طرح سمجھتے تھے۔ جس کے مشوروں کو وہ آنکھیں بند کر کے تسلیم کرتے تھے اور جس کی وفاداری پر ان کا ایمان تھا۔

"تت .... تم؟" وہ دنیا جہاں کی حیرت لہجے میں سمیٹ کر بولے۔

"ہاں میں۔" ڈیوک نے پر خباثت سرگوشی کی۔ اس کی نیلی آنکھیں اندرونی غضب سے روشن تھیں۔ باریک ہونٹوں سے بے رحم مسکراہٹ چپکی ہوئی تھی۔ وہ اپنا خنجر [illegible]

ہوا پُراسرار لہجے میں بولا۔

"تجھے یاد ہے کنیاز یوری! آج سے پندرہ برس قبل "کیف" کے سب سے بڑے بازار میں ایک مظاہرہ ہوا تھا۔ مظاہرین اپنا وہی پرانا مطالبہ دوہرا رہے تھے کہ دارالحکومت "ولادی میر" نہیں "کیف" ہونا چاہیے۔ یہ ایک عام سا مظاہرہ تھا لیکن .... تو نے اسے اپنی غیر معمولی سفاکی سے خاص بنا دیا۔ لوگ اس مظاہرے کو مدت تک نہ بھول سکے۔ تو نے نہتے مظاہرین پر وحشیانہ تشدد کیا اور ان میں سے تین کو موقعہ پر ہلاک کر دیا........... ان تینوں مقتولین میں سے ایک میرا بڑا بھائی تھا۔ میری ماں کو اس سے بہت پیار تھا۔ وہ اس کی موت کی خبر سن کر ہی مر گئی تھی۔ میری عمر اس وقت صرف بارہ برس تھی۔ میں نے بھائی اور ماں کی لاش پر کھڑے ہو کر قسم کھائی تھی کہ ایک روز ان کے قاتل سے انتقام ضرور لوں گا۔ رئیس اعظم! یہ انتقام میرے ساتھ ساتھ جوان ہوا ہے۔ میں نے اس انتقام کو دن کے چین اور راتوں کی نیند سے سینچا ہے۔ اب یہ طاقتور ہو گیا ہے۔ اتنا طاقتور کہ تیرے پورے خاندان کی لاشیں گرا کر بھی اس کی تسکین نہیں ہوگی۔ اب یہ تجھے مارے گا........... اور پھر تیری بیٹی نتاشا کو........... اور اگر پھر بھی تیرے نام کو آگے چلانے والا کوئی فرد زندہ بچا تو وہ اسے بھی ڈھونڈ نکالے گا۔"

رئیس اعظم سناٹے کے عالم یہ سب کچھ سن رہے تھے۔ ان کا ڈوبتا ہوا ذہن کی ماضی کے گردابوں میں چلا گیا تھا۔ ڈیوک نے انہیں جو کچھ یاد دلایا تھا وہ ان کی آنکھوں کے سامنے آ گیا تھا۔ پندرہ برس پہلے کیف کے اس بازار میں انہوں نے تین آدمیوں کو قتل کیا تھا' لیکن ان کا قصور صرف یہ نہیں تھا کہ وہ مظاہرے کر رہے تھے۔ وہ ایک بے کس انسان کو اذیتیں دے دے کر موت کے گھاٹ اتار رہے تھے۔ مظاہرے کے دوران انہوں نے اپنے مخالف کو پکڑ لیا تھا جس پر انہیں شبہ تھا کہ وہ جاسوسی کرتا ہے اس شبہ کی بنیاد پر انہوں نے اسے چوراہے میں گرا لیا تھا اور نوکیلی سلاخوں سے اس کا جسم چھید رہے تھے۔ وہ چیخ رہا تھا اور مدد کے لیے پکار رہا تھا۔ اس وقت کنیاز یوری نے جو ایک دستے کا سالار تھا' مردانہ وار آگے بڑھ کر مظاہرین کو منتشر کیا تھا اور جاں بلب شخص کو درندہ صفت افراد کے چنگل سے نکالا تھا۔ اس کارروائی میں دو تین افراد ہلاک ہوئے تھے...........

خیالوں کے گرداب سے نکل کر کنیاز یوری نے ایک بار پھر غور سے ڈیوک کا چہرہ دیکھا جیسے یقین کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ کیا ان کا قاتل یہی آستین کا سانپ ہے۔ ڈیوک کے چہرے پر مسکراہٹ بدستور قائم تھی .... بتدریج یہ مسکراہٹ رئیس اعظم کی نظروں میں دھندلانے لگی۔ شاید تاریکی ایک دم بڑھ گئی تھی یا شاید ان کی آنکھوں میں

کرتا ہوا دوسرے کنارے پر پہنچ ہی گیا۔ خشکی پر آکر اس نے شیزی کا بے حرکت جسم کندھے پر لادا اور ٹیلوں کی طرف بڑھنے لگا۔

جان بچا کر دریا پار کر آنے والے خوش قسمت فوجی ان ٹیلوں میں جابجا نظر آرہے تھے۔ کچھ شدید زخمی حالت میں پڑے کراہ رہے تھے۔ یورق جانتا تھا ابھی کچھ ہی دیر میں منگول دستے بھی کشتیوں میں دریا پار کر آئیں گے اور روسی سپاہیوں کی تلاش شروع کر دی جائے گی۔ وہ جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ کوئی دو فرلانگ تک وہ اسی طرح بھاگتا چلا گیا پھر ایک جگہ اس نے شیزی کو اوندھا لٹا کر اس کے شکم سے پانی نکالا۔ اس کا تنفس معمول پر آگیا مگر بے ہوشی میں افاقہ نہیں ہوا۔ وہ پھر آگے بڑھنے لگا۔ دریا سے قریباً دو کوس آگے یورق کو پناہ کے لئے ایک نہایت محفوظ جگہ نظر آئی۔ یوں لگتا تھا جیسے قدرت نے خاص طور پر ان کی مدد کی ہے۔ یورق کو اس جگہ کا پتہ اتفاقاً ہی چلا۔ ذرا دم لینے کے لیے وہ کوئی مناسب جگہ دیکھ رہا تھا کہ اس کی نگاہ برف میں نظر آنے والے ایک سیاہ دھبے پر پڑی۔ اس نے دھبے کو ہاتھ سے چھوا تو وہ لکڑی کا ایک تختہ تھا۔ معاً یورق کو احساس ہوا کہ تختہ اپنی جگہ سے حرکت کر سکتا ہے۔ اس نے دباؤ ڈالا تو تختہ اندر کی طرف کھل گیا۔ وہ ایک کھڑکی تھی۔ اندر سے یورق کو شراب، گندم اور سڑے ہوئے پھل کی ملی جلی خوشبو آئی تو وہ یہ سوچ کر حیران رہ گیا کہ برف میں کوئی گھر ہے؟ اس نے شیزی کو ایک ہموار جگہ لٹایا اور کھڑکی کے راستے اندر داخل ہونے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کے پاؤں کافی دیر فضا میں معلق رہے آخر کسی چیز کے سہارے وہ اندر اترنے میں کامیاب ہو گیا۔ پاؤں کے نیچے فرش ڈھلوان تھا۔ دفعتاً اس کا سر کسی چیز سے ٹکرایا۔ اس نے ٹٹولا۔ یہ دیوار میں اڑسی ہوئی ایک مشعل تھی۔ یورق کو خیال آیا کہ عموماً دیا سلائیاں مشعل کے قریب ہی رکھی جاتی ہیں۔ وہ اندھوں کی طرح چاروں طرف ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ کافی کوشش کے بعد وہ دیا سلائی اور تیل ڈھونڈنے اور مشعل روشن کرنے میں کامیاب رہا روشنی ہوتے ہی اس کی آنکھیں حیرت سے وا رہ گئیں۔ یہ ایک مکمل کمرہ تھا۔ بستر، الماریاں، آتشدان، دروازے سب کچھ موجود تھا۔ مگر ہر چیز ایک خاص زاویے سے ترچھی تھی۔ مطلب یہ کہ پورا کمرہ اپنے پہلو پر جھکا ہوا تھا۔ اس جھکاؤ سے کھڑکی اوپر آگئی تھی اور یورق جب اندر داخل ہوا تھا تو اسے فرش ڈھلوان لگا تھا۔ اس کا شبہ یقین میں بدل گیا کہ یہ چھوٹا سا مکان کسی برفانی تودے کی زد میں آیا ہو گا۔ ایک عرصہ یہ سب کچھ برف میں دبا رہا تھا اور اب بالائی برف پگھلنے کے سبب مکان کی کھڑکی کچھ حصہ نمودار ہوا تھا۔ یورق نے دیکھا یہاں ضروریات زندگی کی بیشتر اشیاء موجود تھیں۔ اس کے ساتھ ہی اسے خیال آیا کہ یہاں کوئی

مکین بھی رہا ہو گا اس نے تشویشناک نظروں سے اردگرد دیکھا۔ تب اس کی نگاہ ایک طرف اٹھی اور وہ ٹھٹک گیا۔ ایک الٹی ہوئی الماری کے نیچے ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ دبا پڑا تھا۔ لباس اور بالوں سے یورق نے اندازہ لگایا کہ یہ کوئی دیہاتی عورت رہی ہو گی جو شاید پچھلے موسم میں اپنے خاوند کی کھیتوں میں روانگی کے بعد حادثے سے دوچار ہوئی اور یہیں دفن ہو گئی۔ یورق کمرے کا اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد باہر گیا اور تھوڑی سی تگ و دو کے نتیجے میں شیزی کو اندر لے آیا۔ سب سے پہلے اس نے الماری کے نیچے سے عورت کا ڈھانچہ نکالا اور اسے ٹھکانے لگانے کا سوچنے لگا۔ کمرے میں ایک بغلی دروازہ دکھائی دے رہا تھا۔ یورق نے دروازہ کھولا تو ایک چھوٹا سا کباڑ خانہ نظر آیا۔ شاید یہ اس گھر کا مطبخ تھا۔ اس کی چھت گر چکی تھی اور برف اندر داخل ہو گئی تھی۔ یورق نے عورت کا ڈھانچہ یہاں پھینک کر دروازہ بند کر دیا۔ تب اس نے آگ جلانے کا انتظام کیا۔ آتش دان موجود تھا مگر اس میں آگ جلا کر وہ کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ ممکن تھا دھات کی بنی ہوئی چمنی گرم ہو کر برف کو پگھلا دیتی۔ اس نے آتشدان سے لکڑیاں لے کر کمرے کے درمیان آگ جلائی۔ اس عذاب ناک سردی میں یہ آگ دنیا کی حسین ترین نعمت محسوس ہو رہی تھی مگر اس نعمت سے لطف اندوز ہونے کا خیال یورق کے دل میں تب ہی آسکتا تھا کہ شیزی ہوش میں آجاتی۔ اس کے کپڑے گیلے اور حالت تشویشناک تھی۔ یورق کے سامنے اب ایک نہایت مشکل مرحلہ تھا، وہ منگول ضرور تھا لیکن ذاتی طور پر شریف النفس تھا۔ اپنی بیوی کی وفات کے بعد اس نے عورت ذات کے بارے میں سوچنا ہی چھوڑ دیا تھا اور اب تو وہ ویسے بھی اسلام قبول کر چکا تھا۔ شیزی کی زندگی بچانے کے لیے اس کا لباس تبدیل کرنا ضروری تھا اور یہ کام یورق ہی کو کرنا تھا۔ اس نے اٹھ کر گری ہوئی الماری کی تلاشی لی۔ ایک خانے سے مختلف زنانہ لباس برآمد ہوئے۔ وہیں ایک کمبل بھی پڑا ہوا ملا۔ یورق نے مشعل گل کی اور دل کڑا کر کے شیزی کو بھیگے لباس سے نجات دلائی۔ پھر اس کا جسم کمبل میں لپیٹ دیا۔ تب وہ مطبخ میں داخل ہوا اور خشک راشن ڈھونڈنے لگا۔ جلد ہی اسے مطلوبہ اشیاء مل گئیں۔ آگ کی حدت سے کمرہ اب خاصا گرم ہو چکا تھا۔ اس نے ایک برتن لیا اور کھانا پکانے میں مصروف ہو گیا۔ آگ کی لو شیزی کے چہرے پر منعکس ہو رہی تھی۔ اس کے چہرے کی نیلاہٹ بتدریج سفیدی اور سرخی میں ڈھل رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے چہرے کی فطری دلکشی نمایاں ہو رہی تھی۔

☆--------☆--------☆

اسد نے بروقت پہنچ کر رتاشا اور علی کو شاہی رہائش گاہ سے نکال لیا تھا۔ علی کو اس

روشنی کم ہو رہی تھی۔ وہ سمجھ گئے کہ آخری وقت آگیا ہے "یاخدا رحم" ان کے ہونٹوں سے نکلا۔ وہ اپنے ہونٹوں سے نکلی ہوئی آواز نہیں سن سکے۔ یا ہو سکتا ہے آواز ان کے ہونٹوں سے نکلی ہی نہ ہو۔ میدان جنگ کا ساعت شکن شور اب کہیں دور سے آتا محسوس ہو رہا تھا.......... اچانک یہ شور تھم گیا۔ یکسر خاموشی چھاگئی۔ ایک ٹھنڈی لہر رئیس اعظم کے بدن میں اتری اور وہ ایک گہرے .... بہت گہرے یخ بستہ کنویں میں اترتے چلے گئے۔ اس وقت قریب بیٹھے ڈیوک کی آنکھوں میں شیطانی چمک ابھری۔ اس کے ہاتھ میں دبے خنجر کا پھل مدھم چاندنی میں چمک رہا تھا۔ اس نے مردہ رئیس اعظم کے سنہری بال مٹھی میں جکڑے اور ان کا سر تن سے جدا کر دیا۔

☆ ☆ ☆

جنگ رئیس اعظم کے لیے ختم ہو چکی تھی اور ان سب کے لیے ختم ہو چکی تھی جو میدان جنگ میں زندگی کی بازی ہار چکے تھے۔ مگر جو زندہ تھے ان کے لیے ابھی جنگ جاری تھی۔ دریائے سیت کے کنارے منگول آندھی میں دسطی روس کے اقتدار کا چراغ ٹمٹما رہا تھا۔

نیم تاریک یخ بستہ فضا میں دل ہلا دینے والا قتل عام ہو رہا تھا۔ خیموں کی آگ دریائے سیت کے پانیوں میں منعکس ہو رہی تھی اور اس کے شعلوں میں منگولوں کی قاتل تلواریں چمک رہی تھیں۔ وہ روسی فوج کا شیرازہ بکھیر چکے تھے اور اب فوج کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں کو گھیر کر ان کا شکار کر رہے تھے۔ میدان جنگ میں اسد نے یورق کو دیکھا اور اس کی طرف لپکتا چلا گیا۔

"اباقہ کا کچھ پتہ چلا؟" اس نے چیخ کر پوچھا۔

"نہیں۔" یورق نے ایک تیر کو ڈھال پر روکتے ہوئے جواب دیا۔ اسد نے اس کے قریب پہنچ کر کہا۔ "میرا خیال ہے مجھے شہزادی نتاشا اور علی کی فکر کرنی چاہیے جنگ کا فیصلہ تقریباً ہو چکا ہے۔"

یورق نے زور سے کہا۔ "ٹھیک ہے تم نتاشا کی طرف جاؤ میں اباقہ کو دیکھتا ہوں۔"

اسد نے کہا۔ "شاید ہم یہیں کہیں مل جائیں۔ اگر نہ ملے تو یاد رکھنا ہماری منزل اب نووو گرود ہے۔"

یورق نے کہا "ٹھیک ہے۔" اور گھوڑے کو ایڑ لگا کر میدان جنگ کے دھوئیں میں روپوش ہو گیا۔ جلتے خیموں اور چھکڑوں کے درمیان گھوڑا بھگاتا وہ اس مقام کی طرف جا رہا تھا جہاں اس نے آخری بار اباقہ کو دیکھا تھا۔ اس کی بے چینی اس کے چہرے سے عیاں

تھی۔ آج اباقہ کی شادی ہوئی تھی اور آج ہی اسے ایک خونی معرکے میں شریک ہونا پڑ گیا تھا۔ یورق نے سوچا۔ "اگر اسے کچھ ہو گیا تو کیا وہ یہ صدمہ برداشت کر سکے گا؟" اس کا دل ڈول کر رہ گیا وہ اسے بیٹوں کی طرح عزیز تھا اور دولہا بنے بیٹے کی لاش کون باپ دیکھ سکتا ہے۔ وہ بے قرار ہو کر اسے آوازیں دینے لگا۔ رزم گاہ کے بلاخیز شور میں یورق کی پاٹ دار آواز ایک گھٹی ہوئی صدا بن کر رہ گئی۔ دفعتاً ایک چیخ نے یورق کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ اس نے گھوم کر دیکھا۔ صرف چند گز کے فاصلے سے ایک لڑکی گھوڑا بھگاتی ہوئی گزر رہی تھی۔ تین منگول گھڑ سوار اس کے تعاقب میں تھے جن کے خوف سے وہ چلا رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ لڑکی دھوئیں کے ایک مرغولے میں روپوش ہو جاتی' یورق اس کے ڈیل ڈول اور اس کے منڈھے ہوئے سر سے پہچان گیا' وہ شیزی کولت تھی' رانیل کی بڑی بہن۔ یقیناً منگول شاہی رہائش گاہ تک پہنچ گئے تھے۔ شیزی کولت وہاں سے اپنی جان بچانے کے لیے بھاگی تھی۔ اس کا مطلب تھا نتاشا کی زندگی بھی خطرے میں تھی۔ یورق نے سوچا خدا کرے اسد اسے اور علی کو بچانے میں کامیاب رہے۔ پھر اس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور سامنے آنے والے ایک منگول پیادے کو جہنم واصل کرتا شیزی کولت کے پیچھے لپکا۔ جلد ہی اس نے اسے دیکھ لیا۔ وہ منگول سپاہیوں سے پیچھا چھڑانے کے لیے سیدھی دریا کی طرف بھاگی جا رہی تھی۔ دریا کے کنارے پہنچ کر اس کا گھوڑا ہنہنایا اور پچھلے پاؤں پر کھڑا ہو گیا۔ شیزی کولت نے جب سپاہیوں کو اپنے قریب پایا تو گھوڑے سے اتر کر دریا میں چھلانگ لگا دی۔ منگول درندوں کے ہاتھوں ذلت اور اذیت کی موت مرنے کی بجائے اس نے عزت کی موت کو ترجیح دی تھی۔ یورق نے یہ سارا منظر ایک جلتے خیمے کی اوٹ سے دیکھا۔ جونہی منگول گھڑ سوار شیزی کی طرف سے مایوس ہو کر دوسری جانب روانہ ہوئے' یورق گھوڑے سے اترا اور بھاگتا ہوا دریا میں کود گیا۔ یخ بستہ پانی اس کے جسم پر خنجروں کی طرح چل گیا۔ "شیزی .... شیزی!" وہ زور سے پکارا مگر کوئی جواب نہیں آیا۔ کچھ دیر بعد جب وہ اس کی طرف سے قریباً ناامید ہو گیا تھا اچانک اس کا ریشمی لبادہ یورق کے ہاتھ میں آگیا۔ وہ بے حس و حرکت تھی لیکن یورق کو توقع تھی کہ وہ ابھی زندہ ہو گی۔ اس نے اسے بازوؤں کے نیچے سے تھام لیا اور ایک ہاتھ سے تیرنے لگا۔ شیزی کی تلاش میں وہ کنارے سے کافی دور آگیا تھا اور اب دونوں کناروں کا فاصلہ تقریباً برابر تھا۔ بہتر یہی تھا کہ اب وہ دوسرے کنارے پر اترنے کی کوشش کرے۔ ایک انسانی زندگی بچانے کے جذبے نے اس کے بوڑھے جسم میں خون کی حرارت کم نہیں ہونے دی۔ حالانکہ وزنی زرہ بکتر اور ہتھیار تیرنے میں سخت رکاوٹ بن رہے تھے۔ پھر بھی وہ شیزی کے ساتھ سرد پانی کو عبور

نے اپنے گھوڑے پر بٹھالیا تھا جب کہ نتاشا دوسرے گھوڑے پر اس کے ساتھ تھی۔ وہ ابھی تک اپنے سفید عروسی لباس میں تھی۔ یہ اور بات ہے کہ اب اس کے مرمریں ہاتھ میں گلدستے کی بجائے تلوار تھی وہ اسد کے پیچھے گھوڑا بھگاتی جلتے خیموں کے درمیان سے گزر رہی تھی۔ ابھی وہ پڑاؤ کے اندر ہی تھے کہ نتاشا کو عقب میں ایک گھڑ سوار سرپٹ آتا دکھائی دیا۔

"اسد!" وہ ہلکی سی آوازی میں چیخی۔

اسد نے مڑ کر دیکھا اور گھوڑے کی رفتار کم کر دی نتاشا اس کے پہلو سے ہوتی ہوئی آگے نکل گئی۔ گھڑ سوار اب کافی نزدیک آچکا تھا۔ اچانک علی نے اسے پہچان لیا۔ "بھائی جان!" وہ خوشی سے چلایا۔ اباقہ نے تلوار لہرا کر اس کی پکار کا جواب دیا۔ جلد ہی وہ تینوں پہلو بہ پہلو گھوڑے بھگا رہے تھے۔ اسد نے محسوس کیا کہ ان کے تعاقب میں کم از کم دو ڈھائی سو گھڑ سوار چلے آرہے ہیں۔ اس نے پریشان نظروں سے اباقہ کی طرف دیکھا تو وہ اطمینان سے بولا۔ "گھبراؤ نہیں! یہ اپنے ہی ساتھی ہیں جنگ میں انہوں نے میری زیر کمان بڑی اچھی کارکردگی دکھائی ہے۔ اب یہ ہمارے ساتھ ہی رہنا چاہتے ہیں۔"

باتیں کرتے کرتے اچانک اباقہ نے گھوڑے کی لگامیں کھینچ لیں۔ وہ غیر محفوظ راستے پر جارہے تھے۔ پڑاؤ کی اس جانب منگول کثیر تعداد میں موجود تھے۔ اباقہ اور اسد نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور رخ بدلنے کا فیصلہ کیا۔ اباقہ نے تلوار لہرا کر عقب میں آنے والے ساتھیوں کو بھی راستہ تبدیل کرنے کی ہدایت کی اور اپنا گھوڑا دریا کی مخالف سمت موڑ دیا۔

وہ ساری رات بغیر رکے سفر کرتے رہے اور دریائے سیت سے پون منزل آگے نکل آئے آخر ان کے گھوڑے سردی اور تھکن سے چور ہو گئے۔ درختوں کے ایک گھنے جھنڈ میں انہوں نے بسیرا کیا۔ ان کے ساتھی سوار بھی گھوڑوں سے اتر آئے اور ہتھیار کھول کر ادھر اُدھر گھاس پر لیٹ گئے۔ مشرق سے ایک دھندلی صبح طلوع ہو چکی تھی۔ فضاؤں کی سوگوار خاموشی کو کبھی کسی پہاڑی پرندے کی کراہتی ہوئی آواز توڑ جاتی تھی۔ دریائے سیت کی جانب سے آنے والی ہواؤں نے اپنے دامن پر بے گور و کفن لاشوں کے نوحے لکھ رکھے تھے۔ انہیں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ ایک ایسے بحری جہاز کے مسافر ہیں جو رات طوفانی لہروں میں گھر کر تختہ تختہ ہو گیا ہے۔ ان کے سینکڑوں ہم سفر عمیق پانیوں کی نذر ہو گئے ہیں اور وہ ایک کشتی پر طوفان کے تھپیڑے سہتے نڈھال و بدحال ایک جزیرے پر آ نکلے ہیں۔ سردی' خوف اور بھوک کے سمندر میں یہ ایک چھوٹا سا جزیرہ ہی تو تھا۔ یہاں وہ

کچھ دیر تازہ دم ہونے کے بعد آگے سفر کر سکتے تھے۔ درختوں کے اس جھنڈ میں اترتے ہی علی اپنے گھوڑوں کے لئے سرسبز شاخیں توڑنے میں مصروف ہو گیا۔ اسد نے خرجین سے خشک گوشت اور بھنے ہوئے چنے نکالے اور برف پر ایک چھوٹا سا دسترخوان لگا دیا۔ اس کام میں نتاشا نے بھی اس کی مدد کی۔ پھر وہ چاروں دسترخوان کے گرد آبیٹھے۔ علی کے سوا کسی نے بھی کھانے کو ہاتھ نہیں لگایا۔ وہ سب پریشان اور غمزدہ تھے۔ نتاشا کو اپنے والد کی فکر تھی۔ اباقہ اور اسد اپنے ساتھی یورش کے بارے پریشان تھے۔ شیزری کولت بھی ان تینوں کو رہ رہ کر یاد آرہی تھی۔ نتاشا نے بتایا تھا کہ شیزری کولت نے اس کے اور علی کے لئے بے مثال قربانی دی ہے۔ منگولوں کے خوف سے وہ تینوں ایک ہی کمرے میں چھپے ہوئے تھے۔ منگول عمارت میں مار دھاڑ کر رہے تھے اور پہریداروں کو چن چن کر قتل کرنے میں مصروف تھے۔ تین منگولوں کی ایک ٹولی اس کمرے تک بھی آن پہنچی جہاں انہوں نے پناہ لے رکھی تھی۔ مگر اس سے پہلے کہ منگول دروازہ توڑ کر اندر داخل ہوتے شیزری نے کھڑکی میں سے چھلانگ لگائی اور منگولوں کو اپنے پیچھے لگاتی اصطبل کی طرف بھاگ نکلی۔ نتاشا نے آنسو بہاتے ہوئے کہا تھا بہت کم امکان ہے کہ وہ منگول سپاہیوں سے بچ سکی ہو۔

کھانا ان کے سامنے پڑا تھا لیکن بھوک اڑ چکی تھی۔ اسد نے کہہ سن کر شہزادی نتاشا کو ایک دو لقمے کھلائے۔ دو دو لقمے ان دونوں نے بھی لئے۔ باقی سب کچھ علی چٹ کر گیا۔ اسے صرف اباقہ سے غرض تھی' اباقہ ان کے ساتھ تھا اب اسے کسی کی فکر نہیں تھی۔ نتاشا نے نظریں جھکائے جھکائے اباقہ سے پوچھا۔

"ابا جان کا کچھ پتہ چلا؟"

اباقہ نے نفی میں سر ہلا دیا۔ وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا لیکن پھر خاموش ہو گیا۔ اسد نے نتاشا کو دلاسا دیتے ہوئے کہا۔ "گھبرائیں نہ شہزادی صاحبہ! مجھے امید ہے وہ محفوظ ہوں گے۔ میں نے ان کے دستے کو جس جگہ لڑتے دیکھا وہاں سے میسرہ بہت قریب تھا۔ غالباً وہ میسرہ میں شامل ہو گئے ہوں گے۔"

نتاشا نے سسک کر کہا۔ "ہم نے تو سنا ہے کہ لشکر کا قلب پورے کا پورا.......... تباہ ہو گیا ہے۔"

اسد نے کہا۔ "شہزادی! ہم بھی تو قلب میں تھے۔ اگر ہم زندہ ہیں تو انشاء اللہ رئیس اعظم بھی حیات ہوں گے۔"

جب نتاشا دسترخوان سمیٹ رہی تھی' اسد اور اباقہ درختوں میں ٹہلنے لگے۔ اباقہ

نے غمزدہ لہجے میں کہا۔ "اسد! رئیس اعظم جنگ میں کام آچکے ہیں۔"

اسد کے لیے یہ اطلاع دھماکہ خیز تھی۔ وہ بے یقینی سے اباقہ کو دیکھنے لگا۔ اباقہ نے جیب سے وہ طلائی صلیب نکالی جس میں ایک نہایت قیمتی پتھر جڑا ہوا تھا اور جو ہر وقت رئیس اعظم کے گلے میں آویزاں رہتی تھی۔ اباقہ نے کہا۔

"یہ دیکھو! اسے میں نے رئیس اعظم کی کٹی ہوئی گردن سے اتارا تھا۔ وہ پتھروں کے درمیان پڑے تھے اور سر غائب تھا۔ میں نے انہیں ان کے مخصوص لباس اور اس صلیب سے پہچانا۔" اسد اور اباقہ دیر تک گم صم کھڑے رہے آخر انہیں اس حقیقت کو تسلیم کرنا پڑا کہ رئیس اعظم اپنے چاہنے والوں کو تنہا چھوڑ کر جا چکے ہیں۔ یہ ایک ہولناک صدمہ تھا۔ خاص طور پر شہزادی کے لیے یہ خبر جانکاہ ثابت ہو سکتی تھی، لیکن اسے یہ سب کچھ برداشت کرنا تھا۔ مشورے کے بعد اسد اور اباقہ نے فیصلہ کیا کہ شہزادی نتاشا سے یہ خبر پوشیدہ نہ رکھی جائے۔ وہ آگ اور خون کے سمندر سے گزر کر یہاں تک پہنچی تھی اور ان مناظر نے اس کے اندر بہت کچھ سننے اور سہنے کا حوصلہ پیدا کر دیا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی اس کیفیت کو بدل جانا تھا۔

اباقہ اور اسد بوجھل قدموں سے نتاشا تک پہنچے۔ وہ علی کا سر گود میں رکھے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھی۔ حسین آنکھیں کسی سوچ میں غلطاں تھیں۔ اباقہ نے ایک بلند درخت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے علی سے کہا کہ وہ گھوڑوں کے لیے کچھ اور شاخیں توڑے۔ علی چلا گیا تو اسد نے نہایت دھیمے اور محتاط لہجے میں یہ اندوہناک خبر نتاشا کو سنا دی۔ وہ پہلے تو سکتے کے عالم میں بیٹھی رہ گئی پھر اس نے باپ کی خون آلود طلائی صلیب دیکھی اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگی .... آج وہ تنہا رہ گئی تھی۔ ماضی خون میں نہا کر برف میں دفن ہو گیا تھا۔ سب پچھلے سہارے ٹوٹ گئے تھے، سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔

دوپہر تک اس جگہ آرام کرنے کے بعد اباقہ اور اسد نے دوبارہ سفر شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ اباقہ اپنے ساتھی سپاہیوں کے پاس پہنچا۔ وہ سب بھی کھانا کھا کر سستا چکے تھے اور اب روانگی کو تیار تھے۔ اباقہ نے انہیں ایک جگہ اکٹھا کیا اور بولا۔

"ساتھیو! کل رات جو کچھ ہوا وہ آپ کے سامنے ہے۔ ہم منگولوں کی کامیابیوں کا سلسلہ منقطع کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ تاہم ہمیں یہ اطمینان ضرور ہے کہ ہم نے جانیں لڑا کر دشمن کا مقابلہ کیا اور آخر وقت تک لڑتے رہے۔ مجھے آپ سب پر فخر ہے۔ جب تک آپ جیسے جاں فروش اس ملک میں موجود ہیں کوئی اسے غلام نہیں بنا سکتا۔ آپ اپنے حوصلے بلند رکھیے جلد یا بدیر موقع آئے گا کہ آپ ان وحشی حملہ آوروں پر کاری

ضرب لگا سکیں گے۔ چونکہ جنگ فی الحال ختم ہو چکی ہے اس لیے آپ اپنی منشاء کے مطابق مختلف علاقوں کا رخ کر سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ آپ کے لئے شمال کی جانب سفر زیادہ مناسب رہے گا ...."

اباقہ کی باتوں سے دستے کے ارکان جان گئے کہ وہ انہیں خود سے علیحدہ کرنا چاہ رہا ہے۔ بیک وقت دو تین آدمی کھڑے ہو گئے اور بولے۔ "سردار! ہم آپ کے ساتھ جائیں گے .... ہم آپ کے ساتھ رہیں گے۔ آپ جیسے سالار کی کمان میں آئی ہوئی موت ہمیں انفرادی زندگی سے زیادہ عزیز ہے۔"

ایک ادھیڑ عمر سپاہی کھڑا ہو کر ترکی میں بولا۔ "سردار! بخدا ہم آپ کے حکم پر اپنے سر کاٹ کر آپ کے قدموں میں ڈال سکتے ہیں۔ آپ کی شجاعت اور جوانمردی نے ہمیں خرید لیا ہے۔ یہ آپ کی قیادت ہے جس نے ہمارے بازوؤں کو اتنی طاقت دی کہ ہم نے منگولوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹا۔ ورنہ ہم کیا تھے اور ہماری بساط کیا تھی۔ ہم سے کہیں زیادہ شجاع اور ماہر عسکری اس سیلاب میں خس و خاشاک کی طرح بہہ گئے۔"

ایک نوجوان سپاہی جس کی پیشانی پر تازہ زخم تھا اٹھا اور جوش سے بولا۔ "سالار! یسوع کی قسم، ہم آپ پر بوجھ نہیں بنیں گے۔ بس صرف ہمیں اپنی کمان میں رکھ لیجئے۔ آپ ہماری شہزادی نتاشا کے شوہر بھی ہیں ہمارے لیے آپ رئیس کی طرح محترم اور قابل اطاعت ہیں۔"

تمام سپاہی شور کرنے لگے۔ اباقہ نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں خاموش کرایا اور اسد کی طرف دیکھنے لگا۔ کچھ دیر مشورے کے بعد اس نے ٹھہری ہوئی آواز میں کہا۔ "ساتھیو! اس اعتماد کا شکریہ جو آپ نے مجھ پر کیا ہے۔ اگر آپ میرے ساتھ جانے پر بضد ہیں تو یونہی سہی۔ میرا ارادہ نوود گرود جانے کا ہے۔ جو لوگ نوود گرود جانا چاہتے ہیں، وہ ساتھ چل سکتے ہیں۔"

تھوڑی سی چہ میگوئیوں کے بعد سارے کے سارے سپاہی نوود گرود جانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

☆ ☆ ☆

اس بند کمرے میں دن اور رات میں امتیاز دشوار تھا۔ یورق نے دل ہی دل میں حساب لگایا اور اسے اندازہ ہوا کہ صبح ہو چکی ہے۔ اس خیال کے ساتھ ہی اس کا دھیان کھڑکی کی طرف چلا گیا۔ کھڑکی کا ایک تختہ برف سے جھانک رہا تھا۔ اگر وہ رات کے وقت اسے دیکھ سکتا تھا تو کوئی منگول سپاہی اسے دن کے وقت کیوں نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ضروری

تھا کہ اس تختے کو برف کے نیچے چھپا دیا جائے لیکن اندر رہتے ہوئے یہ کام ناممکن نہیں تو دشوار ضرور تھا۔ وہ کچھ سوچتا ہوا کھڑکی کی طرف گیا۔ اس کے پٹ کو اندر کی طرف کھولنا چاہا تو یکلخت بہت سی برف گر کر اندر آ گئی۔ یورق نے فوراً زور لگا کر پٹ دوبارہ بند کر دیا۔ قدرت نے ان کی مدد کی تھی۔ رات مزید برف باری ہوئی تھی اور کھڑکی برف میں چھپ گئی تھی۔ اس سے مطمئن ہو کر وہ شیزی کے سرہانے آ بیٹھا اور آگ پر گندم کا دلیہ پکانے میں مصروف ہو گیا۔ دلیہ پکاتے پکاتے اس نے مڑ کر دیکھا تو شیزی آنکھیں کھول چکی تھی۔ پہلے تو وہ حیرت سے اردگرد دیکھتی رہی پھر اس کی نظر یورق پر پڑی اور اس نے جلدی سے اٹھنا چاہا تب اسے کمبل کے نیچے اپنے جسم کی برہنگی کا احساس ہوا اور وہ جوں کی توں لیٹی رہ گئی۔ غیر ارادی طور پر اس نے کمبل کو اپنے پہلوؤں پر تھام لیا تھا۔

"میں .... میں کہاں ہوں؟" وہ روسی میں بولی۔

یورق کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا لیکن وہ جان گیا کہ اس سے کیا پوچھا جا رہا ہے۔ اس نے اشاروں کنایوں سے اسے سمجھایا کہ وہ اسے دریا سے نکال کر لایا ہے اور وہ یہاں تاتاریوں کے خوف سے چھپے ہوئے ہیں۔

شیزری اپنی خوبصورت نیلی آنکھیں پٹ پٹا کر یہ سب کچھ سنتی رہی۔ پھر نہ جانے اس کے ذہن میں کیا خیال گزرا کہ اس کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔ یورق کی طرف دیکھنے کی بجائے اس نے پلکیں جھکائیں اور اپنے لباس کی تلاش میں چاروں طرف نظر دوڑانے لگی۔ یورق نے اس کا لباس نچوڑ کر آگ کے قریب گری ہوئی الماری پر پھیلا رکھا تھا۔ وہ ٹوٹی پھوٹی فارسی میں بولی۔ "میرے .... کپڑے .... تم؟"

یورق بولا۔ "ہاں' میں نے اتارے تھے۔ تمہارے بیمار ہونے کا خدشہ تھا۔"

شیزری کولت کچھ دیر گم صم لیٹی رہی' پھر کمبل کو لپیٹتی ہوئی احتیاط سے اٹھی اور اپنے کپڑے سمیٹ کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ یورق ہمہ تن آگ پر رکھے ہوئے دلیے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ اطمینان سے کپڑے بدل سکتی ہے۔ کچھ دیر بعد یورق نے سر اٹھایا تو وہ لباس تبدیل کر چکی تھی۔ آگ کے قریب بیٹھ کر ہاتھ سینکنے لگی اور کل رات کے ان واقعات کو یاد کرنے لگی جو اس کے لیے ایک ڈراؤنے خواب کی طرح تھے۔ یورق بھی اپنے خیالوں میں گم تھا وہ شیزری کولت کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس ویران اور بے کار تنہائی میں جہاں کہنے سننے کے لیے بہت کچھ تھا وہ زبان کی اجنبیت کے سبب گفتگو سے قاصر تھے۔ شیزری کولت تو پھر بھی ٹوٹی پھوٹی فارسی میں چند فقرے بول سکتی تھی' یورق روسی کی ابجد سے بھی واقف نہیں تھا۔ شہد سے شیریں کیا ہوا دلیہ کھانے کے

بعد دونوں پھر قریب قریب آ بیٹھے۔ شیزری پر پہلے شرم سوار رہی تھی پھر دھیرے دھیرے وہ یورق سے باتیں کرنے لگی۔ ان باتوں میں اشارے کنایے اور الفاظ زیادہ تھے جب کہ مفہوم بہت کم تھا۔ دوپہر تک انہوں نے جو "طویل طویل" گفتگو کی اسے مندرجہ ذیل چند فقروں میں سمیٹا جا سکتا ہے۔

شیزری نے پوچھا۔ "باقی ساتھی کہاں ہیں؟"

یورق نے جواب دیا۔ "ان کا علم نہیں۔ وہ ہمیں نوودگرود میں ملیں گے۔"

"ہم نوودگرود کب روانہ ہوں گے؟"

"تاتاریوں کی گشتی ٹولیاں ابھی ایک دو روز یہاں گھومیں گی' اس کے بعد ہی روانگی کا خطرہ مول لیا جا سکتا ہے۔"

"یہ مکان ٹیڑھا کیوں ہے؟"

"شاید پچھلے برس کسی برفانی تودے کی زد میں آ گیا تھا۔"

"باہر موسم کیسا ہے؟"

"رات برف باری ہوئی ہے۔"

اس گفتگو کے بعد شیزری قریباً تھک کر نڈھال ہو چکی تھی کیونکہ زیادہ اشارے اسی کو کرنے پڑے تھے۔ یورق تو بس فرفر بولتا چلا جاتا تھا۔ شیزری کو سمجھ نہ آتی تھی تو وہ اسے بار بار فقرا دوہرانے کو کہتی تھی۔

شیزری کی حالت اب کافی بہتر تھی۔ سہ پہر کو کھانا اسی نے پکایا۔ شام کو جب وہ کھانا شروع کر رہے تھے انہیں کہیں قریب ہی گھوڑوں کی ٹاپیں سنائی دیں ان دونوں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ یہ گھوڑے تھوڑی دیر پہلے نہیں گزرے' کیونکہ انہوں نے کھڑکی کے پٹ تھوڑے سے کھول رکھے تھے۔ کھانے کے بعد وقت گزاری کے لیے وہ پھر باتوں میں مشغول ہو گئے۔ اس دفعہ ان کی گفتگو ماضی کے متعلق تھی۔ رات گئے تک شیزری' یورق کو اپنی کہانی سناتی رہی۔ اس نے بہت کچھ بتایا لیکن جتنا یورق کے پلے پڑا وہ اس طرح تھا۔

"وہ اپنے بہن بھائیوں میں سے بڑی تھی۔ اس کی بیمار ماں نے اپنی زندگی میں ہی اس کے فرض سے سبکدوش ہونے کے لیے اس کی شادی بچپن میں کر دی تھی۔ اس وقت وہ صرف سولہ سال کی تھی۔ اس کے دو بچے ہوئے' جن میں ایک بیمار رہ کر مر گیا۔ دوسری بچی اور شوہر ولادی میر کی تباہی میں ہلاک ہوئے۔ پورے گھرانے میں وہ اور اس کا چھوٹا بھائی رانئل بچے تھے۔ انہوں نے حضرت مریم کے کلیسا میں پناہ لی۔ مگر جب منگولوں

نے کلیسا کو بھی آگ لگا دی تو وہ بھاگ نکلے۔ پھر ان کے ساتھ کشتی میں بیٹھ کر وہ نوودگرود کی طرف روانہ ہوئے جہاں ایک جھڑپ میں راتیل بھی ہلاک ہو گیا۔"

راتیل کی موت کا ذکر کرتے کرتے شیزی افسردہ ہو گئی۔ یورق نے موضوع بدلنے کے لیے اس سے کہا کہ کیوں نہ قہوہ پیا جائے' یہاں الماری میں قہوہ موجود ہے۔ شیزی اطاعت مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے فوراً قہوہ بنانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ یورق آگ کے پاس ہی نیم دراز ہو گیا۔ قہوے کا برتن آگ پر رکھ کر شیزی نے مزید ایندھن کے لیے ادھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ پھر وہ بغلی دروازے کی طرف اشارہ کرکے بولی' شاید وہاں ایندھن موجود ہو' یورق نے اثبات میں سر ہلا کر اس کے خیال کی تائید کی۔ ٹوٹی ہوئی چھت کی صورت میں وہاں کافی لکڑیاں موجود تھیں۔ وہ مشعل لے کر بغلی دروازے کی طرف چلی گئی .... اچانک ایک بلند چیخ نے یورق کو جھنجھوڑ دیا۔ وہ تلوار سنبھالتا ہوا جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس وقت بغلی دروازہ کھلا اور شیزی چیختی ہوئی یورق کی طرف لپکی اور اس سے لپٹ گئی۔ وہ روسی زبان میں پتہ نہیں کیا کچھ کہہ رہی تھی۔ اچانک یورق ساری بات سمجھ گیا اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل گئی۔ وہ اس انسانی ڈھانچے کو بھول گیا تھا جو رات اس نے مطبخ میں چھپایا تھا۔

☆-------☆-------☆

اباقہ اور اسد کی کمان میں ڈھائی سو سپاہیوں کا یہ دستہ نوودگرود کی طرف رواں تھا۔ یہ ایک انتہائی دشوار گزار سفر تھا۔ علاقے میں بارشیں شروع ہو گئی تھیں۔ ندی نالے طغیانی پر تھے اور جنگلوں میں ہر گام پر دلدلیں منہ کھولے کھڑی تھیں۔ نتاشا ہر وقت اداس اور سوگوار رہتی تھی۔ اباقہ نے اکثر اس کی آنکھیں متورم دیکھیں۔ اسد اور اباقہ نے علی کو ہدایت کی تھی کہ وہ شہزادی کی دلجوئی میں لگا رہے اور اس نے واقعی کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔ وہ ہمہ وقت شہزادی کی خدمت میں مشغول رہتا۔ چٹکلے سناتا اور الٹی سیدھی حرکتوں سے اسے ہنسانے کی کوشش کرتا۔ بعض اوقات وہ اس کوشش میں کامیاب بھی ہوتا۔ شہزادی کے چہرے پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ پھیل جاتی' لیکن مسکراہٹ کی اس دھوپ کو جلد ہی سوگواری کے مہیب سائے ڈھانپ لیتے۔

ایک روز جب انہوں نے ایک دلدل کے قریب پڑاؤ ڈال رکھا تھا' علی کہیں سے ایک کچھوا پکڑ لایا۔ اندھیرا گہرا ہوا تو اس نے ایک شمع جلا کر کچھوے کی پشت پر جمائی اور اسے پڑاؤ کی سمت چھوڑ دیا۔ اباقہ اس وقت اپنے خیمے سے باہر بیٹھا چند سپاہیوں سے گفتگو کر رہا تھا۔ اچانک ایک سپاہی نے ڈری ڈری آواز میں اس طرف اشارہ کیا۔ سب حیرانی

سے اس متحرک شمع کو دیکھنے لگے۔ تاریکی کے سبب صرف شمع زمین پر رینگتی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ چند لمحوں کے لیے تو سب بھونچکے رہ گئے پھر ایک سپاہی نے ہمت کی اور تلوار سونت کر شمع کی طرف بڑھا۔ جب وہ محتاط قدموں سے کچھوے کے قریب پہنچا تو ایک خیمے کی اوٹ سے علی قہقہے برساتا ہوا برآمد ہوا۔ سب اٹھ کر شمع کے قریب پہنچ گئے کچھوے کو رینگتے دیکھ کر انہیں ہنسی روکنا مشکل ہو گئی۔ اباقہ کے چہرے پر بھی مسکراہٹ کھیل گئی۔ سپاہیوں کے ہاتھ ایک تماشا آ گیا تھا۔ وہ بڑی دلچسپی سے کچھوے کی چہل قدمی دیکھنے لگے۔

علی بھاگتا ہوا خیمے میں گیا' اباقہ جانتا تھا وہ اب نتاشا کو یہ تماشا دیکھنے پر مجبور کرے گا۔ پھر اس نے دیکھا کہ خیمے کے جالی دار روزن میں نتاشا کا سایہ نظر آیا۔ وہ روزن سے آنکھیں لگائے باہر جھانک رہی تھی۔ اچانک اباقہ کے دل میں ٹیس سی اٹھی۔ نہ جانے کیا بات تھی اسے ہر روز نتاشا کی کسی نہ کسی ادا پر مارینا یاد آ جاتی تھی۔ اس وقت بھی یہی ہوا تھا۔ اباقہ کے ذہن میں عہد رفتہ کی وہ چمکیلی صبح گھس آئی تھی جب وہ قراقرم سے چین کی مہم پر روانہ ہو رہا تھا۔ مارینا نے اسے ایسے ہی خیمے کے روزن سے دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں نے خاموشی کی زبان میں اسے الوداع کہا تھا۔ اس کی نگاہوں نے اس سے لپٹ کر اسے رخصتی بوسے دیے تھے۔ ہاں ایسا ہی دلربا انداز تھا۔ خیمے کے اندر سے محبت اور گرمجوشی کی غیر مرئی لہریں نکل نکل کر اس کے دل میں جذب ہو گئی تھیں۔ اچانک اباقہ بے قرار سا ہو گیا۔ وہ کچھوے کے ہنگامے سے کنی کترا کر پڑاؤ سے باہر نکل آیا اور درختوں کے درمیان بلا مقصد گھومنے لگا۔ ذہن ماضی کی خاک چھان رہا تھا۔ مارینا کی تمنا میں ایک زمانہ گزر گیا تھا۔ چین کی طویل مہم' پھر بغداد کے ہنگامے' پھر علاقہ افغاناں میں راجی خاتون کا سراغ' پھر خلیج فارس کا پُر خطر سفر اور شیخ نجدی کا تعاقب اور پھر روس کی مہم۔ کب کب اور کہاں کہاں اس نے مارینا کو یاد نہیں کیا تھا۔ ہر ہر پل اسے پانے کی آس بندھی تھی اور ہر ہر دھڑکن نے اس کی جدائی محسوس کی تھی۔ ہاں ایک مدت گزر گئی تھی۔ اس دشت کی سیاحی میں ایک مدت گزر گئی تھی .... پہلی بار اباقہ کو محسوس ہوا کہ وہ آہستہ آہستہ مارینا کو کھو رہا ہے اور شاید وہ اسے کبھی نہ پا سکے .... ایک روز اسے پتہ چلا کہ وقت کا برق رفتار رخش آگے نکل آیا ہے اور اس کی گرد میں مارینا اور اس کی محبت کی تمام چنگاریاں دب کر بجھ چکی ہیں۔ "نہیں .... نہیں' میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔" اس نے بے قرار ہو کر سوچا۔ "میں وقت گزرنے سے پہلے اپنی محبت کو زندہ جاوید کر دوں گا۔ مارینا کا اور میرا ادھورا خواب ضرور پورا ہو گا۔"

بہت دیر اسی طرح گھومنے اور سوچنے کے بعد اس نے اسد کے خیمے کا رخ کیا۔ خیمے

میں روشنی تھی۔ اس کا مطلب تھا ابھی وہ جاگ رہا ہے۔ اباقہ اندر داخل ہوا تو وہ عشاء کی نماز کے بعد اٹھ رہا تھا۔ اباقہ رنجور وملول ایک طرف بیٹھ گیا۔

"کیا بات ہے دوست؟" اسد نے خوش مزاجی سے کہا۔

اباقہ گہری سانس لے کر بولا۔ "اسد! میں ماریتا کو خط لکھنا چاہتا ہوں۔"

اسد نے ذرا توقف کیا پھر بولا۔ "لیکن یہ خط اس تک پہنچے گا کیسے؟"

اباقہ نے کہا۔ "اس کا انتظام بھی ہو جائے گا۔ تم صرف مجھے خط لکھ دو۔"

اس نے کہا۔ "مجھے خط لکھنے سے انکار نہیں لیکن بتاؤ تو سہی نامہ بر کون ہو گا؟"

اباقہ نے کہا "ہمارے اس قافلے کا ایک سپاہی سرائے استراخان کا رہنے والا ہے۔ وہاں سے عراق کی سرحد زیادہ دور نہیں۔ میں یہ کام اسے سونپوں گا۔"

اسد کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا وہ کاغذ اور قلم لے کر بیٹھ گیا۔ اباقہ اسے خط لکھانے لگا۔ اس نے ایک کہنی زمین پر ٹیک رکھی تھی اور آنکھیں دور کہیں خلاؤں میں گھور رہی تھیں۔ خط مکمل ہوا تو اسد نے اسے پڑھ کر سنایا۔

"ماریتا! یہ خط میں تمہیں شمالی روس کے ایک دور دراز علاقے سے لکھ رہا ہوں۔ ہمارا پڑاؤ ایک گھنے جنگل میں ہے۔ مشہور شہر نودو گرود یہاں سے صرف تیس کوس کے فاصلے پر ہے۔ ماریتا! ہمارا سفر پسپائی اور ہزیمت کا سفر ہے۔ منگول' روسی شہروں کو تاراج کرتے بڑھتے چلے آ رہے ہیں مگر ہمیں اطمینان ہے کہ ہم شکست خوردہ فوج کا حصہ ہونے کے باوجود شکست خوردہ نہیں۔ ہم نے قدم قدم پر دشمن کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے۔ اب بھی اگر اہل روس نے کسی مقام پر ہمارے ساتھ ذہنی ہم آہنگی کا ثبوت دیا تو ہم دشمن کو منہ توڑ جواب دیں گے .... ماریتا مجھے یقین ہے کہ تمہاری دعا قبول ہو گی اور میں ایک روز کامیاب و کامران تمہارے پاس لوٹوں گا۔ میں تمہیں دیکھ نہیں سکتا لیکن جانتا ہوں کہ تمہاری آنکھوں میں میرے انتظار کے دیے روشن رہتے ہیں۔ میں سن نہیں سکتا لیکن مجھے معلوم ہے تم راتوں کو جاگ کر میرے لیے دعائیں مانگتی ہو۔ میں بھی تمہیں یاد کرتا ہوں ماریتا۔ میرا دل ہر وقت تمہاری طرف لگا رہتا ہے۔ سوتے جاگتے تمہارا ہی خیال رہتا ہے۔ میں نے وہ خط سنبھال کر رکھا ہوا ہے جو وقت رخصت تم نے میرے بستر میں رکھ دیا تھا۔ تمہارے جسم کا ایک حصہ بھی میرے پاس ہے اور مجھے جان سے زیادہ عزیز ہے .... تم جانتی ہو میں نے ان بالوں کا کیا کیا ہے؟ میں نے ان کو بٹ کر ایک چلہ تیار کیا ہے۔ اس چلے سے جو کمان تیار ہوئی ہے وہ نہایت کڑی ہے اور اب تک بیسیوں منگولوں کے سینے چھلنی کر چکی ہے۔ میں نے اس طرح تمہیں بھی اس جنگ میں شریک کر

لیا ہے۔ میدان جنگ کے ہنگاموں میں تم اس کمان کی صورت ہر وقت میرے ساتھ رہتی ہو۔ تمہاری زلفیں جو میرے لیے زندگی ہیں میرے دشمنوں کے لیے موت بن چکی ہیں۔

ماریتا! تم نے ایک بار ٹھیک کہا تھا کہ فاصلے بے مہر ہوتے ہیں۔ ان فاصلوں نے ہمارے ساتھ بھی ایک نامہربانی کی ہے لیکن مجھے امید ہے کہ ہماری محبت سب دکھوں کو اپنے دامن میں سمیٹ لے گی۔ تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ تمہارے لیے یہ جان لینا ہی کافی ہے کہ میں تمہارا ہوں' صرف تمہارا .... باقی تفصیلات آ کر بتاؤں گا۔ اسد اور یورتی بھی خیریت سے ہیں۔ انشاء اللہ ہم بہت جلد واپس لوٹیں گے۔ باقی قاصد کے ہاتھ تمہارے اخراجات کے لیے کچھ رقم بھی بھیج رہا ہوں۔ اگر تم اپنے حالات سے آگاہ کرنا چاہو تو جوابی خط لکھ کر قاصد کے حوالے کر دینا۔ وہ مجھ تک پہنچانے کی پوری کوشش کرے گا .... ہم تینوں کی طرف سے سلیمان اور نبیلہ کے لیے نیک خواہشات اور اگر سلیمان بچے کا باپ بن چکا ہے تو بچے کو بہت بہت پیار اور دعائیں۔"

خدا حافظ۔ اباقہ

خط سننے کے بعد اباقہ نے احتیاط سے تہہ کر کے اپنی جیب میں رکھ لیا۔ اسد نے پوچھا۔ "تم نے ابھی اپنی بیوی کو تو ماریتا کے متعلق نہیں بتایا۔" اباقہ نے نفی میں جواب دیا۔ اسد بولا۔ "ابھی کچھ بتانا بھی نہیں۔ ہمیں بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ خاص طور پر اسے یہ ہرگز معلوم نہیں ہونا چاہئے کہ رئیس اعظم نے تمہیں اس شادی پر مجبور کیا تھا۔ یہ انکشاف اسے بے حد دکھی کر دے گا۔ بظاہر وہ شہزادی نہیں رہی لیکن رگوں میں خون تو شاہی ہے۔"

اباقہ نے کہا۔ "اسد! میں سمجھتا ہوں۔ اپنی طرف سے میں نے اس کی دلجوئی میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ پہلے تو وہ ہر وقت آنسو بہاتی رہتی تھی مگر اب کچھ سنبھلنے لگی ہے۔"

ابھی وہ یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ خیمے کے باہر سے شور وغل سنائی دیا۔ اول تو اباقہ سمجھا کہ شاید شمع بردار کچھوا اس طرف چلا آیا ہے مگر جب گھوڑوں کی ٹاپیں بھی سنائی دیں تو اسد اور اباقہ بوکھلا کر باہر نکل آئے۔ اباقہ نے دیکھا کہ خیموں کے درمیان کھلی جگہ ایک ہرن بری طرح چکرا رہا ہے۔ چاند اب نکل آیا تھا اور اس کی روشنی میں صاف دکھائی دے رہا تھا کہ وہ پسینے میں بھیگا ہوا ہے اور ہانپ رہا ہے۔ دفعتاً وہ مڑا اور بھاگتا ہوا اسد کے خیمے میں داخل ہو گیا۔ اباقہ بھی لپک کر اندر داخل ہوا اس نے ہرن کو دبوچ لیا۔ دراصل وہ ایک ہرنی تھی جو نہ جانے کب سے شکاریوں کے آگے آگے بھاگ رہی تھی۔ اباقہ نے مادہ

ہرن کو اپنے دو سپاہیوں کے سپرد کیا اور خیمے سے باہر نکل آیا۔ شکاری تعداد میں کوئی تیس عدد تھے اور ہاتھوں میں مشعلیں اٹھائے خیمے سے باہر کھڑے تھے۔ ان کے گھوڑے بھی بری طرح ہانپ رہے تھے۔

اسد نے روسی زبان میں ان سے پوچھا کہ وہ کون ہیں اور اس وقت شکار کی کیا تک ہے۔ جواب دینے کی بجائے ایک شکاری نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ "تم کون ہو اور یہاں کیا کر رہے ہو؟"

اسد نے جواب دیا۔ "ہم دلداری میر کی طرف سے آئے ہیں لیکن تم یہ سب پوچھنے والے کون ہو؟"

وہی شخص جو بول چال سے ان کا سردار نظر آتا تھا تحکم سے بولا۔ "اس بات کا جواب بعد میں دیں گے اور تم سے یہ بھی بعد میں پوچھیں گے کہ یہاں تم نے کس کی اجازت سے پڑاؤ ڈالا ہے پہلے وہ ہرنی ہمارے حوالے کرو۔"

اباقہ نے غصے سے کہا۔ "ہرنی واپس نہیں کی جا سکتی۔ تم گھوڑے سے نیچے اترو اور ذرا تمیز سے بات کرو۔"

وہ شخص ہنس کر بولا۔ "میرا گھوڑے سے اترنا تمہیں بہت گراں پڑے گا۔"

وہ ترکی جانتا تھا' اباقہ نے زمین پر تھوکتے ہوئے کہا۔ "میں بھی تو دیکھوں ایک گدھے کا گھوڑے سے اترنا کتنا گراں پڑتا ہے۔"

اجنبی گھڑ سوار نے گہری نظروں سے ارد گرد دیکھا جیسے اباقہ کے ساتھیوں کی تعداد جانچ رہا ہو' پھر پر سکون لہجے میں بولا۔ "ٹھیک ہے۔ اگر تمہیں تمہارے باپ نے پیدا کیا ہے تو پھر یہ ہرنی اپنے پاس رکھنا۔" یہ کہتے ہوئے اس نے گھوڑے کی باگیں موڑیں اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ تاریکی میں گم ہو گیا۔

اسد نے مسکرا کر کہا۔ "میرا خیال ہے یہ سرپھرا نوجوان کوئی گل کھلانے کی کوشش کرے گا۔"

اباقہ نے ہانپتی کانپتی ہرنی کو اپنی گود میں اٹھا لیا اور بولا۔ "دیکھ لیں گے اس چڑی مار کو بھی۔"

نوجوان شکاری کے لیے اباقہ کے خطاب نے سپاہیوں کو ہنسنے پر مجبور کر دیا۔ اسد نے کہا۔ "یہ ہو کون سکتا ہے؟"

ایک بوڑھے سپاہی نے جواب دیا۔ "مجھے تو کوئی جاگیردار لگتا ہے۔" اباقہ نے غور سے دیکھا تو ہرنی کی ٹانگ پر ایک زخم تھا۔ غالباً شکاریوں کا پھینکا ہوا کوئی نیزا اس کی ران کو

چھید تا گزر گیا تھا۔ اباقہ نے ایک مشعل منگوائی اور اس کی روشنی میں زخم کو اچھی طرح دیکھنے کے بعد مرہم پٹی کر دی۔ پھر اسے دیکھ بھال کے لیے دو سپاہیوں کے سپرد کر دیا۔ اسد بولا۔

"علی کے لیے یہ اچھا تحفہ ثابت ہو گی" .... لیکن اس سے بہت پہلے کہ ہرنی علی تک پہنچتی یا وہ اسے دیکھ سکتا' پڑاؤ پر قیامت ٹوٹ پڑی۔

خاموش جنگل پر دھیرے دھیرے صبح کا اجالا پھیل رہا تھا' اچانک نتاشا کی ہلکی سی چیخ سنائی دی وہ اباقہ کے خیمے میں لیٹی تھی۔ اباقہ اور اس کے درمیان علی خواب خرگوش کے مزے لے رہا تھا۔ اباقہ گھبرا کر اٹھا اور روزن سے باہر جھانکنے لگا۔

پڑاؤ کے چاروں طرف مشعل بردار گھڑ سوار نظر آ رہے تھے۔ ان کی تعداد کسی طرح بھی ایک ہزار سے کم نہیں تھی۔ یعنی وہ اباقہ اور اس کے ساتھیوں سے چار گنا زیادہ تھے۔ اباقہ نے خیمے کی دیوار سے تلوار اور ڈھال اتاری اور نتاشا کو تسلی دیتا ہوا باہر نکل آیا۔ باہر نکلا تو اس نے عجیب منظر دیکھا۔ رات والی ہرنی ایک درخت سے الٹی لٹکی ہوئی تھی اور اس کی کٹی ہوئی گردن سے قطرہ قطرہ خون ٹپک کر گھاس میں جذب ہو رہا تھا۔ قریب ہی دو سپاہیوں کی لاشیں بھی نظر آ رہی تھیں۔ اباقہ نے رات ہرنی کو انہی سپاہیوں کی تحویل میں دیا تھا۔

رات والا نوجوان تمسخر سے اباقہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ چھوٹی چھوٹی سنہری داڑھی والا ایک کیم شحیم روسی تھا لیکن عمر زیادہ نہیں تھی۔ اس کے امیرانہ لباس اور وضع قطع سے شبہ ہوتا تھا کہ وہ شاہی خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ اس شبہے کو یوں بھی تقویت پہنچتی تھی کہ اس کے تمام ساتھی وردیوں میں ملبوس اور جنگی ساز و سامان سے لیس تھے۔ ان سب کے تیور خطرناک تھے اور خاص طور پر اباقہ کو وہ نہایت درندگی سے گھور رہے تھے۔ اباقہ اور اسد کے گمان میں بھی نہ تھا کہ بیس تیس شکاریوں کا جتھا صبح تک اتنی بڑی جمعیت کے ساتھ ان کے مقابل آ جائے گا۔

نوجوان نے اباقہ سے مخاطب ہو کر انکشاف کرتے ہوئے کہا۔ "میرا نام نکولس ہے اور میں نوود گرود کا والئی تخت ہوں۔ تمہیں اصل سزا تو بعد میں ملے گی' لیکن پہلے تم اپنے ہاتھوں سے اس ہرنی کی کھال اتار کر اس کے گوشت سے ہماری ضیافت کرو گے۔"

یہ جان کر کہ نوجوان نوود گرود کا والئی تخت ہے اباقہ کے تمام ساتھیوں کے چہرے حیرت میں ڈوب گئے .... اباقہ کے کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ وفورِ غضب نے اس کی سماعت جیسے زائل کر دی تھی۔ اس کی نگاہیں ہرنی پر جمی تھیں اور اسے ایسا محسوس

ہو رہا تھا جیسے بے زبان جانور اس سے شکوہ کر رہا ہے .... میں کتنی دور سے بھاگتا ہوا تیرے پاس پہنچا تھا' تیری ٹانگوں سے لپٹا تھا' تیرے خیمے میں گھس گیا تھا کہ شاید تو مجھے ان درندوں سے بچالے گا لیکن تو بھی کچھ نہ کر سکا..........."

اباقہ نے نہایت دھیمی مگر قہرناک آواز میں اپنے دستے کے تین افسروں کو اپنے پاس بلایا اور کہا۔ "یہ ہماری لڑائی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ ہماری وجہ سے تمہیں کوئی نقصان پہنچے۔ تم لوگ پیچھے ہٹنا چاہو تو ہٹ سکتے ہو۔ یا چاہو تو میں ان .... لوگوں سے کہہ دیتا ہوں کہ تم ہمارے ساتھ نہیں۔"

اباقہ کا لہجہ بتا رہا تھا کہ جانور کی موت کے بظاہر معمولی واقعے نے اس کو کس قدر غمزدہ کیا ہے وہ مرنے مارنے پر آمادہ ہو گیا تھا۔ ساتھی سپاہیوں کو اس کا عندیہ معلوم ہوا تو ان سب نے اباقہ اور اسد کا ساتھ چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ ان کے ایک افسر نے کہا۔

"سردار اباقہ! اصل لڑائی تو ہماری ہے کیونکہ ہمارے دو آدمی مارے گئے ہیں۔"

اسد نے کہا۔ "اچھی طرح سوچ لو۔ یہ خود کو والئی تخت بتا رہا ہے۔ کیا تم اس سے دشمنی نبھا سکو گے۔"

اسد کے جواب میں ایک سردار نے بڑے جذباتی لہجے میں کہا۔ "جناب! ہماری زندگی اور موت اب سردار اباقہ کے ساتھ ہے۔"

اسد اور اباقہ نے جب ساتھیوں کا ارادہ اٹل دیکھا تو صف بندی کی اور خم ٹھونک کر میدان میں آ گئے۔ مخالف فوج بھی صفیں باندھ چکی تھی۔ سپاہیوں نے تلواریں سونت لی تھیں اور اپنے کماندار کے حکم کا انتظار کر رہے تھے۔ صورت حال سنگین تھی۔ کسی بھی لمحے خون خرابہ شروع ہو سکتا تھا۔ اباقہ گھوڑا ہانکتا ہوا اپنے دستے کے آگے جا کھڑا ہوا۔ اس کی سفید بے حرکت آنکھیں والئی تخت نکولس پر مرکوز تھیں۔ اباقہ کے اس انداز کو اسد اچھی طرح پہچانتا تھا۔ وہ جانتا تھا نتیجہ چاہے کچھ بھی ہو نکولس کی خیر نہیں۔ زخمی جانور اور دو سپاہیوں کو ہلاک کر کے نووِد گرود والوں نے اباقہ کو غضب کی انتہا تک پہنچا دیا تھا۔ وہ اباقہ کے قریب پہنچا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

"اباقہ! ذرا تحمل سے کام لو۔ ایک معمولی واقعے پر یہ جنگ و جدل ٹھیک نہیں۔ ہم یہاں ان لوگوں کی مدد کے لیے آئے ہیں ان سے لڑنے نہیں۔ جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔ میں ایک بار ان لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں' شاید لڑائی ٹل جائے ...." اباقہ کو سمجھا بجھا کر اسد نے ہاتھ میں سفید رومال لیا اور دھیرے دھیرے گھوڑا ہانکتا نکولس کے سامنے جا پہنچا۔

"میرا نام اسد اللہ ہے۔ آپ کا نام؟" اس نے دوستانہ لہجے میں پوچھا۔

"میں تمہاری موت ہوں۔" کرخت لہجے میں جواب ملا۔

اسد نے کہا۔ "جناب! ہم لوگ دور دراز علاقوں سے سفر کر کے یہاں تک پہنچے ہیں تاکہ منگولوں کے خلاف اہل روس کی مدد کر سکیں۔ ہم دشمن نہیں دوست ہیں۔ ہمارے یہ جنگی لباس اور ہمارے جسموں پر لگے ہوئے زخم اس امر کے گواہ ہیں کہ ہم نے قدم قدم پر آپ کی جنگ لڑی ہے اور انشاء اللہ آپ آئندہ بھی ہمیں اپنا خیر خواہ پائیں گے۔ یہ موقع اپنے خیر خواہوں سے الجھنے کا نہیں' آپ کا دشمن موت کی رفتار سے آپ کی طرف بڑھ رہا ہے۔ منگولوں کا اگلا نشانہ یقیناً نووِد گرود ہے۔ بخدا ہم نیک نیتی سے آپ کو مشورہ دیتے ہیں کہ ہمیں اپنے وفاداروں میں شامل کیجئے اور اصل دشمن کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو جائیے۔"

شہزادہ نکولس نے نہایت اطمینان سے اسد کی باتیں سنیں۔ یوں لگا جیسے وہ یہ سب کچھ پہلے سے جانتا تھا اور اسے اسد کے انکشافات پر حیرت نہیں ہوئی۔ خشک لہجے میں بولا۔ "نوجوان! مجھے تیری باتوں سے اتفاق ہے' لیکن تمہارے اس لمبے بالوں والے ساتھی کو میں معاف نہیں کر سکتا۔ اس کی اکڑی ہوئی گردن میں جھکا کر چھوڑوں گا .... ہاں وہ میری شرط مان لے تو اس کی جان بخشی کی جا سکتی ہے۔"

اسد نے کہا۔ "شہزادہ حضور! میں نہایت ادب سے عرض کرتا ہوں کہ وہ ایک خود سر شخص ہے۔ آپ کی سختی .... اسے آپ کے عتاب کا شکار کر دے گی لیکن اگر آپ اس کے ساتھ صلہ رحمی کا رویہ اپنائیں تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ وہ آپ کے لیے جان ہتھیلی پر رکھ لے گا۔ وہ ایک بے مثال جنگجو ہے۔ دلادی میر سے آئے ہوئے لوگ آپ کو اس کے بارے بتا سکتے ہیں۔"

شہزادہ نکولس ڈھٹائی سے بولا۔ "کیا تم کہنا چاہتے ہو کہ اس کے بغیر ہم منگولوں سے لڑنے کے قابل نہیں۔"

اسد شہزادے کے سامنے بات واضح کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اباقہ اس سے چالیس پچاس گز کے فاصلے پر کھڑا سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ نکولس کے پُر غرور تاثرات اور اسد کا معذرت خواہانہ رویہ اس کا خون کھولا رہا تھا۔ دفعتاً اس نے پیچھے مڑ کر اپنے ساتھیوں کو مخصوص اشارہ کیا اور ایک فلک شگاف نعرے کے ساتھ گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔ یکایک جنگل قیامت خیز شور سے گونج اٹھا۔ اسد نے مڑ کر اباقہ کی طرف دیکھا۔ اس مختصر وقت میں شہزادہ نکولس اپنا وار کر گیا۔ اس کی تلوار بجلی کی طرح لپک کر اسد پر آئی۔ اسد

الٹ کر نیچے گرا۔ اباقہ نے پوری رفتار سے گھوڑا بھگاتے ہوئے دس گز کے فاصلے سے یہ منظر دیکھا۔ اسد کے گرنے کا لمحہ اباقہ کی رگوں میں آگ بھر گیا۔ وہ کسی خونی درندے کی طرح مخالف فوج پر پل پڑا۔ ایسے لگا کہ کوئی بھوکا بھیڑیا بکریوں کے ریوڑ میں گھس گیا ہے اور بکریاں ہراساں ہو کر چاروں طرف بھاگ رہی ہیں۔ اس کا غضب نیلگوں آگ جیسا تھا جو قریب تھے وہ تو جل ہی رہے تھے جو دور تھے وہ بھی جھلس رہے تھے۔ وہ اکیلا ہی بیسیوں سپاہیوں کو دھکیلتا ہوا سینکڑوں قدم پیچھے لے گیا۔ اس کے سپاہیوں نے اپنے کماندار کے جوش کا عالم دیکھا تو ان کے حوصلے قیامت ہو گئے۔ ایک بے قراری ان کے جسموں میں پھونک گئی۔ جیسے ایک چراغ سے سینکڑوں آبگینے جگمگا اٹھتے ہیں جیسے ایک سورج لاکھوں ذروں کو روشن کر دیتا ہے اباقہ کا ہر سپاہی ایک بگولا بن گیا۔ ذرا سی دیر میں دشمن کے دوا ڈھائی سو سپاہی خاک و خون میں لوٹ گئے باقی منتشر ہو کر ادھر ادھر پھیل گئے۔ شہزادہ نکولس جو اباقہ کے وار سے معمولی زخمی ہوا تھا اپنے سو ڈیڑھ سو سپاہیوں کے ساتھ ایک ٹیلے پر چڑھ گیا۔ اباقہ پر جنون طاری تھا۔ وہ اپنے مٹھی بھر جاں نثاروں کے ساتھ ٹیلے کی طرف لپکا۔ یوں لگتا تھا جب تک وہ شہزادے کو قتل نہیں کر ڈالے گا کسی اور جانب نہیں دیکھے گے۔ معاً ایک آواز نے اسے گھوڑے روکنے پر مجبور کر دیا' یہ اسد کی آواز تھی وہ اپنے گھوڑے پر سوار اس کی طرف آ رہا تھا۔ اسد کو صحیح سلامت دیکھ کر اباقہ کی وحشت میں قدرے کی واقعی ہوئی۔ چہرے پر طاری تشنج کی کیفیت بھی ماند پڑ گئی۔ اس نے کہا۔

"اسد' تجھے کوئی نقصان تو نہیں پہنچا۔"

اسد نے مسکراتے ہوئے کہا "بالکل نہیں۔" تلوار میرے آہنی بازو بند پر لگی تھی۔ دھکے کی وجہ سے میں گھوڑے پر توازن برقرار نہ رکھ سکا۔"

اباقہ نے کہا۔ "خدا کا شکر ہے۔" پھر ٹیلے کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔ "اسد! میں اس شخص کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" اس کا اشارہ واضح طور پر شہزادہ نکولس کی طرف تھا۔ اسد نے میدان کی صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "اباقہ! ذرا سوچ سمجھ کر۔ میرا خیال ہے ٹیلے پر چڑھنا مناسب نہیں۔ ہم اپنے ساتھیوں کو دو دستوں میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ میں ایک دستے کو لے کر درختوں میں گھستا ہوں اور شہزادے کے منتشر سپاہیوں کو مزید منتشر کرنے کی کوشش کرتا ہوں' تم دوسرے دستے کے ساتھ یہاں ٹھہر کر اس کے ٹیلے سے اترنے کا انتظار کرو۔ وہ اپنی فوج کو تتر بتر ہوتے دیکھ کر زیادہ دیر ٹیلے پر نہیں رہ سکے گا۔"

اباقہ نے اسد کی بات مان لی۔ اسد اپنے سپاہیوں کو جمع کر کے آخری ہدایات دینے

لگا۔ دوسری طرف اباقہ کی نگاہیں علی اور نتاشا کو ڈھونڈنے لگیں۔ پھر اسے وہ دونوں ایک درخت کے نیچے کھڑے نظر آ گئے۔ علی کے ہاتھ میں تیر کمان تھا اور وہ نہایت "سنجیدگی" سے نتاشا کا پہرا دے رہا تھا۔ اباقہ نے دو مسلح سپاہیوں کو ان دونوں کی حفاظت پر مامور کر دیا ادھر ٹیلے پر اور درختوں میں مخالف سپاہیوں کی ٹولیاں پھر منظم ہونے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اسد نے اپنے دستے کو ترتیب دیا۔ ایک نظر اباقہ کی طرف دیکھا اور حملے کے لیے تیار ہو گیا.......... مگر اس سے پہلے کہ لڑائی کا یہ دوسرا مرحلہ شروع ہوتا دونوں حریف گروہ ٹھٹک کر رہ گئے۔ اچانک جنگل گھوڑوں کی بے شمار ٹاپوں سے لرزنے لگا۔ محسوس ہوا کوئی بہت بڑا لشکر موقعے کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اباقہ اور اسد کے ذہن میں بیک وقت بہت سے اندیشے جاگ اٹھے۔ پھر یہ جان کر انہیں قدرے اطمینان ہوا کہ آنے والی فوج جنوب کی بجائے شمال مغرب سے آ رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا آنے والے منگول نہیں ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے لشکر ان کے سروں پر پہنچ گیا۔ ان گنت گھڑ سوار گھنے درختوں سے برآمد ہوئے اور موقع پر پہنچ کر طویل قطاروں کی صورت رک گئے۔ لشکر کی تعداد کا صحیح اندازہ لگانا مشکل تھا۔ ہاں جو حصہ نظر آ رہا تھا وہ کم از کم دس ہزار گھڑ سواروں پر مشتمل تھا۔ ان کے پھڑ پھڑاتے علم اور چمکیلی وردیاں دیکھ کر اسد اور اباقہ فوراً جان گئے کہ یہ نوود گرود کی فوج ہے۔ اب شہزادہ نکولس سے مقابلے کا سوچنا فضول تھا۔ وہ مکمل طور پر گھر چکے تھے۔ اباقہ کے چہرے پر ایک گھمبیر سنجیدگی طاری ہو گئی۔ جبڑے مضبوطی سے ایک دوسرے پر جمے ہوئے تھے۔ اس وقت نتاشا اور علی بھاگتے ہوئے ان کے پاس پہنچ گئے۔ نتاشا نے اپنی جھرنوں جیسی خوبصورت مگر لرزاں آواز میں کہا۔ "یہ نوود گرود کے رئیس وزیولند کا لشکر ہے.......... اب کیا ہو گا؟"

اسد نے کہا۔ "گھبرائیں نہیں شہزادی۔ ہمارے ہوتے ہوئے آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔"

علی اباقہ کے گھوڑے کے ساتھ لگا کھڑا تھا۔ غیر ارادی طور پر اس نے اباقہ کی پنڈلی تھام رکھی تھی۔ جیسے کوئی بچہ خطرے کے وقت باپ کی انگلی پکڑ لیتا ہے۔

دفعتاً لشکر میں سے چند گھڑ سوار برآمد ہوئے اور گھوڑے بھگاتے اباقہ وغیرہ کے قریب پہنچ گئے ان میں ایک ادھیڑ عمر کا.......... تنومند شخص سب سے آگے تھا۔ اس کے مشکی گھوڑے پر بیش قیمت ساز تھا اور وہ خود بھی ایک نہایت قیمتی زرہ پہنے ہوئے تھا۔ اباقہ اور اسد کو اندازہ لگانے میں دشواری نہیں ہوئی کہ یہی شخص سپہ سالار ہے۔ اس کی

گھنی بھنوؤں والی گہری آنکھیں اباقہ اور اسد پر جمی تھیں۔ اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں اسد سے پوچھا کہ وہ کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں۔

جواب میں اسد نے بے کم وکاست سب کچھ بتا دیا۔ اس نے یہ بھی بتا دیا کہ یہاں ہونے والی لڑائی کیوں شروع ہوئی اور کس کی ہٹ دھرمی سے قتل و غارت تک نوبت پہنچی۔

سپہ سالار جس کا نام شاخان تھا نہایت غور سے اسد کی باتیں سنتا رہا اس دوران شہزادہ نکولس اور اس کے ساتھی بھی ٹیلے سے اتر کر ان کے پاس پہنچ گئے۔ سپہ سالار شاخان نے ولی عہد شہزادہ نکولس سے بھی صورت حال دریافت کی۔ شہزادہ نکولس نے اکھڑے لہجے میں مختصر جواب دیئے۔ اباقہ اور اسد کو اندازہ ہوا کہ سپہ سالار شاخان اور شہزادہ نکولس میں تعلقات زیادہ بہتر نہیں۔ یہ بات ان کے لیے خوش آئند تھی۔ اسد اور نکولس کا مؤقف سننے کے بعد اور ساتھیوں سے صلاح مشورہ کرکے شاخان نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"چونکہ ولی عہد نکولس اس تنازعے میں بذات خود ملوث ہیں لہٰذا اس کا فیصلہ عزت مآب رئیس وزیولڈ کریں گے۔" پھر وہ اسد سے مخاطب ہو کر بولا۔ "متنازعہ جانور میرے حوالے کر دیا جائے۔ تم سب کو بھی ہمارے ساتھ نوود گرود چلنا ہو گا۔"

اسد نے سر تسلیم خم کر دیا' لیکن شہزادہ نکولس بھڑک کر بولا۔ "شاخان! تم معاملے کو خواہ مخواہ الجھا رہے ہو۔ اگر ہم ایسے معمولی فیصلوں کے لیے رئیس سے رجوع کرنے لگے تو وہ امور مملکت انجام دے چکے۔"

شاخان نے نرمی سے کہا۔ "شہزادہ نکولس! آپ اسے معمولی واقعہ کہہ رہے ہیں اور میں چاروں طرف رئیس کے وفاداروں کی لاشیں دیکھ رہا ہوں۔ کم از کم میں تو اسے معمولی واقعہ نہیں کہہ سکتا۔"

شہزادے نے کسی قدر گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "شاخان! خاک ڈالو اس بات پر۔ میں اپنی شرط واپس لیتا ہوں۔ ان لوگوں کو بھی .... میں معاف کرتا ہوں۔"

شہزادے کا رویہ بتا رہا تھا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے باپ رئیس وزیولڈ کو اس معاملے کی ہوا لگے' ورنہ وہ یوں پیچھے ہٹنے والا شخص نہیں تھا۔

شاخان نے خشک لہجے میں کہا۔ "معاف کیجئے شہزادہ نکولس۔ میں ان لوگوں کو معاف نہیں کر سکتا۔ یہ سب کچھ محترم رئیس کے علم میں لانا اشد ضروری ہو چکا ہے۔"

شہزادے نے شاخان کو اس فیصلے سے باز رکھنا چاہا لیکن کامیاب نہ ہوا۔ بالآخر وہ

بدتمیزی پر اتر آیا۔ مجبوراً شاخان کو اپنے خاص آدمیوں کو حکم دینا پڑا کہ ولی عہد کو اپنی حفاظت میں لے لیا جائے تاکہ اس سنگین جھگڑے کے دونوں فریقوں کو رئیس وزیولڈ کے حضور پیش کیا جا سکے۔ شاخان نے مردہ ہرنی بھی درخت سے اتروا کر قبضے میں لے لی۔

☆--------☆--------☆

شمالی روس کا شہر نوود گرود آزاد جمہوریہ تھا' بالٹک کے قریب جھیل ایلمن کے کنارے یہ خوبصورت شہر دولت مندی و خوشحالی کے اعتبار سے اپنی مثال آپ تھا۔ یہاں تاجروں کا بہت اثر تھا اور وہ جرمنوں کی بازنطائی بندر گاہوں سے تجارت میں خوب نفع کما رہے تھے۔ کشید گاہوں' باغوں' شہد کی مکھیوں اور گھنے درختوں میں گھری ہوئی یہ عظیم بستی زندگی کی تمام رعنائیوں سے بھرپور تھی۔

رئیس وزیولڈ اپنے پُر شکوہ دربار میں مزین طلائی کرسی پر براجمان تھا۔ دربار کی بلند وبالا چھت بیش قیمت فانوسوں سے سجی ہوئی تھی۔ فرش پر دبیز قالین تھے اور دیواروں پر مصوری کے حسین و جمیل شاہکار نظر آ رہے تھے۔ رئیس کے سامنے کرسیوں کی دو رویہ قطار میں امراء و مصاحبین قیمتی لباس پہنے درجہ بدرجہ رونق افروز تھے۔

ایک اہم مقدمہ رئیس کے سامنے پیش تھا۔ ایک تیس پینتیس سالہ عورت اپنے دو بچوں کے ساتھ فریادی کی صورت رئیس کے سامنے کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے جنہیں وہ بار بار ہاتھ میں پکڑے رومال سے پونچھ رہی تھی۔ یہ عورت ریازان سے مہاجر ہو کر نوود گرود پہنچی تھی اور کسی ایسے فوجی افسر کی بیوی تھی جو منگولوں سے جنگ میں لاپتہ ہو چکا تھا۔ رئیس وزیولڈ کی بارعب آواز دربار میں گونجی۔ وہ شہر کے منتظم اعلیٰ سے مخاطب تھا۔

"فیدوتک! یہ کیسا اندھیر ہے۔ کیا ہم لڑائی پر جانے والے سپاہیوں کے کنبوں کی حفاظت بھی نہیں کر سکتے؟ ہم پوچھتے ہیں اب تک اس عورت کی بچی کیوں برآمد نہیں ہوئی۔"

منتظم اعلیٰ کا رنگ سفید ہو رہا تھا۔ وہ کانپتی آواز میں بولا۔ "محترم رئیس! ہم اپنی طرف سے پوری کوشش کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ جلد ہی کوئی سراغ مل جائے گا۔"

رئیس وزیولڈ گرجا۔ "امید .... امید .... امید .... امید ہے کہ اس عورت کی بچی مل جائے گی۔ امید ہے کہ منگولوں کو ولادی میر میں شکست ہو گی' امید ہے کہ ہم اپنا دفاع کر سکیں گے۔ ہم تنگ آ گئے ہیں اس لفظ سے امید .... تنہا امید کیا کر سکتی ہے' جب تم لوگوں میں عمل نہیں۔ امید تو عمل کی کوکھ سے جنم لیتی ہے اور ہم اسے

سنہرے خوابوں میں ڈھونڈ رہے ہیں۔ سنبھل جاؤ ابھی وقت ہے ورنہ بیازان' ولادی میر اور سیت کی کہانی یہاں بھی دہرائی جائے گی۔ اگر ہم اپنے گھر کا نظام ٹھیک نہیں کر سکتے' یہاں ہونے والے جرائم کی رفتار پر قابو نہیں پاسکتے تو منگول گھوڑوں کی رفتار پر کیا قابو پائیں گے؟ وہ پہاڑ سے پھسلنے والے تودے اور سمندر سے اچھلنے والے پانی کی طرح ہمارے شہروں کے اوپر سے گزر جائیں گے.........." رئیس کی پُرطیش آواز نے دربار کو سہما کر رکھ دیا۔ اس نے منتظم اعلیٰ سے کہا۔ "ہمیں تفصیل سے بتایا جائے کہ تمہاری تفتیش کہاں سے شروع ہوئی اور کہاں پہنچی؟"

منتظم نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور بولا۔ "جناب رئیس! تین روز پیشتر شام کے وقت یہ محترم خاتون مقامی کوتوال پہنچی اور اس نے بتایا کہ اس کی چودہ پندرہ سالہ بیٹی جولی مکان کے عقب میں واقع نہر کے کنارے گھومنے نکلی تھی مگر ابھی تک واپس نہیں آئی۔ اسی وقت چار اہلکار اس عورت کے ساتھ موقعے پر پہنچے۔ نہر کے کنارے لمبی گھاس کے اندر سے لڑکی کا ایک پاپوش برآمد ہوا۔ اس کے علاوہ قریب ہی ایک گھوڑا گاڑی کے پہیوں کے نشان بھی پائے گئے۔ محترم خاتون نے بتایا۔

ان کی بیٹی کے ساتھ ایک پالتو مادہ ہرن بھی تھا۔ یقینی بات تھی کہ اگر لڑکی کو اغوا کیا گیا ہے تو مادہ ہرن قرب و جوار میں موجود ہو گا مگر تلاش بسیار کے باوجود ہرن نہیں مل سکا۔ متعلقہ عملے نے اسی رات آٹھ افراد کو شامل تفتیش کر لیا۔ ان میں مدعیہ کے چار گھریلو خادم بھی شامل تھے۔ ان آٹھوں افراد سے پوچھ گچھ جاری ہے۔ امید ہے.......... میرا مطلب ہے مجھے یقین ہے کہ ایک آدھ روز تک حقیقت کھل جائے گی.........."

مزید تفصیلات سے آگاہ ہونے کے بعد رئیس وزیولڈ نے منتظم اعلیٰ کو حکم دیا کہ زیادہ سے زیادہ تین روز میں اصل مجرموں کو گرفتار کر کے اس کے سامنے پیش کیا جائے تاکہ ایک سپاہی کے کنبے سے بدسلوکی کرنے والوں کو عبرتناک سزا دی جا سکے۔ منتظم کو ضروری ہدایات دے کر رئیس وزیولڈ نے رخصت کر دیا۔

اس وقت چوبدار خاص نے آکر اطلاع دی کہ سپہ سالار شاخان دارالحکومت واپس پہنچ گئے ہیں اور شرف باریابی چاہتے ہیں۔ رئیس نے ہاتھ اٹھا کر اجازت دی۔ شاخان دو چوبداروں کی معیت میں مؤدب قدموں سے اندر داخل ہوا اور کورنش بجا کر اپنی مخصوص نشست پر جا بیٹھا۔

رئیس نے کہا۔ "کیا احوال ہے شاخان؟"

شاخان ادب سے بولا۔ "رئیس معظم! خدمتگار اگناتیوز تک گشت لگا کر آیا ہے۔

دشمن ابھی ہمارے علاقے سے بہت دور ہے.......... برف پگھلنا شروع ہو گئی ہے اور شدید بارشوں کے سبب راستے دلدلی ہوتے جا رہے ہیں' لگتا ہے دشمن کو پیش قدمی میں سخت دشواری ہو گی۔"

رئیس نے کہا۔ "اچھی خبر ہے.......... کوئی اور اطلاع۔"

شاخان نے کچھ جھجکنے کے بعد کہا۔ "رئیس اعظم! اگناتیوز سے پانچ کوس نو دو گرد کی طرف ترائی کے جنگل میں مجھے ولی عہد شہزادہ نکولس سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا ہے۔"

"شہزادہ نکولس؟" رئیس نے حیرت سے کہا۔ "لیکن وہ تو مضافات سے فوج جمع کر رہا ہے۔"

شاخان نے کہا۔ "گستاخی کی معافی چاہتا ہوں' رئیس محترم۔ ولی عہد کچھ اور مشاغل میں بھی مصروف ہیں۔"

رئیس اعظم نے پُرتشویش لہجے میں کہا۔ "کھل کر بات کرو شاخان۔ ہمیں تم پر کامل بھروسہ ہے۔"

شاخان نے حوصلہ پاتے ہوئے کہا۔ "رئیس محترم! میں نے آپ کے بخشے ہوئے اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے اور آپ کی انصاف پسندی کی شہ پر ولی عہد کو گرفتار کیا ہے تاکہ آپ اس تنازعے کا فیصلہ کر سکیں جو آپ کے سینکڑوں وفاداروں کی ہلاکت کا سبب بنا ہے۔"

وفاداروں کی ہلاکت کا سن کر رئیس وزیولڈ کے چہرے پر پریشانی منڈلانے لگی لیکن اس نے خاموش رہ کر شاخان کو بات آگے بڑھانے کا موقع دیا۔ شاخان نے محتاط لفظوں میں ٹھہر ٹھہر کر سارا واقعہ رئیس کے گوش گزار کر دیا۔ مادہ ہرن اور اس سے پیدا ہونے والے تنازعے کے ذکر پر رئیس کے ساتھ ساتھ اہل دربار کے چہروں پر بھی بے چینی اور کشمکش نظر آنے لگی۔ شاخان کے خاموش ہونے کے بعد رئیس اعظم نے پُرخیال انداز میں کہا۔

"کہاں ہے وہ ہرنی جو تم ساتھ لائے ہو۔"

شاخان نے ایک خادم کو اشارہ کیا۔ وہ سر جھکا کر باہر نکل گیا۔ ذرا ہی دیر بعد وہ چار سپاہیوں کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ انہوں نے مردہ ہرنی کو لکڑی کے ایک موٹے ڈنڈے کے ساتھ باندھ رکھا تھا۔ ہرنی کو دیکھتے ہی فوجی افسر کی بیوی شاہی آداب کو فراموش کرتی ہوئی آگے بڑھی اور سپہ سالار کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر چیخنے لگی۔

"کہاں ہے میری بیٹی۔ بتاؤ کہاں ہے میری معصوم بچی .... خدا کے لیے کچھ تو بتاؤ۔"

دربار پر گہرا سناٹا طاری تھا۔

رئیس کی بارعب آواز دربار میں گونجی۔ "ولی عہد کو حاضر کیا جائے۔"

سپہ سالار شاخان نے اپنے سپاہیوں کی طرف دیکھا۔ وہ ادب سے سر جھکا کر باہر چلے گئے۔ تھوڑی ہی دیر بعد ولی عہد نکولس سپاہیوں کی معیت میں اندر داخل ہوا۔ طیش سے اس کا چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔ رئیس کے سامنے پہنچ کر اس نے تعظیم پیش کی اور قہرناک آواز میں بولا۔

"والد محترم! سپہ سالار شاخان نے حد سے تجاوز کیا ہے۔ مجھے گرفتار کرکے آپ کے پاس لایا گیا۔"

رئیس نے کہا۔ "نکولس! ہم یہ بات جانتے ہیں۔ کیا تم یہ بتانا پسند کرو گے کہ شاخان کو تمہیں گرفتار کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟"

باپ کے چبھتے ہوئے لہجے نے نکولس کو پریشان کر دیا۔ مگر پھر وہ سنبھل کر بولا۔ "والد گرامی! میرا خیال ہے' شاخان میرے خلاف کافی زہر فشانی کر چکا ہے لیکن میں.........." دفعتاً شہزادے کی نظر ایک جانب کھڑی فریادی عورت پر پڑی اور الفاظ جیسے اس کی حلق میں اٹک گئے۔ اس کے چہرے پر ایک پُر خوف تاثر ابھرا اور وہ پھٹی پھٹی نظروں سے عورت کو دیکھتا رہ گیا۔ اس کا چونکنا اتنا واضح اور بے ساختہ تھا کہ دربار میں موجود ہر شخص نے اسے محسوس کیا۔

رئیس وزیولڈ نے پُر طیش آواز میں کہا۔ "شہزادہ نکولس کی گویائی کو کیا ہوا۔ کیا وہ گفتگو کے آداب بھی بھول گیا ہے؟"

شہزادہ حیرت سے کبھی فریادی عورت اور کبھی مردہ ہرنی کی طرف دیکھ رہا تھا اس کے ذہن میں جیسے مختلف کڑیاں خود بخود ملتی جا رہی تھیں۔ گھبراہٹ اس کے چہرے پر دھواں بن کر پھیل گئی تھی۔ اس نے بمشکل سنبھالا لیا اور تھوک نگل کر بولا۔

"پدر محترم! میرا خیال ہے میرے خلاف کوئی گہری سازش کی جا رہی ہے۔"

رئیس نے کاٹ دار لہجے میں کہا۔ "اس عورت کو دیکھ کر تمہیں یہ خیال کیوں گزرا کہ تمہارے خلاف گہری سازش کی جا رہی ہے۔"

شہزادہ گڑبڑایا۔ "نہیں والد محترم! میں اس عورت کو نہیں جانتا۔"

"تم اس عورت کو جانتے ہو۔" رئیس نے گرج کر کہا۔ دربار پر گہرا سناٹا طاری تھا۔

ئیس کچھ دیر قہر آلود نظروں سے ولی عہد کو گھورتا رہا پھر مردہ ہرنی کی طرف اشارہ کر کے ا۔ "یہ ہرنی تمہیں کہاں سے ملی؟"

شہزادے نے کہا۔ "یہ سوال آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

رئیس نے کہا۔ "اس لیے کہ ہرنی اکیلی نہیں تھی۔ اس کے ساتھ ایک دوشیزہ بھی ی اور وہ دوشیزہ تین روز سے لاپتہ ہے۔"

اچانک شہزادے کے چہرے پر شدید برہمی نظر آنے لگی۔ وہ دلیری سے بولا۔

"والد محترم! اگر آپ مجھے مجرم گردانے کا فیصلہ کر ہی چکے ہیں تو میں اپنی صفائی میں کچھ نہ کہوں گا۔"

شہزادے کے گستاخانہ انداز نے رئیس کی آنکھوں میں قہر بھر دیا۔ وہ دھاڑا۔ "یہ ت سمجھنا کہ تو ولی عہد ہے۔ میں ایک عام مجرم کی طرح کوڑوں سے تیری کھال ادھیڑ دں گا......... بتا کہاں ہے اس عورت کی بیٹی؟"

"میں کسی عورت کی کسی بیٹی کو نہیں جانتا۔ رہا آپ کی سزا کا سوال تو اس سے زیادہ کیا کریں گے کہ میری گردن مروا دیں گے مجھے آپ سے ایسی ہی توقع ہے۔"

شہزادے کے لہجے میں بے ادبی اور جرأت اس طرح یکجا ہو گئی تھی کہ رئیس کے ساتھ ساتھ اہل دربار بھی سناٹے میں رہ گئے۔ کچھ دیر دربار میں گہری خاموشی طاری رہی۔ ئیس وزیولڈ جیسے اپنے ہی ساتھ جنگ میں مصروف تھا۔ اس کی نیم نگاہیں آنے والی نا ہرباں ساعتوں کی تصویر دیکھ رہی تھیں۔ پھر وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "گویا تمہیں عتراف ہے کہ اس عورت کی بیٹی کو تم نے اغوا کیا ہے۔"

شہزادے نے اسی لہجے میں جواب دیا۔ "میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ اس سے زیادہ بں کچھ نہیں کہوں گا۔ آپ نے جو کرنا ہے بصد شوق کریں۔"

رئیس نے گرج کر کہا۔ "شاخان! زنجیریں ڈال دو اس بدبخت کو۔ ہم اس سے اس کے گناہوں کا پورا پورا حساب لیں گے۔"

کچھ درباریوں نے اٹھ کر "رحم رحم" کی صدا لگائی لیکن محسوس ہوتا تھا رئیس کا پیمانہ صبر لبریز ہو چکا ہے۔ یقیناً وہ اس سے پہلے بھی شہزادے کے اطوار سے نالاں تھا۔ اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"خاموشی! میں انصاف کے تقاضوں کے منافی کوئی بات سننا پسند نہیں کروں گا۔ اس مردود کو میری نگاہوں سے دور لے جاؤ اور زنداں میں ڈال دو۔"

رئیس کی ہدایت پر فوراً عمل ہوا۔ سپاہی اسے نرغے میں لے کر دربار سے باہر نکل

گئے۔ رئیس نے شاخان کو حکم دیا۔ "شاخان! شہزادہ نکولس کے قریبی ساتھیوں سے دریافت کرو کہ مغویہ کہاں ہے۔ اگر وہ نہ بتائیں تو ان کی کھالیں کھینچ کر ان میں بھس بھردو۔ آٹھ پہر کے اندر مجھے ہر صورت میں لڑکی کا سراغ چاہیے۔" شاخان نے تعمیل میں سر جھکایا۔ رئیس نے کہا۔ "شاخان! وہ لوگ کہاں ہیں جنھوں نے نکولس کے ساتھیوں سے مقابلہ کیا اور کم تعداد میں ہونے کے باوجود انہیں شکست دی۔ ہم ان سے ملنا چاہتے ہیں۔" سپہ سالار شاخان نے دوبارہ سر جھکایا اور سپاہیوں کو دھیمے لہجے میں ہدایات دینے لگا۔ سپاہی گئے اور چند ہی لمحے میں اباقہ' اسد' نتاشا اور علی وغیرہ کو لیے اندر داخل ہوئے۔ نتاشا کو دیکھتے ہی رئیس وزیولڈ کی آنکھوں میں شناسائی کی چمک نظر آئی۔ وہ ذہن پر زور دیتے ہوئے بولا۔

"اگر ہم تمہیں پہچاننے میں غلطی نہیں کر رہے تو تم کنیاز یوری کی بیٹی ہو۔"

نتاشا نے سر جھکا کر کہا۔ "آپ درست فرما رہے ہیں۔ میں نتاشا ہوں اور یہ میرے شوہر ہیں۔" اس کا اشارہ پہلو میں کھڑے اباقہ کی طرف تھا۔

رئیس اپنی جگہ کھڑا ہو گیا اور استقبالیہ انداز میں بولا۔ "آؤ بیٹی آؤ۔ تمہارے باپ سے ہمارے اختلافات یقیناً تھے لیکن اس وقت تم ہماری مہمان ہو۔"

رئیس کے اشارے پر نتاشا اباقہ اور اس کے ساتھیوں کو رئیس کے قریب ہی نشستیں فراہم کر دی گئیں.......... اہل دربار ان سے سیت اور دلادی میر کی جنگوں کے حالات معلوم کرنے میں مصروف ہو گئے۔

رئیس نے شاہی محل کے قریب ہی ایک عمدہ رہائش گاہ اباقہ اور نتاشا کے لیے مخصوص کر دی۔ ظاہر تھا علی اور اسد بھی ان کے ساتھ تھے۔ اباقہ کے ساتھ آنے والے فوجی دستے کو نوود گرود کی باقاعدہ فوج میں شامل کر لیا گیا۔ اباقہ اور اسد کو رئیس نے صدی سالار بنانے کی پیشکش کی جو انھوں نے بخوشی قبول کر لی۔ نوود گرود میں یہ ان کا چوتھا روز تھا۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ نتاشا نے باغ کی طرف کھلنے والے دریچے کے پردے اٹھا دیے تھے۔ وہ مسہری پر نیم دراز محویت سے باہر دیکھ رہی تھی۔ علی اس کے قریب بیٹھا شاید کوئی نیا لطیفہ سوچ رہا تھا۔ اباقہ دروازے کے قریب ایک گدے دار تخت پر بیٹھا اپنی کمان کا چلہ کسنے میں مصروف تھا۔ اچانک دروازہ کھلا اور اسد تیز قدموں سے اندر داخل ہوا۔ اس کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔ صحن میں پہنچتے ہی اس نے زور سے کہا۔ "اباقہ! ایک خوشخبری سنو۔" اباقہ کے ساتھ ساتھ علی اور نتاشا بھی ہمہ تن گوش ہو گئے۔ اسد نے کہا۔ "مائیکل کے بیوی بچے مل گئے۔"

"مائیکل کے بیوی بچے مل گئے؟" اباقہ حیرانی سے بولا۔

اس کے ساتھ ہی مائیکل کا افسردہ چہرہ اس کی نظروں میں گھوم گیا۔ آخری بار وہ اسے دلادی میر میں نظر آیا تھا۔ فصیل پر جب گھمسان کی جنگ ہو رہی تھی اباقہ نے اسے ایک دستے کی کمان کرتے دیکھا تھا۔ اس کے بعد اس کا کچھ پتہ نہیں چلا۔ اباقہ اور اسد کو کم ہی امید تھی کہ وہ اسے دوبارہ دیکھ سکیں گے۔ بہت ممکن تھا کہ وہ جنگ میں کام آ گیا ہو اور اگر بچا بھی تھا تو ہزاروں لاکھوں بے خانماں لوگوں کے اس ہجوم میں اور منتشر افواج میں وہ اسے کہاں پاتے۔ اس کے بقول اس کے بیوی بچے ریازان میں تھے اور جب وہ عراق سے واپس آیا تو ریازان کی اینٹ سے اینٹ بج چکی تھی۔ مائیکل اکثر اپنے اہل خانہ کو یاد کر کے اداس ہو جاتا تھا.......... اب اسد سے اس کے بیوی بچوں کا سن کر اباقہ کا حیران ہونا لازمی تھا۔ وہ حیرت سے بولا۔

"تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

اسد نے کہا۔ "پرسوں جس عورت کو ہم نے فریادی کے روپ میں رئیس کے سامنے دیکھا وہ مائیکل کی بیوی تھی اور اغوا ہونے والی اس کی بیٹی تھی .... آج وہ بھی مل گئی ہے۔" اباقہ اور نتاشا پر حیرت کا یہ دوسرا حملہ تھا۔ اباقہ نے آنکھیں پھاڑ کر پوچھا۔ "کب ملی وہ لڑکی!"

اسد نے اطمینان سے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "آج دوپہر.......... عقوبت خانے میں شہزادہ نکولس کے ایک ساتھی نے آخر سب کچھ بتا دیا۔ اس نے بتایا کہ لڑکی ترائی کے جنگل میں واقع ایک مسمار قلعے میں ہے۔ اسے وہاں محبوس رکھا گیا تھا۔"

نتاشا نے پوچھا۔ "کس نے محبوس کیا تھا اسے؟"

اسد نے کہا۔ "ٹھہرو! میں تمہیں شروع سے بتاتا ہوں۔ یہ لڑکی جو دراصل مائیکل کی بیٹی ہے اور اپنی ماں کے ساتھ ایک متروک حویلی میں مقیم تھی' شہزادے نکولس کی نظروں میں آ گئی۔ شہزادے نے ایک روز اسے نہر کے کنارے گھومتے دیکھا اور فریفتہ ہو گیا۔ اس نے لڑکی کو اپنے جال میں پھنسانا چاہا مگر ناکام رہا۔ عیاش طبع شہزادے نے ایک روز اسے اغوا کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اس نے اپنے ایک خاص آدمی کو یہ ذمے داری سونپی کہ لڑکی جب گھر سے نکلے تو اسے اٹھا کر ترائی کے مسمار شدہ قلعے میں پہنچا دیا جائے۔ شہزادے کا ہرکارہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ لڑکی کی تاک میں رہنے لگا۔ ایک روز اس کا داؤ چل گیا اور وہ لڑکی کو ہرنی سمیت گھوڑا گاڑی میں ڈالنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کارروائی کے بعد لڑکی کو شہزادے کے سامنے پیش کیا گیا۔ شہزادہ لڑکی کو داشتہ بنا کر رکھنا چاہتا تھا مگر لڑکی

چاہتی تھی کہ وہ اس سے شادی کرے۔ آخر شہزادے نے اسے جھانسا دیتے ہوئے کہا کہ وہ اس سے خفیہ شادی کرلیتا ہے بعدازاں موقع محل دیکھ کرباپ کو اس فیصلے سے آگاہ کر دے گا۔ لڑکی شہزادے کے بس میں تھی طوعاً و کرہاً اس نے یہ بات مان لی۔ مگر اس سے پہلے کہ شہزادے کے مذموم مقاصد پورے ہوتے ایک روز لڑکی کی پالتو ہرنی' جو اس کے ساتھ ہی کھنڈرات میں لائی گئی تھی نکل بھاگی۔ شہزادے اور اس کے ساتھیوں کو فکر لاحق ہوئی کہ کہیں اس ہرنی کے سبب ان کا راز فاش نہ ہو جائے وہ اسے قابو کرنے کے لئے اس کے پیچھے لپکے مگر وہ انھیں بھگاتی ہوئی کئی کوس آگے لے گئی۔ یہاں تک کہ شہزادہ اس کا تعاقب کرتا ہمارے پڑاؤ میں پہنچ گیا.........." اباقہ نتاشا اور علی حیرت سے یہ روئیداد سن رہے تھے۔ تقدیر نے بے رحم شہزادے کو کس وسیلے سے گھیرا تھا۔ اگر وہ ہرنی کا مسئلہ کھڑا نہ کرتا تو کبھی جنگ وجدل تک نوبت نہ آتی اور نتیجے میں شاخان اسے گرفتار نہ کرتا۔ اسد نے بتایا کہ شاہی دستے نے چھاپا مار کر لڑکی جولیا ہود رتھ کو مسمار قلعے سے برآمد کرلیا ہے شہزادہ نکولس کے دو ساتھی ابھی تک وہاں اس کی نگرانی کر رہے تھے۔"

اباقہ نے اسد سے کہا۔ "اسد! میں مائیکل کے گھر والوں سے ملنا چاہتا ہوں۔"

اسد بولا۔ "آؤ میرے ساتھ یہاں سے ان کی رہائش گاہ خاصی دور ہے مگر ہم گھوڑوں پر مغرب سے پہلے وہاں پہنچ جائیں گے۔"

علی نے کہا۔ "بھائی جان! میں ساتھ جاؤں گا۔"

اسد مسکرا کر بولا۔ "ہمیں کوئی اعتراض نہیں لیکن کسی نے نتاشا کی حفاظت بھی تو کرنی ہے۔ کوئی مرد تو اس کے پاس ہونا چاہیے۔ تم دیکھ ہی رہے ہو یہاں لڑکیاں کس طرح اغوا ہو رہی ہیں۔"

تیر نشانے پر لگا۔ علی کے چہرے پر تذبذب نظر آیا پھر وہ بولا۔ "ٹھیک ہے۔ آپ جائیں' میں یہیں رہوں گا۔"

اسد اور اباقہ باہر نکل گئے تو علی نتاشا کی مسہری پر چڑھ بیٹھا۔ تھوڑی دیر غور سے اس کا چہرہ دیکھتا رہا پھر ٹھوڑی اپنے ہاتھ پر ٹکا کر بولا۔ "آپا! آپ بھائی جان اباقہ کی بیوی ہیں؟"

نتاشا نے کہا۔ "تم یہ سوال کیوں پوچھ رہے ہو؟"

علی نے معصومیت سے کہا۔ "میں نے کبھی آپ کو بھائی جان کے ساتھ.......... میرا مطلب ہے.......... کبھی آپ کو بھائی جان کے ساتھ نہیں دیکھا۔"

"کیا مطلب؟" نتاشا نے آنکھیں نکالیں۔

"میرا مطلب ہے آپ تو ایک دوسرے سے بولتے تک نہیں۔"

نتاشا نے ایک گہری سانس لی اور اچانک اس کی آنکھوں سے اداسی جھلکنے لگی۔ شاید اسے بھی آج ہی احساس ہوا تھا کہ اباقہ اور وہ میاں بیوی ہونے کے باوجود اجنبیوں کی طرح ہیں۔ باپ کے غم نے شہزادی کو اس طرح جکڑا تھا کہ دنیا اندھیر ہو گئی تھی۔ مگر وقت کے ساتھ ساتھ ہر گھاؤ بھر جاتا ہے۔ ناقابل علاج زخم بھی مندمل ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ آج وہ علی کی بات پر غور کر رہی تھی۔ جونہی اباقہ کی دلہن ہونے کا خیال اس کے ذہن میں آیا ایک سرخی سی اس کے رخساروں کو ڈھانپ گئی۔ وہ علی سے بولی۔ "ہمارا کیا قصور ہے۔ تمہارے بھائی جان خود ہی لئے دیے رہتے ہیں"

علی چہکا۔ "تو آپ نے مجھے پہلے بتانا تھا۔ میں تو انھیں چٹکی بجاتے ٹھیک کرلوں گا۔"

نتاشا نے پریشانی سے پوچھا۔ "کیا کرو گے تم؟"

"کچھ نہیں۔ انھیں کہوں گا کہ آپ سے.......... ذرا ہنسا بولا کریں۔"

بات آئی گئی ہو گئی۔ اگلے روز صبح سویرے علی بھاگتا ہوا نتاشا کے کمرے میں پہنچا۔

"آپا جان.......... آپا جان.......... بھائی جان کو کچھ ہو گیا ہے وہ جاگ ہی نہیں رہے۔ میں آوازیں دے دے کر تھک گیا ہوں۔"

نتاشا نے کہا۔ "گہری نیند سو رہے ہوں گے ذرا زور سے آواز دینا تھی۔"

علی نے کہا۔ "زور سے ہی دی تھی۔"

نتاشا کے چہرے پر پریشانی جھلکنے لگی وہ بولی۔ "اسد کہاں ہے؟"

علی نے بتایا کہ وہ تو صبح سویرے نماز پڑھ کر سیر کے لیے نکل جاتے ہیں اور دن چڑھے لوٹتے ہیں۔

نتاشا نے بے قراری سے اِدھر اُدھر دیکھا پھر علی کے ساتھ اباقہ کی خواب گاہ کی طرف بڑھی۔ اباقہ مسہری پر چت لیٹا تھا۔ ریشمی تو شک نے سینے سے نیچے اس کا جسم ڈھانپ رکھا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں لگتا تھا گہری نیند سو رہا ہے۔ علی نے کہا۔ "بھائی جان اٹھیے۔ دیکھیے سورج طلوع ہو گیا۔" اباقہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ نتاشا جانتی تھی کہ اباقہ نشے کا عادی نہیں' پھر وہ اتنی گہری نیند کیوں سو رہا تھا۔ یہ بھی ناممکن تھا کہ وہ مذاق کر رہا ہو۔

نتاشا نے اس کے بالکل قریب جا کر کہا۔ "دیکھیے.......... دھوپ کہاں آگئی ہے۔ اب اٹھ جائیے۔" نتاشا کی آواز کافی بلند تھی۔ صبح کے وقت ایک سوئے ہوئے آدمی کو جگانے کے لیے یہ آواز بہت کافی تھی۔ یکایک نتاشا کا چہرہ زرد ہو گیا۔ کہیں اباقہ کو کچھ ہو تو

نہیں گیا تھا۔ وہ بے اختیار جھکی اور کندھوں سے تھام کر اباقہ کو جھنجھوڑنے لگی۔ ساتھ تو وہ گھبراہٹ میں "اباقہ .... اباقہ" پکار رہی تھی۔ نتاشا کا ہاتھ جسم سے چھوتے ہی اباقہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔ یوں لگا جیسے وہ نیند پوری کر چکا تھا اور جاگنے کے لیے کسی اشارے کا منتظر تھا۔ اسے اٹھتے اور اپنی طرف گھورتے پا کر نتاشا جھجک کر پیچھے ہٹ گئی۔ ایک لمحے میں اس کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے تھے۔ اباقہ بولا۔

"نتاشا! تم یہاں؟"

نتاشا ہکلائی۔ "ہم .... ہم وہ۔" اس نے مڑ کر دیکھا تو علی غائب اور دروازہ بند تھا۔ وہ سنبھل کر بولی۔ "ہمیں علی نے بتایا تھا کہ آپ کی طبیعت خراب ہے۔"

"کیا کہا؟" اباقہ زور سے بولا۔

نتاشا نے کہا۔ "ہمیں علی نے بتایا تھا کہ آپ کی طبیعت خراب ہے۔"

"کیا خراب ہے؟" اباقہ نے پھر بلند آواز سے پوچھا۔

نتاشا حیرانی سے اباقہ کو دیکھنے لگی جیسے اس کی ذہنی صحت پر شک کر رہی ہو۔ وہ دھیمی تو نہیں بول رہی تھی' آخر اباقہ کو سمجھ کیوں نہیں آ رہی تھی۔ "کیا ہوا ہے آپ کو؟" وہ الجھن سے بولی۔

دفعتاً اباقہ کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔ اس کے ہاتھ اپنے کانوں کی طرف گئے اور سفید روئی کے دو ٹکڑے اس کے ہاتھوں میں آ گئے۔ اس کے ساتھ ہی اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ بولا۔ "یہ لڑکا بالکل شیطان کی دُم ہے۔ رات دیا سلائی کے ساتھ یہ روئی میرے کانوں ٹھونستا رہا۔ کہتا تھا اس سے بڑی اچھی نیند آتی ہے۔ آدمی جس کروٹ سوئے اسی کروٹ اٹھ جاتا ہے۔"

نتاشا شرمگیں مسکراہٹ سے بولی۔ "اور ہمیں کہہ رہا تھا کہ بھائی جان کو پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے۔ بار بار آوازیں دینے کے باوجود سوئے پڑے ہیں .... ہم تو ڈر گئے کہ خبر نہیں........."

اباقہ بولا۔ "میں ابھی کان کھینچتا ہوں شیطان کے۔"

نتاشا نے کہا۔ "نہیں رہنے دیں بچہ ہے۔" پھر وہ سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے بولی۔ "شہر کی کیا صورت حال ہے؟"

اباقہ نے کہا۔ "وہی وادی میر والی کیفیت ہے۔ لوگوں میں زبردست ہراس پایا جاتا ہے۔ بہت سے لوگ تو شمالی علاقوں کی طرف نکل گئے ہیں مگر خراب راستوں کی وجہ سے نقل مکانی بھی آسان نہیں۔ پورے شہر کے کلیساؤں میں شب و روز عبادت ہو رہی ہے۔

بعض افراد نے مستقل طور پر عبادت گاہوں میں ڈیرے ڈال لیے ہیں۔"

نتاشا نے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "منگول لشکر کے بارے کچھ پتہ چلا؟"

اباقہ نے کہا۔ "کل میں اور اسد کچھ دوسرے سرداروں کے ساتھ اگناتیوز کی طرف کوئی پندرہ کوس تک گئے تھے۔ ابھی تک منگول لشکر کے آثار نظر نہیں آئے .... ہاں دریائے سیت کی طرف سے آنے والے ایک قافلے نے بتایا ہے کہ منگول کاریگر لشکر کے راستے میں ندیوں پر پل باندھ رہے ہیں۔ تیاریوں سے صاف ظاہر ہے کہ ان کا رخ نوووگرود ہی کی طرف ہے۔"

نتاشا نے کہا۔ "یورق اور شیزی کولت کے بارے میں کچھ پتہ چلا۔"

اباقہ نے تاسف سے جواب دیا۔ "نہیں ابھی کچھ معلوم نہیں ہوا۔ شیزی تو ہو سکتا ہے گرفتار ہو گئی ہو لیکن یورق ہتھیار پھینکنے والوں میں سے نہیں تھا۔ یا وہ آزاد ہے یا مر چکا ہے۔" اچانک اباقہ کو کچھ یاد آیا وہ بولا۔ "نتاشا! تمہارے لیے ایک اور اطلاع ہے ذیوک کل دوپہر نوووگرود پہنچا ہے۔"

نتاشا کے چہرے پر ناگواری کے آثار ابھرے وہ بولی۔ "اباقہ! آپ اس کی طرف سے بے حد ہوشیار رہیں۔ وہ نہایت خطرناک شخص ہے۔"

اباقہ نے چونک کر نتاشا کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک بیوی کی دردمندی جھلک رہی تھی۔ اباقہ کو اس طرح اپنی طرف دیکھتے پا کر بے اختیار نتاشا کی پلکیں جھک گئیں۔ وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

"اچھا ہم چلتے ہیں۔ آپ ناشتے کے لیے منہ ہاتھ دھو لیں۔" علی کی شریر آنکھیں ایک کھڑکی کی درز سے لگی ہوئی تھیں۔ نتاشا کے اٹھتے ہی یہ آنکھیں وہاں سے اوجھل ہو گئیں۔

.... عین اس وقت شاہی محل میں رئیس وزیولڈ اپنی نشست گاہ میں بیٹھا تھا۔ اباقہ کے ساتھ آنے والے فوجی دستے کا ایک ادھیڑ عمر سردار اس کے ساتھ تھا۔ سردار جذباتی لہجے میں کہہ رہا تھا۔ "رئیس محترم! وہ فولادی انسان ہے۔ بے پناہ حوصلے کا مالک اور حیرت انگیز جنگجو۔ دریائے سیت کے کنارے میں نے اپنی آنکھوں سے اسے منگولوں کے سر اڑاتے دیکھا ہے۔ اس کی جنگی چالوں میں بھوکے درندوں کی عیاری اور وار میں رعد و برق کی تیزی ہے تلوار اٹھاتا ہے تو قضا بن جاتی ہے' تیر چلاتا ہے تو وہ موت ہوتا ہے اس کے جنگی نعرے میں ایسی گرج ہے کہ مدمقابل کا کلیجہ دہل جاتا ہے۔ رئیس معظم وہ ایک غیر قوم اور غیر مذہب کا شخص ہے۔ وہ نہ میرا قرابت دار ہے اور نہ ہموطن۔ اگر میں

اس کی تعریف کر رہا ہوں تو صرف اور صرف اس لیے کہ وہ ہے ہی تعریف کے قابل بخدا وہ کسی فوج کا سالار بننے کے لائق ہے۔ اگر حضور مجھ بندہ ناچیز کو کسی رائے کے قابل سمجھتے ہیں تو میں پورے اخلاص سے عرض کروں گا کہ اسے کوئی بڑی ذمے داری سونپی جائے وہ ہماری توقعات سے کہیں بڑھ کر سود مند ثابت ہو گا۔"

رئیس نے کہا۔ "اس سے پہلے بھی کچھ سردار اس نوجوان کی تعریف کر چکے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ تم جو کچھ کہہ رہے ہو خلوص نیت سے کہہ رہے ہو۔ بہر حال ہم اس بارے سوچیں گے۔"

فوجی سردار نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "جناب رئیس! اگر اجازت ہو اور آپ میری اس گستاخی کو معاف کریں تو میں ایک عرض اور کروں گا۔"

رئیس نے فراخدالی سے کہا۔ "کہو سردار! ہم تمہاری ہر بات سنیں گے۔"

سردار نے کہا۔ "جناب رئیس! ڈیوک یہاں کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ یقیناً وہ آپ کو بھی محبوب ہو گا۔ مگر مجھے اندیشہ ہے کہ اباقہ اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں اس کی رائے غیر جانبدارانہ نہیں ہو گی۔ ولادی میر میں وہ اباقہ کا سب سے بڑا مخالف رہا ہے۔"

رئیس نے فوجی سردار کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "گھبراؤ نہیں سردار! یہ ایک جمہوری ریاست ہے۔ یہاں جو بھی فیصلہ ہو گا ملک کے بہترین مفاد میں ہو گا۔ اگر ان حالات میں بھی ہم ذاتی کرو فر اور انتقام کی باتیں کرتے رہے تو عذاب الٰہی کو دعوت دیں گے۔"

کچھ دیر بعد فوجی سردار تعظیم پیش کر کے باہر نکل گیا۔ اس کی روانگی کے بعد رئیس نے خادم خاص کو حکم دیا کہ ڈیویز باف کو حاضر کیا جائے۔

ڈیوک انتظار گاہ میں بیٹھا رئیس کے بلاوے کا انتظار کر رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں رئیس کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ اس کے ہاتھوں میں ایک چرمی تھیلا تھا۔ اس نے جھک کر رئیس کو آداب پیش کیا۔ رئیس نے کہا۔ "سناؤ ڈیوک! کیسے ہو؟"

ڈیوک کے باریک لب مخصوص انداز میں مسکرائے اس نے تھیلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "رئیس محترم! اس میں آپ کے ایک دشمن کنیازیوری کا سر ہے۔ اسے میں نے اپنے ہاتھوں سے جہنم واصل کیا ہے۔"

اگر ڈیوک کا خیال تھا کہ رئیس اس خبر پر بے پناہ مسرت کا اظہار کرے گا تو اسے مایوسی ہوئی۔ رئیس کے چہرے پر اطمینان کی ایک لہر ضرور نظر آئی مگر اسے مسکراہٹ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔

"ٹھیک ہے ڈیوک! بلآخر تم نے اپنے بھائی کے قتل کا انتقام لے لیا .... لیکن اب ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اپنے مفادات اور تنازعے بھول کر منگولوں کے انتقام سے بچنے کی کوشش کریں۔ اس بارے میں تمہاری کیا رائے ہے اور تم نے کیا تیاری کی ہے؟"

ڈیوک جسے رئیس کے رویے پر قدرے مایوسی ہوئی تھی۔ گہری سانس لے کر قالین کو گھورنے لگا۔ اس کا سازشی ذہن پھر متحرک ہو چکا تھا۔ کچھ دیر وہ خیالوں کو جمع کرتا رہا پھر مدبرانہ انداز میں بولا۔ "رئیس محترم! سب سے پہلے تو میں یہ عرض کروں گا کہ کنیازیوری کے داماد اباقہ اور اس کے ساتھیوں پر........."

اچانک رئیس نے ہاتھ اٹھا کر اس کی بات کاٹی۔ "ڈیوک! ہم نے تم سے کسی کے بارے رائے طلب نہیں کی۔ صرف یہ پوچھا ہے کہ شہر کے دفاع کے لیے تمہاری تیاری کیا ہے؟"

ڈیوک نے گڑ بڑا کر کہا۔ "جناب رئیس! میں اس سلسلے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اباقہ اور اس کے ساتھی........."

"ڈیوک! تمہیں ہماری بات سمجھ نہیں آئی؟" اس دفعہ رئیس نے خاصے تلخ لہجے میں کہا تھا۔ "ہم کسی کے بارے تمہاری رائے جاننا نہیں چاہتے .... اس وقت ذاتی اختلافات بھلا کر ہم سب کو مل جل کر کام کرنا ہے اگر ہمیں اس شہر کو بچانا ہے تو ہر شخص کو اس کی قابلیت اور استطاعت کے مطابق ذمے داری سونپنا ہو گی .... اسی اصول کے پیش نظر ہم کچھ فوجی عہدوں میں رد و بدل کر رہے ہیں۔ ممکن ہے اباقہ کو بھی کوئی اہم عہدہ دیا جائے۔ لہٰذا تم اس کے متعلق کوئی بھی رائے ظاہر کرنے سے گریز کرو۔"

رئیس کے ان واشگاف الفاظ نے ڈیوک کو کاٹ کر رکھ دیا۔ اس نے گھبراہٹ کے عالم میں نشست پر پہلو بدلا اور بولا۔ "رئیس محترم! معافی چاہتا ہوں۔ یقیناً آپ ہمارے لیے بہتری سوچیں گے۔"

☆-------☆-------☆

عشاء کی نماز کے بعد اسد سو گیا۔ علی بھی اباقہ کا انتظار کرتے کرتے خواب گاہ کے قالین پر ہی نیند کی آغوش میں پہنچ گیا لیکن نتاشا ابھی تک جاگ رہی تھی۔ شام سے موسلا دھار بارش کا سلسلہ شروع تھا۔ اس سے سردی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ نتاشا نے ایک گرم شال کندھے پر پھیلا رکھی تھی اور ہاتھ بغلوں میں دبے دالان میں ٹہل رہی تھی۔ کبھی ٹہلتے ٹہلتے کرسی پر بیٹھ جاتی اور ایک سنگی ستون کے گرد لپٹی ہوئی سدا بہار کی بیل کو

گھورنے لگی۔ بیل اور ستون۔ کیا منطقی رشتہ تھا۔ بیل کی موجودگی سے ستون دلکش تھا اور ستون کے وجود نے بیل کو سہارا دے رکھا تھا۔ یہ ستون نہ ہوتا تو بیل چند پتوں کی صورت میں مختصر کر رہ جاتی۔ پھر ایک دن یہ پتے بھی کسی کے قدموں تلے روندے جاتے۔

دفعتاً وہ اپنے خیالوں سے چونکی۔ ڈیوڑھی کی طرف قدموں کی آوازیں آئی تھیں۔ پھر اباقہ دو سپاہیوں کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ یقیناً وہ کسی طویل گشت کے بعد لوٹے تھے۔ نہ جانے کیوں نتاشا کا دل چاہا کہ وہ شہزادی نہ ہوتی ایک عام لڑکی ہوتی۔ اس خوبصورت رہائش گاہ کی جگہ ایک معمولی سا مکان ہوتا۔ اباقہ گھوڑے پر سوار سیدھا اندر چلا آتا۔ وہ اس کے گھوڑے کی لگام تھامتی۔ اسے اصطبل میں باندھتی' اپنے ہاتھ سے اس کے آگے چارہ ڈالتی اور اس کی گردن تھپ تھپاتی۔ وہ سرحد کے محافظ کا گھوڑا تھا۔ اس کی خدمت کرکے اسے کتنا سکون ملتا لیکن ایک شہزادی ہونے کی وجہ سے وہ یہ سب کچھ نہ کر سکتی تھی۔ نامعلوم کیوں اسے اپنے شاہی نام و نسب پر افسوس ہونے لگا۔

اباقہ اب سپاہیوں کو واپس بھیج کر دالان میں پہنچ چکا تھا۔ اس کے شانوں پر ایک سبز سوتی چادر تھی۔ اس نے چادر اتاری اور اسے جھاڑ کر ایک کھونٹی پر لٹکانا چاہا۔ اس وقت نتاشا جلدی سے آگے بڑھی اور چادر تھام لی۔ پھر خود اسے کھونٹی پر لٹکایا اور بولی۔

"آیئے! بہت سردی ہے۔ ہم نے خادمہ کو آپ کے کمرے میں آتشدان دہکانے کا کہا تھا۔"

اباقہ نے "شکریہ" کہا اور نتاشا کے ساتھ چلتا کمرے چلا آیا۔ "اسد کہاں ہے؟" اس نے دریافت کیا۔

"وہ اور علی تو آپ کے انتظار میں سو گئے۔" نتاشا نے جواب دیا پھر آگے بڑھ کر اباقہ کو زرہ کھولنے میں مدد دینے لگی۔ اباقہ کی خدمت پر مامور خادمہ بھی سو چکی تھی نتاشا نے اسے جگانا مناسب نہیں سمجھا اور خود ہی اباقہ کے لیے رات کا لباس ڈھونڈ کر نکالا اور مطبخ سے کھانا لینے چلی گئی۔ اباقہ کا کام کرتے ہوئے اسے عجیب خوشی محسوس ہو رہی تھی۔ ایسی خوشی اسے کبھی نصیب نہیں ہوئی۔ نہ خدام پر حکم چلاتے' نہ مجرموں کو سزائیں سناتے اور نہ امور سلطنت انجام دیتے۔ اسے لگا جیسے وہ کام غیر اہم تھے جو اس نے مجبوری سے کیے' اہم کام یہی ہے کہ وہ اپنے محبوب شوہر کی خدمت کرے۔ اسے آرام پہنچائے اور اس کی مسرت کا باعث ہو۔

اباقہ قدرے حیرانی سے نتاشا کی مصروفیات کا جائزہ لے رہا تھا۔ نہ صرف اس نے

کھانا اباقہ کے سامنے چنا بلکہ خود بھی اس کے ساتھ بیٹھ کر کھانے لگی۔ آج اس کا ہر انداز بدلا ہوا تھا۔ کھانا کھاتے ہوئے اس کی ترنم ریز آواز اباقہ کے کانوں سے ٹکرائی۔

"آپ نے بہت دیر لگائی۔"

اباقہ نے کہا۔ "ہاں .... ہم آج دوپہر گشت پر نکلے تھے۔ شدید بارش کے سبب راستہ خراب تھا اس لیے طویل چکر کاٹ کر آنا پڑا۔" شہزادی منگولوں کے بارے میں سوالات پوچھنے لگی۔ اباقہ مختصر جواب دیتا رہا اور ساتھ ساتھ نوالے حلق سے نیچے اتارتا رہا۔

شہزادی نے پوچھا۔ "کیا بات ہے آپ جلدی میں نظر آتے ہیں؟"

اباقہ نے کہا۔ "ابھی داروغہ نے بتایا ہے کہ مجھے اور اسد کو رئیس نے محل میں طلب کیا ہے۔"

شہزادی نے حیرانی سے کہا۔ "اس وقت؟ کیا کوئی خاص بات ہے؟"

اباقہ نے کہا۔ "ہاں خاص بات ہی لگتی ہے۔"

شہزادی نتاشا کے چہرے سے ظاہر تھا کہ وہ اس بے وقت کے بلاوے سے افسردہ ہے۔ غالباً اسے اباقہ کی دن بھر کی تھکن کا احساس تھا۔ اباقہ نے جیسے تیسے کھانا ختم کیا پھر اسد کو جگایا اور اسے محل سے آنے والے بلاوے کے متعلق بتایا۔ اسد نے شب خوابی کا لباس تبدیل کر کے اباقہ کو بھی لباس تبدیل کرنے پر مجبور کیا۔ پھر دونوں نتاشا کو خدا حافظ کہہ کر محل کی طرف روانہ ہو گئے۔

وہ محل میں پہنچے تو وہاں خاصی چہل پہل نظر آئی۔ بیرونی دروازے پر اعلیٰ فوجی وغیر فوجی عہدیداروں کی گھوڑا گاڑیاں موجود تھیں۔ ظاہر تھا کوئی اہم نشست ہونے والی ہے۔ ان کا اندازہ درست نکلا۔ محل کی نشست گاہ میں کم و بیش سارے اعلیٰ افسران موجود تھے۔ رئیس وزیونڈ' نائب رئیس اور مشیر جنگ بھی تھوڑی دیر بعد پہنچ گئے۔ رئیس کی آمد کے بعد نشست گاہ کے دروازے بند کر دیے گئے اور ہنگامی نوعیت کی اس نہایت اہم گفتگو کا آغاز ہو گیا۔

یہ گفتگو رات کے آخری پہر تک جاری رہی۔ اس میں جنگی حکمت عملی تیار کی گئی اور دفاعی نوعیت کے کچھ نہایت اہم فیصلے کیے گئے۔ رئیس نے اباقہ کو دو دس ہزاری دستوں کا سالار اعلیٰ مقرر کر کے اپنے مصاحبین کو حیران کر دیا۔ اسد کو اس کا معاون خصوصی بنایا گیا۔ اباقہ کو یہ شایان شان منصب دینے کے بعد رئیس نے اس کی سابقہ خدمات کو سراہا اور اس سے دریافت کیا کہ موجودہ صورت حال میں دفاع کے حوالے سے

اس کی کیا رائے ہے؟

اباقہ پر یکلخت ایک بہت بڑی ذمے داری آن پڑی تھی۔ رئیس نے جس طرح اس کی عزت افزائی کی تھی اور اب جس طرح اس سے مشورہ طلب کیا جا رہا تھا' اباقہ کے لیے ضروری ہو گیا تھا کہ وہ فی الواقع اپنے آپ کو اس تکریم کا حقدار ثابت کرے۔ اس نے دھیمے لہجے میں اسد سے مشورہ طلب کیا' پھر اپنی جگہ پر کھڑا ہوتا ہوا بولا۔

"جناب رئیس! آپ کی عزت افزائی کا بہت شکریہ۔ میں اپنی جان دے کر بھی آپ کے اعتماد پر پورا اترنے کی کوشش کروں گا.......... جہاں تک میری رائے کا سوال ہے میں نہایت احترام سے عرض کرتا ہوں کہ یہاں پر مجھ سے کہیں زیادہ قابل اور تجربہ کار جنگی ماہر موجود ہیں۔ ان کی موجودگی میں' میں کوئی بہتر رائے نہ دے سکوں گا.......... ہاں ایک بات جو میں نے یہاں قیام کے دوران محسوس کی ہے اور جو سراسر منگول حملہ آوروں کے خلاف جاتی ہے' میں آپ سے ضرور کہنا چاہوں گا۔ نوودگرود کے مضافاتی علاقے کی صورت حال ایسی ہے کہ یہاں منگول لشکر کے خلاف چھاپا مار کارروائیاں نہایت کارگر ثابت ہو سکتی ہیں۔ بلکہ مجھے کہنے دیجیے کہ اگر منگول لشکر کو کسی جگہ سبق سکھایا جا سکتا ہے اور ان سے اپنی شکستوں کا بدلہ لیا جا سکتا ہے تو وہ نوودگرود ہی ہے۔ یہاں کے نواحی جنگل' کھائیاں' دلدلیں اور پُرپیچ راستے منگولوں کے قبرستان ثابت ہو سکتے ہیں۔ اگر ہم ہمت سے کام لیں اور کسی طرح منگول لشکر کو شہر تک پہنچنے سے پہلے ہی جا لیں تو میں پورے وثوق سے کہتا ہوں کہ وہ بکھر جائیں گے اور اس دشوار گزار علاقے میں دوبارہ ایک متحدہ مضبوط لشکر کی صورت اختیار نہ کر پائیں گے۔ اس کے بعد ہم مختلف اطراف سے حملہ کر کے انہیں اس طرح ہراساں کریں گے کہ ان کی ہمت ٹوٹ جائے گی۔ بہت ممکن ہے کہ اس دوران دوسرے علاقوں سے بھی کمک پہنچ جائے اور ہم نوودگرود کے جنگلوں میں منگول لشکر کو ایک عبرتناک شکست دے سکیں۔" اباقہ کی تجاویز کو اس مشاورت میں نہایت ہمدردی اور غور و فکر سے سنا گیا۔ مختلف ماہرین کے درمیان ایک طویل مذاکرہ ہوا اور یہ طے پایا کہ اباقہ اسد اور شاخان دس ہزار سپاہیوں کے ساتھ شہر سے چھاپا مار کارروائی کے لیے نکلیں گے اور دشمن کے راستے میں گھات لگا کر بیٹھ جائیں گے۔ اگنا تیوز سے کوئی دو کوس آگے ایک گھنا جنگل دشمن پر ہلہ بولنے کے لیے نہایت موزوں تھا۔ طے ہوا کہ اگر یہ حملہ مفید ثابت ہوا اور منگول لشکر میں ابتری کے نمایاں آثار نظر آئے تو تیز رفتار قاصد شہر کی طرف روانہ کیے جائیں گے اور روسی فوج شہر سے نکل کر دشمن کے مقابل آ جائے گی۔

.... اس رات تمام تفصیلات طے کر لی گئیں اور رئیس نے ہدایت کی کہ کل شام تک ایک دس ہزاری دستہ کیل کانٹے سے لیس ہو کر مضافات کی طرف روانہ ہو جائے۔

☆=========☆=========☆

اگلے روز دوپہر کے وقت اباقہ اسد اور شاخان دس ہزار سپاہیوں کے ساتھ اگناتیوز کی طرف روانہ ہو گئے۔ نتاشا اور علی نے رقت آمیز انداز میں انہیں الوداع کیا۔ شہر پر اس وقت خوف و ہراس کی فضا طاری تھی۔ آنکھیں ویران' رنگ زرد اور ہونٹ خشک۔ ہر شخص سہما ہوا تھا۔ اہل شہر نے دھڑکتے دلوں اور خاموش دعاؤں سے انہیں رخصت کیا۔ اباقہ کے دس ہزاری دستے میں وہ ڈیڑھ سو سرفروش بھی شامل تھے۔ جو اباقہ کے ساتھ یہاں پہنچے تھے۔ انہوں نے دوسرے سپاہیوں میں اباقہ کی عزت افزائی کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ نتیجتاً ہر سپاہی کی آنکھوں میں اباقہ کے لیے عزت و احترام کے جذبات تھے۔ وہ اپنے سالار پر فخر محسوس کرتے تھے اور میدان جنگ میں اس کے جوہر دیکھنے کے مشتاق تھے۔ ان لوگوں کے اعتماد نے اباقہ کی ذمے داریوں میں بے پناہ اضافہ کر دیا تھا۔ کبھی کبھی وہ ان کی ضرورت سے زیادہ عزت و تکریم پر جھنجلا بھی جاتا تھا۔ ایسے میں اسد اس کو سمجھاتا کہ اسے خود پر قابو رکھنا چاہیے۔ ورنہ ان کے دل ٹوٹ جائیں گے۔

دشوار گزار راستوں پر سفر کرتے وہ دوسرے روز شام تک اپنی منزل پر پہنچ گئے۔ ڈھلوان میں پھیلا ہوا ایک وسیع جنگل انہیں آغوش میں لینے کو بے تاب تھا۔ یہاں سے دارالحکومت نوودگرود جانے والا راستہ ایک وادی کی شکل اختیار کر گیا تھا اور یقینی بات تھی کہ منگول لشکر یہیں سے گزرے گا۔ دوسری صورت میں منگولوں کو ایک طویل چکر کاٹنا پڑتا جس کے وہ ہرگز متحمل نہ ہو سکتے تھے۔ پھر بھی امکان کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اسد اور شاخان سے مشورے کے بعد اباقہ نے فیصلہ کیا کہ دستے کے تین ہزار سپاہی پہاڑوں کے پار بھیج دیے جائیں تاکہ اگر دشمن دوسرا راستہ اختیار کرے تو وہ آگاہ ہو سکیں۔ اس دستے کا سالار اسد کو بنا دیا گیا۔ باقی سات ہزار سپاہیوں کے ساتھ اباقہ اور شاخان نے جنگل میں ڈیرے ڈال لیے۔ منگول لشکر کی آمد تک انہیں خیموں کے بغیر گزارہ کرنا تھا اس لیے ہر فوجی کے جسم پر برساتی کی شکل کا ایک لبادہ تھا جو اسے سردی سے بھی محفوظ رکھتا تھا۔ سبز رنگ کے ایسے ہی موٹے لبادے گھوڑوں پر بھی ڈالے گئے تھے۔ یہ لبادے درختوں کا ایک حصہ ہی دکھائی دیتے تھے۔ چمکدار ہتھیار بھی ان لبادوں میں چھپائے گئے تھے تاکہ دشمن کی نظر سے اوجھل رہ سکیں۔ بارشوں کا سلسلہ جاری تھا اس لیے پوری فوج

کے لیے خشک راشن کا انتظام تھا۔ آگ جلانے اور کھانا پکانے کے لیے نہ ان کے پاس وقت تھا اور نہ ہی یہ جگہ مناسب تھی۔ تمام کے تمام سپاہی بالکل تیار حالت میں درختوں کے نیچے گھات لگا کر بیٹھ گئے۔ اباقہ نے انھیں شاخان کے مشورے سے سات نہایت تیز رفتار اور متحرک دستوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ جاسوسوں کی اطلاعات کے مطابق منگول لشکر کی آمد اب کسی بھی وقت متوقع تھی۔ لہٰذا اباقہ اور شاخان ساری رات جاگتے رہے دونوں گھوم پھر کر سپاہیوں کے حوصلے بڑھاتے اور ان کی تیاری کا جائزہ لیتے رہے اباقہ کی موجودگی نے سپاہیوں کی بے قراری کو ایک عجیب طرح کے سکون میں بدل دیا تھا وہ پورے اعتماد اور تحمل سے منگول لشکر کے منتظر تھے۔

انھیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ صبح کی آمد کے ساتھ ہی شمال سے منگول وحشی طلوع ہو گئے۔ دو جاسوس بھاگتے ہوئے پہنچے اور انھوں نے بتایا کہ منگول ہراول وادی کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اباقہ نے مخصوص اشارہ کیا اور تمام سردار اپنے سپاہیوں کو حملے کی حالت میں لے آئے۔ وسطی روس کے فاتحین کامیابی اور طاقت کے نشے میں چور اس وسیع اور پُر خطر جنگل کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ان کے بڑھتے ہوئے قدموں کو روکنے کے لیے سات ہزار سر فروش ایک غیر معمولی شخص کی قیادت میں حملے کے لیے تیار تھے۔ وہ فرد واحد کی طرح کامل سکون اور یکجہتی کے ساتھ کھڑے تھے۔ اس سبزہ پوش زمین اور برف برساتے آسمان کے نیچے مزاحمت اور دفاع کی ایک نئی تاریخ رقم ہونے والی تھی۔ پہلی پھر گونجتی لرزتی زمین نے اعلان کیا کہ منگول پہنچ گئے ہیں۔ گھوڑوں کی طویل قطاریں .... اور پرچم لہراتی ان کے سامنے سے گزریں۔ منگول معمول رفتار سے گھوڑے بھگاتے اردگرد کے نظارے دیکھتے محو سفر تھے۔ یوں لگتا تھا وہ اس بات سے بے خبر ہیں کہ موت ان سے صرف بیس کوس کے فاصلے پر رہ گیا ہے۔ اس وقت چھ سات ہزار سوار وادی میں پہنچ چکے تھے۔ جب اباقہ نے تلوار بلند کی اور نعرہ تکبیر کی پُر جوش آواز اس کے حلق سے نکل کر نشیب و فراز کو گرما گئی۔ یکلخت جیسے کوئی خوابیدہ قیامت جاگ اٹھی۔ سرداروں نے مخصوص جنگی نعرے بلند کئے اور گھوڑوں کو ہوا کر دیا۔ ان کی چمکتی تلواریں منگول لشکر کی طرف اٹھی ہوئی تھیں اور نظریں برف پر جمی تھیں۔ منگول لشکر اور اباقہ کے دستے کے درمیان کوئی سو قدم کا فاصلہ تھا۔ یہ فاصلہ پورے دستے نے شہاب ثاقب کی طرح طے کیا اور تباہی و بربادی کا پیامبر بن کر ان پر جا پڑا۔ منگول جو سردی سے ٹھٹھرے ہوا روی میں چلے جا رہے تھے اس اچانک افتاد سے اس وقت سنبھلے جب ان کے تین چار سو سوار میدان میں کھیت چکے تھے۔ اپنی غیر معمولی تنظیم کی بدولت وہ حتی الامکان تیزی سے سنبھلے۔ چند سو گز پیچھے ہٹے اور پھر یک جان ہو کر روسیوں پر ٹوٹ پڑے لیکن روسی بھی

اب ماسکو یا ولادی میر کے روسی نہیں تھے۔ ان کے حوصلے جوان تھے اور ان کے لہو کو گرمانے کے لیے اباقہ کی للکاریں موجود تھیں۔ وہ جرأت اور ہمت کا پیکر، مجسم غضب اور ہلاکت، ٹوٹ ٹوٹ کر منگولوں پر برس رہا تھا۔ ساتھ ساتھ وہ قریبی سپاہیوں کو بلند آواز میں ہدایات دے رہا تھا۔ اس کا انداز دیدنی تھا۔ یوں لگتا تھا وہ منگول سپاہیوں سے چیخ چیخ کر موت طلب کر رہا ہے لیکن کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اسے موت دے سکے۔ وہ اس کے سامنے اپنی زندگیاں ردی کاغذ کی طرح پھینک رہے تھے اور پیچھے ہٹ رہے تھے اچانک ایک جانب سے ایک منگول سردار چیخا۔

"یہ بدبخت اباقہ ہے۔ خبردار زندہ نہ بچے۔ شاباش سپاہیو، تمہیں نیلے آسمان کی قسم، خان اعظم کی روح کی قسم .... تمہیں یاک کے پرچم کی قسم، اسے زندہ نہ چھوڑنا۔" پُر جوش منگول بہادروں کا ایک ٹولہ للکارتا ہوا اباقہ کی طرف بڑھا۔ ان میں سے ہر ایک کی تلوار اباقہ کے خون کی پیاسی تھی۔ وہ اس نامور بہادر کو مار کر اپنا سر فخر سے بلند کرنا چاہتے تھے لیکن ان سروں کی قسمت میں کچھ اور لکھا تھا۔ شاخان نے جب اپنے جیالے ساتھی کو منگول بہادروں کے نرغے میں دیکھا تو اس نے اپنے دستے کو پکارا اور بجلی کی طرح حرکت کرتا اباقہ کے عقب میں پہنچ گیا۔ اس مقام پر ایک خونریز اور خوفناک معرکہ ہوا۔ للکارے گونجے، تلواریں ٹکرائیں نیزے ہوا میں سنسنائے۔ چاروں طرف منگولوں اور روسیوں کی لاشیں بکھر گئیں۔ دونوں طرف سے بڑے بڑے بہادر اور جنگجو اس گھمسان کے رن میں کام آئے۔ سپہ سالار شاخان بھی مارا گیا لیکن اس کی قربانی رائیگاں نہیں گئی۔ منگول سواروں کے قدم اس بری طرح اکھڑے کہ وہ حواس باختہ ہو کر ایک خطرناک دلدل کی طرف بھاگ اٹھے۔ اس وقت اباقہ پر یہ انکشاف ہوا کہ اصل منگول لشکر ابھی پیچھے ہے۔ یہ لشکر کے ہراول دستے تھے جو لاپرواہی میں زیادہ آگے نکل آئے تھے۔ اباقہ نے پکار کر کہا۔

"ساتھیو! ان میں سے کسی شخص کو زندہ نہیں بچنا چاہیے۔ اس وادی کو ان کا قبرستان بنا دو۔"

منگولوں کی پسپائی پر اس آواز نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ روسی سپاہیوں کا تمام غضب، جوش اور انتقام ان کی تلواروں میں سما گیا۔ انھوں نے تیزی سے حرکت کر کے منگول دستوں کی واپسی کا راستہ مسدود کر دیا اور نتائج سے بے پرواہ ہو کر ان پر ٹوٹ پڑے۔ اس دوران پہاڑیوں کے عقب سے اسد کا دستہ بھی جنگی نعرے بلند کرتا میدان

میں پہنچ گیا۔ منگولوں کو تین اطراف سے اس طرح گھیر لیا گیا کہ انہیں چوتھی طرف دلدل میں کودنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ مجبور ہو کر انہوں نے ہتھیار پھینک دیے اور خود کو گرفتاری کے لیے پیش کر دیا۔ ایک روسی سردار نے چلا کر کہا۔ "سردار اباقہ! دشمن خود کو حراست کے لیے پیش کر رہا ہے۔" اباقہ کی آنکھوں میں وحشت رقصاں تھی۔ سلطان جلال کا فرمان اس کے کانوں میں گونج رہا تھا۔ سمرقند بخارا اور پھر بیازان و دلادی میر کے خونی نظارے اس کی آنکھوں کے سامنے تھے۔ وہ ان درندوں کو کیسے گرفتار کر سکتا تھا' کیسے ان کی زندگیاں بخش سکتا تھا۔ اس نے کسی درندے ہی کی طرح غرا کر کہا۔

"ساتھیو! یہ انسان نہیں' زہریلے سانپ ہیں۔ ان کے پھن کاٹ ڈالو' قتل کر دو ان سب کو۔"

اباقہ کا حکم سنتے ہی روسی سپاہی پوری غضبناکی سے منگولوں پر ٹوٹ پڑے۔ پلک جھپکنے میں ان درندوں کو بے ضرر چوپائیوں کی طرح ذبح کر دیا گیا۔ صرف چھوٹی چھوٹی دو ٹولیوں نے واپس بھاگنے کی کوشش کی لیکن اطراف میں کھڑے سپاہیوں کے تیروں نے انہیں گھوڑوں سمیت چھلنی کر دیا .... اب ہر طرف منگول ہراول کی لاشیں بکھری تھیں۔ موسلا دھار بارش ان کے ناپاک خون سے زمین کو دھونے کی ناکام کوشش کر رہی تھی .... اور جنوب مغرب سے ایک طوفان آنے والا تھا .... منگول لشکر کا طوفان۔ یقیناً اصل لشکر کسی بھی وقت یہاں پہنچ سکتا تھا۔ اپنے ہراول دستوں کا انجام دیکھ کر باتو خاں اور سبودائی بہادر جس قدر بھی غضبناک ہوتے کم تھا۔

اباقہ اور اسد ایک گھنے درخت کے نیچے کھڑے میدان کی صورت حال دیکھ رہے تھے۔ وادی کے خونی معرکے میں اباقہ کے گھٹنے پر بھی ایک شدید زخم آیا تھا۔ زمین پر گرے ہوئے ایک منگول نے تلوار کا بھرپور وار کیا تھا جو چمڑے کا زیر جامہ کاٹ کر گوشت میں اتر گیا تھا۔ اسد نے اپنا رومال کس کے زخم پر باندھ دیا تھا۔ پھر بھی قطرہ قطرہ خون اباقہ کے جوتے میں جمع ہو رہا تھا۔ اباقہ کی نگاہیں میدان پر جمی تھیں' وہ اور اسد سوچ رہے تھے کہ اب انہیں کیا کرنا چاہیے۔ مرنے والے منگول کسی طرح بھی چھ ہزار سے کم نہیں تھے۔ ان میں سے بہت سے دلدل کی نذر ہوئے تھے۔ پھر بھی چاروں طرف لاشیں ہی لاشیں دکھائی دے رہی تھیں۔ ان کا جنگی سامان دور تک بکھرا پڑا تھا اور ان کے خالی گھوڑے ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ روسی سپاہی بڑی تندہی سے مال غنیمت سمیٹنے میں مصروف تھے۔ اباقہ اور اسد نے دو روسی سرداروں کے ساتھ مشورہ کیا اور کافی سوچ بچار کے بعد فیصلہ ہوا کہ اب منگول لشکر کے لیے کچھ آگے جا کر گھات لگانی چاہیے۔

چند سو سپاہی مال غنیمت کو ٹھکانے لگانے کے لیے موقعے پر موجود رہے جب کہ باقی فوج اباقہ اور اسد کی قیادت میں آگے چل دی۔ بارش کا سلسلہ بدستور جاری تھا۔ گھوڑے پھسل پھسل جا رہے تھے۔ خون ریز معرکے کی جگہ سے کوئی پانچ کوس آگے نکل کر اباقہ نے رکنے کا فیصلہ کر لیا۔ یہاں جنگل کافی گھنا تھا اور لشکر کے راستے سے زیادہ دور بھی نہیں تھا۔ گو یہ جگہ منگول لشکر پر چھاپہ مارنے کے لیے زیادہ موزوں نہیں تھی لیکن اگر وہ اچانک حملہ کرنے میں کامیاب ہو جاتے تو منگولوں کو تتر بتر کیا جا سکتا تھا۔

حسب سابق اباقہ نے اپنے سپاہیوں کو گھنے درختوں میں چھپا دیا اور مکمل خاموشی کی ہدایت کی۔ دھڑکتے دلوں سے وہ دشمن کا انتظار کرنے لگے' لیکن یہ ایک طویل انتظار ثابت ہوا منگولوں سے ان کی مڈبھیڑ اگلے روز سہ پہر سے پہلے نہیں ہو سکی .... ابھی شام نہیں ہوئی تھی' لیکن گہرے' تاریک بادلوں نے شام کا سماں پیدا کر رکھا تھا۔ چھتوں پر گرتی ہوئی مسلسل موسلا دھار بارش کی آوازیں میں کبھی کسی گھوڑے کی ہنہناہٹ یا ہتھیار کی کھنک شامل ہو جاتی تھی اس کے سوا مکمل خاموشی تھی۔ کوئی گمان نہیں کر سکتا تھا کہ ان درختوں میں کم و بیش دس ہزار گھڑ سوار موجود ہیں۔

اس وقت اسد نے ظہر کی نماز سے فراغت حاصل کی تھی جب ہوا کی لہروں پر منگول لشکر کی آمد کا اعلان ہوا۔ پہلے دور افتادہ آوازیں سنائی دیں۔ آہستہ آہستہ یہ آوازیں واضح ہوتی گئیں۔ اس کے ساتھ ہی گھوڑوں کی ٹاپوں سے زمین لرزہ بر اندام ہونے لگی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ زمین کے نیچے کوئی لاوا پیچ و تاب کھا رہا ہے جو عنقریب کسی حصے سے پھوٹ پڑے گا۔ زمین کی یہ گڑگڑاہٹ اور جنبش بڑھتی چلی گئی۔ منگول لشکر نزدیک تر آتا گیا .... پھر یکایک جیسے زلزلہ تھم گیا۔ آتشیں لاوے کو قرار ہو گیا۔ منگول گھوڑے رک گئے تھے شاید انہوں نے پڑاؤ ڈال دیا تھا یا ان کے راستے میں کوئی ندی آ گئی تھی' لیکن جس فاصلے پر لشکر رکا تھا وہاں کوئی ندی نہیں تھی۔ اس کا مطلب تھا انہوں نے پڑاؤ ڈالا ہے' مگر ڈیڑھ دو کوس پیچھے تو کوئی ایسی جگہ بھی نہ تھی جہاں پڑاؤ ڈالا جا سکتا۔ اباقہ' اسد اور روسی سرداروں نے کچھ دیر انتظار کیا پھر صورت حال جاننے کے لیے بے قرار ہو گئے۔ اباقہ نے اپنے ساتھ اسد اور تین ہوشیار روسی سرداروں کو لیا اور شمال کی طرف بڑھا۔ وہ گھوڑوں پر سوار نہایت احتیاط سے درختوں کے درمیان سفر کر رہے تھے۔ کوئی ایک کوس آگے ٹیلوں کا ایک سلسلہ تھا۔ منگول لشکر اس ٹیلے کے عقب میں رکا تھا۔ یہاں پہنچ کر اباقہ اور اس کے ساتھیوں نے گھوڑے درختوں میں باندھ دیے اور احتیاط سے ٹیلوں پر چڑھنے لگے۔ زمین پھسلوان اور ڈھلوان تھی۔ بمشکل وہ بلندی تک پہنچ سکے۔

دوسری طرف نگاہ دوڑائی تو بارش کی بوچھاڑوں میں دور تک قراقرم کے جنگجو وحشی نظر آئے۔ وہ اونچے نیچے ٹیلوں میں حد نگاہ تک پھیلے ہوئے تھے۔ ان کے پرچم جو بھیگ کر لٹک رہے تھے دیوہیکل نیزوں کی طرح آسمان کی طرف اٹھے تھے۔ دفعتاً اباقہ اور اسد چونک گئے۔ انہیں بالکل قریب سے گھوڑوں کی ٹاپیں سنائی دی تھیں۔ کچھ گھڑ سوار درختوں میں گھوڑے بھگاتے ان کی طرف بڑھ رہے تھے۔

"چھپ جاؤ۔" اباقہ نے تیز سرگوشی کی۔

وہ پانچوں بھاگے اور حتی الامکان تیزی سے گھنے درختوں کے ایک جھنڈ میں گھس گئے لمبی جنگلی گھاس نے انہیں اپنے اندر چھپا لیا۔ وہ اوندھے لیٹ کر آنے والوں کا انتظار کرنے لگے۔

جلد ہی وہ درختوں کی اوٹ سے نکل آئے۔ وہ تعداد میں آٹھ تھے۔ ان کے گھوڑوں پر طلائی ساز تھے اور لباس سے ان کی اعلیٰ حیثیت کا اظہار ہوتا تھا۔ بھاری اور قیمتی سموری لبادوں میں لپٹے وہ جھنڈ کے بالکل پاس آن کھڑے ہوئے۔ وہ اباقہ اور اس کے ساتھیوں سے اس قدر نزدیک تھے کہ ان کے گھوڑوں کی ہانپتی ہوئی سانسیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ اباقہ نے بے حس و حرکت لیٹے لیٹے اپنی آنکھوں کو حرکت دی اور گھڑ سواروں کو دیکھنے لگا۔ اس کا سارا خون جیسے سمٹ کر اس کے چہرے میں آ گیا۔ جسم میں ایک عجیب سی سنسناہٹ دوڑ گئی۔ اس کے سامنے منگول لشکر کے چوٹی کے سردار کھڑے تھے اور ان میں سوبدائی بہادر اور سالار اعظم باتو خان بھی شامل تھے۔ مشرق و مغرب جن کے خوف سے لرزہ بر اندام تھے۔ زمین جن کے وجود سے پناہ مانگتی تھی اور آسمان جن کی سفاکی پر خون روتا تھا' وہ اس کے سامنے کھڑے تھے۔ ان کے چہروں پر طویل مسافتوں کی پرچھائیاں تھیں اور وہ اپنے گھوڑوں ہی کی طرح ہانپتے ہوئے اور نڈھال تھے۔ اباقہ نے دیکھا سوبدائی بہادر اور باتو خان ساتھ ساتھ کھڑے تھے۔ ان کے چہرے بارش کی بوچھاڑوں سے تر تھے اور مونچھیں بھیگ کر لٹک گئی تھیں۔ وہ گہری نظروں سے اطراف کا جائزہ لے رہے تھے۔ پھر باتو خاں نے اپنا داہنا ہاتھ بڑھایا ایک سردار نے جلدی سے شراب کی چوبی بوتل اس کی طرف بڑھا دی۔ اس نے بوتل ہونٹوں سے لگا کر غٹاغٹ کئی گھونٹ پیئے پھر آستین سے ہونٹ پونچھ کر دور افق میں دیکھنے لگا۔

اباقہ اشارے سے اپنے ساتھیوں کو بتا چکا تھا کہ وہ بے حرکت پڑے رہیں۔ وہ سب اس طرح لیٹے ہوئے تھے کہ سبزے کا ایک حصہ بن گئے تھے۔ ان نازک لمحوں میں انہوں نے اپنے سانس تک روک لیے تھے۔ باتو خان افق کو گھورتا رہا پھر اس کی آواز بارش کے

شور میں ابھری۔

"......... نہ کوئی گاؤں' نہ کوئی بستی اور نہ کوئی انسان .... صرف سنسان زمین' ندی نالے بارشیں اور دلدل .... سوابدائی بہادر۔ آخر ہم کب تک ایسے بھٹکیں گے؟"

سوبادائی بہادر کی گونجدار آواز آئی۔ "جمیل ایلمن دیکھنے کا خواب' میں نے ایک مدت پہلے دیکھا تھا۔ کاش ہم نووگرود تک پہنچ سکتے۔ وہاں کے پوشیدہ خزانے ہماری ساری تھکن اتار دیتے۔ غلے کے گوداموں' شراب کے ذخیروں اور خوشبودار عورتوں سے بھرا ہوا وہ شہر ہمارے سپاہیوں میں نئی زندگی پھونک دیتا۔"

باتو خان کہا۔ "لیکن ہم کب تک سفر کریں گے۔ گھوڑوں کی بری حالت ہے۔ چراگاہیں ناپید ہیں اور دلدلیں اب تک سینکڑوں سپاہیوں کو نگل چکی ہیں۔"

شہزادے پوتا بوری کی الجھی ہوئی آواز آئی۔ "سمجھ نہیں آتی جوکا تا چھ یک ہزاری دستوں کے ساتھ آخر کہاں گیا۔ اسے زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا۔ مجھے تو اندیشہ ہے کہیں وہ بھی ان دستوں کے ساتھ کسی دلدل کی تہہ میں نہ بیٹھ گیا ہو۔"

سوبدائی نے مدبرانہ لہجے میں کہا۔ "اگر ایسا ہوتا تو اس کا کوئی سپاہی تو واپس پہنچتا۔"

باتو خاں نے کہا۔ "میرا خیال تو یہی ہے کہ وہ راستہ بھٹک گیا ہے۔"

شہزادے قاندو نے کہا۔ "مجھے تو ڈر ہے اسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے ہم خود بھی نہ بھٹک جائیں۔ اسے ملنا ہوتا تو اب تک مل جاتا۔"

آٹھوں منگول سوار چند لمحے خاموش رہے۔ شاید وہ کسی آخری فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ آخر باتو خاں کی آواز آئی۔

"سوبدائی بہادر' تم دادا چنگیز خان کے دست راست رہ چکے ہو۔ بتاؤ' اس وقت میری جگہ خانِ اعظم ہوتا تو کیا کرتا؟"

سوبدائی بہادر کی سوچ میں ڈوبی ہوئی آواز آئی۔ "خان اعظم کا خیال تھا کہ سپاہی کو چاق و چوبند اور گھوڑے کو تندرست ہونا چاہیے۔ خوراک وافر اور موسم مناسب ہو' خاص طور پر ابر آلود موسم میں وہ فوج کو پڑاؤ میں رہنے کا حکم دیتے تھے .... اگر ان پہلوؤں سے دیکھا جائے تو پیش قدمی ہمارے لیے مناسب نہیں۔"

باتو خاں کچھ دیر خاموش رہا۔ شاید سوبدائی بہادر کے مشورے کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا پھر اس کی تھکی ہوئی آواز سنائی دی۔ "ٹھیک ہے ساتھیو! ہم اس سفر کو ترک کرتے ہیں۔ لشکر کو اطلاع کر دو کہ ہم واپس روانہ ہوں گے۔ جنوب کی طرف سفر کرتے ہوئے ہم بحیرہ اسود کے کنارے کے زرخیز جنگلوں تک پہنچیں گے تاکہ گھوڑوں کا حال درست

ہو سکے۔ اس کے بعد آئندہ کے بارے سوچا جائے گا۔"

یہ کہتے ہوئے باتو نے لگام کو خفیف جھٹکا دیا۔ اس کا گھوڑا چند قدم چل کر اور آگے آیا۔ اب اس کے سموں اور اباقہ کے درمیان بمشکل دو گز کا فاصلہ تھا۔ صرف دو گز کے فاصلے پر وہ شخص موجود تھا جو نوودگرود کے لیے تباہی و بربادی کا طوفان بن سکتا تھا۔ صرف دو گز کے فاصلے پر نوودگرود کے ہزاروں لاکھوں انسانوں کی موت مجسم قہر اور غضب کی صورت میں کھڑی تھی۔ اس موت کا نام باتو خاں تھا .... لیکن وہ واپس جارہا تھا اسے معلوم نہیں تھا کہ نوودگرود یہاں سے صرف تیس کوس دور ہے اور صرف پانچ کوس دور وہ خونی وادی ہے جہاں اس کے گمشدہ ہراول دستوں کی کٹی پھٹی لاشیں پڑی ہیں .... اور صرف دو گز کے فاصلے پر وہ انسان ہے جو اس تمام تباہی کا ذمے دار ہے۔ کہنے کو نوودگرود صرف تیس کوس دور تھا' لیکن وہ تیس کوس بھی دور نہیں تھا۔ وہ صرف دو گز کے فاصلے پر تھا۔ دو گز کے فاصلے سے باتو خاں واپس جارہا تھا اور اباقہ اور اس کے ساتھیوں کو یہ دو گز کا فاصلہ برقرار رکھنا تھا۔ انہیں کوئی حرکت نہیں کرنا تھی۔ اباقہ کے ہاتھ میں خم دار خنجر تھا' وہ ایک ہی جست میں باتو تک پہنچ سکتا تھا اور مارنے کی کامیاب کوشش بھی کر سکتا تھا لیکن اسے معلوم تھا کہ اسے اپنی نفرت عداوت اور بالادستی سے قطع نظر خاموش پڑے رہنا ہے۔ اس میں نوودگرود اور اس کے لاکھوں باشندگان کی بھلائی تھی۔ وہ یکسر بے حرکت و بے صدا پڑے رہے .... پھر تاریخ اس نازک موڑ سے گزر گئی۔ باتو خان اور اس کے ساتھیوں نے گھوڑے موڑے اور نشیب میں اترتے چلے گئے۔ نوودگرود' تاریخ کی بدترین تباہی سے بچ چکا تھا۔

☆☆☆

سردار یورق اور شیزی کو لت برف میں دبے ہوئے مکان میں پورا ایک ہفتہ گزار چکے تھے۔ منگول لشکر شاید آگے روانہ ہو گیا تھا مگر وہ اپنے کچھ دستے اس علاقے میں چھوڑ گیا تھا۔ یہ دستے دن بھر اس علاقے میں سیر و شکار میں مصروف رہتے .... آخر ایک روز یورق نے محسوس کیا کہ اگر وہ اس کمرے میں دبکے رہے تو کسی دن چوہوں کی طرح پھنس جائیں گے۔ دراصل برف پگھلنا شروع ہو گئی تھی اور کمرے کی کھڑکی پھر ظاہر ہو گئی تھی۔ یہ درست تھا کہ اردگرد درخت موجود تھے مگر کسی بھی وقت کوئی بھٹکا ہوا منگول اس جانب آسکتا تھا۔ اس روز گھرے بادل چھائے تھے اور بوندا باندی ہو رہی تھی۔ یورق جانتا تھا منگول ایسے موسم میں خیموں سے کم ہی نکلتے ہیں۔ اس نے شیزی کو تیاری کی ہدایت کی۔ شیزی نے کمرے کی الماری سے برآمد ہونے والا ایک مردانہ لباس پہن لیا۔ یہ لباس

کھوڑھیلا ڈھالا تھا مگر شیزی اس میں کچھ اور بھی دلکش لگ رہی تھی۔ اس کے چھوٹے چھوٹے بالوں نے اسے ایک حسین نوجوان کی شکل دے دی تھی۔ ایک تھیلے میں خشک خوراک لے کر اور ہتھیار سنبھال کر دونوں کھڑکی سے باہر نکل آئے۔ شام کا اندھیرا دھیرے دھیرے اس برفستان کو نگل رہا تھا۔ نوودگرود جانے کے لیے ضروری تھا کہ وہ دریا کو پار کریں لیکن دریا پار کرنے کے لیے وہ اس مقام پر نہیں جا سکتے تھے جہاں کچھ روز پیشتر خون ریز جنگ ہوئی تھی۔ انہیں دریا کے متوازی سفر کرتے ہوئے کچھ آگے جانا تھا اور پھر کسی مناسب جگہ سے دریا پار کرنے کی کوشش کرنا تھی۔ وہ بڑے محتاط طریقے سے آگے بڑھتے رہے۔ تلوار یورق کے ہاتھ میں تھی اور شیزی اس سے لگی ہوئی ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ ان چند دنوں میں وہ آپس میں کافی بے تکلف ہو چکے تھے اور الفاظ کے بغیر بھی ایک دوسرے کا مدعا سمجھنے لگے تھے۔ اچانک انہیں قریب ہی کہیں بھیڑیوں کی خوفناک آوازیں آئیں۔ یہ آوازیں اپنی برف دوز پناہ گاہ میں وہ پہلے بھی کئی بار سن چکے تھے' لیکن آج یہ آوازیں ان کے رونگٹے کھڑے کر رہی تھیں کیونکہ وہ کھلی جگہ پر تھے۔ بہت جلد دونوں پر انکشاف ہوا کہ بھیڑیوں کا غول ان کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ان کی کریہہ آوازیں ہر لحہ قریب تر آرہی تھیں۔ یورق اور شیزی نے بھاگنا شروع کر دیا۔ ساتھ ساتھ ان کے ذہن تیزی سے اپنے دفاع کے متعلق سوچ رہے تھے۔ بچاؤ کی واحد صورت یہ تھی کہ وہ کسی درخت پر چڑھ جائیں' لیکن سیدھے اور ہموار تنوں والے درختوں پر چڑھنا کوئی سہل کام نہیں تھا اور وہ بھی گہری تاریکی میں۔ اکیلا یورق ہوتا تو شاید یہ کوشش بھی کر گزرتا' لیکن شیزی کے ساتھ ایسا ناممکن تھا۔ دونوں بری طرح ہانپ رہے تھے اور بھاگ رہے تھے۔ اب اس بات میں شبہے کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ بھیڑیے ان کے تعاقب میں ہیں۔ وہ اب دو اطراف سے انہیں گھیر رہے تھے۔ کبھی کبھی درختوں کے عقب سے ان کی بھاگتی ہوئی پرچھائیاں بھی نظر آجاتی تھیں۔ شیزی خوف کے عالم میں بار بار گر رہی تھی۔ ہر بار یورق رک کر اسے اٹھاتا اور ہاتھ تھام کر ساتھ بھاگنے لگتا۔ پھر اچانک پہلو سے ایک پرچھائیں ان دونوں پر جھپٹی اور شیزی کی دلدوز چیخ بھیڑیے کی کریہہ آواز میں شامل ہو گئی۔ ایک بھیڑیے نے پچھلے پنجوں پر کھڑے ہو کر اپنے ناخن شیزی کی پوستین میں گاڑ دیے تھے۔ یورق نے تیزی سے تلوار کو حرکت دی اور بھیڑیے کا پیٹ پھاڑ کر رکھ دیا۔ وہ تڑپ کر اچھلا اور برف پر لڑھکتا چلا گیا۔ مگر اس دوران دو اور بھیڑیے ان کے بالکل قریب پہنچ چکے تھے۔ موت یورق اور شیزی کی آنکھوں میں ناچنے لگی۔ بھوکے بھیڑیوں کا غول انہیں گھیر چکا تھا۔ اس سے تو بہتر تھا کہ وہ منگولوں کے ہتھے چڑھ جاتے۔ کم از کم بچنے کی یا

کوئی تدبیر کرنے کی مہلت تو ملتی۔ یہاں تو فوری موت سے سامنا تھا۔ خونی درندے ان کے گرم جسموں کی تکہ بوٹی کر کے جلد سے جلد اپنے معدوں میں اتار لینا چاہتے تھے۔ "کیسی بے کار موت ہے۔" یورق نے بھاگتے بھاگتے سوچا وہ اس وقت کو کوس رہا تھا جب اس نے پناہ گاہ سے نکلنے کا فیصلہ کیا تھا۔ بہر حال اب کیا ہو سکتا تھا۔ اسے معلوم تھا اس کی تلوار زیادہ دیر بھیڑیوں کو دور نہ رکھ سکے گی۔ وہ چند بھیڑیوں کو ضرور مار دے گا .... لیکن پھر وہ بیسیوں کی تعداد میں اس سے اور شیزی سے لپٹ جائیں گے۔ اپنے نوکیلے دانتوں سے ان کی پوستینیں پھاڑ دیں گے اور گوشت بھنبھوڑنے لگیں گے۔ شیزی کی آخری چیخیں ابھی سے یورق کے کانوں میں گونجنے لگی تھیں .... دفعتاً یورق کو ایک جھٹکا لگا۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ فضا میں اڑ رہا ہے .... اور وہ اکیلا نہیں تھا' شیزی بھی اس کے ساتھ تھی۔ چند لمحے تو دونوں کو کچھ سمجھ نہیں آئی وہ زمین سے کوئی چھ گز کی بلندی پر ہوا میں معلق تھے۔ ان کے نیچے بھیڑیے زور و شور سے بھونک رہے تھے تب آہستہ آہستہ یورق اور شیزی پر انکشاف ہوا کہ وہ منگول شکاریوں کے لگائے ہوئے ایک جال میں پھنس گئے ہیں۔ یہ جال شاید برفانی ریچھ کو پکڑنے کے لیے برف پر اس طرح بچھایا گیا تھا کہ جانور کے پھنستے ہی خود بخود سمٹ کر فضا میں معلق ہو جاتا تھا اور ایک تناور درخت کی شاخ سے کسی پوٹلی کی طرح لٹکنے لگتا تھا .... اور اب اس پوٹلی میں برفانی ریچھ یا کسی بھیڑیے کی بجائے یورق اور شیزی لٹک رہے تھے۔ لٹکتے ہوئے جال نے انہیں ایک دوسرے سے اس قدر قریب کر دیا تھا کہ شاید وہ عام حالات میں کبھی اتنے قریب نہ آسکتے۔ شیزی کی ہانپتی ہوئی سانسیں یورق کی گردن سے ٹکرا رہی تھیں اور یورق کا ایک بازو اس کی کمر میں تھا۔

وہ ساری رات انہوں نے اسی جال میں جھولتے ہوئے گزار دی۔ بھیڑیے رات کے دوسرے پہر تک ان کے نیچے چیختے چلاتے رہے پھر بھوک سے بے تاب ہو کر منتشر ہو گئے' لیکن وہ زیادہ دور نہیں گئے تھے۔ اطراف کے درختوں سے ان کی آوازیں دن چڑھے تک سنائی دیتی رہیں۔ یورق اور شیزی کے لیے دونوں طرف موت تھی۔ اگر وہ جال کاٹ کر نیچے کودنے کی کوشش کرتے تو بھیڑیے ان کا مزاج پوچھتے اگر ایسے ہی لٹکے رہتے تو منگولوں کے ہتھے چڑھتے۔ بہر طور انہیں ایک صورت کو قبول کرنا تھا اور شیزی پر بھیڑیوں کا خوف کچھ ایسا سوار ہو گیا تھا کہ اس نے یورق کو جال کاٹنے کی ہر کوشش سے باز رکھا۔

بالآخر اجالا پھیلا اور اس کے ساتھ ہی منگول گھوڑوں کی ہنہناہٹ اور سواروں کی آواز سنائی دینے لگیں۔ ان کے خیمے کہیں قریب ہی تھے۔ جلد ہی وہ اس درخت کے نیچے

پہنچ گئے۔ وہ تعداد میں چار تھے۔ ان کے لباس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ منگول فوج کا حصہ ہیں' لیکن وہ چال ڈھال سے سپاہی نہیں لگتے تھے۔ شاید ان کا تعلق لشکر کے کسی اور شعبے سے تھا۔ یورق اور شیزی کو جال میں دیکھ کر ان کے حلق سے فلک شگاف قہقہے برآمد ہونے لگے۔ ان کے بلند قہقہوں نے ان کے دوسرے ساتھیوں کو بھی وہاں کھینچ لیا۔ وہ سب مل کر اور ان کی طرف انگلیاں اٹھا اٹھا کر دیر تک قہقہے برساتے رہے۔ پھر ایک منگول نے درخت سے بندھے ہوئے ایک رسے کو ڈھیلا کیا اور جال آہستہ آہستہ برف پر اتر آیا۔ منگولوں نے انہیں جال سے نکالا۔ یورق نے شکر کیا کہ ان میں سے کوئی اسے بطور سردار پہچانتا نہیں تھا۔ ایک منگول نے جو ان کا سالار لگتا تھا آگے بڑھ کر یورق سے پوچھا۔

"تو کون ہے اور تیرے ساتھ یہ لڑکا کون ہے؟"

یورق اس سوال کا جواب رات ہی سوچ چکا تھا۔ اس نے دھیمے لہجے میں تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

"دوستو! میں شہزادہ قائدو کے فوجی دستوں میں شامل ہوں۔ ہیت کی فتح کے بعد مال غنیمت کی تقسیم میں یہ نوجوان لڑکا میرے حصے آیا تھا' لیکن اگلے ہی روز یہ میری تلوار اور دو قیمتی پوستینیں چرا کر بھاگ نکلا۔ میں نے اس کا پیچھا کیا۔ یہ کم بخت بہت ہوشیار نکلا۔ پورے دو روز مجھے جنگل میں بھگاتا رہا۔ آخر جب میں نے اسے پکڑا تو ہم دونوں راستہ بھول چکے تھے۔ کئی روز بھٹکنے کے بعد ہم آج یہاں پہنچے تھے کہ تمہارے لگائے ہوئے اس جال میں پھنس گئے۔"

منگول سردار نے مشکوک لہجے میں کہا۔ "قائدہ کی فوج میں تمہاری کیا حیثیت ہے؟"

یورق اس سوال کی اہمیت سمجھتا تھا۔ اس نے جو کہانی سنائی تھی اس سے ظاہر تھا کہ وہ ایک معمولی آدمی ہے' ورنہ ایک تلوار' دو پوستینوں اور ایک غلام لڑکے کے لیے وہ دو روز جنگل میں کیوں بھٹکتا۔ اس کے علاوہ اگر وہ کوئی سردار تھا تو پھر اسے مال غنیمت میں ایک کمزور سا لڑکا کیوں ملا۔ کوئی خوبصورت عورت یا توانا خدمتگار مرد کیوں نہ ملا۔ اس نے محتاط لہجے میں کہا۔

"میں .... تجربہ کار سائیس ہوں۔ فوج کے مرکزی اصطبل میں کام کرتا ہوں۔ میرے ذمے جنگی گھوڑوں کی دیکھ بھال ہے۔" اس کے ساتھ ہی یورق نے اپنی شکل بھی ویسی بنالی جیسے وہ واقعی ساری زندگی گھوڑوں کو چارہ ڈالتا رہا ہے۔ منگول سردار نے اس کے کندھے پر دھپ لگائی اور بولا۔

"کم بخت تو اس کیکڑے کے پیچھے بھاگتا رہا اور لشکر تین دن ہوئے یہاں سے روانہ ہو گیا۔"

"کیا واقعی۔" یورق نے حیرت ظاہر کی۔

"تو اور کیا میں تجھ سے دل لگی کر رہا ہوں۔"

"اب کیا ہو گا؟" یورق نے تاسف سے کہا۔ "منصب دار تو مجھے جان سے مار دے گا۔"

منگول سردار نے اسے ایک اور دھپ لگائی۔ "چل آ........ ہمارے پڑاؤ میں آجا۔ ہم تین چار روز میں نوودگرود روانہ ہو رہے ہیں۔ ساتھ چلے جانا۔"

یورق نے فوراً رضامندی ظاہر کر دی۔ اس روز وہ اور شیزی شکاریوں کے پڑاؤ میں منتقل ہو گئے۔ یہاں پہنچ کر یورق کا اندازہ درست ثابت ہوا۔ یہ لوگ عسکری نہیں بلکہ مداری یعنی شعبدہ باز تھے۔ منگول فوج میں مداریوں کے بہت سے ٹولے بھرتی کیے جاتے تھے۔ فراغت کے دنوں میں یہ مداری لشکر کا دل بہلاتے تھے۔ ان کا ایک دلچسپ کھیل ریچھوں کا تماشا تھا۔ اس کے علاوہ وہ مختلف سوانگ بھر کر سپاہیوں کی تفریح طبع کا سامان کرتے تھے۔ مداریوں کا یہ ٹولہ بھی اسی غرض سے یہاں آیا تھا' لیکن اب انہیں مقامی کماندار سے نوگرود جانے کا حکم ملا تھا۔

چوتھے روز انہوں نے دریا پار کیا اور نوگرود کی سمت روانہ ہوئے۔ پہلے تو یورق کا خیال تھا کہ وہ موقع دیکھ کر شیزی کے ساتھ مداریوں کے پڑاؤ سے فرار ہو جائے گا مگر پھر اس نے ارادہ ملتوی کر دیا۔ علاقے میں ہر طرف منگول دستے موجود تھے۔ انہوں نے راستے میں عارضی چوکیاں بھی قائم کر رکھی تھیں جہاں پر مویشیوں کے لیے چارے اور سپاہیوں کے لیے خوراک وغیرہ کا انتظام تھا۔ ان انتظامات کی موجودگی میں یورق اور شیزی کے لیے بہتر تھا کہ وہ مداریوں کے ساتھ ہی محو سفر رہیں۔ مداری ان پر یقین کر چکے تھے ضروری نہیں تھا کہ کوئی دوسرا پوچھ گچھ کرنے والا بھی ان پر یقین کر لیتا۔

مداریوں نے یورق اور شیزی کو گھوڑوں کی دیکھ بھال کا کام سونپ دیا تھا۔ اس میں ان کا بھی کیا قصور تھا' یورق نے انہیں اپنا پیشہ ہی یہ بتایا تھا لہٰذا اپنا بھرم قائم رکھنے کے لیے انہیں گھوڑوں کی مالش بھی کرنا پڑتی تھی۔ ان کو چارہ بھی ڈالنا پڑتا تھا اور لید بھی اٹھانا پڑتی تھی۔ یورق تو سخت جان تھا لیکن یہ مشقت طلب کام کرتے ہوئے شیزی کا ہاتھ بار بار اپنی نازک کمر کی طرف چلا جاتا تھا۔ بعض دفعہ تو اس مشقت سے ہلکان ہو جاتی۔ اس ساری کوفت کے ساتھ ساتھ یہ خطرہ بھی لاحق رہتا تھا کہ کہیں ان کا بھید نہ کھل جائے مداریوں

کے اس قافلے کا سامنا جونہی کسی دوسرے قافلے یا فوجی دستے سے ہوتا یورق اور شیزی نہایت محتاط ہو جاتے۔ یورق اپنی ٹوپی کو اس طرح کھول لیتا کہ صرف ناک اور آنکھیں ہی دکھائی دیتیں۔ وہ جانتا تھا اگر کسی نے اسے بطور سردار یورق پہچان لیا تو اس کے ساتھ شیزی بھی عبرتناک موت سے دوچار ہو گی۔ منگولوں کی نظروں میں وہ ایک باغی سردار تھا جس نے ان کے سب سے بڑے دشمن اباقا کے ساتھ مل کر انہیں ناقابل تلافی نقصان پہنچایا تھا۔ منگول لشکر میں اسے غدار اعظم' نمک حرام اور نہ جانے کن کن ناموں سے یاد کیا جاتا تھا........ لہٰذا ضروری تھا کہ وہ اپنی اور شیزی کی سلامتی کے لیے ازحد محتاط رہتا۔

دن گزرتے رہے اور وہ مداریوں کے قافلے کے ساتھ گھنے جنگلوں اور دلدلی علاقوں میں محو سفر رہے۔ ایک روز شیزی سخت خوفزدہ ہوئی۔ راستے میں ملنے والے ایک فوجی دستے کا سالار دیر تک اسے گھورتا رہا پھر قہقہہ لگا کر اپنے ساتھی سے بولا۔ "اگر روسی عورتیں اسی طرح کے مرد جنم دیتی رہیں تو آئندہ دو تین صدیاں ہم یہاں اطمینان سے حکومت کریں گے۔"

بھید کھلنے کے خطرات کے ساتھ ساتھ یورق اور شیزی کو مداریوں کے نہایت ناروا رویے کا سامنا بھی تھا۔ خاص طور پر یورق کے لیے یہ رویہ برداشت کرنا خاصا مشکل تھا۔ وہ ایک سردار ہی نہیں تھا' ایک بہادر سردار اور نڈر جنگجو تھا۔ ان تمام مداریوں کو وہ اکیلا اپنی تلوار کے زور پر تگنی کا ناچ نچا سکتا تھا مگر صورت حال ایسی تھی کہ الٹا وہ اسے تگنی کا ناچ نچا رہے تھے۔ بسا اوقات یورق اور شیزی کو گالیوں سے نوازا جاتا۔ بچا کھچا کھانا دیا جاتا اور گدھے کی طرح کام لیا جاتا مداریوں کا سرغنہ ذرا کھلے ہاتھ پیر کا شخص تھا اور اندھوں میں کانا راجہ کے مصداق شہ زور بنتا تھا۔ اس وقت بڑی دلچسپ صورت حال پیدا ہو جاتی جب وہ آتے جاتے یورق کی کمر پر دھپ لگاتا اور اسے مردود قرار دے کر جلدی جلدی کام کرنے کی تنبیہہ کرتا۔ ایسے موقعوں پر یورق کا خون کھول کر رہ جاتا قراقرم میں ایسے مداری بچے اس کے سامنے سانس بھی آہستہ لیتے تھے۔ وہ ایک ہاتھ سے اس کمینت کا ٹینٹوا دبا سکتا تھا' لیکن حالات کا تقاضا تھا کہ وہ اپنا سارا قہر کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھے۔

یہ ایک نہایت طویل اور کٹھن سفر ثابت ہوا۔ کئی ہفتے جنگل میں بھٹکنے کے بعد انہیں معلوم ہوا کہ منگول لشکر کا رخ بدل گیا ہے۔ باتو خاں' نوودگرود کا ارادہ ترک کر کے جنوب کی سمت جا رہا ہے۔ اس اطلاع کے بعد مداریوں کے اس قافلے کا رخ بھی جنوب مشرق کی طرف ہو گیا۔ یورق کسی فیصلے پر نہیں پہنچ رہا تھا کہ وہ مداریوں کے ساتھ رہے یا ان سے علیحدہ ہو کر نوودگرود کی طرف جائے۔ اسد نے آخری بار اسے نوودگرود پہنچنے کی

ہدایت کی تھی مگر منگول لشکر اب نوودگرود نہیں جارہا تھا۔ بہت سوچ بچار کے بعد شیزری اور یوتق نے فیصلہ کیا کہ وہ مداریوں کے ساتھ ہی رہیں گے' کیونکہ اباقہ اور اسد منگول لشکر سے جدا نہیں ہو سکتے تھے۔ ان کی تلواروں اور منگولوں کی گردنوں میں انوٹ رشتے استوار تھے۔ زندگی موت کا یہ ساتھ ختم نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ دونوں جہاں بھی تھے انہیں منگول لشکر تک پہنچ جانا تھا۔ لہٰذا یوتق اور شیزری نے مداریوں کے ساتھ اپنا سفر جاری رکھا۔

☆------☆------☆

شہزادی نتاشا اٹھ کر کھڑکی تک پہنچی۔ نوودگرود میں چراغاں کا سماں تھا۔ لوگ منگول لشکر کی واپسی پر خوشی منارہے تھے۔ کھڑکی سے نیچے زیریں منزل کے دروازے پر لوگوں کا ہجوم تھا۔ ان میں عورتیں بچے بوڑھے' سب شامل تھے۔ ان کے چہرے خوشی سے تمتما رہے تھے' وہ اباقہ سے ملنا چاہتے تھے۔ اس مجاہد کو خراج عقیدت پیش کرنا چاہتے تھے جس نے آگے بڑھ کر منگول وحشیوں کا شایان شان استقبال کیا تھا اور اگناتیوز کے جنگل میں ان کی لاشوں کے انبار لگا دیے تھے۔ اباقہ کی بہادری کی کہانی ہر زبان پر تھی۔ ہر آنکھ اسے دیکھنے کی مشتاق تھی۔ مسلح محافظ پُرجوش لوگوں کو آگے بڑھنے سے روکے ہوئے تھے ورنہ وہ شاید دروازے توڑ کر اندر گھس آتے۔ نتاشا نے آہستگی سے کھڑکی بند کر دی۔ شور ایک دم مدھم ہو گیا۔ وہ نرم قالین پر چلتی آتشدان کے پاس پہنچی۔ جہاں اباقہ ایک آرام دہ مسہری پر محو خواب تھا۔ طبیبوں نے اسے چند روز مکمل آرام کا مشورہ دیا تھا۔ اس کے زخمی گھٹنے پر مرہم پٹی کر دی گئی تھی۔ نتاشا نے ہاتھ بڑھا کر اس کی پیشانی کو چھوا' تین روز بارش میں بھیگنے اور زخم خراب ہونے کے سبب اسے بخار ہو رہا تھا۔ نتاشا نے احتیاط سے ریشمی توشک اس کے سینے تک کھینچ دی اور محویت سے اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔ نیند میں وہ کتنا معصوم اور بے ضرر لگتا تھا جیسے کوئی فرشتہ پڑا سو رہا ہے۔ نتاشا کی انگلیاں بے اختیار اس کے لمبے بالوں میں گردش کرنے لگیں۔ وہ کچھ دیر اس کا سر سہلاتی رہی پھر آہستہ آہستہ اس کا بازو دبانے لگی .... ہاں یہی وہ بازو تھا جس سے وہ تلوار چلاتا تھا اور فصیلوں کی حفاظت کرتا تھا۔ اس بازو کے زور پر وہ ان گنت منگولوں کو جہنم واصل کر چکا تھا۔ یہ بازو ان گنت زندگیوں کا محافظ بھی تھا......... اور یہ بازو تھکا ہوا تھا۔ وہ اسے دبانے لگی۔ اس کے ہاتھوں کے نیچے سخت فولادی گوشت کے مسل تھے۔ خوبصورت نشیب و فراز اس کی ہتھیلیوں سے مس ہو رہے تھے۔ اسے اپنے اوپر فخر محسوس ہونے لگا۔ یہ بے مثال جنگجو' یہ عظیم شخص اس کا شوہر تھا۔ وہ اس کی مالک تھی۔ تنہا اور بلا شرکت غیرے۔ کتنی خوش نصیب تھی وہ۔ اس خواب گاہ سے باہر سینکڑوں لوگ اس سے ملنے کو بے تاب تھے اور وہ اس کے ساتھ اس کمرے میں موجود تھی' اس قدر قریب اور بااختیار۔

اس نے جی بھر کر اباقہ کا چہرا دیکھا اور ایک عجیب سی مسرت اس کے رگ و پے میں سما گئی۔ وہ اٹھی ایک ہلکی سی انگڑائی لی اور ریشمی بالوں کو جوڑے کی صورت میں گردن پر سمیٹتی قالین پر آبیٹھی۔ ہاتھی دانت کی خوبصورت منقش چوکی پر کاغذ اور قلم رکھا تھا۔ اس نے قلم سنبھالا اور دیوار سے ٹیک لگا کر خیالوں میں گم ہو گئی .... جب اس کے ملک کی فضاؤں میں سکون تھا اور امن کے گیت گونجتے تھے تو وہ اپنے محل کے جھروکے میں بیٹھ کر شعر موزوں کیا کرتی تھی۔ اس نے کچھ بہت خوبصورت نظمیں لکھی تھیں' جنہیں اہل ذوق نے تہہ دل سے سراہا تھا۔ قلم خود بخود اس کے ہاتھوں میں اور پھر دانتوں میں آ گیا۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ اس کے ذہن میں کوئی خوبصورت خیال شعر کے سانچے میں ڈھل رہا ہے۔ اس کی آنکھیں نشے میں ڈوبنے لگیں۔ پھر قلم کاغذ پر آیا اور اس نے لکھنا شروع کیا۔

بلبل نے میرے محبوب کو دیکھا تو وہ اسے گلاب کا پھول لگا' وہ اس کے گرد منڈلانے لگی۔

پروانے نے میرے محبوب کو دیکھا تو وہ اسے موم شمع کی طرح نظر آیا' وہ اس پر قربان ہونے کو بے تاب ہو گیا۔

زمین نے دیکھا تو اسے آسمان نظر آیا' وہ اسے چھونے کو بے قرار ہو گئی۔

جھرنے نے دیکھا تو اسے پہاڑ نظر آیا' وہ اس کی قدموں میں مچلنے لگا۔

اور میں نے دیکھا تو مجھے شہزادہ نظر آیا' جس کے خواب میں نے نگی تایا کے کنارے بیٹھ کر دیکھے تھے۔ میں نے اسے نظروں سے چوم لیا۔

ہاں میرا محبوب بے مثال ہے۔ وہ ہر دل میں دھڑکن اور ہر آنکھ میں روشنی بن کر اتر جاتا ہے .... لیکن ....

ابھی نتاشا لکھ رہی تھی کہ اچانک اباقہ نے کراہ کر کروٹ بدلنا چاہی۔ پھر فوراً اس کا ہاتھ اپنے گھٹنے تک گیا اور وہ جوں کا توں لیٹا رہ گیا۔ "پانی" اس کے ہونٹوں سے صدا آئی۔ نتاشا جلدی سے اٹھی اور تپائی پر رکھے مٹکے سے پانی چاندی کے پیالے میں نکال کر اباقہ کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ ایسا کرتے ہوئے اس کی سنہری زلفیں اباقہ کے چہرے اور گردن سے چھونے لگیں۔ نتاشا نے کن اکھیوں سے یہ سب کچھ دیکھا اور اس کے چہرے پر شفق پھیل گئی۔

پانی پی کر اباقہ کی نیند پوری طرح کھل گئی۔ نتاشا کے سہارے سے وہ گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ آنکھیں ملتے ہوئے اس نے پوچھا۔ "میں کتنی دیر سوتا رہا.........؟"

نتاشا نے مترنم آواز میں کہا۔ "یہی کوئی ڈھائی پہر۔"

اباقہ نے کہا۔ "اس کا مطلب ہے شام ہو چکی ہے۔"

"تقریباً۔" نتاشا نے مختصر سا جواب دیا اور مسکرانے لگی۔

اچانک اباقہ کی نگاہ منقش چوکی پر رکھے ہوئے کاغذ اور قلم پر پڑی۔ اس نے پوچھا۔ "کیا لکھ رہی تھیں تم؟"

نتاشا نے کاغذ چوکی سے اٹھاتے ہوئے کہا۔ "ہاں......... ایک نظم لکھی ہے۔"

اباقہ نے پوچھا۔ "کیا لکھا ہے؟"

نتاشا نے کہا۔ "جو ہمارے دل میں آیا۔" اس کی نوخیز آواز میں کسی جھرنے کی ترنگ تھی۔

اباقہ بولا۔ "کچھ مجھے بھی تو سناؤ۔"

نتاشا بولی۔ "ابھی مکمل نہیں ہوئی' مکمل ہونے کے بعد۔"

اس وقت دروازے پر دستک ہونے لگی۔ نتاشا نے اٹھ کر پوچھا۔ "کون ہے۔" جواب میں اسد کی آواز سنائی دی۔ نتاشا نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ اسد شائستگی سے بولا۔

"شہزادی صاحبہ میں مخل ہو سکتا ہوں؟"

شہزادی نتاشا مسکرائی۔ "آپ کے لیے ہر وقت اجازت ہے۔"

اسد مسکراتی نظروں سے اباقہ کو دیکھتا اندر آ گیا۔ حال احوال پوچھنے کے بعد اس کے چہرے پر سنجیدگی طاری ہو گئی اور وہ بولا۔ "اباقہ' مجھے معلوم ہوا ہے کہ کل ولی عہد شہزادہ نکولس کو قید خانے میں کوڑوں کی سزا دی جا رہی ہے۔ اسے عریاں جسم پر چالیس کوڑے مارے جائیں گے۔ یہ نہایت سخت سزا ہے اور بعض اوقات مجرموں کی جان لے جاتی ہے۔ خاص طور پر ولی عہد جیسے ناز و نعم میں پلے شہزادے کے لیے یہ عذاب بہت زیادہ ہے۔"

اباقہ نے کہا۔ "یہ تو واقعی تشویشناک بات ہے۔"

اسد بولا۔ "اس طرح تو شہزادہ نکولس بچ بھی گیا تو اس کی زندگی تباہ ہو کر رہ جائے گی۔ وہ کہنے کو تو ولی عہد ہے لیکن یہاں کے سیاسی نظام کے مطابق اسے عام لوگوں نے منتخب کرنا ہے۔ ایسے سزا یافتہ مجرم کو کون اپنا رئیس چننے لگا .... تھوڑی دیر پہلے نکولس کی والدہ رئیس زادہ یوسا خود مجھ سے ملنے آئی تھیں۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ تم اور اباقہ اس سزا کی معافی کے لیے رئیس سے درخواست کرو۔ میں نے ہامی بھر لی ہے۔ میرا خیال ہے ابھی تھوڑی دیر میں رئیس وزیولڈ بہ نفس نفیس تمہاری عیادت کے لیے یہاں آنے

والے ہیں۔ ان سے درخواست کے لیے وہ موقع بہترین ہو گا۔"

اباقہ نے کہا۔ "ہمیں شہزادے کے لیے جان بخشی کی درخواست ضرور کرنی چاہیے۔"

ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ انہوں نے سمجھا کہ شاید رئیس وزیولڈ آرہے ہیں لیکن دروازہ کھولنے پر معلوم ہوا کہ پہریدار دستے کا کماندار ہے۔ اس کے ساتھ تین عورتیں دو بچے اور چند مرد تھے اس نے اسد سے سفارش کی یہ لوگ اباقہ سے ملنے کو بہت بے چین ہیں۔ انہیں ذرا دیر کے لئے اباقہ سے ملا دیا جائے۔ اس دوران اباقہ بھی دروازے پر ہونے والی گفتگو سن چکا تھا۔ بچوں کے ہاتھوں میں گلدستے دیکھ کر وہ خاموش نہ رہ سکا اس نے اسد سے کہا کہ ان لوگوں کو اندر آنے دو۔ اسد راستے سے ہٹ گیا۔ اباقہ کے پرستاروں کی یہ پر جوش ٹولی اندر آگئی۔ یہ کل چودہ پندرہ افراد تھے۔ انہوں نے اباقہ کی مسہری کو گھیر لیا۔ حال احوال دریافت کیا اور گلدستے پیش کیے۔ ایک ادھیڑ عمر عورت نے جھک کر اباقہ کی پیشانی چومی اور آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی۔ "اے ہمارے بچوں کے محافظ خدا تجھے سلامت رکھے اور جلد صحت یاب کرے۔" عورت پیچھے ہٹی تو ایک تنومند مرد اباقہ پر جھکا۔ دفعتاً اس نے اباقہ کے گریبان میں ہاتھ ڈالا اور ایک زور دار جھٹکے سے اسے مسہری سے قالین پر گرا دیا۔ اس لمحے اس کا دایاں ہاتھ بلند ہوا جس میں خوفناک خنجر چمک رہا تھا۔ خنجر پورے زور سے اباقہ کی طرف آیا' لیکن وہ بروقت جھک کر خود کو بچانے میں کامیاب رہا۔ پھر بھی خنجر کی تیز دھار اس کے ایک کندھے کو زخمی کرتی چلی گئی۔ چند ساعتوں کے لیے تو کمرے میں موجود ہر شخص مبہوت رہ گیا۔ جب خنجر اباقہ کے سر پر چمکا اس وقت ایک ساتھ بہت سی چیخیں بلند ہوئیں اور لوگ مختلف اطراف میں بھاگے .... جس وقت حملہ آور کا خنجر دوسری مرتبہ بلند ہوا اسد عقاب کی طرح جھپٹا اور اس نے یہ وار اپنے ہاتھ پر روکا۔ حملہ آور کی غیر معمولی چوڑی کلائی سیدھی اسد کے ہاتھ میں آئی تھی۔ اس نے اسے بے پناہ قوت کے ساتھ تھام کر حملہ آور کی طرف دیکھا اور ساعت کے ہزارویں حصے میں اسے پہچان گیا......... اس کے سامنے گیوڈا کھڑا تھا۔ دلادی میر کے عقوبت خانے کا گرانڈیل جلاد اور ڈیوک کا دست راست۔ دلادی میر میں ڈیوک کی گرفتاری کے بعد وہ اچانک روپوش ہو گیا تھا اور کوشش کے باوجود اس کا سراغ نہیں ملا تھا۔ انسان اس کی ہیبت ناک شکل ایک بار دیکھ کر پھر نہیں بھول سکتا تھا اور اسد نے تو اسے کئی بار دیکھا تھا۔ اس سفاک انسان کی آنکھوں میں ہر وقت موت رقصاں رہتی تھی .... اور اس وقت وہ سفاک انسان خنجر بدست اباقہ کے

سر پر موجود تھا۔ اس کی آنکھیں غضب کے شعلے اگل رہی تھیں اور چہرا قہرناک ہو کر بگڑ گیا تھا۔ اسد نے ایک ساعت کے اندر اندر یہ سب کچھ دیکھا اور محسوس کیا' اور پھر اس کے دل نے پکار کر کہا۔ اسد' تجھے ہر صورت میں اباقہ کو اس قاتل سے بچانا ہے۔ اس سے پہلے کہ گیوڈا اپنا خنجر والا ہاتھ اسد کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کرتا۔ اسد کا جسم بجلی کی طرح حرکت میں آیا اور اس کی بھرپور ٹانگ گیوڈا کے سینے پر پڑی۔ گیوڈا لڑکھڑا کر ہاتھی دانت کی چوکی پر گرا اور اسے چکنا چور کرتا ہوا ایک آرائشی صراحی کو ملیامیٹ کر گیا' لیکن یوں لگا کہ وہ گرنے سے پہلے ہی دوبارہ اٹھ گیا ہو یا جیسے وہ لڑکھڑایا ہی نہ تھا۔ اس کے ہاتھ میں ابھی تک خنجر دبا ہوا تھا اور نگاہیں اسد پر مرکوز تھیں یہ نگاہیں چیخ چیخ کر کہہ رہی تھیں کہ اسد کی زندگی شدید خطرے میں ہے۔ دوسری طرف اسد بھی دونوں بازو کھول کر مردانہ وار گیوڈا کے سامنے آگیا تھا۔ اباقہ نے شدید تکلیف کے باوجود گیوڈا کی طرف بڑھنا چاہا لیکن ماشا چلا کر اس سے لپٹ گئی۔ ایک اور مرد نے بھی بڑھ کر اسے تھام لیا۔ باقی افراد اب دروازے پر کھڑے چیخ چیخ کر پہریداروں کو بلا رہے تھے اس دوران گیوڈا نے ایک دل ہلا دینے والی چنگھاڑ کے ساتھ اسد پر وار کیا۔ اسد نے بے انتہا پھرتی سے پہلو بچایا اور ایک زور دار گھونسا گیوڈا کے منہ پر مارا۔ گیوڈا پر اس فولادی گھونسے کا کچھ خاص اثر نہیں ہوا اور اس نے بلا توقف اسد پر دوسرا وار کیا۔ اس دفعہ خنجر کا مہلک پھل اس کے سر کے بالوں کو چھوتا گزر گیا۔ اسد نے وار خالی دیکھتے ہی لپک کر دیوار سے تلوار اتارلی۔ اس وقت بھاگتے قدموں کی آوازیں آئیں اور کماندار کے پیچھے کوئی دس عدد مسلح محافظ اندر گھس آئے۔ ان کے ہاتھوں میں عریاں تلواریں تھیں۔ ایک ساعت ضائع کیے بغیر انہوں نے گیوڈا پر حملہ کیا۔ گیوڈا نے پلک جھپکتے ایک محافظ کا گلا کاٹ دیا اور دو قدم بھاگ کر اس کھلی کھڑکی سے چھلانگ لگا دی۔ اسد اور دوسرے محافظ بھاگ کر کھڑکی تک پہنچے تو گیوڈا جست کر کے ایک گھوڑے پر سوار ہو رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ اسد کی ہدایت پر کوئی محافظ چلے پر تیر چڑھاتا۔ گیوڈا نے کھڑکی کی طرف تلوار لہرا کر ایک زوردار جنگی نعرہ لگایا اور گھوڑا بھگاتا ایک گلی میں گم ہو گیا۔

یہ سب کچھ اتنا آناً فاناً ہوا تھا کہ کمرے میں موجود ہر شخص حواس باختہ ہو کر رہ گیا۔ زخمی محافظ جان کنی کے عالم میں تڑپ رہا تھا۔ اس کا خون قالین پر گلاب کے ایک بہت بڑے پھول کا اضافہ کر چکا تھا۔ اباقہ کی ہدایت پر چند سپاہی اسے اٹھا کر علاج گاہ کی طرف لپکے۔ کچھ سپاہیوں نے اباقہ کو بھی طبی امداد کے لیے لے جانا چاہا' لیکن اس نے انہیں منع کر دیا۔ کندھے پر آنے والا نیا زخم معمولی تھا۔ اصل تکلیف گھٹنے کے زخم کی تھی جو پھر

کھل گیا تھا اور سفید پٹیاں خون میں تر ہوتی جا رہی تھیں۔ کمرے میں مختلف اشیاء کے ٹکڑے اور گلدستے بکھرے ہوئے تھے۔ یہ ایک خوفناک قاتلانہ حملہ تھا اور اتنے منظم انداز سے کیا گیا تھا کہ اگر اسد بروقت حرکت میں نہ آتا تو وہ گرانڈیل وحشی یقیناً کسی سنگین حادثے کا سبب بن جاتا۔ اباقہ' اسد اور نتاشا کے ذہنوں میں ایک ہی بات گونج رہی تھی' یہ یقیناً ڈیوک کا کام تھا۔ وہ شیطان اپنے سب سے خوفناک کارندے کو حرکت میں لے آیا تھا۔

☆ ــــــــــ ☆ ــــــــــ ☆

اباقہ کا زخم آہستہ آہستہ اچھا ہو رہا تھا' لیکن ابھی وہ ازخود مسہری سے اترنے کے قابل نہیں تھا۔ ان دنوں میں نتاشا نے اس طرح ٹوٹ کر اس کی خدمت کی کہ اباقہ کو اس پر ترس آنے لگا۔ وہ اباقہ کی تمام تر ضروریات کا خود خیال رکھتی اور ہر وقت اس کے کاموں میں لگی رہتی۔ دوائیوں کے بارے میں اباقہ بہت لاپرواہ تھا لیکن شہر کے اہم ترین طبیب اباقہ کو ہدایت کر چکے تھے کہ اگر وہ اپنے زخم کو ناقابل علاج ہونے سے بچانا چاہتا ہے تو مرہم پٹی کے ساتھ ساتھ کھانے والی دوائیاں بھی باقاعدگی سے استعمال کرے۔ نتاشا نے یہ نصیحت پلے سے باندھ لی تھی اور اباقہ کے ہزاروں انکار کے باوجود وہ اسے مقررہ دوائیاں کھلا کر ہی چھوڑتی تھی۔ رات گئے تک وہ اباقہ کے پاس بیٹھی رہتی۔ اس کی ٹانگیں دباتی۔ اس کا دل لگانے کے لیے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی۔ اکثر علی بھی ان کے پاس آ بیٹھتا۔ کبھی اسد بھی چلا آتا اور وہ ہلکی پھلکی باتیں کرنے کے علاوہ کچھ سنجیدہ موضوعات چھیڑنے پر بھی مجبور ہو جاتے۔ یوسق اور شیزی کی تاحال کوئی خبر نہیں تھی۔ اباقہ پر قاتلانہ حملے کے بعد گوڈا کے ساتھ ڈیوک بھی غائب ہو چکا تھا۔ شہزادہ نکولس کی سزا اباقہ' اسد اور نتاشا کی پے درپے درخواستوں پر معاف کر دی گئی تھی۔ ان موضوعات اور ایسے ہی دوسرے موضوعات پر وہ رات گئے تک گفتگو کرتے رہتے۔ پھر اسد اور علی تو چلے جاتے اور نتاشا محافظوں کو چوکس کر کے اور دروازہ بند کر کے اباقہ کے ساتھ بچھی ہوئی مسہری پر آ لیٹتی رات کو بھی اسے کم کم ہی نیند آتی تھی۔ اباقہ جانتا تھا وہ اس کی طرف سے ہر وقت فکر مند رہتی ہے۔ خاص طور پر گوڈا کی دید کے بعد اس کے چہرے سے قرار اور آنکھوں سے نیند اڑ چکی تھی۔

ایک رات کسی پہر اباقہ کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ نتاشا کھڑکی کے پاس کھڑی ہے۔ ہاتھ میں پکڑے شمعدان کی روشنی میں اس کا حسین چہرا پریشان نظر آتا تھا۔

"کیا بات ہے نتاشا؟" اباقہ نے نرمی سے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" وہ گڑبڑائی۔ "ہمیں اس طرف آہٹ سنائی دی تھی۔"

اباقہ نے مسکرا کر کہا۔ "نتاشا! اس طرح تو تم خود کو بیمار کر لو گی۔ اتنی فکر مندی ٹھیک نہیں۔ ہم مسلمانوں کا ایمان ہے کہ موت کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے۔"

نتاشا نے شمعدان تپائی پر رکھ دیا اور اباقہ کے قریب آ کر بیٹھ گئی۔ بڑے پیار سے بولی۔

"ہم اپنے دل کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں' لیکن بخدا وہ ہمارے بس میں نہیں۔ ہم سوچتے ہیں کیا اچھا ہو جو ہماری زندگی آپ کو لگ جائے۔"

اباقہ نے مسکرا کر کہا۔ "تم یونہی جی ہلکان نہ کرو۔ میں بہت ڈھیٹ ہوں' ایسے مرنے والا نہیں۔ ذرا چلنے پھرنے کے قابل ہو لوں پھر دیکھنا اس گوڈا سے کیسے نبٹتا ہوں۔"

اباقہ کے بے خوف لہجے نے نتاشا کے چہرے پر تشویش کے سائے سمیٹ دیے۔ اس نے بے اختیار اباقہ کا ہاتھ تھام لیا اور بولی۔ "ہم کتنے خوش نصیب ہیں کہ آپ جیسے دلیر اور بے خوف شخص کی رفاقت نصیب ہوئی۔ دنیا میں کون لڑکی ہو گی جس نے ہمارے جیسی قسمت پائی ہو گی ...."

دفعتاً اسے کچھ دیا آیا اور وہ اباقہ کا ہاتھ چھوڑ کر کھڑی ہو گئی۔ ایک الماری کی طرف چلتی ہوئی بولی۔ "جب آپ سو رہے تھے تو ایک شخص آیا تھا' کوئی قاصد لگتا تھا' کہتا تھا کہ آپ سے ملنا بہت ضروری ہے۔ بہت تھکا ہوا تھا ہم نے اسے نیچے مہمان خانے میں آرام کے لیے بھیج دیا۔ ایک خط دے گیا تھا کہتا تھا جونہی آپ اٹھیں آپ کو پہنچا دیا جائے۔"

یہ کہتے ہوئے نتاشا نے الماری سے ایک ملفوف نکالا اور اباقہ کی طرف بڑھا دیا۔ اس وقت اباقہ کے گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ مارینا کا خط ہے' جو مختلف ہاتھوں سے ہوتا آخر آج اس تک پہنچا ہے۔ اگر اسے معلوم ہوتا تو وہ کبھی نتاشا کو یہ خط پڑھنے کا نہ کہتا ....

اس خط میں محبت بند تھی' ایک عورت کا انتظار بند تھا۔ اس کی امیدیں اور آرزوئیں بند تھیں۔ یہ ایک بہت پیارا خط تھا' لیکن نتاشا کے لیے بے حد خطرناک تھا۔

ابھی نتاشا خط کی مہریں کھول ہی رہی تھی کہ اچانک خوابگاہ کا دروازہ کھلا۔ ریشمی پردہ اچھلا اور اسد جیسے بھاگتا ہوا اندر داخل ہوا۔ ایک لمحہ رک کر اس نے خوابگاہ کی صورت حال کا جائزہ لیا' پھر سیدھا نتاشا کی طرف آیا اور اس کے ہاتھ خط لیتے ہوئے بولا۔

"معاف کریں شہزادی صاحب! یہ میرا خط ہے۔ غلطی سے قاصد نے آپ کو دے دیا۔ اباقہ کا خط ابھی قاصد کے پاس ہے۔"

نتاشا اور اباقہ حیرت سے اسد کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اسد ایک مہذب اور باوقار

شخص تھا۔ اس کا یوں دروازہ کھول کر دندناتے ہوئے خوابگاہ میں چلتے آنا دونوں کو عجیب سا لگا۔ نتاشا نے جھینپتے ہوئے کہا۔ "ہمیں افسوس ہے اسد۔ قاصد نے ہمیں یہی بتایا تھا کہ یہ .... اباقہ کا خط ہے۔"

اس وقت اسد کو احساس ہوا کہ بلا اجازت خواب گاہ میں گھس کر اس نے غیر شائستہ حرکت کی ہے۔ اس کے چہرے پر ندامت کی لکیریں ابھریں۔ وہ بولا۔ "شہزادی صاحبہ! میں آپ دونوں سے معافی چاہتا ہوں۔ مجھے .... مجھے دستک دیے بغیر اندر نہیں آنا چاہیے تھا۔"

شہزادی اس کی دلجوئی کے لیے چہرے پر مسکراہٹ طاری کرتے ہوئے بولی۔

"اسد! کچھ دن پہلے ہم نے خود ہی کہا تھا کہ تمہارے لیے وقت کی کوئی قید نہیں تم جب چاہو بلا اجازت یہاں آ سکتے ہو۔"

اسد نے کہا۔ "شہزادی صاحبہ! آپ مجھے مزید شرمندہ نہ کریں۔ مجھے واقعی افسوس ہے۔"

پھر وہ دونوں پر معذرت کی نگاہ ڈالتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

دوسرے روز صبح کے وقت اسد سیر سے واپس آیا تو سیدھا اباقہ کے کمرے میں چلا آیا۔ نتاشا اس وقت مطبخ میں مصروف تھی۔ اسے دیکھتے ہی اباقہ نے پوچھا۔ "اسد! وہ میرے والا خط کہاں ہے؟"

اسد نے پوستین کے اندر سے رات والا خط نکال کر اباقہ کے سامنے رکھ دیا اور بولا۔ "یہ لو اپنا خط۔ رات تم بھانڈا ہی پھوڑ دینے لگے تھے۔"

"کیا مطلب؟" اباقہ نے چونک کر پوچھا۔

اسد بولا۔ "مطلب یہ کہ یہ خط کسی اور کا نہیں مارینا کا ہے۔ عراق سے آیا ہے۔"

اباقہ کا منہ کھلا رہ گیا اور وہ جیسے مسہری سے اچھل پڑا۔ جلدی سے خط پکڑ کر وہ اسے الٹنے پلٹنے لگا جیسے اس کے اندر سے مارینا کو تلاش کر رہا ہو۔ اسد نے کہا۔

"رات مجھے جب قاصد نے بتایا کہ وہ تمہارا خط نتاشا کو دے آیا ہے تو میں بھاگتا ہوا تمہارے کمرے میں پہنچ گیا۔ یہ تو قسمت اچھی تھی جو نتاشا نے ابھی پڑھنا شروع نہیں کیا تھا ورنہ اب تک وہ سب کچھ جان چکی ہوتی۔"

اب اباقہ کو ساری بات سمجھ آ رہی تھی۔ واقعی اس سے غلطی سرزد ہوئی تھی۔ اسے نتاشا سے پوچھ لینا چاہیے تھا کہ کس کا خط ہے۔ وہ اپنے طور پر یہی سمجھتا رہا کہ کسی فوجی سردار کا خط ہے .... اس نے مارینا کا خط کھولتے ہوئے اسد کے ہاتھ میں دے دیا اور بے تابی سے بولا۔ "اسد! مجھے پڑھ کر سناؤ۔"

اسد نے کن انکھیوں سے اس کی بے قراری دیکھی پھر دھیمے لہجے میں پڑھنے لگا۔

"اباقہ! کل قاصد نے تمہارا نامہ پہنچایا۔ پڑھ کر حالات سے آگاہی ہوئی۔ تم سب کی خیریت کے بارے جان کر ازحد خوشی ہوئی۔ ہم بھی یہاں خیریت سے ہیں۔ اس وقت میں اور نبیلہ گھر کے سامنے زیتون کے درخت کے نیچے بیٹھی ہیں۔ سلیمان کا ننھا بیٹا قاسم ایک جھولے میں لیٹا ہوا ہے۔ موسم خوشگوار ہے۔ ہوا میں پکی فصلوں کی خوشبو رچی ہوئی ہے۔ خدا کرے اس خوشبو میں لاشوں کی بدبو شامل نہ ہو۔ کیونکہ سننے میں آ رہا ہے کہ چنگیز خاں کا پوتا ہلاکو خاں دار السلطنت بغداد پر حملے کے لیے ایران اور ترکستان میں فوجیں جمع کر رہا ہے۔ ان وحشیوں نے سلطنت عباسیہ کے سرحدی علاقوں میں لوٹ مار بھی کی ہے۔ تاہم ان اطلاعات کی فراہمی سے میرا مقصد تمہیں پریشان کرنا ہرگز نہیں۔ فی الحال یہاں فوری خطرے کی کوئی بھی بات نہیں۔ تم جس جنگی مہم پر ہو اسے پوری توجہ اور ثابت قدمی سے انجام دو۔ خدا کرے آپ لوگ سرخرو ہو کر واپس لوٹیں۔ میری دعائیں آپ سب کے ساتھ ہیں۔ تم نے اخراجات کے لیے جو رقم بھیجی تھی مل گئی ہے۔ میری جانب سے کسی طرح پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ سلیمان اور نبیلہ کا سلوک مجھ سے حقیقی بہن بھائیوں جیسا ہے۔ مجھے یہ جان کر ازحد مسرت ہوئی ہے کہ تمہاری کمان کا چلہ میرے بالوں کا بنا ہوا ہے۔ مجھے ان بالوں پر رشک آ رہا ہے جو ان خون آشام "آسمان پرستوں" کی موت کا وسیلہ بن رہے ہیں۔ ہر مسلمان عورت کی طرح میری بھی یہ خواہش ہے کہ اس زمین سے ناپاک منگولوں کا بوجھ کم ہو۔ مجھے امید ہے تم میری اس خواہش کو پورا کرتے رہو گے۔"

اس کے نیچے چند سطور اور لکھیں تھیں۔ یہ سطور خط کے اصل مضمون سے جدا ہوتی تھیں اور اباقہ و اسد کے لیے جاننا دشوار نہیں تھا کہ یہ سطور نبیلہ نے اپنی طبع کا مظاہرہ کرتے ہوئے مارینا کی بے خبری میں لکھی ہیں۔ لکھا تھا۔

"اباقہ! دن بھر سورج کے قدم گنتی ہوں اور رات بھر لمحوں کی چاپ سنتی ہوں۔ میرا دل و دماغ اور جسم تمہاری مملکت ہے۔ میرے مسافر بادشاہ! اپنی مملکت پر حکومت کرنے کے لیے واپس آ جاؤ۔ میں ہاتھوں میں چاہتوں کے پھول لئے تمہارے فاتح قدموں کا انتظار کر رہی ہوں۔ تمہاری .... تمہاری .... اور صرف تمہاری .... مارینا

اسد نے خط پڑھ کر مسکراتی نظروں سے اباقہ کو دیکھا۔ وہ جیسے تصور ہی تصور میں عراق پہنچا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں جیسے مارینا کو دیکھ رہی تھیں اور ہونٹ پیاس اور تمنا کی شدت سے خشک ہو رہے تھے۔ اباقہ نے اس کے بازو پہ ہاتھ رکھتے ہوئے تہ شدہ خط اس کے سپرد کیا اور بولا۔ "اباقہ! میری ایک بات غور سے سن لو۔ نتاشا کو مارینا کے بارے کچھ علم نہیں ہونا چاہیے۔ وہ بے حد حساس لڑکی ہے۔ وہ تم سے اتنی محبت کرتی ہے کہ تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ شاید تمہیں معلوم نہیں وہ تمہاری صحت یابی کے لیے چپکے چپکے غریبوں اور مسکینوں کو خیرات دیتی ہے۔ دعائیں کرتی ہے اور منتیں مانتی ہے۔ اس کی آنکھوں سے لے کر اس کے دل تک صرف تم ہی تم ہو۔ جانتے ہو پچھلے دنوں اس نے کیا کیا تھا؟" اباقہ سوالیہ نظروں سے اسد کی طرف دیکھنے لگا۔

اسد بولا۔ "مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس نے رئیس وزیولڈ سے کہہ کر شاہی محل کی تین کنیزوں کو راتوں رات نوو گرود سے کیف بھجوا دیا تھا۔ ان کا قصور یہ تھا کہ ان میں سے ایک کنیز عاشقانہ انداز میں تمہاری تعریفیں کر رہی تھی اور دوسری دو اس کی باتوں سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔ نتاشا کی ذاتی خادمہ نے نتاشا کو یہ سب کچھ بتایا تو وہ بے قرار ہو گئی۔ وہ اسی وقت رئیس سے ملی۔ اس سے کہہ کنیزوں کو آزاد کروایا اور معقول رقم دے کر انہیں کیف بھجوا دیا۔ اباقہ وہ تمہیں بلا شرکت غیرے اپنا محبوب جانتی ہے اور سمجھتی ہے کہ تم بھی اس سے اتنی الفت کرتے ہو جتنی وہ کرتی ہے۔ اگر اسے معلوم ہو جائے کہ تم نے اس سے مجبوراً شادی کی تھی اور تم دل و جان سے کسی اور عورت کو چاہتے ہو تو شاید وہ رنج و مایوسی کے عالم میں اپنی جان لے جائے۔ وہ شاعرانہ مزاج رکھنے والی مغربی شہزادی ہے اور اس کے لیے اپنی محبت میں کسی کو شریک کرنا نہایت دشوار ہو گا۔"

اباقہ نے پریشانی سے پوچھا۔ "اسد! پھر یہ سب کچھ کیسے چلے گا۔ آخر تو اسے مارینا کی حقیقت سے آگاہ کرنا ہی ہو گا۔"

اسد نے کہا۔ "بے شک ایک روز تو اسے معلوم ہو جانا ہے لیکن یہ کام نہایت احتیاط اور آہستہ روی سے ہونا چاہیے۔ دھیرے دھیرے' سمجھداری کے ساتھ۔ تم نے کسی کو ہیرا تراشتے دیکھا ہے۔ کتنی ملائمت اور کس قدر تحمل

سے کام ہوتا ہے۔ ذرا ٹھیس لگ جائے تو ہیرا ٹوٹ جاتا ہے۔ شہزادی کے دل کو بھی ایک ہیرا ہی سمجھو۔ حالات کی پتھری اسے بتدریج تمہاری منشا اور ضرورت کے مطابق تراش سکتی ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تمہارے نہ چاہنے کے باوجود وہ ٹوٹ جائے۔ اس ہیرے کا مستقبل کیا ہے؟ ابھی ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ فی الحال ضرورت اس بات کی ہے کہ تم نتاشا کو مارینا کے بارے کچھ معلوم نہ ہونے دو۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ یہ خط بھی مجھے ہی دے دو۔ کہیں تمہاری لاپرواہی سے اس کی نگاہ میں نہ آجائے۔"

اباقہ نے تکیے کے نیچے سے خط نکال کر اسد کو تھما دیا۔ اباقہ کے تاثرات سے ظاہر تھا کہ اس نے اسد کی باتوں سے اثر لیا ہے اور انہیں درست تسلیم کر رہا ہے۔

☆=======☆=======☆

کوئی ڈیڑھ ہفتے تک اباقہ کا زخم بہت حد تک اچھا ہو گیا۔ ایک روز شہزادہ نکولس اپنی والدہ کے ہمراہ اس سے ملنے آیا۔ وہ اس بات پر اباقہ اور اسد کا احسان مند تھا کہ انہوں نے اسے رئیس محترم سے معافی دلانے کے لیے پرخلوص اور انتھک کوششیں کیں۔ اب اس کے چہرے پر ندامت کے ساتھ ساتھ اباقہ کے لیے دوستی کے جذبات بھی پائے جاتے تھے۔ اس نے اباقہ سے کہا کہ وہ مستقل طور پر یہیں رک جائے۔

اس کی بات آگے بڑھاتے ہوئے نکولس کی والدہ رئیس نادی یوسا نے کہا "اباقہ! رئیس چاہتے ہیں کہ فوج میں تمہارا عہدہ مستقل کر دیا جائے۔ وہ تم پر بہت مہربان ہیں تم یہاں بہت عیش و آرام سے رہو گے۔ نتاشا بھی ہماری بیٹیوں کی طرح ہے۔ تمہاری خوشیاں دیکھ کر ہم بھی خوش ہوں گے۔ اگر اسد چاہے تو وہ بھی یہاں سکتا ہے اسے بھی فوج میں کوئی عہدہ دے دیا جائے گا.........."

اباقہ خاموشی سے نکولس اور یوسا کی باتیں سنتا رہا۔ وہ بڑے خلوص اور پیار سے اسے ایک پرسکون اور آرام دہ زندگی کی پیشکش کر رہے تھے۔ اس زندگی میں اختیار بھی تھا۔ عزت اور مقام بھی تھا' اور نتاشا جیسی حسین لڑکی کی دلنشیں رفاقت بھی .... لیکن کیا وہ اپنے فرض کو ان نعمتوں پر قربان کر سکتا تھا؟ ہرگز نہیں۔ وہ محلوں کا نہیں' ویرانوں کا انسان تھا۔ تلواروں کی جھنکار اس کے لیے حسین چوڑیوں کی کھنک سے زیادہ طرب انگیز تھی۔ میدان جنگ کے فاقے اسے شہر عیش کی نعمتوں سے زیادہ عزیز تھے اس نے گہری سانس لی اور نفوس لہجے میں بولا۔

"رئیس زادی! میرے پاس الفاظ نہیں کہ میں آپ کی نوازشات کا شکریہ ادا کر سکوں لیکن نہایت معذرت سے میں عرض کروں گا کہ میں اور میرے ساتھی ایک بڑے مقصد کے تحت آپ کی سرزمین پر آئے تھے اور یہ مقصد تھا ہر جگہ اور ہر مقام پر منگولوں کی مزاحمت اور یہ مقصد ابھی پورا نہیں ہوا۔ منگول گھوڑوں کا رخ ضرور بدلا ہے لیکن وہ ابھی حرکت میں ہیں۔ ان کی تلواریں نیاموں میں ضرور چلی گئی ہیں مگر ان کی نگاہیں کسی نئی بستی کی تلاش میں ہیں۔ ہمیں وہاں پہنچنا ہے' جہاں وہ ہیں یا جہاں وہ جا رہے ہیں۔ لہٰذا محترم خاتون! میں نہایت ادب سے عرض کرتا ہوں کہ آپ ہمارے رکنے پر اصرار نہ فرمائیں۔"

اباقہ کے فیصلہ کن لہجے نے یوسا اور نکولس کو چپ لگا دی۔ کچھ دیر بعد یوسا نے کہا۔ "اباقہ! نتاشا کا خیال بھی یہ تھا کہ تم یہاں رکنے پر تیار ہو جاؤ گے ...."

نتاشا قریب ہی بیٹھی تھی اس نے جلدی سے یوسا کی بات کاٹی اور کہا۔ "خالہ جان! ہمارا اپنا کوئی خیال نہیں ہے۔ جو اباقہ اور ان کے ساتھیوں کا فیصلہ ہو گا وہی ہمارا ہو گا۔"

یوسا اور نکولس کو اندازہ ہو چکا تھا کہ اباقہ کا ارادہ اٹل ہے۔ اس لیے انہوں نے اس پر زیادہ زور نہیں دیا۔ ان کے لیے نیک تمناؤں کا اظہار کر کے وہ دونوں واپس چلے گئے .... اگلے روز اباقہ اسد اور نتاشا نے رئیس وزیولڈ سے آخری ملاقات کی۔ انعام واکرام سے لدے ہوئے وہ واپس آئے اور اس سے اگلے روز سفر کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔ سفر کی تیاری کے ساتھ ساتھ وہ یورق اور شیزی کو تلاش کرنے کی آخری کوششیں بھی کر رہے تھے۔ جب اباقہ' نتاشا اور علی سامان وغیرہ باندھنے میں مصروف تھے' اسد گھوڑا لے کر شہر کا چکر لگانے گیا ہوا تھا۔ اس نے شہر میں بہت سے آدمیوں کو یورق اور شیزی کی تلاش میں لگا رکھا تھا۔ وہ اس امید پر گیا تھا کہ شاید کسی طرف سے کوئی حوصلہ افزا اطلاع مل جائے۔

وہ دوپہر کا گیا شام پڑے واپس آیا۔ اس کے ساتھ یورق اور شیزی تو نہیں تھے مگر شہزادہ نکولس تھا۔ اباقہ نے آگے بڑھ کر شہزادے کا استقبال کیا۔ شہزادے نے کہا۔ "اباقہ! میں اسد اور تم سے تنہائی میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

نتاشا شہزادے کی بات سن چکی تھی اس لیے علی کو انگلی تھام کر اسے باہر لے گئی۔ اب کمرے میں وہ تینوں رہ گئے تھے۔ اباقہ نے آگے بڑھ کر دروازہ بند کر دیا۔ شہزادہ نکولس ایک گہری سانس بھر کر بولا۔

"آپ دونوں میرے مہمان بھی ہیں اور دوست بھی مگر سب سے اہم بات یہ ہے کہ

میں آپ کو بڑے بھائیوں کی طرح سمجھنے لگا ہوں۔ رئیس محترم کی ناراضگی مول لے کر آپ نے جس طرح میری جان بخشی کی کوششیں کیں انہیں میں کبھی فراموش نہ کر سکوں گا۔ اب میں آپ دونوں سے تھوڑی سی اور قربانی چاہتا ہوں۔ میری درخواست ہے کہ آپ اپنی روانگی صرف تین روز کے لیے ملتوی کر دیں۔"

اباقہ نے احترام سے کہا۔ "شہزادے! ان تین دنوں میں آپ ہم سے کیا کام لینا چاہتے ہیں؟"

شہزادے نے سنجیدگی سے کہا۔ "اباقہ! اس واقعے نے میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ میں اپنے سابقہ رویے پر بہت نادم ہوں اور اس کی تلافی اسی طرح ہو سکتی ہے کہ میں جولیا کو دلہن بنا کر اپنے محل میں لاؤں .... میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

اباقہ اور اسد حیرت سے نکولس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اسد نے محتاط لہجے میں کہا۔ "شہزادہ حضور آپ کا خیال بہت نیک ہے مگر کیا' جو کچھ ہو چکا ہے اس کے باوجود جولیا آپ سے شادی پر .... رضامند ہو جائے گی؟"

نکولس نے جذباتی لہجے میں کہا۔ "اگر اس نے انکار کر دیا تو میں یسوع کی قسم کھا کر آپ دونوں سے عہد کرتا ہوں کہ کبھی اس کا نام زبان پر نہیں لاؤں گا۔"

شہزادے کا لہجہ اباقہ اور اسد کو بہت کچھ سمجھا رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا جولیا بھی اس سے محبت کرتی تھی۔ بے شک شہزادہ نکولس نے اس سے بدسلوکی کی تھی۔ اسے بہ زور اٹھوایا تھا اور ایک کھنڈر میں قید رکھا تھا پھر بھی وہ اس کی محبت سے منہ نہیں موڑ سکتی تھی۔

اباقہ نے ایک آہ بھرتے ہوئے سوچا۔ یہ عورت بھی عجیب گورکھ دھندا ہے۔ جو مرد اس کی راہوں میں آنکھیں بچھاتا ہے ضروری نہیں کہ وہ بھی اس سے پیار کرے اور جو اسے دکھ دیتا ہے' مظالم توڑتا ہے ضروری نہیں کہ وہ اس سے نفرت کرنے لگے۔ شہزادہ نکولس کے لہجے کا اعتماد بتا رہا تھا کہ جولیا اس کے ساتھ شادی سے انکار کر ہی نہیں سکتی۔ اباقہ اور اسد نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر اسد نے کہا۔

"شہزادہ حضور! آپ کی بات کا جواب دینے کے مجاز تو صرف لڑکی کے والدین ہیں مگر میں یہ عرض ضرور کروں گا کہ لڑکی ابھی کم عمر ہے۔ غالباً وہ لوگ ابھی شادی کرنا نہیں چاہیں گے۔ خاص طور پر اس صورت میں کہ لڑکی کا باپ بھی ابھی تک لاپتہ ہے۔"

نکولس نے جذباتی لہجے میں کہا۔ "اسد! مجھے شادی کی کوئی جلدی نہیں۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ ایک تقریب میں اس سے میری نسبت طے ہو جائے۔ مجھے یہ یقین ہو

جائے کہ جولیا میری ہے۔"

شہزادہ نکولس کے اس مسئلے نے اباقہ اور اسد کو روانگی ملتوی کرنے پر مجبور کر دیا۔ باہمی مشورے کے بعد وہ دونوں اس نتیجے پر پہنچے کہ ولی عہد کا رشتہ ہر طرح جولیا کے شایانِ شان ہے اور اگر کبھی کسی موڑ پر مائیکل سے ان کی ملاقات ہوئی تو اس رشتے کے سبب انہیں اس کے سامنے شرمندہ نہ ہونا پڑے گا۔ نتاشا نے بھی یہی رائے دی کہ انہیں اس رشتے کے لیے کوشش کرنا چاہیے۔

اباقہ اور اسد مائیکل کی بیوی سے ملے۔ اسے تمام صورت حال سے آگاہ کیا۔ وہ جانتی تھی کہ اباقہ اور اسد اس کے شوہر کے مخلص دوست ہیں۔ اس نے ان کی بات نہایت توجہ سے سنی پھر اپنی بیٹی سے رضامندی لی۔ رضامندی ظاہر ہونے کے بعد اباقہ اور اسد نے رئیس زادی یوسا کے ساتھ مل کر رئیس سے بات کی۔ افہام و تفہیم کا یہ سلسلہ دو تین روز جاری رہا۔ آخر اہل نووگرود کی خوشیوں میں ایک اور خوشی کا اضافہ ہو گیا اور یہ خوشی تھی شہزادہ نکولس کی تقریب منگنی کی۔ ایک پُرجوش اور رنگارنگ تقریب میں شہزادہ نکولس کی نسبت جولیا ہورتھ سے طے کر دی گئی۔

چوتھے روز اباقہ اسد، علی اور نتاشا اپنے سفر پر روانہ ہو گئے۔ انہیں رخصت کرنے والوں میں شہزادہ نکولس بذات خود شامل تھا۔ بوقت رخصت شہزادے نے اباقہ اور اسد سے پُرجوش مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

"عزیز بھائیو! آپ دونوں اطمینان رکھیں۔ آپ کے بعد بھی آپ کے دوست یورق کی تلاش اسی طرح جاری رکھی جائے گی۔ جونہی وہ ہمیں ملا اسے آپ کی ہدایت کے مطابق کالگا کی طرف روانہ کر دیا جائے گا۔" (کالگا اس علاقے کا نام تھا جس کے متعلق خیال ظاہر کیا جا رہا تھا کہ منگول اس طرف گئے ہیں)۔

خاص و عام کے الوداعی کلمات کے شور میں ان کا قافلہ نووگرود سے روانہ ہوا۔ اس قافلے میں ڈھائی سو جانبازوں کا وہ دستہ بھی شامل تھا۔ جنہوں نے اباقہ کے ساتھ جینے مرنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ اس کے علاوہ رئیس کی باقاعدہ فوج کا ایک دستہ بھی ان کے ساتھ تھا۔ یہ دستہ تعظیماً انہیں شہر کے نواح تک چھوڑنے جا رہا تھا .... دوپہر تک یہ دستہ ان کے ساتھ رہا۔ پھر اباقہ اور اسد نے اسے واپس بھیج دیا۔ اب وہ شہر سے کافی دور نکل آئے تھے۔ ان کی اطراف گھنے درخت تھے۔ سبزے سے ڈھکی ہوئی پہاڑیاں تھیں اور پس منظر میں فلک بوس و برف پوش چوٹیاں سینہ تانے کھڑی تھیں۔ مسلسل بارشوں کے بعد مطلع اب صاف ہو گیا تھا۔ گہرے نیلگوں آسمان پر سورج کسی بہت بڑے ہیرے کی

طرح دمک رہا تھا۔ اس کی خوشگوار تمازت نے ہر جاندار و بے جان شے میں زندگی کی لہر دوڑا دی تھی۔ قدرت کی رنگینیوں اور مناظر کی نیرنگیوں سے لطف اندوز ہوتے وہ چشمہ چشمہ اور ٹیلہ ٹیلہ آگے بڑھتے رہے۔ ان کے گھوڑے تازہ دم تھے۔ ان کی خرجینیں خوراک سے بھری ہوئی تھیں اور دل تازہ ولولوں سے معمور تھے۔ سپاہیوں کی ایک ٹولی ترنگ میں آکر کوئی گیت گانے لگی تھی۔ اس قدیم روسی گیت کی بازگشت خوش الحان پرندوں کے غول کی طرح ان کے ساتھ ساتھ پرواز کر رہی تھی۔ اس گیت کا مطلب تھا ہم دشمن کا تعاقب کریں گے یہاں تک کہ سمندر کی لہریں اسے نگل لیں یا وہ غضب کے دریا کی وادی میں داخل ہو جائے ....

جھیل الیمن سے کوئی تیس کوس جنوب میں وہ ان کا دوسرا پڑاؤ تھا۔ ایک چشمے کے پہلو میں ہموار جگہ دیکھ کر خیمے لگا دیے گئے تھے۔ شہزادہ نکولس نے اباقہ کو ایک شاندار خیمے کا تحفہ دیا تھا۔ یہ خیمہ کسی شہزادے کے خیمے سے کم نہیں تھا۔ اباقہ نے یہ خیمہ پہلے اسد اور پھر اپنے دستے کے ایک سردار کو دینے کی کوشش کی تھی مگر وہ دونوں رضامند نہیں ہوئے تھے۔ اب یہ خیمہ اباقہ، نتاشا اور علی کے تصرف میں تھا۔

موسم نہایت خوشگوار تھا۔ پڑاؤ ڈال کر اسد، علی اور اباقہ نے عصر کی نماز ادا کی اور پھر شکار کے لیے نکل گئے۔ تین گھوڑوں پر سوار وہ جنگل میں آگے تک چلے گئے۔ مغرب میں جھکے سورج کی کرنیں درختوں میں ان سے آنکھ مچولی کھیل رہی تھیں۔ پرندوں کی چہکاروں سے اطراف گونج رہی تھیں۔ کہیں کہیں کوئی گیدڑ یا لومڑ بھی نظر آ جاتا تھا۔ شام سے پہلے پہلے علی اور اباقہ نے ایک ایک مرغابی اور اسد نے ایک تنومند جنگلی بلا شکار کر لیا۔ کھال حاصل کرنے کے لیے جنگلی بلے کو گھوڑے کی زین کے ساتھ باندھ لیا گیا۔ دونوں مرغابیاں علی نے بڑی شان سے اپنے کندھے پر لٹکا لیں۔ وہ پڑاؤ میں واپس پہنچے تو اندھیرا پھیل رہا تھا۔ سپاہی کھانا وغیرہ پکانے میں مشغول تھے۔ کچھ انہی کی طرح شکار سے واپس لوٹ رہے تھے۔ علی دونوں مرغابیاں لے کر خیمے کی طرف بھاگ گیا، وہ نتاشا کو اپنی کارگزاری دکھانے گیا تھا۔ ایک مرغابی اباقہ نے شکار کی تھی مگر اباقہ جانتا تھا علی اس کا نام صاف چھپا جائے گا بلکہ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ جنگلی بلا بھی اپنے کھاتے میں ڈال لے اور نتاشا کو بتائے کہ یہ بلا دراصل اسی نے گرایا تھا۔ اسد بھائی جان کا تیر تو اسے بعد لگا تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔ مگر یہ دیکھ کر اباقہ چونک گیا کہ علی خیمے میں جاتے ہی واپس لوٹ آیا ہے۔ اس کے چہرے پر حیرت تھی۔ مرغابیاں بھی اسی طرح اس کے ہاتھوں میں لٹک رہی تھیں۔

"یا خدا خیر" اباقہ کے ہونٹوں سے نکلا .... کیا نتاشا خیمے میں موجود نہیں؟ وہ چند قدم

چل کر علی کی طرف گیا۔ اسے دیکھ کر علی کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔ وہ بھاگتا ہوا اباقہ کے پاس پہنچا اور بولا۔

"بھائی جان! میرے ساتھ آیئے۔ میں آپ کو ایک چیز دکھاؤں۔"

اباقہ نے بے تابی سے پوچھا۔ "شہزادی تو اندر ہی ہے نا؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور اباقہ کو ساتھ لیتا ہوا خیمے کے سامنے پہنچ گیا۔ پھر ایک مرغابی نیچے رکھ کر اس نے آہستگی سے پردہ ہٹایا۔ اندر کا منظر دیکھ کر اباقہ چونک گیا۔ شمع دان کی روشنی میں اباقہ کو نتاشا نظر آئی۔ اباقہ کی طرف اس کی پشت تھی۔ وہ قالین پر مصلیٰ بچھائے نماز ادا کر رہی تھی۔ ریشمی سفید اوڑھنی سے اس نے پیشانی اور سر ڈھانپ رکھا تھا۔ صرف چہرہ کھلا تھا۔ وہ دو زانو بیٹھی التحیات پڑھ رہی تھی پھر اس نے سلام پھیرا۔ جب اس نے دوسری طرف سلام پھیرا تو اس کی نظر اباقہ پر پڑی۔ اس نے اپنی پلکیں جھکائیں اور خاموشی سے اباقہ کے ردعمل کا انتظار کرنے لگی۔ اباقہ سکتے کی کیفیت میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس لباس اور اس انداز میں وہ کوئی آسمانی حور لگ رہی تھی۔ روشن چہرے پر ایک دھیمی اور پیاری سی مسکراہٹ رنگ بہار کی طرح کھلی ہوئی تھی یہ مسکراہٹ اس سے داد طلب کر رہی تھی۔ اس فیصلے کی داد جو دلاور میر کی شہزادی نے نہایت خاموشی سے کر لیا تھا۔ وہ خاموشی کی زبان میں اس سے کہہ رہی تھی۔ تم جس روپ میں مجھے دیکھنا چاہتے تھے میں اس روپ میں آ گئی ہوں۔ بتاؤ تو کیسی لگتی ہوں؟

اباقہ کو واقعی وہ بہت خوبصورت لگی۔ وہ قدم بڑھا کر اندر آیا اس وقت نتاشا مصلیٰ سمیٹ رہی تھی۔ اباقہ نے کہا۔ "میں یہ کیا دیکھ رہا ہوں نتاشا؟"

نتاشا نے پلکیں جھکائے جھکائے کہا۔ "آپ وہ دیکھ رہے ہیں جو ہمارے دل میں ہے۔" اس نے مصلیٰ ایک طرف رکھا اور بولی۔ "اباقہ ہم نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ بخدا ہمیں یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے ہمارے اندر ایک خلا تھا جو آج پُر ہو گیا ہے۔ ایک پیاس تھی جو بجھ گئی ہے۔ ہم نے بہت سوچا ہے اباقہ! اور آخر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ برسوں سے ہم کسی ایک ایسے شخص کے منتظر تھے جو ہمارے دل کی دنیا بدل ڈالے اور وہ شخص آپ ہیں اباقہ۔ آپ نے ہمیں وہ سب کچھ دیا ہے جس کی ہمیں آرزو تھی اور ان عنایات میں یہ شرف مسلمانی بھی شامل ہے۔"

اباقہ کو کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی وہ اس موقع پر کیا جواب دے۔ وہ تو خود کوئی ایسا پابند صوم صلوٰۃ نہیں تھا۔ بس کبھی کبھار اسد کے کہنے پر نماز پڑھ لیا کرتا تھا۔ ہاں.......... مسلمان وہ تھا اور اس کا ڈنکے کی چوٹ پر اعلان کرتا تھا۔ شاید یہی سبب تھا کہ نتاشا کی اس

لی پر اسے بے حد خوشی ہو رہی تھی۔ وہ اسد کو یہ خبر سنانے کے لیے الٹے قدموں مڑا تو دروازے پر علی سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔ وہ شریر ہاتھ میں مرغابیاں تھامے ابھی تک پردے کے پیچھے کھڑا تھا۔

بحیرہ اسود کے ساحل کی طرف ان کا سفر جاری رہا۔ ان کی رفتار خاصی سست تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ حتی الامکان دشوار راستے اختیار کر رہے تھے تاکہ تاتاریوں سے مڈبھیڑ کے امکانات کم سے کم رہیں۔ پھر ایک جگہ انھیں چند تاتاریوں سے واسطہ پڑ ہی گیا۔ انھوں نے ایک پہاڑ کی کھوہ میں عیش و نشاط کا سامان فراہم کر رکھا تھا۔ کسی بستی سے وہ تین دہقان عورتوں کو اٹھا لائے تھے اور اب بھوکے بھیڑیوں کی طرح ان کے جسم بھنبھوڑنے میں مصروف تھے ان میں دو جوان عورتیں تھیں اور ایک ادھیڑ عمر۔ اباقہ اور اسد نے نہایت غضبناکی سے حملہ کر کے اس ظلم کدے کو تباہ کر دیا اور عورتوں کو نجات دلائی۔ دو تاتاریوں کو اباقہ کے حکم پر زندہ گرفتار کیا گیا۔ ان سے انھیں معلوم ہوا کہ منگول لشکر "کاکھا" کے نزدیک "کوزل سک" کے مقام پر رکا ہوا ہے اور اس قصبے کی مقامی آبادی زبردست مزاحمت کر رہی ہے۔

معلومات حاصل کرنے کے بعد اباقہ نے دونوں تاتاریوں کو اپنے ہاتھ سے موت کے گھاٹ اتارا۔ مظلوم عورتوں نے منگولوں کے لرزہ خیز مظالم کی داستانیں سنائیں۔ انھوں نے بتایا کہ ان وحشیوں نے راستے میں آنے والی کسی بستی کو نہیں بخشا۔ فتح اور طاقت کے نشے میں چور وہ بے بس انسانیت کو آدم خور شیطانوں کی طرح بھنبھوڑتے رہے ہیں۔ ایک عورت نے بتایا کہ اس کی بستی کے تمام مکینوں کو ایک کھلے میدان میں جمع کیا گیا۔ پھر انھیں حکم دیا گیا کہ وہ ایک دوسرے کے ہاتھ باندھیں۔ بعد ازاں منگول قاتل وزنی کلہاڑے لیے ہجوم میں گھس گئے اور لوگوں کی گردنوں پر اس طرح وار کیے کہ ان کی ریڑھ کی ہڈیاں ٹوٹ گئیں اور وہ تڑپ تڑپ کر ہلاک ہو گئے۔ اس عورت نے بتایا کہ علاقے کے لوگوں پر منگولوں کی دہشت اس بری طرح سوار ہے کہ وہ انھیں آسمانی بلا سمجھنے لگے ہیں۔ اس نے کہا۔

"قتل عام کے بعد میں اپنے خاوند اور بستی کے چند دوسرے لوگوں کے ساتھ بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئی۔ ہم راستے میں تھے کہ ایک منگول گھڑ سوار نے ہمیں روک لیا۔ وہ اکیلا تھا اور ہم گیارہ۔ اس نے ہم سب کو روک لیا اور کہا کہ ایک دوسرے کے ہاتھ باندھو۔ سارے مرد ایک دوسرے کے ہاتھ باندھنے کے لیے گھوڑوں سے اتر آئے۔ میں نے انھیں غیرت دلائی کہ یہ تنہا ہے اور تم دس ہو۔ اسے گھیر کر پکڑ لو۔ میرے کہنے پر

انہوں نے اسے پکڑا اور مار دیا۔ بعد میں جب ہمارا قافلہ نوو گرود کی طرف جا رہا تھا' ایک فوجی چوکی پر ہمیں گرفتار کر لیا گیا؟"

ایسے اور اس قسم کے بہت سے واقعات ان عورتوں نے سنائے جن سے اندازہ ہوا کہ روس کے طول و عرض میں اور خصوصاً مضافاتی علاقوں میں منگولوں کو انسانوں کی بجائے شیطانی ارواح سمجھا جا رہا ہے اور لوگ اپنی تلواریں تیز کرنے کی بجائے روحانی پابندیوں میں مصروف رہتے ہیں۔ پھر جب حملہ ہوتا ہے تو بھاگ کر عبادت گاہوں میں جا چھپتے ہیں۔ درحقیقت 1238ء کے ان اولین مہینوں میں پورا روس ایک پُراسرار خوف کی دھند میں لپٹا ہوا تھا............ اور جس خوف سے لوگ بھاگ رہے تھے' کوہ الطائی کا دیوانہ اس خوف کا پیچھا کر رہا تھا۔

☆======☆======☆

یورق کو اباقہ کی یاد بہت ستا رہی تھی۔ وہ ہر وقت سوچتا رہتا۔ نہ جانے وہ کہاں ہے' کیا کر رہا ہے' کس حال میں ہے۔ ثیزری کو جب اسے سوچوں میں ڈوبا دیکھتی تو دلجوئی کی کوشش کرنے لگتی۔ اسے یورق سے عجیب طرح کا اُنس ہو گیا تھا۔ شاید یہ اُنس مسلسل قربت کی وجہ سے تھا۔ یورق پہلے پہل تو ثیزری سے بہت کھچا ہوا رہتا تھا۔ مگر اب اسے ثیزری کی باتیں نہ صرف سمجھ آ جاتی تھیں بلکہ وہ ان کا لطف بھی لیتا تھا۔ ثیزری نہایت ہنس مکھ اور خوش طبع تھی۔ اتنے مصائب سے گزرنے کے باوجود اس نے ہمت نہیں ہاری تھی۔ وہ نہ صرف اپنا حوصلہ بلند رکھتی بلکہ یورق کو بھی مایوس نہیں ہونے دیتی تھی۔ وہ مداریوں کے قافلے کے ساتھ کالگا کی طرف محو سفر تھے۔ راستے کی چوکیوں سے انہیں اندازہ ہو رہا تھا کہ منزل اب زیادہ دور نہیں۔ وہ کسی بھی وقت منگول لشکر تک پہنچنے والے تھے۔ جوں جوں وہ لشکر کے قریب پہنچ رہے تھے یورق کے اضطراب میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اب تک تو سب خیریت تھی مگر منگول لشکر میں اس بات کا بہت امکان تھا کہ کوئی اسے پہچان لے۔ یوں تو اس نے گھوڑوں کے خدمتگار کے طور پر اپنی چال ڈھال اور لب و لہجہ بدل لیا تھا اور چہرے پر بھی ہر وقت ایک پگڑی لپیٹے رہتا تھا مگر شناخت کیے جانے کے امکانات بہرحال اپنی جگہ موجود تھے............ بالآخر ایک روز وہ کالگا کے نواح میں "کوزل سک" پہنچ گئے۔ منگولوں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر اس وسیع و عریض پہاڑی قصبے کے نواح میں خیمہ زن تھا۔ منگول لشکری ٹڈی دل کی طرح نشیب و فراز میں پھیلے ہوئے تھے۔ یورق نے مداریوں کے سرغنہ ارغون کو بتایا تھا کہ وہ مرکزی اصطبل کا سائیس ہے۔ لہٰذا اب ضروری تھا کہ وہ اور ثیزری ان مداریوں سے چھٹکارا حاصل کر لیں اور کہیں اور سر چھپانے کی کوشش

کریں یا پھر پکڑے جانے کے لیے تیار ہو جائیں۔ جس رات مداری لشکر میں پہنچے اسی رات یورق اور ثیزری نے وہاں سے نکلنے کا منصوبہ بنا لیا۔ وہ دونوں گھوڑوں کے قریب ہی ایک چھوٹے سے خستہ حال خیمے میں لیٹے ہوئے تھے۔ نیند دونوں میں سے کسی کو نہیں آئی تھی۔ اس لیے جب یورق نے ثیزری کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ فوراً اٹھ بیٹھی۔ یورق نے آنکھوں آنکھوں میں اسے چلنے کا اشارہ کیا۔ پوستین سے ایک خنجر نکال کر یورق نے خیمے کا عقبی کپڑا چاک کیا اور بہ آہستگی باہر نکل آیا۔ رات کافی بیت چکی تھی۔ منگول پڑاؤ میں جگہ جگہ بھڑکنے والے آگ کے الاؤ اب سرد ہو چکے تھے کوئی بیس گز دور چند ٹھٹھرے ہوئے پہریدار ایک ادھ بجھے الاؤ کے گرد کھڑے جسم گرمانے کی کوشش میں مصروف تھے۔ یورق نے ثیزری کا ہاتھ تھام کر اسے باہر نکال لیا اور پہلے سے منتخب شدہ راستے پر چلتا ہوا پڑاؤ کی جنوبی سمت بڑھنے لگا۔ راستے میں ایک پہریدار نے روک کر ان کی شناخت کی۔ یورق نے ثیزری کی طرف اشارہ کر کے بتایا کہ اس "لڑکے" کے پیٹ میں سخت درد ہے اسے شامان (معالج) کی طرف لے جا رہا ہوں۔ پہریدار نے انہیں جانے دیا۔

وہ کوئی ایک فرلانگ سیدھا چلنے کے بعد گھومے اور پڑاؤ کے مضافات میں آ گئے۔ اس وقت اچانک یورق کو احساس ہوا کہ کوئی ان کا تعاقب کر رہا ہے۔ پہلے تو اس نے سوچا شاید یہ وہی پہریدار ہے مگر پھر اسے اپنی رائے بدلنا پڑی۔ پہریداروں کے علاقے متعین تھے اور وہ کسی صورت اپنی حدود سے باہر نہیں نکلتے تھے۔ آخر یہ شخص کون ہو سکتا ہے؟ یورق نے پریشانی کے عالم میں سوچا۔ ثیزری ابھی تک اس تعاقب سے بے خبر تھی اور یورق اسے بتانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ تعاقب کرنے والے کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ انہیں پکڑنا نہیں چاہتا بلکہ ان کے ارادوں سے باخبر ہونا چاہتا ہے۔ یورق ثیزری کو لیے ہوئے گھنے درختوں میں پہنچا اور ایک اُبھری ہوئی چٹان کے پیچھے بیٹھ کر تعاقب کرنے والے کا انتظار کرنے لگا۔ ٹھٹھری ہوئی مدھم چاندنی نے نشیب و فراز کو خوابناک بنا رکھا تھا۔ پڑاؤ سے گاہے گاہے اٹھنے والی پہریداروں کی آوازوں کے سوا فضا میں مکمل سکوت تھا۔ آخر یورق کو وہ طویل سایہ نظر آیا جو ایک خیمے کی اوٹ سے نکلا تھا اور اب قدرے پریشانی کے عالم میں چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے ڈیل ڈول اور انداز سے یورق کو............ اندازہ ہو گیا کہ وہ کون ہے؟ وہ مداریوں کا ہٹا کٹا سرغنہ ارغون تھا۔ کم بخت نے انہیں خیمے سے نکلتے دیکھ لیا تھا یا اس نے پہلے سے کوئی آدمی ان کی نگرانی پر لگا رکھا تھا۔ اسے دیکھتے ہی یورق کا دماغ کھولنے لگا۔ اس کا جی چاہا کہ چٹان کے پیچھے سے لپک کر اسے دبوچ لے............ لیکن اس موقع پر تحمل کی ضرورت تھی۔ شکار خود ہی پھندے تک آنے والا تھا۔

وہ اور شیزی دم سادھے دبکے رہے۔ گہرے سکوت میں انہیں ایک دوسرے کے سانسوں کی آوازیں تک سنائی دے رہی تھیں۔ طویل القامت شخص اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد محتاط قدموں سے آگے بڑھنے لگا۔ اس کا ایک ہاتھ تلوار کے قبضے پر تھا اور وہ بالکل تنہا تھا۔ شاید یہاں تک پہنچ کر وہ تھوڑا سا ہراساں ہو گیا تھا۔ محتاط قدموں سے وہ یورق اور شیزی کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ یورق کے ہاتھ پاؤں سنسنانے لگے۔ اس نے شیزی کا نازک ہاتھ آہستگی سے دبایا اس کا مطلب تھا۔ ہوشیار ہو جاؤ میں ارغون پر حملہ کرنے والا ہوں۔ پھر اس نے پوستین سے پیش قبض نکالی اور جست بھرنے کو تیار ہو گیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ کھڑا ہوتا یا جست بھرتا کوئی نہایت وزنی شے اس کے سر سے ٹکرائی اور وہ ایک کراہ کے ساتھ گھاس پر لڑھک گیا۔ اس وقت درختوں سے تین سائے نکل کر طویل القامت ارغون پر جھپٹے۔ شیزی نے یہ سب کچھ دیکھا اور اس کے حلق سے بے اختیار ایک چیخ بلند ہوئی لیکن یہ چیخ اختتام تک پہنچتے پہنچتے ایک کراہ میں ڈھل گئی۔ شیزی کی گردن پر کسی نے تلوار کا قبضہ اس زور سے مارا تھا کہ وہ مردہ چھپکلی کی طرح پٹاک سے پتھر پر جا گری تھی۔

.... دوبارہ یورق کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو ایک تنگ کوٹھڑی میں پایا۔ وہ یخ بستہ فرش پر اوندھا پڑا تھا۔ تماشہ گر ارغون بھی اس کے قریب ہی لیٹا تھا سورج کی کرنیں ایک تنگ روزن کے راستے کمرے میں مٹگجا سا اجالا بکھیر رہی تھیں۔ یورق نے دیکھا کہ ارغون کے ہونٹوں اور ناک سے خون بہہ رہا ہے۔ لگتا تھا اس کی کافی پٹائی کی گئی ہے۔ مشکل میں ہونے کے باوجود یورق کو اس صورت حال کا لطف آیا۔ اسے دلی مسرت ہو رہی تھی کہ وہ اکیلا نہیں پھنسا اس کے ساتھ ارغون بھی ہے۔ کمبخت نے دھپ مار مار کر اس کے کندھے ہلا ڈالے تھے۔ وہ اسے بدلہ لئے بغیر نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ خود یورق کا سر بھی زخمی تھا۔ شیزی کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا یا تو وہ موقع سے بھاگ گئی تھی یا پھر اس کے عورت ہونے کا راز کھل گیا تھا۔ سب سے پہلا سوال یورق کے ذہن میں یہی آیا کہ آخر وہ کن لوگوں کی قید میں ہے۔ اگر وہ منگول تھے تو انہوں نے ارغون کو کس جرم میں قید کیا تھا اور پھر یہ نیم پختہ کوٹھڑی بھی منگول پڑاؤ کا حصہ نہیں تھی۔ دفعتاً کوٹھڑی کے دروازے پر کھٹ پٹ کی آواز آئی۔ دروازہ کھلا اور دو قیم شحیم روسی دندناتے ہوئے اندر گھس آئے۔ انہوں نے آگے بڑھ کر یورق اور ارغون کی پسلیوں میں ایک ایک ٹھوکر ماری۔ یورق تو فوراً اٹھ بیٹھا مگر ارغون کو تین چار ٹھوکروں کے بعد ہوش آئی۔ روسی سپاہیوں نے اسے بے دردی کے ساتھ بالوں سے پکڑا اور گھسیٹ کر کھڑا کر دیا ....

یورق پہلے ہی کھڑا ہو چکا تھا۔ وہ انہیں عریاں تلواروں کی نوک پر دھکیلتے باہر لے آئے۔ یہ ایک قدیم گرجے کا بہت بڑا صحن تھا۔ چاروں طرف خوشگوار دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ ایک طرف لکڑی کی بلند کرسی پر ایک ادھیڑ عمر باریش شخص براجمان تھا۔ اس کے ساتھ ایک کرسی اس سے بھی بلند اور مزین تھی۔ اس پر شاہانہ لباس میں ایک سات آٹھ سال کا بچہ بیٹھا تھا۔ مسلح روسی اس کے چاروں طرف زمین پر حلقہ بنائے بیٹھے تھے۔ پہریدار یورق اور ارغون کو دھکیلتے ہوئے بچے کے سامنے لے گئے۔

"رئیس قیدی حاضر ہیں۔" ایک شخص نے سر جھکا کر کہا۔

اس وقت یورق کی نظر شیزی پر پڑی۔ وہ کچھ دوسری عورتوں کے ساتھ خوبصورت زنانہ لباس پہنے "ننھے رئیس" کے عقب میں کھڑی تھی۔ اب یورق کو اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ قصبے کے روسی سپاہیوں کی قید میں ہیں۔ یقیناً رات انہوں نے نہایت جرأت مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے منگول پڑاؤ پر شبخون مارا تھا اور انہیں گرفتار کر کے لے آئے تھے۔

کرسی پر براجمان جس بچے کو "رئیس" کہا گیا تھا اس کا نام ویژلی تھا۔ اس نے بڑے اعتماد لہجے میں اپنے ساتھ بیٹھے باریش بزرگ سے کہا۔ "نائب رئیس! آپ ان قیدیوں سے سوالات پوچھیے۔"

نائب رئیس نے یورق اور ارغون کا حسب نسب پوچھا۔ پھر منگول لشکر کے ارادوں اور حکمت عملی کو جاننے کے لیے مختلف سوالات کئے۔ یورق اور ارغون نے جو جواب دیئے نائب رئیس ان سے مطمئن نہیں ہوا۔ اس کے حکم پر ان دونوں کو آہنی شکنجوں میں کس دیا گیا۔ شیزی یہ مناظر دیکھ دیکھ کر مسلسل آنسو بہا رہی تھیں پھر جب کوڑا بردار نے یورق کے عریاں جسم پر کوڑا رسید کرنے کے لیے ہاتھ اٹھایا تو شیزی پہریداروں کا گھیرا توڑ کر بھاگتی ہوئی آئی اور بے اختیار یورق پر گر گئی۔ چونکہ اس دوران چرمی کوڑا حرکت میں آ چکا تھا۔ اس لیے اس کی بھرپور ضرب شیزی کی پشت پر پڑی۔ اس نے ایک سسکاری لی مگر یورق سے جدا نہیں ہوئی۔ نائب رئیس زور سے چیخا۔

"یہ کیا حماقت ہے؟ کیا یہ عورت پاگل ہو گئی ہے۔ جو ایک نجس منگول کو بچانے کی کوشش کر رہی ہے۔"

دراز بالوں والا ایک روسی کماندار آگے بڑھا اور احترام سے بولا۔ "محترم نائب! یہ لڑکی بھی شب ان کے ساتھ ہی گرفتار ہوئی تھی۔ ہم نے اسے منگول سمجھا تھا۔ یہ مردوں کے لباس میں تھی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ نہ صرف روسی ہے بلکہ عورت ہے۔ اب یہ اس بات پر مصر ہے کہ یہ ادھیڑ عمر منگول اس کا ساتھی اور ہمارا خیر خواہ ہے۔"

"جھوٹ ہے یہ۔" نائب رئیس دھاڑا۔ "منگول صرف اپنے خاقان کا خیر خواہ ہوتا ہے۔ اگر وہ وقتی طور پر کسی سے ہمدردی کرتا بھی ہے تو یہ خیر خواہی نہیں عیاری ہوتی ہے۔"

شیزی کھڑی ہو گئی اور آنسو بہاتے ہوئے بولی۔ "رئیس! میں اس زمین کی بیٹی ہوں' ایک غیر قوم کے شخص کے لیے جھوٹ کیوں بولوں گی۔ میں جو کچھ کہہ رہی ہوں وہی حقیقت ہے۔ اس شخص نے اپنے ساتھیوں سمیت ہماری خاطر بے انتہا دکھ جھیلے ہیں۔"

نائب رئیس نے کڑک کر کہا۔ "دیکھو لڑکی! ہمارے دل میں تمہارے لیے رحم اور محبت ہے' تم نے ان وحشیوں کی قید کاٹی ہے اور آلام اٹھائے ہیں' لیکن ہماری محبت سے غلط فائدہ اٹھانے کی کوشش نہ کرو۔ جیسے آگ ٹھنڈک نہیں بخش سکتی۔ ویسے منگول بھی قابل اعتبار نہیں ہو سکتا۔"

شیزی بولی۔ "رئیس .... لیکن اس شخص کی آگ بجھ چکی ہے۔ میرا یہ ساتھی مسلمان ہو چکا ہے۔ اب یہ ہماری طرح اہل کتاب ہے۔ اب یہ منگول نہیں۔"

نائب رئیس شیزی کولت کی بحث سے بیزار نظر آتا تھا۔ اس نے کماندار کو اشارہ کیا۔ وہ آگے بڑھا اور شیزی کو سمجھاتا بجھاتا پیچھے لے گیا۔ شیزی جانتی تھی کہ جونہی وہ موقعے سے ہٹ گئی اس کے ہم وطن سپاہی یورق پر ظلم و ستم کی انتہا کر دیں گے اور ممکن ہے آج کا سورج یورق کی زندگی کا آخری سورج ثابت ہو۔ لہٰذا وہ اڑ گئی۔ اس نے کماندار کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ اس نے خود کو چھڑایا اور رئیس کی نشست کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔ پھر اس کے چھوٹے چھوٹے پیروں کو اپنے چہرے سے لگا کر لگاتار آنسو بہاتے ہوئے بولی۔

"رئیس! کیا ایک لٹی پٹی بے خانماں عورت کی اشک شوئی آپ اس طرح کریں گے کہ اس کے محسن کو اذیت ناک موت مار دیں۔ کیا میرے شوہر' میرے جگر کے ٹکڑوں اور میرے بہن بھائیوں کے خون کی اتنی قیمت بھی نہیں کہ میں ایک مخلص دوست کی جاں بخشی کرا سکوں .... جواب دیں رئیس۔"

وہ مزید بھی کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن فرط رنج سے اس کی ہچکی بندھ گئی۔ رئیس کے چہرے پر الجھن تھی۔ وہ کچھ دیر معصوم انداز میں سوچتا رہا پھر نائب رئیس سے بولا۔

"ان دونوں کو فی الحال بند کر دیجئے۔ ہم ان کا فیصلہ بعد میں کریں گے۔"

☆======☆======☆

نوگرود سے چار منزل جنوب کی طرف انہوں نے ایک گھاٹی میں پڑاؤ ڈال رکھا تھا۔

اباقہ کا زرنگار خیمہ پڑاؤ میں نمایاں نظر آتا تھا۔ رات کا وقت تھا خیمے میں موی شمعوں کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ بے تکلف محفل جمی تھی۔ اباقہ' اسد' نتاشا اور علی کے علاوہ ان کے ساتھی دستے کے دو سردار بھی خیمے میں موجود تھے' کافی دیر باتوں میں مصروف رہنے کے بعد ایک ایک کر کے سب چلے گئے۔ آخر میں اسد اور علی بھی اٹھ کر اپنے خیمے کی طرف روانہ ہو گئے۔ علی نے اسد کے پاس سونا شروع کر دیا تھا۔ وہ اسے سلطان صلاح الدین ایوبی کی ولولہ انگیز کہانیاں سنایا کرتا تھا۔

خیمے کے نیم گرم اور خواب ناک ماحول میں اب اباقہ اور نتاشا تنہا تھے۔ نتاشا اٹھ کر خیمے کے عقبی حصے میں گئی اور شب باشی کا حسین لباس پہنے واپس آ گئی۔

اس کے دراز گیسو شانوں پر جھول رہے تھے۔ آنکھ کٹوروں میں عجیب سا نشہ چھلک رہا تھا۔ اباقہ نے محسوس کیا کہ اس کی اداؤں میں ایک معصوم سی مستی عود کر آئی ہے۔ وہ اباقہ سے کچھ فاصلے پر توبہ شکن انداز میں لیٹ گئی۔

"اباقہ!" اس کی مخمور آواز اباقہ کے کانوں سے ٹکرائی۔ اباقہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ نتاشا نے کہا۔ "اباقہ! ہم نے سنا ہے بغداد بڑا حسین شہر ہے دریائے دجلہ اس کے بیچوں بیچ بہتا ہے؟"

اباقہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ نتاشا خوابیدہ لہجے میں بولی۔ "ہمارا دل چاہتا ہے جب اس مہم سے فارغ ہو کر ہم بغداد پہنچیں تو دجلہ کے کنارے ہمارا خوبصورت سا گھر ہو' جس کی بالکونی میں بیٹھ کر ہم دونوں پہروں دریا کی لہروں کو دیکھا کریں۔ ہمیں بہتے پانیوں سے بڑا انس ہے۔"

اباقہ بولا۔ "اگر ہم عافیت سے بغداد پہنچے تو میں تمہاری یہ خواہش ضرور پوری کروں گا۔"

نتاشا خاموشی سے اباقہ کی آنکھوں میں دیکھتی رہی جیسے سوتے سوتے اس کا چہرہ نگاہوں میں بسا لینا چاہتی ہو۔ پھر آہستہ آہستہ اس کی آنکھیں مندھ گئیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اباقہ بھی نیند کی آغوش میں چلا گیا........... نہ جانے اباقہ کتنی دیر سویا رہا۔ دفعتاً اس کی آنکھ کھل گئی۔ کوئی اسے جھنجوڑ جھنجوڑ کر جگا رہا تھا۔ اباقہ نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا یہ نتاشا تھی۔ شمعدان کی اکلوتی شمع خیمے کی تاریکی دور کرنے کی کوشش میں مصروف تھی۔ نتاشا نے نہایت خوفزدہ انداز میں ایک جانب اشارہ کیا۔ اباقہ نے اس طرف دیکھا تو اس کے اعصاب تن گئے اور ذہن ایک ہی جست میں نیند کی قید سے آزاد ہو گیا۔ منظر واقعی ہوشربا تھا۔ ایک خنجر کا پھل سموری خیمے کے اندر نظر آ رہا تھا۔ کوئی شخص باہر سے نہایت

آہستگی اور احتیاط کے ساتھ خیمہ چاک کر رہا تھا۔ اباقہ نے کمربند سے اپنا خنجر نکالا اور بہ آہستگی اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے اٹھنے سے معمولی سی آہٹ ہوئی اور خنجر اچانک او جھل ہو گیا۔ اباقہ تیر کی طرح لپک کر اس جگہ پہنچا جہاں خنجر کا پھل نظر آیا تھا۔ اس نے خیمے کے چاک میں ہاتھ ڈالا اور ایک ہی جھٹکے میں اسے پھاڑ دیا۔

تاریکی میں اسے ایک ہیولا درختوں کی طرف بھاگتا دکھائی دیا۔ وہ چھلانگ لگا کر باہر نکلا اور اس کے عقب میں لپکا۔ جب تک وہ درختوں میں پہنچا ہیولا نظروں سے او جھل ہو چکا تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ کیا کرے دفعتاً اسے اپنے سامنے دو سائے اوپر نیچے پڑے نظر آئے۔ اباقہ نے دیکھا وہ فوجی دستے کے دو پہریدار تھے۔ ایک ہلاک ہو چکا تھا اور دوسرا شدید زخمی تھا۔ اباقہ نے جھک کر زخمی کو زمین سے اٹھایا۔ اس دوران اردگرد کے کئی خیموں میں روشنی ہونے لگی تھی۔ اسد اور نتاشا بھاگتے ہوئے اس کی جانب آرہے تھے۔ ان کے عقب میں وہ پہریدار بھی تھا جو آٹھوں پہر چوکسی سے اباقہ کے خیمے پر پہرا دیتا رہتا تھا۔ اباقہ اور اسد نے دو سپاہیوں کی مدد سے زخمی اور مردہ سپاہی کو ایک خیمے میں پہنچایا۔ ایک طبیب نے زخمی کی مرہم پٹی شروع کر دی۔ اس کی گردن پر خنجر کا گہرا زخم آیا تھا مگر خوش قسمتی سے شہ رگ کٹنے سے بچ گئی تھی۔

صبح تک زخمی کی حالت سنبھل گئی۔ اس نے حملہ آور کا جو حلیہ بتایا اس سے اباقہ اور اسد کے ذہن میں فوراً گیوڑا کی شبیہہ گھومنے لگی اور اس کے ساتھ ہی ڈیوک کا مکار چہرا ان کے تصور میں آگیا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ کینہ پرور شخص کسی طرح اپنی دشمنی بھولنے پر تیار نہیں اور ان کی گھات میں ہے۔ نتاشا نے ڈیوک کا نام سنا تو اس کی آنکھوں میں لہراتی تشویش مزید گہری ہو گئی۔ وہ دونوں اس وقت اپنے خیمے میں تھے۔ نتاشا نے اباقہ کا بازو تھام لیا اور تشویشناک لہجے میں بولی۔

"اباقہ! آپ بہت ہوشیار رہیں۔ ڈیوک اچھا شخص نہیں۔ اس کا دست راست گیوڑا جیسا بھیانک شخص ہے۔ گیوڑا کی سفاکی اور ڈیوک کی عیاری مل کر کوئی بھی برے سے برا کام انجام دے سکتی ہیں۔"

اباقہ نے اپنے مخصوص لہجے میں نتاشا کو تسلی دی۔ اس کے پُر اعتماد لہجے اور جادو اثر باتوں نے جلد ہی نتاشا کے چہرے کو تفکرات سے صاف کر دیا۔ وہ شبنم سے دھلے ہوئے پھول کی طرح دکھائی دینے لگی۔

یہ ان کے سفر کا آٹھواں روز تھا۔ انہوں نے سبزے اور پھولوں سے لدی ہوئی ایک نہایت خوبصورت وادی میں پڑاؤ ڈالا۔ اباقہ کا خیمہ ایک اونچی اور ہموار چٹان پر لگا دیا گیا۔

اس چٹان کے ساتھ ہی ایک چوڑے پاٹ کی ندی بہتی تھی۔ کنارے پر گھنے سایہ دار درخت تھے۔ گھاس وافر تھی۔ گھوڑوں اور مسافروں کی تھکن اتارنے کے لیے جگہ نہایت مناسب تھی۔ اباقہ اور اسد نے فیصلہ کیا کہ وہ کم از کم دو روز یہاں قیام کریں۔ اس دوران برساتی ندی کی طغیانی بھی کم ہو جائے گی اور وہ آسانی سے اس پار اتر سکیں گے۔

یہ دوپہر کا وقت تھا۔ فوجی دستے کے سواروں نے اپنے گھوڑوں کو سرسبز گھاس پر چرنے کے لیے آزاد چھوڑ دیا۔ خود وہ پانچ پانچ دس دس کی ٹولیوں میں سیر و شکار کے لیے نکل گئے۔ اباقہ نے دیکھا علی اور نتاشا ندی کے کنارے سے جنگلی پھول توڑنے میں مصروف ہیں۔ جلدی انہوں نے بہت سے پھول اکٹھے کر لیے۔ پھر وہ دونوں وہیں گھاس پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے اور ہار پرونے لگے وہ دونوں روسی دوشیزائیں بھی ان کے ساتھ شریک ہو گئیں جنہیں اباقہ نے منگولوں کی قید سے چھڑایا تھا۔ موسم خوشگوار دیکھ کر اسد کا دل تیراکی کو چاہ رہا تھا۔ اس نے اباقہ سے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو وہ بھی تیار ہو گیا۔ تھکن اتارنے کو یہ اچھا مشغلہ تھا۔ دونوں نے اپنی صدریاں اتار کر پانی میں چھلانگیں لگا دیں۔ پانی کے رخ پر بہتے بہتے جب وہ علی اور نتاشا کے قریب سے گزرے تو اسد نے علی پر پانی کے چھینٹے پھینکے وہ چلاتا ہوا بھاگ گیا۔ اباقہ نے یونہی علی کو ستانے کے لیے روسی سپاہی کو حکم دیا کہ علی کے کپڑے اتار کر اسے پانی میں پھینک دیا جائے۔ سپاہی مسکراتے ہوئے علی کی طرف بڑھے تو وہ کیکڑے کی طرح چھلانگیں لگاتا درختوں کی طرف بھاگ گیا .... اور دور تک انہیں مڑ مڑ کر دیکھتا رہا۔

دور تک تیرنے کے بعد اسد اور اباقہ سہ پہر کے وقت واپس آئے۔ انہیں سخت بھوک لگ رہی تھی۔ کھانا تیار تھا علی اور نتاشا ان دونوں کا ہی انتظار کر رہے تھے۔ سپاہیوں نے ندی سے کافی مچھلیاں پکڑی تھیں اور اب دسترخوان پر چھوٹی بڑی ہر طرح کی مچھلیاں نظر آرہی تھیں۔ علی ان مچھلیوں میں سے کوئی خاص مچھلی ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ اس نے بھی ایک مچھلی پکڑی تھی۔ اتنے میں نتاشا نے سالن میں سے ایک مچھلی پکڑ کر سب کے سامنے لہرا دی۔ یہ بمشکل پانچ چھ انگل کی مچھلی تھی۔ وہ بولی۔ "یہ مچھلی پکڑی تھی علی نے۔"

علی کا چہرا شرم سے سرخ ہو گیا۔ وہ تکرار کرنے لگا کہ نہیں اس نے دوسری مچھلی پکڑی تھی۔ بدقسمتی سے باقی سب مچھلیاں بڑی تھیں اور ان میں سے کسی پر علی اپنا حق نہیں جتا سکتا تھا۔ اسد نے اس کا دل رکھنے کو کہا۔ "ممکن ہے علی والی مچھلی باورچی نے خود چکھ لی ہو۔" علی اس توضیح سے مطمئن ہو کر کھانے میں مشغول ہو گیا۔ کھانے کے دوران

اباقہ کن انکھیوں سے نتاشا کی طرف دیکھتا رہا.......... آج اس نے نہایت خوبصورت اور بھڑکیلا لباس پہن رکھا تھا۔ کانوں میں چمکیلے بندے تھے۔ صراحی دار گردن میں ایک قیمتی ہار جگمگا رہا تھا۔ یہی ہار اس نے نتاشا کی گردن میں شب عروسی کو دیکھا تھا۔

کھانے سے فارغ ہو کر وہ اپنے خیمے میں پہنچا تو ششدر رہ گیا۔ پورا خیمہ جنگلی پھولوں سے سجا ہوا تھا۔ ہر طرف خوشبو بکھری تھی۔ سرخ پھولوں کی ان گنت لڑیاں خیمے کی چھت سے آویزاں تھیں۔ سفید پھولوں کے ہار خیمے کی دیواروں سے لٹک رہے تھے۔ آرائش کا سلیقہ ظاہر کرتا تھا کہ یہ سب کچھ دلادی میر کی شہزادی نے اپنے ہاتھوں سے کیا ہے۔ اباقہ نے گھوم کر دیکھا تو وہ اس کے عقب میں کھڑی تھی۔ اس کے احمریں لبوں پر ایک حسین مسکراہٹ اور غلافی آنکھوں میں ایک مسکراتا ہوا پیغام تھا۔ وہ مصور کی تصویر اور سنگتراش کے مجسمے کی طرح خاموش اور بے حرکت کھڑی تھی۔ وہ چپ تھی مگر اس کے جسم کا ہر حصہ مدعا بیان کر رہا تھا۔ خاموش فضا میں ان کہے لفظوں کی بازگشت سنائی دے رہی تھی۔ "ہم آپ سے محبت کرتے ہیں۔ ہمارے دل و دماغ پر آپ ہی کا نام لکھا ہے۔ ہماری روح آپ کی خوشبو میں بسی ہوئی ہے۔" اباقہ مبہوت اسے دیکھتا رہ گیا۔ اس نے کوشش کی مگر ہونٹوں کو بولنے کا یارا نہ ہوا۔ وہ گنگناتے جھرنوں اور چٹکتی کلیوں کی سحرانگیز آواز میں بولی۔ "ہمیں پھول بہت اچھے لگتے ہیں اور بہتا ہوا پانی بھی بہت اچھا لگتا ہے۔ یہ دونوں چیزیں یہاں موجود تھیں۔ ہم آج بہت خوش ہیں۔"

اباقہ نے ایک گہری سانس لی اور خیمے کے روزن سے باہر دیکھنے لگا۔ جہاں مغرب کی طرف جھکا سورج ندی کے شفاف پانی پر ستارے سے بکھیر رہا تھا۔ اس کا ہاتھ اپنے گھوڑے کی زین کی طرف بڑھ گیا۔ نتاشا نے پوچھا۔

"آپ کہیں جا رہے ہیں۔"

اباقہ نرمی سے بولا۔ "ہاں تھوڑی دور تک ندی کے کنارے کنارے جانا چاہتا ہوں کہیں کوئی منگول ٹولی اطراف میں موجود نہ ہو۔"

نتاشا نے آہستگی کے ساتھ خود کو بستر پر گرا دیا اور اس سے نگاہیں ملائے بغیر بولی۔ "کب تک واپس آجائیں گے۔" سوال کرنے کا انداز دلنشیں اور دلنواز تھا۔

اباقہ نے کہا۔ "چراغ جلتے ہی آجاؤں گا۔"

نتاشا سے رخصت ہو کر اباقہ اپنے گھوڑے تک آیا۔ اس پر زین ڈالی اور سوار ہو کر اکیلا ہی ندی کے کنارے کنارے نیچے کی طرف نکل گیا۔ کوس ڈیڑھ کوس دور آکر اس نے گھوڑا ایک درخت سے باندھا اور کنارے کے ایک پتھر پر خاموش بیٹھ گیا۔ اس کی سفید

آنکھیں گہری سوچ میں غلطاں تھیں۔ چہرے پر سنجیدگی ٹوٹ کر برس رہی تھی۔ کمان اس کے ہاتھ میں تھی اور وہ اس کے چلے پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیر رہا تھا۔ اس کی نگاہوں میں مارینا کا غمزدہ چہرا تھا۔ وہ رخساروں پر اشک چمکائے اس سے پوچھ رہی تھی۔ "اباقہ! تمہاری وفائیں کیا ہوئیں؟ کیا اس جاں گسل انتظار کا یہی صلہ تھا۔" اس وقت نتاشا کی شبیہہ اس کے تصور میں نمایاں ہوئی وہ آنکھوں میں سامنے سپنے سجائے۔ اپنی بے تاب دھڑکنیں سینے میں سمیٹے اس کا انتظار کر رہی تھی۔ خیمے کے روزن سے وہ اپنے شوہر کی راہ دیکھ رہی تھی۔ وہ شوہر جس کی محبت کے لیے وہ سب کچھ قربان کرنے کو تیار تھی۔ جو اس کی کل کائنات تھا جسے وہ اپنی زندگی سمجھتی تھی۔

"میں کیا کروں.......... میں کیا کروں۔" اباقہ اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام کر بڑبڑا رہا تھا۔ سورج دور مغرب کی پہاڑیوں کے پیچھے او جھل ہو رہا تھا۔ فضا میں آہستہ آہستہ روشنی کم ہو رہی تھی۔ اس کے دل سے آواز آئی۔ "اباقہ! تمہیں کوئی درمیانی راہ اختیار کرنا ہو گی۔ نہ تم نتاشا کو چھوڑ سکتے ہو اور نہ مارینا کے اعتبار کا خون کر سکتے ہو۔ وہ تمہاری پہلی اور آخری محبت ہے۔ تم اس کی وفاؤں سے منہ نہیں موڑ سکتے۔ اس مسئلے کا حل یہ ہے کہ نتاشا کے پاس جاؤ اور اسے نرمی و محبت سے مارینا کے بارے سب کچھ بتا دو۔ اسے بتا دو کہ میں تمہارا شوہر ہی نہیں ایک باوفا اور صابر عورت کی آنکھوں کا انتظار بھی ہوں۔ میں تمہاری آغوش میں محبت کے پھول ڈال کر اس کے دل میں کانٹے نہیں پرو سکتا۔ اس کا حق مجھ پر تم سے زیادہ ہے۔ ہم دونوں کو اس کی عدالت میں پیش ہونا ہو گا۔ پھر جو فیصلہ وہ کرے گی وہ ماننا ہو گا۔"

دل کے اندر ہی سے ایک صدا نتاشا کے حق میں ابھری۔ "اباقہ.......... یہ تم کس قسم کا ارادہ کر رہے ہو۔ نتاشا کے ساتھ یہ سلوک کرنے سے بہتر ہے کہ تم اسے موت کے گھاٹ اتار دو۔ وہ تمہاری محبت میں دیوانی ہے۔ تمہیں اپنی حیات کا حاصل سمجھتی ہے۔ جب اسے معلوم ہو گا کہ تم اس کے نہیں کسی اور کے ہو تو سوچو اس کے ارمانوں بھرے دل میں کیا بیتے گی۔ وہ یہ عظیم صدمہ کیونکر برداشت کر پائے گی۔ وہ تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ جاؤ.......... اس سے پہلے کہ اس کے معصوم خواب بکھرنے لگیں۔ اسے اس کا حق دے دو۔"

اباقہ کا سر کسی بھٹی کی طرح دہک رہا تھا۔ اس نے گھٹنوں کے بل جھک کر سر کو ندی کے خنک پانی میں بھگویا اور بے قراری سے ٹہلنے لگا۔ مارینا کی شبیہہ تاریکی کے بطن سے ابھر کر اس کے سامنے آگئی۔ وہ زیتون کے پیڑ کے نیچے افسردہ کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں

میں آنسو تھے۔ وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔ "تو تم نے میری محبت کی لاش پر اپنی خوشیوں کا محل تعمیر کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ فیصلہ اور یہ نئی زندگی تمہیں مبارک ہو۔ مجھے تو پہلے ہی معلوم تھا۔ میں ایک کمزور عورت ہوں اور تمہیں مجھ سے کوئی بھی چھین سکتا ہے۔ مجھے تم سے کوئی شکوہ نہیں۔ میری دعائیں تمہارے اور تمہاری نئی شریک سفر کے ساتھ ہیں" .... مارینا کی شبیہہ واپس مڑی اور افسردگی سے چلتی تاریکی میں گم ہونے لگی۔ "مارینا.......... مارینا۔" اباقہ بے اختیار پکار اٹھا۔ اس کی آواز ندی کے تاریک پانی پر دور تک پھسلتی چلتی گئی۔ وہ تن کر کھڑا ہو گیا۔ "نہیں .... ہرگز نہیں۔ میں مارینا کے دل میں بے وفائی کا یہ خنجر نہیں اتار سکتا۔ مجھے یہ سب کچھ نتاشا کو بتانا ہی ہو گا۔ اسے اس تلخ حقیقت کا زہریلا گھونٹ پینا ہی پڑے گا۔ اس کے خواب بکھرتے ہیں تو بکھریں' اس کے محل مسمار ہوتے ہیں تو ہو جائیں' میں ایک کچے گھروندے میں جلتا ہوا آس کا دیا نہیں بجھا سکتا۔"

وہ مستحکم قدموں سے اپنے گھوڑے کی طرف بڑھا۔ اسے درخت سے کھولا اور اس پر بیٹھ کر پڑاؤ کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو رہی تھیں۔ وہ بڑے بڑے معرکوں میں لڑا تھا مگر یوں اس کے دل کے رخش پر بے قراری کبھی سوار نہ ہوئی تھی۔ اس کا دم فیصلے کے بوجھ سے گھٹا جا رہا تھا' مگر فیصلہ وہ کر چکا تھا۔ وہ گھوڑے کو سست روی سے بڑھاتا رہا۔ شاید گھوڑا تھکا ہوا تھا یا وہ خود ہی اسے تیز چلانا نہیں چاہتا تھا۔ فیصلے کی طاقت اسے عقب سے دھکیل رہی تھی اور فیصلے کا انجام اسے سامنے سے روک رہا تھا۔ خنک ہوا میں ندی کے کنارے کنارے وہ آگے بڑھتا رہا۔ آخر اسے پڑاؤ اور پڑاؤ کے ساتھ بلندی پر اپنا خیمہ نظر آنے لگا۔ خیمے میں روشنی ہو رہی تھی۔ ندی کے رخ پر روزن کھلا ہوا تھا۔ وہ جانتا تھا اس روزن کی طرف آج کی رات نتاشا کے دل کے دروازے بھی اس کے لیے کھلے ہیں۔ مگر وہ ان دروازوں کو نہایت سختی سے بند کرنے جا رہا تھا۔

وہ گھوڑے کو گھما کر چٹان تک لایا۔ پھر اسے دوسرے گھوڑوں کے ساتھ باندھ کر اور نگران کو اس کے سامنے چارہ وغیرہ ڈالنے کی ہدایت کر کے وہ اپنے خیمے کی طرف بڑھا۔ خیمے کے دروازے پر معمور دونوں پہریدار نظر نہیں آ رہے تھے۔ وہ کہیں اِدھر اُدھر ہو گئے تھے یا نتاشا نے انہیں ہٹا دیا تھا اباقہ چٹان پر چڑھ کر دروازے کے سامنے پہنچا۔ پھر پردہ ہٹا کر وہ اندر داخل ہوا اور یکلخت جیسے زمین نے اس کے قدم تھام لیے۔ وہ پھٹی ہوئی ناقابل یقین نگاہوں سے اپنے سامنے دیکھ رہا تھا۔ اس کے جسم میں جیسے خون کا ایک قطرہ

تک نہیں رہا تھا اور تمام حسیات پتھر ہو گئی تھیں۔ اس کے سامنے قالین پر نتاشا خون میں لت پت پڑی تھی اس کا ہاتھ تلوار کے قبضے پر جما ہوا تھا.......... وہ دیر ہوئی مر چکی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور چہرے پر ایک ملکوتی حسن منجمد ہو گیا تھا۔

.... ہاں وہ مر چکی تھی۔ سینے میں پیوست خنجر اس کی جان لے چکا تھا۔ اس کا خون قالین میں جذب ہو کر ایک ناقابل فہم تحریر لکھ گیا تھا۔ اباقہ کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی وہ سکتے کی کیفیت سے نکلا اور تڑپ کر نتاشا کے سرہانے جا بیٹھا۔ "نتاشا!" اس نے سب کچھ جانتے ہوئے بھی اسے آواز دی۔ "نتاشا!" وہ پورے زور سے چیخا' لیکن اس کی آواز پر سراپا "جواب" بن جانے والی نتاشا آج خاموش تھی۔ اس کے نازک ہونٹ بے جنبش تھے۔ اباقہ کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ وقت کے مانے ہوئے جنگجو کے نایاب آنسو نتاشا کا خون آلود چہرا دھونے لگے۔ اس کی اشک بار آنکھیں نتاشا کے سینے پر جمی تھیں' جہاں سنہری دستے والا ایک وزنی خنجر پوری بے رحمی کے ساتھ پیوست تھا۔ اباقہ اس خنجر کو پہچانتا تھا۔ یہ خنجر ایک دفعہ اسے بھی گھائل کر چکا تھا۔ وہ اس خنجر کو ایک سے زائد بار دیکھ چکا تھا۔ یہ گگوڈا کا خنجر تھا اور گگوڈا یہ خنجر نتاشا کے سینے میں چھوڑ کر اسے ایک خوفناک دعوت دے گیا تھا۔ "گگوڈا" اباقہ کے ہونٹوں سے ایک مہلک سرگوشی' پیام اجل کی طرح نکلی۔ اس سرگوشی کو ان لوگوں نے بھی سنا جو اس کی چنگھاڑ سن کر خیمے میں داخل ہوئے تھے اور اب دہشت زدہ نگاہوں سے نتاشا کی لاش دیکھ رہے تھے۔ ان میں اسد بھی شامل تھا۔ اباقہ کی سرگوشی نے اسے سمجھا دیا کہ جس شخص کا نام گگوڈا ہے وہ اس دنیا میں نہیں رہے گا اور اگر وہ رہے گا تو اباقہ نہیں رہے گا۔ اس وقت علی بھاگتا ہوا خیمے میں داخل ہوا۔ اس نے نتاشا کی لاش دیکھی تو ایک چیخ ماری پھر بھاگ کر اسے لپٹ گیا اور بلک بلک کر رونے لگا۔ اس کی "آپا" ہمیشہ مسکرانے اور کبھی برا نہ منانے والی آپا اس دنیا سے جا چکی تھی۔ وہ تو اس کا محافظ تھا۔ ہر وقت تیر کمان لیے اس کے سر پر سوار رہتا تھا .... لیکن آج .... آج جب وہ اس تنہا خیمے میں موت اور زندگی کی جنگ لڑ رہی تھی وہ اس کے پاس کیوں نہیں تھا۔ وہ نتاشا کے سینے سے چمٹا رہا اور روتا رہا۔ اس کا رونا خیمے میں موجود ہر فرد کو رلاتا چلا گیا۔ اگر نہیں رویا تو اباقہ نہیں رویا۔ اس کی آنکھیں اب کسی صحرا کی طرح خشک تھیں۔ اس کی آنکھوں میں اب آنسو نہیں تھے۔ ایک دہشت کروٹ لے رہی تھی۔ آنکھوں کے ریگ زار سے ایک سرخ آندھی اٹھ رہی تھی۔ اس نے خیمے کے روزن سے باہر دیکھا.......... جہاں جنگلی پھول اور بہتا ہوا پانی تاریکی کی چادر میں لپٹا تھا اور اس تاریکی میں وہ قاتل بھی لپٹا ہوا تھا جس نے پھولوں اور بہتے پانی سے پیار

کرنے والی کی جان لی تھی۔ وہ تیزی سے مڑا بغیر کسی کو دیکھے باہر نکلا اور اپنے گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ پھر اس نے میان سے تلوار نکالی اور آہنی میان کو توڑ پھوڑ کر تاریکی میں پھینک دیا۔ پھر گھوڑے کو ایڑ لگائی اور ہوا کی طرح تیرگی میں گم ہو گیا۔

☆---------☆---------☆

اسد اس وقت علی کے ساتھ خیمے میں لیٹا ہوا تھا۔ جب پریشان کن آوازیں سنائی دیں۔ وہ خیمے سے نکلا اور بھاگتا ہوا اباقہ کے خیمے میں پہنچا۔ پھر وہاں اس نے جو کچھ دیکھا وہ اس کا سینہ شق کرنے کے لیے کافی تھا۔ وہ سنگی مجسمے کی مانند ساکت و جامد کھڑا رہ گیا۔ اس کے سامنے قالین پر تناشا کی لاش پڑی تھی اور اباقہ اس کا سر گود میں لیے زار و قطار رو رہا تھا .... پھر اسد نے پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اباقہ کو اٹھتے، گھومتے اور غضب کے عالم میں باہر نکلتے دیکھا تھا۔ گھوڑے پر سوار ہو کر اس نے اپنا نیام پھینک دیا تھا اور کسی شعلے کی طرح تاریکی میں لپک گیا تھا۔

اسد نے دیکھا علی اب تناشا کی لاش سے جدا ہو کر اس کی ٹانگوں سے چمٹا ہوا تھا اور چیخ چیخ کر رو رہا تھا۔ اسد نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور گود میں اٹھا لیا۔ پھر اسے دلاسہ دیتے ہوئے گلوگیر آواز میں بولا۔ "علی! تم تو ایک بہادر مرد ہو اور مرد رویا نہیں کرتے اور پھر تمہاری آپا مری تو نہیں۔ وہ شہید ہوئی ہے اور شہید زندہ ہوتے ہیں۔"

علی ہچکیاں لیتے ہوئے اسد کی باتیں سن رہا تھا۔

معصومیت سے بولا۔ "مگر بھائی جان! آپ کیوں رو رہے ہیں۔"

اسد نے چونک کر چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ اس کے رخسار آنسوؤں سے تر تھے۔ وہ منہ پھیر کر آنسو ضبط کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ تناشا کی لاش پر ایک بڑی سی چادر ڈال دی گئی تھی چادر ڈالنے سے پہلے اس کے سینے سے خنجر نکال لیا گیا تھا اور مٹھی کھول کر تلوار بھی چھڑا لی گئی تھی۔ یہ دونوں چیزیں اب اسد کے سامنے قالین پر پڑی تھیں۔ وہ بھی سنہری دستے والے اس خنجر کو اچھی طرح پہچان چکا تھا اور یہ بھی جان چکا تھا کہ اباقہ کس کی تلاش میں نکلا ہے۔

اتنے میں فوجی دستے کے کمانڈر نے ان دونوں پہریداروں کو اسد کے سامنے حاضر کر دیا جو اس قتل کے وقت خیمے کی حفاظت پر معمور تھے۔ دونوں رنجیدہ اور ہراساں نظر آتے تھے۔ اسد نے ان سے پوچھا کہ وہ حملے کے وقت کہاں تھے۔ ان میں سے ایک نے جواب دیا۔

"سالار! شام کے بعد ہمیں شہزادی صاحبہ نے ہماری ذمے داری سے فارغ کر دیا تھا۔

انہوں نے فرمایا تھا، آج رات .... تم چاہو تو اپنے خیموں میں گزار سکتے ہو۔ ان کا خیال تھا کہ اس علاقے میں خطرے کی کوئی بات نہیں۔"

اسد نے فوجی دستے میں سے بیس جنگجو سوار چنے اور ان کے ساتھ اباقہ کی اعانت کے لیے تیار ہو گیا۔ تناشا کی میت اور پڑاؤ کی حفاظت کے متعلق ضروری ہدایات دے کر وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ گھوڑوں کی طرف آگیا۔ سپاہیوں نے زینیں کس کے گھوڑے تیار کر دیے تھے۔ اسد اور اس کے بیس ساتھی گھوڑوں پر سوار ہوئے۔ ایک سپاہی نے اسد سے کہا۔ "سالار! ہمارا دل چاہتا ہے کہ ہم بھی اپنے سردار اباقہ کی طرح اپنے نیام پھینک دیں، اور تلواروں کو اس وقت تک عریاں کریں جب تک شہزادی کے قاتلوں کو کیفر کردار تک نہیں پہنچا دیتے۔"

سپاہی کی زندھی ہوئی جذباتی آواز نے پورے دستے کو جوش اور ولولے سے بھر دیا۔ انہوں نے اسد کے حکم سے پہلے ہی تلواریں نکال کر نیام تاریکی میں پھینک دیے۔ پھر جب اسد نے بھی اپنا نیام پھینکا تو سب نے مل کر ایک غضبناک جنگی نعرہ بلند کیا اور اسد کی کمان میں آندھی و طوفان کی طرح روانہ ہو گئے۔

چاند بادلوں کی اوٹ میں آنکھ مچولی کھیل رہا تھا۔ کبھی اس کی کرنیں جنگل کے نشیب و فراز کو نمایاں کر دیتیں اور کبھی گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا جاتا۔ ان کے گھوڑوں کی ٹاپیں سنسان وسعتوں میں گونج رہی تھیں۔ اسد نے انہیں تین ٹولیوں میں تقسیم کر دیا اور وہ ایک نیم دائرے کی شکل میں آگے بڑھنے لگے۔ تین اطراف چٹیل پہاڑیاں تھیں اور ایک طرف گھنا جنگل اور یہی ایک سمت تھی جو قاتل یا قاتلوں کو پناہ فراہم کر سکتی تھی۔ آخر رات کے تیسرے پہر اسد کے ایک سلگتا ہوا "الاؤ" ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گیا۔ کوئلوں اور راکھ کے ایک بڑے ڈھیر کے پاس گھوڑوں کی لید اور کسی جانور کی ہڈیاں موجود تھیں۔ ان نشانیوں سے صاف ظاہر تھا کہ رات کے پہلے حصے میں یہاں پندرہ بیس گھڑ سواروں نے قیام کیا ہے اور کھانا کھایا ہے۔ غالب امکان یہی تھا کہ یہ گگوڈا اور اس کے ساتھی ہوں گے۔ اسد نے جلد ہی ان کی سمت کا اندازہ کر لیا اور برساتی ندی کے ساتھ ساتھ ان کے تعاقب میں روانہ ہو گیا۔

پورے دو روز وہ بغیر کہیں رکے بھوکے پیاسے قاتلوں کی تلاش میں سرگرداں رہے۔ آخر تیسرے روز ان کی دیوانہ وار جدوجہد رنگ لائی اور انہوں نے گھنے جنگل میں ایک مقام پر گانے بجانے کی آوازیں سنیں۔ اسد اپنے ایک ساتھی کے ساتھ گھوڑے سے اتر کر احتیاط سے آگے بڑھا۔ کوئی پچاس گز دور گھنے درختوں میں گھری ہوئی ایک ہموار

جگہ انہیں دو خیمے دکھائی دیے۔ یہ شام کا وقت تھا۔ الاؤ پر ایک سالم جانور بھونا جا رہا تھا۔ قریباً دو درجن بدو شراب پینے اور رقص کرنے میں مصروف تھے۔ ایک شخص بربط بجا رہا تھا۔ دوسرے دف پر ساتھ دے رہے تھے۔ غلیظ لباسوں اور مکروہ صورتوں والے روسی زمین پر پاؤں تھپ تھپا کر ناچ رہے تھے۔ ان میں سب سے نمایاں گرانڈیل یگوڈا تھا۔ اس کے ہاتھ میں گوشت کا ایک بڑا پارچہ تھا اور وہ بے ڈھنگے انداز میں اس پر دانت آزما رہا تھا۔ اسد کا خون نتاشا کے انتقام میں کھولنے لگا۔ وہ کسی درندے کی طرح اس پر جھپٹ پڑنا چاہتا تھا' مگر اسے اپنے بے پناہ اشتعال کو قابو میں رکھنا تھا۔ ساتھیوں کے ساتھ حکمت عملی تیار کرنے کے لیے وہ واپس مڑا مگر ٹھٹک کر رک گیا۔ اس کے سامنے اباقہ کھڑا تھا۔ وہ درختوں سے کسی آسیب کی طرح برآمد ہوا تھا اور نہایت خاموشی سے ان کے عقب میں کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں عریاں تلوار تھی اور آنکھیں شعلہ فشاں تھیں۔ وہ گھمبیر لہجے میں بولا۔

"اسد! یگوڈا میرا شکار ہے اور میں جانتا ہوں مجھے اس سے کیسے نبٹنا ہے۔ تم اس معاملے میں داخل اندازی نہیں کرو گے۔"

اس کے لہجے نے اسد کو خاموش رہنے پر مجبور کر دیا۔ اباقہ نے کہا۔ "تم صرف تماشا دیکھو گے۔ ہاں اگر چاہو تو اپنے ساتھیوں کو بھی خاموشی سے یہاں بلا سکتے ہو۔" اسد نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ کچھ ہی دیر بعد اسد اور اس کے ساتھی نہایت خاموشی سے یگوڈا کے پڑاؤ کو گھیر چکے تھے۔ تب اباقہ تلوار سونت کر یگوڈا اور اس کے ساتھیوں کے سامنے پہنچ گیا۔ وہ سب ٹھٹک کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ اباقہ نے غرا کر کہا۔

"تم میں سے شہزادی نتاشا کا قاتل کون ہے؟"

یگوڈا اور اس کے ساتھ حیرت کے شدید جھٹکے سے سنبھلے پھر ایک ساتھ ان کے قہقہے بلند ہوئے۔ یگوڈا مستی سے بولا۔ "بہت خوب .... بہت خوب۔ تو تو بیوی کا انتقام لینے یہاں پہنچا ہے۔"

اباقہ پوری وحشت سے بولا۔ "بیوی کا انتقام لینے ہی نہیں پہنچا ہوں' ان سب مظلوموں کا حساب بھی چکانا چاہتا ہوں جو داؤدی میر کے عقوبت خانے سے باہر تیری سفاکی کا نشانہ بنے ہیں۔ یہ تیرا یوم حساب ہے یگوڈا۔ میں تجھے کتے کی موت ماروں گا اور تیرے جسم کے ٹکڑے جنگلی جانوروں کے لئے ان درختوں میں چھوڑ جاؤں گا۔ تیرا مکروہ گوشت کھانا ان کے لیے کوئی خوشگوار تجربہ تو نہیں ہو گا مگر کوئی نہ کوئی بھوکا جانور یہ غلاظت کھانے پر تیار ہو ہی جائے گا۔"

یگوڈا سناٹے کے عالم میں یہ سب کچھ سن رہا تھا۔ یہ توہین اس کی برداشت سے بہت زیادہ تھی۔ وہ اپنے آپ سے باہر ہو گیا اور اباقہ یہی چاہتا تھا۔ یگوڈا نے اپنی تلوار نکالنے کے لیے نیام کی طرف ہاتھ بڑھایا تو اباقہ بولا۔ "ٹھہرو! دیکھو میں تمہارے سامنے تنہا ہوں۔ اگر تمہیں خود پر مرد ہونے کا شبہ ہے تو اپنے ان پالتو کتوں کو بتا دو کہ یہ مقابلہ صرف ہم دونوں میں ہو گا۔"

یگوڈا کی وحشت اب انتہا کو چھو رہی تھی۔ اس نے جوش اور غضب سے چلا کر کہا۔ "مشرق سے برآمد ہونے والے بدبخت جانور! مجھے قسم ہے یسوع کی' تجھے ماروں گا نہیں تیری زندگی ہی میں تیری کھال اتاروں گا۔" پھر وہ ایک پرہیبت چنگھاڑ کے ساتھ اباقہ پر جھپٹا۔ اب اباقہ میں بھی صبر کا یارا نہ رہا تھا' وہ یگوڈا کی توقع سے کہیں زیادہ طاقت کے ساتھ اس سے ٹکرایا۔ تلواریں پوری شدت سے ٹکرائیں اور چند ہی لمحوں میں ٹوٹ گئیں۔ یگوڈا نے لپک کر اپنا وزنی کلہاڑا اٹھا لیا۔ اباقہ نے اچھل کر ایک درخت کی شاخ تھامی اور یگوڈا کے منہ پر دونوں پاؤں کی ایسی بھرپور ضرب ماری کہ وہ کلہاڑے سمیت اچھل کر کئی گز دور جا گرا۔ اس مہلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اباقہ نے جھپٹ کر ایک سپاہی کے ہاتھ سے نیزا چھین لیا۔ نیزا اور کلہاڑا دو مختلف اور متضاد ہتھیار تھے مگر وحشت کی فراوانی نے انہیں استعمال کرنے والوں کے ہاتھوں میں موزوں و مناسب بنا دیا تھا۔ ایک موت تھی جو لپک لپک کر کسی ایک کو چاٹ لینا چاہتی تھی۔ صرف ایک ....
صرف ایک غلطی اور غلطی کرنے والے کو مقابلے سے خارج اور وادی اجل سے داخل ہو جانا تھا۔ یہی وقت کا فیصلہ تھا۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ یہ غلطی کس طرف سے ہوتی ہے اور پھر یہ غلطی یگوڈا کی طرف سے ہوئی۔ غضب سے پاگل ہو کر وہ اپنا تحمل کھو بیٹھا۔ اس نے کلہاڑے کا ایک ایسا بھرپور وار کیا کہ کلہاڑے کا پھل گہرائی تک ایک درخت کے تنے میں گھس گیا۔ جس وقت یگوڈا کلہاڑا نکالنے کے لئے زور لگا رہا تھا اباقہ کا نیزا بجلی کی طرح چمکا اور قضا کا پیامبر بن کر یگوڈا کی پسلیوں میں اتر گیا۔ دوسروں کی اذیت پر قہقہے برسانے والا اپنی تکلیف پر ذبح ہوتے بکرے کی طرح چیخا۔ اس چیخ کے جواب میں اباقہ کی بھرپور ٹانگ اس کے سینے پر پڑی ادھر کلہاڑے کا دستہ اس کے ہاتھ سے چھوٹا ادھر نیزا اس کی پسلیوں سے نکلا اور وہ ڈکراتا ہوا اپنے ایک ساتھی پر ڈھیر ہو گیا۔ اس کے ساتھیوں نے اباقہ پر جھپٹنا چاہا مگر اس وقت ارد گرد کے درختوں میں ہلچل ہوئی اور اسد اپنے ساتھیوں کے ساتھ میدان میں آ گیا۔ وہ گھوڑوں پر سوار تھے اور ان کی کمانوں پر تیر چڑھے ہوئے تھے۔ یگوڈا کے ساتھی ٹھٹک کر رہ گئے۔ اس دوران اباقہ یگوڈا کو گریبان سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا ایک

تناور درخت کے نیچے لے آیا تھا۔ گیوڑا شدید زخمی ہونے کے باوجود خود کو چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا کیونکہ وہ جان چکا تھا اباقہ کیا کرنے والا ہے۔ اس کی چھٹی حس نے اسے اپنے انجام سے باخبر کر دیا تھا۔ اباقہ نے نہایت پھرتی سے ایک گھوڑے کی لگام کاٹی اور اس کا پھندا بنا کر گیوڑا کے گلے میں ڈال دیا۔ پھر اس نے اس پھندے کا دوسرا سرا درخت کی ایک موٹی شاخ کی طرف پھینکا۔ وہ گیوڑا کو پھانسی دینے جا رہا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر گیوڑا کے ساتھی بے قابو ہو گئے۔ انہوں نے اپنے سردار کو بچانے کے لیے اس کی طرف لپکنا چاہا مگر اسد اور اس کے ساتھیوں کے چلائے ہوئے تیروں نے انہیں راستے میں ڈھیر کر دیا۔ کم از کم آٹھ آدمی نشانہ بنے اور باقیوں پر اسد اپنے شاہینوں کے ساتھ بلائے ناگہانی کی طرح ٹوٹ پڑا۔ گیوڑا کے ساتھی گھڑ سواروں کی غضبناک کاٹ کا زیادہ دیر مقابلہ نہ کر سکے اور دم دبا کر گھنے درختوں میں راہ فرار اختیار کی۔ اس دوران اباقہ ایک جھٹکے سے گیوڑا کو درخت کی شاخ سے لٹکا چکا تھا۔ سینکڑوں انسانوں کو پھانسی دینے والا آج خود پھانسی پا رہا تھا .... اس کا جسم تڑپا مچلا۔ درخت کے پتوں نے جیسے اس کے انجام پر خوشی سے تالیاں بجائیں آخر ایک بار زور سے اینٹھ کر نتاشا کا قاتل اپنے انجام کو پہنچ گیا۔ اباقہ اچانک ہی بے دم سا ہو کر زمین پر بیٹھ گیا اور آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر گزرے لمحوں کا ماتم کرنے لگا۔

اسد نے گیوڑا کے زخمی ساتھیوں میں سے ایک کی گردن پر خنجر رکھ کر اسے روانی سے بولنے پر مجبور کر لیا تھا۔ اس شخص نے بتایا کہ شہزادی نتاشا کے قتل کے لئے گیوڑا تنہا گیا تھا۔ وہ ان کے پڑاؤ سے کچھ دور درختوں میں چھپے ہوئے تھے۔ ایک شخص بلند درخت پر بیٹھا پڑاؤ پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ جب شام سے کچھ پہلے اباقہ اپنے خیمے سے نکل کر ندی کی طرف سیر کو نکل گیا تو گیوڑا اس نتیجے پر پہنچا کہ شہزادی کو ختم کرنے کے لیے یہ موقع نہایت مناسب ہے۔ اتفاقاً تھوڑی دیر بعد پہریدار بھی خیمے سے ہٹ گئے۔ گیوڑا کے لیے یہ شگون بہت اچھا تھا وہ فوراً پڑاؤ کی طرف روانہ ہو گیا۔ گیوڑا نے ساتھیوں کو جو روئیداد سنائی تھی اس کے مطابق شہزادی نتاشا نے گیوڑا کی زبردست مزاحمت کی تھی۔ گیوڑا نے خیمے میں داخل ہوتے ہی اس کے ہونٹوں پر ہاتھ جما کر اسے آواز نکالنے سے روک دیا تھا۔ شہزادی نے دونوں ہاتھوں سے اس کا خنجر والا ہاتھ تھام لیا تھا۔ اسی کشمکش میں اس نے خیمے کی دیوار سے تلوار بھی اتار لی مگر اس سے پہلے کہ وہ تلوار سے کوئی فائدہ اٹھا پاتی گیوڑا نے خنجر اس کے سینے میں اتار دیا۔ وہ تیورا کر لکڑی کی اس چوکی پر گری، جس پر بیٹھی ہوئی وہ کچھ لکھ رہی تھی۔ چند ہی لمحوں میں اس نے جان دے دی۔

اسد کے سوالوں کے جواب میں زخمی سپاہی نے بتایا کہ نتاشا کو قتل کرنے کا حکم

گیوڑا کو ڈیوک کی طرف سے ملا تھا اور ڈیوک اس وقت "کوزل سک" کے قصبے میں موجود ہے۔ جہاں منگول لشکر کو اہل قصبہ کی طرف سے زبردست مزاحمت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ ڈیوک اور "کوزل سک" کا نام سنتے ہی اباقہ اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور اسد سے کہنے لگا۔ "اسد! لگتا ہے! کوزل سک میں کوئی خونریز معرکہ ہو رہا ہے۔ ہمیں فوراً وہاں پہنچنا چاہیے۔ ویسے بھی میں اب اس ڈیوک نامی شیطان کو زمین کے سینے میں دندنانے کی زیادہ مہلت نہیں دے سکتا۔"

زخمی روسیوں کو اپنے ساتھ لے کر اور باقیوں کی لاشیں گوشت خور درندوں کے لئے چھوڑ کر وہ اپنے پڑاؤ کی طرف روانہ ہو گیا۔

پڑاؤ پر ماتمی خاموشی طاری تھی۔ نتاشا کو دو روز پیشتر ہی دفن کر دیا گیا تھا۔ صنوبر کے گھنے درختوں کے درمیان مٹی کے ایک ڈھیر پر علی خاموش بیٹھا تھا۔ اباقہ اور اسد یہ جان کر افسردہ ہوئے کہ وہ نتاشا کی آخری جھلک دیکھنے سے محروم رہے ہیں اور اب وہ کبھی اس کا روشن چہرہ نہ دیکھ سکیں گے۔ علی انہیں دیکھ کر ایک بار پھر سسکنے لگا تھا۔ اباقہ نے اسے بازوؤں میں اٹھا کر دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔

"علی! تیری ایک آپا چلی گئی' لیکن میں بغداد میں تجھے ایک اور ایسی ہی آپا سے ملواؤں گا۔ وہ بھی تجھے نتاشا ہی کی طرح پیار کرے گی۔ تجھ سے یہ میرا وعدہ ہے۔"

علی نے بھولپن سے پوچھا۔ "بھائی جان کیا اس کا چہرا بھی شہزادی نتاشا جیسا ہی ہو گا۔"

نتاشا کا جاذب چہرا اباقہ کی نگاہوں میں گھوما اور اس کی نظر دھندلا سی گئی۔ وہ علی کو پچکار کر بولا۔ "نہیں علی۔ اس کا چہرا تو مختلف ہے' لیکن اس کا دل تیری شہزادی جیسا ہی ہو گا۔ وہ تجھے بہت چاہے گی۔"

نتاشا کی قبر پر فاتحہ پڑھ کے اور دعا مانگ کر اباقہ اور اسد خیمے میں آ گئے۔ نتاشا کی چاہتوں کے پھول وقت کی دھوپ میں مرجھا چکے تھے۔ کملائی ہوئی پتیاں اور اُڑے ہوئے رنگ اس شام کی کہانی سنا رہے تھے۔ جب کسی نے اس خیمے کو حجلۂ عروسی کی طرح سجا دیا تھا۔ اباقہ پچھتا رہا تھا۔ وہ کیوں گیا۔ وہ شہزادی کو تنہا چھوڑ کر کیوں گیا۔ وہ پچھتا سکتا تھا لیکن مداوا نہیں کر سکتا تھا۔

ایک سردار نے آگے بڑھ کر ایک تہہ شدہ کاغذ اباقہ کے ہاتھ میں دے دیا۔ وہ بولا۔ "سردار اباقہ! یہ کاغذ شہزادی صاحبہ کے قلمدان کے پاس سے ملا تھا .... حملے سے پہلے شاید وہ کچھ لکھ رہی تھیں۔"

سردار کاغذ تھما کر باہر چلا گیا۔ اباقہ نے کاغذ اسد کو دیا۔ وہ اس کی تہیں کھول کر پڑھنے لگا۔

"بلبل نے میرے محبوب کو دیکھا تو وہ اسے گلاب کا پھول لگا۔ وہ اس کے گرد منڈلانے لگی..........

جھرنے نے دیکھا تو اسے پہاڑ نظر آیا' وہ اس کے قدموں میں مچلنے لگا۔

اور میں نے دیکھا تو مجھے شہزادہ نظر آیا جس کے خواب میں نے نگلی نایا کے کنارے بیٹھ کر دیکھے تھے۔ میں نے اسے نظروں سے چوم لیا۔

ہاں میرا محبوب بے مثال ہے' وہ ہر دل میں دھڑکن اور ہر آنکھ میں روشنی بن کر اتر جاتا ہے.......... لیکن..........

لیکن وہ میرا ہے صرف میرا۔ اے آوارہ بادلو' اے کلی کلی منڈلانے والے بھنورو' اے دل پھینک پروانو اور اے پہاڑوں کی طلائی شہزادیو! وہ میرا ہے صرف میرا۔ اس کے دل اور اس کی روح میں میرا آشیانہ ہے اور میری جان اور میری روح میں اس کا بسیرا ہے۔

اگر تم سب اسے دیکھنا چاہتے ہو تو میری آنکھوں سے دیکھو صرف میری آنکھوں سے۔

یہ نظم سن کر اور نتاشا کے خیالات جان کر اباقہ کا ذہن فوراً سلطان جلال الدین کے اس فرمان کی طرف چلا گیا کہ "ہر کام میں خدا کی حکمت پوشیدہ ہوتی ہے۔" اباقہ سوچنے لگا موت سے پہلے قدرت نے نتاشا کو ایک کتنے بڑے دکھ سے بچا لیا تھا۔ کتنا عظیم صدمہ تھا جسے وہ جل دے کر سفر آخرت پر روانہ ہو گئی تھی۔ اگر اسے وہ سب کچھ معلوم ہو جاتا جو اباقہ اسے بتانے کا ارادہ رکھتا تھا اور جو بتانے کے لیے وہ اس کی طرف آ بھی رہا تھا۔ تو اس کا کیا حال ہوتا.......... وہ اطمینان' سکون اور محبت جو وہ اپنے ساتھ لے گئی تھی' سب کچھ اباقہ کے چند بولوں سے فنا ہو جاتا۔ وہ زندہ درگور ہو جاتی۔

اباقہ کو پہلی بار اندازہ ہوا کہ دل میں ایک ہی وقت میں غم اور خوشی کیسے جمع ہوتے ہیں۔ اس کے دل میں نتاشا کی موت کے شدید غم کے ساتھ' نتاشا کی بے خبری کی خوشی شامل ہو گئی تھی۔ وہ ایک نہایت خوبصورت اور دلنواز بے خبری کے ساتھ اس دنیا سے رخصت ہو گئی تھی۔ اپنے دل میں اباقہ کی محبت سمیٹے ہوئے اور اس کی وفاؤں پر نازاں.......... اور اب اباقہ کو اس کی وفاؤں کا بھرم رکھتے ہوئے اس کے اصل قاتل ڈیوک کو انجام تک پہنچانا تھا۔

☆--------☆--------☆

شیزی چپ اور افسردہ بیٹھی تھی جب ایک افسر نے آکر اطلاع دی کہ رئیس ویزلی نے اسے طلب کیا ہے۔ شیزی کا دل شدت سے دھڑکنے لگا۔ یہ ایک سنہری موقعہ تھا۔ وہ یوحق کے لئے معلومات حاصل کر سکتی تھی۔ اس افسر نے شیزی کو ساتھ لیا اور نہایت خاموشی کے ساتھ گرجے کے مشرقی جانب ایک تکونی عمارت میں آ گیا۔ یہ عمارت رئیس کا مسکن تھی۔

چند راہداریوں سے گزر کر شیزی ایک بڑے دروازے کے سامنے پہنچی۔ اس بلند و بالا دروازے پر بیش قیمت پردے جھول رہے تھے۔ اسے ہمراہ لانے والا واپس لوٹ گیا۔ شیزی کچھ دیر سوچتی رہی پھر پردہ اٹھا کر اندر چلی گئی اور ننھا رئیس ایک مسہری پر گاؤ تکیہ لگائے بیٹھا تھا۔ خوبصورت کنیزیں اسے گھیرے ہوئے تھیں۔ وہ کسی کنیز کے چٹکلے پر دل کھول کر ہنس رہا تھا۔ شیزی کو دیکھتے ہی ہنسی رک گئی۔ اس نے گہری نظروں سے اسے دیکھا پھر کنیزوں کو تخلیے کا حکم دیا۔ کنیزیں الٹے پاؤں چلتی کمرے سے رخصت ہو گئیں۔ اب رئیس اور شیزی کمرے میں تنہا تھے۔ رئیس نے کہا۔

"اے عورت! ہمارے قریب آ جاؤ۔"

شیزی اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ رئیس نے کہا۔ "ہمارے پاس بیٹھ جاؤ۔" شیزی کچھ جھجکتی ہوئی مسہری کی پائنتی بیٹھ گئی۔ سات آٹھ سالہ رئیس نے ہاتھ بڑھا کر شیزی کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ پھر اس کا ہاتھ سہلاتا ہوا بولا۔

"تمہارے ہاتھ بڑے خوبصورت ہیں۔"

شیزی جواب میں صرف شکریہ ہی کہہ سکی ننھے رئیس نے تیز نظروں سے ادھر ادھر دیکھا جیسے اسے شبہ ہو کہ کہیں سے کوئی اسے دیکھ رہا ہو گا۔ پھر وہ شاہی تمکنت سے اٹھا اور دریچوں کے پردے برابر کرنے لگا۔ اس نے دروازے کو بھی اندر سے بند کر دیا۔ پھر شیزی کے سامنے پہنچ کر اسے عجیب نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ شیزی اس کی طرف دیکھ کر نرمی سے مسکرا رہی تھی۔ ننھے رئیس نے بارعب آواز میں کہا۔

"تم جانتی ہو' ہم یہاں کے رئیس ہیں؟"

شیزی بولی۔ "ہاں حضور! ہمیں کیوں معلوم نہ ہو گا"

رئیس نے کہا۔ "جو ہم کہیں گے کرو گی؟"

شیزی خوشدلی سے بولی۔ "کیوں نہیں حضور؟"

اچانک رئیس کی آنکھوں میں پیاری سی معصومیت نظر آنے لگی۔ وہ مصنوعی شان

وشوکت جو اس نے خود پر طاری کر رکھی تھی یکایک ہی نہ جانے کہاں کھو گئی تھی۔ وہ بڑے خوبصورت انداز میں جھجکتا ہوا بولا۔ "ہمیں اپنی گود میں اٹھالو۔"

شیزی نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا......... پھر بانہیں بڑھا کر اسے گود میں اٹھا لیا۔ رئیس اس کی گود کی نرمی اور حرارت کو محسوس کرتا ہوا بولا۔ "تمہاری شکل ہماری ماں سے ملتی جلتی ہے اس کے ہاتھ بھی بالکل تمہارے جیسے تھے۔ وہ ایسے ہی ہمیں گود میں اٹھا کر سمندر پار کی کہانیاں سنایا کرتی تھی۔"

"شیزی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "کیا میں بھی آپ کو کہانی سناؤں؟"

"ہاں......... نہیں۔" اچانک ننھا رئیس گڑبڑا گیا۔ پھر وہ اس کی گود سے نکلتا ہوا بولا۔ "وہ بوڑھا کونسل ابھی کہیں سے کھانستا ہوا آجائے گا اور تمہاری کہانی ادھوری رہ جائے گی۔"

شیزی نے پوچھا۔ "کون بوڑھا کونسل۔"

رئیس ناک چڑھا کر بولا۔ "وہی نائب رئیس ہر وقت ہم پر نگاہ رکھتا ہے جیسے ہم چھوٹے سے بچے ہیں۔"

شیزی کو سمجھ نہیں آ رہی تھی رئیس کی ہاں میں ہاں ملائے یا خاموش رہے۔ ننھا رئیس گاؤ تکیے سے ٹیک لگاتا ہوا بولا۔

"وہ منگول تمہارا کیا لگتا ہے؟"

شیزی نے اسے مختصراً یورق کے بارے میں بتایا اور کہا کہ وہ شخص ہم سب کے لیے نہایت مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ رئیس الجھی ہوئی نظروں سے شیزی کو دیکھ رہا تھا۔ کچھ سوچ کر بولا۔

"ہمیں صرف ایک بات بتاؤ۔ اسے چھوڑنے سے کوئی ایسا نقصان تو نہیں ہو گا کہ ہمیں بوڑھے کونسل کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے۔"

شیزی نے عاجزی سے کہا۔ "رئیس! آپ مجھ پر اعتماد کر رہے ہیں تو پورا اعتماد کیجئے۔ میں حلفاً کہتی ہوں کہ اس کی جان بخشی منگولوں کی بدبختی ثابت ہوگی۔"

رئیس نے کہا۔ "ہم ایک شرط پر اسے چھوڑ سکتے ہیں۔"

شیزی نے کہا۔ "حکم کیجئے حضور۔"

رئیس نے کہا۔ "تم وقتاً فوقتاً ہمیں اسی طرح ملتی رہا کرو گی۔"

شیزی نے کہا۔ "آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔"

ننھا رئیس خوش ہوتا ہوا بولا۔ "تو ٹھیک ہے۔ ہم تمہیں ایسی ترکیب بتاتے ہیں کہ

تم اپنے ساتھی کو میرے سرداروں کے سامنے بے گناہ ثابت کر سکو گی۔" یہ کہتے ہوئے رئیس اٹھا اور ایک الماری سے سونے کی ایک مہر نکال لایا کہنے لگا۔ "رئیس اعظم یوری مرحوم یہ مہر اپنے خاص دوستوں اور ساتھیوں کو دیا کرتا تھا۔ ایسی ہی ایک مہر ہمارے والد صاحب کے پاس بھی تھی۔ یہ مہر ہم آج اس جگہ پھینکوا دیں گے جہاں سے ہمارے آدمی تمہیں اور تمہارے ساتھی کو اٹھا کر لائے تھے۔ تم اپنے ساتھی کو سمجھا دو' جب ہمارے پاس اس کی پیشی ہو تو وہ کہے کہ اس کے پاس رئیس اعظم کی دی ہوئی ایک مہر تھی جو اس کے لباس میں سے کہیں گر گئی ہے۔"

شیزی نو عمر رئیس کی بات سمجھ رہی تھی۔ اس نے کہا۔ "حضور! میں ویسا ہی کروں گی جیسا آپ کہیں گے۔"

اگلے روز جب گرجے کے وسیع صحن میں مجرموں کی پیشیاں شروع ہوئیں تو جلد ہی یورق کی باری بھی آ گئی۔ حسب معمول رئیس اور نائب رئیس اونچی کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ بیگمات مصاحبین کے ساتھ عقب میں ہاتھ باندھے کھڑی تھیں۔ ان میں شیزی بھی موجود تھی۔ وہ یورق کو کال کوٹھڑی میں ملی تھی اور سب کچھ سمجھا چکی تھی۔ یورق نے وہی کہا جو اسے بتایا گیا تھا۔ اس کی بات سنی تو نائب کونسل بگڑ کر بولا۔

"یہ ناپاک منگول جھوٹ بول رہا ہے۔ اپنی گردن بچانے کے لیے کہانی گھڑ رہا ہے۔ لے جاؤ اسے اور ہتھوڑے سے اس کی ہڈیاں توڑ کر اسے موت کے گھاٹ اتار دو۔"

ننھے رئیس نے سنجیدگی سے کہا۔ "نائب رئیس! ملزم کے بیان کی تصدیق کر لینے میں کیا حرج ہے۔ ممکن ہے یہ جس مہر کا ذکر کر رہا ہے وہ اس جگہ گر گئی ہو جہاں سے اسے گرفتار کر کے گھوڑے پر ڈالا گیا تھا۔"

نائب رئیس کے چہرے پر ناگواری کے آثار ابھرے لیکن اس کے بولنے سے پیشتر ہی ننھے رئیس نے ایک دستہ سالار کو حکم دیا کہ وہ اس مقام پر اور اچھی طرح سے مہر تلاش کرے تاکہ ملزم کے بیان کی صحت جانچی جا سکے۔

رئیس کے اس حکم پر محافظ' یورق کو دھکیلتے ہوئے پیچھے لے گئے نیا مقدمہ پیش کر دیا گیا۔

اس روز سہ پہر کے وقت یورق کو رہا کر دیا گیا۔ جھاڑیوں میں پڑی ہوئی سونے کی وہ مہر مل گئی تھی اور اب یورق کو قید رکھنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ وہ روسیوں کا وفادار ثابت ہو چکا تھا۔ شیزی اور یورق اس وقت قیمتی لباس پہنے ننھے رئیس اور بوڑھے نائب رئیس کے سامنے موجود تھے۔ یہ رات کے کھانے کا وقت تھا۔ کچھ اور سردار بھی دستر خوان پر

موجود تھے۔ بوڑھا نائب رئیس جو قصبے کے رئیس مرحوم کا ایک دیرینہ ساتھی تھا' بڑی تفصیل اور وضاحت سے رئیس کی بہادری کے قصے سنا رہا تھا۔ درحقیقت وہ بالواسطہ ننھے رئیس کی تربیت کی کوشش بھی کر رہا تھا۔ اس کی باتوں سے پتہ چلا کہ یہاں کا رئیس چند ماہ پہلے ایک فوجی دستے کے ساتھ ولادی میر کی دفاعی جنگ میں شرکت کے لیے گیا تھا' لیکن میدان جنگ میں کام آیا۔ اس کی بیوی دو سال پہلے ہی فوت ہو چکی تھی' لہٰذا یہاں کے دستور کے مطابق ان کے نو عمر بچے کو اقتدار سنبھالنا پڑا (اس کم عمر رئیس کا ذکر تاریخ کی کتابوں میں کثرت سے ملتا ہے) ابھی یہ گفتگو جاری تھی کہ ایک خادم نے طعام گاہ میں پہنچ کر ایک نامہ رئیس کے حوالے کیا۔ یہ نامہ ایک تیز رفتار قاصد کے ذریعے پہنچا تھا۔ رئیس نے یہ نامہ نائب رئیس کے حوالے کر دیا۔ نائب رئیس نے ماہرانہ نظروں سے تحریر کا جائزہ لیا اور پھر اسے با آواز بلند پڑھنے کے لیے ایک مشیر کے سپرد کر دیا۔ مشیر نے پڑھنا شروع کیا۔

"محترم رئیس دیزلی' مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کا قصبہ منگول وحشیوں کے راستے میں چٹان کی طرح ڈٹا ہوا ہے اور آپ نے کئی دنوں سے ان کی پیش قدمی روک رکھی ہے' آپ کی ہمت قابل صد تحسین ہے۔ میں نووگرود سے جانبازوں کے ایک دستے کے ساتھ آپ کی مدد کے لیے آ رہا ہوں......... ہماری تعداد تھوڑی ہے مگر حوصلے زیادہ ہیں۔ بہت جلد ہم اپنے سر ہتھیلیوں پر لیے آپ کے ساتھ شامل ہو جائیں گے۔ میرے دل کی گواہی ہے کہ ہم یہاں منگولوں کو ایسا سبق سکھائیں گے کہ ان کا لشکر واپسی کا راستہ بھول جائے گا"......... اباقہ۔

اباقہ کا نام سن کر یوری اور شیزی اچھل پڑے' لیکن فی الحال انہوں نے خاموش رہنا مناسب سمجھا۔ اباقہ کے نام نے نائب اور دوسرے سرداروں پر بھی خاطر خواہ اثر کیا تھا۔ ان کے چہروں پر دبا دبا جوش نظر آنے لگا تھا۔ نائب رئیس نے جذباتی لہجے میں کہا۔ "میں اسے تائید غیبی ہی کہہ سکتا ہوں۔ یہ اباقہ نام کا شخص منگولوں پر دہشت بن کر چھا چکا ہے۔ اگر یہ اس قصبے تک پہنچ گیا تو ہماری "مزاحمت" میں نئی روح پھونکی جائے گی۔"

ننھا رئیس بھی نہایت دلچسپی سے اباقہ کی باتیں سن رہا تھا۔ جلدی اباقہ کی آمد کی اطلاع چیدہ چیدہ افراد میں پھیل گئی۔ پھر اس سے پہلے کہ نائب رئیس اس خبر کو پوشیدہ رکھنے کا حکم جاری کرتا جنگل کی آگ کی طرح یہ خبر خاص و عام میں پھیلتی چلی گئی۔ مسلسل جنگ اور رسد کی کمی نے اہل قصبہ کی حالت پتلی کر رکھی تھی۔ بے شک وہ بڑی جرأت سے لڑ رہے تھے مگر آہستہ آہستہ ان کی مزاحمت کمزور پڑتی جا رہی تھی۔ اب یہ اندیشہ پیدا

ہو چلا تھا کہ کسی روز منگول زوردار حملہ بولیں گے اور انہیں روندتے ہوئے گزر جائیں گے .... مگر اباقہ کی آمد کا سن کر مرجھائے ہوئے چہروں پر تازہ حوصلوں کی چمک نظر آنے لگی۔ عورتیں' مرد' بچے' بوڑھے سب اس نام کی تکرار کر رہے تھے۔ جنہیں اباقہ کے بارے پہلے سے کچھ معلوم تھا وہ دوسروں کو بتا رہے تھے اور جو یہ نام پہلی دفعہ سن رہے تھے۔ ان کا تجسس اور بھی بڑھ گیا تھا۔ ایک عورت ایک چوراہے میں کھڑی چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی۔ "یسوع نے ہماری دعائیں سن لی ہیں۔ اس کی مدد ایسے جری اور بہادر نوجوان کی صورت ہماری طرف آ رہی ہے جو دشمنوں کے لیے اجل کا دوسرا نام ہے۔ وہ بلائے آسمانی کی طرح منگولوں پر ٹوٹتا ہے اور برق آسمانی کی طرح انہیں خاکستر کر دیتا ہے۔ اس کی شجاعت اور بے جگری کی داستانیں ماسکو' ولادی میر اور نووگرود کے در و دیوار پر رقم ہیں۔ اگر منگول آگ ہیں تو وہ پانی ہے' اگر وہ تاروں کی طرح بے شمار ہیں تو وہ سورج کی طرح یکتا ہے' اگر وہ موجوں کی طرح بے قرار ہیں تو وہ سنگلاخ کناروں کی طرح مستحکم ہے' اگر وہ بادلوں کی طرح گھمبیر ہیں تو وہ سرکش ہواؤں کی طرح منہ زور ہے اور تم دیکھنا وہ منگولوں کو ایسے ہی تتر بتر کرے گا جیسے مشرق سے چلنے والی ہوا کالی گھٹاؤں کے سینے شق کر دیتی ہے۔"

ایک بوڑھا چلا کر بولا۔ "ہاں سورج نکلے گا۔ آزادی کا سورج طلوع ہو گا۔ ہم منگول وحشیوں کو اپنی سرزمین سے مار بھگائیں گے۔"

جنگ کے مارے ہوئے' بھوکے اور افلاس زدہ لوگ پرجوش نعرے لگانے لگے۔ ایک روسی نوجوان ایک بلند چبوترے پر چڑھ گیا اور تقریر کرنے والے لہجے میں بولا۔

"بھائیو! ہمیں ابھی ابھی اطلاع ملی ہے کہ وہ بہادر اور غیور نوجوان جس کا نام اباقہ ہے اپنے ڈھائی سو سرفروشوں کے ساتھ قصبے سے صرف آٹھ کوس کی دوری پر پہنچ چکا ہے۔ سورج ڈھلنے سے پہلے پہلے وہ آفتاب بلند اقبال ہمارے قصبے کے افق پر طلوع ہونے والا ہے۔ آیئے ہم سب مل کر اس کا استقبال کریں۔"

نوجوان کی اطلاع نے سامعین کے جوش و خروش میں اضافہ کر دیا۔ بچے' بوڑھے اور جوان ہتھیار لہرا لہرا کر خوشی کا اظہار کرنے لگے۔ کچھ ہی دیر بعد قصبے کی شمالی جانب ایک وسیع میدان میں سینکڑوں افراد اکٹھے ہو چکے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں کپڑے کی رنگ برنگی دھجیاں اور پھول تھے۔ ان کی نگاہیں دور ایک ٹیلے پر جمی ہوئی تھیں۔ اباقہ اور اس کے ساتھی اسی ٹیلے کے عقب سے برآمد ہونے والے تھے۔ انہیں محفوظ راستے سے قصبے تک لانے کے لیے روسی دستہ صبح سویرے روانہ ہو چکا تھا۔ غروب آفتاب تک کوزل سک

کے باشندوں کا جوش و خروش انتہا تک پہنچ چکا تھا۔ وہ نہایت بے چینی سے اپنے مہمان کے منتظر تھے .... اور پھر انہیں ٹیلے کے عقب سے اباقہ اور اس کے ساتھی نمودار ہوتے دکھائی دیے۔ ڈوبتے سورج کی روشنی میں ان کے علم ہوا میں پھڑپھڑا رہے تھے۔ وہ درمیانی رفتار سے قصبے کی طرف بڑھے چلے آرہے تھے۔ آخر وہ لوگوں کے درمیان پہنچ گئے۔ نعرہ ہائے تحسین بلند کیے گئے۔ گل پاشی ہوئی اور لوگ اباقہ اور اس کے ساتھیوں کو دیکھنے کے لیے ٹوٹ پڑے۔ اس افراتفری میں بہت سے ایسے سپاہی بھی اپنے مورچوں سے ہٹ گئے جن کا اپنی جگہوں پر رہنا نہایت ضروری تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ منگولوں کو ایک زوردار حملہ کرنے کا موقع مل گیا۔

کوزل سک کا قصبہ درحقیقت ایک نہایت اہم اور عسکری اہمیت کے مقام پر واقع تھا۔ جنوب کی طرف بحر اسود کی جانب سفر کرنے والوں کو اس درّے سے ہو کر گزرنا پڑتا ہے۔

اہل قصبہ کی پُرجوش مزاحمت نے کئی ہفتوں سے منگول لشکر پر اس گزرگاہ کو بند کر رکھا تھا .... آج جب انہوں نے مزاحم فوج کو غافل دیکھا تو ہتھیار تول کر ٹوٹ پڑے۔

اس وقت اباقہ استقبال کرنے والوں کے ہجوم میں تھا جب اس نے ایک جانب سے چیخ و پکار کی آوازیں سنیں اور منگولوں کو مار دھاڑ کرتے اپنی طرف بڑھتے دیکھا۔ اس نے چلا کر اپنے ساتھیوں کو ہوشیار کیا۔ اس دوران استقبال کی مصروفیت میں گم اہل قصبہ بھی چوکنے ہو چکے تھے۔ اباقہ کی دل ہلا دینے والی للکار فضا میں گونجی۔ اسد اور اس کے ساتھیوں نے یک زبان ہو کر نعرہ بلند کیا اور گھوڑوں کو ایڑ لگا کر حملہ آور دستوں کی طرف بڑھے۔ پلک جھپکتے میں میدان کارزار گرم ہو گیا ....

ایک خونریز جھڑپ کے بعد منگول دستے پھر اپنے مورچوں تک پسپا ہو گئے۔ ان کے کم از کم سو سپاہی اس معرکے میں کام آئے جبکہ اہل قصبہ کا نقصان ایک چوتھائی سے بھی کم تھا۔ اباقہ کے دستے کے صرف دو سپاہی ہلاک ہوئے۔

☆ ------- ☆ ------- ☆

تاشا کی موت کے بعد سے اباقہ نے باقاعدگی سے نماز شروع کر دی تھی۔ علی اباقہ اور اسد نے عشاء کی نماز اکٹھے پڑھی۔ پھر تینوں اپنی اپنی مسہریوں پر گر گئے۔ سفر کی تھکان انہیں فوراً ہی گہری نیند کی آغوش میں لے گئی۔ یہ قصبے کا پرانا گرجا تھا جس کے ایک حصے میں رئیس کی رہائش تھی۔ اسی رہائش گاہ میں اباقہ اور اسد مہمانان خصوصی کے طور پر مقیم تھے۔ دفعتاً دروازہ کھلا اور ایک مسلح شخص آہنی خود پہنے اندر داخل ہوا۔ وہ دبے

قدموں آگے بڑھا اور نہایت خاموشی سے اباقہ اور اسد کے ہتھیاروں پر قبضہ کر لیا۔ یہ ہتھیار اس نے ایک مسہری کے نیچے چھپائے اور پھر لپک کر اباقہ کا گلا تھام لیا۔ اس کے دونوں ہاتھ مضبوطی سے اس کی گردن پر جمے ہوئے تھے۔ اباقہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور حملہ آور کی مزاحمت کرنے لگا۔ اس اثنا میں اسد اور علی بھی اٹھ گئے۔ اسد جب چھلانگ لگا کر مسہری سے اترا تو اس نے حملہ آور کو اباقہ کا طوفانی مکہ کھا کر ایک چوبی صندوق پر گرتے دیکھا۔ اسد نے اپنی تلوار کی طرف دیکھا لیکن وہ وہاں موجود نہیں تھی۔ وہ خالی ہاتھ ہی حملہ آور پر ٹوٹ پڑا' لیکن حملہ آور بھی کوئی معمولی شخص نہیں تھا۔ اس نے زمین پر لیٹے لیٹے اسد کو ٹانگوں پر اچھال دیا۔ پلک جھپکتے ہی کمرے کے اندر گھمسان کا رن پڑ گیا۔ اباقہ اور اسد حملہ آور کو روئی کی طرح دھنک رہے تھے۔ دوسری طرف حملہ آور بھی برابر کا جواب دے رہا تھا۔ علی ان تینوں کے درمیان پھدکتا پھرتا تھا' کبھی ایک مسہری پر چڑھتا تھا' کبھی دوسری پر۔ دفعتاً اباقہ کا ایک گھونسہ ایسا پڑا کہ حملہ آور کا آہنی خود اچھل کر دور جا پڑا۔ ان تینوں کے منہ حیرت سے کھلے رہ گئے۔ ان کے سامنے سردار یورق کھڑا تھا۔ اچانک سردار کے حلق سے ایک فلک شگاف قہقہہ بلند ہوا اور در و دیوار کو لرزا گیا۔ تب اباقہ نے ادھ کھلی کھڑکی سے ایک پہریدار کو دیکھا جو اندر کی صورت حال پر مسکرا رہا تھا۔

"سردار یورق تم؟" اباقہ کے ہونٹوں سے تحیر خیز آواز نکلی پھر وہ بھاگ کر سردار سے لپٹ گیا۔ دوسری طرف اسد کا بھی یہی حال تھا۔ اس کی آنکھوں میں مسرت کے آنسو تھے۔ اباقہ سے بغلگیر ہونے کے بعد سردار نے اسد کو سینے لگایا' پھر علی کو اٹھا کر پیار کرنے لگا۔ اس نے بتایا کہ اسے ان کی آمد کا شام ہی پتہ چل گیا تھا مگر وہ جان بوجھ کر سامنے نہیں آیا۔ تینوں وہیں مسہریوں پر بیٹھ گئے۔ اباقہ نے چھوٹتے ہی پوچھا۔ "شیزی کہاں ہے؟"

یورق قہقہہ لگا کر بولا۔ "بڑے مزے میں ہے۔" پھر آواز دھیمی کرکے کہنے لگا۔ "اس نے یہاں کے رئیس کو گود لے لیا ہے اور اب وہ اس کی ہر بات مانتا ہے۔"

"گود لے لیا ہے؟" اسد حیرانی سے بولا۔

سردار یورق نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "شاید تمہیں ابھی معلوم نہیں۔ یہاں کا رئیس سات آٹھ سال کا ایک بچہ ہے۔ وہ شیزی سے بڑی محبت کرتا ہے۔ اس وقت بھی شیزی شاید اسی کے کمرے میں ہوگی۔ محترم رئیس اس کی گود میں بیٹھے کوئی کہانی سن رہے ہوں گے اور وہ بڈھا کونسل خواہ مخواہ پیچ و تاب کھا رہا ہوگا۔"

اس نے پوچھا۔ "یہ کونسل کون ہے؟"

یورق نے بتایا۔ "وہی نائب رئیس' جس کے ساتھ تم نے رات کا کھانا کھایا ہے۔ کم

بخت بڑا وہمی ہے۔ ہر وقت رئیس کی نگرانی کرتا ہے۔" اچانک یورق کو کچھ یاد آیا وہ اباقہ سے بولا۔ "او جنگلی! تیری بیوی کہاں ہے۔ ابھی تو نے شب زفاف منائی کہ نہیں؟"

یورق کے اس سوال نے ان تینوں کے چہروں کو غم و اندوہ میں ڈبو دیا۔ یورق نے تاثرات کی اس تبدیلی کو محسوس کیا اور اس کی آنکھوں میں بھی تشویش لہرانے لگی۔ "کیا ہوا؟" اس نے حیرانی سے پوچھا۔

اسد نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ "سردار یورق .... شہزادی نتاشا اب ہم میں نہیں۔ کوئی دس روز پہلے وہ ڈیوک کے ہاتھوں ماری گئی۔" یورق پر یہ خبر بجلی بن کر گری۔ وہ کتنی دیر گم صم بیٹھا رہا۔ وہ تینوں بھی خاموش تھے۔ قہقہے بکھیرتی فضا اچانک ہی سوگوار ہو گئی تھی۔ کافی دیر بعد یورق نے نگاہیں اٹھائیں تو اس کی آنکھیں خون کی طرح سرخ تھیں۔ وہ قہرناک آواز میں بولا۔ "ہم تینوں کے لیے ایک خوشخبری ہے۔"

"کیا؟" اسد اللہ نے پوچھا۔

یورق نے کہا۔ "نتاشا کا قاتل ہم سے زیادہ دور نہیں وہ قصبے کا گھیراؤ کرنے والے منگول لشکر میں موجود ہے۔"

اباقہ نے کہا۔ "تمہیں کیسے معلوم؟"

یورق نے کہا۔ "ابھی بتاتا ہوں۔" پھر اس نے ایک پہریدار کے پاس جا کر کچھ کہا۔ پہریدار واپس چلا گیا اور تھوڑی ہی دیر بعد ایک شخص کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ یہ مداری ارغون تھا۔ یورق نے رئیس سے اس کی بھی جان بخشی کروالی تھی اور اسے اپنا خادم رکھ لیا تھا۔ اب "مالک" نوکر بن کر یورق کے دھپ کھا رہا تھا۔ یورق اسے پوری طرح ذلیل کرنے پر تلا ہوا تھا۔ ارغون گھبرایا گھبرایا سا اندر داخل ہوا تو یورق نے ایک ایسا ہاتھ اس کے کندھے پر مارا کہ وہ لڑکھڑاتا ہوا اباقہ کے پاؤں میں جا گرا۔ یورق نے اسے اٹھنے کا حکم دیا۔ وہ فوراً تیر کی طرح سیدھا کھڑا ہو گیا۔ یورق نے کمرے کا دروازہ بند کیا اور ارغون سے مخاطب ہو کر کہا۔ "مداری کے بچے! تو نے بتایا تھا کہ ڈیوک منگول لشکر میں موجود ہے۔ تو نے اسے کہاں دیکھا تھا۔"

ارغون نے لرزاں آواز میں کہا۔ "آقا! میں نے اسے بڑے عذاب کی حالت میں دیکھا تھا۔ میں منگول پڑاؤ میں پہنچنے کے بعد سالار اعظم کے مشیر خاص سودائی بہادر کے خیمے میں حاضری دینے گیا تھا۔ وہاں میں نے ڈیوک کو دیکھا خیمے کے ایک گوشے میں ڈیوک مادر زاد برہنہ پڑا تھا اور چند خادم اسے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس کے سارے جسم پر بڑے بڑے نیل تھے اور کئی جگہ سے خون رس رہا تھا۔ قریب ہی اذیت

رسانی کے آلات پڑے تھے۔"

یورق نے کہا۔ "کیا تو نے سودائی بہادر سے اس کے بارے کوئی بات کی۔"

ارغون بولا۔ "آقا! میری اتنی مجال کہاں .... میں تو بس اپنی آمد کی اطلاع دے کر واپس چلا آیا تھا .... میرا خیال ہے ڈیوک کو کسی نافرمانی کی سزا ملی ہے۔"

ارغون بات پوری کر چکا تو یورق نے اس کی پیٹھ پر ایک لات رسید کی اور بولا۔ "چل دفع ہو جا۔" ارغون بھیگی بلی کی طرح دم دبا کر باہر نکل گیا۔ یورق نے اسے واقعی شیر سے بھیگی بلی بنا دیا تھا۔ ارغون کے جانے کے بعد انہوں نے ڈیوک کے بارے گفتگو کا آغاز کیا۔ کافی سوچ بچار کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ منگول پڑاؤ میں داخل ہوئے بغیر ڈیوک سے ملاقات ممکن نہیں۔ سردار یورق نے کہا۔ "ابھی جو شخص یہاں موجود تھا یہ منگولوں کا ماہر فن تماشہ گر ہے۔ بہروپ بھرنے میں اسے خاص ملکہ حاصل ہے۔ کیوں نہ ایسا کیا جائے کہ ہم بھیس بدل کر منگول پڑاؤ میں داخل ہوں۔" یورق کی تجویز قابل غور تھی۔ سوچ بچار کے بعد انہوں نے فیصلہ کیا کہ ارغون کے فن کا کمال دیکھا جائے۔ اگر وہ انہیں قبل بخش روپ دینے میں کامیاب ہو گیا تو کل ہی منگول پڑاؤ میں گھس کر ڈیوک سے حساب کتاب برابر کر لیا جائے۔

اگلے روز یورق نے ارغون سے بات کی اور اس کی ہدایت کے مطابق اسے کچھ ضروری چیزیں' انسانی بال' گندم کا آٹا' قلمی شورہ اور ایسی ہی دوسری اشیاء لا دیں۔ ارغون نے یورق اور اباقہ کو اپنے سامنے بٹھا لیا اور ان کے چہروں پر دست کاری شروع کر دی۔ کوئی دو گھڑی بعد انہوں نے اپنے چہرے دیکھے تو حیران رہ گئے۔ وہ ہو بہو چینی طبیب نظر آ رہے تھے۔ جھریوں والے چہرے' چھوٹی چھوٹی سفید داڑھیاں اور مندھی ہوئی آنکھیں۔ لمبے سفید چغے پہن کر وہ سرتاپا طبیب نظر آنے لگے۔ اسد نے انہیں تنقیدی نگاہوں سے دیکھا اور پھر تعریفی نظروں سے ارغون کو دیکھنے لگا۔ ان کا بہروپ مکمل تھا۔ اپنے لبادوں کے نیچے انہوں نے آب دار تلواریں میانوں میں رکھیں اور روانگی کے لیے تیار ہو گئے۔ اس دوران شیزی کولت رئیس سے اجازت حاصل کر چکی تھی۔ اب ان دونوں کے لیے قصبے سے نکلنے میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔

جونہی شام کے سائے شب کی تاریکی میں تحلیل ہونے لگے اباقہ اور یورق نے گھوڑے سنبھالے اور پہلے سے منتخب راستے پر چل دیے۔ قصبے کے مضافات میں ایک جگہ انہوں نے گھوڑے چھوڑے اور دشوار گزار گھاٹیوں کو عبور کر کے منگول پڑاؤ کی طرف بڑھنے لگے۔ کوئی نصف کوس کی پر خطر مسافت کے بعد وہ منگول پڑاؤ کے اندر تھے۔

دونوں عمر رسیدہ افراد کے انداز میں جھکے جھکے چل رہے تھے۔ پڑاؤ میں اس وقت چہل پہل آہستہ آہستہ کم ہو رہی تھی۔ منگول سپاہیوں کی ٹولیاں رات کا کھانا کھا کر دہکتے انگاروں کے گرد بیٹھی تھیں۔ سردی زیادہ نہیں تھی' لیکن آگ کے گرد بیٹھنا منگولوں کی عادت بن چکا تھا۔ وہ بے تحاشہ شراب پی رہے تھے اور شمال جنوب کی گپیں ہانکنے میں مصروف تھے۔ کہیں کہیں سفری ناچ گھر قائم تھے اور ان کے اندر سے گانے بجانے کی صدائیں آ رہی تھیں۔ ان ناچ گھروں میں رقص کرنے والی عورتیں مظلومیت کی منہ بولتی تصویریں تھیں۔ شرفا کی یہ بہو بیٹیاں نہ جانے کس کس شہر اور قصبے سے اٹھائی گئی تھیں۔ آج ان کی کوئی پہچان نہیں تھی۔ وہ صرف داشتائیں تھیں مشرق کے بعد اب مغرب بھی ذلت کے گڑھے میں تھا۔ صحرائے گوبی کے وحشیوں کے مقابلے میں ناعاقبت اندیش اور تفرقہ پسند قوموں کا یہ انجام عبرتناک تھا۔

یورق اور اباقہ مسلح پہریداروں اور چوکنے مخبروں سے کنی کتراتے اور دامن بچاتے دھیرے دھیرے سوبدائی بہادر کے ٹھکانے کی طرف جا نکلے۔ جلد ہی انہیں موٹے چمڑے اور لوہے کی تاروں کا بنا ہوا وہ خیمہ نظر آ گیا جو سوبدائی بہادر کے خیمے کے ساتھ ہی نصب تھا۔ ایسے خیمے منگول پڑاؤ میں اہم قیدیوں کو رکھنے کے لیے استعمال ہوتے تھے۔ یہ بات تو صاف ظاہر تھی کہ سوبدائی بہادر ڈیوک کو مستقلاً اپنے خیمے میں نہیں رکھ سکتا تھا۔ اگر ڈیوک اب تک زندہ تھا تو یقیناً وہ کسی اور جگہ موجود تھا اور غالب امکان یہی تھا کہ وہ لوہے کی تاروں والے اس خیمے میں موجود ہو گا۔ خیمے کے سامنے ایک مسلح منگول پہرا دے رہا تھا۔ اباقہ اور یورق خیمے کی طرف بڑھے تو اس نے انہیں روک لیا۔ یورق نے چینی لب و لہجہ میں اسے بتایا کہ وہ سوبدائی بہادر کے حکم پر قیدیوں کو دیکھنے آئے ہیں۔

"کون سے قیدی؟" منگول نے مشکوک لہجے میں پوچھا اور اس کے ساتھ ہی اس کا ہاتھ تلوار کی طرف بڑھ گیا۔ اباقہ اور یورق جان گئے کہ ان سے غلطی ہوئی ہے شاید اس خیمے میں قیدی نہیں رکھے گئے تھے۔ تاہم اب سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ اباقہ نے نہایت پھرتی سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھا پھر دونوں نے اس کی بغلوں میں ہاتھ دیئے اور اسے خیمے کے اندر لے گئے۔ پہریدار نے اباقہ کا ہاتھ منہ سے ہٹا کر چیخنا چاہا مگر اس وقت تک اباقہ چغے کے نیچے سے اپنی تلوار برآمد کر چکا تھا۔ نہایت بے دردی سے اس نے تلوار پہریدار کے سینے میں گھونپ دی۔ اس کی اونی صدری سے خون کا فوارہ ابلا اور چند ہی لمحوں میں وہ ساکت ہو گیا۔ تب اباقہ کی نگاہ خیمے کے ایک گوشے کی طرف اٹھ گئی۔ یکایک اس کا جسم سنسنا اٹھا۔ شمعدان کی مدھم روشنی میں ڈیوک نظر آ رہا تھا' لیکن اس طرح کہ

وہ شیشے کے ایک بہت بڑے مرتبان میں بند تھا۔ اس خاص قسم کے مرتبان کا پیندا لوہے کا تھا اور پیندے کے ساتھ ایک آہنی زنجیر منسلک تھی جس نے ڈیوک کے پیروں کو مضبوطی سے جکڑ رکھا تھا۔ ڈیوک کے ہاتھ پشت پر ایک مضبوط رسی سے بندھے ہوئے تھے۔ مرتبان میں پانی بھرا ہوا تھا اور اس کی بلندی اتنی تھی کہ صرف ڈیوک کی تھوڑی پانی سے باہر تھی۔ اس کے جسم پر صرف ایک لنگوٹ تھا اور سارا جسم ضربات کے نشانات سے بھرا ہوا تھا۔ جب اباقہ اور یورق نے پہریدار کو ہلاک کیا تو وہ حیرانی سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔ اباقہ نے یورق کی طرف دیکھ کر معنی خیز انداز میں سرہلایا کچھ دیر سوچنے کے بعد اباقہ نے مردہ پہریدار کو اٹھایا اور اسے خیمے کے دروازے پر باہر کی طرف اس طرح بٹھا دیا کہ وہ ٹیک لگا کر سستاتا ہوا نظر آئے۔ اس کی تلوار اس کی گود میں رکھ دی۔ تب اباقہ اور یورق' ڈیوک کی طرف متوجہ ہوئے۔ ڈیوک کا منحوس چہرا دیکھ کر اباقہ کو خود پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا' لیکن اس نے خود کو سنبھالا پھر دھیمی اور بیٹھی ہوئی سی آواز میں بولا۔

"تم یہاں اکیلے قید ہو؟" ڈیوک نے اثبات میں سرہلا دیا۔ اب اباقہ اور یورق کو سمجھ آ رہی تھی کہ پہریدار ان کی طرف سے مشکوک کیوں ہو گیا تھا۔ انہوں نے "قیدیوں" کا لفظ استعمال کیا تھا جبکہ خیمے میں صرف ایک قیدی تھا اور وہ تھا ڈیوک۔ ڈیوک نے تیزی سے پوچھا۔

"کون لوگ ہو تم؟"

اباقہ نے جواب دیا۔ "آپ کے خیر خواہ۔ آپ کی جان بچانے کے لیے آئے ہیں۔"

ڈیوک کی تیز نگاہیں ان دونوں کے چہروں پر جمی تھیں۔ شمعدان کی روشنی میں اس کی نیلی آنکھوں میں بلا کی چمک تھی۔ وہ بولا۔ "جہاں تک میرا اندازہ ہے تم دونوں نے بہروپ بھر رکھا ہے کیا میں غلط کہہ رہا ہوں۔"

اباقہ نے تیزی سے سنبھالا لیا۔ "ہاں.......... آپ کا اندازہ بالکل درست ہے ہم نے بھیس بدلا ہوا ہے۔ آپ تک پہنچنے کے لیے ایسا ضروری تھا۔ ہمیں سردار گیوڈو نے آپ کی طرف بھیجا ہے اسے چند روز پیشتر ہی آپ کی گرفتاری کی خبر ملی ہے۔"

ڈیوک نے چونک کر کہا۔ "تو تم گیوڈا کے آدمی ہو لیکن گیوڈا خود کیوں نہیں آیا۔"

اباقہ نے کہا۔ "جناب! وہ آپ کے حکم کی تعمیل میں کچھ زخمی ہو گئے ہیں۔"

"کیا مطلب؟" ڈیوک نے تیزی سے پوچھا۔

اباقہ نے کہا۔ "جناب' سردار گیوڈا نے شہزادی نتاشا کو ہلاک کر دیا ہے' مگر اس کوشش میں انہیں بھی کچھ زخم آئے ہیں۔"

ڈیوک کی نگاہوں میں مسرت کی چمک نظر آنے لگی۔ وہ اپنی جسمانی تکلیف کو بھولتا ہوا بولا۔ "بہت خوب یگوڑا.......... بہت خوب.......... تو نے حق نمک ادا کر ڈالا۔" پھر اباقہ سے مخاطب ہو کر بولا۔ "اور نتاشا کا وہ جنگلی خاوند بھی ہلاک ہوا یا نہیں۔"

اباقہ نے کہا۔ "نہیں حضور! وہ خیمے میں موجود نہیں تھا اس لیے بچ گیا۔" ڈیوک نے اس خبر کو نظر انداز کرتے ہوئے جذباتی لہجے میں کہا۔ "یگوڑا نے نتاشا کو ہلاک کر کے آج مجھے اپنے عہد کے بوجھ سے آزاد کر دیا۔ جب رئیس یوری نے پندرہ برس پہلے میرے بھائی کو کیف کے چوراہے میں ہلاک کیا تھا اور میری ماں اس کے صدمے سے جاں بحق ہوئی تھی میں نے قسم کھائی تھی کہ رئیس کے خاندان کے بچے بچے کو موت کے گھاٹ اتار دوں گا.......... اور آج میں نے ایسا کر دکھایا۔ میں نے اس زمین سے اس کا نام ونشان مٹا دیا ہے۔"

اباقہ نے کہا۔ "جناب! ہم آپ کو یہاں سے لے جانے کے لیے آئے ہیں۔"

ڈیوک نے جیسے اپنے خیالوں سے چونکتے ہوئے کہا۔

"ہاں.......... ہاں جلدی کرو ہو سکتا ہے کوئی دوسرا پہریدار اس طرف آ نکلے۔"

اباقہ نے کہا۔ "لیکن آپ کے پاؤں کیسے کھولے جائیں؟"

ڈیوک بولا۔ "اس پہریدار کی کسی جیب میں زنجیر میں لگے قفل کی چابی ہو گی۔ تم وہ چابی لے آؤ تو میں پانی میں بیٹھ کر اپنے پاؤں آزاد کرا سکتا ہوں۔"

اباقہ نے اثبات میں سر ہلایا اور احتیاط سے خیمے کا پردہ اٹھا کر باہر آ گیا۔ تاریکی میں پہریدار اسی طرح اکڑوں بیٹھا تھا۔ اباقہ نے اس کا لباس ٹٹولا اور چابی ڈھونڈنے میں کامیاب رہا لیکن اس نے چابی نکالی نہیں اور خالی ہاتھ واپس اندر چلا گیا۔ ڈیوک نے بے تابی سے پوچھا چابی ملی۔ اباقہ نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ڈیوک کے چہرے پر مایوسی پھیل گئی۔ وہ بولا اس کا مطلب ہے چابی دوسرے پہریدار کے پاس ہے وہ کم بخت شام کا کہیں نکلا ہوا ہے۔ اب تمہیں اس کی آمد تک انتظار کرنا ہو گا۔"

اباقہ نے اس کی بات سمجھتے ہوئے یورق کو ہدایت کی کہ وہ دروازے کے پاس چوکس کھڑا رہے اور جونہی دوسرا پہریدار دروازے پر پہنچے اسے اندر گھسیٹ لے۔ یورق نے اطاعت میں سر ہلایا اور چغے کے اندر سے تلوار نکال کر دروازے پر براجمان ہو گیا۔

اباقہ نے کہا۔ "جناب! یہ سب کچھ کیسے ہوا۔ آپ نے تو منگولوں کے لیے گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ ان سے یہ احسان فراموشی کیوں ہوئی؟"

ڈیوک نے تلخ لہجے میں کہا۔ "لوگ ٹھیک کہتے ہیں' یہ منگول اپنے ہم قوموں کے

سوا کسی کے دوست نہیں ہوتے۔ مجھے اس بد بخت سوبدائی بہادر نے خود کئی بار پیغام بھیجا تھا کہ مجھے انعام و کرام سے نوازنا چاہتا ہے لیکن میں یہاں آیا تو مجھے گرفتار کر لیا اور الزام لگایا کہ میری وجہ سے اس کا لشکر نووگرود تک نہیں پہنچ سکا۔ اس بے وقوف کا خیال ہے کہ میں نووگرود کو منگول لشکر سے بچانے کے لیے روپوش ہو گیا تھا۔"

اباقہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ نووگرود تباہ ہو تا یا بچتا آپ کی بلا سے۔ آپ تو صرف شہزادی نتاشا اور اس کے شوہر اباقہ کو پھانسنے کے لیے لشکر سے جدا ہوئے تھے۔"

"ہاں.......... نہیں۔" یکایک ڈیوک کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ اسے احساس ہوا تھا کہ یگوڑا کا ایک معمولی ساتھی اس سے طنزیہ لہجے میں گفتگو کر رہا ہے وہ غور سے اس کا چہرہ دیکھتا ہو بولا۔ "مجھے.......... مجھے تمہاری آواز کچھ جانی پہچانی لگ رہی ہے۔"

یورق نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ "جانی پہچانی تو لگے گی کیونکہ یہ اس فرشتے کی آواز ہے جس نے تمہاری جان قبض کرنا ہے۔"

"کیا مطلب؟" ڈیوک نے ہراساں ہو کر کہا۔ پھر اس کی نگاہ اباقہ کے چہرے کی طرف اٹھ گئی۔ اس کی آنکھیں شعلہ فشاں تھیں۔ دانت اتنی مضبوطی سے ایک دوسرے پر جمے تھے کہ داڑھی کی اطراف جبڑوں کی ہڈیاں ابھر آئی تھی۔ وہ سراپا قہر نظر آ رہا تھا۔ ڈیوک کے باریک لب تھرتھرائے اور وہ ہکلاتا ہوا بولا۔ "تم.......... تم اباقہ تو نہیں۔"

اباقہ کی گھمبیر خاموشی نے جیسے اسے خود ہی جواب دے دیا۔ یکبارگی اس کا چہرا ان چھوئی برف کی مانند سفید ہو گیا۔ اباقہ کی آنکھوں میں اب آنسو جھلملا رہے تھے۔ اس کی نگاہوں میں نتاشا کا حسین چہرہ گھوم رہا تھا۔ اس کی سانسوں میں ان پھولوں کی خوشبو رچ رہی تھی جنھوں نے ایک شام اس کا خیمہ مہکا دیا تھا۔ اس کے کان نتاشا کے آخری فقروں کی صدا سن رہے تھے۔ "آپ کہیں جا رہے ہیں؟ آپ کب تک واپس آ جائیں گے۔ آپ کہیں جا رہے ہیں؟".......... الفاظ اباقہ کی سماعت میں گونج رہے تھے اور اس کا انتقام زخمی پرندے کی طرح اس کے سینے میں پھڑ پھڑا رہا تھا۔ وہ موت جیسے سرد اور سرسراتے ہوئے لہجے میں بولا۔

"ڈیوک مرنے کے لیے تیار ہو جا۔ میں اپنی بیوی کے قتل کے جرم میں تجھے سزائے موت دے رہا ہوں۔"

ڈیوک کی وحشت زدہ نگاہیں اباقہ کے ہاتھ میں پکڑی تلوار پر جم گئیں۔ وہ ہکلا کر بولا۔ "اباقہ.......... تت تم.......... تم.......... میں نے تمہاری بیوی کو ہلاک نہیں کیا۔

خدا کی قسم اسے میں نے ہلاک نہیں کیا۔"

اباقہ بولا۔ "موت کے خوف نے تجھے پاگل کر دیا ہے ڈیوک۔ تو ابھی نتاشا کی موت پر اپنی دلی مسرت کا اظہار کر چکا ہے۔"

یکایک ڈیوک کو اندازہ ہو گیا کہ وہ بری طرح پھنس چکا ہے۔ اسے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اباقہ سے رحم کی درخواست کرنا اور اپنی جان بخشی کی امید رکھنا فضول ہو گا۔ لہذا بہتر ہے کہ خاموش رہا جائے اور موت کو وقار کے ساتھ گلے لگایا جائے۔ اس فیصلے پر پہنچتے ہی اس کا چہرہ جذبات سے عاری ہو گیا۔ اباقہ نے نہایت سفاکی سے اسے گھورا' پھر دھیمی آواز میں بولا۔ "تیرے جرم اتنے زیادہ ہیں ڈیوک کہ میں تجھے سو بار بھی ہلاک کروں تو میرا سینہ ٹھنڈا نہیں ہو گا' لیکن میں تجھے ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔ میں تجھے کچھ کہے بغیر واپس جا رہا ہوں۔"

ایکا ایکی ڈیوک کے چہرے پر امید کی روشنی نظر آئی۔ وہ بڑی لجاجت سے بولا۔ "اباقہ! میری درخواست ہے کہ جو ہوا اسے بھول جاؤ۔ میرا وعدہ ہے اگر زندہ بچا.......... تو تمہارا بہترین دوست ثابت ہوں گا۔"

اباقہ بولا۔ "تم جیسے غدار وطن کی زبان پر بھروسا تو نہیں کرنا چاہیے' بہر حال میں واپس لوٹ رہا ہوں۔ مگر جانے سے پہلے میں ایک کام ضرور کروں گا۔"

ڈیوک سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اباقہ بائیں طرف گیا اور کونے میں رکھی ہوئی ایک بالٹی اٹھالی۔ اس بالٹی میں نمکین پانی تھا۔ ایسا ہی نمکین پانی مرتبان میں بھرا ہوا تھا۔ اباقہ نے یہ بالٹی اٹھائی اور پلک جھپکتے میں مرتبان میں انڈیل دی۔ پانی جو پہلے ڈیوک کی ٹھوڑی تک تھا اس کی پیشانی کو ڈبو گیا۔ اس نے تڑپ کر منہ اوپر اٹھایا تاکہ اپنی ناک پانی سے باہر نکال سکے لیکن پانی کی سطح اس کی ناک سے دو انگل بلند تھی اور یہ دو انگل کا فاصلہ اس کے لیے زندگی موت کا فاصلہ تھا۔ اس کے پاؤں آہنی پیندے کے ساتھ زنجیر تھے اور ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ اب وہ تڑپنے مچلنے کے سوا اور کچھ نہ کر سکتا تھا۔ مرتبان کا ساکت پانی بری طرح اچھل رہا تھا اور اس کے اندر نیلی آنکھوں والا شیطان عالم نزع سے گزر رہا تھا۔ کوئی آواز نہیں تھی' کوئی چیخ و پکار نہیں تھی۔ صرف پانی کی اچھل تھی اور رات کا سناٹا تھا۔ اباقہ کسی بت کی طرح ساکت یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ جب ڈیوک اپنی زندگی سے محروم ہو گیا تو اباقہ اور یورق خیمے کے دروازے کی طرف بڑھے مگر اس وقت انہیں چونکنا پڑا جب خیمے کی چاروں جانب مسلح تاتاری گھڑسوار دکھائی دیئے۔ ان کا سالار گرج کر بولا۔

"خبردار' تلواریں پھینک دو۔ تمہارے بچنے کا کوئی راستہ نہیں۔"

یورق نے کہا "بچنا کون کم بخت چاہتا ہے۔ ہم تو پہلے ہی قبر کے لیے جگہ ڈھونڈ رہے ہیں۔"

سالار چلایا۔ "زیادہ ہوشیار بننے کی کوشش مت کرو۔ ہم تمہارے بڑھاپے کو اچھی طرح سمجھ رہے ہیں۔ تم نے بھیس بدل رکھا ہے۔"

یورق نے کہا۔ "بھیس ہی بدلا ہے نا۔ کوئی تمہاری دم پر پاؤں تو نہیں رکھا۔ کیوں برفانی ریچھ کی طرح چلا رہے ہو۔"

اس مکالمے بازی کے دوران اباقہ کا ذہن تیزی سے فرار کا راستہ سوچ رہا تھا۔ منگولوں کے لشکر میں ان کی قید میں چلے جانے کا مطلب اذیت ناک موت کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ اباقہ کے رقیب طوطم خاں کے ساتھ تو ایک اتفاق ہو گیا تھا ورنہ منگول اپنے قیدی کو بچ نکلنے کا موقعہ کم ہی دیتے تھے۔ اب تلواروں کے اس گھیرے میں قسمت آزمائی کے سوا کوئی چارا نہ تھا۔ اباقہ اور یورق نے ایک دوسرے سے پشت جوڑی اور منگولوں کے تنگ ہوتے ہوئے گھیرے کے درمیان سینہ تان کر کھڑے ہو گئے۔ ایک وحشیانہ نعرے کے ساتھ منگول سوار ان پر جھپٹے۔ تلواریں ٹکرائیں اور گھمسان کا رن پڑ گیا۔ اباقہ اور یورق زندگی و موت سے بے پرواہ ہو کر لڑ رہے تھے۔ انہیں معلوم ہو چکا تھا کہ اب منگول پڑاؤ سے زندہ بچ نکلنا ممکن نہیں' اور قید ہونے کا مطلب تھا' حسرتناک موت۔ اس لیے وہ میدان جنگ کا حساب میدان جنگ میں چکا دینا چاہتے تھے۔ منگولوں کے غول میں لحہ بہ لحہ اضافہ ہو رہا تھا۔ اباقہ کو اپنی چاروں طرف دور دور تک انسانی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ یہاں ہونے والی جھڑپ نے بہت سے منگولوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا.......... ابھی تک اباقہ کی پشت محفوظ تھی۔ اس کا مطلب تھا یورق ابھی زندہ ہے اور اپنی بقاء کی جنگ لڑ رہا ہے۔ گاہے گاہے اباقہ کو اس کی وحشیانہ چنگھاڑ سنائی دے جاتی تھی۔ گھیرا اب بہت تنگ ہو چکا تھا۔ منگول ان کے اوپر چڑھتے آ رہے تھے۔ یہاں تک کہ اباقہ کی پشت سے یورق کی پشت آ لگی۔ اس وقت اچانک اچل کی آوازیں آئیں۔ شور کا آہنگ تبدیل ہوا اور اباقہ کو اندازہ ہوا کہ منگول سپاہیوں کے للکاروں میں گھوڑوں کی ٹاپیں بھی شامل ہو گئی ہیں۔ کسی طرف سے کوئی چلا کر بولا۔

"روسی آ گئے.......... گھوڑے سنبھالو.......... روسی آ گئے۔"

ایکا ایکی اباقہ اور یورق پر دباؤ کم ہو گیا۔ اس وقت اباقہ نے نہایت جوش سے نعرہ تکبیر بلند کیا اور رہی سہی قوت کے ساتھ منگول سپاہیوں پر ٹوٹ پڑا۔ اس کا یہ حملہ دیدنی

تھا۔ منگول اس کے دائیں بائیں کٹ کٹ کر گرے اور گھیرا ٹوٹ گیا۔ اباقہ نے لپک کر ایک گھوڑا قابو کیا۔ دوسری طرف یورق بھی ایک گھڑسوار کے عقب میں سوار ہو چکا تھا۔ اس نے ایک ہاتھ سے گھڑسوار پر قابو پالیا تھا اور دوسرے ہاتھ سے اندھا دھند تلوار چلا رہا تھا۔ یکایک اباقہ کی نظر روسی سواروں پر پڑی۔ انہوں نے ایک کامیاب شبخون مارا تھا۔ منگولوں کے لاتعداد خیمے جل رہے تھے اور وہ بری طرح حواس باختہ تھے۔ اباقہ اور یورق نے اس افراتفری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اندھا دھند گھوڑے بھگائے اور روسی سواروں میں شامل ہو گئے۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ اس تیز رفتار روسی دستے کے ساتھ گھوڑے بھگاتے جنگل میں گم ہو رہے تھے۔

☆ ☆ ☆

کوزل سک نامی اس قصبے کی فوج نے منگول لشکر کا ناک میں دم کر دیا۔ عظیم سوبدائی بہادر اور سالار اعظم باتو خاں حیران تھے کہ یہ ان کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ جہاں انہوں نے بڑے بڑے روسی شہروں کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر پیوند زمین کر دیا تھا وہاں یہ چھوٹا سا قصبہ ان کے راستے کی ناقابل عبور رکاوٹ بن گیا تھا۔ قصبے کی مختصر فوج چھاپا مار جنگ کی نئی تاریخ رقم کر رہی تھی۔ منگول جاسوس باتو خاں اور سوبدائی بہادر کو اس بات کی اطلاع فراہم کر چکے تھے کہ روسیوں کی کامیاب اور مسلسل مزاحمت کا سبب ان کی قیادت ہے۔ ان کا وہی دشمن جاں اباقہ' روسیوں کے درمیان موجود ہے اور ان کی تحریک مزاحمت کی رہنمائی کر رہا ہے۔ اس اطلاع کے بعد باتو خاں اور سوبدائی بہادر نے سارا زور اس بات پر لگا دیا کہ کسی طرح اباقہ کو زندہ یا مردہ گرفتار کر لیا جائے' لیکن وہ ہمیشہ کی طرح ان کی دسترس سے باہر رہا۔ اس کوشش میں کئی ہفتے ضائع ہوئے اور کئی منگول چھاپا ماروں نے جان گنوائی۔

منگول لشکر میں اب بے دلی پھیل رہی تھی۔ انہیں ناموافق حالات اور ناموافق موسموں میں پھنسے ہوئے ایک عرصہ ہو گیا تھا۔ ان کے گھوڑوں کی حالت پتلی تھی اور ان کے اپنے جسم نحیف ہو چکے تھے۔ انہیں جنوب کی شاداب چراگاہیں اور نیم گرم ہوائیں یاد آ رہی تھیں۔ وہ اپنے اصل مسکن یعنی صحرائے گوبی سے ہزاروں میل دور آ چکے تھے اور اب اپنی جنم بھومی کی یاد انہیں بری طرح ستا رہی تھی۔

اباقہ تک رسائی میں ناکامی کے بعد سوبدائی بہادر کے مشورے سے باتو خاں نے ایک خطرناک چال چلی۔ اس نے ایک طرف تو اہل قصبہ سے کشمکش جاری رکھی' دوسری طرف اپنے چھاپا مار پیادوں کو چھوٹی چھوٹی ٹولیوں کی صورت میں پہاڑوں کے پار پہنچانا شروع کر

دیا۔ یہ پیادے دشوار گزار چڑھائیاں عبور کرتے ہوئے پہاڑی سلسلے کی دوسری طرف ایک مخصوص جگہ پر جمع ہونے لگے .... یہ سلسلہ دو ہفتے جاری رہا اور جب مناسب تعداد میں پیادے دوسری جانب اتر چکے تو باتو خاں نے' قصبے پر ایک بھرپور حملے کا فیصلہ کیا .... دوسری جانب موجود پیادے ایسے مقام پر جمع تھے کہ تھوڑا سا فاصلہ طے کر کے قصبے پر حملہ آور ہو سکتے تھے۔ ان پیادوں کی زندگی صرف اسی صورت محفوظ رہ سکتی تھی کہ اگر یہ حملہ کامیاب ہو جاتا' ورنہ اہل قصبہ انہیں گھیر کر بھیڑ بکریوں کی طرح کاٹ ڈالتے۔ لہٰذا باتو خاں اس حملے کو کامیاب بنانے کا تہیہ کیے ہوئے تھا۔ درحقیقت نصف کامیابی وہ پیادوں کو پار اتار کر ہی حاصل کر چکا تھا۔ اب بقایا نصف کامیابی حاصل کرنا تھی۔ حملے کے لیے مہینے کی آٹھ تاریخ مقرر ہوئی۔

.... یہ سات تاریخ کا واقعہ ہے۔ اسد' اباقہ اور علی باجماعت ظہر کی نماز ادا کر رہے تھے۔ ساتھ والے کمرے میں یورق قیلولہ کرنے میں مصروف تھا۔ کبھی کبھی تو اس کا دل بھی چاہتا تھا کہ اباقہ کی طرح نماز شروع کر دے۔ مگر ابھی تک وہ اپنے خیال کو عملی جامہ نہیں پہنا سکا تھا۔ اچانک دروازہ کھلا اور شیزی کولت اندر آ گئی۔

"کیسے ہو سردار؟" اس نے یورق سے پوچھا۔

یورق نے صرف "ٹھیک" کہنے پر اکتفا کیا۔ شیزی کچھ دیر انتظار کرتی رہی کہ شاید یورق کچھ اور بولے لیکن وہ چپ رہا تو اس نے کہا۔ "سردار جنگ کی کیا صورت حال ہے؟" یورق نے اس سوال کا جوب بھی "ٹھیک" میں دیا۔ شیزی کچھ کھسیانی سی ہو گئی۔ پھر اس نے اپنی مٹھی یورق کے سامنے کھولتے ہوئے کہا۔ "یہ دیکھو" یورق نے دیکھا شیزی کی نازک اور سفید ہتھیلی پر ایک ہیرا جگمگا رہا تھا۔

"یہ کس لیے ہے؟" یورق نے لاپرواہی سے پوچھا۔

شیزی بڑے انداز سے بولی۔ "تمہارے لیے۔" پھر اس سے پوچھنے لگی۔ "تمہارے ہاتھ میں جو انگوٹھی ہے' اس کا نگ کہاں گیا؟"

یورق بولا۔ "عرصہ ہوا لڑائی میں کہیں گر گیا تھا۔"

شیزی بولی۔ "یہ ہیرا تمہاری اس خالی انگوٹھی کے لیے ہے۔"

یورق کو شیزی کے والہانہ انداز سے سخت الجھن ہو رہی تھی۔ یہ تیسرا موقعہ تھا کہ اس نے بہانے بہانے سے اسے کوئی تحفہ دینے کی کوشش کی تھی۔ اسے اس لڑکی کی کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ وہ اس سے کئی برس چھوٹی تھی پھر بھی یورق کے ساتھ اس کے رویے میں عجیب طرح کی لگاوٹ پائی جاتی تھی۔ یورق نے اس دفعہ سخت رویہ اختیار کرنے

کا فیصلہ کیا۔ اس نے خشک لہجے میں کہا۔ "یہ تم کیا کرتی ہو۔ کوئی نہ کوئی چیز اٹھائے چلی آتی ہو۔ تم سے کس نے کہا تھا کہ مجھے اپنی انگوٹھی کے لیے ہیرے کی ضرورت ہے۔ مجھے نہیں چاہیے یہ سوغات۔" پھر اس نے جھلاہٹ میں پرانی انگوٹھی اتار کر ایک طرف پھینک دی۔ شیزی سکتے کی سی کیفیت میں اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ دل ٹوٹنے کی خاموش صدا آنسو بن کر اس کی آنکھوں میں چھلک آئی تھی۔ اس نے آنسو روکنے کے لیے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبایا۔ پھر شکوہ کناں نظروں سے اسے دیکھتی ہوئی واپس چلی گئی۔ ننھا ہیرا اس کی مٹھی میں دبا ہوا تھا۔

شام سے ذرا پہلے علی بھاگتا ہوا یورق کے پاس آیا۔ یورق اس وقت گرجے کے صحن میں چہل قدمی کر رہا تھا۔ علی بولا۔

"سردار یورق! تم نے کہیں شیزی کو تو نہیں دیکھا۔ وہ سہ پہر سے نظر نہیں آ رہی۔"

یورق نے لاپرواہی سے نفی میں جواب دیا۔ دفعتاً اسے کچھ یاد آیا۔ یورق کی تلخ کلامی کے بعد وہ تیز قدموں سے باہر چلی گئی تھی اور پھر کچھ دیر بعد چادر لپیٹے گرجے سے نکلتی دکھائی دی تھی۔ اس وقت تو یورق نے غور نہیں کیا تھا مگر اب علی کی اطلاع اسے کچھ سوچنے پر مجبور کر رہی تھی۔ اس نے پریشانی سے آسمان کی طرف نگاہ دوڑائی۔ سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے اور کبھی بجلی ان کے درمیان کسی حسینہ کی تیز نگاہ کی مانند کوند جاتی تھی۔ ہلکی ہلکی پھوار بھی پڑنا شروع ہو گئی تھی۔ ایسے غیر یقینی موسم میں شیزی کا گرجے سے نکلنا ٹھیک نہیں تھا۔ کچھ سوچتے ہوئے یورق اصطبل کی طرف بڑھا اور اپنا گھوڑا سنبھال کر سوار ہو گیا۔ اس کا رخ قصبے کی مشرقی جانب تھا۔ اس نے شیزی کو اسی رخ پر جاتے دیکھا تھا۔

جس وقت شام کا دھندلکا ٹھٹھری ہوئی تاریکی میں تبدیل ہونا شروع ہوا یورق قصبے سے کوئی ایک کوس آگے گھنے درختوں میں پہنچ چکا تھا۔ ابھی وہ واپس جانے کا سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک اس کی نگاہ ایک ہیولے پر پڑی۔ ایک جوہڑ کے کنارے بارش کی بوچھاڑ میں کوئی چادر اوڑھے تنہا بیٹھا تھا۔ یورق گھوڑا چلاتا ہوا قریب پہنچا تو یہ دیکھ کر اس کا دماغ سنسنا اٹھا کہ وہ ہیولا شیزی کا ہے۔ وہ درخت سے ٹیک لگائے گم صم بیٹھی جوہڑ کی سطح کو گھور رہی تھی۔ اس کے بال جو اب لمبے ہو چکے تھے بھیگ کر پیشانی اور گردن سے چپکے تھے۔ یورق کو دیکھ کر اس نے بیگانگی سے منہ پھیر لیا۔

یورق نے غصے سے بولا۔ "یہ کیا بیہودگی ہے۔ یہاں بیمار ہونے کے لیے آئی ہو۔"

شیزی بولی۔ "بیمار ہونے کے لئے نہیں مرنے کے لئے آئی ہوں۔"

یورق نے کہا۔ "مجھے یہ الٹی سیدھی باتیں اچھی نہیں لگتیں اور نہ ہی میں سننا چاہتا

ہوں۔"

شیزی نے بھنا کر کہا۔ "تو کس نے کہا تھا کہ سننے کے لیے یہاں آؤ۔" اس کے ساتھ ہی وہ زور زور سے رونے لگی۔ یورق کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اسے کیسے چپ کرائے۔ اگر غصے سے بولتا تو وہ اور برافروختہ ہو جاتی۔ آخر اس نے نرمی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ پھر اسے بازو سے پکڑ کر اٹھا لیا۔ بے ساختہ اس کے ہونٹوں سے نکلا۔ "مجھے معاف کر دے شیزی شاید میں نے تیرا دل توڑا ہے۔" اس سے پہلے کہ شیزی کوئی جواب دیتی، بجلی انتہائی شدت سے کڑکی اور وہ سہم کر اس کے بازو سے لگنے پر مجبور ہو گئی۔ اس خوفناک کڑک کا اثر یورق کے گھوڑے پر بھی ہوا اور وہ بدک کر بھاگ کھڑا ہوا۔ یورق پکارتا ہوا اس کے پیچھے لپکا۔ مگر گھوڑا کہاں رکنے والا تھا۔ وہ یورق کو دو تین فرلانگ تک بھگاتا چلا گیا۔ آخر ایک جگہ درختوں میں گم ہو گیا............ یورق گھوڑے کو ڈھونڈ رہا تھا جب وہ اس راز سے آگاہ ہوا جس نے اس کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ وہ کتنی ہی دیر سکتے کے عالم میں دیکھتا رہ گیا۔ ایک گھاس میں گھنے درختوں کے درمیان بہت سے منگول پیادے جمع تھے۔ جہاں تک یورق کی نظر کام کر سکتی تھی اسے سبز پتوں سے منگولوں کے سرخ لبادے جھلکتے نظر آ رہے تھے۔

"او خدایا۔" یورق کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔ کوزل سخت شدید خطرے میں تھا۔ وہ الٹے پاؤں واپس مڑا اور بھاگتا ہوا شیزی تک پہنچا۔ پھر شیزی کو لے کر وہ حتی الامکان تیزی سے دوڑتا ہوا قصبے کی طرف بڑھنے لگا۔

☆======☆======☆

نائب رئیس کونسل حیران نظروں سے اباقہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اباقہ نے یورق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ حقیقت ہے سردار یورق خود اپنی آنکھوں سے انہیں دیکھ کر آیا ہے۔"

نائب رئیس نے پریشانی سے کہا۔ "اب کیا ہو گا؟"

اباقہ بولا۔ "ہماری تجویز ہے کہ اس وقت یہ قصبہ فوراً خالی کر دیا جائے اور مغربی جانب کے ٹیلوں میں پناہ لی جائے۔ وہاں سے ہم بخوبی دشمن کا مقابلہ کر سکیں گے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ منگول لشکر ہم سے الجھے بغیر آگے بڑھ جائے اور ہم دوبارہ قصبے کو آباد کر لیں۔"

نائب رئیس نے فیصلہ کن انداز میں سر نفی میں ہلایا۔ "اباقہ! یہ کسی صورت نہیں ہو سکتا۔ ہم موت کے خوف سے اپنے قدیم رواج کو نہیں توڑ سکتے۔ ہمیں اس قصبے میں

مرنا اور اسی میں جینا ہے۔"

اباقہ یورق اور اسد نے نائب رئیس کو سمجھانے کی بہت کوشش کی کہ کبھی کبھی خود کو نقصان سے بچانے کے لیے پسپائی ضروری ہو جاتی ہے اور ایسی پسپائی کسی صورت بزدلی کے زمرے میں نہیں آتی لیکن نائب رئیس اور قصبے کے دوسرے سردار ماننے کو تیار نہیں تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ اپنے گلی کوچوں کو منگول گھوڑوں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتے۔

صورت حال الجھ گئی تھی۔ اباقہ اور اس کے ساتھی اہل قصبہ کے شانہ بشانہ منگولوں سے لڑتے رہے تھے مگر اب ان کی آرا مختلف ہو گئی تھیں۔ اباقہ وغیرہ کا کہنا تھا کہ اس وقت قصبے کو نہ چھوڑنا خودکشی کے مترادف ہے جبکہ اہل قصبہ کا تہیہ تھا کہ وہ دشمن کا مقابلہ کریں گے۔ سخت کوشش کے باوجود جب وہ اہل قصبہ کو قائل نہیں کر سکے تو انہوں نے خود ہی وہاں سے نکلنے کا فیصلہ کر لیا۔ شیزی کولت نے ننھے رئیس ویزلی سے کہا۔

"رئیس! آپ ہمارے ساتھ چلیں۔ یہاں آپ کی زندگی کو سخت خطرہ ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے رئیس کا بازو تھام لیا۔ نائب رئیس گرج کر بولا۔

"اے عورت! رئیس کا بازو چھوڑ دے۔ رئیس یہاں قصبے میں اپنے لوگوں کے ساتھ رہیں گے۔"

شیزی چلا کر بولی۔ "قصبے کے لوگ تو پاگل ہو گئے ہیں میں اس معصوم کو زندگی سے ہاتھ نہیں دھونے دوں گی۔ یہ ہمارے ساتھ جائے گا۔"

شیزی' رئیس کو اپنی طرف اور نائب رئیس اپنی طرف کھینچنے لگا۔ جھگڑا جب طول پکڑ گیا تو سردار یورق نے آگے بڑھ کر کہا۔

"تم دونوں رئیس کو چھوڑ دو۔ رئیس اپنی عمر سے زیادہ سمجھدار ہے۔ اسے خود فیصلہ کرنے دو کہ وہ ہمارے ساتھ جائے گا یا یہاں رہے گا۔"

شیزی نے رئیس کو چھوڑا تو نائب رئیس نے بھی چھوڑ دیا۔ یورق بولا۔ "محترم رئیس! تمہاری کیا رائے ہے' تم ہمارے ساتھ جانا چاہتے ہو یا یہاں رہو گے۔"

ننھا رئیس پریشانی سے کبھی شیزی اور کبھی کونسل کی طرف دیکھتا تھا۔

شیزی نے کہا۔ "رئیس! میری بات پر یقین کرو۔ یہاں سخت خطرہ ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ہم یہاں سے کیوں جاتے۔ کیا اب تک ہم بہادری سے دشمن کا مقابلہ نہیں کرتے رہے۔"

کونسل بولا۔ "اگر تم اپنے بزرگوں کی قبروں کو منگول گھوڑوں کے سموں میں پامال

ہونے کے لیے چھوڑ گئے تو ان کی روحیں تمہیں کبھی معاف نہیں کریں گی۔ کیا تم اپنے باپ کا فرمان بھول گئے ہو۔ اس نے کہا تھا' مادر وطن پر بھینٹ چڑھانے کے لیے اپنی جان ہر وقت ہتھیلی پر رکھنا اور تمہاری ماں نے مرتے وقت کیا کہا تھا۔ کچھ یاد ہے نہیں.........."

شیزی اس کی بات کاٹ کر بولی۔ "رئیس۔ یہ بوڑھے سردار تیری زندگی سے دشمنی کر رہے ہیں۔ ان کی بات پر کان نہ دھر۔ آجا میرے پاس۔" اس نے اپنی بانہیں رئیس کے لیے پھیلا دیں۔

نائب رئیس بولا۔ "رئیس محترم۔ تمہاری ماں تمہاری بزدلی دیکھے گی تو قبر میں شرم سے پانی پانی ہو جائے گی۔ اس نے تجھے حکم دیا تھا ہر قیمت پر اپنی مٹی کی حفاظت کرنا۔"

رئیس ایک ایسے دوراہے پر کھڑا تھا جس کی ایک جانب شیزی تھی اور دوسری جانب نائب رئیس۔ وہ اپنے ننھے سے وجود کے ساتھ تن کر کھڑا تھا اور کسی جلیل القدر بادشاہ کی طرح غور و فکر میں ڈوبا نظر آتا تھا۔ وہ اپنی عمر سے کہیں زیادہ دانا نظر آرہا تھا۔ آخر اس نے شیزی کولت' علی اور اباقہ پر الوداعی نظر ڈالی اور تیز قدموں سے اپنے کمرے کی طرف مڑ گیا۔ شیزی نے بے اختیار اس کے پیچھے لپکنا چاہا لیکن نائب رئیس نے اس کا راستہ روک لیا۔ وہ سسک پڑی اور روتی ہوئی اپنے ساتھیوں کے ساتھ واپس مڑ گئی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے آج ایک بار پھر اس کی گود اجڑ گئی ہے۔

اباقہ کے ساتھ اس کا وفادار دستہ بھی تھا۔ اس کے علاوہ اسد' یورق' علی اور شیزی کولت بھی اس قافلے میں شامل تھے۔ وہ گھوڑوں پر سوار قصبے سے نکلے اور ایک طویل چکر کاٹ کر مغربی جانب کے ٹیلوں میں روپوش ہو گئے۔ وہ رات انہوں نے ان ٹیلوں میں گزاری۔ دوسرے روز علی الصبح وہ اٹھ گئے۔ سپیدہ سحر نمودار ہونے کے ساتھ ہی انہوں نے مشرق کی جانب دھوئیں کے بادل دیکھے۔ ان کی آنکھوں میں پریشانی اتر آئی۔ یقیناً اہل قصبہ تباہی سے دوچار ہو چکے تھے۔ اباقہ اور اسد نے گھوڑوں پر زینیں ڈالیں اور قصبے کا حال احوال دریافت کرنے کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ کوئی چھ کوس چل کر وہ قصبے میں پہنچے اور ان کے دل رنج و غم کے اتھاہ سمندر میں ڈوب گئے۔ قصبہ ملیامیٹ ہو چکا تھا۔ گلیاں اور بازار لاشوں سے پٹے ہوئے تھے۔ کئی مقامات پر خون کے تالاب بن چکے تھے۔ ایک ایسے تالاب میں انہوں نے ننھے رئیس ویزلی اور نائب رئیس کی لاشیں دیکھیں۔ قصبے کے بیشتر مکانوں کی طرح گرجا بھی جل کر خاکستر ہو چکا تھا اور گرجے کے عین سامنے کٹے ہوئے انسانی سروں کا ایک بہت بڑا مینار نظر آرہا تھا۔ اس مینار میں جہاں اباقہ کو بہت سے

شناسا چہرے نظر آئے وہاں یوسق کے خادم مداری گر ارغون کا چہرہ بھی دکھائی دیا۔ اتفاقاً وہ مینار کی چوٹی پر رکھا ہوا تھا اور یوں لگتا تھا جیسے وہ مرنے کے بعد بھی کوئی کرتب دکھا رہا ہے .... آثار سے دکھائی دیتا تھا کہ شاید قصبے کا ایک متنفس بھی زندہ نہیں بچا۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ظاہر ہو رہا تھا کہ منگولوں کو اس جنگ میں زبردست نقصان اٹھانا پڑا ہے اور قصبے کے بہادر باشندوں نے آخر دم تک لڑائی کی ہے۔ قصبے کے ایک چورا ہے میں ایک ہموار پتھر پر کسی پڑھے لکھے منگول نے خون میں انگلی ڈبو کر لکھ دیا تھا "بلاؤں کا شہر" (تاریخ بتاتی ہے کہ اپنے زبردست جانی نقصان کے سبب منگول اس قصبے کو The Evil City کا نام دینے پر مجبور ہو گئے تھے) قصبے کے پُرحسرت دورے کے دوران اباقہ اور اسد کو صرف چند افراد زندہ ملے لیکن یہ سب کے سب شدید زخمی تھے۔ ان میں دو منگول اور چار روسی تھے۔ ان منگولوں سے اباقہ اور اسد نے کچھ دیر گفتگو کی۔ ان کی باتوں سے معلوم ہوا کہ اس قصبے کی مسلسل اور سخت مزاحمت نے منگول لشکر کی کمر توڑ دی ہے۔ وہ کمزور اور نڈھال تو پہلے ہی سے تھے اب بددل بھی ہو چکے تھے۔ ان میں سے اکثر زخمی اور بیمار ہیں لہٰذا سپہ سالار باتو خان نے جنوب کی طرف واپسی کا فیصلہ کیا ہے۔ (اور واقعی منگولوں کی خستہ جانی کا یہ عالم ہو چکا تھا کہ اس لڑائی کے بعد انہوں نے برباد شدہ وسط ایشیا کو چھوڑا اور جنوبی دشت کی چراگاہوں کی طرف کوچ کر گئے۔ یہاں وہ کافی عرصہ مقیم رہنے کے بعد 1239ء میں دوبارہ نمودار ہوئے۔ اس دفعہ ان کا رخ جنوبی روس کے وسطی علاقے کی طرف تھا۔)

☆--------☆--------☆

اباقہ اور اسد اپنے پڑاؤ میں واپس پہنچے۔ دو روز انہوں نے اسی مقام پر قیام کیا۔ اچھی طرح ستانے کے بعد وہ آئندہ کا لائحہ عمل ترتیب دینے میں مصروف ہو گئے۔ منگول چونکہ اب جنوبی دشت کی طرف جا چکے تھے اس لیے مستقبل قریب میں ان سے مڈبھیڑ کا کوئی امکان نہیں تھا۔ دوسری طرف بغداد کی طرف سے متضاد خبریں آ رہی تھیں۔ کچھ اطلاعات سے پتہ چلتا تھا کہ منگول فاتحین امت مسلمہ پر کاری ضرب لگانے کے لیے دارالخلافہ پر حملہ کرنے والے ہیں۔ اس سلسلے میں نمایاں نقل و حرکت بھی دیکھنے میں آ رہی تھی۔

کافی سوچ بچار اور غور و خوض کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ وہ اب عراق واپس جائیں گے۔ اس فیصلے کی بازگشت اباقہ کے کانوں میں خوش آواز گھنٹیوں کی طرح گونج اٹھی۔ "عراق .... عراق .... عراق۔" اس کے جسم کا رواں رواں پکار اٹھا۔ اچانک اسے

ایسا محسوس ہوا کہ جنوب سے آنے والی ہوائیں الہڑ دوشیزاؤں کی طرح مچل اٹھی ہیں۔ اونچے دیوداروں کے پیڑ، چیڑ کے خوشنما پتے، لمبی لمبی سبز گھاس سب کچھ خوشی سے جھومنے لگا۔ اس نے دور افق کی طرف دیکھا اور ایکا ایکی اس کا دل مارینا کو چھونے کے لیے بے قرار ہو گیا .... کہاں اس نے مارینا کے بغیر مہینوں گزار دیے تھے اور کہاں اسے آغاز سفر سے پہلے کی یہ چند گھڑیاں بھی دشوار محسوس ہو رہی تھیں۔ آخر یہ چند گھڑیاں بھی گزر گئیں اور سرحد عراق کی طرف ان کا طویل اور دشوار گزار سفر شروع ہوا۔

منزلوں پر منزلیں مارتے اور راستے کی دشواریوں پر قابو پاتے وہ آگے بڑھتے رہے۔ روس کی سرزمین، اس کے شہر اس کے گاؤں اب پیچھے رہتے جا رہے تھے لیکن کچھ یادیں ان کے ساتھ ساتھ چلی جا رہی تھیں، ان یادوں میں ایک یاد طوطم خان کی تھی جو باتو خان کا سر حاصل کرنے ان کے ساتھ روانہ ہوا تھا مگر اب اس کی لاش دلادی میر اور دریائے سیت کے درمیان ایک خاموش برفستان میں دبی پڑی تھی۔ ان میں سے ایک یاد رئیس اعظم یوری کی تھی۔ جس کا سربریدہ لاشا وہ سیت کے کنارے چھوڑ آئے تھے اور ان یادوں میں ایک یاد نتاشا کی تھی۔ نتاشا......... پھولوں کی طرح شگفتہ اور سربلند پہاڑوں کی طرح باوقار تھی۔ جس کی کنواری ہنسی میں جھرنے گنگناتے تھے اور جس کی فراخ جبیں پر آفتاب طلوع رہتا تھا۔ وہ اپنی ناتمام آرزوؤں کے ساتھ کوزل سک کے نواح میں ایک گھنے پیڑ کے تلے ابدی نیند سو رہی تھی .... ہاں یہ ساری یادیں ان کے ساتھ ساتھ آ رہی تھیں اور وہ جانتے تھے زندگی بھر وہ ان سے دامن نہ چھڑا سکیں گے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ انہیں آگے بڑھنا ہے۔ زندگی کا سفر مدام جاری رہتا ہے اور یادوں کا بار گراں اٹھائے انہیں بھی یہ سفر جاری رکھنا تھا۔

☆--------☆--------☆

وہ ایک سرمئی شام تھی۔ افق پر لال کناروں والے بادلوں کے ٹکڑے تیر رہے تھے۔ نیم گرم ہوا میں پرندوں کی چہکار اور پھولوں کی خوشبو شامل تھی۔ مارینا نے سلیمان کے چھ ماہ کے بچے کو نہلایا دھلایا، پھر اسے کپڑے پہنائے اور پالنے میں بٹھا کر پالنا دھوپ میں رکھ دیا۔ پھر وہ بڑی محبت سے اس کی آنکھوں میں سرمہ لگا کر اس کے سر پر کنگھی کرنے لگی۔ بچہ اس کے کان کا جھمکا کھینچنے کی کوشش میں قلقاریاں مار رہا تھا۔

نبیلہ سبزی فروش کی طرف گئی ہوئی تھی جبکہ سلیمان ابھی کام سے واپس نہیں آیا تھا، وہ کھجوروں کے ایک باغ میں نگران کا کام کرتا تھا۔ دفعتاً صحن کا دروازہ کھلا اور نبیلہ بھاگتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ مارینا چونک کر کھڑی ہو گئی۔ نبیلہ جھپٹ کر مارینا سے بغلگیر

ہو گئی اور پٹ سے اس کے گال کا ایک بوسہ لیا۔ مارینا حیرت سے گنگ ہو رہی تھی۔ نبیلہ نے اسے چھوڑا اور چیختے ہوئے بولی۔ "آپا! دولہا بھائی آ گئے۔" مارینا کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ نبیلہ پھر چیخی "آپا! اباقہ بھائی جان آ گئے۔ میں خود انھیں دیکھ کر آ رہی ہوں۔"

مارینا نے ناگواری سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ پہلے بھی ایک دوبار اسی انداز میں اسے پریشان کر چکی تھی۔ ایک بار تو مارینا اس سے ناراض ہو گئی تھی۔

مارینا نے دل سنبھالتے ہوئے کہا۔ "آج پھر شرارت سوجھ رہی ہے۔"

نبیلہ نے کہا۔ "خدا کی قسم' قرآن کی قسم' میں سچ کہہ رہی ہوں۔" اس وقت مارینا کی نگاہ سلیمان پر پڑی وہ ابھی اندر آیا تھا۔ اس کا چہرہ بھی مسرت سے گلنار ہو رہا تھا۔ وہ بولا۔ "مبارک ہو بہن!........."

مارینا نے اس سے آگے کچھ نہیں سنا' وہ سن ہی نہیں سکی۔ اس کا دل اچانک بلیوں اچھلنے لگا تھا اور شرم نے اس کا چہرہ سرخ کر دیا تھا۔ وہ مڑی اور تیز قدموں سے کمرے میں گھس گئی۔ ذرا ہی دیر بعد اسے گھر سے باہر گھوڑوں کی آہٹ سنائی دی۔ پھر صحن کا دروازہ کھلا اور سلیمان' اسد کے ساتھ اندر داخل ہوا' مارینا دروازے کی جھری سے سب کو دیکھ رہی تھی۔ اسد کے پیچھے ایک دبلا پتلا نو عمر بچہ تھا۔ اس کے پیچھے وہ شخص تھا جس کی راہ میں مارینا نے ایک مدت سے آنکھیں بچھا رکھی تھیں۔ لمبا چوڑا اباقہ سر جھکا کر دروازے سے اندر داخل ہوا۔ مارینا کا دل بے قابو ہونے لگا۔ اس نے ایک نظر اباقہ کو دیکھا پھر جا کر اپنے بستر پر گر گئی۔ باہر سے باتوں کی آوازیں آتی رہیں۔ تب دروازے پر نبیلہ کی تیز دستک ہوئی۔ پھر اس کی چیختی ہوئی آواز آئی۔

"آپا! باہر آؤ۔ بھائی جان اباقہ بے چین ہو رہے ہیں۔" مارینا نے نبیلہ کو دل ہی دل میں صلواتیں سنائیں۔ اسے کچھ جواب بن نہیں پڑ رہا تھا۔ ایک تو اس نے کمرے میں گھس غلطی کی تھی دوسرے یہ نبیلہ کی بچی بک بک کر کے سب کو اس کی طرف متوجہ کر رہی تھی۔ "آتی ہوں۔" مارینا نے مری مری آواز میں جواب دیا۔ پھر باہر نکلنے کے لیے حوصلہ جمع کرنے لگی۔ کتنی عجیب بات تھی جس گھڑی کے انتظار میں اس نے ایک ایک پل گن کر گزارا تھا۔ وہ گھڑی آئی تھی تو اس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔

"آپا جی! شکرانے کے نوافل بعد میں پڑھ لینا پہلے ان سے مل تو لو۔" نبیلہ نے دوبارہ آواز لگائی۔ مارینا ہونٹ کاٹ کر رہ گئی۔ پھر اس نے ایک اچٹتی سی نظر آئینے پر ڈالی۔ آنچل درست کیا اور خود کو حتی الامکان پر سکون اور باوقار بناتی ہوئی باہر نکل آئی۔

"السلام علیکم.........." اس نے مشترکہ سلام کہی۔ اسد نے چند قدم آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگا لیا۔ یورق نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر بزرگانہ دعا دی۔ مارینا نے کن انکھیوں سے اباقہ کی طرف دیکھا۔ وہ ایسے والہانہ انداز میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا کہ اسے پھر جھینپنا پڑ گیا۔ گھبراہٹ چھپانے کے لیے وہ علی کی طرف متوجہ ہو گئی۔ اس کے گالوں کو سہلاتی ہوئی بولی۔ "کتنا پیارا بچہ ہے۔ کیا نام ہے تمہارا۔"

"علی۔" علی نے مختصر جواب دیا۔

اسد نے کہا۔ "جنگ میں یہ بے چارہ تنہا رہ گیا ہے۔ اس لیے ہم ساتھ لے آئے ہیں۔"

نبیلہ نے گفتگو کا رخ مڑتے دیکھا تو پھر بات اباقہ اور مارینا پر لے آئی۔ ہاتھ نچا کر بولی۔ "ذرا اباقہ بھائی جان کو دیکھئے' ایسے بیٹھے ہیں جیسے چور کوتوالی میں بیٹھا ہوتا ہے۔ اجی کچھ فرمایئے کیوں اتنے شرمسار ہیں آپ؟"

اباقہ بولا۔ "کون شرمسار ہے؟ میں تو نہیں۔"

نبیلہ نے فوراً بات سے بات نکالی۔ "ہاں.......... آپ کیوں شرمسار ہوں گے' شرم تو آپ کو چھو کر نہیں گزری۔ توبہ میری یا اللہ۔ شادی سے پہلے آپا کو اس طرح گھور رہے ہیں تو بعد میں کیسے گھوریں گے۔"

مارینا کی پلکیں بے اختیار جھکنے لگیں۔ اباقہ بغلیں جھانک کر رہ گیا۔ سلیمان نے ان دونوں کی جان چھڑاتے ہوئے کہا۔ "میں سمجھتا تھا کہ ماں بن جاؤ گی تو زبان کی تیزی کچھ کم ہو جائے گی لیکن یہاں تو الٹا اثر ہو رہا ہے مجھے آئندہ کی حکمت عملی پر نظرثانی کرنی ہو گی۔"

اس دفعہ باری نبیلہ کے شرمانے کی تھی۔ وہ گھور کر سلیمان کو دیکھنے لگی۔ موقع غنیمت جان کر مارینا نے علی کو گود میں اٹھا لیا اور دھیمے لہجے میں اس سے باتیں کرنے لگی۔ علی شرمیلے انداز میں مارینا کے جھمکے سے کھیل رہا تھا۔ کچھ دیر اس میں گول گول انگلی گھماتا رہا۔ پھر بولا۔

"بھائی جان اباقہ! ان کے بندے بالکل شہزادی نتاشا جیسے ہیں۔"

"یہ شہزادی نتاشا کون ہے جی؟" نبیلہ نے تڑاخ سے سوال کیا۔

یکایک اباقہ کے چہرے پر تاریکی سی پھیل گئی۔ اسد اور یورق کے چہروں کو بھی گہری سنجیدگی نے ڈھانپ لیا۔ مارینا اور نبیلہ حیرت سے تاثرات کی یہ تبدیلی دیکھ رہی تھیں۔ نبیلہ نے گھور کر اباقہ کو دیکھا اور کہنے لگی۔ "بھائی جان! آپ تو یوں گھبرا گئے ہیں

جیسے ہم نے آپ کی کوئی چوری پکڑ لی ہو۔"

اس وقت اس کے بلند قہقہے نے سب کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ وہ خوشدلی سے بولا۔ "آپ ہم لوگوں کو کچھ کھلائیں پلائیں گے بھی یا یونہی کوتوالوں کی طرح ڈانٹتے رہیں گے۔"

نبیلہ نے کہا۔ "لیکن .... اسد بھائی یہ نتاشا تھی کون؟"

اسد سنجیدہ ہوتا ہوا بولا۔ "تھی ایک بیچاری لڑکی۔ اس کے بارے میں بھی آپ کو بتائیں گے۔ فی الحال آپ ذرا ہم سے ہلکی پھلکی باتیں کریں۔ سفر کی تھکان اتارنے کے لئے اگر آج سلیمان اور نبیلہ کے درمیان لطیفے بازی کا مقابلہ ہو جائے تو مناسب ہے۔"

نبیلہ آنکھیں مٹکا کر بولی۔ "اسد بھائی! آپ بڑے چالاک ہیں۔ بات ٹالنا تو کوئی آپ سے سیکھے۔" پھر اچانک نبیلہ کی نظر شیزری کولت پر پڑی۔ وہ اس ساری گفتگو کے دوران خاموشی سے اباقہ کے قریب بیٹھی رہی تھی۔ اس نے سلیمان کے بچے قاسم کو گود میں اٹھا رکھا تھا اور اسے ہنسانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسے فارسی کم آتی تھی اس لئے وہ ان کی بات چیت کی طرف زیادہ توجہ نہیں دے رہی تھی۔ نبیلہ نے کہا۔ "یہ کون ذات شریف ہیں؟"

اسد نے کہا۔ "یہ بھی ایک بے سہارا لڑکی ہے۔ اس کا شوہر' بچے ماں باپ سب منگولوں کے ساتھ جنگ میں مارے گئے ہیں۔ بڑی ہمت کی مالک ہے۔ ہر مشکل وقت میں ہمارے ساتھ رہی ہے۔ دریائے سیت کے کنارے لڑی جانے والی جنگ میں یہ منگول سپاہیوں سے بچنے کے لئے یخ بستہ دریا میں کود گئی تھی۔ یورق نے خود کو خطرے میں ڈال کر اس کی جان بچائی۔ بعد میں اس نے بھی ہر طرح ہم سے حق دوستی نبھایا۔" اسد نے شیزری کولت کے متعلق تمام چیدہ چیدہ واقعات نبیلہ اور مارینا کو بتائے۔ اس جرأت مند روسی لڑکی کے حالات زندگی نے ان دونوں کو بہت متاثر کیا۔ وہ گھل مل کر شیزری سے باتیں کرنے لگیں۔

یورق نے انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔ "بھائیو! یہاں تو تین زنانہ زبانیں حرکت میں آ گئی ہیں لہٰذا اپنے کانوں کو قید بامشقت سے محفوظ رکھنے کے لئے میں تو یہاں سے چلا۔ آپ کو بھی مخلصانہ مشورہ ہے کہ اپنی سماعت پر رحم فرماتے ہوئے کان لپیٹ کر یہاں سے نکل چلیں۔"

نبیلہ نے بھڑک کر کہا۔ "آپ کیوں جاتے ہیں۔ ہم ہی چلی جاتی ہیں' بلکہ اگر آپ کا حکم ہو تو گھر سے باہر ہی چلی جاتی ہیں۔ پھر آپ مطبخ میں چلے جایئے گا اور وہ مرغیاں جو

میں چولہے پر چڑھا آئی ہوں خود ہی کھا لیجئے گا۔"

"ہم .... مرغیاں۔" یورق نے تھوک نگل کر کہا۔ نبیلہ کے ہاتھ کی بھنی ہوئی مرغی پر تو وہ سب کچھ قربان کر سکتا تھا۔ فوراً ریشہ خطمی ہوتے ہوئے بولا۔ "ارے بھئی' خفا کیوں ہوتی ہو۔ اگر کوئی بات ہمارے سننے والی ہے تو ہم نہیں جاتے' یہیں بیٹھے رہتے ہیں۔"

نبیلہ نے ہاتھ نچا کر کہا۔ "جی نہیں۔ آپ شوق سے جایئے۔ یہاں ہم بھنی ہوئی مرغیوں اور بطخوں کی باتیں نہیں کرنے والے۔ کوئی کام کی بات ہی کریں گے جو آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گی۔"

یورق نے کہا۔ "مرغی کھانے سے پہلے' میں تمہیں جواب دینے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ لہٰذا جا رہا ہوں۔"

یورق کی اس عیارانہ پسپائی پر سارے دل کھول کر ہنس دیئے۔ یورق کے جانے کے بعد اباقہ اور اسد بھی اٹھ گئے۔ کمرے میں پہنچ کر اسد نے اباقہ سے کہا۔

"اگر میں بات نہ ٹالتا تو بڑی گڑبڑ ہو جاتی۔ علی تو بیچ چوراہے میں تمہاری شادی کا بھانڈا پھوڑنے لگا تھا۔"

اباقہ پریشانی سے بولا۔ "اب کیا کیا جائے؟"

اسد بولا۔ "میں ابھی علی کو ایک طرف لے جا کر سمجھا دیتا ہوں کہ وہ ابھی نتاشا کے بارے میں کسی کے سوال کا جواب نہ دے۔ ایک آدھ روز میں' میں خود مارینا کو آرام سے سب کچھ بتا دوں گا۔"

اباقہ نے کہا۔ "اسد! اس معاملے کو اب تم نے ہی سنبھالنا ہے۔"

اسد نے کہا۔ "تم بے فکر رہو .... سب ٹھیک ہو جائے گا۔" مگر پھر یہ ہوا کہ اسی رات اسد کو بلخ جانا پڑ گیا۔ درحقیقت پچھلے دو ماہ سے اسد کی بیوی ہاجرہ سخت بیمار تھی۔ سلیمان اور نبیلہ وغیرہ کو اس کا علم تھا' مگر انہوں نے اسد کو فوری طور پر یہ اطلاع دینا مناسب نہیں سمجھا۔ رات کے کھانے کے بعد سلیمان نے اسد کو یہ خبر سنائی۔ ان کا خیال تھا کہ اسد صبح روانہ ہو گا مگر اپنی محبوب رفیقہء حیات کی علالت نے اسے اتنا پریشان کیا کہ وہ اسی وقت بلخ کے قصد سے روانہ ہو گیا۔

☆======☆======☆

اباقہ اور یورق وغیرہ کو روسی مہم سے واپس آئے آٹھ دس روز ہو چکے تھے۔ ان دنوں میں انہوں نے آرام کے سوا اور کچھ نہیں کیا۔ دیہات کی خالص آب و ہوا نے ان

کی صحتوں پر اچھا اثر ڈالا تھا۔ رہی سہی کسر نبیلہ اور مارینا کے پُر تکلف کھانوں نے پوری کر دی تھی۔ ان کے زرد چہروں کی سرخی واپس آ گئی تھی۔ چھوٹے موٹے زخم مندمل ہو گئے تھے۔ علی کی پتلی پتلی ٹانگوں میں بھی کچھ جان پڑنے لگی تھی۔ شیزی کولت اس ماحول میں بہت خوش تھی۔ وہ نبیلہ اور مارینا سے مقامی کھانے پکانا سیکھ رہی تھی۔ فارغ وقت میں وہ تین گہری سہیلیوں کی طرح بیٹھ کے باتیں کرتیں۔ سلیمان صبح سویرے اپنے کام پر نکل جاتا۔ جب دن خوب چڑھ آتا تو اباقہ اور یورق گھوڑوں پر بیٹھ کر کھیتوں کی طرف نکل جاتے۔ گاؤں والوں کو بس اتنا ہی معلوم تھا کہ سلیمان کے گھر کچھ دور کے مہمان ٹھہرے ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ اباقہ یورق اور علی کے متعلق کچھ نہیں جانتے تھے۔ انہوں نے بھی گاؤں والوں سے گھلنے ملنے کی کوشش نہیں کی اور یہی ان کے حق میں بہتر تھا۔ اباقہ جانتا تھا کہ اگر لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ بغداد کے اعلیٰ حکام کو یرغمال بنانے والا اور شہر کے طول و عرض میں خونریزی کرنے والا اباقہ نزدیک کے ایک گاؤں میں موجود ہے تو وہ اس سے انتقام لینے کے لئے سراپا آگ بن جائے۔ ان کی وہ تلواریں جو منگولوں کے خوف سے میانوں میں گھسی پڑی تھیں' نکل آتیں اور اباقہ کا خون اچھالنے کے لئے گلی کوچوں میں نکل آتیں۔ خلافت عباسیہ کی یہ اندھی اور بے حس تلواریں کبھی نہ دیکھ سکتیں کہ یہ وہ شخص ہے جو ان کے دشمنوں کا سب سے خوفناک دشمن ہے۔ وہ ان سے چین' روس اور قراقرم کی وسعتوں میں برسرپیکار رہا ہے۔ اسلام کا جھنڈا ہاتھ میں اٹھائے اور لبوں پر نعرہ تکبیر سجائے وہ ملک ملک اور قوم قوم ان کی مزاحمت کرتا رہا ہے اور آج اس کا نام ایک گمنام مسلمان مجاہد کے طور پر قراقرم کے ایوانوں سے لے کر وسطی روس کی فصیلوں تک گونج رہا ہے۔ اہل بغداد کی یہ اندھی تلواریں کبھی نہ جان سکتیں کہ جس گردن کو وہ کاٹ رہی ہیں وہ لوہے کی نہیں پھولوں کے ہاروں کی مستحق تھی۔ یہ شخص راہوں میں آنکھیں بچھائے جانے اور کندھوں پر اٹھائے جانے کا اہل تھا۔

اباقہ اہل بغداد کی نادانیوں کو سمجھتا تھا۔ لہٰذا وہ بغداد کی طرف جانے کا تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔ اگر وہ کبھی یورق کے ساتھ گاؤں سے نکلتا تھا تو کھیتوں میں گھوم پھر کر واپس آ جاتا تھا یا کبھی کبھی سرحدی علاقے کے گھنے جنگل کی طرف چلا جاتا تھا۔ یہاں درختوں کے ایک ذخیرے میں ان ڈھائی سو سپاہیوں نے پڑاؤ ڈال رکھا تھا جو اباقہ کے ساتھ ہی روس سے یہاں پہنچے تھے۔ اباقہ چونکہ انہیں گاؤں نہیں لے جا سکتا تھا اس لئے ان کے قیام و طعام کا بندوبست یہیں کر دیا گیا تھا۔

ایک روز اباقہ اپنے سپاہیوں سے مل کر اکیلا ہی واپس آ رہا تھا۔ گھر کے قریب پہنچ کر

اس نے ایک سریلی آواز سنی اور رک گیا۔ یہ آواز زیتون کے درختوں سے آئی تھی۔ اباقہ نے اپنا گھوڑا ادھر موڑا اور جلد ہی مارینا کو ایک جگہ تنہا کھڑے پایا۔ دیہاتی عورت کے سادہ لباس نے اس کے حسن کو کچھ اور بھڑکا دیا تھا۔ موٹی اوڑھنی کو بے تکلفی سے گلے میں ڈالے وہ اس طرح کھڑی تھی کہ ایک مور اس کی بغل میں تھا اور مورنی کو ڈھونڈنے کے لئے وہ آوازیں دے رہی تھی۔ موروں کا یہ جوڑا سلیمان نے گھر میں رکھا ہوا تھا۔ سارا دن یہ پرندے اِدھر اُدھر گھومتے رہتے تھے اور شام کو انہیں گھر میں بند کر لیا جاتا تھا۔ اس وقت شام ہونے کو تھی اور مارینا غالباً انہیں گھر لے جانے آئی تھی۔ اباقہ کو اس طرح اپنے سامنے کھڑا پا کر حیا کا رنگ اس کے چہرے پر بکھر گیا۔ اباقہ گھوڑے سے اتر کر اس کے قریب چلا آیا۔

ابھی وہ کوئی بات بھی نہ کرنے پایا تھا کہ درختوں سے آواز آئی۔

"ٹھیک ہے .... میں بالکل نہیں دیکھ رہی۔" اباقہ اور مارینا نے چونک کر دیکھا۔ نبیلہ دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھے شرارت سے مسکرا رہی تھی۔

مارینا نے صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔ "یہ تو ابھی آئے ہیں۔"

نبیلہ بولی۔ "لیکن ابھی جائیں گے نہیں۔ کافی دیر یہاں رکیں گے۔ لہٰذا آپا جان! تم یہ مور مجھے دے دو تاکہ میں تو گھر جاؤں۔"

مارینا بولی۔ "اتنی جلدی کیوں کرتی ہو۔ مورنی کو نہیں ڈھونڈو گی۔"

نبیلہ شوخی سے بولی۔ "مور مل گیا ہے' مورنی اسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے خود ہی پہنچ جائے گی۔"

مارینا نے اسے مور لے کر واپس جاتے دیکھا تو گھبرا کر بولی۔ "ٹھہرو' میں بھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔"

نبیلہ بولی۔ "میں یہاں زیادہ دیر آنکھیں بند کئے کھڑی نہیں رہ سکتی۔ اس لئے مجھے تو معاف ہی رکھو' میں جا رہی ہوں۔"

اس سے پہلے کہ مارینا کچھ کہتی وہ ہرنی کی طرح قلانچیں بھرتی درختوں میں غائب ہو گئی۔

"نبیلہ!" مارینا نے آخری کوشش کے طور پر آواز دی۔

"میرا منا رو رہا ہے۔" درختوں سے آواز آئی۔

اباقہ اس کی تیزی پر مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ پھر مارینا کی جھکی پلکوں کو دیکھتا ہوا بولا۔

"مارینا! تم مجھ سے کچھ کچھی کچھی رہتی ہو۔"

ماریتا نے جب دیکھا کہ اب تو پھنس ہی گئی ہے تو کچھ شوخ ہوتے ہوئے بولی۔ ”ایسا ضروری ہوتا ہے۔“

اباقہ اس کی بات سمجھتا ہوا بولا۔ ”یہ اسد بھی نہ جانے کہاں جا کر بیٹھ گیا ہے۔ آئے تو کچھ انتظام وغیرہ ہو .... ہماری شادی کا۔“

ماریتا نے کہا۔ ”ایسی بھی کیا جلدی ہے۔“

اباقہ اس کے لہجے میں چھپا ہوا ہلکا ہلکا طنز اور درد محسوس کر رہا تھا۔ واقعی انہوں نے ایک ہونے میں بہت دیر کی تھی .... بہت دیر کی تھی۔ ان کے بعد محبت کے سفر کا آغاز کرنے والے ان سے کہیں آگے نکل گئے تھے۔ نہ جانے ایسا کیوں ہوا کہ بارہا وہ اپنی منزل کے قریب پہنچتے پہنچتے رہ گئے تھے۔ ماریتا کے اظہار غم نے اباقہ کو بے قرار کر دیا۔ اس نے بے اختیار ہو کر ماریتا کا گداز ہاتھ تھام لیا۔

ماریتا نے لامبی پلکیں اٹھا کر اباقہ کا چہرہ دیکھا اور جلدی سے پیچھے ہٹتی ہوئی بولی۔ ”وہ جو آنکھیں بند کئے درختوں سے نکلی تھی، درختوں میں جا کر آنکھیں کھول بھی سکتی ہے۔“

اباقہ ٹھٹک کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ نبیلہ نظر تو کہیں نہیں آ رہی تھی مگر یہ بھی ضروری نہیں تھا کہ وہ جا چکی ہو۔ ماریتا کی کھنک دار ہنسی نے فضا میں ایک خوبصورت ارتعاش پیدا کیا۔ وہ موتیوں جیسے دانت چمکا کر بولی۔ ”آپ کی بیماری کی یہی ایک دوا ہے۔“

اباقہ منہ بنا کر بولا۔ ”یہ دوا نہیں خود بیماری ہے ہر جگہ ہر موقع پر چھلاوے کی طرح موجود ہوتی ہے۔ پتہ نہیں سلیمان اس سے کیسے نبھا کرتا ہے۔“

ماریتا ہنسی۔ ”اگر یہ بیماری ہے تو بھی آپ ہی لائے تھے .... خلیج فارس سے۔“

اباقہ بولا۔ ”مجھے تو ڈر ہے یہ کم بخت ہمارے حجلۂ عروسی میں بھی آ ٹپکے گی۔“

ماریتا نے مصنوعی خفگی سے کہا۔ ”دیکھئے اب یہاں ایسی باتیں ہوں گی تو میں چلی جاؤں گی۔“

اباقہ نے کہا۔ ”ٹھیک ہے اگر تم یہاں رہنے کا وعدہ کرو تو میں کوئی بات ہی نہیں کرتا۔“

ماریتا نے کہا۔ ”روسی لڑکیوں نے آپ کو بہت باتیں کرنا سکھا دی ہیں۔“

اباقہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میں نے تو سنا ہے کہ روسی لڑکیاں ایسے موقعوں پر بالکل باتیں نہیں کرتیں۔“

”پھر کیا کرتی ہیں؟“ ماریتا نے خوبصورت حیرانی سے پوچھا۔

جواب میں اباقہ مسکرا کر رہ گیا۔ ماریتا بری طرح جھینپ گئی۔

اسی رات کا ذکر ہے جب گھر میں سب سو گئے تو اباقہ بہ آہستگی اپنے بستر سے اٹھا اور نبیلہ کے کمرے میں جا پہنچا۔ سلیمان اور وہ بچے کو درمیان میں لٹائے گہری نیند سو رہے تھے۔ اباقہ نے نبیلہ کو دو تین بار جھنجھوڑا تو وہ جاگ گئی۔ ساتھ ہی سلیمان بھی بیدار ہو گیا۔ اباقہ نے سلیمان سے کہا کہ وہ بچے کا خیال رکھے اور اباقہ نے نبیلہ سے کہا۔ ”میں تم سے ایک اہم بات کرنا چاہتا ہوں۔“ نبیلہ اباقہ کے ساتھ باہر آ گئی۔ اباقہ اسے صحن میں لے آیا۔ دونوں کھجور کے ایک درخت تلے پتھر کے چبوترے پر بیٹھ گئے۔ اباقہ کافی دیر اپنا حوصلہ جمع کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر بولا۔

”نبیلہ! میں جو بات کہنے لگا ہوں وہ فی الحال تمہارے اور میرے درمیان رہنی چاہئے۔“

نبیلہ نے کہا۔ ”بھائی جان! آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔“

اباقہ بولا۔ ”میں تم سے ایک اہم مشورہ طلب کرنا چاہتا ہوں .... بات یہ ہے کہ .... حالات کے ہاتھوں مجبور ہو کر .... میں نے روس میں شادی کر لی تھی۔“

مدھم چاندنی میں نبیلہ کے چہرے سے لگا جیسے اس پر بجلی گر پڑی ہو۔ وہ حیرت زدہ نگاہوں سے اباقہ کی صورت دیکھ رہی تھی۔ چند لمحے تو اسے یقین ہی نہیں آیا کہ اس کے کان کیا سن رہے ہیں۔ اباقہ اس کے جذبات سمجھتا تھا .... اس لئے دھیرے دھیرے نرمی کے ساتھ اسے ان حالات اور واقعات سے آگاہ کرنے لگا جن میں اسے یہ قدم اٹھانا پڑا۔ دلادی میر کی افواہوں سے لے کر نتاشا کی بدنامی تک اور رئیس اعظم یوری کی منت سماجت سے لے کر اپنے ساتھیوں کی مشکلات تک سب کچھ نبیلہ کو بتایا۔ نبیلہ ساکت بیٹھی گھمبیر خاموشی سے سب کچھ سنتی رہی۔ جب اباقہ نے اپنی بات ختم کی تو نبیلہ کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔ وہ بولی۔

”بھائی جان! یہ سب کیسے ہو گیا۔ آپ نے اتنا بڑا قدم کیونکر اٹھا لیا۔ میں آپ کی مجبوریاں سن چکی ہوں لیکن مجھے سمجھ نہیں آتی کہ آپا یہ خبر کیونکر سن پائے گی۔ بھائی جان! آپ کو کچھ معلوم نہیں آپا آپ سے کتنی محبت کرتی ہیں۔ خدا کی قسم آپ کو کچھ معلوم نہیں۔ وہ آپ کی پرستش کرتی ہیں۔ خدا کی ذات کے بعد وہ آپ پر ایمان رکھتی ہیں۔ میں نے موسم سرما کی طویل راتوں میں انہیں آپ کے نام کا ورد کرتے سنا ہے۔ میں نے صبح کاذب کے وقت مصلے پر بیٹھ کر انہیں طویل دعائیں مانگتے اور روتے دیکھا ہے۔ آپ تو یہاں سے چلے گئے تھے لیکن یہاں جس جس چیز میں آپ اپنی خوشبو چھوڑ گئے تھے وہ آپا کو جان سے پیاری تھی۔ آپ کے پرانے جوتے، آپ کا بوسیدہ لباس اور بے کار ہتھیار، سب

کچھ آپا نے سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔ پہروں کمرہ بند کر کے وہ انہیں دیکھتی رہتی تھیں۔ شاید آپ کو معلوم نہ ہو کہ آپ نے کب کس برتن میں کھانا کھایا تھا مگر آپا کو سب معلوم ہے۔ وہ آج تک آپ کے جھوٹے برتنوں میں کھانا کھاتی رہیں اور ہر نوالے پر آپ کو یاد کرتی رہیں لیکن آپ نے یہ کیا کیا بھائی جان! آپا کے بے پناہ اعتماد کا خون کر دیا۔"

اباقہ نے کہا۔ "نبیلہ! کیا وہ مجھے میری اس مجبوری پر معاف نہیں کر دے گی؟"

نبیلہ نے کہا۔ "بھائی جان! آپا آپ سے محبت نہیں کرتیں، عشق کرتی ہیں اور عشق بڑا ظالم ہوتا ہے۔ محبوب کی مجبوریوں کو نہیں دیکھتا۔ صرف محبوب کو دیکھتا ہے.........."

نبیلہ آگے بھی کچھ کہنا چاہتی تھی، لیکن پھر جھجک گئی اور خاموشی سے آنسو بہانے لگی۔ اس کی آنکھوں میں بے نام اندیشے تھے۔ ایک عورت ہونے کے ناطے وہ دوسری عورت کے درد کو بخوبی سمجھ سکتی تھی اور یہی آگاہی اسے خوفزدہ کر رہی تھی۔

دونوں دیر تک اس بارے میں مشورہ کرتے رہے کہ ماریتا کو اس خبر سے کیونکر آگاہ کیا جائے۔ آخر دونوں اس نتیجے پر پہنچے کہ ماریتا کو یہ اطلاع دینے کے لئے اسد سے مناسب اور کوئی شخص نہیں۔ اسد میں دوسرے کو قائل کرنے کی خوبی تھی اور ماریتا اسد کی بات مانتی بھی تھی۔ وہ اپنے مدبرانہ انداز سے اس واقعے کی شدت کو کم سے کم کر سکتا تھا۔ دونوں نے فیصلہ کیا کہ اسد کے آنے تک اس خبر کو راز رکھا جائے۔

اگلے روز کی بات ہے سلیمان کی روانگی کے بعد جب اباقہ اور یورق بھی گھومنے پھرنے نکل گئے تو ماریتا اس کمرے میں پہنچی جہاں اباقہ یورق اور شیزی کولت کا سامان رکھا تھا۔ اباقہ کی خرجین کھول کر ماریتا اس میں سے استعمال شدہ لباس اور دوسری اشیاء نکالنے لگی۔ وہ چاہتی تھی کہ کارآمد اشیاء رکھ کر باقی فالتو چیزیں پھینک دے یا کسی مستحق شخص کو دے ڈالے۔ اباقہ کی خرجین سے اس نے ایک جوڑا برفانی جوتے، دو بوسیدہ صدریاں، ایک پھٹا ہوا کمبل، ایک زنگ آلود خنجر اور چند ٹوٹے ہوئے تیر نکالے۔ اس کے علاوہ سینے پرونے اور مرہم پٹی کا کچھ ناقابل استعمال سامان بھی تھا۔ ماریتا نے اچھی طرح دیکھنے بھالنے کے بعد نتیجہ اخذ کیا کہ کمبل اور بوسیدہ صدریاں اباقہ کے استعمال کی نہیں لہٰذا وہ کسی کو دے دینی چاہئیں۔ اس نے سوچا کہ کل سلیمان جب کام پر روانہ ہوگا تو وہ یہ چیزیں اسے تھما دے گی تاکہ وہ کسی ضرورتمند کو دے ڈالے۔ اچانک ماریتا نے سوچا کہ صدریوں کو دیکھ لینا چاہئے کہیں ان میں کوئی چیز نہ رہ گئی ہو۔ اس نے صدریوں کی جیبیں ٹٹولیں تو ایک جیب میں سے تہہ کیا ہوا ایک کاغذ برآمد ہوا۔ اس کاغذ پر خون کے دھبے موجود تھے۔ ماریتا بے خیالی میں کاغذ کھول کر دیکھنے لگی۔ نبیلہ نے اسے تھوڑی بہت فارسی پڑھا دی تھی

اور اب وہ خوشخط لکھی ہوئی تحریر معمولی کوشش سے پڑھ سکتی تھی۔

اس کاغذ پر جو کچھ لکھا تھا وہ پڑھنے میں ماریتا کو بہت دشواری پیش آئی مگر جوں جوں وہ پڑھتی گئی اس کا رنگ زرد ہوتا چلا گیا۔ ایک عجیب سا خوف اس کی آنکھوں سے جھانکنے لگا۔ تحریر کی آخری سطور کچھ یوں تھی۔

.... اے آوارہ بادلو! اے کلی کلی منڈلانے والے بھنورو! اے دل پھینک پروانو! اور اے پہاڑوں کی نادان شہزادیو! وہ میرا ہے صرف میرا۔ اس کے دل اور اس کی روح میں میرا آشیانہ ہے اور میری جان اور میری روح میں اس کا بسیرا ہے۔ اگر تم سب اسے دیکھنا چاہتے ہو تو میری آنکھوں سے دیکھو.......... صرف میری آنکھوں سے۔

آخر میں "نتاشا" لکھا تھا۔ یہ نام پڑھ کر ماریتا کے ذہن میں ان گنت وسوسے سر اٹھانے لگے۔ وہ یہ نام اس سے پیشتر بھی سن چکی تھی۔ چند روز پہلے علی نے یہ نام لیا تھا اور نبیلہ نے اباقہ سے پوچھا تھا کہ یہ عورت کون ہے تو اسد نے فوراً بات ٹال دی تھی۔ اب وہ سارا واقعہ ماریتا کے ذہن میں تازہ ہو رہا تھا۔ ماریتا نے کمرے کے دریچے سے باہر جھانکا۔ یہ دریچہ مکان کے پہلو میں کھلتا تھا اور یہاں سے کھیتوں کے مناظر صاف دیکھے جا سکتے تھے۔ زیتون کے درخت تلے علی جھولا جھولنے میں مصروف تھا۔ ماریتا نے دریچے سے آواز دے کر اسے اندر بلا لیا۔ ذرا ہی دیر بعد وہ اچھلتا کودتا اندر چلا گیا۔ ماریتا نے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیریں اور نرمی سے کہا۔

"علی، کیا تم مجھے نتاشا کے بارے کچھ بتاؤ گے۔"

علی چونکا پھر یکایک اس نے اپنے ہونٹ مضبوطی سے بند کر لئے اور نفی میں سر ہلانے لگا۔ اس کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ کسی نے اسے نتاشا کا ذکر کرنے سے منع کر رکھا ہے۔ ماریتا کا چہرہ غم کے اتھاہ سمندر میں ڈوب گیا۔ وہ خالی خالی اداس نظروں سے علی کو دیکھتی چلی گئی۔ علی نے اس کی اداسی اور ناراضگی کو محسوس کیا اور کچھ پریشان سا ہو گیا۔ جھٹ اپنی قبا کے اندر سے اس نے سمرقند کا شیریں سیب نکالا اور ماریتا کے ہونٹوں سے مس کرتا ہوا بولا۔

"آپا! یہ سیب کھائیں۔ سلیمان بھائی جان نے لا کر دیا تھا۔"

ماریتا نے آہستگی سے سیب پیچھے ہٹا دیا۔ ہوشیار علی سمجھ گیا کہ اس نے اپنے جواب سے ماریتا کو صدمہ پہنچایا ہے۔ کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا۔

"آپا جان! آپ خفا نہ ہوں۔ میں آپ کو بتا دیتا ہوں لیکن اسد بھائی جان کو بالکل نہ بتانا کہ میں نے آپ کو بتایا تھا۔" ماریتا خاموشی سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ علی نے

زبردستی مارینا کی گود میں گھستے ہوئے کہا۔ "شہزادی نتاشا بڑی خوبصورت تھیں اتنی ساری کہ بہت ہی پیاری۔ اباقہ بھائی جان نے ان سے شادی کی تھی۔ اس شادی میں' میں نے بڑے مزے مزے کے پکوان کھائے تھے۔ میں ہر روز شہزادی نتاشا اور بھائی جان اباقہ کے ساتھ ان کے خیمے میں سوتا تھا۔ دونوں مجھ سے بڑا پیار کرتے تھے .... لیکن ایک روز کسی نے شہزادی کو تلوار سے مار ڈالا۔ اس روز اباقہ بھائی جان بہت روئے تھے اور میں بھی بہت رویا تھا اور ہم سب بہت روئے تھے۔ پھر اباقہ بھائی جان نے اپنی تلوار کا نیام توڑ کر پھینک دیا تھا اور اس وقت تک کھانا نہیں کھایا تھا جب تک شہزادی کو مارنے والے کی جان نہیں لے لی تھی۔"

مارینا سکتے کے عالم میں یہ سب کچھ سن رہی تھی۔ علی بہت دیر نتاشا کی خوبیاں بیان کرتا رہا۔ اس کی بات ختم ہوئی تو مارینا لرزاں لہجے میں بولی۔

"علی! تمہیں دھوکا ہوا ہو گا۔ تمہارے بھائی جان نے اس عورت سے شادی نہیں کی ہو گی۔ وہ ایسے ہی تمہارے ساتھ سفر کر رہی ہو گی۔"

علی نے کہا۔ "نہیں آپا جان! مجھے معلوم ہے شادی کیسے ہوتی ہے۔ دولہا اور دلہن چمکدار کپڑے پہنتے ہیں۔ دلہن چہرے پر غازہ لگاتی ہے۔ سرخی لگاتی ہے اور زیور پہنتی ہے۔ لوگ ان دونوں کو مبارکباد دیتے ہیں۔ پھر ان کا کمرہ پھولوں اور رنگوں سے خوب خوب سجایا جاتا ہے اور وہ دونوں رات کو اس کمرے میں اکٹھے سوتے ہیں۔"

مارینا نے کمزور لہجے میں پوچھا۔ "کیا یہ سب کچھ تمہارے بھائی جان کی شادی پر بھی ہوا تھا؟"

علی اپنی پتلی گردن زور زور سے ہلا کر بولا۔ "اور نہیں تو کیا۔"

مارینا کو اب بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔ ستم ظریفی یہ تھی کہ وہ اپنی زندگی کی بھیانک ترین خبر ایک بچے کی زبانی سن رہی تھی۔ اس کا دل اسے فریب دے رہا تھا کہ یہ سب کچھ جھوٹ ہے۔ شاید اس بچے نے کوئی خواب دیکھا ہے۔ یا شاید اس کے ساتھ کوئی سوچا سمجھا مذاق کیا گیا ہے۔ اس نے علی کو باہر بھیج دیا اور دل میں درد و کرب کی ناقابل برداشت لہریں چھپائے اباقہ کا انتظار کرنے لگی۔

☆------☆------☆

یہ منظر قراقرم کا تھا۔ سینکڑوں ہزاروں خیموں پر مشتمل یہ عظیم الشان بستی افق تا افق پھیلی ہوئی تھی۔ دن بھر کا تھکا ماندہ سورج صحرائے گوبی کے ٹیلوں میں منہ چھپا رہا تھا۔ اس کی الوداعی کرنیں اس عظیم الشان محل کے سنہری کلسوں اور برجوں پر پڑ رہی تھیں

خاقان اوغدائی نے حال ہی میں تعمیر کرایا تھا۔ اس محل کی خواہش خاقان کی چہیتی بیوی توراکینہ نے کی تھی اور خاقان نے اپنی قدیم روایات کو توڑتے ہوئے اس بے کراں خیمہ بستی کے بیچوں بیچ یہ شاندار عمارت کھڑی کر دی تھی۔ مشرق و مغرب کی سلطنتوں سے لوٹا ہوا بیش قیمت سامان آرائش اس محل میں یوں سجا دیا گیا تھا جیسے یہ محل نہ ہو کوئی خوبصورت نمائش گاہ ہو۔ اوغدائی کے اس محل کی تعمیر میں چین' ختا اور خوارزم کے ہنرمند ترین کاریگروں نے حصہ لیا تھا اور اپنی شبانہ روز محنت سے اسے دنیا میں یکتائے روزگار بنا دیا تھا۔ منگول شہنشاہ نے یہ محل مہذب قوموں کی نقل پر تعمیر کرایا تھا مگر یہ نقل' اصل سے بھی بڑھ گئی تھی۔ مؤرخین کے مطابق اس محل کی وسعت ایک تیر کی اڑان کے برابر تھی۔ اس کے اندر مختلف جانوروں کی شکل کے طلائی مجسمے تھے جن میں شراب یا گھوڑی کا دودھ بھر دیا جاتا تھا۔ ان مجسموں سے یہ مشروب چاندی کے ظروف میں گرتے تھے۔

اس وقت خاقان اوغدائی اپنے اس نو تعمیر شدہ محل میں ایک شاندار تخت پر بڑے طمطراق سے بیٹھا تھا۔ حسین کنیزیں اور خدام خدمت کے لئے دست بستہ کھڑے تھے۔ اوغدائی کی بیوی اس کے پہلو میں بڑے کروفر سے جلوہ افروز تھی۔ ایک بہت بڑے طلائی طشت میں میوہ جات کا ڈھیر لگا تھا۔ اس طشت کی ایک جانب اوغدائی اور دوسری طرف چغتائی تھا۔ چنگیز خاں کے یہ دونوں عمر رسیدہ بیٹے پھلوں پر ہاتھ صاف کرنے کے ساتھ ساتھ باتوں میں مصروف تھے۔ توراکینہ بھی گاہے گاہے اس گفتگو میں حصہ لے لیتی تھی۔

اتنے میں شاہی نقیب اندر داخل ہوا اور اس نے منگولوں کے مخصوص انداز میں آداب پیش کرنے کے بعد اطلاع دی کہ ملک عراق سے ایک اہم پیام بر آیا ہے اور فوراً آستانہ بوسی کی اجازت چاہتا ہے۔ خاقان اوغدائی نے سر کی جنبش سے اجازت دی۔ چند لمحے بعد ایک دراز قدم منگول ایک پستہ قامت عراقی کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ آداب بجا کر کے دونوں دست بستہ کھڑے ہو گئے۔ اوغدائی اپنے منگول کارندے کو پہچانتا ہوا بولا۔ "تنگیزی تیرا چہرہ دمک رہا ہے۔ جاودانی آسمان کی قسم مجھے یقین ہے کہ تُو کوئی زبردست خبر لایا ہے۔"

تنگیزی نے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کی' لیکن اس کی آواز پھر بھی وفور مسرت سے لرز رہی تھی۔ وہ گھٹنوں کے بل بیٹھتا ہوا بولا۔ "اے خاقان! خاقان اعظم کی روح ہم پر مہربان رہے۔ تیرا یہ غلام' تیرے بدبخت دشمن کا کھوج لگانے میں کامیاب رہا ہے۔"

اس دفعہ خاقان کی آواز میں بھی ارتعاش تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھتا ہوا بولا۔ "تو تُو

نے اباقہ کو ڈھونڈ نکالا ہے۔"

تنگیزی نے اظہار جذبات کے لئے اپنا سر زمین سے لگا کر خاقان کو سجدہ کیا اور بولا۔

"ہاں خاقان! چغتائی خان کی بے وفا بیوی مارینا اور اباقہ اس وقت بغداد کے ایک نواحی گاؤں میں موجود ہیں۔ اباقہ کے ساتھی بھی اس کے ساتھ مقیم ہیں۔"

اب چغتائی خان کے لئے بھی خود پر قابو رکھنا دشوار تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھتا ہوا بولا۔ "تنگیزی تفصیل سے بتا .... ہمیں تفصیل سے بتا۔ یاسا کی قسم جونہی تیری بات ختم ہو گی ان دونوں بدبختوں کے آخری سانس کی گنتی شروع ہو جائے گی۔"

توراکینہ نے خاقان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ خاقان بیٹھا تو چغتائی' دراز قد تنگیزی اور عراقی بھی بیٹھ گئے۔ تنگیزی نے کہنا شروع کیا۔

"اے خاقان محترم! تیرے حکم کے مطابق پچھلے آٹھ ماہ سے میرا یہ عراقی دوست دیہاتی کے بھیس میں اس مکان کی نگرانی کر رہا تھا جہاں ہم نے چغتائی کی بے وفا بیوی کا سراغ لگایا تھا۔ نہایت خاموشی اور صبر کے ساتھ ہم اس انتظار میں تھے کہ ہمارا دوسرا شکار بھی اس مکان میں پہنچے اور ہم قراقرم خبر پہنچائیں۔ آخر آج سے کوئی ایک ماہ پہلے اس ایرانی سلیمان کے گھر کچھ مہمان آئے۔ میرے اس عراقی ساتھی نے فوراً مجھے اطلاع دی کہ کچھ اجنبی مسافر سلیمان کے گھر پہنچے ہیں اور ان کی نقل و حرکت مشکوک ہے۔ ایک روز میں اپنا سر لپیٹ کر کوڑھی کے بھیس میں گاؤں پہنچا اور سلیمان کے گھر کے سامنے گھات لگا کر بیٹھ گیا۔ دوپہر سے کچھ پہلے اباقہ اور سردار یورق گھوڑوں پر سوار نکلے اور ایک جانب چل دیئے۔ میں اباقہ اور یورق کو اچھی طرح پہچان چکا تھا مگر دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ کدھر جاتے ہیں۔ وہ سرحدی علاقے کی طرف نکل گئے۔ یہاں انہوں نے گھنے درختوں میں اپنے دو ڈھائی سو سپاہیوں کو ٹھہرا رکھا ہے۔ سپاہیوں سے مل کر واپس گاؤں پہنچ گئے۔

دو تین روز میں ہم نے پتہ چلا لیا کہ سلیمان کے یہ "مہمان" یہاں کافی دیر قیام کا ارادہ رکھتے ہیں اور اس بات کا کوئی اندیشہ نہیں کہ ہماری واپسی تک روپوش ہو جائیں۔ میں نے اپنے دو تین خاص کارندوں کو گاؤں میں مقرر کر دیا اور فوراً تیری طرف روانہ ہو گیا۔"

خاقان اوغدائی نے کہا۔ "تیرے عراقی ساتھیوں میں سے کوئی ایسا شخص تو نہیں جو اباقہ کی موجودگی کی اطلاع خلیفہ تک پہنچا دے۔"

تنگیزی نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "خاقان' تیرا یہ غلام اچھی طرح جانتا ہے کہ اباقہ ہمارے علاوہ بغداد والوں کا بھی مجرم ہے۔ انہیں بتانے کا مطلب تو یہ تھا کہ یہاں

پہنچنے سے پہلے ہی اس بدبخت کی تکہ بوٹی ہو جاتی۔"

بوڑھے چغتائی نے بڑے جوش سے تنگیزی کی پیٹھ ٹھونکتے ہوئے کہا۔ "تُو نے حق نمک ادا کر دیا .... شاباش۔"

خاقان اوغدائی نے ادھر گرد نگاہ دوڑائی پھر ایک نہایت حسین خوارزمی کنیز کو بازو سے پکڑ کر تنگیزی کی آغوش میں پھینک دیا اور ایک دوسری کنیز عراقی کے حوالے کر دی۔ پھر کہنے لگا۔

"جاؤ اب کھانا کھا کر آرام کرو۔ ہو سکتا ہے کل صبح تمہیں واپسی کے سفر پر روانہ ہونا پڑے .... اور ہاں صبح ان کنیزوں کا وزن کروا لینا۔ وزن کے برابر تمہیں سونا اور چاندی تول کر دے دیا جائے گا۔"

تشکر کا عاجزانہ اظہار کرتے ہوئے دونوں افراد واپس چلے گئے تو اوغدائی' چغتائی اور توراکینہ سر جوڑ کر گفتگو کرنے لگے۔ اب محل میں کافوری شمعیں جل اٹھی تھیں اور ان کی روشنی میں تینوں کے چہرے جوش سے تمتما رہے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد خاقان کی چہیتی بیوی توراکینہ محل کے خادم خاص کو حکم دے رہی تھی کہ آج رات کا کھانا تمام بڑے بڑے سردار اور مصاحبین ہمارے ساتھ کھائیں گے۔

محلوں میں آ جانے کے باوجود ان صحرا نشینوں کے طور اطوار نہیں بدلے تھے۔ کھانے پر وہ اب بھی وحشیوں کی طرح ٹوٹ پڑتے تھے۔ بڑے بڑے طباقوں میں گوشت کے ابلے ہوئے اور تلے ہوئے پارچہ جات رکھ دیئے گئے تھے۔ ساتھ گھوڑی کے دودھ کے مٹکے تھے اور شراب کی صراحیاں۔ پورے محل میں لوبان و عنبر کی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ ایک طرف مدھر چینی موسیقی میں نیم برہنہ چینی حسینائیں رقص غلای میں مصروف تھیں۔ منگول سردار دانت تو گوشت میں گاڑتے تھے اور دیکھتے ان پری وش عورتوں کی جانب تھے۔ کھانے سے فراغت کے بعد اس نشست گاہ میں سنجیدگی کا ماحول پیدا ہو گیا۔ خاقان اوغدائی نے اپنی بھاری بھرکم لیکن بوڑھی آواز میں کہنا شروع کیا۔

"اے نیلے آسمان کے بیٹو! میں نے آج تمہیں ایک خاص مقصد کے لئے اکٹھا کیا ہے۔ تمہیں معلوم ہو گا کہ ہمارے دشمنوں میں سے ایک شیطان صفت دشمن کا نام ہے اباقہ۔ شامانوں کا کہنا ہے کہ اس بدبخت کے جسم میں کوئی بھٹکی ہوئی لعنتی روح حلول کر چکی ہے۔ جس کے سبب وہ ایک خطرناک درندہ بن چکا ہے۔ مجھے یہ کہتے ہوئے دکھ ہو رہا ہے کہ اس وحشی نے قدم قدم پر ہمیں للکارا ہے اور ہمارے جسم پر چرکے لگائے ہیں۔ ہم جو ریت کے ذروں کی طرح لاتعداد' پہاڑوں کی طرح بلند اقبال اور سمندر کی طرح بے کراں

ہیں' اس شیطان کو اپنے جسم میں ایک زہریلے کانٹے کی مانند پیوست محسوس کرتے ہیں۔ آپ جانتے ہی ہوں گے کہ یہ شخص نہایت دیدہ دلیری کے ساتھ روس پہنچا ہے اور اس نے ہمارے خلاف وہاں کے رئیسوں کی ہر طرح مدد کی ہے۔ روس میں ہمیں جہاں جہاں زک اٹھانا پڑی ہے وہاں وہاں اس کا ہاتھ رہا ہے۔ بلکہ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ روس کی سرزمین سے ہماری پسپائی کی بڑی وجہ یہی شخص ہے۔ اس شخص کی زیر قیادت جنوبی روس کے چھوٹے سے قصبے کوزل سک کے باسیوں نے ایسی پُرزور اور طویل مزاحمت کی کہ ہمارے لشکریوں کے حوصلے ٹوٹ گئے اور انہوں نے بددل ہو کر بیابانوں کا رخ کر لیا۔ اے چنگیز خان کے باغیرت اور سرفروش بیٹو! تمہیں یاد ہو گا کہ یہی شخص تھا جس نے کچھ برس پہلے میرے بڑے بھائی چغتائی خاں کی بیوی مارینا کو بہکایا اور اسے یہاں سے لے اڑا۔ ہم اس واقعے کو کیوں کر بھول سکتے ہیں۔ ہمارے دلوں میں وہ زخم تازہ ہے۔ اس زخم کے مرہم کے لئے ہم مسلسل کوشاں رہے ہیں۔ دنیا کے طول و عرض میں ہم نے ان دونوں کی تلاش کا کام جاری رکھا ہے اور کسی موقع پر ہمت نہیں ہاری۔ میرے ساتھیو! میں تمہیں یہ خوشخبری سنانا چاہتا ہوں کہ بالآخر ہماری کوششیں رنگ لائی ہیں اور ہم ان دونوں کا سراغ لگانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ آج سے تقریباً نو ماہ پہلے ہمارے جاسوسوں نے چغتائی کی بے وفا بیوی مارینا کا سراغ لگا لیا تھا مگر میری ہدایت کے مطابق وہ خاموشی سے اس وقت کا انتظار کر رہے تھے۔ جب مارینا کا ساتھی اباقہ اس تک پہنچتا اور دونوں کو اکٹھے پکڑ لیا جاتا۔ ایک صبر آزما انتظار کے بعد آخر یہ وقت آ گیا ہے۔ مارینا اور اباقہ دونوں بغداد کے ایک مضافاتی گاؤں میں موجود ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ وقت ضائع کئے بغیر منگول لشکر میں سے ایک بہترین دستہ تیار کر کے خوارزم روانہ کیا جائے اور وہ خاموشی سے سرحد پار کر کے اس عراقی گاؤں سے قراقرم کے ان دونوں مجرموں کو اٹھا لائے..........."

خاقان اوغدائی کے اس اعلان نے سرداروں میں جوش و خروش کی لہر دوڑا دی اور وہ پوری دلچسپی سے اس گفتگو میں حصہ لینے لگے۔ خاقان نے سرداروں سے مشورے کے بعد فیصلہ کیا کہ لشکر کے تمام تومانوں (دستوں) میں سے سرفروش رضاکاروں کو چن کر اس مہم پر روانہ کیا جائے۔ کیونکہ اباقہ کو گرفتار کر لینا اتنا سہل نہیں۔ نہ صرف اس کے خطرناک ساتھی اس گاؤں میں موجود ہیں بلکہ روسی جاں بازوں کا ایک دستہ بھی گاؤں کے نواح میں خیمہ زن ہے۔ رات کا اندھیرا گہرا ہوتے ہوتے اس مہم کی خبر قراقرم کے طول و عرض میں پھیل چکی تھی۔ جلد ہی منگول لشکر کے نامور جنگجو خاقان اوغدائی کے زرنگار محل کے سامنے جمع ہونے لگے۔ مشعلوں کی روشنی میں ان کے چہرے جوش سے تمتما رہے

تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ ہجوم چار پانچ سو نفوس تک پہنچ گیا۔ خطرناک چہروں اور قوی جسموں والے یہ منگول اپنے اپنے تومانوں کے مانے ہوئے جنگجو تھے۔ ایک زمانہ ان کی کاٹ کا لوہا مان چکا تھا' اور اب وہ سب کے سب اس مہم میں حصہ لے کر اپنی شہرت کو چار چاند لگانا چاہتے تھے۔ ان کے نزدیک اس "کار خیر" میں شرکت کر کے وہ نہ صرف نیلے آسمان کو خوش کر سکتے تھے بلکہ اباقہ جیسے دشمن کی گرفتاری کا انعام ان کی زندگیاں سنوار سکتا تھا۔ ہر رضاکار کی تمنا تھی کہ اسے اس مہم کے لئے منتخب کیا جائے۔ خاقان اوغدائی بذات خود رضاکاروں کے چناؤ میں مصروف تھا۔ اتنے میں چغتائی خاں ایک خطرناک صورت چوڑے چکلے منگول کو لئے وہاں پہنچا۔ اس نے خاقان سے اس منگول کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

"خاقان محترم! اس جوان رعنا کا نام نویان ہے۔ یہ اس سردار بوغالی کا بیٹا ہے جسے آج سے نو برس پہلے اباقہ نے کوہ سیاہ پر ہلاک کر ڈالا تھا۔ بعد میں بوغالی کے بڑے بیٹوں اریان اور داریان نے بھی اباقہ سے لڑتے ہوئے جان دی تھی۔ بوغالی کا یہ بیٹا مدت سے انتقام کی آگ میں جل رہا ہے۔ بارہا مجھ سے درخواست کر چکا ہے کہ میں اسے اباقہ تک پہنچنے کا راستہ بتاؤں میں آج تک اسے صبر کی تلقین کرتا رہا ہوں مگر میرا خیال ہے کہ اب اس کی خواہش پوری کرنے کا وقت آ گیا ہے..........."

خاقان نے "نویان" کو پہچانتے ہوئے کہا۔ "یہ وہی نوجوان ہے نا جس نے گئے برس تین سفید پہلوانوں سے خالی ہاتھ مقابلہ کیا تھا اور انہیں ہلاک کر ڈالا تھا..........."

چغتائی نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "ہاں خاقان .... اور آپ نے اسے یک ہزاری دستے کا سالار بنانے کے علاوہ اپنی پیش قبض انعام دی تھی..........."

نوجوان منگول نے فوراً لبادے میں ہاتھ ڈال کر ہیروں سے مرصع پیش قبض خاقان کے سامنے کر دی۔ خاقان سر ہلاتا ہوا بولا۔

"چغتائی! تو نے میری مشکل آسان کر دی۔ اگر سوبدائی بہادر قویوق یا بودی وغیرہ میں سے کوئی یہاں ہوتا تو میں اسے اس مہم کا کماندار مقرر کر دیتا۔ مگر تم جانتے ہو وہ سب روس کی مہم پر ہیں۔ میرا خیال ہے اس صورت حال میں یہ نوجوان اس ذمے داری کے لئے موزوں رہے گا۔ یہ بہادر اور سمجھدار بھی ہے اور اس کے سینے میں وہ آگ بھی روشن ہے جو انسان کو کامیابیوں سے ہمکنار کرتی ہے۔ میں اس نوجوان کو خوارزم جانے والے دستے کا سالار مقرر کرتا ہوں۔"

اوغدائی کے اعلان پر نویان کی چمکتی آنکھوں کی لپک کچھ اور اور تیز ہو گئی۔ اس نے

رکوع کے انداز میں جھک کر خاقان کا شکریہ ادا کیا اور تن کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ خاقان ایک بار پھر رضاکاروں کے انتخاب میں مصروف ہو گیا۔ رات خاموش تھی مگر صحرائے گوبی کی گود میں قراقرم جاگ رہا تھا۔

☆------☆------☆

اُسی شب' قراقرم سے سینکڑوں میل دور عراق کے اس سرحدی گاؤں میں زیتون کے ایک پیڑ تلے اباقہ اور ماریتا کھڑے تھے۔ مدھم چاندنی میں ان کے سائے ایک دوسرے سے بغلگیر تھے مگر وہ خود فاصلے پر کھڑے تھے۔ ماریتا کی تیز سرگوشی فضا میں ابھری۔

"اباقہ! مجھے صرف ایک بات کا جواب چاہئے .... آپ نے نتاشا نامی اس روسی شہزادی سے شادی کی تھی یا نہیں۔"

اباقہ بولا۔ "ماریتا! میری بات سمجھنے کی کوشش کرو........"

ماریتا نے اس کی بات کاٹی۔ "مجھے صرف ہاں یا نہ میں جواب چاہئے۔ شادی کی تھی یا نہیں۔"

اباقہ نے سر جھکایا۔ کچھ دیر بعد سر اٹھایا اور مستحکم لہجے میں بولا۔ "ہاں ماریتا! میں نے شادی کی تھی۔"

لبوں تک آنے والی ایک سسکی کو ماریتا نے بمشکل روکا اور منہ پھیر کر گھر کی طرف بڑھ گئی۔ اباقہ "ماریتا .... ماریتا" کہتا ہوا اس کے عقب میں گیا مگر جب اس نے دیکھا کہ وہ اس کے پیچھے آ رہا ہے تو وہ دوڑنے لگی اور دوڑتے دوڑتے گھر میں گھس گئی۔ اباقہ کچھ دیر مایوسی کے عالم میں وہاں کھڑا رہا پھر وہ بھی آہستہ آہستہ گھر کے اندر چلا گیا۔

اگلے روز نبیلہ دیر تک دروازہ کھٹکھٹاتی رہی مگر ماریتا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بعد میں سلیمان' یورق اور علی نے بھی باری باری کوشش کی مگر ماریتا باہر نہیں آئی۔ اس نے اندر ہی سے کہہ دیا کہ اسے بھوک نہیں ہے۔ دوپہر کے بعد نبیلہ رو رو کر ماریتا سے باہر آنے کو کہتی رہی مگر وہ شاید منہ سر لپیٹ کر پڑی ہوئی تھی۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ نبیلہ کو روتے دیکھ کر اباقہ بے قرار ہو گیا۔ وہ دروازے پر پہنچا۔ ماریتا کو مخاطب کر کے پہلے ایک دو جملے غصے میں کہے مگر جب کوئی جواب نہیں آیا تو نرم لہجہ اختیار کرتے ہوئے اسے سمجھانے کی کوشش کرنے لگا .... یہاں تک کہ اندر سے ماریتا کی آنسوؤں میں بھیگی ہوئی اور کراہتی ہوئی آواز آئی۔ وہ غصے میں کہہ رہی تھی۔ "یہاں سے چلے جاؤ۔ خدا کے لئے میرے حال پر رحم کرو۔ مجھے کسی سے بات نہیں کرنا........"

رات تک وہ سب سخت پریشان رہے۔ رات کے کھانے کا وقت ہوا تو اباقہ نے سوچا

کہ دروازہ توڑ کر اندر چلے جانا چاہئے۔ مگر نبیلہ اور سلیمان کا خیال تھا کہ اس طرح آپا اور ناراض ہو جائے گی .... اتنے میں گھر سے باہر آہٹ ہوئی اور انہیں ایک ایسا چہرہ دروازے پر نظر آیا جس نے ان کی ساری پریشانیاں دور کر دیں۔ وہ اسد تھا۔ اس کے مسکراتے ہوئے چہرے نے ان کی مایوسی کو بھاپ کی طرح اڑا دیا۔ سلام دعا کے بعد اسد نے بتایا کہ اس کی بیوی ہاجرہ اب بالکل ٹھیک ہے اور آپ سب لوگوں سے ملنے کے لئے بہت بے تاب ہے۔ وہ اپنے سفر کے بارے اور بھی بہت کچھ بتانا چاہتا تھا مگر ان کے اترے ہوئے چہرے دیکھ کر ٹھٹک گیا۔

"کیا بات ہے؟" اس نے اباقہ سے پوچھا۔

جواب میں علی بولا۔ "آپا جان نے خود کو کمرے میں بند کر رکھا ہے اور کل رات سے باہر نہیں نکلیں۔ ابھی آپا نبیلہ زور زور سے رو رہی تھیں۔"

اسد نے اُن سب کے چہرے دیکھے اور پھر جلد ہی بات کی تہہ تک پہنچ گیا۔ خود کلامی کے انداز میں بولا۔ "یہ سب کیسے ہوا۔" تب اس کی نگاہیں علی کے چہرے پر جم گئیں۔ وہ معصومیت سے سر جھکائے زمین پر لکیریں کھینچ رہا تھا۔ "اچھا میں دیکھتا ہوں۔" اسد یہ کہتے ہوئے اٹھا اور دروازے کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے ہاتھ کی پشت سے بند دروازے پر دستک دی۔ پھر بولا۔

"ماریتا! میں اسد ہوں۔ دروازہ کھولو۔" ماریتا کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔

"ماریتا بہن دروازہ کھولو۔" اسد نے دوسری بار کہا تو اندر سے ماریتا کی دبی دبی سسکیاں سنائی دیں۔ پھر یہ سسکیاں ہچکیوں میں بدل گئیں۔ اس کے ضبط کا بند ٹوٹ گیا تھا اور وہ رو رہی تھی لیکن اس نے دروازہ نہیں کھولا۔ اسد اسے سمجھانے کی کوشش کرنے لگا۔ ڈھکے چھپے لفظوں میں اسے بتانے لگا کہ جو کچھ ہوا ہے اس کی کوئی وجہ ہے۔ کوئی مجبوری ہے جس کے سبب ہمیں یہ فیصلہ کرنا پڑا۔ تم دروازہ کھولو تو میں تمہیں تفصیل سے بتاؤں کہ یہ سب کیوں ہوا۔

سب کا خیال تھا کہ اب کنڈی کی کھڑکھڑاہٹ سنائی دے گی اور ماریتا دروازہ کھول دے گی مگر کنڈی کی آواز کی بجائے ماریتا کی شکستہ آواز سنائی دی۔ وہ فریاد کے لہجے میں کہہ رہی تھی۔ "اسد! بخدا میرا سر درد سے پھٹا جا رہا ہے۔ مجھے اس وقت تنہا چھوڑ دو۔ میں صبح تم سے بات کروں گی۔"

اسد نے اسے زیادہ زچ کرنا مناسب نہیں سمجھا اور اباقہ وغیرہ سے کہا کہ وہ آرام کر رہی ہے' صبح میں خود اس سے بات کروں گا۔

.... مگر وہ صبح کسی اور ہی رنگ سے طلوع ہوئی۔ فجر کی نماز ادا کرنے کے بعد اسد نے مارینا کو جگانا چاہا تو اس کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا ملا۔ اسد کے ہاتھ کا دباؤ پا کر دونوں پٹ وا ہو گئے۔ اسد اندر داخل ہوا تو مارینا کہیں دکھائی نہیں دی۔ اس نے سمجھا شاید صحن میں ہے۔ وہ جلدی جلدی سارے گھر میں گھوم گیا۔ پھر دوبارہ مارینا کے کمرے میں پہنچا اور آثار دیکھ کر اسے اندازہ ہوا کہ مارینا یہ گھر چھوڑ کر جا چکی ہے۔ لکڑی کا ایک صندوق جس میں مارینا کے پارچہ جات تھے' کھلا پڑا تھا اور کمرے کی وہ عقبی کھڑکی بھی کھلی تھی جسے اندر سے بند ہونا چاہئے تھا۔

اچانک آہٹ ہوئی۔ اسد نے گھوم کر دیکھا تو اسے اباقہ کا افسردہ چہرہ نظر آیا۔ وہ ابھی ابھی کمرے میں آیا تھا اور بات کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسد نے غمگین لہجے میں کہا۔

"اباقہ! بہت برا ہوا۔ مارینا ہم سے خفا ہو کر چلی گئی ہے۔"

اباقہ نے ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ہاں اسد! یہ تو ہونا ہی تھا۔ میں نے اس کے ساتھ کون سا اچھا سلوک کیا ہے۔"

اسد نے کہا۔ "اباقہ اتنا بددل ہونے کی ضرورت نہیں' ہم اسے ڈھونڈتے ہیں۔ مجھے یقین ہے میں اسے سمجھانے میں کامیاب رہوں گا۔"

اباقہ بولا۔ "اسد! مجھے شک ہے کہ اس دفعہ تم ایسا نہ کر سکو گے۔ وہ ہماری توقع سے بڑھ کر خفا ہے۔"

اسد نے اباقہ کو تسلی دی اور اسے ساتھ لے کر صحن میں آ گیا۔ انہوں نے یورق کو صورت حال سے آگاہ کیا تو وہ بھی ساتھ چلنے کو تیار ہو گیا۔ اب نبیلہ اور شیزی کولت بھی مارینا کی غیر موجودگی سے آگاہ ہو چکی تھیں اور ان کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔ سلیمان انہیں تسلی دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ علی حیران حیران سا اِدھر اُدھر پھر رہا تھا۔ شاید اسے احساس تھا کہ اس افراتفری میں اس کا بھی کچھ نہ کچھ ہاتھ ہے۔

اسد' اباقہ اور یورق دیہاتیوں کے بھیس میں سارا دن گاؤں گاؤں اور بستی بستی گھومتے رہے مگر انہیں مارینا کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ دوپہر سے شام اور پھر رات ہو گئی۔ وہ گھر آ کر چند گھڑیوں کے لئے سوئے اور علی الصبح پھر تلاش کے کام میں لگ گئے۔ اس روز سہ پہر کو اباقہ تھکا ہارا ایک شفاف ندی کے کنارے بیٹھا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اگر آج بھی مارینا نہیں ملی تو پھر اس کا مطلب ہو گا کہ وہ یہاں موجود نہیں اور غالباً بغداد پہنچ چکی ہے۔ ان تینوں کا اس کی تلاش میں باہر جانا نہایت خطرناک تھا وہ کسی بھی وقت شناخت کئے جا

سکتے تھے مگر گرفتاری کے خوف سے وہ مارینا کی تلاش کیسے ختم کر سکتے تھے۔ یقینی بات تھی کہ کل ان تینوں کو شہر کا رخ کرنا ہو گا............

اباقہ انہی سوچوں میں گم تھا جب عقب سے کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ یہ چھوٹی چھوٹی داڑھی والا ایک محنت کش دیہاتی نظر آتا تھا۔ اباقہ سے کہنے لگا میں اسی گاؤں کا ہوں جہاں تم مہمان ٹھہرے ہوئے ہو۔ مجھے معلوم ہے تمہارے گھر کی خاتون کہاں ہے؟ اباقہ جیسے اچھل پڑا۔ دیہاتی اس کی بے قراری پر زیر لب مسکرایا اور بولا۔

"وہ اس وقت بغداد کے محلہ قرح ابی ثمم کی ایک سرائے میں موجود ہے۔ اگر اسے کھونا نہیں چاہتے تو فوراً شہر روانہ ہو جاؤ۔ سرائے کے مالک کا نام عبدالرحمان بن ہاشم ہے۔ وہ بڑا مہربان شخص ہے۔ وہ رات گئے تک سرائے ہی میں موجود رہتا ہے۔ اگر تم نصف شب تک بھی سرائے میں پہنچ گئے تو وہ وہاں تمہیں اونگھتا ہوا ملے گا۔ اس سے مل لینا۔"

اباقہ نے پوچھا۔ "کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ اس سرائے میں ٹھہری ہوئی ہے۔"

دیہاتی نے کہا۔ "میں نے خود اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ میں اس سرائے میں بکریوں کا دودھ فروخت کرنے جاتا ہوں۔ تم اس طرح باتوں میں وقت ضائع مت کرو۔ سرائے سے قافلے نکلتے رہتے ہیں یہ نہ ہو کہ خاتون بھی کسی قافلے کے ساتھ آگے روانہ ہو جائے۔"

اباقہ کو وہ دیہاتی کچھ مشکوک سا لگ رہا تھا مگر یہ موقع نہیں تھا کہ وہ اسے کھوجنے کی کوشش کرتا۔ اس لئے وہ دیہاتی سے مزید معلومات حاصل کرنے کے بعد گھوڑے پر سوار ہوا اور شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کی روانگی کے بعد دیہاتی جوار کے کھیتوں میں داخل ہو گیا۔ وہاں ایک اور دیہاتی چھپا بیٹھا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرانے لگے۔

کھیت میں چھپا ہوا دیہاتی بولا۔ "تم اس کے ساتھ ہی چلے جاتے؟"

دوسرے دیہاتی نے کہا۔ "ہمیں کیا ضرورت ہے ہلکان ہونے کی وہ بہت ہوشیار شخص ہے۔ عورت کو لے کر ہی آئے گا۔"

پہلے دیہاتی نے کہا۔ "خدا کرے استاد مشہدی اور وہ دراز قد منگول قراقرم سے جلدی لوٹ آئیں۔ نگہبانی کی اس ذمے داری نے تو میری کمر توڑ دی ہے۔"

دوسرا بولا۔ "کمر ٹوٹے گی تو نصیب جڑے گا۔" دونوں عیاری سے مسکرانے لگے۔

☆---------☆---------☆

اباقہ جان ہتھیلی پر لئے شہر بغداد میں داخل ہوا تو بیس لاکھ انسانوں پر مشتمل اس

عظیم الشان بستی کے ہنگامے نیند کی آغوش میں پناہ لے چکے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی دلنواز حسینہ تڑپتے مچلتے جذبوں پر پلکوں کے پردے گرائے شباب کی نیند سو رہی ہے۔ بغداد نہیں سو رہا تھا۔ ایک بہت بڑا فتنہ سو رہا تھا۔ ایک قیامت محو خواب تھی۔ رنگ و نور اور صوت و آہنگ کا ایک طوفان تھا جو اس بھیگی رات میں کچھ گھڑیوں کے لئے تھم گیا تھا۔ بغداد کی فضاؤں میں پہنچتے ہی اباقہ کو بھولی بسری یادوں نے آگھیرا۔ اسی بغداد میں کہیں اس کے بدترین دشمن ابن یاشر، مسلم بن داؤد اور عبداللہ مشہدی رہتے تھے اور یہی شہر اس کی کچھ عزیز ہستیوں کا مسکن بھی تھا۔ ان ہستیوں میں ایک فاطمہ بھی تھی۔ وزیر داخلہ عبدالرشید کی اکلوتی بیٹی۔ جسے اس نے عین شادی کی رات اغوا کر لیا تھا اور کئی روز یرغمال رکھنے کے بعد بحفاظت چھوڑ دیا تھا۔ وہ خوبصورت اور معصوم فاطمہ بھی اسی شہر بغداد کی کسی حویلی میں اپنے محبوب شوہر کے ساتھ محو خواب تھی۔ یادوں کی بھول بھلیوں میں الجھتا، اباقہ چھوٹی چھوٹی گلیوں میں سفر کرتا قرح ابی کی شحم کی طرف بڑھتا رہا۔ بغداد قدیم کی ان تنگ و تاریک گلیوں میں کسی بڑے خطرے سے مڈبھیڑ کا امکان نہیں تھا۔ ہاں ایک دو مقامات پر اسے بڑی شاہراہوں کو قطع کرنا تھا اور وہ فیصلہ کر چکا تھا کہ حتی الامکان خونریزی سے باز رہے گا اور اگر کسی محافظ نے اس سے الجھنا چاہا تو اسے دلیل سے مطمئن کرنے کی کوشش کرے گا۔ یہ ضروری تو نہیں تھا کہ اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی اسے فوراً اباقہ کی حیثیت سے پہچان لیا جائے۔ بہرحال اسے قرح ابی شحم پہنچنے تک کسی رکاوٹ کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ قرح ابی شحم کے سنسان کوچوں میں نصف شب کی نوبت گونج رہی تھی۔

جب وہ سرائے رحمان میں داخل ہوا۔ اندر داخل ہوتے ہی اباقہ نے اندازہ لگایا کہ یہ سرائے شہر کے چند بڑے سرائے خانوں میں ہو گا۔ ایک طویل دالان سے گزر کر اباقہ ایک وسیع کمرے میں پہنچا۔ لکڑی کے بوسیدہ تخت پر ایک تومند باریش شخص اونی نمدہ لپیٹے بیٹھا تھا اور شاید دن بھر کی کمائی ہوئی اشرفیاں شمار کر رہا تھا۔

اباقہ کو دیکھ کر وہ ٹھٹکا۔ اباقہ نے اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "یا شیخ" سیاہ شال اوڑھے ہوئے ایک خاتون کل شب آپ کے سرائے میں اتری ہے۔ اس کے بارے معلوم کرنا تھا۔"

سرائے کے مالک نے اسے پہلے تو سر سے پاؤں تک گھورا۔ پھر اپنی بھاری بھرکم آواز میں صاف انکار کر دیا کہ کوئی ایسی خاتون یہاں پہنچی ہے۔ جلد ہی اباقہ نے اس کی باتوں سے اندازہ لگا لیا کہ یہ شخص دروغ گوئی سے کام لے رہا ہے۔ غالباً یا تو مارینا نے اسے افشائے راز سے منع کر رکھا تھا یا سرائے کے مالک کو خدشہ تھا کہ مسافر کے متعلق بتانے سے اسے

مالی نقصان ہو گا۔ اباقہ کا دل چاہا کہ اس دروغ گو کا ٹیٹوا دبا کر سب کچھ معلوم کر لے مگر پھر اس نے حکمت سے کام لینے کا فیصلہ کیا۔ لبادے میں ہاتھ ڈال کر تھیلی نکالی اور مٹھی بھر دینار اس کے سامنے ڈال دیئے۔ دیناروں نے کام دکھایا اور جلد ہی عبدالرحمان بن ہاشم راہ راست پر آ گیا۔ اس نے انکشاف کیا کہ مذکورہ خاتون علی الصبح ایک کارواں کے ساتھ بصرہ روانہ ہونے والی ہے۔ وہاں سے بحری جہاز میں سوار ہو کر اسے ہندوستان کی طرف چلے جانا ہے۔ عبدالرحمان نے بتایا کہ اس نے بصرہ کے ایک ہوشیار سوداگر سے اس کی ملاقات کروائی ہے، اس سوداگر نے ذمہ اٹھایا ہے کہ وہ خاتون کو بحفاظت بحری جہاز میں سوار کرا دے گا۔ اس کے عوض خاتون اسے معقول رقم دے گی۔

اباقہ یہ سب کچھ سن کر حیران ہو رہا تھا۔ مارینا اس قدر آگے نکل جائے گی، اسے گمان تک نہ تھا۔ واقعی اگر آج رات اسے دیر ہو جاتی تو بات کہاں سے کہاں پہنچ جاتی۔ تھوڑی ہی دیر بعد اباقہ سرائے کے ایک بند کمرے کے سامنے کھڑا تھا۔ اس نے دروازے پر دستک دی۔ "کون ہے؟" اندر سے مارینا نے دریافت کیا۔ عبدالرحمان بن ہاشم پاس ہی کھڑا تھا۔ اباقہ کے اشارے پر اس نے جواب دیا۔ "میں ہوں" مارینا نے دروازہ کھول کر جھری میں سے جھانکا۔ اباقہ اسے تیزی سے دھکیلتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ مارینا نے پہلے حیرانی سے اسے دیکھا پھر ادھ کھلے دروازے سے نکل جانا چاہا مگر اباقہ اتنی دیر میں دروازہ بند کر چکا تھا۔ مارینا ایک آہ بھر کر مسہری پر گر گئی اور اوڑھنی میں منہ چھپا کر رونے لگی۔ اباقہ پاس بیٹھا بہت دیر انتظار کرتا رہا آخر رو رو کر مارینا کا جی کچھ ہلکا ہوا تو اس نے اسے مخاطب کرنا چاہا۔ مگر بار بار کی کوشش کے باوجود مارینا نے کوئی جواب نہیں دیا۔

اباقہ دھیمے لہجے میں دھیرے دھیرے اپنی ان مجبوریوں کی روئیداد سنانے لگا جن کے سبب اسے بے وفائی کا یہ تلخ گھونٹ پینا پڑا تھا۔ اس نے ایک ایک بات ایک ایک احساس اور کیفیت کھول کر بیان کی۔ کوئی چیز بھی نہیں چھپائی، سب کچھ کہہ ڈالا۔ سارا بوجھ اتار پھینکا۔ مارینا سنتی رہی اور اپنی جھیل سی گہری آنکھوں کے موتی لٹاتی رہی۔ وہ حسن اور سوگواری کا ایک ایسا نادر مجسمہ نظر آ رہی تھی جسے رعب اور وقار کی مقدس دھند نے چشم زمانہ سے یوں چھپا رکھا تھا کہ وہ پل بھر میں حقیقت اور پل بھر میں افسانہ معلوم ہوتی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کوئی آسمانی مخلوق تھی جو ایک داستان عشق کا کردار بننے کے لئے اس دنیا میں آئی تھی اور اب سوچ رہی تھی کہ اس نے یہاں آ کر کیا کھویا اور کیا پایا۔

اپنی صفائی پیش کرنے کے بعد اباقہ نے التجا کا لہجہ اختیار کیا اور بولا۔ "مارینا! سلطان محترم کی جدائی کے بعد میں آدھا رہ گیا تھا، اگر اب تم نے بھی منہ پھیر لیا تو میں شاید

.... ختم ہو جاؤں گا۔ تمہارے بغیر اباقہ ایک بے جان لاشے کا نام ہو گا۔ میں کھلے دل سے اپنی غلطی کا اعتراف کرتا ہوں اور تمہارا دل دکھا کر میں نے جو جرم کیا ہے اس پر تہہ دل سے شرمندہ ہوں.........."

رات پل پل سرکتی رہی اور اباقہ اپنی "زندگی" کو منانے کی کوشش میں مصروف رہا۔ مگر یوں لگتا تھا جیسے وہ مارینا جو اباقہ کو پہچانتی تھی اور اس پر جان نچھاور کرتی تھی' مر چکی ہے۔ اپنی آخری سانسیں بھی فرشتۂ اجل کو سونپ چکی ہے۔ یہ آرزوؤں کے جنگل میں ہانپتی ہوئی کوئی اور عورت ہے جس کا دم اباقہ کی موجودگی سے گھٹ رہا ہے۔ آخر وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھتی ہوئی بولی۔

"اباقہ! میں سب کچھ سن چکی ہوں۔ تمہاری ہر بات سمجھ چکی ہوں لیکن میں واپس نہیں جا سکتی۔ میری واپسی کا خیال دل سے نکال دو۔"

اباقہ آزردگی سے بولا۔ "مارینا! کیا یہ میرے بس میں ہے؟"

مارینا نے کہا۔ "کچھ باتیں میرے بس میں بھی نہیں۔ میں .... تم سے نفرت کرتی ہوں اباقہ .... خدا کے واسطے یہاں سے چلے جاؤ۔"

مارینا کے ہونٹوں سے "نفرت" کا لفظ سن کر اباقہ کا چہرہ چراغ مزار کی طرح بجھ گیا۔ وہ ایک گہری سانس بھر کر بولا۔

"مارینا' ٹھیک ہے۔ تمہیں اپنے دل پر اختیار نہیں مگر میں تمہیں اس طرح بھٹکنے نہیں دوں گا۔ میرے ساتھ واپس چلو میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ کبھی کسی بات پر تمہیں مجبور نہ کروں گا۔"

مارینا روتے روتے بولی۔ "مجھے اب کسی کے وعدے پر اعتبار نہیں رہا۔"

اباقہ بولا۔ "میں تیری قسم کھاتا ہوں مارینا۔ کبھی تجھ سے کوئی سوال نہ کروں گا۔ مگر اس طرح خود کو دربدر نہ کرو۔" وہ بہت دیر اپنی بات پر اصرار کرتا رہا۔ آخر مارینا نے کہا۔

"تم مجھ سے کوئی سوال نہ کرو گے' مگر دوسرے تو کریں گے' نبیلہ کرے گی' یورق اور اسد کریں گے۔ مجھے تم سے شادی پر مجبور کیا جائے گا۔ اپنی اپنی محبت کے واسطے دیئے جائیں گے' اپنا اپنا حق جتایا جائے گا.......... اور آخر میں مجبور کر دی جاؤں گی' ایک ایسے شخص کے ساتھ شادی کرنے پر جو میری پہلی اور آخری محبت کا قاتل ہے۔ جس کے ساتھ میں قراقرم سے اس لئے آئی تھی کہ وہ مجھے دجلہ کے کنارے ایک چھوٹا سا گھر دے گا جس میں وہ صرف میرا ہو گا' جس کی خواب گاہ میں چنگیز زادوں کی طرح بیویوں اور کنیزوں کے ریوڑ نہیں ہوں گے' جس کے دل پر صرف اور صرف میری حکومت ہو گی اور جس کی

بانہوں میں صرف اور صرف میرا جسم سمائے گا.......... نہیں اباقہ میں خود کو اتنا رسوا نہیں کر سکتی۔ میں اس گھر میں واپس نہیں جاؤں گی۔"

اباقہ ویران آنکھوں سے دیر تک اس کا ملیح چہرہ دیکھتا رہا پھر بولا۔ "میری ایک آخری خواہش مان لو مارینا .... اس گھر میں واپس چلی جاؤ۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ وہ گھر چھوڑ دوں گا اور کبھی تمہیں اپنی صورت نہیں دکھاؤں گا۔ تم عورت ہو بے سہارا بھٹکو گی تو یہ زمانہ تمہیں بے حد ستائے گا۔ میں مرد ہوں کہیں نہ کہیں ٹھکانا ڈھونڈ لوں گا۔ اس گھر کی تمہیں مجھ سے زیادہ ضرورت ہے.........."

مارینا نے اباقہ کی بات ماننے سے صاف انکار کر دیا۔ وہ بولی۔ "تمہیں دیکھ کر تم سے محبت کرنے کی غلطی میں نے کی تھی' اس کی سزا بھی مجھے ملنی چاہئے۔"

اباقہ نے کہا۔ "مارینا' میں تمہیں ایسا کرنے نہیں دوں گا۔ چاہے مجھے کچھ بھی کرنا پڑے۔ تم اس وقت جذبات کے دھارے میں بہہ رہی ہو۔ یہ بہت بڑا فیصلہ ہے۔ یہ فیصلہ کرنے سے پہلے اچھی طرح سوچ سمجھ لو۔ میں تمہیں غور و فکر کے لئے پورا موقع دیتا ہوں۔ میری مجبوریوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس سارے معاملے کو ایک بار پھر جان بوجھ لو۔" یہ کہتے ہوئے اباقہ نے کمرے کا دروازہ باہر سے بند کیا اور سرائے کے مالک عبدالرحمان کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

رات گزر گئی' صبح طلوع ہوئی' بغداد جاگ گیا' زندگی رواں دواں ہو گئی۔ اباقہ سرائے کے ایک گوشے میں بیٹھا قسمت کے فیصلے کا انتظار کرتا رہا۔ جب دوپہر کی نوبت گونجی تو وہ اٹھا اور مارینا کے کمرے میں پہنچ گیا۔ وہ گھٹنوں میں سر دیئے مسہری پر خاموش بیٹھی تھی۔ دروازہ کھلنے پر بھی اس کے جسم میں کوئی حرکت نمودار نہ ہوئی۔

اباقہ نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔ "مارینا! کیا تمہارے دل میں میرے لئے کچھ رحم پیدا ہوا۔"

مارینا نے کہا۔ "میں کہہ چکی ہوں مجھے اپنے دل پر اختیار نہیں۔"

اباقہ نے آخری کوشش کے طور پر کہا۔ "کیا تم سلطان جلال کے قائم کئے ہوئے رشتے کو ہمیشہ کے لئے ختم کر رہی ہو؟"

مارینا بولی۔ "اباقہ! یہ رشتہ میں نے ختم نہیں کیا' اور اگر تم لوگوں کے مجبور کرنے پر میں یہ شادی کر بھی لوں گی تو بخدا تمہیں کبھی ایک شوہر کی محبت اور احترام نہ دے سکوں گی۔"

مارینا کے فیصلہ کن الفاظ نے اباقہ کے چہرے پر ایک پُر عزم سختی پیدا کر دی۔ وہ

بولا۔ "اگر تمہارا آخری فیصلہ یہی ہے' تو میرا بھی ایک آخری فیصلہ ہے۔ میں آج ہی بغداد سے جا رہا ہوں اور اس کے ساتھ ساتھ تمہاری زندگی سے بھی جا رہا ہوں .... ہمیشہ ہمیشہ کے لئے .... اب تمہارے گھر لوٹنے یا نہ لوٹنے سے میرے اس فیصلے پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ تم میری خاطر وہ گھر نہ چھوڑو اور واپس چلی جاؤ۔ یہ تم سے میری زندگی کی آخری درخواست ہے اور مجھے امید ہے تم اسے ٹھکراؤ گی نہیں۔ میں سرائے کے مالک عبدالرحمان کو ہدایت کر چکا ہوں۔ وہ تمہیں بحفاظت اسد اور سلیمان تک پہنچا دے گا۔ چند روز بعد میں سلیمان کے پتے پر ایک نامہ ارسال کر دوں گا۔ جس میں اسد اور یورق کو بتا دوں گا کہ مجھے ہنگامی طور پر عراق سے باہر جانا پڑا ہے اور وہ میری تلاش میں وقت ضائع نہ کریں..........." ایک لحہ رک کر اباقہ نے آنکھوں میں امڈنے والے آنسوؤں کو روکا۔ پھر رندھے ہوئے گلے کو صاف کر کے بولا۔ "ماریتا' علی کا خیال رکھنا' وہ مجھ سے بڑا انس رکھتا ہے' کوشش کرنا کہ وہ مجھے بھول جائے۔ وہ بہت کمزور ہے تم لوگ اس کی خوراک کا دھیان رکھنا۔"

پھر اباقہ نے ماریتا پر الوداعی نگاہ ڈالی۔ وہ اسی طرح گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھی تھی اور ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ "خدا حافظ" اباقہ کے ہونٹوں سے ایک کراہتی ہوئی آواز بلند ہوئی اور وہ دھیمے قدموں سے دروازے کی طرف مڑا۔ جیسے کوئی جواری اپنا سب کچھ ہار کر شکستہ و دل گرفتہ گھر کی طرف روانہ ہوتا ہے۔ وہ دھیمے قدموں سے چل رہا تھا جیسے اسے امید ہو کہ اس کی محبوبہ اب بھی اسے روک لے گی .... اس کا دل موم ہو جائے گا اور وہ بے تابانہ اٹھ کر اس کا دامن تھام لے گی مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ وہ سست قدموں سے چلتا گیا اور دروازہ پار کر کے باہر آ گیا۔

☆------☆------☆

شاید اباقہ فوراً بغداد چھوڑ دیتا۔ مگر ابھی یہاں اسے ایک کام اور کرنا تھا۔ اسے سلطان جلال کے مبینہ قاتل عبداللہ مشہدی کو کیفر کردار تک پہنچانا تھا اور وہ یہ کام نمٹا دینا چاہتا تھا تاکہ پھر کبھی اسے اس شہر بے وفا کا رخ نہ کرنا پڑے۔ سرائے رحمان سے نکلنے کے بعد وہ کچھ دیر مقصد بے مقصد بغداد کی بھری پڑی سڑکوں پر گھومتا رہا' اس گلشن رنگ و بو میں آوارہ پتے کی طرح ڈولتا رہا۔ آخر جب شام کی شفق رنگ دلہن بغداد کی گود میں اتری اور اس کا لمس پا کر شہر کی جبیں پر ستارے جگمگائے تو اباقہ نے خود کو امراء کے محلے میں قصر خلد کے نواح میں پایا۔ ایک جگہ رک کر اس نے ایک ڈیوڑھی پر کھڑے دربان سے مسلم بن داؤد کا پتہ پوچھا تو دربان نے اس کی خستہ حالت پر ایک نگاہ غلط ڈالی اور بھنویں چڑھا کر

بولا۔ "میں اس سے پہلے اسی بخیل کا ملازم تھا۔ کم بخت خادموں کی تنخواہیں شیر مادر کی طرح پی جاتا ہے۔ وہ سامنے والی گلی سکنہ العروس کہلاتی ہے اس میں دائیں طرف چوتھی حویلی داؤد کی ہے۔"

اباقہ تھوڑی ہی دیر بعد داؤد کے گھر کے سامنے اس کے دربان سے بات کر رہا تھا۔ اباقہ کی خستہ حالی دیکھ کر دربان کی تیوریاں چڑھ گئی تھیں اور وہ کسی صورت اباقہ کا پیغام اپنے مالک تک پہنچانے کو تیار نہیں تھا۔ اس دوران کسی نے بالائی منزل کے دریچے سے جھانکا اور نیچے گلی میں گرتے گرتے بچا۔ یہ مسلم بن داؤد ہی تھا۔ چند لمحے بعد ڈیوڑھی میں بھاگتے قدموں کی آواز آئی پھر لرزتا کانپتا مسلم بن داؤد اباقہ کے سامنے پہنچ گیا۔ اباقہ کے بدبودار لباس کی پرواہ کئے بغیر پہلے تو اس نے بغلگیر ہونے کی کوشش کی' پھر نہایت عقیدت سے اس کا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں تھام کر مصافحہ کیا اور دربان کو ایک طرف دھکا دیتا ہوا اسے ڈیوڑھی میں لے آیا۔ ساتھ ساتھ وہ اہلاً و سہلاً مرحبا بھی پکار رہا تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی داڑھی نہایت شتابی سے حرکت کر رہی تھی .... اباقہ سے مسلم بن داؤد کی آخری ملاقات خوارزم کی سرحد پر ہوئی تھی جب اباقہ داؤد اور وزیر خارجہ ابن یاشر کو رسیوں میں جکڑ کر ایک ویران مکان میں چھوڑ گیا تھا۔ اس واقعے کو قریباً ڈیڑھ برس گزر گیا تھا اور داؤد اس وقت کے مقابلے میں اب کافی فربہ نظر آ رہا تھا۔

وہ اباقہ کو اتنے احترام سے نشست گاہ میں لایا جیسے وہ کوئی شہنشاہ ہو اور داؤد ادنیٰ غلام لیکن اباقہ جانتا تھا اس احترام میں محبت کا شائبہ تک نہیں' صرف خوف ہے جو کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ رات گئے تک داؤد اباقہ کی خدمت گزاری میں بچھ بچھ گیا۔ اس کے تمام خادم اور کنیزیں اباقہ کی آنکھ کے ایک اشارے کے منتظر رہے۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد اباقہ نے اچانک مسلم بن داؤد کی گردن پکڑ لی' وہ کسی کبوتر کی طرح پھڑپھڑا کر رہ گیا۔ دہشت زدہ نگاہیں اباقہ کے چہرے پر جمی تھیں۔

اباقہ نے سرد لہجے میں کہا۔ "داؤد' اس دفعہ کوئی فریب دینے کی کوشش نہ کرنا۔ میں پہلے ہی موت ڈھونڈتا پھر رہا ہوں۔ یہ نہ ہو اپنے ساتھ تجھے بھی لے مروں۔"

مسلم بن داؤد خدا رسول کے واسطے دینے کے بعد اپنے آباؤاجداد کی قسمیں کھانے لگا کہ وہ اب اباقہ سے دھوکا کرنے کا خیال بھی دل میں نہیں لا سکتا۔ اباقہ نے اس کی گردن چھوڑتے ہوئے کہا۔ "میں یہاں بدنام قاتل عبداللہ مشہدی کی تلاش میں ہوں اور اس تلاش میں مجھے تمہاری مدد درکار ہے۔ تم جانتے ہو میں بغداد میں کھلے بندوں نہیں پھر سکتا۔ میں چاہتا ہوں کہ تم نہایت رازداری سے اپنے وسائل استعمال کر کے عبداللہ

مشہدی کا سراغ لگاؤ۔"

مسلم بن داؤد نے فوراً سر تسلیم خم کر دیا۔

قریباً دو ہفتے اباقہ' مسلم بن داؤد کی شاندار حویلی میں مقیم رہا۔ داؤد اس کے حکم کے مطابق تندہی سے عبداللہ مشہدی کی تلاش میں لگا رہا۔ اس سلسلے میں وہ کئی مشکوک افراد کو پکڑ کر حویلی میں بھی لایا مگر مشہدی کے بارے میں اس کے سوا اور کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ کوئی ڈیڑھ ماہ پہلے اسے تنگیزی نامی ایک دراز قد منگول کے ساتھ خوارزم کی سرحد میں داخل ہوتے دیکھا گیا تھا۔ اس کے بعد سے وہ بغداد میں کہیں نظر نہیں آیا۔ داؤد' اباقہ سے اس قدر مرعوب تھا کہ وہ مشہدی کی نایابی کو بھی اپنی ہی غلطی سمجھ رہا تھا اور اٹھتے بیٹھتے اباقہ سے معذرت کرنے لگتا تھا۔ مگر اس کے رویے سے ظاہر ہوتا تھا جیسے اباقہ کی میزبانی کے لطف نے اسے سرشار کر رکھا ہے۔ چند ہی روز میں بے چارے کی ساری زائد چربی پگھل گئی تھی اور آنکھیں اندر دھنس گئی تھیں۔ آخر اباقہ سوچنے لگا کہ مجھے اس کی جان چھوڑ دینی چاہئے مگر اس کی جان چھوڑنے سے پہلے اباقہ کو اپنی اگلی منزل کا تعین کرنا تھا۔ شواہد سے اندازہ ہوتا تھا کہ عبداللہ مشہدی خوارزم میں داخل ہوا ہے۔ لہٰذا اباقہ کی اگلی منزل خوارزم ہی ہو سکتی تھی۔ وہ جانے کی تیاریوں میں مصروف ہو گیا مگر ایک کانٹا ہر وقت دل میں چبھتا رہتا تھا۔ وہ بغداد چھوڑنے سے پہلے ایک بار اس گھر کو دیکھنا چاہتا تھا جہاں مارینا' اسد اور علی رہتے تھے۔ وہ بے خواب راتوں میں بستر پر پڑا سوچتا کہ وہ چھپتا چھپاتا اس گاؤں میں جائے گا۔ پھر کسی کھیت میں چھپ کر بیٹھ رہے گا۔ اس کھیت سے سلیمان کا گھر نظر آتا ہو گا۔ جب صبح ہو گی تو علی گھر سے باہر نکلے گا اور زیتون کے نیچے جھولا جھولنے لگے گا۔ وہ اسے جی بھر کر دیکھے گا۔ پھر ہو سکتا ہے مارینا بھی کسی کام سے باہر نکلے' وہ آخری بار اس کے حسین چہرے کا دیدار کرے گا۔ اسے اطمینان ہو جائے گا کہ وہ اپنوں میں پہنچ گئی ہے اور بالکل محفوظ ہے۔ پھر وہ ہر فکر سے آزاد ہو کر گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھے گا اور دور بہت دور نکل جائے گا .... شاید اس کی ان سوچوں میں کہیں یہ امید بھی چھپی بیٹھی تھی کہ ممکن ہے ایک بار پھر اس گاؤں کا رخ کرنے سے روشنی کی کوئی کرن نمودار ہو جائے لیکن کبھی کبھی وہ اس خیال کو بالکل دل سے نکال دیتا اور سوچتا کہ زندگی بھر مڑ کر نہیں دیکھے گا۔ جو پیچھے رہ گیا اسے بھول جائے گا۔ اسی کشمکش کے دوران وہ روانگی کی تیاری بھی کر رہا تھا۔

.... اور یہی وہ وقت تھا جب قراقرم کے افق سے نمودار ہونے والا سرخ طوفان عراق کی سرحد پر پہنچا۔ وہ دنیا کی بہترین فوج سے چنے ہوئے چار سو خونخوار جنگجو تھے۔ ان

میں سے ہر ایک کے دل میں ایک ہی امنگ تھی' اباقہ کی زندہ یا مردہ گرفتاری۔ یہ چار سو انسان نہیں تھے' چار سو خونی درندے تھے جو ملائکہ اجل کا روپ دھار کر عراق کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ان کی وحشت کا نشانہ ایک چھوٹے سے گاؤں کو بننا تھا۔ زیتون کے درختوں اور لہلہاتے کھیتوں میں گھرا ہوا وہ گاؤں اپنے انجام سے بے خبر تھا۔ ایک قیامت تھی جو نہایت خاموشی سے اس گاؤں پر ٹوٹنے والی تھی اور خلیفۂ وقت مستنصر باللہ اپنی سرحدوں اور اپنے عوام کی نگہبانی سے لاتعلق اپنے محل میں آرام کر رہا تھا۔ اس کے اہلکار بغداد کے طلسماتی اندھیرے میں خوبصورت عورتوں کے ریشمی جسموں سے کھیل رہے تھے اور شراب کے جام لنڈھا رہے تھے۔

رات گہری ہو چکی تھی۔ عراق کے اس سرحدی گاؤں میں سلیمان کے گھر کا منظر تھا۔ سردار یورق مسہری پر دراز تھا۔ نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اس کا بے خواب ذہن اباقہ کے متعلق سوچ رہا تھا۔ چند روز پہلے ایک قاصد نے اباقہ کا خط پہنچایا تھا جس میں اس نے لکھا تھا کہ اسے ایک کام کے سلسلے میں ہنگامی طور پر بصرہ جانا پڑ گیا ہے۔ اسے دو تین ماہ یا اس سے بھی زیادہ لگ سکتے ہیں۔ لہٰذا وہ لوگ فکرمند نہ ہوں۔ اس خط نے اسد اور یورق کو پوری طرح مطمئن تو نہیں کیا تھا تاہم انہوں نے اباقہ کی تلاش ختم کر دی تھی' جہاں تک مارینا کی تلاش کا کام تھا وہ ایک ہفتہ پیشتر ہی ختم ہو چکا تھا۔ وہ جس طرح چپ چاپ گئی تھی' اسی طرح خاموشی سے واپس آ گئی تھی۔ اس نے اپنے آنے اور جانے کی بابت کچھ نہیں بتایا تھا اور نہ ہی انہوں نے اسے کریدنا مناسب سمجھا تھا۔ وہ جب سے لوٹی تھی قطعی گم صم اور نہایت افسردہ تھی۔ بہرحال ان کے لئے یہی کافی تھا کہ وہ واپس لوٹ آئی ہے۔

یورق انہی خیالوں میں گم تھا جب دروازہ کھلا اور شیزی کولت آہستگی سے اندر آ گئی۔ اس نے اب روسی لباس چھوڑ کر مقامی لباس پہننا شروع کر دیا تھا۔ کچھ روز پہلے نبیلہ نے اسے کانچ کی چوڑیاں بھی لا کر دی تھیں۔ یہی چوڑیاں چھنکاتی شیزی کولت سردار یورق کے پاس آ بیٹھی۔ شمعدان کی روشنی میں اس کی خوبصورت آنکھیں چمک رہی تھیں۔ شاید وہ کوئی دلچسپ بات شروع کرنا چاہتی تھی مگر جب یورق کو سنجیدہ دیکھا تو محتاط ہو گئی۔ وہ یورق کی اداسی کا سبب سمجھ رہی تھی۔ اگلے روز عیدالاضحیٰ کا تہوار تھا اور اباقہ ان میں موجود نہیں تھا۔ اس نے کہا۔

"سردار! کیا یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ اباقہ بھائی یہ تہوار ہمارے ساتھ گزار کر جاتے۔"

یورق نے کھوئے لہجے میں کہا۔ "اس کے خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا کام

زیادہ ضروری تھا۔"

شیزی کولت نے کہا۔ "سردار یورق! کہیں اباقہ کی روانگی' کا تعلق مارینا کی خاموشی سے تو نہیں۔"

یورق نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ "تم نے یہ کیسے سوچ لیا؟"

شیزی بولی۔ "جہاں تک میں سمجھی ہوں' اباقہ' مارینا سے بے پناہ محبت کرتا ہے۔ پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اس کی گمشدگی کے دوران ہی اسے کوئی ضروری کام یاد آ جاتا اور وہ تین چار ماہ کے لئے کہیں روانہ ہو جاتا۔"

شیزی ٹھیک کہہ رہی تھی۔ خود یورق کو شبہ تھا کہ کہیں نہ کہیں اباقہ اور مارینا کی ملاقات ضرور ہوئی ہے۔ بہرحال وہ اس بارے میں زیادہ سوچ کر اپنے ذہن کو پراگندہ کرنا نہیں چاہتا تھا اور نہ ہی وہ یہ چاہتا تھا کہ شیزی اس بارے میں قیاس آرائیاں کرے۔ اس نے خشک لہجے میں کہا۔

"تم اباقہ کے بارے اتنا نہیں جانتی جتنا میں جانتا ہوں۔"

یورق کا مزاج بگڑتے دیکھ کر شیزی جلدی سے بولی۔ "میں تو یونہی کہہ رہی تھی۔ غالباً میرا اندازہ غلط ہے۔"

یورق خاموشی سے چھت کو گھورنے لگا۔ شیزی کولت اس کی فکرمندی دور کرنے کے لئے ہلکی پھلکی باتوں میں مصروف ہو گئی۔ وہ بہت خوش گفتار لڑکی تھی۔ وہ بلاتکان باتیں کرتی رہی اور کچھ ہی دیر میں اس نے یورق کو وقفے وقفے سے مسکرانے اور ہنسنے پر مجبور کر دیا۔ شیزی کے ایک روسی لطیفے پر یورق اتنا کھل کر ہنسا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے وہ اسی طرح کھانستا ہوا بولا۔

"شیزی! تُو آخر کیا چیز ہے۔ کہاں سے لی ہے تُو نے اتنی زندہ دلی۔"

شیزی اطمینان سے بولی۔ "حادثوں سے۔ زندگی کی محرومیوں نے مجھے ہنسنا سکھا دیا ہے۔"

یورق بستر پر بیٹھتے ہوئے سنجیدگی سے بولا۔ "شیزی ایک بات تو بتا۔ تُو رات کے اس پہر اس تنہا کمرے میں میرے پاس بیٹھی ہے۔ آخر وہ کیا چیز ہے' جو تجھے ہر وقت میرے تعاقب میں رکھتی ہے۔ کیا مل جاتا ہے تجھے مجھ سے۔"

شیزی اندازِ بے نیازی سے بولی۔ "پیار"۔

"کیسا پیار؟" یورق نے پوچھا۔

"بتاؤں؟" شیزی نے کہا۔

"ہاں بتاؤ۔" یورق نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

شیزی چند لمحے آبدیدہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر ہونٹوں پر مسکراہٹ کے ستارے سجا کر بولی۔ "اچھا کل بتاؤں گی۔ کل صبح جب تم عید کی عبادت کرنے کے بعد واپس آؤ گے تو بتاؤں گی۔"

یورق نے کہا۔ "وعدہ؟"

شیزی بولی۔ "ہاں وعدہ۔"

اس کے بعد وہ اٹھی اور مسکراتی ہوئی باہر نکل گئی۔ یورق مسہری پر لیٹ کر سوچنے لگا۔ اس کی سوچوں کا محور شیزی ہی تھی۔ عجب لڑکی تھی یہ کبھی یورق کو محسوس ہوتا کہ وہ اس سے ایک بیٹی کی طرح محبت کرتی ہے۔ کبھی لگتا کہ اس کی محبت صرف ایک ہم سفر ساتھی کی محبت ہے جس میں اور کوئی جذبہ شامل نہیں اور کبھی اسے یہ گمان ہوتا کہ وہ اسے ایک عورت کی نظر سے دیکھتی ہے۔ یورق کو کچھ سمجھ نہیں آتی تھی۔ اس لڑکی نے اس کے تجربہ کار ذہن کو چکرا کر رکھ دیا تھا۔ وہ سوچتا رہا' سوچتا رہا اور پھر گہری نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

اگلی صبح بہت اجلی تھی۔ اسد' یورق اور علی نے نئے کپڑے زیب تن کئے اور نماز ادا کرنے کے لئے عیدگاہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ سلیمان کی طبیعت چونکہ کچھ خراب تھی' وہ نماز ادا کرنے نہ جا سکا۔ ایک نہایت خوبصورت اور پلا ہوا ترکی دنبہ علی کے پیچھے پیچھے جا رہا تھا۔ اس کی ریشمی ڈوری علی نے اپنی کلائی سے لپیٹ رکھی تھی اور رک رک کر بار بار دنبے کی پیشانی چومنے کی کوشش کر رہا تھا۔ نبیلہ اور شیزی دروازے پر کھڑی اس کی حرکتوں پر مسکرا رہی تھیں۔ جب وہ سب لوگ عیدگاہ کی طرف مڑ گئے تو نبیلہ نے قاسم کا منہ دھلا کر اسے نئے کپڑے پہنائے اور شیزی کے سپرد کر دیا۔ پھر وہ مارینا کو لے کر چشمے کی طرف روانہ ہو گئی۔

مارینا جیسے مجبوری کی حالت میں اس کے ساتھ جا رہی تھی۔ اس کے چہرے پر مسرت کا شائبہ تک نہ تھا۔ آنکھیں مسلسل رونے کی وجہ سے سرخ اور متورم تھیں۔ چشمے پر غسل کے لئے آنے والی دیہاتی عورتوں کی بھیڑ تھی۔ مارینا اور نبیلہ ایک پتھر پر بیٹھ کر اپنی باری کا انتظار کرنے لگیں۔ نبیلہ بہت حد تک مارینا سے بے تکلف تھی۔ مگر ان دنوں اس کی گہری سنجیدگی سے خوف کھانے لگی تھی۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اس کا غم کیسے غلط کرے۔ پچھلے دو ہفتے میں اس نے صرف ایک دفعہ اباقہ کا نام لیا تھا اور مارینا نے اسے بُری طرح جھڑک دیا تھا۔

ابھی نبیلہ اس سے بات کرنے کے لئے کوئی موضوع ڈھونڈ ہی رہی تھی کہ اچانک کچھ فاصلے سے گھڑسوار آتے دکھائی دیے۔ اُن کے گھوڑوں کی اڑاتی ہوئی دھول اوپر تک اٹھ رہی تھی۔ ماریتا اور نبیلہ گہری نظروں سے گھڑسواروں کو دیکھنے لگیں۔ دفعتاً انہیں احساس ہوا کہ گھڑسواروں کے لباس غیرمانوس ہیں اور ان کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے۔ وہ کم و بیش چار سو سوار تھے۔ اچانک نبیلہ کے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بج اٹھی۔ یہ گاؤں سرحد کے قریب تھا اور پچھلے دنوں ایسے واقعات رونما ہوئے تھے کہ تاتاریوں کے دستوں نے خوارزم کے مقبوضہ علاقے سے نکل کر لوٹ مار کی تھی۔ وہ بہت سے مویشی اور سبزیوں سے لدے ہوئے چھکڑے ہانک کر لے گئے تھے۔ اب ماریتا اور نبیلہ کے ساتھ ساتھ دوسری عورتیں بھی ہوشیار ہو گئی تھیں۔ یکایک ایک دہقان بھاگتا ہوا پہنچا۔ اس کا رنگ سرسوں کی مانند زرد ہو رہا تھا۔ وہ چیخ کر بولا۔

”بی بیو! یہ تاتاری گھڑسوار ہیں' اپنے گھروں کو بھاگ جاؤ۔“

عورتوں نے تاتاریوں کا سنا تو بُری طرح حواس باختہ ہو گئیں۔ اُن کے ہاتھوں میں عریاں تلواریں چمک رہی تھیں اور بے مہر چہروں کے تیور نہایت خطرناک تھے۔ نیم برہنہ عورتیں گرتی پڑتی گاؤں کی طرف بھاگیں تو منگولوں نے ان کا پیچھا کیا۔ اچانک ایک منگول کی نظر ماریتا پر پڑی اور وہ حلق کی پوری قوت سے چیخا۔

”وہ دیکھو .... وہ رہی خان چغتائی کی بیوی۔ پکڑلو اسے۔“

یہ دہشت ناک آواز ماریتا اور نبیلہ نے بھی سنی۔ ان کے دل جیسے سینوں میں بیٹھ گئے۔ ماریتا دیکھ رہی تھی کہ اب گھڑسوار واضح طور پر اس کی طرف متوجہ ہیں۔ غیرارادی طور ماریتا کے قدموں میں تیزی آ گئی۔ نبیلہ بھی اس کے ساتھ بھاگنے لگی۔ وہ اب گاؤں کی حدود میں پہنچ چکی تھیں۔ ایک گھر کے سامنے پہنچ کر نبیلہ نے اچانک ماریتا کا بازو کھینچا اور اسے لیتے ہوئے اندر داخل ہو گئی۔ ایک بوڑھے دیہاتی نے ان کے دہشت زدہ چہرے دیکھے تو بوکھلا گیا۔

”کیا ہوا بیٹی؟“ اس نے بیک وقت دونوں سے پوچھا۔

نبیلہ روتی ہوئی بولی۔ ”بابا! کچھ لوگ ہمارا پیچھا کر رہے ہیں۔“

بوڑھے نے تیزی سے صورت حال کا جائزہ لیا اور ان دونوں کو ایک عقبی کمرے میں دھکیل کر باہر سے دروازہ بند کر دیا۔ ذرا ہی دیر بعد بوڑھے کے گھر کے سامنے قیامت خیز شور بلند ہوا اور منگول گماشتے دندناتے ہوئے اندر گھر آئے۔

”لڑکیاں کہاں ہیں؟“ ایک ترجمان نے فارسی میں چلا کر پوچھا۔

بوڑھا کپکپاتا ہوا بولا۔ ”مم .... مجھے کچھ معلوم نہیں۔“

ابھی بوڑھے کا فقرہ بمشکل مکمل ہوا تھا کہ منگول سالار کی تلوار حرکت میں آئی اور بوڑھے کے سر کو گردن تک دو حصوں میں تقسیم کر گئی۔ وہ لڑکھڑا کر گرا اور اپنے ہی خون میں لت پت ہونے لگا۔ بوڑھے کا ایک بیٹا باپ کو سنبھالنے کے لئے بڑھا تو ایک منگول نے اس کے سینے میں ایسا نیزا مارا کہ آر پار کر دیا۔ ماریتا اور نبیلہ نے بند دروازے کی جھریوں سے یہ بھیانک مناظر دیکھے اور موت ان کی آنکھوں کے سامنے رقصاں ہو گئی۔ نبیلہ نے جلدی سے عقبی کھڑکی کھولی اور ماریتا کو لیتی ہوئی باہر گلی میں نکل آئی۔ گلی میں پہنچ کر انہوں نے دیکھا لوگ مکانوں کی چھتوں پر دہشت زدہ کھڑے ہیں اور منگول پیادے و سوار ان دونوں کو چاروں طرف ڈھونڈ رہے ہیں۔ جونہی وہ گلی میں نکلیں ایک منگول سوار کی نظر ماریتا اور نبیلہ پر پڑی اور وہ ان کی طرف انگلی اٹھا کر چلایا۔

اس کے حکم پر منگول مختلف اطراف سے ان کی جانب لپکے۔ ماریتا اور نبیلہ دہشت زدہ ہرنیوں کی طرح ایک گلی میں داخل ہوئیں اور ننگے سر ننگے پاؤں بھاگتی چلی گئیں۔ اچانک ایک نوجوان نے ان کا راستہ روکا اور انہیں کھینچتا ہوا ایک گھر میں لے گیا۔ یہ نوجوان گاؤں کا واحد نانبائی تھا اور دکان کے ساتھ ہی اس کا گھر بھی تھا۔ اس نے ان دونوں کو اپنی بیوی کے سپرد کر دیا۔ وہ انہیں لے کر گھر کی چھت پر آ گئی۔ یہاں ایک کونے میں خشک گھاس کا بڑا سا ڈھیر پڑا تھا۔ اس نے ان دونوں کو گھاس کے پیچھے چھپا دیا اور خود جلدی جلدی سیڑھیاں اتر کر نیچے چلی گئی۔ ابھی بمشکل وہ اپنے خاوند کے پاس پہنچی تھی کہ منگولوں نے نانبائی کی دکان پر ہلہ بول دیا۔ ایک منگول نے پکار کر کہا۔

”وہ دونوں اسی گھر میں گھسی ہیں؟“

ترجمان خونی لہجے میں نانبائی سے بولا۔ ”بتا کہاں ہیں وہ دونوں عورتیں؟“

نانبائی نے بھی بوڑھے کی طرح انکار کر دیا۔ وہ لجاجت سے بولا۔ ”حضور! مجھے کچھ معلوم نہیں۔“

منگول دستے کا سالار آگ بگولا ہو گیا۔ اس نے دو توانا سپاہیوں کو اشارہ کیا اور انہوں نے نانبائی کو اٹھا کر پلک جھپکتے میں جلتے تندور کے اندر پھینک دیا۔ اس کی بیوی نے یہ المناک منظر دیکھا تو ایک دلخراش چیخ مار کر بے ہوش ہو گئی۔ منگول دروازہ کھول کر گھر میں آ گھسے اور پاگل کتوں کی طرح ان دونوں کو تلاش کرنے لگے۔ آخر منگول سردار کی پُرہول گرج ماریتا اور نبیلہ کو سنائی دی۔ وہ اپنے ساتھیوں سے کہہ رہا تھا۔ ”اس گھر کو آگ لگا دو اور ہر اس گھر کو آگ لگا دو جس پر تمہیں شبہ ہو کہ یہاں ہمارے دشمنوں کو پناہ دی گئی

ہے۔"

چند لمحے بعد ماریتا اور نُبیلہ نے نانبائی کے گھر سے اٹھتے ہوئے شعلے دیکھے اور چلاتی ہوئی اپنی پناہ گاہ سے نکل آئیں۔ چھتوں چھتوں پر بھاگتیں وہ کئی گھر آگے آگئیں۔ پھر ایک گھر کی سیڑھیاں اتر کر اس گلی میں پہنچ گئیں جو سیدھی ان کے مکان کو جاتی تھی۔ منگول سوار ان کو گلی میں پہنچتے دیکھ چکے تھے۔ لہٰذا وہ مختلف اطراف سے سمٹے اور ان کے پیچھے لپکے۔ گھوڑوں کی ٹاپوں سے در و دیوار گونج اٹھے۔ تب نبیلہ کو دروازے پر سلیمان نظر آیا۔ وہ حیرت سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ نبیلہ دور ہی سے چیخی۔ "سلیمان .... بچاؤ .... یہ منگول ہیں۔"

سلیمان چند قدم بھاگ کر آگے آیا۔ پھر واپس گیا اور گھر میں گھس کر تلوار اور تیر کمان نکال لایا۔ جس وقت اس نے زمین پر بیٹھ کر منگول سواروں پر تیر برسانے شروع کئے ماریتا اور نبیلہ دروازہ کھولتی ہوئی گھر میں گھس گئیں۔ "قاسم .... قاسم۔" نبیلہ اپنے ننھے بیٹے کے لئے چیخی۔ شیزی کولت ایک کمرے سے بھاگتی ہوئی نکلی۔ قاسم اس کے بازوؤں میں تھا۔ نبیلہ نے اس سے قاسم کو جھپٹا اور روتی ہوئی بولی۔

"......... شیزی! آؤ پچھلے دروازے سے بھاگ جائیں۔ یہ منگول ہمیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

نبیلہ' ماریتا اور شیزی ابھی پچھلے دروازے کی طرف بڑھی ہی تھیں کہ سامنے والا دروازہ کھلا اور چار منگول سلیمان کو دھکیلتے ہوئے اندر لے آئے۔ سلیمان کی ایک تلوار کے مقابلے میں ان کی چار تلواریں تھیں مگر سلیمان پوری جانفشانی سے لڑ رہا تھا اور ساتھ ساتھ چیخ رہا تھا۔

"بھاگ جاؤ .... بھاگ جاؤ۔" اس کی یہ ہدایات نبیلہ ماریتا وغیرہ کے لئے تھیں مگر اچانک اس کی آواز بند ہو گئی۔ ایک منگول نے پہلو سے آکر اس پر تلوار کا ایسا وار کیا کہ اس کا سر تن سے جدا ہو کر دور جا گرا .... خلیج فارس کا ماہر غوطہ زن اور نبیلہ کا محبوب سلیمان' اپنی جان ہار چکا تھا۔ اس کا سربریدہ لاشہ تیزی سے خون اگل رہا تھا اور وہ لڑھکتا ہوا دہلیز تک چلا گیا تھا۔ "سلیمان .... سلیمان!" نبیلہ اور ماریتا دلدوز انداز میں چیخیں۔ انہوں نے سلیمان کے لاشے کی طرف لپکنا چاہا مگر پھر انہیں اندازہ ہوا کہ ان کی یہ حرکت انہیں منگولوں کے لئے تر نوالہ بنا دے گی۔ اپنی جان بچانے کے لئے وہ تینوں عقبی دروازے کی طرف بھاگیں۔ ننھا قاسم ماں کی بانہوں میں بری طرح چلا رہا تھا۔ شاید وہ بھی اس موت سے باخبر ہو گیا تھا جو اس پورے گاؤں کو اپنے نرغے میں لے چکی تھی۔

تینوں بھاگتی ہوئی عقبی دروازے سے نکلیں تو شیزی کولت سب سے پیچھے تھی۔ منگول گھڑسوار کریہہ آوازیں نکالتے ان کے تعاقب میں تھے۔ جونہی شیزی نے دہلیز پار کی اسے عقب سے سنسناہٹ سنائی دی۔ ایک وزنی تیر اس کی پشت میں پیوست ہوا اور سینے کی جانب سے باہر نکل آیا۔ شیزی کولت نے اپنے ریشمی لبادے کے نیچے ابھرے ہوئے تیر کو دیکھا اور بے اختیار اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ وہ اپنے انجام سے باخبر ہو چکی تھی۔ اس نے لبوں پر آنے والی کربناک چیخ کو کمال جرأت سے روکا اور لڑکھڑاتے قدموں سے ماریتا اور نبیلہ کے پیچھے بھاگنے لگی۔ ہر لحظہ اس کے جسم میں ایک سرد لہر اترتی جا رہی تھی۔ ذرا سی دیر میں اس کا ریشمی لباس خون سے تر ہو گیا اور پیٹ و ناف پر ابلتے خون کی گرمی محسوس ہونے لگی۔ آخر چند قدم بھاگ کر اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور وہ چکرا کر اوندھے منہ گری۔ ماریتا اور نبیلہ نے مڑ کر اسے دیکھا اور ٹھٹک گئیں۔

"شیزی۔" ماریتا کے ہونٹوں سے چیخ نکلی۔ اس نے پیچھے آکر شیزی کی مدد کرنا چاہی مگر اس وقت اسد اللہ نے عقاب کی طرح ایک مکان کی چھت سے چھلانگ لگائی اور ان کے سامنے آگیا۔ اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا مگر آنکھوں میں غضب کی سختی تھی۔ اس نے ایک نظر نیم جان شیزی کی طرف دیکھا پھر ماریتا اور نبیلہ کو پوری قوت سے دھکیلتے ہوئے بولا۔

"بھاگ جاؤ .... میں کہتا ہوں بھاگ جاؤ۔"

اسد کے فیصلہ کن لہجے نے ان دونوں کو واپس مڑنے اور بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ منگول سوار اور پیادے اب بالکل قریب پہنچ چکے تھے۔ اسد نے رُخ پھیرا اور تلوار سونت کر ان کے مقابل آگیا۔ اس کے جسم میں بجلیاں کوند رہی تھیں۔ جلال الدین خوارزم شاہ کا شیر دل مجاہد اپنی بہنوں کی حفاظت کے لئے سر تا پا قہر بن گیا تھا۔ وہ ایک ناقابل تسخیر چٹان کی طرح منگولوں کے سامنے ڈٹ گیا۔ اس کے فولادی بازوؤں نے شمشیر کو برق آسمانی بنا دیا لیکن اس کے مدمقابل بھی کوئی معمولی اشخاص نہیں تھے۔ وہ شہر قراقرم کے چنے ہوئے جنگجو اور منگولوں کی عسکری قوت کا سرمایہ تھے۔ ان میں سے ہر ایک شخص ایک قیامت تھا اور یہ قیامتیں اسد کو تین اطراف سے گھیر رہی تھیں۔ تنہا شیر ان گنت خونی بھیڑیوں کے نرغے میں تھا۔ مگر اس کی مدافعت دیکھنے کے قابل تھی۔ وہ پورے مجاہدانہ وقار اور جرأت رندانہ کے ساتھ ان کو موت سے ہمکنار کر رہا تھا۔ ان کی تعداد اور ان کی مہارت کو خاطر میں لائے بغیر وہ ان پر اجل بن کر ٹوٹ رہا تھا۔

☆------☆------☆

جس وقت منگولوں نے گاؤں پر حملہ کیا' گاؤں کے لوگ نماز عید کی ادائیگی کے بعد ایک دوسرے سے گلے مل رہے تھے۔ سردار یورق اور اسد آپس میں بغلگیر تھے' جب گاؤں کی جانب سے چیخ وپکار کی صدائیں بلند ہوئیں اور ایک جانب سے شعلے اٹھتے ہوئے نظر آئے۔ تمام لوگ حیرانی سے گاؤں کی طرف دیکھنے لگے۔ اس وقت چند افراد بھاگتے ہوئے عیدگاہ کی طرف بڑھے۔ ان میں دو تین عورتیں بھی تھیں۔ اسد اور یورق نے نگاہوں کا تبادلہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ کوئی حادثہ پیش آگیا ہے۔ گاؤں سے بھاگ کر آنے والے عیدگاہ پہنچے تو زور زور سے رونے لگے۔ عورتیں بین کر رہی تھیں۔ ایک بوڑھے مرد نے اسداللہ کو دیکھا تو پکار کر بولا۔

"بھائی! جاؤ اپنی عورتوں کی عزتیں بچاؤ۔ ان درندوں نے تمہارے میزبان کو ہلاک کر دیا اور گھر کو آگ لگادی۔"

اسد حیرانی سے بولا۔ "کیا مطلب' سلیمان.........."

اس شخص نے کہا۔ "ہاں' سلیمان مارا گیا.......... اور وہ سب بھی مارے گئے جنہوں نے تمہاری عورتوں کو پناہ دینے کی کوشش کی۔ گاؤں میں جگہ جگہ آگ بھڑک رہی ہے۔ خدا کے لئے کچھ کرو ورنہ پوری بستی خاک ہو جائے گی۔"

اسد کا دل سینے میں پھنکار کر رہ گیا۔ دوسری طرف یورق کی آنکھوں میں انگارے دہکنے لگے تھے۔ اسد نے معاملہ فہم نگاہوں سے یورق کو دیکھا اور بولا۔

"یورق! میرا خیال ہے کہ ہمارے ازلی دشمن ہمیں ڈھونڈتے ہوئے یہاں پہنچ گئے ہیں۔"

"پھر اب کیا کرنا چاہئے؟" یورق نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

اسد نے ایک شخص کے نیام سے تلوار کھینچی اور بولا۔ "میں گھر کی طرف جاتا ہوں۔ تم فوراً جنگل کی طرف جاؤ اور پڑاؤ میں پہنچ کر اباقہ کے ساتھیوں کو اطلاع دو۔ لگتا ہے دشمن کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ہمیں مدد کی ضرورت ہے.........."

یورق نے اثبات میں سرہلایا اور اسد کو خدا حافظ کہہ کر عیدگاہ کی عقبی جانب بڑھا۔ علی اس کے ساتھ ساتھ بھاگا آرہا تھا۔ یورق کی نگاہیں کوئی گھوڑا تلاش کر رہی تھیں لیکن گھوڑا وہاں ایک بھی نہیں تھا۔ ہاں ایک جانب درختوں تلے دو تین گھوڑا گاڑیاں کھڑی تھیں۔ غالباً قریبی گاؤں سے جو لوگ نماز عید ادا کرنے آئے تھے یہ ان کی گاڑیاں تھیں۔ ان میں سے ایک گاڑی کے گھوڑے کافی توانا تھے۔ گاڑی کا مالک جو شکل و صورت سے کوئی امیر لگتا تھا' گاڑی کے قریب ہی کھڑا تھا۔ وہ خاصا مہربان شخص تھا۔ گاؤں والوں کی

حالت زار دیکھ کر اس کا چہرہ ملول ہو رہا تھا۔ یورق کو اس سے درخواست کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ یورق کو اپنی جانب بڑھتے دیکھ کر وہ خود ہی بول اٹھا۔

"میرے بھائی! پریشان ہونے کی ضرورت نہیں اگر تم کہیں جلد پہنچنا چاہتے ہو تو میری گاڑی لے جاسکتے ہو۔ میں تو تنہا ہوں کسی دوسری گاڑی میں بیٹھ جاؤں گا۔"

یورق نے اس کا شکریہ ادا کیا اور لپک کر گاڑی میں سوار ہوگیا۔ علی بھی اس کا سہارا لے کر اوپر چڑھ آیا۔ یورق نے گھوڑوں کو تھپکی دی پھر انہیں تیزی سے گھماتا ہوا کچے راستے پر لے آیا۔ عیدگاہ میں افراتفری مچ چکی تھی۔ لوگ چیختے چلاتے اپنے گھروں کی جانب بھاگ رہے تھے۔ دوسری طرف کچھ بچے اور عورتیں گاؤں سے عیدگاہ کی طرف آ رہے تھے۔ عجب بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ گاؤں کے کئی مکانوں سے آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے اور کچھ عورتوں کی آہ و زاری سے پتہ چلتا تھا کہ گاؤں میں بہت سے لوگ قتل ہو گئے ہیں۔ یورق کا جسم آتش فشاں بنتا جا رہا تھا۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ پڑاؤ کی طرف جائے یا گاؤں کی طرف۔ آخر وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ بہت دیر ہو چکی ہے اب پڑاؤ کی طرف جانا بے کار ہو گا۔ اس کا دل جیسے اندر ہی اندر کٹ رہا تھا اور اس کی چھٹی حس اسے احساس دلا رہی تھی کہ پانی سر سے گزر چکا ہے۔ اس نے گھوڑوں کی لگامیں کھینچیں اور انہیں روک لیا۔ پھر انہیں موڑتا ہوا گاؤں کی طرف بڑھا۔ چابک لہراتا ہوا وہ انہیں سرپٹ بھگا رہا تھا۔ آخر وہ گاؤں کی گلیوں میں داخل ہوا اور اس کے بدترین خدشات حقیقت کا روپ دھار گئے۔ حملہ آور منگول ہی تھے اور وہ اپنی حیوانی روایات کے مطابق گاؤں میں لوٹ مار کا بازار گرم کر چکے تھے۔ ان کی تعداد یورق کی توقعات سے کہیں زیادہ تھی۔ وہ گھروں میں گھس گھس کر عورتوں کو بے آبرو اور مردوں کو قتل کر رہے تھے۔ بلا امتیاز عمر و جنس ہر کوئی ان کی زد میں تھا۔ ان کی درندگی سے بچنے کے لئے جس کا جدھر منہ اٹھتا تھا' بھاگ رہا تھا۔ علی کی نظروں کو ان مناظر سے محفوظ رکھنے کے لئے یورق نے اسے گاڑی کے عقبی حصہ میں بھیج دیا۔ اس گاؤں کی آبادی سات آٹھ سو نفوس سے زیادہ نہیں تھی۔ سیدھے سادے دہقان لوگ تھے۔ ان میں لڑنے والے مردوں کی تعداد چالیس پچاس کے قریب ہو گی۔ مگر دہشت کے اس ریلے میں وہ بھی تنکوں کی طرح بہہ گئے تھے۔ کوئی ایک تلوار بھی منگولوں کے مقابل نہیں تھی اور وہ خونی درندوں کی طرح گاؤں کی گلیوں میں دندنا رہے تھے۔ مگر نہیں.......... ایک تلوار ان کے مقابل تھی اور یہ تلوار سلطان جلال الدین کے ساتھی اور اباقہ کے پیارے دوست اسداللہ کی تھی۔

یورق نے اسے کوئی پچاس گز کے فاصلے سے دیکھا۔ سفید قبا پہنے ایک منگول کے

چھینے ہوئے گھوڑے سے پر سوار وہ کوئی افسانوی کردار دکھائی دیتا تھا وہ اکیلا تھا' بالکل تنہا اور اس کے چاروں طرف قاتل تلواریں تھیں اور وہ بڑی شان سے ان تلواروں کے سائے میں حق دوستی ادا کر رہا تھا۔ جلال الدین نہیں تھا تو کیا ہوا۔ وہ تو تھا۔ اباقہ نہیں تھا تو کیا ہوا وہ تو تھا اور یورق نہیں تھا تو کیا ہوا' وہ تو تھا۔ ماریتا کو اس کے جھوٹے وارثوں سے بچانے کے لئے وہ آہنی دیوار بن گیا تھا۔ قراقرم سے اٹھنے والے انتقام کے طوفان کے لئے اس نے ایک ناقابل عبور رکاوٹ کھڑی کر دی تھی۔ پھر یورق نے دیکھا کہ قریبی مکانوں کی چھتوں سے کود کود کر پندرہ بیس منگول اسد کے عقب میں پہنچے اور انہوں نے اسے مار گرایا۔ ایک بے رحم تلوار اس کی پشت میں پیوست ہوئی اور وہ گھوڑے پر اوندھا گر گیا۔ پھر ایک نیزا اس کے جسم میں داخل ہوا اور وہ اپنی سفید قبا میں لپٹا ہوا گھوڑے سے نیچے آ رہا۔ یہ منظر یورق کی آنکھوں میں زہریلی برچھی کی مانند اتر گیا۔ اس نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھا اور سینے کی پوری قوت سے چلایا۔ "اسد............"

تب اس نے پاگلوں کی طرح ایک وحشیانہ چیخ بلند کی اور ایسا زوردار جھٹکا دیا کہ چاروں گھوڑے اپنے پچھلے پیروں پر الف ہو گئے سبک رفتار گھوڑا گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھی۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ طوفانی رفتار اختیار کرتی اور سردار یورق کسی خونی دیوانے کی طرح منگولوں پر جا پڑتا' اسے گھوڑوں کی لگامیں پھر کھینچنا پڑیں۔ چند عورتیں اس کی طرف بھاگی آ رہی تھیں اور ان میں ماریتا اور نبیلہ بھی تھیں۔ ان کے رنگ خوف سے زرد ہو رہے تھے اور نبیلہ کی بانہوں میں ننھا قاسم رو رو کر بے حال ہو رہا تھا۔ عورتیں بھاگتی ہوئی آئیں اور گھوڑا گاڑی پر آ بیٹھیں۔ نبیلہ ماتم کرنے والے انداز میں بولی۔

"سردار یورق! اب کچھ باقی نہیں رہا۔ آؤ بھاگ چلیں۔ اب کچھ باقی نہیں رہا۔"

یورق پاگلوں کی طرح کبھی پیچھے اور کبھی سامنے دیکھ رہا تھا۔ سامنے اس خونی گلی کا وہ موڑ تھا جہاں اس نے اسد اللہ کا بے جان جسم گھوڑے سے لڑھکتے دیکھا تھا اور عقب میں وہ راستہ تھا جہاں سے وہ زندگی کا سراغ پا سکتے تھے۔ سامنے یورق کا انتقام تھا اور عقب میں ماریتا' نبیلہ اور علی کی سلامتی۔ وہ اپنی زندگی کے اہم ترین دوراہے پر کھڑا تھا۔ اسے اندازہ ہوا کہ اگر وہ کچھ دیر اور اس خونی دوراہے پر کھڑا رہا تو اس کے اندر کا وحشی بے قابو ہو جائے گا۔ وہ گھوڑا گاڑی سے چھلانگ لگائے گا اور انتقام انتقام پکارتا منگولوں کی طرف لپک جائے گا۔ اس وحشت سے بچنے کے لئے اس نے پھرتی سے گھوڑوں کو موڑ لیا۔ اچانک اسے کچھ یاد آیا۔ وہ چلا کر بولا۔

"شیزی کہاں ہے؟"

نبیلہ روتے ہوئے بولی۔ "کچھ نہ پوچھو سردار' ہم سے کچھ نہ پوچھو۔"

نبیلہ کا جواب سن کر سردار کے سینے میں ایک کربناک ٹیس ابھری۔ مگر یہ وقت آنسو بہانے کا نہیں تھا۔ اس نے لگاموں کو زوردار جھٹکا دے کر گھوڑے آگے بڑھائے۔ منگول اب اسد کی رکاوٹ پار کر کے گھوڑا گاڑی کی طرف لپک رہے تھے۔ یورق ایک بل کھاتی ہوئی تنگ سی گلی میں داخل ہو گیا۔ یہ طویل گلی گاؤں کے بیچوں بیچ گزرتی اسے دو حصوں میں تقسیم کرتی تھی۔ اس گلی سے بمشکل پانچ گھوڑے پہلو بہ پہلو گزر سکتے تھے۔ لہٰذا تعداد میں کثیر ہونے کے باوجود منگول سوار گھوڑا گاڑی پر بھرپور حملہ نہ کر سکتے تھے۔ تاہم انہیں فائدہ ضرور حاصل تھا کہ وہ گھوڑوں پر تھے اور گھوڑا گاڑی کی نسبت تیز رفتاری کا مظاہرہ کر سکتے تھے اور انہوں نے ایسا ہی کیا۔ گھوڑا گاڑی کچھ ہی آگے گئی تھی کہ وہ ان کے سروں پر پہنچ گئے۔ انہیں قریب دیکھ کر عورتیں چیخنے چلانے لگیں۔ یورق نے گھوڑوں کی لگامیں ماریتا کے سپرد کر دیں اور خود گھوڑا گاڑی کے عقب میں آ گیا۔ یہ ایک نہایت شاندار اور مزین گھوڑا گاڑی تھی۔ گھوڑا گاڑی کی اندرونی آرائش سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کا مالک ایک باذوق شخص ہے۔ گاڑی میں داخل ہوتے ہی یورق نے ایک نہایت شاندار کمان دیکھی تھی۔ اس کے ساتھ ایک بڑا ترکش بھی موجود تھا۔ یورق ان دونوں چیزوں کو استعمال کرنا چاہتا تھا۔ اس نے کمان اتاری تو اس کا وزن دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس قسم کی مخصوص کمانیں شمالی ترکستان میں تیار کی جاتی تھیں۔ یہ کمان دراصل تین کمانوں کا مجموعہ تھی۔ جس سے ایک وقت تین تیر چھوڑے جا سکتے تھے۔ کمانوں کا زاویہ ایسا تھا کہ تینوں تیر ذرا ترچھے ہو کر نکلتے تھے اور آگے جا کر پھیل جاتے تھے اس کڑی کمان میں وزنی اور دور مار تیر استعمال ہوتے تھے۔

یورق نے کمان سنبھالی اور زبردست مہارت سے متعاقب گھڑسواروں پر تیراندازی شروع کر دی۔ چار پانچ سوار گھائل ہو کر گرے تو متعاقب منگولوں کی رفتار سست ہو گئی مگر پھر جلد ہی یورق کا شاندار ترکش خالی ہو گیا۔ جب کچھ دیر تک گھوڑا گاڑی کی طرف سے کوئی تیر نہیں آیا تو منگول سواروں کے حوصلے بلند ہو گئے۔ ان کے وحشیانہ جنگی نعروں میں شدت آ گئی اور وہ دلیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے گھوڑا گاڑی سے قریب تر پہنچنے لگے۔ اب یورق ان کی خون بار آنکھیں اور تمتماتے چہرے دیکھ سکتا تھا' ان کی پیاسی تلواروں کی دھاریں پرکھ سکتا تھا۔

.... اور اب پھر فیصلے کا لمحہ تھا۔ کسی بھی لمحے گھوڑا گاڑی ان کی زد میں آ سکتی تھی۔ ماریتا اسے حتی الامکان رفتار سے بھگا رہی تھی اگر وہ اس سے زیادہ رفتار دکھاتی تو

یقیناً گاڑی الٹ جاتی۔ لہٰذا اب یورق کو کچھ کرنا تھا۔ اس نے ماریتا کو ہدایت کی کہ گھوڑے روک دو۔ ماریتا نے یورق کے اس فیصلے پر حیران ہوتے ہوئے لگامیں کھینچیں اور گاڑی رک گئی۔ متعاقب سواروں نے جب گاڑی رکتے دیکھی تو وہ بھی رک گئے۔ وہ درمیانی فاصلہ اتنی جلدی ختم کرنا نہیں چاہتے تھے۔ شاید وہ یورق کے دور مار تیروں سے ہراساں تھے۔ غالباً وہ یہ بھی سوچ رہے تھے کہ گھوڑا گاڑی کے یوں رکنے میں کوئی چال رہی ہو گی۔

یورق نے اپنے ترکش کے آخری دو تیروں میں سے ایک تیر استعمال کیا اور اٹھ کر گاڑی کے اگلے حصے میں چلا گیا۔ اس نے ماریتا سے کہا۔

"ماریتا! یہ گلی ختم ہونے والی ہے اور اگر ہم کھیتوں میں پہنچ گئے تو منگول ہمیں چاروں طرف سے گھیر لیں گے۔ اس لئے تم گاڑی کو بھگا لے جاؤ میں انہیں اس تنگ گلی میں روکتا ہوں۔"

علی چیخ مار کر اس سے لپٹ گیا اور روتا ہوا بولا۔ "نہیں .... میں تمہیں نہیں جانے دوں گا۔ تم بھی سلیمان اور اسد بھائی کی طرح یہیں رہ جاؤ گے۔"

نبیلہ نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔ "سردار! تم بھی ہمیں چھوڑ گئے تو ہمارا کیا بنے گا؟"

یورق نے آبدیدہ نظروں سے نبیلہ کو دیکھا پھر رندھی ہوئی آواز میں بولا۔ "نبیلہ یہ ضروری ہے اگر ہم سب منگول تلواروں کا شکار ہونا نہیں چاہتے' تو مجھے یہاں اترنا پڑے گا۔" نبیلہ کے ساتھ دوسری عورتیں بھی ہچکیاں لے لے کر رونے لگیں۔ یورق نے زار و قطار روتے علی کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا پھر آبدیدہ نگاہوں سے ماریتا کی طرف دیکھا اور بولا۔

"ماریتا! میں پوری کوشش کروں گا کہ منگول سواروں کو زیادہ سے زیادہ دیر یہاں روک سکوں' مگر میں تمہیں بہت زیادہ مہلت فراہم نہیں کر سکوں گا کیونکہ منگول مکانوں کی چھتوں پر چڑھ کر اپنا راستہ نکال لیں گے۔ تم گلی سے نکلتے ہی جنوبی سمت بڑھنا۔ کچھ آگے جا کر ایک نیم پختہ راستہ آئے گا جو تمہیں سیدھا سرحد کی جانب لے جائے گا۔ یہاں علی تمہاری راہنمائی کرے گا اور تمہیں اس مقام تک پہنچا دے گا جہاں اباقہ کے جاں نثار ساتھی پڑاؤ ڈالے ہوئے ہیں۔ وہ پڑاؤ تمہاری واحد پناہ گاہ ثابت ہو سکتا ہے۔"

ماریتا نے ایسی نظروں سے یورق کو دیکھا جیسے کہہ رہی ہو۔ "سردار! یہ سب کچھ تو تب ہو گا' جب ہم یہاں سے بچ پائیں گے۔ یہ قیامت جو ہم پر ٹوٹی ہے ہمیں موت کے نرغے سے کب نکلنے دے گی۔"

"خدا حافظ!" یورق نے کہا۔ اس کے لہجے میں کچھ ایسی بات تھی کہ ماریتا کانپ کر رہ

گئی۔ سردار یورق ہمیشہ ماریتا سے کھچا کھچا رہا تھا پہلے پہلے وہ ماریتا کو بڑے قہر سے گھورا کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ماریتا نے اپنے دل میں کبھی یورق کے لئے نرم گوشہ محسوس نہیں کیا مگر آج نہ جانے کیا بات تھی کہ یورق کے الوداعی الفاظ ماریتا کے دل میں تیروں کی طرح لگے تھے۔ اس نے کانپتی آواز میں کہا۔

"خدا حافظ سردار یورق! اپنا خیال رکھنا۔"

یورق نے تعظیم سے سر جھکایا جیسے ذہن کے کسی گوشے میں وہ آج بھی ماریتا کو ملکہ سمجھتا ہو۔ پھر جلدی سے نیچے اتر آیا۔ تب اس نے اپنی کمان سے ایک گھوڑے کی پشت پر زوردار ضرب لگائی۔ گھوڑے حرکت میں آئے اور گاڑی کو بھگاتے چلے گئے۔ علی' نبیلہ اور دوسری عورتوں کی سہمی ہوئی نگاہیں یورق پر جمی تھیں۔ وہ سکون سے کھڑا انہیں جاتے دیکھ رہا تھا۔ جونہی گاڑی ایک موڑ پر اوجھل ہوئی۔ سردار یورق نے اپنا رخ پھیرا۔ ایک بے خوف منگول چھتیں پھلانگتا ہوا یورق کے سر پر پہنچ چکا تھا اور اب اس پر تیر چلانے کے لئے کمان کندھے سے اتار رہا تھا۔ یورق نے پھرتی سے کمان سیدھی کی اور اس کے ترکش کا آخری تیر منگول کی گردن میں پیوست ہو گیا۔ وہ قلابازی کھاتا ہوا چھت سے گلی میں آ گرا۔ ایک دوسرا منگول جو اس کی تقلید میں آ رہا تھا۔ ساتھی کا حشر دیکھ کر ایک آڑ میں ہو گیا۔ یورق کا شاندار ترکش اب خالی تھا۔ مگر منگول سواروں پر اس کی دہشت ابھی قائم تھی۔ اس نے سوچا اگر چند تیر بھی اس کے پاس مزید ہوتے تو وہ منگول سواروں کو تادیر یہاں روکے رکھتا' مگر اب عیار دشمن کو زیادہ دھوکے میں رکھنا ممکن نہیں تھا۔ وہ گھوڑوں پر سوار اپنے سینوں پر ڈھالیں سجائے لحہ بہ لحہ اس کے قریب پہنچ رہے تھے اگر انہوں نے ابھی تک اس پر تیروں کی بوچھاڑ نہیں کی تھی تو اس کی ایک ہی وجہ تھی۔ وہ اسے بطور سردار یورق پہچان چکے تھے اور اپنی قوم کے اس "غدار عظیم" کو زندہ خاقان اوغدائی کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے تھے تاکہ وہ اس کے جسم کے ایک ریشے کو علیحدہ علیحدہ موت سے ہمکنار کر کے اپنے دل کو ٹھنڈک پہنچا سکے .... اور سردار یورق زندہ ان کے ہاتھ نہیں آنا چاہتا تھا۔ وہ موت کا کھلاڑی تھا' خطرے تمام زندگی اس کے ہمرکاب رہے تھے۔ وہ اپنے انجام سے خوفزدہ کیوں ہوتا؟ اس نے ایک نگاہ آسمان پر ڈالی۔ نیلے فلک پر چمکتا سورج نہایت انہماک سے اس گلی میں جھانک رہا تھا۔ چند سفید پرندے ایک دائرے کی شکل میں چکرا رہے تھے' جیسے وہ بھی اس گلی میں ہونے والے خونی فیصلے کے منتظر تھے .... منگول سوار اب اس پر چڑھ دوڑنے کو پر تول رہے تھے۔ سردار یورق نے اطمینان سے اپنی کمان ایک طرف پھینکی اور قبا کے نیچے سے اپنا دو دھاری خنجر نکال

لیا۔ تب اس نے نہایت جوش اور ولولے سے نعرۂ تکبیر بلند کیا اور منگول سواروں کی طرف بھاگ پڑا۔ چند گز دوڑ کر وہ بپھرے ہوئے شیر کی طرح ان میں گھس گیا۔ منگول سوار یورق کو زندہ گرفتار کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے اس کے دو دھاری خنجر نے ان کا اس قدر نقصان کیا جس کا وہ تصور بھی نہ کر سکتے تھے۔ وہ چمکدار خنجر ایک روشن لکیر کی طرح ان کے درمیان لپک رہا تھا اور ان کے ناپاک اجسام کو زندگیوں سے محروم کر رہا تھا۔ انتڑیاں بکھر رہی تھیں انگلیاں کٹ رہی تھیں۔ چیخیں بلند ہو رہی تھیں۔ آخر منگول قابو سے باہر ہو گئے وہ بھوکے کتوں کی طرح یورق پر پل پڑے۔ ان کے خنجر' کلہاڑے' نیزے' یورق کے جسم کو چھیدنے لگے۔ چند ہی لمحوں کے اندر وہ خاک و خون میں لوٹ گیا۔ بپھرے ہوئے گھوڑوں نے اس کے جسم کو کچل ڈالا مگر اس کے جسم میں جیسے کوئی مافوق الفطرت قوت کام کر رہی تھی۔ وہ مسلسل اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے اور منگولوں سے لڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ آخر اس کا جسم نڈھال ہو کر بے حرکت ہو گیا۔ سردار بوغالی کا بیٹا نویان جو اس قہرمان دستے کا سالار تھا چلا کر اپنے ساتھیوں سے بولا۔

"اس گھوڑا گاڑی کے پیچھے جاؤ اور چغتائی کی بیوی کے سوا سب کو موت کے گھاٹ اتار دو۔"

فرشتۂ اجل کا حکم سنتے ہی اس کے ہرکاروں نے گھوڑوں کو ایڑ لگائی اور گھوڑا گاڑی کے پیچھے لپکے۔ نویان نے نہایت نفرت سے یورق کے بے جان جسم کو دیکھا اور تھوک دیا۔ ہاں یہی وہ شخص تھا جس نے اباقہ کی مدد کی تھی .... اور اباقہ اس کے باپ کا قاتل تھا۔ اس کے دل کا ناقابل علاج زخم تھا۔ نویان کے قریب ہی عبداللہ مشہدی اور تنگیزی کھڑے تھے۔ نویان نے عبداللہ مشہدی سے کہا۔

"مشہدی! تُو جا اور محاصرہ کرنے والے سواروں سے کہہ کہ بالکل چوکس رہیں' اصل مجرم اباقہ ابھی تک گرفتار نہیں ہوا' وہ جب تک پکڑا نہ جائے انہیں اپنی تلواریں میانوں سے باہر رکھنی ہیں۔"

عبداللہ مشہدی نے گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے سر جھکایا اور تیزی سے ایک جانب روانہ ہو گیا۔ نویان نے ایک بار پھر یورق کے زخم زخم جسم کو حقارت کی نگاہ سے دیکھا پھر تنگیزی سے بولا۔

"تنگیزی! اس کتے کی لاش کو گھسیٹتے ہوئے لے جاؤ اور گاؤں کے چوراہے میں ڈال دو۔"

تنگیزی کمینگی سے مسکرایا۔ پھر اس نے سردار یورق کے بے جان جسم کو ایک رسے

کی مدد سے گھوڑے کے پیچھے باندھا اور گھسیٹتا ہوا لے گیا۔ گاؤں کے گلی کوچوں میں آگ بھڑک رہی تھی۔ جگہ جگہ کٹی پھٹی لاشیں پڑی تھیں۔ گھروں کے اندر ہی جل مرنے والوں کے گوشت کی بو چاروں اور پھیلی تھی۔ یہ وہ گاؤں تھا جہاں تھوڑی دیر پہلے خوشیاں رقص کر رہی تھیں۔ ننھے بچے رنگین لباس پہنے تتلیوں کی مانند اڑتے پھرتے تھے۔ سہاگنوں کی آنکھوں میں سہاگ اور کنواریوں کی آنکھوں میں سپنے تھے مگر اب وہاں آگ اور خون کے سوا کچھ نہیں تھا۔ گاؤں کے چوراہے میں پہنچ کر تنگیزی نے رسی کاٹ دی اور یورق کا جسم خونچکاں لاشوں کے درمیان پڑا رہ گیا۔

یورق میں ابھی زندگی کی رمق باقی تھی۔ اچانک اسے اپنے کان کے بالکل قریب سے ایک آواز سنائی دی۔ "سردار یورق۔"

اس مدھم آواز پر سردار کا جسم متحرک ہوا۔ اس نے اپنی خون میں لتھڑی ہوئی پلکوں کو جنبش دی۔ پھر گردن کی نحیف حرکت کے ساتھ چہرے کا رخ تھوڑا سا پھیرا ایک بڑھیا کے سربریدہ دھڑ کے پاس اسے شیزی نظر آئی۔ اس کے سینے میں پیوست تیر کی انی ریشمی لبادہ پھاڑ کر باہر نکل آئی تھی۔ اس کی شفاف اور نازک گردن پر کسی گھوڑے کا سم مہر کی طرح ثبت تھا۔ شیزی آخری سانسیں لے رہی تھی۔ مگر اس کے چہرے پر ایک غیر محسوس مسکان دھوپ کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔ وہ بولی۔

"سردار یورق .... آج عید کا تہوار ہے .... تم مجھے میرا وعدہ یاد نہیں دلاؤ گے۔ مجھ سے نہیں پوچھو گے .... میں تم سے کیسا پیار .... کرتی ہوں۔"

یورق نے اپنی زخمی زبان کو حرکت دی۔ "اب .... کیا .... فائدہ .... شیزی۔"

شیزی مسکرائی۔ "ہاں .... تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو .... محبت کو محبت ہی رہنے دیتے ہیں .... اسے کوئی نام نہیں دیتے ...."

یورق نے اپنا ٹوٹا ہوا ہاتھ سرکا کر شیزی کے خون آلود بالوں پر رکھ دیا۔ "ٹھیک .... کہتی ہو۔"

دفعتاً منگول سواروں کا ایک دستہ سرپٹ گھوڑے بھگاتا ان کے اوپر سے گزر گیا۔ .... دونوں جاں بحق ہو گئے۔

سردار یورق نے جونہی کمان رسید کی تھی گھوڑے بھاگ اٹھے تھے۔ ماربنا انہیں ٹلی میں بھگاتی کھیتوں تک پہنچی تھی۔ علی اس کی ٹانگوں سے لپٹا ہوا آنکھیں میچے زور زور سے رو رہا تھا۔ گاڑی میں موجود تمام عورتیں سکتے کی حالت میں بیٹھی تھیں۔ یورق کی ہدایت

کے مطابق مارینا نے گھوڑے جنوبی رخ پر موڑے اور چابک کے استعمال سے ان کی رفتار تیز کرنے لگی۔ وہ جلد از جلد منگول سواروں سے دور نکل جانا چاہتی تھی مگر اسے معلوم نہیں تھا کہ یہ چھوٹا سا گاؤں مکمل طور پر منگولوں کے محاصرے میں ہے۔ انہوں نے اس گاؤں پر زندگی کا ہر راستہ بند کر دیا ہے۔ جونہی مارینا' یورق کے بتائے ہوئے نیم پختہ راستے پر پہنچی درختوں سے برآمد ہونے والے منگول سوار اس کی راہ میں حائل ہو گئے۔ سر تا پا لوہے میں ڈوبے' آہنی ڈھالیں سینوں پر سنبھالے وہ خوفناک تیوروں سے گھوڑا گاڑی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ مارینا نے حتی الامکان سرعت سے گاڑی کو کھیتوں میں موڑنا چاہا مگر اس وقت منگول سواروں نے اگلے دو گھوڑوں پر تیروں کی بوچھاڑ کر دی۔ ایک گھوڑا گھائل ہو کر اوندھے منہ گرا اور اس کے ساتھ ہی گاڑی الٹ گئی۔ عورتیں ہذیانی انداز میں چیخیں اور مارینا نے علی کو اچھل کر دور گرتے دیکھا۔ منگول سوار سرپٹ گھوڑے دوڑاتے ان کے سروں پر پہنچے۔ مارینا کو دیکھتے ہی وہ اس پر یوں جھپٹے جیسے وہ کوئی پرچھائیں ہو۔ جو روپوش ہو جائے گی۔ شاید وہ سب کے سب اس کی گرفتاری کے دعویدار بننا چاہتے تھے۔ انہوں نے مارینا کو یوں دبوچا جیسے اس کے حصے بخرے کر دیں گے۔ مارینا نے ان پر تابڑ توڑ چابک برسائے مگر جلد ہی وہ بے بس ہو گئی۔ دوسری عورتوں کو بھی منگول سپاہیوں نے بے بس کر دیا تھا۔ ایک ادھیڑ عمر عورت کو انہوں نے پلک جھپکتے میں ہلاک کر دیا اور باقی عورتوں کو ہوس پرستی کے لئے درختوں کی جانب کھینچنے لگے۔ عورتوں کی آہ و بکا پر دستے کا سالار شیطانی قہقہہ لگا کر بولا۔

""سپاہیو! استعمال کے بعد ان کو ضائع کر دینا۔"

مارینا جو منگول زبان سمجھتی تھی سپاہیوں کی گرفت میں ماہئی بے آب کی طرح تڑپ رہی تھی لیکن لاچار تھی۔ سپاہیوں کی کھینچا تانی کا نشانہ بننے والی عورتوں میں نبیلہ بھی شامل تھی۔ ننھا قاسم اس کی گود میں تھا اور دو سپاہی اسے درختوں میں لے جانے سے پہلے بچہ اس سے چھین لینا چاہتے تھے۔ وہ مامتا کی ماری پوری جان سے بچے کو اپنے بازوؤں میں سمیٹے ہوئے تھی۔ کھینچا تانی سے بچہ زخمی ہو چکا تھا اور پوری قوت سے چلا رہا تھا۔

مارینا چیخ چیخ کر سپاہیوں کو اس ظلم سے باز رہنے کا کہہ رہی تھی' مگر وہ کسی صورت نبیلہ کو چھوڑنے پر تیار نہیں تھے۔ علی وحشت کے عالم میں پکار رہا تھا۔ "اباقہ بھائی .... اسد بھائی' سردار........" مگر آج اس کی آواز سننے والا کوئی نہ تھا۔ یہ دن ہی ایسا طلوع ہوا تھا کہ تمام ساعتیں مفلوج ہو گئی تھیں۔ یہ گھڑی ہی ایسی آئی تھی کہ سارے غمگسار تنہا چھوڑ گئے تھے۔ بے رحم آسمان اور سنگلاخ زمین کے درمیان' علی تنہا تھا اور

قراقرم کے وحشیوں کا شیطانی رقص دیکھ رہا تھا۔ اسلام کا نام لینے والوں کو جو سزا دی جا رہی تھی اس کا نظارہ کر رہا تھا......... آخر ایک سپاہی نے نبیلہ کے بازو موڑتے ہوئے بچہ اس سے چھین لیا۔ ایک دوسرے سپاہی نے نیزے کو حرکت دی اور ننھے قاسم کو انی میں پرو کر ہوا میں لہرا دیا۔ بچے کی آخری چیخ ماں کی آنکھوں میں انگارے بھر گئی' اس کے کانوں میں سیسہ انڈیل گئی۔ وہ موت و حیات سے بے پرواہ ہو کر وحشی منگول پر جھپٹی اور اس کے میان سے تلوار نکالنے کی کوشش کرنے لگی' مگر ظالم بے شمار تھے اور مظلوم تنہا۔ اس سے پہلے کہ نبیلہ تلوار نکالنے میں کامیاب ہوتی دو منگولوں نے اسے بالوں سے پکڑ کر کھینچا اور قاسم کے قاتل سے جدا کر دیا۔ پھر وہ اسے گھسیٹتے ہوئے درختوں کی طرف لے جانے لگے۔

مارینا چیخی۔ "نبیلہ......... نبیلہ۔"

مارینا کی زبان سے نبیلہ کا نام سن کر دستہ سالار ٹھٹک گیا۔ اس نے سپاہیوں کو رکنے کا اشارہ کیا اور مارینا کے سامنے پہنچ کر کہنے لگا۔ "یہ تمہاری ساتھی ہے؟"

مارینا کے لئے اس سوال کا جواب دینا مشکل تھا مگر پھر نہ جانے اس کے دل میں کیا آئی کہ اس نے کہا۔ "ہاں"۔

اس کا جواب سنتے ہی دستہ سالار نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ نبیلہ کو زمین پر لٹا کر اس کی مشکیں کس دی جائیں۔

سپاہی فوراً حکم کی تعمیل مصروف ہو گئے۔ دستہ سالار نے کہا۔ "اے چغتائی کی بے وفا بیوی' تیری "ہاں" نے فی الحال اس عورت کی جان بچالی ہے۔ ہمیں حکم ہے کہ تیرے اور اباقہ کے تمام ساتھیوں کو زندہ سلامت قراقرم پہنچانے کی کوشش کی جائے۔ مگر اس سے یہ مطلب نہیں کہ ہم تمہاری ہر حرکت کو معاف کر دیں گے۔ اگر تم میں سے کسی نے ہوشیار بننے کی کوشش کی تو ہم راستے میں بھی تمہیں موت کا عذاب دے سکتے ہیں۔"

مارینا پھٹی پھٹی ویران نگاہوں سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی اس کے کانوں میں یورق کے الفاظ گونج رہے تھے "......... مارینا! تو اباقہ کی زندگی سے نکل جا' تو اسے نہیں مل سکے گی' مگر تیری وجہ سے اس کی زندگی ضرور برباد ہو جائے گی........." برسوں پہلے منگول شامان کی کہی ہوئی یہ بات آج حقیقت محسوس ہو رہی تھی۔

☆------☆------☆

اباقہ بغداد سے روانہ ہونے کے لئے تیار ہو چکا تھا۔ مگر وہ ایک بار......... صرف ایک بار اس گھر کو دیکھنا چاہتا تھا' جہاں اس کی زندگی کے پیارے ہمراہی رہتے تھے۔ نبیلہ' سلیمان' یورق' اسد اور علی۔ ان سب کے علاوہ وہاں وہ ہستی بھی مقیم تھی جس کا نام اباقہ

کے دل میں اَن مٹ سنہری حروف میں لکھا ہوا تھا.......... "مارینا" یہ نام اس کی زندگی کا حاصل تھا۔ مارینا کا خیال ذہن میں آتے ہی اباقہ کے دل سے ایک ہوک اٹھی۔ شاید اس کی زندگی اس سے ہمیشہ کے لئے روٹھ چکی تھی۔ اباقہ نے اس کی ناراضگی کے بارے ٹھنڈے دل سے سوچا تھا اور اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ وہ اس سے نفرت کرنے میں حق بجانب ہے۔ درست ہے کہ وہ پہلے سے شادی شدہ تھی مگر اباقہ کو دیکھنے کے بعد اس نے کسی اور کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ اس کے ذہن کا صرف ایک ہی مقصد رہ گیا تھا۔ اباقہ کے متعلق سوچنا اور اس کے دل کا ایک ہی مصرف رہ گیا تھا۔ اباقہ کے لئے دھڑکنا۔ اباقہ کے پیار کو اس نے اپنا ایمان بنا لیا تھا اور حوادث کی آندھیوں میں اس ایمان کی حفاظت کی تھی۔ وہ قراقرم کی شہزادی تھی۔ اس کا شمار دنیا کی حسین ترین عورتوں میں کیا جا سکتا تھا مگر اس نے عام شکل و صورت کے مالک ایک گمنام اور معمولی شخص کو اپنا سب کچھ سونپ دیا تھا۔ افسوس اباقہ سے محبت کے اس تحفہ گراں مایہ کی قدر نہ ہو سکی.......... اور اب وہ اور مارینا دو اجنبیوں کی طرح تھے جو ایک دوسرے سے کبھی نہ ملنے کا پختہ ارادہ کر چکے تھے۔

اباقہ کو علی کی من موہنی صورت بھی بہت یاد آ رہی تھی۔ وہ جانتا تھا علی اس کے بغیر انتہائی اداس ہو گا۔ مگر جو فیصلہ اباقہ کر چکا تھا اس میں تبدیلی کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ ہاں' وہ ایک بار علی کو ضرور دیکھنا چاہتا تھا۔ دور ہی سے سہی لیکن ایک بار دیکھ کر وہ اس کی صورت آنکھوں میں بسا لینا چاہتا تھا۔ اسے یاد تھا اس نے علی سے کہا تھا کہ عید کے موقع پر وہ اسے ایک خوبصورت خنجر کا تحفہ دے گا۔ اسے اپنا یہ وعدہ یاد تھا۔ کل عید تھی اور کل بغداد چھوڑنے سے پہلے وہ علی کو اس کا تحفہ پہنچا دینا چاہتا تھا۔

شام کے وقت اس نے مسلم بن داؤد کو بلایا اور کہا کہ ایک ننھا سا خوبصورت خنجر بازار سے لا کر دو۔ مسلم بن داؤد تو حکم کا غلام بنا ہوا تھا۔ فوراً "ابھی لیجئے' ابھی لیجئے" کہتا ہوا باہر نکل گیا۔ مگر عشاء سے قبل واپس نہیں آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک آبنوسی صندوق تھا۔ اس ڈبہ نما صندوق کے اندر مخملیں کپڑے کے اوپر نہایت قیمتی خنجر پڑے ہوئے تھے۔ جڑاؤ دستوں والے یہ بیش قیمت خنجر مسلم بن داؤد نہ جانے کہاں کہاں سے ڈھونڈ کر لایا تھا۔ بڑے احترام سے اباقہ کو پیش کرتے ہوئے بولا۔

"لیجئے جناب! جو مزاج کو اچھا لگے رکھ لیجئے۔" وہ اب اباقہ کو "جناب.......... حضور" کہنے میں ذرا تامل نہیں کرتا تھا۔ اباقہ نے صندوق میں سے ایک چھوٹا سا خنجر اٹھا لیا۔ مسلم بن داؤد خوشامدی انداز میں اس کے انتخاب کی داد دینے لگا۔ "واہ.......... واہ' سبحان اللہ۔ خدا کی قسم اس ذوق کا آدمی بغداد میں ایک بھی نہ ہو گا۔ ماشاء اللہ کیا چیز منتخب

کی ہے۔ لگتا ہے جوہری کی آنکھ دی ہے آپ کو قدرت نے۔"

اباقہ نے بھنا کر کہا۔ "قدرت نے تمہیں بھی تو یہ قینچی جیسی زبان دی ہے' جس سے ہر ایک کے کان کترتے ہو۔"

داؤد نے بوکھلا کر دائیں بائیں دیکھا۔ خادموں کے سامنے مزید رسوائی ٹھیک نہیں تھی۔ لہٰذا اباقہ کے تلخ فقرے پر فرمائشی قہقہے کا پردہ ڈالتے ہوئے اس نے صندوق اٹھایا اور باہر نکل گیا۔

اگلی صبح جب بغداد کے طول و عرض میں عید کی خوشیاں منائی جا رہی تھیں' اباقہ نے داؤد کے اصطبل سے سب سے عمدہ گھوڑا لیا اور عازم سفر ہو گیا۔ وقت رخصت داؤد نے اپنی پگڑی اتار کر اباقہ کے قدموں میں رکھ دی اور بولا۔

"جناب! آپ جانتے ہیں' میں دل کا مریض ہوں۔ اکثر اختلاج قلب کا دورہ پڑتا رہتا ہے۔ بڑے بڑے ملکی اور غیر ملکی طبیبوں کو دکھایا ہے لیکن کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ دراصل میرے مرض کا علاج آپ کے پاس ہے۔ صرف آپ کے پاس۔"

"میرے پاس؟" اباقہ حیرت سے بولا۔

"جی ہاں۔" داؤد عاجزی سے بولا۔ "آپ مجھے دل کی گہرائیوں سے معاف کر دیں تو میں کل ہی بھلا چنگا ہو جاؤں گا۔"

اباقہ کچھ دیر گہری نظروں سے اسے دیکھتا رہا' پھر بولا۔ "ٹھیک ہے داؤد میں تجھے معاف کرتا ہوں اور یہ بھی وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ کبھی بغداد نہ آؤں گا۔"

"واقعی؟" داؤد نے بے انتہا مسرت سے کہا۔ پھر یکایک اس کا چہرہ زرد ہونے لگا اور اس نے بایاں ہاتھ سینے پر رکھ لیا۔ اسے پھر اختلاج قلب ہونے لگا تھا۔ مگر تھوڑی دیر بعد اس نے اپنی حالت پر قابو پا لیا اور ایک خادم کا سہارا لے کر لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ دوسرے خادم پہنچے اور اسے بازوؤں میں اٹھا کر اندر لے گئے۔ ایک نو عمر خادم اباقہ کے پاس کھڑا رہ گیا۔ وہ بہت افسردہ تھا۔ کہنے لگا۔

"جناب! میرا آقا مر تو نہیں جائے گا.......... اس نے میری ایک برس کی مزدوری دینی ہے۔"

اباقہ نے کہا۔ "گھبراؤ نہیں۔ یہ اس پر بیماری کا آخری حملہ تھا۔"

گھوڑے کو ایڑ لگا کر اباقہ بازار سوق الطرب میں پہنچا اور مختلف غیر معروف گلیوں سے ہوتا ہوا' جہت شرقی' کی طرف نکل آیا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ تیز رفتاری سے سرحدی علاقے کی جانب بڑھ رہا تھا۔

اباقہ جس وقت اس سرحدی گاؤں کے نواح میں پہنچا' دوپہر ہونے والی تھی۔ وہ سوچنے لگا۔ نبیلہ' قاسم اور علی زیتون کے پیڑ تلے جھولا جھول رہے ہوں گے۔ ہو سکتا ہے ماریتا اور شیزی بھی وہیں موجود ہوں۔ عید کے تہوار کی وجہ سے اسد اور یورق بھی گھر ہی ہوں گے۔ ان کو ایک ساتھ دیکھنے کا یہ بہترین موقعہ تھا۔ اس نے سوچا وہ جوار کے کھیت میں چھپ کر بیٹھ رہے گا۔ پھر جب وہ ظہرانے کے لئے اندر چلے جائیں گے تو وہ علی کا خنجر پیڑ کے نیچے کہیں رکھ دے گا جہاں سے وہ بہ آسانی اسے نظر آ سکے۔ یا پھر وہ کسی دہقان سے کہے گا کہ یہ خنجر سلیمان تک پہنچا دے اور اسے کہے کہ یہ علی کے لئے ہے ....

اپنی انہی سوچوں میں گم وہ گاؤں کے قریب پہنچ چکا تھا۔ یہ دیکھ کر اس کا ماتھا ٹھنکا کہ گاؤں کے مکانوں سے دھوئیں کے بادل اٹھ رہے ہیں۔ اچانک ایک مقام پر اسے جھاڑیوں سے سرسراہٹ سنائی دی۔ وہ گھوڑے کو گھما کر جھاڑیوں میں داخل ہوا تو وہاں کوئی نہیں تھا' مگر یہ دیکھ کر اس کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں کہ وہاں کئی برہنہ اور نیم برہنہ عورتوں کی کٹی پھٹی لاشیں پڑی تھیں۔ انہیں وحشیانہ درندگی کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ وہ اس منظر سے نظر چراتا ہوا آگے بڑھا تو کچے راستے پر ایک گھوڑا گاڑی الٹی نظر آئی۔ ایک گھوڑا بھی مردہ پڑا تھا۔ یہاں بھی ایک دو لاشیں موجود تھیں۔ ایک لاش دیکھ کر اباقہ کا سر گھومنے لگا۔ یہ ننھے قاسم کی لاش تھی کسی درندے نے اس کا پھول سا جسم نیزے میں پرو کر کھیت میں پھینک دیا تھا۔ اباقہ لپک کر گھوڑے سے اترا اور معصوم بچے کو اٹھا کر حیرت ناک نگاہوں سے دیکھنے لگا .... یکایک اسے اندازہ ہوا کہ اس گاؤں میں کوئی نہایت المناک واقعہ رونما ہو چکا ہے۔ اس کے جسم کا خون سر کو چڑھنے لگا اور گلے کی رگیں پھولتی چلی گئیں۔ اس نے قاسم کی لاش کو اپنی چادر میں لپیٹا اور اسے اپنے سامنے گھوڑے پر رکھ کر دیوانہ وار گاؤں کی طرف بڑھا۔

جوں جوں وہ آگے بڑھتا گیا اس کے خدشات عفریتوں کا روپ دھارتے گئے۔ اس کی سانس پھولتی گئی اور اعصاب کھنچتے گئے۔ گاؤں ایک بہت بڑے مقتل کا نقشہ پیش کر رہا تھا۔ گلی کوچوں میں لاشیں بکھری تھیں اور مکان سلگتے ملبے کی شکل اختیار کر گئے تھے۔ "یہ کیا ہوا؟ یہ کیا ہوا؟" اس کا دل چیخ چیخ کر اس سے یہ سوال پوچھ رہا تھا۔ ان متبسم چہروں اور اُجلے لباسوں والے لوگوں کی بستی پر عین روز عید یہ کیا قیامت گزری تھی؟ اس کی آنکھوں میں اپنے پیاروں کی شکلیں گھوم رہی تھیں۔ اب وہ گاؤں کے چوراہے میں پہنچ چکا تھا۔ یہاں لاشوں کا انبار لگا تھا۔ اچانک اسے ایک ایسا چہرہ نظر آیا کہ وہ سر تا پا پتھر ہو گیا۔ اگر وہ غلطی نہیں کر رہا تھا تو یہ کچلی ہوئی لاش اس کے پیارے دوست یورق کی تھی۔ وہ

جیسے خواب میں چلتا ہوا اس کے سرہانے پہنچا۔ تب اس کی نگاہ یورق کے بائیں ہاتھ پر پڑی ایک انگوٹھا کٹا ہوا تھا۔ برسوں پہلے یہ انگوٹھا یورق نے اباقہ کی محبت میں کاٹا تھا۔ وہ اسے ایک غار میں قید چھوڑ آیا تھا۔ یورق نے اپنی کلائی زنجیر سے نکالنے کے لئے یہ انگوٹھا قلم کر لیا تھا اور یہ سب کچھ اس نے اباقہ کی بھلائی میں کیا تھا۔ آج یہ کٹا ہوا انگوٹھا اباقہ کو بتا رہا تھا کہ خاک و خون میں لتھڑی یہ لاش اس کے بے لوث غم خوار یورق کی ہے۔ "سردار .... سردار!" اباقہ نے آگے بڑھ کر یورق کو جھنجھوڑ ڈالا۔ مگر آج اباقہ کو جنگلی کہنے والی زبان خاموش تھی۔ اباقہ یورق سے لپٹ گیا اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ تب اس کی نگاہ شیزی کولت کی لاش پر پڑی۔ وہ کسی موہوم امید کے سہارے شیزی کو جھنجھوڑنے لگا مگر وہ بھی زندگی کی سرحد پار کر چکی تھی۔

اباقہ اٹھا اور اسد' نبیلہ اور سلیمان کے نام پکارتا ہوا گھر کی طرف بھاگا۔ وہاں بھی ہر طرف ویرانی اور موت کا راج تھا۔ گھر کے سامنے زیتون کے نیچے جھولا ٹوٹا پڑا تھا۔ ایک طرف سلیمان کا ایک مور اس حالت میں پڑا تھا کہ اس کی گردن جڑ سے غائب تھی۔ مکان کے سلگتے ملبے سے نفرتوں کی آنچ بلند ہو رہی تھی۔ اباقہ بھاگتا ہوا دلہیز پر پہنچا تو سامنے صحن میں سلیمان کی ادھ جلی لاش نظر آئی۔ "نبیلہ' اسد علی!" اباقہ جگر پاش لہجے میں انہیں آوازیں دینے لگا۔ مگر اس سلگتے قبرستان سے کوئی صدا بلند نہیں ہوئی۔ کسی نے اسے مدد کے لئے نہیں پکارا۔ اس کی آنکھیں خون رونے لگیں۔ وہ پاگلوں کی طرح گاؤں کی گلیوں میں گھومنے لگا۔ کچھ دور ایک گلی میں اسے اسد نظر آیا۔ چوڑے سینے اور کشادہ پیشانی والا اس کا جان سے پیارا دوست ہمیشہ مسکرانے اور کبھی ہمت نہ ہارنے والا اسد۔ وہ شیر دل جوان' نیکی جس کی پیشانی پر لکھی تھی اور نور جس کے چہرے کی زینت تھا..........

.... ہاں وہی اسد آج خاک و خون میں لپٹا خاموش پڑا تھا۔ اس کا فولادی جسم منگول سپاہیوں کی لاشوں میں چھپا ہوا تھا۔ تلوار ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھی اور اس پر بہتا ہوا خون گواہی دے رہا تھا کہ چاروں طرف بکھری ہوئی لاشیں اسی جوانِ رعنا کے زورِ بازو کا شاہکار ہیں۔ سنسان گلی کے اس موڑ پر ابھی تک اس کا غضب اور جلال مہیب بادلوں کی طرح گرج رہا تھا۔ خاموش فضا میں ابھی تک اس کے نعروں کی گونج باقی تھی .... سوختہ مکانوں کی کوکھ سے ابھرتے ہوئے دھوئیں میں اس کا حسین چہرہ خیال کی طرح نظر آ رہا تھا۔

یکایک اباقہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا۔ اس نے پوری قوت سے مٹھیاں بھینچیں اور اس کے حلق سے ایک لرزہ خیز چنگھاڑ نکل کر در و دیوار کو لرزا گئی۔ اس نے تلوار نیام

سے نکالی اور ایک منگول کی لاش پر کھڑا ہو کر ہذیانی انداز میں چلانے لگا۔

"کہاں ہو تم .... میرے سامنے آؤ .... کہاں ہو تم۔"

اچانک ایک مکان کی چھت سے ایک جال اچھلا اور اباقہ پر آن گرا۔ پلک جھپکنے میں اس جال نے اباقہ کو اپنی گرفت میں لے لیا اور اردگرد کے مکانوں سے بیسیوں منگول نکل کر اس کے سامنے آ گئے منگولوں کو دیکھ کر اباقہ جال کے اندر بری طرح تڑپنے لگا مگر اس انتہائی مضبوط جال سے نکلنا کسی کے بس میں نہیں تھا۔ ماہر شکاریوں نے اسے اس بری طرح جکڑ لیا تھا کہ ہاتھ میں پکڑی تلوار بھی اس کے لئے بے کار ہو گئی تھی۔ غضب کی فراوانی نے اسے دیوانہ کر دیا تھا وہ کبھی دانتوں سے جال کی رسیاں کاٹنے کی کوشش کرتا اور کبھی حلق پھاڑ کر چلانے لگتا تھا۔ اس کی آنکھیں دو دہکتے انگارے تھیں جو جال کے حلقوں سے چمک رہی تھیں۔

دستہ سالار نویان آگے آیا اور اباقہ کی بے بسی کو دلچسپی سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"چچ .... چچ۔ مسلمانوں کا عظیم مجاہد' خوارزم شاہ کا قریبی ساتھی اور اس جال میں۔ افسوس' چوہیا کا نومولود بچہ بھی اس سے زیادہ اختیار رکھتا ہے۔"

منگول سپاہی دل کھول کر ہنسنے لگے۔ ایک توانا منگول نے اباقہ کو عقب سے دھکا دے کر اوندھے منہ گرا دیا اور باقی منگول اسے لاشوں کے درمیان گھسیٹنے لگے۔

☆------☆------☆

اسی شب قراقرم کا یہ خونی دستہ اباقہ اور ماریتا کو لے کر واپس روانہ ہو رہا تھا۔ کچھ عرصہ پہلے جو کام طوطم خاں کی وجہ سے ادھورا رہ گیا تھا وہ پایہ تکمیل کو پہنچنے والا تھا۔ ماریتا واپس اپنے منگول شوہر کے پاس پہنچ رہی تھی اور اباقہ اپنے کئے کی سزا پانے کے لئے خاقان کے سامنے پیش ہو رہا تھا۔ اس کے ساتھیوں میں سے صرف نبیلہ اور علی ان کے ساتھ تھے باقی سب راہ وفا میں حادثوں کا رزق ہو گئے تھے۔

نہایت خاموشی کے ساتھ یہ قافلہ خوارزم کے مقبوضہ علاقے میں داخل ہوا اور وہاں سے منزلوں پر منزلیں مارتا صحرائے گوبی کی سمت بڑھنے لگا۔ اباقہ کو لے جانے کے لئے خاص طور پر احتیاط کی جا رہی تھی۔ اسے ایک لمحے کے لئے بھی جال سے نہیں نکالا گیا تھا مزید حفاظت کے لئے اس کے ہاتھ میں آہنی کڑیاں اور پاؤں میں بیڑیاں پہنا دی گئی تھیں۔ وہ براہ راست دستہ سالار نویان کی نگہداشت میں تھا۔ وہ رات بھر خود جاگ کر اباقہ کا پہرا دیتا تھا۔ کبھی کبھی یہ لوگ اباقہ کو یوں دیکھتے تھے جیسے وہ گوشت پوست کا انسان نہ ہو' ایک واہمہ ہو جو ان کے نگاہیں پھیرتے ہی ناپید ہو جائے گا۔ غالباً قراقرم کے محل سے راستے کی

چوکیوں کے لئے خصوصی ہدایات جاری کی گئی تھیں۔ ایران و ترکستان کے وسیع علاقوں سے گزرتے ہوئے انہیں کہیں بھی رکنا نہیں پڑا۔ مہینوں کا سفر ہفتوں میں طے کرتے آخر قراقرم کے یہ قیدی منگولیا میں داخل ہوئے اور صحرائے گوبی کے جنوبی حصے کی جانب بڑھنے لگے۔ قراقرم' صحرا کے اسی حصے میں واقع تھا۔

☆------☆------☆

خاقان اوغدائی کے محل کا اندرونی منظر تھا۔ کافوری شمعیں ابھی ابھی روشن ہوئی تھیں۔ محل کی وسیع و عریض نشست گاہ میں خاقان اپنے مصاحبین کے ساتھ موجود تھا۔ اطلس و کمخواب کے لباس پہنے ختائی' ترکی و فرنگی کنیزیں ساقی گری میں مصروف تھیں۔ ان میں سے کچھ منگول سرداروں کی آغوش کی زینت بنی ہوئی تھیں اور منگول سردار ایک دوسرے کی موجودگی سے قطعی بے تعلق ان سے بے حجابانہ چھیڑ چھاڑ میں مشغول تھے۔ فضا رباب و چنگ سے معمور تھی اور ایک رومی رقاصہ جسم تھرکا تھرکا کر منگول بہادروں کے قصیدے گا رہی تھی۔ اچانک ایک نقیب نے اندر آ کر اطلاع دی کہ عراق جانے والا فوجی دستہ قیدیوں کو لے کر پہنچ گیا ہے۔ اس خبر نے خاقان اوغدائی کے جھریوں بھرے چہرے پر جوش کی لہر دوڑا دی۔ اس نے بے تابی سے پوچھا۔

"اباقہ اور ماریتا بھی ساتھ ہیں؟"

نقیب نے تعظیم سے جھک کر اقرار میں جواب دیا۔ خاقان اوغدائی بے تابانہ اپنی جگہ کھڑا ہو گیا اور نقیب سے بولا۔ "انہیں فوراً حاضر کیا جائے۔" نقیب کے جاتے ہی ساز خاموش ہو گئے اور رقص تھم گیا۔

کچھ ہی دیر بعد نویان اور مشہدی' طوق و سلاسل میں جکڑے قیدیوں کو لے کر اندر داخل ہوئے۔ نشست گاہ میں موجود ہر فرد نے بے انتہا اشتیاق سے قیدیوں کا نظارہ کیا۔ ان میں اباقہ سب سے آگے تھا۔ وہ سر تا پا زنجیروں میں جکڑا تھا اور اسے چلنے میں مدد دینے کے لئے دو سپاہی سہارا دیئے ہوئے تھے۔ اس کے پہلو میں ماریتا تھی۔ اس کے گلے میں بھی طوق و زنجیریں تھیں۔ عقب میں نبیلہ اور علی آ رہے تھے۔

خاقان اوغدائی نے اباقہ کی صورت دیکھتے ہوئے کہا۔ "شومئی قسمت اس وقت چغتائی خاں علالت کے سبب یہاں موجود نہیں ورنہ عین ممکن تھا وہ اس جنگلی کو دیکھتے ہی آپے سے باہر ہو جاتا اور اس کا سر تن سے جدا کر کے اسے ان عذابوں سے بچا لیتا جو مرنے سے پہلے اس پر ٹوٹنے والے ہیں۔" پھر وہ بغور ماریتا کو دیکھتے ہوئے بولا۔

"چغتائی کی حسین بیوی! کاش تو اپنے حسن پر ترس کھاتی اور اس موت کی مستحق نہ

ٹھہرتی جو اب تیرا اٹل نصیب ہے۔ تُو نے اس جنگلی کے لئے خان چغتائی سے بے وفائی کر کے پوری منگول قوم کے منہ پر طمانچہ مارا ہے اور اس کی سزا تجھے جتنی بھی ملے کم ہے۔"

ماریتا بالکل سیدھی کھڑی تھی اور خاموش تھی۔ اس کے چہرے پر خجالت یا ندامت کا شائبہ تک نہ تھا۔ اس کے برعکس ایک عجب طرح کا جلال اس کے نقوش سے ٹپک رہا تھا۔ خاقان نے رخ پھیر کر نویان سے کہا۔

"اس جنگلی کے باقی ساتھی کہاں ہیں؟"

نویان نے سر جھکا کر کہا۔ "خاقان محترم! آسمان آپ پر برکتیں نازل کرے' اباقہ کے باقی ساتھی ہمارے ہاتھوں ہلاک ہوئے۔"

خاقان نے افسردگی سے کہا۔ "مجھے اس غدار یورق سے ملنے کا بہت شوق تھا۔ میری دلی آرزو تھی کہ اسے کتوں کے آگے ڈال کر اس کا جسم پارا پارا ہوتے دیکھوں .... خیر جو کچھ ہوا ٹھیک ہوا۔"

نویان نے پوچھا۔ "خاقان محترم! اب ان قیدیوں کے لئے کیا حکم ہے؟" اس سے پہلے کہ خاقان کوئی جواب دیتا اس کی حسین و جمیل بیوی تورا کینہ جھک کر اس کے کان میں کوئی سرگوشی کرنے لگی۔ سرگوشیوں کے مختصر تبادلے کے بعد خاقان نے کہا۔

"شوق تو یہی چاہتا ہے کہ ان بدبختوں کو اسی جگہ اذیت ناک موت مار دیا جائے لیکن گناہگاروں کا یہ ٹولہ ہمارا ہی نہیں کچھ اور لوگوں کا بھی مجرم ہے۔ جن میں وہ تمام منگول شہزادے اور سردار شامل ہیں جنہوں نے روس میں ان کے ہاتھوں زک اٹھائی ہے اور ان کی سازشوں کا شکار ہوئے ہیں۔ یہ ان لوگوں کا حق بنتا ہے کہ ان بدبخت دشمنوں کو موت سے پہلے روتے بلکتے اور تڑپتے پھڑکتے دیکھیں۔ لہٰذا ہم چاہتے ہیں کہ جب تک منگول شہزادے اور سردار روسی مہم سے واپس نہ آ جائیں ان قیدیوں کو نہایت حفاظت کے ساتھ زندہ رکھا جائے۔"

تورا کینہ نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے' اباقہ کی میزبانی کا شرف ہمیں ایک بار پہلے بھی حاصل ہو چکا ہے۔ میری رائے میں اباقہ کو اسی بندی خانے میں رکھا جائے جہاں اس سے پیشتر وہ ایک برس پڑا رہا تھا۔ وہ جگہ محفوظ ترین اور اس کے شایان شان ہے۔"

نویان نے کہا۔ "ملکہ کا خیال بالکل درست ہے۔ وہ جگہ اس عیار شخص کے لئے نہایت موزوں رہے گی۔"

خاقان نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "میرے خیال میں جہاں تک ماریتا کا سوال ہے'

اسے چغتائی کے حوالے کر دیا جائے تاکہ وہ اس کے لہو سے اپنے انتقام کے شعلوں کو سرد کر سکے۔ میرا بھائی اس دن کے لئے بہت تڑپ چکا ہے۔ اسے مزید انتظار میں رکھنا ٹھیک نہیں۔"

اہل دربار نے متفقہ طور پر اس فیصلے کو سراہا۔ نبیلہ یہ فیصلہ سن کر سسک پڑی۔ اسے روتے دیکھ کر علی بھی رونے لگا۔ اباقہ کا چہرہ پتھر کی طرح سخت اور بے روح تھا۔ خاقان اوغدائی نے حکم دیا کہ ماریتا کو فوراً چغتائی کے سامنے پیش کر دیا جائے اور اباقہ وغیرہ کو برہنہ پا قراقرم کے گلی کوچوں میں پھراتے ہوئے بندی خانے میں پہنچا دیا جائے۔

فوراً حکم کی تعمیل ہوئی۔ منگول سپاہی ماریتا کو کھینچتے ہوئے باہر لے گئے۔ پھر کچھ دوسرے سپاہیوں نے اباقہ نبیلہ اور علی کو ننگی تلواروں سے ہانکنا شروع کر دیا۔ قراقرم میں وحشی منگولوں کا جوش و خروش دیدنی تھا۔

☆--------☆--------☆

ماریتا کو چغتائی کے محل میں پہنچا دیا گیا۔ یہ محل اوغدائی کے محل کے پہلو میں تعمیر کیا گیا تھا۔ بوڑھا چغتائی بستر علالت پر تھا۔ اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے اور ہاتھوں پاؤں کے جوڑ ورم زدہ تھے۔ وہ گنٹھیا کا پرانا مریض تھا۔ اب اسے آنتوں کا مرض بھی لاحق ہو گیا تھا۔ چینی اور ختائی طبیب اسے ہر وقت لعاب دار دوائیں پلاتے رہتے تھے۔ خصوصاً سردی اسے بہت ستاتی تھی۔ اس کے کمرے میں ہمہ وقت کئی انگیٹھیاں روشن رہتی تھیں۔ ماریتا کو پابہ زنجیر اپنے سامنے دیکھ کر چغتائی کی آنکھوں میں نفرت و قہر کی بجلیاں کوندنے لگیں۔ لگتا تھا وہ ابھی بستر سے اتر آئے گا۔ مگر جب اس نے گاؤ تکیے سے سر اٹھانا چاہا تو کراہ کر رہ گیا۔

غصے سے اس کے لب پھڑک رہے تھے۔ شاید اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اپنی بے وفا بیوی پر کس طرح اپنے غضب کا اظہار کرے۔ اچانک اسے کھانسی کا شدید دورہ پڑ گیا۔ اسی طرح کھانستے ہوئے وہ بستر پر دوہرا ہونے لگا۔ کھانسی کے دوران ہی اس نے ہاتھ کے اشارے سے سپاہیوں کو ہدایت کی وہ ماریتا کو باہر لے جائیں۔

حکم کی تعمیل ہوئی۔ ماریتا باہر چلی گئی اور شاہی طبیب ہوچی دواؤں کا پنڈورا اٹھائے تیز قدموں سے اندر آیا۔ اس نے ایک پیالے میں جلدی جلدی کوئی محلول انڈیلا پھر ہاتھ کا سہارا دے کر چغتائی کا سر اٹھایا اور پیالا اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ محلول گلے سے نیچے اترا تو چغتائی کی جان میں جان آئی۔ کھانسی رک گئی تو وہ طبیب کی مدد سے گاؤ تکیے کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھیں ابھی تک خون کی طرح سرخ تھیں۔ چہرے پر عجیب سی

کر خنگی عود کر آئی تھی۔ لگتا تھا وہ طیش سے بے قابو ہو رہا ہے۔ اس نے اپنے محافظ دستے کے سالار کو بلایا اور اسے حکم دیا کہ قیدی عورت کو اسی وقت عقوبت گاہ میں لے جایا جائے اور اس کا سر مونڈ کر اسے تیل کی ابلتی ہوئی کڑاہی میں ڈال دیا جائے۔ بعدازاں اس کا سر کاٹ کر اس کی خدمت میں پیش کیا جائے۔ سالار نے حکم کی تعمیل میں سر جھکایا اور ضروری ہدایات لے کر باہر نکل گیا۔ مگر ابھی وہ بمشکل محل کے دروازے تک پہنچا ہو گا کہ چغتائی نے اسے واپس بلوا لیا۔ اس نے سالار سے کہا کہ وہ اس بے وفا عورت کی دردناک موت کا تماشا اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا ہے۔ لہٰذا اذیت رسانی کے تمام آلات اسی کمرے میں لائے جائیں اور اسے اس کے سامنے موت کے گھاٹ اتارا جائے۔ سالار نے ایک بار پھر تعظیم میں سر جھکایا اور باہر نکل گیا۔ اس کے کارندے عقوبت خانے سے اذیت رسانی کے آلات لا لا کر کمرے میں رکھنے لگے۔ مگر تھوڑی ہی دیر میں چغتائی نے اپنا فیصلہ پھر تبدیل کر دیا۔ یوں لگتا تھا بڑھاپے نے اس کی قوت فیصلہ کا کام تمام کر دیا ہے۔ وہ بستر پر زخمی سانپ کی مانند پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ شاید اسے خود سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ گھنی بھنوؤں کے نیچے اس کی انگارہ آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ خود سے بے وفائی کرنے والی عورت کو المناک انجام سے دوچار کرنا چاہتا ہے لیکن کیسے؟ یہ سوال' جواب طلب تھا۔ لگتا تھا مارینا کو دیکھ کر اس کی زندگی کا ٹمٹماتا ہوا چراغ پھر شدومد سے بھڑکنے لگا ہے' وہ طبیب سے بولا۔

"ہوچی! میں ابھی مرنا نہیں چاہتا۔ کوئی ایسی دوا ڈھونڈو کہ میرے جوڑوں کی اینٹھن کم ہو جائے۔ جہاں تک پیٹ کے درد کا تعلق ہے وہ تو میں برداشت کر لیتا ہوں۔ یہ کم بخت جوڑ ٹھیک ہو جائیں تو میں روزمرہ کے کاموں میں حصہ لینے لگوں۔"

طبیب ہوچی نے غور سے چغتائی کا چہرہ دیکھا' آج اسے اپنے بوڑھے مریض کے تیور بدلے ہوئے نظر آتے تھے۔ اس کے اندر بستر چھوڑنے کی خواہش پیدا ہو رہی تھی اور یہ ایک خوش آئند بات تھی۔ اس نے کہا۔

"خانِ محترم! ایک بُوٹی نہایت نایاب قسم کی دریا کے کنارے پائی جاتی ہے۔ جوڑوں کے درد کے لئے نہایت مفید ہے۔ پچھلے دنوں میں نے اپنے ہرکارے دوڑائے تھے اب خود کوشش کر کے دیکھ لیتا ہوں' شاید دستیاب ہو جائے۔"

اپنے طبیب کو کوشش پر مائل دیکھا تو چغتائی نے کانپتے ہاتھوں سے گاؤ تکیہ ہٹایا اور اس کے نیچے سے ایک پوٹلی نکال کر طبیب کے حوالے کر دی۔ "یہ لو ہوچی! ایک دو روز میں وہ دوائی مل جانی چاہئے۔ شاید تم حیران ہو رہے ہو کہ میں اپنی بیماری کے متعلق

ایکا ایکی اتنا فکرمند کیوں ہو گیا ہوں۔ سیانے کہتے ہیں کہ اپنے معالج سے کوئی بات چھپانا نہیں چاہئے۔ میں بھی نہیں چاہتا۔ ہوچی! بات دراصل یہ ہے کہ میں اس عیار عورت کو خود اپنے ہاتھ سے جہنم واصل کرنا چاہتا ہوں۔ میری روح کو اس صورت قرار آئے گا' جب میں اس کی نجس زندگی کو اپنے ہاتھ سے عذاب دوں گا۔"

طبیب ہوچی نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "خان محترم! دیوتا آپ کی عمر دراز کریں۔ ابھی منگول قوم کو آپ کے سائے کی ضرورت ہے۔ نیلے آسمان نے چاہا تو آپ بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گے۔"

پھر چغتائی سے جھوٹے سچے وعدے کرتا ہوا ہوچی باہر نکل گیا۔

.... دن گزرتے رہے۔ ہوچی شب و روز چغتائی کے علاج میں مصروف تھا۔ چغتائی کی دو درجن بیویاں باری باری اس کی تیمارداری میں مصروف رہتی تھیں۔ کبھی کبھی اس کے حکم پر مارینا کو بھی اس کی خدمت میں پیش کیا جاتا۔ مارینا کو سامنے دیکھ کر چغتائی کا چہرہ پتھر کی طرح سخت ہو جاتا۔ وہ قہرناک نگاہوں سے مسلسل اسے گھورتا رہتا۔ پھر اسے بے حیا' بدکار اور فاحشہ جیسے القابات سے نوازتا اور دنیا کی رذیل ترین عورت قرار دے کر کمرے سے باہر نکلوا دیتا۔ چغتائی کے سارے غیض و غضب کے سامنے مارینا بڑی خاموشی اور وقار سے کھڑی رہتی۔

ایک روز نصف شب کے وقت چغتائی نے اپنی خادمہ سے کہا۔ "جاؤ دیکھ کر آؤ کہ وہ بدکار عورت کیا کر رہی ہے؟" اس کا اشارہ مارینا کی طرف تھا۔ وہ اسے اسی نام سے پکارتا تھا۔ خادمہ گئی اور کچھ دیر بعد اس نے آ کر اطلاع دی کہ قیدی عورت اپنی کوٹھڑی میں گہری نیند سو رہی ہے۔ چغتائی آگ بگولا ہو گیا۔ پھنکار کر کہنے لگا۔

"اس کی یہ جرأت کہ اپنے انجام سے بے پرواہ وہ کر آرام سے سوئے۔ یہ جانتے بوجھتے بھی وہ آرام سے سو رہی ہے کہ عنقریب اسے چغتائی کے عتاب کا شکار ہونا ہے۔ جاؤ' محافظ دستے کے سالار سے کہو کہ اسے لا کر یہاں میرے سامنے بٹھائے۔ اگر میں انتقام کی آگ میں جل رہا ہوں تو وہ بھی چین کی نیند نہیں سو سکتی۔" بوڑھا چغتائی جسم و جان کی پوری قوت سے بولا تھا اس لئے اسے کھانسی ہونے لگی۔ خادمہ نے پہلے اسے پانی پلایا پھر حکم کی تعمیل کے لئے باہر چلی گئی۔ کچھ دیر کے بعد دستہ سالار مارینا کو لئے چغتائی کے کمرے میں داخل ہوا اور اسے بستر کے قریب ایک نشست پر بٹھا دیا۔ مارینا کے ہاتھ حسب معمول پشت پر بندھے تھے اور دروازے پر ایک مسلح محافظ موجود تھا۔ مارینا کی حسین آنکھیں نیند سے بوجھل تھیں اور شہد رنگ زلفیں بے ترتیبی کا دلکش نمونہ پیش کر رہی

تھیں۔

رات دھیرے دھیرے گزرتی رہی اور ماریتا بوڑھے چغتائی کے سامنے بے حس و حرکت بیٹھی رہی۔ نسیم سحری کے جھونکوں نے قراقرم کی وسعتوں کو چھوا تو چغتائی کی خواب گاہ میں بھی بے صدا لوریاں گونجنے لگیں۔ ہوا نے بوجھل ہو کر ماریتا کی پلکوں کو رخساروں پر جھکا دیا۔ وہ جو نصف شب کی جاگی ہوئی تھی بے اختیار اونگھنے لگی۔ چغتائی خان کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اونگھتا ہوا یہ حسن اسے خوابوں کی دنیا کا اسرار لگا۔ یکایک اسے اندازہ ہوا کہ وہ ماریتا کے متعلق بالکل مختلف انداز سے سوچ رہا ہے۔ اس کی حسن پرست طبع پر ماریتا کا حسن کسی چابک کی طرح پڑ رہا تھا۔ اس کے سیاہ ہونٹ خشک ہونے لگے۔ دل میں کوئی چور انگڑائیاں لینے لگا۔ وہ ماریتا کے سراپا پر نظر دوڑانے لگا۔ پُرکشش و شاداب جسم کی حدت بخارات کی طرح اس کے گلے میں جمع ہونے لگی اور اس کا دم گھٹنے لگا۔ وہ سوچنے لگا' اس بے وفا عورت نے مجھے کیوں چھوڑا؟ اس لئے کہ میں جوان نہیں تھا۔ میرے جسم میں زندگی کا آبشار نہیں تھا۔ میری محبت خشک اور بنجر تھی۔ آخر کیوں چھوڑا اس نے مجھے؟

اس روز صبح جب طبیب چغتائی سے ملا تو چغتائی نے تکیے کے نیچے سے ایک اور پوٹلی نکال کر اسے دی اور کہا کہ وہ اسے جلد از جلد صحت مند کرے اور اسے ایسی مقوی ادویات دے جس سے اس کی جسمانی طاقت بحال ہو جائے۔ ہوشیار طبیب نے آج چغتائی کی آنکھوں میں ایک نیا پیغام پڑھ لیا تھا۔ اس نے پوٹلی کو احتیاط سے اپنے لبادے میں رکھا اور چغتائی کو اس کی صحت کے متعلق سبز باغ دکھانے میں مصروف ہو گیا۔ طبیب کی ہر بات سیدھی چغتائی کے دل میں لگتی تھی اور وہ اس کی عقلمندی کا معترف ہو جاتا تھا۔ طبیب نے اس سے وعدہ کیا کہ وہ آج ہی ایک ایسے خراسانی کیمیاگر سے ملے گا جو خاقان اوغدائی کے محل میں ایک معمولی خدمت گار ہے مگر حقیقت میں ایک پہنچا ہوا حکیم ہے۔ وہ سونے کے کشتے سے ایسی دوائی بنانے کا نسخہ جانتا ہے جو پیر صد سالہ کو بھی بیس برس کا جوان بنا دیتی ہے .... طبیب کی باتیں سن سن کر بوڑھے چغتائی کی آنکھوں میں شیطانی چمک نمودار ہونے لگی۔ ساری زندگی عیش پرستی میں مشغول رہنے والا بوڑھا منگول زندگی کے آخری لمحات میں بھی اس لعنت سے پیچھا نہیں چھڑا پا رہا تھا۔ اچانک ہی اس کے لئے ماریتا کا حسن ناقابل برداشت ہو گیا تھا۔ وہ اس حسن کو فتح کرنا چاہتا تھا۔ ماریتا کو بتانا چاہتا تھا کہ اس بوڑھے منگول میں اب بھی جوانوں سے بڑھ کر طاقت ہے' وہ اب بھی جسموں اور دلوں کو تسخیر کر سکتا ہے.........

رات تاریک اور خاموش تھی۔ اباقہ پتھریلی دیواروں والی اسی کوٹھڑی میں پہنچ چکا تھا جو قراقرم کے سنگین مجرموں کے لئے مخصوص تھی۔ یہ کوٹھڑی نہیں تھی ایک قبر تھی جس میں قید ہونے والا زندہ دفن ہو جاتا تھا۔ اس تنگ و تاریک کوٹھڑی میں صرف ایک چھوٹا سا سوراخ تھا' جس کے راستے بدنصیب قیدی کو محض اتنی خوراک پہنچائی جاتی تھی کہ اس کے جسم و جان کا رشتہ برقرار رہ سکے .... اس وقت کوٹھڑی میں اباقہ کے علاوہ نبیلہ اور علی بھی قید تھے۔ اباقہ ہی کی طرح وہ دونوں بھی پتھروں کے کھردرے فرش پر لیٹے ہوئے تھے۔ اباقہ کی نگاہیں روزن سے باہر دیکھ رہی تھیں۔ اس روزن سے اسے تاروں بھرے آسمان کا چھوٹا سا ٹکڑا نظر آ رہا تھا۔ اس ٹکڑے میں پانچ یا چھ ستارے تھے۔ اباقہ کو لگا جیسے یہ پانچ چھ ستارے نہ ہوں اس کے ساتھی ہوں۔ ہر ستارے میں اسے اپنے ایک ساتھی کی شکل نظر آنے لگی۔ اسد' یورق' ثیزی کولت' سلیمان .... اُسے لگا جیسے وہ سب ڈبڈبائی آنکھوں سے اُس کی طرف دیکھ رہے ہیں' اُن کے چہروں پر خون کے چھینٹے ہیں اور اُن کی نگاہوں میں شکووں کا غبار ہے۔ وہ شکایتی لہجے میں کہہ رہے ہیں۔ "اباقہ .... تم کہاں چلے گئے تھے .... جب ہم پر کلہاڑے چلائے جا رہے تھے۔ تم کہاں تھے؟ جب ہمارے جسموں کو تیروں سے چھلنی کیا جا رہا تھا' تم کہاں تھے؟ اباقہ ہم کو تڑپا تڑپا کر مارا گیا۔ ہمیں گھیر گھیر کر قتل کیا گیا۔ ہم پر ظلم اور سفاکی کی انتہا کی گئی .... لیکن تم بے خبر رہے۔ تم ہماری مدد کو نہ آئے .... کہاں تھے تم۔ کیوں اتنی دور چلے گئے تھے؟"

سلیمان کی شبیہہ اباقہ کی آنکھوں میں لہرائی۔ وہ غمگین چہرہ لئے اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اُس کے ہاتھوں میں اپنے معصوم قاسم کی خون میں نہائی ہوئی لاش تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"اباقہ بھائی' یہ دیکھئے' یہ میرا قاسم ہے' میری آنکھوں کا نور اور میرے جگر کا ٹکڑا۔ دشمنوں نے اُسے نیزے میں پرو کر ہوا میں اچھال دیا تھا۔ اس کی ماں کے دل پر کیا بیتی ہو گی اباقہ بھائی! ذرا سوچئے وہ کیسے کیسے روئی اور تڑپی ہو گی۔ آپ اس کمسن کو کیوں نہ بچا سکے؟ کیوں اُس کی زندگی کے پھول کو ظالم ہاتھوں سے محفوظ نہ رکھ سکے۔"

پھر یورق کا چہرہ اباقہ کے سامنے آیا۔ اُس کا جسم لہولہان اور زخموں سے چُور تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "اباقہ! میں بڑی ہمت سے' اور اپنے بوڑھے جسم کی پوری طاقت سے لڑا۔ مگر کیا کرتا۔ میں اکیلا تھا اور وہ سینکڑوں۔ میں اُن میں گھرا ہوا لڑتا رہا اور میری آنکھیں تمہارا انتظار کرتی رہیں' میں تمہاری راہ دیکھتا رہا۔ اباقہ میری پیٹھ پر کوئی نہ تھا۔ میں کیا کرتا؟ آخر میں مارا گیا۔ میری لاش کو زمین پر گھسیٹا گیا اور گھوڑوں تلے روندا گیا۔ میں نے جب دم

توڑا تو میری زبان پر تمہارا ہی نام تھا۔"

پھر شیزی کولت اباقہ کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔ اُس کی کمر میں ایک تیر پیوست تھا جو سینے کی جانب سے باہر نکل آیا تھا۔ اس کا کومل اور نازک جسم موت کے بوجھ سے لرز رہا تھا۔ اُس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور بولی۔ "اباقہ! تم تو بڑے بہادر تھے' میں نے سردار یورق اور اسد سے تمہاری شجاعت کی داستانیں سنی تھیں مگر جب تمہارے ساتھیوں پر قیامت ٹوٹ رہی تھی اور وہ وحشی دشمنوں سے نبرد آزما ہو کر اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر رہے تھے' تم کہاں چلے گئے تھے۔ میں تو تمہاری کچھ نہ لگتی تھی مگر تم نے نبیلہ اور ماریتا کی آہ و پکار بھی نہ سنی۔ کیا ننھے قاسم کی آخری چیخ بھی تمہارے کانوں تک نہ پہنچ سکی؟"

پھر شیزی کا چہرہ اوجھل ہوا اور اسد اباقہ کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ اُس کا سفید لبادہ خون شہادت سے تر تھا اور نورانی چہرہ زخموں سے اٹا ہوا تھا۔ وہ بولا۔ "اباقہ! تُو تو میرا دست و بازو تھا۔ میری جان .... میرے یار' تُو کہاں چلا گیا تھا۔ دیکھ تیرے پیچھے ہم کیسی قیامت سے گزر گئے۔ اگر تُو ہوتا تو کس کی مجال تھی کہ عقب سے میری پشت میں تلوار گھونپتا۔ کسی کی ہمت تھی کہ ماریتا اور نبیلہ کو برہنہ پا دوڑاتا' کس میں یہ دم خم تھا کہ ہمارے گھروں کو آگ کی نذر کرتا لیکن یہ سب کچھ ہوا۔ اس لئے کہ تُو میرے ساتھ نہ تھا .... میں تیرے نعرے کی گونج کو ترستا رہا اور لڑتا رہا۔ میں نے بہت منگول مارے' مگر پھر میں گر گیا۔ دم توڑتے وقت دل میں یہی حسرت تھی کہ ایک بار تیرا چہرہ دیکھ لوں۔"

اسد خاموش ہو کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ پھر وہ سارے ایک ایک کر کے نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ ستاروں کے روشن نقطوں میں واپس چلے گئے۔ اباقہ کے کانوں میں صرف ایک ہی لفظ کی گونج باقی رہ گئی۔

"الوداع .... الوداع۔"

یکایک اباقہ چلا اٹھا۔ "اسد .... اسد .... یورق' سلیمان!" اس کی دل سوز دھاڑ کوٹھڑی میں گونج کر رہ گئی۔ نبیلہ اور علی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے اور ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ انہیں اس تاریک کوٹھڑی میں قید ہوئے پورا ایک ماہ ہو چکا تھا۔ اس ایک ماہ میں اکثر انہوں نے اباقہ کو پہریداروں پر چیختے چلاتے سنا تھا لیکن آج اُس کی دھاڑوں میں خوفناک شدت تھی۔ پھر اُن دونوں کو اندازہ ہوا کہ اباقہ پتھریلی دیواروں پر مکے برسا رہا ہے اور سر ٹکرا رہا ہے' یہ آوازیں سن کر علی اونچی آواز میں رونے لگا۔ نبیلہ کو خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں وحشت کی فراوانی میں اباقہ اپنی جان ہی نہ لے لے۔ اُس نے علی کو بمشکل خود سے

جدا کیا اور اندھیرے میں ٹٹولتی ہوئی اباقہ سے لپٹ گئی۔

"بھائی جان!" وہ التجائیہ لہجے میں بولی۔ "خدا کے لئے ایسا نہ کریں۔ اگر ایسا کرنا ہی ہے تو پہلے ہمارا گلا گھونٹ دیں۔"

اچانک باقہ کی وحشت میں کمی آ گئی۔ اس نے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیئے اور نبیلہ کو گلے سے لگا کر سسکنے لگا۔ علی بھی رینگتا ہوا اُن کے پاس پہنچ گیا .... تینوں دیر تک اسی طرح ایک دوسرے سے جڑے گہری تاریکی میں بیٹھے رہے۔ قراقرم کی نامہرباں رات دھیرے دھیرے سرکتی رہی۔ جب علی سسک سسک کر سو گیا تو اباقہ نے بھرائی ہوئی آواز میں نبیلہ سے کہا۔

"نبیلہ! مجھے بتاؤ۔ کیا یہ سب کچھ حقیقت ہے؟ کیا واقعی اسد یورق اور سلیمان ہم سے جدا ہو چکے ہیں۔ کہیں میں کوئی بھیانک خواب تو نہیں دیکھ رہا؟"

نبیلہ دکھی لہجے میں بولی۔ "بھائی جان! نیند کتنی بھی گہری ہو ایسے بھیانک خواب کے بعد باقی نہیں رہ سکتی۔ ہم جو کچھ دیکھ چکے ہیں وہ ہو چکا ہے۔"

اباقہ نے ایک طویل اور گہری سانس لی اور دھیرے دھیرے اپنے لمبے بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگا۔ ان بالوں میں ایک چھوٹا سا خنجر چھپا ہوا تھا۔ یہ وہی خنجر تھا جو اباقہ نے عید سے ایک روز پہلے علی کے لئے خریدا تھا۔ اس چھوٹے سے خنجر کا پھل بہت سخت اور خاص قسم کے فولاد سے بنا ہوا تھا۔ جب وہ بستی میں پہنچ کر منگولوں کے ہاتھوں گرفتار ہوا تو انہوں نے اس سے سب چیزیں چھین لی تھیں مگر یہ کھلونا سا خنجر اس کی صدری کی ایک جیب میں پڑا رہ گیا تھا۔ بعد ازاں اباقہ نے سفر کے دوران یہ خنجر اپنی صدری سے نکال کر اپنے لمبے بالوں کے اندر اس طرح الجھایا تھا کہ وہ اُن میں چھپ کر رہ گیا تھا۔ قراقرم پہنچ کر اباقہ کو اس کوٹھڑی میں منتقل کرنے سے پہلے منگول محافظوں نے ایک بار پھر پوری احتیاط سے اباقہ کی تلاشی لی تھی مگر اس وقت وہ خنجر اباقہ کے گھنے بالوں میں پہنچ چکا تھا۔

اس سنگلاخ کوٹھڑی میں اس ننھے منے خنجر کے سوا دھات پتھر یا لکڑی کی کوئی چیز موجود نہیں تھی۔ اباقہ' نبیلہ اور علی کو جو ہتھکڑیاں و بیڑیاں پہنائی گئی تھیں ان کے کنارے بھی بالکل گول و ہموار تھے۔ اس کے علاوہ ہر بیڑی و ہتھکڑی کو اس طرح منسلک کیا گیا تھا کہ قیدی کے لئے سیدھا ہو کر چلنا ناممکن تھا۔ چلتے وقت قیدی کو رکوع کی حالت میں جھکے رہنا پڑتا تھا۔ کوٹھڑی میں داخل ہونے والے کسی محافظ پر حملہ کرنا تو دور کی بات ہے' ان کے لئے یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ وہ فوری طور پر کھڑے بھی ہو سکیں۔ سفاکی کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے معصوم اور کمزور علی کو بھی زنجیروں میں جکڑ رکھا تھا۔ آٹھ پہر میں صرف ایک

بار کوٹھڑی کے سوراخ پر آہٹ ہوتی تھی۔ وہ اپنے اپنے خالی پیالے سوراخ کی طرف بڑھا دیتے تھے۔ ایک ہاتھ سوراخ میں داخل ہو کر خالی پیالے لے لیتا تھا اور جَو سے بھرے ہوئے تین پیالے انہیں تھما دیتا تھا۔ یہ اُبلے ہوئے جَو اُن کی غذائی ضرورت پوری تو نہیں کرتے تھے مگر انہیں زندہ رکھے ہوئے تھے۔ پہلے پہل نبیلہ نے کچھ کھانے پینے سے انکار کر دیا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ نبیلہ کے حصے کے جَو آنے بند ہو گئے تھے۔ پانچ چھ روز میں وہ بے حد کمزور ہو گئی تھی۔ آخر اباقہ اور علی کے کہنے سننے پر اُس نے تھوڑا بہت کھانا شروع کیا تھا۔

اباقہ خیالوں میں کھویا دھیرے دھیرے اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ نبیلہ اُس کے شانے سے لگی ہوئی اونگھنے لگی تھی، علی اُس کے زانو پر سر رکھ کر سو چکا تھا۔ اباقہ کی پھیلی ہوئی آنکھیں کسی بہت گہری سوچ میں ڈوبی تھیں۔ کچھ اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے شاید تقدیر پر غور کر رہا تھا۔ شاید ماریتا کے انجام کے بارے سوچ رہا تھا۔ یا سوچ رہا تھا کہ اُس کے بالوں میں چھپا ہوا یہ معمولی خنجر کیا کام دے سکتا ہے .... نبیلہ یا علی کی نیند خراب کئے بغیر وہ اسی طرح بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ دھیرے دھیرے تاریکی کی چادر سمٹنے لگی۔ اس تاریک کوٹھڑی سے باہر دور کہیں کوئی پرندہ چہچہایا اور صحرائے گوبی کے آتش بار سویرے سے ڈر کر ستاروں کی وہ ٹولی او جھل ہو گئی جو رات بھر اباقہ کو روزن سے نظر آیا کرتی تھی .... کچھ دیر بعد سورج جب نیلے آسمان پر نمودار ہوا اور اُس کی تماش بین کرنوں نے کوٹھڑی کے روزن سے جھانکا تو ایک مدھم سا اجالا کوٹھڑی کے سنگلاخ فرش پر بھی پھیل گیا۔ آٹھ پہر میں یہی بالشت بھر دھوپ اُن کے حصے میں آیا کرتی تھی۔ اباقہ بے حرکت بیٹھا اس اجنبی دھوپ کو دیکھ رہا تھا۔ جب اچانک اُس کی نگاہ ایک پیالے پر پڑی اور اٹک کر رہ گئی۔ اس پیالے کے پیندے کے ساتھ کوئی شے چپکی ہوئی نظر آئی تھی۔ شاید کوئی کاغذ تھا۔ اباقہ نے نبیلہ کو اپنے شانے سے ہٹایا اور رینگتا ہوا پیالے کی طرف بڑھا۔ یہ بھربھری مٹی کا پیالا تھا۔ اباقہ نے اُسے دھوپ کی طرف کر کے غور سے دیکھا۔ واقعی اس کے پیندے سے ایک میلا سا کاغذ چپکا ہوا تھا۔ اس کاغذ پر کوئی عبارت تحریر تھی۔ اباقہ نے یہ پیالا نبیلہ کی طرف بڑھایا۔ وہ بے چینی سے کاغذ کی تحریر پر نگاہ دوڑانے لگی۔ اس کے ساتھ ہی اُس کے چہرے پر عجیب سا ہیجان نظر آنے لگا۔ "کیا لکھا ہے؟" اباقہ نے بے قراری سے پوچھا۔ نبیلہ نے لرزاں سرگوشی میں کہا۔ "بھائی جان! آپ .... آپ کے کچھ وفادار ساتھی قراقرم پہنچ گئے ہیں۔ یہ پیغام ایڈورڈ جان نامی شخص کی طرف سے ہے۔"

اباقہ کچھ دیر حیران نظروں سے نبیلہ کا چہرہ دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔ "پڑھو! اس نے کیا لکھا ہے؟"

نبیلہ نے پڑھنا شروع کیا۔ "سردار اباقہ! کاش ہمیں بروقت اطلاع مل جاتی اور ہم اس قیامت کو روک لیتے جو آپ کے ساتھیوں پر ٹوٹی۔ سردار، ہمارے دل خون کے آنسو رو رہے ہیں اور ہماری تلواریں ہمارے نیاموں میں تڑپ رہی ہیں۔ آقا! ہماری جان آپ پر قربان، ہماری سانسیں آپ پر نچھاور، ہم آپ کے گناہگار ہیں اور ان گناہوں کو دھونے کے لئے ہم سر ہتھیلیوں پر لئے قراقرم پہنچ گئے ہیں۔ اگر خدا نے چاہا تو ہم عنقریب آپ کو آزاد کروالیں گے۔ ہم روسی بازی گروں کے بھیس میں یہاں پہنچے ہیں اور ہمارے کچھ ساتھیوں نے اہم مقام تک رسائی حاصل کر لی ہے .... آپ اپنی خوراک کے پیالوں پر نگاہ رکھیں۔ بہت جلد ہم آپ کو خوشخبری سنائیں گے۔"

آپ کا ادنیٰ غلام ایڈورڈ

اباقہ سمجھ چکا تھا کہ وہ اپنے جن ڈھائی سو روسی سپاہیوں کو دجلہ کے کنارے چھوڑ آیا تھا، اُن میں سے کچھ اس کی مدد کو پہنچ گئے ہیں۔

مختصر تحریر ختم کرنے کے بعد نبیلہ سوالیہ نظروں سے اباقہ کی طرف دیکھنے لگی۔ علی بھی امید وبیم کی نگاہوں سے اباقہ کا چہرہ تک رہا تھا۔ اس قید کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں انہیں آس کی ایک کرن نظر آئی تھی مگر اباقہ کے چہرے پر اس کرن کا کوئی عکس نظر نہیں آتا تھا۔ وہ اسی طرح خاموش اور افسردہ تھا۔

.... ٹھیک آٹھ روز بعد ایک بار پھر پیالے کے پیندے سے چپکی ہوئی ایک تحریر ان تک پہنچی اور یہ تحریر نہایت چونکا دینے والی اور سنسنی خیز تھی۔ ایڈورڈ نے شستہ فارسی میں لکھا تھا۔

"سردار اباقہ! ہمیں معلوم ہوا ہے کہ آپ کے قید خانے کا آہنی دروازہ صرف اور صرف ایک شخص کے حکم نامے سے کھلتا ہے، اور وہ شخص ہے منگولوں کا بادشاہ اوغدائی خاں۔ ہم کوشش کر رہے ہیں کہ کسی طرح اوغدائی خاں کے محل تک رسائی حاصل کر سکیں۔ اس کے علاوہ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ آپ کی زندگیوں کو فی الحال کوئی خطرہ نہیں کیونکہ اردوئے معلیٰ (منگول لشکر) کی روس سے واپسی تک آپ کو ہر صورت میں زندہ رکھا جائے گا .... آپ کی ماریتا نامی ساتھی کو اُس کے سابق شوہر چغتائی خاں کے سپرد کر دیا گیا ہے اور وہ اُس کے محل میں زندہ سلامت موجود ہے۔ جلد ہی آپ سے پھر رابطہ قائم کریں گے۔"

ایڈورڈ کا تیسرا اور آخری پیغام اباقہ کو کوئی چھ روز بعد ملا اور یہ ایک دھماکہ خیز پیغام تھا۔ تحریر پڑھنے کے بعد نبیلہ کی بجھی ہوئی آنکھوں میں روشنی نظر آنے لگی اور علی کے سوکھے ہونٹ بھی تھرا اٹھے۔ اباقہ کے بے حس چہرے پر بھی اس پیغام نے بے قراری کی کیفیت پیدا کر دی تھی مگر اس بے قراری میں بے نام اندیشے بھی جھلک رہے تھے۔

تیسرا پیغام کچھ اس طرح تھا۔

"سردار اباقہ! ہماری زندگیاں آپ پر قربان۔ ہم آپ کی آزادی کے لئے بھرپور کوششیں جاری رکھے ہوئے ہیں۔ وہ وقت اب دور نہیں جب آپ ہمارے درمیان ہوں گے۔ ہم نے اوغدائی خاں کا فرضی حکم نامہ تیار کرا لیا ہے اور اس قید خانے پر شب خون مارنے کی بھی پوری تیاری کرلی ہے۔ ہم یہاں کل چالیس افراد پہنچے ہیں اور ہم میں سے ہر ایک کی آرزو ہے کہ آپ کو دشمن کی قید سے نکالیں یا آپ کی محبت میں اپنی جانیں ہار کر اپنی نظروں میں سرخرو ہو جائیں۔

.... اس وقت ہمیں صرف مناسب موقع کا انتظار ہے۔ ہم اپنی کارروائی کے لئے کسی ایسی طوفانی رات کا انتظار کر رہے ہیں جب اس قید خانے کی بیرونی دیواروں پر اور احاطے میں جلتی ہوئی مشعلیں گل ہوں اور ہمیں آپ کو کوٹھڑی سے نکالنے میں تاریکی کا سہارا میسر آئے۔ باقی سب تیاریاں مکمل ہیں' آپ بھی پوری طرح تیار رہیں آج کے بعد .... جس رات بھی تیز ہوائیں چلیں گی' وہ آپ کی رہائی کی رات ہو گی۔ ہمیں یقین ہے کہ ہم اہلِ قراقرم کو ایک یادگار زخم دے جائیں گے۔ جس وقت ہمیں اوغدائی خاں کا حکم نامہ آپ کی کوٹھڑی میں پہنچائے گا۔ قید خانے سے باہر موجود میرے دستے کے سپاہی قید خانے پر دھاوا بول دیں گے۔ گہری تاریکی اور افراتفری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم آپ کو کوٹھڑی سے نکال لے جائیں گے۔ خدا نے چاہا تو وہ رات آپ کے جاں نثاروں کی سرخروئی کی رات ہو گی۔

اُس طوفانی رات تک کے لئے خدا حافظ

آپ کی عظمتوں کا شیدائی ایڈورڈ"

اباقہ دیوار سے ٹیک لگائے گم صم بیٹھا رہا۔ نبیلہ نے اس کی خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔ "بھائی جان! کیا آپ اپنے اس ساتھی کی کوششوں سے خوش نہیں ہیں۔"

اباقہ نے ایک سرد آہ بھری۔ "ہاں نبیلہ! میں خوش نہیں اس لئے کہ میں وہ جانتا ہوں جو ایڈورڈ اور اس کے ساتھی نہیں جانتے۔ اس قید خانے سے نکل جانا یا کسی کو نکال لینا ناممکن ہے۔ یہاں کے قیدی کو صرف موت یا اوغدائی خاں ہی رہائی دلا سکتے ہیں۔"

نبیلہ نے کہا۔ "اباقہ بھائی! آپ کے ساتھی نے لکھا ہے کہ وہ اوغدائی کا حکم نامہ لا رہا ہے۔"

اباقہ نے کہا۔ "ہاں یہ بات اہم ہے.........." اور خاموش ہو گیا۔ نبیلہ کافی دیر اس کے بولنے کا انتظار کرتی رہی۔ مگر وہ اپنی ویران آنکھوں کے ساتھ ایک بار پھر نامعلوم سوچوں کے سفر پر روانہ ہو چکا تھا۔

وہ ایک ابر آلود رات تھی۔ قراقرم میں تیز آندھیاں تو چلتی ہی رہتی تھیں مگر اس روز غیر متوقع طور پر ہلکی بارش بھی ہو رہی تھی۔ بادلوں کی مہیب گڑگڑاہٹ سے نبیلہ اور علی سہمے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی بجلی کا کوئی کوندا اس تاریک کوٹھڑی میں بھی لپک جاتا تھا۔ تیز ہوا سیٹیاں بجاتی ان دیکھی منزلوں کی طرف رواں تھی۔ دفعتاً نبیلہ پکار اٹھی۔

"وہ آ گئے .... اباقہ بھائی .... وہ آ گئے۔"

اباقہ نے بھی غور کیا تو اسے آہنی دروازے کی دوسری جانب کچھ آہٹیں سنائی دیں۔ وہ جھک کر چلتا ہوا دروازے کے پاس پہنچا اور اس کے آہنی پٹ سے کان لگا دیئے۔ ایڈورڈ کی بوڑھی آواز گونجتی ہوئی اس کے کانوں سے ٹکرائی اور اس کا جسم سنسنا اٹھا۔ آخر باہمت روسی سردار اس کوٹھڑی کے دروازے تک پہنچ ہی گیا تھا۔ پہلی بار اباقہ کی آنکھوں میں ایک بے نام چمک نظر آئی۔ یہ ایک خوفناک چمک تھی۔ علی اور نبیلہ میں سے کسی نے یہ چمک نہیں دیکھی ورنہ شاید وہ اباقہ سے خوف کھانے لگتے۔ اباقہ کے کان بیرونی آوازوں پر لگے تھے۔ ایڈورڈ منگول پہریداروں سے مصروف گفتگو تھا۔ وہ پہریدار کو بتا رہا تھا کہ اس کا تعلق روسی طائفے سے ہے اور کوٹھڑی میں داخل ہونے کا اجازت نامہ خود اوغدائی خاں نے اسے مرحمت فرمایا ہے تاکہ وہ علی نامی قیدی بچے کو دیکھ سکے۔ پہریدار کے پوچھنے پر ایڈورڈ نے بتایا کہ علی نام کا ایک بچہ کچھ عرصہ پہلے ان کے طائفے سے بھاگا تھا۔

اباقہ اور نبیلہ دھڑکتے دل سے ایڈورڈ اور پہریداروں کا مکالمہ سن رہے تھے ....

مگر جلد ہی یہ جان کر ان کے چہرے تاریک ہو گئے کہ پہریداروں کو جعلی اجازت نامے پر شبہ ہو گیا ہے۔ محافظ دستے کا سالار نہایت عیاری سے ایڈورڈ کو بتا رہا تھا کہ انہیں دروازہ کھلنے کے لئے کچھ دیر انتظار کرنا پڑے گا کیونکہ دروازے کو جو تین چابیاں لگتی ہیں ان میں سے ایک نائب سالار کے پاس ہے۔ اباقہ کوٹھڑی کے اندر ہونٹ کاٹ کر رہ گیا .... دوسری طرف شاید ایڈورڈ بھی منگولوں کی چال سمجھ چکا تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ ان کا راز فاش ہو گیا ہے .... یکایک اباقہ کو تلواروں کی جھنکار سنائی دی اور دو منگولوں کی کربناک چیخیں در و دیوار کو لرزا گئیں۔ ایڈورڈ خطرات سے بے نیاز ہو کر منگول

پہریداروں پر ٹوٹ پڑا تھا۔ باہر سے پہنچنے والی آوازوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ ایڈورڈ کے ساتھ اس کا ایک ساتھی بھی ہے' دونوں نہایت بے جگری سے منگولوں کے ساتھ برسرپیکار ہو گئے تھے .... پھر اباقہ کو ایڈورڈ کی کراہ سنائی دی اور اسے اندازہ ہوا کہ وہ شدید زخمی ہو کر گر گیا ہے۔ نبیلہ سسکتی ہوئی فرش پر ڈھیر ہو گئی۔ علی نے اباقہ کا دامن تھام لیا .... باہر اب تلواروں کی جھنکار ختم ہو چکی تھی۔ بیسیوں پہریداروں نے ایڈورڈ کے ساتھی کو دبوچ لیا تھا اور اسے گھسیٹتے ہوئے کوٹھڑی کے دروازے سے دور لے جا رہے تھے۔ سنگلاخ سرنگ میں اس کی پکار گونج رہی تھی۔ "سردار اباقہ .... سردار اباقہ .... ہم تمہیں آزاد کرا کے رہیں گے .... ہم تمہیں آزاد کرا کے رہیں گے .... ہمت نہ ہارنا سردار! دل چھوٹا نہ کرنا۔ ہم تمہارے ساتھ رہیں گے.........." پھر جوشیلے سپاہی کی آواز مدھم ہوتی چلی گئی اور آخر طویل سرنگ میں خاموشی کے سوا کچھ باقی نہ رہ گیا۔

یہ اگلی صبح کی بات ہے' علی اپنے سر کو جھکا کر پیالے میں سے جَو کھانے کی کوشش کر رہا تھا اور اباقہ رحم آمیز نظروں سے اُس کی طرف دیکھ رہا تھا' اچانک نبیلہ کی چیختی ہوئی آواز اباقہ کے کانوں سے ٹکرائی۔ وہ کوٹھڑی کے واحد روزن کے پاس کھڑی باہر دیکھ رہی تھی۔ اس نے دردناک لہجے میں کہا۔

"بھائی جان! یہ دیکھیں .... یہ لوگ کیا کر رہے ہیں۔" اباقہ اپنی زنجیریں گھسیٹتا اور رکوع کے بل چلتا ہوا روزن تک پہنچا۔ باہر دیکھ کر وہ بھی سکتے میں رہ گیا۔ اس کے وفادار روسی دستے کے بیشتر ارکان ایک کھلے احاطے میں نظر آ رہے تھے۔ ان میں ایڈورڈ بھی تھا' وہ شدید زخمی حالت میں زمین پر پڑا کراہ رہا تھا۔ ان سب کے بازو پشت پر رسیوں سے بندھے تھے اور ان کے جسموں کا چپہ چپہ خون اُگل رہا تھا۔ یوں لگتا تھا انہیں یہاں لانے سے پہلے شدید تشدد کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ ان سب کو مسلح منگول محافظوں نے گھیر رکھا تھا۔ اباقہ کو کسی نامعلوم مقام سے خونخوار کتوں کے غرانے کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ یہی آوازیں اس نے کئی برس پہلے چغتائی خاں کے یورت کے سامنے سنی تھیں۔ جب وہ پہلی بار قراقرم میں داخل ہوا تھا اور چغتائی کے حکم پر اسے ایک ایسے گڑھے میں پھینک دیا گیا تھا جہاں دیو قامت بھوکے کتے اس کی چیر پھاڑ کے لئے بے قرار تھے۔ اس نے ہمت نہیں ہاری تھی اور بے پناہ دلیری سے صورت حال کا مقابلہ کیا تھا۔ نتیجے میں چغتائی خاں نے اس کے ساتھ ساتھ سردار یورق کی بھی جان بخشی کر دی تھی .... شاید آج پھر یہاں ویسا ہی کوئی خونی تماشا ہونے والا تھا۔

کچھ دیر بعد دو منگول سپاہیوں نے ایک زخمی روسی کے ہاتھ پشت سے کھولے اور سے سہارا دے کر کھڑا کر دیا۔ تب وہ اسے چلاتے ہوئے ایک مخصوص جگہ لے آئے۔ جہاں پہنچ کر روسی جانباز خود کو چھڑانے کی دلیرانہ جدوجہد کرنے لگا۔ ایک منگول نے پھرتی سے اس کے سر پر کوئی سفید چیز انڈیلی اور عقب سے دھکا دے دیا۔ روسی سپاہی اچانک اباقہ کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی کتوں کے غرانے اور جھپٹنے کی پُر ہیبت آوازیں آنے لگیں .... تب اباقہ کو علم ہوا کہ روسی سپاہی کو "موت کے گڑھے" میں دھکیل دیا گیا ہے اور اب آدم خور کتے انسانی گوشت کی چیر پھاڑ میں مصروف ہیں۔ وہ خود پر ضبط نہ رکھ سکا اور حلق کی پوری قوت سے چلایا۔

"چغتائی خاں .... چغتائی خاں .... ان کو چھوڑ دے اگر سزا دینی ہے تو مجھے سزا دے' اگر مارنا ہے تو مجھے مار .... ان کا کیا قصور ہے .... انہوں نے تیرا کیا بگاڑا ہے۔ او بدبخت چغتائی خاں چھوڑ دے ان کو.........."

لیکن چغتائی خاں وہاں تھا کہاں جو اس کی چیخ و پکار سنتا۔ اباقہ کی وحشت ناک چنگھاڑیں سن کر احاطے میں موجود تمام افراد کوٹھڑی کے روزن کی طرف متوجہ ہو گئے۔ پھر منگولوں کے چہروں پر مسکراہٹیں ابھریں اور ان کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں شرارت سے کچھ اور بھی چھوٹی ہو گئیں۔ وہ اباقہ کی چیخ و پکار سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ شاید یہ خونی کھیل اس کوٹھڑی کے سامنے کھیلا ہی اس لئے جا رہا تھا کہ اباقہ کو دکھ پہنچے۔ وہ اپنے غمگساروں کا حشر دیکھ دیکھ کر خون کے آنسو روئے۔ یقیناً انہوں نے رات ہی پورے دستے کو گرفتار کر لیا تھا اور صبح تک انہیں اذیتوں کے دوزخ سے گزارتے رہے تھے۔ ایڈورڈ نے اپنے دستے کی تعداد چالیس بتائی تھی۔ وہ چھتیس تھے۔ اس کا مطلب تھا صرف تین چار افراد ہی گرفتاری سے بچنے میں کامیاب ہوئے تھے۔

دوسری طرف اباقہ کے وفادار ساتھیوں نے جب اپنے سردار کی آواز پہچانی تو جذبات سے بے قابو ہو کر کوٹھڑی کے روزن کی طرف بڑھے' مگر نیزا بردار سپاہیوں نے انہیں آگے بڑھنے سے روک دیا۔ پھر دھکے دے دے کر انہیں زمین پر گرا دیا گیا۔ ہاتھ بندھے ہونے کی وجہ سے وہ فوراً اٹھ بھی نہ سکتے تھے اور ہر ایک سینے پر نیزے کی انی تھی۔ پھر بھی چند مسلمان روسیوں نے جوش سے بے قابو ہو کر اباقہ کی طرف آنا چاہا' منگولوں نے نہایت بے دردی سے انہیں نیزوں سے چھلنی کر دیا۔ کلمہ طیبہ سے سجی ہوئی کراہوں کے ساتھ ہی ان کے جسم خون اگلنے لگے اور زمین اس سرخی سے گلگوں ہونے لگی۔ باقی سپاہیوں کو جہاں جہاں وہ گرے تھے دبوچ لیا گیا۔ بے بسی کا یہ منظر اباقہ کے لئے ناقابلِ

برداشت تھا۔ وہ چیخ رہا تھا اور اپنے حلق کی پوری قوت سے چیخ رہا تھا۔ چنگیز خاں کے ناپاک بیٹوں کو ناپاک ناموں سے پکار رہا تھا کہ شاید اسی طرح وہ اسے اس کوٹھڑی سے نکالنے کا ارادہ کرلیں۔ مگر صیاد اتنے بھولے نہیں تھے۔ وہ سب کچھ سن رہے تھے اور مسکرا رہے تھے۔ خاموشی کی زبان میں کہہ رہے تھے کہ چیخ لو جتنا چیخنا چاہتے ہو۔ وقت آنے پر ہم تمہاری اس بدزبانی کا تمہیں ایسا مزا چکھائیں گے کہ تم بلک بلک کر موت کی دعائیں کرو گے۔ پھر اباقہ چیختا رہا اور دھاڑتا رہا اور اس کے پیارے ساتھی' اُس کے جاں نثار ایک ایک کرکے موت کے گڑھے میں پھینکے جاتے رہے۔ وہ سب اس کے پرستار تھے۔ اس کی بہادری کے قائل تھے' اس کی جوانمردی کے عاشق تھے .... اور آج اس کے سامنے وہ ایک ایک کرکے اذیت ناک موت کے منہ میں جا رہے تھے۔ انہوں نے دریائے سیت کے کنارے سے قراقرم کے ظلمت کدے تک اباقہ سے وفاداری کا حق ادا کیا تھا اور اب آخری وقت بھی ان کے چہروں پر پشیمانی کا شائبہ تک نہیں تھا.......... وہ مسلسل جدوجہد کررہے تھے' گڑھے میں گرنے سے پہلے بھی' اور گرنے کے بعد بھی۔

اباقہ کو روزن سے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا مگر وہ دیکھ رہا تھا کہ گڑھے میں بار بار تازہ دم کتے اتارے جا رہے ہیں۔ یقیناً انسانی لاشوں کے ساتھ ساتھ وہاں کتوں کی لاشوں میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ تاہم منگولوں کے پاس آدم خور کتوں کی کمی نہیں تھی اور اباقہ کے ساتھی چھتیس کیا چھتیس سو بھی ہوتے' وہ اس درندگی کے سامنے بے بس تھے۔ چلا چلا کر اباقہ کا گلا رندھ گیا۔ یہاں تک کہ اس کے وفادار دستے کا آخری سپاہی بھی روزن کی طرف الوداعی نظروں سے دیکھتا ہوا گڑھے کی جان لیوا گہرائی میں گم ہو گیا۔ کتے ایک بار پھر زور و شور سے غرائے۔ منگول تماشائی کچھ دیر دلچسپی سے گڑھے میں جھانکتے رہے۔ پھر ایک آخری انسانی چیخ گڑھے سے ابھری اور منگول خوشی سے ناچنے لگے۔ اباقہ کا آخری جاں نثار بھی اس پر اپنی جان کا قرض چڑھا کر موت کے سفر پر روانہ ہو گیا تھا۔

اباقہ بے دم ہو کر کوٹھڑی کے فرش پر بیٹھ گیا اور بے بسی کے عالم میں اپنی زنجیروں کو پتھروں پر مارنے لگا۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے سوتے پھوٹ رہے تھے۔ نبیلہ نے اس کی حالت زار دیکھ کر آنکھیں بند کرلی تھیں اور علی نے سہم کر سر گھٹنوں میں چھپا لیا تھا۔

☆------☆------☆

بوڑھے چغتائی خاں کی صحت اب پہلے سے بہتر تھی۔ وہ چینی طبیب ہوچی پر خوب دولت لٹا رہا تھا اور ہوچی اسے اناپ شناپ نسخے کھلانے میں مصروف رہتا تھا۔ چغتائی کے

شاندار بستر کے سرہانے مختلف معجونوں' کشتوں اور لعاب دار دواؤں کی بھرمار رہتی تھی۔ خراسانی کیمیاگر کا طلائی نسخہ' چغتائی خاں خاص احتیاط سے کھاتا تھا کیونکہ ہوچی کے بقول یہی وہ نسخہ تھا جو اس کے کھنڈر جسم کو شباب کی رعنائیوں سے معمور کرسکتا تھا۔

کچھ روز تو اس نسخے سے چغتائی کو خاصا فائدہ محسوس ہوا لیکن ایک روز وہ صبح اٹھا تو پیٹ میں شدید درد تھا۔ دوپہر تک اسے زبردست پیچش شروع ہو گئی۔ طبیب ہوچی بوکھلایا بوکھلایا پہنچا۔ اس نے پیچش کی روک تھام کے لئے کچھ اور دوائیں دیں جس سے مرض نے ہیضے کی شکل اختیار کرلی۔ شباب کی رعنائیاں' تو رہیں ایک طرف' اب چغتائی کو جان کے لالے پڑ رہے تھے۔ آٹھ پہر بعد چغتائی کی قے تو تھم گئی لیکن پیچش کا ایسا سلسلہ شروع ہوا کہ وہ چارپائی سے لگ گیا۔ آنتوں کے اس مرض کے ساتھ ہی اس کو کھانسی کے دورے بھی شدت سے پڑنے لگے۔ ایک شام چغتائی کو اندازہ ہوا کہ اس کا دانہ پانی ختم ہونے کو ہے۔ موت کے احساس کے ساتھ ہی اس کے اندر کا زخمی سانپ پھنکارنے لگا۔ اسے لگا کہ اس کی اس حالت کی ذمہ دار صرف اور صرف مارینا ہے۔ مارینا کا دلکش چہرہ اس کی نگاہوں میں گھوما اور اس کی آنکھیں جل اٹھیں۔ اس وقت اس کی پانچ بیویاں اس کے پاس بیٹھی تھیں۔ چغتائی نے انہیں حکم دیا کہ وہ تخلیہ چاہتا ہے۔ بیویاں اور خادمائیں چلی گئیں تو اس نے خادم خاص کو حکم دیا کہ مارینا کو اس کے کمرے میں حاضر کیا جائے۔ بوڑھے خاں کے حکم کی تعمیل ہوئی۔ کچھ ہی دیر بعد مارینا اس کے سرہانے موجود تھی۔ اس نے سفید رنگ کا ایک سادہ سا لباس پہن رکھا تھا اور چہرے پر سوگواری طاری تھی مگر اس حالت میں بھی اس کا حسن قیامت لگ رہا تھا۔ چغتائی کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ اس کے مرنے سے پیشتر ہی اس کا سوگ منانے میں مصروف ہے۔ "نہیں .... میں نہیں مروں گا۔" اس نے اپنے ارادے کی پوری قوت سے سوچا۔ اس نے مارینا کے سامنے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی مگر اس کوشش میں اس کی سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگی۔ گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر وہ یک ٹک مارینا کا چہرہ دیکھنے لگا۔ پھر اس کے ہونٹوں سے ایک پھنسی آواز سرگوشی کی صورت نکلی۔

"میرے پاس آ.......... مارینا' میرے پاس آ۔"

مارینا نے ایک پُرحقارت نگاہ اُس پر ڈالی مگر اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی۔

"میرے قریب آ مارینا۔" وہ عجیب لرزی لرزی اور بہکی سی آواز میں بولا۔ "میں تیرا شوہر ہوں۔"

مارینا آگے جھکنے کی بجائے جھجک کر کچھ اور پیچھے ہو گئی۔ آتشدان کی روشنی میں

بوڑھے چغتائی کا چہرہ بھیانک لگ رہا تھا۔ لگتا تھا کوئی مردہ فطرت کے خلاف جنگ میں مصروف ہے۔ اُس کے نتھنے پھڑک رہے تھے اور آنکھیں حلقوں سے باہر اُبلی پڑ رہی تھیں۔ غیر محسوس طور پر وہ سر سے پاؤں تک کانپ رہا تھا۔ پھر اُس نے اپنا استخوانی ہاتھ آگے بڑھایا اور ماریتا کی شفاف گردن پر لے آیا۔ گردن سے پھسلتا ہوا اُس کا ہاتھ ماریتا کی ریشمی زلفوں تک پہنچا تھا کہ اُسے کھانسی کا انتہائی شدید دورہ پڑ گیا۔ اُس نے دوسرا ہاتھ اپنے سینے پر رکھا اور بری طرح کھانسنے لگا۔ اُس کی زبان بل کھا کر منہ سے باہر نکلی پڑ رہی تھی اور آنکھیں حلقوں سے باہر ابل آئی تھیں۔ مگر اس حالت میں بھی اُس کی نگاہیں ماریتا کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ اُس کے بائیں ہاتھ نے ماریتا کے بالوں کو مٹھی میں جکڑ لیا تھا اور ہر لحظہ یہ گرفت مضبوط ہوتی جا رہی تھی۔ ماریتا کی آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ چہرے پر نفرت کا تاثر لئے بے حس و حرکت بیٹھی چغتائی کو دیکھ رہی تھی۔ آخر بوڑھے چغتائی کی کھانسی اتنی شدید ہوئی کہ اُس کے ہونٹوں سے خون بہنے لگا۔ اُس کے حلق سے گھرر گھرر کی خوفناک آواز نکل رہی تھی۔ ان آوازوں نے بالآخر خوابگاہ کے باہر موجود خادمین اور معالجوں کو ہوشیار کر دیا۔ وہ بھاگتے ہوئے اندر پہنچے تو چغتائی پر نزع کا عالم طاری ہو چکا تھا۔ بمشکل انہوں نے ماریتا کے بال چغتائی خاں کی مٹھی سے چھڑائے اور اُسے بستر پر لٹا دیا۔ چغتائی خاں کا سانس قریباً بند ہو چکا اور آنکھیں اوپر چڑھی ہوئی تھیں۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے چنگیز خاں کے بوڑھے بیٹے کی رگوں میں چنگیزی خون ساکت ہو گیا۔ اُس نے نہایت کرب کے عالم میں آخری ہچکی لی اور دارِ فانی سے کوچ کر گیا۔ چغتائی کی بیویاں قطار در قطار اندر آئیں اور خادماؤں کے ساتھ مل کر رونے پیٹنے لگیں۔ "چغتائی خاں مر گیا .... چغتائی خاں نیلے آسمان کے پار چلا گیا۔" نقیبوں کی آوازیں محل سرا میں گونجیں اور قراقرم کی وسعتوں میں پھیلتی چلی گئیں۔

☆ ------ ☆ ------ ☆

چغتائی خاں کی آخری رسومات دھوم دھام سے ادا کی گئیں۔ ایک درجن حسین کنیزیں "خدمت گزاری" کے لیے اس کی قبر میں زندہ دفن کر دی گئیں۔ پھر مختلف نسلوں کے انتہائی صحت مند گھوڑے اس کی قبر پر ذبح کئے گئے اور ان کا خون چغتائی کی قبر پر چھڑکا گیا۔ کئی روز تک قراقرم میں بوڑھے منگول کی موت کا سوگ منایا گیا .... اس کی موت سے ٹھیک دو ماہ بعد کی بات ہے، منگول جنتری کے حساب سے یہ بکری کے سال کا آغاز تھا۔ خاقان اور غدائی کے ذی شان محل کے سامنے ایک کھلے میدان میں جس کی چاروں طرف نیزے گاڑ کر حدبندی کی گئی تھیں، کشتیوں کے مقابلے ہو رہے تھے۔ خاقان

اوغدائی بھی اپنی مشہور بیوی توراکینہ کے ساتھ مسند پر موجود تھا۔ ان مقابلوں کی خصوصی بات یہ تھی کہ ان میں صرف غلام حصہ لے رہے تھے کچھ کنیزیں ایک طرف چبوترے پر کھڑے تھیں۔ شاہی نقیب ایک ایک کنیز کو چبوترے سے نیچے لاتا تھا اور بلند آواز سے کہتا تھا کہ اس عورت سے کون شادی کا خواہش مند ہے۔ اگر جواب میں صرف ایک مرد آگے آتا تھا تو اس کا ہاتھ کنیز کے ہاتھ میں تھما دیا جاتا تھا اور وہ دونوں خاقان اوغدائی کے سامنے سجدہ ریز ہو کر ہنسی خوشی ایک دوسرے چبوترے پر جا کھڑے ہوتے تھے لیکن اگر ایک سے زیادہ مرد کسی عورت کے طلبگار ہوتے تھے تو ان کے درمیان زور آزمائی ہوتی تھی۔ پھر مقررہ قواعد کے مطابق ان میں سے جیتنے والا عورت کا حقدار ٹھہرتا تھا .... یہ سلسلہ تادیر جاری رہا۔ آخر شاہی محافظ ایک مفلوک الحال عورت کو چبوترے سے نیچے لے کر آئے عورت کے دونوں ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ اس کے بالوں میں مہینوں کی خاک تھی اور لباس جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا۔ پہلی نظر میں وہ کوئی بدحال بھکارن نظر آتی تھی۔ مگر بغور دیکھنے سے پتہ چلتا تھا کہ وہ خوبصورت ہے .... یہ ماریتا تھی .... وہی ماریتا تھی جس کے حسن سے آنکھیں خیرہ ہو جاتی تھیں اور جس کا وقار پیشانیوں کو عرق آلود کر دیتا تھا۔ آج وہی قراقرم کی شہزادی ایک حقیر اور کمتر کنیز کے روپ میں سینکڑوں تماشائیوں کے سامنے کھڑی تھی۔ نقیب نے حسب معمول بلند آواز سے کہا۔

"خاقان محترم کے حکم سے، میں تم لوگوں سے دریافت کرتا ہوں کہ اس عورت سے کون شادی کرے گا؟"

مرد غلام جو ایک گروہ کی صورت میں چبوترے پر کھڑے تھے قطعی خاموش رہے۔ کوئی ہاتھ ماریتا کے لیے بلند نہیں ہوا۔ کسی نے اسے بیوی بنانے کی حامی نہیں بھری۔ نشے میں بدمست اوغدائی نے چاول کی شراب کا ایک اور جام چڑھایا اور زرنگار آستین سے ہونٹ پونچھ کر بولا۔

"یہ کون بدنصیب عورت ہے، جسے کوئی غلام تک اپنی زوجیت میں قبول کرنے کو تیار نہیں۔" خاقان کے انداز سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ماریتا کے بارے سب کچھ جانتا ہے لیکن صرف اس کا مضحکہ اڑانے کے لیے یہ سوال پوچھ رہا ہے۔

شاہی نقیب نے جوابی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔ "خاقان محترم! فلک نیلگوں آپ پر مہربان رہے۔ یہ بدبخت عورت ماریتا ہے۔ کسی وقت یہ معظم چغتائی خان کے حرم میں تھی۔"

خاقان اوغدائی نے ہاتھ لہرا کر کہا۔ "مجھے اس بدنصیب کی حالت پر ترس آیا

.... میرے خیال میں اپنا سوال پھر دوہراؤ۔ شاید کوئی مرد اسے اپنی خدمت گزاری کے لیے قبول کر لے۔"

حسب ہدایت شاہی نقیب نے اپنا سوال دوہرایا غلاموں کی ٹولی خاموش رہی۔ یقیناً ان میں سے بہت سے ماریتا جیسی پُرکشش عورت کے ساتھ چند گھڑی کی رفاقت کے لیے اپنی جانیں داؤ پر لگا سکتے تھے مگر اس وقت وہ جان بوجھ کر خاموش تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ سابقہ شہزادی کو اس طرح ان کے سامنے لانے سے خاقان کا مقصد اس کی تذلیل کرنا ہے۔ وہ ماریتا کے حصول کی خواہش کر کے خاقان کے غضب کو ہوا کیسے دے سکتے تھے۔ نہ جانے خاقان کے جی میں کیا آئی کہ وہ اپنی شاہی مسند سے اٹھا اور لہراتا ڈگمگاتا ہوا غلاموں کی ٹولی کی طرف بڑھا۔ پھر اس نے بڑی بے تکلفی سے ایک ختائی غلام کا شانہ پکڑا۔ بھدا سا ختائی غلام اپنی مٹکا سی توند چھپائے آخر میں کھڑا تھا۔ خاقان نے اس کے گنجے سر پر چپت لگاتے ہوئے کہا۔

"او موٹے ختائی! تُو اس عورت سے شادی کرے گا؟"

موٹے ختائی نے صورت حال سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا۔ "خاقان اعظم غلام سے ایسا کون سا جرم سرزد ہوا ہے جو ایسی بدشکل' بدبو دار اور بے وفا عورت کو میرے لیے تجویز فرما رہے ہیں۔ اپنے ہاتھ سے میرا گلا گھونٹ دیجئے مگر یہ سزا مجھے نہ دیجئے۔"

چالاک ختائی کے برمحل اور چست جواب پر سارے منگول کھل کھلا کر ہنسنے لگے۔ خاقان اوغدائی نے بڑے تاسف سے سر ہلایا پھر ڈگمگاتا ہوا ایک اور کوتاہ قد غلام کے پاس پہنچا۔ اس کے شانے پر ہاتھ مار کر کہنے لگا۔

او بھینگے یہودی! کیا تُو اس بدنصیب عورت سے شادی کرے گا۔"

یہودی غلام نے خاقان کی بے تکلفی سے حوصلہ پاتے ہوئے اپنی بھینگی آنکھوں کو حرکت دی اور چند قدم آگے جا کر ماریتا پر تھوک دیا۔ اس کے اس خاموش اور مختصر جواب پر ایک بار پھر بہکے ہوئے منگول قہقہے لگانے لگے۔ ماریتا سر جھکائے اور آنکھیں بند کیے خاموش کھڑی تھی۔ آنسو خودبخود اس کے میلے رخساروں پر پھسلتے جا رہے تھے۔ خاقان اوغدائی جھومتا ہوا پھر اپنی نشست پر جا بیٹھا۔

شاہی نقیب نے کہا۔ "خاقان محترم و بلند اقبال! غلاموں کی دھتکاری ہوئی اس عورت کے لیے کیا حکم ہے؟"

خاقان اوغدائی نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ "ایسا کرو .... نقارچی سے اعلان کرواؤ کہ اس مجمعے میں موجود بدشکل ترین غلام ہمارے سامنے آ جائیں۔"

خاقان کے حکم کی تعمیل ہوئی اور نقارچی ایک اونچی جگہ چڑھ کر خاقان کا حکم سنانے لگا۔ سینکڑوں ہزاروں کے مجمعے میں عجیب طرح کی ہلچل نظر آنے لگی۔ ہر چھ ماہ بعد شاہی محل کے سامنے برپا ہونے والی شادیوں کی یہ محفل آج بے تکلفانہ رنگ اختیار کرتی جا رہی تھی۔ کافی دیر مچھلی بازار گرم رہنے کے بعد بیس عدد غلام قطار باندھ کر خاقان کے روبرو کھڑے ہو گئے .... اور واقعی وہ حاضر تماشائیوں میں سے بدصورت ترین افراد سمجھے جا سکتے تھے۔ ان میں سے کسی کی آنکھ پھوٹی ہوئی تھی۔ کسی کا چہرا چیچک زدہ تھا' کوئی کالا بھجنگ تھا اور کسی کی شکل مجموعی طور پر بھیانک تھی۔ خاقان کے حکم سے ان میں سے پانچ غلاموں کو علیحدہ کر دیا گیا کیونکہ وہ کمزور یا ضعیف العمر تھے۔ باقی غلاموں کے جوڑے بنا دیئے گئے اور خاقان کا حکم ہوا کہ وہ آپس میں زور آزمائی کریں ان میں سے جو سب کو پچھاڑ گیا۔ وہ اس عورت کا مالک ہو گا مگر اس شرط کے ساتھ کہ اس عورت کو کنیز بنا رکھے گا اور اس کا ایک پاؤں ٹخنے پر سے کاٹ دے گا تاکہ وہ زندگی میں کبھی بھاگنے کا خیال دل میں نہ لا سکے۔"

اس دفعہ خاقان کے لہجے میں طنز نہیں تھا۔ اس کا مطلب تھا وہ جو کچھ کہہ رہا ہے۔ ٹھیک ہے۔

.... خاقان کی اجازت سے مقابلے شروع ہوئے۔ تنومند غلاموں نے ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ کئی ایک کو چوٹیں آئیں۔ کئی ایک کے ہاتھ پاؤں ٹوٹے۔ آخر جوزف نامی ایک حبشی پہلوان نے سب کو زیر کر لیا۔ یہ کرخت چہرے والا ایک تنومند شخص تھا۔ اس کی گردن اور ٹھوڑی پر ایک گہرے زخم کا نشان تھا۔ اپنی کامیابی کے بعد اس نے سجدہ ریز ہو کر خاقان کو تعظیم پیش کی اور خاقان کے حکم سے ماریتا کی طرف بڑھا۔ ماریتا نے سہم کر اس کی طرف دیکھا۔ جب وہ شخص ماریتا کے بالکل قریب پہنچا' تو اچانک ماریتا نے خود کو سپاہیوں سے چھڑایا اور ایک طرف بھاگ کھڑی ہوئی۔ اس کا یوں بھاگنا بالکل اضطراری عمل تھا۔ ورنہ وحشیوں سے گھرے ہوئے اس خطہ ارضی میں اس کے لیے پناہ کہاں ہو سکتی تھی۔ وہ بھاگی تو حبشی جوزف نے اس کا پیچھا کیا۔ ماریتا نے ایک مقام سے تماشائیوں کا حلقہ توڑا اور خیموں میں گھس گئی۔ حبشی جوزف بھی خیموں میں داخل ہو گیا۔ لوگ دونوں طرف سمٹ گئے اور قہقہوں کی گونج میں یہ دلچسپ کھیل دیکھنے لگے۔ ماریتا جان بچانے کے لیے مختلف خیموں میں گھس رہی تھی اور حبشی وحشت کے عالم میں خیموں کو اکھاڑتا پچھاڑتا جا رہا تھا۔ آخر تھوڑی سی جدوجہد کے بعد اس نے ماریتا کو جا لیا اور کھینچتا ہوا میدان میں لے آیا۔ خاقان نے حبشی کی پھرتی پر اسے شاباش

دی اور رسمی طور پر مارینا کو اس کے سپرد کر دیا۔ سجدہ ریز ہونے کے بعد حبشی جوزف مارینا کو گھسیٹتا ہوا ایک جانب لے گیا۔

جس وقت مارینا پر یہ سب کچھ گزر رہی تھی' قراقرم سے سینکڑوں میل دور صحرائے گوبی سے آگے خوارزم کے اس پار خلافت عباسیہ کے مرکز بغداد میں تین اجنبی خلیفہ کے نام کی دہائی دے رہے تھے۔ یہ تینوں روسی مسلمان تھے۔ ان کے جسموں اور لباسوں پر ہفتوں کی گرد تھی۔ وہ خلیفہ مستنصر باللہ کے دربار میں دست بستہ کھڑے تھے۔ امرا و مصاحبین درجہ بدرجہ اپنی نشستوں پر موجود تھے۔ دربار میں گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ایک روسی جس نے اپنا نام رزاق بتایا تھا۔ اپنے دو ساتھیوں کی نمائندگی کر رہا تھا۔ وہ ترکی میں کہہ رہا تھا۔

"خلیفہ المسلمین! ہم کل چالیس افراد قراقرم پہنچے تھے۔ مگر ہم چار افراد کے علاوہ سب وحشی منگولوں کی بھینٹ چڑھ گئے۔ بعد میں ہم چاروں میں سے بھی ایک مارا گیا۔ ہم تینوں بمشکل صحرائے گوبی سے نکل پائے۔ اے خلیفہ اپنی ان گناہگار آنکھوں سے ہم نے قراقرم میں اسلام کے نام لیواؤں کی جو زبوں حالی دیکھی ہے' اسے لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہیں۔ جناب عالی اباقہ وہ مجاہد ہے جس نے روس کے طول و عرض میں چپے چپے پر منگول حملہ آوروں کے دانت کھٹے کیے ہیں۔ جو سفر سلطان جلال الدین خوارزم شاہ نے تبریز سے شروع کیا تھا۔ وہ اس کے جاں نثار ساتھی اباقہ نے روس اور خوارزم کے کوہ و دشت میں جاری رکھا ہے۔ جو جھنڈا شیر خوارزم نے اٹھایا تھا وہ اس مجاہد نے ایک لحظے کے لیے گرنے نہیں دیا۔ آج قراقرم میں اس کا نام بچے بچے کی زبان پر ہے اور اس کے دیے ہوئے زخم ہر منگول کے سینے کا ناسور ہیں۔ اے خلیفہ آج وہی مسلمان مجاہد قراقرم کے تاریک ترین قید خانے میں کلمہ گوئی کی سزا بھگتنے والا ہے۔ چند ماہ پہلے منگول لٹیرے نہایت دیدہ دلیری سے آپ کی سرحد میں داخل ہو کر اس کے قریبی ساتھیوں کو چن چن کر مار چکے ہیں اور اباقہ کو گرفتار کر کے پابہ زنجیر خاقان کے سامنے پیش کیا گیا ہے۔ کوئی دن جاتا ہے کہ قراقرم کے ظلمت کدے میں انہیں بھی ان کے ساتھیوں کی طرح تکلیفیں دے دے کر مار ڈالا جائے گا۔

خلیفہ المسلمین! اس وقت آپ کے سوا کوئی ہستی نہیں جو اباقہ اور اس کے ساتھیوں کی زندگی کے لیے چارہ جوئی کر سکے۔ آپ بہتر سمجھتے ہیں کہ ان کے لیے کیا کر سکتے ہیں' بس ہماری تو یہی درخواست ہے کہ ان مجبور و بے کس مسلمانوں کو بچا لیجیے۔ جنہیں آپ کے سایہ عاطفت سے محروم کر کے قراقرم کے جلتے سورج کے نیچے پہنچا دیا گیا ہے۔ خلیفہ

معظم! اگر آج آپ نے ان کی داد رسی نہ کی' ان کے سروں پر اپنا سایہ نہ کیا تو ان کی بے کسی کی موت ہر درد مند کے دل کا بوجھ بن جائے گی۔ پھر یہ بوجھ قصے کہانیوں کا حصہ بن کر تاریخ کی کتابوں میں اس طرح بکھرے گا کہ اسے سمیٹنا مشکل ہو جائے گا............"

عبدالرزاق کی طویل تقریر بے حد دل سوز اور اثر انگیز تھی اور شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آرہا تھا اور راہ وفا میں کام آجانے والے اپنے ساتھیوں کی صورتیں ابھی اس کے ذہن میں تازہ تھیں۔

رزاق کی تقریر ختم ہوئی تو دربار کا وقت بھی ختم ہو چکا تھا۔ خلیفہ کے ظہرانے کا وقت ہو چکا تھا۔ انہوں نے اپنے خالی پیٹ پر ہاتھ پھیرا اور کہا۔ "نوجوان' ہم تیرے جذباتی انداز سے بہت متاثر ہوئے۔ تاہم اس مسئلے پر غور و فکر کی ضرورت ہے۔ میرا خیال ہے اپنے مصاحبین سے مشاورت کے بعد ہم کل کسی نتیجے تک پہنچ سکیں گے۔" ان الفاظ کے ساتھ ہی دربار برخاست ہو گیا۔ امراء و مصاحبین دوپہر کے طعام کے لیے شاہی دسترخوان کی طرف لپکنے لگے۔ وزیر داخلہ عبدالرشید (جو اپنی بیٹی فاطمہ کے اغوا اور اس کے واپسی کے بعد بہت حد تک بدل چکا تھا۔) متانت سے چلتا ہوا تینوں روسیوں کے پاس پہنچا اور انہیں اپنے عقب میں آنے کا اشارہ کرتا ہوا ایک غلام گردش میں لے آیا۔ اس بلند جگہ سے خلیفہ کے محل کا بیرونی حصہ دکھائی دے رہا تھا۔ سنگ مرمر کے شفاف فرشوں کے درمیان فوارے چھوٹ رہے تھے۔ گھاس کے سرسبز قطعات پر مور اور ہنس راج اٹھکیلیاں کر رہے تھے۔ زندگی حسین اور خوبصورت نظر آتی تھی۔

وزیر داخلہ عبدالرشید نے عمامے سے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے عبدالرزاق سے کہا۔ "میں تم لوگوں کے جذبات کی قدر کرتا ہوں اور یہ جان کر تمہاری طرح میں بھی غم و اندوہ کے سمندر میں ڈوب گیا ہوں کہ اباقہ بالآخر وحشی تاتاریوں کے چنگل میں پھنس گیا ہے۔ بہرحال میں تمہیں یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ خلیفہ کے سامنے گزارشات پیش کر کے تم پتھر سے سر پھوڑنے کی کوشش کر رہے ہو۔ اس سے تمہیں زخموں کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ تم اباقہ کے بہی خواہ ہو لیکن اباقہ کے بدخواہوں کی شناخت تمہیں نہیں ہے............ شاید تمہیں یہ سن کر حیرانی ہو کہ اباقہ کے لیے خلیفہ اور خاقان اوغدائی ایک ہی موت کے دو نام ہیں۔"

عبدالرزاق ششدر کھڑا وزیر داخلہ کا منہ دیکھ رہا تھا ہکلا کر بولا۔ "جناب! آپ کیا فرما رہے ہیں۔ اباقہ جیسے عظیم مجاہد سے خلیفہ المسلمین کو کیا عناد ہو سکتا ہے؟"

وزیر داخلہ نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "دوست! عناد تو خلیفہ کو تم سے بھی نہیں'

مگر مجھے یقین ہے کہ ایک دو روز میں تم دجلہ کے قید خانے میں پہنچ جاؤ گے یا تمہاری لاشیں پتھروں سے بندھی دریا کی تہہ میں پڑی ہوں گی۔"

"ایسا کیوں ہے آقا............ ایسا کیوں ہے؟" روسی سپاہی عبدالرزاق نے نہایت درد سے پوچھا۔ "کیا اباقہ مسلمان نہیں۔ کیا خلیفہ کی ذمہ داری نہیں کہ اسے اذیت ناک موت سے بچانے کے لیے منگولوں کے بادشاہ پر دباؤ ڈالے۔ ایسے جنگجو تو قوموں کا سرمایہ ہوا کرتے ہیں کیا خلیفہ کے ذہن سے زیاں کا احساس بھی مٹ گیا ہے؟"

وزیر داخلہ عبدالرشید نے بہتر سمجھا کہ ان جوشیلے اور غمزدہ اجنبیوں کو اپنے ساتھ گھر لے جائے اور رات رات میں انہیں سمجھا بجھا کر بغداد سے نکال دے تاکہ کم از کم ان کی زندگیاں تو محفوظ رہ سکیں۔

☆------☆------☆

اباقہ اپنی تاریک کوٹھڑی میں بیٹھا فلک کی نامہربانیوں پر غور کر رہا تھا۔ کیسے کیسے صدمے اس پر گزر چکے تھے اور ابھی نہ جانے کیا کچھ ہونا باقی تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا علی دن بدن کمزور ہوتا جا رہا ہے۔ کبھی کبھی وہ سوتے میں بری طرح بلکنے لگتا تھا۔ اس کی چیخیں اباقہ اور نبیلہ کا دل دہلا دیتی تھیں۔ "چھوڑ دو .... خدا کے لیے چھوڑ دو .... اسد بھائی آپا کو بچاؤ۔ سردار یورق تم کہاں ہوں۔ وہ آ رہے ہیں۔ وہ مجھے مار ڈالیں گے۔ اباقہ بھائی مجھے بچالو ...." پھر چیختے چیختے وہ ایک دم جاگ جاتا۔ اس وقت اس کا ننھا سا دل سینے میں گھائل پرندے کی طرح پھڑکتا محسوس ہوتا۔ وہ نبیلہ یا اباقہ سے اس بری طرح چمٹتا تھا کہ دوبارہ سونے کے بعد بھی جدا نہیں ہوتا تھا .... اس وقت بھی وہ اباقہ کے زانو پر سر رکھے یوں سو رہا تھا کہ اس کے ہاتھ اباقہ کے بازو پر تھے۔ اباقہ دھیرے دھیرے اس کی نازک کلائی اس جگہ سے سہلا رہا تھا جہاں آہنی ہتھکڑیوں نے کھردرے داغ سے ڈال دیئے تھے۔ اچانک روزن پر آہٹ سنائی دی۔ اس نے گردن گھما کر دیکھا تو ایک چہرا کوٹھڑی میں جھانک رہا تھا۔ یہ ایک تنومند منگول تھا۔ اس کی آنکھوں میں اباقہ کے لئے نفرت اور حقارت کے سمندر ہلکورے لے رہے تھے۔

اباقہ اب اس چہرے کو اچھی طرح پہچان چکا تھا۔ یہ سردار بوغالی کا سب سے چھوٹا بیٹا نویان تھا۔ وہ اباقہ کو عراق سے گرفتار کر کے لانے والے دستے کا سالار تھا اور اس "عظیم" کارنامے کے صلے میں خاقان اوغدائی اسے دستے سمیت اپنے خاص محافظوں میں شامل کر چکا تھا۔ پچھلے تین ماہ میں وہ اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ اس طرح کوٹھڑی میں جھانک چکا تھا۔ ہر مرتبہ وہ ہونٹوں پر ایک مضحکہ خیز مسکراہٹ سجا کر لاتا تھا اور اس کی زبان اباقہ کے

ذہن پر نت نئے چرکے لگاتی تھی۔ آج وہ کچھ زیادہ ہی خوش نظر آ رہا تھا۔ اس نے کہا۔

"اباقہ، تُو جانتا ہے پرسوں اوغدائی خاں کے محل کے سامنے، میدان میں کیا ہوا؟" پھر خود ہی بولا۔ "پرسوں ہم سب نے تیری محبوبہ کا انجام دیکھا۔ مگر میں تجھے بتاؤں گا نہیں کہ ہم نے کیا دیکھا۔ بس اتنا جان لے کر وہ اس وقت ایک سیاہ فام شکاری کے چنگل میں کسی چڑیا کی طرح پھنسی تجھے پکار رہی ہو گی .... ہاہا .... بڑا ظالم شکاری ہے وہ۔"

اباقہ نے خونی نظروں سے اسے دیکھا اور خاموشی سے اپنے گھٹنوں پر سر جھکا لیا۔

نویان کا بلند قہقہہ روزن میں گونجا۔ "کیا عورتوں کی طرح منہ چھپا رہا ہے اباقہ۔ ابھی تجھے اور بھی بہت سے دردناک مناظر دیکھنا ہیں۔ ابھی تو میرے باپ کا انتقام بھی پورا نہیں ہوا، میرے دو بھائیوں کا انتقام اس کے علاوہ ہے۔ میں تجھے بتاؤں گا بدلہ لینا کسے کہتے ہیں اور چنگیز کے غلاموں سے ٹکرانے والوں کے لیے موت کتنی کٹھن ہوتی ہے۔"

اچانک نبیلہ اپنی جگہ سے اٹھی۔ جھک کر چلتی ہوئی سوراخ تک پہنچی۔ پھر اس نے بے پناہ نفرت سے سانس اندر کھینچا اور پوری قوت سے نویان کے منہ پر تھوک دیا۔ نویان آنکھیں پھاڑے، ہکا بکا نبیلہ کو دیکھتا رہ گیا۔ نبیلہ گرج کر بولی۔

"تُو بہادر نہیں نویان، بے غیرت ہے۔ خدا کی قسم میں نے تجھ سا بزدل شخص زندگی میں نہیں دیکھا۔ اگر تُو حلال زادہ ہوتا تو اپنے بل بوتے پر اپنے باپ اور بھائیوں کی موت کا انتقام لیتا .... تُو ہر دوسرے روز یہاں آ دھمکتا ہے اور ایک بے بس قیدی پر اپنی طاقت کا رعب گانٹھتا ہے۔ اگر تو اپنے باپ کا فرزند ہے اور تیری رگوں میں کسی فاحشہ کا خون نہیں تو ایک بار .... صرف ایک بار اباقہ کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر دیکھ۔ میں اپنے مرحوم بچے کی قسم کھاتی ہوں اگر تیرا ایک وار بھی میرے بھائی کے جسم پر چھو گیا تو میں تیری ادنیٰ لونڈی بن جاؤں گی۔ اگر تُو کہے گا تو اپنے ہاتھوں اپنا سر کاٹ کر تیرے قدموں میں ڈال دوں گی .... اور اگر تُو یہ سب کچھ نہیں کر سکتا تو اپنا منحوس چہرا لے کے یہاں سے دفعان ہو جا اور آئندہ کبھی اپنی شکل نہ دکھانا۔"

نبیلہ کا لہجہ ایسا کاٹ دار اور غصیلا تھا کہ نوجوان سالار کا گرم خون بری طرح جوش مار گیا۔ وہ کچھ دیر خون بار نظروں سے نبیلہ کو گھورتا رہا پھر خطرناک سرگوشی میں بولا۔

"ٹھیک ہے۔ بدذات عورت! اب تیرا یہ تھوک اس وقت تک میرے گال پر رہے گا جب تک تُو خود اسے صاف نہیں کرے گی .... میں تجھے اور تیرے بھائی کو بتا دوں گا کہ نویان کس بلا کا نام ہے۔ میرا .... انتظار کرنا۔"

آخری الفاظ نویان نے عجیب ہیجانی انداز میں کہے تھے اور پھر فوراً ہی وہاں سے

رخصت ہو گیا تھا۔

نبیلہ نے جس انداز سے جوشیلے نویان کو بھڑکایا تھا' اباقہ کو امید پیدا ہو گئی تھی کہ حالات کوئی انوکھی کروٹ لینے والے ہیں اور امید کی اس کرن کے ساتھ ہی اباقہ کے نیم مردہ جسم میں خفیہ قوتیں انگڑائی لے کر بیدار ہونے لگی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں بتدریج ایک بے نام سرخی اترتی آ رہی تھی۔

.... مگر نویان پھر واپس نہیں آیا۔ پورے سات روز وہ تینوں اس کے منتظر رہے۔ آٹھویں روز کی بات ہے۔ کوٹھڑی سے باہر صحرا کا سورج غروب ہوا اور رات کی خنک پرچھائیاں در و دیوار پر اتریں تو حسب معمول ایک ہاتھ نے ان سے خالی پیالے وصول کیے اور خوراک کے پیالے ان کی جانب بڑھا دیے۔ ان میں سے ایک پیالے میں ابلے ہوئے جو کی بجائے' شیریں چاول تھے۔ خوراک پہنچانے والے نے سوراخ میں جھک کر کہا۔

"یہ چاول قیدی عورت کے لیے ہیں۔"

اباقہ نے کہا۔ "یہ مہربانی کیوں؟"

پہریدار روکھے لہجے میں بولا۔ "یہ مہربانی نہیں۔ یہاں کا دستور ہے۔ موت سے پہلے قیدی کو یہی خوراک دی جاتی ہے۔"

یکایک اباقہ کا رنگ زرد پڑ گیا۔ وہ پھٹی آنکھوں سے پہریدار کا چہرا تکتا رہا۔ "کیا مطلب؟" اس کے ہونٹوں سے بے روح سرگوشی برآمد ہوئی۔

پہریدار نے اطمینان سے کہا۔ "مطلب یہ کہ آج کی رات اس عورت کی آخری رات ہے' صبح اسے موت کی سزا دی جا رہی ہے۔"

"کیا بکواس کر رہا ہے۔" اباقہ پھیپھڑوں کی پوری قوت سے دھاڑا۔ وحشت کی فراوانی سے اس کا چہرا بگڑ رہا تھا۔ دوسری طرف علی اور نبیلہ بھی سہمے ہوئے یہ گفتگو سن رہے تھے۔

پہریدار نے کہا۔ "یہ بکواس نہیں حقیقت ہے دوست اس عورت نے جو کیا تھا اب یہ اس کی سزا پانے والی ہے۔"

"کک .... کیا' کیا تھا اس نے؟" اباقہ نے پوچھا۔

پہریدار نے کہا۔ "آج سے ٹھیک سات روز پہلے رات کے وقت اوغدائی کے ذاتی محافظ دستے کے نوجوان سالار نویان نے تمہاری اس کوٹھڑی تک رسائی کی کوشش کی تھی مگر پکڑا گیا تھا۔ اسے عقوبت خانے لے جایا گیا اور تشدد کی چکی میں پسنے کے بعد اس نے

بتایا کہ وہ تمہیں آزاد کرانا چاہتا تھا تاکہ تم سے دو بدو مقابلہ کر کے اپنے مرحوم باپ اور بھائیوں کا انتقام لے سکے .... اس نے ایسا کر کے بہت سنگین غلطی کی تھی کیونکہ اپنے اس عمل کی وجہ سے وہ خاقان کے بے پناہ غضب کا شکار ہوا۔ خاقان کی نظر میں اُس نے اپنے ذاتی انتقام کی خاطر ایک نہایت خطرناک اور عیار مجرم کو چھڑانے کی کوشش کی تھی۔ ایک ایسے مجرم کو .... جس کی نگرانی کے لئے خاقان نے خصوصی ہدایات دے رکھی تھیں۔ خاقان کا خیال تھا کہ اس طرح بے وقوف نویان نے قراقرم کی اہم ترین شخصیات کی سلامتی کو داؤ پر لگا دیا تھا۔ لہٰذا اس نے فوری طور پر نویان کی موت کی سزا کا حکم سنایا۔ نویان نے خاقان سے جان بخشی کی درخواست کی اور کہا کہ اُس نے نبیلہ نامی قیدی عورت کے رویے سے مشتعل ہو کر یہ قدم اٹھایا تھا۔ اس نے خاقان کو بتایا کہ اس عورت نے بڑی ہوشیاری سے اسے بھڑکا دیا تھا۔ وہ اس قدر طیش میں آگیا کہ اسے بُرے بھلے کی تمیز نہ رہی۔ نویان کی اس وضاحت پر خاقان نے اُسے تو معاف نہیں کیا مگر اس عورت کی موت کی سزا کا حکم بھی سنا ڈالا۔ کل صبح ان دونوں کو خاقان کی موجودگی میں موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔"

اباقہ کی آنکھوں میں وحشت تھی اور چہرہ زلزلوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح چیخنے لگا۔ "تم یہ نہیں کر سکتے .... میں تم لوگوں کو یہ سب نہیں کرنے دوں گا۔ میں تم سب کے ٹکڑے کر دوں گا۔ تمہاری نسلوں کو تباہ کر ڈالوں گا۔" بے ربط جملے اس کے منہ سے نکل رہے تھے اور وہ دیواروں پر مکے برسا برسا کر ہذیانی انداز میں چیخ رہا تھا۔ اُس کی بے بسی اپنے عروج پر پہنچ چکی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ اب خود کو ختم کر ڈالے گا یا کسی طرح آزاد ہو جائے گا۔ وہ ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا۔ اُس کی ہتھکڑیوں اور بیڑیوں کو جس وزنی زنجیر سے باہم مربوط کر دیا گیا تھا اُس کی موٹائی کسی طرح بھی ایک صحت مند انسانی کلائی سے کم نہیں تھی۔ یہ زنجیر اتنی چھوٹی رکھی گئی تھی کہ قیدی پورے قد سے کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ شاید وہ زنجیر کسی مست ہاتھی کے پاؤں میں ہوتی تو وہ بھی اسے توڑنے میں کامیاب نہ ہو سکتا تھا۔ اباقہ تو پھر انسان تھا۔ وہ اس زنجیر کو بار بار پتھروں پر مار رہا تھا لیکن اس کوشش میں اپنی کلائیاں زخمی کرنے کے سوا اُسے کچھ حاصل نہیں ہو رہا تھا۔ آخر وہ بے دم ہو کر زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ نبیلہ آنسو پونچھتی اٹھی اور اس کے پاس آ بیٹھی۔

"اباقہ بھائی جان! کیوں خود کو ہلکان کرتے ہیں۔ میری قسمت میں جو لکھا ہے وہی ہو گا اور مجھ سے زیادہ خوش قسمت اور کون ہو گا۔ میں اپنے لئے شہادت کی نوید سن رہی

ہوں۔ خدا کی قسم سلیمان اور قاسم کے بعد مجھے اب اور جینے کی آرزو بھی نہیں۔"

اباقہ نے کراہ کر کہا۔ "نبیلہ! ایسی بات منہ سے مت نکال۔ میں تجھے مرنے نہیں دوں گا۔"

نبیلہ نے کہا۔ "بھائی جان! آپ اسے مرنا کیوں کہہ رہے ہیں۔ میں تو زندگی پاؤں گی۔ خدا کی راہ میں جان دینے والے بھی کبھی مرتے ہیں۔ کیا ہم خدا کی راہ میں خدا کے دشمنوں سے نہیں لڑ رہے۔ کیا ہماری ان مشکلات کی وجہ صرف یہ نہیں کہ ہم نے آسمان پرستوں کے عروج سے مرعوب ہوئے بغیر اُن کے منہ پر کلمۂ حق کہا ہے .... اگر اس کلمۂ حق پر ہماری گردنیں ماری جا رہی ہیں تو بخدا ہم کامران ہیں۔ بغداد کے ایوانوں میں چین کی بانسری بجانے والے ایک روز ہماری قسمت پر رشک کریں گے۔"

نبیلہ کے گرم آنسو نہایت خاموشی سے اباقہ کی پیشانی پر گر رہے تھے۔ یہ آنسو نہیں تھے' تیزاب کے قطرے تھے جو اباقہ کے روئیں روئیں میں اذیت جگا رہے تھے۔ اسے احساس ہو رہا تھا جیسے اس کا وجود پھٹ کر ریزہ ریزہ ہو جائے گا اور اگر اس کا وجود نہ پھٹا تو یہ زنجیریں پگھل جائیں گی یا اس کوٹھڑی کی سنگلاخ دیواریں دھماکوں سے اڑ جائیں گی۔

قاتل اندھیرے میں لپٹی ہوئی رات کی زہریلی ناگن دھیرے دھیرے صبح کے سفاک اجالے کی طرف سرکتی رہی۔ یہ قیامت کی رات تھی اور شاید اس رات کے بعد روزِ محشر طلوع ہونے والا تھا۔ اباقہ نبیلہ اور علی تینوں جاگ رہے تھے۔ چاولوں اور جَو سے بھرے ہوئے تینوں پیالے ان کے درمیان پڑے تھے۔ ان میں سے کسی نے اس خوراک کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ اُن کے ذہنوں میں اندیشوں کے دیو کلبلا رہے تھے۔ مگر تینوں خاموش تھے یوں ظاہر کر رہے تھے جیسے سوئے ہوئے ہیں۔ مگر سویرے کی نامہربان چاپ وہ تینوں سن رہے تھے۔ یہ کیسا تاریک سویرا تھا کہ آنکھیں کھولنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ یہ کیسا اجالا تھا کہ ہراس بن کر رگ جان میں اتر رہا تھا۔ سوچیں مفلوج تھیں' زبانیں گنگ تھیں اور اس سناٹے میں حرفِ تسلی تک ہونٹوں پر منجمد ہو گیا تھا۔ آخر قراقرم کے آسمان پر چمکنے والے سورج نے بالشت بھر دھوپ اس کوٹھڑی میں پھینک دی اور اس کے ساتھ ہی آہنی دروازے کی دوسری جانب بے رحم قدموں کی چاپ سنائی دینے لگی۔ نبیلہ نے اشک بار آنکھوں سے اباقہ کو دیکھا پھر اس کے قریب سمٹ کر اس کی پیشانی چومی اور بولی۔

"میرے بھائی! حوصلہ رکھنا۔ اگر شہادت میرا نصیب ہو چکی ہے تو کوئی مجھے اس سے محروم نہیں رکھ سکتا۔ اپنی چھوٹی بہن کی آخری خواہش مان لینا۔ اسے ہمت سے رخصت کرنا۔ ان زنجیروں میں تڑپنے سے تمہیں زخموں کے سوا کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ اپنے اس

لہو کو بچا کر رکھو۔ اس وقت تک کے لئے جب قدرت کی طرف سے تمہیں کوئی موقعہ ملے اور تم ان منگولوں سے ہمارے بدلے چکا سکو اور مجھے یقین ہے قدرت تمہیں اس موقعے سے محروم نہیں رکھے گی۔ انشاء اللہ ایک دن تمہارے سر پر آزادی کا سورج چمکے گا اور تمہارے ہاتھوں میں وہ چمکتی ہوئی تلوار آئے گی جو ظالموں کے لئے پیام اجل بن جائے گی۔ اس روز ان بے ضمیر کافروں کے لئے کہیں پناہ نہ ہو گی؟"

اباقہ یکسر خاموش تھا۔ نبیلہ نے اُس کے شانے سے سر لگا کر کہا۔ "میرے بھائی وعدہ کرو۔ تم خود کو سنبھالے رکھو گے اور اپنے ساتھ ساتھ علی کو بھی ہمت نہیں ہارنے دو گے۔"

آنسوؤں کے بوجھ سے اباقہ کی آنکھیں سرخ تھیں اور اُس کے نتھنے لرز رہے تھے۔ قدموں کی چاپ اب بالکل نزدیک پہنچ چکی تھی۔ پھر یکے بعد دیگرے دیو ہیکل دروازے کے تینوں قفل کھلے اور آہنی پٹ وا ہو گئے۔ ایک مدت بعد یہ غلیظ کوٹھڑی دن کی روشنی سے آشنا ہوئی۔ ان کے سامنے زرہ پوش منگول سپاہیوں کا ایک چوکس دستہ کھڑا تھا۔ دستے کے گرانڈیل سردار نے کرخت آواز میں نبیلہ سے کہا۔

"اٹھ جا لڑکی۔ ہم تجھے لینے آئے ہیں۔"

اچانک اباقہ نے اپنی بھاری بھرکم آواز میں سردار کو مخاطب کیا۔

"سردار! میں اوغدئی خاں سے ملنا چاہتا ہوں۔ صرف ایک بار تم مجھے اس سے ملا دو۔ مجھے یقین ہے کہ میں خاقان کو اس ارادے سے باز رکھ سکوں گا۔ میں یہ بھی وعدہ کرتا ہوں کہ اس اقدام سے تم پر کوئی حرف نہیں آئے گا۔"

جواب میں دستہ سالار کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ بکھر گئی وہ سفاکی سے بولا۔ "جنگلی! آج تو تُو خاقان کا نام بڑے احترام سے لے رہا ہے۔ میرا خیال ہے تجھ جیسے بدزبان کو یہ لب و لہجہ زیب نہیں دیتا۔"

اباقہ نے کہا۔ "سردار! میرا مذاق مت اڑا اور .... اور اگر تُو پسند کرے تو میں تجھ سے اکیلے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔"

سردار کے حلق سے فلک شگاف قہقہہ بلند ہوا۔ "میرا خیال ہے صدمے کی زیادتی نے تیرے دماغ پر اثر کیا ہے جو خاقان کے وفاداروں کو لالچ دینے کے منصوبے بنا راہ ہے۔ تُو اپنے سبز باغ اپنے پاس رکھ اور عبرتناک موت کا انتظار کر۔" پھر اُس نے گرج کر سپاہیوں کو حکم دیا۔ "اٹھا لو اس لڑکی کو۔"

دو تنومند منگول آگے بڑھے اور انہوں نے نبیلہ کو بازوؤں سے پکڑ کر اٹھا لیا۔ علی جو

بلک بلک کر رو رہا تھا چلا کر نبیلہ کی ٹانگوں سے لپٹ گیا اور سپاہیوں کی منتیں کرنے لگا کہ وہ اس کی آپا کو چھوڑ دیں مگر وہ اسے دروازے کی طرف کھینچنے لگے۔ اچانک اباقہ کے حلق سے ایک خوفناک چنگھاڑ برآمد ہوئی اور اس نے ایک قریبی محافظ پر جھپٹنا چاہا مگر چوکنا محافظ پھرتی سے ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اباقہ زنجیروں کی وجہ سے اوندھے منہ سنگلاخ فرش پر گرا۔ شیریں چاولوں والا پیالہ ٹوٹ گیا اور چاول دور تک بکھر گئے۔ اس سے پہلے کہ اباقہ دوبارہ اٹھ سکتا سپاہیوں کی ایک ٹولی نے اسے دبوچ لیا۔ وہ ان کی گرفت میں بُری طرح مچلنے لگا مگر اپنی جگہ سے ایک بالشت بھی حرکت نہ کر سکا۔ اُس کی آنکھیں ابھی تک نبیلہ پر لگی ہوئی تھیں۔ وہ رندھی ہوئی آواز میں چلا رہا تھا۔

”سردار! چھوڑ دے اس کو۔ اس کو کچھ مت کہنا سردار۔ ورنہ میرے انتقام سے بچ نہیں سکے گا۔ خدا کی قسم میں تجھے ڈھونڈ لوں گا۔ تیری بوٹیاں نوچ لوں گا۔ تیرے بال بچوں کو جلا کر خاک کر دوں گا۔ اسے چھوڑ دے سردار۔“

پھر اچانک آہنی دروازہ بند ہو گیا اور نبیلہ کے ساتھ ساتھ منگول سپاہی بھی اباقہ کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ اباقہ جیسے نیم پاگل ہو چکا تھا۔ وہ اپنی زنجیریں گھسیٹتا جھک کر چلتا دروازے تک پہنچا اور پوری قوت سے اسے پیٹنے لگا۔ ساتھ ساتھ وہ منگولوں کو عبرتناک انجام کی دھمکیاں دے رہا تھا۔ اس مختصر سی کوٹھڑی میں اس کی چنگھاڑوں سے حشر برپا تھا۔ غضب کے عالم میں اس کے نقوش بگڑ گئے تھے اور آواز بیٹھ گئی تھی۔ مگر وہ پھر بھی چیخ رہا تھا .... یہ انسانی بے بسی کی انتہا تھی‘ یہ غم و غصے کا آخری درجہ تھا‘ یہ دیوانگی کی پہلی سیڑھی تھی‘ کوئی اسے دیکھتا تو دہشت سے لرز اٹھتا‘ قریب سے اس کی آواز سنتا تو سکتے میں رہ جاتا .... اور معصوم علی یہ سب کچھ دیکھ اور سن رہا تھا۔ اچانک اس کی دبلی دبلی ٹانگیں لرزنے لگیں۔ اس کے منہ سے ایک سسکی نکلی اور وہ تیورا کر سنگلاخ زمین پر جا گرا۔ اباقہ نے اس کی زنجیروں کی جھنجھناہٹ سنی تو چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ علی کی آنکھیں الٹ چکی تھیں اور منہ سے کف بہہ رہا تھا۔ اس کے استخوانی ہاتھ پاؤں بتدریج مڑتے جا رہے تھے۔ اباقہ نے لپک کر اسے تھام لیا۔

”علی .... علی!“ وہ بے بسی سے چلایا۔

علی یکسر خاموش تھا۔ اباقہ نے اسے آہنی گرفت میں جھنجھوڑ ڈالا۔ ”علی .... میرے بیٹے آنکھیں کھول۔ تجھے کیا ہو گیا۔ علی‘ خدا کے لئے آنکھیں کھول۔“ مگر علی پر مرگی کا شدید دورہ پڑ چکا تھا۔ اس کی زبان حلق میں گر کر تالو سے چپک گئی تھی اور سینے میں سانس رکنے لگی تھی۔ اباقہ لڑکھڑاتا ہوا سوراخ تک پہنچا اور رندھے ہوئے گلے سے

چلایا۔

”پہریدار! مجھے پانی دے۔ میرا بیٹا مر رہا ہے .... میرا بیٹا مر رہا ہے۔“

مگر کسی نے اس کی آواز نہیں سنی۔ کسی کو اس پر رحم نہیں آیا۔ وہ چیختا رہا۔ کبھی علی کی طرف اور کبھی سوراخ کی طرف بھاگتا رہا۔ کوئی اُس کی مدد کو نہیں پہنچا۔ کسی نے اُس کی پکار کا جواب نہیں دیا۔ علی کے ہونٹ سوکھ کر سیاہ ہو گئے۔ اس کا معصوم چہرہ کملاتا چلا گیا۔ وہ ننھی سی جان اس کے سامنے دم توڑ رہی تھی۔ مگر اباقہ بے بس تھا۔ دشمنوں پر بجلی بن کر گرنے والا۔ ناقابل یقین معرکے انجام دینے والا۔ وقت کا مانا ہوا جنگجو آج لاچار تھا۔

وہ علی کو جھنجھوڑ رہا تھا اور رندھے ہوئے گلے سے بار بار اس کا نام پکارتا جا رہا تھا‘ مگر علی خاموش تھا۔ آخر دیو ہیکل آہنی دروازہ کھلا اور منگول پہریدار اندر داخل ہوئے۔ علی میں زندگی کی رمق ابھی باقی تھی۔ انہوں نے لاپرواہی سے اسے اٹھایا اور مردہ بکری کی طرح کندھے پر لاد کر بیمارستان کی طرف لے گئے .... وزنی دروازہ ایک پُرگونج دھماکے سے دوبارہ بند ہو گیا۔ یکے بعد دیگرے تین قفل لگے اور بھاری قدموں کی آواز کوٹھڑی سے دور ہوتی چلی گئی۔

نبیلہ چلی گئی‘ علی بھی چلا گیا‘ روزن سے جو بالشت بھر دھوپ آتی تھی وہ بھی رخصت ہو گئی۔ تاریکی اور خاموشی میں اباقہ اکیلا رہ گیا۔ اسے لگا جیسے وہ اس کوٹھڑی میں نہیں دنیا میں اکیلا رہ گیا ہے۔ اب کون تھا جس کے ملنے کی اسے آس ہوتی یا جس کی موت کا اسے خوف ہوتا .... ہاں اب کوئی نہیں تھا۔ ایک ایک کر کے سب مر گئے تھے۔ ساری آسیں ٹوٹ گئی تھیں .... اچانک اس کے آنسو تھم گئے۔ اس کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔ اس کا غضبناک چہرہ بتدریج پُرسکون ہو گیا۔ یہ ایک عجیب سا سکون تھا۔ وہ تھکا ہارا نڈھال ہو کر کوٹھڑی کے فرش پر بیٹھ گیا۔ جیسے کوئی راہ گم کردہ مسافر صحرا کو گھر سمجھ کر ریت پر دراز ہو جائے .... وہ دیر تک اسی طرح گم صم بیٹھا رہا۔ اس کی سفید آنکھیں کسی غیر مرئی نقطے پر مرکوز رہیں۔ پھر دھیرے سے اس کا ہاتھ اٹھا اور اپنے بالوں تک پہنچ گیا۔ ان بالوں میں وہ ننھا سا خنجر اب تک چھپا ہوا تھا۔ اباقہ نے اسے بالوں کی ایک لٹ میں اس طرح گرہ دے رکھی تھی کہ وہ اوپر سے بالکل نظر نہیں آتا تھا۔ سر جھکا کر اباقہ نے وہ گرہ کھول دی اور خنجر نکال لیا۔ یہ بے ضرر خنجر اس کوٹھڑی میں اباقہ کی واحد متاع تھا۔

☆————☆————☆

اوغدائی کے محل کے سامنے مجرموں کو سزائیں دی جا رہی تھیں۔ ایسے مقاصد کے لیے خیموں کے بیچوں بیچ جو کھلا میدان چھوڑا گیا تھا اس میں تماشائیوں کا ہجوم تھا۔ مجرموں کو ان کے جرائم کی سنگینی کے مطابق مختلف طریقوں سے موت کے گھاٹ اتارا جارہا تھا۔ کسی کو بوری میں بند کرکے سرد پانی میں غوطے دیئے جاتے تھے۔ کسی کی دونوں ٹانگیں گھوڑوں سے باندھ کر گھوڑوں کو مخالف اطراف میں دوڑا دیا جاتا تھا۔ کسی کو کتوں کے آگے ڈالا جارہا تھا۔ الغرض وحشیوں نے موت کو اندوہناک بنانے کے نت نئے طریقے ایجاد کر رکھے تھے۔ کچھ دیر بعد سردار بوغالی کے نوجوان بیٹے نویان کی باری بھی آگئی۔ اس جوشیلے منگول کے چہرے پر تشدد کے نشانات تھے۔ وہ آنکھوں میں شرمندگی اور خجالت لیے سرجھکائے کھڑا تھا۔ شاید اسے اب تک امید تھی کہ اس کے خاندان کی سابقہ خدمات کے پیش نظر خاقان کے دل میں اس کے لئے رحم آجائے گا۔ پھر اس نے خود بھی تو کوئی چھوٹا کارنامہ انجام نہیں دیا تھا' اباقہ اور اس کے ناقابل شکست ساتھیوں کو زیر کرنا اور قراقرم تک لانا اسی کا کام تھا .... مگر اس شہر اجل میں رحم کا کیا کام تھا۔ خاقان کا دست کرم پتھر کی طرح ساکت تھا۔ کچھ ہی دیر میں مسلح سپاہی اسے کھینچتے ہوئے موت کے گڑھے پر لے گئے۔ اس کے سر پر جما ہوا دودھ ڈال کر خونخوار کتوں کے سامنے پھینک دیا گیا۔ کتوں کا منحوس شور بلند ہوا اور چند ہی لمحوں میں نویان کا جسم آدھ کھائے چیتھڑوں میں تبدیل ہو چکا تھا۔

اس کے بعد نبیلہ کو خاقان کے روبرو لایا گیا۔ خاقان نے نفرت سے اس کی طرف دیکھا اور بولا۔ "اچھا تو یہ عورت ہے جس نے اپنی عیاری سے ہمیں ہمارے ایک قابل جنگجو سے محروم کیا ہے۔"

جلاد نے کہا۔ "ہاں خاقان! یہی وہ خرافہ ہے۔"

خاقان نے کہا۔ "ہمیں افسوس ہے کہ تیری موت سے ہمارے شہزادے اور اردوئے معلی کے سردار لطف اندوز نہیں ہو سکیں گے' مگر اے بدبخت! تو نے اپنی عیاری سے ہمیں اتنا مشتعل کر دیا ہے کہ ہم تجھے سزا دینے کے لئے بے قرار ہو رہے ہیں۔"

نبیلہ خاموش رہی۔ خاقان بولا۔ "اگر تیرے عریاں جسم پر گھوڑی کا جما ہوا دودھ ڈال کر تجھے کتوں کے آگے پھینک دیا جائے تو کیسا رہے؟"

نبیلہ نے بے خوفی سے زبان کھولی۔ "منگولوں کے بادشاہ! میں بے بس ہوں۔

تو میرے ساتھ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ مگر یاد رکھ ایک روز تجھے اپنے ان مظالم کا حساب دینا پڑے گا۔"

خاقان نے قہقہہ لگایا۔ "اچھا اباقہ کی بات کر رہی ہو .... وہ چوہیا کا بچہ جو چوہے دان میں پھنسا ہوا ہے۔ بہت خوب .... مجھے تیری عقل پر رحم آرہا ہے۔ کاش تو چنگیز کے بیٹے کو کوئی شایان شان دھمکی دینے کے قابل ہوتی۔"

نبیلہ نے تنک کر کہا۔ "مسلمان دھمکی نہیں دیتا۔"

خاقان نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "ہاں مسلمان بڑا اصول پرست ہوتا ہے۔ حرام چیز کو ہاتھ نہیں لگاتا۔" پھر اس نے اپنے خاص خادم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "محل سے شراب لائی جائے اور اس عورت کو پلائی جائے۔ مرنے سے پہلے یہ اس لطف سے محروم کیوں رہے۔"

خاقان کے حکم پر عمل درآمد کرنے کے لیے چند خادم محل کی طرف بڑھ گئے۔ خاقان نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ "ہاں عورت! مجھے یاد آیا تو نے نویان کے منہ پر تھوک دیا تھا۔ اس کی وجہ؟"

نبیلہ نے کہا۔ "وجہ میں صرف خاقان کو بتا سکتی ہوں۔"

تماشائیوں میں چہ مگوئیاں ہونے لگیں۔ خاقان نے اپنے ایک محافظ کو حکم دیا۔ وہ نبیلہ کی طرف آیا اور اسے دوسرے مجرموں سے علیحدہ کرکے خاقان کے روبرو لے گیا۔ خاقان زریں نشست سے ٹیک لگائے بڑی تمکنت سے بیٹھا تھا۔ نبیلہ قریب پہنچی تو بولا۔

"ہاں کیوں تھوکا تھا تو نے؟"

نبیلہ نے گردن آگے بڑھا کر خاقان پر بھی تھوک دیا اور بولی۔ "اس لیے کہ وہ بھی تیری طرح میری پہنچ سے دور تھا۔"

معلوم دنیا کے سب سے بڑے فرمانروا کے منہ پر تھوکنے کی کوشش کی گئی تھی چند ساعتوں کے لیے کسی کو اپنی نگاہ پر یقین نہیں آیا .... حبشی جوزف جس نے چند روز پہلے ماریا کو جیتا تھا' خاقان کے عقب میں کھڑا تھا۔ دفعتاً وہ لپک کر نبیلہ کے سر پر پہنچا اور وزنی تلوار کے ایک ہی وار سے اس کی گردن اڑا کر رکھ دی۔ نبیلہ کا سر اچھل کر خاک میں لڑھک گیا۔

اباقہ اور اسد کی بہن' سلیمان کی چہیتی بیوی اور قاسم کی غمزدہ ماں اجل کے ایک ہی وار سے خاک و خون میں لوٹ گئی۔ غموں کی چکی میں پسا ہوا اس کا قیدی

بدن زمین پڑا رہ گیا اور روح آسمانوں کی طرف پرواز کر گئی۔

"شاباش جوزف۔" خاقان کی آواز سناٹے کی کوکھ سے ابھری۔ "تم نے اس بدبخت کو اچھا جواب دیا ہے۔ اس حاضر جوابی پر میں خوش ہوا۔ مگر افسوس رہے گا کہ اس کی موت کا تماشا تادیر جاری نہ رہ سکا۔"

.... عین اس وقت جب مسلح سپاہی نبیلہ کا سربریدہ لاشہ میدان سے اٹھا کر لے جا رہے تھے' اباقہ اپنی کوٹھڑی میں بیٹھا بغور اس چھوٹے سے خنجر کا پھل دیکھ رہا تھا۔ یہ پھل اس کی چھوٹی انگلی سے بھی چھوٹا تھا۔ مگر قیمتی ہونے کی وجہ سے بے انتہا پختہ لوہے کا بنا ہوا تھا۔ اباقہ نے گہری نظروں سے کوٹھڑی کے درودیوار کا جائزہ لیا۔ پھر ایک جگہ اس نے خنجر کی باریک نوک رکھی اور پتھر کو کریدنا شروع کر دیا۔ کوئی پہریدار اسے دیکھتا تو یہی سمجھتا کہ قیدی کا دماغ چل گیا ہے۔ ان وزنی پتھروں کو کسی خنجر سے کریدنا ایسا ہی تھا جیسے پہاڑ کو تیشے سے کھودنے کی کوشش کی جائے یا ہاتھی کو گرانے کے لیے کنکر مارے جائیں۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ کسی وقت بے ضرر چیونٹی ہاتھی کو ہلاک کر دیتی ہے اور اگر تیشہ چلانے والے بازو مسلسل حرکت میں رہیں تو پہاڑوں سے "دودھ کی نہریں" بھی نکل آتی ہیں' قطرے قطرے سے دریا بنتا ہے اور قطرہ قطرہ پتھر پر گرتا رہے تو اس میں سوراخ کر دیتا ہے۔ موسم کی نرم انگلیاں قلعوں کو کھنڈر بنا دیتی ہیں اور مسلسل رینگنے والا وقت صدیوں کے فاصلے طے کر لیتا ہے .... اور یہ بھی حقیقت ہے کہ جب سب راستے بند ہو جاتے ہیں تو ایک راستہ کھل جاتا ہے اور جب سب کچھ برباد ہو جاتا ہے تو ایک نئے وجود کی تشکیل ہوتی ہے۔ ایک نیا عزم کروٹ لیتا ہے اور یہ تشکیل اباقہ کے اندر بھی ہو چکی تھی' یہ عزم اس کے اندر بھی جاگ چکا تھا۔ وہ انتقام کی "شیریں" کا فرہاد بن چکا تھا۔ وہ ننھا سا خنجر اس کا تیشہ تھا اور وہ سنگلاخ دیوار کوہ گراں .... وقت گزرتا رہا سورج کا پہریدار مشرق سے مغرب تک گشت لگاتا رہا۔ رات اور دن باری باری اس کی کوٹھڑی میں جھانکتے رہے' دن ہفتوں اور ہفتے مہینوں میں بدلتے چلے گئے اور اباقہ قراقرم کی اس ویران اور تاریک کوٹھڑی میں سر جھکائے بیٹھا رہا۔ وہ ایک ہی جگہ بیٹھا رہتا تھا اور کسی کو معلوم نہیں تھا کہ کیا کرتا رہتا ہے۔ بظاہر وہ اندھیرے میں لپٹی ہوئی ایک زندہ لاش تھا لیکن اس کا ایک ہاتھ دھیرے دھیرے پتھر کی دیوار کو کریدتا رہتا تھا۔ شب و روز اس کا یہ عمل مسلسل جاری رہتا تھا۔ ریت کے جو مٹھی بھر ذرے دن بھر میں اکٹھے ہوتے تھے وہ

انہیں اس تنگ دراز میں پھینک دیتا تھا جو اس کوٹھڑی میں رفع حاجت کے کام آتی تھی اور نہ جانے کتنی گہرائی تک چلی گئی تھی۔

☆------☆------☆

اباقہ کے قید خانے سے باہر موسم گرما زوروں پر تھا۔ خاقان اور غدائی نیلی جھیل کے کنارے گرمیاں گزارنے کے لئے محل میں فروکش تھا۔ جھیل کے کنارے آبی پرندے جمع ہو رہے تھے۔ جنگلی مرغابیاں ٹنڈرا کے علاقے سے اپنے گرمائی مسکن کو چھوڑ کے چلاتی ہوئی جنوب کی طرف محو پرواز تھیں۔ مرطوب ہواؤں کے خنک جھکڑ موسم کو خوشگوار رکھتے تھے' ایک روز خلافت عباسیہ کے چار قاصد خاقان اوغدائی کے دربار میں حاضر ہوئے۔ یہ چاروں مسلمان تھے اور قیمتی تحائف کے ساتھ خلیفہ کا ایک اہم پیغام لے کر آئے تھے۔ خاقان کچھ علیل تھا اس لیے اس نے تیسرے روز رات کے کھانے پر ان سے ملاقات کی۔ منگولوں کے بادشاہ کی شان و شوکت دیکھ کر وہ ششدر رہ گئے شاندار محل میں جا بجا سجے ہوئے طلائی و نقرئی مجسمے' سنگ مرمر کے حوضوں میں شراب اور دودھ کے فوارے' دنیا کے بیش قیمت قالین اور غالیچے' قیمتی پتھروں سے آراستہ بلند وبالا ستون اور ان میں تتلیوں کی طرح اڑتی پھرتی حسین کنیزیں۔ وہ خاقان کے رہن سہن سے مرعوب ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ وہ آئے تو اس لیے تھے کہ منگولوں کے بادشاہ سے اباقہ اور اس کے ساتھیوں کی واپسی کا مطالبہ کریں تاکہ انہیں بغداد میں لے جا کر قرار واقعی سزا دی جا سکے مگر خاقان کا رعب و دبدبہ دیکھ کر انہیں مدعا زبان پر لانے کی جرأت نہ ہوئی۔ خاقان کی ملاقات سے پہلے انہیں مشہور بغدادی قاتل عبد اللہ مشہدی بھی ملا اور اس نے بھی ایلچیوں کو یہی مشورہ دیا کہ وہ اباقہ اور اس کے ساتھیوں کی واپسی کا مطالبہ زبان پر نہ لائیں۔ اس سے خاقان کی ناراضگی کا خدشہ ہے۔ نتیجتاً وہ اپنے ارادے سے باز آگئے۔ خاقان سے ان کی جو گفتگو مترجم کی وساطت سے ہوئی وہ کچھ اس طرح تھی۔

وفد کے سربراہ نے کہا۔ "خاقان محترم! ہم سلطنت عباسیہ کی طرف سے نیک خواہشات لے کر آئے ہیں۔ خلیفہ المسلمین سلطنت تاتار سے دوستانہ تعلقات کے آرزو مند ہیں۔"

خاقان اوغدائی کے عمر رسیدہ چہرے پر ایک مکارانہ مسکراہٹ ابھری وہ بولا۔ "تمہارے خلیفہ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہم دوستوں کے دوست ہیں۔

جب تک آپ چاہیں گے یہ دوستی برقرار رہے گی ...."

رسمی باتوں کے بعد گفتگو کا رخ اباقہ اور اس کے ساتھیوں کی طرف مڑ گیا۔ وفد کے سربراہ نے کہا۔ "خاقان محترم! ہمیں حضور کی دانشمندی و فراست پر شبہ نہیں مگر ہم آپ کو اپنی تشویش سے آگاہ کرنا بھی ضروری سمجھتے ہیں۔"

خاقان نے کہا۔ "کہو' کیا کہنا چاہتے ہو؟"

قاصد نے کہا۔ "خاقان معظم! اباقہ ایک غیر معمولی شخص ہے اس میں جناتی قوت اور شیطانی صلاحیتیں ہیں۔ آپ اس کی سزا میں زیادہ تاخیر نہ کریں اور اگر ایسا ضروری ہے تو اسے جہاں بھی رکھیں سخت نگہداشت میں رکھیں۔ وہ ہوا کی طرح اڑ جانے اور دھوئیں کی طرح تحلیل ہو جانے کی شہرت رکھتا ہے۔"

خاقان نے اپنے داروغہ جیل کی طرف دیکھا اور کہا۔ "بغورچی! یہ مہمان کیا کہہ رہے ہیں؟"

بغورچی نے خاقان کا مدعا سمجھ کر کہا۔ "اے بغداد کے دوستو! اباقہ کو ہم نے جس کوٹھڑی میں رکھا ہے اسے تم دنیا کا محفوظ ترین قید خانہ سمجھ سکتے ہو۔ وہاں سے فرار ہونا تو دور کی بات' وہ اس کوٹھڑی میں اپنی مرضی سے مر بھی نہیں سکتا۔ اس کی کلائیوں پر لوہے کے پترے چڑھائے گئے ہیں تاکہ وہ اپنی نسوں کو دانتوں سے کاٹ کر خون ضائع نہ کر سکے۔ اس کی ہتھکڑیوں و بیڑیوں کے کنارے گول ہیں تاکہ انہیں ہتھیار کے طور پر استعمال نہ کر سکے۔ یہاں تک کہ اسے جس پیالے میں کھانا دیا جاتا ہے وہ بھربھری مٹی کا ہوتا ہے' تاکہ پیالہ توڑ کر وہ اس کے ٹکڑوں سے کوئی مقصد حاصل نہ کر سکے۔ آٹھ پہر مسلح پہریدار اس کی کوٹھڑی کے گرد موجود رہتے ہیں۔"

وفد کے سربراہ نے مرعوب ہو کر کہا۔ "بلاشبہ آپ کے انتظامات سخت ترین ہیں۔ پھر بھی .... اگر آپ گستاخی نہ جانیں تو میں عرض کروں گا کہ گاہے گاہے اس کوٹھڑی میں جھانکتے رہیے کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ اس شیطان صفت شخص سے کچھ بھی بعید نہیں۔"

خاقان نے قاصدوں کا اصرار دیکھا تو داروغہ کو حکم دیا۔ "بغورچی ہمارے مہمان خاصے وہمی واقع ہوئے ہیں۔ ہمارا حکم نامہ لے جاؤ اور کل صبح انہیں اس چوہے دان کی سیر کرا لاؤ۔"

بغورچی نے ادب سے سر جھکا دیا۔

اگلے روز شام کے وقت چاروں قاصد بغورچی کے ساتھ اس سرنگ میں داخل ہو رہے تھے جہاں اباقہ کو رکھا گیا تھا۔ دروازے کے آہنی قفل کھلے اور تاریک کوٹھڑی میں مدھم روشنی پھیل گئی۔ قاصدوں کو اپنے سامنے ایک عجیب الخلقت شخص نظر آیا۔ اس کے سر اور داڑھی کے بال بے تحاشہ بڑھے ہوئے تھے۔ ہاتھ پاؤں گندے تھے اور ناخن نوٹ چکے تھے۔ اس کی سفید آنکھیں بالکل ساکت تھیں۔ وہ زنجیروں میں جکڑا ایک دیوار سے ٹیک لگائے بے حرکت بیٹھا تھا' قاصدوں کی طنزیہ نظریں اس پر جم کر رہ گئیں' مگر وہ زیادہ دیر اس کی طرف نہ دیکھ سکے کیونکہ قیدی کے چہرے پر عجیب سی وحشت برس رہی تھی۔ انہوں نے کوٹھڑی کے در و دیوار کا بغور جائزہ لیا اور آہنی دروازے کو ٹھونک بجا کر دیکھتے رہے۔ اگر وہ اباقہ کو اس کی جگہ سے اٹھانے کی کوشش کرنے تو انہیں معلوم ہوتا کہ اس کے پیچھے دیوار میں ایک گڑھا نمودار ہو چکا ہے۔ مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا اور مطمئن انداز میں سرہلاتے ہوئے واپس چلے گئے۔

☆ ☆ ☆

وقت رینگتا رہا۔ قراقرم کا نیلا آسمان رات اور دن کے چولے بدلتا رہا اور پھر موسم سرما پوری حشر سامانیوں کے ساتھ صحرائے گوبی پر وارد ہو گیا۔ یخ بستہ ہواؤں نے زندگی کو ٹھٹھرا کر رکھ دیا۔ منگول اپنے گول خیموں میں مقید ہونے لگے۔ شکار ندارد اور گھاس ناپید ہو گئی .... خاقان اوغدائی بیمار تھا۔ وہ اپنے ذاتی محافظ دستے اور مصاحبین کے جم غفیر کے ساتھ ابھی تک نیلی جھیل کے کنارے مقیم تھا۔ اس کے چینی دانا لیوست چائی نے کہا بھی کہ سخت سردی میں جھیل کے کنارے قیام مناسب نہیں' اب قراقرم واپس چلنا چاہئے مگر اوغدائی نے اس کی بات نہیں مانی۔ جھیل چھوڑنے کو اس کا دل نہیں چاہتا تھا۔ نہ جانے کیا بات تھی۔ آج کل وہ شراب ضرورت سے زیادہ استعمال کرتا تھا اور ہر وقت اداس رہتا تھا۔ اس کے چہرے پر عجیب سی پریشانی چپک کر رہ گئی تھی۔ کبھی کبھی اسے بڑے بھیانک خواب آتے تھے۔ ایک روز اس نے "سکاکی" نامی شاہی نجومی کو بلا کر کہا۔

"مجھے کچھ دن سے ایک عجیب خواب آرہا ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ ایک بہت بڑا جانور جس کی شکل چوہے جیسی ہے کسی دیوار کو کرید رہا ہے' میں اسے دیوار کی دوسری طرف سے دیکھتا ہوں اور بھگانے کی کوشش کرتا ہوں لیکن وہ الٹا مجھ پر غرانے لگتا ہے اور دوبارہ دیوار کریدنے میں مصروف ہو جاتا ہے۔"

نجومی نے اس خواب کی تعبیر خاقان کو یہ بتائی کہ اس کا کوئی بدخواہ سازشوں میں

مصروف ہے لیکن وہ کامیاب نہیں ہو گا اور اپنی موت آپ مارا جائے گا۔ تاہم خاقان اس تعبیر سے مطمئن نہیں ہوا۔ اس نے کچھ دوسرے نجومیوں کو بلایا انہوں نے اس خواب کی مختلف تعبیریں بتائیں۔ کسی نے کہا کہ منگولوں کا یورپ میں لڑنے والا لشکر کسی مصیبت میں گرفتار ہے۔ کسی نے کہا وبا پھیلنے کا اندیشہ ہے۔ خاقان رنگ رنگ کی تعبیریں سن کر زچ ہو گیا اور اس نے سب نجومیوں کو ڈانٹ کر بھگا دیا۔

ایک روز خاقان کو کچھ افاقہ محسوس ہوا تو وہ لیوست چائی کے مشورے کے خلاف پھر سوار ہو کر شکار کھیلنے کو تیار ہو گیا۔ جب وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہوا تو ایک منگول چرواہا اس کے پاس آکر فریاد کرنے لگا کہ ایک بھیڑیا اس کی بھیڑوں کو کھائے جا رہا ہے۔ خاقان کے اشارے پر منگول سوار چرواہے کی مدد کو لپکے اور تھوڑی ہی دیر بعد ایک بھیڑیا خاقان کے سامنے پیش کیا' جسے انہوں نے جال باندھ رکھا تھا۔ تھوڑی دیر تک خاقان اس جانور کو دیکھتا اور تذبذب میں اپنی لگام مروڑتا رہا۔ پھر اس نے حکم دیا کہ انعام کے طور پر اس چرواہے کو کچھ بھیڑیں دے دی جائیں اور بھیڑیے کو کھول دیا جائے۔ طبلچی اور محافظ حیرت سے خاقان کی طرف دیکھنے لگے۔ اوغدائی نے سنجیدگی سے کہا۔

"میں اس بھیڑیے کو اس لیے چھوڑ رہا ہوں کہ یہ واپس جا کے اپنے ساتھ کے اور بھیڑیوں کو خبردار کرے گا کہ میں کیسے سخت خطرے میں گرفتار ہوا تھا اور پھر سارے بھیڑیے اس علاقے سے نکل جائیں گے۔"

اوغدائی کی بات سننے والے سمجھ نہ پائے کہ وہ ابھی تک نشے میں ہے یا اس کے دل میں کوئی انوکھی ترنگ آئی ہے۔ بہر حال انہوں نے بھیڑیے کو چھوڑ دیا لیکن وہ ابھی خیمے سے باہر بھی نہ نکلنے پایا تھا کہ خیمہ گاہ کے کتوں کے جم غفیر نے اس پر حملہ کر دیا اور اسے مار ڈالا۔ اس واقعے سے اوغدائی کا دل بیٹھ گیا۔ گھوڑے سے اتر کر وہ اپنے شامیانے میں گیا اور تادیر چپ چاپ بیٹھا رہا۔ اس نے شکار کا خیال ترک کر دیا۔ بالآخر اس نے کہا "میری طاقت سلب ہو رہی ہے۔ میرا خیال تھا کہ جاودانی آسمان مجھے کچھ دن اور زندہ رکھے گا' مگر اب محسوس ہو رہا ہے کہ کچھ ہونے والا ہے۔ بھیڑیے کے مرنے کا شگون میرے لیے اچھا نہیں نکلا۔" اپنے گدے پر آکر اس نے پھر شراب نوشی شروع کر دی۔

☆------☆------☆

وہ ٹھٹھرے ہوئے دسمبر کی ایک طوفانی رات تھی۔ تند تیز ریتلے جھکڑ قراقرم کی وسعتوں کو تہ و بالا کر رہے تھے۔ رہ رہ کر آسمان پر بجلی کے کوندے لپکتے تھے اور مہیب گرج سے وحشی منگولوں کے دل دہل جاتے تھے۔ مائیں اپنے بچوں کو بتا رہی تھیں کہ آج

آسمان دیوتا غضبناک ہے۔ مرد خاموش بیٹھے تھے اور بوڑھی عورتیں آنکھیں بند کئے قدیم مناجات پڑھنے میں مصروف تھیں۔ گھٹا ٹوپ فضا میں ایک عجیب طرح کا خوف رچا ہوا تھا۔ ایک تہائی رات گزر چکی تھی جب قراقرم کے اس بدترین قید خانے کے ایک گوشے میں مدہم کھٹکا سنائی دیا۔ پتھر کی ایک چھوٹی سی ٹکڑی ٹوٹ کر پتھریلی زمین پر گری اور اس کے گرنے کی آواز طوفان کے شور میں جذب ہو کر رہ گئی۔ کچھ ہی دیر بعد ایک اور بڑی ٹکڑی پتھر سے علیحدہ ہو کر نیچے گری اور اس کے ساتھ ہی انسانی ہاتھ نمودار ہوا۔ یہ میلا کچیلا ہاتھ پتھریلی دیوار سے زور آزمائی کرنے لگا۔ کتنی ہی دیر درو دیوار پر گھٹا ٹوپ تاریکی چھائی رہی اور کچھ دکھائی نہیں دیا۔ پھر جب ایک بار زور سے بجلی چمکی تو اس کی روشنی میں ایک عجیب منظر نظر آیا۔ پتھریلی دیوار میں ایک گہرا شگاف ہو چکا تھا اور اس میں سے ایک عجیب وضع انسان برآمد ہو رہا تھا۔ اس کے لمبے بال ہوا میں لہرا رہے تھے اور آنکھیں شمعوں کی طرح روشن تھیں۔ طوفانی ہوا نے قید خانے کے احاطے اور فصیلوں پر جلنے والی تمام مشعلیں بجھا ڈالی تھیں اور پہریدار رعد و کڑک سے خوفزدہ ہو کر مختلف گوشوں میں چھپے ہوئے تھے۔ وہ عجیب حلیہ شخص باہر نکلا اور کسی سائے کی طرح رینگتا ہوا قید خانے کے بیرونی دروازے کی طرف بڑھنے لگا .... کچھ ہی دیر میں وہ طوفانی جھکڑوں میں لپٹا ہوا قید خانے سے باہر تھا۔ طوفان کی گھن گرج میں اس کی زنجیروں کا مدھم شور سنائی دے رہا تھا اور وہ جھک کر چلتا دھیرے دھیرے قید خانے سے دور ہوتا جا رہا تھا۔ اس کا رخ ایک خاص سمت میں تھا۔ مختلف راستوں سے ہوتا ہوا وہ بالآخر ایک بڑے خیمے کے پاس پہنچ کر رک گیا۔ یہ خیمہ قراقرم کے ہزاروں لاکھوں خیموں میں سے ایک تھا مگر اس کی دور کش (چمنی) بہت بڑی تھی۔ کچھ دیر وہ شخص اپنی سفید آنکھوں سے خیمے کا جائزہ لیتا رہا پھر اس نے دروازے کی ڈوری توڑی اور اندر داخل ہو گیا۔ یہ ایک آہن گر (لوہار) کا خیمہ تھا۔ شمعدان کی مدھم اور لرزاں روشنی میں ایک طرف جنگی ہتھیاروں کے سانچے نظر آ رہے تھے۔ خیمے کے ایک کونے میں ایک بہت بڑی بھٹی تھی جو اس وقت سرد پڑی تھی' اس کے قریب ہی آہن گری کے اوزار دھرے تھے۔ آہن گر ایک نرم بستر پر کسی عورت کے ساتھ لیٹا ہوا تھا۔ مدھم روشنی میں ان دونوں نے حیرت سے اجنبی کو دیکھا اور ان کی آنکھیں دہشت سے پھیل گئیں۔

"کک .... کون ہو تم؟" آہن گر نے بے حد خوفزدہ لہجے میں پوچھا۔

اس دوران اجنبی ان کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ آہن گر کے سامنے کر دیے۔ پھر اس کے ہونٹوں سے ایک عجیب ہیبت ناک آواز نکلی۔ "اس ....

زنجیر.......... کو کھولو۔"

آہن گر نے کچھ کہنے کے لیے ہونٹوں کو جنبش ہی دی تھی کہ اجنبی نے جھٹکے سے اپنے دونوں ہاتھ پوری قوت سے گھما کر اس کے سینے پر مارے آہن گر بستر سے قلابازی کھا کر اپنی بھٹی کے پاس جا گرا۔ اس کے ساتھ لیٹی لڑکی دھکا لگنے سے زمین پر گر گئی تھی۔ اس نے لیٹے لیٹے چیخنا چاہا مگر اس کی آواز حلق میں گھٹ کر رہ گئی کیونکہ اجنبی نے پلک جھپکتے میں اس کا گلا دبوچ کر گردن کی ہڈی توڑ ڈالی تھی۔ آہن گر نے یہ منظر سکتے کے عالم میں دیکھا اور تھر تھر کانپنے لگا۔ یوں لگتا تھا اس میں چلانے یا خیمے سے بھاگ جانے کی سکت بھی نہیں رہی۔ اجنبی اپنی سفید آنکھوں سے گھورتا ہوا اس کے سر پر پہنچا اور ایک بار پھر اپنے ہاتھ آہن گر کے آگے کر دیے۔ آہن گر' نے کانپتے ہاتھوں سے اوزار سنبھالے اور اجنبی کے حکم کی تعمیل میں مصروف ہو گیا۔

کوئی تین گھڑی بعد آہن گر کے خیمے میں آہن گر اور اس کی بیوی کی سربریدہ لاشیں پڑی تھیں اور اجنبی ایک منہ زور گھوڑے پر سوار طوفانی رفتار سے قراقرم کے مضافات کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کی منزل نیلی جھیل تھی' جہاں وقت کا ظالم ترین حکمراں اپنے سفاک ترین مصاحبوں کے ساتھ خیمہ زن تھا۔ اجنبی کے بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ اس کے جسم پر صرف ایک لنگوٹ تھا۔ کندھے پر رسے کی ایک کمند تھی۔ دائیں ہاتھ میں تلوار تھی اور آنکھیں سفید ہیروں کی طرح دمک رہی تھیں .... وہ اباقہ تھا۔

اس تاریک کوٹھڑی میں ڈیڑھ برس سے جو لاوا چپکے چپکے کھول رہا تھا وہ آج پتھر توڑ کر بہہ نکلا تھا ڈیڑھ برس بعد آج وہ بلا آزاد ہو گئی تھی جسے زنجیروں میں جکڑ کر منگول فراموش کر چکے تھے اور.......... آج کی رات اسی بلا کی تھی .... ہاں وہ انسان نہیں تھا ایک بلا تھی' جس کے روئیں روئیں میں خون آشامی رچی ہوئی تھی۔ اس کے دل کی جگہ ایک بہت بڑا انگارہ دہک رہا تھا اور اس انگارے کی تپش نے اسے دنیا و مافیہا سے بیگانہ کر دیا تھا۔ وہ چرمی کوڑے سے گھوڑے کی کھال ادھیڑتا رہا اور اسے تیز سے تیز تر دوڑاتا رہا۔

☆ ——— ☆ ——— ☆

یہ دسمبر 1241ء کی 11 تاریخ تھی۔ کافی روز بیمار رہنے کے بعد خاقان اوغدائی کی طبیعت کچھ سنبھلی تھی۔ صبح اسے عطر آمیز گرم پانی سے غسل صحت دیا گیا تھا۔ اس وقت شام ہو چکی تھی اور نیلی جھیل کے کنارے خاقان کی صحت یابی کی خوشی منائی جا رہی تھی۔ خاقان اپنے شاندار محل میں آرام دہ گدے پر بیٹھا ہلکی قسم کی شراب پی رہا تھا۔ سیورا قطنی کی ایک بہن اور اس کا ایک بھتیجا بھی شراب نوشی میں اس کا ساتھ دے رہے تھے۔ دو

چینی رقاصائیں بھڑکیلے لباس پہنے مدھم سازوں پر باری باری رقص پیش کر رہی تھیں۔ یہ محفل رات گئے تک جمی رہی اور پھر خاقان سونے کے لیے اپنی خواب گاہ میں چلا گیا .... یہ محفل خاقان کی زندگی کی آخری محفل تھی۔ جو شراب اس نے پینا تھی وہ پی چکا تھا' جو رقص اس نے دیکھنا تھا دیکھا چکا تھا' وہ اپنے حصے کا ظلم بھی کر چکا تھا اور اپنے حصے کی حکومت بھی ....

.... اس وقت 11 دسمبر کی شب کا دوسرا پہر شروع ہوا تھا جب اباقہ ایک سائے کی طرح خاقان کے محل کے سامنے پہنچا۔ اس کے جسم میں جیسے بجلیاں کوند رہی تھیں۔ اس کی حرکات و سکنات میں ناقابل یقین سرعت اور ہوشیاری تھی۔ پہریداروں کی تیز نظروں سے بچتا وہ محل کی دیوار کے پاس پہنچ گیا' یوں لگتا تھا آج قدرت بھی اس کی مدد پر تُلی ہوئی ہے۔ محل کے اس حصے میں موجود تینوں پہریدار شراب کے نشے میں اتنے بدمست تھے کہ ایک دوسرے سے بغلگیر ہو کر جھیل کے کنارے پڑے تھے۔ اباقہ انہیں نگاہ میں رکھتا ہوا بالکل دیوار کے ساتھ چپک گیا۔ پھر اس نے رسے کی کمند ہوا میں اچھالی جو پہلی ہی کوشش میں چھت کے کنگروں میں پھنس گئی۔ اباقہ کچھ لمحے ساکت کھڑا رہا۔ تب اس نے تلوار دانتوں میں دبائی اور بے انتہا پھرتی سے کمند پر چڑھتا چلا گیا۔ چھت پر پہنچ کر اس نے کمند اوپر کھینچی اور اسے لپیٹ کر ایک کونے میں رکھ دیا۔ پھر وہ ننگے پاؤں بے آواز چلتا محل کی سیڑھیوں پر پہنچا۔ چند زینے اتر کر اس نے نیچے جھانکا۔ غلام گردشوں میں مسلح محافظوں کا گشت جاری تھا۔ ان کی عریاں تلواریں' فانوسوں اور شمعدانوں کی روشنی میں چمک رہی تھیں .... مگر لگتا تھا اباقہ تمام خطرات سے بے نیاز ہو چکا تھا .... آج اس کی نظر میں کوئی رکاوٹ نہیں رہی تھی۔ اس کی روشن آنکھیں کسی درندے کی طرح متحرک تھیں۔ بلّی کی چال چلتا وہ زینوں سے اُترا اور لومڑی کی عیاری سے پہریداروں کو دھوکا دیتا ہوا اندرونی عمارت میں داخل ہو گیا۔ اس کے پاؤں تلے نرم قالین تھا اور فضا مشک و عنبر میں بسی ہوئی تھی۔ حریری پردوں کی آڑ لیتا ہوا وہ کمرہ کمرہ آگے بڑھنے لگا۔ اس کے چاروں طرف موت کا پہرہ تھا اور وہ ابھی تک ننگی تلواروں کے نرغے میں یوں محفوظ تھا جیسے بتیس دانتوں کے بیچ زبان سلامت رہتی ہے۔ دو ایک جگہ وہ پہریداروں کی نظر سے بال بال بچا اور آخر عالیشان خواب گاہ کے سامنے پہنچ گیا جہاں چنگیز کا سفاک بیٹا اپنی تمام قہر سامانیوں کے ساتھ محو خواب تھا۔ اباقہ نے لپک کر دبیز پردہ ہٹایا اور اندر داخل ہو گیا۔ مگر یہ خواب گاہ دو حصوں میں تقسیم تھی۔ خاقان جس حصے میں سوتا تھا وہ اس سے آگے تھا۔ یہ حصہ قاخان کے اس محافظ کے لیے مخصوص تھا جو ساری رات پلک نہیں

جھپکتا تھا اور ننگی کٹار لیے چوکس کھڑا رہتا تھا۔ جونہی اباقہ اندر داخل ہوا اس حبشی محافظ نے گھوم کر اسے دیکھا اور دونوں اپنی اپنی جگہ ساکت رہ گئے۔ یہ حبشی غلام جوزف تھا۔ وہی جوزف جس نے نبیلہ کو ہلاک کیا تھا۔ خواب گاہ کی نہایت مدھم روشنی میں اس کا سیاہ سراپا کسی سائے کی مانند نظر آرہا تھا۔ چوڑے پھل کی ایک وزنی کٹار اس کے کندھے پر تھی اور اس کا چوڑا سینہ کسی دیوار کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ ان ڈیڑھ برسوں میں حبشی جوزف ترقی کی منازل طے کرتا ہوا خاقان کا ذاتی محافظ بن چکا تھا اور خاقان اس پر بے پناہ اعتماد کرتا تھا اور وہ تھا بھی اعتماد کے قابل۔ بلا کا سخت کوش' بہادر اور پاگل پن کی حد تک وفادار۔ لوگ کہتے تھے کہ وہ کئی کئی روز بغیر خوراک اور پانی کے گزارا کر سکتا ہے اور ہفتے میں صرف ایک شب کے لئے سوتا ہے۔ اس وقت یہ عجیب و غریب شخص سینہ تانے اباقہ کے سامنے کھڑا تھا۔ گھنگھریالے بالوں کے نیچے اُس کی آنکھیں یک ٹک اباقہ کا چہرہ دیکھ رہی تھیں۔ ان آنکھوں میں ایک عجیب چمک تھی جسے کوئی نہیں سمجھ سکتا تھا۔ اباقہ بھی بے حس و حرکت اُس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ اپنی تلوار پر اُس کی آہنی گرفت مضبوط تر ہو رہی تھی اور آنکھوں کے ہیرے شدت قہر سے جلنے لگے تھے۔ محسوس ہوتا جیسے اُس کے جسم سے آگ کی لپٹیں نکل رہی ہیں جو ہر مدمقابل شے کو جلا کر خاکستر کر دینا چاہتی ہیں .... پھر اچانک حبشی جوزف دھیمے قدموں سے چلتا اباقہ کے قریب پہنچ گیا۔ ملگجی تاریکی کی کوکھ سے اُس کی مدھم آواز اُبھری۔

"خاقان کو قتل کرنے آئے ہو؟"

اباقہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اُس کے ہاتھ کی تلوار ہی اُس کے سوال کا جواب تھی۔ حبشی نے کہا۔ "اباقہ تم نے یہ کیوں سمجھ لیا کہ اتنی آسانی سے خاقان کی خوابگاہ تک پہنچ سکو گے؟ کیا تم نے خاقان کے غلاموں کو اتنا بے خبر جان لیا تھا؟" اباقہ نے پھر بھی کوئی جواب نہیں دیا۔ حبشی کچھ دیر اُس کے بولنے کا انتظار کرتا رہا پھر اُس نے ایک گہری سانس لی اور خود ہی کہنے لگا۔ "لیکن .... میں تیری راہ میں نہیں آؤں گا۔ تو جس کام کے لئے آیا ہے وہ انجام دے سکتا ہے۔" اباقہ کے بے جان چہرے پر حیرت کا مدھم عکس نظر آیا۔ اُس نے گونج دار آواز میں کہا۔ "کیوں؟"

حبشی نے کہا۔ "اس سوال کا جواب میں تجھے بعد میں دوں گا فی الحال تو یہی سمجھ لے کہ تیری اور میری ضرورت ایک ہے۔"

اباقہ نے حبشی کی پُر پیچ باتوں کو نظرانداز کرتے ہوئے پُرہیبت آواز میں کہا۔ "کہاں ہے وہ؟"

حبشی نے ایک بغلی دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ اباقہ چوکنی نظروں سے حبشی کو دیکھتا دروازے کی سمت بڑھا اور سرخ رنگ کا مخملیں پردہ ہٹا کر اندر داخل ہو گیا۔ خاقان اپنے شاندار گدے پر محو خواب تھا۔ اُس کا ریچھ نما جسم بے ڈھنگے انداز میں پھیلا ہوا تھا۔ اس وسیع و عریض گدے پر اُس کے ساتھ اُس کی 28 عدد حسین بیویاں سویا کرتی تھیں مگر یوست چائی کے پیہم اصرار پر اُس نے تنہا سونا شروع کر دیا تھا۔ اُس چینی دانا نے اوغدائی کو یہ باور کرایا تھا کہ عورت اور شراب کی اندھا دھند قربت اُس کی صحت کو برباد کر دے گی۔

اباقہ بغور اُس کا چہرہ تکتا رہا۔ اُس کے کانوں میں کچھ دور افتادہ چیخیں گونج رہی تھیں۔ پتہ نہیں یہ کسی کی چیخیں تھیں۔ شیزی کولت کی تھیں' قاسم کی تھیں یا علی اور نبیلہ کی تھیں۔ وہ ان چیخوں کو پہچان نہیں سکتا تھا کیونکہ ان چیخوں میں سینکڑوں' ہزاروں اور چیخیں بھی شامل ہوتی جا رہی تھیں۔ ایران و ترکستان کے مظلوموں کی چیخیں۔ چین و ختا کے مجبوروں اور روس کے مقتولوں کی چیخیں۔ اباقہ کا چہرہ خوفناک ہوتا جا رہا تھا۔ پھر اچانک خاقان اوغدائی نے گہری نیند سے آنکھیں کھول دیں۔ شاید اُس کی چھٹی حس نے اُسے خبردار کیا تھا کہ کچھ ہونے والا ہے۔ یا شاید اباقہ کے جسم سے نکلنے والی غضب کی غیر مرئی لہروں نے اُسے جھنجھوڑ دیا تھا۔ یا ہو سکتا ہے اُس نے پھر وہی چوہے والا بھیانک خواب دیکھا ہو .... اُس کی آنکھیں کھلیں تو اباقہ اُس کے سامنے تھا۔ اوغدائی کے چہرے پر دنیا جہاں کا خوف سمٹ آیا۔ اُس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ کتنی ہی دیر وہ اسی سکتے میں رہا۔ تب اُس کی رگوں میں چنگیزی خون نے ہلچل کی۔ اُس نے تیزی سے کروٹ بدلی اور اُٹھ کر اپنی تلوار کی طرف لپکا مگر دو قدم ہی چلا تھا کہ شب خوابی کا لباس اُس کے پاؤں تلے آگیا اور وہ الجھ کر اوندھے منہ قالین پر گرا۔ کروٹ بدل کر اس نے پھر اباقہ کو دیکھا جیسے یقین کرنے کی کوشش کر رہا ہو کہ یہ سب کچھ خواب نہیں۔ اس کی پتلیاں دہشت سے پھیل گئی تھیں۔ یکایک اباقہ وحشت سے دیوانہ ہو گیا۔ اُس کے حلق سے ایک لرزہ خیز غراہٹ نکلی اور وہ درندے کی طرح اوغدائی پر جھپٹا۔ اوغدائی نے اباقہ کو اپنے اوپر آتے دیکھا تو اُس نے جوزف کو آواز دی۔ مگر ابھی جوزف کا "ف" اُس کے حلق سے برآمد نہیں ہوا تھا کہ اباقہ کے آہنی ہاتھ اُس کی گردن پر پہنچ گئے۔ نہایت وحشت سے اُس نے اوغدائی کا گلا گھونٹنا شروع کر دیا۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے ایک دھند سی چھا گئی تھی اور کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اچانک جوزف نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"اباقہ! چھوڑ دے اسے' یہ تو مرگیا ہے۔"

اباقہ نے حیرت سے اوغدائی کی طرف دیکھا۔ واقعی وہ ایک مردہ شخص کا گلا گھونٹ رہا تھا۔ اوغدائی تو اُسی وقت مرگیا تھا جب اباقہ کے ہاتھ اُس کی گردن سے چھوئے تھے۔ بے پناہ خوف نے اُس کی حرکت قلب بند کر دی تھی۔ وہ چہرے پر سخت دہشت لئے راہی عدم ہو چکا تھا۔ اباقہ نے غرا کر اپنی تلوار اٹھائی اور اوغدائی کی لاش پر جھپٹا۔ انداز سے ظاہر تھا کہ وہ اُس کے جسم کے سینکڑوں ٹکڑے کر ڈالے گا مگر اُس وقت حبشی غلام اُس کے سامنے آ گیا۔

"نہیں اباقہ۔" وہ بولا۔ "اس سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ تم اپنے ساتھ میری زندگی بھی خطرے میں ڈال دو گے اور تمہارا انتقام بھی ادھورا رہ جائے گا۔"

حبشی کے آخری الفاظ نے اباقہ کے تنے ہوئے عضلات نرم کر دیئے۔ دفعتاً اُس نے مردہ خاقان کی جانب سے رخ پھیرا اور لپک کر حبشی کی گردن تھام لی۔ اُس کی گرفت اتنی بلاخیز تھی کہ حبشی کا چہرہ خون کے دباؤ سے تاریک ہو گیا۔ اباقہ کے ہونٹوں سے روح پر لرزا طاری کرنے والی سرگوشی برآمد ہوئی۔

"اوغدائی کا محافظ دستہ کہاں ہے؟"

حبشی نے بمشکل اپنی گردن چھڑائی اور جلد کو سہلاتا ہوا بولا۔ "آ میرے ساتھ' میں تجھے سب کچھ بتاؤں گا' مجھ پر بھروسا کر۔ میں تجھے کہہ چکا ہوں کہ تیری اور میری ضرورت ایک ہے۔"

خوابگاہ کی کمزور روشنی میں حبشی کے تاثرات نظر نہیں آتے تھے مگر اُس کا لہجہ سچائی کا گواہ تھا۔ اباقہ غرایا۔ "چلو۔"

حبشی بولا۔ "ٹھہرو۔ پہلے خاقان کو اس کے بستر پر لٹا دیں ورنہ وقت سے پہلے ہی حشر برپا ہو جائے گا۔"

حبشی نے اباقہ کے ساتھ مل کر خاقان کو قالین سے اٹھایا اور بستر پر لٹا کر اوپر توشک ڈال دی۔ منگول تاریخ کی اس سنسنی خیز خبر کو صبح تک کے لئے توشک کے نیچے چھپا دیا گیا تھا۔ حبشی اباقہ کو لیتا ہوا ایک اندرونی راستے کی طرف بڑھا۔ وہ محل کے گوشے گوشے سے واقف تھا۔ نہایت رازداری اور ہوشیاری سے وہ اسے محل سے باہر نکال لایا۔

اب وہ دو تاریک سایوں کی مانند جھیل کے کنارے کھڑے تھے' اُن کی ایک طرف جھیل کا ساکت پانی تھا اور تین اطراف دیودار کے اونچے درخت تھے۔ رات سرد تھی اور سیاہ آسمان پر صحرائے گوبی کے ستارے کپکپا رہے تھے۔ حبشی نے کہا۔

"خاقان کا محافظ دستہ اپنی فوجی قیام گاہ میں ہو گا۔ مگر اُس قیام گاہ تک پہنچنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے تم محافظ دستے کے سالار پر قابو پا لو اور یہ کام کوئی ایسا دشوار نہیں۔ دستے کا سالار ایک عراقی عبداللہ مشہدی نامی ہے۔ وہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ علیحدہ خیمے میں رہتا ہے۔ یہ خیمہ یہاں سے زیادہ دور نہیں۔ میرا خیال ہے اس وقت مشہدی وہیں پر ہو گا۔"

مشہدی کا نام سن کر اباقہ کی رگوں میں خون کی گردش تیز تر ہو گئی۔ بے خیالی میں اُس کا ہاتھ تلوار کے دستے پر گھومنے لگا۔ اُس نے حبشی سے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ "چلو"

حبشی اسے لے کر درختوں کے درمیان جھیل کے کنارے کنارے آگے بڑھنے لگا۔

اوغدائی کے محل کے ساتھ ہی مصاحبین کے لئے کچھ اور عمارتیں تھیں اور اُن سے ملحق ایک وسیع پڑاؤ تھا جس میں سینکڑوں گول خیمے ایستادہ تھے۔ خیموں سے کہیں کہیں کتوں کے بھونکنے اور گھوڑوں کے ہنہنانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ کبھی کبھار کسی پہریدار کی پکار بھی ان آوازوں میں شامل ہو جاتی تھی۔ خیموں میں جلتی ہوئی مشعلوں کی روشنی درختوں سے چھن چھن کر آ رہی تھی۔ کچھ درختوں کے ساتھ بڑی بڑی مشعلیں باندھ دی گئی تھیں تاکہ جنگلی جانور پڑاؤ کا رخ کرنے سے باز رہیں۔ کسی کسی جگہ آگ کے الاؤ بھی روشن تھے اور ان کے گرد ابھی تک منچلے شکاری بیٹھے گپ بازی میں مصروف تھے لیکن یہ سب کچھ جھیل سے ہٹ کر تھا اور حبشی اور اباقہ چونکہ جھیل کے کنارے جا رہے تھے لہٰذا پڑاؤ والوں کی نگاہ سے محفوظ تھے۔ دونوں تاریکی کا سینہ چیرتے آخرکار ایک بڑے خیمے کے سامنے پہنچ کر رک گئے۔

حبشی نے پست آواز میں کہا۔ "یہ ہے سردار مشہدی کا خیمہ۔" پھر اُس نے اپنی بھاری بھرکم کٹار نیام میں ڈالی اور آگے بڑھ کر مشہدی کو آواز دی۔ تھوڑی دیر بعد اس شاندار خیمے کا دروازہ کھلا اور تیس بتیس سال کی ایک خوبصورت عورت نے باہر جھانکا۔ اس کے ہاتھ میں شمعدان تھا اور عقب میں دو بچے نظر آ رہے تھے۔ ایک لڑکی تھی جس کی عمر دس سال رہی ہو گی۔ دوسرا سات آٹھ سالہ لڑکا تھا۔ عورت نے حبشی کو سر تا پا گھورا پھر بولی۔

"جوزف! کیا بات ہے؟"

جوزف نے کہا۔ "مالکن! آقا کدھر ہیں؟"

اُس وقت عورت کی نگاہ حبشی کے عقب میں کھڑے اباقہ پر پڑی اور وہ ٹھٹک گئی۔ تاریکی میں اباقہ کا ننگ دھڑنگ ہیولا اُسے عجب پُراسرار لگا تھا۔ اس نے مشکوک لہجے میں

کہا۔

”تمہیں کیا کام ہے؟“

حبشی نے کہا۔ ”مالکن! اُن کے لئے خاقان محترم کا خصوصی پیغام ہے۔“

عورت کچھ دیر تذبذب میں رہی پھر بولی۔ ”وہ سب لوگ تو سفید محل میں ہیں۔“

”بہت شکریہ مالکن۔“ حبشی نے جھک کر کہا۔ پھر آداب پیش کر کے اباقہ کے پاس آ گیا۔ دونوں پھر جھیل کے کنارے چلنے لگے۔ دس بیس قدم آگے جا کر حبشی نے انگلی سے ایک طرف اشارہ کیا۔ کچھ دور درختوں میں روشنیاں چمک رہی تھیں اور سازوں کی مدھم آواز آ رہی تھی۔ حبشی نے کہا۔

”وہ جگہ سفید محل ہے۔ اس کا ایک چوتھائی حصہ جھیل کے اندر ستونوں پر کھڑا ہے' یہ چغتائی کی تخلیق ہے۔ خاقان کبھی کبھی شام کے وقت اس محل کی چھت سے جھیل کا نظارہ کیا کرتا تھا۔ مشہدی کی بیوی نے بتایا ہے کہ خاقان کا محافظ دستہ اور دستے کا سالار سب اس وقت سفید محل میں ہیں۔ میرا خیال ہے وہاں خاقان کے جشن صحت کے سلسلے میں کوئی تقریب برپا ہے۔ ان لوگوں کو تو رنگ رلیاں منانے کے لئے بس بہانے کی ضرورت ہوتی ہے۔“

حبشی کی باتیں سن کر اباقہ کے پتھریلے چہرے پر درندگی پھیلتی جا رہی تھی۔ جوزف نے کہا۔ ”اباقہ! جہاں تک میں نے اندازہ لگایا ہے تم خاقان کے محافظ دستے سے انتقام لینا چاہتے ہو کیونکہ یہی وہ لوگ تھے جو تمہیں عراق سے گرفتار کر کے لائے تھے اور جنہوں نے تمہارے ساتھیوں کو ہلاک کیا۔ بعد میں خاقان نے انہیں اپنے ذاتی دستے میں شامل کر لیا تھا۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“

اباقہ یکسر خاموش تھا۔ لگتا تھا وہ جوزف کی بات سن ہی نہیں رہا اُس کی نگاہیں دور سفید محل کی روشنیوں کی طرف لگی تھیں اور مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں۔ نتھنے کسی خون آشام جانور کی طرح پھول گئے تھے اور گلے کی رگیں ابھر آئی تھیں۔ یکایک اُس نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور روشنیوں کی طرف بھاگا۔ جوزف ایک لمحے کے لئے ٹھٹکا پھر اُس نے بھی اباقہ کی تقلید کی۔ دونوں آگے پیچھے بھاگتے' درختوں میں گھری ہوئی ایک تنہا عمارت کے سامنے پہنچ کر رک گئے۔ لکڑی اور پتھر کی بنی ہوئی یہ گول عمارت عین جھیل پر واقع تھی۔ اس کا کچھ حصہ جھیل کے اندر ستونوں پر کھڑا تھا۔ اس کے چاروں طرف تھوڑے تھوڑے فاصلے پر دروازے تھے۔ اس وقت اباقہ اور جوزف کو تین دروازے نظر آ رہے تھے۔ دروازوں پر تین محافظ چوکس کھڑے تھے۔ ایک جگہ افسروں اور سپاہیوں کے

گھوڑے بندھے ہوئے تھے اور پانچ چھ آدمی اُن کی نگرانی پر معمور تھے۔ عمارت کی بالائی منزل پر کھڑکیوں میں شیشہ کاری کی گئی تھی۔ شیشوں کے اندر پردے کھنچے ہوئے تھے اور ان پردوں کے پیچھے سے شمعدانوں اور فانوسوں کی روشنی یوں پھوٹ رہی تھی جیسے ہلکے بادلوں کی اوٹ سے چاند جھانکتا ہے۔ عمارت کے اندر سے موسیقی کی پُر شور صدا آ رہی تھی۔ ستار' رباب' دف' جلترنگ سب کچھ بجایا جا رہا تھا اور اس بے ہنگم شور میں منگول افسر اور سپاہی رقاصاؤں کے ساتھ مل کر ناچ رہے تھے۔ اُن کے سائے کھڑکیوں میں تھرک رہے تھے اور اُن کی بہکی ہوئی آوازیں عمارت کے باہر تک پہنچ رہی تھیں۔ پھر یکبارگی یہ ہنگامہ تھم گیا۔ کھڑکیوں میں ناچتے سائے بھی ساکت ہو گئے تب کسی شخص کی مدھم آواز عمارت کے اندر سے ابھری۔

”ایک جام .... خاقان کی درازی عمر کے نام۔“

ایک دوسری آواز ابھری۔ ”ایک جام محبوب ملکہ توراکینہ کے نام۔“

تیسری آواز گونجی۔ ”ایک جام اُن دونوں کی لازوال خوشیوں کے نام۔“

اس کے بعد ایک بار پھر وہی ہنگامہ محشر برپا ہو گیا۔ ساز بجنے لگے اور بدمست سائے کھڑکیوں پر تھرکنے لگے .... دفعتاً اباقہ نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور کسی درندے کی مانند پہریداروں کی طرف جھپٹا۔ اس کا رخ ان پہریداروں کی طرف تھا جو گھوڑوں کی رکھوالی پر کھڑے تھے۔ اس کی تلوار بجلی بن کر پہریداروں پر گری اور اُن میں سے چار کو خاکستر کر گئی۔ باقی دو پہریداروں نے اپنی تلواریں بے نیام کرنا چاہیں مگر اباقہ کے غضب کا سامنا کرنا اب کسی پہریدار کے بس کا روگ نہیں تھا۔ پلک جھپکتے میں اباقہ نے اُن کے جسموں کو زندگی سے محروم کر دیا۔ اس دوران جوزف بھی اپنی جگہ سے حرکت کر چکا تھا۔ اُس نے دروازے پر کھڑے پہریدار کو اپنی وزنی کٹار کا نشانہ بنایا۔ دو پہریدار چلا کر اُس کی طرف بڑھے۔ ایک پہریدار کا وار اس نے جھک کر بچایا اور اس کی کمر پر ایسی کٹار ماری کہ وہ درمیان سے دو لخت ہو گیا۔ دوسرا پہریدار دہشت سے ٹھٹکا۔ ایک لمحے کا توقف اس کی موت بن گیا۔ اباقہ تاریکی سے ابھر کر عفریت کی طرح اس کی گردن سے لپٹ گیا۔ ہڈی چٹخنے کی صدا آئی اور پہریدار کٹے شہتیر کی طرح زمین بوس ہو گیا۔ پہریداروں کے چلانے سے ان کے تین اور ساتھی مخالف سمت سے نکل کر اباقہ اور جوزف کی طرف بڑھے۔ اس کا مطلب تھا عمارت کی دوسری جانب تین دروازے اور تھے۔ ان تین پہریداروں کو بھی اباقہ کی تلوار نے اس طرح چاٹا کہ انہیں ہاتھ اٹھانے کی مہلت نہ ملی .... چند لمحوں میں بارہ منگول خاک اور خون میں لوٹ چکے تھے۔ ان کی آخری کراہیں موسیقی کے

بے ہنگم شور میں دم توڑ چکی تھیں۔ اباقہ پر خون سوار ہو چکا تھا اُس کے حلق سے غراہٹیں نکل رہی تھیں۔ اچانک اُس کی نگاہ چند قدم دور ایک خیمے پر پڑی۔ اس خیمے میں کھانے پینے کا سامان ذخیرہ کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ روغن کے بڑے بڑے برتن بھی نظر آ رہے تھے وہ بھاگتا ہوا خیمے تک پہنچا ایک برتن میں زیتون کا تیل تھا۔ دوسرے میں فانوسوں کے لئے اور تیسرے میں مشعلوں کے لئے روغن تھا۔ اباقہ نے مشعلوں والے روغن کا بڑا برتن کنارے سے تھاما اور اسے گھسیٹتا ہوا دروازے کے سامنے لے آیا۔ حبشی خاموش کھڑا حیرت سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اباقہ آگے بڑھا اور اس نے عمارت کے دروازے کو باہر سے مقفل کر دیا۔ وہ دوسرے دروازے کی طرف بڑھا اور اسے بھی کنڈی چڑھا کر مقفل کر دیا۔ یہی عمل اس نے تیسرے اور چوتھے دروازے کے ساتھ دہرایا۔ چند ہی لمحوں میں وہ عمارت کے تمام دروازے بند کر کے واپس پہلے دروازے پر آ چکا تھا۔ تب اُس نے روغن کے بڑے برتن میں ایک ڈول ڈالا اور اسے روغن سے لبریز کر کے نکال لیا۔ دروازے کے سامنے پہنچ کر اس نے نہایت طاقت سے روغن اچھالا اور بالائی کھڑکیوں تک چھڑکاؤ کر دیا۔ خالی ڈول لے کر وہ دوبارہ بڑے برتن کی طرف لپکا۔ اس کی حرکات و سکنات میں عجب ہولناکی پائی جاتی تھی۔ اس کے ارادے نہایت واضح تھے۔ وہ اس عمارت کو مکینوں سمیت جلا کر راکھ کر دینا چاہتا تھا۔ حبشی جوزف نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"اباقہ' انتقام ضرور لو .... مگر یہ بھی سوچو اس عمارت میں صرف خاقان کے حفاظتی دستے کے ارکان ہی نہیں کچھ اور لوگ بھی ہیں جن میں غلام کنیزیں اور خدمت گار شامل ہیں۔ ممکن ہے اندر موجود رقاصاؤں میں سے بھی کچھ بے گناہ ہوں۔ ان سب لوگوں کے بارے تمہیں سوچنا چاہئے۔"

اباقہ نے اپنے بازو سے حبشی جوزف کو ایسا دھکا دیا کہ وہ دور تک لڑکھڑاتا چلا گیا۔ بغیر ایک لفظ کہے اباقہ پھر روغن کے برتن کی طرف بڑھا اور ڈول میں روغن بھر بھر کر عمارت کے در و دیوار پر چھڑکنے لگا .... تھوڑی ہی دیر میں وہ پوری عمارت پر چھڑکاؤ مکمل کر چکا تھا۔ پھر وہ بھاگتا ہوا بڑے دروازے کے سامنے پہنچا اور چمکدار نظروں سے اردگرد دیکھنے لگا۔ چند گز دور ایک درخت پر مشعل اڑسی ہوئی تھی۔ یہ کوئی پون گز لمبی مضبوط مشعل تھی۔ اباقہ نے پنجوں کے بل اچھل کر یہ مشعل اتاری اس پر تھوڑا سا روغن پھینک کر اسے روشن تر کیا اور جیسے خواب میں چلتا ہوا عمارت کی طرف بڑھنے لگا۔ اندر اُسی طرح ہنگامہ ہائے ہو جاری تھا۔ سفید محل کے کم و بیش چھ سو مکین اپنی طرف

بڑھنے والی موت سے بے خبر اچھل کود میں مصروف تھے۔ اچانک جھاڑیوں میں سرسراہٹ ہوئی اور ایک عورت اباقہ کے پہلو سے نکل کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کے ساتھ دو بچے بھی تھے .... یہ وہی عورت تھی جو تھوڑی دیر پہلے انہیں مشہدی کے یورت (خیمے) میں ملی تھی۔ یہ اُس کی بیوی تھی۔ اُس نے عجیب مشکوک انداز میں اباقہ اور جوزف کو دیکھا۔

"تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" اُس کا سوال تھا۔

اتنے میں اس کی نگاہ زمین پر پڑی اور شعلوں کی روشنی میں اسے پہریداروں کی لاشیں دکھائی دیں۔ اُس کے ہونٹوں سے چیخ نکل گئی۔ وہ جوزف سے بولی۔

"جج .... جوزف' یہ سب کیا ہو رہا ہے؟"

جوزف مجسمے کی طرح ساکت تھا۔ وہ جوزف کو جھنجھوڑنے کے لئے آگے بڑھی مگر اچانک رک گئی۔ نتھنے پھیلا کر وہ کچھ سونگھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ یکایک اس کی بچی عمارت کے دروازے کی طرف انگلی اٹھا کر چیخی۔ "ماں وہ دیکھو۔ انہوں نے محل کی دیواروں پر تیل چھڑک دیا ہے۔ یہ تیل کی بو ہے۔"

عورت پھٹی نظروں سے کبھی تیل آلود در و دیوار اور کبھی اباقہ کی طرف دیکھنے لگی۔ اس نے دیکھا تمام دروازے باہر سے مقفل کئے جا چکے ہیں۔ اچانک وہ زور سے چلائی "نہیں .... نہیں۔" اُس نے جھپٹ کر اباقہ کے ہاتھ سے مشعل چھیننا چاہی مگر اس نے ایسا جھٹکا دیا کہ وہ ایک بچے کو ساتھ لیتی ہوئی دور جا گری۔ مگر گرتے ساتھ ہی وہ پھر اٹھی اور اس نے بھاگ کر اباقہ کے قدم پکڑ لئے۔ "نہیں .... خدا کے لئے نہیں .... خدا کے لئے نہیں۔" اباقہ نے ٹانگیں جھٹک کر اسے دور پھینک دیا۔ وہ چلا چلا کر پہریداروں کو آوازیں دینے لگی لیکن پہریدار نیلے آسمان کے پار اپنے وحشی باپ چنگیز خاں کے پاس پہنچ چکے تھے۔ عورت نے دیکھا کہ چلانے سے کچھ حاصل نہیں تو ایک بار پھر بھاگ کر اباقہ کے قدموں میں گر پڑی۔ اس کی آواز دہشت سے پھٹی ہوئی تھی۔

"یہ کیا کر رہے ہو؟ کیا قیامت برپا کر رہے ہو۔ خاقان کے عذاب سے ڈرو۔ اس کے غضب سے پناہ مانگو۔"

اباقہ نے جیسے اس کی آواز سنی ہی نہیں وہ عورت کو جھٹک کر پھر آگے بڑھا۔ اس دفعہ عورت کے ساتھ ساتھ اس کے بچے بھی اباقہ کی ٹانگوں سے لپٹ گئے اور رونے لگے۔ وہ اپنے باپ کے لئے رحم کی التجائیں کر رہے تھے اور عورت اپنے شوہر کے لئے گڑگڑا رہی تھی۔ وہ سب جونکوں کی طرح اباقہ سے چمٹے ہوئے تھے اور اباقہ قدم قدم

دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا وہ جیسے گونگا اور بہرہ ہو چکا تھا۔ اسے یہ احساس ہی نہیں تھا کہ وہ تینوں اس کے ساتھ گھسٹتے آ رہے ہیں۔ وہ گھسٹ رہے تھے اور بلک رہے تھے .... اور ابھی تو وہ تینوں بلک رہے تھے مگر کچھ دیر بعد بے شمار بیویوں کو بلکنا اور بچوں کو چیخنا تھا .... ان سب کی آہ و بکا بھی ابھی سے فضاؤں میں پھیلتی محسوس ہو رہی تھی۔ عورت چلا چلا کر اب صرف اپنے شوہر کے لئے رحم کی بھیک مانگ رہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی اگر سب کو نہیں تو صرف میرے شوہر کو چھوڑ دو۔ صرف اسے یہاں سے نکل جانے دو۔ مگر اباقہ کے کان اور ہی کچھ سن رہے تھے۔ اس کی نگاہوں میں کچھ اور ہی منظر تھا۔ سلطان جلال کی خون آلود چادر، عبداللہ مشہدی کا منحوس چہرہ اور اس پر سلطانی خون کے چھینٹے .... اور پھر قاسم کی لاش، علی کی پکار، نبیلہ کی فریاد، وفادار ساتھیوں کی جدوجہد۔ وہ قرضوں کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا اور اس بوجھ نے اسے ہر احساس سے بیگانہ کر دیا تھا۔

عمارت کے مکین باہر کے حالات سے قطعی بے خبر اپنے حال میں مگن تھے۔ موسیقی طوفان برپا کر رہی تھی۔ جسم تھرک رہے تھے۔ صراحیاں گردش میں تھیں .... اور پھر اباقہ کا مشعل والا ہاتھ اٹھا اور اس نے چوبی دروازے کو آگ دکھا دی۔ شعلے تیزی سے بلند ہوئے اور انتقام .... انتقام پھنکارتے پھیلنے لگے۔ عورت اور اس کے بچوں نے جب آگ بھڑکتے دیکھی تو اباقہ کی ٹانگیں چھوڑ کر چیختے چلاتے پڑاؤ کی جانب بھاگے۔ اباقہ نہایت خاموشی اور سکون سے ایک ایک دروازے کو آگ دکھاتا چلا گیا۔ مہیب شعلے رنگین پردوں والی کھڑکیوں کو ڈھانپنے لگے۔ آگ کی پھنکاریں موسیقی کے شور سے ہم آہنگ ہونے لگیں۔ اباقہ الٹے پاؤں واپس مڑا اور حبشی جوزف کے پہلو میں پتھر کی طرح خاموش کھڑا ہو گیا۔ شعلوں کا عکس اس کے سنگلاخ چہرے پر منعکس ہو رہا تھا۔ آنکھیں کسی اتھاہ گہرائی میں اتری ہوئی تھیں۔ دفعتاً ساز تھم گئے اور ان کی جگہ انسانی چیخیں ابھرنے لگیں۔ پھر دھیرے دھیرے یہ چیخیں بلند سے بلند ہوتی چلی گئیں۔

ناگاہ ایک نامانوس شور نے اباقہ کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ اس نے گھوم کر دیکھا۔ جھیل کی جانب سے بہت سے لوگ ان کی طرف بھاگے آ رہے تھے۔ ان میں منگول لشکر کے سپاہی بھی تھے اور عام افراد بھی۔ ان کے ہاتھوں میں پانی کے مشکیزے، ڈول اور دوسرے برتن تھے۔ وہ "آگ آگ" چیخ رہے تھے اور اسے بجھانے کے لئے لپک رہے تھے۔ اباقہ نے مشعل پھینکی اور تلوار سونت کر ان کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"خبردار!" اس کے حلق سے دل ہلا دینے والی چنگھاڑ نکلی۔ "کوئی آگے نہ بڑھے۔"

ان میں سے مسلح افراد آگے بڑھے مگر اباقہ نے ان پر ایسی درندگی سے حملہ کیا کہ

ایک ہی ہلے میں انہیں سینکڑوں قدم پیچھے دھکیل دیا۔ اس مرحلے میں حبشی جوزف بھی اس کا پورا ساتھ دے رہا تھا۔ اس نے ایک مردہ پہریدار کا تیر کمان حاصل کیا اور درختوں کی اوٹ سے آگے بڑھنے والوں پر تیروں کی بوچھاڑ کر رہا تھا۔ معمولی مزاحمت کے بعد آگ بجھانے والے پسپا ہو گئے اور مدد کے لئے پڑاؤ کی طرف بھاگے۔ کچھ عورتیں اور بچے فاصلے پر کھڑے ہو کر ماتم کرنے لگے۔ ہاں یہ ماتم کا وقت تھا۔ کچھ کرنے کا وقت اب گزر چکا تھا، سفید محل آگ کے محل کا روپ دھار چکا تھا۔ شعلوں کی پھنکاروں کے سوا کوئی صدا نہیں تھی، کوئی حرکت نہیں تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس عمارت میں کبھی کوئی انسان تھا ہی نہیں۔ ان گول دیواروں کے اندر جو کچھ بھی تھا وہ نہایت خاموشی سے ختم ہو رہا تھا۔ قراقرم کے مانے ہوئے جنگجو جن میں سے ہر ایک، ایک قیامت تھا، حسین رقاصائیں، خوبصورت غلام، بیش قیمت پردے، نفیس ظروف، شراب کی صراحیاں، ساقی، ساز، سازندے، سب کچھ آگ کا رزق بن رہا تھا۔ آگ کے شعلے ان چار سو وحشیوں کی لاشوں پر مسرت کا رقص کر رہے تھے جنہوں نے آج سے قریباً دو برس پہلے عراق کے سرحدی گاؤں میں سفاکی کی انتہا کر کے اباقہ کی دیوانگی کو للکارا تھا .... اس کے جنون کو آواز دی تھی۔

☆ ——— ☆ ——— ☆

سفید محل جل کر بجھ گیا۔ چوہے کا ایک بچہ بھی اس میں سے باہر نہ نکل سکا۔ تاریک فضاؤں میں دھواں اور جلے ہوئے گوشت کی باس رہ گئی .... اور اب اباقہ اور جوزف کو تین اطراف سے منگول گھیر چکے تھے۔ جنگل ان کی مشعلوں سے روشن تھا۔ وہ دونوں ایک پہاڑی کھوہ میں مورچہ جمائے بیٹھے تھے۔ انہوں نے اپنے گھوڑے بھی اس تنگ کھوہ میں داخل کر لئے تھے۔ ان کے پاس بارہ ترکشوں کے تیر اور دو درجن نیزے تھے۔ ان ہتھیاروں سے وہ صبح تک دشمن کو خود سے دور رکھ سکتے تھے۔ مگر وہ صبح کی آمد کا انتظار نہیں کر سکتے تھے۔ انہیں اس سے پہلے ہی دشمن کے نرغے سے نکل جانا تھا .... یا بہادری سے لڑتے ہوئے جان دے دینا تھی۔ کھوہ میں فروزاں مشعل کی روشنی میں اباقہ نے عجیب نظروں سے جوزف کا چہرہ دیکھا اور دیکھتا چلا گیا۔

جوزف نے اس کا انداز بھانپ کر کہا۔ "میری صورت جانی پہچانی لگ رہی ہے؟"

اباقہ اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔ جوزف نے غیر معمولی انداز سے کہا۔ "مجھے پہچانا نہیں؟"

اباقہ نے نفی میں سر ہلا دیا۔ اچانک جوزف کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔ وہ لرزاں آواز میں بولا۔ "میرے یار اتنی جلدی بھول گئے۔"

اچانک اباقہ کا سنگلاخ چہرہ اپنی سختی کھو بیٹھا۔ وہ حیرت ناک نگاہوں سے جوزف کا چہرہ دیکھتا چلا گیا۔

”تت .... تیری آواز۔“ اُس کے ہونٹوں سے سرگوشی برآمد ہوئی۔

جوزف نے پتھر میں گڑی مشعل اکھاڑی اور اُسے اپنے چہرے کے بالکل قریب لے آیا۔ اباقہ کو پہلی دفعہ اُس کا چہرہ غور سے دیکھنے کا موقعہ ملا۔ اس کی گردن اور ٹھوڑی پر زخم کا ایک گہرا نشان تھا۔ آنکھوں میں عجیب سی شناسائی تھی۔ دفعتاً تلوار اباقہ کے ہاتھوں سے پھسلی اور چھناکے سے پتھروں پر جا گری۔ وہ اس کی طرف انگلی اٹھا کر ہکلایا۔

”تت تم .... تم .... اسد ہو؟“

یکایک حبشی کی آنکھوں سے آنسوؤں کے سوتے پھوٹ پڑے اس نے اپنے دونوں بازو پھیلا دیئے۔ اباقہ کے بازو بھی خود بخود کھل گئے۔ پھر وہ دونوں لپک کر ایک دوسرے سے پیوست ہو گئے۔

”اسد .... اسد۔“ اباقہ بے قراری سے بولا۔ ”تُو زندہ ہے؟“

”ہاں میرے یار! میں زندہ ہوں۔“ اسد گلوگیر لہجے میں بولا۔

اچانک اباقہ کی بے حسی ختم ہو گئی۔ اُس کی چپ ٹوٹ گئی۔ وہ اسد کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ایک ایسے معصوم بچے کی طرح جو بہت دن بعد بچھڑنے والوں سے ملا ہو۔ اس کا غضب اور قہر آنسوؤں میں ڈھل ڈھل کر اسد کے شانے کو بھگونے لگا۔ اس کے اشکوں کی روانی اسد کی گردن کی نقلی سیاہی کو دھونے لگی۔ بہت دیر بعد وہ ایک دوسرے سے جدا ہوئے تو دونوں کی آنکھیں غم کے بوجھ سے سرخ تھیں۔ عین اس وقت پہاڑی کھوہ سے باہر منگول ان کے گرد گھیرا تنگ کرنے لگے۔ مشعلوں کا ایک وسیع دائرہ بناتے وہ قدم قدم کھوہ کی طرف بڑھنے لگے۔ اباقہ نے متحرک شعلوں کو دیکھا تو اس کے جبڑے بھینچ گئے۔ اس نے کہا۔

”اسد! سوال تو بے شمار ہیں، لیکن ہمارے حرکت میں آنے کا وقت آ گیا ہے۔“

اسد نے گلوگیر آواز میں کہا۔ ”اباقہ تُو میرے ساتھ ہے تو پھر یہ تین چار سو منگول کیا ان کا پورا لشکر بھی میرا راستہ نہیں روک سکتا۔“

اباقہ نے اسد کی ہمت دیکھی تو اس کا حوصلہ آسمان کو چھونے لگا۔ اس نے اسد کا ہاتھ مضبوطی سے دبایا اور کہا۔ ”ٹھیک ہے اسد! صبح کا اجالا، ہمیں نیلی جھیل سے سو کوس دور دیکھے گا۔“

”انشاء اللہ العزیز۔“ اسد نے مضبوط لہجے میں کہا۔

اباقہ نے پتھر سے تلوار اٹھائی۔ اسد نے نیام سے کٹار نکالی۔ پھر دونوں نے اظہارِ محبت کے طور پر اپنے ہتھیار بدلے اور طے شدہ منصوبے کے تحت اپنے اپنے گھوڑے پر بیٹھ گئے۔ کھوہ کی بلندی کم تھی اس لئے انہیں گھوڑوں کی پشت سے چپک جانا پڑا۔ مشعل کو اسد پہلے ہی بجھا چکا تھا۔ وہ کھوہ کی تاریکی میں دم سادھ کر منگولوں کے قریب آنے کا انتظار کرنے لگے۔ منگول نیم دائرے کی شکل میں لحہ بہ لحہ کھوہ کی سمت بڑھ رہے تھے۔ وہ اب اتنے نزدیک آ چکے تھے کہ ان کی مشعلوں کی چرچراہٹ اور ہتھیاروں کی کھنک اسد اور اباقہ کو صاف سنائی دے رہی تھی۔ وہ بڑے محتاط طریقے سے آگے بڑھ رہے تھے۔ تاریکی سے اُبھرنے والی آوازوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان کے ساتھ کچھ چھکڑے ہیں اور وہ ان کی آڑ لیتے ہوئے آ رہے ہیں۔ آخر اباقہ اور اسد کو منگول کماندار کی گرجدار آواز سنائی دی۔

”اباقہ! تجھے اور تیرے ساتھی کو چاروں طرف سے گھیرا جا چکا ہے اگر تُو چند لمحوں میں کھوہ سے نہ نکلا تو ہمیں تمہیں اندر ہی جلا کر راکھ کر دیں گے۔“

اباقہ اور اسد خاموش رہے۔ وہ اپنے گھوڑوں کی گردنوں کو مسلسل سہلا رہے تھے تاکہ وہ ہنہنانے سے باز رہیں .... تھوڑی تھوڑی دیر بعد منگول کماندار نے اپنی دھمکی تین دفعہ دہرائی مگر اباقہ اور اسد کی طرف سے کوئی ردعمل ظاہر نہیں ہوا حالانکہ اگر وہ چاہتے تو آٹھ دس منگولوں کو باآسانی تیروں سے چھلنی کر سکتے تھے۔ بالآخر منگول یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ کہیں اباقہ انہیں چکمہ دے کر نکل تو نہیں گیا؟ وہ محتاط انداز سے چند قدم مزید آگے آئے۔ ان کی مشعلوں کی روشنی اب کھوہ کے ایک حصے کو روشن کرنے لگی تھی۔ شاید وہ کھوہ میں جھانکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ [illegible] اسد نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور لگامیں ڈھیلی چھوڑ کر [illegible] وڑوں کو ایڑ لگا دی۔ مشکی گھوڑے جھٹکے سے آگے بڑھے اور ایک ساعت میں رفتار پکڑ کر تند بگولے کی طرح کھوہ سے نکلے۔ یہ سب کچھ اتنا اچانک تھا کہ محاصرہ کرنے والے ہکا بکا رہ گئے۔ پیشتر اس کے کہ وہ کچھ کر سکتے اباقہ کی کٹار اور اسد کی تلوار بجلی بن کر اُن پر گری اور کئی آدمیوں کو جہنم واصل کر گئیں۔ اپنے زور میں وہ گھیرا توڑ کر نکلے اور گھوڑوں کو بھگاتے چلے گئے۔ وہ سو دو سو قدم دور گئے تھے کہ منگولوں کے عقبی دستے سے واسطہ پڑ گیا۔ رات کے برف پوش اندھیروں میں نعرۂ تکبیر کی ولولہ انگیز صدا بلند ہوئی .... گھوڑے ہنہنائے، تلواریں ٹکرائیں اور ایک زبردست معرکہ شروع ہو گیا۔ اباقہ اور اسد کے مقابل کم و بیش تیس منگول تھے اور ان دونوں کی کامیابی اسی میں تھی کہ وہ جلد از جلد اُن کے نرغے سے نکل

جائیں۔ منگول ٹوٹ ٹوٹ کر اباقہ پر آ رہے تھے اور اسے ہر صورت زیر کرنا چاہتے تھے مگر وہ یہ بھی جانتے تھے کہ یہی وہ جنگجو ہے جس کی کمان میں لڑنا وہ کبھی اپنے لئے قابل فخر سمجھتے تھے۔ وہ اس کی قہر سامانیوں اور خوں ریزیوں سے آگاہ تھے۔ ان کے شامان اور جادوگر انہیں برسوں سے بتاتے آئے تھے کہ اباقہ کے جسم میں شیطانی ارواح حلول کر چکی ہیں اور اس کا جسم اذیت کے احساس سے بیگانہ ہو چکا ہے۔ وہ اپنی حکایتوں میں اسے ایک مافوق الفطرت انسان کے طور پر پیش کرتے ہیں اور آج وہی مافوق الفطرت انسان کھلے میدان میں ان کے مقابل تھا' ان کے ذہنوں پر خوف مسلط ہو رہا تھا اور بازو شل ہوتے جا رہے تھے .... اباقہ اور اسد نے سر دھڑ کی بازی لگا دی اور اس تنگ گھاٹی کو منگولوں کی لاشوں کا قبرستان بنا دیا۔ اس سے پیشتر کہ ہراول صف ان کا تعاقب کرتی ہوئی پہنچتی' اباقہ اور اسد نے ایڑ لگائی اور ان کے گھوڑے سموں سے چنگاریاں چھوڑتے رات کے اندھیرے میں روپوش ہو گئے .... منگول سوار بدحواسی میں اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے اور ان کے تاریک سایوں کے پس منظر میں نیلی جھیل کے کنارے سفید محل کی راکھ سلگ رہی تھی۔

☆------☆------☆

12 دسمبر کے بھیدوں بھرے سورج نے اباقہ اور اسد کو دریائے کیرولان کے کنارے گھنے درختوں میں دیکھا۔ انہوں نے اپنے ہانپتے ہوئے گھوڑے گھاس پر منہ مارنے کے لئے چھوڑ دیئے تھے اور خود باتوں میں مصروف تھے۔ اسد کہہ رہا تھا۔

".......... میں آٹھ پہر بے ہوش رہنے کے باوجود زندہ رہا۔ میری آنکھ کھلی تو منگول گاؤں کو خاکستر کر کے جا چکے تھے۔ میں نے سلیمان' یورق' شیزی اور قاسم کی لاشیں دفن کیں اور ایک گھوڑا لے کر خوارزم کی طرف روانہ ہو گیا۔ مگر میرے زخم شدید تھے اور مجھے قریباً ایک ماہ خوارزم میں رک کر علاج کروانا پڑا۔ صحت یابی کے بعد میں نے حبشی کا بھیس بدلا اور قراقرم کا رخ کیا۔ یہاں میں جوزف کے نام سے غلاموں کے گروہ میں شامل ہو گیا۔ مجھے معلوم تھا تمہیں کہاں رکھا گیا ہے لیکن تمہیں وہاں سے نکالنا میرے بس میں نہیں تھا۔ میں خاموشی سے وقت کا انتظار کرتا رہا۔ ایک روز مجھے معلوم ہوا کہ خاقان کے محل کے سامنے مجرموں کو سزائیں دی جا رہی ہیں۔ میں وہاں پہنچا تو نبیلہ کو مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا پایا۔ خاقان اوغدائی اس پر درندگی کی انتہا کر دینا چاہتا تھا۔ مگر میں نے اسے بچا لیا۔

اباقہ کی آنکھوں میں چمک ابھری۔ "تو .... نبیلہ زندہ ہے؟"

اسد نے مایوسی سے کہا۔ "نہیں .... میں نے اُسے صرف ذلت آمیز موت سے بچایا۔ ہماری اس غیور بہن نے خاقان کے منہ پر تھوک دیا تھا۔ میں نے اسے اپنے ہاتھ سے قتل ڈالا اور ان عذابوں سے بچا لیا جو اس پر ٹوٹنے والے تھے۔ خاقان نے میرے اس فعل کو میری "حاضر جوابی" قرار دیا اور بہت خوش ہوا۔ بعد ازاں میں درجہ بدرجہ ترقی کرتا اس کے ذاتی محافظوں میں شامل ہو گیا۔ پھر ایک وقت ایسا آیا جب مجھے اس کی حفاظت کے لئے منتخب کر لیا گیا۔ خاقان مجھ پر بہت مہربان تھا اور انعامات سے نوازتا رہتا تھا مگر اس کا ہر انعام میرے سینے میں ایک تیر کی طرح لگتا تھا۔ میں شب و روز اس جستجو میں تھا کہ کس طرح تمہیں اس عقوبت خانے سے نکال سکوں .... کوشش کے ساتھ میں رات دن دعاؤں میں بھی مصروف رہتا تھا' آخر قدرت کو میری حالت پر رحم آیا اور طویل آزمائش کے بعد کل رات میں نے تمہیں تلوار بدست خاقان کی خوابگاہ میں کھڑے پایا۔ اُس وقت تم پر جنون کی کیفیت طاری تھی۔ میں نے تم پر اپنی اصلیت ظاہر کرنا مناسب نہیں سمجھا اور جوزف کے طور پر تمہارے ساتھ رہا یہاں تک کہ ہمارا "کام" مکمل ہو گیا۔ کیا میں نے غلط کہا تھا کہ تمہاری اور میری منزل ایک ہے؟"

اباقہ خاموشی سے اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔ اسد نے ایک گہری سانس لی۔ سورج اب افق سے بلند ہو گیا تھا۔ دریا پر جا کر اسد نے اچھی طرح مل مل کر چہرہ دھویا اور تمام کالک اتار دی۔ پھر اس نے اپنے سر کے گھنگھریالے بالوں کو بھی دھو ڈالا۔ پوستین سے رگڑ کر اس نے چہرہ صاف کیا تو چمکتا دمکتا اسد اباقہ کے سامنے تھا۔ صرف ٹھوڑی پر تلوار کا ایک گہرا زخم تھا مگر یہ زخم بھی بہت جلد اُس کی خوبصورت داڑھی میں چھپ جانے والا تھا۔ اسد نے گھوڑے کی خرجین سے خشک گوشت کا ایک ٹکڑا نکالا اور اُسے دو حصوں میں تقسیم کر کے ایک حصہ اباقہ کی طرف بڑھا دیا۔ اباقہ نے انکار میں سر ہلا کر گوشت واپس کر دیا۔ اسد کچھ دیر گہری نظروں سے اسے دیکھتا رہا' پھر بولا۔

"اباقہ! میں ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں۔ شام یا رات تک واپس آ جاؤں گا۔ یہ جگہ محفوظ ہے۔ تم یہیں پر میرا انتظار کرو گے۔"

اباقہ نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ اسد بولا۔ "میں تمہیں تھوڑا سا حیران کرنا چاہتا ہوں۔ اس لئے یہ نہیں بتاؤں گا کہ کہاں جا رہا ہوں۔ امید ہے تم رات تک صبر کرو گے۔"

اباقہ خالی نظروں سے اس کا چہرہ تکتا رہا۔ اسد نے چند نوالے لینے کے بعد گھوڑا سنبھالا اور دریا کے ساتھ ساتھ مشرق کی طرف روانہ ہو گیا۔ ایک لاکھ خیموں کا شہر قراقرم

اسی رخ پر تھا۔

.... اسد کی واپسی اگلے روز صبح سے پہلے نہیں ہوئی۔ اباقہ اس وقت ایک درخت پر ٹہنیوں کی مچان بنا کر سو رہا تھا۔

اچانک اس کے حساس کانوں نے گھوڑوں کی ٹاپیں سنیں۔ اس نے آنکھیں کھولیں تو نگاہ سیدھی اسد پر پڑی۔ مگر اسد کے عقب میں اسے جو کچھ نظر آیا اس نے اسے ہلا کر رکھ دیا۔ وہ سکتے کی حالت میں یک ٹک دیکھتا چلا گیا .... اسد کے عقب میں علی اور مارینا کھڑے تھے۔ اباقہ کو یہ منظر خواب کا حصہ لگ رہا تھا' مگر یہ خواب نہیں تھا۔ وہ دونوں اس کے سامنے تھے .... وہ جست لگا کر درخت سے نیچے آیا اور دیوانہ وار علی کی طرف بھاگا۔ علی "بھائی جان۔" پکارتا ہوا اس سے لپٹ گیا۔ اباقہ وارفتگی میں اس کے گالوں اور سر پر بوسے دینے لگا۔ علی بھی کیکڑے کی طرح اس سے چمٹا ہوا تھا۔ بہت دیر بعد جب وہ جدا ہوئے تو اباقہ کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔ ان آنسوؤں کی اوٹ سے اس نے مارینا کو دیکھا۔ وہ گلبدن سیاہ چشم' پری چہرہ ایک موٹی اوڑھنی میں خاموش کھڑی تھی۔ اس اوڑھنی میں اس کا حسین' باوقار چہرہ بادلوں کا چاند نظر آ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا' نہ غمی کا نہ خوشی کا۔ وہ اباقہ کو دیکھ نہیں رہی تھی۔ اس کی آواز سن نہیں رہی تھی مگر سن بھی رہی تھی۔ اباقہ نے لرزاں لہجے میں اسد سے کہا۔

"اسد یہ سب کیا ہے۔ یہ دونوں تم تک کیسے پہنچے؟"

اباقہ کے اس سوال کا جواب اسد اللہ نے اس وقت دیا جب وہ اپنا خیمہ گاڑنے کے بعد درختوں کے نیچے دسترخوان بچھا کر ناشتہ کرنے کے لئے بیٹھے۔

اسد اللہ نے کہا۔ "اباقہ نبیلہ کی شہادت سے پہلے ایک روز خاقان کے محل کے سامنے شادیوں کی شش ماہی محفل برپا تھی۔ اس میں مارینا کو ایک ادنیٰ کنیز کے طور پر لایا گیا تھا۔ میں نے جوزف کے روپ میں مارینا کے حصول کا مقابلہ جیتا اور اسے خاقان کے عتاب سے بچا کر اپنے ساتھ لے گیا۔ جہاں تک علی کا تعلق ہے اس کے بچاؤ میں میرا کوئی ہاتھ نہیں' اس نے خود اپنے آپ کو بچایا ہے۔ صحت یاب ہونے کے بعد یہ بیمارستان سے فرار ہو گیا تھا۔ قراقرم کے حکام میں جب یہ مشہور ہوا کہ اباقہ کے ساتھ گرفتار ہونے والا بچہ روپوش ہو گیا ہے تو اس کی تلاش میں جس شخص نے سب سے زیادہ سرگرمی دکھائی وہ میں تھا۔ اس سرگرمی کے نتیجے میں' میں نے اس کا سراغ لگا لیا۔ یہ بڑی ہوشیاری سے بیمارستان کے اندر ہی ایک تہہ خانے میں چھپا ہوا تھا۔ میں نے اسے وہاں سے برآمد کیا اور نہایت حفاظت سے اپنے گھر لے آیا .... جہاں یہ قریباً ڈیڑھ برس تک نہایت خاموشی

سے مارینا کے ساتھ رہا ہے۔"

کھانے کے بعد اسد اباقہ اور علی میں باتوں کا طویل سلسلہ شروع ہوا۔ تلخ و شیریں حکایتیں' مہربان واقعات۔ وہ ایک دوسرے کو اپنے حالات سے آگاہ کرتے رہے۔ مارینا نے اس گفتگو میں بہت کم حصہ لیا۔ بس کبھی کبھار وہ اسد کی کسی بات کا مختصر جواب دے دیتی تھی........... باتوں کا یہ سلسلہ ظہر کے وقت ختم ہوا۔ نماز ادا کرنے کے بعد اسد نے گھوڑوں کی خرجینوں میں موجود خوراک کا اچھی طرح جائزہ لیا اور ایک کاغذ تھامے اباقہ مارینا اور علی کے پاس چلا آیا۔ اس نے اباقہ سے کہا۔

"اباقہ! جیسا کہ میں نے تجھے بتایا تھا۔ خاقان مجھ پر بے حد مہربان تھا۔ میں نے ایک خوشگوار موقعے پر اس سے ایک اجازت نامہ حاصل کیا تھا۔ اس کے نامے کی رو سے میں کسی بھی بھیس اور نام کے ساتھ سلطنت تاتار کے طول و عرض میں سفر کر سکتا ہوں۔ میرا خیال ہے یہ اجازت نامہ ہمارے بہت کام آئے گا۔ خاقان کی موت کے بعد راستے کی چوکیوں پر نگرانی کے انتظامات بہت سخت کر دیے گئے ہیں۔ میں دیکھ کر آ رہا ہوں کہ ڈاک کے راستے بند کر دیے گئے ہیں۔ مسافروں کو سراؤں میں روک لیا گیا ہے۔ کسی تاجر یا اجنبی کو قراقرم کے دروازوں سے اندر آنے کی اجازت نہیں۔ ان ساری پابندیوں کے باوجود میں مارینا اور علی کو قراقرم سے لے آیا ہوں تو یہ اس اجازت نامے ہی کا کمال ہے .... میں چاہتا ہوں کہ اس اجازت نامے کے ساتھ ہم یہاں سے براستہ تبت کاشغر پہنچیں اور وہاں سے غزنی کا رخ کریں۔ اس وقت ہمارے لیے بہترین جائے قیام وہی ہے۔ تم لوگوں کا کیا خیال ہے؟"

اباقہ اور مارینا بالکل خاموش رہے۔ ان کی خاموشی نے اسد کو غمگین کر دیا۔ اسے محسوس ہوا کہ ان دونوں کی سوچیں اس سے بہت مختلف ہیں۔ تاہم اس نے جی کڑا کر کے اپنا سوال دہرایا تو مارینا خاموشی سے اٹھی اور خیمے میں چلی گئی۔ اباقہ گردن جھکائے کسی اور ہی سوچ میں غرق تھا۔ اسد اپنی جگہ کھڑا سوچتا رہا۔ وہ جانتا تھا۔ مارینا اور اباقہ کے دلوں میں وسیع خلیج حائل ہو چکی ہے اس نے ان ڈیڑھ سالوں میں یہ خلیج پاٹنے کی بہت کوشش کی تھی۔ وہ اکثر باتوں باتوں میں مارینا سے اباقہ کا ذکر کرتا تھا اور کوشش کرتا تھا کہ اباقہ کے بارے اس کے دل کی میل نکل جائے۔ کبھی بھائی بن کر اسے سمجھاتا تھا اور کبھی سہیلی کا لہجہ اختیار کرتا تھا۔ ایک روز مارینا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ اس نے کہا تھا' اسد تم جانتے ہو اباقہ نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا؟ اس لیے کہ میں شادی شدہ تھی اور وہ کنوارہ تھا۔ اس نے اپنی شادی کر کے مجھے یہ احساس دلایا کہ میں اس کے قابل نہیں تھی۔ کاش

وقت نے میری دوشیزگی نہ چھینی ہوتی اور میں اس کی وفاؤں کی مستحق ٹھہر سکتی۔ اسد نے ماریتا کو سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ وہ غلط انداز میں سوچ رہی ہے۔ اباقہ دنیا کی حسین ترین لڑکیوں کو اس کی محبت پر قربان کر سکتا ہے۔ مگر ماریتا کے دل میں جو گرہ پڑ چکی تھی وہ کسی صورت نہیں کھلی تھی۔ اس روز ماریتا نے اسد سے دو ٹوک الفاظ میں کہا تھا۔

"اسد' تم میرے بھائی ہو لیکن اگر تم آئندہ میرے سامنے اس کا نام لو گے تو میں تمہیں چھوڑ کر چلی جاؤں گی۔"

اس دن کے بعد اسد نے ماریتا سے اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کی تھی۔ اس واقعے کو تین چار ماہ گزر چکے تھے اور آج اسد کا دل چاہ رہا تھا کہ صرف ایک بار اور آخری بار ماریتا سے یہ بات ضرور کرے۔

دسترخوان سے اُٹھ کر وہ بوجھل قدموں سے چلتا خیمے میں پہنچا تو ماریتا گھٹنوں پر سر جھکائے دری پر خاموش بیٹھی تھی۔

اسد نے کہا۔ "ماریتا' مجھے تمہاری قسم آج کے بعد میں کبھی اس سلسلے میں بات نہیں کروں گا۔ مگر خدا کے لئے آج میرے بات سن لو۔ قدرت نے ہمیں کتنے امتحانوں سے گزارنے کے بعد پھر ایک جگہ اکٹھا کیا ہے۔ کیا ہم اپنی نادانیوں سے یہ موقع ہمیشہ کے لیے کھودیں گے؟ .... دیکھو ماریتا رب العزت نے ہم پر بہت بڑا انعام کیا ہے۔ ہم زندہ ہیں اور ایک دوسرے کے سامنے ہیں۔ ہم ہاتھوں میں ہاتھ ڈالیں تو ایک نئی زندگی ہمارا استقبال کر سکتی ہے۔ عراق کے اس گاؤں میں ہم نے جیسا گھر گنوایا تھا ویسا ہی ایک گھر ہمیں غزنی میں پھر حاصل ہو سکتا ہے۔ اسے ویسے ہی پھولوں سے سجا سکتے ہیں اور زیتون کے پیڑ پر ویسے ہی جھولا ڈال سکتے ہیں۔ تم' علی' اباقہ اور میں' میری بیوی ہاجرہ بھی وہاں ہو گی اور میرا بیٹا عثمان بھی۔ وہ دونوں ہمیں نبیلہ اور قاسم کی کمی محسوس نہیں ہونے دیں گے۔ بلخ میں میرا ایک خوش ذوق اور خوش مزاج ملازم نصیرالدین ہے۔ وہ یورق کی عمر کا ہے اور ویسا ہی لحیم شحیم۔ اسے دیکھ کر ہم یورق کا غم بھول جائیں گے۔ پھر آہستہ آہستہ ہمارے ٹوٹے خواب جڑنے لگیں گے' ہمارے زخم بھرنے لگیں گے .... دیکھو میری بہن صرف ایک بار اپنے فیصلوں پر نظرثانی کر لو .... ایک نئی اور تازہ بہار ہماری منتظر ہے۔"

ماریتا یکسر خاموش رہی۔ اچانک خیمے کا پردہ ہلا اور اباقہ اندر داخل ہوا۔ علی اس کے ساتھ تھا۔ اباقہ کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔ ان تاثرات نے اسد کے ذہن میں نئے وسوسے جگا دیے۔ اباقہ آہستگی سے اسد کے سامنے بیٹھ گیا۔ پھر اس نے اپنی تلوار اور

ترکش کے علاوہ وہ چھوٹا سا گھسا ہوا خنجر بھی اسے دے دیا جس سے اس نے قراقرم کی اندھی کوٹھڑی میں آزادی کا راستہ بنایا تھا۔ اپنے گھوڑے کی خرجین وہ پہلے ہی اسد کے حوالے کر چکا تھا۔ تلوار' ترکش اور خنجر دیکھ کر اسد نے حیرانی سے پوچھا۔ "یہ سب کیا ہے؟"

"میں واپس جا رہا ہوں۔" اباقہ نے سر جھکائے جھکائے کہا۔

"کہاں؟" اسد بولا۔

"جہاں سے آیا تھا .... کوہ الطائی کے جنگل میں۔"

"کیا کہہ رہے ہو اباقہ۔ تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے۔"

اباقہ نے آزردہ لہجے میں کہا۔ "ہاں دماغ ہی تو خراب تھا اسد۔ جو اتنے برس خود بھی مصیبت میں مبتلا رہا اور تمہیں بھی رکھا۔ کیا حق پہنچتا تھا مجھے۔ تمہیں جنگ میں جھونکنے کا اور دربدر بھٹکانے کا .... کوئی حق نہیں پہنچتا تھا۔ بے وقوف تھا میں جو جنگجو اور بہادر کہلانے کے شوق میں اپنے ساتھ ساتھ تمہاری زندگیاں بھی داؤ پر لگاتا رہا۔ مجھے معاف کر دینا اسد۔ میں کم عقل تھا' جنگلی تھا اس لیے سلطان معظم کی باتیں سن سن کر جذباتی ہو گیا۔ یہ سمجھنے لگا کہ میں اکیلا ہی اسلام کی کوئی خدمت کر سکتا ہوں۔ منگولوں سے ٹکرا سکتا ہوں اور انہیں نیست و نابود کر سکتا ہوں .... کیا معلوم تھا کہ اس کوشش میں میں اپنے پرائے سب کو دشمن کر لوں گا۔ میں دنیا کا ناکام ترین انسان ہوں اسد۔ بتاؤ کون سی کامرانی ہے میرے حساب میں۔ میری ناکامیوں کی انتہا یہ ہے کہ زمین میرے لیے تنگ ہو گئی ہے۔ کوئی مجھے قبول کرنے کو تیار نہیں لہٰذا میرا واپس جانا ہی بہتر ہے۔" ایک پل رک کر اس نے آنسو ضبط کیے اور بولا۔ "ماریتا! تُو بھی مجھے معاف کر دینا۔ میری نادانیوں نے تجھے بھی بہت دکھ دیے ہیں۔ جو سلوک تُو مجھ سے کر رہی ہے خدا کی قسم میں اسی قابل تھا۔ میری بے شکلی اور بے عقلی پر اس سے زیادہ مہربانیاں اور کی بھی نہیں جا سکتیں۔ میرا وعدہ ہے ماریتا .... میں تجھے اپنی اچھی دعاؤں میں ہمیشہ یاد رکھوں گا۔ تُو جب میرے خوابوں میں آئے گی میرا سر تیرے سامنے جھکا رہے گا۔ میں تیرا گناہگار ہوں۔ بہت اکیلا تھا نا۔ کبھی پیار نہیں ملا تھا۔ تمہیں دیکھا تو پاگل ہو گیا۔ اپنے ساتھ ساتھ تمہیں بھی کانٹوں میں گھسیٹتا رہا۔ مجھے معاف کر دینا ...."

اسد چیخا۔ "اباقہ! یہ کیا کہہ رہا ہے۔ ہم بھلا تجھے جانے دیں گے' خدا کی قسم نہیں۔ ابھی تیری تلوار کی ضرورت قراقرم سے بغداد اور مصر تک ہے۔ ابھی تیرے بازوؤں کا سہارا ہر مسلمان سپاہی کو درکار ہے۔ کون کہتا ہے کہ تُو ناکام ہے کس کو تیری بہادری پر شبہ

ہے۔ ان حکمرانوں اور گدی نشینوں کو چھوڑ۔ عام آدمی کی بات کر۔ آمیں تجھے' بغداد اور بصرہ کی گلیوں میں لے جاؤں اور دکھاؤں کو لوگ تجھے کیا سمجھتے ہیں۔ تیری کہانیاں ان کے لبوں پر اور تیری یاد ان کے دلوں میں ہے۔"

اباقہ کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ اُبھری۔ "نہیں اسد!" وہ پُر عزم لہجے میں بولا۔ "مجھے اور فریب نہ دے۔ تیرے کہنے سے ایک پتھر' ہیرا نہیں بن جائے گا۔ میں ایک ناکام شخص ہوں اور رہوں گا .... ہاں میں کوشش کروں گا کہ کسی اور شخص کو وہ بنا سکوں جو میں نہیں بن سکا .... میں علی کو اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔ مجھے امید ہے میں کمزور ٹانگوں والے اس لڑکے .... کو ایک جری بہادر کا روپ دے سکوں گا۔ پھر ایک روز .... یہ کوہ الطائی کے ویرانے سے تمہاری دنیا میں آئے گا اور کسی تمہارے جیسے اسد کے ساتھ مل کر مسلمانوں کا دست و بازو بنے گا۔ میں دعا کرتا ہوں اور تم بھی کرنا کہ اسے خاقان اوغدائی جیسے کافر تو ملیں مگر خلیفہ مستنصر جیسے مسلمان نہ ملیں۔"

اچانک اسد اُٹھ کر اباقہ سے لپٹ گیا اور اس کے گالوں کو بوسے دیتا ہوا بولا۔ "یہ کیا کہہ رہے ہو میری جان۔ یہ کیا سوچ لیا ہے تم نے؟"

اباقہ نے اسد کو بہ آہستگی خود سے جدا کیا اور بولا۔ "اسد جو سوچنا تھا سوچ چکا۔ اُمید ہے تم مجھے روکنے کی کوشش نہیں کرو گے۔"

اس نے اباقہ کے لہجے پر غور کیا اور سرتاپا کانپ گیا۔ یہ وہی لہجہ تھا جو پہاڑوں کو اپنی جگہ سے ہلا دیتا تھا اور لشکروں کے رُخ پھیر دیتا تھا۔ اس مخصوص لہجے نے اسد کو سمجھا دیا کہ اب وہی ہو گا جو اباقہ نے کہہ دیا ہے اور اب تمام دنیاوی طاقتیں مل کر بھی اس فیصلے کو بدل نہیں سکتیں۔ وہ بے دم سا ہو کر دری پر بیٹھ گیا اور ویران نظروں سے اباقہ کا چہرا تکنے لگا۔

.... اور یہ رخصت کا منظر تھا۔ دن کی مسافت ختم ہو گئی تھی۔ سرما کا تیز گام سورج مغرب کی جھیل میں غوطہ زن تھا۔ دور جنوب میں تبت کے سلسلہ ہائے کوہ کی برفیلی چوٹیاں سورج کی الوداعی کرنوں میں چمک رہی تھی۔ اباقہ علی کو کندھے پر اٹھائے جانے کو تیار ہو چکا تھا۔ شاید وہ جس طرح آیا تھا۔ ویسے ہی واپس جانا چاہتا تھا۔ اس کے جسم پر ایک لنگوٹ کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ یہاں تک کہ سواری کے لیے گھوڑا بھی نہیں تھا۔ وہ اس دنیائے رنگ وبو کی ہر شے یہیں چھوڑ کر جا رہا تھا۔ اگر لے جا رہا تھا تو علی کو۔ جو کچھ حیران سا اس کے کندھے پر بیٹھا اپنی ننگی ٹانگیں ہلاتا سوچ رہا تھا کہ وہ جنگل کیسا ہو گا جہاں اسے اب رہنا ہے۔ اس کی آنکھوں .... میں سہانے منظر گھوم رہے تھے۔ ہرنوں کی قطاریں'

شہد کے چھتے' برفانی ریچھ' بھیڑیوں کے غول اور جنگلی پھلوں سے لدے ہوئے درخت۔ وہ اپنے ہم سفر کی دلی کیفیت سے قطعی بے خبر تھا۔

اباقہ نے الوداعی نگاہوں سے مارینا اور اسد کو دیکھا اسد نے آگے بڑھ کر اباقہ کے ہاتھ مضبوطی سے تھامے اور بولا۔

"اباقہ! ہم تمہارا انتظار کریں گے۔ موسم موسم تمہاری راہ دیکھیں گے۔ ہمیں یقین ہے تم لوٹ آؤ گے۔"

اباقہ نے کہا۔ "شاید!" پھر اباقہ اور علی نے الوداع کہا اور رُخ پھیر کر دھیرے دھیرے مدھم تاریکی میں گم ہو گئے۔ مارینا نڈھال ہو کر ایک پتھر پر بیٹھ گئی۔

☆ ——— ☆ ——— ☆

اگلے روز اسد اور مارینا بھی پڑاؤ چھوڑ کر عراق کی طرف روانہ ہو رہے تھے۔ ہمیشہ ساتھ رہنے والی یادیں ان کے ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔ ہر قدم پر ان کے دل کا بوجھ دوگنا ہو جاتا تھا۔ وہ چلتے رہے۔ ان کے گھوڑے کبھی پہلو بہ پہلو اور کبھی آگے پیچھے بھاگتے رہے۔ مارینا پر گہری خاموشی طاری تھی۔ اس کی حسین آنکھیں کسی گہری سوچ میں غلطاں تھیں۔ اس وقت دوپہر ہو چکی تھی اور اسد کسی جگہ رکنے کا سوچ رہا تھا جب اچانک اسے احساس ہوا کہ مارینا رک گئی ہے۔ اس نے مڑ کر دیکھا وہ چند قدم کے فاصلے پر کھڑی تھی اور دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے سسک رہی تھی۔ ایک عرصے بعد اسد نے اُسے آج روتے دیکھا تھا۔ وہ گھوڑا گھما کر اس کے پاس پہنچا۔ دونوں گھوڑوں سے نیچے اتر آئے اور مارینا اس کے بازو سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"میں کیا کروں اسد .... مجھے کچھ سمجھ نہیں آتی۔ مجھے بتاؤ میں کیا کروں۔"

اسد نے ایک طویل سانس لی۔ بڑی محبت سے اس کے ریشمی بالوں پر ہاتھ پھیرا اور اسے کندھے سے لگائے بولا۔

"میری بہن! وہ بہت دُکھی ہے۔ بالکل ٹوٹا ہوا ہے اسے سہارے کی ضرورت ہے۔ اگر وہ تنہا رہا تو بالکل بکھر جائے گا .... ریزہ ریزہ ہو جائے گا۔ پھر اس کے ساتھ اس بچے کی زندگی بھی خطرے میں پڑ جائے گی۔ میری بہن! اب اسے تیری دانائی اور فراست ہی تباہی سے بچا سکتی ہے .... تیری محبت اس کے ساتھ رہی تو ممکن ہے کسی روز وہ سچ مچ اس دنیا میں لوٹ آئے .... ابھی کچھ نہیں بگڑا۔ تُو چاہے تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔"

مارینا اسد کے کندھے سے لگی روتی رہی۔

☆ ——— ☆ ——— ☆

رات کا وقت تھا۔ دریائے کیرولان کے کنارے آہوؤں کے جنگل میں ایک جگہ اباقہ درختوں میں علی کے ساتھ لیٹا ہوا تھا۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ علی سویا ہوا تھا مگر نیند اباقہ کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ یہ ایک ابر آلود رات تھی۔ بارش کی باریک پھوار گھنے درخت کے پتوں پر گر رہی تھی۔ ایک چھوٹا سا الاؤ علی کے بالکل قریب جل رہا تھا ورنہ اس سردی میں اسے نیند کہاں آتی۔

اباقہ کے چہرے پر دنیا جہاں کی محرومیاں تھیں۔ بیچارگی اور مایوسی اس کی آنکھوں میں نقش ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کی آنکھوں کے گوشے بار بار بھیگ رہے تھے اور وہ انہیں اپنے ہاتھوں سے صاف کرنے پر مجبور ہو جاتا تھا ابھی اس کے سفر کا آغاز تھا۔ ابھی گھنے جنگلوں میں اسے بہت دور جانا تھا۔ بہت دور۔ وہ سوچتا رہا اور اپنے بائیں ہاتھ کی انگلیوں سے بازو کو اس جگہ سے سہلاتا رہا جہاں "ماں اور انتقام" کے قدیم الفاظ کندہ تھے۔ اس کے کٹھن سفر کا آغاز انہی الفاظ سے ہوا تھا۔ سردار بوغالی سے لے کر شہزادی نتاشا اور خاقان اوغدائی تک وہ تمام چہرے اس کی نگاہوں میں گھوم گئے جو اس راہ پُر خار میں اسے ملے تھے۔ ان چہروں کو سوچتا سوچتا بالآخر وہ سو گیا .... نہ جانے وہ کتنی دیر تک سوتا رہا۔ رات کے تیسرے پہر' کوئی وقت تھا جب اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔ اسے محسوس ہوا جیسے ملائم بالوں والا کوئی جانور اس کے پاؤں میں رینگ رہا ہے۔ اباقہ اس جنگل سے اچھی طرح آگاہ تھا۔ یہاں بے ضرر قسم کے چھوٹے جانوروں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ اس کی پاؤں میں کیا ہو سکتا ہے۔ پھر اس نے آہستگی سے سر اٹھایا اور پاؤں پر نگاہ ڈالی۔ دفعتاً اس کی تمام حسیات سمٹ کر آنکھوں میں آگئیں۔ وہ سکتے کے عالم میں دیکھتا چلا گیا۔ اس کے پاؤں میں ایک انسانی جسم تھا۔ ایک عورت تھی .... اور یہ عورت اس کے لیے دنیا کی محبوب ترین عورت تھی .... ماریتا۔ وہ اس کے پاؤں پر جھکی ہوئی تھی۔ آگ کی روشنی اس کے خدوخال پر منعکس ہو رہی تھی۔ اس کا چاند سا چہرا اباقہ کے بھدے اور میلے پیروں سے چھو رہا تھا اور اس کی ریشمی زلفوں نے اباقہ کی پنڈلیوں کو ڈھانپ رکھا تھا۔ وہ رو رہی تھی .... تحیر اور سنسنی کی ایک لہر سرتا پیر اباقہ کے جسم میں دوڑ گئی۔ وہ تڑپ کر اٹھا اور اس نے ماریتا کو دونوں کندھوں سے تھام لیا اس کی گرفت لرز رہی تھی۔ وہ خوابناک آواز میں بولا۔

"ماریتا .... تم .... یہاں؟"

ماریتا نے آنسوؤں سے بھیگا ملیح چہرا اٹھایا اور چاندنی جیسی مہربان اور جھرنوں جیسی خوبصورت آواز میں بولی۔ "ہاں .... میں۔"

اباقہ منہ کھولے اسے دیکھتا رہا پھر بولا۔ "ماریتا .... یہاں .... کس لئے آئی ہو؟"

ماریتا پُر عزم لہجے میں بولی۔ "تمہارے ساتھ جانے کے لیے۔"

"کہاں؟"

"دنیا کے آخری کنارے تک۔"

یکایک اباقہ کے دل کی مرجھائی ہوئی کلی کھلنے لگی عجیب بے قراری سے اس نے آگے بڑھ کر ماریتا کو گلے سے لگا لیا۔ اس جذباتی کوشش میں اس کا پاؤں تھوڑا سا پھسلا اور وہ دونوں ڈھلوان پر لڑھک کر چند گز نشیب میں چلے گئے۔ ہلکی بارش نے یہاں معمولی پانی جمع کر رکھا تھا۔ وہ دونوں کیچڑ میں لت پت ہو گئے اور بارش کی پھوار جو اب براہ راست ان کے جسموں پر پڑ رہی تھی انہیں اور بھی شرابور کرنے لگی .... لیکن وہ دونوں جیسے دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو چکے تھے۔ سردی' گرمی' بارش' کیچڑ' تاریکی' جنگل ان چیزوں کی ان کے نزدیک کوئی اہمیت نہ رہ گئی تھی۔ وہ ایک دوسرے میں کھو گئے تھے۔ اس وقت جہاں وہ تھے وہاں صرف محبت اوڑھنا اور محبت بچھونا تھی۔ ان کے کانوں میں صرف وصال کے نغمے گونج رہے تھے .... لازوال محبت کے پر لگائے۔ عطر بیز ہواؤں پر اُڑتے وہ سہانے خوابوں کی منزل کی طرف اُٹھتے جا رہے تھے۔ اگر دنیا میں کہیں محبت تھی تو آج یہاں تھی۔ اگر دنیا میں کہیں سچی خوشی تھی تو آج یہاں تھی۔ اگر کوئی ویرانوں کا حسن دیکھنا چاہتا تھا تو آج ان درختوں تلے دیکھ سکتا تھا۔ اگر کوئی دنیا کی حسین ترین سرگوشیاں سننا چاہتا تھا تو اس تاریکی سے کان لگا کر سن سکتا تھا .... اور اگر کسی کو خدائے رحیم و کریم کو دیکھنے کی تمنا تھی تو وہ اُسے ٹھیک اس گھڑی یہاں مل سکتا تھا۔ جنگل میں خوشبو کے ڈیرے تھے اور غیر مرئی نغموں کی گونج تھی۔

اور .... قریباً یہی وہ وقت تھا جب اسد اللہ' ماریتا کو اباقہ اور علی کے پاس چھوڑ کر گھوڑا بھگاتا ہوا واپس جا رہا تھا۔ دریائے کیرولان کے کنارے آخر شب کی خنک ہوا میں وہ آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں جدائیوں کا گہرا غم تھا لیکن ایک اطمینان بھی تھا۔ وہ تصور میں اباقہ اور ماریتا کے شاداں چہرے دیکھ رہا تھا .... اب اس کی منزل سینکڑوں میل دور شہر بلخ کی بستی تھی۔ جہاں اس کی بیوی اور بچہ رہتے تھے۔

دور کہیں دریا کے پاٹ پر کوئی کشتی رواں تھی۔ دیہاتی مچھیروں کی کوئی ٹولی پچھلی رات کی تیرگی میں شکار کی تلاش میں روانہ ہو رہی تھی۔ باد صبا کے رخ پر بادبان کھولے وہ مغرب کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اُن کی خمار آلود آوازیں ایک قدیم گیت کی صورت

فضاؤں میں ابھر رہی تھیں۔ ترکی زبان کے اس گیت کا مطلب کچھ یوں تھا۔

ہم طوفانوں کے بیٹے ہیں۔
ہم نے گردابوں میں زندگی گزاری ہے۔
ہم نے جھکنا نہیں سیکھا' ہم نے رُکنا نہیں سیکھا۔
ہر طوفان نوح کے بعد ہم پھر زندہ ہوتے ہیں۔
ٹوٹی پتواروں کی جگہ نئی پتواریں بناتے ہیں
اور اُن ساتھیوں کا انتظار کرتے ہیں جو ہم سے بچھڑ گئے تھے۔
ہمیں یقین رہتا ہے کہ وہ ہم سے آملیں گے۔
اور جب وہ آملتے ہیں تو ہم ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر
نئی منزلوں کی جانب رواں ہو جاتے ہیں۔
ہم طوفانوں کے بیٹے ہیں۔
ہم نے گردابوں میں زندگی گزاری ہے۔

☆------ تمت بالخیر ------☆